

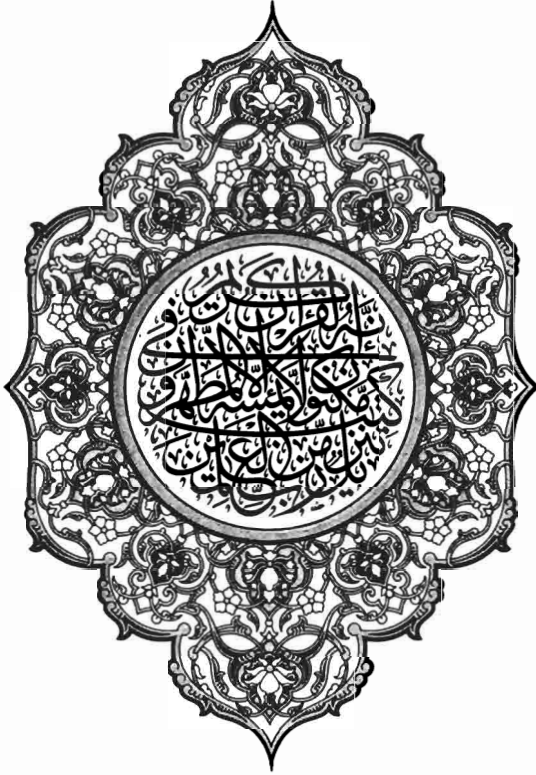
القرآن الكريم
وترجمة معانيه وتفسيره إلى
اللغة الأردنية

Translation of the Meanings and
interpretations of
THE NOBLE QURAN
in the Urdu Language

القرآن الكريم

وترجمته معانيه وتفسيره
إلى اللغة الأردنية

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي آتَانَا هَذَا وَبِالْحَمْدِ نَعْبُدُهُ



اس قرآن کریم صحیح تخریج کی طباعت کے مکرم دینے کا شرف فرما رہے ہیں ملکیت سعودی عرب خادم حسین شینین شاہ نمبرین
عبدالعزیز آل سعود کو حاصل ہوا۔

تقدیم بالاعتراف طباعة هذا المصحف الشريف وترجمة معانيه
عبدالعزیز آل سعود بن عبدالمعز آل سعود
ملك المملكة العربية السعودية

هَذَا الْمُصْحَفُ الشَّرِيفُ وَتَرْجَمَهُ مَعَانِيهِ
هَدِيَّةً مِنْ خَادِمِ الْحَرَمَيْنِ الشَّرِيفَيْنِ الْمَلِكِ فَهْدِ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ آلِ سَعُودٍ

شَوْرَعٌ مَجَانًا



مَجِيعُ الْمَلِكِ الْفَهْدِ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ آلِ سَعُودٍ الشَّرِيفِ

یہ قرآن شریف مع ترجمہ و تفسیر خادمِ حرمین شریفین
شاہ فہد بن عبد العزیز آل سعود کی طرف سے ہدیہ ہے

مفت تقسیم کے لئے



شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس

مقدمة

بقلم معالي الشيخ: صالح بن عبدالعزيز بن محمد آل الشيخ
وزير الشؤون الإسلامية والأوقاف والدعوة والإرشاد
المشرف العام على المجمع

الحمد لله رب العالمين ، القائل في كتابه الكريم :
﴿ ... قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ﴾ .
والصلاة والسلام على أشرف الأنبياء والمرسلين ، نبينا محمد ، القائل :
((خيركم من تعلم القرآن وعلمه)) .

أما بعد :

فإنفاذاً لتوجيهات خادم الحرمين الشريفين الملك فهد بن عبدالعزيز آل سعود ، حفظه الله ، بالعبارة بكتاب الله ، والعمل على تيسير نشره ، وتوزيعه بين المسلمين في مشارق الأرض ومغاربها ، وتفسيره ، وترجمة معانيه إلى مختلف لغات العالم .
وإيماناً من وزارة الشؤون الإسلامية والأوقاف والدعوة والإرشاد بالمملكة العربية السعودية ، بأهمية ترجمة معاني القرآن الكريم ، إلى جميع لغات العالم المهمة ، تسهيلاً لفهمه على المسلمين الناطقين بغير العربية ، وتحقيقاً للبلاغ المأمور به في قوله ﷺ : ((بلِّغوا عني ولو آية)) .
وخدمة لإخواننا الناطقين باللغة الأردنية ، يطيب لمجمع الملك فهد لطباعة المصحف الشريف بالمدينة المنورة ، أن يقدم للقارئ الكريم هذه الترجمة الأردنية ، التي قام بها فضيلة الشيخ محمد الجوناكروهي . مع تفسير فضيلة الشيخ صلاح الدين يوسف . وراجعها من قبل المجمع كل من فضيلة الشيخين د. وصي الله بن محمد عباس و د. أخت جمال لقمان .
ولحمد الله سبحانه وتعالى أن وفق لإحجاز هذا العمل العظيم ، الذي نرجو أن يكون خالصاً لوجهه الكريم ، وأن ينفع به الناس .

إننا لنندرك أن ترجمة معاني القرآن الكريم ، مهما بلغت دقتها ستكون قاصرة عن أداء المعاني العظيمة التي يدل عليها النص القرآني المعجز ، وأن المعاني التي تؤدبها الترجمة إنما هي حصيلة ما بلغه علم المترجم في فهم كتاب الله الكريم ، وأنه يعتريها ما يعتري عمل البشر كله من خطأ ونقص .

ومن ثم نرجو من كل قارئ لهذه الترجمة أن يسواي لمجمع الملك فهد لطباعة المصحف الشريف بالمدينة النبوية ، بما قد يجده فيها من خطأ أو نقص أو زيادة ، للإفادة من الاستدراكات في الطباعات القادمة إن شاء الله .

والله الموفق ، وهو الهادي إلى سواء السبيل ، اللهم تقبل منا إنك أنت السميع العليم .

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

از قلم عالیٰ الشیخ صلح بن عبدالعزیز بن محمد آل الشیخ

وزیر اسلامی امور اوقاف اور دعوت و ارشاد

نگران اعلیٰ مجمع الملک فہد

الحمد لله رب العالمین، القائل فی کتابہ الکریم ﴿ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِیْنٌ ﴾ والصلاة والسلام علی أشرف الأنبیاء والمرسلین، نبینا محمد القائل: «خیرکم من تعلّم القرآن وعلمه».

خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز آل سعود حفظہ اللہ نے کتاب الہی کی خدمت کے سلسلہ میں جو ہدایات دی ہیں ان میں قرآن مجید کی طباعت، وسیع پیمانے پر مسلمانان عالم میں اس کی تقسیم کے اہتمام اور دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ و تفسیر کی اشاعت پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔

”وزارۃ الشؤون الإسلامیة والأوقاف والدعوة والإرشاد“ کی نظر میں عربی زبان سے ناواقف مسلمانوں کے لئے قرآن فہمی کی راہ ہموار کرنے اور تبلیغ کی اس ذمہ داری سے عمدہ برآ ہونے کے لئے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی: ”ہلموا عنی ولو آتہ“ (میری جانب سے لوگوں تک پہنچاؤ خواہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو) میں بیان کی گئی ہے، دنیا کی تمام اہم زبانوں میں قرآن مجید کے مطالب کو منتقل کیا جانا انتہائی ضروری ہے۔

خادم الحرمین الشریفین کی انہی ہدایات اور وزارت برائے اسلامی امور کے اسی احساس کے پیش نظر ”مجمع الملک فہد لطباعة المصحف الشریف بالمدينة المنورة“ اردو داں قارئین کے استفادہ کے لئے قرآن مجید کا یہ اردو ترجمہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

یہ ترجمہ مولانا محمد جونائز صہمی کے قلم سے ہے اور تفسیری حواشی مولانا صلاح الدین یوسف کے تحریر کردہ ہیں۔ مجمع کی جانب سے نظر ثانی کا کام ڈاکٹر وصی اللہ بن محمد عباس اور ڈاکٹر اختر جمال لقمان ہردو حضرات نے انجام دیا ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے اس عظیم کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق دی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ خدمت قبول فرمائے اور لوگوں کے لئے اسے نفع بخش بنائے۔

یہ ایک سلسلہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید کا کوئی بھی ترجمہ خواہ کیسی ہی دقت نظر سے انجام پایا ہو، ان عظیم معانی کو کا حقد ادا کرنے سے بہر حال قاصر رہے گا جو اس معجزانہ متن کے عربی دہلاوت ہیں۔ نیز یہ کہ ترجمہ میں جن مطالب کو پیش کیا جاتا ہے وہ دراصل مترجم کی قرآن فہمی کا ما حاصل ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر انسانی کوشش کی طرح ترجمہ قرآن میں بھی غلطی، کوتاہی اور نقص کا امکان باقی رہتا ہے۔

اس بنا پر قارئین سے ہماری درخواست ہے کہ انہیں اس ترجمہ میں کسی مقام پر کوئی فروگزاشت نظر آئے تو ”مجمع الملک فہد لطباعة المصحف الشریف بالمدينة النبویة“ کو ضرور مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں ان استدراکات سے فائدہ اٹھایا جاسکے، واللہ الموفق وهو الهادی إلی سواء السبیل۔

اللهم تقبل منا إنك أنت السميع العليم.

سورۃ فاتحہ (۱) کہی ہے، (۳) اس میں سات آیتیں ہیں۔ (۳)

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔ (۱) (۳)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ①

(۱) سورۃ الفاتحہ قرآن مجید کی سب سے پہلی سورت ہے، جس کی احادیث میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ فاتحہ کے معنی آغاز اور ابتداء کے ہیں، اس لیے اسے اَلْفَاتِحَةُ یعنی فَاتِحَةُ الْكِتَابِ کہا جاتا ہے۔ اس کے اور بھی متعدد نام احادیث سے ثابت ہیں، مثلاً: اُمُّ الْقُرْآنِ، السَّبْعُ الْمَثَانِي، الْقُرْآنُ الْعَظِيمُ، الشِّفَاءُ، الرَّفِیَّةُ (دم) وَغَيْرَهَا مِنَ الْأَسْمَاءِ۔ اس کا ایک اہم نام "الصَّلَاةُ" بھی ہے، جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: «قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي»۔ الحدیث (صحیح مسلم - کتاب الصلوة) "میں نے صلاۃ (نماز) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر دیا ہے" مراد سورہ فاتحہ ہے جس کا نصف حصہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور اس کی رحمت و ربوبیت اور عدل و بادشاہت کے بیان میں ہے اور نصف حصے میں دعا و مناجات ہے جو بندہ اللہ کی بارگاہ میں کرتا ہے۔ اس حدیث میں سورۃ فاتحہ کو "نماز" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں اس کا پڑھنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ کے ارشادات میں اس کی خوب وضاحت کر دی گئی ہے، فرمایا: «لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ» (صحیح بخاری و صحیح مسلم) "اس شخص کی نماز نہیں جس نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی۔" اس حدیث میں (من) کا لفظ عام ہے جو ہر نمازی کو شامل ہے۔ منفرد ہو یا امام، یا امام کے پیچھے مقتدی۔ سری نماز ہو یا جری، فرض نماز ہو یا نفل۔ ہر نمازی کے لیے سورۃ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے۔

اس عموم کی مزید تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نماز فجر میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی نبی ﷺ کے ساتھ قرآن کریم پڑھتے رہے جس کی وجہ سے آپ ﷺ پر قراءت ہو جمل ہو گئی، نماز ختم ہونے کے بعد جب آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم بھی ساتھ پڑھتے رہے ہو؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا تَفْعَلُوا إِلَّا بِأَمْرِ الْقُرْآنِ؛ فَإِنَّهُ لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِهَا»۔ "تم ایسا مت کیا کرو (یعنی ساتھ ساتھ مت پڑھا کرو) البتہ سورۃ فاتحہ ضرور پڑھا کرو، کیونکہ اس کے پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی۔" (ابوداؤد، ترمذی، نسائی) اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا «مَنْ صَلَّى صَلَاةً لَمْ يَقْرَأْ فِيهَا بِأَمْرِ الْقُرْآنِ، فَهِيَ حِدَاجٌ - ثَلَاثًا - غَيْرُ تَمَامٍ» "جس نے بغیر فاتحہ کے نماز پڑھی تو اس کی نماز ناقص ہے" تین مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے عرض کیا گیا: إِنَّا نَكُونُ ذُرَّاءَ الْإِيمَانِ (امام کے پیچھے بھی ہم نماز پڑھتے ہیں، اس وقت کیا کریں؟) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (اقْرَأْ بِهَا فِي نَفْسِكَ) (امام کے پیچھے تم سورۃ فاتحہ اپنے جی میں پڑھو) صحیح مسلم۔

مذکورہ دونوں حدیثوں سے واضح ہوا کہ قرآن مجید میں جو آتا ہے: ﴿وَلِذَا قُورِئَ الْقُرْآنَ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا﴾ (الأعراف- ۲۰۴) ”جب قرآن پڑھا جائے تو سنو اور خاموش رہو“ یا حدیث ”إِذَا قُرَأَ فَأَنْصِتُوا (بشروط صحت)“ جب امام قراءت کرے تو خاموش رہو“ کا مطلب یہ ہے کہ جبری نمازوں میں مقتدی سورۃ فاتحہ کے علاوہ باقی قراءت خاموشی سے سنیں۔ امام کے ساتھ قرآن نہ پڑھیں۔ یا امام سورۃ فاتحہ کی آیات و قفوں کے ساتھ پڑھے تاکہ مقتدی بھی احادیث صحیحہ کے مطابق سورۃ فاتحہ پڑھ سکیں، یا امام سورۃ فاتحہ کے بعد اتنا سکتہ کرے کہ مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔ اس طرح آیت قرآنی اور احادیث صحیحہ میں الحمد للہ کوئی تعارض نہیں رہتا۔ دونوں پر عمل ہو جاتا ہے۔ جب کہ سورۃ فاتحہ کی ممانعت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خاکم بدن قرآن کریم اور احادیث صحیحہ میں ٹکراؤ ہے اور دونوں میں سے کسی ایک پر عمل ہی ہو سکتا ہے۔ بیک وقت دونوں پر عمل ممکن نہیں۔ فَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ هَذَا دیکھیے سورۃ اعراف، آیت ۲۰۴ کا حاشیہ (اس مسئلے کی تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو کتاب ”تحقیق الکلام“ از مولانا عبد الرحمن مبارک پوری و ”توضیح الکلام“ مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ وغیرہ)۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سلف کی اکثریت کا قول یہ ہے کہ اگر مقتدی امام کی قراءت سن رہا ہو تو نہ پڑھے اور اگر سن رہا ہو تو پڑھے (مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ۲۳/۲۶۵)

(۲) یہ سورت کلی ہے۔ کلی یا مدنی کا مطلب یہ ہے کہ جو سورتیں ہجرت (۱۳ نبوت) سے قبل نازل ہوئیں وہ کلی ہیں، خواہ ان کا نزول مکہ مکرمہ میں ہو، یا اس کے اطراف و جوانب میں اور مدنی وہ سورتیں ہیں جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں، خواہ مدینہ یا اس کے اطراف میں نازل ہوئیں یا اس سے دور۔ حتیٰ کہ مکہ اور اس کے اطراف ہی میں کیوں نہ نازل ہوئی ہوں۔

(۳) بسم اللہ کی بابت اختلاف ہے کہ آیا یہ ہر سورت کی مستقل آیت ہے، یا ہر سورت کی آیت کا حصہ ہے، یا یہ صرف سورۃ فاتحہ کی ایک آیت ہے یا یہ کسی بھی سورت کی مستقل آیت نہیں ہے، اسے صرف دوسری سورت سے ممتاز کرنے کے لیے ہر سورت کے آغاز میں لکھا جاتا ہے۔ قراء مکہ و کوفہ نے اسے سورۃ فاتحہ سمیت ہر سورت کی آیت قرار دیا ہے، جبکہ قراء مدینہ، بصرہ و شام نے اسے کسی بھی سورت کی آیت تسلیم نہیں کیا ہے، سوائے سورۃ نمل کی آیت ۳۰ کے کہ اس میں بالاتفاق بسم اللہ اس کا جزو ہے۔ اسی طرح جبری نمازوں میں اس کے اونچی آواز سے پڑھنے میں بھی اختلاف ہے۔ بعض اونچی آواز سے پڑھنے کے قائل ہیں اور بعض سری آواز سے (فتح القدیر) اکثر علمائے سری آواز سے پڑھنے کو راجح قرار دیا ہے۔ تاہم جبری آواز سے بھی پڑھنا جائز ہے۔

(۴) بسم اللہ کے آغاز میں افزاً، ابداً یا اَنْلُوْ حذوف ہے یعنی اللہ کے نام سے پڑھتا، یا شروع کرتا یا تلاوت کرتا ہوں۔ ہر اہم کام کے شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ حکم دیا گیا ہے کہ کھانے، زنج، وضو اور جماع سے پہلے بسم اللہ پڑھو۔ تاہم قرآن کریم کی تلاوت کے وقت بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھنا بھی ضروری ہے ﴿فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾ (النحل- ۹۸) ”جب تم قرآن کریم پڑھنے لگو تو اللہ کی جناب میں شیطان رجیم سے پناہ مانگو“۔

سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے (۱) جو تمام جہانوں کا
پالنے والا ہے۔ (۲)
بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا۔ (۳)
بدلے کے دن (یعنی قیامت) کا مالک ہے۔ (۴)

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝

(۱) الحمد میں ال، استغراق یا انحصار کے لیے ہے، یعنی تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، یا اس کے لیے خاص ہیں، کیوں کہ تعریف کا اصل مستحق اور سزاوار صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ کسی کے اندر کوئی خوبی، حسن یا کمال ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کا پیدا کردہ ہے اس لیے حمد (تعریف) کا مستحق بھی وہی ہے۔ اللہ یہ اللہ کا ذاتی نام ہے، اس کا استعمال کسی اور کے لیے جائز نہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلَّهِ یہ کلمہ شکر ہے جس کی بڑی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔ ایک حدیث میں لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ كُوْا أَفْضَلُ الذِّكْرِ اور اَلْحَمْدُ لِلَّهِ كُوْا أَفْضَلُ الدُّعَاءِ کہا گیا ہے۔ (ترمذی، نسائی وغیرہ) صحیح مسلم اور نسائی کی روایت میں ہے اَلْحَمْدُ لِلَّهِ تَمْلَأُ الْمِيزَانَ "اَلْحَمْدُ لِلَّهِ مِيزَانٌ كُوْبُهُ رِيْتَا" اسی لیے ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ اللہ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ ہر کھانے پر اور پینے پر بندہ اللہ کی حمد کرے۔ (صحیح مسلم)۔

(۲) رَبِّ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے، جس کے معنی ہیں ہر چیز کو پیدا کر کے اس کی ضروریات مہیا کرنے اور اس کو تکمیل تک پہنچانے والا۔ اس کا استعمال بغیر اضافت کے کسی اور کے لیے جائز نہیں۔ عَالَمِيْنَ عَالَمٌ (جہان) کی جمع ہے۔ ویسے تو تمام خلائق کے مجموعے کو عالم کہا جاتا ہے، اسی لیے اس کی جمع نہیں لائی جاتی۔ لیکن یہاں اس کی ربوبیت کاملہ کے اظہار کے لیے عالم کی بھی جمع لائی گئی ہے، جس سے مراد مخلوقات کی الگ الگ جنسیں ہیں۔ مثلاً عالم جن، عالم انس، عالم ملائکہ اور عالم وحوش و طیور وغیرہ۔ ان تمام مخلوقات کی ضرورتیں ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں، لیکن رَبِّ الْعَالَمِيْنَ سب کی ضروریات، ان کے احوال و ظروف اور طباع و اجسام کے مطابق مہیا فرماتا ہے۔

(۳) رَحْمٰنٌ بِرَوْزِنٍ فَعْلَانٌ اور رَحِيْمٌ بِرَوْزِنٍ فَعِيْلٌ ہے۔ دونوں مبالغے کے صیغے ہیں، جن میں کثرت اور دوام کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بہت رحم کرنے والا ہے اور اس کی یہ صفت دیگر صفات کی طرح دائمی ہے۔ بعض علما کہتے ہیں: رَحْمٰنٌ میں رَحِيْمٌ کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے، اسی لیے رَحْمٰنٌ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ کہا جاتا ہے۔ دنیا میں اس کی رحمت عام ہے جس سے بلا تخصیص کافر و مومن سب فیض یاب ہو رہے ہیں اور آخرت میں وہ صرف رحیم ہو گا، یعنی اس کی رحمت صرف مومنین کے لیے خاص ہو گی۔ اَللّٰهُمَّ! اجْعَلْنَا مِنْهُمْ (آمین)

(۴) دنیا میں بھی اگرچہ مکافات عمل کا سلسلہ ایک حد تک جاری رہتا ہے، تاہم اس کا مکمل ظہور آخرت میں ہو گا اور اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کے اچھے یا برے اعمال کے مطابق مکمل جزا اور سزا دے گا۔ اسی طرح دنیا میں عارضی طور پر اور بھی کئی لوگوں کے پاس تحت الاسباب اختیارات ہوتے ہیں، لیکن آخرت میں تمام اختیارات کا مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اس روز فرمائے گا: لَمَنِ النُّمْلُ الْيَوْمَ؟ (آج کس کی بادشاہی ہے؟) پھر وہی جواب دے گا: اللّٰهُ الْوَحِيْدُ الْقَهَّارُ

ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔^(۱) (۵)

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ سَتَعِينُ ﴿۵﴾

(صرف ایک غالب اللہ کے لیے) ﴿يَوْمَ لَا تَنبُتُ الشَّجَرُ لِمَنِّسٍ شَيْئًا وَالْأَنْرُ يُوقَدُ مِن نَّارٍ﴾ (الانفطار) ”اس دن کوئی ہستی کسی کے لیے اختیار نہیں رکھے گی، سارا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہو گا۔“ یہ ہو گا جزا کا دن۔

(۱) عبادت کے معنی ہیں کسی کی رضا کے لیے انتہائی تذلل و عاجزی اور کمال خشوع کا اظہار اور بقول ابن کثیر ”شریعت میں کمال محبت، خضوع اور خوف کے مجموعے کا نام ہے“ یعنی جس ذات کے ساتھ محبت بھی ہو، اس کی مانوق الاسباب طاقت کے سامنے عاجزی و بے بسی کا اظہار بھی ہو اور اسباب و مانوق الاسباب ذرائع سے اس کی گرفت کا خوف بھی ہو۔ سیدھی عبارت (نَعْبُدُكَ وَنَسْتَعِينُكَ) (ہم تیری عبادت کرتے اور تجھ سے مدد چاہتے ہیں) ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہاں مفعول کو فعل پر مقدم کر کے ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ سَتَعِينُ﴾ فرمایا، جس سے مقصد اختصاص پیدا کرنا ہے، یعنی ”ہم تیری ہی عبادت کرتے اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں“ نہ عبادت اللہ کے سوا کسی اور کی جائز ہے اور نہ استعانت ہی کسی اور سے جائز ہے۔ ان الفاظ سے شرک کا سدباب کر دیا گیا ہے، لیکن جن کے دلوں میں شرک کا روگ راہ پا گیا ہے، وہ مانوق الاسباب اور ماتحت الاسباب استعانت میں فرق کو نظر انداز کر کے عوام کو مغالطے میں ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو ہم بیمار ہو جاتے ہیں تو ڈاکٹر سے مدد حاصل کرتے ہیں، بیوی سے مدد چاہتے ہیں، ڈرائیور اور دیگر انسانوں سے مدد کے طالب ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ یہ باور کراتے ہیں کہ اللہ کے سوا اوروں سے مدد مانگنا بھی جائز ہے۔ حالانکہ اسباب کے ماتحت ایک دوسرے سے مدد چاہنا اور مدد کرنا یہ شرک نہیں ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے، جس میں سارے کام ظاہری اسباب کے مطابق ہی ہوتے ہیں، حتیٰ کہ انبیاء بھی انسانوں کی مدد حاصل کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿مَنْ أَنْصَرَنِي إِلَى اللَّهِ﴾ (الصف) ”اللہ کے دین کے لیے کون میرا مددگار ہے؟“ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو فرمایا: ﴿وَتَقَاوَمُوا عَلَى الْيَوْمِ وَاللَّعُونِ﴾ (المائدة - ۲) ”نیکی اور تقویٰ کے کاموں پر ایک دوسرے کی مدد کرو ظاہریات ہے کہ یہ تعاون ممنوع ہے، نہ شرک، بلکہ مطلوب و محمود ہے۔ اس کا اصطلاحی شرک سے کیا تعلق؟ شرک تو یہ ہے کہ ایسے شخص سے مدد طلب کی جائے جو ظاہری اسباب کے لحاظ سے مدد نہ کر سکتا ہو، جیسے کسی فوت شدہ شخص کو مدد کے لیے پکارنا، اس کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھنا، اس کو نافع و ضار باور کرنا اور دور و نزدیک سے ہر ایک کی فریاد سننے کی صلاحیت سے بہرہ ور تسلیم کرنا۔ اس کا نام ہے مانوق الاسباب طریقے سے مدد طلب کرنا، اور اسے خدائی صفات سے متصف ماننا۔ اسی کا نام شرک ہے، جو بد قسمتی سے محبت اولیاء کے نام پر مسلمان ملکوں میں عام ہے۔ أَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ۔ توحید کی تین قسمیں: اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ توحید کی تین اہم قسمیں بھی مختصر بیان کر دی جائیں۔ یہ قسمیں ہیں۔ توحید ربوبیت، توحید الوہیت اور توحید صفات۔

۱۔ توحید ربوبیت کا مطلب ہے کہ اس کائنات کا خالق، مالک، رازق اور مدبر صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس توحید کو ملاحظہ

إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿١﴾ | ہمیں سیدھی (اور سچی) راہ دکھا۔ (۶)

و زادقہ کے علاوہ تمام لوگ مانتے ہیں، حتیٰ کہ مشرکین بھی اس کے قائل رہے ہیں اور ہیں، جیسا کہ قرآن کریم نے مشرکین مکہ کا اعتراف نقل کیا ہے۔ مثلاً فرمایا: ”اے پیغمبر (ﷺ)! ان سے پوچھیں کہ تم کو آسمان و زمین میں رزق کون دیتا ہے؟ یا (تمہارے) کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے اور بے جان سے جاندار اور جاندار سے بے جان کون پیدا کرتا ہے اور دنیا کے کاموں کا انتظام کون کرتا ہے؟ جھٹ کہہ دیں گے کہ اللہ“ (یعنی یہ سب کام کرنے والا اللہ ہے)۔ (سورہ یونس- ۳۱) دوسرے مقام پر فرمایا: اگر آپ ﷺ ان سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کا خالق کون ہے؟ تو یقیناً یہی کہیں گے کہ اللہ (الزمر- ۳۸) ایک اور مقام پر فرمایا: ”اگر آپ ﷺ ان سے پوچھیں کہ زمین اور زمین میں جو کچھ ہے، یہ سب کس کا مال ہے؟ ساتوں آسمان اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ ہر چیز کی بادشاہی کس کے ہاتھ میں ہے؟ اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے، اور اس کے مقابل کوئی پناہ دینے والا نہیں۔ ان سب کے جواب میں یہ یہی کہیں گے کہ اللہ یعنی یہ سارے کام اللہ ہی کے ہیں۔ (المؤمنون- ۸۳-۸۹) وَغَيْرَهَا مِنَ الْآيَاتِ

۲- توحید الوہیت کا مطلب ہے کہ عبادت کی تمام اقسام کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور عبادت ہر وہ کام ہے جو کسی مخصوص ہستی کی رضا کے لئے، یا اس کی ناراضی کے خوف سے کیا جائے، اس لیے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ صرف یہی عبادت نہیں ہیں بلکہ کسی مخصوص ہستی سے دعا و التجا کرنا، اس کے نام کی نذر و نیاز دینا، اس کے سامنے دست بستہ کھڑا ہونا، اس کا طواف کرنا، اس سے طبع اور خوف رکھنا وغیرہ بھی عبادت ہیں۔ توحید الوہیت یہ ہے کہ یہ تمام کام صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے کیے جائیں۔ قبر پرستی کے مرض میں مبتلا عوام و خواص اس توحید الوہیت میں شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور مذکورہ عبادت کی بہت سی قسمیں وہ قبروں میں مدفون افراد اور فوت شدہ بزرگوں کے لیے بھی کرتے ہیں جو سراسر شرک ہے۔

۳- توحید صفات کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو صفات قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہیں، ان کو بغیر کسی تاویل اور تحریف کے تسلیم کریں اور وہ صفات اس انداز میں کسی اور کے اندر نہ مائیں۔ مثلاً جس طرح اس کی صفت علم غیب ہے، یا دور اور نزدیک سے ہر ایک کی فریاد سننے پر وہ قادر ہے، کائنات میں ہر طرح کا تصرف کرنے کا اسے اختیار حاصل ہے، یہ یا اس قسم کی اور صفات الہیہ ان میں سے کوئی صفت بھی اللہ کے سوا کسی نبی، ولی یا کسی بھی شخص کے اندر تسلیم نہ کی جائیں۔ اگر تسلیم کی جائیں گی تو یہ شرک ہو گا۔ افسوس ہے کہ قبر پرستوں میں شرک کی یہ قسم بھی عام ہے اور انہوں نے اللہ کی مذکورہ صفات میں بہت سے بندوں کو بھی شریک کر رکھا ہے۔ اَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ.

(۱) ہدایت کے کئی مفہوم ہیں۔ راستے کی طرف رہنمائی کرنا، راستے پر چلا دینا، منزل مقصود پر پہنچا دینا۔ اسے عربی میں ارشاد، توفیق، الہام اور دلالت سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی ہماری صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرما، اس پر چلنے کی توفیق اور اس پر استقامت نصیب فرما، تاکہ ہمیں تیری رضا (منزل مقصود) حاصل ہو جائے۔ یہ صراط مستقیم محض عقل اور ذہانت سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ صراط مستقیم وہی ”الإسلام“ ہے، جسے نبی ﷺ نے دنیا کے سامنے پیش فرمایا اور جو

ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام کیا^(۱) ان کی نہیں جن پر غضب کیا گیا اور نہ گمراہوں کی۔^(۲) (۷)

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۚ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ
وَالضَّالِّينَ ۝

اب قرآن و احادیث صحیحہ میں محفوظ ہے۔

(۱) یہ صراط مستقیم کی وضاحت ہے کہ یہ سیدھا راستہ وہ ہے جس پر وہ لوگ چلے، جن پر تیرا انعام ہوا۔ یہ منعم علیہ گروہ ہے انبیاء شہداء صدیقین اور صالحین کا۔ جیسا کہ سورہ نساء میں ہے ﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا﴾ (النساء۔ ۶۹) ”اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں، وہ (قیامت کے روز) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین، اور ان لوگوں کی رفاقت بہت ہی خوب ہے۔“ اس آیت میں یہ بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ انعام یافتہ لوگوں کا یہ راستہ اطاعت الہی اور اطاعت رسول ﷺ ہی کا راستہ ہے، نہ کہ کوئی اور راستہ۔

(۲) بعض روایات سے ثابت ہے کہ مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ (جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا) سے مراد یہودی اور ضالین (گمراہوں) سے مراد نصاریٰ (عیسائی) ہیں۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ مفسرین کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں، لا اَعْلَمُ خِلَافًا بَيْنَ الْمُفَسِّرِينَ فِي تَفْسِيرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ: بِالْيَهُودِ وَالضَّالِّينَ، بِالنَّصَارَى، (فتح القدير) اس لیے صراط مستقیم پر چلنے کی خواہش رکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہود اور نصاریٰ دونوں کی گمراہیوں سے بچ کر رہیں۔ یہودی بڑی گمراہی ہی تھی کہ وہ جانتے بوجھے صحیح راستے پر نہیں چلتے تھے، آیات الہی میں تحریف اور حیلہ کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے، حضرت عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے، اپنے احبار اور رہبان کو حرام و حلال کرنے کا مجاز سمجھتے تھے۔ نصاریٰ کی بڑی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں غلو کیا اور انہیں ابن اللہ اور نَالِثٌ نَلَاثَةً (اللہ کا بیٹا اور تین خدا میں سے ایک) قرار دیا۔ افسوس ہے کہ امت محمدیہ میں بھی یہ گمراہیاں عام ہیں اور اسی وجہ سے وہ دنیا میں ذلیل و رسوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ضلالت کے گڑھے سے نکالے، تاکہ ادبار و کبکٹ کے بڑھتے ہوئے سامنے سے وہ محفوظ رہ سکے۔

سورہ فاتحہ کے آخر میں آمین کہنے کی نبی ﷺ نے بڑی تاکید اور فضیلت بیان فرمائی ہے۔ اس لیے امام اور مقتدی ہر ایک کو آمین کہنی چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (جری نمازوں میں) اونچی آواز سے آمین کہا کرتے تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم بھی، حتیٰ کہ مسجد گونج اٹھتی (ابن ماجہ۔ ابن کثیر) بنا بریں آمین اونچی آواز سے کہنا سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول یہ ہے۔ آمین کے معنی مختلف بیان کیے گئے ہیں۔ وَكَذٰلِكَ فَيُكْبَرُ، (اسی طرح ہو) وَلَا تُخَيِّبْ رَجَاءَنَا، (ہمیں مارا نہ کرنا) وَاللّٰهُمَّ! اسْتَجِبْ لَنَا، (اے اللہ ہماری دعا قبول فرمائے)۔

سورۃ بقرہ مدنی ہے^(۱) اور اس میں دوسو چھیالیس آیات اور چالیس رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الم^(۲) (۱) اس کتاب (کے اللہ کی کتاب ہونے) میں کوئی شک نہیں،^(۳) پر ہمیں گاروں کو راہ دکھانے والی ہے۔^(۴)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْاِیْمَانَ وَالتَّقْوٰی وَالتَّوْبَةَ وَالتَّوْبَةَ وَالتَّوْبَةَ

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْاِیْمَانَ وَالتَّقْوٰی وَالتَّوْبَةَ وَالتَّوْبَةَ وَالتَّوْبَةَ

(۱) اس سورت میں آگے چل کر گائے کا واقعہ بیان ہوا، اس لیے اسے بقرہ (گائے کے واقعے والی سورت) کہا جاتا ہے۔ حدیث میں اس کی ایک خاص فضیلت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ جس گھر میں یہ پڑھی جائے، اس گھر سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ فرمایا: لَا تَجْعَلُوْا بَیْوتَکُمْ قُبُوْرًا، فَاِنَّ النِّیْتَ الَّذِیْ تَقْرَؤُا فِیْهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ لَا یَدْخُلُهٗ الشَّیْطَانُ (صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین، باب استحباب صلاة النافلة فی بیتہ.....) نزول کے اعتبار سے یہ مدنی دور کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے البتہ اس کی بعض آیات مجتہد الوداع کے موقع پر نازل ہوئیں۔ بعض علما کے نزدیک اس میں ایک ہزار خبر، ایک ہزار احکام اور ایک ہزار منہیات ہیں۔ (ابن کثیر)

(۲) انہیں حروف مقطعات کہا جاتا ہے، یعنی علیحدہ علیحدہ پڑھے جانے والے حروف۔ ان کے معنی کے بارے میں کوئی مستند روایت نہیں ہے۔ واللہ اَعْلَمُ بِمُرَادِهِ۔ البتہ نبی ﷺ نے یہ ضرور فرمایا ہے کہ میں نہیں کہتا کہ آئمہ ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے اور ہر حرف پر ایک نیکی اور ایک نیکی کا اجر دس گنا ہے۔ (سنن ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فیمن قرأ حرفاً.....)

(۳) اس کے منزل من اللہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں جیسا کہ دوسرے مقام پر ہے: ﴿ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ الْکَرِیْمِ فِیْ یَوْمِ الْقٰیٰمَةِ عَلَی الْغٰلِیّٰیْنَ ﴾ (الم السجدۃ) بعض علما نے کہا ہے کہ یہ خبر بمعنی نھی ہے۔ اُنّٰی: لَا تَزِنٰوْا فِیْہِ (اس میں شک نہ کرو)۔ علاوہ ازیں اس میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان کی صداقت میں جو احکام و مسائل بیان کیے گئے ہیں، ان سے انسانیت کی فلاح و نجات وابستہ ہونے میں اور جو عقائد (توحید و رسالت اور معاد کے بارے میں) بیان کیے گئے ہیں، ان کے برحق ہونے میں کوئی شک نہیں۔

(۴) ویسے تو یہ کتاب الہی تمام انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نازل ہوئی ہے، لیکن اس چشمہ فیض سے سیراب صرف وہی لوگ ہوں گے، جو آپ حیات کے متلاشی اور خوف الہی سے سرشار ہوں گے۔ جن کے دل میں مرنے کے بعد اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر جواب دیں، کا احساس اور اس کی فکر ہی نہیں، جن کے اندر ہدایت کی طلب، یا گمراہی سے بچنے کا جذبہ ہی نہیں ہو گا تو انہیں ہدایت کہاں سے اور کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے؟

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿۱﴾

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمِمَّا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ
وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُؤْمِنُونَ ﴿۲﴾

أُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۳﴾

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنذِرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ

جو لوگ غیب پر ایمان لاتے ہیں^(۱) اور نماز کو قائم رکھتے ہیں^(۲) اور ہمارے دیئے ہوئے (مال) میں سے خرچ کرتے ہیں۔^(۳)

اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ کی طرف اتارا گیا اور جو آپ سے پہلے اتارا گیا،^(۴) اور وہ آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔^(۵)

یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں۔^(۵)

کافروں کو آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے، یہ لوگ

(۱) اُمُوذٌ غَيْبِيٌّ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کا ادراک عقل و حواس سے ممکن نہیں۔ جیسے ذات باری تعالیٰ، وحی الہی، جنت، دوزخ، ملائکہ، عذاب قبر اور حشر اجساد وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ اور رسول ﷺ کی بتلائی ہوئی ماورائے عقل و احساس باتوں پر یقین رکھنا، جزو ایمان ہے اور ان کا انکار کفر و ضلالت ہے۔

(۲) اقامت صلوة سے مراد پابندی سے اور سنت نبوی کے مطابق نماز کا اہتمام کرنا ہے، ورنہ نماز تو منافقین بھی پڑھتے تھے۔

(۳) اِنْفَاقٌ کا لفظ عام ہے، جو صدقات و اجبہ اور نائلہ دونوں کو شامل ہے۔ اہل ایمان حسب استطاعت دونوں میں کو تاہی نہیں کرتے، بلکہ ماں باپ اور اہل و عیال پر صحیح طریقے سے خرچ کرنا بھی اس میں داخل ہے اور باعث اجر و ثواب ہے۔

(۴) سچھلی کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ جو کتابیں انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئیں، وہ سب سچی ہیں، وہ اب اپنی اصل شکل میں دنیا میں پائی نہیں جاتیں، نیز اب ان پر عمل بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اب عمل صرف قرآن اور اس کی تشریح نبوی۔ حدیث۔ پر ہی کیا جائے گا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وحی و رسالت کا سلسلہ آنحضرت ﷺ پر ختم کر دیا گیا ہے، ورنہ اس پر بھی ایمان لانے کا ذکر اللہ تعالیٰ ضرور فرماتا۔

(۵) یہ ان اہل ایمان کا انجام بیان کیا گیا ہے جو ایمان لانے کے بعد تقویٰ و عمل اور عقیدہ صحیحہ کا اہتمام کرتے ہیں۔ محض زبان سے اظہار ایمان کو کافی نہیں سمجھتے۔ کامیابی سے مراد آخرت میں رضائے الہی اور اس کی رحمت و مغفرت کا حصول ہے۔ اس کے ساتھ دنیا میں بھی خوش حالی اور سعادت و کامرانی مل جائے تو سبحان اللہ۔ ورنہ اصل کامیابی آخرت ہی کی کامیابی ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ دوسرے گروہ کا تذکرہ فرما رہا ہے جو صرف کافر ہی نہیں، بلکہ اس کا کفر و عناد اس اہتمام تک پہنچا ہوا ہے جس کے بعد اس سے خیر اور قبول اسلام کی توقع ہی نہیں۔

لَا يُؤْمِنُونَ ۝

خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ
غَشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

ایمان نہ لائیں گے۔^(۱)

اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر
دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا
عذاب ہے۔^(۲)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے
دن پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ ایمان والے
نہیں ہیں۔^(۳)

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ
بِیُؤْمِنِينَ ۝

(۱) نبی ﷺ کی شدید خواہش تھی کہ سب مسلمان ہو جائیں اور اسی حساب سے آپ ﷺ کو شش فرماتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایمان ان کے نصیب میں ہی نہیں ہے۔ یہ وہ چند مخصوص لوگ ہیں جن کے دلوں پر مہر لگ چکی تھی (جیسے ابو جہل اور ابولہب وغیرہ) ورنہ آپ ﷺ کی دعوت و تبلیغ سے بے شمار لوگ مسلمان ہوئے، حتیٰ کہ پھر پورا جزیرہ عرب اسلام کے سایہ عاطفت میں آگیا۔

(۲) یہ ان کے عدم ایمان کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ چونکہ کفر و معصیت کے مسلسل ارتکاب کی وجہ سے ان کے دلوں سے قبول حق کی استعداد ختم ہو چکی ہے، ان کے کان حق بات سننے کے لیے آمادہ نہیں اور ان کی نگاہیں کائنات میں پھیلی ہوئی رب کی نشانیوں دیکھنے سے محروم ہیں تو اب وہ ایمان کس طرح لاسکتے ہیں؟ ایمان تو انہی لوگوں کے حصے میں آتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرتے اور ان سے معرفت کر دگار حاصل کرتے ہیں۔ اس کے برعکس لوگ تو اس حدیث کا مصداق ہیں جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ”مومن جب گناہ کر بیٹھتا ہے تو اس کے دل میں سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اگر وہ توبہ کر کے گناہ سے باز آجاتا ہے تو اس کا دل پہلے کی طرح صاف شفاف ہو جاتا ہے اور اگر وہ توبہ کی بجائے گناہ پر گناہ کرتا جاتا ہے تو وہ نقطہ سیاہ پھیل کر اس کے پورے دل پر چھا جاتا ہے۔“ نبی ﷺ نے فرمایا ”یہی وہ زنگ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے ﴿كَذَلِكَ يَمْسِرُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْفُرُونَ﴾ (المطففين: ۱۳) یعنی ”ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے۔“ (ترمذی، تفسیر سورہ مطففين) اسی کیفیت کو قرآن نے ”ختم“ (مہر لگ جانے) سے تعبیر فرمایا ہے، جو ان کی مسلسل بد اعمالیوں کا منطقی نتیجہ ہے۔

(۳) یہاں سے تیسرے گروہ منافقین کا تذکرہ شروع ہوتا ہے جن کے دل تو ایمان سے محروم تھے، مگر وہ اہل ایمان کو فریب دینے کے لیے زبان سے ایمان کا اظہار کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ نہ اللہ کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، کیوں کہ وہ تو سب کچھ جانتا ہے اور نہ اہل ایمان کو مستقل فریب میں رکھ سکتے ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے سے مسلمانوں کو ان کی فریب کاریوں سے آگاہ فرمادیتا تھا۔ یوں اس فریب کاری کا سارا نقصان خود انہی کو پہنچا کہ انہوں نے اپنی عاقبت برباد کر لی اور دنیا میں بھی رسوا ہوئے۔

وہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دیتے ہیں، لیکن دراصل وہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں، مگر سمجھتے نہیں۔ (۹)

ان کے دلوں میں بیماری تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں بیماری میں مزید بڑھا دیا^(۱۰) اور ان کے جھوٹ کی وجہ سے ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (۱۰)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں۔ (۱۱)

خبردار ہو! یقیناً یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں،^(۱۲) لیکن شعور (سمجھ) نہیں رکھتے۔ (۱۲)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اور لوگوں (یعنی صحابہ) کی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم ایسا ایمان لائیں جیسا یہی قوف لائے ہیں،^(۱۳) خبردار ہو جاؤ!

يُضِلُّعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَعْتَدُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٩﴾

فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ۗ وَاللَّهُ عَذَابُ الْعَالِمِينَ ﴿١٠﴾

وَإِذْ أَقْبَلْنَا لَهُمْ لَعْنَتَنَا وَإِنَّا لَكَاذِبُونَ ﴿١١﴾

إِنَّا لَنَعْلَمُ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِن لَّا يَشْعُرُونَ ﴿١٢﴾

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ امْنُوا كَمَا مَنَّ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ إِنَّا لَنَعْلَمُ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾

(۱) بیماری سے مراد وہی کفر و نفاق کی بیماری ہے، جس کی اصلاح کی فکر نہ کی جائے تو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح جھوٹ بولنا منافقین کی علامات میں سے ہے، جس سے اجتناب ضروری ہے۔

(۲) فساد، صلاح کی ضد ہے۔ کفر و معصیت سے زمین میں فساد پھیلتا ہے اور اطاعت الہی سے امن و سکون ملتا ہے۔ ہر دور کے منافقین کا کردار یہی رہا ہے کہ پھیلاتے وہ فساد ہیں، اشاعت وہ منکرات کی کرتے ہیں اور پامال حدود الہی کو کرتے ہیں اور سمجھتے یا دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ وہ اصلاح و ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔

(۳) ان منافقین نے ان صحابہ رضی اللہ عنہم کو ”بے وقوف“ کہا، جنہوں نے اللہ کی راہ میں جان و مال کی کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور آج کے منافقین یہ باور کراتے ہیں کہ نعوذ باللہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دولتِ ایمان ہی سے محروم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جدید و قدیم دونوں منافقین کی تردید فرمائی۔ فرمایا کسی اعلیٰ تر مقصد کے لیے دنیوی مفادات کو قربان کر دینا، بے وقوفی نہیں، عین عقل مندی اور سعادت ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسی سعادت مندی کا ثبوت مہیا کیا ہے، اس لیے وہ کچے مومن ہی نہیں، بلکہ ایمان کے لیے ایک معیار اور کسوٹی ہیں، اب ایمان انہی کا معیار ہو گا جو صحابہ کرام ہی کی طرح ایمان لائیں گے۔ ﴿وَإِن مِّن مِّنكُمْ يَهْتَدِي لِمَا مَنَعْتُمْ بِهِ قَدِ افْتَدَىٰ﴾ ﴿البقرة - ۱۷۷﴾

یقیناً یہی ہو قوف ہیں، لیکن جانتے نہیں۔^(۱) (۱۳)

اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان والے ہیں اور جب اپنے بڑوں کے پاس جاتے ہیں^(۲) تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو ان سے صرف مذاق کرتے ہیں۔ (۱۴)

اللہ تعالیٰ بھی ان سے مذاق کرتا ہے^(۳) اور انہیں ان کی سرکشی اور برکاوے میں اور بڑھادیتا ہے۔ (۱۵)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے میں خرید لیا، پس نہ تو ان کی تجارت^(۴) نے ان کو فائدہ پہنچایا اور نہ یہ ہدایت والے ہوئے۔ (۱۶)

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی،

وَاذِ الْقَوْمِ الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيْطَانِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ ﴿۱۳﴾

اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْبَهُونَ ﴿۱۴﴾

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبَّتْ بِتِجَارَتِهِمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿۱۵﴾

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَنَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ

(۱) ظاہر بات ہے کہ نفع عاجل (فوری فائدے) کے لیے نفع آجمل (دیر سے ملنے والے فائدے) کو نظر انداز کر دینا اور آخرت کی پائیدار اور دائمی زندگی کے مقابلے میں دنیا کی فانی زندگی کو ترجیح دینا اور اللہ کی بجائے لوگوں سے ڈرنا پرلے درجے کی سفاہت ہے جس کا ارتکاب ان منافقین نے کیا۔ یوں ایک مسلمہ حقیقت سے بے علم رہے۔

(۲) شیاطین سے مراد سردارانِ قریش و یہود ہیں جن کے ایمان پر وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے تھے، یا منافقین کے اپنے سردار۔

(۳) ”اللہ تعالیٰ بھی ان سے مذاق کرتا ہے“ کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ جس طرح مسلمانوں کے ساتھ استہزا و استخفاف کا معاملہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ بھی ان سے ایسا ہی معاملہ کرتے ہوئے انہیں ذلت و ادبار میں مبتلا کرتا ہے۔ اس کو استہزا سے تعبیر کرنا، زبان کا اسلوب ہے، ورنہ حقیقتاً یہ استہزا نہیں ہے، ان کے فعل استہزا کی سزا ہے جیسے ﴿وَيَجْزَىٰ سَيِّئَاتِهِمْ سَيِّئَاتٍ مِّثْلُهَا﴾ (الشوریٰ) ”برائی کا بدلہ، اسی کی مثل برائی ہے“ میں برائی کے بدلے کو برائی کہا گیا ہے حالانکہ وہ برائی نہیں ہے ایک جائز فعل ہے۔ اسی طرح ﴿يُخْلِجُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ﴾ ﴿وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ﴾ وغیرہ آیات میں ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ بھی ان سے استہزا فرمائے گا۔ جیسا کہ سورۃ حدید کی آیت ﴿يَوْمَ يَقُولُ الْمُنْفِقُونَ﴾ الایۃ میں وضاحت ہے۔

(۴) تجارت سے مراد ہدایت چھوڑ کر گمراہی اختیار کرنا ہے، جو سراسر گھائے کا سودا ہے۔ منافقین نے نفاق کا جامہ پہن کر یہی گھائے والی تجارت کی۔ لیکن یہ گھانا آخرت کا گھانا ہے، ضروری نہیں کہ دنیا میں ہی اس گھائے کا انہیں علم ہو جائے۔ بلکہ دنیا میں تو اس نفاق کے ذریعے سے انہیں جو فوری فائدے حاصل ہوتے تھے، اس پر وہ بڑے خوش ہوتے اور اس کی بنیاد پر اپنے آپ کو بہت دانا اور مسلمانوں کو عقل و فہم سے عاری سمجھتے تھے۔

پس آس پاس کی چیزیں روشنی میں آئی ہی تھیں کہ اللہ ان کے نور کو لے گیا اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا، جو نہیں دیکھتے۔ (۱۷)

بہرے، گونگے، اندھے ہیں۔ پس وہ نہیں لوٹتے۔ (۱۸)

یا آسانی برسات کی طرح جس میں اندھیراں اور گرج اور بجلی ہو، موت سے ڈر کر کرا کے کی وجہ سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے۔ (۱۹)

قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھیں اچک لے جائے، جب ان کے لئے روشنی کرتی ہے تو اس میں چلتے پھرتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا کرتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں (۲۰) اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کے کانوں اور آنکھوں کو

ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ﴿۱۷﴾

صُمُّوا بِكُمْ عُمَىٰ قَهْمًا لَا يُبْصِرُونَ ﴿۱۸﴾

أَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَنُبُقٌ يَّجْعَلُونَ
أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُخِيطٌ
بِالْكَافِرِينَ ﴿۱۹﴾

يَجَادُ الْبُرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهَا
وَإِذَا أظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ
وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۰﴾

(۱) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے: کہ نبی ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو کچھ لوگ مسلمان ہو گئے، لیکن پھر جلد ہی منافق ہو گئے۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اندھیرے میں تھا، اس نے روشنی جلائی جس سے اس کا ماحول روشن ہو گیا اور مفید اور نقصان دہ چیزیں اس پر واضح ہو گئیں؛ ذلتاً وہ روشنی بچھ گئی، اور وہ حسب سابق تاریکیوں میں گھر گیا۔ یہی حال منافقین کا تھا۔ پہلے وہ شرک کی تاریکی میں تھے، مسلمان ہوئے تو روشنی میں آگئے۔ حلال و حرام اور خیر و شرک پہچان گئے، پھر وہ دوبارہ کفر و نفاق کی طرف لوٹ گئے تو ساری روشنی جاتی رہی (فتح القدر)

(۲) یہ منافقین کے ایک دوسرے گروہ کا ذکر ہے جس پر کبھی حق واضح ہوتا ہے اور کبھی اس کی بابت وہ ریب و شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پس ان کے دل ریب و تردد میں اس بارش کی طرح ہیں جو اندھیروں (شکوہ، کفر اور نفاق) میں اترتی ہے، گرج چمک سے ان کے دل ڈر ڈر جاتے ہیں، حتیٰ کہ خوف کے مارے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔ لیکن یہ تدبیریں اور یہ خوف و دہشت انہیں اللہ کی گرفت سے نہیں بچا سکے گا، کیوں کہ وہ اللہ کے گھرے سے نہیں نکل سکتے۔ کبھی حق کی کرنیں ان پر پڑتی ہیں تو حق کی طرف جھک پڑتے ہیں، لیکن پھر جب اسلام یا مسلمانوں پر مشکلات کا دور آتا ہے تو پھر حیران و سرگردان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ (ابن کثیر) منافقین کا یہ گروہ آخر وقت تک تذبذب اور گونگو کا شکار اور قبول حق (اسلام) سے محروم رہتا ہے۔

بیکار کر دے۔^(۱) یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ (۲۰)

اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے کے لوگوں کو پیدا کیا، یہی تمہارا بچاؤ ہے۔ (۲۱)

جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتار کر اس سے پھل پیدا کر کے تمہیں روزی دی، خبردار باوجود جاننے کے اللہ کے شریک مقرر نہ کرو۔^(۲) (۲۲)

ہم نے جو کچھ اپنے بندے پر اتارا ہے اس میں اگر تمہیں شک ہو اور تم سچے ہو تو اس جیسی ایک سورت تو بنا لاؤ، تمہیں اختیار ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلا لو۔^(۳) (۲۳)

پس اگر تم نے نہ کیا اور تم ہرگز نہیں کر سکتے^(۴) تو (اے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ
وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۲۱﴾

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً
وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ
فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا
وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۲﴾

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا
مِنَّا فَأَنْتُمْ لَا مَعْنَىٰ ۚ إِن يَهْدِنَا رَبُّنَا
لَسَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿۲۳﴾

إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ لَوْلَا فَتَنَّا الْكَافِرِينَ
وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَيُصِيبُنَّهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۲۴﴾

(۱) اس میں اس امر کی تشبیہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ اپنی دی ہوئی صلاحیتوں کو سلب کر لے۔ اس لیے انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے گریزاں اور اس کے عذاب اور مواخذے سے کبھی بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔

(۲) ہدایت اور ضلالت کے اعتبار سے انسانوں کے تین گروہوں کے تذکرے کے بعد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی عبادت کی دعوت تمام انسانوں کو دی جا رہی ہے۔ فرمایا کہ جب تمہارا اور کائنات کا خالق اللہ ہے، تمہاری تمام ضروریات کامیا کرنے والا وہی ہے، تو پھر تم اسے چھوڑ کر دوسروں کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ دوسروں کو اس کا شریک کیوں ٹھہراتے ہو؟ اگر تم عذاب خداوندی سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اللہ کو ایک مانو اور صرف اسی کی عبادت کرو، جانتے بوجھتے شرک کا ارتکاب مت کرو۔

(۳) توحید کے بعد اب رسالت کا اثبات فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے اپنے بندے پر جو کتاب نازل فرمائی ہے، اس کے منزل من اللہ ہونے میں اگر تمہیں شک ہے تو تم اپنے تمام حمایتیوں کو ساتھ ملا کر اس جیسی ایک ہی سورت بنا کر دکھا دو اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ واقعی یہ کلام کسی انسان کی کاوش نہیں ہے، کلام الہی ہی ہے اور ہم پر اور رسالت محمدیہ پر ایمان لا کر جنم کی آگ سے بچنے کی سعی کرنی چاہیے، جو کافروں کے لیے ہی تیار کی گئی ہے۔

(۴) یہ قرآن کریم کی صداقت کی ایک اور واضح دلیل ہے کہ عرب و عجم کے تمام کافروں کو چیلنج دیا گیا، لیکن وہ آج تک اس کا جواب دینے سے قاصر ہیں اور یقیناً قیامت تک قاصر رہیں گے۔

النَّاسِ وَالْحِجَارَةَ الْعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿۳۱﴾

سچا مان کر اس آگ سے بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں،^(۱) جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔^(۲) (۲۳)

اور ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو^(۳) ان جنتوں کی خوشخبریاں دو، جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔ جب کبھی وہ پھلوں کا رزق دیئے جائیں گے اور ہم شکل لائے جائیں گے تو کہیں گے یہ وہی ہے جو ہم اس سے پہلے دیئے گئے تھے^(۴) اور ان کے لئے بیویاں ہیں صاف^(۵) ستھری اور وہ ان جنتوں میں ہمیشہ رہنے والے ہیں^(۶) (۲۵)

وَيَسِّرُ الْيَدِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّ لَهُمْ حَدِيثًا يُحْيَوْنَ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا وَلَهُمْ فِيهَا أَنْجَارٌ مُطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۳۱﴾

(۱) پتھر سے مراد بقول ابن عباس گندھک کے پتھر ہیں اور بعض حضرات کے نزدیک پتھر کے وہ ”أَصْنَامٌ“ (بت) بھی جنم کا ایندھن ہوں گے جن کی لوگ دنیا میں پرستش کرتے رہے ہوں گے جیسا کہ قرآن مجید میں بھی ہے: ﴿إِنَّهُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ (الأنبياء-۹۸) ”تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو، جنم کا ایندھن ہوں گے۔“ (۲) اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ جنم اصل میں کافروں اور مشرکوں کے لیے تیار کی گئی ہے اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جنت اور دوزخ کا وجود ہے جو اس وقت بھی ثابت ہے۔ یہی سلف امت کا عقیدہ ہے۔ یہ تمثیلی چیزیں نہیں ہیں، جیسا کہ بعض متجددین اور منکرین حدیث باور کراتے ہیں۔

(۳) قرآن کریم نے ہر جگہ ایمان کے ساتھ عمل صالح کا تذکرہ فرما کر اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ایمان اور عمل صالح ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عمل صالح کے بغیر ایمان ثمر آور نہیں اور ایمان کے بغیر اعمال خیر کی عند اللہ کوئی اہمیت نہیں۔ اور عمل صالح کیا ہے؟ جو سنت کے مطابق ہو اور خالص رضائے الہی کی نیت سے کیا جائے۔ خلاف سنت عمل بھی نامقبول اور نمود و نمائش اور ریا کاری کے لیے کیے گئے عمل بھی مردود و مطرود۔

(۴) مُتَشَابِهًا کا مطلب یا تو جنت کے تمام میوؤں کا آپس میں ہم شکل ہونا ہے، یا دنیا کے میوؤں کے ہم شکل ہونا۔ تاہم یہ مشابہت صرف شکل یا نام کی حد تک ہی ہوگی، ورنہ جنت کے میوؤں کے مزے اور ذائقے سے دنیا کے میوؤں کو کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ جنت کی نعمتوں کی بابت حدیث میں ہے: مَا لِأَعْيُنٍ رَأَتْ، وَلَا لِأُذُنٍ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبٍ بَشَرٍ (صحیح بخاری، تفسیر الم السجدة) ”نہ کسی آنکھ نے انہیں دیکھا، نہ کسی کان نے ان کی بابت سنا (اور دیکھا سنا تو کجا) کسی انسان کے دل میں ان کا گمان بھی نہیں گزرا۔“

(۵) یعنی حیض و نفاس اور دیگر آلائشوں سے پاک ہوں گی۔

(۶) خُلُودٌ کے معنی بیہنگی کے ہیں۔ اہل جنت ہمیشہ ہمیش کے لیے جنت میں رہیں گے اور خوش رہیں گے اور اہل دوزخ

یقیناً اللہ تعالیٰ کسی مثال کے بیان کرنے سے نہیں شرمتا،
خواہ چھھر کی ہو، یا اس سے بھی ہلکی چیز کی۔^(۱) ایمان
والے تو اسے اپنے رب کی جانب سے صحیح سمجھتے ہیں اور
کفار کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ نے کیا مراد لی ہے؟
اس کے ذریعہ بیشتر کو گمراہ کرتا ہے اور اکثر لوگوں کو راہ
راست پر لاتا ہے^(۲) اور گمراہ تو صرف فاسقوں کو ہی کرتا
ہے (۲۶)

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے مضبوط عہد کو^(۳) توڑ دیتے ہیں اور

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَعِجُ أَنْ يَتْرُوبَ مَثَلًا تَابِعُوصَةً فَمَا فَوْقَهَا قَالَمًا
الَّذِينَ آمَنُوا يَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَإِنَّا الْبَرِّينَ
كَلَّمُوا وَقَالُوا لَوْ نَدَانَا اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا لَكُنَّا
بِهِ كَذِبًا وَإِن يَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يَضِلُّ بِهِ
إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿۲۶﴾

الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ

بیشہ ہمیش کے لیے جہنم میں رہیں گے اور جتلائے عذاب رہیں گے۔ حدیث میں ہے۔ جنت اور جہنم میں جانے کے بعد
ایک فرشتہ اعلان کرے گا ”اے جہنیو! اب موت نہیں ہے اور اے جنتیو! اب موت نہیں ہے۔ جو فریق جس حالت
میں ہے، اسی حالت میں ہمیشہ رہے گا۔ (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب يدخل الجنة سبعون ألفاً۔ و
صحیح مسلم کتاب الجنة)۔

(۱) جب اللہ تعالیٰ نے دلائل قاطعہ سے قرآن کا معجزہ ہونا ثابت کر دیا تو کفار نے ایک دوسرے طریقے سے معارضہ کر
دیا اور وہ یہ کہ اگر یہ کلام الہی ہو تا تو اتنی عظیم ذات کے نازل کردہ کلام میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کی مثالیں نہ ہوتیں۔ اللہ
تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ بات کی توضیح اور کسی حکمت بالغہ کے پیش نظر تمثیلات کے بیان کرنے میں کوئی
حرج نہیں، اس لیے اس میں حیا و حجاب بھی نہیں۔ فَوْقَهَا جو چھھر کے اوپر ہو، یعنی پر یا بازو، مراد اس چھھر سے بھی حقیر تر
چیز۔ یا فَوْقُ کے معنی، اس سے بڑھ کر، بھی ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں معنی ”چھھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز“ کے ہوں
گے۔ لفظ فَوْقَهَا میں دونوں مفہوم کی گنجائش ہے۔

(۲) اللہ کی بیان کردہ مثالوں سے اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ اور اہل کفر کے کفر میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ سب اللہ
کے قانون قدرت و مشیت کے تحت ہی ہوتا ہے۔ جسے قرآن نے ﴿ذُوْلِكَ مَا تَقُوْلُ﴾ (النساء۔ ۱۱۵) (جس طرف کوئی پھرتا
ہے، ہم اسی طرف اس کو پھیر دیتے ہیں) اور حدیث میں ﴿كُلُّ مَيْسَرَةٍ لِمَا خَلِقَ لَهُ﴾ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ اللیل) سے
تعبیر کیا گیا ہے۔ فق، اطاعت الہی سے خروج کو کہتے ہیں، جس کا ارتکاب عارضی اور وقتی طور پر ایک مومن سے بھی ہو
سکتا ہے۔ لیکن اس آیت میں فق سے مراد اطاعت سے کلی خروج یعنی کفر ہے۔ جیسا کہ اگلی آیت سے واضح ہے کہ
اس میں مومن کے مقابلے میں کافروں والی صفات کا تذکرہ ہے۔

(۳) مفسرین نے عَهْدُ کے مختلف مفہوم بیان کیے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی وہ وصیت جو اس نے اپنے اوامر بجالانے اور
نواہی سے باز رکھنے کے لیے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے مخلوق کو کی۔ ۲- وہ عہد جو اہل کتاب سے تورات میں لیا گیا
کہ نبی آخر الزمان ﷺ کے آجانے کے بعد تمہارے لیے ان کی تصدیق کرنا اور ان کی نبوت پر ایمان لانا ضروری ہو

اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، انہیں کاٹنے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں (۲۷)

تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو؟ حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا، پھر تمہیں مار ڈالے گا، پھر زندہ کرے گا، (۲۸) پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ (۲۸)

وہ اللہ جس نے تمہارے لئے زمین کی تمام چیزوں کو پیدا کیا، (۲۹) پھر آسمان کی طرف قصد کیا (۳۰) اور ان کو ٹھیک ٹھاک سات آسمان (۳۱) بنایا اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ (۲۹)

مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُدْوَصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۲۷﴾

كَيْفَ تَقْفُونَ يَا اللَّهُ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمَيِّتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۸﴾

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ جَنَابًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۲۹﴾

گا۔ وہ عمد است جو صلب آدم سے نکالنے کے بعد تمام زریت آدم سے لیا گیا، جس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے : ﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّ الْأَمْرَ مِنْ قُلُوبِهِمْ﴾ (الأعراف- ۱۷۲) نقض عمد کا مطلب عمد کی پروا نہ کرنا ہے (ابن کثیر) (۱) ظاہر بات ہے کہ نقصان اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کو ہی ہوگا، اللہ کا یا اس کے پیغمبروں اور داعیوں کا کچھ نہ بگڑے گا۔

(۲) آیت میں دو موتوں اور دو زندگیوں کا تذکرہ ہے۔ پہلی موت سے مراد عدم (نیست یعنی نہ ہونا) ہے اور پہلی زندگی ماں کے پیٹ سے نکل کر موت سے ہمتا رہنے تک ہے۔ پھر موت آجائے گی اور پھر آخرت کی زندگی دو سری زندگی ہوگی، جس کا انکار کفار اور منکرین قیامت کرتے ہیں۔ شوکانی نے بعض علماء کی رائے ذکر کی ہے کہ قبر کی زندگی (کَمَا هِيَ) دنیوی زندگی میں ہی شامل ہوگی (فتح القدر) صحیح یہ ہے کہ برزخ کی زندگی، حیات آخرت کا پیش خیمہ اور اس کا سرنامہ ہے، اس لیے اس کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے۔

(۳) اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ زمین کی اشیاء مخلوقہ کے لیے ”اصل“ حلت ہے۔ الایہ کہ کسی چیز کی حرمت نص سے ثابت ہو (فتح القدر)

(۴) بعض سلف امت نے اس کا ترجمہ ”پھر آسمان کی طرف چڑھ گیا“ کیا ہے (صحیح بخاری) اللہ تعالیٰ کا آسمانوں کے اوپر عرش پر چڑھنا اور خاص خاص مواقع پر آسمان دنیا پر نزول، اللہ کی صفات میں سے ہے، جن پر اسی طرح بغیر تاویل کے ایمان رکھنا ضروری ہے جس طرح قرآن یا احادیث میں بیان کی گئی ہیں۔

(۵) اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ”آسمان“ ایک حسی وجود اور حقیقت ہے۔ محض بلندی کو سماء سے تعبیر نہیں کیا گیا ہے۔ دو سری بات یہ معلوم ہوئی کہ ان کی تعداد سات ہے۔ اور حدیث کے مطابق دو آسمانوں کے درمیان ۵۰۰ سال کی مسافت ہے۔ اور زمین کی بابت قرآن کریم میں ہے : ﴿ذَوَاتِ الْأَرْضِ وَالْمَلَائِكَةُ﴾ (الطلاق- ۱۲) اور زمین بھی آسمان کی مثل

اور جب تیرے رب نے فرشتوں^(۱) سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں، تو انہوں^(۲) نے کہا ایسے شخص کو کیوں پیدا کرتا ہے جو زمین میں فساد کرے اور خون بہائے؟ اور ہم تیری تسبیح، حمد اور پاکیزگی بیان کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔^(۳) (۳۰)

اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھا کر ان چیزوں کو

وَرَأَىٰ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۰﴾

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ

ہیں) اس سے زمین کی تعداد بھی سات ہی معلوم ہوتی ہے جس کی مزید تائید حدیث نبوی سے ہو جاتی ہے: «مَنْ أَخَذَ شَيْئًا مِنَ الْأَرْضِ ظُلْمًا، فَإِنَّهُ يَطْوِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرْضِينَ» (صحیح بخاری، بدء الخلق، ماجاء فی سبع أرضین) ”جس نے ظلماً کسی کی ایک باشت زمین لے لی تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ساتوں زمینوں کا طوق پہنائے گا۔“ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے پہلے زمین کی تخلیق ہوئی ہے لیکن سورہ نازعات میں آسمان کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے۔ ﴿وَالْأَرْضُ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا﴾ (زمین کو اس کے بعد بچھایا) اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ تخلیق پہلے زمین ہی کی ہوئی ہے اور دَحَا (صاف اور ہموار کر کے بچھانا) تخلیق سے مختلف چیز ہے جو آسمان کی تخلیق کے بعد عمل میں آیا۔ (فتح القدر)

(۱) مَلَائِكَةُ (فرشتے) اللہ کی نوری مخلوق ہیں، جن کا مسکن آسمان ہے، جو اوامرا الہی کے بجالانے اور اس کی تمجید و تقدیس میں مصروف رہتے ہیں اور اس کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کرتے

(۲) خَلِيفَةٌ سے مراد ایسی قوم ہے جو ایک دوسرے کے بعد آئے گی اور یہ کہنا کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور نائب ہے غلط ہے۔

(۳) فرشتوں کا یہ کہنا حسد یا اعتراض کے طور پر نہیں تھا، بلکہ اس کی حقیقت اور حکمت معلوم کرنے کی غرض سے تھا کہ اے رب اس مخلوق کے پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے، جب کہ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو فساد پھیلائیں گے اور خون ریزی کریں گے؟ اگر مقصود یہ ہے کہ تیری عبادت ہو تو اس کام کے لیے ہم تو موجود ہیں، ہم سے وہ خطرات بھی نہیں جو نئی مخلوق سے متوقع ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں وہ مصلحت راجحہ جانتا ہوں جس کی بنا پر ان ذکر کردہ مفاسد کے باوجود میں اسے پیدا کر رہا ہوں، جو تم نہیں جانتے۔ کیوں کہ ان میں انبیاء، شہداء و صالحین اور زہاد بھی ہوں گے۔ (ابن کثیر)

زیت آدم کی بابت فرشتوں کو کیسے علم ہوا کہ وہ فساد برپا کرے گی؟ اس کا اندازہ انہوں نے انسانی مخلوق سے پہلے کی مخلوق کے اعمال یا کسی اور طریقے سے کر لیا ہو گا۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی بتلایا تھا کہ وہ ایسے ایسے کام بھی کرے گی۔ یوں وہ کلام میں حذف مانتے ہیں کہ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً بِنَعْلِكَ كَذًا وَكَذَا (فتح القدر)

أَتَشْعُرُونَ بِأَسْمَاءَ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۱﴾

فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا، اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ (۳۱)

قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَعَلَّمْنَا الْاِمَامَا عَلِمْنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾

ان سب نے کہا اے اللہ! تیری ذات پاک ہے ہمیں تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھا رکھا ہے، پورے علم و حکمت والا تو تو ہی ہے۔ (۳۲)

قَالَ يَا اٰدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاسْمَائِهِمْ فَلَمَّا اَنْبَاَهُمْ بِاسْمَائِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَكُمْ اِنَّ اَعْلَمَ عَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

اللہ تعالیٰ نے (حضرت) آدم (علیہ السلام) سے فرمایا تم ان کے نام بتا دو۔ جب انہوں نے بتا دیئے تو فرمایا کہ کیا میں نے تمہیں (پہلے ہی) نہ کہا تھا کہ زمین اور آسمانوں کا غیب میں ہی جانتا ہوں اور میرے علم میں ہے جو تم ظاہر کر رہے ہو اور جو تم چھپاتے تھے۔ (۳۳)

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّا اِبْلِیْسَ ۗ اَبٰی

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو (۳) تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کیا (۳)

(۱) اسماء سے مراد مسمیات (اشخاص و اشیا) کے نام اور ان کے خواص و فوائد کا علم ہے، جو اللہ تعالیٰ نے القاد الامام کے ذریعے حضرت آدم علیہ السلام کو سکھلادیا۔ پھر جب ان سے کہا گیا کہ آدم علیہ السلام ان کے نام بتاؤ تو انہوں نے فوراً سب کچھ بیان کر دیا، جو فرشتے بیان نہ کر سکے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک تو فرشتوں پر حکمت تخلیق آدم واضح کر دی۔ دوسرے دنیا کا نظام چلانے کے لیے علم کی اہمیت و فضیلت بیان فرمادی، جب یہ حکمت و اہمیت علم فرشتوں پر واضح ہوئی، تو انہوں نے اپنے تصور علم و فہم کا اعتراف کر لیا۔ فرشتوں کے اس اعتراف سے یہ بھی واضح ہوا کہ عالم الغیب صرف اللہ کی ذات ہے، اللہ کے برگزیدہ بندوں کو بھی اتنا ہی علم ہوتا ہے جتنا اللہ تعالیٰ انہیں عطا فرماتا ہے۔

(۲) علمی فضیلت کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کی یہ دوسری تکریم ہوئی۔ سجدہ کے معنی ہیں خضوع اور تذلل کے، اس کی انتہا ہے ”زمین پر پیشانی کا ٹکا دینا“ (قرطبی) یہ سجدہ شریعت اسلامیہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ کا مشہور فرمان ہے کہ اگر سجدہ کسی اور کے لیے جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاندان کو سجدہ کرے۔ (سنن ترمذی) تاہم فرشتوں نے اللہ کے حکم پر حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا، جس سے ان کی تکریم و فضیلت فرشتوں پر واضح کر دی گئی۔ کیوں کہ یہ سجدہ اکرام و تعظیم کے طور پر ہی تھا، نہ کہ عبادت کے طور پر۔ اب تعظیماً بھی کسی کو سجدہ نہیں کیا جاسکتا۔

(۳) ابلیس نے سجدے سے انکار کیا اور راندہ درگاہ ہو گیا۔ ابلیس حسب صراحت قرآن جنات میں سے تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے اعزازاً فرشتوں میں شامل کر رکھا تھا، اس لیے بحکم الہی اس کے لیے بھی سجدہ کرنا ضروری تھا، لیکن اس

اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں ہو گیا۔^(۱) (۳۴)
 اور ہم نے کہہ دیا کہ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت
 میں رہو^(۲) اور جہاں کہیں سے چاہو با فراغت کھاؤ پیو،
 لیکن اس درخت کے قریب بھی نہ جانا^(۳) ورنہ ظالم ہو
 جاؤ گے۔ (۳۵)

لیکن شیطان نے ان کو بہکا کر وہاں سے نکلوا ہی دیا^(۴) اور
 ہم نے کہہ دیا کہ اتر جاؤ! تم ایک دوسرے کے
 دشمن ہو^(۵) اور ایک وقت مقرر تک تمہارے لئے زمین
 میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے۔ (۳۶)

(حضرت) آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے چند باتیں
 سیکھ لیں^(۶) اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، بے
 شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا
 ہے۔ (۳۷)

وَاسْتَكْبَرُوا وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝
 وَقُلْنَا يَا اٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا
 رَغَدًا حَيْثُ رَشْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ
 فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَقُلْنَا
 اٰهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ
 وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝

فَتَلَقٰى اٰدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمٰتٍ مَّتَابٍ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ
 الرَّحِيْمُ ۝

نے حسد اور تکبر کی بنا پر سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ گویا حسد اور تکبر وہ گناہ ہیں جن کا ارتکاب دنیائے انسانیت میں
 سب سے پہلے کیا گیا اور اس کا مرتکب ابلیس تھا۔
 (۱) یعنی اللہ تعالیٰ کے علم و تقدیر میں۔

(۲) یہ حضرت آدم علیہ السلام کی تیسری فضیلت ہے جو جنت کو ان کا مسکن بنا کر عطا کی گئی۔

(۳) یہ درخت کس چیز کا تھا؟ اس کی بابت قرآن و حدیث میں کوئی صراحت نہیں ہے۔ اس کو گندم کا درخت مشہور کر
 دیا گیا ہے جو بے اصل بات ہے، ہمیں اس کا نام معلوم کرنے کی ضرورت ہے، نہ اس کا کوئی فائدہ ہی ہے۔

(۴) شیطان نے جنت میں داخل ہو کر رو بہرو انہیں بہکایا، یا سوسہ اندازی کے ذریعے سے، اس کی بابت کوئی صراحت
 نہیں۔ تاہم یہ واضح ہے کہ جس طرح سجدے کے حکم کے وقت اس نے حکم الہی کے مقابلے میں قیاس سے کام لے کر
 (کہ میں آدم سے بہتر ہوں) سجدے سے انکار کیا، اسی طرح اس موقع پر اللہ تعالیٰ کے حکم (وَلَا تَقْرَبَا) کی تاویل کر کے
 حضرت آدم علیہ السلام کو پھسلانے میں کامیاب ہو گیا، جس کی تفصیل سورہ اعراف میں آئے گی۔ گویا حکم الہی کے مقابلے
 میں قیاس اور نص کی دور از کار تاویل کا ارتکاب بھی سب سے پہلے شیطان نے کیا۔ فَتَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذَا

(۵) مراد آدم علیہ السلام اور شیطان ہیں، یا یہ مطلب ہے کہ بنی آدم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔

(۶) حضرت آدم علیہ السلام جب پشیمانی میں ڈوبے دنیا میں تشریف لائے تو توبہ و استغفار میں مصروف ہو گئے۔ اس
 موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے رہنمائی و دست گیری فرمائی اور وہ کلمات معافی سکھا دیئے جو ”الاعراف“ میں بیان کیے گئے

ہم نے کہا تم سب یہاں سے چلے جاؤ، جب کبھی تمہارے پاس میری ہدایت پہنچے تو اس کی تابعداری کرنے والوں پر کوئی خوف و غم نہیں۔ (۳۸)

اور جو انکار کر کے ہماری آیتوں کو جھٹلائیں، وہ جسمی ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ (۳۹)^(۱)

اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی اور میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرو۔ (۴۰)

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا اِنَّا نَايْتِكُمْ مَرِيْقًا هٰذَا فَتَمَنَّيْتُمْ هٰذَا فَاذْكُرْوْا عَلَیْهِمْ وَاذْكُرْهُمْ يَوْمَ لَا كُفْرَانَ لِحٰجَّتِهِمْ ذٰلِكَ اَنْتُمْ عَلٰی رَبِّكُمْ حٰقِقُوْنَ ﴿۳۸﴾

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِآيٰتِنَا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوْا لِعَهْدِيْ الَّذِيْ اٰتَيْتُمْ عَلَيْهِمْ وَاذْكُرُوْا عَهْدِيْ اَوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّاىَ فَاذْكُرُوْنَ ﴿۴۰﴾

ہیں ﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنٰ اَنْفُسَنَا اِىْمَانًا لَّمْ تَقْبَلْهَا وَتَرْضٰهَا ﴿۳۸﴾ الْآیۃ بعض حضرات یہاں ایک موضوع روایت کا سارا لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت آدم نے عرش الہی پر لا اِلهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ لکھا ہوا دیکھا اور محمد رسول اللہ کے وسیلے سے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمایا۔ یہ روایت بے سند ہے اور قرآن کے بھی معارض ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے طریقے کے بھی خلاف ہے۔ تمام انبیا علیہم السلام نے ہمیشہ براہ راست اللہ سے دعائیں کی ہیں، کسی نبی، ولی، بزرگ کا واسطہ اور وسیلہ نہیں پکڑا، اس لیے نبی کریم ﷺ سمیت تمام انبیا کا طریقہ دعا یہی رہا ہے کہ بغیر کسی واسطے اور وسیلے کے اللہ کی بارگاہ میں دعا کی جائے۔

(۱) قبولیت دعا کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ جنت میں آباد کرنے کے بجائے دنیا میں ہی رہ کر جنت کے حصول کی تلقین فرمائی اور حضرت آدم علیہ السلام کے واسطے سے تمام بنو آدم کو جنت کا یہ راستہ بتلایا جا رہا ہے کہ انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے میری ہدایت (زندگی گزارنے کے احکام و ضابطے) تم تک پہنچے گی، جو اس کو قبول کرے گا وہ جنت کا مستحق اور بصورت دیگر عذاب الہی کا سزاوار ہو گا۔ ”ان پر خوف نہیں ہو گا“ کا تعلق آخرت سے ہے۔ اٰی : فَبِمَا يَسْتَفْتِلُوْنَ مِنْ اَمْرِ الْاٰخِرَةِ۔ اور ”حزن نہیں ہو گا“ کا تعلق دنیا سے۔ عَلٰی مَا فَاَنَّهُمْ مِنْ اٰمُوْرِ الدُّنْيَا (جو فوت ہو گیا امور دنیا سے یا اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ آئے) جس طرح دوسرے مقام پر ہے، ﴿ فَمَنْ اٰتٰنَا هٰذَا اِنَّا كٰذِبِيْنَ وَلَا يَشْفٰى ﴿۳۸﴾ (طہ۔ ۱۲۳) جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، پس وہ (دنیا میں) گمراہ ہو گا اور نہ (آخرت میں) بد بخت۔“ (ابن کثیر) گویا ﴿ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا كُفْرٌ يَخْرُجُوْنَ ﴿۳۹﴾ کا مقام ہر مومن صادق کو حاصل ہے۔ یہ کوئی ایسا مقام نہیں جو صرف بعض اولیاء اللہ ہی کو حاصل ہو اور پھر اس ”مقام“ کا مفہوم بھی کچھ کا کچھ بیان کیا جاتا ہے۔ حالانکہ تمام مومنین و متقین بھی اولیاء اللہ ہیں ”اولیاء اللہ“ کوئی الگ مخلوق نہیں۔ ہاں البتہ اولیاء کے درجات میں فرق ہو سکتا ہے۔

(۲) اِسْرَآئِیْلُ (معنی عبد اللہ) حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا۔ یہود کو بنو اسرائیل کہا جاتا ہے یعنی یعقوب علیہ السلام کی اولاد۔ کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، جن سے یہود کے بارہ قبیلے بنے اور ان میں بکثرت انبیا و رسل ہوئے۔ یہود کو عرب میں اس کی گزشتہ تاریخ اور علم و مذہب سے وابستگی کی وجہ سے ایک خاص مقام حاصل

وَالْمُؤَابَهَاتُ أَنْزَلْتُ مَصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَلَا تَقُولُوا الْقَوْلَ
كَافِرِينَ وَلَا تَقُولُوا بِآيَاتِنَا كِبًا وَلِيَأْمُرُوا بِالْعَدْلِ وَالْإِيمَانِ فَاتَّقُوا اللَّهَ

وَلَا تَقُولُوا الْحَقُّ بِالْحَقِّ وَالْحَقُّ لِلْحَقِّ وَأَنْتُمْ تَقُولُونَ ﴿۳۱﴾

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْتَعِبُوا رِجْزَ يَوْمٍ ﴿۳۲﴾

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ
الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۳۳﴾

اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو میں نے تمہاری کتابوں کی تصدیق میں نازل فرمائی ہے اور اس^(۱) کے ساتھ تم ہی پہلے کافر نہ بنو اور میری آیتوں کو تھوڑی تھوڑی قیمت^(۲) پر نہ فروخت کرو اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔ (۳۱)

اور حق کو باطل کے ساتھ غلط طوط نہ کرو اور نہ حق کو چھپاؤ، تمہیں تو خود اس کا علم ہے۔ (۳۲)

اور نمازوں کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ (۳۳)

کیا لوگوں کو بھلائیوں کا حکم کرتے ہو؟ اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو باوجودیکہ تم کتاب پڑھتے ہو، کیا اتنی بھی تم میں سمجھ نہیں؟ (۳۳)

تھا۔ اس لیے انہیں گزشتہ انعامات الہی یاد کرا کے کہا جا رہا ہے کہ تم میرا وہ عہد پورا کرو جو تم سے نبی آخر الزمان کی نبوت اور ان پر ایمان لانے کی بابت لیا گیا تھا۔ اگر تم اس عہد کو پورا کرو گے تو میں بھی اپنا عہد پورا کروں گا کہ تم سے وہ بوجھ اتار دیے جائیں گے جو تمہاری غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے بطور سزا تم پر لا دیے گئے تھے اور تمہیں دوبارہ عروج عطا کیا جائے گا۔ اور مجھ سے ڈرو کہ میں تمہیں مسلسل اس ذلت و ادبار میں مبتلا رکھ سکتا ہوں جس میں تم بھی مبتلا ہو اور تمہارے آبا و اجداد بھی مبتلا رہے۔

(۱) یہ کی ضمیر قرآن کی طرف، یا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے۔ دونوں ہی قول صحیح ہیں کیونکہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں، جس نے قرآن کے ساتھ کفر کیا، اس نے محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کفر کیا اور جس نے محمد ﷺ کے ساتھ کفر کیا، اس نے قرآن کے ساتھ کفر کیا (ابن کثیر) ”پہلے کافر نہ بنو“ کا مطلب ہے کہ ایک تو تمہیں جو علم ہے دوسرے اس سے محروم ہیں، اس لیے تمہاری ذمہ داری سب سے زیادہ ہے۔ دوسرے، مدینہ میں یہود کو سب سے پہلے دعوت ایمان دی گئی، ورنہ ہجرت سے پہلے بہت سے لوگ قبول اسلام کر چکے تھے۔ اس لیے انہیں تشبیہ کی جا رہی ہے کہ یہودیوں میں تم اولین کافر مت بنو۔ اگر ایسا کرو گے تو تمام یہودیوں کے کفر و جحود کا وبال تم پر پڑے گا۔

(۲) ”تھوڑی قیمت پر فروخت نہ کرو“ کا یہ مطلب نہیں کہ زیادہ معاوضہ مل جائے تو احکام الہی کا سودا کرو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ احکام الہی کے مقابلے میں دنیاوی مفادات کو اہمیت نہ دو۔ احکام الہی تو اتنے قیمتی ہیں کہ ساری دنیا کا مال و متاع بھی ان کے مقابلے میں بیچ اور شرم قلیل ہے۔ آیت میں اصل مخاطب اگرچہ بنی اسرائیل ہیں، لیکن یہ حکم قیامت تک آنے والوں کے لیے ہے، جو بھی ابطال حق یا اثبات باطل یا کتمان علم کا ارتکاب اور احقاق حق سے محض طلب دنیا کے لیے، گریز کرے گا وہ اس وعید میں شامل ہو گا۔ (فتح القدیر)

اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو^(۱) یہ چیز شاق ہے، مگر ڈر رکھنے والوں پر۔^(۲) (۳۵)

جو جانتے ہیں کہ بے شک وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے اور یقیناً وہ اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ (۳۶) اے اولاد یعقوب! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی اور میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دی۔^(۳) (۳۷)

وَأَسْمِعُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴿۳۵﴾

الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقَاوَاتِهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿۳۶﴾

يَذَرِيكُمْ فِي النَّارِ أَنْ لَا تَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَنْصِتُ لَكُمْ وَأَنَّ

فَعَلَّكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۳۷﴾

(۱) صبر اور نماز ہر اللہ والے کے دو بڑے ہتھیار ہیں۔ نماز کے ذریعے سے ایک مومن کا رابطہ و تعلق اللہ تعالیٰ سے استوار ہوتا ہے، جس سے اسے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت حاصل ہوتی ہے۔ صبر کے ذریعے سے کردار کی پختگی اور دین میں استقامت حاصل ہوتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے (إِذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ فَرَّغَ إِلَى الصَّلَاةِ) (احمد و ابوداؤد بحوالہ فتح القدیر) ”نبی ﷺ کو جب بھی کوئی اہم معاملہ پیش آتا آپ فوراً نماز کا اہتمام فرماتے۔“

(۲) نماز کی پابندی عام لوگوں کے لیے گراں ہے، لیکن خشوع و خضوع کرنے والوں کے لیے یہ آسان، بلکہ اطمینان اور راحت کا باعث ہے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ وہ جو قیامت پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ گویا قیامت پر یقین اعمال خیر کو آسان کر دیتا اور آخرت سے بے فکری انسان کو بے عمل، بلکہ بد عمل بنا دیتی ہے۔

(۳) یہاں سے دوبارہ بنی اسرائیل کو وہ انعامات یاد کرائے جا رہے ہیں، جو ان پر کیے گئے اور ان کو قیامت کے دن سے ڈرایا جا رہا ہے، جس دن نہ کوئی کسی کے کام آئے گا، نہ سفارش قبول ہوگی، نہ معاوضہ دے کر چھٹکارا ہو سکے گا، نہ کوئی مددگار آگے آئے گا۔ ایک انعام یہ بیان فرمایا کہ ان کو تمام جہانوں پر فضیلت دی گئی، یعنی امت محمدیہ سے پہلے افضل العالمین ہونے کی یہ فضیلت بنو اسرائیل کو حاصل تھی جو انہوں نے معصیت الہی کا ارتکاب کر کے گنواہی اور امت محمدیہ کو خَیْزُ أُمَّةٍ کے لقب سے نوازا گیا۔ اس میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ انعامات الہی کسی خاص نسل کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں، بلکہ یہ ایمان اور عمل کی بنیاد پر ملتے ہیں، اور ایمان و عمل سے محرومی پر سلب کر لیے جاتے ہیں، جس طرح امت محمدیہ کی اکثریت بھی اس وقت اپنی بد عملیوں اور شرک و بدعات کے ارتکاب کی وجہ سے ”خَیْزُ أُمَّةٍ“ کے بجائے ”سَزْرُ أُمَّةٍ“ بنی ہوئی ہے۔ هَذَا اللَّهُ تَعَالَى

یہود کو یہ دھوکہ بھی تھا کہ ہم تو اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں، اس لیے مؤاخذہ آخرت سے محفوظ رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ وہاں اللہ کے نافرمانوں کو کوئی سارا نہیں دے سکے گا، اسی فریب میں امت محمدیہ بھی مبتلا ہے اور مسئلہ شفاعت کو (جو اہل سنت کے یہاں مسلمہ ہے) اپنی بد عملی کا جواز بنا رکھا ہے۔

نبی ﷺ یقیناً شفاعت فرمائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی شفاعت قبول بھی فرمائے گا (احادیث صحیحہ سے یہ ثابت ہے) لیکن یہ بھی احادیث میں آتا ہے کہ إِخْدَاتٌ فِي الدِّينِ (بدعات) کے مرتکب اس سے محروم ہی رہیں گے۔ نیز بہت سے

اس دن سے ڈرتے رہو جب کوئی کسی کو نفع نہ دے سکے گا اور نہ ہی اسکی بابت کوئی سفارش قبول ہوگی اور نہ کوئی بدلہ اسکے عوض لیا جائے گا اور نہ وہ مددکے جائیں گے۔ (۳۸) اور جب ہم نے تمہیں فرعونیوں^(۱) سے نجات دی جو تمہیں بدترین عذاب دیتے تھے جو تمہارے لڑکوں کو مار ڈالتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو چھوڑ دیتے تھے، اس نجات دینے میں تمہارے رب کی بڑی مہربانی تھی۔ (۳۹) اور جب ہم نے تمہارے لئے^(۲) دریا چیر (پھاڑ) دیا اور تمہیں اس سے پار کر دیا اور فرعونیوں کو تمہاری نظروں کے سامنے اس میں ڈبو دیا۔ (۵۰)

اور ہم نے (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا، پھر تم نے اس کے بعد ہچھڑا پوجنا شروع کر دیا اور ظالم بن گئے۔^(۳) (۵۱)

وَأَتَقُوا أَيَّامَ آلِ عَجْرٍ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقِيمُونَ
مِنْهَا شَفَاعَةً وَلَا يَخْشَوْنَ اللَّهَ عَدْلًا وَلَا هُمْ يُبْصِرُونَ ﴿۳۸﴾

وَإِذْ نَجَّيْنَاكَ مِنَ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكَ وَسَوْمُكَ وَسَوْمُ الْعَدَابِ
يُذَخِّرُونَ آيَاتِنَا لَكُمْ وَيَسْتَعِينُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَلِكَ لَبَآئِلٌ لِمَنْ
رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿۳۹﴾

وَإِذْ قَرَّبْنَا بِلُحْيِكُمُ الْبَحْرَ الْيَمِينَ لَكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ
وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۵۰﴾

وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَلْبَانًا لَيْلَةَ نَسْرِهِ أَنْتَحِدْنَا لَكُمْ الْعِجْلَ
مِنْ بَعْدِهِ ۚ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿۵۱﴾

گناہ گاروں کو جہنم میں سزا دینے کے بعد آپ ﷺ کی شفاعت پر جہنم سے نکالا جائے گا، کیا جہنم کی یہ چند روزہ سزا قابل برداشت ہے کہ ہم شفاعت پر تکیہ کر کے معصیت کا ارتکاب کرتے رہیں؟

(۱) آل فرعون سے مراد صرف فرعون اور اس کے اہل خانہ ہی نہیں، بلکہ فرعون کے تمام پیروکار ہیں۔ جیسا کہ آگے: ﴿أَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ﴾ ہے (ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا) یہ غرق ہونے والے فرعون کے گھر والے ہی نہیں تھے، اس کے فوجی اور دیگر پیروکار تھے۔ گویا قرآن میں «آل» مُتَّبِعِينَ (پیروکاروں) کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، اس کی مزید تفصیل «الأحزاب» میں ان شاء اللہ آئے گی۔

(۲) سمندر کا یہ پھاڑنا اور اس میں سے راستہ بنا دینا، ایک معجزہ تھا جس کی تفصیل سورہ شعراء میں بیان کی گئی ہے۔ یہ سمندر کا مد و جزر نہیں تھا، جیسا کہ سرسید احمد خان اور دیگر منکرین معجزات کا خیال ہے۔

(۳) یہ گوسالہ پرستی کا واقعہ اس وقت ہوا جب فرعونیوں سے نجات پانے کے بعد بنو اسرائیل جزیرہ نمائے سینا پہنچے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دینے کے لیے چالیس راتوں کے لیے کوہ طور پر بلایا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد بنی اسرائیل نے سامری کے پیچھے لگ کر ہچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ انسان کتنا ظاہر پرست ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھنے کے باوجود اور نبیوں (حضرت ہارون و موسیٰ علیہما السلام) کی موجودگی کے باوصف ہچھڑے کو اپنا «معبود» سمجھ لیا۔ آج کا مسلمان بھی شرکیہ عقائد و اعمال میں بری طرح مبتلا ہے، لیکن وہ سمجھتا ہے کہ مسلمان مشرک کس طرح ہو سکتا ہے؟ ان مشرک مسلمانوں نے شرک کو پتھر کی مورتیوں کے

لَمْ نَعْفُوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۵۲﴾

وَإِذْ أَخَذْنَا مَوْسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۵۳﴾

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ
بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجَلِ فَتُوبُوا إِلَى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ
ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ
هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۵۴﴾

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَى لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهُ جَهَنَّمَ
فَأَخَذْنَا مِنْهُمُ الضَّمِيضَةَ وَأَنْتُمْ تُنظَرُونَ ﴿۵۵﴾

لیکن ہم نے باوجود اس کے پھر بھی تمہیں معاف کر دیا،
تا کہ تم شکر کرو۔ (۵۲)

اور ہم نے (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) کو تمہاری
ہدایت کے لئے کتاب اور معجزے عطا فرمائے۔ (۵۳)
جب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ
اے میری قوم! پھڑے کو معبود بنا کر تم نے اپنی جانوں پر
ظلم کیا ہے، اب تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف
رجوع کرو، اپنے کو آپس میں قتل کرو، تمہاری بہتری اللہ
تعالیٰ کے نزدیک اسی میں ہے، تو اس نے تمہاری توبہ
قبول کی، وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم و کرم کرنے والا
ہے۔ (۵۴)^(۲)

اور (تم اسے بھی یاد کرو) تم نے (حضرت) موسیٰ (علیہ
السلام) سے کہا تھا کہ جب تک ہم اپنے رب کو سامنے نہ
دیکھ لیں ہرگز ایمان نہ لائیں گے (جس گستاخی کی سزا
میں) تم پر تمہارے (۳) دیکھتے ہوئے بجلی گری۔ (۵۵)

پجاریوں کے لیے خاص کر دیا ہے کہ صرف وہی مشرک ہیں۔ جب کہ یہ نام نہاد مسلمان بھی قبروں پر قبوں کے ساتھ وہی
کچھ کرتے ہیں جو پتھر کے پجاری اپنی مورتیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ.

(۱) یہ بھی بحر قلم پار کرنے کے بعد کا واقعہ ہے (ابن کثیر) ممکن ہے کتاب یعنی تورات ہی کو فرقان سے بھی تعبیر کیا گیا
ہو، کیوں کہ ہر آسمانی کتاب حق و باطل کو واضح کرنے والی ہوتی ہے، یا معجزات کو فرقان کہا گیا ہے کہ معجزات بھی حق و
باطل کی پہچان میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

(۲) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شرک پر متنبہ فرمایا تو پھر انہیں توبہ کا احساس ہوا، توبہ کا طریقہ قتل تجویز کیا گیا:
﴿فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ﴾ (اپنے کو آپس میں قتل کرو) کی دو تفسیریں کی گئی ہیں: ایک یہ کہ سب کو دو صفوں میں کر دیا گیا اور
انہوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔ دوسری یہ کہ ارتکاب شرک کرنے والوں کو کھڑا کر دیا گیا اور جو اس سے محفوظ
رہے تھے، انہیں قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے قتل کیا۔ مقتولین کی تعداد ستر ہزار بیان کی گئی ہے۔ (ابن کثیر و
فتح القدر)

(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام ستر (۷۰) آدمیوں کو کوہ طور پر تورات لینے کے لیے ساتھ لے گئے۔ جب حضرت موسیٰ
علیہ السلام واپس آنے لگے تو انہوں نے کہا کہ جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے نہ دیکھ لیں، ہم تیری بات پر یقین

لیکن پھر اس لئے کہ تم شکر گزاری کرو، اس موت کے بعد بھی ہم نے تمہیں زندہ کر دیا۔ (۵۶)

اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا اور تم پر من و سلوی اتارا^(۱) (اور کہہ دیا) کہ ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ، اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا، البتہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ (۵۷)

اور ہم نے تم سے کہا کہ اس بستی میں^(۲) جاؤ اور جو کچھ جہاں کہیں سے چاہو با فراغت کھاؤ پو اور دروازے میں سجدے کرتے ہوئے گزرو^(۳) اور زبان سے حلہ^(۴) کہو، ہم تمہاری خطائیں معاف فرمادیں گے اور نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ دیں گے۔ (۵۸)

ثُمَّ بَعَثْنَاكَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكَ لَعَلَّكَ تَشْكُرُونَ ﴿۵۶﴾

وَلَقَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْمُمَامَةَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْمَنِّ وَالسَّلْوَىٰ كُلُّوْا مِنْ طَعْمِهَا مَا زَادَكُمْ لَهَا وَالْمَاطَمُونَ تَنَا وَلَا لَكِن كَالْوَأَانِ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۵۷﴾

وَأَذِّنْ لَنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ كُلُّوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا أَوْ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا أَوْ تَوَلَّوْا حِطَّةً نَعْفُو لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ وَسَيَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۸﴾

کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جس پر بطور عتاب ان پر بجلی گری اور مر گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سخت پریشان ہوئے اور ان کی زندگی کی دعا کی، جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندہ کر دیا۔ دیکھتے ہوئے بجلی گرنے کا مطلب یہ ہے کہ ابتدا میں جن پر بجلی گری، آخر والے اسے دیکھ رہے تھے، حتیٰ کہ سب موت کی آغوش میں چلے گئے۔

(۱) اکثر مفسرین کے نزدیک یہ مصر اور شام کے درمیان میدان تیار واقع ہے۔ جب انہوں نے بحکم الہی علاقہ کی بستی میں داخل ہونے سے انکار کر دیا اور بطور سزا بنو اسرائیل چالیس سال تک تیار کے میدان میں پڑے رہے۔ بعض کے نزدیک یہ تخصیص صحیح نہیں۔ صحرائے سینا میں اترنے کے بعد جب سب سے پہلے پانی اور کھانے کا مسئلہ درپیش آیا تو اسی وقت یہ انتظام کیا گیا۔

من، بعض کے نزدیک ترنجبین ہے، یا اوس جو درخت یا پتھر گر تھی، شہد کی طرح ٹھنسی ہوتی اور خشک ہو کر گوند کی طرح ہو جاتی۔ بعض کے نزدیک شہد یا بیٹھا پانی ہے۔ بخاری و مسلم وغیرہ میں حدیث ہے کہ کھنسی من کی اس قسم سے ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل کو وہ کھانا بلا وقت بہم پہنچ جاتا تھا، اسی طرح کھنسی بغیر کسی کے بونے کے پیدا ہو جاتی ہے (تفسیر احسن التفسیر) سلوئی بیڑیا چڑیا کی طرح کا ایک پرندہ تھا جسے ذبح کر کے کھالیتے۔ (فتح القدر)

(۲) اس بستی سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک بیت المقدس ہے۔

(۳) سجدہ سے بعض حضرات نے یہ مطلب لیا ہے کہ جھکتے ہوئے داخل ہو اور بعض نے سجدہ شکر ہی مراد لیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بارگاہ الہی میں مجز و انکسار کا اظہار اور اعتراف شکر کرتے ہوئے داخل ہو۔

(۴) حِطَّةً اس کے معنی ہیں ”ہمارے گنہ معاف فرمادے۔“

پھر ان ظالموں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی (۱) بدل ڈالی، ہم نے بھی ان ظالموں پر ان کے فسق و نافرمانی کی وجہ سے آسمانی عذاب (۲) نازل کیا۔ (۵۹)

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے کہا کہ اپنی لاٹھی پتھر پر مارو، جس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور (۳) ہر گروہ نے اپنا چشمہ پہچان لیا (اور ہم نے کہہ دیا کہ) اللہ تعالیٰ کا رزق کھاؤ پیو اور زمین میں فساد نہ کرتے پھرو۔ (۶۰)

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم سے ایک ہی قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہ ہو سکے گا، اس لئے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں زمین کی پیداوار ساگ، مکڑی، گیہوں، مسور اور پیاز دے، آپ نے فرمایا، بہتر چیز کے بدلے ادنیٰ چیز کیوں طلب کرتے ہو! اچھا شہر میں جاؤ وہاں تمہاری چاہت کی یہ سب چیزیں ملیں گی۔ (۴) ان پر

قَبَلِ الَّذِينَ كَلَّمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي يَجِبُ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ كَلَّمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿٥٩﴾

وَإِذِ اسْتَسْفَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنثَىٰ مَشْرِبُهَا وَسَيَرُونَهَا مِن زُرْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْوَىٰ لَهَا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٦٠﴾

وَإِذْ قُلْنَا لِمُوسَىٰ لَنْ نُصِيبَ عَلَىٰ طَاعِهِمْ وَإِذَا قَادَعْنَا رَبِّكَ يُخْرِجُ لَنَا مِمَّا تُثْمِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُؤُومِهَا وَعَدَسَ بِهَاءٍ وَبَصَلَهَا قَالَ أَكُنْتُ بِأَنَّ لَوْ أَنَّ الَّذِي هُوَ أَذْنِي يَأْتِيَنِي هُوَ خَيْرٌ أَهْبِطُوا مَصْرًا فَإِن لَّكُمْ مِمَّا سَأَلْتُمْ وَضَعْنَاهُمْ عَلَيْهِمُ الْيَأْسَ وَالسَّكَنَةَ وَبَاءَ وَيَعْصِبُ

(۱) اس کی وضاحت ایک حدیث میں آتی ہے جو صحیح بخاری و صحیح مسلم وغیرہا میں ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ان کو حکم دیا گیا تھا کہ سجدہ کرتے ہوئے داخل ہوں، لیکن وہ سرینوں کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے اور جِطَّة کے بجائے حَبَّة فِي شَعْرَةٍ (یعنی گندم بالی میں) کہتے رہے۔ اس سے ان کی اس سرتابی و سرکشی کا، جو ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی اور احکام الہی سے تمسخر و استہزا کا جس کا ارتکاب انہوں نے کیا، اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی قوم اخلاق و کردار کے لحاظ سے زوال پذیر ہو جائے تو اس کا معاملہ پھر احکام الہیہ کے ساتھ اسی طرح کا ہو جاتا ہے۔

(۲) یہ آسمانی عذاب کیا تھا؟ بعض نے کہا غضب الہی، سخت پالا، طاعون۔ اس آخری معنی کی تائید حدیث سے ہوتی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا "یہ طاعون اسی رجز اور عذاب کا حصہ ہے جو تم سے پہلے بعض لوگوں پر نازل ہوا۔ تمہاری موجودگی میں کسی جگہ یہ طاعون پھیل جائے تو وہاں سے مت نکلو اور اگر کسی اور علاقے کی بابت تمہیں معلوم ہو کہ وہاں طاعون ہے تو وہاں مت جاؤ" صحیح مسلم، کتاب السلام باب الطاعون والبطيرة والكهانة ونحوها حدیث (۳۱۱۸)

(۳) یہ واقعہ بعض کے نزدیک تیبہ کا اور بعض کے نزدیک صحرائے سینا کا ہے، وہاں پانی کی طلب ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا اپنی لاٹھی پتھر پر مار۔ چنانچہ پتھر سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔ قبیلے بھی بارہ تھے۔ ہر قبیلہ اپنے اپنے چشمے سے سیراب ہوتا۔ یہ بھی ایک معجزہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمایا۔

(۴) یہ قصہ بھی اسی میدان تیبہ کا ہے۔ مصر سے مراد یہاں ملک مصر نہیں، بلکہ کوئی ایک شہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں سے

زلت اور مسکینی ڈال دی گئی اور اللہ کا غضب لے کر وہ لوٹے^(۱) یہ اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے^(۲) تھے، یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا نتیجہ ہے۔^(۳) (۶۱)

مسلمان ہوں، یہودی^(۴) ہوں، نصاریٰ^(۵) ہوں یا صابی^(۶) ہوں، جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے

مِنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِآيَاتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيَّيْنَ يَعْزِبُوْنَ اَلْحَقَّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرَى وَالصّٰبِيْنَ

کسی بھی شہر میں چلے جاؤ اور وہاں کھیتی باڑی کرو، اپنی پسند کی سبزیاں، دالیں اگاؤ اور کھاؤ۔ انکا یہ مطالبہ چونکہ کفرانِ نعمت اور استکبار پر مبنی تھا، اس لیے زجر و توبیح کے انداز میں ان سے کہا گیا ”تمہارے لیے وہاں تمہاری مطلوبہ چیزیں ہیں۔“

(۱) کہاں وہ انعامات و احسانات، جس کی تفصیل گزری؟ اور کہاں وہ زلت و مسکنت جو بعد میں ان پر مسلط کر دی گئی؟ اور وہ غضب الہی کے مصداق بن گئے، غضب بھی رحمت کی طرح اللہ کی صفت ہے، جس کی تاویل ارادہ، عقوبت یا نفسِ عقوبت سے کرنا صحیح نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر غضب ناک ہوا۔ کَمَا هُوَ شَانُهُ۔ (اپنی شان کے لائق)

(۲) یہ زلت و غضب الہی کی وجہ بیان کی جا رہی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار اور اللہ کی طرف بلانے والے انبیاءِ علیہم السلام اور داعیانِ حق کا قتل اور ان کی تذلیل و اہانت، یہ غضب الہی کا باعث ہے۔ کل یہود اس کا ارتکاب کر کے مغضوب اور ذلیل و رسوا ہوئے تو آج اس کا ارتکاب کرنے والے کس طرح معزز اور سرخرو ہو سکتے ہیں: اٰمِنَ مَا كَانُوْا وَحٰنِثٌ مَا كَانُوْا۔ وہ کوئی بھی ہوں اور کہیں بھی ہوں؟

(۳) یہ زلت و مسکنت کی دوسری وجہ ہے۔ عَصَوْا (نافرمانی کی) کا مطلب ہے جن کاموں سے انہیں روکا گیا تھا، ان کا ارتکاب کیا اور (يَعْتَدُوْنَ) کا مطلب ہے مامور بہ کاموں میں حد سے تجاوز کرتے تھے۔ اطاعت و فرمانبرداری یہ ہے کہ منہیات سے باز رہا جائے اور مأمورات کو اس طرح بجالایا جائے جس طرح ان کو بجالانے کا حکم دیا گیا ہو۔ اپنی طرف سے کسی بیشی یہ زیادتی (اغْتِدَاء) ہے جو اللہ کو سخت ناپسند ہے۔

(۴) يَهُودُ هَوَادَّةٌ (بمعنی محبت) سے یا نَهْوَدٌ (بمعنی توبہ) سے بنا ہے۔ گویا ان کا یہ نام اصل میں توبہ کرنے یا ایک دوسرے کے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے پڑا۔ تاہم موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کو یہود کہا جاتا ہے۔

(۵) نَصَارَى، نَصْرَانُ کی جمع ہے۔ جیسے سَكَرَانُ سَكَرَانُ کی جمع ہے۔ اس کا مادہ نصرت ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کی وجہ سے ان کا یہ نام پڑا، ان کو انصار بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا تھا ﴿عَنْ اَنْصَارِ اللّٰهِ﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو نصاریٰ کہا جاتا ہے، جن کو عیسائی بھی کہتے ہیں۔

(۶) صَابِيْنَ صَابِيٌّ کی جمع ہے۔ یہ لوگ وہ ہیں جو یقیناً ابتدائے دینِ حق کے پیرو رہے ہوں گے (اسی لیے قرآن میں یہودیت و عیسائیت کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے) لیکن بعد میں ان کے اندر فرشتہ پرستی اور ستارہ پرستی آگئی، یا یہ کسی بھی دین کے پیرو نہ رہے۔ اسی لیے لاندہب لوگوں کو صابی کہا جانے لگا۔

دن پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے ان کے اجر ان کے رب کے پاس ہیں اور ان پر نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ اداسی۔^(۱) (۲۳)

مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۲۳﴾

(۱) بعض جدید مفسرین کو اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں بڑی غلطی لگی ہے اور اس سے انہوں نے ”وحدت ادیان“ کا فلسفہ کشید کرنے کی مذموم سعی کی ہے۔ یعنی رسالت محمدیہ پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، بلکہ جو بھی جس دین کو مانتا ہے اور اس کے مطابق ایمان رکھتا اور اچھے عمل کرتا ہے، اس کی نجات ہو جائے گی۔ یہ فلسفہ سخت گمراہ کن ہے، آیت کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیات میں یہودیوں کی بد عملیوں اور سرکشیوں اور اس کی بنا پر ان کے مستحق عذاب ہونے کا تذکرہ فرمایا تو ذہن میں اشکال پیدا ہو سکتا تھا کہ ان یہودیوں میں جو لوگ صحیح کتاب الہی کے پیرو اور اپنے پیغمبر کی ہدایات کے مطابق زندگی گزارنے والے تھے، ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ فرمایا؟ یا کیا معاملہ فرمائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت فرمادی کہ صرف یہودی نہیں، نصاریٰ اور صابئی بھی اپنے اپنے وقت میں جنہوں نے اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھا اور عمل صالح کرتے رہے، وہ سب نجات اخروی سے ہمکنار ہوں گے اور اسی طرح اب رسالت محمدیہ پر ایمان لانے والے مسلمان بھی اگر صحیح طریقے سے ایمان باللہ والیوم الآخر اور عمل صالح کا اہتمام کریں تو یہ بھی یقیناً آخرت کی ابدی نعمتوں کے مستحق قرار پائیں گے۔ نجات اخروی میں کسی کے ساتھ امتیاز نہیں کیا جائے گا۔ وہاں بے لاگ فیصلہ ہو گا۔ چاہے مسلمان ہوں یا رسول آخر الزمان ﷺ سے پہلے گزر جانے والے یہودی، عیسائی اور صابئی وغیرہم۔ اس کی تائید بعض مرسل آثار سے ہوتی ہے، مثلاً مجاہد حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے ان اہل دین کے بارے میں پوچھا جو میرے ساتھی تھے، عبادت گزار اور نمازی تھے (یعنی رسالت محمدیہ سے قبل وہ اپنے دین کے پابند تھے) تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿إِنَّ الْكَافِرِينَ لَمُنْتَوٰا وَكَذٰبِيْنَ هَادُوًا﴾۔ الآیة (ابن کثیر) قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے مثلاً ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِندَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران- ۱۹) ”اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے۔“ ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ عِوٰا الْاِسْلَامِ دِيْنًا لَّنْ يَّقْبَلَ مِنْهُ﴾ (آل عمران- ۸۵) ”جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا متلاشی ہو گا، وہ ہرگز مقبول نہیں ہو گا“ اور احادیث میں بھی نبی ﷺ نے وضاحت فرمادی کہ اب میری رسالت پر ایمان لائے بغیر کسی شخص کی نجات نہیں ہو سکتی، مثلاً فرمایا: ﴿وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيْدهِ! لَا يَسْمَعُ بِيْ رَجُلٌ مِّنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ يَهُودِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا نَّمَّ لَا يُؤْمِنُ بِيْ اِلَّا دَخَلَ النَّارَ﴾ (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب الایمان برسالة نبينا محمد ﷺ) ”قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میری اس امت میں جو شخص بھی میری بابت سن لے، وہ یہودی ہو یا عیسائی، پھر وہ مجھ پر ایمان نہ لائے تو وہ جہنم میں جائے گا“ اس کا مطلب یہ ہے کہ وحدت ادیان کی گمراہی، جہاں دیگر آیات قرآنی کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے، وہاں احادیث کے بغیر قرآن کو سمجھنے کی مذموم سعی کا بھی اس میں بہت دخل ہے۔ اسی لیے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ احادیث صحیحہ کے بغیر قرآن کو نہیں سمجھا جاسکتا۔

اور جب ہم نے تم سے وعدہ لیا اور تم پر طور پہاڑ لا کھڑا کر دیا ^(۱) (اور کہا) جو ہم نے تمہیں دیا ہے، اسے مضبوطی سے تھام لو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد کرو تاکہ تم بیخسکو۔ (۶۳)

لیکن تم اس کے بعد بھی پھر گئے، پھر اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم نقصان والے ہو جاتے۔ (۶۴)

اور یقیناً تمہیں ان لوگوں کا علم بھی ہے جو تم میں سے ہفتہ ^(۲) کے بارے میں حد سے بڑھ گئے اور ہم نے بھی کہہ دیا کہ تم ذلیل بند رہن جاؤ۔ (۶۵)

اسے ہم نے اگلوں پچھلوں کے لئے عبرت کا سبب بنا دیا اور پرہیزگاروں کے لئے وعظ و نصیحت کا۔ (۶۶)

اور (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے جب اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک گائے زین کرنے کا حکم دیتا ہے ^(۳) تو انہوں نے کہا ہم سے مذاق کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ میں ایسا جاہل ہونے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑتا ہوں۔ (۶۷)

وَاذْخُلْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بَقْوَةً وَادْكُرُوا مَا فِيهَا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۶۳﴾

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۶۴﴾

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ عَنْ حَبِيبِي ﴿۶۵﴾

فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْجِزَةً لِلْمُتَّقِينَ ﴿۶۶﴾

وَاذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبُحُوا بَقَرَةً قَالُوا أَتَشْتَجِدُ نَاهُزُؤًا قَالِ اعْوِذْ بِاللَّهِ إِنَّ الْكُفْرَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿۶۷﴾

(۱) جب تورات کے احکام کے متعلق یہود نے ازراہ شرارت کہا کہ ہم سے تو ان احکام پر عمل نہیں ہو سکے گا تو اللہ تعالیٰ نے طور پہاڑ کو سائبان کی طرح ان کے اوپر کر دیا، جس سے ڈر کر انہوں نے عمل کرنے کا وعدہ کیا۔

(۲) سَبْتٌ (ہفتہ) کے دن یہودیوں کو مچھلی کا شکار، بلکہ کوئی بھی دیناوی کام کرنے سے منع کیا گیا تھا، لیکن انہوں نے ایک حیلہ اختیار کر کے حکم الہی سے تجاوز کیا۔ ہفتے والے دن (بطور امتحان) مچھلیاں زیادہ آئیں، انہوں نے گڑھے کھود لیے، تاکہ مچھلیاں ان میں پھنسی رہیں اور پھر اتوار والے دن ان کو پکڑ لیتے۔

(۳) بنی اسرائیل میں ایک لاد ولد مالدار آدمی تھا جس کا وارث صرف ایک بھتیجا تھا، ایک رات اس بھتیجے نے اپنے چچا کو قتل کر کے لاش کسی آدمی کے دروازے پر ڈال دی، صبح قاتل کی تلاش میں ایک دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرانے لگے، بالآخر بات حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پہنچی تو انہیں ایک گائے زین کرنے کا حکم ہوا، گائے کا ایک ٹکڑا متوتل کو مارا گیا جس سے وہ زندہ ہو گیا اور قاتل کی نشاندہی کر کے مر گیا (فتح القدر)

انہوں نے کہا اے موسیٰ! دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے اس کی ماہیت بیان کر دے، آپ نے فرمایا سنو! وہ گائے نہ تو بالکل بڑھیا ہو، نہ بچہ، بلکہ درمیانی عمر کی نوجوان ہو، اب جو تمہیں حکم دیا گیا ہے، بجلاؤ۔ (۶۸)

وہ پھر کہنے لگے کہ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ بیان کرے کہ اس کارنگ کیا ہے؟ فرمایا وہ کتا ہے کہ وہ گائے زرد رنگ کی ہے، چمکیلا اور دیکھنے والوں کو بھلا لگنے والا اس کارنگ ہے۔ (۶۹)

وہ کہنے لگے کہ اپنے رب سے اور دعا کیجئے کہ ہمیں اس کی مزید ماہیت بتلائے، اس قسم کی گائے تو بہت ہیں پتہ نہیں چلتا، اگر اللہ نے چاہا تو ہم ہدایت والے ہو جائیں گے۔ (۷۰)

آپ نے فرمایا کہ اللہ کا فرمان ہے کہ وہ گائے کام کرنے والی زمین میں بل جو تنے والی اور کھیتوں کو پانی پلانے والی نہیں، وہ تندرست اور بے داغ ہے۔ انہوں نے کہا، اب آپ نے حق واضح کر دیا گو وہ حکم برداری کے قریب نہ تھے، لیکن اسے مانا اور وہ گائے زبح کر دی۔ (۷۱)^(۱)

جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا، پھر اس میں اختلاف کرنے لگے اور تمہاری پوشیدگی کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا تھا۔ (۷۲)^(۲)

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ كَلَّا قَارِضٌ وَلَا يَكُونُ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ فَاعْتَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿۶۸﴾

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءٌ فَاقِعَةٌ لَوْ نُفِئْنَا تَسْرُ الْغُظْرَيْنِ ﴿۶۹﴾

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشْبَهُ عَلَيْهَا وَانَّا نَشَاءُ اللَّهَ لِكَيْفَ نَدُونُ ﴿۷۰﴾

قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ كَلَّا ذُلُونٌ يُنْبِرُوا لِأَصْحَابِهَا فَالْمُطَفِّئُ انْحَرِبَتْ مُسْكِمَةٌ لَرِيشَةٍ فِيهَا قَالُوا الَّذِي جَدَّتْ بِالْحَقِيقِ فَعَذَابُكُمْ مَا وَصَا كَادُوا بِفَعْلُونِ ﴿۷۱﴾

وَإِذْ قَاتَلْتُمُوهُمْ فَلَا تُرِيتُمْ فِيهَا وَاللَّهُ مُخَبِّرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۷۲﴾

(۱) انہیں حکم تو یہ دیا گیا تھا کہ ایک گائے زبح کرو۔ وہ کوئی سی بھی ایک گائے زبح کر دیتے تو حکم الہی پر عمل ہو جاتا، لیکن انہوں نے حکم الہی پر سیدھے طریقے سے عمل کرنے کی بجائے، مین میخ نکالنا اور طرح طرح کے سوالات کرنے شروع کر دیے، جس پر اللہ تعالیٰ بھی ان پر سختی کرتا چلا گیا۔ اسی لیے دین میں صحیح اور سختی اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

(۲) یہ قتل کا وہی واقعہ ہے جس کی بنا پر بنی اسرائیل کو گائے زبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس قتل کا راز فاش کر دیا، دراصل حالیکہ وہ قتل رات کی تاریکی میں لوگوں سے چھپ کر کیا گیا تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ نیکی یا بدی تم کتنی بھی چھپ کر کرو، اللہ کے علم میں ہے اور اللہ تعالیٰ اسے لوگوں پر ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس لیے خلوت ہو یا جلوت ہو وقت اور ہر جگہ اچھے کام ہی کیا کرو تاکہ اگر وہ کسی وقت ظاہر بھی ہو جائیں اور لوگوں کے علم میں

ہم نے کہا کہ اس گائے کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم پر لگا دو، (وہ جی اٹھے گا) اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کر کے تمہیں تمہاری عقل مندی کے لئے اپنی نشانیاں دکھاتا ہے۔^(۱) (۷۳)

پھر اس کے بعد تمہارے دل پتھر جیسے بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے،^(۲) بعض پتھروں سے تو نہریں ہمہ نکلتی ہیں، اور بعض پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکل آتا ہے، اور بعض اللہ تعالیٰ کے ڈر سے گر گر پڑتے ہیں،^(۳) اور تم اللہ تعالیٰ کو اپنے اعمال سے غافل نہ جانو۔ (۷۴)

فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بَعْضَهَا اَكْبَرُ لَكَ يٰعِبي اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَرَبِّكَ
الْيَتِيْمَ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاٰنِ كَالْحِجَارِ
اَوْ اَشَدَّ قَسْوًا وَاِنَّ مِنَ الْجِبَارِ لَمَآ يَتَخَفَرُوْنَ اِلَّا نُهْرًا وَاِنَّ
مِنْهَا لَمَآ يَشْفِقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَآ يَهْبِطُ
مِنْ حَصِيَّةٍ اللّٰهُ وَاَللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

بھی آجائیں تو شرمندگی نہ ہو، بلکہ اس کے احترام و وقار میں اضافہ ہی ہو اور بڑی کتنی بھی چھپ کر کیوں نہ کی جائے، اس کے فاش ہونے کا امکان ہے جس سے انسان کی بدنامی اور ذلت و رسوائی ہوتی ہے۔

(۱) مقتول کے دوبارہ جی اٹھنے سے استدلال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ روز قیامت تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت کا اعلان فرما رہا ہے۔ قیامت والے دن دوبارہ مردوں کا زندہ ہونا، منکرین قیامت کے لیے ہمیشہ حیرت و استعجاب کا باعث رہا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کو بھی قرآن کریم میں جگہ جگہ مختلف اسلوب اور پیرائے میں بیان فرمایا ہے سورہ بقرہ میں ہی اللہ تعالیٰ نے اس کی پانچ مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک مثال: ﴿ثُمَّ نَبْعَثُكُم مِّنۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ﴾ (البقرہ: ۵۶) میں گزر چکی ہے۔ دوسری مثال یہی قصہ ہے۔ تیسری مثال دوسرے پارے کی آیت نمبر ۲۳۳ ﴿مَوْثُوْا كَيْفَ تَاٰهَلُوْا﴾ چوتھی آیت نمبر ۲۵۹ ﴿فَاَمَّا تِلْكَ اُمَّةٌ اَللّٰهُ مَآءَةٌ عَلٰہِمْ تَنۢبِئَتۡہُمْ﴾ اور پانچویں مثال اس کے بعد والی آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طیور اربعہ (چار چڑیوں) کی ہے۔

(۲) یعنی گزشتہ معجزات اور یہ تازہ واقعہ کہ مقتول دوبارہ زندہ ہو گیا، دیکھ کر بھی تمہارے دلوں کے اندر اِنَابَةٌ اِلٰی اللّٰهِ کا داعیہ اور توبہ و استغفار کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے برعکس تمہارے دل پتھر کی طرح سخت، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ دلوں کا سخت ہو جانا یہ افراد اور امتوں کے لیے سخت تباہ کن، اور اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ دلوں سے اثر پذیری کی صلاحیت سلب اور قبول حق کی استعداد ختم ہو گئی ہے، اس کے بعد اس کی اصلاح کی توقع کم اور مکمل فنا اور تباہی کا اندیشہ زیادہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اہل ایمان کو خاص طور پر تاکید کی گئی ہے: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوْا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْعَمَلُ فَحَسَبَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ (الحمدید- ۱۶) ”اہل ایمان ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان سے قبل کتاب دی گئی، لیکن مدت گزرنے پر ان کے دل سخت ہو گئے۔“

(۳) پتھروں کی سنگینی کے باوجود، ان سے جو جو فوائد حاصل ہوتے اور جو جو کیفیت ان پر گزرتی ہے، اس کا بیان ہے۔

(مسلمانو!) کیا تمہاری خواہش ہے کہ یہ لوگ ایماندار بن جائیں، حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی جو کلام اللہ کو سن کر، عقل و علم والے ہوتے ہوئے، پھر بھی بدل ڈالا کرتے ہیں۔^(۱) (۷۵)

جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو اپنی ایمانداری ظاہر کرتے ہیں،^(۲) اور جب آپس میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو کیوں وہ باتیں پہنچاتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں سکھائی ہیں، کیا جانتے نہیں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے پاس تم پر ان کی حجت ہو جائے گی۔ (۷۶)

کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پوشیدگی اور ظاہر داری سب کو جانتا ہے؟^(۳) (۷۷)

اَتَتْظَهْرُونَ اَنْ يُؤْمِنُوا بِالْكِتٰبِ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلِمَةَ اللّٰهِ ثُمَّ يَحْرِفُوْنَ عَنْ اُخْبَارِهَا مَاعَقْلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۵

وَ اِذَا الْغَوْا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْا اَلَمْ نَكُنْ لَكُمْ اَحْلٰبًا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْا اَلَمْ نَكُنْ لَكُمْ رِيْجًا فَخَمَّ اللّٰهُ عَنْكُمُ وِجْهًا لَّيْسَ لَكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ اَقْلٰبٌ تَعْمَلُوْنَ ۝۷۶

اَوْ لَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُضَيُّوْنَ
وَمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۷۷

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پتھروں کے اندر بھی ایک قسم کا ادراک و احساس موجود ہے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ تَسْتَفِيْهُ السَّمَوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاَنْ يَّذِيْبُوْا مِنْ سَمٰى الْاَرْضِ يَسْبُوْهُ وَلٰكِنْ لَا تَقْتَعُوْنَ سَبِيْلَهُمْ ﴾ (بنی اسرائیل - ۳۴) (مزید وضاحت کے لیے سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۳۴ کا حاشیہ دیکھئے)۔

(۱) اہل ایمان سے خطاب کر کے یہودیوں کی بابت کہا جا رہا ہے کہ کیا تمہیں ان کے ایمان لانے کی امید ہے، دراصل حالیکہ ان کے پچھلے لوگوں میں ایک فریق ایسا بھی تھا جو کلام الہی میں جانتے بوجھتے تحریف (لفظی و معنوی) کرتا تھا۔ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی ایسے لوگوں کے ایمان لانے کی قطعاً امید نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ دنیوی مفادات یا حزبی تعصبات کی وجہ سے کلام الہی میں تحریف تک کرنے سے گریز نہیں کرتے، وہ گمراہی کی ایسی دلدل میں پھنس جاتے ہیں کہ اس سے نکل نہیں پاتے۔ امت محمدیہ کے بہت سے علاو مشائخ بھی بد قسمتی سے قرآن و حدیث میں تحریف کے مرتکب ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس جرم سے محفوظ رکھے۔ (دیکھئے سورہ نساء آیت ۷۷ کا حاشیہ)

(۲) یہ بعض یہودیوں کے منافقانہ کردار کی نقاب کشائی ہو رہی ہے کہ وہ مسلمانوں میں تو اپنے ایمان کا اظہار کرتے، لیکن جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو اس بات پر ملامت کرتے کہ تم مسلمانوں کو اپنی کتاب کی ایسی باتیں کیوں بتاتے ہو جس سے رسول عربی کی صداقت واضح ہوتی ہے۔ اس طرح تم خود ہی ایک ایسی حجت ان کے ہاتھ میں دے رہے ہو جو وہ تمہارے خلاف بارگاہ الہی میں پیش کریں گے۔

(۳) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم بتلاؤ یا نہ بتلاؤ، اللہ کو تو ہر بات کا علم ہے اور وہ ان باتوں کو تمہارے بتلائے بغیر بھی مسلمانوں پر ظاہر فرما سکتا ہے۔

ان میں سے بعض ان پڑھ ایسے بھی ہیں کہ جو کتاب کے صرف ظاہری الفاظ کو ہی جانتے ہیں اور صرف گمان اور انکل ہی پر ہیں۔^(۱) (۷۸)

ان لوگوں کے لئے ”ویل“ ہے جو اپنے ہاتھوں کی لکھی ہوئی کتاب کو اللہ تعالیٰ کی طرف کی کہتے ہیں اور اس طرح دنیا کھاتے ہیں، ان کے ہاتھوں کی لکھائی کو اور ان کی کمانی کو ویل (ہلاکت) اور افسوس ہے۔^(۲) (۷۹)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف چند روز جنم میں رہیں گے، ان سے کہو کہ کیا تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا کوئی پروانہ ہے؟^(۳) اگر ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کا خلاف نہیں کرے گا (ہرگز نہیں) بلکہ تم تو اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاتے ہو^(۴) جنہیں تم نہیں جانتے۔ (۸۰)

وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَتْلُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمْثَانَ وَإِن هُمْ إِلَّا يَتْلُونَ ﴿٧٨﴾

قَوْلِي لَكَ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا قَوْلِي لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْتُمُونَ ﴿٧٩﴾

وَقَالُوا لَن نَسْتَنَالِكَ يَا مَعْزُودًا مِّمَّا أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا أَفَلَنْ تُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَكُمْ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ بِالْأَعْيُنِ ﴿٨٠﴾

(۱) یہ تو ان کے اہل علم کی باتیں تھیں۔ رہے ان کے ان پڑھ لوگ، وہ کتاب (تورات) سے توبے خبر ہیں، لیکن وہ آرزوئیں ضرور رکھتے ہیں اور گمانوں پر ان کا گزارہ ہے، جس میں انہیں ان کے علمائے جتلا کیا ہوا ہے، مثلاً ہم تو اللہ کے جیتے ہیں۔ ہم جنم میں اگر گئے بھی تو صرف چند دن کے لیے اور ہمیں ہمارے بزرگ بخشوا لیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ جیسے آج کے جاہل مسلمانوں کو بھی علما و مشائخ نے ایسے ہی حسین جالوں اور پر فریب وعدوں میں پھنسا رکھا ہے۔

(۲) یہ یہود کے علما کی جسارت اور خوف الہی سے بے نیازی کی وضاحت ہے کہ اپنے ہاتھوں سے مسئلے گھڑتے ہیں اور بہ بانگ دہل یہ باور کراتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہیں۔ حدیث کی رو سے ”وَيْلٌ“ جنم میں ایک وادی بھی ہے جس کی گہرائی اتنی ہے کہ ایک کافر کو اس کی یہ تک کرنے میں چالیس سال لگیں گے۔ (احمد، ترمذی، ابن حبان والحاکم بحوالہ فتح القدیر) بعض علمائے اس آیت سے قرآن مجید کی فروخت کو ناجائز قرار دیا ہے، لیکن یہ استدلال صحیح نہیں۔ آیت کا مصداق صرف وہی لوگ ہیں جو دنیا کمانے کے لیے کلام الہی میں تحریف کرتے اور لوگوں کو مذہب کے نام پر دھوکہ دیتے ہیں۔

(۳) یہود کہتے تھے کہ دنیا کی کل عمر سات ہزار سال ہے اور ہم ہزار سال کے بدلے ایک دن جنم میں رہیں گے اس حساب سے صرف سات دن جنم میں رہیں گے۔ کچھ کہتے تھے کہ ہم نے چالیس دن چھڑے کی عبادت کی تھی، چالیس دن جنم میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم نے اللہ سے عہد لیا ہے؟ یہ بھی استغمام انکاری ہے۔ یعنی یہ غلط کہتے ہیں اللہ کے ساتھ اس قسم کا کوئی عہد و پیمانہ نہیں ہے۔

(۴) یعنی تمہارا یہ دعویٰ کہ ہم اگر جنم میں گئے بھی تو صرف چند دن ہی کے لیے جائیں گے، تمہاری اپنی طرف سے

یقیناً جس نے بھی برے کام کئے اور اس کی نافرمانیوں سے
اسے گھیر لیا، وہ ہمیشہ کے لئے جہنمی ہے۔ (۸۱)
اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں وہ جنتی ہیں
جو جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۸۲) (۱)

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا کہ تم اللہ تعالیٰ
کے سوا دوسرے کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ
اچھا سلوک کرنا، اسی طرح قرابتداروں، یتیموں اور
مسکینوں کے ساتھ اور لوگوں کو اچھی باتیں کہنا، نمازیں
قائم رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہا کرنا، لیکن تھوڑے سے
لوگوں کے علاوہ تم سب پھر گئے اور منہ موڑ لیا۔ (۸۳)
اور جب ہم نے تم سے وعدہ لیا کہ آپس میں خون نہ بہانا
(قتل نہ کرنا) اور آپس والوں کو جلا وطن نہ کرنا، تم نے
اقرار کیا اور تم اس کے شاہد بنے۔ (۸۴) (۲)

بَلْ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَيْرَاتُهُ فَأُولَٰئِكَ
أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٨١﴾
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٨٢﴾
وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا نَعْبُدُونَ
إِلَّا اللَّهَ نُبُوًّا لَّوَالِدِينَ إِحْسَانًا وَقَدْ ذَرَى الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينُ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا
وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَذُكِّرُوا تَوَكُّفَهُمْ
إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿٨٣﴾
وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَاسْتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ
وَلَا تَتَّخِذُونَ
أَنْفُسَكُمْ مِن دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنْتُمْ تَشَاهِدُونَ ﴿٨٤﴾

ہے اور اس طرح تم اللہ کے ذمے ایسی باتیں لگاتے ہو، جن کا تمہیں خود بھی علم نہیں ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ اپنا وہ اصول
بیان فرما رہا ہے جس کی رو سے قیامت والے دن اللہ تعالیٰ نیک و بد کو ان کی نیکی اور بدی کی جزا دے گا۔
(۱) یہ یہود کے دعوے کی تردید کرتے ہوئے جنت و جہنم میں جانے کا اصول بیان کیا جا رہا ہے۔ جس کے نامہ اعمال میں
برائیاں ہی برائیاں ہوں گی، یعنی کفر و شرک (کہ ان کے ارتکاب کی وجہ سے اگر بعض اچھے عمل بھی کیے ہوں گے تو وہ
بھی بے حیثیت رہیں گے) تو وہ ہمیشہ کے لئے جہنمی ہیں اور جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہوں گے وہ جنتی، اور جو
مومن گناہ گار ہوں گے، ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہو گا، وہ چاہے گا تو اپنے فضل و کرم سے ان کے گناہ معاف فرما کر یا
بطور سزا کچھ عرصہ جہنم میں رکھنے کے بعد یا نبی کریم ﷺ کی شفاعت سے ان کو جنت میں داخل فرما دے گا، جیسا کہ
یہ باتیں صحیح احادیث سے ثابت ہیں اور اہل سنت کا عقیدہ ہے۔

(۲) ان آیات میں پھر وہ عہد بیان کیا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا، لیکن اس سے بھی انہوں نے اعراض ہی کیا۔
اس عہد میں اولاً صرف ایک اللہ کی عبادت کی تاکید ہے جو ہر نبی کی بنیادی اور اولین دعوت رہی ہے (جیسا کہ سورۃ
الأنبیاء آیت ۲۵ اور دیگر آیات سے واضح ہے) اس کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے اللہ کی عبادت کے
بعد دوسرے نمبر پر والدین کی اطاعت و فرماں برداری اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید ہے واضح کر دیا گیا کہ جس
طرح اللہ کی عبادت بہت ضروری ہے، اسی طرح اس کے بعد والدین کی اطاعت بھی بہت ضروری ہے اور اس میں
کو تاہی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد دوسرے نمبر پر

لیکن پھر بھی تم نے آپس میں قتل کیا اور آپس کے ایک فریقے کو جلا وطن کیا اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ان کے خلاف دوسرے کی طرفداری کی، ہاں جب وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئے تو تم نے ان کے فدیے دیئے، لیکن ان کا نکالنا جو تم پر حرام تھا (اس کا کچھ خیال نہ کیا) کیا بعض احکام پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟^(۱) تم میں سے جو بھی ایسا کرے، اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو کہ دنیا میں رسوائی اور قیامت کے دن سخت عذاب کی مار، اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔ (۸۵)

ثُمَّ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ مِّن دِيَارِهِمْ يَنْظُرُونَ عَلَيْهِم بِأَلْسِنَتِهِم وَالْعُدْوَانِ وَإِن يَأْتُواكُمُ الْمُسْرَىٰ فُتَدُّوهُمْ وَهُمْ وَمَوْلَاهُمْ عَلَيْهِمْ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ أَفْتَوْا مِمَّنْ يَبْغِضُ الْكُفْرَ وَيَتَّقُونَ بَعْضُهُمْ فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلْ ذَلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَرُدُّونَ إِلَىٰ أَسْفَلِ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۸۵﴾

والدین کی اطاعت کا ذکر کر کے اس کی اہمیت کو واضح کر دیا ہے، اس کے بعد رشتے داروں، یتیموں اور مساکین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید اور حسن گفتار کا حکم ہے۔ اسلام میں بھی ان باتوں کی بڑی تاکید ہے، جیسا کہ احادیث رسول ﷺ سے واضح ہے۔ اس عہد میں اقامتِ صلوٰۃ اور اتانے زکوٰۃ کا بھی حکم ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں عبادتیں پچھلی شریعتوں میں بھی موجود رہی ہیں جن سے ان کی اہمیت واضح ہے۔ اسلام میں بھی یہ دونوں عبادتیں نہایت اہم ہیں، حتیٰ کہ ان میں سے کسی ایک کے انکار یا اس سے اعراض کو کفر کے مترادف سمجھا گیا ہے، جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کرنے سے واضح ہے۔

(۱) نبی کریم ﷺ کے زمانے میں انصار (جو اسلام سے قبل مشرک تھے) کے دو قبیلے تھے اوس اور خزرج، ان کی آپس میں آئے دن جنگ رہتی تھی۔ اسی طرح یہود مدینہ کے تین قبیلے تھے، بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ یہ بھی آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ بنو قریظہ اوس کے حلیف (ساتھی) اور بنو قینقاع اور بنو نضیر، خزرج کے حلیف تھے۔ جنگ میں یہ اپنے اپنے حلیفوں (ساتھیوں) کی مدد کرتے اور اپنے ہی ہم مذہب یہودیوں کو قتل کرتے، ان کے گھروں کو لوٹتے، اور انہیں جلا وطن کر دیتے۔ دران حالیکہ تورات کے مطابق ایسا کرنا ان کے لیے حرام تھا۔ لیکن پھر انہی یہودیوں کو جب وہ مغلوب ہونے کی وجہ سے قیدی بن جاتے تو فدیہ دے کر چھڑاتے اور کہتے کہ ہمیں تورات میں یہی حکم دیا گیا ہے۔ ان آیات میں یہودیوں کے اسی کردار کو بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے شریعت کو موم کی ناک بنا لیا تھا، بعض چیزوں پر ایمان لاتے اور بعض کو ترک کر دیتے، کسی حکم پر عمل کر لیتے اور کسی وقت شریعت کے حکم کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتے۔ قتل، اخراج اور ایک دوسرے کے خلاف مدد کرنا، ان کی شریعت میں بھی حرام تھا، ان امور کا تو انہوں نے بے محابا ارتکاب کیا اور فدیہ دے کر چھڑا لینے کا جو حکم تھا، اس پر عمل کر لیا۔ حالانکہ اگر پہلے تین امور کا وہ لحاظ رکھتے تو فدیہ دے کر چھڑانے کی نوبت ہی نہ آتی۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے خرید لیا ہے، ان کے نہ تو عذاب ہلکے ہوں گے اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ (۸۶)^(۱)

ہم نے (حضرت) موسیٰ کو کتاب دی اور ان کے پیچھے اور رسول بھیجے اور ہم نے (حضرت) عیسیٰ ابن مریم کو روشن دلیلیں دیں اور روح القدس سے ان کی تائید کروائی۔^(۲) لیکن جب کبھی تمہارے پاس رسول وہ چیز لائے جو تمہاری طبیعتوں کے خلاف تھی، تم نے جھٹ سے تکبر کیا، پس بعض کو تو جھٹلایا اور بعض کو قتل بھی کر ڈالا۔^(۳) (۸۷)

أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يَخَفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٨٦﴾

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَفَقَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ ۖ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۖ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْكُمْ أَنْفَكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۖ فَكَّرِيعًا كَذَّبْتُمْ وَفَرَّغْنَا قَتْلَهُنَّ ﴿٨٧﴾

(۱) یہ شریعت کے کسی حکم کے مان لینے اور کسی کو نظر انداز کر دینے کی سزا بیان کی جا رہی ہے۔ اس کی سزا دنیا میں عزت و سرفرازی کی جگہ (جو مکمل شریعت پر عمل کرنے کا نتیجہ ہے) ذلت و رسوائی اور آخرت میں ابدی نعمتوں کے بجائے سخت عذاب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں وہ اطاعت مقبول ہے جو مکمل ہو، بعض بعض باتوں کا مان لینا یا ان پر عمل کر لینا اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ آیت ہم مسلمانوں کو بھی دعوت غورو فکر دے رہی ہے کہ کہیں مسلمانوں کی ذلت و رسوائی کی وجہ بھی مسلمانوں کا وہی کردار تو نہیں جو مذکورہ آیات میں یہودیوں کا بیان کیا گیا ہے؟

(۲) ﴿وَفَقَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ﴾ کے معنی ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد مسلسل پیغمبر آتے رہے، حتیٰ کہ بنی اسرائیل میں انبیاء کا یہ سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ختم ہو گیا۔ ”بَيِّنَاتٌ“ سے معجزات مراد ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے، جیسے مردوں کو زندہ کرنا، کوڑھی اور اندھے کو صحت یاب کرنا وغیرہ، جن کا ذکر سورۃ آل عمران (آیت ۴۹) میں ہے۔ ”رُوحُ الْقُدُسِ“ سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں، ان کو روح القدس اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ امر تکوینی سے ظہور میں آئے تھے، جیسا کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ”رُوحُ“ کہا گیا ہے، اور ”الْقُدُسُ“ سے ذات الہی مراد ہے اور اس کی طرف روح کی اضافت تشریحی ہے۔ ابن جریر نے اسی کو صحیح تر قرار دیا ہے، کیونکہ المائدۃ (آیت ۱۰) میں روح القدس اور انجیل دونوں الگ الگ مذکور ہیں (اس لیے روح القدس سے انجیل مراد نہیں ہو سکتی) ایک اور آیت میں حضرت جبریل علیہ السلام کو ”الرُّوحُ الْأَمِينُ“ فرمایا گیا ہے اور آنحضرت ﷺ نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا: اللَّهُمَّ! أَيَّدَهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ (اے اللہ روح القدس سے اس کی تائید فرما) ایک دوسری حدیث میں ہے ”وَجِبْرِيلُ مَعَكَ“ (جبریل علیہ السلام تمہارے ساتھ ہیں) معلوم ہوا کہ روح القدس سے مراد حضرت جبریل ہی ہیں، (فتح البیان، ابن کثیر بحوالہ اشرف الحواشی)۔

(۳) جیسے حضرت محمد ﷺ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا اور حضرت زکریا و یحییٰ علیہما السلام کو قتل کیا۔

وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ
فَقَلِيلًا لِمَا يُلْمُونَ ﴿۵۱﴾

یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلاف والے ہیں (۱)
نہیں نہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے انہیں اللہ
تعالیٰ نے ملعون کر دیا ہے، ان کا ایمان بہت ہی تھوڑا
ہے۔ (۲) (۸۸)

اور ان کے پاس جب اللہ تعالیٰ کی کتاب ان کی
کتاب کو سچا کرنے والی آئی، حالانکہ پہلے یہ خود
(اس کے ذریعہ) کافروں پر فتح چاہتے تھے تو باوجود
آ جانے اور باوجود پہچان لینے کے پھر کفر کرنے لگے،
اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کافروں پر۔ (۸۹)

بہت بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انہوں نے اپنے آپ
کو بیچ ڈالا، وہ انکا کفر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے
نازل شدہ چیز کے ساتھ محض اس بات (۳) سے جل کر کہ
اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل اپنے جس بندہ پر چاہا نازل فرمایا،

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ
وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا
جَاءَهُمْ شَاعِرٌ وَعَفُوا كَقَوْمِ آدَمَ ۖ فَكَفَعَتْهُ
اللَّهُ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿۵۱﴾

بِحَسْبِ آسَافِئُوا بِآيَةِ آفَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ بَعِيًا
أَنْ يُكْفِرَ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ

(۱) یعنی ہم پر اے محمد (ﷺ) تیری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا، جس طرح دوسرے مقام پر ہے: ﴿وَقَالُوا قُلُوبُنَا قَلْبٌ﴾
﴿حَمِ السُّجُودَةِ-۵﴾ ”ہمارے دل اس دعوت سے پردے میں ہیں، جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے۔“
(۲) دلوں پر حق بات کا اثر نہ کرنا، کوئی فخر کی بات نہیں۔ بلکہ یہ تو ملعون ہونے کی علامت ہے، پس ان کا ایمان بھی
تھوڑا ہے (جو عند اللہ نامقبول ہے) یا ان میں ایمان لانے والے کم ہی لوگ ہوں گے۔

(۳) ﴿يَسْتَفْتِحُونَ﴾ کے ایک معنی یہ ہیں غلبہ اور نصرت کی دعا کرتے تھے، یعنی جب یہ یہود مشرکین سے شکست کھا
جاتے تو اللہ سے دعا کرتے، یا اللہ آخری نبی جلد مبعوث فرما، تاکہ اس سے مل کر ہم ان مشرکین پر غلبہ حاصل کریں یعنی
اَسْتَفْتِحُ، بمعنی اَسْتَنْصِرُ ہے۔ دوسرے معنی خبر دینے کے ہیں۔ اَنْ: يُخْبِرُونَهُمْ بِأَنَّهُ سَيَبْعَثُ، یعنی یہودی کافروں
کو خبر دیتے کہ عنقریب نبی کی بعثت ہوگی۔ (فتح القدر) لیکن بعثت کے بعد علم رکھنے کے باوجود نبوت محمدی پر محض حسد کی
وجہ سے ایمان نہیں لائے، جیسا کہ اگلی آیت میں ہے۔

(۴) یعنی اس بات کی معرفت کے بعد بھی، کہ حضرت محمد رسول ﷺ، وہی آخری پیغمبر ہیں، جن کے اوصاف تورات و
انجیل میں مذکور ہیں اور جن کی وجہ سے ہی اہل کتاب ان کے ایک ”نجات دہندہ“ کے طور پر منتظر بھی تھے، لیکن ان پر
محض اس جلن اور حسد کی وجہ سے ایمان نہیں لائے کہ نبی ﷺ ہماری نسل میں سے کیوں نہ ہوئے، جیسا کہ ہمارا گمان
تھا، یعنی ان کا انکار دلائل پر نہیں، نسلی منافرت اور حسد و عناد پر مبنی تھا۔

اس کے باعث یہ لوگ غضب^(۱) پر غضب کے مستحق ہو گئے اور ان کافروں کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ (۹۰)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لاؤ تو کہہ دیتے ہیں کہ جو ہم پر اتاری گئی اس پر ہمارا ایمان ہے۔^(۲) حالانکہ اس کے بعد والی کے ساتھ جو ان کی کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے، کفر کرتے ہیں، اچھا ان سے یہ تو دریافت کریں کہ اگر تمہارا ایمان پہلی کتابوں پر ہے تو پھر تم نے اگلے انبیاء کو کیوں قتل کیا؟^(۳) (۹۱)

تمہارے پاس تو موسیٰ ہی دلیل لے کر آئے لیکن تم نے پھر بھی پھینچا پوجا^(۴) تم ہو ہی ظالم۔ (۹۲)

جب ہم نے تم سے وعدہ لیا اور تم پر طور کو کھڑا کر دیا (اور کہہ دیا) کہ ہماری دی ہوئی چیز کو مضبوط تھامو اور سنو! تو انہوں نے کہا، ہم نے سنا اور نافرمانی کی^(۵) اور ان کے

فَبَأْتَوْهُ بِطَبَعٍ عَلَىٰ غَضَبٍ ۚ وَاللَّظِيمِينَ عَذَابٍ مُّهِينٍ ﴿۹۰﴾

وَإِذِ اقْبَلْنَا لَهُمْ اٰمْنًا مِمَّا اَنْزَلْنَا اللّٰهُ قَالُوْا نُوْمِنُ بِمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَاْرَاْنَا ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِيَاءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهَا وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

وَإِذْ اَخَذْنَا مِمَّا يَتَّبِعُوْنَ رَفْعًا تَوَقَّعْتُمْ الطُّوْرَ حُنًۢا وَاَمَّا اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوْفٍ وَّاَسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاَشْرَبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ

(۱) غضب پر غضب کا مطلب ہے بہت زیادہ غضب۔ کیوں کہ بار بار وہ غضب والے کام کرتے رہے، جیسا کہ تفصیل

گزری، اور اب محض حسد کی وجہ سے قرآن اور حضرت محمد ﷺ کا انکار کیا۔

(۲) یعنی تورات پر ہم ایمان رکھتے ہیں یعنی اس کے بعد ہمیں قرآن پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۳) یعنی تمہارا تورات پر دعویٰ ایمان بھی صحیح نہیں ہے۔ اگر تورات پر تمہارا ایمان ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کو تم قتل نہ کرتے، اس سے معلوم ہوا کہ اب بھی تمہارا انکار محض حسد اور عناد پر مبنی ہے۔

(۴) یہ ان کے انکار اور عناد کی ایک اور دلیل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام آیات و اوضاحت اور دلائل قاطعہ اس بات کی لے کر آئے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ معبود صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، لیکن تم نے اس کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی تنگ کیا اور اللہ واحد کو چھوڑ کر پھینچنے کو معبود بنا لیا۔

(۵) یہ کفر و انکار کی انتہا ہے کہ زبان سے تو اقرار کہ سن لیا، یعنی اطاعت کریں گے اور دل میں یہ نیت کہ ہم نے کون سا عمل کرنا ہے؟

يَكْفُرْهُمْ قُلُوبُهُمْ قَدْ يَسْمَأُونَ مُؤْمَرِيَةً
إِيمَانًا لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِرِينَ ﴿۹۲﴾

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِن
دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوْا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۹۳﴾

وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا إِمَّا فَتَمَنَّتْ أَيْدِيهِمْ
وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿۹۴﴾

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاتِهِمْ وَمِن
الَّذِينَ أَسْرَفُوا أَيُّوْمَهُمْ كَمَا أَسْرَفْتُمْ يَوْمَ
الْبَيْتِ

دلوں میں پھڑے کی محبت (گویا) پلا دی گئی (۱) بسبب ان کے کفر کے۔ (۲) ان سے کہہ دیجئے کہ تمہارا ایمان تمہیں برا حکم دے رہا ہے، اگر تم مومن ہو۔ (۹۳) آپ کہہ دیجئے کہ اگر آخرت کا گھر صرف تمہارے ہی لئے ہے، اللہ کے نزدیک اور کسی کے لئے نہیں، تو آؤ اپنی سچائی کے ثبوت میں موت طلب کرو۔ (۹۴) لیکن اپنی کرتوتوں کو دیکھتے ہوئے کبھی بھی موت نہیں مانگیں گے (۳) اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے، (۹۵) بلکہ سب سے زیادہ دنیا کی زندگی کا حریص اے نبی! آپ انہیں کو پائیں گے۔ یہ حرص زندگی میں مشرکوں سے بھی زیادہ ہیں (۴) ان میں سے تو ہر شخص ایک ایک ہزار

(۱) ایک تو محبت خود ایسی چیز ہوتی ہے کہ انسان کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ دوسرے، اس کو اُنسُرْبُوْا (پلا دی گئی) سے تعبیر کیا گیا، کیوں کہ پانی انسان کے رگ و ریشہ میں خوب دوڑتا ہے جب کہ کھانے کا گزر اس طرح نہیں ہوتا۔ (فتح القدیر)

(۲) یعنی عصیان اور پھڑے کی محبت و عبادت کی وجہ وہ کفر تھا جو ان کے دلوں میں گھر کر چکا تھا۔

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر دعوت مہابلہ سے کی ہے، یعنی یہودیوں کو کہا گیا کہ اگر تم نبوت محمدیہ کے انکار اور اللہ سے محبوبیت کے دعوے میں سچے ہو تو مہابلہ کر لو، یعنی اللہ کی بارگاہ میں مسلمان اور یہودی دونوں ملکر یہ عرض کریں کہ یا اللہ دونوں میں سے جو جھوٹا ہے، اسے موت سے ہمکنار کر دے، یہی دعوت انہیں سورت جمعہ میں بھی دی گئی ہے۔ نجران کے عیسائیوں کو بھی دعوت مہابلہ دی گئی تھی، جیسا کہ آل عمران میں ہے۔ لیکن چون کہ یہودی بھی عیسائیوں کی طرح، جھوٹے تھے، اس لیے عیسائیوں ہی کی طرح یہودیوں کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ہرگز موت کی آرزو (یعنی مہابلہ) نہیں کریں گے۔ حافظ ابن کثیر نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے (تفسیر ابن کثیر)

(۴) موت کی آرزو تو کجا، یہ تو دنیوی زندگی کے تمام لوگوں حتی کہ مشرکین سے بھی زیادہ حریص ہیں، لیکن عمر کی یہ درازی انہیں عذاب الہی سے بچانے کے لیے ہی تھی۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ یہودی اپنے ان دعووں میں یکسر جھوٹے تھے کہ وہ اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں، یا جنت کے مستحق صرف وہی ہیں اور دوسرے جہنمی، کیوں کہ فی الواقع اگر ایسا ہوتا، یا کم از کم انہیں اپنے دعووں کی صداقت پر پورا یقین ہوتا، تو یقیناً وہ مہابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے، تاکہ ان کی سچائی واضح اور مسلمانوں کی غلطی آشکارا ہو جاتی۔ مہابلے سے پہلے یہودیوں کا اعراض اور گریز اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ گو وہ زبان سے اپنے بارے میں خوش کن باتیں کر لیتے تھے، لیکن ان کے دل اصل حقیقت سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ اللہ کی بارگاہ میں جانے کے بعد ان کا شروہی ہو گا جو اللہ نے اپنے نافرمانوں کے لیے طے کر رکھا ہے۔

سال کی عمر چاہتا ہے، گو یہ عمر دیا جانا بھی انہیں عذاب سے نہیں چھڑا سکتا، اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کو بخوبی دیکھ رہا ہے۔ (۹۶)

(اے نبی!) آپ کہہ دیجئے کہ جو جبریل کا دشمن ہو جس نے آپ کے دل پر پیغام باری تعالیٰ اتارا ہے، جو پیغام ان کے پاس کی کتاب کی تصدیق کرنے والا اور مومنوں کو ہدایت اور خوشخبری دینے والا ہے۔ (۹۷) (۱)

(تو اللہ بھی اس کا دشمن ہے) جو شخص اللہ کا اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہو، ایسے کافروں کا دشمن خود اللہ ہے۔ (۹۸) (۲)

وَمَا هُوَ بِذَرْجَةٍ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَذِّبَ وَاللَّهُ
بَصِيرٌ ﴿۹۶﴾

كُلٌّ مَنِ كَانَ عَدُوًّا لِلْجِبْرِيِّلِ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ
بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَى
لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۹۷﴾

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيْلَ
وَمِيكَائِيلَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ ﴿۹۸﴾

(۱) احادیث میں ہے کہ چند یہودی علمائے نبی ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ اگر آپ ﷺ نے ان کا صحیح جواب دے دیا تو ہم ایمان لے آئیں گے، کیوں کہ نبی کے علاوہ کوئی ان کا جواب نہیں دے سکتا۔ جب آپ ﷺ نے ان کے سوالوں کا صحیح جواب دے دیا تو انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ پر وحی کون لاتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جبریل۔ یہود کہنے لگے: جبریل تو ہمارا دشمن ہے، وہی تو حرب و قتال اور عذاب لے کر آتا رہا ہے۔ اور اس بہانے سے آپ ﷺ کی نبوت ماننے سے انکار کر دیا (ابن کثیر و فتح القدر)

(۲) یہود کہتے تھے کہ میکائیل ہمارا دوست ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ سب میرے مقبول بندے ہیں جو ان کا یا ان میں سے کسی ایک کا بھی دشمن ہے، وہ اللہ کا بھی دشمن ہے۔ حدیث میں ہے: (مَنْ عَادَى لِيْ وَرِيْثًا فَقَدْ بَارَزَنِيْ بِالْحَرْبِ) (صحیح بخاری کتاب الرقاق باب التواضع) ”جس نے میرے کسی دوست سے دشمنی رکھی، اس نے میرے ساتھ اعلان جنگ کیا ہے“ گویا اللہ کے کسی ایک ولی سے دشمنی سارے اولیاء اللہ سے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے بھی دشمنی ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ اولیاء اللہ کی محبت اور ان کی تعظیم نہایت ضروری اور ان سے بغض و عناد اتنا بڑا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے خلاف اعلان جنگ فرماتا ہے۔ اولیاء اللہ کون ہیں؟ اس کے لیے ملاحظہ ہو سورہ یونس، آیت ۶۲-۶۳، لیکن محبت اور تعظیم کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی قبروں پر گنبد اور قبے بنائے جائیں، ان کی قبروں پر سالانہ عرس کے نام پر میلوں ٹھیلوں کا اہتمام کیا جائے، ان کے نام کی نذر و نیاز اور قبروں کو غسل دیا جائے اور ان پر چادریں چڑھائی جائیں اور انہیں حاجت روا، مشکل کشا، نافع و ضار سمجھا جائے، ان کی قبروں پر دست بستہ قیام اور ان کی چوکھٹوں پر سجدہ کیا جائے وغیرہ، جیسا کہ بد قسمتی سے ”اولیاء اللہ کی محبت“ کے نام پر یہ کاروبار لات و منات فروغ پذیر ہے۔ حالانکہ یہ ”محبت“ نہیں ہے، ان کی عبادت ہے، جو شرک اور ظلم عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ اس فتنہ عبادت قبور سے محفوظ رکھے۔

اور یقیناً ہم نے آپ کی طرف روشن دلیلیں بھیجی ہیں جن کا انکار سوائے بدکاروں کے کوئی نہیں کرتا۔ (۹۹)

یہ لوگ جب کبھی کوئی عہد کرتے ہیں تو ان کی ایک نہ ایک جماعت اسے توڑ دیتی ہے، بلکہ ان میں سے اکثر ایمان سے خالی ہیں۔ (۱۰۰)

جب کبھی ان کے پاس اللہ کا کوئی رسول ان کی کتاب کی تصدیق کرنے والا آیا، ان اہل کتاب کے ایک فرقہ نے اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے ڈال دیا گویا جانتے ہی نہ تھے۔ (۱۰۱)

اور اس چیز کے پیچھے لگ گئے جسے شیاطین (حضرت) سلیمان کی حکومت میں پڑھتے تھے۔ سلیمان نے تو کفر نہ کیا تھا، بلکہ یہ کفر شیطانوں کا تھا، وہ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے، (۲) اور بابل میں ہاروت ماروت دو فرشتوں پر

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَ مُبَارَكًا
الْفَيْصُورَ ﴿۹۹﴾
أَوْ كَلِمَاتٍ مَّعَهُدًا وَعَهْدًا ابْتَدَأَ قَرِينٌ مِنْهُمْ بَلَّ الْكُفْرَ لَمْ
لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱۰۰﴾

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ
بَتَدْفِيرٍ مِنْ الْأَنْبِيَاءِ قَالُوا الْكُفْرُ يَكُونُ لِلدَّوْدِ وَآءِ
ظُهُورِهِمْ كَالظُّلُمِ لَا يَتَكُونُونَ ﴿۱۰۱﴾

وَالْحَبَشِيُّونَ وَتَشَلُّوا الشَّيْطَانِ عَلَى مَلِكٍ سُلَيْمَانَ
وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَكِنَّ الشَّيْطَانِ كَفَرُوا يَعْلَمُونَ
النَّاسِ الشَّعْرَةَ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمَلِكَيْنِ بِبَابِلَ

(۱) اللہ تعالیٰ نبی ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرما رہا ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کو بہت سی آیات بینات عطا کی ہیں، جن کو دیکھ کر یہود کو بھی ایمان لے آنا چاہیے تھا۔ علاوہ ازیں خود ان کی کتاب تورات میں بھی آپ ﷺ کے اوصاف کا ذکر اور آپ ﷺ پر ایمان لانے کا عہد موجود ہے، لیکن انہوں نے پہلے بھی کسی عہد کی کب پروا کی ہے جو اس عہد کی وہ کریں گے؟ عہد شکنی ان کے ایک گروہ کی ہمیشہ عادت رہی ہے۔ حتیٰ کہ اللہ کی کتاب کو بھی اس طرح پس پشت ڈال دیا، جیسے وہ اسے جانتے ہی نہیں۔

(۲) یعنی ان یہودیوں نے اللہ کی کتاب اور اس کے عہد کی تو کوئی پروا نہیں کی، البتہ شیطان کے پیچھے لگ کر نہ صرف جادو ٹونے پر عمل کرتے رہے، بلکہ یہ دعویٰ کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بھی (نعوذ باللہ) اللہ کے پیغمبر نہیں تھے بلکہ ایک جادو گر تھے اور جادو کے زور سے ہی حکومت کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حضرت سلیمان علیہ السلام جادو کا عمل نہیں کرتے تھے، کیوں کہ عمل سحر تو کفر ہے، اس کفر کا ارتکاب حضرت سلیمان علیہ السلام کیوں کر کر سکتے تھے؟ کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جادو گری کا سلسلہ بہت عام ہو گیا تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے سدباب کے لیے جادو کی کتابیں لے کر اپنی کرسی یا تخت کے نیچے دفن کر دیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد ان شیاطین اور جادو گروں نے ان کتابوں کو نکال کر نہ صرف لوگوں کو دکھایا، بلکہ لوگوں کو یہ باور کرایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی قوت و اقتدار کا راز یہی جادو کا عمل تھا اور اسی بنا پر ان ظالموں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی کافر قرار دیا، جس کی تردید اللہ تعالیٰ نے فرمائی (ابن کثیر۔ وغیرہ) واللہ اعلم۔

هَارُونَ وَمَارُوتَ وَمَا يَعْلَمِينَ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا
 نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ
 بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ وَمَا هُمْ بِضَآئِرِينَ بِهِ مِنْ
 أَحَدٍ إِلَّا يَأْذِنُ اللَّهُ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ
 وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلَّمُوا الْكَلِمَ اشْتَرَاهُ مَالًا

جو اتارا گیا تھا،^(۱) وہ دونوں بھی کسی شخص کو اس وقت
 تک نہیں سکھاتے تھے^(۲) جب تک یہ نہ کہہ دیں کہ ہم
 تو ایک آزمائش ہیں^(۳) تو کفر نہ کر، پھر لوگ ان سے وہ
 سیکھتے جس سے خاوند و بیوی میں جدائی ڈال دیں اور
 دراصل وہ بغیر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے کسی کو کوئی نقصان
 نہیں پہنچا سکتے،^(۴) یہ لوگ وہ سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان

(۱) بعض مفسرین نے وَمَا أُذْرِلَ فِيهِ مَا نَافِيَهُ مراد لیا ہے اور ہاروت و ماروت پر کسی چیز کے اترنے کی نفی کی ہے، لیکن
 قرآن کریم کا سیاق اس کی تائید نہیں کرتا۔ اسی لیے ابن جریر وغیرہ نے اس کی تردید کی ہے (ابن کثیر) اسی طرح ہاروت و
 ماروت کے بارے میں بھی تفاسیر میں اسرائیلی روایات کی بھرمار ہے۔ لیکن کوئی صحیح مرفوع روایت اس بارے میں ثابت
 نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی تفصیل کے نہایت اختصار کے ساتھ یہ واقعہ بیان کیا ہے، ہمیں صرف اس پر اور اسی حد
 تک ایمان رکھنا چاہیے (تفسیر ابن کثیر) قرآن کے الفاظ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بابل میں ہاروت و
 ماروت فرشتوں پر جادو کا علم نازل فرمایا تھا اور اس کا مقصد واللہ أَعْلَمُ بالصَّوَابِ یہ معلوم ہوتا ہے، تاکہ وہ لوگوں کو
 بتائیں کہ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں پر ظاہر شدہ معجزے، جادو سے مختلف چیز ہے اور جادو یہ ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ کی
 طرف سے ہمیں عطا کیا گیا ہے (اس دور میں جادو عام ہونے کی وجہ سے لوگ انبیاء کو بھی نعوذ باللہ جادوگر اور شعبہ باز
 سمجھنے لگے تھے) اسی مغالطے سے لوگوں کو بچانے کے لیے اور بطور امتحان فرشتوں کو نازل فرمایا گیا۔

دوسرا مقصد بنو اسرائیل کی اخلاقی گراؤ کی نشاندہی معلوم ہوتا ہے کہ بنو اسرائیل کس طرح جادو سیکھنے کے لیے
 ان فرشتوں کے پیچھے پڑے اور یہ بتلانے کے باوجود کہ جادو کفر ہے اور ہم آزمائش کے لیے آئے ہیں، وہ علم سحر حاصل
 کرنے کے لیے ٹوٹے پڑے تھے جس سے انکا مقصد ہتھ پستے گھروں کو اجاڑنا اور میاں بیوی کے درمیان نفرت کی
 دیواریں کھڑی کرنا تھا۔ یعنی یہ ان کے گراؤ، بگاڑ اور فساد کے سلسلے کی ایک اہم کڑی تھی اور اس طرح کے توہمات
 اور اخلاقی گراؤ کسی قوم کی انتہائی بگاڑ کی علامت ہیں۔ أَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ

(۲) یہ ایسے ہی ہے جیسے باطل کی تردید کے لیے، باطل مذہب کا علم کسی استاذ سے حاصل کیا جائے، استاذ شاگرد کو اس
 یقین دہانی پر باطل مذہب کا علم سکھائے کہ وہ اس کی تردید کرے گا۔ لیکن علم حاصل کرنے کے بعد وہ خود بد مذہب ہو
 جائے، یا اس کا غلط استعمال کرے تو استاذ اس میں قصور وار نہیں ہوگا۔

(۳) أَيْ: إِنَّمَا نَحْنُ آيَاتٌ وَاختِبَاءٌ مِنَ اللَّهِ لِعِبَادِهِ هَمُّ اللَّهِ فِي طَرَفٍ مِنْ بَدَنِهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّهُمْ لَيْسُوا بِمُتَعَلِّمِينَ
 (۴) یہ جادو بھی اس وقت تک کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا جب تک اللہ کی مشیت اور اس کا اذن نہ ہو۔ اس لیے اس
 کے سیکھنے کا فائدہ بھی کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جادو کے سیکھنے اور اس پر عمل کرنے کو کفر قرار دیا ہے، ہر قسم کی
 خیر کی طلب اور ضرر کے دفع کے لیے صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کیا جائے، کیوں کہ وہی ہر چیز کا خالق ہے اور

فِي الْأَجْرَةِ مِنْ خَلْقِي يَوْمَ كَيْدِي مَا شَرَرُوا بِهِ
أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۱۰۱﴾

وَلَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۱۰۲﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا
وَأَسْمِعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۰۳﴾

مَا يَدْعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمَشْرِكِينَ
أَنْ يُنْزِلَ عَلَيْهِمْ مِنْ خَبَرٍ مَنْ رَزَقَهُمُ اللَّهُ لِيُخْطِئُوا
بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَأْ اللَّهُ ذُو الْقُدْرَةِ الْعَظِيمِ ﴿۱۰۴﴾

مَا نَسْعُرُ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنَبِّئُهَا نَاتِلَ عَلَيْهَا قُدْرَتْنَا أَوْ مِثْلَهَا الْكَمْرُ
تَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۰۵﴾

پہنچائے اور نفع نہ پہنچا سکے، اور وہ بالیقین جانتے ہیں کہ
اس کے لینے والے کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور
وہ بدترین چیز ہے جس کے بدلے وہ اپنے آپ کو فروخت
کر رہے ہیں، کاش کہ یہ جانتے ہوتے۔ (۱۰۲)

اگر یہ لوگ صاحب ایمان متقی بن جاتے تو اللہ تعالیٰ کی
طرف سے بہترین ثواب انہیں ملتا، اگر یہ جانتے ہوتے۔ (۱۰۳)
اے ایمان والو! تم (نبی ﷺ کو) ”راعنا“ نہ کہا کرو، بلکہ
”انظرنا“ کہو^(۱) یعنی ہماری طرف دیکھئے اور سنتے رہا کرو
اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (۱۰۴)

نہ تو اہل کتاب کے کافروں نہ مشرکین چاہتے ہیں کہ تم پر
تمہارے رب کی کوئی بھلائی نازل ہو (ان کے اس حسد
سے کیا ہوا) اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنی رحمت خصوصیت
سے عطا فرمائے، اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔ (۱۰۵)

جس آیت کو ہم منسوخ کر دیں، یا بھلا دیں اس سے بہتر یا
اس جیسی اور لاتے ہیں، کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ ہر
چیز پر قادر ہے۔ (۱۰۶)

کائنات میں ہر کام اسی کی مشیت سے ہوتا ہے۔

(۱) رَاعِنَا کے معنی ہیں، ہمارا لحاظ اور خیال کیجئے۔ بات سمجھ میں نہ آئے تو سامع اس لفظ کا استعمال کر کے متکلم کو اپنی
طرف متوجہ کرتا تھا، لیکن یہودی اپنے بغض و عناد کی وجہ سے اس لفظ کو تھوڑا سا بگاڑ کر استعمال کرتے تھے جس سے اس
کے معنی میں تبدیلی اور ان کے جذبہ عناد کی تسلی ہو جاتی، مثلاً وہ کہتے رَاعِنَا (ہمارے چرواہے) یا رَاعِنَا (احق) وغیرہ،
جیسے وہ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ کی بجائے السَّامُ عَلَيْكُمْ (تم پر موت آئے) کہا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ”انظُرْنَا“
کہا کرو۔ اس سے ایک تو یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ ایسے الفاظ، جن میں تنقیص و اہانت کا شائبہ ہو، ادب و احترام کے پیش
نظر اور سد ذریعہ کے طور پر ان کا استعمال صحیح نہیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ کفار کے ساتھ افعال و اقوال میں
مشابہت اختیار کرنے سے بچا جائے، تاکہ مسلمان «مَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ» (ابوداؤد) کتاب اللباس، باب فی
لبس الشهرة: وقال الألبانی هذا إسناد حسن، بحوالہ حجاب المرأة، ص ۱۰۳، (جو کسی قوم کی مشابہت اختیار
کرے گا، وہ انہی میں شمار ہوگا) کی وعید میں داخل نہ ہوں۔

کیا تجھے علم نہیں کہ زمین و آسمان کا ملک اللہ ہی کے لئے ہے ^(۱) اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی ولی اور مددگار نہیں۔ (۱۰۷)

کیا تم اپنے رسول سے یہی پوچھنا چاہتے ہو جو اس سے پہلے موسیٰ (علیہ السلام) سے پوچھا گیا تھا؟ ^(۲) (سنو ایمان کو کفر سے بدلنے والا سیدھی راہ سے بھٹک جاتا ہے۔ (۱۰۸)

أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ قَوْلٍ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۱۰۷﴾

أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سَأَلُوا
مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَنْ يَتَّبِعِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ
سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿۱۰۸﴾

(۱) نسخ کے لغوی معنی تو نقل کرنے کے ہیں، لیکن شرعی اصطلاح میں ایک حکم کو بدل کر دوسرا حکم نازل کرنے کے ہیں۔ یہ نسخ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے۔ جیسے آدم علیہ السلام کے زمانے میں سنگے بن بھائیوں کا آپس میں نکاح جائز تھا، بعد میں اسے حرام کر دیا گیا، وغیرہ، اسی طرح قرآن میں بھی اللہ تعالیٰ نے بعض احکام منسوخ فرمائے اور ان کی جگہ نیا حکم نازل فرمایا۔ ان کی تعداد میں اختلاف ہے۔ شاہ ولی اللہ نے ”الفوز الکبیر“ میں ان کی تعداد صرف پانچ بیان کی ہے۔ یہ نسخ تین قسم کا ہے۔ ایک تو مطلقاً نسخ حکم یعنی ایک کو بدل کر دوسرا حکم نازل کر دیا گیا۔ دوسرا ہے نسخ مع استلاوہ۔ یعنی پہلے حکم کے الفاظ قرآن مجید میں موجود رکھے گئے ہیں، ان کی تلاوت ہوتی ہے لیکن دوسرا حکم بھی، جو بعد میں نازل کیا گیا، قرآن میں موجود ہے، یعنی ناخ اور منسوخ دونوں آیات موجود ہیں۔ نسخ کی ایک تیسری قسم یہ ہے کہ ان کی تلاوت منسوخ کر دی گئی۔ یعنی قرآن کریم میں نبی ﷺ نے انہیں شامل نہیں فرمایا، لیکن ان کا حکم باقی رکھا گیا۔ جیسے «الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَانَا فَارْجُمُوهُمَا بِالْبَيْتَةِ» (موطامام مالک) ”شادی شدہ مرد اور عورت اگر زنا کار تکاب کریں تو یقیناً انہیں سنگسار کر دیا جائے“ اس آیت میں نسخ کی پہلی دو قسموں کا بیان ہے ﴿مَا تَنكِحُوا مِنْ آيَاتِهِ﴾ میں دوسری قسم اور ﴿أَوْ ذُنُوبِهِمْ﴾ میں پہلی قسم۔ نُنْسِبَهَا (ہم بھلاو دیتے ہیں) کا مطلب ہے کہ اس کا حکم اور تلاوت دونوں اٹھالیتے ہیں۔ گویا کہ ہم نے اسے بھلا دیا اور نیا حکم نازل کر دیا۔ یا نبی ﷺ کے قلب سے ہی ہم نے اسے مٹا دیا اور اسے نیا منسیا کر دیا گیا۔ یہودی تورات کو ناقابل نسخ قرار دیتے تھے اور قرآن پر بھی انہوں نے بعض احکام کے منسوخ ہونے کی وجہ سے اعتراض کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی اور کہا کہ زمین و آسمان کی بادشاہی اسی کے ہاتھ میں ہے، وہ جو مناسب سمجھے کرے، جس وقت جو حکم اس کی مصلحت و حکمت کے مطابق ہو، اسے نافذ کرے اور جسے چاہے منسوخ کر دے۔ یہ اس کی قدرت ہی کا ایک مظاہرہ ہے۔ بعض قدیم گمراہوں (مثلاً ابو مسلم اصفہانی معتزلی) اور آج کل کے بھی بعض متجددین نے یہودیوں کی طرح قرآن میں نسخ ماننے سے انکار کیا ہے۔ لیکن صحیح بات وہی ہے جو مذکورہ سطروں میں بیان کی گئی ہے، سلف صالحین کا عقیدہ بھی اثبات نسخ ہی رہا ہے۔

(۲) مسلمانوں (صحابہ رضی اللہ عنہم) کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تم یہودیوں کی طرح اپنے پیغمبر ﷺ سے از راہ سرکشی غیر ضروری سوالات مت کیا کرو۔ اس میں اندیشہ کفر ہے۔

ان اہل کتاب کے اکثر لوگ باوجود حق واضح ہو جانے کے محض حسد و بغض کی بنا پر تمہیں بھی ایمان سے ہٹا دینا چاہتے ہیں، تم بھی معاف کرو اور چھوڑو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لائے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (۱۰۹)

تم نمازیں قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہا کرو اور جو کچھ بھلائی تم اپنے لئے آگے بھیجو گے، سب کچھ اللہ کے پاس پالو گے، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔^(۱) (۱۱۰)

یہ کہتے ہیں کہ جنت میں یہود و نصاریٰ کے سوا اور کوئی نہ جائے گا، یہ صرف ان کی آرزوئیں ہیں، ان سے کہو کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل تو پیش کرو۔^(۲) (۱۱۱)

سنو! جو بھی اپنے آپ کو خلوص کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا دے۔^(۳) بے شک اسے اس کا رب پورا بدلہ دے گا، اس پر نہ تو کوئی خوف ہو گا، نہ غم اور اداسی۔ (۱۱۲) یہود کہتے ہیں کہ نصرانی حق پر نہیں^(۴) اور نصرانی کہتے ہیں

وَذَكِّرْتُمْ مِنْ أَمَلِ الْكِتَابِ لَتُوبِكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ
إِيمَانِكُمْ لَعَلَّكُمْ أَتَقْتَدُونَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ
مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْتَدُوا وَأَصْحَابُ حَاكِي يَأْتِي
اللَّهُ بِأَمْرٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَمَا تَقَدَّسُوا
لَكُمْ فَيَسِّرْ لَكُمْ مِنْ حَيْثُ شِئْتُمْ وَرَبُّكُمْ يَعْلَمُ
بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا
أَوْ نَصْرَانِيًّا تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا
بُرْهَانَكُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝

يَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ
رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَبِستِ النَّصْرَانِي عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصْرَانِي

(۱) یہودیوں کو اسلام اور نبی ﷺ سے جو حسد اور عناد تھا اس کی وجہ سے وہ مسلمانوں کو دین اسلام سے پھیرنے کی مذموم سعی کرتے رہتے تھے۔ مسلمانوں کو کما جا رہا ہے کہ تم صبر اور درگزر سے کام لیتے ہوئے، ان احکام و فرائض اسلام کو بجالاتے رہو، جن کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔

(۲) یہاں اہل کتاب کے اس غرور اور فریب نفس کو پھر بیان کیا جا رہا ہے جس میں وہ مبتلا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں جن کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔

(۳) ﴿اسَلِّمْ وَجْهَكَ لِلَّهِ﴾ کا مطلب ہے محض اللہ کی رضا کے لیے کام کرے اور ﴿وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ کا مطلب ہے اخلاص کے ساتھ پیغمبر آخر الزمان ﷺ کی سنت کے مطابق۔ قبولیت عمل کے لیے یہ دو بنیادی اصول ہیں اور نجات اخروی انہی اصولوں کے مطابق کیے گئے اعمال صالحہ پر مبنی ہے، نہ کہ محض آرزوؤں پر۔

(۴) یہودی تورات پڑھتے ہیں جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق موجود ہے، لیکن اس کے باوجود یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکفیر کرتے تھے۔ عیسائیوں کے پاس انجیل موجود ہے جس

کہ یہودی حق پر نہیں، حالانکہ یہ سب لوگ تورات پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ان ہی جیسی بات بے علم بھی کہتے ہیں۔^(۱) قیامت کے دن اللہ ان کے اس اختلاف کا فیصلہ ان کے درمیان کر دے گا۔ (۱۱۳)

اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کئے جانے کو روکے^(۲) اور ان کی بربادی کی کوشش کرے،^(۳) ایسے لوگوں کو خوف کھاتے ہوئے ہی اس میں جانا چاہئے،^(۴) ان کے لئے دنیا

كَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتَّبِعُونَ الْكِتَابَ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ كَانَتْ هِيَ عَنكُمُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۱۳﴾

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهِ ۗ أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ لَهُمْ فِي النَّبَاِ حَزْبًا ۗ أُولَٰئِكَ فِي النَّارِ

میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات کے مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ہونے کی تصدیق ہے، اس کے باوجود یہ یہودیوں کی تکفیر کرتے ہیں، یہ گویا اہل کتاب کے دونوں فرقوں کے کفر و عناد اور اپنے اپنے بارے میں خوش فہمیوں میں مبتلا ہونے کو ظاہر کیا جا رہا ہے۔

(۱) اہل کتاب کے مقابلے میں عرب کے مشرکین ان پڑھ (أُمِّيِّينَ) تھے، اس لیے انہیں بے علم کہا گیا، لیکن وہ بھی مشرک ہونے کے باوجود یود و نصاریٰ کی طرح، اس زعم باطل میں مبتلا تھے کہ وہی حق پر ہیں۔ اسی لیے وہ نبی ﷺ کو صابی یعنی بے دین کہا کرتے تھے۔

(۲) جن لوگوں نے مسجدوں میں اللہ کا ذکر کرنے سے روکا، یہ کون ہیں؟ ان کے بارے میں مفسرین کی دو رائے ہیں: ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد عیسائی ہیں، جنہوں نے بادشاہ روم کے ساتھ مل کر بیت المقدس میں یہودیوں کو نماز پڑھنے سے روکا اور اس کی تخریب میں حصہ لیا۔ ابن جریر طبری نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے، لیکن حافظ ابن کثیر نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے اس کا مصداق مشرکین مکہ کو قرار دیا ہے، جنہوں نے ایک تو نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ ﷺ کو مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور یوں خانہ کعبہ میں مسلمانوں کو عبادت سے روکا۔ پھر صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی یہی کردار دہرایا اور کہا کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے قاتلوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے، حالانکہ خانہ کعبہ میں کسی کو عبادت سے روکنے کی اجازت اور روایت نہیں تھی۔

(۳) تخریب اور بربادی صرف یہی نہیں ہے کہ اسے ڈھا دیا جائے اور عمارت کو نقصان پہنچایا جائے، بلکہ ان میں اللہ کی عبادت اور ذکر سے روکنا، اقامت شریعت اور مظاہر شرک سے پاک کرنے سے منع کرنا بھی تخریب اور اللہ کے گھروں کو برباد کرنا ہے۔

(۴) یہ الفاظ خبر کے ہیں، لیکن مراد اس سے یہ خواہش ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تمہیں ممکن اور غلبہ عطا فرمائے تو تم ان مشرکین کو اس میں صلح اور جزیے کے بغیر رہنے کی اجازت نہ دینا، چنانچہ جب ۸ ہجری میں مکہ فتح ہوا تو نبی ﷺ نے اعلان فرمادیا کہ آئندہ سال کعبہ میں کسی مشرک کو حج کرنے کی اور ننگا طواف کرنے کی اجازت نہیں ہوگی اور جس سے

میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔ (۱۱۳)

اور مشرق اور مغرب کا مالک اللہ ہی ہے۔ تم جدھر بھی منہ کرو ادھر ہی اللہ کا منہ ہے،^(۱) اللہ تعالیٰ کشادگی اور وسعت والا اور بڑے علم والا ہے۔ (۱۱۵)

یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے، (نہیں بلکہ) وہ پاک ہے زمین و آسمان کی تمام مخلوق اس کی ملکیت میں ہے اور ہر ایک اس کا فرمانبردار ہے۔ (۱۱۶)

وہ زمین اور آسمانوں کا ابتداء پیدا کرنے والا ہے، وہ جس کام کو کرنا چاہے کہہ دیتا ہے کہ ہو جا، بس وہ وہیں ہو جاتا ہے۔^(۲) (۱۱۷)

اسی طرح بے علم لوگوں نے بھی کہا کہ خود اللہ تعالیٰ ہم سے باتیں کیوں نہیں کرتا، یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں

عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۱۳﴾

وَاللَّهُ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ قَائِمًا مَّا كُنْتُمْ تَدْعُونَ وَجِبَةُ اللَّهِ تَارَةً
اللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۱۵﴾

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۚ سُبْحٰنَہٗٓ بَل لَّعَنَّا رَبَّنَا لَمَّا كُنَّا فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ كُلِّ لَهٗ قٰنِیْنُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

بِیْدِیْعِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَاِذْ اَقْصٰی اَمْرًا قٰنِیْمًا یَقُوْلُوْنَ
لَهٗ کُنْ فِیْکُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

وَقَالَ الْاٰنْبِیّٰیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْلَا کَلٰمُنَا لَآلِهٖٓ اَوْ تَاٰتِیٰنَا

جو معاہدہ ہے، معاہدے کی مدت تک اسے یہاں رہنے کی اجازت ہے، بعض نے کہا ہے کہ یہ خوشخبری اور پیش گوئی ہے کہ عنقریب مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو جائے گا اور یہ مشرکین خانہ کعبہ میں ڈرتے ہوئے داخل ہوں گے کہ ہم نے جو مسلمانوں پر پہلے زیادتیاں کی ہیں، انکے بدلے میں ہمیں سزا سے دوچار یا قتل نہ کر دیا جائے۔ چنانچہ جلد ہی یہ خوشخبری پوری ہو گئی۔

(۱) ہجرت کے بعد جب مسلمان بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے تو مسلمانوں کو اس کا رخ تھا، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض کہتے ہیں اس وقت نازل ہوئی جب بیت المقدس سے، پھر خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم ہوا تو یہودیوں نے طرح طرح کی باتیں بنائیں، بعض کے نزدیک اس کے نزول کا سبب سفر میں سواری پر نفل نماز پڑھنے کی اجازت ہے کہ سواری کا منہ کدھر بھی ہو، نماز پڑھ سکتے ہو۔ کبھی چند اسباب جمع ہو جاتے ہیں اور ان سب کے حکم کے لیے ایک ہی آیت نازل ہو جاتی ہے۔ ایسی آیتوں کے شان نزول میں متعدد روایات مروی ہوتی ہیں، کسی روایت میں ایک سبب نزول کا بیان ہوتا ہے اور کسی میں دوسرے کا۔ یہ آیت بھی اسی قسم کی ہے (مخلص از احسن التفاسیر)۔

(۲) یعنی وہ اللہ تو وہ ہے کہ آسمان و زمین کی ہر چیز کا وہ مالک ہے، ہر چیز اس کی فرماں بردار ہے، بلکہ آسمان و زمین کا بغیر کسی نمونے کے بنانے والا بھی وہی ہے۔ علاوہ ازیں وہ جو کام کرنا چاہے اس کے لیے اسے صرف لفظ کن کافی ہے۔ ایسی ذات کو بھلا اولاد کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟

أَيُّهُ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ
قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ
يُوْقِنُونَ ﴿۱۱۸﴾

إِنَّا أَسْأَلُكَ يَا حَقُّ بِشَيْءٍ أَوْ تَنْدِيرًا وَلَا تَسْأَلُ عَنْ
أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ﴿۱۱۹﴾

وَلَنْ نَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودَ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ
قُلْ إِنْ هَدَىٰ اللَّهُ هُوَ الْهَدَىٰ وَلَئِنَّ الْآبِعْتِ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ
الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۱۲۰﴾

نہیں آتی؟^(۱) اسی طرح ایسی ہی بات ان کے اگلوں نے
بھی کسی تھی، ان کے اور ان کے دل یکساں ہو گئے۔^(۲)
ہم نے تو یقین والوں کے لئے نشانیاں بیان کر
دیں۔ (۱۱۸)

ہم نے آپ کو حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور
ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور جنہیوں کے بارے میں
آپ سے پرسش نہیں ہوگی۔ (۱۱۹)

آپ سے یہود و نصاریٰ ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب
تک کہ آپ ان کے مذہب کے تابع نہ بن جائیں،^(۳)
آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے^(۴) اور
اگر آپ نے باوجود اپنے پاس علم آجانے کے، پھر ان کی
خواہشوں کی پیروی کی تو اللہ کے پاس آپ کا نہ تو کوئی
ولی ہو گا اور نہ مددگار۔^(۵) (۱۲۰)

(۱) اس سے مراد مشرکین عرب ہیں جنہوں نے یہودیوں کی طرح مطالبہ کیا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے براہ راست گفتگو کیوں
نہیں کرتا، یا کوئی بڑی نشانی کیوں نہیں دکھا دیتا؟ جسے دیکھ کر ہم مسلمان ہو جائیں جس طرح کہ سورہ بنی اسرائیل (آیت
۹۰ تا ۹۳) میں اور دیگر مقامات پر بھی بیان کیا گیا ہے۔

(۲) یعنی مشرکین عرب کے دل، کفر و عناد اور انکار و سرکشی میں اپنے ما قبل کے لوگوں کے دلوں کے مشابہ ہو گئے۔ جیسے
سورہ زاریات میں فرمایا گیا: ﴿كَذَلِكَ مَا آتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِذْ قَالُوا اسْأَلُوا سُبْحَانَ رَبِّهِمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا﴾ (ان
سے پہلے جو بھی رسول آیا، اس کو لوگوں نے جادوگر یا دیوانہ ہی کہا۔ کیا یہ اس بات کی ایک دوسرے کو وصیت کر جاتے
تھے؟ نہیں یہ سب سرکش لوگ ہیں) یعنی قدر مشترک ان سب میں سرکشی کا جذبہ ہے، اس لیے داعیان حق کے سامنے
نئے نئے مطالبے رکھتے ہیں، یا انہیں دیوانہ گردانتے ہیں۔

(۳) یعنی یہودیت یا نصرانیت اختیار کر لے۔

(۴) جو اب اسلام کی صورت میں ہے، جس کی طرف نبی کریم ﷺ دعوت دے رہے ہیں، نہ کہ تحریف شدہ یہودیت
و نصرانیت۔

(۵) یہ اس بات پر وعید ہے کہ علم آجانے کے بعد بھی اگر محض ان بر خود غلط لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی پیروی
کی تو تیرا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ یہ دراصل امت محمدیہ کو تعلیم دی جا رہی ہے کہ اہل بدعت اور گمراہوں کی خوشنودی کے
لیے وہ بھی ایسا کام نہ کریں، نہ دین میں مداخلت اور بے جا تاویل کا ارتکاب کریں۔

جنہیں ہم نے کتاب دی ہے ^(۱) اور وہ اسے پڑھنے کے حق کے ساتھ پڑھتے ہیں، ^(۲) وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور جو اس کے ساتھ کفر کرے وہ نقصان والا ہے۔ ^(۳) (۱۲۱)

اے اولاد یعقوب! میں نے جو نعمتیں تم پر انعام کی ہیں انہیں یاد کرو اور میں نے تو تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دے رکھی تھی۔ (۱۲۲)

اس دن سے ڈرو جس دن کوئی نفس کسی نفس کو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکے گا، نہ کسی شخص سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا، نہ اسے کوئی شفاعت نفع دے گی، نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ (۱۲۳)

جب ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کے رب نے کئی کئی باتوں سے آزمایا ^(۴) اور انہوں نے سب کو پورا کر دیا تو

الَّذِينَ اتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِمْ وَأُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ
بِهِمْ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿۱۲۱﴾

يَذَرِي سِرَآئِيلَ اَذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاِنِّي
فَعَلْتُ لَكُمْ عَلَي الْعَالَمِينَ ﴿۱۲۲﴾

وَالْقَوْمُ اَيُّوْمًا لَا يَخْرُجُوْنَ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا
عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿۱۲۳﴾

وَإِذْ ابْتَلَىٰ اِبْرٰهٖمَ رَبُّهُ بِكَلِمٰتٍ قَالَتْ لِيْ جَاعِلٌ
لِّلنَّاسِ اِمٰمًا قَالِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ قَالِ لِكَيْتٰلِ عَهْدِيْ

(۱) اہل کتاب کے ناخلف لوگوں کے مذموم اخلاق و کردار کی ضروری تفصیل کے بعد ان میں جو کچھ لوگ صالح اور اچھے کردار کے تھے، اس آیت میں ان کی خوبیاں، اور ان کے مومن ہونے کی خبر دی جا رہی ہے۔ ان میں عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہم اور ان جیسے دیگر افراد ہیں، جن کو یہودیوں میں سے قبول اسلام کی توفیق حاصل ہوئی۔

(۲) ”وہ اس طرح پڑھتے ہیں جس طرح پڑھنے کا حق ہے۔“ کے کئی مطلب بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً (۱) خوب توجہ اور غور سے پڑھتے ہیں۔ جنت کا ذکر آتا ہے تو جنت کا سوال کرتے اور جہنم کا ذکر آتا ہے تو اس سے پناہ مانگتے ہیں۔ (۲) اس کے حلال کو حلال، حرام کو حرام سمجھتے اور کلام الہی میں تحریف نہیں کرتے (جیسے دوسرے یہودی کرتے تھے)۔ (۳) اس میں جو کچھ تحریر ہے، لوگوں کو بتلاتے ہیں، اس کی کوئی بات چھپاتے نہیں۔ (۴) اس کی محکم باتوں پر عمل کرتے، تشابہات پر ایمان رکھتے اور جو باتیں سمجھ میں نہیں آتیں، انہیں علماء سے حل کراتے ہیں (۵) اس کی ایک ایک بات کا اتباع کرتے ہیں (فتح القدیر) واقعہ یہ ہے کہ حق تلاوت میں یہ سارے ہی مفہوم داخل ہیں اور ہدایت ایسے ہی لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو مذکورہ باتوں کا اہتمام کرتے ہیں۔

(۳) اہل کتاب میں سے جو نبی ﷺ کی رسالت پر ایمان نہیں لائے گا، وہ جہنم میں جائے گا۔ کَمَا فِي الصَّحِيح (ابن کثیر) (۴) کلمات سے مراد احکام شریعت، مناسک حج، ذبح پسر، ہجرت، نار نمود وغیرہ وہ تمام آزمائشیں ہیں، جن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام گزارے گئے اور ہر آزمائش میں کامیاب و کامران رہے، جس کے صلے میں امام الناس کے منصب پر

الْغُلِيَّيْنِ ﴿۱۳۳﴾

اللہ نے فرمایا کہ میں تمہیں لوگوں کا امام بنا دوں گا، عرض کرنے لگے: اور میری اولاد کو،^(۱) فرمایا میرا وعدہ ظالموں سے نہیں۔ (۱۳۳)

ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے ثواب اور امن وامان کی جگہ بنائی،^(۲) تم مقام ابراہیم کو جائے نماز مقرر کر لو،^(۳) ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَانجَيْنَا وَامْرَأَتَآئِمَّ مَقَامِہِم مَّصَلًّیٰ مِّنۡ دُونِنَا اِلٰی اٰیۡتِہِمۡ وَاسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ ظَہَرَا لَیۡسٰی لِّلۡکَافِرِیۡنَ وَالْعَلِیۡفِیۡنَ وَالزُّکْرِ الشُّجُوۡرِ ﴿۱۳۳﴾

فاز کیے گئے، چنانچہ مسلمان ہی نہیں، یہودی، عیسائی حتیٰ کہ مشرکین عرب سب ہی میں ان کی شخصیت محترم اور پیشوا مانی اور سمجھی جاتی ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس خواہش کو پورا فرمایا، جس کا ذکر قرآن مجید میں ہی ہے: ﴿وَجَعَلْنَا لِقَابِیْ ذُرِّیَّتِہِ التَّوْبَةَ وَالنَّکْبَاتِ﴾ (العنکبوت - ۲۷) ”ہم نے نبوت اور کتب کو اس کی اولاد میں کر دیا۔“ پس ہر نبی جسے اللہ نے مبعوث کیا اور ہر کتاب جو ابراہیم علیہ السلام کے بعد نازل فرمائی، اولاد ابراہیم ہی میں یہ سلسلہ رہا۔ (ابن کثیر) اس کے ساتھ ہی یہ فرما کر کہ ”میرا وعدہ ظالموں سے نہیں“ اس امر کی وضاحت فرمادی کہ ابراہیم کی اتنی اونچی شان اور عند اللہ منزلت کے باوجود، اولاد ابراہیم میں سے جو ناخلف اور ظالم و مشرک ہوں گے، ان کی شقاوت و محرومی کو دور کرنے والا کوئی نہیں ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پیہر زادگی کی جڑ کاٹ دی ہے۔ اگر ایمان و عمل صالح نہیں، تو پیہر زادگی اور صاحب زادگی کی بارگاہ الہی میں کیا حیثیت ہو گی؟ نبی ﷺ کا فرمان ہے: (مَنْ بَطَأَ بِہِ عَمَلُہٗ لَمْ یُسْرِعْ بِہِ نَسَبُہٗ) (صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء... باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن.....) (جس کو اس کا عمل پیچھے چھوڑ گیا، اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکے گا)

(۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت سے جو اس کے بانی اول ہیں، بیت اللہ کی دو خصوصیتیں اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان فرمائیں: ایک ﴿مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾ (لوگوں کے لیے ثواب کی جگہ) دوسرے معنی ہیں بار بار لوٹ کر آنے کی جگہ۔ جو ایک مرتبہ بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہو جاتا ہے، دوبارہ سہ بارہ آنے کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ یہ ایسا شوق ہے جس کی کبھی تسکین نہیں ہوتی، بلکہ روز افزوں رہتا ہے۔ دوسری خصوصیت ”امن کی جگہ“ یعنی یہاں کسی دشمن کا بھی خوف نہیں رہتا چنانچہ زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ حدود حرم میں کسی دشمن جان سے بدلہ نہیں لیتے تھے۔ اسلام نے اس کے اس احترام کو باقی رکھا، بلکہ اس کی مزید تاکید اور توسیع کی۔

(۳) مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کعبہ کرتے رہے۔ اس پتھر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم کے نشانات ہیں۔ اب اس پتھر کو ایک شیشے میں محفوظ کر دیا گیا ہے، جسے ہر حاجی و معتمر طواف کے دوران باسانی دیکھتا ہے۔ اس مقام پر طواف مکمل کرنے کے بعد دو رکعت پڑھنے کا حکم ہے۔ ﴿وَانجِنَا وَامْرَأَتَآئِمَّ مَقَامِہِم مَّصَلًّیٰ﴾

﴿۱۳۳﴾

السلام) سے وعدہ لیا کہ تم میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک صاف رکھو۔ (۱۲۵)

جب ابراہیم نے کہا، اے پروردگار! تو اس جگہ کو امن والا شہر بنا اور یہاں کے باشندوں کو جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہوں، پھلوں کی روزیاں دے۔ (۱) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں کافروں کو بھی تھوڑا فائدہ دوں گا، پھر انہیں آگ کے عذاب کی طرف بے بس کر دوں گا، یہ بچنے کی جگہ بری ہے۔ (۱۲۶)

ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ السلام) کعبہ کی بنیادیں اور دیواریں اٹھاتے جاتے تھے اور کتے جا رہے تھے کہ ہمارے پروردگار! تو ہم سے قبول فرما، تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (۱۲۷)

اے ہمارے رب! ہمیں اپنا فرمانبردار بنا لے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت کو اپنی اطاعت گزار رکھ اور ہمیں اپنی عبادتیں سکھا اور ہماری توبہ قبول فرما، تو توبہ قبول فرمانے والا اور رحم و کرم کرنے والا ہے۔ (۱۲۸)

اے ہمارے رب! ان میں انہیں میں سے رسول بھیج (۲) جو ان کے پاس تیری آیتیں پڑھے، انہیں کتاب و

وَأَذَقْنَا لِرِجْلِهِم مَّرَاتَ الْجَحِيمِ ۚ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الْآيَاتِ هَاتِيئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝۱۲۵
وَأَذَقْنَا لِرِجْلِهِم مَّرَاتَ الْجَحِيمِ ۚ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الْآيَاتِ هَاتِيئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝۱۲۶
وَأَذَقْنَا لِرِجْلِهِم مَّرَاتَ الْجَحِيمِ ۚ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الْآيَاتِ هَاتِيئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝۱۲۷
وَأَذَقْنَا لِرِجْلِهِم مَّرَاتَ الْجَحِيمِ ۚ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الْآيَاتِ هَاتِيئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝۱۲۸

وَأَذَقْنَا لِرِجْلِهِم مَّرَاتَ الْجَحِيمِ ۚ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الْآيَاتِ هَاتِيئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝۱۲۹
وَأَذَقْنَا لِرِجْلِهِم مَّرَاتَ الْجَحِيمِ ۚ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الْآيَاتِ هَاتِيئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝۱۳۰
وَأَذَقْنَا لِرِجْلِهِم مَّرَاتَ الْجَحِيمِ ۚ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الْآيَاتِ هَاتِيئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝۱۳۱
وَأَذَقْنَا لِرِجْلِهِم مَّرَاتَ الْجَحِيمِ ۚ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الْآيَاتِ هَاتِيئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝۱۳۲

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝۱۲۹
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝۱۳۰
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝۱۳۱
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝۱۳۲

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝۱۳۳
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝۱۳۴
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝۱۳۵
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝۱۳۶

(۱) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعائیں قبول فرمائیں، یہ شہر امن کا گوارہ بھی ہے اور وادی غیر زری (غیر کھیتی والی) ہونے کے باوجود اس میں دنیا بھر کے پھل فروٹ اور ہر قسم کے غلے کی وہ فراوانی ہے جسے دیکھ کر انسان حیرت و تعجب میں ڈوب جاتا ہے۔

(۲) یہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی آخری دعا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرت محمد رسول ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ اسی لیے نبی ﷺ نے فرمایا: ”میں اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی والدہ کا خواب ہوں“ (فتح الربانی، ج ۲۰، ص ۱۸۱ اور ۱۸۹)

الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۳۰﴾

حکمت^(۱) سکھائے اور انہیں پاک کرے،^(۲) یقیناً تو غلبہ والا اور حکمت والا ہے۔ (۱۲۹)

دین ابراہیمی سے وہی بے رغبتی کرے گا جو محض بے وقوف ہو، ہم نے تو اسے دنیا میں بھی برگزیدہ کیا تھا اور آخرت میں بھی وہ نیکو کاروں میں سے ہے۔^(۳) (۱۳۰)

جب کبھی بھی انہیں ان کے رب نے کہا، فرمانبردار ہو جا، انہوں نے کہا، میں نے رب العالمین کی فرمانبرداری کی۔^(۴) (۱۳۱)

اسی کی وصیت ابراہیم اور یعقوب نے اپنی اولاد کو کی، کہ ہمارے بچو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اس دین کو پسند فرمایا ہے، خبردار! تم مسلمان ہی مرنے۔^(۵) (۱۳۲)

وَمَنْ يَرْغَبْ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِذْ آمَنَ سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا ۗ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۳۱﴾

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۳۲﴾

وَوَضِعْنَا بَعثًا لِبَنِيهِمْ يُذَكِّرُ بِهِ وَيَعْقُوبَ يَبْنَؤُا إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَى لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۳۳﴾

(۱) کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد حدیث ہے۔ تلاوت آیات کے بعد تعلیم کتاب و حکمت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی نفس تلاوت بھی مقصود اور باعث اجر و ثواب ہے۔ تاہم اگر ان کا مفہوم و مطلب بھی سمجھ میں آتا جائے تو سبحان اللہ، سونے پر سہاگہ ہے۔ لیکن اگر قرآن کا ترجمہ و مطلب نہیں آتا تب بھی اس کی تلاوت میں کو تاہی جائز نہیں ہے۔ تلاوت بجائے خود ایک الگ اور نیک عمل ہے۔ تاہم اس کے مفہیم اور مطالب سمجھنے کی بھی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔

(۲) تلاوت و تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کے بعد آپ ﷺ کی بعثت کا یہ جو تھا مقصد ہے کہ انہیں شرک و توہمات کی آلائشوں سے اور اخلاق و کردار کی کوتاہیوں سے پاک کریں۔

(۳) عربی زبان میں رَغَبٌ کا صلہ عَنْ ہو تو اس کے معنی بے رغبتی ہوتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ عظمت و فضیلت بیان فرما رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا و آخرت میں عطا فرمائی ہے اور یہ بھی وضاحت فرمادی کہ ملت ابراہیم سے اعراض اور بے رغبتی بے وقوفوں کا کام ہے، کسی عقل مند سے اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

(۴) یہ فضیلت و برگزیدگی انہیں اس لیے حاصل ہوئی کہ انہوں نے اطاعت و فرمان برداری کا بے مثال نمونہ پیش کیا۔

(۵) حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت یعقوب علیہ السلام نے اَلدِّينَ کی وصیت اپنی اولاد کو بھی فرمائی جو یودیت نہیں اسلام ہی ہے، جیسا کہ یہاں بھی اس کی صراحت موجود ہے اور قرآن کریم میں دیگر متعدد مقامات پر بھی اس کی تفصیل آئے گی۔ ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ ﴿آل عمران ۱۹﴾ وغیرہ ”اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے“

کیا (حضرت) یعقوب کے انتقال کے وقت تم موجود تھے؟ جب^(۱) انہوں نے اپنی اولاد کو کہا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ تو سب نے جواب دیا کہ آپ کے معبود کی اور آپ کے آباو اجداد ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ السلام) اور اسحاق (علیہ السلام) کے معبود کی جو معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے۔ (۱۳۳)

یہ جماعت تو گزر چکی، جو انہوں نے کیا وہ ان کے لئے ہے اور جو تم کرو گے تمہارے لئے ہے۔ ان کے اعمال کے بارے میں تم نہیں پوچھتے جاؤ گے۔^(۲) (۱۳۴)

یہ کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔ تم کہو بلکہ صحیح راہ پر ملت ابراہیمی والے ہیں، اور ابراہیم خالص اللہ کے پرستار تھے اور مشرک نہ تھے۔^(۳) (۱۳۵)

أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتَ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهَكَ وَإِلَهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَهُاتِنَا أَجْمَعِينَ وَتَوَخَّوْا لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿۱۳۳﴾

بَلَىٰ إِنَّكَ أَنْتَ اللَّهُ قَدْ خَلَقْتَ لَهُم مَّا تُكْسِبُونَ ﴿۱۳۴﴾

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ آلِ إِبْرَاهِيمَ حَتَّىٰ إِذْ كَانُوا لِلْمُشْرِكِينَ ﴿۱۳۵﴾

(۱) یہود کو زجر و توبیح کی جا رہی ہے کہ تم جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ ابراہیم و یعقوب (علیہما السلام) نے اپنی اولاد کو یہودیت پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی تھی، تو کیا تم وصیت کے وقت موجود تھے؟ اگر وہ یہ کہیں کہ موجود تھے تو یہ کذب و زور اور بہتان ہوا اور اگر یہ کہیں کہ حاضر نہیں تھے تو ان کا مذکورہ دعویٰ غلط ثابت ہو گیا، کیوں کہ انہوں نے جو وصیت کی، وہ تو اسلام کی تھی نہ کہ یہودیت، یا عیسائیت یا وثنیت کی۔ تمام انبیاء کا دین اسلام ہی تھا، اگرچہ شریعت اور طریقہ کار میں کچھ اختلاف رہا ہے۔ اس کو نبی ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے (الْأَنْبِيَاءُ أَوْلَادُ عَلَاتٍ، أُمَّهَاتُهُمْ شَتَّىٰ، وَدِينُهُمْ وَاحِدٌ) (صحیح بخاری، کتاب الأنبياء، باب واذكر في الكتاب مرسم إذا انتبذت من أهلها) ”انبیاء کی جماعت اولاد علات ہیں، انکی مائیں مختلف (اور باپ ایک) ہے اور ان کا دین ایک ہی ہے۔“

(۲) یہ بھی یہود کو کہا جا رہا ہے کہ تمہارے آباو اجداد میں جو انبیاء و صالحین ہو گزرے ہیں، ان کی طرف نسبت کا کوئی فائدہ نہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا ہے، اس کا صلہ انہیں ہی ملے گا، تمہیں نہیں، تمہیں تو وہی کچھ ملے گا جو تم کماؤ گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلاف کی نیکیوں پر اعتماد اور سارا غلط ہے۔ اصل چیز ایمان اور عمل صالح ہی ہے جو پچھلے صالحین کا بھی سرمایہ تھا اور قیامت تک آنے والے انسانوں کی نجات کا بھی واحد ذریعہ ہے۔

(۳) یہودی، مسلمانوں کو یہودیت کی اور عیسائی، عیسائیت کی دعوت دیتے اور کہتے کہ ہدایت اسی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ان سے کہو ہدایت ملت ابراہیم کی پیروی میں ہے جو حنیف تھا (یعنی اللہ واحد کا پرستار اور سب سے کٹ کر اسی کی عبادت کرنے والا) اور وہ مشرک نہیں تھا۔ جب کہ یہودیت اور عیسائیت دونوں میں شرک کی آئیز موجود ہے۔

اے مسلمانو! تم سب کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر بھی جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو چیز ابراہیم اسماعیل اسحاق یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور جو کچھ اللہ کی جانب سے موسیٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) اور دوسرے انبیاء (علیہم السلام) دیئے گئے۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے، ہم اللہ کے فرما تہ دار ہیں۔^(۱) (۱۳۶)

اگر وہ تم جیسا ایمان لائیں تو ہدایت پائیں، اور اگر منہ موڑیں تو وہ صریح اختلاف میں ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے عنقریب آپ کی کفایت کرے گا^(۲) اور وہ خوب سننے اور جاننے والا ہے۔ (۱۳۷)

قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرٰهٖمَ
وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ مُوسٰى
وَعِيسٰى وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ النَّبِيِّنَّ مِنْ رَبِّهِمْ ؕ لَا نَقْرُبُ مِنَّ بَدَنِ أَحَدٍ
مِّنْهُمْ ؕ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿۱۳۶﴾

فَإِن مَّن مِّنكُمْ مَّن مَّا مَنَعْتُمْ بِهِ فَعَدَا هُنَّ وَأَن تَكُونُوا
فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ؕ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ
الْعَلِيمُ ﴿۱۳۷﴾

اور اب بد قسمتی سے مسلمانوں میں بھی شرک کے مظاہر عام ہیں، اسلام کی تعلیمات اگرچہ بحمد اللہ قرآن و حدیث میں محفوظ ہیں، جن میں توحید کا تصور بالکل بے غبار اور نہایت واضح ہے، جس سے یہودیت، عیسائیت اور ثنویت (دو خداؤں کے قائل مذاہب) سے اسلام کا امتیاز نمایاں ہے لیکن مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے اعمال و عقائد میں جو شرکانہ اقدار و تصورات در آئے ہیں، اس نے اسلام کے امتیاز کو دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ کیوں کہ غیر مذاہب والوں کی دسترس براہ راست قرآن و حدیث تک تو نہیں ہو سکتی، وہ تو مسلمانوں کے عمل کو دیکھ کر ہی یہ اندازہ کریں گے کہ اسلام میں اور دیگر شرکانہ تصورات سے آلودہ مذاہب کے مابین تو کوئی امتیاز ہی نظر نہیں آتا۔ اگلی آیت میں ایمان کا معیار بتلایا جا رہا ہے۔

(۱) یعنی ایمان یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو جو کچھ بھی ملایا نازل ہوا سب پر ایمان لایا جائے، کسی بھی کتاب یا رسول کا انکار نہ کیا جائے۔ کسی ایک کتاب یا نبی کو ماننا، کسی کو نہ ماننا، یا انبیاء کے درمیان تفریق ہے جس کو اسلام نے جائز نہیں رکھا ہے۔ البتہ عمل اب صرف قرآن کریم کے ہی احکام پر ہو گا۔ کچھ کتابوں میں لکھی ہوئی باتوں پر نہیں کیوں کہ ایک تو وہ اصلی حالت میں نہیں رہیں، تحریف شدہ ہیں، دوسرے قرآن نے ان سب کو منسوخ کر دیا ہے۔

(۲) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اسی مذکورہ طریقے پر ایمان لائے تھے، اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم کی مثال دیتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں جس طرح اے صحابہ رضی اللہ عنہم! تم ایمان لائے ہو تو پھر یقیناً وہ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے۔ اگر وہ ضد اور اختلاف میں منہ موڑیں گے، تو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، ان کی سازشیں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں

اللہ کا رنگ اختیار کرو اور اللہ تعالیٰ سے اچھا رنگ کس کا ہو گا؟^(۱) ہم تو اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔ (۱۳۸)

آپ کہہ دیجئے کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو جو ہمارا اور تمہارا رب ہے، ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال، ہم تو اسی کے لئے مخلص ہیں۔^(۲) (۱۳۹)

کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے؟ کہہ دو کیا تم زیادہ جانتے ہو، یا اللہ تعالیٰ؟^(۳) اللہ کے پاس شہادت چھپانے والے سے زیادہ ظالم اور کون ہے؟ اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل

صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عِبْدُونَ ﴿۱۳۸﴾

قُلْ أَمْحَا بْحُنَّ فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَكِنَّا أَعْمَالُنَا
وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مَخْلُوعُونَ ﴿۱۳۹﴾

أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ
وَأَلْسَباطًا كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ
اللَّهُ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ
وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۴۰﴾

گی کیوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی کفایت کرنے والا ہے۔ چنانچہ چند سالوں میں ہی یہ وعدہ پورا ہوا اور بنو قیسحاق اور بنو نصیر کو جلا وطن کر دیا گیا اور بنو قریظہ قتل کیے گئے۔ تاریخی روایات میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت ایک مصحف عثمان ان کی اپنی گود میں تھا اور اس آیت کے جملہ ﴿مَسِيحِينَ كُفَرُوا﴾ پر ان کے خون کے چھینٹے گرے بلکہ دھار بھی۔ کہا جاتا ہے یہ مصحف آج بھی ترکی میں موجود ہے۔

(۱) عیسائیوں نے ایک زرد رنگ کا پانی مقرر کر رکھا ہے جو ہر عیسائی بچے کو بھی اور ہر اس شخص کو بھی دیا جاتا ہے جس کو عیسائی بنانا مقصود ہوتا ہے۔ اس رسم کا نام ان کے ہاں ”پستسم“ ہے۔ یہ ان کے نزدیک بہت ضروری ہے، اس کے بغیر وہ کسی کو پاک تصور نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی اور کہا کہ اصل رنگ تو اللہ کا رنگ ہے، اس سے بہتر کوئی رنگ نہیں اور اللہ کے رنگ سے مراد وہ دین فطرت یعنی دین اسلام ہے، جس کی طرف ہر نبی نے اپنے اپنے دور میں اپنی اپنی امتوں کو دعوت دی۔ یعنی دعوت توحید۔

(۲) کیا تم ہم سے اس بارے میں جھگڑتے ہو کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اسی کے لیے اخلاص و نیاز مندی کے جذبات رکھتے ہیں اور اس کے اوامر کا اتباع اور زواجر سے اجتناب کرتے ہیں، حالانکہ وہ ہمارا رب ہی نہیں، تمہارا بھی ہے اور تمہیں بھی اس کے ساتھ یہی معاملہ کرنا چاہیے جو ہم کرتے ہیں اور اگر تم ایسا نہیں کرتے تو تمہارا عمل تمہارے ساتھ، ہمارا عمل ہمارے ساتھ۔ ہم تو اسی کے لیے اخلاص عمل کا اہتمام کرنے والے ہیں۔

(۳) تم کہتے ہو کہ یہ انبیاء اور ان کی اولاد یہودی یا عیسائی تھی، جب کہ اللہ تعالیٰ اس کی نفی فرماتا ہے۔ اب تم ہی بتلاؤ کہ زیادہ علم اللہ کو ہے یا تمہیں؟۔

نہیں۔^(۱) (۱۴۰)

یہ امت ہے جو گزر چکی، جو انہوں نے کیا ان کے لئے ہے اور جو تم نے کیا تمہارے لئے، تم ان کے اعمال کے بارے میں سوال نہ کئے جاؤ گے۔^(۲) (۱۴۱)

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۗ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۱﴾

(۱) تمہیں معلوم ہے کہ یہ انبیاء یہودی یا عیسائی نہیں تھے، اسی طرح تمہاری کتابوں میں آنحضرت ﷺ کی نشانیاں بھی موجود ہیں، لیکن تم ان شہادتوں کو لوگوں سے چھپا کر ایک بڑے ظلم کا ارتکاب کر رہے ہو جو اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں۔

(۲) اس آیت میں پھر کسب و عمل کی اہمیت بیان فرما کر بزرگوں کی طرف انتساب یا ان پر اعتماد کو بے فائدہ قرار دیا گیا۔ کیوں کہ من بطنہ عملہ لم یسرع بہ نسبہ (صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن)، ”جس کو اس کا عمل پیچھے چھوڑ گیا“ اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھائے گا“ مطلب ہے کہ اسلاف کی نیکیوں سے تمہیں کوئی فائدہ اور ان کے گناہوں پر تم سے مواخذہ نہیں ہو گا، بلکہ ان کے عملوں کی بابت تم سے یا تمہارے عملوں کی بابت ان سے نہیں پوچھا جائے گا۔ ﴿وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (فاطر۔ ۱۸) ﴿وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى﴾ (النجم۔ ۳۹) ”کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔“ ”انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی سعی اس نے کی۔“

عنقریب نادان لوگ کہیں گے کہ جس قبلہ پر یہ تھے اس سے انہیں کس چیز نے ہٹایا؟ آپ کہہ دیجئے کہ مشرق و مغرب کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے (۱) وہ جسے چاہے سیدھی راہ کی ہدایت کر دے۔ (۱۳۲)

ہم نے اسی طرح تمہیں عادل امت بنایا ہے (۲) تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تم پر گواہ ہو جائیں، جس قبلہ پر تم پہلے سے تھے اسے ہم نے صرف اس لئے مقرر کیا تھا کہ ہم جان لیں کہ رسول کا سچا تابعدار کون ہے اور کون ہے جو اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ

سَيَقُولُ الشُّقْمَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَهُمْ عَن قِبَلِهِمُ الَّذِي كَانُوا عَلَيْهِمْ ۚ قُلْ بَلَدُ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۱۳۲﴾

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۚ وَأَجْعَلْنَا الْعِلْمَةَ الَّذِي كُنْتُمْ عَلَيْهِمْ إِلَّا لَتَعْلَمَهُمْ مِنَ تَعْلِيمِ الرَّسُولِ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكِبْرَةٌ إِلَّا ذِي الْأَعْلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ عِبْرَانًا لَّا تَكَذِّبُنَّ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَكَرِيمٌ ﴿۱۳۳﴾

(۱) جب آنحضرت ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو ۱۶، ۱۷، ۱۸ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے، درآں حالیکہ آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ خانہ کعبہ کی طرف ہی رخ کر کے نماز پڑھی جائے جو قبلہ ابراہیمی ہے۔ اس کے لیے آپ ﷺ دعا بھی فرماتے اور بار بار آسمان کی طرف نظر بھی اٹھاتے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کا حکم دے دیا، جس پر یہودیوں اور منافقین نے شور مچا دیا، حالانکہ نماز اللہ کی ایک عبادت ہے اور عبادت میں عابد کو جس طرح حکم ہوتا ہے، اس طرح کرنے کا وہ پابند ہوتا ہے، اس لیے جس طرف اللہ نے رخ پھیر دیا، اس طرف پھر جانا ضروری تھا۔ علاوہ ازیں جس اللہ کی عبادت کرنی ہے مشرق، مغرب ساری جہتیں اسی کی ہیں، اس لیے جہتوں کی کوئی اہمیت نہیں، ہر جہت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت ہو سکتی ہے، بشرطیکہ اس جہت کو اختیار کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہو۔ تحویل قبلہ کا یہ حکم نماز عصر کے وقت آیا اور عصر کی نماز خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے پڑھی گئی۔

(۲) وَسَطٌ کے لغوی معنی تو درمیان کے ہیں، لیکن یہ بہتر اور افضل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، یہاں اسی معنی میں اس کا استعمال ہوا ہے، یعنی جس طرح تمہیں سب سے بہتر قبلہ عطا کیا گیا ہے، اسی طرح تمہیں سب سے افضل امت بھی بنایا گیا ہے اور مقصد اس کا یہ ہے کہ تم لوگوں پر گواہی دو۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ہے ﴿لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (سورۃ الحج - ۷۸) ”رسول تم پر اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔“ اس کی وضاحت بعض احادیث میں اس طرح آتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ پیغمبروں سے قیامت والے دن پوچھے گا کہ تم نے میرا پیغام لوگوں تک پہنچایا تھا؟ وہ اثبات میں جواب دیں گے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تمہارا کوئی گواہ ہے؟ وہ کہیں گے ہاں محمد ﷺ اور ان کی امت، چنانچہ یہ امت گواہی دے گی۔ اس لیے اس کا ترجمہ عادل بھی کیا گیا ہے۔ (ابن کثیر) ایک معنی وسط کے اعتدال کے بھی کیے گئے ہیں، یعنی امت معتدل یعنی افراط و تفریط سے پاک۔ یہ اسلام کی تعلیمات کے اعتبار سے ہے کہ اس میں اعتدال ہے، افراط و تفریط نہیں۔

جاتا ہے (۱) گو یہ کام مشکل ہے، مگر جنیں اللہ نے ہدایت دی ہے (ان پر کوئی مشکل نہیں) اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان ضائع نہ کرے گا (۲) اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ شفقت اور مہربانی کرنے والا ہے۔ (۱۴۳)

ہم آپ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اب ہم آپ کو اس قبلہ کی جانب متوجہ کریں گے جس سے آپ خوش ہو جائیں، آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور آپ جہاں کہیں ہوں اپنا منہ اسی طرف پھیرا کریں۔ اہل کتاب کو اس بات کے اللہ کی طرف سے برحق ہونے کا قطعی علم ہے (۳) اور اللہ تعالیٰ ان اعمال سے غافل نہیں جو یہ کرتے ہیں۔ (۱۴۴)

اور آپ اگرچہ اہل کتاب کو تمام دلیلیں دے دیں لیکن

قَدَرْتُمْ تَقَابُ وَجْهَكَ فِي السَّمَاءِ فَلَمَّا لَيْدَتِكَ قِبَلَهُ تَرْضَاهَا قَوْلًا
وَوَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا لَمْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ
شَطْرَهُ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ
وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۳﴾

وَلَيْنَ آتَيْنَتِ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِنُحْلٍ آيَةٍ قَاتِبَعُوا قِبَلَتَكَ

(۱) یہ تحویل قبلہ کی ایک غرض بیان کی گئی ہے، مومنین صادقین تو رسول اللہ ﷺ کے اشارہ ابرو کے منتظر رہا کرتے تھے، اس لیے ان کے لیے تو ادھر سے ادھر پھر جانا کوئی مشکل معاملہ نہ تھا بلکہ ایک مقام پر تو عین نماز کی حالت میں جب کہ وہ رکوع میں تھے یہ حکم پہنچا تو انہوں نے رکوع ہی میں اپنا رخ خانہ کعبہ کی طرف پھیر لیا۔ یہ مسجد قبلتین (یعنی وہ مسجد جس میں ایک نماز دو قبلوں کی طرف رخ کر کے پڑھی گئی) کہلاتی ہے اور ایسا ہی واقعہ مسجد قبائیں بھی ہوا۔ لِنَلْمَنَ (تاکہ ہم جان لیں) اللہ کو تو پہلے بھی علم تھا، اس کا مطلب ہے تاکہ ہم اہل یقین کو اہل شک سے علیحدہ کر دیں تاکہ لوگوں کے سامنے بھی دونوں قسم کے لوگ واضح ہو جائیں (فتح القدیر)

(۲) بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہوا کہ جو صحابہ رضی اللہ عنہم بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کے زمانے میں فوت ہو چکے تھے، یا ہم جتنے عرصے اس طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے ہیں یہ ضائع ہو گئیں، یا شاید ان کا ثواب نہیں ملے گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ نمازیں ضائع نہیں ہوں گی، تمہیں پورا ثواب ملے گا۔ یہاں نماز کو ایمان سے تعبیر کر کے یہ بھی واضح کر دیا کہ نماز کے بغیر ایمان کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایمان تب ہی معتبر ہے جب نماز اور دیگر احکام الہی کی پابندی ہوگی۔

(۳)۔ اہل کتاب کے مختلف صحیفوں میں خانہ کعبہ کے قبلہ آخر الانبیاء ہونے کے واضح اشارات موجود ہیں۔ اس لیے اس کا برحق ہونا انہیں یقینی طور پر معلوم تھا، مگر ان کا نسلی غرور و حسد قبول حق میں رکاوٹ بن گیا۔

وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبَلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبَلَةَ بَعْضٍ
وَلَكِنَّ الْقِبْلَةَ أَهْوَأَ ۚ هُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءُوا مِنْ
الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذْ لَبِيتَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۵﴾

وہ آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے (۱) اور نہ آپ ان کے قبلے کو ماننے والے ہیں (۲) اور نہ یہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلے کو ماننے والے ہیں (۳) اور اگر آپ باوجودیکہ آپ کے پاس علم آچکا پھر بھی ان کی خواہشوں کے پیچھے لگ جائیں تو بالیقین آپ بھی ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔ (۱۳۵) (۴)

الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْكُفْرَ يَوْمَئِذٍ كَيْفَ يُؤْمِنُونَ أَنْتَاهُمْ هُوَ
فَرِيقًا بَدَأَ اللَّهُ لِيُكْفِرَهُمُ الشَّقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۱۶﴾

جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ تو اسے ایسا پہچانتے ہیں جیسے کوئی اپنے بچوں کو پہچانے، ان کی ایک ہماعت حق کو پہچان کر پھر چھپاتی ہے۔ (۱۳۶) (۵)

الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكْفُرُوا بِالَّذِينَ آمَنُوا
وَلِكُلِّ وُجْهَةٍ هُوَ مُوَلِّئُهَا قِبَلًا تَشَاءُوا الْحَيَاتِ أَبَيْنَ مَا تُكَلِّمُونَ

آپ کے رب کی طرف سے یہ سراسر حق ہے، خبردار آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔ (۱۳۷) (۶) ہر شخص ایک نہ ایک طرف متوجہ ہو رہا ہے (۷) تم

یہودی کی مخالفت تو حسد و عناد کی بنا پر ہے، اس لیے دلائل کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ گویا اثر پذیری کے لیے ضروری ہے کہ انسان کا دل صاف ہو۔

(۱) کیوں کہ یہودی کی مخالفت تو حسد و عناد کی بنا پر ہے، اس لیے دلائل کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ گویا اثر پذیری کے لیے ضروری ہے کہ انسان کا دل صاف ہو۔

(۲) کیونکہ آپ ﷺ وحی الہی کے پابند ہیں، جب تک آپ ﷺ کو اللہ کی طرف سے ایسا حکم نہ ملے آپ انکے قبلے کو کیوں کر اختیار کر سکتے ہیں۔

(۳) یہود کا قبلہ حصرہ بیت المقدس اور عیسائیوں کا بیت المقدس کی شرقی جانب ہے۔ جب اہل کتاب کے یہ دو گروہ بھی ایک قبلے پر متفق نہیں تو مسلمانوں سے کیوں یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے میں ان کی موافقت کریں گے۔

(۴) یہ وعید پہلے بھی گزر چکی ہے، مقصد امت کو متنبہ کرنا ہے کہ قرآن و حدیث کے علم کے باوجود اہل بدعت کے پیچھے لگنا، ظلم اور گمراہی ہے۔

(۵) یہاں اہل کتاب کے ایک فریق کو حق کے چھپانے کا مجرم قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ ان میں ایک فریق عبد اللہ بن سلام بنی النضر، جیسے لوگوں کا بھی تھا جو اپنے صدق و صفائے باطنی کی وجہ سے مشرف بہ اسلام ہوا۔

(۶) پیغمبر اللہ کی طرف سے جو بھی حکم اترتا ہے، وہ یقیناً حق ہے، اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

(۷) یعنی ہر مذہب والے نے اپنا پسندیدہ قبلہ بنا رکھا ہے جس کی طرف وہ رخ کرتا ہے۔ ایک دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ہر ایک مذہب نے اپنا ایک منہاج اور طریقہ بنا رکھا ہے، جیسے قرآن مجید کے دوسرے مقام پر ہے:

﴿ لِكُلِّ جَعَلْنَا مَنَازِلَهُمْ رِجْعًا وَمِنْهَا جَاءُوا وَنُوشًا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَبَعْدُكُمْ أُمَّةٌ وَوَاحِدٌ ۚ وَكَانَ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ﴾ (المائدة - ۳۸) یعنی اللہ تعالیٰ

يَأْتِيَكُمْ اللَّهُ جَمِيعًا، إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِشَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۳۸﴾

وَمِنْ حَيْثُ حَرَجْتَ قَوْلِي وَهَكَ سَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِنَّهُ
لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۳۹﴾

وَمِنْ حَيْثُ حَرَجْتَ قَوْلِي وَهَكَ سَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ
تَأْتِيكُمْ قَوْلُوا وَحَوْكُهُمْ سَطْرَ كَالْبَلَا يُكُونُ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حِجَّةٌ
إِلَّا الَّذِينَ تَكَلَّمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَحْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلَا تَزِيهَ
يَعْبِقِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۴۰﴾

نیکیوں کی طرف دوڑو۔ جہاں کہیں بھی تم ہو گے، اللہ تمہیں لے آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۱۳۸) آپ جہاں سے نکلیں اپنا منہ (نماز کے لئے) مسجد حرام کی طرف کر لیا کریں، یہی حق ہے آپ کے رب کی طرف سے، جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں۔ (۱۳۹)

اور جس جگہ سے آپ نکلیں اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور جہاں کہیں تم ہو اپنے چہرے اسی طرف کیا کرو^(۱) تاکہ لوگوں کی کوئی حجت تم پر باقی نہ رہ جائے^(۲) سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ان میں سے ظلم کیا ہے^(۳) تم ان سے نہ ڈرو^(۴) مجھ ہی سے ڈرو اور تاکہ

نے ہدایت اور ضلالت دونوں کی وضاحت کے بعد انسان کو ان دونوں میں سے کسی کو بھی اختیار کرنے کی جو آزادی دی ہے، اس کی وجہ سے مختلف طریقے اور دستور لوگوں نے بنا لیے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب کو ایک ہی راستے یعنی ہدایت کے راستے پر چلا سکتا تھا، لیکن یہ سلب اختیارات کے بغیر ممکن نہ تھا اور اختیار دینے سے مقصود ان کا امتحان ہے۔ اس لیے اے مسلمانو! تم تو خیرات کی طرف سبقت کرو، یعنی نیکی اور بھلائی ہی کے راستے پر گامزن رہو اور یہ وحی الہی اور اتباع رسول ﷺ ہی کا راستہ ہے جس سے دیگر اہل ادیان محروم ہیں۔

(۱) قبلہ کی طرف منہ پھیرنے کا حکم تین مرتبہ دہرایا گیا ہے، یا تو اس کی تاکید اور اہمیت واضح کرنے کے لیے، یا یہ چوں کہ نسخ حکم کا پہلا تجربہ تھا، اس لیے ذہنی خلجان دور کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اسے بار بار دہرا کر دلوں میں راجح کر دیا جائے، یا تعدد علت کی وجہ سے ایسا کیا گیا۔ ایک علت نبی ﷺ کی مرضی اور خواہش تھی، وہاں اسے بیان کیا۔ دوسری علت، ہر اہل ملت اور صاحب دعوت کے لیے ایک مستقل مرکز کا وجود ہے، وہاں اسے دہرایا۔ تیسری، علت مخالفین کے اعتراضات کا ازالہ ہے، وہاں اسے بیان کیا گیا ہے (فتح القدر)

(۲) یعنی اہل کتاب یہ نہ کہہ سکیں کہ ہماری کتابوں میں تو ان کا قبلہ خانہ کعبہ ہے اور نماز یہ بیت المقدس کی طرف پڑھتے ہیں۔

(۳) یہاں ظَلَمُوا سے مراد معاندین (عناد رکھنے والے) ہیں یعنی اہل کتب میں سے جو معاندین ہیں، وہ یہ جاننے کے باوجود کہ پیغمبر آخر الزماں ﷺ کا قبلہ خانہ کعبہ ہی ہو گا، وہ بطور عناد کہیں گے کہ بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کو اپنا قبلہ بنا کر یہ پیغمبر ﷺ بالآخر اپنے آبائی دین ہی کی طرف مائل ہو گیا ہے اور بعض کے نزدیک اس سے مراد مشرکین مکہ ہیں۔

(۴) ظالموں سے نہ ڈرو۔ یعنی مشرکوں کی باتوں کی پروا مت کرو۔ انہوں نے کہا تھا کہ محمد ﷺ نے ہمارا قبلہ تو اختیار

میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور اس لئے بھی کہ تم
راہ راست پاؤ (۱۵۰)

جس^(۱) طرح ہم نے تم میں تمہیں میں سے رسول بھیجا جو
ہماری آیتیں تمہارے سامنے تلاوت کرتا ہے اور تمہیں
پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت اور وہ چیزیں
سکھاتا ہے جن سے تم بے علم تھے۔ (۱۵۱)

اس لئے تم میرا ذکر کرو، میں بھی تمہیں یاد کروں گا، میری
شکر گزاری کرو اور ناشکری سے بچو۔^(۲) (۱۵۲)

اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ مدد چاہو، اللہ تعالیٰ
صبر والوں کا ساتھ دیتا ہے۔^(۳) (۱۵۳)

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمُ الْآيَاتِ وَيُزَكِّيكُمْ
وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۱۵۰﴾

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿۱۵۱﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ
الصَّابِرِينَ ﴿۱۵۲﴾

کر لیا ہے، عنقریب ہمارا دین بھی اپنالیں گے۔ ”مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔“ جو حکم میں دیتا رہوں، اس پر بلا خوف عمل
کرتے رہو۔ تحویل قبلہ کو اتمام نعمت اور ہدایت یافتگی سے تعبیر فرمایا کہ حکم الہی پر عمل کرنا یقیناً انسان کو انعام و اکرام کا
مستحق بھی بناتا ہے اور ہدایت کی توفیق بھی اسے نصیب ہوتی ہے۔

(۱) کما (جس طرح) کا تعلق ماقبل کلام سے ہے، یعنی یہ اتمام نعمت اور توفیق ہدایت تمہیں اس طرح ملی جس طرح اس
سے پہلے تمہارے اندر تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہارا تزکیہ کرتا، کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا اور جن کا تمہیں
علم نہیں، وہ سکھاتا ہے۔

(۲) پس ان نعمتوں پر تم میرا ذکر اور شکر کرو۔ کفران نعمت مت کرو۔ ذکر کا مطلب ہر وقت اللہ کو یاد کرنا ہے، یعنی اس
کی تسبیح، تہلیل اور تجبیر بلند کرو اور شکر کا مطلب اللہ کی دی ہوئی قوتوں اور توانائیوں کو اس کی اطاعت میں صرف کرنا
ہے۔ خدا داد قوتوں کو اللہ کی نافرمانی میں صرف کرنا، یہ اللہ کی ناشکر گزاری (کفران نعمت) ہے۔ شکر کرنے پر
مزید احسانات کی نوید اور ناشکری پر عذاب شدید کی وعید ہے۔ ﴿لَٰكِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَٰكِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي
لَشَدِيدٌ﴾ (ابراہیم-۷)

(۳) انسان کی دو ہی حالتیں ہوتی ہیں: آرام و راحت (نعمت) یا تکلیف و پریشانی۔ نعمت میں شکر الہی کی تلقین اور
تکلیف میں صبر اور اللہ سے استعانت کی تاکید ہے۔ حدیث میں ہے ”مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے، اسے خوشی پہنچتی
ہے تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے۔ دونوں ہی حالتیں اس کے لیے خیر ہیں“ (صحیح
مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب المؤمن أمرہ کلمہ خیر حدیث ۳۹۹۹) صبر کی دو قسمیں ہیں: ایک محرمات اور
معاصی کے ترک اور اس سے بچنے پر اور لذتوں کے قریبان اور عارضی فائدوں کے نقصان پر صبر۔ دوسرا احکام الہیہ کے
بجالانے میں جو مشقتیں اور تکلیفیں آئیں، انہیں صبر و ضبط سے برداشت کرنا۔ بعض لوگوں نے اس کو اس طرح تعبیر کیا

اور اللہ تعالیٰ کی راہ کے شہیدوں کو مردہ مت کہو^(۱) وہ زندہ ہیں، لیکن تم نہیں سمجھتے۔ (۱۵۴)

اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے، دشمن کے ڈر سے، بھوک پیاس سے، مال و جان اور پھلوں کی کمی سے اور ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے (۱۵۵)

جنہیں، جب کبھی کوئی مصیبت آتی ہے تو کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم تو خود اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں (۱۵۶)

ان پر ان کے رب کی نوازشیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔^(۲) (۱۵۷)

صفا اور مردہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں،^(۳) اس لئے بیت اللہ کا حج و عمرہ کرنے والے پر ان کا طواف کر لینے میں بھی کوئی گناہ نہیں^(۴) اپنی خوشی سے بھلائی

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْواتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَمْ تَشْعُرُوا ۝۱۵۴

وَأَنْذِرُوا كَوْمًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالشَّرْبِ وَالْطَّرِيقِ ۝۱۵۵

الَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝۱۵۶

أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝۱۵۷

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوَاعْتَمَرَ فَلَا جُنَاةَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ

ہے۔ اللہ کی پسندیدہ باتوں پر عمل کرنا چاہے وہ نفس و بدن پر کتنی ہی گراں ہوں اور اللہ کی ناپسندیدہ باتوں سے بچنا چاہے خواہشات و لذات اس کو اس کی طرف کتنا ہی کھینچیں۔ (ابن کثیر)۔

(۱) شہدا کو مردہ نہ کہنا، ان کے اعزاز و تکریم کے لیے ہے۔ یہ زندگی برزخ کی زندگی ہے جسے ہم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یہ زندگی علی قدر مراتب انبیاء و مومنین، حتیٰ کہ کفار کو بھی حاصل ہے۔ شہید کی روح اور بعض روایات میں مومن کی روح بھی ایک پرندے کے جوف (یا سینہ) میں جنت میں جہاں چاہتی ہے پھرتی ہے (ابن کثیر نیز دیکھیے آل عمران- ۱۶۹)

(۲) ان آیات میں صبر کرنے والوں کے لیے خوش خبریاں ہیں۔ حدیث میں نقصان کے وقت ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ کے ساتھ «اللَّهُمَّ أَجْرَنِي فِي مُصِيبَتِي، وَأَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِنْهَا» پڑھنے کی بھی فضیلت اور تاکید آئی ہے۔ (صحیح

مسلم، کتاب الجنائز، باب ما يقال عند المصيبة، حدیث ۹۱۸)

(۳) شَعَائِرُ شَعِيرَةٌ کی جمع ہے، جس کے معنی علامت کے ہیں، یہاں حج کے وہ مناسک (مثلاً موقف، سعی، منحر، ہدیٰ قربانی) کو اشعار کرنا وغیرہ مراد ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں۔

(۴) صفا اور مردہ کے درمیان سعی کرنا، حج کا ایک رکن ہے۔ لیکن قرآن کے الفاظ (کوئی گناہ نہیں) سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ شبہ ہوا کہ شاید یہ ضروری نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علم میں جب یہ بات آئی تو انہوں نے

اللَّهُ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿۵۸﴾

کرنے والوں کا اللہ قدر دان ہے اور انہیں خوب جاننے والا ہے۔ (۱۵۸)

جو لوگ ہماری اتاری ہوئی دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم اسے اپنی کتاب میں لوگوں کے لئے بیان کر چکے ہیں، ان لوگوں پر اللہ کی اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے۔ (۱۵۹)^(۱)

مگر وہ لوگ جو توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں اور بیان کر دیں تو میں ان کی توبہ قبول کر لیتا ہوں اور میں توبہ قبول کرنے والا اور رحم و کرم کرنے والا ہوں۔ (۱۶۰)

یقیناً جو کفار اپنے کفر میں ہی مرجائیں، ان پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ (۱۶۱)^(۲)

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ الْمُجْرِمُونَ ﴿۶۰﴾

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنَّاهُمْ فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۶۱﴾

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَأْمَنُوا وَهُمْ لَكَآؤُاُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۶۲﴾

فرمایا: اگر اس کا یہ مطلب ہو تا تو پھر اللہ تعالیٰ یوں فرماتا: (فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ لَا يَطَّوَّفَ بِهِمَا) (اگر ان کا طواف نہ کرے تو کوئی گناہ نہیں) پھر اس کی شان نزول بیان فرمائی کہ انصار قبول اسلام سے قبل مناة طاغیہ (بت) کے نام کا تلبیہ پکارتے، جس کی وہ مثل پھاڑی پر عبادت کرتے تھے اور پھر مکہ پہنچ کر ایسے لوگ صفا مروہ کے درمیان سعی کو گناہ سمجھتے تھے، مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو یہ آیت نازل ہوئی جس میں کہا گیا کہ صفا مروہ کے درمیان سعی گناہ نہیں۔ (صحیح بخاری، کتاب الحج باب وجوب الصفا والمروة) بعض حضرات نے اس کا پس منظر اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جاہلیت میں مشرکوں نے صفا پھاڑی پر ایک بت (اساف) اور مروہ پھاڑی پر نائلہ بت رکھا ہوا تھا، جنہیں وہ سعی کے دوران بوسہ دیتے یا چھوتے۔ جب لوگ مسلمان ہوئے تو ان کے ذہن میں آیا کہ صفا مروہ کے درمیان سعی تو شاید گناہ ہو، کیوں کہ اسلام سے قبل دو بتوں کی وجہ سے سعی کرتے رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کے اس وہم اور غلطی کو دور فرمادیا۔ اب یہ سعی ضروری ہے جس کا آغاز صفا سے اور خاتمہ مروہ پر ہوتا ہے۔ (ایسر التفاسیر)

(۱) اللہ تعالیٰ نے جو باتیں اپنی کتاب میں نازل فرمائی ہیں، انہیں چھپانا اتنا بڑا جرم ہے کہ اللہ کے علاوہ دیگر لعنت کرنے والے بھی اس پر لعنت کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے: «مَنْ سَنَّ لِغَيْرِهِ عِلْمًا فَكُنْتُمْ، أَلْجَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ» (ابوداؤد، کتاب العلم باب کراہیۃ منع العلم، و سنن ترمذی حدیث ۶۵۱، وقال حدیث حسن) ”جس سے کوئی ایسی بات پوچھی گئی جس کا اس کو علم تھا اور اس نے اسے چھپایا تو قیامت والے دن آگ کی لگام اس کے منہ میں دی جائے گی۔“

(۲) اس سے معلوم ہوا کہ جن کی بابت یقینی علم ہے کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے، ان پر لعنت جائز ہے، لیکن ان کے

خُلْدِيْنَ فِيْهَا لَا يَخْفَعُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿۱۱۳﴾

وَاللَّهُمَّ إِنَّكَ أَعْلَمُ بِمَا فِيْ قُلُوْبِنَا ۖ فَاصْنَعْ لَنَا عَمَلًا نَسْتَعْمَلُهُ وَرَحْمَةً نَسْتَسْتَعِيْنُهَا ۖ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا حِرْمًا وَلَا كِبْرًا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۱۱۴﴾

جس میں یہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں ڈھیل دی جائے گی۔ (۱۱۳)

تم سب کا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں^(۱) وہ بہت رحم کرنے والا اور بڑا مہربان ہے۔ (۱۱۳)

آسمانوں اور زمین کی پیدائش، رات دن کا ہیر پھیر، کشتیوں کا لوگوں کو نفع دینے والی چیزوں کو لئے ہوئے سمندوں میں چلنا، آسمان سے پانی اتار کر، مردہ زمین کو زندہ کر دینا،^(۲) اس میں ہر قسم کے جانوروں کو پھیلا دینا، ہواؤں کے رخ بدلنا، اور بادل، جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں، ان میں عقلمندوں کے لئے قدرت الہی کی نشانیاں ہیں۔ (۱۱۳)

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے شریک اوروں کو ٹھہرا کر ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں، جیسی محبت اللہ سے

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَاللِّفْكَ الْبَرِّيِّ وَالْبَرِّيِّ فِي الْبَحْرِ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَكَ فِيهَا مِنْ كُلِّ ذَاكِبَةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيْحِ وَالسَّحَابِ الْمُتَحَرِّبِينَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّعَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۱۱۴﴾

وَصَوْنِ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُونَ دُونِ اللَّهِ إِذَا دُعُوا إِلَيْهِمْ يَخْتِ

علاوہ کسی بھی بڑے سے بڑے گنہگار مسلمان پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ ممکن ہے مرنے سے پہلے اس نے توبہ نصوح کر لی ہو یا اللہ نے اس کے دیگر نیک اعمال کی وجہ سے اس کی غلطیوں پر قلم عفو پھیر دیا ہو۔ جس کا علم ہمیں نہیں ہو سکتا۔ البتہ جن بعض معاصی پر لعنت کا لفظ آیا ہے، ان کے مرتکبین کی بابت کہا جا سکتا ہے کہ یہ لعنت والے کام کر رہے ہیں، ان سے اگر انہوں نے توبہ نہ کی تو یہ بارگاہ الہی میں ملعون قرار پا سکتے ہیں۔

(۱) اس آیت میں پھر دعوت توحید دی گئی ہے۔ یہ دعوت توحید مشرکین مکہ کے لیے ناقابل فہم تھی، انہوں نے کہا: ﴿أَجْمَلُ اللَّهِ عَلَيْهَا وَاجِدْنَا مِنَ الْإِنِّ هَذَا الَّذِي كُنَّا نَعْبُدُ﴾ (سورۃ ص: ۵) ”کیا اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود بنا دیا یہ تو بڑی عجیب بات ہے!“۔ اس لیے اگلی آیت میں اس توحید کے دلائل بیان کیے جا رہے ہیں۔

(۲) یہ آیت اس لحاظ سے بڑی جامع ہے کہ کائنات کی تخلیق اور اس کے نظم و تدبیر کے متعلق سات اہم امور کا اس میں یکجا تذکرہ ہے، جو کسی اور آیت میں نہیں۔

۱- آسمان اور زمین کی پیدائش، جن کی وسعت و عظمت محتاج بیان ہی نہیں۔

۲- رات اور دن کا یکے بعد دیگرے آنا، دن کو روشنی اور رات کو اندھیرا کر دینا تاکہ کاروبار معاش بھی ہو سکے اور آرام بھی۔ پھر رات کا لمبا اور دن کا چھوٹا ہونا اور پھر اس کے برعکس دن کا لمبا اور رات کا چھوٹا ہونا۔

۳- سمندر میں کشتیوں اور جہازوں کا چلنا، جن کے ذریعے سے تجارتی سفر بھی ہوتے ہیں اور فٹوں کے حساب سے

ہونی چاہئے^(۱) اور ایمان والے اللہ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں^(۲) کاش کہ مشرک لوگ جانتے جب کہ اللہ کے عذاب کو دیکھ کر (جان لیں گے) کہ تمام طاقت اللہ ہی کو ہے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے (تو ہرگز شرک نہ کرتے)۔ (۱۲۵)

جس وقت پیشوا لوگ اپنے تابعداروں سے بیزار ہو جائیں گے اور عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور کل رشتے ناتے ٹوٹ جائیں گے۔ (۱۲۶)

اللَّهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرُونَ الْعَذَابَ أَنَّ الْعُقُوتَ لِلَّهِ جَمِيعًا أَتَوَّانَ اللَّهُ مُذِيبًا الْعَذَابِ ۝

إِذْ تَنْبَرُ الَّذِينَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَى الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ۝

سامان رزق و آسائش بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے۔

۴- بارش جو زمین کی شادابی و روئیدگی کے لیے نہایت ضروری ہے۔

۵- ہر قسم کے جانوروں کی پیدائش، جو نقل و حمل، کھیتی باڑی اور جنگ میں بھی کام میں آتے ہیں اور انسانی خوراک کی بھی ایک بڑی مقدار ان سے پوری ہوتی ہے۔

۶- ہر قسم کی ہوائیں ٹھنڈی بھی، گرم بھی، بار آور بھی اور غیر بار آور بھی، شرقی غربی بھی اور شمالی جنوبی بھی۔ انسانی زندگی اور ان کی ضروریات کے مطابق۔

۷- بادل جنہیں اللہ تعالیٰ جہاں چاہتا ہے، برساتا ہے۔ یہ سارے امور کیا اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی وحدانیت پر دلالت نہیں کرتے؟ یقیناً کرتے ہیں۔ کیا اس تخلیق میں اور اس نظم و تدبیر میں اس کا کوئی شریک ہے؟ نہیں۔ یقیناً نہیں۔ تو پھر اس کو چھوڑ کر دوسروں کو معبود اور حاجت روا سمجھنا کہاں کی عقل مندی ہے؟

(۱) مذکورہ دلائل واضحہ اور براہین قاطعہ کے باوجود ایسے لوگ ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اس کا شریک بنا لیتے ہیں اور ان سے اسی طرح محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ سے کرنی چاہیے، بعثت محمدی کے وقت ہی ایسا نہیں تھا، شرک کے یہ مظاہر آج بھی عام ہیں، بلکہ اسلام کے نام لیواؤں کے اندر بھی یہ بیماری گھر گھر گئی ہے، انہوں نے بھی نہ صرف غیر اللہ اور پیروں، فقیروں اور سجادہ نشینوں کو اپنا ماویٰ و ملجا اور قبلۂ حاجات بنا رکھا ہے، بلکہ ان سے ان کی محبت، اللہ سے بھی زیادہ ہے اور توحید کا وعظ ان کو بھی اسی طرح کھلتا ہے جس طرح مشرکین مکہ کو اس سے تکلیف ہوتی تھی، جس کا نقشہ

اللہ نے اس آیت میں کھینچا ہے: ﴿وَإِذْ أَذَكَرَ اللَّهُ وَحْدَهُ شَمَائِلَ قُلُوبِ الَّذِينَ لَدُوْهُ مُؤْمِنُونَ بِالْأَخْثَةِ وَإِذْ أَذَكَرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذْ أَهْمُ يَسْتَبِيحُونَ﴾ (سورۃ الزمر- ۳۵) ”اور جب تمہارا اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے، ان کے دل سکر جاتے ہیں اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو خوش ہو جاتے ہیں۔“ اِسْمَاءُ زَيْدٍ، دلوں کا تنگ ہونا)

(۲) تاہم اہل ایمان کو مشرکین کے برعکس اللہ تعالیٰ ہی سے سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ کیونکہ مشرکین جب سمندر

اور تابعدار لوگ کہنے لگیں گے، کاش ہم دنیا کی طرف دوبارہ جائیں تو ہم بھی ان سے ایسے ہی بیزار ہو جائیں جیسے یہ ہم سے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال دکھائے گا ان کو حسرت دلانے کو، یہ ہرگز جہنم سے نہ نکلیں گے۔ (۱۶۷)

لوگو! زمین میں جتنی بھی حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں انہیں کھاؤ پیو اور شیطانی راہ پر نہ چلو، (۱۶۸) وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ (۱۶۸)

وہ تمہیں صرف برائی اور بے حیائی کا اور اللہ تعالیٰ پر ان باتوں کے کہنے کا حکم دیتا ہے جن کا تمہیں علم نہیں۔ (۱۶۹)

اور ان سے جب کبھی کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب کی تابعداری کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا، گو ان کے باپ دادے بے عقل اور گم کردہ

وَقَالَ الَّذِينَ الْبَعُولُونَ لَنَا كُرْهٌ فَنَتَّبِعُ آلَهُمْ كَمَا تَبَعُوا
وَمَا كُنَّا لِنُؤْمِنَهُمْ اللَّهُ أَعْمَاءُ لَهُمْ حَسْرَتٌ عَلَيْهِمْ
وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿۱۶۷﴾

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا
مُخَلَّوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۱۶۸﴾

إِنَّمَا يَأْتِيكُمْ بِالشُّبُهَةِ وَالْفِتْنَةِ وَأَنْ تُقُولُوا عَلَى اللَّهِ
مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۶۹﴾

وَإِذْ يُحِيلُ لَهُمُ الشَّيْءَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ تَتَّبِعُهُ
مَا كَفَرُوا عَلَيْهِ ۖ أَبَاءَهُمْ أَوْلَوْا كَانَ آبَاءُهُمْ
لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَتَذَكَّرُونَ ﴿۱۷۰﴾

وغیرہ میں بھنس جاتے ہیں تو وہاں انہیں اپنے معبود بھول جاتے ہیں اور وہاں صرف اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں۔

﴿فَإِذْ يَكْفُرُونَ بِالْفُلْكِ دَعَاؤَ اللَّهِ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ (العنكبوت - ۲۵) ﴿وَأِذْ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ مَوْجًا كَالظَّلْمِ دَعَاؤَ اللَّهِ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ (القلمن - ۳۲) ﴿وَكَلَّمْنَا أُولَئِكَ بِأَحْسَنِ لُغَةٍ دَعَاؤَ اللَّهِ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ (يونس - ۲۲) ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ مشرکین سخت مصیبت میں مدد کے لئے صرف ایک اللہ کو پکارتے ہیں۔

(۱) آخرت میں بیرون اور گدی نشینوں کی بے بسی اور بے وفائی پر مشرکین حسرت کریں گے لیکن وہاں اس حسرت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کاش دنیا میں ہی وہ شرک سے توبہ کر لیں۔

(۲) یعنی شیطان کے پیچھے لگ کر اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام مت کرو۔ جس طرح مشرکین نے کیا کہ اپنے بتوں کے نام وقف کردہ جانوروں کو وہ حرام کر لیتے تھے، جس کی تفصیل سورۃ الأنعام میں آئے گی۔ حدیث میں آتا ہے نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”میں نے اپنے بندوں کو حنیف پیدا کیا، پس شیطانوں نے ان کو ان کے دین سے گمراہ کر دیا اور جو چیزیں میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں، وہ اس نے ان پر حرام کر دیں۔ (صحیح مسلم) کتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب الصفات التي يعرف بها أهل الدنيا أهل الجنة وأهل النار۔

راہ ہوں۔^(۱) (۱۷۰)

کفار کی مثال ان جانوروں کی طرح ہے جو اپنے چرواہے کی صرف پکار اور آواز ہی کو سنتے ہیں (سمجھتے نہیں) وہ سرے گونگے اور اندھے ہیں، انہیں عقل نہیں۔^(۲) (۱۷۱)

اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں انہیں کھاؤ، پیو اور اللہ تعالیٰ کا شکر کرو، اگر تم خاص اسی کی عبادت کرتے ہو۔^(۳) (۱۷۲)

تم پر مردہ اور (بہا ہوا) خون اور سور کا گوشت اور ہر وہ چیز جس پر اللہ کے سوا دوسروں کا نام پکارا گیا ہو حرام ہے^(۴)

پھر جو مجبور ہو جائے اور وہ حد سے بڑھنے والا اور زیادتی

وَمَثَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الذِّبْيِ يَعْقِبُ بِمَا لَا يَمَسُّهُ إِلَّا
دُعَاؤُ وَرَبِّ آءِضًا بِكُمْ عُمِّي فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۷۰﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا مِنْ طَبِيبَاتِ مَا ذَرَأْتُمْ
وَأَشْكُرُوا لِلَّهِ إِنَّ كُنتُمْ رَايَا لَهُ تَعْبُدُونَ ﴿۱۷۱﴾

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَاللَّحْمَ الْخَائِضَةَ وَمَا أَهْلَ بِهِ
لَعَنَ اللَّهُ فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ

(۱) آج بھی اہل بدعت کو سمجھایا جائے کہ ان بدعات کی دین میں کوئی اصل نہیں تو وہ یہی جواب دیتے ہیں کہ یہ رسمیں تو ہمارے آباؤ اجداد سے چلی آ رہی ہیں۔ حالانکہ آباؤ اجداد بھی دینی بصیرت سے بے بہرہ اور حدایت سے محروم رہ سکتے ہیں، اس لیے دلائل شریعت کے مقابلے میں آبا پرستی یا اپنے ائمہ و علما کی اتباع غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس دلدل سے نکالے۔

(۲) ان کافروں کی مثال جنہوں نے تقلید آبا میں اپنی عقل و فہم کو معطل کر رکھا ہے، ان جانوروں کی طرح ہے جن کو چرواہا بلاتا اور پکارتا ہے وہ جانور آواز تو سنتے ہیں، لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ انہیں کیوں بلایا اور پکارا جا رہا ہے؟ اسی طرح یہ مقلدین بھی سرے ہیں کہ حق کی آواز نہیں سنتے گونگے ہیں کہ حق ان کی زبان سے نہیں نکلتا، اندھے ہیں کہ حق کے دیکھنے سے عاجز ہیں اور بے عقل ہیں کہ دعوت حق اور دعوت توحید و سنت کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یہاں دعا سے قریب کی آواز اور ندا سے دور کی آواز مراد ہے۔

(۳) اس میں اہل ایمان کو ان تمام پاکیزہ چیزوں کے کھانے کا حکم ہے جو اللہ نے حلال کی ہیں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کی تاکید ہے۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اللہ کی حلال کردہ چیزیں ہی پاک اور طیب ہیں، حرام کردہ اشیاء پاک نہیں، چاہے وہ نفس کو کتنی ہی مرغوب ہوں (جیسے اہل یورپ کو سور کا گوشت بڑا مرغوب ہے) دو سرا یہ کہ جنوں کے نام پر منسوب جانوروں اور اشیاء کو مشرکین اپنے اوپر جو حرام کر لیتے تھے (جس کی تفصیل سورۃ الأنعام میں ہے) مشرکین کا یہ عمل غلط ہے اور اس طرح ایک حلال چیز حرام نہیں ہوتی، تم ان کی طرح ان کو حرام مت کرو (حرام صرف وہی ہیں جس کی تفصیل اس کے بعد والی آیت میں ہے)، تیسرا یہ کہ اگر تم صرف ایک اللہ کے عبادت گزار ہو تو ادائے شکر کا اہتمام کرو۔

(۴) اس آیت میں چار حرام کردہ چیزوں کا ذکر ہے، لیکن اسے کلمہ حصر (انما) کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جس سے ذہن

عَفْوَرٌ حَبِيمٌ ۝۱۰

کرنے والا نہ ہو، اس پر ان کے کھانے میں کوئی گناہ نہیں، اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا مہربان ہے۔ (۱۷۳)

بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب چھپاتے ہیں اور اسے تھوڑی تھوڑی سی قیمت پر بیچتے ہیں، یقین مانو کہ یہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے بات بھی نہ کرے گا، نہ انہیں پاک کرے گا، بلکہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (۱۷۳)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور عذاب کو مغفرت کے بدلے خرید لیا ہے، یہ لوگ آگ کا عذاب کتنا برداشت کرنے والے ہیں۔ (۱۷۵)

ان عذابوں کا باعث یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سچی کتاب

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتُرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُخَدِّعُهُمْ ۝۱۱
وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱۲

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْغَفْوَةِ ۚ فَمَا أَصَابَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝۱۱

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لِكِتَابِ الْحَقِّ لِذٰلِكَ الَّذِيْنَ

میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ حرام صرف یہی چار چیزیں ہیں، جب کہ ان کے علاوہ بھی کئی چیزیں حرام ہیں۔ اس لیے اول تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ حصر ایک خاص سیاق میں آیا ہے، یعنی مشرکین کے اس فعل کے ضمن میں کہ وہ حلال جانوروں کو بھی، حرام قرار دے لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ حرام نہیں، حرام تو صرف یہ ہے۔ اس لیے یہ حصر اضافی ہے، یعنی اس کے علاوہ بھی دیگر محرّمات ہیں جو یہاں مذکور نہیں۔ دوسرے، حدیث میں دو اصول، جانوروں کی حلت و حرمت کے لیے، بیان کر دیے گئے ہیں، وہ آیت کی صحیح تفسیر کے طور پر سامنے رہنے چاہئیں۔ درندوں میں ذو ناب (وہ درندہ جو کپیلوں سے شکار کرے) اور پرندوں میں ذو غلب (جو پنجے سے شکار کرے) حرام ہیں۔ تیسرے، جن جانوروں کی حرمت حدیث سے ثابت ہے، مثلاً گدھا، کتا، وغیرہ وہ بھی حرام ہیں، جس سے اس بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے کہ حدیث بھی قرآن کریم کی طرح دین کا ماخذ اور دین میں حجت ہے اور دین دونوں کے ماننے سے مکمل ہوتا ہے، نہ کہ حدیث کو نظر انداز کر کے، صرف قرآن سے۔ مردہ سے مراد ہر وہ حلال جانور ہے، جو بغیر زبح کیے طبعی طور پر یا کسی حادثے سے (جسکی تفصیل المائدہ میں ہے) مر گیا ہو۔ یا شرعی طریقے کے خلاف اسے زبح کیا گیا ہو، مثلاً گلا گھونٹ دیا جائے، یا پتھر اور لکڑی وغیرہ سے مارا جائے، یا جس طرح آجکل مشینی زبح کا طریقہ ہے جس میں جھٹکے سے مارا جاتا ہے۔ البتہ حدیث میں دو مردار جانور حلال قرار دیئے گئے ہیں۔ ایک مچھلی، دوسری مڈی، وہ اس حکم میتہ سے مستثنیٰ ہیں۔ خون سے مراد دم مسفوح ہے یعنی زبح کے وقت جو خون نکلتا اور بہتا ہے۔ گوشت کے ساتھ جو خون لگا رہتا ہے وہ حلال ہے۔ یہاں بھی دو خون حدیث کی رو سے حلال ہیں: کبچی اور تلی۔ خنزیر یعنی سور کا گوشت، یہ بے غمتری میں بدترین جانور ہے، اللہ نے اسے حرام قرار دیا ہے، وَمَا أَهْلُ وَهْ جَانُورِ يَا كُوْنِيْ اُوْر جِيْزِيْ نَسِيْ غِيْر اللّٰه كِيْ نَامِ پَر پِكارَا جَايْ۔ اس سے مراد وہ جانور ہیں جو غیر اللہ کے نام پر زبح کیے جائیں۔ جیسے مشرکین عرب لات و عزیٰ وغیرہ کے ناموں پر زبح کرتے تھے، یا

اَحْتَكَمُوا فِي الْكِتَابِ لَعْنُ شَقَاتٍۙ اَعْبُدُ ۞

اتاری اور اس کتاب میں اختلاف کرنے والے یقیناً دور کے خلاف میں ہیں۔ (۱۷۶)

ساری اچھائی مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنے میں ہی نہیں^(۱) بلکہ حقیقتاً اچھا وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر،

لَيْسَ الْبِرَّانَ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ
وَلَكِنَّ الْبِرَّ اَمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ

آگ کے نام پر، جیسے جو سی کرتے تھے۔

اور اسی میں وہ جانور بھی آجاتے ہیں جو جاہل مسلمان فوت شدہ بزرگوں کی عقیدت و محبت ان کی خوشنودی و تقرب حاصل کرنے کے لیے یا ان سے ڈرتے اور امید رکھتے ہوئے، قبروں اور آستانوں پر ذبح کرتے ہیں یا مجاورین کو بزرگوں کی نیاز کے نام پر دے آتے ہیں (جیسے بہت سے بزرگوں کی قبروں پر بوڑھے ہوئے ہیں مثلاً ”اتا“ صاحب کی نیاز کے لیے بکرے یہاں جمع کرائے جائیں) ان جانوروں کو، چاہے ذبح کے وقت اللہ ہی کا نام لے کر ذبح کیا جائے، یہ حرام ہی ہوں گے۔ کیوں کہ اس سے مقصود، رضائے الہی نہیں، رضائے اہل قبور اور تعظیم لغیر اللہ، یا خوف یا رجاء من غیر اللہ (غیر اللہ سے مافوق الاسباب طریقے سے ڈر یا امید) ہے، جو شرک ہے۔ اسی طریقے سے جانوروں کے علاوہ جو شیابھی غیر اللہ کے نام پر نذر نیاز اور چڑھاوے کی ہوں گی، حرام ہوں گی، جیسے قبروں پر لے جا کر یا وہاں سے خرید کر، قبور کے ارد گرد فقرا، و مساکین پر دیگوں اور لنگروں کی، یا مٹھائی اور پیسوں وغیرہ کی تقسیم، یا وہاں صندوقچی میں نذر نیاز کے پیسے ڈالنا، یا عرس کے موقع پر وہاں دودھ پہنچانا، یہ سب کام حرام اور ناجائز ہیں، کیوں کہ یہ سب غیر اللہ کی نذر و نیاز کی صورت ہیں اور نذر بھی۔ نماز، روزہ وغیرہ عبادات کی طرح، ایک عبادت ہے، اور عبادت کی ہر قسم صرف ایک اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ اسی لیے حدیث میں ہے: «مَلْعُونٌ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللَّهِ». (صحیح الجامع الصغیر و زیادہ

السنائی- ج ۲ ص ۱۰۲۳۔ جس نے غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کیا، وہ ملعون ہے۔“

تفسیر عزیز میں بحوالہ تفسیر نیشاپوری ہے: «أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ لَوْ أَنَّ مُسْلِمًا ذَبَحَ ذَبِيحَةً، يُرِيدُ بِذَبْحِهَا التَّعَرُّبَ إِلَى غَيْرِ اللَّهِ، صَارَ مُزْنَدًا وَذَبِيحَتُهُ ذَبِيحَةُ مُزْنَدٍ» — (تفسیر عزیز ص ۷۱۱ بحوالہ اشرف الحواشی) «علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کوئی جانور غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی نیت سے ذبح کیا تو وہ مرتد ہو جائے گا اور اس کا ذبیحہ ایک مرتد کا ذبیحہ ہو گا۔

(۱) یہ آیت قبلے کے ضمن میں ہی نازل ہوئی۔ ایک تو یہودی اپنے قبلے کو (جو بیت المقدس کا مغربی حصہ ہے) اور نصاریٰ اپنے قبلے کو (جو بیت المقدس کا مشرقی حصہ ہے) بڑی اہمیت دے رہے تھے اور اس پر فخر کر رہے تھے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے تحویل قبلہ پر چہ میگوئیاں کر رہے تھے، جس سے بعض مسلمان بھی بعض دفعہ کبیدہ خاطر ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، مشرق یا مغرب کی طرف رخ کر لینا بذات خود کوئی نیکی نہیں ہے بلکہ یہ تو صرف مرکزیت اور اجتماعیت کے حصول کا ایک طریقہ ہے، اصل نیکی تو ان عقائد پر ایمان رکھنا ہے جو اللہ نے بیان فرمائے اور ان اعمال و اخلاق کو اپنانا ہے جس کی تاکید اس نے فرمائی ہے۔ پھر آگے ان عقائد و اعمال کا بیان ہے۔ اللہ پر ایمان یہ ہے کہ اسے

قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب اللہ پر اور نبیوں پر ایمان رکھنے والا ہو، جو مال سے محبت کرنے کے باوجود قربت داروں، قییموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والے کو دے، غلاموں کو آزاد کرے، نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرے، جب وعدہ کرے تب اسے پورا کرے، تگمدستی، دکھ درد اور لڑائی کے وقت صبر کرے، یہی سچے لوگ ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں۔ (۱۷۷)

اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض کیا گیا ہے، آزاد آزاد کے بدلے، غلام غلام کے بدلے، عورت عورت کے بدلے۔ (۱) ہاں جس کسی کو اس کے بھائی کی

وَالَّذِينَ ءَاتَى الْهَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ
وَالسَّكِينِ ۚ وَابْنَ السَّبِيلِ ۚ وَالسَّامِيْنَ فِي الرِّقَابِ
وَأَقَامَ الصَّلَاةَ ۚ وَآتَى الزَّكَاةَ ۚ وَهُوَ مُؤْمِنٌ بِمَهْدِهِمْ ۚ إِذَا
عَاهَدُوا وَعَوَّضُوا فِي الْبِنَاءِ وَالصَّرَءِ وَحِينِ
الْبَأْسِ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۱۷۷﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ ۚ الْحُرُّ
بِالْحُرِّ ۚ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ ۚ وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ ۚ وَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ

اپنی ذات و صفات میں کیلنا، تمام عیوب سے پاک و منزہ اور قرآن و حدیث میں بیان کردہ تمام صفات باری کو بغیر کسی تاویل یا تعطیل یا تکسیت کے تسلیم کیا جائے۔ آخرت کے روز جزا ہونے، حشر نثر اور جنت و دوزخ پر یقین رکھا جائے۔ اَلْكِتَابِ، سے مراد تمام آسمانی کتابوں کی صداقت پر ایمان ہے۔ اور فرشتوں کے وجود پر اور تمام پیغمبروں پر یقین رکھا جائے۔ ان ایمانیات کے ساتھ ان اعمال کو اپنایا جائے جس کی تفصیل اس آیت میں ہے۔ عَلَىٰ حُبِّهِ میں (ہ) ضمیر مال کی طرف راجع ہے، یعنی مال کی محبت کے باوجود مال خرچ کرے۔ الْبِنَاءِ سے تگمدستی اور شدت فقر الصَّرَاءِ سے نقصان یا بیماری اور اَلْبَأْسِ سے لڑائی اور اس کی شدت مراد ہے۔ ان تینوں حالتوں میں صبر کرنا، یعنی احکامات الہیہ سے سرمونحراف نہ کرنا نہایت کٹھن ہوتا ہے اس لیے ان حالتوں کو خاص طور پر بیان فرمایا ہے۔

(۱) زمانہ جاہلیت میں کوئی نظم اور قانون تو تھا نہیں، اس لیے زور آور قبیلے کمزور قبیلوں پر جس طرح چاہتے، ظلم و جور کا ارتکاب کر لیتے۔ ایک ظلم کی شکل یہ تھی کہ کسی طاقت ور قبیلے کا کوئی مرد قتل ہو جاتا تو وہ صرف قاتل کو قتل کرنے کے بجائے قاتل کے قبیلے کے کئی مردوں کو، بلکہ بسا اوقات پورے قبیلے ہی کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرتے اور عورت کے بدلے مرد کو اور غلام کے بدلے آزاد کو قتل کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فرق و امتیاز کو ختم کرتے ہوئے فرمایا کہ جو قاتل ہو گا، قصاص (بدلے) میں اسی کو قتل کیا جائے گا۔ قاتل آزاد ہے تو بدلے میں وہی آزاد، غلام ہے تو بدلے میں وہی غلام اور عورت ہے تو بدلے میں وہی عورت ہی قتل کی جائے گی، نہ کہ غلام کی جگہ آزاد اور عورت کی جگہ مرد یا ایک مرد کے بدلے میں متعدد مرد۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مرد اگر عورت کو قتل کر دے تو قصاص میں کوئی عورت قتل کی جائے گی، یا عورت مرد کو قتل کر دے تو کسی مرد کو قتل کیا جائے گا (جیسا کہ ظاہری الفاظ سے مفہوم نکلتا ہے) بلکہ یہ الفاظ شان نزول کے اعتبار سے ہیں جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قصاص میں قاتل ہی کو قتل کیا جائے گا، چاہے مرد ہو

طرف سے کچھ معافی دے دی جائے اسے بھلائی کی اتباع کرنی چاہئے اور آسانی کے ساتھ دیت ادا کرنی چاہئے۔^(۱) تمہارے رب کی طرف سے یہ تخفیف اور رحمت ہے^(۲) اس کے بعد بھی جو سرکشی کرے اسے دردناک عذاب ہوگا۔^(۳) (۱۷۸)

تفکرو! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے اس باعث تم (قتل ناحق سے) رکو گے^(۴) (۱۷۹)
تم پر فرض کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی مرنے

تَمَّيْ قَاتِلًا بِالْمَعْرُوفِ وَأَذًا لِّيَوْمِ يَحْسَبُنَ ذَلِكَ عَفْوَ مِنْ رَبِّكَ وَرَحْمَةً مِّنْ عِنْدِي بَعْدَ ذَلِكَ فَالَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۷۸﴾

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۷۹﴾

كُلِّبَ عَلَيْكَ إِذْ أَحَقَّ رَأْسُكَ الْمَوْتَ إِنَّ تَرْتَلِي خَيْرًا لِّوَصِيَّةٍ

یا عورت، طاقتور ہو یا کمزور۔ «الْمُسْلِمُونَ تَنَكَّفًا دِمَاؤُهُمْ»۔ الحدیث (سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی السریة ترد علی اهل العسکر) ”تمام مسلمانوں کے خون (مرد ہو یا عورت) برابر ہیں۔“ گویا آیت کا وہی مفہوم ہے جو قرآن کریم کی دوسری آیت ﴿الْعَفْوَ بِالْعَفْوَ﴾ (المائدہ، ۳۵) کا ہے۔ احناف نے اس سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ مسلمان کو کافر کے قصاص میں قتل کیا جائے گا لیکن جمہور علماء اس کے قائل نہیں، کیوں کہ حدیث میں وضاحت ہے: «لَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ» (صحیح بخاری، کتاب الدیات، باب لا یقتل المسلم بالکافر) ”مسلمان، کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا“ (فتح القدیر) مزید دیکھئے آیت ۳۵، سورۃ المائدہ۔

(۱) معافی کی دو صورتیں ہیں: ایک بغیر معاوضہ مالی یعنی دیت لیے بغیر ہی محض رضائے الہی کے لیے معاف کر دینا، دوسری صورت، قصاص کی بجائے دیت قبول کر لینا، اگر یہ دوسری صورت اختیار کی جائے تو کہا جا رہا ہے کہ طالب دیت بھلائی کا اتباع کرے۔ ﴿وَأَذًا لِّيَوْمِ يَحْسَبُنَ﴾ میں قاتل کو کہا جا رہا ہے کہ بغیر تک کیے اچھے طریقے سے دیت کی ادائیگی کرے۔ اولیائے مقتول نے اس کی جان بخشی کر کے اس پر جو احسان کیا ہے، اس کا بدلہ احسان ہی کے ساتھ دے۔ ﴿هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ﴾ (الرہمن)

(۲) یہ تخفیف اور رحمت (یعنی قصاص، معافی یا دیت تین صورتیں) اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص تم پر ہوئی ہے ورنہ اس سے قبل اہل تورات کے لیے قصاص یا معافی تھی، دیت نہیں تھی اور اہل انجیل (عیسائیوں) میں صرف معافی ہی تھی، قصاص تھا نہ دیت۔ (ابن کثیر)

(۳) قبول دیت یا اخذ دیت کے بعد قتل بھی کر دے تو یہ سرکشی اور زیادتی ہے جس کی سزا اسے دنیا و آخرت میں بھگتنی ہوگی۔

(۴) جب قاتل کو یہ خوف ہو گا کہ میں بھی قصاص میں قتل کر دیا جاؤں گا تو پھر اسے کسی کو قتل کرنے کی جرات نہیں ہوگی اور جس معاشرے میں یہ قانون قصاص نافذ ہو جاتا ہے، وہاں یہ خوف معاشرے کو قتل و خونریزی سے محفوظ رکھتا ہے، جس سے معاشرے میں نہایت امن اور سکون رہتا ہے، اس کا مشاہدہ آج بھی سعودی معاشرے میں کیا جا سکتا ہے

لگے اور مال چھوڑ جاتا ہو تو اپنے ماں باپ اور قرابت داروں کے لئے اچھائی کے ساتھ وصیت کر جائے،^(۱)

پر ہمیزگاروں پر یہ حق اور ثابت ہے۔ (۱۸۰)

اب جو شخص اسے سننے کے بعد بدل دے اس کا گناہ بدلنے والے پر ہی ہو گا، واقعی اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔ (۱۸۱)

ہاں جو شخص وصیت کرنے والے کی جانب داری یا گناہ کی وصیت کر دینے سے ڈرے^(۲) پس وہ ان میں آپس میں اصلاح کرا دے تو اس پر گناہ نہیں، اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۱۸۲)

اے ایمان والو! تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو^(۳) (۱۸۳)

لِلَّذِينَ وَالَّذِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿۱۸۰﴾

فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا أَثْمُهٗ عَلَى الَّذِينَ
يَبْدُوْنَ لَهُ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۸۱﴾

فَمَنْ خَافَ مِنْ مَوْصٍ جَنَفًا وَاِئْتَابًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ
فَلَا آثَمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۸۲﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ
عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾

جہاں اسلامی حدود کے نفاذ کی یہ برکات الحمد للہ موجود ہیں۔ کاش دوسرے اسلامی ممالک بھی اسلامی حدود کا نفاذ کر کے اپنے عوام کو یہ پرسکون زندگی مہیا کر سکیں۔

(۱) وصیت کرنے کا یہ حکم آیت موارثت کے نزول سے پہلے دیا گیا تھا۔ اب یہ منسوخ ہے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے «إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ، فَلَا وَصِيَّةَ لِرِثٍ» (أخبرجه السنن- بحوالہ ابن کثیر) "اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے (یعنی ورثا کے حصے مقرر کر دیے ہیں) پس اب کسی وارث کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں" البتہ اب ایسے رشتہ داروں کے لیے وصیت کی جاسکتی ہے جو وارث نہ ہوں، یا راہ خیر میں خرچ کرنے کے لیے کی جاسکتی ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ حد ثلث (ایک تہائی) مال ہے، اس سے زیادہ کی وصیت نہیں کی جاسکتی (صحیح بخاری، کتاب الفرائض باب میراث البنات)

(۲) جَنَفًا (ما نکل ہونا) کا مطلب ہے غلطی یا بھول سے کسی ایک رشتے دار کی طرف زیادہ مائل ہو کر دوسروں کی حق تلفی کرے اور اِئْتَابًا سے مراد ہے جان بوجھ کر ایسا کرے (الیر القاسمیر) یا اِئْتَابًا سے مراد گناہ کی وصیت ہے جس کا بدلنا اور اس پر عمل نہ کرنا ضروری ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وصیت میں عدل و انصاف کا اہتمام ضروری ہے، ورنہ دنیا سے جاتے جاتے بھی ظلم کا ارتکاب، اس کے اخروی نجات کے نقطہ نظر سے سخت خطرناک ہے۔

(۳) صِيَامًا، صَوْمًا (روزہ) کا مصدر ہے جس کے شرعی معنی ہیں، صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور بیوی سے ہم بستری کرنے سے، اللہ کی رضا کے لیے، رکے رہنا، یہ عبادت چوں کہ نفس کی طہارت اور تزکیہ کے لیے

گنتی کے چند ہی دن ہیں لیکن تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ اور دنوں میں گنتی کو پورا (۱) کر لے اور اس کی طاقت رکھنے والے (۲) فدیہ میں ایک مسکین کو کھانا دیں، پھر جو شخص نیکی میں سبقت کرے وہ اسی کے لئے بہتر ہے (۳) لیکن تمہارے حق میں بہتر کام روزے رکھنا ہی ہے اگر تم با علم ہو۔ (۱۸۴)

ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا (۴) جو لوگوں کو ہدایت کرنے والا ہے اور جس میں ہدایت کی اور حق و

اَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ الصَّيْئَةَ
طَعَامَ مَسْكِينٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ وَأَنْ
تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾

شَهْرٍ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ
وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ

بہت اہم ہے، اس لیے اسے تم سے پہلی امتوں پر بھی فرض کیا گیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا مقصد تقویٰ کا حصول ہے۔ اور تقویٰ انسان کے اخلاق و کردار کے سنوارنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

(۱)۔ یہ بیمار اور مسافر کو رخصت دے دی گئی ہے کہ وہ بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان المبارک میں جتنے روزے نہ رکھ سکے ہوں، وہ بعد میں رکھ کر گنتی پوری کر لیں۔

(۲) يُطِيقُونَ کا ترجمہ ”نہایت مشقت سے روزہ رکھ سکیں“ کیا گیا ہے (یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے، امام بخاری نے بھی اسے پسند کیا ہے) یعنی جو شخص زیادہ بڑھا پے یا ایسی بیماری کی وجہ سے، جس سے شفا یابی کی امید نہ ہو، روزہ رکھنے میں مشقت محسوس کرے، وہ ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دے دے، لیکن جمہور مفسرین نے اس کا ترجمہ ”طاقت رکھتے ہیں“ ہی کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں روزے کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے طاقت رکھنے والوں کو بھی رخصت دے دی گئی تھی کہ اگر وہ روزہ نہ رکھیں تو اس کے بدلے ایک مسکین کو کھانا دے دیا کریں۔ لیکن بعد میں ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ کے ذریعے اسے منسوخ کر کے ہر صاحب طاقت کے لیے روزہ فرض کر دیا گیا، تاہم زیادہ بوڑھے، دائمی مریض کے لیے اب بھی یہی حکم ہے کہ وہ فدیہ دے دیں اور حَامِلَةٌ (حمل والی) اور مُزْبِعَةٌ (دودھ پلانے والی) عورتیں اگر مشقت محسوس کریں تو وہ مریض کے حکم میں ہوں گی یعنی وہ روزہ نہ رکھیں اور بعد میں روزے کی قضا دیں (تحفة الأحمودی شرح ترمذی)

(۳) جو خوشی سے ایک مسکین کی بجائے دو یا تین مسکینوں کو کھانا کھلا دے تو اس کے لیے زیادہ بہتر ہے۔

(۴) رمضان میں نزول قرآن کا یہ مطلب نہیں کہ مکمل قرآن کسی ایک رمضان میں نازل ہو گیا، بلکہ یہ ہے کہ رمضان کی شب قدر میں لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اتار دیا گیا اور وہاں بِنْتُ الْعَرَّةِ میں رکھ دیا گیا۔ وہاں سے حسب حالات ۲۳ سالوں تک اترتا رہا۔ (ابن کثیر) اس لئے یہ کہنا کہ قرآن رمضان میں، یا لیلۃ القدر، یا لیلۃ مبارکہ میں اترتا۔ یہ سب صحیح ہے کیوں کہ لوح محفوظ سے تو رمضان میں ہی اترتا ہے اور لیلۃ القدر اور لیلۃ مبارکہ یہ ایک ہی رات ہے یعنی قدر کی رات، جو رمضان میں ہی آتی ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ رمضان میں نزول قرآن کا آغاز ہوا اور پہلی

باطل کی تیز کی نشانیاں ہیں، تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو پائے اسے روزہ رکھنا چاہئے، ہاں جو بیمار ہو یا مسافر ہو اسے دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کرنی چاہئے، اللہ تعالیٰ کا ارادہ تمہارے ساتھ آسانی کا ہے، سختی کا نہیں، وہ چاہتا ہے کہ تم گنتی پوری کرو اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت پر اس کی بڑائیاں بیان کرو اور اس کا شکر کرو۔ (۱۸۵)

جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں ہر پکارنے والے کی پکار کو جب کبھی وہ مجھے پکارے، قبول کرتا ہوں^(۱) اس لئے لوگوں کو بھی چاہئے کہ وہ میری بات مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں، یہی ان کی

اللَّهُمَّ قَلْبُصَبْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَّ سَمَوْتِ قَعْدًا
تَوْنِ آيَاتِهِمْ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمْ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمْ الْعُسْرَ
وَلِيَتَّقُوا الْعِبَادَةَ وَيَحْكُمُوا بِآيَاتِ اللَّهِ عَلَى مَا هَدَاكُمْ
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۸۵﴾

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ اجِيبْ دَعْوَةَ
الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ
يَرْشُدُونَ ﴿۱۸۶﴾

وہی جو غار حرا میں آئی، وہ رمضان میں آئی۔ اس اعتبار سے قرآن مجید اور رمضان المبارک کا آپس میں نہایت گہرا تعلق ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ اس ماہ مبارک میں حضرت جبریل علیہ السلام سے قرآن کا دور کیا کرتے تھے اور جس سال آپ ﷺ کی وفات ہوئی آپ ﷺ نے رمضان میں جبریل علیہ السلام کے ساتھ دو مرتبہ دور کیا رمضان کی تین راتوں (۲۳، ۲۵، اور ۲۷) میں آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو باجماعت قیام اللیل بھی کرایا، جس کو اب تراویح کہا جاتا ہے (صحیح ترمذی و صحیح ابن ماجہ، البانی) یہ تراویح آٹھ رکعات مع وتر گیارہ رکعات تھیں جس کی صراحت حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت (جو قیام اللیل مروزی وغیرہ میں ہے) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت (صحیح بخاری) میں موجود ہے۔ نبی ﷺ کا ۲۰ رکعات تراویح پڑھنا کسی بھی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ چونکہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے گیارہ رکعت سے زیادہ پڑھنا ثابت ہے اس وجہ سے محض نفل کی نیت سے بیس رکعتیں یا اس سے کم یا زیادہ پڑھی جاسکتی ہیں۔

(۱) رمضان المبارک کے احکام و مسائل کے درمیان دعا کا مسئلہ بیان کر کے یہ واضح کر دیا گیا کہ رمضان میں دعا کی بھی بڑی فضیلت ہے، جس کا خوب اہتمام کرنا چاہیے، خصوصاً انظار کی وقت کو قبولیت دعا کا خاص وقت بتلایا گیا ہے (مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بحوالہ ابن کثیر) تاہم قبولیت دعا کے لیے ضروری ہے کہ ان آداب و شرائط کو ملحوظ رکھا جائے جو قرآن و حدیث میں بیان ہوئے ہیں۔ جن میں سے دو یہاں بیان کیے گئے ہیں: ایک اللہ پر صحیح معنوں میں ایمان اور دوسرا اس کی اطاعت و فرمانبرداری۔ اسی طرح احادیث میں حرام خوراک سے بچنے اور خشوع و خضوع کا اہتمام کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

بھلائی کا باعث ہے۔ (۱۸۶)

روزے کی راتوں میں اپنی بیویوں سے ملنا تمہارے لئے حلال کیا گیا، وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کے لباس ہو، تمہاری پوشیدہ خیانتوں کا اللہ تعالیٰ کو علم ہے، اس نے تمہاری توبہ قبول فرما کر تم سے درگزر فرمایا، اب تمہیں ان سے مباشرت کی اور اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی چیز کو تلاش کرنے کی اجازت ہے، تم کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ صبح کا سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے ظاہر ہو جائے۔^(۱) پھر رات تک روزے کو پورا کرو^(۲) اور عورتوں سے اس وقت مباشرت نہ کرو جب کہ تم مسجدوں میں اعتکاف میں ہو۔^(۳) یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں، تم ان کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے بیان فرماتا ہے تاکہ وہ بچیں۔ (۱۸۷)

اِحْلَ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ. هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ غَفَّارُونَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ. قَالَ لَنْ بَايَسُوهُنَّ وَاِنْتَفَعُوا اَمَّا لَكُنَّبَ اللهُ لَكُمْ وَاَنْتُمْ بَايَسُوهُنَّ يَكْفُرُ بَكُنْبِ لَكُمْ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ آتُوا الصِّيَامَ رِالِ الْكَيْلِ وَلَا تَبَايَسُواهُنَّ وَاَنْتُمْ عَلَيْكُمْ فِي الْمَسْجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللهِ فَلَا تَقْرُبُوهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لِيَتِيهِمُ لِلنَّاسِ لِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۱۸۷﴾

(۱)۔ ابتدائے اسلام میں ایک حکم یہ تھا کہ روزہ انظار کرنے کے بعد عشا کی نماز یا سونے تک کھانے پینے اور بیوی سے مباشرت کرنے کی اجازت تھی، سونے کے بعد ان میں سے کوئی کام نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ظاہر بات ہے یہ پابندی سخت تھی اور اس پر عمل مشکل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ دونوں پابندیاں اٹھالیں اور انظار سے لے کر صبح صادق تک کھانے پینے اور بیوی سے مباشرت کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ الرَّفَثُ سے مراد بیوی سے ہم بستری کرنا ہے الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ سے صبح صادق، اور الْخَيْطُ الْاَسْوَدُ (سیاہ دھاری) سے مراد رات ہے (ابن کثیر)

مسئلہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حالت جنابت میں روزہ رکھا جاسکتا ہے، کیوں کہ فجر تک اللہ تعالیٰ نے مذکورہ امور کی اجازت دی ہے اور صبح بخاری و صبح مسلم کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ (ابن کثیر)

(۲)۔ یعنی رات ہوتے ہی (غروب شمس کے فوراً بعد) روزہ انظار کرو۔ تاخیر مت کرو، جیسا کہ حدیث میں بھی روزہ جلد انظار کرنے کی تاکید اور فضیلت آئی ہے۔ دو سیر یا کہ وصال مت کرو۔ وصال کا مطلب ہے ایک روزہ انظار کیے بغیر دوسرا روزہ رکھ لینا۔ اس سے نبی ﷺ نے نہایت سختی سے منع فرمایا ہے۔ (کتب حدیث)

(۳)۔ اعتکاف کی حالت میں بیوی سے مباشرت اور بوس و کنار کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ ملاقات اور بات چیت جائز ہے۔ ﴿عَلَيْكُمْ فِي الْمَسْجِدِ﴾ سے استدلال کیا گیا ہے کہ اعتکاف کے لیے مسجد ضروری ہے، چاہے مرد ہو یا عورت۔ ازواج مطہرات نے بھی مسجد میں اعتکاف کیا ہے۔ اس لیے عورتوں کا اپنے گھروں میں اعتکاف بیٹھنا صحیح نہیں۔ البتہ مسجد میں ان کے لیے ہر چیز کا مردوں سے الگ انتظام کرنا ضروری ہے، تاکہ مردوں سے کسی طرح کا اختلاط نہ ہو، جب

اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھایا کرو، نہ حاکموں کو رشوت پہنچا کر کسی کا کچھ مال ظلم و ستم سے اپنا کر لیا کرو، حالانکہ تم جانتے ہو۔^(۱) (۱۸۸)

لوگ آپ سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ یہ لوگوں (کی عبادت) کے وقتوں اور حج کے موسم کے لئے ہے (احرام کی حالت میں) اور گھروں کے پیچھے سے تمہارا آنا کچھ نیکی نہیں، بلکہ نیکی والا وہ ہے جو متقی ہو۔ اور گھروں میں تو دروازوں میں سے آیا کرو^(۲)

اور اللہ سے ڈرتے رہو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ (۱۸۹)
لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو،^(۳) اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ (۱۹۰)

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْءُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۸﴾

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْإِهْلَاقِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ اللَّيَالِي وَالنَّجْمِ وَلَيْسَ إِلَهِدِي أَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْإِهْلَاقَ مِنَ الشَّعْرِ وَأَنْتُمْ الْبُيُوتَ مِنْ أَسْبَابِهَا ﴿۱۸۹﴾

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَرِيتُمْ يُعَاتِلُوكُمْ

وَلَا تَقْتُلُوا الرِّفَاقَ اللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُتَعَدِّينَ ﴿۱۹۰﴾

تک مسجد میں معقول، محفوظ اور مردود سے بالکل الگ انتظام نہ ہو، عورتوں کو مسجد میں اعکاف بیٹھنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے اور عورتوں کو بھی اس پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ایک نقلی عبادت ہی ہے، جب تک پوری طرح تحفظ نہ ہو، اس نقلی عبادت سے گریز بہتر ہے۔ فقہ کا اصول ہے: (ذَرُّهُ الْمَقَاسِدِ يُقَدِّمُ عَلَى جَلْبِ النَّصَالِحِ). (مصلح کے حصول کے مقابلے میں مفاسد سے بچنا اور ان کو نالنا زیادہ ضروری ہے)

(۱)۔ ایسے شخص کے بارے میں ہے جس کے پاس کسی کا حق ہو، لیکن حق والے کے پاس ثبوت نہ ہو، اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وہ عدالت یا حاکم مجاز سے اپنے حق میں فیصلہ کروالے اور اس طرح دوسرے کا حق غصب کرلے۔ یہ ظلم ہے اور حرام ہے۔ عدالت کا فیصلہ ظلم اور حرام کو جائز اور حلال نہیں کر سکتا۔ یہ ظالم عند اللہ مجرم ہو گا۔ (ابن کثیر)

(۲)۔ انصار اور دوسرے عرب جاہلیت میں جب حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیتے اور پھر کسی خاص ضرورت کے لیے گھر آنے کی ضرورت پڑ جاتی تو دروازے سے آنے کی بجائے پیچھے سے دیوار پھلانگ کر اندر آتے، اس کو وہ نیکی سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ نیکی نہیں ہے (السر التفسیر)

(۳) اس آیت میں پہلی مرتبہ ان لوگوں سے لڑنے کی اجازت دی گئی ہے جو مسلمانوں سے آمادہ قتال رہتے تھے۔ تاہم زیادتی سے منع فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ مثلہ مت کرو، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرو جن کا جنگ میں حصہ نہ ہو، اسی طرح درخت وغیرہ جلا دینا، یا جانوروں کو بغیر مصلحت کے مار ڈالنا بھی زیادتی ہے، جن سے بچا جائے۔ (ابن کثیر)

انہیں مارو جہاں بھی پاؤ اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے اور (سنو) قتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے^(۱) اور مسجد حرام کے پاس ان سے لڑائی نہ کرو جب تک کہ یہ خود تم سے نہ لڑیں، اگر یہ تم سے لڑیں تو تم بھی انہیں مارو^(۲) کافروں کا بدلہ یہی ہے۔ (۱۹۱)

اگر یہ باز آجائیں تو اللہ تعالیٰ بخشے والا مہربان ہے۔ (۱۹۲)
ان سے لڑو جب تک کہ قتنہ نہ مٹ جائے اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب نہ آجائے، اگر یہ رک جائیں (تو تم بھی رک جاؤ) زیادتی تو صرف ظالموں پر ہی ہے۔ (۱۹۳)

حرمت والے مہینے حرمت والے مہینوں کے بدلے ہیں اور حرمتیں ادلے بدلے کی ہیں^(۳) جو تم پر زیادتی کرے

وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ تَقْتُلُوهُمْ وَأُخْرَجُوا مِنْ حَيْثُ
أُخْرَجْتُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تَقْتُلُواهُمْ
عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقْتَلُوا كُمْ فِيهِ إِنْ
قَاتَلْتُمُوهُمْ فَاقْتُلُواهُمْ كَمَا قَاتَلْتُمُ الْكُفْرَانَ ۝۱۹۱

إِنْ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝۱۹۲

وَقَاتِلُواهُمْ حَتَّى لَا تَكُونُوا فِتْنَةً وَيَكُونَ الدِّينُ
بِلَهُوَ يُقَاتِلُ إِنَّهُمْ قُلُوبُهُ وَإِنَّ الْإِلَهَ الْعَلِيمِينَ ۝۱۹۳

الشُّهُرَ الْحَرَامَ بِالشُّهُرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ فَمَنْ

(۱) مکہ میں مسلمان چوں کہ کمزور اور منتشر تھے، اس لیے کفار سے قتال ممنوع تھا، ہجرت کے بعد مسلمانوں کی ساری قوت مدینہ میں مجتمع ہو گئی تو پھر ان کو جہاد کی اجازت دے دی گئی۔ ابتداء میں آپ صرف انہی سے لڑتے جو مسلمانوں سے لڑنے میں پہل کرتے، اس کے بعد اس میں مزید توسیع کر دی گئی اور مسلمانوں نے حسب ضرورت کفار کے علاقوں میں بھی جا کر جہاد کیا۔ قرآن کریم نے اَعْتَدَا (زیادتی کرنے) سے منع فرمایا، اس لیے نبی کریم ﷺ اپنے لشکر کو تاکید فرماتے کہ خیانت، بد عمدی اور مشلہ نہ کرنا، نہ بچوں، عورتوں اور گرجوں میں مصروف عبادت درویشوں کو قتل کرنا۔ اسی طرح درختوں کے جلانے اور حیوانات کو بغیر کسی مصلحت کے مارنے سے بھی منع فرماتے (ابن کثیر۔ بحوالہ صحیح مسلم وغیرہ) ﴿حَيْثُ تَقْتُلُوهُمْ﴾ (جہاں بھی پاؤ) کا مطلب ہے نَمَكَنْتُمْ مِنْ قِتَالِهِمْ ان کو قتل کرنے کی قدرت تمہیں حاصل ہو جائے (ایسر التفاسیر) ﴿وَمَنْ حَيْثُ أُخْرَجْتُمْ﴾ یعنی جس طرح کفار نے تمہیں مکہ سے نکالا تھا، اسی طرح تم بھی ان کو مکہ سے نکال جاہر کرو۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد جو لوگ مسلمان نہیں ہوئے انہیں مدت معاہدہ ختم ہونے کے بعد وہاں سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔ قتنہ سے مراد، کفر و شرک ہے۔ یہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے، اس لیے اس کو ختم کرنے کے لیے جہاد سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔

(۲) حدود حرم میں قتال منع ہے، لیکن اگر کفار اس کی حرمت کو ملحوظ نہ رکھیں اور تم سے لڑیں تو تمہیں بھی ان سے لڑنے کی اجازت ہے۔

(۳) ۶ ہجری میں رسول اللہ ﷺ چودہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر عمرہ کے لیے گئے تھے، لیکن کفار مکہ نے انہیں مکہ نہیں جانے دیا اور یہ طے پایا کہ آئندہ سال مسلمان تین دن کے لیے عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ آسکیں گے۔ یہ

تم بھی اس پر اسی کے مثل زیادتی کرو جو تم پر کی ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ پر ہمیشہ گاروں کے ساتھ ہے۔ (۱۹۳)

اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو^(۱) اور سلوک و احسان کرو، اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (۱۹۵)

حج اور عمرے کو اللہ تعالیٰ کے لئے پورا کرو،^(۲) ہاں اگر تم روک لئے جاؤ تو جو قربانی میسر ہو، اسے کر ڈالو^(۳) اور اپنے سر نہ منڈواؤ جب تک کہ قربانی قرآن گاہ تک نہ پہنچ جائے^(۴) البتہ تم میں سے جو بیمار ہو، یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (جس کی وجہ سے سر منڈالے) تو اس

اَعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاَعْتَدُوا عَلَيْهِ وَيَوْمَئِذٍ مَّا اَعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ
وَأَعْتَدُوا لِلَّهِ وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿۱۹۳﴾

وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تَقْلُوا بَآئِنَ بَيْنِكُمْ الْكَلِمَةَ
وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۹۵﴾

وَأْتُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ
مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَقْلُوا زُرُّوْكُمْ عَلَىٰ سَبِيلِ الْهَدْيِ مَحَلَّةٌ
فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ بِهِمْ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ
مِنَ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ

میعینہ تھا جو حرمت والے مہینوں میں سے ایک ہے۔ جب دوسرے سال مسلمان حسب معاہدہ اسی مہینے میں عمرہ کرنے کے لیے جانے لگے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس دفعہ بھی اگر کفار مکہ اس مہینے کی حرمت پامال کر کے (گزشتہ سال کی طرح) تمہیں مکے میں جانے سے روکیں تو تم بھی اس کی حرمت کو نظر انداز کر کے ان سے بھرپور مقابلہ کرو۔ حرمتوں کو ملحوظ رکھنے میں بدلہ ہے، یعنی وہ حرمت کا خیال رکھیں تو تم بھی رکھو، بصورت دیگر تم بھی حرمت کو نظر انداز کر کے کفار کو عبرت ناک سبق سکھاؤ (ابن کثیر)

(۱) اس سے بعض لوگوں نے ترک انفاق، بعض نے ترک جماد اور بعض نے گناہ پر گناہ کیے جانا مراد لیا ہے۔ اور یہ ساری ہی صورتیں ہلاکت کی ہیں، جماد چھوڑ دو گے، یا جماد میں اپنا مال صرف کرنے سے گریز کرو گے تو یقیناً دشمن قوی ہو گا اور تم کمزور۔ نتیجہ بتائی ہے۔

(۲) یعنی حج یا عمرے کا احرام باندھ لو تو پھر اس کا پورا کرنا ضروری ہے، چاہے نفل حج و عمرہ ہو۔ (ایسر التفسیر)

(۳) اگر راستے میں دشمن یا شدید بیماری کی وجہ سے رکاوٹ ہو جائے تو ایک جانور (ہدی)۔ ایک بکری اور گائے یا اونٹ کا ساتواں حصہ جو بھی میسر ہو، وہیں ذبح کر کے سر منڈاؤ اور حلال ہو جاؤ، جیسے نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ اللہ علیہم السلام نے وہیں حدیبیہ میں قربانیاں ذبح کی تھیں اور حدیبیہ حرم سے باہر ہے (فتح القدیر) اور آئندہ سال اس کی قضا دو جیسے نبی ﷺ نے ۶ ہجری والے عمرے کی قضا ۶ ہجری میں دی۔

(۴) اس کا عطف ﴿وَأْتُوا الْحَجَّ﴾ پر ہے اور اس کا تعلق حالت امن سے ہے، یعنی امن کی حالت میں اس وقت تک سر نہ منڈاؤ (احرام کھول کر حلال نہ ہو) جب تک تمام مناسک حج پورے نہ کر لو۔

پر فدیہ ہے، خواہ روزے رکھ لے، خواہ صدقہ دے دے، خواہ قربانی کرے^(۱) پس جب تم امن کی حالت میں ہو جاؤ تو جو شخص عمرے سے لے کر حج تک تمتع کرے، پس اسے جو قربانی میسر ہو اسے کر ڈالے، جسے طاقت ہی نہ ہو وہ تین روزے توجج کے دنوں میں رکھ لے اور سات واپسی میں،^(۲) یہ پورے دس ہو گئے۔ یہ حکم ان کے لئے ہے جو مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں،^(۳) لوگو! اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت

عذاب والا ہے۔ (۱۹۶)

حج کے مینے مقرر ہیں^(۳) اس لئے جو شخص ان میں حج

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْبَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ كُنْهَ يَجِدُ
فُصِيًّا مَثَلَةً يَأْكُلُ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةً إِذَا جَعَلْتُمْ تِلْكَ عَشْرَةً
كَامِلَةً ذَلِكَ لِمَنْ كُنْهَ أَهْلُهُ حَاضِرِي السَّجِدِ الْحَرَامِ
وَأَعْرَابِ اللَّهِ وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

الْحَجِّ أَشْهُرٌ مَعْلُومَاتٌ فَمَنْ قَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفْعَ

(۱) یعنی اس کو ایسی تکلیف ہو جائے کہ سر کے بال منڈانے پڑ جائیں تو اس کا فدیہ ضروری ہے۔ حدیث کی رو سے ایسا شخص ۶ مسکینوں کو کھانا کھلا دے، یا ایک بکری ذبح کر دے، یا تین دن کے روزے رکھے۔ روزوں کے علاوہ پہلے دو ذبیحوں کی جگہ کے بارے میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ کھانا اور خون مکہ میں ہی دے، بعض کہتے ہیں کہ روزوں کی طرح اس کے لیے بھی کوئی خاص جگہ متعین نہیں ہے۔ امام شوکانی نے اسی رائے کی تائید کی ہے (فتح القدیر)

(۲) حج کی تین قسمیں ہیں: 'إِفْرَادٌ'۔ صرف حج کی نیت سے احرام باندھنا۔ 'قِرَانٌ' حج اور عمرہ دونوں کی ایک ساتھ نیت کر کے احرام باندھنا۔ ان دونوں صورتوں میں تمام مناسک حج کی ادائیگی سے پہلے احرام کھولنا جائز نہیں ہے۔ حَجٌّ تَمَتُّعٌ۔ اس میں بھی حج و عمرہ دونوں کی نیت ہوتی ہے، لیکن پہلے صرف عمرہ کی نیت سے احرام باندھا جاتا ہے اور عمرہ کر کے پھر احرام کھول دیا جاتا ہے اور پھر ۸ ذوالحجہ کو حج کے لیے مکہ سے ہی دوبارہ احرام باندھا جاتا ہے، تمتع کے معنی فائدہ اٹھانے کے ہیں۔ گویا درمیان میں احرام کھول کر فائدہ اٹھالیا جاتا ہے۔ حج قرآن اور حج تمتع دونوں میں ایک ہدی (یعنی ایک بکری یا پھر اونٹ یا گائے کے ساتویں حصے) کی بھی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اس آیت میں اسی حج تمتع کا حکم بیان کیا گیا ہے کہ تمتع حسب طاقت ۱۰ ذوالحجہ کو ایک جانور کی قربانی دے، اگر قربانی کی طاقت نہ ہو تو تین روزے ایام حج میں اور سات روزے گھر جا کر رکھے، ایام حج، جن میں روزے رکھے ہیں، ۹ ذی الحجہ (یوم عرفات) سے پہلے، یا پھر ایام تشریق ہیں۔ (فتح القدیر)

(۳) یعنی تمتع اور اس کی وجہ سے ہدی یا روزے صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جو مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں، مراد اس سے حدود حرم میں یا اتنی مسافت پر رہنے والے ہیں کہ ان کے سفر پر قہر کا اطلاق نہ ہو سکتا ہو۔ (ابن کثیر، بحوالہ ابن جریر)

(۴) اور یہ ہیں شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے پہلے دس دن۔ مطلب یہ ہے کہ عمرہ تو سال میں ہر وقت جائز ہے، لیکن حج صرف مخصوص دنوں میں ہی ہوتا ہے، اس لیے اس کا احرام حج کے مینوں کے علاوہ باندھا جائز نہیں۔ (ابن کثیر)

لازم کر لے وہ اپنی تیوی سے میل ملاپ کرنے، گناہ کرنے اور لڑائی جھگڑے کرنے سے بچتا رہے،^(۱) تم جو نیکی کرو گے اس سے اللہ تعالیٰ باخبر ہے اور اپنے ساتھ سفر خرچ لے لیا کرو، سب سے بہتر توشہ اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے^(۲) اور اے عقلمند! مجھ سے ڈرتے رہا کرو۔ (۱۹۷)

تم پر اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی گناہ نہیں^(۳) جب تم عرفات سے لوٹو تو مشعر حرام کے پاس ذکر الہی کرو اور اس کا ذکر کرو جیسے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی، حالانکہ تم اس سے پہلے راہ بھولے ہوئے

وَلَا تُسْئَلُونَ فِي الْحَسَبِ وَإِنَّمَا تَسْعَلُونَ إِسْرَارًا يَوْمَ لَا يُعْلَمُهُ
اللَّهُ وَسَوْفَ يُؤْتِي الْمُتَّقُونَ
وَإِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَجْمَعِينَ وَيُطَهِّرَ الْبَاطِنَ
وَالظَّالِمِينَ ﴿۱۹۷﴾

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَسْتَغْفِرُوا مِنْ رَبِّكُمْ
فَإِنَّمَا أَنْتُمْ مُنَادُونَ فَمَا ذَكَرُوا اللَّهَ
عِنْدَ التَّسْعِيرِ الْحَرَامِ وَأَذْكُرُوهَا كَمَا هَدَاكُمْ
وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمَنِ الصَّالِحِينَ ﴿۱۹۸﴾

مسئلہ: حج قرآن یا افراد کا احرام اہل مکہ، مکہ کے اندر سے ہی باندھیں گے۔ البتہ حج تمتع کی صورت میں عمرے کے احرام کے لیے حرم سے باہر حل میں جانا ان کے لیے ضروری ہے۔ (فتح الباری، کتاب الحج و أبواب العمرة و موطا إمام مالك، اسی طرح آفاقی لوگ حج تمتع میں ۸ ذوالحجہ کو مکہ سے ہی احرام باندھیں گے۔ البتہ بعض علما کے نزدیک اہل مکہ کو عمرے کے احرام کے لیے حدود حرم سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے وہ ہر طرح کے حج اور عمرے کے لیے اپنی اپنی جگہ سے ہی احرام باندھ سکتے ہیں۔

تنبیہ: حافظ ابن القیم نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قول و عمل سے صرف دو قسم کے عمرے ثابت ہیں۔ ایک وہ جو حج تمتع کے ساتھ کیا جاسکتا ہے اور دوسرا وہ عمرہ مفردہ جو ایام حج کے علاوہ صرف عمرے کی نیت سے ہی سفر کر کے کیا جائے۔ باقی حرم سے جا کر کسی قریب ترین حل سے عمرے کے لیے احرام باندھ کر آنا غیر مشروع ہے۔ (الآیہ کہ جن کے احوال و ظروف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جیسے ہوں) (زاد المعاد - ج ۲، طبع جدید) نوٹ: حدود حرم سے باہر کے علاقے کو حل اور بیرون میقات سے آنے والے جہان کو آفاقی کہا جاتا ہے۔

(۱) صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حدیث ہے «مَنْ حَجَّ هَذَا الْبَيْتِ، فَلَمْ يَزُقْهُ، وَلَمْ يَفْسُقْ؛ خَرَجَ مِنْ ذُنُوبِهِ كَيَوْمٍ وُلِدَتْهُ أُمُّهُ». (صحیح بخاری، کتاب المحصر، باب قول اللہ عزوجل فلا فث) ”جس نے حج کیا اور شہوانی باتوں اور فسق و فجور سے بچا، وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے، جیسے اس دن پاک تھا جب اسے اس کی ماں نے جتا تھا۔“

(۲) تقویٰ سے مراد یہاں سوال سے بچنا ہے۔ بعض لوگ بغیر زاد راہ لیے حج کے لیے گھر سے نکل پڑتے اور کہتے کہ ہمارا اللہ پر توکل ہے۔ اللہ نے توکل کے اس مفہوم کو غلط قرار دیا اور زاد راہ لینے کی تاکید فرمائی۔

(۳) فضل سے مراد تجارت اور کاروبار ہے، یعنی سفر حج میں تجارت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

تھے^(۱) (۱۹۸)

پھر تم اس جگہ سے لوٹو جس جگہ سے سب لوگ لوٹتے ہیں^(۲) اور اللہ تعالیٰ سے طلب بخشش کرتے رہو یقیناً اللہ تعالیٰ بخشے والا مہربان ہے۔ (۱۹۹)

پھر جب تم ارکان حج ادا کر چکو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جس طرح تم اپنے باپ دادوں کا ذکر کیا کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی زیادہ^(۳) بعض لوگ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں دے۔ ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ (۲۰۰)

اور بعض لوگ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں نیکی دے^(۴) اور آخرت میں بھی بھلائی عطا

ثُمَّ أَيْفُضُوا مِنْ حَيْثُ أَقَاصَ النَّاسِ وَأَسْتَغْفِرُوا
اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۹۹﴾

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ
كَمَا ذَكَرْتُمُ آبَاءَكُمْ إِذْ كُنْتُمْ فِي التَّالِسِ
مَنْ يَفْعُولْ رِبِّيًّا أَيَّتَافِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي
الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾

وَمِنْهُمْ مَنْ يَفْعُولُ رِبِّيًّا أَيَّتَافِي الدُّنْيَا حَسَنَةً

(۱) - ۹ ذوالحجہ کو زوال آفتاب سے غروب شمس تک میدان عرفات میں وقوف، حج کا سب سے اہم رکن ہے، جس کی بابت حدیث میں کہا گیا ہے۔ «الْحَجُّ عَرَفَةٌ» (عرفات میں وقوف ہی حج ہے) یہاں مغرب کی نماز نہیں پڑھنی ہے، بلکہ مزدلفہ پہنچ کر مغرب کی تین رکعات اور عشا کی دو رکعت (قصر) جمع کر کے ایک اذان اور دو اقامت کے ساتھ پڑھی جائے گی۔ مزدلفہ ہی کو مشعر حرام کہا گیا ہے، کیوں کہ یہ حرم کے اندر ہے۔ یہاں ذکر الہی کی تاکید ہے۔ یہاں رات گزارنی ہے، فجر کی نماز غَلَسَ (اندھیرے) میں یعنی اول وقت میں پڑھ کر طلوع آفتاب تک ذکر میں مشغول رہا جائے، طلوع آفتاب کے بعد منیٰ جایا جائے۔

(۲) - مذکورہ بالا ترتیب کے مطابق عرفات جانا اور وہاں وقوف کر کے واپس آنا ضروری ہے، لیکن عرفات چوں کہ حرم سے باہر ہے اس لیے قریش مکہ عرفات تک نہیں جاتے تھے، بلکہ مزدلفہ سے ہی لوٹ آتے تھے، چنانچہ حکم دیا جا رہا ہے کہ جہاں سے سب لوگ لوٹ کر آتے ہیں وہیں سے لوٹ کر آؤ یعنی عرفات سے۔

(۳) - عرب کے لوگ حج سے فراغت کے بعد منیٰ میں میلہ لگاتے اور آباؤ اجداد کے کارناموں کا ذکر کرتے، مسلمانوں کو کہا جا رہا ہے کہ جب تم ۱۰ ذوالحجہ کو کنکریاں مارنے، قربانی کرنے، سر منڈانے، طواف کعبہ اور سعی صفا و مروہ سے فارغ ہو جاؤ تو اس کے بعد جو تین دن منیٰ میں قیام کرنا ہے تو وہاں خوب اللہ کا ذکر کرو، جیسے جاہلیت میں تم اپنے آباؤ اجداد کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔

(۴) - یعنی اعمال خیر کی توفیق، یعنی اہل ایمان دنیا میں بھی دنیا طلب نہیں کرتے، بلکہ نیکی کی ہی توفیق طلب کرتے ہیں۔ نبی ﷺ کثرت سے یہ دعا پڑھتے تھے۔ طواف کے دوران لوگ ہر چکر کی الگ الگ دعا پڑھتے ہیں جو خود ساختہ ہیں ان کے بجائے طواف کے وقت یہی دعا ﴿رَبَّنَا أَيَّتَافِي الدُّنْيَا حَسَنَةً﴾ رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان پڑھنا سنوں عمل ہے۔

فرما اور ہمیں عذاب جہنم سے نجات دے۔ (۲۰۱)
یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ہے اور
اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔ (۲۰۲)
اور اللہ تعالیٰ کی یاد ان گنتی کے چند دنوں (ایام تشریق)
میں کرو،^(۱) دودن کی جلدی کرنے والے پر بھی کوئی گناہ
نہیں، اور جو پیچھے رہ جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں،^(۲)
یہ پرہیزگار کے لئے ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو
اور جان رکھو کہ تم سب اسی کی طرف جمع کئے جاؤ
گے۔ (۲۰۳)

بعض لوگوں کی دنیاوی غرض کی باتیں آپ کو خوش کر
دیتی ہیں اور وہ اپنے دل کی باتوں پر اللہ کو گواہ کرتا ہے،
حالانکہ دراصل وہ زبردست جھگڑالو ہے۔ (۲۰۴)^(۳)
جب وہ لوٹ کر جاتا ہے تو زمین میں فساد پھیلانے کی اور
کھیتی اور نسل کی بربادی کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور
اللہ تعالیٰ فساد کو ناپسند کرتا ہے۔ (۲۰۵)
اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو تکبر اور

وَفِي الْأَخِرَةِ حَسَنَةٌ وَقَنَا عَذَابَ النَّارِ ۝
أُولَئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ سَرِيعُ
الْحِسَابِ ۝

وَأذْكُرُوا لِلَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ
فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا
إِثْمَ عَلَيْهِ وَسِمَنَ ائْتَفَىٰ وَالْفَوَالِقَ وَالْعَمَلَةَ
الْكَلْبَ إِلَىٰ يَوْمِئِذٍ ۝

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجْعَلُ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ
اللَّهُ عَلَىٰ مَنَاقِبِهِ ۖ لَهُمْ أَجْرٌ كَثِيرٌ ۝

وَأَذْكُرُوا لِيَسْعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُقْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ
الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ ۝

وَأَذْكُرُوا لِيَأْتِيَ اللَّهُ أَحَدَتَهُ الْعُرَةَ بِالْأَثَرِ

(۱)۔ مراد ایام تشریق ہیں، یعنی ۱۱ اور ۱۳ ذوالحجہ۔ ان میں ذکر الہی، یعنی بہ آواز بلند تکبیرات مسنون ہیں، صرف فرض
نمازوں کے بعد ہی نہیں (جیسا کہ ایک ضعیف حدیث کی بنیاد پر مشہور ہے) بلکہ ہر وقت یہ تکبیرات پڑھی جائیں، اللہ
أَكْبَرُ، اللہ أَكْبَرُ، اللہ أَكْبَرُ، لا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، واللَّهُ أَكْبَرُ، اللہ أَكْبَرُ واللَّهِ الْحَمْدُ کنکریاں مارتے وقت ہر کنکری کے
ساتھ تکبیر پڑھنی مسنون ہے۔ (نیل الأوطار۔ ج ۵ ص ۸۶)۔

(۲)۔ رمی جمار (جمرات کو کنکریاں مارنا) ۳ دن افضل ہیں، لیکن اگر کوئی دودن (۱۱ ذوالحجہ) کو کنکریاں مار کر منی سے واپس
آجائے تو اس کی بھی اجازت ہے۔

(۳)۔ بعض ضعیف روایات کے مطابق یہ آیت ایک منافق اخص بن شریق ثقفی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن
صحیح تر بات یہ ہے کہ اس سے مراد سارے ہی منافقین اور متکبرین ہیں، جن میں یہ مذموم اوصاف پائے جائیں جو قرآن
نے اس کے ضمن میں بیان فرمائے ہیں۔

وَصَنِبُهُ جَهَنَّمَ وَلِكُنَّ الْوَهَادُ ۝

وَمِنَ النَّكٰثِيْنَ مَنْ يَكْتُمُوْا نَفْسَهُ اِبْتِغَاءَ مَرْضٰتِ

اللّٰهِ وَاللّٰهُ سَرُوْٓنٌ بِالْعِبَادِ ۝

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَدْخُلُوْا فِي السَّلٰمِ

كٰفٰةً مَّا كُنْتُمْ تَعْبُوْنَ اَخْلَطُوْا النَّسِيْطِيْنَ اِنَّهٗ

لَكٰذِبٌ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

تعب اسے گناہ پر آمادہ کر^(۱) دیتا ہے، ایسے کے لئے بس

جہنم ہی ہے اور یقیناً وہ بدترین جگہ ہے۔ (۲۰۶)

اور بعض لوگ وہ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی

طلب میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں^(۲) اور اللہ تعالیٰ

اپنے بندوں پر بڑی مہربانی کرنے والا ہے۔ (۲۰۷)

ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور

شیطان کے قدموں کی تابعداری نہ کرو^(۳) وہ تمہارا کھلا

دشمن ہے۔ (۲۰۸)

(۱) ﴿ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاُتْمِ ﴾ تکبر اور غرور اسے گناہ پر ابھارتا ہے۔ عزت کے معنی غرور و انانیت کے ہیں۔

(۲) یہ آیت کہتے ہیں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ، رومی کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جب وہ ہجرت کرنے لگے تو کافروں

نے کہا کہ یہ مال سب یہاں کا کمایا ہوا ہے، اسے ہم ساتھ نہیں لے جانے دیں گے، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے یہ سارا

مال ان کے حوالے کر دیا اور دین ساتھ لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ ﷺ نے سن کر فرمایا ”صہیب

نے نفع بخش تجارت کی ہے“ دو مرتبہ فرمایا (فتح القدیر) لیکن یہ آیت بھی عام ہے، جو تمام مومنین، متقین اور دنیا کے

مقابلے میں دین کو اور آخرت کو ترجیح دینے والوں کو شامل ہے، کیوں کہ اس قسم کی تمام آیات کے بارے میں، جو کسی

خاص شخص یا واقعہ کے بارے میں نازل ہوئیں یہ اصول ہے: (العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب) یعنی

لفظ کے عموم کا اعتبار ہوگا، سبب نزول کے خصوص کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ پس انحنس بن شریق (جس کا ذکر پچھلے

آیت میں ہوا) برے کردار کا ایک نمونہ ہے جو ہر اس شخص پر صادق آئے گا جو اس جیسے برے کردار کا حامل ہو گا اور

صہیب رضی اللہ عنہ، خیر اور کمال ایمان کی ایک مثال ہیں ہر اس شخص کے لیے جو ان صفات خیر و کمال سے متصف ہو گا۔

(۳) اہل ایمان کو کہا جا رہا ہے کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اس طرح نہ کرو کہ جو باتیں تمہاری

مصلحتوں اور خواہشات کے مطابق ہوں، ان پر تو عمل کرو اور دوسرے حکموں کو نظر انداز کر دو۔ اسی طرح جو دین تم

چھوڑ آئے ہو، اس کی باتیں اسلام میں شامل کرنے کی کوشش مت کرو، بلکہ صرف اسلام کو مکمل طور پر اپناؤ۔ اس سے

دین میں بدعات کی بھی نفی کر دی گئی اور آج کل کے سیکولر ذہن کی تردید بھی، جو اسلام کو مکمل طور پر اپنانے کے لیے

تیار نہیں، بلکہ دین کو عبادات، یعنی مساجد تک محدود کرنا، اور سیاست اور ایوان حکومت سے دیس نکالا دینا چاہتا ہے۔

اسی طرح عوام کو بھی سمجھایا جا رہا ہے جو رسوم و رواج اور علاقائی ثقافت و روایات کو پسند کرتے ہیں اور انہیں چھوڑنے

کے لیے آمادہ نہیں ہوتے، جیسے مرگ اور شادی بیاہ کی سرفانہ اور ہندوانہ رسوم اور دیگر رواج۔ اور یہ کہا جا رہا ہے کہ

شیطان کے قدموں کی پیروی مت کرو، جو تمہیں مذکورہ خلاف اسلام باتوں کے لیے حسین فلسفے تراش کر پیش کرتا،

برائیوں پر خوش نماغلاف چڑھاتا اور بدعات کو بھی نیکی باور کرتا ہے، تاکہ اس کے دام ہم رنگ زمین میں پھنسے رہو۔

اگر تم باوجود تمہارے پاس دلیلیں آجانے کے بھی پھسل جاؤ تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ غلبہ والا اور حکمت والا ہے۔ (۲۰۹)

کیا لوگوں کو اس بات کا انتظار ہے کہ ان کے پاس خود اللہ تعالیٰ ابر کے ساتیانوں میں آجائے اور فرشتے بھی اور کام انتہا تک پہنچا^(۱) دیا جائے، اللہ ہی کی طرف تمام کام لوٹائے جاتے ہیں۔ (۲۱۰)

بنی اسرائیل سے پوچھو تو کہ ہم نے انہیں کس قدر روشن نشانیاں عطا فرمائیں^(۲) اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اپنے پاس پہنچ جانے کے بعد بدل ڈالے (وہ جان لے)^(۳) کہ اللہ تعالیٰ بھی سخت عذابوں والا ہے۔ (۲۱۱)

کافروں کے لئے دنیا کی زندگی خوب زینت دار کی گئی ہے، وہ ایمان والوں سے ہنسی مذاق کرتے ہیں،^(۴) حالانکہ پرہیزگار لوگ قیامت کے دن ان سے اعلیٰ ہوں گے، اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا

قَالَ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمْ الْمَوْتُ
قَاعَلِمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۰۹﴾

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلْمٍ لَّيِّنٍ
الْعَمَاءُ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُؤُوتِ الْأَنْرُ
وَرَأَى اللَّهُ شُرُجَهُ الْأُمُورِ ﴿۲۱۰﴾

سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمَا آتَيْنَاهُم مِّنْ آيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ
وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ
فَرَأَى اللَّهُ شَدِيدَ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَسَخَّرْنَا مِنَ الَّذِينَ
آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا أَزْوَاجَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاللَّهُ يَرْزُقُ
مَنْ يَشَاءُ بِعَدْوٍ حَسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

(۱) یہ یا تو قیامت کا منظر ہے جیسا کہ بعض تفسیری روایات میں ہے۔ (ابن کثیر) یعنی کیا یہ قیامت برپا ہونے کا انتظار کر رہے ہیں؟ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے جلو میں اور بادلوں کے سائے میں ان کے سامنے آئے اور فیصلہ چکائے، تب وہ ایمان لائیں گے۔ لیکن ایسا اسلام قابل قبول ہی نہیں، اس لیے قبول اسلام میں تاخیر مت کرو اور فوراً اسلام قبول کر کے اپنی آخرت سنوار لو۔

(۲) مثلاً عصائے موسیٰ، جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے جاودگروں کا توڑ کیا، سمندر سے راستہ بنایا، پتھر سے بارہ چشمے جاری کیے، بادلوں کا سایہ، من و سلوئی کا نزول وغیرہ جو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کی دلیل تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے احکام الہی سے اعراض کیا۔

(۳) نعمت کے بدلنے کا مطلب یہی ہے کہ ایمان کے بدلے انہوں نے کفر اور اعراض کا راستہ اپنایا۔
(۴) چون کہ مسلمانوں کی اکثریت غریب پر مشتمل تھی جو دنیوی آسائشوں اور سہولتوں سے محروم تھے، اس لیے کافر یعنی قریش مکہ ان کا مذاق اڑاتے تھے، جیسا کہ اہل ثروت کا ہر دور میں شیوہ رہا ہے۔

ہے۔^(۱) (۲۱۳)

در اصل لوگ ایک ہی گروہ تھے^(۲)، اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو خوشخبریاں دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ سچی کتابیں نازل فرمائیں، تاکہ لوگوں کے ہر اختلافی امر کا فیصلہ ہو جائے۔ اور صرف ان ہی لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی تھی، اپنے پاس دلائل آچکنے کے بعد آپس کے بغض و عناد کی وجہ سے اس میں اختلاف کیا^(۳) اس لئے اللہ پاک نے ایمان والوں کی اس اختلاف میں بھی حق کی طرف اپنی مشیت سے رہبری کی^(۴) اور اللہ

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ۗ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۖ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ۗ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۲۱۳﴾

(۱) اہل ایمان کے فخر اور سادگی کا کفار جو استہزا و تمسخر اڑاتے، اس کا ذکر فرما کر کہا جا رہا ہے کہ قیامت والے دن یہی فخر اپنے تقویٰ کی بدولت بلند و بالا ہوں گے ”بے حساب روزی“ کا تعلق آخرت کے علاوہ دنیا سے بھی ہو سکتا ہے کہ چند سالوں کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے ان فخر پر بھی فتوحات کے دروازے کھول دیے، جن سے سامان دنیا اور رزق کی فراوانی ہو گئی۔

(۲) یعنی توحید پر۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام، یعنی دس صدیوں تک لوگ توحید پر، جس کی تعلیم انبیاء دیتے رہے، قائم رہے۔ آیت میں مفسرین صحابہ نے فَاخْتَلَفُوا محذوف مانا ہے، یعنی اس کے بعد شیطان کی وسوسہ اندازی سے ان کے اندر اختلاف پیدا ہو گیا اور شرک و مظاہر پرستی عام ہو گئی۔ فَبَعَثَ اس کا عطف فَاخْتَلَفُوا (جو محذوف ہے) پر ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو کتابوں کے ساتھ بھیج دیا، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اختلافات کا فیصلہ اور حق اور توحید کو قائم و واضح کریں (ابن کثیر)

(۳) اختلاف ہمیشہ راہ حق سے انحراف کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس انحراف کا منبع بغض و عناد بنتا ہے، امت مسلمہ میں بھی جب تک یہ انحراف نہیں آیا، یہ امت اپنی اصل پر قائم اور اختلافات کی شدت سے محفوظ رہی، لیکن اندھی تقلید اور بدعات نے حق سے گریز کا جو راستہ کھولا، اس سے اختلافات کا دائرہ پھیلتا اور بڑھتا ہی چلا گیا، تاکہ اتحاد امت ایک ناممکن چیز بن کر رہ گیا ہے فَهَدَى اللَّهُ الْمُسْلِمِينَ۔

(۴) چنانچہ مثلاً اہل کتاب نے جمعہ میں اختلاف کیا، یہود نے ہفتہ کو اور نصاریٰ نے اتوار کو اپنا مقدس دن قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جمعے کا دن اختیار کرنے کی ہدایت دے دی۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا۔ یہود نے ان کی تکذیب کی اور ان کی والدہ حضرت مریم پر بہتان باندھا، اس کے برعکس عیسائیوں نے ان کو اللہ کا بیٹا اور اللہ بنا دیا۔ اللہ نے مسلمانوں کو ان کے بارے میں صحیح موقف اپنانے کی توفیق عطا فرمائی کہ وہ اللہ کے پیغمبر اور اس کے فرماں بردار بندے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں بھی انہوں نے اختلاف کیا، ایک نے

جس کو چاہے سیدھی راہ کی طرف رہبری کرتا ہے۔ (۲۱۳)

کیا تم یہ گمان کئے بیٹھے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے، حالانکہ اب تک تم پر وہ حالات نہیں آئے جو تم سے اگلے لوگوں پر آئے تھے۔^(۱) انہیں بیماریاں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ یہاں تک جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور اس کے ساتھ کے ایمان والے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ سن رکھو کہ اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔ (۲۱۴)

آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے جو مال تم خرچ کرو وہ ماں باپ کے لئے ہے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے^(۲) اور تم جو کچھ بھلائی کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے۔ (۲۱۵)

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتَّخَلَّوْا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَا تَتَّخِذُونَ بِالدِّينِ
خَلَائِفَ الَّذِينَ فِي الْأَنْفُسِ الَّذِينَ أُفْتِنُوا
وَمَا يَتَّبِعُونَ إِلَّا مَوْتًا وَمَا يَنْقُضُونَ إِلَّا
مَعَهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَرِيبٌ ۝

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۗ قُلْ مَا أُنْفِقُ مِنْ خَيْرٍ
فَلَوْلَا الدِّينُ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالسَّكِينِ
وَابْنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝

یہودی اور دوسرے نے نصرانی کہا مسلمانوں کو اللہ نے صحیح بات بتلائی کہ وہ ﴿حَنِيفًا مَسْلُوبًا﴾ تھے اور اس طرح کے دیگر کئی مسائل میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اذن یعنی اپنے فضل سے مسلمانوں کو صراط مستقیم دکھائی۔

(۱) ہجرت مدینہ کے بعد جب مسلمانوں کو یہودیوں، منافقوں اور مشرکین عرب سے مختلف قسم کی ایذائیں اور تکلیفیں پہنچیں تو بعض مسلمانوں نے نبی ﷺ سے شکایت کی، جس پر مسلمانوں کی تسلی کے لیے یہ آیت بھی نازل ہوئی اور خود نبی ﷺ نے بھی فرمایا ”تم سے پہلے لوگوں کو ان کے سر سے لے کر پیروں تک آرے سے چرا گیا اور لوہے کی کنگھی سے ان کے گوشت پوست کو نوچا گیا، لیکن یہ ظلم و تشدد ان کو ان کے دین سے نہیں پھیر سکا“ پھر فرمایا ”اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ اس معاملے کو مکمل (یعنی اسلام کو غالب) فرمائے گا۔ یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضرموت تک تماشاً سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو گا۔ الحدیث (صحیح بخاری، کتاب الإكراه، باب من اختار الضرب والقتل والهوان على الكفر) مقصد نبی ﷺ کا مسلمانوں کے اندر حوصلہ اور استقامت کا عزم پیدا کرنا تھا۔

(۲) اس لیے ”كُلُّ مَا هُوَ آتٍ فَهُوَ قَرِيبٌ“ (ہر آنے والی چیز، قریب ہے) اور اہل ایمان کے لیے اللہ کی مدد یقینی ہے اس لیے وہ قریب ہی ہے۔

(۳) بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے استفسار پر مال خرچ کرنے کے اولین مصارف بیان کیے جا رہے ہیں، یعنی یہ سب سے زیادہ تمہارے مالی تعاون کے مستحق ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اتفاق کا یہ حکم صدقات نافلہ سے متعلق ہے، زکوٰۃ سے متعلق

تم پر جہاد فرض کیا گیا گو وہ تمہیں دشوار معلوم ہو، ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو بری جانو اور دراصل وہی تمہارے لئے بھلی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو اچھی سمجھو، حالانکہ وہ تمہارے لئے بری ہو، حقیقی علم اللہ ہی کو ہے، تم محض بے خبر ہو۔^(۱) (۲۱۶)

لوگ آپ سے حرمت والے مہینوں میں لڑائی کی بابت سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ ان میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے، لیکن اللہ کی راہ سے روکنا، اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور وہاں کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا، اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے یہ فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے،^(۲) یہ لوگ تم سے

كُذِّبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ وَعَلَيْكُمْ أَنْ تَكْفُرُوا شَيْئًا
وَهُوَ حَبْرٌ كَلْبٌ وَعَلَيْكُمْ أَنْ تُجْبُوا شَيْئًا وَهُوَ سُرٌّ لَكُمْ وَاللَّهُ
يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۱۶﴾

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْقَوْلِ فِيهِ قِتَالٍ فِيهِ
يَكْفُرُونَ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ أَوَّلَ كُفْرِهِمُ الْكُفْرُ بِمَنْعِ الْحَرَامِ
وَالْأَخْرَاجِ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ
الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ يُبْعَثُونَ كُفْرًا حَتَّى يَرْوُدُوا عَنْ
دِينِكُمْ لِأَنَّهُمْ اسْتَغْنَوْا وَمَنْ يَزِدْكُمْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ

نہیں۔ کیوں کہ ماں باپ پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنی جائز نہیں ہے۔ حضرت میمون بن مہران نے اس آیت کی تلاوت کر کے فرمایا ”مال خرچ کرنے کی ان جگہوں میں نہ طلبہ سارنگی کا ذکر ہے اور نہ چوٹی تصویروں اور دیواروں پر لٹکائے جانے والے آرائشی پردوں کا“ مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں پر مال خرچ کرنا ناپسندیدہ اور اسراف ہے۔ افسوس ہے کہ آج یہ مسرفانہ اور ناپسندیدہ اخراجات ہماری زندگی کا اس طرح لازمی حصہ بن گئے ہیں کہ اس میں کراہت کا کوئی پہلو ہی ہماری نظروں میں نہیں رہا۔

(۱) جہاد کے حکم کی ایک مثال دے کر اہل ایمان کو سمجھایا جا رہا ہے کہ اللہ کے ہر حکم پر عمل کرو، چاہے تمہیں وہ گراں اور ناگوار ہی لگے۔ اس لیے کہ اس کے انجام اور نتیجے کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ہو سکتا ہے، اس میں تمہارے لیے بہتری ہو۔ جیسے جہاد کے نتیجے میں تمہیں فتح و غلبہ، عزت و سربلندی اور مال و اسباب مل سکتا ہے، اسی طرح تم جس کو پسند کرو، (یعنی جہاد کے بجائے گھر میں بیٹھ رہنا) اس کا نتیجہ تمہارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے، یعنی دشمن تم پر غالب آجائے اور تمہیں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے۔

(۲) رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔ یہ چار مہینے زمانہ جاہلیت میں بھی حرمت والے سمجھے جاتے تھے، جن میں قتال و جدال ناپسندیدہ تھا۔ اسلام نے بھی ان کی حرمت کو برقرار رکھا۔ نبی ﷺ کے زمانے میں ایک مسلمان فوجی دستے کے ہاتھوں رجب کے مہینے میں ایک کافر قتل ہو گیا اور بعض کافر قیدی بنا لیے گئے۔ مسلمانوں کے علم میں یہ نہیں تھا کہ رجب شروع ہو گیا ہے۔ کفار نے مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ دیکھو یہ حرمت والے مہینے کی حرمت کا بھی خیال نہیں رکھتے،

لڑائی بھڑائی کرتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان سے ہو سکے تو تمہیں تمہارے دین سے مرتد کر دیں^(۱) اور تم میں سے جو لوگ اپنے دین سے پلٹ جائیں اور اسی کفر کی حالت میں مریں، ان کے اعمال دنیوی اور اخروی سب غارت ہو جائیں گے۔ یہ لوگ جہنمی ہوں گے اور ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں ہی رہیں گے۔ (۲۱۷)

البتہ ایمان لانے والے، ہجرت کرنے والے، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہی رحمت الہی کے امیدوار ہیں، اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بہت مہربانی کرنے والا ہے۔ (۲۱۸)

لوگ آپ سے شراب اور جوئے کا مسئلہ پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے^(۲) اور

فَسَبَّتُمْ وَمَا كُنْتُمْ عَلَيْهِمْ صَاحِبِينَ
الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هُمْ يَكْفُرُونَ
خُلْدُونَ ﴿۲۱۷﴾

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هُمْ يَكْفُرُونَ
اللَّهُ أَوْلَىٰ بِكُمْ صِرَاطًا وَعَدْلًا وَأَلَّهُ عَلِيمٌ غَلِيظٌ ﴿۲۱۸﴾

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْمِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ
وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا

جس پر یہ آیت نازل ہوئی اور کہا گیا کہ یقیناً حرمت والے مہینے میں قتال بڑا گناہ ہے، لیکن حرمت کی دہائی دینے والوں کو اپنا عمل نظر نہیں آتا؟ یہ خود اس سے بھی بڑے جرائم کے مرتکب ہیں یہ اللہ کے راستے سے اور مسجد حرام سے لوگوں کو روکتے ہیں اور وہاں سے مسلمانوں کو نکلنے پر انہوں نے مجبور کر دیا۔ علاوہ ازیں کفر و شرک بجائے خود قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اس لیے اگر مسلمانوں سے غلطی سے ایک آدھ قتل حرمت والے مہینے میں ہو گیا تو کیا ہوا؟ اس پر داویلا کرنے کے بجائے ان کو اپنا نامہ سیاہ بھی تو دیکھ لینا چاہیے۔

(۱) جب یہ اپنی شرارتوں، سازشوں اور تمہیں مرتد بنانے کی کوششوں سے باز آنے والے نہیں تو پھر تم ان سے مقاتلہ کرنے میں شہر حرام کی وجہ سے کیوں رکے رہو؟

(۲) جو دین اسلام سے پھر جائے، یعنی مرتد ہو جائے (اگر وہ توبہ نہ کرے) تو اس کی دنیوی سزا قتل ہے۔ حدیث میں ہے: «مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ» (صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب لا يعذب بعداب الله) آیت میں اس کی اخروی سزایمان کی جا رہی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ایمان کی حالت میں کیے گئے اعمال صالحہ بھی کفر و ارتداد کی وجہ سے کالعدم ہو جائیں گے اور جس طرح ایمان قبول کرنے سے انسان کے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اسی طرح کفر و ارتداد سے تمام نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ تاہم قرآن کے الفاظ سے واضح ہے کہ جسطرح اعمال اسی وقت ہو گا جب خاتمہ کفر پر ہو گا، اگر موت سے پہلے تائب ہو جائے گا تو ایسا نہیں ہو گا، یعنی مرتد کی توبہ مقبول ہے۔

(۳) بڑا گناہ تو دین کے اعتبار سے ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ذُكِّرْكَ الْعَقُولُ كَذَلِكَ
يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۹﴾

لوگوں کو اس سے دنیاوی فائدہ بھی ہوتا ہے، لیکن ان کا
گناہ ان کے نفع سے بہت زیادہ^(۱) ہے۔ آپ سے یہ بھی
دریافت کرتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں؟ تو آپ کہہ
دیجئے حاجت سے زائد چیز،^(۲) اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنے
احکام صاف صاف تمہارے لئے بیان فرما رہا ہے، تاکہ تم
سوچ سمجھ سکو، (۲۱۹)

دنیا اور آخرت کے امور کو۔ اور تجھ سے تیسوں کے بارے میں
بھی سوال کرتے ہیں^(۳) آپ کہہ دیجئے کہ ان کی خیر خواہی

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ قُلْ إِصْلَاحٌ
لَّهُمْ خَيْرٌ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَامْحُوا كَتْمَهُمُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ

(۱) فائدوں کا تعلق دنیا سے ہے، مثلاً شراب سے وقتی طور پر بدن میں چستی و مستعدی اور بعض ذہنوں میں تیزی آ جاتی
ہے۔ جنسی قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے، جس کے لیے اس کا استعمال عام ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کی خرید و فروخت نفع
بخش کاروبار ہے۔ جو میں بھی بعض دفعہ آدمی جیت جاتا ہے تو اس کو کچھ مال مل جاتا ہے، لیکن یہ فائدے ان نقصانات و
مفسد کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے جو انسان کی عقل اور اس کے دین کو ان سے بچتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ
”ان کا گناہ، ان کے فائدوں سے بہت بڑا ہے۔“ اس طرح اس آیت میں شراب اور جو کو حرام تو قرار نہیں دیا گیا، تاہم
اس کے لیے تمہید باندھ دی گئی ہے۔ اس آیت سے ایک بہت اہم اصول یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر چیز میں چاہے وہ کتنی
بھی بری ہو، کچھ نہ کچھ فائدے بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً ریڈیو، ٹی وی اور دیگر اس قسم کی ایجادات ہیں اور لوگ ان کے
بعض فوائد بیان کر کے اپنے نفس کو دھوکہ دے لیتے ہیں۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ فوائد اور نقصانات کا تقابل کیا ہے۔ خاص
طور پر دین و ایمان اور اخلاق و کردار کے لحاظ سے۔ اگر دینی نقطہ نظر سے نقصانات و مفسد زیادہ ہیں تو تھوڑے سے
دنوی فائدوں کی خاطر اسے جائز قرار نہیں دیا جائے گا۔

(۲) اس معنی کے اعتبار سے یہ اخلاقی ہدایت ہے، یا پھر یہ حکم ابتدائے اسلام میں دیا گیا، جس پر فرضیت زکوٰۃ کے بعد
عمل ضروری نہیں رہا، تاہم افضل ضرور ہے، یا اس کے معنی ہیں ما سَهَّلَ وَتَيَسَّرَ وَلَمْ يَشُقَّ عَلَى الْقَلْبِ (فتح القدر)
”جو آسان اور سہولت سے ہو اور دل پر شاق (گراں) نہ گزرے“ اسلام نے یقیناً انفاق کی بڑی ترغیب دی ہے۔ لیکن
یہ اعتدال ملحوظ رکھا ہے کہ ایک تو اپنے زیر کفالت افراد کی خبر گیری اور ان کی ضروریات کو مقدم رکھنے کا حکم دیا ہے۔
دوسرے، اس طرح خرچ کرنے سے بھی منع کیا ہے کہ کل کو تمہیں یا تمہارے اہل خاندان کو دوسروں کے آگے دست
سوال دراز کرنا پڑ جائے۔

(۳) جب تیسوں کا مال، ملکا کھانے والوں کے لیے وعید نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ڈر گئے اور تیسوں کی ہر چیز
الگ کر دی حتیٰ کہ کھانے پینے کی کوئی چیز بچ جاتی، تو اسے بھی استعمال نہ کرتے اور وہ خراب ہو جاتی، اس ڈر سے کہ کہیں
ہم بھی اس وعید کے مستحق نہ قرار پائیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (ابن کثیر)

بہتر ہے، تم اگر ان کا مال اپنے مال میں ملا بھی لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں، بد نیت اور نیک نیت ہر ایک کو اللہ خوب جانتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا،^(۱) یقیناً اللہ تعالیٰ غلبہ والا اور حکمت والا ہے۔ (۲۳۰)

اور شرک کرنے والی عورتوں سے تا وقتیکہ وہ ایمان نہ لائیں تم نکاح نہ کرو،^(۲) ایمان والی لونڈی بھی شرک کرنے والی آزاد عورت سے بہت بہتر ہے، گو تمہیں مشرک ہی اچھی لگتی ہو اور نہ شرک کرنے والے مردوں کے نکاح میں اپنی عورتوں کو دو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں، ایمان والا غلام آزاد مشرک سے بہتر ہے، گو مشرک تمہیں اچھا لگے۔ یہ لوگ جنم کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت کی طرف اور اپنی بخشش کی طرف اپنے حکم سے بلاتا ہے، وہ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے بیان فرما رہا ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ (۲۳۱)

آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ

مِنَ الْمُصَلِّينَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْتَبْتُمْ إِنْ اللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۳۰﴾

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَلَكُمْ مُمْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ وَيُبَيِّنُ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۳۱﴾

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذَىٰ فَأَعْتَزِلُوا لِلنِّسَاءِ فِي

(۱) یعنی تمہیں بغرض اصلاح و بہتری بھی، ان کا مال اپنے مال میں ملانے کی اجازت نہ دیتا۔

(۲) مشرک عورتوں سے مراد بتوں کی پجاری عورتیں ہیں۔ کیوں کہ اہل کتاب (یہودی یا عیسائی) عورتوں سے نکاح کی اجازت قرآن نے دی ہے۔ البتہ کسی مسلمان عورت کا نکاح کسی اہل کتاب مرد سے نہیں ہو سکتا۔ تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصلحتاً اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو ناپسند کیا ہے (ابن کثیر) آیت میں اہل ایمان کو ایمان دار مردوں اور عورتوں سے نکاح کی تاکید کی گئی ہے اور دین کو نظر انداز کر کے محض حسن و جمال کی بنیاد پر نکاح کرنے کو آخرت کی بربادی قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح حدیث میں بھی نبی ﷺ نے فرمایا کہ ”عورت سے چار وجہوں سے نکاح کیا جاتا ہے: مال، حسب نسب، حسن و جمال یا دین کی وجہ سے۔ تم دین دار عورت کا انتخاب کرو۔ (صحیح بخاری۔ کتاب النکاح، باب الاكفاء في الدين - و صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب استحباب نكاح ذات الدين) اسی طرح آپ ﷺ نے نیک عورت کو دنیا کی سب سے بہتر متاع قرار دیا ہے۔ فرمایا: خیر متاع دنیا المرأة الصالحة (صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب خیر متاع دنیا المرأة الصالحة)

دیتے کہ وہ گندگی ہے، حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو^(۱) اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ، ہاں جب وہ پاک ہو جائیں^(۲) تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمہیں اجازت دی^(۳) ہے، اللہ توبہ کرنے والوں کو اور پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ (۲۲۲)

تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں، اپنی کھیتوں میں جس طرح چاہو^(۴) آؤ اور اپنے لئے (نیک اعمال) آگے

الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرُبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَظْهَرَْنَ ۖ وَإِذَا ظَهَرَْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿۲۲۲﴾

يَسْأَلُكُمْ خِزْيُكُمْ لَكُمْ فَأْتُوا حُرْمَتَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ۚ وَقَدْ مَوَّأَ لَأَنْفُسِكُمْ وَأَتَقُوا اللَّهَ وَاعْتَبُوا أَنْتُمْ مَلَاقُوا وَبَيِّنُوا

(۱) بلوغت کے بعد ہر عورت کو ایام ماہواری میں جو خون آتا ہے، اسے حیض کہا جاتا ہے اور بعض دفعہ عادت کے خلاف بیماری کی وجہ سے خون آتا ہے، اسے استحاضہ کہتے ہیں، جس کا حکم حیض سے مختلف ہے۔ حیض کے ایام میں عورت کے لئے نماز معاف ہے اور روزے رکھنے ممنوع ہیں، تاہم روزوں کی قضا بعد میں ضروری ہے۔ مرد کے لیے صرف ہم بستری منع ہے، البتہ بوس و کنار جائز ہے۔ اسی طرح عورت ان دنوں میں کھانا پکانا اور دیگر گھر کا ہر کام کر سکتی ہے، لیکن یہودیوں میں ان دنوں میں عورت کو بالکل نجس سمجھا جاتا تھا، وہ اس کے ساتھ اختلاط اور کھانا پینا بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی بابت حضور ﷺ سے پوچھا تو یہ آیت اتری، جس میں صرف جماع کرنے سے روکا گیا۔ علیحدہ رہنے اور قریب نہ جانے کا مطلب صرف جماع سے ممانعت ہے۔ (ابن کثیر وغیرہ)

(۲) جب وہ پاک ہو جائیں۔ اس کے دو معنی بیان کیے گئے ہیں ”ایک خون بند ہو جائے“ یعنی پھر غسل کیے بغیر بھی پاک ہیں، مرد کے لیے ان سے مباشرت کرنا جائز ہے۔ ابن حزم اور بعض ائمہ اس کے قائل ہیں۔ علامہ البانی نے بھی اس کی تائید کی ہے (آداب الزفاف ص ۴۷) دوسرے معنی ہیں، خون بند ہونے کے بعد غسل کر کے پاک ہو جائیں۔ اس دوسرے معنی کے اعتبار سے عورت جب تک غسل نہ کر لے، اس سے مباشرت حرام رہے گی۔ امام شوکانی نے اس کو راجح قرار دیا ہے (فتح القدیر) ہمارے نزدیک دونوں مسلک قابل عمل ہیں، لیکن دوسرا قابل ترجیح ہے۔

(۳) ”جہاں سے اجازت دی ہے“ یعنی شرمگاہ سے۔ کیوں کہ حالت حیض میں بھی اسی کے استعمال سے روکا گیا تھا اور اب پاک ہونے کے بعد جو اجازت دی جا رہی ہے تو اس کا مطلب اسی (فرج، شرمگاہ) کی اجازت ہے، نہ کہ کسی اور حصے کی۔ اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ عورت کی دبر کا استعمال حرام ہے، جیسا کہ احادیث میں اس کی مزید صراحت کردی گئی ہے۔

(۴) یہودیوں کا خیال تھا کہ اگر عورت کو پیٹ کے بل لٹا کر (مُذْبِرَةً) مباشرت کی جائے تو بچہ بھیگتا پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تردید میں کہا جا رہا ہے کہ مباشرت آگے سے کرو (چپٹ لٹا کر) یا پیچھے سے (پیٹ کے بل) یا کروٹ پر، جس طرح چاہو، جائز ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ ہر صورت میں عورت کی فرج ہی استعمال ہو۔ بعض لوگ اس سے یہ استدلال کرتے ہیں

الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲۳۳﴾

بھیجو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو اور جان رکھو کہ تم اس سے ملنے والے ہو اور ایمان والوں کو خوش خبری سنا دیجئے۔ (۲۳۳)

اور اللہ تعالیٰ کو اپنی قسموں کا (اس طرح) نشانہ نہ بناؤ کہ بھلائی اور پرہیزگاری اور لوگوں کے درمیان کی اصلاح کو چھوڑ بیٹھو^(۱) اور اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔ (۲۳۴)

اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری ان قسموں پر نہ پکڑے گا جو پختہ نہ ہوں^(۲) ہاں اس کی پکڑ اس چیز پر ہے جو تمہارے دلوں کا فعل ہو، اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور بردبار ہے۔ (۲۳۵)

جو لوگ اپنی بیویوں سے (تعلق نہ رکھنے کی) قسمیں کھائیں، ان کے لئے چار مہینے کی مدت^(۳) ہے، پھر اگر وہ لوٹ آئیں تو اللہ تعالیٰ بھی بخشنے والا مہربان ہے۔ (۲۳۶)

وَلَا جَعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِّأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا
وَتُصَلِّوا بَيْنَ النَّاسِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۳۴﴾

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِالْعَمَلِ الَّذِي أَيمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ
بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۲۳۵﴾

لَٰكِنَّ يَنْ يُؤَلُّونَ مِنْ نِسَائِهِمْ نَزْئِلُصَ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَإِنْ
قَاءُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۲۳۶﴾

(جس طرح چاہو) میں تو دبر بھی آجاتی ہے، لہذا دبر کا استعمال بھی جائز ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ جب قرآن نے عورت کو کھیتی قرار دیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ صرف کھیتی کے استعمال کے لیے یہ کہا جا رہا ہے کہ ”اپنی کھیتوں میں جس طرح چاہو، آؤ“ اور یہ کھیتی (موضع ولد) صرف فرج ہے نہ کہ دبر۔ بہر حال یہ غیر فطری فعل ہے ایسے شخص کو جو اپنی عورت کی دبر استعمال کرتا ہے ملعون قرار دیا گیا ہے (بخوالد ابن کثیر وفتح القدر)

(۱) یعنی غصے میں اس طرح کی قسم مت کھاؤ کہ میں فلاں کے ساتھ نیکی نہیں کروں گا، فلاں سے نہیں بولوں گا، فلاں کے درمیان صلح نہیں کراؤں گا۔ اس قسم کی قسموں کے لیے حدیث میں کہا گیا ہے کہ اگر کھالو تو انہیں توڑ دو اور قسم کا کفارہ ادا کرو (کفارہ قسم کے لیے دیکھیے: سورۃ المائدہ، آیت ۸۹)

(۲) یعنی جو غیر ارادی اور عادت کے طور پر ہوں۔ البتہ عمد آجھوئی قسم کھانا کبیرہ گناہ ہے۔

(۳) ایلاء کے معنی قسم کھانے کے ہیں، یعنی کوئی شوہر اگر قسم کھالے کہ اپنی بیوی سے ایک مہینے یا دو مہینے (مثلاً) تعلق نہیں رکھوں گا۔ پھر قسم کی مدت پوری کر کے تعلق قائم کر لیتا ہے تو کوئی کفارہ نہیں، ہاں اگر مدت پوری ہونے سے قبل تعلق قائم کرے گا تو کفارہ قسم ادا کرنا ہو گا۔ اور اگر چار مہینے سے زیادہ مدت کے لیے یا مدت کی تعیین کے بغیر قسم کھاتا ہے تو اس آیت میں ایسے لوگوں کے لیے مدت کا تعیین کر دیا گیا ہے کہ وہ چار مہینے گزرنے کے بعد یا بیوی سے تعلق قائم کر لیں، یا پھر اسے طلاق دے دیں (اسے چار مہینے سے زیادہ معلق رکھنے کی اجازت نہیں ہے) پہلی صورت میں اسے

اور اگر طلاق کا ہی قصد کر لیں ^(۱) تو اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔ (۲۲۷)

طلاق والی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں، ^(۲) انہیں حلال نہیں کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو پیدا کیا ہو اسے چھپائیں، ^(۳) اگر انہیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہو، ان کے خاوند اس مدت میں انہیں لوٹا لینے کے پورے حق دار ہیں اگر ان کا ارادہ اصلاح کا ہو۔ ^(۴) اور عورتوں کے بھی ویسے ہی حق ہیں

وَأَنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۲۷﴾

وَالْمُطَلَّغَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبِعَوَلْتَهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَاللَّيْظُ جَائِلٌ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةً

کفارہ قسم ادا کرنا ہو گا اور اگر دونوں میں سے کوئی صورت اختیار نہیں کرے گا تو عدالت اس کو دونوں میں سے کسی ایک بات کے اختیار کرنے پر مجبور کرے گی کہ وہ اس سے تعلق قائم کرے، یا طلاق دے، تاکہ عورت پر ظلم نہ ہو۔ (تفسیر ابن کثیر)

(۱) ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ چار مہینے گزرتے ہی از خود طلاق واقع نہیں ہوگی (جیسا کہ بعض علما کا مسلک ہے) بلکہ خاوند کے طلاق دینے سے طلاق ہوگی، جس پر اسے عدالت بھی مجبور کرے گی۔ جیسا کہ جمہور علما کا مسلک ہے۔ (ابن کثیر)

(۲) اس سے وہ مطلقہ عورت مراد ہے جو حاملہ بھی نہ ہو (کیوں کہ حمل والی عورت کی مدت وضع حمل ہے) جسے دخول سے قبل طلاق مل گئی ہو، وہ بھی نہ ہو (کیوں کہ اس کی کوئی عدت ہی نہیں ہے) آٹھ مہینے بھی نہ ہو، یعنی جن کو حیض آتا بند ہو گیا ہو (کیوں کہ ان کی عدت تین مہینے ہے) گویا یہاں مذکورہ عورتوں کے علاوہ صرف مدخولہ عورت کی عدت بیان کی جا رہی ہے اور وہ ہے تین قروء۔ جس کے معنی طہریات تین حیض کے ہیں۔ یعنی تین طہریات تین حیض عدت گزار کے وہ دوسری جگہ شادی کرنے کی مجاز ہے۔ سلف نے قروء کے دونوں ہی معنی صحیح قرار دیے ہیں، اس لیے دونوں کی گنجائش ہے (ابن کثیر وفتح القدير)

(۳) اس سے حیض اور حمل دونوں ہی مراد ہیں۔ حیض نہ چھپائیں، مثلاً کہے کہ طلاق کے بعد مجھے ایک یا دو حیض آئے ہیں، درآں حالیکہ اسے تینوں حیض آچکے ہوں۔ مقصد پہلے خاوند کی طرف رجوع کرنا ہو (اگر وہ رجوع کرنا چاہتا ہو) یا اگر رجوع کرنا نہ چاہتی ہو تو یہ کہہ دے کہ مجھے تو تین حیض آچکے ہیں جب کہ واقعہً ایسا نہ ہو، تاکہ خاوند کا حق رجوع ثابت نہ ہو سکے۔ اسی طرح حمل نہ چھپائیں، کیوں کہ اس طرح دوسری جگہ شادی کرنے کی صورت میں نسب میں اختلاط ہو جائے گا۔ نطفہ وہ پہلے خاوند کا ہو گا اور منسوب دوسرے خاوند کی طرف ہو جائے گا۔ یہ سخت کبیرہ گناہ ہے۔

(۴) رجوع کرنے سے خاوند کا مقصد اگر تنگ کرنا نہ ہو تو عدت کے اندر خاوند کو رجوع کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ عورت کے ولی کو اس حق میں رکاوٹ ڈالنے کی اجازت نہیں ہے۔

وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۸﴾

جیسے ان پر مردوں کے ہیں اچھائی کے ساتھ۔^(۱) ہاں مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے۔ (۲۲۸)

یہ طلاقیں دو مرتبہ^(۲) ہیں، پھریا تو اچھائی سے روکنا^(۳) یا عہدگی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے^(۴) اور تمہیں حلال نہیں کہ تم نے انہیں جو دے دیا ہے اس میں سے کچھ بھی لو، ہاں یہ اور بات ہے کہ دونوں کو اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ

الطَّلَاقُ مَرْثِيٌّ مِّمَّا سَأَلُ الْمَرْءُ مِنْ أَهْلِهِ وَإِنْ طَلَّقَ الْمَرْءُ زَوْجَهُ فَلَمْ يَحْضُرْ فَإِنَّهُ يَبْغِضُهَا وَيَكْفُرُ بِهَا وَلِلْمَرْءِ عَلَى نَفْسِهِ مَا خَلَّ بِيَدِهِ وَالْمَرْءُ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا بِمَوْتَاكُمْ وَأَنْتُمْ مُؤْمِنُونَ كَيْفَا آتَىٰ بِمَا خَلَّ وَدَّ اللَّهُ

(۱) یعنی دونوں کے حقوق ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، جن کے پورے کرنے کے دونوں شرعاً پابند ہیں، تاہم مرد کو عورت پر فضیلت یا درجہ حاصل ہے، مثلاً فطری قوتوں میں، جہاد کی اجازت میں، میراث کے دوگنا ہونے میں، قومیت اور حاکمیت میں اور اختیار طلاق و رجوع (وغیرہ) میں۔

(۲) یعنی وہ طلاق جس میں خاوند کو (عدت کے اندر) رجوع کا حق حاصل ہے، وہ دو مرتبہ ہے۔ پہلی مرتبہ طلاق کے بعد بھی اور دوسری مرتبہ طلاق کے بعد بھی رجوع ہو سکتا ہے۔ تیسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد رجوع کی اجازت نہیں۔ زمانہ جاہلیت میں یہ حق طلاق و رجوع غیر محدود تھا جس سے عورتوں پر بڑا ظلم ہوتا تھا، آدمی بار بار طلاق دے کر رجوع کرتا رہتا تھا، اس طرح اسے نہ بسانا تھا، نہ آزاد کرتا تھا۔ اللہ نے اس ظلم کا راستہ بند کر دیا۔ اور پہلی یا دوسری مرتبہ سوچنے اور غور کرنے کی سہولت سے محروم بھی نہیں کیا۔ ورنہ اگر پہلی مرتبہ طلاق میں ہی ہمیشہ کے لیے جدائی کا حکم دے دیا جاتا تو اس سے پیدا ہونے والی معاشرتی مسائل کی پیچیدگیوں کا اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے ”طَلَّقَتَانِ“ (دو طلاقیں) نہیں فرمایا، بلکہ الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ (طلاق دو مرتبہ) فرمایا، جس سے اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ بیک وقت دو یا تین طلاقیں دینا اور انہیں بیک وقت نافذ کر دینا حکمت الہیہ کے خلاف ہے۔ حکمت الہیہ اسی بات کی مقتضی ہے کہ ایک مرتبہ طلاق کے بعد (چاہے وہ ایک ہو یا کئی ایک) اور اسی طرح دوسری مرتبہ طلاق کے بعد (چاہے وہ ایک ہو یا کئی ایک) مرد کو سوچنے سمجھنے اور جلد بازی یا غصے میں کیے گئے کام کے ازالے کا موقع دیا جائے، یہ حکمت ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق رجعی قرار دینے میں ہی باقی رہتی ہے، نہ کہ تینوں کو بیک وقت نافذ کر کے سوچنے اور غلطی کا ازالہ کرنے کی سہولت سے محروم کر دینے کی صورت میں، (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: کتاب مجموعہ مقالات علمیہ بابت۔ ایک مجلس کی تین طلاق۔ اور ”اختلاف امت اور صراط مستقیم“۔ نیز معلوم ہونا چاہئے کہ بہت سے علما ایک مجلس کی تین طلاقوں کے واقع ہونے ہی کا فتویٰ دیتے ہیں۔

(۳) یعنی رجوع کر کے اچھے طریقے سے اسے بسانا۔

(۴) یعنی تیسری مرتبہ طلاق دے کر۔

سکنے کا خوف ہو، اس لئے اگر تمہیں ڈر ہو کہ یہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے تو عورت رہائی پانے کے لئے کچھ دے ڈالے، اس میں دونوں پر گناہ نہیں^(۱) یہ اللہ کی حدود ہیں خبردار ان سے آگے نہ بڑھنا اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے تجاوز کر جائیں وہ ظالم ہیں۔ (۲۲۹)

پھر اگر اس کو (تیسری بار) طلاق دے دے تو اب اس کے لئے حلال نہیں جب تک کہ وہ عورت اس کے سوا دوسرے سے نکاح نہ کرے، پھر اگر وہ بھی طلاق دے دے تو ان دونوں کو میل جول کر لینے میں کوئی گناہ نہیں^(۲) بشرطیکہ یہ جان لیں کہ اللہ کی حدوں کو قائم رکھ سکیں گے، یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں جنہیں وہ جاننے والوں کے لئے بیان فرما رہا ہے۔ (۲۳۰)

جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت ختم کرنے پر آئیں تو اب انہیں اچھی طرح بساؤ، یا بھلائی کے ساتھ

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُعِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۲۹﴾

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدِ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُعِيمَا حُدُودَ اللَّهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۲۳۰﴾

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَبَسْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ

(۱) اس میں خلع کا بیان ہے، یعنی عورت خاوند سے علیحدگی حاصل کرنا چاہے تو اس صورت میں خاوند عورت سے اپنا دیا ہوا امر واپس لے سکتا ہے۔ خاوند اگر علیحدگی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو تو عدالت خاوند کو طلاق دینے کا حکم دے گی اور اگر وہ اسے نہ مانے تو عدالت نکاح فسخ کر دے گی۔ گویا خلع بذریعہ طلاق بھی ہو سکتا ہے اور بذریعہ فسخ بھی۔ دونوں صورتوں میں عدت ایک حیض ہے (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، والحاکم۔ فتح القدیر) عورت کو یہ حق دینے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی سخت تاکید کی گئی ہے کہ عورت بغیر کسی معقول عذر کے خاوند سے علیحدگی یعنی طلاق کا مطالبہ نہ کرے۔ اگر ایسا کرے گی تو نبی ﷺ نے ایسی عورتوں کے لیے یہ سخت وعید بیان فرمائی ہے کہ وہ جنت کی خوشبو تک نہیں پائیں گی۔ (ابن کثیر وغیرہ)

(۲) اس طلاق سے تیسری طلاق مراد ہے۔ یعنی تیسری طلاق کے بعد خاوند اب نہ رجوع کر سکتا ہے اور نہ نکاح۔ البتہ یہ عورت کسی اور جگہ نکاح کر لے اور دوسرا خاوند اپنی مرضی سے اسے طلاق دے دے، یا فوت ہو جائے تو اس کے بعد زوج اول سے اس کا نکاح جائز ہو گا۔ لیکن اس کے لیے بعض ملکوں میں جو حلالہ کا طریقہ رائج ہے، یہ لعنتی فعل ہے۔ نبی ﷺ نے حلالہ کرنے والے اور کروانے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ حلالہ کی غرض سے کیا گیا نکاح، نکاح نہیں ہے، زنا کاری ہے۔ اس نکاح سے عورت پہلے خاوند کے لیے حلال نہیں ہوگی۔

الگ کر دو^(۱) اور انہیں تکلیف پہنچانے کی غرض سے ظلم و زیادتی کے لئے نہ روکو، جو شخص ایسا کرے اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ تم اللہ کے احکام کو ہنسی کھیل نہ^(۲) بناؤ اور اللہ کا احسان جو تم پر ہے یاد کرو اور جو کچھ کتاب و حکمت اس نے نازل فرمائی ہے جس سے تمہیں نصیحت کر رہا ہے، اسے بھی۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ (۲۳۱)

اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو انہیں ان کے خاندانوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جب کہ وہ آپس میں دستور کے مطابق رضامند ہوں۔^(۳) یہ نصیحت انہیں کی جاتی ہے جنہیں تم میں سے اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر یقین و

وَلَا تُسَبِّحُوهُنَّ حُرَّامًا لِّتَعْتُنَّ ذُنُوبًا وَمَنْ يَفْعَلْ
ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ، وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ
هُزُوًا وَإِذْ تُرْوَابُنَا نَعْمَتِ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلْ
عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَإِحْكَمَةَ يُعْظَمُ بِهِ وَالْتَقُوا
اللَّهَ وَعَلِمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٣١﴾

وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمَّا عَلِمْتُمْ أَنَّكُمْ
تَعْطُونَهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاصُوا
بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ذَلِكَ يُؤْخَذُ بِهِ مَنْ
كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

(۱) ﴿الطَّلَاقِ مَرْثِيْنَ﴾ میں بتلایا گیا تھا کہ دو طلاق تک رجوع کرنے کا اختیار ہے۔ اس آیت میں کہا جا رہا ہے کہ رجوع عدت کے اندر اندر ہو سکتا ہے، عدت گزرنے کے بعد نہیں۔ اس لیے یہ تکرار نہیں ہے جس طرح کہ بظاہر معلوم ہوتی ہے۔
(۲) بعض لوگ مذاق میں طلاق دے دیتے، یا نکاح کر لیتے، یا آزاد کر دیتے ہیں، پھر کہتے کہ میں نے تو مذاق کیا تھا۔ اللہ نے اسے آیات الہی سے استہزا قرار دیا، جس سے مقصود اس سے روکنا ہے۔ اسی لیے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ مذاق سے بھی اگر کوئی مذکورہ کام کرے گا تو وہ حقیقت ہی سمجھا جائے گا اور مذاق کی طلاق، یا نکاح یا آزادی نافذ ہو جائے گی۔ (تفسیر ابن کثیر)۔

(۳) اس میں مطلقہ عورت کی بابت ایک تیسرا حکم دیا جا رہا ہے وہ یہ کہ عدت گزرنے کے بعد (پہلی یا دوسری طلاق کے بعد) اگر سابقہ خاوند بیوی باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو تم ان کو مت روکو۔ نبی ﷺ کے زمانے میں ایک ایسا واقعہ ہوا تو عورت کے بھائی نے انکار کر دیا جس پر یہ آیت اتری (صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب لانکاح إلا بولی، اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ عورت اپنا نکاح نہیں کر سکتی، بلکہ اس کے نکاح کے لیے ولی کی اجازت اور رضامندی ضروری ہے۔ تب ہی تو اللہ تعالیٰ نے ولیوں کو اپنا حق ولایت غلط طریقے سے استعمال کرنے سے روکا ہے۔ اس کی مزید تائید حدیث نبوی ﷺ سے ہوتی ہے: «لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيِّ» (ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں) (رواہ الخمسة إلا النسائی، إرواء الغلیل ج ۶ ص ۲۳۵۔ صحیحہ الألبانی، ایک اور روایت میں ہے۔ «أَيَّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ إِذْنٍ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ» (حوالہ مذکور و صحیحہ ایضاً الألبانی، جس عورت نے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کر لیا، پس اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس

ایمان ہو، اس میں تمہاری بہترین صفائی اور پاکیزگی ہے۔
اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (۲۳۲)
مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلائیں جن کا ارادہ
دودھ پلانے کی مدت بالکل پوری کرنے کا ہو^(۱) اور جن
کے بچے ہیں ان کے ذمہ ان کا روٹی کپڑا ہے جو مطابق
دستور کے ہو۔^(۲) ہر شخص اتنی ہی تکلیف دیا جاتا ہے

ذَلِكُمْ أَذَىٰ لَكُمْ وَأَطَهْرٌ وَإِنَّهُ يُعَلِّمُ

وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۳۲﴾

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَلَدْنَ
يُتِمُّهُ الرِّضَاعُ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَيَكْفِيَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ
لَا يَجُكَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وَسْعَهَا لَا كُفْرًا وَاللَّهُ يَكْفِي مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا

کا نکاح باطل ہے.... (حوالہ مذکور) ان احادیث کو علامہ انور شاہ کشمیری نے بھی، دیگر محدثین کی طرح، صحیح اور احسن
تسلیم کیا ہے۔ فیض الباری، ج ۳، کتاب النکاح) دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ عورت کے ولیوں کو بھی عورت پر جبر
کرنے کی اجازت نہیں، بلکہ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ عورت کی رضامندی کو بھی ضرور ملحوظ رکھیں۔ اگر ولی
عورت کی رضامندی کو نظر انداز کر کے زبردستی نکاح کر دے، تو شریعت نے عورت کو بذریعہ عدالت نکاح فسخ کرانے کا
اختیار دیا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ نکاح میں دونوں کی رضامندی حاصل کی جائے، کوئی ایک فریق بھی من مانی نہ
کرے۔ اگر عورت من مانے طریقے سے ولی کی اجازت نظر انداز کرے گی تو وہ نکاح ہی صحیح نہیں ہو گا اور ولی زبردستی
کرے گا اور لڑکی کے مفادات کے مقابلے میں اپنے مفادات کو ترجیح دے گا تو عدالت ایسے ولی کو حق ولایت سے محروم
کر کے ولی العبد کے ذریعے سے یا خود ولی بن کر اس عورت کے نکاح کا فریضہ انجام دے گی۔ «فَإِنْ اشْتَجَرَ نَا فَالْسُلْطَانُ
وَلِيُّ مَنْ لَّا وَلِيَّ لَهَا» (ادواء الغلیل)

(۱) اس آیت میں مسئلہ رضاعت کا بیان ہے۔ اس میں پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ جو مدت رضاعت پوری کرنی چاہے تو
وہ دو سال پورے دودھ پلائے۔ ان الفاظ سے اس سے کم مدت تک دودھ پلانے کی بھی گنجائش نکلتی ہے، دوسری بات
یہ معلوم ہوئی کہ مدت رضاعت زیادہ سے زیادہ دو سال ہے، جیسا کہ ترمذی میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً
روایت ہے: «(لَا يَحْرُمُ مِنَ الرِّضَاعِ إِلَّا مَا فَتَقَ الْأَمْعَاءَ فِي النَّذِي، وَكَانَ قَبْلَ الْفِطَامِ)»۔ (الترمذی، کتاب الرضاع)
باب ماجاء أن الرضاعة لا تحرم إلا في الصغرة دون الحولين) «وہی رضاع (دودھ پلانا) حرمت ثابت کرتا
ہے، جو چھاتی سے نکل کر آنتوں کو پھاڑے اور یہ دودھ چھڑانے (کی مدت) سے پہلے ہو۔» چنانچہ اس مدت کے اندر کوئی
بچہ کسی عورت کا اس طریقے سے دودھ پی لے گا، جس سے رضاعت ثابت ہو جاتی ہے، تو ان کے درمیان رضاعت کا وہ
رشتہ قائم ہو جائے گا، جس کے بعد رضاعی بہن بھائیوں میں آپس میں اسی طرح نکاح حرام ہو گا جس طرح نسبی بہن
بھائیوں میں حرام ہوتا ہے۔ «(يَحْرُمُ مِنَ الرِّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ)»۔ (صحیح بخاری، کتاب الشهادات) باب
الشهادة على الأتساب والرضاع المستفيض والموت القديم) «رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام ہو جائیں
گے جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔»

(۲) مَوْلُودٌ لَهَا سے مراد باپ ہے۔ طلاق ہو جانے کی صورت میں شیر خوار بچے اور اس کی ماں کی کفالت کا مسئلہ ہمارے

جتی اس کی طاقت ہو۔ ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے یا باپ کو اس کی اولاد کی وجہ سے کوئی ضرر نہ پہنچایا جائے۔^(۱) وارث پر بھی اسی جیسی ذمہ داری^(۲) ہے، پھر اگر دونوں (یعنی ماں باپ) اپنی رضامندی اور باہمی مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں اور اگر تمہارا ارادہ اپنی اولاد کو دودھ پلوانے کا ہو تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تم ان کو مطابق دستور کے جو دینا ہو وہ ان کے حوالے کر دو،^(۳) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جاننے رہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ (۲۳۳)

تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس (دن) عدت میں رکھیں،^(۴) پھر جب مدت ختم کر لیں تو جو

لَهُ يُولَدُ وَيَحْلُ الْوَارِثُ مِثْلُ ذَلِكَ فَإِنْ أَرَادَ فِصَالًا عَنِ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فَوَلَاكُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ لِيَتَرْضِعْنَ عَلَيْكُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّفْعِ وَاللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَبْتَئِمْ بَعِيْرٌ ﴿۲۳﴾

وَالَّذِينَ يُولَدُونَ مِنْكُمْ وَيَبْدُونَ أَوْلَادًا لَكُمْ بِأَنْفُسِهِمْ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا إِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ

معاشرے میں بڑا پیچیدہ بن جاتا ہے اور اس کی وجہ شریعت سے انحراف ہے۔ اگر حکم الہی کے مطابق خاندان اپنی طاقت کے مطابق مطلقہ عورت کی روٹی کپڑے کا ذمہ دار ہو، جس طرح کہ اس آیت میں کہا جا رہا ہے تو نہایت آسانی سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

(۱) ماں کو تکلیف پہنچانا یہ ہے کہ مثلاً ماں بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہے، مگر ماما کے جذبے کو نظر انداز کر کے بچہ زبردستی اس سے چھین لیا جائے، یا یہ کہ بغیر خرچ کی ذمہ داری اٹھائے، اسے دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے۔ باپ کو تکلیف پہنچانے سے مراد یہ ہے کہ ماں دودھ پلانے سے انکار کر دے، یا اس کی حیثیت سے زیادہ کا، اس سے مالی مطالبہ کرے۔

(۲) باپ کے فوت ہو جانے کی صورت میں یہی ذمہ داری وارثوں کی ہے کہ وہ بچے کی ماں کے حقوق صحیح طریقے سے ادا کریں، تاکہ نہ عورت کو تکلیف ہو اور نہ بچے کی پرورش اور نگہداشت متاثر ہو۔

(۳) یہ ماں کے علاوہ کسی اور عورت سے دودھ پلوانے کی اجازت ہے بشرطیکہ اس کا ماں واجب (معاوضہ) دستور کے مطابق ادا کر دیا جائے۔

(۴) یہ عدت وفات ہر عورت کے لیے ہے، چاہے مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ، جو ان ہو یا بوڑھی۔ البتہ اس سے حاملہ عورت مستثنیٰ ہے، کیوں کہ اس کی عدت وضع حمل ہے۔ ﴿وَأُولَئِكَ أَجْمَلُ أَجَلَهُنَّ لَنْ يَفْقَهُنَّ سَمَلَهُنَّ﴾ — (الطلاق) ”حمل والی عورتوں کی مدت وضع حمل ہے۔“ اس عدت وفات میں عورت کو زیب و زینت کی (حتیٰ کہ سرمہ لگانے کی بھی) اور خاوند کے مکان سے کسی اور جگہ منتقل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ مطلقہ رجعیہ کے لیے عدت کے اندر زیب و زینت ممنوع نہیں ہے اور

اچھائی کے ساتھ وہ اپنے لئے کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں^(۱) اور اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل سے خبردار ہے۔ (۲۳۳)

تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم اشارہ کنائیۃ ان عورتوں سے نکاح کی بابت کہو، یا اپنے دل میں پوشیدہ ارادہ کرو، اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ تم ضرور ان کو یاد کرو گے، لیکن تم ان سے پوشیدہ وعدے نہ کر لو^(۲) ہاں یہ اور بات ہے کہ تم بھلی بات بولا کرو^(۳) اور عقد نکاح جب تک کہ عدت ختم نہ ہو جائے پختہ نہ کرو، جان رکھو کہ

فِيْمَا تَعْلَمُوْنَ فِيْ اَنْفُسِكُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَزَمْتُمْ بِهِ مِنْ حَدِيثِ النَّسَاءِ وَالنِّسَاءِ
فِيْ اَنْفُسِكُمْ حَتّٰى يَخْرُجَ مِنْكُمْ سَتْرٌ لَّكُمْ سِتْرٌ لَّكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُرْوَدُوْنَ
سِرًّا اِلَّا اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَلَا تَعْرَضُوْا عِنْدَهَا لِلنِّكَاحِ
حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَحْلٰهٖ وَاَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْ
اَنْفُسِكُمْ فَاَحْذَرُوْهُ وَاَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ عَفُوٌّ رَّحِيْمٌ ﴿۲۳۳﴾

مطلقہ بانہ میں اختلاف ہے، بعض جواز کے اور بعض ممانعت کے قائل ہیں۔ (ابن کثیر)

(۱) یعنی عدت گزرنے کے بعد وہ زیب و زینت اختیار کریں اور اولیا کی اجازت و مشاورت سے کسی اور جگہ نکاح کا بندوبست کریں، تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں، اس لیے تم پر بھی (اے عورت کے ولیوں) کوئی گناہ نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیوہ کے عقد ثانی کو برا سمجھنا چاہیے، نہ اس میں رکاوٹ ڈالنی چاہیے۔ جیسا کہ ہندوؤں کے اثرات سے ہمارے معاشرے میں یہ چیز پائی جاتی ہے۔

(۲) یہ بیوہ یا وہ عورت، جس کو تین طلاقیں مل چکی ہوں، یعنی طلاق بانہ۔ ان کی بابت کہا جا رہا ہے کہ عدت کے دوران ان سے اشارے کنایے میں تو تم نکاح کا پیغام دے سکتے ہو (مثلاً میرا ارادہ شادی کرنے کا ہے، یا میں نیک عورت کی تلاش میں ہوں، وغیرہ) لیکن ان سے کوئی خفیہ وعدہ مت لو اور نہ مدت گزرنے سے قبل عقد نکاح پختہ کرو۔ لیکن وہ عورت جس کو خاوند نے ایک یا دو طلاقیں دی ہیں، اس کو عدت کے اندر اشارے کنایے میں بھی نکاح کا پیغام دینا جائز نہیں، کیونکہ جب تک عدت نہیں گزر جاتی، اس پر خاوند کا ہی حق ہے۔ ممکن ہے خاوند رجوع ہی کر لے۔

مسئلہ: بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جاہل لوگ عدت کے اندر ہی نکاح کر لیتے ہیں، اس کی بابت حکم یہ ہے کہ اگر ان کے درمیان ہم بستری نہیں ہوئی ہے تو فوراً ان کے درمیان تفریق کرادی جائے اور اگر ہم بستری ہو گئی ہے تب بھی تفریق تو ضروری ہے، تاہم دوبارہ ان کے درمیان (عدت گزرنے کے بعد) نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ بعض علما کی رائے یہ ہے کہ ان کے درمیان اب کبھی باہم نکاح نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک دوسرے کے لیے ابد احرام ہیں، لیکن جمہور علما ان کے درمیان نکاح کے جواز کے قائل ہیں (تفسیر ابن کثیر)

(۳) اس سے مراد بھی وہی تعریض و کنایہ ہے جس کا حکم پہلے دیا گیا ہے، مثلاً میں تیرے معاملے میں رغبت رکھتا ہوں، یا ولی سے کہے کہ اس کے نکاح کی بابت فیصلہ کرنے سے قبل مجھے اطلاع ضرور کرنا۔ وغیرہ (ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ کو تمہارے دلوں کی باتوں کا بھی علم ہے، تم اس سے خوف کھاتے رہا کرو اور یہ بھی جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ بخشش اور حلم والا ہے۔ (۲۳۵)

اگر تم عورتوں کو بغیر ہاتھ لگائے اور بغیر مہر مقرر کئے طلاق دے دو تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، ہاں انہیں کچھ نہ کچھ فائدہ دو۔ خوشحال اپنے انداز سے اور تنگ دست اپنی طاقت کے مطابق دستور کے مطابق اچھا فائدہ دے۔ بھلائی کرنے والوں پر یہ لازم ہے۔^(۱) (۲۳۶)

اور اگر تم عورتوں کو اس سے پہلے طلاق دے دو کہ تم نے انہیں ہاتھ لگایا ہو اور تم نے ان کا مہر بھی مقرر کر دیا ہو تو مقررہ مہر کا آدھا مردے دو، یہ اور بات ہے کہ وہ خود معاف کر دیں^(۲) یا وہ شخص معاف کر دے جس کے

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً يَوْمَ يَعْتَبِرْنَ وَعَلَى الْمُسِيءِ قَدْرُهُ وَعَلَى الْمُتَّقِرِ قَدْرُهُ مِمَّا عَالَمًا مَّعْرُوفٍ حَقَّ عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿۲۳۶﴾

وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَمِصْفٌ مِمَّا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوا إِلَيْكُمْ بِبِدْعِهِمْ عَقْدًا إِلْبَاقًا وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَوَدَّ اللَّهُ الْمُفْضِلِينَ بَيْنَكُمْ إِنْ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۳۷﴾

(۱) یہ اس عورت کی بابت حکم ہے کہ نکاح کے وقت مہر مقرر نہیں ہوا تھا اور خاوند نے خلوت صحیحہ یعنی ہم بستری کے بغیر طلاق بھی دے دی تو اسے کچھ نہ کچھ فائدہ دے کر رخصت کرو۔ یہ فائدہ (متحد طلاق) ہر شخص کی طاقت کے مطابق ہونا چاہیے۔ خوش حال اپنی حیثیت اور تنگ دست اپنی طاقت کے مطابق دے۔ تاہم محسنین کے لیے ہے یہ ضروری۔ اس متحدہ کی تعیین بھی کی گئی ہے، کسی نے کہا، خادم۔ کسی نے کہا، ۵۰۰ درہم۔ کسی نے کہا ایک یا چند سوٹ، وغیرہ۔ بہر حال یہ تعیین شریعت کی طرف سے نہیں ہے۔ ہر شخص کو اپنی طاقت کے مطابق دینے کا اختیار اور حکم ہے۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ یہ متحدہ طلاق ہر قسم کی طلاق یافتہ عورت کو دینا ضروری ہے، یا خاص اسی عورت کی بابت حکم ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔ قرآن کریم کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر قسم کی طلاق یافتہ عورت کے لیے ہے، وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔ اس حکم متحدہ میں جو حکمت اور فوائد ہیں، وہ محتاج وضاحت نہیں۔ تعلق، کشیدگی اور اختلاف کے موقع پر، جو طلاق کا سبب ہوتا ہے، احسان کرنا اور عورت کی دلجوئی و دلداری کا اہتمام کرنا، مستقبل کی متوقع خصوصیتوں کے سد باب کا نہایت اہم ذریعہ ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں اس احسان و سلوک کے بجائے، مطلقہ کو ایسے برے طریقے سے رخصت کیا جاتا ہے کہ دونوں خاندانوں کے آپس کے تعلقات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے ہیں۔

(۲) یہ دوسری صورت ہے کہ مساس (خلوت صحیحہ) سے قبل ہی طلاق دے دی اور حق مہر بھی مقرر تھا۔ اس صورت میں خاوند کے لیے ضروری ہے کہ نصف مراد کرے۔ الایہ کہ عورت اپنا یہ حق معاف کر دے۔ اس صورت میں خاوند کو کچھ نہیں دینا پڑے گا۔

ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے^(۱) تمہارا معاف کر دینا تقویٰ سے بہت نزدیک ہے اور آپس کی فضیلت اور بزرگی کو فراموش نہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ (۲۳۷)

نمازوں کی حفاظت کرو، بالخصوص درمیان والی نماز کی^(۲) اور اللہ تعالیٰ کے لئے باادب کھڑے رہا کرو۔ (۲۳۸)

اگر تمہیں خوف ہو تو بیدل ہی سہی یا سواری ہی سہی ہاں جب امن ہو جائے تو اللہ کا ذکر کرو جس طرح کہ اسے تمہیں

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَكُونُوا مِنْ قَوَّيْنٍ ﴿۲۳۸﴾

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أُنْتَمِتُمْ فَادْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ يَكُنُوا يَعْلَمُونَ ﴿۲۳۹﴾

(۱) اس سے مراد خاوند ہے، کیوں کہ نکاح کی گرہ (اس کا توڑنا اور باقی رکھنا) اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ نصف حق مہر معاف کر دے، یعنی ادا شدہ حق مہر میں سے نصف مہر واپس لینے کی بجائے، اپنا یہ حق (نصف مہر) معاف کر دے اور پورے کا پورا مہر عورت کو دے دے۔ اس سے آگے آپس میں فضل و احسان کو نہ بھولنے کی تاکید کر کے حق مہر میں بھی اسی فضل و احسان کو اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

ملاحظہ: بعض نے ﴿يُنَادِي عِنْدَ النَّكَاحِ﴾ سے عورت کا ولی مراد لیا ہے کہ عورت معاف کر دے یا اس کا ولی معاف کر دے، لیکن یہ صحیح نہیں۔ ایک تو عورت کے ولی کے ہاتھ میں عقدہ نکاح نہیں، دوسرے مہر عورت کا حق اور اس کا مال ہے، اسے معاف کرنے کا حق بھی ولی کو حاصل نہیں۔ اس لیے وہی تفسیر صحیح ہے جو آغاز میں کی گئی ہے (فتح القدیر) ضروری وضاحت: طلاق یافتہ عورتوں کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ جن کا حق مہر بھی مقرر ہے، خاوند نے جماعت بھی کی ہے ان کو پورا حق مہر دیا جائے گا۔ جیسا کہ آیت ۲۲۹ میں اس کی تفصیل ہے۔ ۲۔ حق مہر بھی مقرر نہیں، جماعت بھی نہیں کی گئی، ان کو صرف متعہ طلاق دیا جائے گا۔ ۳۔ حق مہر مقرر ہے، لیکن جماعت نہیں کی گئی، ان کو نصف مہر دینا ضروری ہے (ان دونوں کی تفصیل زیر نظر آیت میں ہے)۔ ۴۔ جماعت کی گئی ہے، لیکن حق مہر مقرر نہیں، ان کے لیے مہر مثل ہے، مہر مثل کا مطلب ہے اس عورت کی قوم میں جو رواج ہے، یا اس جیسی عورت کے لیے بالعموم جتنا مہر مقرر کیا جاتا ہو۔ (نیل الاوطار و عون المعیود)

(۲) درمیان والی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے جس کو اس حدیث رسول ﷺ نے متعین کر دیا ہے جس میں آپ ﷺ نے خندق والے دن عصر کی نماز کو صَلَاةٌ وُضِعَتْ قَرَارًا دِیَا۔ (صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب الدعاء علی المشرکین بالہزیمۃ و صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب الدلیل لمن قال الصلاۃ الوسطیٰ...

اس بات کی تعلیم دی جسے تم نہیں جانتے تھے۔ (۲۳۹)^(۱)
 جو لوگ تم میں سے فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ
 جائیں وہ وصیت کر جائیں کہ ان کی بیویاں سال بھر تک
 فائدہ اٹھائیں^(۲) انہیں کوئی نہ نکالے، ہاں اگر وہ خود نکل
 جائیں تو تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو وہ اپنے لئے
 اچھائی سے کریں، اللہ تعالیٰ غالب اور حکیم ہے۔ (۲۴۰)
 طلاق والیوں کو اچھی طرح فائدہ دینا پرہیزگاروں پر لازم
 ہے۔ (۲۴۱)^(۳)

اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنی آیتیں تم پر ظاہر فرما رہا ہے تاکہ
 تم سمجھو۔ (۲۴۲)
 کیا تم نے انہیں نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے
 اور موت کے ڈر کے مارے اپنے گھروں سے نکل
 کھڑے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا مرجاؤ، پھر

وَالَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنكُمُ وَيَدْرُؤْنَ أَرْوَاهَا وَصِيَّةً
 لِأَزْوَاجِهِم مِّمَّا عَاقَبُوا إِلَى الْخَوْلِ عَيْرَ إِحْرَافٍ فَإِنْ حَرَجْنَ
 فَلَهُنَّ مَا عَلَنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ
 وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۴۰﴾

وَلْيَمْلِكْ لِي مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿۲۴۱﴾

كَذَلِكَ يبينُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۲۴۲﴾

الَّذِينَ رَأَى الَّذِينَ حَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَّاءُ الْمَوْتِ
 فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى
 النَّاسِ وَلَئِنَّ أَلْكَرَّ النَّاسِ لَآيِتُونَ ﴿۲۴۰﴾

(۱) یعنی دشمن سے خوف کے وقت جس طرح بھی ممکن ہے، پیادہ چلتے ہوئے، سواری پر بیٹھے ہوئے نماز پڑھ لو۔ تاہم
 جب خوف کی حالت ختم ہو جائے تو پھر اسی طرح نماز پڑھو جس طرح سکھایا گیا ہے۔

(۲) یہ آیت، گو ترتیب میں مؤخر ہے، مگر منسوخ ہے، ناخ آیت پہلے گزر چکی ہے، جس میں عدت وفات ۴ مہینے ۱۰ دن
 بتلائی گئی۔ علاوہ ازیں آیت مواریث نے بیویوں کا حصہ بھی مقرر کر دیا ہے، اس لیے اب خاوند کو عورت کے لیے کسی
 بھی قسم کی وصیت کرنے کی ضرورت نہیں رہی، نہ رہائش (سکنی) کی اور نہ نان و نفقہ کی۔

(۳) یہ حکم عام ہے جو ہر مطلقہ عورت کو شامل ہے۔ اس میں تفریق کے وقت جس حسن سلوک اور تطہیب قلوب کا
 اہتمام کرنے کی تاکید کی گئی ہے، اس کے بے شمار معاشرتی فوائد ہیں۔ کاش مسلمان اس نہایت ہی اہم نصیحت پر عمل
 کریں، جسے انہوں نے بالکل فراموش کر رکھا ہے۔ آج کل کے بعض ”جمہتدین“ نے ”مَتَاعٌ“ اور ”مَتَعُونَهُنَّ“ سے یہ
 استدلال کیا ہے کہ مطلقہ کو اپنی جائیداد میں سے باقاعدہ حصہ دو، یا عمر بھر نان و نفقہ دیتے رہو۔ یہ دونوں باتیں بے بنیاد
 ہیں، بھلا جس عورت کو مرد نے نہایت ناپسندیدہ سمجھ کر اپنی زندگی سے ہی خارج کر دیا، وہ ساری عمر کس طرح اس کے
 اخراجات کی ادائیگی کے لیے تیار ہو گا؟

انہیں زندہ کر دیا^(۱) بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا فضل والا ہے، لیکن اکثر لوگ ناشکرے ہیں۔ (۲۳۳)

اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ سنتا، جانتا ہے (۲۳۴)

ایسا بھی کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض^(۲) دے پس اللہ تعالیٰ اسے بہت بڑھا چڑھا کر عطا فرمائے، اللہ ہی تنگی اور کشادگی کرتا ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ (۲۳۵)

کیا آپ نے (حضرت) موسیٰ کے بعد والی بنی اسرائیل کی جماعت کو نہیں دیکھا^(۳) جب کہ انہوں نے اپنے پیغمبر

وَقَالُوا يَا سَيِّدِیْلَ اللّٰهِ وَاَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۳۳﴾

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فِیْضِعِفَهُ لَهٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَةً وَاَللّٰهُ یَقْضِیْ وَیُحْضِطُّ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۳۴﴾

اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِیْمِۙنَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی اِذْ قَالُوْۤا لِنَبِیِّۙنَا اِنَّمَا عَلَّمَنَا اللّٰهُ قَوْلًا

(۱) یہ واقعہ سابقہ کسی امت کا ہے، جس کی تفصیل کسی صحیح حدیث میں بیان نہیں کی گئی۔ تفسیری روایات میں اسے بنی اسرائیل کے زمانے کا واقعہ اور اس پیغمبر کا نام، جس کی دعا سے انہیں اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زندہ فرمایا، حزقیل بتلایا گیا ہے۔ یہ جہاد میں قتل کے ڈر سے، یا وہابی بیماری راعون کے خوف سے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے، تاکہ موت کے منہ میں جانے سے بچ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مار کر ایک تو یہ بتلایا کہ اللہ کی تقدیر سے تم بچ کر کہیں نہیں جا سکتے، دوسرا یہ کہ انسانوں کی آخری جائے پناہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے اور وہ تمام انسانوں کو اسی طرح زندہ فرمائے گا جس طرح اللہ نے ان کو مار کر زندہ کر دیا۔ اگلی آیت میں مسلمانوں کو جہاد کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے اس واقعے کے بیان میں یہی حکمت ہے کہ جہاد سے جی مت چراؤ، موت و حیات تو اللہ کے قبضے میں ہے اور اس موت کا وقت بھی متعین ہے جسے جہاد سے گریز و فرار کر کے تم ٹال نہیں سکتے۔

(۲) قَرْضٌ حَسَنٌ سے مراد اللہ کی راہ میں اور جہاد میں مال خرچ کرنا ہے یعنی جان کی طرح مالی قربانی میں بھی تامل مت کرو۔ رزق کی کشادگی اور کمی بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔ اور وہ دونوں طریقوں سے تمہاری آزمائش کرتا ہے۔ کبھی رزق میں کمی کر کے اور کبھی اس میں فراوانی کر کے۔ پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے تو کمی بھی نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ اس میں کئی کئی گنا اضافہ فرماتا ہے، کبھی ظاہری طور پر، کبھی معنوی و روحانی طور پر اس میں برکت ڈال کر اور آخرت میں تو یقیناً اس میں اضافہ حیران کن ہو گا۔

(۳) ملاً کسی قوم کے ان اشراف، سردار اور اہل حل و عقد کو کہا جاتا ہے جو خاص مشیر اور قائد ہوتے ہیں، جن کے دیکھنے سے آنکھیں اور دل رعب سے بھر جاتے ہیں ملاً کے لغوی معنی (بھرنے کے ہیں) (ایسر التفسیر) جس پیغمبر کا یہاں

سے کہا کہ کسی کو ہمارا بادشاہ بنا دیجئے^(۱) تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ پیغمبر نے کہا کہ ممکن ہے جہاد فرض ہو جانے کے بعد تم جہاد نہ کرو، انہوں نے کہا بھلا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے؟ ہم تو اپنے گھروں سے اجاڑے گئے ہیں اور بچوں سے دور کر دیئے گئے ہیں۔ پھر جب ان پر جہاد فرض ہوا تو سوائے تھوڑے سے لوگوں کے سب پھر گئے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ (۲۴۶)

اور انہیں ان کے نبی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے طاقتور کو تمہارا بادشاہ بنا دیا ہے تو کہنے لگے بھلا اس کی ہم پر حکومت کیسے ہو سکتی ہے؟ اس سے تو بہت زیادہ حقدار بادشاہت کے ہم ہیں، اس کو تو مالی کشادگی بھی نہیں دی گئی۔ نبی نے فرمایا، سنو، اللہ تعالیٰ نے اسی کو تم پر برگزیدہ

مَنْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا
وَاللّٰنَا اَلَا نُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ
دِيَارِنَا وَاَبْنَانَا قُلْنَا كَيْبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا
مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا
قَالُوْا اَنْتَ اَنْتَ يَكُوْنُ لَكَ السُّلْطٰنُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَعْمٰی بِالْمَلِكِ
وَمَنْهٗ وَاَمْ نُبِئْتُمْ سَعَةً مِنَ الْمَالِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ
عَلَيْكُمْ وَاَزَادَ لَابْسَاطِهٖ فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّٰهُ يُؤْتِي
مُلْكُهٗ مَنْ يَشَآءُ وَاللّٰهُ وَاَسِعَ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۶﴾

ذکر ہے اس کا نام شمویل بتلایا جاتا ہے۔ ابن کثیر وغیرہ مفسرین نے جو واقعہ بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنو اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کچھ عرصے تک تو ٹھیک رہے، پھر ان میں انحراف آگیا، دین میں بدعات ایجاد کر لیں۔ حتیٰ کہ بتوں کی پوجا شروع کر دی۔ انبیا ان کو روکتے رہے، لیکن یہ معصیت اور شرک سے باز نہیں آئے۔ اس کے نتیجے میں اللہ نے ان کے دشمنوں کو ان پر مسلط کر دیا، جنہوں نے ان کے علاقے بھی چھین لیے اور ان کی ایک بڑی تعداد کو قیدی بھی بنا لیا، ان میں نبوت وغیرہ کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا، بالآخر بعض لوگوں کی دعاؤں سے شمویل نبی پیدا ہوئے، جنہوں نے دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا۔ انہوں نے پیغمبر سے یہ مطالبہ کیا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں جس کی قیادت میں ہم دشمنوں سے لڑیں۔ پیغمبر نے ان کے سابقہ کردار کے پیش نظر کہا کہ تم مطالبہ تو کر رہے ہو، لیکن میرا اندازہ یہ ہے کہ تم اپنی بات پر قائم نہیں رہو گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے۔

(۱) نبی کی موجودگی میں بادشاہ مقرر کرنے کا مطالبہ، بادشاہت کے جواز کی دلیل ہے۔ کیونکہ اگر بادشاہت جائز نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس مطالبے کو رد فرمادیتا، لیکن اللہ نے اس معاملے کو رد نہیں فرمایا، بلکہ طاقتور کو ان کے لئے بادشاہ مقرر کر دیا، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بادشاہ اگر مطلق العنان نہیں ہے بلکہ وہ احکام الہی کا پابند اور عدل و انصاف کرنے والا ہے تو اس کی بادشاہت جائز ہی نہیں، بلکہ مطلوب و محبوب بھی ہے۔ مزید دیکھئے: سورۃ المائدہ آیت ۲۰ کا حاشیہ۔

کیا ہے اور اسے علمی اور جسمانی برتری بھی عطا فرمائی ہے^(۱) بات یہ ہے کہ اللہ جسے چاہے اپنا ملک دے، اللہ تعالیٰ کسادگی والا اور علم والا ہے۔ (۲۴۷)

ان کے نبی نے انہیں پھر کہا کہ اس کی بادشاہت کی ظاہری نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق^(۲) آ

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ

(۱) حضرت طالوت اس نسل سے نہیں تھے جس سے بنی اسرائیل کے بادشاہوں کا سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ یہ غریب اور ایک عام فوجی تھے، جس پر انہوں نے اعتراض کیا۔ پیغمبر نے کہا کہ یہ میرا انتخاب نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں مقرر کیا ہے۔ علاوہ ازیں قیادت و سیادت کے لیے مال سے زیادہ عقل و علم اور جسمانی قوت و طاقت کی ضرورت ہے اور طالوت اس میں تم سب میں ممتاز ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں اس منصب کے لیے چن لیا ہے۔ وہ واسع الفضل ہے، جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت و عنایات سے نوازتا ہے۔ علیم ہے، یعنی وہ جانتا ہے کہ بادشاہت کا مستحق کون ہے اور کون نہیں ہے (معلوم ہوتا ہے کہ جب انہیں بتلایا گیا کہ یہ تقرری اللہ کی طرف سے ہے تو اس کے لیے انہوں نے مزید کسی نشانی کا مطالبہ کیا، تاکہ وہ پوری طرح مطمئن ہو جائیں۔ چنانچہ اگلی آیت میں ایک اور نشانی کا بیان ہے۔)

(۲) صندوق یعنی تابوت، جو توب سے ہے، جس کے معنی رجوع کرنے کے ہیں۔ کیوں کہ بنی اسرائیل تبرک کے لیے اس کی طرف رجوع کرتے تھے (فتح القدیر) اس تابوت میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے تبرکات تھے، یہ تابوت بھی ان کے دشمن ان سے چھین کر لے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نشانی کے طور پر یہ تابوت فرشتوں کے ذریعے سے حضرت طالوت کے دروازے پر پہنچا دیا۔ جسے دیکھ کر بنو اسرائیل خوش بھی ہوئے اور اسے طاقت کی بادشاہی کے لیے منجانب اللہ نشانی بھی سمجھا اور اللہ تعالیٰ نے بھی اسے ان کے لیے ایک اعجاز (آیت) اور فتح و سکینت کا سبب قرار دیا۔ سکینت کا مطلب ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص نصرت کا ایسا نزول ہے جو وہ اپنے خاص بندوں پر نازل فرماتا ہے اور جس کی وجہ سے جنگ کی خون ریز معرکہ آرائیوں میں جس سے بڑے بڑے شیر دل بھی کانپ کانپ اٹھتے ہیں، اہل ایمان کے دل دشمن کے خوف اور ہیبت سے خالی اور فتح و کامرانی کی امید سے لبریز ہوتے ہیں۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و صالحین کے تبرکات یقیناً باذن اللہ اہمیت و افادیت رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ واقعی تبرکات ہوں۔ جس طرح اس تابوت میں یقیناً حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے تبرکات تھے لیکن محض جھوٹی نسبت سے کوئی چیز تبرک نہیں بن جاتی، جس طرح آج کل ”تبرکات“ کے نام پر کئی جگہوں پر مختلف چیزیں رکھی ہوئی ہیں، جن کا تاریخی طور پر پورا ثبوت نہیں ہے۔ اسی طرح خود ساختہ چیزوں سے بھی کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جس طرح بعض لوگ نبی ﷺ کے نعل مبارک کی تمثال بنا کر اپنے پاس رکھنے کو، یا گھروں میں لٹکانے کو، یا مخصوص طریقے سے اس کے استعمال کو قضاے حاجات اور دفع بلیات کے لیے اکسیر سمجھتے ہیں۔ اسی طرح قبروں پر بزرگوں کے ناموں کی نذر و نیاز کی چیزوں کو اور لنگر کو

حَيْهَلُ الْمَلَائِكَةِ إِنْ فِذَلِكَ آيَةٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٢٣٨﴾

جائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلجمعی ہے اور آل موسیٰ اور آل ہارون کا بقیہ ترک ہے، فرشتے اسے اٹھا کر لائیں گے۔ یقیناً یہ تو تمہارے لئے کھلی دلیل ہے اگر تم ایمان والے ہو۔ (۲۳۸)

جب (حضرت) طالوت لشکروں کو لے کر نکلے تو کہا سنو اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر^(۱) سے آزمانے والا ہے، جس نے اس میں سے پانی پی لیا وہ میرا نہیں اور جو اسے نہ چکھے وہ میرا ہے، ہاں یہ اور بات ہے کہ اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔ لیکن سوائے چند کے باقی سب نے وہ پانی پی لیا^(۲) (حضرت) طالوت مومنین سمیت جب نہر سے گزر گئے تو وہ لوگ کہنے لگے آج تو ہم میں طاقت نہیں کہ جالوت اور اس کے لشکروں سے لڑیں۔^(۳) لیکن

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَفَرَّوْا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا الْكُفَّاءُ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلغُوا اللَّهُ كَرِهُوا فَوَسَّوْا قَلِيلًا عَكَبَتْ فَمَنْ كَرِهُوا فَأَيُّ ذِي قُوَّةٍ مَعَهُ الضَّعِيفِينَ ﴿٢٣٩﴾

متبرک سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ غیر اللہ کے نام کا چڑھاوا ہے جو شرک کے دائرے میں آتا ہے، اس کا کھانا قطعاً حرام ہے، قبروں کو غسل دیا جاتا ہے اور اس کے پانی کو تبرک سمجھا جاتا ہے، حالانکہ قبروں کو غسل دینا بھی خانہ کعبہ کے غسل کی نقل ہے، جس کا کوئی جواز نہیں ہے، یہ گند پانی کیسے تبرک ہو سکتا ہے؟ بہر حال یہ سب باتیں غلط ہیں جن کی کوئی اصل شریعت میں نہیں ہے۔

(۱) یہ نہراون اور فلسطین کے درمیان ہے۔ (ابن کثیر)

(۲) اطاعت امیر بہر حال میں ضروری ہے، تاہم دشمن سے معرکہ آرائی کے وقت تو اس کی اہمیت دوچند، بلکہ صدچند ہو جاتی ہے۔ دوسرے، جنگ میں کامیابی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ فوجی اس دوران بھوک، پیاس اور دیگر شدائد کو نہایت صبر اور حوصلے سے برداشت کریں۔ چنانچہ ان دونوں باتوں کی تربیت اور امتحان کے لیے طالوت نے کہا کہ نہر پر تمہاری پہلی آزمائش ہوگی۔ جس نے پانی پی لیا، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ لیکن اس تنبیہ کے باوجود اکثریت نے پانی پی لیا۔ ان کی تعداد میں مغسبین نے مختلف اقوال نقل کیے ہیں۔ اسی طرح نہ پینے والوں کی تعداد ۳۱۳ بتلائی گئی ہے، جو اصحاب، بدر کی تعداد ہے۔ واللہ اعلم۔

(۳) ان اہل ایمان نے بھی، ابتداءً جب دشمن کی بڑی تعداد دیکھی تو اپنی قلیل تعداد کے پیش نظر اس رائے کا اظہار کیا، جس پر ان کے علماء اور ان سے زیادہ پختہ یقین رکھنے والوں نے کہا کہ کامیابی، تعداد کی کثرت اور اسلحہ کی فراوانی پر منحصر

اللہ تعالیٰ کی ملاقات پر یقین رکھنے والوں نے کہا، بسا اوقات چھوٹی اور تھوڑی سی جماعتیں بڑی اور بہت سی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غلبہ پالیتی ہیں، اللہ تعالیٰ صبر والوں کے ساتھ ہے۔ (۲۳۹)

جب ان کا جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ ہوا تو انہوں نے دعا مانگی کہ اے پروردگار ہمیں صبر دے، ثابت قدمی دے اور قوم کفار پر ہماری مدد فرما۔^(۱) (۲۵۰)

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہوں نے جالوتوں کو شکست دے دی اور (حضرت) داود (علیہ السلام) کے ہاتھوں جالوت قتل ہوا^(۲) اور اللہ تعالیٰ نے داود (علیہ السلام) کو مملکت و حکمت^(۳) اور جتنا کچھ چاہا علم بھی عطا فرمایا۔ اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض سے دفع نہ کرتا

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا
وَيُكَلِّمُنَا وَأَنْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۲۵۰﴾

فَهُزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَانْشَأَ اللَّهُ الْمَلِكَ
وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ وَلَوْ كَادَ فَعَرَا لَئِنَّ النَّاسَ
بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ
ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۲۵۱﴾

نہیں، بلکہ اللہ کی مشیت اور اس کے اذن پر موقوف ہے اور اللہ کی تائید کے لیے صبر کا اہتمام ضروری ہے۔
(۱) جالوت اس دشمن قوم کا کمانڈر اور سربراہ تھا جس سے طاقت اور ان کے رفقا کا مقابلہ تھا۔ یہ قوم عمالقتہ تھی جو اپنے وقت کی بڑی جنگجو اور بہادر قوم سمجھی جاتی تھی۔ ان کی اسی شہرت کے پیش نظر، عین معرکہ آرائی کے وقت اہل ایمان نے بارگاہ الہی میں صبر و ثبات اور کفر کے مقابلے میں ایمان کی فتح و کامیابی کی دعا مانگی۔ گویا مادی اسباب کے ساتھ ساتھ اہل ایمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نصرت الہی کے لیے ایسے موقعوں پر بطور خاص طلبگار رہیں، جیسے جنگ بدر میں نبی ﷺ نے نہایت الحاح و زاری سے فتح و نصرت کی دعائیں مانگیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور مسلمانوں کی ایک نہایت قلیل تعداد کافروں کی بڑی تعداد پر غالب آئی۔

(۲) حضرت داود علیہ السلام بھی، جو ابھی بیغیر تھے نہ بادشاہ، اس لشکر طاقت میں ایک سپاہی کے طور پر شامل تھے۔ ان کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے جالوت کا خاتمہ کیا اور ان تھوڑے سے اہل ایمان کے ذریعے سے ایک بڑی قوم کو شکست فاش دلوائی۔

(۳) اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داود علیہ السلام کو بادشاہت بھی عطا فرمائی اور نبوت بھی۔ حکمت سے بعض نے نبوت، بعض نے صنعت آہن گری اور بعض نے ان امور کی سمجھ مراد لی ہے، جو اس موقعہ جنگ پر اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادے سے فیصلہ کن ثابت ہوئے۔

تو زمین میں فساد پھیل جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر بڑا فضل و کرم کرنے والا ہے۔^(۱) (۲۵۱)

یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جنہیں ہم حقانیت کے ساتھ آپ پر پڑھتے ہیں، بالیقین آپ رسولوں میں سے ہیں^(۲) (۲۵۲)

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَأَنَّكَ لَوَيْنَ
الْمُرْسَلِينَ ﴿۲۵﴾

(۱) اس میں اللہ کی ایک سنت الہی کا بیان ہے کہ وہ انسانوں کے ہی ایک گروہ کے ذریعے سے دوسرے انسانی گروہ کے ظلم اور اقتدار کا خاتمہ فرماتا رہتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا اور کسی ایک ہی گروہ کو ہمیشہ قوت و اختیار سے بہرہ ور کیے رکھتا تو یہ زمین ظلم و فساد سے بھر جاتی۔ اس لیے یہ قانون الہی اہل دنیا کے لیے فضل الہی کا خاص مظہر ہے۔ اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورہ حج کی آیت ۳۸ اور ۴۰ میں بھی فرمایا ہے۔

(۲) یہ گزشتہ واقعات، جو آپ ﷺ پر نازل کردہ کتاب کے ذریعے سے دنیا کو معلوم ہو رہے ہیں، اے محمد ﷺ (ﷺ) یقیناً آپ کی رسالت و صداقت کی دلیل ہیں، کیوں کہ آپ ﷺ نے یہ نہ کسی کتاب میں پڑھے ہیں، نہ کسی سے سنے ہیں۔ جس سے یہ واضح ہے کہ یہ غیب کی وہ خبریں ہیں جو بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ آپ پر نازل فرما رہا ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر گزشتہ امتوں کے واقعات کے بیان کو آپ ﷺ کی صداقت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

یہ رسول ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے،^(۱) ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے بات چیت کی ہے اور بعض کے درجے بلند کئے ہیں، اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزات عطا فرمائے اور روح القدس سے ان کی تائید کی۔^(۲) اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کے بعد والے اپنے پاس دلیلیں آجانے کے بعد ہرگز آپس میں لڑائی بھڑائی نہ کرتے، لیکن ان لوگوں نے اختلاف کیا، ان میں سے بعض تو مومن ہوئے اور بعض کافر، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ آپس میں نہ لڑتے،^(۳) لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ (۲۵۳)

تِلْكَ الرُّسُلُ فَصَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ ذُرِّيَّتَٰنَا وَإِنَّا عِندَ ابْنِ مَرْيَمَ الْيَقِينِ وَإِذْ نَادَىٰ رُوحَ الْقُدُسِ لَوْ أَنَا اللَّهُ لَأَنْزَلُ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِ هُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنْ لَخِفَّتُوا فِيمَهُمْ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ مَنْ كَفَرُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَقْتَلُوا وَلَكِنْ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿۳﴾

(۱) قرآن نے ایک دوسرے مقام پر بھی اسے بیان کیا ہے ﴿وَلَقَدْ فَصَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّنَ عَلَىٰ بَعْضٍ﴾ (بی اسرائیل ۵۵) ”ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت عطا کی ہے“ اس لیے اس حقیقت میں تو کوئی شک نہیں۔ البتہ نبی ﷺ نے جو فرمایا ہے «لَا تَخْبِرُونِي مِنْ بَيْنِ الْأَنْبِيَاءِ» (صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورة الأعراف، باب ۱۳۵- مسلم، کتاب الفضائل، باب من فضائل موسیٰ) ”تم مجھے انبیاء کے درمیان فضیلت مت دو“ تو اس سے ایک کی دوسرے پر فضیلت کا انکار لازم نہیں آتا بلکہ یہ امت کو انبیاء علیہم السلام کی بابت ادب و احترام سکھایا گیا ہے کہ تمہیں چونکہ تمام باتوں اور ان امتیازات کا، جن کی بنا پر انہیں ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہے، پورا علم نہیں ہے۔ اس لیے تم میری فضیلت بھی اس طرح بیان نہ کرنا کہ اس سے دوسرے انبیاء کی کسر شان ہو۔ ورنہ بعض نبیوں کی بعض پر فضیلت اور تمام پیغمبروں پر نبی ﷺ کی فضیلت و اشریت مسلمہ اور اہل سنت کا متفقہ عقیدہ ہے جو نصوص کتاب و سنت سے ثابت ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے فتح القدر للشوکانی)

(۲) مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے تھے، مثلاً احیائے موتی (مردوں کو زندہ کرنا) وغیرہ۔ جس کی تفصیل سورہ آل عمران میں آئے گی۔ روح القدس سے مراد حضرت جبریل ہیں، جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

(۳) اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ بیان فرمایا ہے۔ مطلب اس کا یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نازل کردہ دین میں اختلاف پسندیدہ ہے۔ یہ اللہ کو سخت ناپسند ہے، اس کی پسند (رضا) تو یہ ہے کہ تمام انسان اس کی نازل کردہ شریعت کو اپنا کرنا، جنم سے بچ جائیں۔ اسی لیے اس نے کتابیں اتاریں، انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ قائم کیا تاکہ نبی کریم ﷺ پر رسالت کا خاتمہ فرمادیا۔ تاہم اس کے بعد بھی خلفا اور علماء و دعاۃ کے ذریعے سے دعوت حق اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا سلسلہ جاری رکھا گیا اور اس کی سخت اہمیت و تاکید بیان فرمائی گئی۔ کس لیے؟ اسی لیے تاکہ لوگ اللہ کے پسندیدہ راستے کو اختیار کریں۔ لیکن چونکہ اس نے ہدایت اور گمراہی دونوں راستوں کی نشان دہی کر کے انسانوں کو

اے ایمان والو! جو ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہو اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ تجارت ہے نہ دوستی اور شفاعت^(۱) اور کافر ہی ظالم ہیں۔ (۲۵۳)

اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو زندہ اور سب کا تھانے والا ہے، جسے نہ اونگھ آئے نہ نیند، اس کی ملکیت میں زمین اور آسمانوں کی تمام چیزیں ہیں۔ کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کر سکے، وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے،^(۲) اس کی کرسی کی

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا مِثْقَالَ ذَرَّةٍ قَدِّمُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمَ لَا بَنْعُ فِيهِ وَلَا خِلَافٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۵۳﴾

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿۲۵۴﴾

کوئی ایک راستہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا ہے بلکہ بطور امتحان اسے اختیار اور ارادہ کی آزادی سے نوازا ہے، اس لیے کوئی اس اختیار کا صحیح استعمال کر کے مومن بن جاتا ہے اور کوئی اس اختیار و آزادی کا غلط استعمال کر کے کافر۔ یہ گویا اس کی حکمت و مشیت ہے، جو اس کی رضا سے مختلف چیز ہے۔

(۱) یہود و نصاریٰ اور کفار و مشرکین اپنے اپنے پیشواؤں یعنی نبیوں، ولیوں، بزرگوں، پیروں، مرشدوں وغیرہ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ پر ان کا اتنا اثر ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے دباؤ سے اپنے پیرو کاروں کے بارے میں جو بات چاہیں اللہ سے منواتے ہیں اور منوا لیتے ہیں۔ اسی کو وہ شفاعت کہتے تھے۔ یعنی ان کا عقیدہ تقریباً وہی تھا جو آج کل کے جاہلوں کا ہے کہ ہمارے بزرگ اللہ کے پاس اڑ کر بیٹھ جائیں گے، اور بخشوا کراٹھیں گے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے یہاں ایسی کسی شفاعت کا کوئی وجود نہیں۔ پھر اس کے بعد آیت الکرسی میں اور دوسری متعدد آیات و احادیث میں بتایا گیا کہ اللہ کے یہاں ایک دوسری قسم کی شفاعت بے شک ہوگی، مگر یہ شفاعت وہی لوگ کر سکیں گے۔ جنہیں اللہ اجازت دے گا۔ اور صرف اسی بندے کے بارے میں کر سکیں گے جس کے لیے اللہ اجازت دے گا۔ اور اللہ صرف اور صرف اہل توحید کے بارے میں اجازت دے گا۔ یہ شفاعت فرشتے بھی کریں گے، انبیاء و رسل بھی، اور شہداء و صالحین بھی۔ مگر اللہ پر ان میں سے کسی بھی شخصیت کا کوئی دباؤ نہ ہو گا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ لوگ خود اللہ کے خوف سے اس قدر لرزاؤں و ترساؤں ہوں گے کہ ان کے چروں کا رنگ اڑ رہا ہو گا۔ ﴿وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْتَضَىٰ وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ﴾ (الانبیاء - ۲۸)۔

(۲) یہ آیت الکرسی ہے جس کی بڑی فضیلت صحیح احادیث سے ثابت ہے مثلاً یہ آیت قرآن کی اعظم آیت ہے۔ اس کے پڑھنے سے رات کو شیطان سے تحفظ رہتا ہے۔ ہر فرض نماز کے بعد پڑھنے کی بڑی فضیلت ہے وغیرہ (ابن کثیر) یہ اللہ

وسعت^(۱) نے زمین و آسمان کو گھیر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت سے نہ ٹھکتا اور نہ اکتاتا ہے، وہ تو بہت بلند اور بہت بڑا ہے (۲۵۵)

دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت ضلالت سے روشن ہو چکی ہے،^(۲) اس لئے جو شخص اللہ تعالیٰ

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ

تعالیٰ کی صفات جلال، اس کی علو شان اور اس کی قدرت و عظمت پر مبنی نہایت جامع آیت ہے۔

(۱) کُزَيْبِيٌّ سے بعض نے مَوْضِعُ قَدَمَيْنِ (قدم رکھنے کی جگہ)، بعض نے علم، بعض نے قدرت و عظمت، بعض نے بادشاہی اور بعض نے عرش مراد لیا ہے۔ لیکن صفات باری تعالیٰ کے بارے میں محدثین اور سلف کا یہ مسلک ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو صفات جس طرح قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہیں، ان کی بغیر تاویل اور کیفیت بیان کیے، ان پر ایمان رکھا جائے۔ اس لیے یہی ایمان رکھنا چاہیے کہ یہ فی الواقع کرسی ہے جو عرش سے الگ ہے۔ اس کی کیفیت کیا ہے، اس پر وہ کس طرح بیٹھتا ہے؟ اس کو ہم بیان نہیں کر سکتے کیونکہ اس کی حقیقت سے ہم بے خبر ہیں۔

(۲) اس کی شان نزول میں بتایا گیا ہے کہ انصار کے کچھ نوجوان یہودی یا عیسائی ہو گئے تھے، پھر جب یہ انصار مسلمان ہو گئے تو انہوں نے اپنی نوجوان اولاد کو بھی جو یہودی یا عیسائی بن چکے تھے، زبردستی مسلمان بنانا چاہا، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ شان نزول کے اس اعتبار سے بعض مفسرین نے اسے اہل کتاب کے لیے خاص مانا ہے یعنی مسلمان مملکت میں رہنے والے اہل کتاب، اگر وہ جزئیہ ادا کرتے ہوں، تو انہیں قبول اسلام پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ لیکن یہ آیت حکم کے اعتبار سے عام ہے، یعنی کسی پر بھی قبول اسلام کے لیے جبر نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور گمراہی دونوں کو واضح کر دیا ہے۔ تاہم کفر و شرک کے خاتمے اور باطل کا زور توڑنے کے لیے جہاد ایک الگ اور جبر و اکراہ سے مختلف چیز ہے۔ مقصد معاشرے سے اس قوت کا زور اور دباؤ ختم کرنا ہے جو اللہ کے دین پر عمل اور اس کی تبلیغ کی راہ میں روڑہ بنی ہوئی ہو۔ تاکہ ہر شخص اپنی آزاد مرضی سے چاہے تو اپنے کفر پر قائم رہے اور چاہے تو اسلام میں داخل ہو جائے۔ چونکہ روڑہ بننے والی طاقتیں رہ رہ کر ابھرتی رہیں گی اس لیے جہاد کا حکم اور اس کی ضرورت بھی قیامت تک رہے گی، جیسا کہ حدیث میں ہے «الْجِهَادُ مَا ضَىٰ اِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ» (جہاد قیامت تک جاری رہے گا) خود نبی ﷺ نے کافروں اور مشرکوں سے جہاد کیا ہے اور فرمایا ہے: «أُمِرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّىٰ يَسْهَدُوا» (صحیح بخاری۔ کتاب الإیمان، باب فإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ) ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جہاد کروں جب تک کہ وہ لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کا اقرار نہ کر لیں۔“ اسی طرح سزائے ارتداد (قتل) سے بھی اس آیت کا کوئی ٹکراؤ نہیں ہے (جیسا کہ بعض لوگ ایسا باور کراتے ہیں)۔ کیونکہ ارتداد کی سزا۔ قتل۔ سے مقصود جبر و اکراہ نہیں ہے بلکہ اسلامی ریاست کی نظریاتی حیثیت کا تحفظ ہے۔ ایک اسلامی مملکت میں ایک کافر کو اپنے کفر پر قائم رہ جانے کی اجازت تو بے شک دی جاسکتی ہے لیکن ایک بار جب وہ اسلام میں داخل ہو جائے تو پھر اس سے بغاوت و انحراف کی

کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا، جو کبھی نہ ٹوٹے گا اور اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔ (۲۵۶)

ایمان لانے والوں کا کارساز اللہ تعالیٰ خود ہے، وہ انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لے جاتا ہے اور کافروں کے اولیاء شیاطین ہیں۔ وہ انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں، یہ لوگ جنسی ہیں جو ہمیشہ اسی میں پڑے رہیں گے۔ (۲۵۷)

کیا تو نے اسے نہیں دیکھا جو سلطنت پا کر ابراہیم (علیہ السلام) سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑ رہا تھا، جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، وہ کہنے لگا میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں، ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق کی طرف سے لے آتا ہے تو اسے مغرب کی جانب سے لے آ۔ اب تو وہ کافر بھونچکا رہ گیا، اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (۲۵۸)

یا اس شخص کے مانند کہ جس کا گزر اس بستی پر ہوا جو چھت کے بل اوندھی پڑی ہوئی تھی، وہ کہنے لگا اس کی

الْوُحْيُ لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۵۷﴾

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ
وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاءُ لَهُمُ الظَّالِمُونَ يُخْرِجُوهُمْ مِّنَ النُّورِ
إِلَى الظُّلُمَاتِ أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۵۸﴾

أَلَمْ يَرَ إِلَى الَّذِينَ حَاجَبُوا بِرُءُوسِهِمْ فِي رَيْبٍ أَنِ انْشَأَ اللَّهُ
الْمَلَكُ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمَ رَبِّيَ الَّذِي يُعْبُدُ وَيُؤْتِيكَ آتَا
أُخِي وَإِمِينًا قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالْحَمِيمِ مِنَ
الشَّرْقِ قَاتِلَ بَنِي إِسْرَائِيلَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاللَّهُ
لَا يَعْبُدِي الْعَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۲۵۸﴾

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوسِهَا
قَالَ أَلَيْسَ هَذَا اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا قَامَاتَهُ اللَّهُ

اجازت نہیں دی جاسکتی لہذا وہ خوب سوچ سمجھ کر اسلام لائے۔ کیونکہ اگر یہ اجازت دے دی جاتی تو نظریاتی اساس مندم ہو سکتی تھی جس سے نظریاتی انتشار اور فکری اتار کی پھیلتی جو اسلامی معاشرے کے امن کو اور ملک کے استحکام کو خطرے میں ڈال سکتی تھی۔ اس لیے جس طرح انسانی حقوق کے نام پر، قتل، چوری، زنا، ڈاکہ اور حرابہ وغیرہ جرائم کی اجازت نہیں دی جاسکتی، اسی طرح آزادی رائے کے نام پر ایک اسلامی مملکت میں نظریاتی بغاوت (ارتداد) کی اجازت بھی نہیں دی جاسکتی۔ یہ جبر و اکراہ نہیں ہے۔ بلکہ مرتد کا قتل اسی طرح عین انصاف ہے جس طرح قتل و غارت گری اور اخلاقی جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو سخت سزائیں دینا عین انصاف ہے۔ ایک کامقصد ملک کا نظریاتی تحفظ ہے اور دوسرے کامقصد ملک کو شر و فساد سے بچانا ہے اور دونوں ہی مقصد، ایک مملکت کے لیے ناگزیر ہیں۔ آج اکثر اسلامی ممالک ان دونوں ہی مقاصد کو نظر انداز کر کے جن الجھنوں، دشواریوں اور پریشانیوں سے دو چار ہیں، محتاج وضاحت نہیں۔

وَمِنَآءَ عَالِمٍ ثُمَّ بَمَثَلِهِ قَالَ كَمْ لَيْثٌ قَالَ لَيْثٌ يَوْمَآ
 أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَيْثٌ مِآءَةٌ عَالِمٍ فَأَنْظُرْ إِلَى
 طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ كَمْ يَسْتَنَّهُ وَأَنْظُرْ إِلَى حِمَارِكَ
 وَلَنْ جَمْعَكَ إِلَيْهِ لَلنَّكَالِيسِ وَأَنْظُرْ إِلَى الْوِجَاهِ
 كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ تَكْسُوهُمَا فَهَلْ كَمَاتَ يَكِينٌ لَهُ
 قَالَ أَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

موت کے بعد اللہ تعالیٰ اسے کس طرح زندہ کرے گا؟^(۱)
 تو اللہ تعالیٰ نے اسے مار دیا سو سال کے لئے، پھر اسے
 اٹھایا، پوچھا کتنی مدت تجھ پر گزری؟ کہنے لگا ایک دن یا
 دن کا کچھ حصہ،^(۲) فرمایا بلکہ تو سو سال تک رہا، پھر اب تو
 اپنے کھانے پینے کو دیکھ کہ بالکل خراب نہیں ہوا اور
 اپنے گدھے کو بھی دیکھ، ہم تجھے لوگوں کے لئے ایک
 نشانی بناتے ہیں تو دیکھ کہ ہم ہڈیوں کو کس طرح اٹھاتے
 ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں، جب یہ سب ظاہر ہو
 چکا تو کہنے لگا میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر
 ہے۔^(۳) (۲۵۹)

اور جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے
 پروردگار! مجھے دکھا تو مردوں کو کس طرح زندہ
 کرے گا؟^(۴) (جناب باری تعالیٰ نے) فرمایا، کیا تمہیں

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ قَالَ أَرَأَيْتَ
 إِذَا مَاتَ قَالَ بَلْ وَلَكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً
 مِنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ

(۱) اَوْ كَالَّذِي كَاعِطْفٍ پهلے واقعہ پر ہے اور مطلب یہ ہے کہ آپ نے (پہلے واقعہ کی طرح) اس شخص کے قصے پر نظر
 نہیں ڈالی جو ایک بستی سے گزرا.... یہ شخص کون تھا؟ اس کی بابت مختلف اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ زیادہ مشہور حضرت
 عزیر کا نام ہے جس کے بعض صحابہ و تابعین قائل ہیں۔ واللہ اعلم۔ اس سے پہلے کے واقعہ (حضرت ابراہیم علیہ السلام و
 نمرود) میں صانع یعنی باری تعالیٰ کا اثبات تھا اور اس دوسرے واقعے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت احیائے موتی کا اثبات ہے کہ
 جس اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو اور اس کے گدھے کو سو سال کے بعد زندہ کر دیا، حتیٰ کہ اس کے کھانے پینے کی چیزوں کو
 بھی خراب نہیں ہونے دیا۔ وہی اللہ تعالیٰ قیامت والے دن تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ فرمائے گا۔ جب وہ سو سال کے
 بعد زندہ کر سکتا ہے تو ہزاروں سال کے بعد بھی زندہ کرنا اس کے لیے مشکل نہیں۔

(۲) کہا جاتا ہے کہ جب وہ شخص مذکور مرا تھا، اس وقت کچھ دن چڑھا ہوا تھا اور جب زندہ ہوا تو ابھی شام نہیں ہوئی
 تھی، اس سے اس نے یہ اندازہ لگایا کہ اگر میں یہاں کل آیا تھا تو ایک دن گزر گیا ہے اور اگر یہ آج ہی کا واقعہ ہے تو دن
 کا کچھ حصہ ہی گزرا ہے۔ جب کہ واقعہ یہ تھا کہ اس کی موت پر سو سال گزر چکے تھے۔

(۳) یعنی یقین تو مجھے پہلے بھی تھا لیکن اب عینی مشاہدے کے بعد میرے یقین اور علم میں مزید چٹنگی اور اضافہ ہو گیا
 ہے۔

(۴) یہ احیائے موتی کا دوسرا واقعہ ہے جو ایک نہایت جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خواہش اور ان کے
 اطمینان قلب کے لیے دکھایا گیا۔ یہ چار پرندے کون کون سے تھے؟ مفسرین نے مختلف نام ذکر کیے ہیں لیکن ناموں کی

ایمان نہیں؟ جواب دیا ایمان تو ہے لیکن میرے دل کی تسکین ہو جائے گی، فرمایا چار پرند لو، ان کے نکلنے کر ڈالو، پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک نکلزارکھ دو پھر انہیں پکارو، تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمتوں والا ہے، (۲۶۰)

جو لوگ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال اس دانے جیسی ہے جس میں سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں، اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے بڑھا چڑھا کر دے^(۱) اور اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علم والا ہے (۲۶۱)

جُرءُكُمْ اذْهَمَّنْ يَأْتِيَنَّكَ سَعْيًا. وَاَعْلَمَنَّ اللهُ
عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۶۰﴾

مَنْ الَّذِي يَنْفِقُونَ اَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ كَمَثَلِ
حَبَّةٍ اَنْتَدَّتْ سَبْعَ سَتَابِلٍ فِي كُلِّ سَبْتَاةٍ مِائَةِ حَبَّةٍ
وَاللهُ يَضْعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ وَاللهُ وَاَسْمَ عَلِيمٌ ﴿۲۶۱﴾

تعیین کا کوئی فائدہ نہیں، اس لیے اللہ نے بھی ان کے نام ذکر نہیں کیے۔ بس یہ چار مختلف پرندے تھے۔ فَصُرْهُنَّ کے ایک معنی اَمْلَهُنَّ کیے گئے ہیں یعنی ان کو ”ہلا لے“ (مانوس کر لے) تاکہ زندہ ہونے کے بعد ان کو آسانی سے پہچان لے کہ یہ وہی پرندے ہیں اور کسی قسم کا شک باقی نہ رہے۔ اس معنی کے اعتبار سے پھر اس کے بعد نُمَّ فَطَعْنَهُ (پھر ان کو نکلنے نکلنے کر لے) محذوف ماننا پڑے گا۔ دوسرے معنی فَطَعْنَهُ (نکلنے نکلنے کر لے) کیے گئے ہیں۔ اس صورت میں کچھ محذوف مانے بغیر معنی واضح ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نکلنے نکلنے کر کے مختلف پہاڑوں پر ان کے اجزا باہم ملا کر رکھ دے، پھر تو آواز دے تو وہ زندہ ہو کر تیرے پاس آجائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بعض جدید و قدیم مفسرین نے (جو صحابہ و تابعین کی تفسیر اور سلف کے منہج و مسلک کو اہمیت نہیں دیتے) فَصُرْهُنَّ کا ترجمہ صرف ”ہلا لے“ کا کیا ہے۔ اور ان کے نکلنے کرنے اور پہاڑوں پر ان کے اجزا بکھیرنے اور پھر اللہ کی قدرت سے ان کے بڑنے کو وہ تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن یہ تفسیر صحیح نہیں، اس سے واقعے کی ساری اعجازی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور مردے کو زندہ کر دکھانے کا سوال جوں کا توں قائم رہتا ہے۔ حالانکہ اس واقعہ کے ذکر سے مقصود اللہ تعالیٰ کی صفت احیائے موتی اور اس کی قدرت کاملہ کا اثبات ہے۔ ایک حدیث میں ہے نبی ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعے کا تذکرہ کر کے فرمایا «نَحْنُ اَحَقُّ بِالشُّكِّ مِنْ اِبْرَاهِيمَ» (صحیح بخاری، کتاب التفسیر) ”ہم ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کے حق دار ہیں۔“ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے شک کیا، لہذا ہمیں ان سے زیادہ شک کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ بلکہ مطلب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شک کی نفی ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے احیائے موتی کے مسئلے میں شک نہیں کیا اگر انہوں نے شک کا اظہار کیا ہو تا تو ہم یقیناً شک کرنے میں ان سے زیادہ حق دار ہوتے (مزید وضاحت کے لیے دیکھیے فتح القدر۔ للشوکانی)

(۱) یہ اتفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت ہے۔ اس سے مراد اگر جہاد ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جہاد میں خرچ کی گئی

جو لوگ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے بعد نہ تو احسان جتاتے ہیں نہ ایذا دیتے ہیں،^(۱) ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے ان پر نہ تو کچھ خوف ہے نہ وہ ادا اس ہوں گے۔ (۲۶۲)

نرم بات کہنا اور معاف کر دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد ایذا رسانی ہو^(۲) اور اللہ تعالیٰ بے نیاز اور بردبار ہے،^(۳)

اسے ایمان والوں! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور ایذا پہنچا کر

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَمْ يُؤْمَرُوا
مَّا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أذَىٰ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۳﴾

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أذَىٰ
وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَلِيمٌ ﴿۳﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ

رقم کا یہ ثواب ہو گا اور اگر اس سے مراد تمام مصارف خیر ہیں تو یہ فضیلت نفقات و صدقات نافلہ کی ہوگی اور دیگر نیکیاں «الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا» (ایک نیکی کا اجر دس گنا) کی ذیل میں آئیں گی۔ (فتح القدر) گویا نفقات و صدقات کا عام اجر و ثواب، دیگر امور خیر سے زیادہ ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کی اس اہمیت و فضیلت کی وجہ بھی واضح ہے کہ جب تک سامان و اسلحہ جنگ کا انتظام نہیں ہو گا، فوج کی کارکردگی بھی صفر ہوگی اور سامان اور اسلحہ رقم کے بغیر میا نہیں کیے جاسکتے۔

(۱) انفاق فی سبیل اللہ کی مذکورہ فضیلت صرف اس شخص کو حاصل ہوگی جو مال خرچ کر کے احسان نہیں جتلاتا نہ زبان سے ایسا کلمہ تحقیر ادا کرتا ہے جس سے کسی غریب، محتاج کی عزت نفس مجروح ہو اور وہ تکلیف محسوس کرے۔ کیونکہ یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ نبی ﷺ کا فرمان ہے: قیامت والے دن اللہ تعالیٰ تین آدمیوں سے کلام نہیں فرمائے گا، ان میں ایک احسان جتلانے والا ہے (مسلم، کتاب الإیمان، باب غلظت تحریم إسبال الإزار والمن بالعطية)۔

(۲) سائل سے نرمی اور شفقت سے بولنا یا دعائیہ کلمات (اللہ تعالیٰ تجھے بھی اور ہمیں بھی اپنے فضل و کرم سے نوازے وغیرہ) سے اس کو جواب دینا قول معروف ہے اور مغفرت کا مطلب سائل کے فقر اور اس کی حاجت کا لوگوں کے سامنے عدم اظہار اور اس کی پردہ پوشی ہے اور اگر سائل کے منہ سے کوئی نازیبا بات نکل جائے تو اس سے چشم پوشی بھی اس میں شامل ہے۔ یعنی سائل سے نرمی و شفقت اور چشم پوشی، پردہ پوشی، اس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد اس کو لوگوں میں ذلیل و رسوا کر کے اسے تکلیف پہنچائی جائے۔ اسی لیے حدیث میں کہا گیا ہے «الْكَلِمَةُ الطَّيْبَةُ صَدَقَةٌ» (صحیح مسلم کتاب الزکاۃ، باب بیان أن اسم الصدقة يقع على كل نوع من المعروف،) (پاکیزہ کلمہ بھی صدقہ ہے) نیز نبی ﷺ نے فرمایا «تم کسی بھی معروف (نیکی) کو حقیر مت سمجھو، اگرچہ اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا ہی ہو۔ «لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ شَيْئًا وَلَوْ أَنَّ تَلَقَّى أَخَاكَ بِوَجْهِ طَلِقٍ» (مسلم، کتاب البر، باب استحباب طلاقة الوجه عند اللقاء)۔

برباد نہ کرو! جس طرح وہ شخص جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرے اور نہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھے نہ قیامت پر، اس کی مثال اس صاف پتھر کی طرح ہے جس پر تھوڑی سی مٹی ہو پھر اس پر زور دار مینہ برسے اور وہ اسے بالکل صاف اور سخت چھوڑ دے،^(۱) ان ریاکاروں کو اپنی کمائی میں سے کوئی چیز ہاتھ نہیں لگتی اور اللہ تعالیٰ کافروں کی قوم کو (سیدھی) راہ نہیں دکھاتا۔ (۲۶۴)

ان لوگوں کی مثال جو اپنا مال اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی طلب میں دل کی خوشی اور یقین کے ساتھ خرچ کرتے ہیں اس باغ جیسی ہے جو اونچی زمین پر ہو^(۲) اور زور دار بارش اس پر برسے اور وہ اپنا پھل دگنالاوے اور اگر اس پر بارش نہ بھی برسے تو پھوار ہی کافی ہے اور اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔ (۲۶۵)

كَانَ يَوْمَ يُنْفِقُ مَالَهُ رِيقًا تَالِيًا وَلَا يُؤْمِنُ يَأْتِيهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَعْوَانَ عَلَيْهِ ثَوَابٌ كَأَصَابَةِ
وَابِلٍ وَتَرَكَهُ صَلْدًا الْيَقِيدُونَ عَلَى شَيْءٍ مِمَّا كَتَبُوا وَاللَّهُ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿۲۶۴﴾

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ
وَتَشْبِيهُتَاتٍ أَنفُسُهُمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ
كَاتَمَتْ أَكْطَافُهَا ضَعْفَيْنِ فَإِن كَرِهْتُمُوهَا وَابِلٌ قَطَلٌ وَاللَّهُ
بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۶۵﴾

(۱) اس میں ایک تو یہ کہا گیا ہے کہ صدقہ و خیرات کر کے احسان جملانا اور تکلیف دہ باتیں کرنا، اہل ایمان کا شیوہ نہیں، بلکہ ان لوگوں کا وطیرہ ہے جو منافق ہیں اور ریاکاری کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ دوسرے، ایسے خرچ کی مثال صاف چٹان کی سی ہے جس پر کچھ مٹی ہو، کوئی شخص پیداوار حاصل کرنے کے لیے اس میں بیج بودے لیکن بارش کا ایک جھٹکا پڑتے ہی وہ ساری مٹی اس سے اتر جائے اور وہ پتھر مٹی سے بالکل صاف ہو جائے۔ یعنی جس طرح بارش اس پتھر کے لیے نفع بخش ثابت نہیں ہوئی، اسی طرح ریاکار کو بھی اس کے صدقہ کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

(۲) یہ ان اہل ایمان کی مثال ہے جو اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں، ان کا خرچ کیا ہو یا مال اس باغ کی مانند ہے جو پر فضا اور بلند چوٹی پر ہو، کہ اگر زور دار بارش ہو تو اپنا پھل دگنلاوے ورنہ ہلکی سی پھوار اور شبنم بھی اس کو کافی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ان کے نفقات بھی، چاہے کم ہو یا زیادہ، عند اللہ کئی گنا اجر و ثواب کے باعث ہوں گے جتنے اس زمین کو کہتے ہیں جس میں اتنی کثرت سے درخت ہوں جو زمین کو ڈھانک لیں یا وہ باغ، جس کے چاروں طرف باڑھ ہو اور باڑھ کی وجہ سے باغ نظروں سے پوشیدہ ہو۔ یہ جن سے ماخوذ ہے، جن اس مخلوق کا نام ہے جو نظر نہیں آتی، پیٹ کے بچے کو جنمیں کہا جاتا ہے کہ وہ بھی نظر نہیں آتا، دیوانگی کو جنون سے تعبیر کرتے ہیں کہ اس میں بھی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ اور جنت کو بھی اس لیے جنت کہتے ہیں کہ وہ نظروں سے مستور ہے۔ زَبْوَةٌ اونچی زمین کو کہتے ہیں۔ وَابِلٌ تیز بارش۔

کیا تم میں سے کوئی بھی یہ چاہتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو، جس میں نسریں بس رہی ہوں اور ہر قسم کے پھل موجود ہوں، اس شخص کا بڑھاپا آگیا ہو، اس کے ننھے ننھے سے بچے بھی ہوں اور اچانک باغ کو گبولا لگ جائے جس میں آگ بھی ہو، پس وہ باغ جل جائے،^(۱) اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آیتیں بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو۔ (۲۶۶)

اے ایمان والو! اپنی پاکیزہ کمائی میں سے اور زمین میں سے تمہارے لئے ہماری نکالی ہوئی چیزوں میں سے خرچ کرو،^(۲) ان میں سے بری چیزوں کے خرچ کرنے کا قصد

أَيُّدًا أَحَدَكُمْ أَنْ يَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ جَنَّةٍ مِّثْلٍ مَا عَتَبَنِي
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ
وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَةٌ ضَعُفًا فَلَمَّا صَاحَبَهَا
إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ كَاخِرَةٌ كَذَلِكَ يَبْهَتُونَ اللَّهَ
لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦٦﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا مِن تَحْتِهَا مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا
أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا الْهَيْبَةَ مِنهُ
تَنْفَعُونَ ۖ وَلَسْتُمْ بِأَجْدِيَاءَ إِلَّا أَنْ تُغِيظُوا

(۱) اسی ریاکاری کے نقصانات کو واضح کرنے اور اس سے بچنے کے لیے مزید مثال دی جا رہی ہے کہ جس طرح ایک شخص کا باغ ہو جس میں ہر طرح کے پھل ہوں (یعنی اس سے بھرپور آمدنی کی امید ہو)، وہ شخص بوڑھا ہو جائے اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں (یعنی وہ خود بھی ضعف پیری اور کبرسنی کی وجہ سے محنت و مشقت سے عاجز ہو چکا ہو اور اولاد بھی اس کے بڑھاپے کا سہارا تو کیا؟ خود اپنا بوجھ بھی اٹھانے کے قابل نہ ہو) اس حالت میں تیز و تند ہوا آئیں چلیں اور اس کا سارا باغ جل جائے۔ اب نہ وہ خود دوبارہ اس باغ کو آباد کرنے کے قابل رہا نہ اس کی اولاد۔ یہی حال ان ریاکار خرچ کرنے والوں کا قیامت کے دن ہو گا۔ کہ نفاق و ریاکاری کی وجہ سے ان کے سارے اعمال اکارت چلے جائیں گے جب کہ وہاں نیکیوں کی شدید ضرورت ہوگی اور دوبارہ اعمال خیر کرنے کی مہلت و فرصت نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا یہی حال ہو؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مثال کا مصداق ان لوگوں کو بھی قرار دیا ہے جو ساری عمر نیکیاں کرتے ہیں اور آخر عمر میں شیطان کے جال میں پھنس کر اللہ کے نافرمان ہو جاتے ہیں جس سے عمر بھر کی نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں (صحیح بخاری، کتاب التفسیر، فتح القدیر، للشوکانی وتفسیر ابن جریر طبری)۔

(۲) صدقے کی قبولیت کے لیے جس طرح ضروری ہے کہ من واذی اور ریاکاری سے پاک ہو (جیسا کہ گذشتہ آیات میں بتایا گیا ہے) اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حلال اور پاکیزہ کمائی سے ہو۔ چاہے وہ کاروبار (تجارت و صنعت) کے ذریعے ہو یا فصل اور بانگات کی پیداوار سے۔ اور یہ جو فرمایا کہ ”خبیث چیزوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا قصد مت کرو۔“ تو خبیث سے ایک تو وہ چیزیں مراد ہیں جو غلط کمائی سے ہوں۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں فرماتا۔ حدیث

فِيهِ وَعَلَّمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفِيٌّ حَمِيدٌ ﴿۲۱﴾

نہ کرنا، جسے تم خود لینے والے نہیں ہو، ہاں اگر آنکھیں بند کر لو تو،^(۱) اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ بے پرواہ اور خوبیوں والا ہے۔ (۲۶۷)

شیطان تمہیں فقیری سے دھمکاتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے،^(۲) اور اللہ تعالیٰ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ وسعت والا اور علم والا ہے۔ (۲۶۸)

وہ جسے چاہے حکمت اور دانائی دیتا ہے اور جو شخص حکمت اور سمجھ دیا جائے وہ بہت ساری بھلائی دیا گیا^(۳)

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً وَمِنَّةً وَفَضْلًا وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۱﴾

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿۲۱﴾

میں ہے «إِنَّ اللَّهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا» (اللہ تعالیٰ پاک ہے، پاک (حلال) چیز ہی قبول فرماتا ہے۔) دوسرے خبیث کے معنی ردی اور کچی چیز کے ہیں، ردی چیزیں بھی اللہ کی راہ میں خرچ نہ کی جائیں، جیسا کہ آیت ﴿لَنْ نَقُولُوا لِلَّذِي لَا نَشْفَعُ أَمَّا تُجِيبُونَ﴾ کا بھی مفاد ہے۔ اس کی شان نزول کی روایت میں بتلایا گیا ہے کہ بعض انصار مدینہ خراب اور کچی کھجوریں بطور صدقہ مسجد میں دے جاتے، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (فتح القدیر۔ بحوالہ ترمذی وابن ماجہ وغیرہ)۔

(۱) یعنی جس طرح تم خود ردی چیزیں لینا پسند نہیں کرتے، اسی طرح اللہ کی راہ میں بھی اچھی چیز ہی خرچ کرو۔
(۲) یعنی بھلے کام میں مال خرچ کرنا ہو تو شیطان ڈراتا ہے کہ مفلس اور قلاش ہو جاؤ گے۔ لیکن برے کام پر خرچ کرنا ہو تو ایسے اندیشوں کو نزدیک نہیں پھٹکنے دیتا۔ بلکہ ان برے کاموں کو اس طرح سجا اور سنوار کر پیش کرتا ہے اور ان کے لیے ہفتہ آرزوؤں کو اس طرح جگاتا ہے کہ ان پر انسان بڑی سے بڑی رقم بے دھڑک خرچ کر ڈالتا ہے۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ مسجد، مدرسے یا اور کسی کار خیر کے لیے کوئی چندہ لینے پہنچ جائے تو صاحب مال سو، دو سو کے لیے بار بار اپنے حساب کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ اور مانگنے والے کو بسا اوقات کئی کئی بار دوڑاتا اور پلٹاتا ہے۔ لیکن یہی شخص سینما، ٹیلی ویژن، شراب، بدکاری اور مقدمے بازی وغیرہ کے جال میں پھنستا ہے تو اپنا مال بے تحاشا خرچ کرتا ہے۔ اور اس سے کسی قسم کی ہچکچاہٹ اور تردد کا ظہور نہیں ہوتا۔

(۳) حِكْمَةٌ سے بعض کے نزدیک، عقل و فہم، علم اور بعض کے نزدیک اصابت رائے، قرآن کے ناخ و منسوخ کا علم و فہم، قوت فیصلہ اور بعض کے نزدیک صرف سنت یا کتاب و سنت کا علم و فہم ہے یا سارے ہی مفہوم اس کے مصداق میں شامل ہو سکتے ہیں۔ صحیحین وغیرہ کی ایک حدیث میں ہے کہ ”دو شخصوں پر رشک کرنا جائز ہے ایک وہ جس کو اللہ نے مال دیا اور وہ اس راہ حق میں خرچ کرتا ہے۔ دوسرا وہ جسے اللہ نے حکمت دی جس سے وہ فیصلے کرتا ہے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔“ (صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الاغصاط فی العلم والحکمة۔ مسلم، کتاب صلاة:

اور نصیحت صرف عقلمند ہی حاصل کرتے ہیں۔ (۲۶۹)
تم جتنا کچھ خرچ کرو یعنی خیرات اور جو کچھ نذر مانو^(۱) اسے
اللہ تعالیٰ بخوبی جانتا ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار
نہیں (۲۷۰)

اگر تم صدقے خیرات کو ظاہر کرو تو وہ بھی اچھا ہے اور اگر
تم اسے پوشیدہ پوشیدہ مسکینوں کو دے دو تو یہ تمہارے
حق میں بہتر ہے،^(۲) اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو مٹا دے
گا اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال کی خبر رکھنے والا
ہے، (۲۷۱)

انہیں ہدایت پر لا کھڑا کرنا تیرے ذمہ نہیں بلکہ ہدایت
اللہ تعالیٰ دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تم جو بھلی چیز اللہ کی
راہ میں دو گے اس کا فائدہ خود پاؤ گے۔ تمہیں صرف
اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی طلب کے لئے ہی خرچ کرنا

وَمَا أَنْفَعَكُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذْرٍ مِمَّنْ تَنْذِرُ
قَالَ اللَّهُ يَعْلَمُهَا وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

إِنْ تَبُدُوا الصَّدَقَاتِ فَيُعْتَمَرُ وَإِنْ تَخْفَوْهَا
وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَيَكْفُرُ عَنْكُمْ
مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۲۷۱﴾

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ
وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا تُنْفِسْكُمْ وَمَا تُنْفِقُونَ
إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ لِيُوقِ
إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَظْلَمُونَ ﴿۲۷۲﴾

المسافرين 'باب فضل من يقوم بالقرآن ويعلمه...)

(۱) نذیر کا مطلب ہے کہ میرا فلاں کام ہو گیا یا فلاں ابتلا سے نجات مل گئی تو میں اللہ کی راہ میں اتنا صدقہ کروں گا۔ اس
نذر کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اگر کسی نافرمانی یا ناجائز کام کی نذر مانی ہے تو اس کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔ نذر بھی
نماز روزہ کی طرح، عبادت ہے۔ اس لیے اللہ کے سوا کسی اور کے نام کی نذر ماننا اس کی عبادت کرنا ہے جو شرک ہے،
جیسا کہ آج کل مشہور قبروں پر نذر نیا ز کا یہ سلسلہ عام ہے، اللہ تعالیٰ اس شرک سے بچائے۔

(۲) اس سے معلوم ہوا کہ عام حالات میں خفیہ طور پر صدقہ کرنا افضل ہے، سوائے کسی ایسی صورت کے کہ علانیہ
صدقہ دینے میں لوگوں کے لیے ترغیب کا پہلو ہو۔ اگر ریاکاری کا جذبہ شامل نہ ہو تو ایسے موقعوں پر پہل کرنے والے جو
خاص فضیلت حاصل کر سکتے ہیں، وہ احادیث سے واضح ہے۔ تاہم اس قسم کی مخصوص صورتوں کے علاوہ دیگر مواقع پر
خاموشی سے صدقہ و خیرات کرنا ہی بہتر ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ جن لوگوں کو قیامت کے دن عرش الہی کا سایہ
نصیب ہو گا، ان میں ایک وہ شخص بھی ہو گا جس نے اتنے خفیہ طریقے سے صدقہ کیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی یہ پتہ
نہیں چلا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔ صدقے میں اخفا کی افضلیت کو بعض علما نے صرف نقلی صدقات
تک محدود رکھا ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی میں اظہار کو بہتر سمجھا ہے۔ لیکن قرآن کا عموم صدقات نافلہ اور واجبہ دونوں کو
شامل ہے (ابن کثیر) اور حدیث کا عموم بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔

چاہیے تم جو کچھ مال خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدلہ تمہیں دیا جائے گا،^(۱) اور تمہارا حق نہ مارا جائے گا۔ (۲۷۲)

صدقات کے مستحق صرف وہ غریب ہیں جو اللہ کی راہ میں روک دیئے گئے، جو ملک میں چل پھر نہیں سکتے^(۲) نادان لوگ ان کی بے سوالی کی وجہ سے انہیں مال دار خیال کرتے ہیں، آپ ان کے چرے دیکھ کر قیافہ سے انہیں پہچان لیں گے وہ لوگوں سے چٹ کر سوال نہیں کرتے،^(۳) تم جو کچھ مال خرچ کرو تو اللہ تعالیٰ اس کا جاننے والا ہے۔ (۲۷۳)

لِلْفَقْرَاءِ الَّذِينَ اٰخَصَرُوا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ
لَا يَسْتَطِيعُوْنَ سَهْرًا فِي الْاَرْضِ يَسْتَعِيْمُهُمُ الْجَاهِلُ
اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَطُّفِ تَعْرِفُوهُمْ بَيْنَهُمْ لَا يَسْتَلُوْنَ
الْاِنْسَ الْاِحْقَاقًا وَمَا تَنْفَعُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ
بِهِ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾

(۱) تفسیری روایات میں اس کی شان نزول یہ بیان کی گئی ہے کہ مسلمان اپنے مشرک رشتے داروں کی مدد کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہدایت کے راستے پر لگا دینا یہ صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ تم لوجہ اللہ جو بھی خرچ کرو گے، اس کا پورا ابراہم سے یہ معلوم ہوا کہ غیر مسلم رشتے داروں کے ساتھ بھی صلہ رحمی کرنا باعث اجر ہے۔ تاہم زکوٰۃ صرف مسلمانوں کا حق ہے یہ کسی غیر مسلم کو نہیں دی جاسکتی۔

(۲) اس سے مراد وہ مہاجرین ہیں جو مکہ سے مدینہ آئے اور اللہ کے راستے میں ہر چیز سے کٹ گئے۔ دینی علوم حاصل کرنے والے طلباء اور علماء بھی اس کی ذیل میں آسکتے ہیں۔

(۳) گویا اہل ایمان کی صفت یہ ہے کہ تقویٰ و غریب کے باوجود وہ تَعَطُّف (سوال سے بچنا) اختیار کرتے اور اِلْحَاف (چٹ کر سوال کرنا) سے گریز کرتے ہیں۔ بعض نے اِلْحَاف کے معنی کیے ہیں، بالکل سوال نہ کرنا کیونکہ ان کی پہلی صفت عفت بیان کی گئی ہے (فتح القدیر) اور بعض نے کہا ہے کہ وہ سوال میں اِلْحَاف و زاری نہیں کرتے اور جس چیز کی انہیں ضرورت نہیں ہے اسے لوگوں سے طلب نہیں کرتے۔ اس لیے کہ اِلْحَاف یہ ہے کہ ضرورت نہ ہونے کے باوجود (بطور پیشہ) لوگوں سے مانگے اس مفہوم کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ ”مسکین وہ نہیں ہے جو ایک ایک دو دو کھجور یا ایک ایک دو دو لقمے کے لیے در در پر جا کر سوال کرتا ہے۔ مسکین تو وہ ہے جو سوال سے بچتا ہے“ پھر نبی ﷺ نے آیت ﴿لَا يَسْتَلُوْنَ الْاِنْسَ الْاِحْقَاقًا﴾ کا حوالہ پیش فرمایا (صحیح بخاری، التفسیر و الزکوٰۃ)۔ اس لیے پیشہ ور گداگروں کی بجائے، مہاجرین، دین کے طلباء اور سفید پوش ضرورت مندوں کا پتہ چلا کر ان کی امداد کرنی چاہیے۔ جو سوال کرنے سے گریز کرتے ہیں، کیونکہ دو سروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا انسان کی عزت نفس اور خودداری کے خلاف

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ يَأْتِيلَ وَالنَّهَارِ سِرًّا
وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۳۰﴾
الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي

جو لوگ اپنے مالوں کو رات دن چھپے کھلے خرچ کرتے ہیں
ان کے لئے ان کے رب تعالیٰ کے پاس اجر ہے اور نہ
انہیں خوف ہے اور نہ غمگینی۔ (۲۷۳)
سود خور (۱) لوگ نہ کھڑے ہوں گے مگر اسی طرح جس

ہے۔ علاوہ ازیں حدیث میں آتا ہے کہ جس کے پاس مایغنی ہو (یعنی اتنا سامان ہو جو اس کو کفایت کرتا ہو) لیکن اس کے باوجود وہ لوگوں سے سوال کرے گا، تو قیامت والے دن اس کے چہرے پر زخم ہوں گے۔ (رواہ اهل السنن الأربعة۔ ترمذی، کتاب الزکاة) اور بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ ہمیشہ لوگوں سے سوال کرنے والے کے چہرے پر قیامت کے دن گوشت نہیں ہو گا۔ (بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الزکاة باب من لا تحل له المسألة ومن تحل له)

(۱) ربوا کے لغوی معنی زیادتی اور اضافے کے ہیں۔ اور شریعت میں اس کا اطلاق رَبِّ الْفَضْلِ اور رَبِّ النَّسْبَةِ پر ہوتا ہے۔ رَبِّ الْفَضْلِ اس سود کو کہتے ہیں جو چھ اشیا میں کسی بیشی یا نقد و ادھار کی وجہ سے ہوتا ہے (جس کی تفصیل حدیث میں ہے)۔ مثلاً گندم کا تبادلہ گندم سے کرنا ہے تو فرمایا گیا ہے کہ ایک تو برابر برابر ہو۔ دوسرے بِدَا بَيْدٍ (ہاتھوں ہاتھ) ہو۔ اس میں کسی بیشی ہوگی تب بھی اور ہاتھوں ہاتھ ہونے کی بجائے، ایک نقد اور دوسرا ادھار یا دونوں ہی ادھار ہوں، تب بھی سود ہے) رَبِّ النَّسْبَةِ کا مطلب ہے کسی کو (مثلاً) ۶ مہینے کے لیے اس شرط پر سو روپے دینا، کہ واپسی ۱۲۵ روپے ہو گی۔ ۲۵ روپے ۶ مہینے کی مہلت کے لیے جائیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب قول میں اسے اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ «كُلُّ قَرْضٍ جَزَاءٌ مُنْفَعَةٌ فَهَوَ رَبِّا» (فیض القدیبر شرح الجامع الصغیر، ج ۵ ص ۳۸) (قرض پر لیا گیا نفع سود ہے) یہ قرضہ ذاتی ضرورت کے لیے لیا گیا ہو یا کاروبار کے لیے دونوں قسم کے قرضوں پر لیا گیا سود حرام ہے اور زمانہ جاہلیت میں بھی دونوں قسم کے قرضوں کا رواج تھا۔ شریعت نے بغیر کسی قسم کی تفریق کے دونوں کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے۔ اس لیے بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ تجارتی قرضہ (جو عام طور پر بنک سے لیا جاتا ہے) اس پر اضافہ، سود نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرض لینے والا اس سے فائدہ اٹھاتا ہے جس کا کچھ حصہ وہ بنک کو یا قرض دہندہ کو لوٹا دیتا ہے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اس کی قباحت ان متجددین کو نظر نہیں آتی جو اس کو جائز قرار دینا چاہتے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں تو اس میں بڑی قباحتیں ہیں۔ مثلاً قرض لے کر کاروبار کرنے والے کا منافع تو یقینی نہیں ہے، بلکہ، منافع تو کجا اصل رقم کی حفاظت کی بھی ضمانت نہیں ہے۔ بعض دفعہ کاروبار میں ساری رقم ہی ڈوب جاتی ہے۔ جب کہ اس کے برعکس قرض دہندہ (چاہے وہ بنک ہو یا کوئی ساہو کار) کا منافع متعین ہے جس کی ادائیگی ہر صورت میں لازمی ہے۔ یہ ظلم کی ایک واضح صورت ہے جسے شریعت اسلامیہ کس طرح جائز قرار دے سکتی ہے؟ علاوہ ازیں شریعت تو اہل ایمان کو معاشرے کے ضرورت مندوں پر بغیر کسی دنیوی غرض و منفعت کے خرچ کرنے کی ترغیب دیتی ہے، جس سے معاشرے میں اخوت، بھائی چارے، ہمدردی، تعاون اور شفقت و محبت کے جذبات فروغ پاتے ہیں۔ اس کے برعکس سودی نظام سے سنگ دلی اور

طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان چھو کر خجلی بنا دے،^(۱) یہ اس لئے کہ یہ کہا کرتے تھے کہ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے،^(۲) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام، جو شخص اپنے پاس آئی ہوئی اللہ تعالیٰ کی نصیحت سن کر رک گیا اس کے لئے وہ ہے جو گزرا^(۳) اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے،^(۴) اور جو پھر دوبارہ (حرام کی طرف) لوٹا، وہ جہنمی ہے، ایسے لوگ ہمیشہ ہی اس میں رہیں گے۔ (۲۷۵)

اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقہ کو بڑھاتا ہے^(۵) اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے اور گنہگار سے محبت نہیں کرتا۔ (۲۷۶)

بے شک جو لوگ ایمان کے ساتھ (سنت کے مطابق)

يَتَخَيَّلُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَيْمَنِ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ
مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَكَ
مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ
وَمَنْ عَادَ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۷۵﴾

يَسَخِّرُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيهِ الصَّدَقَاتِ وَاللَّهُ كَرِيمٌ غَلِيظٌ
كَلَّامٌ آسِيفٌ ﴿۲۷۶﴾

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ

خود غرضی کو فروغ ملتا ہے۔ ایک سرمائے دار کو اپنے سرمائے کے نفع سے غرض ہوتی ہے چاہے معاشرے میں ضرورت مند، بیماری، بھوک، افلاس سے کراہ رہے ہوں یا بے روزگار اپنی زندگی سے بیزار ہوں۔ شریعت اس شقاوت و سنگدلی کو کس طرح پسند کر سکتی ہے؟ اس کے اور بہت سے نقصانات ہیں، تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ بہر حال سود مطلقاً حرام ہے چاہے ذاتی ضرورت کے لیے لیے گئے قرضے کا سود ہو یا تجارتی قرضے پر۔

(۱) سود خور کی یہ کیفیت قبر سے اٹھتے وقت یا میدان محشر میں ہوگی۔

(۲) حالانکہ تجارت میں تو نفع رقم اور کسی چیز کا آپس میں تبادلہ ہوتا ہے۔ دوسرے اس میں نفع نقصان کا امکان رہتا ہے، جب کہ سود میں یہ دونوں چیزیں مفقود ہیں، علاوہ ازیں بیع کو اللہ نے حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ پھر یہ دونوں ایک کس طرح ہو سکتے ہیں؟

(۳) قبول ایمان یا توبہ کے بعد پچھلے سود پر گرفت نہیں ہوگی۔

(۴) کہ وہ توبہ پر ثابت قدم رکھتا ہے یا سوء عمل اور فساد نیت کی وجہ سے اسے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ اسی لیے اس کے بعد دوبارہ سود لینے والے کے لیے وعید ہے۔

(۵) یہ سود کی معنوی اور روحانی مضمرتوں اور صدقے کی برکتوں کا بیان ہے۔ سود میں بظاہر بڑھوتری نظر آتی ہے لیکن معنوی حساب سے یا مال (انجام) کے اعتبار سے سودی رقم ہلاکت و بربادی ہی کا باعث بنتی ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف اب یورپی ماہرین معیشت بھی کرنے لگے ہیں۔

نیک کام کرتے ہیں، نمازوں کو قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، ان کا اجر ان کے رب تعالیٰ کے پاس ہے، ان پر نہ تو کوئی خوف ہے، نہ اداسی اور غم۔ (۲۷۷)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو، اگر تم سچ بیچ ایمان والے ہو۔ (۲۷۸)

اور اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ،^(۱) ہاں اگر توبہ کر لو تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے، نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔^(۲) (۲۷۹)

اور اگر کوئی تنگی والا ہو تو اسے آسانی تک مہلت دینی چاہئے اور صدقہ کرو تو تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے،^(۳) اگر تم میں علم ہو (۲۸۰)

وَإِنَّ الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۲۷۷﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۲۷۸﴾

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُبْتِغُوا فَكَلِمَةٌ مِّنْ أَمْرِكُمْ لَا تُظْلَمُونَ وَلَا تظْلَمُونَ ﴿۲۷۹﴾

وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَإِن تصَدَّقُوا حَبِيرًا فَكُلٌّ لَّكُمْ فَعَلَمُونَ ﴿۲۸۰﴾

(۱) یہ ایسی سخت و عید ہے جو اور کسی معصیت کے ارتکاب پر نہیں دی گئی۔ اس لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اسلامی مملکت میں جو شخص سود چھوڑنے پر تیار نہ ہو، تو خلیفہ وقت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سے توبہ کرائے اور بازنہ آنے کی صورت میں اس کی گردن اڑا دے (ابن کثیر)

(۲) تم اگر اصل زر سے زیادہ وصول کرو گے تو یہ تمہاری طرف سے ظلم ہو گا اور اگر تمہیں اصل زر بھی نہ دیا جائے تو یہ تم پر ظلم ہو گا۔

(۳) زمانہ جاہلیت میں قرض کی ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں سود اور سود، اصل رقم میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا تھا؛ جس سے وہ تھوڑی سی رقم ایک پہاڑ بن جاتی اور اس کی ادائیگی ناممکن ہو جاتی۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ کوئی تنگ دست ہو تو (سود لینا تو درکنار اصل مال لینے میں بھی) آسانی تک اسے مہلت دے دو اور اگر قرض بالکل ہی معاف کر دو تو زیادہ بہتر ہے، احادیث میں بھی اس کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ کتنا فرق ہے ان دونوں نظاموں میں؟ ایک سراسر ظلم، سنگ دلی اور خود غرضی پر مبنی نظام اور دوسرا ہمدردی، تعاون اور ایک دوسرے کو سہارا دینے والا نظام۔ مسلمان خود ہی اس بابرکت اور پر رحمت نظام الہی کو نہ اپنائیں تو اس میں اسلام کا کیا قصور اور اللہ پر کیا الزام؟ کاش مسلمان اپنے دین کی اہمیت و افادیت کو سمجھ سکیں اور اس پر اپنے نظام زندگی کو استوار کر سکیں۔

اور اس دن سے ڈرو جس میں تم سب اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (۲۸۱) اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک دوسرے سے میعاد مقرر پر قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو، (۲) اور لکھنے والے کو چاہئے کہ تمہارا آپس کا معاملہ عدل سے لکھے، کاتب کو چاہئے کہ لکھنے سے انکار نہ کرے جیسے اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے، پس اسے بھی لکھ دینا چاہئے اور جس کے ذمہ حق ہو (۳) وہ لکھوائے اور اپنے اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور حق میں سے کچھ گھٹائے نہیں، ہاں جس شخص کے ذمہ حق ہے وہ اگر نادان ہو یا کمزور ہو یا لکھوانے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی عدل کے ساتھ لکھوادے اور اپنے میں سے دو مرد

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۲۸۱﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَايْتُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَالْتَبِئُوهُ وَلْيَكُتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْتِ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَمَلَكُمُ اللَّهُ فَلْيَكُتُبْ وَابْتِئِلْ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيُكْفَى اللَّهُ رِيبَهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْطِيعُ أَنْ يَبْلُغَ هُوَ فَلْيَبْلُغْ وَلْيُؤْتِ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِن لَّمْ يَكُنَا تَارِكَيْنِ فَرَجُلٍ وَامْرَأَتَيْنِ وَمَنْ تَرَضَوْنَ مِنْ الشُّهُدَاءِ أَنْ تَصِلَ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَا إِحْدَهُمَا الْأُخْرَىٰ وَلَا يَأْتِ الشُّهُدَاءُ إِلَّا إِذًا مُحَدِّثِينَ وَالسَّمْعَ شَامِعِينَ وَلَا تَسْبُوهُ

(۱) بعض آمار میں ہے کہ یہ قرآن کریم کی آخری آیت ہے جو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی، اس کے چند دن بعد ہی آپ دنیا سے رحلت فرما گئے۔ ﷺ (ابن کثیر)

(۲) جب سودی نظام کی سختی سے ممانعت اور صدقات و خیرات کی تاکید بیان کی گئی تو پھر ایسے معاشرے میں دیون (قرضوں) کی بہت ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ سود تو ویسے ہی حرام ہے اور ہر شخص صدقہ و خیرات کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اسی طرح ہر شخص صدقہ لینا پسند بھی نہیں کرتا۔ پھر اپنی ضروریات و حاجات پوری کرنے کے لیے قرض ہی باقی رہ جاتا ہے۔ اسی لیے احادیث میں قرض دینے کا بڑا ثواب بیان کیا گیا ہے۔ تاہم قرض جس طرح ایک ناگزیر ضرورت ہے، اس میں بے احتیاطی یا تساہل جھگڑوں کا باعث بھی ہے۔ اس لیے اس آیت میں، جسے آیۃ الدین کہا جاتا ہے اور جو قرآن کی سب سے لمبی آیت ہے، اللہ تعالیٰ نے قرض کے سلسلے میں ضروری ہدایات دی ہیں تاکہ یہ ناگزیر ضرورت لڑائی جھگڑے کا باعث نہ بنے۔ اس کے لیے ایک حکم یہ دیا گیا ہے کہ مدت کا تعین کر لو، دوسرا یہ کہ اسے لکھ لو، تیسرا یہ کہ اس پر دو مسلمان مرد کو یا ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا لو۔

(۳) اس سے مراد مقروض ہے یعنی وہ اللہ سے ڈرنا ہوا اور تم کی صحیح تعداد لکھوائے، اس میں کمی نہ کرے۔ آگے کہا جا رہا ہے کہ یہ مقروض اگر کم عقل یا کمزور بچہ یا مجنون ہے تو اس کے ولی کو چاہیے کہ انصاف کے ساتھ لکھوالے تاکہ صاحب حق (قرض دینے والے) کو نقصان نہ ہو۔

گواہ رکھ لو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جنہیں تم گواہوں میں سے پسند کر لو،^(۱) تاکہ ایک کی بھول چوک کو دوسری یاد دلا دے^(۲) اور گواہوں کو چاہئے کہ وہ جب بلائے جائیں تو انکار نہ کریں اور قرض کو جس کی مدت مقرر ہے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو لکھنے میں کاہلی نہ کرو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات بہت انصاف والی ہے اور گواہی کو بھی درست رکھنے والی اور شک و شبہ سے بھی زیادہ بچانے والی ہے،^(۳) ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ معاملہ نقد تجارت کی شکل میں ہو جو آپس میں تم لین دین کر رہے ہو تو تم پر اس کے نہ لکھنے میں کوئی گناہ نہیں۔ خرید و فروخت کے وقت بھی گواہ مقرر کر

صَغِيرًا ذَكَبَ إِلَىٰ آخِيهِ ذَلِكُمْ أَصْطَقَ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ
بِالشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً
تُدْرِكُوا بِهَا صَئِبَكُمْ فَمِصَّةٌ عَلَىٰكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا
تَكْتُبُوهَا وَأَشْهَدُوا وَإِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا بَيْعًا كَاتِبًا
وَلَا شَهِيدًا وَإِنْ تَعَلَّقُوا فِئْتَهُ فُتُوْا بِكُمْ
وَأَسْتَعُوْا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۳۰﴾

(۱) یعنی جن کی دین داری اور عدالت پر تم مطمئن ہو۔ علاوہ ازیں قرآن کریم کی اس نص سے معلوم ہوا کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔ نیز مرد کے بغیر صرف ایک عورت کی گواہی بھی جائز نہیں، سوائے ان معاملات کے جن پر عورت کے علاوہ کوئی اور مطلع نہیں ہو سکتا۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ مدعی کی ایک قسم کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی پر فیصلہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جس طرح ایک مرد گواہ کے ساتھ فیصلہ کرنا جائز ہے جب کہ دوسرے گواہ کی جگہ مدعی قسم کھالے۔ فقہائے احناف کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں، جب کہ محدثین اس کے قائل ہیں، کیونکہ حدیث سے ایک گواہ اور قسم کے ساتھ فیصلہ کرنا ثابت ہے اور دو عورتیں جب ایک مرد گواہ کے برابر ہیں تو دو عورتوں اور قسم کے ساتھ فیصلہ کرنا بھی جائز ہو گا۔ (فتح القدیر)

(۲) یہ ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کو مقرر کرنے کی علت و حکمت ہے۔ یعنی عورت عقل اور یادداشت میں مرد سے کمزور ہے (جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں بھی عورت کو ناقص العقل کہا گیا ہے) اس میں عورت کے استخفاف اور فروتری کا اظہار نہیں ہے (جیسا کہ بعض لوگ باور کراتے ہیں) بلکہ ایک فطری کمزوری کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت پر مبنی ہے۔ مکابرة کوئی اس کو تسلیم نہ کرے تو اور بات ہے۔ لیکن حقائق و واقعات کے اعتبار سے یہ ناقابل تردید ہے۔

(۳) یہ لکھنے کے فوائد ہیں کہ اس سے انصاف کے تقاضے پورے ہوں گے، گواہی بھی درست رہے گی (کہ گواہ کے فوت یا غائب ہونے کی صورت میں بھی تحریر کام آئے گی) اور شک و شبہ سے بھی فریقین محفوظ رہیں گے۔ کیونکہ شک پڑنے کی صورت میں تحریر دیکھ کر شک دور کر لیا جاسکتا ہے۔

لیا کرو^(۱) اور (یاد رکھو کہ) نہ تو لکھنے والے کو نقصان پہنچایا جائے نہ گواہ کو^(۲) اور اگر تم یہ کرو تو یہ تمہاری کھلی نافرمانی ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرو،^(۳) اللہ تمہیں تعلیم دے رہا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے (۲۸۲) اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو رہن قبضہ میں رکھ لیا کرو،^(۴) ہاں اگر آپس میں ایک دوسرے سے مطمئن ہو تو جسے امانت دی گئی ہے وہ اسے ادا کر دے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے جو اس کا رب ہے۔^(۵) اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو اسے چھپالے وہ گنہگار دل والا ہے^(۶) اور جو کچھ تم کرتے ہو اسے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ (۲۸۳)

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنَ مَقْبُوضَهُ فَإِنْ
أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الْأُدْيَةَ الْأَمَانَةَ وَلْيَقِئِ اللَّهُ
رَبَّهُ وَلَا تَكْتُمُوا لِلشَّهَادَةِ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ لَشَرٌّ قَلْبُهُ
وَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿۲۸۳﴾

(۱) یہ وہ خرید و فروخت ہے جس میں ادھار ہو یا سودا طے ہو جانے کے بعد بھی انحراف کا خطرہ ہو۔ ورنہ اس سے پہلے نقد سودے کو لکھنے سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ بعض نے اس بیع سے مکان، دکان، باغ یا حیوانات کی بیع مراد لی ہے۔ (السر القاسم)

(۲) ان کو نقصان پہنچانا یہ ہے کہ دور دراز کے علاقے میں ان کو بلایا جائے کہ جس سے ان کی مصروفیات میں حرج یا کاروبار میں نقصان ہو یا ان کو جھوٹی بات لکھنے یا اس کی گواہی دینے پر مجبور کیا جائے۔

(۳) یعنی جن باتوں کی تاکید کی گئی ہے، ان پر عمل کرو اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے، ان سے اجتناب کرو۔ (۴) اگر سفر میں قرض کا معاملہ کرنے کی ضرورت پیش آجائے اور وہاں لکھنے والا یا کانفذ پنل وغیرہ نہ ملے تو اس کی متبادل صورت بتلائی جا رہی ہے کہ قرض لینے والا کوئی چیز دائن (قرض دینے والے) کے پاس رہن (گروی) رکھ دے۔ اس سے گروی کی مشروعیت اور اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ نبی ﷺ نے بھی اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس گروی رکھی تھی۔ (صحیحین) تاہم اگر مَزْهُونَةٌ (گروی رکھی ہوئی چیز) ایسی ہے جس سے نفع موصول ہوتا ہے تو اس نفع کا حق دار مالک ہو گا نہ کہ دائن۔ البتہ اس پر دائن کا اگر کچھ خرچ ہوتا ہے تو اس سے وہ اپنا خرچہ وصول کر سکتا ہے۔ باقی نفع مالک کو ادا کرنا ضروری ہے۔

(۵) یعنی اگر ایک دوسرے پر اعتماد ہو تو بغیر گروی رکھے بھی ادھار کا معاملہ کر سکتے ہو۔ امانت سے مراد یہاں قرض ہے، اللہ سے ڈرتے ہوئے اسے صحیح طریقے سے ادا کرے۔

(۶) گواہی کا چھپانا کبیرہ گناہ ہے، اس لیے اس پر سخت وعید یہاں قرآن میں اور احادیث میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اسی

بَلِّغْ مَا فِي التَّوْرَةِ وَبِالْأَنْبِيَاءِ وَإِنْ شُدُّوا مَا فِي
أَنْفُسِكُمْ أَوْ تَخَفُوا يَعْسَبْكُمْ بِهِ اللَّهُ فَيَغْفِرْ لِمَنْ
يَشَاءُ وَيُعَذِّبْ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۳۱﴾

آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے۔
تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے تم ظاہر کرو یا چھپاؤ،
اللہ تعالیٰ اس کا حساب تم سے لے گا۔^(۱) پھر جسے چاہے

لیے صحیح گواہی دینے کی فضیلت بھی بڑی ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ”وہ سب سے بہتر گواہ ہے جو گواہی طلب کرنے سے قبل ہی از خود گواہی کے لیے پیش ہو جائے“ «أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ الشُّهَدَاءِ؟ الَّذِي يَأْتِي بِشَهَادَتِهِ قَبْلَ أَنْ يُسْأَلَ» (صحیح مسلم، کتاب الأفضیة، باب بیان خیر الشہود) ایک دوسری روایت میں بدترین گواہ کی نشان دہی بھی فرمادی گئی ہے۔ «أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِشَرِّ الشُّهَدَاءِ؟ الَّذِي يَشْهَدُونَ قَبْلَ أَنْ يُسْتَشْهَدُوا» (صحیح بخاری، کتاب الرقاق۔ مسلم، کتاب فضائل الصحابة) ”کیا میں تمہیں وہ گواہ نہ بتلاؤں جو بدترین گواہ ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں جو گواہی طلب کرنے سے قبل ہی گواہی دیتے ہیں“ مطلب ہے یعنی جھوٹی گواہی دے کر گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ نیز آیت میں دل کا خاص ذکر کیا گیا ہے، اس لیے کہ کتمان دل کا فعل ہے۔ علاوہ ازیں دل تمام اعضا کا سردار ہے اور یہ ایسا مفعول گوشت ہے کہ اگر یہ صحیح رہے تو سارا جسم صحیح رہتا ہے اور اگر اس میں فساد آ جائے تو سارا جسم فساد کا شکار ہو جاتا ہے۔ «أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ؛ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ»۔ (صحیح بخاری، کتاب الإیمان، باب فضل من استبرأ لدينه)

(۱) احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام بڑے پریشان ہوئے۔ انہوں نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! نماز، روزہ، زکوٰۃ و جہاد وغیرہ یہ سارے اعمال، جن کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، ہم بجا لاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہماری طاقت سے بالا نہیں ہیں۔ لیکن دل میں پیدا ہونے والے خیالات اور دوسوسوں پر تو ہمارا اختیار ہی نہیں ہے اور وہ تو انسانی طاقت سے ہی ماورا ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر بھی محاسبہ کا اعلان فرمادیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ فی الحال تم «سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا» ہی کہو۔ چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے جذبہ سمع و طاعت کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اسے آیت ﴿لَا يَكْفُرُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا) سے منسوخ فرمادیا (ابن کثیر و فتح القدر) صحیحین و سنن اربعہ کی یہ حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ «إِنَّ اللَّهَ تَجَاوَزَ لِي عَنِ أَثْمِي مَا وَسَوَّسَتْ بِهِ صُدُورُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَنْكَلُمْ» (صحیح بخاری، کتاب العتق، باب الخطأ والنسيان في العتاقة..... و مسلم، کتاب الإیمان، باب تجاوز الله عن حديث النفس.....) (اللہ تعالیٰ نے میری امت سے جی میں آنے والی باتوں کو معاف کر دیا ہے۔ البتہ ان پر گرفت ہوگی جن پر عمل کیا جائے یا جن کا اظہار زبان سے کر دیا جائے) اس سے معلوم ہوا کہ دل میں گزرنے والے خیالات پر محاسبہ نہیں ہوگا، صرف ان پر محاسبہ ہوگا جو پختہ عزم و ارادہ میں ڈھل جائیں یا عمل کا قالب اختیار کر لیں۔ اس کے برعکس امام ابن جریر طبری کا خیال ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے کیونکہ محاسبہ معاقبہ کو لازم نہیں ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کا بھی محاسبہ کرے، اس کو سزا بھی ضرور دے، بلکہ اللہ تعالیٰ محاسبہ تو ہر ایک کا کرے گا، لیکن بہت سے لوگ ہوں گے کہ محاسبہ کرنے کے

بخشے اور جسے چاہے سزا دے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲۸۴)

رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے اتری اور مومن بھی ایمان لائے، یہ سب اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، اس کے رسولوں میں سے کسی میں ہم تفریق نہیں کرتے،^(۱) انہوں نے کہہ دیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی، ہم تیری بخشش طلب کرتے ہیں اے ہمارے رب! اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹنا ہے، (۲۸۵)

اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، جو نیکی وہ کرے وہ اس کے لئے اور جو برائی وہ

أَمَّنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِنَ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ
كُلٌّ أَمَّنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ ۚ لَا تَفْرِقُوا
بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ ۚ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا
عُفْرَانًا ۚ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ﴿۲۸۵﴾

لَا يَكْفُرُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَسَعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا
اَكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنَّا كُنَّا مُسِيئِينَ ۚ أَوْ لَخَطَا نَا رَبَّنَا

بعد اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمادے گا بلکہ بعض کے ساتھ تو یہ معاملہ فرمائے گا کہ اس کا ایک ایک گناہ یاد کرا کہ ان کا اس سے اعتراف کروائے گا اور پھر فرمائے گا کہ میں نے دنیا میں ان پر پردہ ڈالے رکھا، جا آج میں ان کو معاف کرتا ہوں (یہ حدیث صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں ہے بحوالہ ابن کثیر) اور بعض علمائے کما ہے کہ یہاں نسخ اصطلاحی معنی میں نہیں ہے بلکہ بعض دفعہ اسے وضاحت کے معنی میں بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام کے دل میں جو شبہ اس آیت سے پیدا ہوا تھا، اسے آیت ﴿لَا يَكْفُرُ اللَّهُ نَفْسًا﴾ اور حدیث «إِنَّ اللَّهَ تَجَاوَزَ لِي عَنْ أُمَّتِي...» وغیرہ سے دور کر دیا گیا۔ اس طرح ناخ منسوخ ماننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

(۱) اس آیت میں پھر ان ایمانیات کا ذکر ہے جن پر اہل ایمان کو ایمان رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے اگلی آیت ﴿لَا يَكْفُرُ اللَّهُ﴾ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت اور اس کے فضل و کرم کا تذکرہ ہے کہ اس نے انسانوں کو کسی ایسی بات کا مکلف نہیں کیا ہے جو ان کی طاقت سے بالا ہو۔ ان دونوں آیات کی احادیث میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ”جو شخص سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں رات کو پڑھ لیتا ہے تو یہ اس کو کافی ہو جاتی ہیں“ (صحیح بخاری۔ ابن کثیر) یعنی اس عمل کی بدولت اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرماتا ہے۔ دوسری حدیث میں ہے۔ نبی ﷺ کو معراج کی رات جو تین چیزیں ملیں، ان میں سے ایک سورہ بقرہ کی یہ آخری دو آیات بھی ہیں۔ (صحیح مسلم، باب فی ذکر سدرۃ المنتهی) کئی روایت میں یہ بھی وارد ہے کہ اس سورہ کی آخری آیات آپ ﷺ کو ایک خزانے سے عطا کی گئیں جو عرش الہی کے نیچے ہے۔ اور یہ آیات آپ کے سوا کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں (الاحمد، نسائی، طبرانی، بیہقی، حاکم دارمی وغیرہ۔ درمنشوں حضرت معاذ رضی اللہ عنہما اس سورت کے خاتمے پر آمین کہا کرتے تھے۔ (ابن کثیر)

کرے وہ اس پر ہے، اے ہمارے رب! اگر ہم بھول گئے ہوں یا خطا کی ہو تو ہمیں نہ پکڑنا، اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا، اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں طاقت نہ ہو اور ہم سے درگزر فرما! اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کرنا تو ہی ہمارا مالک ہے، ہمیں کافروں کی قوم پر غلبہ عطا فرما۔ (۲۸۶)

سورہ آل عمران مدنی ہے۔ اس میں دو سو آیات اور بیس رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الم (۱)

اللہ تعالیٰ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو زندہ اور سب کا نگہبان ہے۔ (۲)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ

لِلّٰهِ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ

☆ یہ سورت مدنی ہے اس کی تمام آیتیں مختلف اوقات میں ہجرت کے بعد اتری ہیں۔ اور اس کا ابتدائی حصہ یعنی ۸۳ آیات تک عیسائیوں کے وفد نجران کے بارے میں نازل ہوا ہے جو ۹ ہجری میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ عیسائیوں نے آکر نبی ﷺ سے اپنے عیسائی عقائد اور اسلام کے بارے میں مذاکرہ و مباحثہ کیا، جس کا رد کرتے ہوئے انہیں دعوت مباہلہ بھی دی گئی، جسکی تفصیل آگے آئے گی۔ اسی پس منظر میں قرآن کریم کی ان آیات کا مطالعہ کیا جائے۔

(۱) حَیٌّ اور قَیُّوْمٌ اللہ تعالیٰ کی خاص صفات ہیں جن کا مطلب وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا، اسے موت اور فنا نہیں۔ قیوم کا مطلب ساری کائنات کا قائم رکھنے والا، محافظ اور نگران، ساری کائنات اس کی محتاج وہ کسی کا محتاج نہیں۔ عیسائی حضرت عیسیٰ کو اللہ یا ابن اللہ یا تین میں سے ایک مانتے تھے۔ گویا ان کو کہا جا رہا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کی مخلوق ہیں، وہ ماں کے بیٹے سے پیدا ہوئے اور ان کا زمانہ ولادت بھی تخلیق کائنات سے بہت عرصے بعد کا ہے تو پھر وہ اللہ یا اللہ کا بیٹا کس طرح ہو سکتے ہیں؟ اگر تمہارا عقیدہ صحیح ہو تو انہیں مخلوق کے بجائے الوہی صفات کا حامل اور قدیم ہونا چاہیے تھا۔ نیز ان پر موت بھی نہیں آنی چاہیے لیکن ایک وقت آئے گا کہ وہ موت سے بھی کنار ہوں گے۔ اور عیسائیوں کے بقول ہکنار ہو چکے۔ احادیث میں آتا ہے کہ تین آیتوں میں اللہ کا اسم اعظم ہے جس کے ذریعے سے دعا کی جائے تو وہ رد نہیں ہوتی۔ ایک یہی آل عمران کی آیت۔ دوسری آیت انکری میں ﴿اللّٰهُ لَکَلّٰہِ الْاِحْمٰقُ الْاَبْتُوْمُ﴾ تیسری سورہ ط میں ﴿وَعَدَّتْ الْجُوْدُ لِلْحٰی الْقَیُّوْمِ﴾ (ابن کثیر۔ تفسیر آیت انکری)

جس نے آپ پر حق کے ساتھ اس کتاب کو نازل فرمایا ہے،^(۱) جو اپنے سے پہلے کی تصدیق کرنے والی ہے، اسی نے اس سے پہلے تورات اور انجیل کو اتارا تھا۔ (۳)

اس سے پہلے، لوگوں کو ہدایت کرنے والی بنا کر،^(۲) اور قرآن بھی اسی نے اتارا،^(۳) جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے کفر کرتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے، بدلہ لینے والا ہے۔ (۴)

یقیناً اللہ تعالیٰ پر زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ (۵)

وہ ماں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں جس طرح کی چاہتا ہے بناتا ہے۔^(۴) اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں وہ غالب ہے، حکمت والا ہے۔ (۶)

تَنْزِيلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ يَا الْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
وَآتَزَّلَ الْعُورَةَ وَالْأَنْجِيلَ ۝

مِنْ قَبْلِ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ إِنَّ الْعُورَةَ كَفَرُوا
بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۝

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَآ إِلَهَ إِلَّا
هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

(۱) یعنی اس کے منزل من اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ کتاب سے مراد قرآن مجید ہے۔

(۲) اس سے پہلے انبیاء پر جو کتابیں نازل ہوئیں۔ یہ کتاب اس کی تصدیق کرتی ہے یعنی جو باتیں ان میں درج تھیں، ان کی صداقت اور ان میں بیان کردہ پیش گوئیوں کا اعتراف کرتی ہے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ قرآن کریم بھی اسی ذات کا نازل کردہ ہے جس نے پہلے بہت سی کتابیں نازل فرمائیں۔ اگر یہ کسی اور کی طرف سے یا انسانی کاوشوں کا نتیجہ ہو تا تو ان میں باہم مطابقت کے بجائے مخالفت ہوتی۔

(۳) یعنی اپنے اپنے وقت میں تورات اور انجیل بھی یقیناً لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ تھیں، اس لیے کہ ان کے اتارنے کا مقصد ہی یہی تھا۔ تاہم اس کے بعد ﴿وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ﴾ دوبارہ کہہ کر وضاحت فرمادی۔ کہ مگر اب تورات و انجیل کا دور ختم ہو گیا، اب قرآن نازل ہو چکا ہے، وہ فرقان ہے اور اب صرف وہی حق و باطل کی پہچان ہے، اس کو سچا مانے بغیر عند اللہ کوئی مسلمان اور مومن نہیں۔

(۴) خوب صورت یا بد صورت، مذکر یا مؤنث، نیک بخت یا بد بخت، ناقص الخلق یا تام الخلق۔ جب رحم مادر میں سارے تصرفات صرف اللہ تعالیٰ ہی کرنے والا ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کس طرح ہو سکتے ہیں جو خود بھی مرحلہ تخلیق سے گزر کر دنیا میں آئے ہیں جس کا سلسلہ اللہ نے رحم مادر میں قائم فرمایا ہے۔

وہی اللہ تعالیٰ ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری جس میں واضح مضبوط آیتیں ہیں جو اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ آیتیں ہیں۔^(۱) پس جن کے دلوں میں کجی ہے وہ تو اس کی متشابہ آیتوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں، فتنے کی طلب اور ان کی مراد کی جستجو کے لئے، حالانکہ ان کے حقیقی مراد کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا^(۲) اور پختہ و مضبوط علم والے ہی کہتے ہیں کہ ہم تو ان پر ایمان لاپچھے، یہ ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ①

(۱) - مُنْخَمَّاتٌ سے مراد وہ آیات ہیں جن میں اوامرو نواہی، احکام و مسائل اور قصص و حکایات ہیں جن کا مفہوم واضح اور اٹل ہے، اور ان کے سمجھنے میں کسی کو اشکال پیش نہیں آتا۔ اس کے برعکس آيَاتٌ مُتَشَابِهَاتٌ ہیں مثلاً اللہ کی ہستی، قضا و قدر کے مسائل، جنت و دوزخ، ملائکہ وغیرہ یعنی ماوراء عقل حقائق جن کی حقیقت سمجھنے سے عقل انسانی قاصر ہو یا ان میں ایسی تاویل کی گنجائش ہو یا کم از کم ایسا ابہام ہو جس سے عوام کو گمراہی میں ڈالنا ممکن ہو۔ اسی لیے آگے کہا جا رہا ہے کہ جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ آیات متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کے ذریعے سے ”فتنے“ برپا کرتے ہیں۔ جیسے عیسائی ہیں۔ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عبد اللہ اور نبی کہا ہے یہ واضح اور محکم بات ہے۔ لیکن عیسائی اسے چھوڑ کر قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ جو کہا گیا ہے، اس سے اپنے گمراہ کن عقائد پر غلط استدلال کرتے ہیں۔ یہی حال اہل بدعت کا ہے۔ قرآن کے واضح عقائد کے برعکس اہل بدعت نے جو غلط عقائد گھڑ رکھے ہیں، وہ انہی مُتَشَابِهَاتٌ کو بنیاد بناتے ہیں اور بسا اوقات مُنْخَمَّاتٌ کو بھی اپنے فلسفیانہ استدلال کے گورکھ دھندے سے مُتَشَابِهَاتٌ بنا دیتے ہیں۔ اَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ۔ ان کے برعکس صحیح العقیدہ مسلمان محکمات پر عمل کرتا ہے اور مُتَشَابِهَاتٌ کے مفہوم کو بھی (اگر اس میں اشتباہ ہو) محکمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ قرآن نے انہی کو ”اصل کتاب“ قرار دیا ہے۔ جس سے وہ فتنے سے بھی محفوظ رہتا ہے اور عقائد کی گمراہی سے بھی جَعَلْنَا اللَّهُ مِنْهُمْ

(۲) تاویل کے ایک معنی تو ہیں ”کسی چیز کی اصل حقیقت“ اس معنی کے اعتبار سے اِلَّا اللَّهُ پر وقف ضروری ہے۔ کیونکہ ہر چیز کی اصل حقیقت واضح طور پر صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ تاویل کے دوسرے معنی ہیں ”کسی چیز کی تفسیر و تعبیر اور بیان و توضیح“ اس اعتبار سے اِلَّا اللَّهُ پر وقف کے بجائے ﴿وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ پر بھی وقف کیا جا سکتا ہے کیوں کہ مضبوط علم والے بھی صحیح تفسیر و توضیح کا علم رکھتے ہیں۔ ”تاویل“ کے یہ دونوں معنی قرآن کریم کے استعمال سے ثابت ہیں۔ (مخلص از ابن کثیر)

نصیحت تو صرف عقل مند حاصل کرتے ہیں۔ (۷)
 اے ہمارے رب! ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے
 دل ٹیڑھے نہ کر دے اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت
 عطا فرما، یقیناً تو ہی بہت بڑی عطا دینے والا ہے۔ (۸)
 اے ہمارے رب! تو یقیناً لوگوں کو ایک دن جمع کرنے
 والا ہے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، یقیناً اللہ تعالیٰ
 وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ (۹)

کافروں کو ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ تعالیٰ (کے
 عذاب) سے چھڑانے میں کچھ کام نہ آئیں گی، یہ تو جہنم کا
 ایندھن ہی ہیں۔ (۱۰)

جیسا آل فرعون کا حال ہوا، اور انکا جو ان سے پہلے تھے،
 انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، پھر اللہ تعالیٰ نے بھی
 انہیں ان کے گناہوں پر پکڑ لیا، اور اللہ تعالیٰ سخت
 عذاب والا ہے۔ (۱۱)

کافروں سے کہہ دیجئے! کہ تم عنقریب مغلوب کئے جاؤ
 گے^(۱) اور جہنم کی طرف جمع کئے جاؤ گے اور وہ برا ٹھکانا
 ہے۔ (۱۲)

یقیناً تمہارے لئے عبرت کی نشانی تھی ان دو جماعتوں میں
 جو سمجھ گئی تھیں، ایک جماعت تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑ
 رہی تھی اور دوسرا گروہ کافروں کا تھا وہ انہیں اپنی
 آنکھوں سے اپنے سے دگنا دیکھتے تھے^(۲) اور اللہ تعالیٰ

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ
 رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

رَبَّنَا أَنْتَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ
 الْوَعْدَ ۝

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُغْنِي عَنْهُمْ آمْوَالَهُمْ وَلَا أَوْلَادَهُمْ
 مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَأُولَئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ۝

كَذَّابٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا
 فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَاللَّهُ سَدِيدٌ الْعِقَابِ ۝

قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَعْلَبُونَ وَنَحْمَسُونَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ
 وَيُخْسِئُ إِلَهُهُمْ ۝

فَدَان كَان لَكُمْ آيَةٌ فِي فَمْتَيْنِ الثَّقَاتِ فَمَتَّعْنَا فِي سَبِيلِ
 اللَّهِ وَالْآخِرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مُمْلَكِينَ وَاللَّهُ
 يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي
 الْأَبْصَارِ ۝

(۱) یہاں کافروں سے مراد یہودی ہیں۔ اور یہ پیش گوئی جلد ہی پوری ہو گئی۔ چنانچہ بنو قینقاع اور بنو نضیر جلا وطن کیے

گئے، بنو قریظہ قتل کیے گئے۔ پھر خیبر فتح ہو گیا اور تمام یہودیوں پر جزیہ عائد کر دیا گیا (فتح القدر)

(۲) یعنی ہر فریق، دوسرے فریق کو اپنے سے دو گنا دیکھتا تھا۔ کافروں کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی، انہیں مسلمان دو
 ہزار کے قریب دکھائی دیتے تھے۔ مقصد اس سے ان کے دلوں میں مسلمانوں کی دھاک بٹھانا تھا۔ اور مسلمانوں کی تعداد
 تین سو سے کچھ اوپر (یا ۳۱۳) تھی، انہیں کافر ۶۰۰ اور ۷۰۰ کے درمیان نظر آتے تھے۔ دراصل حاکم ان کی اصل تعداد

جسے چاہے اپنی مدد سے قوی کرتا ہے۔ یقیناً اس میں آنکھوں والوں کے لئے بڑی عبرت ہے۔ (۱۳)

مرغوب چیزوں کی محبت لوگوں کے لئے مزنن کر دی گئی ہے، جیسے عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے جمع کئے ہوئے خزانے اور نشاندار گھوڑے اور چوپائے اور کھیتی،^(۱) یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور لوٹنے کا اچھا ٹھکانا تو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے (۱۳)

رُزِينَ لِلنَّاسِ حُثَّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ
وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْحَبْلِ
السُّوْدَانِ وَالْأَنْعَامِ وَالْعُرْتِ ذَلِكُمْ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَبَآئِ ۝

ہزار کے قریب (۳ گنا) تھی مقصد اس سے مسلمانوں کے عزم و حوصلہ میں اضافہ کرنا تھا۔ اپنے سے تین گنا دیکھ کر ممکن تھا مسلمان مرعوب ہو جاتے۔ جب وہ تین گنا کے بجائے دو گنا نظر آئے تو ان کا حوصلہ پست نہیں ہوا۔ لیکن یہ دگنا دیکھنے کی کیفیت ابتدا میں تھی، پھر جب دونوں گروہ آسنے سامنے صف آرا ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے برعکس دونوں کو ایک دوسرے کی نظروں میں کم کر کے دکھایا تاکہ کوئی بھی فریق لڑائی سے گریز نہ کرے بلکہ ہر ایک پیش قدمی کی کوشش کرے (ابن کثیر) یہ تفصیل سورۃ الأنفال۔ آیت ۴۴ میں بیان کی گئی ہے۔ یہ جنگ بدر کا واقعہ ہے جو ہجرت کے بعد دوسرے سال مسلمانوں اور کافروں کے درمیان پیش آیا۔ یہ کئی لحاظ سے نہایت اہم جنگ تھی۔ ایک تو اس لیے کہ یہ پہلی جنگ تھی۔ دوسرے، یہ جنگی منصوبہ بندی کے بغیر ہوئی۔ مسلمان ابو سفیان کے قافلے کے لیے نکلے تھے جو شام سے سامان تجارت لے کر مکہ جا رہا تھا، مگر اطلاع مل جانے کی وجہ سے وہ اپنا قافلہ تو بچا کر لے گیا، لیکن کفار مکہ اپنی طاقت و کثرت کے گھمنڈ میں مسلمانوں پر چڑھ دوڑے اور مقام بدر میں یہ پہلا معرکہ برپا ہوا۔ تیسرے، اس میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد حاصل ہوئی، چوتھے، اس میں کافروں کو عبرت ناک شکست ہوئی، جس سے آئندہ کے لیے کافروں کے حوصلے پست ہو گئے۔

(۱) شَهَوَاتٌ سے مراد یہاں مُشْتَهَاتٌ ہیں یعنی وہ چیزیں جو طبعی طور پر انسان کو مرغوب اور پسندیدہ ہیں۔ اسی لیے ان میں رغبت اور ان کی محبت ناپسندیدہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ اعتدال کے اندر اور شریعت کے دائرے میں رہے۔ ان کی تزیین بھی اللہ کی طرف سے بطور آزمائش ہے۔ ﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ ذِينَةً لَهُمُ الْآيَاتُ﴾ (الکہف، ۷) (ہم نے زمین پر جو کچھ ہے، اسے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ہم لوگوں کو آزمائیں) سب سے پہلے عورت کا ذکر کیا ہے کیونکہ یہ ہر بالغ انسان کی سب سے بڑی ضرورت بھی ہے اور سب سے زیادہ مرغوب بھی۔ خود نبی ﷺ کا فرمان ہے: «حُبِّبَ إِلَيَّ النِّسَاءُ وَالطِّيبُ» (مسند احمد) «عورت اور خوشبو مجھے محبوب ہیں»۔ اسی طرح نبی ﷺ نے نیک عورت کو «دنیا کی سب سے بہتر متاع» قرار دیا ہے «خَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ» اس لیے اس کی محبت شریعت کے دائرے سے تجاوز نہ کرے تو یہ بہترین رفیق زندگی بھی ہے اور زادِ آخرت بھی۔ ورنہ یہی عورت مرد کے لیے سب سے بڑا فتنہ ہے۔ فرمان رسول ﷺ ہے: «مَا تَرَكْتُ بَعْدِي فِتْنَةً أَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ» (صحیح بخاری کتاب

آپ کہہ دیجئے! کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز بتاؤں؟ تقویٰ والوں کے لئے ان کے رب تعالیٰ کے پاس جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے^(۱) اور پاکیزہ بیویاں^(۲) اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہے، سب بندے اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں۔ (۱۵)

جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لا چکے اس لئے ہمارے گناہ معاف فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ (۱۶)

قُلْ اُوْنِبْتُكُمْ بِعَدْوِيْنَ ذٰلِكُمْ لِيَاْتِيَنَّ الْاَنْفَالَ عِنْدَ رَبِّهِمْ
جَدِيْكَ يَحْوِيْ مِنْ مَحْتَمِلِهَا الْاَنْفَالُ خَلِيْدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ
مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعٰبِدِيْنَ ﴿۱۵﴾

اَلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ رَبَّ اِيْمًا اَمَّا مَا غُفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَرَبَّنَا
عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾

النكاح' باب ما يتسقى من شؤم المرأة' "میرے بعد جو فتنے رونما ہوں گے، ان میں مردوں کے لیے سب سے بڑا فتنہ عورتوں کا ہے۔" اسی طرح بیٹوں کی محبت ہے۔ اگر اس سے مقصد مسلمانوں کی قوت میں اضافہ اور بقا و تکثیر نسل ہے تو محمود ہے ورنہ مذموم۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے: «تَزَوَّجُوا النُّوْدُودَ النُّوْدُودَ؛ فَإِنِّي مَكَاثِرٌ بِكُمْ الْأُمَّمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» (بہت محبت کرنے والی اور زیادہ سچے جننے والی عورت سے شادی کرو، اس لیے کہ میں قیامت والے دن دوسری امتوں کے مقابلے میں اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں گا) اس آیت سے رہبانیت کی تردید اور تحریک خاندانی منصوبہ بندی کی تردید بھی ثابت ہوتی ہے کیونکہ بَنِیْتٌ جمع ہے۔ مال و دولت سے بھی مقصود قیام معیشت، صلہ رحمی، صدقہ و خیرات اور اسے امور خیر میں خرچ کرنا اور سوال سے بچنا ہے تاکہ اللہ کی رضا حاصل ہو، تو اس کی محبت بھی عین مطلوب ہے ورنہ مذموم۔ گھوڑوں سے مقصد، جہاد کی تیاری، دیگر جانوروں سے کھیتی باڑی اور بار برداری کا کام لینا اور زمین سے اس کی پیداوار حاصل کرنا ہو تو یہ سب پسندیدہ ہیں اور اگر مقصود محض دنیا کمانا اور پھر اس پر فخر و غرور کا اظہار کرنا اور یاد الہی سے غافل ہو کر عیش و عشرت سے زندگی گزارنا ہے تو یہ سب مفید چیزیں اس کے لیے وبال جان ثابت ہوں گی۔ فَنَاطِيْرٌ فَنَاطِيْرٌ (خزانہ) کی جمع ہے۔ مراد ہے خزانے یعنی سونے چاندی اور مال و دولت کی فراوانی اور کثرت۔ اَلْمُسَوَّبَةُ وہ گھوڑے جو چراگاہ میں چرنے کے لیے چھوڑے گئے ہوں۔ یا جہاد کے لیے تیار کیے گئے ہوں یا نشان زدہ، جن پر امتیاز کے لیے کوئی نشان یا نمبر لگا دیا جائے (فتح القدر و ابن کثیر)

(۱) اس آیت میں اہل ایمان کو بتلایا جا رہا ہے کہ دنیا کی مذکورہ چیزوں میں ہی مت کھوجانا، بلکہ ان سے بہتر تو وہ زندگی اور اس کی نعمتیں ہیں جو رب کے پاس ہیں، جن کے مستحق اہل تقویٰ ہی ہوں گے۔ اس لیے تم تقویٰ اختیار کرو۔ اگر یہ تمہارے اندر پیدا ہو گیا تو یقیناً تم دین و دنیا کی بھلائیاں اپنے دامن میں سمیٹ لو گے۔

(۲) پاکیزہ، یعنی وہ دنیاوی میل کچیل، حیض و نفاس اور دیگر آلودگیوں سے پاک ہوں گی اور پاک دامن ہوں گی۔ اس سے اگلی دو آیات میں اہل تقویٰ کی صفات کا تذکرہ ہے۔

جو صبر کرنے والے اور سچ بولنے والے اور فرمانبرداری کرنے والے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے اور پچھلی رات کو بخشش مانگنے والے ہیں۔ (۱۷)

اللہ تعالیٰ، فرشتے اور اہل علم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں^(۱) اور وہ عدل کو قائم رکھنے والا ہے، اس غالب اور حکمت والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں (۱۸)

بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے،^(۲)

الضَّالِّينَ وَالضَّالِّينَ وَالضَّالِّينَ وَالضَّالِّينَ
وَالْمُتَعَفِّينَ بِالسَّحَابِ ⑤

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَائِمُ
قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ⑥

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَتِ الدِّينَ

(۱) - شہادت کے معنی بیان کرنے اور آگاہ کرنے کے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا اور بیان کیا، اس کے ذریعے سے اس نے اپنی وحدانیت کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی۔ (فتح القدیر) فرشتے اور اہل علم بھی اس کی توحید کی گواہی دیتے ہیں۔ اس میں اہل علم کی بڑی فضیلت اور عظمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور فرشتوں کے ناموں کے ساتھ ان کا ذکر فرمایا ہے تاہم اس سے مراد صرف وہ اہل علم ہیں جو کتاب و سنت کے علم سے بہرہ ور ہیں (فتح القدیر)

(۲) اسلام وہی دین ہے جس کی دعوت و تعلیم ہر پیغمبر اپنے اپنے دور میں دیتے رہے ہیں اور اب اس کی کامل ترین شکل وہ ہے جسے نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ نے دنیا کے سامنے پیش کیا، جس میں توحید و رسالت اور آخرت پر اس طرح یقین و ایمان رکھنا ہے جس طرح نبی کریم ﷺ نے بتلایا ہے۔ اب محض یہ عقیدہ رکھ لینا کہ اللہ ایک ہے یا کچھ اچھے عمل کر لینا، یہ اسلام نہیں نہ اس سے نجات آخرت ہی ملے گی۔ ایمان و اسلام اور دین یہ ہے کہ اللہ کو ایک مانا جائے اور صرف اسی ایک معبود کی عبادت کی جائے، محمد رسول اللہ ﷺ سمیت تمام انبیاء پر ایمان لایا جائے۔ اور نبی ﷺ کی ذات پر رسالت کا خاتمہ تسلیم کیا جائے اور ایمانیت کے ساتھ ساتھ وہ عقائد و اعمال اختیار کیے جائیں جو قرآن کریم میں یا حدیث رسول ﷺ میں بیان کیے گئے ہیں۔ اب اس دین اسلام کے سوا کوئی اور دین عند اللہ قبول نہیں ہو گا۔ ﴿ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴾ (آل عمران - ۸۵) نبی ﷺ کی رسالت پوری انسانیت کے لیے ہے۔ ﴿ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ﴾ (الأعراف - ۱۵۸) ”کہہ دیجئے! اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ ﴿ تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ﴾ (الفرقان - ۱) ”برکتوں والی ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا تاکہ وہ جانوں کا ڈرانے والا ہو“ اور حدیث میں ہے، نبی ﷺ نے فرمایا ”قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، جو یہودی یا نصرانی مجھ پر ایمان لائے بغیر فوت ہو گیا، وہ جنسی ہے۔“ (صحیح مسلم) مزید فرمایا ”بُعِثْتُ إِلَى الْأَخْمَرِ وَالْأَسْوَدِ“ (میں احمر و اسود یعنی تمام انسانوں کے لیے) نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں) اسی لیے آپ ﷺ نے اپنے وقت کے تمام سلاطین اور بادشاہوں کو خطوط تحریر فرمائے جن میں انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی (صحیحین۔ بحوالہ ابن کثیر)

اور اہل کتاب نے اپنے پاس علم آجانے کے بعد آپس کی سرکشی اور حسد کی بنا پر ہی اختلاف کیا ہے (۱) اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ جو بھی کفر کرے (۲) اللہ تعالیٰ اس کا جلد حساب لینے والا ہے۔ (۱۹)

پھر بھی اگر یہ آپ سے جھگڑیں تو آپ کہہ دیں کہ میں اور میرے تابعداروں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دیا ہے اور اہل کتاب سے اور ان پڑھ لوگوں (۳) سے کہہ دیجئے! کہ کیا تم بھی اطاعت کرتے ہو؟ پس اگر یہ بھی تابعدار بن جائیں تو یقیناً ہدایت والے ہیں اور اگر یہ روگردانی کریں، تو آپ پر صرف پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھ بھال رہا ہے (۲۰)

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے کفر کرتے ہیں اور ناحق نبیوں کو قتل کر ڈالتے ہیں اور جو لوگ عدل و انصاف کی بات کہیں انہیں بھی قتل کر ڈالتے ہیں، (۴) تو اے نبی!

اَوْتُوا الْكِتَابَ الْاٰلَمٰنَ بَعْدَ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَيِّنًا
بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَكْفُرْ يَابِتِ اللّٰهُ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعٌ
الْحِسَابِ ۝

فَاِنَّ حَآجُوَكُمْ قَتْلَ اَسْمٰنَتٌ وَجِهِيْ بِاللّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ
وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰتُوْا الْكِتٰبَ وَالْمُسِيْمِيْنَ اَسْمٰنَتُهُمْ فَاِنَّ
اَسْمٰنَتُهُمْ قَدِ اَهْتَمَّتْ وَاَوْاٰنٌ تَوَكَّلُوْا قٰتِلًا عَلَيْكَ الْبَلٰغَةُ
وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعٰبَادِ ۝

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ يَابِتِ اللّٰهُ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيْنَ
بَعِيْرٌ حَقِيْقًا وَيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يٰمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ
التّٰوْبٰتِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذٰبٍ اَلِيْمٍ ۝

(۱) ان کے اس باہمی اختلاف سے مراد وہ اختلاف ہے جو ایک ہی دین کے ماننے والوں نے آپس میں برپا کر رکھا تھا مثلاً یہودیوں کے باہمی اختلافات اور فرقہ بندیوں، اسی طرح عیسائیوں کے باہمی اختلافات اور فرقہ بندیوں۔ پھر وہ اختلاف بھی مراد ہے جو اہل کتاب کے درمیان آپس میں تھا۔ اور جس کی بنا پر یہودی نصرانیوں کو اور نصرانی یہودیوں کو کما کرتے تھے ”تم کسی چیز پر نہیں ہو“۔ نبوت محمدی ﷺ اور نبوت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ سارے اختلافات دلائل کی بنیاد پر نہیں تھے، محض حسد اور بغض و عناد کی وجہ سے تھے یعنی وہ لوگ حق کو جاننے اور پہچاننے کے باوجود محض اپنے خیالی دنیاوی مفاد کے چکر میں غلط بات پر جتے رہتے اور اس کو دین باور کراتے تھے۔ تاکہ ان کی ناک بھی اونچی رہے اور ان کا عوامی حلقہٴ ارادت بھی قائم رہے۔ افسوس آج مسلمان علما کی ایک بڑی تعداد ٹھیک ان ہی غلط مقاصد کے لیے ٹھیک اسی غلط ڈگر پر چل رہی ہے۔

(۲) یہاں ان آیتوں سے مراد وہ آیات ہیں جو اسلام کے دین الہی ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

(۳) ان پڑھ لوگوں سے مراد مشرکین عرب ہیں جو اہل کتاب کے مقابلے میں بالعموم ان پڑھ تھے۔

(۴) یعنی ان کی سرکشی و بغاوت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ صرف نبیوں کو ہی انہوں نے ناحق قتل نہیں کیا بلکہ ان تک کو بھی قتل کر ڈالا جو عدل و انصاف کی بات کرتے تھے۔ یعنی وہ مومنین مخلصین اور داعیانِ حق جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ نبیوں کے ساتھ ان کا تذکرہ فرما کر اللہ تعالیٰ نے ان کی عظمت و فضیلت بھی واضح کر دی۔

اُولَئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا
وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿۲۱﴾

اَلَّذِيْنَ اٰتٰهُمُ الْكِتٰبَ يَدْعُوْنَ اِلٰى كَيْفٍ
اَللّٰهِ لِيُخَلِّصَهُمْ مِنْهُمْ وَلِيُعَذِّبَهُمْ ۝ ﴿۲۲﴾

ذٰلِكَ يٰۤاَهُمْ قَالُوْا لَنْ نَّمَسَّكُنَا النَّارُ اِلَّا اَيّٰمًا مَّعْدُوْمَةٍ وَّ نَحْنُمْ
فِيْ دِيْنِنَا مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۳﴾

فَلَيَكْفِيْكَ اِذَا جَمَعْتَهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَّ وُعِدَتْ كُلُّ نَفْسٍ
مَا كَسَبَتْ وَّهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۴﴾

قُلِ اللّٰهُمَّ بَلِّغْ اِلَيْنَا نُوْحِي الْمَلٰٓئِكِ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِيْح الْمَلٰٓئِكِ
وَمَنْ تَشَاءُ وَتَعْرِضْ مَنْ تَشَاءُ وَتَدٰٓئِلْ مَنْ تَشَاءُ اُوْحِيْكَ الْخَيْرُ
اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵﴾

انہیں دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے! (۲۱)

ان کے اعمال دنیا و آخرت میں عارت ہیں اور ان کا کوئی
مددگار نہیں۔ (۲۲)

کیا آپ نے انہیں نہیں دیکھا جنہیں ایک حصہ کتاب کا
دیا گیا ہے وہ اپنے آپس کے فیصلوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی
کتاب کی طرف بلائے جاتے ہیں، پھر بھی ایک جماعت
ان کی منہ پھیر کر لوٹ جاتی ہے (۲۳)

اس کی وجہ ان کا یہ کہنا ہے کہ ہمیں تو گئے پنے چند دن
ہی آگ جلائے گی، ان کی گھڑی گھڑائی باتوں نے انہیں
ان کے دین کے بارے میں دھوکے میں ڈال رکھا
ہے۔ (۲۴)

پس کیا حال ہو گا جبکہ ہم انہیں اس دن جمع کریں گے؟ جس
کے آنے میں کوئی شک نہیں اور ہر شخص اپنا اپنا کیا پورا پورا
دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ (۲۵)

آپ کہہ دیجئے اے اللہ! اے تمام جہان کے مالک!
تو جسے چاہے بادشاہی دے اور جس سے چاہے سلطنت
چھین لے اور تو جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے
ذلت دے، تیرے ہی ہاتھ میں سب بھلائیاں ہیں، (۲۶)
بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲۶)

(۱)۔ ان اہل کتاب سے مراد مدینے کے وہ یہودی ہیں جن کی اکثریت قبول اسلام سے محروم رہی اور وہ اسلام، مسلمانوں
اور نبی ﷺ کے خلاف مکروہ سازشوں میں مصروف رہے تاکہ ان کے دو قبیلے جلاوطن اور ایک قبیلہ قتل کر دیا گیا۔
(۲)۔ یعنی کتاب اللہ کے ماننے سے گریز و اعراض کی وجہ ان کا یہ زعم باطل ہے کہ اول تو وہ جہنم میں جائیں گے ہی نہیں،
اور اگر گئے بھی تو صرف چند دن ہی کے لیے جائیں گے۔ اور انہی من گھڑت باتوں نے انہیں دھوکے اور فریب میں
ڈال رکھا ہے۔

(۳)۔ قیامت والے دن ان کے یہ دعوے اور غلط عقائد کچھ کام نہ آئیں گے اور اللہ تعالیٰ بے لاگ انصاف کے ذریعے
سے ہر نفس کو، اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دے گا، کسی پر ظلم نہیں ہو گا۔

(۴)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قوت و طاقت کا اظہار ہے، شاہ کو گدا بنا دے، گدا کو شاہ بنا دے، تمام اختیارات

تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں لے جاتا ہے،^(۱) تو ہی بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے اور تو ہی جاندار سے بے جان پیدا کرتا ہے،^(۲) تو ہی ہے کہ جسے چاہتا ہے بے شمار روزی دیتا ہے۔ (۲۷)

مومنوں کو چاہئے کہ ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں^(۳) اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی

تُولِيهِمُ اللَّيْلَ فِي الْبَهَارِ وَتُولِيهِمُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخَوِّمُهُمُ النَّجْمَ مِنَ الْمَيْمَنَةِ وَتُخَوِّمُهُمُ الْيَمِينَةَ مِنَ الشِّمَالِ وَتَرْتُزُّهُمُ مِنْ نَشَأِهِ بِعَبْرٍ حِسَابٍ ۝

لَا يَتَّخِذُ الْمُؤْمِنُونَ الْكُفْرَانَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ

کا مالک وہی ہے۔ اَنْخِزِ بِبَيْدِكَ كِي بِجَائِ بَيْدِكَ اَنْخِزِ (خبر کی تقدیم کے ساتھ) سے مقصود تخصیص ہے یعنی تمام بھلائیاں صرف تیرے ہی ہاتھ میں ہیں۔ تیرے سوا کوئی بھلائی دینے والا نہیں۔ ”شر“ کا خالق بھی اگرچہ اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن ذکر صرف خیر کا کیا گیا ہے، شر کا نہیں۔ اس لیے کہ خیر اللہ کا فضل محض ہے، بخلاف شر کے کہ یہ انسان کے اپنے عمل کا بدلہ ہے جو اسے پہنچتا ہے یا اس لیے کہ شر بھی اس کے قضا و قدر کا حصہ ہے جو خیر کو مستغنی ہے، اس اعتبار سے اس کے تمام افعال خیر ہیں۔ فَأَفْعَالُهُ كُلُّهَا خَيْرٌ (فتح القدیر)

(۱)۔ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنے کا مطلب موسمی تغیرات ہیں۔ رات لمبی ہوتی ہے تو دن چھوٹا ہوا جاتا ہے اور دوسرے موسم میں اس کے برعکس دن لمبا اور رات چھوٹی ہو جاتی ہے۔ یعنی کبھی رات کا حصہ دن میں اور کبھی دن کا حصہ رات میں داخل کر دیتا ہے جس سے رات اور دن چھوٹے یا بڑے ہو جاتے ہیں۔

(۲)۔ جیسے نطفہ (مردہ) پہلے زندہ انسان سے نکلتا ہے پھر اس مردہ (نطفہ) سے انسان۔ اسی طرح مردہ انڈے سے پہلے مرغی اور پھر زندہ مرغی سے انڈہ (مردہ) یا کافر سے مومن اور مومن سے کافر پیدا فرماتا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے نبی ﷺ سے اپنے اوپر قرض کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم آیت ﴿قُلِ اللَّهُمَّ لَكَ الْمَالُ﴾ (آل عمران) پڑھ کر یہ دعا کرو (رَحْمَنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَرَجِمَهُمَا تَعْطِينِي مِنَ الْفَقْرِ، وَأَقْضِ عَنِّي الدَّيْنَ) ایک دوسری روایت میں ہے کہ ”یہ ایسی دعا ہے کہ تم پر احد پہاڑ جتنا قرض بھی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی ادائیگی کا تمہارے لیے انتظام فرمادے گا۔“ (مجمع الزوائد ۱۰/۱۸۶۔ رجالہ ثقات)

(۳)۔ اولیا ولی کی جمع ہے۔ ولی ایسے دوست کو کہتے ہیں جس سے دلی محبت اور خصوصی تعلق ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو اہل ایمان کا ولی قرار دیا ہے۔ ﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (البقرہ۔ ۲۵۷) یعنی ”اللہ اہل ایمان کا ولی ہے۔“ مطلب یہ ہوا کہ اہل ایمان کو ایک دوسرے سے محبت اور خصوصی تعلق ہے اور وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی (دوست) ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں اہل ایمان کو اس بات سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے کہ وہ کافروں کو اپنا دوست بنائیں۔ کیونکہ کافر اللہ کے بھی دشمن ہیں اور اہل ایمان کے بھی دشمن ہیں۔ تو پھر ان کو دوست بنانے کا جواز کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو قرآن کریم میں کئی جگہ بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے تاکہ اہل ایمان

إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً وَيُحَدِّثْكُمْ اللَّهُ

نَفْسَهُ مَوَالِي اللَّهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾

کسی حمایت میں نہیں مگر یہ کہ ان کے شر سے کسی طرح بچاؤ مقصود ہو،^(۱) اور اللہ تعالیٰ خود تمہیں اپنی ذات سے ڈرا رہا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ جانا ہے۔ (۲۸)

کہہ دیجئے! کہ خواہ تم اپنے سینوں کی باتیں چھپاؤ خواہ ظاہر کرو اللہ تعالیٰ (بہرحال) جانتا ہے، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسے معلوم ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲۹)

جس دن ہر نفس (شخص) اپنی کی ہوئی نیکیوں کو اور اپنی کی ہوئی برائیوں کو موجود پالے گا، آرزو کرے گا کہ کاش! اس کے اور برائیوں کے درمیان بہت ہی دوری ہوتی۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈرا رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے۔ (۳۰)

کہہ دیجئے! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو،^(۲) خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور

قُلْ إِنْ تَحْفَظُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ يُبَدُّوهُ يُعَلِّمَكُمُ اللَّهُ

وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۹﴾

يَوْمَ يَحْجِزُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا وَلَوْ أَنَّ عَمَلَتْ مِنْ

سُوْءٍ لَوَدَّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهَا أَمَدًا أَبَدًا لَأَوْجِدَ مَا يَحْجِزُكُمْ اللَّهُ

نَفْسَهُ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ

ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۳۱﴾

کافروں کی موالات (دوستی) اور ان سے خصوصی تعلق قائم کرنے سے گریز کریں۔ البتہ حسب ضرورت و مصلحت ان سے صلح و معاہدہ بھی ہو سکتا ہے اور تجارتی لین دین بھی۔ اسی طرح جو کافر، مسلمانوں کے دشمن نہ ہوں، ان سے حسن سلوک اور مدارات کا معاملہ بھی جائز ہے (جس کی تفصیل سورہ ممتحنہ میں ہے) کیونکہ یہ سارے معاملات، موالات (دوستی) سے مختلف ہے۔

(۱) یہ اجازت ان مسلمانوں کے لیے ہے جو کسی کافر حکومت میں رہتے ہوں کہ ان کے لیے اگر کسی وقت اظہار دوستی کے بغیر ان کے شر سے بچنا ممکن نہ ہو تو وہ زبان سے ظاہری طور پر دوستی کا اظہار کر سکتے ہیں۔

(۲) یہود اور نصاریٰ دونوں کا دعویٰ تھا کہ ہمیں اللہ سے اور اللہ تعالیٰ کو ہم سے محبت ہے، بالخصوص عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ و مریم علیہما السلام کی تعظیم و محبت میں جو اتنا غلو کیا کہ انہیں درجۃ الوہبیت پر فائز کر دیا، اس کی بابت بھی ان کا خیال تھا کہ ہم اس طرح اللہ کا قرب اور اس کی رضا و محبت چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے دعووں اور خود ساختہ طریقوں سے اللہ کی محبت اور اس کی رضا حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کا تو صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ میرے آخری پیغمبر ایمان لاؤ اور اس کا اتباع کرو۔ اس آیت نے تمام دعوے داران محبت کے لیے ایک کوئی اور معیار مہیا کر دیا ہے کہ محبت الہی کا طالب اگر اتباع محمد ﷺ کے ذریعے سے یہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے، تو پھر تو یقیناً وہ کامیاب ہے

تمہارے گناہ معاف فرما دے گا^(۱) اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے (۳۱)

کہہ دیجئے! کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت کرو، اگر یہ منہ پھیر لیں تو بے شک اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔^(۲) (۳۲)

بے شک اللہ تعالیٰ نے تمام جہان کے لوگوں میں سے آدم (علیہ السلام) کو اور نوح (علیہ السلام) کو، ابراہیم (علیہ السلام) کے خاندان اور عمران کے خاندان کو منتخب فرمایا۔^(۳) (۳۳)

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِن اللّٰه
لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۱

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓ اٰدَمَ وَنُوْحًا وَاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلٰى
الْعٰلَمِيْنَ ۝۳۲

اور اپنے دعوے میں سچا ہے، ورنہ وہ جھوٹا بھی ہے اور اس مقصد کے حصول میں ناکام بھی رہے گا۔ نبی ﷺ کا بھی فرمان ہے 'مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ' (متفق علیہ) جس نے ایسا کام کیا جس پر ہمارا معاملہ نہیں ہے یعنی ہمارے بتلائے ہوئے طریقے سے مختلف ہے تو وہ مسترد ہے۔"

(۱)۔ یعنی اتباع رسول ﷺ کی وجہ سے تمہارے گناہ ہی معاف نہیں ہوں گے بلکہ تم محب سے محبوب بن جاؤ گے۔ اور یہ کتنا اونچا مقام ہے کہ بارگاہ الہی میں ایک انسان کو محبیت کا مقام مل جائے۔

(۲)۔ اس آیت میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اطاعت رسول ﷺ کی پھر تاکید کر کے واضح کر دیا کہ اب نجات اگر ہے تو صرف اطاعت محمدی میں ہے اور اس سے انحراف کفر ہے اور ایسے کافروں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔ چاہے وہ اللہ کی محبت اور قرب کے کتنے ہی دعوے دار ہوں۔ اس آیت میں حجیت حدیث کے منکرین اور اتباع رسول ﷺ سے گریز کرنے والوں دونوں کے لیے سخت وعید ہے کیونکہ دونوں ہی اپنے اپنے انداز سے ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جسے یہاں کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ۔

(۳)۔ انبیاء علیہم السلام کے خاندانوں میں دو عمران ہوئے ہیں۔ ایک حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے والد اور دوسرے حضرت مریم علیہا السلام کے والد۔ اس آیت میں اکثر مفسرین کے نزدیک یہی دوسرے عمران مراد ہیں اور اس خاندان کو بلند درجہ حضرت مریم علیہا السلام اور ان کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے حاصل ہوا اور حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کا نام مفسرین نے حِنَّةُ بِنْتُ فَاوُزٍ لکھا ہے (تفسیر قرطبی و ابن کثیر) اس آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے آل عمران کے علاوہ مزید تین خاندانوں کا تذکرہ فرمایا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے وقت میں جہانوں پر فضیلت عطا فرمائی۔ ان میں پہلے حضرت آدم علیہ السلام ہیں، جنہیں اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا اور اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی، انہیں مسجود ملائکہ بنایا، اس کا علم انہیں عطا کیا اور انہیں جنت میں رہائش پذیر کیا، جس سے پھر انہیں زمین میں

کہ یہ سب آپس میں ایک دوسرے کی نسل سے ہیں^(۱)
اور اللہ تعالیٰ سنتا جانتا ہے۔ (۳۴)

جب عمران کی بیوی نے کہا کہ اے میرے رب! میرے پیٹ میں جو کچھ ہے، اسے میں نے تیرے نام آزاد کرنے^(۲) کی نذر مانی، تو میری طرف سے قبول فرما! یقیناً تو خوب سننے والا اور پوری طرح جاننے والا ہے۔ (۳۵)
جب بچی کو جنا تو کہنے لگیں کہ پروردگار! مجھے تو لڑکی ہوئی، اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ کیا اولاد ہوئی ہے اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں^(۳) میں نے اس کا نام مریم رکھا،^(۴) میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔^(۵) (۳۶)

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۴﴾

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَدَّيْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي
مُحَرَّرًا مُفْتَعَلًا مِثْلَ ابْنِكُمْ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۳۵﴾

فَلَمَّا وَصَعْتَهَا مَا كَذَبَ وَإِنِّي وَصَعْتُهَا إِنثِي وَاللَّهُ أَعْلَمُ
بِمَا وَصَعْتَ ۚ وَ لَيْسَ الذَّكَوٰةُ الْإِنثٰى ۚ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ
وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾

بھیج دیا گیا جس میں اس کی بہت سی مکھتیس تھیں۔ دوسرے حضرت نوح علیہ السلام ہیں، انہیں اس وقت رسول بنا کر بھیجا گیا جب لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو معبود بنالیا، انہیں عمر طویل عطا کی گئی، انہوں نے اپنی قوم کو ساڑھے نو سو سال تبلیغ کی، لیکن چند افراد کے سوا، کوئی آپ پر ایمان نہیں لایا۔ بالآخر آپ کی بددعا سے اہل ایمان کے سوا، دوسرے تمام لوگوں کو غرق کر دیا گیا۔ آل ابراہیم کو یہ فضیلت عطا کی کہ ان میں انبیاء و سلاطین کا سلسلہ قائم کیا اور بیشتر پیغمبر آپ ہی کی نسل سے ہوئے۔ حتیٰ کہ علی الاطلاق کائنات میں سب سے افضل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے، اسمعیل علیہ السلام کی نسل سے ہوئے۔

(۱) یا دوسرے معنی ہیں دین میں ایک دوسرے کے معاون اور مددگار۔

(۲) مُحَرَّرًا (تیرے نام آزاد) کا مطلب تیری عبادت گاہ کی خدمت کے لیے وقف۔

(۳) اس جملے میں حسرت کا اظہار بھی ہے اور عذر بھی۔ حسرت، اس طرح کہ میری امید کے برعکس لڑکی ہوئی ہے اور عذر، اس طرح کہ نذر سے مقصود تو تیری رضا کے لیے ایک خدمت گار وقف کرنا تھا اور یہ کام ایک مرد ہی زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتا تھا۔ اب جو کچھ بھی ہے تو اسے جانتا ہی ہے۔ (فتح القدیر)

(۴) حافظ ابن کثیر نے اس سے اور احادیث نبوی سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سچے کا نام ولادت کے پہلے روز رکھنا چاہیے اور ساتویں دن نام رکھنے والی حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن حافظ ابن القیم نے تمام احادیث پر بحث کر کے آخر میں لکھا ہے کہ پہلے روز، تیرے روز یا ساتویں روز نام رکھا جا سکتا ہے، اس مسئلے میں گنجائش ہے۔ وَالْأَمْرُ فِيهِ وَاسِعٌ (تحفۃ المودود)

(۵) اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی۔ چنانچہ حدیث صحیح میں ہے کہ جو بھی بچہ پیدا ہوتا ہے تو شیطان اس کو مس کرتا

پس اسے اس کے پروردگار نے اچھی طرح قبول فرمایا اور اسے بہترین پرورش دی۔ اس کی خیر خبر لینے والا زکریا (علیہ السلام) کو بنایا،^(۱) جب کبھی زکریا (علیہ السلام) ان کے حجرے میں جاتے ان کے پاس روزی رکھی ہوئی پاتے،^(۲) وہ پوچھتے اے مریم! یہ روزی تمہارے پاس کہاں سے آئی؟ وہ جواب دیتیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہے، بے شک اللہ تعالیٰ جسے چاہے بے شمار روزی دے۔ (۳۷)

اسی جگہ زکریا (علیہ السلام) نے اپنے رب سے دعا کی، کہا کہ اے میرے پروردگار! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد

مَقْتَبَهَا رَبُّهَا يَقْبُولُ حَسَنًا وَأَكْتَبَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَلَهَا زَكْرِيَّا لَمَّا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ لَيْسَ عَلَيَّ لِهَذَا قَوْلٌ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَرِّزُقِي مَنْ يَشَاءُ يُعْطِيهِ ۝۳۷

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ۝۳۸

(چھوٹا) ہے جس سے وہ چیتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس مس شیطان سے حضرت مریم علیہا السلام اور ان کے بیٹے (عیسیٰ علیہ السلام) کو محفوظ رکھا ہے۔ «مَا مِنْ مَوْلُودٍ يُوَلَّدُ إِلَّا مَسَّهُ الشَّيْطَانُ حِينَ يُوَلَّدُ، فَيَسْتَهْلُ صَارِحًا مِنْ مَسِّهِ إِيَّاهُ، إِلَّا مَرْيَمَ وَابْنَهَا» (صحیح بخاری، کتاب التفسیر، مسلم، کتاب الفضائل)

(۱) حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت مریم علیہا السلام کے خالو بھی تھے، اس لیے بھی علاوہ ازیں اپنے وقت کے پیغمبر ہونے کے لحاظ سے بھی وہی سب سے بہتر کفیل بن سکتے تھے جو حضرت مریم علیہا السلام کی مادی ضروریات اور علمی و اخلاقی تربیت کے تقاضوں کا صحیح اہتمام کر سکتے تھے۔

(۲) مِحْرَاب سے مراد حجرہ ہے جس میں حضرت مریم علیہا السلام رہائش پذیر تھیں۔ رزق سے مراد پھل۔ یہ پھل ایک تو غیر موسمی ہوتے، گرمی کے پھل سردی کے موسم میں اور سردی کے گرمی کے موسم میں ان کے کمرے میں موجود ہوتے، دوسرے حضرت زکریا علیہ السلام یا کوئی اور شخص لا کر دینے والا نہیں تھا۔ اس لیے حضرت زکریا علیہ السلام نے ازراہ تعجب و حیرت پوچھا کہ یہ کہاں سے آئے؟ انہوں نے کہا اللہ کی طرف سے۔ یہ گویا حضرت مریم علیہا السلام کی کرامت تھی۔ معجزہ اور کرامت خرق عادت امور کو کہا جاتا ہے یعنی جو ظاہری اور عادی اسباب کے خلاف ہو۔ یہ کسی نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو تو اسے معجزہ اور کسی ولی کے ہاتھ پر ظاہر ہو تو اسے کرامت کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں برحق ہیں۔ تاہم ان کا صدور اللہ کے حکم اور اس کی مشیت سے ہوتا ہے۔ نبی یا ولی کے اختیار میں یہ بات نہیں کہ وہ معجزہ اور کرامت جب چاہے صادر کر دے۔ اس لیے معجزہ اور کرامت اس بات کی تودلیل ہوتی ہے کہ یہ حضرات اللہ کی بارگاہ میں خاص مقام رکھتے ہیں لیکن اس سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ ان مقبولین بارگاہ کے پاس کائنات میں تصرف کرنے کا اختیار ہے، جیسا کہ اہل بدعت اولیا کی کرامتوں سے عوام کو یہی کچھ باور کرا کے انہیں شریک عقیدوں میں مبتلا کر دیتے ہیں اس کی مزید وضاحت بعض معجزات کے ضمن میں آئے گی۔

عطا فرما، بے شک تو دعا کا سننے والا ہے۔ (۳۸)

پس فرشتوں نے انہیں آواز دی، جب کہ وہ حجرے میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، کہ اللہ تعالیٰ تجھے یحییٰ کی یقینی خوشخبری دیتا ہے جو (۱) اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی تصدیق کرنے والا، (۲) سردار، ضابطہ نفس اور نبی ہے نیک لوگوں میں

سے۔ (۳۹)

کننے لگے اے میرے رب! میرے ہاں بچہ کیسے ہو گا؟ میں بالکل بوڑھا ہو گیا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے، فرمایا، اسی طرح اللہ تعالیٰ جو چاہے کرتا ہے۔ (۴۰)

کننے لگے پروردگار! میرے لئے اس کی کوئی نشانی مقرر کر دے، فرمایا، نشانی یہ ہے کہ تین دن تک تو لوگوں سے بات نہ کر سکے گا، صرف اشارے سے سمجھائے گا، تو اپنے رب کا ذکر کثرت سے کر اور صبح و شام اسی کی تسبیح بیان (۳) کرتا رہ! (۴۱)

فَتَادَعُ الْمُكَلِّمَةَ وَمَوْقَاهِمُ يُصَلِّى فِي الْبَحْرَابِ
اِنَّ اللّٰهَ يَبْدُءُ الرُّسُلَ بِمَنْ يَّحِبُّ مَصَدَّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا
وَّحَصُوْرًا اَوْ نَبِيًّا مِّنَ الضّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾

قَالَ رَبِّ اَنْىٰ يَكُوْنُ لِىْ غُلَامٌ وَّ قَدْ بَلَغَتْنِى الْكِبَرُ وَاَمْرًا
عَاقِرًا قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْ اٰيَةً قَالَ اِيْتٰنَكَ الْاَنْكَلَمَةُ النَّاسَ
ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمًا وَاذْكُرْ نَبَاكَ كَيْتٰرًا وَاَسْمٰتِہٖ
بِالْعَشِيْمِ وَاِلْبِكَارِ ﴿۴۱﴾

(۱) بے موسمی پھل دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں بھی (بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود) یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش اللہ تعالیٰ انہیں بھی اسی طرح اولاد سے نواز دے۔ چنانچہ بے اختیار دعا کے لیے ہاتھ بارگاہ الہی میں اٹھ گئے، جسے اللہ تعالیٰ نے شرف قبولیت سے نوازا۔

(۲) اللہ کے کلمے کی تصدیق سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق ہے۔ گویا حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے بڑے ہوئے۔ دونوں آپس میں خالہ زاد تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی تائید کی۔ سیداً کے معنی ہیں سردار حضوراً کے معنی ہیں، گناہوں سے پاک یعنی گناہوں کے قریب نہیں پھٹکتے گویا کہ ان کو ان سے روک دیا گیا ہے۔ یعنی حَصُوْرًا بمعنی مَحْصُوْرٍ، بعض نے اس کے معنی نامرد کے کیے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں، کیونکہ یہ ایک عیب ہے جب کہ یہاں ان کا ذکر مدح اور فضیلت کے طور پر کیا گیا ہے۔

(۳) بڑھاپے میں معجزانہ طور پر اولاد کی خوش خبری سن کر اشتیاق میں اضافہ ہوا اور نشانی معلوم کرنی چاہی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تین دن کے لیے تیری زبان بند ہو جائے گی۔ جو ہماری طرف سے بطور نشانی ہو گی لیکن تو اس خاموشی میں کثرت سے صبح و شام اللہ کی تسبیح بیان کیا کر۔ تاکہ اس نعمت الہی کا جو تجھے ملنے والی ہے، شکر ادا ہو۔ یہ گویا سبق دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری طلب کے مطابق تمہیں مزید نعمتوں سے نوازے تو اسی حساب سے اس کا شکر بھی زیادہ سے زیادہ کرو۔

اور جب فرشتوں نے کہا، اے مریم! اللہ تعالیٰ نے تجھے برگزیدہ کر لیا اور تجھے پاک کر دیا اور سارے جہان کی عورتوں میں سے تیرا انتخاب کر لیا۔^(۱) (۳۲)

اے مریم! تو اپنے رب کی اطاعت کر اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔ (۳۳)

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم تیری طرف وحی سے پہنچاتے ہیں، تو ان کے پاس نہ تھا جب کہ وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ مریم کو ان میں سے کون پالے گا؟ اور نہ تو ان کے جھگڑنے کے وقت ان کے پاس تھا۔^(۲) (۳۴)

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ ﴿۳۲﴾

يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْمَعِي وَأَطِئِي مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿۳۳﴾

ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَقُولُونَ أَفَلَا مَهْمُ الْيَوْمِ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿۳۴﴾

(۱)- حضرت مریم ملیسا السلام کا یہ شرف و فضل ان کے اپنے زمانے کے اعتبار سے ہے کیونکہ صحیح احادیث میں حضرت مریم ملیسا السلام کے ساتھ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو بھی خَيْرُ نِسَائِنَهَا (سب عورتوں میں بہتر) کہا گیا ہے۔ اور بعض احادیث میں چار عورتوں کو کامل قرار دیا گیا ہے۔ حضرت مریم، حضرت آسیہ (فرعون کی بیوی)، حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہن۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بابت کہا گیا ہے کہ ان کی فضیلت دیگر تمام عورتوں پر ایسے ہے جیسے ثرید کو تمام کھانوں پر فوقیت حاصل ہے۔ (ابن کثیر) اور ترمذی کی روایت میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد ﷺ کو بھی فضیلت والی عورتوں میں شامل کیا گیا ہے (ابن کثیر) اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مذکورہ خواتین ان چند عورتوں میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے دیگر عورتوں پر فضیلت اور بزرگی عطا فرمائی یا یہ کہ اپنے اپنے زمانے میں فضیلت رکھتی ہیں۔ واللہ اعلم۔

(۲)- آج کل کے اہل بدعت نے نبی کریم ﷺ کی شان میں غلو عقیدت کا مظاہرہ کرتے ہوئے، ان کے اللہ تعالیٰ کی طرح عالم الغیب اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ گھڑ رکھا ہے۔ اس آیت سے ان دونوں عقیدوں کی واضح تردید ہوتی ہے۔

اگر آپ نبی ﷺ عالم الغیب ہوتے، تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا کہ ”ہم غیب کی خبریں آپ کو بیان کر رہے ہیں“ کیونکہ جس کو پہلے ہی علم ہو، اس کو اس طرح نہیں کہا جاتا اور اسی طرح حاضر و ناظر کو یہ نہیں کہا جاتا کہ آپ اس وقت وہاں موجود نہیں تھے جب لوگ قرعہ اندازی کے لیے قلم ڈال رہے تھے۔ قرعہ اندازی کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ حضرت مریم ملیسا السلام کی کفالت کے اور بھی کئی خواہش مند تھے۔ ﴿ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ﴾ سے نبی کریم ﷺ کی رسالت اور آپ کی صداقت کا اثبات بھی ہے جس میں یہودی اور عیسائی شک کرتے تھے کیونکہ وحی شریعت پیغمبر پر ہی آتی ہے، غیر پیغمبر پر نہیں۔

جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ تعالیٰ تجھے اپنے ایک کلمے^(۱) کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے جو دنیا اور آخرت میں ذی عزت ہے اور وہ میرے مقربین میں سے ہے۔ (۳۵)

وہ لوگوں سے اپنے گوارے میں باتیں کرے گا اور ادھیڑ عمر میں بھی^(۳) اور وہ نیک لوگوں میں سے ہو گا۔ (۳۶)

إِذْ قَالَتِ الْمَلِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِوَجْهَةٍ مُّبَارَكَةٍ إِنَّهَا إِنَّا لَبِئْسُ لِمَنْ يَكْفُرُ الْآيَاتِ
وَالْآخِرَةَ وَمِنَ الْمُعْتَدِينَ ۝
وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْبَدِ وَأَكْهَلًا وَمِنَ الضَّالِّينَ ۝

(۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ یعنی کلمۃ اللہ اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ ان کی ولادت اعجازی شان کی مظہر اور عام انسانی اصول کے برعکس، باپ کے بغیر اللہ کی خاص قدرت اور اس کے کلمہ کن کی تخلیق ہے۔

(۲) مَسِيحٌ مَسْحٌ سے ہے: مَسَحَ الْأَرْضَ یعنی کثرت سے زمین کی سیاحت کرنے والا، یا اس کے معنی ہاتھ پھیرنے والا ہے، کیونکہ آپ ہاتھ پھیر کر مریضوں کو باذن اللہ شفا یاب فرماتے تھے۔ ان دونوں معنوں کے اعتبار سے یہ فَعِيلٌ بمعنی فاعل ہے اور قیامت کے قریب ظاہر ہونے والے دجال کو جو مسیح کہا جاتا ہے وہ یا تو بمعنی مفعول یعنی مَنْسُوحُ النَّعِينِ (اس کی ایک آنکھ کالی ہوگی) کے اعتبار سے ہے یا وہ بھی چونکہ کثرت سے دنیا میں پھرے گا اور مکہ اور مدینہ کے سوا ہر جگہ پہنچے گا، بخاری و مسلم) اور بعض روایات میں بیت المقدس کا بھی ذکر ہے اس لیے اسے بھی الْمَسِيحُ الدَّجَالُ کہا جاتا ہے۔ عام اہل تفسیر نے عموماً یہی بات درج کی ہے۔ کچھ اور محققین کہتے ہیں کہ مسیح یسود و نصاریٰ کی اصطلاح میں بڑے مامور من اللہ پیغمبر کو کہتے ہیں، یعنی ان کی یہ اصطلاح تقریباً اولوالعزم پیغمبر کے ہم معنی ہے۔ دجال کو مسیح اس لیے کہا گیا ہے کہ یسود کو جس انقلاب آفریں مسیح کی بشارت دی گئی ہے۔ اور جس کے وہ غلط طور پر اب بھی نظر ہیں، دجال اسی مسیح کے نام پر آئے گا یعنی اپنے آپ کو وہی مسیح قرار دے گا۔ مگر وہ اپنے اس دعویٰ سمیت تمام دعویٰں میں دجل و فریب کا اتنا بڑا پیکر ہو گا کہ اولین و آخرین میں اس کی کوئی مثال نہ ہوگی اس لیے وہ الدجال کہلائے گا۔ اور عیسیٰ عجمی زبان کا لفظ ہے۔ بعض کے نزدیک یہ عربی اور عَاسَ يَعُوسُ سے مشتق ہے جس کے معنی سیاست و قیادت کے ہیں (قرطبی و فتح القدر)

(۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مہذب (گوارے) میں گفتگو کرنے کا ذکر خود قرآن کریم کی سورہ مریم میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ صحیح حدیث میں دو بچوں کا ذکر اور ہے۔ ایک صاحب جرنج اور ایک اسرائیلی عورت کا بچہ (صحیح بخاری) کتاب الانبیاء، باب واذ کرنی الکتاب مریم) اس روایت میں جن تین بچوں کا ذکر ہے، ان سب کا تعلق بنو اسرائیل سے ہے، کیونکہ ان کے علاوہ صحیح مسلم میں اصحاب الاخدود کے قصے میں بھی شیر خوار بچے کے بولنے کا ذکر ہے۔ اور حضرت یوسف کی بابت فیصلہ کرنے والے شاہد کے بارے میں جو مشہور ہے کہ وہ بچہ تھا، صحیح نہیں ہے۔ بلکہ وہ ذُو لِحْيَةٍ (داڑھی والا) تھا (الضعیفہ۔ رقم ۸۸۱) کھنڈ (ادھیڑ عمر) میں کلام کرنے کا مطلب بعض نے یہ بیان کیا ہے کہ جب وہ بڑے ہو کر وہی اور رسالت سے سرفراز کیے جائیں گے اور بعض نے کہا ہے کہ آپ کا قیامت کے قریب جب آسمان سے نزول

کننے لگیں الہی مجھے لڑا کیسے ہو گا؟ حالانکہ مجھے تو کسی انسان نے ہاتھ بھی نہیں لگایا، فرشتے نے کہا، اسی طرح اللہ تعالیٰ جو چاہے پیدا کرتا ہے، جب کبھی وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا! تو وہ ہو جاتا ہے (۱) (۳۷)

اللہ تعالیٰ اسے لکھنا (۲) اور حکمت اور توراہ اور انجیل سکھائے گا۔ (۳۸)

اور وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول ہو گا، کہ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی نشانی لایا ہوں، میں تمہارے لئے پرندے کی شکل کی طرح مٹی کا پرندہ بناتا ہوں، (۳) پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے میں مادر زوائد سے کو اور کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں اور مردوں کو زندہ کرتا ہوں (۴) اور جو کچھ تم کھاؤ اور جو اپنے گھروں میں ذخیرہ کرو میں تمہیں بتا

قَالَتْ رَبِّ اَنْىٰ يَكُوْنُ لى وَلَدًا وَلَمْ يَمْسَسْنى بَشَرًا قَالَ كَذٰلِكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۗ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنْتَابِقُوْا لَهٗ لَنْ يَّمْكُوْنُ ﴿۳۷﴾

وَيَعْلَمُ الْكِنٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالنُّوْرَ وَالْغَيْبَ ﴿۳۸﴾

وَسُوْرًا لِّىۡنِىۡ اِسْرَآءِيْلَ ۗ اِنِّىۡ كَدَّ جُنْتَكُمْ بِآيٰتٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۗ اِنِّىۡ اَخْلَقْتُ لَكُمْ مِّنَ الطَّيْرِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَاَنْفَعُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُنْرِىۡ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُنْحِىۡ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُنْمِتْكُمْ مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ وَاَمَّا خُرُوْبٌ فِىۡ بُيُوْتِكُمْ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۳۹﴾

ہو گا جیسا کہ اہل سنت کا عقیدہ ہے جو صحیح اور متواتر احادیث سے ثابت ہے، تو اس وقت جو وہ اسلام کی تبلیغ کریں گے، وہ کلام مراد ہے۔ (تفسیر ابن کثیر و قرطبی)

(۱)۔ تیرا تعجب بجا، لیکن قدرت الہی کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے، وہ تو جب چاہے اسباب عادیہ و ظاہریہ کا سلسلہ ختم کر کے حکم کن سے پلک جھپکتے میں، جو چاہے کر دے۔

(۲)۔ کتاب سے مراد کتابت (لکھنا) ہے۔ جیسا کہ ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے یا انجیل و تورات کے علاوہ کوئی اور کتاب ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ نے انہیں دیا (قرطبی) یا تورات و انجیل، الْکِتٰبُ اور اَلْحِکْمَةُ کی تفسیر ہے۔

(۳)۔ اَخْلَقْتُ لَكُمْ: اٰی: اَصُوْرًا وَاَنْدَرًا لِّكُمْ (قرطبی) یعنی خلق یہاں پیدائش کے معنی میں نہیں ہے، اس پر تو صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے کیونکہ وہی خالق ہے۔ یہاں اس کے معنی ظاہری شکل و صورت گھرنے اور بنانے کے ہیں۔

(۴)۔ دوبارہ باذن اللہ (اللہ کے حکم سے) کہنے سے مقصد یہی ہے کہ کوئی شخص اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے کہ میں خدائی صفات یا اختیارات کا حامل ہوں۔ نہیں، میں تو اس کا عاجز بندہ اور رسول ہی ہوں۔ یہ جو کچھ میرے ہاتھ پر ظاہر ہو رہا ہے، معجزہ ہے جو محض اللہ کے حکم سے صادر ہو رہا ہے۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے نہر نبی کو اس کے زمانے کے حالات کے مطابق معجزے عطا فرمائے تاکہ اس کی صداقت اور بالاتری نمایاں ہو سکے۔ حضرت موسیٰ علیہ

دیتا ہوں، اس میں تمہارے لئے بڑی نشانی ہے، اگر تم ایمان لانے والے ہو۔ (۳۹)

اور میں توراہ کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے اور میں اس لئے آیا ہوں کہ تم پر بعض وہ چیزیں حلال کروں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں^(۱) اور میں تمہارے پاس تمہارے رب کی نشانی لایا ہوں، اس لئے تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری فرمانبرداری کرو! (۵۰)

یقین مانو! میرا اور تمہارا رب اللہ ہی ہے، تم سب اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔ (۵۱)^(۲)

مگر جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان کا کفر محسوس کر لیا^(۳) تو کہنے لگے اللہ تعالیٰ کی راہ میں میری مدد کرنے

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَلَا جُنْدًا لَّكَ بَعْضُ
الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجُنُودَكُمْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا
اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۝

إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَى مِنْهُمْ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ
قَالَ الْحَوَارِيُّونَ غَيْرِنَا أَنْصَارُ اللَّهِ الْمَكَارِئَةُ وَالشَّهَدَاءُ

السلام کے زمانے میں جادوگری کا بڑا زور تھا، انہیں ایسا معجزہ عطا فرمایا گیا جس کے سامنے بڑے بڑے جادوگر اپنا کرتب دکھانے میں ناکام رہے جس سے ان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت واضح ہو گئی اور وہ ایمان لے آئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں طب کا بڑا چرچا تھا، چنانچہ انہیں مردہ کو زندہ کر دینے، مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دینے کا معجزہ عطا فرمایا گیا جو کوئی بھی بڑا سے بڑا طبیب اپنے فن کے ذریعے سے کرنے پر قادر نہیں تھا۔ ہمارے پیغمبر نبی کریم ﷺ کے دور میں شعر و ادب اور فصاحت و بلاغت کا زور تھا، چنانچہ انہیں قرآن جیسا فصیح و بلیغ اور پر اعجاز کلام عطا فرمایا گیا، جس کی نظیر پیش کرنے سے دنیا بھر کے فصحا و بلغا اور ادبا و شعرا عاجز رہے اور چیخ و پکار کے باوجود آج تک عاجز ہیں اور قیامت تک عاجز رہیں گے۔ (ابن کثیر)

(۱)۔ اس سے مراد یا تو وہ بعض چیزیں ہیں جو بطور سزا اللہ تعالیٰ نے ان پر حرام کر دی تھیں یا پھر وہ چیزیں ہیں جو ان کے علما نے اجتہاد کے ذریعے سے حرام کی تھیں اور اجتہاد میں ان سے غلطی کا ارتکاب ہوا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس غلطی کا ازالہ کر کے انہیں حلال قرار دیا۔ (ابن کثیر)

(۲)۔ یعنی اللہ کی عبادت کرنے میں اور اس کے سامنے زلت و عاجزی کے اظہار میں اور تم دونوں برابر ہیں۔ اس لیے سیدھا راستہ صرف یہ ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کی الوہیت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

(۳)۔ یعنی ایسی گہری سازشیں اور مٹھوک حرکتیں جو کفر یعنی حضرت مسیح کی رسالت کے انکار پر مبنی تھیں۔

والا کون کون ہے؟^(۱) حواریوں^(۲) نے جواب دیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی راہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور آپ گواہ رہے کہ ہم تابعدار ہیں۔ (۵۲)

اے ہمارے پالنے والے معبود! ہم تیری اتاری ہوئی وحی پر ایمان لائے اور ہم نے تیرے رسول کی اتباع کی، پس تو ہمیں گواہوں میں لکھ لے۔ (۵۳)

اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی (مکر) خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے۔^(۳) (۵۴)

يَا كَا مُنِيُون ۝

رَبَّنَا إِنَّمَا إِنَّمَا نَزَّلْتُمْ عَلَيْنَا لِقَاءَ رَسُولِكَ مَا كُنَّا نَعْلَمُ
مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝

وَمَكْرُوهُوَ وَمَكْرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَكْرِيْنَ ۝

(۱)۔ بہت سے نبیوں نے اپنی قوم کے ہاتھوں تنگ آ کر ظاہری اسباب کے مطابق اپنی قوم کے باشعور لوگوں سے مدد طلب کی ہے۔ جس طرح خود نبی ﷺ نے بھی ابتدا میں، جب قریش آپ کی دعوت کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے، تو آپ موسم حج میں لوگوں کو اپنا ساتھی اور مددگار بننے پر آمادہ کرتے تھے تاکہ آپ رب کا کلام لوگوں تک پہنچائیں، جس پر انصار نے لبیک کہا اور نبی ﷺ کی انہوں نے قبل ہجرت اور بعد ہجرت مدد کی۔ اسی طرح یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مدد طلب فرمائی۔ یہ وہ مدد نہیں ہے جو مافوق الاسباب طریقے سے طلب کی جاتی ہے کیونکہ وہ تو شرک ہے اور ہر نبی شرک کے سد باب ہی کے لیے آتا رہا ہے، پھر وہ خود شرک کا ارتکاب کس طرح کر سکتے تھے؟ لیکن قبرستانوں کی غلط روش قابل ماتم ہے کہ وہ فوت شدہ اشخاص سے مدد مانگنے کے جواز کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قول من انصاری الی اللہ سے استدلال کرتے ہیں؟ فَإِنَّ اللَّهَ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت نصیب فرمائے۔

(۲) حواریوں، حواری کی جمع ہے بمعنی انصار (مددگار) جس طرح نبی ﷺ کا فرمان ہے «إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيًّا وَحَوَارِيَ الرَّزِيِّزِ» (صحیح بخاری کتاب الجہاد، باب فضل الطلیعة) ”ہر نبی کا کوئی مددگار خاص ہوتا ہے اور میرا مددگار زیر زمین ہے۔“

(۳)۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں شام کا علاقہ رومیوں کے زیر نگیں تھا، یہاں ان کی طرف سے جو حکمران مقرر تھا وہ کافر تھا۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف اس حکمران کے کان بھردیئے کہ یہ نعوذ باللہ بغیر باپ کے اور فساد ہے وغیرہ وغیرہ۔ حکمران نے ان کے مطالبے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بحفاظت آسمان پر اٹھالیا اور ان کی جگہ ان کے ہم شکل ایک آدمی کو انہوں نے سولی دے دی، اور سمجھتے رہے کہ ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی ہے مَنَكْرُ عَرَبِيٌّ زَبَانٍ فِي طَيْفٍ أَوْ خَفِيَةٍ تَدِيرُ كَوَسْمَةٍ هِيَ فِي أَسْمَانِ اللَّهِ تَعَالَى كَوَسْمَةٍ نَمَاكِزِينَ كَمَا كُنَّا نَعْلَمُ۔ گویا یہ مکر، سیٹی (برا) بھی ہو سکتا ہے، اگر غلط مقصد کے لیے ہو اور خیر (اچھا) بھی ہو سکتا ہے اگر اچھے مقصد کے لیے ہو۔

جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے عیسیٰ! میں تجھے پورا لینے والا ہوں^(۱) اور تجھے اپنی جانب اٹھانے والا ہوں اور تجھے کافروں سے پاک کرنے والا ہوں^(۲) اور تیرے تابعداروں کو کافروں کے اوپر غالب کرنے والا ہوں قیامت کے دن تک،^(۳) پھر تم سب کا لوٹنا میری ہی طرف ہے میں ہی تمہارے آپس کے تمام تر اختلافات کا فیصلہ کروں گا۔ (۵۵)

پھر کافروں کو تو میں دنیا اور آخرت میں سخت تر عذاب دوں گا اور ان کا کوئی مددگار نہ ہو گا۔ (۵۶)

لیکن ایمان والوں اور نیک اعمال والوں کو اللہ تعالیٰ ان کا ثواب پورا پورا دے گا اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔ (۵۷)

اِذْ قَالَ اللَّهُ لِيَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ كَفَرُوا وَرَافَعُوا بِيْنَ
وَمَطَّهْرُوا لِمَنْ الذِّينَ كَفَرُوا وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ
فَوَقَّ الذِّينَ نَفَرُوا اِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ اِلَى مَرْجِعِكُمْ
فَاَنْكُرْكُمْ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُونَ ۝

فَاَمَّا الذِّينَ كَفَرُوا فَاعَذِّبْهُمْ عَذَابًا سَدِيدًا اِنِّ
الذِّينَ وَالْآخِرَةَ وَمَا لَهُمْ مِنْ شَيْءٍ عِندِيْ
وَآمَنَ الذِّينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ
اُجْرَهُمْ وَ اللهُ لَظَلِيْمٌ ۝

(۱)۔ المتوفی کا مصدر توفی اور مادہ وفی ہے جس کے اصل معنی پورا پورا لینے کے ہیں انسان کی موت پر جو وفات کا لفظ بولا جاتا ہے تو اسی لیے کہ اس کے جسمانی اختیارات مکمل طور پر سلب کر لیے جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے موت اس کے معنی کی مختلف صورتوں میں سے محض ایک صورت ہے۔ نیند میں بھی چونکہ انسانی اختیارات عارضی طور پر معطل کر دیئے جاتے ہیں اس لیے نیند پر بھی قرآن نے وفات کے لفظ کا اطلاق کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس کے حقیقی اور اصل معنی پورا پورا لینے کے ہی ہیں۔ ﴿ اِنِّ مَتَّوَفَّيْكَ ﴾ میں یہ اسی اپنے حقیقی اور اصلی معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی میں اے عیسیٰ علیہ السلام تجھے یہودیوں کی سازش سے بچا کر پورا پورا اپنی طرف آسمانوں پر اٹھاؤں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور بعض نے اس کے مجازی معنی کی شہرت استعمال کے مطابق موت ہی کے معنی کیے ہیں لیکن اس کے ساتھ انہوں نے کہا ہے کہ الفاظ میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی رَافَعْلَن (میں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں) کے معنی مقدم ہیں اور مَتَّوَفَّيْكَ (فوت کرنے والا ہوں) کے معنی متاخر، یعنی میں تجھے آسمان پر اٹھاؤں گا اور پھر جب دوبارہ دنیا میں نزول ہو گا تو اس وقت موت سے ہمکنار کروں گا۔ یعنی یہودیوں کے ہاتھوں تیرا قتل نہیں ہو گا بلکہ تجھے طبعی موت ہی آئے گی۔ (فتح القدیر و ابن کثیر)

(۲)۔ اس سے مراد ان الزامات سے پاکیزگی ہے جن سے یہودی آپ کو متهم کرتے تھے، نبی ﷺ کے ذریعے سے آپ کی صفائی دنیا کے سامنے پیش کر دی گئی۔

(۳)۔ اس سے مراد یا تو نصاریٰ کا وہ دنیاوی غلبہ ہے جو یہودیوں پر قیامت تک رہے گا گو وہ اپنے غلط عقائد کی وجہ سے نجات اخروی سے محروم ہی رہیں گے۔ یا امت محمدیہ کے افراد کا غلبہ ہے جو درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر تمام انبیاء کی تصدیق کرتے اور ان کے صحیح اور غیر محرف دین کی پیروی کرتے ہیں۔

یہ جسے ہم تیرے سامنے پڑھ رہے ہیں آیتیں ہیں اور حکمت والی نصیحت ہیں۔ (۵۸)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک عیسیٰ (علیہ السلام) کی مثال ہو بہو آدم (علیہ السلام) کی مثال ہے جسے مٹی سے بنا کر کے کہہ دیا کہ ہو جا! پس وہ ہو گیا! (۵۹)

تیرے رب کی طرف سے حق یہی ہے خبردار شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔ (۶۰)

اس لئے جو شخص آپ کے پاس اس علم کے آجانے کے بعد بھی آپ سے اس میں جھگڑے تو آپ کہہ دیں کہ آؤ ہم تم اپنے اپنے فرزندوں کو اور ہم تم اپنی اپنی عورتوں کو اور ہم تم خاص اپنی اپنی جانوں کو بلا لیں، پھر ہم عاجزی کے ساتھ التجا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں۔^(۶۱)

یقیناً صرف یہی سچا بیان ہے اور کوئی معبود برحق نہیں۔ بجز اللہ تعالیٰ کے اور بے شک غالب اور حکمت والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (۶۲)

ذٰلِكَ تَتْلُوهُ عَلٰیكَ مِنَ الْاٰیٰتِ وَ التَّوْحٰیدِ ۝۵۸

اِنَّ مَثَلٰ عِيسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقْنٰهُ

مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۵۹

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝۶۰

فَمَنْ حَآجَبَكَ بَيْنَهُ وَمِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ

تَعَالَوْا نَدْعُ اٰبَتَنَا نَا وَاَبْنَاؤُنَا وَنِسَاؤُنَا وَنِسَاؤُكُمْ

وَ اَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَكَ غَدًّا اللّٰهُ

عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝۶۱

اِنَّ هٰذَا لَهٗوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ

وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶۲

(۱)۔ یہ آیت مباہلہ کہلاتی ہے۔ مباہلہ کے معنی ہیں دو فریق کا ایک دوسرے پر لعنت یعنی بددعا کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ جب دو فریقوں میں کسی معاملے کے حق یا باطل ہونے میں اختلاف و نزاع ہو اور دلائل سے وہ ختم ہوتا نظر نہ آتا ہو تو دونوں بارگاہ الہی میں یہ دعا کریں کہ یا اللہ ہم دونوں میں سے جو جھوٹا ہے، اس پر لعنت فرما۔ اس کا مختصر پس منظر یہ ہے کہ ۹ ہجری میں نجران سے عیسائیوں کا ایک وفد نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وہ جو غلو آمیز عقائد رکھتے تھے اس پر بحث و مناظرہ کرنے لگا۔ بالآخر یہ آیت نازل ہوئی اور نبی ﷺ نے انہیں مباہلہ کی دعوت دی۔ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو بھی ساتھ لیا، اور عیسائیوں سے کہا کہ تم بھی اپنے اہل و عیال کو بلاؤ اور پھر مل کر جھوٹے پر لعنت کی بددعا کریں۔ عیسائیوں نے باہم مشورہ کے بعد مباہلہ کرنے سے گریز کیا اور پیش کش کی کہ آپ ہم سے جو چاہتے ہیں ہم دینے کے لیے تیار ہیں، چنانچہ نبی ﷺ نے ان پر جزیہ مقرر فرما دیا جس کی وصولی کے لیے آپ ﷺ نے حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ کو، جنہیں آپ ﷺ نے امین امت کا خطاب عنایت فرمایا تھا، ان کے ساتھ بھیجا (مخلص از تفسیر ابن کثیر و فتح القدیر وغیرہ) اس سے اگلی آیت میں اہل کتاب (یہودیوں اور عیسائیوں) کو دعوت توحید دی جا رہی ہے۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْعِلِينَ ﴿۳۰﴾

پھر بھی اگر قبول نہ کریں تو اللہ تعالیٰ بھی صحیح طور پر
فسادیوں کو جاننے والا ہے۔ (۶۳)

آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! ایسی انصاف والی بات
کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ
کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں نہ اس کے ساتھ کسی کو
شریک بنائیں،^(۱) نہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر آپس میں ایک
دوسرے کو ہی رب بنائیں۔^(۲) پس اگر وہ منہ پھیر لیں
تو تم کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں^(۳) (۶۳)
اے اہل کتاب! تم ابراہیم کی بابت کیوں جھگڑتے ہو
حالانکہ تورات و انجیل تو ان کے بعد نازل کی گئیں، کیا تم
پھر بھی نہیں سمجھتے؟^(۴) (۶۵)

فَلْيَأْهَلِكِ الْكُذِبُ تَعَالَى كَلِمَةُ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ
أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا
بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا
اشْهَدُوا بِمَا أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۳۱﴾

يَأْهَلِكِ الْكُذِبُ لِمَا نَحْنُ جَاهِلُونَ فِي آيَاتِهِ وَمَا نَزَلَتْ التَّوْرَةُ
وَالْإِنْجِيلَ إِلَّا لِمَنْ بَعْدَهَا أَفَلَا تَتَعَلَّمُونَ ﴿۳۲﴾

(۱) کسی بت کو نہ صلیب کو، نہ آگ کو اور نہ کسی اور چیز کو۔ بلکہ صرف ایک اللہ کی عبادت کریں جیسا کہ تمام انبیاء کی
دعوت رہی ہے۔

(۲) یہ ایک تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم نے حضرت مسیح اور حضرت عزیر علیہما السلام کی ربوبیت (رب ہونے)
کا جو عقیدہ گھڑ رکھا ہے یہ غلط ہے، وہ رب نہیں ہیں انسان ہی ہیں۔ دوسرا، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم نے اپنے
احبار و رہبان کو حلال و حرام کرنے کا جو اختیار دے رکھا ہے، یہ بھی ان کو رب بنانا ہے جیسا کہ آیت — ﴿رَأَيْتُمْ دُفًا
أَحْبَبْتُمْ إِلَيْكُمْ﴾ اس پر شاہد ہے، یہ بھی صحیح نہیں ہے، حلال و حرام کا اختیار بھی صرف اللہ ہی کو ہے۔ (ابن کثیر و فتح القدیر)۔
(۳) صحیح بخاری میں ہے کہ قرآن کریم کے اس حکم کے مطابق آپ ﷺ نے ہر قتل شاہ روم کو مکتوب تحریر فرمایا اور
اس میں اسے اس آیت کے حوالے سے قبول اسلام کی دعوت دی اور اسے کہا کہ تو مسلمان ہو جائے گا تو تجھے دہرا اجر
ملے گا ورنہ ساری رعایا کا گناہ بھی تجھ پر ہو گا۔ «فَأَسْلِمْنَا تَسْلَمًا، أَسْلَمْنَا بِؤْتِكَ اللَّهُ أُجْرَكَ مَرَّتَيْنِ، فَإِنْ تَوَلَّيْتَ، فَإِنَّ
عَلَيْكَ إِثْمَ الْأَرَبِيِّينَ» (صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی نمبر ۷)، «اسلام قبول کر لے، سلامتی میں رہے گا۔
اسلام لے آ، اللہ تعالیٰ تجھے دو گنا اجر دے گا۔ لیکن اگر تو نے قبول اسلام سے اعراض کیا تو رعایا کا گناہ بھی تجھ پر ہی ہو
گا۔» کیونکہ رعایا کے عدم قبول اسلام کا سبب تو ہی ہو گا۔ اس آیت میں مذکور تین نکات یعنی ۱- صرف اللہ کی عبادت
کرنا ۲- اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا ۳- اور کسی کو شریعت سازی کا خدائی مقام نہ دینا وہ کلمہ سوا ہے
جس پر اہل کتاب کو اتحاد کی دعوت دی گئی۔ لہذا اس امت کے شیرازہ کو جمع کرنے کے لیے بھی ان ہی تینوں نکات اور
اس کلمہ سوا کو بدرجہ اولیٰ اساس و بنیاد بنانا چاہیے۔

(۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جھگڑنے کا مطلب یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی دونوں دعویٰ کرتے تھے کہ

سنو! تم لوگ اس میں جھگڑ چکے جس کا تمہیں علم تھا پھر اب اس بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں؟^(۱) اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے‘ (۶۶) ابراہیم تو نہ یہودی تھے نہ نصرانی تھے بلکہ وہ تو یک طرفہ (خالص) مسلمان تھے،^(۲) وہ مشرک بھی نہ تھے، (۶۷) سب لوگوں سے زیادہ ابراہیم سے نزدیک تر وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کا کہا مانا اور یہ نبی اور جو لوگ ایمان لائے،^(۳) مومنوں کا ولی اور سارا اللہ ہی ہے، (۶۸) اہل کتاب کی ایک جماعت چاہتی ہے کہ تمہیں گمراہ کر دیں، دراصل وہ خود اپنے آپ کو گمراہ کر رہے ہیں اور سمجھتے نہیں۔^(۴) (۶۹)

هَآأَنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَآجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۶۶﴾
مَا كَانَ إِبْرَاهِيمَ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۶۷﴾
إِنَّ أَوَّلَ الْغَايِسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَكَذِبِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا السَّبِيحُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَرَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿۶۸﴾
وَدَّتْ ظَالِمَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَضِلُّوكُمْ وَمَا يَضِلُّونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿۶۹﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے دین پر تھے، حالانکہ تورات، جس پر یہودی ایمان رکھتے تھے، اور انجیل جسے عیسائی مانتے تھے، دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سینکڑوں برس بعد نازل ہوئیں، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی یا عیسائی کس طرح ہو سکتے تھے؟ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار سال کا اور حضرت ابراہیم و عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان دو ہزار سال کا فاصلہ تھا (قرطبی)

(۱)۔ تمہارے علم و دیانت کا تو یہ حال ہے کہ جن چیزوں کا تمہیں علم ہے یعنی اپنے دین اور اپنی کتاب کا، اس کی بابت تمہارے جھگڑے (جس کا ذکر پچھلی آیت میں کیا جا چکا ہے) بے اصل بھی ہیں اور بے عقلی کا مظہر بھی۔ تو پھر تم اس بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمہیں سرے سے علم ہی نہیں ہے یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان اور ان کی ملت حنیفیہ کے بارے میں، جس کی اساس توحید و اخلاص پر ہے۔

(۲) ﴿حَنِيفًا مُّسْلِمًا﴾ (یک طرفہ خالص مسلمان) یعنی شرک سے بیزار اور صرف خدائے واحد کے پرستار۔

(۳) اسی لیے قرآن کریم میں نبی کریم ﷺ کو ملت ابراہیمی کا اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے ﴿إِن اتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا﴾ (انجیل، ۱۲۳) علاوہ ازیں حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ﴿إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ وِلَاةً مِنَ النَّبِيِّينَ، وَإِنَّ وِلَاةِي مِنْهُمْ أَبِي وَخَلِيلِي رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ﴾ (ہر نبی کے نبیوں میں سے کچھ دوست ہوتے ہیں، میرے ولی (دوست) ان میں سے میرے باپ اور میرے رب کے خلیل (ابراہیم علیہ السلام ہیں)۔ پھر آپ ﷺ نے یہی آیت تلاوت فرمائی (ترمذی بحوالہ ابن کثیر)

(۴)۔ یہ یہودیوں کے اس حسد و بغض کی وضاحت ہے جو وہ اہل ایمان سے رکھتے تھے اور اسی عناد کی وجہ سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس طرح وہ خود ہی بے شعوری میں اپنے آپ کو گمراہ کر رہے ہیں۔

اے اہل کتاب تم (باوجود قائل ہونے کے پھر بھی) دانستہ اللہ کی آیات کا کیوں کفر کر رہے ہو؟^(۱) (۷۰)
 اے اہل کتاب! باوجود جاننے کے حق و باطل کو کیوں خلط
 طط کر رہے ہو اور کیوں حق کو چھپا رہے ہو؟^(۲) (۷۱)
 اور اہل کتاب کی ایک جماعت نے کہا کہ جو کچھ ایمان والوں
 پر اتارا گیا ہے اس پر دن چڑھے تو ایمان لاؤ اور شام کے
 وقت کافر بن جاؤ؛ تاکہ یہ لوگ بھی پلٹ جائیں۔^(۳) (۷۲)
 اور سوائے تمہارے دین پر چلنے والوں کے اور کسی کا
 یقین نہ کرو۔^(۴) آپ کہہ دیجئے کہ بے شک ہدایت تو
 اللہ ہی کی ہدایت ہے^(۵) (اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ
 تَعْتَمِدُونَ ﴿٧٠﴾
 يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ
 وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٧١﴾
 وَقَالَتْ طَافِيَةُ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أَيْنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَيَّ الَّذِينَ
 آمَنُوا وَجِهَةَ النُّجُومِ وَالْغُرَابَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٧٢﴾
 وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا بِمَا نُنزِلُ فِي الْفُتَىٰ إِنَّ الْفُتَىٰ هُدَىٰ اللَّهُ
 أَنْ يَأْتِيَنَّ أَحَدًا مِمَّا نَحْنُ بِعَايُنِكُمْ عَلَيْنَا عِنْدَ
 رَبِّكُمْ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ

(۱) قائل ہونے کا مطلب ہے کہ تمہیں نبی کریم ﷺ کی صداقت و حقانیت کا علم ہے۔

(۲) اس میں یہودیوں کے دو بڑے جرائم کی نشاندہی کر کے انہیں ان سے باز رہنے کی تلقین کی جا رہی ہے، پہلا جرم حق و باطل اور سچ اور جھوٹ کو خلط طط کرنا تاکہ لوگوں پر حق اور باطل واضح نہ ہو سکے۔ دوسرا کتمان حق۔ یعنی نبی کریم ﷺ کے جو اوصاف تو رات میں لکھے ہوئے تھے، انہیں لوگوں سے چھپانا؛ تاکہ نبی ﷺ کی صداقت کم از کم اس اعتبار سے نمایاں نہ ہو سکے۔ اور یہ دونوں جرم جانتے بوجھے کرتے تھے جس سے ان کی بد بختی دو چند ہو گئی تھی۔ ان کے جرائم کی نشان دہی سورہ بقرہ میں بھی کی گئی ہے ﴿وَلَا تَكْتُمُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (البقرہ: ۲۲۰) ”حق کو باطل کے ساتھ مت ملاؤ اور حق مت چھپاؤ اور تم جانتے ہو۔“ اہل کتاب کے لفظ کو بعض مفسرین نے عام رکھا ہے، جس میں یہود و نصاریٰ دونوں شامل ہیں۔ یعنی دونوں کو ان جرائم مذکورہ سے باز رہنے کی تلقین کی گئی ہے اور بعض کے نزدیک اس سے مراد صرف وہ قبائل یہود ہیں جو مدینے میں رہائش پذیر تھے۔ بنو قریظہ؛ بنو نضیر؛ اور بنو قینقاع۔ زیادہ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کا براہ راست انہی سے معاملہ تھا اور یہی نبی ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

(۳) یہ یہودیوں کے ایک اور مکر کا ذکر ہے۔ جس سے وہ مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے تھے کہ انہوں نے باہم طے کیا کہ صبح کو مسلمان ہو جائیں اور شام کو کافر تاکہ مسلمانوں کے دلوں میں بھی اپنے اسلام کے بارے میں شک پیدا ہو کہ یہ لوگ قبول اسلام کے بعد دوبارہ اپنے دین میں واپس چلے گئے ہیں تو ممکن ہے کہ اسلام میں ایسے عیوب اور خامیاں ہوں جو ان کے علم میں آئی ہوں۔ (۴) یہ آپس میں انہوں نے ایک دوسرے کو کہا۔ کہ تم ظاہری طور پر تو اسلام کا اظہار ضرور کرو لیکن اپنے ہم مذہب (یہود) کے سوا کسی اور کی بات پر یقین مت رکھنا۔

(۵) یہ ایک جملہ معترضہ ہے جس کا ماقبل اور مابعد سے تعلق نہیں ہے۔ صرف ان کے مکر و حیلہ کی اصل حقیقت اس

وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۷۳﴾

بات کا بھی یقین نہ کرو کہ کوئی اس جیسا دیا جائے جیسا تم
دیئے گئے ہو،^(۱) یا یہ کہ یہ تم سے تمہارے رب کے پاس
جھگڑا کریں گے، آپ کہہ دیجئے کہ فضل تو اللہ تعالیٰ ہی
کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہے اسے دے، اللہ تعالیٰ
وسعت والا اور جاننے والا ہے۔ (۷۳)

وہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہے مخصوص کر لے اور
اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔ (۷۴)^(۲)

بعض اہل کتاب تو ایسے ہیں کہ اگر انہیں توخزانے کا امین بنا
دے تو بھی وہ تجھے واپس کر دیں اور ان میں سے بعض ایسے
بھی ہیں کہ اگر تو انہیں ایک دینار بھی امانت دے تو تجھے ادا

يَخْتَصُ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيمِ ﴿۷۴﴾

وَمِنَ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ
يَقْتَضِرْ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ
وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِدِينَارٍ
كَأُيُودَةٍ إِلَيْكَ

سے واضح کرنا مقصود ہے کہ ان کے جیلوں سے کچھ نہیں ہو گا کیونکہ ہدایت تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ جس کو ہدایت
دے دے یا دینا چاہے، تمہارے حیلے اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔

(۱) یہ بھی یہودیوں کا قول ہے اور اس کا عطف وَلَا تَأْمَنُوا پر ہے۔ یعنی یہ بھی تسلیم مت کرو کہ جس طرح تمہارے اندر نبوت
وغیرہ رہی ہے، یہ کسی اور کو بھی مل سکتی ہے اور اس طرح یہودیت کے سوا کوئی اور دین بھی حق ہو سکتا ہے۔

(۲) اس آیت کے دو معنی بیان کیے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہود کے بڑے بڑے علما جب اپنے شاگردوں کو یہ سکھاتے کہ
دن چڑھتے ایمان لاؤ اور دن اترتے کفر کرو تا کہ جو لوگ فی الواقع مسلمان ہیں وہ بھی مذہب ہو کر مرتد ہو جائیں تو ان
شاگردوں کو مزید یہ تاکید کرتے تھے کہ دیکھو صرف ظاہراً مسلمان ہونا، حقیقتاً اور واقعہً مسلمان نہ ہو جانا، بلکہ یہودی ہی
رہنا۔ اور یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ جیسا دین، جیسی وحی و شریعت اور جیسا علم و فضل تمہیں دیا گیا ہے ویسا ہی کسی اور کو بھی دیا
جا سکتا ہے، یا تمہارے بجائے کوئی اور حق پر ہے جو تمہارے خلاف اللہ کے نزدیک حجت قائم کر سکتا ہے۔ اور تمہیں غلط
ٹھہرا سکتا ہے۔ اس معنی کی رو سے جملہ معترضہ کو چھوڑ کر عند ربکم تک کل کا کل یہود کا قول ہو گا۔ دوسرے معنی یہ ہیں
کہ اے یہودیو! تم حق کو دبانے اور مٹانے کی یہ ساری حرکتیں اور سازشیں اس لیے کر رہے ہو کہ ایک تمہیں اس بات
کا غم اور جلن ہے کہ جیسا علم و فضل، وحی و شریعت اور دین تمہیں دیا گیا تھا اب ویسا ہی علم و فضل اور دین کسی اور کو
کیوں دے دیا گیا۔ دوسرا تمہیں یہ اندیشہ اور خطرہ بھی ہے کہ اگر حق کی یہ دعوت پھیل گئی، اور اس نے اپنی جڑیں
مضبوط کر لیں تو نہ صرف یہ کہ تمہیں دنیا میں جو جاہ و وقار حاصل ہے وہ جاتا رہے گا۔ بلکہ تم نے جو حق چھپا رکھا ہے
اس کا پردہ بھی فاش ہو جائے گا۔ اور اس بنا پر یہ لوگ اللہ کے نزدیک بھی تمہارے خلاف حجت قائم کر بیٹھیں گے۔
حالانکہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ دین و شریعت اللہ کا فضل ہے۔ اور یہ کسی کی میراث نہیں۔ بلکہ وہ اپنا فضل جسے
چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور اسے معلوم ہے کہ یہ فضل کس کو دینا چاہیے۔

نہ کریں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ تو اس کے سر پر ہی کھڑا رہے، یہ اس لئے کہ انہوں نے کہہ رکھا ہے کہ ہم پر ان جاہلوں (غیر یہودی) کے حق کا کوئی گناہ نہیں، یہ لوگ باوجود جاننے کے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کہتے ہیں۔ (۱) (۷۵)

کیوں نہیں (مواخذہ ہو گا) البتہ جو شخص اپنا قرار پورا کرے اور پرہیزگاری کرے، تو اللہ تعالیٰ بھی ایسے پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے۔ (۲) (۷۶)

بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اللہ تعالیٰ نہ تو ان سے بات چیت کرے گا نہ ان کی طرف قیامت کے دن دیکھے گا، نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (۳) (۷۷)

اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ذٰلِكَ يَاقُوْمًا لَّيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاٰمِنِيْنَ سَبِيْلٌ وَيَقُوْلُوْنَ عَلٰى اللّٰهِ الْكٰذِبُ وَهُمْ يَعْتَمُوْنَ ۝

بَلِي مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

اِنَّ الْكٰذِبِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ شَمًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَخٰلِقٍ لَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَاَلَا يَكْفٰهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

(۱) اُمِّيَّة (ان پڑھ۔ جاہل) سے مراد مشرکین عرب ہیں یہودی کے خائن لوگ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ یہ چونکہ مشرک ہیں اس لیے ان کا مال ہڑپ کر لینا جائز ہے، اس میں کوئی گناہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں، اللہ تعالیٰ کس طرح کسی مال ہڑپ کر جانے کی اجازت دے سکتا ہے؟ اور بعض تفسیری روایات میں ہے کہ نبی ﷺ نے بھی یہ سن کر فرمایا کہ ”اللہ کے دشمنوں نے جھوٹ کہا، زمانہ جاہلیت کی تمام چیزیں میرے قدموں تلے ہیں، سوائے امانت کے کہ وہ ہر صورت میں ادا کی جائے گی، چاہے وہ کسی نیکو کار کی ہو یا بد کار کی۔“ (ابن کثیر وفتح القدر) افسوس ہے کہ یہودی کی طرح آج بعض مسلمان بھی مشرکین کا مال ہڑپ کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ دارالحرب کا سود جائز ہے۔ اور حربی کے مال کے لیے کوئی عصمت نہیں۔

(۲) ”قرار پورا کرے“ کا مطلب، وہ عہد پورا کرے جو اہل کتاب سے یا ہرنی کے واسطے سے ان کی امتوں سے نبی ﷺ پر ایمان لانے کی بابت لیا گیا ہے اور ”پرہیزگاری کرے“ یعنی اللہ تعالیٰ کے محارم سے بچے اور ان باتوں پر عمل کرے جو نبی ﷺ بیان فرمائیں۔ ایسے لوگ یقیناً مواخذہ الہی سے نہ صرف محفوظ رہیں گے بلکہ محبوب باری تعالیٰ ہوں گے۔

(۳) مذکورہ افراد کے برعکس دوسرے لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ دو طرح کے لوگوں کو شامل ہے ایک تو وہ لوگ جو عہد الہی اور اپنی قسموں کو پس پشت ڈال کر تھوڑے سے دینی مفادات کے لیے نبی ﷺ پر ایمان نہیں لائے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا سودا بیچتے یا کسی کا مال ہڑپ کر جاتے ہیں جیسا کہ احادیث میں وارد ہے۔ مثلاً نبی ﷺ نے فرمایا کہ ”جو شخص کسی کا مال ہتھیانے کے لیے جھوٹی قسم کھائے، وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ اس پر غضب ناک ہو گا“ (صحیح بخاری، کتاب المساقاة، باب الخصومة فی البئر والقضاء فیہا۔

یقیناً ان میں ایسا گروہ بھی ہے جو کتاب پڑھتے ہوئے اپنی زبان مروڑتا ہے تاکہ تم اسے کتاب ہی کی عبارت خیال کرو حالانکہ دراصل وہ کتاب میں سے نہیں اور یہ کہتے بھی ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے حالانکہ دراصل وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں، وہ تو دانستہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں۔^(۱) (۷۸)

کسی ایسے انسان کو جسے اللہ تعالیٰ کتاب و حکمت اور نبوت دے، یہ لائق نہیں کہ پھر بھی وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، بلکہ وہ تو کہے گا کہ تم سب رب کے ہو جاؤ،^(۲) تمہارے کتاب سکھانے کے باعث اور تمہارے کتاب پڑھنے کے سبب۔^(۳) (۷۹)

وَأَنَّ مِنْهُمْ لَفِرْيَاقِيُونَ أَلَسَدْتَهُمْ بِالْكِتَابِ لِيَتَّصِبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكِبْرُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۷۹﴾

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَ وَالنَّبِيَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّيْحَةً لِي بِمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ الْكُتُبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تُدْرِسُونَ ﴿۸۰﴾

مسلم، کتاب الایمان، باب وعید من اقتطع حق مسلم.... نیز فرمایا تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ نہ کلام کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا، نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا، ان میں ایک وہ شخص ہے جو جھوٹی قسم کے ذریعے سے اپنا سودا بیچتا ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان غلظت تحریم إسبال الإزار....) متعدد احادیث میں یہ باتیں بیان کی گئی ہیں۔ (ابن کثیر، فتح القدر)

(۱) یہ یہود کے ان لوگوں کا تذکرہ ہے جنہوں نے کتاب الہی (تورات) میں نہ صرف تحریف و تبدیلی کی بلکہ دو جرم اور بھی کیے کہ ایک تو زبان کو مروڑ کر کتاب کے الفاظ پڑھتے جس سے عوام کو خلاف واقعہ تاثر دینے میں وہ کامیاب رہتے۔ دوسرے، وہ اپنی خود ساختہ باتوں کو من عند اللہ باور کراتے۔ بد قسمتی سے امت محمدیہ کے مذہبی پیشواؤں میں بھی، نبی ﷺ کی پیش گوئی «لَتَتَّبِعَنَّ سَنَنْ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ» (تم اپنے سے پہلی امتوں کی قدم بہ قدم پیروی کرو گے) کے مطابق بکثرت ایسے لوگ ہیں جو دنیوی اغراض، یا جماعتی تعصب یا فقهی جمود کی وجہ سے قرآن کریم کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرتے ہیں۔ پڑھتے قرآن کی آیت ہیں اور مسئلہ اپنا خود ساختہ بیان کرتے ہیں۔ عوام سمجھتے ہیں کہ مولوی صاحب نے مسئلہ قرآن سے بیان کیا ہے دراصل حالیکہ اس مسئلے کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یا پھر آیات میں معنوی تحریف و طبع سازی سے کام لیا جاتا ہے تاکہ باور یہی کرایا جائے کہ یہ من عند اللہ ہے۔ أَعَادَنَا اللَّهُ مِنْهُ۔

(۲) یہ عیسائیوں کے ضمن میں کہا جا رہا ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا بنایا ہوا ہے حالانکہ وہ ایک انسان تھے جنہیں کتاب و حکمت اور نبوت سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اور ایسا کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے پجاری اور بندے بن جاؤ، بلکہ وہ تو یہی کہتا ہے کہ رب والے بن جاؤ۔ رَبَّانِي رَبِّ كَيْفَ مِنْ رَبِّكَ مَنْ يَخْلُقُ الْفُلَّ لِي يَكُونَ لِي مِثْلُ الْبَحْرِ يَوْمَ يَكْفُرُ الْمَلَائِكَةُ بِمَا كُنْتُمْ تَفْعَلُونَ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ يَكْفُلُ بِكُمْ يَرْغَبُ فِيكُمْ وَيُنذِرُ لَكُمْ يُنذِرُ لَكُمْ وَأَنْتُمْ كَاذِبُونَ ﴿۸۱﴾

(۳) یعنی کتاب اللہ کی تعلیم و تدریس کے نتیجے میں رب کی شناخت اور رب سے خصوصی ربط و تعلق قائم ہونا چاہیے۔

اور یہ نہیں (ہو سکتا) کہ وہ تمہیں فرشتوں اور نبیوں کو رب بنالینے کا حکم کرے، کیا وہ تمہارے مسلمان ہونے کے بعد بھی تمہیں کفر کا حکم دے گا۔ (۸۰)^(۱)

جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے عہد لیا کہ جو کچھ میں تمہیں کتاب و حکمت دوں پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو تمہارے پاس کی چیز کوچ بتائے تو تمہارے لئے اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا ضروری ہے۔^(۲) فرمایا کہ تم اس کے اقراری ہو اور اس پر میرا ذمہ لے رہے ہو؟ سب نے کہا کہ ہمیں اقرار ہے، فرمایا تو اب گواہ رہو اور خود میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں (۸۱)

پس اس کے بعد بھی جو پلٹ جائیں وہ یقیناً پورے

وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ
أَرْبَابًا. أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿٨٠﴾

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْنَاكُمْ مِنْ كِتَابٍ

وَحِكْمَةٍ لِكُمْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْكُمْ فَيَأْتِيكُمْ

لَكُمْ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِمْ قَالُوا أَتُزَكَّوْنا وَأَنْتُمْ

عَلَىٰ ذُلِكُمْ أَصْرَبُونَ قَالُوا أَتُزَكَّوْنا قَالَ فَاشْهَدُوا

وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨١﴾

فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ﴿٨٢﴾

اسی طرح کتاب اللہ کا علم رکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو بھی قرآن کی تعلیم دے۔ اس آیت سے واضح ہے کہ جب اللہ کے پیغمبروں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی عبادت کرنے کا حکم دیں، تو کسی اور کو یہ حق کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے؟ (تفسیر ابن کثیر)

(۱) یعنی نبیوں اور فرشتوں (یا کسی اور کو) رب والی صفات کا حامل باور کرانا یہ کفر ہے۔ تمہارے مسلمان ہو جانے کے بعد ایک نبی یہ کام بھلا کس طرح کر سکتا ہے؟ کیونکہ نبی کا کام تو ایمان کی دعوت دینا ہے جو اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کا نام ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی شان نزول میں یہ بات بیان کی ہے کہ بعض مسلمانوں نے نبی ﷺ سے اس بات کی اجازت مانگی کہ وہ آپ کو سجدہ کریں۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (فتح القدر) اور بعض نے اس کی شان نزول میں یہ کہا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے جمع ہو کر نبی ﷺ سے کہا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی اس طرح عبادت و پرستش کریں جس طرح عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کرتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ کی پناہ، اس بات سے کہ ہم اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کریں یا کسی کو اس کا حکم دیں، اللہ نے مجھے نہ اس لیے بھیجا ہے نہ اس کا حکم ہی دیا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (ابن کثیر۔ بحوالہ سیرة ابن ہشام)

(۲) یعنی ہر نبی سے یہ وعدہ لیا گیا کہ اس کی زندگی اور دور نبوت میں اگر دو سرا نبی آئے گا تو اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا ضروری ہو گا؛ جب نبی کی موجودگی میں آنے والے نئے نبی پر خود اس نبی کو ایمان لانا ضروری ہے تو ان کی امتوں کے لیے تو اس نئے نبی پر ایمان لانا بطریق اولیٰ ضروری ہے۔ بعض مفسرین نے دَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ سے الرَّسُوْلُ کا مفہوم مراد لیا ہے یعنی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بابت تمام نبیوں سے عہد لیا گیا کہ اگر ان کے دور میں وہ آجائیں تو اپنی نبوت ختم کر کے ان پر ایمان لانا ہو گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ پہلے معنی میں ہی یہ دو سرا مفہوم از خود آجاتا ہے۔ اس لیے الفاظ

نافرمان ہیں^(۱) (۸۲)

کیا وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے سوا اور دین کی تلاش میں ہیں؟ حالانکہ تمام آسمانوں والے اور سب زمین والے اللہ تعالیٰ ہی کے فرمانبردار ہیں خوشی سے ہوں یا ناخوشی سے،^(۲) سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ (۸۳)

آپ کہہ دیجئے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور جو کچھ ہم پر اتار گیا ہے اور جو کچھ ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ السلام) اور یعقوب (علیہ السلام) اور ان کی اولاد پر اتار گیا اور جو کچھ موسیٰ و عیسیٰ (علیہما السلام) اور دوسرے انبیاء (علیہم السلام) اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے گئے، ان سب پر ایمان لائے،^(۳) ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں

أَفَتَدْعُونَ إِلَهُ مِثْلَ اللَّهِ يَبْعَثُونَ لَوْلَا أَسْأَلُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَالَّذِينَ يَرِجَعُونَ ﴿۸۲﴾

كُلُّ الْمَلِكِ بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ
وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْإِسْبَاطِ وَمَا أَتَىٰ مُوسَىٰ
وَ عِيسَىٰ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ
وَعَنْ لَّهُ مُشْرِكُونَ ﴿۸۳﴾

قرآن کے اعتبار سے پہلا مفہوم ہی زیادہ صحیح ہے اور اس مفہوم کے لحاظ سے بھی یہ بات واضح ہے کہ نبوت محمدی کے سراج منیر کے بعد کسی بھی نبی کا چراغ نہیں جل سکتا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما تورات کے اوراق پڑھ رہے تھے تو نبی ﷺ یہ دیکھ کر غضب ناک ہوئے اور فرمایا کہ ”قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہو کر آجائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کے پیچھے لگ جاؤ تو یقیناً گمراہ ہو جاؤ گے“ (مسند احمد، بحوالہ ابن کثیر) بہر حال اب قیامت تک واجب الاتباع صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور نجات انہی کی اطاعت میں منحصر ہے نہ کہ کسی امام کی اندھی تقلید یا کسی بزرگ کی بیعت میں۔ جب کسی پیغمبر کا سکھہ اب نہیں چل سکتا تو کسی اور کی ذات غیر مشروط اطاعت کی مستحق کیوں کر ہو سکتی ہے؟ اصرار بمعنی عہد اور ذمہ ہے۔

(۱) یہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) اور دیگر اہل مذاہب کو تنبیہ ہے کہ بعثت محمدی کے بعد بھی ان پر ایمان لانے کے بجائے اپنے اپنے مذاہب پر قائم رہنا اس عہد کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے واسطے سے ہر امت سے لیا اور اس عہد سے انحراف کفر ہے۔ فسق یہاں کفر کے معنی میں ہے کیونکہ نبوت محمدی سے انکار صرف فسق نہیں، سراسر کفر ہے۔

(۲) جب آسمان اور زمین کی کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے باہر نہیں، چاہے خوشی سے یا ناخوشی سے۔ تو پھر تم اس کے سامنے قبول اسلام سے کیوں گریز کرتے ہو؟ اگلی آیات میں ایمان لانے کا طریقہ بتلا کر (کہ ہر نبی اور ہر منزل کتاب پر بغیر تفریق کے ایمان لانا ضروری ہے) پھر کہا جا رہا ہے کہ اسلام کے سوا کوئی اور دین قبول نہیں ہو گا، کسی اور دین کے پیروکاروں کے حصے میں سوائے گھائلے کے اور کچھ نہیں آئے گا۔

(۳) یعنی تمام سچے نبیوں پر ایمان لانا کہ وہ اپنے اپنے وقت میں اللہ کی طرف سے مبعوث تھے، نیز ان پر جو کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے ان کی بابت بھی یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ آسمانی کتابیں تھیں جو واقعی اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ
وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۵۰﴾

كَيْفَ يَعْبُدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا وَعَدَلْنَا بِهِمْ وَسَمِعُوا
أَنَ الرَّسُولِ حَقَّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۵۱﴾

أُولَئِكَ جَزَّأَهُمُ أَنَّ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَكَةِ
وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۵۲﴾

خَلِيدِينَ فِيهَا لَا يَخْفَعُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يَنْظُرُونَ ﴿۵۳﴾

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا إِنَّ اللَّهَ
عَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۵۴﴾

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَدَلْنَا بِهِمْ ثُمَّ اتَّخَذُوا كُفْرًا لَّن
نُقْبَلُ تَوْبَهُمْ وَاللَّهُ لَمُتَّسِلُونَ ﴿۵۵﴾

کرتے اور ہم اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں۔ (۸۳)
جو شخص اسلام کے سوا اور دین تلاش کرے، اس کا دین
قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں
میں ہو گا۔ (۸۵)

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا جو اپنے ایمان
لانے اور رسول کی حقانیت کی گواہی دینے اور اپنے پاس
روشن دلیلیں آجانے کے بعد کافر ہو جائیں، اللہ تعالیٰ
ایسے بے انصاف لوگوں کو راہ راست پر نہیں لاتا۔ (۸۶)
ان کی تو یہی سزا ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی
اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔ (۸۷)

جس میں یہ ہمیشہ پڑے رہیں گے، نہ تو ان سے عذاب ہلکا
کیا جائے گا نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔ (۸۸)
مگر جو لوگ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں تو بے
شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۸۹) ^(۱)

بے شک جو لوگ ^(۲) اپنے ایمان لانے کے بعد کفر کریں
پھر کفر میں بڑھ جائیں، ان کی توبہ ہرگز ہرگز قبول نہ کی
جائے گی، ^(۳) یہی گمراہ لوگ ہیں۔ (۹۰)

ضروری ہے۔ گواہ عمل صرف قرآن کریم ہی پر ہو گا، کیونکہ قرآن نے کھجلی کتابوں کو منسوخ کر دیا۔

(۱) انصار میں سے ایک مسلمان مرتد ہو گیا اور مشرکوں سے جا ملا، لیکن جلد ہی اسے ندامت ہوئی اور اس نے لوگوں کے
ذریعے سے رسول اللہ ﷺ تک پیغام بھجوایا کہ (هل لي من توبة) (کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟) اس پر یہ آیات
نازل ہوئیں۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ مرتد کی سزا اگرچہ بہت سخت ہے کیونکہ اس نے حق کو پہچاننے کے بعد بغض و
عناد اور سرکشی سے حق سے اعراض و انکار کیا۔ تاہم اگر کوئی خلوص دل سے توبہ اور اپنی اصلاح کر لے تو اللہ تعالیٰ غفور
ورحیم ہے، اس کی توبہ قابل قبول ہے۔

(۲) اس آیت میں ان کی سزایمان کی جارہی ہے جو مرتد ہونے کے بعد توبہ کی توفیق سے محروم رہیں اور کفر پر ان کا انتقال ہو۔

(۳) اس سے وہ توبہ مراد ہے جو موت کے وقت ہو۔ ورنہ توبہ کا دروازہ تو ہر ایک کے لیے ہر وقت کھلا ہے۔ اس سے

ہاں جو لوگ کفر کریں اور مرتے دم تک کافر رہیں ان میں سے کوئی اگر زمین بھر سونا دے گو فدیے میں ہی ہو تو بھی ہرگز قبول نہ کیا جائے گا یہی لوگ ہیں جنکے لئے تکلیف دینے والا عذاب ہے اور جن کا کوئی مددگار نہیں۔ (۹۱)^(۱)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفْرًا فَكَانُوا يُقْبَلُونَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلَّةَ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلِيُوَفَّقُوا بِهِ*
أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ مُصِيرِينَ ﴿۹۱﴾

پہلی آیت میں بھی قبولیت توبہ کا اثبات ہے۔ علاوہ ازیں قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بار بار توبہ کی اہمیت اور قبولیت کو بیان فرمایا ہے ﴿وَالَّذِينَ يُقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ﴾ (الشوریٰ- ۲۵) ﴿الَّذِينَ يَكْفُرُونَ إِنَّ اللَّهَ يُوَفِّيكَ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ﴾ ... (التوبہ- ۱۰۳) ”کیا انہوں نے نہیں جانا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے“ اور احادیث میں بھی یہ مضمون بڑی وضاحت سے بیان ہوا ہے۔ اس لیے اس آیت سے مراد آخری سانس کی توبہ ہے جو نامقبول ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کے ایک اور مقام پر ہے ﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ الشَّيْءَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ﴾ (النساء- ۱۸) ”ان کی توبہ (قبول) نہیں ہے جو برائی کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے ایک کو موت آنے لگتی ہے تو کہتا ہے میری توبہ“۔ حدیث میں بھی ہے ﴿إِنَّ اللَّهَ يُغْفِرُ النَّوْبَةَ الْعَبْدَ مَا لَمْ يُغْرَبْ﴾ (مسند احمد، ترمذی، بحوالہ فیض القدر، شرح الجامع الصغیر) ”اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک اسے موت کا پھون نہ لگے“ یعنی جان کنی کے وقت کی توبہ قبول نہیں۔

(۱) حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن ایک جنمی سے کہے گا کہ اگر تیرے پاس دنیا بھر کا سامان ہو تو کیا تو اس عذاب نار کے بدلے اسے دیتا پسند کرے گا؟ وہ کہے گا ”ہاں“ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے دنیا میں تجھ سے اس سے کہیں زیادہ آسان بات کا مطالبہ کیا تھا کہ میرے ساتھ شرک نہ کرنا، مگر تو شرک سے باز نہیں آیا“ (مسند احمد و کلذا اخرج البخاری و مسلم۔ ابن کثیر) اس سے معلوم ہوا کہ کافر کے لیے جہنم کا دائمی عذاب ہے۔ اس نے اگر دنیا میں کچھ اچھے کام بھی کیے ہوں گے تو کفر کی وجہ سے وہ بھی ضائع ہی جائیں گے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ عبد اللہ بن جدعان کی بابت پوچھا گیا کہ وہ ممان نواز، غریب پرور تھا اور غلاموں کو آزاد کرنے والا تھا، کیا یہ اعمال اسے نفع دیں گے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ”نہیں“ کیونکہ اس نے ایک دن بھی اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی نہیں مانگی (صحیح مسلم۔ کتاب الایمان)۔ اسی طرح اگر کوئی شخص وہاں زمین بھر سونا بطور فدیہ دے کر یہ چاہے کہ وہ عذاب جہنم سے بچ جائے، تو یہ ممکن نہیں ہو گا۔ اول تو وہاں کسی کے پاس ہو گا ہی کیا؟ اور اگر بالفرض اس کے پاس دنیا بھر کے خزانے ہوں اور انہیں دے کر عذاب سے چھوٹ جانا چاہے تو یہ بھی نہیں ہو گا، کیونکہ اس سے وہ معاوضہ یا فدیہ قبول ہی نہیں کیا جائے گا۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا سَبِيلَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَلَا تَتَّبِعُوا سَبِيلَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (البقرة، ۱۳۳) ”اس سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ کوئی سفارش اسے فائدہ پہنچائے گی۔“ ﴿لَا تَتَّبِعُوا سَبِيلَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (سورۃ ابراہیم، ۳۱) ”اس دن میں کوئی خرید و فروخت ہوگی نہ کوئی دوستی (ہی کام آئے گی)۔“

جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرو گے ہرگز بھلائی نہ پاؤ گے،^(۱) اور تم جو خرچ کرو اسے اللہ تعالیٰ بخوبی جانتا ہے۔^(۲) (۹۲)

توراة کے نزول سے پہلے (حضرت) یعقوب (علیہ السلام) نے جس چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اس کے سوا تمام کھانے بنی اسرائیل پر حلال تھے، آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو توراة لے آؤ اور پڑھ سناؤ۔^(۳) (۹۳)

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿۹۲﴾

كُلُّ الظَّالِمِ كَانَ حِلًّا لِنَبِيِّ إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنزَلَ التَّوْرَةُ قُلْ فَاذْكُرُوا التَّوْرَةَ فَالْتَمَسُوا فِيهَا مَا تُلْمَهُمْ صِدْقَيْنِ ﴿۹۳﴾

(۱) بر (بیکل بھلائی) سے مراد یہاں عمل صالح یا جنت ہے (فتح القدیر) حدیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ جو مدینہ میں اصحابِ حشیت میں سے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرا باغ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے، میں اسے اللہ کی رضا کے لیے صدقہ کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”وہ تو بہت نفع بخش مال ہے، میری رائے یہ ہے کہ تم اسے اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دو۔“ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے سے انہوں نے اسے اپنے اقارب اور عم زادوں میں تقسیم کر دیا۔ (مسند احمد) اسی طرح اور بھی متعدد صحابہ نے اپنی پسندیدہ چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کیں۔ مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ میں مِنْ تَنْبِيضِ کے لیے ہے یعنی ساری پسندیدہ چیزیں خرچ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ بلکہ پسندیدہ چیزوں میں سے کچھ۔ اس لیے کوشش یہی ہونی چاہیے کہ اچھی چیز صدقہ کی جائے۔ یہ افضل اور اکمل درجہ حاصل کرنے کا طریقہ ہے جس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کمتر چیز یا اپنی ضرورت سے زائد فالتو چیز یا استعمال شدہ پرانی چیز کا صدقہ نہیں کیا جا سکتا یا اس کا اجر نہیں ملے گا۔ اس قسم کی چیزوں کا صدقہ کرنا بھی یقیناً جائز اور باعث اجر ہے گو کمال و افضلیت محبوب چیز کے خرچ کرنے میں ہے۔

(۲) تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے، اچھی یا بری چیز، اللہ اسے جانتا ہے، اس کے مطابق جزا سے نوازے گا۔

(۳) یہ اور مابعد کی دو آیتیں یہود کے اس اعتراض پر نازل ہوئیں کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دین ابراہیمی کے پیرو کار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اونٹ کا گوشت بھی کھاتے ہیں جب کہ اونٹ کا گوشت اور اس کا دودھ دین ابراہیمی میں حرام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہود کا دعویٰ غلط ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین میں یہ چیزیں حرام نہیں تھیں۔ ہاں البتہ بعض چیزیں اسرائیل (حضرت یعقوب علیہ السلام) نے خود اپنے اوپر حرام کر لی تھیں اور وہ یہی اونٹ کا گوشت اور اس کا دودھ تھا (اس کی ایک وجہ نذر یا بیماری تھی) اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا یہ فعل بھی نزولِ توراة سے پہلے کا ہے، اس لیے کہ توراة تو حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت یعقوب علیہ السلام کے بہت بعد نازل ہوئی ہے۔ پھر تم کس طرح مذکورہ دعویٰ کر سکتے ہو؟ علاوہ ازیں توراة میں بعض چیزیں تم (یہودیوں) پر تمہارے ظلم اور سرکشی کی وجہ سے حرام کی گئی تھیں۔ (سورۃ الانعام ۳۶۔ النساء ۱۶۰) اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو توراة لاؤ اور اسے پڑھ کر سناؤ جس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں یہ چیزیں

اس کے بعد بھی جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بہتان باندھیں وہی ظالم ہیں۔ (۹۴)
 کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ سچا ہے تم سب ابراہیم حنیف کے ملت کی پیروی کرو، جو مشرک نہ تھے۔ (۹۵)
 اللہ تعالیٰ کا پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ (شریف) میں ہے (۱) جو تمام دنیا کے لئے برکت و ہدایت والا ہے۔ (۹۶)

جس میں کھلی کھلی نشانیاں ہیں، مقام ابراہیم ہے، اس میں جو آجائے امن والا ہو جاتا ہے (۲) اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر جو اس کی طرف راہ پا سکتے ہوں اس گھر کا حج فرض کر دیا ہے۔ (۳) اور جو کوئی کفر کرے تو اللہ تعالیٰ (اس سے بلکہ) تمام دنیا سے بے پرواہ ہے (۴) (۹۷)

آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب تم اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کیوں کرتے ہو؟ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ

مَنْ افترى على الله الكذب من بعد ذلك فأولئك هم الظالمون ﴿۹۴﴾

قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَإِذَا تَوَلَّوْا لِرَبِّهِمْ حَقِيقًا وَمَا كَانَ مِنَ الشُّرِكِينَ ﴿۹۵﴾

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ﴿۹۶﴾

فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ عَنِّي وَعَنْ عِبَدِهِ الْعَالَمِينَ ﴿۹۷﴾

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ ﴿۹۸﴾

حرام نہیں تھیں اور تم پر بھی بعض چیزیں حرام کی گئیں تو اس کی وجہ تمہاری ظلم و زیادتی تھی یعنی ان کی حرمت بطور سزا تھی۔ (ایسرالتفسیر)

(۱) یہ یہود کے دوسرے اعتراض کا جواب ہے، وہ کہتے تھے کہ بیت المقدس سب سے پہلا عبادت خانہ ہے۔ محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے اپنا قبلہ کیوں بدل لیا؟ اس کے جواب میں کہا گیا تمہارا یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ پہلا گھر جو اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر کیا گیا ہے، وہ ہے جو مکہ میں ہے۔

(۲) اس میں قتال، خون ریزی، شکار حتیٰ کہ درخت تک کا کاٹنا ممنوع ہے (صحیحین)

(۳) ”راہ پا سکتے ہوں“ کا مطلب زاد راہ کی استطاعت اور فراہمی ہے۔ یعنی اتنا خرچ کہ سفر کے اخراجات پورے ہو جائیں۔ علاوہ ازیں استطاعت کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ راستہ پر امن ہو اور جان و مال محفوظ رہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ صحت و تندرستی کے لحاظ سے سفر کے قابل ہو۔ نیز عورت کے لیے محرم بھی ضروری ہے۔ (فتح القدیر) یہ آیت ہر صاحب استطاعت کے لیے وجوب حج کی دلیل ہے اور احادیث سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ یہ عمر میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے (تفسیر ابن کثیر)

(۴) استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے کو قرآن نے ”کفر“ سے تعبیر کیا ہے جس سے حج کی فرضیت میں اور اس کی تاکید میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ احادیث و آثار میں بھی ایسے شخص کے لیے سخت وعید آئی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

تعالیٰ اس پر گواہ ہے۔ (۹۸)

ان اہل کتاب سے کہو کہ تم اللہ تعالیٰ کی راہ سے لوگوں کو کیوں روکتے ہو؟ اور اس میں عیب ٹٹولتے ہو، حالانکہ تم خود شاہد ہو،^(۱) اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔ (۹۹)

اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب کی کسی جماعت کی باتیں مانو گے تو وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد مرتد کافر بنا دیں گے۔ (۱۰۰)

(گویہ ظاہر ہے کہ) تم کیسے کفر کر سکتے ہو؟ باوجودیکہ تم پر اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور تم میں رسول اللہ (ﷺ) موجود ہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ (کے دین) کو مضبوط تھام لے^(۲) تو بلاشبہ اسے راہ راست دکھا دی گئی۔ (۱۰۱)

قُلْ يَا مَعْ كُتِبَ لِمَنْ تَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ تَبِعُوا نَهَا عَمَّا وَانْتُمْ شُهَدَاءُ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۹۸﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا فَرِيضًا مِنَ الدِّينِ أَوْ تَوَلَّوْا الْكُتُبَ يَزِدْكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفْرًا ۖ ﴿۹۹﴾

وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُثَلِّثُونَ عَلَى كُفْرِكُمْ أَتَيْتُمُ اللَّهَ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۱۰۰﴾

(۱) یعنی تم جانتے ہو کہ یہ دین اسلام حق ہے، اس کے داعی اللہ کے سچے پیغمبر ہیں کیونکہ یہ باتیں ان کتابوں میں درج ہیں جو تمہارے انبیاء پر آئیں اور جنہیں تم پڑھتے ہو۔

(۲) یہودیوں کے مکرو فریب اور ان کی طرف سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی مذموم کوششوں کا ذکر کرنے کے بعد مسلمانوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تم بھی ان کی سازشوں سے ہشیار رہو اور قرآن کی تلاوت کرنے اور رسول اللہ (ﷺ) کے موجود ہونے کے باوجود کہیں یہود کے جال میں نہ پھنس جاؤ۔ اس کا پس منظر تفسیری روایات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ انصار کے دونوں قبیلے اوس اور خزرج ایک مجلس میں اکٹھے بیٹھے باہم گفتگو کر رہے تھے کہ شاس بن قیس یہودی ان کے پاس سے گزرا اور ان کا باہمی پیار دیکھ کر جل بھن گیا کہ پہلے یہ ایک دوسرے کے سخت دشمن تھے اور اب اسلام کی برکت سے باہم شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ اس نے ایک نوجوان کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ ان کے درمیان جا کر جنگ بعثت کا تذکرہ کرے جو ہجرت سے ذرا پہلے ان کے درمیان برپا ہوئی تھی اور انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف جو رزمیہ اشعار کہے تھے وہ ان کو سنائے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا، جس پر ان دونوں قبیلوں کے پرانے جذبات پھر بھڑک اٹھے اور ایک دوسرے کو گالی گلوچ دینے لگے یہاں تک کہ ہتھیار اٹھانے کے لیے لاکار اور پکار شروع ہو گئی۔ اور قریب تھا کہ ان میں باہم قتال بھی شروع ہو جائے کہ اتنے میں نبی (ﷺ) تشریف لے آئے اور انہیں سمجھایا اور وہ باز آگئے اس پر یہ آیات بھی اور جو آگے آ رہی ہیں وہ بھی نازل ہوئیں (تفسیر ابن کثیر، فتح القدیر وغیرہ)

(۳) اَعْتَصَمَ بِاللَّهِ کے معنی ہیں۔ اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھام لینا اور اس کی اطاعت میں کوتاہی نہ کرنا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَتَّبِعُوْنَ
اِلٰهًا وَّانْتُمْ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ
عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءَ فَاَلْفَ بَيْنٍ فَارْبَحْتُمْ فَاصْبِرْ لِمَا يَنْعَمُ بِهٖ
اِخْوَانًا وَّكُنْتُمْ عَلٰٓى شَفَا حُفْرٍ وَّ مِنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ
مِنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے اتنا ڈرو جتنا اس سے ڈرنا
چاہیے^(۱) اور دیکھو مرتے دم تک مسلمان ہی رہنا۔ (۱۰۲)
اللہ تعالیٰ کی رسی کو سب مل کر مضبوط تھام لو^(۲) اور
پھوٹ نہ ڈالو،^(۳) اور اللہ تعالیٰ کی اس وقت کی نعمت کو
یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، تو اس نے
تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی، پس تم اس کی مہربانی
سے بھائی بھائی ہو گئے، اور تم آگ کے گڑھے کے
کنارے پہنچ چکے تھے تو اس نے تمہیں بچالیا۔ اللہ تعالیٰ
اسی طرح تمہارے لیے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم
ہدایت پاؤ۔ (۱۰۳)

(۱) اس کا مطلب ہے کہ اسلام کے احکام و فرائض پورے طور پر بجالائے جائیں اور منہیات کے قریب نہ جایا جائے۔
بعض کہتے ہیں کہ اس آیت سے صحابہ رضی اللہ عنہم پریشان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آیت ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ”اللہ سے
اپنی طاقت کے مطابق ڈرو“ نازل فرمادی۔ لیکن اسے ناحی کی بجائے اس کی مُبَيِّن (بیان و توضیح کرنے والی) قرار دیا جائے
تو زیادہ صحیح ہے، کیونکہ نسخ و ہیں ماننا چاہیے جہاں دونوں آیتوں میں جمع و تطبیق ممکن نہ ہو اور یہاں یہ تطبیق ممکن ہے۔
معنی یہ ہوں گے ”اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تَقَاتِهِ مَا اسْتَطَعْتُمْ“ ”اللہ سے اس طرح ڈرو جس طرح اپنی طاقت کے مطابق ڈرنے
کا حق ہے“ (فتح القدیر)

(۲) تقویٰ کے بعد اعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا، — ”سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں“ کا درس دے کر
واضح کر دیا کہ نجات بھی انہی دو اصولوں میں ہے اور اتحاد بھی انہی پر قائم ہو سکتا اور رہ سکتا ہے۔

(۳) وَلَا تَفَرَّقُوْا ”اور پھوٹ نہ ڈالو“ کے ذریعے فرقہ بندی سے روک دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مذکورہ دو
اصولوں سے انحراف کرو گے تو تمہارے درمیان پھوٹ پڑ جائے گی اور تم الگ الگ فرقوں میں بٹ جاؤ گے۔ چنانچہ فرقہ
بندی کی تاریخ دیکھ لیجیے، یہی چیز نمایاں ہو کر سامنے آئے گی، قرآن و حدیث کے فہم اور اس کی توضیح و تعبیر میں کچھ باہم
اختلاف، یہ فرقہ بندی کا سبب نہیں ہے۔ یہ اختلاف تو صحابہ و تابعین کے عہد میں بھی تھا لیکن مسلمان فرقوں اور
گروہوں میں تقسیم نہیں ہوئے۔ کیونکہ اس اختلاف کے باوجود سب کا مرکز اطاعت اور محور عقیدت ایک ہی تھا قرآن
اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم لیکن جب شخصیات کے نام پر دبستان فکر معرض وجود میں آئے تو اطاعت و عقیدت کے یہ مرکز
و محور تبدیل ہو گئے۔ اپنی اپنی شخصیات اور ان کے اقوال و افکار اولین حیثیت کے اور اللہ رسول اور ان کے فرمودات
ثانوی حیثیت کے حامل قرار پائے۔ اور ہمیں سے امت مسلمہ کے افتراق کے لمحیے کا آغاز ہوا جو دن بہ دن بڑھتا ہی چلا
گیا اور نہایت مستحکم ہو گیا۔

تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے اور نیک کاموں کا حکم کرے اور برے کاموں سے روکے، اور یہی لوگ فلاح و نجات پانے والے ہیں۔ (۱۰۳)

تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے پاس روشن دلیلیں آ جانے کے بعد بھی تفرقہ ڈالا^(۱) اور اختلاف کیا، انہیں لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے۔ (۱۰۵)
جس دن بعض چرے سفید ہوں گے اور بعض سیاہ^(۲) سیاہ چرے والوں (سے کہا جائے گا) کہ کیا تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا؟ اب اپنے کفر کا عذاب چکھو۔ (۱۰۶)
اور سفید چرے والے اللہ تعالیٰ کی رحمت میں داخل ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۱۰۷)

اے نبی! ہم ان حنائی آیتوں کی تلاوت آپ پر کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ لوگوں پر ظلم کرنے کا نہیں۔ (۱۰۸)
اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف تمام کام لوٹائے جاتے ہیں۔ (۱۰۹)

وَلَنْتَنِيَنَّكُمْ أَنَّمَا يُنذِرُ إِلَىٰ الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوكَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۰۳﴾

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنۢ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۰۵﴾

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكْفَرْتُمْ بَعْدَٰئِمَانِكُمْ فَمَا تَكْفُرُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۱۰۶﴾

وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۰۷﴾

تَبٰرَكَ اٰنٓبَا اللّٰهُ نَسَلُوْهَا عَلَيْكَ يَا لِحَقِّيْ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ لِكُلِّمَلَآئِكُمْ اٰيٰتٍ ﴿۱۰۸﴾

وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَاِلٰى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾

(۱) روشن دلیلیں آ جانے کے بعد تفرقہ ڈالا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ کے باہمی اختلاف و تفرقہ کی وجہ یہ نہ تھی کہ انہیں حق کا پتہ نہ تھا۔ اور وہ اس کے دلائل سے بے خبر تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے سب کچھ جانتے ہوئے محض اپنے دنیاوی مفاد اور نفسانی اغراض کے لیے اختلاف و تفرقہ کی راہ پکڑی تھی اور اس پر جتے ہوئے تھے۔ قرآن مجید نے مختلف اسلوب اور پیرائے سے بار بار اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے اور اس سے دور رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ مگر افسوس کہ اس امت کے تفرقہ بازوں نے بھی ٹھیک یہی روش اختیار کی کہ حق اور اس کی روشن دلیلیں انہیں خوب اچھی طرح معلوم ہیں۔ مگر وہ اپنی فرقہ بندیوں پر جتے ہوئے ہیں اور اپنی عقل و ذہانت کا سارا جوہر سابقہ امتوں کی طرح تاویل و تحریف کے کمروہ شغل میں ضائع کر رہے ہیں۔

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس سے اہل سنت و الجماعت اور اہل بدعت و افتراق مراد لیے ہیں۔ (ابن کثیر و فتح القدیر) جس سے معلوم ہوا کہ اسلام وہی ہے جس پر اہل سنت و جماعت عمل پیرا ہیں اور اہل بدعت و اہل افتراق اس نعمت اسلام سے محروم ہیں جو ذریعہ نجات ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ
بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ
وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ
وَأَلْفَبُحُورًا ۝۱۰

لَنْ يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى وَإِنْ يُضَايِقُوكُمْ يُؤْذِكُمْ
الَّذِينَ بَاتِلُوا بِهِمُ الْبَيْتَ ۝۱۱

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے کہ تم نیک باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو، اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو،^(۱) اگر اہل کتاب بھی ایمان لاتے تو ان کے لیے بہتر تھا، ان میں ایمان والے بھی ہیں^(۲) لیکن اکثر تو فاسق ہیں۔ (۱۱۰)

یہ تمہیں ستانے کے سوا اور زیادہ کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے، اگر لڑائی کا موقع آجائے تو پیٹھ موڑ لیں گے، پھر مدد نہ کیے جائیں گے۔^(۳) (۱۱۱)

(۱) اس آیت میں امت مسلمہ کو ”خیر امت“ قرار دیا گیا ہے اور اس کی علت بھی بیان کر دی گئی ہے جو امر بالمعروف نہی عن المنکر اور ایمان باللہ ہے۔ گویا یہ امت اگر ان امتیازی خصوصیات سے متصف رہے گی تو ”خیر امت“ ہے، بصورت دیگر اس امتیاز سے محروم قرار پاسکتی ہے۔ اس کے بعد اہل کتاب کی مذمت سے بھی اسی نکتے کی وضاحت مقصود و معلوم ہوتی ہے کہ جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہیں کرے گا، وہ بھی اہل کتاب کے مشابہ قرار پائے گا۔ ان کی صفت بیان کی گئی ہے ﴿كَانُوا إِلَّا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ﴾ (المائدہ ۷۹) ”وہ ایک دوسرے کو برائی سے نہیں روکتے تھے“ اور یہاں اسی آیت میں ان کی اکثریت کو فاسق کہا گیا ہے۔ امر بالمعروف یہ فرض عین ہے یا فرض کفایہ؟ اکثر علما کے خیال میں یہ فرض کفایہ ہے یعنی علما کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ فرض ادا کرتے رہیں کیونکہ معروف و منکر شرعی کا صحیح علم وہی رکھتے ہیں۔ ان کے فریضہ تبلیغ و دعوت کی ادائیگی سے دیگر افراد امت کی طرف سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا۔ جیسے جماد بھی عام حالات میں فرض کفایہ ہے یعنی ایک گروہ کی طرف سے ادائیگی سے اس فرض کی ادائیگی ہو جائے گی۔

(۲) جیسے عبد اللہ بن سلام، ابو بکر، وغیرہ جو مسلمان ہو گئے تھے۔ تاہم ان کی تعداد نہایت قلیل تھی۔ اس لیے ”مِنْهُمْ“ میں من، تَبَعِيضُ کے لیے ہے۔

(۳) اَذًى (ستانے) سے مراد زبانی بہتان تراشی اور افترا ہے جس سے دل کو وقتی طور پر ضرور تکلیف پہنچتی ہے تاہم میدان حرب و ضرب میں یہ تمہیں شکست نہیں دے سکیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مدینہ سے بھی یہودیوں کو نکلنا پڑا، پھر خیبر فتح ہو گیا اور وہاں سے بھی نکلے، اسی طرح شام کے علاقوں میں عیسائیوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ تا آنکہ حروب ملیبیہ میں عیسائیوں نے اس کا بدلہ لینے کی کوشش کی اور بیت المقدس پر قابض بھی ہو گئے مگر اسے سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۹۰ سال کے بعد واپس لے کر لیا۔ لیکن اب مسلمانوں کی ایمانی کمزوری کے نتیجے میں یہود و نصاریٰ کی مشترکہ سازشوں اور کوششوں سے بیت المقدس پھر مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ تاہم ایک

ان پر ہر جگہ ذلت کی مار پڑی، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی یا لوگوں کی پناہ میں ہوں،^(۱) یہ غضب الہی کے مستحق ہو گئے اور ان پر فقیری ڈال دی گئی، یہ اس لیے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے کفر کرتے تھے اور بے وجہ انبیاء کو قتل کرتے تھے، یہ بدلہ ہے ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا۔^(۲) (۱۱۳)

یہ سارے کے سارے یکساں نہیں بلکہ ان اہل کتاب میں ایک جماعت (حق پر) قائم رہنے والی بھی ہے جو راتوں کے وقت بھی کلام اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدے بھی کرتے ہیں۔ (۱۱۳)

یہ اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان بھی رکھتے ہیں، بھلائیوں کا حکم کرتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔ یہ نیک بخت لوگوں میں سے ہیں۔ (۱۱۳)

یہ جو کچھ بھی بھلائیاں کریں ان کی نافرمانی نہ کی جائے گی اور اللہ تعالیٰ پر ہیز گاروں کو خوب جانتا ہے۔^(۳) (۱۱۵)

صُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذَّلَالَةُ ابْنِ مَا تَقْفُوا اَلْاِحْتِطَالَ مِنَ اللّٰهِ
وَحَبْلٌ مِنَ النَّاسِ وَبِأَنَّهُ يُغَضِبُ مِنَ اللّٰهِ وَصُرِبَتْ عَلَيْهِمُ
السُّكْنَةُ ذَلِكَ يَأْتُهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ
وَيَقْتُلُونَ اَلْاَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذَلِكَ يَمَاعَصُوا
وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿۱۱۳﴾

لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ
آيَاتِ اللّٰهِ اِنَّآ اَلَيْنَا اَلْبَيْتُ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ﴿۱۱۴﴾

يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يُؤْمِنُونَ
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ
فِي الْخَيْرَاتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوْهُ وَاَللّٰهُ
عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

وقت آئے گا کہ یہ صورت حال تبدیل ہو جائے گی بالخصوص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد عیسائیت کا خاتمہ اور اسلام کا غلبہ یقینی ہے جیسا کہ صحیح احادیث میں وارد ہے۔ (ابن کثیر)

(۱) یہودیوں پر جو ذلت و مسکنت، غضب الہی کے نتیجے میں مسلط کی گئی ہے، اس سے وقتی طور پر بچاؤ کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی پناہ میں آجائیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ یا اسلامی مملکت میں جزیہ دے کر ذمی کی حیثیت سے رہنا قبول کر لیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ لوگوں کی پناہ ان کو حاصل ہو جائے، اس کے دو مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اسلامی مملکت کی بجائے عام مسلمان ان کو پناہ دے دیں جیسا کہ ہر مسلمان کو یہ حق حاصل ہے اور اسلامی مملکت کے حکمرانوں کو تائید کی گئی ہے کہ وہ ادنیٰ مسلمان کی دی گئی پناہ کو بھی رد نہ کریں۔ دوسرا یہ کہ کسی بڑی غیر مسلم طاقت کی پشت پناہی ان کو حاصل ہو جائے۔ کیونکہ انسان عام ہے۔ اس میں مسلمان اور غیر مسلمان دونوں شامل ہیں۔

(۲) یہ ان کے کروتوت ہیں جن کی پاداش میں ان پر ذلت مسلط کی گئی۔

(۳) یعنی سارے اہل کتاب ایسے نہیں جن کی مذمت پچھلی آیات میں بیان کی گئی ہے، بلکہ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی

کافروں کو ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ کے ہاں کچھ کام نہ آئیں گی، یہ تو جہنمی ہیں جو ہمیشہ اسی میں پڑے رہیں گے۔ (۱۱۶)

یہ کفار جو خرچ اخراجات کریں اس کی مثال یہ ہے کہ ایک تند ہوا چلی جس میں پالا تھا جو ظالموں کی کھیتی پر پڑا اور اسے تہس نہس کر دیا۔^(۱) اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ (۱۱۷)

اے ایمان والو! تم اپنا دلی دوست ایمان والوں کے سوا اور کسی کو نہ بناؤ۔^(۲) (تم تو) نہیں دیکھتے دوسرے لوگ

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِي عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ
مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۱۶﴾

مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ مَّهِمَّهَا
صَوَّاءٌ صَابَتْ حَرَّتٌ قَوِيْرٌ كُلَّمَا أَنتَفَسُوا فَأَهْلَكْتَهُ وَمَا
كَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۱۱۷﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِلطَانَةِ مَن دُونِكُمْ
أَوْلِيَاءَ لَوْ تَوَكَّلْتُمْ عَلَىٰ أَوْلِيَاءِهِمْ قَدَّ بَدَأَ الْبَغْضَاءَ

ہیں، جیسے عبد اللہ بن سلام، أسد بن عبد ثعلبہ بن سعید اور أسید بن سعید وغیرہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے شرف اسلام سے نوازا اور ان میں اہل ایمان و تقویٰ والی خوبیاں پائی جاتی ہیں رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ۔ قَائِمَةَ کے معنی ہیں، شریعت کی اطاعت اور نبی کریم ﷺ کا اتباع کرنے والی یَسْجُدُونَ کا مطلب، رات کو قیام کرتے یعنی سجدہ پڑھتے اور نمازوں میں تلاوت کرتے ہیں۔ اس مقام پر امر بالمعروف..... کے معنی بعض نے یہ کیئے ہیں کہ وہ نبی ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دیتے اور آپ ﷺ کی مخالفت کرنے سے روکتے ہیں۔ اسی گروہ کا ذکر آگے بھی کیا گیا ہے۔ ﴿وَلَنْ يَمُنَ أَهْلَ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَآلِ الْإِسْلَامِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ خَبَرٍ مِنْ رَبِّهِمْ﴾ (آل عمران، ۱۹۹)

(۱) قیامت والے دن کافروں کے نہ مال کچھ کام آئیں گے نہ اولاد حتیٰ کہ رفاہی اور بظاہر بھلائی کے کاموں پر وہ جو خرچ کرتے ہیں، وہ بھی بیکار جائیں گے اور ان کی مثال اس سخت پالے کی سی ہے جو ہری بھری کھیتی کو جلا کر خاکستر کر دیتا ہے، ظالم اس کھیتی کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوتے اور اس سے نفع کی امید رکھے ہوتے ہیں کہ اچانک ان کی امیدیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب تک ایمان نہیں ہو گا، رفاہی کاموں پر رقم خرچ کرنے والوں کی چاہے دنیا میں کتنی ہی شہرت ہو جائے، آخرت میں انہیں ان کا کوئی صلہ نہیں ملے گا، وہاں تو ان کے لیے جہنم کا دائمی عذاب ہے۔

(۲) یہ مضمون پہلے بھی گزر چکا ہے۔ یہاں اس کی اہمیت کے پیش نظر پھر دہرایا جا رہا ہے۔ بلطانہ، دلی دوست اور رازدار کو کہا جاتا ہے۔ کافر اور مشرک مسلمانوں کے بارے میں جو جذبات و عراغہ رکھتے ہیں، ان میں سے جن کا وہ اظہار کرتے اور جنہیں اپنے سینوں میں مخفی رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان سب کی نشاندہی فرمادی ہے یہ اور اس قسم کی دیگر آیات کے پیش نظر ہی علماء و فقہانے تحریر کیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو کلیدی مناصب پر فائز کرنا جائز نہیں ہے۔ مروی ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے، ایک ذمی (غیر مسلم) کو کاتب (سکریٹری) رکھ لیا، حضرت عمرؓ کے علم میں یہ بات آئی تو آپ نے انہیں سختی سے ڈانٹا اور فرمایا کہ ”تم انہیں اپنے قریب نہ کرو جب کہ اللہ نے انہیں دور

يَتَيَّمُونَ إِنْ أَلَّ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُجِئًا ۝

گاری کرو تو ان کا مکرم تمہیں کچھ نقصان نہ دے گا۔ (۱) اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کا احاطہ کر رکھا ہے۔ (۱۲۰) اے نبی! اس وقت کو بھی یاد کرو جب صبح ہی صبح آپ اپنے گھر سے نکل کر مسلمانوں کو میدان جنگ میں لڑائی کے مورچوں پر باقاعدہ (۲) بٹھا رہے تھے اللہ تعالیٰ سننے جاننے والا ہے۔ (۱۲۱)

وَأَذَعَدَاتٍ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

خوش حالی میسر آتی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تائید و نصرت ملتی اور مسلمانوں کی تعداد و قوت میں اضافہ ہوتا تو منافقین کو بہت برا لگتا اور اگر مسلمان قحط سالی یا تنگدستی میں مبتلا ہوتے، یا اللہ کی مشیت و مصلحت سے دشمن، وقتی طور پر مسلمانوں پر غالب آجاتے (جیسے جنگ احد میں ہوا) تو بڑے خوش ہوتے۔ مقصد بتلانے سے یہ ہے کہ جن لوگوں کا یہ حال ہو، کیا وہ اس لائق ہو سکتے ہیں کہ مسلمان ان سے محبت کی پیٹنگیں بڑھائیں اور انہیں اپنا رازدان اور دوست بنائیں؟ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ سے بھی دوستی رکھنے سے منع فرمایا ہے (جیسا کہ قرآن کریم کے دوسرے مقامات پر ہے) اسی لیے کہ وہ بھی مسلمانوں سے نفرت و عداوت رکھتے، ان کی کامیابیوں سے ناخوش اور ان کی ناکامیوں سے خوش ہوتے ہیں۔

(۱) یہ ان کے مکرو فریب سے بچنے کا طریقہ اور علاج ہے۔ گویا منافقین اور دیگر اعدائے اسلام و مسلمین کی سازشوں سے بچنے کے لیے صبر اور تقویٰ نہایت ضروری ہے۔ اس صبر اور تقویٰ کے فقدان نے غیر مسلموں کی سازشوں کو کامیاب بنا رکھا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ کافروں کی یہ کامیابی مادی اسباب و وسائل کی فراوانی اور سائنس و ٹیکنالوجی میں ان کی ترقی کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی پستی و زوال کا اصل سبب یہی ہے کہ وہ اپنے دین پر استقامت (جو صبر کا متقاضی ہے) سے محروم اور تقویٰ سے عاری ہو گئے ہیں جو مسلمان کی کامیابی کی کلید اور تائید الہی کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

(۲) جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے مراد جنگ احد کا واقعہ ہے جو شوال ۳ ہجری میں پیش آیا۔ اس کا پس منظر مختصراً یہ ہے کہ جب جنگ بدر ۲ ہجری میں کفار کو عبرت ناک شکست ہوئی، ان کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر قید ہوئے تو ان کفار کے لیے یہ بڑی بدنامی کا باعث اور ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک زبردست انتقامی جنگ کی تیاری کی جس میں عورتیں بھی شریک ہوئیں۔ ادھر مسلمانوں کو جب اس کا علم ہوا کہ کافر تین ہزار کی تعداد میں احد پہاڑ کے قریب خیمہ زن ہو گئے تو نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کہ وہ مدینہ میں ہی رہ کر لڑیں یا مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کریں، بعض صحابہ کرام نے اندر رہ کر ہی مقابلہ کا مشورہ دیا اور رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا۔ لیکن اس کے برعکس بعض پر جوش صحابہ کرام نے جنہیں جنگ بدر میں حصہ لینے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی، مدینہ سے باہر جا کر لڑنے کی حمایت کی۔ آپ ﷺ اندر حجرے میں تشریف لے گئے

جب تمہاری دو جماعتیں پست ہمتی کا ارادہ کر چکی تھیں،^(۱) اللہ تعالیٰ ان کا ولی اور مددگار ہے۔^(۲) اور اسی کی پاک ذات پر مومنوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔ (۱۲۲)

جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے عین اس وقت تمہاری مدد فرمائی تھی جبکہ تم نہایت گری ہوئی حالت میں تھے،^(۳) اس لیے اللہ ہی سے ڈرو! (نہ کسی اور سے) تاکہ تمہیں شکر گزاری کی توفیق ہو۔ (۱۲۳)

(اور یہ شکر گزاری باعث نصرت و امداد ہو) جب آپ مومنوں کو تسلی دے رہے تھے، کیا آسمان سے تین ہزار فرشتے اتار کر اللہ تعالیٰ کا تمہاری مدد کرنا تمہیں کافی نہ ہو گا؟ (۱۲۴)

کیوں نہیں، بلکہ اگر تم صبر و پرہیزگاری کرو اور یہ لوگ اسی دم تمہارے پاس آجائیں تو تمہارا رب تمہاری امداد پانچ ہزار فرشتوں سے کرے گا^(۴) جو

إِذْ هَبَّتْ كَلْبَاتِنَ مِنْكُمْ أَنْ تَنْشَلُوا وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا وَعَلَى اللَّهِ قَلْبُوكُمْ الْمُؤْمِنُونَ ۝

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُشْكُرُونَ ۝

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُبَدِّلَ كُمْ رَبُّكُمْ بَدَلَةً الْيَوْمِ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزَلِينَ ۝

بَلِ أَنْ تَصِيدُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُمْ مِنْ فُجُورِهِمْ هَذَا يُبَدِّلُكُمْ رَبُّكُمْ بِمِثْلِ الْيَوْمِ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ۝

اور جب ہتھیار پہن کر باہر آئے، دوسری رائے والوں کو ندامت ہوئی کہ شاید ہم نے رسول اللہ ﷺ کو آپ کی خواہش کے برعکس باہر نکلنے پر مجبور کر کے ٹھیک نہیں کیا چنانچہ انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! آپ اگر اندر رہ کر مقابلہ کرنا پسند فرمائیں تو اندر ہی رہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ لباس حرب پہن لینے کے بعد کسی نبی کے لائق نہیں ہے کہ وہ اللہ کے فیصلے کے بغیر واپس ہو یا لباس اتارے۔ چنانچہ مسلمان ایک ہزار کی تعداد میں روانہ ہو گئے مگر صبح دم جب مقام شوط پر پہنچے تو عبد اللہ بن ابی اپنے تین سوساتھیوں سمیت یہ کہہ کر واپس آ گیا کہ اس کی رائے نہیں مانی گئی۔ خواہ مخواہ جان دینے کا کیا فائدہ؟ اس کے اس فیصلے سے وقتی طور پر بعض مسلمان بھی متاثر ہو گئے اور انہوں نے بھی کمزوری کا مظاہرہ کیا۔ (ابن کثیر)

(۱) یہ اوس اور خزرج کے دو قبیلے (بنو حارثہ اور بنو سلمہ) تھے۔

(۲) اس سے معلوم ہوا کہ اللہ نے ان کی مدد کی اور ان کی کمزوری کو دور فرما کر ان کی ہمت باندھ دی۔

(۳) بہ اعتبار قلت تعداد اور قلت سامان کے، کیونکہ جنگ بدر میں مسلمان ۳۱۳ تھے اور یہ بھی بے سروسامان۔ صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے، باقی سب پیدل تھے (ابن کثیر)

(۴) مسلمان بدر کی جانب محض قافلہ قریش پر جو تقریباً ہمتا تھا چھاپ مارنے نکلے تھے۔ مگر بدر پہنچتے پہنچتے معلوم ہوا کہ مکہ

نشاندار ہوں گے۔^(۱) (۱۴۵)

اور یہ تو محض تمہارے دل کی خوشی اور اطمینان قلب کے لیے ہے، ورنہ مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہے جو غالب اور حکمتوں والا ہے۔ (۱۴۶)

(اس امداد الہی کا مقصد یہ تھا کہ اللہ) کافروں کی ایک جماعت کو کاٹ دے یا انہیں ذلیل کر ڈالے اور (سارے کے سارے) نامراد ہو کر واپس چلے جائیں^(۲) (۱۴۷) اے پیغمبر! آپ کے اختیار میں کچھ نہیں،^(۳) اللہ تعالیٰ

وَمَا جَعَلَ اللَّهُ الْإِبْرَئِيْمَ لَكُمْ دَلِيْمًا قُلُوْبِكُمْ بِهِ وَمَا التَّوْرَةُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۴۵﴾

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْ يَكْتُمُوْهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا عَلٰۤى اٰخِطٰۤىٖٔنَ ﴿۱۴۶﴾

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْْءٌ اَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يَعٰبَا۟هُمْ

سے مشرکین کا ایک لشکر جرار پورے غیظ و غضب اور جوش و خروش کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ یہ سن کر مسلمانوں کی صف میں گھبراہٹ، تشویش اور جوش قتال کا ملا جلا رد عمل ہوا اور انہوں نے رب تعالیٰ سے دعا و فریاد کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک ہزار پھر تین ہزار فرشتے اتارنے کی بشارت دی اور مزید وعدہ کیا کہ اگر تم صبر و تقویٰ پر قائم رہے اور مشرکین اسی حالت غیظ و غضب میں آدھکے تو فرشتوں کی یہ تعداد پانچ ہزار کر دی جائے گی۔ کہا جاتا ہے کہ چونکہ مشرکین کا جوش و غضب برقرار نہ رہ سکا۔ (بدر بچنے سے پہلے ہی ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ ایک گروہ مکہ پلٹ گیا اور باقی جو بدر آئے ان میں سے اکثر سرداروں کی رائے تھی کہ لڑائی نہ کی جائے) اس لیے حسب بشارت تین ہزار فرشتے اتارے گئے اور پانچ ہزار کی تعداد پوری کرنے کی ضرورت پیش نہ آسکی اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ تعداد پوری کی گئی۔

(۱) یعنی پہچان کے لیے ان کی مخصوص علامت ہوگی۔

(۲) یہ اللہ غالب و کار فرما کی مدد کا نتیجہ بتلایا جا رہا ہے۔ سورہ انفال میں فرشتوں کی تعداد ایک ہزار بتلائی گئی ہے ﴿اِذْ تَسْتَعِيْنُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اٰنٰی مُہِیْمًا لِّمَآ لَغِبَ مِنْ الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ (الانفال-۹) ”جب تم اپنے رب سے مدد طلب کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہاری فریاد سنتے ہوئے کہا کہ میں ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا“ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے واقعتاً تو ایک ہزار ہی نازل ہوئے اور مسلمانوں کے حوصلے اور تسلی کے لیے تین ہزار کا اور پھر پانچ ہزار کا مزید مشروط وعدہ کیا گیا۔ پھر حسب حالات مسلمانوں کی تسلی کے نقطہ نظر سے بھی ان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اس لیے بعض مفسرین کے نزدیک یہ تین ہزار پانچ ہزار فرشتوں کا نزول نہیں ہوا کیونکہ مقصد تو مسلمانوں کے حوصلوں میں اضافہ کرنا تھا، ورنہ اصل مددگار تو اللہ تعالیٰ ہی تھا اور وہ اپنی مدد کے لیے فرشتوں کا یا کسی اور کا محتاج ہی نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور جنگ بدر میں مسلمانوں کو تاریخی کامیابی حاصل ہوئی، کفر کی طاقت کمزور ہوئی اور کافروں کا گھمنڈ خاک میں مل گیا۔ (ایسر التفاسیر)

(۳) یعنی ان کافروں کو ہدایت دینا یا ان کے معاملے میں کسی بھی قسم کا فیصلہ کرنا سب اللہ کے اختیار میں ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ جنگ احد میں نبی کریم ﷺ کے دندان مبارک بھی شہید ہو گئے اور چہرہ مبارک بھی زخمی ہوا تو آپ

وَأَنَّهُمْ ظَالِمُونَ ﴿۱۸﴾

چاہے تو ان کی توبہ قبول کرے ^(۱) یا عذاب دے، کیونکہ وہ ظالم ہیں۔ (۱۲۸)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے، وہ جسے چاہے بخشے جسے چاہے عذاب کرے، اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا مہربان ہے۔ (۱۲۹)

اے ایمان والو! بڑھا چڑھا کر سو دن نہ کھاؤ، ^(۲) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو تاکہ تمہیں نجات ملے۔ (۱۳۰)

اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ (۱۳۱)

وَلَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ
وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمُ الْبَيْنٰتَ مَعًا
مُضَعَّفَةً لِّتُؤَكِّلُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُوْنَ ﴿۲۰﴾
وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ أُعِدَّتْ لِّلْكَافِرِيْنَ ﴿۲۱﴾

ﷺ نے فرمایا ”وہ قوم کس طرح فلاح یاب ہوگی جس نے اپنے نبی کو زخمی کر دیا“ گویا آپ ﷺ نے ان کی ہدایت سے ناامیدی ظاہر فرمائی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اسی طرح بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے بعض کفار کے لیے قوت نازل کا بھی اہتمام فرمایا جس میں ان کے لیے بدعا فرمائی جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے بدعا کا سلسلہ بند فرمادیا۔ (ابن کثیر فتح القدیر) اس آیت سے ان لوگوں کو عبرت پکڑنی چاہیے جو نبی کریم ﷺ کو مختار کل قرار دیتے ہیں کہ آپ ﷺ کو تو اتنا اختیار بھی نہ تھا کہ کسی کو راہ راست پر لگا دیں حالانکہ آپ ﷺ اسی راستے کی طرف بلانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔

(۱) یہ قبیلے جن کے لیے بدعا فرماتے رہے اللہ کی توفیق سے سب مسلمان ہو گئے۔ جن سے معلوم ہوا کہ مختار کل اور عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

(۲) چونکہ غزوہ احد میں ناکامی رسول ﷺ کی نافرمانی اور مال دنیا کے لالچ کے سبب ہوئی تھی اس لیے اب طمع دنیا کی سب سے زیادہ بھیاں تک اور مستقل شکل سود سے منع کیا جا رہا ہے اور اطاعت کبھی کی تاکید کی جا رہی ہے اور بڑھا چڑھا کر سو دن نہ کھاؤ کا یہ مطلب نہیں بڑھا چڑھا کر نہ ہو تو مطلق سود جائز ہے۔ بلکہ سو دن کم ہو یا زیادہ مفروضاً مرکب، مطلقاً حرام ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ یہ قید نبی (حرمت) کے لیے بطور شرط نہیں ہے بلکہ واقعے کی رعایت کے طور پر ہے یعنی سود کی اس وقت جو صورت حال تھی، اس کا بیان و اظہار ہے۔ زمانہ جاہلیت میں سود کا یہ رواج عام تھا کہ جب ادائیگی کی مدت آجاتی اور ادائیگی ممکن نہ ہوتی تو مزید مدت میں اضافے کے ساتھ سود میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا جس کی وجہ سے تھوڑی سی رقم بھی بڑھ چڑھ کر کہیں پہنچ جاتی اور ایک عام آدمی کے لیے اس کی ادائیگی ناممکن ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے جس سے تنبیہ بھی مقصود ہے کہ سود خوری سے باز نہ آئے توبہ فعل حرام تمہیں کفر تک پہنچا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ اللہ و رسول سے محاربہ ہے۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۱۳۲﴾

اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (۱۳۲)

اور اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف دوڑو^(۱) جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ (۱۳۳)

جو لوگ آسانی میں اور سختی کے موقعہ پر بھی اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں،^(۲) غصہ پینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں،^(۳) اللہ تعالیٰ ان نیک کاروں سے محبت کرتا ہے۔ (۱۳۴)

جب ان سے کوئی ناشائستہ کام ہو جائے یا کوئی گناہ کر بیٹھیں تو فوراً اللہ کا ذکر اور اپنے گناہوں کے لیے استغفار کرتے ہیں،^(۴) فی الواقع اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون گناہوں کو بخش سکتا ہے؟ اور وہ لوگ باوجود علم کے کسی برے کام پر اڑ نہیں جاتے۔ (۱۳۵)

انہیں کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے اور جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، ان نیک کاموں کے کرنے والوں کا ثواب کیا ہی اچھا ہے۔ (۱۳۶)

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ لَّكُمْ مِن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۱۳۳﴾

الَّذِينَ يُقِيمُونَ فِي التَّسْبَاءِ وَالشَّرَاءِ وَالْكُظُمِينَ الْعَيْظِ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۳۴﴾

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَنَسَتْهُمُ الذُّنُوبُ وَالذُّنُوبُ بِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرِ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَلَمْ يُبْسَرْ أَعْمَلْ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۱۳۵﴾

أُولَٰئِكَ جَزَاءُ الَّذِينَ مَغْفِرَةٌ لَّهُمْ مِن رَّبِّهِمْ وَجَنَّةٌ جَارِيَةٌ مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَبِعَمَلِهِمُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۳۶﴾

(۱) مال و دولت دنیا کے پیچھے لگ کر آخرت تباہ کرنے کے بجائے، اللہ و رسول کی اطاعت کا اور اللہ کی مغفرت اور اس کی جنت کا راستہ اختیار کرو۔ جو متقین کے لیے اللہ نے تیار کی ہے۔ چنانچہ آگے متقین کی چند خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔

(۲) یعنی محض خوش حالی میں ہی نہیں، تنگ دستی کے موقع پر بھی خرچ کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر حال اور ہر موقع پر اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

(۳) یعنی جب غصہ انہیں بھڑکاتا ہے تو اسے پی جاتے ہیں یعنی اس پر عمل نہیں کرتے اور ان کو معاف کر دیتے ہیں جو ان کے ساتھ برائی کرتے ہیں۔

(۴) یعنی جب ان سے بہ تقاضائے بشریت کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب ہو جاتا ہے تو فوراً توبہ و استغفار کا اہتمام کرتے ہیں۔

تم سے پہلے بھی ایسے واقعات گزر چکے ہیں، سو زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ (آسمانی تعلیم کے) جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟- (۱۳۷)

عام لوگوں کے لیے تو یہ (قرآن) بیان ہے اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت و نصیحت ہے۔ (۱۳۸)
تم نہ سستی کرو اور نہ غمگین ہو، تم ہی غالب رہو گے، اگر تم ایمان دار ہو۔ (۱۳۹)

اگر تم زخمی ہوئے ہو تو تمہارے مخالف لوگ بھی تو ایسے ہی زخمی ہو چکے ہیں، ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان ادا لیتے بدلتے رہتے ہیں۔ (۱۴۰)

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَمِيَّزُوا فِي الْأَرْضِ
فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِبِينَ ﴿۱۳۷﴾

هَذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۱۳۸﴾

وَلَا تَهَمُّوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمْ اَعْلَمُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

اِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْصٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْصٌ مِّثْلُهٗ
وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا يَبِيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ

(۱) جنگ احد میں مسلمانوں کا لشکر سات سو افراد پر مشتمل تھا، جس میں سے ۵۰ تیر اندازوں کا ایک دستہ آپ نے عبداللہ ابن جبیر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک پہاڑی پر مقرر فرمادیا اور انہیں تاکید کر دی کہ چاہے ہمیں فتح ہو یا شکست، تم یہاں سے نہ ہلنا اور تمہارا کام یہ ہے کہ جو گھڑسوار تمہاری طرف آئے تیروں سے اسے پیچھے دھکیل دینا۔ لیکن جب مسلمان فتح یاب ہو گئے اور مال و اسباب سمیٹنے لگے تو اس دستے میں اختلاف ہو گیا۔ کچھ کہنے لگے کہ نبی کریم ﷺ کے فرمان کا مقصد تو یہ تھا کہ جب تک جنگ جاری رہے ہمیں جئے رہنا، لیکن جب یہ جنگ ختم ہو گئی ہے اور کفار بھاگ رہے ہیں تو یہاں رہنا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی وہاں سے ہٹ کر مال و اسباب جمع کرنا شروع کر دیا اور وہاں نبی کریم ﷺ کے فرمان کی اطاعت میں صرف دس آدمی باقی رہ گئے۔ جس سے کافروں نے فائدہ اٹھایا اور ان کے گھڑسوار پلٹ کر وہیں سے مسلمانوں کے عقب میں جا پہنچے اور ان پر اچانک حملہ کر دیا جس سے مسلمانوں میں افراتفری مچ گئی اور وہ غیر متوقع حملے سے سخت سراپیمہ ہو گئے جس سے مسلمانوں کو قدرتی طور پر بہت تکلیف ہوئی۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو تسلی دے رہا ہے کہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پہلے بھی ایسا ہوا آیا ہے۔ تاہم بالآخر تباہی و بربادی اللہ و رسول کی تکذیب کرنے والوں کا ہی مقدر بنی ہے۔

(۲) گزشتہ جنگ میں تمہیں جو نقصان پہنچا ہے، اس سے نہ سست ہو اور نہ اس پر غم کھاؤ کیونکہ اگر تمہارے اندر ایمانی قوت موجود رہی تو غالب و کامران تم ہی رہو گے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی قوت کا اصل راز اور ان کی کامیابی کی بنیاد واضح کر دی ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اس کے بعد مسلمان ہر معرکے میں سرخرو ہی رہے ہیں۔

(۳) ایک اور انداز سے مسلمانوں کو تسلی دی جا رہی ہے کہ اگر جنگ احد میں تمہارے کچھ لوگ زخمی ہوئے ہیں تو کیا ہوا؟ تمہارے مخالف بھی تو (جنگ بدر میں) اور احد کی ابتدا میں اسی طرح زخمی ہو چکے ہیں اور اللہ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ فتح و شکست کے ایام کو ادا بدلتا رہتا ہے۔ کبھی غالب کو مغلوب اور کبھی مغلوب کو غالب کر دیتا ہے۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذُوا مِنكُمُ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ
لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿۱۰﴾

وَلِيُمَيِّضَ اللَّهُ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَيَمَيِّزَ الْكٰفِرِينَ ﴿۱۱﴾

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتَّخَلَّوْا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا
جَهْدًا وَمِنكُمُ يَعْلَمُ الصَّادِقِينَ ﴿۱۲﴾

کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ظاہر کر دے اور تم میں سے
بعض کو شہادت کا درجہ عطا فرمائے، اللہ تعالیٰ ظالموں
سے محبت نہیں کرتا۔ (۱۳۰)

(یہ وجہ بھی تھی) کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو بالکل الگ
کر دے اور کافروں کو مٹا دے۔ (۱۳۱) (۱)

کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم جنت میں چلے جاؤ گے، (۲)
حالانکہ اب تک اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ تم میں
سے جماد کرنے والے کون ہیں اور صبر کرنے والے کون
ہیں۔؟ (۳) (۱۳۲)

(۱) احد میں مسلمانوں کو جو عارضی شکست ان کی اپنی کوتاہی کی وجہ سے ہوئی، اس میں بھی مستقبل کے لیے کئی حکمتیں
پہنچاں تھیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ آگے بیان فرما رہا ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ظاہر کر دے (کیونکہ صبر
استقامت ایمان کا تقاضا ہے) جنگ کی شدتوں اور مصیبتوں میں جنہوں نے صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا، یقیناً وہ سب
مومن ہیں۔ دوسری یہ کہ کچھ لوگوں کو شہادت کے مرتبہ پر فائز کر دے۔ تیسری یہ کہ ایمان والوں کو ان کے گناہوں سے
پاک کر دے۔ تمنجیص کے ایک معنی اختیار (چن لینا) کے لیے گئے ہیں۔ ایک معنی تطہیر اور ایک معنی تخلیص کے کیے گئے
ہیں۔ آخری دونوں کا مطلب گناہوں سے پاکی اور خلاصی ہے۔ (فتح القدر) مرحوم مترجم نے پہلے معنی کو اختیار کیا ہے۔
چوتھی، یہ کہ کافروں کو ہٹا دے۔ وہ اس طرح کہ وقتی فتح یا بی سے ان کی سرکشی اور تکبر میں اضافہ ہو گا اور یہی چیز ان کی
تباہی و ہلاکت کا سبب بنے گی۔

(۲) یعنی بغیر قتال و شہادت کی آزمائش کے تم جنت میں چلے جاؤ گے؟ نہیں بلکہ جنت ان لوگوں کو ملے گی جو آزمائش میں
پورے اتریں گے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتَّخَلَّوْا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَلْفًا مِنْ قَبْلِكُمْ
مَنْتَهُمُ النَّاسُ وَاللَّعَنُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (البقرة - ۲۱۳) ”کیا تم نے گمان کیا کہ تم جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر وہ حالت
نہیں آئی جو تم سے پہلے لوگوں پر آئی تھی، انہیں تنگ دستی اور تکلیفیں پہنچیں اور وہ خوب ہلائے گئے“ مزید فرمایا
﴿أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يُؤْتُوا آلَافَ مِائَاتٍ مِّنَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمِمَّا يَضَعُونَ﴾ (العنکبوت - ۲) ”کیا لوگ گمان کرتے ہیں کہ انہیں صرف یہ کہنے پر
چھوڑ دیا جائے گا کہ ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش نہ ہوگی؟“

(۳) یہ مضمون اس سے پہلے سورہ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ یہاں موضوع کی مناسبت سے پھر بیان کیا جا رہا ہے کہ جنت
یوں ہی نہیں مل جائے گی، اس کے لیے پہلے تمہیں آزمائش کی بجٹی سے گزارا اور میدان جماد میں آزمایا جائے گا وہاں
نرغہ اعدا میں گھر کر تم سرفروشی اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہو یا نہیں؟

جنگ سے پہلے تو تم شہادت کی آرزو میں تھے (۱) اب اسے اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھ لیا۔ (۲) (۱۳۳) (حضرت) محمد ﷺ صرف رسول ہی ہیں، (۳) ان سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے ہیں، کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید ہو جائیں، تو تم اسلام سے اپنی ایزبوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایزبوں پر تو ہرگز اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ بگاڑے گا، (۴) عنقریب اللہ تعالیٰ

وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۱۳۳﴾
وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَصُرَ لِوَالِدَيْهِ شَيْئًا وَسِعَ جِزْيُ اللَّهِ الشُّكْرَ ﴿۱۳۴﴾

(۱) یہ اشارہ ان صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی طرف ہے جو جنگ بدر میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے ایک احساس محرومی رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ میدان کارزار گرم ہو تو وہ بھی کافروں کی سرکوبی کر کے جہاد کی فضیلت حاصل کریں۔ انہی صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے جنگ احد میں جوش جہاد سے کام لیتے ہوئے مدینہ سے باہر نکلنے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن جب مسلمانوں کی فتح، کافروں کے اچانک حملے سے شکست میں تبدیل ہو گئی (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی) تو یہ پر جوش مجاہدین بھی سراپسیگما کی شکار ہو گئے اور بعض نے راہ فرار اختیار کی۔ (جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی) اور بہت تھوڑے لوگ ہی ثابت قدم رہے۔ (فتح القدیر) اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ ”تم دشمن سے مڈھ بھیڑی آرزومت کرو اور اللہ سے عافیت طلب کیا کرو تاہم جب از خود حالات ایسے بن جائیں کہ تمہیں دشمن سے لڑنا پڑ جائے تو پھر ثابت قدم رہو اور یہ بات جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے“ (صحیحین بحوالہ ابن کثیر)

(۲) رَأَيْتُمُوهُ اور تَنْظُرُونَ۔ دونوں کے ایک ہی معنی یعنی دیکھنے کے ہیں۔ تاکید اور مبالغے کے لیے دو لفظ لائے گئے ہیں۔ یعنی تلواروں کی چمک، نیزوں کی تیزی، تیروں کی یلغار اور جاں بازوں کی صف آرائی میں تم نے موت کا خوب مشاہدہ کر لیا۔ (ابن کثیر وفتح القدیر)

(۳) محمد ﷺ صرف رسول ہی ہیں ”یعنی ان کا امتیاز بھی وصف رسالت ہی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ بشری خصائص سے بالاتر اور خدائی صفات سے متصف ہوں کہ انہیں موت سے دو چار نہ ہونا پڑے۔“

(۴) جنگ احد میں شکست کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کافروں نے یہ افواہ اڑا دی کہ محمد ﷺ قتل کر دیئے گئے۔ مسلمانوں میں جب یہ خبر پھیلی تو اس سے بعض مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے اور لڑائی سے پیچھے ہٹ گئے۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ نبی ﷺ کا کافروں کے ہاتھوں قتل ہو جانا یا ان پر موت کا وارد ہو جانا کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ پچھلے انبیاء علیہم السلام بھی قتل اور موت سے ہمکنار ہو چکے ہیں۔ اگر آپ ﷺ بھی (بافرض) اس سے دو چار ہو جائیں تو کیا تم اس دین سے ہی پھر جاؤ گے۔ یاد رکھو جو پھر جائے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ وفات کے وقت جب حضرت عمرؓ شہادت جذبہ میں وفات نبوی کا انکار کر رہے تھے، حضرت ابو بکر صدیقؓ نے نہایت حکمت سے کام لیتے ہوئے منبر رسول ﷺ کے پہلو میں کھڑے ہو کر انہی آیات کی تلاوت کی، جس

شکر گزاروں کو نیک بدلہ دے گا (۱۳۴)

بغیر اللہ تعالیٰ کے حکم کے کوئی جاندار نہیں مر سکتا، مقرر شدہ وقت لکھا ہوا ہے، دنیا کی چاہت والوں کو ہم کچھ دنیا دے دیتے ہیں اور آخرت کا ثواب چاہنے والوں کو ہم وہ بھی دیں گے۔ (۲) اور احسان ماننے والوں کو ہم بہت جلد نیک بدلہ دیں گے۔ (۱۳۵)

بہت سے نبیوں کے ہم رکاب ہو کر، بہت سے اللہ والے جہاد کر چکے ہیں، انہیں بھی اللہ کی راہ میں تکلیفیں پہنچیں لیکن نہ تو انہوں نے ہمت ہاری نہ ست رہے اور نہ دبے، اور اللہ صبر کرنے والوں کو (بی) چاہتا ہے۔ (۱۳۶)

وہ بھی کہتے رہے کہ اے پروردگار! ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہم سے ہمارے کاموں میں جو بے جا زیادتی ہوئی ہے اسے بھی معاف فرما اور ہمیں ثابت قدمی عطا فرما اور ہمیں کافروں کی قوم پر مدد دے۔ (۱۳۷)

اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کا ثواب بھی دیا اور آخرت کے ثواب کی خوبی بھی عطا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے۔ (۱۳۸)

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكْتُمُوا لِلَّهِ شَيْبًا مَّا جَاءَهُ
وَمَنْ يُؤَدِّ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُوَدِّ

ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا وَسَخَّرْنَا لِنَبِيِّنَا

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكْتُمُوا لِلَّهِ شَيْبًا مَّا جَاءَهُ
وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكْتُمُوا لِلَّهِ شَيْبًا مَّا جَاءَهُ
وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكْتُمُوا لِلَّهِ شَيْبًا مَّا جَاءَهُ
وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكْتُمُوا لِلَّهِ شَيْبًا مَّا جَاءَهُ

وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ إِلَّا الْآنَ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا
ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا
وَاصْرِفْنَا عَنِ الْكُفْرَيْنِ

فَاتَّخَذَهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحَسَنَ ثَوَابَ الْآخِرَةِ
وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ

سے حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی متاثر ہوئے اور انہیں محسوس ہوا کہ یہ آیات ابھی ابھی اتری ہیں۔

(۱) یعنی ثابت قدم رہنے والوں کو جنہوں نے صبر و استقامت کا مظاہرہ کر کے اللہ کی نعمتوں کا عملی شکر ادا کیا۔

(۲) یہ کمزوری اور بزدلی کا مظاہرہ کرنے والوں کے حوصلوں میں اضافہ کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے کہ موت تو اپنے وقت پر آکر رہے گی، پھر بھاگنے یا بزدلی دکھانے کا کیا فائدہ؟ اسی طرح محض دنیا طلب کرنے سے کچھ دنیا تو مل جاتی ہے لیکن آخرت میں کچھ نہیں ملے گا، اس کے برعکس آخرت کے طالبوں کو آخرت میں اخروی نعمتیں تو ملیں گی ہی، دنیا بھی اللہ تعالیٰ انہیں عطا فرماتا ہے۔ آگے مزید حوصلہ افزائی اور تسلی کے لیے پچھلے انبیا علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کے صبر اور ثابت قدمی کی مثالیں دی جا رہی ہیں۔

(۳) یعنی ان کو جو جنگ کی شدتوں میں پست ہمت نہیں ہوتے اور ضعف اور کمزوری نہیں دکھاتے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا
يُرِيدُوا كُفْرًا بِكُمْ فَتَقْتَلُوكُمُ الْخَاسِرِينَ ﴿۳۱﴾

بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ ﴿۳۱﴾

سَنَلْفِقُ فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا
يَاللَّهُ مَا لَهُمُ لِيَنْزِلَ بِهِ سُلْطَانًا وَمَا لَهُمُ النَّارُ وَ
يَسْئَلُ مَثْوَى الظَّالِمِينَ ﴿۳۱﴾

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدًا إِذْ تَحَضَّرْتَهُمْ بِأَذْنٍ
حَتَّى إِذَا فِشَلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأُمْرِ وَعَصَيْتُمْ

اے ایمان والو! اگر تم کافروں کی باتیں مانو گے تو وہ تمہیں تمہاری ایڑیوں کے بل پلٹا دیں گے، یعنی تمہیں مرتد بنا دیں گے) پھر تم نامراد ہو جاؤ گے۔ (۱۳۹)

بلکہ اللہ ہی تمہارا مولا ہے اور وہی بہترین مددگار ہے۔ (۱۵۰)

ہم عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے، اس وجہ سے کہ یہ اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو شریک کرتے ہیں جس کی کوئی دلیل اللہ نے نہیں اتاری، (۳) ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور ان ظالموں کی بری جگہ ہے۔ (۱۵۱)

اللہ تعالیٰ نے تم سے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا جبکہ تم اس کے حکم سے انہیں کٹ رہے تھے۔ (۳) یہاں تک کہ جب تم

(۱) یہ مضمون پہلے بھی گزر چکا ہے، یہاں پھر دہرایا جا رہا ہے کیونکہ احد کی شکست سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض کفار یا منافقین مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ تم اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ آؤ۔ ایسے میں مسلمانوں کو کہا گیا کہ کافروں کی اطاعت ہلاکت و خسران کا باعث ہے۔ کامیابی اللہ کی اطاعت ہی میں ہے اور اس سے بہتر کوئی مددگار نہیں۔

(۲) مسلمانوں کی شکست دیکھتے ہوئے بعض کافروں کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ موقع مسلمانوں کے بالکل خاتمہ کے لیے بڑا اچھا ہے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا۔ پھر انہیں اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا حوصلہ نہ ہوا (فتح القدیر) صحیحین کی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے قبل کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ نصرت بالرغب مسيرة مشہور دشمن کے دل میں ایک مینے کی مسافت پر میرا رعب ڈال کر میری مدد کی گئی ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کا رعب مستقل طور پر دشمن کے دل میں ڈال دیا گیا تھا۔ اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کی امت یعنی مسلمانوں کا رعب بھی مشرکوں پر ڈال دیا گیا ہے اور اس کی وجہ ان کا شرک ہے۔ گویا شرک کرنے والوں کا دل دوسروں کی ہیبت سے لرزاں و ترساں رہتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مشرکانہ عقائد و اعمال میں مبتلا ہوئی ہے، دشمن ان سے مرعوب ہونے کی بجائے، وہ دشمنوں سے مرعوب ہیں۔

(۳) اس وعدے سے بعض مفسرین نے تین ہزار اور ۵ ہزار فرشتوں کا نزول مراد لیا ہے لیکن یہ رائے سرے سے صحیح نہیں بلکہ صحیح یہ ہے کہ فرشتوں کا یہ نزول صرف جنگ بدر کے ساتھ مخصوص تھا۔ باقی رہا وہ وعدہ جو اس آیت میں مذکور

نے پست بہتی اختیار کی اور کام میں جھگڑنے لگے اور نافرمانی کی،^(۱) اس کے بعد کہ اس نے تمہاری چاہت کی چیز تمہیں دکھادی،^(۲) تم میں سے بعض دنیا چاہتے تھے^(۳) اور بعض کا ارادہ آخرت کا تھا^(۴) تو پھر اس نے تمہیں ان سے پھیر دیا تاکہ تم کو آزمائے^(۵) اور یقیناً اس نے تمہاری لغزش سے درگزر فرمادیا اور ایمان والوں پر اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔^(۶) (۱۵۲)

جب کہ تم چڑھے چلے جا رہے تھے^(۷) اور کسی کی طرف

مِن بَعْدِ مَا آتَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ
الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ تَوَصَّرَفَكُمْ
عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۗ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللَّهُ
ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۵۲﴾

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلَوْنَهَا عَلَىٰ أَحَدٍ ۚ وَالرَّسُولُ

ہے تو اس سے مراد فتح و نصرت کا وہ عام وعدہ ہے جو اہل اسلام کے لیے اور اس کے رسول کی طرف سے بہت پہلے سے کیا جا چکا تھا۔ حتیٰ کہ بعض آیتیں مکہ میں نازل ہو چکی تھیں۔ اور اس کے مطابق ابتدائے جنگ میں مسلمان غالب و فاتح رہے جس کی طرف ﴿إِذْ تَخْشَوْنَهُمْ بِأَذْيَانٍ﴾ سے اشارہ کیا گیا ہے۔

(۱) اس تنازع اور عصیان سے مراد ۵۰ تیرا نوازوں کا وہ اختلاف ہے جو فتح و غلبہ دیکھ کر ان کے اندر واقع ہوا اور جس کی وجہ سے کافروں کو پلٹ کر دوبارہ حملہ آور ہونے کا موقع ملا۔

(۲) اس سے مراد وہ فتح ہے جو ابتدا میں مسلمانوں کو حاصل ہوئی تھی۔

(۳) یعنی مال غنیمت، جس کے لیے انہوں نے وہ پہاڑی چھوڑ دی جس کے نہ چھوڑنے کی انہیں تاکید کی گئی تھی۔

(۴) وہ لوگ ہیں جنہوں نے مورچہ چھوڑنے سے منع کیا اور نبی کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق اسی جگہ ڈٹے رہنے کا عزم ظاہر کیا۔

(۵) یعنی غلبہ عطا کرنے کے بعد پھر تمہیں شکست دے کر ان کافروں سے پھیر دیا تاکہ تمہیں آزمائے۔

(۶) اس میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس شرف و فضل کا اظہار ہے جو ان کی کوتاہیوں کے باوجود اللہ نے ان پر فرمایا۔ یعنی ان کی غلطیوں کی وضاحت کر کے آئندہ اس کا اعادہ نہ کریں، اللہ نے ان کے لیے معافی کا اعلان کر دیا تاکہ کوئی بدباطن ان پر زبان طعن و دراز نہ کرے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہی قرآن کریم میں ان کے لیے عفو عام کا اعلان فرمایا تو اب کسی کے لیے طعن و تشنیع کی گنجائش کہاں رہ گئی؟ صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک حج کے موقع پر ایک شخص نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہما پر بعض اعتراضات کیے کہ وہ جنگ بدر میں بیعت رضوان میں شریک نہیں ہوئے۔ نیز یوم احد میں فرار ہو گئے تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جنگ بدر میں تو انکی اہلیہ (بنت رسول ﷺ) بیمار تھیں، بیعت رضوان کے موقع پر آپ رسول ﷺ کے سفیر بنکر مکہ گئے ہوئے تھے اور یوم احد کے فرار کو اللہ نے

معاف فرمایا ہے۔ (ملخصاً۔ صحیح بخاری، غزوة احد)

(۷) کفار کے یکبارگی اچانک حملے سے مسلمانوں میں جو بھگدڑ مچی اور مسلمانوں کی اکثریت نے راہ فرار اختیار کی۔ یہ

يَذُوعُوكُمْ فِيْ اَخْرُوكُمْ فَاَتَابَكُمْ غَمًّا بَعِيْدًا لِّكَيْلًا
تَخْرُؤُوْا عَلٰى مَا فَاَتَاكُمْ وَلَا مَا اَصَابَكُمْ
وَاللّٰهُ حَيِيْبٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۰﴾

توجہ تک نہیں کرتے تھے اور اللہ کے رسول تمہیں
تمہارے پیچھے سے آوازیں دے رہے تھے،^(۱) بس تمہیں
غم پر غم پہنچا^(۲) تاکہ تم فوت شدہ چیز پر غمگین نہ ہو اور
نہ پہنچنے والی (تکلیف) پر اداس ہو،^(۳) اللہ تعالیٰ تمہارے
تمام اعمال سے خبردار ہے۔ (۱۵۳)

پھر اس نے اس غم کے بعد تم پر امن نازل فرمایا اور تم
میں سے ایک جماعت کو امن کی نیند آنے لگی۔^(۴) ہاں
کچھ وہ لوگ بھی تھے کہ انہیں اپنی جانوں کی پڑی ہوئی
تھی،^(۵) وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ناحق جہالت بھری
بدگمانیاں کر رہے تھے^(۶) اور کہتے تھے کیا ہمیں بھی کسی چیز

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْنَا مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ اٰمَنَةً لِّعَاسَا تَغْشٰى طٰٓئِفَةً
مِّنْكُمْ وَطٰٓئِفَةٌ قَدْ اٰهَمَتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ
ظَنَّ الْجٰهِلِيَّةِ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ اِنَّ
الْمَرْكُزَةَ لِلّٰهِ يُغْفِرُ فِىْ اَنْفُسِهِمْ تَالٰىبُ الْبُدُوْنِ لَكَ يَقُوْلُوْنَ

اس کا نقشہ بیان کیا جا رہا ہے۔ تَضَعُوْنَ اِضْعَادًا سے ہے جس کے معنی اپنی رو بھاگے جانے یا وادی کی طرف چڑھے
جانے یا بھاگنے کے ہیں۔ (طبری)

(۱) نبی ﷺ اپنے چند ساتھیوں سمیت پیچھے رہ گئے اور مسلمانوں کو پکارتے رہے۔ «إِلَىٰ عِبَادِ اللّٰهِ ! إِلَىٰ عِبَادِ اللّٰهِ !»
بندو! میری طرف لوٹ کر آؤ! اللہ کے بندو میری طرف لوٹ کر آؤ۔ لیکن سراپیسگی کے عالم میں یہ پکار کون سنتا؟
(۲) فَأَتَابَكُمْ تمہاری کوتاہی کے بدلے میں تمہیں غم پر غم دیا غَمًّا بَعِيْدًا بمعنی غَمًّا عَلٰى غَمِّ ابْنِ جَرِيْرٍ اور ابن کثیر کے
اختیار کردہ راجح قول کے مطابق پہلے غم سے مراد ہے، مال غنیمت اور کفار پر فتح و ظفر سے محرومی کا غم اور دوسرے غم
سے مراد ہے مسلمانوں کی شہادت، ان کے زخمی ہونے، نبی ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی اور آپ ﷺ کی خبر شہادت
سے پہنچنے والا غم۔

(۳) یعنی یہ غم پر غم اس لیے دیا تاکہ تمہارے اندر شہداء برداشت کرنے کی قوت اور عزم و حوصلہ پیدا ہو۔ جب یہ
قوت اور حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر انسان کو فوت شدہ چیز پر غم اور پہنچنے والے شہداء پر ملال نہیں ہوتا۔

(۴) مذکورہ سراپیسگی کے بعد اللہ تعالیٰ نے پھر مسلمانوں پر اپنا فضل فرمایا اور میدان جنگ میں باقی رہ جانے والے
مسلمانوں پر اوگٹھ مسلط کر دی۔ یہ اوگٹھ اللہ کی طرف سے سکینت اور نصرت کی دلیل تھی۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے
ہیں کہ میں بھی ان لوگوں میں سے تھا جن پر احد کے دن اوگٹھ چھائی جا رہی تھی حتیٰ کہ میری تلوار کئی مرتبہ میرے ہاتھ
سے گری میں اسے پکڑتا، وہ پھر گر جاتی، پھر پکڑتا اور پھر گر جاتی۔ (صحیح بخاری) نَعَسَا اٰمَنَةً سے بدل ہے۔ طائفۃ واحد
اور جمع دونوں کے لیے مستعمل ہے (فتح القدر)

(۵) اس سے مراد منافقین ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں ان کو تو اپنی جانوں ہی کی فکر تھی۔

(۶) وہ یہ تھیں کہ نبی کریم ﷺ کا معاملہ باطل ہے، یہ جس دین کی دعوت دیتے ہیں، اس کا مستقبل مخدوش ہے، انہیں

کا اختیار ہے؟^(۱) آپ کہہ دیجیے کہ کام کل کا کل اللہ کے اختیار میں ہے،^(۲) یہ لوگ اپنے دلوں کے بھید آپ کو نہیں بتاتے،^(۳) کہتے ہیں کہ اگر ہمیں کچھ بھی اختیار ہوتا تو یہاں قتل نہ کہے جاتے۔^(۴) آپ کہہ دیجیے کہ گو تم اپنے گھروں میں ہوتے پھر بھی جن کی قسمت میں قتل ہونا تھا وہ تو مقتل کی طرف چل کھڑے ہوتے،^(۵) اللہ تعالیٰ کو تمہارے سینوں کے اندر کی چیز کا آزمانا اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اس کو پاک کرنا تھا،^(۶) اور اللہ تعالیٰ سینوں کے بھید سے آگاہ ہے۔^(۷) (۱۵۳)

تم میں سے جن لوگوں نے اس دن بیٹھ دکھائی جس دن دونوں جماعتوں کی مڈبھیڑ ہوئی تھی یہ لوگ اپنے بعض

لَوْ كَانُوا لَمَّا مِنَ الْأُمْرِ شَيْءًا فَأَقْتَلْنَا لَهُمُ الْقَتْلَ لَوْ كُنْتُمْ فِي بَيْتِهِمْ لَعَزَّ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ وَلَا يَمْتَلُونَ
اللَّهُ مَا فِي صُدُورِهِمْ وَيَلْمِزُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ
بِدَاتِ الصُّدُورِ ﴿۱۵۳﴾

إِنَّ الَّذِينَ يَتُوكَ لَوِ آيَاتِنَا لَمَّا اسْتَرَكَّهُمُ
الشَّيْطَانُ بَعْضُ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ إِنَّ

اللہ کی مدد ہی حاصل نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

- (۱) یعنی کیا اب ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نفع و نصرت کا امکان ہے؟ یا یہ کہ کیا ہماری بھی کوئی بات چل سکتی ہے اور مانی جا سکتی ہے؟
- (۲) تمہارے یا دشمن کے اختیار میں نہیں ہے، مدد بھی اسی کی طرف سے آئے گی اور کامیابی بھی اس کے حکم سے ہوگی اور امر و نہی بھی اسی کا ہوگا۔
- (۳) اپنے دلوں میں نفاق چھپائے ہوئے ہیں، ظاہر یہ کرتے ہیں کہ وہ رہنمائی کے طالب ہیں۔
- (۴) یہ وہ آپس میں کہتے یا اپنے دل میں کہتے تھے۔
- (۵) اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اس قسم کی باتوں کا کیا فائدہ؟ موت تو ہر صورت میں آتی ہے اور اسی جگہ پر آتی ہے جہاں اللہ کی طرف سے لکھ دی گئی ہے۔ اگر تم گھروں میں بیٹھے ہوتے اور تمہاری موت کسی مقتل میں لکھی ہوتی تو تمہیں قضا ضرور وہاں کھینچ لے جاتی؟
- (۶) یہ جو کچھ ہوا اس سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ تمہارے سینوں کے اندر جو کچھ ہے یعنی ایمان، اسے آزمائے (ناکہ) منافق الگ ہو جائیں) اور پھر تمہارے دلوں کو شیطانی وساوس سے پاک کر دے۔
- (۷) یعنی اس کو تو علم ہے کہ مخلص مسلمان کون ہے اور نفاق کا لبادہ کس نے اوڑھ رکھا ہے؟ جہاد کی متعدد حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ اس سے مومن اور منافق کھل کر سامنے آ جاتے ہیں جنہیں عام لوگ بھی پھر دیکھ اور پہچان لیتے ہیں۔

اللَّهُ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۵۵﴾

کرتوتوں کے باعث شیطان کے پھسلانے میں آگئے^(۱)
لیکن یقین جانو کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا^(۲) اللہ
تعالیٰ ہے بخشنے والا اور نخل والا۔ (۱۵۵)

اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں
نے کفر کیا اور اپنے بھائیوں کے حق میں جب کہ وہ سفر
میں ہوں یا جہاد میں ہوں، کہا کہ اگر یہ ہمارے پاس
ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے،^(۳) اس کی وجہ یہ
تھی کہ اس خیال کو اللہ تعالیٰ ان کی دلی حسرت کا سبب بنا
دے،^(۴) اللہ تعالیٰ جلاتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ
تمہارے عمل کو دیکھ رہا ہے۔ (۱۵۶)

قسم ہے اگر اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید کیجے جاؤ یا اپنی
موت مرو تو بے شک اللہ تعالیٰ کی بخشش و رحمت اس

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا كَذِبًا وَأَقُولُوا
لِإخوانِهِمْ إِذًا عَدُوًّا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا عَدُوًّا
عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَأَقْتُلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَلِكَ حَسْرَةً فِي
قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ يُعْجِبُ وَيُبْهِتُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ
بَصِيرٌ ﴿۵۶﴾

وَلَكِنْ قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْمَتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ
وَرَحْمَةُ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ﴿۵۷﴾

(۱) یعنی احد میں مسلمانوں سے جو لغزش اور کوتاہی ہوئی اس کی وجہ ان کی پچھلی بعض کمزوریاں تھیں جس کی وجہ سے
شیطان اس روز بھی انہیں پھسلانے میں کامیاب ہو گیا۔ جس طرح بعض سلف کا قول ہے کہ ”نیکی کا بدلہ یہ بھی ہے کہ
اس کے بعد مزید نیکی کی توفیق ملتی ہے اور برائی کا بدلہ یہ ہے کہ اس کے بعد مزید برائی کا راستہ کھلتا اور ہموار ہوتا ہے۔“
(۲) اللہ تعالیٰ صحابہ رضی اللہ عنہم کی لغزشوں، ان کے نتائج اور حکمتوں کے بیان کے بعد پھر اپنی طرف سے ان کے معافی کا
اعلان فرما رہا ہے۔ جس سے ایک تو ان کا محبوب بارگاہ الہی ہونا واضح ہے اور دوسرے، عام مومنین کو تنبیہ ہے کہ ان
مومنین صادقین کو جب اللہ نے معاف فرمایا ہے تو اب کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ انہیں ہدف ملامت یا نشانہ تنقید
بنائے۔

(۳) اہل ایمان کو اس فساد عقیدہ سے روکا جا رہے ہے جس کے حامل کفار اور منافقین تھے کیونکہ یہ عقیدہ بزودی کی بنیاد
ہے اس کے برعکس جب یہ عقیدہ ہو کہ موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے، نیز یہ کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے تو اس
سے انسان کے اندر عزم و حوصلہ اور اللہ کی راہ میں لڑنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

(۴) مذکورہ فساد عقیدہ دلی حسرت کا ہی سبب بنتا ہے کہ اگر وہ سفر پر یا میدان جنگ میں نہ جاتے بلکہ گھر میں ہی رہتے تو
موت کے آغوش میں جانے سے بچ جاتے۔ درآں حالیکہ موت تو مضبوط قلعوں کے اندر بھی آجاتی ہے، ﴿يَأْتِيَنَّ مَا
تَلَّوْا لَوْ لَا إِذْ بَدَّكَهُمُ الْوَيْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بَرْزَخٍ مِّنْ دُونِ هَذَا﴾ (النساء - ۷۸) ”تم جہاں کہیں بھی ہو، موت تمہیں پالے گی اگرچہ تم
ہو مضبوط قلعوں میں“۔ اس لیے اس حسرت سے مسلمان ہی بچ سکتے ہیں جن کے عقیدے صحیح ہیں۔

وَلَنْ نُعْطِيَهُمْ أَزْوَاجَهُمْ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ يُخْشَرُونَ ﴿۵۵﴾

فِيمَا رَحْمَةً مِّنَ اللَّهِ لَئِن تَأْمُرُوا لَأَنفُسِكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّهُمْ لَآ يُغْنِيكُمْ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۵۶﴾
وَسَاءَ مَا يَحْكُمُونَ فِي الْآيَاتِ ۚ فَإِذَا دُعُوا عَلَى اللَّهِ أَوْ عَلَىٰ رَسُولِهِ لَجَأُوا بِهَا إِلَىٰ آلِهِمْ لِيُقْضَىٰ لَهُمْ ۚ فَلَا تَمْلِكُ لَهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَمْوَالُ آلِهِمْ شَيْئًا مِنَ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ لِمَن يَشَاءُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ ذَكِيمٌ ﴿۵۷﴾

سے بہتر ہے جسے یہ جمع کر رہے ہیں۔ (۱۵۷) (۱)
بالمیقن خواہ تم مرجاؤ یا مار ڈالے جاؤ جمع تو اللہ تعالیٰ کی
طرف ہی کئے جاؤ گے۔ (۱۵۸)

اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث آپ ان پر نرم دل ہیں اور
اگر آپ بد زبان اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے
پاس سے چھٹ جاتے، سو آپ ان سے درگزر کریں اور
ان (۲) کے لئے استغفار کریں اور کام کا مشورہ ان سے کیا
کریں، (۳) پھر جب آپ کا پختہ ارادہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ
پر بھروسہ کریں، (۴) بے شک اللہ تعالیٰ توکل کرنے

(۱) موت تو ہر صورت میں آنی ہے لیکن اگر موت ایسی آئے کہ جس کے بعد انسان اللہ کی مغفرت و رحمت کا مستحق قرار
پائے تو یہ دنیا کے مال و اسباب سے بہت بہتر ہے جس کے جمع کرنے میں انسان عمر کھپا دیتا ہے۔ اس لئے اللہ کی راہ میں
جماد کرنے سے گریز نہیں، اس میں رغبت اور شوق ہونا چاہئے کہ اس طرح رحمت و مغفرت الہی یقینی ہو جاتی ہے بشرطیکہ
اخلاص کے ساتھ ہو۔

(۲) نبی ﷺ جو صاحب خلق عظیم تھے، اللہ تعالیٰ اپنے اس پیغمبر پر ایک احسان کا ذکر فرما رہا ہے کہ آپ ﷺ کے اندر
جو نرمی اور ملامت ہے یہ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی کا نتیجہ ہے اور یہ نرمی دعوت و تبلیغ کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اگر
آپ ﷺ کے اندر یہ نہ ہوتی بلکہ اس کے برعکس آپ ﷺ تند خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے قریب ہونے
کی بجائے، آپ ﷺ سے دور بھاگتے۔ اس لئے آپ درگزر سے ہی کام لیتے رہیں۔

(۳) یعنی مسلمانوں کی طیب خاطر کے لئے مشورہ کر لیا کریں۔ اس آیت سے مشاورت کی اہمیت، افادیت اور اس کی
ضرورت و مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔ مشاورت کا یہ حکم بعض کے نزدیک وجوب کے لئے اور بعض کے نزدیک
استحباب کے لئے ہے (ابن کثیر)۔ امام شوکانی لکھتے ہیں ”حکمرانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ علماء سے ایسے معاملات میں
مشورہ کریں جن کا انہیں علم نہیں ہے۔ یا ان کے بارے میں انہیں اشکال ہیں۔ فوج کے سربراہوں سے فوجی معاملات
میں، سربراہ آوردہ لوگوں سے عوام کے مصالح کے بارے میں اور ماتحت حکام و والیان سے ان کے علاقوں کی ضروریات
و ترجیحات کے سلسلے میں مشورہ کریں۔“ ابن عطیہ کہتے ہیں کہ ایسے حکمران کے وجوب عزل پر کوئی اختلاف نہیں ہے جو
اہل علم و اہل دین سے مشورہ نہیں کرتا۔“ یہ مشورہ صرف ان معاملات تک محدود ہو گا جن کی بابت شریعت خاموش ہے
یا جن کا تعلق انتظامی امور سے ہے۔ (فتح القدیر)

(۴) یعنی مشاورت کے بعد جس پر آپ کی رائے پختہ ہو جائے، پھر اللہ پر توکل کر کے اسے کر گزریں۔ اس سے ایک تو
یہ بات معلوم ہوئی کہ مشاورت کے بعد بھی آخری فیصلہ حکمران ہی کا ہو گا نہ کہ ارباب مشاورت یا ان کی اکثریت کا جیسا

والوں سے محبت کرتا ہے۔ (۱۵۹)

اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرے؟ ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ (۱۶۰)

ناممکن ہے کہ نبی سے خیانت ہو جائے (۱) ہر خیانت کرنے والا خیانت کو لئے ہوئے قیامت کے دن حاضر ہو گا، پھر ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور وہ ظلم نہ کئے جائیں گے۔ (۱۶۱)

کیا پس وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے درپے ہے، اس شخص جیسا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی لے کر لوٹتا ہے؟ اور جس کی جگہ جہنم ہے جو بدترین جگہ ہے۔ (۱۶۲)

اللہ تعالیٰ کے پاس ان کے الگ الگ درجے ہیں اور ان کے تمام اعمال کو اللہ بخوبی دیکھ رہا ہے۔ (۱۶۳)

بے شک مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ ان ہی میں سے ایک رسول ان میں بھیجا، (۲) جو انہیں اس کی

إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخُدَّكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللَّهِ قَلْبُ كُلِّ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۵۹﴾

وَمَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يَقْتُلَ وَمَنْ يَقْتُلْ يَأْتِ بِمَاعَلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۱۶۰﴾

أَقَمِينَ اتَّبِعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِنَ اللَّهِ وَمَا لَهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۱۶۱﴾

هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ بِصِعْتِهِمَ يَعْلَمُونَ ﴿۱۶۲﴾

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

کہ جمہوریت میں ہے۔ دوسری یہ کہ سارا اعتماد و توکل اللہ کی ذات پر ہو نہ کہ مشورہ دینے والوں کی عقل و فہم پر۔ اگلی آیت میں بھی توکل علی اللہ کی مزید تاکید ہے۔

(۱) جنگ احد کے دوران جو لوگ، مورچہ چھوڑ کر مال غنیمت سمیٹنے دوڑ پڑے تھے ان کا خیال تھا کہ اگر ہم نہ بچنے تو سارا مال غنیمت دوسرے لوگ سمیٹ لے جائیں گے اس پر تنبیہ کی جا رہی ہے کہ آخر تم نے یہ تصور کیسے کر لیا کہ اس مال میں سے تمہارا حصہ تم کو نہیں دیا جائے گا۔ کیا تمہیں قائد غزوہ محمد ﷺ کی امانت پر اطمینان نہیں۔ یاد رکھو کہ ایک پیغمبر سے کسی قسم کی خیانت کا صدور ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ خیانت، نبوت کے منافی ہے۔ اگر نبی ہی خائن ہو تو پھر اس کی نبوت پر یقین کیوں کر کیا جاسکتا ہے؟ خیانت بہت بڑا گناہ ہے احادیث میں اس کی سخت مذمت آئی ہے۔

(۲) نبی کے بشر اور انسانوں میں سے ہی ہونے کو اللہ تعالیٰ ایک احسان کے طور پر بیان کر رہا ہے اور نبی واقعی بے احسان عظیم ہے کہ اس طرح ایک تو وہ اپنی قوم کی زبان اور لہجے میں ہی اللہ کا پیغام پہنچائے گا جسے سمجھنا ہر شخص کے لئے آسان

وَاَنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَكُمْ ضَلِيلٌ مُّبِينٌ ﴿۳۱﴾

آیتیں پڑھ کر سنا تا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت^(۱) سکھاتا ہے، یقیناً^(۲) یہ سب اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (۱۸۳)

(کیا بات ہے) کہ جب تمہیں ایک ایسی تکلیف پہنچی کہ تم اس جیسی دو چند پہنچا چکے،^(۳) تو یہ کہنے لگے کہ یہ کہاں سے آگئی؟ آپ کہہ دیجئے کہ یہ خود تمہاری طرف سے

اَوْلَانًا اَصَابَكُمْ مُّصِيبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ وَمَتَلَبَهَا اَتَىٰ هَذَا قُلٌ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَفْوَيْكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۱﴾

ہو گا۔ دوسرے، لوگ ہم جنس ہونے کی وجہ سے اس سے مانوس اور اس کی قریب ہوں گے۔ تیسرے انسان کے لئے انسان، یعنی بشر کی پیروی تو ممکن ہے لیکن فرشتوں کی پیروی اس کے بس کی بات نہیں اور نہ فرشتہ انسان کے وجدان و شعور کی گمراہیوں اور باریکیوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس لئے اگر پیغمبر فرشتوں میں سے ہوتے تو وہ ان ساری خوبیوں سے محروم ہوتے جو تبلیغ و دعوت کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ اس لئے جتنے بھی انبیاء آئے ہیں سب کے سب بشری تھے۔ قرآن نے ان کی بشریت کو خوب کھول کر بیان کیا ہے۔ مثلاً فرمایا ﴿ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوحِيْ اِلَيْهِمْ ﴾ (یوسف - ۱۰۹) ”ہم نے آپ ﷺ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے وہ مرد تھے جن پر ہم وحی کرتے تھے“ ﴿ وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا اَنْهُمْ لِيَاْكُلُوْنَ الْكَلٰمَ وَيَسْمَعُوْنَ فِي الْاَسْوَابِ ﴾ (سورۃ الفرقان - ۲۰) ”ہم نے آپ ﷺ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے، سب کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے تھے“۔ اور خود نبی ﷺ کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا ﴿ قُلْ اِنَّمَا اَنَا نَبِيٌّ مِّثْلُ نُبُوِّ الَّذِيْنَ رَاٰی ﴿ (سورۃ حم السجدة - ۶) ”آپ ﷺ کہہ دیجئے میں بھی تو تمہاری طرح صرف بشری ہوں البتہ مجھ پر وحی کا نزول ہوتا ہے“۔ آج بہت سے افراد اس چیز کو نہیں سمجھتے اور انحراف کا شکار ہیں۔

(۱) اس آیت میں نبوت کے تین اہم مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ ۱- تلاوت آیات - ۲- تزکیہ - ۳- تعلیم کتاب و حکمت۔ تعلیم کتاب میں تلاوت از خود آجاتی ہے، تلاوت کے ساتھ ہی تعلیم ممکن ہے، تلاوت کے بغیر تعلیم کا تصور ہی نہیں۔ اس کے باوجود تلاوت کو الگ ایک مقصد کے طور پر ذکر کیا گیا ہے جس سے اس نکتے کی وضاحت مقصود ہے کہ تلاوت بجائے خود ایک مقدس اور نیک عمل ہے، چاہے پڑھنے والا اس کا مفہوم سمجھے یا نہ سمجھے۔ قرآن کے معانی و مطالب کو سمجھنے کی کوشش کرنا یقیناً ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ لیکن جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو یا اتنی فہم و استعداد بہم نہ پہنچ جائے، تلاوت قرآن سے اعراض یا غفلت جائز نہیں۔ تزکیے سے مراد عقائد اور اعمال و اخلاق کی اصلاح ہے، جس طرح آپ ﷺ نے انہیں شرک سے ہٹا کر توحید پر لگایا اسی طرح نہایت بد اخلاق اور بد اطوار قوم کو اخلاق و کردار کی رفعتوں سے ہمکنار کر دیا، حکمت سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک حدیث ہے۔

(۲) یہ اِنْ مُّخَفَّفَةً مِنَ الْمُنْفَلَةِ ہے یعنی «اِنْ» (تحقیق، یقیناً بلاشبہ) کے معنی ہیں۔

(۳) یعنی احد میں تمہارے ستر آدمی شہید ہوئے تو بدر میں تم نے ستر کافر قتل کئے تھے اور ستر قیدی بنائے تھے۔

ہے،^(۱) بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۱۶۵)
 اور تمہیں جو کچھ اس دن پہنچا جس دن دو جماعتوں میں
 ٹڈ بھڑ ہوئی تھی، وہ سب اللہ کے حکم سے تھا اور اس
 لئے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ظاہری طور پر جان
 لے۔ (۱۶۶)

اور منافقوں کو بھی معلوم کر لے^(۲) جن سے کہا گیا کہ آؤ
 اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یا کافروں کو ہٹاؤ، تو وہ کہنے لگے
 کہ اگر ہم لڑائی جانتے ہوتے تو ضرور ساتھ دیتے،^(۳) وہ
 اس دن بہ نسبت ایمان کے کفر سے بہت قریب تھے،^(۴)
 اپنے منہ سے وہ باتیں بناتے ہیں جو ان کے دلوں میں
 نہیں،^(۵) اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے
 ہیں۔ (۱۶۷)

یہ وہ لوگ ہیں جو خود بھی بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں کی
 بابت کہا کہ اگر وہ بھی ہماری بات مان لیتے تو قتل نہ کئے

وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ التَّتْلِ الْجَمْعُ فَبَادِئِ اللَّهُ وَلِيَعْلَمَ
 الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۶۵﴾

وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ
 اللَّهِ أَوْ ادْعُوا كَالَّذِينَ نَزَّلْنَا عَلَيَّكُمْ مِنَ الْكِتَابِ هُمْ يَكْفُرُونَ
 يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ
 فِي قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿۱۶۶﴾

الَّذِينَ قَالُوا لِنُحَايِهِمْ وَوَعْدُ وَالْوَأَعُونَ مَا فَعِلُوا قُلْ

(۱) یعنی تمہاری اس غلطی کی وجہ سے جو رسول اللہ ﷺ کے تاکید حکم کے باوجود پہاڑی مورچہ چھوڑ کر تم نے کی
 تھی۔ جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے گزری کہ اس غلطی کی وجہ سے کافروں کے ایک دستے کو اس درے سے دوبارہ حملہ
 کرنے کا موقع مل گیا۔

(۲) یعنی احد میں تمہیں جو کچھ نقصان پہنچا، وہ اللہ کے حکم سے ہی پہنچا ہے (تاکہ آئندہ تم اطاعت رسول کا کماحقہ اہتمام
 کرو) علاوہ ازیں اس کا ایک مقصد مومنین اور منافقین کو ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز کرنا بھی تھا۔

(۳) لڑائی جانے کا مطلب یہ ہے کہ اگر واقعی آپ لوگ لڑائی لڑنے چل رہے ہوتے تو ہم بھی ساتھ دیتے۔ مگر آپ تو
 لڑائی کے بجائے اپنے آپ کو تباہی کے دہانے میں جھونکنے جا رہے ہیں۔ ایسے غلط کام میں ہم کیوں آپ کا ساتھ دیں۔ یہ
 عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے اس لئے کہا کہ ان کی بات نہیں مانی گئی تھی اور اس وقت کہا جب وہ مقام شوط پر
 پہنچ کر واپس ہو رہے تھے اور عبد اللہ بن حرام انصاری جو بیٹھہ انہیں سمجھا بجا کر شریک جنگ کرنے کی کوشش کر رہے
 تھے۔ (قدرے تفصیل گزر چکی ہے)

(۴) اپنے نفاق اور ان باتوں کی وجہ سے جو انہوں نے کیں۔

(۵) یعنی زبان سے تو ظاہر کیا جو مذکور ہوا لیکن دل میں یہ تھا کہ ہماری علیحدگی سے ایک تو مسلمانوں کے اندر بھی ضعف

فَادْرَبُوا عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۰﴾

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ
عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْزُقُونَ ﴿۳۱﴾

فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَهُمْ
يَلْقَهُوا يَوْمَئِذٍ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَا حَتُوفٌ عَلَيْهِمْ وَآلِهِمْ يَرْزُقُونَ ﴿۳۲﴾

جاتے۔ کہہ دیجئے! کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی جانوں سے
موت کو ہٹا دو۔^(۱) (۱۶۸)

جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید کئے گئے ہیں ان کو ہرگز
مردہ نہ سمجھیں، بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کی پاس
روزیاں دیئے جاتے ہیں۔^(۲) (۱۶۹)

اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل جو انہیں دے رکھا ہے اس سے
بہت خوش ہیں اور خوشیاں منا رہے ہیں ان لوگوں کی
بابت جو اب تک ان سے نہیں ملے ان کے پیچھے
ہیں،^(۳) اس پر کہ انہیں نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ
غمگین ہوں گے۔ (۱۷۰)

پیدا ہو گا۔ دوسرے، کافروں کو فائدہ ہو گا۔ مقصد اسلام، مسلمانوں اور نبی کریم ﷺ کو نقصان پہنچانا تھا۔

(۱) یہ منافقین کے اس قول کا رد ہے کہ ”اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو قتل نہ کئے جاتے“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”اگر تم سچے ہو تو اپنے سے موت نال کر دکھاؤ“ مطلب یہ ہے کہ تقدیر سے کسی کو مفر نہیں۔ موت بھی جہاں اور جیسے مقدر ہے، وہاں اور اسی صورت میں آکر رہے گی۔ اس لئے جہاد اور اللہ کی راہ میں لڑنے سے گریز و فرار یہ کسی کو موت کے شکنجے سے نہیں بچا سکتا۔

(۲) شہدائی یہ زندگی حقیقی ہے یا مجازی، یقیناً حقیقی ہے لیکن اس کا شعور اہل دنیا کو نہیں (جیسا کہ قرآن نے وضاحت کر دی ہے۔ ملاحظہ ہو (سورہ بقرہ آیت نمبر ۱۵۳) پھر اس کا مطلب کیا ہے؟ بعض کہتے ہیں قبروں میں ان کی روحیں لوٹادی جاتی ہیں اور وہاں اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ جنت کے پھلوں کی خوشبوئیں انہیں آتی ہیں جن سے ان کے مشام جان معطر رہتے ہیں۔ لیکن حدیث سے ایک تیسری شکل معلوم ہوتی ہے اس لئے وہی صحیح ہے، وہ یہ کہ ان کی روحیں سبز پرندوں کے جوف یا سینوں میں داخل کر دی جاتی ہیں اور وہ جنت میں کھاتی پھرتی اور اسکی نعمتوں سے متنعم ہوتی ہیں (فتح القدیر بحوالہ صحیح مسلم، کتاب البارة)

(۳) یعنی وہ اہل اسلام جو ان کے پیچھے دنیا میں زندہ ہیں یا مصروف جہاد ہیں، ان کی بابت وہ خواہش کرتے ہیں کہ کاش وہ بھی شہادت سے ہمکنار ہو کر یہاں ہم جیسی پر لطف زندگی حاصل کریں۔ شہدائے احد نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ ہمارے وہ مسلمان بھائی جو دنیا میں زندہ ہیں، انہیں ہمارے حالات اور پر مسرت زندگی سے کوئی مطلع کرنے والا ہے؟ تاکہ وہ جنگ و جہاد سے اعراض نہ کریں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”میں تمہاری بات ان تک پہنچا دیتا ہوں“ اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ (مسند احمد ۱ / ۳۶۵-۳۶۶ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد) علاوہ ازیں متعدد احادیث

وہ خوش ہوتے ہیں اللہ کی نعت اور فضل سے اور اس سے بھی کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے اجر کو برباد نہیں کرتا۔^(۱) (۱۷۱)

جن لوگوں نے اللہ اور رسول کے حکم کو قبول کیا اس کے بعد کہ انہیں پورے زخم لگ چکے تھے، ان میں سے جنہوں نے نیکی کی اور پرہیزگاری برتی ان کے لئے بہت زیادہ اجر ہے۔^(۲) (۱۷۲)

يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةِ رَبِّهِمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّبُ أَمْرَ
الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۷۱﴾

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَالرُّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا اٰصَابَهُمْ
الْقَرْصَةُ ۗ لَذٰلِكَ اٰخَصْنَاوَهُمْ وَالْقَوٰاَجِرَ عَظِيْمًا ﴿۱۷۲﴾

سے شہادت کی فضیلت ثابت ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں فرمایا «مَا مِنْ نَفْسٍ تَمُوْتُ، لَهَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ، يَسْرُهَا أَنْ تَرْجَعَ إِلَى الدُّنْيَا إِلَّا الشَّهِيْدُ، فَإِنَّهُ يَسْرُهُ أَنْ يَرْجَعَ إِلَى الدُّنْيَا فَيَقْتَلَ مَرَّةً أُخْرَى لِمَا يَرَى مِنْ فَضْلِ الشَّهَادَةِ»۔ (مسند أحمد ۳-۱۳۶، صحیح مسلم، کتاب الإمامة، باب فضل الشہادۃ) ”کوئی مرنے والی جان، جس کو اللہ کے ہاں اچھا مقام حاصل ہے، دنیا میں لوٹنا پسند نہیں کرتی۔ البتہ شہید دنیا میں دوبارہ آنا پسند کرتا ہے تاکہ وہ دوبارہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے۔ یہ آرزو وہ اس لیے کرتا ہے کہ شہادت کی فضیلت کا وہ مشاہدہ کر لیتا ہے۔“ حضرت جابر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھے معلوم ہے کہ اللہ نے تیرے باپ کو زندہ کیا اور اس سے کہا کہ مجھ سے اپنی کسی آرزو کا اظہار کر (تاکہ میں اسے پورا کر دوں) تیرے باپ نے جواب دیا کہ میری تو صرف یہی آرزو ہے کہ مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تاکہ دوبارہ تیری راہ میں مارا جاؤں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، یہ تو ممکن نہیں ہے اس لیے کہ میرا فیصلہ ہے کہ یہاں آنے کے بعد کوئی دنیا میں واپس نہیں جاسکتا۔

(۱) یہ استبشار، پہلے استبشار کی تاکید اور اس بات کا بیان ہے کہ ان کی خوشی محض خوف و حزن کے فقدان کی ہی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ کی نعمتوں اور اس کے بے پایاں فضل و کرم کی وجہ سے بھی ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے پہلی خوشی کا تعلق دنیا میں رہ جانے والے بھائیوں کی وجہ سے اور یہ دوسری خوشی اس انعام و اکرام کی ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے خود ان پر ہوا۔ (فتح القدیر)

(۲) جب مشرکین جنگ احد سے واپس ہوئے تو راستے میں انہیں خیال آیا کہ ہم نے تو ایک نہایت سنہری موقع ضائع کر دیا۔ مسلمان شکست خوردگی کی وجہ سے بے حوصلہ اور خوف زدہ تھے۔ ہمیں اس سے فائدہ اٹھا کر مدینہ پر بھرپور حملہ کر دینا چاہئے تھا تاکہ اسلام کا یہ پودا اپنی سرزمین (مدینہ) سے ہی نیست و نابود ہو جائے۔ ادھر مدینہ پہنچ کر نبی کریم ﷺ کو بھی اندیشہ ہوا کہ شاید وہ پھر پلٹ آئیں لہذا آپ ﷺ نے صحابہ کو لڑنے کے لئے آمادہ کیا آپ ﷺ کے کہنے پر صحابہ باوجود اس بات کے کہ وہ اپنے مقنولین و مجروحین کی وجہ سے دل گرفتہ اور محزون و مغموم تھے، تیار ہو گئے۔ مسلمانوں کا یہ قافلہ جب مدینہ سے ۸ میل کے فاصلے پر واقع ”حراء الاسد“ پر پہنچا تو مشرکین کو خوف محسوس ہوا۔ چنانچہ ان کا ارادہ بدل گیا اور وہ مدینہ پر حملہ آور ہونے کے بجائے مکہ واپس چلے گئے۔ اس کے بعد نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقا بھی

وہ لوگ کہ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ کافروں نے تمہارے مقابلے پر لشکر جمع کر لئے ہیں، تم ان سے خوف کھاؤ تو اس بات نے انہیں ایمان میں اور بڑھا دیا اور کہنے لگے ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔^(۱) (۱۷۳)

(نتیجہ یہ ہوا کہ) اللہ کی نعمت و فضل کے ساتھ یہ لوٹے،^(۲) انہیں کوئی برائی نہ پہنچی، انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی پیروی کی، اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔ (۱۷۴)

یہ خبر دینے والا صرف شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں

الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدِ جَمَعُوا لَكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ فَإِنَّهُمْ يَأْتُونَ بِنَايَا وَأَنْهَارٍ قَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ﴿۱۷۳﴾

فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ وَاللَّهُ وَكَانَ يُضَوِّنَ اللَّهُ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ ﴿۱۷۴﴾

إِنَّمَا ذَلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَصَلَوْا

مدینہ واپس آگئے۔ آیت میں مسلمانوں کے اسی جذبہ اطاعت اللہ و رسول کی تعریف کی گئی ہے بعض نے اس کا سبب نزول حضرت ابو سفیان کی اس دھمکی کو بتلایا ہے کہ آئندہ سال بدر صفری میں ہمارا تمہارا مقابلہ ہو گا۔ (ابو سفیان ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) جس پر مسلمانوں نے بھی اللہ و رسول کی اطاعت کے جذبے کا مظاہرہ کرتے ہوئے، جہاد میں بھرپور حصہ لینے کا عزم کر لیا۔ (مخلص از فتح القدر و ابن کثیر مگر یہ آخری قول سیاق سے میل نہیں کھاتا)

(۱) حمرہ الاسد اور کہا جاتا ہے کہ بدر صفری کے موقع پر ابو سفیان نے بعض لوگوں کی خدمات مالی معاوضہ دے کر حاصل کیں اور ان کے ذریعے سے مسلمانوں میں یہ افواہ پھیلائی کہ مشرکین مکہ لڑائی کے لئے بھرپور تیاری کر رہے ہیں تاکہ یہ سن کر مسلمانوں کے حوصلے پست ہو جائیں۔ بعض روایات کی رو سے یہ کام شیطان نے اپنے چیلے چانٹوں کے ذریعے سے لیا۔ لیکن مسلمان اس قسم کی افواہیں سن کر خوف زدہ ہونے کی بجائے، مزید عزم و ولولہ سے سرشار ہو گئے جس کو یہاں ایمان کی زیادتی سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ ایمان جتنا پختہ ہو گا، جہاد کا عزم اور ولولہ بھی اتنا ہی زیادہ ہو گا۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان جلد قسم کی چیز نہیں ہے بلکہ اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، جیسا کہ محدثین کا مسلک ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ابتلا و معیبت کے وقت اہل ایمان کا شیوہ اللہ پر اعتماد و توکل ہے۔ اسی لئے حدیث میں بھی حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ پڑھنے کی فضیلت وارد ہے۔ نیز صحیح بخاری وغیرہ میں ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا تو آپ کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ (فتح القدر)

(۲) نِعْمَةٌ سے مراد سلامتی ہے اور فَضْلٌ سے مراد وہ نفع ہے جو بدر صفری میں تجارت کے ذریعے سے حاصل ہوا۔ نبی کریم ﷺ نے بدر صفری میں ایک گزرنے والے قافلے سے سامان تجارت خرید کر فروخت کیا جس سے نفع حاصل ہوا اور آپ ﷺ نے مسلمانوں پر تقسیم کر دیا۔ (ابن کثیر)

إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ ﴿۱۰﴾

سے ڈراتا ہے^(۱) تم ان کافروں سے نہ ڈرو اور میرا خوف رکھو، اگر تم مومن ہو۔^(۲) (۱۷۵)

کفر میں آگے بڑھنے والے لوگ تجھے غمناک نہ کریں، یقین مانو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے کہ ان کے لئے آخرت کا کوئی حصہ عطا نہ کرے،^(۳) اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ (۱۷۶)

کفر کو ایمان کے بدلے خریدنے والے ہرگز ہرگز اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور ان ہی کے لئے المناک عذاب ہے۔ (۱۷۷)

کافر لوگ ہماری دی ہوئی مہلت کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں، یہ مہلت تو اس لئے ہے کہ وہ گناہوں میں اور بڑھ جائیں،^(۴) ان ہی کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب

وَلَا يَحْزَنكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَنْ يَصُرُوا اللَّهُ سُبُطًا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْأَخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۱﴾

إِنَّ الَّذِينَ اسْتَرَوْا الْكُفْرَ إِلَى الْإِيمَانِ لَنْ يَصُرُوا اللَّهُ سُبُطًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۲﴾

وَلَا يَصْبَحِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَّا مَائِلِينَ لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنفُسِهِمْ إِلَّا مَائِلِينَ لَهُمْ لِيَذُؤُوا أَنفُسَهُمْ وَعَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿۱۳﴾

(۱) یعنی تمہیں اس وسوسے اور وہم میں ڈالتا ہے کہ وہ بڑے مضبوط اور طاقتور ہیں۔

(۲) یعنی جب وہ تمہیں اس وہم میں مبتلا کرے تو تم صرف مجھ پر ہی بھروسہ رکھو اور میری ہی طرف رجوع کرو! میں تمہیں کافی ہو جاؤں گا اور تمہارا ناصر رہوں گا۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿الَّذِينَ اللَّهُ يَكُفِّرُ بَعْضُهُمْ أَلْسِنَةً﴾ (الزمر-۳۶) ”کیا اللہ اپنے بندے کو کافی نہیں ہے؟“۔ مزید ملاحظہ ہوں۔ ﴿كُتِبَ اللَّهُ لَآخِلِينَآ أَنَا وَرَسُولِي﴾ وَغَيْرِهَا مِنَ الْآيَاتِ

(۳) نبی ﷺ کے اندر اس بات کی شدید خواہش تھی کہ سب لوگ مسلمان ہو جائیں، اسی لئے ان کے انکار اور تکذیب سے آپ کو سخت تکلیف پہنچتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں آپ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ آپ ﷺ عمگین نہ ہوں، یہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اپنی ہی آخرت برباد کر رہے ہیں۔

(۴) اس میں اللہ کے قانون اعمال (مہلت دینے) کا بیان ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی حکمت و مشیت کے مطابق کافروں کو مہلت عطا فرماتا ہے، وقتی طور پر انہیں دنیا کی فراغت و خوش حالی سے، توحات سے اور مال و اولاد سے نوازتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان پر اللہ کا فضل ہو رہا ہے لیکن اگر اللہ کی نعمتوں سے فیض یاب ہونے والے نیکی اور اطاعت الہی کا راستہ اختیار نہیں کرتے تو یہ دنیوی نعمتیں، فضل الہی نہیں مہلت الہی ہے۔ جس سے ان کے کفر و فسوق میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ بالآخر وہ جہنم کے دائمی عذاب کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے اور بھی کئی مقامات پر بیان کیا ہے۔ مثلاً ﴿الْمُؤْمِنُونَ آمَنُوا بِذُنُوبِهِمْ مِن قَبْلِ هَٰذَا وَرَبُّنَا عَلِيمٌ خَبِيرٌ * فَسَارِعُوا لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ بَل لَّا يَشْعُرُونَ﴾ (المؤمنون-۵۶، ۵۷) ”کیا وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کے مال و اولاد میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ ہم ان کے لئے بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں؟ نہیں بلکہ وہ سمجھتے نہیں ہیں۔“

ہے۔ (۱۷۸)

جس حال پر تم ہو اسی پر اللہ ایمان والوں کو نہ چھوڑ دے گا جب تک کہ پاک اور ناپاک کو الگ الگ نہ کر دے،^(۱) اور نہ اللہ تعالیٰ ایسا ہے کہ تمہیں غیب سے آگاہ کر دے،^(۲) بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جس کا چاہے انتخاب کر لیتا ہے،^(۳) اس لئے تم اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھو، اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ کرو تو تمہارے لئے بڑا بھاری اجر ہے۔ (۱۷۹)

مَا كَانَ اللَّهُ لِيُذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَكْتُمُ عَلَيْهِمْ حَتَّىٰ يَبَيِّنَ
الْحَدِيثَ مِنَ الظَّهِيرِ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظْلِمَكُمْ عَلَى الظَّهِيرِ
وَلَكِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ مِّنْ رَبِّهِمْ فَأُولَٰئِكَ
يُرْسِلُهُمْ وَإِنْ تَوَلَّوْا وَتَوَلَّوْا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۱۷۹﴾

(۱) اس لئے اللہ تعالیٰ ابتلا کی بھٹی سے ضرور گزارتا ہے تاکہ اس کے دوست واضح اور دشمن ذلیل ہو جائیں۔ مومن صابر، منافق سے الگ ہو جائے جس طرح احد میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو آزمایا جس سے ان کے ایمان، صبر و ثبات اور جذبہ اطاعت کا اظہار ہوا اور منافقین نے اپنے اوپر جو نفاق کا پردہ ڈال رکھا تھا وہ بے نقاب ہو گیا۔

(۲) یعنی اگر اللہ تعالیٰ اس طرح ابتلا کے ذریعے سے لوگوں کے حالات اور ان کے ظاہر و باطن کو نمایاں نہ کرے تو تمہارے پاس کوئی غیب کا علم تو ہے نہیں کہ جس سے تم پر یہ چیزیں منکشف ہو جائیں اور تم جان سکو کہ کون منافق ہے اور کون مومن خالص؟

(۳) ہاں البتہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے غیب کا علم عطا فرماتا ہے جس سے بعض دفعہ ان پر منافقین کا اور ان کے حالات اور ان کی سازشوں کا راز فاش ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ بھی کسی کسی وقت اور کسی کسی نبی پر ہی ظاہر کیا جاتا ہے۔ ورنہ عام طور پر نبی بھی (جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے) منافقین کے اندرونی نفاق اور ان کے کمزورید سے بے خبر ہی رہتا ہے (جس طرح کہ سورہ توبہ کی آیت نمبر ۱۰۱ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اعراب اور اہل مدینہ میں جو منافق ہیں اے پیغمبر! آپ ﷺ ان کو نہیں جانتے، ہم انہیں جانتے ہیں) اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غیب کا علم ہم صرف اپنے رسولوں کو ہی عطا کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کی منہی ضرورت ہے۔ اس وجہ الٰہی اور امور غیبیہ کے ذریعے سے ہی وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلائے اور اپنے کو اللہ کا رسول ثابت کرتے ہیں؟ اس مضمون کو دوسرے مقام پر اس طرح بیان کیا گیا ہے ﴿عَلَّمَ الغَيْبَ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا * إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ﴾

(الحج، ۲۶، ۲۷) ”عالم الغیب (اللہ تعالیٰ) ہے اور وہ اپنے غیب سے پسندیدہ رسولوں کو ہی خبردار کرتا ہے“ ظاہر بات ہے یہ امور غیبیہ وہی ہوتے ہیں جن کا تعلق منصب و فرائض رسالت کی ادائیگی سے ہوتا ہے نہ کہ مآکانَ وَمَا يَكُونُ جو کچھ ہو چکا اور آئندہ قیامت تک جو ہونے والا ہے“ کا علم۔ جیسا کہ بعض اہل باطل اس طرح کا علم غیب انبیاء علیہم السلام کے لیے اور کچھ اپنے ”ائمہ معصومین“ کے لیے باور کراتے ہیں۔

وَلَا يَخْسِبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا أَنعَمَ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرٌ مِّنْهُم بَلْ هُوَ شَرٌّ لَهُمْ سُبُطُورُونَ
مَا عُولُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ لِلَّهِ ميراثُ السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿١٠﴾

لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ قَدِيرٌ وَعَجُنْ
أَعْيَابَهُ سَتَكُنُّبٌ مَّا قَالُوا وَ تَتْلُوهُمُ الْآيَاتِ بِغَيْرِ حِسٍّ
وَقَوْلُوكُمْ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيطِ ﴿١١﴾

ذَلِكَ بِمَا قَاتَمْتُمْ آيَاتِي كُمْ وَإِنَّ اللَّهَ لَيَسْ
بِظُلْمِكُمْ لِلْعَالَمِينَ ﴿١٢﴾

الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ سَعَى الْبَيْنَا الْآلُومِينَ لِيُرْسُولِ
حَسْبِيَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَأْكُلُهُ النَّارُ كُلَّ مَا جَاءَكُمْ مِنْ

جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کچھ دے رکھا ہے وہ اس میں اپنی کجسوی کو اپنے لئے بہتر خیال نہ کریں بلکہ وہ ان کے لئے نہایت بدتر ہے، عنقریب قیامت والے دن یہ اپنی کجسوی کی چیز کے طوق ڈالے جائیں گے،^(۱) آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ تعالیٰ ہی کے لئے اور جو کچھ تم کر رہے ہو، اس سے اللہ تعالیٰ آگاہ ہے۔ (۱۸۰)
یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا قول بھی سنا جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فقیر ہے اور ہم تو نکر ہیں^(۲) ان کے اس قول کو ہم لکھ لیں گے۔ اور ان کا انبیاء کو بلا وجہ قتل کرنا بھی،^(۳) اور ہم ان سے کہیں گے کہ جلنے والا عذاب چکھو!۔ (۱۸۱)

یہ تمہارے پیش کردہ اعمال کا بدلہ ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ (۱۸۲)
یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ کسی رسول کو نہ مانیں جب تک وہ ہمارے پاس ایسی قربانی نہ لائے جسے آگ کھا جائے۔ آپ کہہ دیجئے

(۱) اس میں اس بخیل کا بیان کیا گیا ہے جو اللہ کے دیئے ہوئے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا حتیٰ کہ اس میں سے فرض زکوٰۃ بھی نہیں نکالتا۔ صحیح بخاری کی حدیث میں آتا ہے کہ قیامت والے دن اس کے مال کو ایک زہریلا اور نہایت خوفناک سانپ بنا کر طوق کی طرح اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا، وہ سانپ اس کی بانجھیں پڑے گا اور کسے گا کہ میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔ «مَنْ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا فَلَمْ يُؤَدِّ زَكَاتَهُ، مِثْلَ لَهُ شُجَاعًا أَفْرَعًا، لَهُ زَبَبَاتَانِ، يُطَوِّقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ». (صحیح بخاری۔ کتاب التفسیر باب تفسیر آل عمران، کتاب الزکاة۔ حدیث نمبر ۳۵۱۶)

(۲) جب اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی اور فرمایا ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يَفْوِضُ اللَّهُ قَوْلًا حَسَنًا﴾ (البقرہ- ۲۴۵) ”کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے“ تو یہود نے کہا اے محمد (ﷺ)! تیرا رب فقیر ہو گیا ہے کہ اپنے بندوں سے قرض مانگ رہا ہے؟ جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (ابن کثیر)

(۳) یعنی مذکورہ قول جس میں اللہ کی شان میں گستاخی ہے اور اسی طرح ان کے (اسلاف) کا انبیاء علیہم السلام کو ناحق قتل کرنا، ان کے یہ سارے جرائم اللہ کی بارگاہ میں درج ہیں، جن پر وہ جنم کی آگ میں داخل ہوں گے۔

مِنْ قَبْلِ يَأْتِيَنَّكَ وَيَأْتِيَنَّكَ فَلَنْ تَنَالُوا
إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝

فَإِنْ كَذَّبْتُمْ فَلَا تَكُفِّرُ بَدَلًا وَلَا تَكُفِّرُ
بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ۝

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِعَةٌ لِوَعْدِ اللَّهِ وَآثِمَاتٌ قُوتُونَ أَجُورَهُمْ
يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَنْ زُحِرَ عَنْ الْغَرَارِ وَأُذْخِلَ
الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا
إِلَّا مَتَاعٌ الْعُرُورِ ۝

کہ اگر تم سچے ہو تو مجھ سے پہلے تمہارے پاس جو رسول
دیگر معجزوں کے ساتھ یہ بھی لائے جسے تم کہہ رہے ہو تو
پھر تم نے انہیں کیوں مار ڈالا؟۔ (۱۸۳)

پھر بھی اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلائیں تو آپ سے پہلے بھی
ہست سے وہ رسول جھٹلائے گئے ہیں جو روشن دلیلیں
صحیفے اور منور کتاب لے کر آئے۔ (۱۸۴)

ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے اور قیامت کے دن تم
اپنے بدلے پورے پورے دیئے جاؤ گے، پس جو شخص
آگ سے ہٹا دیا جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے
بے شک وہ کامیاب ہو گیا، اور دنیا کی زندگی تو صرف
دھوکے کی جنس (۳) ہے۔ (۱۸۵)

(۱) اس میں یہودیوں کی ایک اور بات کی تکذیب کی جا رہی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ عہد لیا ہے کہ تم
صرف اس رسول کو ماننا جس کی دعا پر آسمان سے آگ آئے اور قربانی و صدقات کو جلا ڈالے۔ مطلب یہ تھا کہ اے محمد
(ﷺ) آپ کے ذریعے سے اس معجزے کا چونکہ صدور نہیں ہوا۔ اس لئے بحکم الہی آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانا
ہمارے لئے ضروری نہیں ہے حالانکہ پہلے نبیوں میں ایسے نبی بھی آئے کہ جن کی دعا سے آسمان سے آگ آتی اور اہل
ایمان کے صدقات اور قربانیوں کو کھا جاتی۔ جو ایک طرف اس بات کی دلیل ہوتی کہ اللہ کی راہ میں پیش کردہ صدقہ یا
قربانی بارگاہ الہی میں قبول ہو گئی۔ دوسری طرف اس بات کی دلیل ہوتی کہ یہ نبی برحق ہے۔ لیکن ان یہودیوں نے ان
نبیوں اور رسولوں کی بھی تکذیب ہی کی تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو پھر تم نے
ایسے پیغمبروں کو کیوں جھٹلایا اور انہیں قتل کیا جو تمہاری طلب کردہ نشانی ہی لے کر آئے تھے“

(۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں کی ان کٹ جتھیوں سے بدل نہ
ہوں۔ ایسا معاملہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں کیا جا رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آنے
والے پیغمبروں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو چکا ہے۔

(۳) اس آیت میں ایک تو اس اٹل حقیقت کا بیان ہے کہ موت سے کسی کو مفر نہیں۔ دوسرا یہ کہ دنیا میں جس نے
اچھایا برا، جو کچھ کیا ہو گا، اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ تیسرا، کامیابی کا معیار بتلایا گیا ہے کہ کامیاب اصل میں
وہ ہے جس نے دنیا میں رہ کر اپنے رب کو راضی کر لیا جس کے نتیجے میں وہ جہنم سے دور اور جنت میں داخل کر دیا گیا۔
چوتھا یہ کہ دنیا کی زندگی مسلمان فریب ہے، جو اس سے دامن بچا کر نکل گیا، وہ خوش نصیب اور جو اس کے فریب میں
پھنس گیا، وہ ناکام و نامراد ہے۔

لَتَجِبُوا فِيْ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْتَعْنَ
 مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ
 اَشْرَكُوا اَذَى كَثِيْرًا وَاِنْ تَصِيْرُوا وَاَتَعْتَمُوا فَاِنَّ
 ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝۱۰

وَ اِذَا خَدَا اللّٰهُ مِنْ بَيْنَايَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ لَتَجِبَنَّهٗ
 لَلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَ لَهُ الْغَنَبَاتِ وَاِنَّ رَاٰهُ ظَهَرَ مِنْهُ

یقیناً تمہارے مالوں اور جانوں سے تمہاری آزمائش کی جائے گی^(۱) اور یہ بھی یقین ہے کہ تمہیں ان لوگوں کی جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے اور مشرکوں کی بہت سی دکھ دینے والی باتیں بھی سننی پڑیں گی اور اگر تم صبر کر لو اور پرہیزگاری اختیار کرو تو یقیناً یہ بہت بڑی ہمت کا کام ہے۔ (۱۸۶)^(۲)

اور اللہ تعالیٰ نے جب اہل کتاب سے عہد لیا کہ تم اسے سب لوگوں سے ضرور بیان کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں، تو پھر بھی ان لوگوں نے اس عہد کو اپنی پیٹھ پیچھے

(۱) اہل ایمان کو ان کے ایمان کے مطابق آزمانے کا بیان ہے۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۵۵ میں گزر چکا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں ایک واقعہ بھی آتا ہے کہ رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی نے ابھی اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا اور جنگ بدر بھی نہیں ہوئی تھی کہ نبی ﷺ حضرت سعد بن عبادۃ بنی ہذیل کی عیادت کے لئے بنی حارث بن خزرج میں تشریف لے گئے۔ راستے میں ایک مجلس میں مشرکین، یہود اور عبد اللہ بن ابی وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کی سواری سے جو گرد اٹھی، اس نے اس پر بھی ناگواری کا اظہار کیا اور آپ ﷺ نے انہیں ٹھہر کر قبول اسلام کی دعوت بھی دی جس پر عبد اللہ بن ابی نے گستاخانہ کلمات بھی کہے۔ وہاں بعض مسلمان بھی تھے، انہوں نے اس کے برعکس آپ ﷺ کی تحسین فرمائی، قریب تھا کہ ان کے مابین جھگڑا ہو جائے، آپ ﷺ نے ان سب کو خاموش کرایا۔ پھر آپ ﷺ حضرت سعد بن ہذیل کے پاس پہنچے تو انہیں بھی یہ واقعہ سنایا جس پر انہوں نے فرمایا کہ عبد اللہ بن ابی یہ باتیں اس لئے کرتا ہے کہ آپ ﷺ کے مدینہ آنے سے قبل، یہاں کے باشندگان کو اس کی تاج پوشی کرنی تھی، آپ ﷺ کے آنے سے اس کی سرداری کا یہ حسین خواب اودھورا رہ گیا جس کا اسے سخت صدمہ ہے اور اس کی یہ باتیں اس کے اس بغض و عناد کا مظہر ہیں۔ اس لئے آپ ﷺ درگزر رہی سے کام لیں۔ (صحیح البخاری کتاب التفسیر ملخصاً)

(۲) اہل کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ یہ نبی ﷺ، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مختلف انداز سے طعن و تشنیع کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح مشرکین عرب کا حال تھا۔ علاوہ ازیں مدینہ میں آنے کے بعد منافقین بالخصوص ان کا رئیس عبد اللہ بن ابی بھی آپ ﷺ کی شان میں استخفاف کرتا رہتا تھا۔ آپ کے مدینہ آنے سے قبل اہل مدینہ اپنا سردار بنانے لگے تھے اور اس کے سر پر تاج سیادت رکھنے کی تیاری مکمل ہو چکی تھی کہ آپ ﷺ کے آنے سے اس کا یہ سارا خواب بکھر کر رہ گیا، جس کا اسے شدید صدمہ تھا چنانچہ انتقام کے طور پر بھی یہ شخص آپ کے خلاف سب و شتم کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا (جیسا کہ صحیح بخاری کے حوالے سے اس کی ضروری تفصیل گزشتہ حاشیہ میں ہی بیان کی گئی ہے) ان حالات میں مسلمانوں کو عنف و درگزر اور صبر اور تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ جس سے

وَاشْتَرَوْا بِهِ كَمَاتًا قَلِيلًا فِيمَسَّ مَا يَشْتَرُونَ ﴿۱۸۷﴾

ڈال دیا اور اسے بہت کم قیمت پر بیچ ڈالا۔ ان کا یہ بیوپار بہت برا ہے۔ (۱۸۷)

لَا تَخْشَوْنَ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا آتَاكُمْ وَيُحْزِنُونَ أَنْ تُخْسِدُوا
بِمَالِكُمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسِبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ
وَأَلْهَمُوا عَذَابَ الْآلِيمِ ﴿۱۸۸﴾

وہ لوگ جو اپنے کرتوتوں پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو انہوں نے نہیں کیا اس پر بھی ان کی تعریفیں کی جائیں آپ انہیں عذاب سے چھکارا میں نہ سمجھئے ان کے لئے تو دردناک عذاب ہے۔ (۱۸۸)

وَاللَّهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۱۸۹)

عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۸۹﴾

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے ہیر پھیر میں یقیناً عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ (۱۹۰)

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاختلافِ الْآيَاتِ
وَالْمَعَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾

معلوم ہوا کہ داعیان حق کا اذیتوں اور مشکلات سے دوچار ہونا اس راہ حق کے ناگزیر مرحلوں میں سے ہے اور اس کا علاج صرف نبی اللہ، استعانت باللہ اور رجوع الی اللہ کے سوا کچھ نہیں (ابن کثیر)

(۱) اس میں اہل کتاب کو زجر و توبیح کی جا رہی ہے کہ ان سے اللہ نے یہ عہد لیا تھا کہ کتاب الہی (تورات اور انجیل) میں جو باتیں درج ہیں اور آخری نبی کی جو صفات ہیں، انہیں لوگوں کے سامنے بیان کریں گے اور انہیں چھپائیں گے نہیں۔ لیکن ان لوگوں نے دنیا کے تھوڑے سے مفادات کے لئے اللہ کے اس عہد کو پس پشت ڈال دیا۔ یہ گویا اہل علم کو تلقین و تنبیہ ہے کہ ان کے ہاں جو علم نافع ہے، جس سے لوگوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح ہو سکتی ہو، وہ لوگوں تک ضرور پہنچانا چاہئے اور دنیوی اغراض و مفادات کی خاطر ان کو چھپانا بہت بڑا جرم ہے۔ قیامت والے دن ایسے لوگوں کو آگ کی لگام پسنائی جائے گی (کافی الحدیث)

(۲) اس میں ایسے لوگوں کے لئے سخت وعید ہے جو صرف اپنے واقعی کارناموں پر ہی خوش نہیں ہوتے بلکہ چاہتے ہیں کہ ان کے کھاتے میں وہ کارنامے بھی درج یا ظاہر کئے جائیں جو انہوں نے نہیں کئے ہوتے۔ یہ بیماری جس طرح عہد رسالت کے بعض لوگوں میں تھی جن کے پیش نظر آیات کا نزول ہوا۔ اسی طرح آج بھی جاہ پسند قسم کے لوگوں اور پروپیگنڈے اور دیگر ہتھکنڈوں کے ذریعے سے بننے والے لیڈروں میں یہ بیماری عام ہے۔ اَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ

آیت کے سابق سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہودی کتاب الہی میں تحریف و کتمان کے مجرم تھے، مگر وہ اپنے ان کرتوتوں پر خوش ہوتے تھے، یہی حال آج کے باطل گروہوں کا بھی ہے، وہ بھی لوگوں کو گمراہ کر کے، غلط رہنمائی کر کے اور آیات الہی میں معنوی تحریف و تلبیس کر کے بڑے خوش ہوتے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ وہ اہل حق ہیں اور یہ کہ ان کے اجل و فریب کاری کی انہیں داد دی جائے۔ فَاتَلَّهُمُ اللَّهُ أَنِّي يُؤَفِّكُونَ

(۳) یعنی جو لوگ زمین و آسمان کی تخلیق اور کائنات کے دیگر اسرار و رموز پر غور کرتے ہیں، انہیں کائنات کے خالق

جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر لیٹے ہوئے کرتے ہیں اور آسمانوں و زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ بے فائدہ نہیں بنایا، تو پاک ہے پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے۔^(۱) (۱۹۱)

اے ہمارے پالنے والے! تو جسے جنم میں ڈالے یقیناً تو نے اسے رسوا کیا، اور ظالموں کا مددگار کوئی نہیں۔ (۱۹۲)

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَمًا وَقَعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ
وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا
خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ قَوْمًا عٰدَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

رَبَّنَا اِنَّكَ مَنْ تَدْعِيْلُ النَّارَ فَقَدْ اَخْرَجْتَهُ وَاللَّظْلِمِيْنَ
مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾

اور اس کے اصل فرمانروا کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتے ہیں کہ اتنی طویل و عریض کائنات کا یہ لگا بندھا نظام، جس میں ذرا خلل واقع نہیں ہوتا، یقیناً اس کے پیچھے ایک ذات ہے جو اسے چلا رہی اور اس کی تدبیر کر رہی ہے اور وہ ہے اللہ کی ذات۔ آگے انہی اہل دانش کی صفات کا تذکرہ ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے اور کروٹوں پر لیٹے ہوئے اللہ کا ذکر کرتے ہیں.... حدیث میں آتا ہے کہ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ سے لے کر آخر سورت تک یہ آیات نبی کریم ﷺ رات کو جب تہجد کے لئے اٹھتے، تو پڑھتے اور اس کے بعد وضو کرتے (صحیح بخاری، کتاب التفسیر - صحیح مسلم، کتاب صلوة المسافرین و قصرھا، باب الدعاء فی صلوة اللیل و قیامہ)

(۱) ان دس آیات میں سے پہلی آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی قدرت و طاقت کی چند نشانیاں بیان فرمائی ہیں اور فرمایا ہے کہ یہ نشانیاں ضرور ہیں لیکن کن کے لیے؟ اہل عقل و دانش کے لئے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان عجائبات تخلیق اور قدرت الہیہ کو دیکھ کر بھی جس شخص کو باری تعالیٰ کا عرفان حاصل نہ ہو، وہ اہل دانش ہی نہیں۔ لیکن یہ الہیہ بھی بڑا عجیب ہے کہ عالم اسلام میں ”دانش ور“ سمجھا ہی اس کو جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں تشکیک کا شکار ہو۔ فَإِنَّ اللَّهَ وَإِنَّا إِلٰهٌ رَّاجِعُونَ دوسری آیت میں اہل دانش کے ذوق ذکر الہی اور ان کا آسمان و زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرنے کا بیان ہے۔ جیسا کہ حدیث میں بھی آتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ”کھڑے ہو کر نماز پڑھو۔ اگر کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر اور بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتے تو کروٹ کے بل لیٹے لیٹے ہی نماز پڑھ لو“ (صحیح بخاری، کتاب الصلوة) ایسے لوگ جو ہر وقت اللہ کو یاد کرتے اور رکھتے ہیں اور آسمان و زمین کی تخلیق اور اس کی حکمتوں پر غور کرتے ہیں جن سے خالق کائنات کی عظمت و قدرت، اس کا علم و اختیار اور اس کی رحمت و ربوبیت کی صحیح معرفت انہیں حاصل ہوتی ہے تو وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ رب کائنات نے یہ کائنات یوں ہی بے مقصد نہیں بنائی ہے بلکہ اس سے مقصد بندوں کا امتحان ہے۔ جو امتحان میں کامیاب ہو گیا، اس کے لئے ابدالاباد تک جنت کی نعمتیں ہیں اور جو ناکام ہوا اس کے لئے عذاب نار ہے۔ اس لئے وہ عذاب نار سے بچنے کی دعا بھی کرتے ہیں۔ اس کے بعد والی تین آیات میں بھی مغفرت اور قیامت کے دن کی رسوائی سے بچنے کی دعائیں ہیں۔

اے ہمارے رب! ہم نے سنا کہ منادی کرنے والا با آواز بلند ایمان کی طرف بلا رہا ہے کہ لوگو! اپنے رب پر ایمان لاؤ! پس ہم ایمان لائے۔ یا الٰہی! اب تو ہمارے گناہ معاف فرما اور ہماری برائیاں ہم سے دور کر دے اور ہماری موت نیکیوں کے ساتھ کر۔ (۱۹۳)

اے ہمارے پالنے والے معبود! ہمیں وہ دے جس کا وعدہ تو نے ہم سے اپنے رسولوں کی زبانی کیا ہے اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کر، یقیناً تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ (۱۹۴)

پس ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمائی (۱) کہ تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت میں ہرگز ضائع نہیں کرتا، (۲) تم آپس میں ایک دوسرے کے ہم جنس ہو، (۳) اس لئے وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور جنہیں میری راہ میں ایذا دی گئی اور جنہوں نے جہاد کیا اور شہید کئے گئے، میں ضرور ضرور ان کی برائیاں ان سے دور کر دوں گا اور بالیقین انہیں ان جنتوں میں لے

رَبَّنَا إِنَّا أَمَّا آتَانَا وَمَا عَدَّتْ عَلَيْنَا فَاغْرَبْنَاكَ اللَّهُ لَدُنَّ بَنَاتٍ لَّا يَعْلَمْنَ مِصْرًا وَأَنْتَ الْمُبْدِي

رَبَّنَا وَإِنَّا نَاوَدُّكَ عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا نَخْشَىٰ نَارَ الْقِيَامَةِ إِنَّكَ لَاطْعَلِفُ الْبِعَادِ ﴿۱۹۴﴾

فَأَسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ بَاطِنًا مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ تَوَابًا مِمَّنْ عِنْدَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

(۱) فَأَسْتَجَابَ يہاں اَجَابَ یعنی ”قبول فرمائی“ کے معنی میں ہے (فتح القدر)

(۲) مرد ہو یا عورت کی وضاحت اس لئے کر دی کہ اسلام نے بعض معاملات میں، مرد اور عورت کے درمیان ان کے ایک دوسرے سے مختلف فطری اوصاف کی بنا پر جو فرق کیا ہے۔ مثلاً تو امیت و حاکمیت میں، کسب معاش کی ذمہ داری میں، جہاد میں حصہ لینے میں اور وراثت میں نصف حصہ ملنے میں۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ نیک اعمال کی جزا میں بھی شاید مرد و عورت کے درمیان کچھ فرق کیا جائے گا۔ نہیں ایسا نہیں ہو گا بلکہ ہر نیکی کا جو اجر ایک مرد کو ملے گا، وہ نیکی اگر ایک عورت کرے گی تو اس کو بھی وہی اجر ملے گا۔

(۳) یہ جملہ معترضہ ہے اور اس کا مقصد بچھلے نکتے کی ہی وضاحت ہے یعنی اجر و اطاعت میں تم مرد اور عورت ایک ہی ہو یعنی ایک جیسے ہی ہو۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے سلسلے میں عورتوں کا نام نہیں لیا۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی (تفسیر طبری، ابن کثیر و فتح القدر)

جاؤں گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، یہ ہے ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ ہی کے پاس بہترین ثواب ہے۔ (۱۹۵)

تجھے کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا فریب میں نہ ڈال دے،^(۱) (۱۹۶)

یہ تو بہت ہی تھوڑا فائدہ ہے،^(۲) اس کے بعد ان کا ٹھکانہ تو جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے۔ (۱۹۷)

لیکن جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے ان کے لئے جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے یہ مسمانی ہے اللہ کی طرف سے اور نیک کاروں کے لئے جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ بہت ہی بہتر ہے۔^(۳) (۱۹۸)

لَا يَغُزُّكَ تَعْلَابَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْإِلَادِ ﴿۱﴾

مَتَاعًا قَلِيلًا تَتَمَّوْا بِهِمْ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْيَهَادُ ﴿۲﴾

لِيَكُنَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ

خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ

خَيْرٌ لِمَا يَكْتُمُونَ ﴿۳﴾

(۱) خطاب اگرچہ نبی ﷺ سے ہے لیکن مخاطب پوری امت ہے شہروں میں چلنے پھرنے سے مراد تجارت و کاروبار کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ملک سے دوسرے ملک جانا ہے۔ یہ تجارتی سفروں میں دنیا کی فراوانی اور کاروبار کے وسعت و فروغ کی دلیل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، یہ سب کچھ عارضی اور چند روزہ فائدہ ہے، اس سے اہل ایمان کو دھوکہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ اصل انجام پر نظر رکھنی چاہئے، جو ایمان سے محرومی کی صورت میں جہنم کا دائمی عذاب ہے جس میں دولت دنیا سے مالا مال یہ کافر مبتلا ہوں گے۔ یہ مضمون اور بھی متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً ﴿ مَا يَجِدُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ إِلَّا الْكَرْهَ وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَلَا يَغُزُّكَ تَعْلَابُهُمْ فِي الْإِلَادِ ﴾ (سورۃ المؤمن-۳) ”اللہ کی آیتوں میں وہی لوگ جھگرتے ہیں جو کافر ہیں، پس ان کا شہروں میں چلنا پھرنا آپ کو دھوکے میں نہ ڈالے۔“ ﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴾ ﴿ مَتَاعًا فِي الدُّنْيَا نُفَاتًا أَلَيْسَ أَمْرًا جَهَنَّمَ ﴾ (سورۃ یونس-۶۹، ۷۰)۔ ﴿ نَبِيَّتُهُمْ وَقِيلَ لَهُمْ فَسَظُنُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴾ (سورۃ لقمان-۲۳)

(۲) یعنی یہ دنیا کے وسائل، آسائش اور سولتیں بظاہر کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، درحقیقت متاع قلیل ہی ہیں۔ کیونکہ بالآخر انہیں فنا ہونا ہے اور ان کے بھی فنا ہونے سے پہلے وہ حضرات خود فنا ہو جائیں گے، جو ان کے حصول کی کوششوں میں اللہ کو بھی فراموش کئے رکھتے ہیں اور ہر قسم کے اخلاقی ضابطوں اور اللہ کی حدوں کو بھی پامال کرتے ہیں۔

(۳) ان کے برعکس جو تقویٰ اور خدا خونی کی زندگی گزار کر اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے، گو دنیا میں ان کے پاس خدا فراموشوں کی طرح دولت کے انبار اور رزق کی فراوانی نہ رہی ہوگی، مگر وہ اللہ کے مہمان ہوں گے جو تمام کائنات کا

یقیناً اہل کتاب میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں اور تمہاری طرف جو اتارا گیا ہے اور ان کی جانب جو نازل ہوا اس پر بھی، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو تھوڑی تھوڑی قیمت پر بیچتے بھی نہیں،^(۱) ان کا بدلہ ان کے رب کے پاس ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔ (۱۹۹)

اے ایمان والو! تم ثابت قدم رہو^(۲) اور ایک دوسرے کو تھامے رکھو اور جہاد کے لئے تیار رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم مراد کو پہنچو۔ (۲۰۰)

وَأَنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِمْ خَيْرٌ مِنْهُ لَا تَشْتَرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

خالق و مالک ہے اور وہاں ان ابرار (نیک لوگوں) کو جو اجر و صلہ ملے گا، وہ اس سے بہت بہتر ہو گا جو دنیا میں کافروں کو عارضی طور پر ملتا ہے۔

(۱) اس آیت میں اہل کتاب کے اس گروہ کا ذکر ہے۔ جسے رسول کریم ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کے ایمان اور ایمانی صفات کا تذکرہ فرما کر اللہ تعالیٰ نے انہیں دوسرے اہل کتاب سے ممتاز کر دیا، جن کا مشن ہی اسلام، پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنا، آیات الہی میں تحریف و تلبیس کرنا اور دنیا کے عارضی اور فانی مفادات کے لئے کتمان علم کرنا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ مومنین اہل کتاب ایسے نہیں ہیں، بلکہ یہ اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ اللہ کی آیتوں کو تھوڑی تھوڑی قیمت پر بیچنے والے نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو علماء و مشائخ دنیوی اغراض کے لئے آیات الہی میں تحریف یا ان کے مفہوم کے بیان میں دجل و تلبیس سے کام لیتے ہیں، وہ ایمان و تقویٰ سے محروم ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ آیت میں جن مومنین اہل کتاب کا ذکر ہے، یہود میں سے ان کی تعداد دس تک بھی نہیں پہنچتی البتہ عیسائی بڑی تعداد میں مسلمان ہوئے اور انہوں نے دین حق کو اپنایا۔ (تفسیر ابن کثیر)

(۲) صبر کرو یعنی طاعات کے اختیار کرنے اور شہوات و لذات کے ترک کرنے میں اپنے نفس کو مضبوط اور ثابت قدم رکھو۔ مُصَابِرَةٌ (صَابِرًا) جنگ کی شدتوں میں دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہنا، یہ صبر کی سخت ترین صورت ہے۔ اس لئے اسے علیحدہ بیان فرمایا۔ رَابِطًا امیدان جنگ یا محاذ جنگ میں مورچہ بند ہو کر ہمہ وقت چوکنا اور جہاد کے لئے تیار رہنا مرابطہ ہے۔ یہ بھی بڑے عزم و حوصلہ کا کام ہے۔ اسی لئے حدیث میں اس کی یہ فضیلت بیان کی گئی ہے۔ «رَبَّاطُ يَوْمٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا» (صحیح بخاری، باب فضل رباط یوم فی سبیل اللہ) "اللہ کے راستے (جہاد) میں ایک دن پڑاؤ ڈالنا۔ (یعنی مورچہ بند ہونا) دنیا و مافیہا سے بہتر ہے" علاوہ ازیں حدیث میں مکارہ (یعنی ناگواری کے حالات میں) مکمل وضو کرنے، مسجدوں میں زیادہ دور سے چل کر جانے اور نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کرنے کو بھی رباط کہا گیا ہے۔ (صحیح مسلم۔ کتاب الصلوة) ---

سورہ نساء مدنی ہے اور اس میں ایک سو چھتر آیات اور چوبیس رکوع ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا^(۱) اور اسی سے اس کی بیوی کو پیدا کر کے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں، اس اللہ سے ڈرو جس کے نام پر ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور رشتے ناطے توڑنے سے بھی بچو^(۲) بے شک اللہ تعالیٰ تم پر نگہبان ہے۔ (۱)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۝

☆ نساء کے معنی ہیں ”عورتیں“ اس سورت میں عورتوں کے بہت سے اہم مسائل کا تذکرہ ہے۔ اس لئے اسے سورہ نساء کہا جاتا ہے۔

(۱) ”ایک جان“ سے مراد ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا میں ”بنا“ سے وہی ”جان“ یعنی آدم علیہ السلام مراد ہیں یعنی آدم علیہ السلام سے ان کی زوج (بیوی) حضرت حوا کو پیدا کیا۔ حضرت حوا حضرت آدم علیہ السلام سے کس طرح پیدا ہوئیں اس میں اختلاف ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول مروی ہے کہ حضرت حوا مرد (یعنی آدم علیہ السلام) سے پیدا ہوئیں۔ یعنی ان کی بائیں پبلی سے۔ ایک حدیث میں کہا گیا ہے۔ «إِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلْعٍ وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلْعِ أَعْلَاهُ» (صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، صحیح مسلم، کتاب الرضاع) کہ ”عورت پبلی سے پیدا کی گئی ہے اور پبلی میں سب سے ٹیڑھا حصہ، اس کا بالائی حصہ ہے۔ اگر تو اسے سیدھا کرنا چاہے تو توڑ بیٹھے گا اور اگر تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہے تو کچی کے ساتھ ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔“ بعض علمائے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول رائے کی تائید کی ہے۔ قرآن کے الفاظ خَلَقَ مِنْهَا سے اسی موقف کی تائید ہوتی ہے حضرت حوا کی تخلیق اسی نفس واحدہ سے ہوئی ہے جسے آدم کہا جاتا ہے۔

(۲) وَالْأَرْحَامَ کا عطف اللہ پر ہے یعنی رحموں (رشتوں ناطوں) کو توڑنے سے بھی بچو أَرْحَامَ، رَحِمٌ کی جمع ہے۔ مراد رشتے داریاں ہیں جو رحم مادر کی بنیاد پر ہی قائم ہوتی ہیں۔ اس سے محرم اور غیر محرم دونوں رشتے مراد ہیں رشتوں ناطوں کا توڑنا سخت کبیرہ گناہ ہے جسے قطع رحمی کہتے ہیں۔ احادیث میں قرابت داریوں کو ہر صورت میں قائم رکھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی بڑی تاکید اور فضیلت بیان کی گئی ہے جسے صلہ رحمی کہا جاتا ہے۔

اور یتیموں کو ان کے مال دے دو اور پاک اور حلال چیز کے بدلے ناپاک اور حرام چیز نہ لو، اور اپنے مالوں کے ساتھ ان کے مال ملا کر کھانہ جاؤ، بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔^(۱) (۲)

اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے تم انصاف نہ رکھ سکو گے تو اور عورتوں میں سے جو بھی تمہیں اچھی لگیں تم ان سے نکاح کر لو، دو دو، تین تین، چار چار سے، لیکن اگر تمہیں برابری نہ کر سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے یا تمہاری ملکیت کی لونڈی^(۲) یہ زیادہ قریب ہے، کہ (ایسا کرنے سے ناانصافی اور) ایک

وَأَنْزِلْنَا إِلَيْكُمْ آمَوَالَهُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا الْوَيْحِيَّةَ بِالطَّبَاطِبِ
وَلَا تَأْكُلُوا آمَوَالَهُمْ إِلَىٰ آمَوَالِكُمْ إِنَّهُ كَانَ
خُوبًا كَثِيرًا ②

وَأَنْ خِفْتُمْ أَزْوَاجًا ثَمَرًا فَإِنِ اتَّبَعْتُم مِّنَ النِّسَاءِ مَنَعْنِي وَتَلْتُم
وَرُبْعًا فَإِنِ خِفْتُمْ أَزْوَاجًا فَلِحَدَّةٍ
أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَلِكَ آدَنَىٰ الْأَتْعُولِ ③

(۱) یتیم جب بالغ اور باشعور ہو جائیں تو ان کا مال ان کے سپرد کر دو۔ خبیث سے گھنیا چیزیں اور طیب سے عمدہ چیزیں مراد ہیں یعنی ایسا نہ کرو کہ ان کے مال سے اچھی چیزیں لے لو اور محض گنتی پوری کرنے کے لئے گھنیا چیزیں ان کے بدلے میں رکھ دو۔ ان گھنیا چیزوں کو خبیث (ناپاک) اور عمدہ چیزوں کو طیب (پاک) سے تعبیر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ اس طرح بدلایا گیا مال، جو اگرچہ اصل میں تو طیب (پاک اور حلال) ہے لیکن تمہاری اس بددیانتی نے اس میں خباثت داخل کر دی اور وہ اب طیب نہیں رہا، بلکہ تمہارے حق میں وہ خبیث (ناپاک اور حرام) ہو گیا۔ اسی طرح بددیانتی سے ان کا مال اپنے مال میں ملا کر کھانا بھی ممنوع ہے ورنہ اگر مقصد خیر خواہی ہو تو ان کے مال کو اپنے مال میں ملانا جائز ہے۔

(۲) اس کی تفسیر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس طرح مروی ہے کہ صاحب حیثیت اور صاحب ہمال یتیم لڑکی کسی ولی کے زیر پرورش ہوتی تو وہ اس کے مال اور حسن و جمال کی وجہ سے اس سے شادی تو کر لیتا لیکن اس کو دوسری عورتوں کی طرح پورا حق مہر نہ دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس ظلم سے روکا، کہ اگر تم گھر کی یتیم بچیوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے تو تم ان سے نکاح ہی مت کرو، تمہارے لئے دوسری عورتوں سے نکاح کرنے کا راستہ کھلا ہے (صحیح بخاری، کتاب التفسیر) بلکہ ایک کے بجائے دو سے تین سے حتیٰ کہ چار عورتوں تک سے تم نکاح کر سکتے ہو، بشرطیکہ ان کے درمیان انصاف کے تقاضے پورے کر سکو۔ ورنہ ایک سے ہی نکاح کرو یا اس کے بجائے لونڈی پر گزارا کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان مرد (اگر وہ ضرورت مند ہے) تو چار عورتیں بیک وقت اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ نہیں، جیسا کہ صحیح احادیث میں اس کی مزید صراحت اور تحدید کر دی گئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جو چار سے زائد شادیاں کیں وہ آپ ﷺ کے خصائص میں سے ہے جس پر کسی امتی کے لئے عمل کرنا جائز نہیں۔ (ابن کثیر)

طرف جھک پڑنے سے بچ جاؤ۔^(۱) (۳)

اور عورتوں کو ان کے مہر راضی خوشی دے دو، ہاں اگر وہ خود اپنی خوشی سے کچھ مہر چھوڑ دیں تو اسے شوق سے خوش ہو کر کھالو۔ (۴)

بے عقل لوگوں کو اپنا مال نہ دے دو جس مال کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری گزران کے قائم رکھنے کا ذریعہ بنایا ہے، ہاں انہیں اس مال سے کھلاؤ، پلاؤ، پہناؤ اوڑھاؤ اور انہیں معقولیت سے نرم بات کہو۔ (۵)

اور یتیموں کو ان کے بالغ ہو جانے تک سدھارتے اور آزما تے رہو پھر اگر ان میں تم ہو شیاری اور حسن تدبیر پاؤ تو انہیں ان کے مال سونپ دو اور ان کے بڑے ہو جانے کے ڈر سے ان کے مالوں کو جلدی جلدی فضول خرچیوں میں تباہ نہ کر دو، مال داروں کو چاہئے کہ (ان کے مال سے) بچتے رہیں، ہاں مسکین محتاج ہو تو دستور کے مطابق واجبی طور سے کھالے، پھر جب انہیں ان کے مال سونپو تو گواہ بنا لو، دراصل حساب لینے والا اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے۔^(۲) (۶)

وَأَتُوا النِّسَاءَ صَدُقَتِهِنَّ نِحْلَةً فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ فَمِنْهُنَّ فَكُلُوهُ هَيْئًا مَرِيئًا ۝

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَمًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۝

وَابْتَلُوا النِّسَاءَ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمُ رُسْدًا فَإِذَا فَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَن يَكْبُرُوا وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْعِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهَدُوا عَلَيْهِمْ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝

(۱) یعنی ایک ہی عورت سے شادی کرنا کافی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی صورت میں انصاف کا اہتمام بہت مشکل ہے جس کی طرف قلبی میلان زیادہ ہو گا، ضروریات زندگی کی فراہمی میں زیادہ توجہ بھی اسی کی طرف ہو گی۔ یوں بیویوں کے درمیان وہ انصاف کرنے میں ناکام رہے گا اور اللہ کے ہاں مجرم قرار پائے گا۔ قرآن نے اس حقیقت کو دوسرے مقام پر نہایت بلیغانہ انداز میں اس طرح بیان فرمایا ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَيَمُنُوا كُلُّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ﴾ (سورۃ النساء- ۱۲۹) ”اور تم ہرگز اس بات کی طاقت نہ رکھو گے کہ بیویوں کے درمیان انصاف کر سکو، اگرچہ تم اس کا اہتمام کرو۔ (اس لئے اتنا تو کرو) کہ ایک ہی طرف نہ جھک جاؤ کہ دوسری بیویوں کو بیچ ادھر میں لٹکا رکھو۔“ اس سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ شادی کرنا اور بیویوں کے ساتھ انصاف نہ کرنا نامناسب اور نہایت خطرناک ہے۔

(۲) یتیموں کے مال کے بارے میں ضروری ہدایات دینے کے بعد یہ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک یتیم کا مال

ماں باپ اور خویش و اقارب کے ترکہ میں مردوں کا حصہ بھی ہے اور عورتوں کا بھی۔ (جو مال ماں باپ اور خویش و اقارب چھوڑ مرے) خواہ وہ مال کم ہو یا زیادہ (اس میں) حصہ مقرر کیا ہوا ہے۔ (۷)

اور جب تقسیم کے وقت قرابت دار اور یتیم اور مسکین آجائیں تو تم اس میں سے تھوڑا بہت انہیں بھی دے دو اور ان سے نرمی سے بولو۔ (۸)

اور چاہئے کہ وہ اس بات سے ڈریں کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے (نئے نئے) ناتواں بچے چھوڑ جاتے جن کے ضائع ہو

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ
وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ
مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۖ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ
وَالْمَسْكِينُ فَأَرْضُوهُمْ مِنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ
قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكَوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً

تمہارے پاس رہا، تم نے اس کی کس طرح حفاظت کی اور جب مال ان کے سپرد کیا تو اس میں کوئی کمی بیشی یا کسی قسم کی تبدیلی کی یا نہیں؟ عام لوگوں کو تو تمہاری امانت داری یا خیانت کا شاید پتہ نہ چلے۔ لیکن اللہ سے تو کوئی چیز مخفی نہیں۔ وہ یقیناً جب تم اس کی بارگاہ میں جاؤ گے تو تم سے حساب لے گا۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ یہ بہت ذمہ داری کا کام ہے۔ نبی ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا ”ابوذر! میں تمہیں ضعیف دیکھتا ہوں اور تمہارے لئے وہی چیز پسند کرتا ہوں، جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں، تم دو آدمیوں پر بھی امیر نہ بنانا کسی یتیم کے مال کا والی اور سرپرست“ (صحیح مسلم، کتاب الایمان)

(۱) اسلام سے قبل ایک یہ ظلم بھی روا رکھا جاتا تھا کہ عورتوں اور چھوٹے بچوں کو وراثت سے حصہ نہیں دیا جاتا تھا اور صرف بڑے لڑکے جو لڑنے کے قابل ہوتے، سارے مال کے وارث قرار پاتے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مردوں کی طرح عورتیں اور بچے پچیاں اپنے والدین اور اقارب کے مال میں حصہ دار ہوں گی، انہیں محروم نہیں کیا جائے گا۔ تاہم یہ الگ بات ہے کہ لڑکی کا حصہ لڑکے کے حصے سے نصف ہے (جیسا کہ ۳ آیات کے بعد مذکور ہے) یہ عورت پر ظلم نہیں ہے نہ اس کا استخفاف ہے بلکہ اسلام کا یہ قانون میراث عدل و انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ عورت کو اسلام نے معاش کی ذمہ داری سے فارغ رکھا ہے اور مرد کو اس کا کفیل بنایا ہے۔ علاوہ ازیں عورت کے پاس مہر کی صورت میں مال آتا ہے جو ایک مرد ہی اسے ادا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے عورت کے مقابلے میں مرد پر کئی گنا زیادہ مالی ذمہ داریاں ہیں۔ اس لئے اگر عورت کا حصہ نصف کے بجائے مرد کے برابر ہوتا تو یہ مرد پر ظلم ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے کسی پر بھی ظلم نہیں کیا ہے کیونکہ وہ عادل بھی ہے اور حکیم بھی۔

(۲) اسے بعض علمائے آیت میراث سے منسوخ قرار دیا ہے لیکن صحیح تر بات یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں، بلکہ ایک بہت ہی اہم اخلاقی ہدایت ہے۔ کہ امداد کے مستحق رشتے داروں میں سے جو لوگ وراثت میں حصہ دار نہ ہوں، انہیں بھی تقسیم کے وقت کچھ دے دو۔ نیز ان سے بات بھی پیار و محبت کے انداز میں کرو۔ دولت کو آتے ہوئے دیکھ کر قارون و فرعون نہ بنو۔

ضَمْعًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلَيَتَقُوا اللَّهَ
وَلْيَفُؤُوا قَوْلَ سَيِّدِنَا ①

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا
يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ②

يُؤْتِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمُ لِلَّذِينَ كُنْتُمْ عَلَيْهِمُ الْيَتَامَىٰ فَإِنَّ
نِسَاءَ فُرُوقٍ أَتَيْنِي فَلَمْ يَأْتِكُنَّ مَا تَزْكُرِينَ كَأَنَّكَ وَاحِدَةٌ فَلَئِمَّا
الْوَصْفُ وَلَا يَنْبَغِي لِكُلِّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُمَا الشُّرُكُ وَمِمَّا تَزْكُرُ إِنَّ

جانے کا اندیشہ رہتا ہے، (تو ان کی چاہت کیا ہوتی) پس
اللہ تعالیٰ سے ڈر کر چچی تلی بات کہا کریں۔ (۹)^(۱)
جو لوگ ناحق ظلم سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں، وہ اپنے
پیٹ میں آگ ہی بھر رہے ہیں اور عنقریب وہ دوزخ میں
جائیں گے۔ (۱۰)

اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم کرتا ہے
کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے (۲)^(۳) اور اگر
صرف لڑکیاں ہی ہوں اور دو سے زیادہ ہوں تو انہیں مال
متروکہ کا دو تہائی ملے گا۔ (۳)^(۳) اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو

(۱) بعض مفسرین کے نزدیک اس کے مخاطب اوصیا ہیں (جن کو وصیت کی جاتی ہے) ان کو نصیحت کی جا رہی ہے کہ ان
کے زیر کفالت جو یتیم ہیں ان کے ساتھ وہ ایسا سلوک کریں جو وہ اپنے بچوں کے ساتھ اپنے مرنے کے بعد کیا جانا پسند
کرتے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کے مخاطب عام لوگ ہیں کہ وہ یتیموں اور دیگر چھوٹے بچوں کے ساتھ اچھا سلوک
کریں، قطع نظر اس کے کہ وہ ان کی زیر کفالت ہیں یا نہیں بعض کے نزدیک اس کے مخاطب وہ ہیں جو قریب المرگ کے
پاس بیٹھے ہوں، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ مرنے والے کو اچھی باتیں سمجھائیں تاکہ وہ نہ حق اللہ میں کوتاہی کر سکیں نہ
حقوق بنی آدم میں اور وصیت میں وہ ان دونوں باتوں کو ملحوظ رکھے۔ اگر وہ خوب صاحب حیثیت ہے تو ایک تہائی مال کی
وصیت ایسے لوگوں کے حق میں ضرور کرے جو اس کے قریبی رشتہ داروں میں غریب اور مستحق امداد ہیں یا پھر کسی دینی
مقصد اور ادارے پر خرچ کرنے کی وصیت کرے تاکہ یہ مال اس کے لئے زادِ آخرت بن جائے اور اگر وہ صاحب
حیثیت نہیں ہے تو اسے تہائی مال میں وصیت کرنے سے روکا جائے تاکہ اس کے اہل خانہ بعد میں مفلسی اور احتیاج
سے دوچار نہ ہوں۔ اسی طرح کوئی اپنے ورثہ کو محروم کرنا چاہے تو اس سے اس کو منع کیا جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ
اگر ان کے بعد ان کے بچے فقرو فاقہ سے دوچار ہو جائیں تو اس کے تصور سے ان پر کیا گزرے گی۔ اس تفصیل سے
مذکورہ سارے ہی مخاطبین اس کا مصداق ہیں۔ (تفسیر قرطبی و فتح القدر)

(۲) اس کی حکمت اور اس کا جہنی بر عدل و انصاف ہونا ہم واضح کر آئے ہیں۔ ورثہ میں لڑکی اور لڑکے دونوں ہوں تو پھر
اس اصول کے مطابق تقسیم ہوگی۔ لڑکے چھوٹے ہوں یا بڑے، اسی طرح لڑکیاں چھوٹی ہوں یا بڑی سب وارث ہوں
گی۔ حتیٰ کہ جنسین (ماں کے پیٹ میں زیر پرورش بچہ) بھی وارث ہو گا۔ البتہ کا فر اولاد وارث نہ ہوگی۔

(۳) یعنی بیٹا کوئی نہ ہو تو مال کا دو تہائی (یعنی کل مال کے تین حصے کر کے دو حصے) دو سے زائد لڑکیوں کو دینے جائیں گے
اور اگر صرف دو ہی لڑکیاں ہوں، تب بھی انہیں دو تہائی حصہ ہی دیا جائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ سعد بن

اس کے لئے آدھا ہے اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کے لئے اس کے چھوڑے ہوئے مال کا چھٹا حصہ ہے، اگر اس (میت) کی اولاد ہو،^(۱) اور اگر اولاد نہ ہو اور ماں باپ وارث ہوتے ہوں تو اس کی ماں کے لئے تیسرا حصہ ہے،^(۲) ہاں اگر میت کے کئی بھائی ہوں تو پھر اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے۔^(۳) یہ حصے اس وصیت کی

كَانَ لَهُ وَلَدٌ فَإِنْ كُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبُوهُ فَلِلَّوَالِدِ الثَّلَاثُ
فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِلَّوَالِدِ الشُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّتِهِ
يُؤْتِيهِمْ بِمَا وَدَّيْنَا أَبَاؤُهُمْ وَأَبْنَاؤُهُمْ لَا تَنْدَرُونَ أَنَّهُمْ أَقْرَبُ
لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةٌ مِنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۱۰﴾

ربیع ہدیہ: احد میں شہید ہو گئے اور ان کی دو لڑکیاں تھیں۔ مگر سعد کے سارے مال پر ان کے ایک بھائی نے قبضہ کر لیا تو نبی ﷺ نے ان دونوں لڑکیوں کو ان کے چچا سے دو ثلث مال دلویا (ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ، کتاب الفرائض) علاوہ ازیں سورہ نساء کے آخر میں بتلایا گیا ہے کہ اگر کسی مرنے والے کی وارث صرف دو بہنیں ہوں تو ان کے لئے بھی دو تہائی حصہ ہے لہذا جب دو بہنیں دو تہائی مال کی وارث ہوں گی تو دو بیٹیاں بطریق اولیٰ دو تہائی مال کی وارث ہوں گی جس طرح دو بہنوں سے زیادہ ہونے کی صورت میں انہیں دو سے زیادہ بیٹیوں کے حکم میں رکھا گیا ہے (فتح القدر) خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ دو یا دو سے زائد لڑکیاں ہوں، تو دونوں صورتوں میں مال متروکہ سے دو تہائی لڑکیوں کا حصہ ہو گا۔ باقی مال عصبہ میں تقسیم ہو گا۔

(۱) ماں باپ کے حصے کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ پہلی صورت ہے کہ مرنے والے کی اگر اولاد بھی ہو تو مرنے والے کے ماں باپ میں سے ہر ایک کو ایک ایک سدس ملے گا یعنی باقی دو تہائی مال اولاد پر تقسیم ہو جائے گا البتہ اگر مرنے والے کی اولاد میں صرف ایک بیٹی ہو تو اس میں سے چونکہ صرف نصف مال (یعنی چھ حصوں میں سے ۳ حصے) بیٹی کے ہوں گے اور ایک سدس (چھٹا حصہ) ماں کو اور ایک سدس باپ کو دینے کے بعد مزید ایک سدس باقی بچ جائے گا اس لئے بچنے والا یہ سدس بطور عصبہ باپ کے حصہ میں جائے گا یعنی اس صورت میں باپ کو دو سدس ملیں گے، ایک باپ کی حیثیت سے دوسرے، عصبہ ہونے کی حیثیت سے۔

(۲) یہ دوسری صورت ہے کہ مرنے والے کی اولاد نہیں ہے (یا دوسرے کہ پوتا پوتی بھی اولاد میں اجماعاً شامل ہیں) اس صورت میں ماں کے لئے تیسرا حصہ ہے اور باقی دو حصے (جو ماں کے حصے میں دو گنا ہیں) باپ کو بطور عصبہ ملیں گے اور اگر ماں باپ کے ساتھ مرنے والے مرد کی بیوی یا مرنے والی عورت کا شوہر بھی زندہ ہے تو راجح قول کے مطابق بیوی یا شوہر کا حصہ (جس کی تفصیل آ رہی ہے) نکال کر باقی ماندہ مال میں سے ماں کے لئے ثلث (تیسرا حصہ) اور باقی باپ کے لئے ہو گا۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ ماں باپ کے ساتھ، مرنے والے کے بھائی بہن زندہ ہیں۔ وہ بھائی چاہے سگے (یعنی) ہوں یعنی ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہوں۔ یا باپ ایک ہو، مائیں مختلف ہوں یعنی علاقائی بھائی بہن ہوں یا ماں ایک ہو، باپ مختلف ہوں یعنی اخائی بھائی بہن ہوں۔ اگرچہ یہ بھائی بہن میت کے باپ کی موجودگی میں وراثت کے حق دار نہیں ہوں گے۔ لیکن ماں کے لئے جب (نقصان کا سبب) بن جائیں گے یعنی جب ایک سے زیادہ ہوں گے تو ماں کے ثلث

تکمیل) کے بعد ہیں جو مرنے والا کر گیا ہو یا ادائے قرض کے بعد، تمہارے باپ ہوں یا تمہارے بیٹے تمہیں نہیں معلوم کہ ان میں سے کون تمہیں نفع پہنچانے میں زیادہ قریب ہے،^(۱) یہ حصے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں بے شک اللہ تعالیٰ پورے علم اور کامل حکمتوں والا ہے۔ (۱۱)

تمہاری بیویاں جو کچھ چھوڑ مرس اور ان کی اولاد نہ ہو تو آدھوں آدھ تمہارا ہے اور اگر ان کی اولاد ہو تو ان کے چھوڑے ہوئے مال میں سے تمہارے لیے چوتھائی حصہ ہے۔^(۲) اس وصیت کی ادائیگی کے بعد جو وہ کر گئی ہوں یا قرض کے بعد۔ اور جو (ترکہ) تم چھوڑ جاؤ اس میں ان کے لیے چوتھائی ہے، اگر تمہاری اولاد نہ ہو اور اگر تمہاری اولاد ہو تو پھر انہیں تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا،^(۳) اس وصیت کے بعد جو تم کر گئے ہو اور قرض کی ادائیگی کے بعد۔ اور جن کی میراث لی جاتی ہے وہ مرد یا عورت کلالہ ہو یعنی اس کا باپ بیٹا نہ

وَلَكُمْ يَصْفُ مَاتَرَكْتُمْ أَزْوَاجَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ لَكُمْ لَهْوٌ وَلَكُمْ إِنْ كَانَتْ لَكُمْ لَهْوٌ وَلَكُمْ الرِّبْعُ مِمَّا تَرَكَتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِيْنَ بِهَا أَوْ ذِيْنَ وَلَهُنَّ الرِّبْعُ مِمَّا تَرَكَتُمْ إِنْ كُنْتُمْ لَكُمْ وَلَدٌ وَإِنْ كَانَتْ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّلُثُ مِمَّا تَرَكَتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ ذِيْنَ وَلَنْ كَانَ لِحُلْمِ بُرْتِكُمْ كَلِمَةٌ أَوْ امْرَأَةٌ وَآخِرُ أَوْ ائْتِ قَلْبِكُمْ وَاحِدَةً مِمَّا السُّدُسُ إِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ فَهُمُ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِيْ بِهَا أَوْ ذِيْنَ عَاقِبَتِهَا وَصِيَّةٌ مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿۱۱﴾

(تیسرے حصے) کو سدس (چھٹے حصے) میں تبدیل کر دیں گے۔ باقی سارا مال (۵/۶) باپ کے حصہ میں چلا جائے گا۔ بشرطیکہ کوئی اور وارث نہ ہو۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک دو بھائیوں کا بھی وہی حکم ہے جو دو سے زیادہ بھائیوں کا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ایک بھائی یا بہن ہو تو اس صورت میں مال میں ماں کا حصہ ثلث برقرار رہے گا۔ وہ سدس میں تبدیل نہیں ہو گا۔ (تفسیر ابن کثیر)

(۱) اس لئے تم اپنی سمجھ کے مطابق وراثت تقسیم مت کرو، بلکہ اللہ کے حکم کے مطابق جس کا جتنا حصہ مقرر کر دیا گیا ہے، وہ ان کو دو۔

(۲) اولاد کی عدم موجودگی میں بیٹے کی اولاد یعنی پوتے بھی اولاد کے حکم میں ہیں، اس پر امت کے علما کا اجماع ہے (فتح القدیر وابن کثیر) اسی طرح مرنے والے شوہر کی اولاد خواہ اس کی وراثت ہونے والی موجودہ بیوی سے ہو یا کسی اور بیوی سے۔ اسی طرح مرنے والی عورت کی اولاد اس کے وارث ہونے والے موجودہ خاندان سے ہو یا پہلے کے کسی خاندان سے۔

(۳) بیوی اگر ایک ہوگی تب بھی اسے چوتھایا آٹھواں حصہ ملے گا۔ اگر زیادہ ہوں گی تب بھی یہی حصہ ان کے درمیان

ہو،^(۱) اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو^(۲) تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو ایک تنائی میں سب شریک ہیں،^(۳) اس وصیت کے بعد جو کی جائے اور قرض کے بعد^(۴) جب کہ اوروں

تقسیم ہو گا، ایک ایک کو چوتھائی یا آٹھواں حصہ نہیں ملے گا، یہ بھی اجماعی مسئلہ ہے (فتح القدر)

(۱) کلامہ سے مراد وہ میت ہے جس کا باپ ہو نہ بیٹا۔ یہ اکلیل سے مشتق ہے۔ اکلیل ایسی چیز کو کہتے ہیں جو کہ سر کو اس کے اطراف (کناروں) سے گھیر لے۔ کلامہ کو بھی کلامہ اس لئے کہتے ہیں کہ اصول و فروع کے اعتبار سے تو اس کا وارث نہ بنے لیکن اطراف و جوانب سے وارث قرار پائے (فتح القدر و ابن کثیر) اور کہا جاتا ہے کہ کلامہ کل سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں تھک جانا۔ گویا اس شخص تک پہنچتے پہنچتے سلسلہ نسل و نسب تھک گیا اور آگے نہ چل سکا۔

(۲) اس سے مراد اخیانی بہن بھائی ہیں جن کی ماں ایک ہو باپ الگ الگ کیونکہ یعنی بھائی بہن یا علاقائی بہن بھائی کا حصہ میراث اس طرح نہیں ہے اور اس کا بیان اسی سورت کے اخیر میں آ رہا ہے اور یہ مسئلہ بھی اجماعی ہے (فتح القدر) اور دراصل نسل کے لئے مردوزن ﴿لِلْمَوْلَىٰ كَمَا لِمَوْلَىٰ الرَّسُولِ﴾ کا قانون چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیٹے بیٹیوں کے لئے اس جگہ اور بہن بھائیوں کے لئے آخری آیت نساء میں ہر دو جگہ یہی قانون ہے البتہ صرف ماں کی اولاد میں چونکہ نسل کا حصہ نہیں ہوتا اس لئے وہاں ہر ایک کو برابر کا حصہ دیا جاتا ہے۔ بہر حال ایک بھائی یا ایک بہن کی صورت میں ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

(۳) ایک سے زیادہ ہونے کی صورت میں یہ سب ایک تنائی حصے میں شریک ہوں گے۔ نیز ان میں مذکر اور مؤنث کے اعتبار سے بھی فرق نہیں کیا جائے گا۔ بلا تفریق سب کو مساوی حصہ ملے گا، مرد ہو یا عورت۔

ملحوظہ: ماں زاد یعنی اخیانی بھائی بعض احکام میں دوسرے وارثوں سے مختلف ہیں۔ ۱- یہ صرف اپنی ماں کی وجہ سے وارث ہوتے ہیں۔ ۲- ان کے مرد اور عورت، حصے میں مساوی ہوں گے۔ ۳- یہ اس وقت وارث ہوں گے جب کہ میت کلامہ ہو۔ پس باپ دادا بیٹا اور پوتے وغیرہ کی موجودگی میں یہ وارث نہیں ہوں گے۔ ۴- ان کے مرد و عورت کتنے بھی زیادہ ہوں، ان کا حصہ ثلث (ایک تنائی) سے زیادہ نہیں ہو گا اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ان کو اپنے مرنے والے اخیانی بھائی سے جو مال ملے گا اس میں مرد اور عورت کا حصہ برابر ہو گا یہ نہیں کہ مرد کو عورت سے دو گنا دیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں یہی فیصلہ کیا تھا اور امام زہری فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ یقیناً اس وقت ہی کیا ہو گا جب ان کے پاس نبی ﷺ کی کوئی حدیث ہو گی۔ (ابن کثیر)

(۴) میراث کے احکام بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ تیسری مرتبہ کہا جا رہا ہے کہ ورثے کی تقسیم و وصیت پر عمل کرنے اور فرض کی ادائیگی کے بعد کی جائے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں باتوں پر عمل کرنا کتنا ضروری ہے۔ پھر اس پر بھی اتفاق ہے کہ سب سے پہلے قرضوں کی ادائیگی کی جائے گی اور وصیت پر عمل اس کے بعد کیا جائے گا لیکن اللہ تعالیٰ

کا نقصان نہ کیا گیا ہو^(۱) یہ مقرر کیا ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ دانا ہے بردبار۔ (۱۲)

یہ حدیں اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول (ﷺ) کی فرمانبرداری کرے گا اسے اللہ تعالیٰ جنتوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ (۱۳)

اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول (ﷺ) کی نافرمانی کرے اور اس کی مقررہ حدوں سے آگے نکلے اسے وہ جہنم میں ڈال دے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، ایسوں ہی کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔ (۱۴)

تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا کام کریں ان پر اپنے میں سے چار گواہ طلب کرو، اگر وہ گواہی دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں قید رکھو، یہاں تک کہ موت ان کی عمریں پوری کر دے،^(۲) یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۲﴾

وَمَنْ يُعِصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَعْتَدِ حُدُودَ اللَّهِ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿۱۳﴾

وَالَّذِي يَأْتِيَنَّهَا فَجَاشَتَهُ مِنْ نِسَائِكُمْ فَاسْتَشْهَدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِنْكُمْ فَإِنْ شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّى يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا ﴿۱۴﴾

نے تینوں جگہ وصیت کا ذکر دین (قرض) سے پہلے کیا حالانکہ ترتیب کے اعتبار سے دین کا ذکر پہلے ہونا چاہئے تھا۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ قرض کی ادائیگی کو تو لوگ اہمیت دیتے ہیں، نہ بھی دیں تو لینے والے زبردستی بھی وصول کر لیتے ہیں۔ لیکن وصیت پر عمل کرنے کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے اور اکثر لوگ اس معاملے میں تساہل یا تغافل سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے وصیت کا پہلے ذکر فرما کر اس کی اہمیت واضح کر دی گئی۔ (روح المعانی)

ملاحظہ: اگر بیوی کا حق مراد نہ کیا گیا ہو تو وہ بھی دین (قرض) میں شمار ہو گا اور اس کی ادائیگی بھی وراثت کی تقسیم سے پہلے ضروری ہے۔ نیز عورت کا حصہ شرعی اس مہر کے علاوہ ہو گا۔

(۱) بائیں طور کہ وصیت کے ذریعے سے کسی وارث کو محروم کر دیا جائے یا کسی کا حصہ گھٹا بڑھا دیا جائے یا یوں ہی وارثوں کو نقصان پہنچانے کے لئے کہہ دے کہ فلاں شخص سے میں نے اتنا قرض لیا ہے درآں حالیکہ کچھ بھی نہ لیا ہو۔ گویا اضرار کا تعلق وصیت اور دین دونوں سے ہے اور دونوں کے ذریعے سے نقصان پہنچانا ممنوع اور کبیرہ گناہ ہے۔ نیز ایسی وصیت بھی باطل ہوگی۔

(۲) یہ بدکار عورتوں کی بدکاری کی وہ سزا ہے جو ابتدائے اسلام میں جب کہ زنا کی سزا متعین نہیں ہوئی تھی، عارضی

راستہ نکالے۔^(۱) (۱۵)

تم میں سے جو دو افراد ایسا کام کر لیں^(۲) انھیں ایذا دو^(۳)
اگر وہ توبہ اور اصلاح کر لیں تو ان سے منہ پھیر لو، بے
شک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا
ہے۔ (۱۶)

اللہ تعالیٰ صرف انہی لوگوں کی توبہ قبول فرماتا ہے جو بوجہ
نادانی کوئی برائی کر گزریں پھر جلد اس سے باز آ جائیں
اور توبہ کریں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی توبہ قبول کرتا ہے،
اللہ تعالیٰ بڑے علم والا حکمت والا ہے۔ (۱۷)

ان کی توبہ نہیں جو برائیاں کرتے چلے جائیں یہاں تک
کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آ جائے تو کہہ

وَالَّذِينَ يَأْتِيهِمْ مِّنكُمْ قَاذُوهُمَا فَإِن تَابَا وَأَصْلَحَا
قَاتَعِرْضُوا عَنْهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ تَوَّابًا حَنِيفًا ﴿۱۵﴾

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ
ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ
عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۱۶﴾

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّى
إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ اللَّهَ

طور پر مقرر کی گئی تھی ہاں یہ بھی یاد رہے کہ عربی زبان میں ایک سے دس تک کی گنتی میں یہ مسلمہ اصول ہے کہ عدد
نذر کہ ہو گا تو معدود مونث اور عدد مونث ہو گا تو معدود مذکر۔ یہاں اربعہ (یعنی ۴ کا عدد) مونث ہے، اس لئے اس کا معدود
جو یہاں ذکر نہیں کیا گیا اور محذوف ہے، یقیناً مذکر آئے گا اور وہ ہے رجال یعنی اربعہ رجال جس سے یہ بات واضح طور پر
معلوم ہوتی ہے کہ اثبات زنا کے لئے چار مرد گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ گویا جس طرح زنا کی سزا سخت مقرر کی گئی ہے،
اس کے اثبات کے لئے گواہوں کی کڑی شرط عائد کر دی گئی ہے یعنی چار مسلمان مرد یعنی گواہ، اس کے بغیر شرعی سزا کا
اثبات ممکن نہیں ہو گا۔

(۱) اس راستے سے مراد زنا کی وہ سزا ہے جو بعد میں مقرر کی گئی یعنی شادی شدہ زنا کار مرد و عورت کے لئے رجم
اور غیر شادی شدہ بدکار مرد و عورت کے لئے سو سو کوڑے کی سزا۔ (جس کی تفصیل سورۃ نور اور احادیث صحیحہ میں
موجود ہے)

(۲) بعض نے اس سے اغلام بازی مراد لی ہے یعنی عمل لواطت۔ دو مردوں کا ہنسی آپس میں بد فعلی کرنا اور بعض نے اس
سے باکرہ مرد و عورت مراد لئے ہیں اور اس سے قبل کی آیت کو انہوں نے مصححات یعنی شادی شدہ کے ساتھ خاص کیا ہے
اور بعض نے اس تشبیہ کے صیغے سے مرد اور عورت مراد لئے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ وہ باکرہ ہوں یا شادی شدہ۔ ابن
جریر طبری نے دو سرے مفہوم یعنی باکرہ (مرد و عورت) کو ترجیح دی ہے۔ اور پہلی آیت میں بیان کردہ سزا کو نبی ﷺ کی
بتلائی ہوئی سزا سزائے رجم سے اور اس آیت میں بیان کردہ سزا کو سورۃ نور میں بیان کردہ سو کوڑے کی سزا سے منسوخ
قرار دیا ہے۔ (تفسیر طبری)

(۳) یعنی زبان سے زجر و توبیح اور ملامت یا ہاتھ سے کچھ زد و کوب کر لینا۔ اب یہ منسوخ ہے، جیسا کہ گزرا۔

وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَرَاءَ أُولَئِكَ
أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ①

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَجِدُ لَكُمْ أَنْ تَرْتُوا الْبَيْتَاءَ كُفْرًا وَلَا
تَعْتَلُونَهُنَّ لِيَتَذَكَّرْنَ أَلَمْ يَنْبَغِ لَكُمْ أَنْ تَأْتِيَنَ
بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ وَعَوَّضُوا مِنْهَا بِمَعْرُوفٍ وَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ
فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ②

وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْتُمُوسِبْتُمْ آلَ ذُورِكُمْ مَكَانَ دُورِكُمْ وَالْيَوْمَ إِحْدَاهُنَّ
فَقَطْرًا فَلَا تَأْخُذْ وَآمِنَهُ شَيْئًا فَأْتَاخُذْنَ وَنَهَّ بَهْتَا

دے کہ میں نے اب توبہ کی،^(۱) اور ان کی توبہ بھی قبول
نہیں جو کفر پر ہی مرجائیں، یہی لوگ ہیں جن کے لئے
ہم نے المناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (۱۸)

ایمان والو! تمہیں حلال نہیں کہ زبردستی عورتوں کو
ورثے میں لے بیٹھو^(۲) انہیں اس لئے روک نہ رکھو کہ جو
تم نے انہیں دے رکھا ہے، اس میں سے کچھ لے لو^(۳) ہاں
یہ اور بات ہے کہ وہ کوئی کھلی برائی اور بے حیائی کریں^(۴)
ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بودوباش رکھو، گو تم انہیں
ناپسند کرو لیکن بہت ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو برا جانو، اور
اللہ تعالیٰ اس میں بہت ہی بھلائی کر دے۔^(۵) (۱۹)

اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کرنا ہی چاہو اور
ان میں سے کسی کو تم نے خزانہ کا خزانہ دے رکھا ہو، تو بھی

(۱) اس سے واضح ہے کہ موت کے وقت کی گئی توبہ غیر مقبول ہے؛ جس طرح کہ حدیث میں بھی آتا ہے اس کی ضروری
تفصیل آل عمران کی آیت ۹۰ میں گزر چکی ہے۔

(۲) اسلام سے قبل عورت پر ایک یہ ظلم بھی ہوتا تھا کہ شوہر کے مرجانے پر اس کے گھر کے لوگ اس کے مال کی طرح
اس کی عورت کے بھی زبردستی وارث بن بیٹھے تھے اور خود اپنی مرضی سے، اس کی رضامندی کے بغیر اس سے نکاح کر
لیتے یا اپنے بھائی، بھتیجے سے اس کا نکاح کر دیتے، حتیٰ کہ سوتیلے بیٹا تک بھی مرنے والے باپ کی عورت سے نکاح کر لیتا
اگر چاہتے تو اسے کسی بھی جگہ نکاح کرنے کی اجازت نہ دیتے اور وہ ساری عمریوں ہی گزارنے پر مجبور ہوتی۔ اسلام نے
ظلم کے ان تمام طریقوں سے منع فرما دیا۔

(۳) ایک ظلم یہ بھی عورت پر کیا جاتا تھا کہ اگر خاوند کو وہ پسند نہ ہوتی اور وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تو از خود
اس کو طلاق نہ دیتا (جس طرح ایسی صورت میں اسلام نے طلاق کی اجازت دی ہے) بلکہ اسے خوب تنگ کرتا تاکہ وہ
مجبور ہو کر حق مہر یا جو کچھ خاوند نے اسے دیا ہو، آؤ خود واپس کر کے اس سے خلاصی حاصل کرنے کو ترجیح دے۔ اسلام
نے اس حرکت کو بھی ظلم قرار دیا ہے۔

(۴) کھلی برائی سے مراد بد کاری یا بد زبانی اور نافرمانی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں البتہ یہ اجازت دی گئی ہے کہ خاوند
اس کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرے کہ وہ اس کا دیا ہوا مال یا حق مہر واپس کر کے خلع کرانے پر مجبور ہو جائے جیسا کہ خلع
کی صورت میں خاوند کو حق مہر واپس لینے کا حق دیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۲۹)

(۵) یہ بیوی کے ساتھ حسن معاشرت کا وہ حکم ہے جس کی قرآن نے بڑی تاکید کی ہے اور احادیث میں بھی نبی ﷺ نے اس

وَأَنَّمَا يُهَيَّبُنَا ①

اس میں سے کچھ نہ لو^(۱) کیا تم اسے ناحق اور کھلا گناہ ہوتے ہوئے بھی لے لو گے، تم اسے کیسے لے لو گے۔ (۲۰)
 حالانکہ تم ایک دوسرے سے مل چکے ہو^(۲) اور ان عورتوں نے تم سے مضبوط عہد و پیمان لے رکھا ہے۔ (۲۱)^(۳)
 اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا ہے^(۴) مگر جو گزر چکا ہے، یہ بے حیائی کا کام

وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَى بَعْضُكُمْ إِلَى بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنْكُمْ نَيْبَاتًا فَاعْلَمُوا ②

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ

کی بڑی وضاحت اور تاکید کی ہے۔ ایک حدیث میں آیت کے اسی مفہوم کو یوں بیان کیا گیا ہے «لَا يَفْرَقُ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً إِنْ سَخَطَ مِنْهَا خُلْفًا، رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ» (صحیح مسلم۔ کتاب الرضاع) ”مومن مرد (شوہر) مومنہ عورت (بیوی) سے بغض نہ رکھے۔ اگر اس کی ایک عادت اسے ناپسند ہے تو اس کی دوسری عادت پسندیدہ بھی ہو گی“ مطلب یہ ہے کہ بے حیائی اور نشوز و عصیان کے علاوہ اگر بیوی میں کچھ اور کوتاہیاں ہوں جن کی وجہ سے خاوند اسے ناپسند کرتا ہو تو اسے جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے طلاق نہ دے بلکہ صبر اور برداشت سے کام لے، ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اس میں سے اس کے لئے خیر کثیر پیدا فرمادے یعنی نیک اولاد دے دے یا اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے کاروبار میں برکت ڈال دے۔ وغیرہ وغیرہ۔ افسوس ہے کہ مسلمان قرآن و حدیث کی ان ہدایات کے برعکس ذرا سی باتوں میں اپنی بیویوں کو طلاق دے ڈالتے ہیں اور اس طرح اسلام کے عطا کردہ حق طلاق کو نہایت ظالمانہ طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ حق تو انتہائی ناگزیر حالات میں استعمال کے لئے دیا گیا تھا نہ کہ گھرا جائزے، عورتوں پر ظلم کرنے اور بچوں کی زندگیاں خراب کرنے کے لئے۔ علاوہ ازیں اس طرح یہ اسلام کی بدنامی کا بھی باعث بنتے ہیں کہ اسلام نے مرد کو طلاق کا حق دے کر عورت پر ظلم کرنے کا اختیار اسے دے دیا۔ یوں اسلام کی ایک بہت بڑی خوبی کو خرابی اور ظلم باور کرایا جاتا ہے۔

(۱) خود طلاق دینے کی صورت میں حق مرد واپس لینے سے نہایت سختی کے ساتھ روک دیا گیا ہے۔ فَنظَارُ خَزَانَةَ اور مال کثیر کو کتنے ہیں یعنی کتنا بھی حق مرد یا ہو واپس نہیں لے سکتے۔ اگر ایسا کرو گے تو یہ ظلم (بہتان) اور کھلا گناہ ہو گا۔
 (۲) ”ایک دوسرے سے مل چکے ہو“ کا مطلب ہم بستری ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے کنایہ بیان فرمایا ہے۔
 (۳) ”مضبوط عہد و پیمان“ سے وہ عہد مراد ہے جو نکاح کے وقت مرد سے لیا جاتا ہے کہ تم ”اسے اچھے طریقے سے آباد کرنا یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا“

(۴) زمانہ جاہلیت میں سوتیلے بیٹے اپنے باپ کی بیوی سے (یعنی سوتیلی ماں سے) نکاح کر لیتے تھے، اس سے روکا جا رہا ہے کہ یہ بہت ہی بے حیائی کا کام ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ کا عموم ایسی عورت سے نکاح کو ممنوع قرار دیتا ہے جس سے اس کے باپ نے نکاح کیا لیکن دخول سے قبل ہی طلاق دے دی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ بات مروی ہے۔ اور علماء اسی کے قائل ہیں (تفسیر طبری)

إِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا وَسَاءَ سَبِيلًا ﴿۲۲﴾

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَوْنَتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ
وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأَخْتِ وَأُمَّهَاتُ الْوَالِدِ الْأَبِ وَالْأُمِّ وَالْأَخْتِ
وَمِنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ وَرَبَّائِكُمُ الَّذِينَ فِي حُجُورِكُمْ
مِمَّنْ نَسَأْتُمُ اللَّيْلَ ۚ خَلَعْتُمْ يَهُنَّ ۚ فَإِنْ تَلَوْتُمْ أَوْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ
فَأُولَٰئِكَ جُنَاحٌ عَلَيْكُمْ وَإِذَا كُنْتُمْ لِلزَّوْجِ الْكَافِرِ مِنَ الْأَصْلَابِ
وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ ۗ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۚ إِنَّ اللَّهَ
كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿۲۳﴾

اور بغض کا سبب ہے اور بڑی بری راہ ہے۔ (۲۲)
حرام کی گئیں (۱) تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری لڑکیاں اور
تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیوں اور تمہاری خالائیں اور
بھائی کی لڑکیاں اور بہن کی لڑکیاں اور تمہاری وہ مائیں
جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہو اور تمہاری دودھ شریک
بہنیں اور تمہاری ساس اور تمہاری وہ پرورش کردہ لڑکیاں
جو تمہاری گود میں ہیں، تمہاری ان عورتوں سے جن سے تم
دخول کر چکے ہو، ہاں اگر تم نے ان سے جماع نہ کیا ہو تو تم پر
کوئی گناہ نہیں اور تمہارے صلبی گنے بیٹوں کی بیویاں اور

(۱) جن عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے، ان کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔ ان میں سات محرمات نسب، سات رضاعی اور چار
سسرالی بھی ہیں۔ ان کے علاوہ حدیث رسول سے ثابت ہے کہ بھتیجی اور پھوپھی اور بھانجی اور خالہ کو ایک نکاح میں جمع کرنا
حرام ہے۔ سات نسبی محرمات میں مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیوں، خالائیں، بھتیجی اور بھانجی ہیں اور سات رضاعی محرمات
میں رضاعی مائیں، رضاعی بیٹیاں، رضاعی بہنیں، رضاعی پھوپھیوں، رضاعی خالائیں، رضاعی بھتیجیاں اور رضاعی بھانجیاں اور
سسرالی محرمات میں ساس، ربائبہ (مدخولہ بیوی کی پہلے خاوند سے لڑکیاں) بہو اور دو سگی بہنوں کا جمع کرنا ہے۔ ان کے علاوہ باپ
کی منکوحہ (جس کا ذکر اس سے پہلی آیات میں ہے) اور حدیث کے مطابق بیوی جب تک عقد نکاح میں ہے اس کی پھوپھی اور
اس کی خالہ اور اس کی بھتیجی اور اس کی بھانجی سے بھی نکاح حرام ہے۔ محرمات نسبی کی تفصیل: اُمَّهَاتُ (مائیں) میں ماؤں کی
مائیں (نانیاں) ان کی دادیاں اور باپ کی مائیں (دادیاں) پر دادیاں اور ان سے آگے تک (شامل ہیں۔ بَنَاتُ (بیٹیاں) میں
پوتیاں، نواسیاں اور پوتیوں، نواسیوں کی بیٹیاں (نیچے تک) شامل ہیں۔ زنا سے پیدا ہونے والی لڑکی بیٹی میں شامل ہے یا نہیں
اس میں اختلاف ہے۔ ائمہ ثلاثہ اسے بیٹی میں شامل کرتے ہیں اور اس سے نکاح کو حرام سمجھتے ہیں۔ البتہ امام شافعی کہتے
ہیں کہ وہ بنت شرعی نہیں ہے۔ پس جس طرح ﴿يُؤْتِيكُمُ اللَّهُ فِي آيَاتِهِ مَالًا﴾ (اللہ تعالیٰ تمہیں مال متروکہ کہ تقسیم کرنے کا
حکم دیتا ہے) میں داخل نہیں اور بلاجماع وہ وارث نہیں۔ اسی طرح وہ اس آیت میں بھی داخل نہیں۔ واللہ اعلم (ابن کثیر)
أَخَوَاتُ (بہنیں) یعنی ہوں یا اخیانی و علاقائی عَمَّاتُ (پھوپھیوں) اس میں باپ کی سب مذکورہ اصول یعنی نانا، دادا کی تینوں قسموں
کی بہنیں شامل ہیں۔ خَالَاتُ (خالائیں) اس میں ماں کی سب مونث اصول (یعنی نانی، دادی) کی تینوں قسموں کی بہنیں شامل
ہیں۔ بھتیجیاں، اس میں تینوں قسم کے بھائیوں کی اولاد بواوسط اور بلاواسطہ (یا صلبی و فرعی) شامل ہیں۔ بھانجیاں، اس میں تینوں
قسم کی بہنوں کی اولاد بواوسط و بلاواسطہ یا صلبی و فرعی) شامل ہیں۔

تمہارا دو بہنوں کا جمع کرنا ہاں جو گزر چکا سو گزر چکا 'یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔' (۲۳)

قسم دوم، محرمات رضاعیہ: رضاعی ماں، جس کا دودھ تم نے مدت رضاعت (یعنی دو سال) کے اندر پیا ہو۔ رضاعی بہن، وہ عورت جسکو تمہاری حقیقی یا رضاعی ماں نے دودھ پلایا، تمہارے ساتھ پلایا یا تم سے پہلے یا بعد تمہارے اور بہن بھائیوں کے ساتھ پلایا۔ یا جس عورت کی حقیقی یا رضاعی ماں نے تمہیں دودھ پلایا، چاہے مختلف اوقات میں پلایا ہو۔ رضاعت سے بھی وہ تمام رشتے حرام ہو جائیں گے جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ رضاعی ماں بننے والی عورت کی نسبی و رضاعی اولاد دودھ پینے والے بچے کی بہن بھائی، اس عورت کا شوہر اس کا باپ اور اس مرد کی بہنیں، اس کی پھوپھیاں، اس عورت کی بہنیں، خالائیں اور اس عورت کے جٹھ، دیور، اس کے رضاعی بچچا، تایا بن جائیں گے اور اس دودھ پینے والے بچے کی نسبی بہن بھائی وغیرہ اس گھرانہ پر رضاعت کی بنا پر حرام نہ ہونگے۔

قسم سوم سسرالی محرمات: بیوی کی ماں یعنی ساس (اس میں بیوی کی نانی دادی بھی داخل ہے) اگر کسی عورت سے نکاح کر کے بغیر ہم بستری کے ہی طلاق دے دی ہو، تب بھی اس کی ماں (ساس) سے نکاح حرام ہو گا۔ البتہ کسی عورت سے نکاح کر کے اسے بغیر مباشرت کے طلاق دے دی ہو تو اس کی لڑکی سے اس کا نکاح جائز ہو گا۔ (فتح القدیر)

رَبِيبَةٌ: بیوی کے پہلے خاوند سے لڑکی۔ اسکی حرمت مشروط ہے یعنی اس کی ماں سے اگر مباشرت کر لی گئی ہوگی تو ریبیہ سے نکاح حرام، بصورت دیگر حلال ہو گا۔ فِی حُجُورِکُمْ (وہ ریبیہ جو تمہاری گود میں پرورش پائیں) یہ قید غالب احوال کے اعتبار سے ہے، بطور شرط کے نہیں ہے۔ اگر یہ لڑکی کسی اور جگہ بھی زیر پرورش یا مقیم ہوگی۔ تب بھی اس سے نکاح حرام ہو گا۔ حَلَائِلُ یہ حَلَائِلُ کی جمع ہے یہ حل مکمل (اترنا) سے فَعِيلَةٌ کے وزن پر بمعنی فَاعِلَةٌ ہے۔ بیوی کو حلیلہ اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کا محل (جائے قیام) خاوند کے ساتھ ہی ہوتا ہے یعنی جہاں خاوند اترتا یا قیام کرتا ہے یہ بھی وہیں اترتی یا قیام کرتی ہے۔ بیٹوں میں پوتے تو اسے بھی داخل ہیں یعنی انکی بیویوں سے بھی نکاح حرام ہو گا۔ اسی طرح رضاعی اولاد کے جوڑے بھی حرام ہوں گے مِنْ اَصْلَابِکُمْ (تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویوں) کی قید سے یہ واضح ہو گیا کہ لے پالک بیٹوں کی بیویوں سے نکاح حرام نہیں ہے۔ دو بہنیں (رضاعی ہوں یا نسبی) ان سے بیک وقت نکاح حرام ہے۔ البتہ ایک کی وفات کے بعد یا طلاق کی صورت میں عدت گزرنے کے بعد دوسری بہن سے نکاح جائز ہے۔ اسی طرح چار بیویوں میں سے ایک کو طلاق دینے سے پانچویں نکاح کی اجازت نہیں جب تک طلاق یافتہ عورت عدت سے فارغ نہ ہو جائے۔

ملحوظہ: زنا سے حرمت ثابت ہوگی یا نہیں؟ اس میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ اکثر اہل علم کا قول ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی عورت سے بدکاری کی تو اس بدکاری کی وجہ سے وہ عورت اس پر حرام نہیں ہوگی اسی طرح اگر اپنی بیوی کی ماں (ساس) سے یا اسکی بیٹی سے (جو دوسرے خاوند سے ہو) زنا کر لے گا تو اسکی بیوی اس پر حرام نہیں ہوگی (دلائل کے لئے دیکھئے فتح القدیر) احناف اور دیگر بعض علما کی رائے میں زنا کاری سے بھی حرمت ثابت ہو جائے گی۔ اول الذکر مسلک کی تائید بعض احادیث سے ہوتی ہے۔

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ يَحْتَبِ
 اللَّهُ عَلَيْكُمْ وَأَجْرُكُمْ مِمَّا ذَلَّلْتُمْ أَنْ تَتَّبِعُوا بِأَمْوَالِكُمْ
 مُخْتَصِمِينَ عَيْرُ مُسْلِفِينَ قَبْلَ أَنْ يَسْتَنْعَمَ بِهِ مِنْهُنَّ فَانْزِلْ
 أَجْرَهُنَّ قَرِيبَةً مِمَّا رَزَقْتُمْ عَلَيْكُمْ فِي مَا تَرَضَيْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ
 الْفَرَاغِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۳۱﴾

اور (حرام کی گئیں) شوہروالی عورتیں مگر وہ جو تمہاری
 ملکیت میں آجائیں،^(۱) اللہ تعالیٰ نے یہ احکام تم پر فرض
 کر دیئے ہیں، اور ان عورتوں کے سوا اور عورتیں
 تمہارے لیے حلال کی گئیں کہ اپنے مال کے مہر سے تم
 ان سے نکاح کرنا چاہو برے کام سے بچنے کے لیے نہ کہ
 شہوت رانی کرنے کے لئے،^(۲) اس لیے جن سے تم

(۱) قرآن کریم میں إحصان چار معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ (۱) شادی (۲) آزادی (۳) پاک دامنی (۴) اور اسلام۔ اس
 اعتبار سے محصنات کے چار مطلب ہیں (۱) شادی شدہ عورتیں (۲) آزاد عورتیں (۳) پاک دامن عورتیں (۴) اور مسلمان
 عورتیں۔ یہاں پہلا معنی مراد ہے۔ اس کی شان نزول میں آتا ہے کہ جب بعض جنگوں میں کافروں کی عورتیں بھی
 مسلمانوں کی قید میں آگئیں تو مسلمانوں نے ان سے ہم بستری کرنے میں کراہت محسوس کی کیونکہ وہ شادی شدہ تھیں۔
 صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، جس پر یہ آیت نازل ہوئی (ابن کثیر) جس سے یہ معلوم ہوا کہ جنگ میں حاصل
 ہونے والی کافر عورتیں، جب مسلمانوں کی لونڈیاں بن جائیں تو شادی شدہ ہونے کے باوجود ان سے مباشرت کرنا جائز
 ہے۔ البتہ استبرائے رحم ضروری ہے۔ یعنی ایک حیض آنے کے بعد یا حاملہ ہیں تو وضع حمل کے بعد ان سے جنسی تعلق
 قائم کیا جائے۔

لونڈی کا مسئلہ: نزول قرآن کے وقت غلام اور لونڈیوں کا سلسلہ عام تھا جسے قرآن نے بند نہیں کیا، البتہ ان کے بارے
 میں ایسی حکمت عملی اختیار کی گئی کہ جس سے غلاموں اور لونڈیوں کو زیادہ سے زیادہ سولتیں حاصل ہوں تاکہ غلامی کی
 حوصلہ شکنی ہو۔ اس کے دو ذریعے تھے۔ ایک تو بعض خاندان صدیوں سے ایسے چلے آ رہے تھے کہ ان کے مرد اور
 عورت فروخت کر دیئے جاتے تھے۔ یہی خریدے ہوئے مرد و عورت غلام اور لونڈی کہلاتے تھے۔ مالک کو ان سے ہر
 طرح کے استمتاع (فائدہ اٹھانے) کا حق حاصل ہوتا تھا۔ دوسرا ذریعہ جنگ میں قیدیوں والا تھا، کہ کافروں کی قیدی
 عورتوں کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اور وہ ان کی لونڈیاں بن کر ان کے پاس رہتی تھیں۔ قیدیوں کے لیے یہ
 بہترین حل تھا۔ کیونکہ اگر انہیں معاشرے میں یوں ہی آزاد چھوڑ دیا جاتا تو معاشرے میں ان کے ذریعے سے فساد پیدا
 ہوتا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب ”الرق فی الاسلام“ اسلام میں غلامی کی حقیقت از مولانا سعید احمد اکبر آبادی)۔ ہر
 حال مسلمان شادی شدہ عورتیں تو ویسے ہی حرام ہیں تاہم کافر عورتیں بھی حرام ہی ہیں الایہ کہ وہ مسلمانوں کی ملکیت
 میں آجائیں۔ اس صورت میں استبرائے رحم کے بعد وہ ان کے لیے حلال ہیں۔

(۲) یعنی مذکورہ محرمت قرآنی اور حدیثی کے علاوہ دیگر عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ چار چیزیں اس میں
 ہوں۔ اول یہ کہ طلب کرواؤ تَبْتَغُوا یعنی دونوں طرف سے ایجاب و قبول ہو۔ دوسری یہ کہ مال یعنی مہر ادا کرنا قبول
 کرو۔ تیسری یہ کہ ان کو شادی کی قید (دامنی قبضے) میں لانا مقصود ہو۔ صرف شہوت رانی غرض نہ ہو (جیسے زنا میں یا اس

فائدہ اٹھاؤ انہیں ان کا مقرر کیا ہوا مرد سے دو،^(۱) اور مقرر ہو جانے کے بعد تم آپس کی رضامندی سے جو طے کر لو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں،^(۲) بے شک اللہ تعالیٰ علم والا حکمت والا ہے۔ (۲۴)

اور تم میں سے جس کسی کو آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی پوری وسعت و طاقت نہ ہو تو وہ مسلمان لونڈیوں سے جن کے تم مالک ہو (اپنا نکاح کر لے) اللہ تمہارے اعمال کو بخوبی جاننے والا ہے، تم سب آپس میں ایک ہی تو ہو، اس لئے ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کر لو،^(۳) اور قاعدہ کے مطابق ان کے مہران کو دو، وہ پاک دامن ہوں نہ کہ علانیہ بدکاری کرنے والیاں، نہ خفیہ آشنائی کرنے والیاں، پس جب یہ لونڈیاں نکاح میں آجائیں پھر اگر وہ بے حیائی کا کام کریں تو انہیں

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَمَا لَكُمْ مِنَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُنْمَوِّنَاتِ
فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَاللَّهُ أَعْلَمُ
بِأَيْمَانِكُمْ بِبَعْضِكُمْ مِنْ بَعْضٍ ۚ فَإِنَّكُمْ يَرِذْنَ
أَهْلِيهِنَّ وَأَنْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَاللَّهُ يَكْتُبُ
وَأَلْمَمَ بِذَاتِ آخُنَا ۚ فَإِذَا أَحْسَنَ فَإِنَّ تَيْنَ بِمَا حَشَوُ
فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَدْلِ ۚ ذَلِكَ
لِيَنْتَهِي الْعَنْتَ وَمِنْكُمْ وَإِنْ نَصَبُوا وَخَيْرٌ لَكُمْ
وَاللَّهُ عَفْوٌ رَحِيمٌ ۝

متعہ میں ہوتا ہے جو شیعوں میں رائج ہے یعنی جنسی خواہش کی تسکین کے لیے چند روز یا چند گھنٹوں کا نکاح)۔ چوتھی، یہ کہ چھپی یا رسی دوستی نہ ہو بلکہ گواہوں کی موجودگی میں نکاح ہو۔ یہ چاروں شرطیں اس آیت سے مستفاد ہیں۔ اس سے جہاں شیعوں کے متعہ کا بطلان ہوتا ہے وہیں مروجہ حلالہ کا بھی ناجائز ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس کا مقصد بھی عورت کو نکاح کی دائمی قید میں لانا نہیں ہوتا، بلکہ عرفاً یہ صرف ایک رات کے لیے مقرر اور معهود ذہنی ہے۔

(۱) یہ اس امر کی تائید ہے کہ جن عورتوں سے تم نکاح شرعی کے ذریعے سے استمتاع اور تلذذ کرو۔ انہیں ان کا مقرر کردہ مضر و ادا کرو۔

(۲) اس میں آپس کی رضامندی سے مہر میں کمی بیشی کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

ملحوظہ: ”استمتاع“ کے لفظ سے شیعہ حضرات نکاح متعہ کا اثبات کرتے ہیں۔ حالانکہ اس سے مراد نکاح کے بعد صحبت و مباشرت کا استمتاع ہے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ البتہ متعہ ابتدائے اسلام میں جائز رہا ہے اور اس کا جواز اس آیت کی بنیاد پر نہیں تھا، بلکہ اس رواج کی بنیاد پر تھا جو اسلام سے قبل چلا آ رہا تھا۔ پھر نبی ﷺ نے نہایت واضح الفاظ میں اسے قیامت تک کے لیے حرام کر دیا۔

(۳) اس سے معلوم ہوا کہ لونڈیوں کا مالک ہی لونڈیوں کا ولی ہے، لونڈی کا کسی جگہ نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح غلام بھی اپنے مالک کی اجازت کے بغیر کسی جگہ نکاح نہیں کر سکتا۔

آدھی سزا ہے اس سزا سے جو آزاد عورتوں کی ہے۔^(۱)
کنیزوں سے نکاح کا یہ حکم تم میں سے ان لوگوں کے لئے
ہے جنہیں گناہ اور تکلیف کا اندیشہ ہو اور تمہارا ضبط کرنا
بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور بڑی رحمت
والا ہے۔^(۲) (۲۵)

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے خوب کھول کر بیان
کرے اور تمہیں تم سے پہلے کے (نیک) لوگوں کی راہ پر
چلائے اور تمہاری توبہ قبول کرے، اور اللہ تعالیٰ جاننے
والا حکمت والا ہے۔^(۳) (۲۶)

اور اللہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے اور جو لوگ
خواہشات کے پیرو ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم اس سے بہتر
دور ہٹ جاؤ۔^(۴) (۲۷)

اللہ چاہتا ہے کہ تم سے تخفیف کر دے کیونکہ انسان
کمزور پیدا کیا گیا ہے۔^(۵) (۲۸)

اے ایمان والو! اپنے آپس کے مال ناجائز طریقہ سے
مت کھاؤ،^(۶) مگر یہ کہ تمہاری آپس کی رضامندی سے

يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَخْلِفُونَ
وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۲۵﴾

وَاللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ
أَنْ تَبُولُوا مِثْلَ نَجَسٍ ﴿۲۶﴾

يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا ﴿۲۷﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ

(۱) یعنی لونڈیوں کو سو (۱۰۰) کے بجائے (نصف یعنی) پچاس کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ گویا ان کے لیے سزائے رجم نہیں
ہے کیونکہ وہ نصف نہیں ہو سکتی اور غیر شادی شدہ لونڈی کو تعزیری سزا ہوگی۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے تفسیر ابن کثیر)
(۲) یعنی لونڈیوں سے شادی کی اجازت ایسے لوگوں کے لیے ہے جو جوانی کے جذبات پر کنٹرول رکھنے کی طاقت نہ رکھتے
ہوں اور بدکاری میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو، اگر ایسا اندیشہ نہ ہو تو اس وقت تک صبر کرنا بہتر ہے جب تک کسی آزاد
خاندانی عورت سے شادی کے قابل نہ ہو جائے۔

(۳) أَنْ تَبُولُوا یعنی حق سے باطل کی طرف جھک جاؤ۔

(۴) اس کمزوری کی وجہ سے اس کے گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ زیادہ ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ممکن آسانیاں اسے فراہم
کی ہیں۔ انہیں میں سے لونڈیوں سے شادی کی اجازت ہے۔ بعض نے اس ضعف کا تعلق عورتوں سے بتلایا ہے یعنی عورت
کے بارے میں کمزور ہے، اسی لیے عورتیں بھی باوجود نقصان عقل کے، اس کو آسانی سے اپنے دام میں پھنسا لیتی ہیں۔

(۵) بِالْبَاطِلِ میں دھوکہ، فریب، جعل سازی، ملاوٹ کے علاوہ وہ تمام کاروبار بھی شامل ہیں جن سے شریعت نے منع

ہو خرید و فروخت،^(۱) اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو^(۲) یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نہایت مہربان ہے۔ (۲۹)

اور جو شخص یہ (نافرمانیاں) سرکشی اور ظلم سے کرے گا^(۳) تو عنقریب ہم اس کو آگ میں داخل کریں گے۔ اور یہ اللہ پر آسان ہے۔ (۳۰)

اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے جن سے تم کو منع کیا جاتا^(۴) ہے تو ہم تمہارے چھوٹے گناہ دور کر دیں گے اور عزت و بزرگی کی جگہ داخل کریں گے۔ (۳۱)

اور اس چیز کی آرزو نہ کرو جس کے باعث اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر بزرگی دی ہے۔ مردوں کا اس میں سے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کے

إِلَّا أَنْ تَكُونُ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَحْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝
وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ عَدْوًا وَاثْمًا فَمَوْفٍ نُصَلِّيْهِ نَارًا وَاوَّكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۝
إِنْ يَجْتَنِبُوا كِبْرًا مِمَّا نُهَوْهُمْ عَنْهُ لَنْكَرًا عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدُخِلْكُمْ مُدَاخِلَ كُؤُومِنَا ۝
وَلَا تَتَّبِعُوا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا كَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا كَسَبْنَ وَسَوَّاهُ اللَّهُ

- کیا ہے، جیسے قمار، ربا، وغیرہ۔ اسی طرح ممنوع اور حرام چیزوں کا کاروبار کرنا بھی باطل میں شامل ہے۔ مثلاً بلا ضرورت فونوگرافی، ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر، ویڈیو فلمیں اور فٹش کیسٹس وغیرہ۔ ان کا بیانا، بیچنا، مرمت کرنا سب ناجائز ہے۔
- (۱) اس کے لیے بھی شرط یہ ہے کہ یہ لین دین حلال اشیا کا ہو۔ حرام اشیا کا کاروبار باہمی رضامندی کے باوجود ناجائزی رہے گا۔ علاوہ ازیں رضامندی میں خیار مجلس کا مسئلہ بھی آجاتا ہے یعنی جب تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں سودا فسخ کرنے کا اختیار رہے گا جیسا کہ حدیث میں ہے **الْبَيْعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا** (صحیح بخاری و مسلم۔ کتاب البوع) ”دونوں باہم سودا کرنے والوں کو“ جب تک جدا نہ ہوں“ اختیار ہے۔“
- (۲) اس سے مراد خودکشی بھی ہو سکتی جو کبیرہ گناہ ہے اور ارتکاب معصیت بھی جو ہلاکت کا باعث ہے اور کسی مسلمان کو قتل کرنا بھی کیونکہ مسلمان جد و واحد کی طرح ہیں۔ اس لیے اس کا قتل بھی ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو قتل کیا۔
- (۳) یعنی منیات کا ارتکاب، جانتے بوجھے، ظلم و تعدی سے کرے گا۔
- (۴) کبیرہ گناہ کی تعریف میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک وہ گناہ ہیں جن پر حد مقرر ہے، بعض کے نزدیک وہ گناہ جس پر قرآن میں یا حدیث میں سخت و عید یا لعنت آئی ہے، بعض کہتے ہیں ہر وہ کام جس سے اللہ نے یا اس کے رسول نے بطور تحریم کے روکا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی کسی گناہ میں پائی جائے تو وہ کبیرہ ہے۔ احادیث میں مختلف کبیرہ گناہوں کا ذکر ہے جنہیں بعض علما نے ایک کتاب میں جمع بھی کیا ہے۔ جیسے الکبائر للذہبی، الزواجر عن اقتراف الكبائر للہیثمی وغیرہ۔ یہاں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ جو مسلمان کبیرہ گناہوں مثلاً شرک، عقوق والدین، جھوٹ وغیرہ سے اجتناب کرے گا تو ہم اس کے صغیرہ گناہ معاف کر دیں گے۔ سورہ نغم میں بھی یہ

مِنْ فَضْلِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بَدِيعٌ مِّنِّي وَعَلِيمًا ۝

لئے اس میں سے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا، اور اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو،^(۱) یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ (۳۲)

ماں باپ یا قرابت دار جو چھوڑ مریں اس کے وارث ہم نے ہر شخص کے مقرر کر دیئے ہیں^(۲) اور جن سے تم نے اپنے ہاتھوں معاہدہ کیا ہے انہیں ان کا حصہ دو^(۳) حقیقتاً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر حاضر ہے۔ (۳۳)

وَالَّذِينَ جَعَلْنَا مَوَالِيَهُمْ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبُونَ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتَوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ۝

مضمون بیان کیا گیا ہے، البتہ وہاں کبار کے ساتھ فواہش (بے حیائی کے کاموں) سے اجتناب کو بھی صغیرہ گناہوں کی معافی کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں صغیرہ گناہوں پر اصرار و مداومت بھی صغیرہ گناہوں کو کبار بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح اجتناب کبار کے ساتھ احکام و فرائض اسلام کی پابندی اور اعمال صالحہ کا اہتمام بھی نہایت ضروری ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شریعت کے اس مزاج کو سمجھ لیا تھا، اس لئے انہوں نے صرف وعدہ مغفرت پر ہی تکیہ نہیں کیا، بلکہ مغفرت و رحمت الہی کے یقینی حصول کے لیے مذکورہ تمام ہی باتوں کا اہتمام کیا۔ جب کہ ہمارا دامن عمل سے تو خالی ہے لیکن ہمارے قلب امیدوں اور آرزوں سے معمور ہیں۔

(۱) اس کی شان نزول میں بتلایا گیا ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ مرد جہاد میں حصہ لیتے ہیں اور شہادت پاتے ہیں۔ ہم عورتیں ان فضیلت والے کاموں سے محروم ہیں۔ ہماری میراث بھی مردوں سے نصف ہے۔ اس پر آیت نازل ہوئی۔ (مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۳۲۲) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے جو جسمانی قوت و طاقت اپنی حکمت و ارادہ کے مطابق عطا کی ہے اور جس کی بنیاد پر وہ جہاد بھی کرتے ہیں اور دیگر بیرونی کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ ان کے لیے اللہ کا خاص عطیہ ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے عورتوں کو مردانہ صلاحیتوں کے کام کرنے کی آرزو نہیں کرنی چاہیے۔ البتہ اللہ کی اطاعت اور نیکی کے کاموں میں خوب حصہ لینا چاہیے اور اس میدان میں وہ جو کچھ کمائیں گی، مردوں کی طرح، ان کا پورا پورا صلہ انہیں ملے گا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرنا چاہیے کیونکہ مرد اور عورت کے درمیان استعداد، صلاحیت اور قوت کار کا جو فرق ہے، وہ تو قدرت کا ایک اہل فیصلہ ہے جو محض آرزو سے تبدیل نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس کے فضل سے کسب و محنت میں رہ جانے والی کمی کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

(۲) مَوَالِيٌ، مَوْلٰی کی جمع ہے۔ مَوْلٰی کے کئی معنی ہیں دوست، آزاد کردہ غلام، پچھا زاد، پڑوسی۔ لیکن یہاں اس سے مراد ورثا ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر مرد عورت جو کچھ چھوڑ جائیں گے، اس کے وارث ان کے ماں باپ اور دیگر قریبی رشتہ دار ہوں گے۔

(۳) اس آیت کے محکم یا منسوخ ہونے کے بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ ابن جریر طبری وغیرہ اسے غیر منسوخ

مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر تفصیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں،^(۱) پس نیک

الزَّيَالِ كَوُفُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا آتَوْهُم مِّنْ أَمْوَالِهِمْ ۚ فَالطَّيْلُتُ قُنَيْتُ حَفِظَتْ

(محکم) مانتے ہیں اور اٰیْمَانُكُمْ (معاہدہ) سے مراد وہ حلف اور معاہدہ لیتے ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کے لیے اسلام سے قبل دو اشخاص یا دو قبیلوں کے درمیان ہوا اور اسلام کے بعد بھی وہ چلا آ رہا تھا۔ نَصِيْبُهُمْ (حصہ) سے مراد اسی حلف اور معاہدے کی پابندی کے مطابق تعاون و تناصر کا حصہ ہے اور ابن کثیر اور دیگر مفسرین کے نزدیک یہ آیت منسوخ ہے۔ کیونکہ اٰیْمَانُكُمْ سے ان کے نزدیک وہ معاہدہ ہے جو ہجرت کے بعد ایک انصاری اور مہاجر کے درمیان اخوت کی صورت میں ہوا تھا۔ اس میں ایک مہاجر، انصاری کے مال کا اس کے رشتہ داروں کی بجائے، وارث ہوتا تھا لیکن یہ چونکہ ایک عارضی انتظام تھا، اس لیے پھر ﴿وَاُولُو الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ﴾ (الانفال-۷۵) ”رشتے دار اللہ کے حکم کی رو سے ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں“ نازل فرما کر اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اب ﴿فَاَتَوْهُمْ نَصِيْبُهُمْ﴾ سے مراد دوستی و محبت اور ایک دوسرے کی مدد ہے اور بطور وصیت کچھ دے دینا بھی اس میں شامل ہے۔ موالات عقد، موالات حلف یا موالات اخوت میں اب وراثت کا تصور نہیں ہو گا۔ اہل علم کے ایک گروہ نے اس سے مراد ایسے دو شخصوں کو لیا جن میں سے کم از کم ایک لا وارث ہے۔ اور ایک دوسرے شخص سے یہ طے کرتا ہے کہ میں تمہارا موٹی ہوں۔ اگر کوئی جنایت کروں تو میری مدد کرنا اور اگر مارا جاؤں تو میری دیت لے لیما۔ اس لا وارث کی وفات کے بعد اس کا مال مذکورہ شخص لے گا۔ بشرطیکہ واقعتاً اس کا کوئی وارث نہ ہو۔ بعض دوسرے اہل علم نے اس آیت کا ایک اور معنی بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ﴿وَالَّذِيْنَ عَقَدْتُمْ اٰیْمَانُكُمْ﴾ سے مراد بیوی اور شوہر ہیں اور اس کا عطف الِاقْرَبُوْنَ پر ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ”ماں باپ نے، قرابت داروں نے اور جن کو تمہارا عہد و پیمانہ آپس میں باندھ چکا ہے (یعنی شوہر یا بیوی) انہوں نے جو کچھ چھوڑا اس کے حقدار یعنی حصے دار ہم نے مقرر کر دیئے ہیں۔ لہذا ان حقداروں کو ان کے حصے دے دو“ گویا پیچھے آیات میراث میں تفصیلاً جو حصے بیان کئے گئے تھے یہاں اجمالاً ان کی ادائیگی کی تاکید مزید کی گئی ہے۔

(۱) اس میں مرد کی حاکمیت و قومیت کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک وہی ہے جو مردانہ قوت و دماغی صلاحیت ہے جس میں مرد عورت سے خلقی طور پر ممتاز ہے۔ دوسری وجہ کسی ہے، جس کا مکلف شریعت نے مرد کو بنایا ہے اور عورت کو اس کی فطری کمزوری اور خصوص تعلیمات کی وجہ سے جنہیں اسلام نے عورت کی عفت و حیا اور اس کے تقدس کے تحفظ کے لیے ضروری قرار دیا ہے، عورت کو معاشی جھیلیوں سے دور رکھا ہے۔ عورت کی سربراہی کے خلاف قرآن کریم کی یہ نص قطعی بالکل واضح ہے جس کی تائید صحیح بخاری کی اس حدیث سے ہوتی ہے۔ جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے ”وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہوگی جس نے اپنے امور ایک عورت کے سپرد کر دیئے۔“

فرمانبردار عورتیں خاوند کی عدم موجودگی میں بہ حفاظت الہی نگہداشت رکھنے والیاں ہیں اور جن عورتوں کی نافرمانی اور بد دماغی کا تمہیں خوف ہو انہیں نصیحت کرو اور انہیں الگ بستروں پر چھوڑ دو اور انہیں مار کی سزا دو پھر اگر وہ تابعداری کریں تو ان پر کوئی راستہ تلاش نہ کرو،^(۱) بے شک اللہ تعالیٰ بڑی بلندی اور بڑائی والا ہے (۳۴)

اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان آپس کی ان بن کا خوف ہو تو ایک منصف مرد والوں میں سے اور ایک عورت کے گھر والوں میں سے مقرر کرو،^(۲) اگر یہ دونوں صلح کرانا چاہیں گے تو اللہ دونوں میں ملاپ کر دے گا، یقیناً اللہ تعالیٰ پورے علم والا پوری خبر والا ہے۔ (۳۵)

اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ سلوک و احسان کرو

الْبَغْيِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ وَاللَّيْلِ نَحْفَاؤُنَ نُسُورَهُنَّ فَحِظُوهُنَّ
وَأَعْبِرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاصْرَبُوهُنَّ فَإِنْ أَطَعْتَكُمْ
فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا كَبِيرًا ۝۳۴

وَأَنْ حِفْظُهُنَّ شَقَائِكُمْ بَيْنَهُمَا فَاتَّبِعُوا حَاكِمًا مِنْ أَهْلِهَا
وَحَاكِمًا مِنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا
إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝۳۵

وَأَعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا

(۱) نافرمانی کی صورت میں عورت کو سمجھانے کے لیے سب سے پہلے وعظ و نصیحت کا نمبر ہے، دوسرے نمبر پر ان سے وقتی اور عارضی علیحدگی ہے جو سمجھ دار عورت کے لیے بہت بڑی تنبیہ ہے۔ اس سے بھی نہ سمجھے تو ہلکی سی مار کی اجازت ہے۔ لیکن یہ مار و حشیانہ اور ظالمانہ نہ ہو جیسا کہ جاہل لوگوں کا وطیرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اس ظلم کی اجازت کسی مرد کو نہیں دی ہے۔ اگر وہ اصلاح کر لے تو پھر راستہ تلاش نہ کرو یعنی ماری پیٹ نہ کرو تنگ نہ کرو، یا طلاق نہ دو، گویا طلاق بالکل آخری مرحلہ ہے جب کوئی اور چارہ کار باقی نہ رہے۔ لیکن مرد اس حق کو بھی بہت ناجائز طریقے سے استعمال کرتے ہیں اور ذرا سی بات میں فوراً طلاق دے ڈالتے ہیں اور اپنی زندگی بھی برباد کرتے ہیں، عورت کی بھی اور بچے ہوں تو ان کی بھی۔

(۲) گھر کے اندر مذکورہ تینوں طریقے کار گر ثابت نہ ہوں تو یہ چوتھا طریقہ ہے اور اس کی بابت کہا کہ حکمین (فیصلہ کرنے والے) اگر مخلص ہوں گے تو یقیناً ان کی سعی اصلاح کامیاب ہوگی۔ تاہم ناکامی کی صورت میں حکمین کو تفریق بین الزوجین یعنی طلاق کا اختیار ہے یا نہیں؟ اس میں علما کا اختلاف ہے۔ بعض اس کو حاکم مجاز کے حکم یا زوجین کے توکیل بالفرقہ (جدائی کے لئے وکیل بنانا) کے ساتھ مشروط کرتے ہیں اور جمہور علما اس کے بغیر اس اختیار کے قائل ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر طبری، فتح القدر تفسیر ابن کثیر)

اور رشتہ داروں سے اور یتیموں سے اور مسکینوں سے اور قربت دار ہمسایہ سے اور اجنبی ہمسایہ سے (۱) اور پہلو کے ساتھی سے (۲) اور راہ کے مسافر سے اور ان سے جن کے مالک تمہارے ہاتھ ہیں، (غلام کنیز) (۳) یقیناً اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں اور سچی خوروں کو پسند نہیں فرماتا۔ (۳۶) (۴)

جو لوگ خود بخلی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخلی کرنے کو کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو اپنا فضل انہیں دے رکھا ہے اسے چھپا لیتے ہیں ہم نے ان کافروں کے لئے ذلت کی مارتیاری کر رکھی ہے۔ (۳۷)

اور جو لوگ اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور جس کا ہم نشین اور ساتھی شیطان ہو، (۵)

وَيَذَى الْعَرَبِيَّ وَالْيَمَنِيَّ وَالْمَسْكِينِ وَالْمَجْرِيَّ وَالْقُرْبَانِيَّ
وَالْمَجْرِيَّ وَالْمَجْرِيَّ وَالْمَجْرِيَّ وَالْمَجْرِيَّ
مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ مَنْ كَانَ
مُتَّعًا لَكُمْ خَيْرًا ۝

الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبَخْلِ وَيَكْمُنُونَ
مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَاعْتَدُوا لِلْكَافِرِينَ
عَذَابًا عَظِيمًا ۝

وَالَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ
بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَنْ يَكُنِ الشَّيْطَانُ

(۱) اَلْجَارِ الْاَجْنَبِ قَرَابَتِ دَارِ پڑوسی کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں ایسا پڑوسی جس سے قربت داری نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ پڑوسی سے بہ حیثیت پڑوسی کے حسن سلوک کیا جائے، وہ رشتہ دار ہو یا غیر رشتہ دار جس طرح کہ احادیث میں بھی اس کی بڑی تاکید بیان کی گئی ہے۔

(۲) اس سے مراد رفیق سفر، شریک کار، بیوی اور وہ شخص ہے جو فائدے کی امید پر کسی کی قربت و ہم نشینی اختیار کرے۔ بلکہ اس کی تعریف میں وہ لوگ بھی آسکتے ہیں جنہیں تحصیل علم، تعلم صناعت (کوئی کام سیکھنے) کے لیے یا کسی کاروباری سلسلے میں آپ کے پاس بیٹھنے کا موقع ملے۔ (فتح القدر)

(۳) اس میں گھر، دکان اور کارخانوں، ملوں کے ملازم اور نوکر چاکر بھی آجاتے ہیں۔ غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی بڑی تاکید احادیث میں آئی ہے۔

(۴) فخر و غرور اور تکبر اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے بلکہ ایک حدیث میں یہاں تک آتا ہے کہ ”وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں رائی کے ایک دانے کے برابر بھی کبر ہو گا۔“ (صحیح مسلم کتاب الایمان، باب تحريم الكبر وبيانہ حدیث نمبر ۹۱) یہاں کبریٰ بطور خاص مذمت سے یہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور جن جن لوگوں سے حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ اس پر عمل وہی شخص کر سکتا ہے جس کا دل کبر سے خالی ہو گا۔ متکبر اور مغرور شخص صحیح معنوں میں نہ حق عبادت ادا کر سکتا ہے اور نہ اپنوں اور بیگانوں کے ساتھ حسن سلوک کا اہتمام۔

(۵) بخل (یعنی اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا) یا خرچ تو کرنا لیکن ریاکاری یعنی نمود و نمائش کے لیے کرنا۔ یہ دونوں باتیں

لَهُ قَرِيْبًا فَسَاءَ قَرِيْبًا ۝

وَمَا ذَا عَلَيْهِمْ لَوْمَاتُ اللَّهِ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَأَنْفَعُوا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللَّهُ وَكَانَ اللَّهُ بِهِنَّ عَلِيْمًا ۝

وہ بدترین ساتھی ہے۔ (۳۸)
بھلا ان کا کیا نقصان تھا اگر یہ اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے اور اللہ تعالیٰ نے جو انہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے، اللہ تعالیٰ انہیں خوب جاننے والا ہے۔ (۳۹)

بے شک اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا اور اگر نیکی ہو تو اسے دوگنی کر دیتا ہے اور خاص اپنے پاس سے بہت بڑا ثواب دیتا ہے۔ (۴۰)

پس کیا حال ہو گا جس وقت کہ ہر امت میں سے ایک گواہ ہم لائیں گے اور آپ کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے۔ (۴۱)^(۱)

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِنْ تَكَ حَسَنَةً يُّضَعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ أَجْرًا عَظِيْمًا ۝

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَؤُلَاءِ سَهِيدًا ۝

اللہ کو سخت ناپسند ہیں اور ان کی مذمت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ یہاں قرآن کریم میں ان دونوں باتوں کو کافروں کا شیوہ اور ان لوگوں کا وطیرہ بتایا گیا ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور شیطان ان کا ساتھی ہے۔

(۱) ہر امت میں سے اس کا پیغمبر اللہ کی بارگاہ میں گواہی دے گا کہ یا اللہ! ہم نے تو تیرا پیغام اپنی قوم کو پہنچا دیا تھا، اب انہوں نے نہیں مانا تو ہمارا کیا قصور؟ پھر ان سب پر نبی کریم ﷺ گواہی دیں گے کہ یا اللہ! یہ سچے ہیں۔ آپ ﷺ یہ گواہی اسی قرآن کی وجہ سے دیں گے جو آپ ﷺ پر نازل ہوا اور جس میں گزشتہ انبیاء اور ان کی قوموں کی سرگزشت بھی حسب ضرورت بیان کی گئی ہے۔ یہ ایک سخت مقام ہو گا، اس کا تصور ہی لرزہ بر اندام کر دینے والا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے قرآن سننے کی خواہش ظاہر فرمائی، وہ سناتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچے تو آپ ﷺ نے فرمایا بس، اب کافی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا تو آپ ﷺ کی دونوں آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ (صحیح بخاری فضائل القرآن) بعض لوگ کہتے ہیں کہ گواہی وہی دے سکتا ہے جو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اس لیے وہ ”شہید“ (گواہ) کے معنی ”حاضر ناظر“ کے کرتے ہیں اور یوں نبی ﷺ کو ”حاضر ناظر“ باور کراتے ہیں۔ لیکن نبی ﷺ کو حاضر ناظر سمجھنا، یہ آپ ﷺ کو اللہ کی صفت میں شریک کرنا ہے جو شرک ہے کیوں کہ حاضر ناظر صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ ”شہید“ کے لفظ سے ان کا استدلال اپنے اندر کوئی قوت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ شہادت یقینی علم کی بنیاد پر بھی ہوتی ہے اور قرآن میں بیان کردہ حقائق و واقعات سے زیادہ یقینی علم کس کا ہو سکتا ہے؟ اسی یقینی علم کی بنیاد پر خود امت محمدیہ کو بھی قرآن نے ﴿شَهِدَاةٌ عَلَى النَّاسِ﴾ (تمام کائنات کے لوگوں پر گواہ) کہا ہے۔ اگر گواہی کے لیے حاضر ناظر ہونا ضروری ہے تو پھر امت محمدیہ کے ہر فرد کو حاضر ناظر مانا پڑے گا۔ بہر حال نبی ﷺ کے بارے میں یہ عقیدہ مشرکانہ اور بے بنیاد ہے۔ أَعَادَنَا اللَّهُ مِنْهُ .

جس روز کافر اور رسول کے نافرمان آرزو کریں گے کہ کاش! انہیں زمین کے ساتھ ہموار کر دیا جاتا اور اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔ (۴۲)

اے ایمان والو! جب تم نشے میں مست ہو نماز کے قریب بھی نہ جاؤ،^(۱) جب تک کہ اپنی بات کو سمجھنے نہ لگو اور جنابت کی حالت میں جب تک کہ غسل نہ کر لو،^(۲) ہاں اگر راہ چلتے گزر جانے والے ہو تو اور بات ہے^(۳) اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آیا ہو یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو اور تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی کا قصد کرو اور اپنے منہ اور اپنے ہاتھ مل لو۔^(۴) بے شک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا، بخشنے والا ہے۔ (۴۳)

يَوْمَئِذٍ يَكْفُرُونَ بِالَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهُ حَدِيثًا ۞

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَرَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدًا مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَسْتُمْ إِلَيْهَا فَلَئِمْتُمْ بِهَا فَمَسَحُوا بِمَاءٍ فَغَسَلُوا صَبِيحًا طَيِّبًا فَاغْتَسَلُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا ۞

(۱) یہ حکم اس وقت دیا گیا تھا کہ ابھی شراب کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک دعوت میں شراب نوشی کے بعد جب نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو نشے میں قرآن کے الفاظ بھی امام صاحب غلط پڑھ گئے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے ترمذی، تفسیر سورۃ النساء) جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ نشے کی حالت میں نماز مت پڑھا کرو۔ گویا اس وقت صرف نماز کے وقت کے قریب شراب نوشی سے منع کیا گیا۔ بالکل ممانعت اور حرمت کا حکم اس کے بعد نازل ہوا۔ (یہ شراب کی بابت دو سرا حکم ہے جو مشروط ہے)

(۲) یعنی ناپاکی کی حالت میں بھی نماز مت پڑھو۔ کیونکہ نماز کے لیے طہارت ضروری ہے۔

(۳) اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسافر کی حالت میں اگر پانی نہ ملے تو جنابت کی حالت میں ہی نماز پڑھ لو (جیسا کہ بعض نے کہا ہے) بلکہ جمہور علماء کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ جنابت کی حالت میں تم مسجد کے اندر مت بیٹھو، البتہ مسجد کے اندر سے گزرنے کی ضرورت پڑے تو گزر سکتے ہو بعض صحابہ کے مکان اس طرح تھے کہ انہیں ہر صورت میں مسجد نبوی کے اندر سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ یہ رخصت ان ہی کے پیش نظر دی گئی ہے۔ (ابن کثیر) اور نہ مسافر کا حکم آگے آ رہا ہے۔

(۴) بیمار سے مراد وہ بیمار ہے جسے وضو کرنے سے نقصان یا بیماری میں اضافے کا اندیشہ ہو۔ (۲) مسافر عام ہے، لمبا سفر کیا ہو یا مختصر۔ اگر پانی دستیاب نہ ہو تو تیمم کرنے کی اجازت ہے۔ پانی نہ ملنے کی صورت میں یہ اجازت تو مقیم کو بھی حاصل ہے، لیکن بیمار اور مسافر کو چونکہ اس قسم کی ضرورت عام طور پر پیش آتی تھی اس لیے بطور خاص ان کے لیے

کیا تم نے انہیں نہیں دیکھا؟ جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے، وہ گمراہی خریدتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ سے بھٹک جاؤ۔ (۴۴)

اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو خوب جاننے والا ہے اور اللہ تعالیٰ کا دوست ہونا کافی ہے اور اللہ تعالیٰ کا مددگار ہونا بس ہے۔ (۴۵)

بعض یہود کلمات کو ان کی ٹھیک جگہ سے بہرہ پھیر کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی اور سن اس کے بغیر کہ تو سنا جائے^(۱) اور ہماری رعایت کرا (لیکن اس کہنے میں) اپنی زبان کو تپچ دیتے ہیں اور دین میں طعنہ دیتے ہیں اور اگر یہ لوگ کہتے کہ ہم نے سنا اور ہم نے فرمانبرداری کی اور آپ سنئے اور ہمیں دیکھئے تو یہ ان کے لیے بہت بہتر اور نہایت ہی مناسب تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی وجہ سے انہیں لعنت کی ہے۔ پس یہ

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أَوْتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكُفْبِ يَسْتَأْذِنُونَ
الصَّلَاةَ وَيُرِيدُونَ أَنْ تَضِلُّوا السَّبِيلَ ﴿۴۴﴾

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ وَكَفَى بِاللَّهِ وَلِيًّا ذُو كِفْلِ
بِاللَّهِ نَصِيرًا ﴿۴۵﴾

مِنَ الَّذِينَ هَادُوا وَيَحِرُّونَ الْكَلِمَةَ عَن مَّوَاضِعِهَا
وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأَسْمَعُ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعَيْنَا
لِيَايَا لَيْسَتْ لَهُمْ وَطَعْنَا فِي الَّذِينَ أُوتُوا أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا
وَاطَعْنَا وَأَسْمَعُ وَانظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمًا
وَلَكِن لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۴۵﴾

اجازت بیان کر دی گئی ہے۔ (۳) قضائے حاجت سے آنے والا (۴) اور بیوی سے مباشرت کرنے والا، ان کو بھی پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کر کے نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ ہاتھ زمین پر مار کر کلائی تک دونوں ہاتھ ایک دوسرے پر پھیر لے۔ (کنہیوں تک ضروری نہیں) اور منہ پر بھی پھیر لے قَالَ فِي النَّيْمِ : «ضَرْبَةُ اللَّوْجِ وَالْكَفَّيْنِ» (مسند احمد - عمار بیڑ جلد ۳ صفحہ ۲۳۲) نبی ﷺ نے تیمم کے بارے میں فرمایا کہ یہ دونوں ہتھیلیوں اور چہرے کے لیے ایک ہی مرتبہ مارنا ہے۔ ﴿صَبِيحًا طَيِّبًا﴾ سے مراد ”پاک مٹی“ ہے۔ زمین سے نکلنے والی ہر چیز نہیں جیسا کہ بعض کا خیال ہے۔ حدیث میں اس کی مزید وضاحت کر دی گئی ہے۔ «جُعِلَتْ تَرْتِبَتُهَا لَنَا طَهُورًا إِذَا لَمْ نَجِدِ الْمَاءَ» (صحیح مسلم - کتاب المساجد) جب ہمیں پانی نہ ملے تو زمین کی مٹی ہمارے لیے پاکیزگی کا ذریعہ بنا دی گئی ہے۔

(۱) یہودیوں کی خباثوں اور شرارتوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ”ہم نے سنا“ کے ساتھ ہی کہہ دیتے لیکن ہم نافرمانی کریں گے یعنی اطاعت نہیں کریں گے۔ یہ دل میں کہتے یا اپنے ساتھیوں سے کہتے یا شوخ چشمانہ جسارت کا ارتکاب کرتے ہوئے منہ پر کہتے۔ اسی طرح غَيْرَ مُسْمَعٍ (تیری بات نہ سنی جائے) یہ بددعا کے طور پر کہتے یعنی تیری بات مقبول نہ ہو۔ رَاعَيْنَا کی بابت سورۃ البقرۃ آیت ۱۰۳ کا حاشیہ۔

بست ہی کم ایمان لاتے ہیں،^(۱) (۳۶)

اے اہل کتاب! جو کچھ ہم نے نازل فرمایا ہے جو اس کی بھی تصدیق کرنے والا ہے جو تمہارے پاس ہے، اس پر ایمان لاؤ اس سے پہلے کہ ہم چہرے بگاڑ دیں اور انہیں لوٹا کر پیٹھ کی طرف کر دیں،^(۲) یا ان پر لعنت بھیجیں جیسے ہم نے ہفتے کے دن والوں پر لعنت کی^(۳) اور ہے اللہ تعالیٰ کا کام کیا گیا۔^(۴) (۳۷)

یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ شریک کیے جانے کو نہیں بخشتا اور اس کے سوا جسے چاہے بخش دیتا ہے^(۵) اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک مقرر کرے اس نے بست بڑا گناہ اور ہستان باندھا۔^(۶) (۳۸)

کیا آپ نے انہیں نہیں دیکھا جو اپنی پاکیزگی اور ستائش خود کرتے ہیں؟ بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے پاکیزہ کرتا ہے، کسی پر ایک دھاگے کے برابر ظلم نہ کیا جائے گا۔^(۷) (۳۹)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا لَنَاطِقُ مَا تَدْعُونَ قَالِمَا مَعَكُمْ مِمَّنْ قَبْلُ أَنْ تَقُولَ وَجْهًا فَنَزَعْنَا عَلَيَّ آذَانًا وَأَوَّلَتْهُمْ كَمَا لَعْنَا أَصْحَابَ السَّبْتِ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿۳۶﴾

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ أَنْ يُشْرِكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا ﴿۳۷﴾
 اللَّهُ تَرَىٰ الَّذِينَ يَزُكُّونَ أَنْفُسَهُمْ سِيلَ اللَّهُ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ وَلَا يَظْلُمُونَ قَدِيرًا ﴿۳۸﴾

- (۱) یعنی ایمان لانے والے بست ہی قلیل ہیں۔ پہلے گزر چکا ہے کہ یہود میں سے ایمان لانے والوں کی تعداد دس تک بھی نہیں پہنچتی۔ یا یہ معنی ہیں کہ بست ہی کم باتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ جب کہ ایمان نافع یہ ہے کہ سب باتوں پر ایمان لایا جائے۔
- (۲) یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تمہیں تمہارے کرتوتوں کی پاداش میں ہی سزا دے سکتا ہے۔
- (۳) یہ قصہ سورہ اعراف میں آئے گا، کچھ اشارہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔ یعنی تم بھی ان کی طرح ملعون قرار پا سکتے ہو۔
- (۴) یعنی جب وہ کسی بات کا حکم کر دے تو نہ کوئی اس کی مخالفت کر سکتا ہے اور نہ اسے روک ہی سکتا ہے۔
- (۵) یعنی ایسے گناہ جن سے مومن توبہ کیے بغیر ہی مرجائیں، اللہ تعالیٰ اگر کسی کے لیے چاہے گا تو بغیر کسی قسم کی سزا دیئے معاف فرما دے گا اور بست سوں کو سزا کے بعد اور بست سوں کو نبی ﷺ کی شفاعت پر معاف فرما دے گا۔ لیکن شرک کسی صورت میں معاف نہیں ہو گا کیونکہ شرک پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے۔
- (۶) دوسرے مقام پر فرمایا ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ ﴿انعام﴾ ”شرک ظلم عظیم ہے“ حدیث میں اسے سب سے بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے۔ أَكْبَرُ الْكِبَائِرِ الشِّرْكَ بِاللَّهِ....
- (۷) یہود اپنے منہ میں مٹھو بٹھتے تھے مثلاً ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں وغیرہ، اللہ نے فرمایا تزکیہ کا اختیار بھی

أَنْظُرُ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَكَفَى بِهِ
إِثْمًا مُّبِينًا ۝

دیکھو یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر کس طرح جھوٹ باندھتے
ہیں^(۱) اور یہ (حرکت) صریح گناہ ہونے کے لئے کافی
ہے۔^(۲) (۵۰)

کیا آپ نے انہیں نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ ملا
ہے؟ جو بت کا اور باطل معبود کا اعتقاد رکھتے ہیں اور
کافروں کے حق میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ ایمان والوں
سے زیادہ راہ راست پر ہیں۔^(۳) (۵۱)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أَوْتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ
بِالْحَبِيبِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَؤُلَاءِ
أَهْدَىٰ مِنَ الْإِسْلَامِ الَّذِي كُنَّا عَلَىٰهِ سَبِيلًا ۝

اللہ کو ہے اور اس کا علم بھی اسی کو ہے۔ فتیل کھجور کی گٹھلی کے کٹاؤ پر جو دھاگے یا سوت کی طرح نکلتا یا دکھائی دیتا ہے
اس کو کہا جاتا ہے۔ یعنی اتنا سا ظلم بھی نہیں کیا جائے گا۔
(۱) یعنی مذکورہ دعوائے تزکیہ کر کے۔

(۲) یعنی ان کی یہ حرکت اپنی پاکیزگی کا ادعا ان کے کذب و افتراء کے لیے کافی ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت اور اس کی
شان نزول کی روایات سے معلوم ہوا کہ ایک دوسرے کی مدح و توصیف بالخصوص تزکیہ نفوس کا دعویٰ کرنا صحیح اور جائز
نہیں۔ اسی بات کو قرآن کریم کے دوسرے مقام پر اس طرح فرمایا گیا۔ ﴿فَلَا تَكُونُوا أَقْسَامًا عَلَىٰ مَا بَيْنَ أَيْدِيكُمْ﴾
(النجم: ۳۲) ”اپنے نفوس کی پاکیزگی اور ستائش مت کرو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، تم میں متقی کون ہے؟“ حدیث میں ہے
حضرت مقداد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ”نبی کریم ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم تعریف کرنے والوں کے چروں پر مٹی ڈال
دیں ”أَنْ نَحْتَوْ فِي وَجْهِهِ الْمَدَّاحِينَ الثُّرَابَ“ (صحیح مسلم، کتاب الزهد) ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ
نے ایک آدمی کو ایک دوسرے آدمی کی تعریف کرتے ہوئے سنا تو آپ ﷺ نے فرمایا ﴿وَيْحَكَ فَطَعْت عُنُقَ
صَاحِبِكَ﴾ ”افسوس ہے تجھ پر تو نے اپنے ساتھی کی گردن کاٹ دی“ پھر فرمایا کہ ”اگر تم میں سے کسی کو کسی کی لامحالہ
تعریف کرنی ہے تو اس طرح کہا کرے أَحْسِبُهُ كَذَا فِي اس طرح گمان کرتا ہوں۔ اللہ پر کسی کا تزکیہ بیان نہ
کرے۔“ (صحیح بخاری، کتاب الشهادات والأدب۔ مسلم، کتاب الزهد)

(۳) اس آیت میں یودویوں کے ایک اور فعل پر تعجب کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ اہل کتاب ہونے کے باوجود یہ جبنت
(بت، کاہن یا ساحر) اور طَّاغُوت (جھوٹے معبودوں) پر ایمان رکھتے اور کفار کہہ کر مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ سمجھتے
ہیں۔ جبنت کے یہ سارے مذکورہ معنی کیے گئے ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے ﴿إِنَّ الْعِبَادَةَ وَالطَّرِيقَ وَالطَّيْرَةَ مِنَ
النَّجْبِ﴾ (سنن ابی داؤد، کتاب الطب) ”پرندے اڑا کر، خط کھینچ کر، بد خالی اور بد شگونئی لینا یہ جبنت سے ہیں۔“ یعنی
یہ سب شیطانی کام ہیں اور یودوں میں بھی یہ چیزیں عام تھیں۔ طَّاغُوت کے ایک معنی شیطان بھی کیے گئے ہیں۔ دراصل
معبودان باطل کی پرستش، شیطان ہی کی پیروی ہے۔ اس لیے شیطان بھی یقیناً طاغوت میں شامل ہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اور جسے اللہ تعالیٰ لعنت کر دے، تو اس کا کوئی مددگار نہ پائے گا۔ (۵۲)

کیا ان کا کوئی حصہ سلطنت میں ہے؟ اگر ایسا ہو تو پھر یہ کسی کو ایک کھجور کی گٹھلی کے شگاف کے برابر بھی کچھ نہ دیں گے۔ (۱) (۵۳)

یا یہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس پر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے، (۲) پس ہم نے تو آل ابراہیم کو کتاب اور حکمت بھی دی ہے اور بڑی سلطنت بھی عطا فرمائی ہے۔ (۵۴)

پھر ان میں سے بعض نے تو اس کتاب کو مانا اور بعض اس سے رک گئے، (۳) اور جنم کا جلا نا کافی ہے۔ (۵۵) جن لوگوں نے ہماری آیتوں سے کفر کیا، انہیں ہم یقیناً آگ میں ڈال دیں گے (۴) جب ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ وَمَنْ يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَنْ يَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ﴿٥٢﴾

أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِنَ الْمُلْكِ فَإِذْ الْأَيْدِي تَوَدُّونَ النَّاسَ نَفِيرًا ﴿٥٣﴾

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۗ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا ﴿٥٤﴾

فَيَهُودٌ مِّنْ أُمَّنٍ بِهِ وَمِنَهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ﴿٥٥﴾

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصَلِّيهِمْ نَارًا كَلِمًا كُفْرًا

(۱) یہ استغمام انکاری ہے یعنی بادشاہی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اگر اس میں ان کا کچھ حصہ ہوتا تو یہ یہود اتنے بخیل ہیں کہ لوگوں کو بالخصوص حضرت محمد ﷺ کو اتنا بھی نہ دیتے جس سے کھجور کی گٹھلی کا شگاف ہی پر ہو جاتا۔ نَفِيرًا اس نقطے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے اوپر ہوتا ہے۔ (ابن کثیر)

(۲) ام (یا) بدل کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے یعنی بلکہ یہ اس بات پر حسد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو چھوڑ کر دو سروں میں نبی (یعنی آخری نبی) کیوں بنایا؟ نبوت اللہ کا سب سے بڑا فضل ہے۔

(۳) یعنی بنی اسرائیل کو، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت اور آل میں سے ہیں، ہم نے نبوت بھی دی اور بڑی سلطنت و بادشاہی بھی۔ پھر بھی یہود کے یہ سارے لوگ ان پر ایمان نہیں لائے۔ کچھ ایمان لائے اور کچھ نے اعراض کیا۔ مطلب یہ ہے کہ اے محمد ﷺ! اگر یہ آپ کی نبوت پر ایمان نہیں لارہے ہیں تو کوئی انوکھی بات نہیں ہے، ان کی تو تاریخ ہی نبیوں کی تکذیب سے بھری ہوئی ہے حتیٰ کہ اپنی نسل کے نبیوں پر بھی یہ ایمان نہیں لائے۔ بعض نے آتَنَ بِہِ میں ہا کا مرجع نبی ﷺ کو بتلایا ہے یعنی ان یہود میں سے کچھ نبی ﷺ پر ایمان لائے اور کچھ نے انکار کیا۔ ان منکرین نبوت کا انجام جہنم ہے۔

(۴) یعنی جہنم میں اہل کتاب کے منکرین ہی نہیں جائیں گے، بلکہ دیگر تمام کفار کا ٹھکانہ بھی جہنم ہی ہے۔

جُلُودُهُمْ بَدَلَتْهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ
إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿۵۶﴾

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ
تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا لَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ
وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ﴿۵۷﴾

ان کے سوا اور کھالیں بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب چکھتے
رہیں،^(۱) یقیناً اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔ (۵۶)
اور جو لوگ ایمان لائے اور شائستہ اعمال کئے^(۲) ہم
عنقریب انہیں ان جنتوں میں لے جائیں گے جن کے
نیچے نہریں بہ رہی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے،
ان کے لئے وہاں صاف ستھری بیویاں ہوں گی اور ہم
انہیں گھنی چھاؤں (اور پوری راحت) میں لے جائیں
گے۔^(۳) (۵۷)

(۱) یہ جہنم کے عذاب کی سختی، تسلسل اور دوام کا بیان ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول بعض آثار میں بتلایا گیا ہے۔
کھالوں کی یہ تبدیلی دن میں بیسیوں بلکہ سینکڑوں مرتبہ عمل میں آئے گی اور مسند احمد کی روایت کی رو سے جہنمی جہنم
میں اتنے فریب ہو جائیں گے کہ ان کے کانوں کی لوسے پیچھے گردن تک کا فاصلہ سات سو سال کی مسافت جتنا ہو گا، ان کی
کھال کی موٹائی ستریاشت اور داڑھ احد پہاڑ جتنی ہوگی۔

(۲) کفار کے مقابلے میں اہل ایمان کے لیے جو بڑی نعمتیں ہیں، ان کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن وہ اہل ایمان جو اعمال
صالحہ کی دولت سے مالا مال ہوں گے۔ جَعَلْنَا اللَّهُ مِنْهُمْ — اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ہر جگہ ایمان کے ساتھ اعمال
صالحہ کا ذکر کر کے واضح کر دیا کہ ان کا آپس میں چوٹی دامن کا ساتھ ہے۔ ایمان، عمل صالح کے بغیر ایسے ہی ہے جیسے
پھول ہو مگر خوشبو کے بغیر، درخت ہو لیکن بے ثمر۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور خیر القرون کے دوسرے
مسلمانوں نے اس نکتے کو سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ ان کی زندگیاں ایمان کے پھل۔ اعمال صالحہ۔ سے مالا مال تھیں۔ اس دور
میں بے عمل یا بد عملی کے ساتھ ایمان کا تصور ہی نہیں تھا۔ اس کے برعکس آج ایمان صرف زبانی جمع خرچ کا نام رہ گیا
ہے۔ اعمال صالحہ سے دعوے داران ایمان کا دامن خالی ہے۔ هَذَا اللَّهُ تَعَالَى . اسی طرح اگر کوئی شخص ایسے عمل
کرتا ہے جو اعمال صالحہ کی ذیل میں آتے ہیں۔ مثلاً راست بازی، امانت و دیانت، ہمدردی و غم گساری اور دیگر اخلاقی
خوبیاں۔ لیکن ایمان کی دولت سے یہ محروم ہے تو اس کے یہ اعمال، دنیا میں تو اس کی شہرت و نیک نامی کا ذریعہ ثابت ہو
سکتے ہیں لیکن اللہ کی بارگاہ میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی اس لیے کہ ان کا سرچشمہ ایمان نہیں ہے جو اچھے اعمال کو
عند اللہ بار آور بناتا ہے بلکہ صرف اور صرف دنیوی مفادات یا قومی اخلاق و عادات ان کی بنیاد ہے۔

(۳) گھنی، گہری، عمدہ اور پاکیزہ چھاؤں جس کو ترجمہ میں ”پوری راحت“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے
”جنت میں ایک درخت ہے جس کا سایہ اتنا ہے کہ ایک سو سو سال میں بھی اسے طے نہیں کر سکے گا یہ شجرۃ الجلد ہے۔
(مسند أحمد، جلد ۲، ص ۳۵۵، وأصله في البخاري، كتاب بدء الخلق باب نمبر ۸، ماجاء في صفة الجنة

اللہ تعالیٰ تمہیں تاکید حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انہیں پہنچاؤ! (۱) اور جب لوگوں کا فیصلہ کرو تو عدل و انصاف سے فیصلہ کرو! (۲) یقیناً وہ بہتر چیز ہے جس کی نصیحت تمہیں اللہ تعالیٰ کر رہا ہے۔ (۳) بے شک اللہ تعالیٰ سنتا ہے، دیکھتا ہے۔ (۵۸)

اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی اور فرمانبرداری کرو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اور تم میں سے اختیار والوں کی۔ (۴) پھر اگر کسی چیز میں اختلاف کرو

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿۵۸﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ

(۱) اکثر مفسرین کے نزدیک یہ آیت حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کی شان میں، جو خاندانی طور پر خانہ کعبہ کے دربان و کلید بردار چلے آ رہے تھے، نازل ہوئی ہے۔ کد فح ہونے کے بعد جب رسول اللہ ﷺ خانہ کعبہ میں تشریف لائے تو طواف وغیرہ کے بعد آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو جو صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمان ہو چکے تھے، طلب فرمایا اور انہیں خانہ کعبہ کی چابیاں دے کر فرمایا ”یہ تمہاری چابیاں ہیں آج کادون و فاور نیکی کادون ہے“ (ابن کثیر) آیت کا یہ سبب نزول اگرچہ خاص ہے لیکن اس کا حکم عام ہے اور اس کے مخاطب عوام اور حکام دونوں ہیں۔ دونوں کو تاکید ہے کہ امانتیں انہیں پہنچاؤ جو امانتوں کے اہل ہیں۔ اس میں ایک تو وہ امانتیں شامل ہیں جو کسی نہ کسی کے پاس رکھوائی ہوں۔ ان میں خیانت نہ کی جائے بلکہ یہ بحفاظت عند اللہ لوٹادی جائیں۔ دوسرے عمدے اور مناصب اہل لوگوں کو دیئے جائیں، محض سیاسی بنیاد یا نسلی و وطنی بنیاد یا قربابت و خاندانی بنیاد یا کوئی سسٹم کی بنیاد پر عمدہ و منصب دینا اس آیت کے خلاف ہے۔

(۲) اس میں حکام کو بطور خاص عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔ ”حاکم جب تک ظلم نہ کرے، اللہ اس کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ ظلم کا ارتکاب شروع کر دیتا ہے تو اللہ اسے اس کے اپنے نفس کے حوالے کر دیتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ کتاب الأحکام)

(۳) یعنی امانتیں اہل لوگوں کے سپرد کرنا اور عدل و انصاف مہیا کرنا۔

(۴) اولوالامر (اپنے میں سے اختیار والے) سے مراد بعض کے نزدیک امرا و حکام اور بعض کے نزدیک علماء و فقہا ہیں مفہوم کے اعتبار سے دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اصل اطاعت تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہے کیونکہ ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَالْحَقُّ وَالْكَرْمُ﴾ (الأعراف: ۵۳) ”خبردار مخلوق بھی اسی کی ہے، حکم بھی اسی کا ہے“ ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾ (یوسف: ۴۰) ”حکم صرف اللہ ہی کا ہے“ لیکن چونکہ رسول ﷺ خالص منشاء الہی ہی کا منظر اور اس کی مرضیات کا نمائندہ ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ رسول ﷺ کے حکم کو بھی مستقل طور پر واجب الطاعت قرار دیا اور فرمایا کہ رسول ﷺ

وَالرَّسُولَ إِنَّ كَلِمَتَهُ تُوْمِنُونَ بِأَنَّهُ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿۵۹﴾

اللَّهُ تَزَالُ الَّذِينَ يَرْعُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا نُزِّلَ إِلَيْكَ
وَمَا نُزِّلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا كَمَا لِيَ الْكَاغُوتِ

تو اسے لوٹاؤ، اللہ تعالیٰ کی طرف اور رسول کی طرف، اگر تمہیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے۔ یہ بہت بہتر ہے اور باعتبار انجام کے بہت اچھا ہے۔ (۵۹) (۱) کیا آپ نے انہیں نہیں دیکھا؟ جن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ جو کچھ آپ پر اور جو کچھ آپ سے پہلے اتارا گیا ہے اس

کی اطاعت وراصل اللہ کی اطاعت ہے۔ ﴿مَنْ طِيعَ الرَّسُولَ فَقَدْ طَاعَ اللَّهَ﴾ (النساء۔ ۸۰) ”جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی“ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حدیث بھی اسی طرح دین کا ماخذ ہے جس طرح قرآن کریم۔ تاہم امرا و حکام کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ کیونکہ وہ یا تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کا نفاذ کرتے ہیں۔ یا امت کے اجتماعی مصالح کا انتظام اور نگہداشت کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ امرا و حکام کی اطاعت اگرچہ ضروری ہے لیکن وہ علی الاطلاق نہیں بلکہ مشروط ہے اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ۔ اسی لیے أُطِيعُوا اللَّهَ کے بعد أُطِيعُوا الرَّسُولَ تو کہا کیونکہ یہ دونوں اطاعتیں مستقل اور واجب ہیں لیکن أُطِيعُوا أَوْلِي الْأَمْرِ نہیں کہا کیونکہ أَوْلِي الْأَمْرِ کی اطاعت مستقل نہیں اور حدیث میں بھی کہا گیا ہے۔ «لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ» (وقال الألبانی حدیث صحیح۔ مشکوٰۃ نمبر ۳۶۱۶ فی لفظ لمسلم لاطاعة فی معصية الله كتاب الإمامة باب وجوب طاعة الأمراء فی غیر معصية حدیث نمبر ۱۸۳۰ اور «إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ» صحیح بخاری کتاب الأحکام باب نمبر ۴) «السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ لِلْإِمَامِ مَا لَمْ تَكُنْ مَعْصِيَةً»۔ ”معصیت میں اطاعت نہیں، اطاعت صرف معروف میں ہے۔“ یہی حال علما و فقہا کا بھی ہے۔ (اگر اولوالامر میں ان کو بھی شامل کیا جائے) یعنی ان کی اطاعت اس لیے کرنی ہوگی کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام و فرمودات بیان کرتے ہیں اور اس کے دین کی طرف ارشاد و ہدایت اور رہنمائی کا کام کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ علما و فقہا بھی دینی امور و معاملات میں حکام کی طرح یقیناً مرجع عوام ہیں۔ لیکن ان کی اطاعت بھی صرف اس وقت تک کی جائے گی جب تک کہ عوام کو صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات بتلائیں لیکن اگر وہ اس سے انحراف کریں تو عوام کے لیے ان کی اطاعت بھی ضروری نہیں بلکہ انحراف کی صورت میں جانتے بوجھتے ان کی اطاعت کرنا سخت معصیت اور گناہ ہے۔

(۱) اللہ کی طرف لوٹانے سے مراد، قرآن کریم اور الرسول ﷺ سے مراد اب حدیث رسول ہے۔ یہ تنازعات کے ختم کرنے کے لیے ایک بہتر اصول بتلادیا گیا ہے۔ اس اصول سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی تیسری شخصیت کی اطاعت واجب نہیں۔ جس طرح تقلید شخصی یا تقلید معین کے قائلین نے ایک تیسری اطاعت کو واجب قرار دے رکھا ہے اور اسی تیسری اطاعت نے، جو قرآن کی اس آیت کے صریح مخالف ہے، مسلمانوں کو امت متحدہ کی بجائے امت منتشر بنا رکھا ہے اور ان کے اتحاد کو تقریباً ناممکن بنا دیا ہے۔

پر ان کا ایمان ہے، لیکن وہ اپنے فیصلے غیر اللہ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ شیطان کا انکار کریں، شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ انہیں بہکا کر دور ڈال دے۔ (۶۰)

ان سے جب کبھی کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ کلام کی اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف آؤ تو آپ دیکھ لیں گے کہ یہ منافق آپ سے منہ پھیر کر رکے جاتے ہیں۔ (۶۱)

پھر کیا بات ہے کہ جب ان پر ان کے کروت کے باعث کوئی مصیبت آ پڑتی ہے تو پھر یہ آپ کے پاس آ کر اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمارا ارادہ تو صرف بھلائی اور میل ملاپ ہی کا تھا۔ (۶۲)

یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے دلوں کا بھید اللہ تعالیٰ پر بخوبی روشن ہے، آپ ان سے چشم پوشی کیجئے، انہیں نصیحت کرتے رہیے اور انہیں وہ بات کہئے! جو ان کے دلوں میں گھر کرنے والی ہو۔ (۶۳)

وَقَدْ أَمَرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝

وَلَدَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتُ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا ۝

كَذِبَتْ إِذَا أصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيَهُمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَخْلِفُونَ رَبَّكَ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا أَحْسَانًا وَّتُؤْتِيَانَا ۝

أُولَئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَكَبِّرْ لَهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ۝

(۱) یہ آیات ایسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئیں جو اپنا فیصلہ عدالت میں لے جانے کے بجائے سردارانِ یہود یا سردارانِ قریش کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ تاہم اس کا حکم عام ہے اور اس میں تمام وہ لوگ شامل ہیں جو کتاب و سنت سے اعراض کرتے ہیں اور اپنے فیصلوں کے لئے ان دونوں کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف جاتے ہیں۔ ورنہ مسلمانوں کا حال تو یہ ہوتا ہے ﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ (النور-۵۱) کہ جب انہیں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو وہ کہتے ہیں کہ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ایسے ہی لوگوں کے بارے میں آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ ”یہی لوگ کامیاب ہیں“

(۲) یعنی جب اپنے اس کروت کی وجہ سے عتاب الہی کا شکار ہو کر مصیبتوں میں پھنستے ہیں تو پھر آ کر کہتے ہیں کہ کسی دوسری جگہ جانے سے مقصد یہ نہیں تھا کہ وہاں سے ہم فیصلہ کروائیں یا آپ ﷺ سے زیادہ ہمیں وہاں انصاف ملے گا بلکہ مقصد صلح اور ملاپ کرنا تھا۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگرچہ ہم ان کے دلوں کے تمام بھیدوں سے واقف ہیں (جس پر ہم انہیں جزا دیں گے) لیکن

ہم نے ہر ہر رسول کو صرف اسی لئے بھیجا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی فرمانبرداری کی جائے اور اگر یہ لوگ جب انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، تیرے پاس آ جاتے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے اور رسول بھی ان کے لئے استغفار کرتے،^(۱) تو یقیناً یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو معاف کرنے والا مہربان پاتے۔ (۶۴)

سو قسم ہے تیرے پروردگار کی! یہ مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ تمام آپس کے اختلاف میں آپ کو حاکم نہ مان لیں، پھر جو فیصلے آپ ان میں کر دیں ان سے اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی اور ناخوشی نہ پائیں اور فرمانبرداری کے ساتھ قبول کر لیں^(۲) (۶۵)

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا ﴿۶۵﴾

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِي مَا بَيْنَهُمْ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيكَ آفِيَةً ۖ وَجَاءَ بِمَا قَضَيْتَ وَيَسْئَلُوكَ اسْتِغْفَارًا ﴿۶۶﴾

اے پیغمبر! آپ ان کے ظاہر کو سامنے رکھتے ہوئے درگزر ہی فرمائیے اور وعظ و نصیحت اور قولِ بلیغ کے ذریعے سے ان کے اندر کی اصلاح کی کوشش جاری رکھئے! جس سے یہ معلوم ہوا کہ دشمنوں کی سازش کو عفو و درگزر، وعظ و نصیحت اور قولِ بلیغ کے ذریعے سے ہی ناکام بنانے کی سعی کی جانی چاہیے۔

(۱) مغفرت کے لئے بارگاہِ الہی میں ہی توبہ و استغفار ضروری اور کافی ہے۔ لیکن یہاں ان کو کہا گیا کہ اے پیغمبر! وہ تیرے پاس آتے اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور تو بھی ان کے لئے مغفرت طلب کرتا۔ یہ اس لئے کہ چونکہ انہوں نے فصلِ خصومات (جھگڑوں کے فیصلے) کے لئے دوسروں کی طرف رجوع کر کے آپ ﷺ کا استخفاف کیا تھا۔ اس لئے اس کے ازالے کے لئے آپ ﷺ کے پاس آنے کی تاکید کی۔

(۲) اس آیت کی شانِ نزول میں ایک یہودی اور مسلمان کا واقعہ عموماً بیان کیا جاتا ہے جو بارگاہِ رسالت سے فیصلے کے باوجود حضرت عمرؓ سے فیصلہ کروانے گیا جس پر حضرت عمرؓ نے اس مسلمان کا سر قلم کر دیا۔ لیکن سند ایہ واقعہ صحیح نہیں ہے جیسا کہ ابن کثیر نے بھی وضاحت کی ہے۔ صحیح واقعہ جو اس آیت کے نزول کا سبب ہے وہ یہ ہے کہ حضرت زبیرؓ کا جو رسول اللہ ﷺ کے چھوٹے زاد تھے۔ اور ایک آدمی کا کھیت کو سیراب کرنے والے (نالے) کے پانی پر جھگڑا ہو گیا۔ معاملہ نبی ﷺ تک پہنچا آپ ﷺ نے صورت حال کا جائزہ لے کر جو فیصلہ دیا تو وہ اتفاق سے حضرت زبیرؓ سے تھا۔ جس پر دوسرے آدمی نے کہا کہ آپ ﷺ نے یہ فیصلہ اس لئے کیا ہے کہ وہ آپ ﷺ کا چھوٹے زاد ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (صحیح بخاری تفسیر سورۃ النساء) آیت کا مطلب یہ ہوا کہ نبی ﷺ کی کسی بات یا فیصلے سے اختلاف تو کجا، دل میں انقباض بھی محسوس کرنا ایمان کے منافی ہے۔ یہ آیت بھی منکرینِ حدیث کے لیے

اور اگر ہم ان پر یہ فرض کر دیتے کہ اپنی جانوں کو قتل کر ڈالو! یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ! تو اسے ان میں سے بہت ہی کم لوگ بجالاتے اور اگر یہ وہی کریں جس کی انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو یقیناً یہی ان کے لئے بہتر اور بہت زیادہ مضبوطی والا ہو۔^(۱) (۶۶)

اور تب تو انہیں ہم اپنے پاس سے بڑا ثواب دیں۔ (۶۷)
اور یقیناً انہیں راہ راست دکھادیں۔ (۶۸)
اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فرمانبرداری کرے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے، جیسے نبی اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ، یہ بہترین رفیق ہیں۔^(۲) (۶۹)

وَلَوْ أَنَا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ أَوْ احْرُقُوا
مِنْ دِيَارِكُمْ مَا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ وَلَوْ أَنَّهُمْ
فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَأَسَدًا تُبَيِّنَاتٌ ۝

وَأَلَّا آتَيْنَاهُمْ مِنْ دُونِهَا أَجْرًا عَظِيمًا ۝
وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۝

وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ
اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ
وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ۝

تو ہے ہی دیگر افراد کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے جو قول امام کے مقابلے میں حدیث صحیح سے انقباض ہی محسوس نہیں کرتے بلکہ یا تو کھلے لفظوں میں اسے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یا اس کی دور از کار تاویل کر کے یا ثقہ راویوں کو ضعیف باور کرا کے مسترد کرنے کی مذموم سعی کرتے ہیں۔

(۱) آیت میں انہی نافرمان قسم کے لوگوں کی جبلت ردیہ کی طرف اشارہ کر کے کہا جا رہا ہے کہ اگر انہیں حکم دیا جاتا کہ ایک دوسرے کو قتل کر دیا یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو، جب یہ آسان باتوں پر عمل نہیں کر سکتے تو اس پر عمل کس طرح کر سکتے تھے؟ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے مطابق ان کی بابت فرمایا ہے جو یقیناً واقعات کے مطابق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سخت حکموں پر عمل تو یقیناً مشکل ہے لیکن اللہ تعالیٰ بہت شفیق اور مہربان ہے، اس کے احکامات بھی آسان ہیں۔ اس لیے اگر وہ ان حکموں پر چلیں جن کی ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو یہ ان کے لیے بہتر اور ثابت قدمی کا باعث ہو۔ کیونکہ ایمان اطاعت سے زیادہ اور معصیت سے کم ہوتا ہے۔ نیکی سے نیکی کا راستہ کھلتا اور بدی سے بدی متولد ہوتی ہے۔ یعنی اس کا راستہ کشادہ اور آسان ہوتا ہے۔

(۲) اللہ ورسول کی اطاعت کا صلہ بتلایا جا رہا ہے اس لیے حدیث میں آتا ہے «الْعَمْرُءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ» (صحیح بخاری کتاب الآداب باب نمبر ۷۷، علامہ حب اللہ عزوجل مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب باب المرء مع من أحب حدیث نمبر ۱۶۳۰) آدمی انہی کے ساتھ ہو گا جن سے اس کو محبت ہوگی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ «صحابہ رضی اللہ عنہم کو جتنی خوشی اس فرمان رسول کو سن کر ہوئی اتنی خوشی کبھی نہیں ہوئی۔» کیونکہ وہ جنت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت پسند کرتے تھے۔ اس کی شان نزول کی روایات میں بتایا گیا ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے

ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عٰلِمًا ۝۶

یہ فضل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور کافی ہے اللہ تعالیٰ جاننے والا۔ (۷۰)

اے مسلمانو! اپنے بچاؤ کا سامان لے لو (۱) پھر گروہ گروہ بن کر کوچ کرو یا سب کے سب اکٹھے ہو کر نکل کھڑے ہو! (۷۱)

اور یقیناً تم میں بعض وہ بھی ہیں جو پس و پیش کرتے ہیں، (۲) پھر اگر تمہیں کوئی نقصان ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا۔ (۷۲)

اور اگر تمہیں اللہ تعالیٰ کا کوئی فضل (۳) مل جائے تو اس طرح کہ گویا تم میں ان میں دوستی تھی ہی نہیں، (۳) کہتے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبٰتًا اَوْ اَنْفِرُوْا جَبِيْعًا ۝۷

وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيَبْطِئَنَّ ۚ وَاِنْ اَصَابَكُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْا قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلٰۤى اِذْ لَمْ اَكُنْ مَعَهُمْ شٰهِيْدًا ۝۷

وَ اِنَّ اَصٰبَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيُبَيِّنُوْنَ ۙ كَاَنْ لَّمْ يَكُنْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُ مَوَدَّةٌ يَّابِتٌۢ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُمْ

یہ عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے گا اور ہمیں اس سے فروتر مقام ہی ملے گا اور یوں ہم آپ ﷺ کی اس صحبت و رفاقت اور دیر سے محروم رہیں گے جو ہمیں دنیا میں حاصل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتار کر ان کی تسلی کا سامان فرمایا۔ (ابن کثیر) بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے بطور خاص نبی ﷺ سے جنت میں رفاقت کی درخواست کی «أَسْأَلُكَ مُرَافَقَتَكَ فِي الْجَنَّةِ» جس پر نبی ﷺ نے انہیں کثرت سے نقلی نماز پڑھنے کی تاکید فرمائی «فَأَعْيَتِي عَلَى نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُودِ» (صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ باب فضل السجود والحث علیہ حدیث نمبر ۳۸۸) «پس تم کثرت سجد کے ساتھ میری مدد کرو۔» علاوہ ازیں ایک اور حدیث ہے۔ «التَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْأَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّ وَالصَّيْدِيْقَيْنِ وَالشَّهَدَاءِ» (ترمذی۔ کتاب البیوع باب ما جاء فی التجار و تسمیة النسی رضی اللہ عنہم ایہم) راست باز امانت دار تاجر انبیا، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہو گا۔ «صدیقیت، کمال ایمان و کمال اطاعت کا نام ہے، نبوت کے بعد اس کا مقام ہے، امت محمدیہ میں اس مقام میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سب سے ممتاز ہیں۔ اور اسی لیے بلا تفاق غیر انبیا میں وہ نبی ﷺ کے بعد افضل ہیں، صالح وہ ہے جو اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کا مل طور پر ادا کرے اور ان میں کوتاہی نہ کرے۔

(۱) حِذْرُكُمْ (اپنا بچاؤ اختیار کرو) اسلحہ اور سامان جنگ اور دیگر ذرائع سے۔

(۲) یہ منافقین کا ذکر ہے۔ پس و پیش کا مطلب، جماد میں جانے سے گریز کرتے اور پیچھے رہ جاتے ہیں۔

(۳) یعنی جنگ میں فتح و غلبہ اور غنیمت۔

(۴) یعنی گویا وہ تمہارے اہل دین میں سے ہی نہیں بلکہ اجنبی ہیں۔

ہیں کاش! میں بھی ان کے ہمراہ ہوتا تو بڑی کامیابی کو پہنچتا۔^(۱) (۷۳)

پس جو لوگ دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے بیچ چکے ہیں،^(۲) انہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا چاہئے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے شہادت پا لے یا غالب آجائے، یقیناً ہم اسے بہت بڑا ثواب عنایت فرمائیں گے۔ (۷۴)

بھلا کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان ناتواں مردوں، عورتوں اور ننھے ننھے بچوں کے چھٹکارے کے لئے جہاد نہ کرو؟ جو یوں دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ان ظالموں کی ہستی سے ہمیں نجات دے اور ہمارے لئے خود اپنے پاس سے حمایتی مقرر کر دے اور ہمارے لئے خاص اپنے پاس سے مددگار بنا۔^(۳) (۷۵)

فَأُولَٰئِكَ قَوْلًا عَظِيمًا ۝

فَلْيَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا
بِالْآخِرَةِ ۚ وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ
أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝

وَمَا لَكُمْ لَأَنْتُمْ تُلَاحِقُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ
مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ
رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا
وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۗ وَاجْعَلْ لَنَا
مِنْ لَدُنْكَ قَصِيرًا ۝

(۱) یعنی مال غنیمت سے حصہ حاصل کرنا جو اہل دنیا کاسب سے اہم مقصد ہوتا ہے۔

(۲) شَرَىٰ يَشْرِي کے معنی بیچنے کے بھی آتے ہیں اور خریدنے کے بھی۔ متن میں پہلا ترجمہ اختیار کیا گیا ہے اس اعتبار سے فَلْيَقَاتِلْ کا فاعل ﴿الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا﴾ بنے گا لیکن اگر اس کے معنی خریدنے کے کیے جائیں تو اس صورت میں الَّذِينَ مفعول بنے گا اور فَلْيَقَاتِلْ کا فاعل، الْمُؤْمِنِينَ النَّافِلِينَ (راہ جہاد میں کوچ کرنے والے مومن) محذوف ہو گا۔ مومن ان لوگوں سے لڑیں جنہوں نے آخرت بیچ کر دنیا خرید لی۔ یعنی جنہوں نے دنیا کے تھوڑے سے مال کی خاطر اپنے دین کو فروخت کر دیا۔ مراد منافقین اور کافرین ہوں گے۔ (ابن کثیر نے یہی مفہوم بیان کیا ہے)

(۳) ظالموں کی ہستی سے مراد (نزول کے اعتبار سے) مکہ ہے۔ ہجرت کے بعد وہاں باقی رہ جانے والے مسلمان خاص طور پر بوڑھے مرد، عورتیں اور بچے، کافروں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر اللہ کی بارگاہ میں مدد کی دعا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کہ تم ان مستضعفین کو کفار سے نجات دلانے کے لیے جہاد کیوں نہیں کرتے؟ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے علما نے کہا کہ جس علاقے میں مسلمان اس طرح ظلم و ستم کا شکار اور نزعہ کفار میں گھرے ہوئے ہوں تو دوسرے مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان کو کافروں کے ظلم و ستم سے بچانے کے لیے جہاد کریں۔ یہ جہاد کی دوسری قسم ہے۔ پہلی قسم ہے اِعْلَاءُ كَلِمَةِ اللَّهِ یعنی دین کی نشرو اشاعت اور كَلِمَةِ اللَّهِ کے غلبے کے لیے لڑنا جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں اور مابعد کی آیت میں ہے۔

جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے سوا اوروں کی راہ میں لڑتے ہیں۔^(۱) پس تم شیطان کے دوستوں سے جنگ کرو! یقین مانو کہ شیطانی حیلہ (بالکل بودا اور) سخت کمزور ہے۔^(۲) (۷۶)

کیا تم نے انہیں نہیں دیکھا جنہیں حکم کیا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نمازیں پڑھتے رہو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔ پھر جب انہیں جہاد کا حکم دیا گیا تو اسی وقت ان کی ایک جماعت لوگوں سے اس قدر ڈرنے لگی جیسے اللہ تعالیٰ کا ڈر ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ، اور کہنے لگے اے ہمارے رب! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا؟^(۳)

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا ۝

الَّذِينَ تَرَى إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ فَالْتَمَسْنَا لِكَلْبِ عَلَيْهِمُ الْقِتَالَ إِذَا فَرَغُوا مِنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشِيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْ لَأَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ قُلْ

(۱) مومن اور کافر دونوں کو جنگوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن دونوں کے مقاصد جنگ میں عظیم فرق ہے، مومن اللہ کے لئے لڑتا ہے، محض طلب دنیا یا ہوس ملک گیری کی خاطر نہیں۔ جب کہ کافر کا مقصد یہی دنیا اور اس کے مفادات ہوتے ہیں۔

(۲) مومنوں کو ترغیب دی جا رہی ہے کہ طاعوتی مقاصد کے لئے حیلے اور مکر کمزور ہوتے ہیں، ان کے ظاہری اسباب کی فراوانی اور کثرت تعداد سے مت ڈرو تمہاری ایمانی قوت اور عزم جہاد کے مقابلے میں شیطان کے یہ حیلے نہیں ٹھہر سکتے۔

(۳) مکے میں مسلمان چونکہ تعداد اور وسائل کے اعتبار سے لڑنے کے قابل نہیں تھے۔ اس لئے مسلمانوں کی خواہش کے باوجود انہیں قتال سے روکے رکھا گیا اور دو باتوں کی تائید کی جاتی رہی، ایک یہ کہ کافروں کے ظالمانہ رویے کو صبر اور حوصلے سے برداشت کریں اور غمخورد رگزر سے کام لیں۔ دوسرے یہ کہ نماز زکوٰۃ اور دیگر عبادات و تعلیمات پر عمل کا اہتمام کریں تا کہ اللہ تعالیٰ سے ربط و تعلق مضبوط بنیادوں پر استوار ہو جائے۔ لیکن ہجرت کے بعد جب مدینہ میں مسلمانوں کی طاقت جمع ہو گئی تو پھر انہیں قتال کی اجازت دے دی گئی اور جب اجازت دے دی گئی تو بعض لوگوں نے کمزوری اور پست ہمتی کا اظہار کیا۔ اس پر آیت میں کمی دور کی ان کی آرزو یاد دلا کر کہا جا رہا ہے کہ اب یہ مسلمان حکم جہاد میں کھڑے ہو رہے ہیں جب کہ یہ حکم جہاد خود ان کی اپنی خواہش کے مطابق ہے۔ آیت قرآن میں تحریف: آیت کا پہلا حصہ جس میں كَفَّ أَيْدِيْهِمْ (لڑائی سے ہاتھ روک رکھنے) کا حکم ہے۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ نماز میں رکوع سے اٹھتے وقت رفع الیدین نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نماز کی حالت میں ہاتھوں کو روک رکھنے کا حکم دیا ہے۔ یہ ایک

کیوں ہمیں تھوڑی سی زندگی اور نہ جینے دی؟^(۱) آپ کہہ دیجئے کہ دنیا کی سود مندی تو بہت ہی کم ہے اور پرہیز گاروں کے لئے تو آخرت ہی بہتر ہے اور تم پر ایک دھاگے کے برابر بھی ستم روانہ رکھا جائے گا۔ (۷۷)

تم جہاں کہیں بھی ہو موت تمہیں آپکڑے گی، گو تم مضبوط قلعوں میں ہو^(۲) اور اگر انہیں کوئی بھلائی ملتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اگر کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ تیری طرف سے ہے۔^(۳) انہیں کہہ دو کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ انہیں کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات سمجھنے

مَتَاءُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝

أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَدْرِكَكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشِيدَةٍ وَإِن تُبْهِمُوا حَسَنَةً يَقُولُوا هٰذَا مِن عِنْدِ اللّٰهِ وَإِن تُبْهِمُوهُمُ سَيِّئَةً يَقُولُوا هٰذَا مِن عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حٰدِيَةً ۝

انتہائی غلط اور وہابیت استدلال ہے۔ اس کے لئے ان صاحب نے آیت کے الفاظ میں بھی تحریف کی اور معنی میں بھی۔ یعنی لفظی اور معنوی دونوں قسم کے تحریف سے کام لیا ہے۔

(۱) اس کا دوسرا ترجمہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس حکم کو کچھ اور مدت کے لئے موخر کیوں نہ کر دیا یعنی اَجَلٍ قَرِيبٍ سے مراد موت یا فرض جہاد کی مدت ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

(۲) ایسے کمزور مسلمانوں کو سمجھانے کے لئے کہا جا رہا ہے کہ ایک تو یہ دنیا فانی اور اس کا فائدہ عارضی ہے جس کے لئے تم کچھ مہلت طلب کر رہے ہو۔ اس کے مقابلے میں آخرت بہت بہتر اور پائیدار ہے جس کے اطاعت الہی کے صلے میں تم سزاوار ہو گے۔ دوسرے یہ کہ جہاد کرو یا نہ کرو، موت تو اپنے وقت پر آکر رہے گی چاہے تم مضبوط قلعوں میں بند ہو کر بیٹھ جاؤ پھر جہاد سے گریز کا کیا فائدہ؟ مضبوط برجوں سے مراد مضبوط اور بلند وبالا فصیلوں والے قلعے ہیں۔

ملحوظہ: بعض مسلمانوں کا چونکہ یہ خوف بھی طبعی تھا۔ اسی طرح تاخیر کی خواہش بھی بطور اعتراض یا انکار نہ تھی، بلکہ طبعی خوف کا ایک منطقی نتیجہ تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما دیا اور نہایت مضبوط دلائل سے انہیں سہارا اور حوصلہ دیا۔

(۳) یہاں سے پھر منافقین کی باتوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ سابقہ امت کے منکرین کی طرح انہوں نے بھی کہا کہ بھلائی (خوش حالی، غنہ کی پیداوار، مال و اولاد کی فراوانی وغیرہ) اللہ کی طرف سے ہے اور برائی (قحط سالی، مال و دولت میں کمی وغیرہ) اسے محمد (ﷺ)! تیری طرف سے ہے یعنی تیرے دین اختیار کرنے کے نتیجے میں یہ ابتلا آئی۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قوم فرعون کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ”جب ان کو بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں، یہ ہمارے لیے ہے (یعنی ہم اس کے مستحق ہیں) اور جب ان کو کوئی برائی پہنچتی ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں سے بد شکوئی پکڑتے ہیں، (یعنی نعوذ باللہ ان کی نحوست کا نتیجہ بتلاتے ہیں)“ (الأعراف: ۱۳۱)

کے بھی قریب نہیں۔^(۱) (۷۸)

تجھے جو بھلائی ملتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے^(۲) اور جو برائی پہنچتی ہے وہ تیرے اپنے نفس کی طرف سے ہے،^(۳) ہم نے تجھے تمام لوگوں کو پیغام پہنچانے والا بنا کر بھیجا ہے اور اللہ تعالیٰ گواہ کافی ہے۔ (۷۹)

اس رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو اطاعت کرے اسی نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی اور جو منہ پھیر لے تو ہم نے آپ کو کچھ ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔ (۸۰)

یہ کہتے تو ہیں کہ اطاعت ہے، پھر جب آپ کے پاس سے اٹھ کر باہر نکلتے ہیں تو ان میں کی ایک جماعت، جو بات آپ نے یا اس نے کہی ہے اس کے خلاف راتوں کو مشورے کرتی ہے،^(۴) ان کی راتوں کی بات چیت اللہ لکھ رہا ہے، تو آپ ان سے منہ پھیر لیں اور اللہ پر

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَأَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ وَأَنْتَ لِلنَّاسِ رَسُولٌ وَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا ۝۴۱

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ وَمَنْ تَوَلَّى فَمَا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَافِيًا ۝

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَّوْا مِنْ عِنْدِكَ بَدَّتْ كَلِمَةُ اللَّهِ مِنْهُمْ عِبْرَاتٍ لِيُنذِرَ لِقَوْمٍ الَّذِينَ يُنذِرُونَ فَأَنْزَلْنَا عَنْهُمْ وَالْوَكِيلَ عَلَى اللَّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝۴۱

(۱) یعنی بھلائی اور برائی دونوں اللہ کی طرف سے ہی ہے لیکن یہ لوگ قلت فہم و علم اور کثرت جہل و ظلم کی وجہ سے اس بات کو سمجھ نہیں پاتے۔

(۲) یعنی اس کے فضل و کرم سے ہے یعنی کسی نیکی یا اطاعت کا صلہ نہیں ہے۔ کیونکہ نیکی کی توفیق بھی دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ علاوہ ازیں اسکی نعمتیں اتنی بے پایاں ہیں کہ ایک انسان کی عبادت و طاعت اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔ اسی لیے ایک حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا جنت میں جو بھی جائے گا، محض اللہ کی رحمت سے جائے گا (اپنے عمل کی وجہ سے نہیں) صحابہ اللہ ﷺ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ولانت آپ ﷺ بھی اللہ کی رحمت کے بغیر جنت میں نہیں جائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”ہاں جب تک اللہ مجھے بھی اپنے دامن رحمت میں نہیں ڈھانک لے گا جنت میں نہیں جاؤں گا۔“ (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمدامۃ علی العمل، ۱۸)

(۳) یہ برائی بھی اگرچہ اللہ کی مشیت سے ہی آتی ہے۔ جیسا کہ کل من عند اللہ سے واضح ہے لیکن یہ برائی کسی گناہ کی عقوبت یا اس کا بدلہ ہوتی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ یہ تمہارے نفس سے ہے یعنی تمہاری غلطیوں، کوتاہیوں اور گناہوں کا نتیجہ ہے۔ جس طرح فرمایا ﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعَوَّاعُنَ كَيْتَابٌ﴾ (الشوریٰ، ۳۰)

”تمہیں جو مصیبت پہنچتی ہے، وہ تمہارے اپنے عملوں کا نتیجہ ہے اور بہت سے گناہ تو معاف ہی فرماتا ہے۔“
(۴) یعنی یہ منافقین آپ ﷺ کی مجلس میں جو باتیں ظاہر کرتے ہیں۔ راتوں کو ان کے برعکس باتیں کرتے اور

بھروسہ رکھیں، اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہے۔ (۸۱)
 کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ تعالیٰ
 کے سوا کسی اور کی طرف سے ہو تا تو یقیناً اس میں بہت
 کچھ اختلاف پاتے۔^(۱) (۸۲)

جہاں انہیں کوئی خبر امن کی یا خوف کی ملی انہوں نے
 اسے مشہور کرنا شروع کر دیا، حالانکہ اگر یہ لوگ اسے
 رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور اپنے میں سے ایسی
 باتوں کی تمہ تک پہنچنے والوں کے حوالے کر دیتے، تو اس
 کی حقیقت وہ لوگ معلوم کر لیتے جو نتیجہ اخذ کرتے
 ہیں^(۲) اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر
 نہ ہوتی تو معدودے چند کے علاوہ تم سب شیطان کے
 پیروکار بن جاتے۔ (۸۳)

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ
 لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ
 إِلَى الرَّسُولِ وَالْإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ
 مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَفُتِنْتُمْ بِالشَّيْطَانِ
 الْأَقْبَلِينَ ۝

سازشوں کے جال بنتے ہیں۔ آپ ﷺ ان سے اعراض کریں اور اللہ پر توکل کریں۔ ان کی باتیں اور سازشیں آپ
 ﷺ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی کیونکہ آپ کا وکیل اور کارساز اللہ ہے۔

(۱) قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے اس میں غور و تدبر کی تاکید کی جا رہی ہے اور اس کی صداقت جانچنے
 کے لئے ایک معیار بھی بتلایا گیا ہے کہ اگر یہ کسی انسان کا بنایا ہوا کلام ہو تا (جیسا کہ کفار کا خیال ہے) تو اس کے مضامین
 اور بیان کردہ واقعات میں تعارض و تناقص ہوتا۔ کیونکہ ایک تو یہ کوئی چھوٹی سے کتاب نہیں ہے۔ ایک ضخیم اور مفصل
 کتاب ہے، جس کا ہر حصہ اعجاز و بلاغت میں ممتاز ہے۔ حالانکہ انسان کی بنائی ہوئی بڑی تصنیف میں زبان کا معیار اور
 اس کی فصاحت و بلاغت قائم نہیں رہتی۔ دوسرے، اس میں پچھلی قوموں کے واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ جنہیں
 اللہ علام الغیوب کے سوا کوئی اور بیان نہیں کر سکتا۔ تیسرے ان حکایات و قصص میں نہ باہمی تعارض و تضاد ہے اور نہ
 ان کا چھوٹے سے چھوٹا کوئی جزئیہ قرآن کی کسی اصل سے ٹکراتا ہے۔ حالانکہ ایک انسان گزشتہ واقعات بیان کرے تو
 تسلسل کی کڑیاں ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہیں اور ان کی تفصیلات میں تعارض و تضاد واقع ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کے ان تمام
 انسانی کوتاہیوں سے مبرا ہونے کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ یقیناً کلام الہی ہے جو اس نے فرشتے کے ذریعے سے اپنے
 آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمایا ہے۔

(۲) یہ بعض کمزور اور جلد باز مسلمانوں کا رویہ، ان کی اصلاح کی غرض سے بیان کیا جا رہا ہے۔ امن کی خبر سے مراد
 مسلمانوں کی کامیابی اور دشمن کی ہلاکت و شکست کی خبر ہے۔ (جس کو سن کر امن اور اطمینان کی لہر دوڑ جاتی ہے اور جس
 کے نتیجے میں بعض دفعہ ضرورت سے زیادہ پراعتمادی پیدا ہو جاتی ہے جو نقصان کا باعث بن سکتی ہے) اور خوف کی خبر

تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتا رہے، تجھے صرف تیری ذات کی نسبت حکم دیا جاتا ہے، ہاں ایمان والوں کو رغبت دلاتا رہے، بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی جنگ کو روک دے اور اللہ تعالیٰ سخت قوت والا ہے اور سزا دینے میں بھی سخت ہے۔ (۸۴)

جو شخص کسی نیکی یا بھلے کام کی سفارش کرے، اسے بھی اس کا کچھ حصہ ملے گا اور جو برائی اور بدی کی سفارش کرے اس کے لئے بھی اس میں سے ایک حصہ ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ (۸۵)

اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس سے اچھا جواب دو یا انہی الفاظ کو لوٹا دو،^(۱) بے شبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ (۸۶)

اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں وہ تم سب کو یقیناً قیامت کے دن جمع کرے گا، جس کے (آنے) میں کوئی شک نہیں، اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچی بات والا اور کون ہو گا۔ (۸۷)

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ
الْمُؤْمِنِينَ عَلَى اللَّهِ أَنْ يَكْفَىٰ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاللَّهُ أَشَدُّ
بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا ۝

مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِنْهَا وَمَنْ يَشْفَعْ
شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِنْهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ
مُقِيبًا ۝

وَأِذْ أُخِيذُكُمْ بِبَيْتِكُمْ لِيُحَافَظُوا فِيهَا وَأَوْذَوْهَا لِئِنْ أَلَّفَهُ
كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ۝

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لِيَجْعَلَ لَكُمْ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ لَدَرَجَاتٍ فِيهِ
وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ۝

سے مراد مسلمانوں کی شکست اور ان کے قتل و ہلاکت کی خبر ہے، (جس سے مسلمانوں میں افسردگی پھیلنے اور ان کے حوصلے پست ہونے کا امکان ہوتا ہے) اس لیے انہیں کہا جا رہا ہے کہ اس قسم کی خبریں، چاہے امن کی ہوں یا خوف کی انہیں سن کر عام لوگوں میں پھیلانے کے بجائے رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچا دو یا اہل علم و تحقیق میں انہیں پہنچا دو تاکہ وہ یہ دیکھیں کہ یہ خبر صحیح ہے یا غلط؟ اگر صحیح ہے تو اس وقت اس سے مسلمانوں کا باخبر ہونا مفید ہے یا بے خبر رہنا نفع ہے؟ یہ اصول ویسے تو عام حالات میں بھی بڑا اہم اور نہایت مفید ہے لیکن عین حالت جنگ میں تو اس کی اہمیت و افادیت بہت ہی زیادہ ہے۔ اسْتَنْبَاطُ كَامَادِهِ نَبْطُ هُوَ نَبْطُ اس پانی کو کہتے ہیں جو کنواں کھودتے وقت سب سے پہلے نکلتا ہے۔

اسی لیے اسْتَنْبَاطُ تَحْقِيقِ اور بات کی تمہ تک پہنچنے کو کہا جاتا ہے۔ (فتح القدیر)

(۱) نَجِيَّةٌ اصل میں نَجِيَّةٌ (نَفْعَلَةٌ) ہے۔ یا کے یا میں ادغام کے بعد نَجِيَّةٌ ہو گیا۔ اس کے معنی ہیں۔ درازی عمر کی دعا (الدُّعَاءُ بِالْحَيَاةِ) میں یہ سلام کرنے کے معنی میں ہے۔ (فتح القدیر) زیادہ اچھا جواب دینے کی تفسیر حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ السلام علیکم کے جواب میں ورحمۃ اللہ کا اضافہ اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ کے جواب میں وبراکۃ کا اضافہ

تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کہ منافقوں کے بارے میں دو گروہ ہو رہے ہو؟^(۱) انہیں تو ان کے اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اوندھا کر دیا ہے۔^(۲) اب کیا تم یہ منصوبے باندھ رہے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے گمراہ کئے ہوؤں کو تم راہ راست پر لا کھڑا کرو، جسے اللہ تعالیٰ راہ بھلا دے تو ہرگز اس کے لئے کوئی راہ نہ پائے گا۔^(۳) (۸۸)

ان کی تو چاہت ہے کہ جس طرح کے کافروہ ہیں تم بھی ان کی طرح کفر کرنے لگو اور پھر سب یکساں ہو جاؤ، پس جب تک یہ اسلام کی خاطر وطن نہ چھوڑیں ان میں سے کسی کو حقیقی دوست نہ بناؤ،^(۴) پھر اگر یہ منہ پھیر لیں تو

قَدَاكَ لُكُوفِي الْمُنْفِقِينَ فَتَعَبْنَا وَنَحْنُ كَمَا كُنَّا
أَتْرِيدُونَ أَنْ تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ وَمَنْ يُضِلَّ اللَّهُ
فَلَنْ يَجْعَلَ لَهُ سَبِيلًا ۝

وَذُوَا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً قَلِيلًا
تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَهْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَإِن
تَوَلَّوْا فَعَدُوًّا لَهُمُ اللَّهُ وَقَاتِلُهُمْ حَتَّىٰ وَجَدْتُمُوهُمْ

کر دیا جائے۔ لیکن اگر کوئی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہے تو پھر اضافے کے بغیر انہی الفاظ میں جواب دیا جائے۔ (ابن کثیر) ایک اور حدیث میں ہے کہ صرف السلام علیکم کہنے سے دس نیکیاں اس کے ساتھ ورحمۃ اللہ کہنے سے بیس نیکیاں اور برکاتہ بھی کہنے سے تیس نیکیاں ملتی ہیں۔ (مسند أحمد، جلد ۲، ص ۳۳۹، ۳۴۰) یاد رہے کہ یہ حکم مسلمانوں کے لیے ہے، یعنی ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان کو سلام کرے۔ لیکن اہل ذمہ یعنی یہود و نصاریٰ کو سلام کرنا ہو تو ایک تو ان کو سلام کرنے میں پہل نہ کی جائے۔ دوسرے اضافہ نہ کیا جائے بلکہ صرف وعلیکم کے ساتھ جواب دیا جائے۔ (صحیح بخاری، کتاب الاستیذان - مسلم، کتاب السلام)

(۱) یہ استفہام انکار کے لئے ہے، یعنی تمہارے درمیان ان منافقین کے بارے میں اختلاف نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ان منافقین سے مراد وہ ہیں جو احد کی جنگ میں مدینہ سے کچھ دور جا کر واپس آ گئے تھے، کہ ہماری بات نہیں مانی گئی۔ (صحیح بخاری سورۃ النساء صحیح مسلم کتاب المنافقین) جیسا کہ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ ان منافقین کے بارے میں اس وقت مسلمانوں کے دو گروہ بن گئے، ایک گروہ کا کہنا تھا کہ ہمیں ان منافقین سے (بھی) لڑنا چاہئے۔ دوسرا گروہ اسے مصلحت کے خلاف سمجھتا تھا۔

(۲) كَسَبُوا (اعمال) سے مراد، رسول کی مخالفت اور جہاد سے اعراض ہے اَزْكَسَهُمْ اوندھا کر دیا۔ یعنی جس کفر و ضلالت سے نکلے تھے، اسی میں مبتلا کر دیا، یا اس کے سبب ہلاک کر دیا۔

(۳) جس کو اللہ گمراہ کر دے یعنی مسلسل کفر و عناد کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دے، انہیں کوئی راہ یاب نہیں کر سکتا۔

(۴) ہجرت (ترک وطن) اس بات کی دلیل ہو گی کہ اب یہ مخلص مسلمان بن گئے ہیں۔ اس صورت میں ان سے دوستی اور محبت جائز ہو گی۔

وَلَا تَكْفُرُوا بِهِمْ وَإِلَيْكُمْ رُجُوعُكُمْ ۝۹

انہیں پکڑو^(۱) اور قتل کرو جہاں بھی یہ ہاتھ لگ جائیں،^(۲) خبردار! ان میں سے کسی کو اپنا رفیق اور مددگار نہ سمجھ بیٹھنا۔ (۸۹)

سوائے ان کے جو اس قوم سے تعلق رکھتے ہوں جن سے تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے یا جو تمہارے پاس اس حالت میں آئیں کہ تم سے جنگ کرنے سے بھی تنگ دل ہیں اور اپنی قوم سے بھی جنگ کرنے سے تنگ دل ہیں^(۳) اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انہیں تم پر مسلط کر دیتا اور وہ تم سے یقیناً جنگ کرتے،^(۴) پس اگر یہ لوگ تم سے کنارہ کشی اختیار کر لیں اور تم سے لڑائی نہ کریں اور تمہاری جانب صلح کا پیغام ڈالیں،^(۵) تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان پر کوئی راہ لڑائی کی نہیں کی۔ (۹۰)

إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مَبِئَاتٌ أَوْ جَاءَوكُمْ حَصْرَتٌ مِّنْ دُونِهِمْ أَنْ يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقْتُلُوكُمْ وَإِنْ عَزَمْتُمْ لَمَاتُوا بِكُمُ الْيَوْمَ الْيَوْمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ۝۱۰

(۱) یعنی جب تمہیں ان پر قدرت و طاقت حاصل ہو جائے۔

(۲) حل ہو یا حرم۔

(۳) یعنی جن سے لڑنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس سے دو قسم کے لوگ مستثنیٰ ہیں۔ ایک وہ لوگ جو ایسی قوم سے ربط و تعلق رکھتے ہیں یعنی ایسی قوم کے فرد ہیں یا اس کی پناہ میں ہیں جس قوم سے تمہارا معاہدہ ہے۔ دوسرے وہ جو تمہارے پاس اس حال میں آتے ہیں کہ ان کے سینے اس بات سے تنگ ہیں کہ وہ اپنی قوم سے مل کر تم سے یا تم سے مل کر اپنی قوم سے جنگ کریں یعنی تمہاری حمایت میں لڑنا پسند کرتے ہیں نہ تمہاری مخالفت میں۔

(۴) یعنی یہ اللہ کا احسان ہے کہ ان کو لڑائی سے الگ کر دیا ورنہ اگر اللہ تعالیٰ ان کے دل میں بھی اپنی قوم کی حمایت میں لڑنے کا خیال پیدا کر دیتا تو یقیناً وہ بھی تم سے لڑتے۔ اس لئے اگر واقعی یہ لوگ جنگ سے کنارہ کش رہیں تو تم بھی ان کے خلاف کوئی اقدام مت کرو۔

(۵) کنارہ کش رہیں، نہ لڑیں، تمہاری جانب صلح کا پیغام ڈالیں، سب کا مفہوم ایک ہی ہے۔ تاکید اور وضاحت کے لیے تین الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ تاکہ مسلمان ان کے بارے میں محتاط رہیں کیونکہ جو جنگ و قتال سے پہلے ہی علیحدہ ہیں اور ان کی یہ علیحدگی مسلمانوں کے مفاد میں بھی ہے، اسی لیے اس کو اللہ تعالیٰ نے بطور امتنان اور احسان کے ذکر کیا ہے، تو ان کے بارے میں چھیڑ چھاڑ کا رویہ یا غیر محتاط طرز عمل ان کے اندر بھی مخالفت و مناصمت کا جذبہ بیدار کر سکتا ہے جو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس لیے جب تک وہ مذکورہ حال پر قائم رہیں، ان سے مت لڑو! اس کی مثال وہ

تم کچھ اور لوگوں کو ایسا بھی پاؤ گے جن کی (بظاہر) چاہت ہے کہ تم سے بھی امن میں رہیں۔ اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں^(۱) (لیکن) جب کبھی فتنہ انگیزی^(۲) کی طرف لوٹائے جاتے ہیں تو اوندھے منہ اس میں ڈال دیئے جاتے ہیں، پس اگر یہ لوگ تم سے کنارہ کشی نہ کریں اور تم سے صلح کا سلسلہ جنبانی نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روک لیں،^(۳) تو انہیں پکڑو اور مار ڈالو جہاں کہیں بھی پالو! یہی وہ ہیں جن پر ہم نے تمہیں ظاہر حجت عنایت فرمائی ہے۔^(۴) (۹۱)

کسی مومن کو دوسرے مومن کا قتل کر دینا زیبا نہیں^(۵) مگر غلطی سے ہو جائے^(۶) (تو اور بات ہے)؛ جو شخص کسی

سَجَدُونَ الْخَرِيْنَ يُرِيدُونَ اَنْ يَأْمَنُوْكُمْ وَيَأْمَنُوْا
قَوْمَهُمْ كَمَا زُوْا اِلَى الْفِتْنَةِ اُذْ كَسَبُوْا فِيْهَا عِيْنَ
لَمْ يَنْتَهِزْ لَوْكُمْ وَيُلْفُوْا اِلَيْكُمْ السَّلْمَ وَيَلْفُوْا
اَيْدِيَهُمْ فُحْدًا وَهُمْ وَاَقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ تَقْتُلُوْهُمْ
وَاُولٰٓئِكَ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾

وَكَانَ يُرِيدُ اَنْ يَقْتُلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَلَا خَطَاۗءُ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاۗءً
فَعَرَّ يَوْمَئِذٍ رَّجْمَةً مُّؤْمِنَةً وَّوَدِيْعَةً مُّسَلَّمَةً اِلٰى اٰهْلِهَا اَلَا اِنَّ يَتَذَقُّوْا قٰوَانِ

جماعت بھی ہے جس کا تعلق بنی ہاشم سے تھا، یہ جنگ بدر والے دن مشرکین مکہ کے ساتھ میدان جنگ میں تو آئے تھے، لیکن یہ ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑنا پسند نہیں کرتے تھے، جیسے حضرت عباسؓ، عم رسولؓ وغیرہ جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، اسی لیے ظاہری طور پر کافروں کے کیمپ میں تھے۔ اس لیے نبی ﷺ نے حضرت عباسؓ کو قتل کرنے سے روک دیا اور انہیں صرف قیدی بنانے پر اکتفا کیا۔ سلّم یہاں مُسَلَّمَةٌ یعنی صلح کے معنی میں ہے۔ (۱) یہ ایک تیسرے گروہ کا ذکر ہے جو منافقین کا تھا۔ یہ مسلمانوں کے پاس آتے تو اسلام کا اظہار کرتے تاکہ مسلمانوں سے محفوظ رہیں، اپنی قوم کے پاس جاتے تو شرک و بت پرستی کرتے تاکہ وہ انہیں اپنا ہی ہم مذہب سمجھیں اور یوں دونوں سے مفادات حاصل کرتے۔

(۲) الْفِتْنَةُ سے مراد شرک بھی ہو سکتا ہے۔ اُذْ كَسَبُوْا فِيْهَا اِسْحَابُ الشَّرْكِ مِمَّنْ لُوْا فِيْهَا اِسْحَابُ الْاِسْحَابِ۔ یا الْفِتْنَةُ سے مراد قتال ہے کہ جب انہیں مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کی طرف بلایا یعنی لوٹایا جاتا ہے تو وہ اس پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ (۳) يُلْفُوْا اور يَكْفُوْا کا عطف بِعَنْتَرِ لَوْكُمْ پر ہے یعنی سب نفی کے معنی میں ہیں، سب میں لم لگے گا۔ (۴) اس بات پر کہ واقعی ان کے دلوں میں نفاق اور ان کے سینوں میں تمہارے خلاف بغض و عناد ہے، تب ہی تو وہ بہ ادنیٰ کوشش دوبارہ فتنے (شرک یا تمہارے خلاف آمادہ قتال ہونے) میں مبتلا ہو گئے۔

(۵) یہ نفی۔ نفی کے معنی میں ہے جو حرمت کی متقاضی ہے یعنی ایک مومن کا دوسرے مومن کو قتل کرنا ممنوع اور حرام ہے جیسے ﴿ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤَدُّوْا رُءُوْسَ اللّٰهِ ﴾ (الاحزاب: ۵۳) ”تمہارے یہ لائق نہیں ہے کہ تم اللہ کے رسول ﷺ کو ایذا پہنچاؤ“ یعنی حرام ہے۔

(۶) غلطی کے اسباب و وجوہ متعدد ہو سکتے ہیں۔ مقصد ہے کہ نیت اور ارادہ قتل کا نہ ہو۔ مگر وجوہ قتل ہو جائے۔

كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوِّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ كَتَحْرِيرِ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَإِنْ
كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ بِيْتَانٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ
وَكَتَحْرِيرِ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ
تَوْبَةً مِنَ اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۹۱﴾

مسلمان کو بلا قصد مار ڈالے، اس پر ایک مسلمان غلام کی گردن آزاد کرنا اور مقتول کے عزیزوں کو خون بہا پھینچانا ہے۔^(۱) ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ بطور صدقہ معاف کر دیں^(۲) اور اگر مقتول تمہاری دشمن قوم کا ہو اور ہو وہ مسلمان، تو صرف ایک مومن غلام کی گردن آزاد کرنی لازمی ہے۔^(۳) اور اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں عہد و پیمانہ ہے تو خون بہا لازم ہے، جو اس کے کنبے والوں کو پھینچایا جائے اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا بھی (ضروری ہے)،^(۴) پس جو

(۱) یہ قتل خطا کا جرمانہ بیان کیا جا رہا ہے جو دو چیزیں ہیں۔ ایک بطور کفارہ و استغفار ہے۔ یعنی مسلمان غلام کی گردن آزاد کرنا اور دوسری چیز بطور حق العباد کے ہے اور وہ ہے، دیتہ (خون بہا)۔ مقتول کے خون کے بدلے میں جو چیز مقتول کے وارثوں کو دی جائے، وہ دیت ہے۔ اور دیت کی مقدار احادیث کی رو سے سواونٹ یا اس کے مساوی قیمت سونے، چاندی یا کرنسی کی شکل میں ہوگی۔

ملحوظہ: خیال رہے کہ قتل عمد میں قصاص یا دیت مغفلہ ہے اور دیت مغفلہ کی مقدار سواونٹ ہے جو عمر اور وصف کے لحاظ سے تین قسم یا تین معیار کے ہوں گے۔ جب کہ قتل خطا میں صرف دیت ہے۔ قصاص نہیں ہے۔ اس دیت کی مقدار سواونٹ ہے مگر معیار اتنا کڑا نہیں۔ علاوہ ازیں اس دیت کی قیمت سنن ابی داؤد کی حدیث میں ۸۰۰ سو دینار یا ۸ ہزار درہم اور ترمذی کی روایت میں بارہ ہزار درہم بتلائی گئی ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں قیمت دیت میں کمی بیشی اور مختلف پیشوں والوں کے اعتبار سے اس کی مختلف نوعیتیں مقرر فرمائی تھیں: (إدواء الغلغلی، جلد ۸)۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اصل دیت (سواونٹ) کی بنیاد پر اس کی قیمت ہر دور کے اعتبار سے مقرر کی جائے گی۔ (تفصیل کے لئے شروح حدیث و کتب فقہ ملاحظہ ہوں)

(۲) معاف کر دینے کو صدقہ سے تعبیر کرنے سے مقصد معافی کی ترغیب دینا ہے۔

(۳) یعنی اس صورت میں دیت نہیں ہوگی۔ اس کی وجہ بعض نے یہ بیان کی ہے کہ کیونکہ اس کے وارث حربی کافر ہیں، اس لئے وہ مسلمان کی دیت لینے کے حق دار نہیں۔ بعض نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ اس مسلمان نے اسلام قبول کرنے کے بعد جو تکہ ہجرت نہیں کی، جب کہ ہجرت کی اس وقت بڑی تاکید تھی۔ اس کو تاہی کی وجہ سے اس کے خون کی حرمت کم ہے۔ (فتح القدر)

(۴) یہ ایک تیسری صورت ہے، اس میں بھی وہی کفارہ اور دیت ہے جو پہلی صورت میں ہے، بعض نے کہا ہے کہ اگر

نہ پائے اس کے ذمے دو مہینے کے لگاتار روزے
ہیں،^(۱) اللہ تعالیٰ سے بخشوانے کے لئے اور اللہ تعالیٰ
بخوبی جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ (۹۲)

اور جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کر ڈالے، اس کی سزا
دورخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ تعالیٰ کا
غضب ہے،^(۲) اسے اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اور اس
کے لئے بڑا عذاب تیار رکھا ہے۔ (۹۳)^(۳)

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا جَزَاءُ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا وَعَذَّبَ اللَّهُ
عَلَيْهِ وَعَلَّتْهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ﴿۹۳﴾

مقتول معاهد (ذمی) ہو تو اس کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہوگی، کیونکہ حدیث میں کافر کی دیت مسلمان کی دیت
سے نصف بیان کی گئی ہے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس تیسری صورت میں بھی مقتول مسلمان ہی کا
حکم بیان کیا جا رہا ہے۔

(۱) یعنی اگر گردن آزاد کرنے کی استطاعت نہ ہو تو پہلی صورت اور اس آخری صورت میں دیت کے ساتھ مسلسل لگاتار (بغیر
ناغہ کے) دو مہینے کے روزے ہیں۔ اگر درمیان میں ناغہ ہو گیا تو نئے سرے سے روزے رکھنے ضروری ہوں گے۔
البتہ عذر شرعی کی وجہ سے ناغہ ہونے کی صورت میں نئے سرے سے روزے رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے حیض، نفاس
یا شدید بیماری، جو روزہ رکھنے میں مانع ہو۔ سفر کے عذر شرعی ہونے میں اختلاف ہے۔ (ابن کثیر)

(۲) یہ قتل عمد کی سزا ہے۔ قتل کی تین قسمیں ہیں۔ قتل خطا (جس کا ذکر ما قبل کی آیت میں ہے) (۳) قتل شبہ عمد جو
حدیث سے ثابت ہے۔ (۳) قتل عمد جس کا مطلب ہے، ارادہ اور نیت سے کسی کو قتل کرنا اور اس کے لیے وہ آلہ
استعمال کرنا جس سے فی الواقع عادتاً قتل کیا جا رہا ہے جیسے تلوار، خنجر وغیرہ۔ آیت میں مومن کے قتل پر نہایت سخت وعید
بیان کی گئی ہے۔ مثلاً اس کی سزا جہنم ہے، جس میں ہمیشہ رہنا ہوگا، نیز اللہ کا غضب اور اس کی لعنت اور عذاب عظیم بھی
ہو گا۔ اتنی سخت سزا میں بیک وقت کسی بھی گناہ کی بیان نہیں کی گئیں۔ جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایک مومن کو
قتل کرنا اللہ کے ہاں کتنا بڑا جرم ہے۔ احادیث میں بھی اس کی سخت مذمت اور اس پر سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں۔

(۳) مومن کے قاتل کی توبہ قبول ہے یا نہیں؟ بعض علما مذکورہ سخت وعیدوں کے پیش نظر قبول توبہ کے قائل نہیں۔
لیکن قرآن و حدیث کی نصوص سے واضح ہے کہ خالص توبہ سے ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے۔ ﴿لَا تَنْتَظِرْ تَابَ وَالْمَنَّ وَتَعْمَلْ
عَمَلًا صَالِحًا﴾ (الفرقان-۷۰) اور دیگر آیات توبہ عام ہیں۔ ہر گناہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا یا بہت بڑا توبہ انصوح سے اس کی
معافی ممکن ہے۔ یہاں اس کی سزا جہنم جو بیان کی گئی ہے اس کا مطلب ہے کہ اگر اس نے توبہ نہیں کی تو اس کی یہ سزا
ہے جو اللہ تعالیٰ اس جرم پر اسے دے سکتا ہے۔ اسی طرح توبہ نہ کرنے کی صورت میں خلود (ہمیشہ جہنم میں رہنے) کا
مطلب بھی مکنت طویل (لمبی مدت) ہے۔ کیونکہ جہنم میں خلود کافروں اور مشرکوں کے لیے ہی ہے۔ علاوہ ازیں قتل کا
تعلق اگرچہ حقوق العباد سے ہے جو توبہ سے بھی ساقط نہیں ہوتے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے بھی اس کی

اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں جا رہے ہو تو تحقیق کر لیا کرو اور جو تم سے سلام علیک کرے تم اسے یہ نہ کہہ دو کہ تو ایمان والا نہیں۔^(۱) تم دنیاوی زندگی کے اسباب کی تلاش میں ہو تو اللہ تعالیٰ کے پاس بہت سی غنیمتیں ہیں۔^(۲) پہلے تم بھی ایسے ہی تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا لہذا تم ضرور تحقیق و تفتیش کر لیا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ (۹۴)

اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مومن اور بغیر عذر کے بیٹھ رہنے والے مومن برابر نہیں،^(۳) اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اللہ تعالیٰ نے درجوں میں بہت فضیلت دے رکھی ہے اور یوں تو اللہ تعالیٰ نے ہر

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا صَرْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَيْنَا
وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْفَىٰ إِلَيْكُمْ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ عَذَابِ اللَّهِ الَّذِي هُوَ
عَمَّا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۹۴﴾

لَا يَسْتَوِي الْفَعْدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ عِبَادُ اللَّهِ وَالْمُجَاهِدُونَ
فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ
بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْفَعْدِينَ دَرَجَةً وَوَكَلَا وَعَدَ اللَّهُ
الْحُسْنَىٰ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْفَعْدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۹۵﴾

تخلانی اور ازالہ فرما سکتا ہے اس طرح مقتول کو بھی بدلہ مل جائے گا اور قاتل کی بھی معافی ہو جائے گی۔ (فتح القدر، روایت کشی)

(۱) احادیث میں آتا ہے کہ بعض صحابہ کسی علاقے سے گزرے جہاں ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا، مسلمانوں کو دیکھ کر چرواہے نے سلام کیا، بعض صحابہ نے سمجھا کہ شاید وہ جان بچانے کے لئے اپنے کو مسلمان ظاہر کر رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بغیر تحقیق کے اسے قتل کر ڈالا اور بکریاں (بطور مال غنیمت) لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (صحیح بخاری، ترمذی تفسیر سورة النساء، بعض روایات میں آتا ہے کہ نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ مکہ میں پہلے تم بھی اس چرواہے کی طرح ایمان چھپانے پر مجبور تھے (صحیح بخاری، کتاب الديات) مطلب یہ تھا کہ اس قتل کا کوئی جواز نہیں تھا۔

(۲) یعنی تمہیں چند بکریاں، اس مقتول سے حاصل ہو گئیں، یہ کچھ بھی نہیں، اللہ کے پاس اس سے کہیں زیادہ بہتر غنیمتیں ہیں جو اللہ ورسول کی اطاعت کی وجہ سے تمہیں دنیا میں بھی مل سکتی ہیں اور آخرت میں تو ان کا ملنا یقینی ہے۔

(۳) جب یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور گھروں میں بیٹھ رہنے والے برابر نہیں تو حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ (ناپا صحابی) وغیرہ نے عرض کیا کہ ہم تو معذور ہیں جس کی وجہ سے ہم جہاد میں حصہ لینے سے محروم ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ گھر میں بیٹھ رہنے کی وجہ سے جہاد میں حصہ لینے والوں کے برابر ہم اجر و ثواب حاصل نہیں کر سکیں گے در آن حالیکہ ہمارا گھر میں بیٹھ رہنا بطور شوق، یا جان کی حفاظت کے نہیں ہے بلکہ عذر شرعی کی وجہ سے ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ﴿عِبَادُ اللَّهِ الَّذِينَ هُمْ﴾ (بغیر عذر کے) کا اشتراک نازل فرمایا یعنی عذر کے ساتھ بیٹھ رہنے والے، مجاہدین کے ساتھ اجر میں برابر کے شریک ہیں کیونکہ ﴿حَسَبَهُمُ الْعُذْرُ﴾ ”ان کو عذر نے روکا ہوا ہے“ (صحیح بخاری، کتاب الجہاد)

ایک کو خوبی اور اچھائی کا وعدہ دیا،^(۱) ہے لیکن مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر بہت بڑے اجر کی فضیلت دے رکھی ہے۔ (۹۵)

اپنی طرف سے مرتبے کی بھی اور بخشش کی بھی اور رحمت کی بھی اور اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (۹۶)

جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں جب فرشتے ان کی روح قبض کرتے ہیں تو پوچھتے ہیں، تم کس حال میں تھے؟^(۲) یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم اپنی جگہ کمزور اور مغلوب تھے۔^(۳) فرشتے کہتے ہیں کیا اللہ تعالیٰ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم ہجرت کر جاتے؟ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ پتھرنے کی بری جگہ ہے۔ (۹۷)

ذَرَجَاتٍ مِّنْهُ وَمَعْقِرَةٌ زُرْحَمَةٌ، وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا رَّحِيمًا ﴿۹۵﴾

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّيْنَاهُمُ الْيَتِيمَ الَّذِينَ تَلَائِمُوا أَنفُسَهُمْ قَالُوا فِينَا كُنْتُمْ قَالُوا لَئِنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضَ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا قَالُوا لَيْلِكَ مَا دُلَّهُمْ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿۹۶﴾

(۱) یعنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو جو فضیلت حاصل ہوگی، جہاد میں حصہ نہ لینے والے اگرچہ اس سے محروم رہیں گے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے دونوں کے ساتھ ہی بھلائی کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ اس سے علما نے استدلال کیا ہے کہ عام حالات میں جہاد فرض عین نہیں، فرض کفایہ ہے۔ یعنی اگر بقدر ضرورت آدمی جہاد میں حصہ لے لیں تو اس علاقے کے دوسرے لوگوں کی طرف سے بھی یہ فرض ادا شدہ سمجھا جائے گا۔

(۲) یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو مکہ اور اس کے قرب و جوار میں مسلمان تو ہو چکے تھے لیکن انہوں نے اپنے آبائی علاقے اور خاندان چھوڑ کر ہجرت کرنے سے گریز کیا۔ جب کہ مسلمانوں کی قوت کو ایک جگہ مجتمع کرنے کے لئے ہجرت کا نہایت نامیدی حکم مسلمانوں کو دیا جا چکا تھا۔ اس لئے جن لوگوں نے ہجرت کے حکم پر عمل نہیں کیا، ان کو یہاں ظالم قرار دیا گیا ہے اور ان کا ٹھکانہ جنہم بتلایا گیا ہے۔ جس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ حالات و ظروف کے اعتبار سے اسلام کے بعض احکام کفر یا اسلام کے مترادف بن جاتے ہیں جیسے اس موقع پر ہجرت اسلام اور اس سے گریز کفر کے مترادف قرار پایا۔ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ ایسے دارالکفر سے ہجرت کرنا فرض ہے جہاں اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنا مشکل اور وہاں رہنا کفر اور اہل کفر کی حوصلہ افزائی کا باعث ہو۔

(۳) یہاں ارض (جگہ) سے مراد شان نزول کے اعتبار سے مکہ اور اس کا قرب و جوار ہے اور آگے ارض اللہ سے مراد مدینہ ہے لیکن حکم کے اعتبار سے عام ہے یعنی پہلی جگہ سے مراد ارض کفار ہوگی۔ جہاں اسلام پر عمل مشکل ہو اور ارض اللہ سے مراد ہر وہ جگہ ہوگی جہاں انسان اللہ کے دین پر عمل کرنے کی غرض سے ہجرت کر کے جائے۔

مگر جو مرد عورتیں اور بچے بے بس ہیں جنہیں نہ تو کسی چارہ کار کی طاقت اور نہ کسی راستے کا علم ہے۔ (۹۸)^(۱) بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے درگزر کرے، اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا اور معاف فرمانے والا ہے۔ (۹۹) جو کوئی اللہ کی راہ میں وطن کو چھوڑے گا، وہ زمین میں بہت سی قیام کی جگہیں بھی پائے گا اور کشادگی بھی،^(۲) اور جو کوئی اپنے گھر سے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف نکل کھڑا ہوا، پھر اسے موت نے آ پکڑا تو بھی یقیناً اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ثابت ہو گیا،^(۳) اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ (۱۰۰)

إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانَ
لَا يَنْتَظِعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿٩٨﴾
قَالَ لَيْكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُو عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ
عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٩٩﴾

وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ
مَرْغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ
مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ
فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿١٠٠﴾

(۱) یہ ان مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہجرت سے مستثنیٰ کرنے کا حکم ہے جو اس کے وسائل سے محروم اور راستے سے بھی بے خبر تھے۔ بچے اگرچہ شرعی احکام کے مکلف نہیں ہوتے لیکن یہاں ان کا ذکر ہجرت کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے کیا گیا ہے کہ بچے تک بھی ہجرت کریں یا پھر یہاں بچوں سے مراد قریب البلوغت بچے ہوں گے۔

(۲) اس میں ہجرت کی ترغیب اور مشرکین سے مفارقت اختیار کرنے کی تلقین ہے۔ مُرَاغَمًا کے معنی جگہ، جائے قیام یا جائے پناہ ہے۔ اور سَعَةً سے رزق یا جگہوں اور ملکوں کی کشادگی و فراخی ہے۔

(۳) اس میں نیت کے مطابق اجر و ثواب ملنے کی یقین دہانی ہے چاہے موت کی وجہ سے وہ اس عمل کے مکمل کرنے سے قاصر رہا ہو۔ جیسا کہ گزشتہ امتوں میں سے ایک سو افراد کے قاتل کا واقعہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ جو توبہ کے لئے نیکوں کی ایک بستی میں جا رہا تھا کہ راستے میں موت آگئی۔ اللہ تعالیٰ نے نیکوں کی بستی کو، بہ نسبت دوسری بستی کے قریب تر کر دیا جس کی وجہ سے اسے ملائکہ رحمت اپنے ساتھ لے گئے (صحیح بخاری، کتاب الأنبياء، باب ما ذكر عن بنی اسرائیل نمبر ۵۳، و مسلم کتاب التوبة، باب قبول توبة القاتل و ان كسر قعله)، اسی طرح جو شخص ہجرت کی نیت سے گھر سے نکلے لیکن راستے میں ہی اسے موت آجائے تو اسے اللہ کی طرف سے ہجرت کا ثواب ضرور ملے گا، گو ابھی وہ ہجرت کے عمل کو پایہ تکمیل تک بھی نہ پہنچا سکا ہو۔ جیسے حدیث میں بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" "عملوں کا دار و مدار نیتوں پر ہے" "وَأِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مِمَّا نَوْحًا" آدمی کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔" جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہجرت کی پس، اس کی ہجرت ان ہی کے لئے ہے اور جس نے دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے شادی کرنے کی نیت سے ہجرت کی پس اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس نیت سے اس نے ہجرت کی" (صحیح بخاری، باب بدء الوحى و مسلم، كتاب الإمارة، یہ حکم عام ہے جو دین کے ہر کام کو شامل ہے۔ یعنی اس کو کرتے وقت اللہ کی رضا پیش نظر ہوگی تو وہ مقبول، ورنہ مردود ہو گا۔

جب تم سفر میں جا رہے ہو تو تم پر نمازوں کے قصر کرنے میں کوئی گناہ نہیں، اگر تمہیں ڈر ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے،^(۱) یقیناً کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔ (۱۰۱)

جب تم ان میں ہو اور ان کے لئے نماز کھڑی کرو تو چاہئے کہ ان کی ایک جماعت تمہارے ساتھ اپنے ہتھیار لئے کھڑی ہو، پھر جب یہ سجدہ کر چکیں تو یہ ہٹ کر تمہارے پیچھے آ جائیں اور وہ دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی وہ آ جائے اور تیرے ساتھ نماز ادا کرے اور اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار لئے رہے، کافر چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے بے خبر ہو جاؤ، تو وہ تم پر اچانک دھاوا بول دیں،^(۲) ہاں اپنے ہتھیار

وَإِذَا صَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ ۚ إِنَّ خِفَتُمْ أَنْ يُفِيقَكُمُ الْكُفْرُ وَإِنَّ الْكُفْرَانَ كَانُوا كَالْمُهَيْبَةِ ۝

وَإِذَا كُنْتُمْ فِيهَا فَامْتَمَّ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلَمْ تَكُنْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ مَعَكُمْ وَلْيَأْخُذُوا سِلْحَهُمْ ۚ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ وَرَائِكُمْ وَلِلنَّائِبِ طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكُمْ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝

وَإِذَا سَأَلَكَ السَّالِتُونَ غَيْرَ مَا سَأَلْتَهُمْ قِيمَةً فَلْيَوَدُّ أَنَّ فِي رَكْعَةٍ مِنْ مَطْيُورٍ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ۝

(۱) اس میں حالت سفر میں نماز قصر کرنے (دو گانہ ادا کرنے) کی اجازت دی جا رہی ہے۔ اِنْ خِفْتُمْ ”اگر تمہیں ڈر ہو.....“ غالب احوال کے اعتبار سے ہے۔ کیونکہ اس وقت پورا عرب دارالحرب بنا ہوا تھا۔ کسی طرف کا بھی سفر خطرات سے خالی نہیں تھا۔ یعنی یہ شرط نہیں ہے کہ سفر میں خوف ہو تو قصر کی اجازت ہے۔ جیسے قرآن مجید میں اور بھی بعض مقامات پر اس قسم کی قیدیں بیان کی گئی ہیں جو اتفاقاً یعنی غالب احوال کے اعتبار سے مثلاً ﴿لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً﴾ (آل عمران ۱۳۰) ﴿وَلَا تَكُونُوا تَبٰئِبَةً عَلَى الْبِعَادِ إِنَّكُمْ تَعْتَصِنَ﴾ (النور ۳۳) تم اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ اس سے بچنا چاہیں۔“ چونکہ بچنا چاہتی تھیں، اس لئے اللہ نے اسے بیان فرمادیا۔ یہ نہیں ہے کہ اگر وہ بدکاری پر آمادہ ہوں تو پھر تمہارے لئے یہ جائز ہے کہ تم ان سے بدکاری کرو لیا کرو ﴿وَرَبَّانِيكَ الْبَنِي فِي حُجْرِكَ مِنْ سُكَّانِكَ﴾ وَغَيْرَهَا مِنَ الْآيَاتِ (النساء۔ ۲۳) بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم کے ذہن میں بھی یہ اشکال آیا کہ اب تو امن ہے، ہمیں سفر میں نماز قصر نہیں کرنی چاہئے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ”یہ اللہ کی طرف سے تمہارے لئے صدقہ ہے، اس کے صدقے کو قبول کرو۔“ (مسند احمد جلد ۱، ص ۳۶۲۵ و صحیح مسلم، کتاب المسافریں اور دیگر کتب حدیث)

ملحوظہ: سفر کی مسافت اور ایام قصر کی تعیین میں کافی اختلاف ہے۔ امام شوکانی نے ۳ فرسخ (یعنی ۹ کوس) والی روایت کو ترجیح دی ہے۔ (نیل الاوطار جلد ۳ صفحہ ۲۲۰) اسی طرح بہت سے محققین علماء اس بات کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ دوران سفر کسی ایک مقام پر تین یا چار دن سے زیادہ قیام کی نیت نہ ہو اور اگر اس سے زیادہ قیام کی نیت ہو تو پھر نماز قصر کی اجازت نہیں۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مرآة المفاتیح)

(۲) اس آیت میں صلوة الخوف کی اجازت بلکہ حکم دیا جا رہا ہے۔ صلوة الخوف کے معنی ہیں، خوف کی نماز۔ یہ اس وقت

اتار رکھنے میں اس وقت تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تمہیں تکلیف ہو یا بوجہ بارش کے یا بسبب بیمار ہو جانے کے اور اپنے بچاؤ کی چیزیں ساتھ لئے رہو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے منکروں کے لئے ذلت کی ماری تیار کر رکھی ہے۔ (۱۰۲)

پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو اٹھتے بیٹھتے اور لیئے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہو (۱) اور جب اطمینان پاؤ تو نماز قائم کرو! (۲) یقیناً نماز مومنوں پر مقررہ وقتوں پر فرض ہے، (۳) (۱۰۳)

وَحُنُودًا وَإِحْدَارًا إِنَّ اللَّهَ عَدَدُ الْكَلْبِ مِنَ عَدَابَاتِهِنَّ ۝۱۰۲

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَادْكُرُوا اللَّهَ قِيَمًا وَنَعْوًا
وَعَلَىٰ جُوبِكُمْ ۖ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ ۚ إِنَّ
الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا ۝۱۰۳

مشروع ہے جب مسلمان اور کافروں کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل جنگ کے لئے تیار کھڑی ہوں اور ایک لمحے کی بھی غفلت مسلمانوں کے لئے سخت خطرناک ثابت ہو سکتی ہو۔ ایسے حالات میں اگر نماز کا وقت ہو جائے تو صلوة الخوف پڑھنے کا حکم ہے؛ جس کی مختلف صورتیں حدیث میں بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً فوج دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصہ دشمن کے بالمقابل کھڑا رہا تاکہ کافروں کو حملہ کرنے کی جسارت نہ ہو اور ایک حصے نے آکر نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی۔ جب یہ حصہ نماز سے فارغ ہو گیا تو یہ پہلے کی جگہ مورچہ زن ہو گیا اور مورچہ زن حصہ نماز کے لئے آ گیا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے دونوں حصوں کو ایک ایک رکعت نماز پڑھائی، اس طرح آپ ﷺ کی دو رکعت اور باقی فوجیوں کی ایک ایک رکعت ہوئی۔ بعض میں آتا ہے کہ دو دو رکعات پڑھائیں، اس طرح آپ کی چار رکعت اور فوجیوں کی دو دو رکعت ہوئیں اور بعض میں آتا ہے کہ ایک رکعت پڑھ کر التیمات کی طرح بیٹھے رہے، فوجیوں نے کھڑے ہو کر اپنے طور پر ایک رکعت اور پڑھ کر دو رکعات پوری کیں اور دشمن کے سامنے جا کر ڈٹ گئے۔ دوسرے حصے نے آکر نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، آپ ﷺ نے انہیں بھی ایک رکعت پڑھائی اور التیمات میں بیٹھ گئے اور اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک فوجیوں نے دوسری رکعت پوری نہیں کر لی۔ پھر ان کے ساتھ آپ ﷺ نے سلام پھیر دیا۔ اس طرح آپ ﷺ کی بھی دو رکعت اور فوج کے دونوں حصوں کی بھی دو رکعات ہوئیں۔ (دیکھئے کتب حدیث)

(۱) مراد یہی خوف کی نماز ہے اس میں جو تکہ تخفیف کر دی گئی ہے، اس لئے اس کی تلاپی کے لئے کہا جا رہے کہ کھڑے، بیٹھے، لیئے اللہ کا ذکر کرتے رہو۔

(۲) اس سے مراد ہے کہ جب خوف اور جنگ کی حالت ختم ہو جائے تو پھر نماز کو اس کے اس طریقے کے مطابق پڑھنا ہے جو عام حالات میں پڑھی جاتی ہے۔

(۳) اس میں نماز کو مقررہ وقت میں پڑھنے کی تاکید ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر شرعی عذر کے دو نمازوں کو جمع کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح کم از کم ایک نماز غیر وقت میں پڑھی جائے گی جو اس آیت کے خلاف ہے۔

ان لوگوں کا پیچھا کرنے سے ہارے دل ہو کر بیٹھ نہ رہو! (۱) اگر تمہیں بے آرامی ہوتی ہے تو انہیں بھی تمہاری طرح بے آرامی ہوتی ہے اور تم اللہ تعالیٰ سے وہ امیدیں رکھتے ہو، جو امیدیں انہیں نہیں، (۲) اور اللہ تعالیٰ دانا اور حکیم ہے۔ (۱۰۴)

یقیناً ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ تم لوگوں میں اس چیز کے مطابق فیصلہ کرو جس سے اللہ نے تم کو شاسا کیا ہے (۳) اور خیانت کرنے والوں (۴) کے حمایتی نہ بنو۔ (۱۰۵)

وَلَا تَهْتُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِنْ تَكُونُوا تَأْمِنُونَ
فِي أَنفُسِكُمْ يَأْتِكُمْ مِمَّا تَكُونُونَ وَمَنْ يَتَزَوَّجْ مِنْ اللَّهِ
لَا يَزْجُوَنَّ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۱۰۴﴾

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَدَّبَكَ
اللَّهُ وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِبِينَ حَصِيمًا ﴿۱۰۵﴾

(۱) یعنی اپنے دشمن کے تعاقب کرنے میں کمزوری مت دکھاؤ، بلکہ ان کے خلاف بھرپور جدوجہد کرو اور گھات لگا کر بیٹھو!
(۲) یعنی زخم تو تمہیں بھی اور انہیں بھی دونوں کو پہنچے ہیں لیکن ان زخموں پر تمہیں تو اللہ سے اجر کی امید ہے لیکن وہ اس کی امید نہیں رکھتے۔ اس لئے اجر آخرت کے حصول کے لئے جو محنت و کاوش تم کر سکتے ہو، وہ کافر نہیں کر سکتے۔
(۳) ان آیات (۱۰۴ سے ۱۱۳ تک) کی شان نزول میں بتلایا گیا ہے کہ انصار کے قبیلہ بنی ظفر میں ایک شخص طعمہ یا بشیر بن امیہ نے ایک انصاری کی زہ چرائی، جب اس کا چرچا ہوا اور اس کو اپنی چوری کے بے نقاب ہونے کا خطرہ محسوس ہوا تو اس نے وہ ذرہ ایک یہودی کے گھر پھینک دی اور بنی ظفر کے کچھ آدمیوں کو ساتھ لے کر نبی ﷺ کی خدمت میں پہنچ گیا، ان سب نے کہا کہ زہ چوری کرنے والا فلاں یہودی ہے۔ یہودی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا کہ بنی امیہ نے زہ چوری کر کے میرے گھر پھینک دی ہے۔ بنی ظفر اور بنی امیہ (طعمہ یا بشیر وغیرہ) ہیشار تھے اور نبی ﷺ کو باور کراتے رہے کہ چور یہودی ہی ہے اور وہ طعمہ پر الزام لگانے میں جھوٹا ہے۔ نبی ﷺ بھی ان کی چکنی چیزیں باتوں سے متاثر ہو گئے اور قریب تھا کہ اس انصاری کو چوری کے الزام سے بری کر کے یہودی پر چوری کی فرد جرم عائد فرما دیتے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی۔ جس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ نبی ﷺ بھی یہ حیثیت ایک انسان کے غلط فہمی میں پڑ سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی کہ آپ عالم الغیب نہیں تھے، ورنہ آپ ﷺ پر فوراً صورتحال واضح ہو جاتی۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کی حفاظت فرماتا ہے اور اگر کبھی حق کے پوشیدہ رہ جانے اور اس سے ادھر ادھر ہو جانے کا مرحلہ آجائے تو فوراً اللہ تعالیٰ اسے متنبہ فرمادیتا اور اس کی اصلاح فرما دیتا ہے جیسا کہ عصمت انبیا کا تقاضا ہے۔ یہ وہ مقام عصمت ہے جو انبیا کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں۔

(۴) اس سے مراد وہی بنی امیہ ہیں۔ جنہوں نے چوری خود کی لیکن اپنی چرب زبانی سے یہودی کو چور باور کرانے پر تلے ہوئے تھے۔ اگلی آیات میں بھی ان کے اور ان کے حمایتیوں کے غلط کردار کو نمایاں کر کے نبی ﷺ کو خبردار کیا جا رہا ہے۔

وَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

وَالْجَادِلِ عَنِ الدِّينِ يَغْتَابُونَ أَنفُسَهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ۝

يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّسِيسِ وَلَا يَسْتَحْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَى مِنَ الْقَوْلِ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ۝

هَآئِنَّمَا هُوَ لآءُ جَادٍ لَّمْ يَغْتَابِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَن يُجَادِلِ اللَّهَ عَنْهُمْ يُؤْمَرُ إِلَىٰ أَمْرٍ مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكَذٰلِكَ ۝

وَمَن يَعْمَلْ سُوْءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ لَمْ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝

اور اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگو! ^(۱) بے شک اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا مہربانی کرنے والا ہے۔ (۱۰۶)

اور ان کی طرف سے بھگڑنا نہ کرو جو خود اپنی ہی خیانت کرتے ہیں، یقیناً دعا باز گنہگار اللہ تعالیٰ کو اچھا نہیں لگتا۔ (۱۰۷)

وہ لوگوں سے تو چھپ جاتے ہیں، (لیکن) اللہ تعالیٰ سے نہیں چھپ سکتے، وہ راتوں کے وقت جب کہ اللہ کی ناپسندیدہ باتوں کے خفیہ مشورے کرتے ہیں اس وقت بھی اللہ ان کے پاس ہوتا ہے، ان کے تمام اعمال کو وہ گھیرے ہوئے ہے۔ (۱۰۸)

ہاں تو یہ ہو تم لوگ کہ دنیا میں تم نے ان کی حمایت کی لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے قیامت کے دن ان کی حمایت کون کرے گا؟ اور وہ کون ہے جو ان کا وکیل بن کر کھڑا ہو سکے گا؟ ^(۲) (۱۰۹)

جو شخص کوئی برائی کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے استغفار کرے تو وہ اللہ کو بخشے والا مہربانی کرنے والا پائے گا۔ (۱۱۰)

(۱) یعنی بغیر تحقیق کئے آپ ﷺ نے جو خیانت کرنے والوں کی حمایت کی ہے، اس پر اللہ سے مغفرت طلب کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فریقین میں سے جب تک کسی کی بابت پورا یقین نہ ہو کہ وہ حق پر ہے، اس کی حمایت و وکالت کرنا جائز نہیں۔ علاوہ ازیں اگر کوئی فریق دھوکے اور فریب اور اپنی چرب زبانی سے عدالت یا حاکم مجاز سے اپنے حق میں فیصلہ کرا لے گا در آں حالیکہ وہ صاحب حق نہ ہو تو ایسے فیصلے کی عند اللہ کوئی اہمیت نہیں۔ اس بات کو نبی ﷺ نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا خبردار! میں ایک انسان ہی ہوں اور جس طرح میں سنتا ہوں، اسی کی روشنی میں فیصلہ کرتا ہوں۔ ممکن ہے ایک شخص اپنی دلیل و حجت پیش کرنے میں تیز طرار اور ہشیار ہو اور میں اس کی گفتگو سے متاثر ہو کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں در آنحالیکہ وہ حق پر نہ ہو اور اس طرح میں دوسرے مسلمان کا حق اسے دے دوں، اسے یاد رکھنا چاہئے کہ یہ آگ کا ٹکڑا ہے۔ یہ اس کی مرضی ہے کہ اسے لے لے یا چھوڑ دے۔ (صحیح بخاری، کتاب الشہادۃ والحیل والأحكام۔ صحیح مسلم، کتاب الأقضية)

(۲) یعنی جب اس گناہ کی وجہ سے اس کا مؤاخذہ ہو گا تو کون اللہ کی گرفت سے اسے بچا سکے گا؟

اور جو گناہ کرتا ہے اس کا بوجھ اسی پر ہے (۱) اور اللہ بخوبی جاننے والا اور پوری حکمت والا ہے۔ (۱۱۱)

اور جو شخص کوئی گناہ یا خطا کر کے کسی بے گناہ کے ذمہ تھوپ دے، اس نے بہت بڑا بہتان اٹھایا اور کھلا گناہ کیا۔ (۱۱۲)

اگر اللہ تعالیٰ کا فضل و رحم تجھ پر نہ ہوتا تو ان کی ایک جماعت نے تو تجھے برکانے کا قصد کر ہی لیا تھا، (۱۱۳) مگر دراصل یہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کرتے ہیں، یہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اللہ تعالیٰ نے تجھ پر کتاب و حکمت اتاری ہے اور تجھے وہ سکھایا ہے جسے تو نہیں جانتا تھا (۱۱۴) اور اللہ تعالیٰ کا تجھ پر بڑا بھاری فضل ہے۔ (۱۱۳)

وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَى نَفْسِهِ وَكَانَ اللَّهُ عَلَيْهَا حَكِيمًا ۝

وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِي بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ۝

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَصُدُّوكَ مِنْ شَيْءٍ ۝ وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا ۝

(۱) اس مضمون کی ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿ وَلَا تَزِدُوا زِينَةً لِّرِجَالِكُمْ ﴾ (بنی اسرائیل - ۱۵) ”کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا“ یعنی کوئی کسی کا ذمہ دار نہیں ہوگا، ہر نفس کو وہی کچھ ملے گا جو وہ کما کر ساتھ لے گیا ہوگا۔

(۲) جس طرح بنو امیرق نے کیا کہ چوری خود کی اور تممت کسی اور پر دھردی۔ یہ زجر و توبیخ عام ہے۔ جو بنو امیرق کو بھی شامل ہے اور ان کو بھی جو ان کی سی بد خصلتوں کے حامل اور ان جیسے برے کاموں کے مرتکب ہوں گے۔

(۳) یہ اللہ تعالیٰ کی اس خاص حفاظت و نگرانی کا ذکر ہے جس کا اہتمام انبیا علیہم السلام کے لئے فرمایا ہے جو انبیا پر اللہ کے فضل خاص اور اس کی رحمت خاصہ کا مظہر ہے۔ طائفہ (جماعت) سے مراد وہ لوگ ہیں جو بنو امیرق کی حمایت میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ان کی صفائی پیش کر رہے تھے جس سے یہ اندیشہ پیدا ہو چلا تھا کہ نبی ﷺ اس شخص کو چوری کے الزام سے بری کر دیں گے، جو فی الواقع چور تھا۔

(۴) یہ دوسرے فضل و احسان کا تذکرہ ہے جو آپ ﷺ پر کتاب و حکمت (سنت) نازل فرما کر اور ضروری باتوں کا علم دے کر فرمایا گیا۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿ وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ ﴾ (الشوری - ۵۲) ”اور اسی طرح بھیجا ہم نے تیری طرف (قرآن لے کر) ایک فرشتہ اپنے حکم سے تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟“ ﴿ وَمَا كُنْتَ تَرْجُو أَن يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِنَّا ﴾ (القصص - ۸۶) ”اور تجھے یہ توقع نہیں تھی کہ تجھ پر کتاب اتاری جائے گی، مگر تیرے رب کی رحمت سے (یہ کتاب اتاری گئی)“ ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ نے آپ ﷺ پر فضل و احسان فرمایا اور کتاب و حکمت بھی عطا فرمائی، ان کے علاوہ دیگر بہت سی باتوں کا آپ ﷺ کو علم

ان کے اکثر خفیہ مشوروں میں کوئی خیر نہیں، (۱) ہاں! بھلائی اس کے مشورے میں ہے جو خیرات کا یا نیک بات کا یا لوگوں میں صلح کرانے کا حکم کرے (۲) اور جو شخص صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے ارادہ سے یہ کام کرے (۳) اسے ہم یقیناً بہت بڑا ثواب دیں گے (۴) (۱۱۴)

جو شخص باوجود راہ ہدایت کے واضح ہو جانے کے بھی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خلاف کرے اور تمام مومنوں کی راہ چھوڑ کر چلے، ہم اسے ادھر ہی متوجہ کر

لَاخِيَرِي فِي كَيْفِيَّةِ مَنْ تَجَوَّبَهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝

وَمَنْ يُثَاقِبِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ لُوَلِّهِ

دیا گیا جن سے آپ ﷺ بے خبر تھے۔ یہ بھی گویا آپ ﷺ کے عالم الغیب ہونے کی نفی ہے کیونکہ جو خود عالم الغیب ہو، اسے تو کسی اور سے علم حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور جسے دوسرے سے معلومات حاصل ہوں، وحی کے ذریعے سے یا کسی اور طریقے سے وہ عالم الغیب نہیں ہوتا۔

(۱) تَجَوَّبَ (سرگوشی) سے مراد وہ باتیں ہیں جو منافقین آپس میں مسلمانوں کے خلاف یا ایک دوسرے کے خلاف کرتے تھے۔ (۲) یعنی صدقہ خیرات، معروف (جو ہر قسم کی نیکی کو شامل ہے) اور اصلاح بین الناس کے بارے میں مشورے، خیرِ بری ہیں۔ جیسا کہ احادیث میں بھی ان امور کی فضیلت و اہمیت بیان کی گئی ہے۔

(۳) کیونکہ اگر اخلاص (یعنی رضائے الہی کا مقصد) نہیں ہو گا تو بڑے سے بڑا عمل بھی نہ صرف ضائع جائے گا بلکہ وبال جان بن جائے گا۔ نعوذ باللہ من الرياء و النفاق۔

(۴) احادیث میں اعمال مذکورہ کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اللہ کی راہ میں حلال کمائی سے ایک کھجور کے برابر صدقہ بھی احد پناہ جتنا ہو جائے گا (صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، نیک بات کی اشاعت بھی بڑی فضیلت ہے۔ اسی طرح رشتے داروں، دوستوں اور باہم ناراض دیگر لوگوں کے درمیان صلح کر دینا، بہت بڑا عمل ہے۔ ایک حدیث میں اسے نفلی روزوں، نفلی نمازوں اور نفلی صدقات و خیرات سے بھی افضل بتلایا گیا ہے۔ فرمایا «أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلِ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَالصَّلَاةِ وَالصَّدَقَةِ؟» قَالُوا بَلَىٰ: قَالَ: «إِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ، - قَالَ: - وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ» (ابوداؤد کتاب الأدب - ترمذی، کتاب البر و مسند احمد ۶/۴۴۴، ۴۴۵) حتیٰ کہ صلح کرانے والے کو جھوٹ تک بولنے کی اجازت دے دی گئی تاکہ اسے ایک دوسرے کو قریب لانے کے لئے دروغ مصلحت آمیز کی ضرورت پڑے تو وہ اس میں بھی تامل نہ کرے۔ «لَيْسَ الْكَذَابُ الَّذِي يُضْلَعُ بَيْنَ النَّاسِ، فَيَنْمِي خَيْرًا أَوْ يَقُولُ خَيْرًا» (بخاری، کتاب الصلح مسلم و الترمذی، کتاب البر - ابوداؤد، کتاب الأدب) ”وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے اچھی بات پھیلاتا یا اچھی بات کرتا ہے۔“

مَا تَوَلَّى وَوَضِعِهِ جَهَنَّمَ مَوَسَّاتٌ مِّصْرًا ۝

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝

إِنْ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِنشَاءً وَإِنْ يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَرِيدًا ۝

دیں گے جدھر وہ خود متوجہ ہو اور دوزخ میں ڈال دیں گے،^(۱) وہ بچنے کی بہت ہی بری جگہ ہے۔ (۱۱۵)

اسے اللہ تعالیٰ قطعاً نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ شریک مقرر کیا جائے؛ ہاں شرک کے علاوہ گناہ جس کے چاہے معاف فرما دیتا ہے اور اللہ کے ساتھ شریک کرنے والا بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ (۱۱۶)

یہ تو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر صرف عورتوں کو پکارتے ہیں^(۲) اور دراصل یہ صرف سرکش شیطان کو پوجتے ہیں۔^(۳) (۱۱۷)

(۱) ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر کسی اور راستے کی پیروی، دین اسلام سے خروج ہے جس پر یہاں جہنم کی وعید بیان فرمائی گئی ہے۔ مومنین سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جو دین اسلام کے اولین پیرو اور اس کی تعلیمات کا کامل نمونہ تھے۔ اور ان آیات کے نزول کے وقت جن کے سوا کوئی گروہ مومنین موجود نہ تھا کہ وہ مراد ہو۔ اس لئے رسول ﷺ کی مخالفت اور غیر سبیل المومنین کا اتباع دونوں حقیقت میں ایک ہی چیز کا نام ہے۔ اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے راستے اور منہاج سے انحراف بھی کفر و ضلال ہی ہے۔ بعض علما نے سبیل المومنین سے مراد اجماع امت لیا یعنی اجماع امت سے انحراف بھی کفر ہے۔ اجماع امت کا مطلب ہے کسی مسئلے میں امت کے تمام علما و فقہاء کا اتفاق۔ یا کسی مسئلے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق یہ دونوں صورتیں اجماع امت کی ہیں اور دونوں کا انکار یا ان میں سے کسی ایک کا انکار کفر ہے۔ تاہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق تو بہت سے مسائل میں ملتا ہے یعنی اجماع کی یہ صورت تو ملتی ہے۔ لیکن اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد کسی مسئلے میں پوری امت کے اجماع و اتفاق کے دعوے تو بہت سے مسائل میں کئے گئے ہیں لیکن فی الحقیقت ایسے اجماعی مسائل بہت ہی کم ہیں۔ جن میں فی الواقع امت کے تمام علما و فقہاء کا اتفاق ہو۔ تاہم ایسے جو مسائل بھی ہیں، ان کا انکار بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجماع کے انکار کی طرح، کفر ہے۔ اس لئے کہ صحیح حدیث میں ہے ”اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر اکٹھا نہیں کرے گا اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے“ (صحیح ترمذی للآلبانی جلد نمبر ۱۷۵۹)

(۲) إِنانث (عورتیں) سے مراد یا تو وہ بت ہیں جن کے نام مونث تھے جیسے لات، عزلی، مناة، نائلہ وغیرہا۔ یا مراد فرشتے ہیں۔ کیونکہ مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں سمجھتے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔

(۳) بتوں، فرشتوں اور دیگر ہستیوں کی عبادت دراصل شیطان کی عبادت ہے۔ کیونکہ شیطان ہی انسان کو اللہ کے در سے چھڑا کر دوسروں کے آستانوں اور چوکھٹوں پر جھکا تا ہے، جیسا کہ اگلی آیت میں ہے۔

جسے اللہ نے لعنت کی ہے اور اس نے بیڑا اٹھایا ہے کہ تیرے بندوں میں سے میں مقرر شدہ حصہ لے کر رہوں گا۔^(۱۱۸)

اور انہیں راہ سے بہکاتا رہوں گا اور باطل امیدیں دلاتا رہوں گا^(۱۱۹) اور انہیں سکھاؤں گا کہ جانوروں کے کان چیر دیں،^(۱۲۰) اور ان سے کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑ دیں،^(۱۲۱) سنو! جو شخص اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا رفیق بنائے گا وہ صریح نقصان میں ڈوبے گا۔^(۱۱۹)

وہ ان سے زبانی وعدے کرتا رہے گا، اور سبزباغ دکھاتا رہے گا، (مگر یاد رکھو!) شیطان کے جو وعدے ان سے ہیں وہ سراسر فریب کاریاں ہیں۔^(۱۲۰)

یہ وہ لوگ ہیں جن کی جگہ جہنم ہے، جہاں سے انہیں چھٹکارا نہ ملے گا۔^(۱۲۱)

تَعَنَّهُ اللَّهُ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا ﴿۱۱۸﴾

وَأَلْهَمَهُمُ الْوَالِمِغْنَةَ وَلَا مَيْدَنَهُمْ وَلَا مُرْتَهَمٌ فَلْيَبْئِثْ كَيْفَ أَذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَا مُرْتَهَمٌ فَلْيَبْئِثْ كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ وَمَنْ يَتَّبِعِ الشَّيْطَانَ وَبِئَاتٍ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُبِينًا ﴿۱۱۹﴾

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ﴿۱۲۰﴾

أُولَئِكَ مَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيضًا ﴿۱۲۱﴾

- (۱) مقرر شدہ حصہ سے، مراد وہ نذر و نیاز بھی ہو سکتی ہے جو مشرکین اپنے بتوں اور قبروں میں مدفون اشخاص کے نام نکالتے ہیں اور جہنمیوں کا وہ کونہ بھی ہو سکتا ہے جنہیں شیطان گمراہ کر کے اپنے ساتھ جہنم میں لے جائے گا۔
- (۲) یہ وہ باطل امیدیں ہیں جو شیطان کے وسوسوں اور دغل اندازی سے پیدا ہوتی ہیں اور انسانوں کی گمراہی کا سبب بنتی ہیں۔
- (۳) یہ بحیرہ اور سائبہ جانوروں کی علامتیں اور صورتیں ہیں۔ مشرکین ان کو بتوں کے نام وقف کرتے تو شناخت کے لئے ان کا کان وغیرہ چیر دیا کرتے تھے۔

(۴) نَعْيِيضٌ خَلْقُ اللَّهِ (اللہ کی تخلیق کو بدلتا) کی کئی صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک تو یہی جس کا ابھی یہاں ذکر ہوا یعنی کان وغیرہ کاٹنا، چیرنا، سوراخ کرنا، ان کے علاوہ اور کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے چاند، سورج، پتھر اور آگ وغیرہ اشیا مختلف مقاصد کے لئے بنائی ہیں، لیکن مشرکین نے ان کے مقصد تخلیق کو بدل کر ان کو معبود بنا لیا۔ یا تغیر کا مطلب تغیر فطرت ہے، یا حلت و حرمت میں تبدیلی ہے۔ وغیرہ۔ اسی تغیر میں مردوں کی نس بندی کر کے اور اسی طرح عورتوں کے آپریشن کر کے انہیں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتا۔ میک اپ کے نام پر ابروؤں کے بال وغیرہ اکھاڑ کر اپنی صورتوں کو صمغ کرنا اور وشم (یعنی گودنے گدوانا) وغیرہ بھی شامل ہے۔ یہ سب شیطانی کام ہیں جن سے بچنا ضروری ہے۔ البتہ جانوروں کو اس لئے خصی کرنا کہ ان سے زیادہ انتفاع ہو سکے یا ان کا گوشت زیادہ بہتر ہو سکے یا اسی قسم کا کوئی اور صحیح مقصد ہو، تو جائز ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خصی جانور قربانی میں ذبح فرمائے ہیں۔ اگر جانور کو خصی کرنے کا جواز نہ ہوتا تو آپ ﷺ ان کی قربانی نہ کرتے۔

اور جو ایمان لائیں اور بھلے کام کریں ہم انہیں ان جنتوں میں لے جائیں گے جن کے نیچے چشمے جاری ہیں، جہاں یہ ابدالاباد رہیں گے، یہ ہے اللہ کا وعدہ جو سراسر سچا ہے اور کون ہے جو اپنی بات میں اللہ سے زیادہ سچا ہو؟^(۱) (۱۲۲)

حقیقت حال نہ تو تمہاری آرزو کے مطابق ہے اور نہ اہل کتاب کی امیدوں پر موقوف ہے، جو برا کرے گا اسکی سزا پائے گا اور کسی کو نہ پائے گا جو اس کی حمایت و مدد اللہ کے پاس کر سکے۔ (۱۲۳)

جو ایمان والا ہو مرد ہو یا عورت اور وہ نیک اعمال کرے، یقیناً ایسے لوگ جنت میں جائیں گے اور کھجور کی کٹھلی کے شگاف برابر بھی ان کا حق نہ مارا جائے گا۔^(۲) (۱۲۴)

باعتبار دین کے اس سے اچھا کون ہے؟ جو اپنے کو اللہ

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا وَعَدَّ اللَّهُ حَقًّا وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ۝

لَيْسَ بِأَمَانَةٍ كُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزِيهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَبِيًّا ۝

وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ

(۱) شیطانی وعدے تو سراسر دھوکہ اور فریب ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں اللہ کے وعدے جو اس نے اہل ایمان سے کئے ہیں سچے اور برحق ہیں، اور اللہ سے زیادہ سچا کون ہو سکتا ہے؟ لیکن انسان کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ یہ بچوں کی بات کو کم مانتا ہے اور جھوٹوں کے پیچھے زیادہ چلتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ شیطانی چیزوں کا چلن عام ہے اور ربانی کاموں کو اختیار کرنے والے ہر دور میں اور ہر جگہ کم ہی رہے ہیں اور کم ہی ہیں ﴿وَقِيلَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَذِهِمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾ (سبا-۱۳) ”میرے شکر گزار بندے کم ہی ہیں“

(۲) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ اہل کتاب اپنے متعلق بڑی خوش فہمیوں میں مبتلا تھے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے پھر ان کی خوش فہمیوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا کہ آخرت کی کامیابی محض امیدوں اور آرزوؤں سے نہیں ملے گی۔ اس کے لئے تو ایمان اور عمل صالح کی پونجی ضروری ہے۔ اگر اس کے برعکس نامہ اعمال میں برائیاں ہوں گی تو اسے ہر صورت میں اس کی سزا بھگتنی ہوگی، وہاں کوئی ایسا دوست یا مددگار نہیں ہوگا جو برائی کی سزا سے بچا سکے۔ آیت میں اہل کتاب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو بھی خطاب فرمایا ہے تاکہ وہ بھی یہود و نصاریٰ کی سی غلط فہمیوں، خوش فہمیوں اور عمل سے خالی آرزوؤں اور تمناؤں سے اپنا دامن بچا کر رکھیں۔ لیکن افسوس مسلمان اس تنبیہ کے باوجود انہیں خام خیالیوں میں مبتلا ہو گئے جن میں سابقہ امتیں گرفتار ہوئیں۔ اور آج بے عملی اور بد عملی مسلمان کا بھی شعار بنی ہوئی ہے اور اس کے باوجود وہ امت مرحومہ کملانے پر مصر ہے۔ هَدَانَا اللَّهُ تَعَالَىٰ .

کے تابع کر دے اور ہو بھی نیکیو کار، ساتھ ہی یکسوئی والے ابراہیم کے دین کی پیروی کر رہا ہو اور ابراہیم (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دوست بنا لیا ہے (۱۳۵)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو گھیرنے والا ہے۔ (۱۳۶)

آپ سے عورتوں کے بارے میں حکم دریافت کرتے ہیں، (۳) آپ کہہ دیجئے کہ خود اللہ ان کے بارے میں حکم دے رہا ہے اور قرآن کی وہ آیتیں جو تم پر ان یتیم لڑکیوں کے بارے میں پڑھی جاتی ہیں جنہیں ان کا مقرر حق تم نہیں دیتے (۳) اور انہیں اپنے نکاح میں لانے کی

وَاتَّبِعْ مَلَائِكَةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا ﴿۱۳۵﴾

وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطًا ﴿۱۳۶﴾

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِي يَتٰمٰى النِّسَاءِ الّٰتٰى لَا تُوْتُوْنَ لَهُنَّ مَآ كَيْتَبَ لَهُنَّ وَتَرَعَبُونَ اَنْ تَكُوْنُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوُلْدَانِ اَوْ اَنْ تَقُوْمُوْا بِالْبَيْتِي

(۱) یہاں کامیابی کا ایک معیار اور اس کا ایک نمونہ بیان کیا جا رہا ہے۔ معیار یہ ہے کہ اپنے کو اللہ کے سپرد کر دے، محسن بن جائے اور ملت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرے اور نمونہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیل بنایا۔ خلیل کے معنی ہیں کہ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت اس طرح راسخ ہو جائے کہ کسی اور کے لئے اس میں جگہ نہ رہے۔ خلیل (بروزن فعل) بمعنی فاعل ہے جیسے علیم بمعنی عالم اور بعض کہتے ہیں کہ بمعنی مفعول ہے۔ جیسے حبیب بمعنی محبوب اور حضرت ابراہیم علیہ السلام یقیناً اللہ کے محب بھی تھے اور محبوب بھی علیہ الصلوٰۃ والسلام (فتح القدیر)۔ اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے ”اللہ نے مجھے بھی خلیل بنایا ہے جس طرح اس نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا“ (صحیح مسلم، کتاب المساجد)

(۲) عورتوں کے بارے میں جو سوالات ہوتے رہتے تھے، یہاں سے ان کے جوابات دیئے جا رہے ہیں۔

(۳) وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ — اس کا عطف اللہ يُفْتِيكُمْ — پر ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان کی بابت وضاحت فرماتا ہے اور کتاب اللہ کی وہ آیات وضاحت کرتی ہیں جو اس سے قبل یتیم لڑکیوں کے بارے میں نازل ہو چکی ہیں۔ مراد ہے سورہ نساء کی آیت ۳ جس میں ان لوگوں کو اس بے انصافی سے روکا گیا ہے کہ وہ یتیم لڑکی سے ان کے حسن و جمال کی وجہ سے شادی تو کر لیتے تھے لیکن مہر مثل دینے سے گریز کرتے تھے۔

رغبت رکھتے ہو^(۱) اور کمزور بچوں کے بارے میں^(۲) اور اس بارے میں کہ یتیموں کی کارگزاری انصاف کے ساتھ کرو۔^(۳) تم جو نیک کام کرو، بے شبہ اللہ اسے پوری طرح جانے والا ہے۔ (۱۲۷)

اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی بددماغی اور بے پرواہی کا خوف ہو تو دونوں آپس میں جو صلح کر لیں اس میں کسی پر کوئی گناہ نہیں۔^(۴) صلح بہتر چیز ہے، طع ہر ہر نفس

بِالْقِسْطِ وَمَا تَفَعَّلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا ﴿۱۲۷﴾

وَإِن مَّرَأَةً تَخَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ وَإِنْ عُثِرُوا بِتَعَوُّفٍ فَإِنَّ اللَّهَ

(۱) اس کے دو ترجمے کئے گئے ہیں، ایک تو یہی جو مرحوم مترجم نے کیا ہے، اس میں فی کالفظ مخدوف ہے۔ اس کا دوسرا ترجمہ عن کالفظ مخدوف مان کر کیا گیا ہے یعنی نَزَعْتُونَّ عَنْ أَنْ تَنكِحُوهُنَّ، ”تمہیں ان سے نکاح کرنے کی رغبت نہ ہو“ رغب کا صلہ عن آئے تو معنی اعراض اور بے رغبتی کے ہوتے ہیں۔ جیسے ﴿وَمَنْ يُزَيِّجْ بَيْنَهُمَا فَإِنَّ اللَّهَ خَيْرٌ مِنْكُمْ﴾ میں ہے یہ گویا دوسری صورت بیان کی گئی ہے کہ یتیم لڑکی بعض دفعہ بد صورت ہوتی تو اس کے ولی یا اس کے ساتھ وراثت میں شریک دوسرے ورثا خود بھی اس کے ساتھ نکاح کرنا پسند نہ کرتے اور کسی دوسری جگہ بھی اس کا نکاح نہ کرتے، تاکہ کوئی اور شخص اس کے حصہ جائیداد میں شریک نہ بنے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلی صورت کی طرح ظلم کی اس دوسری صورت سے بھی منع فرمایا۔

(۲) اس کا عطف بِنَامَى النِّسَاءِ پر ہے۔ یعنی (وَمَا يُنلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي نِكَاحِ النِّسَاءِ وَفِي الْمُنْتَضَعَيْنِ مِنَ الْوِلْدَانِ) ”یتیم لڑکیوں کے بارے میں تم پر جو پڑھا جاتا ہے (سورۃ النساء کی آیت نمبر ۳) اور کمزور بچوں کی بابت جو پڑھا جاتا ہے“ اس سے مراد قرآن کا حکم ﴿يُؤْتِيكَ اللَّهُ فِي الْأَوْلَادِ﴾ ہے جس میں بیٹوں کے ساتھ بیٹیوں کو بھی وراثت میں حصہ دار بنایا گیا۔ جب کہ زمانہ جاہلیت میں صرف بڑے لڑکوں کو ہی وارث سمجھا جاتا تھا، چھوٹے کمزور بچے اور عورتیں وراثت سے محروم ہوتی تھیں۔ شریعت نے سب کو وارث قرار دیا۔

(۳) اس کا عطف بھی بِنَامَى النِّسَاءِ پر ہے۔ یعنی کتاب اللہ کا یہ حکم بھی تم پر پڑھا جاتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو۔ یتیم بچی صاحب جمال ہو تب بھی اور بد صورت ہو تب بھی۔ دونوں صورتوں میں انصاف کرو (جیسا کہ تفصیل گزری)

(۴) خاوند اگر کسی وجہ سے اپنی بیوی کو ناپسند کرے اور اس سے دور رہنا (نشوز) اور اعراض کرنا معمول بنا لے یا ایک سے زیادہ بیویاں ہونے کی صورت میں کسی کم تر خوب صورت بیوی سے اعراض کرے تو عورت اپنا کچھ حق چھوڑ کر (مہر سے یا نان و نفقہ سے یا باری سے) خاوند سے مصالحت کر لے تو اس مصالحت میں خاوند یا بیوی پر کوئی گناہ نہیں۔ کیونکہ صلح بہر حال بہتر ہے۔ حضرت ام المومنین سودة بنت العاصم نے بھی بڑھاپے میں اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لئے ہبہ کر دی تھی جسے نبی ﷺ نے قبول فرمایا تھا۔ (صحیح بخاری و مسلم۔ کتاب النکاح)

كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ جَبِيزًا ﴿۱۸﴾

میں شامل کر دی گئی ہے۔^(۱) اگر تم اچھا سلوک کرو اور پرہیز گاری کرو تو تم جو کر رہے ہو اس پر اللہ تعالیٰ پوری طرح خبردار ہے۔ (۱۲۸)

تم سے یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ اپنی تمام بیویوں میں ہر طرح عدل کرو، گو تم اس کی کتنی ہی خواہش و کوشش کر لو، اس لئے بالکل ہی ایک کی طرف مائل ہو کر دوسری کو ادھر لٹکتی ہوئی نہ چھوڑو^(۲) اور اگر تم اصلاح کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت اور رحمت والا ہے۔ (۱۲۹)

اور اگر میاں بیوی جدا ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت سے ہر ایک کو بے نیاز کر دے گا،^(۳) اللہ تعالیٰ وسعت والا حکمت والا ہے۔ (۱۳۰)

وَلَنْ تَسْتَظِيغُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ الْبَيْتَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ
فَلَا تَبْيُغُوا وَكُلُّ الْمَرْءِ لَكَافِرٌ وَإِنْ تَضِلُّوا
وَتَضَلُّوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿۱۹﴾

وَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ كُفْرَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَهُ
وَاللَّهُ وَاسِعٌ حَكِيمٌ ﴿۲۰﴾

(۱) شیخ بخل اور طمع کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد اپنا اپنا مفاد ہے جو ہر نفس کو عزیز ہوتا ہے یعنی ہر نفس اپنے مفاد میں بخل اور طمع سے کام لیتا ہے۔

(۲) یہ ایک دوسری صورت ہے کہ ایک شخص کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو دلی تعلق اور محبت میں وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک نہیں کر سکتا۔ کیونکہ محبت، فعلِ قلب ہے جس پر کسی کو اختیار نہیں ہے۔ خود نبی ﷺ کو بھی اپنی بیویوں میں سب سے زیادہ محبت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے تھی۔ خواہش کے باوجود انصاف نہ کرنے سے مطلب یہی قلبی میلان اور محبت میں عدم مساوات ہے۔ اگر یہ قلبی محبت ظاہری حقوق کی مساوات میں مانع نہ بنے تو عند اللہ قابلِ مؤاخذہ نہیں۔ جس طرح کہ نبی ﷺ نے اس کا نہایت عمدہ نمونہ پیش فرمایا۔ لیکن اکثر لوگ اس قلبی محبت کی وجہ سے دوسری بیویوں کے حقوق کی ادائیگی میں بہت کوتاہی کرتے ہیں اور ظاہری طور پر بھی ”محبوب بیوی“ کی طرح دوسری بیویوں کے حقوق ادا نہیں کرتے اور انہیں معاف (درمیان میں لٹکی ہوئی) بنا کر رکھ چھوڑتے ہیں، نہ انہیں طلاق دیتے ہیں نہ حقوق زوجیت ادا کرتے ہیں۔ یہ انتہائی ظلم ہے جس سے یہاں روکا گیا ہے اور نبی ﷺ نے بھی فرمایا ہے ”جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ایک کی طرف ہی مائل ہو (یعنی دوسری کو نظر انداز کر کے رکھے) تو قیامت کے دن وہ اس طرح آئے گا کہ اس کے جسم کا ایک حصہ (یعنی نصف) ساقط ہو گا۔ (ترمذی، کتاب النکاح)

(۳) یہ تیسری صورت ہے کہ کوشش کے باوجود اگر نباہ کی صورت نہ بنے تو پھر طلاق کے ذریعے سے علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ ممکن ہے علیحدگی کے بعد مرد کو مطلوبہ صفات والی بیوی اور عورت کو مطلوبہ صفات والا مرد مل جائے۔ اسلام میں طلاق

زمین اور آسمانوں کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت میں ہے اور واقعی ہم نے ان لوگوں کو جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے تھے اور تم کو بھی یہی حکم کیا ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور اگر تم کفر کرو تو یاد رکھو کہ اللہ کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ بہت بے نیاز اور تعریف کیا گیا ہے۔ (۱۳۱)

اللہ کے اختیار میں ہیں آسمانوں کی سب چیزیں اور زمین کی بھی اور اللہ کا ساز کافی ہے۔ (۱۳۲)

اگر اسے منظور ہو تو اسے لوگو! وہ تم سب کو لے جائے اور دوسروں کو لے آئے، اللہ تعالیٰ اس پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔ (۱۳۳)

جو شخص دنیا کا ثواب چاہتا ہو تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے پاس تو دنیا اور آخرت (دونوں) کا ثواب موجود ہے (۲) اور اللہ تعالیٰ بہت سننے والا اور خوب دیکھنے والا ہے۔ (۱۳۴)

وَاللَّهُ مَافِي السَّمَوَاتِ وَمَافِي الْأَرْضِ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنْ اتَّقُوا اللَّهَ وَإِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَافِي الْأَرْضِ وَكَانَ اللَّهُ غَدِيًّا حَمِيدًا ﴿۱۳۱﴾

وَاللَّهُ مَافِي السَّمَوَاتِ وَمَافِي الْأَرْضِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكَيْلًا ﴿۱۳۲﴾

إِن يَشَاءُ يُنَزِّلْ عَلَيْكُمْ مِمَّا فِي السَّمَاوَاتِ مَاءً بَارِكًا يَخْرُجُ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا ذَلِيلًا قَدِيرًا ﴿۱۳۳﴾

مَنْ كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ مِمَّا كَانَ اللَّهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿۱۳۴﴾

کو اگرچہ سخت ناپسند کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے اُبْغَضُ الْحَلَائِلِ إِلَى اللَّهِ الطَّلَاقُ (رواہ ابو داؤد مشکوٰۃ) ”طلاق حلال تو ہے لیکن یہ ایسا حلال ہے جو اللہ کو سخت ناپسند ہے“ اس کے باوجود اللہ نے اس کی اجازت دی ہے۔ اس لئے کہ بعض دفعہ حالات ایسے موڑ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اس کے بغیر چارہ نہیں ہوتا اور فریقین کی بہتری اسی میں ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لیں۔ مذکورہ حدیث میں صحت اسناد کے اعتبار سے اگرچہ ضعف ہے تاہم قرآن و سنت کی نصوص سے یہ واضح ہے کہ یہ حق اسی وقت استعمال کرنا چاہئے جب نباہ کی کوئی صورت کسی طرح بھی نہ بن سکے۔

ملحوظہ: حدیث مذکور (اُبْغَضُ الْحَلَائِلِ...) کو شیخ الہبانی نے ضعیف قرار دیا ہے (ارواء الغلیل، نمبر ۲۰۴۰) تاہم عذر شرعی کے بغیر طلاق کے ناپسندیدہ ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

(۱) یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت قاہرہ و کاملہ کا اظہار ہے جب کہ ایک دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَإِن تَتَوَلَّوْا يَتَّبِعَنَّ قَوْمًا شِرْكُكُمْ لَا يَكُونُوا آيَةً لَّكُمْ﴾ (محمد-۳۸) ”اگر تم پھرو گے تو وہ تمہاری جگہ اوروں کو لے آئے گا اور وہ تمہاری طرح کے نہیں ہوں گے“

(۲) جیسے کوئی شخص جہاد صرف مال غنیمت کے حصول کے لئے کرے تو کتنی نادانی کی بات ہے۔ جب اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت دونوں کا ثواب عطا فرمانے پر قادر ہے تو پھر اس سے ایک ہی چیز کیوں طلب کی جائے؟ انسان دونوں ہی کا طالب کیوں نہ بنے؟

اے ایمان والو! عدل و انصاف پر مضبوطی سے جم جانے والے اور خوشنودی مولا کے لئے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ، گو وہ خود تمہارے اپنے خلاف ہو یا اپنے ماں باپ کے یا رشتہ دار عزیزوں کے،^(۱) وہ شخص اگر امیر ہو تو اور فقیر ہو تو دونوں کے ساتھ اللہ کو زیادہ تعلق ہے،^(۲) اس لئے تم خواہش نفس کے پیچھے پڑ کر انصاف نہ چھوڑ دینا^(۳) اور اگر تم نے کج بیانی یا پہلو تہی کی^(۴) تو جان لو کہ جو کچھ تم کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ (۱۳۵)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَوْ لَوْنَا قَوْمَيْنِ يَالْقَسِيطِ شَهَدَاءَ بَلَدِهِ
وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أُولُو الْأَرْحَامِ وَالْأَقْرَبِينَ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا
أَوْ فَقِيرًا فَإِنَّهُ أُولَىٰ بِهِمَا قَلَّا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا
وَإِنْ تَلَوْنَا أَوْ نَعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿۱۳۵﴾

(۱) اس میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو عدل و انصاف قائم کرنے اور حق کے مطابق گواہی دینے کی تاکید فرما رہا ہے چاہے اس کی وجہ سے انہیں یا ان کے والدین اور رشتہ داروں کو نقصان ہی اٹھانا پڑے۔ اس لئے کہ حق سب پر حاکم ہے اور سب پر مقدم ہے۔

(۲) یعنی کسی مال دار کی مالدار کی وجہ سے رعایت کی جائے نہ کسی فقیر کے فقر کا اندیشہ تمہیں سچی بات کہنے سے روکے بلکہ اللہ ان دونوں سے تمہارے زیادہ قریب اور مقدم ہے۔

(۳) یعنی خواہش نفس، عصبیت یا بغض تمہیں انصاف کرنے سے نہ روک دے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا﴾ (المائدہ - ۸) ”تمہیں کسی قوم کی دشمنی اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔“

(۴) نَلُوْنَا، لیبی سے ہے جو تحریف اور جان بوجھ کر جھوٹ بولنے کو کہا جاتا ہے۔ مطلب شہادت میں تحریف و تغیر ہے اور اعراض سے مراد شہادت کا کتمان (چھپانا) اور اس کا ترک کرنا ہے۔ ان دونوں باتوں سے بھی روکا گیا ہے۔ اس آیت میں عدل و انصاف کی تاکید اور اس کے لئے جن باتوں کی ضرورت ہے، ان کا اہتمام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً:

☆ ہر حال میں عدل کرو اس سے سرمو انحراف نہ کرو، کسی ملامت گر کی ملامت اور کوئی اور محرک اس میں رکاوٹ نہ بنے۔ بلکہ اس کے قیام میں تم ایک دوسرے کے معاون اور دست و بازو بنو

☆ صرف اللہ کی رضا تمہارے پیش نظر ہو، کیونکہ اس صورت میں تم تحریف، تبدیل اور کتمان سے گریز کرو گے اور تمہارا فیصلہ عدل کی میزان میں پورا ہوتے گا۔

☆ عدل و انصاف کی زد اگر تم پر یا تمہارے والدین پر یا دیگر قریبی رشتہ داروں پر بھی پڑے، تب بھی تم پروامت کرو اور اپنی اور ان کی رعایت کے مقابلے میں عدل کے تقاضوں کو اہمیت دو۔

☆ کسی مال دار کی اس کی تو گمری کی وجہ سے رعایت نہ کرو اور کسی تنگ دست کے فقر سے خوف مت کھاؤ کیونکہ وہی

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ پر، اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اتاری ہے اور ان کتابوں پر جو اس سے پہلے اس نے نازل فرمائی ہیں، ایمان لاؤ! جو شخص اللہ تعالیٰ سے اور اس کے فرشتوں سے اور اسکی کتابوں سے اور اس کے رسولوں سے اور قیامت کے دن سے کفر کرے وہ تو بہت بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ (۱۳۶)

جن لوگوں نے ایمان قبول کر کے پھر کفر کیا، پھر ایمان لا کر پھر کفر کیا، پھر اپنے کفر میں بڑھ گئے، اللہ تعالیٰ یقیناً انہیں نہ بخشے گا اور نہ انہیں راہ ہدایت سچائے گا۔ (۱۳۷)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَى رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿۱۳۶﴾

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ أزدَادُوا كُفْرًا أَهُمْ يَكْفُرُونَ إِنَّ اللَّهَ لِيُغَيِّرَ لِمَنْ يَشَاءُ سَيَرَاتِهِ ﴿۱۳۷﴾

جانتا ہے کہ ان دونوں کی بہتری کس میں ہے؟

☆ فیصلے میں خواہش نفس، عصبیت اور دشمنی آڑے نہیں آنی چاہئے۔ بلکہ ان سب کو نظر انداز کر کے بے لاگ عدل کرو۔ عدل کا یہ اہتمام جس معاشرے میں ہو گا، وہاں امن و سکون اور اللہ کی طرف سے رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہو گا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے اس نکتے کو بھی خوب سمجھ لیا تھا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی بابت آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں خیبر کے یہودیوں کے پاس بھیجا کہ وہ وہاں کے پھلوں اور فصلوں کا تخمینہ لگا کر آئیں۔ یہودیوں نے انہیں رشوت کی پیشکش کی تاکہ وہ کچھ نرمی سے کام لیں۔ انہوں نے فرمایا ”اللہ کی قسم، میں اس کی طرف سے نمائندہ بن کر آیا ہوں جو دنیا میں مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے اور تم میرے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہو۔ لیکن اپنے محبوب کی محبت اور تمہاری دشمنی مجھے اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ میں تمہارے معاملے میں انصاف نہ کروں۔“ یہ سن کر انہوں نے کہا ”اسی عدل کی وجہ سے آسمان و زمین کا یہ نظام قائم ہے“ (تفسیر ابن کثیر)

(۱) ایمان والوں کو ایمان لانے کی تاکید، تحصیل حاصل والی بات نہیں، بلکہ کمال ایمان اور اس پر استقرار و اثبات کا حکم ہے۔ ﴿هُدًى وَبَرَكَاتٍ وَسَعِيدَةٍ﴾ کا مفہوم ہے۔

(۲) بعض مفسرین نے اس سے مراد یہود لئے ہیں۔ یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے، لیکن حضرت عزیر علیہ السلام کا انکار کیا، پھر حضرت عزیر علیہ السلام پر ایمان لائے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا۔ پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ حضرت محمد ﷺ کی نبوت کا بھی انکار کیا اور بعض نے اس سے مراد منافقین لئے ہیں، چونکہ مقصد ان کا مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا، اس لئے وہ بار بار اپنی مسلمانی کا ڈھونگ رچاتے تھے بالآخر کفر و ضلالت میں اتنے بڑھ گئے کہ ان کی ہدایت کی امید منقطع ہو گئی۔

بَشِيرَ الْمُتَّقِينَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا جَاءْنَاكُمْ بِالْحَقِّ وَالْحَقُّ لَا يَأْتِي الْبُاطِلَ وَأَن تَأْتِي السُّحُورَ لَيْسَ بِشَيْءٍ عِنْدَ اللَّهِ بِكَبِيرٍ ۝۱۰۰

منافقوں کو اس امر کی خبر پہنچا دو کہ ان کے لئے دردناک عذاب یقینی ہے۔ (۱۳۸)

جن کی یہ حالت ہے کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے پھرتے ہیں، کیا ان کے پاس عزت کی تلاش میں جاتے ہیں؟ (تو یاد رکھیں کہ) عزت تو ساری کی ساری اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔ (۱۳۹)^(۲)

اور اللہ تعالیٰ تمہارے پاس اپنی کتاب میں یہ حکم اتار چکا ہے کہ تم جب کسی مجلس والوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے اور مذاق اڑاتے ہوئے سناؤ تو اس مجمع میں ان کے ساتھ نہ بیٹھو! جب تک کہ وہ اس کے علاوہ اور باتیں نہ کرنے لگیں، (ورنہ) تم بھی اس وقت انہی جیسے ہو،^(۳) یقیناً اللہ تعالیٰ تمام کافروں اور سب منافقوں کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔ (۱۴۰)

وَالَّذِينَ يَخُونُونَ ذُورَ الْمُؤْمِنِينَ ۝۱۰۱
يَتَّبِعُونَ عِندَهُمُ الْعُرَّةَ فَإِنَّ الْعُرَّةَ لَتَلَّهُنَّ جَحِيمًا ۝۱۰۲

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَن إِذْ اسْمِعُوا بِلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ يَكْفُرُ بِهِادِيَّتُهُمْ أَنَّهُمْ لَا تَفْعَلُونَ مَا بِهِمْ حَتَّى يُخْضَعُوا فِي حَدِيثِ غَيْرِهِمْ ۝۱۰۳ إِذْ امْتَلَاهُمْ ۝۱۰۴ إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُتَّقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا ۝۱۰۵

(۱) جس طرح سورہ بقرہ کے آغاز میں گزر چکا ہے کہ منافقین کافروں کے پاس جا کر یہی کہتے تھے کہ ہم تو حقیقت میں تمہارے ہی ساتھی ہیں، مسلمانوں سے تو ہم یوں ہی استہزا کرتے ہیں۔

(۲) یعنی عزت، کافروں کے ساتھ مولات و محبت سے نہیں ملے گی، کیونکہ یہ تو اللہ کے اختیار میں ہے اور وہ عزت اپنے ماننے والوں کو ہی عطا فرماتا ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا ﴿مَنْ كَانَ يُرِيدِ الْعُرَّةَ فَلِلَّهِ الْعُرَّةُ جَمِيعًا﴾ (فاطر-۱۰) ”جو عزت کا طالب ہے، تو (اسے سمجھ لینا چاہیے کہ) عزت سب کی سب اللہ کے لئے ہے“ اور فرمایا ﴿وَلِلَّهِ الْعُرَّةُ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُتَّقِينَ لَا يَحْتَمُونَ﴾ (المنافقون-۸) ”عزت اللہ کے لئے ہے اس کے رسول کے لئے ہے اور مومنین کے لئے ہے لیکن منافق نہیں جانتے۔“ یعنی وہ نفاق کے ذریعے سے اور کافروں سے دوستی کے ذریعے سے عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ درآں حالیکہ یہ طریقہ ذلت و خواری کا ہے، عزت کا نہیں۔

(۳) یعنی منع کرنے کے باوجود اگر تم ایسی مجلسوں میں، جہاں آیات الہی کا استہزا کیا جاتا ہو بیٹھو گے اور اس پر نکیر نہیں کرو گے تو پھر تم بھی گناہ میں ان کے برابر ہو گے۔ جیسے ایک حدیث میں آتا ہے کہ ”جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، وہ اس دعوت میں شریک نہ ہو جس میں شراب کا دور چلے۔“ (مسند أحمد جلد ۱ ص ۲۰ جلد ۲ ص ۳۲۰) اس سے معلوم ہوا کہ ایسی مجلسوں اور اجتماعات میں شریک ہونا جن میں اللہ و رسول ﷺ کے احکام کا تو لیا یا عملاً مذاق اڑایا جاتا ہو، جیسے آج کل امر، فیشن اہل اور مغرب زدہ حلقوں میں بالعموم ایسا ہوتا ہے یا شادی بیاہ اور سالگرہ وغیرہ کی تقریبات میں کیا جاتا ہے، سخت گناہ ہے۔ ﴿إِنَّكُمْ إِذْ امْتَلَاهُمْ﴾ کی وعید قرآنی اہل ایمان کے اندر کپکپی طاری کر

یہ لوگ تمہارے انجام کار کا انتظار کرتے رہتے ہیں پھر اگر تمہیں اللہ فتح دے تو یہ کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھی نہیں اور اگر کافروں کو تھوڑا سا غلبہ مل جائے تو (ان سے) کہتے ہیں کہ ہم تم پر غالب نہ آنے لگے تھے اور کیا ہم نے تمہیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے نہ بچایا تھا؟^(۱) پس قیامت میں خود اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا^(۲) اور اللہ تعالیٰ کافروں کو ایمان والوں پر ہرگز راہ نہ دے گا۔^(۳) (۱۴۱)

بے شک منافع اللہ سے چالبازیاں کر رہے ہیں اور وہ

لَاذِينَ يَتْرَضُونَ بِكُمْ ؕ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ فَخْرٌ مِنَ اللَّهِ قَالُوا أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ ؕ وَإِنْ كَانَ لِلْكَافِرِينَ نَصِيبٌ قَالُوا أَلَمْ نَسْتَجِدْكُمْ عَلَيْهِمْ وَنَمْنَعُهُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ قَالَهُ اللَّهُ يَتْلُو عَلَيْكُمْ يُومِئُ الْقَائِمَةُ وَلَنْ يُجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ۝

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخِلُّوا بَيْنَ اللَّهِ وَهُوَ خَدَائِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوا

دینے کے لئے کافی ہے بشرطیکہ دل کے اندر ایمان ہو۔

(۱) یعنی ہم تم پر غالب آنے لگے تھے لیکن تمہیں اپنا ساتھی سمجھ کر چھوڑ دیا اور مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر ہم نے تمہیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے بچایا۔ مطلب یہ کہ تمہیں غلبہ ہماری اس دوغلی پالیسی کے نتیجے میں حاصل ہوا ہے۔ جو ہم نے مسلمانوں میں ظاہری طور پر شامل ہو کر اپنائے رکھی۔ لیکن درپردہ ان کو نقصان پہنچانے میں ہم نے کوئی کوتاہی اور کمی نہیں کی تاکہ تم ان پر غالب آگئے۔ یہ منافقین کا قول ہے جو انہوں نے کافروں سے کہا۔

(۲) یعنی دنیا میں تم نے دھوکے اور فریب سے وقتی طور پر کچھ کامیابی حاصل کر لی۔ لیکن قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ان باطنی جذبات و کیفیات کی روشنی میں ہو گا جنہیں تم سینوں میں چھپائے ہوئے تھے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تو سینوں کے رازوں کو بھی خوب جانتا ہے اور پھر اس پر جو وہ سزا دے گا تو معلوم ہو گا کہ دنیا میں منافقت اختیار کر کے نہایت خسارے کا سودا کیا تھا، جس پر جہنم کا دائمی عذاب بھگتنا ہو گا۔ أَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ.

(۳) یعنی غلبہ نہ دے گا۔ اس کے مختلف مفہوم بیان کئے گئے ہیں۔ (۱) اہل اسلام کا یہ غلبہ قیامت والے دن ہو گا (۲) حجت اور دلائل کے اعتبار سے کافر مسلمانوں پر غالب نہیں آسکتے۔ (۳) کافروں کا ایسا غلبہ نہیں ہو گا کہ مسلمان کی دولت و شوکت کا بالکل ہی خاتمہ ہو جائے گا اور وہ حرف غلط کی طرح دنیا کے نقشے سے ہی محو ہو جائیں۔ ایک حدیث صحیح سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے (۴) جب تک مسلمان اپنے دین کے عامل، باطل سے غیر راضی اور منکرات سے روکنے والے رہیں گے، کافر ان پر غالب نہ آسکیں گے۔ امام ابن العربی فرماتے ہیں کہ ”یہ سب سے عمدہ معنی ہے“ کیونکہ اللہ تعالیٰ کافرمان ہے۔

﴿وَاصَابَكُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ مُمْسِكَةٌ بِمَا كَذَّبْتُمْ إِلَيْهِمْ﴾ — (الشوریٰ: ۳۰) ”اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے، سو تمہارے اپنے نفلوں کی وجہ سے“ (فتح القدر) گویا مسلمانوں کی مغلوبیت ان کی اپنی کوتاہیوں کا نتیجہ ہے۔

انہیں اس چالبازی کا بدلہ دینے والا ہے^(۱) اور جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو بڑی کاہلی کی حالت میں کھڑے ہوتے ہیں^(۲) صرف لوگوں کو دکھاتے ہیں،^(۳) اور یاد الہی تو یونہی ہی برائے نام کرتے ہیں۔^(۴) (۱۳۲)

وہ درمیان میں ہی معلق ڈگمگا رہے ہیں، نہ پورے ان کی طرف نہ صحیح طور پر ان کی طرف^(۵) اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دے تو تو اس کے لئے کوئی راہ نہ پائے گا۔ (۱۳۳)

إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كَسَالَى يُبْأَوْنَ النَّاسَ وَلَا يَكُونُونَ
اللَّهُ إِلَّا قَلِيلًا ۝

مُتَذَبِّبِينَ بَيْنَ ذَلِكَ إِلَى هَوْلَاءِ وَلَا إِلَى هَوْلَاءِ وَمَنْ
يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَنْ يَهْدِيَهُ لَشَيْءٍ ۝

(۱) اس کی مختصر توضیح سورہ بقرہ کے آغاز میں ہو چکی ہے۔

(۲) نماز اسلام کا اہم ترین رکن اور اشرف ترین فرض ہے اور اس میں بھی وہ کاہلی اور سستی کا مظاہرہ کرتے تھے کیونکہ ان کا قلب ایمان، خشیت الہی اور خلوص سے محروم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عشا اور فجر کی نماز بطور خاص ان پر بہت بھاری تھی جیسا کہ نبی ﷺ کا فرمان ہے «أَنْقَلُ الصَّلَاةَ عَلَى الْمُنَافِقِينَ صَلَاةَ الْعِشَاءِ وَصَلَاةَ الْفَجْرِ...» (صحیح بخاری، موافیت الصلوٰۃ - صحیح مسلم، کتاب المساجد) ”منافق پر عشا اور فجر کی نماز سب سے زیادہ بھاری ہے۔“

(۳) یہ نماز بھی وہ صرف ریاکاری اور دکھاوے کے لئے پڑھتے تھے، تاکہ مسلمانوں کو فریب دے سکیں۔
(۴) اللہ کا ذکر تو برائے نام کرتے ہیں یا نماز مختصری پڑھتے ہیں ہی لا يُصَلُّونَ إِلَّا صَلَاةَ قَلِيلَةٍ جب نماز اخلاص، خشیت الہی اور خشوع سے خالی ہو تو اطمینان سے نماز کی ادائیگی نہایت گراں ہوتی ہے۔ جیسا کہ ﴿وَأَمَّا الْكِبِيرَةُ إِلَّا عَلَى الْخَشِيِّينَ﴾ (البقرہ - ۴۵) سے واضح ہے۔ حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا ”یہ منافق کی نماز ہے، یہ منافق کی نماز ہے، یہ منافق کی نماز ہے کہ بیٹھا ہوا سورج کا انتظار کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان (یعنی غروب کے قریب) ہو جاتا ہے تو اٹھتا ہے اور چار ٹھونگیں مار لیتا ہے..... (صحیح مسلم، کتاب المساجد۔ موطا کتاب القرآن)

(۵) کافروں کے پاس جاتے ہیں تو ان کے ساتھ اور مومنوں کے پاس آتے ہیں تو ان کے ساتھ دوستی اور تعلق کا اظہار کرتے ہیں۔ ظاہر آو باطناؤہ مسلمانوں کے ساتھ ہیں نہ کافروں کے ساتھ۔ ظاہر ان کا مسلمانوں کے ساتھ ہے تو باطن کافروں کے ساتھ اور بعض منافق تو کفر و ایمان کے درمیان متحیر اور تذبذب ہی کا شکار رہتے تھے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے ”منافق کی مثال اس بکری کی طرح ہے جو جنتی کے لئے دو ریوڑوں کے درمیان متردد رہتی ہے، (بکرے کی تلاش میں) کبھی ایک ریوڑ کی طرف جاتی ہے، کبھی دوسرے کی طرف“ (صحیح مسلم، کتاب المنافقین)

اے ایمان والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی صاف حجت قائم کر لو۔^(۱) (۱۳۳)

منافق تو یقیناً جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں جائیں گے،^(۲) ناممکن ہے کہ تو ان کا کوئی مددگار پالے۔ (۱۳۵)

ہاں جو توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں اور اللہ تعالیٰ پر کامل یقین رکھیں اور خالص اللہ ہی کے لئے دینداری کریں تو یہ لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں،^(۳) اللہ تعالیٰ مومنوں کو بہت بڑا اجر دے گا۔ (۱۳۶)

اللہ تعالیٰ تمہیں سزا دے کر کیا کرے گا؟ اگر تم شکر گزاری کرتے رہو اور اور باایمان رہو،^(۴) اللہ تعالیٰ بہت قدر کرنے والا اور پورا علم رکھنے والا ہے۔ (۱۳۷)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ أَرْبُدُونَ أَنْ يَحْمِلُوا إِلَيْهِ عَلَىٰ لَكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِينًا ۝

إِنَّ الْمُنٰفِقِينَ فِي الدَّرَكِ الرَّاسِخِ مِنَ الْكٰفِرِينَ لَنْ يَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ۝

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَاعْتَصَمُوا بِاللّٰهِ وَأَخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلّٰهِ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ۝

مَا يَعْزِلُ اللّٰهُ بَعْدَ اٰيٰتِهِ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاَمَنْتُمْ وَاَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ۝

(۱) یعنی اللہ نے تمہیں کافروں کی دوستی سے منع فرمایا ہے۔ اب اگر تم دوستی کرو گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کو یہ دلیل مہیا کر رہے ہو کہ وہ تمہیں بھی سزا دے سکے (یعنی معصیت الہی اور حکم عدولی کی وجہ سے)

(۲) جہنم کا سب سے نیچلا طبقہ ہاویۃ کلمات ہے۔ اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا منافقین کی مذکورہ عادات و صفات سے ہم سب مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ بچائے۔

(۳) یعنی منافقین میں سے جو ان چار چیزوں کا خلوص دل سے اہتمام کرے گا، وہ جہنم میں جانے کے بجائے جنت میں اہل ایمان کے ساتھ ہو گا۔

(۴) شکر گزاری کا مطلب ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق برائیوں سے اجتناب اور عمل صالح کا اہتمام کرنا۔ یہ گویا اللہ کی نعمتوں کا عملی شکر ہے اور ایمان سے مراد اللہ کی توحید و ربوبیت پر اور نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت پر ایمان ہے۔

(۵) یعنی جو اس کا شکر کرے گا، وہ قدر کرے گا؛ جو دل سے ایمان لائے گا، وہ اس کو جان لے گا اور اس کے مطابق وہ بہترین جزا سے نوازے گا۔

برائی کے ساتھ آواز بلند کرنے کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا مگر مظلوم کو اجازت ہے^(۱) اور اللہ تعالیٰ خوب سنتا جانتا ہے۔ (۱۳۸)

اگر تم کسی نیکی کو علانیہ کرو یا پوشیدہ، یا کسی برائی سے درگزر کرو،^(۲) پس یقیناً اللہ تعالیٰ پوری معافی کرنے والا اور پوری قدرت والا ہے۔ (۱۳۹)

لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوَاءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ
وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا عَلِيمًا ﴿۱۳۸﴾

إِنَّ تُوْبَدَ وَأَخِيْرًا أَوْ تَعْفَوْا عَنْ سُوءِ قَوْلِ اللَّهِ كَانَ
عَفْوًا قَدِيْرًا ﴿۱۳۹﴾

(۱) شریعت نے ناید کی ہے کہ کسی کے اندر برائی دیکھو تو اس کا چرچا نہ کرو، بلکہ تنہائی میں اس کو سمجھاؤ، الایہ کہ کوئی دینی مصلحت ہو۔ اسی طرح کھلے عام اور علی الاعلان برائی کرنا بھی سخت ناپسندیدہ ہے۔ ایک تو برائی کا ارتکاب ویسے ہی ممنوع ہے، چاہے پردے کے اندر ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرا اسے برسرعام کیا جائے یہ مزید ایک جرم ہے اور اس کی وجہ سے اس برائی کا جرم دو چند بلکہ وہ چند بھی ہو سکتا ہے۔ قرآن کے الفاظ مذکورہ دونوں قسم کی برائیوں کے اظہار سے ممانعت کو شامل ہیں اور اس میں یہ بھی داخل ہے کہ کسی شخص کو اس کی کردہ یا ناکردہ حرکت پر برا بھلا کہا جائے۔ البتہ اس سے ایک اشتنا ہے کہ ظالم کے ظلم کو تم لوگوں کے سامنے بیان کر سکتے ہو۔ جس سے ایک فائدہ یہ متوقع ہے کہ شاید وہ ظلم سے باز آجائے یا اس کی تلافی کی سعی کرے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ لوگ اس سے بچ کر رہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور کہا کہ مجھے میرا پڑوسی ایذا دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا ”تم اپنا سامان نکال کر باہر راستے میں رکھ دو“ اس نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ جو بھی گزرتا اس سے پوچھتا، وہ پڑوسی کے ظالمانہ رویے کی وضاحت کرتا تو سن کر ہرگز اس پر لعنت ملامت کرتا۔ پڑوسی نے یہ صورت حال دیکھ کر معذرت کر لی اور آئندہ کے لیے ایذا نہ پہنچانے کا فیصلہ کر لیا اور اس سے اپنا سامان اندر رکھنے کی التجا کی۔ (سنن ابی داؤد۔ کتاب الأدب)

(۲) کوئی شخص کسی کے ساتھ ظلم یا برائی کا ارتکاب کرے تو شریعت نے اس حد تک بدلہ لینے کی اجازت دی ہے۔ جس حد تک اس پر ظلم ہوا ہے۔ الْمُسْتَبَانَ مَا قَالَا، فَعَلَى الْبَادِي، مَا لَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُومُ، صَحِيْحٌ مُسْلِمٌ، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب النهی من السباب حدیث نمبر ۳۵۸۷ ”اِس میں گالی گلوچ کرنے والے دو شخص جو کچھ کہیں اس کا گناہ پہل کرنے والے پر ہے (بشرطیکہ مظلوم (یعنی جسے پہلے گالی دی گئی) اور اس نے جواب میں گالی دی) زیادتی نہ کرے۔“ لیکن بدلہ لینے کی اجازت کے ساتھ ساتھ معافی اور درگزر کو زیادہ پسند فرمایا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود باوجود قدرت کاملہ کے عفو و درگزر سے کام لینے والا ہے۔ اس لیے فرمایا ﴿ وَحَزْوَاسِيْنَةَ سَيِّئَةً مِّثْلَهَا، فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ﴾ (الشوریٰ-۳۰) برائی کا بدلہ، اسی کی مثل برائی ہے، مگر جو درگزر کرے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے اور حدیث میں بھی ہے ”معاف کر دینے سے اللہ تعالیٰ عزت میں اضافہ فرماتا ہے۔“ صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب باب استحباب العفو والتواضع۔

جو لوگ اللہ کے ساتھ اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق رکھیں اور جو لوگ کہتے ہیں کہ بعض نبیوں پر تو ہمارا ایمان ہے اور بعض پر نہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے اور اس کے بین بین کوئی راہ نکالیں۔ (۱۵۰)

یقین مانو کہ یہ سب لوگ اصلی کافر ہیں،^(۱) اور کافروں کے لیے ہم نے اہانت آمیز سزاتیار کر رکھی ہے۔ (۱۵۱)

اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے تمام پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے، یہ ہیں جنہیں اللہ ان کو پورا ثواب دے گا^(۲) اور اللہ بڑی مغفرت والا ہے۔ (۱۵۲)

آپ سے یہ اہل کتاب درخواست کرتے ہیں کہ آپ ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب لائیں،^(۳) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے تو انہوں نے اس سے بہت بڑی درخواست

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا
بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنُكْفِرُ بِبَعْضٍ
وَيُرِيدُونَ أَنْ يُخَيِّطُوا بَيْنَ ذَلِكَ سُبُلًا ۝

أُولَٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ حَقًّا ۖ وَأَعْتَدْنَا لَلكٰفِرِينَ
عَذَابًا مُّهِينًا ۝

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ
أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمُ اللّٰهُ أَجْرًا كَثِيرًا ۖ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝

يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تَنزِلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِنَ السَّمَاءِ
فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَىٰ الْأَكْبَرِينَ ذَلِكَ فَقَالُوا إِنْ أَرَادَ اللّٰهُ جَهَنَّمَ
فَأَخَذَتْهُمُ الضُّعْفَةُ يُظْلِمُهُمْ ثُمَّ أَخَذُوا الْعِجْلَ

(۱) اہل کتاب کے متعلق پہلے گزر چکا ہے کہ وہ بعض نبیوں کو مانتے تھے اور بعض کو نہیں۔ جیسے یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام و حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور عیسائیوں نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام کے درمیان تفریق کرنے والے یہ کپے کافر ہیں۔

(۲) یہ ایمانداروں کا شیوہ بتلایا کہ وہ سب انبیاء علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں۔ جس طرح مسلمان ہیں کہ وہ کسی بھی نبی کا انکار نہیں کرتے۔ اس آیت سے بھی ”وحدت ادیان“ کی نفی ہوتی ہے جس کے قائلین کے نزدیک رسالت محمدیہ پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ اور وہ ان غیر مسلموں کو بھی نجات یافتہ سمجھتے ہیں جو اپنے تصورات کے مطابق ایمان باللہ رکھتے ہیں۔ لیکن قرآن کی اس آیت نے واضح کر دیا کہ ایمان باللہ کے ساتھ رسالت محمدیہ پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اگر اس آخری رسالت کا انکار ہو گا تو اس انکار کے ساتھ ایمان باللہ غیر معتبر اور نامقبول ہے (مزید دیکھیے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۶۲ کا حاشیہ)

(۳) یعنی جس طرح موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر گئے اور تختیوں پر لکھی ہوئی تورات لے کر آئے، اسی طرح آپ بھی آسمان پر جا کر لکھا ہوا قرآن مجید لے کر آئیں۔ یہ مطالبہ محض عناد و مجود اور تعنت کی بنا پر تھا۔

مَنْ بَعْدَ مَا حَاءَ تَهُمُ الْبَيْتِ فَعَقَّبُوا عَنْ ذِكْرِكَ وَإِنَّا مُؤْمِنٌ سُلْطَانًا مُبِينًا ﴿۱۵۰﴾

کی تھی کہ ہمیں کھلا اللہ تعالیٰ کو دکھادے، پس ان کے اس ظلم کے باعث ان پر کڑا کے کی بجلی آپڑی پھر باوجودیکہ ان کے پاس بہت دلیلیں پہنچ چکی تھیں انہوں نے پھڑے کو اپنا معبود بنا لیا، لیکن ہم نے یہ بھی معاف فرما دیا اور ہم نے موسیٰ کو کھلا غلبہ (اور صریح دلیل) عنایت فرمائی۔ (۱۵۳)

اور ان کا قول لینے کے لیے ہم نے ان کے سروں پر طور پہاڑ لاکھڑا کر دیا اور انہیں حکم دیا کہ سجدہ کرتے ہوئے دروازے میں جاؤ اور یہ بھی فرمایا کہ ہفتہ کے دن میں تجاوز نہ کرنا اور ہم نے ان سے سخت سے سخت قول و قرار لیے۔ (۱۵۴)

(یہ سزا تھی) بہ سبب ان کی عمد شکنی کے اور احکام الہی کے ساتھ کفر کرنے کے اور اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کر ڈالنے کے،^(۱) اور اس سبب سے کہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہے۔ حالانکہ دراصل ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے، اس لیے یہ قدر قلیل ہی ایمان لاتے ہیں۔ (۱۵۵)

اور ان کے کفر کے باعث اور مریم پر بہت بڑا بہتان باندھنے کے باعث۔^(۲) (۱۵۶)

اور یوں کہنے کے باعث کہ ہم نے اللہ کے رسول مسیح عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا حالانکہ نہ تو انہوں نے اسے

وَرَعَيْنَا قَوْلَهُمْ الظُّورُ بَيْنَنَا قِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمْ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا أَوْ قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا ﴿۱۵۰﴾

فِيمَا نَقَضْتَهُمْ مِيثَاقَهُمْ وَكُفِّرَهُمْ بِآيَاتِ اللَّهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَنْبِيَاءَ بَغْيًا حَتَّىٰ وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبِعَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ لِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۱۵۰﴾

وَيَكْفُرُهُمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا ﴿۱۵۶﴾

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَىٰ ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ

(۱) تقدیری عبارت یوں ہوگی فَبَيْنَقَضْتَهُمْ مِيثَاقَهُمْ لَعْنَاهُمْ یعنی ہم نے ان کے نقض میثاق، کفر بیایات اللہ اور قتل انبیاء وغیرہ کی وجہ سے ان پر لعنت کی یا سزا دی۔

(۲) اس سے مراد یوسف نجار کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام پر بدکاری کی تہمت ہے۔ آج بھی بعض نام نہاد محققین اس بہتان عظیم کو ایک ”حقیقت ثابتہ“ باور کرانے پر تلے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ یوسف نجار (نَعُوذُ بِاللَّهِ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ تھا اور یوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ کے معجزانہ ولادت کا بھی انکار کرتے ہیں۔

وَأَنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَقَدْ شَكَّ مِنْهُ
مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظُّلْمِ
وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ﴿٥٥﴾

قتل کیانہ سولی پر چڑھایا ^(۱) بلکہ ان کے لیے ان (عیسیٰ) کا
شبیہ بنا دیا گیا تھا۔ ^(۲) یقین جانو کہ حضرت عیسیٰ (علیہ
السلام) کے بارے میں اختلاف کرنے والے ان کے
بارے میں شک میں ہیں، انہیں اس کا کوئی یقین نہیں۔ بجز
تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے ^(۳) اتنا یقینی ہے کہ انہوں
نے انہیں قتل نہیں کیا۔ (۱۵۷)

بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف اٹھالیا ^(۴) اور اللہ بڑا

بَلَّغٌ رِّزْقَهُ اللَّهُ الْبَيِّنَاتِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿٥٦﴾

(۱) اس سے واضح ہو گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودی قتل کرنے میں کامیاب ہو سکے نہ سولی چڑھانے میں۔ جیسا
کہ ان کا منصوبہ تھا۔ جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۵۵ کے حاشیے میں مختصر تفصیل گزر چکی ہے۔

(۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں کی سازش کا پتہ چلا تو انہوں نے اپنے حواریوں کو
جن کی تعداد ۱۲ یا ۱۷ تھی، جمع کیا اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص میری جگہ قتل ہونے کے لیے تیار ہے؟ تاکہ اللہ تعالیٰ
کی طرف سے اس کی شکل و صورت میری جیسی بنا دی جائے۔ ایک نوجوان اس کے لیے تیار ہو گیا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ
علیہ السلام کو وہاں سے آسمان پر اٹھالیا گیا۔ بعد میں یہودی آئے اور انہوں نے اس نوجوان کو لے جا کر سولی پر چڑھا دیا
جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل بنا دیا گیا تھا۔ یہودی یہی سمجھتے رہے کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی ہے
در آں حالیکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت وہاں موجود ہی نہ تھے وہ زندہ جسم غضری کے ساتھ آسمان پر اٹھائے جا
چکے تھے۔ (ابن کثیر و فتح القدر)

(۳) عیسیٰ علیہ السلام کے ہم شکل شخص کو قتل کرنے کے بعد ایک گروہ تو یہی کھتا رہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا،
جب کہ دوسرا گروہ جسے یہ اندازہ ہو گیا کہ مصلوب شخص عیسیٰ علیہ السلام نہیں، کوئی اور ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے
قتل اور مصلوب ہونے کا انکار کرتا رہا۔ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔
بعض کہتے ہیں کہ اس اختلاف سے مراد وہ اختلاف ہے جو خود عیسائیوں کے منظر یہ فرقے نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام جسم کے
لحاظ سے تو سولی دے دیئے گئے لیکن لاہوت (خداوندی) کے اعتبار سے نہیں۔ مگر یہ فرقے نے کہا کہ یہ قتل و صلب ناسوت اور
لاہوت دونوں اعتبار سے مکمل طور پر ہوا ہے (فتح القدر) بہر حال وہ اختلاف، تردد اور شک کا شکار رہے۔

(۴) یہ نص صریح ہے اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا
اور متواتر صحیح احادیث سے بھی یہ بات ثابت ہے۔ یہ احادیث حدیث کی تمام کتابوں کے علاوہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں
بھی وارد ہیں۔ ان احادیث میں آسمان پر اٹھائے جانے کے علاوہ قیامت کے قریب ان کے نزول کا اور دیگر بہت سی باتوں
کا تذکرہ ہے۔ امام ابن کثیر یہ تمام روایات ذکر کر کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں ”پس یہ احادیث رسول اللہ ﷺ سے

زبردست اور پوری حکمتوں والا ہے۔^(۱) (۱۵۸)
اہل کتاب میں ایک بھی ایسا نہ سچے گا جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لائے۔^(۲) اور

وَلَنْ يَمُنَ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لِيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ
وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ سَهْبِيلًا ﴿۱۵۸﴾

متواتر ہیں۔ ان کے راویوں میں حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبد اللہ بن مسعود، عثمان بن ابی العاص، ابو امامہ، نواس بن سمعان، عبد اللہ بن عمرو بن العاص، مجمع بن جاریہ، ابی سربجہ اور حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہم ہیں۔ ان احادیث میں آپ کے نزول کی صفت اور جگہ کا بیان ہے، آپ علیہ السلام دمشق میں منارہ شرقیہ کے پاس اس وقت اتریں گے جب فجر کی نماز کے لیے اقامت ہو رہی ہوگی۔ آپ خنزیر کو قتل کریں گے، صلیب توڑ دیں گے، جزیہ معاف کر دیں گے، ان کے دور میں سب مسلمان ہو جائیں گے، دجال کا قتل بھی آپ کے ہاتھوں سے ہو گا اور یاجوج و ماجوج کا ظہور و فساد بھی آپ کی موجودگی میں ہو گا، بالآخر آپ ہی کی بددعا سے ان کی ہلاکت واقع ہوگی۔

(۱) وہ زبردست اور غالب ہے، اس کے ارادہ اور مشیت کو کوئی ٹال نہیں سکتا اور جو اس کی پناہ میں آجائے، اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور وہ حکیم بھی ہے، وہ جو فیصلہ بھی کرتا ہے، حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

(۲) قَبْلَ مَوْتِهِ میں ”ہ“ کی ضمیر کا مرجع بعض مفسرین کے نزدیک اہل کتاب (نصاری) ہیں اور مطلب یہ کہ ہر عیسائی موت کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے۔ گو موت کے وقت کا ایمان نافع نہیں۔ لیکن سلف اور اکثر مفسرین کے نزدیک اس کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جب ان کا دوبارہ دنیا میں نزول ہو گا اور وہ دجال کو قتل کر کے اسلام کا بول بالا کریں گے تو اس وقت جتنے یہودی اور عیسائی ہوں گے ان کو بھی قتل کر ڈالیں گے اور روئے زمین پر مسلمان کے سوا کوئی اور باقی نہ بچے گا اس طرح اس دنیا میں جتنے بھی اہل کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے ہیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے ان پر ایمان لا کر اس دنیا سے گزر چکیں گے۔ خواہ ان کا ایمان کسی بھی ڈھنگ کا ہو۔ صحیح احادیث سے بھی یہی ثابت ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! ضرور ایک وقت آئے گا کہ تم میں ابن مریم حاکم و عادل بن کرنازل ہوں گے، وہ صلیب کو توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ اٹھادیں گے اور مال کی اتنی بہتات ہو جائے گی کہ کوئی اسے قبول کرنے والا نہیں ہو گا۔ (یعنی صدقہ خیرات لینے والا کوئی نہیں ہو گا) حتیٰ کہ ایک سجدہ دنیا و دنیاویات سے بہتر ہو گا۔ پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے اگر تم چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو ﴿وَلَنْ يَمُنَ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لِيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ﴾ (صحیح بخاری۔ کتاب الأنبیاء) یہ احادیث اتنی کثرت سے آئی ہیں کہ انہیں تو اتار کا درجہ حاصل ہے اور انہی متواتر صحیح روایات کی بنیاد پر اہلسنت کے تمام مکاتب کا متفقہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں اور قیامت کے قریب دنیا میں ان کا نزول ہو گا اور دجال کا اور تمام ادیان کا خاتمہ فرما کر اسلام کو غالب فرمائیں گے۔ یاجوج و ماجوج کا خروج بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کی موجودگی میں ہو گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا کی برکت سے ہی اس فتنے کا بھی خاتمہ ہو گا جیسا کہ احادیث سے واضح ہے۔

قیامت کے دن آپ ان پر گواہ ہوں گے۔ (۱۵۹) ^(۱)

جو نفیس چیزیں ان کے لیے حلال کی گئی تھیں وہ ہم نے ان پر حرام کر دیں ان کے ظلم کے باعث اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے اکثر لوگوں کو روکنے کے باعث۔ (۱۶۰) ^(۲)

اور سو جس سے منع کیے گئے تھے اسے لینے کے باعث اور لوگوں کا مال ناحق مار کھانے کے باعث اور ان میں جو کفار ہیں ہم نے ان کے لیے المناک عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ (۱۶۱)

لیکن ان میں سے جو کامل اور مضبوط علم والے ہیں ^(۳) اور ایمان والے ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپ کی طرف اتارا گیا اور جو آپ سے پہلے اتارا گیا اور نمازوں کو قائم رکھنے والے ہیں ^(۴) اور زکوٰۃ کے ادا کرنے والے ہیں ^(۵) اور اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہیں ^(۶) یہ ہیں جنہیں ہم بہت بڑے اجر عطا فرمائیں گے۔ (۱۶۲)

يَظُنُّوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوا حَرَمًا عَلَيْهِمْ طَبِئَتْ اُجَلَتْ لَهُمْ
وَيَصِدَّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿١٥٩﴾

وَ اَحٰذِيْهِمُ الرِّيْوَاوَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَطٰمِهِمْ اَمْوَالُ النَّاسِ
بِالْبَاطِلِ وَاَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٦٠﴾

لٰكِنَ الرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ
بِمَا نَزَّلَ اِلَيْكَ وَمَا نَزَّلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُعْمِيْنَ الصَّلٰوةَ
وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اُولٰٓئِكَ
سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿١٦١﴾

(۱) یہ گواہی اپنی پہلی زندگی کے حالات سے متعلق ہوگی۔ جیسا کہ سورہ مائدہ کے آخر میں وضاحت ہے ﴿وَكُنْتُ

عَلَيْهِمْ شَهِيدًا اِذْ دُمْتُ فِيْهِمْ﴾ ”میں جب تک ان میں موجود رہا“ ان کے حالات سے باخبر رہا“

(۲) یعنی ان کے ان جرائم و معاصی کی وجہ سے بطور سزا بہت سی حلال چیزیں ہم نے ان پر حرام کر دی تھیں۔ (جن کی تفصیل سورہ الانعام-۱۳۶ میں ہے)

(۳) ان سے مراد عبداللہ بن سلامؓ، وغیرہ ہیں جو یہودیوں میں سے مسلمان ہو گئے تھے۔

(۴) ان سے مراد بھی وہ اہل ایمان ہیں جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہوئے یا پھر مہاجرین و انصار مراد ہیں۔ یعنی شریعت کا پختہ علم رکھنے والے اور کمال ایمان سے متصف لوگ ان معاصی کے ارتکاب سے بچتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے۔

(۵) اس سے مراد زکوٰۃ اموال ہے یا زکوٰۃ نفوس یعنی اپنے اخلاق و کردار کی تطہیر اور ان کا تزکیہ کرنا یا دونوں ہی مراد ہیں۔

(۶) یعنی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ نیز بعثت بعد الموت اور عملوں پر جزا و سزا کا یقین رکھتے ہیں۔

یقیناً ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی کی ہے جیسے کہ نوح (علیہ السلام) اور ان کے بعد والے نبیوں کی طرف کی، اور ہم نے وحی کی ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف۔^(۱) اور ہم نے داود (علیم السلام) کو زبور عطا فرمائی۔ (۱۶۳)

اور آپ سے پہلے کے بہت سے رسولوں کے واقعات ہم نے آپ سے بیان کیے ہیں^(۲) اور بہت سے رسولوں کے نہیں بھی کیے^(۳) اور موسیٰ (علیہ السلام) سے اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر کلام کیا۔^(۴) (۱۶۴)

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَآلِ يَحْيَىٰ مِّن بَعْدِهِ
وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ
وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ
وَاتِّتَدْنَا أَوْدَ زُكُورًا ﴿١٦٣﴾

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ
نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ﴿١٦٤﴾

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بعض لوگوں نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کسی انسان پر اللہ تعالیٰ نے کچھ نازل نہیں کیا اور یوں نبی ﷺ کی وحی و رسالت سے بھی انکار کیا، جس پر یہ آیت نازل ہوئی (ابن کثیر) جس میں مذکورہ قول کارد کرتے ہوئے رسالت محمدیہ ﷺ کا اثبات کیا گیا ہے۔

(۲) جن نبیوں اور رسولوں کے اسمائے گرامی اور ان کے واقعات قرآن کریم میں بیان کیے گئے ہیں ان کی تعداد ۲۳ یا ۲۵ ہے۔ (۱) آدم (۲) ادریس (۳) نوح (۴) ہود (۵) صالح (۶) ابراہیم (۷) لوط (۸) اسماعیل (۹) اسحاق (۱۰) یعقوب (۱۱) یوسف (۱۲) ایوب (۱۳) شعیب (۱۴) موسیٰ (۱۵) ہارون (۱۶) یونس (۱۷) داود (۱۸) سلیمان (۱۹) الیاس (۲۰) ایسح (۲۱) زکریا (۲۲) یحییٰ (۲۳) عیسیٰ (۲۴) ذوالکفل۔ (اکثر مفسرین کے نزدیک) (۲۵) حضرت محمد صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلیہم اجمعین۔

(۳) جن انبیاء و رسل کے نام اور واقعات قرآن میں بیان نہیں کیے گئے، ان کی تعداد کتنی ہے؟ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ایک حدیث میں جو بہت مشہور ہے ایک لاکھ ۲۳ ہزار اور ایک حدیث میں ۸ ہزار تعداد بتلائی گئی ہے۔ لیکن یہ روایات سخت ضعیف ہیں۔ قرآن و حدیث سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ادوار و حالات میں مہشرین و منذرین (انبیاء) آتے رہے ہیں۔ بالآخر یہ سلسلہ نبوت حضرت محمد ﷺ پر ختم فرمایا گیا۔ آپ سے پہلے کتنے نبی آئے؟ ان کی صحیح تعداد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تاہم آپ ﷺ کے بعد جتنے بھی دعوے داران نبوت ہو گزرے یا ہوں گے، سب کے سب دجال اور کذاب ہیں اور ان کی جھوٹی نبوت پر ایمان لانے والے دائرۃ اسلام سے خارج ہیں اور امت محمدیہ سے الگ ایک متوازی امت ہیں۔ جیسے امت بابیہ، بہائیہ اور امت مرزائیہ وغیرہ۔ اسی طرح مرزا قادیانی کو مسیح موعود ماننے والے لاہوری مرزائی بھی۔

(۴) یہ موسیٰ علیہ السلام کی وہ خاص صفت ہے جس میں وہ دوسرے انبیاء سے ممتاز ہیں۔ صحیح ابن حبان کی ایک روایت

ہم نے انہیں رسول بنایا ہے، خوشخبریاں سنانے والے اور آگاہ کرنے والے (۱) تاکہ لوگوں کی کوئی حجت اور الزام رسولوں کے بھیجنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر رہ نہ جائے (۲)۔ اللہ تعالیٰ بڑا غالب اور بڑا باحکمت ہے۔ (۱۶۵)

جو کچھ آپ کی طرف اتارا ہے اس کی بابت خود اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ اسے اپنے علم سے اتارا ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بطور گواہ کافی ہے۔ (۱۶۶)

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے اوروں کو روکا وہ یقیناً گمراہی میں دور نکل گئے۔ (۱۶۷)

جن لوگوں نے کفر کیا اور ظلم کیا، انہیں اللہ تعالیٰ ہرگز ہرگز نہ بخشے گا اور نہ انہیں کوئی راہ دکھائے گا۔ (۱۶۸) (۳)

بجز جنم کی راہ کے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ پڑے رہیں گے، اور یہ اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے۔ (۱۶۹)

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق لے کر رسول آگیا ہے، پس تم ایمان لاؤ تاکہ تمہارے لئے بہتری ہو اور اگر تم کافر ہو گئے تو اللہ ہی کی ہے ہر وہ

رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿۱۶۵﴾

لَكِنَّ اللَّهَ يَتَعَدَّىٰ بِمَا آتَزَلَّ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ وَاللَّيْلُ كُهُ يَتَعَدَّىٰ وَنُكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ﴿۱۶۶﴾

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدَّوْا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿۱۶۷﴾

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيُغْفِرْ لَهُمْ وَلَا لِيُعَذِّبَهُمْ عَذَابًا ظَرِيفًا ﴿۱۶۸﴾

إِلَّا ظَرِيفًا جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿۱۶۹﴾

يَأْتِيهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَهُمُ الرِّسُولُ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّهِمْ قَامِنًا خَيْرًا لَكُمْ وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ

کی رو سے امام ابن کثیر نے اس صفت ہم کلامی میں حضرت آدم علیہ السلام و حضرت محمد ﷺ کو بھی شریک مانا ہے۔

تفسیر ابن کثیر زیر آیت ﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ﴾

(۱) ایمان والوں کو جنت اور اس کی نعمتوں کی خوشخبری دینا اور کافروں کو اللہ کے عذاب اور بھڑکتی ہوئی جہنم سے ڈرانا۔

(۲) یعنی نبوت یا انذار و تبشیر کا یہ سلسلہ ہم نے اس لیے قائم فرمایا کہ کسی کے پاس یہ عذر باقی نہ رہے کہ ہمیں تو میرا

پیغام پہنچا ہی نہیں۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿ وَلَوْ أَنَا أَهْلُكُمْ بَعْدَ آيَاتِنَا لَمَلَأْنَا رِيبًا لَوْلَا أَرْسَلْنَا إِلَيْنَا

رُسُلًا فَتَنَّبَهُ إِلَيْكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَدِينَنَا وَنَحْنُ ﴿ ط - ۱۳۴ ﴾ ” اگر ہم ان کو پیغمبر (کے بھیجنے سے) پہلے ہی ہلاک کر

دیتے تو وہ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا کہ ہم ذلیل و رسوا ہونے سے

پیشتر تیری آیات کی پیروی کر لیتے۔“

(۳) کیونکہ مسلسل کفار اور ظلم کار تکاب کر کے، انہوں نے اپنے دلوں کو سیاہ کر لیا ہے جس سے اب ان کی ہدایت و

معفرت کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔

وَالْأَرْضِ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۵۰﴾

چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے،^(۱) اور اللہ دانا ہے حکمت والا ہے۔ (۱۷۰)

اے اہل کتاب! اپنے دین کے بارے میں حد سے نہ گزر جاؤ^(۲) اور اللہ پر بجز حق کے اور کچھ نہ کہو، مسیح عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) تو صرف اللہ تعالیٰ کے رسول اور اس کے کلمہ (کن سے پیدا شدہ) ہیں، جسے مریم (علیہا السلام)

يَا هَذِهِ الْكِتَابُ لَا نُغَلِّبُ فِي دِينِكُمْ وَلَا نَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَةٌ أُلْقِيَهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَدُورٌ مِنْهُ فَآمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَا

(۱) یعنی تمہارے کفر سے اللہ کا کیا بگڑے گا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا ﴿لَنْ تَكْفُرُوا أَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا أَبَدًا﴾ ﴿١٨٠﴾ (ابراہیم: ۸) ”اگر تم اور روئے زمین پر بسنے والے سب کے سب کفر کا راستہ اختیار کر لیں تو وہ اللہ کا کیا بگاڑیں؟ یقیناً اللہ تعالیٰ تو بے پروا تعریف کیا گیا ہے۔“ اور حدیث قدسی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”اے میرے بندو! اگر تمہارے اول و آخر تمام انسان اور جن اس ایک آدمی کے دل کی طرح ہو جائیں جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے تو اس سے میری بادشاہی میں اضافہ نہیں ہو گا اور اگر تمہارے اول و آخر اور انس و جن اس ایک آدمی کے دل کی طرح ہو جائیں جو تم میں سب سے بڑا نافرمان ہو تو اس سے میری بادشاہی میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اے میرے بندو! اگر تم سب ایک میدان میں جمع ہو جاؤ اور مجھ سے سوال کرو اور میں ہر انسان کو اس کے سوال کے مطابق عطا کروں تو اس سے میرے خزانے میں اتنی ہی کمی ہوگی جتنی سوئی کے سمندر میں ڈبو کر نکلنے سے سمندر کے پانی میں ہوتی ہے۔“ (صحیح مسلم، کتاب البر، باب تحريم الظلم)

(۲) غلو کا مطلب ہے کسی چیز کو اس کی حد سے بڑھا دینا۔ جیسے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کے بارے میں کیا کہ انہیں رسالت و بندگی کے مقام سے اٹھا کر الوہیت کے مقام پر فائز کر دیا اور ان کی اللہ کی طرح عبادت کرنے لگے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو بھی غلو کا مظاہرہ کرتے ہوئے، معصوم بناؤ والا اور ان کو حرام و حلال کے اختیار سے نواز دیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَإِذْ أَخْبَرْنَا رَحْمَةً أَنَّهُمْ آذُنًا يَأْتِينَ دُونَ اللَّهِ﴾ (التوبہ: ۳۱) ”انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا۔“ یہ رب بنانا حدیث کے مطابق ان کے حلال کیے کو حلال اور حرام کیے کو حرام سمجھنا تھا۔ دران حالیکہ یہ اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے لیکن اہل کتاب نے یہ حق بھی اپنے علماء وغیرہ کو دے دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اہل کتاب کو دین میں اسی غلو سے منع فرمایا ہے۔ نبی ﷺ نے بھی عیسائیوں کے اس غلو کے پیش نظر اپنے بارے میں اپنی امت کو متنبہ فرمایا۔ ﴿لَا تَطْرُقُونِي كَمَا أَطْرَقَتِ النَّصَارَىٰ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ؛ فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ، فَقُولُوا: عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ﴾ (صحیح بخاری - کتاب الانبیاء مسند احمد جلد ۱ صفحہ ۲۳ نیز دیکھئے مسند احمد جلد ۱ صفحہ ۱۵۳) ”تم مجھے اس طرح حد سے نہ بڑھانا جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو بڑھایا، میں تو صرف اللہ کا بندہ ہوں، پس تم مجھے اس کا بندہ اور رسول ہی کہنا، لیکن افسوس امت محمدیہ اس کے باوجود بھی اس غلو سے محفوظ نہ رہ سکی، جس میں عیسائی جتلا ہوئے اور امت محمدیہ نے بھی اپنے پیغمبر کو بلکہ نیک بندوں تک کو

کی طرف ڈال دیا تھا اور اس کے پاس کی روح^(۱) ہیں اس لیے تم اللہ کو اور اس کے سب رسولوں کو مانو اور نہ کہو کہ اللہ تین ہیں^(۲) اس سے باز آ جاؤ کہ تمہارے لیے بہتری ہے، اللہ عبادت کے لائق تو صرف ایک ہی ہے اور وہ اس سے پاک ہے کہ اس کی اولاد ہو، اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ کافی ہے کام بنانے والا۔ (۱۷۱)

صبح (علیہ السلام) کو اللہ کا بندہ ہونے میں کوئی تنگ و عار یا تکبر و انکار ہرگز ہو ہی نہیں سکتا اور نہ مقرب فرشتوں کو،^(۳) اس کی بندگی سے جو بھی دل چرائے اور تکبر و انکار کرے، اللہ تعالیٰ ان سب کو اکٹھا اپنی طرف جمع کرے گا۔ (۱۷۲)

تَقُولُوا اِنَّهُ لَمَّا اَلَهُ الْاِلٰهَ وَاحِدًا
سُبْحٰنَةَ اَنْ يَكُوْنَ لَهُ وَلَدًا لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى
الْاَرْضِ وَكَفَىٰ بِاللّٰهِ وَكِيلًا ﴿۱۷۱﴾

لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْيَسِيْرُ اَنْ يَكُوْنَ عَبْدًا لِلّٰهِ وَلَا الْمَلِكَةُ
الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ
فَسَبْحَشْرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾

خدائی صفات سے متصف ٹھہرا دیا جو دراصل عیسائیوں کا وطیرہ تھا۔ اسی طرح علما و فقہا کو بھی دین کا شارح اور مفسر ماننے کے بجائے ان کو شارح (شریعت سازی کا اختیار رکھنے والے) بنا دیا ہے۔ فَإِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ سچ فرمایا نبی ﷺ نے «لَتَبْعَنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حَذْوًا النَّعْلُ بِالنَّعْلِ» «جس طرح ایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے، بالکل اسی طرح تم بچھیلی امتوں کی پیروی کرو گے» یعنی ان کے قدم بہ قدم چلو گے۔

(۱) کَلِمَةَ اللّٰهِ کا مطلب یہ ہے کہ لفظ کُنْ سے باپ کے بغیر ان کی تخلیق ہوئی اور یہ لفظ حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے سے حضرت مریم علیہا السلام تک پہنچایا گیا۔ روح اللہ کا مطلب وہ نفخہ (پھونک) ہے جو حضرت جبریل علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے حضرت مریم علیہا السلام کے گریبان میں پھونکا، جسے اللہ تعالیٰ نے باپ کے نطفہ کے قائم مقام کر دیا۔ یوں عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا کلمہ بھی ہیں جو فرشتے نے حضرت مریم علیہا السلام کی طرف ڈالا اور اس کی وہ روح ہیں، جسے لے کر جبریل علیہ السلام مریم علیہا السلام کی طرف بھیجے گئے۔ (تفسیر ابن کثیر)

(۲) عیسائیوں کے کئی فرقے ہیں۔ بعض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ، بعض اللہ کا شریک اور بعض اللہ کا بیٹا مانتے ہیں۔ پھر جو اللہ مانتے ہیں وہ اَقَانِيْمٌ ثَلَاثَةٌ (تین خداؤں) کے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ثالث ثلاثہ (تین سے ایک) ہونے کے قائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ تین خدا کہنے سے باز آ جاؤ، اللہ تعالیٰ ایک ہی ہے۔

(۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح بعض لوگوں نے فرشتوں کو بھی خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا تھا، اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہ تو سب کے سب اللہ کے بندے ہیں اور اس سے انہیں قطعاً کوئی انکار نہیں ہے۔ تم انہیں اللہ یا اس کی الوہیت میں شریک کس بنیاد پر بناتے ہو؟

پس جو لوگ ایمان لائے ہیں اور شائستہ اعمال کئے ہیں ان کو ان کا پورا پورا ثواب عنایت فرمائے گا اور اپنے فضل سے انہیں اور زیادہ دے گا^(۱) اور جن لوگوں نے ننگ و عار اور سرکشی اور انکار کیا،^(۲) انہیں المناک عذاب دے گا^(۳) اور وہ اپنے لئے سوائے اللہ کے کوئی حمایتی، اور امداد کرنے والا نہ پائیں گے۔ (۱۷۳)

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے سند اور دلیل آ پینچی^(۴) اور ہم نے تمہاری جانب واضح اور صاف نور اتار دیا ہے۔ (۱۷۴)^(۵)

پس جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اسے مضبوط پکڑ لیا، انہیں تو وہ عنقریب اپنی رحمت اور فضل میں لے لے گا اور انہیں اپنی طرف کی راہ راست دکھا دے گا۔ (۱۷۵)

آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ (خود) تمہیں کمالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص مرجائے جس کی اولاد نہ ہو اور ایک بہن ہو تو اس

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ
وَيَزِيدُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنكفُوا وَاسْتَكْبَرُوا
فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۖ وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ
وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٧٣﴾

يَا أَيُّهَا النَّاسُ فَإِنَّ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا
إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا ﴿١٧٤﴾

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ
فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِنْهُ وَفَضْلٍ
وَيُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿١٧٥﴾

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلِمَةِ إِنَّ أَمْرًا هَذَا كَلِمَةٌ
لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِيحُهَا

(۱) بعض نے اس ”زیادہ“ سے مراد یہ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو شفاعت کا حق عطا فرمائے گا یہ اذن شفاعت پا کر جن کی بابت اللہ چاہے گا یہ شفاعت کریں گے۔

(۲) یعنی اللہ کی عبادت و اطاعت سے رکے رہے اور اس سے انکار و تکبر کرتے رہے۔

(۳) جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ ذُخْرًا ﴾ (المؤمن - ۶۰)

”بے شک جو لوگ میری عبادت سے استکبار (انکار و تکبر) کرتے ہیں، یقیناً ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔“

(۴) برہان، ایسی دلیل قاطعہ، جس کے بعد کسی کو عذر کی گنجائش نہ رہے اور ایسی حجت جس سے ان کے شبہات زائل ہو جائیں، اسی لیے آگے اسے نور سے تعبیر فرمایا۔

(۵) اس سے مراد قرآن کریم ہے جو کفر و شرک کی تاریکیوں میں ہدایت کا نور ہے۔ ضلالت کی پگڈنڈیوں میں صراط مستقیم اور جبل اللہ المتین ہے۔ پس اس کے مطابق ایمان لانے والے اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کے مستحق ہوں گے۔

کے لیے چھوڑے ہوئے مال کا آدھا حصہ ہے^(۱) اور وہ بھائی اس بہن کا وارث ہو گا اگر اس کے اولاد نہ ہو۔^(۲) پس اگر بہنیں دو ہوں تو انہیں کل چھوڑے ہوئے کا دو تہائی ملے گا۔^(۳) اور اگر کئی شخص اس ناطے کے ہیں مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد کے لئے حصہ ہے مثل دو عورتوں کے،^(۴) اللہ تعالیٰ تمہارے لئے بیان فرما رہا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تم بسک جاؤ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے۔ (۱۷۶)

إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثَّلَاثُ مِمَّا تَرَكَ وَإِنْ كَانُوا إِخْوَةً رِجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثِيَيْنِ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَن تَصَلُّوا وَأَنَّ اللَّهَ يُجِلُّ سَمِيًّا عَلَيْهِ ۝

(۱) كَلَاةٌ کے بارے میں پہلے گزر چکا ہے کہ اس مرنے والے کو کہا جاتا ہے جس کا باپ ہو نہ بیٹا۔ یہاں پھر اس کی میراث کا ذکر ہو رہا ہے۔ بعض لوگوں نے کلالہ اس شخص کو قرار دیا ہے جس کا صرف بیٹا نہ ہو۔ یعنی باپ موجود ہو، لیکن یہ صحیح نہیں۔ کلالہ کی پہلی تعریف ہی صحیح ہے۔ کیونکہ باپ کی موجودگی میں بہن سرے سے وارث ہی نہیں ہوتی۔ باپ اس کے حق میں حاجب بن جاتا ہے۔ لیکن یہاں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اگر اس کی بہن ہو تو وہ اس کے نصف مال کی وارث ہوگی۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کلالہ وہ ہے کہ بیٹے کے ساتھ جس کا باپ بھی نہ ہو۔ یوں بیٹے کی نفی تو نص سے ثابت ہے اور باپ کی نفی اشارۃ النقص سے ثابت ہو جاتی ہے۔

ملفوظ: بیٹے سے مراد بیٹا اور پوتا دونوں ہیں۔ اسی طرح بہن سے مراد سگی بہن یا علاقائی (باپ شریک) بہن ہے (ایسر التفسیر) احادیث سے ثابت ہے کہ کلالہ کی بہن کے ساتھ بیٹی کی موجودگی میں بیٹی کو نصف اور بہن کو نصف اور بیٹی اور پوتی کی موجودگی میں بیٹی کو نصف، پوتی کو سدس (چھٹا حصہ) اور بہن کو باقی یعنی ثلث دیا گیا۔ (فتح القدر و ابن کثیر) اس سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کی اولاد موجود ہو تو بہن کو بحیثیت ذوی الفروض کچھ نہیں ملے گا۔ اب اگر وہ اولاد بیٹا ہو تو کسی اور حیثیت سے بھی کچھ نہیں ملے گا۔ اور اگر بیٹی ہو تو بہن اس کے ساتھ عصبہ ہو جائے گی اور مَتَابِقَ لے لے گی۔ یہ مَتَابِقَ ایک بیٹی کی موجودگی میں نصف اور ایک سے زائد کی موجودگی میں ثلث ہو گا۔

(۲) اسی طرح باپ بھی نہ ہو۔ اس لئے کہ باپ، بھائی سے قریب ہے، باپ کی موجودگی میں بھائی وارث ہی نہیں ہوتا اگر اس کلالہ عورت کا خاوند یا کوئی ماں جایا بھائی ہو گا تو ان کا حصہ نکالنے کے بعد باقی مال کا وارث بھائی قرار پائے گا۔ (ابن کثیر)

(۳) یہی حکم دو سے زائد بہنوں کی صورت میں بھی ہو گا۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ کلالہ شخص کی دو یا دو سے زائد بہنیں ہوں تو انہیں کل مال کا دو تہائی حصہ ملے گا۔

(۴) یعنی کلالہ کے وارث مخلوط (مرد اور عورت دونوں) ہوں تو پھر ”ایک مرد دو عورت کے برابر“ کے اصول پر ورثے کی تقسیم ہوگی۔

سورہ مائدہ مدنی ہے اس میں ایک سو بیس آیتیں اور سورہ رکوع ہیں

سُورَةُ الْمَائِدَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اے ایمان والو! عموماً پورے کرو،^(۱) تمہارے لئے موبیٰ چوپائے حلال کئے گئے ہیں^(۲)۔ بجز ان کے جن کے نام پڑھ کر سنا دیئے جائیں گے^(۳) مگر حالت احرام میں شکار کو حلال جاننے والے نہ بننا، یقیناً اللہ جو چاہے حکم کرتا ہے۔^(۱)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ إِحْلَلْتُ لَكُمْ بَهِيمَةَ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يَمْلِكُ عَلَيْهِ غَيْرُ الْحَيْدِ وَأَنْتُمْ حُرْمَةٌ لِلَّهِ يَعْلَمُ مَا يُرِيدُ ①

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا الْأَمْشَلُوا شَعَاءَ بَرِّ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَةَ

(۱) عُقُودٌ عَقْدٌ کی جمع ہے، جس کے معنی گرہ لگانے کے ہیں۔ اس کا استعمال کسی چیز میں گرہ لگانے کے لئے بھی ہوتا ہے اور پختہ عموماً بیان کرنے پر بھی۔ یہاں اس سے مراد احکام الہی ہیں جن کا اللہ نے انسانوں کو مکلف ٹھہرایا ہے اور عموماً بیان و معاملات بھی ہیں جو انسان آپس میں کرتے ہیں۔ دونوں کا ایفا ضروری ہے۔

(۲) بَهِيمَةٌ چوپائے (چار ٹانگوں والے جانور) کو کہا جاتا ہے۔ اس کا مادہ بَهَمٌ، اِبْهَامٌ ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ان کی گفتگو اور عقل و فہم میں چونکہ ابہام ہے، اس لیے ان کو بَهِيمَةٌ کہا جاتا ہے۔ اَنْعَامٌ اونٹ، گائے، بکری اور بھیڑ کو کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی چال میں نرمی ہوتی ہے۔ یہ بَهِيمَةٌ اَلْاَنْعَامِ زراور مادہ مل کر اٹھ قسمیں ہیں، جن کی تفصیل سورۃ الأنعام آیت نمبر ۱۳۳ میں آئے گی علاوہ ازیں جو جانور وحشی کہلاتے ہیں مثلاً ہرن، نیل گائے وغیرہ، جن کا عموماً شکار کیا جاتا ہے، یہ بھی حلال ہیں۔ البتہ حالت احرام میں ان کا اور دیگر پرندوں کا شکار ممنوع ہے۔ سنت میں بیان کردہ اصول کی رو سے جو جانور ذُو نَابِ اور جو پرندے ذُو مِخْلَبِ نہیں ہیں، وہ سب حلال ہیں، جیسا کہ سورہ بقرہ آیت نمبر ۱۷۱ کے حاشیے میں تفصیل گزر چکی ہے۔ ذُو نَابِ کا مطلب ہے وہ جانور جو اپنے کچلی کے دانت سے اپنا شکار پکڑتا ہو اور چیرتا ہو، مثلاً شیر، چیتا، کتا، بھیڑیا وغیرہ اور ذُو مِخْلَبِ کا مطلب ہے وہ پرندہ جو اپنے پنجے سے اپنا شکار چھینتا پکڑتا ہو۔ مثلاً شکرہ، باز، شاہین، عقاب وغیرہ۔

(۳) ان کی تفصیل آیت نمبر ۳ میں آرہی ہے۔

(۴) شَعَائِرٌ، شَعَائِرٌ کی جمع ہے، اس سے مراد حرمت اللہ ہیں (جن کی تعظیم و حرمت اللہ نے مقرر فرمائی ہے) بعض نے اسے عام رکھا ہے اور بعض کے نزدیک یہاں حج و عمرے کے مناسک مراد ہیں یعنی ان کی بے حرمتی اور بے توقیری نہ کرو۔ اسی طرح حج و عمرے کی ادائیگی میں کسی کے درمیان رکاوٹ بھی مت بنو، کہ یہ بھی بے حرمتی ہی ہے۔

نہ ادب والے مہینوں کی^(۱) نہ حرم میں قربان ہونے والے اور پٹے پہنائے گئے جانوروں کی جو کعبہ کو جارہے ہوں^(۲) اور نہ ان لوگوں کی جو بیت اللہ کے قصد سے اپنے رب تعالیٰ کے فضل اور اس کی رضا جوئی کی نیت سے جارہے ہوں،^(۳) ہاں جب تم احرام اتار ڈالو تو شکار کھیل سکتے ہو،^(۴) جن لوگوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا تھا ان کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم حد سے گزر جاؤ،^(۵) نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی امداد کرتے رہو اور گناہ اور ظلم و زیادتی میں

وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا أَيْدِي الْبَيْتِ الْحَرَامِ يَبْتَغُونَ
فَضْلًا مِنْ رَبِّهِمْ وَيَصُونَ آيَاتِ اللَّهِ فَاصْطَادُوا
وَلَا يُحِبُّ مَنَّا مَنَّا قَوْمٌ أَنْ صَدُّوا عَنْ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَنْ
تَعْتَدُوا وَاتَّقُوا عَاقِبَ الْبُرْءِ وَالْمَقْوَى وَلَا تَقَاوُنُوا عَلَى الْإِلَاقَةِ
وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ⑥

(۱) ﴿أَشْهُدُ الْحَرَامُ﴾ مراد اس سے جنس ہے یعنی حرمت والے چاروں مہینوں (رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم) کی حرمت برقرار رکھو اور ان میں قتال مت کرو۔ بعض نے اس سے صرف ایک مہینہ یعنی ماہ ذوالحجہ (حج کا مہینہ) مراد لیا ہے۔ بعض نے اس حکم کو ﴿كَافَتْهُ الشُّرَيْكِيُّنَ حَيْثُ وَجَدْتُمْوَهُمْ﴾ سے منسوخ مانا ہے۔ مگر اس کی ضرورت نہیں۔ دونوں احکام کے اپنے اپنے دائرے ہیں، جن میں تعارض نہیں۔

(۲) ہڈی ایسے جانور کو کہا جاتا ہے جو حاجی حرم میں قربان کرنے کے لئے ساتھ لے جاتے تھے۔ فَلَا يَذُوقُ فَلَادَةَ كَيْ جَمْعُ هَبِّهِ جُغْلَةَ كَيْ پُتْ كَيْ كَمَا جَاتَا هَبِّ، یہاں حج یا عمرہ کے موقع پر قربان کئے جانے والے ان جانوروں کو مراد لیا گیا ہے۔ جن کے گلوں میں علامت اور نشانی کے طور پر جوتے یا پٹے ڈال دیئے جاتے تھے پس فَلَادَةُ سے مقصود وہی جانور ہوئے جنہیں حرم لے جایا جاتا تھا۔ یہ حدی کی مزید تائید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان جانوروں کو کسی سے چھینا جائے نہ ان کے حرم تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کی جائے۔

(۳) یعنی حج و عمرے کی نیت سے یا تجارت و کاروبار کی غرض سے حرم جانے والوں کو مت روکو نہ انہیں تنگ کرو۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ احکام اس وقت کے ہیں جب مسلمان اور مشرک اکٹھے حج و عمرہ کرتے تھے۔ لیکن جب آیت ﴿إِنَّمَا الشُّرَيْكِيُّونَ بَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَلِيمِهِمْ هَذَا﴾ (التوبہ - ۲۸) ”مشرکین تو پلید ہیں“ پس اس برس کے بعد وہ خانہ کعبہ کے پاس نہ جانے پائیں“ نازل ہو گئی، تو مشرکین کی حد تک یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ بعض کے نزدیک یہ آیت محکم یعنی غیر منسوخ ہے اور یہ حکم مسلمانوں کے بارے میں ہے۔ (فتح القدر)

(۴) یہاں امراباحت یعنی جواز بتلانے کے لیے ہے۔ یعنی جب تم احرام کھول دو تو شکار کرنا تمہارے لیے جائز ہے۔ (۵) یعنی گو تمہیں ان مشرکین نے ۶ ہجری میں مسجد حرام میں جانے سے روک دیا تھا لیکن تم ان کے اس روکنے کی وجہ سے ان کے ساتھ زیادتی والا رویہ اختیار مت کرنا۔ دشمن کے ساتھ بھی ظلم اور عنف کا سبق دیا جا رہا ہے۔

مدونہ کرو،^(۱) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔ (۲)

تم پر حرام کیا گیا مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس پر اللہ کے سوا دوسرے کا نام پکارا گیا ہو^(۲) اور جو گلا گھٹنے سے مرا ہو^(۳) اور جو کسی ضرب سے مر گیا ہو^(۴) اور جو اونچی جگہ سے گر کر مرا ہو^(۵) اور جو کسی کے سینگ مارنے سے مرا ہو^(۶) اور جسے درندوں نے پھاڑ کھایا ہو^(۷) لیکن اسے تم ذبح کر ڈالو تو حرام نہیں^(۸)

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالْدَّمُ وَنَحْوُهُمْ يُخْبِرُونَ مَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْكَرِ ذَلِكُمْ فَنسُخُ الْيَوْمِ يَسِّرُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَحْتَسِبُوهُمْ أَصْحَابُونَ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ

(۱) یہ ایک نہایت اہم اصول بیان کر دیا گیا ہے۔ جو ایک مسلمان کے لیے قدم قدم پر رہنمائی مہیا کر سکتا ہے۔ کاش مسلمان اس اصول کو اپنائیں۔

(۲) یہاں سے ان محرمات کا ذکر شروع ہو رہا ہے جن کا حوالہ سورت کے آغاز میں دیا گیا ہے۔ آیت کا اتنا حصہ سورہ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ (دیکھیے آیت نمبر ۱۷۳)

(۳) گلا کوئی شخص گھونٹ دے یا کسی چیز میں بیچس کر خود گلا گھٹ جائے۔ دونوں صورتوں میں مردہ جانور حرام ہے۔

(۴) کسی نے پتھر، لاشی یا کوئی اور چیز ماری جس سے وہ بغیر ذبح کیے مر گیا۔ زمانہ جاہلیت میں ایسے جانوروں کو کھایا جاتا تھا۔ شریعت نے منع کر دیا۔

بندوق کا شکار: بندوق کا شکار کیے ہوئے جانور کے بارے میں علما کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شوکانی نے ایک حدیث سے استدلال کرتے ہوئے بندوق کے شکار کو حلال قرار دیا ہے۔ (فتح القدر) یعنی اگر بسم اللہ پڑھ کر گولی چلائی گئی اور شکار ذبح سے پہلے ہی مر گیا تو اس کا کھانا اس قول کے مطابق حلال ہے۔

(۵) چاہے خود گرا ہو یا کسی نے پہاڑ وغیرہ سے دھکا دے کر گرایا ہو۔

(۶) نَطِيحَةٌ، مَنْطُوحَةٌ کے معنی میں ہے۔ یعنی کسی نے اسے مکر ماردی اور بغیر ذبح کیے وہ مر گیا۔

(۷) یعنی شیر، چیتا اور بھیڑیا وغیرہ جسے زونا ب (کچیلوں سے شکار کرنے والے درندوں میں سے کسی نے) اسے کھایا ہو اور وہ مر گیا ہو۔ زمانہ جاہلیت میں مرجانے کے باوجود ایسے جانور کو کھایا جاتا تھا۔

(۸) جمہور مفسرین کے نزدیک یہ اشتنا تمام مذکورہ جانوروں کے لیے ہے یعنی مَنْخَنِقَةٌ، مَوْقُوذَةٌ، مُتَرَدِّيَةٌ، نَطِيحَةٌ اور درندوں کا کھایا ہوا، اگر تم انہیں اس حال میں پالو کہ ان میں زندگی کے آثار موجود ہوں اور پھر تم انہیں شرعی طریقے سے ذبح کر لو تو تمہارے لیے ان کا کھانا حلال ہو گا۔ زندگی کی علامت یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت جانور پھڑکے اور ٹانگیں مارے۔ اگر چھری پھیرتے وقت یہ اضطراب و حرکت نہ ہو تو سمجھ لو یہ مردہ ہے۔ ذبح کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ بسم اللہ

اور جو آستانوں پر ذبح کیا گیا ہو^(۱) اور یہ بھی کہ قرعہ کے تیروں کے ذریعے فال گیری کرو^(۲) یہ سب بدترین گناہ ہیں، آج کفار تمہارے دین سے ناامید ہو گئے، خبردار! تم ان سے نہ ڈرنا اور مجھ سے ڈرتے رہنا، آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھرا کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہو گیا۔ پس جو شخص شدت کی بھوک میں بے قرار ہو جائے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بہت بڑا مہربان ہے۔^(۳)

عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمِهِ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۲﴾

پڑھ کر تیز دھار آلے سے اس کا گلا اس طرح کاٹا جائے کہ رگیں کٹ جائیں۔ ذبح کے علاوہ نحر بھی مشروع ہے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ کھڑے جانور کے لمبے پر چھری ماری جائے (اونٹ کو نحر کیا جاتا ہے) جس سے زرخہ اور خون کی خاص رگیں کٹ جاتی ہیں اور سارا خون بہہ جاتا ہے۔

(۱) مشرکین اپنے بتوں کے قریب پتھریا کوئی چیز نصب کر کے ایک خاص جگہ بناتے تھے۔ جسے نُصْبُ (تھان یا آستانہ) کہتے تھے۔ اسی پر وہ بتوں کے نام نذر کئے گئے جانوروں کو ذبح کرتے تھے یعنی یہ ﴿وَمَا أَوْلَىٰ لَهُ بِغَيْرِ اللَّهِ﴾ ہی کی ایک شکل تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آستانوں، مقبروں اور درگاہوں پر، جہاں لوگ طلب حاجات کے لئے جاتے ہیں اور وہاں مدفون افراد کی خوشنودی کے لئے جانور (مرغا، بکرا وغیرہ) ذبح کرتے ہیں، یا پکی ہوئی دیکھیں تقسیم کرتے ہیں، ان کا کھانا حرام ہے یہ ﴿وَمَا ذُكِرَ عَلَى النَّصْبِ﴾ میں داخل ہیں۔

(۲) ﴿وَأَنْ تَسْتَمْتُمُوا بِأِلَازِكُمْ﴾ کے دو معنی کیے گئے ہیں ایک تیروں کے ذریعے تقسیم کرنا دوسرے، تیروں کے ذریعہ قسمت معلوم کرنا، پہلے معنی کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ جوئے وغیرہ میں ذبح شدہ جانور کی تقسیم کے لیے یہ تیر ہوتے تھے جس میں کسی کو کچھ مل جاتا، کوئی محروم رہ جاتا۔ دوسرے، معنی کی رو سے کہا گیا ہے کہ ازلام سے مراد تیر ہیں جن سے وہ کسی کام کا آغاز کرتے وقت فال لیا کرتے تھے۔ انہوں نے تین قسم کے تیر بنا رکھے تھے۔ ایک أَفْعَلُ (کر) دوسرے میں لَا تَفْعَلُ (نہ کر) اور تیسرے میں کچھ نہیں ہوتا تھا۔ أَفْعَلُ وَاللَّا تَعْمَلُ نَکَلُ آتَاوہ کام کر لیا جاتا، لَا تَفْعَلُ وَاللَّا تَفْعَلُ تَعْمَلُ (نہ کر) اور تیسرا تیر نَکَلُ آتَاوہ پھر دوبارہ فال نکالتے۔ یہ بھی گویا کمات اور اسْتِمْدَادٌ بِغَيْرِ اللَّهِ کی شکل ہے، اس لیے اسے بھی حرام کر دیا گیا استقسام کے معنی طلب قسمت ہیں۔ یعنی تیروں سے قسمت طلب کرتے تھے۔

(۳) یہ بھوک کی اضطراری کیفیت میں مذکورہ محرمات کے کھانے کی اجازت ہے بشرطیکہ مقصد اللہ کی نافرمانی اور حد سے تجاوز کرنا نہ ہو، صرف جان بچانا مطلوب ہو۔

آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کے لئے کیا کچھ حلال ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ تمام پاک چیزیں تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں،^(۱) اور جن شکار کھیلنے والے جانوروں کو تم نے سدھا رکھا ہے یعنی جنہیں تم تھوڑا بہت وہ سکھاتے ہو جس کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے تمہیں دے رکھی ہے^(۲) پس جس شکار کو وہ تمہارے لئے پکڑ کر روک رکھیں تو تم اس سے کھا لو اور اس پر اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کر لیا کرو۔^(۳) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، یقیناً اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔ (۴)

کل پاکیزہ چیزیں آج تمہارے لئے حلال کی گئیں اور اہل کتاب کا ذبیحہ تمہارے لئے حلال ہے^(۴) اور تمہارا ذبیحہ ان کے لئے حلال ہے، اور پاک دامن مسلمان عورتیں اور جو لوگ تم سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں ان کی پاک

يَتَلَوْنَكُمْ مَاذَا أَحَلَّ لَهُمْ قُلُوبُكُمْ لَكُمْ الْكَلْبُ وَمَا عَمَدْتُمْ مِنَ
الْجَوَارِحِ مُكَلَّبِينَ يُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَمَدَكُمْ اللَّهُ فَكُلُوا مِمَّا
أَمْسَلْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا السَّمَاءَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ وَاللَّهُ يَرَى اللَّهُ
سِرِّيَكُمْ الْحَسْبِ ۝

الْيَوْمَ أَحَلَّ لَكُمْ الْكَلْبُ وَطَعَامَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَلًا
لَكُمْ وَطَعَامَ مَا كُرِّهْتُمْ مِنَ الْفُؤَادِ وَالْمُحْضَنَاتِ
مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ الْجُورَهُنَّ

(۱) اس سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جو حلال ہیں۔ ہر حلال طیب ہے اور ہر حرام خبیث۔

(۲) جَوَارِحُ، جَارِحُ کی جمع ہے جو کا سب (کمانے والا) کے معنی میں ہے۔ مراد شکاری کتا، باز، چیتا، شکر اور دیگر شکاری پرندے اور درندے ہیں۔ مُكَلَّبِينَ کا مطلب ہے شکار پر چھوڑنے سے پہلے ان کو شکار کے لیے سدھایا گیا ہو۔ سدھانے کا مطلب ہے جب اسے شکار پر چھوڑا جائے۔ تو دوڑتا ہوا جائے، جب روک دیا جائے تو رک جائے اور بلایا جائے تو واپس آجائے۔

(۳) ایسے سدھائے ہوئے جانوروں کا شکار کیا ہوا جانور دو شرطوں کے ساتھ حلال ہے۔ ایک یہ کہ اسے شکار کے لیے چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھ لی گئی ہو۔ دوسری یہ کہ شکاری جانور شکار کر کے اپنے مالک کے لیے رکھ چھوڑے اور اسی کا انتظار کرے، خود نہ کھائے۔ حتیٰ کہ اگر اس نے اسے مار بھی ڈالا ہو، تب بھی وہ مقتول شکار شدہ جانور حلال ہو گا بشرطیکہ اس کے شکار میں سدھائے اور چھوڑے ہوئے جانور کے علاوہ کسی اور جانور کی شرکت نہ ہو۔ (اصحیح بخاری، کتاب الذبائح والصيد مسلم، کتاب الصيد)

(۴) اہل کتاب کا وہی ذبیحہ حلال ہو گا جس میں خون بہ گیا ہو۔ گویا ان کا مشقی ذبیحہ حلال نہیں ہے، کیونکہ اس میں خون بہنے کی ایک بنیادی شرط مفقود ہے۔

دامن عورتیں بھی حلال ہیں^(۱) جب کہ تم ان کے مراداً کرو، اس طرح کہ تم ان سے باقاعدہ نکاح کرو یہ نہیں کہ علانیہ زنا کرو یا پوشیدہ بدکاری کرو، منکرین ایمان کے اعمال ضائع اور اکارت ہیں اور آخرت میں وہ ہارنے والوں میں سے ہیں۔ (۵)

اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ کو، اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولو^(۲) اپنے سروں کا مسح کرو^(۳) اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھولو،^(۴)

مُحْصِنِينَ غَيْرِ مُسْفِحِينَ وَلَا مُتَخَذِي الْأَخْدَانِ وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي الْأَخِرَةِ مِنَ الْخُسِرِينَ ٥

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا وَإِنْ كُنْتُمْ

(۱) اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت کے ساتھ ایک تو پاکدامن کی قید ہے، جو آج کل اکثر اہل کتاب کی عورتوں میں مفقود ہے۔ دوسرے، اس کے بعد فرمایا گیا جو ایمان کے ساتھ کفر کرے، اس کے عمل برباد ہو گئے۔ اس سے یہ تشبیہ مقصود ہے کہ اگر ایسی عورت سے نکاح کرنے میں ایمان کے ضیاع کا اندیشہ ہو تو بہت ہی خسارہ کا سودا ہو گا اور آج کل اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح میں ایمان کو جو شدید خطرات لاحق ہوتے ہیں، محتاج وضاحت نہیں۔ درآں حالیکہ ایمان کو بچانا فرض ہے۔ ایک جائز کام کے لیے فرض کو خطرے میں نہیں ڈالا جاسکتا۔ اس لیے اسکا جواز بھی اس وقت تک ناقابل عمل رہے گا، جب تک مذکورہ دونوں چیزیں مفقود نہ ہو جائیں۔ علاوہ ازیں آج کل کے اہل کتاب ویسے بھی اپنے دین سے بالکل ہی بیگانہ بلکہ بیزار اور باغی ہیں۔ اس حالت میں کیا وہ واقعی اہل کتاب میں شمار بھی ہو سکتے ہیں؟ واللہ اعلم۔

(۲) ”منہ دھو“ یعنی ایک ایک، دو دو یا تین تین مرتبہ دونوں ہتھیلیاں دھونے، کلی کرنے، ناک میں پانی ڈال کر جھاڑنے کے بعد۔ جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔ منہ دھونے کے بعد ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھویا جائے۔

(۳) مسح پورے سر کا کیا جائے، جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے اپنے ہاتھ آگے سے پیچھے گدی تک لے جائے اور پھر وہاں سے آگے کو لائے جہاں سے شروع کیا تھا۔ اسی کے ساتھ کانوں کا مسح کر لے۔ اگر سر پر پگڑی یا عمامہ ہو تو حدیث کی رو سے موزوں کی طرح اس پر بھی مسح جائز ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ) علاوہ ازیں ایک مرتبہ ہی اس طرح مسح کر لینا کافی ہے۔

(۴) أَرْجُلِكُمْ کا عطف وُجُوهِكُمْ پر ہے یعنی اپنے پیر ٹخنوں تک دھوؤ! اور اگر موزے یا جرابیں پہنی ہوئی ہیں (بشرطیکہ وضو کی حالت میں پہنی ہوں) تو حدیث کی رو سے پیر دھونے کی بجائے جرابوں پر مسح بھی جائز ہے۔

ملحوظہ: ۱۔ اگر پہلے سے پاؤں ہو تو نیا وضو کرنا ضروری نہیں۔ تاہم ہر نماز کے لیے تازہ وضو بہتر ہے۔ ۲۔ وضو سے پہلے نیت فرض ہے۔ ۳۔ وضو سے پہلے بسم اللہ پڑھنی بھی ضروری ہے۔ ۴۔ داڑھی گھنی ہو تو اس کا خلال کیا جائے۔

اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کر لو،^(۱) ہاں اگر تم بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی حاجت ضروری سے فارغ ہو کر آیا ہو، یا تم عورتوں سے ملے ہو اور تمہیں پانی نہ ملے تو تم پاک مٹی سے تیمم کر لو، اسے اپنے چہروں پر اور ہاتھوں پر مل لو^(۲) اللہ تعالیٰ تم پر کسی قسم کی تنگی ڈالنا نہیں چاہتا^(۳) بلکہ اس کا ارادہ تمہیں پاک کرنے کا اور تمہیں اپنی بھرپور نعمت دینے کا ہے،^(۴) تاکہ تم شکر ادا کرتے رہو۔ (۶)

تم پر اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں نازل ہوئی ہیں انہیں یاد رکھو اور اس کے اس عہد کو بھی جس کا تم سے معاہدہ ہوا ہے

مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ
أَوْ لَسْتُمْ عَلَىٰ النِّسَاءِ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا
طَيِّبًا فَأَمْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ مِنْهُ مَا يُرِيدُ اللَّهُ
لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَا لَكِن يُّرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ
لِيُنِزِلَ عَلَيْكُمْ رِجَابًا مُّغْفِرًا لِّذُنُوبِكُمْ ۗ تَتَذَكَّرُونَ ۝

وَأَذَلُّوْا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَوَيْتَاتِ الْاَذَىٰ
وَأَنْفَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا

۵- اعضا کو ترتیب وار دھویا جائے۔ ۶- ان کے درمیان فاصلہ نہ کیا جائے۔ یعنی ایک عضو دھونے کے بعد دوسرے عضو دھونے میں دیر نہ کی جائے۔ بلکہ سب اعضا تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے دھوئے جائیں۔ ۷- اعضائے وضو میں سے کسی بھی عضو کا کوئی حصہ خشک نہ رہے، ورنہ وضو نہیں ہو گا۔ ۸- کوئی عضو بھی تین مرتبہ سے زیادہ نہ دھویا جائے۔ ایسا کرنا خلاف سنت ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، فتح القدر وایسر التفسیر)

(۱) جنابت سے مراد وہ ناپاکی ہے جو احتلام یا بیوی سے ہم بستری کرنے کی وجہ سے لاحق ہو جاتی ہے اور اسی حکم میں حیض اور نفاس بھی داخل ہے۔ جب حیض یا نفاس کا خون بند ہو جائے تو پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے طہارت یعنی غسل ضروری ہے۔ البتہ پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کی اجازت ہے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔ (فتح القدر وایسر التفسیر)

(۲) اس کی مختصر تشریح اور تیمم کا طریقہ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۴۳ میں گزر چکا ہے۔ صحیح بخاری میں اس کی شان نزول کی بابت آتا ہے کہ ایک سفر میں بیداء کے مقام پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہو گیا جس کی وجہ سے وہاں رکنیا رکے رہنا پڑا۔ صبح کی نماز کے لیے لوگوں کے پاس پانی نہ تھا اور تلاش ہوئی تو پانی دستیاب بھی نہیں ہوا۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں تیمم کی اجازت دی گئی ہے۔ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے آیت سن کر کہا اے آل ابی بکر! تمہاری وجہ سے اللہ نے لوگوں کے لیے برکتیں نازل فرمائی ہیں اور یہ تمہاری کوئی پہلی برکت نہیں ہے۔ (تم لوگوں کے لیے سراپا برکت ہو۔) (صحیح بخاری۔ سورۃ المائدۃ)

(۳) اسی لیے تیمم کی اجازت مرحمت فرمادی ہے۔

(۴) اسی لیے حدیث میں وضو کرنے کے بعد دعا کرنے کی ترغیب ہے۔ دعاؤں کی کتابوں سے یہ دعایا دکر لی جائے۔

جبکہ تم نے کہا ہم نے سنا اور مانا اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، یقیناً اللہ تعالیٰ دلوں کی باتوں کا جاننے والا ہے۔ (۷) اے ایمان والو! تم اللہ کی خاطر حق پر قائم ہو جاؤ، راستی اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ،^(۱) کسی قوم کی عداوت تمہیں خلاف عدل پر آمادہ نہ کر دے،^(۲) عدل کیا کرو جو پرہیز گاری کے زیادہ قریب ہے، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ (۸)

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کے لئے وسیع مغفرت اور بہت بڑا اجر و ثواب ہے۔ (۹)

اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہمارے احکام کو جھٹلایا وہ دوزخی ہیں۔ (۱۰)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو احسان تم پر کیا ہے اسے یاد کرو جب کہ ایک قوم نے تم پر دست درازی کرنی چاہی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں کو تم تک پہنچنے سے روک دیا^(۳) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور مومنوں کو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ (۱۱)

وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ①

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوْمِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ
يَالْقِسْطَ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَا نُ قَوْمٍ عَلَى
أَلَّا تَعْبُدُوا لِدُونِ اللَّهِ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ
وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ②

وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ
مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ③

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَانُوا بَيْنَنَا أَوْلِيَاءَ لَأَصْحَابُ
الْجَحِيمِ ④

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ
هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ
أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَصَلَّى اللَّهُ قَلْبَتَكُمْ
الْمُؤْمِنُونَ ⑤

(۲-۱) پہلے جیلے کی تشریح سورۃ النساء آیت نمبر ۱۳۵ میں اور دوسرے جملہ کی سورۃ المائدہ کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ نبی کریم ﷺ کے نزدیک عادلانہ گواہی کی کتنی اہمیت ہے، اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے جو حدیث میں آتا ہے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں میرے باپ نے مجھے عطیہ دیا تو میری والدہ نے کہا، اس عطیہ پر آپ جب تک اللہ کے رسول کو گواہ نہیں بنائیں گے میں راضی نہیں ہوں گی۔ چنانچہ میرے والد نبی ﷺ کی خدمت میں آئے تو آپ ﷺ نے پوچھا کیا تم نے اپنی ساری اولاد کو اسی طرح کا عطیہ دیا ہے؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ”اللہ سے ڈرو! اور اولاد کے درمیان انصاف کرو“ اور فرمایا کہ ”میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا“ (صحیح بخاری و مسلم، کتاب الہبۃ)

(۳) اس کی شان نزول میں مفسرین نے متعدد واقعات بیان کیے ہیں۔ مثلاً اس اعرابی کا واقعہ کہ رسول اللہ ﷺ ایک سفر سے واپسی پر ایک درخت کے سائے میں آرام فرماتے تھے، تلوار درخت سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس اعرابی نے تلوار پکڑ کر

اور اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد و پیمانہ لیا^(۱) اور انہی میں سے بارہ سردار ہم نے مقرر فرمائے^(۲) اور اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ یقیناً میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم رکھو گے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے اور میرے رسولوں کو مانتے رہو گے اور ان کی مدد کرتے رہو گے اور اللہ تعالیٰ کو بہتر قرض دیتے رہو گے تو یقیناً میں تمہاری برائیاں تم سے دور رکھوں گا اور تمہیں ان جنتوں میں لے جاؤں گا جن کے نیچے چشمے بہ رہے ہیں، اب اس عہد و پیمانہ کے بعد بھی تم میں سے جو انکاری ہو جائے وہ یقیناً راہ راست سے بھٹک گیا۔ (۱۳)

وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا وَقَالَ اللَّهُ إِنِّي مَعَكُمْ لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَآمَنْتُمْ بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ صَلَّى سِوَاءَ السَّبِيلِ ⑬

آپ ﷺ پر سنت لی اور کہنے لگا۔ اے محمد (ﷺ)! آپ کو مجھ سے کون بچائے گا؟ آپ ﷺ نے بلا تامل فرمایا ”اللہ“ (یعنی اللہ بچائے گا) یہ کہنا تھا کہ تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ بعض کہتے ہیں کعب بن اشرف اور اس کے ساتھیوں نے نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کے خلاف، جب کہ آپ ﷺ وہاں تشریف فرما تھے، دھوکہ اور فریب سے نقصان پہنچانے کی سازش تیار کی تھی، جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بچایا۔ بعض کہتے ہیں کہ ایک مسلمان کے ہاتھوں غلط فہمی سے جو دو عامری شخص قتل ہو گئے تھے، ان کی دیت کی ادائیگی میں یہودیوں کے قبیلے بنو نضیر سے حسب معاہدہ جو تعاون لینا تھا، اس کے لئے نبی کریم ﷺ اپنے رفقا سمیت وہاں تشریف لے گئے اور ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے یہ سازش تیار کی کہ اوپر سے چکی کا پتھر آپ ﷺ پر گرا دیا جائے، جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بذریعہ وحی مطلع فرمادیا۔ ممکن ہے کہ ان سارے ہی واقعات کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ہو۔ کیونکہ ایک آیت کے نزول کے کئی اسباب و عوامل ہو سکتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر، امیر التفاسیر و فتح القدر)

(۱) جب اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو وہ عہد اور میثاق پورا کرنے کی تاکید کی جو اس نے حضرت محمد ﷺ کے ذریعے سے لیا اور انہیں قیام حق اور شہادت عدل کا حکم دیا اور انہیں وہ انعامات یاد کرائے جو ان پر ظاہراً و باطناً ہوئے اور بالخصوص یہ بات کہ انہیں حق و صواب کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائی تو اب اس مقام پر اس عہد کا ذکر فرمایا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا اور جس میں وہ ناکام رہے۔ یہ گویا بالواسطہ مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ تم بھی کہیں بنو اسرائیل کی طرح عہد و میثاق کو پامال کرنا شروع نہ کر دینا۔

(۲) اس وقت کا واقعہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جابرہ سے قتال کے لئے تیار ہوئے تو انہوں نے اپنی قوم کے بارہ قبیلوں پر بارہ نقیب مقرر فرمادئے تاکہ وہ انہیں جنگ کے لئے تیار بھی کریں، ان کی قیادت و رہنمائی بھی کریں اور دیگر معاملات کا انتظام بھی کریں۔

پھر ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان پر اپنی لعنت نازل فرمادی اور ان کے دل سخت کر دیئے کہ وہ کلام کو اس کی جگہ سے بدل ڈالتے ہیں^(۱) اور جو کچھ نصیحت انہیں کی گئی تھی اس کا بہت بڑا حصہ بھلا بیٹھے،^(۲) ان کی ایک نہ ایک خیانت پر تجھے اطلاع ملتی ہی رہے گی^(۳) ہاں تھوڑے سے ایسے نہیں بھی ہیں^(۴) پس تو انہیں معاف کرتا جا اور درگزر کرتا رہ،^(۵) بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ (۱۳)

فِيمَا أَنْفَضَهُمْ مِيثَاقَهُمْ لَعْنَهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَى خَائِنَةٍ مِنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٣﴾

(۱) یعنی اتنے انتظامات اور عہد مواعید کے باوجود بنو اسرائیل نے عہد شکنی کی، جس کی بنا پر وہ لعنت الہی کے مستحق بنے۔ اس لعنت کے دنیوی نتائج یہ سامنے آئے کہ ایک، ان کے دل سخت کر دیئے گئے جس سے ان کے دل اثر پذیری سے محروم ہو گئے اور انبیاء کے وعظ و نصیحت ان کے لئے بے کار ہو گئے، دوسرے، یہ کہ وہ کلمات الہی میں تحریف کرنے لگ گئے۔ یہ تحریف لفظی اور معنوی دونوں طرح کی ہوتی تھی جو اس بات کی دلیل تھی کہ ان کی عقل و فہم میں کئی آگئی ہے اور ان کی جسارتوں میں بھی بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے کہ اللہ کی آیتوں تک میں تصرف کرنے سے انہیں گریز نہیں۔ بد قسمتی سے اس قساوت قلبی اور کلمات الہی میں تحریف سے امت محمدیہ کے افراد بھی محفوظ نہیں رہے۔ مسلمان کہلانے والے عوام نہیں خواص بھی، جیسا ہی نہیں علماء بھی، ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ وعظ و نصیحت اور احکام الہی کی یاد دہانی ان کے لئے بیکار ہے، وہ سن کر ان سے ذرا اثر قبول نہیں کرتے اور جن غفلتوں اور کوتاہیوں کا وہ شکار ہیں، ان سے تائب نہیں ہوتے۔ اسی طرح اپنی بدعات، خود ساختہ مزعومات اور اپنے تاویلات باطلہ کے اثبات کے لئے کلام الہی میں تحریف کر ڈالتے ہیں۔

(۲) یہ تیسرا نتیجہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ احکام الہی پر عمل کرنے میں انہیں کوئی رغبت اور دلچسپی نہیں رہی بلکہ بے عملی اور بد عملی ان کا شعار بن گئی اور وہ پستی کے اس مقام پر پہنچ گئے کہ ان کے دل سلیم رہے نہ ان کی فطرت مستقیم۔

(۳) یعنی شذر، خیانت اور مکر، ان کے کردار کا جزو بن گیا ہے جس کے نمونے ہر وقت آپ کے سامنے آتے رہیں گے۔ (۴) یہ تھوڑے سے لوگ وہی ہیں جو یہودیوں میں سے مسلمان ہو گئے تھے اور ان کی تعداد دس سے بھی کم تھی۔

(۵) عفو و درگزر کا یہ حکم اس وقت دیا گیا تھا، جب لڑنے کی اجازت نہیں تھی۔ بعد میں اس کی جگہ حکم دیا گیا ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَلَا يَأْبَىٰ إِلَهُهُ﴾ (التوبہ - ۲۹) ”ان لوگوں سے جنگ کرو جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے“ بعض کے نزدیک عفو و درگزر کا یہ حکم منسوخ نہیں ہے۔ یہ بجائے خود ایک اہم حکم ہے، حالات و ظروف کے مطابق اسے بھی اختیار کیا جاسکتا ہے اور اس سے بھی بعض دفعہ وہ نتائج حاصل ہو جاتے ہیں جن کے لیے قتال کا حکم ہے۔

اور جو اپنے آپ کو نصرانی کہتے ہیں ^(۱) ہم نے ان سے بھی عموماً بیان لیا، انہوں نے بھی اس کا بڑا حصہ فراموش کر دیا جو انہیں نصیحت کی گئی تھی، تو ہم نے بھی ان کے آپس میں بغض و عداوت ڈال دی جو تاقیامت رہے گی ^(۲) اور جو کچھ یہ کرتے تھے عنقریب اللہ تعالیٰ انہیں سب بتادے گا۔ (۱۴)

اے اہل کتاب! یقیناً تمہارے پاس ہمارا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آچکا جو تمہارے سامنے کتاب اللہ کی بکثرت ایسی باتیں ظاہر کر رہا ہے جنہیں تم چھپا رہے تھے ^(۳) اور بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے، تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور اور واضح کتاب آچکی ہے۔ ^(۴) (۱۵)

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصْرَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿۱۴﴾

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ﴿۱۵﴾

(۱) نَصْرَىٰ نُصْرَةٌ ”مد“ سے ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوال ﴿مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ﴾ ”اللہ کے دین میں کون میرا مددگار ہے؟“ کے جواب میں ان کے چند مخلص پیروکاروں نے جواب دیا تھا ﴿عَنْ أَنْصَارِ اللَّهِ﴾ ”ہم اللہ کے مددگار ہیں“ اسی سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی یہود کی طرح اہل کتاب ہیں۔ ان سے بھی اللہ نے عدا لیا، لیکن انہوں نے بھی اس کی پرواہ نہیں کی، اس کے نتیجے میں ان کے دل بھی اثر پذیری سے خالی اور ان کے کردار کھوکھلے ہو گئے۔

(۲) یہ عدا اللہی سے انحراف اور بے عملی کی وہ سزا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر قیامت تک کے لیے مسلط کر دی گئی۔ چنانچہ عیسائیوں کے کئی فرقے ہیں جو ایک دوسرے سے شدید نفرت و عناد رکھتے اور ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے معبد میں عبادت نہیں کرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ امت مسلمہ پر بھی یہ سزا مسلط کر دی گئی ہے۔ یہ امت بھی کئی فرقوں میں بٹ گئی ہے، جن کے درمیان شدید اختلافات اور نفرت و عناد کی دیواریں حائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

(۳) یعنی انہوں نے تورات و انجیل میں جو تبدیلیاں اور تحریفات کیں، انہیں طشت ازبام کیا اور جن کو وہ چھپاتے تھے، ظاہر کیا، جیسے سزائے رجم۔ جیسا کہ احادیث میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

(۴) نُورٌ اور كِتَابٌ مُّبِينٌ دونوں سے مراد قرآن کریم ہے ان کے درمیان واو، مغایرت مصداق نہیں مغایرت معنی کے لئے ہے اور یہ عطف تفسیری ہے جس کی واضح دلیل قرآن کریم کی اگلی آیت ہے جس میں کہا جا رہا ہے يَهْدِي بِهِ اللَّهُ لِمَا يَشَاءُ اللَّهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ”کہ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ہدایت فرماتا ہے“ اگر نور اور کتاب یہ دو الگ الگ چیزیں ہوتیں تو الفاظ يَهْدِي بِهِمَ اللَّهُ ہوتے ”یعنی اللہ تعالیٰ ان دونوں کے ذریعے سے ہدایت فرماتا ہے“ قرآن کریم کی اس نص سے واضح ہو گیا کہ نور اور کتاب مبین دونوں سے مراد ایک ہی چیز یعنی قرآن کریم ہے۔ یہ نہیں ہے کہ نور سے آنحضرت ﷺ اور

جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ انہیں جو رضائے رب کے درپے ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتا ہے اور اپنی توفیق سے اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف ان کی رہبری کرتا ہے۔ (۱۶)

یقیناً وہ وہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے، آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم اور اس کی والدہ اور روئے زمین کے سب لوگوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر کچھ بھی اختیار رکھتا ہو؟ آسمانوں و زمین اور دونوں کے درمیان کا کل ملک اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۱۷)

يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ
السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ
وَيَهْدِي لَهُم إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿١٦﴾

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ
مَرْيَمَ قُلْ مَن يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ
يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَن فِي الْأَرْضِ
جَمِيعًا وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا
يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيرٌ ﴿١٧﴾

کتاب سے قرآن مجید مراد ہے۔ جیسا کہ وہ اہل بدعت باور کراتے ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی بابت نُورٌ مِّنْ نُورِ اللَّهِ کا عقیدہ گھڑ رکھا ہے۔ اور آپ ﷺ کی بشریت کا انکار کرتے ہیں۔ اسی طرح اس خانہ ساز عقیدے کے اثبات کے لئے ایک حدیث بھی بیان کرتے ہیں کہ اللہ نے سب سے پہلے نبی ﷺ کا نور پیدا کیا اور پھر اس نور سے ساری کائنات پیدا کی۔ حالانکہ یہ حدیث، حدیث کے کسی بھی مستند مجموعے میں موجود نہیں ہے علاوہ ازیں یہ اس صحیح حدیث کے بھی خلاف ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے قلم پیدا فرمایا (إِن أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللَّهُ الْقَلَمَ) یہ روایت ترمذی اور ابو داؤد میں ہے۔ محدث البانی لکھتے ہیں (فَالْحَدِيثُ صَحِيحٌ بَلَا رَيْبٍ، وَهُوَ مِنَ الْأَدْلَةِ الظَّاهِرَةِ عَلَى بُطْلَانِ الْحَدِيثِ الْمَشْهُورِ «أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللَّهُ نُورَ نَبِيِّكَ يَا جَابِرُ») (تعلیقات المشکوٰۃ جلد ۱ ص ۳۳) ”مشہور حدیث جابر کہ اللہ نے سب سے پہلے تیرے نبی کا نور پیدا کیا“ باطل ہے۔ (خلاصہ ترجمہ)

(۱) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ اور ملکیت تامہ کا بیان فرمایا ہے۔ مقصد عیسائیوں کے عقیدہ الوہیت مسیح کا رد و ابطال ہے۔ حضرت مسیح کے عین اللہ ہونے کے قائل پہلے تو کچھ ہی لوگ تھے یعنی ایک ہی فرقہ۔ یعقوبیہ۔ کا یہ عقیدہ تھا لیکن اب تقریباً تمام عیسائی الوہیت مسیح کے کسی نہ کسی انداز سے قائل ہیں۔ اسی لیے مسیحیت میں اب عقیدہ تثلیث یا اقانم ثلاثہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ بہر حال قرآن نے اس مقام پر تصریح کر دی کہ کسی پیغمبر اور رسول کو الٰہی صفات سے متصف قرار دینا کفر صریح ہے۔ اس کفر کا ارتکاب عیسائیوں نے، حضرت مسیح کو اللہ قرار دے کر کیا، اگر کوئی اور گروہ یا فرقہ کسی اور پیغمبر کو بشریت و رسالت کے مقام سے اٹھا کر الوہیت کے مقام پر فائز کرے گا تو وہ بھی اسی کفر کا ارتکاب کرے گا، فَتَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ هَذِهِ الْعَقِيدَةِ الْفَاسِدَةِ.

یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں،^(۱) آپ کہہ دیجئے کہ پھر تمہیں تمہارے گناہوں کے باعث اللہ کیوں سزا دیتا ہے؟^(۲) نہیں بلکہ تم بھی اس کی مخلوق میں سے ایک انسان ہو وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے عذاب کرتا ہے،^(۳) زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ (۱۸)

اے اہل کتاب! بالیقین ہمارا رسول تمہارے پاس رسولوں کی آمد کے ایک وقفے کے بعد آ پہنچا ہے۔ جو تمہارے لئے صاف صاف بیان کر رہا ہے تاکہ تمہاری یہ بات نہ رہ جائے کہ ہمارے پاس تو کوئی بھلائی، برائی سنانے والا آیا ہی نہیں، پس اب تو یقیناً خوشخبری سنانے والا اور آگاہ کرنے والا آ پہنچا^(۴) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۱۹)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ قُل فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّثْلَ سَائِرِ الْبَشَرِ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۗ وَاللَّهُ الْبَصِيرُ ﴿۱۸﴾

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَى قُرْآنٍ مِنَ الرُّسُلِ أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِن بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۹﴾

(۱) یہودیوں نے حضرت عزیر کو اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہا۔ اور اپنے آپ کو بھی ابناء اللہ (اللہ کے بیٹے) اور اس کا محبوب قرار دے لیا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہاں ایک لفظ محذوف ہے یعنی اَتْبَاعُ اَبْنَاءِ اللّٰهِ ہم ”اللہ کے بیٹوں (عزیر و مسیح) کے پیروکار ہیں“ دونوں مفہوموں میں سے کوئی سا بھی مفہوم مراد لیا جائے، اس سے ان کے تفاخر اور اللہ کے بارے میں بے جا اعتماد کا اظہار ہوتا ہے، جس کی اللہ کے ہاں کوئی حیثیت نہیں۔

(۲) اس میں ان کے مذکورہ تفاخر کا بے بنیاد ہونا واضح کر دیا گیا کہ اگر تم واقعی اللہ کے محبوب اور چہیتے ہوتے یا محبوب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تم جو چاہو کرو، اللہ تعالیٰ تم سے باز پرس ہی نہیں کرے گا، تو پھر اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں سزا کیوں دیتا رہا ہے؟ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی بارگاہ میں فیصلہ، دعویٰ کی بنیاد پر نہیں ہوتا نہ قیامت والے دن ہو گا، بلکہ وہ تو ایمان و تقویٰ اور عمل دیکھتا ہے اور دنیا میں بھی اسی کی روشنی میں فیصلہ فرماتا ہے اور قیامت والے دن بھی اسی اصول پر فیصلہ ہو گا۔

(۳) تاہم یہ عذاب یا مغفرت کا فیصلہ اسی سنت اللہ کے مطابق ہو گا، جس کی اس نے وضاحت فرمادی ہے کہ اہل ایمان کے لیے مغفرت اور اہل کفر و فسق کے لیے عذاب، تمام انسانوں کا فیصلہ اسی کے مطابق ہو گا۔ اے اہل کتاب! تم بھی اسی کی پیدا کردہ مخلوق یعنی انسان ہو۔ تمہاری بابت فیصلہ دیگر انسانی مخلوق سے مختلف کیوں کر ہو گا؟

(۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے درمیان جو تقریباً ۵۷۰/ یا ۶۰۰ سال کا فاصلہ ہے یہ

اور یاد کرو موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا، اے میری قوم کے لوگو! اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا ذکر کرو کہ اس نے تم میں سے پیغمبر بنائے اور تمہیں بادشاہ بنا دیا (۱) اور تمہیں وہ دیا جو تمام عالم میں کسی کو نہیں دیا۔ (۲) (۳۰) اے میری قوم! والو! اس مقدس زمین (۳) میں داخل ہو جاؤ

وَاذْكَرَ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَقَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ لَكُمْ مِنْكُمْ اَنْبِيَاءً وَجَعَلَ لَكُم مِّنْ اَوْكَاثِكُمْ مَّاءً لَّمْ يَؤْتِ اَحَدًا مِّنْ الْعَالَمِينَ ﴿٣٠﴾
يَقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ

زمانہ فترت کھلاتا ہے۔ اہل کتاب کو کہا جا رہا ہے کہ اس فترت کے بعد ہم نے اپنا آخری رسول ﷺ بھیج دیا ہے۔ اب تم یہ بھی نہ کہہ سکو گے کہ ہمارے پاس تو کوئی بشیر و نذیر پیغمبر ہی نہیں آیا۔

(۱) پیشتر انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہی ہوئے ہیں جن کا سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ختم کر دیا گیا اور آخری پیغمبر بنو اسماعیل سے ہوئے ﷺ۔ اسی طرح متعدد بادشاہ بھی بنی اسرائیل میں ہوئے اور بعض نبیوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے ملوکیت (بادشاہت) سے نوازا۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نبوت کی طرح ملوکیت (بادشاہت) بھی اللہ کا انعام ہے، جسے علی الاطلاق برا سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ اگر ملوکیت بری چیز ہوتی تو اللہ تعالیٰ کسی نبی کو بادشاہ بنا تا نہ اس کا ذکر انعام کے طور پر فرماتا، جیسا کہ یہاں ہے آج کل مغربی جمہوریت کا کابوس اس طرح ذہنوں پر مسلط ہے اور شاطران مغرب نے اس کا فسوں اس طرح چھونکا ہے کہ مغربی افکار کے اسیر اہل سیاست ہی نہیں بلکہ اصحاب جبہ و دستار بھی ہیں۔ بہر حال ملوکیت یا شخصی حکومت، اگر بادشاہ اور حکمران عادل و متقی ہو تو جمہوریت سے ہزار درجے بہتر ہے۔

(۲) یہ اشارہ ہے ان انعامات اور معجزات کی طرف، جن سے بنی اسرائیل نوازے گئے۔ جیسے من و سلویٰ کا نزول، بادلوں کا سایہ، فرعون سے نجات کے لیے دریا سے راستہ بنا دینا۔ وغیرہ۔ اس لحاظ سے یہ قوم اپنے زمانے میں فضیلت اور اونچے مقام کی حامل تھی لیکن پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کی رسالت و بعثت کے بعد اب یہ مقام فضیلت امت محمدیہ کو حاصل ہو گیا ہے۔ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اَخْرَجْتُ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران۔ ۱۱۰) تم بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کے لیے بنایا گیا ہے لیکن یہ بھی مشروط ہے اس مقصد کی تکمیل کے ساتھ جو اسی آیت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ ﴿تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ (تم لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو) اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو اس مقصد کے لیے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ وہ اپنے خیر امت ہونے کا اعزاز برقرار رکھ سکے۔

(۳) بنو اسرائیل کے مورث اعلیٰ حضرت یعقوب علیہ السلام کا مسکن بیت المقدس تھا۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے امارت مصر کے زمانے میں یہ لوگ مصر جا کر آباد ہو گئے تھے اور پھر تب سے اس وقت تک مصر ہی میں رہے، جب تک کہ موسیٰ علیہ السلام انہیں راتوں رات (فرعون سے چھپ کر) مصر سے نکال نہیں لے گئے۔ اس وقت بیت المقدس پر عمالقہ کی حکمرانی تھی جو ایک بہادر قوم تھی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر بیت المقدس جا کر آباد

جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے نام لکھ دی ہے ^(۱) اور اپنی پشت کے بل روگردانی نہ کرو ^(۲) کہ پھر نقصان میں جا پڑو۔ (۲۱)

انہوں نے جواب دیا کہ اے موسیٰ وہاں تو زور آور سرکش لوگ ہیں اور جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں ہم تو ہرگز وہاں نہ جائیں گے ہاں اگر وہ وہاں سے نکل جائیں پھر تو ہم (بخوشی) چلے جائیں گے۔ ^(۳) (۲۲)

دو شخصوں نے جو خدا ترس لوگوں میں سے تھے، جن پر اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہا کہ تم ان کے پاس دروازے میں تو پہنچ جاؤ، دروازے میں قدم رکھتے ہی یقیناً تم غالب آ جاؤ گے، اور تم اگر مومن ہو تو تمہیں اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ ^(۴) (۲۳)

قوم نے جواب دیا کہ اے موسیٰ! جب تک وہ وہاں ہیں تب تک ہم ہرگز وہاں نہ جائیں گے، اس لئے تم اور تمہارا پروردگار جا کر دونوں ہی لڑ بھڑ لو، ہم یہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ^(۵) (۲۴)

وَلَا تَوَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَائِبِينَ ﴿۲۱﴾

قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَابِرِينَ ﴿۲۱﴾ وَإِنَّا لَنَرُّوهُمْ كَمَا نَرُّكَ حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا كَاذِبُونَ ﴿۲۲﴾

قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِينَ يَخْفَوْنَ أَنَّ اللَّهَ عَلَيْهِمَا إِدْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَانكروا عَلَيْهِمْ وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِنَّ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۲۳﴾

قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَنَرُّوهُمْ كَمَا نَرُّكَ وَإِنَّا لَمُؤْمِنُونَ ﴿۲۴﴾

ہونے کا عزم کیا تو اس کے لیے وہاں قابض عمالقہ سے جماد ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس ارض مقدسہ میں داخل ہونے کا حکم دیا اور نصرت الہی کی بشارت بھی سنائی۔ لیکن اس کے باوجود بنو اسرائیل عمالقہ سے لڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ (ابن کثیر)

(۱) اس سے مراد وہی فتح و نصرت ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے جماد کی صورت میں ان سے کر رکھا تھا۔

(۲) یعنی جماد سے اعراض مت کرو۔

(۳) بنو اسرائیل عمالقہ کی بہادری کی شہرت سے مرعوب ہو گئے اور پہلے مرطلے پر ہی ہمت ہار بیٹھے۔ اور جماد سے دست بردار ہو گئے۔ اللہ کے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کی کوئی پرواہ کی اور نہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ نصرت پر یقین کیا۔ اور وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا۔

(۴) قوم موسیٰ علیہ السلام میں سے صرف یہ دو شخص صحیح معنوں میں ایماندار نکلے، جنہیں نصرت الہی پر یقین تھا، انہوں نے قوم کو سمجھایا کہ تم ہمت تو کرو، پھر دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ تمہیں غلبہ عطا فرماتا ہے۔

(۵) لیکن اس کے باوجود بنی اسرائیل نے بدترین ہزدلی، سوء ادبی اور ترمود سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ تو اور تیرا رب جا کر لڑے۔ اس کے برعکس جب جنگ بدر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا تو انہوں

موسیٰ (علیہ السلام) کہنے لگے الٰہی! مجھے تو بجز اپنے اور میرے بھائی کے کسی اور پر کوئی اختیار نہیں، پس تو ہم میں اور ان نافرمانوں میں جدائی کر دے۔ (۲۵)^(۱)

ارشاد ہوا کہ اب زمین ان پر چالیس سال تک حرام کر دی گئی ہے، یہ خانہ بدوش ادھر ادھر سرگرداں پھرتے رہیں گے (۲) اس لئے تم ان فاسقوں کے بارے میں غمگین نہ ہونا۔ (۳)^(۲)

آدم (علیہ السلام) کے دونوں بیٹوں کا کھرا کھرا حال بھی انہیں سنا دو، (۳) ان دونوں نے ایک نذرانہ پیش کیا، ان

قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي فَافْرِقْ بَيْنَنَا
وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿۲۵﴾

قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَكْفِئُونَ
فِي الْأَرْضِ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿۲۶﴾

وَأْتَىٰ عَلَيْهِمُ بَنُو آدَمَ الْبَاقِيَةُ إِذْ قَرَّبْنَا مَا لَمْ تَكُنْ
مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ قَالَ

نے قلت تعداد و قلت وسائل کے باوجود جہاد میں حصہ لینے کے لیے بھرپور عزم کا اظہار کیا اور یہ بھی کہا کہ ”یا رسول اللہ! ہم آپ کو اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح قوم موسیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا تھا۔“ (صحیح بخاری۔

کتاب المغازی والتفسیر)

(۱) اس میں نافرمان قوم کے مقابلے میں اپنی بے بسی کا اظہار بھی ہے اور براءت کا اعلان بھی۔

(۲) یہ میدان تیرہ کھاتا ہے، جس میں چالیس سال یہ قوم اپنی نافرمانی اور جہاد سے اعراض کی وجہ سے سرگرداں رہی۔ اس میدان میں اس کے باوجود ان پر من و سلوئی کا نزول ہوا، جس سے اکثر انہوں نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ روز روز ایک ہی کھانا کھا کر ہمارا جی بھر گیا ہے۔ اپنے رب سے دعا کر کہ وہ مختلف قسم کی سبزیاں اور دالیں ہمارے لیے پیدا فرمائے۔ میں ان پر بادلوں کا سایہ ہوا، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاشی مارنے سے بارہ قبیلوں کے لیے بارہ چشمے جاری ہوئے، اور اس طرح کے دیگر انعامات ہوتے رہے۔ چالیس سال بعد پھر ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ یہ بیت المقدس کے اندر داخل ہوئے۔

(۳) پیغمبر، دعوت و تبلیغ کے باوجود جب دیکھتا ہے کہ میری قوم سیدھا راستہ اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں، جس میں اس کے لیے دین و دنیا کی سعادتیں اور بھلائیاں ہیں تو فطری طور پر اس کو سخت افسوس اور دلی قلق ہوتا ہے۔ یہی نبی ﷺ کا بھی حال ہوتا تھا، جس کا ذکر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہ فرمایا ہے۔ لیکن آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ جب تو نے فریضہ تبلیغ ادا کر دیا اور پیغام الٰہی لوگوں تک پہنچا دیا اور اپنی قوم کو ایک عظیم الشان کامیابی کے نقطہ آغاز پر لاکھڑا کیا۔ لیکن اب وہ اپنی دون ہمتی اور بددماغی کے سبب تیری بات ماننے کو تیار نہیں تو تو اپنے فرض سے سبک دوش ہو گیا اور اب تجھے ان کے بارے میں غمگین ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایسے موقع پر غمگینی تو ایک فطری چیز ہے۔ لیکن مراد اس تسلی سے یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے بعد اب تم عند اللہ بری الذمہ ہو۔

(۴) آدم علیہ السلام کے ان دو بیٹوں کے نام ہابیل اور قابیل تھے۔

میں سے ایک کی نذر تو قبول ہو گئی اور دوسرے کی مقبول نہ ہوئی^(۱) تو وہ کہنے لگا کہ میں تجھے مار ہی ڈالوں گا، اس نے کہا اللہ تعالیٰ تقویٰ والوں کا ہی عمل قبول کرتا ہے۔ (۲۷)

گو تو میرے قتل کے لئے دست درازی کرے لیکن میں تیرے قتل کی طرف ہرگز اپنے ہاتھ نہ بڑھاؤں گا، میں تو اللہ تعالیٰ پروردگار عالم سے خوف کھاتا ہوں۔ (۲۸)

میں تو چاہتا ہوں کہ تو میرا گناہ اور اپنے گناہ اپنے سر پر رکھ لے^(۲) اور دوزخیوں میں شامل ہو جائے، ظالموں کا یہی بدلہ ہے۔ (۲۹)

پس اسے اس کے نفس نے اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ﴿۲۷﴾

لَئِنْ بَطَّطْتَ إِلَى يَدِكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِسِطْرِيكَ إِلَيْكَ
لِرَأْفَتِكَ إِنَّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ﴿۲۸﴾

إِنِّي أُرِيدُ أَنْ سَبُوَ آبَائِي وَإِيَّكَ فَتَكُونَ مِنَ
أَصْحَابِ النَّارِ وَذَلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ﴿۲۹﴾

فَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ قَتْلَ أَخِيهِ فَقَتَلَهُ فَأَصْبَحَ مِنَ الخَاسِرِينَ ﴿۳۰﴾

(۱) یہ نذر یا قربانی کس لیے پیش کی گئی؟ اس کے بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں۔ البتہ مشور یہ ہے کہ ابتدا میں حضرت آدم و حوا کے ملاپ سے بیک وقت لڑکا اور لڑکی پیدا ہوتی۔ دوسرے حمل سے پھر لڑکا لڑکی ہوتی، ایک حمل کے بن بھائی کا نکاح دوسرے حمل کے بن بھائی سے کر دیا جاتا۔ ہاتیل کے ساتھ پیدا ہونے والی بن بد صورت تھی، جب کہ قاتیل کے ساتھ پیدا ہونے والی بن خوبصورت تھی۔ اس وقت کے اصول کے مطابق ہاتیل کا نکاح قاتیل کی بن کے ساتھ اور قاتیل کا نکاح ہاتیل کی بن کے ساتھ ہونا تھا۔ لیکن قاتیل چاہتا تھا کہ وہ ہاتیل کے بن کی بجائے اپنی ہی بن کے ساتھ جو خوبصورت تھی، نکاح کرے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اسے سمجھایا، لیکن وہ نہ سمجھا، بالآخر حضرت آدم علیہ السلام نے دونوں کو بارگاہ الہی میں قربانیاں پیش کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جس کی قربانی قبول ہو جائے گی قاتیل کی بن کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا جائے گا۔ ہاتیل کی قربانی قبول ہو گئی، یعنی آسمان سے آگ آئی اور اسے کھا گئی جو اس کے قبول ہونے کی دلیل تھی۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ویسے ہی دونوں بھائیوں نے اپنے اپنے طور پر اللہ کی بارگاہ میں نذر پیش کی، ہاتیل نے ایک عمدہ دنبہ کی قربانی اور قاتیل نے گندم کی بالی قربانی میں پیش کی، ہاتیل کی قربانی قبول ہونے پر قاتیل حسد کا شکار ہو گیا۔

(۲) میرے گناہ کا مطلب، قتل کا وہ گناہ ہے جو مجھے اس وقت ہوتا جب میں تجھے قتل کرتا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ کرام نے پوچھا قاتل کا جہنم میں جانا تو سمجھ میں آتا ہے، مقتول جہنم میں کیوں جائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا، اس لیے کہ وہ بھی اپنے ساتھی کو قتل کرنے کا حریص تھا۔ (صحیح بخاری

دیا اور اس نے اسے قتل کر ڈالا، جس سے نقصان پانے والوں میں سے ہو گیا۔ (۳۰)

پھر اللہ تعالیٰ نے ایک کوے کو بھیجا جو زمین کھود رہا تھا تاکہ اسے دکھائے کہ وہ کس طرح اپنے بھائی کی نعش کو چھپا دے، وہ کہنے لگا، ہائے افسوس! کیا میں ایسا کرنے سے بھی گیا گزرا ہو گیا کہ اس کوے کی طرح اپنے بھائی کی لاش کو دفن دیتا؟ پھر تو (بڑا ہی) پشیمان اور شرمندہ ہو گیا۔ (۳۱)

اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ لکھ دیا کہ جو شخص کسی کو بغیر اس کے کہ وہ کسی کا قاتل ہو یا زمین میں فساد چھانے والا ہو، قتل کر ڈالے تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا، اور جو شخص کسی ایک کی جان بچالے، اس نے گویا تمام لوگوں کو زندہ کر دیا (۳) اور ان کے پاس

فَبَعَثَ اللَّهُ غُرَابًا يَبْحَثُ فِي الْأَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ يُورِثُ سَوْءَةَ أَخِيهِ وَقَالَ يُورِثُنِي أَعَزُّتُ أَنْ أَكُونَ مِثْلَ هَذَا الْغُرَابِ فَأَوَارَى سَوْءَةَ أَخِي فَأَصْبَحَ مِنَ الْمَدْمُونِ ﴿٣١﴾

مِنْ أَجْلِ ذَلِكَ كَتَبْنَا عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنَاتِ لَنْفَرَانَ كَثِيرًا مِنْهُمْ بَعْدَ

(۱) چنانچہ حدیث میں آتا ہے «لَا تُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْمًا إِلَّا كَانَ عَلَى ابْنِ آدَمَ الْأَوَّلِ كِفْلٌ مِنْ ذِمَّتِهَا؛ لِأَنَّهُ كَانَ أَوَّلَ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ» (صحیح بخاری، کتاب الأنبياء، و مسلم، کتاب القسامۃ) ”جو قتل بھی ظلماً ہوتا ہے، (قاتل کے ساتھ) اس کے خون ناحق کا بوجہ آدم کے اس پہلے بیٹے پر بھی ہوتا ہے کیونکہ یہ پہلا شخص ہے جس نے قتل کا کام کیا“ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ”ظاہر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ قاتیل کو ہاتیل کے قتل ناحق کی سزا دنیا میں ہی فوری طور پر دے دی گئی تھی۔“ حدیث میں آتا ہے نبی ﷺ نے فرمایا « مَا مِنْ ذَنْبٍ أَجْدَرُ أَنْ يُعَجِّلَ اللَّهُ عُقُوبَتَهُ فِي الدُّنْيَا مَعَ مَا يَذْخِرُ لِصَاحِبِهِ فِي الْآخِرَةِ مِنْ الْبَغْيِ وَقَطِيعَةِ الرَّحِمِ » (أبو داؤد، کتاب الأدب۔ ابن ماجہ، کتاب الزہد و مسند أحمد ۵/۳۶-۳۸) ”بغی (ظلم و زیادتی) اور قطع رحمی یہ دونوں گناہ اس بات کے زیادہ لائق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے مرتکبین کو دنیا میں ہی جلد سزا دے دے، تاہم آخرت کی سزا اس کے علاوہ اس کے لیے ذخیرہ ہوگی جو انہیں وہاں بھگتنی ہوگی“ اور قاتیل میں یہ دونوں گناہ جمع ہو گئے تھے۔“ فَإِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (ابن کثیر)

(۲) اس قتل ناحق کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کی قدر و قیمت کو واضح کرنے کے لیے بنو اسرائیل پر یہ حکم نازل فرمایا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ کے ہاں انسانی خون کی کتنی اہمیت اور تکریم ہے اور یہ اصول صرف بنی اسرائیل ہی کے لیے نہیں تھا، اسلام کی تعلیمات کے مطابق بھی یہ اصول ہمیشہ کے لیے ہے۔ سلیمان بن ربیع کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حسن (بھری) سے پوچھا یہ آیت ہمارے لیے بھی ہے جس طرح بنو اسرائیل کے لیے تھی، انہوں نے فرمایا ”ہاں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بنو اسرائیل کے خون اللہ کے ہاں ہمارے خونوں سے زیادہ قابل احترام نہیں تھے“ (تفسیر ابن کثیر)

ذَلِكَ فِي الْأَرْضِ لَمْ يَفُوتَنَّ ۝

ہمارے ہمت سے رسول ظاہر دلیلیں لے کر آئے لیکن پھر اس کے بعد بھی ان میں کے اکثر لوگ زمین میں ظلم و زیادتی اور زبردستی کرنے والے ہی رہے۔ (۳۲)

جو اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے لڑیں اور زمین میں فساد کرتے پھریں ان کی سزا یہی ہے کہ وہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی چڑھا دیئے جائیں یا مخالف جانب سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں، یا انہیں جلا وطن کر دیا جائے،^(۱) یہ تو ہوئی ان کی دنیوی ذلت اور خواری، اور آخرت میں ان کے لئے بڑا بھاری عذاب ہے۔ (۳۳)

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا ۚ وَأَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

(۱) اس میں یہود کو زجر و توبیح ہے کہ ان کے پاس انبیاء دلائل و براہین لے کر آتے رہے۔ لیکن ان کا رویہ ہمیشہ حد سے تجاوز کرنے والا ہی رہا۔ اس میں گویا نبی ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ یہ آپ کو قتل کرنے اور نقصان پہنچانے کی جو سازشیں کرتے رہتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ان کی ساری تاریخ ہی مکرو و فساد سے بھری ہوئی ہے۔ آپ بہر حال اللہ پر بھروسہ رکھیں جو خیر الما کرین ہے۔ تمام سازشوں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

(۲) اس کی شان نزول کی بابت آتا ہے کہ عکل اور عربینہ قبیلے کے کچھ لوگ مسلمان ہو کر مدینہ آئے، انہیں مدینہ کی آب و ہوا اس نہ آئی تو نبی ﷺ نے انہیں مدینہ سے باہر، جہاں صدقے کے اونٹ تھے، بھیج دیا کہ ان کا دودھ اور پیشاب پیو، اللہ تعالیٰ شفا عطا فرمائے گا۔ چنانچہ چند روز میں وہ ٹھیک ہو گئے لیکن اس کے بعد انہوں نے اونٹوں کے رکھوالے اور چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹ ہنکا کر لے گئے۔ جب نبی ﷺ کو اس امر کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے ان کے پیچھے آدمی دوڑائے جو انہیں اونٹوں سمیت پکڑ لائے۔ نبی ﷺ نے ان کے ہاتھ پیر مخالف جانب سے کاٹ ڈالے ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروائیں، (کیونکہ انہوں نے بھی چرواہے کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا) پھر انہیں دھوپ میں ڈال دیا گیا حتیٰ کہ وہیں مر گئے۔ صحیح بخاری میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ انہوں نے چوری بھی کی، قتل بھی کیا، ایمان لانے کے بعد کفر بھی کیا اور اللہ و رسول کے ساتھ محاربہ بھی (صحیح بخاری کتاب الدیات، والطب والتفسیر۔ صحیح مسلم کتاب القسامۃ) یہ آیت محاربہ کہلاتی ہے۔ اس کا حکم عام ہے یعنی مسلمانوں اور کافروں دونوں کو شامل ہے۔ محاربہ کا مطلب ہے۔ کسی منظم اور مسلح جتھے کا اسلامی حکومت کے دائرے میں یا اس کے قریب صحرا وغیرہ میں راہ چلتے قاتلوں اور افراد اور گروہوں پر حملے کرنا، قتل و غارت گری کرنا، سلب و نهب، اغوا اور آبروریزی کرنا وغیرہ اس کی جو سزا میں بیان کی گئی ہیں، امام (خلیفہ وقت) کو اختیار ہے کہ ان میں سے جو سزا مناسب سمجھے، دے۔ بعض لوگ کہتے ہیں اگر محاربین نے قتل و سلب کیا اور دہشت گردی کی تو انہیں قتل اور سولی کی سزا دی جائے گی اور جس نے صرف قتل کیا،

ہاں جو لوگ اس سے پہلے توبہ کر لیں کہ تم ان پر قابو پا لو^(۱) تو یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ بہت بڑی بخشش اور رحم و کرم والا ہے۔ (۳۳)

مسلمانو! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور اس کا قرب تلاش کرو^(۲) اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تمہارا بھلا ہو۔ (۳۵)

یقین مانو کہ کافروں کے لئے اگر وہ سب کچھ ہو جو ساری

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْدُرُوا عَلَيْهِمْ
فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَفُوٌّ رَحِيمٌ ﴿۳۳﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَاسْتَعُوا إِلَيْهِ
الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ
تُقْلِحُونَ ﴿۳۵﴾

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَأَوْاتٍ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ

مال نہیں لیا، اسے قتل کیا جائے گا اور جس نے قتل کیا اور مال بھی چھینا، اس کا ایک دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں یا بایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں کٹ دیا جائے گا۔ اور جس نے نہ قتل کیا نہ مال لیا، صرف دہشت گردی کی اسے جلاوطن کر دیا جائے گا۔ لیکن امام شوکانی فرماتے ہیں پہلی بات صحیح ہے کہ سزا دینے میں امام کو اختیار حاصل ہے۔ (فتح القدیر)

(۱) یعنی گرفتار ہونے سے پہلے اگر وہ توبہ کر کے اسلامی حکومت کی اطاعت کا اعلان کر دیں تو پھر انہیں معاف کر دیا جائے گا، مذکورہ سزائیں نہیں دی جائیں گی۔ لیکن پھر اس امر میں اختلاف ہے کہ سزاؤں کی معافی کے ساتھ انہوں نے قتل کر کے یا مال لوٹ کر یا آبروریزی کر کے بندوں پر جو دست درازی کی یہ جرائم بھی معاف ہو جائیں گے یا ان کا بدلہ لیا جائے گا، بعض علما کے نزدیک یہ معاف نہیں ہوں گے بلکہ ان کا قصاص لیا جائے گا۔ امام شوکانی اور امام ابن کثیر کا رجحان اس طرف ہے کہ مطلقاً انہیں معاف کر دیا جائے گا اور اسی کو ظاہر آیت کا متقاضی بتلایا ہے۔ البتہ گرفتاری کے بعد توبہ سے جرائم معاف نہیں ہوں گے۔ وہ مستحق سزا ہوں گے۔ (فتح القدیر و ابن کثیر)

(۲) وسیلہ کے معنی ایسی چیز کے ہیں جو کسی مقصود کے حصول یا اس کے قرب کا ذریعہ ہو۔ ”اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ تلاش کرو“ کا مطلب ہو گا ایسے اعمال اختیار کرو جس سے تمہیں اللہ کی رضا اور اس کا قرب حاصل ہو جائے۔ امام شوکانی فرماتے ہیں ((إِنَّ الْوَسِيلَةَ - الَّتِي هِيَ الْقُرْبَةُ - تَصْدُقُ عَلَى التَّقْوَى وَعَلَى غَيْرِهَا مِنْ خِصَالِ الْحَيْرِ، الَّتِي يَنْقَرِبُ الْعِبَادُ بِهَا إِلَى رَبِّهِمْ)) ”وسیلہ جو قربت کے معنی میں ہے، تقویٰ اور دیگر خصال خیرہ صادق آتا ہے جن کے ذریعے سے بندے اپنے رب کا قرب حاصل کرتے ہیں“ اسی طرح منہیات و محرمات کے اجتناب سے بھی اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے منہیات و محرمات کا ترک بھی قرب الہی کا وسیلہ ہے۔ لیکن جاہلون نے اس حقیقی وسیلے کو چھوڑ کر قبروں میں مدفون لوگوں کو اپنا وسیلہ سمجھ لیا ہے جس کی شریعت میں کوئی بنیاد نہیں ہے۔ البتہ حدیث میں اس مقام محمود کو بھی وسیلہ کہا گیا ہے جو جنت میں نبی ﷺ کو عطا فرمایا جائے گا۔ اسی لئے آپ نے فرمایا جو اذان کے بعد میرے لئے یہ دعائے وسیلہ کرے گا وہ میری شفاعت کا مستحق ہو گا (صحیح بخاری۔ کتاب الأذان، صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، دعائے وسیلہ جو اذان کے بعد پڑھنی مسنون ہے «اللَّهُمَّ اِرْبِّ هَذِهِ الدَّعْوَةِ الثَّاقَةِ، وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ؛ اَتِ مُحَمَّدًا الْوَسِيلَةَ وَالْفَضِيلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَحْمُودًا الَّذِي وَعَدْتَهُ»۔

زمین میں ہے بلکہ اسی کے مثل اور بھی ہو اور وہ اس سب کو قیامت کے دن کے عذاب کے بدلے فدیے میں دینا چاہیں تو بھی ناممکن ہے کہ ان کا فدیہ قبول کر لیا جائے، ان کے لئے تو دردناک عذاب ہی ہے۔ (۳۶) (۱)

یہ چاہیں گے کہ دوزخ میں سے نکل جائیں لیکن یہ ہرگز اس میں سے نہ نکل سکیں گے، ان کے لئے تو دوامی عذاب ہیں۔ (۳۷) (۲)

چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹ دیا کرو۔ (۳) یہ بدلہ ہے اس کا جو انہوں نے کیا، عذاب اللہ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ قوت و حکمت والا ہے۔ (۳۸)

جو شخص اپنے گناہ کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح کر لے تو اللہ تعالیٰ رحمت کے ساتھ اس کی طرف لوٹتا ہے (۳)

جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ
الْقِيَامَةِ مَا تُقْبَلُ مِنْهُمْ وَأَلْهَمَ عَذَابَ الْيَوْمِ ۝

يُرِيدُونَ أَنْ يُخْرِجُوهُمْ مِنَ النَّارِ وَمَا لَهُمْ بِخُرُوجِ
مِنْهَا وَأَلْهَمَ عَذَابَ مُقِيمٍ ۝

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا
نَكَالًا مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ
عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

(۱) حدیث میں آتا ہے کہ ایک جنسی کو جنم سے نکال کر اللہ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا ”تو نے اپنی آرام گاہ کیسی پائی؟“ وہ کہے گا ”بدترین آرام گاہ“ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ”کیا تو زمین بھر سونا فدیہ دے کر اس سے چھٹکارا حاصل کرنا پسند کرے گا؟“ وہ اثبات میں جواب دے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے تو دنیا میں اس سے بھی بہت کم کا تجھ سے مطالبہ کیا تھا تو نے وہاں اس کی پروا نہیں کی اور اسے دوبارہ جنم میں ڈال دیا جائے گا (صحیح مسلم، صفة القيامة، صحیح بخاری، کتاب الرقاق والانبیاء)

(۲) یہ آیت کافروں کے حق میں ہے، کیونکہ مومنوں کو بالآخر سزا کے بعد جنم سے نکال لیا جائے گا جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔

(۳) بعض فقہا ظاہری کے نزدیک سرقہ کا یہ حکم عام ہے چوری تھوڑی سی چیز کی ہو یا زیادہ کی۔ اسی طرح وہ حرز (محفوظ جگہ) میں رکھی ہو یا غیر حرز میں۔ ہر صورت میں چوری کی سزا دی جائے گی۔ جب کہ دوسرے فقہا اس کے لیے حرز اور نصاب کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ پھر نصاب کی تعیین میں ان کے مابین اختلاف ہے۔ محدثین کے نزدیک نصاب ربع دینار یا تین درہم (یا ان کے مساوی قیمت کی چیز) ہے، اس سے کم چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی طرح ہاتھ رسخ (پہنچوں) سے کاٹے جائیں گے۔ کنسی یا کندھے سے نہیں۔ جیسا کہ بعض کا خیال ہے۔ (تفسیرات کے لیے کتب حدیث و فقہ اور تفسیر کا مطالعہ کیا جائے)

(۴) اس توبہ سے مراد عند اللہ قبول توبہ ہے۔ یہ نہیں کہ توبہ سے چوری یا کسی اور قابل حد جرم کی سزا معاف ہو جائے گی۔ حدود، توبہ سے معاف نہیں ہوں گی۔

یقیناً اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا مہربانی کرنے والا ہے۔ (۳۹)

کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے زمین و آسمان کی بادشاہت ہے؟ جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۴۰)

اے رسول! آپ ان لوگوں کے پیچھے نہ کڑھیے جو کفر میں سبقت کر رہے ہیں خواہ وہ ان (منافقوں) میں سے ہوں جو زبانی تو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن حقیقتاً ان کے دل بالیمان نہیں^(۱) اور یہودیوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو غلط باتیں سننے کے عادی ہیں اور ان لوگوں کے جاسوس ہیں جو اب تک آپ کے پاس نہیں آئے، وہ کلمات کے اصلی موقعہ کو چھوڑ کر انہیں متغیر کر دیا کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ اگر تم یہی حکم دیئے جاؤ تو قبول کر لینا اور اگر یہ حکم نہ دیئے جاؤ تو الگ تھلگ^(۲) رہنا اور جس کا خراب کرنا اللہ کو منظور ہو تو آپ اس کے لیے خدائی ہدایت میں سے کسی چیز کے مختار نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارادہ ان کے دلوں کو پاک کرنے کا نہیں، ان کے لیے دنیا میں بھی بڑی ذلت اور رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے بڑی سخت سزا ہے۔ (۴۱)

أَلَمْ تَعْلَمَ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يُعَذِّبُ
مَنْ يَشَاءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٩﴾

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزَنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ
مِنَ الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِأَنْبِيَائِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ
وَمِنَ الَّذِينَ هَادُوا فَاسْتَمْعُنْ لِلْكَذِبِ فَسَمِعُونَ
لِقَوْمٍ آخَرِينَ لَمْ يَأْتُواكَ بِبَيِّنَاتٍ مِنَ الْكَلِمِ مِنْ بَعْدِ
مَوَاضِعِهِ يُقُولُونَ إِنْ أُوْتِينَا هَذَا فَخَدُّوهٗ وَإِنْ
كَمْ تَوْتُوهُ فَاحْذَرُوهُ وَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَنْ
تَمْلِكَ لَهُ مِنْ اللَّهِ شَيْئًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ
اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرْ قُلُوبَهُمْ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ
وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٤٠﴾

(۱) نبی کریم ﷺ کو اہل کفر و شرک کے ایمان نہ لانے اور ہدایت کا راستہ نہ اپنانے پر جو قلق اور افسوس ہوتا تھا، اس پر اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو زیادہ غم نہ کرنے کی ہدایت فرما رہا ہے تاکہ اس اعتبار سے آپ کو تسلی رہے کہ ایسے لوگوں کی بابت عند اللہ مجھ سے باز پرس نہیں ہوگی۔

(۲) آیت نمبر ۴۱ تا ۴۴ کی شان نزول میں دو واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ ایک تو دو شادی شدہ یہودی زانیوں (مرد و عورت) کا۔ انہوں نے اپنی کتاب تورات میں تو رد و بدل کر ڈالا تھا، علاوہ ازیں اس کی کئی باتوں پر عمل بھی نہیں کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک حکم رجم بھی تھا جو ان کی کتاب میں شادی شدہ زانیوں کے لئے تھا اور اب بھی موجود ہے لیکن وہ چونکہ اس سزا سے بچنا چاہتے تھے اس لئے آپس میں فیصلہ کیا کہ محمد ﷺ کے پاس چلتے ہیں اگر انہوں نے ہمارے ایجاد کردہ طریقہ کے مطابق کوڑے مارنے اور منہ کالا کرنے کی سزا کا فیصلہ کیا تو مان لیں گے اور اگر رجم کا فیصلہ دیا تو نہیں

یہ کان لگا لگا کر جھوٹ کے سننے والے^(۱) اور جی بھر بھر کر حرام کے کھانے والے ہیں، اگر یہ تمہارے پاس آئیں تو تمہیں اختیار ہے خواہ ان کے آپس کا فیصلہ کرو خواہ ان کو ٹال دو، اگر تم ان سے منہ بھی پھیرو گے تو بھی یہ تم کو ہرگز کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے، اور اگر تم فیصلہ کرو تو ان میں عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو، یقیناً عدل والوں کے ساتھ اللہ محبت رکھتا ہے۔ (۴۲)

(تعجب کی بات ہے کہ) وہ کیسے اپنے پاس تورات ہوتے ہوئے جس میں احکام الہی ہیں تم کو منصف بناتے ہیں پھر اس کے بعد بھی پھر جاتے ہیں، دراصل یہ ایمان و یقین والے ہیں ہی نہیں۔ (۴۳)

سَمْعُونَ لَكِنِّي أَكْثَرُونَ لِلشُّحْتِ فَإِنْ جَاءُوكَ فَاحْكُم بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرُضْ عَنْهُمْ وَإِنْ تُعْرَضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَضُرُّوكَ شَيْئًا وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿٤٢﴾

وَكَيْفَ يُحْكُمُ لَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ تَكُونُونَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَمَا أُولَئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٣﴾

مائیں گے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہودی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تورات میں رجم کی بابت کیا ہے؟ انہوں نے کہا تورات میں زنا کی سزا کوڑے مارنا اور رسوا کرنا ہے۔ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو، تورات میں رجم کا حکم موجود ہے، جاؤ تورات لاؤ، تورات لا کر وہ پڑھنے لگے تو آیت رجم پر ہاتھ رکھ کر آگے پیچھے کی آیات پڑھ دیں۔ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا ہاتھ اٹھاؤ، ہاتھ اٹھایا تو وہاں آیت رجم تھی۔ بالآخر انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ محمد ﷺ سچ کہتے ہیں، تورات میں آیت رجم موجود ہے۔ چنانچہ دونوں زانیوں کو سنگسار کر دیا گیا۔ (ملاحظہ ہو صحیحین و دیگر کتب حدیث) ایک دو سرا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ یہود کا ایک قبیلہ اپنے آپ کو دوسرے یہودی قبیلے سے زیادہ معزز اور محترم سمجھتا تھا اور اسی کے مطابق اپنے مقتول کی دیت سو و سق اور دوسرے قبیلے کے مقتول کی پچاس و سق مقرر کر رکھی تھی۔ جب نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے، تو یہود کے دوسرے قبیلے کو کچھ حوصلہ ہوا جس کے مقتول کی دیت نصف تھی اور اس نے دیت سو و سق دینے سے انکار کر دیا۔ قریب تھا کہ ان کے درمیان اس مسئلے پر لڑائی چھڑ جاتی، لیکن ان کے سمجھدار لوگ نبی ﷺ سے فیصلہ کرانے پر رضامند ہو گئے اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں جن میں سے ایک آیت میں قصاص میں برابری کا حکم دیا گیا ہے۔ (یہ روایت مسند احمد میں ہے جس کی سند کو شیخ احمد شاکر نے صحیح کہا ہے۔ مسند احمد جلد ۱، ص ۲۳۶۔ حدیث نمبر ۲۲۱۲) امام ابن کثیر فرماتے ہیں ممکن ہے دونوں سبب ایک ہی وقت میں جمع ہو گئے ہوں اور ان سب کے لیے ان آیات کا نزول ہوا ہو (ابن کثیر)

(۱) سَمَاعُونَ کے معنی ”بہت زیادہ سننے والے“ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں، جاسوسی کرنے کے لیے زیادہ باتیں سننا یا دوسروں کی باتیں ماننے اور قبول کرنے کے لیے سننا۔ بعض مفسرین نے پہلے معنی مراد لیے ہیں اور بعض نے دوسرے۔

ہم نے تورات نازل فرمائی ہے جس میں ہدایت و نور ہے، یہودیوں میں (۱) اسی تورات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ماننے والے انبیاء (علیہم السلام) (۲) اور اہل اللہ اور علمائے فیصلے کرتے تھے کیونکہ انہیں اللہ کی اس کتاب کی حفاظت کا حکم دیا گیا تھا۔ (۳) اور وہ اس پر اقراری گواہ تھے (۴) اب تمہیں چاہیے کہ لوگوں سے نہ ڈرو اور صرف میرا ڈر رکھو، میری آیتوں کو تھوڑے تھوڑے مول پر نہ بیچو، (۵) جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی وحی کے ساتھ فیصلے نہ کریں وہ (پورے اور پختہ) کافر ہیں۔ (۶) (۴۴)

اور ہم نے یہودیوں کے ذمہ تورات میں یہ بات مقرر کر دی تھی کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور خاص زخموں کا بھی

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا بِالَّذِينَ هَذَا وَآرَ الرَّبِّ يُشْجُونَ وَالْحَبَّارِ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ فَلَا تَعْتَمِدُوا النَّاسَ وَالْخَشْيَةَ وَلَا تَتَّبِعُوا بِآيَاتِي تَمَتًّا قَلِيلًا وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِهَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ ﴿٤٤﴾

وَكُنْتُمْ عَلَيهِمْ فِيهَا أَنْ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ

(۱) ﴿يَلْذِينَ هَذَا﴾ اس کا تعلق بِحُكْمٍ سے ہے۔ یعنی یہودیوں سے متعلق فیصلے کرتے تھے۔

(۲) أَنْسَلَمُوا یہ نَبِيِّنَ کی صفت بیان کی کہ وہ سارے انبیاء دین اسلام ہی کے پیرو کار تھے جس کی طرف محمد ﷺ دعوت دے رہے ہیں۔ یعنی تمام پیغمبروں کا دین ایک ہی رہا ہے۔ اسلام جس کی بنیادی دعوت یہ تھی کہ ایک اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ ہر نبی نے سب سے پہلے اپنی قوم کو یہی دعوت توحید و اخلاص پیش کی ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنْهُ لَذَالِمَةَ الْإِنْسَانِ فَاعْبُدُونِ﴾ (الأنبياء ۲۵) ہم نے آپ سے پہلے جتنے رسول بھیجے، سب کو یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، پس تم سب میری ہی عبادت کرو۔“ اسی کو قرآن میں الدین بھی کہا گیا ہے۔ جیسا کہ سورہ شوریٰ کی آیت ۱۳ ﴿ثُمَّ لَكَ مِنَ الَّذِينَ مَا وَطَّئُوا بِهِ نُؤُحًا﴾ الآية میں کہا گیا ہے، جس میں اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے کہ آپ کے لیے ہم نے وہی دین مقرر کیا ہے جو آپ سے قبل دیگر انبیاء کے لیے کیا تھا۔

(۳) چنانچہ انہوں نے تورات میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا، جس طرح بعد میں لوگوں نے کیا۔

(۴) کہ یہ کتاب کی پیشی سے محفوظ ہے اور اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔

(۵) یعنی لوگوں سے ڈر کر تورات کے اصل احکام پر پردہ مت ڈالو نہ دنیا کے تھوڑے سے مفادات کے لیے ان میں رد و بدل کرو۔

(۶) پھر تم کیسے ایمان کے بدلے کفر پر راضی ہو گئے ہو؟

بدلہ ہے،^(۱) پھر جو شخص اس کو معاف کر دے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے، اور جو لوگ اللہ کے نازل کئے ہوئے کے مطابق حکم نہ کریں، وہی لوگ ظالم ہیں۔^(۲) (۳۵)

اور ہم نے ان کے پیچھے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا جو اپنے سے پہلے کی کتاب یعنی تورات کی تصدیق کرنے والے تھے^(۳) اور ہم نے انہیں انجیل عطا فرمائی جس میں نور اور ہدایت تھی اور وہ اپنے سے پہلے کی کتاب تورات کی

كَفَّارَةً لِّهِمْ وَ مَن لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۳۵﴾

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ مِّمَّا مَّصَّبْنَا عَلَيْهِ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَهُدًى وَ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۳۵﴾

(۱) جب تورات میں جان کے بدلے جان اور زخموں میں قصاص کا حکم دیا گیا تھا تو پھر یہودیوں کے ایک قبیلے (بنو نضیر) کا دوسرے قبیلے (بنو قریظہ) کے ساتھ اس کے برعکس معاملہ کرنا اور اپنے مقتول کی دیت دوسرے قبیلے کے مقتول کی بہ نسبت دوگنا رکھنے کا کیا جو از ہے؟ جیسا کہ اس کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزری۔

(۲) یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جس قبیلے نے مذکورہ فیصلہ کیا تھا، یہ اللہ کے نازل کردہ حکم کے خلاف تھا اور اس طرح انہوں نے ظلم کا ارتکاب کیا۔ گویا انسان اس بات کا مکلف ہے کہ وہ احکامات الہی کو اپنائے، اسی کے مطابق فیصلے کرے اور زندگی کے تمام معاملات میں اس سے رہنمائی حاصل کرے، اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو بارگاہ الہی میں ظالم متصور ہو گا، فاسق متصور ہو گا اور کافر متصور ہو گا۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے تینوں لفظ استعمال کر کے اپنے غضب اور ناراضگی کا بھرپور اظہار فرمادیا۔ اس کے بعد بھی انسان اپنے ہی خود ساختہ قوانین یا اپنی خواہشات ہی کو اہمیت دے تو اس سے زیادہ بد قسمتی کیا ہوگی؟

ملحوظہ: علمائے اصولیین نے لکھا ہے کہ پچھلی شریعت کا حکم، اگر اللہ نے برقرار رکھا ہے تو ہمارے لیے بھی اس پر عمل کرنا ضروری ہے اور اس آیت میں بیان کردہ حکم غیر منسوخ ہے اس لیے یہ بھی شریعت اسلامیہ ہی کے احکام ہیں جیسا کہ احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اسی طرح احادیث سے ﴿النَّفْسُ بِالنَّفْسِ﴾ (جان، بدلے جان کے) کے عموم سے دو صورتیں خارج ہوں گی۔ کہ کوئی مسلمان اگر کسی کافر کو قتل کر دے تو قصاص میں اس کافر کے بدلے مسلمان کو، اسی طرح غلام کے بدلے آزاد کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، فتح الباری ونیل الأوطار وغیرہ)

(۳) یعنی انبیائے سابقین کے فوراً بعد، متصل ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا جو اپنے سے پہلے نازل شدہ کتاب تورات کی تصدیق کرنے والے تھے، اس کی تکذیب کرنے والے نہیں، جو اس بات کی دلیل تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے سچے رسول ہیں اور اسی اللہ کے فرستادہ ہیں جس نے تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی، تو اس کے باوجود بھی یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی بلکہ ان کی تکفیر اور تنقیص و اہانت کی۔

تصدیق کرتی تھی اور وہ سرا سر ہدایت و نصیحت تھی پارسا لوگوں کے لئے۔^(۱) (۳۶)

اور انجیل والوں کو بھی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ انجیل میں نازل فرمایا ہے اسی کے مطابق حکم کریں^(۲) اور جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ سے ہی حکم نہ کریں وہ (بدکار) فاسق ہیں۔ (۳۷)

اور ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ یہ کتاب نازل فرمائی ہے جو اپنے سے اگلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور ان کی محافظ ہے۔^(۳) اس لئے آپ ان کے آپس کے معاملات میں اسی اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کے

وَلِيَعْلَمَ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ﴿۳۷﴾

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّئًا عَلَيْهِ فَاخْرَجَهُم مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَأَنزَلْنَا لَهُمُ الْهٰؤَآءَ هُمُ عٰتِبَآءٌ لِّذٰلِكَ مِنَ الْحَقِّ لِئَلَّا يَجْعَلْنَا

(۱) یعنی جس طرح تورات اپنے وقت میں لوگوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ تھی۔ اسی طرح انجیل کے نزول کے بعد اب یہی حیثیت انجیل کو حاصل ہو گئی اور پھر قرآن کریم کے نزول کے بعد تورات و انجیل اور دیگر صحائف آسمانی پر عمل منسوخ ہو گیا اور ہدایت و نجات کا واحد ذریعہ قرآن کریم رہ گیا اور اسی پر اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابوں کا سلسلہ ختم فرمادیا۔ یہ گویا اسی بات کا اعلان ہے کہ قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کی فلاح و کامیابی اسی قرآن سے وابستہ ہے۔ جو اس سے جڑ گیا، سرخو رہے گا۔ جو کٹ گیا ناکامی و نامرادی اس کا مقدر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ”وحدت ادیان“ کا فلسفہ بکسر غلط ہے، حق ہر دور میں ایک ہی رہا ہے، متعدد نہیں۔ حق کے سوا دوسری چیزیں باطل ہیں۔ تورات اپنے دور کا حق تھی، اس کے بعد انجیل اپنے دور کا حق تھی انجیل کے نزول کے بعد تورات پر عمل کرنا جائز نہیں تھا۔ اور جب قرآن نازل ہو گیا تو انجیل منسوخ ہو گئی، انجیل پر عمل کرنا جائز نہیں رہا اور صرف قرآن ہی واحد نظام عمل اور نجات کے لئے قابل عمل رہ گیا۔ اس پر ایمان لائے بغیر یعنی نبوت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو تسلیم کئے بغیر نجات ممکن نہیں۔ مزید ملاحظہ ہو، سورہ بقرہ آیت ۶۲ کا حاشیہ۔

(۲) اہل انجیل کو یہ حکم اس وقت تک تھا، جب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا زمانہ تھا۔ نبی ﷺ کی بعثت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور نبوت بھی ختم ہو گیا۔ اور انجیل کی پیروی کا حکم بھی۔ اب ایماندار وہی سمجھا جائے گا جو رسالت محمدی پر ایمان لائے گا اور قرآن کریم کی اتباع کرے گا۔

(۳) ہر آسمانی کتاب اپنے سے ماقبل کتاب کی مصدق رہی ہے جس طرح قرآن پچھلی تمام کتابوں کا مصدق ہے اور تصدیق کا مطلب ہے کہ یہ ساری کتابیں فی الواقع اللہ کی نازل کردہ ہیں۔ لیکن قرآن مصدق ہونے کے ساتھ ساتھ مُهَيِّئٌ (محافظ، امین، شاہد اور حاکم) بھی ہے۔ یعنی پچھلی کتابوں میں چونکہ تحریف و تغیر بھی ہوئی ہے اس لئے قرآن کا فیصلہ ناطق ہو گا، جس کو یہ صحیح قرار دے گا وہی صحیح ہے۔ باقی باطل ہے۔

مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَا جَاوِزًا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً
وَّاحِدَةً وَلَكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا
الْحَيَاتِ إِلَى اللَّهِ رُحْمًا حَمِيمًا جَمِيعًا فَيُنَبِّئَكُمْ بِمَا
كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٥﴾

وَإِنْ أَحْكَمَ بَيْنَهُمْ يَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ
وَإِذَا حُكِمَ أَنْ يَفْتَنُوا وَلَا عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ

ساتھ حکم کیجئے،^(۱) اس حق سے ہٹ کر ان کی
خواہشوں کے پیچھے نہ جائیے^(۲) تم میں سے ہر ایک
کے لئے ہم نے ایک دستور اور راہ مقرر کر دی ہے۔^(۳)
اگر منظور موٹی ہو تا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا،
لیکن اس کی چاہت ہے کہ جو تمہیں دیا ہے اس
میں تمہیں آزمائے،^(۴) تم نیکیوں کی طرف جلدی کرو،
تم سب کا رجوع اللہ ہی کی طرف ہے، پھر وہ تمہیں ہر وہ
چیز بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو۔ (۴۸)
آپ ان کے معاملات میں خدا کی نازل کردہ وحی کے
مطابق ہی حکم کیا کیجئے، ان کی خواہشوں کی تابعداری نہ
کیجئے اور ان سے ہوشیار رہیے کہ کہیں یہ آپ کو اللہ

(۱) اس سے پہلے آیت نمبر ۴۲ میں نبی ﷺ کو اختیار دیا گیا تھا کہ آپ ان کے معاملات کے فیصلے کریں یا نہ کریں۔ آپ
کی مرضی ہے۔ لیکن اب اس کی جگہ یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ ان کے آپس کے معاملات میں بھی قرآن کریم کے مطابق
فیصلے فرمائیں۔

(۲) یہ دراصل امت کو تعلیم دی جا رہی ہے کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب سے ہٹ کر لوگوں کی خواہشات اور آرایا ان
کے خود ساختہ مزعومات و افکار کے مطابق فیصلے کرنا گمراہی ہے، جس کی اجازت جب پیغمبر کو نہیں ہے تو کسی اور کو کس
طرح حاصل ہو سکتی ہے؟

(۳) اس سے مراد پچھلی شریعتیں ہیں جن کے بعض فروعی احکامات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ ایک شریعت میں
بعض چیزیں حرام تو دوسری میں حلال تھیں، بعض میں کسی مسئلے میں تشدید تھی تو دوسری میں تخفیف، لیکن دین سب کا
ایک یعنی توحید پر مبنی تھا۔ اس لحاظ سے سب کی دعوت ایک ہی تھی۔ اس مضمون کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا
ہے۔ ((نَحْنُ مَعَاذِرُ الْأَنْبِيَاءِ إِخْوَةٌ لِعَلَات، دِينُنَا وَاحِدٌ)) (صحیح بخاری) ”ہم انبیاء کی جماعت علاقائی بھائی ہیں۔ ہمارا
دین ایک ہے“ علاقائی بھائی وہ ہوتے ہیں جن کی مائیں تو مختلف ہوں باپ ایک ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا دین ایک ہی تھا
اور شریعتیں (دستور اور طریقے) مختلف تھیں۔ لیکن شریعت محمدیہ کے بعد اب ساری شریعتیں بھی منسوخ ہو گئیں ہیں
اور اب دین بھی ایک ہے اور شریعت بھی ایک۔

(۴) یعنی نزول قرآن کے بعد اب نجات تو اگرچہ اسی سے وابستہ ہے لیکن اس راہ نجات کو اختیار کرنے کے لیے اللہ
تعالیٰ نے انسانوں پر جبر نہیں کیا ہے۔ ورنہ وہ چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا، لیکن اس طرح تمہاری آزمائش ممکن نہ ہوتی؛ جب
کہ وہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے۔

کے اتارے ہوئے کسی حکم سے ادھر ادھر نہ کریں، اگر یہ لوگ منہ پھیر لیں تو یقین کریں کہ اللہ کا ارادہ یہی ہے کہ انہیں ان کے بعض گناہوں کی سزا دے ہی ڈالے اور اکثر لوگ نافرمان ہی ہوتے ہیں۔ (۴۹)

کیا یہ لوگ پھر سے جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں (۱) یقین رکھنے والے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ سے بہتر فیصلے اور حکم کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟۔ (۵۰) (۲)

اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ (۳) یہ تو آپس میں ہی ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ (۴) تم میں سے جو بھی ان میں سے کسی سے دوستی کرے وہ بے شک انہی میں سے ہے، ظالموں کو اللہ تعالیٰ ہرگز راہ راست نہیں دکھاتا۔ (۵) (۵۱)

إِنَّكَ فَإِنْ تَوَلَّوْنَا فَآعَلَمُوا أَنَّمَا رِزْقُ اللَّهِ أَزْوَاجُهُمْ
بَعْضُ ذُنُوبِهِمْ وَإِنْ كَثُرَ إِيَّاهُنَّ النَّاسُ
لَفِئُونَ ۝

أَحْكَمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْعُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ
حُكْمًا لَقَوْمٌ يُؤْتُونَ ۝

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ
بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ
إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝

(۱) اب قرآن اور اسلام کے سوا سب جاہلیت ہے، کیا یہ اب بھی روشنی اور ہدایت (اسلام) کو چھوڑ کر جاہلیت ہی کے متلاشی اور طالب ہیں؟ یہ استفہام، انکار اور توبیح کے لیے ہے اور ”فا“ لفظ مقدر پر عطف ہے اور معنی ہیں ﴿ يَنْغَرِضُونَ عَنْ حُكْمِكَ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَيَتَوَلَّوْنَ عَنْهُ، يَتَّبِعُونَ حُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ ﴾ ”تیرے اس فیصلے سے جو اللہ نے تجھ پر نازل کیا ہے یہ اعراض کرتے اور پیٹھ پھیرتے ہیں اور جاہلیت کے طریقوں کے متلاشی ہیں“ (فتح القدیر)

(۲) حدیث میں آتا ہے نبی ﷺ نے فرمایا ((أَبْغَضُ النَّاسِ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ ثَلَاثَةٌ: مُتَّبِعٌ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةَ النَّجَاهِيَّةِ، وَطَالِبٌ دَمِ امْرِئٍ بَعِيْرٍ حَقٌّ لِرَيْفِقٍ دَمَهُ)) (صحیح بخاری۔ کتاب الديات) ”اللہ کو سب سے زیادہ ناپسندیدہ شخص وہ ہے جو اسلام میں جاہلیت کے طریقے کا متلاشی ہو اور جو ناحق کسی کا خون ہمانے کا طالب ہو“

(۳) اس میں یہود و نصاریٰ سے موات و محبت کا رشتہ قائم کرنے سے منع کیا گیا ہے جو اسلام کے اور مسلمانوں کے دشمن ہیں اور اس پر اتنی سخت وعید بیان فرمائی کہ جو ان سے دوستی رکھے گا وہ انہی میں سے سمجھا جائے گا۔ (مزید دیکھئے سورہ آل عمران آیت ۲۸، اور آیت ۱۱۸ کا حاشیہ)

(۴) قرآن کی اس بیان کردہ حقیقت کا مشاہدہ ہر شخص کر سکتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کا اگرچہ آپس میں عقائد کے لحاظ سے شدید اختلاف اور باہمی بغض و عناد ہے، لیکن اس کے باوجود یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک دوسرے کے معاون بازو اور محافظ ہیں۔

(۵) ان آیات کی شان نزول میں بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت انصاری بڑھپڑ اور رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی دونوں ہی عمد جاہلیت سے یہود کے حلیف چلے آ رہے تھے۔ جب بدر میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو عبد اللہ

آپ دیکھیں گے کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے (۱) وہ دوڑ دوڑ کر ان میں گھس رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں خطرہ ہے، ایسا نہ ہو کہ کوئی حادثہ ہم پر پڑ جائے (۲) بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ فتح دے دے۔ (۳) یا اپنے پاس سے کوئی اور چیز لائے (۴) پھر تو یہ اپنے دلوں میں چھپائی ہوئی باتوں پر (بے طرح) نادام ہونے لگیں گے۔ (۵۲)

اور ایمان والے کہیں گے، کیا یہی وہ لوگ ہیں جو بڑے مبالغہ سے اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ان کے اعمال غارت ہوئے اور یہ ناکام ہو گئے۔ (۵۳)

اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے (۵) تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو لائے گا جو اللہ کی محبوب ہوگی اور وہ بھی اللہ سے محبت رکھتی ہوگی (۶)

فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَحْشَىٰ أَنْ تُصِيبَنَا آيَةٌ ۚ قَعَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنَا بِالْقِتْمِ وَأَوْ أَمْرٍ مِنْ عِنْدِهِ ۖ فَيُصِيبُوا عَلٰى مَا سَوَّوْا فِي أَنْفُسِهِمْ نَدِيمِينَ ﴿٥٢﴾

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَهَؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ إِنَّهُمْ لَمَعْلَمٌ حَيْطَتَ أَعْمَالِهِمْ فَأَصْحَابُ خَيْرٍ ﴿٥٣﴾

يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْ يَزِيدَ مِنْكَ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَ أَذِلَّةَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعْرَافًا

بن ابی نے بھی اسلام کا اظہار کیا۔ ادھر بنو قینقاع کے یہودیوں نے تھوڑے ہی دنوں بعد فتنہ برپا کیا اور وہ کس لئے گئے، جس پر حضرت عبادہ بن بشر نے تو اپنے یہودی حلیفوں سے اعلان براءت کر دیا۔ لیکن عبد اللہ بن ابی نے اس کے برعکس یہودیوں کو پچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

(۱) اس سے مراد نفاق ہے۔ یعنی منافقین یہودیوں سے محبت اور دوستی میں جلدی کر رہے ہیں۔

(۲) یعنی مسلمانوں کو شکست ہو جائے اور اس کی وجہ سے ہمیں بھی کچھ نقصان اٹھانا پڑے۔ یہودیوں سے دوستی ہوگی تو ایسے موقع پر ہمارے بڑے کام آئے گی۔

(۳) یعنی مسلمانوں کو۔

(۴) یہود و نصاریٰ پر جزیہ عائد کر دے یہ اشارہ ہے بنو قریظہ کے قتل اور ان کی اولاد کے قیدی بنانے اور بنو نضیر کی جلا وطنی وغیرہ کی طرف، جس کا وقوع مستقبل قریب میں ہی ہوا۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے مطابق فرمایا، جس کا وقوع نبی کریم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد ہوا۔ اس فتنہ ارتداد کے خاتمے کا شرف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما اور ان کے رفقاء کو حاصل ہوا۔

(۶) مرتدین کے مقابلے میں جس قوم کو اللہ تعالیٰ کھڑا کرے گا ان کی ۴ نمایاں صفات بیان کی جا رہی ہیں۔ ۱۔ اللہ سے محبت کرنا اور اس کا محبوب ہونا۔ ۲۔ اہل ایمان کے لیے نرم اور کفار پر سخت ہونا۔ ۳۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ ۴۔ اور

وہ نرم دل ہوں گے مسلمانوں پر اور سخت اور تیز ہوں گے کفار پر، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ بھی نہ کریں گے،^(۱) یہ ہے اللہ تعالیٰ کا فضل جسے چاہے دے، اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور زبردست علم والا ہے۔ (۵۴)

(مسلمانو!) تمہارا دوست خود اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور ایمان والے ہیں^(۲) جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ رکوع (خشوع و خضوع) کرنے والے ہیں۔ (۵۵)

اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے اور مسلمانوں سے دوستی کرے، وہ یقین مانے کہ اللہ تعالیٰ کی جماعت ہی غالب رہے گی۔^(۳) (۵۶)

عَلَى الْكُفْرَانِ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ
لَوْمَةَ آدَمٍ ذَلِكُمْ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ
وَاسِعٌ عَلَيْهِمْ ۝

إِنَّمَا يَلِيكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ
الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رُكُوعُونَ ۝

وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ
اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ ۝

اللہ کے بارے میں کسی کی ملامت سے نہ ڈرنا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان صفات اور خوبیوں کا مظہر تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا و آخرت کی سعادتوں سے مشرف فرمایا اور دنیا میں ہی اپنی رضامندی کی سند سے نواز دیا۔

(۱) یہ ان اہل ایمان کی چوتھی صفت ہے۔ یعنی اللہ کی اطاعت و فرماں برداری میں انہیں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ ہوگی۔ یہ بھی بڑی اہم صفت ہے۔ معاشرے میں جن برائیوں کا چلن عام ہو جائے، ان کے خلاف نیکی پر استقامت اور اللہ کے حکموں کی اطاعت اس صفت کے بغیر ممکن نہیں۔ ورنہ کتنے ہی لوگ ہیں جو برائی، معصیت الہی اور معاشرتی خرابیوں سے اپنا دامن بچانا چاہتے ہیں لیکن ملامت گروں کا مقابلہ کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے۔ نتیجتاً ان برائیوں کی دلدل سے نکل نہیں پاتے اور حق و باطل سے بچنے کی توفیق سے محروم ہی رہتے ہیں۔ اسی لیے آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جن کو مذکورہ صفات حاصل ہو جائیں تو یہ اللہ کا ان پر خاص فضل ہے۔

(۲) جب یہود و نصاریٰ کی دوستی سے منع فرمایا گیا تو اب اس سوال کا جواب دیا جا رہا ہے کہ پھر وہ دوستی کن سے کریں؟ فرمایا کہ اہل ایمان کے دوست سب سے پہلے اللہ اور اس کے رسول ہیں اور پھر ان کے ماننے والے اہل ایمان ہیں۔ آگے ان کی مزید صفات بیان کی جا رہی ہیں۔

(۳) یہ حِزْبُ اللَّهِ (اللہ کی جماعت) کی نشاندہی اور اس کے خلیفے کی نوید سنائی جا رہی ہے۔ حزب اللہ وہی ہے جس کا تعلق صرف اللہ، رسول اور مومنین سے ہو اور کافروں، مشرکوں اور یہود و نصاریٰ سے چاہے وہ ان کے قریبی رشتے دار

مسلمانو! ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جو تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنائے ہوئے ہیں (خواہ) وہ ان میں سے ہوں جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے یا کفار ہوں^(۱) اگر تم مومن ہو تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ (۵۷)

اور جب تم نماز کے لیے پکارتے ہو تو وہ اسے ہنسی کھیل ٹھہرا لیتے ہیں۔^(۲) یہ اس واسطے کہ بے عقل ہیں۔ (۵۸)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ آمَنُوا دِينَكُمْ هُزُؤًا وَلَعِبًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَالْكَافِرَ أَوْلِيَاءَ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ كُفْرَكُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخَذُوا هُزُؤًا وَلَعِبًا ۚ ذَٰلِكُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ۝

ہوں، وہ محبت و مموالات کا تعلق نہ رکھیں۔ جیسا کہ سورہ مجادلہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ ”تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والوں کو ایسا نہیں پاؤ گے کہ وہ ایسے لوگوں سے محبت رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہوں“ چاہے وہ ان کے باپ ہوں، ان کے بیٹے ہوں، ان کے بھائی ہوں یا ان کے خاندان اور قبیلے کے لوگ ہوں“ پھر خوشخبری دی گئی کہ ”یہ وہ لوگ ہیں، جن کے دلوں میں ایمان ہے اور جنہیں اللہ کی مدد حاصل ہے، انہیں ہی اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمائے گا..... اور یہی حزب اللہ ہے، کامیابی جس کا مقدر ہے۔“ (سورہ مجادلہ آخری آیت)

(۱) اہل کتاب سے یہود و نصاریٰ اور کفار سے مشرکین مراد ہیں۔ یہاں پھر یہی تاکید کی گئی ہے کہ دین کو کھیل مذاق بنانے والے چونکہ اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں، اس لیے ان کے ساتھ اہل ایمان کی دوستی نہیں ہونی چاہیے۔

(۲) حدیث میں آتا ہے کہ جب شیطان اذان کی آواز سنتا ہے تو گوزارتا ہوا بھاگ جاتا ہے، جب اذان ختم ہو جاتی ہے تو پھر آ جاتا ہے، تکبیر کے وقت پھر بیٹھ پھیر کر چل دیتا ہے، جب تکبیر ختم ہو جاتی ہے تو پھر آ کر نمازیوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتا ہے۔ الحدیث (صحیح بخاری۔ کتاب الاذان، صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، شیطان ہی کی طرح شیطان کے پیروکاروں کو اذان کی آواز اچھی نہیں لگتی، اس لیے وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث رسول ﷺ بھی قرآن کی طرح دین کا ماخذ اور اسی طرح حجت ہے۔ کیونکہ قرآن نے نماز کے لیے ”مدا“ کا تو ذکر کیا ہے لیکن یہ ”مدا“ کس طرح دی جائے گی؟ اس کے الفاظ کیا ہوں گے؟ یہ قرآن کریم میں کہیں نہیں ہے۔ یہ چیزیں حدیث سے ثابت ہیں، جو اس کی حجیت اور ماخذ دین ہونے پر دلیل ہیں۔ حجیت حدیث کا مطلب: حدیث کے ماخذ دین اور حجت شرعیہ ہونے کا مطلب ہے، کہ جس طرح قرآن کریم کی نص سے ثابت ہونے والے احکام و فرائض پر عمل کرنا ضروری اور ان کا انکار کفر ہے۔ اسی طرح حدیث رسول ﷺ سے ثابت ہونے والے احکام کا ماننا بھی فرض، ان پر عمل کرنا ضروری اور ان کا انکار کفر ہے۔ تاہم حدیث کا صحیح مرفوع اور متصل ہونا ضروری ہے۔ صحیح حدیث چاہے متواتر ہو یا آحاد، قولی ہو، فعلی ہو یا تقریری۔ یہ سب قابل عمل ہیں۔ حدیث کا خبر واحد کی بنیاد پر، یا قرآن سے زائد ہونے کی بنیاد پر یا ائمہ کے قیاس و اجتہادات کی بنیاد پر یا راوی کی عدم فقہت کے دعویٰ کی بنیاد پر یا عقلی

آپ کہہ دیجئے اے یہودیو اور نصرانیو! تم ہم سے صرف اس وجہ سے دشمنیاں کر رہے ہو کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور جو کچھ ہماری جانب نازل کیا گیا ہے اور جو کچھ اس سے پہلے اتارا گیا ہے اس پر ایمان لائے ہیں اور اس لئے بھی کہ تم میں اکثر فاسق ہیں۔ (۵۹)

کہہ دیجئے کہ کیا میں تمہیں بتاؤں؟ کہ اس سے بھی زیادہ برے اجر پانے والا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون ہے؟ وہ جس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی اور اس پر وہ غصہ ہوا اور ان میں سے بعض کو بندر اور سور بنا دیا اور جنہوں نے معبودان باطل کی پرستش کی، یہی لوگ بدتر درجے والے ہیں اور یہی راہ راست سے بہت زیادہ بھٹکنے والے ہیں۔ (۶۰)^(۱)

اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ وہ کفر لئے ہوئے ہی آئے تھے اور اسی کفر کے ساتھ ہی گئے بھی اور یہ جو کچھ چھپا رہے ہیں اسے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ (۶۱)^(۲)

ثُمَّ لِيَأْكُلَ الْكَيْبَ هَلْ تَنْتَهُمُونَ مِنْهَا أَلَا إِنَّ امْتَنَّا
بِاللَّهِ وَمَا نُنزِلُ إِلَيْهَا وَمَا نُخْرِجُ مِنْ قَبْلُ
وَأَنَّ أَكْثَرَكُمْ فَاسِقُونَ ⑤

ثُمَّ هَلْ أَنْتُمْ بِتَرْغِبِينَ ذَلِكَ مُتُوبَةً عِنْدَ اللَّهِ مَنْ لَعَنَهُ
اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمْ الْقِرَادَةَ وَالْمُتَنَادِرِينَ
وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ أُولَئِكَ سَرُّ مَكَاثِدَ أَضَلُّ عَنْ سَوَاءِ
السَّبِيلِ ⑥

وَإِذَا جَاءُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَقَدْ دَخَلُوا بِالْكُفْرِ وَهُمْ
قَدْ خَرَجُوا بِهِ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ ⑦

استحالی کی بنیاد پر یا اسی قسم کے دیگر دعوؤں کی بنیاد پر، رد کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہ سب حدیث سے اعراض کی مختلف صورتیں ہیں۔

(۱) یعنی تم تو (اے اہل کتاب!) ہم سے یوں ہی ناراض ہو جب کہ ہمارا قصور اس کے سوا کوئی نہیں کہ ہم اللہ پر اور قرآن کریم اور اس سے قبل اتاری گئی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ کیا یہ بھی کوئی قصور یا عیب ہے؟ یعنی یہ عیب اور مذمت والی بات نہیں، جیسا کہ تم نے سمجھ لیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ استثنا منقطع ہے۔ البتہ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ بدترین لوگ اور گمراہ ترین لوگ، جو نفرت اور مذمت کے قابل ہیں، کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت اور اس کا غضب ہوا اور جن میں سے بعض کو اللہ نے بندر اور سور بنا دیا اور جنہوں نے طاغوت کی پوجا کی۔ اور اس آئینے میں تم اپنا چہرہ اور کردار دیکھ لو! کہ یہ کن کن تاریخ ہے اور کون لوگ ہیں؟ کیا یہ تم ہی نہیں ہو؟

(۲) یہ منافقین کا ذکر ہے۔ جو نبی ﷺ کی خدمت میں کفر کے ساتھ ہی آتے ہیں اور اسی کفر کے ساتھ واپس چلے جاتے ہیں، آپ ﷺ کی صحبت اور آپ کے وعظ و نصیحت کا کوئی اثر ان پر نہیں ہوتا۔ کیوں کہ دل میں تو کفر چھپا ہوتا

آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے اکثر گناہ کے کاموں کی طرف اور ظلم و زیادتی کی طرف اور مال حرام کھانے کی طرف لپک رہے ہیں، جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ نہایت برے کام ہیں۔ (۶۲)

انہیں ان کے عابد و عالم جھوٹ باتوں کے کہنے اور حرام چیزوں کے کھانے سے کیوں نہیں روکتے، بے شک برا کام ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ (۶۳)^(۱)

اور یہودیوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔^(۲) انہی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور ان کے اس قول کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے اور جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی

وَوَيْ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْأَثْمَارِ وَالْعُدْوَانَ
وَأَكْثَرُهُمُ السُّمْتَ لَا تَمَسُّ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۶۲﴾

لَوْ لَا يَهْتَمُّهُمُ الرَّبُّ لَيَكُونُوا فِي الْأَجْبَارِ عَنْ قَوْلِهِمْ
الْأَثْمَارَ وَأَكْثَرُهُمُ السُّمْتَ لَا تَمَسُّ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۶۳﴾

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُوبَةٌ عَلَيْنَا وَإِن نَحْنُ لَنُؤْتِيهِمَا
قَالُوا بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُغْفِرُ كَيْفَ يَشَاءُ وَيُؤَذِّقُ كَيْفَ يَشَاءُ
مِنَهُمْ مَا نُزِّلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ لَطْفًا نَّأْوُكْفُرًا وَالْقَيْنَاتُ لِيَكِنَّ
الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ كَلِمًا أَوْ قَدْرًا وَأَنَارًا

ہے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری سے مقصد ہدایت کا حصول نہیں، بلکہ دھوکہ اور فریب دینا ہوتا ہے۔ تو پھر ایسی حاضری سے فائدہ بھی کیا ہو سکتا ہے؟

(۱) یہ علماء و مشائخ دین اور عباد و زہاد پر نکیر ہے کہ عوام کی اکثریت تمہارے سامنے فسق و فجور اور حرام خوری کا ارتکاب کرتی ہے لیکن تم انہیں منع نہیں کرتے۔ ایسے حالات میں تمہاری یہ خاموشی بہت بڑا جرم ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کتنی اہمیت اور اس کے ترک پر کتنی سخت وعید ہے۔ جیسا کہ احادیث میں بھی یہ مضمون وضاحت اور کثرت سے بیان کیا گیا ہے۔

(۲) یہ وہی بات ہے جو سورہ آل عمران کی آیت ۱۸۱ میں کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی اور اسے اللہ کو قرض حسن دینے سے تعبیر کیا تو ان یہودیوں نے کہا کہ ”اللہ تعالیٰ تو فقیر ہے“ لوگوں سے قرض مانگ رہا ہے اور وہ تعبیر کے اس حسن کو نہ سمجھ سکے جو اس میں پنہاں تھا۔ یعنی سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے۔ اور اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کر دینا، کوئی قرض نہیں ہے۔ لیکن یہ اس کی کمال مرہانی ہے کہ وہ اس پر بھی خوب اجر عطا فرماتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک ایک دانے کو سات سات سووانے تک بڑھا دیتا ہے۔ اور اسے قرض حسن سے اسی لیے تعبیر فرمایا کہ جتنا تم خرچ کرو گے، اللہ تعالیٰ اس سے کئی گنا تمہیں واپس لوٹائے گا۔ مَغْلُوبَةً کے معنی بَخِيلَةٌ (بخل والے) کیے گئے ہیں۔ یعنی یہود کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اللہ کے ہاتھ واقعتاً بندھے ہوئے ہیں، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ خرچ کرنے سے روکے ہوئے ہیں۔ (ابن کثیر) اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ہاتھ تو انہی کے

لَلْحَرْبِ أَطْفَالًا اللَّهُ وَيَسْعُونَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿۱۰﴾

جانب سے اتارا جاتا ہے وہ ان میں سے اکثر کو تو سرکشی اور کفر میں اور بڑھادیتا ہے اور ہم نے ان میں آپس میں ہی قیامت تک کے لئے عداوت اور بغض ڈال دیا ہے، وہ جب کبھی لڑائی کی آگ کو بھڑکانا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے بھادیتا ہے،^(۱) یہ ملک بھر میں شروفساد چاہتے پھرتے ہیں^(۲) اور اللہ تعالیٰ فسادیوں سے محبت نہیں کرتا۔ (۶۳) اور اگر یہ اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے^(۳) تو ہم ان کی تمام برائیاں معاف فرمادیتے اور ضرور انہیں راحت و آرام کی جنتوں میں لے جاتے۔ (۶۵)

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكُنَّا عَنْهُمْ سَبِيلًا ﴿۱۱﴾
وَلَا دَخَلَهُمْ جَذَبَاتُ الْبَعِيثِ ﴿۱۲﴾

وَلَوْ أَنَّهُمْ آتَمُوا أَوَّلَ الْتَوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ

اور اگر یہ لوگ توراہ و انجیل اور ان کی جانب جو کچھ اللہ

بندھے ہوئے ہیں یعنی بخیلی انہی کا شیوہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوتے ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے۔ خرچ کرتا ہے۔ وہ واسع الفضل اور جزيل العطاء ہے، تمام خزانے اسی کے پاس ہیں۔ نیز اس نے اپنی مخلوقات کے لیے تمام حاجات و ضروریات کا انتظام کیا ہوا ہے، ہمیں رات یا دن کو، سفر میں اور حضر میں اور دیگر تمام احوال میں جن جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے یا پڑ سکتی ہے، سب وہی مہیا کرتا ہے۔ ﴿ وَاللَّهُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ أَعْيُنٌ مِرْآتٍ ﴾ ﴿۱۱﴾ ”تم نے جو کچھ اس سے مانگا، وہ اس نے تمہیں دیا، اللہ کی نعمتیں اتنی ہیں کہ تم گن نہیں سکتے، انسان ہی نادان اور نہایت ناشکر ہے۔“ حدیث میں بھی ہے نبی ﷺ نے فرمایا ”اللہ کا دایاں ہاتھ بھرا ہوا ہے، رات دن خرچ کرتا ہے لیکن کوئی کمی نہیں آتی، ذرا دیکھو تو، جب سے آسمان و زمین اس نے پیدا کیے ہیں وہ خرچ کر رہا ہے لیکن اس کے ہاتھ کے خزانے میں کمی نہیں آئی..... (البخاری، کتاب التوحید، باب وکان عرشہ علی الماء۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی النفقۃ)

(۱) یعنی یہ جب بھی آپ کے خلاف کوئی سازش کرتے یا لڑائی کے اسباب مہیا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو باطل کر دیتا اور ان کی سازش کو انہی پر الٹا دیتا ہے اور ان کو ”چاہ کن راجاہ در پیش“ کی سی صورت حال سے دوچار کر دیتا ہے۔

(۲) ان کی عادت ثانیہ ہے کہ ہمیشہ زمین میں فساد پھیلانے کی مذموم کوششیں کرتے ہیں دراصل حالیکہ اللہ تعالیٰ مفسدین کو پسند نہیں فرماتا۔

(۳) یعنی وہ ایمان، جس کا مطالبہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے، ان میں سب سے اہم محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانا

تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمایا گیا ہے، ان کے پورے پابند رہتے^(۱) تو یہ لوگ اپنے اوپر سے اور نیچے سے روزیاں پاتے اور کھاتے،^(۲) ایک جماعت تو ان میں سے درمیانہ روش کی ہے، باقی ان میں سے بہت سے لوگوں کے برے اعمال ہیں۔^(۳) (۶۶)

اے رسول جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت ادا نہیں کی^(۴) اور آپ کو

رَبِّهِمْ لَا كُفْرًا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ مَحْتِ أَرْجُلِهِمْ مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُقْتَصِدَةٌ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ﴿۶۶﴾

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَةَ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ

ہے، جیسا کہ ان پر نازل شدہ کتابوں میں بھی ان کو اس کا حکم دیا گیا ہے۔ وَانفُوا اور اللہ کی معاصی سے بچتے، جن میں سب سے اہم وہ شرک ہے جس میں وہ مبتلا ہیں اور وہ موجود ہے جو آخری رسول کے ساتھ وہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

(۱) تورات اور انجیل کے پابند رہنے کا مطلب، ان کے ان احکام کی پابندی ہے جو ان میں انہیں دیئے گئے، اور انہی میں ایک حکم آخری نبی پر ایمان لانا بھی تھا۔ اور وَمَا أُنزِلَ سے مراد تمام آسمانی کتب پر ایمان لانا ہے جن میں قرآن کریم بھی شامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اسلام قبول کر لیتے۔

(۲) اوپر نیچے کا ذکر یا تو بطور مبالغہ ہے، یعنی کثرت سے اور انواع و اقسام کے رزق اللہ تعالیٰ میا فرماتا۔ یا اوپر سے مراد آسمان ہے یعنی حسب ضرورت خوب بارشیں برساتا اور ”نیچے“ سے مراد زمین ہے۔ یعنی زمین اس بارش کو اپنے اندر جذب کر کے خوب پیداوار دیتی۔ نتیجتاً شادابی اور خوش حالی کا دور دورہ ہو جاتا۔ جس طرح ایک دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ﴾ (الأعراف - ۹۶) اگر بستیوں والے ایمان

لائے ہوتے اور انہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہوتا تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکات کے (دروازے) کھول دیتے۔“ (۳) لیکن ان کی اکثریت نے ایمان کا یہ راستہ اختیار نہیں کیا اور وہ اپنے کفر پر مصر اور رسالت محمدی سے انکار پر اڑے ہوئے ہیں۔ اسی اصرار اور انکار کو یہاں برے اعمال سے تعبیر کیا گیا ہے۔ درمیانہ روش کی ایک جماعت سے مراد عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جیسے ۱۹۸ افراد ہیں جو یوم مدینہ میں سے مسلمان ہوئے۔

(۴) اس حکم کا مفاد یہ ہے کہ جو کچھ آپ ﷺ پر نازل کیا گیا ہے، بلا کم و کاست اور بلا خوف لومنتہ لا اثم آپ لوگوں تک پہنچادیں، چنانچہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ”جو شخص یہ گمان کرے کہ نبی ﷺ نے کچھ چھپا لیا، اس نے یقیناً جھوٹ کہا۔“ (صحیح بخاری - ۳۸۵۵) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی جب سوال کیا گیا کہ تمہارے پاس قرآن کے علاوہ وحی کے ذریعے سے نازل شدہ کوئی بات ہے؟ تو انہوں نے قسم کھا کر نفی فرمائی اور فرمایا اِلَّا فَهَمَّا يُعْطِيهِ اللَّهُ رَجُلًا (البتہ قرآن کا فہم ہے جسے اللہ تعالیٰ کسی کو بھی عطا فرمادے) (صحیح بخاری - نمبر ۳-۶۹)

لَا يُجِيبُ اللَّهُ الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٥٠﴾

اللہ تعالیٰ لوگوں سے بچالے گا^(۱) بے شک اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (۶۷)

آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! تم دراصل کسی چیز پر نہیں جب تک کہ تورات و انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے قائم نہ کرو، جو کچھ آپ کی جانب آپ کے رب کی طرف سے اترا ہے وہ ان میں سے بہتوں کو شرارت اور انکار میں اور بھی بڑھائے گا ہی،^(۲) تو آپ ان کافروں پر غمگین نہ ہوں۔ (۶۸)

قُلْ يَا قَوْمِ الْكِتَابِ لَسْتُ عَلَىٰ شَيْءٍ مُّبِينٌ حَتَّىٰ تُؤْتِيَهُمُ التَّوْرَةَ
وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَكِنَّ يَدْرَأَكُمُ
مِنْهُمْ مَّا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ طَعْيَانًا كَثِيرًا ۖ فَلَا
تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٥٠﴾

اور حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے صحابہ کے ایک لاکھ یا ایک لاکھ چالیس ہزار کے جم غفیر میں فرمایا ”تم میرے بارے میں کیا کہو گے؟“ انہوں نے کہا (نَنْهَهُدُكَ أَنْ تَبْلُغْتَ، وَأَذَيْتَ، وَنَصَحْتُ) (ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام دیا اور ادا کر دیا اور خیر خواہی فرمادی۔“ آپ ﷺ نے آسمان کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اللَّهُمَّ هَلْ بَلَّغْتَ (تین مرتبہ) یا اللَّهُمَّ فَاشْهَدْ (تین مرتبہ) (صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النسبی صلی اللہ علیہ وسلم) ”یعنی اے اللہ! میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا، تو گواہ رہ، تو گواہ رہ، تو گواہ رہ۔“

(۱) یہ حفاظت اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طریقہ پر بھی فرمائی اور دنیاوی اسباب کے تحت بھی دنیاوی اسباب کے تحت اس آیت کے نزول سے بہت قبل اللہ تعالیٰ نے پہلے آپ کے بچا ابو طالب کے دل میں آپ کی طبعی محبت ڈال دی، اور وہ آپ کی حفاظت کرتے رہے، ان کا کفر پر قائم رہنا بھی شاید انہی اسباب کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اگر وہ مسلمان ہو جاتے تو شاید سرداران قریش کے دل میں ان کی وہ ہیبت و عظمت نہ رہتی جو ان کے ہم مذہب ہونے کی صورت میں آخر وقت تک رہی۔ پھر ان کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ نے بعض سرداران قریش کے ذریعہ پھر انصار مدینہ کے ذریعے سے آپ کا تحفظ فرمایا۔ پھر جب یہ آیت نازل ہو گئی تو آپ نے تحفظ کے ظاہری اسباب (پہرے وغیرہ) اٹھوا دیئے۔ اس کے بعد بارہا سنگین خطرے پیش آئے لیکن اللہ نے حفاظت فرمائی۔ چنانچہ وحی کے ذریعے سے اللہ نے وقتاً فوقتاً یہودیوں کے مکروکید سے مطلع فرما کر خاص خطرے کے مواقع پر بچایا اور گھسان کی جنگوں میں کفار کے انتہائی پرخطر حملوں سے بھی آپ کو محفوظ رکھا۔ ذَلِكَ مِنْ قُدْرَةِ اللَّهِ وَقَدْرُهُ بِمَا شَاءَ، وَلَا يَزِدُّ قُدْرَةَ اللَّهِ وَقَصَاةً أَحَدٌ وَلَا يَغْلِبُهُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ.

(۲) یہ ہدایت اور گمراہی اس اصول کے مطابق ہے جو سنت اللہ رہی ہے۔ یعنی جس طرح بعض اعمال و اشیاء سے اہل ایمان کے ایمان و تصدیق، عمل صالح اور علم نافع میں اضافہ ہوتا ہے، اسی طرح معاصی اور تہمتوں سے کفر و طغیان میں

مسلمان، یہودی، ستارہ پرست اور نصرانی کوئی ہو، جو بھی اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے وہ محض بے خوف رہے گا اور بالکل بے غم ہو جائے گا۔^(۱) (۶۹)

ہم نے بالیقین بنو اسرائیل سے عہد و پیمانہ لیا اور ان کی طرف رسولوں کو بھیجا؛ جب کبھی رسول ان کے پاس وہ احکام لے کر آئے جو ان کی اپنی منشا کے خلاف تھے تو انہوں نے ان کی ایک جماعت کی تکذیب کی اور ایک جماعت کو قتل کر دیا۔ (۷۰)

اور سمجھ بیٹھے کہ کوئی پکڑ نہ ہوگی، پس اندھے بہرے بن بیٹھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی، اس کے بعد بھی ان میں سے اکثر اندھے بہرے ہو گئے۔^(۲) اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو بخوبی دیکھنے والا ہے۔ (۷۱)

بے شک وہ لوگ کافر ہو گئے جن کا قول ہے کہ مسیح ابن

رَأَى الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّيِّئِينَ وَالصَّٰرِي
مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُونَ ①

لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَرَسَلْنَا إِلَيْهِمُ رُسُلًا كَلِمًا
جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا
وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ②

وَصِبْغَ الْوَاحِشِينَ فَأَنبَأَهُمُ اللَّهُ بِصَبْغِهِمْ
فَنُجِّوهُمْ مِنْهُمُ بِرَحْمَتِنَا وَاللَّهُ بِصَابِرِينَ يَعْمَلُونَ ③

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ

زیادتی ہوتی ہے۔ اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد جگہ بیان فرمایا ہے۔ مثلاً ﴿ قُلْ هُوَ الَّذِي أَنْشَأَ
هُدًى وَشِقَاقًا وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي إِذَانِهِمْ وَقُرْءَانِهِمْ وَعَلَيْهِمْ عَمَّا آتَاكَ مِنْ تَحْتِ الْكُرْسِيِّ ۚ ﴿۳۳﴾ ”فرما
دیجئے یہ قرآن ایمان والوں کے لیے ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں
گرانی (سہراپن) ہے اور یہ ان پر اندھا پن ہے۔ گرانی کے سبب ان کو (گویا) دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔“
﴿ وَنَزَّلُ مِنَ الْقُرْآنِ نَافِثَةً وَنَسِفَةً لِلَّذِينَ يَكْفُرُونَ ۚ وَالَّذِينَ يَكْفُرُونَ لِيَكْفُرُوا بِاللَّهِ وَالرَّسُولِ ۚ وَكَرِهَتْ
سِوَاهُ ۚ وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَهُوَ ضَالٌّ ۚ وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۚ ﴿۸۲﴾ ”اور ہم قرآن کے ذریعے
سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور ظالموں کے حق میں تو اس سے نقصان
ہی بڑھتا ہے۔“

(۱) یہ وہی مضمون ہے جو سورہ بقرہ کی آیت ۶۲ میں بیان ہوا ہے، اسے دیکھ لیا جائے۔

(۲) یعنی سمجھے یہ تھے کہ کوئی سزا مرتب نہ ہوگی۔ لیکن مذکورہ اصول الہی کے مطابق یہ سزا مرتب ہوئی کہ یہ حق کے
دیکھنے سے مزید اندھے اور حق کے سننے سے مزید بہرے ہو گئے اور توبہ کے بعد پھر یہی عمل انہوں نے دہرایا ہے تو اس
کی وہی سزا بھی دوبارہ مرتب ہوئی۔

مریم ہی اللہ ہے ^(۱) حالانکہ خود مسیح نے ان سے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل! اللہ ہی کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا سب کا رب ہے، ^(۲) یقین مانو کہ جو شخص اللہ کے ساتھ شریک کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے، اس کا ٹھکانہ جہنم ہی ہے اور گنہگاروں کی مدد کرنے والا کوئی نہیں ہو گا۔ ^(۳) (۷۲)

وہ لوگ بھی قطعاً کافر ہو گئے جنہوں نے کہا، اللہ تین میں کا تیسرا ہے، ^(۴) دراصل سوا اللہ تعالیٰ کے کوئی معبود

الْمَسِيحُ يَدْعِي إِلَى اسْمِ رَبِّكَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ إِنَّهُ
مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَزَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ
وَمَا أُوهُ لِنَارًا وَاللَّظْلِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ۝

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ كَالْثَلَاثَةِ وَوَمَا مِنَ اللّٰهِ اِلٰهٌ اِلَّا وَاحِدٌ وَاِنْ كُنْتُمْ بِهٖمْ لَعٰلَمِيْنَ لَيَسْتَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

(۱) یہی مضمون آیت نمبر ۷۱ میں بھی گزر چکا ہے۔ یہاں اہل کتاب کی گمراہیوں کے ذکر میں اس کا پھر ذکر فرمایا۔ اس میں ان کے اس فرقے کے کفر کا اظہار ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے عین اللہ ہونے کا قائل ہے۔

(۲) چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یعنی مسیح ابن مریم ملیحاً السلام نے عالم شیر خوارگی میں (اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب کہ بچے اس عمر میں قوت گویائی نہیں رکھتے) سب سے پہلے اپنی زبان سے اپنی عبودیت ہی کا اظہار فرمایا، ﴿ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اَسْمٰی الْکَلْبِیْ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴾ (سودہ مریم: ۳۰) ”میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، مجھے اس نے کتاب بھی عطا کی ہے“ حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ نہیں کہا، میں اللہ ہوں یا اللہ کا بیٹا ہوں۔ صرف یہ کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اور عمر کھولتے ہی انہوں نے یہی دعوت دی ﴿ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴾ (آل عمران: ۵۱) یہ وہی الفاظ ہیں جو ماں کی گود میں بھی کہے تھے (ملاحظہ ہو سورہ مریم: ۳۶) اور جب قیامت کے قریب ان کا آسمان سے نزول ہو گا، جس کی خبر صحیح احادیث میں دی گئی ہے اور جس پر اہل سنت کا اجماع ہے، تب بھی وہ نبی ﷺ کی تعلیمات کے مطابق لوگوں کو اللہ کی توحید اور اس کی اطاعت کی طرف ہی بلائیں گے، نہ کہ اپنی عبادت کی طرف۔

(۳) حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی زندگی اور رسالت کا اظہار اللہ کے حکم اور مشیت سے اس وقت بھی فرمایا تھا جب وہ ماں کی گود میں یعنی شیر خوارگی کی حالت میں تھے۔ پھر سن کھولتے ہیں یہ اعلان فرمایا۔ اور ساتھ ہی شرک کی شاعت و قباحت بھی بیان فرمادی کہ مشرک پر جنت حرام ہے اور اس کا کوئی مددگار بھی نہیں ہو گا جو اسے جہنم سے نکال لائے، جیسا کہ مشرکین سمجھتے ہیں۔ (۴) یہ عیسائیوں کے دوسرے فرقے کا ذکر ہے جو تین خداؤں کا قائل ہے، جن کو وہ اَقَانِیْمٌ مَثَلًا کہتے ہیں۔ ان کی تعبیر و تشریح میں اگرچہ خود ان کے مابین اختلاف ہے۔ تاہم صحیح بات یہی ہے کہ اللہ کے ساتھ، انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت مریم ملیحاً السلام کو بھی الہ (معبود) قرار دے لیا ہے، جیسا کہ قرآن نے صراحت کی ہے، اللہ تعالیٰ قیامت والے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھے گا۔ ﴿ اَلَمْ تَقُلْ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْا مِنِّیْ دُیُوْسًا ۚ وَابۡنِیْ الْعَرَبِیْنَ دُیُوْسًا ۚ

نہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے اس قول سے باز نہ رہے تو ان میں سے جو کفر پر رہیں گے، انہیں المناک عذاب ضرور پہنچے گا۔ (۷۳)

یہ لوگ کیوں اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں جھکتے اور کیوں استغفار نہیں کرتے؟ اللہ تعالیٰ تو بہت ہی بخشنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔ (۷۴)

مسح ابن مریم سوا پیغمبر ہونے کے اور کچھ بھی نہیں، اس سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہو چکے ہیں ان کی والدہ ایک راست باز عورت تھیں^(۱) دونوں ماں بیٹے کھانا کھایا کرتے تھے،^(۲) آپ دیکھئے کہ کس طرح ہم ان کے سامنے دلیلیں رکھتے ہیں پھر غور کیجئے کہ کس طرح وہ پھرے جاتے ہیں۔ (۷۵)

آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہارے کسی نقصان کے مالک ہیں نہ کسی نفع کے، اللہ

مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۷۳﴾

أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لَهُ وَاللَّهُ شَفِيفٌ رَحِيمٌ ﴿۷۴﴾

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُنْتَه صِدْقُهُ كَانَ نَابًا كَلِيمًا الْطَّعَامَ أَنْظَرَكُمُف تَبِينَ الْآيَاتِ ثُمَّ أَنْظَرَأَنِي يُؤْفَكُونَ ﴿۷۵﴾

قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۷۶﴾

(المائدة - ۱۱۲) کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا، معبود بنا لینا؟“ اس سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ اور مریم، علیہما السلام ان دونوں کو عیسائوں نے الہ بنایا، اور اللہ تیسرا الہ ہوا، جو ثَلَاثَةٌ (تین) میں کا تیسرا کھلایا، پہلے عقیدے کی طرح اللہ تعالیٰ نے اسے بھی کفر سے تعبیر فرمایا۔

(۱) صِدْقَةُ کے معنی مومنہ اور ولیہ کے ہیں یعنی وہ بھی حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لانے والوں اور ان کی تصدیق کرنے والوں میں سے تھیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نَبِيَّةٌ (پیغمبر) نہیں تھیں۔ جیسا کہ بعض لوگوں کو وہ ہم ہوا ہے اور انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام سمیت، حضرت سارہ (ام اسحاق علیہ السلام) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو نَبِيَّةٌ قرار دیا ہے۔ استدلال اس بات سے کیا ہے کہ اول الذکر دونوں سے فرشتوں نے آکر گفتگو کی اور حضرت ام موسیٰ کو خود اللہ تعالیٰ نے وحی کی۔ یہ گفتگو اور وحی نبوت کی دلیل ہے۔ لیکن جمہور علماء کے نزدیک یہ دلیل ایسی نہیں جو قرآن کی نص صریح کا مقابلہ کر سکے۔ قرآن نے صراحت کی ہے کہ ہم نے جتنے رسول بھی بھیجے وہ مرد تھے۔ (سورۃ یوسف - ۱۰۹)

(۲) یہ حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام دونوں کی الوہیت (اللہ ہونے) کی نفی اور بشریت کی دلیل ہے۔ کیونکہ کھانا پینا، انسانی حوائج و ضروریات میں سے ہے۔ جو الہ ہو، وہ تو ان چیزوں سے ماوراء بلکہ وراہ اور اء ہوتا ہے۔

ہی خوب سننے اور پوری طرح جاننے والا ہے۔^(۱) (۷۶)

کہہ دیجئے اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو اور زیادتی نہ کرو^(۲) اور ان لوگوں کی نفسانی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو پہلے سے ہمک چکے ہیں اور بہتوں کو ہمکا بھی چکے ہیں^(۳) اور سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں۔ (۷۷)

بنی اسرائیل کے کافروں پر (حضرت) داود (علیہ السلام) اور (حضرت) عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کی زبانی لعنت کی گئی^(۴) اس وجہ سے کہ وہ نافرمانیاں کرتے تھے اور حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔^(۵) (۷۸)

آپس میں ایک دوسرے کو برے کاموں سے جو وہ کرتے

ثُمَّ يَا هَلُمَّ الْكَيْبِ لَا تَعْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ
وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ
وَاصْلُوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ ۝
لِئِنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَعَلَّ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ
وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝
كَانُوا إِلَّا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا

(۱) یہ مشرکوں کی کم عقلی کی وضاحت کی جا رہی ہے کہ ایسوں کو انہوں نے معبود بنا رکھا ہے جو کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، بلکہ نفع نقصان پہنچانا تو کجا، وہ تو کسی کی بات سننے اور کسی کا حال جاننے کی ہی قدرت نہیں رکھتے۔ یہ قدرت صرف اللہ ہی کے اندر ہے۔ اس لیے حاجت روا مشکل کشا بھی صرف وہی ہے۔

(۲) یعنی اتباع حق میں حد سے تجاوز نہ کرو اور جن کی تعظیم کا حکم دیا گیا ہے، اس میں مبالغہ کر کے انہیں منصب نبوت سے اٹھا کر مقام الوہیت پر فائز مت کرو، جیسے حضرت مسیح علیہ السلام کے معاملے میں تم نے کیا۔ غلو ہر دور میں شرک اور گمراہی کا سب سے بڑا ذریعہ رہا ہے۔ انسان کو جس سے عقیدت و محبت ہوتی ہے، وہ اس کی شان میں خوب مبالغہ کرتا ہے۔ وہ امام اور دینی قائد ہے تو اس کو پیغمبر کی طرح معصوم سمجھنا اور پیغمبر کو خدائی صفات سے متصف ماننا عام بات ہے، بد قسمتی سے مسلمان بھی اس غلو سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ انہوں نے بعض ائمہ کی شان میں بھی غلو کیا اور ان کی رائے اور قول، حتیٰ کہ ان کی طرف منسوب فتویٰ اور فقہ کو بھی حدیث رسول ﷺ کے مقابلے میں ترجیح دے دی۔

(۳) یعنی اپنے سے پہلے لوگوں کے پیچھے مت لگو، جو ایک نبی کو الہ بنا کر خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ (۴) یعنی زبور میں جو حضرت داود علیہ السلام پر اور انجیل میں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور اب یہی لعنت قرآن کریم کے ذریعے سے ان پر کی جا رہی ہے جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ لعنت کا مطلب اللہ کی رحمت اور خیر سے دوری ہے۔

(۵) یہ لعنت کے اسباب ہیں ۱- عصیان، یعنی واجبات کا ترک اور محرمات کا ارتکاب کر کے۔ انہوں نے اللہ کی نافرمانی کی ۲- اور اغتداء یعنی دین میں غلو اور بدعات ایجاد کر کے انہوں نے حد سے تجاوز کیا۔

تھے روکتے نہ تھے^(۱) جو کچھ بھی یہ کرتے تھے یقیناً وہ بہت برا تھا۔ (۷۹)

ان میں سے بہت سے لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ کافروں سے دوستیاں کرتے ہیں، جو کچھ انہوں نے اپنے لیے آگے بھیج رکھا ہے وہ بہت برا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہو اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔ (۸۰)^(۲)

اگر انہیں اللہ تعالیٰ پر اور نبی پر اور جو نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان ہوتا تو یہ کفار سے دوستیاں نہ کرتے، لیکن ان میں کے اکثر لوگ فاسق ہیں۔ (۸۱)^(۳)

یقیناً آپ ایمان والوں کا سب سے زیادہ دشمن یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے^(۴) اور ایمان والوں سے سب

يَفْعَلُونَ ۝

تَرَى كَثِيرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَلَيْسَ نَارًا مَّتَّ
لَهُمْ أَنفُسُهُمْ أَنْ سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ لَهُمْ
خِلْدَانٌ ۝

وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ مَا
أَنزَلْنَا لَهُمْ الْقُرْآنَ وَلَٰكِن كَذَّبُوا عَنْهُمْ
الْقُرْآنَ ۝

لَتَجِدَنَّ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ عَدَاؤًا لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ
وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا لَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً ۝

(۱) اس پر متزاد یہ کہ وہ ایک دوسرے کو برائی سے روکتے نہیں تھے۔ جو بجائے خود ایک بہت بڑا جرم ہے۔ بعض مفسرین نے اسی ترکِ نبی کو عصیان اور اعتدا قرار دیا ہے جو لعنت کا سبب بنا۔ بہر حال دونوں صورتوں میں برائی کو دیکھتے ہوئے برائی سے نہ روکنا، بہت بڑا جرم اور لعنت و غضبِ الہی کا سبب ہے۔ حدیث میں بھی اس جرم پر بڑی سخت و عیدیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ ایک حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا ”سب سے پہلا نقص جو بنی اسرائیل میں داخل ہوا یہ تھا کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو برائی کرتے ہوئے دیکھتا تو کہتا، اللہ سے ڈرو اور یہ برائی چھوڑ دے، یہ تیرے لیے جائز نہیں۔ لیکن دوسرے روز پھر اسی کے ساتھ اسے کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے میں کوئی عاریا شرم محسوس نہ ہوتی“ (یعنی اس کا ہم نوالہ وہم پیالہ اور ہم نشین بن جاتا) در آن حالیکہ ایمان کا تقاضا اس سے نفرت اور ترک تعلق تھا۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان آپس میں عداوت ڈال دی اور وہ لعنتِ الہی کے مستحق قرار پائے“ پھر فرمایا کہ ”اللہ کی قسم! تم ضرور لوگوں کو نیکی کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکا کرو، ظالم کا ہاتھ پکڑ لیا کرو (ورنہ تمہارا حال بھی یہی ہوگا).....“ الحدیث (ابوداؤد۔ کتاب الملاحم نمبر ۳۳۳) ایک دوسری روایت میں اس فریضے کے ترک پر یہ وعید سنائی گئی ہے کہ تم عذابِ الہی کے مستحق بن جاؤ گے، پھر تم اللہ سے دعائیں بھی مانگو گے تو قبول نہیں ہوں گی۔ (مسند احمد جلد ۵۔ ص ۳۸۸)

(۲) یہ اہل کفر سے دوستانہ تعلق کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر ناراض ہو اور اسی ناراضی کا نتیجہ جہنم کا دائمی عذاب ہے۔

(۳) اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے اندر صحیح معنوں میں ایمان ہوگا، وہ کافروں سے کبھی دوستی نہیں کرے گا۔

(۴) اس لیے کہ یہودیوں کے اندر عناد و وجود، حق سے اعراض و استکبار اور اہل علم و ایمان کی تنقیص کا جذبہ بہت پایا

سے زیادہ دوستی کے قریب آپ یقیناً انہیں پائیں گے جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں، یہ اس لیے کہ ان میں علما اور عبادت کے لیے گوشہ نشین افراد پائے جاتے ہیں اور اس وجہ سے کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔^(۱) (۸۲)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصْرِيْٓ ذٰلِكَ
يٰۤاَنَ مِنْهُمْ قَسِيْبِيْنَ وَرُهْبٰنًا وَاٰنْهَمُ
لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝

جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ نبیوں کا قتل اور ان کی تکذیب ان کا شعار رہا ہے، حتیٰ کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے قتل کی بھی کئی مرتبہ سازش کی، آپ ﷺ پر جادو بھی کیا اور ہر طرح نقصان پہنچانے کی مذموم سعی کی۔ اور اس معاملے میں مشرکین کا حال بھی یہی ہے۔

(۱) ذُہْبَانٌ سے مراد نیک، عبادت گزار اور گوشہ نشین لوگ اور قَسِيْبِيْنَ سے مراد علما و خطبا ہیں، یعنی ان عیسائیوں میں علم و تواضع ہے، اس لیے ان میں یہودیوں کی طرح مجھو و استکبار نہیں ہے۔ علاوہ ازیں دین مسیحی میں نرمی اور عفو و درگزر کی تعلیم کو امتیازی حیثیت حاصل ہے، حتیٰ کہ ان کی کتابوں میں لکھا ہے کہ کوئی تمہارے دائیں رخسار پر مارے تو بائیں رخسار بھی اس کو پیش کر دو۔ یعنی لڑومت۔ ان وجوہ سے یہ مسلمانوں کے، بہ نسبت یہودیوں کے زیادہ قریب ہیں۔ عیسائیوں کا یہ وصف یہودیوں کے مقابلے میں ہے۔ تاہم جہاں تک اسلام دشمنی کا تعلق ہے، کم و بیش کے کچھ فرق کے ساتھ، اسلام کے خلاف یہ عناد عیسائیوں میں بھی موجود ہے، جیسا کہ صلیب و ہلال کی صدیوں پر محیط معرکہ آرائی سے واضح ہے اور جس کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔ اور اب تو اسلام کے خلاف یہودی اور عیسائی دونوں ہی مل کر سرگرم عمل ہیں۔ اسی لیے قرآن نے دونوں سے ہی دوستی کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اور جب وہ رسول کی طرف نازل کردہ (کلام) کو سنتے ہیں تو آپ ان کی آنکھیں آنسو سے بہتی ہوئی دیکھتے ہیں اس سبب سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا، وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے پس تو ہم کو بھی ان لوگوں کے ساتھ لکھ لے جو تصدیق کرتے ہیں۔ (۸۳)

اور ہمارے پاس کون سا عذر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور جو حق ہم کو پہنچا ہے اس پر ایمان نہ لائیں اور ہم اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو نیک لوگوں کی رفاقت میں داخل کر دے گا۔ (۸۳)^(۱)

وَإِذِاسِمِعُوَا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّمَا نَأْكُلُ مِمَّا مَعَ الشُّهُدِينَ ۝

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَنْ يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ۝

(۱) جہشے میں، جہاں مسلمان کسی زندگی میں دو مرتبہ ہجرت کر کے گئے۔ اَضَمَمَةَ نجاشی کی حکومت تھی، یہ عیسائی مملکت تھی۔ یہ آیات جہشے میں رہنے والے عیسائیوں ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہیں تاہم روایات کی رو سے نبی ﷺ نے حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کو اپنا مکتوب دے کر نجاشی کے پاس بھیجا تھا، جو انہوں نے جا کر اسے سنایا، نجاشی نے وہ مکتوب سن کر جہشے میں موجود مہاجرین اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بلایا اور اپنے علماء اور عباد و زہاد (قیسین) کو بھی جمع کر لیا، پھر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو قرآن کریم پڑھنے کا حکم دیا۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورہ مریم پڑھی، جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اعجازی ولادت اور ان کی عبدیت و رسالت کا ذکر ہے جسے سن کر وہ بڑے متاثر ہوئے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور ایمان لے آئے۔ بعض کہتے ہیں کہ نجاشی نے اپنے کچھ علمائے نبی ﷺ کے پاس بھیجے تھے، جب آپ ﷺ نے انہیں قرآن پڑھ کر سنایا تو بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور ایمان لے آئے۔ (فتح القدر) آیات میں قرآن کریم سن کر ان پر جو اثر ہوا اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور ان کے ایمان لانے کا تذکرہ ہے قرآن کریم میں بعض اور مقامات پر اس قسم کے عیسائیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً ﴿وَلَانَ مِنَ الْوَعْدِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا تَزُولُ إِلَيْهِمْ خُضِعِينَ﴾ (سورہ آل عمران ۱۹۹) ”یقیناً اہل کتاب میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ پر اور اس کتاب پر جو تم پر نازل ہوئی اور اس پر جو ان پر نازل ہوئی ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کے آگے عاجزی کرتے ہیں“ وَغَيْرَهَا مِنَ الْآيَاتِ اور حدیث میں آتا ہے کہ جب نجاشی کی موت کی خبر نبی ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ جہشے میں تمہارے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے، اس کی نماز جنازہ پڑھو! چنانچہ ایک صحرا میں آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ (عائبانہ) ادا فرمائی۔ صحیح بخاری، مناقب الأنصار و کتاب الجنائز۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، ایک اور حدیث میں ایسے اہل کتاب کی بابت، جو نبی ﷺ کی نبوت پر ایمان لائے بتلایا گیا ہے کہ انہیں دو گنا اجر ملے گا (بخاری۔ کتاب العلم و کتاب النکاح)

اس لئے ان کو اللہ تعالیٰ ان کے اس قول کی وجہ سے ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نمرس جاری ہوں گی، یہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور نیک لوگوں کا یہی بدلہ ہے۔ (۸۵) اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلاتے رہے وہ لوگ دوزخ والے ہیں۔ (۸۶)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو پاکیزہ چیزیں تمہارے واسطے حلال کی ہیں ان کو حرام مت کرو^(۱) اور حد سے آگے مت نکلو، بے شک اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۸۷)

اور اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تم کو دی ہیں ان میں سے حلال مرغوب چیزیں کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔ (۸۸)

فَأَنذَرْتَهُمْ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَذِبْنَا نَجْمًا مِّنْ تَحْتِهِمُ الْأَرْضَ فُجِرُوا فِيهَا وَذَلِكَ جزاء المُنْجِنِينَ ①

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ②

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحْرِمُوا مَبْعَآتِ اللَّهِ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ③

وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا مَّا آتَاكُمُ اللَّهُ الَّذِي آتَاكُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ ④

(۱) حدیث میں آتا ہے ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آکر کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! جب میں گوشت کھاتا ہوں تو نفسانی شہوت کا غلبہ ہو جاتا ہے، اس لئے میں نے اپنے اوپر گوشت حرام کر لیا ہے، جس پر آیت نازل ہوئی۔ (صحیح ترمذی۔ لئالیسانی، جلد ۳ ص ۴۶) اسی طرح سب نزول کے علاوہ دیگر روایات سے ثابت ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم زہد و عبادت کی غرض سے بعض حلال چیزوں سے (مثلاً عورت سے نکاح کرنے، رات کے وقت سونے، دن کے وقت کھانے پینے سے) اجتناب کرنا چاہتے تھے۔ نبی ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو آپ ﷺ نے انہیں منع فرمایا۔ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی بیوی سے کنارہ کشی اختیار کی ہوئی تھی، ان کی بیوی کی شکایت پر آپ ﷺ نے انہیں بھی اس سے روکا۔ (کتب حدیث) بہر حال اس آیت اور احادیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ کسی بھی چیز کو حرام کر لینا یا اس سے ویسے ہی پرہیز کرنا جائز نہیں ہے چاہے اس کا تعلق ماکولات و مشروبات سے ہو یا لباس سے ہو یا مرغوبات و جائز خواہشات سے۔

مسئلہ: اس طرح اگر کوئی شخص کسی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لے گا تو وہ حرام نہیں ہوگی، سوائے عورت کے۔ البتہ اس صورت میں بعض علما یہ کہتے ہیں کہ اسے قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا اور بعض کے نزدیک کفارہ ضروری نہیں۔ امام شوکانی کہتے ہیں کہ احادیث صحیحہ سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے کیونکہ نبی ﷺ نے کسی کو بھی کفارہ یمین ادا کرنے کا حکم نہیں دیا۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے قسم کا کفارہ بیان فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی حلال چیز کو حرام کر لینا، یہ قسم کھانے کے مرتبے میں ہے جو تکفیر (یعنی کفارہ ادا کرنے) کا متقاضی ہے۔ لیکن یہ استدلال احادیث صحیحہ کی موجودگی میں محل نظر ہے۔ فالصَّحِيحُ مَا قَالَهُ الشُّوْكَانِيُّ.

اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں میں لغو قسم پر تم سے مؤاخذہ نہیں فرماتا لیکن مؤاخذہ اس پر فرماتا ہے کہ تم جن قسموں کو مضبوط کرو۔ (۱) اس کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا دینا ہے اوسط درجے کا جو اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو (۲) یا ان کو کپڑا دینا (۳) یا ایک غلام یا لونڈی آزاد کرنا ہے (۴) اور جس کو مقدور نہ ہو تو تین دن کے روزے ہیں (۵) یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب کہ تم قسم کھا لو اور اپنی قسموں کا خیال رکھو! اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے واسطے اپنے احکام بیان فرماتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔ (۸۹)

اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جو اور تھان اور فال نکالنے کے پانے کے تیریہ سب گندی باتیں، شیطانی کام ہیں

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِالْعُوثِيّٰ اِيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَدْتُمْ مِنَ الْاَيْْمَانِ فَلَكَفَارَتُهٗ اَطْعَامُ عَشْرَةِ مَسْكِيْنٍ مِّنْ اَوْسَطِ مَا نَطْعَمُوْنَ اِهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْفٌ مِّنْهُمۡ اَوْ جُرْبُوعٌ رَّيْبِيٌّ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامٌ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَارَةُ اِيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَاَحْفَظُوْا اَيْْمَانَكُمْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اِلَيْهِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اَلْمَوَالِمَ اَلْغُمُوۡسَ وَالْاَنْصَابَ وَالَّذِيۡلَ اَكُمۡ رِيۡحًا مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ فَاَجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفۡحَشُوْنَ ﴿۵﴾

(۱) قسم جس کو عربی میں حلف یا یمنین کہتے ہیں جن کی جمع اخلاف اور ایمان ہے، تین قسم کی ہیں۔ ۱- لغو ۲- غموس ۳- معقده لغو: وہ قسم ہے جو انسان بات بات میں عادتاً بغیر ارادہ اور نیت کے کھاتا رہتا ہے۔ اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ غموس: وہ جو بی قسم ہے جو انسان دھوکہ اور فریب دینے کے لئے کھائے۔ یہ کبیرہ گناہ بلکہ اکبرا کبائر ہے۔ لیکن اس پر کفارہ نہیں۔ معقده: وہ قسم ہے جو انسان اپنی بات میں تاکید اور پختگی کے لئے ارادہ اور نیت کھائے، ایسی قسم اگر توڑے گا تو اس کا وہ کفارہ ہے جو آگے آیت میں بیان کیا جا رہا ہے۔

(۲) اس کھانے کی مقدار میں کوئی صحیح روایت نہیں ہے، اس لئے اختلاف ہے۔ البتہ امام شافعی نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے، جس میں رمضان میں روزے کی حالت میں بیوی سے ہم بستری کرنے والے کے کفارہ کا ذکر ہے، ایک مد (تقریباً ۱۰/ چھناک) فی مسکین خوراک قرار دی ہے۔ کیونکہ نبی ﷺ نے اس شخص کو کفارہ جماع ادا کرنے کے لئے ۱۵ صاع کھجوریں دی تھیں، جنہیں ساٹھ مسکینوں پر تقسیم کرنا تھا۔ ایک صاع میں ۴ مد ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے بغیر سالن کے دس مسکینوں کے لئے دس مد (یعنی سوا چھ سیر یا چھ کلو) خوراک کفارہ ہوگی۔ (ابن کثیر)

(۳) لباس کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ بظاہر مراد جوڑا ہے جس میں انسان نماز پڑھ سکے۔ بعض علما خوراک اور لباس دونوں کے لئے عرف کو معتبر قرار دیتے ہیں۔ (حاشیہ ابن کثیر، تحت آیت زیر بحث)

(۴) بعض علما قتل خطا کی دیت پر قیاس کرتے ہوئے لونڈی، غلام کے لئے ایمان کی شرط عائد کرتے ہیں۔ امام شوکانی کہتے ہیں، آیت میں عموم ہے مومن اور کافر دونوں کو شامل ہے۔

(۵) یعنی جس کو مذکورہ تینوں چیزوں میں سے کسی کی طاقت نہ ہو تو وہ تین دن کے روزے رکھے، یہ روزے اس کی قسم کا کفارہ ہو جائیں گے۔ بعض علما پے درپے روزے رکھنے کے قائل ہیں اور بعض کے نزدیک دونوں طرح جائز ہیں۔

ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم فلاح یاب ہو۔^(۱) (۹۰)
شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے
سے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض واقع کرا دے
اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے^(۲) سو
اب بھی باز آ جاؤ۔ (۹۱)

اور تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے رہو اور رسول کی
اطاعت کرتے رہو اور احتیاط رکھو۔ اگر اعراض کرو گے
تو یہ جان رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف صاف
صاف پہنچا دینا ہے۔ (۹۲)

ایسے لوگوں پر جو کہ ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے
ہوں اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھاتے پیتے

اِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ
فِي الصُّمْرِ وَالشُّبُرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ
اَنْتُمْ تَنْتَهُوْنَ ۝

وَاطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَاَحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاَعْلَوْا النَّامٰ
عَلٰى رُسُوْلِنَا الْبَلٰغَةُ الْبَيِّنٰتُ ۝

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَآءٌ مِّمَّا طَعَمُوْا
اِذَا مَا اتَقَوْا وَاَعْمَلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَقَوْا وَاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَقَوْا

(۱) یہ شراب کے بارے میں تیسرا حکم ہے۔ پہلے اور دوسرے حکم میں صاف طور پر ممانعت نہیں فرمائی گئی۔ لیکن یہاں
اسے اور اس کے ساتھ، جو پرستش گاہوں یا تھانوں اور فال کے تیروں کو ر جس (پلیدی) اور شیطانی کام قرار دے کر صاف
لفظوں میں ان سے اجتناب کا حکم دے دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت میں شراب اور جو کے مزید نقصانات بیان کر
کے سوال کیا گیا ہے کہ اب بھی باز آؤ گے یا نہیں؟ جس سے مقصود اہل ایمان کی آزمائش ہے۔ چنانچہ جو اہل ایمان تھے،
وہ تو منشاء الہی سمجھ گئے اور اس کی قطعی حرمت کے قائل ہو گئے۔ اور کہا اَنْتَهَيٰنَا رَبَّنَا! ”اے رب ہم باز آ گئے“
(مسند احمد جلد ۲، صفحہ ۲۵۱) لیکن آج کل کے بعض ”دانشر“ کہتے ہیں کہ اللہ نے شراب کو حرام کہاں قرار دیا
ہے؟ ع

یعنی شراب کو ر جس (پلیدی) اور شیطانی عمل قرار دے کر اس سے اجتناب کا حکم دینا، نیز اس اجتناب کو باعث فلاح قرار
دینا، ان ”مجتہدین“ کے نزدیک حرمت کے لئے کافی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے نزدیک پلیدی کام بھی جائز ہے،
شیطانی کام بھی جائز ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ اجتناب کا حکم دے، وہ بھی جائز ہے اور جس کی بابت کہے کہ اس کا
ارتکاب عدم فلاح اور اس کا ترک فلاح کا باعث ہے، وہ بھی جائز ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ.

(۲) یہ شراب اور جو کے مزید معاشرتی اور دینی نقصانات ہیں، جو محتاج وضاحت نہیں ہیں۔ اسی لئے شراب کو ام
الغنیث کہا جاتا ہے اور جو بھی ایسی بری لت ہے کہ یہ انسان کو کسی کام کا نہیں چھوڑتی اور بسا اوقات رئیس زادوں اور
پیشینی جاگیرداروں کو مفلس و قلاش بنا دیتی ہے۔ اَعَاذْنَا اللّٰهُ مِنْهُمَا.

ہوں جبکہ وہ لوگ تقویٰ رکھتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں پھر ہیزگاری کرتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں پھر ہیزگاری کرتے ہوں اور خوب نیک عمل کرتے ہوں، اللہ ایسے نیکو کاروں سے محبت رکھتا ہے۔^(۱) (۹۳)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ قدرے شکار سے تمہارا امتحان کرے گا^(۲) جن تک تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکیں گے^(۳) تاکہ اللہ تعالیٰ معلوم کر لے کہ کون شخص اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے سو جو شخص اس کے بعد حد سے نکلے گا اس کے واسطے دردناک سزا ہے۔ (۹۴)

اے ایمان والو! (وحشی) شکار کو قتل مت کرو جب کہ تم حالت احرام میں ہو۔^(۴) اور جو شخص تم میں سے اس کو

وَأَحْسِنُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۹۳﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْلُغُوا إِلَىٰ الْغَيْبِ مِنَّا لَعَلَّكُمْ أَتَىٰكُمُ الْغَيْبُ مِن لَدُنَّا فَاعْتَدُوا يَوْمَ تُصْعَقُونَ فَمَا تَعْبَأُكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ إِذْ كُنْتُمْ تَقُولُونَ لَا نَحْمِلُ فِيهِ ذُنُوبَكُمْ قُلْ بَلْ كَفَرْتُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْبَأُونَ عَنْكُمْ وَاللَّهُ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ أَعْيُنًا ﴿۹۴﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْلُغُوا إِلَىٰ الْغَيْبِ وَأَنْتُمْ حُرُومٌ مِّنَّا وَمَنْ كَفَرَ مِنكُمْ فَاعْتَدِ لِلْكَافِرِينَ مَا قَاتِلُوا مِنَ النَّارِ لِيَكُنَّ لَهُمْ سَبِيلٌ مِّنْ دُونِهَا يَخْتَارُونَ ﴿۹۴﴾

(۱) حرمت شراب کے بعد بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ہمارے کئی ساتھی جنگوں میں شہید یا ویسے ہی فوت ہو گئے۔ جب کہ وہ شراب پیتے رہے ہیں۔ تو اس آیت میں اس شبہ کا ازالہ کر دیا گیا کہ ان کا خاتمہ ایمان و تقویٰ پر ہی ہوا ہے کیونکہ شراب اس وقت تک حرام نہیں ہوئی تھی۔

(۲) شکار عربوں کی معاش کا ایک اہم عنصر تھا، اس لئے حالت احرام میں اس کی ممانعت کر کے ان کا امتحان لیا گیا۔ خاص طور پر حدیبیہ میں قیام کے دوران کثرت سے شکار صحابہ رضی اللہ عنہم کے قریب آتے، لیکن انہی ایام میں ان ۴ آیات کا نزول ہوا جن میں اس سے متعلقہ احکام بیان فرمائے گئے۔

(۳) قریب کا شکار یا چھوٹے جانور عام طور پر ہاتھ ہی سے پکڑ لئے جاتے ہیں اور دور کے یا بڑے جانوروں کے لئے تیر اور نیزے استعمال ہوتے تھے۔ اس لئے صرف ان دونوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن مراد یہ ہے کہ جس طرح بھی اور جس چیز سے بھی شکار کیا جائے، احرام کی حالت میں ممنوع ہے۔

(۴) امام شافعی نے اس سے مراد، صرف ان جانوروں کا قتل لیا ہے جو ماکول اللحم ہیں یعنی جو کھانے کے کام میں آتے ہیں۔ دوسرے بری جانوروں کا قتل وہ جائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن جمہور علماء کے نزدیک اس میں کوئی تفریق نہیں، ماکول اور غیر ماکول دونوں قسم کے جانور اس میں شامل ہیں۔ البتہ ان موزی جانوروں کا قتل جائز ہے جن کا استئنا احادیث میں آیا ہے اور وہ پانچ ہیں کوا، جیل، بچھو، چوہا اور باڈلا کتا۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب ما یندب للمحرم

جان بوجھ کر قتل کرے گا^(۱) تو اس پر فدیہ واجب ہو گا جو کہ مساوی ہو گا اس جانور کے جس کو اس نے قتل کیا ہے^(۲) جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کر دیں^(۳) خواہ وہ فدیہ خاص چوپایوں میں سے ہو جو نیاز کے طور پر کعبہ تک پہنچایا جائے^(۴) اور خواہ کفارہ مساکین کو دے دیا جائے اور خواہ اس کے برابر روزے رکھ لئے جائیں^(۵) تاکہ اپنے کئے کی شامت کا مزہ چکھے، اللہ

وَمَنْ هَذَا الْبَلِغَةُ الْكَعْبَةُ أَوْ كَفَّارَةُ طَعَامِ مَسْكِينٍ أَوْ عَدْلٌ ذَلِكَ صِيَامًا لَيْدُونَ وَبِالْأَمْرِ عَفَا اللَّهُ عَمَّا سَلَفَ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَعِمِ اللَّهُ مِنْهُ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو نِقَامٍ ﴿۵﴾

وغیرہ قتلہ من الدواب فی الحل والحرم، وموطأ، امام مالک، حضرت نافع سے سانپ کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا، اس کے قتل میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔ (ابن کثیر) اور امام احمد اور امام مالک اور دیگر علما نے بھی بھیرے، درندے، چیتے اور شیر کو کلب عقور (کانٹے والے کتے) میں شامل کر کے حالت احرام میں ان کے قتل کی بھی اجازت دی ہے۔ (ابن کثیر)

(۱) ”جان بوجھ کر“ کے الفاظ سے بعض علما نے یہ استدلال کیا ہے کہ بغیر ارادہ کے یعنی بھول کر قتل کر دے تو اس کے لئے فدیہ نہیں ہے۔ لیکن جمہور علما کے نزدیک بھول کر، یا غلطی سے بھی قتل ہو جائے تو فدیہ واجب ہو گا۔ مُتَعَمِدًا کی قید غالب احوال کے اعتبار سے ہے بطور شرط نہیں ہے۔

(۲) مساوی جانور (یا اس جیسے جانور) سے مراد خلقت یعنی قد و قامت میں مساوی ہونا ہے۔ قیمت میں مساوی ہونا نہیں ہے، جیسا کہ احناف کا مسلک ہے۔ مثلاً اگر ہرن کو قتل کیا ہے تو اس کی مثل (مساوی) بکری ہے۔ گائے کی مثل نیل گائے ہے۔ وغیرہ۔ البتہ جس جانور کا مثل نہ مل سکتا ہو، وہاں اس کی قیمت بطور فدیہ لے کر مکہ پہنچادی جائے گی۔

(۳) کہ مقتول جانور کی مثل (مساوی) فلاں جانور ہے اور اگر وہ غیر مثل ہے یا مثل دستیاب نہیں ہے تو اس کی اتنی قیمت ہے۔ اس قیمت سے غلہ خرید کر مکہ کے مساکین میں فی مسکین ایک مد کے حساب سے تقسیم کر دیا جائے گا۔ احناف کے نزدیک فی مسکین دود ہیں۔

(۴) یہ فدیہ، جانور یا اس کی قیمت، کعبہ پہنچائی جائے گی اور کعبہ سے مراد حرم ہے، (فتح القدیر) یعنی ان کی تقسیم حرم مکہ کی حدود میں رہنے والے مساکین پر ہوگی۔

(۵) او (یا) تخسیر کے لئے ہے یعنی کفارہ، اطعام مساکین ہو یا اس کے برابر روزے۔ دونوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنا جائز ہے۔ مقتول جانور کے حساب سے طعام میں جس طرح کی بیشی ہوگی، روزوں میں بھی کسی بیشی ہوگی۔ مثلاً محرم (احرام والے) نے ہرن قتل کیا ہے تو اس کی مثل بکری ہے، یہ فدیہ حرم مکہ میں ذبح کیا جائے گا، اگر یہ نہ ملے تو ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ایک قول کے مطابق چھ مساکین کو کھانا یا تین دن کے روزے رکھنے ہوں گے، اگر اس نے بارہ سگھیا، سانہر یا اس جیسا کوئی جانور قتل کیا ہے تو اس کی مثل گائے ہے، اگر یہ دستیاب نہ ہو یا اس کی طاقت نہ ہو تو میں

تعالیٰ نے گذشتہ کو معاف کر دیا اور جو شخص پھر ایسی ہی حرکت کرے گا تو اللہ انتقام لے گا اور اللہ زبردست ہے انتقام لینے والا۔ (۹۵)

تمہارے لئے دریا کا شکار پکڑنا اور اس کا کھانا حلال کیا گیا ہے۔ (۱) تمہارے فائدہ کے واسطے اور مسافروں کے واسطے اور خشکی کا شکار پکڑنا تمہارے لئے حرام کیا گیا ہے جب تک تم حالت احرام میں رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کے پاس جمع کئے جاؤ گے۔ (۹۶)

اللہ نے کعبہ کو جو کہ ادب کا مکان ہے لوگوں کے قائم رہنے کا سبب قرار دے دیا اور عزت والے مہینہ کو بھی اور حرم میں قربانی ہونے والے جانور کو بھی اور ان جانوروں کو بھی جن کے گلے میں پٹے ہوں (۲) یہ اس لئے تاکہ تم اس بات کا یقین کر لو کہ بے شک اللہ تمام آسمانوں اور زمین کے اندر کی چیزوں کا علم رکھتا ہے اور بے شک اللہ سب چیزوں کو خوب جانتا ہے۔ (۹۷)

أَحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيْرَةِ وَحُرْمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي هُوَ الْيَسِيرُ الْمُحْصِرُ ۝

جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ ذَلِكَ لِيَتَّعَلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

مسکین کو کھانا یا عید کے روزے رکھنے ہوں گے۔ یا ایسا جانور (شتر مرغ یا گور خر وغیرہ) قتل کیا ہے جس کی مثل اونٹ ہے تو اس کی عدم دستیابی کی صورت میں ۳۰ مسکین کو کھانا یا ۳۰ دن کے روزے رکھنے ہوں گے۔ (ابن کثیر)

(۱) صَبْدٌ سے مراد زندہ جانور اور طَعَامُهُ سے مراد وہ مردہ (مچھلی وغیرہ) ہے جسے سمندر یا دریا باہر پھینک دے یا پانی کے اوپر آجائے۔ جس طرح کہ حدیث میں بھی وضاحت ہے کہ سمندر کا مردار حلال ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ تفسیر ابن کثیر اور نیل الاوطار وغیرہ)

(۲) کعبہ کو البیت الحرام اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی حدود میں شکار کرنا، درخت کاٹنا وغیرہ حرام ہیں۔ اسی طرح اس میں اگر باپ کے قاتل سے بھی سامنا ہو جاتا تو اس سے تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔ اسے قِيَامًا لِّلنَّاسِ (لوگوں کے قیام اور گزران کا باعث) قرار دیا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ اس کے ذریعے سے اہل مکہ کا نظم و انصرام بھی صحیح ہے اور ان کی معاشی ضروریات کی فراہمی کا ذریعہ بھی ہے۔ اسی طرح حرمت والے مہینے (رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم) اور حرم میں جانے والے جانور (حدی اور قلائد) بھی قِيَامًا لِّلنَّاسِ ہیں کہ تمام چیزوں سے بھی اہل مکہ کو مذکورہ فوائد حاصل ہوتے تھے۔

تم یقین جانو کہ اللہ تعالیٰ سزا بھی سخت دینے والا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت اور بڑی رحمت والا بھی ہے۔ (۹۸) رسول کے ذمہ تو صرف پہنچانا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ پوشیدہ رکھتے ہو۔ (۹۹)

آپ فرما دیجئے کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں گو آپ کو ناپاک کی کثرت بھلی لگتی ہو^(۱) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اے عقل مندو! تاکہ تم کامیاب ہو۔ (۱۰۰)

اے ایمان والو! ایسی باتیں مت پوچھو کہ اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں اور اگر تم زمانہ نزول قرآن میں ان باتوں کو پوچھو گے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی^(۲) سوالات گزشتہ اللہ نے معاف کر دیئے اور اللہ بڑی مغفرت والا بڑے حلم والا ہے۔ (۱۰۱) ایسی باتیں تم سے پہلے اور لوگوں نے بھی پوچھی تھیں پھر ان باتوں کے منکر ہو گئے۔^(۳) (۱۰۲)

إِعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ وَأَنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۹۸﴾

مَا عَلَّمَ الرَّسُولَ إِلَّا الْبَلَاغَ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَبْدُونَ
وَمَا تَكْتُمُونَ ﴿۹۹﴾

قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ
الْخَبِيثَاتِ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۰۰﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنَ أَشْيَاءَ إِن بُدِدَ لَكُمْ
سُئُلُكُمْ وَإِن سَأَلْتُمُوهُنَّ لَيَبْزُلَنَّ الْفُرْقَانُ يُدَّ
لَكُمْ عَقَابُ اللَّهِ عَلَيْهَا وَاللَّهُ عَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۰۱﴾

فَدَسَّأَلَهَا تَوْمَنًا مِّن قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ ﴿۱۰۲﴾

(۱) خَبِيثُ (ناپاک) سے مراد حرام یا کافر یا گناہ گار یا ردی۔ طیب (پاک) سے مراد حلال یا مومن یا فرماں بردار اور عمدہ چیز ہے یا یہ سارے ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس چیز میں خبث (ناپاکی) ہوگی وہ کفر ہو، فسق و فجور ہو، اشیا و اقوال ہوں، کثرت کے باوجود وہ ان چیزوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے جن میں پاکیزگی ہو۔ یہ دونوں کسی صورت میں برابر نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ خبث کی وجہ سے اس چیز کی منفعت اور برکت ختم ہو جاتی ہے جب کہ جس چیز میں پاکیزگی ہو گی اس سے اس کی منفعت اور برکت میں اضافہ ہو گا۔

(۲) یہ ممانعت نزول قرآن کے وقت تھی۔ خود نبی ﷺ بھی صحابہ اللہ علیہم السلام کو زیادہ سوالات کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا ”مسلمانوں میں وہ سب سے بڑا مجرم ہے جس کے سوال کرنے کی وجہ سے کوئی چیز حرام کر دی گئی در آن حالیکہ اس سے قبل وہ حلال تھی۔“ (صحیح بخاری، نمبر ۲۸۹۹، وصحیح مسلم، کتاب الفضائل باب توقیرہ ﷺ و ترک اِکْشَادِ سْؤَالِهِ)

(۳) کہیں اس کو تاہی کے مرتکب تم بھی نہ ہو جاؤ۔ جس طرح ایک مرتبہ نبی ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے“ ایک شخص نے سوال کیا؟ ”کیا ہر سال؟“ آپ ﷺ خاموش رہے، اس نے تین مرتبہ سوال دہرایا، پھر آپ

اللہ تعالیٰ نے نہ بچیرہ کو مشروع کیا ہے اور نہ سائبہ کو اور نہ وصیلہ کو اور نہ حام کو^(۱) لیکن جو لوگ کافر ہیں وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگاتے ہیں اور اکثر کافر عقل نہیں رکھتے۔ (۱۰۳)

مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ
وَالَّذِينَ الَّذِينَ كَفَرُوا يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ
وَكَثِيرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۰۳﴾

ﷺ نے فرمایا کہ ”اگر میں ہاں کہہ دیتا تو حج ہر سال حج کرنا تمہارے لئے ممکن نہ ہوتا۔“ (صحیح مسلم) کتاب الحج حدیث نمبر ۳۱۲ ومسند أحمد سنن أبی داود نسائی ابن ماجہ) اسی لئے بعض مفسرین نے عَفَا اللَّهُ عَنْهَا کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ جس چیز کا تذکرہ اللہ نے اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے، پس وہ ان چیزوں میں سے ہے جن کو اللہ نے معاف کر دیا ہے۔ پس تم بھی ان کی بابت خاموش رہو؛ جس طرح وہ خاموش رہا۔ (ابن کثیر) ایک حدیث میں نبی ﷺ نے اس مفہوم کو مابین الفاظ بیان فرمایا، ذَرُونِي مَا تَرَكْتُمْ؛ فَإِنَّمَا أَهْلَكُ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَثْرَةَ سُؤَالِهِمْ، وَأَخْتِلَافُهُمْ عَلَيَّ أَنْبِيَائِهِمْ (صحیح مسلم) کتاب وباب مذکور ”تمہیں جن چیزوں کی بابت نہیں بتایا گیا، تم مجھ سے ان کی بابت سوال مت کرو، اس لئے کہ تم سے پہلی امتوں کی ہلاکت کا سبب ان کا کثرت سوال اور اپنے انبیاء سے اختلاف بھی تھا۔“

(۱) یہ ان جانوروں کی قسمیں ہیں جو اہل عرب اپنے بتوں کی نذر کر دیا کرتے تھے۔ ان کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں اس کی تفسیر حسب ذیل نقل کی گئی ہے۔ بَحِيرَةٌ: وہ جانور، جس کا دودھ دوہنا چھوڑ دیا جاتا اور کھا جاتا کہ یہ بتوں کے لئے ہے۔ چنانچہ کوئی شخص اس کے تھنوں کو ہاتھ نہ لگاتا۔ سَائِبَةٌ: وہ جانور، جسے وہ بتوں کے لئے آزاد چھوڑ دیتے تھے، اسے نہ سواری کے لئے استعمال کرتے نہ بار برداری کے لئے۔ وَصِيلَةٌ: وہ اونٹنی، جس سے پہلی مرتبہ مادہ پیدا ہوتی اور اس کے بعد پھر دوبارہ بھی مادہ ہی پیدا ہوتی۔ (یعنی ایک مادہ کے بعد دوسری مادہ مل گئی، ان کے درمیان کسی نر سے تفریق نہیں ہوئی) ایسی اونٹنی کو بھی وہ بتوں کے لئے آزاد چھوڑ دیتے تھے اور حَامٍ: وہ نر اونٹ ہے؛ جس کی نسل سے کئی بچے ہو چکے ہوتے۔ (اور نسل کافی بڑھ جاتی) تو اس سے بھی بار برداری یا سواری کا کام نہ لیتے اور بتوں کے لئے چھوڑ دیتے اور اسے وہ حامی کہتے۔“ اسی روایت میں یہ حدیث بھی بیان کی گئی ہے کہ سب سے پہلے بتوں کے جانور آزاد چھوڑنے والا شخص عمرو بن عامر خزاعی تھا۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ ”میں نے اسے جہنم میں اتاریا کھینچتے ہوئے دیکھا“ (صحیح بخاری۔ تفسیر سورة المائدة) آیت میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو اس طرح مشروع نہیں کیا ہے، کیونکہ اس نے تو نذر و نیاز صرف اپنے لیے خاص کر رکھی ہے۔ بتوں کے لئے یہ نذر و نیاز کے طریقے مشرکوں نے ایجاد کئے ہیں اور بتوں اور معبودان باطل کے نام پر جانور چھوڑنے اور نذر نیاز پیش کرنے کا یہ سلسلہ آج بھی مشرکوں میں بلکہ بہت سے نام نہاد مسلمانوں میں بھی قائم و جاری ہے۔ أَعَادَنَا اللَّهُ مِنْهُ.

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں ان کی طرف اور رسول کی طرف رجوع کرو تو کہتے ہیں کہ ہم کو وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا، کیا اگرچہ ان کے بڑے نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ ہدایت رکھتے ہوں۔ (۱۰۴)

اے ایمان والو! اپنی فکر کرو، جب تم راہ راست پر چل رہے ہو تو جو شخص گمراہ رہے اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں۔^(۱) اللہ ہی کے پاس تم سب کو جانا ہے پھر وہ تم سب کو تلامذے گا جو کچھ تم سب کرتے تھے۔ (۱۰۵)

اے ایمان والو! تمہارے آپس میں دو شخص کا گواہ ہونا مناسب ہے جبکہ تم میں سے کسی کو موت آنے لگے اور وصیت کرنے کا وقت ہو وہ دو شخص ایسے ہوں کہ دیندار ہوں خواہ تم میں سے ہوں^(۲) یا غیر لوگوں میں سے دو

وَأَذِّنْ لَهُمْ تَعَالَى إِلَى مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا وَأُلُوكَانَ آبَاءَهُمْ لَا يَتَّبِعُونَ سُنِّيَةً وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۰۴﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ إِلَى اللَّهِ رُجْعَتُكُمْ جَمِيعًا بَيْنِيكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۰۵﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا سَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدُكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنِ ذَوَاعِلٍ مِنْكُمْ أَوْ آخَرٍ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنْتُمْ صَرَفْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةُ الْمَوْتِ

(۱) بعض لوگوں کے ذہن میں ظاہری الفاظ سے یہ شبہ پیدا ہوا کہ اپنی اصلاح اگر کر لی جائے تو کافی ہے۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ضروری نہیں ہے۔ لیکن یہ مطلب صحیح نہیں ہے کیونکہ امر بالمعروف کا فریضہ بھی نہایت اہم ہے۔ اگر ایک مسلمان یہ فریضہ ہی ترک کر دے گا تو اس کا تارک ہدایت پر قائم رہنے والا کب رہے گا؟ جب کہ قرآن نے إِذَا اهْتَدَيْتُمْ (جب تم خود ہدایت پر چل رہے ہو) کی شرط عائد کی ہے۔ اسی لئے جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے فرمایا کہ ”لوگو! تم آیت کو غلط جگہ استعمال کر رہے ہو، میں نے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ”جب لوگ برائی ہوتے ہوئے دیکھ لیں اور اسے بدلنے کی کوشش نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے عذاب کی گرفت میں لے لے“ (مسند احمد، جلد ۱ ص ۲۱۷، ترمذی نمبر ۲۱۷۸، ابوداؤد نمبر ۲۳۲۸) اس لئے آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ تمہارے سمجھانے کے باوجود اگر لوگ نیکی کا راستہ اختیار نہ کریں یا برائی سے باز نہ آئیں تو تمہارے لئے یہ نقصان وہ نہیں ہے جب کہ تم خود نیکی پر قائم اور برائی سے مجتنب ہو۔ البتہ ایک صورت میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ترک جائز ہے کہ جب کوئی شخص اپنے اندر اس کی طاقت نہ پائے اور اس سے اس کی جان کو خطرہ ہے۔ اس صورت میں فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ کے تحت اس کی گنجائش ہے۔ اس صورت کی متحمل ہے۔

(۲) ”تم میں سے ہوں“ کا مطلب بعض نے یہ بیان کیا ہے کہ مسلمانوں میں سے ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ مؤمنین

فخص ہوں اگر تم کہیں سفر میں گئے ہو اور تمہیں موت آجائے^(۱) اگر تم کو شبہ ہو تو ان دونوں کو بعد نماز روک لو پھر دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ ہم اس قسم کے عوض کوئی نفع نہیں لینا چاہتے^(۲) اگرچہ کوئی قربت دار بھی ہو اور اللہ تعالیٰ کی بات کو ہم پوشیدہ نہ کریں گے، ہم اس حالت میں سخت گنہگار ہوں گے۔ (۱۰۶)

پھر اگر اس کی اطلاع ہو کہ وہ دونوں گواہ کسی گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں^(۳) تو ان لوگوں میں سے جن کے مقابلہ میں گناہ کا ارتکاب ہوا تھا اور دو شخص جو سب میں قریب تر ہیں جہاں وہ دونوں کھڑے ہوئے تھے^(۴) یہ دونوں کھڑے ہوں پھر دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ بالیقین ہماری یہ قسم ان دونوں کی اس قسم سے زیادہ راست ہے اور ہم نے ذرا تجاوز نہیں کیا، ہم اس حالت میں سخت ظالم ہوں گے۔ (۱۰۷)

تَحْسَبُوهُمَا مِنَ بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيَقْسِمْنَ بِاللَّهِ إِنْ اُنْتَبَهُمْ
لَا تَشْتَرِي بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ وَلَا تَلْتَمِسُوا شَهَادَةَ
اللَّهِ اِنَّكَ اِذَا هَمَّ مِنَ الْاٰمِنِ الْاٰمِنِ ۝۱۰۶

وَإِنْ غَيْرَ ذَلِكَ فَسَبَّحُوا بِحَمْدِ اللَّهِ الْكَلِيمِ
مِنَ الَّذِينَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلٰئِيْنَ فَيَقْسِمْنَ بِاللَّهِ
لَشَهَادَتُنَا اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا عَدَّتْ بَيْنَنَا اِنَّكَ اِذَا
لَمِنَ الظَّالِمِيْنَ ۝۱۰۷

(وصیت کرنے والے) کے قبیلے سے ہوں۔ اسی طرح ﴿اٰخِرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ﴾ میں دو مفہوم ہوں گے یعنی من غَيْرِكُمْ سے مراد یا غیر مسلم (اہل کتاب) ہوں گے یا موسیٰ کے قبیلے کے علاوہ کسی اور قبیلے سے۔

(۱) یعنی سفر میں کوئی ایسا شدید بیمار ہو جائے کہ جس سے زندہ بچنے کی امید نہ ہو تو وہ سفر میں دو عادل گواہ بنا کر جو وصیت کرنا چاہے، کر دے۔

(۲) یعنی مرنے والے مؤمنین کے ورثا کو شک پڑ جائے کہ ان اوصیاء نے مال میں خیانت یا تبدیلی کی ہے تو وہ نماز کے بعد یعنی لوگوں کی موجودگی میں ان سے قسم لیں اور وہ قسم کھا کے کہیں ہم اپنی قسم کے عوض دنیا کا کوئی فائدہ حاصل نہیں کر رہے ہیں۔ یعنی جھوٹی قسم نہیں کھا رہے ہیں۔

(۳) یعنی جھوٹی قسمیں کھائیں ہیں۔

(۴) اَوْلِيَّانِ، اَوْلٰی کا تشبیہ ہے، مراد ہے میت یعنی موسیٰ (وصیت کرنے والے) کے قریب ترین دو رشتے دار ﴿مِنَ الْاَوْلِيَّانِ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ﴾ کا مطلب یہ ہے جن کے مقابلے پر گناہ کا ارتکاب ہوا تھا یعنی جھوٹی قسم کا ارتکاب کر کے ان کو ملنے والا مال ہڑپ کر لیا تھا۔ الْاَوْلِيَّانِ یہ یا تو ہما مبتدا محذوف کی خبر ہے یا يَقُوْمَانِ یا اٰخِرَانِ کی ضمیر سے بدل ہے۔ یعنی یہ دو قریبی رشتے دار، ان کی جھوٹی قسموں کے مقابلے میں اپنی قسم دیں گے۔

یہ قریب ذریعہ ہے اس امر کا کہ وہ لوگ واقعہ کو ٹھیک طور پر ظاہر کریں یا اس بات سے ڈر جائیں کہ ان سے قسمیں لینے کے بعد قسمیں الٹی پڑ جائیں گی^(۱) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سنو! اور اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ (۱۰۸)

جس روز اللہ تعالیٰ تمام پیغمبروں کو جمع کرے گا، پھر ارشاد فرمائے گا کہ تم کو کیا جواب ملا تھا، وہ عرض کریں گے کہ ہم کو کچھ خبر نہیں^(۲) تو ہی بے شک پوشیدہ باتوں کو پورا جانے والا ہے۔ (۱۰۹)

ذَلِكَ اَذْنُ اَنْ يَبْأْتُوا بِالْمَهَادَةِ عَلٰى وُجُوْهِهَا وَيَخْفُوْا اَنْ
سُرُّ اِيْمَانٌ بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوا وَاللّٰهُ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

يَوْمَ يَمْعَمُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَا اِيْحَبُّكُمْ قَالُوْا اَلَا يَعْلَمُ
لَنَا اَنْتَ اَنْتَ عَلٰمُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾

(۱) یہ اس فائدے کا ذکر ہے جو اس حکم میں پنہاں ہے جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے وہ یہ کہ یہ طریقہ اختیار کرنے میں اوصیا صحیح صحیح گواہی دیں گے کیونکہ انہیں خطرہ ہو گا کہ اگر ہم نے خیانت یا دروغ گوئی یا تبدیلی کا ارتکاب کیا تو یہ کاروائیاں خود ہم پر الٹ سکتی ہیں۔ اس واقعہ کی شان نزول میں بدیل بن ابی مریم کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ شام تجارت کی غرض سے گئے، وہاں بیمار اور قریب المرگ ہو گئے، ان کے پاس سامان اور چاندی کا ایک پیالہ تھا، جو انہوں نے دو عیسائیوں کے سپرد کر کے اپنے رشتہ داروں تک پہنچانے کی وصیت کر دی اور خود فوت ہو گئے، یہ دونوں وصی جب واپس آئے تو پیالہ تو انہوں نے بیچ کر پیسے آپس میں تقسیم کر لئے اور باقی سامان ورثا کو پہنچا دیا۔ سامان میں ایک رقعہ بھی تھا جس میں سامان کی فہرست تھی جس کی رو سے چاندی کا پیالہ گم تھا، ان سے کہا گیا تو انہوں نے جھوٹی قسم کھالی لیکن بعد میں پتہ چل گیا کہ وہ پیالہ انہوں نے فلاں صراف کو بیچا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان غیر مسلموں کے مقابلے میں قسمیں کھا کر ان سے پیالے کی رقم وصول کی۔ یہ روایت تو سنداً ضعیف ہے۔ (ترمذی نمبر ۳۰۵۰ بہ تحقیق أحمد شاکر۔ مصر) تاہم ایک دوسری سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مختصراً یہ مروی ہے، جسے علامہ البہانی نے صحیح قرار دیا ہے۔ (صحیح ترمذی، جلد ۳ نمبر ۳۳۳۹)

(۲) انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان کی قوموں نے اچھایا برا جو بھی معاملہ کیا، اس کا علم تو یقیناً انہیں ہو گا لیکن وہ اپنے علم کی نفی یا تو محشر کی ہولناکیوں اور اللہ جل جلالہ کی ہیبت و عظمت کی وجہ سے کریں گے یا اس کا تعلق ان کی وفات کے بعد کے حالات سے ہو گا۔ علاوہ ازیں باطنی امور کا علم تو کلیتاً صرف اللہ ہی کو ہے۔ اسی لئے وہ کہیں گے علام الغیوب تو تو ہی ہے نہ کہ ہم۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء و رسل عالم الغیب نہیں ہوتے، عالم الغیب صرف ایک اللہ کی ذات ہے۔ انبیاء کو جتنا کچھ بھی علم ہوتا ہے، اولاً تو اس کا تعلق ان امور سے ہوتا ہے جو فرائض رسالت کی ادائیگی کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ ثانیاً ان سے بھی ان کو بذریعہ وحی ہی آگاہ کیا جاتا ہے۔ حالانکہ عالم الغیب وہ ہوتا ہے جس کو ہر چیز کا علم ذاتی

جب کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم! میرا انعام یاد کرو جو تم پر اور تمہاری والدہ پر ہوا ہے، جب میں نے تم کو روح القدس^(۱) سے تائید دی۔ تم لوگوں سے کلام کرتے تھے گود میں بھی^(۲) اور بڑی عمر میں بھی اور جب کہ میں نے تم کو کتاب اور حکمت کی باتیں اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی^(۳) اور جب کہ تم میرے حکم سے گارے سے ایک شکل بناتے تھے جیسے پرندہ کی شکل ہوتی ہے پھر تم اس کے اندر پھونک مار دیتے تھے جس سے وہ پرند بن جاتا تھا میرے حکم سے اور تم اچھا کر دیتے تھے مادرزاد اندھے کو اور کوڑھی کو میرے حکم سے اور جب کہ تم مردوں کو نکال کر کھڑا کر لیتے تھے میرے حکم سے^(۴) اور جب کہ میں نے بنی اسرائیل کو تم سے باز رکھا جب تم ان کے پاس دلیلیں لے کر آئے تھے^(۵) پھر ان میں جو کافر تھے انہوں نے کہا تھا کہ بجز کھلے جادو کے یہ اور کچھ بھی نہیں۔^(۶) (۱۱۰)

إِذْ قَالَ اللَّهُ لِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ادْكُرِي عَمِيْقِي عَلَيْكَ وَعَلَى
وَالدِّيَارِ إِذْ أَنْتَ نَذِيرٌ الْقُدُسِ لِيُكَفِّرَ النَّاسَ
فِي الْمُهْدِ وَكَهَلًا وَإِذْ عَلَّمْنَاكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ
وَالْإِنْجِيلَ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ
يَآدِي فَيَنْفُخُ فِيهَا فَيَكُونُ طَيْرًا يَآدِي وَتُؤَيُّ
الْأَكْمَةَ وَالرِّبَصَ يَآدِي وَإِذْ تَخْوِجُ الْعَمُوْنَ يَآدِي
وَإِذْ كَفَفْتَ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنْكَ إِذْ جَنَّهُمْ
يَالسَّيِّئَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِن
هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝

طور پر ہو، نہ کہ کسی کے بتلانے پر اور جس کو بتلانے پر کسی چیز کا علم حاصل ہو اسے عالم الغیب نہیں کہا جاتا، نہ وہ عالم الغیب ہوتا ہی ہے۔ فَافْهَمْ وَتَذَكَّرْ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ

- (۱) اس سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۸ میں گزرا۔
- (۲) گود میں اس وقت کلام کیا، جب حضرت مریم علیہا السلام اپنے اس نومولود (بچے) کو لے کر اپنی قوم میں آئیں اور انہوں نے اس بچے کو دیکھ کر تعجب کا اظہار اور اس کی بابت استفسار کیا تو اللہ کے حکم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شیر خوارگی کے عالم میں کلام کیا اور بڑی عمر میں کلام سے مراد نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد دعوت و تبلیغ ہے۔
- (۳) اس کی وضاحت سورہ آل عمران کی آیت ۴۸ میں گزر چکی ہے۔
- (۴) ان معجزات کا ذکر بھی مذکورہ سورت کی آیت ۴۹ میں گزر چکا ہے۔
- (۵) یہ اشارہ ہے اس سازش کی طرف جو یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کرنے اور سولی دینے کے لئے تیار کی تھی۔ جس سے اللہ نے بچا کر انہیں آسمان پر اٹھالیا تھا۔ ملاحظہ ہو حاشیہ سورہ آل عمران آیت ۵۴۔
- (۶) ہر نبی کے مخالفین، آیات الہی اور معجزات دیکھ کر انہیں جادو ہی قرار دیتے رہے ہیں۔ حالانکہ جادو تو شعبہ بازی کا ایک فن ہے، جس سے انبیاء علیہم السلام کو کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ علاوہ ازیں انبیاء کے ہاتھوں ظاہر ہونے والے معجزات

اور جب کہ میں نے حواریین کو حکم دیا^(۱) کہ تم مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ، انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور آپ شاہد رہیے کہ ہم پورے فرماں بردار ہیں۔ (۳)

وہ وقت یاد کے قابل ہے جب کہ حواریوں نے عرض کیا کہ اے عیسیٰ بن مریم! کیا آپ کرب ایسا کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرمادے؟^(۲) آپ نے

وَاذْأَوْحَيْتُ إِلَىٰ الْحَوَارِيِّينَ أَنْ امْنُوا بِي وَبِرَسُولِي
قَالُوا آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿۳﴾

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَعْيسَىٰ ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ
رَبُّكَ أَنْ يُنْزِلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ قَالَ
أَتَعْبُدُونَ اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۴﴾

قادر مطلق، اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرت و طاقت کا مظہر ہوتے تھے، کیونکہ وہ اللہ ہی کے حکم سے اور اس کی مشیت و قدرت سے ہوتے تھے۔ کسی نبی کے اختیار میں یہ نہیں تھا کہ وہ جب چاہتا اللہ کے حکم اور مشیت کے بغیر کوئی معجزہ صادر کر کے دکھاتا، اسی لئے یہاں بھی دیکھ لیجئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہر معجزے کے ساتھ اللہ نے چار مرتبہ یہ فرمایا "بِإِذْنِي" کہ "ہر معجزہ میرے حکم سے ہوا ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ جب نبی ﷺ سے مشرکین مکہ نے مختلف معجزات کے دکھانے کا مطالبہ کیا جس کی تفصیل سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر ۹۱-۹۳ میں ذکر کی گئی ہے تو اس کے جواب میں نبی ﷺ نے یہ فرمایا ﴿بَشَرًا مِثْلَ هَذَا كُنْتُمْ لِآبَائِكُمْ شُرَكَاءَ﴾ "میرا رب پاک ہے (یعنی وہ تو اس کمزوری سے پاک ہے کہ وہ یہ چیزیں نہ دکھا سکے، وہ تو دکھا سکتا ہے لیکن اس کی حکمت اس کی مقتضی ہے یا نہیں؟ یا کب مقتضی ہو گی؟ اس کا علم اسی کو ہے اور اسی کے مطابق وہ فیصلہ کرتا ہے) لیکن میں تو صرف بشر اور رسول ہوں" یعنی میرے اندر یہ معجزات دکھانے کی اپنے طور پر طاقت نہیں ہے۔ بہر حال انبیاء کے معجزات کا جادو سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو جادوگر اس کا توڑ میا کر لیتے۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے سے ثابت ہے کہ دنیا بھر کے جمع شدہ بڑے بڑے جادوگر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کا توڑ نہ کر سکے اور جب ان کو معجزہ اور جادو کا فرق واضح طور پر معلوم ہو گیا تو وہ مسلمان ہو گئے۔

(۱) حَوَارِيَّتَيْنِ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وہ پیروکار ہیں جو ان پر ایمان لائے اور ان کے ساتھی اور مددگار بنے۔ ان کی تعداد ۱۲ بیان کی جاتی ہے۔ وحی سے مراد یہاں وہ وحی نہیں ہے جو بذریعہ فرشتہ انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی تھی بلکہ یہ وحی الہام ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض لوگوں کے دلوں میں القا کر دی جاتی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریم علیہا السلام کو اسی قسم کا الہام ہوا جسے قرآن نے وحی ہی سے تعبیر کیا ہے۔

(۲) مَائِدَةٌ ایسے برتن (سینی، پلیٹ یا ترے وغیرہ) کو کہتے ہیں جس میں کھانا ہو۔ اسی لئے دسترخوان بھی اس کا ترجمہ کر لیا جاتا ہے کیونکہ اس پر بھی کھانا چنا ہوتا ہے۔ سورت کا نام بھی اسی مناسبت سے ہے کہ اس میں اس کا ذکر ہے حَوَارِيَّتَيْنِ نے مزید اطمینان قلب کے لیے یہ مطالبہ کیا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے احیائے موتی کے مشاہدے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی۔

فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔ (۱۱۳)^(۱)
 وہ بولے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں اور
 ہمارے دلوں کو پورا اطمینان ہو جائے اور ہمارا یہ یقین
 اور بڑھ جائے کہ آپ نے ہم سے سچ بولا ہے اور ہم
 گواہی دینے والوں میں سے ہو جائیں۔ (۱۱۳)

عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی کہ اے اللہ اے ہمارے
 پروردگار! ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرما! کہ وہ ہمارے
 لئے یعنی ہم میں جو اول ہیں اور جو بعد کے ہیں سب کے
 لئے ایک خوشی کی بات ہو جائے^(۲) اور تیری طرف

قَالُوا اِنُرِيْدُ اَنْ نَّأْكُلَ مِنْهَا وَنَقْطَعِيْنَ قُلُوْبَنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ
 صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنُ عَلَيْهِمِنَ الشَّاهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَآءِ
 تَكُوْنُ لَنَا عَدِيْلًا اَلَا قَوْلَنَا وَانْزِلْنَا وَايَةً مِنْكَ وَارْزُقْنَا
 وَاَنْتَ خَيْرُ الرَّزِقِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

(۱) یعنی یہ سوال مت کرو، ممکن ہے یہ تمہاری آزمائش کا سبب بن جائے کیونکہ حسب طلب معجزہ دکھائے جانے کے بعد
 اس قوم کی طرف سے ایمان میں کمزوری عذاب کا باعث بن سکتی ہے۔ اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں اس
 مطالبے سے روکا اور انہیں اللہ سے ڈرایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے وحی کے لفظ سے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت
 مریم نَبِيَّةٌ تھیں، اس لئے کہ ان پر بھی اللہ کی طرف سے وحی آئی تھی، صحیح نہیں۔ اس لئے کہ یہ وحی؛ وحی الہام ہی
 تھی، جیسے یہاں ﴿اَوْحِيْنَا اِلَى الْاَنْبِيَاۡتِ﴾ میں ہے یہ وحی رسالت نہیں ہے۔

(۲) اسلامی شریعتوں میں عید کا مطلب یہ نہیں رہا ہے کہ قومی تہوار کا ایک دن ہو جس میں تمام اخلاقی قیود اور شریعت
 کے ضابطوں کو پامال کرتے ہوئے بے ہنگم طریقے سے طرب و مسرت کا اظہار کیا جائے، چراغاں کیا جائے اور جشن منایا
 جائے، جیسا کہ آج کل اس کا یہی مفہوم سمجھ لیا گیا ہے اور اسی کے مطابق تہوار منائے جاتے ہیں۔ بلکہ آسمانی شریعتوں
 میں اس کی حیثیت ایک ملی تقریب کی ہوتی ہے، جس کا اہم مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس روز پوری ملت اجتماعی طور پر اللہ
 تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اس کی تکبیر و تحمید کے زمرے بلند کرے۔ یہاں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس دن کو عید
 بنانے کی جس خواہش کا اظہار کیا ہے اس سے ان کا مطلب یہی ہے کہ ہم تعریف و تحمید اور تکبیر و تحمید کریں۔ بعض اہل
 بدعت اس ”عید مادہ“ سے ”عید میلاد“ کا جواز ثابت کرتے ہیں۔ حالانکہ اول تو یہ ہماری شریعت سے پہلے کی شریعت
 کا واقعہ ہے، جسے اگر اسلام برقرار رکھنا چاہتا تو وضاحت کر دی جاتی۔ دوسرے یہ پیغمبر کی زبان سے ”عید“ بنانے کی
 خواہش کا اظہار ہوا تھا اور پیغمبر بھی اللہ کے حکم سے شرعی احکام بیان کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ تیسرے عید کا مفہوم
 و مطلب بھی وہ ہوتا ہے جو مذکورہ بالا سطروں میں بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ ”عید میلاد“ میں ان میں سے کوئی بات بھی
 نہیں ہے۔ لہذا ”عید میلاد“ کے بدعت ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اسلام میں صرف دو ہی عیدیں ہیں جو
 اسلام نے مقرر کی ہیں، عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ ان کے علاوہ کوئی تیسری عید نہیں ہے۔

سے ایک نشانی ہو جائے اور تو ہم کو رزق عطا فرما دے اور تو سب عطا کرنے والوں سے اچھا ہے۔ (۱۱۳)

حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں وہ کھانا تم لوگوں پر نازل کرنے والا ہوں، پھر جو شخص تم میں سے اس کے بعد ناحق شناسی کرے گا تو میں اس کو ایسی سزا دوں گا کہ وہ سزا دنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہ دوں گا۔^(۱) (۱۱۵)

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب کہ اللہ تعالیٰ فرماتے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی علاوہ اللہ کے معبود قرار دے لو! عیسیٰ عرض کریں گے کہ میں تو تجھ کو منزه

قَالَ اللَّهُ إِنِّي مَرْسَلُهَا عَلَيْكَ مَتَّعْتُكَ بِهَا مِنْكَ وَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَّا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿١١٥﴾

وَلَا قَالَ اللَّهُ يُعَسِّي ابْنَ مَرْيَمَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخَذُوا مِنِّي وَلِئِي الْهَيْئَةِ مِنْ دُونِ اللَّهِ قَالَ جَعَلْتُكَ مَائِدُونَ لِي أَن أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِعَيْشِي إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعَلَّمُوا مِنِّي فَعَسِي

(۱) یہ مائِدَة (خوان طعام) آسمان سے اترا یا نہیں؟ اس کی بابت کوئی صحیح اور صریح مرفوع حدیث نہیں۔ جمہور علماء امام شوکانی اور امام ابن جریر طبری سمیت) اس کے نزول کے قائل ہیں اور ان کا استدلال قرآن کے الفاظ ﴿إِنِّي مَرْسَلُهَا عَلَيْكَ﴾ سے ہے کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے جو یقیناً سچا ہے لیکن اسے اللہ کی طرف سے یقینی وعدہ قرار دینا اس لئے صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ اگلے الفاظ فَمَنْ يَكْفُرْ اس وعدے کو مشروط ہونے کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے دوسرے علماء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شرط سن کر انہوں نے کہا کہ پھر ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ جس کے بعد اس کا نزول نہیں ہوا۔ امام ابن کثیر نے ان آثار کی اسانید کو جو امام مجاہد اور حضرت حسن بن بصری سے منقول ہیں، صحیح قرار دیا ہے۔ نیز کہا ہے کہ ان آثار کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ نزول ماندہ کی کوئی شہرت عیسائیوں میں ہے، نہ ان کی کتابوں میں درج ہے۔ حالانکہ اگر یہ نازل ہوا ہوتا تو اسے ان کے ہاں مشہور بھی ہونا چاہئے تھا اور کتابوں میں بھی تواتر سے یا کم از کم آحاد سے نقل ہونا چاہئے تھا۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

(۲) یہ سوال قیامت والے دن ہو گا اور مقصد اس سے اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو معبود بنالینے والوں کی زجر و توبخ ہے کہ جن کو تم معبود اور حاجت روا سمجھتے تھے، وہ تو خود اللہ کی بارگاہ میں جو اب رہے ہیں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کو بھی الہ (معبود) بنایا ہے۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مِنْ دُونِ اللَّهِ (اللہ کے سوا معبود) وہی نہیں ہیں جنہیں مشرکین نے پتھریا لکڑی کی مورتیوں کی شکل میں بنا کر ان کی پوجا کی، جس طرح کہ آج کل کے قبر پرست علماء اپنے عوام کو یہ باور کرا کر مغالطہ دیتے ہیں۔ بلکہ وہ اللہ کے نیک بندے بھی مِنْ دُونِ اللَّهِ میں شامل ہیں جن کی لوگوں نے کسی بھی انداز سے عبادت کی۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مریم کی عیسائیوں نے کی۔

سمجھتا ہوں، مجھ کو کسی طرح زیبانہ تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کے کہنے کا مجھ کو کوئی حق نہیں، اگر میں نے کہا ہو گا تو تجھ کو اس کا علم ہو گا۔ تو تو میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتا ہے اور میں تیرے نفس میں جو کچھ ہے اس کو نہیں جانتا۔^(۱) تمام غیبوں کا جاننے والا تو ہی ہے۔ (۱۱۶)

میں نے تو ان سے اور کچھ نہیں کہا مگر صرف وہی جو تو نے مجھ سے کہنے کو فرمایا تھا کہ تم اللہ کی بندگی اختیار کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔^(۲) میں ان پر گواہ رہا جب تک ان میں رہا۔ پھر جب تو نے مجھ کو اٹھا لیا تو تو ہی ان پر مطلع رہا۔^(۳) اور تو ہر چیز کی پوری خبر رکھتا ہے۔ (۱۱۷)

وَلَا تَأْسَفُ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُوفٍ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿۱۱۶﴾

مَا كُنْتُ عَلَيْكُمْ إِذْ مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ أَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الْوَهَّابُ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿۱۱۷﴾

(۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کتنے واضح الفاظ میں اپنی بابت علم غیب کی نفی فرما رہے ہیں۔

(۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے توحید و عبادت رب کی یہ دعوت عالم شیر خوارگی میں بھی دی، جیسا کہ سورہ مریم میں ہے اور عمر جوانی و کولت میں بھی۔

(۳) تَوَفَّيْتَنِي کا مطلب ہے جب تو نے مجھے دنیا سے اٹھالیا جیسا کہ اس کی تفصیل سورہ آل عمران کی آیت ۵۵ میں گزر چکی ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ پیغمبروں کو اتنا ہی علم ہوتا ہے جتنا اللہ کی طرف سے انہیں عطا کیا جاتا ہے یا جس کا مشاہدہ وہ اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں سے کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کو کسی بات کا علم نہیں ہوتا۔ جب کہ عالم الغیب وہ ہوتا ہے جسے بغیر کسی کے بتلائے ہر چیز کا علم ہوتا ہے اور اس کا علم ازل سے ابد تک پر محیط ہوتا ہے۔ یہ صفت علم اللہ کے سوا کسی اور کے اندر نہیں۔ اس لئے عالم الغیب صرف ایک اللہ ہی کی ذات ہے۔ اس کے علاوہ کوئی عالم الغیب نہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ میدان محشر میں نبی ﷺ کی طرف آپ کے کچھ امتی آنے لگیں گے تو فرشتے ان کو پکڑ کر دوسری طرف لے جائیں گے، آپ ﷺ فرمائیں گے ان کو آنے دو یہ تو میرے امتی ہیں، فرشتے آپ کو بتلائیں گے، إِنَّكَ لَا تَدْرِي مَا أَخَذْنَا بِعَدَاكَ (اے محمد! ﷺ) آپ ﷺ نہیں جانتے کہ آپ ﷺ کے بعد انہوں نے دین میں کیا کیا بدعتیں ایجاد کیں ”جب آپ ﷺ یہ سنیں گے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں بھی اس وقت یہی کہوں گا جو العبد الصالح (حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا) ﴿ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الْوَهَّابُ عَلَيْهِمْ ﴾ (صحیح بخاری، تفسیر سورہ المائدة و کتاب الأنبياء، صحیح مسلم، باب فناء الدنيا و بيان المحشر يوم القيامة)۔

اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف فرمادے تو تو زبردست ہے حکمت والا ہے۔ (۱۱۸)

اللہ ارشاد فرمائے گا کہ یہ وہ دن ہے کہ جو لوگ سچے تھے ان کا سچا ہونا ان کے کام آئے گا (۲) ان کو باغ ملیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور خوش اور یہ اللہ سے راضی اور خوش ہیں یہ بڑی (بھاری) کامیابی ہے۔ (۱۱۹)

اللہ ہی کی ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی اور ان چیزوں کی جو ان میں موجود ہیں اور وہ ہر شے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ (۱۲۰)

سورۃ الانعام کی ہے اس میں ایک سو پینٹھ آیتیں اور
میں رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو کہ نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے۔
تمام تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیوں اور نور کو بنایا (۳) پھر بھی کافر

إِنْ نَعَدُ لَهُمْ قَاتِلَهُمْ عِبَادًا وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ قَاتِلَ الَّذِينَ
الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ۝

قَالَ اللَّهُ هَذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي
مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا
عَنْ ذَلِكَ الْغَوْرُ الْعَظِيمُ ۝

يَلْبَسُونَكَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

سُورَةُ الْأَنْعَامِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

أَحْمَدُ يَلْبَسُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ
وَالنُّورَ فَكَرَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ ۝

(۱) یعنی مطلب یہ کہ یا اللہ! ان کا معاملہ تیری مشیت کے سپرد ہے، اس لئے کہ تُوَفَّقْنَا لِمَا بُرِيدُ بھی ہے، (جو چاہے کر سکتا ہے) اور تجھ سے کوئی باز پرس کرنے والا بھی نہیں ہے۔ ﴿لَا يُسْئَلُ عَنْمَا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ﴾ (الانبیاء- ۲۳) ”اللہ جو کچھ کرتا ہے، اس سے باز پرس نہیں ہوگی، لوگوں سے ان کے کاموں کی باز پرس ہوگی۔“ گویا آیت میں اللہ کے سامنے بندوں کی عاجزی و بے بسی کا اظہار بھی ہے اور اللہ کی عظمت و جلالت اور اس کے قادر مطلق اور مختار کل ہونے کا بیان بھی اور پھر ان دونوں باتوں کے حوالے سے عفو و مغفرت کی التجا بھی۔ سبحان اللہ! کسی عجب و بلیغ آیت ہے۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ ایک رات نبی ﷺ پر نوافل میں اس آیت کو پڑھتے ہوئے ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ بار بار ہر رکعت میں اسے ہی پڑھتے رہے، حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔ (مسند احمد جلد ۵، ص ۱۱۹)

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں يَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ تَوْحِيدَهُمْ وَوَعْدَهُمْ نَجَاتَهُمْ وَوَعْدَهُمْ نَجَاتَهُمْ وَوَعْدَهُمْ نَجَاتَهُمْ وہ دن ایسا ہوگا کہ صرف توحید ہی موحدین کو نفع پہنچائے گی، یعنی مشرکین کی معافی اور مغفرت کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

(۳) ظلمات سے رات کی تاریکی اور نور سے دن کی روشنی یا کفر کی تاریکی اور ایمان کی روشنی مراد ہے۔ نور ہے۔

لوگ (غیر اللہ کو) اپنے رب کے برابر قرار دیتے ہیں۔^(۱) وہ ایسا ہے جس نے تم کو مٹی سے بنایا^(۲) پھر ایک وقت معین کیا^(۳) اور (دوسرا) معین وقت خاص اللہ ہی کے نزدیک ہے^(۴) پھر بھی تم شک رکھتے ہو۔^(۵)

اور وہی ہے معبود برحق آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی، وہ تمہارے پوشیدہ احوال کو بھی اور تمہارے ظاہر احوال کو بھی جانتا ہے اور تم جو کچھ عمل کرتے ہو اس کو بھی جانتا ہے۔^(۶)

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلَكُمْ وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَنَا لَكُمْ أَنْتُمْ مَعْتَرُونَ ﴿۱﴾

وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ يَعْلَمُ بِزَكَاةِكُمْ وَجَهْرِكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُونَ ﴿۲﴾

مقابلے میں ظلمات کو جمع ذکر کیا گیا ہے، اس لئے کہ ظلمات کے اسباب بھی بہت سے ہیں اور اس کی انواع بھی متعدد ہیں اور نور کا ذکر بطور جنس ہے جو اپنی تمام انواع کو شامل ہے۔ (فتح القدیر) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ ہدایت اور ایمان کا راستہ ایک ہی ہے، چار یا پانچ یا متعدد نہیں ہیں، اس لئے نور کو واحد ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) یعنی اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔

(۲) یعنی تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو، جو تمہاری اصل ہیں اور جن سے تم سب نکلے ہو۔ اس کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم جو خوراک اور غذائیں کھاتے ہو، سب زمین سے پیدا ہوتی ہیں اور انہی غذاؤں سے نطفہ بنتا ہے جو رحم مادر میں جا کر تخلیق انسانی کا باعث بنتا ہے۔ اس لحاظ سے گویا تمہاری پیدائش مٹی سے ہوئی۔

(۳) یعنی موت کا وقت۔

(۴) یعنی آخرت کا وقت، اس کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ گویا پہلی اجل سے مراد پیدائش سے لے کر موت تک انسان کی عمر ہے اور دوسری اجل مسمیٰ ہے۔ مراد انسان کی موت سے لے کر وقوع قیامت تک دنیا کی کل عمر ہے، جس کے بعد وہ زوال و فنا سے دوچار ہو جائے گی اور ایک دوسری دنیا یعنی آخرت کی زندگی کا آغاز ہو جائے گا۔

(۵) یعنی قیامت کے وقوع میں جیسا کہ کفار و مشرکین کہا کرتے تھے کہ جب ہم مر کر مٹی میں مل جائیں گے تو کس طرح ہمیں دوبارہ زندہ کیا جاسکے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا دوبارہ بھی وہی اللہ تمہیں زندہ کرے گا (سورۃ یسین)

(۶) اہل سنت یعنی سلف کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود تو عرش پر ہے جس طرح اس کی شان کے لائق ہے لیکن اپنے علم کے لحاظ سے ہر جگہ ہے یعنی اس کے علم و خبر سے کوئی چیز باہر نہیں۔ البتہ بعض گمراہ فرقے اللہ تعالیٰ کو عرش پر نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے اور وہ اس آیت سے اپنے اس عقیدے کا اثبات کرتے ہیں۔ لیکن یہ عقیدہ جس طرح غلط ہے یہ استدلال بھی صحیح نہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذات جس کو آسمانوں اور زمین میں اللہ کہہ کر پکارا جاتا ہے اور آسمانوں اور زمین میں جس کی حکمرانی ہے اور آسمانوں اور زمین میں جس کو معبود برحق سمجھا اور

اور ان کے پاس کوئی نشانی بھی ان کے رب کی نشانیوں میں سے نہیں آتی مگر وہ اس سے اعراض ہی کرتے ہیں۔ (۴)

انہوں نے اس سچی کتاب کو بھی جھٹلایا جب کہ وہ ان کے پاس پہنچی، سو جلدی ہی ان کو خبر مل جائے گی اس چیز کی جس کے ساتھ یہ لوگ استہزا کیا کرتے تھے۔ (۵)

کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ہم ان سے پہلے کتنی جماعتوں کو ہلاک کر چکے ہیں جن کو ہم نے دنیا میں ایسی قوت دی تھی کہ تم کو وہ قوت نہیں دی اور ہم نے ان پر خوب بارشیں برسائیں اور ہم نے ان کے نیچے سے نہریں جاری کیں۔ پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کر ڈالا (۶) اور ان کے بعد دوسری جماعتوں کو پیدا کر دیا۔ (۷)

اور اگر ہم کانفر پر لکھا ہوا کوئی نوشتہ آپ پر نازل فرماتے پھر اس کو یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے تب بھی

وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِنَا إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿۴﴾

فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَسَوْفَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَانُوا فِيهَا يَتَّبِعُونَ ﴿۵﴾

الَّذِينَ كَذَّبُوا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَوْمٍ مَكَرُهُمْ فِي الْأَرْضِ مَالِكٌ يُحْكِنُ لَهُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ صُفْرًا وَجَعَلْنَا الْآلِهَةَ سَجْدَىٰ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَأَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَوْمًا آخَرِينَ ﴿۶﴾

وَلَوْ كُنَّا لَبَدَّلْنَا آيَاتِنَا كَمَا تَبَدَّلُوا فِي قَوْمِ آلِ فِرْعَوْنَ فَاسْتَوَتْ بِآيَاتِنَا فَكَلَّمْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَإِن هَذَا إِلَّا إِسْحَاقُ مُؤْمِنِينَ ﴿۷﴾

مانا جاتا ہے، وہ اللہ تمہارے پوشیدہ اور ظاہر اور جو کچھ تم عمل کرتے ہو، سب کو جانتا ہے۔ (فتح القدر) اس کی اور بھی بعض توجیہات کی گئی ہیں جنہیں اہل علم تفسیروں میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً تفسیر طبری وابن کثیر وغیرہ۔

(۱) یعنی اس اعراض اور تکذیب کا وبال انہیں پہنچے گا اس وقت انہیں احساس ہو گا کہ کاش! ہم اس کتاب برحق کی تکذیب اور اس کا استہزانہ کرتے۔

(۲) یعنی جب گناہوں کی پاداش میں تم سے پہلی امتوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں در آں حالیکہ وہ طاقت و قوت میں بھی تم سے کہیں زیادہ تھیں اور خوش حالی اور وسائل رزق کی فراوانی میں بھی تم سے بہت بڑھ کر تھیں، تو تمہیں ہلاک کرنا ہمارے لئے کیا مشکل ہے؟ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی قوم کی محض مادی ترقی اور خوش حالی سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ بہت کامیاب و کامران ہے۔ یہ استدراج و اممال کی وہ صورتیں ہیں جو بطور امتحان اللہ تعالیٰ قوموں کو عطا فرماتا ہے۔ لیکن جب یہ مملت عمل ختم ہو جاتی ہے تو پھر یہ ساری ترقیاں اور خوش حالیاں انہیں اللہ کے عذاب سے بچانے میں کامیاب نہیں ہوتیں۔

(۳) تاکہ انہیں بھی پچھلی قوموں کی طرح آزمائیں۔

یہ کافر لوگ یہی کہتے کہ یہ کچھ بھی نہیں مگر صریح جادو ہے۔^(۱) (۷)

اور یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا اور اگر ہم کوئی فرشتہ بھیج دیتے تو سارا قصہ ہی ختم ہو جاتا۔ پھر ان کو ذرا مہلت نہ دی جاتی۔^(۲) (۸)

وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكَ الْقُدُّوسِ
الَّذِينَ لَا يُبْطِرُونَ ۝

(۱) یہ ان کے عنادِ محمود اور مکابرہ کا اظہار ہے کہ اتنے واضح نوشتہ الہی کے باوجود وہ اسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے اور اسے ایک ساحرانہ کرتب قرار دیں گے۔ جیسے قرآن مجید کے دوسری مقام پر فرمایا گیا ہے۔ ﴿وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ وَيَعْرُجُونَ * لَقَالُوا إِنَّمَا سَكَبَ لَنَا مَلَكٌ مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا تَدْبُرُ الْآيَاتُ لِنَبْلُوهُمْ هَلْ يُؤْتُونَ السَّمَاءَ سَكَبًا يَكُونُ صَدَقًا ثُمَّ نُؤْتُهُم مِّنْهُ مِمَّا حَبِطَ إِلَى الْإِنسَانِ مِن ذُرَاهِ الظُّلُمِ ۝۱۳﴾ (الحجر، ۱۳) ”اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں اور یہ اس میں چڑھنے بھی لگ جائیں تب بھی کہیں گے ہماری آنکھیں متوالی ہو گئی ہیں بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے“ ﴿وَإِن يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَلْعَنُوا لِمِثَابِ كُرُومِهِمْ﴾ (الطور، ۳۴) ”اور اگر وہ آسمان سے گرتا ہوا ٹکڑا بھی دیکھ لیں تو کہیں گے کہ یہ بہت بادل ہیں“۔ یعنی عذاب الہی کی کوئی نہ کوئی ایسی توجیہ کر لیں گے کہ جس میں مشیت الہی کا کوئی دخل انہیں تسلیم کرنا نہ پڑے۔ حالانکہ کائنات میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی مشیت سے ہوتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے جتنے بھی انبیاء و رسل بھیجے وہ انسانوں میں سے ہی تھے اور ہر قوم میں اسی کے ایک فرد کو وحی و رسالت سے نوازا جاتا تھا۔ یہ اس لئے کہ اس کے بغیر کوئی رسول فریضہ تبلیغ و دعوت ادا ہی نہیں کر سکتا تھا، مثلاً اگر فرشتوں کو اللہ تعالیٰ رسول بنا کر بھیجتا تو ایک تو وہ انسانی زبان میں گفتگو ہی نہ کر پاتے دوسرے وہ انسانی جذبات سے عاری ہونے کی وجہ سے انسان کے مختلف حالات میں مختلف کیفیات و جذبات کے سمجھنے سے بھی قاصر رہتے۔ ایسی صورت میں ہدایت و رہنمائی کا فریضہ کس طرح انجام دے سکتے تھے؟ اس لئے اللہ تعالیٰ کا انسانوں پر ایک بڑا احسان ہے کہ اس نے انسانوں کو ہی نبی اور رسول بنایا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی اسے بطور احسان ہی قرآن کریم میں ذکر فرمایا ہے ﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ﴾ (آل عمران، ۱۶۴) ”اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان فرمایا جب کہ انہی کی جانوں میں سے ایک شخص کو رسول بنا کر بھیجا“، لیکن پیغمبروں کی بشریت کافروں کے لیے حیرت و استعجاب کا باعث رہی۔ وہ سمجھتے تھے کہ رسول انسانوں میں سے نہیں، فرشتوں میں سے ہونا چاہئے گویا ان کے نزدیک بشریت رسالت کے شایان شان نہیں تھی۔ جیسا کہ آج کل کے اہل بدعت بھی یہی سمجھتے ہیں۔ نَسَبَهُنَّ فُلُوهُنَّ اہل کفر و شرک، رسولوں کی بشریت کا تو انکار کر نہیں سکتے تھے، کیونکہ وہ ان کے خاندان، حسب نسب ہر چیز سے واقف ہوتے تھے لیکن رسالت کا وہ انکار کرتے رہے۔ جبکہ آج کل کے اہل بدعت رسالت کا انکار تو نہیں کرتے لیکن بشریت کو رسالت کے منافی سمجھنے کی وجہ سے رسولوں کی بشریت کا انکار کرتے ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرما رہا ہے کہ اگر ہم کافروں کے مطالبے پر کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے یا اس رسول کی تصدیق کے

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبَسُونَ ﴿٩﴾

اور اگر ہم اس کو فرشتہ تجویز کرتے تو ہم اس کو آدمی ہی بناتے اور ہمارے اس فعل سے پھر ان پر وہی اشکال ہوتا جو اب اشکال کر رہے ہیں۔ (۹)

اور واقعی آپ سے پہلے جو پیغمبر ہوئے ہیں ان کے ساتھ بھی استہزا کیا گیا ہے۔ پھر جن لوگوں نے ان سے مذاق کیا تھا ان کو اس عذاب نے آگھیرا جس کا تمسخر اڑاتے تھے۔ (۱۰)

آپ فرما دیجئے کہ ذرا زمین میں چلو پھرو پھر دیکھ لو کہ تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا۔ (۱۱)

آپ کہئے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجود ہے یہ سب کس کی ملکیت ہے، آپ کہہ دیجئے کہ سب اللہ ہی کی ملکیت ہے، اللہ نے مہربانی فرمانا اپنے اوپر لازم فرمایا ہے (۱۲) تم کو اللہ قیامت کے روز جمع کرے گا، اس میں کوئی شک نہیں، جن لوگوں نے اپنے آپ کو گھائے میں ڈالا ہے سو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (۱۳)

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظروا كيف كان عاقبة المكدبين ﴿١١﴾

قُلْ لئن مآبى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ قُلْ بَلْهَ كَتَبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لِيَجْزِيََكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لِأَنْتُمْ بِنِعْمَةِ اللَّهِ بَيْنَ خَيْرِ مَا أَنْفَسْتُمْ فِيهِمْ لِأَنْتُمْ بِنِعْمَةِ اللَّهِ ﴿١٢﴾

لئے ہم کوئی فرشتہ نازل کر دیتے (جیسا کہ یہاں یہی بات بیان کی گئی ہے) اور پھر وہ اس پر ایمان نہ لاتے تو انہیں مہلت دینے بغیر ہلاک کر دیا جاتا۔

(۱) یعنی اگر ہم فرشتے ہی کو رسول ﷺ بنا کر بھیجے گا فیصلہ کرتے تو ظاہر بات ہے کہ وہ فرشتے کی اصل شکل میں تو آئیں سکتا تھا، کیونکہ اس طرح انسان اس سے خوف زدہ ہونے اور قریب و مانوس ہونے کے بجائے، دور بھاگے اس لئے ناگزیر تھا کہ اسے انسانی شکل میں بھیجا جاتا۔ لیکن یہ تمہارے لیڈر پھر یہی اعتراض اور شبہ پیش کرتے کہ یہ تو انسان ہی ہے، جو اس وقت بھی وہ رسول کی بشریت کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں تو پھر فرشتے کے بھیجے کا بھی کیا فائدہ؟

(۲) جس طرح حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا ”جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو عرش پر یہ لکھ دیا إِنَّ رَحْمَتِي تَغْلِبُ غَضَبِي (صحیح بخاری، کتاب التوحید، وبدء الخلق، مسلم کتاب التوبة) ”یقیناً میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے“ لیکن یہ رحمت قیامت والے دن صرف اہل ایمان کے لئے ہوگی، کافروں کے لئے رب سخت غضب ناک ہو گا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تو اس کی رحمت یقیناً عام ہے، جس سے مومن اور کافر نیک اور بد، فرماں بردار اور نافرمان سب ہی فیض یاب ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کی بھی روزی نافرمانی کرنے کی وجہ سے بند

اور اللہ ہی کی ملک ہیں وہ سب کچھ جو رات میں اور دن میں رہتی ہیں اور وہی بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے۔ (۱۳)

آپ کہتے کہ کیا اللہ کے سوا، جو کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور جو کہ کھانے کو دیتا ہے اور اس کو کوئی کھانے کو نہیں دیتا، اور کسی کو معبود قرار دوں،^(۱) آپ فرما دیجئے کہ مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے میں اسلام قبول کروں اور تو مشرکین میں سے ہرگز نہ ہونا۔ (۱۳)

آپ کہہ دیجئے کہ میں اگر اپنے رب کا کمانہ مانوں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔^(۲) (۱۵)
جس شخص سے اس روز وہ عذاب ہٹا دیا جائے تو اس پر اللہ نے ہزار حم کیا اور یہ صریح کامیابی ہے۔^(۳) (۱۶)
اور اگر تجھ کو اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کا دور کرنے والا سوا اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں۔ اور اگر تجھ

وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي الْغَيْبِ وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۰﴾

قُلْ أَغْيَرُ اللَّهُ أَجْعِدُ وَيَلْبِغُ قَاطِرُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ يُظَعِّمُهُمْ وَيَأْكُلُهُمْ فُلٌ إِيَّائِي أَمْرًا أَنْ أَكُونَ أَكَلًا مِّنْ أَسْلَمَ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۰﴾

قُلْ إِيَّائِي تَخَافُونَ إِن عَصَيْتُمْ رَبِّي عَذَابٌ يَوْمَ عَظِيمٍ ﴿۱۰﴾

مَنْ يُضَرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْنَا وَذَلِكَ الْقُورُ الْمُهَيَّيْنُ ﴿۱۰﴾

وَأَنْ يَسْسَسَكَ اللَّهُ بَصُورًا فَلَا يَكْشِفُ لَهٗ إِلَّا هُوَ وَإِنْ

نہیں کرتا، لیکن اس کی رحمت کا یہ عموم صرف دنیا کی حد تک ہے۔ آخرت میں جو کہ دارالجزا ہے، وہاں اللہ کی صفت عدل کا کامل ظہور ہو گا جس کے نتیجے میں اہل ایمان و امان رحمت میں جگہ پائیں گے اور اہل کفر و فسق جہنم کے دائمی عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔ اسی لئے قرآن میں فرمایا گیا ہے۔ ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَلْتُهُمُ اللَّذِينَ يَتَّبِعُونَ أَوْلَادَهُمْ لِيَنصُرُوا لَهُمْ إِن يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَوَاتِ مَاءً سَاطِعًا فَيَأْتُواكُم مِّنَ الْجِبَالِ يَذُرُّونَ﴾ (الأعراف: ۱۵۶) اور میری رحمت تمام اشیاء پر محیط ہے۔ تو وہ رحمت ان لوگوں کے نام ضرور لکھوں گا جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

(۱) دُئِبٌ سے مراد یہاں معبود ہے جیسا کہ ترجمہ سے واضح ہے ورنہ دوست بنانا تو جائز ہے۔

(۲) یعنی اگر میں نے بھی رب کی نافرمانی کرتے ہوئے اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو معبود بنالیا تو میں بھی اللہ کے عذاب سے نہیں بچ سکوں گا۔

(۳) جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿فَمَنْ ذُخِرْتُمْ عَنْ النَّارِ وَأَدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ قَانَ﴾ (آل عمران: ۱۸۵) ”جو آگ سے دور اور جنت میں داخل کر دیا گیا، وہ کامیاب ہو گیا“ اس لئے کہ کامیابی، خسارے سے بچ جانے اور نفع حاصل کر لینے کا نام ہے۔ اور جنت سے بڑھ کر نفع کیا ہو گا؟

کو اللہ تعالیٰ کوئی نفع پہنچائے تو وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔ (۱۷)

اور وہی اللہ اپنے بندوں کے اوپر غالب ہے برتر ہے اور وہی بڑی حکمت والا اور پوری خبر رکھنے والا ہے۔ (۱۸)

آپ کہتے کہ سب سے بڑی چیز گواہی دینے کے لئے کون ہے، آپ کہتے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے (۳) اور میرے پاس یہ قرآن بطور وحی کے بھیجا گیا ہے تاکہ میں اس قرآن کے ذریعہ سے تم کو اور جس جس کو یہ قرآن پہنچے ان سب کو ڈراؤں (۴) کیا تم سچ سچ یہی گواہی دو گے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ میں تو گواہی نہیں دیتا۔ آپ فرما دیجئے کہ بس وہ تو ایک ہی معبود ہے اور بے شک میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ (۱۹)

يَسِّرْكَ يَغْيِرْ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۷﴾

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ﴿۱۸﴾

قُلْ أَيْ شَيْءٍ أَنْبَأْتُكُمْ بِشَهَادَةِ قُلُوبِ اللَّهِ سَهْبًا يُبَيِّنُ وَيُنَبِّئُكُمْ
وَأَوْحَىٰ إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ لِأَنَّكَ رُكِبَ بِهِ وَمَنْ يَكْفُرْ أَتَيْتَهُ
لِتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ قُلْ لَا أَشْهَدُ قُلُوبَنَا
هُوَ إِلَهُ الْوَاحِدُ وَالَّذِينَ يَبْرئُونَ مِمَّا آتَيْنَاهُم مِّنْ

(۱) یعنی نفع و ضرر کا مالک، کائنات میں ہر طرح کا تصرف کرنے والا صرف اللہ ہے اور اس کے حکم و قضا کو کوئی رد کرنے والا نہیں ہے۔ ایک حدیث میں اس مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ اللَّهُمَّ لَا مَنَاعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا مُعْطِي لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ (صحیح بخاری، کتاب الاعتصام والقدور والدعوات۔ مسلم کتاب الصلوٰۃ والمساجد) ”جس کو تو دے اس کو کوئی روکنے والا نہیں، اور جس سے تو روک لے اس کو کوئی دینے والا نہیں اور کسی صاحب حیثیت کو اس کی حیثیت تیرے مقابلے میں نفع نہیں پہنچا سکتی“ نبی ﷺ ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

(۲) یعنی تمام گردنیں اس کے سامنے جھکی ہوئی ہیں، بڑے بڑے جابر لوگ اس کے سامنے بے بس ہیں، وہ ہر چیز پر غالب ہے اور تمام کائنات اس کی مطیع ہے وہ اپنے ہر کام میں حکیم ہے اور ہر چیز سے باخبر ہے، پس اسے معلوم ہے کہ اس کے احسان و عطا کا کون مستحق ہے اور کون غیر مستحق۔

(۳) یعنی اللہ تعالیٰ ہی اپنی وحدانیت اور ربوبیت کا سب سے بڑا گواہ ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی گواہ نہیں۔

(۴) ربیع بن انس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اب جس کے پاس بھی یہ قرآن پہنچ جائے۔ اگر وہ سچا متبع رسول ہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ بھی لوگوں کو اللہ کی طرف اسی طرح بلائے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو دعوت دی اور اس طرح ڈرائے جس طرح آپ ﷺ نے لوگوں کو ڈرایا۔ (ابن کثیر)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ لوگ رسول کو پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنے آپ کو گھائے میں ڈالا ہے سو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (۲۰)^(۱)

اور اس سے زیادہ بے انصاف کون ہو گا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بتانے یا اللہ کی آیات کو جھوٹا بتلائے (۲)^(۲) ایسے بے انصافوں کو کامیابی نہ ہوگی۔ (۲۱)^(۳)

اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جس روز ہم ان تمام خلائق کو جمع کریں گے، پھر ہم مشرکین سے کہیں گے کہ تمہارے وہ شرکا، جن کے معبود ہونے کا تم دعویٰ کرتے تھے، کہاں گئے؟۔ (۲۲)

الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ كَفَرُوا كَمَا يَعْرِفُونَ آبَاءَهُمْ
الَّذِينَ كَفَرُوا أَنفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۲۰﴾

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ إِنَّهُ
لَأَرْسِلُهُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۱﴾

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَبَابِثًا تَتَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مِين
سُرْرًا وَاكْذِبُوا الَّذِينَ كُنْتُمْ تُزْعَمُونَ ﴿۲۲﴾

(۱) يَعْرِفُونَهُ میں ضمیر کا مرجع رسول ﷺ ہیں یعنی اہل کتاب آپ ﷺ کو اپنے بیٹوں کی طرح پہچانتے ہیں کیونکہ آپ ﷺ کی صفات ان کی کتابوں میں بیان کی گئی تھیں اور ان صفات کی وجہ سے وہ آخری نبی کے منتظر بھی تھے۔ اس لئے اب ان میں سے ایمان نہ لانے والے سخت خسارے میں ہیں کیونکہ یہ علم رکھتے ہوئے بھی انکار کر رہے ہیں۔

فَإِنْ كُنْتَ لَا تَدْرِي فِتْنَتِكَ مُصِيبَةً * وَإِنْ كُنْتَ تَدْرِي فَالْمُصِيبَةُ أَعْظَمُ.

(اگر تجھے علم نہیں ہے تو یہ بھی اگرچہ مصیبت ہی ہے تاہم اگر علم ہے تو پھر زیادہ بڑی مصیبت ہے)

(۲) یعنی جس طرح اللہ پر جھوٹ گھڑنے والا (یعنی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والا) سب سے بڑا ظالم ہے، اسی طرح وہ بھی بڑا ظالم ہے جو اللہ کی آیات اور اس کے سچے رسول کی تکذیب کرے۔ جھوٹے دعوائے نبوت پر اتنی سخت وعید کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ متعدد لوگوں نے ہر دور میں نبوت کے جھوٹے دعوے کئے ہیں اور یوں یقیناً نبی ﷺ کی یہ پیش گوئی پوری ہو گئی کہ تیس جھوٹے دجال ہونگے۔ ہر ایک کا دعویٰ ہو گا کہ وہ نبی ہے۔ گذشتہ صدی میں بھی قادیان کے ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور آج اس کے پیروکار اسے اس لئے سچا نبی اور بعض مسیح موعود مانتے ہیں کہ اسے ایک قلیل تعداد نبی مانتی ہے۔ حالانکہ کچھ لوگوں کا کسی جھوٹے کو سچا مان لینا، اس کی سچائی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ صداقت کے لئے تو قرآن و حدیث کے واضح دلائل کی ضرورت ہے۔

(۳) جب یہ دونوں ہی ظالم ہیں تو نہ مفتری (جھوٹ گھڑنے والا) کامیاب ہو گا اور نہ کذب (جھٹلانے والا) اس لئے ضروری ہے کہ ہر ایک اپنے انجام پر اچھی طرح غور کر لے۔

تَحَلَّوْا بَعْدَ ذَلِكَ مِنْهُمْ وَالَّذِينَ قَالُوا وَاللَّهِ رَبُّنَا مَا كُنَّا
مُشْرِكِينَ ﴿۲۳﴾

أَنْظُرْ كَيْفَ كَذَّبُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَصَلَّ عَنْهُمْ
مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۲۴﴾

وَمَنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ
يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا وَإِنْ يَرَوْا كَلِمًا إِلَيْكَ لِؤُمُوًا
بِهَا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ
هَذَا إِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۲۵﴾

پھر ان کے شرک کا انجام اس کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو گا
کہ وہ یوں کہیں گے کہ قسم اللہ کی اپنے پروردگار کی ہم
مشرک نہ تھے۔ (۲۳)

ذرا دیکھو تو انہوں نے کس طرح جھوٹ بولا اپنی جانوں پر
اور جن چیزوں کو وہ جھوٹ موٹ تراشا کرتے تھے وہ
سب غائب ہو گئے۔ (۲۴)

اور ان میں بعض ایسے ہیں کہ آپ کی طرف کان لگاتے
ہیں (۲۵) اور ہم نے ان کے دلوں پر پردہ ڈال رکھا ہے اس
سے کہ وہ اس کو سمجھیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ
دے رکھی ہے (۲۵) اور اگر وہ لوگ تمام دلائل کو دیکھ لیں
تو بھی ان پر کبھی ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ جب یہ
لوگ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ سے خواہ مخواہ

(۱) فتنہ کے ایک معنی حجت اور ایک معنی معذرت کے کئے گئے ہیں۔ بالآخر یہ حجت یا معذرت پیش کر کے چھٹکارا حاصل
کرنے کی کوشش کریں گے کہ ہم تو مشرک ہی نہ تھے۔ اور امام ابن جریر نے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں ثُمَّ لَمْ يَتَّخِذُوا
فِيهِمْ عِنْدَ فِتْنَتِنَا إِثْمًا أَعْتَادُوا مِمَّا سَلَفَتْ مِنْهُمْ مِنَ الشِّرْكِ بِاللَّهِ۔ (جب ہم انہیں سوال کی بھیجی میں
جھوٹیں گے تو دنیا میں انہوں نے جو شرک کیا، اس کی معذرت کے لئے یہ کئے بغیر ان کے لئے چارہ نہیں ہو گا کہ ہم تو
مشرک ہی نہ تھے) یہاں یہ اشکال پیش نہ آئے کہ وہاں تو انسانوں کے ہاتھ پیر گواہی دیں گے اور زبانوں پر تو میرں لگادی
جائیں گی، پھر یہ انکار کس طرح کریں گے؟ اس کا جواب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ دیا ہے کہ جب مشرکین دیکھیں
گے کہ اہل توحید مسلمان جنت میں جا رہے ہیں تو یہ باہم مشورہ کر کے اپنے شرک کرنے سے ہی انکار کر دیں گے۔ تب
اللہ تعالیٰ ان کے مومنوں پر مہر لگا دے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں جو کچھ انہوں نے کیا ہو گا اس کی گواہی دیں گے اور پھر یہ
اللہ سے کوئی بات چھپانے پر قادر نہ ہو سکیں گے۔ (ابن کثیر)

(۲) لیکن وہاں اس کذب صریح کا کوئی فائدہ انہیں نہیں ہو گا، جس طرح بعض دفعہ دنیا میں انسان ایسا محسوس کرتا ہے۔
اسی طرح ان کے معبودان باطل بھی، جن کو وہ اللہ کا شریک اپنا سماجیتی ومددگار اور سفارشی سمجھتے تھے، غائب ہوں گے اور
وہاں ان پر شرک کی حقیقت واضح ہوگی، لیکن وہاں اس کے ازالے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

(۳) یعنی یہ مشرکین آپ کے پاس آکر قرآن تو سنتے ہیں لیکن چونکہ مقصد طلب ہدایت نہیں، اس لئے بے فائدہ ہے۔
(۴) علاوہ ازیں مُجَازَاةً عَلٰی كُفْرِهِمْ ان کے کفر کے نتیجے میں ان کے دلوں پر بھی ہم نے پردے ڈال دیئے ہیں اور
ان کے کانوں میں ڈاٹ جس کی وجہ سے ان کے دل حق بات سمجھنے سے قاصر اور ان کے کان حق کو سننے سے عاجز ہیں۔

جھڑتے ہیں، یہ لوگ جو کافر ہیں یوں کہتے ہیں کہ یہ تو کچھ بھی نہیں صرف بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے چلی آ رہی ہیں۔ (۲۵)^(۱)

اور یہ لوگ اس سے دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور دور رہتے ہیں^(۲) اور یہ لوگ اپنے ہی کو تباہ کر رہے ہیں اور کچھ خبر نہیں رکھتے۔ (۲۶)^(۳)

اور اگر آپ اس وقت دیکھیں جب کہ یہ دوزخ کے پاس کھڑے کئے جائیں^(۴) تو کہیں گے ہائے کیا اچھی بات ہو کہ ہم پھر واپس بھیج دیئے جائیں اور اگر ایسا ہو جائے تو ہم اپنے رب کی آیات کو جھوٹا نہ بتلائیں اور ہم ایمان والوں میں سے ہو جائیں۔ (۲۷)^(۵)

بلکہ جس چیز کو اس کے قبل چھپایا کرتے تھے وہ ان کے سامنے آگئی ہے^(۶) اور اگر یہ لوگ پھر واپس بھیج دیئے

وَهُمْ يَهَيِّجُونَ عَنْهُ وَيَنْهَوْنَ عَنْهُ وَإِنْ يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَيَسْخَرُونَ ﴿۲۵﴾

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ ذُقُوا إِلَىٰ النَّارِ فَقَالُوا الْبَيْتَاتُ نَارُؤُذُ وَلَا تَكْذِبْ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَتَكُونُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲۶﴾

بَلْ بَدَأَ اللَّهُ مَا كَانُوا يَخْفَوْنَ مِنْ قَبْلُ وَكَوْذُؤُا الْعَادُؤُا

(۱) اب وہ گمراہی کی ایسی دلدل میں پھنس گئے ہیں کہ بڑے سے بڑا معجزہ بھی دیکھ لیں، تب بھی ایمان لانے کی توفیق سے محروم رہیں گے اور ان کا عناد و محود اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ قرآن کریم کو پہلے لوگوں کی بے سند کہانیاں کہتے ہیں۔

(۲) یعنی عام لوگوں کو آپ ﷺ سے اور قرآن سے روکتے ہیں تاکہ وہ ایمان نہ لائیں اور خود بھی دور دور رہتے ہیں۔

(۳) لیکن لوگوں کو روکنا اور خود بھی دور رہنا، اس سے ہمارا یا ہمارے پیغمبر ﷺ کا کیا بگڑے گا؟ اس طرح کے کام کر کے وہ خود ہی بے شعوری میں اپنی ہلاکت کا سامان کر رہے ہیں۔

(۴) یہاں لوگ کا جواب محذوف ہے تقدیری عبارت یوں ہوگی ”تو آپ کو ہولناک منظر نظر آئے گا“

(۵) لیکن وہاں سے دوبارہ دنیا میں آنا ممکن ہی نہیں ہو گا کہ وہ اپنی اس آرزو کی تکمیل کر سکیں۔ کافروں کی اس آرزو کا قرآن نے متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ مثلاً ﴿رَبِّنَا أَخْرَجْنَا مِنْهَا قَانِ عَدَانَا قَانَا ظَلْمُونَ * قَالَ احْسَبُوا مِنَّا وَلَا تَحْكُمُونَ﴾

(المؤمنون - ۱۰۸ - ۱۰۷) ”اے ہمارے رب! ہمیں اس جہنم سے نکال لے اگر ہم دوبارہ تیری نافرمانی کریں تو یقیناً ظالم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا“ اسی میں ذیل و خوار پڑے رہو، مجھ سے بات نہ کرو۔ ﴿رَبِّنَا أَخْرَجْنَا مِنْهَا قَانِ عَدَانَا قَانَا ظَلْمُونَ﴾

فَأَرْجَمْنَا قَانِ صَالِحًا إِذَا مَوْتُونَ ﴿۱۳﴾ (الم السجدة - ۱۳) ”اے ہمارے رب ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا“ پس ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیج دے تاکہ ہم نیک عمل کریں، اب ہمیں یقین آگیا ہے۔“

(۶) بل جو اضراب (یعنی پہلی بات سے گریز کرنے) کے لئے آتا ہے۔ اس کے کئی مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ (۱) ان کے لئے وہ کفر اور عناد و تکذیب ظاہر ہو جائے گی، جو اس سے قبل وہ دنیا یا آخرت میں چھپاتے تھے۔ یعنی جس کا انکار

لِيَأْمُرُوا عَنَّهُ وَأَنَّهُمْ لَكَذِبُونَ ﴿۳۸﴾

وَقَالُوا إِن هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ﴿۳۹﴾

وَلَوْ تَرَى إِذُوقُوا عَذَابَ رَبِّهِمْ قَالُوكَ أَلَيْسَ هَذَا الَّذِي كُنَّا نَقُولُ أَلَمْ نَكْفُرْ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۴۰﴾

فَدَخَلَ الْجَنَّةَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيَلْقُوا أَهْلَهُمْ أَصْحَابَهُمْ فَكَانَ عَذَابُكَ أَشَدَّ مِنْهُم وَلَهُمْ فِيهَا زُجُجٌ كَثِيرٌ سَاءَ لِمَنْ كَفَرَ بِهِمْ آلُؤَاءُ مَا يُرِيدُونَ ﴿۴۱﴾

جائیں تب بھی یہ وہی کام کریں گے جس سے ان کو منع کیا گیا تھا اور یقیناً یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ (۳۸)

اور یہ کہتے ہیں کہ صرف یہی دنیاوی زندگی ہماری زندگی ہے اور ہم زندہ نہ کئے جائیں گے۔ (۳۹)

اور اگر آپ اس وقت دیکھیں جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے۔ اللہ فرمائے گا کہ کیا یہ امر واقعی نہیں ہے؟ وہ کہیں گے بے شک قسم اپنے رب کی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو اب اپنے کفر کے عوض عذاب چکھو۔ (۳۰)

بے شک خسارہ میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے ملنے کی تکذیب کی، یہاں تک کہ جب وہ معین وقت ان پر دفعتاً آ پہنچے گا، کہیں گے کہ ہائے افسوس ہماری کوتاہی پر جو اس کے بارے میں ہوئی، اور حالت ان کی یہ ہوگی کہ وہ اپنے بار اپنی پیٹھوں پر لا دے ہوں گے، خوب سن لو کہ بری ہوگی وہ چیز جس کو وہ لا دیں گے۔ (۳۱)

کرتے تھے، جیسے وہاں بھی ابتداءً کہیں گے ﴿مَا لَكُمْ مُشْرِكِينَ﴾ (ہم تو مشرک ہی نہ تھے) (۲) یا رسول اللہ ﷺ اور قرآن کریم کی صداقت کا علم جو ان کے دلوں میں تھا، لیکن اپنے پیروکاروں سے چھپاتے تھے۔ وہاں ظاہر ہو جائے گا۔ (۳) یا منافقین کا وہ نفاق وہاں ظاہر ہو جائے گا جسے وہ دنیا میں اہل ایمان سے چھپاتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

(۱) یعنی دوبارہ دنیا میں آنے کی خواہش ایمان لانے کے لئے نہیں، صرف عذاب سے بچنے کے لئے ہے، جو ان پر قیامت کے دن ظاہر ہو جائے گا اور جس کا وہ معاشرہ کر لیں گے ورنہ اگر یہ دنیا میں دوبارہ بھیج دیئے جائیں تب بھی یہ وہی کچھ کریں گے جو پہلے کرتے رہے ہیں۔

(۲) یہ بَغْتٌ بَغْدٌ النُّوْبِ (مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے) کا انکار ہے جو ہر کافر کرتا ہے اور اس حقیقت سے انکار ہی دراصل ان کے کفر و عصیان کی سب سے بڑی وجہ ہے ورنہ اگر انسان کے دل میں صحیح معنوں میں اس عقیدہ آخرت کی صداقت راسخ ہو جائے تو کفر و عصیان کے راستے سے فوراً تائب ہو جائے۔

(۳) یعنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لینے کے بعد تو وہ اعتراف کر لیں گے کہ آخرت کی زندگی واقعی برحق ہے۔ لیکن وہاں اس اعتراف کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا اور اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا کہ اب تو اپنے کفر کے بدلے میں عذاب کا مزہ چکھو۔

(۴) اللہ کی ملاقات کی تکذیب کرنے والے جس خسارے اور نامرادی سے دوچار ہوں گے اپنی کوتاہیوں پر جس طرح

اور دنیاوی زندگی تو کچھ بھی نہیں بجز لہو و لعب کے۔
اور دارِ آخرت متقیوں کے لئے بہتر ہے۔ کیا تم سوچتے
سمجھتے نہیں ہو۔ (۳۲)

ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان کے اقوال منعموم
کرتے ہیں، سو یہ لوگ آپ کو جھوٹا نہیں کہتے لیکن یہ
ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ (۳۳)^(۱)

اور بہت سے پیغمبر جو آپ سے پہلے ہوئے ہیں ان کی بھی
کھذیب کی جاچکی ہے سو انہوں نے اس پر صبر ہی کیا، ان
کی کھذیب کی گئی اور ان کو ایذا میں پہنچائی گئیں یہاں
تک کہ ہماری امداد ان کو پہنچی (۲) اور اللہ کی باتوں کا کوئی

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَلَكِنَّ الْآخِرَةَ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ
يَعْقُونَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۳۲﴾

قَدْ عَلِمْنَا أَنَّهُ لَيْحٌ نُّكَ الْذِي يُؤُولُونَ ۖ وَاللَّهُمَّ
لَا يَكْذِبُونَكَ ۖ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿۳۳﴾

وَلَقَدْ كَذَّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا
وَإِذْ وَاحٍ حَتَّىٰ أَنصَبَهُمْ صُرًى ثُمَّ أَنَاؤًا لِّكُمِبٍ ۖ إِنَّ اللَّهَ
وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبَائِ الْمُرْسَلِينَ ﴿۳۳﴾

نامد ہوں گے اور برے اعمال کا جو بوجھ اپنے اوپر لادے ہوں گے آیت میں اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے فَرَطْنَا فِيهَا میں
ضمیر الساعۃ کی طرف راجع ہے یعنی قیامت کی تیاری اور تصدیق کے معاملے میں جو کو تاہی ہم سے ہوئی۔ یا الصَّفْقَةُ
(سودا) کی طرف راجع ہے، جو اگرچہ عبارت میں موجود نہیں ہے لیکن سیاق اس پر دلالت کتا ہے۔ اس لئے کہ نقصان
سودے میں ہی ہوتا ہے اور مراد اس سودے سے وہ ہے جو ایمان کے بدلے کفر خرید کر انہوں نے کیا۔ یعنی یہ سودا کر
کے ہم نے سخت کو تاہی کی یا حَیَاةَ کی طرف راجع ہے یعنی ہم نے اپنی زندگی میں برائیوں اور کفر و شرک کا ارتکاب
کر کے جو کو تاہیاں کیں۔ (فتح القدر)

(۱) نبی ﷺ کو کفار کی طرف سے اپنی کھذیب کی وجہ سے جو غم و حزن پہنچتا، اس کے ازالے اور آپ کی تسلی کے لئے
فرمایا جا رہا ہے کہ یہ کھذیب آپ کی نہیں۔ (آپ کو تو وہ صادق و امین مانتے ہیں) دراصل یہ آیات الہی کی کھذیب ہے
اور یہ ایک ظلم ہے۔ جس کا وہ ارتکاب کر رہے ہیں۔ ترمذی وغیرہ کی ایک روایت میں ہے کہ ابو جہل نے ایک بار
رسول اللہ ﷺ سے کہا اے محمد (ﷺ)! ہم تم کو نہیں بلکہ جو کچھ تم لے کر آئے ہو اس کو جھٹلاتے ہیں۔ اس پر یہ
آیت نازل ہوئی۔ ترمذی کی یہ روایت اگرچہ سنداً ضعیف ہے لیکن دوسری صحیح روایات سے اس امر کی تصدیق ہوتی
ہے کہ کفار مکہ نبی ﷺ کی امانت و دیانت اور صداقت کے قائل تھے، لیکن اس کے باوجود وہ آپ ﷺ کی رسالت پر
ایمان لانے سے گریزاں رہے۔ آج بھی جو لوگ نبی ﷺ کے حسن اخلاق، رفعت کردار اور امانت و صداقت کو تو خوب
جھوم جھوم کر بیان کرتے اور اس موضوع پر فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہیں لیکن اتباع رسول ﷺ میں وہ
انقباض محسوس کرتے آپ کی بات کے مقابلے میں فقہ و قیاس اور اقوال ائمہ کو ترجیح دیتے ہیں، انہیں سوچنا چاہیے کہ یہ
کس کا کردار ہے جسے انہوں نے اپنایا ہوا ہے؟

(۲) نبی ﷺ کی مزید تسلی کے لئے کہا جا رہا ہے کہ یہ پہلا واقعہ نہیں ہے کہ کافر اللہ کے پیغمبر کا انکار کر رہے ہیں بلکہ

بدلنے والا نہیں^(۱) اور آپ کے پاس بعض پیغمبروں کے بعض خبریں پہنچ چکی ہیں۔^(۲) (۳۳)

اور اگر آپ کو ان کا اعراض گراں گزر رہا ہے تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ لو پھر کوئی معجزہ لے آؤ تو کرو اور اگر اللہ کو منظور ہو تا تو ان سب کو راہ راست پر جمع کر دیتا^(۳) سو آپ نادانوں میں سے نہ ہو جائیے۔^(۴) (۳۵)

وَلَنْ كَانَ كَذِبًا عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْحَثَ
تَفَقَّافِي الْأَرْضِ أَوْ سَمَكًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ وَكَوَسَاءَ اللَّهِ
لِجَمْعِهِمْ عَلَى الْهُدَىٰ فَلَا تَكُونُ مِنَ الْإِجْهَالِينَ ﴿۳۵﴾

اس سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں جن کی تکذیب کی جاتی رہی ہے۔ پس آپ بھی ان کی اقتدا کرتے ہوئے اسی طرح صبر اور حوصلے سے کام لیں جس طرح انہوں نے تکذیب اور ایذا پر صبر سے کام لیا، حتیٰ کہ آپ کے پاس بھی اسی طرح ہماری مدد آجائے، جس طرح پہلے رسولوں کی ہم نے مدد کی اور ہم اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتے۔ ہم نے وعدہ کیا ہوا ہے ﴿وَإِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَتَالِيَنَ أَمْنًا﴾ (المؤمن - ۵۱) ”یقیناً ہم اپنے پیغمبروں اور اہل ایمان کی مدد کریں گے“ ﴿كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي﴾ (المجادلة - ۲۱) ”اللہ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب رہیں گے“ وَغَيْرَ هَٰمِئِنَ الْآيَاتِ . (مَثَلًا لِلصَّافَاتِ - ۱۷۱، ۱۷۲)

- (۱) بلکہ اس کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا کہ آپ کافروں پر غالب و منصور رہیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔
- (۲) جن سے واضح ہے کہ ابتدا میں گو ان کی قوموں نے انہیں جھٹلایا، انہیں ایذا نہیں پہنچائیں اور ان کے لئے عرصہ حیات تنگ کر دیا، لیکن بالآخر اللہ کی نصرت سے کامیابی و کامرانی اور نجات ابدی انہی کا مقدر رہی۔
- (۳) نبی ﷺ کو معاندین و کافرن کی تکذیب سے جو گرائی اور مشقت ہوتی تھی، اسی کے حوالے سے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور تقدیر سے ہونا ہی تھا اور اللہ کے حکم کے بغیر آپ ان کو قبول اسلام پر آمادہ نہیں کر سکتے، حتیٰ کہ اگر آپ کوئی سرنگ کھود کر یا آسمان پر سیڑھی لگا کر بھی کوئی نشانی ان کو لا کر دکھادیں، تو اول تو آپ کے لیے ایسا کرنا محال ہے اور اگر بالفرض آپ ایسا کر دکھائیں بھی تو یہ ایمان لانے کے نہیں۔ کیوں کہ ان کا ایمان نہ لانا، اللہ کی حکمت و مشیت کے تحت ہے جس کا مکمل احاطہ انسانی عقل و فہم نہیں کر سکتے۔ البتہ جس کی ایک ظاہری حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اختیار و ارادے کی آزادی دے کر آزما رہا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے لیے تمام انسانوں کو ہدایت کے ایک راستے پر لگا دینا مشکل کام نہ تھا، اس کے لیے لفظ ”كُنَّ“ سے پلک جھپکتے میں یہ کام ہو سکتا ہے۔
- (۴) یعنی آپ ان کے کفر پر زیادہ حسرت و افسوس نہ کریں کیونکہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی مشیت و تقدیر سے ہے، اس لیے اسے اللہ ہی کے سپرد کر دیں، وہی اس کی حکمت و مصلحت کو بہتر سمجھتا ہے۔

إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴿٣٥﴾

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَنْ يُنَزِّلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٦﴾

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا ظَلِيمٍ يَطْمِئِنُّ بِهَا جَبَلٌ إِلَّا آمَنَّا بِهَا لَكُمْ مَفَاتِحُ الْكَلْبِ فِي الْكَلْبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ لِلرَّيْبِ مِجْمَعُونَ ﴿٣٧﴾

وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں۔^(۱) اور مردوں کو اللہ زندہ کر کے اٹھائے گا پھر سب اللہ ہی کی طرف لائے جائیں گے۔ (۳۶)

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل کیا گیا ان کے رب کی طرف سے آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کو بے شک پوری قدرت ہے اس پر کہ وہ معجزہ نازل فرمادے^(۲) لیکن ان میں اکثر بے خبر ہیں۔ (۳۷)^(۳)

اور جتنے قسم کے جاندار زمین پر چلنے والے ہیں اور جتنے قسم کے پرند جانور ہیں کہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتے ہیں ان میں کوئی قسم ایسی نہیں جو کہ تمہاری طرح کے گروہ نہ ہوں،^(۴) ہم نے دفتر میں کوئی چیز نہیں چھوڑی^(۵) پھر سب اپنے پروردگار کے پاس جمع کیے جائیں گے۔ (۳۸)^(۶)

(۱) اور ان کافروں کی حیثیت تو ایسی ہے جیسے مردوں کی ہوتی ہے جس طرح وہ سننے اور سمجھنے کی قدرت سے محروم ہیں، یہ بھی چونکہ اپنی عقل و فہم سے حق کو سمجھنے کا کام نہیں لیتے، اس لیے یہ بھی مردہ ہی ہیں۔

(۲) یعنی ایسا معجزہ جو ان کو ایمان لانے پر مجبور کر دے، جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے فرشتہ اترے، یا پہاڑ ان پر اٹھا کر بلند کر دیا جائے، جس طرح بنی اسرائیل پر کیا گیا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ تو یقیناً ایسا کر سکتا ہے لیکن اس نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ پھر انسانوں کے ابتلا کا مسئلہ ختم ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے مطالبے پر اگر کوئی معجزہ دکھلایا جاتا اور پھر بھی وہ ایمان نہ لاتے تو پھر فوراً انہیں اسی دنیا ہی میں سخت سزا دے دی جاتی۔ یوں گویا اللہ کی اس حکمت میں بھی انہی کا دنیاوی فائدہ ہے۔

(۳) جو اللہ کے حکم و مشیت کی حکمت بالغہ کا ادراک نہیں کر سکتے۔

(۴) یعنی انہیں بھی اللہ نے اسی طرح پیدا فرمایا جس طرح تمہیں پیدا کیا، اسی طرح انہیں روزی دیتا ہے جس طرح تمہیں دیتا ہے اور تمہاری ہی طرح وہ بھی اس کی قدرت و علم کے تحت داخل ہیں۔

(۵) کتاب (دفتر) سے مراد لوح محفوظ ہے۔ یعنی وہاں ہر چیز درج ہے یا مراد قرآن ہے جس میں اجمالاً یا تفصیلاً دین کے ہر معاملے پر روشنی ڈالی گئی ہے، جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَوَكَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تَتَّبِعُنَا أَنْ نَحْكُمَ﴾ (النحل - ۸۹)

ہم نے آپ پر ایسی کتاب اتاری ہے جس میں ہر چیز کا بیان ہے۔ ”یہاں پر سیاق کے لحاظ سے پہلا معنی اقرب ہے۔

(۶) یعنی تمام مذکورہ گروہ اکٹھے کیے جائیں گے۔ اس سے علما کے ایک گروہ نے استدلال کیا ہے کہ جس طرح تمام انسانوں کو زندہ کر کے ان کا حساب کتاب لیا جائے گا، جانوروں اور دیگر تمام مخلوقات کو بھی زندہ کر کے ان کا بھی حساب

اور جو لوگ ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں وہ تو طرح طرح کی ظلمتوں میں بہرے گونگے ہو رہے ہیں، اللہ جس کو چاہے بے راہ کر دے اور وہ جس کو چاہے سیدھی راہ پر لگا دے۔ (۳۹)^(۱)

آپ کہتے کہ اپنا حال تو بتلاؤ کہ اگر تم پر اللہ کا کوئی عذاب آ پڑے یا تم پر قیامت ہی آ پینچے تو کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے۔ اگر تم سچے ہو۔ (۴۰)

بلکہ خاص اسی کو پکارو گے، پھر جس کے لئے تم پکارو گے اگر وہ چاہے تو اس کو ہٹا بھی دے اور جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو ان سب کو بھول بھال جاؤ گے۔ (۴۱)^(۲)

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ وَكَفَرُوا فِي الظُّلُمَاتِ مَنْ يَشَاءُ اللَّهُ يُضِلُّهُ وَمَنْ يَشَاءُ يُصِغِرْهُ عَلٰٓى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۳۹﴾

قُلْ اِنَّ سِرِّيْكُمْ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ اَوْ اَتَيْنٰكُمْ السَّاعَةَ اَعْبُرُوا اللّٰهَ تَدْعُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾

بَلْ اِنَّمَا تَدْعُوْنَ فَيَكْتَسِفُ مَا تَدْعُوْنَ الْيٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ شَآءُوْا تَدْعُوْنَ مَا شِئْتُمْ لَكُمْ ﴿۴۱﴾

کتاب ہو گا۔ جس طرح ایک حدیث میں بھی نبی ﷺ نے فرمایا، کسی سینگ والی بکری نے اگر بغیر سینگ والی بکری پر کوئی زیادتی کی ہوگی تو قیامت والے دن سینگ والی بکری سے بدلہ لیا جائے گا۔ (صحیح مسلم۔ نمبر ۱۹۹۷) بعض علما نے حشر سے مراد صرف موت لی ہے۔ یعنی سب کو موت آئے گی۔ اور بعض علما نے کہا ہے کہ یہاں حشر سے مراد کفار کا حشر ہے۔ اور درمیان میں مزید جو باتیں آئی ہیں، وہ جملہ معترضہ کے طور پر ہیں۔ اور حدیث مذکور (جس میں بکری سے بدلہ لیے جانے کا ذکر ہے) بطور تمثیل ہے جس سے مقصد قیامت کے حساب و کتاب کی اہمیت و عظمت کو واضح کرنا ہے۔ یا یہ کہ حیوانات میں سے صرف ظالم اور مظلوم کو زندہ کر کے ظالم سے مظلوم کو بدلہ دلا دیا جائے گا۔ پھر دونوں معدوم کر دیئے جائیں گے۔ (فتح القدیر وغیرہ) اس کی تائید بعض احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

(۱) آیات الہی کی تکذیب کرنے والے چونکہ اپنے کانوں سے حق بات سنتے نہیں اور اپنی زبانوں سے حق بات بولتے نہیں، اس لیے وہ ایسے ہی ہیں جیسے گونگے اور بہرے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ کفر و ضلالت کی تاریکیوں میں بھی گھرے ہوئے ہیں۔ اس لیے انہیں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جس سے ان کی اصلاح ہو سکے۔ پس ان کے حواس گویا مسلوب ہو گئے جن سے کسی حال میں وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ پھر فرمایا: تمام اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ جسے چاہے گمراہ کر دے اور جسے چاہے سیدھی راہ پر لگا دے۔ لیکن اس کا یہ فیصلہ یوں ہی الٹ نہیں ہو جاتا بلکہ عدل و انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے، گمراہ اسی کو کرتا ہے جو خود گمراہی میں پھنسا ہوا ہے اور اس سے نکلنے کی وہ سعی کرتا ہے نہ نکلنے کو وہ پسند ہی کرتا ہے۔ (مزید دیکھئے سورہ بقرہ آیت ۲۶ کا حاشیہ)

(۲) اَزَّۤاٰنَتِكُمْ میں کاف اور میم خطاب کے لیے ہے اس کے معنی اَخْبِرُوْنِیْ (مجھے بتلاؤ یا خبر دو) کے ہیں۔ اس مضمون کو بھی قرآن کریم میں کئی جگہ بیان کیا گیا ہے (دیکھئے سورہ بقرہ آیت ۱۲۵ کا حاشیہ) اس کا مطلب یہ ہوا کہ توحید انسانی فطرت

اور ہم نے اور امتوں کی طرف بھی جو کہ آپ سے پہلے گزر چکی ہیں پیغمبر بھیجے تھے، سو ہم نے ان کو تنگدستی اور بیماری سے پکڑا تاکہ وہ اظہارِ عجز کر سکیں۔ (۴۲)

سو جب ان کو ہماری سزا پہنچی تھی تو انہوں نے عاجزی کیوں نہیں اختیار کی؟ لیکن ان کے قلوب سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے خیال میں آراستہ کر دیا۔^(۱) (۴۳)

پھر جب وہ لوگ ان چیزوں کو بھولے رہے جن کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کشادہ کر دیے یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر جو کہ ان کو ملی تھیں وہ خوب اتر آ گئے، ہم نے ان کو دغمتاً پکڑ لیا، پھر تو وہ بالکل مایوس ہو گئے۔ (۴۴)

پھر ظالم لوگوں کی جڑ کٹ گئی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔^(۲) (۴۵)

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَآخَذْنَاهُم بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۴۲﴾

فَلَوْلَا إِذْ دَخَلْنَا عَلَيْهِمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَلَكِن مَّقَسَت قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ لَّهُمُ الشَّيْطَانَ مَأْكَثًا يُعْمَلُونَ ﴿۴۳﴾

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِهَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ ﴿۴۴﴾

فَقَطَّعَ دَائِرَ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۴۵﴾

کی آواز ہے۔ انسان ماحول، یا آبا و اجداد کی تقلید ناسدید میں مشرکانہ عقائد و اعمال میں مبتلا رہتا ہے اور غیر اللہ کو اپنا حاجت روا و مشکل کشا سمجھتا رہتا ہے، نذر نیا زبھی انہی کے نام کی نکالتا ہے، لیکن جب کسی ابتلا سے دو چار ہوتا ہے تو پھر یہ سب بھول جاتا ہے اور فطرت ان سب پر غالب آ جاتی ہے اور بے اختیار انسان پھر اسی ذات کو پکارتا ہے جس کو پکارنا چاہیے۔ کاش! لوگ اسی فطرت پر قائم رہیں کہ نجات اخروی تو مکمل طور پر اسی صدائے فطرت یعنی توحید کے اختیار کرنے میں ہی ہے۔

(۱) تو میں جب اخلاق و کردار کی پستی میں مبتلا ہو کر اپنے دلوں کو زنگ آلود کر لیتی ہیں تو اس وقت اللہ کے عذاب بھی انہیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور جھنجھوڑنے میں ناکام رہتے ہیں۔ پھر ان کے ہاتھ طلبِ مغفرت کے لیے اللہ کے سامنے نہیں اٹھتے، ان کے دل اس کی بارگاہ میں نہیں جھکتے اور ان کے رخِ اصلاح کی طرف نہیں مڑتے۔ بلکہ اپنی بد اعمالیوں پر تاویلات و توجیہات کے حسین غلاف چڑھا کر اپنے دل کو مطمئن کر لیتی ہیں۔ اس آیت میں ایسی ہی قوموں کا وہ کردار بیان کیا گیا ہے جسے شیطان نے ان کے لیے خوبصورت بنا دیا ہوتا ہے۔

(۲) اس میں خدا فراموش قوموں کی بابت اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ ہم بعض دفعہ وقتی طور پر ایسی قوموں پر دنیا کی آسائشوں اور فراوانیوں کے دروازے کھول دیتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ اس میں خوب مگن ہو جاتی ہیں اور اپنی مادی خوش حالی و ترقی پر اترنے لگ جاتی ہیں تو پھر ہم اچانک انہیں اپنے مواخذے کی گرفت میں لے لیتے ہیں اور ان کی

آپ کہنے کہ یہ بتلاؤ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری سماعت اور بصارت بالکل لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود ہے کہ یہ تم کو پھر دے دے۔ آپ دیکھئے تو ہم کس طرح دلائل کو مختلف پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں پھر بھی یہ اعراض کرتے ہیں۔^(۱) (۳۶)

آپ کہنے کہ یہ بتلاؤ اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آپڑے خواہ اچانک یا اعلانیہ تو کیا۔ جز ظالم لوگوں کے اور بھی کوئی ہلاک کیا جائے گا۔^(۲) (۳۷)

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَ أَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلَى قُلُوبِكُمْ مَنْ إِلَهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِهِ أَنْظُرْ كَيْفَ تُصْرَفُونَ
الذِّبْتُمْ ثُمَّ هُمْ يَصِدُّونَ ﴿۳۶﴾

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ مِنْكُمْ عَذَابَ اللَّهِ بَغْتَةً أَوْ جَهْرَةً هَلْ يُعَلِّكُمُ إِلَّا الْعَوْمُ الظَّالِمُونَ ﴿۳۷﴾

جز ہی کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ حدیث میں بھی آتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جب تم دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نافرمانیوں کے باوجود کسی کو اس کی خواہشات کے مطابق دنیا دے رہا ہے تو یہ ”استدرج“ (ڈھیل دینا) ہے۔ پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ (مسند احمد، جلد ۴، صفحہ ۱۳۵) قرآن کریم کی اس آیت اور حدیث نبوی ﷺ سے معلوم ہوا کہ دنیوی ترقی اور خوش حالی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ جس فرد یا قوم کو یہ حاصل ہو تو وہ اللہ کی چیت ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہے، جیسا کہ بعض لوگ ایسا سمجھتے ہیں بلکہ بعض تو انہیں ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْفَعُوْنَ اَعْيَادِيَ الظَّالِمِيْنَ ﴾ (الانبیاء ۱۰۵) کا مصداق قرار دے کر انہیں ”اللہ کے نیک بندے“ تک قرار دیتے ہیں۔ ایسا سمجھنا اور کسنا غلط ہے، گمراہ قوموں یا افراد کی دنیوی خوش حالی، ابتلا اور مہلت کے طور پر ہے نہ کہ یہ ان کے کفر و معاصی کا صلہ ہے۔

(۱) آنکھیں، کان اور دل، یہ انسان کے نہایت اہم اعضاء و جوارح ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اگر وہ چاہے تو ان کی وہ خصوصیات سلب کر لے جو اللہ نے ان کے اندر رکھی ہیں یعنی سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی خصوصیات، جس طرح کافروں کے یہ اعضا ان خصوصیات سے محروم ہوتے ہیں۔ یا اگر وہ چاہے تو اعضا کو ویسے ہی ختم کر دے، وہ دونوں ہی باتوں پر قادر ہے، اس کی گرفت سے کوئی بچ نہیں سکتا، مگر یہ کہ وہ خود کسی کو بچانا چاہے۔ آیات کو مختلف پہلوؤں سے پیش کرنے کا مطلب ہے کبھی انذار و تبشیر اور ترغیب و ترہیب کے ذریعے سے، اور کبھی کسی اور ذریعے سے۔

(۲) بَغْتَةً (بے خبری) سے مراد رات اور جَهْرَةً (خبرداری) سے دن مراد ہے، جسے سورہ یونس میں ﴿ بَيِّنَاتٍ اَوْ نَبَاتٍ ﴾ (سورہ یونس۔ ۵۰) سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی دن کو عذاب آجائے یا رات کو۔ یا پھر بَغْتَةً وہ عذاب ہے جو اچانک بغیر تمہید اور مقدمات کے آجائے اور جَهْرَةً وہ عذاب جو تمہید اور مقدمات کے بعد آئے۔ یہ عذاب جو قوموں کی ہلاکت کے لیے آتا ہے۔ ان ہی پر آتا ہے جو ظالم ہوتی ہیں یعنی کفر و طغیان اور معصیت الہی میں حد سے تجاوز کرتی ہیں۔

اور ہم پیغمبروں کو صرف اس واسطے بھیجا کرتے ہیں کہ وہ بشارت دیں اور ڈرائیں^(۱) پھر جو ایمان لے آئے اور درستی کر لے سوان لوگوں پر کوئی اندیشہ نہیں اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔^(۲) (۳۸)

اور جو لوگ ہماری آیتوں کو جھوٹا بتلائیں ان کو عذاب پہنچے گا بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے ہیں۔^(۳) (۳۹)

آپ کہہ دیجئے کہ نہ تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف جو کچھ میرے پاس وحی آتی ہے اس کا اتباع کرتا ہوں^(۴) آپ کہتے کہ اندھا اور بینا کہیں برابر ہو سکتا ہے۔^(۵) سو کیا تم غور نہیں کرتے؟ (۵۰)

وَمَا يُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۚ لَمَنْ آمَنَ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۳۸﴾

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا بَشَّرْنَاهُمُ الْعَذَابَ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۳۹﴾

قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ ۚ إِنِّي أَنبِئُكُمْ بِمَا تَأْتُونِي بِالْحَقِّ ۚ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۚ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ ﴿۵۰﴾

(۱) وہ اطاعت گزاروں کو ان نعمتوں اور اجر جزیل کی خوش خبری دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے جنت کی صورت میں ان کے لیے تیار کر رکھا ہے اور نافرمانوں کو ان عذابوں سے ڈراتے ہیں جو اللہ نے ان کے لیے جہنم کی صورت میں تیار کیے ہوئے ہیں۔

(۲) مستقبل (یعنی آخرت) میں پیش آنے والے حالات کا انہیں اندیشہ نہیں اور اپنے پیچھے دنیا میں جو کچھ چھوڑ آئے یا دنیا کی جو آسودگیاں وہ حاصل نہ کر سکے، اس پر وہ مغموم نہیں ہوں گے کیونکہ دونوں جہانوں میں ان کا ولی اور کارساز وہ رب ہے جو دونوں ہی جہانوں کا رب ہے۔

(۳) یعنی ان کو عذاب اس لیے پہنچے گا کہ انہوں نے تکفیر و تکذیب کا راستہ اختیار کیا، اللہ کی اطاعت اور اس کے اوامر کی پرواہ نہیں کی اور اس کے محارم و منہای کار تکاب بلکہ اس کی حرمتوں کو پامال کیا۔

(۴) میرے پاس اللہ کے خزانے بھی نہیں (جس سے مراد ہر طرح کی قدرت و طاقت ہے) کہ میں تمہیں اللہ کے اذن و مشیت کے بغیر کوئی ایسا بڑا معجزہ صادر کر کے دکھا سکوں، جیسا کہ تم چاہتے ہو، جسے دیکھ کر تمہیں میری صداقت کا یقین ہو جائے۔ میرے پاس غیب کا علم بھی نہیں کہ مستقبل میں پیش آنے والے حالات سے میں تمہیں مطلع کر دوں، مجھے فرشتہ ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کہ تم مجھے ایسے خرق عادات امور پر مجبور کرو جو انسانی طاقت سے بالا ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کا پیرو ہوں جو مجھ پر نازل ہوتی ہے اور اس میں حدیث بھی شامل ہے، جیسا کہ آپ نے فرمایا: أُرِيْنَتْ الْفُرْقَانَ وَبَيْنَهُ مَعَهُ ”مجھے قرآن کے ساتھ اس کی مثل بھی دیا گیا یہ مثل حدیث رسول ﷺ ہی ہے۔

(۵) یہ استفہام انکار کے لیے ہے یعنی اندھا اور بینا، گمراہ اور ہدایت یافتہ اور مومن و کافر برابر نہیں ہو سکتے۔

اور ایسے لوگوں کو ڈرائیے جو اس بات سے اندیشہ رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس ایسی حالت میں جمع کئے جائیں گے کہ جتنے غیر اللہ ہیں نہ کوئی ان کا مددگار ہو گا اور نہ کوئی شفیق ہو گا، اس امید پر کہ وہ ڈر جائیں۔ (۵۱)^(۱)

اور ان لوگوں کو نہ نکالے جو صبح و شام اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں، خاص اسی کی رضامندی کا قصد رکھتے ہیں۔ ان کا حساب ذرا بھی آپ کے متعلق نہیں اور آپ کا حساب ذرا بھی ان کے متعلق نہیں کہ آپ ان کو نکال دیں۔ ورنہ آپ ظلم کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ (۵۲)^(۲)

اور اسی طرح ہم نے بعض کو بعض کے ذریعہ سے آزمائش میں ڈال رکھا ہے تاکہ یہ لوگ کہہ سکیں، کیا یہ لوگ ہیں کہ ہم سب میں سے ان پر اللہ تعالیٰ نے فضل کیا ہے۔ کیا یہ بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ شکر

وَأَنْذِرِيهِمُ الَّذِينَ يَخْتَفُونَ أَنْ يُخْتَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِنْ دُونِهِ وِلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۵۱﴾

وَلَا تَنْظُرِي الَّذِينَ يُدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْعَدْوَىٰ وَالْعَنَتِي يُرِيدُونَ وَجْهَهُ، مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ تَنْظُرُهُمْ فَتَكُونُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۵۲﴾

وَكَذَٰلِكَ نَتَنَّبَأُ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِيُتَّقُوا وَأَمْلُوا رَبَّهُمْ مَنَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنْ بَيْنِنَا، أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ ﴿۵۲﴾

(۱) یعنی انذار کا فائدہ ایسے ہی لوگوں کو ہو سکتا ہے، ورنہ جو بعث بعد الموت اور حشر و نشر یقین ہی نہیں رکھتے، وہ اپنے کفر و جود پر ہی قائم رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں ان اہل کتاب اور کافروں اور مشرکوں کا رد بھی ہے جو اپنے آبا اور اپنے بتوں کو اپنا سفارشی سمجھتے تھے۔ نیز کار ساز اور سفارشی نہیں ہو گا کا مطلب، یعنی ان کے لیے جو عذاب جنم کے مستحق قرار پائے ہوں گے۔ ورنہ مومنوں کے لیے تو اللہ نیک بندے، اللہ کے حکم سے سفارش کریں گے۔ یعنی شفاعت کی نفی اہل کفر و شرک کے لیے ہے اور اس کا اثبات ان کے لیے جو گناہ گار مومن و موحد ہوں گے، اسی طرح دونوں قسم کی آیات میں کوئی تعارض بھی نہیں رہتا۔

(۲) یعنی یہ بے سارا اور غریب مسلمان، جو بڑے اخلاص سے رات دن اپنے رب کو پکارتے ہیں یعنی اس کی عبادت کرتے ہیں، آپ مشرکین کے اس طعن یا مطالبہ سے کہ اے محمد! (ﷺ) تمہارے ارد گرد تو غریب و فقرا کا ہی جھوم رہتا ہے ذرا انہیں ہٹاؤ تو ہم بھی تمہارے ساتھ بیٹھیں، ان غریب کو اپنے سے دور نہ کرنا، بالخصوص جب کہ آپ کا کوئی حساب ان کے متعلق نہیں اور ان کا آپ کے متعلق نہیں۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو یہ ظلم ہو گا جو آپ کے شایان شان نہیں۔ مقصد امت کو سمجھانا ہے کہ بے وسائل لوگوں کو حقیر سمجھنا یا ان کی صحبت سے گریز کرنا اور ان سے وابستگی نہ رکھنا، یہ نادانوں کا کام ہے۔ اہل ایمان کا نہیں۔ اہل ایمان تو اہل ایمان سے محبت رکھتے ہیں چاہے وہ غریب اور مسکین ہی کیوں نہ ہوں۔

(۳) ابتدا میں اکثر غریب، غلام قسم کے لوگ ہی مسلمان ہوئے تھے۔ اس لیے یہی چیز روسائے کفار کی آزمائش کا ذریعہ

گزاروں کو خوب جانتا ہے۔^(۱) (۵۳)

اور یہ لوگ جب آپ کے پاس آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو (یوں) کہہ دیجئے کہ تم پر سلامتی ہے^(۲) تمہارے رب نے مہربانی فرمانا اپنے ذمہ مقرر کر لیا ہے^(۳) کہ جو شخص تم میں سے برا کام کر بیٹھے جہالت سے پھر وہ اس کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح رکھے تو اللہ (کی یہ شان ہے کہ وہ) بڑی مغفرت کرنے والا ہے بڑی رحمت والا ہے۔^(۴) (۵۴)

اسی طرح ہم آیات کی تفصیل کرتے رہتے ہیں اور تاکہ مجرّمین کا طریقہ ظاہر ہو جائے۔ (۵۵)

وَاذْأَجَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَن حَمَلَ مِنكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِن بَعْدِهَا وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۵۴﴾

وَلَذَلِكَ نَقُصُّكَ الْآيَاتِ وَالْمُتَّبِعِينَ سَبِيلَ الْمُجْرِمِينَ ﴿۵۵﴾

بن گئی اور وہ ان غریبوں کا مذاق بھی اڑاتے اور جن پر ان کا بس چلتا، انہیں تعذیب و اذیت سے بھی دوچار کرتے اور کہتے کہ کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے احسان فرمایا ہے؟ مقصد ان کا یہ تھا کہ ایمان اور اسلام اگر واقعی اللہ کا احسان ہوتا تو یہ سب سے پہلے ہم پر ہوتا، جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿لَوْ كَانَتْ حَتُّونًا سَبَقُونَا إِلَيْهِ﴾ ﴿الأحکاف﴾ ۱۱۔ ”اگر یہ بہتر چیز ہوتی تو اس کے قبول کرنے میں یہ ہم سے سبقت نہ کرتے“ یعنی ان ضعفاء کے مقابلے میں ہم پہلے مسلمان ہوتے۔

(۱) یعنی اللہ تعالیٰ ظاہری چمک دمک، ٹھانڈا ہانڈ اور ریسانہ کرو فرو وغیرہ نہیں دیکھتا، وہ تو دلوں کی کیفیت کو دیکھتا ہے اور اس اعتبار سے وہ جانتا ہے کہ اس کے شکر گزار بندے اور حق شناس کون ہیں؟ پس اس نے جن کے اندر شکرگزاری کی خوبی دیکھی، انہیں ایمان کی سعادت سے سرفراز کر دیا جس طرح حدیث میں آتا ہے۔ ”اللہ تعالیٰ تمہاری صورتیں اور تمہارے رنگ نہیں دیکھتا، وہ تو تمہارے دل اور تمہارے عمل دیکھتا ہے۔“ (صحیح مسلم، کتاب البر، باب تحریم ظلم المسلم وحذله واحتقاره ودمه وعرضه)

(۲) یعنی ان پر سلام کر کے یا ان کے سلام کا جواب دے کر ان کی تکریم اور قدر افزائی کریں۔

(۳) اور انہیں خوشخبری دیں کہ تفضل و احسان کے طور پر اللہ تعالیٰ نے اپنے شکر گزار بندوں پر اپنی رحمت کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ جس طرح حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تخلیق کائنات سے فارغ ہو گیا تو اس نے عرش پر لکھ

وَيَا إِنَّ رَحْمَتِي تَغْلِبُ غَضَبِي ﴿صحیح بخاری و مسلم﴾ ”میری رحمت، میرے غضب پر غالب ہے۔“

(۴) اس میں بھی اہل ایمان کے لیے بشارت ہے کیونکہ ان ہی کی یہ صفت ہے کہ اگر نادانی سے یا بہ تقاضائے بشریت کسی گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے ہیں تو پھر فوراً توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیتے ہیں۔ گناہ پر اصرار اور دوام اور توبہ و انابت سے اعراض نہیں کرتے۔

آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو اس سے ممانعت کی گئی ہے کہ ان کی عبادت کروں جن کو تم لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر پکارتے ہو۔ آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہاری خواہشات کی اتباع نہ کروں گا کیوں کہ اس حالت میں تو میں بے راہ ہو جاؤں گا اور راہ راست پر چلنے والوں میں نہ رہوں گا۔ (۵۶)

آپ کہہ دیجئے کہ میرے پاس تو ایک دلیل ہے میرے رب کی طرف سے (۲) اور تم اس کی تکذیب کرتے ہو، جس چیز کی تم جلد بازی کر رہے ہو وہ میرے پاس نہیں۔ حکم کسی کا نہیں۔ بجز اللہ تعالیٰ کے (۳) اللہ تعالیٰ واقعی بات کو بتلا دیتا ہے (۴) اور سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا وہی ہے۔ (۵۷)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے پاس وہ چیز ہوتی جس کا تم تقاضا کر رہے ہو تو میرا اور تمہارا باہمی قصہ فیصل (۵) ہو

قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ قُلْ لَا آتِيَهُمْ هَوَاءٌ كَمَا قَدْ ضَلَلْتُمْ إِذَا وَمَا تَأْمُرُونَ
الْمُهْتَدِينَ ۝

قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَاتٍ مِّنْ رَبِّي وَكَذَّبْتُمْ بِهِ مَا عَصَيْتُمْ مَا تَتَّبِعُونَ بِإِذْنِ الْحَاكِمِ إِلَّا اللَّهُ يَقْضِيَ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِينَ ۝

قُلْ لَوْ أَنِّي عِنْدِي مَا تَتَّبِعُونَ بِهِ لَقُضِيَ الْأُمُورُ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالظَّالِمِينَ ۝

(۱) یعنی اگر میں بھی تمہاری طرح اللہ کی عبادت کرنے کے بجائے، تمہاری خواہشات کے مطابق غیر اللہ کی عبادت شروع کر دوں تو یقیناً میں بھی گمراہ ہو جاؤں گا۔ مطلب یہ ہے کہ غیر اللہ کی عبادت پر شش 'سب سے بڑی گمراہی ہے لیکن بد قسمتی سے یہ گمراہی اتنی ہی عام بھی ہے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد اس میں مبتلا ہے۔ هَدَاهُمْ اللَّهُ تَعَالَىٰ -

(۲) مراد وہ شریعت ہے جو وحی کے ذریعے سے آپ ﷺ پر نازل کی گئی، جس میں توحید کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ «إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَىٰ صُورِكُمْ وَلَا إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ، وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ» (صحیح مسلم و مسند أحمد ۲/۲۸۵-۵۳۱) ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب القساعة

(۳) تمام کائنات پر اللہ ہی کا حکم چلتا ہے اور تمام معاملات اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لیے تم جو چاہتے ہو کہ جلد ہی اللہ کا عذاب تم پر آجائے تاکہ تمہیں میری صداقت یا کذب کا پتہ چل جائے، تو یہ بھی اللہ ہی کے اختیار میں ہے، وہ اگر چاہے تو تمہاری خواہش کے مطابق جلدی عذاب بھیج کر تمہیں متنبہ یا تباہ کر دے اور چاہے تو اس وقت تک تمہیں مصلحت دے جب تک اس کی حکمت اس کی مقتضی ہو۔

(۴) يَقْضُ قَضَاءً سے ہے یعنی يَقْضُ قَضَاءً الْحَقِّ (حق باتیں بیان کرنا یا بتلاتا ہے) یا قَضَّ أَرْهَ (کسی کے پیچھے پیروی کرنا) سے ہے یعنی يَتَّبِعُ الْحَقَّ فِيمَا يَخْتَكُمُ بِهِ (اپنے فیصلوں میں وہ حق کی پیروی کرتا ہے یعنی حق کے مطابق فیصلے کرتا ہے)۔ (فتح القدیر)

(۵) یعنی اگر اللہ تعالیٰ میرے طلب کرنے پر فوراً عذاب بھیج دیتا یا اللہ تعالیٰ میرے اختیار میں یہ چیز دے دیتا تو پھر

چکا ہوتا اور ظالموں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ (۵۸)
 اور اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں غیب کی کنجیاں، (خزانے)
 ان کو کوئی نہیں جانتا۔ بجز اللہ کے۔ اور وہ تمام چیزوں کو
 جانتا ہے جو کچھ خشکی میں ہیں اور جو کچھ دریاؤں میں ہیں
 اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس کو بھی جانتا ہے اور کوئی
 دانہ زمین کے تاریک حصوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر
 اور نہ کوئی خشک چیز گرتی ہے مگر یہ سب کتاب مبین میں
 ہیں۔^(۱) (۵۹)

اور وہ ایسا ہے کہ رات میں تمہاری روح کو (ایک گونہ)
 قبض کر دیتا ہے^(۲) اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس کو

وَعِنْدَنَا مَفَازُهُ الْعُغَيْبِ لَيَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ يُعَلِّمُهُ مَا فِي الْبُرُوجِ وَمَا
 تَسْطُرُ مِنْ وَرْدَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حِجَابَ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا ظِلٍ
 وَلَا يَابِسِ الْأَرْضِ يَكْتُبُ مُبِينٍ ۝

وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ
 لَيُبَدِّلْ لَكُمْ فِيهِ لِقَاضِي آجَلٍ مُسَمًّى ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ

تمہاری خواہش کے مطابق عذاب بھیج کر جلد ہی فیصلہ کر دیا جاتا۔ لیکن یہ معاملہ چونکہ کلیتاً اللہ کی مشیت پر موقوف ہے،
 اس لیے اس نے مجھے اس کا اختیار دیا ہے اور نہ ہی ممکن ہے کہ میری درخواست پر فوراً عذاب نازل فرمادے۔
 ضروری وضاحت: حدیث میں جو آتا ہے کہ ایک موقع پر اللہ کے حکم سے پہاڑوں کا فرشتہ نبی ﷺ کے خدمت میں
 آیا اور اس نے کہا کہ اگر آپ ﷺ حکم دیں تو میں ساری آبادی کو دونوں پہاڑوں کے درمیان کچل دوں آپ ﷺ
 نے فرمایا۔ ”نہیں، بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں سے اللہ کی عبادت کرنے والا پیدا فرمائے گا، جو اس کے
 ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے“ (صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب إذا قال أحدكم آمین
 والملائكة فی السماء..... و صحیح مسلم، کتاب الجهاد باب مالقی النبی من أذى المشركین) یہ
 حدیث آیت زیر وضاحت کے خلاف نہیں ہے، جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ آیت میں عذاب طلب کرنے
 پر عذاب دینے کا اظہار ہے جب کہ اس حدیث میں مشرکین کے طلب کیے بغیر صرف ان کی ایذا دہی کی وجہ سے ان پر
 عذاب بھیجے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے جسے آپ ﷺ نے پسند نہیں فرمایا۔

(۱) ”کِتَابُ مُبِينٌ“ سے مراد لوح محفوظ ہے۔ اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ عالم الغیب صرف اللہ کی ذات ہے غیب
 کے سارے خزانے اسی کے پاس ہیں، اس لیے کفار و مشرکین اور معاندین کو کب عذاب دیا جائے؟ اس کا علم بھی صرف
 اسی کو ہے اور وہی اپنی حکمت کے مطابق اس کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ حدیث میں بھی آتا ہے کہ مفتاح الغیب پانچ ہیں
 قیامت کا علم، بارش کا نزول، رحم مادر میں پلنے والا بچہ، آئندہ کل میں پیش آنے والے واقعات، اور موت کہاں آئے
 گی۔ ان پانچوں امور کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الأنعام)

(۲) یہاں نیند کو وفات سے تعبیر کیا گیا ہے، اسی لیے اسے وفات اصغر اور موت کو وفات اکبر کہا جاتا ہے۔ (وفات کی
 وضاحت کے لیے دیکھیے آل عمران کی آیت ۵۵ کا حاشیہ)

يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٠﴾

جانتا ہے پھر تم کو جگا اٹھاتا ہے^(۱) تاکہ معاد معین تمام کر دی جائے^(۲) پھر اسی کی طرف تم کو جانا ہے^(۳) پھر تم کو بتلائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔ (۶۰)

اور وہی اپنے بندوں کے اوپر غالب ہے برتر ہے اور تم پر نگہداشت رکھنے والے بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچتی ہے، اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے قبض کر لیتے ہیں اور وہ ذرا کوتاہی نہیں کرتے۔^(۴) (۶۱)

پھر سب اپنے مالک حقیقی کے پاس لائے جائیں گے۔^(۵) خوب سن لو فیصلہ اللہ ہی کا ہو گا اور وہ بہت جلد حساب لے گا۔ (۶۲)

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً مِّمَّنْ حَقَّقَ إِذَا جَاءَهُ أَحَدُكُمُ الْمَوْتَ تَوَفَّيْتَهُ نُسْنًا وَأَوْهَمُوا لَكُمْ لِقَافِطُونَ ﴿٦١﴾

تَمُرُّوْنَ وَإِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمْ الْحَقُّ الْإِلَٰهَةُ الْحَكِيمَةُ وَهِيَ أَسْرَعُ الْحَسِيبِينَ ﴿٦٢﴾

(۱) یعنی دن کے وقت روح واپس لوٹا کر زندہ کر دیتا ہے۔

(۲) یعنی یہ سلسلہ شب و روز اور وفاتِ اصغر سے ہمکنار ہو کر دن کو پھر اٹھ کھڑے ہونے کا معمول، انسان کی وفاتِ اکبر تک جاری رہے گا۔

(۳) یعنی پھر قیامت والے دن زندہ ہو کر سب کو اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔

(۴) یعنی اپنے اس مفوضہ کام میں اور روح کی حفاظت میں بلکہ وہ فرشتہ، مرنے والا اگر نیک ہوتا ہے تو اس کی روح عَلَّيْنِ میں اور اگر بد ہوتا ہے تو سِجِّينَ میں بھیج دیتا ہے۔

(۵) آیت میں ردوا (لوٹائے جائیں گے) کا مرجع بعض نے فرشتوں کو قرار دیا ہے یعنی قبض روح کے بعد فرشتے اللہ کی بارگاہ میں لوٹ جاتے ہیں۔ اور بعض نے اس کا مرجع تمام لوگوں کو بنایا ہے۔ یعنی سب لوگ حشر کے بعد اللہ کی بارگاہ میں لوٹائے جائیں گے (پیش کیے جائیں گے) اور پھر وہ سب کا فیصلہ فرمائے گا۔ آیت میں روح قبض کرنے والے فرشتوں کو رسل (جمع کے صیغے کے ساتھ) بیان کیا گیا ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ روح قبض کرنے والا فرشتہ ایک نہیں متعدد ہیں۔ اس کی توجیہ بعض مفسرین نے اس طرح کی ہے کہ قرآن مجید میں روح قبض کرنے کی نسبت اللہ کی طرف بھی ہے۔ ﴿اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا﴾ (الزمر ۴۲) ”اللہ لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روہیں قبض کر لیتا ہے“ اور اس کی نسبت ایک فرشتہ (ملک الموت) کی طرف بھی کی گئی ہے۔ ﴿قُلْ يَتَوَفَّاكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي ذُكِّرَ بِكُمْ﴾ (الم السجدۃ ۱۱) ”کہہ دو تمہاری روہیں وہ فرشتہ موت قبض کرتا ہے جو تمہارے لیے مقرر کیا گیا ہے“ اور اس کی نسبت متعدد فرشتوں کی طرف بھی کی گئی ہے، جیسا کہ اس مقام پر ہے اور اسی طرح سورہ نساء آیت ۹۷ اور الأنعام آیت ۹۳ میں بھی ہے۔ اس لیے اللہ کی طرف اس کی نسبت اس لحاظ سے ہے کہ وہی اصل آمر

آپ کیسے کہ وہ کون ہے جو تم کو خشکی اور دریا کی ظلمات سے نجات دیتا ہے۔ تم اس کو پکارتے ہو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے کہ اگر تو ہم کو ان سے نجات دے دے تو ہم ضرور شکر کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ (۶۳)

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی تم کو ان سے نجات دیتا ہے اور ہر غم سے، تم پھر بھی شرک کرنے لگتے ہو۔ (۶۳)

آپ کیسے کہ اس پر بھی وہی قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب تمہارے اوپر سے بھیج دے^(۱) یا تمہارے پاؤں تلے سے^(۲) یا کہ تم کو گروہ گروہ کر کے سب کو بھڑا دے اور تمہارے ایک کو دوسرے کی لڑائی چکھا دے۔^(۳) آپ دیکھیے تو سہی ہم کس طرح دلائل مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں شاید وہ سمجھ جائیں۔ (۶۵)

قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَنْعُوهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً لَئِنْ أَنْجَيْتُمْ مِنْ هَذَا لَتَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝

قُلْ إِنَّ اللَّهَ يَنْجِيكُمْ مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنْتُمْ مُشْكِرُونَ ۝

قُلْ مَوَالِقَادِرَ عَلَيَّ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِمَّنْ قَدْ بَدَأَ آوِينَ مِنْ عَذَابِ اللَّهِ أَوْ يَلَسَّكُمْ شَيْعًا وَيُذَيِّقَنَّ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ أَنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْأَيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ۝

(حکم دینے والا) بلکہ فاعل حقیقی ہے۔ متعدد فرشتوں کی طرف نسبت اس لحاظ سے ہے کہ وہ ملک الموت کے مددگار ہیں، وہ رگوں، شریانوں، پھوسوں سے روح نکالنے اور اس کا تعلق ان تمام چیزوں سے کاٹنے کا کام کرتے ہیں اور ملک الموت کی طرف نسبت کے معنی یہ ہیں کہ پھر آخر میں وہ روح قبض کر کے آسمانوں کی طرف لے جاتا ہے۔ (تفسیر روح المعانی جلد ۵- صفحہ ۱۲۵) حافظ ابن کثیر، امام شوکانی اور جمہور علماء اس بات کے قائل ہیں کہ ملک الموت ایک ہی ہے جیسا کہ سورۃ الم السجدۃ کی آیت سے اور مسند أحمد (جلد ۴، صفحہ ۲۸۷) میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے اور جہاں جمع کے صیغے میں ان کا ذکر ہے تو وہ اس کے اعوان و انصار ہیں۔ اور بعض آثار میں ملک الموت کا نام ”عزرائیل“ بتلایا گیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر۔ الم السجدۃ۔ واللہ اعلم۔)

(۱) یعنی آسمان سے، جیسے بارش کی کثرت، یا ہوا، پتھر کے ذریعے سے عذاب۔ یا امرا و حکام کی طرف سے ظلم و ستم۔

(۲) جیسے دھنسیا جانا، طوفانی سیلاب، جس میں سب کچھ غرق ہو جائے۔ یا مراد ہے ماتحتوں، غلاموں اور نوکروں چاکروں کی طرف سے عذاب کہ وہ بددیانت اور خائن ہو جائیں۔

(۳) يَنْبَسُّكُمْ أَيُّ: يَخْلَطُ أَمْرَكُمْ تَمَّارَةً مَعَالِي كَوْ خَلَطَ لَطًّا يَأْتِيهِ مَشْتَبَةً كَرَدَءٍ جَسْ كِي وَجْهٍ سَمَّ غُرُوبٍ أَوْ جَمَاعَتُونَ مِثْلَ بَثِّ جَاوٍ وَبُذَيْنِ، أَيُّ: يَقْتُلُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَتَذِيقُ كُلُّ طَائِفَةٍ الْآخِرَى الْآلَمِ الْحَرْبِ. تمہارا ایک، دوسرے کو قتل کرے۔ اس طرح ہر گروہ دوسرے گروہ کو لڑائی کا مزہ چکھائے (ایسراف التفسیر) حدیث میں آتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے تین دعائیں کیں۔ ۱- میری امت غرق کے ذریعے ہلاک نہ کی جائے۔ ۲- قحط عام کے ذریعے اس کی تباہی نہ ہو۔ ۳- آپس میں ان کی لڑائی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے پہلی دو دعائیں قبول فرمائیں۔ اور تیسری دعا

وَلَا تَأْسَىٰ لَهُمْ قَوْلُكَ وَهُوَ الْحَقُّ قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِمُكَيِّلٍ ﴿٥١﴾

لِكُلِّ نَبِيٍّ مُّسْتَفْزِعُونَ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٥٢﴾

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي الْبَيْنَاتِ فَاغْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ وَإِمَّا يُبَيِّنُكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَعْتَدُ بَعْدَ ذَلِكَ مِنْهُمْ قَوْمًا يَتَّبِعُونَ ﴿٥٣﴾

وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مِنْ حَسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَلَكِنْ ذِكْرِي لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿٥٤﴾

اور آپ کی قوم ^(۱) اس کی تکذیب کرتی ہے حالانکہ وہ یقینی ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ میں تم پر تعینات نہیں کیا گیا ہوں۔ ^(۲) (۶۶)

ہر خبر (کے وقوع) کا ایک وقت ہے اور جلد ہی تم کو معلوم ہو جائے گا۔ (۶۷)

اور جب آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو ہماری آیات میں عیب جوئی کر رہے ہیں تو ان لوگوں سے کنارہ کش ہو جائیں یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں اور اگر آپ کو شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھیں۔ ^(۳) (۶۸)

اور جو لوگ پرہیزگار ہیں ان پر ان کی باز پرس کا کوئی اثر نہ پہنچے گا ^(۴) اور لیکن ان کے ذمہ نصیحت کر دینا ہے شاید

سے مجھے روک دیا۔ (صحیح مسلم، نمبر ۲۲۱۶) یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ امت محمدیہ میں اختلاف وانشقاق واقع ہو گا اور اس کی وجہ اللہ کی نافرمانی اور قرآن وحدیث سے اعراض ہو گا جس کے نتیجے میں عذاب کی اس صورت سے امت محمدیہ بھی محفوظ نہ رہ سکے گی۔ گویا اس کا تعلق اس سنت اللہ سے ہے جو قوموں کے اخلاق و کردار کے بارے میں ہمیشہ رہی ہے۔ جس میں تبدیلی ممکن نہیں ﴿فَلَنْ يَجْعَلَ لَسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا وَلَنْ نَجْعَلَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا﴾ (فاطر-۳۳)

(۱) بہ کا مرجع قرآن ہے یا عذاب (فتح القدیر)

(۲) یعنی مجھے اس امر کا مکتف نہیں کیا گیا ہے کہ میں تمہیں ہدایت کے راستے پر لگا کر ہی چھوڑوں۔ بلکہ میرا کام صرف دعوت و تبلیغ ہے ﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ﴾ (الکہف-۲۹)

(۳) آیت میں خطاب اگرچہ نبی ﷺ سے ہے لیکن مخاطب امت مسلمہ کا ہر فرد ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک ناکیدی حکم ہے جسے قرآن مجید میں متعدد جگہ بیان کیا گیا ہے۔ سورہ نساء آیت نمبر ۱۳ میں بھی یہ مضمون گزر چکا ہے۔ اس سے ہر وہ مجلس مراد ہے جہاں اللہ رسول کے احکام کا مذاق اڑایا جا رہا ہو یا عملاً ان کا استخفاف کیا جا رہا ہو یا اہل بدعت و اہل زندق اپنی تاویلات رکھ کر اور توجیہات مخفیہ کے ذریعے سے آیات الہی کو توڑ مروڑ رہے ہوں۔ ایسی مجالس میں غلط باتوں پر تنقید کرنے اور کلمہ حق بلند کرنے کی نیت سے تو شرکت جائز ہے، بصورت دیگر سخت گناہ اور غضب الہی کا باعث ہے۔

(۴) مِنْ حِسَابِهِمْ کا تعلق آیات الہی کا استہزاء کرنے والوں سے ہے۔ یعنی جو لوگ ایسی مجالس سے اجتناب کریں گے، تو استہزاء آیات اللہ کا جو گناہ، استہزاء کرنے والوں کو ملے گا، وہ اس گناہ سے محفوظ رہیں گے۔

وہ بھی تقویٰ اختیار کریں۔^(۱) (۶۹)

اور ایسے لوگوں سے بالکل کنارہ کش رہیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے اور دنیوی زندگی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے اور اس قرآن کے ذریعہ سے نصیحت بھی کرتے رہیں تاکہ کوئی شخص اپنے کردار کے سبب (اس طرح) نہ پھنس جائے^(۲) کہ کوئی غیر اللہ اس کا نہ مددگار ہو اور نہ سفارشی اور یہ کیفیت ہو کہ اگر دنیا بھر کا معاوضہ بھی دے ڈالے تب بھی اس سے نہ لیا جائے۔^(۳) ایسے ہی ہیں کہ اپنے کردار کے سبب پھنس گئے، ان کے لیے نہایت تیز گرم پانی پینے کے لئے ہو گا اور دردناک سزا ہوگی اپنے کفر کے سبب۔ (۷۰)

آپ کہہ دیجئے کہ کیا ہم اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی چیز کو پکاریں کہ نہ وہ ہم کو نفع پہنچائے اور نہ ہم کو نقصان پہنچائے اور کیا ہم لئے پھر جائیں اس کے بعد کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کر دی ہے، جیسے کوئی شخص ہو کہ

وَدَّرَ الَّذِينَ أَخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَكُفْرًا وَعَزَّزْتَهُمُ الْحُبُورُ
الَّذِي يُؤَيِّدُ كُفْرِيَهُمْ أَنْ يُبْسَلَ نَفْسًا بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا
مِنْ دُونِ اللَّهِ وَكِيلٌ وَلَا شَفِيعٌ مِمَّنْ وَلَا تَعْدِلُ كُلُّ عَدِيلٍ
لَأُنْفِذَهُمْ فِيهَا وَلِلَّذِينَ آذَيْنُوا بِهَا كُتُبًا لَهُمْ
شَرَابٌ مِنْ حَبِيرٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۷۰﴾

قُلْ إِنَّ عُواصِمَ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلَى
أَعْقَابِنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا اللَّهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيَاطِينُ
فِي الْأَرْضِ حَيْرَانًا لَهُ أَصْحَابٌ يَدْعُونَهُ إِلَى الْهُدَى انظُرْنَا

(۱) یعنی اجتناب و علیحدگی کے باوجود وعظ و نصیحت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ حتی المقدور ادا کرتے رہیں۔ شاید وہ بھی اپنی اس حرکت سے باز آجائیں۔

(۲) بُسِّلَ، أي: لَيْلًا بُسِّلَ بَسْلٌ کے اصل معنی تو منع کے ہیں، اسی سے ہے شُجَاعٌ بِاسِئَلٍ لیکن یہاں اس کے مختلف معنی کیے گئے ہیں۔ ۱- تُسَلِّمُ (سونپ دیئے جائیں)۔ ۲- تُنْفِضُ (رسوا کر دیا جائے)۔ ۳- نُوَاخِذُ (مؤاخذہ کیا جائے)۔ ۴- تُجَازِئُ (بدلہ دیا جائے) امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ سب کے معنی قریب قریب ایک ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ انہیں اس قرآن کے ذریعے سے نصیحت کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نفس کو جو اس نے کمایا، اس کے بدلے ہلاکت کے سپرد کر دیا جائے۔ یا رسوائی اس کا مقدر بن جائے یا وہ مؤاخذہ اور مجازات کی گرفت میں آجائے۔ ان تمام مفہوم کو فاضل مترجم نے ”پھنس نہ جائے“ سے تعبیر کیا ہے۔

(۳) دنیا میں انسان عام طور پر کسی دوست کی مدد یا کسی کی سفارش سے یا مالی معاوضہ دے کر چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن آخرت میں یہ تینوں ذریعے کام نہیں آئیں گے۔ وہاں کافروں کا کوئی دوست نہ ہو گا جو انہیں اللہ کی گرفت سے بچالے، نہ کوئی سفارشی ہو گا جو انہیں عذاب الہی سے نجات دلا دے اور نہ کسی کے پاس معاوضہ دینے کے لیے کچھ ہو گا، اگر بالفرض ہو بھی تو وہ قبول نہیں کیا جائے گا کہ وہ دے کر چھوٹ جائے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے۔

اس کو شیطانوں نے کہیں جنگل میں بے راہ کر دیا ہو اور وہ بھٹکتا پھرتا ہو، اس کے کچھ ساتھی بھی ہوں کہ وہ اس کو ٹھیک راستہ کی طرف بلا رہے ہوں کہ ہمارے پاس آ۔^(۱) آپ کہہ دیجئے کہ یقینی بات ہے کہ راہ راست وہ خاص اللہ ہی کی راہ ہے^(۲) اور ہم کو یہ حکم ہوا ہے کہ ہم پروردگار عالم کے پورے مطیع ہو جائیں۔ (۷۱) اور یہ کہ نماز کی پابندی کرو اور اس سے ڈرو^(۳) اور وہی ہے جس کے پاس تم سب جمع کئے جاؤ گے۔ (۷۲) اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا^(۴)

ثُمَّ إِنَّ هَدَى اللَّهُ هُوَ الْهُدَىٰ وَأُمْرًا لِّسَلِيمٍ لِّرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٥﴾

وَأَنْ أَيْمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا زَكَاةً وَأَنْ هُمْ يُؤْتُونَ ﴿٥﴾

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ يُؤْتِي مَوْتًا

(۱) یہ ان لوگوں کی مثال بیان فرمائی ہے جو ایمان کے بعد کفر اور توحید کے بعد شرک کی طرف لوٹ جائیں۔ ان کی مثال ایسے ہی ہے کہ ایک شخص اپنے ان ساتھیوں سے پچھڑ جائے جو سیدھے راستے پر جا رہے ہوں۔ اور پچھڑ جانے والا جنگلوں میں حیران و پریشان بھٹکتا پھر رہا ہو، ساتھی اسے بلا رہے ہوں لیکن حیرانی میں اسے کچھ بھائی نہ دے رہا ہو۔ یا جنات کے نرغے میں پھنس جانے کے باعث صحیح راستے کی طرف مراجعت اس کے لیے ممکن نہ رہی ہو۔

(۲) مطلب یہ ہے کہ کفر و شرک اختیار کر کے جو گمراہ ہو گیا ہے، وہ بھٹکے ہوئے راہی کی طرح ہدایت کی طرف نہیں آ سکتا۔ ہاں البتہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ہدایت مقدر کر دی ہے تو یقیناً اللہ کی توفیق سے وہ راہ یاب ہو جائے گا۔ کیونکہ ہدایت پر چلا دینا، اسی کا کام ہے۔ جیسے دوسرے مقامات پر فرمایا گیا۔ ﴿فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الضَّالِّينَ وَمَا لَهُمْ مِنْ مُصْرِفِينَ﴾ (النحل۔ ۳۷) ”اگر تو ان کی ہدایت کی خواہش رکھتا ہے (تو کیا؟) بے شک اللہ اس کو ہدایت نہیں دیتا، جس کو وہ گمراہ کر دے، اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہو گا۔“ لیکن یہ ہدایت اور گمراہی اسی اصول کے تحت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے بنایا ہوا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ یوں ہی جسے چاہے گمراہ اور جسے چاہے راہ یاب کرے۔ جیسا کہ اس کی وضاحت متعدد جگہ کی جا چکی ہے۔

(۳) وَأَنْ أَيْمُوا كَاعْتَفَافٍ لِّسَلِيمٍ پر ہے یعنی ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم رب العالمین کے مطیع ہو جائیں اور یہ کہ ہم نماز قائم کریں اور اس سے ڈریں۔ تسلیم و انقیاد الہی کے بعد سب سے پہلا حکم اقامتِ صلوٰۃ کا دیا گیا ہے جس سے نماز کی اہمیت واضح ہے اور اس کے بعد تقویٰ کا حکم ہے کہ نماز کی پابندی تقویٰ اور خشوع کے بغیر ممکن نہیں ﴿وَاتَّقُوا الْكِبْرِيَّةَ﴾ (البقرة: ۳۵)

(۴) حق کے ساتھ یا بافائدہ پیدا کیا، یعنی ان کو عبت اور بے فائدہ (کھیل کود کے طور پر) پیدا نہیں کیا، بلکہ ایک خاص مقصد کے لیے کائنات کی تخلیق فرمائی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس اللہ کو یاد رکھا اور اس کا شکر ادا کیا جائے جس نے یہ سب کچھ بنایا۔

اور ^(۱) جس وقت اللہ تعالیٰ اتنا کہہ دے گا تو ہو جا بس وہ ہو پڑے گا۔ اس کا کناحق اور بااثر ہے۔ اور ساری حکومت خاص اسی کی ہو گی جب کہ صور میں پھونک ماری جائے گی ^(۲) وہ جاننے والا ہے پوشیدہ چیزوں کا اور ظاہر چیزوں کا اور وہی ہے بڑی حکمت والا پوری خبر رکھنے والا۔ (۷۳)

اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ آزر ^(۳) سے فرمایا کہ کیا تو بتوں کو معبود قرار دیتا ہے؟ بے شک میں تجھ کو اور تیری ساری قوم کو صریح گمراہی میں دیکھتا ہوں۔ (۷۴)

اور ہم نے ایسے ہی طور پر ابراہیم (علیہ السلام) کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات دکھلائیں اور تاکہ کامل یقین کرنے والوں سے ہو جائیں ^(۴) (۷۵)

يَقُولُ لَنْ يَكْفُرَ بِنِعْمَةِ اللَّهِ عَلَيْهِمْ أَذْرَأُ إِنَّهُمْ يَعْلَمُونَ ۝
فِي الصُّورِ عَلِيمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْحَمِيدُ ۝

وَأَذَّارٌ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ إِذْ رَأَى أَنَّهُ اتَّخَذَ أَصْنَامًا اللَّهُمَّ إِنِّي آذِنُكَ وَقَوْمِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

وَكَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝

(۱) يَوْمَ فَعْلٍ محذوف وَأَذْكُرِيَا وَأَنْقُوا کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی اس دن کو یاد کرو یا اس دن سے ڈرو! کہ اس کے لفظ کن (ہو جا) سے وہ جو چاہے گا ہو جائے گا۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حساب کتاب کے کٹھن مراحل بھی بڑی سرعت کے ساتھ طے ہو جائیں گے۔ لیکن کن کے لیے؟ ایمان داروں کے لیے۔ دوسروں کو تو یہ دن ہزار سال یا پچاس ہزار سال کی طرح بھاری لگے گا۔

(۲) صُورٌ سے مراد وہ نرسنگا یا بگل ہے جس کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ ”سرافیل اسے منہ میں لیے اور اپنی پیشانی جھکائے، حکم الہی کے منتظر کھڑے ہیں کہ جب انہیں کہا جائے تو اس میں پھونک دیں“ (ابن کثیر) ابوداؤد اور ترمذی میں ہے الصور قرن یسفخ فیہ (نمبر ۷۴۲۲-۷۴۲۳ و ۳۰۳۰ و ۳۲۴۴) ”صور ایک قرن (نرسنگا) ہے جس میں پھونکا جائے گا“ بعض علما کے نزدیک تین نفعے ہوں گے، نَفْعَةُ الصَّغْفَرِ (جس سے تمام لوگ بے ہوش ہو جائیں گے) نَفْعَةُ الْفَنَاءِ جس سے تمام لوگ فنا ہو جائیں گے۔ نَفْعَةُ الْإِنشَاءِ جس سے تمام انسان دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ بعض علما آخری دو نفعوں کے ہی قائل ہیں۔

(۳) مورخین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کے دو نام ذکر کرتے ہیں، آزر اور تارخ۔ ممکن ہے دوسرا نام لقب ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ آزر آپ کے چچا کا نام تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں، اس لیے کہ قرآن نے آزر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کے طور پر ذکر کیا ہے، لہذا یہی صحیح ہے۔

(۴) مَلَكُوتٌ، مبالغہ کا صیغہ ہے جیسے رَغْبَةٌ سے رَغْبُوتٌ اور رَهْبَةٌ سے رَهْبُوتٌ اس سے مراد مخلوقات ہے، جیسا کہ

پھر جب رات کی تاریکی ان پر چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا آپ نے فرمایا کہ یہ میرا رب ہے مگر جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا^(۱) (۷۶)

پھر جب چاند کو دیکھا چمکتا ہوا تو فرمایا کہ یہ میرا رب ہے لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر مجھ کو میرے رب نے ہدایت نہ کی تو میں گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں گا۔ (۷۷)

پھر جب آفتاب کو دیکھا چمکتا ہوا تو فرمایا کہ^(۲) یہ میرا رب ہے یہ تو سب سے بڑا ہے پھر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا بے شک میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔^(۳) (۷۸)

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَى الْكَوْكَبَ قَالَ هَذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ
قَالَ لَا أُحِبُّ الْإِفْلَاقَ ۝

فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِعًا قَالَ هَذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَيْسَ
كَذَلِكَ رَبِّي لَئِن لَّكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ ۝

فَلَمَّا رَأَى النَّهْرَ بَارِعًا قَالَ هَذَا رَبِّي هَذَا الْكَبِيرُ فَلَمَّا أَفَلَ
قَالَ يَفْقَهُونَ إِنِّي بَرَّيْتُ رَبِّي إِنَّمَا شَرِكُهُونَ ۝

ترجمہ میں یہی مفہوم اختیار کیا گیا ہے۔ یا ربوبیت والوہیت ہے یعنی ہم نے اس کو یہ دکھائی اور اس کی معرفت کی توفیق دی۔ یا یہ مطلب ہے کہ عرش سے لے کر اسفل ارض تک کا ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو مکاشفہ و مشاہدہ کرایا۔ (فتح القدیر)

(۱) یعنی غروب ہونے والے معبودوں کو پسند نہیں کرتا، اس لیے کہ غروب، تغیر حال پر دلالت کرتا ہے جو حادث ہونے کی دلیل ہے اور جو حادث ہو معبود نہیں ہو سکتا۔

(۲) شَمْسٌ (سورج) عربی میں مؤنث ہے۔ لیکن اسم اشارہ مذکر ہے۔ مراد الطالع ہے یعنی یہ طلوع ہونے والا سورج، میرا رب ہے۔ کیونکہ یہ سب سے بڑا ہے۔ جس طرح کہ سورج پرستوں کو مغالطہ لگا اور وہ اس کی پرستش کرتے ہیں۔ (اجرام سماویہ میں سورج سب سے بڑا اور سب سے زیادہ روشن ہے اور انسانی زندگی کے بقا و وجود کے لیے اس کی اہمیت و افادیت محتاج وضاحت نہیں۔ اسی لیے مظاہر پرستوں میں سورج کی پرستش عام رہی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہایت لطیف پیرائے میں چاند سورج کے پجاریوں پر ان کے معبودوں کی بے حیثیتی کو واضح فرمایا۔

(۳) یعنی ان تمام چیزوں سے، جن کو تم اللہ کا شریک بناتے ہو اور جن کی عبادت کرتے ہو، میں بیزار ہوں۔ اس لیے کہ ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے، کبھی طلوع ہوتے، کبھی غروب ہوتے ہیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مخلوق ہیں اور ان کا خالق کوئی اور ہے جس کے حکم کے یہ تابع ہیں۔ جب یہ خود مخلوق اور کسی کے تابع ہیں تو کسی کو نفع نقصان پہنچانے پر کس طرح قادر ہو سکتے ہیں؟

میں اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں^(۱) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا کیسو ہو کر، اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ (۷۹)

اور ان سے ان کی قوم نے حجت کرنا شروع کیا،^(۲) آپ نے فرمایا کیا تم اللہ کے کے معاملہ میں مجھ سے حجت کرتے ہو حالانکہ اس نے مجھ کو طریقہ بتا دیا ہے اور میں ان چیزوں سے جن کو تم اللہ کے ساتھ شریک بناتے ہو نہیں ڈرتا ہاں اگر میرا پروردگار ہی کوئی امر چاہے میرا پروردگار ہر چیز کو اپنے علم میں گھیرے ہوئے ہے، کیا تم پھر بھی خیال نہیں کرتے۔ (۸۰)

اور میں ان چیزوں سے کیسے ڈروں جن کو تم نے شریک بنایا ہے حالانکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٧٩﴾

وَسَأَلْتَهُ قَوْمُهُ قَالَ إِنَّمَا أَحْبَبْتَنِي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ
وَلَا أَعْبَأُ بِمَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَن يُشَاءَ رَبِّي شَيْئًا
وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ﴿٨٠﴾

وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللَّهِ
مَا لَمْ يَنْزِلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا فَأَلَيْسَ الْغُلُوبُتَيْنِ أَحَقَّ بِالْأَلَمِ

مشورہ ہے کہ اس وقت کے بادشاہ نمرو نے اپنے ایک خواب اور کاہنوں کی تعبیر کی وجہ سے نومولود لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم دے رکھا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی انہی ایام میں پیدا ہوئے جس کی وجہ سے انہیں ایک غار میں رکھا گیا تاکہ نمرو اور اس کے کارندوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ جائیں۔ وہیں غار میں جب کچھ شعور آیا اور چاند سورج دیکھے تو یہ تاثرات ظاہر فرمائے، لیکن یہ غار والی بات مستند نہیں ہے۔ قرآن کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم سے گفتگو اور مکالمے کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ باتیں کی ہیں، اسی لیے آخر میں قوم سے خطاب کر کے فرمایا کہ میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے بیزار ہوں۔ اور مقصد اس مکالمے سے معبودان باطل کی اصل حقیقت کی وضاحت تھی۔

(۱) رخ یا چہرے کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ چہرے سے ہی انسان کی اصل شناخت ہوتی ہے، مراد اس سے شخص ہی ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری عبادت اور توحید سے مقصود اللہ عز و جل ہے جو آسمان و زمین کا خالق ہے۔

(۲) جب قوم نے توحید کا یہ وعظ سنا جس میں ان کے خود ساختہ معبودوں کی تردید بھی تھی تو انہوں نے بھی اپنے دلائل دینے شروع کیے۔ جس سے معلوم ہوا کہ مشرکین نے بھی اپنے شرک کے لیے کچھ نہ کچھ دلائل تراش رکھے تھے۔ جس کا مشاہدہ آج بھی کیا جاسکتا ہے۔ جتنے بھی مشرکانہ عقائد رکھنے والے گروہ ہیں، سب نے اپنے اپنے عوام کو مطمئن کرنے اور رکھنے کے لیے ایسے ”سارے“ تلاش کر رکھے ہیں جن کو وہ ”دلائل“ سمجھتے ہیں یا جن سے کم از کم دام تزویر میں پھنسے ہوئے عوام کو جال میں پھنسانے رکھا جاسکتا ہے۔

إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۸۱﴾

اللہ کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرایا ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی، سو ان دو جماعتوں میں سے امن کا زیادہ مستحق کون ہے (۱) اگر تم خبر رکھتے ہو۔ (۸۱)

جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ مخلوط نہیں کرتے، ایسوں ہی کے لیے امن ہے اور وہی راہ راست پر چل رہے ہیں۔ (۸۲) (۳)

اور یہ ہماری حجت تھی وہ ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کی قوم کے مقابلہ میں دی تھی (۳) ہم جس کو چاہتے ہیں مرتبوں میں بڑھا دیتے ہیں۔ بے شک آپ کا رب بڑا حکمت والا بڑا علم والا ہے۔ (۸۳)

الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ ﴿۸۲﴾

وَتِلْكَ جُبْنَا أُتَيْنَاهَا بِرُحْمِهِمْ عَلَىٰ قَوْمِهِمْ تَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ لَّدُنَّا إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۸۳﴾

(۱) یعنی مومن اور مشرک میں سے؟ مومن کے پاس تو توحید کے بھرپور دلائل ہیں، جب کہ مشرک کے پاس اللہ کی اتاری ہوئی دلیل کوئی نہیں، صرف اوہام باطلہ ہیں یا دور از کار تاویلات۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امن اور نجات کا مستحق کون ہو گا؟

(۲) آیت میں یہاں ظلم سے مراد شرک ہے جیسا کہ ترجمہ سے واضح ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے ظلم کا عام مطلب (کو تاہی، غلطی، گناہ، زیادتی وغیرہ) سمجھا، جس سے وہ پریشان ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر کہنے لگے ائینا لَمْ يَظْلِمْنَا نَفْسَهُنَّ فِيهِمْ مِنْ شَيْءٍ مِنْ شَيْءٍ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اس سے وہ ظلم مراد نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو بلکہ اس سے مراد شرک ہے۔ جس طرح حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو کہا تھا ﴿إِنَّ الشِّرْكَ أَكْظَمُ عَظِيمٍ﴾ (لقمان: ۱۲) یقیناً شرک ظلم عظیم ہے۔“ (صحیح بخاری تفسیر سورۃ الأنعام)۔

(۳) یعنی توحید الہی پر ایسی حجت اور دلیل، جس کا کوئی جواب ابراہیم علیہ السلام کی قوم سے نہ بن پڑا۔ اور وہ بعض کے نزدیک یہ قول تھا ﴿وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُ وَلَٰكِنِّي مُؤْمِنٌ بِاللَّهِ مَا لَمْ يَنْزِلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا فَكَيْفَ يُرِيدُ الْمُحْسِنُ بِالْكَافِرِينَ﴾ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول کی تصدیق فرمائی اور کہا ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ﴾۔

اور ہم نے ان کو اسحاق دیا اور یعقوب ^(۱) ہر ایک کو ہم نے ہدایت کی اور پہلے زمانہ میں ہم نے نوح کو ہدایت کی اور ان کی اولاد میں سے ^(۲) داود کو اور سلیمان کو اور ایوب کو اور یوسف کو اور موسیٰ کو اور ہارون کو اور اسی طرح ہم نیک کام کرنے والوں کو جزا دیا کرتے ہیں (۸۴) اور (نیز) زکریا کو اور یحییٰ کو اور عیسیٰ کو ^(۳) اور الیاس کو، سب نیک لوگوں میں سے تھے۔ (۸۵)

اور نیز اسماعیل کو اور یسع کو اور یونس کو اور لوط کو اور ہر ایک کو تمام جہان والوں پر ہم نے فضیلت دی۔ (۸۶)

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۸۴﴾

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ كُلًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿۸۵﴾

وَأِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيُوسُفَ وَأَلْيَاسَ كُلًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿۸۶﴾

(۱) یعنی بڑھاپے میں جب کہ وہ اولاد سے ناامید ہو گئے تھے، جیسا کہ سورہ ہود، آیت ۷۲، ۷۳ میں ہے، پھر بیٹے کے ساتھ ایسے پوتے کی بھی بشارت دی جو یعقوب (علیہ السلام) ہوگا، جس کے معنی میں یہ مفہوم شامل ہے کہ اس کے بعد ان کی اولاد کا سلسلہ چلے گا، اس لیے کہ یہ عقب (پیچھے) سے مشتق ہے۔

(۲) ذُرِّيَّتِهِ میں ضمیر کا مرجع بعض مفسرین نے حضرت نوح علیہ السلام کو قرار دیا ہے کیونکہ وہی اقرب ہیں۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے داود اور سلیمان علیہما السلام کو۔ اور بعض نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو۔ اس لیے کہ ساری گفتگو انہی کے ضمن میں ہو رہی ہے۔ لیکن اس صورت میں یہ اشکال پیش آتا ہے کہ پھر ”لوط علیہ السلام“ کا ذکر اس فہرست میں نہیں آنا چاہیے تھا کیونکہ وہ ذریت ابراہیم علیہ السلام میں سے نہیں ہیں۔ وہ ان کے بھائی ہارون بن آزر کے بیٹے یعنی ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام، لوط علیہ السلام کے باپ نہیں، بیچا ہیں۔ لیکن بطور تغلیب انہیں بھی ذریت ابراہیم علیہ السلام میں شمار کر لیا گیا ہے۔ اس کی ایک اور مثال قرآن مجید میں ہے۔ جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اولاد یعقوب علیہ السلام کے آبا میں شمار کیا گیا ہے جب کہ وہ ان کے بچا تھے۔ (دیکھیے سورہ بقرہ آیت ۱۳۳)

(۳) عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر حضرت نوح علیہ السلام یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں اس لیے کیا گیا ہے (حالانکہ ان کا باپ نہیں تھا) کہ لڑکی کی اولاد بھی ذریت رجال میں ہی شمار ہوتی ہے۔ جس طرح نبی ﷺ نے حضرت حسن بن علیؓ (اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کے صاحبزادے) کو اپنا بیٹا فرمایا ”إِنَّ أَيْنِي هَذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يُصَلِّحَ بِهِ بَيْنَ فِتْنَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ، مِنَ الْمُسْلِمِينَ“ (صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب قول النبی للحسن بن علیؓ: اِسنی ہذا سید) (تفصیل کے لیے دیکھیے تفسیر ابن کثیر)

اور نیز ان کے کچھ باپ دادوں کو اور کچھ اولاد کو اور کچھ بھائیوں کو،^(۱) اور ہم نے ان کو مقبول بنایا اور ہم نے ان کو راہ راست کی ہدایت کی۔ (۸۷)

اللہ کی ہدایت ہی ہے جس کے ذریعہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کی ہدایت کرتا ہے اور اگر فرضاً یہ حضرات بھی شرک کرتے تو جو کچھ یہ اعمال کرتے تھے وہ سب اکارت ہو جاتے۔^(۲) (۸۸)

یہ لوگ ایسے تھے کہ ہم نے ان کو کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی تھی سو اگر یہ لوگ نبوت کا انکار کریں^(۳) تو ہم نے اس کے لیے ایسے بہت سے لوگ مقرر کر دیئے ہیں جو اس کے منکر نہیں ہیں^(۴) (۸۹)

یہی لوگ ایسے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی تھی، سو آپ بھی ان ہی کے طریق پر چلیے^(۵) آپ کہہ دیجیے کہ میں

وَمِنَ آبَائِهِمْ ذُرِّيَّتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ وَأَجْنَئَتِهِمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝

ذَلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحِطَّ عَلَيْهِمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

أُولَئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالنُّبُوَّةَ لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْهَا آيَاتِنَا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝

أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهِدَاهُمْ ائْتَدَبَهُمْ ۝ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِمْ أَجْرًا إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ

(۱) آبا سے اصول اور ذریعات سے فروع مراد ہیں۔ یعنی ان کے اصول و فروع اور اخوان میں سے بھی بہت سوں کو ہم نے مقام اجنبیا اور ہدایت سے نوازا۔ اجنبیاء کے معنی ہیں جن لیما اور اپنے خاص بندوں میں شمار کرنا اور ان کے ساتھ ملا لینا۔ یہ جَبَبْتُ الْمَاءَ فِي الْحَوْضِ (میں نے حوض میں پانی جمع کر لیا) سے مشتق ہے۔ پس اجنبیاء کا مطلب ہو گا اپنے خاص بندوں میں ملا لینا۔ اَضِيفَاءً تَخْلِصُ اور اختیاری بھی اسی معنی میں مستعمل ہے۔ جس کا مفعول مصطفیٰ (مجتبیٰ) مخلص اور مختار ہے۔ (فتح القدر)

(۲) اٹھارہ انبیاء کے اسمائے گرامی ذکر کر کے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے، اگر یہ حضرات بھی شرک کا ارتکاب کر لیتے تو ان کے سارے اعمال برباد ہو جاتے۔ جس طرح دوسرے مقام پر نبی ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿لَقَدْ آتَيْنَاكَ لِيُحَبِّطَنَّ عَنْكَ﴾ (الزمر- ۲۵) ”اے پیغمبر! اگر تو نے بھی شرک کیا تو تیرے سارے عمل برباد ہو جائیں گے۔“ حالانکہ پیغمبروں سے شرک کا صدور ممکن نہیں۔ مقصد امتوں کو شرک کی خطرناکی اور ہلاکت خیزی سے آگاہ کرنا ہے۔

(۳) اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کے مخالفین، مشرکین اور کفار ہیں۔

(۴) اس سے مراد ماجرین و انصار اور قیامت تک آنے والے ایماندار ہیں۔

(۵) اس سے مراد انبیاء مقررین ہیں۔ ان کی اقتدا کا حکم مسئلہ توحید میں اور ان احکام و شراعیہ میں ہے جو منسوخ نہیں

لِلْعَالَمِينَ ﴿۱۰﴾

تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں چاہتا ^(۱) یہ تو صرف تمام جہان والوں کے واسطے ایک نصیحت ہے۔ ^(۲) (۹۰)

اور ان لوگوں نے اللہ کی جیسی قدر کرنا واجب تھی ویسی قدر نہ کی جب کہ یوں کہہ دیا کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی ^(۳) آپ یہ کیسے کہ وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جس کو موسیٰ لائے تھے جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ نور ہے اور لوگوں کے لیے وہ ہدایت ہے جس کو تم نے ان متفرق

وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِذْ قَالُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِّن مِّثْقَلِ ذَرَّةٍ مِّنْ أَنْزَالِ الْكِتَابِ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ نُورًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ فَرَأَيْتُمْ كَيْفَ تَكْفُرُونَ وَتَكْفُرُونَ كَيْفًا وَرَبُّكُمُ اللَّهُ عَلِيمٌ فَلَا يُبَدِّلُ اللَّهُ قَوْلِ اللَّهِ لَكُمْ تَكْفُرُهُمْ

ہوئے۔ (فتح القدیر) کیونکہ اصول دین تمام شریعتوں میں ایک ہی رہے ہیں، گو شرائع اور مناجح میں کچھ کچھ اختلاف رہا۔ جیسا کہ آیت ﴿مَثَرَةٌ لَّكُمْ مِّنَ الَّذِينَ مَادَاطَىٰ بِهِ نُوحًا﴾ (الشوریٰ-۱۱۳) سے واضح ہے۔

(۱) یعنی تبلیغ و دعوت کا کیونکہ مجھے اس کا وہ صلہ ہی کافی ہے جو آخرت میں عند اللہ ملے گا۔

(۲) جہان والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔ پس یہ قرآن انہیں کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنی عطا کرے گا اور ضلالت کی پگڈنڈیوں سے نکال کر ایمان کی صراط مستقیم پر گامزن کر دے گا۔ بشرطیکہ کوئی اس سے نصیحت حاصل کرنا چاہے، ورنہ عیدہ کور کو کیا نظر آئے کیا دیکھے۔ والا معاملہ ہو گا۔

(۳) قَدَّرَ کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں اور یہ کسی چیز کی اصل حقیقت جاننے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مشرکین مکہ ارسال رسل اور انزال کتب کا انکار کرتے ہیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ انہیں اللہ کی صحیح معرفت ہی حاصل نہیں ورنہ وہ ان چیزوں کا انکار نہ کرتے۔ علاوہ ازیں اسی عدم معرفت الہی کی وجہ سے وہ نبوت و رسالت کی معرفت سے بھی قاصر رہے اور یہ سمجھتے رہے کہ کسی انسان پر اللہ کا کلام کس طرح نازل ہو سکتا ہے؟ جس طرح دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿اَكَانَ لِلنَّاسِ عِجَابًا لِّئَلَّا يَقُولُوا لِمَ كُنَّا مِنَ الْاُنْبِيَاءِ النَّاسِ﴾ (یونس-۲) ”کیا یہ بات لوگوں کے لیے باعث تعجب ہے کہ ہم نے ان ہی میں سے ایک آدمی پر وحی نازل کر کے اسے لوگوں کو ڈرانے پر مامور کر دیا ہے؟“ دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَمَا مَنَعَهُ النَّاسَ اَنْ يُؤْمِنُوْا اِذْ جَاءَهُمُ الْهُدٰى اِلَّا اَنْ قَالُوْا لَآ بَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا نَّبِيًّا وَّلَا﴾ (بنی اسرائیل-۹۴) ہدایت آجانے کے بعد لوگ اسے قبول کرنے سے اس لیے رک گئے کہ انہوں نے کہا کہ کیا اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا ہے؟“ اس کی کچھ تفصیل اس سے قبل آیت نمبر ۸ کے حاشیے میں بھی گزر چکی ہے۔ آیت زیر وضاحت میں بھی انہوں نے اپنے اسی خیال کی بنیاد پر اس بات کی نفی کی کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان پر کوئی کتاب نازل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ایسی بات ہے تو ان سے پوچھو! موسیٰ علیہ السلام پر تورات کس نے نازل کی تھی؟ (جس کو یہ بھی مانتے ہیں)

اوراق میں رکھ چھوڑا^(۱) ہے جن کو ظاہر کرتے ہو اور بہت سی باتوں کو چھپاتے ہو اور تم کو بہت سی ایسی باتیں بتائی گئی ہیں جن کو تم نہ جانتے تھے اور نہ تمہارے بڑے۔^(۲) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے نازل فرمایا ہے^(۳) پھر ان کو ان کے خرافات میں کھیلتے رہنے دیجئے (۹۱)

اور یہ بھی ایسی ہی کتاب ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے جو بڑی برکت والی ہے، اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور تاکہ آپ مکہ والوں کو اور آس پاس والوں کو ڈرائیں۔ اور جو لوگ آخرت کا یقین رکھتے ہیں ایسے لوگ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور وہ اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں۔ (۹۲)

اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہو گا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ سمت لگائے یا یوں کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے حالانکہ اس کے پاس کسی بات کی بھی وحی نہیں آئی اور

فِي حُوزِهِمْ يَلْعَبُونَ ﴿۹۱﴾

وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَهُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿۹۲﴾

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ قَالَ أُوحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ وَمَنْ قَالَ سَأُنزِلُ مِثْلَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوا

(۱) آیت کی مذکورہ تفسیر کے مطابق اب یہود سے خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ تم اس کتاب کو متفرق اوراق میں رکھتے ہو جن میں سے جس کو چاہتے ہو، ظاہر کر دیتے ہو اور جن کو چاہتے ہو، چھپا لیتے ہو۔ جیسے رجم کا مسئلہ یا نبی ﷺ کی صفات کا مسئلہ ہے۔ حافظ ابن کثیر اور امام ابن جریر طبری وغیرہ نے یَجْعَلُونَهُ اور يُنذِرُونَهَا صیغہ غائب کے ساتھ والی قراءت کو ترجیح دی ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ یہ کی آیت ہے۔ اس میں یہود سے خطاب کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور بعض مفسرین نے پوری آیت کو ہی یہود سے متعلق قرار دیا ہے اور اس میں سرے سے نبوت و رسالت کا جو انکار ہے اسے یہود کی ہٹ دھرمی، ضد اور عناد پر مبنی قول قرار دیا ہے۔ گویا اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کی تین رائے ہیں۔ ایک پوری آیت کو یہود سے، دوسرے پوری آیت کو مشرکین سے متعلق اور تیسرے آیت کے ابتدائی حصے کو مشرکین سے متعلق اور نَجْعَلُونَهُ سے یہود سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔

(۲) یہود سے متعلق ماننے کی صورت میں اس کی تفسیر ہوگی کہ تورات کے ذریعے سے تمہیں بتائی گئیں، بصورت دیگر قرآن کے ذریعے سے۔

(۳) یہ مَنْ أَنْزَلَ (کس نے اتارا) کا جواب ہے۔

جو شخص یوں کہے کہ جیسا کلام اللہ نے نازل کیا ہے اسی طرح کا میں بھی لاتا ہوں اور اگر آپ اس وقت دیکھیں جب کہ یہ ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے کہ ہاں اپنی جانیں نکالو۔ آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی^(۱) اس سبب سے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ذمہ جھوٹی باتیں لگاتے تھے، اور تم اللہ تعالیٰ کی آیات سے تکبر کرتے تھے۔^(۲) (۹۳)

اور تم ہمارے پاس تنہا تنہا آگئے^(۳) جس طرح ہم نے اول بار تم کو پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا اس کو اپنے پیچھے ہی چھوڑ آئے اور ہم تو تمہارے ہمراہ تمہارے ان شفاعت کرنے والوں کو نہیں دیکھتے جن کی

أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفُسَكُمْ الْيَوْمَ نُحْزِرُونَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ عِبْرَاتٍ وَكُنْتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿۹۳﴾

وَلَقَدْ جَعَلْنَا نُورًا فِرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُمْ نَارَكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَ الَّذِينَ يَدْعُونَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءَ لَقَدْ تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ

(۱) ظالم سے مراد ہر ظالم ہے اور اس میں کتاب الہی کا انکار کرنے والے اور جھوٹے مدعیان نبوت سب سے پہلے شامل ہیں۔ غَمْرَات سے موت کی سختیاں مراد ہیں۔ ”فرشتے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے۔“ یعنی جان نکالنے کے لیے۔ الْيَوْمَ (آج) سے مراد قبض روح کا دن ہے اور یہی عذاب کے آغاز کا وقت بھی ہے جس کا مبداء قبر ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عذاب قبر برحق ہے۔ ورنہ ہاتھ پھیلانے اور جان نکالنے کا حکم دینے کے ساتھ اس بات کے کہنے کے کوئی معنی نہیں کہ آج تمہیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔ خیال رہے قبر سے مراد برزخ کی زندگی ہے۔ یعنی دنیا کی زندگی کے بعد اور آخرت کی زندگی سے قبل یہ ایک درمیان کی زندگی ہے جس کا عرصہ انسان کی موت سے قیامت کے وقوع تک ہے۔ یہ برزخ کی زندگی کہلاتی ہے۔ چاہے اسے کسی درندے نے کھالیا ہو، اس کی لاش سمندر کی موجوں کی نذر ہو گئی ہو یا اسے جلا کر رکھ بنا دیا گیا یا قبر میں دفن دیا گیا ہو۔ یہ برزخ کی زندگی ہے جس میں عذاب دینے پر اللہ تعالیٰ قادر ہے۔

(۲) اللہ کے ذمے جھوٹی باتیں لگانے میں انزال کتب اور ارسال رسل کا انکار بھی ہے اور جھوٹا دعوائے نبوت بھی ہے۔ اسی طرح نبوت و رسالت کا انکار و استکبار ہے۔ ان دونوں وجوہ سے انہیں ذلت و رسوائی کا عذاب دیا جائے گا۔

(۳) فِرَادَىٰ فِرْدٌ کی جمع ہے جس طرح سُكْرَايَ سَكْرَانٌ کی اور كُنْسَالِي كُنْسَالٍ کی جمع ہے۔ مطلب ہے کہ تم علیحدہ علیحدہ ایک ایک کر کے میرے پاس آؤ گے۔ تمہارے ساتھ نہ مال ہو گا نہ اولاد اور نہ وہ معبود جن کو تم نے اللہ کا شریک اور اپنا مددگار سمجھ رکھا تھا۔ یعنی ان میں سے کوئی چیز بھی تمہیں فائدہ پہنچانے پر قادر نہ ہوگی۔ اگلے جملوں میں انہی امور کی مزید وضاحت ہے۔

مَا كُنْتُمْ تَرْجُونَ ﴿٥٠﴾

إِنَّ اللَّهَ فَلِقُ الْحَبِيبِ وَالنَّوَىٰ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ذَلِكُمْ اللَّهُ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٥١﴾

فَالِقُ الْإِصْبَارِ وَجَعَلَ الْبَيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حَسْبَانَا
ذَلِكُمْ تَعْبِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿٥٢﴾

نسبت تم دعویٰ رکھتے تھے کہ وہ تمہارے معاملہ میں شریک ہیں۔ واقعی تمہارے آپس میں تو قطع تعلق ہو گیا اور وہ تمہارا دعویٰ سب تم سے گیا گزرا ہوا۔ (۹۳) بے شک اللہ تعالیٰ دانہ کو اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے،^(۱) وہ جاندار کو بے جان سے نکال لاتا ہے^(۲) اور وہ بے جان کو جاندار سے نکالنے والا ہے^(۳) اللہ تعالیٰ یہ ہے، سو تم کہاں اٹلے چلے جا رہے ہو۔ (۹۵) وہ صبح کا نکالنے والا ہے^(۴) اور اس نے رات کو راحت کی چیز بنایا ہے^(۵) اور سورج اور چاند کو حساب سے رکھا ہے۔^(۶) یہ ٹھہرائی بات ہے ایسی ذات کی جو کہ قادر ہے

(۱) یہاں سے اللہ تعالیٰ کی بے مثال قدرت اور کاریگری کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ دانے (حب) اور گٹھلی (نواہ: جمع نوی) کو، جسے کاشت کار زمین کی تہ میں دبا دیتا ہے، پھاڑ کر اس سے انواع و اقسام کے درخت پیدا فرماتا ہے۔ زمین ایک ہوتی ہے، پانی بھی، جس سے کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں، ایک ہی ہوتا ہے۔ لیکن جس جس چیز کے وہ دانے یا گٹھلیاں ہوتی ہیں۔ اس کے مطابق ہی اللہ تعالیٰ مختلف قسم کے غلوں اور پھلوں کے درخت ان سے پیدا فرمادیتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے سوا بھی، کوئی ہے، جو یہ کام کرتا ہو یا کر سکتا ہو؟

(۲) یعنی دانے اور گٹھلیوں سے درخت اگا دیتا ہے جس میں زندگی ہوتی ہے اور وہ بڑھتا، پھیلتا اور پھل یا غلہ دیتا ہے یا وہ خوشبودار، رنگ برنگ کے پھول ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر انسان فرحت و انبساط محسوس کرتا یا نطفے اور انڈے سے انسان اور حیوانات پیدا کرتا ہے۔

(۳) یعنی حیوانات سے انڈے، جو مردہ کے حکم میں ہیں۔ حی اور میت کی تعبیر مومن اور کافر سے بھی کی گئی ہے، یعنی مومن کے گھر میں کافر اور کافر کے گھر میں مومن پیدا کر دیتا ہے۔

(۴) اندھیرے اور روشنی کا خالق بھی وہی ہے۔ وہ رات کی تاریکی سے صبح روشن پیدا کرتا ہے جس سے ہر چیز روشن ہو جاتی ہے۔

(۵) یعنی رات کو تاریکیوں میں بدل دیتا ہے تاکہ لوگ روشنی کی تمام مصروفیات ترک کر کے آرام کر سکیں۔

(۶) یعنی دونوں کے لیے ایک حساب بھی مقدر ہے جس میں کوئی تغیر و اضطراب نہیں ہوتا، بلکہ دونوں کی اپنی اپنی منزلیں ہیں، جن پر وہ گرمی اور سردی میں رواں رہتے ہیں۔ جس کی بنیاد پر سردی میں دن چھوٹے اور راتیں لمبی اور

بڑے علم والا ہے۔ (۹۶)

اور وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لئے ستاروں کو پیدا کیا، تاکہ تم ان کے ذریعہ سے اندھیروں میں، خشکی میں اور دریا میں بھی راستہ معلوم کر سکو۔^(۱) بے شک ہم نے دلائل خوب کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں ان لوگوں کے لئے جو خبر رکھتے ہیں۔ (۹۷)

اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا پھر ایک جگہ زیادہ رہنے کی ہے اور ایک جگہ چندے رہنے کی^(۲) بے شک ہم نے دلائل خوب کھول کھول کر بیان کر دیئے ان لوگوں کے لئے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ (۹۸)

اور وہ ایسا ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اس کے ذریعہ سے ہر قسم کے نبات کو نکالا^(۳) پھر ہم نے

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ
الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَضَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۹۷﴾

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ
وَمُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَضَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ﴿۹۸﴾

وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ
شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُحْيُوا بِهِ الْأَرْضَ كَيْدًا وَمِنَ النَّخْلِ

گرمی میں اس کے برعکس دن لمبے اور راتیں چھوٹی ہو جاتی ہیں۔ جس کی تفصیل سورہ یونس۔ ۵، سورہ یسین ۳۰ اور سورہ اعراف ۵۴ میں بھی بیان کی گئی ہے۔

(۱) ستاروں کا یہاں ایک فائدہ اور مقصد بیان کیا گیا ہے، ان کے دو مقصد اور ہیں جو دوسرے مقام پر بیان کیے گئے ہیں۔ آسمانوں کی زینت اور شیطانوں کی مرمت۔ رُجُومًا لِلشَّيْطَانِ - یعنی شیطان آسمان پر جانے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ ان پر شعلہ بن کر گرتے ہیں۔ بعض سلف کا قول ہے مَنْ اعْتَمَدَ فِي هَذِهِ النُّجُومِ غَيْرَ ثَلَاثٍ، فَقَدْ أَخْطَأَ وَكَذَبَ عَلَيَّ اللهُ ان تین باتوں کے علاوہ ان ستاروں کے بارے میں اگر کوئی شخص کوئی اور عقیدہ رکھتا ہے تو وہ غلطی پر ہے اور اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے۔ "اس سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے ملک میں جو علم نجوم کا چرچا ہے جس میں ستاروں کے ذریعے سے مستقبل کے حالات اور انسانی زندگی یا کائنات میں ان کے اثرات بتانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، وہ بے بنیاد بھی ہے اور شریعت کے خلاف بھی۔ چنانچہ ایک حدیث میں اسے جاوہی کا ایک شعبہ (حصہ) بتلایا گیا ہے۔ مَنْ افْتَبَسَ عِلْمًا مِنَ النُّجُومِ افْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ السِّحْرِ زَادَ مَا زَادَ (حسنہ الألبانی صحیح ابی داؤد رقم ۳۹۰۵)

(۲) اکثر مفسرین کے نزدیک مُسْتَقَرٌّ سے رحم مادر اور مُسْتَوْدَعٌ سے صلب پدر مراد ہے۔ (فتح القدر، ابن کثیر)

(۳) یہاں سے اس کی ایک اور عجیب صنعت (کارگیری) کا بیان ہو رہا ہے یعنی بارش کا پانی۔ جس سے وہ ہر قسم کے

اس سے سبز شاخ نکالی^(۱) کہ اس سے ہم اوپر تلے دانے چڑھے ہوئے نکالتے ہیں^(۲) اور کھجور کے درختوں سے یعنی ان کے گھبے میں سے، خوشے ہیں جو نیچے کو لٹکے جاتے ہیں^(۳) اور انگوروں کے باغ اور زیتون^(۴) اور انار کہ بعض ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہیں اور کچھ ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہیں ہوتے۔^(۵) ہر ایک کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو ان میں دلائل ہیں^(۶) ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں۔ (۹۹)

اور لوگوں نے شیاطین کو اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دے رکھا ہے حالانکہ ان لوگوں کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے اور ان لوگوں نے اللہ کے حق میں بیٹھے اور بیٹیاں بلا سند

مِنْ طَلْعِهَا فَنَوَافِدُ دَابَّةٍ وَحَبَابٍ مِنَ الْعَنَابِ وَالزَّيْتُونِ
وَالرُّمَّانِ مُشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ انظُرُوا إِلَى ثَمَرِهِ
إِذَا أَشْرَبْتُمُوهُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّعَوْمٍ مُّؤْمِنُونَ ﴿۹۹﴾

وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَخَرَقُوا لَآبِنِينَ وَبَدَّيْنِ
بِعَيْرِهِمْ مُبَدَّلًا وَعَلَىٰ عَصَايِمُونَ ﴿۱۰۰﴾

درخت پیدا فرماتا ہے۔

(۱) اس سے مراد وہ سبز شاخیں اور کونسلیں ہیں جو زمین میں دبے ہوئے دانے سے اللہ تعالیٰ زمین کے اوپر ظاہر فرماتا ہے، پھر وہ پودا یا درخت نشوونما پاتا ہے۔

(۲) یعنی ان سبز شاخوں سے ہم اوپر تلے دانے چڑھے ہوئے نکالتے ہیں۔ جس طرح گندم اور چاول کی بالیاں ہوتی ہیں۔ مراد یہ سب غلہ جات ہیں مثلاً جو، جوار، باجرہ، مکئی، گندم اور چاول وغیرہ۔

(۳) فَنَوَافِدُ فَنُو کی جمع ہے جیسے صِنُو اور صِنَوَانٌ ہے۔ مراد خوشے ہیں۔ طَلْعٌ وہ گابھایا گیا ہے جو کھجور کی ابتدائی شکل ہے، یہی بڑھ کر خوشہ بنتا ہے اور پھر وہ رطب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ دَابَّةٌ سے مراد وہ خوشے ہیں جو قریب ہوں۔ اور کچھ خوشے دور بھی ہوتے ہیں جن تک ہاتھ نہیں پہنچتے۔ بطور امتنان دانیہ کا ذکر فرما دیا ہے، مطلب ہے۔ مِنْهَا دَابَّةٌ وَمِنْهَا بَعِيدَةٌ (کچھ خوشے قریب ہیں اور کچھ دور) بَعِيدَةٌ محذوف ہے۔ (فتح القدر)

(۴) جنت زیتون اور رمان یہ سب منصوب ہیں، جن کا عطف نبات پر ہے۔ یعنی فَأَخْرَجْنَا بِهِ جَنَّاتٍ یعنی بارش کے پانی سے ہم نے انگوروں کے باغات اور زیتون اور انار پیدا کیے۔

(۵) یعنی بعض اوصاف میں یہ باہم ملتے جلتے ہیں اور بعض میں ملتے جلتے نہیں ہیں۔ یا ان کے پتے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ پھل نہیں ملتے، یا شکل میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں لیکن مزے اور ذائقے میں باہم مختلف ہیں۔

(۶) یعنی مذکورہ تمام چیزوں میں خالق کائنات کے کمال قدرت اور اس کی حکمت و رحمت کے دلائل ہیں۔

تراش رکھی ہیں اور وہ پاک اور برتر ہے ان باتوں سے جو یہ کرتے ہیں۔ (۱۰۰)

وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اللہ تعالیٰ کے اولاد کہاں ہو سکتی ہے حالانکہ اس کے کوئی بیوی تو ہے نہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا^(۱) اور وہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ (۱۰۱)

یہ ہے اللہ تعالیٰ تمہارا رب! اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، تو تم اس کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز کا کار ساز ہے۔ (۱۰۲)

اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی^(۲) اور وہ سب

بَدِيعُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَتَىٰ بِكُونِ لَهُمْ لَكِنَّا وَلَمْ يَكُن لَّهُ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۱۰۱﴾

ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيمٌ ﴿۱۰۲﴾

لَا تَأْتِيهِ رِيحٌ أَبْصَارٌ وَهُوَ بِكُلِّ الْبَصَارِ وَهُوَ اللَّطِيفُ

(۱) یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کے پیدا کرنے میں واحد ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ اسی طرح وہ اس لائق ہے کہ اس اکیلے کی عبادت کی جائے، عبادت میں کسی اور کو شریک نہ بنایا جائے۔ لیکن لوگوں نے اس ذات واحد کو چھوڑ کر جنوں کو اس کا شریک بنا رکھا ہے، حالانکہ وہ خود اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ مشرکین عبادت تو بتوں کی یا قبروں میں مدفون اشخاص کی کرتے ہیں لیکن یہاں کہا گیا ہے کہ انہوں نے جنات کو اللہ کا شریک بنایا ہوا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جنات سے مراد شیاطین ہیں اور شیاطین کے کہنے سے ہی شرک کیا جاتا ہے اس لیے گویا شیطان ہی کی عبادت کی جاتی ہے۔ اس مضمون کو قرآن کریم میں متعدد جگہ بیان کیا گیا ہے مثلاً سورہ نساء۔ ۱۷۔ سورہ مریم۔ ۴۴۔ سورہ یٰسین ۶۰۔ سورہ سبأ۔ ۴۱۔

(۲) أَبْصَارٌ بَصَرٌ (نگاہ) کی جمع ہے یعنی انسان کی آنکھیں اللہ کی حقیقت کی کند تک نہیں پہنچ سکتیں۔ اور اگر اس سے مراد رویت بصری ہو تو اس کا تعلق دنیا سے ہو گا یعنی دنیا کی آنکھ سے کوئی اللہ کو نہیں دیکھ سکتا۔ تاہم یہ صحیح اور متواتر روایات سے ثابت ہے کہ قیامت والے دن اہل ایمان اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے اور جنت میں بھی اس کے دیدار سے مشرف ہوں گے۔ اس لیے معتزلہ کا اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا، دنیا میں نہ آخرت میں، صحیح نہیں۔ کیونکہ اس نفی کا تعلق صرف دنیا سے ہے۔ اسی لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے فرماتی تھیں، جس شخص نے بھی یہ دعویٰ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (شب معراج میں) اللہ تعالیٰ کی زیارت کی ہے، اس نے قطعاً جھوٹ بولا ہے۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورہ الأنعام) کیونکہ اس آیت کی رو سے پیغمبر سمیت کوئی بھی اللہ کو دیکھنے پر قادر نہیں ہے۔ البتہ آخرت کی زندگی میں یہ دیدار ممکن ہو گا۔ جیسے دوسرے مقام پر قرآن نے اس کا اثبات فرمایا۔ ﴿وَجِئُوا بِكُوفٍ مِّنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ إِلَىٰ رَبِّهَا كَانِظِرَةً﴾ (القیامۃ) کئی چہرے اس دن تروتازہ

الْحَبِيدُ ⑤

نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے اور وہی بڑا باریک بین باخبر ہے۔ (۱۰۳)

اب بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے حق بنی کے ذرائع پہنچ چکے ہیں سو جو شخص دیکھ لے گا وہ اپنا فائدہ کرے گا اور جو شخص اندھا رہے گا وہ اپنا نقصان کرے گا،^(۱) اور میں تمہارا نگران نہیں ہوں۔^(۲) (۱۰۳)

اور ہم اس طور پر دلائل کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ یہ یوں کہیں کہ آپ نے کسی سے پڑھ لیا ہے^(۳) اور تاکہ ہم اس کو دانشمندیوں کے لئے خوب ظاہر کر دیں۔ (۱۰۵)

آپ خود اس طریق پر چلتے رہئے جس کی وحی آپ کے رب تعالیٰ کی طرف سے آپ کے پاس آئی ہے، اللہ

قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِمُعَيِّنٍ ⑥

وَكَذَلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ⑦

إِنِّي بِنَاءِ مَا أُنزِلُ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ لَأَكِيدُ لِلْكَافِرِينَ الْآخِرِينَ ⑧

ہوں گے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔“

(۱) بَصَائِرُ بَصِيرَةٌ کی جمع ہے۔ جو اصل میں دل کی روشنی کا نام ہے۔ یہاں مراد وہ دلائل و براہین ہیں جو قرآن نے جگہ جگہ اور بار بار بیان کیے ہیں اور جنہیں نبی ﷺ نے بھی احادیث میں بیان فرمایا ہے۔ جو ان دلائل کو دیکھ کر ہدایت کا راستا اپنالے گا، اس میں اسی کا فائدہ ہے، نہیں اپنائے گا، تو اسی کا نقصان ہے۔ جیسے فرمایا ﴿مِنْ أَهْتَدَىٰ بِأَنفَاهُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ هَضَلَّ فَاُتِمَّمُوا لِعَالَمٍ عَلَيْهَا﴾ (بنی اسرائیل - ۱۵) اس کا مطلب بھی وہی ہے جو زیر وضاحت آیت کا ہے۔

(۲) بلکہ صرف مبلغ، داعی اور بشیر و نذیر ہوں۔ راہ دکھلانا میرا کام ہے، راہ پر چلا دینا یہ اللہ کے اختیار میں ہے۔

(۳) یعنی ہم توحید اور اس کے دلائل کو اس طرح کھول کھول کر اور مختلف انداز سے بیان کرتے ہیں کہ مشرکین یہ کہنے لگتے ہیں کہ محمد ﷺ کہیں سے پڑھ کر اور سیکھ کر آیا ہے۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا۔ ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُنزِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ أُولِي الْأَبْصَارِ﴾ (الفرقان - ۳-۵) ”کافروں نے کہا، یہ قرآن تو اس کا اپنا گھڑا ہوا ہے، جس پر دوسروں نے بھی اس کی مدد کی ہے۔ یہ لوگ ایسا دعویٰ کر کے ظلم اور جھوٹ پر اتر آئے ہیں۔ نیز انہوں نے کہا کہ یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں، جس کو اس نے لکھ رکھا ہے۔“ حالانکہ بات یہ نہیں ہے، جس طرح یہ سمجھتے یا دعویٰ کرتے ہیں بلکہ مقصد اس تفصیل سے سمجھ دار لوگوں کے لیے تبيين و تشریح ہے تاکہ ان پر حجت پوری ہو جائے۔

تعالیٰ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اور مشرکین کی طرف خیال نہ کیجئے۔ (۱۰۶)

اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو یہ شرک نہ کرتے^(۱) اور ہم نے آپ کو ان کا نگران نہیں بنایا۔ اور نہ آپ ان پر مختار ہیں!^(۲) (۱۰۷)

اور گالی مت دو ان کو جن کی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں کیونکہ پھر وہ براہِ جمل حد سے گزر کر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے^(۳) ہم نے اسی طرح ہر طریقہ والوں کو ان کا عمل مرغوب بنا رکھا ہے۔ پھر اپنے رب ہی کے پاس ان کو جانا ہے سو وہ ان کو بتلا دے گا جو کچھ بھی وہ کیا کرتے تھے۔ (۱۰۸)

اور ان لوگوں نے قسموں میں بڑا زور لگا کر اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی کہ^(۴) اگر ان کے پاس کوئی نشانی آجائے^(۵) تو

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا
وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ﴿۱۰۷﴾

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا
بِعَدْوٍ عَلَيْهِمْ كَذَلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ
مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۰۸﴾

وَأَنْفُسُوا بِاللَّهِ جَهْدًا أَيْمَانَهُمْ لِيَنْجَاءَ نَفْسَهُمْ إِلَيْهِ فَيَكْفُرُوا
بِهَا قُلْ إِنَّهَا لَآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَمَا بَشِعْرَكُمْ إِنَّهَا إِذَا

(۱) اس نکتے کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے کہ اللہ کی مشیت اور چیز ہے اور اس کی رضا اور اس کی رضا تو اسی میں ہے کہ اس کے ساتھ شرک نہ کیا جائے۔ تاہم اس نے اس پر انسانوں کو مجبور نہیں کیا کیونکہ جبر کی صورت میں انسان کی آزمائش نہ ہوتی، ورنہ اللہ تعالیٰ کے پاس تو ایسے اختیارات ہیں کہ وہ چاہے تو کوئی انسان شرک کرنے پر قادر ہی نہ ہو سکے۔ (مزید دیکھئے سورہ بقرہ آیت ۲۵۳ اور سورہ الانعام آیت ۳۵ کا حاشیہ)

(۲) یہ مضمون بھی قرآن مجید میں متعدد جگہ بیان کیا گیا ہے۔ مقصد نبی ﷺ کی داعیانہ اور مبلغانہ حیثیت کی وضاحت ہے جو منصب رسالت کا تقاضا ہے اور آپ صرف اسی حد تک مکلف تھے۔ اس سے زیادہ آپ کے پاس اگر اختیارات ہوتے تو آپ اپنے محسن پچھا ابوطالب کو ضرور مسلمان کر لیتے، جن کے قبول اسلام کی آپ شدید خواہش رکھتے تھے۔

(۳) یہ سد ذریعہ کے اس اصول پر مبنی ہے کہ اگر ایک مباح کام، اس سے بھی زیادہ بڑی خرابی کا سبب بنتا ہو تو وہاں اس مباح کام کا ترک راجح اور بہتر ہے۔ اسی طرح نبی ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ تم کسی کے ماں باپ کو گالی مت دو کہ اس طرح تم خود اپنے والدین کے لیے گالی کا سبب بن جاؤ گے (صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان الکبائر وأكبرها، امام شوکانی لکھتے ہیں یہ آیت سد ذریعہ کے لیے اصل اصیل ہے۔ (فتح القدیر)

(۴) جِهْدًا أَيْمَانَهُمْ، أَي: حَلَفُوا أَيْمَانًا مُؤَكَّدَةً. بڑی تاکید سے قسمیں کھائیں۔

(۵) یعنی کوئی بڑا معجزہ جو ان کی خواہش کے مطابق ہو، جیسے عصائے موسیٰ علیہ السلام، احیائے موتی اور ناقہٴ ثمود

جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

وہ ضرور ہی اس پر ایمان لے آئیں گے، آپ کہہ دیجئے کہ نشانیاں سب اللہ کے قبضہ میں ہیں^(۱) اور تم کو اس کی کیا خبر کہ وہ نشانیاں جس وقت آجائیں گی یہ لوگ تب بھی ایمان نہ لائیں گے۔ (۱۰۹)

اور ہم بھی ان کے دلوں کو اور ان کی نگاہوں کو پھیر دیں گے جیسا کہ یہ لوگ اس پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے^(۲) اور ہم ان کو ان کی سرکشی میں حیران رہنے دیں گے۔ (۱۱۰)

وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَنزِّلُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝

وغیرہ جیسا۔

(۱) ان کا یہ مطالبہ خرق عادت تعنت و عناد کے طور پر ہے، طلب ہدایت کی نیت سے نہیں ہے۔ تاہم ان نشانیوں کا ظہور تمام تر اللہ کے اختیار میں ہے، وہ چاہے تو ان کا مطالبہ پورا کر دے۔ بعض مرسل روایات میں ہے کہ کفار مکہ نے مطالبہ کیا تھا کہ صفا پہاڑ سونے کا بنا دیا جائے تو وہ ایمان لے آئیں گے، جس پر جبریل علیہ السلام نے آکر کہا کہ اگر اس کے بعد بھی یہ ایمان نہ لائے تو پھر انہیں ہلاک کر دیا جائے گا، جسے نبی ﷺ نے پسند نہیں فرمایا۔ (ابن کثیر)۔

(۲) اس کا مطلب ہے کہ جب پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے تو اس کا وبال ان پر اس طرح پڑا کہ آئندہ بھی ان کے ایمان لانے کا امکان ختم ہو گیا۔ دلوں اور نگاہوں کو پھیر دینے کا یہی مفہوم ہے۔ (ابن کثیر)

اور اگر ہم ان کے پاس فرشتوں کو بھیج دیتے^(۱) اور ان سے مردے باتیں کرنے لگتے^(۲) اور ہم تمام موجودات کو ان کے پاس ان کی آنکھوں کے روبرو لا کر جمع کر دیتے ہیں^(۳) تب بھی یہ لوگ ہرگز ایمان نہ لاتے ہاں اگر اللہ ہی چاہے تو اور بات ہے لیکن ان میں زیادہ لوگ جہالت کی باتیں کرتے ہیں۔^(۴)

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیطان پیدا کئے تھے کچھ آدمی اور کچھ جن،^(۵) جن میں سے بعض بعضوں کو چکنی چڑھی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے تاکہ ان کو دھوکہ میں ڈال دیں^(۶) اور اگر اللہ تعالیٰ

وَلَوْ أَنزَلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلِئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتِيُّ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ وَلَئِنْ أَكْرَمَهُمْ بِجَبَلُونِ ۝

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيْطَانِ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا وَأَلَوْشَاءَ رِبِّكَ مَا فَعَلُوهُ ذَنْبُهُمْ وَمَا يَفْعَرُونَ ۝

(۱) جیسا کہ وہ بار بار اس کا مطالبہ ہمارے پیغمبر سے کرتے ہیں۔

(۲) اور وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کر دیتے۔

(۳) دوسرا مفہوم اس کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ جو نشانیاں وہ طلب کرتے ہیں، وہ سب ان کے روبرو پیش کر دیتے۔ اور ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہر چیز جمع ہو کر گروہ در گروہ یہ گواہی دے کہ پیغمبروں کا سلسلہ برحق ہے تو ان تمام نشانوں اور مطالبوں کے پورا کر دینے کے باوجود یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ مگر جس کو اللہ چاہے۔ اسی مفہوم کی یہ آیت بھی ہے ﴿إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ * وَلَوْ جَاءَهُمْ نَصْرٌ مِنْ رَبِّكَ وَسَيِّدُوا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ﴾ (سورۃ یونس ۹۶-۹۷) ”جن پر تیرے رب کی بات ثابت ہو گئی ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے، اگرچہ ان کے پاس ہر قسم کی نشانی آجائے یہاں تک کہ وہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔“

(۴) اور یہ جہالت کی باتیں ہی ان کے اور حق قبول کرنے کے درمیان حائل ہیں۔ اگر جہالت کا پردہ اٹھ جائے تو شاید حق ان کی سمجھ میں آجائے اور پھر اللہ کی مشیت سے حق کو اپنا بھی لیں۔

(۵) یہ وہی بات ہے جو مختلف انداز میں رسول اللہ ﷺ کی تسلی کے لیے فرمائی گئی ہے کہ آپ سے پہلے جتنے بھی انبیا گزرے، ان کی تکذیب کی گئی، انہیں ایذا نہیں دی گئیں وغیرہ وغیرہ۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے صبر اور حوصلے سے کام لیا، آپ بھی ان دشمنان حق کے مقابلے میں صبر و استقامت کا مظاہرہ فرمائیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیطان کے پیروکار جنوں میں سے بھی ہیں اور انسانوں میں سے بھی۔ اور یہ وہ ہیں جو دونوں گروہوں میں سے سرکش، باغی اور متکبر قسم کے ہیں۔

(۶) وحشیٰ خنثیہ بات کو کہتے ہیں یعنی انسانوں اور جنوں کو گمراہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کو چالبازیاں اور حیلے سکھاتے

چاہتا تو یہ ایسے کام نہ کر سکتے^(۱) سوان لوگوں کو اور جو کچھ یہ افترا پردازی کر رہے ہیں اس کو آپ رہنے دیجئے۔ (۱۱۳)

اور تاکہ اس کی طرف ان لوگوں کے قلوب مائل ہو جائیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور تاکہ اس کو پسند کر لیں اور تاکہ مرتکب ہو جائیں ان امور کے جن کے وہ مرتکب ہوتے تھے۔^(۲) (۱۱۳)

تو کیا اللہ کے سوا کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں حالانکہ وہ ایسا ہے کہ اس نے ایک کتاب کامل تمہارے پاس بھیج دی ہے، اس کے مضامین خوب صاف صاف بیان کئے گئے ہیں اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس بات کو یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ یہ آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ بھیجی گئی ہے، سو آپ شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔^(۳) (۱۱۳)

آپ کے رب کا کلام سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے،^(۴) اس کے کلام کا کوئی بدلنے والا

وَلَيَصْحَبَنَّهُ إِلَيْهِ أَوْدَةٌ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ يَا لَاحِرَةَ
وَلَا يَرْضَوهُ وَلَيُعَذِّبُنَّهُمْ مَا لَهُمْ مَقَرٌّ مَّقُونَ ﴿۱۱۳﴾

أَفَعَدَرَ اللَّهُ آيَاتِنِي حَكْمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ لِيَكْتُمُ الْكِتَابَ
مُقْتَدِلًا وَالَّذِينَ اتَّبَعَتْهُمْ أَكْتُبَتْ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنْزَلٌ
مِّن رَّبِّكَ يَا حَقِّقْ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿۱۱۴﴾

وَوَسَّيْتُ كَلِمَاتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدَلًا لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِنَا
وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۱۵﴾

ہیں۔ تاکہ لوگوں کو دھوکے اور فریب میں مبتلا کر سکیں۔ یہ بات عام مشاہدے میں بھی آئی ہے کہ شیطانی کاموں میں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ خوب بڑھ چڑھ کر تعاون کرتے ہیں جسکی وجہ سے برائی بہت جلدی فروغ پاجاتی ہے۔

(۱) یعنی اللہ تعالیٰ تو ان شیطانی جھمنڈوں کو ناکام بنانے پر قادر ہے لیکن وہ بالآخر ایسا نہیں کرے گا کیونکہ ایسا کرنا اس کے نظام اور اصول کے خلاف ہے جو اس نے اپنی مشیت کے تحت اختیار کیا ہے، جس کی حکمتیں وہ بہتر جانتا ہے۔

(۲) یعنی شیطانی وساوس کا شکار وہی لوگ ہوتے ہیں اور وہی اسے پسند کرتے اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس حساب سے لوگوں کے اندر عقیدہ آخرت کے بارے میں ضعف پیدا ہو رہا ہے، اسی حساب سے لوگ شیطانی جال میں پھنس رہے ہیں۔

(۳) آپ کو خطاب کر کے دراصل امت کو تعلیم دی جا رہی ہے۔

(۴) اخبار و واقعات کے لحاظ سے سچا ہے اور احکام و مسائل کے اعتبار سے عادل ہے یعنی اس کا ہر امر اور نہی عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ کیونکہ اس نے انہی باتوں کا حکم دیا ہے جن میں انسانوں کا فائدہ ہے اور انہی چیزوں سے روکا ہے جن

نہیں^(۱) اور وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔^(۲) (۱۱۵)
 اور دنیا میں زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کا کما
 مانے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بے راہ کر دیں وہ
 محض بے اصل خیالات پر چلتے ہیں اور بالکل قیاسی باتیں
 کرتے ہیں۔^(۳) (۱۱۶)

بالیقین آپ کا رب ان کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ
 سے بے راہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے
 جو اس کی راہ پر چلتے ہیں۔ (۱۱۷)

سو جس جانور پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے اس میں سے
 کھاؤ! اگر تم اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہو۔^(۴) (۱۱۸)

وَأَنْ تَطْعَمَ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ
 إِنَّ يَكْفُرُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ هُمْ إِلَّا جَحْرًا صَوْنٌ ﴿۱۱۶﴾

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ
 بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۱۱۷﴾

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۱۸﴾

میں نقصان اور فساد ہے۔ گو انسان اپنی نادانی یا انوائے شیطانی کی وجہ سے اس حقیقت کو نہ سمجھ سکیں۔

(۱) یعنی کوئی ایسا نہیں جو رب کے کسی حکم میں تبدیلی کر دے، کیونکہ اس سے بڑھ کر کوئی طاقتور نہیں۔

(۲) یعنی بندوں کے اقوال سننے والا اور ان کی ایک ایک حرکت و ادا کو جاننے والا ہے اور وہ اس کے مطابق ہر ایک کو جزا
 دے گا۔

(۳) قرآن کی اس بیان کردہ حقیقت کا بھی، واقعے کے طور پر ہر دور میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے مقام پر اللہ
 تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ ﴾ (سورۃ یوسف: ۱۰۳) ”آپ کی خواہش کے باوجود اکثر لوگ
 ایمان لانے والے نہیں۔“ اس سے معلوم ہوا کہ حق و صداقت کے راستے پر چلنے والے لوگ ہمیشہ تھوڑے ہی ہوتے
 ہیں۔ جس سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ حق و باطل کا معیار، دلائل و براہین ہیں، لوگوں کی اکثریت و اقلیت نہیں۔ یعنی
 ایسا نہیں ہے کہ جس بات کو اکثریت نے اختیار کیا ہوا ہو، وہ حق ہو اور اقلیت میں رہنے والے باطل پر ہوں۔ بلکہ مذکورہ
 حقیقت قرآنی کی رو سے یہ زیادہ ممکن ہے کہ اہل حق تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں ہوں اور اہل باطل اکثریت میں۔
 جس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت ۳۷ فرقوں میں بٹ جائے گی،
 جن میں سے صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا، باقی سب جہنمی۔ اور اس جنتی فرقے کی نشانی آپ ﷺ نے یہ بیان فرمائی کہ جو
 مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي ”میرے اور میرے صحابہ کے طریقے پر چلنے والا ہوگا“ (ابوداؤد کتاب السنۃ، باب شرح
 السنۃ، نمبر ۳۵۹۲۔ ترمذی، کتاب الإیمان، باب ماجاء فی افتراق هذه الأمة وقد حسنه الترمذی فی بعض
 النسخ وأقره الألبانی فی الطحاویة، حدیث نمبر ۳۶۳)

(۴) یعنی جس جانور پر شکار کرتے وقت یا ذبح یا نحر کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے، اسے کھالو بشرطیکہ وہ ان جانوروں میں
 سے ہوں جن کا کھانا مباح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس جانور پر عمد آ ان موقعوں پر اللہ کا نام نہ لیا جائے وہ حلال

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا دُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَضَّلَ
لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْهِ إِلَّا مَا اضْطُرُّرْتُمْ إِلَيْهِ وَإِنْ كَشِيتُمْ
لِيَضْمُونٍ بِأَهْوَابِهِمْ يَخْبِرُ عَلَيْهِمْ إِنْ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ
بِالْمُعْتَدِينَ ﴿۱۱۹﴾

وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِلَافَةِ وَبَاطِنَةَ إِرَائِ الْإِنِّينَ يَكْسِبُونَ الْإِلَافَةَ
سَيَجْزُونَ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۱۲۰﴾

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا دُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ وَإِرَائِ

اور آخر کیا وجہ ہے کہ تم ایسے جانور میں سے نہ کھاؤ جس پر
اللہ کا نام لیا گیا ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان سب جانوروں کی
تفصیل بتادی ہے جن کو تم پر حرام کیا ہے، (۱) مگر وہ بھی جب
تم کو سخت ضرورت پڑ جائے تو حلال ہے اور یہ یقینی بات ہے
کہ بہت سے آدمی اپنے خیالات پر بلا کسی سند کے گمراہ
کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ حد سے
نکل جانے والوں کو خوب جانتا ہے۔ (۱۱۹)

اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی
چھوڑ دو۔ بلاشبہ جو لوگ گناہ کر رہے ہیں ان کو ان کے
کئے کی عقربت سزا ملے گی۔ (۱۲۰)

اور ایسے جانوروں میں سے مت کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ
لیا گیا ہو اور یہ کام نافرمانی کا ہے (۲) اور یقیناً شیاطین اپنے

وطیب نہیں البتہ اس سے ایسی صورت متشبیٰ ہے کہ جس میں یہ التباس ہو کہ ذبح کے وقت ذبح کرنے والے نے اللہ کا
نام لیا یا نہیں؟ اس میں حکم یہ ہے کہ اللہ کا نام لے کر اسے کھا لو۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کچھ لوگ ہمارے پاس گوشت لے کر آتے ہیں (اس سے مراد وہ اعرابی تھے جو نئے نئے مسلمان
ہوئے تھے اور اسلامی تعلیم و تربیت سے پوری طرح بہرہ ور بھی نہیں تھے) ہم نہیں جانتے کہ انہوں نے اللہ کا نام لیا یا
نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سَمُّوا عَلَيْهِ أَنْتُمْ وَكُلُوا (صحیح بخاری۔ باب ذبیحة الأعراب نمبر ۵۵۰) ”تم اللہ
کا نام لے کر اسے کھا لو“ یعنی التباس (شبہ) کی صورت میں یہ رخصت ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر قسم کے جانور کا
گوشت بسم اللہ پڑھ لینے سے حلال ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی منڈیوں اور
دکانوں پر ملنے والا گوشت حلال ہے۔ ہاں اگر کسی کو وہ ہم اور التباس ہو تو وہ کھاتے وقت بسم اللہ پڑھ لے۔

(۱) جس کی تفصیل اسی سورت میں آگے آرہی ہے، اس کے علاوہ بھی اور سورتوں نیز احادیث میں محرمات کی تفصیل
بیان کر دی گئی ہے۔ ان کے علاوہ باقی حلال ہیں اور حرام جانور بھی عند الاضطرار سد رمق کی حد تک جائز ہیں۔

(۲) یعنی عدا اللہ کا نام جس جانور پر نہ لیا گیا اس کا کھانا فسق اور ناجائز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے یہی
معنی بیان کئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ”بھول جانے والے کو فاسق نہیں کہا جاتا“ اور امام بخاری کا رجحان بھی یہی ہے اور یہی
احناف کا مسلک ہے تاہم امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ مسلمان کا ذبیحہ دونوں صورتوں میں حلال ہے چاہے وہ اللہ کا نام
لے یا عدا چھوڑ دے اور وہ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ كُوْفِرِ اللَّهِ کے نام پر ذبح کئے گئے جانور سے متعلق قرار دیتے ہیں۔

دوستوں کے دل میں ڈالتے ہیں تاکہ یہ تم سے جدال کریں^(۱) اور اگر تم ان لوگوں کی اطاعت کرنے لگو تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ گے۔ (۱۴۱)

ایسا شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو ایک ایسا نور دے دیا کہ وہ اس کو لئے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیا ایسا شخص اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے؟ جو تاریکیوں سے نکل ہی نہیں پاتا۔^(۲) اسی طرح کافروں کو ان کے اعمال خوش نما معلوم ہوا کرتے ہیں۔ (۱۴۲)

اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں وہاں کے رئیسوں ہی کو جرائم کا مرتکب بنایا تاکہ وہ لوگ وہاں فریب کریں۔^(۳)

الشَّيْطَانُ يُوْحَىٰ إِلَىٰ أَوْلِيَهِمْ لِيُجَادُواكُمْ وَيُرَاكُمْ تَعْمَىٰ بِهِ
أَوْ مَن كَانَ مَبِيئًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ
فِي النَّجَاسِ كَمَن مَّثَلَهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا
كَذَلِكَ نُزَيِّنُ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكْبَرًا مَّعْرُومًا لِيَسْتَكْبَرُوا

(۱) شیطان نے اپنے ساتھیوں کے ذریعے سے یہ بات پھیلائی کہ یہ مسلمان اللہ کے ذبح کئے ہوئے جانور (یعنی مردہ) کو تو حرام اور اپنے ہاتھ سے ذبح شدہ کو حلال قرار دیتے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ کو ماننے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شیطان اور اس کے دوستوں کے وسوسوں کے پیچھے مت لگو؛ جو جانور مردہ ہے یعنی بغیر ذبح کئے مر گیا (سوائے سمندری میتہ کے کہ وہ حلال ہے) اس پر چونکہ اللہ کا نام نہیں لیا گیا، اس لئے اس کا کھانا حلال نہیں ہے۔

(۲) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کافر کو میت (مردہ) اور مومن کو حی (زندہ) قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ کافر کفر و ضلالت کی تاریکیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے اور اس سے نکل ہی نہیں پاتا جس کا نتیجہ ہلاکت و بربادی ہے اور مومن کے دل کو اللہ تعالیٰ ایمان کے ذریعے سے زندہ فرما دیتا ہے جس سے زندگی کی راہیں اس کے لئے روشن ہو جاتی ہیں اور وہ ایمان و ہدایت کے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے، جس کا نتیجہ کامیابی و کامرانی ہے۔ یہ وہی مضمون ہے جو حسب ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ ﴿ اِنَّ اِلٰهَ الْاِنْسَانِ اَلْمَلٰئِكَةُ اَلَّتِي اَسْمَعُوْنَ اَمْرًا مِّنْ رَّبِّكَ ۗ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾

(سورۃ البقرۃ - ۲۵۷) ﴿ مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرِ وَالسَّبِیْعِ هَلْ یَسْتَوِیْنَ مَثَلًا ﴿١٤٢﴾ (سورۃ ہود - ۲۴) اور ﴿ وَمَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرِ ﴿١٤٣﴾ وَلَا الظُّلُمٰتِ وَلَا النُّوْرِ ﴿١٤٤﴾ وَلَا الظِّلِّ وَلَا النُّوْرِ ﴿١٤٥﴾ وَلَا یَسْتَوِی الْاَحْیٰی وَلَا الْمَوْتٰتِ ﴿١٤٦﴾ (سورۃ

فاطر - ۱۹-۲۴)

(۳) اَكْبَرًا، اَكْبَرُ کی جمع ہے، مراد کافروں اور فاسقوں کے سرغنے اور کھڑ ہتیج ہیں کیونکہ یہی انہما اور داعیانِ حق کی مخالفت میں پیش پیش ہوتے ہیں اور عام لوگ تو صرف ان کے پیچھے لگنے والے ہوتے ہیں، اس لئے ان کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں ایسے لوگ عام طور پر دنیاوی دولت اور خاندانی وجاہت کے اعتبار سے بھی نمایاں ہوتے ہیں، اس

اور وہ لوگ اپنے ہی ساتھ فریب کر رہے ہیں اور ان کو ذرا خبر نہیں۔^(۱) (۱۲۳)

اور جب ان کو کوئی آیت پہنچتی ہے تو یوں کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ ہم کو بھی ایسی ہی چیز نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی جاتی ہے،^(۲) اس موقع کو تو اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کہاں وہ اپنی پیغمبری رکھے؟^(۳) عنقریب ان لوگوں کو جنہوں نے جرم کیا ہے اللہ کے پاس پہنچ کر ذلت پہنچے گی اور ان کی شرارتوں کے مقابلے میں سزائے سخت۔ (۱۲۴)

سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ راستہ پر ڈالنا چاہے اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے اور جس کو بے راہ رکھنا چاہے اس کے سینہ کو بہت تنگ کر دیتا ہے جیسے کوئی آسمان میں چڑھتا ہے،^(۴) اسی طرح اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں پر ناپاکی مسلط کر دیتا ہے۔^(۵) (۱۲۵)

اور یہی تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے۔ ہم نے فصاحت حاصل کرنے والوں کے واسطے ان آیتوں کو صاف صاف بیان کر دیا۔ (۱۲۶)

فِيهَا وَمَا يَكُونُونَ إِلَّا بِأَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿١٢٣﴾

وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۗ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۗ سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ لِّمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿١٢٤﴾

فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ۗ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصْعَقُ فِي السَّمَاءِ كَذَلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٢٥﴾

وَهَذَا صِرَاطٌ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا ۚ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٢٦﴾

لئے مخالفت حق میں بھی ممتاز ہوتے ہیں (یہی مضمون سورہ سبأ کی آیات ۳۱ تا ۳۳ سورہ زخرف ۲۳۔ سورہ نوح ۲۲ وغیرہا میں بھی بیان کیا گیا ہے)۔

(۱) یعنی ان کی اپنی شرارت کا وبال اور اسی طرح ان کے پیچھے لگنے والے لوگوں کا وبال، انہی پر پڑے گا (مزید دیکھئے سورہ عنکبوت ۱۳۔ سورہ نحل ۲۵)

(۲) یعنی ان کے پاس بھی فرشتے وحی لے کر آئیں اور ان کے سروں پر بھی نبوت و رسالت کا تاج رکھا جائے۔

(۳) یعنی یہ فیصلہ کرنا کہ کس کو نبی بنایا جائے؟ یہ تو اللہ ہی کا کام ہے کیونکہ وہی ہر بات کی حکمت و مصلحت کو جانتا ہے اور اسے ہی معلوم ہے کہ کون اس منصب کا اہل ہے؟ مکہ کا کوئی چودھری و رئیس یا جناب عبداللہ و حضرت آمنہ کا دریتیم؟

(۴) یعنی جس طرح زور لگا کر آسمان پر چڑھنا ممکن نہیں ہے، اسی طرح جس شخص کے سینے کو اللہ تعالیٰ تنگ کر دے اس میں توحید اور ایمان کا داخلہ ممکن نہیں ہے۔ الایہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا سینہ اس کے لئے کھول دے۔

(۵) یعنی جس طرح سینہ تنگ کر دیتا ہے اسی طرح جس میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جس سے مراد پلیدی یا عذاب یا شیطان کا تسلط ہے۔

ان لوگوں کے واسطے ان کے رب کے پاس سلامتی کا گھر ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے محبت رکھتا ہے ان کے اعمال کی وجہ سے۔ (۱) (۱۲۷)

اور جس روز اللہ تعالیٰ تمام خلائق کو جمع کرے گا، (کے گا) اے جماعت جنات کی! تم نے انسانوں میں سے بہت سے اپنا لیے (۲) جو انسان ان کے ساتھ تعلق رکھنے والے تھے وہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم میں ایک نے دوسرے سے فائدہ حاصل کیا تھا (۳) اور ہم اپنی اس معین میعاد تک آپہنچے جو تو نے ہمارے لئے معین فرمائی، (۴) اللہ فرمائے گا کہ تم سب کا ٹھکانہ دوزخ ہے جس میں ہمیشہ رہو گے، ہاں اگر اللہ ہی کو

لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُمْ بِهَا كَانُوا
يَعْمَلُونَ ﴿۱۲۷﴾

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا يَمْعَسِرُ الَّذِينَ قَدِ اسْتَكْبَرُوا
مِنَ الْإِنسَانِ وَقَالَ أَطْلَيْتُهُمْ مِنَ الْإِنسَانِ رَبَّنَا اسْتَنْتَع
بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَكَلَفْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَلْتِ لَنَا قَالَ
الَّذَا مَنُوا بِكُمْ خُلِيدِينَ فِيهَا أَلَا مَا شَاءَ اللَّهُ إِنَّ
رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۱۲۸﴾

(۱) یعنی جس طرح دنیا میں اہل ایمان کفر و ضلالت کے کج راستوں سے بچ کر ایمان و ہدایت کی صراط مستقیم پر گامزن رہے، اب آخرت میں بھی ان کے لئے سلامتی کا گھر ہے اور اللہ تعالیٰ بھی ان کا، ان کے نیک عملوں کی وجہ سے دوست اور کار ساز ہے۔

(۲) یعنی انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو تم نے گمراہ کر کے اپنا پیرو کار بنا لیا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے سورہ یٰسین میں فرمایا: ”اے بنی آدم کیا میں نے تمہیں خبردار نہیں کر دیا تھا کہ تم شیطان کی پوجا مت کرنا، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور یہ کہ تم صرف میری عبادت کرنا یہی سیدھا راستہ ہے اور اس شیطان نے تمہاری ایک بہت بڑی تعداد کو گمراہ کر دیا ہے کیا پس تم نہیں سمجھتے؟ (یسین - ۶۰ / ۶۲)

(۳) جنوں اور انسانوں نے ایک دوسرے سے کیا فائدہ حاصل کیا؟ اس کے دو مفہوم بیان کئے گئے ہیں۔ جنوں کا انسانوں سے فائدہ اٹھانا ان کو اپنا پیرو کار بنا کر ان سے تلذذ حاصل کرنا ہے اور انسانوں کا جنوں سے فائدہ اٹھانا یہ ہے کہ شیطانوں نے گناہوں کو ان کے لئے خوبصورت بنا دیا جسے انہوں نے قبول کیا اور گناہوں کی لذت میں پھنسے رہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ انسان ان نبی خبروں کی تصدیق کرتے رہے جو شیاطین و جنات کی طرف سے کہانت کے طور پر پھیلائی جاتی تھیں۔ یہ گویا جنات نے انسانوں کو بے وقوف بنا کر فائدہ اٹھایا اور انسانوں کا فائدہ اٹھانا یہ ہے کہ انسان جنات کی بیان کردہ جھوٹی یا انکلی پچو باتوں سے لطف اندوز ہوتے اور کاہن قسم کے لوگ ان سے دنیاوی مفادات حاصل کرتے رہے۔

(۴) یعنی قیامت واقع ہو گئی ہے ہم دنیا میں نہیں مانتے تھے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اب جہنم تمہارا دائمی ٹھکانہ ہے۔

منظور ہو تو دوسری بات ہے۔^(۱) بے شک آپ کا رب
بڑی حکمت والا بڑا علم والا ہے۔ (۱۲۸)

اور اسی طرح ہم نے بعض کفار کو بعض کے قریب
رکھیں گے ان کے اعمال کے سبب۔^(۲) (۱۲۹)

اے جنات اور انسانوں کی جماعت! کیا تمہارے پاس تم میں
سے ہی پیغمبر نہیں آئے تھے،^(۳) جو تم سے میرے احکام
بیان کرتے اور تم کو اس آج کے دن کی خبر دیتے؟ وہ سب
عرض کریں گے کہ ہم اپنے اوپر اقرار کرتے ہیں اور ان کو
دنیاوی زندگی نے بھول میں ڈالے رکھا اور یہ لوگ اقرار
کرنے والے ہوں گے کہ وہ کافر تھے۔^(۴) (۱۳۰)

یہ اس وجہ سے ہے کہ آپ کا رب کسی ہمتی والوں کو کفر

وَكَذَلِكَ نُورِي بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا يَبْتِئَانُوا
يَكْسِبُونَ ﴿۱۲۸﴾

يَمَعْتُرُ الرِّجِينَ وَالْإِنْسَانَ يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ إِنذِرْهُمْ
يَقْضُونَ عَلَيْكُمْ الْحِسْبَةَ وَيُنذِرْكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ
هَذَا قَالُوا أَشْهَدُ نَاعِلَى أَنْفُسِنَا وَعَنَتُّهُمْ عَنِ
الدُّنْيَا وَشَهِدُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ ﴿۱۲۹﴾

ذَلِكَ أَنْ لَمْ يَكُنْ رَبُّكَ مُهَيِّئًا لِقَوْمٍ يَتَّبِعُونَ أَهْلُهَا

(۱) اور اللہ کی مشیت کفار کے لئے جنم کا دائمی عذاب ہی ہے جس کی اس نے بار بار قرآن کریم میں وضاحت کی ہے۔
بنا بریں اس سے کسی کو مغالطے کا شکار نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ اشتراک اللہ تعالیٰ کے مطلق ارادہ کے بیان کے لئے ہے جسے
کسی چیز کے ساتھ مقید نہیں کیا جاسکتا اس لئے اگر وہ کفار کو جنم سے نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے اس سے نہ وہ عاجز ہے
نہ کوئی دوسرا روکنے والا۔ (امیر القاسم)

(۲) یعنی جنم میں جیسا کہ ترجمہ سے واضح ہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح ہم نے انسانوں اور جنوں کو ایک
دوسرے کا ساتھی اور مددگار بنایا (جیسا کہ گذشتہ آیت میں گذرا) اسی طرح ہم ظالموں کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں ایک
ظالم کو دوسرے ظالم پر ہم مسلط کر دیتے ہیں اس طرح ایک ظالم دوسرے ظالم کو ہلاک و تباہ کرتا ہے اور ایک ظالم کا
انتقام دوسرے ظالم سے لے لیتے ہیں۔

(۳) رسالت و نبوت کے معاملے میں جنات انسانوں کے ہی تابع ہیں ورنہ جنات میں الگ نبی نہیں آئے البتہ رسولوں کا
پیغام پہنچانے والے اور منذرین جنات میں ہوتے رہے ہیں جو اپنی قوم کے جنوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتے رہے ہیں
اور دیتے ہیں۔ لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ چونکہ جنات کا وجود انسان کے پہلے سے ہی ہے تو ان کی ہدایت کے لئے
انھیں میں سے کوئی نبی آیا ہو گا پھر آدم علیہ السلام کے وجود کے بعد ہو سکتا ہے وہ انسانی نبیوں کے تابع رہے ہوں، البتہ
نبی کریم ﷺ کی رسالت بہر حال تمام جن و انس کے لئے ہے اس میں کوئی شبہ نہیں

(۴) میدان حشر میں کافر مختلف پینترے بدلیں گے، کبھی اپنے مشرک ہونے کا انکار کریں گے (الانعام، ۲۳) اور کبھی
اقرار کئے بغیر چارہ نہیں ہو گا، جیسے یہاں ان کا اقرار نقل کیا گیا ہے۔

کے سبب ایسی حالت میں ہلاک نہیں کرتا کہ اس بستی کے رہنے والے^(۱) بے خبر ہوں۔ (۱۳۱)

اور ہر ایک کے لئے ان کے اعمال کے سبب درجے ملیں گے اور آپ کا رب^(۲) ان کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ (۱۳۲)

اور آپ کا رب بالکل غنی ہے رحمت والا ہے۔^(۳) اگر وہ چاہے تو تم سب کو اٹھالے اور تمہارے بعد جس کو چاہے تمہاری جگہ آباد کر دے جیسا کہ تم کو ایک دوسری قوم کی نسل سے پیدا کیا ہے۔^(۴) (۱۳۳)

جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ بے شک آنے والی چیز ہے اور تم عاجز نہیں کر سکتے۔^(۵) (۱۳۴)

آپ یہ فرما دیجئے کہ اے میری قوم! تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو میں بھی عمل کر رہا ہوں،^(۶) سوا ب جلد ہی

غَفِلُونَ ﴿۱﴾

وَلِكُلِّ دَرَجَاتٍ مِّمَّا عَمِلُوا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ
عَبَّاعِمَلُونَ ﴿۲﴾

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِنْ يَشَاءُ يُدْهِمُكُمْ
وَيَسْتَخْلِفُ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ ۚ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ
ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ الْآخَرِينَ ﴿۳﴾

إِنَّ مَا تُوْعَدُونَ لَأَيُّهَا وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۴﴾

قُلْ يَتُومِرُوا أَعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَاسِمٌ ۗ فَسَوْفَ

(۱) یعنی رسولوں کے ذریعے سے جب تک اپنی حجت قائم نہیں کر دیتا، ہلاک نہیں کرتا جیسا کہ یہی بات سورہ فاطر آیت ۲۳۔ سورہ نحل ۲۶۔ سورہ بنی اسرائیل ۱۵ اور سورہ ملک ۸، ۹ وغیرہ میں بیان کی گئی ہے۔

(۲) یعنی ہر انسان اور جن کے، ان کے باہمی درجات میں، عملوں کے مطابق، فرق و تفاوت ہو گا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنات بھی انسانوں کی طرح جنتی اور جہنمی ہوں گے۔

(۳) وہ غنی (بے نیاز) ہے اپنی مخلوقات سے۔ ان کا محتاج ہے نہ ان کی عبادتوں کا ضرورت مند ہے، ان کا ایمان اس کے لئے نفع مند ہے نہ ان کا کفر اس کے لئے ضرر رساں لیکن اس شان غنا کے ساتھ وہ اپنی مخلوق کے لئے رحیم بھی ہے۔ اس کی بے نیازی اپنی مخلوق پر رحمت کرنے میں مانع نہیں ہے۔

(۴) یہ اس کی بے پناہ قوت اور غیر محدود قدرت کا اظہار ہے۔ جس طرح پچھلی کئی قوموں کو اس نے حرف غلط کی طرح مٹا دیا اور ان کی جگہ نئی قوموں کو اٹھا کھڑا کیا، وہ اب بھی اس بات پر قادر ہے کہ جب چاہے تمہیں نیست و نابود کر دے اور تمہاری جگہ ایسی قوم پیدا کر دے جو تم جیسی نہ ہو۔ (مزید ملاحظہ ہو سورہ نساء ۱۳۳۔ سورہ ابراہیم ۲۰۔ سورہ فاطر ۱۵۔ سورہ محمد ﷺ) (۳۸)

(۵) اس سے مراد قیامت ہے۔ ”اور تم عاجز نہیں کر سکتے“ کا مطلب ہے کہ وہ تمہیں دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے چاہے تم مٹی میں مل کر ریزہ ریزہ ہو چکے ہو۔

(۶) یہ کفر اور معصیت پر قائم رہنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ سخت وعید ہے جیسا کہ اگلے الفاظ سے بھی واضح ہے۔

تَعْلَمُونَ مَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ
إِنَّهُ لَا يُفِيدُهُ الظَّالِمُونَ ﴿۱۳۵﴾

تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ اس عالم کا انجام کار کس کے لیے نافع ہو گا۔ یہ یقینی بات ہے کہ حق تلفی کرنے والوں کو کبھی فلاح نہ ہوگی۔^(۱) (۱۳۵)

اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مویشی پیدا کیے ہیں ان لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا اور بزرگ خود کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا ہے اور یہ ہمارے معبودوں کا ہے،^(۲) پھر جو چیز ان کے معبودوں کی ہوتی ہے وہ تو اللہ کی طرف نہیں پہنچتی^(۳) اور جو چیز اللہ کی ہوتی ہے وہ ان کے معبودوں کی طرف پہنچ جاتی ہے^(۴) کیا برا فیصلہ وہ کرتے ہیں۔ (۱۳۶)

اور اسی طرح بہت سے مشرکین کے خیال میں ان کے

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ مَسَازِيرَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا
فَقَالُوا هَذَا لِلَّذِينَ يَزْعِمُونَ أَنَّهُمْ
فَمَا كَانَ لِيُشْرَكَ بِهِمْ فَلَا يُصِلُ إِلَى اللَّهِ وَمَا كَانَ
بِاللَّهِ فَهُوَ يُصِلُ إِلَى شُرَكَائِهِمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿۱۳۶﴾

وَكَذَلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ

جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَقُلْ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ أَعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِهِمْ لَأَنْعَامُونَ * وَانظُرُوا إِلَىٰ مَا تُنظَرُونَ﴾ (سورۃ ہود: ۱۲۲-۱۲۱) جو ایمان نہیں لاتے، ان سے کہہ دیجئے! کہ تم اپنی جگہ عمل کیے جاؤ، ہم بھی عمل کرتے ہیں اور انتظار کرو، ہم بھی منتظر ہیں۔“

(۱) جیسا کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ سچا کر دکھلایا، ۸ ہجری میں مکہ فتح ہو گیا اور اس کے فتح کے بعد عرب قبائل جو درجہ درجہ مسلمان ہونا شروع ہو گئے اور پورا جزیرہ عرب مسلمانوں کے زیر نگیں آ گیا اور یہ دائرہ پھر پھیلتا اور بڑھتا ہی چلا گیا۔

(۲) اس آیت میں مشرکوں کے اس عقیدہ و عمل کا ایک نمونہ بتلایا گیا ہے جو انہوں نے اپنے طور پر گھڑ رکھے تھے۔ وہ زینتی پیداوار اور مال مویشیوں میں سے کچھ حصہ اللہ کے لئے اور کچھ اپنے خود ساختہ معبودوں کے لئے مقرر کر لیتے۔ اللہ کے حصے کو مہمانوں، فقرا اور صلہ رحمی پر خرچ کرتے اور بتوں کے حصے کو بتوں کے مجاورین اور ان کی ضروریات پر خرچ کرتے۔ پھر اگر بتوں کے مقررہ حصے میں توقع کے مطابق پیداوار نہ ہوتی تو اللہ کے حصے میں سے نکال کر اس میں شامل کر لیتے اور اس کے برعکس معاملہ ہوتا تو بتوں کے حصے میں سے نہ نکالتے اور کہتے کہ اللہ تو غنی ہے۔

(۳) یعنی اللہ کے حصے میں کمی کی صورت میں بتوں کے مقررہ حصے میں سے تو صدقات و خیرات نہ کرتے۔
(۴) ہاں اگر بتوں کے مقررہ حصے میں کمی ہو جاتی تو وہ اللہ کے مقررہ حصے سے لے کر بتوں کے مصالح اور ضروریات پر خرچ کر لیتے۔ یعنی اللہ کے مقابلے میں بتوں کی عظمت اور ان کا خوف ان کے دلوں میں زیادہ تھا جس کا مشاہدہ آج کے مشرکین کے رویے سے بھی کیا جاسکتا ہے۔

مجموعوں نے ان کی اولاد کے قتل کرنے کو مستحسن بنا رکھا ہے ^(۱) تاکہ وہ ان کو برباد کریں اور تاکہ ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں ^(۲) اور اگر اللہ کو منظور ہو تا تو یہ ایسا کام نہ کرتے ^(۳) تو آپ ان کو اور جو کچھ یہ غلط باتیں بنا رہے ہیں یونہی رہنے دیجئے (۱۳۷)

اور وہ اپنے خیال پر یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کچھ مواشی ہیں اور کھیت ہیں جن کا استعمال ہر شخص کو جائز نہیں ان کو کوئی نہیں کھا سکتا سوائے ان کے جن کو ہم چاہیں ^(۴) اور مواشی ہیں جن پر سواری یا بار برداری حرام کر دی گئی ^(۵) اور کچھ مواشی ہیں جن پر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیتے محض اللہ پر افترا باندھنے کے طور پر۔ ^(۶) ابھی اللہ تعالیٰ ان کو ان کے افترا کی سزا دیئے دیتا ہے۔ (۱۳۸)

أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاءُ لَهُمْ لِيُؤْذَوْهُمْ وَيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿۱۳۷﴾

وَقَالُوا هَذِهِ الْأَنْعَامُ وَحَرِّتْ حِجْرًا لِيَطْعَمَهَا أَلا مَنْ شَاءَ يَرْعِيهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ أَلَا يُذَكَّرُونَ أَسْمَاءُ اللَّهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءٌ عَلَيْهِ سَيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۱۳۸﴾

(۱) یہ اشارہ ہے ان کے بچیوں کے زندہ درگور کر دینے یا بتوں کی بھینٹ چڑھانے کی طرف۔

(۲) یعنی ان کے دین میں شرک کی آمیزش کر دیں۔

(۳) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے اختیارات اور قدرت سے، ان کے ارادہ و اختیار کی آزادی کو سلب کر لیتا، تو پھر یقیناً یہ وہ کام نہ کرتے جو مذکور ہوئے لیکن ایسا کرنا چونکہ جبر ہوتا، جس میں انسان کی آزمائش نہیں ہو سکتی تھی، جب کہ اللہ تعالیٰ انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی دے کر آزمانا چاہتا ہے، اس لئے اللہ نے جبر نہیں فرمایا۔

(۴) اس میں ان کی جاہلی شریعت اور اباہیل کی تین صورتیں اور بیان فرمائی ہیں۔ حِجْرٌ (بمعنی منع) اگرچہ مصدر ہے لیکن مفعول یعنی مَحْجُورٌ (منوع) کے معنی میں ہے۔ یہ پہلی صورت ہے کہ یہ جانور یا فلاں کھیت کی پیداوار، ان کا استعمال ممنوع ہے۔ اسے صرف وہی کھائے گا جسے ہم اجازت دیں گے۔ یہ اجازت بتوں کے خادم اور مجاورین ہی کے لئے ہوتی۔

(۵) یہ دوسری صورت ہے کہ وہ مختلف قسم کے جانوروں کو اپنے بتوں کے نام آزاد چھوڑ دیتے جن سے وہ بار برداری یا سواری کا کام نہ لیتے۔ جیسے بِحَيْرَةٍ وَغَيْرِهَا کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

(۶) یہ تیسری صورت ہے کہ وہ ذبح کرتے وقت صرف اپنے بتوں کا نام لیتے، اللہ کا نام نہ لیتے۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ ان جانوروں پر بیٹھ کر وہ حج کے لئے نہ جاتے۔ بہر حال یہ ساری صورتیں گھڑی ہوئی تو ان کی اپنی تھیں لیکن وہ اللہ پر افترا باندھتے یعنی یہ باور کراتے کہ اللہ کے حکم سے ہی ہم سب کچھ کر رہے ہیں۔

اور وہ کہتے ہیں کہ جو چیز ان مواشی کے پیٹ میں ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لئے ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے۔ اور اگر وہ مردہ ہے تو اس میں سب برابر ہیں۔^(۱) ابھی اللہ ان کو ان کی غلط بیانی کی سزا دینے دیتا ہے^(۲) بلاشبہ وہ حکمت والا ہے اور وہ بڑا علم والا ہے۔ (۱۳۹)

واقعی خرابی میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو محض براہ حماقت بلا کسی سند کے قتل کر ڈالا اور جو چیزیں ان کو اللہ نے کھانے پینے کو دی تھیں ان کو حرام کر لیا محض اللہ پر افترا باندھنے کے طور پر۔ بے شک یہ لوگ گمراہی میں پڑ گئے اور کبھی راہ راست پر چلنے والے نہیں ہوئے۔ (۱۴۰)

اور وہی ہے جس نے باغات پیدا کئے وہ بھی جو ٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور وہ بھی جو ٹیوں پر نہیں چڑھائے جاتے اور کھجور کے درخت اور کھیتی جن میں کھانے کی چیزیں مختلف طور کی ہوتی ہیں^(۳) اور زیتون اور انار جو باہم

وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُرِّيَّتِنَا وَمَعْرُومٍ عَلَىٰ أَرْوَاحِنَا وَلَوْلَا يَكُنْ مَيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ سِجِّجٍ بِهِمْ وَصَفَّهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۱۳۹﴾

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَاءً عَلَى اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿۱۴۰﴾

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزُّيُوتَ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ

(۱) یہ ایک اور شکل ہے کہ جو جانور وہ اپنے بتوں کے نام وقف کرتے، ان میں سے بعض کے بارے میں کہتے کہ ان کا دودھ اور ان کے پیٹ سے پیدا ہونے والا زندہ بچہ صرف ہمارے مردوں کے لئے حلال ہے، عورتوں کے لئے حرام ہے۔ ہاں اگر بچہ مردہ پیدا ہوتا تو پھر اس کے کھانے میں مرد و عورت برابر ہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ جو غلط بیانی کرتے ہیں اور اللہ پر افترا باندھتے ہیں، ان پر عنقریب اللہ تعالیٰ انہیں سزا دے گا۔ وہ اپنے فیصلوں میں حکیم ہے اور اپنے بندوں کے بارے میں پوری طرح علم رکھنے والا ہے اور اپنے علم و حکمت کے مطابق وہ جزا و سزا کا اہتمام فرمائے گا۔

(۳) مَعْرُوشَاتٍ کا مادہ عَرَشَ ہے جس کے معنی بلند کرنے اور اٹھانے کے ہیں۔ مراد معروشات سے بعض درختوں کی وہ بیلیں ہیں جو ٹیوں (چھپروں، منڈیروں وغیرہ) پر چڑھائی جاتی ہیں، جیسے انگور اور بعض ترکاریوں کی بیلیں ہیں۔ اور غیر معروشات، وہ درخت ہیں جن کی بیلیں اوپر نہیں چڑھائی جاتیں بلکہ زمین پر ہی پھیلتی ہیں، جیسے خربوزہ اور تربوز وغیرہ کی بیلیں ہیں یا وہ تنے دار درخت ہیں جو تیل کی شکل میں نہیں ہوتے۔ یہ تمام بیلیں، درخت اور کھجور کے درخت اور کھیتیاں، جن کے ذائقے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور زیتون و انار، ان سب کا پیدا کرنے والا اللہ ہے۔

كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ

حَصَادِهِ وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿۱۰﴾

وَمِنَ الْأَنْعَامِ حُمُولَةٌ وَفَرَسَاتٌ لِّوَأَمَّا رِزْقُكُمْ فَكُلُوا

وَلَا تُسْرِفُوا خَطْبَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۱۱﴾

ایک دوسرے کے مشابہ بھی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے مشابہ نہیں بھی ہوتے،^(۱) ان سب کے پھلوں میں سے کھاؤ جب وہ نکل آئے اور اس میں جو حق واجب ہے وہ اسکے کاٹنے کے دن دیا کرو^(۲) اور حد سے^(۳) مت گزرو یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔^(۴) (۱۳۱)

اور مویشی میں اونچے قد کے اور چھوٹے قد کے^(۵) (پیدا کیے) جو کچھ اللہ نے تم کو دیا ہے کھاؤ^(۶) اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو،^(۷) بلاشک وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ (۱۳۲)

(۱) اس کے لئے دیکھیے آیت ۹۹ کا حاشیہ۔

(۲) یعنی جب کھیتی سے غلہ کاٹ کر صاف کر لو اور پھل درختوں سے توڑ لو، تو اس کا حق ادا کرو۔ اس حق سے مراد بعض علما کے نزدیک نفلی صدقہ ہے اور بعض کے نزدیک صدقہ واجبہ یعنی عشر، دسواں حصہ (اگر زمین بارانی ہو) یا نصف عشر یعنی بیسواں حصہ (اگر زمین کنویں، ٹیوب ویل یا نہری پانی سے سیراب کی جاتی ہو)

(۳) یعنی صدقہ و خیرات میں بھی حد سے تجاوز نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ کل کو تم ضرورت مند ہو جاؤ۔ بعض کہتے ہیں اس کا تعلق حکام سے ہے یعنی صدقات و زکوٰۃ کی وصولی میں حد سے تجاوز نہ کرو اور امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ سیاق آیت کی رو سے زیادہ صحیح یہ بات لگتی ہے کہ کھانے میں اسراف مت کرو کیونکہ بسیار خوری عقل اور جسم دونوں کے لئے مضر ہے۔ اسراف کے یہ سارے ہی مفہوم اپنی اپنی جگہ درست ہیں، اس لئے سارے ہی مفہوم مراد ہو سکتے ہیں۔ دوسرے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے میں بھی اسراف سے منع فرمایا ہے، جس سے واضح ہے کہ کھانے پینے میں بھی اعتدال بہت ضروری اور اس سے تجاوز اللہ کی نافرمانی ہے۔ آج کل مسلمانوں نے اس اسراف کو اپنی امارت کے اظہار کی علامت بنا لیا ہے۔ فَإِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

(۴) اس لئے اسراف کسی چیز میں بھی پسندیدہ نہیں ہے، صدقہ و خیرات دینے میں نہ کسی اور چیز میں۔ ہر چیز میں اعتدال اور میانہ روی مطلوب و محبوب ہے اور اسی کی تاکید کی گئی ہے۔

(۵) حُمُولَةٌ (بوجھ اٹھانے والے) سے مراد، اونٹ، بیل، گدھا، خچر وغیرہ ہیں، جو بار برداری کے کام میں آتے ہیں اور فَرَسَاتٌ سے مراد زمین سے لگے ہوئے جانور۔ جیسے بکری وغیرہ جس کا تم دودھ پیتے یا گوشت کھاتے ہو۔

(۶) یعنی پھلوں، کھیتوں اور چوپایوں سے۔ ان سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور ان کو تمہارے لئے خوراک بنایا ہے۔

(۷) جس طرح مشرکین اس کے پیچھے لگ گئے اور حلال جانوروں کو بھی اپنے اوپر حرام کر لیا گیا تو اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام یا حرام کو حلال کر لینا، یہ شیطان کی بیروی ہے۔

(پیدا کیے) آٹھ زوجہ (۱) یعنی بھیڑ میں دو قسم اور بکری میں دو قسم (۲) آپ کہتے ہیں کہ کیا اللہ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو؟ یا اس کو جس کو دونوں مادہ پیٹ میں لئے ہوئے ہوں؟ (۳) تم مجھ کو کسی دلیل سے تو بتاؤ اگر سچے ہو۔ (۴) (۱۳۳)

اور اونٹ میں دو قسم اور گائے میں دو قسم (۵) آپ کہتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو؟ یا اس کو جس کو دونوں مادہ پیٹ میں لئے ہوئے ہوں؟ کیا تم حاضر تھے جس وقت اللہ تعالیٰ نے تم کو اس کا حکم دیا؟ (۶) تو اس سے زیادہ کون ظالم ہو گا جو

ثَنِيَّةَ اَزْوَاجٍ مِنَ الصَّانِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ
قُلْ اَلَّذِكْرَيْنِ حَوْرًا لِّلْاُنثِيَيْنِ اَمَّا سَمَكْتُ عَلَيْهِ
اَرْحَامُ الْاُنثِيَيْنِ فَيَسْئَلُنِي فَعَلِمَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ۝

وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ قُلْ اَلَّذِكْرَيْنِ
حَوْرًا لِّلْاُنثِيَيْنِ اَمَّا سَمَكْتُ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنثِيَيْنِ
اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ اِذْ وَضَعَكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّن
اَفْتَرَىٰ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ اللّٰهُ

(۱) یعنی انشأً ثَمَانِيَةَ اَزْوَاجٍ (اسی اللہ نے آٹھ زوج پیدا کئے) اَزْوَاجٍ کی جمع ہے۔ ایک ہی جنس کے نر اور مادہ کو زوج (جوڑا) کہا جاتا ہے اور ان دونوں کے ایک ایک فرد کو بھی زوج کہہ لیا جاتا ہے کیونکہ ہر ایک دوسرے کے لئے زوج ہوتا ہے۔ قرآن کے اس مقام پر بھی ازواج، افراد ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی ۱۸ افراد اللہ نے پیدا کئے۔ جو باہم ایک دوسرے کا جوڑا ہیں۔ یہ نہیں کہ زوج (معنی جوڑے) پیدا کئے کیوں کہ اس طرح تعداد ۸ کے بجائے ۱۶ ہو جائے گی جو آیت کے اگلے حصہ کے مطابق نہیں ہے۔

(۲) یہ ثَمَانِيَةَ سے بدل ہے اور مراد دو قسم سے نر اور مادہ ہے یعنی بھیڑ سے نر اور مادہ اور بکری سے نر اور مادہ پیدا کئے (بھیڑ میں ہی دنبہ چھترا بھی شامل ہے)

(۳) مشرکین جو بعض جانوروں کو اپنے طور پر ہی حرام کر لیتے تھے، اس کے حوالے سے اللہ تعالیٰ پوچھ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے نروں کو حرام کیا ہے یا مادوں کو یا اس سبب کو جو دونوں مادوں کے پیٹ میں ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو کسی کو بھی حرام نہیں کیا ہے۔

(۴) تمہارے پاس حرام قرار دینے کی کوئی یقینی دلیل ہے تو پیش کرو کہ بَحِيْرَةٌ، سَائِبِيَّةٌ وَصِيْلَةٌ اور حَامٍ وغیرہ اس دلیل کی بنیاد پر حرام ہیں۔

(۵) یہ بھی ثَمَانِيَةَ سے بدل ہے اور یہاں بھی دو دو قسم سے دونوں کے نر اور مادہ مراد ہیں اور یوں یہ آٹھ قسمیں پوری ہو گئیں۔

(۶) یعنی تم جو بعض جانوروں کو حرام قرار دیتے ہو، کیا جب اللہ نے ان کی حرمت کا حکم دیا تو تم اس کے پاس موجود تھے؟ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو ان کی حرمت کا کوئی حکم ہی نہیں دیا۔ یہ سب تمہارا افتراء ہے اور اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو۔

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿١١﴾

اللہ تعالیٰ پر بلا دلیل جھوٹی سمت لگائے،^(۱) تاکہ لوگوں کو گمراہ کرے یقیناً اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو راستہ نہیں دکھلاتا۔ (۱۱۳۴)

آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ان میں تو میں کوئی حرام نہیں پاتا کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھائے، مگر یہ کہ وہ مردار ہو یا کہ ہوتا ہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو، کیوں کہ وہ بالکل ناپاک ہے یا جو شرک کا ذریعہ ہو کہ غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو۔^(۲) پھر جو شخص مجبور ہو جائے بشرطیکہ نہ تو طالب لذت ہو اور نہ تجاوز کرنے والا ہو تو واقعی آپ کا رب غفور الرحیم ہے۔ (۱۱۳۵)

قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ فَمِنَ الْأَضْطَّرَّاجِ بَاطِلٌ وَالْأَعَادِي فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١١﴾

(۱) یعنی یہی سب سے بڑا ظالم ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں نے عمرو بن لُحی کو جہنم میں اپنی انتزاع کھینچتے ہوئے دیکھا، اس نے سب سے پہلے بتوں کے نام پر وید اور حام وغیرہ جانور چھوڑنے کا سلسلہ شروع کیا تھا (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ المائدۃ - صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب النار یدخلها الجبارون والجنة.... یدخلها الضعفاء) امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ عمرو بن لُحی، خزاعہ قبیلے کے سرداروں میں سے تھا جو جبرہم قبیلے کے بعد خانہ کعبہ کا والی بنا تھا، اس نے سب سے پہلے دین ابراہیمی میں تبدیلی کی اور حجاز میں بت قائم کر کے لوگوں کو ان کی عبادت کرنے کی دعوت دی اور مشرکانہ رسمیں جاری کیں (ابن کثیر) بہر حال مقصود آیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آٹھ قسم کے جانور پیدا کر کے بندوں پر احسان فرمایا ہے، ان میں سے بعض جانوروں کو اپنی طرف سے حرام کر لینا، اللہ کے احسان کو رد کرنا بھی ہے اور شرک کا ارتکاب بھی۔

(۲) اس آیت میں جن چار محرمات کا ذکر ہے، اس کی ضروری تفصیل سورۃ بقرہ ۱۷۳ کے حاشیے میں گذر چکی ہے۔ یہاں یہ نکتہ مزید قابل وضاحت ہے کہ ان چار محرمات کا ذکر کلمہ حصر سے کیا گیا ہے، جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان چار قسموں کے علاوہ باقی تمام جانور حلال ہیں۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ ان چار کے علاوہ اور جانور بھی شریعت میں حرام ہیں، پھر یہاں حصر کیوں کیا گیا ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ اس سے قبل مشرکین کے جاہلانہ طریقوں اور ان کے رد کا بیان چلا آ رہا ہے۔ ان ہی میں بعض جانوروں کا بھی ذکر آیا ہے جو انہوں نے اپنے طور پر حرام کر رکھے تھے، اس سیاق اور ضمن میں یہ کہا جا رہا ہے کہ مجھ پر جو وحی کی گئی ہے اس میں تو اس سے مقصود مشرکین کے حرام کردہ جانوروں کی حلت ہے یعنی وہ حرام نہیں ہیں کیونکہ اللہ نے جن محرمات کا ذکر کیا ہے ان میں تو وہ شامل ہی نہیں ہیں۔ اگر وہ حرام ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کا بھی ذکر ضرور کرتا۔ امام شوکانی نے اس کی توجیہ اس طرح کی ہے کہ اگر یہ آیت مکی نہ ہوتی تو پھر یقیناً

اور یہود پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے^(۱) اور گائے اور بکری میں سے ان دونوں کی چربیاں ان پر ہم نے حرام کر دی تھیں مگر وہ جو ان کی پشت پر یا انتڑیوں میں لگی ہو یا جو ہڈی سے ملی ہو۔^(۲) ان کی شرارت کے سبب ہم نے ان کو یہ سزا دی^(۳) اور ہم یقیناً سچے ہیں۔^(۴) (۱۳۶)

پھر اگر یہ آپ کو کاذب کہیں تو آپ فرما دیجئے کہ تمہارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے^(۵) اور اس کا عذاب مجرم لوگوں سے نہ ٹلے گا۔^(۶) (۱۳۷)

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَزَمًا كُلِّ ذِي ظُلْمٍ وَمِنَ الْبَقَرِ
وَالْأَنْعَامِ حَزَمًا عَلَيْهِمْ شِئْمُوهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ
ظُهُورُهُمَا وَالْحَوَإِيَّاءَ وَمَا اخْتَلَطَ بِعَظْمِهِ
ذَلِكَ جَزَيْنَهُمْ بِبَعْضِهِمْ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿۱۳۶﴾

فَإِن كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ وَإِلَّا يَرْضَى
بِأَسْمَاءِ عَيْنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴿۱۳۷﴾

محرمات کا حصر قابل تسلیم تھا لیکن چونکہ اس کے بعد خود قرآن نے المائدہ میں بعض اور محرمات کا ذکر کیا ہے اور نبی ﷺ نے بھی کچھ محرمات بیان فرمائیں ہیں، تو اب وہ بھی ان میں شامل ہوں گے۔ اس کے علاوہ نبی ﷺ نے پرندوں اور درندوں کے حلت و حرمت معلوم کرنے کے لئے دو اصول بیان فرما دیئے ہیں جن کی وضاحت بھی مذکورہ محولہ حاشیہ میں موجود ہے۔ اَوْ فِنْسًا كَاعْطَفَ لَحْمَ خِنْزِيرٍ پر ہے۔ اس لئے منصوب ہے، 'معنی ہیں آئی: ذُبِحَ عَلَى الْأَضْمَامِ' "وہ جانور جو بتوں کے نام پر یا ان کے تھانوں پر ان کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ذبح کئے جائیں" یعنی ایسے جانوروں پر گو عند الذبح اللہ کا نام لیا جائے، تب بھی حرام ہوں گے کیونکہ ان سے اللہ کا تقرب نہیں، غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنا مقصود ہے۔ فسق رب کی اطاعت سے خروج کا نام ہے۔ رب نے حکم دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر جانور ذبح کیا جائے اور صرف اسی کے تقرب و نیاز کے لئے کیا جائے، اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو یہی فسق اور شرک ہے۔

(۱) ناخن والے جانور سے مراد وہ ہاتھ والے جانور ہیں جن کی انگلیاں پھٹی ہوئی یعنی جدا جدا نہ ہوں۔ جیسے اونٹ، شتر مرغ، بٹخ، قاز، گائے اور بکری وغیرہ۔ ایسے سب چرند پرند حرام تھے۔ گویا صرف وہ جانور اور پرندے ان کے لئے حلال تھے جن کے بچے کھلے ہوں۔

(۲) یعنی جو چربی گائے یا بکری کی پشت پر ہو (یا دنبے کی چمکتی ہو) یا انتڑیوں (یا اوجھ) یا ہڈیوں کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔ چربی کی یہ مقدار حلال تھی۔

(۳) یہ چیزیں ہم نے بطور سزا ان پر حرام کی تھیں یعنی یہود کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ یہ چیزیں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر حرام کی ہوئی تھیں اور ہم تو ان کے اتباع میں ان کو حرام سمجھتے ہیں۔

(۴) اس کا مطلب یہ ہے کہ یہود یقیناً اپنے مذکورہ دعوے میں جھوٹے ہیں۔

(۵) اس لئے تکذیب کے باوجود عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا۔

(۶) یعنی مہلت دینے کا مطلب ہمیشہ کے لئے عذاب الہی سے محفوظ ہونا نہیں ہے۔ وہ جب بھی عذاب دینے کا فیصلہ

یہ مشرکین (یوں) کہیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کہہ سکتے۔^(۱) اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں انہوں نے بھی تکذیب کی تھی یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھا۔^(۲) آپ کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو اس کو ہمارے روبرو ظاہر کرو۔^(۳) تم لوگ محض خیالی باتوں پر چلتے ہو اور تم بالکل بالکل سے باتیں بناتے ہو۔ (۱۳۸)

آپ کہیں گے کہ بس پوری حجت اللہ ہی کی رہی۔ پھر اگر وہ چاہتا تو تم سب کو راہ راست پر لے آتا۔ (۱۳۹)

آپ کہیں گے کہ اپنے گواہوں کو لاؤ جو اس بات پر شہادت دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کر دیا ہے،^(۴) پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو آپ اس کی شہادت نہ دیجئے اور ایسے لوگوں کے باطل خیالات کا اتباع مت کیجئے! جو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں اور وہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اپنے رب کے برابر دوسروں کو ٹھہراتے ہیں۔^(۵) (۱۵۰)

سَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا آتَيْنَا آلَ
إِبْرَاهِيمَ الْوَالِدَ وَالْأَحْمَرَ مِمَّا قَتَلْنَا كَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ
مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بِأَسَنَاءِ ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ
مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ
أَنْتُمْ إِلَّا خُرُوفُونَ ﴿۱۳۸﴾

قُلْ قَبْلَهُ نِعْمَةُ الْإِبْرَاهِيمَ ۖ فَكَوْشَاءَ لَهَذَا كَمَا أَجْمَعِينَ ﴿۱۳۹﴾

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَاءَ كُمُ الَّذِينَ يَشْهَدُونَ أَنَّ اللَّهَ
حَرَّمَ هَذَا ۖ إِنْ شَهِدُوا فَلَا تَشْهَدُ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا
أَهْوَاءَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَكُمْ
بِالْخَيْرَةِ وَهُمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ يَوْمَئِذٍ
بِالْخَيْرَةِ ﴿۱۴۰﴾

کرے گا تو پھر اسے کوئی مال نہیں سکے گا۔

(۱) یہ وہی مغالطہ ہے جو مشیت الہی اور رضائے الہی کو ہم معنی سمجھ لینے کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جس کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اس مغالطے کا ازالہ اس طرح فرمایا کہ اگر یہ شرک اللہ کی رضا کا مظہر تھا تو پھر ان پر عذاب کیوں آیا؟ عذاب الہی اس بات کی دلیل ہے کہ مشیت اور چیز ہے اور رضائے الہی اور چیز۔

(۳) یعنی اپنے دعوے پر تمہارے پاس دلیل ہے تو پیش کرو! لیکن ان کے پاس دلیل کہاں؟ وہاں تو صرف اوہام و فتنوں ہی ہیں۔

(۴) یعنی وہ جانور، جن کو مشرکین حرام قرار دیئے ہوئے تھے۔

(۵) کیوں کہ ان کے پاس سوائے کذب و افتراء کے کچھ نہیں۔

(۶) یعنی اس کا عدیل (برابر کا) ٹھہرا کر شرک کرتے ہیں۔

قُلْ تَمَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبِّيَ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ
شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّوَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ
إِمْلَاقٍ مَنعْنُ نَزُّوَكُمْ وَأَيْهَاتُمْ وَّوَلَا تَقْرَبُوا الْعَوَاحِشَ مَا
كَلَّهَمِنْهَا وَمَا بَيْنَ وَّوَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا
بِالْحَقِّ ذَلِكُمْ وَصَلُّوا لَكُمْ بِهٖ تَعْقِلُونَ ﴿۱۵۱﴾

آپ کیسے کہ او میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن
(یعنی جن کی مخالفت) کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرما
دیا ہے،^(۱) وہ یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت
ٹھہراؤ^(۲) اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو^(۳) اور اپنی
اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کرو۔ ہم تم کو اور ان کو
رزق دیتے ہیں^(۴) اور بے حیائی کے جتنے طریقے ہیں ان
کے پاس بھی مت جاؤ خواہ وہ علانیہ ہوں خواہ پوشیدہ،
اور جس کا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اس کو
قتل مت کرو، ہاں مگر حق کے ساتھ^(۵) ان کا تم کو تاکید
حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو۔ (۱۵۱)

(۱) یعنی حرام وہ نہیں ہیں جن کو تم نے بلا دلیل ما أَنْزَلَ اللَّهُ، محض اپنے اوہام باطلہ اور فتنوں فاسدہ کی بنیاد پر حرام قرار دے
رکھا ہے۔ بلکہ حرام تو وہ چیزیں ہیں جن کو تمہارے رب نے حرام کیا ہے۔ کیونکہ تمہارا پیداکرنے والا اور تمہارا پالنے والا وہی ہے
اور ہر چیز کا علم بھی اسی کے پاس ہے۔ اس لئے اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس چیز کو چاہے حلال اور جس چیز کو چاہے حرام
کرے۔ چنانچہ میں تمہیں ان باتوں کی تفصیل بتلا تا ہوں جن کی تاکید تمہارے رب نے کی ہے۔

(۲) أَلَّا تُشْرِكُوا سے پہلے اَوْصَاكُمْ مَحْذُوفٌ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس بات کا حکم دیا ہے کہ اس کے ساتھ کسی
چیز کو تم شریک مت ٹھہراؤ۔ شرک سب سے بڑا گناہ ہے، جس کے لئے معافی نہیں، مشرک پر جنت حرام اور دوزخ
واجب ہے۔ قرآن مجید میں یہ ساری چیزیں مختلف انداز سے بار بار بیان ہوئی ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ نے بھی احادیث
میں ان کو تفصیل اور وضاحت سے بیان فرمایا ہے اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ لوگ شیطان کے بکاوے میں آکر
شرک کا عام ارتکاب کرتے ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی توحید و اطاعت کے بعد یہاں بھی (اور قرآن کے دوسرے مقامات پر بھی) والدین کے ساتھ حسن
سلوک کا حکم دیا گیا ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اطاعت رب کے بعد اطاعت والدین کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر
کسی نے اس ربوبیت صغریٰ (والدین کی اطاعت اور ان سے حسن سلوک) کے تقاضے پورے نہیں کئے تو وہ ربوبیت
کبریٰ کے تقاضے بھی پورے کرنے میں ناکام رہے گا۔

(۴) زمانہ جاہلیت کا یہ فعل قبیح آج کل ضبط ولادت یا خاندانی منصوبہ بندی کے نام سے پوری دنیا میں زور و شور سے
جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔

(۵) یعنی قصاص کے طور پر، نہ صرف جائز ہے بلکہ اگر مقتول کے وارث معاف نہ کریں تو یہ قتل نہایت ضروری ہے۔

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ (البقرة-۱۷۹) ”قصاص میں تمہاری زندگی ہے۔“

وَلَا تَقْرُبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ
يَبْلُغَهُ أَشْدَّهٗۗ وَأَوْفُوا بِالْكَيْلِ ۗ وَالْيَمِينَٰ يَا لَيْسَ لَكُم مَّا
نَفْسًا إِلَّا رَوْسُهَا ۗ وَأَقِيمُوا قَاعِدَاتُهَا وَلَا تُؤْكَلُ زُرْبُهَا
وَيَعْصِدُوا لِلَّهِ وَأَوْفُوا ذِكْرَكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۱۰﴾

اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو
کہ مستحسن ہے یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ
جائے ^(۱) اور ناپ تول پوری پوری کرو، انصاف کے
ساتھ، ^(۲) ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ
تکلیف نہیں دیتے۔ ^(۳) اور جب تم بات کرو تو انصاف
کرو، گو وہ شخص قرابت دار ہی ہو اور اللہ تعالیٰ سے جو
عمد کیا اس کو پورا کرو، ان کا اللہ تعالیٰ نے تم کو نایدی
حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔ (۱۵۲)

اور یہ کہ یہ دین ^(۴) میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے سو اس
راہ پر چلو ^(۵) اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں

وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۖ إِنَّا بِأَعْيُنِنَا السُّبُلَ

(۱) جس یتیم کی کفالت تمہاری ذمہ داری قرار پائے، تو اس کی ہر طرح خیر خواہی کرنا تمہارا فرض ہے۔ اسی خیر خواہی کا
تقاضا ہے کہ اگر اس کے اس مال سے یعنی وراثت میں سے اس کو حصہ ملا ہے، چاہے وہ نقدی کی صورت میں ہو یا زمین
اور جائیداد کی صورت میں، تاہم ابھی وہ اس کی حفاظت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس کے مال کی اس وقت تک
پورے خلوص سے حفاظت کی جائے جب تک وہ بلوغت اور شعور کی عمر کو نہ پہنچ جائے۔ یہ نہ ہو کہ کفالت کے نام پر
اس کی عمر شعور سے پہلے ہی اس کے مال یا جائیداد کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔

(۲) ناپ تول میں کمی کرنا، لیتے وقت تو پورا ناپ یا تول کر لینا، مگر دیتے وقت ایسا نہ کرنا بلکہ ڈنڈی مار کر دوسرے کو کم
دینا، یہ نہایت پست اور اخلاق سے گری ہوئی بات ہے۔ قوم شعیب میں یہی اخلاقی بیماری تھی جو ان کی تباہی کے من
جملہ اسباب میں سے تھی۔

(۳) یہاں اس بات کے بیان سے یہ مقصد ہے کہ جن باتوں کی نایدی کر رہے ہیں، یہ ایسے نہیں ہیں کہ جن پر عمل کرنا مشکل
ہو۔ اگر ایسا ہو تا تو ہم ان کا حکم ہی نہ دیتے۔ اس لئے کہ طاقت سے بڑھ کر ہم کسی کو مکلف ہی نہیں ٹھہراتے۔ اس لئے اگر
نجات اخروی اور دنیا میں بھی عزت و سرفرازی چاہتے ہو تو ان احکام الہی پر عمل کرو اور ان سے گریز مت کرو۔

(۴) ہَذَا (یہ) سے مراد قرآن مجید یا دین اسلام یا وہ احکام ہیں جو بطور خاص اس سورت میں بیان کئے گئے ہیں اور وہ ہیں
توحید، معاد اور رسالت۔ اور یہی اسلام کے اصول ثلاثہ ہیں جن کے گرد پورا دین گھومتا ہے۔ اس لئے جو بھی مراد لیا
جائے مفہوم سب کا ایک ہی ہے۔

(۵) صراط مستقیم کو واحد کے صیغے سے بیان فرمایا کیونکہ اللہ کی، یا قرآن کی، یا رسول اللہ ﷺ کی راہ ایک ہی ہے۔
ایک سے زیادہ نہیں۔ اس لئے پیروی صرف اسی ایک راہ کی کرنی ہے کسی اور کی نہیں۔ یہی ملت مسلمہ کی وحدت
واجتماع کی بنیاد ہے جس سے ہٹ کر یہ امت مختلف فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئی ہے۔ حالانکہ اسے نایدی کی گئی ہے

تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی۔ اس کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تائیدی حکم دیا ہے تاکہ تم پر ہمہ نگاری اختیار کرو۔ (۱۵۳)

پھر ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی تھی جس سے اچھی طرح عمل کرنے والوں پر نعمت پوری ہو اور سب احکام کی تفصیل ہو جائے اور رہنمائی ہو اور رحمت ہو (۱) تاکہ وہ لوگ اپنے رب کے ملنے پر یقین لائیں۔ (۱۵۴) اور یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے بھیجا بڑی خیر و برکت والی، (۲) سو اس کا اتباع کرو اور ڈرو تاکہ تم پر رحمت ہو۔ (۱۵۵)

کہیں تم لوگ یوں (۳) نہ کہو کہ کتاب تو صرف ہم سے پہلے جو دو فرقے تھے ان پر نازل ہوئی تھی، اور ہم ان

تَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذَلِكُمْ وَصَلْتُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۵۳﴾

ذُو اسْتِغْنَاءٍ مُمُوسَى الْكِتَابَ تَمَامًا عَلَى الَّذِي أَحْسَنَ وَتَفْصِيلًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهَدًى وَرَحْمَةً لِّعَالَمِهِمْ لِيَقْلَعَ رِيسَهُم بِبُعْدِ لَمُؤْمِنُونَ ﴿۱۵۴﴾

وَلِهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبْرَكًا فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۱۵۵﴾

أَنْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَنْزَلَ الْكِتَابَ عَلَى طَائِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَإِنْ كُنَّا عَنْ وِرَاسَتِهِمْ لَغَافِلِينَ ﴿۱۵۶﴾

کہ ”دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی۔“ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿أَنْ آمِنُوا بِالَّذِينَ ذَكَرْتُمْ فَمَا يُؤْمِنُ بِهِ﴾ (الشورى) ”وہ لوگ قائم رکھو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالو“ گویا اختلاف اور تفرقہ کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ اسی بات کو حدیث میں نبی ﷺ نے اس طرح واضح فرمایا کہ آپ نے اپنے ہاتھ سے ایک خط کھینچا اور فرمایا کہ ”یہ اللہ کا سیدھا راستہ ہے۔“ اور چند خطوط اس کی دائیں اور بائیں جانب کھینچے اور فرمایا ”یہ راستے ہیں جن پر شیطان بیٹھا ہوا ہے اور وہ ان کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے۔“ پھر آپ ﷺ نے یہی آیت تلاوت فرمائی جو زیر وضاحت ہے۔ (مسند احمد، جلد ۱، ص ۲۶۵، ۳۳۵۔ احمد شاکر نے اسے صحیح کہا ہے دیکھئے مسند احمد بہ تعلق احمد شاکر نمبر ۳۱۳۲) بلکہ ابن ماجہ کی روایت میں صراحت ہے کہ دو خط داہنے اور بائیں کھینچے۔ یعنی کل چار خطوط کھینچے اور انہیں شیطان کا راستہ بتلایا۔

(۱) قرآن کریم کا یہ اسلوب ہے جو متعدد جگہ دہرایا گیا ہے کہ جہاں قرآن کا ذکر ہوتا ہے تو وہاں تو رات کا اور جہاں تورات کا ذکر ہو وہاں قرآن کا بھی ذکر کر دیا جاتا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں حافظ ابن کثیر نے نقل کی ہیں۔ اسی اسلوب کے مطابق یہاں تورات کا اور اس کے اس وصف کا بیان ہے کہ وہ بھی اپنے دور کی ایک جامع کتاب تھی جس میں ان کی دینی ضروریات کی تمام باتیں تفصیل سے بیان کی گئی تھیں اور وہ ہدایت و رحمت کا باعث تھی۔

(۲) اس سے مراد قرآن مجید ہے جس میں دین و دنیا کی برکتیں اور بھلائیاں ہیں۔

(۳) یعنی یہ قرآن اس لئے اتارا تاکہ تم یہ نہ کہو۔ دو فرقوں سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔

کے پڑھنے پڑھانے سے محض بے خبر تھے۔ (۱۵۶)^(۱)
 یا یوں نہ کہو کہ اگر ہم پر کوئی کتاب نازل ہوتی تو ہم ان
 سے بھی زیادہ راہ راست پر ہوتے۔ سو اب تمہارے
 پاس تمہارے رب کے پاس سے ایک کتاب واضح اور
 رہنمائی کا ذریعہ اور رحمت آچکی ہے۔ (۲) اب اس
 شخص سے زیادہ ظالم کون ہو گا جو ہماری ان آیتوں کو
 جھوٹا بتائے اور اس سے روکے۔ (۳) ہم جلد ہی ان
 لوگوں کو جو کہ ہماری آیتوں سے روکتے ہیں ان کے اس
 روکنے کے سبب سخت سزا دیں گے۔ (۱۵۷)

کیا یہ لوگ صرف اس امر کے معتقد ہیں کہ ان کے پاس
 فرشتے آئیں یا ان کے پاس آپ کا رب آئے یا آپ کے
 رب کی کوئی بڑی نشانی آئے؟ (۴) جس روز آپ کے رب

اَوْ تَقُولُوا لَوْ اَنَّكَ اَنْزَلْتَ عَلَيْنَا الْكِتَابَ لَكُنَّا اَهْدٰى مِنْهُمْ
 فَتَدَّ جَاؤُكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَهُدٰى وَرَحْمَةٌ فَمَنْ
 اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِآيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا سَجِّزِي
 الَّذِيْنَ يَصِدُّوْنَ عَنِ الْبَيِّنٰتِ سَوَآءَ الْعَذَابِ بِمَا
 كَانُوْا يَصِدُّوْنَ ۝

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِي رَبُّكَ اَوْ يَاْتِي
 بَعْضُ الْاٰتِ رَبِّكَ يَوْمَ يَاْتِي بَعْضُ الْاٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا

(۱) اس لئے کہ وہ ہماری زبان میں نہ تھی۔ چنانچہ اس عذر کو قرآن عربی میں اتار کر ختم کر دیا۔

(۲) گویا یہ عذر بھی تم نہیں کر سکتے۔

(۳) یعنی کتاب ہدایت و رحمت کے نزول کے بعد اب جو شخص ہدایت (اسلام) کا راستہ اختیار کر کے رحمت الہی کا مستحق
 نہیں بننا، بلکہ تکذیب و اعراض کا راستہ اپناتا ہے، تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے؟ صَدَفَ کے معنی اعراض کرنے کے
 بھی کئے گئے ہیں اور دو سروں کو روکنے کے بھی۔

(۴) قرآن مجید کے نزول اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت کے ذریعے سے ہم نے حجت قائم کر دی ہے۔ اب بھی اگر یہ اپنی
 گمراہی سے باز نہیں آتے تو کیا یہ اس بات کے معتقد ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یعنی ان کی روحیں قبض کرنے کے لئے،
 اس وقت یہ ایمان لائیں گے؟ یا آپ کا رب ان کے پاس آئے، یعنی قیامت برپا ہو جائے اور وہ اللہ کے روبرو پیش کئے
 جائیں۔ اس وقت یہ ایمان لائیں گے؟ یا آپ کے رب کی کوئی بڑی نشانی آئے۔ جیسے قیامت کے قریب سورج مشرق کے
 بجائے مغرب سے طلوع ہو گا۔ تو اس قسم کی بڑی نشانی دیکھ کر یہ ایمان لائیں گے؟ گلے جھلے میں وضاحت کی جا رہی ہے کہ اگر
 یہ اس انتظار میں ہیں تو بہت ہی نادانی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ بڑی نشانی کے ظہور کے بعد کافر کا ایمان اور فاسق و فاجر
 شخص کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ صحیح حدیث ہے نبی ﷺ نے فرمایا کہ ”قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ سورج (مشرق کے
 بجائے) مغرب سے طلوع ہو پس جب ایسا ہو گا اور لوگ اسے مغرب سے طلوع ہوتے دیکھیں گے تو سب ایمان لے آئیں
 گے“ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ﴿لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا اَلَّذِيْ كَانَ اَمَنَ مِنْ قَبْلِ﴾ یعنی اس وقت ایمان
 لانا کسی کو نفع نہیں دے گا جو اس سے قبل ایمان نہ لایا ہو گا (صحیح بخاری۔ تفسیر سورۃ الانعام)

کی کوئی بڑی نشانی آپسچے گی، کسی ایسے شخص کا ایمان اس کے کام نہ آئے گا جو پہلے سے ایمان نہیں رکھتا۔^(۱) یا اس نے اپنے ایمان میں کوئی نیک عمل نہ کیا ہو۔^(۲) آپ فرمادیتے تھے کہ تم منتظر رہو، ہم بھی منتظر ہیں۔^(۳) (۱۵۸)

بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے،^(۴) آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں بس ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے۔ پھر ان کو ان کا کیا ہوا اجلاس کے۔ (۱۵۹)

جو شخص نیک کام کرے گا اس کو اس کے دس گنا ملیں گے^(۵) اور جو شخص برا کام کرے گا اس کو اس کے برابر ہی سزا ملے گی^(۶) اور ان لوگوں پر ظلم نہ ہو گا۔ (۱۶۰)

إِيمَانَهُمْ تَكُنْ أَمْتًا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَكُونَ فِي إِيْمَانِهِمْ خَيْرًا قُلْ
أَنْتُمْ قَوْمٌ مُنْتَظَرُونَ ﴿۱۵۸﴾

إِنَّ الَّذِينَ يَفِرُّوْنَ مِنْهُمْ وَيُكَفِّرُونَ بَأْسَهُمْ لَأَن تَكُونَ فِيهِمْ خَيْرًا
لَّيْسَ لَهُمْ جَزَاءٌ إِلَّا أَنْ يَكُونَ فِيهِمْ خَيْرًا قُلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُنْتَظَرُونَ ﴿۱۵۹﴾

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ مِمَّا هِيَ وَ مَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ
فَلَاحْتِجَابٍ لَهَا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۱۶۰﴾

(۱) یعنی کافر کا ایمان فائدہ مند، یعنی قبول نہیں ہو گا۔

(۲) اس کا مطلب ہے کہ کوئی گناہ گار مومن گناہوں سے توبہ کرے گا تو اس وقت اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی اور اس کے بعد عمل صالح غیر مقبول ہو گا۔ جیسا کہ احادیث بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔

(۳) یہ ایمان نہ لانے والوں اور توبہ نہ کرنے والوں کے لئے تہدید و وعید ہے۔ قرآن کریم میں یہی مضمون سورہ محمد ۱۱۸ اور سورہ مومن ۸۳، ۸۵ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

(۴) اس سے بعض لوگ یہود و نصاریٰ مراد لیتے ہیں جو مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ بعض مشرکین مراد لیتے ہیں کہ کچھ مشرک ملائکہ کی، کچھ ستاروں کی، کچھ مختلف بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ لیکن یہ آیت عام ہے کفار و مشرکین سمیت وہ سب لوگ اس میں داخل ہیں جو اللہ کے دین کو اور رسول اللہ ﷺ کے راستے کو چھوڑ کر دوسرے دین یا دوسرے طریقے کو اختیار کر کے تفرق و تحزب کا راستہ اپناتے ہیں۔ سبباً کے معنی فرقتے اور گروہ، اور یہ بات ہر اس قوم پر صادق آتی ہے جو دین کے معاملے میں مجتمع تھی لیکن پھر ان کے مختلف افراد نے اپنے کسی بڑے کی رائے کو ہی مستند اور حرف آخر قرار دے کر اپنا راستہ الگ کر لیا، چاہے وہ رائے حق و صواب کے خلاف ہی ہو (فتح القدر)

(۵) یہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان کا بیان ہے جو اہل ایمان کے ساتھ وہ کرے گا کہ ایک نیکی کا بدلہ دس نیکیوں کے برابر عطا فرمائے گا۔ یہ کم از کم اجر ہے۔ ورنہ قرآن اور احادیث دونوں سے ثابت ہے کہ بعض نیکیوں کا اجر کئی کئی سو گنا بلکہ ہزاروں گنا تک ملے گا۔

(۶) یعنی جن گناہوں کی سزا مقرر نہیں ہے، اور اس کے ارتکاب کے بعد اس نے اس سے توبہ بھی نہیں کی یا اس کی نیکیاں اس کی برائیوں پر غالب نہ آئیں، یا اللہ نے اپنے فضل خاص سے اسے معاف نہیں فرمادیا (کیونکہ ان تمام صورتوں میں

آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو میرے رب نے ایک سیدھا راستہ بتا دیا ہے کہ وہ ایک دین مستحکم ہے جو طریقہ ہے ابراہیم (علیہ السلام) کا جو اللہ کی طرف یکسو تھے۔ اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔ (۱۶۱)

آپ فرما دیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔ (۱۶۲)

اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں میں سے پہلا ہوں۔^(۱) (۱۶۳)

آپ فرما دیجئے کہ کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کے لئے تلاش کروں حالانکہ وہ مالک ہے ہر چیز کا^(۲) اور جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے وہ اسی پر رہتا

قُلْ إِنِّي هَدَىٰ رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۖ وَبِمَا قِيمًا مَّوَدَّةَ
إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۶۱﴾

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ
رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶۲﴾

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ ذِي الْبَرِّ الْوَالِدِ ۖ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۶۳﴾

قُلْ أَعْبُدُوا اللَّهَ أَبْعَىٰ رَبِّي وَأَهْوَىٰ رَبِّي شَيْءٌ ۖ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ
إِلْحَادِيهَا ۖ وَلَا تَرْدُ رِزْقَهُ ۖ وَإِلَّا نَذَرْنَا لآخرىٰ شِعْرًا ۖ إِلَىٰ رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ

مجازات کا قانون بروئے عمل نہیں آئے گا تو پھر اللہ تعالیٰ ایسی برائی کی سزا دے گا اور اس کے برابر ہی دے گا۔
(۱) توحید الوہیت کی یہی دعوت تمام انبیاء نے دی، جس طرح یہاں آخری پیغمبر کی زبان مبارک سے کہلوا گیا کہ ”مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب ماننے والوں سے پہلا ہوں۔“ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی انبیاء بھیجے، سب کو یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس تم میری ہی عبادت کرو“ (الانبیاء - ۲۵) چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی یہ اعلان فرمایا ﴿ وَأُورِثُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴾ (یونس - ۷۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا کہ اَسْلِمْنَا (فرمانبردار ہو جا) تو انہوں نے فرمایا ﴿ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾ (البقرة: ۱۲۱) ”میں رب العالمین کے لئے مسلمان یعنی فرمانبردار ہو گیا“ حضرت ابراہیم علیہ السلام و یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو وصیت فرمائی ﴿ فَلَا تَتَّبِعُوا إِلَّا مَا أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴾ (البقرة - ۱۳۲) ”تمہیں موت اسلام پر آنی چاہیے“ حضرت یوسف علیہ السلام نے دعا فرمائی ﴿ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ ﴾ (یوسف - ۱۰۱) ”مجھے اسلام کی حالت میں دنیا سے اٹھانا“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا ﴿ فَتَعَالَىٰ تَوَكَّلُوا ۖ إِنَّ كُنْتُمْ مُسْلِمِينَ ﴾ (یونس - ۸۳) اگر تم مسلمان ہو تو اسی اللہ پر بھروسہ کرو۔“ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے کہا ﴿ وَاشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴾ (المائدة - ۱۱۱) اسی طرح اور بھی تمام انبیاء اور ان کے مخلص پیروکاروں نے اسی اسلام کو اپنایا جس میں توحید الوہیت کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ گو بعض بعض شرعی احکام ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

(۲) یہاں رب سے مراد وہی الہ ماننا ہے جس کا انکار مشرکین کرتے رہے ہیں اور جو اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے۔ لیکن

ہے اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔^(۱) پھر تم سب کو اپنے رب کی پاس جانا ہو گا۔ پھر وہ تم کو جٹائے گا جس جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے۔^(۲) (۱۴۳) اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا^(۳) اور ایک کا دوسرے پر رتبہ بڑھایا تاکہ تم کو آزمائے ان چیزوں میں جو تم کو دی ہیں۔^(۴) بالیقین آپ کا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بالیقین وہ واقعی بڑی مغفرت کرنے والا مہربانی کرنے والا ہے۔ (۱۴۵)

سورہ اعراف مکی ہے اس میں دو سو چھ آیتیں اور چوبیس رکوع ہیں

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

المص۔ (۱)

یہ ایک کتاب ہے جو آپ کے پاس اس لئے بھیجی گئی ہے کہ آپ اس کے ذریعہ سے ڈرائیں، سو آپ کے دل میں اس سے بالکل تنگی نہ ہو^(۵) اور نصیحت ہے ایمان

فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۲۰﴾

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ خَلِيفَةَ فِي الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُم فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيُبَيِّنَ لَكُمْ فِي مَا نَسَخْتُم مِّن رَّبِّكَ سَرِيعَ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۲۱﴾

سُورَةُ الْأَعْرَافِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْبَقَسِ ﴿۱﴾

كُنْزٌ أُنزِلَ إِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِي صُدْرِكَ حَصَرٌ مِّنْهُ لِيُنذِرَ بِهِ وَيُذَكِّرَ لِمَن يَتَذَكَّرُ ﴿۲﴾

شرکین اس کی ربوبیت کو تو مانتے تھے۔ اور اس میں کسی کو شریک نہیں گردانتے تھے لیکن اس کی الوہیت میں شریک ٹھہراتے تھے۔

(۱) یعنی اللہ تعالیٰ عدل و انصاف کا پورا اہتمام فرمائے گا اور جس نے۔ اچھایا برا۔ جو کچھ کیا ہو گا، اس کے مطابق جزا و سزا دے گا، نیکی پر اچھی جزا اور بدی پر سزا دے گا اور اور ایک کا بوجھ دوسرے پر نہیں ڈالے گا۔

(۲) اس لیے اگر تم اس دعوت توحید کو نہیں مانتے جو تمام انبیاء کی مشترکہ دعوت رہی ہے تو تم اپنا کام کیے جاؤ، ہم اپنا کیے جاتے ہیں۔ قیامت والے دن اللہ کی بارگاہ میں ہی ہمارا تمہارا فیصلہ ہو گا۔

(۳) یعنی حکمران بنا کر اختیارات سے نوازا۔ یا ایک کے بعد دوسرے کو اس کا وارث (خلیفہ) بنایا۔

(۴) یعنی فقرو غنا، علم و جہل، صحت اور بیماری، جس کو جو کچھ دیا ہے، اسی میں اس کی آزمائش ہے۔

(۵) یعنی اس کے ابلاغ سے آپ کا دل تنگ نہ ہو کہ کہیں کافر میری تکذیب نہ کریں اور مجھے ایذا نہ پہنچائیں اس لیے

والوں کے لئے۔ (۲)

تم لوگ اس کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے آئی ہے (۱) اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر من گھڑت سرپرستوں کی اتباع مت کرو تم لوگ بہت ہی کم نصیحت پکڑتے ہو۔ (۳)

اور بہت بستیموں کو ہم نے تباہ کر دیا اور ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت پہنچا یا ایسی حالت میں کہ وہ دوپہر کے وقت آرام میں تھے۔ (۴)

سو جس وقت ان پر ہمارا عذاب آیا اس وقت ان کے منہ سے بجز اس کے اور کوئی بات نہ نکلی کہ واقعی ہم ظالم تھے۔ (۵)

پھر ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے اور ہم پیغمبروں سے ضرور پوچھیں گے۔ (۶)

إِنِّي مُؤْمِنٌ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿۲﴾

وَكَمْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا فَجَاءَهَا بَأْسُنَا بَيِّنًا أَوْ هُمْ قَائِلُونَ ﴿۳﴾

فَمَا كَانَ دَعْوَاهُمْ إِذْ جَاءَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۴﴾

فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ ﴿۵﴾

کہ اللہ آپ کا حافظ و ناصر ہے یا حرج شک کے معنی میں ہے یعنی اس کے منزل من اللہ ہونے کے بارے میں آپ اپنے سینے میں شک محسوس نہ کریں۔ یہ نبی بطور تعریض ہے اور اصل مخاطب امت ہے کہ وہ شک نہ کرے۔

(۱) جو اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے یعنی قرآن اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یعنی حدیث، کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”میں قرآن اور اس کی مثل اس کے ساتھ دیا گیا ہوں۔“ ان دونوں کا اتباع ضروری ہے۔ ان کے علاوہ کسی کا اتباع ضروری نہیں بلکہ ان کا انکار لازمی ہے۔ جیسا کہ اگلے فقرے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کی پیروی مت کرو۔ جس طرح زمانہ جاہلیت میں سرداروں اور نجومیوں کاہنوں کی بات کو ہی اہمیت دی جاتی تھی کہ حلال و حرام میں بھی ان کو سند تسلیم کیا جاتا تھا۔

(۲) قَائِلُونَ قَبِلُوا سے ہے، جو دوپہر کے وقت استراحت (آرام کرنے) کو کما جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا عذاب اچانک ایسے وقتوں میں آیا جب وہ آرام و راحت کے لئے بے خبر بستروں میں آسودہ خواب تھے۔

(۳) لیکن عذاب آجانے کے بعد ایسے اعتراف کا کوئی فائدہ نہیں۔ جیسا کہ پہلے وضاحت گذر چکی ہے ﴿فَكَفَّكَ يَكُفُّ يَنْفَعُهُمْ إِنَّمَا يَنْفَعُهُمْ لِمَا رَزَقْنَا بَنَاتَنَا﴾ (المؤمن - ۸۵) جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو اس وقت ان کا ایمان لانا ان کے لئے نفع مند نہیں ہوا۔“

(۴) امتوں سے یہ پوچھا جائے گا کہ تمہارے پاس پیغمبر آئے تھے؟ انہوں نے تمہیں ہمارا پیغام پہنچایا تھا؟ وہاں وہ جواب

پھر ہم چونکہ پوری خبر رکھتے ہیں ان کے روبرو بیان کر دیں گے۔^(۱) اور ہم کچھ بے خبر نہ تھے۔ (۷)

اور اس روز وزن بھی برحق ہے پھر جس شخص کا پلا بھاری ہو گا سو ایسے لوگ کامیاب ہوں گے۔ (۸)

اور جس شخص کا پلا ہلکا ہو گا سو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنا نقصان کر لیا بسبب اس کے کہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے۔^(۲) (۹)

اور بے شک ہم نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی اور ہم نے تمہارے لئے اس میں سامان رزق پیدا کیا، تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔ (۱۰)

اور ہم نے تم کو پیدا کیا،^(۳) پھر ہم ہی نے تمہاری

فَلَنَنْقُصَنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ ۖ وَمَا كُنَّا غَائِبِينَ ۝

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ بِالْحَقِّ ۖ قَمَنَ تَعَلَّمْتَ مَوَازِينَهُ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ
بِمَا كَانُوا يَٰبِئْسَ مَا يَكْتُمُونَ ۝

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ
قَلِيلًا إِنَّا نَشْكُرُونَ ۝

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ نُصُورًا ثُمَّ نَضَّوْا إِلَيْنَا السُّبُكَةَ ۖ أَسْجُدُوا

دیں گے کہ ہاں! یا اللہ تیرے پیغمبر تو یقیناً ہمارے پاس آئے تھے لیکن ہماری ہی قسمت پھوٹی تھی کہ ہم نے ان کی پروا نہیں کی اور پیغمبروں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے ہمارا پیغام اپنی امتوں کو پہنچایا تھا؟ اور انہوں نے اس کے مقابلے میں کیا رویہ اختیار کیا؟ پیغمبر اس سوال کا جواب دیں گے۔ جس کی تفصیل قرآن مجید کے مختلف مقامات پر موجود ہے۔

(۱) چونکہ ہر ظاہر اور پوشیدہ بات کا علم رکھتے ہیں اس لئے ہم پھر دونوں (امتوں اور پیغمبروں) کے سامنے ساری باتیں بیان کریں گے اور جو جو کچھ انہوں نے کیا ہو گا، ان کے سامنے رکھ دیں گے۔

(۲) ان آیات میں وزن اعمال کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے جو قیامت والے دن ہو گا اور جسے قرآن کریم میں بھی متعدد جگہ اور احادیث میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ترازو میں اعمال تولے جائیں گے، جس کا نیکیوں والا پلڑا بھاری ہو گا، وہ کامیاب ہو گا اور جس کا بدیوں والا پلڑا بھاری ہو گا، وہ ناکام ہو گا۔ یہ اعمال کس طرح تولے جائیں گے جب کہ یہ اعراض ہیں یعنی ان کا ظاہری وجود اور جسم نہیں ہے؟ اس بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن ان کو اجسام میں تبدیل فرمادے گا اور ان کا وزن ہو گا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ وہ صحیفے اور رجسٹر تولے جائیں گے جن میں انسان کے اعمال درج ہوں گے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ خود صاحب عمل کو تولا جائے گا۔ تینوں مسلکوں والوں کے پاس اپنے مسلک کی حمایت میں صحیح احادیث و آثار موجود ہیں، اس لئے امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ تینوں ہی باتیں صحیح ہو سکتی ہیں ممکن ہے کبھی اعمال، کبھی صحیفے اور کبھی صاحب عمل کو تولا جائے (دلائل کے لئے دیکھئے تفسیر ابن کثیر)۔ ہر حال میزان اور وزن اعمال کا مسئلہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ اس کا انکار یا اس کی تاویل گمراہی ہے۔ اور موجودہ دور میں تو اس کے انکار کی اب مزید کوئی گنجائش نہیں کہ بے وزن چیزیں بھی تولی جانے لگی ہیں۔

(۳) خَلَقْنَاكُمْ میں ضمیر اگرچہ جمع کی ہے لیکن مراد ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔

لَا دَرَجَاتٍ مِّنْهُ إِلَّا الَّذِينَ سَجَدُوا لِأَنبِيَائِهِمْ كَمَا حَمَدْنَا لَمَّا كَفَرْنَا ۗ سَنَ عَذِّبُهُمْ بِمَا كَفَرُوا ۗ أَلَمْ يَكُنْ مِنَ الْغَافِقِينَ ﴿۱۱﴾

صورت بنائی پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو سو سب نے سجدہ کیا۔ بجز ابلیس کے، وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ (۱۱)

قَالَ مَا مَنَعَكَ آلَا تَسْجُدُ إِذْ أَمَرْتُكَ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْكَ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ﴿۱۲﴾

حق تعالیٰ نے فرمایا تو جو سجدہ نہیں کرتا تو تجھ کو اس سے کون امر مانع ہے، (۱۲) جبکہ میں تجھ کو حکم دے چکا، کہنے لگا میں اس سے بہتر ہوں، آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو آپ نے خاک سے پیدا کیا ہے۔ (۱۳) (۱۳)

حق تعالیٰ نے فرمایا تو آسمان سے اتر (۱۳) تجھ کو کوئی حق

قَالَ فَأَهْبِطْ مَعَهُمَا لَمَّا كُفِرُوا لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ

(۱) أَلَّا تَسْجُدُ میں لازماً ہے یعنی اَنْ تَسْجُدَ (تجھے سجدہ کرنے سے کس نے روکا؟) یا عبارت محذوف ہے یعنی ”تجھے کس چیز نے اس بات پر مجبور کیا کہ تو سجدہ نہ کرے“ (ابن کثیر فتح القدر) شیطان، فرشتوں میں سے نہیں تھا، بلکہ خود قرآن کی صراحت کے بموجب وہ جنات میں سے تھا۔ (الکہف-۵۰) لیکن آسمان پر فرشتوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اس سجدہ حکم میں شامل تھا جو اللہ نے فرشتوں کو دیا تھا۔ اسی لئے اس سے باز پرس بھی ہوئی اور اس پر عتاب بھی نازل ہوا۔ اگر وہ اس حکم میں شامل ہی نہ ہوتا تو اس سے باز پرس ہوتی نہ وہ راندہ درگاہ قرار پاتا۔

(۲) شیطان کا یہ عذر ”عذر گناہ بدتر از گناہ“ کا آئینہ دار ہے۔ ایک تو اس کا یہ سمجھنا کہ افضل کو مفضول کی تعظیم کا حکم نہیں دیا جا سکتا، غلط ہے۔ اس لئے کہ اصل چیز تو اللہ کا حکم ہے، اس کے حکم کے مقابلے میں افضل وغیر افضل کی بحث اللہ سے سر تابی ہے۔ دوسرے، اس نے بہتر ہونے کی دلیل یہ دی کہ میں آگ سے پیدا ہوا ہوں اور یہ مٹی سے۔ لیکن اس نے اس شرف و عظمت کو نظر انداز کر دیا جو حضرت آدم علیہ السلام کو حاصل ہوا کہ اللہ نے انہیں اپنے ہاتھ سے بنایا اور اپنی طرف سے اس میں روح پھونکی۔ اس شرف کے مقابلے میں دنیا کی کوئی چیز بھی ہو سکتی ہے؟ تیسرا، نص کے مقابلے میں قیاس سے کام لیا، جو کسی بھی اللہ کو ماننے والے کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں اس کا قیاس بھی قیاس فاسد تھا۔ آگ، مٹی سے کس طرح بہتر ہے؟ آگ میں سوائے تیزی، بھڑکنے اور جلانے کے کیا ہے؟ جب کہ مٹی میں سکون اور ثبات ہے، اس میں نبات و نمو، زیادتی اور اصلاح کی صلاحیت ہے۔ یہ صفات آگ سے بہر حال بہتر اور زیادہ مفید ہیں۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ شیطان کی تخلیق آگ سے ہوئی۔ جیسا کہ حدیث میں بھی آتا ہے کہ ”فرشتے نور سے، ابلیس آگ کی لپٹ سے اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔“ (صحیح مسلم کتاب الزہد، باب فی احادیث متفرقة)

(۳) مِنْهَا کی ضمیر کا مرجع اکثر مفسرین نے جنت کو قرار دیا ہے اور بعض نے اس مرتبہ کو جو ملکوت اعلیٰ میں اسے حاصل تھا۔ فاضل مترجم نے اسی دوسرے مفہوم کے مطابق آسمان ترجمہ کیا ہے۔

حاصل نہیں کہ تو آسمان میں رہ کر تکبر کرے سو نکل بے شک تو ذلیلوں میں سے ہے۔^(۱) (۱۳)

اس نے کہا کہ مجھ کو مہلت دیجئے قیامت کے دن تک۔ (۱۴)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا تجھ کو مہلت دی گئی۔^(۲) (۱۵)

اس نے کہا بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو گمراہ کیا ہے^(۳) میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ان کے لئے آپ کی سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔ (۱۶)

پھر ان پر حملہ کروں گا ان کے آگے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی اور ان کی داہنی جانب سے بھی اور ان کی بائیں جانب سے بھی^(۴) اور آپ ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائیے گا۔^(۵) (۱۷)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہاں سے ذلیل و خوار ہو کر نکل جا جو شخص ان میں سے تیرا کہنا مانے گا میں ضرور تم سب سے جہنم کو بھردوں گا۔ (۱۸)

مِنَ الضَّعِيفِينَ ۱۳

قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۱۴

قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ۱۵

قَالَ يَا أَهْلَ عَادِ بُرَيْدِي لَأَرَعَدَنَّ لَهُمْ تَوَاطُكَ الْمُسْتَقِيمِ ۱۶

ثُمَّ لَآتِيَنَّهُمْ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ۱۷

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ أَجْمَعِينَ ۱۸

(۱) اللہ کے حکم کے مقابلے میں تکبر کرنے والا احترام و تعظیم کا نہیں؛ ذلت و خواری کا مستحق ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اس کی خواہش کے مطابق اسے مہلت عطا فرمادی جو اس کی حکمت، ارادے اور مشیت کے مطابق تھی جس کا پورا علم اسی کو ہے۔ تاہم ایک حکمت یہ نظر آتی ہے کہ اس طرح اپنے بندوں کی وہ آزمائش کر سکے گا کہ کون رحمان کا بندہ بنتا ہے اور کون شیطان کا پجاری؟

(۳) گمراہ تو وہ اللہ کی نکلونی مشیت کے تحت ہوا۔ لیکن اس نے اسے بھی مشرکوں کی طرح الزام بنالیا؛ جس طرح وہ کہتے تھے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔

(۴) مطلب یہ ہے کہ ہر خیر اور شر کے راستے پر میں بیٹھوں گا۔ خیر سے ان کو روکوں گا اور شر کو ان کی نظروں میں پسندیدہ بنا کر ان کو اختیار کرنے کی ترغیب دوں گا۔

(۵) شاکرین کے دوسرے معنی مَوَدِّينَ کے کئے گئے ہیں۔ یعنی اکثر لوگوں کو میں شرک میں مبتلا کر دوں گا۔ شیطان نے اپنا یہ گمان فی الواقع سچا کر دکھایا ﴿وَلَقَدْ صَدَقَ عَبْدُهُمْ إِبْلِيسَ نَقْلَهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (سورۃ سبأ: ۲۰) ”شیطان نے اپنا گمان سچا کر دکھایا، اور مومنوں کے ایک گروہ کو چھوڑ کر سب لوگ اس کے پیچھے لگ گئے۔“ اسی لئے احادیث میں شیطان سے پناہ مانگنے کی اور قرآن میں اس کے مکر و کید سے بچنے کی بڑی تاکید آئی ہے۔

اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ پھر جس جگہ سے چاہو دونوں کھاؤ، اور اس درخت کے پاس مت جاؤ^(۱) ورنہ تم دونوں ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ (۱۹)

پھر شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ^(۲) ڈالا تاکہ ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھیں دونوں کے روبرو بے پردہ^(۳) کر دے اور کہنے لگا کہ تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت سے اور کسی سبب سے منع نہیں فرمایا، مگر محض اس وجہ سے کہ تم دونوں کہیں فرشتے ہو جاؤ یا کہیں ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ۔ (۲۰)

اور ان دونوں کے روبرو قسم کھالی کہ یقین جانیئے میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔^(۴) (۲۱)

سو ان دونوں کو فریب سے نیچے^(۵) لے آیا پس ان

وَلَا تَدْرِي أَسْكَنْ أَنتَ وَرَوْحَكَ الْجِنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا
وَلَا تَهْرَبَاهُ ۚ إِنَّ الشَّجَرَةَ مَمْلُوءَةً مِّنَ الظُّلُمِيعِ ۝۱۹

فَوَسَّوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وَّرَىٰ عَنْهُمَا مِنَ
سُوءَاتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ
إِلَّا أَن تَكُونَا مَلَكَتَيْنِ ۚ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ ۝۲۰

وَقَالَتْ لِمَا بَرَأَ إِلَهُكُمَا لِمَ نُنَاصِيكَمُ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ
وَالنَّاسِ كَانُوا عَدُوًّا لِّمَا بَرَأَ إِلَهُكُمَا ۝۲۱

فَدَلَّهَا بِأَعْيُنِنَا وَوَقَعْنَاهَا فِي الْهَبِّ ۚ فَصَارَتَا طَائِفَتًا

(۱) یعنی صرف اس ایک درخت کو چھوڑ کہ جہاں سے اور جتنا چاہو، کھاؤ۔ ایک درخت کا پھل کھانے کی پابندی آزمائش کے طور پر عائد کر دی۔

(۲) وَسَّوَسَ اور وَسَّوَسَ زَكْرَةَ اور زِلْزَالَ کے وزن پر ہے۔ پست آواز اور نفس کی بات۔ شیطان دل میں جو بری باتیں ڈالتا ہے، اس کو وسوسہ کہا جاتا ہے۔

(۳) یعنی شیطان کا مقصد اس بکاوے سے حضرت آدم و حوا کو اس لباس جنت سے محروم کر کے انہیں شرمندہ کرنا تھا، جو انہیں جنت میں پہننے کے لئے دیا گیا تھا سَوَاتٌ، سَوَاءٌ (شرم گاہ) کی جمع ہے۔ شرم گاہ کو سَوَاءٌ سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ اس کے ظاہر ہونے کو برا سمجھا جاتا ہے۔

(۴) جنت کی جو نعمتیں اور آسائشیں حضرت آدم علیہ السلام و حوا کو حاصل تھیں، اس کے حوالے سے شیطان نے دونوں کو ہلایا اور یہ جھوٹ بولا کہ اللہ تمہیں ہمیشہ جنت میں رکھنا نہیں چاہتا، اسی لئے اس درخت کا پھل کھانے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس کی تاثیر ہی یہ ہے کہ جو اسے کھا لیتا ہے، وہ فرشتہ بن جاتا ہے یا دائمی زندگی اسے حاصل ہو جاتی ہے پھر قسم کھا کر اپنا خیر خواہ ہونا بھی ظاہر کیا، جس سے حضرت آدم علیہ السلام و حوا متاثر ہو گئے اس لئے کہ اللہ والے، اللہ کے نام پر آسانی سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

(۵) تَذْلِيَةً اور إِذْلَاءً کے معنی ہیں کسی چیز کو اوپر سے نیچے چھوڑ دینا۔ گویا شیطان ان کو مرتبہ علیا سے اتار کر ممنوعہ درخت کا پھل کھانے تک لے آیا۔

دونوں نے جب درخت کو پکھا دونوں کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے روبرو بے پردہ ہو گئیں اور دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے جوڑ جوڑ کر رکھنے لگے^(۱) اور ان کے رب نے ان کو پکارا کیا میں تم دونوں کو اس درخت سے منع نہ کر چکا تھا اور یہ نہ کہہ چکا کہ شیطان تمہارا صریح دشمن ہے؟۔^(۲)

دونوں نے کہا اے ہمارے رب! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ کرے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو واقعی ہم نقصان پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔^(۳)

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ نیچے ایسی حالت میں جاؤ کہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے واسطے

يَخْضِعْنَ عَلَيْهَامِنْ ذُرِّيِّ الْجَنَّةِ ۖ وَيَذَرُهُمَا كَالَّذِي أَنهَمَكُمَا
عَنْ بَيْتِكُمَا الشَّجَرَةَ ۖ وَأَقْبَلَ تَمَاكُزَانَ الشَّيْطَانِ تَلْمِزًا عَدُوِّمُتَابِعِينَ ۝

فَأَلَّا رَبَّنَا كَلِمَاتًا أَنفُسَنَا ۖ وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ
الضَّالِّينَ ۝

قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ

(۱) یہ اس معصیت کا اثر ظاہر ہوا جو آدم علیہ السلام وحواء سے غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر ہوئی اور پھر دونوں مارے شرم کے جنت کے پتے جوڑ جوڑ کر اپنی شرم گاہ چھپانے لگے۔ وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ اس سے قبل انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسا نورانی لباس ملا ہوا تھا، جو اگرچہ غیر مرئی تھا لیکن ایک دوسرے کی شرم گاہ کے لئے ساتر (پردہ پوش) تھا۔ (ابن کثیر)

(۲) یعنی اس تشبیہ کے باوجود تم شیطان کے وسوسوں کا شکار ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کے جال بڑے حسین اور دلچسپ ہوتے ہیں اور جن سے بچنے کے لئے بڑی کاوش و محنت اور ہر وقت اس سے چوکنار ہونے کی ضرورت ہے۔

(۳) توبہ و استغفار کے یہ وہی کلمات ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تبارک و تعالیٰ سے سیکھے، جیسا کہ سورہ بقرہ، آیت ۳۷ میں صراحت ہے (دیکھئے آیت مذکورہ کا حاشیہ) گویا شیطان نے اللہ کی نافرمانی کا ارتکاب کیا تو اس کے بعد وہ اس پر نہ صرف اڑ گیا بلکہ اس کے جواز و اثبات میں عقلی و قیاسی دلائل دینے لگا۔ نتیجتاً وہ راندہ درگاہ اور ہمیشہ کے لئے ملعون قرار پایا اور حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی غلطی پر ندامت و پشیمانی کا اظہار اور بارگاہ الہی میں توبہ و استغفار کا اہتمام کیا۔ تو اللہ کی رحمت و مغفرت کے مستحق قرار پائے۔ یوں گویا دونوں راستوں کی نشان دہی ہو گئی، شیطانی راستے کی بھی اور اللہ والوں کے راستے کی بھی۔ گناہ کر کے اس پر اترانا، اصرار کرنا اور اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ”دلائل“ کے انبار فراہم کرنا، شیطانی راستہ ہے۔ اور گناہ کے بعد احساس ندامت سے مغلوب ہو کر بارگاہ الہی میں جھک جانا اور توبہ و استغفار کا اہتمام کرنا، بندگان الہی کا راستہ ہے۔ اَللّٰهُمَّ! اجْعَلْنَا مِنْهُمْ۔

مُسْتَقَرًّا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ﴿۲۷﴾

زمین میں رہنے کی جگہ ہے اور نفع حاصل کرنا ہے ایک وقت تک۔ (۲۴)

فرمایا تم کو وہاں ہی زندگی بسر کرنا ہے اور وہاں ہی مرنا ہے اور اسی میں سے پھر نکالے جاؤ گے۔ (۲۵)

اے آدم (علیہ السلام) کی اولاد ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو تمہاری شرم گاہوں کو بھی چھپاتا ہے اور موجب زینت بھی ہے (۱) اور تقوے کا لباس (۲) یہ اس سے بڑھ کر ہے۔ (۳) یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ یہ لوگ یاد رکھیں۔ (۲۶)

اے اولاد آدم! شیطان تم کو کسی خرابی میں نہ ڈال دے جیسا اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے باہر کر دیا ایسی حالت میں ان کا لباس بھی اترا دیا تاکہ وہ ان کو ان کی شرم گاہیں دکھائے۔ وہ اور اس کا لشکر تم کو ایسے طور پر دیکھتا ہے کہ تم ان کو نہیں دیکھتے ہو۔ (۴) ہم نے

قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ فِيهَا تَمُوتُونَ وَمِمَّا تَعْرَجُونَ ﴿۲۸﴾

يُنَبِّئُ أَدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ لِبَاسًا يُؤَلِّقُ سَوَاتِيكُمُ وَرِيْشًا
وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ ذَٰلِكُمْ مِنَ آيَاتِ اللَّهِ لَعَلَّهُمْ
يَذَكَّرُونَ ﴿۲۹﴾

يُنَبِّئُ أَدَمَ لَا يَفْتِنُكُمْ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُم مِّنَ الْجَنَّةِ
يَنْزِعُ عَنْهُمُ اللَّبَاسَ الِّمَّا لَوْ لَهُمْ سُلُوفًا إِنَّهُ يَزِيكُمُ هُوَ وَوَيْلٌ لَهُ مِّنْ
حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيْطَانَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ
لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۳۰﴾

(۱) سَوَاتٍ، جسم کے وہ حصے جنہیں چھپانا ضروری ہے۔ جیسے شرم گاہ اور ریشا وہ لباس جو حسن و رعنائی کے لئے پہنا جائے۔ گویا لباس کی پہلی قسم ضروریات سے اور دوسری قسم تکملہ و اضافہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قسموں کے لباس کے لئے مسلمان اور مواد پیدا فرمایا۔

(۲) اس سے مراد بعض کے نزدیک وہ لباس ہے جو متقی قیامت والے دن پہنیں گے۔ بعض کے نزدیک ایمان، بعض کے نزدیک عمل صالح، خشیت الہی وغیرہ ہیں۔ مفہوم سب کا تقریباً ایک ہے کہ ایسا لباس، جسے پہن کر انسان تکبر کرنے کے بجائے، اللہ سے ڈرے اور ایمان و عمل صالح کے تقاضوں کا اہتمام کرے۔

(۳) اس سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ زیب و زینت اور آرائش کے لئے بھی اگرچہ لباس پہننا جائز ہے۔ تاہم لباس میں ایسی سادگی زیادہ پسندیدہ ہے جو انسان کے زہد و ورع اور تقویٰ کی مظہر ہو۔ علاوہ ازیں نیا لباس پہن کر یہ دعا بھی پڑھی جائے، کیونکہ نبی ﷺ یہ دعا پڑھا کرتے تھے «الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي كَسَانِي مَا أُوَارِي بِهِ عَوْرَتِي وَأَنْجَمَلُ بِهِ فِي حَيَاتِي» (ترمذی، أبواب الدعوات۔ ابن ماجہ، کتاب اللباس، باب ما يقول الرجل إذا لبس ثوبا جديداً) ”تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے ایسا لباس پہنایا جس سے میں اپنا ستر چھپا لوں اور اپنی زندگی میں اس سے زینت حاصل کروں۔“

(۴) اس میں اہل ایمان کو شیطان اور اس کے قبیلے یعنی چیلے چانٹوں سے ڈرایا گیا ہے کہ کہیں وہ تمہاری غفلت اور

شیطانوں کو ان ہی لوگوں کا دوست بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔^(۱) (۲۷)

اور وہ لوگ جب کوئی فحش کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر پایا ہے اور اللہ نے بھی ہم کو یہی بتایا ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ فحش بات کی تعلیم نہیں دیتا، کیا اللہ کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کی تم سند نہیں رکھتے؟۔^(۲) (۲۸)

آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے حکم دیا ہے انصاف کا^(۳)

وَأَذَانًا لِّأَمْرٍ أَتَىٰ نَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا
بِمَا قُلْنَا إِنَّ اللَّهَ لَا يُأْتِرُ الْعَشْيَاءَ أَتَقُولُونَ عَلَىٰ اللَّهِ
مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۷﴾

قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ وَأَنبِئُوا بِوَجْوهِكُمْ عِنْدَ حَلِّ

سستی سے فائدہ اٹھا کر تمہیں بھی اس طرح نفعے اور گمراہی میں نہ ڈال دے جس طرح تمہارے ماں باپ (آدم و حوا) کو اس نے جنت سے نکلوا دیا اور لباس جنت بھی اتروا دیا۔ بالخصوص جب کہ وہ نظر بھی نہیں آتے۔ تو اس سے بچنے کا اہتمام اور فکر بھی زیادہ ہونی چاہئے۔

(۱) یعنی بے ایمان قسم کے لوگ ہی اس کے دوست اور اس کے خاص شکار ہیں۔ تاہم اہل ایمان پر بھی وہ ڈورے ڈالتا رہتا ہے۔ کچھ اور نہیں تو شرک خفی، (ریا کاری) اور شرک جلی میں ہی ان کو مبتلا کر دیتا ہے اور یوں ان کو بھی ایمان کے بعد ایمان صحیح کی پونجی سے محروم کر دیتا ہے۔

(۲) اسلام سے قبل مشرکین بیت اللہ کا ننگا طواف کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اس حالت کو اختیار کر کے طواف کرتے ہیں جو اس وقت تھی جب ہمیں ہماری ماؤں نے جنا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ اس کی یہ تاویل کرتے تھے کہ ہم جو لباس پہنے ہوتے ہیں اس میں ہم اللہ کی نافرمانی کرتے رہتے ہیں، اس لئے اس لباس میں طواف کرنا مناسب نہیں۔ چنانچہ وہ لباس اتار کر طواف کرتے اور عورتیں بھی ننگی طواف کرتیں، صرف اپنی شرمگاہ پر کوئی کپڑا یا چڑے کا ٹکڑا رکھ لیتیں۔ اپنے اس شرمناک فعل کے لئے دو عذر انہوں نے اور پیش کئے۔ ایک تو یہ کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو اس طرح ہی کرتے پایا ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید فرمائی کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بے حیائی کا حکم دے؟ یعنی تم اللہ کے ذمے وہ بات لگاتے ہو جو اس نے نہیں کی۔ اس آیت میں ان مقلدین کے لئے بڑی زجر و توبیخ ہے جو آبا پرستی، پیر پرستی اور شخصیت پرستی میں مبتلا ہیں، جب انہیں بھی حق کی بات بتلائی جاتی ہے تو اس کے مقابلے میں یہی عذر پیش کرتے ہیں کہ ہمارے بڑے یہی کرتے آئے ہیں یا ہمارے امام اور پیر و شیخ کا یہی حکم ہے۔ یہی وہ خصلت ہے جس کی وجہ سے یہودی، یہودیت پر، نصرانی نصرانیت پر اور بدعتی بدعتوں پر قائم رہے۔ (فتح القدیر)

(۳) انصاف سے مراد یہاں بعض کے نزدیک لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ یعنی توحید ہے۔

اور یہ کہ تم ہر سجدہ کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھا کرو (۱) اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طور پر کرو کہ اس عبادت کو خالص اللہ ہی کے واسطے رکھو۔ تم کو اللہ نے جس طرح شروع میں پیدا کیا تھا اسی طرح تم دوبارہ پیدا ہو گے۔ (۲۹)

بعض لوگوں کو اللہ نے ہدایت دی ہے اور بعض پر گمراہی ثابت ہو گئی ہے۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطانوں کو دوست بنا لیا ہے اور خیال رکھتے ہیں کہ وہ راست پر ہیں۔ (۳۰)

اے اولاد آدم! تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔ (۲) اور خوب کھاؤ اور پیو اور حد سے مت نکلو۔ بے شک اللہ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۳)

آپ فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے اسباب

مَسْجِدٍ وَّادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ذَٰلِكُمْ بَدَأْتُمْ تَعُوذُونَ ﴿۲۹﴾

فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰةُ إِنَّهُمْ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ ﴿۳۰﴾

يٰۤاَيُّهَا اٰدَمُ خُذْ زِينَتَكَ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلْ وَاشْرَبْ وَلَا تُسْرِفْ ۗ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۲﴾

فَلَمَن حَرَمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ

(۱) امام شوکانی نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ”اپنی نمازوں میں اپنا رخ قبلے کی طرف کر لو، چاہے تم کسی بھی مسجد میں ہو“ اور امام ابن کثیر نے اس سے استقامت بمعنی متابعت رسول مراد لی ہے اور اگلے جملے سے اخلاص اللہ اور کہا ہے کہ ہر عمل کی مقبولیت کے لئے ضروری ہے کہ وہ شریعت کے مطابق ہو اور دوسرے خالص رضائے الہی کے لئے ہو۔ آیت میں ان باتوں کی تاکید کی گئی ہے۔

(۲) آیت میں زینت سے مراد لباس ہے۔ اس کا سبب نزول بھی مشرکین کے ننگے طواف سے متعلق ہے۔ اس لئے انہیں کہا گیا کہ لباس پہن کر اللہ کی عبادت کرو اور طواف کرو۔

(۳) اِسْرَافٌ (حد سے نکل جانا) کسی چیز میں حتیٰ کہ کھانے پینے میں بھی ناپسندیدہ ہے۔ ایک حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا ”جو چاہو، کھاؤ۔ جو چاہو پیو! البتہ دو باتوں سے گریز کرو۔ اسراف اور تکبر سے (صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب قول اللہ تعالیٰ قل من حرم زينة الله ...) بعض سلف کا قول ہے، اللہ تعالیٰ نے ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا﴾ اس آدمی آیت میں ساری طب جمع فرمادی ہے۔ (ابن کثیر)

بعض کہتے ہیں زینت سے وہ لباس مراد ہے جو آرائش کے لئے پہنا جائے۔ جس سے ان کے نزدیک نماز اور طواف کے وقت تزئین کا حکم نکلتا ہے۔ اس آیت سے نماز میں ستر عورت کے وجود پر بھی استدلال کیا گیا ہے بلکہ احادیث کی رو سے ستر عورت (گھٹنوں سے لے کر ناف تک کے حصے کو ڈھانپنا) ہر حال میں ضروری ہے چاہے آدمی خلوت میں ہی ہو۔ (فتح القدیر) جمعہ اور عید کے دن خوشبو کا استعمال بھی مستحب ہے کہ یہ بھی زینت کا حصہ ہے۔ (ابن کثیر)

زینت کو، جن کو اس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس شخص نے حرام کیا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ یہ اشیا اس طور پر کہ قیامت کے روز خالص ہوں گی اہل ایمان کے لئے، دنیوی زندگی میں مومنوں کے لئے بھی ہیں۔^(۱) ہم اسی طرح تمام آیات کو سمجھ داروں کے واسطے صاف صاف بیان کرتے ہیں۔ (۳۲)

آپ فرمائیے کہ البتہ میرے رب نے صرف حرام کیا ہے ان تمام فحش باتوں کو جو علانیہ ہیں^(۲) اور جو پوشیدہ ہیں اور ہر گناہ کی بات کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو^(۳) اور

الَّذِينَ هُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً
يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَذَلِكَ تَفْصِلُ الْأَلْبَابَ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۳۲﴾

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ ۖ وَالْإِنْتِهَاءَ
وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا

(۱) مشرکین نے جس طرح طواف کے وقت لباس پہننے کو ناپسندیدہ قرار دے رکھا تھا، اسی طرح بعض حلال چیزیں بھی بطور تقرب الہی اپنے اوپر حرام کر لی تھیں (جیسا کہ بعض صوفیا بھی ایسا کرتے ہیں) نیز بہت سی حلال چیزیں اپنے بطن کے نام وقف کر دینے کی وجہ سے حرام گردانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لوگوں کی زینت کے لئے (مثلاً لباس وغیرہ) اور کھانے کی عمدہ چیزیں بنائی ہیں، انہیں کون حرام کرنے والا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے حرام کر لینے سے اللہ کی حلال کردہ چیزیں حرام نہیں ہو جائیں گی، وہ حلال ہی رہیں گی۔ یہ حلال و طیب چیزیں اصلاً اللہ نے اہل ایمان ہی کے لئے بنائی ہیں۔ گو کفار بھی ان سے فیض یاب اور متمتع ہو لیتے ہیں بلکہ بعض دفعہ دنیوی چیزوں اور آسائشوں کے حصول میں وہ مسلمانوں سے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں لیکن یہ بائع اور عارضی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی تکوینی مشیت اور حکمت ہے۔ تاہم قیامت والے دن یہ نعمتیں صرف اہل ایمان کے لئے ہوں گی کیونکہ کافروں پر جس طرح جنت حرام ہوگی، اسی طرح ماکولات و مشروبات بھی حرام ہوں گے۔

(۲) علانیہ فحش باتوں سے مراد بعض کے نزدیک طوائفوں کے اڈوں پر جا کر بدکاری اور پوشیدہ سے مراد کسی ”گرل فرینڈ“ سے خصوصی تعلق قائم کرنا ہے۔ بعض کے نزدیک اول الذکر سے مراد محرموں سے نکاح کرنا ہے جو ممنوع ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ کسی ایک صورت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے اور ہر قسم کی ظاہری بے حیائی کو شامل ہے (جیسے فلمیں، ڈرامے، ٹی وی، وی سی آر، فحش اخبارات و رسائل، رقص و سرود اور مجرموں کی محفلیں، عورتوں کی بے پردگی اور مردوں سے ان کا بے باکانہ اختلاط، مندی اور شادی کی رسموں میں بے حیائی کے کھلے عام مظاہر وغیرہ، یہ سب فواحش ظاہرہ ہیں۔ (أَعَادَنَا اللَّهُ مِنْهَا)۔

(۳) گناہ اللہ کی نافرمانی کا نام ہے اور ایک حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا ”گناہ وہ ہے جو تیرے سینے میں کھلے اور لوگوں

وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۲﴾

اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس بات کو کہ تم لوگ اللہ کے ذمے ایسی بات لگا دو جس کو تم جانتے نہیں۔ (۳۳)

اور ہر گروہ کے لئے ایک میعاد معین^(۱) ہے سو جس وقت انکی میعاد معین آجائے گی اس وقت ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ (۳۴)

اے اولاد آدم! اگر تمہارے پاس پیغمبر آئیں جو تم ہی میں سے ہوں جو میرے احکام تم سے بیان کریں تو جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور درستی کرے سو ان لوگوں پر نہ کچھ اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (۳۵)^(۲)
اور جو لوگ ہمارے ان احکام کو جھٹلائیں اور ان سے تکبر کریں وہ لوگ دوزخ والے ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۳۶)^(۳)

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْذِنُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَعْتَبُونَ ﴿۳۴﴾

يَبْنَئِ أَدَمُ إِنَّا يَا تَبِينُكُمْ رَسُولٌ مِنْكُمْ يَقُضُونَ عَلَيْكُمْ إِلَهِي قَدِيرٌ أَتَقِي وَاصْلَهُ فَلَا حُوفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۳۵﴾

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِالْآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۳۶﴾

کے اس پر مطلع ہونے کو تو برا سمجھے“ (صحیح مسلم، کتاب البر) بعض کہتے ہیں گناہ وہ ہے جس کا اثر، کریو والے کی اپنی ذات تک محدود ہو اور بغی یہ ہے کہ اس کے اثرات دوسروں تک بھی پہنچیں یہاں بغی کے ساتھ بغیر الحق کا مطلب، ناحق، ظلم و زیادتی مثلاً لوگوں کا حق غصب کر لینا، کسی کا مال ہتھیالینا، ناجائز مارنا پیٹنا اور سب و شتم کر کے بے عزتی کرنا وغیرہ ہے۔

(۱) میعاد معین سے مراد وہ مہلت عمل ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ ہر گروہ کو آزمانے کے لئے عطا فرماتا ہے کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے یا اس کی بغاوت و سرکشی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ یہ مہلت بعض دفعہ ان کی پوری زندگیوں تک مہلت ہوتی ہے۔ یعنی دنیوی زندگی میں وہ گرفت نہیں فرماتا بلکہ صرف آخرت میں ہی وہ سزا دے گا ان کی اجل مسمی قیامت کا دن ہی ہے اور جن کو دنیا میں وہ عذاب سے دوچار کر دیتا ہے، ان کی اجل مسمی وہ ہے جب ان کا مؤاخذہ فرماتا ہے۔

(۲) یہ ان اہل ایمان کا حسن انجام بیان کیا گیا ہے جو تقویٰ اور عمل صالح سے آراستہ ہوں گے۔ قرآن نے ایمان کے ساتھ، اکثر جگہ، عمل صالح کا ذکر ضرور کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عند اللہ ایمان وہی معتبر ہے جس کے ساتھ عمل بھی ہو گا۔

(۳) اس میں اہل ایمان کے برعکس ان لوگوں کا برا انجام بیان کیا گیا ہے جو اللہ کے احکام کی تکذیب اور ان کے مقابلے

سو اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو گا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیتوں کو جھوٹا بتائے، ان لوگوں کے نصیب کا جو کچھ کتاب سے ہے وہ ان کو مل جائے گا،^(۱) یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی جان قبض کرنے آئیں گے تو کہیں گے کہ وہ کہاں گئے جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے، وہ کہیں گے کہ ہم سے سب غائب ہو گئے اور اپنے کافر ہونے کا اقرار کریں گے۔ (۳۷)

اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جو فرقہ تم سے پہلے گزر چکے ہیں جنات میں سے بھی اور آدمیوں میں سے بھی، ان کے ساتھ تم بھی دوزخ میں جاؤ۔ جس وقت بھی کوئی جماعت داخل ہوگی اپنی دوسری جماعت کو لعنت کرے گی^(۲) یہاں تک کہ جب اس میں سب جمع ہو

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ
أُولَٰئِكَ يَتَنَاوَسُونَ صِيبَهُمْ مِنَ الْعَذَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَبْجَأَ نَسَهُمْ
رُسُلُنَا يَتَوَقَّوْنَهُمْ وَالْوَالُونَ وَالْآئِينَ مَا كَانُوا لَهُمْ جُرْئُونَ
ذُونَ اللَّهِ قَالُوا صَلُّوا عَنَّا وَشَهِدُوا عَلَيْنَا فِئْتِهِمْ أَهْمُ
كَانُوا كَافِرِينَ ﴿٣٧﴾

قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ
فِي النَّارِ لَكُمْ دَاخِلَتْ أُمَّةٌ لَعَنَتْ أُخْتَهَا حَتَّىٰ إِذَا كَانُوا فِيهَا
جَمِيعًا قَالَتْ أَخْرِبْنَاهُمْ لَوْلَا رَبُّنَا هُوَ أَزْلَمُونَا فَأَيُّ مِ
عَدَايَا ضَعُفًا مِنَ النَّارِ قَالَ لِكُلِّ ضِعْفٌ

میں استکبار کرتے ہیں۔ اہل ایمان اور اہل کفر دونوں کا انجام بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس کردار کو اپنا نہیں جس کا انجام اچھا ہے اور اس کردار سے بچیں جس کا انجام برا ہے۔

(۱) اس کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں۔ ایک معنی عمل، رزق اور عمر کے کئے گئے ہیں۔ یعنی ان کے مقدر میں جو عمر اور رزق ہے اسے پورا کر لینے، اور جتنی عمر ہے، اس کو گزار لینے کے بعد بالآخر موت سے ہمکنار ہوں گے۔ اسی کے ہم معنی یہ آیت ہے ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ لَا يُفْلِحُونَ * مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ﴾ الآية (یونس - ۷۶) ”جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ کامیاب نہیں ہوں گے، دنیا کا چند روزہ فائدہ اٹھا کر، بالآخر ہمارے پاس ہی انہیں لوٹ کر آنا ہے۔“

(۲) اُمَمٌ، اُمَّةٌ کی جمع ہے۔ مراد وہ فرقے اور گروہ ہیں جو کفر و شقاق اور شرک و تکذیب میں ایک جیسے ہوں گے۔ فیہ بمعنی مع بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی تم سے پہلے انسانوں اور جنوں میں جو گروہ تم جیسے یہاں آچکے ہیں، ان کے ساتھ جہنم میں داخل ہو جاؤ یا ان میں شامل ہو جاؤ۔

(۳) ﴿لَعَنَتْ أُخْتَهَا﴾ اپنی دوسری جماعت کو لعنت کرے گی۔ اُخْتٌ بہن کو کہتے ہیں۔ ایک جماعت (امت) کو دوسری جماعت (امت) کی بہن بہ اعتبار دین، یا گمراہی کے کہا گیا۔ یعنی دونوں ہی ایک غلط مذہب کے پیرو یا گمراہ تھے یا جہنم کے ساتھی ہونے کے اعتبار سے ان کو ایک دوسری کی بہن قرار دیا گیا ہے۔

وَلَكِنْ لَّا نَعْلَمُونَ ﴿۳۸﴾

جائیں گے^(۱) تو پچھلے لوگ پہلے لوگوں کی نسبت
کیسے گے^(۲) کہ ہمارے پروردگار ہم کو ان لوگوں نے
گمراہ کیا تھا سو ان کو دوزخ کا عذاب دوگنا دے۔ اللہ^(۳)
تعالیٰ فرمائے گا کہ سب ہی کا دوگنا ہے،^(۴) لیکن تم کو خبر
نہیں۔ (۳۸)

اور پہلے لوگ پچھلے لوگوں سے کیسے گے کہ پھر تم کو ہم پر
کوئی فوقیت نہیں سو تم بھی اپنی کمائی کے بدلے میں
عذاب کا مزہ چکھو۔ (۳۹)

جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا
ان کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں
گے^(۵) اور وہ لوگ کبھی جنت میں نہ جائیں گے جب

وَقَالَتْ أُولَاهُمُ لِحُزْنِهِمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْهِمْ تَأْمِنٌ فُضِّلَ
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿۳۹﴾

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا نَتَّبِعُهُمُ
آبْوَابَ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَهَنَّمُ فِي

(۱) اَدَارْ كُوَا کے معنی ہیں تَدَارَكُوا جب ایک دوسرے کو ملیں گے اور باہم اکٹھے ہوں گے۔

(۲) اُخْرَىٰ (پچھلے) سے مراد بعد میں داخل ہونے والے اور اُولَىٰ (پہلے) سے مراد ان سے پہلے داخل ہونے والے ہیں۔ یا
اُخْرَىٰ سے اَتْبَاعٌ (پیروکار) اور اُولَىٰ سے مَتَّبِعٌ لیڈر اور سردار ہیں۔ ان کا جرم چونکہ زیادہ شدید ہے کہ خود بھی راہ حق سے
دور رہے اور دوسروں کو بھی کوشش کر کے اس سے دور رکھا، اس لئے یہ اپنے اتباع سے پہلے جہنم میں جائیں گے۔

(۳) جس طرح ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا۔ جنہی کہیں گے۔ ﴿رَبَّنَا اِنَّا اٰطَعْنَا سَادَتَنَا وَكِبَرَنَا فَاغْوٰنَا السَّيِّئَاتِ ۗ وَرَبَّنَا
اِنْتَهُمُ ضَعُفٰنٌ مِّنَ الْعَذَابِ وَالْعَنَابِ لَعَنَّا كَيْدًا ۙ﴾ (الأحزاب - ۶۷-۶۸) ”اے ہمارے رب! ہم تو اپنے سرداروں اور
بڑوں کے پیچھے لگے رہے، پس انہوں نے ہمیں سیدھے راستے سے گمراہ کیا، یا اللہ ان کو دوگنا عذاب دے اور ان
کو بڑی لعنت کر“

(۴) یعنی اب ایک دوسرے کو طعنے دینے، کوسنے اور ایک دوسرے پر الزام دھرنے سے کوئی فائدہ نہیں، تم سب ہی اپنی
اپنی جگہ بڑے مجرم ہو اور تم سب ہی دو گئے عذاب کے مستحق ہو۔ اتباع اور متبوعین کا یہ مکالمہ سورہ سبأ ۳۱-۳۲ میں
بھی بیان کیا گیا ہے۔

(۵) اس سے بعض نے اعمال، بعض نے ارواح اور بعض نے دعا مراد لی ہے۔ یعنی ان کے عملوں، یا روحوں یا دعا کے
لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے، یعنی اعمال اور دعا قبول نہیں ہوتی اور روہیں واپس زمین میں لوٹا دی جاتی
ہیں (جیسا کہ مسند احمد، جلد ۲ / صفحہ ۳۶۳-۳۶۵ کی ایک حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے) امام شوکانی فرماتے ہیں کہ تینوں
ہی چیزیں مراد ہو سکتی ہیں۔

سَمِ الْخِيَابِ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿۳۰﴾

تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ کے اندر سے نہ چلا جائے^(۱)
اور ہم مجرم لوگوں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ (۳۰)
ان کے لئے آتش دوزخ کا بچھونا ہو گا اور ان کے اوپر
(اسی کا) اوڑھنا ہو گا^(۲) اور ہم ایسے ظالموں کو ایسی ہی سزا
دیتے ہیں۔ (۳۱)

لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِنْ حَوْرِهِمْ غَوَاشٍ وَكَذَلِكَ نَجْزِي
الظَّالِمِينَ ﴿۳۱﴾

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ہم
کسی شخص کو اس کی قدرت سے زیادہ کسی کا مکلف نہیں
بناتے^(۳) وہی لوگ جنت والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ
ہمیشہ رہیں گے۔ (۳۲)

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا وِزْرًا وَسِعَاءَ
أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۳۲﴾

اور جو کچھ ان کے دلوں میں (کینہ) تھا ہم اس کو دور کر
دیں گے۔^(۴) ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اور وہ

وَتَرَوْنَهَا مِائِي صُدُورٍ هِيَ مِنْ غَيْرِ نَجْزِي مَنْ يَخْتَارُ ﴿۳۳﴾

(۱) یہ تعلق بالحال ہے جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گذرنا ممکن نہیں، اسی طرح اہل کفر کا جنت میں داخلہ
ممکن نہیں۔ اونٹ کی مثال بیان فرمائی اس لئے کہ اونٹ عربوں میں متعارف تھا اور جسمانی اعتبار سے ایک بڑا جانور تھا۔
اور سوئی کا ناکہ (سوراخ) یہ اپنے باریک اور تنگ ہونے کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ ان دونوں کے ذکر نے اس تعلق
بالحال کے مفہوم کو غایت درجے واضح کر دیا ہے۔ تعلق بالحال کا مطلب ہے، ایسی چیز کے ساتھ مشروط کر دینا جو ناممکن
ہو۔ جیسے اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اب کسی چیز کے وقوع کو، اونٹ کے سوئی کے ناکہ میں داخل
ہونے کے ساتھ مشروط کر دینا، تعلق بالحال ہے۔

(۲) غَوَاشٍ، غَوَاشِيَةٌ کی جمع ہے۔ ڈھانپ لینے والی۔ یعنی آگ ہی ان کا اوڑھنا ہو گا یعنی اوپر سے بھی آگ نے ان کو
ڈھانپا یعنی گھیرا ہو گا۔

(۳) یہ جملہ مقررہ ہے جس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ ایمان اور عمل صالح، یہ ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ جو انسانی طاقت
سے زیادہ ہوں اور انسان ان پر عمل کرنے کی قدرت نہ رکھتے ہوں۔ بلکہ ہر انسان ان کو بہ آسانی اپنا سکتا ہے اور ان
کے مقتضیات کو بروئے عمل لاسکتا ہے۔

(۴) غِلٌّ اس کینے اور بغض کو کہا جاتا ہے جو سینوں میں مستور ہو۔ اللہ تعالیٰ اہل جنت پر یہ انعام بھی فرمائے گا کہ ان
کے سینوں میں ایک دوسرے کے خلاف بغض و عداوت کے جو جذبات ہوں گے، وہ دور کر دے گا، پھر ان کے دل ایک
دوسرے کے بارے میں آئینے کی طرح صاف ہو جائیں گے، کسی کے بارے میں دل میں کوئی کدورت اور عداوت نہیں
رہے گی۔ بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اہل جنت کے درمیان درجات و منازل کا جو تفاوت ہو گا، اس پر وہ
ایک دوسرے سے حسد نہیں کریں گے۔ پہلے مفہوم کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے کہ جنتیوں کو، جنت اور دوزخ

لوگ کہیں گے کہ اللہ کا (لاکھ لاکھ) شکر ہے جس نے ہم کو اس مقام تک پہنچایا اور ہماری کبھی رسائی نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ ہم کو نہ پہنچاتا۔^(۱) واقعی ہمارے رب کے پیغمبر سچی باتیں لے کر آئے تھے۔ اور ان سے پکار کر کہا جائے گا کہ اس جنت کے تم وارث بنائے گئے ہو اپنے اعمال کے بدلے۔^(۲) (۴۳)

اور اہل جنت اہل دوزخ کو پکاریں گے کہ ہم سے جو ہمارے رب نے وعدہ فرمایا تھا ہم نے تو اسکو واقعہ کے مطابق پایا، سو تم سے جو تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا تم نے بھی اس کو واقعہ کے مطابق پایا؟^(۳) وہ کہیں گے ہاں،

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا
أَنْ هَدَانَا اللَّهُ لَقَدْ جَدَدْتُ رُسُلًا رَبَّنَا لَتَبِيعَ دُونُؤَا أَنْ
تَبْلُغُوا الْجَنَّةَ أَوْ رُبَّمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۴۳﴾

وَقَادَى أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ أَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا
رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا قَالُوا نَعَمْ فَأَذَّنَ
مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ أَنْ أَعْتَبَ اللَّهُ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿۴۴﴾

کے درمیان ایک پل پر روک لیا جائے گا اور ان کے درمیان آپس کی جو زیادتیاں ہوں گی، ایک دوسرے کو ان کا بدلہ دیا دلایا جائے گا، حتیٰ کہ جب وہ بالکل پاک صاف ہو جائیں گے تو پھر انہیں جنت میں داخلے کی اجازت دے دی جائے گی (صحیح بخاری۔ کتاب المظالم، باب قصاص المظالم)۔ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی باہمی رنجشیں ہیں جو سیاسی رقابت میں ان کے درمیان ہوئیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے ”مجھے امید ہے کہ میں، عثمان رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ وزیر ہوں، ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے ﴿وَتَرَكْنَا مَتَاقِي ضُدُّوهُمْ مِمَّنْ غَبَا﴾ (ابن کثیر)

(۱) یعنی یہ ہدایت جس سے ہمیں ایمان اور عمل صالح کی زندگی نصیب ہوئی اور پھر انہیں بارگاہ الہی میں قبولیت کا درجہ بھی حاصل ہوا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے اور اس کا فضل ہے۔ اگر یہ رحمت اور فضل الہی نہ ہوتا تو ہم یہاں تک نہ پہنچ سکتے۔ اسی مفہوم کی یہ حدیث ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”یہ بات اچھی طرح جان لو کہ تم میں سے کسی کو محض اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا؛ جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نہ ہوگی۔“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں میں بھی، اس وقت تک جنت میں نہیں جاؤں گا جب تک کہ رحمت الہی مجھے اپنے دامن میں نہیں سمیٹ لے گی۔“ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمدامۃ علی العمل۔ صحیح مسلم، کتاب صفة القيامة۔ باب لن يدخل أحد الجنة بعمله۔

(۲) یہ تصریح کچھلی بات اور حدیث مذکور کے منافی نہیں۔ اس لئے کہ نیک عمل کی توفیق بھی بجائے خود اللہ کا فضل و احسان ہے۔

(۳) یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر میں جو کافر مارے گئے تھے اور ان کی لاشیں ایک کنوئیں میں پھینک دی گئی تھیں۔ انہیں خطاب کرتے ہوئے کہی تھی، جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا ”آپ ایسے لوگوں سے خطاب فرما رہے ہیں

پھر ایک پکارنے والا دونوں کے درمیان میں پکارے گا کہ
اللہ کی مار ہو ان ظالموں پر۔ (۴۴)

جو اللہ کی راہ سے اعراض کرتے تھے اور اس میں کجی
تلاش کرتے تھے اور وہ لوگ آخرت کے بھی منکر
تھے۔ (۴۵)

اور ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہوگی^(۱) اور اعراف کے
اوپر بہت سے آدمی ہوں گے وہ لوگ،^(۲) ہر ایک کوان کے
قیانہ سے پہچانیں گے^(۳) اور اہل جنت کو پکار کر کہیں گے،
السلام علیکم! ابھی یہ اہل اعراف جنت میں داخل نہیں
ہوئے ہوں گے اور اس کے امیدوار ہوں گے۔^(۴) (۴۶)
اور جب ان کی نگاہیں اہل دوزخ کی طرف پھریں گی تو
کہیں گے اے ہمارے رب! ہم کوان ظالم لوگوں کے
ساتھ شامل نہ کر۔ (۴۷)

الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا ۗ وَهُمْ
يَا لْآخِرَةَ كُفْرًا ۗ ﴿٤٥﴾

وَيَذَرْنَهُمْ آجَابًا ۗ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَتِهِمْ
وَيَأْذُوا الصَّحَابَ الْجَنَّةَ ۗ أَنْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ لَمَّا بَدِئُوا خُلُوفًا
وَهُمْ يَطْمَعُونَ ﴿٤٦﴾

وَلَا ذَا صُرْفَتْ أَبْصَارُهُمْ تَلْقَاءَ الصَّحَابِ النَّارِ قَالُوا رَبِّ نَارًا
تَجْعَلُنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٤٧﴾

جو ہلاک ہو چکے ہیں“ آپ ﷺ نے فرمایا ”اللہ کی قسم“ میں انہیں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ تم سے زیادہ سن رہے ہیں،
لیکن اب وہ جو اب دینے کی طاقت نہیں رکھتے“ (صحیح مسلم - کتاب الجنة، باب عرض مقعد المیت من
الجنة أو النار والبخاری، کتاب المغازی، باب قتل اُبی جہل)

(۱) ”ان دونوں کے درمیان“ سے مراد جنت دوزخ کے درمیان یا کافروں اور مومنوں کے درمیان ہے۔ حجاب
(آڑ) سے وہ فیصل (دیوار) مراد ہے جس کا ذکر سورہ حدید میں ہے۔ ﴿فَضْرِبَ بَيْنَهُمْ بِمُورِقَةٍ ثَابِتٍ﴾ (الحديد-۱۳) ”پس
ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی، جس میں ایک دروازہ ہوگا“ یہی اعراف کی دیوار ہے۔

(۲) یہ کون ہوں گے؟ ان کی تعین میں مفسرین کے درمیان خاصا اختلاف ہے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک یہ وہ لوگ ہوں
گے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی۔ ان کی نیکیاں جہنم میں جانے سے اور برائیاں جنت میں جانے سے مانع ہوں
گی اور یوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے قطعی فیصلہ ہونے تک وہ درمیان میں معلق رہیں گے۔

(۳) سِنْمَاءُ کے معنی علامت کے ہیں۔ جنتیوں کے چہرے روشن اور تروتازہ اور جہنمیوں کے چہرے سیاہ اور آنکھیں
نیلی ہوں گی۔ اس طرح وہ دونوں قسم کے لوگوں کو پہچان لیں گے۔

(۴) یہاں يَطْمَعُونَ کے معنی بعض لوگوں نے يَعْلَمُونَ کے کئے ہیں یعنی ان کو علم ہوگا کہ وہ عنقریب جنت میں
داخل کر دیئے جائیں گے۔

اور اہل اعراف بہت سے آدمیوں کو جن کو کہ ان کے قیافہ سے پہچانیں گے پکاریں گے کہیں گے کہ تمہاری جماعت اور تمہارا اپنے کو بڑا سمجھنا تمہارے کچھ کام نہ آیا۔^(۱) (۴۸)

کیا یہ وہی ہیں جن کی نسبت تم قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر^(۲) رحمت نہ کرے گا، ان کو یوں حکم ہو گا کہ جاؤ جنت میں تم پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ تم مغموں ہو گے۔ (۴۹)

اور دوزخ والے جنت والوں کو پکاریں گے، کہ ہمارے اوپر تھوڑا پانی ہی ڈال دو یا اور ہی کچھ دے دو، جو اللہ نے تم کو دے رکھا ہے۔ جنت والے کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں چیزوں کی کافروں کے لئے بندش کر دی ہے۔^(۳) (۵۰)

جنہوں نے دنیا میں اپنے دین کو لبو و لعب بنا رکھا تھا اور جن کو دنیاوی زندگی نے دھوکہ میں ڈال رکھا تھا۔ سو ہم (بھی) آج کے روزان کا نام بھول جائیں گے جیسا کہ وہ

وَنَادَى أَصْحَابَ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَ نَهْمَهُمْ قَالُوا مَا عَمِلْنَا عَلَيْهِمْ جَعَلُوا مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿۴۸﴾

أَهْلُوا الدِّينِ أَقْسَمُوا لَيْبِنَاهُمْ لِلَّهِ بِرَحْمَةٍ أَدْخَلُوا الْجَنَّةَ لَا يَخَافُونَ عَلَيْكُمْ وَالَّذِينَ كَفَرُوا تَوَّابُونَ ﴿۴۹﴾

وَنَادَى أَصْحَابُ النَّارِ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ فَيُضَوْا عَلَيْتُمْ مِنَ الْمَاءِ أَوْ مِزِا رَزَقُوا مِنَ اللَّهِ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ حَزَمَهُمَا عَلَى الْكُفْرَيْنِ ﴿۵۰﴾

الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَهْوًا وَلَعِبًا وَغَرَّتُهُمُ الشُّبُهَاتُ الَّذِينَ قَالُوا مَن نَّسَبُهُمْ كَمَا نَسَبُوا الْفِتْيَةَ يَوْمَ هَذَا وَمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿۵۱﴾

(۱) یہ اہل دوزخ ہوں گے جن کو اصحاب الاعراف ان کی علامتوں سے پہچان لیں گے اور وہ اپنے جتنے اور دوسری چیزوں پر جو گھنڈ کرتے تھے، اس کے حوالے سے انہیں یاد دلائیں گے کہ یہ چیزیں تمہارے کچھ کام نہ آئیں۔

(۲) اس سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جو دنیا میں غریب و مسکین اور مفلس و نادار قسم کے تھے جن کا استہزاد کو رہ متکبرین اڑایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اگر یہ اللہ کے محبوب ہوتے تو ان کا دنیا میں یہ حال ہوتا؟ پھر مزید جسارت کرتے ہوئے دعویٰ کرتے کہ قیامت والے دن بھی اللہ کی رحمت ہم پر ہوگی (جس طرح دنیا میں ہو رہی ہے) نہ کہ ان پر۔ بعض نے اس کا قائل اصحاب الاعراف کو بتلایا ہے اور بعض کہتے ہیں جب اصحاب الاعراف جنہیوں کو یہ کہیں گے ”تمہارا جنت اور تمہارا اپنے کو بڑا سمجھنا تمہارے کچھ کام نہ آیا“ تو اس وقت اللہ کی طرف سے جنتیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جائے گا کہ ”یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھاتے تھے کہ ان پر اللہ کی رحمت نہیں ہو گی۔“ (تفسیر ابن کثیر)

(۳) جس طرح پہلے گزر چکا ہے کہ کھانے پینے کی نعمتیں قیامت والے دن صرف اہل ایمان کے لئے ہوں گی۔ ﴿خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (آیت نمبر ۳۲) یہاں اس کی مزید وضاحت جنتیوں کی زبان سے کر دی گئی ہے۔

اس دن کو بھول^(۱) گئے اور جیسا یہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ (۵۱)

اور ہم نے ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب پہنچادی ہے جس کو ہم نے اپنے علم کامل سے بہت واضح کر کے بیان کر دیا ہے،^(۲) وہ ذریعہ ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لائے ہیں۔ (۵۲)

ان لوگوں کو اور کسی بات کا انتظار نہیں صرف اس کے اخیر نتیجہ کا انتظار ہے،^(۳) جس روز اسکا اخیر نتیجہ پیش آئے گا اور اس روز جو لوگ اس کو پہلے سے بھولے

وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عَلَيْهِمْ هُدًى وَرَحْمَةً لِّعِبَادٍ لِّذُرِّيَّتِهِمْ ۝

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلَهُ يُفَؤُودُ الَّذِينَ كَذَبُوا مِن قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلًا بِالْحَقِّ

(۱) حدیث میں آتا ہے، قیامت والے دن اللہ تعالیٰ اس قسم کے بندے سے کہے گا ”کیا میں نے تجھے بیوی بچے نہیں دیئے تھے؟ تجھے عزت و اکرام سے نہیں نوازا تھا؟ کیا اونٹ اور گھوڑے تیرے تابع نہیں کر دیئے تھے؟ اور کیا تو سرداری کرتے ہوئے لوگوں سے جنگی وصول نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا کیوں نہیں؟ یا اللہ یہ سب باتیں صحیح ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا، کیا تو میری ملاقات کا یقین رکھتا تھا؟ وہ کہے گا۔ نہیں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، ”پس جس طرح تو مجھے بھولا رہا، آج میں تجھے بھول جاتا ہوں“ (صحیح مسلم۔ کتاب الزہد) قرآن کریم کی اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کو لوہو و لعب بنانے والے وہی ہوتے ہیں جو دنیا کے فریب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دلوں سے چونکہ آخرت کی فکر اور اللہ کا خوف نکل جاتا ہے۔ اس لئے وہ دین میں بھی اپنی طرف سے جو چاہتے ہیں، اضافہ کر لیتے ہیں اور دین کے جس حصے کو چاہتے ہیں عملاً کالعدم کر دیتے ہیں یا انہیں کھیل کود کا رنگ دے دیتے ہیں۔ اس لیے دین میں اپنی طرف سے بدعات کا اضافہ کر کے انہی کو اصل اہمیت دینا (جیسا کہ اہل بدعت کا شیوہ ہے) یہ بہت بڑا جرم ہے، کیونکہ اس سے دین کھیل کود بن کر رہ جاتا ہے اور احکام و فرائض پر عمل کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

(۲) یہ اللہ تعالیٰ جنہمیوں کے ضمن میں ہی فرما رہا ہے کہ ہم نے تو اپنے علم کامل کے مطابق ایسی کتاب بھیج دی تھی جس میں ہر چیز کو کھول کر بیان کر دیا تھا۔ ان لوگوں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا، تو ان کی بد قسمتی، ورنہ جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئے، وہ ہدایت و رحمت الہی سے فیض یاب ہوئے گویا ہم نے تو ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبَيِّنَ لَهُمُ الْآيَاتِ ۝﴾ (سورۃ بنی اسرائیل-۱۵) ”جب تک ہم رسول بھیج کر تمام حجت نہیں کر دیتے، ہم عذاب نہیں دیتے“ کے مطابق اہتمام کر دیا تھا۔

(۳) تاویل کا مطلب ہے، کسی چیز کی اصل حقیقت اور انجام۔ یعنی کتاب الہی کے ذریعے سے وعدے، وعید اور جنت و دوزخ وغیرہ کا بیان تو کر دیا گیا تھا۔ لیکن یہ اس دنیا کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے منتظر تھے، سو اب وہ انجام ان کے سامنے آگیا۔

ہوئے تھے یوں کہیں گے کہ واقعی ہمارے رب کے پیغمبر
جی جی باتیں لائے تھے، سواب کیا کوئی ہمارا سفارشی ہے
کہ وہ ہماری سفارش کر دے یا کیا ہم پھر واپس بھیجے جا
سکتے ہیں تاکہ ہم لوگ ان اعمال کے، جن کو ہم کیا کرتے
تھے برخلاف دوسرے اعمال کریں۔ بے شک ان لوگوں
نے اپنے آپ کو خسارہ میں ڈال دیا اور یہ جو جو باتیں
تراشتے تھے سب گم ہو گئیں۔^(۱) (۵۳)

بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں
اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا ہے،^(۲) پھر عرش پر قائم
ہوا۔^(۳) وہ شب سے دن کو ایسے طور پر چھپا دیتا ہے کہ

فَصَلِّ لَنَا مِنْ شَفَعَاءِ قَبِيضِ عَمَلِنَا أَوْ مَرَدِّ عَمَلِ غَيْرِ لَدُنِي
كُنَّا نَعْمَلُ قَدْ خَيْرًا وَأَنْفُسَهُمْ وَصَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا
يَعْتَرُونَ ﴿٥٣﴾

إِنَّ رَبَّكُمْ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ فِي سِتَّةِ
أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغِثُ الْمَيِّتَ التَّهَارِيطُ بِنَهْ

(۱) یعنی یہ جس انجام کے منتظر تھے، اس کے سامنے آجانے کے بعد اعتراف حق کرنے یا دوبارہ دنیا میں بھیجے جانے کی
آرزو اور کسی سفارشی کی تلاش، یہ سب بے فائدہ ہوں گی۔ وہ معبود بھی ان سے گم ہو جائیں گے جن کی وہ اللہ کو چھوڑ
کر عبادت کرتے تھے، وہ ان کی مدد کر سکیں گے نہ سفارش اور نہ عذاب جنم سے چھڑا ہی سکیں گے۔

(۲) یہ چھ دن اتوار، پیر، منگل، بدھ، جمعرات اور جمعہ ہیں۔ جمعہ کے دن ہی حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔ ہفتے
والے دن کہتے ہیں کوئی تخلیق نہیں ہوئی، اسی لئے اسے یوم السبت کہا جاتا ہے۔ کیونکہ سبت کے معنی قطع (کٹانے) کے
ہیں یعنی اس دن تخلیق کا کام قطع ہو گیا۔ پھر اس دن سے کیا مراد ہے؟ ہماری دنیا کا دن، جو طلوع شمس سے شروع ہوتا
ہے اور غروب شمس پر ختم ہو جاتا ہے۔ یا یہ دن ہزار سال کے برابر ہے؟ جس طرح کہ اللہ کے یہاں کے دن کی گنتی
ہے، یا جس طرح قیامت کے دن کے بارے میں آتا ہے۔ بظاہر یہ دوسری بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک تو
اس وقت سورج چاند کا یہ نظام ہی نہیں تھا، آسمان و زمین کی تخلیق کے بعد ہی یہ نظام قائم ہوا دوسرے یہ عالم بالا واقعہ
ہے جس کو دنیا سے کوئی نسبت نہیں ہے، اس لئے اس دن کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم قطعیت کے
ساتھ کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ تو لفظ کُن سے سب کچھ پیدا کر سکتا تھا، اس کے باوجود اس نے ہر چیز
کو الگ الگ تدریج کے ساتھ بنایا اس کی بھی اصل حکمت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے تاہم بعض علما نے اس کی ایک حکمت
لوگوں کو آرام، وقار اور تدریج کے ساتھ کام کرنے کا سبق دینا بتلائی ہے۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔

(۳) آسنوآء کے معنی علو اور استقرار کے ہیں سلف نے بلا کیف و بلا تشبیہ یہی معنی مراد لئے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ عرش پر
بلند اور مستقر ہے۔ لیکن کس طرح، کس کیفیت کے ساتھ، اسے ہم بیان نہیں کر سکتے نہ کسی کے ساتھ تشبیہ ہی دے
سکتے ہیں۔ نعیم بن حماد کا قول ہے ”جو اللہ کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ دے اس نے بھی کفر کیا اور جس نے اللہ کی، اپنے
بارے میں بیان کردہ کسی بات کا انکار کیا، اس نے بھی کفر کیا“ اور اللہ کے بارے میں اس کی یا اس کے رسول کی بیان

وہ شب اس دن کو جلدی سے آتی ہے^(۱) اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ یاد رکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا، بڑی خوبیوں سے بھرا

ہوا ہے اللہ جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔ (۵۴)

تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو گز گزرا کر کے بھی اور چپکے چپکے بھی۔ واقعی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو حد سے نکل جائیں۔ (۵۵)

اور دنیا میں اس کے بعد کہ اس کی درستی کر دی گئی ہے، فساد مت پھیلاؤ اور تم اللہ کی عبادت کرو اس سے ڈرتے ہوئے اور امیدوار رہتے ہوئے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک کام کرنے والوں کے نزدیک ہے۔ (۵۶)^(۲)

اور وہ ایسا ہے کہ اپنی باران رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ خوش کر دیتی ہیں،^(۳) یہاں تک کہ جب

حَيْثُ مَا أَتَى السَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مَسْحَرَاتٍ يَا مَعْرِبُ أَتَى
لَهُ الْخَلْقَ وَالْأُمُوتَ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۵۴﴾

ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿۵۵﴾

وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا
وَمُعَافَاتٍ رَضِيَ اللَّهُ قَرِيبًا مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۶﴾

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا لِّبَنِينَ يَدْعُو رَحْمَتَهُ

کر دہ بات کو بیان کرنا، تشبیہ نہیں ہے۔ اس لئے جو باتیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں نص سے ثابت ہیں، ان پر بلا تادیل اور بلا کیف و تشبیہ ایمان رکھنا ضروری ہے۔ (ابن کثیر)

(۱) حَيْثُ مَا کے معنی ہیں نہایت تیزی سے اور مطلب ہے کہ ایک کے بعد دوسرا فوراً آجاتا ہے۔ یعنی دن کی روشنی آتی ہے تو رات کی تاریکی فوراً کافور ہو جاتی ہے اور رات آتی ہے تو دن کا اجالا ختم ہو جاتا ہے اور سب دور و نزدیک سیاہی چھا جاتی ہے۔

(۲) ان آیات میں چار چیزوں کی تلقین کی گئی ہے، ۱۔ اللہ تعالیٰ سے آہ و زاری اور خفیہ طریقے سے دعا کی جائے۔ جس طرح کہ حدیث میں بھی آتا ہے۔ ”لوگو! اپنے نفس کے ساتھ نرمی کرو (یعنی آواز پست رکھو) تم جس کو پکار رہے ہو، وہ بہرا ہے نہ غائب، وہ تمہاری دعائیں سننے والا اور قریب ہے (صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء إذا علا عقیبة۔ ومسلم۔ کتاب الجنة، باب استحباب خفض الصوت بالذکر)

۲۔ دعا میں زیادتی نہ کی جائے یعنی اپنی حیثیت اور مرتبے سے بڑھ کر دعا نہ کی جائے۔ ۳۔ اصلاح کے بعد فساد نہ پھیلا یا جائے یعنی اللہ کی نافرمانیاں کر کے فساد پھیلانے میں حصہ نہ لیا جائے۔ ۴۔ اس کے عذاب کا ڈر بھی دل میں ہو اور اس کی رحمت کی امید بھی۔ اس طریقے سے دعا کرنے والے محسنین ہیں۔ یقیناً اللہ کی رحمت ان کے قریب ہے۔

(۳) اپنی الوہیت و ربوبیت کے اثبات میں اللہ تعالیٰ مزید دلائل بیان فرما کر پھر اس سے احیاء موتی کا اثبات فرما رہا ہے

وہ ہوا میں بھاری بادلوں کو اٹھالیتی ہیں،^(۱) تو ہم اس بادل کو کسی خشک سرزمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں، پھر اس بادل سے پانی برساتے ہیں پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں۔^(۲) یوں ہی ہم مردوں کو نکال کھڑا کریں گے تاکہ تم سمجھو۔^(۳) (۵۷)

اور جو ستھری سرزمین ہوتی ہے اس کی پید اواری تو اللہ کے حکم سے خوب نکلتی ہے اور جو خراب ہے اس کی پید اواری بہت کم نکلتی ہے،^(۴) اسی طرح ہم دلائل کو طرح طرح سے بیان کرتے ہیں، ان لوگوں کے لئے جو شکر کرتے ہیں۔ (۵۸)

ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تو

حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ مَعَآيَا يُعَاثِلَا سَفَعْنَهُ بِسَكْبٍ مَّيْمِيْنٍ
فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ
كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمُؤْمِنِيْنَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرِجُ نَبَاتًا بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبِثَ
لَا يَخْرِجُ إِلَّا تَلْحِيْمًا كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا

بُنْسُرًا بَشِيْرًا كِي جمع ہے رَحْمَةً سے مراد مَطَرٌ (بارش) ہے یعنی بارش سے پہلے وہ ٹھنڈی ہوا میں چلاتا ہے جو بارش کی نوید ہوتی ہیں۔

(۱) بھاری بادل سے مراد پانی سے بھرے ہوئے بادل ہیں۔

(۲) ہر قسم کے پھل، جو رنگوں میں، ذائقوں میں، خوشبوؤں میں اور شکل و صورت میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

(۳) جس طرح ہم پانی کے ذریعے سے مردہ زمین میں روئیدگی پیدا کر دیتے ہیں اور وہ انواع و اقسام کے غلے اور پھل پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح قیامت والے دن تمام انسانوں کو، جو مٹی میں مل کر مٹی ہو چکے ہوں گے، ہم دوبارہ زندہ کریں گے اور پھر ان کا حساب لیں گے۔

(۴) علاوہ ازیں یہ تمثیل بھی ہو سکتی ہے۔ اَلْبَلَدُ الطَّيِّبُ سے مراد سریع الغم اور اَلْبَلَدُ الْخَبِيْثُ سے کند ذہن، وعظ و نصیحت قبول کرنے والا دل اور اس کے برعکس دل۔ قلب مومن یا قلب منافق یا پاکیزہ انسان اور ناپاک انسان۔ مومن، پاکیزہ انسان اور وعظ و نصیحت قبول کرنے والا دل بارش کو قبول کرنے والی زمین کی طرح، آیات الہی کو سن کر ایمان و عمل صالح میں مزید پختہ ہوتا ہے اور دوسرا دل اس کے برعکس زمین شور کی طرح ہے جو بارش کا پانی قبول ہی نہیں کرتی یا کرتی ہے تو برائے نام جس سے پیداوار بھی نکلی اور برائے نام ہوتی ہے۔ اسی کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ ”مجھے اللہ تعالیٰ نے جو علم و ہدایت دے کر بھیجا ہے، اس کی مثال اس موسلا دھار بارش کی طرح ہے جو زمین پر برسی۔ اس کے جو حصے زرخیز تھے، انہوں نے پانی کو اپنے اندر جذب کر کے چارہ اور گھاس خوب اگایا (یعنی بھرپور پیداوار دی) اور اس کے بعض حصے سخت تھے، جنہوں نے پانی کو تو روک لیا (اندر جذب

انہوں نے فرمایا اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود ہونے کے قابل نہیں، مجھ کو تمہارے لئے ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔ (۵۹)

ان کی قوم کے بڑے لوگوں نے کہا کہ ہم تم کو صریح غلطی میں دیکھتے ہیں۔^(۱) (۶۰)

انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم! مجھ میں تو ذرا بھی گمراہی نہیں لیکن میں پروردگار عالم کا رسول ہوں۔ (۶۱) تم کو اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے ان امور کی خبر رکھتا ہوں جن کی تم کو خبر نہیں۔ (۶۲)

اور کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت، جو تمہاری ہی جنس کا ہے، کوئی نصیحت کی بات آگئی تاکہ وہ شخص تم کو ڈرائے اور تاکہ تم ڈر جاؤ^(۲) اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (۶۳)

لَكُمْ مِنَ الْعَذَابِ إِنَّ آخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝

قَالَ الْمَلَأُونَ قَوْمَهُ إِنَّا لَنَرُكَ فِي صَالِحٍ مُّبِينٍ ۝

قَالَ يَقُولُ لَيْسَ بِي صَلَافٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ

الْعَالَمِينَ ۝

أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَصْحَعُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ

اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

أَوْ عَجِبْتُمْ أَن جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَى رَجُلٍ مِّنكُمْ

لِيُنذِرَكُمْ وَيُنذِرَ قَوْمَكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَرْحَمُونَ ۝

نہیں ہوا) تاہم اس سے بھی لوگوں نے فائدہ اٹھایا، خود بھی پیا۔ کھیتوں کو بھی سیراب کیا اور کاشت کاری کی اور زمین کا کچھ حصہ بالکل چھٹیل تھا، جس نے پانی روکا اور نہ کچھ آگیا۔ پس یہ اس شخص کی مثال ہے جس نے اللہ کی دین میں سمجھ حاصل کی اور اللہ نے مجھے جس چیز کے ساتھ بھیجا، اس سے اس نے نفع اٹھایا، پس خود بھی علم حاصل کیا اور دوسروں کو بھی سکھایا اور مثال اس شخص کی بھی ہے جس نے کچھ نہیں سیکھا اور نہ وہ ہدایت ہی قبول کی جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم وعلم،

(۱) شرک اس طرح انسانی عقل کو ماؤف کر دیتا ہے کہ انسان کو ہدایت، گمراہی اور گمراہی، ہدایت نظر آتی ہے۔ چنانچہ قوم نوح کی بھی یہی قلبی ماہیت ہوئی، ان کو حضرت نوح علیہ السلام، جو اللہ کی توحید کی طرف اپنی قوم کو دعوت دے رہے تھے، نعوذ باللہ گمراہ نظر آتے تھے۔

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

(۲) حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام کے درمیان دس قرون یا دس پشتوں کا فاصلہ ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے کچھ پہلے تک تمام لوگ اسلام پر قائم چلے آ رہے تھے پھر سب سے پہلے توحید سے انحراف اس طرح آیا کہ اس قوم

سو وہ لوگ ان کی تکذیب ہی کرتے رہے تو ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اور ان کو جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے، بچالیا اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ان کو ہم نے غرق کر دیا۔ بے شک وہ لوگ اندھے ہو رہے تھے۔^(۱) (۶۳)

اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود (علیہ السلام) کو بھیجا۔^(۲) انہوں نے فرمایا اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں، سو کیا تم نہیں ڈرتے۔ (۶۵)

ان کی قوم میں جو بڑے لوگ کافر تھے انہوں نے کہا ہم تم کو کم عقلی میں دیکھتے ہیں۔^(۳) اور ہم بے شک تم کو جھوٹے لوگوں میں سمجھتے ہیں۔ (۶۶)

انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم! مجھ میں ذرا بھی کم

قَدْ بَوَّهٖ فَآتَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ فِي الْفُلِكِ وَآخِرَتَنَا
الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا إِنَّهُمْ كَانُوا مُعَاوِمِينَ ﴿۶۳﴾

وَالِىٰ عَادِ أَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ
مِنَ الْاِلٰهِ غَيْرِهٖۗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾

قَالَ الْمَلَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِن قَوْمِهٖۗ اِنَّا لَنَرٰكَ فِى
سَفَاهَةٍ وَّرَاۗنَا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۶﴾

قَالَ يَقَوْمِ لَيْسَ بِىْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّىْ رَسُوْلًا مِّنْ

کے صالحین فوت ہو گئے تو ان کے عقیدت مندوں نے ان پر سجدہ گاہیں (عبادت خانے) قائم کر دیں اور ان کی تصویریں بھی وہاں لٹکادیں، مقصد ان کا یہ تھا کہ اس طرح ان کی یاد سے وہ بھی اللہ کا ذکر کریں گے اور ذکر الہی میں ان کی مشابہت اختیار کریں گے۔ جب کچھ وقت گزرا تو انہوں نے ان تصویروں کے مجتھے بنادئے اور پھر کچھ اور عرصہ گزرنے کے بعد یہ مجتھے جوں کی شکل اختیار کر گئے اور ان کی پوجا پائت شروع ہو گئی اور قوم نوح کے یہ صالحین و ذّٰ سواع یعوق، یعقوث اور نسر معبود بن گئے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان میں نبی بنا کر بھیجا جنہوں نے ساڑھے نو سو سال تبلیغ کی۔ لیکن تھوڑے سے لوگوں کے سوا، کسی نے آپ کی تبلیغ کا اثر قبول نہیں کیا بالآخر اہل ایمان کے سوا سب کو غرق کر دیا گیا۔ اس آیت میں بتلایا جا رہا ہے کہ قوم نوح نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ ان ہی میں کایک آدمی نبی بن کر آیا جو انہیں اللہ کے عذاب سے ڈرا رہا ہے؟ یعنی ان کے خیال میں نبوت کے لئے انسان موزوں نہیں۔

(۱) یعنی حق سے، حق کو دیکھتے تھے نہ اسے اپنانے کے لئے تیار تھے۔

(۲) یہ قوم عاد عداوی ہے جن کی رہائش یمن میں ریتلے پہاڑوں میں تھی اور اپنی قوت و طاقت میں بے مثال تھی۔ ان کی طرف حضرت ہود علیہ السلام، جو اسی قوم کے ایک فرد تھے، نبی بن کر آئے۔

(۳) یہ کم عقلی ان کے نزدیک یہ تھی کہ جوں کو چھوڑ کر، جن کی عبادت ان کے آبا و اجداد سے ہوتی آ رہی تھی، الہ واحد کی عبادت کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔

رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۷۰﴾

عقلی نہیں لیکن میں پروردگار عالم کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں۔ (۶۷)

تم کو اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا امانتدار خیر خواہ ہوں۔ (۶۸)

اور کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت، جو تمہاری ہی جنس کا ہے کوئی نصیحت کی بات آ گئی تاکہ وہ شخص تم کو ڈرائے اور تم یہ حالت یاد کرو کہ اللہ نے تم کو قوم نوح کے بعد جانشین بنایا اور ذیل ذول میں تم کو پھیلاؤ زیادہ دیا،^(۱) سو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم کو فلاح ہو۔ (۶۹)

انہوں نے کہا کہ کیا آپ ہمارے پاس اس واسطے آئے ہیں کہ ہم صرف اللہ ہی کی عبادت کریں اور جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے ان کو چھوڑ دیں،^(۲) پس ہم کو جس عذاب کی دھمکی دیتے ہو اس کو ہمارے پاس منگوا دو اگر تم سچے ہو۔^(۳) (۷۰)

أَبَلَيْتُمْ رَسُولِي وَآتَاكُمْ نَاصِحًا أَمِينًا ﴿۷۰﴾

أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرُنَا رَبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ وَأَذِّنْ لَكُمْ خُلُقَاءَ مِنْ بَعْدِهِ قَوْمُ نُوحٍ وَآدَامُ فِي الْخَلْقِ بَهْطَلَةٌ فَاذْكُرُوا الْآيَةَ اللَّهُ لَعَلَّكُمْ تَتْلِحُونَ ﴿۷۰﴾

قَالُوا إِنَّا جِئْنَا لِنُعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ وَنَدْرِمَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤَنَا قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأَىٰ أَلْبَابًا كُفْرًا كَافٍ لَّئِن لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ فِعْلًا لَّهُ سَمِيعًا ﴿۷۰﴾

- (۱) ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ان کی بابت فرمایا ﴿لَمْ يُخَلِّقْ مِنطَلِقًا فِي الْبِلَادِ﴾ (الفجر-۸) ”اس جیسی قوت والی قوم پیدا نہیں کی گئی“ اپنی اسی قوت کے گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اس نے کہا مَن اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ”ہم سے زیادہ طاقت ور کون ہے؟“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”جس نے انہیں پیدا کیا ہے وہ ان سے بہت زیادہ قوت والا ہے“ (الم سجدہ-۱۵)
- (۲) آباؤ اجداد کی تقلید، ہر دور میں گمراہی کی بنیاد رہی ہے۔ قوم عادی نے بھی یہی ”دلیل“ پیش کی اور شرک کو چھوڑ کر توحید کا راستہ اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ بد قسمتی سے مسلمانوں میں بھی اپنے بڑوں کی تقلید کی یہ بیماری عام ہے۔
- (۳) جس طرح قریش نے بھی رسول اللہ ﷺ کی دعوت توحید کے جواب میں کہا تھا۔ ﴿اللَّهُمَّ إِنَّكَ لَهَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمِطْ عَنْ قُلُوبِنَا حِجَابَ مِنَ السَّمَاوَاتِ وَأَشِدَّتْنَا بِعَدَابِ الْإِلَهِ﴾ (الأنفال-۳۲) ”اے اللہ! اگر یہ حق ہے تیری طرف سے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا یا کوئی اور دردناک عذاب ہم پر بھیج دے۔“ یعنی شرک کرتے کرتے مشرک کی مت بھی ماری جاتی ہے۔ حالانکہ عقل مندی کا تقاضا یہ تھا کہ یہ کہا جاتا یا اللہ اگر یہ سچ ہے اور تیری ہی طرف سے ہے تو ہمیں اسے قبول کرنے کی توفیق عطا فرما۔ بہر حال قوم عاد نے اپنے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام سے کہہ دیا کہ اگر تو سچا ہے تو اپنے اللہ سے کہہ جس عذاب سے وہ ڈرتا ہے، بھیج دے۔

انہوں نے فرمایا کہ بس اب تم پر اللہ کی طرف سے عذاب^(۱) اور غضب آیا ہی چاہتا ہے کیا تم مجھ سے ایسے ناموں کے باب میں جھگڑتے ہو^(۲) جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے ٹھہرا لیا ہے؟ ان کے معبود ہونے کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں بھیجی۔ سو تم منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔ (۷۱)

غرض ہم نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی، جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔ (۷۲)^(۳)

اور ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو بھیجا۔^(۴) انہوں نے فرمایا اے میری قوم! تم اللہ کی

قَالَ قَدْ وَقَع عَلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ رَجْسٌ وَغَضَبٌ
الْحَمْدُ لَوْلَا نَفْسِي فِي أَسْمَاءٍ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مِمَّا
نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ فَانظُرُوا إِلَىٰ مَعَكُمْ مِنَ
الْمُنذَرِينَ ﴿٧١﴾

فَأَجْبِنُوهُمْ وَالَّذِينَ مَعَهُ يَرْحَمُوهُم مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ
الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لَمُؤْمِنِينَ ﴿٧٢﴾

وَالِىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَاقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا
لَكُمْ مِنَ الْإِلَهِ غَيْرُهُ قَدْ جَاءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ

(۱) رِجْسٌ کے معنی توپلیدی کے ہیں۔ لیکن یہاں یہ مقلوب (بدلا ہوا) ہے رِجْزٌ سے۔ جس کے معنی عذاب کے ہیں۔ یا پھر رِجْسٌ یہاں ناراضی اور غضب کے معنی میں ہے۔ (ابن کثیر)

(۲) اس سے مراد وہ نام ہیں جو انہوں نے اپنے معبودوں کے رکھے ہوئے تھے، مثلاً صَدًا صُمُودٌ، هَبًا۔ وغیرہ جیسے قوم نوح کے پانچ بت تھے جن کے نام اللہ نے قرآن میں ذکر کئے ہیں جیسے مشرکین عرب کے بتوں کے نام تھے۔ لَاتٌ، عَزَّى مَنَاتٌ هُبَلٌ وغیرہ یا جیسے آج کل کے مشرکانہ عقائد و اعمال میں ملوث لوگوں نے نام رکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً ”داتا گنج بخش“ ”خواجہ غریب نواز“ ”بابا فرید شکر گنج“ ”مشکل کشا“ وغیرہ جن کے معبود یا مشکل کشا و گنج بخش وغیرہ ہونے کی کوئی دلیل ان لوگوں کے پاس نہیں ہے۔

(۳) اس قوم پر بادئہ کا عذاب آیا جو سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل جاری رہا، جس نے ہر چیز کو تہس نہس کر کے رکھ دیا اور یہ قوم عاد کے لوگ، جنہیں اپنی قوت پر بڑا ناز تھا، ان کے لاشے کھجور کے کٹے ہوئے تنوں کی طرح زمین پر پڑے نظر آتے تھے۔ (دیکھئے سورۃ الحاقۃ- ۸۰-۸۱، سورۃ ہود- ۵۳-۵۶، سورۃ احقاف- ۲۳-۲۵، وغیرہا من الآیات)

(۴) یہ ثمود، حجاز اور شام کے درمیان وادی القرئی میں رہائش پذیر تھے۔ ۹/ ہجری میں تبوک جاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ اللہ ﷺ کا ان کے مساکن اور وادی سے گزر ہوا، جس پر آپ ﷺ نے صحابہ اللہ ﷺ سے فرمایا کہ معذب قوموں کے علاقے سے گزرو تو روتے ہوئے یعنی عذاب الہی سے پناہ مانگتے ہوئے گزرو! صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ فی مواضع الخسف، صحیح مسلم، کتاب الزہد، باب لات تدخلوا مساکن

عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں۔ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل آچکی ہے۔ یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل ہے سو اس کو چھوڑ دو کہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں کھاتی پھرے اور اسکو برائی کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا کہ کہیں تم کو دردناک عذاب آپڑے۔ (۷۳)

اور تم یہ حالت یاد کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو عباد کے بعد جانشین بنایا اور تم کو زمین پر رہنے کا ٹھکانا دیا کہ نرم زمین پر محل بناتے ہو^(۱) اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں گھر بناتے ہو،^(۲) سو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد مت پھیلاؤ۔^(۳) (۷۴)

ان کی قوم میں جو متکبر سردار تھے انہوں نے غریب لوگوں سے جو کہ ان میں سے ایمان لے آئے تھے پوچھا، کیا تم کو اس بات کا یقین ہے کہ صالح (علیہ السلام) اپنے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ

هٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةٌ فَمَنْ رَوَاهَا تَأْكُلْ فِي ۖ
أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمْسُوهَا بِمَنُوءِهِ فَيَأْخَذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٥٠﴾
وَادْكُرُوا آدَاءَ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ
فِي الْأَرْضِ تَنْجِدُونَ مِنْ سُوءِهَا فَضُورًا وَتَنْجَسُونَ
إِنْ جِبَالٌ بِيوتَاءَ ۖ فَادْكُرُوا آدَاءَ اللَّهِ وَلَا تَعْتَوُوا فِي الْأَرْضِ
مُفْسِدِينَ ﴿٥١﴾

قَالَ الْمَلَأُ الْكَافِرِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِيَذِرَن
اسْتُضْعِفُوا لِيَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْمُونَ اَنْ ضَلِمَا
مُرْسَلٌ مِّن رَّبِّهِ قَالُوا اِنَّا بِلِمَا اُرْسِلَ بِهِ

الذین ظلموا انفسهم لان تکنونوا باکین ان کی طرف حضرت صالح علیہ السلام نبی بنا کر بھیجے گئے۔ یہ عاد کے بعد کا واقعہ ہے۔ انہوں نے اپنے پیغمبر سے مطالبہ کیا کہ پتھر کی چٹان سے ایک اونٹنی نکال کر دکھا، جسے ہم نکلے ہوئے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان سے عہد لیا کہ اس کے بعد بھی اگر ایمان نہ لائے تو وہ ہلاک کر دیئے جائیں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مطالبے پر اونٹنی ظاہر فرمادی۔ اس اونٹنی کی بابت انہیں تاکید کر دی گئی کہ اسی بری نیت سے کوئی شخص ہاتھ نہ لگائے ورنہ عذاب الہی کی گرفت میں آجاؤ گے۔ لیکن ان ظالموں نے اس اس اونٹنی کو بھی قتل کر ڈالا، جس کے تین دن بعد انہیں چنگھاڑا صَبِيْحَةٌ۔ سخت چیخ اور رَجْفَةٌ۔ زلزلہ کے عذاب سے ہلاک کر دیا گیا، جس سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے۔

(۱) اس کا مطلب ہے کہ نرم زمین سے مٹی لے لے کر اینٹیں تیار کرتے ہو اور ان اینٹوں سے محل، جیسے آج بھی بھٹوں پر اسی طرح مٹی سے اینٹیں تیار کی جاتی ہیں۔

(۲) یہ ان کی قوت، صلاحیت بدن اور مہارت فن کا اظہار ہے۔

(۳) یعنی ان نعمتوں پر اللہ کا شکر کرو اور اس کی اطاعت کا راستہ اختیار کرو، نہ کہ کفران نعمت اور معصیت کا ارتکاب کر کے فساد پھیلاؤ۔

بے شک ہم تو اس پر پورا یقین رکھتے ہیں جو ان کو دے کر بھیجا گیا ہے۔^(۱) (۷۵)

وہ منکبر لوگ کہنے لگے کہ تم جس بات پر یقین لائے ہوئے ہو، ہم تو اس کے منکر ہیں۔^(۲) (۷۶)

پس انہوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی اور کہنے لگے کہ اے صالح! جس کی آپ ہم کو دھمکی دیتے تھے اس کو منگوائیے اگر آپ پیغمبر ہیں۔ (۷۷)

پس ان کو زلزلہ نے آچکرا^(۳) اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے۔ (۷۸)

اس وقت (صالح علیہ السلام) ان سے منہ موڑ کر چلے اور فرمانے لگے^(۴) کہ اے میری قوم! میں نے تو تم کو اپنے پروردگار کا حکم پہنچا دیا تھا اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی لیکن تم لوگ خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔ (۷۹)

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو بھیجا^(۵) جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم ایسا فحش کام کرتے ہو جس کو تم سے پہلے کسی نے دنیا جہان والوں میں سے نہیں کیا۔ (۸۰)

مُؤْمِنُونَ ۷

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ۷

فَعَقَرُوا وَالنَّفَاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يُضْلِلُهُمْ صَبَاتُهُمْ إِيمَانُهُمْ أَنَّا إِن كُنتَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۷

فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جُثَيِّينَ ۷

فَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْغَضَكُمْ رَسُولَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلَكِنْ لَا تُحِبُّونَ النَّصِيحِينَ ۷

وَلَوْطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ إِنَّا أَنذَرْتُكُمْ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقْتُمْ عَلَيْهَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ ۷

(۱) یعنی جو دعوت توحید وہ لے کر آئے ہیں، وہ چونکہ فطرت کی آواز ہے، ہم تو اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ صالح واقعی اللہ کے رسول ہیں؟ جو ان کا سوال تھا، اس سے ان اہل ایمان نے تعرض ہی نہیں کیا۔ کیونکہ ان کے رسول من اللہ ہونے کو وہ بحث کے قابل ہی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ان کی رسالت ایک مسلمہ حقیقت و صداقت تھی۔ جیسا کہ فی الواقع تھی۔

(۲) اس معقول جواب کے باوجود وہ اپنے استکبار اور انکار پر اڑے رہے۔

(۳) یہاں رَجْفَةٌ (زلزلے) کا ذکر ہے۔ دوسرے مقام پر صَنِيعَةٌ (جینج) کا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں قسم کا عذاب ان پر آیا۔ اوپر سے سخت جینج اور نیچے سے زلزلہ۔ ان دونوں عذابوں نے انہیں تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

(۴) یہ یا تو ہلاکت سے قبل کا خطاب ہے یا پھر ہلاکت کے بعد اسی طرح کا خطاب ہے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے جنگ بدر ختم ہونے کے بعد قلیب بدر میں مشرکین کی لاشوں سے خطاب فرمایا تھا۔

(۵) حضرت لوط علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لانے والوں

تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو^(۱) عورتوں کو چھوڑ کر،^(۲) بلکہ تم تو حد ہی سے گزر گئے ہو^(۳) (۸۱)
اور ان کی قوم سے کوئی جواب نہ بن پڑا، بجز اس کے کہ آپس میں کہنے لگے کہ ان لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو۔ یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں۔^(۴) (۸۲)

إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُونِ النِّسَاءِ
بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّصِرُونَ ﴿۸۱﴾
وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ
مِن قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أَنَاسٌ يَّتَطَهَّرُونَ ﴿۸۲﴾

میں سے تھے پھر خود ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایک علاقے میں نبی بنا کر بھیجا۔ یہ علاقہ اردن اور بیت المقدس کے درمیان تھا جسے سدوم کہا جاتا ہے۔ یہ زمین سرسبز و شاداب تھی اور یہاں ہر طرح کے غلے اور پھلوں کی کثرت تھی۔ قرآن نے اس جگہ کو مَوْثِقَاتٍ یا مَوْثِقَاتٍ کے الفاظ سے ذکر کیا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے غالباً سب سے پہلے یا دعوت توحید کے ساتھ ہی، (جو ہرنی کی بنیادی دعوت تھی اور سب سے پہلے وہ اسی کی دعوت اپنی قوم کو دیتے تھے۔ جیسا کہ پچھلے نبیوں کے حالات میں، جن کا ذکر ابھی گذرا ہے، دیکھا جا سکتا ہے۔) جو دوسری بڑی خرابی مردوں سے ساتھ بد فعلی، قوم لوط میں تھی، اس کی شاعت و قباحت بیان فرمائی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ ایک ایسا گناہ ہے جسے دنیا میں سب سے پہلے اسی قوم لوط نے کیا، اس گناہ کا نام ہی لواطت پڑ گیا۔ اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ پہلے قوم کو اس جرم کی خطرناکی سے آگاہ کیا جائے۔ علاوہ ازیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعے دعوت توحید بھی یہاں پہنچ چکی ہو گی۔ لواطت کی سزا میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض ائمہ کے نزدیک اس کی وہی سزا ہے جو زنا کی ہے یعنی مجرم اگر شادی شدہ ہو تو رجم، غیر شادی شدہ ہو تو سو کوڑے۔ بعض کے نزدیک اس کی سزا ہی رجم ہے چاہے مجرم کیسا بھی ہو اور بعض کے نزدیک فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دینا چاہئے۔ البتہ امام ابوحنیفہ صرف تعزیری سزا کے قائل ہیں، حد کے نہیں (تحفۃ الأحوذی جلد ۷ ص ۱۷)

(۱) یعنی مردوں کے پاس تم اس بے حیائی کے کام کے لئے محض شہوت رانی کی غرض سے آتے ہو، اس کے علاوہ تمہاری اور کوئی غرض ایسی نہیں ہوتی جو موافق عقل ہو۔ اس لحاظ سے وہ بالکل بہائم کی طرح تھے جو محض شہوت رانی کے لئے ایک دوسرے پر چڑھتے ہیں۔

(۲) جو قضائے شہوت کا اصل محل اور حصول لذت کی اصل جگہ ہے۔ یہ ان کی فطرت کے مسخ ہونے کی طرف اشارہ ہے، یعنی اللہ نے مرد کی جنسی لذت کی تسکین کے لئے عورت کی شرم گاہ کو اس کا محل اور موضع بنایا ہے اور ان ظالموں نے اس سے تجاوز کر کے مرد کی دبر کو اس کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

(۳) لیکن اب اسی فطرت صحیحہ سے انحراف اور حدود الہی سے تجاوز کو مغرب کی ”مہذب“ قوموں نے اختیار کر لیا ہے تو یہ انسانوں کا ”بنیادی حق“ قرار پایا ہے جس سے روکنے کا کسی کو حق حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ اب وہاں لواطت کو قانونی تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔ اور یہ سمرے سے جرم ہی نہیں رہا۔ فَإِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

(۴) یہ حضرت لوط کو بستی سے نکالنے کی علت ہے۔ باقی ان کی پاکیزگی کا اظہار یا تو حقیقت کے طور پر ہے اور مقصد ان

فَأَجْبِنُهُ وَأَهْلَكَ إِلَّا امْرَأَتَهُ وَكَانَتْ
مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿۸۳﴾

سو ہم نے لوط (علیہ السلام) کو اور ان کے گھر والوں کو بچا
لیا۔ بجز ان کی بیوی کے کہ وہ ان ہی لوگوں میں رہی جو
عذاب میں رہ گئے تھے۔ (۸۳)

اور ہم نے ان پر خاص طرح کا مینہ (۲) برسایا پس دیکھو تو
سہمی ان مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟ (۸۳)

اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب (علیہ
السلام) کو بھیجا۔ (۳) انہوں نے فرمایا اے میری قوم! تم اللہ
کی عبادت کرو اسکے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں، تمہارے
پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل آچکی
ہے۔ پس تم ناپ اور تول پورا پورا کیا کرو اور لوگوں کو ان

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُجْرِمِينَ ﴿۸۴﴾

وَالِى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَوْمَ اعْبُدُوا اللَّهَ
مَا لَكُمْ مِنَ اللَّهِ عِزًّا قَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّن
رَّبِّكُمْ فَآؤُاْهُوَ الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ
أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا.

کایہ ہوا کہ یہ لوگ اس برائی سے بچنا چاہتے ہیں، اس لئے بہتر ہے کہ یہ ہمارے ساتھ ہماری بستی ہی میں نہ رہیں یا استنہزا
اور تمسخر کے طور پر انہوں نے ایسا کہا۔

(۱) إِنَّهَا كَانَتْ مِنَ الْبَاقِينَ فِي عَذَابِ اللَّهِ، یعنی وہ ان لوگوں میں باقی رہ گئی جن پر اللہ کا عذاب آیا۔ کیونکہ وہ بھی
مسلمان نہیں تھی اور اس کی ہمدردیاں بھی مجرمین کے ساتھ تھیں بعض نے اس کا ترجمہ ”ہلاک ہونے والوں میں سے“
کیا ہے۔ لیکن یہ لازمی معنی ہیں، اصل معنی وہی ہیں۔

(۲) یہ خاص طرح کا مینہ کیا تھا؟ پتھروں کا مینہ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَابًا مِّن سِجِّيلٍ﴾
﴿مَنْصُودٌ﴾ (ہود-۸۲) ”ہم نے ان پر تہ بہ تہ پتھروں کی بارش برسائی“ اس سے پہلے فرمایا ﴿جَعَلْنَا عَلَيْهَا سَابِلَهَا﴾
”ہم نے اس بستی کو الٹ کر نیچے اوپر کر دیا“۔

(۳) یعنی اے محمد (ﷺ)! دیکھئے تو سہمی، جو لوگ علانیہ اللہ کی معاصی کا ارتکاب اور پیغمبروں کی تکذیب کرتے ہیں، ان
کا انجام کیا ہوتا ہے؟

(۴) مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے یا پوتے کا نام تھا، پھر انہی کی نسل پر مبنی قبیلے کا نام بھی مدین اور جس بستی
میں یہ رہائش پذیر تھے، اس کا نام بھی مدین پڑ گیا۔ یوں اس کا اطلاق قبیلے اور بستی دونوں پر ہوتا ہے۔ یہ بستی حجاز کے
راستے میں ”معان“ کے قریب ہے۔ انہی کو قرآن میں دوسرے مقام پر أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ (بن کے رہنے والے) بھی
کہا گیا ہے۔ ان کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام نبی بنا کر بھیجے گئے۔ (دیکھئے الشعراء: ۶۷-۷۰ کا حاشیہ)

ملوٹھ: ہر نبی کو اس قوم کا بھائی کہا گیا ہے، جس کا مطلب اسی قوم اور قبیلے کا فرد ہے، جس کو بعض جگہ رَسُولًا مِّنْهُمْ یا مِّن
أَنْفُسِهِمْ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور مطلب ان سب کا یہ ہے کہ رسول اور نبی انسانوں میں سے ہی ایک انسان ہوتا ہے جسے
اللہ تعالیٰ لوگوں کی ہدایت کے لئے جن لیتا ہے اور وحی کے ذریعے سے اس پر اپنی کتاب اور احکام نازل فرماتا ہے۔

ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۸۵﴾

کی چیزیں کم کر کے مت^(۱) دو اور روئے زمین میں اس کے بعد کہ اسکی درستی کر دی گئی، فساد مت پھیلاؤ، یہ تمہارے لئے نافع ہے اگر تم تصدیق کرو۔ (۸۵)

اور تم سڑکوں پر اس غرض سے مت بیٹھا کرو کہ اللہ پر ایمان لانے والے کو دھمکیاں دو اور اللہ کی راہ سے روکو اور اس میں کبھی کی تلاش میں لگے رہو۔^(۲) اور اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم کم تھے پھر اللہ نے تم کو زیادہ کر دیا اور دیکھو کہ کیسا انجام ہوا فساد کرنے والوں کا۔ (۸۶)

اور اگر تم میں سے کچھ لوگ اس حکم پر، جس کو دے کر مجھ کو بھیجا گیا، ایمان لے آئے ہیں اور کچھ ایمان نہیں لائے ہیں تو ذرا ٹھہر جاؤ! یہاں تک کہ ہمارے درمیان اللہ فیصلہ کئے دیتا ہے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے^(۳)۔ (۸۷)

وَلَا تَقْعُدُوا بِحُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصَدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُوا نَهَايَ عِوَجًا ۖ وَأَذْكُرُوا إِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا فَكَرِهْتُمْ ۚ وَأَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿۸۶﴾

وَإِنْ كَانَ ظَلَمَانَةٌ مِنْكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلَتْ بِهِ وَظَلَمَانَةٌ كَفَرُوا فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿۸۷﴾

(۱) دعوت توحید کے بعد، اس قوم میں ناپ تول میں کمی کی جو بڑی خرابی تھی، اس سے اسے منع فرمایا اور پورا پورا ناپ اور تول کر دینے کی تلقین کی۔ یہ کوتاہی بھی بہت خطرناک ہے جس سے اس قوم کی اخلاقی پستی اور گراؤ کا پتہ چلتا ہے جس کے اندر یہ ہو۔ یہ بدترین خیانت ہے کہ پیسے پورے لئے جائیں اور چیز کم دی جائے۔ اسی لئے سورہ مطففین میں ایسے لوگوں کی ہلاکت کی خبر دی گئی ہے۔

(۲) اللہ کے راستے سے روکنے کے لئے اللہ کے راستے میں کجیاں تلاش کرنا۔ یہ ہر دور کے نافرمانوں کا محبوب مشغلہ رہا ہے جس کے نمونے آج کل کے متجددین اور فرنگیت زدہ لوگوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ اَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ۔ علاوہ ازیں راستے میں بیٹھنے کے اور بھی کئی مفہوم بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً لوگوں کو ستانے کے لئے بیٹھنا، جیسے عام طور پر اوباش قسم کے لوگوں کا شیوہ ہے۔ یا حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف جانے والے راستوں میں بیٹھنا تاکہ ان کے پاس جانے والوں کو روکیں اور ان سے انہیں بدظن کریں، جیسے قریش مکہ کرتے تھے یا دین کے راستوں پر بیٹھنا اور اس راہ پر چلنے والوں کو روکنا۔ یوں لوٹ مار کی غرض سے ناکوں پر بیٹھنا تاکہ آنے جانے والوں کا مال سلب کر لیں۔ یا بعض کے نزدیک محصول اور چنگی وصول کرنے کے لئے ان کا راستوں پر بیٹھنا۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ سارے ہی مفہوم صحیح ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ ممکن ہے کہ وہ یہ سب ہی کچھ کرتے ہوں (فتح القدیر)۔

(۳) کفر پر صبر کرنے کا حکم نہیں ہے بلکہ اسکے لیے تمہید اور سخت وعید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اہل حق کا اہل باطل پر فتح و غلبہ ہی ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿فَوَيْصُورَانَا مَعَكُمْ مَتَىٰ تَصُونَ﴾ (السورة۔ ۵۲)

ان کی قوم کے متکبر سرداروں نے کہا کہ اے شعیب! ہم آپ کو اور جو آپ کے ہمراہ ایمان والے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال دیں گے الایہ کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آ جاؤ۔^(۱) شعیب (علیہ السلام) نے جو اب دیا کہ کیا ہم تمہارے مذہب میں آ جائیں گو ہم اس کو کمرہ ہی سمجھتے ہوں۔^(۲) (۸۸)

ہم تو اللہ تعالیٰ پر بڑی جھوٹی تمہمت لگانے والے ہو جائیں گے اگر ہم تمہارے دین میں آ جائیں اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے نجات دی^(۳) اور ہم سے ممکن نہیں کہ تمہارے مذہب میں پھر آ جائیں، لیکن ہاں یہ کہ اللہ ہی نے جو ہمارا مالک ہے مقدر کیا ہو۔^(۴) ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے، ہم اللہ ہی پر

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَشْعَبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَوْمِنَا وَلَتَعُوذُنَّ فِي بِلَدِنَا قَالَ أُولَئِكَ لَا كَرْهِيَن ۖ

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا لَئِنْ عَلِمْنَا فِي مَلِكِكُمْ بَعْدَ اذْخَلْنَا اللَّهُ مِنْهَا مَوَالِكُونَ لَنَأَنَّ نَعُوذُ مِنْهَا اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا رَبُّنَا اَفَنُصِيبُهَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا لِحَقِّي وَاَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ۝

(۱) ان سرداروں کے تکبر اور سرکشی کا اندازہ کیجئے کہ انہوں نے ایمان و توحید کی دعوت کو ہی رد نہیں کیا بلکہ اس سے بھی تجاوز کر کے اللہ کے پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں کو دھمکی دی کہ یا تو اپنے آبائی مذہب پر واپس آ جاؤ، نہیں تو ہم تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔ اہل ایمان کے اپنے سابق مذہب کی طرف واپسی کی بات تو قابل فہم ہے، کیونکہ انہوں نے کفر جھوڑ کر ایمان اختیار کیا تھا۔ لیکن حضرت شعیب علیہ السلام کو بھی ملت آبائی کی طرف لوٹنے کی دعوت اس لحاظ سے تھی کہ وہ انہیں بھی نبوت اور تبلیغ و دعوت سے پہلے اپنا مذہب ہی سمجھتے تھے، گو حقیقتاً ایسا نہ ہو۔ یا بطور تغلیب انہیں بھی شامل کر لیا ہو۔

(۲) یہ سوال مقدر کا جواب ہے اور ہمزہ انکار کے لیے اور واو حالیہ ہے۔ یعنی کیا تم ہمیں اپنے مذہب کی طرف لوٹاؤ گے یا ہمیں اپنے بستی سے نکال دو گے درآں حالیکہ ہم اس مذہب کی طرف لوٹنا اور اس بستی سے نکلنا پسند نہ کرتے ہوں؟ مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ تم ہمیں ان میں سے کسی ایک بات کے اختیار کرنے پر مجبور کرو۔

(۳) یعنی اگر ہم دوبارہ اس دین آبائی کی طرف لوٹ آئے، جس سے اللہ نے ہمیں نجات دی، تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے ایمان و توحید کی دعوت دے کر اللہ پر جھوٹ باندھا تھا؟ مطلب یہ تھا کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ہماری طرف سے ایسا ہو۔

(۴) اپنا عزم ظاہر کرنے کے بعد معاملہ اللہ کی مشیت کے سپرد کر دیا۔ یعنی ہم تو اپنی رضامندی سے اب کفر کی طرف

بھروسہ رکھتے ہیں۔^(۱) اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے موافق فیصلہ کر دے اور تو سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔^(۲) (۸۹)

اور ان کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا کہ اگر تم شعیب (علیہ السلام) کی راہ پر چلو گے تو بے شک بڑا نقصان اٹھاؤ گے۔^(۳) (۹۰)

پس ان کو زلزلے نے آچکڑا سو وہ اپنے گھروں میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے۔^(۴) (۹۱)

جنہوں نے شعیب (علیہ السلام) کی تکذیب کی تھی ان کی یہ حالت ہو گئی جیسے ان گھروں میں کبھی بسے ہی

وَقَالَ الْمَلَكُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا
إِنَّكُمْ إِذًا لَخَيْرُونَ ۝

فَاخَذَتْهُمْ رَجْفَةٌ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جثِيمِينَ ۝

الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَأَن لَّمْ يَعْمُرُوا مَيْمَنَةَ الَّذِينَ كَذَّبُوا

نہیں لوٹ سکتے۔ ہاں اگر اللہ چاہے تو بات اور ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ﴿حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ کی طرح تعلق بالحال ہے۔

(۱) کہ وہ ہمیں ایمان پر ثابت رکھے گا اور ہمارے اور کفر و اہل کفر کے درمیان حاصل رہے گا، ہم پر اپنی نعت کا اتمام فرمائے گا اور اپنے عذاب سے محفوظ رکھے گا۔

(۲) اور اللہ جب فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ یہی ہوتا ہے کہ اہل ایمان کو بچا کر مکذبین اور متکبرین کو ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ گویا عذاب الہی کے نزول کا مطالبہ ہے۔

(۳) اپنے آبائی مذہب کو چھوڑنا اور ناپ تول میں کمی نہ کرنا، یہ ان کے نزدیک خسارے والی بات تھی در آں حالیکہ ان دونوں باتوں میں ان ہی کا فائدہ تھا۔ لیکن دنیا والوں کی نظر میں تو نفع عاجل (دنیا میں فوراً حاصل ہو جانے والا نفع) ہی سب کچھ ہوتا ہے جو ناپ تول میں ڈنڈی مار کر انہیں حاصل ہو رہا تھا، وہ اہل ایمان کی طرح آخرت کے نفع آجل (دیر میں ملنے والے نفع) کے لیے اسے کیوں چھوڑتے؟

(۴) میماں رَجْفَةٌ (زلزلہ) کا لفظ آیا ہے اور سورہ ہود آیت ۹۴ میں صَنِيعَةٌ (چیچ) کا لفظ ہے اور سورہ شعراء۔ ۱۸۹ میں ظَلَّةً (بادل کا سایہ) کے الفاظ ہیں۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ عذاب میں ساری ہی چیزوں کا اجتماع ہوا۔ یعنی سائے والے دن ان پر عذاب آیا۔ پہلے بادل نے ان پر سایہ کیا جس میں شعلے، چنگاریاں اور آگ کے بھسوکے تھے، پھر آسمان سے سخت چیچ آئی اور زمین سے بھونچال، جس سے ان کی روحمیں پرواز کر گئیں اور بے جان لاشے ہو کر پرندوں کی طرح گھٹنوں میں منہ دے کر اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے۔

نہ تھے۔^(۱) جنہوں نے شعیب (علیہ السلام) کی تکذیب کی تھی وہی خسارے میں پڑ گئے۔^(۲) (۹۲)

اس وقت شعیب (علیہ السلام) ان سے منہ موڑ کر چلے اور فرمانے لگے کہ اے میری قوم! میں نے تم کو اپنے پروردگار کے احکام پہنچا دیئے تھے اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی۔ پھر میں ان کافر لوگوں پر کیوں رنج کروں۔^(۳) (۹۳)

اور ہم نے کسی بہستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا کہ وہاں کے رہنے والوں کو ہم نے سختی اور تکلیف میں نہ پکڑا ہو تاکہ وہ گڑگڑائیں۔^(۴) (۹۴)

پھر ہم نے اس بد حالی کی جگہ خوش حالی بدل دی، یہاں تک کہ ان کو خوب ترقی ہوئی اور کہنے لگے کہ ہمارے آبا و اجداد کو بھی تنگی اور راحت پیش آئی تھی تو ہم نے ان کو دفعاً پکڑ لیا^(۵) اور ان کو خبر بھی نہ تھی۔ (۹۵)

شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ الْخَاسِرِينَ ﴿۹۲﴾

مَوَلَىٰ عَلَيْهِمْ وَقَالَ يَوْمَ لَقَدَ ابْتَلَيْتُكُمْ وَرَسُولِي رَبِّي
وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَيْفَ آتَىٰ عَلَىٰ قَوْمٍ كُفْرِينَ ﴿۹۳﴾

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبَأْسَاءِ
وَالْقَارَاءِ لَعَلَّهُمْ يَضَعُونَ ﴿۹۴﴾

ثُمَّ نَبَدْنَا لِمَا كَانُوا السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ حَتَّىٰ عَفَوْا وَقَالُوا قَدْ مَسَّ
آبَاءَنَا الْقَارِئُ وَالسَّرَّاءُ فَأَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۹۵﴾

(۱) یعنی جس بہستی سے یہ اللہ کے رسول اور ان کے پیروکاروں کو نکالنے پر تلے ہوئے تھے، اللہ کی طرف سے عذاب نازل ہونے کے بعد ایسے ہو گئے جیسے وہ یہاں رہتے ہی نہ تھے۔

(۲) یعنی خسارے میں وہی لوگ رہے جنہوں نے پیغمبر کی تکذیب کی، نہ کہ پیغمبر اور ان پر ایمان لانے والے۔ اور خسارہ بھی دونوں جہانوں میں۔ دنیا میں بھی ذلت کا عذاب چکھا اور آخرت میں اس سے کہیں زیادہ عذاب شدید ان کے لیے تیار ہے۔

(۳) عذاب و تباہی کے بعد جب وہ وہاں سے چلے، تو انہوں نے وفور جذبات میں یہ باتیں کہیں۔ اور ساتھ ہی کہا کہ جب میں نے حق تبلیغ ادا کر دیا اور اللہ کا پیغام ان تک پہنچا دیا، تو اب میں ایسے لوگوں پر افسوس کروں تو کیوں کروں؟ جو اس کے باوجود اپنے کفر اور شرک پر ڈٹے رہے۔

(۴) بَأْسَاءُ، وہ تکلیفیں جو انسان کے بدن کو لاحق ہوں یعنی بیماری اور صَرَآءُ سے مراد فقر و تنگ دستی۔ مطلب یہ ہے کہ جس کسی بہستی میں بھی ہم نے رسول بھیجا، انہوں نے اس کی تکذیب کی جس کی پاداش میں ہم نے ان کو بیماری اور محتاجی میں مبتلا کر دیا جس سے مقصد یہ تھا کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کریں اور اس کی بارگاہ میں گڑگڑائیں۔

(۵) یعنی فقر و بیماری کے ابتلا سے بھی جب ان کے اندر رجوع الی اللہ کا داعیہ پیدا نہیں ہوا تو ہم نے ان کی تنگ دستی کو خوش حالی سے اور بیماری کو صحت و عافیت سے بدل دیا تاکہ وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کریں۔ لیکن اس انقلاب حال سے بھی

اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز گاری اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا۔ (۹۶)

کیا پھر بھی ان بستیوں کے رہنے والے اس بات سے بے فکر ہو گئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب شب کے وقت آ پڑے جس وقت وہ سوتے ہوں۔ (۹۷)

اور کیا ان بستیوں کے رہنے والے اس بات سے بے فکر ہو گئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آ پڑے جس وقت کہ وہ اپنے کھیلوں میں مشغول ہوں۔ (۹۸)

کیا پس وہ اللہ کی اس پکڑ سے بے فکر ہو گئے۔ سو اللہ کی پکڑ سے بجز ان کے جن کی شامت ہی آگئی ہو اور کوئی بے فکر نہیں ہوتا۔^(۹۹)

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۹۶﴾

أَفَأَمِّنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا بَيِّنًا وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿۹۷﴾

أَوَأَمِّنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا ضَعْفٍ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿۹۸﴾

أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۹۹﴾

ان کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آئی اور انہوں نے کہا کہ یہ تو ہمیشہ سے ہی ہوتا چلا آ رہا ہے کہ کبھی تنگی آگئی کبھی خوش حالی آگئی، کبھی بیماری تو کبھی صحت، کبھی فقیری تو کبھی امیری۔ یعنی تنگ دستی کا پہلا علاج ان کے لیے موثر ثابت ہوا، نہ خوش حالی، ان کے اصلاح احوال کے لیے کارگر ثابت ہوئی۔ وہ اسے لیل و نمار کی گردش ہی سمجھتے رہے اور اس کے پیچھے کار فرما قدرت الہی اور اس کے ارادہ کو سمجھنے میں ناکام رہے تو ہم نے پھر انہیں اچانک اپنے عذاب کی گرفت میں لے لیا۔ اسی لیے حدیث میں مومنوں کا معاملہ اس کے برعکس بیان فرمایا گیا ہے۔ کہ وہ آرام و راحت ملنے پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور تکلیف پہنچنے پر صبر سے کام لیتے ہیں، یوں دونوں ہی حالتیں ان کے لیے خیر اور اجر کا باعث ہوتی ہیں۔ (صحیح

مسلم۔ کتاب الزہد باب المؤمن أمره كله خيرا)

(۱) ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ بیان فرمایا ہے کہ ایمان و تقویٰ ایسی چیز ہے کہ جس بستی کے لوگ اسے اپنالیں تو ان پر اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے یعنی حسب ضرورت انہیں آسمان سے بارش میا فرماتا ہے اور زمین اس سے سیراب ہو کر خوب پیداوار دیتی ہے۔ نتیجتاً خوش حالی و فراوانی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس تکذیب اور کفر کا راستہ اختیار کرنے پر تو میں اللہ کے عذاب کی مستحق ٹھہر جاتی ہیں، پھر پتہ نہیں ہوتا کہ شب و روز کی کس گھڑی میں عذاب آجائے اور ہنستی کھیلتی بستیوں کو آن واحد میں کھنڈر بنا کر رکھ دے۔ اس لیے اللہ کی ان تدبیروں سے بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔ اس بے خوفی کا نتیجہ سوائے خسارے کے اور کچھ نہیں۔ منکر کے مفہوم کی وضاحت کے لیے دیکھئے سورہ آل عمران آیت ۵۴ کا حاشیہ۔

اور کیا ان لوگوں کو جو زمین کے وارث ہوئے وہاں کے لوگوں کی ہلاکت کے بعد (ان واقعات مذکورہ نے) یہ بات نہیں بتلائی کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے جرائم کے سبب ان کو ہلاک کر ڈالیں اور ہم ان کے دلوں پر بند لگا دیں، پس وہ نہ سن سکیں۔^(۱) (۱۰۰)

ان بستیوں کے کچھ کچھ قصبے ہم آپ سے بیان کر رہے ہیں اور ان سب کے پاس ان کے پیغمبر معجزات لے کر آئے،^(۲) پھر جس چیز کو انہوں نے ابتدا میں جھوٹا کہہ دیا یہ بات نہ ہوئی کہ پھر اس کو مان لیتے،^(۳) اللہ تعالیٰ اسی طرح کافروں کے دلوں پر بند لگا دیتا ہے۔ (۱۰۱)

أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصْبَنَهُم بِأَرْبَابِهِمْ وَقَطَّبَعْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ أَلْسِمُونَ ﴿۱۰۰﴾

تِلْكَ الْقُرَى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ مَا وُلَدَتْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا لِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ﴿۱۰۱﴾

(۱) یعنی گناہوں کے نتیجے میں عذاب ہی نہیں آتا، دلوں پر بھی قفل لگ جاتے ہیں، پھر بڑے بڑے عذاب بھی انہیں خواب غفلت سے بیدار نہیں کر پاتے۔ دیگر بعض مقامات کی طرح یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک تو یہ بیان فرمایا ہے کہ جس طرح گزشتہ قوموں کو ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کیا، ہم چاہیں تو تمہیں بھی تمہارے کرتوتوں کی وجہ سے ہلاک کر دیں اور دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ مسلسل گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے لوگوں کے دلوں پر مر لگا دی جاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق کی آواز کے لیے ان کے کان بند ہو جاتے ہیں۔ پھر انذار اور وعظ و نصیحت ان کے لئے بیکار ہو جاتے ہیں۔ آیت میں ہدایت تَبَيِّنُ (وضاحت) کے معنی میں ہے، اسی لئے لام کے ساتھ متعدی ہے۔

أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ، یعنی کیا ان پر یہ بات واضح نہیں ہوئی۔
(۲) جس طرح گزشتہ صفحات میں چند انبیاء کا ذکر گزرا۔ بَيِّنَاتٌ سے مراد دلائل و براہین اور معجزات دونوں ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ رسولوں کے ذریعے سے جب تک ہم نے حجت تمام نہیں کر دی، ہم نے انہیں ہلاک نہیں کیا۔ کیونکہ ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبَيِّنَ رُسُلًا﴾ (سنی اسرائیل ۱۵) ”جب تک ہم رسول نہیں بھیج دیتے۔ عذاب نازل نہیں کرتے“۔

(۳) اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یوم میثاق کو جب ان سے عہد لیا گیا تھا تو یہ اللہ کے علم میں ایمان لانے والے نہ تھے، اس لیے جب ان کے پاس رسول آئے تو اللہ کے علم کے مطابق ایمان نہیں لائے۔ کیونکہ ان کی تقدیر میں ہی ایمان نہیں تھا جسے اللہ نے اپنے علم کے مطابق لکھ دیا تھا۔ جس کو حدیث میں فَكَلَّمْنَا مَيْسِرًا لَمَّا خَلَقْنَا لَهُ (صحیح بخاری) تفسیر سورۃ اللیل سے تعبیر کیا گیا ہے دو سرا مفہوم یہ ہے کہ جب پیغمبران کے پاس آئے تو وہ اس وجہ سے ان پر ایمان نہیں لائے کہ وہ اس سے قبل حق کی تکذیب کر چکے تھے۔ گویا ابتداءً جس چیز کی وہ تکذیب کر چکے تھے، یہی گناہ ان کے عدم ایمان کا سبب بن گیا اور ایمان لانے کی توفیق ان سے سلب کر لی گئی، اسی کو اگلے جملے میں مر لگانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ﴿وَمَا يَنْتَعِرُونَ أَنَّهُمْ إِذَا بَدَأْتُمْ لَهُمْ آيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ * وَتَقَالِبُ أَقْبَادَهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾

اور اکثر لوگوں میں ہم نے وفائے عہد نہ دیکھا^(۱) اور ہم نے اکثر لوگوں کو بے حکم ہی پایا۔ (۱۰۲)

پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنے دلائل دے کر فرعون اور اس کے امرا کے پاس بھیجا^(۲)، مگر ان لوگوں نے ان کا بالکل حق ادا نہ کیا۔ سو دیکھئے ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا؟^(۳) (۱۰۳)

اور موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اے فرعون! میں رب العالمین کی طرف سے پیغمبر ہوں۔ (۱۰۴)

میرے لئے یہی شایان ہے کہ بجز سچ کے اللہ کی طرف کوئی بات منسوب نہ کروں، میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑی دلیل بھی لایا ہوں،^(۴) سو تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔^(۵) (۱۰۵)

وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ وَإِنْ وَجَدْنَا
أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ ﴿۱۰۲﴾

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِم مُّوسَىٰ يَا أَيُّهَا آلِ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ
قَدْ ظَلَمُوا بِهَا فَأَنْظِرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿۱۰۳﴾

وَقَالَ مُوسَىٰ يُرِيعُونَ ابْنِي رَسُولٍ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۰۴﴾

حَقِيقٌ عَلَىٰ أَنْ لَا أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ قَدْ جُنَّتُمْ بِبَيِّنَاتٍ
مِنْ رَبِّكُمْ فَارْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿۱۰۵﴾

(الأنعام ۱۰۱-۱۰۴) ”اور تمہیں کیا معلوم ہے یہ تو ایسے (بد بخت) ہیں کہ ان کے پاس نشانیاں بھی آجائیں تب بھی ایمان نہ لائیں اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو الٹ دیں گے (تو) جیسے یہ اس (قرآن) پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے (ویسے پھر نہ لائیں گے)۔“

(۱) اس سے بعض نے عہد الست، جو عالم ارواح میں لیا گیا تھا، بعض نے عذاب ٹالنے کے لیے پیغمبروں سے جو عہد کرتے تھے، وہ عہد اور بعض نے عام عہد مراد لیا ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے کرتے تھے۔ اور یہ عہد شکنی، چاہے وہ کسی بھی قسم کی ہو، فسق ہی ہے۔

(۲) یہاں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر شروع ہو رہا ہے جو مذکورہ انبیاء کے بعد آئے جو جلیل القدر پیغمبر تھے، جنہیں فرعون مصر اور اس کی قوم کی طرف دلائل و معجزات دے کر بھیجا گیا تھا۔

(۳) یعنی انہیں فرق کر دیا گیا، جیسا کہ آگے آئے گا۔

(۴) جو اس بات کی دلیل ہے کہ میں واقعی اللہ کی طرف سے مقرر کردہ رسول ہوں۔ اس معجزے اور بڑی دلیل کی تفصیل بھی آگے آ رہی ہے۔

(۵) بنی اسرائیل، جن کا اصل مسکن شام کا علاقہ تھا، حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر چلے گئے تھے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ فرعون نے ان کو غلام بنالیا تھا اور ان پر طرح طرح کے مظالم کرتا تھا، جس کی تفصیل پہلے سورہ بقرہ میں گزر چکی ہے اور آئندہ بھی آئے گی۔ فرعون اور اس کے درباری امرانے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی

قَالَ إِنَّ كُنْتُمْ جُنُتُمْ يَا لَيْلَىٰ قَاتِ يَهَكَانَ كُنْتُمْ مِنَ
الضَّالِّينَ ﴿۱۰۶﴾

قَالَتِ عَصَا يَا قَاذِئِي تَعْبَانِ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۰۷﴾

وَنَزَعْنَا يَدَآءَ قَاذِئِي بِيضًا لِّلْمُظْطَرِّينَ ﴿۱۰۸﴾

قَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَذَا السَّجَدُ عَلِيمٌ ﴿۱۰۹﴾

يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ فَأَذَّاتَا مَرُونَ ﴿۱۱۰﴾

قَالُوا أَرْجَاهُ وَأَنْتَاهُ وَأَرْسِلْ فِي الْمَدَائِنِ خَبِيرِينَ ﴿۱۱۱﴾

يَأْتُونَكَ بِحَقِّ سَجِيرٍ عَلِيمٍ ﴿۱۱۲﴾

فرعون نے کہا، اگر آپ کوئی معجزہ لے کر آئے ہیں تو اس
کو اب پیش کیجئے! اگر آپ سچے ہیں۔ (۱۰۶)
پس آپ نے اپنا عصا ڈال دیا، سو دفعتاً وہ صاف ایک
اژدہا بن گیا۔ (۱۰۷)
اور اپنا ہاتھ باہر نکالا سو وہ یکایک سب دیکھنے والوں کے
روبرو بہت ہی چمکتا ہوا ہو گیا۔ (۱۰۸)^(۱)
قوم فرعون میں جو سردار لوگ تھے انہوں نے کہا کہ
واقعی یہ شخص بڑا ماہر جادو گر ہے۔ (۱۰۹)^(۲)
یہ چاہتا ہے کہ تم کو تمہاری سرزمین سے باہر کر دے سو
تم لوگ کیا مشورہ دیتے ہو۔ (۱۱۰)
انہوں نے کہا کہ آپ ان کو اور ان کے بھائی کو مہلت
دیکھئے اور شہروں میں ہر کاروں کو بھیج دیکھئے۔ (۱۱۱)
کہ وہ سب ماہر جادو گروں کو آپ کے پاس لا کر حاضر کر
دیں۔ (۱۱۲)^(۳)

دعوت کو ٹھکرا دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے یہ دوسرا مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دے تاکہ یہ
اپنے آبائی مسکن میں جا کر عزت و احترام کی زندگی گزاریں اور اللہ کی عبادت کریں۔

(۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے جو دو بڑے معجزے انہیں عطا فرمائے تھے، اپنی صداقت کے لیے انہیں پیش کر دیا۔

(۲) معجزے دیکھ کر ایمان لانے کے بجائے، فرعون کے درباریوں نے اسے جادو قرار دے کر یہ کہہ دیا کہ یہ تو بڑا ماہر
جادو گر ہے جس سے اس کا مقصد تمہاری حکومت کو ختم کرنا ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو کا
بڑا زور اور اس کا عام چلن تھا، اس لیے انہوں نے معجزات کو بھی جادو سمجھا، جن میں سر سے انسان کا دخل ہی نہیں
ہوتا۔ خالص اللہ کی مشیت سے ظہور میں آتے ہیں۔ تاہم اس عنوان سے فرعون کے درباریوں کے لیے حضرت موسیٰ
علیہ السلام کے بارے میں فرعون کو بہکانے کا موقع مل گیا۔

(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو گری کو بڑا عروج حاصل تھا۔ اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے
پیش کردہ معجزات کو بھی انہوں نے جادو سمجھا اور جادو کے ذریعے سے اس کا توڑ مہیا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جس طرح
دوسرے مقام پر فرمایا، کہ فرعون اور اس کے درباریوں نے کہا ”اے موسیٰ علیہ السلام! کیا تو چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے
زور سے ہمیں ہماری زمین سے نکال دے؟“ پس ہم بھی اس جیسا جادو تیرے مقابلے میں لائیں گے، اس کے لیے کسی

اور وہ جادوگر فرعون کے پاس حاضر ہوئے، کہنے لگے کہ اگر ہم غالب آئے تو ہم کو کوئی بڑا صلہ ملے گا؟ (۱۱۳)

فرعون نے کہا کہ ہاں اور تم مقرب لوگوں میں داخل ہو جاؤ گے۔ (۱۱۴)^(۱)

ان ساحروں نے عرض کیا کہ اے موسیٰ! خواہ آپ ڈالنے اور یا ہم ہی ڈالیں؟ (۱۱۵)^(۲)

(موسیٰ علیہ السلام) نے فرمایا کہ تم ہی ڈالو، (۳) پس جب انہوں نے ڈالا تو لوگوں کی نظر بندی کردی اور ان پر ہیبت غالب کردی اور ایک طرح کا بڑا جادو دکھلایا۔ (۱۱۶)^(۴)

وَجَاءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوا إِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَمُوتُ
الْقُلُوبِ ۝

قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُتَقَرَّبِينَ ۝

قَالُوا يَمُوتُ سِوَىٰ إِمْرَأَانَ تَلْفِيًا وَإِنَّا نَمُوتُ وَنَحْنُ الْمُتَّقِينَ ۝

قَالَ أَلَمْ نَأْتِكُمْ أَلْفًا مِّنَ النَّاسِ وَاسْتَهْزَأُوا بِكُمْ
وَجَاءُوا بِسِحْرٍ عَظِيمٍ ۝

ہموار جگہ اور وقت کا ہم تعین کر لیں جس کی دونوں پابندی کریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ نوروز کا دن اور چاشت کا وقت ہے، اس حساب سے لوگ جمع ہو جائیں۔ (سورہ طہ - ۵۷-۵۹)

(۱) جادوگر، چونکہ طالب دنیا تھے، دنیا کمانے کے لیے ہی شعبہ بازی کا فن سیکھتے تھے، اس لیے انہوں نے موقع غنیمت جانا کہ اس وقت تو بادشاہ کو ہماری ضرورت لاحق ہوئی ہے، کیونکہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ اجرت حاصل کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا مطالبہ اجرت کا مہیا بی کی صورت میں پیش کر دیا، جس پر فرعون نے کہا کہ اجرت ہی نہیں بلکہ تم میرے مقربین میں بھی شامل ہو جاؤ گے۔

(۲) جادوگروں نے یہ اختیار اپنے آپ پر مکمل اعتماد کرنے کی وجہ سے دیا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ ہمارے جادو کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ، جسے وہ ایک کرتب ہی سمجھتے تھے، کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور اگر موسیٰ علیہ السلام کو پہلے اپنے کرتب دکھانے کا موقع دے بھی دیا تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا، ہم اس کے کرتب کا توڑ بہر صورت مہیا کر لیں گے۔

(۳) لیکن موسیٰ علیہ السلام چونکہ اللہ کے رسول تھے اور اللہ کی تائید انہیں حاصل تھی، اس لیے انہیں اپنے اللہ کی مدد کا یقین تھا، لہذا انہوں نے بغیر کسی خوف اور تامل کے جادوگروں سے کہا کہ پہلے تم جو دکھانا چاہتے ہو، دکھاؤ! علاوہ ازیں اس میں یہ حکمت بھی ہو سکتی ہے کہ جادوگروں کے پیش کردہ جادو کا توڑ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے معجزانہ انداز میں پیش ہو گا تو یہ لوگوں کے لیے زیادہ متاثر کن ہو گا، جس سے ان کی صداقت واضح تر ہوگی اور لوگوں کے لیے ایمان لانا سہل ہو جائے گا۔

(۴) بعض آثار میں بتایا گیا ہے کہ یہ جادوگر ۷۰ ہزار کی تعداد میں تھے۔ بظاہر یہ تعداد مبالغے سے خالی نہیں، جن میں سے ہر ایک نے ایک ایک رسی اور ایک ایک لاشی میدان میں پھینکی، جو دیکھنے والوں کو دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ یہ گویا بزم خولیش بہت بڑا جادو تھا جو انہوں نے پیش کیا۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَلْقِ عَصَاكَ ۖ إِذْ أَسَاءَ مَا يَأْكُفُونَ ﴿۱۱۷﴾

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ اپنا عصا ڈال دیتے! سو عصا کا ڈالنا تھا کہ اس نے ان کے سارے بنے بنائے کھیل کو نکلنا شروع کیا۔^(۱) (۱۱۷)

پس حق ظاہر ہو گیا اور انہوں نے جو کچھ بنایا تھا سب جاتا رہا۔ (۱۱۸)

پس وہ لوگ اس موقع پر ہار گئے اور خوب ذلیل ہو کر پھرے۔ (۱۱۹)

اور وہ جو ساحر تھے سجدہ میں گر گئے۔ (۱۲۰)

کہنے لگے کہ ہم ایمان لائے رب العالمین پر۔^(۲) (۱۲۱)

جو موسیٰ اور ہارون کا بھی رب ہے۔^(۳) (۱۲۲)

فرعون کہنے لگا کہ تم موسیٰ پر ایمان لائے ہو بغیر اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں؟ بے شک یہ سازش تھی جس پر تمہارا عمل درآمد ہوا ہے اس شہر میں تاکہ تم سب اس شہر سے یہاں کے رہنے والوں کو باہر نکال دو۔ سو اب تم کو حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے۔^(۴) (۱۲۳)

فَوَقَّعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۱۸﴾

فَقَلَّبُوا هُمُوكَ ۖ وَانْقَلَبُوا صُغِيرُونَ ﴿۱۱۹﴾

وَالَّذِي السَّحَرَةَ سُجِدَ مِن ۖ ﴿۱۲۰﴾

قَالُوا الْمَنكَرَاتِ الْعُلَمِينَ ﴿۱۲۱﴾

رَبِّ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿۱۲۲﴾

قَالَ فِرْعَوْنُ الْمَنْتَوِيهِ قَبْلَ أَنْ أَدْنَىٰ لَكَ إِنَّ هَذَا

لَكَذِبٌ مَّا كُنْتُمْ فِي الْمَدِينَةِ لِتُخْرِجُوا مِنهَا أَهْلَهَا ۖ فَسَوْفَ

تَعْلَمُونَ ﴿۱۲۳﴾

(۱) لیکن یہ جو کچھ بھی تھا، ایک تخیل، شعبدہ بازی اور جادو تھا جو حقیقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے لامحی ڈالنے ہی سب کچھ ختم ہو گیا اور لامحی نے ایک خوفناک اثر دھمے کی شکل اختیار کر کے سب کچھ نکل لیا۔

(۲) جادو گروں نے جو جادو کے فن اور اس کی اصل حقیقت کو جانتے تھے، یہ دیکھا تو سمجھ گئے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ یہاں پیش کیا ہے، جادو نہیں ہے، یہ واقعی اللہ کا نمائندہ ہے اور اللہ کی مدد سے ہی اس نے یہ معجزہ پیش کیا ہے۔ جس نے آن واحد میں ہم سب کے کرتبوں پر پانی پھیر دیا۔ چنانچہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا اعلان کر دیا۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ باطل، باطل ہے چاہے اس پر کتنے ہی حسین غلاف چڑھالیے جائیں اور حق، حق ہے چاہے اس پر کتنے ہی پردے ڈال دیئے جائیں، تاہم حق کا ڈنکا بج کر رہتا ہے۔

(۳) سجدے میں گر کر انہوں نے رب العالمین پر ایمان لانے کا اعلان کیا جس سے فرعونوں کو مغالطہ ہو سکتا تھا کہ یہ سجدہ فرعون کو کیا گیا ہے جس کی الوہیت کے وہ قائل تھے، اس لئے انہوں نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کا رب کہہ کر واضح کر دیا کہ یہ سجدہ ہم جہانوں کے رب کو ہی کر رہے ہیں۔ لوگوں کے خود ساختہ کسی رب کو نہیں۔

(۴) یہ جو کچھ ہوا، فرعون کے لیے بڑا حیران کن اور تعجب خیز تھا، اس لیے اسے اور تو کچھ نہیں سوچھا، اس نے یہی کہہ

میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا۔ پھر تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا۔ (۱۲۳)^(۱)
انہوں نے جواب دیا کہ ہم (مرکر) اپنے مالک ہی کے پاس جائیں گے۔ (۱۲۵)^(۲)

اور تو نے ہم میں کونسا عیب دیکھا ہے، بجز اس کے کہ ہم اپنے رب کے احکام پر ایمان لے آئے،^(۳) جب وہ ہمارے پاس آئے۔ اے ہمارے رب! ہمارے اوپر صبر کا فیضان فرما^(۴) اور ہماری جان حالت اسلام پر نکال۔ (۱۲۶)^(۵)

اور قوم فرعون کے سرداروں نے کہا کہ کیا آپ موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی قوم کو یوں ہی رہنے دیں گے کہ وہ ملک میں فساد کرتے پھریں،^(۶) اور وہ آپ کو اور آپ

لَأَقَطِعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۱۲۳﴾

قَالُوا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا مُنْقَلِبُونَ ﴿۱۲۵﴾

وَمَا تَنْفَعُهُمْ ذُنُوبُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّيبَ أَجْمَعِينَ ﴿۱۲۶﴾

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنَ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَدْرُمُونِى وَقَوْمِىَ
الْبَيْتِ فِي الْأَرْضِ وَيَذَرُوكُمُوهَا وَقَالَ سَتَرْنَا لَكُمُ

دیا کہ تم سب آپس میں ملے ہوئے ہو اور اس کا مقصد ہمارے اقتدار کا خاتمہ ہے۔ اچھا! اس کا انجام غنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

(۱) یعنی دایاں پاؤں اور بایاں ہاتھ یا بایاں پاؤں اور دایاں ہاتھ پھر یہی نہیں، سولی پر چڑھا کر تمہیں نشان عبرت بھی بنا دوں گا۔
(۲) اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اگر تو ہمارے ساتھ ایسا معاملہ کرے گا تو تجھے بھی اس بات کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ تجھے اس جرم کی سخت سزا دے گا، اس لیے کہ ہم سب کو مرکر اسی کے پاس جانا ہے، اس کی سزا سے کون بچ سکتا ہے؟ گویا فرعون کے عذاب دنیا کے مقابلے میں اسے عذاب آخرت سے ڈرایا گیا ہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ موت تو ہمیں آتی ہی آتی ہے، اس سے کیا فرق پڑے گا کہ موت سولی پر آئے یا کسی اور طریقے سے؟
(۳) یعنی تیرے نزدیک ہمارا یہی عیب ہے۔ جس پر تو ہم سے ناراض ہو گیا ہے اور ہمیں سزا دینے پر قتل گیا ہے۔ دراصل حالیکہ یہ سرے سے عیب ہی نہیں ہے۔ یہ تو خوبی ہے، بہت بڑی خوبی ہے، کہ جب حقیقت ہمارے سامنے واضح ہو کر آگئی تو ہم نے اس کے مقابلے میں تمام دنیاوی مفادات ٹھکرا دیئے اور حقیقت کو اپنا لیا۔ پھر انہوں نے اپنا روئے سخن فرعون سے پھیر کر اللہ کی طرف کر لیا اور اس کی بارگاہ میں دست بدعا ہو گئے۔

(۴) تاکہ ہم تیرے اس دشمن کے عذاب کو برداشت کر لیں، اور حق میں متصعب اور ایمان پر ثابت قدم رہیں۔

(۵) اس دنیاوی آزمائش سے ہمارے اندر ایمان سے انحراف آئے نہ کسی اور فتنے میں ہم مبتلا ہوں۔

(۶) یہ ہر دور کے مفسدین کا شیوہ رہا ہے کہ وہ اللہ والوں کو فسادی اور ان کی دعوت ایمان و توحید کو فساد سے تعبیر کرتے ہیں۔ فرعونیوں نے بھی یہی کہا۔

کے معبودوں کو ترک کئے رہیں۔^(۱) فرعون نے کہا کہ ہم ابھی ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کرنا شروع کر دیں گے اور عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے اور ہم کو ان پر ہر طرح کا زور ہے۔^(۲) (۱۳۷)

موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا اللہ تعالیٰ کا سہارا حاصل کرو اور صبر کرو، یہ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے وہ مالک بنا دے اور اخیر کامیابی ان ہی کی ہوتی ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔^(۳) (۱۳۸)

قوم کے لوگ کہنے لگے کہ ہم تو ہمیشہ مصیبت ہی میں رہے، آپ کی تشریف آوری سے قبل بھی^(۴) اور آپ کی تشریف آوری کے بعد بھی۔^(۵) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بہت جلد اللہ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا خلیفہ بنا

أَبْنَاءَهُمْ وَنَسَجَیْ نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ جَاهِرُونَ ﴿۲۰﴾

قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا إِنَّ
الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ
وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۳﴾

قَالُوا أُوذِيْنَا مِنْ قَبْلِكَ أَنْ تَأْتِيَنَا وَمَنْ نَعْبُدُ مَا جَعَلْتَنَا
قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوُّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَ فِي
الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿۴﴾

(۱) فرعون کو بھی اگرچہ دعوائے ربوبیت تھا ﴿آتَا رَبُّكَمُ الْأَعْلَىٰ﴾ میں تمہارا بڑا رب ہوں“ (وہ کہا کرتا تھا) لیکن دوسرے چھوٹے چھوٹے معبود بھی تھے جن کے ذریعے سے لوگ فرعون کا تقرب حاصل کرتے تھے۔

(۲) ہمارے اس انتظام میں یہ رکاوٹ نہیں ڈال سکتے۔ قتلِ ابناء کا یہ پروگرام فرعونوں کے کہنے سے بنایا گیا اس سے قبل بھی، جب موسیٰ علیہ السلام کی ولادت نہیں ہوئی تھی، موسیٰ علیہ السلام کے بعد از ولادت خاتے کے لیے اس نے بنی اسرائیل کے نومولود بچوں کو قتل کرنا شروع کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد ان کو بچانے کی تدبیر کی کہ موسیٰ علیہ السلام کو خود فرعون کے محل میں پہنچوا کر اسی کی گود میں ان کی پرورش کروائی۔ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَٰئِزًا۔

(۳) جب فرعون کی طرف سے دوبارہ اس ظلم کا آغاز ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ سے مدد حاصل کرنے اور صبر کرنے کی تلقین کی اور تسلی دی کہ اگر تم صحیح رہے تو زمین کا اقتدار بالآخر تمہیں ہی ملے گا۔

(۴) یہ اشارہ ہے ان مظالم کی طرف جو ولادت موسیٰ علیہ السلام سے قبل ان پر ہوتے رہے۔

(۵) جاوگروں کے واقعے کے بعد ظلم و ستم کا یہ نیا دور ہے، جو موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد شروع ہوا۔

وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصِ مَيْمَنِ
الْعَمَلِ لَعْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ ۝

فَإِذَا جَاءَهُمْ الْحَسَنَةُ قَالُوا لِنَحْنُ بِهَا وَمَا
يَنْظُرُونَ وَيَوْمَئِذٍ وَمَنْ مَعَهُ أَلَّا نَمَّا ظَلَمُوا عِنْدَ اللَّهِ
وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

وَقَالُوا مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ آيَةٍ لَتَسْحَرْنَا بِهَا
فَنَنْسُوهُنَّ ۝

دے گا پھر تمہارا طرز عمل دیکھے گا۔^(۱) (۱۲۹)

اور ہم نے فرعون والوں کو مبتلا کیا قحط سالی میں اور پرحلوں کی
کم پیداواری میں، تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔^(۲) (۱۳۰)
سو جب ان پر خوشحالی آجاتی تو کہتے کہ یہ تو ہمارے لئے ہونا
ہی چاہیے اور اگر ان کو کوئی بد حالی پیش آتی تو موسیٰ (علیہ
السلام) اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے۔^(۳) یاد
رکھو کہ ان کی نحوست اللہ تعالیٰ کے پاس ہے،^(۴) لیکن ان
کے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (۱۳۱)

اور یوں کہتے کیسی ہی بات ہمارے سامنے لاؤ کہ ان کے
ذریعہ سے ہم پر جادو چلاؤ جب بھی ہم تمہاری بات ہرگز
نہ مانیں گے۔^(۵) (۱۳۲)

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی کہ گھبراؤ نہیں، بہت جلد اللہ تمہارے دشمن کو ہلاک کر کے، زمین میں تمہیں
اقتدار عطا فرمائے گا۔ اور پھر تمہاری آزمائش کا ایک نیا دور شروع ہو گا۔ ابھی تو تکلیفوں کے ذریعے سے آزمائے جا رہے
ہو، پھر انعام و اکرام کی بارش کر کے اور اختیار و اقتدار سے بہرہ مند کر کے تمہیں آزمایا جائے گا۔

(۲) آک فِرْعَوْنَ سے مراد فرعون کی قوم ہے۔ اور سِنِينَ سے قحط سالی۔ یعنی بارش کے فقدان اور دردِ خستوں میں کیڑے وغیرہ
لگ جانے سے پیداوار میں کمی۔ مقصد اس آزمائش سے یہ تھا کہ اس ظلم اور استکبار سے باز آجائیں جس میں وہ مبتلا تھے۔

(۳) حَسَنَةً (بھلائی) سے مراد غلے اور پرحلوں کی فراوانی اور سَنِيَّةً (برائی) سے اس کے برعکس اور قحط سالی اور پیداوار
میں کمی۔ حَسَنَةً کا سارا کریڈٹ خود لے لیتے کہ یہ ہماری محنت کا ثمرہ ہے اور بد حالی کا سبب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور
ان پر ایمان لانے والوں کو قرار دیتے کہ یہ تم لوگوں کی نحوست کے اثرات ہمارے ملک پر پڑ رہے ہیں۔

(۴) طَائِرٌ کے معنی ہیں ”اڑنے والا“ یعنی پرندے۔ چون کہ پرندے کے بائیں یا دائیں اڑنے سے وہ لوگ نیک فالی یا بد فالی لیا
کرتے تھے۔ اس لیے یہ لفظ مطلق فال کے لیے بھی استعمال ہونے لگا اور یہاں یہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ
نے فرمایا کہ خیر یا شر جو خوش حالی یا قحط سالی کی وجہ سے انہیں پہنچتا ہے، اس کے اسباب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، موسیٰ علیہ
السلام اور ان کے پیروکار اس کا سبب نہیں۔ ﴿ظَلَمُوا عِنْدَ اللَّهِ﴾ کا مطلب ہو گا کہ ان کی بد شگونگی کا سبب اللہ کے علم میں ہے
اور وہ ان کا کفر و انکار ہے نہ کہ کچھ اور۔ یا اللہ کی طرف سے ہے اور اس کی وجہ ان کا کفر ہے۔

(۵) یہ اسی کفر و مجود کا اظہار ہے جس میں وہ مبتلا تھے، اور معجزات و آیات الہی کو اب بھی وہ جادوگری باور کرتے یا کراتے تھے۔

پھر ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیاں اور گھن کا کیرا اور مینڈک اور خون، کہ یہ سب کھلے کھلے معجزے تھے۔^(۱) سو وہ تکبر کرتے رہے اور وہ لوگ کچھ تھے ہی جراثیم پیشہ۔ (۱۳۳)

اور جب ان پر کوئی عذاب واقع ہوتا تو یوں کہتے کہ اے موسیٰ! ہمارے لئے اپنے رب سے اس بات کی دعا کر دیجئے! جس کا اس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے، اگر آپ اس عذاب کو ہم سے ہٹادیں تو ہم ضرور ضرور آپ کے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور ہم بنی اسرائیل کو بھی (رہا کر کے) آپ کے ہمراہ کر دیں گے۔ (۱۳۴)

پھر جب ان سے اس عذاب کو ایک خاص وقت تک کہ اس تک ان کو پہنچنا تھا ہٹا دیتے، تو وہ فوراً ہی عہد شکنی کرنے لگتے۔^(۲) (۱۳۵)

فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجُرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ
وَالذَّمَ الْيَتِّ مُفْضَلِيًّا ۖ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا
قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ۝

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجُّ قَالُوا لَوْلَا رَبُّنَا الَّذِي أَمَّا
عَهْدًا عِنْدَكَ لَكِنَّ كُنْتُمْ عَنَّا الرِّجُّ لَتُؤْمِنَنَّ لَكَ
وَأَنْتَ سَلِمْنَا مَعَكَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۝

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجَّ زِلَالًا بَدَّلُوا كَلِمًا
هُمْ يَنْكُرُونَ ۝

(۱) طوفان سے سیلاب یا کثرت بارش، جس سے ہر چیز غرق ہو گئی، یا کثرت اموات مراد ہے، جس سے ہر گھر میں ماتم برپا ہو گیا۔ جَرَادٌ مڈی کو کہتے ہیں، مڈی دل کا حملہ فصلوں کی ویرانی کے لیے مشہور ہے۔ یہ مڈیاں ان کے غلوں اور پھلوں کی فصلوں کو کھا کر چٹ کر جاتیں۔ قُمَّلٌ سے مراد جوں ہیں جو انسان کے جسم، کپڑے اور بالوں میں ہو جاتی ہیں یا گھن کا کیرا ہے جو غلے میں لگ جاتا ہے تو اس کے پیشترھے کو ختم کر دیتا ہے۔ جوڑوں سے انسان کو گھن بھی آتی ہے اور اس کی کثرت سے سخت پریشانی بھی۔ اور جب یہ بطور عذاب ہوں تو اس سے لاحق ہونے والی پریشانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح گھن کا عذاب بھی معیشت کو کھوکھلا کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ضَفَادِعٌ، ضَفْدَعَةٌ کی جمع ہے یہ مینڈک کو کہتے ہیں جو پانی اور جوڑوں، چھپڑوں میں ہوتا ہے۔ یہ مینڈک ان کے کھانوں میں، بستروں میں، ابلے ہوئے غلوں میں غرض ہر جگہ اور ہر طرف مینڈک ہی مینڈک ہو گئے، جس سے ان کا کھانا پینا، سونا اور آرام کرنا حرام ہو گیا۔ دَمٌ (خون) سے مراد ہے پانی کا خون بن جانا، یوں پانی پینا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ بعض نے خون سے مراد نکیر کی بیماری لی ہے۔ یعنی ہر شخص کی ناک سے خون جاری ہو گیا آیات مُفْضَلَاتٌ یہ کھلے کھلے اور جدا جدا معجزے تھے، جو وقفہ وقفہ سے ان کے پاس آئے۔

(۲) یعنی ایک عذاب آتا تو اس سے تنگ آکر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آتے، ان کی دعا سے وہ ٹل جاتا تو ایمان لانے کے بجائے، پھر اس کفر و شرک پر جتے رہتے۔ پھر دو سرا عذاب آ جاتا تو پھر اسی طرح کرتے۔ یوں کچھ کچھ وقفوں سے پانچ عذاب ان پر آئے۔ لیکن ان کے دلوں میں جو رعونت اور دماغوں میں جو تکبر تھا، وہ حق کی راہ میں ان کے لیے زنجیر پابنا رہا اور اتنی اتنی واضح نشانیاں دیکھنے کے باوجود وہ ایمان کی دولت سے محروم ہی رہے۔

پھر ہم نے ان سے بدلہ لیا یعنی ان کو دریا میں غرق کر دیا اس سبب سے کہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے بالکل ہی غفلت کرتے تھے۔^(۱) (۱۳۶)

اور ہم نے ان لوگوں کو جو کہ بالکل کمزور شمار کئے جاتے تھے۔^(۲) اس سرزمین کے پورے پچھم کا مالک بنا دیا، جس میں ہم نے برکت رکھی ہے^(۳) اور آپ کے رب کا نیک وعدہ، بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہو گیا^(۴) اور ہم نے فرعون کے اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں کو اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں

فَأَنقَضْنَا مِنْهُمْ قَاعْرَضْنَهُمْ فِي الْيَمِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَلَيْهَا غَافِلِينَ ﴿۱۳۶﴾

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضَعُونَ مَشَارِقَ
الْأَرْضِ وَمَعَارِبَهَا الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ
الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۖ لَئِمَّا صَبَرُوا وَوَدَّ كَثَرْنَا
مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا لِعَيْشُونَ ﴿۱۳۷﴾

(۱) اتنی بڑی بڑی نشانیوں کے باوجود وہ ایمان لانے کے لیے اور خواب غفلت سے بیدار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ بالآخر انہیں دریا میں غرق کر دیا گیا، جس کی تفصیل قرآن مجید کے مختلف مقامات پر موجود ہے۔

(۲) یعنی بنی اسرائیل کو، جن کو فرعون نے غلام بنا رکھا تھا اور ان پر ظلم روا رکھتا تھا۔ اس بنا پر وہ فی الواقع مصر میں کمزور سمجھے جاتے تھے کیونکہ مغلوب اور غلام تھے۔ لیکن جب اللہ نے چاہا تو اسی مغلوب اور غلام قوم کو زمین کا وارث بنا دیا۔ ﴿وَنُفِثْنَا مِنْ نَكَاةٍ وَيُثْبَلُ مَنْ نَشَاءُ﴾ ﴿آل عمران ۲۶﴾

(۳) زمین سے مراد شام کا علاقہ فلسطین ہے، جہاں اللہ تعالیٰ نے عاتقہ کے بعد بنی اسرائیل کو غلبہ عطا فرمایا، شام میں بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام کی وفات کے بعد اس وقت گئے جب حضرت یوشع بن نون نے عاتقہ کو شکست دے کر بنی اسرائیل کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ اور زمین کے ان حصوں میں برکتیں رکھیں، یعنی شام کے علاقے میں۔ جو بکفرت انبیا کا مسکن و مدفن رہا اور ظاہری شادابی و خوش حالی میں بھی ممتاز ہے۔ یعنی ظاہری و باطنی دونوں قسم کی برکتوں سے یہ زمین بالامال رہی ہے۔ مشرق مشرق کی جمع اور مغرب مغرب کی جمع ہے۔ حالانکہ مشرق اور مغرب ایک ایک ہی ہیں۔ جمع سے مراد اس ارض با برکت کے مشرق اور مغربی حصے ہیں یعنی جہات مشرق و مغرب۔

(۴) یہ وعدہ یہی ہے جو اس سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی آیت ۱۲۸ و ۱۲۹ میں فرمایا گیا ہے اور سورہ قصص میں بھی۔ ﴿وَيُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتَضَعُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ﴾ ﴿وَلَمَّا كَانَتْ فِي الْأَرْضِ وَرُؤْيُ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودِهِمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْتَدُونَ﴾ ﴿القصص ۲۰﴾ ہم چاہتے ہیں کہ ان پر احسان کریں جو زمین میں کمزور سمجھے جاتے ہیں اور ان کو پیشوا بنائیں اور ملک کا وارث کریں اور ملک میں ان کو قوت و طاقت دیں اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ چیز دکھادیں جس سے وہ ڈرتے ہیں اور یہ فضل و احسان اس صبر کی وجہ سے ہوا جس کا مظاہرہ انہوں نے فرعونی مظالم کے مقابلے میں کیا۔

بنواتے تھے، سب کو درہم، درہم کر دیا۔^(۱) (۱۳۷)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتار دیا۔ پس ان لوگوں کا ایک قوم پر گزر ہوا جو اپنے چند بتوں سے لگے بیٹھے تھے، کہنے لگے اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی ایک معبود ایسا ہی مقرر کر دیجئے! جیسے ان کے یہ معبود ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے۔^(۲) (۱۳۸)

یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں یہ تباہ کیا جائے گا اور ان کا یہ کام محض بے بنیاد ہے۔^(۳) (۱۳۹)

فرمایا کیا اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو تمہارا معبود تجویز کر دوں؟ حالانکہ اس نے تم کو تمام جہان والوں پر فوقیت دی ہے۔^(۴) (۱۴۰)

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے بچالیا جو تم کو بڑی سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ

وَجَوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَى قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَى أَصْنَانِهِمْ قَالُوا يَا مُوسَى اجْعَلْ لَنَا إِلَهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ قَالُوا لَكُمْ قَوْمٌ يَعْجَبُونَ ﴿۱۳۷﴾

إِنَّ هَؤُلَاءِ مُتَّبِعُوا مَا هُمْ فِيهِ وَيَبْطِلُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۳۸﴾

قَالَ أَغْيَبْ اللَّهُ أَبْصِيكُمْ إِلَهًا وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۱۳۹﴾

وَإِذْ أَنْجَيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُقْتُلُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿۱۴۰﴾

(۱) مصنوعات سے مراد کارخانے، عمارتیں اور ہتھیار وغیرہ ہیں اور یَعْرِشُونَ (جو وہ بلند کرتے تھے) سے مراد اونچی اونچی عمارتیں بھی ہو سکتی ہیں اور انگوروں وغیرہ کے بانغات بھی جو وہ چھپروں پر پھیلاتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی شہری عمارتیں، ہتھیار اور دیگر سامان بھی تباہ کر دیا اور ان کے بانغات بھی۔

(۲) اس سے بڑی جہالت اور نادانی کیا ہوگی کہ جس اللہ نے انہیں فرعون جیسے بڑے دشمن سے نہ صرف نجات دی، بلکہ ان کی آنکھوں کے سامنے اسے اس کے لشکر سمیت غرق کر دیا اور انہیں معجزانہ طریق سے دریا عبور کروایا۔ وہ دریا پار کرتے ہی اس اللہ کو بھول کر پتھر کے خود تراشیدہ معبود تلاش کرنے لگ گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ بت گائے کی شکل کے تھے جو پتھر کی بنی ہوئی تھیں۔

(۳) یعنی یہ مورتیوں کے پجاری جن کے حال نے تمہیں بھی دھوکے میں ڈال دیا، ان کا مقدر تباہی اور ان کا یہ فعل باطل اور خسارے کا باعث ہے۔

(۴) کیا جس اللہ نے تم پر اتنے احسانات کیے اور تمہیں جہانوں پر فضیلت بھی عطا کی، اسے چھوڑ کر میں تمہارے لیے پتھر اور لکڑی کے تراشے ہوئے بت تلاش کروں؟ یعنی یہ ناشکری اور احسان ناشناسی میں کس طرح کر سکتا ہوں؟ اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ کے مزید احسانات کا تذکرہ ہے۔

چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی بھاری آزمائش تھی۔^(۱) (۱۳۱)

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور دس رات مزید سے ان تیس راتوں کو پورا کیا۔ سو ان کے پروردگار کا وقت پورے چالیس رات کا ہو گیا۔^(۲) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے بھائی ہارون (علیہ السلام) سے کہا کہ میرے بعد ان کا انتظام رکھنا اور اصلاح کرتے رہنا اور بد نظم لوگوں کی رائے پر عمل مت کرنا۔^(۳) (۱۳۲)

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) ہمارے وقت پر آئے اور ان کے رب نے ان سے باتیں کیں تو عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! اپنا دیدار مجھ کو کرا دیجئے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں ارشاد ہوا کہ تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے^(۴) لیکن تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو وہ اگر اپنی جگہ پر برقرار رہا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو

وَوَعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتَمَّمْنَا بَعْشَرَ فَنَسَّهَ
مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ
هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ
الْمُفْسِدِينَ ﴿۱۳۱﴾

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ قَالَ رَبِّ أَرِنِي
أَنْظُرْ إِلَيْكَ قَالَ لَنْ نَرِيكَ وَلَكِنْ أَنْظُرْ إِلَى الْعِجَلِ
فَإِنِ اسْتَقَمَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرِيهِ فَلَئِمَّا فَجَمَلَ رَبُّهُ
لِلْجِبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا فَلَمَّا أَفَاقَ
قَالَ سُبْحَانَكَ بُدِئْتُ مِنْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۳۲﴾

(۱) یہ وہی آزمائشیں ہیں جن کا ذکر سورہ بقرہ میں بھی گزرا اور سورہ ابراہیم میں بھی آئے گا۔

(۲) فرعون اور اس کے لشکر کے غرق کے بعد ضرورت لاحق ہوئی کہ بنی اسرائیل کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کوئی کتاب انہیں دی جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تیس راتوں کے لیے کوہ طور پر بلایا، جس میں دس راتوں کا اضافہ کر کے اسے چالیس کر دیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جاتے وقت حضرت ہارون علیہ السلام کو، جو ان کے بھائی، بھی تھے اور نبی بھی، اپنا جانشین مقرر کر دیا تاکہ وہ بنی اسرائیل کی ہدایت و اصلاح کا کام کرتے رہیں اور انہیں ہر قسم کے فساد سے بچائیں۔ اس آیت میں یہی بیان کیا گیا ہے۔

(۳) حضرت ہارون علیہ السلام خود نبی تھے اور اصلاح کا کام ان کے فرائض منصبی میں شامل تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں محض تدبیر و تنبیہ کے طور پر یہ نصیحتیں کیں، میقات سے یہاں مراد وقت معین ہے۔

(۴) جب موسیٰ علیہ السلام طور پر گئے اور وہاں اللہ نے ان سے براہ راست گفتگو کی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں اللہ کو دیکھنے کا بھی شوق پیدا ہوا، اور اپنے اس شوق کا اظہار رَبِّ أَرِنِي کہہ کر کیا۔ جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَنْ نَرِيكَ ”تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا“ اس سے استدلال کرتے ہوئے معتزلہ نے کہا کہ لَنْ نَفْئِي تَأْيِيدًا (بیشہ کی نفی) کے لیے آتا ہے۔ اس لیے اللہ کا دیدار نہ دنیا میں ممکن ہے نہ آخرت میں۔ لیکن معتزلہ کا یہ مسلک صحیح احادیث

گے۔ پس جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو تجلی نے اس کے پر نچے اڑا دیئے اور موسیٰ (علیہ السلام) بے ہوش ہو کر گر پڑے۔^(۱) پھر جب ہوش میں آئے تو عرض کیا، بے شک آپ کی ذات منزہ ہے میں آپ کی جناب میں توبہ کرتا ہوں اور میں سب سے پہلے آپ پر ایمان لانے والا ہوں۔^(۲) (۱۳۳)

ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ! میں نے پیغمبری اور اپنی ہمکلامی سے اور لوگوں پر تم کو امتیاز دیا ہے تو جو کچھ تم کو میں نے عطا کیا ہے اس کو لو اور شکر کرو۔^(۳) (۱۳۴)

اور ہم نے چند تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل ان کو لکھ کر دی،^(۴) تم ان کو پوری طاقت سے

قَالَ يُؤْمَلِي إِيَّيْ أَصْطَفَيْتَكَ عَلَى النَّاسِ يَوْمَ أُوتِيَ وَ
يَحْلَامِي ۖ فَخَذْنَا مَا اتَّيْتُكَ وَكُنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝

وَكُنْتُمْ لَنَا فِي الْكُوَافِرِينَ شَمِي ۖ مَوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا
لِكُلِّ شَيْءٍ ۖ فَخَذْنَاهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَا خُدَا

کے خلاف ہے۔ متوازن، صحیح اور قوی روایات سے ثابت ہے کہ قیامت والے دن اہل ایمان اللہ کو دیکھیں گے اور جنت میں بھی دیدار الہی سے مشرف ہوں گے۔ تمام اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے۔ اس نفی روایت کا تعلق صرف دنیا سے ہے۔ دنیا میں کوئی انسانی آنکھ اللہ کو دیکھنے پر قادر نہیں ہے۔ لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ ان آنکھوں میں اتنی قوت پیدا فرمادے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے جلوے کو برداشت کر سکے۔

(۱) یعنی وہ پہاڑ بھی رب کی تجلی کو برداشت نہ کر سکا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ”قیامت والے دن سب لوگ بے ہوش ہوں گے“ (یہ بے ہوشی امام ابن کثیر کے بقول میدان محشر میں اس وقت ہو گی جب اللہ تعالیٰ فیصلے کرنے کے لیے نزول اجلال فرمائے گا) اور جب ہوش میں آئیں گے تو میں ہوش میں آنے والوں میں سب سے پہلا شخص ہوں گا، میں دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آئے یا انہیں کوہ طور کی بے ہوشی کے بدلے میں میدان محشر کی بے ہوشی سے مستثنیٰ رکھا گیا۔“

(صحیح بخاری۔ تفسیر سورۃ الأعراف۔ صحیح مسلم، باب فضائل موسیٰ علیہ السلام)

(۲) تیری عظمت و جلالت کا اور اس بات کا کہ میں تیرا عاجز بندہ ہوں، دنیا میں تیرے دیدار کا تحمل نہیں ہو سکتا۔

(۳) یہ ہم کلامی کا دوسرا موقع تھا جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مشرف کیا گیا۔ اس سے قبل جب آگ لینے گئے تھے تو اللہ نے ہم کلامی سے نوازا تھا اور پیغمبری عطا فرمائی تھی۔

(۴) گویا تورات تختیوں کی شکل میں عطا فرمائی گئی جس میں ان کے لیے دینی احکام، امر و نہی اور ترغیب و ترہیب کی پوری تفصیل تھی۔

يَأْتِيهَا سَآوِرُهُمْ دَارَ الْفَيْقِينَ ﴿۳۰﴾

پکڑ لو اور اپنی قوم کو حکم کرو کہ ان کے اچھے اچھے احکام پر عمل کریں،^(۱) اب بہت جلد تم لوگوں کو ان بے حکموں کا مقام دکھلاتا ہوں۔^(۲) (۱۳۵)

میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں، جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں اور اگر تمام نشانیاں دیکھ لیں تب بھی وہ ان پر ایمان نہ لائیں،^(۳) اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا طریقہ نہ بنائیں اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اس کو اپنا طریقہ بنالیں۔^(۴) یہ اس سبب سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے غافل رہے۔^(۵) (۱۳۶)

سَآوِرُفٍ عَنِ الْيَمِينِ يُنكَرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِن يَرَوْا كَلِمًا يَأْتِيهِمْ سِيئًا لَّيَتَذَكَّرْنَ لَهَا وَهُمْ سَبِيلَ اللَّهِ لَئِن يَرَوْا سَيئًا لَّيَتَذَكَّرْنَ لَهَا وَهُمْ سَبِيلَ اللَّهِ ذَلِكَ يَأْتِيهِمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ﴿۳۱﴾

(۱) یعنی رخصتوں کی ہی تلاش میں نہ رہیں جیسا کہ سہولت پسندوں کا حال ہوتا ہے۔

(۲) مقام (دار) سے مراد یا تو انجام یعنی ہلاکت ہے یا اس کا مطلب ہے کہ فاسقوں کے ملک پر تمہیں حکمرانی عطا کروں گا اور اس سے مراد ملک شام ہے جس پر اس وقت عراق کی حکمرانی تھی۔ جو اللہ کے نافرمان تھے۔ (ابن کثیر)

(۳) تکبر کا مطلب ہے اللہ کی آیات و احکام کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور لوگوں کو حقیر گردانا۔ یہ تکبر انسان کے لیے زیبا نہیں۔ کیونکہ اللہ خالق ہے اور وہ اس کی مخلوق۔ مخلوق ہو کر، خالق کا مقابلہ کرنا اور اس کے احکام و ہدایات سے اعراض و غفلت کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اسی لیے تکبر اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ اس آیت میں تکبر کا نتیجہ بتلایا گیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ انہیں آیات الہی سے دور ہی رکھتا ہے اور پھر وہ اتنے دور ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح کی بھی نشانی انہیں حق کی طرف لانے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا ﴿رَأَى الْكٰذِبِيْنَ كَذَّبَتْ عَلَيْهِمْ كَلِمٰتٍ رَبِّيْكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ * وَكُوِّجَتْ لَهُمْ قُلُوْبُهُمْ حَتّٰى يَرَوْا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ﴾ (سورہ یونس- ۹۶-۹۷) ”جن پر تیرے رب کی بات ثابت ہو گئی وہ ایمان نہیں لائیں گے، چاہے ان کے پاس ہر طرح کی نشانی آجائے۔ حتیٰ کہ وہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔“

(۴) اس میں احکام الہی سے اعراض کرنے والوں کی ایک اور عادت یا نفسیات کا بیان ہے کہ ہدایت کی کوئی بات ان کے سامنے آئے تو اسے تو نہیں مانتے، البتہ گمراہی کی کوئی چیز دیکھتے ہیں تو اسے فوراً اپنالیتے اور راہ عمل بنا لیتے ہیں۔ قرآن کریم کی بیان کردہ اس حقیقت کا ہر دور میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ آج ہم بھی ہر جگہ اور ہر معاشرے میں حتیٰ کہ مسلمان معاشروں میں بھی یہی کچھ دیکھ رہے ہیں کہ نیکی منہ چھپائے پھر رہی ہے اور بدی کو ہر کوئی لپک لپک کر اختیار کر رہا ہے۔

(۵) یہ اس بات کا سبب بتلایا جا رہا ہے کہ لوگ نیکی کے مقابلے میں بدی کو اور حق کے مقابلے میں باطل کو کیوں زیادہ اختیار کرتے ہیں؟ یہ سبب ہے آیات الہی کی تکذیب اور ان سے غفلت و اعراض کا۔ یہ ہر معاشرے میں عام ہے۔

اور یہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو اور قیامت کے پیش آنے کو جھٹلایا ان کے سب کام غارت گئے۔ ان کو وہی سزا دی جائے گی جو کچھ یہ کرتے تھے۔ (۱۳۷) ^(۱)

اور موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم نے ان کے بعد اپنے زیوروں کا ایک پچھڑا معبود ٹھہرا لیا جو کہ ایک قالب تھا جس میں ایک آواز تھی۔ کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ ان سے بات نہیں کرتا تھا اور نہ ان کو کوئی راہ بتلاتا تھا اس کو انہوں نے معبود قرار دیا اور بڑی بے انصافی کا کام کیا۔ ^(۲) (۱۳۸)

اور جب نام ہوئے ^(۳) اور معلوم ہوا کہ واقعی وہ لوگ گمراہی میں پڑ گئے تو کہنے لگے کہ اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے اور ہمارا گناہ معاف نہ کرے تو ہم بالکل گئے گزرے ہو جائیں گے۔ (۱۳۹)

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَا بَنِي آدَمَ وَلَا تَجِدُوا لَكُمْ عُقُوبًا
أَعْمَأْتُمْ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۳۷﴾

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ آدَمَ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ خَلْقِهِمْ عَجَلًا حَشَدًا
لَهُ خُورَاءٌ أَمْ يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُكْفَرُونَ وَلَا يَذَّبُونَ عَنْهُمُ سَبِيلًا
إِذْ أَخَذْنَا مِنْهُمُ الذُّمِّ الْأُولَىٰ وَقَالُوا لَنْ نُؤْتِيَ عِلْمًا ﴿۱۳۸﴾

وَلَمَّا سَقَطَ فِي أَيِّدِهِمْ وَرَأَوْا أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا الْإِثْقَالَ
لَيْسَ لَهُمْ رِيحٌ مَنَارٍ بَنِيًّا وَيَعْفُرُونَ وَلَكُلُوا مِنْ
الْخَيْبِ مَرِيئِينَ ﴿۱۳۹﴾

(۱) اس میں آیات الہی کی تکذیب اور آخرت کا انکار کرنے والوں کا انجام بتلایا گیا ہے کہ چونکہ ان کے عمل کی اساس عدل و حق نہیں، ظلم و باطل ہے۔ اس لیے ان کے نامہ اعمال میں شر ہی شر ہو گا جس کی کوئی قیمت اللہ کے ہاں نہ ہو گی۔ ہاں اس شر کا بدلہ ان کو وہاں ضرور دیا جائے گا۔

(۲) موسیٰ علیہ السلام جب چالیس راتوں کے لیے کوہ طور پر گئے تو پیچھے سے سامری نامی شخص نے سونے کے زیورات اکٹھے کر کے ایک پچھڑا تیار کیا جس میں اس نے جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے سموں کے نیچے کی مٹی بھی، جو اس نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی شامل کر دی، جس میں اللہ نے زندگی کی تاثیر رکھی تھی، جس کی وجہ سے پچھڑا کچھ کچھ تیل کی آواز نکالتا تھا۔ (گو واضح کلام کرنے اور رہنمائی کرنے سے عاجز تھا جیسا کہ قرآن کے الفاظ واضح کر رہے ہیں) اس میں اختلاف ہے کہ وہ فی الواقع گوشت پوست کا پچھڑا بن گیا تھا، یا تھا وہ سونے کا ہی۔ لیکن کسی طریقے سے اس میں ہوا داخل ہوتی تو گائے، تیل کی سی آواز اس میں سے نکلتی۔ (ابن کثیر) اس آواز سے سامری نے بنی اسرائیل کو گمراہ کیا کہ تمہارا معبود تو یہ ہے، موسیٰ علیہ السلام بھول گئے ہیں اور وہ معبود کی تلاش میں کوہ طور پر گئے ہیں۔ (یہ واقعہ سورہ طہ میں آئے گا)

(۳) سَقَطَ فِي أَيِّدِهِمْ محاورہ ہے جس کے معنی نام ہونا ہیں، یہ ندامت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی کے بعد ہوئی، جب انہوں نے آکر اس پر ان کی زجر و توبیح کی، جیسا کہ سورہ طہ میں ہے۔ یہاں اسے مقدم اس لیے کر دیا گیا ہے کہ ان کا فضل اور قول اکٹھا ہو جائے۔ (فتح القدر)

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) اپنی قوم کی طرف واپس آئے غصہ اور رنج میں بھرے ہوئے تو فرمایا کہ تم نے میرے بعد یہ بڑی بری جانشینی کی؟ کیا اپنے رب کے حکم سے پہلے ہی تم نے جلد بازی کر لی، اور جلدی سے تختیاں ایک طرف رکھیں^(۱) اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر ان کو اپنی طرف گھیننے لگے۔ ہارون (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے ماں جاے! ان لوگوں نے مجھ کو بے حقیقت سمجھا اور قریب تھا کہ مجھ کو قتل کر ڈالیں^(۲) تو تم مجھ پر دشمنوں کو مت ہنساؤ^(۳) اور مجھ کو ان ظالموں کے ذیل میں مت شمار کرو۔^(۴) (۱۵۰)

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِي مِن بَعْدِي أَعْمَلْتُمْ أَمْرًا رَّيْبًا وَاللَّعْنَةُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَإِذْ أَخَذَ مِنَ اللَّهِ عَهْدَ النَّبِيِّينَ أَنِيؤُا يُؤَدُّونَ لِيَؤُا قَالُوا لَئِن لَّمْ يَأْتِكُمْ مَوْجٌ مِّنَ الْبَحْرِ تَأْتِكُم مِّنَ الْأَعْرَافِ وَلَا تُجْعَلُنَّ مَعَهُمْ قَوْمًا ظَالِمِينَ ﴿۱۵۰﴾

(۱) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آ کر دیکھا کہ وہ بچھڑے کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں تو سخت غضب ناک ہوئے اور جلدی میں تختیاں بھی، جو کوہ طور سے لائے تھے، ایسے طور پر رکھیں کہ دیکھنے والوں کو محسوس ہوا کہ انہوں نے نیچے پھینک دی ہیں، جسے قرآن نے ”ذال دیں“ سے تعبیر کیا ہے۔ تاہم اگر پھینک بھی دی ہوں تو اس میں سوء ادبی نہیں کیونکہ مقصد ان کا تختیوں کی بے ادبی نہیں تھا، بلکہ دینی غیرت و حمیت میں بے خود ہو کر غیر اختیاری طور پر ان سے یہ فعل سرزد ہوا۔

(۲) حضرت ہارون علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام آپس میں لگے بھائی تھے، لیکن یہاں حضرت ہارون علیہ السلام نے ”ماں جاے“ اس لیے کہا کہ اس لفظ میں پیار اور نرمی کا پہلو زیادہ ہے۔

(۳) حضرت ہارون علیہ السلام نے یہ اپنا عذر پیش کیا جس کی وجہ سے وہ قوم کو شرک جیسے جرم عظیم سے روکنے میں ناکام رہے۔ ایک اپنی کمزوری اور دوسرا، بنی اسرائیل کا عناد اور سرکشی کہ وہ انہیں قتل تک کر دینے پر آمادہ ہو گئے تھے اور انہیں اپنی جان بچانے کے لیے خاموش ہونا پڑا، جس کی اجازت ایسے موقعوں پر اللہ نے دی ہے۔

(۴) میری ہی سرزنش کرنے سے دشمن خوش ہوں گے، جب کہ یہ موقع تو دشمنوں کی سرکوبی اور ان سے اپنی قوم کو بچانے کا ہے۔

(۵) اور ویسے بھی عقیدہ و عمل میں مجھے کس طرح ان کے ساتھ شمار کیا جاسکتا ہے؟ میں نے نہ شرک کا ارتکاب کیا، نہ اس کی اجازت دی، نہ اس پر خوش ہوا، صرف خاموش رہا اور اس کے لیے بھی میرے پاس معقول عذر موجود ہے، پھر میرا شمار ظالموں (مشرکوں) کے ساتھ کس طرح ہو سکتا ہے؟ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا مانگی۔

موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے رب! میری خطا معاف فرما اور میرے بھائی کی بھی اور ہم دونوں کو اپنی رحمت میں داخل فرما اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ (۱۵۱)

بے شک جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کی ہے ان پر بہت جلد ان کے رب کی طرف سے غضب اور ذلت اس دنیوی زندگی ہی میں پڑے گی^(۱) اور ہم انفرار پر دازوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔ (۱۵۲)^(۲)

اور جن لوگوں نے گناہ کے کام کئے پھر وہ ان کے بعد توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں تو تمہارا رب اس توبہ کے بعد گناہ معاف کر دینے والا، رحمت کرنے والا ہے۔ (۱۵۳)^(۳)

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) کا غصہ فرد ہوا تو ان تختیوں کو اٹھالیا اور ان کے مضامین میں^(۴) ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈرتے تھے ہدایت اور رحمت تھی۔ (۱۵۴)^(۵)

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَارْحَمِي وَأَدْخِلْنِي رَحْمَتِكَ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿٥١﴾

إِنَّ الَّذِينَ اغْتَرَبُوا الْعِجْلَ سَبَّيْنَا لَهُمُ غَضَبًا مِنْ رَبِّهِمْ وَذَلَّةً فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُفْتِرِينَ ﴿٥٢﴾

وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٥٣﴾

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَابَ فِي سِتِّهَا هُدًى وَرَحْمَةً لِلَّذِينَ هُمْ بِرَبِّهِمْ يَرْتَدُّونَ ﴿٥٤﴾

(۱) اللہ کا غضب یہ تھا کہ توبہ کے لیے قتل ضروری قرار پایا۔ اور اس سے قبل جب تک جیتے رہے، ذلت و رسوائی کے وہ مستحق قرار پائے۔

(۲) اور یہ سزا ان ہی کے لیے خاص نہیں ہے، جو بھی اللہ پر انفرار کرتا ہے، اس کو ہم یہی سزا دیتے ہیں۔

(۳) ہاں جنہوں نے توبہ کر لی، ان کے لیے اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ معلوم ہوا کہ توبہ سے ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے بشرطیکہ خالص توبہ ہو۔

(۴) نُسْحَةٌ، فُعْلَةٌ کے وزن پر بمعنی مفعول ہے۔ یہ اس اصل کو بھی کہتے ہیں جس سے نقل کیا جائے اور نقل شدہ کو بھی نسخہ کہہ دیا جاتا ہے۔ یہاں نسخہ سے مراد یا تو وہ اصل الواح ہیں جن پر تورات لکھی گئی تھی، یا اس سے مراد وہ دوسرا نسخہ ہے جو تختیاں زور سے پھینکنے کی وجہ سے ٹوٹ جانے کے بعد اس سے نقل کر کے تیار کیا گیا تھا۔ تاہم صحیح بات پہلی ہی لگتی ہے۔ کیونکہ آگے چل کر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان ”تختیوں کو اٹھالیا“ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تختیاں ٹوٹی نہیں تھیں۔ بہر حال اس کا مرادی مفہوم ”مضامین“ ہے جو ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے۔

(۵) تورات کو بھی، قرآن کریم کی طرح، انہی لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت قرار دیا گیا ہے جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں، کیونکہ اصل فائدہ آسمانی کتابوں سے ایسے ہی لوگوں کو ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ تو چونکہ اپنے کانوں کو حق کے سننے سے، آنکھوں کو حق کے دیکھنے سے بند کئے ہوئے ہوتے ہیں، اس چشمہ فیض سے وہ بالعموم محروم ہی رہتے ہیں۔

اور موسیٰ (علیہ السلام) نے ستر آدمی اپنی قوم میں سے ہمارے وقت معین کے لئے منتخب کئے، سو جب ان کو زلزلہ نے آچکڑا^(۱) تو موسیٰ (علیہ السلام) عرض کرنے لگے کہ اے میرے پروردگار! اگر تجھ کو یہ منظور ہوتا تو اس سے قبل ہی ان کو اور مجھ کو ہلاک کر دیتا۔ کیا تو ہم میں سے چند بے وقوفوں کی حرکت پر سب کو ہلاک کر دے گا؟ یہ واقعہ محض تیری طرف سے ایک امتحان ہے، ایسے امتحانات سے جس کو تو چاہے گمراہی میں ڈال دے اور جس کو چاہے ہدایت پر قائم رکھے۔ تو ہی تو ہمارا کارساز ہے پس ہم پر مغفرت اور رحمت فرما اور تو سب معافی دینے والوں سے زیادہ اچھا ہے۔^(۲) (۱۵۵)

وَلَخَرَّ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا رِقَابًا فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُم مِّن قَبْلِ وَإِنِّي أَنُفِّلُكَ بِمَا عَمِلَ الشُّعْرَاءُ وَمَتَّىٰ إِنَّ هِيَ إِلَّا لَأُفْنِتَنَّكَ فَضَّلْ بِعَا مَن تَشَاءُ وَتَهْدِي مَن تَشَاءُ إِنَّتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ ﴿۱۵۵﴾

(۱) ان ستر آدمیوں کی تفصیل اگلے حاشیے میں آرہی ہے۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے ستر آدمی چنے اور انہیں کوہ طور پر لے گئے، جہاں بطور عذاب انہیں ہلاک کر دیا گیا، جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا.....

(۲) بنی اسرائیل کے یہ ستر آدمی کون تھے؟ اس میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات کے احکام انہیں سنائے تو انہوں نے کہا ہم کیسے یقین کر لیں کہ یہ کتاب واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی نازل شدہ ہے؟ ہم تو جب تک خود اللہ تعالیٰ کو کلام کرتے ہوئے نہ سن لیں، اسے نہیں مانیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ستر بزرگزیادہ آدمیوں کا انتخاب کیا اور انہیں کوہ طور پر لے گئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہمکلام ہوا جسے ان لوگوں نے بھی سنا۔ لیکن وہاں انہوں نے ایک نیا مطالبہ کر دیا کہ ہم تو جب تک اللہ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیں گے، ایمان نہیں لائیں گے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ ستر آدمی وہ ہیں جو پوری قوم کی طرف سے پھڑے کی عبادت کے جرم عظیم کی توبہ اور معذرت کے لیے کوہ طور پر لے جائے گئے تھے اور وہاں جاکر انہوں نے اللہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ تیسری رائے یہ ہے کہ یہ ستر آدمی وہ ہیں کہ جنہوں نے بنی اسرائیل کو پھڑے کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا لیکن انہیں اس سے منع نہیں کیا۔ ایک چوتھی رائے یہ ہے کہ یہ ستر آدمی وہ ہیں جنہیں اللہ کے حکم سے کوہ طور پر لے جانے کے لیے چنا گیا تھا، وہاں جاکر انہوں نے اللہ سے دعائیں کیں۔ جن میں ایک دعایہ بھی تھی کہ ”یا اللہ ہمیں تو وہ کچھ عطا فرما، جو اس سے قبل تو نے کسی کو عطا نہیں کیا اور نہ آئندہ وہ کسی کو عطا کرنا۔“ اللہ تعالیٰ کو یہ دعایہ پسند نہیں آئی، جس پر وہ زلزلے کے ذریعے سے ہلاک کر دیئے گئے۔ زیادہ مفسرین دو سری رائے کے قائل ہیں اور انہوں نے وہی واقعہ قرار دیا ہے جس کا ذکر سورہ بقرہ آیت ۵۶ میں آیا ہے۔ جہاں ان پر صاعقہ (بجلی کی کڑک) سے موت وارد

اور ہم لوگوں کے نام دنیا میں بھی نیک حالی لکھ دے اور آخرت میں بھی، ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔^(۱) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اپنا عذاب اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اور میری رحمت تمام اشیاء پر محیط ہے۔^(۲) تو وہ رحمت ان لوگوں کے نام ضرور لکھوں گا جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ (۱۵۶)

جو لوگ ایسے رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔^(۳) وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں^(۴) اور پاکیزہ چیزوں کو حلال بناتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے^(۵) ان کو دور کرتے

وَأَكْتُبُ لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ إِنَّا هُنَا نَالِكُوكَ قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَلْنَاهَا الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٥٦﴾

أَكْتُبُ لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ إِنَّا هُنَا نَالِكُوكَ قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَلْنَاهَا الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٥٦﴾

ہونے کا ذکر ہے اور یہاں رَحْفَةً (زلزلے) سے موت کا ذکر ہے۔ اس کی توجیہ میں کہا گیا ہے کہ ممکن ہے دونوں ہی عذاب آئے ہوں اور اسے بجلی کی کڑک اور نیچے سے زلزلہ۔ بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا و التجا کے بعد کہ اگر ان کو ہلاک ہی کرنا تھا تو اس سے قبل اس وقت ہلاک کرتا جب یہ پتھرے کی عبادت میں مصروف تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر دیا۔

(۱) یعنی توبہ کرتے ہیں۔

(۲) یہ اس کی وسعت و رحمت ہی ہے کہ دنیا میں صالح و فاسق اور مومن و کافر دونوں ہی اس کی رحمت سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے ”اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ۱۰۰ حصے ہیں۔ یہ اس کی رحمت کا ایک حصہ ہے کہ جس سے مخلوق ایک دوسرے پر رحم کرتی اور وحشی جانور اپنے بچوں پر شفقت کرتے ہیں اور اس نے اپنی رحمت کے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں۔ صحیح مسلم - نمبر ۲۱۰۸، وابن ماجہ - نمبر ۳۲۹۳

(۳) یہ آیت بھی اس امر کی وضاحت کے لیے نص قطعی کی حیثیت رکھتی ہے کہ رسالت محمدیہ پر ایمان لائے بغیر نجات اخروی ممکن نہیں اور ایمان وہی معتبر ہے جس کی تفصیلات محمد رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہیں۔ اس آیت سے بھی تصور ”وحدت ادیان“ کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

(۴) معروف، وہ ہے جسے شریعت نے اچھا اور منکر، وہ ہے جسے شریعت نے برا قرار دیا ہے۔

(۵) یہ بوجھ اور طوق وہ ہیں جو پچھلی شریعت میں تھے، مثلاً نفس کے بدلے نفس کا قتل ضروری تھا، (دیت یا معافی نہیں

ہیں۔ سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے، ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔^(۱) (۱۵۷)

آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہوں، جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے سو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کے نبی امی پر جو کہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا اتباع کرو

أَمْنًا بِهِ وَعَزْرًا وَهُوَ مَأْمُورٌ وَأَسْمَعُوا النُّورَ
الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۵۷﴾

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا
لَأَذِّنَ لَكُمْ مَلَكَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لِكَلِمَةٍ أَمْنًا
وَيُؤَيِّتُ قَامِنًا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأَمِينِ الَّذِي
يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَالشَّعْوَةَ لِعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۷﴾

تھی) یا جس کپڑے کو نجاست لگ جاتی، اس کا قطع کرنا ضروری تھا، شریعت اسلامیہ نے اسے صرف دھونے کا حکم دیا۔ جس طرح قصاص میں دیت اور معافی کی بھی اجازت دی۔ وغیرہ اور آپ ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ ”مجھے آسان دین حنیفی کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔“ (مسند أحمد جلد ۵۔ ص ۲۶۶۔ جلد ۶ ص ۱۱۶ ص ۲۳۲) لیکن افسوس! اس امت نے اپنے طور پر رسوم و رواج کے بہت سے بوجھ اپنے اوپر لاد لیے ہیں اور جاہلیت کے طوق زیب لگو کر لیے ہیں، جن سے شادی اور مرگ دونوں عذاب بن گئے ہیں۔ هَذَا هَا اللَّهُ تَعَالَىٰ .

(۱) ان آخری الفاظ سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ کامیاب وہی لوگ ہوں گے جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والے اور ان کی پیروی کرنے والے ہوں گے۔ جو رسالت محمدیہ پر ایمان نہیں لائیں گے، وہ کامیاب نہیں، خاسر اور ناکام ہوں گے۔ علاوہ ازیں کامیابی سے مراد بھی آخرت کی کامیابی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی قوم رسالت محمدیہ پر ایمان نہ رکھتی ہو اور اسے دنیاوی خوش حالی و فراوانی حاصل ہو۔ جس طرح اس وقت مغربی اور یورپی اور دیگر بعض قوموں کا حال ہے کہ وہ عیسائی یا یہودی یا کافر و مشرک ہونے کے باوجود مادی ترقی اور خوش حالی میں ممتاز ہیں۔ لیکن ان کی یہ ترقی عارضی و بطور امتحان و استدراج ہے۔ یہ ان کی اخروی کامیابی کی ضمانت یا علامت نہیں۔ اسی طرح ﴿وَأَسْمَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ﴾ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ المائدہ کی آیت ۱۵ میں نور سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔ (جیسا وہاں بھی وضاحت کی گئی تھی) کیوں کہ جو نور آپ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، وہ قرآن مجید ہی ہے۔ اس لیے اس ”نور“ سے خود نبی کریم ﷺ کی ذات مراد نہیں ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ آپ کی صفات میں ایک صفت نور بھی ہے۔ جس سے کفر و شرک کی تاریکیاں دور ہو سکیں۔ لیکن آپ کے نوری صفت ہونے سے آپ کا نُورٌ مِّنْ نُورِ اللَّهِ ہونا ثابت نہیں ہو سکتا، جس طرح اہل بدعت یہ ثابت کرتے ہیں۔ (مزید دیکھئے سورۃ المائدۃ آیت ۱۵ کا حاشیہ)

وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٍ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ
يَعْدِلُونَ ﴿٥٥﴾

تاکہ تم راہ پر آ جاؤ۔^(۱) (۱۵۸)

اور قوم موسیٰ میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق کے مطابق ہدایت کرتی ہے اور اسی کے مطابق انصاف بھی کرتی ہے۔^(۲) (۱۵۹)

اور ہم نے ان کو بارہ خاندانوں میں تقسیم کر کے سب کی الگ الگ جماعت مقرر کر دی^(۳) اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم دیا جب کہ ان کی قوم نے ان سے پانی مانگا کہ اپنے عصا کو فلاں پتھر پر مارو پس فوراً اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کر لیا۔ اور ہم نے ان پر ابر کو سایہ لگن کیا اور ان کو من و سلوی (ترنجبین اور بییرس) پہنچائیں، کھاؤ نغیس چیزوں

وَقَطَعْنَاهُمْ اُمَّةً عَشْرًا سَبَاطًا اُمَّمًا وَاَوْحَيْنَا اِلَىٰ
مُوسَىٰ اِذَا سَأَلْتَهُ قَوْمًا اَنْ اَضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ
فَانفَجَسَتْ مِنْهُ اثنَ عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاثِمٍ
مَشْرَبُهُمْ وَظَلَلْنَا عَلَيْهِمُ الْعَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ
الْمَنَّٰ وَالسَّلْوٰى وَاَوْحٰىنَا اِلَىٰ مَنْ لَدُنَّا قَدْ عَلِمَ
وَمَا ظَلَمُوْنَا وَاَلٰكِن كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٥٥﴾

(۱) یہ آیت بھی رسالت محمدیہ کی عالم گیر رسالت کے اثبات میں بالکل واضح ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ اے کائنات کے انسانو! میں سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یوں آپ ﷺ پوری بنی نوع انسانی کے نجات دہندہ اور رسول ہیں۔ اب نجات اور ہدایت نہ عیسائیت میں ہے نہ یہودیت میں نہ کسی اور مذہب میں۔ نجات اور ہدایت اگر ہے تو صرف اسلام کے اپنانے اور اسے ہی اختیار کرنے میں ہے۔ اس آیت میں اور اس سے پہلی آیت میں بھی آپ ﷺ کو الہی الہامی کہا گیا ہے۔ یہ آپ کی ایک خاص صفت ہے۔ امی کے معنی ہیں ان پڑھ۔ یعنی آپ نے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ نہ نہیں کیے، کسی سے کسی قسم کی تعلیم حاصل نہیں کی۔ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے جو قرآن کریم پیش کیا، اس کے اعجاز و بلاغت کے سامنے دنیا بھر کے فصحاء و بلغا عاجز آ گئے اور آپ نے جو تعلیمات پیش کیں، ان کی صداقت و حقانیت کی ایک دنیا معترف ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ واقعی اللہ کے سچے رسول ہیں ورنہ ایک امی نہ ایسا قرآن پیش کر سکتا ہے اور نہ ایسی تعلیمات بیان کر سکتا ہے جو عدل و انصاف کا بہترین نمونہ اور انسانیت کی فلاح و کامرانی کے لیے ناگزیر ہیں، انہیں اپنائے بغیر دنیا حقیقی امن و سکون اور راحت و عافیت سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔

(۲) اس سے مراد وہی چند لوگ ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے، عبد اللہ بن سلام وغیرہ۔ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ

(۳) اَسْبَاطُ، سِبْطُ کی جمع ہے۔ بمعنی پوتا۔ یہاں اسباط قبائل کے معنی میں ہیں۔ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں سے بارہ قبیلے معرض وجود میں آئے، ہر قبیلے پر اللہ تعالیٰ نے ایک ایک نقیب (مگران) بھی مقرر فرما دیا تھا، ﴿وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا﴾ (المائدہ - ۱۲) یہاں اللہ تعالیٰ ان بارہ قبیلوں کے بعض بعض صفات میں ایک ایک دو سرے سے ممتاز ہونے کی بنا پر ان کے الگ الگ گروہ ہونے کو بطور امتنان کے ذکر فرما رہا ہے۔

سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں اور انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔ (۱۶۰)

اور جب ان کو حکم دیا گیا کہ تم لوگ اس آبادی میں جا کر رہو اور کھاؤ اس سے جس جگہ تم رغبت کرو اور زبان سے یہ کہتے جانا کہ توبہ ہے اور جھکے جھکے دروازہ میں داخل ہونا ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے۔ جو لوگ نیک کام کریں گے ان کو مزید برآں اور دیں گے۔ (۱۶۱)

سو بدل ڈالا ان ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمہ کے جس کی ان سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے ان پر ایک آفت سماوی بھیجی اس وجہ سے کہ وہ حکم کو ضائع کرتے تھے۔^(۱) (۱۶۲)

اور آپ ان لوگوں سے،^(۲) اس بستی والوں کا^(۳) جو کہ دریائے شور کے قریب آباد تھے اس وقت کا حال پوچھئے! جب کہ وہ ہفتہ کے بارے میں حد سے نکل رہے تھے جب کہ ان کے ہفتہ کے روز تو ان کی مچھلیاں ظاہر ہو ہو کر ان کے سامنے آتی تھیں، اور جب ہفتہ کا دن نہ ہو تا تو ان کے سامنے نہ آتی تھیں، ہم ان کی اس طرح پر آزمائش کرتے تھے اس سبب سے کہ وہ بے حکمی کیا

وَأَذَقْنَا لَهُمْ اسْكُنُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَعْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتِكُمْ سَتَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۶۱﴾

فَبَدَّلَ الَّذِينَ كَلَّمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِنْ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَظْلِمُونَ ﴿۱۶۲﴾

وَسَأَلْنَاهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةً الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حَيْثَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا هَيْبَةَ لِلَّذِينَ لَا تُؤْتِيهِمْ كَذَلِكَ بَلَّوْنَهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۱۶۳﴾

(۱) ۱۶۰ تا ۱۶۲ آیات میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں یہ وہ ہیں جو پارہ الم، سورہ بقرہ کے آغاز میں بیان کی گئی ہیں۔ وہاں ان کی تفصیل ملاحظہ فرمائی جائے۔

(۲) وَسَأَلْنَاهُمْ میں «ہم» ضمیر سے مراد یہود ہیں۔ یعنی ان سے پوچھئے۔ اس میں یہودیوں کو یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ اس واقعے کا علم نبی کریم ﷺ کو بھی ہے جو آپ ﷺ کی صداقت کی دلیل ہے، کیونکہ اللہ کی طرف سے وحی کے بغیر آپ ﷺ کو اس واقعے کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔

(۳) اس بستی کی تعیین میں اختلاف ہے، کوئی اس کا نام ایلہ کوئی طبریہ کوئی ایلیا اور کوئی شام کی کوئی بستی؛ جو سمندر کے قریب تھی، بتاتا ہے۔ مفسرین کا زیادہ رجحان ”ایلہ“ کی طرف ہے جو مدین اور کوہ طور کے درمیان دریائے قلمز کے ساحل پر تھی۔

کرتے تھے۔^(۱) (۱۶۳)

اور جب کہ ان میں سے ایک جماعت نے یوں کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ بالکل ہلاک کرنے والا ہے یا ان کو سخت سزا دینے والا ہے؟^(۲) انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے رب کے روبرو عذر کرنے کے لئے اور اس لئے کہ شاید یہ ڈر جائیں۔ (۱۶۳)

سو جب وہ اس کو بھول گئے جو ان کو سمجھایا جاتا تھا^(۳) تو ہم نے ان لوگوں کو تو بچا لیا جو اس بری عادت سے منع کیا کرتے تھے اور ان لوگوں کو جو کہ زیادتی کرتے تھے ایک

وَاذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعْبُدُونَ قَوْمًا لَّا يَلَهُمْ شَيْءٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ ؕ قَالُوا مَعذِرَةٌ اِلٰى رَبِّنَا وَلَعَلَّكُمْ يَتَّقُونَ ﴿۱۶۳﴾

فَلَمَّا نَسُوا مَا اٰذَنُوْا بِهٖ اٰجِبْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنْ الشُّعُوْبِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَّيْسٍ مِّمَّا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

(۱) حِينَمَا حُوْتُ (مچھلی) کی جمع ہے۔ شُرْعًا شَارِعُ کی جمع ہے۔ معنی ہیں پانی کے اوپر ابھرا بھر کر آنے والیاں۔ یہ یہودیوں کے اس واقعے کی طرف اشارہ ہیں جس میں انہیں ہفتے والے دن مچھلیوں کا شکار کرنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ لیکن بطور آزمائش ہفتے والے دن مچھلیاں کثرت سے آئیں اور پانی کے اوپر ظاہر ہو کر انہیں دعوت شکار دیتیں۔ اور جب یہ دن گزر جاتا تو اس طرح نہ آئیں۔ بالآخر یہودیوں نے ایک حیلہ کر کے حکم الہی سے تجاوز کیا کہ گڑھے کھود لیے تاکہ مچھلیاں اس میں پھنسی رہیں اور جب ہفتے کا دن گزر جاتا تو پھر انہیں پکڑ لیتے۔

(۲) اس جماعت سے صالحین کی وہ جماعت مراد ہے جو اس حیلے کا ارتکاب بھی نہیں کرتی تھی اور حیلہ گروں کو سمجھا سمجھا کر ان کی اصلاح سے مایوس بھی ہو گئی تھی۔ تاہم کچھ اور لوگ بھی سمجھانے والے تھے جو انہیں وعظ و نصیحت کرتے تھے۔ صالحین کی یہ جماعت انہیں یہ کہتی کہ ایسے لوگوں کو وعظ و نصیحت کا کیا فائدہ جن کی قسمت میں ہلاکت و عذاب الہی ہے۔ یا اس جماعت سے وہی نافرمان اور تجاوز کرنے والے مراد ہیں، جب ان کو وعظ کرنے والے نصیحت کرتے تو یہ کہتے کہ جب تمہارے خیال میں ہلاکت یا عذاب الہی ہمارا مقدر ہے تو پھر ہمیں کیوں وعظ کرتے ہو؟ تو وہ جواب دیتے کہ ایک تو اپنے رب کے سامنے معذرت پیش کرنے کے لیے تاکہ ہم تو اللہ کی گرفت سے محفوظ رہیں۔ کیونکہ معصیت الہی کا ارتکاب ہوتے ہوئے دیکھنا اور پھر اسے روکنے کی کوشش نہ کرنا بھی جرم ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کی گرفت ہو سکتی ہے۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ شاید یہ لوگ حکم الہی سے تجاوز کرنے سے باز ہی آجائیں۔ پہلی تفسیر کی رو سے یہ تین جماعتیں ہوئیں۔ ۱- نافرمان اور شکار کرنے والی جماعت ۲- وہ جماعت جو بالکل کنارہ کش ہو گئی، نہ وہ نافرمانوں میں تھی نہ منع کرنے والوں میں ۳- وہ جماعت جو نافرمان بھی نہیں تھی۔ اور بالکل کنارہ کش بھی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ نافرمانوں کو منع کرتی تھی۔ دوسری تفسیر کی رو سے یہ دو جماعتیں ہوں گی۔ ایک نافرمانوں کی اور دوسری منع کرنے والوں کی۔

(۳) یعنی وعظ و نصیحت کی انہوں نے کوئی پرواہ نہیں کی اور نافرمانی پر اڑے رہے۔

سخت عذاب میں پکڑ لیا اس وجہ سے کہ وہ بے حکمی کیا کرتے تھے۔^(۱) (۱۶۵)

یعنی جب وہ، جس کام سے ان کو منع کیا گیا تھا اس میں حد سے نکل گئے تو ہم نے ان کو کہہ دیا تم ذلیل بند رہن جاؤ۔^(۲) (۱۶۶)

اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے کہ آپ کے رب نے یہ بات بتلا دی کہ وہ ان یہود پر قیامت تک ایسے شخص کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سزائے شدید کی تکلیف پہنچاتا رہے گا،^(۳) بلاشبہ آپ کا رب جلدی ہی سزا دے دیتا ہے اور بلاشبہ وہ واقعی بڑی مغفرت اور بڑی رحمت والا ہے۔^(۴) (۱۶۷)

اور ہم نے دنیا میں ان کی مختلف جماعتیں کر دیں۔ بعض ان میں نیک تھے اور بعض ان میں اور طرح تھے اور ہم

فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَنَّا مَوَاعِنَهُ فُلْنَا لَهُمْ كُونُوتًا
قِرْدَةً خَاسِئِينَ ﴿۱۶۵﴾

وَأَذَاتُكَ رَبِّكَ لِيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ الْبَيْعَةِ مَنْ
يَكُونُ لَهُمْ سُوءُ الْعَذَابِ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ﴿۱۶۶﴾
لَعَنُوا نَجْمَهُمْ ﴿۱۶۷﴾

وَقَطَعْنَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ أَصْبَابًا مِنْهُمْ الضَّالِّحُونَ وَمِنْهُمْ دُونُ
ذَلِكَ وَيَا أُولِيئِهِمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَنَهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۱۶۸﴾

(۱) یعنی وہ ظالم بھی تھے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کا ارتکاب کر کے انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور انہیں جہنم کا ایندھن بنا لیا اور فاسق بھی کہہ اللہ کے حکموں سے سرتابی کو انہوں نے اپنا شیوہ اور وطیرہ بنا لیا۔

(۲) عَتَوْا کے معنی ہیں، جنہوں نے اللہ کی نافرمانی میں حد سے تجاوز کیا۔ مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ نجات پانے والے صرف وہی تھے، جو منع کرتے تھے اور باقی دونوں عذاب الہی کی زد میں آئے؟ یا زد میں آنے والے صرف معصیت کار تھے؟ اور باقی دو جماعتیں نجات پانے والی تھیں؟ امام ابن کثیر نے دوسری رائے کو ترجیح دی ہے۔

(۳) تَأَذَاتُكَ، إِذْنًا بمعنی إِعْلَامٌ (خبر دینا، جتلا دینا) سے باب تفاعل ہے۔ یعنی وہ وقت بھی یاد کرو! جب آپ کے رب نے ان یہودیوں کو اچھی طرح باخبر کر دیا یا جتلا دیا تھا لِيَبْعَثَنَّ میں لام تاکید ہے جو قسم کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی قسم کھا کر نہایت تاکید کے ساتھ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ وہ ان پر قیامت تک ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سخت عذاب میں مبتلا رکھیں گے، چنانچہ یہودیوں کی پوری تاریخ اسی ذلت و مسکنت اور غلامی و محکومی کی تاریخ ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دی ہے۔ اسرائیل کی موجودہ حکومت قرآن کی بیان کردہ اس حقیقت کے خلاف نہیں ہے اس لیے کہ وہ قرآن ہی کے بیان کردہ اشْتَا وَحَبَلِي مِنَ النَّاسِ کی مظہر ہے جو قرآنی حقیقت کے خلاف نہیں بلکہ اس کی مؤید ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے آل عمران - ۱۱۳ کا حاشیہ)

(۴) یعنی اگر ان میں سے کوئی توبہ کر کے مسلمان ہو جائے گا تو وہ اس ذلت و سوء عذاب سے بچ جائے گا۔

ان کو خوش حالیوں اور بد حالیوں سے آزما تے رہے کہ
شاید باز آجائیں۔^(۱) (۱۶۸)

پھر ان کے بعد ایسے لوگ ان کے جانشین ہوئے^(۲) کہ
کتاب کو ان سے حاصل کیا وہ اس دنیائے فانی کا مال
متاع لے لیتے ہیں^(۳) اور کہتے ہیں کہ ہماری ضرور
مغفرت ہو جائے گی^(۴) حالانکہ اگر ان کے پاس ویسا ہی
مال متاع آنے لگے تو اس کو بھی لے لیں گے۔ کیا ان
سے اس کتاب کے اس مضمون کا عہد نہیں لیا گیا کہ اللہ
کی طرف بجز حق بات کے اور کسی بات کی نسبت نہ
کریں،^(۵) اور انہوں نے اس کتاب میں جو کچھ تھا اس کو
پڑھ لیا^(۶) اور آخرت والا گھر ان لوگوں کے لئے بہتر ہے
جو تقویٰ رکھتے ہیں، پھر کیا تم نہیں سمجھتے۔ (۱۶۹)

اور جو لوگ کتاب کے پابند ہیں اور نماز کی پابندی کرتے
ہیں، ہم ایسے لوگوں کا جو اپنی اصلاح کریں ثواب ضائع نہ
کریں گے۔^(۷) (۱۷۰)

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَصَ
هَذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ سَيُغْفِرُ لَنَا وَإِنَّا لَهُمْ عَرَضٌ مِّثْلَهُ
يَأْخُذُونَ أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِيثَاقُ الْكِتَابِ أَن لَا يَقُولُوا عَلَىٰ
اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا مَا فِيهِ وَاللَّذَلِ الْأَجْرَةَ خَيْرٌ لِلَّذِينَ
يَتَّقُونَ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿۱۶۸﴾

وَالَّذِينَ يُمِيتُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ إِكْرَامًا يُؤْتِيهِ
أَجْرًا الْمُنْصَلِحِينَ ﴿۱۶۹﴾

(۱) اس میں یہود کے مختلف گروہوں میں بٹ جانے اور ان میں سے بعض کے نیک ہونے کا ذکر ہے۔ اور ان کو دونوں
طریقوں سے آزمائے جانے کا بیان ہے کہ شاید وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں اور اللہ کی طرف رجوع کریں۔

(۲) خَلَفَتْ (لام پر فتح کے ساتھ) اولاد صالح کو اور خَلَفَتْ (بِسُكُونِ اللَّامِ) تالائق اولاد کو کہتے ہیں۔ اردو میں بھی ناخلف
کی ترکیب تالائق اولاد کے معنی میں مستعمل ہے۔

(۳) آدْنَىٰ، دُنُوًّا (قریب) سے ماخوذ ہے یعنی قریب کا مال حاصل کرتے ہیں جس سے دنیا مراد ہے یا یہ دِنَاءَةٌ سے ماخوذ ہے
جس سے مراد حقیر اور گرا پڑا مال ہے۔ مطلب دونوں سے ان کے دنیا کے مال و متاع کے حرص کی وضاحت ہے۔

(۴) یعنی طالب دنیا ہونے کے باوجود، مغفرت کی امید رکھتے ہیں۔ جیسے آج کل کے مسلمانوں کا بھی حال ہے۔

(۵) اس کے باوجود وہ اللہ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنے سے باز نہیں آتے، مثلاً وہی مغفرت کی بات، جو اوپر
گزری۔

(۶) اس کا ایک دوسرا مفہوم مٹانا بھی ہو سکتا ہے، جیسے دَرَسَتْ الرِّبْحُ الْأَمَّارَ (ہوا نے نشانات مٹا ڈالے) یعنی کتاب کی
باتوں کو مٹا ڈالا، محو کر دیا یعنی ان پر عمل ترک کر دیا۔

(۷) ان لوگوں میں سے جو تقویٰ کا راستہ اختیار کر لیں، کتاب کو مضبوطی سے تھام لیں، جس سے مراد اصلی تورات ہے

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر سا بنان کی طرح ان کے اوپر معلق کر دیا اور ان کو یقین ہو گیا کہ اب ان پر گرا اور کہا کہ جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے اسے مضبوطی کے ساتھ قبول کرو اور یاد رکھو جو احکام اس میں ہیں اس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔^(۱) (۱۷۱)

اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے ان ہی کے معلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کیوں نہیں! ہم سب گواہ بنتے ہیں۔^(۲) تاکہ تم لوگ قیامت کے روزیوں نہ کہو کہ ہم تو اس سے محض بے خبر تھے۔ (۱۷۲)

وَلَا نَسْتَمْتَا الْجِبَلُ فَوَقَّهْمَا كَاهُ طَلَّةٌ وَكَلَّمَا آدَمَ وَأَقْبَعُ يُبْحَرُ ۷
حُدُومًا وَمَا السَّيْبَانُ بِشُوقَةٍ وَأَذْكَرُومًا فِينَا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۷۱﴾

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ
ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ
بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا أَنَّا نَقُولُوا لِيَوْمَ
الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ ﴿۱۷۲﴾

اور جس پر عمل کرتے ہوئے نبوت محمدی پر ایمان لے آئیں، نماز وغیرہ کی پابندی کریں، تو اللہ ایسے مصلحین کا اجر ضائع نہیں کرے گا۔ اس میں ان اہل کتاب (سیاق کلام سے یہاں بطور خاص یہود) کا ذکر ہے جو تقویٰ، تمسک بالکتاب اور اقامت صلوة کا اہتمام کریں اور ان کے لیے آخرت کی خوش خبری ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں اور رسالت محمدیہ پر ایمان لے آئیں۔ کیونکہ اب پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لائے بغیر نجات اخروی ممکن نہیں۔

(۱) یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس تورات لائے اور اس کے احکام ان کو سنائے۔ تو انہوں نے پھر حسب عادت ان پر عمل کرنے سے انکار و اعراض کیا، جس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر پہاڑ کو بلند کر دیا کہ تم پر گرا کر تمہیں کچل دیا جائے گا، جس سے ڈرتے ہوئے انہوں نے تورات پر عمل کرنے کا عہد کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ رفع جبل کا یہ واقعہ ان کے مطالبے پر پیش آیا، جب انہوں نے کہا کہ ہم تورات پر عمل اس وقت کریں گے جب اللہ تعالیٰ پہاڑ کو ہمارے اوپر بلند کر کے دکھائے۔ لیکن پہلی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔ یہاں مطلق پہاڑ کا ذکر ہے۔ لیکن اس سے قبل سورہ بقرہ آیت ۶۳ اور آیت ۹۳ میں دو جگہ اس واقعہ کا ذکر آیا ہے، وہاں اس کا نام صراحت کے ساتھ کوہ طور بتلایا گیا ہے۔

(۲) یہ عہدِ اَلَسْتُ کَلَّمَا ہے جو اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ سے بنی ہوئی ترکیب ہے۔ یہ عہد حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد ان کی پشت سے ہونے والی تمام اولاد سے لیا گیا۔ اس کی تفصیل ایک صحیح حدیث میں اس طرح آتی ہے کہ ”عرفہ والے دن نعمان جگہ میں اللہ تعالیٰ نے اصلاب آدم سے عہد (میشاق) لیا۔ پس آدم کی پشت سے ان کی ہونے والی تمام اولاد کو نکالا اور اس کو اپنے سانسے پھیلا دیا اور ان سے پوچھا، ”کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟“ سب نے کہا ”بَلَىٰ، شَهِدْنَا“ ”کیوں نہیں۔ ہم سب رب ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔“ (مسند أحمد۔ جلد ۱، ص ۲۷۲ والحاکم۔ جلد

یا یوں کہو کہ پہلے پہلے شرک تو ہمارے بڑوں نے کیا اور ہم ان کے بعد ان کی نسل میں ہوئے، سو کیا ان غلط راہ والوں کے فعل پر تو ہم کو ہلاکت میں ڈال دے گا؟^(۱) (۱۷۳)

ہم اسی طرح آیات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں اور تاکہ وہ باز آجائیں۔ (۱۷۴)

اور ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیے کہ جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں پھر وہ ان سے بالکل ہی نکل گیا، پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا سو وہ گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا۔^(۲) (۱۷۵)

اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہو گیا اور اپنی

أَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ لَكَاذِبِينَ ﴿۱۷۳﴾

وَكُنَّا لَكُمْ قَبْلَ بَدْءِ الْحَدِيثِ مَخْلُوعِينَ ﴿۱۷۴﴾

وَأَنزَلْنَا عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَكَانَ سَاهِيًا ﴿۱۷۵﴾

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَئِنَّكَ لَآتِي الْأَرْضَ وَآئِبَةً ﴿۱۷۶﴾

۲ ص ۵۳۳، صحیحہ ووافقہ الذہبی، امام شوکانی اس حدیث کی بابت لکھتے ہیں وَإِسْنَادُهُ لَا مَطْعَنَ فِيهِ (فتح القدر) ”اس کی سند میں کوئی طعن نہیں“ نیز امام شوکانی فرماتے ہیں۔ ”یہ عالم ذکر کہلاتا ہے اس کی یہی تفسیر صحیح اور حق ہے جس سے عدول اور کسی اور مفہوم کی طرف جانا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ مرفوع حدیث اور آثار صحابہ سے ثابت ہے اور اسے مجاز پر بھی محمول کرنا جائز نہیں ہے۔“ بہر حال اللہ کی ربوبیت کی یہ گواہی ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ اسی مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ”ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پس اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ جس طرح جانور کا بچہ صحیح مسلم پیدا ہوتا ہے، اس کا ناک، کان کٹا نہیں ہوتا۔“ (صحیح بخاری۔ کتاب الجنائز و مسلم۔ کتاب القدر) اور صحیح مسلم کی روایت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”میں نے اپنے بندوں کو حنیف (اللہ کی طرف یکسوئی سے متوجہ ہونے والا) پیدا کیا ہے۔ پس شیطان ان کو ان کے دین (فطری) سے گمراہ کر دیتا ہے۔ الحدیث (صحیح مسلم۔ کتاب الجنۃ) یہ فطرت یا دین فطرت، یہی رب کی توحید اور اس کی نازل کردہ شریعت ہے جو اب اسلام کی صورت میں محفوظ اور موجود ہے۔

(۱) یعنی ہم نے یہ اخذ عہد اور اپنی ربوبیت کی گواہی اس لیے لی تاکہ تم یہ عذر پیش نہ کر سکو کہ ہم تو غافل تھے یا ہمارے باپ دادا شرک کرتے آئے تھے، یہ عذر قیامت والے دن بارگاہ الہی میں مسموع نہیں ہوں گے۔

(۲) مفسرین نے اسے کسی ایک متعین شخص سے متعلق قرار دیا ہے جسے کتاب الہی کا علم حاصل تھا لیکن پھر وہ دنیا اور شیطان کے پیچھے لگ کر گمراہ ہو گیا۔ تاہم اس کی تعین میں کوئی مستند بات مروی بھی نہیں۔ اس لیے اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ عام ہے اور ایسے افراد ہر دور میں ہوتے رہے ہیں، جو بھی اس صفت کا حامل ہوگا، وہ اس کا مصداق قرار پائے گا۔

نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا سو اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپنے یا اس کو چھوڑ دے تب بھی ہانپے،^(۱) یہی حالت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔ سو آپ اس حال کو بیان کر دیجئے شاید وہ لوگ کچھ سوچیں۔^(۲) (۱۷۶)

ان لوگوں کی حالت بھی بری حالت ہے^(۳) جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں اور وہ اپنا نقصان کرتے ہیں۔ (۱۷۷)

جس کو اللہ ہدایت کرتا ہے سو ہدایت پانے والا وہی ہوتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دے سو ایسے ہی لوگ خسارے میں پڑنے والے ہیں۔^(۴) (۱۷۸)

اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں،^(۵) جن کے دل ایسے ہیں جن سے نہیں سمجھتے اور جن کی آنکھیں ایسی ہیں جن سے نہیں دیکھتے اور جن کے کان ایسے ہیں جن سے نہیں سنتے۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ یہ ان سے بھی

أَوْ تَرَكُهُ يَلْهَثُ ذَلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا
بِآيَاتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۱۷۶﴾

سَاءَ مَثَلًا لِّلْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَانفُسُهُمْ كَانُوا
يَظْلِمُونَ ﴿۱۷۷﴾

مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِىٌّ وَمَنْ يُضِلَّهُ قَدْ لَبِثَكَ
هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۱۷۸﴾

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا
يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ
لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَئِكَ كَالْإِغْصَارِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ
أُولَئِكَ الضَّالِّينَ ﴿۱۷۹﴾

(۱) لَهَثُ کتے ہیں تھکاوٹ یا پیاس وغیرہ کی وجہ سے زبان کے باہر نکالنے کو۔ کتے کی یہ عادت ہے کہ تم اسے ڈانٹو ڈپٹو یا اس کے حال پر چھوڑ دو، دونوں حالتوں میں وہ بھونکنے سے باز نہیں آتا، اسی طرح اس کی یہ عادت بھی ہے کہ وہ شکم سیر ہو یا بھوکا، تندرست ہو یا بیمار، تھکا ماندہ ہو یا توانا، ہر حال میں زبان باہر نکالے ہانپتا رہتا ہے۔ یہی حال ایسے شخص کا ہے، اسے وعظ کرو یا نہ کرو، اس کا حال ایک ہی رہے گا اور دنیا کے مال و متاع کے لیے اس کی رال چپکتی رہے گی۔

(۲) اور اس قسم کے لوگوں سے عبرت حاصل کر کے، گمراہی سے بچیں اور حق کو اپنائیں۔

(۳) مثلاً تمیز ہے۔ اصل عبارت یوں ہوگی سَاءَ مَثَلًا! مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا۔

(۴) یہ اس کے قانونِ مشیت کا بیان ہے جس کی وضاحت پہلے دو تین مرتبہ کی جا چکی ہے۔

(۵) اس کا تعلق تقدیر سے ہے۔ یعنی ہر انسان اور جن کی بابت اللہ کو علم تھا کہ وہ دنیا میں جا کر اچھے یا بُرے کیا عمل کرے گا، اس کے مطابق اس نے لکھ رکھا ہے۔ یہاں انہی دوزخیوں کا ذکر ہے جنہیں اللہ کے علم کے مطابق دوزخ والے ہی کام کرنے تھے۔ آگے ان کی مزید صفات بیان کر کے بتا دیا گیا کہ جن لوگوں کے اندر یہ چیزیں اسی انداز میں ہوں جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے، تو سمجھ لو کہ اس کا انجام برا ہے۔

زیادہ گمراہ ہیں۔^(۱) یہی لوگ غافل ہیں۔ (۱۷۹)
 اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لئے ہیں سو ان ناموں سے
 اللہ ہی کو موسوم کیا کرو^(۲) اور ایسے لوگوں سے تعلق بھی
 نہ رکھو جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں،^(۳) ان
 لوگوں کو ان کے کئے کی ضرور سزا ملے گی۔ (۱۸۰)

وَاللَّهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ قَادِعُوهَا وَذُرُّو الَّذِينَ يَلْحَدُونَ
 فِي أَسْمَائِهِ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

(۱) یعنی دل، آنکھ، کان یہ چیزیں اللہ نے اس لیے دی ہیں کہ انسان ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے پروردگار کو سمجھے،
 اس کی آیات کا مشاہدہ کرے اور حق کی بات کو غور سے سنے۔ لیکن جو شخص ان مشاعرے سے یہ کام نہیں لیتا، وہ گویا ان
 سے عدم انتفاع (فائدہ نہ اٹھانے) میں چوپایوں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہے۔ اس لیے کہ چوپایے تو پھر بھی
 اپنے نفع نقصان کا کچھ شعور رکھتے ہیں اور نفع والی چیزوں سے نفع اٹھاتے اور نقصان دینے والی چیزوں سے بچ کر رہتے
 ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے اعراض کرنے والے شخص کے اندر تو یہ تمیز کرنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے کہ
 اس کے لیے مفید چیز کون سی ہے اور مضر کون سی؟ اسی لیے اگلے جملے میں انہیں غافل بھی کہا گیا ہے۔

(۲) حُسْنَىٰ أَحْسَنُ کی تائید ہے۔ اللہ کے ان اچھے ناموں سے مراد اللہ کے وہ نام ہیں جن سے اس کی مختلف صفات،
 اس کی عظمت و جلالت اور اس کی قدرت و طاقت کا اظہار ہوتا ہے۔ صحیحین کی حدیث میں ان کی تعداد ۹۹ (ایک کم سو)
 بتائی گئی۔ اور فرمایا کہ ”جو ان کو شمار کرے گا، جنت میں داخل ہو گا“ اللہ تعالیٰ طاق ہے طاق کو پسند فرماتا ہے۔“
 (بخاری، کتاب الدعوات، باب للہ ما شئت اسم غیر واحد۔ مسلم، کتاب الذکر، باب فی أسماء اللہ تعالیٰ
 وفضل من أحصاها) شمار کرنے کا مطلب ہے، ان پر ایمان لانا، یا ان کو گننا اور انہیں ایک ایک کر کے بطور تبرک
 اخلاص کے ساتھ پڑھنا، یا ان کا حفظ، ان کے معانی کا جاننا اور ان سے اپنے کو متصف کرنا۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، کتاب
 الدعوات، باب أسماء اللہ تعالیٰ) بعض روایات میں ان ۹۹ ناموں کو ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ روایات ضعیف ہیں اور علمائے
 انہیں مدرج قرار دیا ہے یعنی راویوں کا اضافہ۔ وہ نبی ﷺ کی حدیث کا حصہ نہیں ہیں۔ نیز علمائے یہ بھی وضاحت کی
 ہے کہ اللہ کے ناموں کی تعداد ۹۹ میں منحصر نہیں ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ ہیں۔ (ابن کثیر، فتح القدر)

(۳) الحاد کے معنی ہیں کسی ایک طرف مائل ہونا۔ اسی سے لحد ہے جو اس قبر کو کہا جاتا ہے جو ایک طرف بنائی جاتی ہے۔
 دین میں الحاد اختیار کرنے کا مطلب کج روی اور گمراہی اختیار کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد (کج روی) کی تین
 صورتیں ہیں۔ ۱۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں تبدیلی کر دی جائے۔ جیسے مشرکین نے کیا۔ مثلاً اللہ کے ذاتی نام سے اپنے
 ایک بت کا نام لات اور اس کے صفاتی ناموں عزیز سے عَزَّیٰ بنا لیا۔ ۲۔ یا اللہ کے ناموں میں اپنی طرف سے اضافے کر
 لینا، جس کا حکم اللہ نے نہیں دیا۔ ۳۔ یا اس کے ناموں میں کمی کر دی جائے مثلاً اسے کسی ایک ہی مخصوص نام سے پکارا
 جائے اور دوسرے صفاتی ناموں سے پکارنے کو برا سمجھا جائے۔ (فتح القدر) اللہ کے ناموں میں الحاد کی ایک صورت یہ
 بھی ہے کہ ان میں تاویل یا تعطیل یا تشبیہ سے کام لیا جائے (ایسر التفاسیر) جس طرح معتزلہ، معتزلہ اور مشبہ وغیرہ گمراہ

اور ہماری مخلوق میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق کے موافق ہدایت کرتی ہے اور اس کے موافق انصاف بھی کرتی ہے۔ (۱۸۱)

اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں ہم ان کو بتدریج (گرفت میں) لئے جا رہے ہیں اس طور پر کہ ان کو خبر بھی نہیں۔ (۱۸۲)

اور ان کو مہلت دیتا ہوں بے شک میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔^(۱) (۱۸۳)

کیا ان لوگوں نے اس بات پر غور نہ کیا کہ ان کے ساتھی کو ذرا بھی جنون نہیں وہ تو صرف ایک صاف صاف ڈرانے والے ہیں۔^(۲) (۱۸۴)

اور کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کے عالم میں اور دوسری چیزوں میں جو اللہ نے پیدا کی ہیں اور اس بات میں کہ ممکن ہے کہ ان کی اجل قریب ہی آ پہنچی ہو۔^(۳) پھر قرآن کے بعد کون سی بات پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟^(۴) (۱۸۵)

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةً يَهْتَدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ﴿۱۸۱﴾

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۱۸۲﴾

وَأَمْلِي لَهُمْ أَجَلٌ كَرِيمٌ ﴿۱۸۳﴾

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جُنْدٍ لَهُمْ آلا نُنزِلُ مِثْرًا ﴿۱۸۴﴾

أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَخَلَقَ اللَّهُ مِثْلَهُ شَيْءًا وَآنَ عَلَىٰ أَنْ يَكُونَ لَدَا قَرَابِ أَجْزَاءَهُمْ قِيَاسًا ۚ بَعْدَ مَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱۸۵﴾

فرتوں کا طریقہ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان سب سے بچ کر رہو۔

(۱) یہ وہی استدراج و اممال ہے جو بطور امتحان اللہ تعالیٰ افراد اور قوموں کو دیتا ہے۔ پھر جب اس کی مشیت مؤاخذہ کرنے کی ہوتی ہے تو کوئی اس سے بچانے پر قادر نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کی تدبیر بڑی مضبوط ہے۔

(۲) صَاحِبٌ سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی ہے جن کی بابت مشرکین کبھی ساحر اور کبھی جمنون (نعوذ باللہ) کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ تمہارے عدم تفکر کا نتیجہ ہے۔ وہ تو ہمارا بیجا مہر ہے جو ہمارے احکام پہنچانے والا اور ان سے غفلت و اعراض کرنے والوں کو ڈرانے والا ہے۔

(۳) مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں پر بھی اگر یہ غور کریں تو یقیناً یہ اللہ پر ایمان لے آئیں، اس کے رسول کی تصدیق اور اس کی اطاعت اختیار کر لیں اور انہوں نے جو اللہ کے شریک بنا رکھے ہیں، انہیں چھوڑ دیں اور اس بات سے ڈریں کہ انہیں موت اس حال میں آجائے کہ وہ کفر پر قائم ہوں۔

(۴) حَدِيثٌ سے مراد یہاں قرآن کریم ہے۔ یعنی نبی ﷺ کے انذار و تمہید اور قرآن کریم کے بعد بھی اگر یہ ایمان نہ لائیں تو ان سے بڑھ کر انہیں ڈرانے والی چیز اور کیا ہوگی جو اللہ کی طرف سے نازل ہو اور پھر یہ اس پر ایمان لائیں؟

جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے اس کو کوئی راہ پر نہیں لا سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کی گمراہی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیتا ہے۔ (۱۸۶)

یہ لوگ آپ سے قیامت (۱) کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہو گا؟ (۲) آپ فرمادیتے کہ اس کا علم صرف میرے رب ہی کے پاس ہے، (۳) اس کے وقت پر اس کو سوا اللہ کے کوئی اور ظاہر نہ کرے گا۔ وہ آسمانوں اور زمین میں بڑا بھاری (حادثہ) ہو گا (۴) وہ تم پر محض اچانک آ پڑے گی۔ وہ آپ سے اس طرح پوچھتے ہیں جیسے گویا آپ اس کی تحقیقات کر چکے ہیں۔ (۵) آپ فرمادیتے کہ اس کا علم خاص اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (۱۸۷)

آپ فرمادیتے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لئے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا، مگر اتنا ہی کہ جتنا اللہ نے چاہا ہو اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیتا اور کوئی نقصان مجھ کو نہ پہنچتا میں تو محض ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں ان

مَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ ۚ وَيَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۱۸۶﴾

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسِمُهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي لَا يُجِيبُهُ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ ۚ وَتِلْكَ السَّاعَةُ كَالَّذِي لَا تَأْتِيكُمُ الْآبَتَاتُ ۚ يُضِلُّونَكُمْ وَأَنْتُمْ لَا حَافِي ۚ عَمَّا قُلْنَا إِنَّمَا عَلَّمَهَا عِنْدَنَا اللَّهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۸۷﴾

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبِ لَاسْتَكْبَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۸۷﴾

(۱) سَاعَةً کے معنی گھڑی (لمحہ یا پل) کے ہیں۔ قیامت کو ساعتہ اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ اچانک اس طرح آ جائے گی کہ پل بھر میں ساری کائنات درہم برہم ہو جائے گی یا سرعت حساب کے اعتبار سے قیامت کی گھڑی کو ساعتہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۲) أَدْسَى يُرْسِمِي کے معنی اثبات و وقوع کے ہیں، یعنی کب یہ قیامت ثابت یا واقع ہوگی؟

(۳) یعنی اس کا یقینی علم نہ کسی فرشتے کو ہے نہ کسی نبی کو، اللہ کے سوا اس کا علم کسی کے پاس نہیں، وہی اس کو اپنے وقت پر ظاہر فرمائے گا۔

(۴) اس کے ایک دوسرے معنی ہیں۔ اس کا علم آسمان اور زمین والوں پر بھاری ہے، کیونکہ وہ مخفی ہے اور مخفی چیز دلوں پر بھاری ہوتی ہے۔

(۵) حَافِي کتے ہیں پیچھے پڑ کر سوال کرنے اور تحقیق کرنے کو۔ یعنی یہ آپ ﷺ سے قیامت کے بارے میں اس طرح سوال کرتے ہیں کہ گویا آپ نے رب کے پیچھے پڑ کر اس کی بابت ضروری علم حاصل کر رکھا ہے۔

لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔^(۱) (۱۸۸)

وہ اللہ تعالیٰ ایسا ہے جس نے تم کو ایک تن واحد سے پیدا کیا^(۲) اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا^(۳) تاکہ وہ اس اپنے جوڑے سے انس حاصل کرے^(۴) پھر جب میاں نے بیوی سے قربت کی تو^(۵) اس کو حمل رہ گیا ہلکا سا۔ سو وہ

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيًّا فَمَرَّتْ بِهِ فَلَمَّا أَفْتَسَتْ دَعَا اللَّهَ رَبَّهَا لَعَلَّهَا لِيَكُنَا صَالِحًا لَتَكُونَنَّ مِنْ الشَّاكِرِينَ ﴿۱۸۸﴾

(۱) یہ آیت اس بات میں کتنی واضح ہے کہ نبی ﷺ کو عالم الغیب نہیں۔ عالم الغیب صرف اللہ کی ذات ہے۔ لیکن ظلم اور جہالت کی انتہا ہے کہ اس کے باوجود اہل بدعت آپ ﷺ کو عالم الغیب باور کراتے ہیں۔ حالانکہ بعض جنگوں میں آپ کے دندان مبارک بھی شہید ہوئے، آپ ﷺ کا چہرہ مبارک بھی زخمی ہوا، اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ قوم کیسے فلاح یاب ہوگی جس نے اپنے نبی کے سر کو زخمی کر دیا، کتب حدیث میں یہ واقعات بھی اور ذیل کے واقعات بھی درج ہیں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگی تو آپ پورا ایک مہینہ سخت معظرب اور نہایت پریشان رہے۔ ایک یہودی عورت نے آپ کی دعوت کی اور کھانے میں زہر ملا دیا، جسے آپ نے بھی تناول فرمایا اور صحابہ نے بھی، حتیٰ کہ بعض صحابہ تو کھانے کے زہر سے ہلاک ہی ہو گئے اور خود نبی ﷺ عمر بھر اس زہر کے اثرات محسوس فرماتے رہے۔ یہ اور اس قسم کے متعدد واقعات ہیں جن سے واضح ہے کہ آپ کو عدم علم کی وجہ سے تکلیف پہنچی، نقصان اٹھانا پڑا، جس سے قرآن کی بیان کردہ حقیقت کا اثبات ہوتا ہے کہ ”اگر میں غیب جانتا ہوتا تو مجھے کوئی مضرت نہ پہنچتی۔“

(۲) ابتدا یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے۔ اسی لیے ان کو انسان اول اور ابوالبشر کہا جاتا ہے۔

(۳) اس سے مراد حضرت حوا ہیں، جو حضرت آدم علیہ السلام کی زوجہ بنیں۔ ان کی تخلیق حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی، جس طرح کہ نہاکی ضمیر سے، جو نفس واحدہ کی طرف راجع ہے، واضح ہے (مزید دیکھئے سورہ نساء آیت ۱، کا حاشیہ) (۴) یعنی اس سے اطمینان و سکون حاصل کرے۔ اس لیے کہ ایک جنس اپنے ہی جنس سے صحیح معنوں میں مانوس اور قریب ہو سکتی ہے جو سکون حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔ قربت کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً﴾ (روم-۲۱) ”اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے (یا تمہاری جنس ہی میں سے) جوڑے پیدا کیے، تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان اس نے پیار و محبت رکھ دی“ یعنی اللہ نے مرد اور عورت دونوں کے اندر ایک دوسرے کے لیے جو جذبات اور کشش رکھی ہے، فطرت کے یہ تقاضے وہ جوڑا بن کر پورا کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے قرب و انس حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جو باہمی پیار میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے وہ دنیا میں کسی اور کے ساتھ نہیں ہوتا۔

(۵) یعنی یہ نسل انسانی اس طرح بڑھی اور آگے چل کر جب ان میں سے ایک زوج یعنی میاں بیوی نے ایک دوسرے سے قربت کی۔ تَغَشَّاهَا کے معنی بیوی سے ہم بستری کرنا ہیں۔ یعنی وطنی کرنے کے لیے ڈھانپنا۔

اس کو لئے ہوئے چلتی پھرتی رہی،^(۱) پھر جب وہ بو جھل ہو گئی تو دونوں میاں بیوی اللہ سے جو ان کا مالک ہے دعا کرنے لگے کہ اگر تو نے ہم کو صحیح سالم اولاد دے دی تو ہم خوب شکرگزاری کریں گے۔^(۲) (۱۸۹)

سو جب اللہ نے دونوں کو صحیح سالم اولاد دے دی تو اللہ کی دی ہوئی چیز میں وہ دونوں اللہ کے شریک قرار دینے لگے،^(۳) سو اللہ پاک ہے ان کے شرک سے۔ (۱۹۰)

کیا ایسوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہ کر سکیں اور وہ خود ہی پیدا کئے گئے ہوں۔ (۱۹۱)

اور وہ ان کو کسی قسم کی مدد نہیں دے سکتے اور وہ خود بھی مدد نہیں کر سکتے۔ (۱۹۲)

اور اگر تم ان کو کوئی بات بتلانے کو پکارو تو تمہارے کہنے پر نہ چلیں^(۴) تمہارے اعتبار سے دونوں امر برابر ہیں خواہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو۔ (۱۹۳)

فَلَمَّا أَتَاهَا صَالِحًا جَعَلَهُ لُحْمًا يُبْتِغَىٰ بِهَا النَّهْمَاءُ فَتَعَلَىٰ اللَّهُ عِبَادُ يُشْرِكُونَ ﴿۱۸۹﴾

أَيُّ شَيْءٍ نَّوَالَىٰ خَلْقًا يُبْتِغَىٰ بِهِمُ الْيَقُونُ ﴿۱۹۰﴾

وَلَا يَسْتَتِيْبُونَ لَهُمْ نَضْرًا وَلَا أَنْفُسَهُمْ يَنْفُرُونَ ﴿۱۹۱﴾

وَأَنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَبْتَغُوا سَوَاءً عَلَيْكُمْ أَدَعَوْتُهُمْ أَمْ أَنْ تَدْعُوهُمْ أَوْ يَدْعُواكُمْ أَوْ لَا تَدْعُوا لَهُمْ

﴿۱۹۲﴾

(۱) یعنی حمل کے ابتدائی ایام میں حتیٰ کہ نطفے سے علقۃ اور علقۃ سے مضعۃ بننے تک، حمل خفیف ہی رہتا ہے، محسوس بھی نہیں ہوتا اور عورت کو زیادہ گرانی بھی نہیں ہوتی۔

(۲) بو جھل ہو جانے سے مراد، جب بچہ پیٹ میں بڑا ہو جاتا ہے تو جوں جوں ولادت کا وقت قریب آتا جاتا ہے، والدین کے دل میں خطرات اور توہمات پیدا ہوتے جاتے ہیں (بالخصوص جب عورت کو اٹھرا کی بیماری ہو) تو انسانی فطرت ہے کہ خطرات میں وہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، چنانچہ وہ دونوں اللہ سے دعائیں کرتے ہیں اور شکرگزاری کا عمد کرتے ہیں۔

(۳) شریک قرار دینے سے مراد یا تو بچے کا نام ایسا رکھنا ہے، مثلاً امام بخش، پیراں دتہ، عبد شمس، بندہ علی، وغیرہ، جس سے یہ اظہار ہوتا ہو کہ یہ بچہ فلاں بزرگ، فلاں پیر کی (نعوذ باللہ) نظر کرم کا نتیجہ ہے۔ یا پھر اپنے اس عقیدے کا اظہار کرے کہ ہم فلاں بزرگ یا فلاں قبر پر گئے تھے جس کے نتیجے میں یہ بچہ پیدا ہوا ہے۔ یا کسی مردہ کے نام کی نذر نیا دے یا بچے کو کسی قبر پر لے جا کر اس کا ماتھا دہاں نکائے کہ ان کے طفیل بچہ ہوا ہے۔ یہ ساری صورتیں اللہ کا شریک ٹھہرانے کی ہیں، جو بد قسمتی سے مسلمان عوام میں بھی عام ہیں۔ اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ شرک کی تردید فرما رہا ہے۔

(۴) یعنی تمہاری بتلائی ہوئی بات پر عمل نہیں کریں گے۔ ایک دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ اگر تم ان سے رشد و ہدایت طلب کرو، تو وہ تمہاری بات نہیں مانیں گے، نہ تمہیں کوئی جواب ہی دیں گے (فتح القدیر)

واقعی تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں (۱) سو تم ان کو پکارو پھر ان کو چاہئے کہ تمہارا کہنا کر دیں اگر تم سچے ہو۔ (۱۹۳)

کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہوں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ کسی چیز کو تھام سکیں، یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہوں، یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں (۲) آپ کہہ دیجئے! تم اپنے سب شرکا کو بلا لو، پھر میری ضرر رسانی کی تدبیر کرو پھر مجھ کو ذرا مہلت مت دو۔ (۳) (۱۹۵)

یقیناً میرا مددگار اللہ تعالیٰ ہے جس نے یہ کتاب نازل فرمائی اور وہ نیک بندوں کی مدد کرتا ہے۔ (۱۹۶)

اور تم جن لوگوں کی اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتے اور نہ وہ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ (۴) (۱۹۷)

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَلُكُمْ قَادَعُوهُمْ فَلَيسَ لَكُمْ بِهِمْ مُبْدِيُونَ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۹۳﴾

أَلَمْ أَرْجُلُ يَمْشُونَ بِهَا أَمْ أَلَمْ أَيْدِي يَبْطِئُونَ بِهَا أَمْ أَلَمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا أَمْ أَلَمْ أَأْذَانٌ تَسْمَعُونَ بِهَا قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ كِيدُوا فَلَا تُنظَرُونَ ﴿۱۹۴﴾

إِنَّ دَرَجَاتٍ لِلَّهِ الَّذِينَ يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ يُؤْتَوْنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۹۵﴾

وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْمَعُونَ نَصْرَكُمْ وَلَا أَنفُسَهُمْ يَصُدُّونَ ﴿۱۹۶﴾

(۱) یعنی جب وہ زندہ تھے۔ بلکہ اب تو تم خود ان سے زیادہ کامل ہو، اب وہ دیکھ نہیں سکتے، تم دیکھتے ہو۔ وہ سن نہیں سکتے، تم سنتے ہو۔ وہ کسی کی بات سمجھ نہیں سکتے، تم سمجھتے ہو۔ وہ جواب نہیں دے سکتے، تم دیتے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشرکین، جن کی مورتیاں بنا کر پوجتے تھے، وہ بھی پہلے اللہ کے بندے یعنی انسان ہی تھے، جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے پانچ بتوں کی بابت صحیح بخاری میں صراحت موجود ہے کہ وہ اللہ کے نیک بندے تھے۔

(۲) یعنی اب ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے پاس موجود نہیں ہے۔ مرنے کے ساتھ ہی دیکھنے، سننے، سمجھنے اور چلنے کی طاقت ختم ہو گئی۔ اب ان کی طرف منسوب یا تو پتھر یا لکڑی کی خود تراشیدہ مورتیاں ہیں یا گنبد، قبے اور آستانے ہیں جو ان کی قبروں پر بنا لیے گئے اور یوں استخوانِ فردوسی کا کاروبار فروغ پذیر ہے۔

اگرچہ پیر ہے آدم، جو ان ہیں لات و منات

(۳) یعنی اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو کہ یہ تمہارے مددگار ہیں تو ان سے کہو کہ میرے خلاف تدبیر کریں۔

(۴) جو اپنی مدد آپ کرنے پر قادر نہ ہوں، وہ بھلا دو سروں کی مدد کیا کریں گے؟

جو خود محتاج ہووے دوسرے کا
بھلا اس سے مدد کا مانگنا کیا

وَأَنَّ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَى لَكُمْ مَعْوَا وَتَرَاهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ
وَهُمْ لَا يَبْصُرُونَ ﴿۳۰﴾

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ﴿۳۱﴾

وَأَمَّا يَنْزِعُكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعًا فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ
سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۲﴾

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَئِفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا
فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ ﴿۳۳﴾

اور ان کو اگر کوئی بات بتلانے کو پکارو تو اس کو نہ سنیں^(۱) اور ان کو آپ دیکھتے ہیں کہ گویا وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں اور وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔ (۱۹۸)

آپ درگزر کو اختیار کریں^(۲) نیک کام کی تعلیم دیں^(۳) اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہو جائیں۔ (۱۹۹)^(۴)

اور اگر آپ کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے^(۵) بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔ (۲۰۰)

یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں، سو

(۱) اس کا وہی مفہوم ہے جو آیت ۱۹۳ کا ہے۔

(۲) بعض علمائے اس کے معنی کیے ہیں خُذْ مَا عَفَاكَ مِنْ أَمْوَالِهِمْ أَيْ: مَا فَضَّلَ لِيَعْنِي ”جو ضرورت سے زائد مال ہو، وہ لے لو“ اور یہ زکوٰۃ کی فرضیت سے قبل کا حکم ہے۔ (فتح الباری، جلد ۸، ص ۳۰۵) لیکن دوسرے مفسرین نے اس سے اخلاقی ہدایت یعنی عفو و درگزر مراد لیا ہے اور امام ابن جریر اور امام بخاری وغیرہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ چنانچہ امام بخاری نے اس کی تفسیر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ عیینہ بن حصن حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آکر ان پر تنقید کرنے لگے کہ آپ ہمیں نہ پوری عطا دیتے ہیں اور نہ ہمارے درمیان انصاف کرتے ہیں جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہما غضب ناک ہوئے، یہ صورت حال دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے مشیر حرب بن قیس نے (جو عیینہ کے بھتیجے تھے) حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نبی ﷺ کو حکم فرمایا تھا۔ ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ — درگزر کو اختیار کیجئے اور نیکی کا حکم دیجئے اور جاہلوں سے اعراض کیجئے۔“ اور یہ بھی جاہلوں میں سے ہے۔“ جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے درگزر فرمایا۔ وَكَانَ وَقَافًا عِنْدَ كِتَابِ اللَّهِ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما اللہ کی کتاب کا حکم سن کر فوراً گردن خم کر دینے والے تھے۔“ (صحیح بخاری۔ تفسیر سورۃ الأعراف) اس کی تائید ان احادیث سے بھی ہوتی ہے جن میں ظلم کے مقابلے میں معاف کر دینے، قطع رحمی کے مقابلے میں صلہ رحمی اور برائی کے بدلے احسان کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

(۳) عُرْفٌ سے مراد معروف یعنی نیکی ہے۔

(۴) یعنی جب آپ نیکی کا حکم دینے میں اتمام حجت کر چکیں اور پھر بھی وہ نہ مانیں تو ان سے اعراض فرمائیں اور ان کے جھگڑوں اور حماقتوں کا جواب نہ دیں۔

(۵) اور اس موقع پر اگر آپ کو شیطان اشتعال میں لانے کی کوشش کرے تو آپ اللہ کی پناہ طلب فرمائیں۔

وَأَخْوَاهُمْ يُبْذَرُونَ فِي النَّارِ لَمْ يَلْقَوْا لِقَابًا يُصْرُونَ ﴿۲۰۱﴾

وَإِذْ أَلَمْنَا لَهُمْ بِآيَاتِنَا أَفَالْحَاقِلُونَ ﴿۲۰۲﴾
مَا يُوَسْوِسُ إِلَيْنَا مِنْ رَبِّهِ هَذَا بَصَافِيرٌ ﴿۲۰۳﴾
وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۲۰۴﴾

وَإِذْ أَخْرَجْنَا الْقُرْآنَ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَكُفِرُوا بِالْعَلَاكَةِ
يَوْمَهُمْ ﴿۲۰۵﴾

یہ ایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ (۲۰۱)
اور جو شیاطین کے تابع ہیں وہ ان کو گمراہی میں کھینچنے لے جاتے ہیں پس وہ باز نہیں آتے۔ (۲۰۲)

اور جب آپ کوئی معجزہ ان کے سامنے ظاہر نہیں کرتے تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ یہ معجزہ کیوں نہ لائے؟ (۲۰۳) آپ فرما دیجئے کہ میں اس کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے حکم بھیجا گیا ہے یہ گویا بہت سی دلیلیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں۔ (۲۰۴)

اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو امید ہے کہ تم پر رحمت ہو۔ (۲۰۵)

(۱) اس میں اہل تقویٰ کی بابت بتلایا گیا ہے کہ وہ شیطان سے چونکار رہتے ہیں۔ طائف یا یثیب، اس تخیل کو کہتے ہیں جو دل میں آئے یا خواب میں نظر آئے۔ یہاں اسے شیطانی وسوسے کے معنی میں استعمال کیا گیا، کیونکہ وسوسہ شیطانی بھی خیالی تصورات کے مشابہ ہے۔ (فتح القدیر)

(۲) یعنی شیطان کافروں کو گمراہی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں، پھر وہ کافر (گمراہی کی طرف جانے میں) یا شیطان انکو لے جانے میں کوتاہی کی نہیں کرتے۔ یعنی لَا يَفْصِرُونَ كَافِعًا لِكُفْرِهِمْ بِنُحُوتِهِمْ اور إِخْوَانُ الْكُفْرَانِ شَيْطَانِيٌّ بَعِيٌّ۔

(۳) مراد ایسا معجزہ ہے جو ان کے کہنے پر ان کی خواہش کے مطابق ظاہر کر کے دکھایا جائے۔ جیسے ان کے بعض مطالبات سورہ بنی اسرائیل، آیت ۹۰-۹۳ میں بیان کیے گئے ہیں۔

(۴) لَوْلَا أَجْنَبْنَاهُمْ مِنَ الْكُفْرَانِ وَالْقَوْلُ جَبِيحٌ ﴿﴾ (حلم السجدة ۲۶) یہ قرآن مت سنو اور شور کرو، ان سے کہا گیا کہ اس کے معجزات پیش کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے میں تو صرف وحی الہی کا پیرو کار ہوں۔ ہاں البتہ یہ قرآن جو میرے پاس آیا ہے، یہ بجائے خود ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ اس میں تمہارے رب کی طرف سے بصائر (دلائل و براہین) اور ہدایت و رحمت ہے۔ بشرطیکہ کوئی ایمان لانے والا ہو۔

(۵) یہ ان کافروں کو کہا جا رہا ہے جو قرآن کی تلاوت کرتے وقت شور کرتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو کہتے تھے ﴿لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْقَوُا جَبِيحٌ﴾ (حلم السجدة ۲۶) یہ قرآن مت سنو اور شور کرو، ان سے کہا گیا کہ اس کے بجائے تم اگر غور سے سنو اور خاموش رہو تو شاید اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت سے نواز دے۔ اور یوں تم رحمت الہی کے مستحق بن جاؤ۔

بعض ائمہ دین اسے عام مراد لیتے ہیں یعنی جب بھی قرآن پڑھا جائے، چاہے نماز ہو یا غیر نماز، سب کو خاموشی سے قرآن

اور اے شخص! اپنے رب کی یاد کیا کر اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ صبح اور شام اور اہل غفلت میں سے مت ہونا۔ (۲۰۵)

یقیناً جو تیرے رب کے نزدیک ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور اس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اس کو سجدہ کرتے ہیں۔ (۲۰۶)

وَأَذْرُؤْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ كَضَرْعًا وَخَيْفَةً وَدُونَ
الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُنْ
مِنَ الْغَافِلِينَ ﴿۲۰۵﴾

۲۰۵

إِنَّ الَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ
وَسَيَسْأَلُونَكَ عَنْهُ وَلَهُ يُجْزَوْنَ ﴿۲۰۶﴾

سورہ انفال مدنی ہے اور اس کی پچتر آیات اور دس رکوع ہیں

میں شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو نہایت مہربان بزرگم کرنے والا ہے

یہ لوگ آپ سے غنیمتوں کا حکم دریافت کرتے ہیں،^(۱)

سُورَةُ الْأَنْفَالِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ فَأَتَقُوا

سننے کا حکم ہے اور پھر وہ اس عموم سے استدلال کرتے ہوئے جہری نمازوں میں مقتدی کے سورہ فاتحہ پڑھنے کو بھی اس قرآنی حکم کے خلاف بتاتے ہیں۔ لیکن دوسرے علما کی رائے یہ ہے کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کی تاکید نبی ﷺ سے صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ ان کے نزدیک اس آیت کو صرف کفار کے متعلق ہی سمجھنا صحیح ہے، جیسا کہ اس کے مکی ہونے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن اگر اسے عام سمجھا جائے تب بھی اس عموم سے نبی ﷺ نے مقتدیوں کو خارج فرما دیا اور یوں قرآن کے اس عموم کے باوجود جہری نمازوں میں مقتدیوں کا سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری ہو گا۔ کیونکہ قرآن کے اس عموم کی یہ تخصیص صحیح و قوی احادیث سے ثابت ہے۔ بنا بریں جس طرح اور بعض عموماً قرآنی کی تخصیص احادیث کی بنیاد پر تسلیم کی جاتی ہے، مثلاً آیت ﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا﴾ الآية (النور: ۲) کے عموم سے شادی شدہ زانی کا اخراج، اور (السارق والسارقة) کے عموم سے ایسے چور کا اخراج یا تخصیص جس نے ربع دینار سے کم مالیت کی چیز چوری کی ہو یا چوری شدہ چیز، حرم میں نہ رکھی ہو۔ وغیرہ۔ اسی طرح ﴿فَالسَّبِيحَةُ وَالْمُؤَلَّةُ وَالْمُؤَلَّتُوهَا﴾ کے عمومی حکم سے مقتدی خارج ہوں گے اور ان کے لیے جہری نمازوں میں بھی سورہ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہو گا، کیونکہ نبی ﷺ نے اس کی تاکید فرمائی ہے (جیسا کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر میں یہ احادیث بیان کی گئی ہیں)

(۱) أَنْفَالٌ، نَفْلٌ کی جمع ہے جس کے معنی زیادہ کے ہیں، یہ اس مال و اسباب کو کہا جاتا ہے، جو کافروں کے ساتھ جنگ میں ہاتھ لگے، جسے غنیمت بھی کہا جاتا ہے اسے نفل (زیادہ) اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ ان چیزوں میں سے ایک ہے جو بھجلی امتوں پر حرام تھیں۔ یہ گویا امت محمدیہ پر ایک زائد چیز حلال کی گئی ہے یا اس لیے کہ یہ جماد کے اجر سے (جو آخرت میں ملے گا) ایک زائد چیز ہے جو بعض دفعہ دنیا میں ہی مل جاتی ہے۔

آپ فرما دیجئے کہ یہ غنیمتیں اللہ کی ہیں اور رسول کی ہیں،^(۱) سو تم اللہ سے ڈرو اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم ایمان والے ہو۔^(۲) (۱)

بس ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلوب ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتیں ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ لوگ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔^(۳) (۲)

اللَّهُ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ①

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحِلَّتْ لَهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ وَإِذَا أُتِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ②

(۱) یعنی اس کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ اللہ کا رسول، اللہ کے حکم سے اسے تقسیم فرمائے گا۔ نہ کہ تم آپس میں جس طرح چاہو اسے تقسیم کرو۔

(۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ تینوں باتوں پر عمل کے بغیر ایمان مکمل نہیں۔ اس سے تقویٰ، اصلاح ذات البین اور اللہ اور رسول کی اطاعت کی اہمیت واضح ہے۔ خاص طور پر مال غنیمت کی تقسیم میں ان تینوں امور پر عمل نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ مال کی تقسیم میں باہمی فساد کا بھی شدید اندیشہ رہتا ہے، اس کے علاج کے لیے اصلاح ذات البین پر زور دیا۔ بہرا پھیری اور خیانت کا بھی امکان رہتا ہے اس کے لیے تقویٰ کا حکم دیا۔ اس کے باوجود بھی کوئی کوتاہی ہو جائے تو اس کا صلہ اللہ اور رسول کی اطاعت میں مضمر ہے۔

(۳) ان آیات میں اہل ایمان کی ۴ صفات بیان کی گئی ہیں: ۱- وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں نہ کہ صرف اللہ کی یعنی قرآن کی۔ ۲- اللہ کا ذکر سن کر اللہ کی جلالت و عظمت سے ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں ۳- تلاوت قرآن سے ان کے ایمانوں میں اضافہ ہوتا ہے (جس سے معلوم ہوا کہ ایمان میں بھی کمی بیشی ہوتی ہے، جیسا کہ محدثین کا مسلک ہے) ۴- اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ توکل کا مطلب ہے کہ ظاہری اسباب اختیار کرنے کے بعد اللہ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہیں۔ یعنی اسباب سے اعراض و گریز بھی نہیں کرتے کیونکہ انہیں اختیار کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے ہی دیا ہے، لیکن اسباب ظاہری کو ہی سب کچھ نہیں سمجھ لیتے بلکہ ان کا یہ یقین ہوتا ہے کہ اصل کار فرما مشیت الہی ہی ہے، اس لیے جب تک اللہ کی مشیت بھی نہیں ہوگی، یہ ظاہری اسباب کچھ نہیں کر سکیں گے اور اس یقین و اعتماد کی بنیاد پر پھر وہ اللہ کی مدد و اعانت حاصل کرنے سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوتے۔ آگے ان کی مزید صفات کا تذکرہ ہے اور ان صفات کے حاملین کے لیے اللہ کی طرف سے سچے مومن ہونے کا سرٹیفکیٹ اور مغفرت و رحمت الہی اور رزق کریم کی نوید ہے۔ جَعَلْنَا اللَّهُ مِنْهُمْ (اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان میں شمار فرمائے)۔

جنگ بدر کا پس منظر: جنگ بدر، جو ۲ ہجری میں ہوئی، کافروں کے ساتھ مسلمانوں کی پہلی جنگ تھی۔ علاوہ ازیں یہ

جو کہ نماز کی پابندی کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو کچھ دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (۳)

سچے ایمان والے یہ لوگ ہیں ان کے لئے بڑے درجے ہیں ان کے رب کے پاس اور مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔ (۴)

جیسا کہ آپ کے رب نے آپ کے گھر سے حق کے ساتھ آپ کو روانہ کیا^(۱) اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس کو گراں سمجھتی تھی۔^(۲) (۵)

وہ اس حق کے بارے میں، اس کے بعد کہ اس کا

الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿۱﴾

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ
وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿۲﴾

كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنَ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ
الْمُؤْمِنِينَ لَكُرْهُونَ ﴿۳﴾

يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ

منسوبہ بندی اور تیاری کے بغیر اچانک ہوئی۔ نیز بے سرو سامانی کی وجہ سے بعض مسلمان ذہنی طور پر اس کے لیے تیار بھی نہیں تھے۔ مختصراً اس کا پس منظر اس طرح ہے کہ ابو سفیان کی (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) سرکردگی میں ایک تجارتی قافلہ شام سے مکہ جا رہا تھا، چونکہ مسلمانوں کا بھی بہت سامان و اسباب ہجرت کی وجہ سے مکہ رہ گیا تھا، یا کافروں نے جھین لیا تھا، نیز کافروں کی قوت و شوکت کو توڑنا بھی متفقہ وقت تھا، ان تمام باتوں کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے اس تجارتی قافلے پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا اور مسلمان اس نیت سے مدینہ سے چل پڑے۔ ابو سفیان کو بھی اس امر کی اطلاع مل گئی۔ چنانچہ انہوں نے ایک تو اپنا راستہ تبدیل کر لیا۔ دوسرے، مکہ اطلاع بھجوا دی جس کی بنا پر ابو جہل ایک لشکر لے کر اپنے قافلے کی حفاظت کے لیے بدر کی جانب چل پڑا، نبی ﷺ کو اس صورت حال کا علم ہوا تو صحابہ کرام کے سامنے معاملہ رکھ دیا اور اللہ کا وعدہ بھی بتلایا کہ ان دونوں (تجارتی قافلہ اور لشکر) میں سے ایک چیز تمہیں ضرور حاصل ہوگی۔ تاہم پھر بھی لڑائی میں بعض صحابہ نے تردد کا اظہار اور تجارتی قافلے کے تعاقب کا مشورہ دیا، جب کہ دوسرے تمام صحابہ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ لڑنے میں بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ اسی پس منظر میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

(۱) یعنی جس طرح مال غنیمت کی تقسیم کا معاملہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف کا باعث بنا ہوا تھا۔ پھر اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حوالہ کر دیا گیا تو اسی میں مسلمانوں کی بہتری تھی، اسی طرح آپ کا مدینہ سے نکلنا اور پھر آگے چل کر تجارتی قافلے کے بجائے، لشکر قریش سے مدبھیڑ ہو جانا، گو بعض طبائع کے لیے ناگوار تھا، لیکن اس میں بھی بلاخر فائدہ مسلمانوں ہی کا ہو گا۔

(۲) یہ ناگواری لشکر قریش سے لڑنے کے معاملے میں تھی، جس کا اظہار چند ایک افراد کی طرف سے ہوا اور اس کی وجہ بھی صرف بے سرو سامانی تھی۔ اس کا تعلق مدینہ سے نکلنے سے نہیں ہے۔

ظہور ہو گیا تھا^(۱) آپ سے اس طرح بھگڑ رہے تھے کہ گویا کوئی ان کو موت کی طرف ہانکے لئے جاتا ہے اور وہ دیکھ رہے ہیں۔^(۲) (۶)

اور تم لوگ اس وقت کو یاد کرو! جب کہ اللہ تم سے ان دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ کرتا تھا کہ وہ تمہارے ہاتھ آجائے گی^(۳) اور تم اس تمنا میں تھے کہ غیر مسلح جماعت تمہارے ہاتھ آجائے^(۴) اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ اپنے احکام سے حق کا حق ہونا ثابت کر دے اور ان کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ (۷)

تاکہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت کر دے گو یہ مجرم لوگ ناپسند ہی کریں۔^(۵) (۸)

اس وقت کو یاد کرو جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہاری سن لی کہ میں تم کو ایک ہزار فرشتوں سے مدد دوں گا جو لگاتار چلے آئیں گے۔^(۶) (۹)

وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۝

وَأَذِيعُكُمْ اللَّهُ أَحَدَى الظَّالِمَاتِ أَنْهَا لَكُمْ
وَتَوَدُونَ أَنْ عَزْدَاتِ الشُّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ
وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُخَيِّقَ الْحَقَّ بِحُلَيْبِهِ وَيَقْطَعُ دَابِرَ
الْكُفْرِيِّنَ ۝

يُخَيِّقُ الْحَقَّ وَيُبْطِلُ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ۝

رَأَى تَسْبِعِينَ نُونًا لَكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِالنَّارِ
مِنَ الْمَلِكَةِ مُرَدِّينَ ۝

(۱) یعنی یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ قافلہ توجہ کر نکل گیا ہے اور اب لشکر قریش ہی سامنے ہے جس سے لڑائی ناگزیر ہے۔

(۲) یہ بے سرو سامانی کی حالت میں لڑنے کی وجہ سے بعض مسلمانوں کی جو کیفیت تھیں، اس کا اظہار ہے۔

(۳) یعنی یا تو تجارتی قافلہ تمہیں مل جائے گا؛ جس سے تمہیں بغیر لڑائی کے وافر مال و اسباب مل جائے گا؛ بصورت دیگر لشکر قریش سے تمہارا مقابلہ ہو گا اور تمہیں غلبہ ہو گا اور مال غنیمت ملے گا۔

(۴) یعنی تجارتی قافلہ، تاکہ بغیر لڑے مال ہاتھ آجائے۔

(۵) لیکن اللہ اس کے برعکس یہ چاہتا تھا کہ لشکر قریش سے تمہاری جنگ ہو تاکہ کفر کی قوت و شوکت ٹوٹ جائے گو یہ امر مجرموں (مشرکوں) کے لیے ناگوار ہی ہو۔

(۶) اس جنگ میں مسلمانوں کی تعداد ۳۱۳ تھی؛ جب کہ کافر اس سے ۳ گنا (یعنی ہزار کے قریب) تھے؛ پھر مسلمان نئے

اور بے سرو سامان تھے جب کہ کافروں کے پاس اسلحے کی بھی فراوانی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کا سہارا صرف اللہ

ہی کی ذات تھی؛ جس سے وہ گڑگڑا کر مدد کی فریادیں کر رہے تھے۔ خود نبی کریم ﷺ الگ ایک خیمے میں نہایت الخ و

زاری سے مصروف دعا تھے۔ (صحیح بخاری۔ کتاب المغازی) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دعائیں قبول کیں اور ایک ہزار فرشتے

ایک دوسرے کے پیچھے مسلسل لگاتار مسلمانوں کی مدد کے لیے آ گئے۔

اور اللہ تعالیٰ نے یہ امداد محض اس لئے کی کہ بشارت ہو اور تاکہ تمہارے دلوں کو قرار ہو جائے اور مدد صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے (۱) جو کہ زبردست حکمت والا ہے۔ (۱۰)

اس وقت کو یاد کرو جب کہ اللہ تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا اپنی طرف سے چین دینے کے لئے (۲) اور تم پر آسمان سے پانی برس رہا تھا کہ اس پانی کے ذریعہ سے تم کو پاک کر دے اور تم سے شیطانی وسوسہ کو دفع کر دے (۳) اور تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور تمہارے پاؤں جما دے۔ (۴)

اس وقت کو یاد کرو جب کہ آپ کا رب فرشتوں کو حکم دیتا تھا کہ میں تمہارا ساتھی ہوں سو تم ایمان والوں کی ہمت بڑھاؤ میں ابھی کفار کے قلوب میں رعب ڈالے دیتا ہوں، (۵) سو تم گردنوں پر مارو اور ان کے پور پور کو

وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُرْئًا وَيُعْظِمُ لَهُ بِهِ قُلُوبَكُمْ وَمَا النَّصْرَ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۱۰﴾

إِذْ يُخَيِّرُكُمْ النَّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُزِيلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيَبْطِرَكُمْ بِهِ وَيَذْهَبَ عَنْكُمْ رَجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَى قُلُوبِكُمْ وَيُكَيِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ﴿۱۱﴾

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَأَةِ أَنِي مَعَكُمْ فَتَيَبَتُوا الَّذِينَ آمَنُوا سَأَلْنِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالرُّعْبَ فَأَضْرِبُوا قُلُوبَ الْكُفْرَانِ وَأَضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿۱۲﴾

(۱) یعنی فرشتوں کا نزول تو صرف خوش خبری اور تمہارے دلوں کے اطمینان کے لیے تھا، ورنہ اصل مدد تو اللہ کی طرف سے تھی، جو فرشتوں کے بغیر بھی تمہاری مدد کر سکتا تھا تاہم اس سے یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں کہ فرشتوں نے عملاً جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ میں فرشتوں نے عملی حصہ لیا اور کئی کافروں کو انہوں نے تہ تیغ کیا، دیکھئے (صحیح بخاری و صحیح مسلم: کتاب المغازی و فضائل الصحابة)

(۲) جنگ احد کی طرح جنگ بدر میں بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اونگھ طاری کر دی، جس سے ان کے دلوں کے بوجھ ہلکے ہو گئے اور اطمینان و سکون کی ایک خاص کیفیت ان پر طاری ہو گئی۔

(۳) تیسرا انعام یہ کیا کہ بارش نازل فرمادی، جس سے ایک تورتیلی زمین میں نقل و حرکت آسان ہو گئی۔ دوسرے وضو و طہارت میں آسانی ہو گئی۔ تیسرے اس سے شیطانی وسوسوں کا ازالہ فرما دیا گیا جو وہ اہل ایمان کے دلوں میں ڈال رہا تھا کہ تم اللہ کے نیک بندے ہوتے ہوئے بھی پانی سے دور ہو، دوسرے جہنم کی حالت میں تم لڑو گے تو کیسے اللہ کی رحمت و نصرت تمہیں حاصل ہوگی؟ تیسرے تم پیاسے ہو، جب کہ تمہارے دشمن سیراب ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

(۴) یہ چوتھا انعام ہے جو دلوں اور قدموں کو مضبوط کر کے کیا گیا۔

(۵) یہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے سے اور خاص اپنی طرف سے جس جس طریقے سے مسلمانوں کی بدر میں مدد فرمائی، اس کا بیان ہے۔

مارو۔^(۱) (۱۲)

یہ اس بات کی سزا ہے کہ انہوں نے اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کی۔ اور جو اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے سو بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے

والا ہے۔ (۱۳)

سو یہ سزا چکھو اور جان رکھو کہ کافروں کے لئے جہنم کا عذاب مقرر رہی ہے۔ (۱۴)

اے ایمان والو! جب تم کافروں سے دو بدو مقابل ہو جاؤ تو ان سے پشت مت پھیرنا۔^(۲) (۱۵)

اور جو شخص ان سے اس موقع پر پشت پھیرے گا مگر ہاں جو لڑائی کے لئے پینترا بدلتا ہو یا جو (اپنی) جماعت کی طرف پناہ لینے آتا ہو وہ مستثنیٰ ہے۔^(۳) باقی اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ کے غضب میں آجائے گا اور اس کا

ذَلِكَ يَأْتُهُمْ شَاقُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۖ وَمَنْ يُضَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

ذَلِكُمْ فَنُذِوهُمَا ۖ وَإِنِّي لِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ النَّارِ ۝

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقَيْتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاحْتَفَا فَلَاتُوهُمْ الْكِبَارَ ۖ

وَمَنْ يُؤَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبرَةً إِلَّا مَتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مَتَحَرِّفًا إِلَىٰ فِتْنَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَا وَدَّ جَهَنَّمَ وَيَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝

(۱) بَنَانٍ۔ ہاتھوں اور پیروں کے پور۔ یعنی ان کی انگلیوں کے اطراف (کنارے)؛ یہ اطراف کاٹ دیئے جائیں تو ظاہر ہے کہ وہ معذور ہو جائیں گے۔ اس طرح وہ ہاتھوں سے تلوار چلانے کے اور پیروں سے بھاگنے کے قابل نہیں رہیں گے۔

(۲) رَحْفًا کے معنی ہیں ایک دوسرے کے مقابل اور دو بدو ہونا۔ یعنی مسلمان اور کافر جب ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہوں تو پیٹھ پھیر کر بھاگنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایک حدیث میں ہے اَجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُؤْبَقَاتِ ”سات ہلاک کر دینے والی چیزوں سے بچو!“ ان سات میں ایک وَالتَّوَلَّى يَوْمَ الرَّحْفِ ”مقابلے والے دن پیٹھ پھیر جانا ہے“

(صحیح بخاری، نمبر ۲۷۱۱ کتاب الوصایا و صحیح مسلم، کتاب الإیمان)

(۳) گزشتہ آیت میں پیٹھ پھیرنے سے جو منع کیا گیا ہے، دو صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں: ایک تحریف کی اور دوسری تمیز کی۔ تَحْرِيفُ کے معنی ہیں ایک طرف پھر جانا۔ یعنی لڑائی میں جنگی چال کے طور پر یا دشمن کو دھوکے میں ڈالنے کی غرض سے لڑنا لڑنا ایک طرف پھر جائے، دشمن یہ سمجھے کہ شاید یہ شکست خوردہ ہو کر بھاگ رہا ہے لیکن پھر وہ ایک دم پینترا بدل کر اچانک دشمن پر حملہ کر دے۔ یہ پیٹھ پھیرنا نہیں ہے بلکہ یہ جنگی چال ہے جو بعض دفعہ ضروری اور مفید ہوتی ہے۔ تَحْيِيزُ کے معنی ملنے اور پناہ لینے کے ہیں۔ کوئی مجاہد لڑتا لڑتا تمہارہ جائے تو بہ لطف اللہ لیل میدان جنگ سے ایک طرف ہو جائے، تاکہ وہ اپنی جماعت کی طرف پناہ حاصل کرے اور اس کی مدد سے دوبارہ حملہ کرے۔ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔

ٹھکانہ دوزخ ہو گا وہ بہت ہی بری جگہ ہے (۱۶)
 سو تم نے انہیں قتل نہیں کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو
 قتل کیا۔ (۱۷) اور آپ نے خاک کی مٹھی نہیں پھینکی بلکہ
 اللہ تعالیٰ نے وہ پھینکی (۱۸) اور تاکہ مسلمانوں کو اپنی
 طرف سے ان کی محنت کا خوب عوض دے (۱۹) بلاشبہ اللہ
 تعالیٰ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔ (۲۰)

(ایک بات تو) یہ ہوئی اور (دوسری بات یہ ہے) اللہ تعالیٰ
 کو کافروں کی تدبیر کو کمزور کرنا تھا۔ (۲۱)
 اگر تم لوگ فیصلہ چاہتے ہو تو وہ فیصلہ تمہارے سامنے آ
 موجود ہوا (۲۲) اور اگر باز آ جاؤ تو یہ تمہارے لئے نہایت
 خوب ہے اور اگر تم پھر وہی کام کرو گے تو ہم بھی پھر وہی
 کام کریں گے اور تمہاری جمعیت تمہارے ذرا بھی کام نہ

فَلَوْ تَقَاتَلُواهُمْ وَلَئِنَّ اللَّهَ فَتَلَهُمْ وَمَا مَيَّبَتْ إِذْ رَمَيْتَ
 وَ لَئِنَّ اللَّهَ هُمَا وَ لَئِنَّ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءٌ حَسَنًا إِنَّ
 اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۷﴾

ذَلِكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ مُوْهُنٌ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾

إِنْ نَسْتَفِيْهُوْا فَقَدْ جَاءَكُمْ الْغَنَمُ وَإِنْ تَدْتَهُوْا فَهَوْ خَيْرٌ
 لَّكُمْ وَإِنْ تَعُوْذُوا لَعَدُوٌّ لَّكُنْ نَعْنِيْ عَنْكُمْ فَمَنْكُمْ شَيْئًا وَ لَوْ
 كَثُرَتْ وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾

(۱) یعنی مذکورہ دو صورتوں کے علاوہ کوئی شخص میدان جنگ سے پیڑھے پھیرے گا، اس کے لیے یہ سخت وعید ہے۔

(۲) یعنی جنگ بدر کی ساری صورت حال تمہارے سامنے رکھ دی گئی ہے اور جس طرح اللہ نے تمہاری وہاں مدد فرمائی، اس کی وضاحت کے بعد تم یہ نہ سمجھ لینا کہ کافروں کا قتل، یہ تمہارا کارنامہ ہے۔ نہیں، بلکہ یہ اللہ کی اس مدد کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے تمہیں یہ طاقت حاصل ہوئی۔ اس لیے دراصل انہیں قتل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

(۳) جنگ بدر میں نبی ﷺ نے کنکریوں کی ایک مٹھی بھر کر کافروں کی طرف پھینکی تھی، جسے ایک تو اللہ تعالیٰ نے کافروں کے مومنوں اور آنکھوں تک پہنچایا اور دوسرے، اس میں یہ تاثیر پیدا فرمادی کہ اس سے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں اور انہیں کچھ بھائی نہیں دیتا تھا، یہ معجزہ بھی، جو اس وقت اللہ کی مدد سے ظاہر ہوا، مسلمانوں کی کامیابی میں بہت مددگار ثابت ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اے پیغمبر! کنکریاں بے شک آپ نے پھینکی تھیں، لیکن اس میں تاثیر ہم نے پیدا کی تھی، اگر ہم اس میں یہ تاثیر پیدا نہ کرتے تو یہ کنکریاں کیا کر سکتی تھیں؟ اس لیے یہ بھی دراصل ہمارا ہی کام تھا نہ کہ آپ کا۔

(۴) بلاء یہاں نعمت کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ کی یہ تائید و نصرت، اللہ کا انعام ہے جو مومنوں پر ہوا۔

(۵) دوسرا مقصد اس کا کافروں کی تدبیر کو کمزور کرنا اور ان کی قوت و شوکت کو توڑنا تھا۔

(۶) ابو جہل وغیرہ رؤسائے قریش نے مکہ سے نکلنے وقت دعا کی تھی کہ ”یا اللہ ہم میں سے جو تیرا زیادہ نافرمان اور قاطع رحم ہے، کل کو تو اسے ہلاک کر دے“ اپنے طور پر وہ مسلمانوں کو قاطع رحم اور نافرمان سمجھتے تھے، اس لیے اس قسم کی دعا کی۔ اب جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمادی تو اللہ تعالیٰ ان کافروں سے کہہ رہا ہے کہ تم فتح یعنی حق اور باطل کے درمیان فیصلہ طلب کر رہے تھے تو وہ فیصلہ تو سامنے آچکا ہے، اس لیے اب تم کفر سے باز آ جاؤ، تو تمہارے

آئے گی گو کتنی زیادہ ہو اور واقعی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔ (۱۹)

اے ایمان والو! اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا مانو اور اس (کا کہنا ماننے) سے روگردانی مت کرو سنتے جانتے ہوئے۔ (۲۰)

اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو ناجو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم نے سن لیا حالانکہ وہ سنتے (سناتے کچھ) نہیں۔ (۲۱)

بے شک بدترین خلاق اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو ہرے ہیں گونگے ہیں جو کہ (ذرا) نہیں سمجھتے۔ (۲۲)

اور اگر اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خوبی دیکھتا تو ان کو سننے کی توفیق دے دیتا (۳) اور اگر ان کو اب سنا دے تو ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے۔ (۲۳)

اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کے کہنے کو بجالاؤ، جب کہ رسول تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف بلا تے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنَّهُ وَ أَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ۝

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۝

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الضُّمُ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يُعْقِلُونَ ۝

وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَأَسْمَعَهُمْ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُونَ ۝

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا

لیے بہتر ہے اور اگر پھر تم دوبارہ مسلمانوں کے مقابلے میں آؤ گے تو ہم بھی دوبارہ ان کی مدد کریں گے اور تمہاری جماعت کثرت کے باوجود تمہارے کچھ کام نہ آئے گی۔

(۱) یعنی سن لینے کے باوجود، عمل نہ کرنا، یہ کافروں کا طریقہ ہے، تم اس رویے سے بچو۔ اگلی آیت میں ایسے ہی لوگوں کو برہہ گونگا، غیر عاقل اور بدترین خلاق قرار دیا گیا ہے۔ دَوَابٌّ دَابَّةٌ کی جمع ہے، جو بھی زمین پر چلنے پھرنے والی چیز ہے وہ دابتہ ہے۔ مراد مخلوقات ہے۔ یعنی یہ سب سے بدتر ہیں جو حق کے معاملے میں ہرے گونگے اور غیر عاقل ہیں۔

(۲) اسی بات کو قرآن کریم میں دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا گیا ہے۔ ﴿لَهُمْ ظُلُومٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَ لَهُمْ آذَانٌ لَا يُسْمَعُونَ بِهَا وَ لَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَ لَهُمْ آفَافٌ لَا يُحِيسُونَ﴾ (الأعراف، ۷۹) ان کے دل ہیں، لیکن ان سے سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں، لیکن ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں یہ چوپائے کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ یہ لوگ (اللہ سے) بے خبر ہیں۔

(۳) یعنی ان کے سماع کو نافع بنا کر ان کو فہم صحیح عطا فرمادیتا، جس سے وہ حق کو قبول کر لیتے اور اسے اپنالیتے۔ لیکن چونکہ ان کے اندر خیر یعنی حق کی طلب ہی نہیں ہے، اس لیے وہ فہم صحیح سے ہی محروم ہیں۔

(۴) پہلے سماع سے مراد سماع نافع ہے۔ اس دوسرے سماع سے مراد مطلق سماع ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ انہیں حق بات سنا بھی دے تو چونکہ ان کے اندر حق کی طلب ہی نہیں ہے، اس لیے وہ بدستور اس سے اعراض ہی کریں گے۔

ہوں۔^(۱) اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ آدمی کے اور اس کے قلب کے درمیان آڑ بن جایا کرتا ہے^(۲) اور بلاشبہ تم سب کو اللہ ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔ (۲۳)

اور تم ایسے وبال سے بچو! کہ جو خاص کر صرف ان ہی لوگوں پر واقع نہ ہو گا جو تم میں سے ان گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں^(۳) اور یہ جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے (۲۵)

دَعَاكُمْ لِمَا يُحِبُّكُمْ وَعَظَمُوا أَنْ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ
الْعُرَىٰ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ نُحْمَرُونَ ﴿۲۳﴾

وَأَتَوْا فَئِنَّةَ لَا تُضَيِّبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ
خَاصَّةً وَعَظَمُوا أَنْ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾

(۱) لِمَا يُحِبُّكُمْ ایسی چیزوں کی طرف جس سے تمہیں زندگی ملے۔ بعض نے اس سے جہاد مراد لیا ہے کہ اس میں تمہاری زندگی کا سرو سامان ہے۔ بعض نے قرآن کے اوامرو نواہی اور احکام شرعیہ مراد لیے ہیں، جن میں جہاد بھی آجاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صرف اللہ اور رسول ﷺ کی بات مانو، اور اس پر عمل کرو، اسی میں تمہاری زندگی ہے۔

(۲) یعنی موت وارد کر کے، جس کا مزہ ہر نفس کو چکھنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قبل اس کے کہ تمہیں موت آجائے، اللہ اور رسول کی بات مان لو اور اس پر عمل کر لو۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے دل کے جس طرح قریب ہے اس میں اسے بطور تمثیل بیان کیا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ دلوں کے بھیدوں کو جانتا ہے، اس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ امام ابن جریر نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ وہ اپنے بندوں کے دلوں پر پورا اختیار رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے ان کے اور ان کے دلوں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انسان اس کی مشیت کے بغیر کسی چیز کو پا نہیں سکتا۔ بعض نے اسے جنگ بدر سے متعلق قرار دیا ہے کہ مسلمان دشمن کی کثرت سے خوف زدہ تھے تو اللہ تعالیٰ نے دلوں کے درمیان حائل ہو کر مسلمانوں کے دلوں میں موجود خوف کو امن سے بدل دیا۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ آیت کے یہ سارے ہی مفہوم مراد ہو سکتے ہیں (فتح القدیر) امام ابن جریر کے بیان کردہ مفہوم کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے، جن میں دین پر ثابت قدمی کی دعائیں کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”بنی آدم کے دل، ایک دل کی طرح رحمن کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، انہیں جس طرح چاہتا ہے پھیرتا رہتا ہے“ پھر آپ ﷺ نے یہ دعا پڑھی۔ اللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوبِ، صَرِّفْ قُلُوبَنَا إِلَىٰ طَاعَتِكَ (صحیح مسلم۔ کتاب القدر) باب تصریف اللہ تعالیٰ القلوب کیف شاء، اے دلوں کے پھیرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔ بعض روایات میں ثَبَّتْ قَلْبِي عَلَيَّ دِينِكَ (سنن ترمذی۔ أبواب القدر) کے الفاظ ہیں۔

(۳) اس سے مراد یا تو بندوں کا ایک دوسرے پر تسلط ہے جو بلا تخصیص، عام و خاص پر ظلم کرتے ہیں، یا وہ عام عذاب ہیں جو کثرت بارش یا سیلاب وغیرہ ارضی و سماوی آفات کی صورت میں آتے ہیں اور نیک و بد سب ہی ان سے متاثر ہوتے ہیں، یا بعض احادیث میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ترک کی وجہ سے عذاب کی جو عید بیان کی گئی ہے، وہ مراد ہے۔

اور اس حالت کو یاد کرو! جب کہ تم زمین میں قلیل تھے، کمزور شمار کئے جاتے تھے۔ اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ تم کو لوگ نوج کھوسٹ نہ لیں، سو اللہ نے تم کو رہنے کی جگہ دی اور تم کو اپنی نصرت سے قوت دی اور تم کو نفیس نفیس چیزیں عطا فرمائیں تاکہ تم شکر کرو۔^(۱) (۲۶)

اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول (کے حقوق) میں جانتے ہوئے خیانت مت کرو اور اپنی قابل حفاظت چیزوں میں خیانت مت کرو^(۲)۔ (۲۷)

اور تم اس بات کو جان رکھو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد ایک امتحان کی چیز ہے۔^(۳) اور اس بات کو بھی جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے پاس بڑا بھاری اجر ہے۔ (۲۸)

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ایک فیصلہ کی چیز دے گا اور تم سے تمہارے

وَأَذْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ مُسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ مَخَافُونَ أَنْ يَمَسَّكُمْ النَّاسُ فَأَنْتُمْ وَإَيْدِيكُمْ يُصِيرُ ۚ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۲۶﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمْثَلَكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۷﴾

وَعَلِمُوا أَنَّ مَالَكُمْ وَأَوْلَادَكُمْ فَغَنَّةٌ وَإِنَّ اللَّهَ عِنْدَ مَا آجُرَ عَظِيمٌ ﴿۲۸﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَشَقُّوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا

(۱) اس میں کمی زندگی کے شدائد و خطرات کا بیان اور اس کے بعد مدنی زندگی میں مسلمان جس آرام و راحت اور آسودگی سے بفضل الہی بہکنار ہوئے، اس کا تذکرہ ہے۔

(۲) اللہ اور رسول کے حقوق میں خیانت یہ ہے کہ جلوت میں اللہ اور رسول ﷺ کا تابع دار بن کر رہے اور خلوت میں اس کے برعکس معصیت کار۔ اسی طرح یہ بھی خیانت ہے کہ فرائض میں سے کسی فرض کا ترک اور نواہی میں سے کسی بات کا ارتکاب کیا جائے۔ اور ﴿وَتَخُونُوا أَمْثَلَكُمْ﴾ کا مطلب ایک شخص دوسرے کے پاس جو امانت رکھواتا ہے اس میں خیانت نہ کرے۔ نبی ﷺ نے بھی امانت کی حفاظت کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ اپنے اکثر خطبوں میں یہ ضرور ارشاد فرماتے تھے: لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ ۚ مُسْنَدُ أَحْمَدُ جلد ۳ صفحہ ۱۳۵ وقال الألبانی حدیث جید تعلیقات الألبانی علی المشکوٰۃ: ”اس کا ایمان نہیں، جس کے اندر امانت کی پاسداری نہیں اور اس کا دین نہیں، جس کے اندر عہد کی پابندی کا احساس نہیں۔“

(۳) مال اور اولاد کی محبت ہی عام طور پر انسان کو خیانت پر اور اللہ اور رسول کی اطاعت سے گریز پر مجبور کرتی ہے۔ اس لیے ان کو فتنہ (آزمائش) قرار دیا گیا ہے، یعنی اس کے ذریعے سے انسان کی آزمائش ہوتی ہے کہ ان کی محبت میں امانت اور اطاعت کے تقاضے پورے کرتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ پورے کرتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ اس آزمائش میں کامیاب ہے۔ بصورت دیگر ناکام۔ اس صورت میں یہی مال اور اولاد اس کے لیے عذاب الہی کا باعث بن جائیں گے۔

گناہ دور کر دے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔^(۲۹)

اور اس واقعہ کا بھی ذکر کیجئے! جب کہ کافر لوگ آپ کی نسبت تدبیر سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کر لیں، یا آپ کو قتل کر ڈالیں یا آپ کو خارج وطن کر دیں^(۲) اور وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور سب سے زیادہ مستحکم تدبیر والا اللہ ہے۔^(۳۰)

اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا، اگر ہم چاہیں تو اس کے برابر ہم بھی کہہ دیں، یہ تو کچھ بھی نہیں صرف بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے منقول چلی آ رہی ہیں۔^(۳۱)

اور جب کہ ان لوگوں نے کہا کہ اے اللہ! اگر یہ قرآن

وَيَكْفُرْ عَنْكُمْ سَمَائِكُمْ وَيَعْمَرُ لَكُمْ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝

وَأَذِيْمُكَ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُنْفِثُوكَ وَيَفْتُلُوكَ
أَوْ يَخْرُجُوكَ وَيَكْذِبُونَ وَيَسْكَرُونَ وَاللَّهُ
خَيْرُ الْكَافِرِينَ ۝

وَأَذِيْمُكَ عَلَيْهِمُ أَيُّنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ
لَعَلَّنَا مِثْلُ هَذَا إِنْ هَذَا إِلَّا آسَاطِيرُ
الْأَوَّلِينَ ۝

وَأَذِيْمُكَ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ

(۱) تقویٰ کا مطلب ہے، اوامر الہی کی مخالفت اور اس کے منہا ہی کے ارتکاب سے بچنا۔ اور فرقان کے کئی معنی بیان کیے گئے ہیں مثلاً ایسی چیز جس سے حق و باطل کے درمیان فرق کیا جاسکے۔ مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کی بدولت دل مضبوط، بصیرت تیز تر اور ہدایت کا راستہ واضح تر ہو جاتا ہے، جس سے انسان کو ہر ایسے موقع پر، جب عام انسان التباس و اشتباہ کی وادیوں میں بھٹک رہے ہوں، صراطِ مستقیم کی توفیق مل جاتی ہے۔ علاوہ ازیں فتح و نصرت اور نجات و مخرج بھی اس کے معنی کیے گئے ہیں۔ اور سارے ہی معانی مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ تقویٰ سے یقیناً یہ سارے ہی فوائد حاصل ہوتے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ تکفیرِ سیئات، مغفرتِ ذنوب اور فضلِ عظیم بھی حاصل ہوتا ہے۔

(۲) یہ اس سازش کا تذکرہ ہے جو رؤسائے مکہ نے ایک رات دارالندوہ میں تیار کی تھی اور بالآخر یہ طے پایا تھا کہ مختلف قبیلوں کے نوجوانوں کو آپ کے قتل پر مامور کیا جائے تاکہ کسی ایک کو قتل کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے بلکہ دیت دے کر جان چھوٹ جائے۔

(۳) چنانچہ اس سازش کے تحت ایک رات یہ نوجوان آپ کے گھر کے باہر اس انتظار میں کھڑے رہے کہ آپ ﷺ باہر نکلیں تو آپ کا کام تمام کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس سازش سے آگاہ فرمادیا اور آپ ﷺ نے گھر سے باہر نکلنے وقت مٹی کی ایک مٹھی لی اور ان کے سروں پر ڈالتے ہوئے نکل گئے، کسی کو آپ ﷺ کے نکلنے کا پتہ ہی نہیں لگا، حتیٰ کہ آپ غار ثور میں پہنچ گئے۔ یہ کافروں کے مقابلے میں اللہ کی تدبیر تھی۔ جس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں کر سکتا۔ (مکر کے معنی کے لیے دیکھئے: آل عمران - ۵۳ کا حاشیہ)

فَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ وَوَأَنزَلْنَا
بَعْدَ ذَلِكَ الْيَوْمِ

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللَّهُ
مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ

وَمَا لَهُمْ آلِيَاءُ يَعْبُدُ لَهُمْ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ إِنْ أَوْلِيَآؤُهُ إِلَّا الْمُتَفُونُونَ
وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً
وَتَصَدِيَةً وَقَوْلًا عَدَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ

آپ کی طرف سے واقعی ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا
یا ہم پر کوئی دردناک عذاب واقع کر دے۔ (۳۲)

اور اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرے گا کہ ان میں آپ کے ہوتے
ہوئے ان کو عذاب دے^(۱) اور اللہ ان کو عذاب نہ دے گا
اس حالت میں کہ وہ استغفار بھی کرتے ہوں۔ (۳۳)

اور ان میں کیا بات ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ سزا نہ دے
حالانکہ وہ لوگ مسجد حرام سے روکتے ہیں، جب کہ وہ
لوگ اس مسجد کے متولی نہیں۔ اس کے متولی تو سوا
متقیوں کے اور اشخاص نہیں، لیکن ان میں اکثر لوگ علم
نہیں رکھتے۔ (۳۴)

اور ان کی نماز کعبہ کے پاس صرف یہ تھی بیسیاں بجانا اور
تالیان بجانا۔^(۲) سوا اپنے کفر کے سبب اس عذاب
کا مزہ چکھو۔ (۳۵)

(۱) یعنی پیغمبر کی موجودگی میں قوم پر عذاب نہیں آتا اس لحاظ سے آپ ﷺ کا وجود گرامی بھی ان کے حفظ و امان کا سبب تھا۔

(۲) اس سے مراد یہ ہے کہ وہ آئندہ مسلمان ہو کر استغفار کریں گے، یا یہ کہ طواف کرتے وقت مشرکین غُفْرَانَكَ رَبَّنَا غُفْرَانَكَ کہا کرتے تھے۔

(۳) یعنی وہ مشرکین اپنے آپ کو مسجد حرام (خانہ کعبہ) کا متولی سمجھتے تھے اور اس اعتبار سے جس کو چاہتے طواف کی
اجازت دیتے اور جس کو چاہتے نہ دیتے۔ چنانچہ مسلمانوں کو بھی وہ مسجد حرام میں آنے سے روکتے تھے۔ دراصل حالیکہ وہ
اس کے متولی ہی نہیں تھے، تَحَاكُمًا (زبردستی) بنے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اس کے متولی تو متقی افراد ہی بن
سکتے ہیں نہ کہ مشرک۔ علاوہ ازیں اس آیت میں جس عذاب کا ذکر ہے، اس سے مراد فتح مکہ ہے جو مشرکین کے لیے
عذاب الیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے قبل کی آیت میں جس عذاب کی نفی ہے، جو پیغمبر کی موجودگی یا استغفار کرتے
رہنے کی وجہ سے نہیں آتا، اس سے مراد عذاب استیصال اور ہلاکت کلی ہے۔ عبرت و تنبیہ کے طور پر چھوٹے موٹے
عذاب اس کے منافی نہیں۔

(۴) مشرکین جس طرح بیت اللہ کا ننگا طواف کرتے تھے، اسی طرح طواف کے دوران وہ انگلیاں منہ میں ڈال کر بیسیاں
اور ہاتھوں سے تالیان بجاتے۔ اس کو بھی وہ عبادت اور نیکی تصور کرتے تھے، جس طرح آج بھی جاہل صوفی مسجدوں اور
آستانوں میں رقص کرتے، ڈھول پیٹتے اور دھمالیں ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں۔ یہی ہماری نماز اور عبادت ہے۔ ناچ ناچ کر
ہم اپنے یار (اللہ) کو منائیں گے نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ هَذِهِ الْخُرَافَاتِ .

بلاشک یہ کافر لوگ اپنے مالوں کو اس لئے خرچ کر رہے ہیں کہ اللہ کی راہ سے روکیں سو یہ لوگ تو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہی رہیں گے، پھر وہ مال ان کے حق میں باعث حسرت ہو جائیں گے۔ پھر مغلوب ہو جائیں گے اور کافر لوگوں کو دوزخ کی طرف جمع کیا جائے گا۔^(۱) (۳۶)

تاکہ اللہ تعالیٰ ناپاک کو پاک سے الگ کر دے^(۲) اور ناپاکوں کو ایک دوسرے سے ملا دے، پس ان سب کو اکٹھا ڈھیر کر دے پھر ان سب کو جہنم میں ڈال دے۔ ایسے لوگ پورے خسارے میں ہیں۔ (۳۷)

آپ ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ باز آجائیں تو ان کے سارے گناہ جو پہلے ہو چکے ہیں

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدَّوْا عَن سَبِيلِ اللَّهِ فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُجْرُونَ ﴿۳۶﴾

لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَاتِ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَاتِ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَجْعَلُهُنَّ جَمِيعًا فَيَجْعَلُهُنَّ فِي جَهَنَّمَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿۳۷﴾

ثُمَّ لَلَّذِينَ كَفَرُوا وَالَّذِينَ يُؤْتُوا نَفَقًا لَّهُمْ مَا قَدَّ سَلَفٌ وَلَا يَتُوبُونَ فَلَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْأَوَّلِينَ ﴿۳۸﴾

(۱) جب قریش مکہ کو بدر میں شکست ہوئی اور ان کے شکست خوردہ اصحاب مکہ واپس گئے۔ ادھر سے ابو سفیان بھی اپنا تجارتی قافلہ لے کر وہاں پہنچ چکے تھے تو کچھ لوگ، جن کے باپ، بیٹے یا بھائی اس جنگ میں مارے گئے تھے، ابو سفیان اور جن کا اس تجارتی سامان میں حصہ تھا، ان کے پاس گئے اور ان سے استدعا کی کہ وہ اس مال کو مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لیے استعمال کریں۔ مسلمانوں نے ہمیں بڑا سخت نقصان پہنچایا ہے اس لیے ان سے انتقامی جنگ ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انہی لوگوں یا اسی قسم کا کردار اپنانے والوں کے بارے میں فرمایا کہ بے شک یہ لوگ اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکنے کے لیے اپنا مال خرچ کر لیں لیکن ان کے حصے میں سوائے حسرت اور مغلوبیت کے کچھ نہیں آئے گا اور آخرت میں ان کا ٹھکانہ جہنم ہو گا۔

(۲) یہ علیحدگی یا تو آخرت میں ہوگی کہ اہل سعادت کو اہل شقاوت سے الگ کر دیا جائے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَمَّا ذُو الْقَوْمِ أَنِبْنَا الْمَعْمُورِينَ﴾ (سورۃ یونس: ۵۹) ”اے گناہ گارو! آج الگ ہو جاؤ“ یعنی نیک لوگوں سے اور مجرموں یعنی کافروں، مشرکوں اور نافرمانوں کو اکٹھا کر کے سب کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ یا پھر اس کا تعلق دنیا سے ہے اور لام تعلیل کے لیے ہے۔ یعنی کافر اللہ کے راستے سے روکنے کے لیے جو مال خرچ کر رہے ہیں، ہم ان کو ایسا کرنے کا موقع دیں گے تا کہ اس طریقے سے اللہ تعالیٰ خبیث کو طیب سے، کافر کو مومن سے اور منافق کو مخلص سے علیحدہ کر دے۔ اس اعتبار سے آیت کے معنی ہوں گے، کفار کے ذریعے سے ہم تمہاری آزمائش کریں گے، وہ تم سے لڑیں گے اور ہم انہیں ان کے مال بھی لڑائی پر خرچ کرنے کی قدرت دیں گے تاکہ خبیث، طیب سے ممتاز ہو جائے۔ پھر وہ خبیث کو ایک دوسرے سے ملا دے گا یعنی سب کو جمع کر دے گا۔ (ابن کثیر)

سب معاف کر دیئے جائیں گے^(۱) اور اگر اپنی وہی عادت رکھیں گے تو (کفار) سابقین کے حق میں قانون نافذ ہو چکا ہے۔^(۲) (۳۸)

اور تم ان سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فساد عقیدہ نہ رہے۔^(۳) اور دین اللہ ہی کا ہو جائے،^(۴) پھر اگر یہ باز آ جائیں تو اللہ تعالیٰ ان اعمال کو خوب دیکھتا ہے۔^(۵) (۳۹)

اور اگر روگردانی کریں^(۶) تو یقین رکھیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارا کارساز ہے،^(۷) وہ بہت اچھا کارساز ہے اور بہت اچھا مددگار ہے۔^(۸) (۴۰)

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ
بِاللَّهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

وَإِن تَوَلَّوْا فَاغْلُظْوا إِنَّ اللَّهَ مَوْلَاكُمْ نِعْمَ الْمَوْلَى
وَنِعْمَ النَّصِيرُ ۝

(۱) باز آ جانے کا مطلب 'مسلمان ہونا ہے۔ جس طرح حدیث میں بھی ہے "جس نے اسلام قبول کر کے نیکی کا راستہ اپنا لیا، اس سے اس کے ان گناہوں کی باز پرس نہیں ہوگی جو اس نے جاہلیت میں کیے ہوں گے اور جس نے اسلام لا کر بھی برائی نہ چھوڑی، اس سے اگلے پچھلے سب عملوں کا مؤاخذہ ہوگا۔" (صحیح بخاری، کتاب استنابۃ المرتدین۔ و صحیح مسلم۔ کتاب الإیمان، باب هل یؤاخذ بأعمال الجاہلیۃ، ایک اور حدیث میں ہے الإسلام یَجِبُ مَا قَبْلَهُ (مسند أحمد۔ جلد ۳، ص ۱۹۹) "اسلام ما قبل کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔"

(۲) یعنی اگر وہ اپنے کفر و عناد پر قائم رہے تو جلد یا بدیر عذاب الہی کے مورد بن کر رہیں گے۔

(۳) فتنہ سے مراد شرک ہے۔ یعنی اس وقت تک جہاد جاری رکھو، جب تک شرک کا خاتمہ نہ ہو جائے۔

(۴) یعنی اللہ کی توحید کا پھر پورا چار دانگ عالم میں لہرا جائے۔

(۵) یعنی تمہارے لیے ان کا ظاہری اسلام ہی کافی ہے، باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دو، کیونکہ اس کو ظاہر و باطن ہر چیز کا علم ہے۔

(۶) یعنی اسلام قبول نہ کریں اور اپنے کفر اور تمہاری مخالفت پر مصر رہیں۔

(۷) یعنی تمہارے دشمنوں پر تمہارا مددگار اور تمہارا حامی و محافظ ہے۔

(۸) پس کامیاب بھی وہی ہو گا جس کا مولیٰ اللہ ہو، اور غالب بھی وہی ہو گا جس کا مددگار وہ ہو۔

جان لو کہ تم جس قسم کی جو کچھ غنیمت حاصل کرو^(۱) اس میں سے پانچواں حصہ تو اللہ کا ہے اور رسول کا اور قرابت داروں کا اور یتیموں اور مسکینوں کا اور مسافروں کا،^(۲) اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر اس دن اتارا ہے،^(۳) جو دن حق و باطل کی جدائی کا تھا^(۴) جس دن دو فوجیں بھڑک گئی تھیں۔^(۵)

اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۴۱)

وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ حُمْسَهُ وَ
لِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ
السَّبِيلِ ۚ إِنَّكُمْ أُمَّتُهُمْ يَوْمَئِذٍ وَ مَا أَنزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ
الْفُرْقَانِ يَوْمَ التَّتَلَّىٰ الْجَمْعِينَ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

(۱) غنیمت سے مراد وہ مال ہے جو کافروں سے، کافروں پر لڑائی میں فتح و غلبہ حاصل ہونے کے بعد، حاصل ہو۔ پہلی امتوں میں اس کے لیے یہ طریقہ تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد کافروں سے حاصل کردہ سارا مال ایک جگہ ڈھیر کر دیا جاتا، آسمان سے آگ آتی اور اسے جلا کر بھسم کر ڈالتی۔ لیکن امت مسلمہ کے لیے یہ مال غنیمت حلال کر دیا گیا۔ اور جو مال بغیر لڑائی کے صلح کے ذریعے یا جزیہ و خراج سے وصول ہو، اسے فنیہ کہا جاتا ہے۔ کبھی غنیمت کو بھی فنیہ سے تعبیر کر لیا جاتا ہے۔ من شئیء سے مراد جو کچھ بھی ہو۔ یعنی تھوڑا ہو یا زیادہ، قیمتی ہو یا معمولی، سب کو جمع کر کے اس کی تقسیم حسب ضابطہ کی جائے گی۔ کسی سپاہی کو اس میں سے کوئی چیز تقسیم سے قبل اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔

(۲) اللہ کا لفظ تو بطور تبرک، نیز اس لیے ہے کہ ہر چیز کا اصل مالک وہی ہے اور حکم بھی اسی کا چلتا ہے۔ مراد اللہ اور اس کے رسول کے حصہ سے ایک ہی ہے، یعنی سارے مال غنیمت کے پانچ حصے کر کے چار حصے تو ان مجاہدین میں تقسیم کیے جائیں گے جنہوں نے جنگ میں حصہ لیا۔ ان میں بھی پیادہ کو ایک حصہ اور سوار کو تین گنا حصہ ملے گا۔ پانچواں حصہ، جسے عربی میں خمس کہتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس کے پھر پانچ حصے کیے جائیں گے۔ ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا (اور آپ ﷺ کے بعد اسے مفاد عامہ میں خرچ کیا جائے گا) جیسا کہ خود آپ ﷺ بھی یہ حصہ مسلمانوں پر ہی خرچ فرماتے تھے بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا بھی ہے۔ وَالْخُمْسُ مَرْدُودٌ عَلَيْكُمْ (سنن النسائی۔ وصحیحہ الألبانی فی صحیح النسائی / ۳۸۵۸۔ ومسند أحمد جلد ۵۔ ص ۳۱۹) یعنی ”میرا جو پانچواں حصہ ہے وہ بھی مسلمانوں کے مصالح پر ہی خرچ ہوتا ہے“ دوسرا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کا، پھر یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کا۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ خمس حسب ضرورت خرچ کیا جائے گا۔

(۳) اس نزول سے مراد فرشتوں کا اور آیات الہی (معجزات وغیرہ) کا نزول ہے جو بدر میں ہوا۔

(۴) بدر کی جنگ ۱۲/ ہجری ۱۷/ رمضان المبارک کو ہوئی۔ اس دن کو یوم الفرقان اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ کافروں اور مسلمانوں کے درمیان پہلی جنگ تھی اور مسلمانوں کو فتح و غلبہ دے کر واضح کر دیا گیا کہ اسلام حق ہے اور کفر و شرک باطل ہے۔

(۵) یعنی مسلمانوں اور کافروں کی فوجیں۔

جب کہ تم پاس والے کنارے پر تھے اور وہ دور والے کنارے پر تھے (۱) اور قافلہ تم سے نیچے تھا۔ (۲) اگر تم آپس میں وعدے کرتے تو یقیناً تم وقت معین پر پہنچنے میں مختلف ہو جاتے۔ (۳) لیکن اللہ کو تو ایک کام کر ہی ڈالنا تھا جو مقرر ہو چکا تھا تاکہ جو ہلاک ہو، دلیل پر (یعنی یقین جان کر) ہلاک ہو اور جو زندہ رہے، وہ بھی دلیل پر (حق پہچان کر) زندہ رہے۔ (۴) بیشک اللہ بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے۔ (۴۲)

جب کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے تیرے خواب میں ان کی تعداد کم دکھائی، اگر ان کی زیادتی دکھاتا تو تم بزدل ہو جاتے اور اس کام کے بارے میں آپس میں اختلاف کرتے لیکن اللہ تعالیٰ نے بچالیا، وہ دلوں کے بھیدوں سے خوب آگاہ ہے۔ (۵) (۴۳)

إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُمْ لَخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ وَلَكِن لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيْتِنَا وَيُعَيَّبَ مَنْ حَتَّىٰ عَن بَيْتِنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَلْسَمِيمِ عَلِيمٌ ﴿٤٢﴾

إِذْ يُرِيكُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكُمْ قَلِيلًا وَلَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ لَخْتَلَفْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِن لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيْتِنَا وَيُعَيَّبَ مَنْ حَتَّىٰ عَن بَيْتِنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَلْسَمِيمِ عَلِيمٌ ﴿٤٣﴾

(۱) دنیا- دُنُو سے ہے، بمعنی قریب۔ مراد ہے وہ کنارہ جو مدینہ شہر کے قریب تھا۔ قصویٰ کہتے ہیں دور کو۔ کافر اس کنارے پر تھے جو مدینہ سے نسبتاً دور تھا۔

(۲) اس سے مراد وہ تجارتی قافلہ ہے جو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی قیادت میں شام سے مکہ جا رہا تھا اور جسے حاصل کرنے کے لیے ہی دراصل مسلمان اس طرف آئے تھے۔ یہ پہاڑ سے بہت دور مغرب کی طرف نشیب میں تھا، جب کہ بدر کا مقام، جہاں جنگ ہوئی، بلندی پر تھا۔

(۳) یعنی اگر جنگ کے لیے باقاعدہ دن اور تاریخ کا ایک دوسرے کے ساتھ وعدہ یا اعلان ہو تا تو ممکن بلکہ یقین تھا کہ کوئی فریق لڑائی کے بغیر ہی پسپائی اختیار کر لیتا لیکن چونکہ اس جنگ کا جو نا اللہ نے لکھ رکھا تھا، اس لیے ایسے اسباب پیدا کر دیئے گئے کہ دونوں فریق بدر کے مقام پر ایک دوسرے کے مقابل بغیر پیشگی وعدہ و وعید کے، صف آرا ہو جائیں۔

(۴) یہ علت ہے اللہ کی اس تقدیری مشیت کی جس کے تحت بدر میں فریقین کا اجتماع ہوا، تاکہ جو ایمان پر زندہ رہے تو وہ دلیل کے ساتھ زندہ رہے اور اسے یقین ہو کہ اسلام حق ہے کیونکہ اس کی حقانیت کا مشاہدہ وہ بدر میں کر چکا ہے اور جو کفر کے ساتھ ہلاک ہو تو وہ بھی دلیل کے ساتھ ہلاک ہو کیونکہ اس پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ مشرکین کا راستہ گمراہی اور باطل کا راستہ ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں کافروں کی تعداد تھوڑی دکھائی اور وہی تعداد آپ نے صحابہ کرام

جبکہ اس نے بوقت ملاقات انہیں تمہاری نگاہوں میں بہت کم دکھائے اور تمہیں ان کی نگاہوں میں کم دکھائے^(۱) تاکہ اللہ تعالیٰ اس کام کو انجام تک پہنچا دے جو کرنا ہی تھا^(۲) اور سب کام اللہ ہی کی طرف پھیرے جاتے ہیں۔ (۴۴)

اے ایمان والو! جب تم کسی مخالف فوج سے بھڑ جاؤ تو ثابت قدم رہو اور بکثرت اللہ کو یاد کرو تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔^(۳) (۴۵)

اور اللہ کی اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتے رہو، آپس میں اختلاف نہ کرو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر و سہار رکھو، یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔^(۴) (۴۶)

وَإِذْ يُرِيدُكُمْ اللَّهُمَّ إِذِ التَّقِيْتُمْ فِي آعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَقَلِيلًا لَكُمْ فِي آعْيُنِهِمْ يَقْضَى اللَّهُ آمْرًا كَانَ مَعْمُولًا ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿۴۴﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا الْقِيْتُمْ فِئَةً فَأَثَبُوا ۖ وَادْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۴۵﴾

وَاطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ ۖ وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۴۶﴾

کے سامنے بیان فرمائی، جس سے ان کے حوصلے بڑھ گئے، اگر اس کے برعکس کافروں کی تعداد زیادہ دکھائی جاتی تو صحابہ میں پست بہتی پیدا ہونے اور باہمی اختلاف کا اندیشہ تھا۔ لیکن اللہ نے ان دونوں باتوں سے بچالیا۔

(۱) تاکہ وہ کافر بھی تم سے خوف کھا کر پیچھے نہ ہٹیں۔ پہلا واقعہ خواب کا تھا اور یہ دکھانا عین قتال کے وقت تھا، جیسا کہ الفاظ قرآنی سے واضح ہے۔ تاہم یہ معاملہ ابتدا میں تھا۔ لیکن جب باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی تو پھر کافروں کو مسلمان اپنے سے دوگنا نظر آتے تھے۔ جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۳ سے معلوم ہوتا ہے۔ بعد میں زیادہ دکھانے کی حکمت یہ نظر آتی ہے کہ کثرت دیکھ کر ان کے اندر مسلمانوں کا خوف اور دہشت بیٹھ جائے، جس سے ان کے اندر بزدلی اور پست بہتی پیدا ہو، اس کے برعکس پہلے کم دکھانے میں حکمت یہ تھی کہ وہ لڑنے سے گریز نہ کریں۔

(۲) اس سب کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا ہوا تھا وہ پورا ہوا جائے۔ اس لیے اس نے اسکے اسباب پیدا فرمادیئے۔

(۳) اب مسلمانوں کو لڑائی کے وہ آداب بتائے جا رہے ہیں جن کو دشمن سے مقابلے کے وقت ملحوظ رکھنا ضروری ہے سب سے پہلی بات ثابت قدمی اور استقلال ہے، کیونکہ اس کے بغیر میدان جنگ میں ٹھہرنا ممکن ہی نہیں ہے تاہم اس سے تحرف اور تہیز کی وہ دونوں صورتیں مستثنیٰ ہوں گی جن کی پہلے وضاحت کی جا چکی ہے۔ کیونکہ بعض دفعہ ثابت قدمی کے لیے بھی تحرف یا تہیز ناگزیر ہوتا ہے۔ دوسری ہدایت یہ کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ تاکہ مسلمان اگر تھوڑے ہوں تو اللہ کی مدد کے طالب رہیں اور اللہ بھی کثرت ذکر کی وجہ سے ان کی طرف متوجہ رہے اور اگر مسلمان تعداد میں زیادہ ہوں تو کثرت کی وجہ سے ان کے اندر عجب اور غرور پیدا نہ ہو، بلکہ اصل توجہ اللہ کی امداد پر ہی رہے۔

(۴) تیسری ہدایت، اللہ اور رسول کی اطاعت، ظاہر بات ہے ان نازک حالات میں اللہ اور رسول کی نافرمانی کتنی سخت خطرناک ہو سکتی ہے۔ اس لیے ایک مسلمان کے لیے ویسے تو ہر حالت میں اللہ اور رسول کی اطاعت ضروری ہے۔ تاہم

ان لوگوں جیسے نہ بنو جو اترتے ہوئے اور لوگوں میں خود نمائی کرتے ہوئے اپنے گھروں سے چلے اور اللہ کی راہ سے روکتے تھے،^(۱) جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اسے گھیر لینے والا ہے۔ (۳۷)

جبکہ ان کے اعمال کو شیطان انھیں زینت دار دکھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ لوگوں میں سے کوئی بھی آج تم پر غالب نہیں آ سکتا، میں خود بھی تمہارا حمایتی ہوں لیکن جب دونوں جماعتیں نمودار ہوئیں تو اپنی ایڑیوں کے بل پیچھے ہٹ گیا اور کہنے لگا میں تو تم سے بری ہوں۔ میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے۔^(۲) میں اللہ سے ڈرتا ہوں،^(۳) اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔^(۴) (۳۸)

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ بَدَأُوا بَطْرًا وَرَأَى
النَّاسَ وَيَصُدُّونَ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ وَاللَّهُ يَمَّا
يَعْمَلُونَ حُجَيْطٌ ۝

وَأَذْرَيْنَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لِغَالِبٍ لَّهُ
الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّهُمْ فَلَمَّا تَرَ آيَاتِ الْفَتْحِ
نَكَصَ عَلَى عَقَبَيْهِ وَقَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنْكُمْ إِنِّي أَرَى مَا لَا تَرَوْنَ
إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

میدان جنگ میں اس کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے اور اس موقع پر تھوڑی سی بھی نافرمانی اللہ کی مدد سے محرومی کا باعث بن سکتی ہے۔ چوتھی ہدایت کہ آپس میں تنازع اور اختلاف نہ کرو، اس سے تم بزدل ہو جاؤ گے اور ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور پانچویں ہدایت کہ صبر کرو! یعنی جنگ میں کتنی بھی شدت آجائے اور تمہیں کتنے بھی کٹھن مراحل سے گزرنا پڑے لیکن صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک حدیث میں فرمایا۔ ”لوگو! دشمن سے مدد بھیر کر آرزومت کرو اور اللہ سے غافیت مانگا کرو! تاہم جب کبھی دشمن سے لڑائی کا موقع پیدا ہو جائے تو صبر کرو (یعنی جم کر لڑو) اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے“ (صحیح بخاری۔ کتاب الجہاد، باب کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم إذا لم یقاتل أول النهار أحر القتال حتی تنزل الشمس)

(۱) مشرکین مکہ جب اپنے قافلے کی حفاظت اور لڑائی کی نیت سے نکلے، تو بڑے اترتے اور فخر و غرور کرتے ہوئے نکلے، مسلمانوں کو اس کا فرانہ شیوے سے روکا گیا ہے۔

(۲) مشرکین جب مکہ سے روانہ ہوئے تو انہیں اپنے حریف قبیلے بنی بکر بن کنانہ سے اندیشہ تھا کہ وہ پیچھے سے انہیں نقصان نہ پہنچائے، چنانچہ شیطان سراقہ بن مالک کی صورت بنا کر آیا، جو بنی بکر بن کنانہ کے ایک سردار تھے، اور انہیں نہ صرف فتح و غلبہ کی بشارت دی بلکہ اپنی حمایت کا بھی پورا یقین دلایا۔ لیکن جب ملا کہ کی صورت میں امداد الہی اسے نظر آئی تو ایڑیوں کے بل بھاگ کھڑا ہوا۔

(۳) اللہ کا خوف تو اس کے دل میں کیا ہونا تھا؟ تاہم اسے یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کو اللہ کی خاص مدد حاصل ہے۔ مشرکین ان کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکیں گے۔

(۴) ممکن ہے یہ شیطان کے کلام کا حصہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے جملہ مستانفہ ہو۔

جبکہ منافق کہہ رہے تھے اور وہ بھی جن کے دلوں میں روگ تھا^(۱) کہ انہیں تو ان کے دین نے دھوکے میں ڈال دیا ہے^(۲) جو بھی اللہ پر بھروسہ کرے اللہ تعالیٰ بلاشک و شبہ غلبے والا اور حکمت والا ہے۔^(۳) (۴۹)

کاش کہ تو دیکھتا جب کہ فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں ان کے منہ پر اور سرینوں پر مار مارتے ہیں (اور کہتے ہیں) تم جلنے کا عذاب چکھو۔^(۴) (۵۰)

یہ سبب ان کاموں کے جو تمہارے ہاتھوں نے پہلے ہی بھیج رکھا ہے بیشک اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔^(۵) (۵۱)

إِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ غَرَّ هَؤُلَاءِ دِينُهُمْ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۴۹﴾

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَكَّلُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَىٰ اللَّيْلِ لَأَبْصُرُوا وَجُوهَهُمْ وَآدْبَارَهُمْ وَذُؤُقُوا عَبَابَ الْحَرِيِّنَ ﴿۵۰﴾

ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمْنَا مِنْ آيَاتِكَ وَإِنَّ اللَّهَ لَيَسَّرُ لِمَنْ يَشَاءُ لِمَ لَعْنَيْدٍ ﴿۵۱﴾

(۱) اس سے مراد یا تو وہ مسلمان ہیں جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور مسلمانوں کی کامیابی کے بارے میں انہیں شک تھا، یا اس سے مراد مشرکین ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مدینہ میں رہنے والے یہودی مراد ہوں۔

(۲) یعنی ان کی تعداد تو دیکھو اور سروسامان کا جو حال ہے، وہ بھی ظاہر ہے۔ لیکن یہ مقابلہ کرنے چلے ہیں مشرکین مکہ سے، جو تعداد میں بھی ان سے کہیں زیادہ ہیں اور ہر طرح کے سامان حرب اور وسائل سے مالا مال بھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دین نے ان کو دھوکے اور فریب میں ڈال دیا ہے۔ اور یہ موٹی سی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان اہل دنیا کو اہل ایمان کے عزم و ثبات کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے جن کا توکل اللہ کی ذات پر ہے، جو غالب ہے یعنی اپنے پر بھروسہ کرنے والوں کو وہ بے سہارا نہیں چھوڑتا اور حکیم بھی ہے اس کے ہر فعل میں حکمت بالغہ ہے جس کے ادراک سے انسانی عقلیں قاصر ہیں۔

(۴) بعض مفسرین نے اسے جنگ بدر میں قتل ہونے والے مشرکین کی بابت قرار دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب مشرکین مسلمانوں کی طرف آتے تو مسلمان ان کے چروں پر تلواریں مارتے، جس سے بچنے کے لیے وہ پیٹھ پھیر کر بھاگتے تو فرشتے ان کی دبروں پر تلواریں مارتے۔ لیکن یہ آیت عام ہے جو ہر کافر و مشرک کو شامل ہے اور مطلب یہ ہے کہ موت کے وقت فرشتے ان کے مونہوں اور پشتوں (یا دبروں یعنی چوڑوں) پر مارتے ہیں، جس طرح سورہ انعام میں بھی فرمایا گیا ہے: ﴿وَاللَّيْلَةَ نَاسِطُونَ أَعْيُنَهُمْ﴾ (آیت-۹۳) ”فرشتے ان کو مارنے کے لیے ہاتھ دراز کرتے ہیں“ اور بعض کے نزدیک فرشتوں کی یہ ماریاقت والے دن جہنم کی طرف لے جاتے ہوئے ہوگی اور داروغہ جہنم کے گا ”تم جلنے کا عذاب چکھو“

(۵) یہ ضرب و عذاب تمہارے اپنے کرتوتوں کا نتیجہ ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے، بلکہ وہ تو عادل ہے جو ہر قسم کے ظلم و جور سے پاک ہے۔ حدیث قدسی میں بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے میرے بندو! میں

مثل فرعونیوں کے حال کے اور ان سے اگلوں کے،^(۱) انہوں نے اللہ کی آیتوں سے کفر کیا پس اللہ نے ان کے گناہوں کے باعث انھیں پکڑ لیا۔ اللہ تعالیٰ یقیناً قوت والا اور سخت عذاب والا ہے۔ (۵۲)

یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ کسی قوم پر کوئی نعمت انعام فرما کر پھر بدل دے جب تک کہ وہ خود اپنی اس حالت کو نہ بدل دیں جو کہ ان کی اپنی تھی^(۲) اور یہ کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (۵۳)

مثل حالت فرعونیوں کے اور ان سے پہلے کے لوگوں کے کہ انہوں نے اپنے رب کی باتیں جھٹلائیں۔ پس ان کے گناہوں کے باعث ہم نے انہیں برباد کیا اور فرعونیوں کو ڈبو دیا۔ یہ سارے ظالم تھے۔^(۳) (۵۴)

تمام جانداروں سے بدتر، اللہ کے نزدیک وہ ہیں جو کفر

كَذَّابٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَآخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾

ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ كَرِهَ لَكُمْ تَوَخُّطَهُمْ أَنِعْمَهُمْ عَلَيْكُمْ وَخَفِيَ بِغَيْرِ مَا يَأْتِيهِمْ وَأَنَّ اللَّهَ سَبِيحٌ عَلِيمٌ ﴿۵۳﴾

كَذَّابٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ فَأَمْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَكُلَّهُمْ كَانُوا ظَالِمِينَ ﴿۵۴﴾

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۵۵﴾

نے اپنے نفس پر ظلم حرام کیا ہے اور میں نے اسے تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے پس تم ایک دوسرے پر ظلم مت کرو۔ اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں نے شمار کر کے رکھے ہوئے ہیں، پس جو اپنے اعمال میں بھلائی پائے، اس پر اللہ کی حمد کرے اور جو اس کے برعکس پائے تو وہ اپنے آپ کو ہی ملامت کرے۔ (صحیح مسلم کتاب البر، باب تحریم الظلم)

(۱) ذَابُّ کے معنی ہیں عادت۔ کاف تشبیہ کے لیے ہے۔ یعنی ان مشرکین کی عادت یا حال، اللہ کے پیغمبروں کے جھٹلانے میں، اسی طرح ہے جس طرح فرعون اور اس سے قبل دیگر مکذبین کی عادت یا حال تھا۔

(۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم کفرانِ نعمت کا راستہ اختیار کرے اور اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی سے اعراض کر کے اپنے احوال و اخلاق کو نہیں بدل لیتی، اللہ تعالیٰ اس پر اپنی نعمتوں کا دروازہ بند نہیں فرماتا۔ دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ گناہوں کی وجہ سے اپنی نعمتیں سلب فرما لیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کا مستحق بننے کے لیے ضروری ہے کہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔ گویا تبدیلی کا مطلب یہی ہے کہ قوم گناہوں کو چھوڑ کر اطاعتِ الہی کا راستہ اختیار کرے۔

(۳) یہ اسی بات کی تاکید ہے جو پہلے گزری، البتہ اس میں ہلاکت کی صورت کا اضافہ ہے کہ انہیں غرق کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں یہ واضح کر دیا کہ اللہ نے ان کو غرق کر کے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ یہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے۔ اللہ تو کسی پر ظلم نہیں کرتا ﴿وَمَا زَيْتُكَ بِظَلْمِ الْعَبِيدِ﴾ ﴿تم السجدة ۴۶﴾

کریں، پھر وہ ایمان نہ لائیں۔^(۱) (۵۵)

جن سے آپ نے عہد و پیمان کر لیا پھر بھی وہ اپنے عہد و پیمان کو ہر مرتبہ توڑ دیتے ہیں اور بالکل پرہیز نہیں کرتے۔^(۲) (۵۶)

پس جب کبھی تو لڑائی میں ان پر غالب آجائے انہیں ایسی مار مار کر ان کے پچھلے بھی بھاگ کھڑے ہوں^(۳) ہو سکتا ہے کہ وہ عبرت حاصل کریں۔ (۵۷)

اور اگر تجھے کسی قوم کی خیانت کا ڈر ہو تو برابری کی حالت میں ان کا عہد نامہ توڑ دے،^(۴) اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔^(۵) (۵۸)

کافر یہ خیال نہ کریں کہ وہ بھاگ نکلے۔ یقیناً وہ عاجز نہیں کر سکتے۔ (۵۹)

تم ان کے مقابلے کے لیے اپنی طاقت بھر قوت کی تیاری

الَّذِينَ عَاهَدْتَ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ ﴿۵۵﴾

فَأَمَّا تَشْتَكِيهِمْ فِي الْعُرُبِ فَشَرٌّ بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَعْلَمُ بِهِ يَبْذُكُونَ ﴿۵۶﴾

وَأَمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَأَبْيُذُكُ الْبَيْهَةِ عَلَى سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَأَكْبُحُ الْفَآئِينَ ﴿۵۷﴾

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا إِلَهُمْ لِأَعْيُزُّونَ ﴿۵۸﴾

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ

(۱) شَرُّ النَّاسِ (لوگوں میں سب سے بدتر) کے بجائے انہیں شَرَّ الدَّوَابِّ کہا گیا ہے۔ جو لغوی معنی کے لحاظ سے تو انسانوں اور چوپایوں وغیرہ سب پر بولا جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر اس کا استعمال چوپایوں کے لیے ہوتا ہے۔ گویا کافروں کا تعلق انسانوں سے ہی نہیں۔ کفر کا ارتکاب کر کے وہ جانور بلکہ جانوروں میں بھی سب سے بدتر جانور بن گئے ہیں۔

(۲) یہ کافروں ہی کی ایک عادت بیان کی گئی ہے کہ ہر بار نقض عہد کا ارتکاب کرتے ہیں اور اس کے عواقب سے ڈرا نہیں ڈرتے۔ بعض لوگوں نے اس سے یہودیوں کے قبیلے بنو قریظہ کو مراد لیا ہے، جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معاہدہ تھا کہ وہ کافروں کی مدد نہیں کریں گے لیکن انہوں نے اس کی پاسداری نہیں کی۔

(۳) شَرِّدْ بِهِمْ کا مطلب ہے کہ ان کو ایسی مار مار کر جس سے ان کے پیچھے، ان کے حمایتیوں اور ساتھیوں میں بھگدڑ مچ جائے، حتیٰ کہ وہ آپ کی طرف اس اندیشے سے رخ ہی نہ کریں کہ کہیں ان کا بھی وہی حشر نہ ہو جو ان کے پیش روؤں کا ہوا ہے۔

(۴) خیانت سے مراد ہے معاہدہ قوم سے نقض عہد کا خطرہ۔ اور عَلَيَّ سَوَاءٌ (برابری کی حالت میں) کا مطلب ہے کہ انہیں باقاعدہ مطلع کیا جائے کہ آئندہ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ نہیں۔ تاکہ دونوں فریق اپنے اپنے طور پر اپنی حفاظت کے ذمہ دار ہوں، کوئی ایک فریق لاطمی اور مغالطے میں نہ مارا جائے۔

(۵) یعنی یہ نقض عہد اگر مسلمانوں کی طرف سے بھی ہو تو یہ خیانت ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، اور رومیوں کے درمیان معاہدہ تھا۔ جب معاہدے کی مدت ختم ہونے کے قریب آئی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے

کرو اور گھوڑوں کے تیار رکھنے کی^(۱) کہ اس سے تم اللہ کے دشمنوں کو خوف زدہ رکھ سکو اور ان کے سوا اوروں کو بھی، جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ انھیں خوب جان رہا ہے جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں صرف کرو گے وہ تمہیں

پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارا حق نہ مارا جائے گا۔ (۶۰)
اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تو بھی صلح کی طرف جھک جا اور اللہ پر بھروسہ رکھ،^(۲) یقیناً وہ بہت سنے جانے والا ہے۔ (۶۱)

اگر وہ تجھ سے دعا بازی کرنا چاہیں گے تو اللہ تجھے کافی ہے، اسی نے اپنی مدد سے اور مومنوں سے تیری تائید کی ہے۔ (۶۲)

ان کے دلوں میں باہمی الفت بھی اسی نے ڈالی ہے۔ زمین

تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخِرِينَ مِنْ دُونِهِمْ
لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ وَأَسْتَفْعُو مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ
اللَّهِ يَوْمَ الْيَوْمِ وَأَنْتُمْ لَا تظلمُونَ ۝

وَأَنْ جَنَّوْا لِلشُّرُكِ فَأَجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ
هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

وَأَنْ يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُواكَ فَإِنْ حَسِبَكَ اللَّهُ هُوَ الَّذِي
أَيْدَكَ بِبَصِيرَةٍ وَالْمُؤْمِنِينَ ۝

وَأَلْفَ بَيْنٍ فَلْيُؤْمِنُوا لَوْ أَنْفَقْتَ مِثْرَ الْبُرُجِ جَمِيعًا مَا آتَتْ

روم کی سرزمین کے قریب اپنی فوجیں جمع کرنا شروع کر دیں۔ مقصد یہ تھا کہ معاہدے کی مدت ختم ہوتے ہی رومیوں پر حملہ کر دیا جائے۔ ایک صحابی حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کے علم میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ تیاری آئی تو انہوں نے اسے غدر سے تعبیر فرمایا اور ایک حدیث رسول بیان فرما کر اسے معاہدے کی خلاف ورزی قرار دیا، جس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔ (مسند أحمد جلد ۵، ص ۱۱۱-۱۱۲، أبو داؤد کتاب الجہاد، باب فی الإمام یكون بينه وبين العدو عهد فیسیر نحوه (إليه)۔ ترمذی، أبواب السیر، باب ما جاء فی الغدر)

(۱) قُوَّة کی تفسیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یعنی تیر اندازی (صحیح مسلم۔ کتاب الإمارة، باب فضل الرمی والحث علیہ۔ و دیگر کتب حدیث) کیونکہ اس دور میں یہ بہت بڑا جنگی ہتھیار اور نہایت اہم فن تھا، جس طرح گھوڑے جنگ کے لیے ناگزیر ضرورت تھے، جیسا کہ اس آیت سے بھی واضح ہے۔ لیکن اب تیر اندازی اور گھوڑوں کی یہ جنگی اہمیت اور افادیت و ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس لیے ﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ کے تحت آج کل کے جنگی ہتھیاروں (مثلاً میزائل، ٹینک، بم اور جنگی جہاز اور بحری جنگ کے لیے آبدوزیں وغیرہ) کی تیاری ضروری ہے۔ (۲) یعنی اگر حالات جنگ کے بجائے صلح کے متقاضی ہوں اور دشمن بھی مائل بہ صلح ہو تو صلح کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر صلح سے دشمن کا مقصد دھوکہ اور فریب ہو، تب بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں، اللہ پر بھروسہ رکھیں، یقیناً اللہ دشمن کے فریب سے بھی محفوظ رکھے گا، اور وہ آپ کو کافی ہے۔ لیکن صلح کی یہ اجازت ایسے حالات میں ہے جب مسلمان کمزور ہوں اور صلح میں اسلام اور مسلمانوں کا مفاد ہو۔ لیکن جب معاملہ اس کے برعکس ہو، مسلمان قوت و

میں جو کچھ ہے تو اگر سارا کا سارا بھی خرچ کر ڈالتا تو بھی ان کے دل آپس میں نہ ملا سکتا۔ یہ تو اللہ ہی نے ان میں الفت ڈال دی ہے ^(۱) وہ غالب حکمتوں والا ہے۔ (۶۳) اے نبی! تجھے اللہ کافی ہے اور ان مومنوں کو جو تیری پیروی کر رہے ہیں۔ (۶۴) اے نبی! ایمان والوں کو جہاد کا شوق دلاؤ ^(۲) اگر تم میں

بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلْفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۹﴾

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۴۰﴾

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ

وسائل میں ممتاز ہوں اور کافر کمزور اور ہزیمت خوردہ تو اس صورت میں صلح کے بجائے کافروں کی قوت و شوکت کو توڑنا ضروری ہے۔ (سورہ محمد- ۳۵) ﴿ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً وَيَتُوبَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ اللَّهَ يُدْرِكُ الْفَاسِقِينَ ﴾ (الأنفال- ۳۹)

(۱) ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں پر جو احسانات فرمائے، ان میں سے ایک بڑے احسان کا ذکر فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ نبی ﷺ کی مومنین کی مدد فرمائی، وہ آپ کے دست و بازو اور محافظ و معاون بن گئے۔ مومنین پر یہ احسان فرمایا کہ ان کے درمیان پہلے جو عداوت تھی، اسے محبت و الفت میں تبدیل فرمادیا۔ پہلے وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اب ایک دوسرے کے جانثار بن گئے، پہلے ایک دوسرے کے دلی دشمن تھے، اب آپس میں رحیم و شفیق ہو گئے۔ صدیوں پرانی باہمی عداوتوں کو اس طرح ختم کر کے، باہم پیار اور محبت پیدا کر دینا، یہ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی اور اس کی قدرت و مشیت کی کار فرمائی تھی، ورنہ یہ ایسا کام تھا کہ دنیا بھر کے خزانے بھی اس پر خرچ کر دیئے جاتے تب بھی یہ گوہر مقصود حاصل نہ ہوتا اللہ تعالیٰ نے اپنے اس احسان کا ذکر سورہ آل عمران ۱۰۳- ﴿ إِذْ كُنْتُمْ أَقْدَاءَ فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ ﴾ میں بھی فرمایا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی غنائم حنین کے موقع پر انصار سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "اے جماعت انصار! کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تم گمراہ تھے، اللہ نے میرے ذریعے سے تمہیں ہدایت نصیب فرمائی۔ تم محتاج تھے، اللہ نے تمہیں میرے ذریعے سے خوش حال کر دیا اور تم ایک دوسرے سے الگ الگ تھے، اللہ نے میرے ذریعے سے تمہیں آپس میں جوڑ دیا" نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو بات کہتے، انصار اس کے جواب میں یہی کہتے "اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْنٌ"۔ "اللہ اور اس کے رسول کے احسانات اس سے کہیں زیادہ ہیں"۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الطائف۔ صحیح مسلم۔ کتاب الزکوٰۃ باب إعطاء المسؤلفة قلوبهم على الإسلام)

(۲) تَنْخَرِبُضُّ کے معنی ہیں ترغیب میں مبالغہ کرنا یعنی خوب رغبت دلانا اور شوق پیدا کرنا۔ چنانچہ اس کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنگ سے قبل صحابہ کو جہاد کی ترغیب دیتے اور اس کی فضیلت بیان فرماتے۔ جیسا کہ بدر کے موقع پر، جب مشرکین اپنی بھاری تعداد اور بھرپور وسائل کے ساتھ میدان میں آ موجود ہوئے، آپ ﷺ نے فرمایا "ایسی جنت میں جانے کے لیے کھڑے ہو جاؤ، جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے" ایک صحابی عمیر بن حمام رضی اللہ عنہ نے کہا "اس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں" اس پر بیخ کنما یعنی

بیس بھی صبر کرنے والے ہوں گے، تو دو سو پر غالب رہیں گے۔ اور اگر تم میں ایک سو ہوں گے تو ایک ہزار کافروں پر غالب رہیں گے^(۱) اس واسطے کہ وہ بے سمجھ لوگ ہیں۔ (۶۵)

اچھا اب اللہ تمہارا بوجھ ہلکا کرتا ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ تم میں ناتوانی ہے، پس اگر تم میں سے ایک سو صبر کرنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں گے تو وہ اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے،^(۲) اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔^(۳) (۶۶)

نبی کے ہاتھ میں قیدی نہیں چلتیں جب تک کہ ملک میں اچھی خونریزی کی جنگ نہ ہو جائے۔ تم تو دنیا کے مال چاہتے ہو اور اللہ کا ارادہ آخرت کا ہے^(۴) اور اللہ زور آور باحکمت ہے۔ (۶۷)

عَشْرُونَ صَبْرًا وَيَغْلِبُوا مَا مَلَائِيهَا ۚ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَآلَهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿٦٥﴾

الَّذِينَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِن يَكُن مِّنْكُمْ مَّنَافٍ فَنَجِبُوا مَا مَلَائِيهَا ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ لَأَنفُسِهِمْ أَكْفَرًا مِّنْكُمْ ۚ إِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۚ ﴿٦٦﴾

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ أَنْ يَتَّخِذَ مِنَّا مَعًا ۚ إِنَّمَا يَحْكُمُ بَيْنَنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّا كُنَّا عِندَ اللَّهِ مُخْلِطِينَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿٦٧﴾

خوشی کا اظہار کیا اور یہ امید ظاہر کی کہ میں بھی جنت میں جانے والوں میں سے ہوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”تم اس میں جانے والوں میں سے ہو گے“۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تلوار کی میان توڑ ڈالی اور کھجوریں نکال کر کھانے لگے، پھر جو بیس ہاتھ سے پھینک دیں اور کہا۔ ”ان کے کھانے تک میں زندہ رہا تو یہ تو طویل زندگی ہوگی“ پھر آگے بڑھے اور داد شجاعت دینے لگے، حتیٰ کہ عروس شہادت سے ہمکنار ہو گئے۔ رضی اللہ عنہ (صحیح مسلم۔ کتاب الإمارة، باب نبوت الجنة للشہید)

(۱) یہ مسلمانوں کے لیے بشارت ہے کہ تمہارے ثابت قدمی سے لڑنے والے بیس مجاہد دو سو پر اور سو ایک ہزار پر غالب رہیں گے۔

(۲) پچھلا حکم صحابہ رضی اللہ عنہم پر گراں گزرا، کیونکہ اس کا مطلب تھا، ایک مسلمان دس کافروں کے لیے، بیس دو سو کے لیے اور سو ایک ہزار کے لیے کافی ہیں اور کافروں کے مقابلے میں مسلمانوں کی اتنی تعداد ہو تو جہاد فرض اور اس سے گریز ناجائز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس میں تخفیف فرما کر ایک اور دس کا تناسب کم کر کے ایک اور دو کا تناسب کر دیا (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الانفال) اب اس تناسب پر جہاد ضروری اور اس سے کم پر غیر ضروری ہے۔

(۳) یہ کہہ کر صبر و ثبات قدمی کی اہمیت بیان فرمادی کہ اللہ کی مدد حاصل کرنے کے لیے اس کا ہتہام ضروری ہے۔

(۴) جنگ بدر میں ستر کافر مارے گئے اور ستر ہی قیدی بنا لیے گئے۔ یہ کفر و اسلام کا چونکہ پہلا معرکہ تھا۔ اس لیے قیدیوں

لَوْلَا كَلْبُ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَمَسَّكُمْ فِي مَا أَتَيْتُمُ
عَدَابٌ عَظِيمٌ ۝

اگر پہلے ہی سے اللہ کی طرف سے بات لکھی ہوئی نہ
ہوتی^(۱) تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس بارے میں تمہیں کوئی
بڑی سزا ہوتی۔ (۶۸)

پس جو کچھ حلال اور پاکیزہ غنیمت تم نے حاصل کی ہے،
خوب کھاؤ بیو^(۲) اور اللہ سے ڈرتے رہو، یقیناً اللہ
غفور ورحیم ہے۔ (۶۹)

فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ
غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

کے بارے میں کیا طرز عمل اختیار کیا جائے؟ ان کی بابت احکام پوری طرح واضح نہیں تھے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ستر قیدیوں کے بارے میں مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے؟ ان کو قتل کر دیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے؟ جواز کی حد تک دونوں ہی باتوں کی گنجائش تھی۔ اسی لیے دونوں ہی باتیں زیر غور آئیں۔ لیکن بعض دفعہ جواز و عدم جواز سے قطع نظر حالات و ظروف کے اعتبار سے زیادہ بہتر صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں بھی ضرورت زیادہ بہتر صورت اختیار کرنے کی تھی۔ لیکن جواز کو سامنے رکھتے ہوئے کم تر صورت اختیار کر لی گئی، جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب نازل ہوا۔ مشورے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے یہ مشورہ دیا کہ کفر کی قوت و شوکت توڑنے کے لیے ضروری ہے کہ ان قیدیوں کو قتل کر دیا جائے، کیونکہ یہ کفر اور کافروں کے سرفتنے ہیں، یہ آزاد ہو کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زیادہ سازشیں کریں گے۔ جبکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ وغیرہ کی رائے اس کے برعکس یہ تھی کہ فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے اور اس مال سے آئندہ جنگ کی تیاری کی جائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی رائے کو پسند فرمایا جس پر یہ اور اس کے بعد کی آیات نازل ہوئیں ﴿حَتَّىٰ يَمُوتُوا فِي الْأَرْضِ﴾ کا مطلب ہے کہ اگر ملک میں کفر کا غلبہ ہے (جیسا کہ اس وقت عرب میں کفر کا غلبہ تھا) تو کافروں کی خون ریزی کر کے کفر کی قوت کو توڑنا ضروری ہے۔ اس نکتے کو نظر انداز کر کے تم نے جو فدیہ قبول کیا ہے تو گویا، زیادہ بہتر صورت کو چھوڑ کر کم تر صورت کو اختیار کیا ہے جو تمہاری غلطی ہے۔ بعد میں جب کفر کا غلبہ ختم ہو گیا تو قیدیوں کے بارے میں امام وقت کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ چاہے تو قتل کر دے، فدیہ لے کر چھوڑ دے یا مسلمان قیدیوں کے ساتھ تبادلہ کر لے اور چاہے تو ان کو غلام بنا لے، حالات و ظروف کے مطابق کوئی بھی صورت اختیار کرنا جائز ہے۔

(۱) اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ یہ لکھی ہوئی بات کیا تھی؟ بعض نے کہا کہ اس سے مال غنیمت کی حلت مراد ہے یعنی چونکہ یہ نوشتہ تقدیر تھا کہ مسلمانوں کے لیے مال غنیمت حلال ہو گا، اس لیے تم نے فدیہ لے کر ایک جائز کام ہی کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تا تو فدیہ لینے کی وجہ سے تمہیں عذاب عظیم پہنچتا۔ بعض نے اہل بدر کی مغفرت اس سے مراد لی ہے، بعض نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کو عذاب میں مانع ہونا مراد لیا ہے وغیرہ۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے فتح القدر)

(۲) اس میں مال غنیمت کی حلت و پاکیزگی کو بیان کر کے فدیہ کا جواز بیان فرما دیا گیا۔ جس سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ ”لکھی ہوئی بات“ سے مراد شاید یہی حلت غنائم ہے۔

اے نبی! اپنے ہاتھ تلے کے قیدیوں سے کہہ دو کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں نیک نیتی دیکھے گا^(۱) تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر تمہیں دے گا^(۲) اور پھر گناہ بھی معاف فرمائے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ہی۔ (۷۰)

اور اگر وہ تجھ سے خیانت کا خیال کریں گے تو یہ تو اس سے پہلے خود اللہ کی خیانت کر چکے ہیں آخر اس نے انہیں گرفتار کرادیا،^(۳) اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔ (۷۱)

جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا^(۴) اور جن لوگوں نے ان کو پناہ دی اور مدد کی،^(۵) یہ سب آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں،^(۶) اور جو ایمان تو لائے ہیں لیکن ہجرت نہیں کی تمہارے لیے ان کی کچھ بھی رفاقت نہیں جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں۔^(۷) ہاں اگر وہ تم سے دین

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُلْ لَيْسَ فِي آيَاتِنَا مِنَّا لَكُمْ مَنَافِعُ إِنَّ كَيْدَ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝٧٠

وَإِن يُرِيدُوا إِخِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِن قَبْلُ مَا كَانُوا مِنهُمْ ۚ وَاللَّهُ عَلَيْهِمْ حَكِيمٌ ۝٧١

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَآجَرُوا وَجَهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَانْتَصَرُوا أُولَئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّنْ وَلَا تَتَهُم مِّنْ شَيْءٍ حَتَّى يُهَاجِرُوا وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ وَاللَّهُ بِمَا

(۱) یعنی ایمان و اسلام لانے کی نیت اور اسے قبول کرنے کا جذبہ۔

(۲) یعنی جو فدیہ تم سے لیا گیا ہے، اس سے بہتر تمہیں اللہ تعالیٰ قبول اسلام کے بعد عطا فرمادے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ، وغیرہ جو ان قیدیوں میں تھے، مسلمان ہو گئے تو اس کے بعد اللہ نے انہیں دنیوی مال و دولت سے بھی خوب نوازا۔

(۳) یعنی زبان سے تو ظاہر اسلام کر دیں لیکن مقصد و ہوکہ دینا ہو، تو اس سے قبل انہوں نے کفر و شرک کا ارتکاب کر کے کیا حاصل کیا؟ یہی کہ وہ مسلمانوں کے قیدی بن گئے، اس لیے آئندہ بھی اگر وہ شرک کے راستے پر قائم رہے تو اس سے مزید ذلت و رسوائی کے سوا انہیں کچھ اور حاصل نہیں ہو گا۔

(۴) یہ صحابہ ماجرین کہلاتے ہیں جو فضیلت میں صحابہ میں اول نمبر پر ہیں۔

(۵) یہ انصار کہلاتے ہیں۔ یہ فضیلت میں دوسرے نمبر پر ہیں۔

(۶) یعنی ایک دوسرے کے حمایتی اور مددگار ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ایک دوسرے کے وارث ہیں۔ جیسا کہ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک ماجر اور ایک ایک انصاری کے درمیان رشتہٴ مائتہ قائم فرمایا تھا حتیٰ کہ وہ ایک دوسرے کے وارث بھی بنتے تھے (بعد میں وراثت کا حکم منسوخ ہو گیا)

(۷) یہ صحابہ کی تیسری قسم ہے جو ماجرین و انصار کے علاوہ ہیں۔ یہ مسلمان ہونے کے بعد اپنے ہی علاقوں اور قبیلوں

تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ﴿۲۱﴾

کے بارے میں مدد طلب کریں تو تم پر مدد کرنا ضروری ہے،^(۱) سوائے ان لوگوں کے کہ تم میں اور ان میں عہد و پیمان ہے،^(۲) تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ خوب دیکھتا ہے۔ (۷۲)

کافر آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ملک میں فتنہ ہو گا اور زبردست فساد ہو جائے گا۔^(۳) (۷۳)

جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد پہنچائی۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لیے بخشش ہے اور عزت کی روزی۔^(۴) (۷۴)

اور جو لوگ اس کے بعد ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ ہو کر جہاد کیا۔ پس یہ لوگ بھی تم میں سے ہی ہیں^(۵) اور رشتے نانتے والے ان میں سے بعض بعض

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۗ الْأَقْلَامُ لَهُ تَلَانٌ فَتَنَانِي
الَّذِينَ وَفَسَادًا كَثِيرًا ﴿۲۱﴾

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجْهَهُمْ وَإِنِّي سَيِّئِينَ اللَّهُ
وَالَّذِينَ آوُوا وَآمَنُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ
مَعْرِضَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿۲۱﴾

وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْ بَعْدِ وَهَاجَرُوا وَآمَنُوا قُلُوبُهُمْ
وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ مَعْرِضَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿۲۱﴾

میں مقیم رہے۔ اس لیے فرمایا کہ تمہاری حمایت یا وراثت کے وہ مستحق نہیں۔

(۱) مشرکین کے خلاف اگر ان کو تمہاری مدد کی ضرورت پیش آجائے تو پھر ان کی مدد کرنا ضروری ہے۔
(۲) ہاں اگر وہ تم سے ایسی قوم کے خلاف مدد کے خواہش مند ہوں کہ تمہارے اور ان کے درمیان صلح کا اور جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہے تو پھر ان مسلمانوں کی حمایت کے مقابلے میں، معاہدے کی پاسداری زیادہ ضروری ہے۔
(۳) یعنی جس طرح کافر ایک دوسرے کے دوست اور حمایتی ہیں اسی طرح اگر تم نے بھی ایمان کی بنیاد پر ایک دوسرے کی حمایت اور کافروں سے عدم مواصلات نہ کی، تو پھر بڑا فتنہ اور فساد ہو گا۔ اور وہ یہ کہ مومن اور کافر کے باہمی اختلاط اور محبت و مواصلات سے دین کے معاملے میں اشتباہ اور مداخلت پیدا ہو گی۔ بعض نے ﴿بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ سے وارث ہونا مراد لیا ہے۔ یعنی کافر ایک دوسرے کے وارث ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کسی کافر کا اور کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہے۔ جیسا کہ احادیث میں اسے وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اگر تم وراثت میں کفر و ایمان کو نظر انداز کر کے محض قرابت کو سامنے رکھو گے تو اس سے بڑا فتنہ اور فساد پیدا ہو گا۔

(۴) یہ مہاجرین و انصار کے انہی دو گروہوں کا تذکرہ ہے، جو پہلے بھی گزرا ہے۔ یہاں دوبارہ ان کا ذکر ان کی فضیلت کے سلسلے میں ہے۔ جب کہ پہلے ان کا ذکر آپس میں ایک دوسرے کی حمایت و نصرت کا وجوب بیان کرنے کے لیے تھا۔

(۵) یہ ایک چوتھے گروہ کا ذکر ہے جو فضیلت میں پہلے دو گروہوں کے بعد اور تیسرے گروہ سے، (جنہوں نے ہجرت

سے زیادہ نزدیک ہیں اللہ کے حکم میں،^(۱) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ (۷۵)

سورہ توبہ مدنی ہے اور اس میں ایک سو انیس آیتیں اور سولہ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بِرَّاءَةٌ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عٰهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے بیزاری کا اعلان ہے۔^(۲) ان مشرکوں کے بارے میں جن سے تم نے عہد و پیمانہ کیا تھا۔ (۱)

پس (اے مشرک!) تم ملک میں چار مہینے تک تو چل پھر لو،^(۳) جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو،

فَيَسْخَرُونَ مِنَ الّٰرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوا اَنَّكُمْ عِنْدَ الْمُحْجَرِ مِنَ اللّٰهِ

نہیں کی تھی، پہلے ہے۔

(۱) اخوت یا حلف کی بنیاد پر وراثت میں جو حصہ دار بنتے تھے اس آیت سے اس کو منسوخ کر دیا گیا اب وراثت صرف وہی ہوں گے جو نسبی اور سسرالی رشتوں میں منسلک ہوں گے۔ اللہ کی کتاب یا اللہ کے حکم سے مراد یہ ہے کہ لوح محفوظ میں اصل حکم یہی تھا۔ لیکن اخوت کی بنیاد پر صرف عارضی طور پر ایک دوسرے کا وارث بنا دیا گیا تھا، جو اب ضرورت ختم ہونے پر غیر ضروری ہو گیا اور اصل حکم نافذ کر دیا گیا۔

☆ وجہ تسمیہ: اس کے مفسرین نے متعدد نام ذکر کئے ہیں لیکن زیادہ مشہور دو ہیں۔ ایک توبہ، اس لیے کہ اس میں بعض مومنین کی توبہ قبول ہونے کا ذکر ہے۔ دوسرا نام براءت ہے۔ اس لیے کہ اس میں مشرکین سے براءت کا اعلان عام ہے۔ یہ قرآن مجید کی واحد سورت ہے جس کے آغاز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم درج نہیں ہے۔ اس کی بھی متعدد وجوہات کتب تفسیر میں درج ہیں۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سورہ انفال اور سورہ توبہ ان دونوں کے مضامین میں بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے، یہ سورت گویا سورہ انفال کا تتمہ یا بقیہ ہے۔ یہ سات بڑی سورتوں میں ساتویں بڑی سورت ہے جنہیں سبع سورتوں کہا جاتا ہے۔

(۲) فتح مکہ کے بعد ۹ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، اور دیگر صحابہ کو قرآن کریم کی یہ آیات اور یہ احکام دے کر بھیجا تاکہ وہ مکہ میں ان کا عام اعلان کر دیں۔ انہوں نے آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق اعلان کر دیا کہ کوئی شخص بیت اللہ کا عریاں طواف نہیں کرے گا، بلکہ آئندہ سال سے کسی مشرک کو بیت اللہ کے حج کی ہی اجازت نہیں ہوگی۔ (صحیح بخاری کتاب الصلاة، باب ما یستمرن العورة مسلم کتاب الحج باب لا یصح البیت المشرک)

(۳) یہ اعلان براءت ان مشرکین کے لیے تھا جن سے غیر مؤقت معاہدہ تھا یا چار مہینے سے کم کا تھا یا جن سے چار مہینے سے زیادہ ایک خاص مدت تک تھا لیکن ان کی طرف سے عہد کی پاسداری کا اہتمام نہیں تھا۔ ان سب کو چار مہینے مکہ میں

اور یہ (بھی یاد رہے) کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔^(۱) (۲)

اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو بڑے حج کے دن^(۲) صاف اطلاع ہے کہ اللہ مشرکوں سے بیزار ہے، اور اس کا رسول بھی، اگر اب بھی تم توبہ کر لو تو تمہارے حق میں بہتر ہے، اور اگر تم روگردانی کرو تو جان لو کہ تم اللہ کو ہرا نہیں سکتے۔ اور کافروں کو دکھ کی مار کی خبر پہنچا دیجئے۔ (۳)

بجز ان مشرکوں کے جن سے تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے اور انہوں نے تمہیں ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچایا نہ کسی کی تمہارے خلاف مدد کی ہے تو تم بھی ان کے معاہدے کی مدت ان کے ساتھ پوری کرو،^(۳) اللہ تعالیٰ پر بیہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے۔ (۴)

وَأَنَّ اللَّهَ مُخِزِي الْكَافِرِينَ ①

وَأَذَانٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ وَهُوَ رَسُولُهُ فَإِنْ بُدِّعْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ وَبَشِيرِ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ آيِ الْيَوْمِ ②

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُواكُمْ شَيْئًا وَلَا مُمَاطُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَلْفَتْهُمُ إِلَيْهِمْ عَهْدُهُمْ إِلَىٰ مَدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ③

رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس مدت کے اندر اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو انہیں یہاں رہنے کی اجازت ہوگی، بصورت دیگر ان کے لیے ضروری ہو گا کہ وہ چار مہینے کے بعد جزیرہ عرب سے نکل جائیں، اگر دونوں صورتوں میں سے وہ کوئی بھی اختیار نہیں کریں گے تو وہ حربی کافر شمار ہوں گے، جن سے لڑنا مسلمانوں کے لیے ضروری ہو گا تاکہ جزیرہ عرب کفر و شرک کی تاریکیوں سے صاف ہو جائے۔

(۱) یعنی یہ مملت اس لیے نہیں دی جا رہی ہے کہ نبی الحال تمہارے خلاف کارروائی ممکن نہیں ہے بلکہ اس سے مقصد صرف تمہاری بھلائی اور خیر خواہی ہے تاکہ جو توبہ کر کے مسلمان ہونا چاہے، وہ مسلمان ہو جائے۔ ورنہ یاد رکھو کہ تمہاری بابت اللہ کی جو تقدیر و مشیت ہے، اسے تم ٹال نہیں سکتے اور اللہ کی طرف سے مسلط ذلت و رسوائی سے تم بچ نہیں سکتے۔

(۲) صحیحین (بخاری و مسلم) اور دیگر صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ یوم حج اکبر سے مراد یوم النحر (۱۰ ذوالحجہ) کا دن ہے (ترمذی۔ نمبر ۹۵، بخاری، نمبر ۳۶۵۵، مسلم، نمبر ۹۸۲) اسی دن منیٰ میں اعلانِ براءت سنایا گیا۔ ۱۰ ذوالحجہ کو حج اکبر کا دن اسی لیے کہا گیا کہ اس دن حج کے سب سے زیادہ اور اہم مناسک ادا کئے جاتے ہیں۔ اور عوام عمرے کو حج اصغر کہا کرتے تھے۔ اس لیے عمرے سے ممتاز کرنے کے لیے حج کو حج اکبر کہا گیا۔ عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ حج جمعہ والے دن آئے، وہ حج اکبر ہے، یہ بے اصل بات ہے۔

(۳) یہ مشرکین کی چوتھی قسم ہے۔ ان سے جتنی مدت کا معاہدہ تھا، اس مدت تک انہیں رہنے کی اجازت دے دی گئی،

پھر حرمت والے مہینوں^(۱) کے گزرتے ہی مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو^(۲) انھیں گرفتار کرو،^(۳) ان کا محاصرہ کر لو اور ان کی تاک میں ہر گھنٹی میں جا بیٹھو،^(۴) ہاں اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز کے پابند ہو جائیں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں تو تم ان کی راہیں چھوڑ دو۔^(۵) یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۵)

فَإِذَا سَلَخَ الْأَشْهُرَ الْحُرْمَ فَاتَّبِعُوا فِي مَشْرِيقِهَا حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخَدَّوهُمْ وَحَصَرُوهُمْ وَأَقْعَدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُم إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۰﴾

کیونکہ انہوں نے معاہدے کی پاسداری کی اور اس کے خلاف کوئی حرکت نہیں کی، اس لیے مسلمانوں کے لیے بھی اس کی پاسداری کو ضروری قرار دیا گیا۔

(۱) ان حرمت والے مہینوں سے کیا مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ ایک رائے تو یہ ہے کہ اس سے مراد وہی چار مہینے ہیں جو حرمت والے ہیں۔ یعنی رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔ اور اعلان براءت ۱۰/ ذوالحجہ کو کیا گیا۔ اس اعتبار سے گویا اعلان کے بعد پچاس دن کی مہلت انہیں دی گئی۔ کیونکہ حرمت والے مہینوں کے گزرنے کے بعد مشرکین کو پکڑنے اور قتل کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن امام ابن کثیر نے کہا ہے کہ یہاں اَشْهُرُ حُرْمٍ سے مراد وہ حرمت والے مہینے نہیں ہیں بلکہ ۱۰ ذوالحجہ سے لے کر ۱۰ ربیع الثانی تک کے چار مہینے مراد ہیں۔ انہیں اَشْهُرُ حُرْمٍ اس لیے کہا گیا ہے کہ اعلان براءت کی رو سے ان چار مہینوں میں ان مشرکین سے لڑنے اور ان کے خلاف کسی اقدام کی اجازت نہیں تھی۔ اعلان براءت کی رو سے یہ تاویل مناسب معلوم ہوتی ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

(۲) بعض مفسرین نے اس حکم کو عام رکھا ہے یعنی حل یا حرم میں، جہاں بھی پاؤ، قتل کرو۔ اور بعض مفسرین نے ﴿وَلَا تَقْبَلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُفْتَلُوا بِكُمْ فِيمَا بَيْنَ يَدَيْهِمْ فَإِن فُتِلُوا فَمَنْ قَاتَلَهُمْ فَاتَّاتُوا بِهِمُ﴾ (البقرة: ۱۹۱) کے مسجد حرام کے پاس ان سے مت لڑو! یہاں تک کہ وہ خود تم سے لڑیں، اگر وہ لڑیں تو پھر تمہیں بھی ان سے لڑنے کی اجازت ہے، اس آیت سے تخصیص کی ہے اور صرف حدود حرم سے باہر حل میں قتل کرنے کی اجازت دی ہے۔ (ابن کثیر)

(۳) یعنی انہیں قیدی بنا لیا اور قتل کر دو۔

(۴) یعنی اس بات پر اکتفا نہ کرو کہ وہ تمہیں کہیں ملیں تو تم کارروائی کرو۔ بلکہ جہاں جہاں ان کے حصار، قلعے اور پناہ گاہیں ہیں، وہاں وہاں ان کی گھات میں رہو۔ حتیٰ کہ تمہاری اجازت کے بغیر ان کے لیے نقل و حرکت ممکن نہ رہے۔

(۵) یعنی کوئی کارروائی ان کے خلاف نہ کی جائے، کیونکہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ گویا قبول اسلام کے بعد اقامت صلوة اور ادائے زکوٰۃ کا اہتمام ضروری ہے، اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کا بھی ترک کرتا ہے تو وہ مسلمان نہیں سمجھا جائے گا۔ جس طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف، اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے جماد کیا۔

اور فرمایا واللہ لأقاتلنَّ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ (متفق علیہ، بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ، فصل

اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ طلب کرے تو تو اسے پناہ دے دے یہاں تک کہ وہ کلام اللہ سن لے پھر اسے اپنی جائے امن تک پہنچا دے۔^(۱) یہ اس لیے کہ یہ لوگ بے علم ہیں۔^(۲) (۶)

مشرکوں کے لئے عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کیسے رہ سکتا ہے سوائے ان کے جن سے تم نے عہد و پیمانہ مسجد حرام کے پاس کیا ہے،^(۳) جب تک وہ لوگ تم سے معاہدہ نبھائیں تم بھی ان سے وفاداری کرو، اللہ تعالیٰ متقیوں سے محبت رکھتا ہے۔^(۴) (۷)

ان کے وعدوں کا کیا اعتبار ان کا اگر تم پر غلبہ ہو جائے تو نہ یہ قربت داری کا خیال کریں نہ عہد و پیمانہ کا،^(۵) اپنی

وَأَنَّ أَحَدًا مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجْرُهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلِمَ اللَّهِ ثُمَّ ابْلَغَهُ مَأْمَنَهُ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ ①

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدُوا عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا لَهُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ بَعِثَ الْمُتَّقِينَ ②

كَيْفَ وَإِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلَّا ذُلًّا وَمَتًّا يَرْضُونَكُمْ يَا قَوْمِ إِيَّاهُمْ وَتَابَى قُلُوبُهُمْ وَأَكْفَرُ لَهُمْ

ثالث، ”اللہ کی قسم میں ان لوگوں سے ضرور لڑوں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کریں گے۔“ یعنی نماز تو پڑھیں لیکن زکوٰۃ ادا کرنے سے گریز کریں۔

(۱) اس آیت میں مذکورہ حربی کافروں کے بارے میں ایک رخصت دی گئی کہ اگر کوئی کافر پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دے دو یعنی اسے اپنی حفظ و امان میں رکھو تاکہ کوئی مسلمان اسے قتل نہ کر سکے۔ اور تاکہ اسے اللہ کی باتیں سننے اور اسلام کے سمجھنے کا موقع ملے، ممکن ہے اس طرح اسے توبہ اور قبول اسلام کی توفیق مل جائے۔ لیکن اگر وہ کلام اللہ سننے کے باوجود مسلمان نہیں ہوتا تو اسے اس کی جائے امن تک پہنچا دو۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی امان کی پاسداری آخر تک کرنی ہے، جب تک وہ اپنے مستقر تک بحیریت واپس نہیں پہنچ جاتا، اس کی جان کی حفاظت تمہاری ذمہ داری ہے۔

(۲) یعنی پناہ کے طلب گاروں کو پناہ کی رخصت اس لیے دی گئی ہے کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔ ممکن ہے اللہ اور رسول کی باتیں ان کے علم میں آئیں اور مسلمانوں کا اخلاق و کردار وہ دیکھیں تو اسلام کی حقانیت و صداقت کے وہ قائل ہو جائیں اور اسلام قبول کر کے آخرت کے عذاب سے بچ جائیں۔ جس طرح صلح حدیبیہ کے بعد بہت سے کافرمان طلب کر کے مدینہ آتے جاتے رہے تو انہیں مسلمانوں کے اخلاق و کردار کے مشاہدے سے اسلام کے سمجھنے میں بڑی مدد ملی اور بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔

(۳) یہ استفہام نفی کے لیے ہے، یعنی جن مشرکین سے تمہارا معاہدہ ہے، ان کے علاوہ اب کسی سے معاہدہ باقی نہیں رہا ہے۔

(۴) یعنی عہد کی پاسداری، اللہ کے ہاں بہت پسندیدہ امر ہے۔ اس لیے معاملے میں احتیاط ضروری ہے۔

(۵) کَيْفَ، پھر بطور تائید، نفی کے لیے ہے۔ اِنَّ کے معنی قربت (رشتہ داری) اور ذِمَّة کے معنی عہد کے ہیں۔ یعنی ان

فَيَقُونُ ①

زبانوں سے تو تمہیں پرچار ہے ہیں لیکن ان کے دل
نہیں مانتے ان میں سے اکثر تو فاسق ہیں۔ (۸)

انہوں نے اللہ کی آیتوں کو بہت کم قیمت پر بیچ دیا اور اس
کی راہ سے روکا۔ بہت برا ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ (۹)

یہ تو کسی مسلمان کے حق میں کسی رشتہ داری کا یا عہد کا
مطلق لحاظ نہیں کرتے، یہ ہیں ہی حد سے گزرنے

والے۔ (۱۰)

اب بھی اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز کے پابند ہو جائیں اور
زکوٰۃ دیتے رہیں، تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ (۱۱) ہم تو
جاننے والوں کے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کر
رہے ہیں۔ (۱۱)

إِشْرَؤُا بِآيَاتِ اللّٰهِ تَمَنَّا قَلِيْلًا فَصَدَّوْا عَنْ سَبِيْلِهِ
لِئَنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ①

لَا يَرْفُقُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلَّا وَاَلَدًا مِّمَّةً وَاُوْلٰئِكَ
هُمُ الْمُتَعَدُوْنَ ②

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوْا الصَّلٰوةَ وَآتَوْا الزَّكٰوةَ فَاَنحَوْا كُنُفُوْا
فِي الدِّیْنِ وَنَقْصِلِ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْمَلُوْنَ ③

مشرکین کی زبانی باتوں کا کیا اعتبار، جب کہ ان کا یہ حال ہے کہ اگر یہ تم پر غالب آجائیں تو کسی قربت اور عہد کا پاس
نہیں کریں گے۔ بعض مفسرین کے نزدیک پہلا کیف مشرکین کے لیے ہے اور دوسرے سے یہودی مراد ہیں، کیونکہ ان
کی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ کی آیتوں کو کم قیمت پر بیچ دیتے ہیں۔ اور یہ وہ طیبرہ یہودیوں ہی کا رہا ہے۔

(۱) بار بار وضاحت سے مقصود مشرکین اور یہود کی اسلام دشمنی اور ان کے سینوں میں مخفی عداوت کے جذبات کو بے
نقاب کرنا ہے۔

(۲) نماز، توحید و رسالت کے اقرار کے بعد، اسلام کا سب سے اہم رکن ہے جو اللہ کا حق ہے، اس میں اللہ کی عبادت
کے مختلف پہلو ہیں۔ اس میں دست بستہ قیام ہے، رکوع و سجود ہے، دعا و مناجات ہے، اللہ کی عظمت و جلالت کا اور اپنی
عاجزی و بے کسی کا اظہار ہے۔ عبادت کی یہ ساری صورتیں اور قسمیں صرف اللہ کے لیے خاص ہیں۔ نماز کے بعد دوسرا
اہم فریضہ زکوٰۃ ہے، جس میں عبادتی پہلو کے ساتھ ساتھ حقوق العباد بھی شامل ہیں۔ زکوٰۃ سے معاشرے کے اور زکوٰۃ
دینے والے کے قبیلے کے ضرورت مند، مفلس و نادار اور معذور و محتاج لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی لیے حدیث میں بھی
شہادت کے بعد ان ہی دو چیزوں کو نمایاں کر کے بیان کیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”مجھے حکم دیا گیا ہے
کہ میں لوگوں سے جنگ کروں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ
علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں“ صحیح بخاری۔ کتاب الإیمان۔ باب فین تابوا
واقاموا الصلوة، مسلم، کتاب الإیمان، باب الأمر بقتال الناس..... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول
ہے۔ ومن لم یزک فلا صلوة له (حوالہ مذکورہ) ”جس نے زکوٰۃ نہیں دی، اس کی نماز بھی نہیں۔“

اگر یہ لوگ عمد و پیمان کے بعد بھی اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین میں طعنہ زنی کریں تو تم بھی ان سرداران کفر سے بھڑ جاؤ۔ ان کی قسمیں (۱) کوئی چیز نہیں ممکن ہے کہ اس طرح وہ بھی باز آجائیں۔ (۱۲)

تم ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے کیوں تیار نہیں ہوتے (۲) جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ دیا اور پیغمبر کو جلا وطن کرنے کی فکر میں ہیں (۳) اور خود ہی اول بار انہوں نے تم سے چھیڑ کی ہے۔ (۴) کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اللہ ہی زیادہ مستحق ہے کہ تم اس کا ڈر رکھو بشرطیکہ تم ایمان والے ہو۔ (۱۳)

ان سے تم جنگ کرو اللہ تعالیٰ انہیں تمہارے ہاتھوں

وَأَنْ تَكُونُوا أَيْمَانَ هُمْ تَرْتَابًا عَهْدًا هُمْ
وَطَعْنُوا فِي دِينِكُمْ فَجَاءُوا آيَةَ الْكُفْرِ
إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُونَ ۝

أَلَا تَقَاتِلُونَ قَوْمًا نَكَتُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا
بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُمْ بَدُّوْكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ
أَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ قَالَ لَهُ أَحْسَنُ أَنْ تَخْشَوْهُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

فَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِيهِمْ وَيَضْرِبُهُمْ بِالْأَعْيُنِ

(۱) اَيْمَانٌ، بَيْنِينَ کی جمع ہے؛ جس کے معنی قسم کے ہیں۔ ائمہ کی جمع ہے۔ مراد پیشوا اور لیڈر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ عمد توڑ دیں، اور دین میں طعن کریں، تو ظاہری طور پر یہ قسمیں بھی کھائیں تو ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ کفر کے ان پیشواؤں سے لڑائی کرو۔ ممکن ہے اس طرح اپنے کفر سے یہ باز آجائیں۔ اس سے احناف نے استدلال کیا ہے کہ ذمی (اسلامی مملکت میں رہائش پذیر غیر مسلم) اگر نقض عمد نہیں کرتا۔ البتہ دین اسلام میں طعن کرتا ہے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ قرآن نے اس سے قتال کے لیے دو چیزیں ذکر کی ہیں، اس لیے جب تک دونوں چیزوں کا صدور نہیں ہوگا، وہ قتال کا مستحق نہیں ہوگا۔ لیکن امام مالک، امام شافعی اور دیگر علماء طعن فی الدین کو نقض عمد بھی قرار دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک اس میں دونوں ہی چیزیں آجاتی ہیں، لہذا اس ذمی کا قتل جائز ہے، اسی طرح نقض عمد کی صورت میں بھی قتل جائز ہے۔ (فتح القدیر)

(۲) آلا حرف تفضیض ہے؛ جس سے رغبت دلائی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جناد کی ترغیب دے رہا ہے۔

(۳) اس سے مراد دارالندوہ کی وہ مشاورت ہے جس میں رؤسائے مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلا وطن کرنے، قید کرنے یا قتل کرنے کی تجویزوں پر غور کیا۔

(۴) اس سے مراد یا تو بدر کی جنگ میں مشرکین مکہ کا رویہ ہے کہ وہ اپنے تجارتی قافلے کی حفاظت کے لیے گئے۔ لیکن اس کے باوجود کہ انہوں نے دیکھ لیا کہ وہ قافلہ بچ کر نکل گیا ہے، وہ بدر کے مقام پر مسلمانوں سے لڑنے کی تیاری کرتے اور چھیڑ خانی کرتے رہے؛ جس کے نتیجے میں بالآخر جنگ ہو کر رہی۔ یا اس سے مراد قبیلہ بنی بکر کی وہ امداد ہے جو قریش نے ان کی کی؛ جب کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف قبیلہ خزاعہ پر چڑھائی کی تھی دراصل حلیف قریش کی یہ امداد معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔

وَيَتَّبِعُ صِدْقَهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۰﴾

وَيَذْهَبُ عَظِيمًا قُلُوبُهُمْ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ
عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۱۱﴾

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ
وَأَلَمْ يَكُنْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَاكِرًا لَهُمْ ۗ وَاللَّهُ الْمُنْتَصِرُ ۗ
وَاللَّهُ جَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۲﴾

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسْجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَىٰ

عذاب دے گا، انہیں ذلیل و رسوا کرے گا، تمہیں ان پر
مدد دے گا اور مسلمانوں کے کلیجے ٹھنڈے کرے گا۔ (۱۳)
اور ان کے دل کا غم و غصہ دور کرے گا،^(۱) اور وہ جس
کی طرف چاہتا ہے رحمت سے توجہ فرماتا ہے۔ اللہ جانتا
بوجھتا حکمت والا ہے۔ (۱۵)

کیا تم یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے^(۲) حالانکہ
اب تک اللہ نے تم میں سے انہیں ممتاز نہیں کیا جو مجاہد
ہیں^(۳) اور جنہوں نے اللہ کے اور اس کے رسول کے اور
مومنوں کے سوا کسی کو دلی دوست نہیں بنایا۔^(۴) اللہ خوب
خبردار ہے جو تم کر رہے ہو۔^(۵) (۱۶)

لائق نہیں کہ مشرک اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو آباد کریں۔
در آں حالیکہ وہ خود اپنے کفر کے آپ ہی گواہ ہیں،^(۶) ان

(۱) یعنی جب مسلمان کمزور تھے تو یہ مشرکین ان پر ظلم و ستم کرتے تھے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے دل ان کی طرف
سے بڑے دکھی اور مجروح تھے۔ جب تمہارے ہاتھوں وہ قتل ہوں گے اور ذلت و رسوائی ان کے حصے میں آئے گی تو
فطری بات ہے کہ اس سے مظلوم اور ستم رسیدہ مسلمانوں کے کلیجے ٹھنڈے اور دلوں کا غصہ فرو ہو گا۔

(۲) یعنی بغیر امتحان اور آزمائش کے۔

(۳) گویا جہاد کے ذریعے امتحان لیا گیا۔

(۴) وَلْيَنْجِئْهُ، گمراہ اور دلی دوست کو کہتے ہیں مسلمانوں کو چونکہ اللہ اور رسول کے دشمنوں سے محبت کرنے اور
دوستانہ تعلقات رکھنے سے بھی منع کیا گیا تھا، لہذا یہ بھی آزمائش کا ایک ذریعہ تھا، جس سے مخلص مومنوں کو دوسروں
سے ممتاز کیا گیا۔

(۵) مطلب یہ ہے کہ اللہ کو تو پہلے ہی ہر چیز کا علم ہے۔ لیکن جہاد کی حکمت یہ ہے کہ اس سے مخلص اور غیر مخلص،
فرماں بردار اور نافرمان بندے نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں، جنہیں ہر شخص دیکھ اور پہچان لیتا ہے۔

(۶) مَسْجِدَ اللَّهِ سے مراد مسجد حرام ہے۔ جمع کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا کہ یہ تمام مساجد کا قبلہ و مرکز ہے یا عربوں
میں واحد کے لیے بھی جمع کا استعمال جائز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے گھر (یعنی مسجد حرام) کو تعمیر یا آباد کرنا یہ ایمان
والوں کا کام ہے نہ کہ ان کا جو کفر و شرک کا ارتکاب اور اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ جیسے وہ تلبیہ میں کہا کرتے تھے
لَيْتَيْكَ إِلَّا شَرِيكَ لَكَ، إِلَّا شَرِيكَ هُوَ لَكَ، تَمَلِكُهُ وَمَا مَلَكَ (صحیح مسلم۔ باب التلبیة) یا اس سے مراد وہ

کے اعمال غارت و اکارت ہیں، اور وہ دائمی طور پر جنمی ہیں۔^(۱) (۱۷)

اللہ کی مسجدوں کی رونق و آبادی تو ان کے حصے میں ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں، نمازوں کے پابند ہوں، زکوٰۃ دیتے ہوں، اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں، توقع ہے کہ یہی لوگ یقیناً ہدایت یافتہ ہیں۔^(۲) (۱۸)

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلا دینا اور مسجد حرام کی خدمت کرنا اس کے برابر کر دیا ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، یہ اللہ کے نزدیک برابر کے نہیں^(۳) اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت

أَنْفُسِهِمْ بِالْكَفْرِ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۷﴾

إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسْجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَغْشُ إِلَّا اللَّهَ فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُتَّقِينَ ﴿۱۸﴾

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۹﴾

اعتراف ہے جو ہر مذہب والا کرتا ہے کہ میں یہودی، نصرانی، صابی یا مشرک ہوں (فتح القدر)

(۱) یعنی ان کے وہ عمل جو بظاہر نیک لگتے ہیں، جیسے طواف و عمرہ اور حاجیوں کی خدمت وغیرہ۔ کیونکہ ایمان کے بغیر یہ اعمال ایسے درخت کی طرح ہیں جو بے ثمر ہیں یا ان پھولوں کی طرح ہیں جن میں خوشبو نہیں ہے۔

(۲) جس طرح حدیث میں بھی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا إِذَا رَأَيْتُمُ الرَّجُلَ يَعْتَادُ الْمَسْجِدَ، فَاشْهَدُوا لَهُ بِالْإِيمَانِ (ترمذی، تفسیر سورة التوبة) ”جب تم دیکھو کہ ایک آدمی مسجد میں پابندی سے آتا ہے تو تم اس کے ایمان کی گواہی دو۔“ قرآن کریم میں یہاں بھی ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے بعد جن اعمال کا ذکر کیا گیا ہے، وہ نماز، زکوٰۃ اور خشیت الہی ہے۔ جس سے نماز، زکوٰۃ اور تقویٰ کی اہمیت واضح ہے۔

(۳) مشرکین حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی دیکھ بھال کا جو کام کرتے تھے، اس پر انہیں بڑا فخر تھا اور اس کے مقابلے میں وہ ایمان و جہاد کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے جس کا اہتمام مسلمانوں کے اندر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تم سقايت حارج اور عمارت مسجد حرام کو ایمان باللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے برابر سمجھتے ہو؟ یاد رکھو! اللہ کے نزدیک یہ برابر نہیں۔ بلکہ مشرک کا کوئی عمل بھی مقبول نہیں، چاہے وہ صورت خیر ہی ہو۔ جیسا کہ اس سے پہلی آیت کے جملے ﴿حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ﴾ میں واضح کیا جا چکا ہے۔ بعض روایت میں اس کا سبب نزول مسلمانوں کی آپس میں ایک گفتگو کو بتلایا گیا ہے کہ ایک روز منبر نبوی کے قریب کچھ مسلمان جمع تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ اسلام لانے کے بعد میرے نزدیک سب سے بڑا عمل حاجیوں کو پانی پلانا ہے۔ دوسرے نے کہا، مسجد حرام کو آباد کرنا ہے۔ تیسرے نے کہا، بلکہ جہاد فی سبیل اللہ ان تمام عملوں سے بہتر ہے جو تم نے بیان کیے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب انہیں اس طرح باہم تکرار کرتے ہوئے سنا تو انہیں ڈانٹا اور فرمایا کہ منبر رسول ﷺ کے پاس آوازیں اونچی مت کرو۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ راوی حدیث حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں جمعہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی آپس کی

نہیں دیتا۔^(۱۹)

جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کیا وہ اللہ کے ہاں بہت بڑے مرتبہ والے ہیں، اور یہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔ (۲۰)

انھیں ان کا رب خوشخبری دیتا ہے اپنی رحمت کی اور رضامندی کی اور جنتوں کی، ان کے لیے وہاں دوا می نعمت ہے۔ (۲۱)

وہاں یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں اللہ کے پاس یقیناً بہت بڑے ثواب ہیں۔^(۲۲)

اے ایمان والو! اپنے باپوں کو اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ کفر کو ایمان سے زیادہ عزیز رکھیں۔ تم میں سے جو بھی ان سے محبت رکھے گا وہ پورا گنہگار

الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجْهَهُمْ وَإِلَىٰ سَبِيلِ اللَّهِ
يَأْتُوا الْإِيمَانَ وَأَنْفُسِهِمْ أَكْثَرُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ وَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿۲۰﴾

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَرِضْوَانٍ وَوَعْدٍ لَهُمْ
بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲۱﴾

خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا إِنَّ اللَّهَ عِنْدَكَ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۲۲﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ
أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَىٰ الْإِيمَانِ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ
فَوَلَّيَكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۳﴾

اس گفتگو کی بابت استفسار کیا، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب فضل الشهادة فی سبیل اللہ، جس میں گویا یہ واضح کر دیا گیا کہ ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور جہاد فی سبیل اللہ، سب سے زیادہ اہمیت و فضیلت والے عمل ہیں۔ گفتگو کے حوالے سے اصل اہمیت و فضیلت تو جہاد کی بیان کرنی تھی لیکن ایمان باللہ کے بغیر چونکہ کوئی بھی عمل مقبول نہیں، اس لیے پہلے اسے بیان کیا گیا۔ بہر حال اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ جہاد فی سبیل اللہ سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں۔ دوسرا، یہ معلوم ہوا کہ اس کا سبب نزول مشرکین کے مزعومات فاسدہ کے علاوہ خود مسلمانوں کا بھی اپنے اپنے طور پر بعض عملوں کو بعض پر زیادہ اہمیت دینا تھا، جب کہ یہ کام شارع کا ہے نہ کہ مومنوں کا۔ مومنوں کا کام تو ہر اس بات پر عمل کرنا ہے جو اللہ اور رسول کی طرف سے انہیں بتلائی جائے۔

(۱) یعنی یہ لوگ چاہے کیسے بھی دعویٰ کریں، حقیقت میں ظالم ہیں یعنی مشرک ہیں، اس لیے کہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ اس ظلم کی وجہ سے یہ ہدایت الہی سے محروم ہیں۔ اس لیے ان کا اور مسلمانوں کا، جو ہدایت الہی سے بہرہ ور ہیں، آپس میں کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔

(۲) ان آیات میں ان اہل ایمان کی فضیلت بیان کی گئی جنہوں نے ہجرت کی اور اپنی جان مال کے ساتھ جہاد میں حصہ لیا۔ فرمایا۔ اللہ کے ہاں انہی کا درجہ سب سے بلند ہے اور یہی کامیاب ہیں، یہی اللہ کی رحمت و رضامندی اور دائمی نعمتوں کے مستحق ہیں نہ کہ جو خود اپنے منہ میاں مٹھو بٹنے اور اپنے آبائی طور طریقوں کو ہی ایمان باللہ کے مقابلے میں عزیز رکھتے ہیں۔

ظالم ہے۔^(۱) (۲۳)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے لڑکے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے کنبے قبیلے اور تمہارے کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس کی کمی سے تم ڈرتے ہو اور وہ حویلیاں جنہیں تم پسند کرتے ہو اگر یہ تمہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جماد سے بھی زیادہ عزیز ہیں، تو تم انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنا عذاب لے آئے۔ اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔^(۲) (۲۳)

یقیناً اللہ تعالیٰ نے بہت سے میدانوں میں تمہیں فتح دی ہے اور حنین کی لڑائی والے دن بھی جب کہ تمہیں اپنی کشرت پر ناز ہو گیا تھا، لیکن اس نے تمہیں کوئی فائدہ نہ

مُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُهُمْ وَأَبْنَاؤُهُمْ وَإِخْوَانُهُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ وَعَشِيرَتُهُمْ وَأَمْوَالٌ يُقْتَضُونَ بِهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسْكَنٌ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرْتَصِفُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴿۲۳﴾

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ۗ وَقَوْمٌ حُنَيْنٍ ۚ إِذْ أَعْبَجَبْتَكُمْ كُنْتُمْ قَلَمَ تَعْنُونَ عَنْكُمْ سَيْئًا وَصَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ

(۱) یہ وہی مضمون ہے جو قرآن کریم میں متعدد جگہ بیان کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ سورۃ آل عمران آیت ۲۸-۱۱۸۔ سورۃ المائدہ آیت ۱۵ اور سورۃ المجادلہ ۲۲) یہاں جماد و ہجرت کے موضوع کے ضمن میں (چونکہ اس کی اہمیت واضح ہے اس لیے) اسے یہاں بھی بیان کیا گیا ہے یعنی جماد و ہجرت میں تمہارے لیے تمہارے باپوں اور بھائیوں وغیرہ کی محبت آڑے نہ آئے، کیونکہ اگر وہ ابھی تک کافر ہیں، تو پھر وہ تمہارے دوست ہو ہی نہیں سکتے، بلکہ وہ تو تمہارے دشمن ہیں۔ اگر تم ان سے محبت کا تعلق رکھو گے تو یاد رکھو تم ظالم قرار پاؤ گے۔

(۲) اس آیت میں بھی اس مضمون ماسبق کو بڑے مؤکد انداز میں بیان کیا گیا ہے عشیرۃ اسم جمع ہے، وہ قریب ترین رشتے دار جن کے ساتھ آدمی زندگی کے شب و روز گزارتا ہے، یعنی کنبہ، قبیلہ۔ اقرار، کسب (کمائی) کے معنی کے لیے آتا ہے۔ تجارت، سودے کی خرید و فروخت کو کہتے ہیں جس سے مقصد نفع کا حصول ہو۔ کساد، مندرے کو کہتے ہیں یعنی سامان فروخت موجود ہو لیکن خریدار نہ ہوں یا اس چیز کا وقت گزر چکا ہو، جس کی وجہ سے لوگوں کو اس کی ضرورت نہ رہے۔ دونوں صورتیں مندرے کی ہیں۔ مساکن سے مراد وہ گھر ہیں جنہیں انسان موسم کے شدائد و حوادث سے بچتے، آبرو منداندہ طریقے سے رہنے سہنے اور اپنے بال بچوں کی حفاظت کے لیے تعمیر کرتا ہے، یہ ساری چیزیں اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں اور ان کی اہمیت و افادیت بھی ناگزیر اور قلوب انسانی میں ان سب کی محبت بھی طبعی ہے (جو مذموم نہیں) لیکن اگر ان کی محبت اللہ اور رسول کی محبت سے زیادہ اور اللہ کی راہ میں جماد کرنے میں مانع ہو جائے، تو یہ بات اللہ کو سخت ناپسندیدہ اور اس کی ناراضی کا باعث ہے۔ اور یہ وہ فسق (نافرمانی) ہے جس سے انسان اللہ کی ہدایت سے محروم ہو

وَلَيْسَ مُؤْمِرِينَ ⑩

دیا بلکہ زمین باوجود اپنی کشادگی کے تم پر تنگ ہو گئی پھر تم پیٹھ پھیر کر مڑ گئے۔ (۲۵)

پھر اللہ نے اپنی طرف کی تسکین اپنے نبی پر اور مومنوں پر اتاری اور اپنے وہ لشکر بھیجے جنہیں تم دیکھ نہیں رہے تھے اور کافروں کو پوری سزا دی۔ ان کفار کا یہی بدلہ تھا۔ (۲۶)

پھر اس کے بعد بھی جس پر چاہے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کی توجہ فرمائے گا^(۱) اللہ ہی بخشش و مہربانی کرنے والا ہے۔ (۲۷)

ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُبُودًا لَمْ تَرَوْهَا وَعَذَابًا الَّذِينَ كَفَرُوا ۗ وَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ⑪

ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَلَى مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ هَفُودٌ ذَكِيَّةٌ ⑫

سکتا ہے۔ جس طرح کہ آخری الفاظ تہدید سے واضح ہے۔ احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس مضمون کو وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ مثلاً ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”یا رسول اللہ! مجھے آپ، اپنے نفس کے سوا، ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا ”جب تک میں اس کے اپنے نفس سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں، اس وقت تک وہ مومن نہیں۔“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ”پس واللہ! اب آپ مجھے اپنے نفس سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا ”اے عمر! اب تم مومن ہو۔“ (صحیح بخاری۔ کتاب الایمان والنذور۔ باب کیف کان یمین النبی صلی اللہ علیہ وسلم) ایک دوسری روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں، جب تک میں اس کو، اس کے والد سے، اس کی اولاد سے اور تمام لوگوں سے زیادہ، محبوب نہ ہو جاؤں۔“ (صحیح بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب حب الرسول ﷺ من الایمان۔ ومسلم کتاب الایمان، باب بیان خصال من اتصف بہن وجد حلاوة الایمان) ایک اور حدیث میں جہاد کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا ”جب تم بیع عنینہ (کسی کو مدت معینہ کے لیے چیز ادھار دے کر، پھر اس سے کم قیمت پر خرید لینا) اختیار کر لو گے اور گایوں کی دہیں پکڑ کر کھیتی باڑی پر راضی و قانع ہو جاؤ گے اور جہاد چھوڑ بیٹھو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسی ذلت مسلط فرمائے گا جس سے تم اس وقت تک نہ نکل سکو گے، جب تک اپنے دین کی طرف نہیں لوٹو گے (ابوداؤد، کتاب البیوع، باب النهی عن العینہ۔ مسند أحمد، جلد ۲، ص ۳۲)

(۱) حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی ہے۔ یہاں ہواؤں اور تھنّف رہتے تھے، یہ دونوں قبیلے تیر اندازی میں مشہور تھے۔ یہ مسلمانوں کے خلاف لڑنے کی تیاری کر رہے تھے جس کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا تو آپ ۱۳ ہزار کاشکر لے کر ان قبیلوں سے جنگ کے لیے حنین تشریف لے گئے، یہ فتح مکہ کے ۱۸، ۱۹ دن بعد، شوال کا واقعہ ہے۔ مذکورہ قبیلوں نے بھرپور تیاری کر رکھی تھی اور مختلف کمین گاہوں میں تیر اندازوں کو مقرر کر دیا تھا۔ ادھر مسلمانوں میں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نجسٌ فَلَا يَقْرَبُوا
 الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَاهِهِمْ هَذَا ۚ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً
 فَهَوِّفُوا بَعْدَ مَا رَأَيْتُم مِّن قِبَلِكُمْ إِنَّ اللَّهَ
 عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۱۰﴾

اے ایمان والو! بے شک مشرک بالکل ہی ناپاک
 ہیں^(۱) وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس بھی نہ
 پھٹکنے پائیں^(۲) اگر تمہیں مفلسی کا خوف ہے تو اللہ
 تمہیں دولت مند کر دے گا اپنے فضل سے اگر

یہ عجب پیدا ہو گیا کہ آج کم از کم قلت کی وجہ سے ہم مغلوب نہیں ہوں گے۔ یعنی اللہ کی مدد کے بجائے اپنی کثرت
 تعداد پر اعتماد زیادہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ عجب اور یہ کلمہ پسند نہیں آیا۔ نتیجتاً جب ہوازن کے تیر اندازوں نے مختلف کمین
 گاہوں سے مسلمانوں کے لشکر پر یک بارگی تیر اندازی کی تو اس غیر متوقع اور اچانک تیروں کی بوچھاڑ سے مسلمانوں کے
 قدم اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ میدان میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سو کے قریب مسلمان رہ
 گئے۔ آپ ﷺ مسلمانوں کو پکار رہے تھے ”اللہ کے بندو! میرے پاس آؤ“ میں اللہ کا رسول ہوں“ کبھی یہ رجز یہ کلمہ
 پڑھتے اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبَ - اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ پھر آپ ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو (جو نہایت بلند آواز تھے)
 حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کو جمع کرنے کے لیے آواز دیں۔ چنانچہ ان کی ندا سن کر مسلمان سخت پشیمان ہوئے اور دوبارہ
 میدان میں آگئے اور پھر اس طرح جم کر لڑے کہ اللہ نے فتح عطا فرمائی، اللہ تعالیٰ کی بھی مدد پھر اس طرح حاصل ہوئی کہ
 ایک تو ان پر سکینت نازل فرمائی گئی، جس سے ان کے دلوں سے دشمن کا خوف دور ہو گیا۔ دوسرے، فرشتوں کا نزول
 ہوا۔ اس جنگ میں مسلمانوں نے چھ ہزار کافروں کو قیدی بنایا (جنہیں بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی درخواست پر چھوڑ
 دیا گیا) اور بہت سامان غنیمت حاصل ہوا۔ جنگ کے بعد ان کے بہت سے سردار بھی مسلمان ہو گئے۔ یہاں ۳ آیات میں
 اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کا مختصر ذکر فرمایا ہے۔

(۱) مشرک کے نجس (پلید، ناپاک) ہونے کا مطلب، عقائد و اعمال کے لحاظ سے ناپاک ہونا ہے۔ بعض کے نزدیک مشرک
 ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے ناپاک ہے۔ کیونکہ وہ طہارت (صفائی و پاکیزگی) کا اس طرح اہتمام نہیں کرتا، جس کا حکم
 شریعت نے دیا ہے۔

(۲) یہ وہی حکم ہے جو سن ۹ ہجری میں اعلان براءت کے ساتھ کیا گیا تھا، جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے یہ ممانعت
 بعض کے نزدیک صرف مسجد حرام کے لیے ہے۔ ورنہ حسب ضرورت مشرکین دیگر مساجد میں داخل ہو سکتے ہیں۔ جس
 طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کو مسجد نبوی کے ستون سے باندھے رکھا تھا۔ حتیٰ کہ اللہ نے
 ان کے دل میں اسلام کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ڈال دی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ علاوہ ازیں اکثر علما کے
 نزدیک یہاں مسجد حرام سے مراد، پورا حرم ہے۔ یعنی حدود حرم کے اندر مشرک کا داخلہ ممنوع ہے۔ بعض آثار کی بنیاد پر
 اس حکم سے ذمی اور خدام کو مستثنیٰ کیا گیا ہے اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس سے استدلال کرتے ہوئے اپنے
 دور حکومت میں یہود و نصاریٰ کو بھی مسلمانوں کی مسجدوں میں داخلے سے ممانعت کا حکم جاری فرمایا تھا۔ (ابن کثیر)

چاہے ^(۱) اللہ علم و حکمت والا ہے۔ (۲۸)

ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے جو اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ شے کو حرام نہیں جانتے، نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ ذلیل و خوار ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔ ^(۲) (۲۹)

یہود کہتے ہیں عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصرانی کہتے ہیں مسیح اللہ کا بیٹا ہے یہ قول صرف ان کے منہ کی بات ہے۔ اگلے منکروں کی بات کی یہ بھی نقل کرنے لگے اللہ انہیں غارت کرے وہ کیسے پٹائے جاتے ہیں۔ (۳۰)

ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علموں اور درویشوں کو رب بنایا ہے ^(۳) اور مریم کے بیٹے مسیح کو حالانکہ

فَاتَّبِعُوا الذِّكْرَ الَّذِي يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ
دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا
الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ۝

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصْرَى
الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَلِكَ قَوْلُهُمْ يَأْفِكُونَهُمْ
يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ
قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّى يُؤْفِكُونَ ۝

إِتَّخَذُوا أَحْبَابَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ
دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَأْمُورًا

(۱) مشرکین کی ممانعت سے بعض مسلمانوں کے دل میں یہ خیال آیا کہ حج کے موسم میں زیادہ اجتماع کی وجہ سے جو تجارت ہوتی ہے، یہ متاثر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اس مفلسی (یعنی کاروبار کی کمی) سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ عنقریب اپنے فضل سے تمہیں غنی کر دے گا چنانچہ فتوحات کی وجہ سے کثرت سے مال غنیمت مسلمانوں کو حاصل ہوا اور پھر یہ تدریج سارا عرب بھی مسلمان ہو گیا اور حج کے موسم میں حاجیوں کی ریل پیل پھر اسی طرح ہو گئی جس طرح پہلے تھی بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہو گئی اور جو مسلسل روز افزوں ہی ہے۔

(۲) مشرکین سے قتال عام کے حکم کے بعد اس آیت میں یہود و نصاریٰ سے قتال کا حکم دیا جا رہا ہے (اگر وہ اسلام نہ قبول کریں) یا پھر وہ جزیہ دے کر مسلمانوں کی ماتحتی میں رہنا قبول کر لیں۔ جزیہ، ایک متعین رقم ہے جو سالانہ ایسے غیر مسلموں سے لی جاتی ہے جو کسی اسلامی مملکت میں رہائش پذیر ہوں۔ اس کے بدلے میں ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی مملکت کی ہوتی ہے۔ یہود و نصاریٰ باوجود اس بات کے کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے تھے، ان کی بات کما گیا کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے تھے، اس سے یہ واضح کر دیا گیا کہ انسان جب تک اللہ پر اس طرح ایمان نہ رکھے جس طرح اللہ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے بتلایا ہے، اس وقت تک اس کا ایمان باللہ قابل اعتبار نہیں۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ ان کے ایمان باللہ کو غیر معتبر اس لیے قرار دیا گیا کہ یہود و نصاریٰ نے حضرت عزیر و حضرت مسیح علیہما السلام کی انبیت (یعنی بیٹا ہونے کا) اور الوہیت کا عقیدہ گھڑ لیا تھا، جیسا کہ اگلی آیت میں ان کے اس عقیدے کا اظہار ہے۔

(۳) اس کی تفسیر حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہما کی بیان کردہ حدیث سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی

إِلَّا يَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا ۚ لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ

سُبْحٰنَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۳۱﴾

انہیں صرف ایک اکیلے اللہ ہی کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ پاک ہے ان کے شریک مقرر کرنے سے۔ (۳۱)

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بچھادیں اور اللہ تعالیٰ انکاری ہے مگر اسی بات کا کہ اپنا نور پورا کرے گو کافر ناخوش رہیں۔^(۱) (۳۲)

يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَىٰ اللَّهُ إِلَّآ أَن يَتَخَذَ نُورُهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ﴿۳۲﴾

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ

لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۚ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴿۳۳﴾

اسی نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے کہ اسے اور تمام مذہبوں پر غالب کر دے^(۲)

اللہ علیہ وسلم سے یہ آیت سن کر عرض کیا کہ یہود و نصاریٰ نے تو اپنے علما کی کبھی عبادت نہیں کی، پھر یہ کیوں کہا گیا کہ انہوں نے ان کو رب بنا لیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے ان کی عبادت نہیں کی۔ لیکن یہ بات تو ہے نا، کہ ان کے علما نے جس کو حلال قرار دے دیا، اس کو انہوں نے حلال اور جس چیز کو حرام کر دیا، اس کو حرام ہی سمجھا۔ یہی ان کی عبادت کرنا ہے۔“ (صحیح ترمذی۔ لئلائبانی۔ نمبر ۲۳۷۱) کیونکہ حرام و حلال کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ یہی حق اگر کوئی شخص کسی اور کے اندر تسلیم کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اس کو اپنا رب بنا لیا ہے۔ اس آیت میں ان لوگوں کے لیے بڑی تنبیہ ہے جنہوں نے اپنے اپنے پیشواؤں کو تحلیل و تحریم کا منصب دے رکھا ہے اور ان کے اقوال کے مقابلے میں وہ نصوص قرآن و حدیث کو بھی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

(۱) یعنی اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے، یہود و نصاریٰ اور مشرکین چاہتے ہیں کہ اپنے جدال و افتراء سے اسے مٹادیں۔ ان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص سورج کی شعاعوں کو یا چاند کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دے۔ پس! جس طرح یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح جو دین حق اللہ نے اپنے رسول کو دے کر بھیجا ہے اس کا مٹانا بھی ناممکن ہے۔ وہ تمام دینوں پر غالب آکر رہے گا۔ جیسا کہ اگلے جملے میں اللہ نے فرمایا۔ کافر کے لغوی معنی ہیں چھپانے والا اسی لیے رات کو بھی ”کافر“ کہا جاتا ہے کہ وہ تمام چیزوں کو اپنے اندھیروں میں چھپا لیتی ہے۔ کاشت کار کو بھی ”کافر“ کہتے ہیں کیونکہ وہ غلے کے دانوں کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ گویا کافر بھی اللہ کے نور کو چھپانا چاہتے ہیں یا اپنے دلوں میں کفر و نفاق اور مسلمانوں اور اسلام کے خلاف بغض و عناد چھپائے ہوئے ہیں۔ اس لیے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔

(۲) دلائل و براہین کے لحاظ سے تو یہ غلبہ ہر وقت حاصل ہے۔ تاہم جب مسلمانوں نے دین پر عمل کیا تو انہیں دنیوی غلبہ بھی حاصل ہوا۔ اور اب بھی مسلمان اگر اپنے دین کے عامل بن جائیں تو ان کا غلبہ یقینی ہے، اس لیے کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ حزب اللہ ہی غالب و فاتح ہو گا۔ شرط یہی ہے کہ مسلمان حزب اللہ بن جائیں۔

اگرچہ مشرک برائیاں۔ (۳۳)

اے ایمان والو! اکثر علما اور عابد، لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روک دیتے ہیں^(۱) اور جو لوگ سونے چاندی کا خزانہ رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک عذاب کی خبر پہنچا دیجئے۔^(۲) (۳۴)

جس دن اس خزانے کو آتش دوزخ میں پتایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (ان سے کہا جائے گا) یہ ہے جسے تم نے اپنے لیے خزانہ بنا کر رکھا تھا۔ پس اپنے خزانوں کا مزہ چکھو۔ (۳۵)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْحَبَارَةِ الرَّهْبَانِ لَيْسَ كَلِمَتٌ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْمَبْطُلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ يَكْتُمُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْحَبَارَةِ الرَّهْبَانِ لَيْسَ كَلِمَتٌ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْمَبْطُلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ يَكْتُمُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾

(۱) اَحْبَاذُ، حِزْبُ کی جمع ہے۔ یہ ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو بات کو خوبصورت طریقے سے پیش کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔ خوبصورت اور منقش کپڑے کو نَوْبٌ مُّحَبَّرٌ کہا جاتا ہے مراد علمائے یہود ہیں۔ رہبان راہب کی جمع ہے جو رہنہ سے مشتق ہے۔ اس سے مراد علمائے نصاریٰ ہیں بعض کے نزدیک یہ صوفیائے نصاریٰ ہیں۔ علما کے لیے ان کے ہاں قِسْبِیْنٌ کا لفظ ہے۔ یہ دونوں ایک تو کلام اللہ میں تحریف و تغیر کر کے لوگوں کی خواہشات کے مطابق مسئلے بتاتے اور یوں لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں دوسرے اس طرح لوگوں سے مال اٹھتے، جو ان کے لیے باطل اور حرام تھا۔ بد قسمتی سے بہت سے علمائے مسلمین کا بھی یہی حال ہے اور یوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کا مصداق ہیں جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا؛ لَتَسْبَعَنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ (صحیح بخاری کتاب الاعتصام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان باب کا عنوان ہے) ”تم پچھلی امتوں کے طور طریقوں کی ضرور پیروی کرو گے۔“

(۲) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ زکوٰۃ کے حکم سے پہلے کا حکم ہے۔ زکوٰۃ کا حکم نازل ہونے کے بعد زکوٰۃ کو اللہ تعالیٰ نے مال کی طہارت کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ اس لیے علما فرماتے ہیں کہ جس مال سے زکوٰۃ ادا کر دی جائے وہ کنز نہیں ہے اور جس مال سے زکوٰۃ ادا نہ کی جائے وہ کنز (خزانہ) ہے جس پر یہ قرآنی وعید ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ہے کہ ”جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا قیامت والے دن اس کے مال کو آگ کی تختیاں بنا دیا جائے گا“ جس سے اس کے دونوں پہلوؤں کو پیشانی کو اور کمر کو داغا جائے گا۔ یہ دن پچاس ہزار سال کا ہو گا اور لوگوں کے فیصلے ہو جائے تک اس کا یہی حال رہے گا اس کے بعد جنت یا جہنم میں اسے لے جایا جائے گا (صحیح مسلم۔ کتاب الزکوٰۃ، باب ائتم مناع الزکوٰۃ) یہ بگڑے ہوئے علما اور صوفیا کے بعد بگڑے ہوئے اہل سرمایہ ہیں تینوں طبقے عوام کے بگاڑ میں سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ «اللَّهُمَّ! احْفَظْنَا مِنْهُمْ»۔

مبینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک کتاب اللہ میں بارہ کی ہے، اسی دن سے جب سے آسمان و زمین کو اس نے پیدا کیا ہے ان میں سے چار حرمت و ادب کے ہیں۔^(۱) یہی درست دین ہے،^(۲) تم ان مبینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو^(۳) اور تم تمام مشرکوں سے جماد کو جیسے کہ وہ تم سب سے لڑتے ہیں^(۴) اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے۔ (۳۶)

مبینوں کا آگے پیچھے کر دینا کفر کی زیادتی ہے^(۵) اس سے

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كَتَبِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿۳۶﴾

إِنَّمَا النَّبِيُّ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا

(۱) فی کتاب اللہ سے مراد لوح محفوظ یعنی تقدیر الہی ہے۔ یعنی ابتدائے آفرینش سے ہی اللہ تعالیٰ نے بارہ مبینے مقرر فرمائے ہیں، جن میں چار حرمت والے ہیں جن میں قتال و جدال کی بالخصوص ممانعت ہے۔ اسی بات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ”زمانہ گھوم گھما کر پھر اسی حالت پر آگیا ہے جس حالت پر اس وقت تھا جب اللہ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی۔ سال بارہ مبینوں کا ہے، جن میں چار حرمت والے ہیں، تین پے درپے۔ ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور چوتھا رجب مضرب جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان ہے“ صحیح بخاری۔ کتاب التفسیر، سورۃ توبہ وصحیح مسلم۔ کتاب القسامۃ، باب تغلیظ تحریم الدماء... زمانہ اسی حالت پر آگیا ہے کا مطلب، مشرکین عرب مبینوں میں جو تاخیر و تقدیم کرتے تھے، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، اس کا خاتمہ ہے۔

(۲) یعنی ان مبینوں کا اسی ترتیب سے ہونا، جو اللہ نے رکھی ہے اور جن میں چار حرمت والے ہیں۔ اور یہی حساب صحیح اور عدد مکمل ہے۔

(۳) یعنی ان حرمت والے مبینوں میں قتال کر کے ان کی حرمت پامال کر کے اور اللہ کی نافرمانی کا ارتکاب کر کے۔

(۴) لیکن حرمت والے مبینے گزرنے کے بعد الایہ کہ وہ لڑنے پر مجبور کر دیں، پھر حرمت والے مبینوں میں بھی تمہارے لیے لڑنا جائز ہو گا۔

(۵) نَسِیَ کے معنی، پیچھے کرنے کے ہیں۔ عربوں میں بھی حرمت والے مبینوں میں قتال و جدال اور لوٹ مار کو سخت ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن مسلسل تین مبینے، ان کی حرمت کو طوطا رکھتے ہوئے، قتل و غارت سے اجتناب، ان کے لیے بہت مشکل تھا۔ اس لیے اس کا حل انہوں نے یہ نکال رکھا تھا کہ جس حرمت والے مبینے میں وہ قتل و غارت گری کرنا چاہتے، اس میں وہ کر لیتے اور اعلان کر دیتے کہ اس کی جگہ فلاں مبینہ حرمت والا ہو گا۔ مثلاً محرم کے مبینے کی حرمت توڑ کر اس کی جگہ صفر کو حرمت والا مبینہ قرار دے دیتے، اس طرح حرمت والے مبینوں میں وہ تقدیم و تاخیر اور اول بدل کرتے رہتے تھے۔ اس کو نَسِیَ کہا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بابت فرمایا کہ یہ کفر میں زیادتی ہے کیونکہ اس اول بدل

وہ لوگ گمراہی میں ڈالے جاتے ہیں جو کافر ہیں۔ ایک سال تو اسے حلال کر لیتے ہیں اور ایک سال اسی کو حرمت والا کر لیتے ہیں، کہ اللہ نے جو حرمت رکھی ہے اس کے شمار میں تو موافقت کر لیں^(۱) پھر اسے حلال بنا لیں جسے اللہ نے حرام کیا ہے انہیں ان کے برے کام بھلے دکھا دیئے گئے ہیں اور قوم کفار کی اللہ رہنمائی نہیں فرماتا۔ (۳۷)

اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ چلو اللہ کے راستے میں کوچ کرو تو تم زمین سے لگے جاتے ہو۔ کیا تم آخرت کے عوض دنیا کی زندگانی پر ہی رہی گئے ہو۔ سنو! دنیا کی زندگی تو آخرت کے مقابلے میں کچھ یونہی سی ہے۔ (۳۸)

اگر تم نے کوچ نہ کیا تو تمہیں اللہ تعالیٰ دردناک سزا دے گا اور تمہارے سوا اور لوگوں کو بدل لائے گا، تم اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے^(۲) اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۳۹)

يُحْيِيهِنَّ عَمَّا قَاتِيَهُنَّ وَمُؤْنَهُ عَمَّا لَبُوا طُغْيَانًا مَّا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحْيِيهِنَّ مَّا حَرَّمَ اللَّهُ زَيْنَ لَهُمْ سَوْءَ أَعْمَالِهِمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٣٧﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّا قَدْ لَقْنَاكُمْ إِلَى الْأَرْضِ أَنْزَلْنَاهُمْ بِأَحْيَايَةِ الدُّنْيَا مِنَ الْأُخْرَىٰ قَمَا مَتَاعًا الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْأُخْرَىٰ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿٣٨﴾

إِلَّا تَتَّقُوا وَاللَّهُ يَبْذُرُ النَّعْمَ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَذُرُّهُ لَكُمْ وَمَا يُبْدِيهِ لَكُمْ إِلَّا مَا يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٩﴾

سے مقصود لڑائی اور دنیاوی مفادات کے حصول کے سوا کچھ نہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کے خاتمے کا اعلان یہ کہہ کر فرمایا کہ زمانہ گھوم گھوم کر اپنی اصلی حالت میں آ گیا ہے۔ یعنی اب آئندہ مہینوں کی یہ ترتیب اسی طرح رہے گی جس طرح ابتدائے کائنات سے چلی آ رہی ہے۔

(۱) یعنی ایک مہینے کی حرمت توڑ کر اس کی جگہ دوسرے مہینے کو حرمت والا قرار دینے سے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو چار مہینے حرمت والے رکھے ہیں، ان کی گنتی پوری رہے، یعنی گنتی پوری کرنے میں اللہ کی موافقت کرتے تھے لیکن اللہ نے قتال و جدال اور غارت گری سے جو منع کیا تھا، اس کی انہیں کوئی پروا نہ تھی، بلکہ انہی ظالمانہ کارروائیوں کے لیے ہی وہ اول بدل کرتے تھے۔

(۲) روم کے عیسائی بادشاہ ہرقل کے بارے میں اطلاع ملی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف لڑائی کی تیاری کر رہا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کے لیے تیاری کا حکم دے دیا۔ یہ شوال سن ۱۹ ہجری کا واقعہ ہے۔ موسم سخت گرمی کا تھا اور سفر بہت لمبا تھا۔ بعض مسلمانوں اور منافقین پر یہ حکم گراں گزرا، جس کا اظہار اس آیت میں کیا گیا ہے اور انہیں

اگر تم ان (نبی ﷺ) کی مدد نہ کرو تو اللہ ہی نے ان کی مدد کی اس وقت جبکہ انھیں کافروں نے (دیس سے) نکال دیا تھا، دو میں سے دوسرا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے،^(۱) پس جناب باری نے اپنی طرف سے تسکین اس پر نازل فرما کر ان لشکروں سے اس کی مدد کی جنہیں تم نے دیکھا ہی نہیں،^(۲) اس نے کافروں کی بات پست کر دی اور بلند و عزیز تو اللہ کا کلمہ ہی ہے،^(۳) اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔ (۳۰)

نکل کھڑے ہو جاؤ ہلکے پھلکے ہو تو بھی اور بھاری بھر کم ہو

إِلَّا تَصْرُوهُ فَقَدْ نَصَرْنَا اللَّهَ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا
ثَانِي اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ
لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ
وَأَيَّدَ بِبُيُوتِهِمْ تَمَّ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا
السُّفْلَى وَكَلِمَةَ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۰﴾

إِنْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ

زجر و توبخ کی گئی ہے۔ یہ جنگ تبوک کلماتی ہے جو حقیقت میں ہوئی نہیں۔ ۲۰ روز مسلمان ملک شام کے قریب تبوک میں رہ کر واپس آگئے۔ اس کو جيش العسرة کہا جاتا ہے کیونکہ اس لمبے سفر میں اس لشکر کو کافی دقتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اِنَّا قَلْبُنَا، یعنی سستی کرتے اور پیچھے رہنا چاہتے ہو۔ اس کا مظاہرہ بعض لوگوں کی طرف سے ہوا لیکن اس کو منسوب سب کی طرف کر دیا گیا۔ (فتح القدیر)

(۱) جہاد سے پیچھے رہنے یا اس سے جان چھڑانے والوں سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم مدد نہیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کا محتاج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی مدد اس وقت بھی کی جب اس نے غار میں پناہ لی تھی اور اپنے ساتھی (یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) سے کہا تھا ”غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے“ اس کی تفصیل حدیث میں آئی ہے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ”جب ہم غار میں تھے تو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اگر ان مشرکین نے (جو ہمارے تعاقب میں ہیں) اپنے قدموں پر نظر ڈالی تو یقیناً ہمیں دیکھ لیں گے“ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، يَا أَبَا بَكْرٍ! مَا ظَنُّكَ بِإِثْنَيْنِ اللَّهُ ثَالِثُهُمَا (صحیح بخاری۔ تفسیر سورۃ التوبۃ، ”اے ابو بکر! تمہارا ان دو کے بارے میں کیا خیال ہے، جن کا تیسرا اللہ ہے“ یعنی اللہ کی مدد اور اس کی نصرت جن کے شامل حال ہے۔

(۲) یہ مدد کی وہ دو صورتیں بیان فرمائی ہیں جن سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد فرمائی گئی۔ ایک سکینت، دوسری فرشتوں کی تائید۔

(۳) کافروں کے نکلے سے شرک اور کلمۃ اللہ سے توحید مراد ہے۔ جس طرح ایک حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔ ایک شخص ہمداری کے جوہر دکھانے کے لیے لڑتا ہے، ایک قبائلی عصبيت و حمیت میں لڑتا ہے، ایک اور ریاکاری کے لیے لڑتا ہے۔ ان میں سے فی سبیل اللہ لڑنے والا کون ہے؟ آپ نے فرمایا ”جو اس لیے لڑتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو جائے، وہ فی سبیل اللہ ہے“۔ (صحیح بخاری، کتاب العلم، باب من سأل وهو

قائم، عالما جالساً ومسلماً، کتاب الإمامۃ، باب من قاتل لتكون كلمته الله هي العليا)

تو بھی،^(۱) اور راہ رب میں اپنی مال و جان سے جہاد کرو،
یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم میں علم ہو۔ (۴۱)
اگر جلد وصول ہونے والا مال و اسباب ہوتا^(۲) اور ہلاک سافر
ہو تا تو یہ ضرور آپ کے پیچھے ہو لیتے^(۳) لیکن ان پر تو دوری
اور دراز کی مشکل پڑ گئی۔ اب تو یہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے
کہ اگر ہم میں قوت و طاقت ہوتی تو ہم یقیناً آپ کے ساتھ
نکلنے، یہ اپنی جانوں کو خود ہی ہلاکت میں ڈال رہے ہیں
ان کے جھوٹا ہونے کا سچا علم اللہ کو ہے۔ (۴۲)
اللہ تجھے معاف فرمادے، تو نے انہیں کیوں اجازت دے
دی؟ بغیر اس کے کہ تیرے سامنے سچے لوگ کھل جائیں
اور تو جھوٹے لوگوں کو بھی جان لے۔ (۴۳)^(۵)

فِي سَبِيلِ اللَّهِ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۴۱﴾

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَسَفَرًا قَاصِدًا لَاتَّبَعُوكَ
وَلَكِنْ بَعَدَتْ عَلَيْهِمُ السُّفُةُ وَسَيَحْلِفُونَ بِآلِهِ
لَوْ أَسْطَعْنَا لَعَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ
وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿۴۲﴾

عَقَّا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ إِذْ نَذَرْتَ لَهُمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكَ
الَّذِينَ صَدَقُوا وَعَلَّمَ الْكَاذِبِينَ ﴿۴۳﴾

(۱) اس کے مختلف مفہوم بیان کیے گئے ہیں مثلاً انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر۔ خوشی سے یا ناخوشی سے۔ غریب ہو یا امیر۔
جوان ہو یا بوڑھا۔ پیادہ ہو یا سوار۔ عیال دار ہو یا اہل و عیال کے بغیر۔ وہ پیش قدمی کرنے والوں میں سے ہو یا پیچھے لشکر
میں شامل۔ امام شوکانی فرماتے ہیں۔ آیت کا حاصل تمام معانی پر ہو سکتا ہے، اس لیے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ ”تم کوچ
کرو، چاہے نقل و حرکت تم پر بھاری ہو یا ہلکی“۔ اور اس مفہوم میں مذکورہ تمام مفاتیم آجاتے ہیں۔
(۲) یہاں سے ان لوگوں کا بیان شروع ہو رہا ہے جنہوں نے عذر معذرت کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے
لی تھی دراصل حالیکہ ان کے پاس حقیقت میں کوئی عذر نہیں تھا۔ عَرَضٌ سے مراد جو دنیوی منافع سامنے آئیں، مطلب
ہے مال غنیمت۔

(۳) یعنی آپ ﷺ کے ساتھ شریک جہاد ہوتے۔ لیکن سفر کی دوری نے انہیں حیلے تراشنے پر مجبور کر دیا۔

(۴) یعنی جھوٹی قسمیں کھا کر۔ کیونکہ جھوٹی قسم کھانا گناہ کبیرہ ہے۔

(۵) یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جا رہا ہے کہ جہاد میں عدم شرکت کی اجازت مانگنے والوں کو تو نے کیوں بغیر یہ
تحقیق کیے کہ اس کے پاس معقول عذر بھی ہے یا نہیں؟ اجازت دے دی؟ لیکن اس تو بیخ میں بھی پیار کا پہلو غالب ہے،
اس لیے اس کو تابی پر معافی کی وضاحت پہلے کر دی گئی ہے۔ یاد رہے یہ تشبیہ اس لیے کی گئی ہے کہ اجازت دینے میں
عجلت کی گئی اور پورے طور پر تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ورنہ تحقیق کے بعد ضرورت مندوں کو اجازت دینے کی
آپ کو اجازت حاصل تھی۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے ﴿فَإِذَا اسْتَأْذَنُوا فَاجِزْ لَهُمْ قَائِدًا يُؤْتِي السُّبْحَانَ بِنُورِهِمْ﴾ (النور: ۲۴)
”جب یہ لوگ تجھ سے اپنے بعض کاموں کی وجہ سے اجازت مانگیں، تو جس کو تو چاہے، اجازت دے دے“۔ ”جس کو
چاہے“ کا مطلب یہ ہے جس کے پاس معقول عذر ہو، اسے اجازت دینے کا حق تجھے حاصل ہے۔

اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان و یقین رکھنے والے تو مالی اور جانی جہاد سے رک رہنے کی کبھی بھی تجھ سے اجازت طلب نہیں کریں گے،^(۱) اور اللہ تعالیٰ پر ہیز گاروں کو خوب جانتا ہے۔ (۴۴)

یہ اجازت تو تجھ سے وہی طلب کرتے ہیں جنہیں نہ اللہ پر ایمان ہے نہ آخرت کے دن کا یقین ہے جن کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنے شک میں ہی سرگرداں ہیں۔^(۲) (۴۵)

اگر ان کا ارادہ جہاد کے لیے نکلنے کا ہوتا تو وہ اس سفر کے لیے سلمان کی تیاری کر رکھتے^(۳) لیکن اللہ کو ان کا اٹھنا پسند ہی نہ تھا اس لیے انہیں حرکت سے ہی

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَاللَّهُ عَلَيْهِمْ
بِالْمُتَّقِينَ ۝

إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهَلْ فِي رَيْبِهِمْ
يَتَرَدَّدُونَ ۝

وَلَوْ أَكْرَدُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوْا لَهُ عُدَّةً وَلَكِنْ كَرِهَ
اللَّهُ الشُّرَكَاءَ فَتَبَتُّهُمْ وَقِيلَ لَهُمْ
مَعَ الْعٰجِدِينَ ۝

(۱) یہ مخلص ایمان داروں کا کردار بیان کیا گیا ہے بلکہ ان کی تو عادت یہ ہے کہ وہ نہایت ذوق و شوق کے ساتھ اور بڑھ چڑھ کر جہاد میں حصہ لیتے ہیں۔

(۲) یہ ان منافقین کا بیان ہے جنہوں نے جھوٹے حیلے تراش کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں نہ جانے کی اجازت طلب کر لی تھی۔ ان کی بابت کہا گیا ہے کہ یہ اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسی عدم ایمان نے انہیں جہاد سے گریز پر مجبور کیا ہے۔ اگر ایمان ان کے دلوں میں راسخ ہوتا تو نہ جہاد سے یہ بھاگتے نہ شکوک و شبہات ان کے دلوں میں پیدا ہوتے۔

نوٹ: خیال رہے کہ اس جہاد میں شرکت کے معاملے میں مسلمانوں کی چار قسمیں تھیں۔ پہلی قسم: وہ مسلمان جو بلا تامل تیار ہو گئے۔ دوسرے، وہ جنہیں ابتداءً تردد ہوا اور ان کے دل ڈولے، لیکن پھر جلد ہی اس تردد سے نکل آئے۔ تیسرے، وہ جو ضعف اور بیماری یا سواری اور سفر خرچ نہ ہونے کی وجہ سے فی الواقع جانے سے معذور تھے اور جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے اجازت دے دی تھی۔ (ان کا ذکر آیت ۹۱-۹۲ میں ہے) چوتھی قسم: وہ جو محض کابلی کی وجہ سے شریک نہیں ہوئے۔ اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم واپس آئے تو انہوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کر کے اپنے آپ کو توبہ اور سزا کے لیے پیش کر دیا۔ ان کے علاوہ باقی منافقین اور ان کے جاسوس تھے۔ یہاں مسلمانوں کے پہلے گروہ اور منافقین کا ذکر ہے۔ مسلمانوں کی باقی تین قسموں کا بیان آگے چل کر آئے گا۔

(۳) یہ انہی منافقین کے بارے میں کہا جا رہا ہے جنہوں نے جھوٹ بول کر اجازت حاصل کی تھی کہ اگر وہ جہاد میں جانے کا ارادہ رکھتے تو یقیناً اس کے لیے تیاری کرتے۔

روک دیا^(۱) اور کہہ دیا گیا کہ تم بیٹھے والوں کے ساتھ بیٹھے ہی رہو۔^(۲) (۳۶)

اگر یہ تم میں کل رکھتے بھی تو تمہارے لیے سوائے فساد کے اور کوئی چیز نہ بڑھاتے^(۳) بلکہ تمہارے درمیان خوب گھوڑے دوڑا دیتے اور تم میں فتنے ڈالنے کی تلاش میں رہتے^(۴) ان کے ماننے والے خود تم میں موجود ہیں،^(۵) اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ (۳۷)

یہ تو اس سے پہلے بھی فتنے کی تلاش کرتے رہے ہیں اور تیرے لیے کاموں کو الٹ پلٹ کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ حق آپہنچا اور اللہ کا حکم غالب آگیا^(۶) باوجودیکہ وہ ناخوشی میں ہی رہے۔ (۳۸)

لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا
وَأَوْصُوا بِإِلْحَاقِكُمْ يَبْعُونَكُمُ الْفِتْنَةَ
وَفِيكُمْ سَمْعُونَ لَهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝

لَعَدَا ابْتَعُوا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلِ وَقَبُولِكَ الْأُمُورَ
حَتَّىٰ حَاءَ الْحَقِّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَرِهُونَ ۝

(۱) فَبَعَثْنَاهُمْ کے معنی ہیں انکو روک دیا یعنی، پیچھے رہنا ان کے لیے پسندیدہ بنا دیا گیا، پس وہ ست ہو گئے اور مسلمانوں کے ساتھ نہیں نکلے (ایسراف التفسیر) مطلب یہ ہے کہ اللہ کے علم میں ان کی شرارتیں اور سازشیں تھیں، اس لیے اللہ کی تقدیری مشیت یہی تھی کہ وہ نہ جائیں۔

(۲) یہ یا تو اسی مشیت الہی کی تعبیر ہے جو تقدیراً لکھی ہوئی تھی۔ یا بطور ناراضی اور غضب کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کہا گیا ہے کہ اچھا ٹھیک ہے تم عورتوں، بچوں، بیماروں اور بوڑھوں کی صف میں شامل ہو کر ان کی طرح گھروں میں بیٹھ رہو۔

(۳) یہ منافقین اگر اسلامی لشکر کے ساتھ شریک ہوتے تو یہ غلط رائے اور مشورے دے کر مسلمانوں میں انتشار ہی کا باعث بنتے۔

(۴) ابْنِ سَاعٍ کے معنی ہوتے ہیں، اپنی سواری کو تیزی سے دوڑانا۔ مطلب یہ ہے کہ چغل خوری وغیرہ کے ذریعے سے تمہارے اندر فتنہ برپا کرنے میں وہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے اور فتنے سے مطلب اتحاد کو پارہ پارہ کر دینا اور ان کے مابین باہمی عداوت و نفرت پیدا کر دینا ہے۔

(۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین کی جاسوسی کرنے والے کچھ لوگ مومنین کے ساتھ بھی لشکر میں موجود تھے جو منافقین کو مسلمانوں کی خیریں پہنچایا کرتے تھے۔

(۶) اسی لیے اس نے گزشتہ اور آئندہ امور کی تمہیں اطلاع دے دی ہے اور یہ بھی بتلادیا ہے کہ یہ منافقین جو ساتھ نہیں گئے، تو تمہارے حق میں اچھا ہی ہوا، اگر یہ جاتے تو یہ یہ خرابیاں ان کی وجہ سے پیدا ہوتیں۔

(۷) یعنی یہ منافقین تو، جب سے آپ مدینہ میں آئے ہیں، آپ کے خلاف فتنے تلاش کرنے اور معاملات کو بگاڑنے میں

ان میں سے کوئی تو کہتا ہے مجھے اجازت دیجئے مجھے فتنے میں نہ ڈالئے، آگاہ رہو وہ تو فتنے میں پڑ چکے ہیں اور یقیناً دوزخ کافروں کو گھیر لینے والی ہے۔ (۳۹)^(۱)

آپ کو اگر کوئی بھلائی مل جائے تو انہیں برا لگتا ہے اور کوئی برائی پہنچ جائے تو یہ کہتے ہیں ہم نے تو اپنا معاملہ پہلے سے ہی درست کر لیا تھا، پھر تو بڑے ہی اتراتے ہوئے لوٹتے ہیں۔ (۵۰)^(۲)

آپ کہہ دیجئے کہ ہمیں سوائے اللہ کے ہمارے حق میں لکھے ہوئے کہ کوئی چیز پہنچ ہی نہیں سکتی وہ ہمارا کارساز اور مولیٰ ہے۔ مومنوں کو تو اللہ کی ذات پاک پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے۔ (۵۱)^(۳)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ اٰذَنْ بِيْ وَلَا تَنْصِيْبِيْۗۤ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْۤا وَاِنْ جَهَنَّمَ لَمُجِيْطَةٌۭ يَّا لَكِنَّ بَرْنَ ۝۵۰

اِنْ تُصِْبَكَ حَسَنَةٌ فَمَسُوْهُمُ وَاِنْ تُصِْبَكَ مُصِيْبَةٌۭ يَقُوْلُوْۤا اَقْدًا اَخَذْنَا اٰمْرًا مِّنْ قَبْلُ وَيَبْتَوُوْۤا وَّهُمْ قٰرِحُوْنَ ۝۵۱

ثَل لَّنْ يُصِيبَنَا اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۵۱

سرگرم رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بدر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتح و غلبہ عطا فرمادیا، جو ان کے لیے بہت ہی ناگوار تھا۔ اسی طرح جنگ احد کے موقع پر بھی ان منافقین نے راستے سے ہی واپس ہو کر مشکلات پیدا کرنے کی اور اس کے بعد بھی ہر موقع پر بگاڑ کی کوششیں کرتے رہے۔ حتیٰ کہ فتح ہو گیا اور اکثر عرب مسلمان ہو گئے جس پر کف حسرت و افسوس مل رہے ہیں۔

(۱) ”مجھے فتنے میں نہ ڈالئے“ کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اگر آپ مجھے اجازت نہیں دیں گے تو مجھے بغیر اجازت رکنے پر سخت گناہ ہو گا۔ اس اعتبار سے فتنہ گناہ کے معنی میں ہو گا۔ یعنی مجھے گناہ میں نہ ڈالئے، دوسرا مطلب فتنے کا ہلاکت ہے یعنی مجھے ساتھ لے جا کر ہلاکت میں نہ ڈالیں کہا جاتا ہے کہ جد بن قیس نے عرض کیا کہ مجھے ساتھ نہ لے جائیں، روم کی عورتوں کو دیکھ کر میں صبر نہ کر سکوں گا۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رخ پھیر لیا اور اجازت دے دی۔ بعد میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”فتنہ میں تو وہ گر چکے ہیں“ یعنی جماد سے پیچھے رہنا اور اس سے گریز کرنا، بجائے خود ایک فتنہ اور سخت گناہ کا کام ہے جس میں یہ لوٹ ہی ہیں۔ اور مرنے کے بعد جنم ان کو گھیر لینے والی ہے، جس سے فرار کا کوئی راستہ ان کے لیے نہیں ہو گا

(۲) سیاق کلام کے اعتبار سے حَسَنَةٌ سے یہاں کامیابی اور غنیمت اور سَبِيْبَةٌ سے ناکامی، شکست اور اسی قسم کے نقصانات جو جنگ میں متوقع ہوتے ہیں، مراد ہیں۔ اس میں ان کے اس خبث باطنی کا اظہار ہے جو منافقین کے دلوں میں تھا۔ اس لیے کہ مصیبت پر خوش ہونا اور بھلائی حاصل ہونے پر رنج و تکلیف محسوس کرنا، غایت عداوت کی دلیل ہے۔

(۳) یہ منافقین کے جواب میں مسلمانوں کے صبر و ثبات اور حوصلے کے لیے فرمایا جا رہا ہے۔ کیونکہ جب انسان کو یہ معلوم ہو کہ اللہ کی طرف سے مقدر کام پر صورت میں ہونا ہے اور جو بھی مصیبت یا بھلائی ہمیں پہنچتی ہے، اسی تقدیر الہی کا حصہ ہے، تو انسان کے لیے مصیبت کا برداشت کرنا آسان اور اس کے حوصلے میں اضافے کا سبب ہوتا ہے۔

کہہ دیجئے کہ تم ہمارے بارے میں جس چیز کا انتظار کر رہے ہو وہ دو بھلائیوں میں سے ایک ہے ^(۱) اور ہم تمہارے حق میں اس کا انتظار کرتے ہیں کہ یا تو اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے کوئی سزا تمہیں دے یا ہمارے ہاتھوں سے ^(۲) پس ایک طرف تم منتظر رہو دوسری جانب تمہارے ساتھ ہم بھی منتظر ہیں۔ (۵۲)

کہہ دیجئے کہ تم خوشی یا ناخوشی کسی طرح بھی خرچ کرو قبول تو ہرگز نہ کیا جائے گا ^(۳) یقیناً تم فاسق لوگ ہو۔ (۵۳)

کوئی سبب ان کے خرچ کی قبولیت کے نہ ہونے کا اس کے سوا نہیں کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے منکر ہیں اور بڑی کابلی سے ہی نماز کو آتے ہیں اور برے دل سے ہی خرچ کرتے ہیں۔ ^(۴) (۵۴)

قُلْ هَلْ تَرْتَضُونَ إِنَّمَا أَخَذَى الْمُسْتَبِينَ
وَمَنْ نَتَرْتَضُ يَكُمُ أَنْ يُصِيبَكُمْ اللَّهُ بِعَذَابٍ
مِنْ عِنْدِهِ أَوْ يَأْتِيَنَّكُمْ فَتَرْتَضُوا إِنَّمَا أَنْعَمَ
مُتَرْتَضُونَ ﴿۵۲﴾

قُلْ أَنْفُسُكُمْ أَنْعَمَ أَوِ كَرِهَالنَّيْتَقَبَلُ مِنْكُمْ إِنْ كُنْتُمْ
تَوَّابِينَ ﴿۵۳﴾

وَمَا مَنَعَهُمْ أَنْ تُقَبَّلَ مِنْهُمْ إِنَّهُمْ إِذْ كَفَرُوا
بِاللَّهِ وَبِرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ
كُسَالَىٰ وَلَا يُنْفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَرِهُونَ ﴿۵۴﴾

(۱) یعنی کامیابی یا شہادت، ان دونوں میں سے جو چیز بھی ہمیں حاصل ہو، ہمارے لیے حسد (بھلائی) ہے۔

(۲) یعنی ہم تمہارے بارے میں دو برائیوں میں سے ایک برائی کا انتظار کر رہے ہیں کہ یا تو آسمان سے اللہ تعالیٰ تم پر عذاب نازل فرمائے جس سے تم ہلاک ہو جاؤ یا ہمارے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ تمہیں (قتل کرنے، یا قیدی بننے وغیرہ قسم کی) سزائیں دے۔ وہ دونوں باتوں پر قادر ہے۔

(۳) أَنْفُسُكُمْ امر کا صیغہ ہے۔ لیکن یہاں یہ یا تو شرط اور جزا کے معنی میں ہے۔ یعنی اگر تم خرچ کرو گے تو قبول نہیں کیا جائے گا۔ یا یہ امر بمعنی خبر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں باتیں برابر ہیں، خرچ کرو یا نہ کرو۔ اپنی مرضی سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے، تب بھی نامقبول ہے۔ کیونکہ قبولیت کے لیے ایمان شرط اول ہے اور وہی تمہارے اندر مفقود ہے اور ناخوشی سے خرچ کیا ہوا مال، اللہ کے ہاں ویسے ہی مردود ہے، اس لیے کہ وہاں قصد صحیح موجود نہیں ہے جو قبولیت کے لیے ضروری ہے۔ یہ آیت بھی اسی طرح ہے جس طرح یہ ہے ﴿إِسْتَعْفُوا لَكُمْ أَوْلَادَكُمْ تَتَّبِعُوا لَكُمْ﴾ (العنقوتہ: ۸۰) آپ ان کے لیے بخشش مانگیں یا نہ مانگیں (یعنی دونوں باتیں برابر ہیں)

(۴) اس میں ان کے صدقات کے عدم قبول کی تین دلیلیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک ان کا کفر و فسق۔ دوسرا، کابلی سے نماز پڑھنا، اس لیے کہ وہ نماز پر ثواب کی امید رکھتے ہیں اور نہ ہی اس کے ترک کی سزا سے انہیں کوئی خوف ہے۔ کیونکہ رجا اور خوف، یہ بھی ایمان کی علامت ہے جس سے یہ محروم ہیں۔ اور تیسرا کراہت سے خرچ کرنا۔ اور جس کام میں دل کی رضائے نہ ہو، وہ قبول کس طرح ہو سکتا ہے؟ بہر حال یہ تینوں وجوہات ایسی ہیں کہ ان میں سے ایک ایک وجہ بھی عمل کی نامقبولیت کے لیے کافی ہے۔ چہ جائیکہ تینوں وجوہات جہاں جمع ہو جائیں تو اس عمل کے مردود بارگاہ الہی ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے؟

پس آپ کو ان کے مال و اولاد تعجب میں نہ ڈال دیں۔^(۱) اللہ کی چاہت یہی ہے کہ اس سے انھیں دنیا کی زندگی میں ہی سزا دے^(۲) اور ان کے کفر ہی کی حالت میں ان کی جانیں نکل جائیں۔^(۳) (۵۵)

یہ اللہ کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ یہ تمہاری جماعت کے لوگ ہیں، حالانکہ وہ دراصل تمہارے نہیں بات صرف اتنی ہے کہ یہ ڈرپوک لوگ ہیں۔^(۴) (۵۶)

اگر یہ کوئی بچاؤ کی جگہ یا کوئی غاری کوئی بھی سرگھسانے کی جگہ پالیں تو ابھی اس طرف لگام توڑ کر لائے بھاگ چھوٹیں۔^(۵) (۵۷)

ان میں وہ بھی ہیں جو خیراتی مال کی تقسیم کے بارے میں آپ پر عیب رکھتے ہیں،^(۶) اگر انھیں اس میں سے مل

فَلَا تَجْعَلْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا أَوْلَادَهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ
بِهَآئِلٍ الْحَيَوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿۵۵﴾

وَيَحْيَوْنَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنكُمْ وَمَا هُمْ بِمِنكُمْ وَلَكِنَّهُمْ قَوْمٌ
يَفْرَحُونَ ﴿۵۶﴾

لَوْ يَدُونَ مَلَجًا أَوْ مَغْرَبًا أَوْ مُدًا خَلًّا لَوَكَّلُوا الْيَتِيمَ
وَهُمْ يَجْحَدُونَ ﴿۵۷﴾

وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا
رَضُوا وَإِنْ لَمْ يُعْطُوا مِنْهَا إِذًا هُمْ يُعْطُونَ ﴿۵۸﴾

(۱) اس لیے کہ یہ سب بطور آزمائش ہے۔ جس طرح فرمایا ﴿وَلَا تَلْمِزَنَّ عَيْنَيْكَ إِلَى مَمْتَعَيْنَا إِذْوَجَابَتْهُمُ ذَهْرَةَ الْحَيَوةِ الدُّنْيَا لَنَنْفَعَنَّهُمْ فِيهَا﴾ (طلہ - ۱۳۱) ”اور کئی طرح کے لوگوں کو جو ہم نے دنیا زندگی میں آزمائش کی چیزوں سے بہرہ مند کیا ہے، تاکہ ان کی آزمائش کریں، ان پر نگاہ نہ کرنا۔“ اور فرمایا ﴿أَحْسِبُونَ أَنَّكُمُنَّ مُبْرَهِنٌ مِّن قَالٍ وَيَنِينٌ﴾ ﴿نَسَاءُ﴾ لَكُمْ فِي الْحَيَاتِ بَلْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ ﴿المؤمنون- ۵۵-۵۶﴾ کیا لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو دنیا میں ان کو مال اور بیٹوں سے مدد دیتے ہیں (تو اس سے) ان کی بھلائی میں ہم جلدی کر رہے ہیں؟ (نہیں) بلکہ یہ سمجھتے ہی نہیں۔“

(۲) امام ابن کثیر اور امام ابن جریر طبری نے اس سے زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ مراد لیا ہے۔ یعنی ان منافقین سے زکوٰۃ و صدقات تو (جو وہ مسلمان ظاہر کرنے کے لیے دیتے ہیں) دنیا میں قبول کر لئے جائیں تاکہ اس طریقے سے ان کو مالی مار بھی دنیا میں دی جائے۔

(۳) تاہم ان کی موت کفر ہی کی حالت میں آئے گی۔ اس لیے کہ وہ اللہ کے پیغمبر کو صدق دل سے ماننے کے لیے تیار نہیں اور اپنے کفر و نفاق پر ہی بدستور قائم و مصر ہیں۔

(۴) اس ڈر اور خوف کی وجہ سے جھوٹی قسمیں کھا کر یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہم بھی تم میں سے ہی ہیں۔
(۵) یعنی نہایت تیزی سے دوڑ کر وہ ان پناہ گاہوں میں چلے جائیں، اس لیے کہ تم سے ان کا جتنا کچھ بھی تعلق ہے، وہ محبت و خلوص پر نہیں، عناد، نفرت اور کراہت پر ہے۔

(۶) یہ ان کی ایک اور بہت بڑی کوتاہی کا بیان ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کو (نعوذ باللہ) صدقات و غنائم کی تقسیم میں غیر منصف باور کراتے، جس طرح ابن ذی الجوارح کے بارے میں آتا ہے کہ آپ ﷺ

جائے تو خوش ہیں اور اگر اس میں سے نہ ملا تو فوراً ہی بگڑ
کھڑے ہوئے۔^(۱) (۵۸)

اگر یہ لوگ اللہ اور رسول کے دیئے ہوئے پر خوش
رہتے اور کہہ دیتے کہ اللہ ہمیں کافی ہے اللہ ہمیں اپنے
فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی، ہم تو اللہ کی ذات
سے ہی توقع رکھنے والے ہیں۔ (۵۹)

صدقے صرف فقیروں^(۲) کے لیے ہیں اور مسکینوں کے
لیے اور ان کے وصول کرنے والوں کے لیے اور ان کے
لیے جن کے دل پر چائے جاتے ہوں اور گردن چھڑانے
میں اور قرض داروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور

وَكُوْنُوهُمْ رَضُوْا مَا اَلَهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَقَالُوْا
حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُوْتِنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ وَرَسُوْلُهُ
رَاٰ اِلَى اللّٰهِ رُغْبُوْنَ ﴿۵۹﴾

اِنَّمَا الصَّدَقَتُ لِلْمُقْرَّبِ وَالْمَسْكِيْنِ وَالْعِيْلِيْنَ عَلَيْهِمَا
وَالْمُوْكَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَرْمِيْنَ وَفِي
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ رِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ

ایک مرتبہ تقسیم فرما رہے تھے کہ اس نے کہا ”انصاف سے کام لیجئے!“ آپ ﷺ نے فرمایا ”افسوس ہے تجھ پر، اگر میں
ہی انصاف نہیں کروں گا تو پھر اور کون کرے گا؟“ الحدیث (صحیح بخاری۔ کتاب المناقب، باب علامات النبوة
صحیح مسلم۔ کتاب الزکوٰۃ، باب ذکر الخوارج.....)

(۱) گویا اس الزام تراشی کا مقصد محض مالی مفادات کا حصول تھا کہ اس طرح ان سے ڈرتے ہوئے انہیں زیادہ حصہ دیا
جائے، یا وہ مستحق ہوں یا نہ ہوں، انہیں حصہ ضرور دیا جائے۔

(۲) اس آیت میں اس طعن کا دروازہ بند کرنے کے لیے صدقات کے مستحق لوگوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ صدقات سے
مراد یہاں صدقات واجبہ یعنی زکوٰۃ ہے۔ آیت کا آغاز اِنَّمَا سے کیا گیا ہے جو قصر کے صیغوں میں سے ہے اور الصدقات
میں لام تعریف جنس کے لیے ہے۔ یعنی صدقات کی یہ جنس (زکوٰۃ) ان آٹھ قسموں میں مقصور ہے جن کا ذکر آیت میں
ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور مصرف پر زکوٰۃ کی رقم کا استعمال صحیح نہیں۔ اہل علم کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ
ان آٹھوں مصارف پر تقسیم کرنا ضروری ہے یا ان میں سے جس مصرف یا مصارف پر امام یا زکوٰۃ ادا کرنے والا، مناسب
سمجھے، حسب ضرورت خرچ کر سکتا ہے۔ امام شافعی وغیرہ پہلی رائے کے قائل ہیں اور امام مالک اور امام ابو حنیفہ وغیرہ
دوسری رائے کے۔ اور یہ دوسری رائے ہی زیادہ صحیح ہے۔ امام شافعی کی رائے کی رو سے زکوٰۃ کی رقم آٹھوں مصارف
پر خرچ کرنا ضروری ہے، یعنی اقتضائے ضرورت اور مصالح دیکھے بغیر رقم کے آٹھ حصے کر کے آٹھوں جگہ پر کچھ کچھ رقم
خرچ کی جائے۔ جبکہ دوسری رائے کے مطابق ضرورت اور مصالح کا اعتبار ضروری ہے، جس مصرف پر رقم خرچ کرنے
کی زیادہ ضرورت یا مصالح کسی ایک مصرف پر خرچ کرنے کے متقاضی ہوں، تو وہاں ضرورت اور مصالح کے
لحاظ سے زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جائے گی، چاہے دوسرے مصارف پر خرچ کرنے کے لیے رقم نہ بچے۔ اس رائے میں جو
معقولیت ہے، وہ پہلی رائے میں نہیں ہے۔

عَلَيْهِمْ حَكِيمٌ ۝

راہرو مسافروں کے لیے،^(۱) فرض ہے اللہ کی طرف سے، اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔ (۶۰)

(۱) ان مصارف ثمانیہ کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے۔

۲۱۔ فقیر اور مسکین چونکہ قریب قریب ہیں اور ایک کا اطلاق دوسرے پر بھی ہوتا ہے یعنی فقیر کو مسکین اور مسکین کو فقیر کہہ لیا جاتا ہے۔ اس لیے ان کی الگ تعریف میں خاصا اختلاف ہے۔ تاہم دونوں کے مفہوم میں یہ بات تو قطعی ہے کہ جو حاجت مند ہوں اور اپنی حاجت و ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مطلوبہ رقم اور وسائل سے محروم ہوں، ان کو فقیر اور مسکین کہا جاتا ہے۔ مسکین کی تعریف میں ایک حدیث آتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ”مسکین وہ گھومنے پھرنے والا نہیں ہے جو ایک ایک یا دو دو لقمے یا کھجور کے لیے گھر گھر پھرتا ہے بلکہ مسکین وہ ہے جس کے پاس اتنا مال بھی نہ ہو جو اسے بے نیاز کر دے، نہ وہ ایسی مسکنت اپنے اوپر طاری رکھے کہ لوگ غریب اور مستحق سمجھ کر اس پر صدقہ کریں اور نہ خود لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرے۔“ (صحیح بخاری و مسلم۔ کتاب الزکوٰۃ) حدیث میں گویا اصل مسکین شخص مذکور کو قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مسکین کی تعریف یہ منقول ہے کہ جو گداگر ہو، گھوم پھر کر اور لوگوں کے پیچھے پڑ کر مانگتا ہو۔ اور فقیر وہ ہے جو نادار ہونے کے باوجود سوال سے بچے اور لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہ کرے (ابن کثیر)

۳۔ عالمین سے مراد حکومت کے وہ اہل کار ہیں جو زکوٰۃ و صدقات کی وصولی و تقسیم اور اس کے حساب و کتاب پر مامور ہوں۔

۴۔ مؤلفۃ القلوب، ایک تو وہ کافر ہے جو کچھ کچھ اسلام کی طرف مائل ہو اور اس کی امداد کرنے پر یہ امید ہو کہ وہ مسلمان ہو جائے گا۔ دوسرے وہ نو مسلم افراد ہیں جن کو اسلام پر مضبوطی سے قائم رکھنے کے لیے امداد دینے کی ضرورت ہو۔ تیسرے وہ افراد بھی ہیں جن کو امداد دینے کی صورت میں یہ امید ہو کہ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کو مسلمانوں پر حملہ آور ہونے سے روکیں گے اور اس طرح وہ قریب کے کمزور مسلمانوں کا تحفظ کریں۔ یہ اور اس قسم کی دیگر صورتیں تالیف قلب کی ہیں جن پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے۔ چاہے مذکورہ افراد مال دار ہی ہوں۔ احتیاف کے نزدیک یہ مصرف ختم ہو گیا ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ حالات و ظروف کے مطابق ہر دور میں اس مصرف پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا جائز ہے۔

۵۔ گردنیں آزاد کرانے میں۔ بعض علمائے اس سے صرف مکاتب غلام مراد لیے ہیں۔ اور دیگر علمائے مکاتب و غیر مکاتب ہر قسم کے غلام مراد لیے ہیں۔ امام شوکانی نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔

۶۔ غارین سے ایک تو وہ مقروض مراد ہیں جو اپنے اہل و عیال کے نان و نفقہ اور ضروریات زندگی فراہم کرنے میں لوگوں کے زیر بار ہو گئے اور ان کے پاس نقد رقم بھی نہیں ہے اور ایسا سامان بھی نہیں ہے جسے بیچ کر وہ قرض ادا کر سکیں۔ دوسرے وہ ذمہ دار اصحاب ضمانت ہیں جنہوں نے کسی کی ضمانت دی اور پھر وہ اس کی ادائیگی کے ذمہ دار قرار پائے، یا کسی کی فصل تباہ یا کاروبار خسارے کا شکار ہو گیا اور اس بنیاد پر وہ مقروض ہو گیا۔ ان سب افراد کی زکوٰۃ کی مدد سے امداد کرنا جائز ہے۔

۷۔ فی سبیل اللہ سے مراد جہاد ہے۔ یعنی جنگی مسلمان و ضروریات اور مجاہد (چاہے وہ مالدار ہی ہو) پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا جائز ہے۔ اور احادیث میں آتا ہے کہ حج اور عمرہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ اسی طرح بعض علماء کے نزدیک تبلیغ و

ان میں سے وہ بھی ہیں جو پیغمبر کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کان کا کچا ہے، آپ کہہ دیجئے کہ وہ کان تمہارے بھلے کے لیے ہے (۱) وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور مسلمانوں کی بات کا یقین کرتا ہے اور تم میں سے جو اہل ایمان ہیں یہ ان کے لیے رحمت ہے، رسول اللہ (ﷺ) کو جو لوگ ایذا دیتے ہیں ان کے لیے دکھ کی مار ہے۔ (۶۱)

محض تمہیں خوش کرنے کے لیے تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھا جاتے ہیں حالانکہ اگر یہ ایمان دار ہوتے تو اللہ اور اس کا رسول رضامند کرنے کے زیادہ مستحق تھے۔ (۶۲) کیا یہ نہیں جانتے کہ جو بھی اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا اس کے لیے یقیناً دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہنے والا ہے، یہ زبردست رسوائی ہے۔ (۶۳) منافقوں کو ہر وقت اس بات کا کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں مسلمانوں پر کوئی سورت نہ اترے جو ان کے دلوں کی باتیں انھیں بتلا دے۔ کہہ دیجئے کہ تم مذاق اڑاتے رہو، یقیناً اللہ تعالیٰ اسے ظاہر کرنے والا ہے جس سے تم ڈر دیک رہے ہو۔ (۶۴)

اگر آپ ان سے پوچھیں تو صاف کہہ دیں گے کہ ہم تو یونہی آپس میں ہنس بول رہے تھے۔ کہہ دیجئے کہ اللہ، اس کی آیتیں اور اس کا رسول ہی تمہارے ہنسی مذاق

وَمِنْهُمْ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيُقُولُونَ هُوَ آذُنٌ قُلٌّ
أُذُنٌ خَيْرٌ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ
وَرَحْمَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ
رَسُولَ اللَّهِ لَعَنَهُمُ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا ۝

يَخْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُؤْذُواكُمْ وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ
أَحَقُّ أَنْ يُؤْذَوْا إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ ۝

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّهُ مَنِ يُحَادِدِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَأَنَّ لَهُ
تَارِجَهُمْ خَالِدًا فِيهَا ذَلِكَ الْغُرُزِيُّ الْعَظِيمُ ۝

يَحْذَرُ الْكُفْرَانَ أَنْ تُنْزَلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ
بِمَأْفِقِهِمْ فُلُوهُمْ قُلٌّ اسْتَهْرَؤُوا إِنَّ اللَّهَ مُحِيزٌ
مَّا عَدَّرُونَ ۝

وَلَكِنْ سَأَلْتَهُمْ لِيُؤْلَوْا إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلٌّ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِئَةِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ كَسْتَهْزِؤُونَ ۝

دعوت بھی نبی سبیل اللہ میں داخل ہے کیونکہ اس سے بھی مقصد، جماد کی طرح، اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔

۸- آئین السَّبِيلِ سے مراد مسافر ہے۔ یعنی اگر کوئی مسافر، سفر میں مستحق امداد ہو گیا ہے تو چاہے وہ اپنے گھر یا وطن میں صاحب حیثیت ہی ہو، اس کی امداد زکوٰۃ کی رقم سے کی جاسکتی ہے۔

(۱) یہاں سے پھر منافقین کا ذکر ہو رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک ہرزہ سرائی انہوں نے یہ کہی کہ یہ کان کا کچا (ہلکا) ہے، مطلب ہے کہ یہ ہر ایک کی بات سن لیتا ہے (یہ گویا آپ ﷺ کے حلم و کرم اور عنف و صغ کی صفت سے ان کو دھوکہ ہوا) اللہ نے فرمایا کہ نہیں، ہمارا پیغمبر شرف و فساد کی کوئی بات نہیں سنتا جو بھی سنتا ہے، تمہارے لیے اس میں خیر اور بھلائی ہے۔

کے لیے رہ گئے ہیں؟^(۱) (۶۵)

تم بھانے نہ بناؤ یقیناً تم اپنے ایمان کے بعد بے ایمان ہو گئے،^(۲) اگر ہم تم میں سے کچھ لوگوں سے درگزر بھی کر لیں^(۳) تو کچھ لوگوں کو ان کے جرم کی سنگین سزا بھی دیں گے۔^(۴) (۶۶)

تمام منافق مرد و عورت آپس میں ایک ہی ہیں،^(۵) یہ بری باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بھلی باتوں سے روکتے ہیں اور اپنی مٹھی بند رکھتے ہیں،^(۶) یہ اللہ کو بھول گئے اللہ نے انھیں بھلا دیا۔^(۷) بیشک منافق ہی فاسق و بد کردار ہیں۔ (۶۷)

لَا تَعْتَدُوا رُؤُوسَكُمْ لِكُفْرَتِهِمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ إِنَّ نَعْفَ عَنْ طَائِفَةٍ مِنْكُمْ يُعَذِّبُ طَائِفَةٌ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا حُذِرُوا مِنْ غُجْرٍ مَعِينٍ ۝

الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ۝

(۱) منافقین آیات الہی کا مذاق اڑاتے، مومنین کا استہزا کرتے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ کلمات کہنے سے گریز نہ کرتے جس کی اطلاع کسی نہ کسی طریقے سے بعض مسلمانوں کو اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو جاتی۔ لیکن جب ان سے پوچھا جاتا تو صاف مکر جاتے اور کہتے کہ ہم تو یوں ہی آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ہنسی مذاق کے لیے کیا تمہارے سامنے اللہ اور اس کی آیات اور اس کا رسول ہی رہ گیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ اگر مقصد تمہارا آپس میں ہنسی مذاق ہی ہو تا تو اس میں اللہ، اس کی آیات و رسول درمیان میں کیوں آتا۔ یہ یقیناً تمہارے اس خبث اور نفاق کا اظہار ہے جو آیات الہی اور ہمارے پیغمبر کے خلاف تمہارے دلوں میں موجود ہے۔

(۲) یعنی تم جو ایمان ظاہر کرتے رہے ہو۔ اللہ اور رسول کے استہزا کے بعد اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اول تو وہ بھی نفاق پر ہی مبنی تھا۔ تاہم اس کی بدولت ظاہری طور پر مسلمانوں میں تمہارا شمار ہو تا تھا اب اس کی بھی گنجائش ختم ہو گئی ہے۔

(۳) اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جنہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور انہوں نے توبہ کر لی اور مخلص مسلمان بن گئے۔ (۴) یہ وہ لوگ ہیں، جنہیں توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوئی اور کفر و نفاق پر اڑے رہے۔ اسی لیے اس عذاب کی علت بھی بیان کر دی گئی ہے کہ وہ مجرم تھے۔

(۵) منافقین، جو حلف اٹھا کر مسلمانوں کو باور کراتے تھے کہ ”ہم تم ہی میں سے ہیں“ اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید فرمائی کہ ایمان والوں سے ان کا کیا تعلق؟ البتہ یہ سب منافق، چاہے مرد ہوں یا عورتیں، ایک ہی ہیں۔ یعنی کفر و نفاق میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ آگے ان کی صفات بیان کی جا رہی ہیں جو مومنین کی صفات کے بالکل الٹ اور برعکس ہیں۔

(۶) اس سے مراد بخل ہے۔ یعنی مومن کی صفت اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے اور منافق کی اس کے برعکس بخل، یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرنا ہے۔

(۷) یعنی اللہ تعالیٰ بھی ان سے ایسا معاملہ کرے گا کہ گویا اس نے انہیں بھلا دیا۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا

اللہ تعالیٰ ان منافق مردوں، عورتوں اور کافروں سے جہنم کی آگ کا وعدہ کر چکا ہے جہاں یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں، وہی انھیں کافی ہے ان پر اللہ کی پھٹکار ہے، اور ان ہی کے لیے دائمی عذاب ہے۔ (۶۸)

مثلاً ان لوگوں کے جو تم سے پہلے تھے، تم میں سے وہ زیادہ قوت والے تھے اور زیادہ مال و اولاد والے تھے پس وہ اپنا دینی حصہ برت گئے پھر تم نے بھی اپنا حصہ برت لیا (۲) جیسے تم سے پہلے کے لوگ اپنے حصے سے فائدہ مند ہوئے تھے اور تم نے بھی اسی طرح مذاقاندہ بحث کی جیسے کہ انہوں نے کی تھی۔ ان کے اعمال دنیا اور آخرت میں عارت ہو گئے۔ یہی لوگ نقصان پانے والے ہیں (۶۹) (۳)

وَعَدَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا هِيَ حَسْبُهُمْ وَلَعْنَةُ اللَّهِ وَاللَّهُمَّ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٦٨﴾

كَانَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَآكْثَرَ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا فَاسْتَبْتَعُوا بِعَلَاقَتِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِعَلَاقَتِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعْتُمُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِعَلَاقَتِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِينَ خَاضُوا أُولَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٦٩﴾

﴿الْيَوْمَ نُنَسِّسُكُمْ كَمَا كُنْتُمْ تُلْفَأُونَ يَوْمَئِذٍ﴾ (سورة الحاشية - ۳۳) ”آج ہم تمہیں اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح تم ہماری ملاقات کے اس دن کو بھولے ہوئے تھے۔“ مطلب یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے دنیا میں اللہ کے احکامات کو چھوڑے رکھا، قیامت والے دن اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل و کرم سے محروم رکھے گا۔ گویا نسیان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف علم بلاغت کے اصول مشاگلت کے اعتبار سے ہے۔ ورنہ اللہ کی ذات نسیان سے پاک ہے (فتح القدیر)

(۱) یعنی تمہارا حال بھی اعمال اور انجام کے اعتبار سے ام ماضیہ کے کافروں جیسا ہی ہے۔ اب غائب کی بجائے، منافقین سے خطاب کیا جا رہا ہے۔

(۲) خلاق کا دو سرا ترجمہ دنیوی حصہ بھی کیا گیا ہے۔ یعنی تمہاری تقدیر میں دنیا کا جتنا حصہ لکھ دیا گیا ہے، وہ برت لو، جس طرح تم سے پہلے لوگوں نے اپنا حصہ برتا اور پھر موت یا عذاب سے ہم کنار ہو گئے۔

(۳) یعنی آیات الہی اور اللہ کے پیغمبروں کی تکذیب کے لیے۔ یا دو سرا مفہوم ہے کہ دنیا کے اسباب اور لہو و لعب میں جس طرح وہ مگن رہے، تمہارا بھی یہی حال ہے۔ آیت میں پہلے لوگوں سے مراد اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہیں۔ جیسے ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں کی ضرور متابعت کرو گے۔ بالشت بہ بالشت، ذراع بہ ذراع اور ہاتھ بہ ہاتھ۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہوں تو تم بھی ضرور گھسو گے۔ لوگوں نے پوچھا، کیا اس سے آپ کی مراد اہل کتاب ہیں؟ آپ نے فرمایا، اور کون؟“ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام مسلم، کتاب العلم۔ البتہ ہاتھ بہ ہاتھ (بَاعًا بِبَاع) کے الفاظ ان میں نہیں ہیں۔ یہ تفسیر طبری میں منقول ایک اثر میں ہے۔

(۴) أُولَئِكَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو مذکورہ صفات و عادات کے حامل ہیں، مشبہین بھی اور مشبہ بہم بھی۔ یعنی جس طرح وہ خاسر

کیا انھیں اپنے سے پہلے لوگوں کی خبریں نہیں پہنچیں، قوم نوح اور عاد اور ثمود اور قوم ابراہیم اور اہل مدین اور اہل مؤتفکات (الٹی ہوئی بستیوں کے رہنے والے) کی،^(۱) ان کے پاس ان کے پیغمبر دلیلیں لے کر پہنچے،^(۲) اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے بلکہ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا۔^(۳) (۷۰)

مومن مرد و عورت آپس میں ایک دوسرے کے (مددگار و معاون اور) دوست ہیں،^(۴) وہ بھلائیوں کا حکم دیتے ہیں

أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَثَمُودٌ وَقَوْمٌ آتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُظِلَّوهُمْ وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۷۰﴾

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

و نامراد رہے، تم بھی اسی طرح رہو گے۔ حالانکہ وہ قوت میں تم سے زیادہ سخت اور مال و اولاد میں بھی بہت زیادہ تھے۔ اس کے باوجود وہ عذاب الہی سے نہ بچ سکے تو تم، جو ان سے ہر لحاظ سے کم ہو، کس طرح اللہ کی گرفت سے بچ سکتے ہو۔

(۱) یہاں ان چھ قوموں کا حوالہ دیا گیا ہے جن کا مسکن ملک شام رہا ہے۔ یہ بلاد عرب کے قریب ہے اور ان کی کچھ باتیں انہوں نے شاید آبا و اجداد سے سنی بھی ہوں۔ قوم نوح، جو طوفان میں غرق کر دی گئی۔ قوم عاد، جو قوت و طاقت میں ممتاز ہونے کے باوجود، باد تندر سے ہلاک کر دی گئی۔ قوم ثمود، جسے آسانی چیخ سے ہلاک کیا گیا۔ قوم ابراہیم، جس کے بادشاہ نمروہ بن کنعان بن کوش کو پھر سے مروا دیا گیا۔ اصحاب مدین (حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم)، جنہیں چیخ، زلزلہ اور بادلوں کے سائے کے عذاب سے ہلاک کیا گیا۔ اور اہل مؤتفکات۔ اس سے مراد قوم لوط ہے جن کی بستی کا نام ”سدوم“ تھا۔ اشفاق کے معنی ہیں انقلاب۔ الٹ پلٹ دینا۔ ان پر ایک تو آسمان سے پتھر برسائے گئے۔ دوسرے، ان کی بستی کو اوپر اٹھا کر نیچے پھینکا گیا جس سے پوری بستی اوپر نیچے ہو گئی اس اعتبار سے انہیں اصحاب مؤتفکات کہا جاتا ہے۔

(۲) ان سب قوموں کے پاس، ان کے پیغمبر، جو ان ہی کی قوم کا ایک فرد ہوتا تھا، آئے۔ لیکن انہوں نے ان کی باتوں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ بلکہ تمکذب اور عناد کا راستہ اختیار کیا، جس کا نتیجہ بالآخر عذاب الہی کی شکل میں نکلا۔

(۳) یعنی یہ عذاب، ان کے ظلم پر استمرار اور دوام کا نتیجہ ہے۔ یوں ہی بلا وجہ عذاب الہی کا شکار نہیں ہوئے۔

(۴) منافقین کی صفات مذمومہ کے مقابلے میں مومنین کی صفات محمودہ کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ پہلی صفت، وہ ایک دوسرے کے دوست، معاون و غم خوار ہیں۔ جس طرح حدیث میں ہے۔ «الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبَيْتَانِ، يَشُدُّ بَعْضُهُمُ بَعْضًا» (صحیح بخاری۔ کتاب الصلوة، باب تشبیک الأصابع فی المسجد وغیرہ۔ مسلم، باب تراحم

المؤمنین وتعاضدهم) ”مومن، مومن کے لیے ایک دیوار کی طرح ہے جس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کی مضبوطی کا ذریعہ ہے۔“ دوسری حدیث میں فرمایا: «مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِهِمْ، وَتَرَاحُمِهِمْ، كَمَثَلِ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ، تَدَاخَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالْحَمَى وَالسَّهَرِ» (صحیح مسلم، باب مذکور، والبخاری۔ کتاب الأدب، باب رحمة الناس والبہائم) ”مومنوں کی مثال، آپس میں ایک دوسرے کے

وَيَقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيَطِيعُونَ
اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ
اللَّهَ عَزِيزٌ رَحِيمٌ ①

اور برائیوں سے روکتے ہیں،^(۱) نمازوں کو پابندی سے بجا لاتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اللہ کی اور اس کے رسول کی بات مانتے ہیں،^(۲) یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ بہت جلد رحم فرمائے گا بیشک اللہ غلبے والا حکمت والا ہے۔ (۱۷)

ان ایمان دار مردوں اور عورتوں سے اللہ نے ان جنتوں کا وعدہ فرمایا ہے جن کے نیچے نہریں لہریں لے رہی ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں اور ان صاف ستھرے پاکیزہ محلات^(۳) کا جو ان بھیگتی والی جنتوں میں ہیں، اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے،^(۴) یہی زبردست کامیابی ہے۔ (۷۲)

اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جماد جاری رکھو،^(۵)

وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسْكِنٍ طَيِّبَةٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْعُرُشُ مِنْ أَلْفِ مِائَةٍ مِنْ أَلْفٍ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ②

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ جَاهِدُوا الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ

ساتھ محبت کرنے اور رحم کرنے میں ایک جسم کی طرح ہے کہ جب جسم کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم تپ کا شکار ہو جاتا ہے اور بیدار رہتا ہے۔"

(۱) یہ اہل ایمان کی دوسری خاص صفت ہے معروف وہ ہے جسے شریعت نے معروف (یعنی نیکی اور بھلائی) اور منکر وہ ہے جسے شریعت نے منکر (یعنی برا) قرار دیا ہے۔ نہ کہ وہ جسے لوگ اچھا یا برا کہیں۔

(۲) نماز، حقوق اللہ میں نمایاں ترن عبادت ہے اور زکوٰۃ، حقوق العباد کے لحاظ سے، امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے ان دونوں کا بطور خاص تذکرہ کر کے فرمادیا گیا کہ وہ ہر معاملے میں اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔

(۳) جو موتی اور یاقوت سے تیار کیے گئے ہوں گے۔ عدن کے کئی معنی کیے گئے ہیں۔ ایک معنی بھیگتی کے ہیں۔

(۴) حدیث میں بھی آتا ہے کہ جنت کی تمام نعمتوں کے بعد اہل جنت کو سب سے بڑی نعمت رضائے الہی کی صورت میں ملے گی۔ (صحیح بخاری و مسلم۔ کتاب الرقاق و کتاب الجنة)

(۵) اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار اور منافقین سے جماد اور ان پر سختی کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کی مخاطب آپ ﷺ کی امت ہے۔ کافروں کے ساتھ منافقین سے بھی جماد کرنے کا حکم ہے، اس کی بابت اختلاف ہے۔ ایک رائے تو یہی ہے کہ اگر منافقین کا نفاق اور ان کی سازشیں بے نقاب ہو جائیں تو ان سے بھی اسی طرح جماد کیا جائے، جس طرح کافروں سے کیا جاتا ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ منافقین سے جماد یہ ہے کہ انہیں زبان سے وعظ و نصیحت کی جائے۔ یا وہ اخلاقی جرائم کا ارتکاب کریں تو ان پر حدود نافذ کی جائیں۔ تیسری رائے یہ ہے کہ جماد کا حکم کفار سے متعلق ہے اور سختی کرنے کا منافقین سے۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ان آرائیں آپس میں کوئی تضاد اور منافات نہیں، اس لیے کہ حالات و ظروف کے مطابق ان میں سے کسی بھی رائے پر عمل کرنا جائز ہے۔

وَمَا أُولَئِكَ بِجَنَّتُمْ وَيَأْتِيَنَّ الْمَوْعِدَ ۝

اور ان پر سخت ہو جاؤ^(۱) ان کی اصلی جگہ دوزخ ہے، جو
نمائت بدترین جگہ ہے۔^(۲) (۷۳)

یہ اللہ کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ انہوں نے نہیں کہا،
حالانکہ یقیناً کفر کا کلمہ ان کی زبان سے نکل چکا ہے اور یہ
اپنے اسلام کے بعد کافر ہو گئے ہیں^(۳) اور انہوں نے اس
کام کا قصد بھی کیا جو پورا نہ کر سکے۔^(۴) یہ صرف اسی بات کا
انتقام لے رہے ہیں کہ انہیں اللہ نے اپنے فضل سے اور
اس کے رسول (ﷺ) نے دولت مند کر دیا،^(۵) اگر یہ اب

يَخْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا
بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا وَمَا نَعَمُوا إِلَّا أَنْ
أَخَذَهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ فَإِنْ يَتُوبُوا يَكُ خَيْرًا
لَهُمْ وَإِنْ يَتَوَكَّأْوا يَتَّخِذْهُمُ اللَّهُ عَدَاوًا لِيُنَازِلَهُمْ فِي
الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ

(۱) غلطی، آفت کی ضد ہے، جس کے معنی نرمی اور شفقت کرنے کے ہیں۔ اس اعتبار سے غلطی کے معنی سختی اور قوت سے
دشمنوں کے خلاف اقدام ہے۔ محض زبان کی سختی مراد نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ
کے ہی خلاف ہے، اسے آپ ﷺ اختیار کر سکتے تھے نہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے اس کا حکم آپ کو مل سکتا تھا۔

(۲) جنم اور سختی کے حکم کا تعلق دنیا سے ہے۔ آخرت میں ان کے لیے جہنم ہے جو بدترین جگہ ہے۔

(۳) مفسرین نے اس کی تفسیر میں متعدد واقعات نقل کیے ہیں، جن میں منافقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
شان میں گستاخانہ کلمات کہے۔ جسے بعض مسلمانوں نے سن لیا اور انہوں نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا، لیکن آپ
کے استفسار پر مکر گئے بلکہ حلف تک اٹھالیا کہ انہوں نے ایسی بات نہیں کی۔ جس پر یہ آیت اتری۔ اس سے یہ بھی معلوم
ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنا کفر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والا
مسلمان نہیں رہ سکتا۔

(۴) اس کی بابت بھی بعض واقعات نقل کیے گئے ہیں۔ مثلاً تبوک سے واپسی پر منافقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کے خلاف ایک سازش کی جس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے کہ دس بارہ منافقین ایک گھاٹی میں آپ کے پیچھے لگ
گئے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باقی لشکر سے الگ تقریباً تنہا گزر رہے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ آپ پر حملہ کر
کے آپ کا کام تمام کر دیں گے اس کی اطلاع وحی کے ذریعے سے آپ کو دے دی گئی، جس سے آپ نے بچاؤ کر لیا۔

(۵) مسلمانوں کی ہجرت کے بعد، مدینہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے وہاں تجارت اور کاروبار کو
بھی فروغ ملا، اور اہل مدینہ کی معاشی حالت بہت اچھی ہو گئی۔ منافقین مدینہ کو بھی اس سے خوب فائدہ حاصل ہوا۔ اللہ
تعالیٰ اس آیت میں یہی فرما رہا ہے کہ کیا ان کو اس بات کی ناراضی ہے کہ اللہ نے ان کو اپنے فضل سے غنی بنا دیا ہے؟
یعنی یہ ناراضی اور غضب والی بات تو نہیں، بلکہ ان کو تو اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے انہیں فقر و تنگ دستی سے
نکال کر خوش حال بنا دیا۔

ملحوظہ: اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس لیے ہے کہ اس غنا اور توغمری کا ظاہری سبب

قُلِّبُوا وَلَا تَصْبِرُوا ۝۴۰

بھی توبہ کر لیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے، اور اگر منہ موڑے رہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں دنیا و آخرت میں دردناک عذاب دے گا اور زمین بھر میں ان کا کوئی حمایتی اور مددگار نہ کھڑا ہو گا۔ (۷۴)

ان میں وہ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے مال دے گا تو ہم ضرور صدقہ و خیرات کریں گے اور کچی طرح نیلو کاروں میں ہو جائیں گے۔ (۷۵)

لیکن جب اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا تو یہ اس میں جھجکی کرنے لگے اور ٹال مٹول کر کے منہ موڑ لیا۔ (۷۶)^(۱)

پس اس کی سزا میں اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا اللہ سے ملنے کے دنوں تک، کیونکہ انہوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدے کا خلاف کیا اور کیوں کہ جھوٹ بولتے رہے۔ (۷۷)

کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے دل کا بھید اور ان کی سرگوشی سب معلوم ہے اور اللہ تعالیٰ غیب کی تمام باتوں سے خبردار ہے۔ (۷۸)^(۲)

جو لوگ ان مسلمانوں پر طعنہ زنی کرتے ہیں جو دل کھول کر خیرات کرتے ہیں اور ان لوگوں پر جنہیں سوائے اپنی محنت مزدوری کے اور کچھ میسر ہی نہیں، پس یہ ان کا

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰمَدَ اللّٰهَ اَلَيْسَ اَتَمَنَّا مِنْ فَضْلِهِ لَمَتَّصَدَقْنَا
وَلَمَّا تَوَسَّوْا مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۴۰

فَلَمَّا اٰتٰهُمْ مِنْ فَضْلِهِ بَخِلُوْا بِهٖ وَكُوَلُوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۴۱

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْٓ اٰيٰتِهِمْ اِلٰى يَوْمِ رِيْلِقُوْتِهٖٓ اِمَّا اَخْلَفُوْا
اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَّ اِمَّا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۴۲

اَلَمْ يَسْأَلُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ وَاَنَّ
اللّٰهَ عَلٰمُ الْغُيُوْبِ ۝۴۳

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّهَّرِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي
الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہی بنی تھی، ورنہ حقیقت میں غنی بنانے والا تو اللہ تعالیٰ ہی تھا۔ اس لیے آیت میں من فضلہ، واحد کی ضمیر ہے کہ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں غنی کر دیا۔

(۱) اس آیت کو بعض مفسرین نے ایک صحابی حضرت ثعلبہ بن حاطب انصاری کے بارے میں قرار دیا ہے۔ لیکن سند ایہ صحیح نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس میں بھی منافقین کا ایک اور کردار بیان کیا گیا ہے۔

(۲) اس میں ان منافقین کے لیے سخت وعید ہے جو اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرتے ہیں اور پھر اس کی پروا نہیں کرتے۔ گویا یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مخفی باتوں اور بھیدوں کو نہیں جانتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے، کیونکہ وہ تو علام الغیوب ہے۔ غیب کی تمام باتوں سے باخبر ہے۔

مذاق اڑاتے ہیں،^(۱) اللہ بھی ان سے تمسخر کرتا ہے^(۲) انہی کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (۷۹)

ان کے لیے تو استغفار کریا نہ کر۔ اگر تو ستر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کرے تو بھی اللہ انہیں ہرگز نہ بخشے گا^(۳) یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ سے اور اس کے رسول سے کفر کیا ہے^(۴) ایسے فاسق لوگوں کو رب کریم ہدایت نہیں دیتا۔^(۵) (۸۰)

قَيْسُ خَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً

فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ذَلِكَ يَأْتِيَهُمْ كُفْرًا وَايْلَهُ وَرَأْسُ سُوْرِهِ

وَاللَّهُ لَذِي هَدًى الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝

(۱) مُطَوِّعِينَ کے معنی ہیں، صدقات واجبہ کے علاوہ اپنی خوشی سے مزید اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے۔ ”جد“ کے معنی محنت و مشقت کے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو مال دار تو نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود اپنی محنت و مشقت سے کمائے ہوئے تھوڑے سے مال میں سے بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ آیت میں منافقین کی ایک اور نہایت قبیح حرکت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ وغیرہ کے موقع پر مسلمانوں سے چندے کی اپیل فرماتے تو مسلمان آپ کی اپیل پر لیکتے ہوئے حسب استطاعت اس میں حصہ لیتے۔ کسی کے پاس زیادہ مال ہوتا، وہ زیادہ صدقہ دیتا جس کے پاس تھوڑا ہوتا، وہ تھوڑا دیتا۔ یہ منافقین دونوں قسم کے مسلمانوں پر طعنہ زنی کرتے۔ زیادہ دینے والوں کی بابت کہتے کہ اس کا مقصد ریاکاری اور نمود و نمائش ہے اور تھوڑا دینے والوں کو کہتے کہ تیرے اس مال سے کیا بنے گا؟ یا اللہ تعالیٰ تیرے اس صدقے سے بے نیاز ہے۔ (صحیح بخاری۔ تفسیر سورہ توبہ۔ مسلم۔ کتاب الزکوٰۃ) باب الحمل أجرة يتصدق بها (... یوں وہ منافقین مسلمانوں کا استنزا کرتے اور مذاق اڑاتے۔

(۲) یعنی مومنین سے استنزا کا بدلہ انہیں اس طرح دیتا ہے کہ انہیں ذلیل و رسوا کرتا ہے۔ اس کا تعلق باب مشکلات سے ہے جو علم بلاغت کا ایک اصول ہے یا یہ بددعا ہے اللہ تعالیٰ ان سے بھی اسی طرح استنزا کا معاملہ کرے جس طرح یہ مسلمانوں کے ساتھ استنزا کرتے ہیں۔ (فتح القدر)

(۳) ستر کا عدد مبالغے اور تکثیر کے لیے ہے۔ یعنی تو کتنی ہی کثرت سے ان کے لیے استغفار کر لے، اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز معاف نہیں فرمائے گا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ستر مرتبہ سے زائد استغفار کرنے پر ان کو معافی مل جائے گی۔

(۴) یہ عدم مغفرت کی علت بیان کر دی گئی ہے تاکہ لوگ کسی کی سفارش کی امید پر نہ رہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح کی پونجی لے کر اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں۔ اگر یہ زاد آخرت کسی کے پاس نہیں ہو گا تو ایسے کافروں اور نافرمانوں کی کوئی شفاعت ہی نہیں کرے گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے لیے شفاعت کی اجازت ہی نہیں دے گا۔

(۵) اس ہدایت سے مراد وہ ہدایت ہے جو انسان کو مطلوب (ایمان) تک پہنچا دیتی ہے۔ ورنہ ہدایت بمعنی رہنمائی یعنی راستے کی نشان دہی۔ اس کا اہتمام تو دنیا میں ہر مومن و کافر کے لیے کر دیا گیا ہے ﴿لِنَهْدِيَهُنَّ الشَّبِيلَ إِتَابًا لِّكُفْرِهِمْ وَإِنَّا لَنُكَفِّرُهُمْ﴾ (الدھر۔ ۳) ﴿وَمَهْدِيْنَهُ التَّجْدِيْنَ﴾ (البلد۔ ۱۰) اور ہم نے اس کو (خیر و شر کے) کے دونوں رستے دکھادیئے ہیں“

پیچھے رہ جانے والے لوگ رسول اللہ (ﷺ) کے جانے کے بعد اپنے بیٹھے رہنے پر خوش ہیں (۱) انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کرنا پسند رکھا اور انہوں نے کہہ دیا کہ اس گرمی میں مت نکلو۔ کہہ دیجئے کہ دوزخ کی آگ بہت ہی سخت گرم ہے، کاش کہ وہ سمجھتے ہوتے۔ (۸۱) (۲)

پس انھیں چاہیے کہ بہت کم ہنسیں اور بہت زیادہ روئیں (۳) بدلے میں اس کے جو یہ کرتے تھے۔ (۸۲) پس اگر اللہ تعالیٰ آپ کو ان کی کسی جماعت (۴) کی طرف لوٹا کر واپس لے آئے پھر یہ آپ سے میدان جنگ میں نکلنے کی اجازت طلب کریں (۵) تو آپ کہہ دیجئے کہ تم میرے ساتھ ہرگز چل نہیں سکتے اور نہ میرے ساتھ تم دشمنوں سے لڑائی کر سکتے ہو۔ تم نے پہلی مرتبہ ہی بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا (۶) پس تم پیچھے رہ جانے والوں میں ہی

فَرِحَ الْخَالِفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خَلْفَ رَسُولِ اللَّهِ وَكَرِهُوا أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ ۝

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝
فَإِنْ رَجَعَكَ اللَّهُ إِلَى طَلِيفَةٍ مِنْهُمْ فَاسْتَأْذِنُوا لَوْلَا لِلْخُرُوجِ فَقُلْ لَنْ عَوَّرَكُمْ مَعِيَ أَبَدًا وَلَنْ تُفَايَلَسُوا مَعِيَ عَدُوًّا أُنْكِرُ رَيْبِيَوْمَ الْقَعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَانصُرُوا مَعَ الْخَالِفِينَ ۝

(۱) یہ ان منافقین کا ذکر ہے جو تبوک میں نہیں گئے اور جھوٹے عذر پیش کر کے اجازت حاصل کر لی۔ خلاف کے معنی ہیں، پیچھے یا مخالفت۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کے بعد آپ کے پیچھے یا آپ کی مخالفت میں مدینہ میں بیٹھے رہے۔

(۲) یعنی اگر ان کو یہ علم ہوتا کہ جنم کی آگ کی گرمی کے مقابلے میں، دنیا کی گرمی کوئی حیثیت نہیں رکھتی، تو وہ کبھی پیچھے نہ رہتے۔ حدیث میں آتا ہے کہ دنیا کی یہ آگ جنم کی آگ کا ۷۰ واں حصہ ہے۔ یعنی جنم کی آگ کی شدت دنیا کی

آگ سے ۶۹ حصے زیادہ ہے (صحیح بخاری۔ بدء الخلق باب صفة النار) اللهم احفظنا منها

(۳) قَلِيلًا اور كَثِيرًا یا تو مصدریت (یعنی ضِحْكًا قَلِيلًا اور بُكَاءً كَثِيرًا یا طریت یعنی (زَمَانًا قَلِيلًا وَزَمَانًا كَثِيرًا) کی بنیاد پر منصوب ہے۔ اور امر کے دونوں صیغے بمعنی خبر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ہنسیں گے تو تھوڑا اور روئیں گے بہت زیادہ۔

(۴) منافقین کی جماعت مراد ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ آپ کو صحیح سلامت تبوک سے مدینہ واپس لے آئے جہاں یہ پیچھے رہ جانے والے منافقین بھی ہیں۔

(۵) یعنی کسی اور جنگ کے لیے، ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کریں۔

(۶) یہ آئندہ ساتھ نہ لے جانے کی علت ہے کہ تم پہلی مرتبہ ساتھ نہیں گئے۔ لہذا اب تم اس لائق نہیں کہ تمہیں کسی بھی جنگ میں ساتھ لے جایا جائے۔

بیٹھے رہو۔^(۱) (۸۳)

ان میں سے کوئی مرجائے تو آپ اس کے جنازے کی ہرگز نماز نہ پڑھیں اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔^(۲) یہ اللہ اور اس کے رسول کے منکر ہیں اور مرتے دم تک بدکار بے اطاعت رہے ہیں۔^(۳) (۸۴)

آپ کو ان کے مال و اولاد کچھ بھی بھلے نہ لگیں! اللہ کی چاہت یہی ہے کہ انہیں ان چیزوں سے دنیوی سزا دے اور یہ اپنی جائیں نکلنے تک کافر ہی رہیں۔ (۸۵)

وَلَا تَصِلْ عَلَىٰ أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَلَا تَقَعُ عَلَىٰ قَبْرِهِ
إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَمَانًا وَهُمْ فِي سَعِيرٍ ۝

وَلَا تُحِبُّكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُعَذِّبَهُمْ
بِغَايِ الدُّنْيَا وَيَتْرُكَهُمْ أَنْفُسَهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ۝

(۱) یعنی اب تمہاری اوقات یہی ہے کہ تم عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے ساتھ ہی بیٹھے رہو؛ جو جنگ میں شرکت کرنے کے بجائے گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت اس لیے دی گئی ہے تاکہ ان کے اس ہم و غم اور حسرت میں اور اضافہ ہو جو انہیں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے تھا۔ (اگر تھا)

(۲) یہ آیت اگرچہ رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ لیکن اس کا حکم عام ہے۔ ہر شخص جس کی موت کفر و نفاق پر ہو؛ وہ اس میں شامل ہے۔ اس کی شان نزول یہ ہے کہ جب عبد اللہ بن ابی کا انتقال ہو گیا تو اس کے بیٹے عبد اللہ (جو مسلمان اور باپ ہی کے ہم نام تھے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ایک تو آپ (بطور تبرک) اپنی قمیص عنایت فرمادیں تاکہ میں اپنے باپ کو اس میں کفن دوں۔ دوسرا، آپ اس کی نماز جنازہ پڑھادیں۔ آپ نے قمیص بھی عنایت فرمادی اور نماز جنازہ پڑھانے کے لیے بھی تشریف لے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کو ایسے لوگوں کی نماز جنازہ پڑھانے سے روکا ہے، آپ کیوں اس کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے“ یعنی روکا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ”اگر تو ستر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کرے گا تو اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں فرمائے گا“ تو میں ستر مرتبہ سے زیادہ ان کے لیے استغفار کر لوں گا“ چنانچہ آپ نے نماز جنازہ پڑھادی۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر آئندہ کے لیے منافقین کے حق میں دعائے مغفرت کی قطعی ممانعت فرمادی۔ (صحیح بخاری۔ تفسیر سورہ براءت و مسلم کتاب صفات المنافقین وأحكامهم)

(۳) یہ نماز جنازہ اور دعائے مغفرت نہ کرنے کی علت ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کا خاتمہ کفر و فسق پر ہو؛ ان کی نہ نماز جنازہ پڑھنی چاہیے اور نہ ان کے لیے مغفرت کی دعا کرنی جائز ہے۔ ایک حدیث میں تو یہاں تک آتا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم قبرستان پہنچے تو معلوم ہوا کہ عبد اللہ بن ابی کو دفنایا جا چکا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے اسے قبر سے نکلوایا اور اپنے گھٹنوں پر رکھ کر اس پر اپنا لعاب دہن تھوکا، اپنی قمیص اسے پہنائی (صحیح بخاری۔ کتاب اللباس۔ باب لبس القمیص و کتاب الجنائز۔ صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین وأحكامهم)

جب کوئی سورت اتاری جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو ان میں سے دولت مندوں کا ایک طبقہ آپ کے پاس آکر یہ کہہ کر رخصت لے لیتا ہے کہ ہمیں تو بیٹھے رہنے والوں میں ہی چھوڑ دیجئے۔^(۱) (۸۶)

یہ تو خانہ نشین عورتوں کا ساتھ دینے پر بھیج گئے اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی اب وہ کچھ سمجھ عقل نہیں رکھتے۔^(۲) (۸۷)

لیکن خود رسول (ﷺ) اور اس کے ساتھ کے ایمان والے اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں، یہی لوگ بھلائیوں والے ہیں اور یہی لوگ کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔ (۸۸)

انہی کے لیے اللہ نے وہ جنتیں تیار کی ہیں جن کے نیچے نسرں جاری ہیں جن میں یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔^(۳) (۸۹)

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُولُو الطُّلُوبِ مِنْهُمْ وَقَالُوا ذَرْنَا لِنُكَلِّمَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۝

رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ۝

لَكِنَّ الرُّسُولَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَأُولَئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

جس سے معلوم ہوا کہ جو ایمان سے محروم ہو گا، اسے دنیا کی بڑی سے بڑی شخصیت کی دعائے مغفرت اور اس کی شفاعت بھی کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گی۔

(۱) یہ انہی منافقین کا ذکر ہے جنہوں نے حیلے تراش کر پیچھے رہنا پسند کیا اُولُو الطُّلُوبِ سے مراد ہے صاحب حیثیت، مال دار طبقہ، یعنی اس طبقے کو پیچھے تو نہیں رہنا چاہیے تھا، کیونکہ اس کے پاس اللہ کا دیا ہوا سب کچھ موجود تھا۔ فَاعِدِينَ سے مراد بعض مجبور یوں کے تحت گھروں میں رک جانے والے افراد ہیں، جیسا کہ اگلی آیت میں ان کو خَوَالِفُ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو خَالِفَةُ کی جمع ہے۔ یعنی پیچھے رہنے والی عورتیں۔

(۲) دلوں پر مہر لگانا، یہ مسلسل گناہوں کا نتیجہ ہوتا ہے جس کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے، اس کے بعد انسان سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتا ہے۔

(۳) ان منافقین کے برعکس اہل ایمان کا رویہ یہ ہے کہ وہ اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، اللہ کی راہ میں انہیں اپنی جانوں کی پروا ہے اور نہ مالوں کی۔ ان کے نزدیک اللہ کا حکم سب پر بالاتر ہے۔ انہی کے لیے خیرات ہیں یعنی آخرت کی بھلائیاں اور جنت کی نعمتیں۔ اور بعض کے نزدیک دین و دنیا کے منافع اور یہی لوگ فلاح یاب اور فوز عظیم کے حامل ہوں گے۔

بادیہ نشینوں میں سے عذر والے لوگ حاضر ہوئے کہ انہیں رخصت دے دی جائے اور وہ بیٹھ رہے جنہوں نے اللہ سے اور اس کے رسول سے جھوٹی باتیں بنائی تھیں۔ اب تو ان میں جتنے کفار ہیں انہیں دکھ دینے والی مار پہنچ کر رہے گی۔^(۱) (۹۰)

ضعیفوں پر اور بیماروں پر اور ان پر جن کے پاس خرچ کرنے کو کچھ بھی نہیں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کرتے رہیں، ایسے نیک کاروں پر الزام کی کوئی راہ نہیں، اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت و رحمت والا ہے۔^(۲) (۹۱)

ہاں ان پر بھی کوئی حرج نہیں جو آپ کے پاس آتے ہیں کہ آپ انہیں سواری مہیا کر دیں تو آپ جو اب دیتے

وَجَاءَ الْمُعَذِّرُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِينَ كَذَبُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ سَيُصِيبُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ④

لَيْسَ عَلَى الضَّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَى وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا رِجْرَاءَ مِنْ مَا يُنْفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا صَحُّوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ⑤

وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا تَوَلَّوْا لَمْ يَحْمِلْهُمْ فَذَلَّتْ لِأَجْدٍ مَا أَحْمِلْكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ

(۱) ان مُعَذِّرِينَ کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ شہر سے دور رہنے والے وہ اعرابی ہیں جنہوں نے جھوٹے عذر پیش کر کے اجازت حاصل کی۔ دوسری قسم ان میں وہ تھی جنہوں نے آکر عذر پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور بیٹھے رہے۔ اس طرح گویا آیت میں منافقین کے دو گروہوں کا تذکرہ ہے اور عذاب الہم کی وعید میں دونوں شامل ہیں اور مِنْهُمْ سے جھوٹے عذر پیش کرنے والے اور بیٹھ رہنے والے دونوں مراد ہوں گے اور دوسرے مفسرین نے مُعَذِّرُونَ سے مراد ایسے بادیہ نشین مسلمان لیے ہیں جنہوں نے معقول عذر پیش کر کے اجازت لی تھی۔ اور مُعَذِّرُونَ ان کے نزدیک اصل میں مُنْتَذِرُونَ ہے۔ تا کو ذال میں مدغم کر دیا گیا ہے اور معتذر کے معنی ہیں، واقعی عذر رکھنے والا۔ اس اعتبار سے آیت کے اگلے جملے میں منافقین کا تذکرہ ہے اور آیت میں دو گروہوں کا ذکر ہے، پہلے جملے میں ان مسلمانوں کا جن کے پاس واقعی عذر تھے اور دوسرے منافقین، جو بغیر عذر پیش کیے بیٹھے رہے اور آیت کے آخری حصے میں جو وعید ہے، اسی دوسرے گروہ کے لیے ہے۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔

(۲) اس آیت میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو واقعی معذور تھے اور ان کا عذر بھی واضح تھا۔ مثلاً، ضعیف و ناتواں یعنی بوڑھے قسم کے لوگ، اور نابینا یا لنگڑے وغیرہ معذورین بھی اسی ذیل میں آجاتے ہیں۔ بعض نے ان کو بیماروں میں شامل کیا ہے۔ ۲- بیمار ۳- جن کے پاس جہاد کے اخراجات نہیں تھے اور بیت المال بھی ان کے اخراجات کا متحمل نہیں تھا۔ اللہ اور رسول کی خیر خواہی سے مراد ہے، جہاد کی ان کے دلوں میں تڑپ، مجاہدین سے محبت رکھتے ہیں اور اللہ اور رسول کے دشمنوں سے عداوت، اور حتی الامکان اللہ اور رسول کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں۔ ایسے محسنین، اگر جہاد میں شرکت کرنے سے معذور ہوں تو ان پر کوئی گناہ نہیں۔

حَدَّثَنَا الْأَكْبَدِيُّ وَأَمَّا التَّفَقُّونَ ①

ہیں کہ میں تو تمہاری سواری کے لیے کچھ بھی نہیں پاتا، تو وہ رنج و غم سے اپنی آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں کہ انھیں خرچ کرنے کے لیے کچھ بھی میسر نہیں۔^(۱) (۹۲)

بیشک انھیں لوگوں پر راہ الزام ہے جو باوجود دولت مند ہونے کے آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں۔ یہ خانہ نشین عورتوں کا ساتھ دینے پر خوش ہیں اور ان کے دلوں پر مہر خد اوندی لگ چکی ہے جس سے وہ محض بے علم ہو گئے ہیں۔^(۲) (۹۳)

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنَاءُ
رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَى
قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ②

(۱) یہ مسلمانوں کے ایک دوسرے گروہ کا ذکر ہے جن کے پاس اپنی سواریاں بھی نہیں تھیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انہیں سواریاں پیش کرنے سے معذرت کی جس پر انہیں اتنا صدمہ ہوا کہ بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ رضی اللہ عنہم۔ گویا مخلص مسلمان، جو کسی بھی لحاظ سے معقول عذر رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کہ ہر ظاہر و باطن سے باخبر ہے، ان کو جہاد میں شرکت سے مستثنیٰ کر دیا۔ بلکہ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان معذورین کے بارے میں جہاد میں شریک لوگوں سے فرمایا کہ ”تمہارے پیچھے مدینے میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ تم جس وادی کو بھی طے کرتے ہو اور جس راستے پر بھی چلتے ہو، تمہارے ساتھ وہ اجر میں برابر کے شریک ہیں“ صحابہ کرام نے پوچھا۔ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے جب کہ وہ مدینے میں بیٹھے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا حَسَبَهُمُ الْعُذْرُ، اصحیح بخاری۔ کتاب الجہاد، باب من حبسه العذر عن الغزو۔ و صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب ثواب من حبسه عن الغزو ومرض....“ عذر نے ان کو وہاں روک دیا ہے۔“

(۲) یہ منافقین ہیں جن کا تذکرہ آیت ۸۶، ۸۷ میں گزرا۔ یہاں دوبارہ ان کا ذکر مخلص مسلمانوں کے مقابلے میں ہوا ہے کہ تَبَيَّنَ الْأَشْيَاءُ بِأَضْدَادِهَا کہ چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ خَوَالِفُ، خَالِفَةُ کی جمع ہے (پیچھے رہنے والی) مراد عورتیں، بچے، معذور اور شدید بیمار اور بوڑھے ہیں جو جنگ میں شرکت سے معذور ہیں۔ لَا يَعْلَمُونَ، کا مطلب ہے وہ نہیں جانتے کہ پیچھے رہنا کتنا بڑا جرم ہے، ورنہ شاید وہ رسول ﷺ سے پیچھے نہ رہتے۔

یہ لوگ تمہارے سامنے عذر پیش کریں گے جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے۔ آپ کہہ دیجئے کہ یہ عذر پیش مت کرو ہم کبھی تم کو سچانہ سمجھیں گے، اللہ تعالیٰ ہم کو تمہاری خبر دے چکا ہے اور آئندہ بھی اللہ اور اس کا رسول تمہاری کارگزاری دیکھ لیں گے پھر ایسے کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو پوشیدہ اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے پھر وہ تم کو بتا دے گا جو کچھ تم کرتے تھے۔ (۹۴)

ہاں وہ اب تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھا جائیں گے جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے تاکہ تم ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو۔ سو تم ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو۔ وہ لوگ بالکل گندے ہیں اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے ان کاموں کے بدلے جنہیں وہ کیا کرتے تھے۔ (۹۵)

یہ اس لیے قسمیں کھائیں گے کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ۔ سو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ تعالیٰ تو ایسے فاسق لوگوں سے راضی نہیں ہوتا۔ (۹۶)^(۱)

يَعْتَنِ زُونَ إِلَيْكُمْ إِذَا جَعَلْتُمْ إِلَيْهِمْ قُلُوبًا لَّاتَعْتَنِ زُونَ نَوْمًا لَكُمْ وَقَدْ بَيَّنَّا اللَّهُ مِنْ أَجْلِكُمْ وَ سَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عِلْمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۹۴﴾

سَيَخْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ إِذَا انْقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِتَعْرِضُوا عَنْهُمْ فَأَعْرِضُوا عَنْهُمْ إِنَّهُمْ رَجِسٌ وَمَا ذُنُوبُهُمْ جَهَنَّمَ حِمْلًا لِّمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۹۵﴾

يَخْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿۹۶﴾

(۱) ان تین آیات میں ان منافقین کا ذکر ہے جو تبوک کے سفر میں مسلمانوں کے ساتھ نہیں گئے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو بحیرت واپسی پر اپنے عذر پیش کر کے ان کی نظروں میں وفادار بنا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جب تم ان کے پاس آؤ گے تو یہ عذر پیش کریں گے، تم ان سے کہہ دو، کہ ہمارے سامنے عذر پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اصل حالات سے ہمیں باخبر کر دیا ہے۔ اب تمہارے جھوٹے عذروں کا ہم اعتبار کس طرح کر سکتے ہیں؟ البتہ ان عذروں کی حقیقت مستقبل قریب میں مزید واضح ہو جائے گی، تمہارا عمل، جسے اللہ تعالیٰ بھی دیکھ رہا ہے اور رسول ﷺ کی نظر بھی اس پر ہے، تمہارے عذروں کی حقیقت کو خود بے نقاب کر دے گا۔ اور اگر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو پھر بھی فریب اور مغالطہ دینے میں کامیاب رہے تو بالآخر ایک وقت وہ تو آئے گا ہی، جب تم ایسی ذات کی بارگاہ میں حاضر کئے جاؤ گے جو ظاہر و باطن ہر چیز کو خوب جانتی ہے۔ اسے تو تم بہر صورت دھوکہ نہیں دے سکتے، وہ اللہ تمہارا سارا کچا چٹھا تمہارے سامنے کھول کر رکھ دے گا۔ دو سری آیت میں فرمایا کہ تمہارے لوٹنے پر یہ قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے اعراض یعنی درگزر کر دو۔ پس تم انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دو۔ یہ لوگ اپنے عقائد و اعمال کے لحاظ سے پلید ہیں، انہوں نے جو کچھ کیا ہے۔ اس کا بدلہ جنم ہی ہے تیسری آیت میں فرمایا: یہ تمہیں راضی کرنے کے لیے قسمیں کھائیں گے۔ لیکن ان نادانوں کو یہ پتہ نہیں کہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی

دیہاتی لوگ کفر اور نفاق میں بہت ہی سخت ہیں^(۱) اور ان کو ایسا ہونا ہی چاہیے کہ ان کو ان احکام کا علم نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے^(۲) ہیں اور اللہ بڑا علم والا بڑی حکمت والا ہے۔ (۹۷)

اور ان دیہاتیوں میں سے بعض^(۳) ایسے ہیں کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو جرمانہ سمجھتے ہیں^(۴) اور تم مسلمانوں کے واسطے برے وقت کے منتظر رہتے ہیں،^(۵) برا وقت ان ہی پر پڑنے والا ہے^(۶) اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (۹۸)

الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَأَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا
حُدُودَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۹۷﴾

وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَعْرَمًا وَيَكْرَهُ
يَكُودًا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَاللَّهِ
سَمِيمٌ ﴿۹۸﴾

جاؤ تو انہوں نے جس فق یعنی اطاعت الہی سے گریز و فرار کا راستہ اختیار کیا ہے اس کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ ان سے راضی کیوں کر ہو سکتا ہے؟

(۱) مذکورہ آیات میں ان منافقین کا تذکرہ تھا جو مدینہ شہر میں رہائش پذیر تھے۔ اور کچھ منافقین وہ بھی تھے جو بادیاہ نشین یعنی مدینہ کے باہر دیہاتوں میں رہتے تھے، دیہات کے ان باشندوں کو اعراب کہا جاتا ہے جو اعرابی کی جمع ہے۔ شہریوں کے اخلاق و کردار کے مقابلے میں جس طرح ان کے اخلاق و کردار میں درشتی اور کھردرا پن زیادہ پایا جاتا ہے۔ اسی طرح ان میں جو کافر و منافق تھے وہ کفر و نفاق میں بھی شہریوں سے زیادہ سخت اور احکام شریعت سے زیادہ بے خبر تھے۔ اس آیت میں انہی کا تذکرہ اور ان کے اسی کردار کی وضاحت ہے۔ بعض احادیث سے بھی ان کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً ایک موقع پر کچھ اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے پوچھا اَتَقْبَلُونَ صَبِيًّا نَكُنْمُ "کیا تم اپنے بچوں کو بوسہ دیتے ہو؟" صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا "ہاں" انہوں نے کہا "واللہ! ہم تو بوسہ نہیں دیتے" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا "اگر اللہ نے تمہارے دلوں سے رحم و شفقت کا جذبہ نکال دیا ہے تو میرا اس میں کیا اختیار ہے؟" (صحیح بخاری کتاب الأدب، باب رحمة الولد وتقبيله ومعانقته۔

صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمته صلى الله عليه وسلم الصبيان والعيال)

(۲) اس کی وجہ یہ ہے کہ چون کہ وہ شہر سے دور رہتے ہیں اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سننے کا اتفاق ان کو نہیں ہوتا۔

(۳) اب ان دیہاتیوں کی دو قسمیں بیان کی جا رہی ہیں یہ پہلی قسم ہے۔

(۴) غُزْمٌ، تاوان اور جرمانے کو کہتے ہیں۔ یعنی ایسا خرچ ہو جو انسان کو نہایت ناگواری سے ناچار کرنا پڑ جاتا ہے۔

(۵) دَوَائِرٌ، دائرے کی جمع ہے، گردش زمانہ یعنی مصائب و آلام یعنی وہ منتظر رہتے ہیں کہ مسلمان زمانے کی گردشوں یعنی مصائب کا شکار ہوں۔

(۶) یہ بدوعایا خبر ہے کہ زمانے کی گردش ان پر ہی پڑے۔ کیونکہ وہی اس کے مستحق ہیں۔

اور بعض اہل دیہات میں ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو عند اللہ قرب حاصل ہونے کا ذریعہ اور رسول کی دعا کا ذریعہ بناتے ہیں،^(۱) یاد رکھو کہ ان کا یہ خرچ کرنا بیشک ان کے لیے موجب قربت ہے، ان کو اللہ تعالیٰ ضرور اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔^(۲) اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے۔ (۹۹)

اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں^(۳) اللہ ان سب

وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرْبًا عِنْدَ اللَّهِ وَصَلَوَاتُ الرَّسُولِ أَلَا إِنَّهَا قُرْبَةٌ لَهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۹۹﴾

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُمْ وَأَعَدَّ لَهُمْ

(۱) یہ اعراب کی دوسری قسم ہے جن کو اللہ نے شہر سے دور رہنے کے باوجود اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے کی توفیق عطا فرمائی۔ اور اس ایمان کی بدولت ان سے وہ جمالت بھی دور فرمادی جو بدویت کی وجہ سے اہل بادیه میں عام طور پر ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کردہ مال کو جرمانہ سمجھنے کے بجائے اللہ کے قرب کا اور رسول ﷺ کی دعائیں لینے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ اشارہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کی طرف، جو صدقہ دینے والوں کے بارے میں آپ ﷺ کا تھا۔ یعنی آپ ﷺ ان کے حق میں دعائے خیر فرماتے۔ جس طرح حدیث میں آتا ہے کہ ایک صدقہ لانے والے کے لیے آپ ﷺ نے دعا فرمائی اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَيَّ آلِ أَبِي أَوْفَى۔ (صحیح بخاری نمبر، ۴۱۶۶، صحیح مسلم، نمبر، ۷۵۶۱) اے اللہ! ابووفی کی آل پر رحمت نازل فرما۔

(۲) یہ خوش خبری ہے کہ اللہ کا قرب انہیں حاصل ہے اور اللہ کی رحمت کے وہ مستحق ہیں۔

(۳) اس میں تین گروہوں کا ذکر ہے۔ ایک مہاجرین کا، جنہوں نے دین کی خاطر اللہ اور رسول ﷺ کے حکم پر، مکہ اور دیگر علاقوں سے ہجرت کی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مدینہ آگئے۔ دوسرے انصار، جو مدینہ میں رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے ہر موقع پر رسول اللہ ﷺ کی مدد اور حفاظت فرمائی اور مدینہ آنے والے مہاجرین کی بھی خوب پذیرائی اور تواضع کی۔ اور اپنا سب کچھ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہاں ان دونوں گروہوں کے سابقین اولوں کا ذکر فرمایا ہے، یعنی دونوں گروہوں میں سے وہ افراد جنہوں نے اسلام قبول کرنے میں سب سے پہلے سبقت کی۔ اس کی تعریف میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک سابقین اولوں وہ ہیں جنہوں نے دونوں قبیلوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ یعنی تحویل قبلہ سے پہلے مسلمان ہونے والے مہاجرین و انصار۔ بعض کے نزدیک یہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں جو حدیبیہ میں بیعت رضوان میں حاضر تھے۔ بعض کے نزدیک یہ اہل بدر ہیں۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ یہ سارے ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ تیسری قسم وہ ہے جو ان مہاجرین و انصار کے خلوص اور احسان کے ساتھ پیرو کار ہیں۔ اس گروہ سے مراد بعض کے نزدیک اصطلاحی تابعین ہیں جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبت سے مشرف ہوئے

سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں ہمیشہ رہیں گے^(۱) یہ بڑی کامیابی ہے۔ (۱۰۰)

اور کچھ تمہارے گرد و پیش والوں میں اور کچھ مدینے والوں میں ایسے منافق ہیں کہ نفاق پر اڑے^(۲) ہوئے ہیں، آپ ان کو نہیں جانتے،^(۳) ان کو ہم جانتے ہیں ہم ان کو دہری سزا دیں گے،^(۴) پھر وہ بڑے بھاری عذاب کی طرف بھیجے جائیں گے۔ (۱۰۱)

جَدَّتْ بُرَيْرٌ مِّنْهَا لَأَنْهَرُ خَلِيدًا فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْعَزْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۰۰﴾

وَمِمَّنْ حَوْلَكُم مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنْفِقُونَ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُّوَاعِلِ النَّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ تَحْنُ تَعْلَمُهُمْ سَعْدًا بِهِمْ مَّتْرَتَيْنِ تَجْرُدُونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ ﴿۱۰۱﴾

اور بعض نے اسے عام رکھا ہے یعنی قیامت تک جتنے بھی انصار و مہاجرین سے محبت رکھنے والے اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے مسلمان ہیں، وہ اس میں شامل ہیں۔ ان میں اصطلاحی تابعین بھی آجاتے ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا۔ کامطلب ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی نیکیاں قبول فرمائیں، ان کی بشری لغزشوں کو معاف فرما دیا اور وہ ان پر ناراض نہیں۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے لیے جنت اور جنت کی نعمتوں کی بشارت کیوں دی جاتی؟ جو اسی آیت میں دی گئی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ رضائے الہی موتق اور عارضی نہیں، بلکہ دائمی ہے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کو مرتد ہو جانا تھا (جیسا کہ ایک باطل ٹولے کا عقیدہ ہے) تو اللہ تعالیٰ انہیں جنت کی بشارت سے نہ نوازتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب اللہ نے ان کی ساری لغزشیں معاف فرمادیں تو اب تنقیص و تنقیض کے طور پر ان کی کوتاہیوں کا تذکرہ کرنا کسی مسلمان کی شان کے لائق نہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کی محبت اور پیروی رضائے الہی کا ذریعہ ہے اور ان سے عداوت اور بغض و عناد رضائے الہی سے محرومی کا باعث ہے۔ فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ.

(۲) مَرَدُّ اور تَمَرَّدُ کے معنی ہیں۔ تَمَرَّدُ، مَلَامَت (چکناہٹ) اور تَجْرُد۔ چنانچہ اس شاخ کو جو بغیر پتے کے ہو، وہ گھوڑا جو بغیر بال کے ہو، وہ لڑکا جس کے چرے پر بال نہ ہوں، ان سب کو مَرَدُّ کہا جاتا ہے اور شَيْثُہ کو صَرْحُ مَمَرَّدُ أَيْ مَجْرَدُ کہا جاتا ہے۔ مَرَدُّ وَاعِلِ النَّفَاقِ کے معنی ہوں گے تَجْرُدُوا عَلَي النَّفَاقِ، گویا انہوں نے نفاق کے لیے اپنے آپ کو خالص اور تنہا کر لیا، یعنی اس پر ان کا اصرار اور استمرار ہے۔

(۳) کتنے واضح الفاظ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے علم غیب کی نفی ہے۔ کاش اہل بدعت کو قرآن سمجھنے کی توفیق نصیب ہو۔
(۴) اس سے مراد بعض کے نزدیک دنیا کی ذلت و رسوائی اور پھر آخرت کا عذاب ہے اور بعض کے نزدیک دنیا میں ہی دہری سزا ہے۔

اور کچھ اور لوگ ہیں جو اپنی خطا کے اقراری ہیں^(۱) جنہوں نے ملے جلے عمل کیے تھے، کچھ بھلے اور کچھ برے۔^(۲) اللہ سے امید ہے کہ ان کی توبہ قبول فرمائے۔^(۳) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے۔ (۱۰۲)

آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے، جس کے ذریعہ سے آپ ان کو پاک صاف کر دیں اور ان کے لیے دعا کیجئے،^(۴) بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لیے موجب اطمینان ہے اور اللہ تعالیٰ خوب سنتا ہے خوب جانتا ہے۔ (۱۰۳)

کیا ان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہی صدقات کو قبول فرماتا ہے^(۵) اور یہ کہ

وَالَّذِينَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا
عَسَىٰ اللَّهُ أَن يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۰۲﴾

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَيُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ
عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۰۳﴾

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَأْخُذُ
الصَّدَقَاتِ وَإِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۰۴﴾

(۱) یہ وہ مخلص مسلمان ہیں جو بغیر نذر کے محض تساہل کی وجہ سے توبہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں گئے بلکہ بعد میں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، اور اعتراف گناہ کر لیا۔

(۲) بھلے سے مراد وہ اعمال صالحہ ہیں جو جہاد میں پیچھے رہ جانے سے پہلے وہ کرتے رہے ہیں جن میں مختلف جنگوں میں شرکت بھی ہے اور ”کچھ برے“ سے مراد یہی توبہ کے موقع پر ان کا پیچھے رہنا ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی طرف سے امید، یقین کا فائدہ دیتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف رجوع فرما کر ان کے اعتراف گناہ کو توبہ کے قائم مقام قرار دے کر انہیں معاف فرما دیا۔

(۴) یہ حکم عام ہے۔ صدقے سے مراد فرضی صدقہ یعنی زکوٰۃ بھی ہو سکتی ہے اور نفلی صدقہ بھی۔ نبی ﷺ کو کہا جا رہا ہے کہ اس کے ذریعے سے آپ مسلمانوں کی تطہیر اور ان کا تزکیہ فرمادیں۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زکوٰۃ و صدقات انسان کے اخلاق و کردار کی طہارت و پاکیزگی کا ایک بڑا ذریعہ ہیں۔ علاوہ ازیں صدقے کو صدقہ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خرچ کرنے والا اپنے دعوائے ایمان میں صادق ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ صدقہ وصول کرنے والے کو صدقہ دینے والے کے حق میں دعائے خیر کرنی چاہیے۔ جس طرح یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کو دعا کرنے کا حکم دیا، اور آپ ﷺ اس کے مطابق دعا فرمایا کرتے تھے۔ اس حکم کے عموم سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی امام وقت کی ذمہ داری ہے۔ اگر کوئی اس سے انکار کرے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرز عمل کی روشنی میں اس کے خلاف جہاد ضروری ہے۔ (ابن کثیر)

(۵) صدقات قبول فرماتا ہے کا مطلب (بشرطیکہ وہ حلال کمائی سے ہو) اس میں اضافہ فرماتا ہے۔ جس طرح حدیث میں آیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ تمہارے صدقے کی اس طرح پرورش کرتا ہے جس طرح تم میں

اللہ ہی توبہ قبول کرنے میں اور رحمت کرنے میں
کامل ہے۔ (۱۰۴)

کہہ دیجئے کہ تم عمل کیے جاؤ تمہارے عمل اللہ خود دیکھ
لے گا اور اس کا رسول اور ایمان والے (بھی دیکھ لیں
گے) اور ضرور تم کو ایسے کے پاس جانا ہے جو تمام چھپی
اور کھلی چیزوں کا جاننے والا ہے۔ سو وہ تم کو تمہارا سب کیا
ہوا بتلا دے گا۔ (۱۰۵)

اور کچھ اور لوگ ہیں جن کا معاملہ اللہ کا حکم آنے
تک ملتوی ہے (۲) ان کو سزا دے گا (۳) یا ان کی توبہ
قبول کر لے گا، (۴) اور اللہ خوب جاننے والا ہے بڑا
حکمت والا ہے۔ (۱۰۶)

اور بعض ایسے ہیں جنہوں نے ان اغراض کے لیے مسجد
بنائی ہے کہ ضرر پہنچائیں اور کفر کی باتیں کریں اور
ایمانداروں میں تفریق ڈالیں اور اس شخص کے قیام کا
سامان کریں جو اس سے پہلے سے اللہ اور رسول کا مخالف
ہے، (۵) اور قسمیں کھا جائیں گے کہ بجز بھلائی کے اور

وَقِيلَ اَعْمَلُوا صَيِّرَ اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وِرْسُولَهُ وَالْمُؤْمِنُونَ
وَسُرُّوْا اِلَىٰ عِلْمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُونَ ﴿۱۰۵﴾

وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهَوْنَ لَا يُؤْمِنُونَ
وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۱۰۶﴾

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِضَاعَادَةِ الْاِيْمَنِ حَاذِبًا اللّٰهُ وِرْسُوْلُهُ مِنْ
قَبْلُ وَيُخْلِفْنَ اِنْ اَرَادْنَا اِلَّا الْفُسْحٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ
اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

سے کوئی شخص اپنے گھوڑے کے بچے کی پرورش کرتا ہے، حتیٰ کہ ایک کھجور کے برابر صدقہ (بڑھ بڑھ کر) احد پہاڑ کی
مثل ہو جاتا ہے۔“ (صحیح بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ، و مسلم، کتاب الزکوٰۃ)

(۱) رویت کا مطلب دیکھنا اور جاننا ہے۔ یعنی تمہارے عملوں کو اللہ تعالیٰ ہی نہیں دیکھتا، بلکہ ان کا علم اللہ کے رسول اور
مومنوں کو بھی (بذریعہ وحی) ہو جاتا ہے۔ (یہ منافقین ہی کے ضمن میں کہا جا رہا ہے) اس مفہوم کی آیت پہلے بھی گزر چکی
ہے۔ یہاں مومنین کا بھی اضافہ ہے جن کو اللہ کے رسول ﷺ کے بتلانے سے علم ہو جاتا ہے۔

(۲) جنگ تبوک میں پیچھے رہنے والے ایک تو منافق تھے، دوسرے وہ جو بلا مذکر پیچھے رہ گئے تھے۔ اور انہوں نے اپنی
غلطی کا اعتراف کر لیا تھا لیکن انہیں معافی عطا نہیں کی گئی تھی۔ اس آیت میں اسی گروہ کا ذکر ہے جن کے معاملے کو مؤخر
کر دیا گیا تھا۔ (یہ تین افراد تھے، جن کا ذکر آگے آ رہا ہے)

(۳) اگر وہ اپنی غلطی پر مصر رہے۔

(۴) اگر وہ خالص توبہ کر لیں گے۔

(۵) اس میں منافقین کی ایک اور نہایت قبیح حرکت کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک مسجد بنائی۔ اور نبی ﷺ کو یہ باور

ہماری کچھ نیت نہیں، اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔^(۱) (۱۰۷)

آپ اس میں کبھی کھڑے نہ ہوں۔^(۲) البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں،^(۳) اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں،^(۴) اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (۱۰۸)

پھر آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ سے ڈرنے پر اور اللہ کی خوشنودی پر رکھی ہو، یا وہ

لَا تَقْرَبُ فِيهِ أَبَدًا لَمْسِجَاتِنَا عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أُولَىٰ يَوْمَ
أَحْسَبُ أَنْ تَكُونُ فِيهِ رِجَالٌ يُجِئُونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ
يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ ﴿۱۰۷﴾

أَمَنْ أَسَسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ
أَمْ مَنْ أَسَسَ بُنْيَانَهُ عَلَى شَفَا حَرْفٍ هَارِقًا نَهَارِيهِ فِي

کرایا کہ بارش، سردی اور اس قسم کے موقعوں پر بیماروں اور کمزوروں کو زیادہ دور جانے میں دقت پیش آتی ہے۔ ان کی سمولت کے لیے ہم نے یہ مسجد بنائی ہے۔ آپ ﷺ وہاں چل کر نماز پڑھیں تاکہ ہمیں برکت حاصل ہو۔ آپ ﷺ اس وقت تبوک کے لیے پابہ رکاب تھے، آپ ﷺ نے واپسی پر نماز پڑھنے کا وعدہ فرمایا۔ لیکن واپسی پر وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے منافقین کے اصل مقاصد کو بے نقاب کر دیا کہ اس سے وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانا، کفر پھیلانا، مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنا، اور اللہ اور رسول ﷺ کے دشمنوں کے لیے کمین گاہ مہیا کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) یعنی جھوٹی قسمیں کھا کر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فریب دینا چاہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان کے مکرو فریب سے بچالیا اور فرمایا کہ ان کی نیت صحیح نہیں اور یہ جو کچھ ظاہر کر رہے ہیں، اس میں جھوٹے ہیں۔

(۲) یعنی آپ ﷺ نے وہاں جا کر نماز پڑھنے کا جو وعدہ فرمایا ہے، اس کے مطابق وہاں جا کر نماز نہ پڑھیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے نہ صرف یہ کہ وہاں نماز نہیں پڑھی بلکہ اپنے چند ساتھیوں کو بھیج کر وہ مسجد ڈھادی اور اسے ختم کر دیا۔ اس سے علما نے استدلال کیا ہے کہ جو مسجد اللہ کی عبادت کے بجائے، مسلمانوں کے درمیان تفریق پیدا کرنے کی غرض سے بنائی جائے، وہ مسجد ضرار ہے، اس کو ڈھا دیا جائے تاکہ مسلمانوں میں تفریق و انتشار پیدا نہ ہو۔

(۳) اس سے مراد کون سی مسجد ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے اسے مسجد قبا اور بعض نے مسجد نبوی ﷺ قرار دیا ہے۔ سلف کی ایک ایک جماعت دونوں کی قائل رہی ہے۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آیت سے اگر مسجد قبا مراد ہے تو بعض احادیث میں مسجد نبوی کو ﴿أَيْسَ عَلَى التَّقْوَىٰ﴾ کا مصداق قرار دیا گیا ہے اور ان دونوں کے درمیان کوئی منافات نہیں۔ اس لیے کہ اگر مسجد قبا کے اندر یہ صفت پائی جاتی ہے کہ اول یوم سے ہی اس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے تو مسجد نبوی تو بطریق اولیٰ اس صفت کی حامل اور اس کی مصداق ہے۔

(۴) حدیث میں آتا ہے کہ اس سے مراد اہل قبا ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری طہارت کی تعریف فرمائی ہے، تم کیا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم ڈھیلے استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ پانی بھی استعمال

شخص، کہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھائی کے کنارے پر جو کہ گرنے ہی کو ہو، رکھی ہو، پھر وہ اس کو لے کر آتش دوزخ میں گر پڑے،^(۱) اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو سمجھ ہی نہیں دیتا۔ (۱۰۹)

ان کی یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں شک کی بنیاد پر (کانٹابن کر) کھٹکتی رہے گی، ہاں مگر ان کے دل ہی اگر پاش پاش ہو جائیں^(۲) تو خیر، اور اللہ تعالیٰ بڑا علم والا بڑی حکمت والا ہے۔ (۱۱۰)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔^(۳) وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو کون پورا کرنے والا ہے،^(۴) تو تم لوگ اپنی

تَارَجَهُمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝۱۰۹

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّ قُلُوبُهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝۱۱۰

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ سَوْعَاءَ عَلَىٰ حَقِّهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِيَعْيِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ وَذَلِكَ هُوَ الْقَوْلُ الْعَظِيمُ ۝۱۱۰

کرتے ہیں۔ (بحوالہ ابن کثیر) امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ایسی قدیم مساجد میں نماز پڑھنا مستحب ہے جو اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کی غرض سے تعمیر کی گئی ہوں، نیز صالحین کی جماعت اور ایسے لوگوں کے ساتھ نماز پڑھنا مستحب ہے جو مکمل وضو کرنے اور طہارت و پاکیزگی کا صحیح صحیح اہتمام کرنے والے ہوں۔

(۱) اس میں مومن اور منافق کے عمل کی مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ مومن کا عمل اللہ کے تقویٰ پر اور اس کی رضامندی کے لیے ہوتا ہے، جب کہ منافق کا عمل ریاکاری اور فساد پر مبنی ہوتا ہے، جو اس حصہ زمین کی طرح ہے جس کے نیچے سے وادی کا پانی گزرتا ہے اور مٹی کو ساتھ ہمالے جاتا ہے۔ وہ حصہ نیچے سے کھوکھلا رہ جاتا ہے جس پر کوئی تعمیر کر لی جائے تو فوراً گر پڑے گی۔ ان منافقین کا مسجد بنانے کا عمل بھی ایسا ہی ہے جو انہیں جہنم میں ساتھ لے کرے گا۔

(۲) دل پاش پاش ہو جائیں، کا مطلب موت سے ہم کنار ہونا ہے۔ یعنی موت تک یہ عمارت ان کے دلوں میں مزید شک و نفاق پیدا کرنے کا ذریعہ بنی رہے گی، جس طرح کہ پچھڑے کے پجاریوں میں پچھڑے کی محبت رچ بس گئی تھی۔

(۳) یہ اللہ تعالیٰ کے ایک خاص فضل و کرم کا بیان ہے کہ اس نے مومنوں کو، ان کے جان و مال کے عوض، جو انہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کیے، جنت عطا فرمادی، جب کہ یہ جان و مال بھی اسی کا عطیہ ہے۔ پھر قیمت اور معاوضہ بھی جو عطا کیا یعنی جنت۔ وہ نہایت ہی بیش قیمت ہے۔

(۴) یہ اسی سوڈے کی تاکید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سچا وعدہ بچھیلی کتابوں میں بھی اور قرآن میں بھی کیا ہے۔ اور اللہ سے

اس بیچ پر جس کا تم نے معاملہ ٹھہرایا ہے خوشی مناؤ،^(۱) اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ (۱۱۱)

وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، (یا راہ حق میں سفر کرنے والے) رکوع اور سجدہ کرنے والے، نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے اور بری باتوں سے باز رکھنے والے اور اللہ کی حدوں کا خیال رکھنے والے ہیں^(۲) اور ایسے مومنین کو آپ خوشخبری سنا دیجئے۔^(۳) (۱۱۲)

پیغمبر کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا مانگیں اگرچہ وہ

الْمَلَأَبُونَ الْعِيدُونَ الْحَمِيدُونَ السَّابِقُونَ الزَّكِيُّونَ
الشُّجُوذُونَ الْأَمْرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ وَيَبْشُرُوا الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۱۱﴾

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا
لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ

زیادہ عہد کو پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟

(۱) یہ مسلمانوں کو کہا جا رہا ہے لیکن یہ خوشی اسی وقت منائی جا سکتی ہے جب مسلمان کو بھی یہ سودا منظور ہو۔ یعنی اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے انہیں دریغ نہ ہو۔

(۲) یہ انہی مومنوں کی مزید صفات بیان کی جا رہی ہیں جن کی جانوں اور مالوں کا سودا اللہ نے کر لیا ہے۔ وہ توبہ کرنے والے، یعنی گناہوں اور فواحش سے۔ پابندی سے اپنے رب کی عبادت کرنے والے، زبان سے اللہ کی حمد و ثناء بیان کرنے والے اور دیگر ان صفات کے حامل ہیں جو آیت میں مذکور ہیں۔ سیاحت سے مراد اکثر مفسرین نے روزے لیے ہیں اور اسی کو ابن کثیر نے صحیح ترین اور مشہور ترین قول قرار دیا ہے۔ اور بعض نے اس سے جہاد مراد لیا ہے۔ تاہم سیاحت سے زمین کی سیاحت مراد نہیں ہے جس طرح کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے۔ اسی طرح اللہ کی عبادت کے لیے پہاڑوں کی چوٹیوں غاروں اور سنسان بیابانوں میں جا کر ڈیرے لگانا بھی اس سے مراد نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ رہبانیت اور جوگی پن کا ایک حصہ ہے جو اسلام میں نہیں ہے۔ البتہ فتنوں کے ایام میں اپنے دین کو بچانے کے لیے شہروں اور آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں اور بیابانوں میں جا کر رہنے کی اجازت حدیث میں دی گئی ہے۔ (صحیح بخاری۔ کتاب الإیمان) باب "من الدین الفراد من الفتن" و کتاب الفتن باب التعرب۔ أي السکنی مع الأعراب۔ فی الفتنۃ)

(۳) مطلب یہ ہے کہ مومن کمال وہ ہے جو قول و عمل میں اسلام کی تعلیمات کا عمدہ نمونہ ہو اور ان چیزوں سے بچنے والا ہو جن سے اللہ نے اسے روک دیا ہے اور یوں اللہ کی حدوں کو پامال نہیں، بلکہ ان کی حفاظت کرنے والا ہو۔ ایسے ہی کمال مومن خوشخبری کے مستحق ہیں۔ یہ وہی بات ہے جسے قرآن میں ﴿آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ کے الفاظ میں بار بار بیان کیا گیا ہے۔ یہاں اعمال صالحہ کی قدرے تفصیل بیان کر دی گئی ہے۔

مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿۱۷﴾

رشتہ دار ہی ہوں اس امر کے ظاہر ہو جانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں۔^(۱) (۱۱۳)

اور ابراہیم (علیہ السلام) کا اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت مانگنا وہ صرف وعدہ کے سبب سے تھا جو انہوں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا۔ پھر جب ان پر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے محض بے تعلق ہو گئے،^(۲) واقعی ابراہیم (علیہ السلام) بڑے نرم دل اور بردبار تھے۔^(۳) (۱۱۴)

اور اللہ ایسا نہیں کرتا کہ کسی قوم کو ہدایت کر کے بعد میں گمراہ کر دے جب تک کہ ان چیزوں کو صاف صاف نہ بتلا دے جن سے وہ بچیں^(۴) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴿۱۷﴾

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُونَ إِنَّ اللَّهَ بَخِيلٌ غَنِيٌّ عَلَيْهِ ﴿۱۷﴾

(۱) اس کی تفسیر صحیح بخاری میں اس طرح ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عم بزرگوار ابوطالب کا آخری وقت آیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس گئے جبکہ ان کے پاس ابوجہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”پچھا جان لا إله إلا الله پڑھ لیں، تاکہ میں اللہ کے ہاں آپ کے لیے حجت پیش کر سکوں، ابوجہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ نے کہا ”اے ابوطالب کیا عبدالمطلب کے مذہب سے انحراف کرو گے؟“ (یعنی مرتے وقت یہ کیا کرنے لگے ہو؟ حتیٰ کہ اسی حال میں ان کا انتقال ہو گیا) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے روک نہیں دیا جائے گا، میں آپ کے لیے استغفار کرتا رہوں گا۔“ جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ جس میں مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب التفسیر، سورة التوبة) اور سورہ قصص کی آیت ۵۶ ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ﴾ بھی اسی سلسلے میں نازل ہوئی۔ مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی والدہ کے لیے مغفرت کی دعا کرنے کی اجازت طلب فرمائی، جس پر یہ آیت نازل ہوئی (مسند احمد ج ۵ ص ۳۵۵) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مشرک قوم کے لیے جو دعا فرمائی تھی اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔ ”یا اللہ میری قوم بے علم ہے اس کی مغفرت فرمادے“ یہ آیت کے منافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا مطلب ان کے لیے ہدایت کی دعا ہے۔ یعنی وہ میرے مقام و مرتبہ سے نا آشنا ہے، اسے ہدایت سے نواز دے تاکہ وہ مغفرت کی اہل ہو جائے۔ اور زندہ کفار و مشرکین کے لیے ہدایت کی دعا کرنی جائز ہے۔

(۲) یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی جب یہ بات واضح ہو گئی کہ میرا باپ اللہ کا دشمن ہے اور جنسی ہے تو انہوں نے اس سے اظہار براءت کر دیا اور اس کے بعد مغفرت کی دعا نہیں کی۔

(۳) اور ابتدا میں باپ کے لیے مغفرت کی دعا بھی اپنے اسی مزاج کی نرمی اور حلیمی کی وجہ سے کی تھی۔

(۴) جب اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے حق میں مغفرت کی دعا کرنے سے روکا تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو جنہوں نے ایسا کیا تھا،

خوب جانتا ہے۔ (۱۱۵)

بلاشبہ اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین میں۔ وہی جلاتا اور مارتا ہے، اور تمہارا اللہ کے سوا نہ کوئی یار ہے اور نہ کوئی مددگار ہے۔ (۱۱۶)

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کے حال پر توجہ فرمائی اور مہاجرین اور انصار کے حال پر بھی جنہوں نے ایسی تنگی کے وقت پیغمبر کا ساتھ دیا،^(۱) اس کے بعد کہ ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں کچھ تزلزل ہو چلا تھا۔^(۲) پھر اللہ نے ان کے حال پر توجہ فرمائی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان سب پر بہت ہی شفیق مہربان ہے۔ (۱۱۷)

اور تین شخصوں کے حال پر بھی جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا۔^(۳) یہاں تک کہ جب زمین باوجود اپنی فراخی

إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يُعْجِبُ وَيُؤْمِنُ
وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ قَوْلٍ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۱۱۵﴾

لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ
الَّذِينَ اشْتَمَعُوا فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا
كَادَ يَزِيغُ قُلُوبَ فِرْيَاقٍ مِنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ
بِهِمْ دُؤُوفٌ رَحِيمٌ ﴿۱۱۶﴾

وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خَلَفُوا حَتَّىٰ إِذَا صَافَتْ عَلَيْهِمُ
الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَصَافَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَنَّ

یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ ایسا کر کے انہوں نے گمراہی کا کام تو نہیں کیا۔؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب تک بچنے والے کاموں کی وضاحت نہیں فرمادیتا، اس وقت تک اس پر مؤاخذہ بھی نہیں فرماتا نہ اسے گمراہی قرار دیتا ہے البتہ جب ان کاموں سے نہیں بچتا، جن سے روکا جا چکا ہو تو پھر اللہ تعالیٰ اسے گمراہ کر دیتا ہے۔ اس لیے جن لوگوں نے اس حکم سے قبل اپنے فوت شدہ مشرک رشتے داروں کے لیے مغفرت کی دعائیں کی ہیں ان کا مؤاخذہ نہیں ہو گا، کیونکہ انہیں مسئلے کا اس وقت علم ہی نہیں تھا۔

(۱) جنگ تبوک کے سفر کو ”تنگی کا وقت“ قرار دیا۔ اس لیے کہ ایک تو موسم سخت گرمی کا تھا۔ دوسرے، فصلیں تیار تھیں۔ تیسرے، سفر خاصا لمبا تھا اور چوتھے وسائل کی بھی کمی تھی۔ اسی لیے اسے «جَبَشُ الْعُسْرَةِ» (تنگی کا قافلہ یا لشکر) کہا جاتا ہے۔ توبہ کے لیے ضروری نہیں ہے کہ پہلے گناہ یا غلطی کا ارتکاب ہو۔ اس کے بغیر بھی رفع درجات اور غیر شعوری طور پر ہو جانے والی کوتاہیوں کے لیے توبہ ہوتی ہے۔ یہاں مہاجرین و انصار کے اس پہلے گروہ کی توبہ اسی مفہوم میں ہے جنہوں نے بلا تامل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم جہاد پر لبیک کہا۔

(۲) یہ اس دوسرے گروہ کا ذکر ہے جسے مذکورہ وجوہ سے ابتداءً تردد ہوا۔ لیکن پھر جلد ہی وہ اس کیفیت سے نکل آیا اور بخوشی جہاد میں شریک ہوا۔ دلوں میں تزلزل سے مراد دین کے بارے میں کوئی تزلزل یا شبہ نہیں ہے بلکہ مذکورہ دنیاوی اسباب کی وجہ سے شریک جہاد ہونے میں جو تذبذب اور تردد تھا، وہ مراد ہے۔

(۳) خَلَفُوا، کا وہی مطلب ہے جو مُرَجَّوْنَ کا ہے یعنی جن کا معاملہ مؤخر اور ملتوی کر دیا گیا تھا اور پچاس دن کے بعد انکی توبہ قبول ہوئی۔ یہ تین صحابہ تھے۔ کعب بن مالک، مرہرہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم۔ یہ تینوں نہایت مخلص

کے ان پر تنگ ہونے لگی اور وہ خود اپنی جان سے تنگ آگئے^(۱) اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی بجز اس کے کہ اسی کی طرف رجوع کیا جائے پھر ان کے حال پر توجہ فرمائی تاکہ وہ آئندہ بھی توبہ کر سکیں۔^(۲) بیشک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا بڑا رحم والا ہے۔ (۱۱۸)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور بچوں کے ساتھ رہو۔^(۳) (۱۱۹)

مدینہ کے رہنے والوں کو اور جو دیہاتی ان کے گرد و پیش ہیں ان کو یہ زیبا نہ تھا کہ رسول اللہ کو چھوڑ کر پیچھے رہ جائیں^(۴) اور نہ یہ کہ اپنی جان کو ان کی جان سے عزیز

لَا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلَوْ أَنَّمَا الضَّالِّينَ ۝

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَن رَسُولِ اللَّهِ وَيَرْجَبُوا بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ

مسلمان تھے اس سے قبل ہر غزوے میں یہ شریک ہوتے رہے۔ اس غزوہ تبوک میں صرف تساہا شریک نہیں ہوئے۔ بعد میں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ تو سوچا کہ ایک غلطی (پیچھے رہنے کی) تو ہو ہی گئی ہے۔ لیکن اب منافقین کی طرح رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جھوٹا عذر پیش کرنے کی غلطی نہیں کریں گے۔ چنانچہ حاضر خدمت ہو کر اپنی غلطی کا صاف اعتراف کر لیا اور اس کی سزا کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ نبی ﷺ نے انکے معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا کہ وہ انکے بارے میں کوئی حکم نازل فرمائے گا۔ تاہم اس دوران آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان تینوں افراد سے تعلق قائم رکھنے حتیٰ کہ بات چیت تک کرنے سے روک دیا۔ اور چالیس راتوں کے بعد انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اپنی بیویوں سے بھی دور رہیں چنانچہ بیویوں سے بھی جدائی عمل میں آگئی مزید دس دن گزرے تو توبہ قبول کر لی گئی اور مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ (اس واقعے کی پوری تفصیل حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو؛

صحیح بخاری، کتاب المغازی باب غزوة تبوك، مسلم کتاب التوبة، باب حدیث توبه كعب بن مالك)

(۱) یہ ان ایام کی کیفیت کا بیان ہے جس سے سوشل بائیکاٹ کی وجہ سے انہیں گزرنا پڑا۔

(۲) یعنی پچاس دن کے بعد اللہ نے ان کی آہ و زاری اور توبہ قبول فرمائی۔

(۳) سچائی ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان تینوں صحابہ کی غلطی نہ صرف معاف فرمادی بلکہ ان کی توبہ کو قرآن بنا کر نازل فرما دیا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ اس لیے مومنین کو حکم دیا گیا کہ اللہ سے ڈرو اور بچوں کے ساتھ رہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کے اندر تقویٰ (یعنی اللہ کا خوف) ہوگا وہ سچا بھی ہوگا اور جو جھوٹا ہوگا، سمجھ لو کہ اس کا دل تقویٰ سے خالی ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ مومن سے کچھ اور کو تاہیوں کا صدور تو ہو سکتا ہے لیکن وہ جھوٹا نہیں ہوتا۔

(۴) جنگ تبوک میں شرکت کے لیے چونکہ عام منادی کر دی گئی تھی، اس لیے معذورین، بوڑھے اور دیگر شرعی عذر

وَلَا تُنْفِقُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطُؤُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ
الْكَفَّارَ وَلَا يَتْلُونَ مِنْ عُذُوِّبَيْلًا إِلَّا كَيْبَ لَهُمْ بِهِ
عَمَلٌ صَالِحٌ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضَيِّعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۰﴾

سمجھیں،^(۱) یہ اس سبب سے کہ^(۲) ان کو اللہ کی راہ میں جو پیاس لگی اور جو تکان پہنچی اور جو بھوک لگی اور جو کسی ایسی جگہ چلے جو کفار کے لیے موجب غیظ ہوا ہو^(۳) اور دشمنوں کی جو کچھ خبر لی،^(۴) ان سب پر ان کے نام (ایک ایک) نیک کام لکھا گیا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ مخلصین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ (۱۲۰)

اور جو کچھ چھوٹا بڑا انہوں نے خرچ کیا اور جتنے میدان ان کو ملے کرنے پڑے،^(۵) یہ سب بھی ان

وَلَا تُنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ
وَادِيًا إِلَّا كَيْبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا

رکنے والوں کے علاوہ، سب کے لیے اس میں شرکت ضروری تھی لیکن پھر بھی جو مکان مدینہ یا اطراف مدینہ میں سے اس جہاد میں شریک نہیں ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی زجر و توبیح کرتے ہوئے فرما رہا ہے کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے تھا۔

(۱) یعنی یہ بھی ان کے لیے زیبا نہیں کہ خود اپنی جانوں کا تو تحفظ کر لیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے تحفظ کا انہیں خیال نہ ہو۔ بلکہ انہیں رسول ﷺ کے ساتھ رہ کر اپنے سے زیادہ ان کے تحفظ کا اہتمام کرنا چاہیے۔

(۲) ذلک سے پیچھے نہ رہنے کی علت بیان کی جا رہی ہے۔ یعنی انہیں اس لیے پیچھے نہیں رہنا چاہیے کہ اللہ کی راہ میں انہیں جو پیاس، تھکاوٹ، بھوک پہنچے گی یا ایسے اقدامات، جن سے کافروں کے غیظ و غضب میں اضافہ ہو گا، اسی طرح دشمنوں کے آدمیوں کو قتل یا ان کو قیدی بناؤ گے، یہ سب کے سب کام عمل صالح لکھے جائیں گے یعنی عمل صالح صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی مسجد میں یا کسی ایک گوشے میں بیٹھ کر نوافل، تلاوت، ذکر الہی وغیرہ کرے بلکہ جہاد میں پیش آنے والی ہر تکلیف اور پریشانی، حتیٰ کہ وہ کاروائیاں بھی جن سے دشمن کے دلوں میں خوف پیدا ہو یا غیظ بھڑکے، ان میں سے ہر ایک چیز اللہ کے ہاں عمل صالح لکھی جائے گی۔ اس لیے محض شوق عبادت میں بھی جہاد سے گریز صحیح نہیں، چہ جائیکہ بغیر عذر کے ہی آدمی جہاد سے جی چرائے؟

(۳) اس سے مراد پیادہ، یا گھوڑوں وغیرہ پر سوار ہو کر ایسے علاقوں سے گزرنا ہے کہ ان کے قدموں کی چاپوں اور گھوڑوں کی ناپوں سے دشمن کے دلوں پر لرزہ طاری ہو جائے اور ان کی آتش غیظ بھڑک اٹھے۔

(۴) ﴿وَلَا يَتْلُونَ مِنْ عُذُوِّبَيْلًا﴾ (التوبة: ۱۲۰) دشمن سے کوئی چیز لیتے ہیں یا ان کی خبر لیتے ہیں، سے مراد، ان کے آدمیوں کو قتل یا قیدی کرتے ہیں یا انہیں شکست سے دوچار کرتے اور مال غنیمت حاصل کرتے ہیں۔

(۵) پہاڑوں کے درمیان کے میدان اور پانی کی گزرگاہ کو وادی کہتے ہیں۔ مراد یہاں مطلق وادیاں اور علاقے ہیں۔ یعنی اللہ کی راہ میں تھوڑا یا زیادہ جتنا بھی خرچ کرو گے اسی طرح جتنے بھی میدان یا علاقے ملے کرو گے، (یعنی جہاد میں تھوڑا یا زیادہ سفر کرو گے) یہ سب نیکیاں تمہارے نامہ اعمال میں درج ہوں گی جن پر اللہ تعالیٰ اچھا سے اچھا بدلہ عطا فرمائے گا۔

يَعْمَلُونَ ۱۱

کے نام لکھا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کا اچھے سے
اچھا بدلہ دے۔ (۱۲۱)

اور مسلمانوں کو یہ نہ چاہیے کہ سب کے سب نکل
کھڑے ہوں سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر بڑی
جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تاکہ وہ
دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور تاکہ یہ لوگ اپنی قوم
کو جب کہ وہ ان کے پاس آئیں، ڈرائیں تاکہ وہ ڈر
جائیں۔ (۱۲۲) (۱)

اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس
پاس ہیں (۲) اور ان کو تمہارے اندر سختی پانا

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ
فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا
قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۱۱

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ
الْكُفَّارِ وَلِيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ

(۱) بعض مفسرین کے نزدیک اس کا تعلق بھی حکم جہاد سے ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ پچھلی آیات میں جب پیچھے رہنے
والوں کے لیے سخت وعید اور زجر و توبیح بیان کی گئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے محتاط ہو گئے اور جب بھی جہاد کا مرحلہ آتا
تو سب کے سب اس میں شریک ہونے کی کوشش کرتے۔ آیت میں انہیں حکم دیا گیا کہ ہر جہاد اس نوعیت کا نہیں ہوتا تاکہ
جس میں ہر شخص کی شرکت ضروری ہو (جیسا کہ تبوک میں ضروری تھا) بلکہ ایک گروہ کی ہی شرکت کافی ہے۔ ان کے
زودیک لیتفقہوا کا مخاطب پیچھے رہ جانے والا طائفہ ہے۔ یعنی ایک گروہ جہاد پر چلا جائے وَتَبَقِيَ طَائِفَةٌ (یہ محذوف
ہو گا) اور ایک گروہ پیچھے رہے، جو دین کا علم حاصل کرے اور جب مجاہدین واپس آئیں تو انہیں بھی احکام دین سے آگاہ
کر کے انہیں ڈرائیں۔ دوسری تفسیر اس کی یہ ہے کہ اس آیت کا تعلق جہاد سے نہیں ہے بلکہ اس میں علم دین سیکھنے کی
اہمیت کا بیان، اس کی ترغیب اور طریقے کی وضاحت ہے اور وہ یہ کہ ہر بڑی جماعت یا قبیلے میں سے کچھ لوگ دین کا علم
حاصل کرنے کے لیے اپنا گھریا چھوڑیں اور مدارس و مراکز علم میں جا کر اسے حاصل کریں اور پھر آکر اپنی قوم میں وعظ و
نصیحت کریں۔ دین میں متفقہ حاصل کرنے کا مطلب اوامر و نواہی کا علم حاصل کرنا ہے تاکہ اوامر الہی کو بجالا سکے اور نواہی
سے دامن کشاں رہے اور اپنی قوم کے اندر بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے۔

(۲) اس میں کافروں سے لڑنے کا ایک اہم اصول بیان کیا گیا ہے کہ الْأَوَّلُونَ فَلَا أَوْلَادَ لَهُمْ فَلَا اقْرَبُ وَلَا بَعْدُ لَهُمْ كَمَا
کافروں سے جہاد کرنا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے جزیرہ عرب میں آباد مشرکین سے قتال کیا، جب
ان سے فارغ ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے مکہ، طائف، یمن، یمامہ، ہجر، خیبر، حضرموت وغیرہ اقالیم پر مسلمانوں کو غلبہ عطا
فرمایا اور عرب کے سارے قبائل فوج در فوج اسلام میں داخل ہو گئے، تو پھر اہل کتاب سے قتال کا آغاز فرمایا اور ۹/
ہجری میں رومیوں سے قتال کے لیے تبوک تشریف لے گئے جو جزیرہ عرب سے قریب ہے۔ اسی کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم
کی وفات کے بعد خلفائے راشدین نے روم کے عیسائیوں سے قتال فرمایا، اور ایران کے مجوسیوں سے جنگ کی۔

الْمُتَّعِينَ ۝

چاہیے۔^(۱) اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کے

ساتھ ہے۔ (۱۲۳)

اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو بعض منافقین کہتے ہیں کہ اس سورت نے تم میں سے کس کے ایمان کو زیادہ کیا ہے،^(۲) سو جو لوگ ایمان والے ہیں اس سورت نے ان کے ایمان کو زیادہ کیا ہے اور وہ خوش ہو رہے ہیں۔^(۳) (۱۲۴)

اور جن کے دلوں میں روگ ہے اس سورت نے ان میں ان کی گندگی کے ساتھ اور گندگی بڑھا دی اور وہ حالت کفر ہی میں مر گئے۔^(۴) (۱۲۵)

وَإِذْ آمَأْنَا نَزَّلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ إِنَّا كُنَّا
زَادَتْهُ هَذِهِ إِيمَانًا فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فزَادَتْهُمْ
إِيمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝

وَإِنَّمَا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا
إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ ۝

(۱) یعنی کافروں کے لیے، مسلمانوں کے دلوں میں نرمی نہیں سختی ہونی چاہیے جیسا کہ ﴿ اَشَدَّ اَوْحَلِ الْكُفَّارِ مَحَابِبَتِهِمْ ﴾ (الفتح-۲۹) صحابہ کی صفت بیان کی گئی۔ اسی طرح ﴿ اَذْكُو عَلَى الْمُؤْمِنِينَ اَحْسَرَ عَلَى الْكُفَّارِينَ ﴾ (المائدہ-۵۳) اہل ایمان کی صفت ہے۔

(۲) اس سورت میں منافقین کے کردار کی جو نقاب کشائی کی گئی ہے، یہ آیات اس کا بقیہ اور تتمہ ہیں۔ اس میں بتلایا جا رہا ہے کہ جب ان کی غیر موجودگی میں کوئی سورت یا اس کا کوئی حصہ نازل ہوتا اور ان کے علم میں بات آتی تو وہ استہزا اور مذاق کے طور پر آپس میں ایک دوسرے سے کہتے کہ اس سے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ ہوا ہے؟

(۳) اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جو بھی سورت اترتی ہے اس سے اہل ایمان کے ایمان میں ضرور اضافہ ہوتا ہے اور وہ اپنے ایمان کے اضافے پر خوش ہوتے ہیں۔ یہ آیت بھی اس بات پر دلیل ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے جس طرح کہ محدثین کا مسلک ہے۔

(۴) روگ سے مراد مذاق اور آیات الہی کے بارے میں شکوک و شبہات ہیں۔ فرمایا: البتہ یہ سورت منافقین کو ان کے مذاق اور خبث میں اور بڑھاتی ہے اور وہ اپنے کفر و مذاق میں اس طرح پختہ تر ہو جاتے ہیں کہ انہیں توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوتی اور کفر پر ہی ان کا خاتمہ ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا کہ ”ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں جو مومنین کے لیے شفا اور رحمت ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان سے ظالموں کے خسارے میں اضافہ ہی فرماتا ہے“ (بنی اسرائیل-۸۲) یہ گویا ان کی بد بختی کی انتہا ہے کہ جس سے لوگوں کے دل ہدایت پاتے ہیں۔ وہی باتیں ان کی ضلالت و ہلاکت کا باعث ثابت ہوتی ہیں جس طرح کسی شخص کا مزاج اور معدہ بگڑ جائے، تو وہی غذا نہیں، جس سے لوگ قوت اور لذت حاصل کرتے ہیں، اس کی بیماری میں مزید بگاڑ اور خرابی کا باعث بنتی ہیں۔

اور کیا ان کو نہیں دکھائی دیتا کہ یہ لوگ ہر سال ایک بار یا دو بار کسی نہ کسی آفت میں پھنستے رہتے ہیں^(۱) پھر بھی نہ توبہ کرتے اور نہ نصیحت قبول کرتے ہیں۔ (۱۲۶)

اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو ایک دو سرے کو دیکھنے لگتے ہیں کہ تم کو کوئی دیکھتا تو نہیں پھر چل دیتے ہیں^(۲) اللہ تعالیٰ نے ان کا دل پھیر دیا ہے اس وجہ سے کہ وہ بے سمجھ لوگ ہیں۔^(۳) (۱۲۷)

تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں^(۴) جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے^(۵) جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں^(۶) ایمان والوں کے ساتھ بڑے ہی

أَوَلَا يَسْرُدُونَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَكَّرُونَ ﴿۱۲۶﴾

وَأَلَمْ آتَيْنَاكَ سُورَةً تَنْظُرُ بِعَعْضِهِمْ إِلَىٰ بَعْضِهِمْ يُرَىٰ لَهُمْ مِنْ أَحَدِهِمْ ثُمَّ انصَرَفُوا صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ ۖ وَإِنِّي لَأَعْلَمُ قَوْمًا لَا يَفْقَهُونَ ﴿۱۲۷﴾

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿۱۲۸﴾

(۱) يُفْتَنُونَ کے معنی ہیں۔ آزمائے جاتے ہیں۔ آفت سے مراد یا تو آسمانی آفات ہیں مثلاً قحط سالی وغیرہ (مگر یہ بعید ہے) یا جسمانی بیماریاں اور تکلیف ہیں یا غزوات ہیں جن میں شرکت کے موقع پر ان کی آزمائش ہوتی تھی۔ سیاق کلام کے اعتبار سے یہ مفہوم زیادہ صحیح ہے۔

(۲) یعنی ان کی موجودگی میں سورت نازل ہوتی جس میں منافقین کی شرارتوں اور سازشوں کی طرف اشارہ ہوتا تو پھر یہ دیکھ کر کہ مسلمان انہیں دیکھ تو نہیں رہے، خاموشی سے کھسک جاتے۔

(۳) یعنی آیات الہی میں غور و تدبر نہ کرنے کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں کو خیر اور ہدایت سے پھیر دیا ہے۔

(۴) سورت کے آخر میں مسلمانوں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں جو احسان عظیم فرمایا گیا، اس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ آپ ﷺ کی پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ تمہاری جنس سے یعنی جنس بشریت سے ہیں (وہ نور یا کچھ اور نہیں) جیسا کہ فساد عقیدہ کے شکار لوگ عوام کو اس قسم کے گورکھ دھندے میں پھنساتے ہیں۔

(۵) عَنَّتْ ایسی چیزیں جن سے انسان کو تکلیف ہو، اس میں دنیاوی مشقتیں اور اخروی عذاب دونوں آجاتے ہیں۔ اس پیغمبر، تمہاری ہر قسم کی تکلیف و مشقت، گراں گزرتی ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”میں آسان دین خستہ دے کر بھیجا گیا ہوں“ (مسند احمد۔ جلد ۵، ص ۲۶۶، جلد ۶ ص ۲۳۳) ایک اور حدیث میں فرمایا۔ إِنَّ هَذَا الدِّينَ يُسْرُّ لَبَشْكِ يَدِينِ آسَانَ هِيَ۔ (صحیح بخاری۔ کتاب الإیمان)

(۶) تمہاری ہدایت اور تمہاری دنیوی و اخروی منفعت کے خواہش مند ہیں۔ اور تمہارا جنم میں جانا پسند نہیں فرماتے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”میں تمہیں تمہاری پشتوں سے پکڑ پکڑ کر کھینچتا ہوں لیکن تم مجھ سے دامن چھڑا کر زبردستی نار جنم میں داخل ہوتے ہو۔ (صحیح بخاری کتاب الرقاق باب نمبر ۳۶) الانتهاء من المعاصی

شفیق اور مہربان ہیں۔^(۱) (۱۴۸)
 پھر اگر روگردانی کریں^(۲) تو آپ کہہ دیجئے کہ میرے
 لیے اللہ کافی ہے،^(۳) اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔
 میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور وہ بڑے عرش کا
 مالک ہے۔^(۴) (۱۴۹)

سورہ یونس کی ہے اور اس کی ایک سو نو آیتیں ہیں اور
 گیارہ رکوع ہیں۔

سُورَةُ يُونُسَ

شروع کرتا ہوں میں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو نہایت
 مہربان بزرگم والا ہے۔

الر۔ یہ پر حکمت کتاب کی آیتیں ہیں۔^(۱)
 کیا ان لوگوں کو اس بات سے تعجب^(۲) ہوا کہ ہم نے ان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

الرَّسْمِ الَّذِیْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْحَکِیْمِ ۝
 اَکَانَ لِلنَّاسِ حُجُبًا اَوْ حِیْمًا اِلٰی رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرَ النَّاسَ

(۱)۔ یہ آپ کی چوتھی صفت بیان کی گئی ہے۔ یہ ساری خوبیاں آپ کے اعلیٰ اخلاق اور کریمانہ صفات کی مظہر ہیں۔ یقیناً
 آپ ﷺ صاحب خلق عظیم ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔
 (۲) یعنی آپ کی لائی ہوئی شریعت اور دین رحمت سے۔
 (۳) جو کفر و اعراض کرنے والوں کے مکروہ کید سے مجھے بچالے گا۔

(۴) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ آیت حَسْبِيَ اللّٰهُ (الآیة) صبح اور شام سات سات مرتبہ پڑھ لے
 گا اللہ تعالیٰ اس کے مہوم (فکر و مشکلات) کو کافی ہو جائے گا۔ (سنن ابی داؤد۔ نمبر ۵۰۸۱)
 ☆ یہ سورت کی ہے۔ البتہ اس کی دو آیات اور بعض نے تین آیات کو مدنی قرار دیا ہے۔ (فتح القدیر)

(۵) الْحَکِیْمِ، کتاب یعنی قرآن مجید کی صفت ہے۔ اس کے ایک تو وہی معنی ہیں جو ترجمے میں اختیار کیے گئے ہیں۔ اس
 کے اور بھی کئی معنی کئے گئے ہیں۔ مثلاً اَلْمُحْكَمِ، یعنی حلال و حرام اور حدود و احکام میں محکم (مضبوط) ہے۔ حکیم بمعنی
 حاکم۔ یعنی اختلافات میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے والی کتاب (البقرہ۔ ۲۳۳) حکیم بمعنی محکوم فیہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے
 اس میں عدل و انصاف کے ساتھ فیصلے کیے ہیں۔

(۶) استغمام انکار تعجب کے لیے ہے، جس میں توبخ کا پہلو بھی شامل ہے۔ یعنی اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ
 تعالیٰ نے انسانوں میں سے ہی ایک آدمی کو وحی و رسالت کے لیے چن لیا، کیونکہ ان کے ہم جنس ہونے کی وجہ سے وہ
 صحیح معنوں میں ان کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ اگر وہ کسی اور جنس سے ہوتا تو فرشتہ یا جن ہوتا، اور دونوں ہی صورتوں میں

میں سے ایک شخص کے پاس وحی بھیج دی کہ سب آدمیوں کو ڈرائیے اور جو ایمان لے آئے ان کو یہ خوشخبری سنائیے کہ ان کے رب کے پاس ان کو پورا اجر و مرتبہ^(۱) ملے گا۔ کافروں نے کہا کہ یہ شخص تو بلاشبہ صریح جاادوگر ہے۔^(۲)

بلاشبہ تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کر دیا پھر عرش پر قائم ہوا^(۳) وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔^(۴) اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس کے پاس سفارش کرنے والا نہیں^(۵) ایسا اللہ تمہارا رب ہے سو تم اس کی عبادت کرو،^(۶) کیا تم پھر بھی نصیحت نہیں پکڑتے۔^(۷)

وَيَعْتَذِرُونَ أَنْ يَدْعُوا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ إِلَهًا إِلَّا اللَّهُ وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ لِيُكْفَرُوا بِهِمْ وَقَدِ افْتَرَيْنَاهُمْ دِينًا وَأَنَّهُمْ سَالِمُونَ ﴿۱۰﴾

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُدِيرُ الْأُمُورَ مَا مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَ بَعْدِ إِذْنِهِ ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ أَقَلَّتْ كُرْبُونَ ﴿۱۰﴾

رسالت کا اصل مقصد فوت ہو جاتا، اس لیے کہ انسان اس سے مانوس ہونے کے بجائے وحشت محسوس کرتے۔ دوسرے، ان کے لیے اس کو دیکھنا بھی ممکن نہ ہوتا۔ اور اگر ہم کسی جن یا فرشتے کو انسانی قالب میں بھیجتے تو پھر وہی اعتراض آتا کہ یہ تو ہماری طرح کا ہی انسان ہے۔ اس لیے ان کے اس تعجب میں کوئی معقولیت نہیں ہے۔

(۱) ﴿قَدَّمَ صِدْقٍ﴾ کا مطلب بلند مرتبہ، اجر حسن اور وہ اعمال صالحہ ہیں جو ایک مومن آگے بھیجتا ہے۔

(۲) کافروں کو جب انکار کے لیے کوئی اور بات نہیں سو جھتی تو یہ کہہ کر چھٹکارا حاصل کر لیتے کہ یہ تو جاادوگر ہے۔ نعوذ باللہ۔

(۳) اس کی وضاحت کے لیے دیکھئے سورۃ اعراف آیت ۵۴ کا حاشیہ۔

(۴) یعنی آسمان و زمین کی تخلیق کر کے اس نے ان کو یوں ہی نہیں چھوڑ دیا، بلکہ ساری کائنات کا نظم و تدبیر وہ اس طرح کر رہا ہے کہ کبھی کسی کا آپس میں تصادم نہیں ہوا، ہر چیز اس کے حکم پر اپنے اپنے کام میں مصروف ہے۔

(۵) مشرکین و کفار، جو اصل مخاطب تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ یہ بت، جن کی وہ عبادت کرتے تھے، اللہ کے ہاں ان کی شفاعت کریں گے اور ان کو اللہ کے عذاب سے چھڑوائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، وہاں اللہ کی اجازت کے بغیر کسی کو سفارش کرنے کی اجازت ہی نہیں ہوگی۔ اور یہ اجازت بھی صرف انہی لوگوں کے لیے ہوگی جن کے لیے اللہ تعالیٰ پسند فرمائے گا۔ ﴿وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ﴾ ﴿الأنبياء- ۲۸﴾ ﴿لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ لَمَّا خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُدِيرُ الْأُمُورَ مَا مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَ بَعْدِ إِذْنِهِ ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ أَقَلَّتْ كُرْبُونَ﴾ ﴿النجم- ۲۶﴾

(۶) یعنی ایسا اللہ، جو کائنات کا خالق بھی ہے اور اس کا مدبر و منتظم بھی علاوہ ازیں تمام اختیارات کا بھی کلی طور پر وہی مالک ہے، وہی اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

تم سب کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے، اللہ نے سچا وعدہ کر رکھا ہے۔ بیشک وہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ بھی پیدا کرے گا تاکہ ایسے لوگوں کو جو کہ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے انصاف کے ساتھ جزا دے اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے واسطے کھولتا ہوا پانی پینے کو ملے گا اور دردناک عذاب ہو گا ان کے کفر کی وجہ سے۔ (۳)

وہ اللہ تعالیٰ ایسا ہے جس نے آفتاب کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو نورانی بنایا (۲) اور اس کے لیے منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو۔ (۳) اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں بے فائدہ نہیں پیدا کیں۔ وہ یہ دلائل ان کو صاف صاف بتلا رہا ہے جو دانش رکھتے ہیں۔ (۵)

إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا وَعَدَّ اللَّهُ حَقًّا أَنَّهُ يَبْدُؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُمْ لِيُعْزِمَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ
وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ سَعِيرٌ مِّنْ حَرِيمٍ وَعَذَابٌ إِلَيْهِمْ يُعَذَّبُونَ ۝

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَرَهُ مَنَازِلَ
لِيَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ
يُقَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝

(۱) اس آیت میں قیامت کے وقوع، بارگاہ الہی میں سب کی حاضری، اور جزا و سزا کا بیان ہے۔ یہ مضمون قرآن کریم میں مختلف اسلوب سے متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے۔

(۲) ضِيَاءٌ ضَوْءٌ کے ہم معنی ہے۔ مضاف یہاں محذوف ہے ذَاتِ ضِيَاءٍ وَالْقَمَرَ ذَا نُورٍ سورج کو چمکنے والا اور چاند کو نور والا بنایا۔ یا پھر انہیں مبالغے پر محمول کیا جائے گا کیونکہ یہ بذات خود ضیا اور نور ہیں۔ آسمان و زمین کی تخلیق اور ان کی تدبیر کے ذکر کے بعد بطور مثال کچھ اور چیزوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن کا تعلق تدبیر کائنات سے ہے، جس میں سورج اور چاند کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ سورج کی حرارت و تپش اور اس کی روشنی، کس قدر ناگزیر ہے اس سے ہر باشعور آدمی واقف ہے۔ اسی طرح چاند کی نورانیت کا جو لطف اور اس کے فوائد ہیں، وہ بھی محتاج بیان نہیں۔ حکما کا خیال ہے کہ سورج کی روشنی بالذات ہے اور چاند کی نورانیت بالعرض ہے جو سورج کی روشنی سے مستفاد ہے۔ (فتح القدر) واللہ اعلم بالصواب۔

(۳) یعنی ہم نے چاند کی چال کی منزلیں مقرر کر دی ہیں ان منزلوں سے مراد وہ مسافت ہے جو وہ ایک رات اور ایک دن میں اپنی مخصوص حرکت یا چال کے ساتھ طے کرتا ہے۔ یہ ۲۸ منزلیں ہیں۔ ہر رات کو ایک منزل پر پہنچتا ہے جس میں کبھی خطا نہیں ہوتی۔ پہلی منزلوں میں وہ چھوٹا اور باریک نظر آتا ہے، پھر بتدریج بڑا ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ چودھویں شب یا چودھویں منزل پر وہ مکمل (بدر کابل) ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر وہ سکڑنا اور باریک ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ آخر میں ایک یا دو راتیں چھپا رہتا ہے۔ اور پھر ہلال بن کر طلوع ہو جاتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ تم برسوں کی گنتی

بلاشبہ رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان سب میں ان لوگوں کے واسطے دلائل ہیں جو اللہ کا ڈر رکھتے ہیں۔ (۶)

جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا یقین نہیں ہے اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں اور جو لوگ ہماری آیتوں سے غافل ہیں۔ (۷)

ایسے لوگوں کا ٹھکانا ان کے اعمال کی وجہ سے دوزخ ہے۔ (۸)

یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے ان کا رب ان کو ان کے ایمان کے سبب ان کے مقصد تک پہنچا دے گا^(۱) نعمت کے بانگوں میں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ (۹)

ان کے منہ سے یہ بات نکلے گی ”سبحان اللہ“^(۲) اور ان کا

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ آيَاتِ الْبَارِ وَالْبَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ آيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ①

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنَّنُوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آلِهَتِنَا غٰفِلُونَ ②

أُولَٰئِكَ مَا لَهُمْ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ③

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِي اللَّهُ رَبُّهُم بِإِيمَانِهِمْ فَرِحُوا مِنْ غَمِّهِمْ الْأَكْبَرِ فِي حَبْتِ النَّجْوِيِّ ④

دَعُوهُمْ فِيهَا سَبْحَنَكَ اللَّهُمَّ وَتَحَيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ وَالْآخِرُ

اور حساب معلوم کر سکو۔ یعنی چاند کی ان منازل اور رفتار سے ہی مینے اور سال بنتے ہیں جن سے تمہیں ہر چیز کا حساب کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ یعنی سال ۱۲ مینے کا، مینہ ۲۹، ۳۰ دن کا۔ ایک دن ۲۴ گھنٹے یعنی رات اور دن کا۔ جو ایام استوا میں ۱۲، ۱۳ گھنٹے اور سردی گرمی میں کم و بیش ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں دنیوی منافع اور کاروبار ہی ان منازل قمر سے وابستہ نہیں۔ دینی منافع بھی اس سے حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طلوع ہلال سے حج، صیام، رمضان، اشہر حرم اور دیگر عبادات کی تعیین ہوتی ہے جن کا اہتمام ایک مومن کرتا ہے۔

(۱) اس کے ایک دوسرے معنی یہ کئے گئے ہیں کہ دنیا میں ایمان کے سبب، قیامت والے دن اللہ تعالیٰ ان کے لیے پل صراط سے گزرنا آسان فرمادے گا، اس صورت میں یہ ”با“ سمیت کے لیے ہے۔ بعض کے نزدیک یہ استغاثت کے لیے ہے اور معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن ان کے لیے ایک نور مہیا فرمائے گا جس کی روشنی میں وہ چلیں گے، جیسا کہ سورہ حدید میں اس کا ذکر آتا ہے۔

(۲) یعنی اہل جنت، اللہ کی حمد و تسبیح میں ہر وقت رطب اللسان رہیں گے۔ جس طرح حدیث میں آتا ہے کہ ”اہل جنت کی زبانوں پر تسبیح و تحمید کا اس طرح الہام ہو گا جس طرح سانس کا الہام کیا جاتا ہے“ (صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعيمها، باب فی صفات الجنة وأهلها وتسيحهم فيها بكرة وعشيا) یعنی جس طرح بے اختیار سانس کی آمد و رفت رہتی ہے، اسی طرح اہل جنت کی زبانوں پر بغیر اہتمام کے حمد و تسبیح الہی کے ترانے رہیں گے۔

دَعْوَاهُمْ اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۰﴾

باہمی سلام یہ ہوگا ”السلام علیکم“^(۱) اور ان کی خیر بات یہ ہوگی تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سارے جہان کا رب ہے۔ (۱۰)

اور اگر اللہ لوگوں پر جلدی سے نقصان واقع کر دیا کرتا جس طرح وہ فائدہ کے لیے جلدی بچاتے ہیں تو ان کا وعدہ کبھی کا پورا ہو چکا ہوتا۔^(۲) سو ہم ان لوگوں کو جن کو ہمارے پاس آنے کا یقین نہیں ہے ان کے حال پر چھوڑے رکھتے ہیں کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔ (۱۱)

اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارتا ہے لیٹے بھی، بیٹھے بھی، کھڑے بھی۔ پھر جب ہم اس کی تکلیف اس سے ہٹا دیتے ہیں تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے اپنی تکلیف کے لیے جو اسے پہنچی تھی کبھی ہمیں

وَلَوْ يُعِزُّ لِلّٰهِ لَمَّا لَسْنَا لَمَّا سَتَرْنَا لِعِبَادِهِمُ الْغَيْبَ لَقَضَىٰ
لَهُمْ اَجَلَهُمْ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي
طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۱۱﴾

وَاِذْ اَمَسَ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَا لِحَبِئهِ اُوْقَاعًا اَوْ قَابًا مَّا
فَلَمَّا كَفَّتْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَا اِلٰى ضُرِّ
مَسَّهُ كَذٰلِكَ دُرِّينَ لِّلْمُنٰثِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱﴾

(۱) یعنی ایک دوسرے کو اس طرح سلام کریں گے، نیز فرشتے بھی انہیں سلام عرض کریں گے۔

(۲) اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جس طرح انسان خیر کے طلب کرنے میں جلدی کرتا ہے، اسی طرح وہ شر (عذاب) کے طلب کرنے میں بھی جلدی بچاتا ہے، اللہ کے پیغمبروں سے کہتا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لے کر آؤ جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ان کے اس مطالبے کے مطابق ہم جلدی عذاب بھیج دیتے تو کبھی کے یہ موت اور ہلاکت سے دوچار ہو چکے ہوتے۔ لیکن ہم مہلت دے کر انہیں پورا موقع دیتے ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ جس طرح انسان اپنے لیے خیر اور بھلائی کی دعائیں مانگتا ہے جنہیں ہم قبول کرتے ہیں۔ اسی طرح جب انسان غصے یا تنگی میں ہوتا ہے تو اپنے لیے اور اپنی اولاد وغیرہ کے لیے بددعائیں کرتا ہے، جنہیں ہم اس لیے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ زبان سے تو ہلاکت مانگ رہا ہے، مگر اس کے دل میں ایسا ارادہ نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم انسانوں کی بددعاؤں کے مطابق انہیں فوراً ہلاکت سے دوچار کرنا شروع کر دیں، تو پھر جلد ہی یہ لوگ موت اور تباہی سے ہمکنار ہو جایا کریں اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ ”تم اپنے لیے، اپنی اولاد کے لیے اور اپنے مال و کاروبار کے لیے بددعائیں مت کیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری بددعائیں، اس گھڑی کو پالیں، جس میں اللہ کی طرف سے دعائیں قبول کی جاتی ہیں، پس وہ تمہاری بددعائیں قبول فرما لے۔“ (سنن ابی داؤد، کتاب الوتر، باب النہی عن ان یدعو الانسان علی اہلہ و مالہ۔

پکارا ہی نہ تھا،^(۱) ان حد سے گزرنے والوں کے اعمال کو ان کے لیے اسی طرح خوشنما بنا دیا گیا ہے۔^(۲) (۱۳)

اور ہم نے تم سے پہلے بہت سے گروہوں کو ہلاک کر دیا جب کہ انہوں نے ظلم کیا حالانکہ ان کے پاس ان کے پیغمبر بھی دلائل لے کر آئے، اور وہ ایسے کب تھے کہ ایمان لے آتے؟ ہم مجرم لوگوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔^(۳) (۱۳)

پھر ان کے بعد ہم نے دنیا میں بجائے ان کے تم کو جانشین کیا^(۴) تاکہ ہم دیکھ لیں کہ تم کس طرح کام کرتے ہو۔ (۱۳)

اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں^(۵) جو بالکل صاف صاف ہیں تو یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کی امید نہیں ہے یوں کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی

وَلَعَلَّ أَهْلَكُمُ الْفُرُونَ مِنْ بَعْلِكُمْ لَمَا تَلَظُّوا أَوجَاهَهُمْ
رُسُلَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كُنْتُمْ لِتُؤْمِنُوا بِكَذَلِكَ يُجْزَى
الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿۱۳﴾

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ
تَعْمَلُونَ ﴿۱۳﴾

وَلَدَأْتَلِيهِمْ عَلَيْهِمْ إِيَّاكُمْ تَأْتِيهِمْ قَالِ الَّذِينَ كَذَّبُوا
لِقَاءَ آيَاتِنَا لِيُؤْمِنُوا بِهَا أَوْ يَرْجُوا لِقَاءَ آيَاتِنَا لِيُؤْمِنُوا بِهَا
أَوْ يَرْجُوا لِقَاءَ آيَاتِنَا لِيُؤْمِنُوا بِهَا أَوْ يَرْجُوا لِقَاءَ آيَاتِنَا لِيُؤْمِنُوا بِهَا

(۱) یہ انسان کی اس حالت کا تذکرہ ہے جو انسانوں کی اکثریت کا شیوہ ہے۔ بلکہ بہت سے اللہ کے ماننے والے بھی اس کو تاہی کا عام ارتکاب کرتے ہیں کہ مصیبت کے وقت تو خوب اللہ اللہ ہو رہا ہے، دعائیں کی جا رہی ہیں، توبہ و استغفار کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ مصیبت کا وہ کڑا وقت نکال دیتا ہے تو پھر بارگاہ الہی میں دعا و تضرع سے بھی غافل ہو جاتے ہیں اور اللہ نے ان کی دعائیں قبول کر کے انہیں جس ابتلا اور مصیبت سے نجات دی، اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کی بھی توفیق انہیں نصیب نہیں ہوتی۔

(۲) یہ تزئین عمل، بطور آزمائش اور مملت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے، وسوسوں کے ذریعے سے شیطان کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے اور انسان کے اس نفس کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے جو انسان کو برائی پر آمادہ کرتا ہے۔ ﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَكْرَاهًا يَلْسُمُ﴾ (یوسف۔ ۵۳) تاہم اس کا شکار ہوتے وہی لوگ ہیں جو حد سے گزر جانے والے ہیں۔ یہاں معنی یہ ہوئے کہ ان کے لیے دعا سے اعراض، شکر الہی سے غفلت اور شہوات و خواہشات کے ساتھ اشتغال کو مزین کر دیا گیا ہے۔ (فتح القدیر)

(۳) یہ کفار مکہ کو تنبیہ ہے کہ گزشتہ امتوں کی طرح تم بھی ہلاکت سے دوچار ہو سکتے ہو۔

(۴) خلافت، خلیفہ کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں، گزشتہ امتوں کا جانشین۔ یا ایک دوسرے کا جانشین۔

(۵) یعنی جو اللہ تعالیٰ کی الوہیت و وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں۔

دوسرا قرآن لائے^(۱) یا اس میں کچھ ترمیم کر دیجئے۔ آپ (ﷺ) یوں کہہ دیجئے کہ مجھے یہ حق نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کر دوں^(۲) بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو میرے پاس وحی کے ذریعہ سے پہنچا ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔^(۳) (۱۵)

آپ یوں کہہ دیجئے کہ اگر اللہ کو منظور ہو تا تو نہ تو میں تم کو وہ پڑھ کر سنا تا اور نہ اللہ تعالیٰ تم کو اس کی اطلاع دیتا^(۴) کیونکہ میں اس سے پہلے تو ایک بڑے حصہ عمر تک تم میں رہ چکا ہوں۔ پھر کیا تم عقل نہیں رکھتے۔^(۵) (۱۶)

سو اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیتوں کو جھوٹا بتلائے، یقیناً ایسے مجرموں کو اصلاً فلاح نہ ہوگی۔ (۱۷)

اور یہ لوگ اللہ کے سوا^(۶) ایسی چیزوں کی عبادت

إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ①

قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُمْهُ عَلَيْكُمْ وَلَا آذَنُكُمْ بِهِ مُفِئِدًا
لَيْسَتْ فِيهِ لَكُمْ خُمُورٌ مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ②

قَمَنَّ أَظْلَمُ مِمَّنْ أَفْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ
إِنَّهُ لَا يُعَلِّمُ الْمُجْرِمُونَ ③

وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَيْسَ لَهُمْ وَلَا لِيُفَعَّلَهُمْ

(۱) مطلب یہ ہے کہ یا تو اس قرآن مجید کی جگہ قرآن ہی دوسرا لائیں یا پھر اس میں ہماری حسب خواہش تبدیلی کر دیں۔

(۲) یعنی مجھ سے دونوں باتیں ممکن نہیں میرے اختیار میں ہی نہیں۔

(۳) یہ اس کی مزید تاکید ہے۔ میں تو صرف اسی بات کا پیرو ہوں جو اللہ کی طرف سے مجھ پر نازل ہوتی ہے۔ اس میں کسی کی بیشی کا میں ارتکاب کروں گا تو یوم عظیم کے عذاب سے میں محفوظ نہیں رہ سکتا۔

(۴) یعنی سارا معاملہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے، وہ چاہتا تو میں نہ تمہیں پڑھ کر سنا تا نہ تمہیں اس کی کوئی اطلاع ہی ہوتی۔ بعض نے آذَنُكُمْ بِہِ کے معنی کیے ہیں أَعَلَّمَكُم بِہِ عَلَيَّ لِسَانِي، کہ وہ تم کو میری زبانی اس قرآن کی بابت کچھ نہ بتلاتا۔

(۵) اور تم بھی جانتے ہو کہ دعوائے نبوت سے قبل چالیس سال میں نے تمہارے اندر گزارے ہیں۔ کیا میں نے کسی استاذ سے کچھ سیکھا ہے؟ اسی طرح تم میری امانت و صداقت کے بھی قائل رہے ہو۔ کیا اب یہ ممکن ہے کہ میں اللہ پر افترا باندھنا شروع کر دوں؟ مطلب ان دونوں باتوں کا یہ ہے کہ یہ قرآن اللہ ہی کا نازل کردہ ہے نہ میں نے کسی سے سن یا سیکھ کر اسے بیان کیا ہے اور نہ یوں ہی جھوٹ موٹ اسے اللہ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

(۶) یعنی اللہ کی عبادت سے تجاوز کر کے نہ کہ بالکلیہ اللہ کی عبادت ترک کر کے۔ کیونکہ مشرکین اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ اور غیر اللہ کی بھی۔

کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچا سکیں اور نہ ان کو نفع پہنچا سکیں^(۱) اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔^(۲) آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ کو معلوم نہیں، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں،^(۳) وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے۔^(۴) (۱۸)

اور تمام لوگ ایک ہی امت کے تھے پھر انہوں نے اختلاف پیدا کر لیا^(۵) اور اگر ایک بات نہ ہوتی جو آپ کے رب کی طرف سے پہلے ٹھہر چکی ہے تو جس چیز میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہوتا۔^(۶) (۱۹)

اور یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ ان پر ان کے رب کی جانب

وَيَقُولُونَ هَؤُلَاءِ شُعَاعٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ فَلْيُرْسِلْ مِن لَّدُنْهُ
اللَّهُ بِمَا لَا يَعْلَمُونَ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ
سُبْحٰنَهُ وَتَعَلَّىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۱۸﴾

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا وَلَوْلَا
كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَفَقَضَىٰ بَيْنَهُمْ فِصْلًا لِّئِي
يَعْتَلِفُونَ ﴿۱۹﴾

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ

(۱) جب کہ معبود کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے اطاعت گزاروں کو بدلہ اور اپنے نافرمانوں کو سزا دینے پر قادر ہو۔
(۲) یعنی ان کی سفارش سے اللہ ہماری ضرورتیں پوری کر دیتا ہے۔ ہماری بگڑی بنا دیتا ہے یا ہمارے دشمن کی بنی ہوئی بگاڑ دیتا ہے۔ یعنی مشرکین بھی اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے تھے ان کو نفع ضرر میں مستقل نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنے اور اللہ کے درمیان واسطہ اور وسیلہ سمجھتے تھے۔

(۳) یعنی اللہ کو تو اس بات کا علم نہیں کہ اس کا کوئی شریک بھی ہے یا اس کی بارگاہ میں سفارشی بھی ہوں گے؟ گویا یہ مشرکین اللہ کو خبر دیتے ہیں کہ تجھے گو خبر نہیں۔ لیکن ہم تجھے بتلاتے ہیں کہ تیرے شریک بھی ہیں اور سفارشی بھی ہیں جو اپنے عقیدت مندوں کی سفارش کریں گے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مشرکین کی یہ باتیں بے اصل ہیں، اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں سے پاک اور برتر ہے۔

(۵) یعنی یہ شرک، لوگوں کی اپنی ایجاد ہے۔ ورنہ پہلے پہل اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ تمام لوگ ایک ہی دین اور ایک ہی طریقے پر تھے اور وہ اسلام ہے جس میں توحید کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام تک لوگ اسی توحید پر قائم رہے۔ پھر ان میں اختلاف ہو گیا اور کچھ لوگوں نے اللہ کے ساتھ، دوسروں کو بھی معبود، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنا شروع کر دیا۔

(۶) یعنی اگر اللہ کا یہ فیصلہ نہ ہوتا کہ اتمام حجت سے پہلے کسی کو عذاب نہیں دینا ہے، اسی طرح اس نے مخلوق کے لیے ایک وقت موعود کا تعین نہ کیا ہوتا تو یقیناً وہ ان کے مابین اختلافات کا فیصلہ اور مومنوں کو سعادت مند اور کافروں کو عذاب و مشقت میں مبتلا کر چکا ہوتا۔

سے کوئی نشانی کیوں نہیں نازل ہوتی؟^(۱) سو آپ فرما دیجئے کہ غیب کی خبر صرف اللہ کو ہے^(۲) سو تم بھی منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔ (۲۰)

اور جب ہم لوگوں کو اس امر کے بعد کہ ان پر کوئی مصیبت پڑ چکی ہو کسی نعمت کا مزہ چکھا دیتے ہیں^(۳) تو وہ فوراً ہی ہماری آیتوں کے بارے میں چالیں چلنے لگتے ہیں،^(۴) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ چال چلنے میں تم سے زیادہ تیز ہے،^(۵) بالیقین ہمارے فرشتے تمہاری سب چالوں کو لکھ رہے ہیں۔ (۲۱)

وہ اللہ ایسا ہے کہ تم کو خشکی اور دریا میں چلاتا ہے،^(۶) یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور وہ

فَعَلَّ إِسْمًا الْعَيْبُ لِلَّهِ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾

وَإِذَا دَفَعْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِنَّا بَعْدَ ظَرْمِهِمْ إِذْ أَنهَم فِي كُرْهُ فِي آيَاتِنَا أَقْبَلِ اللَّهُ أَسْرُهُمْ نُؤْمِنُ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ﴿٢١﴾

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا أَنتَم فِي الْفُلِ وَأَنتُمْ جَرِيرُونَ بَوْمًا بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ عَاصِفٌ

(۱) اس سے مراد کوئی بڑا اور واضح معجزہ ہے، جیسے قوم ثمود کے لیے اونٹنی کا ظہور ہوا۔ ان کے لیے صفا پہاڑی کو سونے کا یا کھانے کے پہاڑوں کو ختم کر کے ان کی جگہ نرس اور باغات بنانے کا یا اور اس قسم کا کوئی معجزہ صادر کر کے دکھلایا جائے۔

(۲) یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کی خواہشات کے مطابق وہ معجزے تو ظاہر کر کے دکھلا سکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی اگر وہ ایمان نہ لائے تو پھر اللہ کا قانون یہ ہے کہ ایسی قوم کو فوراً وہ ہلاک کر دیتا ہے۔ اس لیے اس بات کا علم صرف اسی کو ہے کہ کسی قوم کے لیے اس کی خواہشات کے مطابق معجزے ظاہر کر دینا، اس کے حق میں بہتر ہے یا نہیں؟ اور اسی طرح اس بات کا علم بھی صرف اسی کو ہے کہ ان کے مطلوبہ معجزے اگر ان کو نہ دکھائے گئے تو انہیں کتنی مصلحت دی جائے گی؟ اسی لیے آگے فرمایا، ”تم بھی انتظار کرو“ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔“

(۳) مصیبت کے بعد نعمت کا مطلب ہے، تنگی، قحط سالی اور آلام و مصائب کے بعد، رزق کی فراوانی، اسباب معیشت کی ارزانی وغیرہ۔

(۴) اس کا مطلب ہے کہ وہ ہماری ان نعمتوں کی قدر اور ان پر اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے بلکہ کفر و شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یعنی یہ ان کی وہ بری تدبیر ہے جو وہ اللہ کی نعمتوں کے مقابلے میں اختیار کرتے ہیں۔

(۵) یعنی اللہ کی تدبیر ان سے کہیں زیادہ تیز ہے جو وہ اختیار کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ ان کا مؤاخذہ کرنے پر قادر ہے، وہ جب چاہے ان کی گرفت کر سکتا ہے، فوراً بھی اور اگر اس کی حکمت تاخیر کی مقتضی ہو تو بعد میں بھی۔ مگر عربی زبان میں خفیہ تدبیر اور حکمت عملی کو کہتے ہیں، جو اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بری بھی۔ یہاں اللہ کی عقوبت اور گرفت کو مکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۶) يُسَيِّرُكُمْ، وہ تمہیں چلاتا یا چلنے پھرنے اور سیر کرنے کی توفیق دیتا ہے۔ ”خشکی میں“۔ یعنی اس نے تمہیں قدم عطا

کشتیاں لوگوں کو موافق ہوا کے ذریعہ سے لے کر چلتی ہیں اور وہ لوگ ان سے خوش ہوتے ہیں ان پر ایک جھوٹا سخت ہوا کا آتا ہے اور ہر طرف سے ان پر موجیں اٹھتی چلی آتی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ (برے) آگھرے،^(۱) (اس وقت) سب خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارتے ہیں^(۲) کہ اگر تو ہم کو اس سے بچالے تو ہم ضرور شکر گزار بن جائیں گے۔ (۲۲)

وَصَادَ لَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَكِنِ أَتَيْنَاهُمُنَا مِنْ هَذِهِ لَنُلَوِّنَنَّهُمْ مِنَ الشَّيْكِينَ ﴿٢٢﴾

کیے جن سے تم چلتے ہو، سواریاں میاکیں، جن پر سوار ہو کر دور دراز کے سفر کرتے ہو۔ ”اور سمندر میں“ یعنی اللہ نے تمہیں کشتیاں اور جہاز بنانے کی عقل اور سمجھ دی، تم نے وہ بنائیں اور ان کے ذریعے سے سمندروں کا سفر کرتے ہو۔
(۱) أُحِيطَ بِهِمْ کا مطلب ہے، جس طرح دشمن کسی قوم یا شہر کا احاطہ یعنی محاصرہ کر لیتا ہے اور پھر وہ دشمن کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں، اسی طرح وہ جب سخت ہواؤں کے تھینوں اور تلاطم خیز موجوں میں گھر جاتے ہیں اور موت ان کو سامنے نظر آتی ہے۔

(۲) یعنی پھر وہ دعائیں غیر اللہ کی ملاوٹ نہیں کرتے جس طرح عام حالات میں کرتے ہیں۔ عام حالات میں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ بزرگ بھی اللہ کے بندے ہیں، انہیں بھی اللہ نے اختیارات سے نواز رکھا ہے اور انہی کے ذریعے سے ہم اللہ کا قرب تلاش کرتے ہیں۔ لیکن جب اس طرح شدائد میں گھر جاتے ہیں تو یہ سارے شیطان فلفسے بھول جاتے ہیں اور صرف اللہ یاد رہ جاتا ہے اور پھر صرف اسی کو پکارتے ہیں۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ انسان کی فطرت میں اللہ واحد کی طرف رجوع کا جذبہ ودیعت کیا گیا ہے۔ انسان ماحول سے متاثر ہو کر اس جذبے یا فطرت کو دبا دیتا ہے لیکن مصیبت میں یہ جذبہ ابھر آتا ہے اور یہ فطرت عود کر آتی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ توحید، فطرت انسانی کی آواز اور اصل چیز ہے، جس سے انسان کو انحراف نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس سے انحراف فطرت سے انحراف ہے جو سراسر گمراہی ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مشرکین، جب اس طرح مصائب میں گھر جاتے تو وہ اپنے خود ساختہ معبودوں کے بجائے، صرف ایک اللہ کو پکارتے تھے چنانچہ حضرت عکرمہ بن ابی جہلؓ کے بارے میں آتا ہے کہ جب مکہ فتح ہو گیا تو یہ وہاں سے فرار ہو گئے۔ باہر کسی جگہ جانے کے لیے کشتی میں سوار ہوئے، تو کشتی طوفانی ہواؤں کی زد میں آگئی، جس پر ملاح نے کشتی میں سوار لوگوں سے کہا کہ آج اللہ واحد سے دعا کرو، تمہیں اس طوفان سے اس کے سوا کوئی نجات دینے والا نہیں ہے۔ حضرت عکرمہؓ کہتے ہیں، میں نے سوچا اگر سمندر میں نجات دینے والا صرف ایک اللہ ہے تو خشکی میں بھی یقیناً نجات دینے والا وہی ہے۔ اور یہی بات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کر لیا اگر یہاں سے میں زندہ بچ کر نکل گیا تو مکہ واپس جا کر اسلام قبول کر لوں گا۔ چنانچہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔ رضی اللہ عنہ (سنن نسائی، أبوداؤد۔ نمبر ۲۶۸۳۔ و ذکرہ الألبانی فی

پھر جب اللہ تعالیٰ ان کو بچا لیتا ہے تو فوراً ہی وہ زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں^(۱) اے لوگو! یہ تمہاری سرکشی تمہارے لیے وبال ہونے والی ہے^(۲) دنیاوی زندگی کے (چند) فائدے ہیں، پھر ہمارے پاس تم کو آنا ہے پھر ہم سب تمہارا کیا ہوا تم کو بتلا دیں گے۔ (۲۳)

پس دنیاوی زندگی کی حالت تو ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کی نباتات؛ جن کو آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں، خوب گنجان ہو کر نکلی۔ یہاں تک کہ جب وہ زمین اپنی رونق کا پورا حصہ لے چکی اور اس کی خوب زیبائش ہو گئی اور اس کے مالکوں نے سمجھ لیا کہ اب ہم اس پر بالکل قابض ہو چکے تو دن میں یا رات میں اس پر ہماری طرف سے کوئی حکم (عذاب) آپڑا سو ہم نے اس کو ایسا صاف کر دیا^(۳) کہ گویا کل وہ موجود ہی نہ تھی۔ ہم اسی طرح آیات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں۔ (۲۳)

كَلِمَاتٍ أَتَجْمَعُهمْ إِذْ همْ يَبْعُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ يَأْكُلُوا النَّاسَ
إِنَّمَا بَعَيْتُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ
فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۳﴾

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَلَا تَلْكُطُ
بِهِ نَبَاتٌ الْأَرْضِ وَمِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتَّىٰ إِذَا
أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ
قَدِירוْنَ عَلَيْهِمُ بَأْتَاهُمْ أَمْرًا لَّيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا
حَصِيدًا كَانُوا لَمْ تَعْلَمْ بِآيَاتِنَا كَذَلِكَ نَقُصِّلُ
الْآيَاتِ لِلْقَوْمِ الَّتِي يَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۳﴾

”الصحيحۃ“ (نمبر ۷۲۳) لیکن افسوس! امت محمدیہ کے عوام اس طرح شرک میں پھنسے ہوئے ہیں کہ شدائد و آلام میں بھی وہ اللہ کی طرف رجوع کرنے کے بجائے، فوت شدہ بزرگوں کو ہی مشکل کشا سمجھتے اور انہی کو مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ فَإِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ آه! فَلْيُنَبِّئِكْ عَلَىٰ الْإِسْلَامِ مَنْ كَانَ بَاكِيًا.

(۱) یہ انسان کی اسی ناشکری کی عادت کا ذکر ہے جس کا تذکرہ ابھی آیت ۱۳ میں بھی گزرا، اور قرآن میں اور بھی متعدد مقامات پر اللہ نے اس کا ذکر فرمایا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے فرمایا، تم یہ ناشکری اور سرکشی کر لو، چار روزہ متاع زندگی سے فائدہ اٹھا کر بالآخر تمہیں ہمارے ہی پاس آنا ہے، پھر ہم تمہیں، جو کچھ تم کرتے رہے ہو گے، بتلائیں گے یعنی ان پر سزا دیں گے۔

(۳) حَصِيدًا فَعِيلٌ بمعنی مفعول ہے آنی: مَخْصُودًا یعنی ایسی کھیتی ہے جسے کٹ کر ایک طرف رکھ دیا گیا ہو اور کھیت صاف ہو گیا ہو۔ دنیا کی زندگی کو اس طرح کھیتی سے تشبیہ دے کر اس کے عارضی پن اور ناپائیداری کو واضح کیا گیا ہے کہ کھیتی بھی بارش کے پانی سے نشوونما پاتی اور سرسبز و شاداب ہوتی ہے لیکن اس کے بعد اسے کٹ کر فنا کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ سلامتی کے گھر کی طرف تم کو بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے راہ راست پر چلنے کی توفیق دیتا ہے۔ (۲۵)

جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کے واسطے خوبی ہے اور مزید برآں بھی ^(۱) اور ان کے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی اور نہ ذلت، یہ لوگ جنت میں رہنے والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۲۶)

اور جن لوگوں نے بد کام کیے ان کی بدی کی سزا اس کے برابر ملے گی ^(۲) اور ان کو ذلت چھائے گی، ان کو اللہ تعالیٰ سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ ^(۳) گویا ان کے چہروں پر اندھیری رات کے پرت کے پرت لپیٹ دیے گئے ہیں۔ ^(۴) یہ لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۲۷)

اور وہ دن بھی قابل ذکر ہے جس روز ہم ان سب کو جمع کریں گے ^(۵) پھر مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور

وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ
إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۲۵﴾

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْفَضْلَ وَزِيَادَةً ۖ وَلَا يَجْرُمُ وَجوهَهُمْ نَارًا وَلَا ذِلَّةً ۚ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۶﴾

وَالَّذِينَ كَفَرُوا سَيَاغَتْ جَزَائِهِمْ سَيِّئًا ۖ وَسَبِيلُهُمْ فِيهَا ذِلَّةٌ ۖ مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۖ كَأَنَّهُمْ أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطْعًا مِّنَ الْإِبْرِيمِ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۷﴾

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ
أَنْتُمْ وَمَشْرِكَاؤُكُمْ ۖ فَذَلِكُنَا ابْتِغَاءً مِّنْ رَبِّكَ لِيَكْفُرُوا بِكُم مِّمَّا كَفَرْتُمْ

(۱) اس زیادہ کے کئی مفہوم بیان کیے گئے ہیں لیکن حدیث میں اس کی تفسیر دیدار باری تعالیٰ سے کی گئی ہے جس سے اہل جنت کو جنت اور جنت کی نعمتیں دینے کے بعد، مشرف کیا جائے گا۔ (صحیح مسلم کتاب الإيمان 'باب إنبات رؤیة المؤمنین فی الآخرة لربہم)

(۲) گزشتہ آیت میں اہل جنت کا تذکرہ تھا، اس میں بتلایا گیا تھا کہ انہیں ان کے نیک عملوں کی جزا کئی کئی گنا ملے گی اور پھر مزید دیدار الہی سے نوازے جائیں گے۔ اس آیت میں بتلایا جا رہا ہے کہ برائی کا بدلہ برائی کے مثل ہی ملے گا۔ سببیتات سے مراد کفر و شرک اور دیگر معاصی ہیں۔

(۳) جس طرح کہ اہل ایمان کو بچانے والا اللہ تعالیٰ ہو گا اسی طرح انہیں اس روز اپنے فضل خاص سے نوازے گا علاوہ ازیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کو شفاعت کی اجازت بھی دے گا، جن کی شفاعت بھی وہ قبول فرمائے گا۔

(۴) یہ مبالغہ ہے کہ ان کے چہرے اتنے سخت سیاہ ہوں گے۔ اس کے برعکس اہل ایمان کے چہرے تروتازہ اور روشن ہوں گے جس طرح سورہ آل عمران، آیت ۱۰۶ ﴿يَوْمَ كَبُيْضُ وُجُوهُهُمْ وَكُتِبَ لَهُمُ السَّلَامَةُ﴾ الآية۔ سورہ عبس ۳۸-۳۱ اور سورہ قیامت میں ہے۔

(۵) جَمِيعًا سے مراد 'ازل سے ابد تک کے تمام اہل زمین انسان اور جنات ہیں' سب کو اللہ تعالیٰ جمع فرمائے گا۔ جس طرح کہ دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَنَحْشُرُهُمْ فَلَمَّا نُنَادِيهِمْ فَهُمْ آحَادًا﴾ ﴿الکہف ۴۷﴾ "ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے" کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔"

مَا كُنْتُمْ اِيَّاَنَا تَعْبُدُونَ ﴿۳۸﴾

تمہارے شریک اپنی جگہ ٹھہرو^(۱) پھر ہم ان کے آپس میں پھوٹ ڈال دیں گے^(۲) اور ان کے وہ شرکا کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔ (۳۸)

سو ہمارے تمہارے درمیان اللہ کافی ہے گواہ کے طور پر، کہ ہم کو تمہاری عبادت کی خبر بھی نہ تھی۔ (۳۹)^(۳)

اس مقام پر ہر شخص اپنے اگلے کیسے ہوئے کاموں کی جانچ کر لے گا^(۴) اور یہ لوگ اللہ کی طرف جو ان کا مالک حقیقی ہے لوٹائے جائیں گے اور جو کچھ جھوٹ باندھا کرتے تھے سب ان سے غائب ہو جائیں گے۔ (۳۰)^(۵)

قُلْ يَا لَهِ رَبِّكَ يَا لَهِ شَهِيدٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنِ عِبَادَتِكُمْ لَغْفِيلِينَ ﴿۳۹﴾

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّا سَلَفَتْ وَرُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقُّ وَصَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾

(۱) ان کے مقابلے میں اہل ایمان اور اہل کفر و شرک دونوں کو الگ الگ ایک دوسرے سے ممتاز کر دیا جائے گا۔ جیسے فرمایا ﴿وَأَمَّا ذُو الْقُرْآنِ الْاَلْمِیْمُوْنَ﴾ (سورۃ یس ۵۹) ﴿يَوْمَ هُمْ بِلَا عَمَلٍ مُّسْتَقْسِمُونَ﴾ (الروم ۳۲) اس دن لوگ گروہوں میں بٹ جائیں گے یعنی دو گروہوں میں۔ آئی: یَصْبِرُوْنَ صِدْعَيْنِ۔ (ابن کثیر)

(۲) یعنی دنیا میں ان کے درمیان آپس میں جو خصوصی تعلق تھا، وہ ختم کر دیا جائے گا اور یہ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے اور ان کے معبود اس بات کا ہی انکار کریں گے کہ یہ لوگ ان کی عبادت کرتے تھے، ان کو مدد کے لیے پکارتے تھے، ان کے نام کی نذر نیاز دیتے تھے۔

(۳) یہ انکار کی وجہ ہے کہ ہمیں تو کچھ پتہ ہی نہیں، تم کیا کچھ کرتے تھے اور ہم جھوٹ بول رہے ہوں تو ہمارے درمیان اللہ تعالیٰ گواہ ہے اور وہ کافی ہے، اس کی گواہی کے بعد کسی اور ثبوت کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔ یہ آیت اس بات پر نص صریح ہے کہ مشرکین جن کو مدد کے لیے پکارتے تھے، وہ محض پتھر کی مورتیاں نہیں تھیں (جس طرح کہ آج کل کے قبر پرست اپنی قبر پرستی کو جائز ثابت کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ اس قسم کی آیات تو بتوں کے لیے ہیں) بلکہ وہ عقل و شعور رکھنے والے افراد ہی ہوتے تھے جن کے مرنے کے بعد لوگ ان کے مجتسے اور بت بنا کر پوجنے شروع کر دیتے تھے۔ جس طرح کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے طرز عمل سے بھی ثابت ہے جس کی تصریح صحیح بخاری میں موجود ہے۔ دوسرا یہ بھی معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد، انسان کتنا بھی نیک ہو، حتیٰ کہ نبی و رسول ہو۔ اسے دنیا کے حالات کا علم نہیں ہوتا۔ اس کے متبعین اور عقیدت مند اسے مدد کے لیے پکارتے ہیں اس کے نام کی نذر نیاز دیتے ہیں، اس کی قبر پر میلے ٹھیلے کا انتظام کرتے ہیں، لیکن وہ خبر ہوتا ہے اور ان تمام چیزوں کا انکار ایسے لوگ قیامت والے دن کریں گے۔ یہی بات سورۃ احقاف آیت ۶۵ میں بھی بیان کی گئی ہے۔

(۴) یعنی جان لے گا یا مزہ چکھ لے گا۔

(۵) یعنی کوئی معبود اور ”مشکل کشا“ وہاں کام نہیں آئے گا۔ کوئی کسی کی مشکل کشائی پر قادر نہیں ہو گا۔

آپ کہیں کہ وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے یا وہ کون ہے جو کانوں اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے اور وہ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور وہ کون ہے جو تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے؟ ضرور وہ یہی کہیں گے کہ ”اللہ“^(۱) تو ان سے کہیں کہ پھر کیوں نہیں ڈرتے۔ (۳۱)

سو یہ ہے اللہ تعالیٰ جو تمہارا رب حقیقی ہے۔ پھر حق کے بعد اور کیا رہ گیا۔ بجز گمراہی کے، پھر کہاں پھرے جاتے ہو؟^(۲) (۳۲)

اسی طرح آپ کے رب کی یہ بات کہ یہ ایمان نہ لائیں گے، تمام فاسق لوگوں کے حق میں ثابت ہو چکی ہے۔^(۳) (۳۳)

آپ یوں کہیں کہ کیا تمہارے شرکامیں کوئی ایسا ہے جو پہلی بار بھی پیدا کرے، پھر دوبارہ بھی پیدا کرے؟ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ

ثُمَّ مَنْ يَرْزُقُهُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ
وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخَوِّجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ
الْحَيِّ وَمَنْ يُدْبِرُ الْأُمُورَ فَيَقُولُونَ اللَّهُ هَلْ أَقْلًا تَعْبُونَ ﴿۳۱﴾

فَذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَدَأَ الْحَيُّ إِلَّا الضَّلَالَةَ ۗ فَإِنِّي
تُخَصِّرُونَ ﴿۳۲﴾

كَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَاتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ فَسَقُوا أَنَّهُمْ
لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۳۳﴾

فَلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَن يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۗ فُلِ اللَّهِ
بِدْءُ الْخَلْقِ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۗ فَإِنِّي تَوَكَّلُونَ ﴿۳۱﴾

(۱) - اس آیت سے بھی واضح ہے کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کی مالکیت، خالقیت، ربوبیت اور اس کے مدبر الامور ہونے کو تسلیم کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ وہ اس کی الوہیت میں دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں جنم کا بندھن قرار دیا۔ آج کل کے مدعیان ایمان بھی اسی توحید الوہیت کے منکر ہیں۔ فَتَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ (هَذَا هُمُ اللَّهُ تَعَالَى).

(۲) یعنی رب اور اللہ (معبود) تو یہی ہے، جس کے بارے میں تمہیں خود اعتراف ہے کہ ہر چیز کا خالق و مالک اور مدبر وہی ہے، پھر اس معبود کو چھوڑ کر جو تم دوسرے معبود بنائے پھرتے ہو، وہ گمراہی کے سوا کچھ نہیں تمہاری سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی؟ تم کہاں پھرے جاتے ہو؟

(۳) یعنی جس طرح یہ مشرکین تمام تر اعتراف کے باوجود اپنے شرک پر قائم ہیں اور اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، اسی طرح تیرے رب کی یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ غلط راستہ چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں تو ہدایت اور ایمان انہیں کس طرح نصیب ہو سکتا ہے؟ یہ وہی بات ہے جسے دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا گیا ہے ﴿ وَلَٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴾ (الزمر: ۷۱) ”لیکن عذاب کی بات کافروں پر ثابت ہو گئی۔“

بھی پیدا کرے گا۔ پھر تم کہاں پھرے جاتے ہو؟ (۳۳)^(۱)
 آپ کہنے کہ تمہارے شرکاء میں کوئی ایسا ہے کہ حق کا
 راستہ بتاتا ہو؟ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی حق کا راستہ بتاتا
 ہے۔^(۲) تو پھر آیا جو شخص حق کا راستہ بتاتا ہو وہ زیادہ
 اتباع کے لائق ہے یا وہ شخص جس کو بغیر بتائے خود ہی
 راستہ نہ سوجھے؟^(۳) پس تم کو کیا ہو گیا ہے تم کیسے فیصلے
 کرتے ہو۔^(۴) (۳۵)

اور ان میں سے اکثر لوگ صرف گمان پر چل رہے ہیں۔ یقیناً
 گمان، حق (کی معرفت) میں کچھ بھی کام نہیں دے سکتا^(۵)
 یہ جو کچھ کر رہے ہیں یقیناً اللہ کو سب خبر ہے۔^(۶) (۳۶)

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ قُلِ اللَّهُ يَهْدِي
 لِلْحَقِّ أَكْثَرَ النَّاسِ أَلَيْسَ أَتَى أَنْ يُدْعِمَ آمَنَ الَّذِينَ
 إِذْ أَنْ يَهْدَىٰ فَهَلْ كَلَّمَكُمْ كَيْفَ تَعْبُدُونَ ﴿۳۵﴾

وَمَا يَتَّبِعُهُمُ الْكُفْرَ إِلَّا الظَّنُّ لَا يَتَّبِعِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا
 إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿۳۶﴾

(۱) مشرکین کے شرک کے کھوکھلے پن کو واضح کرنے کے لیے ان سے پوچھا جا رہا ہے کہ بتلاؤ جنہیں تم اللہ کا شریک
 گردانتے ہو، کیا انہوں نے اس کائنات کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے؟ یا دوبارہ اسے پیدا کرنے پر قادر ہیں؟ نہیں، یقیناً نہیں۔
 پہلی مرتبہ بھی پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے اور روز قیامت دوبارہ وہی سب کو زندہ کرے گا۔ تو پھر تم ہدایت کا راستہ چھوڑ
 کر، کہاں پھرے جا رہے ہو؟

(۲) یعنی جھگے ہوئے مسافرین راہ کو راستہ بتانے والا اور دلوں کو گمراہی سے ہدایت کی طرف پھیرنے والا بھی اللہ تعالیٰ
 ہی ہے۔ ان کے شرکاء میں سے کوئی ایسا نہیں جو یہ کام کر سکے۔

(۳) یعنی پھر پیروی کے لائق کون ہے؟ وہ شخص جو دیکھتا سنتا اور لوگوں کی حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے؟ یا وہ جو اندھے
 اور بہرے ہونے کی وجہ سے خود راستے پر چل بھی نہیں سکتا، جب تک کہ دوسرے لوگ اسے راستے پر نہ ڈال دیں یا
 ہاتھ پکڑ کر نہ لے جائیں؟

(۴) یعنی تمہاری عقولوں کو کیا ہو گیا ہے؟ تم کس طرح اللہ کو اور اس کی مخلوق کو برابر ٹھہرائے جا رہے ہو؟ اور اللہ کے
 ساتھ تم دوسروں کو بھی شریک عبادت بنا رہے ہو؟ جب کہ ان دلائل کا تقاضا یہ ہے کہ صرف اسی ایک اللہ کو معبود مانا
 جائے اور عبادت کی تمام قسمیں صرف اسی کے لیے خاص مانی جائیں۔

(۵) لیکن بات یہ ہے کہ لوگ محض اٹکل بچے باتوں پر چلنے والے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ دلائل کے مقابلے میں ادہام و
 خیالات اور ظن و گمان کی کوئی حیثیت نہیں۔ قرآن میں ظن، یقین اور گمان دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں
 دوسرا معنی مراد ہے۔

(۶) یعنی اس ہٹ دھرمی کی وہ سزا دے گا۔ کہ دلائل نہ رکھنے کے باوجود، یہ محض ادہام باطلہ اور خون فاسدہ کے پیچھے
 لگے رہے اور عقل و فہم سے ذرا کام نہ لیا۔

اور یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ (کی وحی) کے بغیر (اپنے ہی سے) گھڑ لیا گیا ہو۔ بلکہ یہ تو (ان کتابوں کی) تصدیق کرنے والا ہے جو اس کے قبل (نازل) ہو چکی ہیں (۱) اور کتاب (احکام ضروریہ) کی تفصیل بیان کرنے والا ہے (۲) اس میں کوئی بات شک کی نہیں (۳) کہ رب العالمین کی طرف سے ہے (۴)۔ (۳۷)

کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ آپ نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ تو پھر تم اس کے مثل ایک ہی سورت لاؤ اور جن جن غیر اللہ کو بلا سکو بلا لو اگر تم سچے ہو۔ (۳۸) (۵) بلکہ ایسی چیز کی تکذیب کرنے لگے جس کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لائے (۶) اور ہنوز ان کو اس کا خیر نتیجہ نہیں ملا۔ (۷)

وَمَا كَانَ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۳۷﴾

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَعْظَمْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنَّ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۸﴾

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ كَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ

(۱) جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قرآن گھڑا ہوا نہیں ہے، بلکہ اسی ذات کا نازل کردہ ہے جس نے پچھلی کتابیں نازل فرمائی تھیں۔

(۲) یعنی حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تفصیل بیان کرنے والا۔

(۳) اس کی تعلیمات میں اس کے بیان کردہ قصص و واقعات میں اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں۔

(۴) یہ سب باتیں واضح کرتی ہیں کہ یہ رب العالمین ہی کی طرف سے نازل ہوا ہے، جو ماضی اور مستقبل کو جاننے والا ہے۔

(۵) ان تمام حقائق و دلائل کے بعد بھی، اگر تمہارا دعویٰ یہی ہے کہ یہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا گھڑا ہوا ہے، تو وہ بھی تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہے، تمہاری زبان بھی اسی کی طرح عربی ہے۔ وہ تو ایک ہے، تم اگر اپنے دعوے میں سچے ہو تو تم دنیا بھر کے ادیبوں، فصحا و بلاغا کو اور اہل علم و اہل قلم کو جمع کر لو اور اس قرآن کی ایک چھوٹی سے چھوٹی سورت کے مثل بنا کر پیش کر دو۔ قرآن کریم کا یہ چیلنج آج تک باقی ہے، اس کا جواب نہیں ملا۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ قرآن، کسی انسانی کاوش کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ فی الواقع کلام الہی ہے جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ہے۔

(۶) یعنی قرآن میں تدبیر اور اس کے معانی پر غور کیے بغیر اس کی تکذیب پر قتل گئے۔

(۷) یعنی قرآن نے جو پچھلے واقعات اور مستقبل کے امکانات بیان کئے ہیں، اس کی پوری سچائی اور حقیقت بھی ان پر واضح نہیں ہوئی، اس کے بغیر ہی تکذیب شروع کر دی، یا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے قرآن پر کما حقہ تدبر کئے بغیر ہی اس کی تکذیب کر دی حالانکہ اگر وہ صحیح معنوں میں اس پر تدبر کرتے اور ان امور پر غور کرتے، جو اس کے کلام الہی

جو لوگ ان سے پہلے ہوئے ہیں اسی طرح انہوں نے بھی جھٹلایا تھا، سو دیکھ لیجئے ان ظالموں کا انجام کیسا ہوا؟ (۳۹)
اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اس پر ایمان لے آئیں گے اور بعض ایسے ہیں کہ اس پر ایمان نہ لائیں گے۔ اور آپ کرب مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔ (۴۰)

اور اگر آپ کو جھٹلاتے رہیں تو یہ کہہ دیجئے کہ میرے لیے میرا عمل اور تمہارے لیے تمہارا عمل، تم میرے عمل سے بری ہو اور میں تمہارے عمل سے بری ہوں۔ (۴۱)

اور ان میں بعض ایسے ہیں جو آپ کی طرف کان لگائے بیٹھے ہیں۔ کیا آپ بہروں کو سناتے ہیں گو ان کو سمجھ بھی نہ ہو؟ (۴۲)

عَابِقَةُ الظَّالِمِينَ ﴿۳۹﴾

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهِ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَا يُؤْمِنُ بِهِ وَرَبُّكَ أَعْلَمُ
بِالْمُفْسِدِينَ ﴿۴۰﴾

وَأَنْ كَذَّبُوا فَقُلْ أِنِّي عَلَىٰ أَعْيُنِكُمْ وَأَنْتُمْ تَبْتَغُونَ
مِمَّا أَعْمَلُوا وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۴۱﴾

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْمَعُونَ الْكَلِمَ الْبَاطِلَ آفَاتٍ تُسْمِعُهُ الْعُمَمُ وَلَوْ كَانُوا
لَا يَعْقِلُونَ ﴿۴۲﴾

ہونے پر دلالت کرتے ہیں تو یقیناً اس کے فہم اور معانی کے دروازے ان پر کھل جاتے۔ اس صورت میں تاویل کے معنی، قرآن کریم کے اسرار و معارف اور لطائف و معانی کے واضح ہو جانے کے ہوں گے۔

(۱) یہ ان کفار و مشرکین کو تنبیہ و تہدید ہے۔ کہ تمہاری طرح پچھلی قوموں نے بھی آیات الہی کی تکذیب کی تو دیکھ لو ان کا کیا انجام ہوا؟ اگر تم اس تکذیب سے باز نہ آئے تو تمہارا انجام بھی اس سے مختلف نہیں ہو گا۔

(۲) وہ خوب جانتا ہے کہ ہدایت کا مستحق کون ہے؟ اسے ہدایت سے نواز دیتا ہے۔ اور گمراہی کا مستحق کون ہے؟ اس کے لیے گمراہی کا راستہ چوپٹ کھول دیتا ہے۔ وہ عادل ہے، اس کے کسی کام میں ظلم کا شائبہ نہیں۔ جو جس بات کا مستحق ہوتا ہے، اس کے مطابق وہ چیز اس کو عطا کر دیتا ہے۔

(۳) یعنی تمام تر سمجھانے اور دلائل پیش کرنے کے بعد بھی اگر وہ جھٹلانے سے باز نہ آئیں تو پھر آپ یہ کہہ دیں، مطلب یہ ہے کہ میرا کام صرف دعوت و تبلیغ ہے، سو وہ میں کر چکا ہوں۔ اب نہ تم میرے عمل کے ذمہ دار ہو، نہ میں تمہارے عمل کا سب کو اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے، وہاں ہر شخص سے اس کے اچھے یا برے عمل کی باز پرس ہو گی۔ یہ وہی بات ہے جو ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ﴿۱﴾ لَّا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ﴿۲﴾﴾ میں ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان الفاظ میں کسی تھی۔ ﴿إِنَّا بَرَزْنَا بِمَنْكُمُ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ ﴿۱﴾ الْآيَةَ (الممتحنہ: ۴)﴾ بے شک ہم تم سے اور جن جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو ان سب سے بالکل بیزار ہیں، ہم تمہارے (عقائد کے) منکر ہیں۔“

(۴) یعنی ظاہری طور پر وہ قرآن تو سنتے ہیں، لیکن سننے کا مقصد چونکہ طلب ہدایت نہیں، اس لیے انہیں اسی طرح کوئی فائدہ نہیں ہوتا، جس طرح ایک بہرے کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بالخصوص جب بہرا غیر عاقل بھی ہو۔ کیونکہ عقل مند بہرہ پھر بھی اشاروں سے کچھ سمجھ لیتا ہے۔ لیکن ان کی مثال تو غیر عاقل بہرے کی طرح ہے جو بالکل ہی بے بہرہ رہتا ہے۔

اور ان میں بعض ایسے ہیں کہ آپ کو تک رہے ہیں۔ پھر کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھانا چاہتے ہیں گو ان کو بصیرت بھی نہ ہو؟^(۱) (۴۳)

یہ یقینی بات ہے کہ اللہ لوگوں پر کچھ ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔^(۲) (۴۴)

اور ان کو وہ دن یاد دلائیے جس میں اللہ ان کو (اپنے حضور) جمع کرے گا (تو ان کو ایسا محسوس ہوگا) کہ گویا وہ (دنیا میں) سارے دن کی ایک آدھ گھڑی رہے ہوں گے^(۳) اور آپس میں ایک دوسرے کو پہچاننے کو ٹھہرے ہوں^(۴)۔ واقعی خسارے میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے پاس جانے

وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْظُرُ إِلَيْكَ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ﴿۴۳﴾

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۴۴﴾

وَيَوْمَ يُخْشَرُهُمْ كَأَن لَّمْ يُبَلِّغُوا إِلَّا سَاعَةً مِنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ قَدْ خِیرَ الَّذِينَ كَذَبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿۴۵﴾

(۱) اسی طرح بعض لوگ آپ کی طرف دیکھتے ہیں، لیکن مقصد ان کا بھی چو تکہ کچھ اور ہوتا ہے، اس لیے انہیں بھی اس طرح کوئی فائدہ نہیں ہوتا، جس طرح ایک اندھے کو نہیں ہوتا۔ بالخصوص وہ اندھا جو بصارت کے ساتھ بصیرت سے بھی محروم ہو۔ کیونکہ بعض اندھے، جنہیں دل کی بصیرت حاصل ہوتی ہے، وہ آنکھوں کی بصارت سے محروم ہونے کے باوجود، بہت کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن ان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی اندھا جو دل کی بصیرت سے بھی محروم ہو۔ مقصد ان باتوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی ہے۔ جس طرح ایک حکیم اور طبیب کو جب معلوم ہو جائے کہ مریض علاج کرانے میں سنجیدہ نہیں اور وہ میری ہدایات اور علاج کی پروا نہیں کرتا، تو وہ اسے نظر انداز کر دیتا ہے اور وہ اس پر اپنا وقت صرف کرنا پسند نہیں کرتا۔

(۲) یعنی اللہ تعالیٰ نے تو انہیں ساری صلاحیتوں سے نوازا ہے، آنکھیں بھی دی ہیں، جن سے دیکھ سکتے ہیں، کان دینے ہیں، جن سے سن سکتے ہیں، عقل و بصیرت دی ہے جن سے حق اور باطل اور جھوٹ اور سچ کے درمیان تمیز کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان صلاحیتوں کا صحیح استعمال کر کے وہ حق کا راستہ نہیں اپناتے، تو پھر یہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو ان پر کوئی ظلم نہیں کیا ہے۔

(۳) یعنی محشر کی سختیاں دیکھ کر انہیں دنیا کی ساری لذتیں بھول جائیں گی اور دنیا کی زندگی انہیں ایسے معلوم ہوگی گویا وہ دنیا میں ایک آدھ گھڑی ہی رہے ہیں۔ ﴿لَمْ يَلْبَسُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحًى﴾ (النازعات ۴۶)

(۴) محشر میں مختلف حالتیں ہوں گی، جنہیں قرآن میں مختلف جگہوں پر بیان کیا گیا ہے۔ ایک وقت یہ بھی ہو گا جب ایک دوسرے کو پہچانیں گے، بعض مواقع ایسے آئیں گے کہ آپس میں ایک دوسرے پر گمراہی کا الزام دھر سگے، اور بعض موقعوں پر ایسی دہشت طاری ہوگی کہ ﴿فَلَا أَسْأَلُ بِبَيْتِهِمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَسْتَأْذِنُونَ﴾ (المؤمنون ۱۰۱) کہ ”آپس میں ایک دوسرے کی رشتہ داریوں کا پتہ ہو گا اور نہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔“

کو جھٹلایا اور وہ ہدایت پانے والے نہ تھے۔ (۳۵)
 اور جس کا ان سے ہم وعدہ کر رہے ہیں اس میں سے کچھ
 تھوڑا سا اگر ہم آپ کو دکھلا دیں یا (ان کے ظہور سے پہلے)
 ہم آپ کو وفات دے دیں، سو ہمارے پاس تو ان کو آنا ہی
 ہے۔ پھر اللہ ان کے سب افعال پر گواہ ہے۔^(۱) (۳۶)
 اور ہر امت کے لیے ایک رسول ہے، سو جب ان کا وہ
 رسول آچکتا ہے ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ کیا جاتا
 ہے،^(۲) اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا۔ (۳۷)

وَأَمَّا يُرِيدُكَ بَعْضُ الَّذِينَ نَادَوْهُمْ أَوْ نَوَّيْنَكَ فَإِلَيْنَا
 مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ ﴿۳۵﴾

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قَضِيَ بَيْنَهُمْ
 بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۳۶﴾

(۱) اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم ان کفار کے بارے میں جو وعدے کر رہے ہیں کہ اگر انہوں نے کفر و شرک پر اصرار جاری رکھا تو ان پر بھی اسی طرح عذاب الہی آسکتا ہے۔ جس طرح کچھلی قوموں پر آیا، ان میں سے بعض اگر ہم آپ کی زندگی میں بھیج دیں تو یہ بھی ممکن ہے، جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ لیکن اگر آپ اس سے پہلے ہی دنیا سے اٹھالیے گئے، تب بھی کوئی بات نہیں، ان کافروں کو بالآخر ہمارے ہی پاس آنا ہے۔ ان کے سارے اعمال و احوال کی ہمیں اطلاع ہے، وہاں یہ ہمارے عذاب سے کس طرح بچ سکیں گے؟ یعنی دنیا میں تو ہماری مخصوص حکمت کی وجہ سے ممکن ہے کہ عذاب سے بچ جائیں لیکن آخرت میں تو ان کے لیے ہمارے عذاب سے بچنا ممکن ہی نہیں ہو گا کیونکہ قیامت کے وقوع کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ وہاں اطاعت گزاروں کو ان کی اطاعت کا صلہ اور نافرمانوں کو ان کی نافرمانی کی سزا دی جائے۔

(۲) اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ہر امت میں ہم رسول بھیجتے رہے۔ اور جب رسول اپنا فریضہ تبلیغ ادا کر چکتا تو پھر ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیتے۔ یعنی پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں کو بچا لیتے اور دوسروں کو ہلاک کر دیتے۔ کیونکہ ﴿ وَمَا لَكُمْ مَعَدِينَ حَتَّىٰ تَبْتَغُوا ﴾ (بنی اسرائیل-۱۵) ”اور ہماری عادت نہیں کہ رسول بھیجنے سے پہلے ہی عذاب دینے لگیں۔“ اور اس فیصلے میں ان پر کوئی ظلم نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ ظلم تو تب ہوتا جب بغیر گناہ کے ان پر عذاب بھیج دیا جاتا یا بغیر حجت تمام کئے، ان کا مؤاخذہ کر لیا جاتا۔ (فتح القدیر) دوسرا مفہوم اس کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کا تعلق قیامت سے ہے یعنی قیامت والے دن ہر امت جب اللہ کی بارگاہ میں پیش ہو گی، تو اس امت میں بھیجا گیا رسول بھی ساتھ ہو گا۔ سب کے اعمال نامے بھی ہوں گے اور فرشتے بھی بطور گواہ پیش ہوں گے۔ اور یوں ہر امت اور اس کے رسول کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔ اور حدیث میں آتا ہے کہ امت محمدیہ کا فیصلہ سب سے پہلے کیا جائے گا۔ جیسا کہ فرمایا ”ہم اگرچہ سب کے بعد آنے والے ہیں، لیکن قیامت کو سب سے آگے ہوں گے، اور تمام مخلوقات سے پہلے ہمارا فیصلہ کیا جائے گا۔“ (صحیح مسلم۔ کتاب الجمعة، باب ہدایۃ هذه الأمة لیوم الجمعة)۔ (تفسیر ابن کثیر)

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہو گا؟ اگر تم سچے ہو۔ (۳۸)

آپ فرمادیتے ہیں کہ میں اپنی ذات کے لیے تو کسی نفع کا اور کسی ضرر کا اختیار رکھتا ہی نہیں مگر جتنا اللہ کو منظور ہو۔ ہر امت کے لیے ایک معین وقت ہے جب ان کا وہ معین وقت آپنچتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے سرک سکتے ہیں۔ (۳۹)^(۱)

آپ فرمادیتے ہیں کہ یہ تو بتلاؤ کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب رات کو آپڑے یا دن کو تو عذاب میں کون سی چیز ایسی ہے کہ مجرم لوگ اس کو جلدی مانگ رہے ہیں۔ (۴۰)^(۲)

کیا پھر جب وہ آہی پڑے گا اس پر ایمان لاؤ گے۔ ہاں اب مانا!^(۳) حالانکہ تم اس کی جلدی مچایا کرتے تھے۔ (۴۱)

پھر ظالموں سے کہا جائے گا کہ ہمیشہ کا عذاب چکھو۔ تم کو تو

وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۸﴾

قُلْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ صَلَاةَ اللَّهِ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَلْمَأَزِمَاتٍ لَّهُمْ فَلَا يُسْتَأْجَرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَعْمِدُونَ ﴿۳۹﴾

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ أَنَا إِلَهُكُمْ وَعَدَابِي فَأُولَٰئِكَ هُمَا ذَا الَّذِي يَسْتَعْتَبُونَ مِنِّي الْمَجْرُمُونَ ﴿۴۰﴾

أَلَمْ إِذْ آتَاكُمْ مِنْكُمْ بِذَلِكَ الشَّيْءِ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ﴿۴۱﴾

ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْرُونَ

(۱) یہ مشرکین کے عذاب الہی مانگنے پر کہا جا رہا ہے کہ میں تو اپنے نفس کے لیے بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ چہ جائیکہ میں کسی دوسرے کو نقصان یا نفع پہنچا سکوں۔ ہاں یہ سارا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنی مشیت کے مطابق ہی کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اللہ نے ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہوا ہے، اس وقت موعود تک وہ مہلت دیتا ہے۔ لیکن جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر وہ ایک گھڑی پیچھے ہو سکتے ہیں نہ آگے سرک سکتے ہیں۔

تنبیہ: یہاں یہ بات نہایت اہم ہے کہ جب افضل الخلاق، سید الرسل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کسی کو نفع نقصان پہنچانے پر قادر نہیں، تو آپ کے بعد انسانوں میں اور کون سی ہستی ایسی ہو سکتی ہے جو کسی کی حاجت برآری اور مشکل کشائی پر قادر ہو؟ اسی طرح خود اللہ کے پیغمبر سے مدد مانگنا، ان سے فریاد کرنا، ”یا رسول اللہ مدد“ اور ”اغثنی یا رسول اللہ“ وغیرہ الفاظ سے استعاذہ و استعانت کرنا، کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کیونکہ یہ قرآن کی اس آیت اور اس قسم کی دیگر واضح تعلیمات کے خلاف ہے بلکہ یہ شرک کی ذیل میں آتا ہے۔ فَتَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ هَذَا.

(۲) یعنی عذاب تو ایک نہایت ہی ناپسندیدہ چیز ہے جس سے دل نفرت کرتے اور طبیعتیں انکار کرتی ہیں، پھر یہ اس میں کیا خوبی دیکھتے ہیں کہ اسے جلدی طلب کرتے ہیں؟

(۳) لیکن عذاب آنے کے بعد ماننے کا کیا فائدہ؟

إِلَيْهَا لَنْتُمْ تَكْبِرُونَ ﴿۵۲﴾

تمہارے کیے کا ہی بدلہ ملا ہے۔ (۵۲)

اور وہ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا عذاب واقعی سچ ہے؟ (۱) آپ فرما دیجئے کہ ہاں قسم ہے میرے رب کی وہ واقعی سچ ہے اور تم کسی طرح اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ (۵۳)

وَيَسْتَوِيُونَكَ أَحْسَنُ هَوَاقِلِ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ كَشِيءٌ وَأَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۵۳﴾

اور اگر ہر جان، جس نے ظلم (شرک) کیا ہے، کے پاس اتنا ہو کہ ساری زمین بھر جائے تب بھی اس کو دے کر اپنی جان بچانے لگے (۲) اور جب عذاب کو دیکھیں گے تو پشیمانی کو پوشیدہ رکھیں گے۔ اور ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ ہو گا۔ اور ان پر ظلم نہ ہو گا۔ (۵۴)

وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْأَرْضِ لَافْتَاتِ بِهَا وَأَسْرَأَ التَّوَلَّاةُ لِنَارِ أَوَّلِ الْعَذَابِ وَقَضَىٰ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۵۴﴾

یاد رکھو کہ جتنی چیزیں آسمانوں میں اور زمین میں ہیں سب اللہ ہی کی ملک ہیں۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے لیکن بہت سے آدمی علم ہی نہیں رکھتے۔ (۵۵)

وہی جان ڈالتا ہے وہی جان نکالتا ہے اور تم سب اسی کے پاس لائے جاؤ گے۔ (۵۶) (۳)

إِلَّا إِنْ يَشَاءُ اللَّهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا رِجْءٌ وَعَدَّ اللَّهُ حَقًّا وَوَلَكِنْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۵۵﴾

هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَاللَّهُ يُرْجِعُونَ ﴿۵۶﴾

(۱) یعنی وہ پوچھتے ہیں کہ یہ معاد و قیامت اور انسانوں کے مٹی ہو جانے کے بعد ان کا دوبارہ جی اٹھنا ایک برحق بات ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اے پیغمبر! ان سے کہہ دیجئے کہ تمہارا مٹی ہو کر مٹی میں مل جانا، اللہ تعالیٰ کو دوبارہ زندہ کرنے سے عاجز نہیں کر سکتا۔ اس لیے یقیناً یہ ہو کر رہے گا۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت کی نظیر قرآن میں مزید صرف ۲ آیتیں ہیں کہ جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا ہے کہ وہ قسم کھا کر معاد کے وقوع کا اعلان کریں۔ ایک سورہ سبأ، آیت ۳ اور دوسرے سورہ تغابن، آیت ۷۔

(۲) یعنی اگر دنیا بھر کا خزانہ دے کر وہ عذاب سے چھوٹ جائے تو دینے کے لیے آمادہ ہو گا۔ لیکن وہاں کسی کے پاس ہو گا ہی کیا؟ مطلب یہ ہے کہ عذاب سے چھٹکارے کو کوئی صورت نہیں ہو گی۔

(۳) ان آیات میں آسمان و زمین کے درمیان ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کی ملکیت تامہ، وعدہ الہی کے برحق ہونے، زندگی اور موت پر اس کے اختیار اور اس کی بارگاہ میں سب کی حاضری کا بیان ہے، جس سے مقصد گزشتہ باتوں ہی کی تائید و توضیح ہے کہ جو ذات اتنے اختیارات کی مالک ہے، اس کی گرفت سے بچ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے؟ اور اس نے حساب کتاب کے لیے جو ایک دن مقرر کیا ہوا ہے، اسے کون ٹال سکتا ہے؟ یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے، وہ ایک دن ضرور آئے گا اور ہر نیک و بد کو اس کے عملوں کے مطابق جزا و سزا دی جائے گی۔

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے^(۱) اور دلوں میں جو روگ ہیں ان کے لیے شفا ہے^(۲) اور رہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔^(۳) (۵۷)

آپ کہہ دیجئے کہ بس لوگوں کو اللہ کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہیے۔^(۴) وہ اس سے بدرجہا بہتر ہے جس کو وہ جمع کر رہے ہیں۔ (۵۸)

آپ کہئے کہ یہ تو بتاؤ کہ اللہ نے تمہارے لیے جو کچھ رزق بھیجا تھا پھر تم نے اس کا کچھ حصہ حرام اور کچھ حلال قرار دے لیا۔^(۵) آپ پوچھئے کہ کیا تم کو اللہ نے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۵۷﴾

قُلْ يَفْضِلُ اللَّهُ وَرَحْمَتَهُ قِيَادَكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ﴿۵۸﴾

قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَامًا وَحَلَلًا قُلْ إِنَّ اللَّهَ آذِنَ لَكُمْ عَلَى اللَّهِ تَقَرُّونَ ﴿۵۹﴾

(۱) یعنی جو قرآن کودل کی توجہ سے پڑھے اور اس کے معانی و مطالب پر غور کرے، اس کے لیے قرآن نصیحت ہے۔ وعظ کے اصل معنی ہیں عواقب و نتائج کی یاد دہانی، چاہے ترغیب کے ذریعے سے ہو یا ترہیب سے۔ اور واعظ کی مثال، طیب کی طرح ہے جو مریض کو ان چیزوں سے روکتا ہے جو اس کے جسم و صحت کے لیے نقصان دہ ہوں۔ اس طرح قرآن بھی ترغیب و ترہیب دونوں طریقوں سے وعظ و نصیحت کرتا ہے اور ان نتائج سے آگاہ کرتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی صورت میں دوچار ہونا پڑے گا اور ان کاموں سے روکتا ہے جن سے انسان کی اخروی زندگی برباد ہو سکتی ہے۔

(۲) یعنی دلوں میں توحید و رسالت اور عقائد حقہ کے بارے میں جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں، ان کا ازالہ اور کفر و نفاق کی جو گندگی و بلیدی ہوتی ہے، اسے صاف کرتا ہے۔

(۳) یہ قرآن مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت کا ذریعہ ہے۔ ویسے تو یہ قرآن سارے جہان والوں کے لیے ہدایت و رحمت کا ذریعہ ہے لیکن چونکہ اس سے فیض یاب صرف اہل ایمان ہی ہوتے ہیں، اس لیے یہاں صرف انہی کے لیے اسے ہدایت و رحمت قرار دیا گیا ہے، اس مضمون کو قرآن کریم میں سورہ بنی اسرائیل، آیت ۸۲ اور سورہ الم سجدہ، آیت ۴۴ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ (نیز ﴿هُدًى لِلْمُتَّقِينَ﴾ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں)

(۴) خوشی، اس کیفیت کا نام ہے جو کسی مطلوب چیز کے حصول پر انسان اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ اہل ایمان کو کہا جا رہا ہے کہ یہ قرآن اللہ کا خاص فضل اور اس کی رحمت ہے، اس پر اہل ایمان کو خوش ہونا چاہیے یعنی ان کے دلوں میں فرحت اور اطمینان کی کیفیت ہونی چاہیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خوشی کے اظہار کے لیے جلے جلوسوں کا، چراغاں کا اور اس قسم کے غلط کام اور اسراف بے جا کا اہتمام کرو۔ جیسا کہ آج کل اہل بدعت اس آیت سے ”جشن عید میلاد“ اور اس کی غلط رسوم کا جواز ثابت کرتے ہیں۔

(۵) اس سے مراد وہی بعض جانوروں کا حرام کرنا ہے جو مشرکین اپنے بتوں کے ناموں پر چھوڑ کر کیا کرتے تھے، جس کی

حکم دیا تھا یا اللہ پر افترا ہی کرتے ہو؟ (۵۹)
 اور جو لوگ اللہ پر جھوٹ افترا باندھتے ہیں ان کا قیامت
 کی نسبت کیا گمان ہے؟^(۱) واقعی لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا بڑا
 ہی فضل ہے^(۲) لیکن اکثر آدمی شکر نہیں کرتے۔^(۳) (۶۰)
 اور آپ کسی حال میں ہوں اور مجملہ ان احوال کے
 آپ کہیں سے قرآن پڑھتے ہوں اور جو کام بھی کرتے
 ہوں ہم کو سب کی خبر ہوتی ہے جب تم اس کام میں
 مشغول ہوتے ہو۔ اور آپ کے رب سے کوئی چیز ذرہ
 برابر بھی غائب نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ
 کوئی چیز اس سے چھوٹی اور نہ کوئی چیز بڑی مگر یہ سب
 کتاب مبین میں ہے^(۴) (۶۱)

وَمَا ظَنُّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ
 اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٥٩﴾

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ
 مِنْ عَمَلٍ إِلَّا لَأَنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُبَيِّنُونَ فِيهِ وَمَا يَعْرَبُ
 عَنْ رَبِّكَ مِنْ شَيْءٍ ذَرَفَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ
 وَلَا اصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ﴿٦٠﴾

تفصیل سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔

(۱) یعنی قیامت والے دن اللہ تعالیٰ ان سے کیا معاملہ فرمائے گا۔

(۲) کہ وہ انسانوں کا دنیا میں فوراً مواخذہ نہیں کرتا، بلکہ اس کے لیے ایک دن مقرر کر رکھا ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ وہ
 دنیا کی نعمتیں بلا تفریق مومن و کافر سب کو دیتا ہے۔ یا جو چیزیں انسانوں کے لیے مفید اور ضروری ہیں، انہیں حلال اور
 جائز قرار دیا ہے، انہیں حرام نہیں کیا۔

(۳) یعنی اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے، یا اس کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کر لیتے ہیں۔

(۴) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ تمام مخلوقات
 کے احوال سے واقف ہے اور ہر لحظہ اور ہر گھڑی انسانوں پر اس کی نظر ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی بڑی چھوٹی چیز اس سے
 مخفی نہیں۔ یہ وہی مضمون ہے جو اس سے قبل سورۃ الانعام، آیت ۵۹ میں گزر چکا ہے کہ ”اسی کے پاس غیب کے
 خزانے ہیں، جنہیں وہی جانتا ہے۔ اسے جنگلوں اور دریاؤں کی سب چیزوں کا علم ہے، اور کوئی پتا نہیں جھڑنا مگر وہ اس کو
 جانتا ہے اور زمین کے اندھروں میں کوئی دانہ اور کوئی ہری اور سوکھی چیز نہیں ہے مگر کتاب مبین میں (لکھی ہوئی) ہے“
 اسی طرح سورۃ الانعام کی آیت ۳۸، اور سورۃ ہود کی آیت ۶ میں بھی اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔ جب واقعہ یہ ہے کہ
 وہ آسمان و زمین میں موجود اشیاء کی حرکتوں کو جانتا ہے تو وہ انسانوں اور جنوں کی ان حرکات و اعمال سے کیوں کر بے خبرہ
 سکتا ہے جو اللہ کی عبادت کے مکلف اور مامور ہیں؟

یاد رکھو اللہ کے دوستوں (۱) پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ
 غمگین ہوتے ہیں۔ (۶۲) (۲)

یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور (برائیوں سے) پرہیز
 رکھتے ہیں۔ (۶۳)

ان کے لیے دنیاوی زندگی میں بھی (۳) اور آخرت میں
 بھی خوش خبری ہے اللہ تعالیٰ کی باتوں میں کچھ فرق ہوا
 نہیں کرتا۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔ (۶۴)

اور آپ کو ان کی باتیں غم میں نہ ڈالیں۔ تمام تر غلبہ اللہ
 ہی کے لیے ہے وہ سنتا جانتا ہے۔ (۶۵)

الَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ لَآخُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۲﴾

الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿۶۳﴾

لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَآبْتَدِيلٌ
 لِّكُلِّبَتِ اللَّهُ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۶۴﴾

وَلَا يَحْزَنُ ذَٰلِكَ لَهُمُ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا
 هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۶۵﴾

(۱) نافرمانوں کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے فرماں برداروں کا ذکر فرما رہا ہے اور وہ ہیں اولیاء اللہ۔ اولیاء ولی کی جمع ہے، جس کے
 معنی لغت میں قریب کے ہیں۔ اس اعتبار سے اولیاء اللہ کے معنی ہوں گے، وہ سچے اور مخلص مومن جنہوں نے اللہ کی
 اطاعت اور معاصی سے اجتناب کر کے اللہ کا قرب حاصل کر لیا۔ اسی لیے اگلی آیت میں خود اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی
 تعریف ان الفاظ سے بیان فرمائی، جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔ اور ایمان و تقویٰ ہی اللہ کے قرب کی
 بنیاد اور اہم ترین ذریعہ ہے، اس لحاظ سے ہر متقی مومن اللہ کا ولی ہے۔ لوگ ولایت کے لیے اظہار کرامت کو ضروری
 سمجھتے ہیں۔ اور پھر وہ اپنے بنائے ہوئے لیوں کے لیے جھوٹی سچی کرامتیں مشہور کرتے ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔
 کرامت کا ولایت سے چولی دامن کا ساتھ ہے نہ اس کے لیے شرط۔ یہ ایک الگ چیز ہے کہ اگر کسی سے کرامت ظاہر ہو
 جائے تو اللہ کی مشیت ہے، اس میں اس بزرگ کی مشیت شامل نہیں ہے۔ لیکن کسی متقی مومن اور متبع سنت سے
 کرامت کا ظہور ہو یا نہ ہو۔ اس کی ولایت میں کوئی شک نہیں۔

(۲) خوف کا تعلق مستقبل سے ہے اور غم (حزن) کا ماضی سے، مطلب یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے زندگی خدا خونی کے
 ساتھ گزاری ہوتی ہے۔ اس لیے قیامت کی ہولناکیوں کا اتنا خوف ان پر نہیں ہو گا، جس طرح دوسروں کو ہو گا۔ بلکہ وہ
 اپنے ایمان و تقویٰ کی وجہ سے اللہ کی رحمت و فضل خاص کے امیدوار اور اس کے ساتھ حسن ظن رکھنے والے ہوں
 گے۔ اسی طرح دنیا میں وہ جو کچھ چھوڑ گئے ہوں گے یا دنیا کی لذتیں انہیں حاصل نہ ہو سکی ہوں گی، ان پر انہیں کوئی
 حزن و ملال نہیں ہو گا۔ ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ دنیا میں جو مطلوبہ چیزیں انہیں نہ ملیں، اس پر وہ غم و حزن کا
 مظاہرہ نہیں کرتے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ سب اللہ کی قضا و تقدیر ہے۔ جس سے ان کے دلوں میں کوئی کدورت پیدا
 نہیں ہوتی، بلکہ ان کے دل قضاے الہی پر مسرور و مطمئن رہتے ہیں۔

(۳) دنیا میں خوشخبری سے مراد، روئے صادقہ ہیں یا وہ خوش خبری ہے جو موت کے وقت فرشتے ایک مومن کو دیتے
 ہیں، جیسا کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔

یاد رکھو کہ جتنے کچھ آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں یہ سب اللہ ہی کے ہیں اور جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے شرکاء کی عبادت کر رہے ہیں کس چیز کی اتباع کر رہے ہیں۔ محض بے سند خیال کی اتباع کر رہے ہیں اور محض افطیس لگا رہے ہیں۔^(۱) (۶۶)

وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن بھی اس طور پر بنایا کہ دیکھنے بھانسنے کا ذریعہ ہے، تحقیق اس میں دلائل ہیں ان لوگوں کے لیے جو سنتے ہیں۔ (۶۷)

وہ کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے۔ سبحان اللہ! وہ تو کسی کا محتاج نہیں^(۲) اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔^(۳) تمہارے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں۔ کیا اللہ کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے۔ (۶۸)

الَّذِينَ لَهُمْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمُ
الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ شُرَكَاءَ اِنَّ
يَكْفُرُونَ بِاللّٰقِنِ وَاِنَّهُمْ اِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿۶۶﴾

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْاَيُّمَ لِتَتَّبِعُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ
مُبْصِرًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّمْسَعُونَ ﴿۶۷﴾

قَالُوْا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ هُوَ الْغَنِيُّ لَهُ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اِنَّ عِنْدَكُمْ مِنْ سُلْطٰنٍ
بِهٰذَا اِتَّفَقُوْا عَلٰى اللّٰهِ مَا لَاتَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

(۱) یعنی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، کسی دلیل کی بنیاد پر نہیں۔ بلکہ یہ محض ظن و تخمین اور رائے و قیاس کی کرشمہ سازی ہے۔ آج اگر انسان اپنے قوائے عقل و فہم کو صحیح طریقے سے استعمال میں لائے تو یقیناً اس پر یہ واضح ہو سکتا ہے کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اور جس طرح وہ آسمان و زمین کی تخلیق میں واحد ہے، کوئی اس کا شریک نہیں ہے تو پھر عبادت میں دوسرے کیوں کر اس کے شریک ہو سکتے ہیں؟

(۲) اور جو کسی کا محتاج نہ ہو، اسے اولاد کی بھی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اولاد تو سہارے کے لیے ہی ہوتی ہے اور جب وہ سہارے کا محتاج نہیں تو پھر اسے اولاد کی کیا ضرورت؟

(۳) جب آسمان و زمین کی ہر چیز اسی کی ہے تو ہر چیز اسی کی مملوک اور غلام ہوئی۔ پھر اسے اولاد کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اولاد کی ضرورت تو اسے ہوتی ہے، جسے کچھ مدد اور سہارے کی ضرورت ہو۔ اور جس کا حکم آسمان و زمین کی ہر چیز پر چلتا ہو، اسے کیا ضرورت لاحق ہو سکتی ہے؟ علاوہ ازیں اولاد کی ضرورت وہ شخص بھی محسوس کرتا ہے جو اپنے بعد مملوکات کا وارث دیکھنا یا بنانا پسند کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ذات کو تو فنا ہی نہیں ہے اس لیے اللہ کے لیے اولاد قرار دینا اتنا بڑا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿ كَذٰلِكَ السَّمٰوٰتُ يَتَّقْنَ مِنْهُ وَتَسْتَخِيْعُ الْاَرْضُ وَرِجَالُهَا هٰكذَا ۗ اَنْ دَعَوْا لِلْجِنِّ وَكَذٰلِكَ ﴾ (مریم ۹۰-۹۱) ”اس بات سے کہ وہ کہتے ہیں رحمن کی اولاد ہے، قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑے، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔“

آپ کہہ دیجئے کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ افترا کرتے ہیں،^(۱) وہ کامیاب نہ ہوں گے۔^(۲) (۶۹)

یہ دنیا میں تھوڑا ساعیش ہے پھر ہمارے پاس ان کو آنا ہے پھر ہم ان کو ان کے کفر کے بدلے سخت عذاب چکھائیں گے۔ (۷۰)

اور آپ ان کو نوح (علیہ السلام) کا قصہ پڑھ کر سنائیے جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم! اگر تم کو میرا رہنا اور احکام الہی کی نصیحت کرنا بھاری معلوم ہوتا ہے تو میرا تو اللہ ہی پر بھروسہ ہے۔ تم اپنی تدبیر مع اپنے شرکا کے پختہ کر لو^(۳) پھر تمہاری تدبیر تمہاری گھٹن کا باعث نہ ہونی چاہیے۔^(۴) پھر میرے ساتھ کرگزر دو اور مجھ کو مہلت نہ دو۔ (۷۱)

پھر بھی اگر تم اعراض ہی کیے جاؤ تو میں نے تم سے کوئی

قُلْ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴿۱﴾

مَتَاعًا فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُنذِرُهُم
العَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۲﴾

وَأَنْتَ عَلَيْهِمْ نَبَأٌ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ لَقَوْمِ! كَانَ كِبَارَكُمْ
تَقَالِبُ وَتَذَكَّرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَّ اللَّهُ تَوَكُّلْتَ فَأَجْمَعُوا
أَمْزَلَكُمْ وَلَسْرَكُمْ فَكُذِّبَتْ أَمْزَلَكُمْ عَلَيْكُمْ عُذَّةٌ تَمْرًا قَضُوا إِلَّا
وَأَنْتَ تَطْوِرُونَ ﴿۳﴾

فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاءَ لَكُمْ مِنَ الْعِزِّ إِنَّ أَعْيُنَ اللَّهِ

(۱) افترا کے معنی جھوٹی بات کہنے کے ہیں۔ اس کے بعد مزید ”جھوٹ“ کا اضافہ تاکید کے لیے ہے۔

(۲) اس سے واضح ہے کہ کامیابی سے مراد آخرت کی کامیابی یعنی اللہ کے غضب اور اس کے عذاب سے بچ جانا ہے محض دنیا کی عارضی خوش حالی، کامیابی نہیں۔ جیسا کہ بہت سے لوگ کافروں کی عارضی خوش حالی سے مغالطے کا اور شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے اگلی آیت میں فرمایا کہ ”یہ دنیا میں تھوڑا ساعیش کر لیں پھر ہمارے ہی پاس ان کو آنا ہے“ یعنی یہ دنیا کا عیش، آخرت کے مقابلے میں نہایت قلیل اور تھوڑا سا ہے جو شمار میں نہیں۔ اس کے بعد انہیں عذاب شدید سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس لیے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ کافروں، مشرکوں اور اللہ کے نافرمانوں کی دنیاوی خوشحالی اور مادی ترقیاں، یہ اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ یہ قومیں کامیاب ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہے۔ یہ مادی کامیابیاں ان کی حمد مسلسل کا ثمرہ ہیں جو اسباب ظاہری کے مطابق ہر اس قوم کو حاصل ہو سکتی ہیں جو اسباب کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کی طرح محنت کرے گی، چاہے وہ مومن ہو یا کافر۔ علاوہ ازیں یہ عارضی کامیابیاں اللہ کے قانون مہلت کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہیں۔ جس کی وضاحت اس سے قبل بعض جگہ ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔

(۳) یعنی جن کو تم نے اللہ کا شریک ٹھہرا رکھا ہے ان کی مدد بھی حاصل کر لو، (اگر وہ تمہارے زعم کے مطابق تمہاری مدد کر سکتے ہیں)

(۴) عُذَّةٌ کے دوسرے معنی ہیں، ابھام اور پوشیدگی۔ یعنی میرے خلاف تمہاری تدبیر واضح اور غیر مبہم ہونی چاہیے۔

وَأَمْرُ أَنْ أَلُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ ﴿٥١﴾

معاوضہ تو نہیں مانگا،^(۱) میرا معاوضہ تو صرف اللہ ہی کے ذمہ ہے اور مجھ کو حکم کیا گیا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے رہوں۔^(۲) (۷۲)

سو وہ لوگ ان کو جھٹلاتے رہے^(۳) پس ہم نے ان کو اور جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے ان کو نجات دی اور ان کو جانشین بنایا^(۴) اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ان کو غرق کر دیا۔ سو دیکھنا چاہیے کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ڈرائے جا چکے تھے۔ (۷۳)

پھر نوح (علیہ السلام) کے بعد ہم نے اور رسولوں کو ان کی قوموں کی طرف بھیجا سو وہ ان کے پاس روشن دلیلیں لے کر آئے^(۵) پس جس چیز کو انہوں نے اول میں جھوٹا کہہ دیا یہ نہ ہوا کہ پھر اس کو مان لیتے۔^(۶) اللہ تعالیٰ اسی طرح حد سے

كَذَّبُوهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي الْفُلَيْنِ وَجَعَلْنَاهُمْ خَلْقًا
وَاعْرِفْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُنْذِرِينَ ﴿٥٢﴾

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ فَجَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ
فَمَا كَانُوا لِلْيُؤْمِنِ بِهَا كَذَّبُوا بِهَا مِنْ قَبْلُ كَذَلِكَ نَطْبَعُ عَلَىٰ
فُؤَادِ الْمُبْتَدِينَ ﴿٥٣﴾

(۱) کہ جس کی وجہ سے تم یہ تمہمت لگا سکو کہ دعوائے نبوت سے اس کا مقصد تو مال و دولت کا اکٹھا کرنا ہے۔

(۲) حضرت نوح علیہ السلام کے اس قول سے بھی معلوم ہوا کہ تمام انبیاء کا دین اسلام ہی رہا ہے۔ گو شرائع مختلف اور نتائج متعدد رہے۔ جیسا کہ آیت ﴿لِخَلْقِ جَعَلْنَا لَكُمْ شُرْعَةً وَفَعَلْنَا لَكُمْ﴾ (العنکبوت: ۴۸) سے واضح ہے۔ لیکن دین سب کا اسلام تھا، ملاحظہ ہو سورۃ النمل، ۹۱۔ سورۃ البقرۃ، ۱۳۱-۱۳۲، سورۃ یوسف، ۱۰۱۔ سورۃ یونس، ۸۳، سورۃ الأعراف، ۱۲۶، سورۃ النمل، ۳۴۔ سورۃ المائدۃ، ۴۳ اور سورۃ الأنعام، ۱۶۲-۱۶۳

(۳) یعنی قوم نوح علیہ السلام نے تمام تر وعظ و نصیحت کے باوجود تکذیب کا راستہ نہیں چھوڑا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کو ایک کشتی میں بٹھا کر بچا لیا اور باقی سب کو حتیٰ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ایک بیٹے کو بھی غرق کر دیا۔

(۴) یعنی زمین میں ان بچنے والوں کو ان سے پہلے کے لوگوں کا جانشین بنایا۔ پھر انسانوں کی آئندہ نسل انہی لوگوں بالخصوص حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سے چلی، اسی لیے حضرت نوح علیہ السلام کو آدم ثانی کہا جاتا ہے۔

(۵) یعنی ایسے دلائل و معجزات لے کر آئے جو اس بات پر دلالت کرتے تھے کہ واقعی یہ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث فرمایا ہے۔

(۶) لیکن یہ امتیں رسولوں کی دعوت پر ایمان نہیں لائیں، محض اس لیے کہ جب اول اول یہ رسول ان کے پاس آئے تو فوراً بغیر غور و فکر کئے، ان کا انکار کر دیا۔ اور یہ پہلی مرتبہ کا انکار ان کے لیے مستقل حجاب بن گیا۔ اور وہ یہی سوچتے رہے کہ ہم تو پہلے انکار کر چکے ہیں، اب اس کو کیا ماننا؟ نتیجتاً ایمان سے وہ محروم رہے۔

بڑھنے والوں کے دلوں پر بند لگا دیتا ہے۔^(۱) (۷۳)
 پھر ان پیغمبروں کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون (علیہما
 السلام) کو،^(۲) فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس
 اپنی نشانیاں دے کر بھیجا۔^(۳) سو انہوں نے تکبر کیا اور وہ
 لوگ مجرم قوم تھے۔^(۴) (۷۵)

پھر جب ان کو ہمارے پاس سے صحیح دلیل پہنچی تو وہ لوگ
 کہنے لگے کہ یقیناً یہ صریح جادو ہے۔^(۵) (۷۶)

موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم اس صحیح دلیل کی
 نسبت جب کہ وہ تمہارے پاس پہنچی ایسی بات کہتے ہو کیا یہ
 جادو ہے، حالانکہ جادو گر کامیاب نہیں ہوا کرتے۔^(۶) (۷۷)
 وہ لوگ کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ
 ہم کو اس طریقہ سے ہٹا دو جس پر ہم نے اپنے باپ

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِم مُّوسَىٰ وَهَارُونَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ
 بِآيَاتِنَا فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ۝

فَلَمَّا جَاءَهُم الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا إِنَّ هَذَا لَيَسْحَرٌ مُّبِينٌ ۝

قَالَ مُوسَىٰ أَتَقُولُونَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَكُمْ أَسِحْرٌ هَذَا أَوْ لَدُنَّا
 السَّحَرُونَ ۝

قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَآبَاءَكُمْ إِنَّا وَكُنَّا لَكُمْ
 الْكُفْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ وَمَا نَحْنُ لَكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ ۝

(۱) یعنی جس طرح ان گزشتہ قوموں پر ان کے کفر و تکذیب کی وجہ سے میریں لگتی رہی ہیں اسی طرح آئندہ بھی جو قوم
 رسولوں کو جھٹلائے گی اور اللہ کی آیتوں کا انکار کرے گی، ان کے دلوں پر مر لگتی رہے گی اور ہدایت سے وہ اسی طرح
 محروم رہے گی، جس طرح گزشتہ قومیں محروم رہیں۔

(۲) رسولوں کے عمومی ذکر کے بعد، حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا ذکر کیا جا رہا ہے، دریاں حالیکہ رسول کے تحت میں وہ
 بھی آجاتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کا شمار جلیل القدر رسولوں میں ہوتا ہے، اس لیے خصوصی طور پر ان کا الگ ذکر فرمایا۔

(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ معجزات، بالخصوص نو آیات بینات، جن کا ذکر اللہ نے سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۰۱
 میں کیا ہے۔ مشہور ہیں۔

(۴) یعنی چونکہ وہ بڑے بڑے جرائم اور گناہوں کے عادی تھے۔ اس لیے انہوں نے اللہ کے بھیجے ہوئے رسول کے
 ساتھ بھی استکبار کا معاملہ کیا۔ کیونکہ ایک گناہ، دوسرے گناہ کا ذریعہ بنتا اور گناہوں پر اصرار بڑے بڑے گناہوں کے
 ارتکاب کی جرأت پیدا کر دیتا ہے۔

(۵) جب انکار کے لیے کوئی معقول دلیل نہیں ہوتی تو اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے۔

(۶) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا، ذرا سوچو تو سہی، حق کی دعوت اور صحیح بات کو تم جادو کہتے ہو، بھلا یہ جادو ہے؟
 جادو گر تو کامیاب ہی نہیں ہوتے۔ یعنی مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے اور ناپسندیدہ انجام سے بچنے میں وہ ناکام ہی رہتے ہیں۔
 اور میں تو اللہ کا رسول ہوں، مجھے اللہ کی مدد حاصل ہے اور اس کی طرف سے مجھے معجزات اور آیات بینات عطا کی گئی
 ہیں مجھے محروم ساری کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور اللہ کے عطا کردہ معجزات کے مقابلے میں اس کی حیثیت ہی کیا ہے؟

دادوں کو پایا ہے اور تم دونوں کو دنیا میں بڑائی مل جائے^(۱) اور ہم تم دونوں کو کبھی نہ مانیں گے۔ (۷۸)
اور فرعون نے کہا کہ میرے پاس تمام ماہر جادو گروں کو حاضر کرو۔ (۷۹)

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُونِي بِحُجْرٍ مَّجِيدٍ ۝

پھر جب جادو گر آئے تو موسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کہ ڈالو جو کچھ تم ڈالنے والے ہو۔ (۸۰)
سو جب انہوں نے ڈالا تو موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ جو کچھ تم لائے ہو جاو ہے۔ یقینی بات ہے کہ اللہ اس کو ابھی درہم برہم کیے دیتا ہے،^(۲) اللہ ایسے فسادوں کا کام بننے نہیں دیتا۔^(۳) (۸۱)

فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالُوا لَمْ نُؤْمِسْ بِالْقَوْمِ اِنَّهُمْ كَانُوا كٰفِرِيْنَ ۝

اور اللہ تعالیٰ حق کو اپنے فرمان سے^(۴) ثابت کر دیتا ہے گو مجرم کیسا ہی ناگوار سمجھیں۔ (۸۲)

فَلَمَّا اَلْقَوْا قَالُوا مَوْجٌ مَّرْكُومٌ يُّؤْتِي السَّحَرٰتَ اللّٰهَ سَبِيْطَةً ۝
اِنَّ اللّٰهَ لَاصْبِرٌ عَلٰى الْمُفْسِدِيْنَ ۝

وَيُخَيِّطُ اللّٰهُ النَّعْصَ بِحُكْمَتِهِ وَيُؤَكِّرُهُ الْمَجْرُمُوْنَ ۝

پس موسیٰ (علیہ السلام) پر ان کی قوم میں سے صرف قدرے

فَمَا اَمَّنَ لِمَوْسٰى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ

(۱) یہ منکرین کی دیگر کٹ جھیاں ہیں جو دلائل سے عاجز آکر، پیش کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم ہمیں ہمارے آباء و اجداد کے راستے سے ہٹانا چاہتے ہو، دوسرے یہ کہ ہمیں جاہ و ریاست حاصل ہے، اسے ہم سے چھین کر خود اس پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔ اس لیے ہم تو کبھی بھی تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔ یعنی تقلید آباء پر اصرار اور دنیوی جاہ و مرتبت کی خواہش نے انہیں ایمان لانے سے روک رکھا۔ اس کے بعد آگے وہی قصہ ہے کہ فرعون نے ماہر جادو گروں کو بلایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادو گروں کا مقابلہ ہوا، جیسا کہ سورہ اعراف میں گزرا اور سورہ طہ میں بھی اس کی کچھ تفصیل آئے گی۔

(۲) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بھلا جھوٹ بھی، سچ کے مقابلے میں کامیاب ہو سکتا ہے؟ جادو گروں نے، چاہے وہ اپنے فن میں کتنے ہی درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے، جو کچھ پیش کیا، وہ جادو ہی تھا اور نظر کی شعبہ بازی ہی تھی اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اپنا عصا پھینکا تو اس نے ساری شعبہ بازیوں کو آن واحد میں ختم کر دیا۔

(۳) اور یہ جادو گر بھی مفسدین تھے۔ جنہوں نے محض دنیا کمانے کے لیے جادو گری کا فن سیکھا ہوا تھا اور جادو کے کرتب دکھا کر لوگوں کو بے وقوف بناتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کے اس عمل فساد کو کس طرح سنوار سکتا تھا؟

(۴) یا کلمات سے مراد وہ دلائل و براہین ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنی کتابوں میں اتار تا رہا ہے جو پیغمبروں کو وہ عطا فرماتا تھا۔ یا وہ معجزات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے انبیاء کے ہاتھوں سے صادر ہوتے تھے، یا اللہ کا وہ حکم ہے جو وہ لفظ کُن سے صادر فرماتا ہے۔

قلیل آدمی ایمان لائے^(۱) وہ بھی فرعون سے اور اپنے حکام سے ڈرتے ڈرتے کہ کہیں ان کو تکلیف پہنچائے^(۲) اور واقع میں فرعون اس ملک میں زور رکھتا تھا، اور یہ بھی بات تھی کہ وہ حد سے باہر ہو جاتا تھا۔^(۳) (۸۳)

اور موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر توکل کرو اگر تم مسلمان ہو۔^(۴) (۸۳)
انہوں نے عرض کیا کہ ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا۔ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ان ظالموں کے لئے فتنہ نہ بنا۔ (۸۵)

وَمَا يَوْمِعَنْ يَفْتَنَهُمْ وَلَئِنْ فَرَعُونَ لَعَالَمٍ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّ
لِإِبْنِ الْمَرْثِيِّ (۱۰)

وَقَالَ مُوسَىٰ يَا قَوْمِ إِيَّاكُمْ يُلَاقِيكُمْ رَبُّكُمْ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَتَوَكَّلْ عَلَى
الظَّالِمِينَ (۱۱)

(۱) قَوْمِهِ کے "ہ" کے مرجع میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض نے اس کا مرجع حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قرار دیا ہے۔ کیونکہ آیت میں ضمیر سے پہلے انہی کا ذکر ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھوڑے سے آدمی ایمان لائے۔ لیکن امام ابن کثیر وغیرہ نے اس کا مرجع فرعون کو قرار دیا ہے۔ یعنی فرعون کی قوم میں سے تھوڑے سے لوگ ایمان لائے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے لوگ تو ایک رسول اور نجات دہندہ کے انتظار میں تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صورت میں انہیں مل گئے اور اس اعتبار سے سارے بنی اسرائیل (سوائے قارون کے) ان پر ایمان رکھتے تھے۔ اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ ﴿ذُرِّيَّةٌ مِّن قَوْمِهِ﴾ سے مراد، فرعون کی قوم سے تھوڑے سے لوگ ہیں، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔ انہی میں سے اس کی بیوی (حضرت آسیہ) بھی ہیں۔

(۲) قرآن کریم کی یہ صراحت بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ ایمان لانے والے تھوڑے سے لوگ فرعون کی قوم میں سے تھے، کیونکہ انہی کو فرعون اور اس کے درباریوں اور حکام سے تکلیف پہنچائے جانے کا ڈر تھا۔ بنی اسرائیل، ویسے تو فرعون کی غلامی و محکومی کی ذلت ایک عرصے سے برداشت کر رہے تھے۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا نہ انہیں اس وجہ سے مزید تکالیف کا اندیشہ تھا۔

(۳) اور ایمان لانے والے اس کے اسی ظلم و ستم کی عادت سے خوف زدہ تھے۔

(۴) بنی اسرائیل، فرعون کی طرف سے جس ذلت و رسوائی کا شکار تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد بھی اس میں کمی نہیں آئی، اس لیے وہ سخت پریشان تھے، بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے انہوں نے یہ تک کہہ دیا، اے موسیٰ! جس طرح تیرے آنے سے پہلے ہم فرعون اور اس کی قوم کی طرف سے تکلیفوں میں مبتلا تھے، تیرے آنے کے بعد بھی ہمارا یہی حال ہے۔ جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا تھا کہ امید ہے کہ میرا رب جلد ہی تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم صرف ایک اللہ سے مدد چاہو اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ (ملاحظہ ہو، سورۃ الأعراف آیات ۱۲۸-۱۲۹) یہاں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تلقین کی کہ اگر تم اللہ کے سچے فرمانبردار ہو تو اسی پر توکل کرو۔

وَعَجَّابِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝

اور ہم کو اپنی رحمت سے ان کافر لوگوں سے نجات دے۔^(۱) (۸۶)

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے بھائی کے پاس وحی بھیجی کہ تم دونوں اپنے ان لوگوں کے لیے مصر میں گھر برقرار رکھو اور تم سب اپنے انہی گھروں کو نماز پڑھنے کی جگہ قرار دے لو^(۲) اور نماز کے پابند رہو اور آپ مسلمانوں کو بشارت دے دیں۔ (۸۷)

اور موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا اے ہمارے رب! تو نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو سالمان زینت اور طرح طرح کے مال دنیاوی زندگی میں دیئے۔ اے ہمارے رب! (اسی واسطے دیئے ہیں کہ) وہ تیری راہ سے گمراہ کریں۔ اے ہمارے رب! انکے مالوں کو نیست و نابود کر دے اور انکے دلوں کو سخت کر دے^(۳) سو یہ ایمان نہ لانے پائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں۔^(۴) (۸۸)

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوَّءَا لِقَوْمِكُمَا
بِصُرِّيُوتًا وَأَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ
وَدَيِّرُوا الْمُؤْمِنِينَ ۝

وَقَالَ مُوسَىٰ رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَكَ أَزِيْمَةً
وَأَمْوَالِيَ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَن سَبِيْلِكَ رَبَّنَا
اطْمِسْ عَلٰی أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتَّىٰ
يُرُوْا الْعَذَابَ الْأَلِيْمَ ۝

(۱) اللہ پر توکل کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے بارگاہ الہی میں دعائیں بھی کیں۔ اور یقیناً اہل ایمان کے لیے یہ ایک بہت بڑا ہتھیار بھی ہے اور سہارا بھی۔

(۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے گھروں کو ہی مسجدیں بنا لو اور ان کا رخ اپنے قبلے (بیت المقدس) کی طرف کر لو۔ تاکہ تمہیں عبادت کرنے کے لیے باہر کینسوں وغیرہ میں جانے کی ضرورت ہی نہ رہے، جہاں تمہیں فرعون کے کارندوں کے ظلم و ستم کا ڈر رہتا ہے۔

(۳) جب موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ فرعون اور اس کی قوم پر وعظ و نصیحت کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا اور اس طرح معجزات دیکھ کر بھی ان کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تو پھر ان کے حق میں بددعا فرمائی، جسے اللہ نے یہاں نقل فرمایا ہے۔

(۴) یعنی اگر یہ ایمان لائیں بھی تو عذاب دیکھنے کے بعد لائیں، جو ان کے لیے نفع بخش نہیں ہو گا۔ یہاں ذہن میں یہ اشکال نہیں آنا چاہیے کہ پیغمبر تو ہدایت کی دعا کرتے ہیں نہ کہ ہلاکت کی بددعا۔ اس لیے کہ دعوت و تبلیغ اور ہر طرح سے اتمام حجت کے بعد، جب یہ واضح ہو جائے کہ اب ایمان لانے کی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے، تو پھر آخری چارہ کار یہی رہ جاتا ہے کہ اس قوم کے معاملے کو اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ گویا اللہ کی مشیت ہی ہوتی ہے جو بے اختیار پیغمبر کی زبان پر جاری ہو جاتی ہے۔ جس طرح حضرت نوح علیہ السلام نے بھی ساڑھے نو سو سال تبلیغ کرنے کے بعد بالآخر اپنی قوم کے بارے میں بددعا فرمائی،

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی، سو تم ثابت قدم رہو^(۱) اور ان لوگوں کی راہ نہ چلنا جن کو علم نہیں۔^(۲) (۸۹)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کر دیا^(۳) پھر ان کے پیچھے پیچھے فرعون اپنے لشکر کے ساتھ ظلم اور زیادتی کے ارادہ سے چلا یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا^(۴) تو کہنے لگا کہ میں ایمان لاتا ہوں کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ (۹۰)

(جواب دیا گیا کہ) اب ایمان لاتا ہے؟ اور پہلے سرکشی

قَالَ قَدْ أُجِيبْتُ دَعْوَتِكُمْ فَأَسْتَقِيمُ وَلَا تَتَّبِعِينَ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۸۹﴾

وَجُورًا بِنَايِبِنَا إِلَيْنَا يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْبُحْرَ فَاتَّبَعْنَاهُمْ فَرَعُونَ وَجُودًا بَيْنَنَا وَعَدُوًّا حَتَّىٰ إِذَا أَدْرَكَهُ الْعُرْقُ قَالَ أَمْنٌ أَنَّهُ لَإِلَهِ إِلَّا الَّذِي آمَنْتُ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۹۰﴾

الَّذِينَ وَقَدَّحَصَيْتَ قَبْلَ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ﴿۹۱﴾

﴿ رَبِّ لَآ تَدْرُدْنِي إِلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكُفْرَيْنِ ذِكْرًا ﴾ (نوح-۲۶) ”اے رب زمین پر ایک کافر کو بھی بسانہ رہنے دے۔“

(۱) اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اپنی بددعا پر قائم رہنا، چاہے اس کے ظہور میں تاخیر ہو جائے۔ کیونکہ تمہاری دعا تو یقیناً قبول کر لی گئی ہے لیکن ہم اسے عملی جامہ کب پہنائیں گے؟ یہ خالص ہماری مشیت و حکمت پر موقوف ہے۔ چنانچہ بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اس بددعا کے چالیس سال بعد فرعون اور اس کی قوم ہلاک کی گئی اور بددعا کے مطابق فرعون جب ڈوبنے لگا، تو اس وقت اس نے ایمان لانے کا اعلان کیا، جس کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ تم اپنی تبلیغ و دعوت، بنی اسرائیل کی ہدایت و رہنمائی اور اس کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے کی جدوجہد جاری رکھو۔

(۲) یعنی جو لوگ اللہ کی سنت، اس کے قانون، اور اس کی مصلحتوں اور حکمتوں کو نہیں جانتے، تم ان کی طرح مت ہونا بلکہ اب انتظار اور صبر کرو، اللہ تعالیٰ اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق جلد یا بہ دیر اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا۔ کیوں کہ وہ وعدہ غلامی نہیں کرتا۔

(۳) یعنی سمندر کو پھاڑ کر، اس میں خشک راستہ بنا دیا۔ (جس طرح کہ سورہ بقرہ آیت ۵۰ میں گزرا اور مزید تفصیل سورہ شعراء میں آئے گی) اور تمہیں ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر پہنچا دیا۔

(۴) یعنی اللہ کے حکم سے معجزانہ طریق پر بنے ہوئے خشک راستے پر، جس پر چل کر موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم نے سمندر پار کیا تھا، فرعون اور اس کا لشکر بھی سمندر پار کرنے کی غرض سے چلنا شروع ہو گیا۔ مقصد یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو جو میری غلامی سے نجات دلانے کے لیے راتوں رات لے آیا تو اسے دوبارہ قید غلامی میں لایا جائے۔ جب فرعون اور اس کا لشکر، اس سمندری راستے میں داخل ہو گیا تو اللہ نے سمندر کو حسب سابق جاری ہو جانے کا حکم دے دیا۔ نتیجتاً فرعون سمیت سب کے سب غرق دریا ہو گئے۔

کرتا رہا اور مفسدوں میں داخل رہا۔ (۹۱)^(۱)
 سو آج ہم صرف تیری لاش کو نجات دیں گے تاکہ تو ان کے
 لیے نشان عبرت ہو جو تیرے بعد ہیں (۳) اور حقیقت یہ ہے
 کہ بہت سے آدمی ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔ (۹۲)
 اور ہم نے بنی اسرائیل کو بہت اچھا ٹھکانا رہنے کو دیا
 اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزیں کھانے کو دیں۔ سو
 انہوں نے اختلاف نہیں کیا یہاں تک کہ ان کے پاس
 علم پہنچ گیا۔ (۳) یقینی بات ہے کہ آپ کا رب ان کے
 درمیان قیامت کے دن ان امور میں فیصلہ کرے گا جن
 میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ (۹۳)

پھر اگر آپ اس کی طرف سے شک میں ہوں جس کو ہم
 نے آپ کے پاس بھیجا ہے تو آپ ان لوگوں سے پوچھ
 دیکھیے جو آپ سے پہلی کتابوں کو پڑھتے ہیں۔ بیشک آپ
 کے پاس آپ کے رب کی طرف سے سچی کتاب آئی ہے۔
 آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔ (۹۴)^(۴)

فَالْيَوْمَ نُجَيِّبُكَ بِدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلَقَكَ آيَةً وَإِنَّ كَيْدَ
 مِنَ النَّاسِ عَنِ آيَاتِنَا لَغَفِيلُونَ ﴿۹۲﴾

وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مُبَوَّأً صِدْقٍ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ
 الطَّيِّبَاتِ فَمَا اخْتَلَفُوا حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْعِلْمُ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي
 بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۹۳﴾

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِينَ يُقْرَأُونَ
 الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَاءَكَ إِذْ أُوحِيَ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَ
 مِنَ الْمُنْتَرِينَ ﴿۹۴﴾

(۱) اللہ کی طرف سے جواب دیا گیا کہ اب ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ جب ایمان لانے کا وقت تھا، اس وقت تو
 نافرمانیوں اور فساد انگیزیوں میں مبتلا رہا۔

(۲) جب فرعون غرق ہو گیا تو اس کی موت کا بہت سے لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم دیا، اس
 نے اس کی لاش کو باہر خشکی پر بھیٹک دیا، جس کا مشاہدہ پھر سب نے کیا۔ مشہور ہے کہ آج بھی یہ لاش مصر کے عجائب
 خانے میں محفوظ ہے۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

(۳) یعنی ایک تو اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے آپس میں اختلاف شروع کر دیا، پھر یہ اختلاف بھی لاعلمی اور جہالت کی وجہ
 سے نہیں کیا، بلکہ علم آجانے کے بعد کیا۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ اختلاف محض عناد اور تکبر کی بنیاد پر تھا۔

(۴) یہ خطاب یا تو عام انسانوں کو ہے یا پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے امت کو تعلیم دی جا رہی ہے۔ کیونکہ نبی
 صلی اللہ علیہ وسلم کو تو وحی کے بارے میں کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ”جو کتاب پڑھتے ہیں، ان سے پوچھ لیں“ کا
 مطلب ہے کہ قرآن مجید سے پہلے کی آسمانی کتابیں، (تورات وانجیل وغیرہ) یعنی جن کے پاس یہ کتابیں موجود ہیں ان سے
 اس قرآن کی بابت معلوم کریں کیونکہ ان میں اس کی نشانیاں اور آخری پیغمبر کی صفات بیان کی گئی ہیں۔

اور نہ ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلایا، کہیں آپ خسارہ پانے والوں میں سے نہ ہو جائیں۔^(۱) (۹۵)

یقیناً جن لوگوں کے حق میں آپ کے رب کی بات ثابت ہو چکی ہے وہ ایمان نہ لائیں گے۔ (۹۶)
گو ان کے پاس تمام نشانیاں پہنچ جائیں جب تک کہ وہ دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں۔^(۲) (۹۷)
چنانچہ کوئی بستی ایمان نہ لائی کہ ایمان لانا اس کو نافع ہوتا سوائے یونس (علیہ السلام) کی قوم کے۔^(۳) جب وہ ایمان

وَلَا يَتُوبُونَ مِنَ الذَّنْبِ كَذَّبُوا آيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونُ مِنَ
الْخَاسِرِينَ ﴿۹۵﴾

إِنَّ الذَّنْبَ حَمَلَتْ عَلَيْهِمْ كَيْدُتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۹۶﴾
وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوْا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿۹۷﴾

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعْنَا إِلَىٰ نَارِهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ ﴿۹۸﴾

(۱) یہ بھی دراصل مخاطب امت کو سمجھایا جا رہا ہے کہ تکذیب کا راستہ خسران اور تباہی کا راستہ ہے۔

(۲) یہ وہی لوگ ہیں جو کفر و معصیت الہی میں اتنے غرق ہو چکے ہوتے ہیں کہ کوئی وعظ ان پر اثر نہیں کرتا اور کوئی دلیل ان کے لیے کارگر نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ نافرمانیاں کر کر کے قبول حق کی فطری استعداد و صلاحیت کو وہ ختم کر لے ہوتے ہیں، ان کی آنکھیں اگر کھلتی ہیں تو اس وقت، جب عذاب الہی ان کے سروں پر آجاتا ہے، تب وہ ایمان اللہ کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوتا۔ ﴿فَكَذَّبْتَ وَيَنْفَعُكُمْ إِيمَانُكُمْ لَكِنَّا لَا نَبْتَئِهَا﴾ (المؤمن ۸۵) ”جب وہ ہمارا عذاب دیکھ چکے (اس وقت) ان کے ایمان نے انہیں کوئی فائدہ نہیں دیا۔“

(۳) لَوْلَا یہاں تخصیض کے لیے، هَلَّا کے معنی میں ہے یعنی جن بستیوں کو ہم نے ہلاک کیا، ان میں کوئی ایک بستی بھی ایسی کیوں نہ ہوئی جو ایسا ایمان لاتی جو اس کے لیے فائدے مند ہوتا، ہاں صرف یونس علیہ السلام کی قوم ایسی ہوئی ہے کہ جب وہ ایمان لے آئی تو اللہ نے اس سے عذاب دور کر دیا۔ اس کا مختصر پس منظر یہ ہے کہ یونس علیہ السلام نے جب دیکھا کہ ان کی تبلیغ و دعوت سے ان کی قوم متاثر نہیں ہو رہی تو انہوں نے اپنی قوم میں اعلان کر دیا کہ فلاں فلاں دن تم پر عذاب آجائے گا اور خود وہاں سے نکل گئے۔ جب عذاب بادل کی طرح ان پر اُمڈ آیا تو وہ بچوں، عورتوں حتیٰ کہ جانوروں سمیت ایک میدان میں جمع ہو گئے اور اللہ کی بارگاہ میں عاجزی و انکساری اور توبہ و استغفار شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرما کر ان سے عذاب نال دیا، حضرت یونس علیہ السلام آنے جانے والے مسافروں سے اپنی قوم کا حال معلوم کرتے رہتے تھے، انہیں جب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم سے عذاب نال دیا ہے، تو انہوں نے اپنی تکذیب کے بعد اس قوم میں جانا پسند نہیں کیا بلکہ ان سے ناراض ہو کر وہ کسی اور طرف روانہ ہو گئے، جس پر وہ کشتی کا واقعہ پیش آیا (جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی)۔ (فتح القدیر) البتہ مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ قوم یونس ایمان کب لائی؟ عذاب دیکھ کر لائی؟ جب کہ ایمان لانا نافع نہیں ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اس قانون سے مستثنیٰ کر کے اس کے ایمان کو قبول کر لیا۔ یا، ابھی عذاب نہیں آیا تھا یعنی وہ

لے آئے تو ہم نے رسوائی کے عذاب کو دنیوی زندگی میں ان پر سے ٹال دیا اور ان کو ایک وقت (خاص) تک کے لیے زندگی سے فائدہ اٹھانے (کا موقع) دیا۔^(۱) (۹۸) اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے،^(۲) تو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں یہاں تک کہ وہ مومن ہی ہو جائیں۔ (۹۹)

حالانکہ کسی شخص کا ایمان لانا اللہ کے حکم کے بغیر ممکن نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بے عقل لوگوں پر گندگی ڈال دیتا ہے۔^(۳) (۱۰۰)

آپ کہہ دیجئے کہ تم غور کرو کہ کیا کیا چیزیں آسمانوں میں اور زمین میں ہیں اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کو نشانیاں

لَبِئْسَ الْأَمْوَالُ الَّتِي نَكْتُمِبُهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ۝۹۸

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مِنَ فِي الْأَرْضِ كُلَّ مَنٍّ بَعْدَ مَا أَقَانَتْ كَذِبُوا
النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مَوْتِيْنًا ۝۹۹

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُوْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ
عَلَىٰ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝۱۰۰

قُلْ أَنْظِرُوا مَاذَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا تُعْبُدُونَ إِلَّا
وَالَّذِي ذَرَعْنَاهُمْ لَكُم مِّنْ قَبْلِهِمْ وَكُنْتُمْ تُكْفِرُونَ ۝۱۰۱

مرحلہ نہیں آیا تھا کہ جب ایمان نافع نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن کریم نے قوم یونس کا الالاکے ساتھ جو اشتنا کیا ہے وہ پہلی تفسیر کی تائید کرتا ہے۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ .

(۱) قرآن نے دنیوی عذاب کے دور کرنے کی صراحت تو کی ہے، اخروی عذاب کی بابت صراحت نہیں کی، اس لیے بعض مفسرین کے خیال میں اخروی عذاب ان سے ختم نہیں کیا گیا۔ لیکن جب قرآن نے یہ وضاحت کر دی کہ دنیوی عذاب، ایمان لانے کی وجہ سے ٹالا گیا تھا، تو پھر اخروی عذاب کی بابت صراحت کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی ہے۔ کیوں کہ اخروی عذاب کا فیصلہ تو ایمان اور عدم ایمان کی بنیاد پر ہی ہوتا ہے۔ اگر ایمان لانے کے بعد قوم یونس اپنے ایمان پر قائم رہی ہو گی، (جس کی صراحت یہاں نہیں ہے) تو یقیناً وہ اخروی عذاب سے بھی محفوظ رہے گی۔ البتہ بصورت دیگر عذاب سے بچنا صرف دنیا کی حد تک ہی ہو گا۔ واللہ اعلم۔

(۲) لیکن اللہ نے ایسا نہیں چاہا، کیونکہ یہ اس کی اس حکمت و مصلحت کے خلاف ہے، جسے مکمل طور پر وہی جانتا ہے۔ یہ اس لیے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید خواہش ہوتی تھی کہ سب مسلمان ہو جائیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یہ نہیں ہو سکتا کیونکہ مشیت الہی، جو حکمت بالغہ اور مصلحت راجحہ پر مبنی ہے، اس کی مقتضی نہیں۔ اس لیے آگے فرمایا کہ آپ لوگوں کو زبردستی ایمان لانے پر کیسے مجبور کر سکتے ہیں؟ جب کہ آپ کے اندر اس کی طاقت ہے نہ اس کے آپ مکلف ہی ہیں۔

(۳) گندگی سے مراد عذاب یا کفر ہے۔ یعنی جو لوگ اللہ کی آیات پر غور نہیں کرتے، وہ کفر میں ہی مبتلا رہتے ہیں اور یوں عذاب کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

اور دھمکیاں کچھ فائدہ نہیں پہنچاتیں۔ (۱۰۱)

سو وہ لوگ صرف ان لوگوں کے سے واقعات کا انتظار کر رہے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ آپ فرمادیتے ہیں کہ اچھا تو تم انتظار میں رہو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ (۱۰۲)^(۱)

پھر ہم اپنے پیغمبروں کو اور ایمان والوں کو بچا لیتے تھے، اسی طرح ہمارے ذمہ ہے کہ ہم ایمان والوں کو نجات دیا کرتے ہیں۔ (۱۰۳)

آپ کہہ دیجئے^(۲) کہ اے لوگو! اگر تم میرے دین کی طرف سے شک میں ہو تو میں ان معبودوں کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو،^(۳) لیکن ہاں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہاری جان قبض کرتا ہے۔^(۴) اور مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔ (۱۰۴)

اور یہ کہ اپنا رخ یکسو ہو کر (اس) دین کی طرف کر

فَهُمْ يَنْتَظِرُونَ إِلَّا مِثْلَ آيَاتِ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ قُلْ فَانظُرُوا إِلَىٰ مَا لَكُمْ مِنَ الْمُنْتَضِرِينَ ﴿۱۰۱﴾

لَقَدْ رَجَعْنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا كُنَّا لَهُمْ عَصَا عَلِيمَاتٍ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۰۲﴾

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي مُنذِرُكُمْ فِي شَيْءٍ مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تُعْبُدُوا الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ أَعْبُدُوا اللَّهَ الَّذِي يَتَوَكَّلُكُمْ وَأُورِثُكُمْ أَنْ تَكُونُوا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۰۳﴾

وَأَنْ أَقِمَّ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ

(۱) یعنی یہ لوگ، جن پر کوئی دلیل اور دھمکی اثر انداز نہیں ہوتی، لہذا ایمان نہیں لاتے۔ کیا اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے ساتھ بھی وہی تاریخ دہرائی جائے جن سے پچھلی امتیں گزر چکی ہیں۔ یعنی اہل ایمان کو بچا کر (جیسا کہ اگلی آیت میں صراحت ہے) باقی سب کو ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ اگر اسی بات کا انتظار ہے تو ٹھیک ہے، تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کر رہا ہوں۔

(۲) اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرما رہا ہے کہ آپ تمام لوگوں پر یہ واضح کر دیں کہ میرا طریقہ اور مشرکین کا طریقہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

(۳) یعنی اگر تم میرے دین کے بارے میں شک کرتے ہو، جس میں صرف ایک اللہ کی عبادت ہے اور یہی دین حق ہے نہ کہ کوئی اور تو یاد رکھو کہ میں ان معبودوں کی کبھی اور کسی حال میں عبادت نہیں کروں گا، جن کی تم کرتے ہو۔

(۴) یعنی موت و حیات اسی کے ہاتھ میں ہے، اسی لیے جب وہ چاہے تمہیں ہلاک کر سکتا ہے، کیونکہ انسانوں کی جانیں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

الْمُشْرِكِينَ ۵۰

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ تَوَّانٍ
فَعَلَّتْ فِتْنَاكَ إِذَا مِنَ الظَّالِمِينَ ۵۱

وَأَنْ يَسْأَلَكَ اللَّهُ بَضْرًا فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنَّ يُرِيدُ
بِعَذَابِكَ فَلَا رَادَّ لِعَذَابِهِ يَصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ
الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۵۲

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنِ
اهْتَدَىٰ فَأَنَا مَتَّبِعُهُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمَنْ هَلَكَ فَأَنَا مُضِلٌّ

لینا،^(۱) اور کبھی مشرکوں میں سے نہ ہونا۔ (۱۰۵)
اور اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت مت کرنا جو تجھ کو نہ
کوئی نفع پہنچا سکے اور نہ کوئی ضرر پہنچا سکے۔ پھر اگر ایسا کیا
تو تم اس حالت میں ظالموں میں سے ہو جاؤ
گے۔^(۲) (۱۰۶)

اور اگر تم کو اللہ کوئی تکلیف پہنچائے تو بجز اس کے اور کوئی
اس کو دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تم کو کوئی خیر پہنچانا
چاہے تو اس کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں،^(۳) وہ اپنا
فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے بچھا کر دے اور
وہ بڑی مغفرت بڑی رحمت والا ہے۔ (۱۰۷)

آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! تمہارے پاس حق تمہارے
رب کی طرف سے پہنچ چکا ہے،^(۴) اس لیے جو شخص راہ
راست پر آجائے سو وہ اپنے واسطے راہ راست پر آئے

(۱) حَیْنِفٌ کے معنی ہیں۔ ایک سو، یعنی ہر دین کو چھوڑ کر صرف دین اسلام کو اپنانا اور ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف ایک
اللہ کی طرف یکسوئی سے متوجہ ہونا۔

(۲) یعنی اگر اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبودوں کو آپ پکاریں گے جو کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہیں، تو یہ ظلم کا
ارتکاب ہو گا۔ ظلم کے معنی ہیں وَضَعَ الشَّيْءَ فِي غَيْرِ مَحَلِّهِ کسی چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا کر کسی اور جگہ رکھ
دینا۔ عبادت چونکہ صرف اس اللہ کا حق ہے جس نے تمام کائنات بنائی ہے اور تمام اسباب حیات بھی وہی مہیا کرتا ہے تو
اس مستحق عبادت ذات کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کرنا، گویا عبادت کا نہایت ہی غلط استعمال ہے۔ اسی لیے شرک کو ظلم
عظیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں بھی خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن اصل مخاطب افراد انسانی اور امت
محمدیہ ہے۔

(۳) خیر کو یہاں فضل سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ جو بھلائی کا معاملہ فرماتا ہے، اعمال کے
اعتبار سے اگرچہ بندے اس کے مستحق نہیں۔ لیکن یہ محض اس کا فضل ہے کہ وہ اعمال سے قطع نظر کرتے ہوئے،
انسانوں پر پھر بھی رحم و کرم فرماتا ہے۔

(۴) حق سے مراد قرآن اور دین اسلام ہے جس میں توحید الہی اور رسالت محمدی پر ایمان نہایت ضروری ہے۔

گا^(۱) اور جو شخص بے راہ رہے گا تو اس کا بے راہ ہونا اسی پر پڑے گا^(۲) اور میں تم پر مسلط نہیں کیا گیا۔^(۳) (۱۰۸)

اور آپ اس کی اتباع کرتے رہیے جو کچھ آپ کے پاس وحی بھیجی جاتی ہے اور صبر کیجئے^(۴) یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں اچھا ہے۔^(۵) (۱۰۹)

سورہ ہود کی ہے اور اس کی ایک سو تیس آیتیں اور دس رکوع ہیں

شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے۔

عَلَيْهَا وَمَا آتَاكُمْ بِوَكِيلٍ ۝

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَخُذَ اللَّهُ وَهُوَ خَبِيرٌ
الْحَكِيمِينَ ۝



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

- (۱) یعنی اس کا فائدہ اسی کو ہو گا کہ قیامت والے دن اللہ کے عذاب سے بچ جائے گا۔
- (۲) یعنی اس کا نقصان اور وبال اسی پر پڑے گا کہ قیامت کو جہنم کی آگ میں جلے گا۔ گویا کوئی ہدایت کا راستہ اپنانے کا، تو اس سے کوئی اللہ کی طاقت میں اضافہ نہیں ہو جائے گا اور اگر کوئی کفر و منکرات کو اختیار کرے گا تو اس سے اللہ کی حکومت و طاقت میں کوئی فرق واقع نہیں ہو جائے گا۔ گویا ایمان و ہدایت کی ترغیب اور کفر و منکرات سے بچنے کی تاکید و ترہیب، دونوں سے مقصد انسانوں ہی کی بھلائی اور خیر خواہی ہے۔ اللہ کی اپنی کوئی غرض نہیں ہے۔
- (۳) یعنی یہ ذمہ داری مجھے نہیں سونپی گئی ہے کہ میں ہر صورت میں تمہیں مسلمان بنا کر چھوڑوں بلکہ میں تو صرف بشیر اور نذیر اور مبلغ اور داعی ہوں۔ میرا کام صرف اہل ایمان کو خوشخبری دینا، نافرمانوں کو اللہ کے عذاب اور اس کے مواخذے سے ڈرانا اور اللہ کے پیغام کی دعوت و تبلیغ ہے۔ کوئی اس دعوت کو مان کر ایمان لاتا ہے تو ٹھیک ہے، کوئی نہیں مانتا، تو میں اس بات کا مکلف نہیں ہوں کہ اس سے زبردستی منوا کر چھوڑوں۔
- (۴) اللہ تعالیٰ جس چیز کی وحی کرے، اسے مضبوطی سے پکڑ لیں، جس کا امر کرے، اسے عمل میں لائیں، جس سے روکے، رک جائیں اور کسی چیز میں کوتاہی نہ کریں۔ اور وحی کی اطاعت و اتباع میں جو تکلیفیں آئیں، مخالفین کی طرف سے جو ایذائیں پہنچیں اور تبلیغ و دعوت کی راہ میں جن دشواریوں سے گزرنا پڑے، ان پر صبر کریں اور ثابت قدمی سے سب کا مقابلہ کریں۔

(۵) کیونکہ اس کا علم بھی کامل ہے، اس کی قدرت و طاقت بھی وسیع ہے اور اس کی رحمت بھی عام ہے۔ اس لیے اس سے زیادہ بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟

☆ اس سورت میں بھی ان قوموں کا تذکرہ ہے جو آیات الہی اور پیغمبروں کی تکذیب کر کے عذاب الہی کا نشانہ بنیں اور تاریخ کے صفحات سے یا تو حرف غلط کی طرح مٹ گئیں، یا اوراق تاریخ پر عبرت کا نمونہ بنی موجود ہیں۔ اسی لیے حدیث

الر' یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں، پھر صاف صاف بیان کی گئی ہیں (۲) ایک حکیم باخبر کی طرف سے۔ (۱) (۳)

یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو میں تم کو اللہ کی طرف سے ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں۔ (۲) اور یہ کہ تم لوگ اپنے گناہ اپنے رب سے معاف کراؤ پھر اسی کی طرف متوجہ رہو، وہ تم کو وقت مقرر تک اچھا سامان (۳) (زندگی) دے گا اور ہر زیادہ عمل کرنے والے کو زیادہ ثواب دے گا۔ اور اگر تم لوگ اعراض کرتے رہے تو مجھ کو تمہارے لیے ایک بڑے دن (۵) کے عذاب کا اندیشہ ہے۔ (۳)

تم کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے اور وہ ہر شے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ (۴)

الْبَصِيصَ الْحَكِيمَ اِنَّهُ فَصَّلَتْ مِنْ لَدُنْ حٰكِيْمٍ خَبِيْرٍ ①

اَلَا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ رَبِّىْ نَذِيْرٌ ②

وَ اِنْ اسْتَفْهَرُوْا اِرْكَبُوْا نُوْحًا الَّذِيْ يَمُرُّبَعَكُمْ مِّنْ تَمَامًا حَسَنًا اِلَىٰ اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ يُؤْتِي مَلْٔ اٰذًى فَعَلَيْكُمْ فَضْلَةُ اٰنْ تَوَكُّوْا عَلٰى اٰنْحَافٍ عَلٰى كُلِّ مَعْدَابٍ يَوْمَ يُكَيِّدُ ③

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ وَّهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ④

میں آتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کیا بات ہے آپ بوڑھے سے نظر آتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”مجھے سورہ ہود، واقعہ، عم یتساء لون اور اذا الشمس کورت وغیرہ نے بوڑھا کر دیا ہے۔“ (ترمذی۔ نمبر ۳۲۹۷۔ صحیح ترمذی للألبانی ۱۱۳/۳)

(۱) یعنی الفاظ و نظم کے اعتبار سے اتنی محکم اور پختہ ہیں کہ ان کی ترکیب اور معنی میں کوئی خلل نہیں۔

(۲) پھر اس میں احکام و شرائع، مواظب و قصص، عقائد و ایمانیات اور آداب و اخلاق جس طرح وضاحت اور تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، سچیلی کتابوں میں اس کی نظیر نہیں آئی۔

(۳) یعنی اپنے اقوال میں حکیم ہے، اس لیے اس کی طرف سے نازل کردہ باتیں حکمت سے خالی نہیں اور وہ خیر بھی ہے یعنی تمام معاملات اور ان کے انجام سے باخبر ہے۔ اس لیے اس کی باتوں پر عمل کرنے سے ہی انسان برے انجام سے بچ سکتا ہے۔

(۴) یہاں اس سامان دنیا کو جس کو قرآن نے عام طور پر ”متاع غرور“ دھوکے کا سامان۔ کہا ہے، یہاں اسے ”متاع حسن“ قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو آخرت سے غافل ہو کر متاع دنیا سے استفادہ کر لے گا، اس کے لیے یہ متاع غرور ہے، کیونکہ اس کے بعد اسے برے انجام سے دوچار ہونا ہے اور جو آخرت کی تیاری کے ساتھ ساتھ اس سے فائدہ اٹھائے گا اس کے لیے یہ چند روزہ سامان زندگی متاع حسن ہے، کیونکہ اس نے اسے اللہ کے احکام کے مطابق برتا ہے۔

(۵) بڑے دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔

یاد رکھو وہ لوگ اپنے سینوں کو دہرا کیے دیتے ہیں تاکہ اپنی باتیں (اللہ) سے چھپا سکیں۔^(۱) یاد رکھو کہ وہ لوگ جس وقت اپنے کپڑے لپیٹتے ہیں وہ اس وقت بھی سب جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ بالیقین وہ دلوں کے اندر کی باتیں جانتا ہے۔ (۵)

اَلَا اِنَّهُمْ يَدْعُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ اَلَا حِينَ يَسْتَفْتُونَ
رَبَّاهُمْ يُعَلِّمُوْا مَا يُبَيِّنُوْنَ وَ مَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ
الصُّدُوْرِ ۝

(۱) اس کی شان نزول میں مفسرین کا اختلاف ہے، اس لیے اس کے مفہوم میں بھی اختلاف ہے۔ تاہم صحیح بخاری (تفسیر سورہ ہود) میں بیان کردہ شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو غلبہ حیا کی وجہ سے قضائے حاجت اور بیوی سے ہم بستری کے وقت برہنہ ہونا پسند نہیں کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے، اس لیے ایسے موقعوں پر وہ شرم گاہ کو چھپانے کے لیے اپنے سینوں کو دہرا کر لیتے تھے۔ اللہ نے فرمایا کہ رات کو اندھیرے میں جب وہ بستروں میں اپنے آپ کو کپڑوں میں ڈھانپ لیتے تھے، تو اس وقت بھی وہ ان کو دیکھتا اور ان کی چھپی اور علانیہ باتوں کو جانتا ہے۔ مطلب یہ کہ شرم و حیا کا جذبہ اپنی جگہ بست اچھا ہے لیکن اس میں اتنا غلو اور افراط بھی صحیح نہیں، اس لیے کہ جس ذات کی خاطر وہ ایسا کرتے ہیں اس سے تو پھر بھی وہ نہیں چھپ سکتے، تو پھر اس طرح کے تکلف کا کیا فائدہ؟

زمین پر چلنے پھرنے والے جتنے جاندار ہیں سب کی روزیاں اللہ تعالیٰ پر ہیں ^(۱) وہی ان کے رہنے سنے کی جگہ کو جانتا ہے اور ان کے سوچنے جانے ^(۲) کی جگہ کو بھی، سب کچھ واضح کتاب میں موجود ہے۔ (۶)

اللہ ہی وہ ہے جس نے چھ دن میں آسمان و زمین کو پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا ^(۳) تاکہ وہ تمہیں آزمانے کے تم میں سے اچھے عمل والا کون ہے، ^(۴) اگر آپ ان سے کہیں کہ تم لوگ مرنے کے بعد اٹھا کھڑے کیے جاؤ گے تو کافر لوگ پلٹ کر جواب دیں گے کہ یہ تو نرا صاف صاف جا دو ہی ہے۔ (۷)

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رُزُقُهَا
وَيَعْلَمُ مَسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ①

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَلَئِنْ قُلْتُمْ إِنَّكُمْ مَعْبُودُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا كِبْرٌ مِنْهُمْ ②

(۱) یعنی وہ کفیل اور ذمے دار ہے۔ زمین پر چلنے والی ہر مخلوق، انسان ہو یا جن، چرند ہو یا پرند، چھوٹی ہو یا بڑی، بحری ہو یا بری۔ ہر ایک کو اس کی نوعی یا جنسی ضروریات کے مطابق وہ خوراک مہیا کرتا ہے۔

(۲) مستقر اور مستودع کی تعریف میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک منہائے سیر (یعنی زمین میں چل پھر کر جہاں رک جائے) مستقر ہے اور جس کو ٹھکانہ بنائے وہ مستودع ہے۔ بعض کے نزدیک رحم مادر مستقر اور باپ کی حلب مستودع ہے اور بعض کے نزدیک زندگی میں انسان یا حیوان جہاں رہائش پذیر ہو، وہ اس کا مستقر ہے اور جہاں مرنے کے بعد دفن ہو، وہ مستودع ہے۔ (تفسیر ابن کثیر) امام شافعی کہتے ہیں، مستقر سے مراد رحم مادر اور مستودع سے وہ حصہ زمین ہے جس میں دفن ہو اور امام حاکم کی ایک روایت کی بنیاد پر اسی کو ترجیح دی ہے۔ بہر حال جو بھی مطلب لیا جائے، آیت کا مفہوم واضح ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کو ہر ایک کے مستقر و مستودع کا علم ہے، اس لیے وہ ہر ایک کو روزی پہنچانے پر قادر ہے اور ذمے دار ہے اور وہ اپنی ذمے داری پوری کرتا ہے۔

(۳) یہی بات صحیح احادیث میں بھی بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال قبل، مخلوقات کی تقدیر لکھی، اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔“ - صحیح مسلم، کتاب القدر۔ نیز دیکھئے، صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق

(۴) یعنی یہ آسمان و زمین یوں ہی عیب اور بلا مقصد نہیں بنائے، بلکہ اس سے مقصود انسانوں (اور جنوں) کی آزمائش ہے کہ کون اچھے اعمال کرتا ہے؟

ملحوظہ: اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ کون زیادہ عمل کرتا ہے بلکہ فرمایا کون زیادہ اچھے عمل کرتا ہے۔ اس لیے کہ اچھا عمل ہو وہ تا ہے جو صرف رضائے الہی کی خاطر ہو اور دوسرا یہ کہ وہ سنت کے مطابق ہو۔ ان دو شرطوں میں سے ایک شرط بھی فوت ہو جائے گی تو وہ اچھا عمل نہیں رہے گا، پھر وہ چاہے کتنا بھی زیادہ ہو، اللہ کے ہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

اور اگر ہم ان سے عذاب کو گنی جینی مدت تک کے لیے پیچھے ڈال دیں تو یہ ضرور پکارا اٹھیں گے کہ عذاب کو کون سی چیز روکے ہوئے ہے، سنو! جس دن وہ ان کے پاس آئے گا پھر ان سے ملنے والا نہیں پھر تو جس چیز کی ہنسی اڑا رہے تھے وہ انہیں گھیر لے گی۔ (۸)

اگر ہم انسان کو اپنی کسی نعمت کا ذائقہ چکھا کر پھر اسے اس سے لے لیں تو وہ بہت ہی ناامید اور برا ہی ناشکر بن جاتا ہے۔ (۹)

اور اگر ہم اسے کوئی نعمت چکھائیں اس سختی کے بعد جو اسے پہنچ چکی تھی تو وہ کہنے لگتا ہے کہ بس برائیاں مجھ سے جاتی رہیں، (۱۰) یقیناً وہ برا ہی اترانے والا شیخی خور ہے۔ (۱۰)

وَلَيْنَ أَخْرَجْنَاهُمُ الْعَذَابَ اِلَى اُمَّةٍ مَّعَدُوْدَةٍ لَّيْسُوْنَ
مَا يَحْسِبُوْنَ اَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ مَّصْرُوْدًا عَنْهُمْ وَّحَاقَ بِهِمْ
مَا كَانُوْا بِمَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸﴾

وَلَيْنَ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مَثَآرِحَهَا ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ اِنَّهُ
لَيَكُوْنُ كُوْفُوْرًا ﴿۹﴾

وَلَكِنْ اَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ صَرَآءٍ مَّا مَسَّتْهُ لَيَكُوْنُ ذَنْبًا
السَّيِّئَاتِ عَرِيًّا اِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾

(۱) یہاں استعجال (جلد طلب کرنے) کو 'استہزا' سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ وہ استعجال، بطور استہزا ہی ہو تا تھا۔ بہر حال مقصود یہ سمجھانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تاخیر پر انسان کو غفلت میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، اس کی گرفت کسی بھی وقت ہو سکتی ہے۔

(۲) انسانوں میں عام طور پر جو مذموم صفات پائی جاتی ہیں اس میں اور اگلی آیت میں ان کا بیان ہے۔ ناامیدی کا تعلق مستقبل سے ہے اور ناشکری کا ماضی و حال سے۔

(۳) یعنی سمجھتا ہے کہ سختیوں کا دور گزر گیا ہے، اب اسے کوئی تکلیف نہیں آئے گی۔

اُمَّةٌ کے مختلف مفہوم: آیت نمبر ۸ میں اُمَّةٌ کا لفظ آیا ہے۔ یہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ یہ ام سے مشتق ہے، جس کے معنی قصد کے ہیں۔ یہاں اس کے معنی اس وقت اور مدت کے ہیں جو نزول عذاب کے لیے مقصود ہے، (فتح القدیر) سورہ یوسف کی آیت ۳۵ ﴿وَاِذْ كُوْبَعْدًا اُمَّةٌ﴾ میں بھی یہی مفہوم ہے اس کے علاوہ جن معنوں میں اس کا استعمال ہوا ہے، ان میں ایک امام و پیشوا ہے۔ جیسے ﴿اِنَّ اِلٰهِيْهِمْ كَانَ اُمَّةٌ﴾ (النحل، ۱۲۰) ملت اور دین ہے، جیسے ﴿اِنَّ اِلٰهِيْكَ يَا اَبَانَا عَلٰى اُمَّةٍ﴾ (الزخرف، ۲۳) جماعت اور طائفہ ہے، جیسے ﴿وَلَمَّا وُرِدَ مَادْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ﴾ (القصص، ۲۳) ﴿وَمِنْ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْ اُمَّةٍ﴾ (الأعراف، ۱۵۹) وغیرہ۔ وہ مخصوص گروہ، یا قوم ہے، جس کی طرف کوئی رسول مبعوث ہو۔ ﴿وَلِيَحْلِلْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ﴾ (یونس، ۳۷) اس کو امت دعوت بھی کہتے ہیں۔ اور اسی طرح پیغمبر پر ایمان لانے والوں کو بھی امت یا امت اتباع یا امت اجابت کہا جاتا ہے۔ (ابن کثیر)

(۴) یعنی جو کچھ اس کے پاس ہے، اس پر اترتا اور دوسروں پر فخر و غرور کا اظہار کرتا ہے۔ تاہم ان صفات مذمومہ سے اہل ایمان اور صاحب اعمال صالحہ مستثنیٰ ہیں جیسا کہ اگلی آیت سے واضح ہے۔

سوائے ان کے جو صبر کرتے ہیں اور نیک کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ انہی لوگوں کے لیے بخشش بھی ہے اور بہت بڑا نیک^(۱) بدلہ بھی۔ (۱۱)

پس شاید کہ آپ اس وحی کے کسی حصے کو چھوڑ دینے والے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی جاتی ہے اور اس سے آپ کا دل تنگ ہے، صرف ان کی اس بات پر کہ اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اترتا؟ یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ ہی آتا، سن لیجئے! آپ تو صرف ڈرانے والے ہی ہیں^(۲) اور ہر چیز کا زمہ دار اللہ تعالیٰ ہے۔ (۱۲)

کیا یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو اسی نے گھڑا ہے۔ جو اب دیجئے کہ پھر تم بھی اسی کے مثل دس سورتیں گھڑی ہوئی لے آؤ اور اللہ کے سوا جسے چاہو اپنے ساتھ بلا بھی لو اگر تم سچے ہو۔^(۳) (۱۳)

إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ
مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿۱۱﴾

فَلَمَّا كَثُرَ نَزَلْنَا نِزْلًا مِّنْ سَمَاءٍ قَدِ ابْتِغَىٰ
مُتَكَبِّرِينَ ﴿۱۲﴾

أَمْ يَتْلُونَ الْقُرْآنَ فَمَا عَلَّمُوهُمْ يَتْلُوهُ
أَعْيُنُهُمْ كَتَبْنَاهُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْهِمُ الذِّكْرَ
وَظَنَنُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَالْمَلَائِكَةِ سَائِمِينَ ﴿۱۳﴾

(۱) یعنی اہل ایمان، راحت و فراغت ہو یا تنگی اور مصیبت، دونوں حالتوں میں اللہ کے احکام کے مطابق طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا ”قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اللہ تعالیٰ مومن کے لیے جو بھی فیصلہ فرماتا ہے، اس میں اس کے لیے بہتری کا پہلو ہوتا ہے۔ اگر اس کو راحت پہنچتی ہے تو اس پر اللہ کا شکر کرتا ہے، جو اس کے لیے بہتر (یعنی اجر کا باعث) ہے اور اگر کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے، یہ بھی اس کے لیے بہتر (یعنی اجر و ثواب کا باعث) ہے یہ امتیاز ایک مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔“ (صحیح مسلم، کتاب الزہد، باب المؤمن أمرہ کلہ خیرا اور ایک اور حدیث میں فرمایا کہ ”مومن کو جو بھی فکر و غم اور تکلیف پہنچتی ہے حتیٰ کہ اسے کاٹنا چھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کی غلطیاں معاف فرمادیتا ہے۔“ (مسند احمد، جلد ۳، ص ۴۳) سورۃ معارج کی آیات ۱۹، ۲۲ میں بھی یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔

(۲) مشرکین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کتے رہتے تھے کہ اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوتا، یا اس کی طرف کوئی خزانہ کیوں نہیں اتار دیا جاتا۔ (الفرقان، ۸) ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا ”ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگ آپ کی بات جو باتیں کہتے ہیں، ان سے آپ کا سینہ تنگ ہوتا ہے“ (سورۃ الحجر، ۹۸) اس آیت میں انہی باتوں کے حوالے سے کہا جا رہا ہے کہ شاید آپ کا سینہ تنگ ہو اور کچھ باتیں جو آپ کی طرف وحی کی جاتی ہیں اور وہ مشرکین پر گراں گزرتی ہیں، ممکن ہے آپ وہ انہیں سنا پاند نہ کریں۔ آپ کا کام صرف انذار و تبلیغ ہے، وہ آپ ہر صورت میں کئے جائیں۔

(۳) امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے چیلنج دیا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ

پھر اگر وہ تمہاری اس بات کو قبول نہ کریں تو تم یقین سے جان لو کہ یہ قرآن اللہ کے علم کے ساتھ اتارا گیا ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، پس کیا تم مسلمان ہوتے ہو؟^(۱) (۱۳)

جو شخص دنیا کی زندگی اور اس کی زینت پر فریفتہ ہوا چاہتا ہو ہم ایسوں کو ان کے کل اعمال (کا بدلہ) ہمیں بھرپور پتھڑا دیتے ہیں اور یہاں انہیں کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ (۱۵) ہاں یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے آگ کے اور کچھ نہیں اور جو کچھ انہوں نے یہاں کیا ہو گا وہاں سب اکارت ہے اور جو کچھ ان کے اعمال تھے سب برباد ہونے والے ہیں۔^(۲) (۱۶)

فَأَلَمْ يَجْعَلِ لَكُمْ فَاعِلًا ۖ أَلَمْ أَنْزِلْ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۳﴾

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزَيَّنَّا لَهَا لُذُنَّهَا فَوَدَّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْصِرُونَ ﴿۱۵﴾

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحِطَّ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۱۶﴾

و (سلم) کا بنایا ہوا قرآن ہے، تو اس کی نظیر پیش کر کے دکھا دو، اور تم جس کی چاہو، مدد حاصل کر لو، لیکن تم کبھی ایسا نہیں کر سکو گے۔ فرمایا ﴿فَلَنْ لِيُنْجِئَنَّ الْإِنْسَانَ وَالْإِنْسَانَ عَلَّلَ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لَئِنْ كَانُوا يَشْعُرُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانُوا يَحْتَسِبُونَ﴾ (بنی اسرائیل ۸۸) ”اعلان کر دیجئے! کہ اگر تمام انسان اور کل جنات مل کر اس قرآن کے مثل لانا چاہیں، تو ان سب سے اس کے مثل لانا مشکل ہے، گو وہ آپس میں ایک دو سرے کے مددگار بھی بن جائیں۔“ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ چیلنج دیا کہ پورا قرآن بنا کر پیش نہیں کر سکتے تو دس سورتیں ہی بنا کر پیش کر دو۔ جیسا کہ اس مقام پر ہے۔ پھر تیسرے نمبر پر چیلنج دیا کہ چلو ایک سورت بنا کر پیش کر دو جیسا کہ سورہ یونس کی آیت ۳۹ اور سورہ بقرہ کے آغاز میں فرمایا (تفسیر ابن کثیر، زیر بحث آیت سورہ یونس) اور اس بناء پر آخری چیلنج یہ ہو سکتا ہے کہ اس جیسی ایک بات ہی بنا کر پیش کر دو۔ ﴿فَلْيَأْتُوا بِمِثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ﴾ (الطور ۳۲) مگر ترتیب نزول سے چیلنج کی اس ترتیب کی تائید نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) یعنی کیا اس کے بعد بھی کہ تم اس چیلنج کا جواب دینے سے قاصر ہو، یہ ماننے کے لیے کہ یہ قرآن اللہ ہی کا نازل کردہ ہے، آمادہ نہیں ہو اور نہ مسلمان ہونے کے لیے تیار ہو؟

(۲) ان دو آیات کے بارے میں بعض کا خیال ہے کہ اس میں اہل ریا کا ذکر ہے، بعض کے نزدیک اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور بعض کے نزدیک اس میں طالبان دنیا کا ذکر ہے۔ کیونکہ دنیا دار بھی جو بعض اچھے عمل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی جزا نہیں دیتا دے دیتا ہے، آخرت میں ان کے لیے سوائے عذاب کے اور کچھ نہیں ہو گا۔ اسی مضمون کو قرآن مجید میں سورہ بنی اسرائیل، آیات ۱۸، ۲۱ اور سورہ شوریٰ، آیت ۲۰ میں بیان کیا گیا ہے۔

کیا وہ شخص جو اپنے رب کے پاس کی دلیل پر ہو اور اس کے ساتھ اللہ کی طرف کا گواہ ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب (گواہ ہو) جو پیشوا اور رحمت ہے (اوروں کے برابر ہو سکتا ہے؟)۔^(۱) یہی لوگ ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں،^(۲) اور تمام فرقوں میں سے جو بھی اس کا منکر ہو اس کے آخری وعدے کی جگہ جنم^(۳) ہے، پس تو اس میں کسی قسم کے شبہ میں نہ رہ، یقیناً یہ تیرے رب کی جانب سے سراسر برحق ہے، لیکن اکثر لوگ ایمان لانے والے

أَمَّنْ كَانَ عَلَىٰ بَيْتِهِ مِن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهِ كُتُبٌ مِّنْ سِيبَةِ رَبِّكَ فَتَدَارَكُ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ ۚ وَمِنْ بَيْنِكُمْ مَنِ اتَّبَعَ مِنَ الضَّالِّينَ الَّذِينَ هُمْ يُرِيدُونَ فَأُولَٰئِكَ لِيُصَلِّ عَلَىٰ ذُرِّيَّتِهِ لِيُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَٰلِمًا بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۰﴾

(۱) منکرین اور کافرین کے مقابلے میں اہل فطرت اور اہل ایمان کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ ”اپنے رب کی طرف سے دلیل“ سے مراد وہ فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا فرمایا ہے اور وہ ہے اللہ واحد کا اعتراف اور اسی کی عبادت۔ جس طرح کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ”ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پس اس کے بعد اس کے ماں باپ اسے یودی، نصرانی، یا مجوسی بنا دیتے ہیں.....“ (صحیح بخاری۔ کتاب الجنائز و مسلم، کتاب القدر) يَتْلُوهُ کے معنی ہیں، اس کے پیچھے۔ یعنی اس کے ساتھ اللہ کی طرف سے ایک گواہ بھی ہو، گواہ سے مراد قرآن یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جو اس فطرت صحیحہ کی طرف دعوت دیتے اور اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تورات بھی جو پیشوا بھی ہے اور رحمت کا سبب بھی ہے۔ یعنی یہ کتاب موسیٰ علیہ السلام بھی قرآن پر ایمان لانے کی طرف رہنمائی کرنے والی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک وہ شخص ہے جو منکر و کافر ہے اور اس کے مقابلے میں ایک دوسرا شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلیل پر قائم ہے، اس پر ایک گواہ (قرآن یا پیغمبر اسلام ﷺ) بھی ہے، اسی طرح اس سے قبل نازل ہونے والی کتاب، تورات، میں بھی اس کے لیے پیشوائی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اور وہ ایمان لے آتا ہے کیا یہ دونوں شخص برابر ہو سکتے ہیں؟ یعنی یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ایک مومن ہے اور دوسرا کافر۔ ایک ہر طرح کے دلائل سے لیس ہے دوسرا بالکل خالی ہے۔

(۲) یعنی جن کے اندر مذکورہ اوصاف پائے جائیں گے وہ قرآن کریم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے۔
(۳) تمام فرقوں سے مراد، روئے زمین پر پائے جانے والے مذاہب ہیں، یودی، عیسائی، زرتشتی، بدھ مت، مجوسی اور مشرکین و کفار وغیرہم، جو بھی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے گا، اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ یہ وہی مضمون ہے جسے اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے ”قسم ہے، اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس امت کے جس یودی، یا عیسائی نے بھی میری نبوت کی بابت سنا اور پھر مجھ پر ایمان نہیں لایا، وہ جہنم میں جائے گا“ (صحیح مسلم، کتاب الإيمان، باب وجوب الإيمان برسالہ نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم إلی جمیع الناس) یہ مضمون اس سے قبل سورہ بقرہ، آیت ۶۲ اور سورہ نساء آیت ۱۵۰، ۱۵۱ میں بھی گزر چکا ہے۔

نہیں ہوتے۔^(۱) (۱۷)

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے^(۲) یہ لوگ اپنے پروردگار کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور سارے گواہ کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ باندھا، خبردار ہو کہ اللہ کی لعنت ہے ظالموں پر۔^(۳) (۱۸)

جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کر لیتے ہیں۔^(۴) یہی آخرت کے منکر ہیں۔ (۱۹)

نہ یہ لوگ دنیا میں اللہ کو ہراسکے اور نہ ان کا کوئی حمایتی اللہ کے سوا ہوا، ان کے لیے عذاب دگنا کیا جائے گا نہ یہ سننے کی طاقت رکھتے تھے اور نہ یہ دیکھتے ہی تھے۔^(۵) (۲۰)

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَيَقُولُ الرَّسُولُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَّبُوا عَلٰی رَبِّهِمْ ۗ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿۱۷﴾

الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿۱۸﴾

أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ مَعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنَ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ يُضَعَّفُ لَهُمُ الْعَذَابَ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ﴿۱۹﴾

(۱) یہ وہی مضمون ہے جو قرآن مجید کے مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ ﴿وَمَا أَكْفَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ﴾ (سورہ یوسف - ۱۰۳) ”تیری خواہش کے باوجود اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے“ ﴿وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا زِيغَاتَيْنِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (سورہ سبأ - ۲۰) ”ابلیس نے اپنا گمان سچا کر دکھایا، مومنوں کے ایک گروہ کے سوا، سب اس کے پیرو کار بن گئے۔“

(۲) یعنی جن کو اللہ نے کائنات میں تصرف کرنے کا یا آخرت میں شفاعت کا اختیار نہیں دیا ہے، ان کی بابت یہ کہا جائے کہ اللہ نے انہیں یہ اختیار دیا ہے۔

(۳) حدیث میں اس کی تفسیر اس طرح آتی ہے کہ ”قیامت والے دن اللہ تعالیٰ ایک مومن سے اس کے گناہوں کا اقرار و اعتراف کروائے گا کہ تجھے معلوم ہے کہ تو نے فلاں گناہ بھی کیا تھا، فلاں بھی کیا تھا، وہ مومن کے گناہ ہاں ٹھیک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، میں نے ان گناہوں پر دنیا میں بھی پردہ ڈالے رکھا تھا، جا آج بھی انہیں معاف کرتا ہوں۔ لیکن دوسرے لوگ یا کافروں کا معاملہ ایسا ہو گا کہ انہیں گواہوں کے سامنے پکارا جائے گا اور گواہ یہ گواہی دیں گے کہ یہی وہ لوگ ہیں، جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا۔“ (صحیح بخاری - تفسیر سورہ ہود)

(۴) یعنی لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے کے لیے، اس میں کجیاں تلاش کرتے اور لوگوں کو اس سے متفرق کرتے ہیں۔

(۵) یعنی ان کا حق سے اعراض اور بغض اس انتہا پر پہنچا ہوا تھا کہ یہ اسے سننے اور دیکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے تھے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ نے ان کو کان اور آنکھیں تو دی تھیں لیکن انہوں نے ان سے حق کی بات نہ سنی اور نہ دیکھی۔ گویا ﴿فَمَا آخِذْنَاهُمْ سَمْعَهُمْ وَلَا أَبْصَارَهُمْ وَلَا أَفْئِدَهُمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ (سورہ الأحقاف - ۲۶) ”نہ ان کے کانوں نے انہیں کوئی فائدہ پہنچایا، نہ ان کی آنکھوں اور دلوں نے“ کیونکہ وہ حق کے سننے سے بہرے اور حق کے دیکھنے سے اندھے بنے رہے،

یہی ہیں جنہوں نے اپنا نقصان آپ کر لیا اور وہ سب کچھ ان سے کھو گیا، جو انہوں نے گھڑ رکھا تھا۔ (۲۱)

پیشک یہی لوگ آخرت میں زیاں کار ہوں گے۔ (۲۲)
یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے کام بھی نیک کیے اور اپنے پالنے والے کی طرف جھکتے رہے، وہی جنت میں جانے والے ہیں، جہاں وہ ہمیشہ ہی رہنے والے ہیں۔ (۲۳)

ان دونوں فرقوں کی مثال اندھے، بہرے اور دیکھنے، سننے والے جیسی ہے۔^(۱) کیا یہ دونوں مثال میں برابر ہیں؟ کیا پھر بھی تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ (۲۴)

یقیناً ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا کہ میں تمہیں صاف صاف ہوشیار کر دینے والا ہوں۔ (۲۵)

کہ تم صرف اللہ ہی کی عبادت کرو،^(۲) مجھے تو تم پر

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَصَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۲۱﴾

لَا جَبْرَ أَنَّهُمْ فِي الْأُخْرَىٰ هُمُ الْآخِضُونَ ﴿۲۲﴾
إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآخَبْتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ
أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۳﴾

مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْكَفَىٰ وَالْبَصِيرِ وَالسَّبِيحِ هَلْ يَسْتَوِينَ مَثَلًا أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۴﴾

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِذِي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿۲۵﴾

أَنْ لَا تَقْبَلُوا لِلَّهِ إِلَّا إِلَهًا إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ

جس طرح کہ وہ جنم میں داخل ہوتے ہوئے کہیں گے، ﴿لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ (المملک۔۱۰) ”اگر ہم سنتے اور عقل سے کام لیتے تو آج جنم میں نہ جاتے۔“

(۱) کچھلی آیات میں مومنین اور کافرین اور سعادت مندوں اور بد بختوں، دونوں کا تذکرہ فرمایا۔ اب اس میں دونوں کی مثال بیان فرما کر دونوں کی حقیقت کو مزید واضح کیا جا رہا ہے۔ فرمایا، ایک کی مثال اندھے اور بہرے کی طرح ہے اور دوسرے کی مثال دیکھنے اور سننے والے کی طرح۔ کافر دنیا میں حق کا روئے زیبا دیکھنے سے محروم اور آخرت میں نجات کے راستے سے بے بہرہ، اسی طرح حق کے دلائل سننے سے بے بہرہ ہوتا ہے، اسی لیے ایسی باتوں سے محروم رہتا ہے جو اس کے لیے مفید ہوں۔ اس کے برعکس مومن سمجھ دار، حق کو دیکھنے والا اور حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے والا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ حق اور خیر کی پیروی کرتا ہے، دلائل کو سنتا اور ان کے ذریعے سے شبہات کا ازالہ کرتا اور باطل سے اجتناب کرتا ہے۔ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ استقمام نفی کے لئے ہے۔ یعنی دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا۔ ﴿لَا يَسْتَوِي السَّاعِدُ وَالسَّاعِدُ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾ (سورۃ الحشر۔۲۰) ”جنتی دوزخی برابر نہیں ہو سکتے۔ جنتی تو کامیاب ہونے والے ہیں“ ایک اور مقام پر اسے اس طرح بیان فرمایا ”انداھا اور دیکھنے والا برابر نہیں۔ اندھیرے اور روشنی، سایہ اور دھوپ برابر نہیں، زندے اور مردے برابر نہیں۔“ (سورۃ فاطر۔۱۰۱۹)

(۲) یہ وہی دعوت توحید ہے جو ہر نبی نے آکر اپنی اپنی قوم کو دی۔ جس طرح فرمایا ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا

الْبَيْتِ ۳۱

دردناک دن کے عذاب کا خوف^(۱) ہے۔ (۲۶)

اس کی قوم کے کافروں کے سرداروں نے جواب دیا کہ ہم تو تجھے اپنے جیسا انسان ہی دیکھتے ہیں^(۲) اور تیرے تابعداروں کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ واضح طور پر سوائے بیخ^(۳) لوگوں کے^(۴) اور کوئی نہیں جو بے سوچے سمجھے (تمہاری پیروی کر رہے ہیں)؛ ہم تو تمہاری کسی قسم کی برتری اپنے اوپر نہیں دیکھ رہے، بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔ (۲۷)

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا تَزْكُرُ الْاِكْبَارُ
مِثْلَنَا وَمَا تَزْكُرُ اَنْتَ عِنَّا اِلَّا الْكَاذِبِينَ هُمْ اَرَادُوا لَنَا
بِادِي الرَّايِ وَمَا زَايَا لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَنْظُرُكُمْ
كَلِيْمِيْنَ ۳۱

تَوَخَّيْ اِلَيْهِ اِنَّكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۱﴾ (الانبیاء۔ ۲۵) ”جو پیغمبر ہم نے آپ سے پہلے بھیجے، ان کی طرف یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو۔“

(۱) یعنی اگر مجھ پر ایمان نہیں لائے اور اس دعوت کو حید کو نہیں اپنایا تو عذاب الہی سے نہیں بچ سکو گے۔

(۲) یہ وہی شبہ ہے، جس کی پہلے کئی جگہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ کافروں کے نزدیک بشریت کے ساتھ نبوت و رسالت کا اجتماع بڑا عجیب تھا، جس طرح آج کے اہل بدعت کو بھی عجیب لگتا ہے اور وہ بشریت رسول ﷺ سے انکار کرتے ہیں۔

(۳) حق کی تاریخ میں یہ بات بھی ہر دور میں سامنے آتی رہی ہے کہ ابتداء میں اس کو اپنانے والے ہمیشہ وہ لوگ ہوتے جنہیں معاشرے میں بے نوا اور کم تر سمجھا جاتا تھا اور صاحب حیثیت اور خوش حال طبقہ اس سے محروم رہتا۔ حتیٰ کہ یہ چیز پیغمبروں کے پیروکاروں کی علامت بن گئی۔ چنانچہ جب شاہ روم ہرقل نے حضرت ابوسفیانؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت باتیں پوچھیں تو اس میں ان سے ایک بات یہ بھی پوچھی کہ ”اس کے پیروکار معاشرے کے معزز سمجھے جانے والے لوگ ہیں یا کمزور لوگ؟“ تو حضرت ابوسفیانؓ نے جواب میں کہا ”کمزور لوگ۔“ جس پر ہرقل نے کہا ”رسولوں کے پیروکار یہی لوگ ہوتے ہیں“ (صحیح بخاری حدیث نمبر۔ ۷) قرآن کریم میں بھی وضاحت کی گئی ہے کہ خوش حال طبقہ ہی سب سے پہلے پیغمبروں کی تکذیب کرتا رہا ہے۔ (سورہ زخرف۔ ۲۳) اور یہ اہل ایمان کی دنیوی حیثیت تھی اور جس کے اعتبار سے اہل کفر انہیں حقیر اور کم تر سمجھتے تھے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ حق کے پیروکار معزز اور اشراف ہیں چاہے وہ مال و دولت کے اعتبار سے فروتر ہی ہوں اور حق کا انکار کرنے والے حقیر اور بے حیثیت ہیں چاہے وہ دنیوی اعتبار سے مال دار ہی ہوں۔

(۴) اہل ایمان چونکہ اللہ اور رسول کے احکام کے مقابلے میں اپنی عقل و دانش اور رائے کا استعمال نہیں کرتے، اس لیے اہل باطل یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بے سوچ سمجھ والے ہیں کہ اللہ کا رسول انہیں جس طرف موڑ دیتا ہے، یہ مڑ جاتے ہیں جس چیز سے روک دیتا ہے، رک جاتے ہیں۔ یہ بھی اہل ایمان کی ایک بڑی خوبی بلکہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ لیکن اہل کفر و باطل کے نزدیک یہ خوبی بھی ”عیب“ ہے۔

نوح نے کہا، میری قوم والو! مجھے بتاؤ تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے کسی دلیل پر ہوا اور مجھے اس نے اپنے پاس کی کوئی رحمت عطا کی ہو،^(۱) پھر وہ تمہاری نگاہوں میں^(۲) نہ آئی تو کیا زبردستی میں اسے تمہارے گلے منڈھ دوں، حالانکہ تم اس سے بیزار ہو۔^(۳) (۲۸)

میری قوم والو! میں تم سے اس پر کوئی مال نہیں مانگتا۔^(۴) میرا ثواب تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے نہ میں ایمان والوں کو اپنے پاس سے نکال سکتا ہوں،^(۵) انہیں اپنے رب سے ملنا ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت کر رہے ہو۔^(۶) (۲۹)

میری قوم کے لوگو! اگر میں ان مومنوں کو اپنے پاس سے نکال دوں تو اللہ کے مقابلہ میں میری مدد کون کر سکتا

قَالَ يَقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيْتَةٍ مِّن رَّبِّي وَآلِيهِ
رَحْمَةً مِّن عِنْدِي فَعَبَيْتُ عَلَيْكُمْ أَأَنْتُمْ مَكْمُومًا
وَأَنْتُمْ لَهَا كِرهُونٌ ﴿۲۸﴾

وَيَقَوْمِ لَا تَشْكُرُوا عَلَيَّ مَا لَأَنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَمَا أَنَا
بِعَاطِرٍ لِّلَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا تُشْكِرُونَ لَهُمْ وَلَٰكِنِّي أَرَأَيْتُمْ كَيْفَ تَمُومُونَ
﴿۲۹﴾

وَيَقَوْمٍ مِّن يَتَّخِفُونَ مِنَ اللَّهِ أَنْ تُرَدَّ أَعْيُنُهُمْ فَلَآتًا لَّنَّا كَرُومًا ﴿۳۰﴾

(۱) بَيْتَةٍ سے مراد ایمان و یقین ہے اور رحمت سے مراد نبوت۔ جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو سرفراز کیا تھا۔
(۲) یعنی تم اس کے دیکھنے سے اندھے ہو گئے۔ چنانچہ تم نے نہ اس کی قدر پہچانی اور نہ اسے اپنانے پر آمادہ ہوئے، بلکہ اس کی تکذیب اور رد کے درپے ہو گئے۔

(۳) جب یہ بات ہے تو یہ ہدایت و رحمت تمہارے حصے میں کس طرح آسکتی ہے؟

(۴) تاکہ تمہارے دماغوں میں یہ شبہ نہ آجائے کہ اس دعوائے نبوت سے اس کا مقصد تو دولت دنیا نکھارنا ہے۔ میں تو یہ کام صرف اللہ کے حکم پر اور اسی کی رضا کے لیے کر رہا ہوں، وہی مجھے اس کا اجر بھی دے گا۔

(۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوح علیہ السلام کے سرداروں نے بھی معاشرے میں کمزور سمجھے جانے والے اہل ایمان کو حضرت نوح علیہ السلام سے اپنی مجلس یا اپنے قرب سے دور رکھنے کا مطالبہ کیا ہو گا، جس طرح رؤسائے مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کا مطالبہ کیا تھا، جس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی یہ آیات نازل فرمائیں تھیں ﴿وَلَا تَنْظُرُوا إِلَيَّ يَوْمَ يُدْعَوْنَ يَكْفُرُونَ بِالْحَدِيثِ﴾ (سورہ الأنعام: ۵۷) ”اے پیغمبر! ان لوگوں کو اپنے سے دور مت کرنا جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں۔“ ﴿وَأَصِدُّنَا مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْحَدِيثِ لِيُزِيدُوا وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنُكَ عَنْهُمْ﴾ (الکہف: ۲۸) اپنے نفسوں کو ان لوگوں کے ساتھ جوڑے رکھیے جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں، اپنے رب کی رضا چاہتے ہیں، آپ کی آنکھیں ان سے گزر کر کسی اور کی طرف تجاوز نہ کریں۔“

(۶) یعنی اللہ اور رسول کے پیروکاروں کو حقیر سمجھنا اور پھر انہیں قرب نبوت سے دور کرنے کا مطالبہ کرنا، یہ تمہاری جہالت ہے۔ یہ لوگ تو اس لائق ہیں کہ انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا جائے نہ کہ دور دھکا کر جائے۔

ہے؟ (۱) کیا تم کچھ بھی نصیحت نہیں پکڑتے۔ (۳۰)

میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں،
(سنو!) میں غیب کا علم بھی نہیں رکھتا، نہ میں یہ کہتا ہوں
کہ میں کوئی فرشتہ ہوں، نہ میرا یہ قول ہے کہ جن پر
تمہاری نگاہیں ذلت سے پڑ رہی ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کوئی
نعمت دے گا ہی نہیں، (۲) ان کے دل میں جو ہے اسے
اللہ ہی خوب جانتا ہے، اگر میں ایسی بات کہوں تو یقیناً میرا
شمار ظالموں میں ہو جائے گا۔ (۳) (۳۱)

(قوم کے لوگوں نے) کہا اے نوح! تو نے ہم سے بحث کر
لی اور خوب بحث کر لی۔ (۴) اب تو جس چیز سے ہمیں
دھمکا رہا ہے وہی ہمارے پاس لے آ، اگر تو بچوں میں
ہے۔ (۵) (۳۲)

جواب دیا کہ اسے بھی اللہ تعالیٰ ہی لائے گا اگر وہ چاہے
اور ہاں تم اسے ہرانے والے نہیں ہو۔ (۶) (۳۳)

وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا
أَقُولُ إِنَّ مَلَكِي وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزَوَّجُكُم مِّنْ بُيُوتِهِمْ
اللَّهُ خَيْرٌ أَلَمْ يَعْلَم بِمَا فِي أَنْفُسِهِمْ إِنَّي إِذَا لِينُ
الظَّالِمِينَ ﴿۳۱﴾

قَالُوا يَا نُوهُمُ قَدْ جَاءَ لَنَا كَلْبٌ أَكْرَمُ مِنَ الَّذِي كُنَّا نَعْبُدُ
إِنْ كُنْتُمْ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۳۲﴾

قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ وَمَا أَنتم بِمُعْجِزِينَ ﴿۳۳﴾

(۱) گویا ایسے لوگوں کو اپنے سے دور کرنا، اللہ کے غضب اور ناراضی کا باعث ہے۔

(۲) بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو انہیں ایمان کی صورت میں خیر عظیم عطا کر رکھا ہے اور جس کی بنیاد پر وہ آخرت میں بھی جنت
کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے اور دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ چاہے گا، تو بلند مرتبے سے ہمکنار ہوں گے۔ گویا تمہارا ان
کو حقیر سمجھنا ان کے لیے کسی نقصان کا باعث نہیں، البتہ تم ہی عند اللہ مجرم ٹھہرو گے کہ اللہ کے نیک بندوں کو، جن کا
اللہ کے ہاں بڑا مقام ہے، تم حقیر اور فرومایہ سمجھتے ہو۔

(۳) کیونکہ میں ان کی بابت ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں، صرف اللہ جانتا ہے، تو یہ ظلم ہے۔

(۴) لیکن اس کے باوجود ہم ایمان نہیں لائے۔

(۵) یہ وہی حماقت ہے جس کا اور تکاب گمراہ قومیں کرتی آئی ہیں کہ وہ اپنے پیغمبر سے کستی رہی ہیں کہ اگر تو سچا ہے تو ہم
پر عذاب نازل کروا کر ہمیں تباہ کروا دے۔ حالانکہ ان میں عقل ہوتی، تو وہ کہتیں کہ اگر تو سچا ہے اور واقعی اللہ کا رسول
ہے، تو ہمارے لیے بھی دعا کر کہ اللہ تعالیٰ ہمارا سینہ بھی کھول دے تاکہ ہم اسے اپنالیں۔

(۶) یعنی عذاب کا اتنا خالص اللہ کی مشیت پر موقوف ہے، یہ نہیں ہے کہ جب میں چاہوں، تم پر عذاب آجائے۔ تاہم
جب اللہ عذاب کا فیصلہ کر لے گا یا بھیج دے گا، تو پھر اس کو کوئی عاجز کرنے والا نہیں ہے۔

تمہیں میری خیر خواہی کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی، گو میں کتنی ہی تمہاری خیر خواہی کیوں نہ چاہوں، بشرطیکہ اللہ کا ارادہ تمہیں گمراہ کرنے کا ہو،^(۱) وہی تم سب کا پروردگار ہے^(۲) اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ (۳۴)

کیا یہ کہتے ہیں کہ اسے خود اسی نے گھڑ لیا ہے؟ تو جواب دے کہ اگر میں نے اسے گھڑ لیا ہو تو میرا گناہ مجھ پر ہے اور میں ان گناہوں سے بری ہوں جو تم کر رہے ہو۔^(۳) (۳۵)

نوح کی طرف وحی بھیجی گئی کہ تیری قوم میں سے جو ایمان لا چکے ان کے سوا اور کوئی اب ایمان لائے گا ہی نہیں، پس تو ان کے کاموں پر غمگین نہ ہو۔^(۴) (۳۶)

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْرِي إِنْ أَرَدْتُ أَنْ أَصْغَرَ لَكُمْ إِنْ كَانَ اللَّهُ يَرِيدُ
أَنْ يُغْوِيَكُمْ هُوَ أَكْبَرُ مِنْكُمْ وَالْيَهُودُ يَرْجِعُونَ ﴿۳۴﴾

أَمْ يَتُوبُونَ أَمْرًا لَهُ قُلْ إِنْ أَفْتَرَيْتُهُ فَعَلَىٰ رِجْأِي وَإِنَّا
بِرَبِّي لَمُتَابِعُونَ ﴿۳۵﴾

وَأَوْحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ آمَنَ
فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۳۶﴾

(۱) اغواء یعنی اضلال (گمراہ کرنا) ہے۔ یعنی تمہارا کفر و حود اگر اس مقام پر پہنچ چکا ہے، جہاں سے کسی انسان کا پلٹ کر آنا اور ہدایت کو اپنا لینا، ناممکن ہے، تو اسی کیفیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہر لگا دینا کہا جاتا ہے، جس کے بعد ہدایت کی کوئی امید باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم بھی اسی خطرناک موڑ تک پہنچ چکے ہو تو پھر میں تمہاری خیر خواہی بھی کرنی چاہوں یعنی ہدایت پر لانے کی اور زیادہ کوششیں کروں، تو یہ کوشش اور خیر خواہی تمہارے لیے مفید نہیں، کیونکہ تم گمراہی کے آخری مقام پر پہنچ چکے ہو۔

(۲) ہدایت اور گمراہی بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور اسی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے، جہاں وہ تمہیں تمہارے عملوں کی جزا دے گا۔ نیوں کو ان کے نیک عمل کی جزا اور بروں کو ان کی برائی کی سزا دے گا۔

(۳) بعض مفسرین کے نزدیک یہ مکالمہ قوم نوح علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان ہوا اور بعض کا خیال ہے کہ یہ جملہ معترضہ کے طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین مکہ کے درمیان ہونے والی گفتگو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن میرا گھڑا ہوا ہے اور میں اللہ کی طرف منسوب کرنے میں جھوٹا ہوں تو یہ میرا جرم ہے، اس کی سزا میں ہی بھگتوں گا۔ لیکن تم جو کچھ کر رہے ہو، جس سے میں بری ہوں، اس کا بھی تمہیں پتہ ہے؟ اس کا وبال تو مجھ پر نہیں، تم پر ہی پڑے گا کیا اس کی بھی تمہیں کچھ فکر ہے؟

(۴) یہ اس وقت کہا گیا کہ جب قوم نوح علیہ السلام نے عذاب کا مطالبہ کیا اور حضرت نوح علیہ السلام نے بارگاہ الہی میں دعا کی کہ یارب! زمین پر ایک کافر بھی بسنے والا نہ رہنے دے۔ اللہ نے فرمایا، اب مزید کوئی ایمان نہیں لائے گا تو ان پر غم مت کھا۔

اور ایک کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی سے تیار کر^(۱) اور ظالموں کے بارے میں ہم سے کوئی بات چیت نہ کروہ پانی میں ڈوب دیے جانے والے ہیں۔^(۲) (۳۷)

وہ (نوح) کشتی بنانے لگے ان کی قوم کے جو سردار ان کے پاس سے گزرتے وہ ان کا مذاق اڑاتے،^(۳) وہ کہتے اگر تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو ہم بھی تم پر ایک دن نہیں گے جیسے تم ہم پر ہنستے ہو۔ (۳۸)

تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے اور اس پر بھیگتی کی سزا^(۴) اتر آئے۔ (۳۹)

یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آپہنچا اور تور ایلنے لگا^(۵) ہم نے کہا کہ اس کشتی میں ہر قسم کے (جانداروں میں سے)

وَأَصْنَعُ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبُنِي فِي الْآيَاتِ كَلِمَاتٍ ۚ إِنَّهُمْ مُخْرَجُونَ ﴿۳۷﴾

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأْنَا مِنْ قَوْمِهِ سَفِينًا ۚ وَاللَّهُ قَالَ إِنَّ مُخْرَجًا لَنَا وَإِنَّا لَنُخْرِجُكُمْ كَمَا تَخْرُجُونَ ﴿۳۸﴾

سَفِينًا تَعْلَمُونَ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُثْقِلٌ ﴿۳۹﴾

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُورَ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلِّ

(۱) ”یعنی ہماری آنکھوں کے سامنے“ اور ”ہماری دیکھ بھال میں“ اس آیت میں اللہ رب العزت کے لئے صفت ”عین“ کا اثبات ہے جس پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ اور ”ہماری وحی سے“ کا مطلب اس کے طول و عرض وغیرہ کی جو کیفیات ہم نے بتلائی ہیں، اس طرح اسے بنا۔ اس مقام پر بعض مفسرین نے کشتی کے طول و عرض اس کی منزلوں اور کس قسم کی لکڑی اور دیگر سامان اس میں استعمال کیا گیا، اس کی تفصیل بیان کی ہے، جو ظاہریات ہے کہ کسی مستند ماخذ پر مبنی نہیں ہے۔ اس کی پوری تفصیل کا صحیح علم صرف اللہ ہی کو ہے۔

(۲) بعض نے اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے اور ان کی اہلیہ کو لیا ہے جو مومن نہیں تھے اور غرق ہونے والوں میں سے تھے۔ بعض نے اس سے غرق ہونے والی پوری قوم مراد لی ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے کوئی مہلت طلب مت کرنا کیونکہ اب ان کے ہلاک ہونے کا وقت آگیا ہے یا یہ مطلب ہے کہ ان کی ہلاکت کے لیے جلدی نہ کریں، وقت مقرر میں یہ سب غرق ہو جائیں گے، (فتح القدر)

(۳) مثلاً کہتے، نوح! نبی بنتے بنتے اب بڑھی بن گئے ہو؟ یا اسے نوح! خشکی میں کشتی کس لیے تیار کر رہے ہو؟

(۴) اس سے مراد جہنم کا داغی عذاب ہے، جو اس دنیوی عذاب کے بعد ان کے لیے تیار ہے۔

(۵) اس سے بعض نے روٹی پکانے والے تور، بعض نے مخصوص جگہیں مثلاً عین اللوردہ اور بعض نے سطح زمین مراد لی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اسی آخری مفہوم کو ترجیح دی ہے یعنی ساری زمین ہی چشموں کی طرح ابل پڑی، اوپر سے آسمان کی بارش نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔

جوڑے (یعنی) دو (جانور، ایک نر اور ایک مادہ) سوار کرا لے^(۱) اور اپنے گھر کے لوگوں کو بھی سوائے ان کے جن پر پہلے سے بات پڑ چکی ہے^(۲) اور سب ایمان والوں کو بھی،^(۳) اس کے ساتھ ایمان لانے والے بہت ہی کم تھے۔^(۴) (۳۰)

نوح علیہ السلام نے کہا، اس کشتی میں بیٹھ جاؤ اللہ ہی کے نام سے اس کا چلنا اور ٹھہرنا ہے،^(۵) یقیناً میرا رب بڑی بخشش اور بڑے رحم والا ہے۔ (۳۱)
وہ کشتی انہیں پہاڑوں جیسی موجوں میں لے کر جا رہی

رَوَّجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ الْأَمْنَ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ
وَمَنْ آمَنَ وَمَنْ آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿۳۰﴾

وَقَالَ اذْكُرُوا لِي يَوْمَ يُخْرِجُ اللَّهُ بِحَبْرَةٍ وَامُوسَىٰ اذْكُرْ رَبِّي لَقَدْ نَادَوْتُهُ
رَبِّهِ ۝

وَهِيَ تَجْرِي بِمَوْجٍ مُّخَالِفٍ تَأْوِيهِ يَوْمَ تَأْتِي بِلُجَّةٍ فَكَادَتْ تُنْحِرُ بِئِنَّهَا

(۱) اس سے مراد مذکر اور مؤنث یعنی نر اور مادہ ہے۔ اس طرح ہر ذی روح مخلوق کا جوڑا کشتی میں رکھ لیا گیا اور بعض کہتے ہیں کہ نباتات بھی رکھے گئے تھے۔ واللہ اعلم۔

(۲) یعنی جن کا غرق ہونا تقدیر الہی میں ثبت ہے۔ اس سے مراد عام کفار ہیں، یا یہ اشتناء اَهْلَكَ سے ہے یعنی اپنے گھر والوں کو بھی کشتی میں سوار کرا لے، سوائے ان کے جن پر اللہ کی بات سبقت کر گئی ہے یعنی ایک بیٹا (کنعان یا۔ یام) اور حضرت نوح علیہ السلام کی اہلیہ (وَاعِلَّةٌ) یہ دونوں کافر تھے، ان کو کشتی میں بیٹھنے والوں سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

(۳) یعنی سب اہل ایمان کو کشتی میں سوار کرا لے۔

(۴) بعض نے ان کی کل تعداد (مرد اور عورت ملا کر) ۸۰ اور بعض نے اس سے بھی کم بتلائی ہے۔ ان میں حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے، جو ایمان لانے والوں میں شامل تھے، سام، حام، یافث اور ان کی بیویاں اور چوتھی بیوی، یام کی تھی، جو کافر تھا، لیکن اس کی بیوی مسلمان ہونے کی وجہ سے کشتی میں سوار تھی۔ (ابن کثیر)

(۵) یعنی اللہ ہی کے نام سے اس کا پانی کی سطح پر چلنا اور اسی کے نام پر اس کا ٹھہرنا ہے۔ اس سے ایک مقصد اہل ایمان کو تسلی اور حوصلہ دینا بھی تھا کہ بلا خوف و خطر کشتی میں سوار ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ ہی اس کشتی کا محافظ اور نگران ہے، اسی کے حکم سے چلے گی اور اسی کے حکم سے ٹھہرے گی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا کہ ”اے نوح! جب تو اور تیرے ساتھی کشتی میں آرام سے بیٹھ جائیں تو کہو۔ ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي بَخَّسَنَا مِنْ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾ * وَقَالَ رَبِّ انقِصْ عَنَّا وَثِقَتَكَ وَخِزْيَانَةَ رِبِّنَا لِئَنَّا نَكْفُرَ بِرَبِّنَا وَمَا نَكْفُرُ بِكَ اللَّهُ يَسْتَجِيبُ لِمَنْ يَشَاءُ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۱﴾“

بعض علما نے کشتی یا سواری پر بیٹھتے وقت ﴿يَوْمَ يُخْرِجُ اللَّهُ بِحَبْرَةٍ وَامُوسَىٰ﴾ - کا پڑھنا مستحب قرار دیا ہے۔ مگر حدیث سے ﴿سُبْحٰنَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ * وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَلْمُنْقَلِبُوْنَ﴾ پڑھنا ثابت ہے۔

(۱) تھی اور نوح (علیہ السلام) نے اپنے لڑکے کو جو ایک کنارے پر تھا، پکار کر کہا کہ اے میرے پیارے بچے ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں میں شامل نہ رہ۔ (۴۲) (۲)

اس نے جواب دیا کہ میں تو کسی بڑے پہاڑ کی طرف پناہ میں آ جاؤں گا جو مجھے پانی سے بچالے گا، (۳) نوح علیہ السلام نے کہا آج اللہ کے امر سے بچانے والا کوئی نہیں، صرف وہی بچیں گے جن پر اللہ کا رحم ہوا۔ اسی وقت ان دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی اور وہ ڈوبنے والوں میں سے ہو گیا۔ (۴) (۴۳)

فرما دیا گیا کہ اے زمین اپنے پانی کو نگل جا (۵) اور اے آسمان بس کر تھم جا، اسی وقت پانی سکھایا گیا اور کام پورا

وَكَانَ فِي مَعْوِلٍ يَدْعُو اَزْكَبْ مَعَنَا وَلَا تَكُنْ مَعَ الْكَافِرِينَ ﴿۵﴾

قَالَ سَلُوْنِي اِلَى جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ قَالَ لِمَنْ اِلَٰهَ اِلَّا مَنْ كَرِهَ وَاَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾

وَقِيلَ يَا اَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَسْبِغِي اَقْلَبِي وَغِيْضِ الْمَاءِ

(۱) یعنی جب زمین پر پانی تھا، حتیٰ کہ پہاڑ بھی پانی میں ڈوبے ہوئے تھے، یہ کشتی حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے، اللہ کے حکم سے اور اس کی حفاظت میں پہاڑ کی طرح رواں دواں تھی۔ ورنہ اتنے طوفانی پانی میں کشتی کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے؟ اسی لیے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اسے بطور احسان ذکر فرمایا۔ ﴿ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْهَيْبَةِ * لِنُجِّلَكُمْ تَذِكْرًا * وَرَعَيْنَا اِذْ نَادَيْتُمْ وَاٰجِعًا ﴾ (المحافہ - ۱۱، ۱۲) جب پانی میں طغیانی آگئی تو اس وقت ہم نے تمہیں کشتی میں چڑھا لیا تاکہ اسے تمہارے لیے نصیحت اور یادگار بنا دیں اور تاکہ یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔

﴿ وَحَمَلْنَا عَلٰٓ ذٰلِكَ الْاَوَابِرَ وَاُدْمُوْا * حَمِيْرًا بِاَمِيْنِنَا اِنَّ الْاَوَابِرَ لَمَّا كَانَتْ كُفْرًا ﴾ (القصص - ۱۳، ۱۴) اور ہم نے اسے تختوں اور کیلوں والی کشتی میں سوار کر لیا، جو ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی۔ بدلہ اس کی طرف سے جس کا کفر کیا گیا تھا۔

(۲) یہ حضرت نوح علیہ السلام کا چوتھا بیٹا تھا جس کا لقب کنعان اور نام "یام" تھا، اسے حضرت نوح علیہ السلام نے دعوت دی کہ مسلمان ہو جا اور کافروں کے ساتھ شامل رہ کر غرق ہونے والوں میں سے مت ہو۔

(۳) اس کا خیال تھا کہ کسی بڑے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر میں پناہ حاصل کر لوں گا، وہاں پانی کیوں کر پہنچ سکے گا؟

(۴) باپ بیٹے کے درمیان یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک طوفانی موج نے اسے اپنی طغیانی کی زد میں لے لیا۔

(۵) نکلنا، کا استعمال جانور کے لیے ہوتا ہے کہ وہ اپنے منہ کی خوراک کو نگل جاتا ہے۔ یہاں پانی کے خشک ہونے کو نگل جانے سے تعبیر کرنے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ پانی بتدریج خشک نہیں ہوا تھا بلکہ اللہ کے حکم سے زمین نے سارا پانی دفعتاً اس طرح اپنے اندر نگل لیا جس طرح جانور لقمہ نگل جاتا ہے۔

کر دیا گیا^(۱) اور کشتی ”جودی“ نامی^(۲) پہاڑ پر جاگلی اور فرما دیا گیا کہ ظالم لوگوں پر لعنت نازل ہو۔^(۳) (۳۴)

نوح علیہ السلام نے اپنے پروردگار کو پکارا اور کہا کہ میرے رب میرا بیٹا تو میرے گھروالوں میں سے ہے، یقیناً تیرا وعدہ بالکل سچا ہے اور تو تمام حاکموں سے بہتر حاکم ہے۔^(۴) (۳۵)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے نوح یقیناً وہ تیرے گھرانے سے نہیں ہے،^(۵) اس کے کام بالکل ہی ناشائستہ ہیں^(۶) تجھے ہرگز وہ چیز نہ مانگنی چاہیے جس کا تجھے مطلقاً علم نہ ہو،^(۷)

وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَأَسْرَتُوا عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۳۴﴾

وَنَادَى نُوحٌ رَبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنْتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ﴿۳۵﴾

قَالَ يُؤْمِرُ ابْنُكَ أَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ وَلَا نَتَّبِعُ مَالِكِينَ لَكِ بِهِ عِلْمٌ إِنَّكَ أَنْ تَكُونِ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۳۶﴾

(۱) یعنی تمام کافروں کو غرق آب کر دیا گیا۔

(۲) جودی، پہاڑ کا نام ہے جو بقول بعض موصول کے قریب ہے، حضرت نوح علیہ السلام کی قوم بھی اسی کے قریب آباد تھی۔

(۳) بُعْدٌ، یہ ہلاکت اور لعنت الہی کے معنی میں ہے اور قرآن کریم میں بطور خاص غضب الہی کی مستحق بننے والی قوموں کے لیے اسے کئی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔

(۴) حضرت نوح علیہ السلام نے غالباً شفقت پداری کے جذبے سے مغلوب ہو کر بارگاہ الہی میں یہ دعا کی اور بعض کہتے ہیں کہ انہیں یہ خیال تھا کہ شاید یہ مسلمان ہو جائے گا، اس لیے اس کے بارے میں یہ استدعا کی۔

(۵) حضرت نوح علیہ السلام نے قرابت نسبی کا لحاظ کرتے ہوئے اسے اپنا بیٹا قرار دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایمان کی بنیاد پر قرابت دین کے اعتبار سے اس بات کی نفی فرمائی کہ وہ تیرے گھرانے سے ہے۔ اس لیے کہ ایک نبی کا اصل گھرانہ تو وہی ہے جو اس پر ایمان لائے، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ اور اگر کوئی ایمان نہ لائے تو چاہے وہ نبی کا باپ ہو، بیٹا ہو یا بیوی، وہ نبی کے گھرانے کا فرد نہیں۔

(۶) یہ اللہ تعالیٰ نے اس کی علت بیان فرمادی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس کے پاس ایمان اور عمل صالح نہیں ہو گا، اسے اللہ کے عذاب سے اللہ کا پیغمبر بھی بچانے پر قادر نہیں۔ آج کل لوگ پیروں، فقیروں اور سجادہ نشینوں سے وابستگی کو ہی نجات کے لیے کافی سمجھتے ہیں اور عمل صالح کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے حالانکہ جب عمل صالح کے بغیر نبی سے نسبی قرابت بھی کام نہیں آتی، تو یہ وابستگیاں کیا کام آسکتی ہیں؟

(۷) اس سے معلوم ہوا کہ نبی عالم الغیب نہیں ہوتا، اس کو اتنا ہی علم ہوتا ہے جتنا وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اسے عطا فرمادیتا ہے۔ اگر حضرت نوح علیہ السلام کو پہلے سے علم ہوتا کہ ان کی درخواست قبول نہیں ہوگی تو یقیناً وہ اس سے پرہیز فرماتے۔

میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو جاہلوں میں سے اپنا شمار
کرانے سے باز رہے۔^(۱) (۳۶)

نوح نے کہا میرے پالنہار میں تیری ہی بناہ چاہتا ہوں اس
بات سے کہ تجھ سے وہ مانگوں جس کا مجھے علم ہی نہ ہو اگر
تو مجھے نہ بخشے گا اور تو مجھ پر رحم نہ فرمائے گا، تو میں خسارہ
پانے والوں میں ہو جاؤں گا۔^(۲) (۳۷)

فرما دیا گیا کہ اے نوح! ہماری جانب سے سلامتی اور ان
برکتوں کے ساتھ اتر،^(۳) جو تجھ پر ہیں اور تیرے ساتھ
کی بہت سی جماعتوں پر^(۴) اور بہت سی وہ امتیں ہوں گی
جنہیں ہم فائدہ تو ضرور پہنچائیں گے لیکن پھر انہیں
ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔^(۵) (۳۸)

یہ خبریں غیب کی خبروں میں سے ہیں جن کی وحی ہم
آپ کی طرف کرتے ہیں انہیں اس سے پہلے آپ
جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم،^(۶) اس لیے آپ صبر

قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ وَإِلَّا
تَغْفِرْ لِي وَرَحْمَتِي أَكْبَرُ مِنَ الْخُسْرِينَ ﴿۳۶﴾

قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ
مِّمَّنْ مَعَكَ وَأَمْرٌ وَسُبُحٌ لَهُمْ تَهْنِئَةٌ لَهُمْ وَمِنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۳۷﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ فَكُلُوا وَشَابِعُوا فِي
أَمْوَالِكُمْ وَلَا تَقْبَلُوا لِلْأَمْوَالِ الَّتِي كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿۳۸﴾

(۱) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام کو نصیحت ہے، جس کا مقصد ان کو اس مقام بلند پر فائز کرنا ہے جو
علمائے عالمین کے لیے اللہ کی بارگاہ میں ہے۔

(۲) جب حضرت نوح علیہ السلام یہ بات جان گئے کہ ان کا سوال واقع کے مطابق نہیں تھا، تو فوراً اس سے رجوع فرمایا
اور اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت و مغفرت کے طالب ہوئے۔

(۳) یہ اترنا کشتی سے یا اس پہاڑ سے ہے جس پر کشتی جا کر ٹھہر گئی تھی۔
(۴) اس سے مراد یا تو وہ گروہ ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار تھے، یا آئندہ ہونے والے وہ گروہ
ہیں جو ان کی نسل سے ہونے والے تھے۔ اگلے فقرے کے پیش نظر یہی دو سرا مفہوم زیادہ صحیح ہے۔

(۵) یہ وہ گروہ ہیں جو کشتی میں بچ جانے والوں کی نسل سے قیامت تک ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کافروں کو دنیا کی
چند روزہ زندگی گزارنے کے لیے ہم دنیا کا ساز و سامان ضرور دیں گے لیکن بالآخر عذاب الیم سے دوچار ہوں گے۔

(۶) یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے اور آپ سے علم غیب کی نفی کی جا رہی ہے کہ یہ غیب کی خبریں ہیں جن
سے ہم آپ کو خبردار کر رہے ہیں ورنہ آپ اور آپ کی قوم ان سے لاعلم تھی۔

کرتے رہیے (یقین مانیئے) کہ انجام کار پر ہمیزگاروں کے لیے ہی ہے۔^(۱) (۳۹)

اور قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو ہم^(۲) نے بھیجا، اس نے کہا میری قوم والو! اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، تم تو صرف بہتان باندھ رہے ہو۔^(۳) (۵۰)

اے میری قوم! میں تم سے اس کی کوئی اجرت نہیں مانگتا، میرا اجر اس کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے تو کیا پھر بھی تم عقل سے کام نہیں لیتے۔^(۴) (۵۱)

اے میری قوم کے لوگو! تم اپنے پالنے والے سے اپنی تفصیروں کی معافی طلب کرو اور اس کی جناب میں توبہ کرو، تاکہ وہ برسنے والے بادل تم پر بھیج دے اور

وَالِیٰ عَادِ اٰخَاهُمْ هُوْدًا قَالِیَقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝

یَقَوْمِ لَا اَسْأَلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِیْ اِلَّا عَلٰی الَّذِیْ فِطَرْتِیْۗ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

وَيَقَوْمِ اسْتَغْفِرْ لِقَوْمِکَ فَاِنَّکَ تُوْبُوْا اِلَیْهِ یُرْسِلُ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مَدْرَارًا وَّیَزِیْدُکُمْ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِکُمْ وَاَنْتُمْ تَوَلَّوْا

(۱) یعنی آپ ﷺ کی قوم آپ کی جو تکذیب کر رہی ہے اور آپ ﷺ کو ایذا میں پہنچا رہی ہے، اس پر صبر سے کام لیجئے، اس لیے کہ ہم آپ کے مددگار ہیں اور حسن انجام آپ کے اور آپ کے پیروکاروں کے لیے ہی ہے، جو تقویٰ کی صفت سے متصف ہیں۔ عاقبت، دنیا و آخرت کے اچھے انجام کو کہتے ہیں۔ اس میں متیقین کے لیے بڑی بشارت ہے کہ ابتدا میں چاہے انہیں کتنا بھی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے، تاہم بالآخر اللہ کی مدد و نصرت اور حسن انجام کے وہی مستحق ہیں۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَاَنْذِرِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ الْحَیْوةَ الدُّنْیَا وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ — (المؤمن ۵۱) یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگانی دنیا میں بھی کریں گے اور اس دن بھی جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے۔

﴿ وَاَلْقَدْ سَبَقَتْ کَلِمَتُنَا لِجَانِبِ الْمُرْسَلِیْنَ * اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمُتَصَوِّرُوْنَ * وَاِنَّ جُنْدًا لَّعَلَمِ الْغُلَبِیْنَ ﴾ (الصافات ۱۷۱-۱۷۳) اور البتہ ہمارا وعدہ پہلے ہی اپنے رسولوں کے لیے صادر ہو چکا ہے کہ وہ مظفر و منصور ہوں گے اور ہمارا ہی لشکر غالب اور برتر رہے گا۔

(۲) بھائی سے مراد انہی ہی کی قوم کا ایک فرد۔

(۳) یعنی اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرا کر تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو۔

(۴) اور یہ نہیں سمجھتے کہ جو بغیر اجرت اور لالچ کے تمہیں اللہ کی طرف بلا رہا ہے، وہ تمہارا خیر خواہ ہے۔ آیت میں یاقوم! اسے دعوت کا ایک طریق کار معلوم ہوتا ہے یعنی بجائے یہ کہنے کے ”اے کافرو“ اے مشرکو“ اے میری قوم سے مخاطب کیا گیا ہے۔

مُجْرِمِينَ ﴿۲۱﴾

تمہاری طاقت پر اور طاقت قوت بڑھادے^(۱) اور تم جرم کرتے ہوئے روگردانی نہ کرو۔^(۲) (۵۲)

انہوں نے کہا اے ہود! تو ہمارے پاس کوئی دلیل تو لایا نہیں اور ہم صرف تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہم تجھ پر ایمان لانے والے ہیں۔^(۳) (۵۳)

بلکہ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تو ہمارے کسی معبود کے برے جھپٹے میں آگیا ہے۔^(۴) اس نے جواب دیا کہ میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں تو اللہ کے سوا ان سب سے بیزار ہوں، جنہیں تم شریک بنا رہے ہو۔^(۵) (۵۴)

قَالُوا يَهُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَاتٍ وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿۲۱﴾

إِنْ تَقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ قَالَ إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ وَاللَّهُ هُنَا وَأَنْتُمْ قَوْمٌ مُّشْرِكُونَ ﴿۲۲﴾

(۱) حضرت ہود علیہ السلام نے توبہ و استغفار کی تلقین اپنی امت یعنی اپنی قوم کو کی اور اس کے وہ فوائد بیان فرمائے جو توبہ و استغفار کرنے والی قوم کو حاصل ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ قرآن کریم میں اور بھی بعض مقامات پر یہ فوائد بیان کیے گئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو سورہ نوح، ۱۱) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی فرمان ہے۔ مَنْ لَزِمَ الْإِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللَّهُ لَهُ مِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا، وَمِنْ كُلِّ ضِيقٍ مَخْرَجًا وَرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (ابوداؤد۔ کتاب الوتر۔ باب فی الاستغفار۔ نمبر ۱۵۱۸-۱۵۱۹۔ وابن ماجہ، نمبر ۳۸۱۹) ”جو پابندی سے استغفار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر فکر سے کشادگی، اور ہر تنگی سے راستہ بنا دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی۔“

(۲) یعنی میں تمہیں جو دعوت دے رہا ہوں، اس سے اعراض اور اپنے کفر پر اصرار مت کرو۔ ایسا کرو گے تو اللہ کی بارگاہ میں مجرم اور گناہ گار بن کر پیش ہو گے۔

(۳) ایک نبی دلائل و براہین کی پوری قوت اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ لیکن شہرہ چشموں کو وہ نظر نہیں آتے قوم ہود علیہ السلام نے بھی اسی ڈھنساٹی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم بغیر دلیل کے محض تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو کس طرح چھوڑ دیں؟

(۴) یعنی تو جو ہمارے معبودوں کی توہین اور گستاخی کرتا ہے کہ یہ کچھ نہیں کر سکتے، معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے معبودوں نے ہی تیری اس گستاخی پر تجھے کچھ کر دیا ہے۔ اور تیرا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ جیسے آج کل کے نام نہاد مسلمان بھی اس قسم کے توہمات کا شکار ہیں؛ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ یہ فوت شدہ اشخاص اور بزرگ کچھ نہیں کر سکتے، تو کہتے ہیں کہ یہ ان کی شان میں گستاخی ہے اور خطرہ ہے کہ اس طرح کی گستاخی کرنے والوں کا وہ بیڑا غرق کر دیں۔ نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ هَذِهِ الْخُرَافَاتِ وَالْأَكْذَابِ.

(۵) یعنی میں ان تمام بتوں اور معبودوں سے بیزار ہوں اور تمہارا یہ عقیدہ کہ انہوں نے مجھے کچھ کر دیا ہے، بالکل غلط ہے، ان کے اندر یہ قدرت ہی نہیں کہ کسی کو مافوق الاسباب طریقے سے نفع یا نقصان پہنچا سکیں۔

مِنْ دُونِهِ كَلْبٌ ذُو نَجْمٍ لَّهُمْ لَا يُنظَرُونَ ﴿٥١﴾

اِنِّى كُوْنُكُنْتُ عَلٰى اللّٰهِ رَبِّىْ وَرَبِّكُمْ مٰمِنٌ دَابَّةٌ اَلَا هُوَ

اِخِذْ بِنٰصِيَةِهَا اِنَّ رَبِّىْ عَلٰى صِرٰطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٥١﴾

اچھا تم سب مل کر میرے خلاف چالیں چل لو اور مجھے بالکل مہلت بھی نہ دو۔ (۵۵)

میرا بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہی ہے، جو میرا اور تم سب کا پروردگار ہے جتنے بھی پاؤں دھرنے والے ہیں سب کی پیشانی وہی تھامے ہوئے (۲) ہے۔ یقیناً میرا رب بالکل صحیح راہ پر ہے۔ (۳) (۵۶)

پس اگر تم روگردانی کرو تو کرو میں تو تمہیں وہ پیغام پہنچا چکا جو دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا تھا۔ (۳) میرا رب تمہارے قائم مقام اور لوگوں کو کر دے گا اور تم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے، (۵) یقیناً میرا پروردگار ہر چیز پر نگہبان ہے۔ (۶) (۵۷)

اور جب ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے ہود کو اور اس کے مسلمان ساتھیوں کو اپنی خاص رحمت سے نجات عطا

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَعَلَّا اَلَمْ نَكُفِّرْكُمْ نَارًا لِّئَلَّا تَسْتَكْبِفُوْا

رَبِّىْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَہٗ سَيِّئًا اِنَّ رَبِّىْ عَلٰى

كُلِّ شَيْءٍ حٰفِظٌ ﴿٥٢﴾

وَلَمَّا جَاءَ اَمْرُنَا لَنَجِيْنَنَّ هُوْدًا وَاٰلَآئِہٖنَ اٰمُوْا مَعًا بِرَحْمَةٍ مِّنَّا

(۱) اور اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں ہے بلکہ تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ بت کچھ کر سکتے ہیں تو لو! میں حاضر ہوں، تم اور تمہارے معبود سب مل کر میرے خلاف کچھ کر کے دکھاؤ۔ مزید اس سے نبی کے اس انداز کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر بصیرت پر ہوتا ہے کہ اسے اپنے حق پر ہونے کا یقین ہوتا ہے۔

(۲) یعنی جس ذات کے ہاتھ میں ہر چیز کا قبضہ و تصرف ہے، وہ وہی ذات ہے جو میرا اور تمہارا رب ہے، میرا توکل اسی پر ہے۔ مقصد ان الفاظ سے حضرت ہود علیہ السلام کا یہ ہے کہ جن کو تم نے اللہ کا شریک ٹھہرا رکھا ہے، ان پر بھی اللہ ہی کا قبضہ و تصرف ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ جو چاہے کر سکتا ہے، وہ کسی کا کچھ نہیں کر سکتے۔

(۳) یعنی وہ جو توحید کی دعوت دے رہا ہے یقیناً یہ دعوت ہی صراطِ مستقیم ہے، اسی پر چل کر نجات اور کامیابی سے ہم کنار ہو سکتے ہو اور اس صراطِ مستقیم سے اعراض و انحراف تباہی و بربادی کا باعث ہے۔

(۴) یعنی اس کے بعد میری ذمے داری ختم اور تم پر حجت تمام ہو گئی۔

(۵) یعنی تمہیں تباہ کر کے تمہاری زمینوں اور املاک کا وہ دو سروں کو مالک بنا دے، تو وہ ایسا کرنے پر قادر ہے اور تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بلکہ وہ اپنی مشیت و حکمت کے مطابق ایسا کرتا رہتا ہے۔

(۶) یقیناً وہ مجھے تمہارے کمرو فریب اور سازشوں سے بھی محفوظ رکھے گا اور شیطانی چالوں سے بھی بچائے گا۔ علاوہ ازیں ہر نیک و بد کو ان کے اعمال کے مطابق اچھی اور بری جزا بھی دے گا۔

فرمائی اور ہم نے ان سب کو سخت عذاب سے بچا لیا۔^(۱) (۵۸)

یہ تھی قوم عاد، جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی^(۲) نافرمانی کی اور ہر ایک سرکش نافرمان کے حکم کی تابعداری کی۔^(۳) (۵۹)

دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی،^(۴) دیکھ لو قوم عاد نے اپنے رب سے کفر کیا، ہود کی قوم عاد پر دوری ہو۔^(۵) (۶۰)

اور قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا،^(۶) اس

وَيَجْبِلُهُمْ مِنْ مَّذَابٍ عَقِيبٍ ۝

وَتِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ الَّتِي يُرْسِلُ فِيهَا الرُّسُلَ لِيُذَكِّرَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ ذَكِيمٌ ۝

وَأْتِىَ مَوْسَىٰ هَذِهِ الْكَلِمَةَ وَيَوْمَ الْآيَاتِ إِذْ أَتَىٰ آلَ هَارُونَ أَنْ يَضَعُوا أَيْدِيَهُمْ وَأَن تَضَعُوا أَيْدِيَكُمْ عَلَىٰ آلِهَتِكُمْ إِنَّكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ فِي كُفْرٍ ۚ

وَأَلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ

(۱) سخت عذاب سے مراد وہی الرِّيحَ الْعَقِيمَةَ تیز آندھی کا عذاب ہے جس کے ذریعے سے حضرت ہود علیہ السلام کی قوم عاد کو ہلاک کیا گیا اور جس سے حضرت ہود علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کو بچا لیا گیا۔

(۲) عاد کی طرف صرف ایک نبی حضرت ہود علیہ السلام ہی بھیجے گئے تھے، یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انہوں نے اللہ کے رسولوں کی نافرمانی کی۔ اس سے یا تو یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ایک رسول کی تکذیب، یہ گویا تمام رسولوں کی تکذیب ہے۔ کیونکہ تمام رسولوں پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ یہ قوم اپنے کفر و انکار میں اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ حضرت ہود علیہ السلام کے بعد اگر ہم اس قوم میں متعدد رسول بھی بھیجتے، تو یہ قوم ان سب کی تکذیب ہی کرتی۔ اور اس سے قطعاً یہ امید نہیں تھی کہ وہ کسی بھی رسول پر ایمان لے آتی۔ یا ہو سکتا ہے کہ اور بھی انبیاء بھیجے گئے ہوں اور اس قوم نے ہر ایک کی تکذیب کی۔

(۳) یعنی اللہ کے پیغمبروں کی تو تکذیب کی لیکن جو لوگ اللہ کے حکموں سے سرکشی کرنے والے اور نافرمان تھے، ان کی اس قوم نے پیروی کی۔

(۴) لَعْنَةُ كَا مَطْلَب ہے اللہ کی رحمت سے دوری، امور خیر سے محرومی اور لوگوں کی طرف سے ملامت و بیزاری۔ دنیا میں یہ لعنت اس طرح کہ اہل ایمان میں ان کا ذکر ہمیشہ ملامت و بیزاری کے انداز میں ہو گا اور قیامت میں اس طرح کہ وہاں علی رؤس الاسماء ذلت و رسوائی سے دوچار اور عذاب الہی میں مبتلا ہوں گے۔

(۵) بَعْدُ كَا یہ لفظ رحمت سے دوری اور لعنت ہلاکت کے معنی کے لیے ہے، جیسا کہ اس سے قبل بھی وضاحت کی جا چکی ہے۔

(۶) وَاللَّيْ ثَمُودَ عَطْف ہے ما قبل پر۔ یعنی وَأَرْسَلْنَا إِلَىٰ ثَمُودَ هَمَّ نَعْمُودَ ہم نے ثمود کی طرف بھیجا۔ یہ قوم تبوک اور مدینہ کے درمیان مدائن صالح (حجرا) میں رہائش پذیر تھی اور یہ قوم عاد کے بعد ہوئی۔ حضرت صالح علیہ السلام کو یہاں بھی ثمود کا بھائی کہا ہے، جس سے مراد انہی کے خاندان اور قبیلے کا ایک فرد ہے۔

نے کہا کہ اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں،^(۱) اسی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا ہے^(۲) اور اسی نے اس زمین میں تمہیں بسایا ہے،^(۳) پس تم اس سے معافی طلب کرو اور اس کی طرف رجوع کرو۔ بیشک میرا رب قریب اور دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے۔ (۶۱)

انہوں نے کہا اے صالح! اس سے پہلے تو ہم تجھ سے بہت کچھ امیدیں لگائے ہوئے تھے، کیا تو ہمیں ان کی عبادتوں سے روک رہا ہے جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے چلے آئے، ہمیں تو اس دین میں حیران کن شک ہے جس کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے۔ (۶۲)^(۴)

اس نے جواب دیا کہ اے میری قوم کے لوگو! ذرا بتاؤ تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے کسی مضبوط دلیل پر ہوا اور اس نے مجھے اپنے پاس کی رحمت عطا کی ہو،^(۵) پھر

عَبْرًا هُوَ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا فَاسْتَعْرِضُوا لَكُمْ نُورًا أَلَيْسَ لِنَرْبٍ قَرِيبٍ مُجِيبٌ ﴿۶۱﴾

قَالُوا لَئِن لَّمْ يَكُنْ لَنَا بَدَلٌ مِنَ اللَّهِ فَمَا كُنَّا وَاعِدًا
يَعْبُدُونَ أَلَيْسَ لَنَا بِمُرْسَلِينَ ﴿۶۲﴾

قَالَ لَقَوْمٌ آتَيْنَاهُم بِنُورٍ كُنْتُمْ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّي وَآتَيْنَاهُمْ رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ إِنَّ مِنْ دُونِ اللَّهِ عَصِيبًا لَّخَبِيرًا
تَحْفِيفًا ﴿۶۳﴾

(۱) حضرت صالح علیہ السلام نے بھی سب سے پہلے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی، جس طرح کہ تمام انبیاء کا طریق رہا ہے۔

(۲) یعنی ابتداءً تمہیں زمین سے پیدا کیا، وہ اس طرح کہ تمہارے باپ آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی اور تمام انسان صلب آدم علیہ السلام سے پیدا ہوئے یوں گویا تمام انسانوں کی پیدائش زمین سے ہوئی۔ یا یہ مطلب ہے کہ تم جو کچھ کھاتے ہو، سب زمین ہی سے پیدا ہوتا ہے اور اسی خوراک سے وہ نطفہ بنتا ہے۔ جو رحم مادر میں جا کر وجود انسانی کا باعث ہوتا ہے۔

(۳) یعنی تمہارے اندر زمین کو بسانے اور آباد کرنے کی استعداد و صلاحیت پیدا کی، جس سے تم رہائش کے لیے مکان تعمیر کرتے، خوراک کے لیے کاشت کاری کرتے اور دیگر ضروریات زندگی میا کرنے کے لیے صنعت و حرفت سے کام لیتے ہو۔

(۴) یعنی پیغمبر اپنی قوم میں چونکہ اخلاق و کردار اور امانت و دیانت میں ممتاز ہوتا ہے، اس لیے قوم کی اس سے اچھی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ اسی اعتبار سے حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے بھی ان سے یہ کہا۔ لیکن دعوت توحید دیتے ہی ان کی امیدوں کا یہ مرکز، ان کی آنکھوں کا کاشنا بن گیا اور اس دین میں شک کا اظہار کیا جس کی طرف حضرت صالح علیہ السلام انہیں بلا رہے تھے یعنی دین توحید۔

(۵) بَيِّنَةٌ سے مراد وہ ایمان و یقین ہے، جو اللہ تعالیٰ پیغمبر کو عطا فرماتا ہے اور رحمت سے نبوت۔ جیسا کہ پہلے وضاحت گزر چکی ہے۔

اگر میں نے اس کی نافرمانی کر^(۱) لی تو کون ہے جو اس کے مقابلے میں میری مدد کرے؟ تم تو میرا نقصان ہی بڑھا رہے ہو۔ (۶۳)^(۲)

اور اے میری قوم والو! یہ اللہ کی بھیجی ہوئی اونٹنی ہے جو تمہارے لیے ایک معجزہ ہے اب تم اسے اللہ کی زمین میں کھاتی ہوئی چھوڑ دو اور اسے کسی طرح کی ایذا نہ پہنچاؤ ورنہ فوری عذاب تمہیں پکڑ لے گا۔ (۶۳)^(۳)

پھر بھی ان لوگوں نے اس اونٹنی کے پاؤں کاٹ ڈالے، اس پر صلح نے کہا کہ اچھا تم اپنے گھروں میں تین تین دن تک تو رہ سہ لو، یہ وعدہ جھوٹا نہیں ہے۔ (۶۵)^(۴)

پھر جب ہمارا فرمان آپنچا،^(۵) ہم نے صلح کو اور ان پر ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے اس سے بھی بچالیا اور اس دن کی رسوائی سے بھی۔ یقیناً تیرا رب نہایت توانا اور غالب ہے۔ (۶۶)

وَيَقُومُ هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً ذَكَرُوهَا تَأْكُلُ فِي أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيبٌ ﴿٦٣﴾

فَقَعَرُوا وَفَاعَلَّ لَمَسَعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ آيَاتٍ ذَلِكَ وَعَذَابٌ غَيْرُ مَلَكُوتٍ ﴿٦٥﴾

فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَالِحًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَمَنْ خَرَفَ يَوْمَئِذٍ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ﴿٦٦﴾

(۱) نافرمانی سے مراد یہ ہے کہ اگر میں تمہیں حق کی طرف اور اللہ واحد کی عبادت کی طرف بلانا چھوڑ دوں، جیسا کہ تم چاہتے ہو۔

(۲) یعنی اگر میں ایسا کروں تو تم مجھے کوئی فائدہ تو نہیں پہنچا سکتے، البتہ اس طرح تم میرے نقصان و خسارے میں ہی اضافہ کرو گے۔

(۳) یہ وہی اونٹنی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے کہنے پر ان کی آنکھوں کے سامنے ایک پہاڑ یا ایک چٹان سے برآمد فرمائی۔ اسی لیے اسے «نَاقَةُ اللَّهِ» (اللہ کی اونٹنی) کہا گیا ہے کیونکہ یہ خالص اللہ کے حکم سے معجزانہ طور پر مذکورہ خلاف عادت طریقے سے ظاہر ہوئی تھی۔ اس کی بابت انہیں تاکید کر دی گئی تھی کہ اسے ایذا نہ پہنچانا، ورنہ تم عذاب الہی کی گرفت میں آ جاؤ گے۔

(۴) لیکن ان ظالموں نے اس زبردست معجزے کے باوجود نہ صرف ایمان لانے سے گریز کیا بلکہ حکم الہی سے صریح سرتابی کرتے ہوئے اسے مار ڈالا، جس کے بعد انہیں تین دن کی مہلت دے دی گئی کہ تین دن کے بعد تمہیں عذاب کے ذریعے سے ہلاک کر دیا جائے گا۔

(۵) اس سے مراد وہی عذاب ہے جو وعدے کے مطابق چوتھے دن آیا اور حضرت صالح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کے سوا، سب کو ہلاک کر دیا گیا۔

اور ظالموں کو بڑے زور کی چنگھاڑنے آدبوجا،^(۱) پھر تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے رہ گئے۔^(۲) (۶۷)
ایسے کہ گویا وہ وہاں کبھی آباد ہی نہ تھے،^(۳) آگاہ رہو کہ قوم ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سن لو! ان ثمودیوں پر پھنکار ہے۔ (۶۸)

اور ہمارے بھیجے ہوئے پیغامبر ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر پہنچے^(۴) اور سلام کہا،^(۵) انہوں نے بھی جواب سلام دیا^(۶) اور بغیر کسی تاخیر کے گائے کا بھنا ہوا چھڑالے آئے۔^(۷) (۶۹)

وَأَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جِثِيًّا ۝

كَانَ لَكُمْ يَوْمَئِذٍ فِيهَا الْأَرَانُ تَبُودًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ أَلَا بُعِدًا
لِئْسَ بَشَرًا ۝

وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلًا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ قَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ
فَمَا لَبِثَ أَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِينًا ۝

(۱) یہ عذاب صَنِحَةٌ (جیح، زور کی کڑک) کی صورت میں آیا، بعض کے نزدیک یہ حضرت جبریل علیہ السلام کی جیح تھی اور بعض کے نزدیک آسمان سے آئی تھی۔ جس سے ان کے دل پارہ پارہ ہو گئے اور ان کی موت واقع ہو گئی، اس کے بعد یا اس کے ساتھ ہی بھونچال (رَجْفَةٌ) بھی آیا، جس نے سب کچھ تہ و بالا کر دیا (جیسا کہ سورہ اعراف ۸۷ء میں ﴿فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ﴾ کے الفاظ ہیں۔

(۲) جس طرح پرندہ مرنے کے بعد زمین پر مٹی کے ساتھ پڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ موت سے ہم کنار ہو کر منہ کے بل زمین پر پڑے رہے۔

(۳) ان کی بستی یا خود یہ لوگ یا دونوں ہی، اس طرح حرف غلط کی طرح مٹا دیئے گئے گویا وہ کبھی وہاں آباد ہی نہ تھے۔
(۴) یہ دراصل حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم کے قحے کا ایک حصہ ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پچازاد بھائی تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بستی بصرہ میت کے جنوب مشرق میں تھی، جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین میں مقیم تھے۔ جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ تو ان کی طرف فرشتے بھیجے گئے۔ یہ فرشتے قوم لوط علیہ السلام کی طرف جاتے ہوئے راستے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس ٹھہرے اور انہیں بیٹی کی بشارت دی۔

(۵) یعنی سَلَّمْنَا عَلَيْكَ سَلَامًا ”ہم آپ کو سلام عرض کرتے ہیں۔“

(۶) جس طرح پہلا سلام ایک فعل مقدر کے ساتھ منصوب تھا۔ اسی طرح یہ سلام مبتدا یا خبر ہونے کی بنا پر مرفوع ہے، عبارت ہوگی أَمْرُكُمْ سَلَامًا يَا عَلَيَّكُمْ سَلَامًا

(۷) حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑے مہمان نواز تھے۔ وہ یہ نہیں سمجھ پائے کہ یہ فرشتے ہیں جو انسانی صورت میں آئے ہیں اور کھانے پینے سے معذور ہیں، بلکہ انہوں نے انہیں مہمان سمجھا اور فوراً مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے بھنا ہوا چھڑالا کر ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ نیز اس سے یہ معلوم ہوا کہ مہمان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں بلکہ جو موجود ہو حاضر خدمت کر دیا جائے۔

اب جو دیکھا کہ ان کے تو ہاتھ بھی اس کی طرف نہیں پہنچ رہے تو ان سے اجنبیت محسوس کر کے دل ہی دل میں ان سے خوف کرنے لگے،^(۱) انہوں نے کہا ڈرو نہیں ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے ہوئے آئے ہیں۔^(۲) (۷۰)

اس کی بیوی جو کھڑی ہوئی تھی وہ ہنس پڑی،^(۳) تو ہم نے اسے اسحاق کی اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی خوشخبری دی۔ (۷۱)

وہ کہنے لگی ہائے میری کم بختی! میرے ہاں اولاد کیسے ہو سکتی ہے میں خود بڑھیا اور یہ میرے خاوند بھی بہت بڑی عمر کے ہیں یہ تو یقیناً بڑی عجیب بات ہے!^(۴) (۷۲)

فرشتوں نے کہا کیا تو اللہ کی قدرت سے تعجب کر رہی^(۵) ہے؟ تم پر اے اس گھر کے لوگو اللہ کی رحمت

فَلَمَّا رَاَ اٰیٰتِیْہِمۡ لَانَصِلَ الَیۡہِمْ وَبٰرَکَہُمۡ وَاَوۡصٰی مِنْہُمۡ خَیۡفَۃً
قَالُوۡا اَلَاۤ اِذَا کُنَّاۤ اِلٰی قَوْمِ لُوۡطٍ ؕ

وَاَمَّا اُنۡتَ فَآئِمَّۃٌ فَضَجَّکَ فَبَشِّرۡنٰہَا بِاسۡحٰقَ وَمِنْ ذُرِّۡہِ
اِسۡحٰقَ یَعۡقُوۡبَ ؕ

قَالَتۡ یٰۤاٰیۡتِیۡ کَیۡۤیٰۤاۤ اَنَا عَجُوۡزٌ وَّہٰذَا بَعۡنِیۡ شَبۡحٰلًاۤ اَہٰذَا
لَشَئِیۡ عَجِیۡبٌ ؕ

قَالُوۡا اَتَعۡجِبِیۡنَ مِنْۢ مَّا رَاۤیۡتَ لَدُوۡنَہٗ وَرَبُّنَا عَلَیۡمٌۭ لَّعَلَّ

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھ ہی نہیں رہے، تو انہیں خوف محسوس ہوا۔ کہتے ہیں کہ ان کے ہاں یہ چیز معروف تھی کہ آئے ہوئے مہمان اگر ضیافت سے فائدہ نہ اٹھاتے تو سمجھا جاتا تھا کہ آنے والے مہمان کسی اچھی نیت سے نہیں آئے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کے پیغمبروں کو غیب کا علم نہیں ہوتا۔ اگر ابراہیم علیہ السلام غیب دان ہوتے تو بھنا ہوا ٹچٹرا بھی نہ لاتے اور ان سے خوف بھی محسوس نہ کرتے۔

(۲) اس خوف کو فرشتوں نے محسوس کیا، یا تو ان آثار سے جو ایسے موقعوں پر انسان کے چہرے پر ظاہر ہوتے ہیں، یا اپنی گفتگو میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کا اظہار فرمایا، جیسا کہ دوسرے مقام پر وضاحت ہے ﴿اِنَّاۤ اٰمَنَّاۤ بِکَ وَجَلَوۡنَا﴾ (الحجر: ۵۲) ”ہمیں تو تم سے ڈر لگتا ہے۔“ چنانچہ فرشتوں نے کہا ڈرو نہیں، آپ جو سمجھ رہے ہیں، ہم وہ نہیں ہیں، بلکہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں اور ہم قوم لوط علیہ السلام کی طرف جا رہے ہیں۔

(۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ کیوں نہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ قوم لوط علیہ السلام کی فساد انگیزیوں سے وہ بھی آگاہ تھیں، ان کی ہلاکت کی خبر سے انہوں نے سرت محسوس کی۔ بعض کہتے ہیں اس لیے ہنسی آئی کہ دیکھو آسمانوں سے ان کی ہلاکت کا فیصلہ ہو چکا ہے اور یہ قوم غفلت کا شکار ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ تقدیم و تاخیر ہے۔ اور اس ہنسنے کا تعلق اس بشارت سے ہے جو فرشتوں نے اس بوڑھے جوڑے کو دی۔ واللہ اعلم۔

(۴) یہ اہلیہ حضرت سارہ تھیں، جو خود بھی بوڑھی تھیں اور ان کے شوہر حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی بوڑھے تھے، اس لیے تعجب ایک فطری امر تھا، جس کا اظہار ان سے ہوا۔

(۵) یہ استفہام انکار کے لیے ہے۔ یعنی تو اللہ تعالیٰ کے تقاضا و قدر پر کس طرح تعجب کا اظہار کرتی ہے جبکہ اس کے لیے کوئی چیز

اور اس کی برکتیں نازل ہوں،^(۱) بیشک اللہ حمد و ثنا کا سزاوار اور بڑی شان والا ہے۔ (۷۳)

جب ابراہیم کا ڈر خوف جاتا رہا اور اسے بشارت بھی پہنچ چکی تو ہم سے قوم لوط کے بارے میں کہنے سننے لگے۔^(۲) (۷۴)

یقیناً ابراہیم بہت تحمل والے نرم دل اور اللہ کی جانب جھکنے والے تھے۔ (۷۵)

اے ابراہیم! اس خیال کو چھوڑ دیجئے، آپ کے رب کا حکم آپہنچا ہے، اور ان پر نہ ٹالے جانے والا عذاب ضرور آنے والا ہے۔^(۳) (۷۶)

جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو وہ ان کی وجہ سے بہت غمگین ہو گئے اور دل ہی دل میں کڑھنے لگے اور کہنے لگے کہ آج کا دن بڑی مصیبت کا دن ہے۔^(۴) (۷۷)

الْبَيِّنَاتِ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَجِيدٌ ۝۶

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَىٰ يُحَادِّثُنَا فِى قَوْمِ لُوطٍ ۝۷

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَكِيمٌ أَدَّاهُ مُنِيبٌ ۝۸

يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرٌ لِّكَ وَ إِنَّهُمْ لَيَبُغُونَ عَدَاؤَكَ فَاغْوِىْهُمْ عَنْ ذُرِّيَّتِهِمُ الْمُرْتَدِينَ ۝۹

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا فِى يَوْمِهِمْ فَذَرَأَ قَالَ هَذَا يَوْمُ عَصِيبٍ ۝۱۰

مشکل نہیں۔ اور نہ وہ اسباب عادیہ ہی کا محتاج ہے، وہ تو جو چاہے، اس کے لفظ کُنْ (ہو جا) سے معرض وجود میں آجاتا ہے۔

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی المیہ محترمہ کو یہاں فرشتوں نے ”اہل بیت“ سے یاد کیا اور دوسرے ان کے لیے جمع مذکر مخاطب (عَلَيْكُمْ) کا صیغہ استعمال کیا۔ جس سے ایک بات تو یہ ثابت ہو گئی کہ ”اہل بیت“ میں سب سے پہلے انسان کی بیوی شامل ہوتی ہے۔ دوسری، یہ کہ ”اہل بیت“ کے لیے جمع مذکر کے صیغے کا استعمال بھی جائز ہے۔ جیسا کہ سورہٴ احزاب، ۳۳ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو بھی اہل بیت کہا ہے اور انہیں جمع مذکر کے صیغے سے مخاطب بھی کیا ہے۔

(۲) اس مجادلے سے مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں سے کہا کہ جس بہتی کو تم ہلاک کرنے جا رہے ہو، اسی میں حضرت لوط علیہ السلام بھی موجود ہیں۔ جس پر فرشتوں نے کہا ”ہم جانتے ہیں کہ لوط علیہ السلام بھی وہاں رہتے ہیں۔ لیکن ہم ان کو اور ان کے گھر والوں کو سوائے ان کی بیوی کے بچالیں گے۔“ (العنکبوت، ۳۳)

(۳) یہ فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ اب اس بحث و تکرار کا کوئی فائدہ نہیں، اسے چھوڑیے! اللہ کا وہ حکم (ہلاکت کا) آپ کا ہے، جو اللہ کے ہاں مقدر تھا۔ اور اب یہ عذاب نہ کسی کے مجادلے سے رکے گا نہ کسی کی دعا سے ملے گا۔

(۴) حضرت لوط علیہ السلام کی اس سخت پریشانی کی وجہ مفسرین نے یہ لکھی ہے کہ یہ فرشتے نو عمر نوجوانوں کی شکل میں آئے تھے، جو بے ریش تھے، جس سے حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کی عادت قبیحہ کے پیش نظر سخت خطرہ محسوس

اور اس کی قوم دوڑتی ہوئی اس کے پاس آ پہنچی، وہ تو پہلے ہی سے بد کاریوں میں مبتلا تھی،^(۱) لوط علیہ السلام نے کہا اے قوم کے لوگو! یہ ہیں میری بیٹیاں جو تمہارے لیے بہت ہی پاکیزہ ہیں،^(۲) اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے بارے میں رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں ایک بھی بھلا آدمی نہیں۔^(۳) (۷۸)

انہوں نے جواب دیا کہ تو بخوبی جانتا ہے کہ ہمیں تو تیری بیٹیوں پر کوئی حق نہیں ہے اور تو ہماری اصلی چاہت سے بخوبی واقف ہے۔^(۴) (۷۹)

لوط علیہ السلام نے کہا کاش کہ مجھ میں تم سے مقابلہ کرنے

وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ اِلَيْهِ وَمَنْ كَانَ يُؤَيَّمُونَ السَّيِّئَاتِ قَالَ يَفْقَهُوْهُمُ اَوْلَادُ بَنَاتِي هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تَعْرُؤُنَّ فِيْ حَقِّيْ يَوْمَ الْكَيْسِ وَمَنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝۷۸

قَالُوْا الْقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ وَّلَا تَنْتَعِمُوْا بِمَا تُرِيْدُوْنَ ۝۷۹

قَالَ لَوْ اَنَّ فِيْ يَدِيْ سُوْفٌ اَوْ اَدْوِيْ اِلَى رُكْنِيْ شَدِيْدٍ ۝۸۰

کیا۔ کیونکہ ان کو یہ پتہ نہیں تھا کہ آنے والے یہ نوجوان، مہمان نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں جو اس قوم کو ہلاک کرنے کے لیے ہی آئے ہیں۔

(۱) جب اغلام بازی کے ان مریضوں کو پتہ چلا کہ چند خوبرو نوجوان لوط علیہ السلام کے گھر آئے ہیں تو دوڑے ہوئے آئے اور انہیں اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا، تاکہ ان سے اپنی غلط خواہشات پوری کریں۔

(۲) یعنی تمہیں اگر جنسی خواہش ہی کی تسکین مقصود ہے تو اس کے لیے میری بیٹیاں موجود ہیں، جن سے تم نکاح کر لو اور اپنا مقصد پورا کرو۔ یہ تمہارے لیے ہر طرح سے بہتر ہے۔ بعض نے کہا کہ بنات سے مراد عام عورتیں ہیں اور انہیں اپنی لڑکیاں اس لیے کہا ہے کہ پیغمبر اپنی امت کے لیے بمنزلہ باپ ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کام کے لیے عورتیں موجود ہیں، ان سے نکاح کرو اور اپنا مقصد پورا کرو! (ابن کثیر)

(۳) یعنی میرے گھر آئے مہمانوں کے ساتھ زیادتی اور زبردستی کر کے مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں ایک آدمی بھی ایسا سمجھدار نہیں ہے، جو میزبانی کے تقاضوں اور اس کی نزاکت کو سمجھ سکے؟ اور تمہیں اپنے برے ارادوں سے روک سکے؟ حضرت لوط علیہ السلام نے یہ ساری باتیں اس کی نزاکت کو سمجھ سکے کہ وہ ان فرشتوں کو فی الواقع نوارد مسافر اور مہمان ہی سمجھتے رہے۔ اس لیے وہ بجا طور پر ان کی حفاظت کو اپنی عزت و وقار کے لیے ضروری سمجھتے رہے۔ اگر ان کو پتہ چل جاتا یا وہ عالم الغیب ہوتے، تو ظاہر بات ہے کہ انہیں یہ پریشانی ہرگز لاحق نہ ہوتی، جو انہیں ہوئی اور جس کا نقشہ یہاں قرآن مجید نے کھینچا ہے۔

(۴) یعنی ایک جائز اور فطری طریقے کو انہوں نے بالکل رد کر دیا اور غیر فطری کام اور بے حیائی پر اصرار کیا، جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ قوم اپنی اس بے حیائی کی عادت خبیثہ میں کتنی آگے جا چکی تھی اور کس قدر اندھی ہو گئی تھی۔

کی قوت ہوتی یا میں کسی زبردست کا آسرا پکڑ پاتا۔^(۸۰) اب فرشتوں نے کہا اے لوٹا! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں ناممکن ہے کہ یہ تجھ تک پہنچ جائیں پس تو اپنے گھروالوں کو لے کر کچھ رات رہے نکل کھڑا ہو۔ تم میں سے کسی کو مڑ کر بھی نہ دیکھنا چاہیے، بجز تیری بیوی کے، اس لیے کہ اسے بھی وہی پہنچنے والا ہے جو ان سب کو پہنچے گا، یقیناً ان کے وعدے کا وقت صبح کا ہے، کیا صبح بالکل قریب نہیں۔^(۸۱)

پھر جب ہمارا حکم آپہنچا، ہم نے اس بستی کو زیر و زبر کر دیا اوپر کا حصہ نیچے کر دیا اور ان پر کنکر لیلے پتھر برسائے جو تہ بہ تہ تھے۔^(۸۲)

تیرے رب کی طرف سے نشان دار تھے اور وہ ان ظالموں سے کچھ بھی دور نہ تھے۔^(۸۳)

قَالُوا لَیْلُوظَرْنَا مَنْ لَدُنَّ رَبِّكَ لَنْ یَصِلُوا إِلَیْكَ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِظُلْمٍ مِنَ اللَّیْلِ وَلَا یَلْتَمِثْ مِنْكَ أَحَدٌ إِلَّا أَمْرَاتُكَ إِنَّهُ مُصِیْبُهُمْ مَا أَصَابَهُمْ إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الضُّبْحُ أَلِیْسَ الضُّبْحُ بَعْرِیْبٌ ۝

فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافًا لَهَا وَآمَطْنَا عَنْهَا حِجَارَةً مِنْ سِجِّیلٍ وَأَمْضُوۤا ۝

مُسْتَوْمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ ۝

(۱) قوت سے اپنے دست و بازو اور اپنے وسائل کی قوت یا اولاد کی قوت مراد ہے اور رکن شدید (مضبوط آسرا) سے خاندان، قبیلہ یا اسی قسم کا کوئی مضبوط سارا مراد ہے۔ یعنی نہایت بے بسی کے عالم میں آرزو کر رہے ہیں کہ کاش! میرے اپنے پاس کوئی قوت ہوتی یا کسی خاندان اور قبیلے کی پناہ اور مدد مجھے حاصل ہوتی تو آج مجھے مہمانوں کی وجہ سے یہ ذلت و رسوائی نہ ہوتی، میں ان بد قماشوں سے نمٹ لیتا اور مہمانوں کی حفاظت کر لیتا۔ حضرت لوط علیہ السلام کی یہ آرزو، اللہ تعالیٰ پر توکل کے منافی نہیں ہے۔ بلکہ ظاہری اسباب کے مطابق ہے۔ اور توکل علی اللہ کا صحیح مفہوم و مطلب بھی یہی ہے کہ پہلے تمام ظاہری اسباب و وسائل بروئے کار لائے جائیں اور پھر اللہ پر توکل کیا جائے۔ یہ توکل کا نہایت غلط مفہوم ہے کہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جاؤ اور کہو کہ ہمارا بھروسہ اللہ پر ہے۔ اس لیے حضرت لوط علیہ السلام نے جو کچھ کہا، ظاہری اسباب کے اعتبار سے بالکل بجا کہا۔ جس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ کا پیغمبر جس طرح عالم الغیب نہیں ہوتا، اسی طرح وہ مختار کل بھی نہیں ہوتا، (جیسا کہ آج کل لوگوں نے یہ عقیدہ گھڑ لیا ہے) اگر نبی دنیا میں اختیارات سے بہرہ ور ہوتے تو یقیناً حضرت لوط علیہ السلام اپنی بے بسی کا اور اس آرزو کا اظہار نہ کرتے جو انہوں نے مذکورہ الفاظ میں کیا۔

(۲) جب فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی بے بسی اور ان کی قوم کی سرکشی کا مشاہدہ کر لیا تو بولے، اے لوٹا! گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، ہم تک تو کیا، اب یہ تجھ تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اب رات کے ایک حصے میں، سوائے بیوی کے، اپنے گھروالوں کو لے کر یہاں سے نکل جا، صبح ہوتے ہی اس بستی کو ہلاک کر دیا جائے گا۔

(۳) اس آیت میں ہیٰ کا مرجع بعض مفسرین کے نزدیک وہ نشان زدہ کنکر لیلے پتھر ہیں جو ان پر برسائے گئے اور بعض

اور ہم نے مدین والوں کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور تم ناپ تول میں بھی کمی نہ کرو^(۲) میں تو تمہیں آسودہ حال دیکھ رہا ہوں اور مجھے تم پر گھبرنے والے دن کے عذاب کا خوف (بھی) ہے۔^(۳) (۸۴)

اے میری قوم! ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کرو لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو^(۵) اور زمین میں فساد

وَالَّذِي مَدِينَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ وَلَا تَنْقُصُوا الْيَتَامَىٰ وَالْيَتِيمَانَ إِنِّي أَرَاكُمْ بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ﴿۸۴﴾

وَيَقْوِمُوا أَوْسُوا الْيَتَامَىٰ وَالْيَتِيمَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْتَوُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿۸۵﴾

کے نزدیک اس کا مرجع وہ بتیاں ہیں جو ہلاک کی گئیں اور جو شام اور مدینہ کے درمیان تھیں اور ظالمین سے مراد مشرکین مکہ اور دیگر مکذبین ہیں۔ مقصد ان کو ڈرانا ہے کہ تمہارا حشر بھی ویسا ہو سکتا ہے جس سے گزشتہ قومیں دوچار ہوئیں۔

(۱) مدین کی تحقیق کے لیے دیکھئے سورۃ الأعراف، آیت ۸۵ کا حاشیہ۔

(۲) توحید کی دعوت دینے کے بعد، اس قوم میں جو نمایاں اخلاقی خرابی۔ ناپ تول میں کمی۔ کی تھی، اس سے انہیں منع فرمایا۔ ان کا معمول یہ بن چکا تھا کہ جب ان کے پاس فروخت کنندہ (بائع) اپنی چیز لے کر آتا تو اس سے ناپ اور تول میں زائد چیز لیتے اور جب خریدار (مشری) کو کوئی چیز فروخت کرتے تو ناپ میں بھی کمی کر کے دیتے اور تول میں بھی ڈنڈی کار لیتے۔

(۳) یہ اس منع کرنے کی علت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تم پر اپنا فضل کر رہا ہے اور اس نے تمہیں آسودگی اور مال و دولت سے نوازا ہے تو پھر تم یہ قبیح حرکت کیوں کرتے ہو؟

(۴) یہ دوسری علت ہے کہ اگر تم اپنی اس حرکت سے باز نہ آئے تو پھر اندیشہ ہے کہ قیامت والے دن کے عذاب سے تم نہ بچ سکو۔ گھبرنے والے دن سے مراد قیامت کا دن ہے کہ اس دن کوئی گناہ گار مؤاخذہ الہی سے بچ سکے گا نہ بھاگ کر کہیں چھپ سکے گا۔

(۵) انبیاء علیہم السلام کی دعوت دو اہم بنیادوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ۱۔ حقوق اللہ کی ادائیگی ۲۔ حقوق العباد کی ادائیگی۔ اول الذکر کی طرف لفظ الْعَبِيدُ وَاللَّهَہُ اور آخر الذکر کی جانب ﴿وَلَا تَنْقُصُوا الْيَتَامَىٰ﴾ سے اشارہ کیا گیا اور اب تاکید کے طور پر انہیں انصاف کے ساتھ پورا پورا ناپ تول کا حکم دیا جا رہا ہے اور لوگوں کو چیزیں کم کر کے دینے سے منع کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ بھی ایک بہت بڑا جرم ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایک پوری سورت میں اس جرم کی شاعت و قباحت اور اس کی اخروی سزا بیان فرمائی ہے۔ ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ * الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ * وَإِذَا كَالُوا لَهُمْ أَوْ ذَرُّهُمْ يُحْتَرُونَ﴾ (سورۃ المطففین ۳-۱) ”مطففین کے لیے ہلاکت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب دوسروں کو ناپ کر لیا تو ل کر دیتے ہیں، تو کم کر کے دیتے ہیں۔“

اور خرابی نہ چھاؤ۔^(۱) (۸۵)

اللہ تعالیٰ کا حلال کیا ہوا جو بیچ رہے تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہے اگر تم ایمان والے ہو،^(۲) میں تم پر کچھ تکمیل (اور داروغہ) نہیں ہوں۔^(۳) (۸۶)

انہوں نے جواب دیا کہ اے شعیب! کیا تیری صلاۃ^(۴) تجھے یہی حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں اور ہم اپنے مالوں میں جو کچھ چاہیں اس کا کرنا بھی چھوڑ دیں^(۵) تو تو بڑا ہی باوقار اور نیک چلن آدمی ہے۔^(۶) (۸۷)

کہا اے میری قوم! دیکھو تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل لیے ہوئے ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے بہترین روزی دے رکھی ہے،^(۷) میرا یہ ارادہ

بَقِيَّتُ اللَّهِ حَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۗ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ۝

قَالُوا يَشْعِبُ أَسْأَلُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ تَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَنْ تَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَكِيمُ الرَّشِيدُ ۝

قَالَ لَقَوْمِ آدَمُ بَيْنَكُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَمْلِكَ الْفُلْكَ إِلَىٰ مَا

(۱) اللہ کی نافرمانی سے، بالخصوص جن کا تعلق حقوق العباد سے ہو، جیسے یہاں ناپ تول کی کمی بیشی میں ہے، زمین میں یقیناً فساد اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے جس سے انہیں منع کیا گیا۔

(۲) ﴿بَقِيَّتُ اللَّهِ﴾ سے مراد وہ نفع ہے جو ناپ تول میں کسی قسم کی کمی کیے بغیر، دیانت داری کے ساتھ سودا دینے کے بعد حاصل ہو۔ یہ چونکہ حلال و طیب ہے اور خیر و برکت بھی اسی میں ہے، اس لیے اللہ کا بقیہ قرار دیا گیا ہے۔

(۳) یعنی میں تمہیں صرف تبلیغ کر سکتا ہوں اور وہ اللہ کے حکم سے کر رہا ہوں۔ لیکن برائیوں سے میں تمہیں روک دوں یا اس پر سزا دوں، یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ ان دونوں باتوں کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔

(۴) صَلَوةٌ سے مراد، عبادت، دین یا تلاوت ہے۔

(۵) اس سے مراد بعض مفسرین کے نزدیک زکوٰۃ و صدقات ہیں جس کا حکم ہر آسمانی مذہب میں دیا گیا ہے۔ اللہ کے حکم سے زکوٰۃ و صدقات کا اخراج اللہ کے نافرمانوں پر نہایت شاق گزرتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم اپنی محنت و لیاقت سے مال کماتے ہیں تو اس کے خرچ کرنے یا نہ کرنے میں ہم پر پابندی کیوں ہو؟ اور اس کا کچھ حصہ ایک مخصوص مد کے لیے نکالنے پر ہمیں مجبور کیوں کیا جائے؟ اسی طریقے سے کمائی اور تجارت میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی پابندی بھی ایسے لوگوں پر نہایت گراں گزرتی ہے، ممکن ہے ناپ تول میں کمی سے روکنے کو بھی انہوں نے اپنے مالی تصرفات میں دخل در معقولات سمجھا ہو۔ اور ان الفاظ میں اس سے انکار کیا ہو۔ دونوں ہی مفہوم اس کے صحیح ہیں۔

(۶) حضرت شعیب علیہ السلام کے لیے یہ الفاظ انہوں نے بطور استہراکے۔

(۷) رزق حسن کا دوسرا مفہوم نبوت بھی بیان کیا گیا ہے۔ (ابن کثیر)

بالکل نہیں کہ تمہارا خلاف کر کے خود اس چیز کی طرف جھک جاؤں جس سے تمہیں روک رہا ہوں،^(۱) میرا ارادہ تو اپنی طاقت بھر اصلاح کرنے کا ہی ہے۔^(۲) میری توفیق اللہ ہی کی مدد سے ہے،^(۳) اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ (۸۸)

اور اے میری قوم (کے لوگو!) کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کو میری مخالفت ان عذابوں کا مستحق بنا دے جو قوم نوح اور قوم ہود اور قوم صالح کو پہنچے ہیں۔ اور قوم لوط تو تم سے کچھ دور نہیں۔^(۴) (۸۹)

تم اپنے رب سے استغفار کرو اور اس کی طرف توبہ کرو، یقین مانو کہ میرا رب بڑی مہربانی والا اور بہت محبت کرنے والا ہے۔ (۹۰)

انہوں نے کہا اے شعیب! تیری اکثر باتیں تو ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتیں^(۵) اور ہم تو تجھے اپنے اندر بہت کمزور پاتے ہیں،^(۶) اگر تیرے قبیلے کا خیال نہ ہوتا تو ہم تو تجھے سنگسار کر دیتے،^(۷) اور ہم تجھے کوئی حیثیت والی ہستی

أَنْهَلِكُمْ عَنْهُ إِنْ أُرِيدَ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَلْعَمْتُ
وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ
أُيْتِبُ ۝

وَيَقَوْمٍ لَا يُخَيِّرُونَكَ إِذْ أَنْ يُضَيَّبُوكُمْ مِثْلَ مَا أَصَابَ
قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِنْكُمْ
بَبَعِيدٍ ۝

وَاسْتَغْفِرْ وَإِلَيْكُمْ تُرْجَعُونَ ۝ وَإِلَيْهِ
رَبِّي رَجِعُ ۝ وَدُوْدُ ۝

قَالُوا يَشْعِبُ مَا نَفَقَهُ كَثِيرًا وَمَا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرُكَ
فِيَنَا ضَعِيفًا وَلَوْلَا رَهْمُكَ لَرَجَمْنَاكَ وَمَا عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ۝

(۱) یعنی جس کام سے میں تمہیں روکوں، تم سے خلاف ہو کر، وہ میں خود کروں، ایسا نہیں ہو سکتا۔

(۲) میں تمہیں جس کام کے کرنے یا جس سے رکنے کا حکم دیتا ہوں، اس سے مقصد اپنی مقدور بھر، تمہاری اصلاح ہی ہے۔

(۳) یعنی حق تک پہنچنے کا جو میرا ارادہ ہے، وہ اللہ کی توفیق سے ہی ممکن ہے، اس لیے تمام معاملات میں میرا بھروسہ اسی پر ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

(۴) یعنی ان کی جگہ تم سے دور نہیں، یا اس سبب میں تم سے دور نہیں جو ان کے عذاب کا موجب بنا۔

(۵) یہ یا تو انہوں نے بطور مذاق اور تحقیر کہا اور یا ان کا خیال ہے کہ تمہیں ان کی باتیں ان کے لیے ناقابل فہم نہیں تھیں۔ اس صورت میں یہاں فہم کی نفی مجازاً ہوگی۔ یا ان کا مقصد ان باتوں کے سمجھنے سے معذوری کا اظہار ہے جن کا تعلق غیب سے ہے۔

مثلاً بے بعد الموت، حشر نشر، جنت و دوزخ وغیرہ اس لحاظ سے، فہم کی نفی حقیقتاً ہوگی۔

(۶) یہ کمزوری جسمانی لحاظ سے تھی، جیسا کہ بعض کا خیال ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹائی کمزور تھی یا وہ نحیف و لاغر جسم کے تھے یا اس اعتبار سے انہیں کمزور کہا کہ وہ خود بھی مخالفین سے تمام مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔

(۷) حضرت شعیب علیہ السلام کا قبیلہ کہا جاتا ہے کہ ان کا پشتیان نہیں تھا، لیکن وہ قبیلہ چونکہ کفر و شرک میں اپنی ہی

نہیں گنتے۔^(۱) (۹۱)

انہوں نے جواب دیا کہ اے میری قوم کے لوگو! کیا تمہارے نزدیک میرے قبیلے کے لوگ اللہ سے بھی زیادہ ذی عزت ہیں کہ تم نے اسے پس پشت ڈال دیا ہے یقیناً میرا رب جو کچھ تم کر رہے ہو سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ (۹۲)

اے میری قوم کے لوگو! اب تم اپنی جگہ عمل کیے جاؤ میں بھی عمل کر رہا ہوں، تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کس کے پاس وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے اور کون ہے جو جھوٹا ہے۔ تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔^(۳) (۹۳)

جب ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا ہم نے شعیب کو اور ان کے ساتھ (تمام) مومنوں کو اپنی خاص رحمت سے نجات بخشی اور ظالموں کو سخت چنگھاڑ کے عذاب

قَالَ يَقَوْمِ اَرَاهِيْكُمْ اَعْرَضْتُمْ عَنِ اللّٰهِ وَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ وَّرَآءِكُمْ ظُهْرًا اِن رَّبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۹۱﴾

وَيَقَوْمِ اِعْمَلُوا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۗ
مَنْ يَّاتِيْكُمْ عَذَابٌ يُعْزِبُوْكُمْ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ وَاَرْتَوِبُوْا اِلَيَّ
مَعَكُمْ رَغِيْبًا ﴿۹۲﴾

وَلَمَّا جَاءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَتِنَا
وَمَا وَاخَذَتِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الْعِقَابُ فَاَصْحَابُوْنَ

قوم کے ساتھ تھا، اس لیے اپنے ہم مذہب ہونے کی وجہ سے اس قبیلے کا لحاظ، بہر حال حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے میں مانع تھا۔

(۱) لیکن چونکہ تیرے قبیلے کی حیثیت بہر حال ہمارے دلوں میں موجود ہے، اس لیے ہم درگزر سے کام لے رہے ہیں۔
(۲) کہ تم مجھے تو میرے قبیلے کی وجہ سے نظر انداز کر رہے ہو۔ لیکن جس اللہ نے مجھے منصب نبوت سے نوازا ہے، اس کی کوئی عظمت اور اس منصب کا کوئی احترام تمہارے دلوں میں نہیں ہے اور اسے تم نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ یہاں حضرت شعیب علیہ السلام نے اَعْرَضْتُ عَلَيْكُمْ مِّنِّي (مجھ سے زیادہ ذی عزت) کی بجائے اَعْرَضْتُ عَنْكُمْ مِّنْ اللّٰهِ (اللہ سے زیادہ ذی عزت) کہا جس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ نبی کی توہین، یہ دراصل اللہ کی توہین ہے۔ اس لیے کہ نبی اللہ کا مبعوث ہوتا ہے۔ اور اسی اعتبار سے اب علمائے حق کی توہین اور ان کو حقیر سمجھنا اللہ کے دین کی توہین اور اس کا استخفاف ہے، اس لیے کہ وہ اللہ کے دین کے نمائندے ہیں۔ وَاَتَّخَذْتُمْ مِّنْ وَّرَآءِكُمْ ظُهْرًا (تم نے پس پشت ڈال دیا ہے اور اس کی کوئی پروا تم نے نہیں کی۔

(۳) جب انہوں نے دیکھا کہ یہ قوم اپنے کفر و شرک پر مصر ہے اور وعظ و نصیحت کا بھی کوئی اثر ان پر نہیں ہو رہا، تو کہا اچھا تم اپنی ڈگر پر چلتے رہو، عنقریب تمہیں جھوٹے سچے کا اور اس بات کا کہ رسوا کن عذاب کا مستحق کون ہے؟ علم ہو جائے گا۔

نے دھر دبوچا^(۱) جس سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے ہو گئے۔ (۹۳)

گویا کہ وہ ان گھروں میں کبھی جیسے ہی نہ تھے، آگاہ رہو مدین کے لیے بھی ویسی ہی دوری^(۲) ہو جیسی دوری ثمود کو ہوئی۔ (۹۵)

اور یقیناً ہم نے ہی موسیٰ کو اپنی آیات اور روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا تھا۔ (۹۶)^(۳)

فرعون اور اس کے سرداروں^(۴) کی طرف، پھر بھی ان لوگوں نے فرعون کے احکام کی پیروی کی اور فرعون کا کوئی حکم درست تھا ہی نہیں۔ (۹۷)^(۵)

وہ تو قیامت کے دن اپنی قوم کا پیش رو ہو کر ان سب کو دوزخ میں جا کھڑا کرے گا،^(۶) وہ بہت ہی برا گھٹ^(۷) ہے جس پر لاکھڑے کیے جائیں گے۔ (۹۸)

دِيَارِهِمْ جَبِينٌ ﴿٩٣﴾

كَانَ لَمْ يَعْتُوا فِيهَا الْآبَعْدَ الْمَدِينِ كَمَا بَعَدَتْ ثَمُودُ ﴿٩٥﴾

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٩٦﴾

إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِم فَآتَوْهُم بِأَمْرٍ فَرَعُونَ وَمَا

أَمْرٌ فَرَعُونَ بِرَشِيدٍ ﴿٩٧﴾

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْدَدَهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ الْوَرْدُ

الْمُورَدُ ﴿٩٨﴾

(۱) اس چیخ سے ان کے دل پارہ پارہ ہو گئے اور ان کی موت واقع ہو گئی اور اس کے معا بعد ہی بھونچال بھی آیا، جیسا کہ سورۃ اعراف-۹۱ اور سورۃ عنکبوت ۷۰-۳۳ میں ہے۔

(۲) یعنی لعنت، پھینکار، اللہ کی رحمت سے محرومی اور دوری۔

(۳) آیات سے بعض کے نزدیک تورات اور سلطان مبین سے معجزات مراد ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ آیات سے آیات تسعہ اور سلطان مبین (روشن دلیل) سے عصا مراد ہے۔ عصا، اگرچہ آیات تسعہ میں شامل ہے لیکن یہ معجزہ چونکہ نہایت ہی عظیم الشان تھا، اس لیے اس کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

(۴) ملاء قوم کے اشراف اور ممتاز قسم کے لوگوں کو کہا جاتا ہے۔ (اس کی تشریح پہلے گزر چکی ہے) فرعون کے ساتھ، اس کے دربار کے ممتاز لوگوں کا نام اس لیے لیا گیا ہے کہ اشراف قوم ہی ہر معاملے کے ذمے دار ہوتے تھے اور قوم ان ہی کے پیچھے چلتی تھی۔ اگر یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتے تو یقیناً فرعون کی ساری قوم ایمان لے آتی۔

(۵) رَشِيدٌ، ذی رشد کے معنی میں ہے۔ یعنی بات تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رشد و ہدایت والی تھی، لیکن اسے ان لوگوں نے رد کر دیا اور فرعون کی بات، جو رشد و ہدایت سے دور تھی، اس کی انہوں نے پیروی کی۔

(۶) یعنی فرعون، جس طرح دنیا میں ان کا رہبر اور پیش رو تھا، قیامت والے دن بھی یہ آگے آگے ہی ہو گا اور اپنی قوم کو اپنی قیادت میں جہنم میں لے کر جائے گا۔

(۷) وَرْدٌ پانی کے گھٹ کو کہتے ہیں، جہاں پیاسے جا کر اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ لیکن یہاں جہنم کو روکھا گیا ہے مَوْزُوْدٌ وہ مقام یا

ان پر تو اس دنیا میں بھی لعنت چکا دی گئی اور قیامت کے دن بھی (۱) برا انعام ہے جو دیا گیا۔ (۹۹) (۲)

بستیوں کی یہ بعض خبریں جنہیں ہم تیرے سامنے بیان فرما رہے ہیں ان میں سے بعض تو موجود ہیں اور بعض (کی فصلیں) کٹ گئی ہیں۔ (۳) (۱۰۰)

ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، (۴) بلکہ خود انہوں نے ہی اپنے اوپر ظلم کیا، (۵) اور انہیں ان کے معبودوں نے کوئی فائدہ نہ پہنچایا جنہیں وہ اللہ کے سوا پکارا کرتے تھے، جب کہ تیرے پروردگار کا حکم آپنچا، بلکہ اور ان کا نقصان ہی انہوں نے بڑھا دیا۔ (۶) (۱۰۱)

تیرے پروردگار کی پکڑ کا یہی طریقہ ہے جب کہ وہ بستیوں کے رہنے والے ظالموں کو پکڑتا ہے بیشک اس کی پکڑ دکھ دینے والی اور نہایت (۷) سخت ہے۔ (۱۰۲)

وَأَنْبِئُونِي بِذُنُوبِ لَعْنَةٍ قَدِ انْتَهَيْتُمْ بِرَبِّكُمْ
الْمَرْفُودِ ۝۱۱

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبِآءِ الْقُرْاٰنِ نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَلِمًا مَّوْحِيًا ۝۱۱

وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَمَا اَغْنَتْ عَنْهُمْ
الْهُنُوْمُ الَّتِي يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اَلَمْ تَجَاۤءِ اُمَّرُ
رَبِّكَ وَاَمَّا دُوۡهُمُ فَاَنْبِئِيۡنِيۡ ۝۱۱

وَكَذٰلِكَ اَخَذَ رَبُّكَ اِذَا اَخَذَ الْقُرْاٰنَ وَهِيَ ظَالِمَةٌ لِّاٰنٍ
اَخَذَهَا لِیَمُرَّ بِهَا بِالْحَدِیۡدِ ۝۱۲

گھاٹ یعنی جہنم جس میں لوگ لے جائے جائیں گے یعنی جگہ بھی بری اور جانے والے بھی برے۔ اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا۔

(۱) لَعْنَةُ سے پھنکارا اور رحمت الہی سے دوری و محرومی ہے، گویا دنیا میں بھی وہ رحمت الہیہ سے محروم اور آخرت میں بھی اس سے محروم ہی رہیں گے، اگر ایمان نہ لائے۔

(۲) رَفِدَ انعام اور عیبے کو کہا جاتا ہے۔ یہاں لعنت کو رَفِدَ کہا گیا ہے۔ اسی لیے اسے برا انعام قرار دیا گیا۔ مَرْفُودٌ سے مراد وہ انعام جو کسی کو دیا جائے۔ یہ الرَفِد کی تائید ہے۔

(۳) قَاتَمٌ سے مراد وہ بستیاں، جو اپنی چھتوں پر قَاتَمٌ ہیں اور حَصِيْدٌ بمعنی محسود سے مراد وہ بستیاں جو کٹی ہوئی کھیتوں کی طرح نابود ہو گئیں۔ یعنی جن گزشتہ بستیوں کے واقعات ہم بیان کر رہے ہیں، ان میں سے بعض تو اب بھی موجود ہیں، جن کے آثار و کھنڈرات نشان عبرت ہیں اور بعض بالکل ہی صفحہ ہستی سے معدوم ہو گئیں اور ان کا وجود صرف تاریخ کے صفحات پر باقی رہ گیا ہے۔

(۴) ان کو عذاب اور ہلاکت سے دوچار کر کے۔

(۵) کفر و معاصی کا ارتکاب کر کے۔

(۶) جب کہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ انہیں نقصان سے بچائیں گے اور فائدہ پہنچائیں گے۔ لیکن جب اللہ کا عذاب آیا تو واضح ہو گیا کہ ان کا یہ عقیدہ فاسد تھا، اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ اللہ کے سوا کوئی کسی کو نفع نقصان پہنچانے پر قادر نہیں۔

(۷) یعنی جس طرح گزشتہ بستیوں کو اللہ تعالیٰ نے تباہ و برباد کیا، آئندہ بھی وہ ظالموں کی اسی طرح گرفت کرنے پر قادر ہے۔

یقیناً اس میں ^(۱) ان لوگوں کے لیے نشان عبرت ہے جو قیامت کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ وہ دن جس میں سب لوگ جمع کیے جائیں گے اور وہ، وہ دن ہے جس میں سب حاضر کیے جائیں گے۔ ^(۲) (۱۰۳)

اسے ہم جو ملتوی کرتے ہیں وہ صرف ایک مدت معین تک ہے۔ ^(۳) (۱۰۴)

جس دن وہ آجائے گی مجال نہ ہوگی کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی بات بھی کر ^(۴) لے، سوان میں کوئی بد بخت ہوگا اور کوئی نیک بخت۔ (۱۰۵)

لیکن جو بد بخت ہوئے وہ دوزخ میں ہوں گے وہاں چیخیں گے چلائیں گے۔ (۱۰۶)

وہ وہیں ہمیشہ رہنے والے ہیں جب تک آسمان و زمین برقرار رہیں ^(۵) سوائے اس وقت کے جو تمہارا رب

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ۗ ذٰلِكَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ ۗ يَوْمَ تَجْمَعُ اِلَيْهِ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمُ مَشْهُودٍ ﴿۱۰۳﴾

وَمَا تُوخَّرُ اِلَّا لِحُجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾

يَوْمَ يَأْتُ لَا تَكَلُمُوْا نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهِمْ فَبِهَؤُلَاءِ سُبُوْحٍ وَّسَبِيْحٍ ﴿۱۰۵﴾

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَغَوْا قِبَلِ النَّارِ لَكُمْ فِيْهَا زَوْجٌ وَّوَسِيْحٌ ﴿۱۰۶﴾

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا نَشَاءُ رَبُّكَ

حدیث میں آتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ اللہَ لَيَمْلِيْ لِلظَّالِمِ حَتّٰى اِذَا اَخَذَهُ لَمَّ يَفْلِسْتُهُ اللہ تعالیٰ یقیناً ظالم کو مہلت دیتا ہے لیکن جب اس کی گرفت کرنے پر آتا ہے تو پھر اس طرح اچانک کرتا ہے کہ پھر مہلت نہیں دیتا۔

(۱) یعنی مواخذة الہی میں یا ان واقعات میں جو عبرت و موعظت کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔

(۲) یعنی حساب اور بدلے کے لیے۔

(۳) یعنی قیامت کے دن میں تاخیر کی وجہ صرف یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کے لیے ایک وقت معین کیا ہوا ہے۔ جب وہ وقت مقرر آجائے گا تو ایک لمحے کی تاخیر نہیں ہوگی۔

(۴) گفتگو نہ کرنے سے مراد، کسی کو اللہ تعالیٰ سے کسی طرح کی بات یا شفاعت کرنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ الایہ کہ وہ اجازت دے دے۔ طویل حدیث شفاعت میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وَلَا يَتَكَلَّمُ يَوْمَئِذٍ اِلَّا الرُّسُلُ وَدَعْوَى الرُّسُلِ يَوْمَئِذٍ؛ اَللّٰهُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ (صحیح بخاری۔ کتاب الإیمان، باب فضل السجود، ومسلم، کتاب الإیمان، باب معرفة طريق الروية) ”اس دن انبیاء کے علاوہ کسی کو گفتگو کی ہمت نہ ہوگی اور انبیاء کی زبان پر بھی اس دن صرف یہی ہوگا کہ یا اللہ! ہمیں بچالے، ہمیں بچالے۔“

(۵) ان الفاظ سے بعض لوگوں کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ کافروں کے لیے جہنم کا عذاب دائمی نہیں ہے بلکہ موقت ہے یعنی اس وقت تک رہے گا، جب تک آسمان و زمین رہیں گے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ کیونکہ یہاں ﴿ مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ

چاہے۔^(۱) یقیناً تیرا رب جو کچھ چاہے کر گزرتا ہے۔ (۱۰۷)

لیکن جو نیک بخت کیے گئے وہ جنت میں ہوں گے جہاں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین باقی رہے مگر جو تیرا پروردگار چاہے۔^(۲) یہ بے انتہا بخشش ہے۔ (۱۰۸)^(۳)

اِنَّ رَبَّكَ فَاعِلٌ لِّمَا يُرِيدُ ۝

وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُوِّدُوْا فَاِنَّهُمْ لَخٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا كَانَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ عَطَاكَ غَيْرَ مَحْذُوْمٍ ۝

وَ الَّذِيْنَ اٰتٰنَا مِنْ رَّبِّنَا هٰذَا نَدْرِيْمْ اَنْتُمْ وَ اٰتٰنَا مِنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (یہ چیز اسی طرح ہمیشہ رہے گی جس طرح آسمان و زمین کا دوام ہے) اسی محاورے کو قرآن کریم میں استعمال کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل کفر و شرک جہنم میں ہمیشہ رہیں گے جس کو قرآن نے متعدد جگہ ﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ﴾ کے الفاظ سے ذکر کیا ہے۔ ایک دوسرا مفہوم اس کا یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آسمان و زمین سے مراد، جنس ہے۔ یعنی دنیا کے آسمان و زمین اور ہیں جو فنا ہو جائیں گے لیکن آخرت کے آسمان و زمین ان کے علاوہ اور ہوں گے، جیسا کہ قرآن کریم میں اس کی صراحت ہے، ﴿ يَوْمَ يُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ ﴾ (سودۃ ابراہیم۔ ۳۸) ”اس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی (بدل دیے جائیں گے)“ اور آخرت کے یہ آسمان و زمین، جنت اور دوزخ کی طرح، ہمیشہ رہیں گے۔ اس آیت میں یہی آسمان و زمین مراد ہے، نہ کہ دنیا کے آسمان و زمین، جو فنا ہو جائیں گے۔ (ابن کثیر) ان دونوں مفہوموں میں سے کوئی بھی مفہوم مراد لے لیا جائے، آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے اور وہ اشکال پیدا نہیں ہوتا جو مذکور ہو۔ امام شوکانی نے اس کے اور بھی کئی مفہوم بیان کیے ہیں جنہیں اہل علم ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ (فتح القدیر)

(۱) اس اشتیاء کے بھی کئی مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ صحیح مفہوم یہی ہے کہ یہ اشتیاء ان گناہ گاروں کے لیے ہے جو اہل توحید و اہل ایمان ہوں گے۔ اس اعتبار سے اس سے ما قبل آیت میں شَقِيًّا کا لفظ عام یعنی کافر اور عاصی دونوں کو شامل ہو گا اور ﴿ اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ﴾ سے عاصی مومنوں کا اشتیاء ہو جائے گا۔ اور مَا شَاءَ میں مَا، مَنْ کے معنی میں ہے۔

(۲) یہ اشتیاء بھی عصاة اہل ایمان کے لیے ہے۔ یعنی دیگر جنتیوں کی طرح یہ نافرمان مومن ہمیشہ سے جنت میں نہیں رہیں ہوں گے۔ بلکہ ابتداء میں ان کا کچھ عرصہ جہنم میں گزرے گا اور پھر انہی اور اہل ایمان کی سفارش سے ان کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا، جیسا کہ احادیث صحیحہ سے یہ باتیں ثابت ہیں۔

(۳) غیر مجزوء کے معنی ہیں غیر مقطوع۔ یعنی نہ ختم ہونے والی عطاء۔ اس جملے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جن گناہ گاروں کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا، یہ دخول عارضی نہیں، ہمیشہ کے لیے ہو گا اور تمام جنتی ہمیشہ اللہ کی عطاء اور اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے، اس میں کبھی انتظار نہیں ہو گا۔

اس لئے آپ ان چیزوں سے شک و شبہ میں نہ رہیں جنہیں یہ لوگ پوج رہے ہیں، ان کی پوجا تو اس طرح ہے جس طرح ان کے باپ دادوں کی اس سے پہلے تھی۔ ہم ان سب کو ان کا پورا پورا حصہ بغیر کسی کمی کے دینے والے ہی ہیں۔^(۱) (۱۰۹)

یقیناً ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی۔ پھر اس میں اختلاف کیا گیا،^(۲) اگر پہلے ہی آپ کے رب کی بات صادر نہ ہو گئی ہوتی تو یقیناً ان کا فیصلہ کر دیا جاتا،^(۳) انہیں تو اس میں سخت شبہ ہے۔ (۱۱۰)

یقیناً ان میں سے ہر ایک جب ان کے روبرو جائے گا تو آپ کا رب اسے اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ بیشک وہ جو گمراہ رہے ہیں ان سے وہ باخبر ہے۔ (۱۱۱)

پس آپ جسے رہیے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ بھی جو آپ کے ساتھ توبہ کر چکے ہیں، خردار تم حد سے نہ بڑھنا،^(۴) اللہ تمہارے تمام اعمال کا دیکھنے والا ہے۔ (۱۱۲)

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هَؤُلَاءِ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاءَهُمْ مِنْ قَبْلُ وَإِنَّا لَنُوفِّهُمُ بِبَيْتِهِمْ فَيَذَرُوكَ خَالِبِينَ ۝۱۰۹

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَخُتِلِمَ فِيهِ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَفُتِنَ بِهِمْ وَلَا تُعْرَفُونَ مِنْهُ ۝۱۱۰

وَإِنْ كُنَّا لَنَافِقِينَ فِيهِمْ رَبَّنَا بِمَا يَأْمُرُونَ خَلْقَهُ ۝۱۱۱

فَأَسْمِعْ كَمَا أَمْرُتُ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطَّعُونَهُ ۝۱۱۲

(۱) اس سے مراد وہ عذاب ہے جس کے وہ مستحق ہوں گے، اس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

(۲) یعنی کسی نے اس کتاب کو مانا اور کسی نے نہیں مانا۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ پچھلے انبیاء کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوتا آیا ہے، کچھ لوگ ان پر ایمان لانے والے ہوتے اور دوسرے تکذیب کرنے والے۔ اس لیے آپ اپنی تکذیب سے نہ گھبرائیں۔

(۳) اس سے مراد یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے ان کے لیے عذاب کا ایک وقت مقرر کیا ہوا نہ ہوتا تو وہ انہیں فوراً ہلاک کر ڈالتا۔

(۴) اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو ایک تو استقامت کی تلقین کی جا رہی ہے، جو دشمن کے مقابلے کے لیے ایک بہت بڑا ہتھیار ہے۔ دوسرے طغیان یعنی بغی (حد سے بڑھ جانے) سے روکا گیا ہے، جو اہل ایمان کی اخلاقی قوت اور رفعت کردار کے لیے بہت ضروری ہے۔ حتیٰ کہ یہ تجاوز، دشمن کے ساتھ معاملہ کرتے وقت بھی جائز نہیں ہے۔

وَلَا تَرَكُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَمَا تَسْتَكْمِلُوا الشَّأْؤَ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُحْصَرُونَ ﴿۱۳﴾

دیکھو ظالموں کی طرف ہرگز نہ بھٹکتا اور نہ تمہیں بھی (دوزخ کی) آگ لگ جائے گی^(۱) اور اللہ کے سوا اور تمہارا مددگار نہ کھڑا ہو سکے گا اور نہ تم مدد دیے جاؤ گے۔ (۱۱۳)

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَرَمْلًا لَمَّا تَمَّ الْبَيْتُ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُدْهَبُنَ بِالسَّيِّئَاتِ ذَلِكَ ذِكْرَى لِلَّذِينَ كَفَرُوا ﴿۱۴﴾

دن کے دونوں سروں میں نماز برپا رکھ اور رات کی کئی ساعتوں میں بھی،^(۲) یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔^(۳) یہ نصیحت ہے نصیحت پکڑنے والوں کے لئے۔ (۱۱۴)

وَأَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضَيِّعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۵﴾

آپ صبر کرتے رہیے یقیناً اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ (۱۱۵)

(۱) اس کا مطلب ہے کہ ظالموں کے ساتھ نرمی اور مدارحت کرتے ہوئے ان سے مدد حاصل مت کرو۔ اس سے ان کو یہ تاثر ملے گا کہ گویا تم ان کی دوسری باتوں کو بھی پسند کرتے ہو۔ اس طرح یہ تمہارا ایک بڑا جرم بن جائے گا جو تمہیں بھی ان کے ساتھ، نار جنم کا مستحق بنا سکتا ہے۔ اس سے ظالم حکمرانوں کے ساتھ ربط و تعلق کی بھی ممانعت نکلتی ہے۔ الا یہ کہ مصلحت عامہ یا دینی منافع متقاضی ہوں۔ ایسی صورت میں دل سے نفرت رکھتے ہوئے ان سے ربط و تعلق کی اجازت ہوگی۔ جیسا کہ بعض احادیث سے واضح ہے۔

(۲) ”دونوں سروں“ سے مراد بعض نے صبح اور مغرب، بعض نے صرف عشاء اور بعض نے عشاء اور مغرب دونوں کا وقت مراد لیا ہے۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ آیت معراج سے قبل نازل ہوئی ہو، جس میں پانچ نمازیں فرض کی گئیں۔ کیونکہ اس سے قبل صرف دو ہی نمازیں ضروری تھیں، ایک طلوع شمس سے قبل اور ایک غروب سے قبل اور رات کے پچھلے پہر میں نماز تہجد۔ پھر نماز تہجد امت سے معاف کر دی گئی، پھر اس کا وجوب بقول بعض آپ ﷺ سے بھی ساقط کر دیا گیا۔ (ابن کثیر) وَاللَّهُ أَعْلَمُ.

(۳) جس طرح کہ احادیث میں بھی اسے صراحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ مثلاً پانچ نمازیں، جمعہ دوسرے جمعہ تک اور رمضان دوسرے رمضان تک، ان کے مابین ہونے والے گناہوں کو دور کرنے والے ہیں بشرطیکہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے“ (صحیح مسلم۔ کتاب الطہارۃ۔ باب الصلوات الخمس والجمعة إلى الجمعة.....) ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ”بتلاؤ! اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر بڑی نہر ہو، وہ روزانہ اس میں پانچ مرتبہ نہاتا ہو، کیا اس کے بعد اس کے جسم پر میل پکچیل باقی رہے گا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ”نہیں“ آپ ﷺ نے فرمایا ”اسی طرح پانچ نمازیں ہیں، ان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ گناہوں اور خطاؤں کو مٹا دیتا ہے“ بخاری۔ کتاب المواقیب، باب الصلوات الخمس کفارة ومسلم کتاب المساجد، باب المشی

إِلَى الصَّلَاةِ تَمْحَى بِهِ الْخَطَايَا وَتَرْفَعُ بِهِ الدَّرَجَاتِ

پس کیوں نہ تم سے پہلے زمانے کے لوگوں میں سے ایسے اہل خیر لوگ ہوئے جو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے، سوائے ان چند کے جنہیں ہم نے ان میں سے نجات دی تھی،^(۱) ظالم لوگ تو اس چیز کے پیچھے پڑ گئے جس میں انہیں آسودگی دی گئی تھی اور وہ گنہگار تھے۔^(۲) (۱۱۶)

آپ کا رب ایسا نہیں کہ کسی بستی کو ظلم سے ہلاک کر دے اور وہاں کے لوگ نیکو کار ہوں۔ (۱۱۷)

اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی راہ پر ایک گروہ کر دیتا۔ وہ تو برابر اختلاف کرنے والے ہی رہیں گے۔ (۱۱۸)

بجز ان کے جن پر آپ کا رب رحم فرمائے، انہیں تو اسی لیے پیدا کیا ہے،^(۳) اور آپ کے رب کی یہ بات پوری ہے کہ میں جنہم کو جنوں اور انسانوں سب سے پر کروں گا۔^(۴) (۱۱۹)

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُو بَعِيثٍ يَهْمُونَ
عَنِ الْمَسَاوِي فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ أَجْمَعْنَا مِنْهُمْ
وَاتَّبَعَهُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أَتَوْا بِبُرْهَانٍ وَكَانُوا
مُجْرِمِينَ ﴿۱۱۶﴾

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا
مُصْطَفُونَ ﴿۱۱۷﴾

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ
مُخْتَلِفِينَ ﴿۱۱۸﴾

إِلَّا مَن نَّحْمَدُ رَبُّكَ وَلَئِنَّكَ خَلْقَهُمْ وَتَنَاتُ كَلِمَةٌ
رَّبِّكَ لَأَكْمَلُنَّ أَجْمَعِينَ مِنَ الْبَشَرِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۱۹﴾

(۱) یعنی گزشتہ امتوں میں سے ایسے نیک لوگ کیوں نہ ہوئے جو اہل شر اور اہل منکر کو شر، منکرات اور فساد سے روکتے؟ پھر فرمایا، ایسے لوگ تھے تو سی، لیکن بہت تھوڑے۔ جنہیں ہم نے اس وقت نجات دے دی، جب دوسروں کو عذاب کے ذریعے سے ہلاک کیا گیا۔

(۲) یعنی یہ ظالم، اپنے ظلم پر قائم اور اپنی مددہوشیوں میں مست رہے حتیٰ کہ عذاب نے انہیں آلیا۔

(۳) ”اسی لیے“ کا مطلب بعض نے اختلاف اور بعض نے رحمت لیا ہے۔ دونوں صورتوں میں مفہوم یہ ہو گا کہ ہم نے انسانوں کو آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے۔ جو دین حق سے اختلاف کا راستہ اختیار کرے گا، وہ آزمائش میں ناکام اور جو اسے اپنالے گا، وہ کامیاب اور رحمت الہی کا مستحق ہو گا۔

(۴) یعنی اللہ کی تقدیر اور قضاء میں یہ بات ثبت ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو جنت کے اور کچھ ایسے ہوں گے جو جنہم کے مستحق ہوں گے اور جنت و جنہم کو انسانوں اور جنوں سے بھردیا جائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جنت اور دوزخ آپس میں جھگڑ پڑیں، جنت نے کہا، کیا بات ہے کہ میرے اندر وہی لوگ آئیں گے جو کزور اور معاشرے کے گرے پڑے لوگ ہوں گے؟“ جنہم نے کہا ”میرے اندر تو بڑے بڑے جبار اور متکبر قسم کے لوگ ہوں گے۔“ اللہ تعالیٰ نے جنت سے فرمایا ”تو میری رحمت کی مظہر ہے، تیرے ذریعے سے میں جس پر چاہوں اپنا رحم کروں۔ اور جنہم سے اللہ تعالیٰ

رسولوں کے سب احوال ہم آپ کے سامنے آپ کے دل کی تسکین کے لیے بیان فرما رہے ہیں۔ آپ کے پاس اس سورت میں بھی حق پہنچ چکا جو نصیحت و وعظ ہے مومنوں کے لیے۔ (۱۲۰)

ایمان نہ لانے والوں سے کہہ دیجئے کہ تم اپنے طور پر عمل کیے جاؤ ہم بھی عمل میں مشغول ہیں۔ (۱۲۱)
اور تم بھی انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں۔ (۱۲۲)^(۱)
زمینوں اور آسمانوں کا علم غیب اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، تمام معاملات کا رجوع بھی اسی کی جانب ہے، پس تجھے اسی کی عبادت کرنی چاہیے اور اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیے اور تم جو کچھ کرتے ہو اس سے اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں۔ (۱۲۳)

سورۃ یوسف کی ہے اور اس میں ایک سو گیارہ آیتیں اور بارہ رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔
الر' یہ روشن کتاب کی آیتیں ہیں۔ (۱)

وَمَا كُنَّا نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نَنْتَبِهُ إِلَيْهِ فَمَا آدَلُوهُ
وَجَاءَكَ فِي هَذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝

وَقُلْ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ أَعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِهِمْ
إِنَّ أَعْمَالَهُمْ لَا تَنَالُهُمْ ۝

وَأَنْظُرُوا إِلَيْنَا مِنْظُورًا ۝

وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْيُوسُفَ وَالْأَنْزُرُ كُلَّهُ فَاَعْبُدْكَ
وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الذَّكَرُ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ۝

نے فرمایا تو میرے عذاب کی منظر ہے تیرے ذریعے سے میں جس کو چاہوں سزا دوں۔ اللہ تعالیٰ جنت اور دوزخ دونوں کو بھر دے گا۔ جنت میں ہمیشہ اس کا فضل ہوگا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ایسی مخلوق پیدا فرمائے گا جو جنت کے باقی ماندہ رقبے میں رہے گی۔ اور جہنم، جہنمیوں کی کثرت کے باوجود ﴿هَلْ مِنْ تَرْفِيدٍ﴾ کا نعرہ بلند کرے گی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم رکھے گا جس پر جہنم پکار اٹھے گی۔ قَطُّ قَطُّ، وَجَزَّ تَكَ "بس، بس، تیری عزت و جلال کی قسم" (صحیح بخاری۔ کتاب التوحید، باب ماجاء فی قوله تعالیٰ إن رحمة الله قریب من المحسنین 'وتفسیر سورۃ ق۔ مسلم، کتاب الجنة، باب النار بدخلها الجبارون والجنة بدخلها الضعفاء)

(۱) یعنی عقرب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ حسن انجام کس کے حصے میں آتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ظالم لوگ کامیاب نہیں ہوں گے۔ چنانچہ یہ وعدہ جلد ہی پورا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غلبہ عطا فرمایا اور پورا جزیرہ عرب اسلام کے زیرِ نگیں آگیا۔

میں نے گیارہ ستاروں کو اور سورج چاند کو (۱) دیکھا کہ وہ سب مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ (۴)

یعقوب علیہ السلام نے کہا پیارے بچے! اپنے اس خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تیرے ساتھ کوئی فریب کاری کریں، (۲) شیطان تو انسان کا کھلا دشمن ہے۔ (۵) اور اسی طرح (۳) تجھے تیرا پروردگار برگزیدہ کرے گا اور تجھے معاملہ فہمی (یا خوابوں کی تعبیر) بھی سکھائے گا اور اپنی نعمت تجھے بھرپور عطا فرمائے گا (۵) اور یعقوب کے گھر والوں کو بھی، (۶) جیسے کہ اس نے اس سے پہلے تیرے دادا اور پردادا یعنی ابراہیم و اسحاق کو بھی بھرپور اپنی نعمت

كُوْنًا وَاَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ رَاٰهُمْ لِيَسْجُدَ لِي ۝

قَالَ لِيُنِي لَاقْتَضُ رُوْيَاكَ عَلٰى رَحْمَتِكَ فَيَكْبِدُ وَاَلَا كَيْدًا اِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝

وَكَاذَلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاٰحَادِيْثِ وَيَهْدِيْكَ لِعَمَلِهِ عَلَيْنِكَ وَعَلَىٰ اِلٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَا اَتَمَمْتَهَا عَلَىٰ اَبُوْبِكَ مِنْ قَبْلِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

(۱) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ گیارہ ستاروں سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی ہیں جو گیارہ ہی تھے اور چاند سورج سے مراد ماں اور باپ ہیں اور خواب کی تعبیر چالیس یا اسی سال کے بعد اس وقت سامنے آئی جب یہ سارے بھائی اپنے والدین سمیت مصر گئے اور وہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے، جیسا کہ یہ تفصیل سورت کے آخر میں آئے گی۔

(۲) حضرت یعقوب علیہ السلام نے خواب سے اندازہ لگا لیا کہ ان کا یہ بیٹا عظمت شان کا حامل ہو گا، اس لیے انہیں اندیشہ ہوا کہ یہ خواب سن کر اس کے دوسرے بھائی بھی اس کی عظمت کا اندازہ کر کے کہیں اسے نقصان نہ پہنچائیں، بنا بریں انہوں نے یہ خواب بیان کرنے سے منع فرما دیا۔

(۳) یہ بھائیوں کے مکرو فریب کی وجہ بیان فرمادی کہ شیطان چونکہ انسان کا ازلی دشمن ہے۔ اس لیے وہ انسانوں کو بہکانے، گمراہ کرنے اور انہیں حسد و بغض میں مبتلا کرنے میں ہر وقت کوشاں اور تاک میں رہتا ہے۔ چنانچہ یہ شیطان کے لیے بڑا اچھا موقع تھا کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خلاف بھائیوں کے دلوں میں حسد و بغض کی آگ بھڑکا دے۔ جیسا کہ فی الواقع بعد میں اس نے ایسا ہی کیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔

(۴) یعنی جس طرح تجھے تیرے رب نے نہایت عظمت والا خواب دکھانے کے لیے چن لیا، اسی طرح تیرا رب تجھے برگزیدگی بھی عطا کرے گا اور خوابوں کی تعبیر سکھائے گا۔ تَاْوِيْلِ الْاٰحَادِيْثِ کے اصل معنی باتوں کی تمہ تک پہنچانا ہے۔ یہاں خواب کی تعبیر مراد ہے۔

(۵) اس سے مراد نبوت ہے جو یوسف علیہ السلام کو عطا کی گئی۔ یا وہ انعامات ہیں جن سے مصر میں یوسف علیہ السلام نوازے گئے۔

(۶) اس سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی، ان کی اولاد وغیر ہم ہیں، جو بعد میں انعامات الہی کے مستحق بنے۔

دی، یقیناً تیرا رب بہت بڑے علم والا اور زبردست حکمت والا ہے۔ (۶)

یقیناً یوسف اور اس کے بھائیوں میں دریافت کرنے والوں کے لئے (بڑی) نشانیاں (۱) ہیں۔ (۷)

جب کہ انہوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی (۲) بہ نسبت ہمارے، باپ کو بہت زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم (طاقتور) جماعت (۳) ہیں، کوئی شک نہیں کہ ہمارے ابا صریح غلطی میں ہیں۔ (۸)

یوسف کو تو مار ہی ڈالو یا اسے کسی (نامعلوم) جگہ پھینک دو کہ تمہارے والد کا رخ صرف تمہاری طرف ہی ہو جائے۔ اس کے بعد تم نیک ہو جانا۔ (۹)

ان میں سے ایک نے کہا یوسف کو قتل تو نہ کرو بلکہ اسے کسی اندھے کنوئیں (کی تہ) میں ڈال آؤ کہ (۱۰) اسے کوئی (آتا جاتا) قافلہ اٹھالے جائے اگر تمہیں کرنا ہی ہے تو یوں کرو۔ (۱۰)

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٍ لِّلَّذَالِمِينَ ۝

إِذْ قَالُوا لِيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِمَّا

وَعَنْ حُصْبَةٍ إِنَّ أَبَانَا لَيَفِي ضَلِيلٍ مُّبِينٍ ۝

لَقَدْ كَانُوا لِيُوسُفَ وَأَخِيهِمْ أَضَلُّوا لِمَا كَانُوا فِيهِ لَمُؤْمِنِينَ ۝

وَتَلَوْنَاهُمْ بَعْدَ ذَلِكَ مِمَّا صَالِحِينَ ۝

قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ لَوْ كُنَّا نُرَى الْيُوسُفَ وَالْقَوْهَ فِي غَيْبَتِ الْجُبِّ

يَلْتَقِظُهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فَعِلِينَ ۝

(۱) یعنی اس قصے میں اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کی بڑی نشانیاں ہیں۔ بعض مفسرین نے یہاں ان بھائیوں کے نام اور ان کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔

(۲) ”اس کا بھائی“ سے مراد بنیامین ہے۔

(۳) یعنی ہم دس بھائی طاقتور جماعت اور اکثریت میں ہیں، جب کہ یوسف علیہ السلام اور بنیامین (جن کی ماں یا مائیں الگ تھیں) صرف دو ہیں، اس کے باوجود باپ کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہیں۔

(۴) یہاں ضلال سے مراد وہ غلطی ہے جو ان کے زعم کے مطابق باپ سے یوسف علیہ السلام اور بنیامین سے زیادہ محبت کی صورت میں صادر ہوئی۔

(۵) اس سے مراد تائب ہو جانا ہے یعنی کنوئیں میں ڈال کر یا قتل کر کے اللہ سے اس گناہ کے لیے توبہ کر لیں گے۔

(۶) جب کہ کنوئیں کو اور غیابۃً اس کی تہ اور گہرائی کو کہتے ہیں۔ کنواں ویسے بھی گہرا ہی ہوتا ہے اور اس میں گری ہوئی چیز کسی کو نظر نہیں آتی۔ جب اس کے ساتھ کنوئیں کی گہرائی کا بھی ذکر کیا تو گویا مبالغے کا اظہار کیا۔

(۷) یعنی آنے جانے والے نووارد مسافر، جب پانی کی تلاش میں کنوئیں پر آئیں گے تو ممکن ہے کسی کے علم میں آجائے کہ کنوئیں میں کوئی انسان گرا ہوا ہے اور وہ اسے نکال کر اپنے ساتھ لے جائیں۔ یہ تجویز ایک بھائی نے ازراہ شفقت

انہوں نے کہا ابا! آخر آپ یوسف (علیہ السلام) کے بارے میں ہم پر اعتبار کیوں نہیں کرتے، ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں۔^(۱۱)

کل آپ اسے ضرور ہمارے ساتھ بھیج دیجئے کہ خوب کھائے پئے اور کھیلے،^(۱۲) اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں۔^(۱۳)

(یعقوب علیہ السلام نے) کہا اسے تمہارا لے جانا مجھے تو سخت صدمہ دے گا اور مجھے یہ بھی کھٹکا لگا رہے گا کہ تمہاری غفلت میں اسے بھیڑیا کھا جائے۔^(۱۳)

انہوں نے جواب دیا کہ ہم جیسی (زور آور) جماعت کی موجودگی میں بھی اگر اسے بھیڑیا کھا جائے تو ہم بالکل ٹکتے ہی ہوئے۔^(۱۳)

پھر جب اسے لے چلے اور سب نے مل کر ٹھان لیا کہ اسے غیر آباد گھرے کنوئیں کی تہ میں پھینک دیں، ہم نے یوسف (علیہ السلام) کی طرف وحی کی کہ یقیناً (وقت

قَالُوا يَا أَبَا نَامٍ لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلَى يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَصْحُونَ ﴿۱۱﴾

أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَزُودَهُ وَيَعْلَبُ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿۱۲﴾

قَالَ إِنِّي كَيِّدٌ فَمَا أَبَدُ وَإِنِّي وَلِيُّ مَا أَبَدُ وَإِنِّي كَيِّدٌ فَمَا أَبَدُ وَإِنِّي كَيِّدٌ فَمَا أَبَدُ
الَّذِي بَوَّأْنَا لَهُ الْغُيُوبَ ﴿۱۳﴾

قَالُوا لَئِن لَّمْ يَكْفُرْ بِالَّذِي تَبَوَّأَ الْغُيُوبَ أَكْفَرُ مِنْكَ وَالنَّاسُ أَكْثَرُ عَدْوًا
إِن كَانُوا إِلَّا لِحُسْنِ الْخَبْرِ ﴿۱۴﴾

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَاجْمَعُوا أَن يَجْعَلُوهُ فِي غُبَابٍ فَخَفَا بِهِ فَوَسَّاسٌ مِّنْ دُونِ الْعَيْنِ فَوَسَّسَ فِي قَلْبِهِ أَن يَسْتَعْزِزْهُ
وَأَوْصَيْنَا آلِيهِ فَمَن يَمُنُّ بِهِمْ بِآمِرِهِمْ هَذَا هُمْ لَأَيُّكُمْ عَادُوْنَ ﴿۱۵﴾

پیش کی۔ قتل کے مقابلے میں یہ تجویز واقعتاً ہمدردی کے جذبات ہی کی حامل ہے۔ بھائیوں کی آتش حسد اتنی بھڑکی ہوئی تھی کہ یہ تجویز بھی اس نے ڈرتے ڈرتے ہی پیش کی کہ اگر تمہیں کچھ کرنا ہی تو یہ کام اس طرح کر لو۔

(۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس سے قبل بھی برادران یوسف علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی ہوگی اور باپ نے انکار کر دیا ہوگا۔

(۲) کھیل اور تفریح کا رجحان، انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اسی لیے جائز کھیل اور تفریح پر اللہ تعالیٰ نے کسی دور میں بھی پابندی عائد نہیں کی۔ اسلام میں بھی ان کی اجازت ہے لیکن مشروط۔ یعنی ایسے کھیل اور تفریح جائز ہیں جن میں شرعی قباحت نہ ہو یا محرمات تک پہنچنے کا ذریعہ نہ بنیں۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی کھیل کود کی حد تک کوئی اعتراض نہیں کیا۔ البتہ یہ خدشہ ظاہر کیا کہ تم کھیل کود میں مدہوش ہو جاؤ اور اسے بھیڑیا کھا جائے۔ کیوں کہ کھلے میدانوں اور صحراؤں میں وہاں بھیڑیے عام تھے۔

(۳) یہ باپ کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم اتنے بھائیوں کی موجودگی میں بھیڑیا یوسف علیہ السلام کو کھا جائے۔

آ رہا ہے کہ) تو انہیں اس ماجرا کی خبر اس حال میں دے گا کہ وہ جانتے ہی نہ ہوں۔^(۱) (۱۵)

اور عشاء کے وقت (وہ سب) اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے پہنچے (۱۶)

اور کہنے لگے کہ ابا جان ہم تو آپس میں دوڑ میں لگ گئے اور یوسف (علیہ السلام) کو ہم نے اسباب کے پاس چھوڑا پس اسے بھیڑیا کھا گیا، آپ تو ہماری بات نہیں مانیں گے، گو ہم بالکل سچے ہی ہوں۔^(۲) (۱۷)

اور یوسف کے کرتے کو جھوٹ موٹ کے خون سے خون آلود بھی کر لائے تھے، باپ نے کہا یوں نہیں، بلکہ تم نے اپنے دل ہی سے ایک بات بنالی ہے۔ پس صبر ہی بہتر^(۳)

وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ﴿۱۵﴾

قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَمَّْا كُنْتُمْ بِمِثْلِهِ خَيْرًا قَالَ يَبْكُونَ ﴿۱۶﴾
مَتَاعَنَا فَأَكَلَهُ الَّذِينَ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا
وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ ﴿۱۷﴾

وَجَاءُوا عَلَى قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ
لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْراً فَاصْبِرْ جَبِيلًا وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ

(۱) قرآن کریم نہایت اختصار کے ساتھ واقعہ بیان کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق انہوں نے یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینک دیا، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی تسلی اور حوصلے کے لئے وحی کی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، ہم تیری حفاظت ہی نہیں کریں گے بلکہ ایسے بلند مقام پر تجھے فائز کریں گے کہ یہ بھائی بھیک مانگتے ہوئے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے اور پھر تو انہیں بتائے گا کہ تم نے اپنے ایک بھائی کے ساتھ اس طرح کاسنگ دلانہ معاملہ کیا تھا، جسے سن کر وہ حیران اور پریشان ہو جائیں گے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اس وقت اگرچہ سچے تھے، لیکن جو سچے نبوت پر سرفراز ہونے والے ہوں، ان پر بچپن میں بھی وحی آجاتی ہے جیسے حضرت عیسیٰ و یحییٰ وغیرہم علیہم السلام پر آئی۔

(۲) یعنی اگر ہم آپ کے نزدیک ثقہ اور اہل صدق ہوتے، تب بھی یوسف علیہ السلام کے معاملے میں آپ ہماری بات کی تصدیق نہ کرتے، اب تو ویسے ہی ہماری حیثیت متہم اور مشکوک افراد کی سی ہے، اب آپ کس طرح ہماری بات کی تصدیق کر لیں گے؟

(۳) کہتے ہیں کہ ایک بکری کا بچہ ذبح کر کے یوسف علیہ السلام کی قمیص خون میں لت پت کر لی اور یہ بھول گئے کہ بھیڑیا اگر یوسف علیہ السلام کو کھاتا تو قمیص کو بھی تو پھٹتا تھا، قمیص ثابت کی ثابت ہی تھی، جس کو دیکھ کر علاوہ ازیں حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب اور فراست نبوت سے اندازہ لگا کر حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ واقعہ اس طرح پیش نہیں آیا ہے جو تم بیان کر رہے ہو، بلکہ تم نے اپنے دلوں سے ہی یہ بات بنالی ہے۔ تاہم چونکہ جو ہونا تھا، ہو چکا تھا، حضرت یعقوب اس کی تفصیل سے بے خبر تھے، اس لیے سوائے صبر کے کوئی چارہ اور اللہ کی مدد کے علاوہ کوئی سارا نہ تھا۔

ہے، اور تمہاری بنائی ہوئی باتوں پر اللہ ہی سے مدد کی طلب ہے۔^(۱) (۱۸)

اور ایک قافلہ آیا اور انہوں نے اپنے پانی لانے والے کو بھیجا اس نے اپنا ڈول لٹکا دیا، کہنے لگا واہ واہ خوشی کی بات ہے یہ تو ایک لڑکا ہے،^(۲) انہوں نے اسے مال تجارت قرار دے کر چھپا^(۳) دیا اور اللہ تعالیٰ اس سے باخبر تھا جو

عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿۱۸﴾

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوًا قَالَ
يَبْنَؤُا هَذَا غُلْمٌ وَسَرُوءٌ بِضَاعَةٌ وَاللَّهُ عَلَيْهِمْ
بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿۱۹﴾

(۱) منافقین نے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی تو انہوں نے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انعام و ارشاد کے جواب میں فرمایا تھا وَاللَّهِ لَا أَجِدُ لِي وَلَا لَكُمْ مَثَلًا إِلَّا أَبَا يُوسُفَ ﴿۱۸﴾ فَصَدَّقُوا صَبِيحِينَ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿۱۹﴾ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ یوسف) ”اللہ کی قسم میں اپنے اور آپ لوگوں کے لیے وہی مثال پاتی ہوں جس سے یوسف علیہ السلام کے باپ یعقوب علیہ السلام کو سابقہ پیش آیا تھا اور انہوں نے فَصَبَّرَ جَعِيلٌ کہہ کر صبر کا راستہ اختیار کیا تھا“ یعنی میرے لیے بھی سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں۔

(۲) وارد، اس شخص کو کہتے ہیں جو قافلے کے لیے پانی وغیرہ کا انتظام کرنے کی غرض سے قافلے کے آگے آگے چلتا ہے۔ تاکہ مناسب جگہ دیکھ کر قافلے کو ٹھہرایا جاسکے۔ یہ وارد (قافلے کے لیے پانی لانے والا) جب کنویں پر آیا اور اپنا ڈول نیچے لٹکایا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی رسی پکڑ لی، وارد نے ایک خوش شکل بچہ دیکھا تو اسے اوپر کھینچ لیا اور بڑا خوش ہوا۔

(۳) بِضَاعَةٌ، سامان تجارت کو کہتے ہیں اَسْرُوءٌ کا فاعل کون ہے؟ یعنی یوسف کو سامان تجارت سمجھ کر چھپانے والا کون ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ حافظ ابن کثیر نے برادران یوسف علیہ السلام کو فاعل قرار دیا ہے مطلب یہ ہے کہ جب ڈول کے ساتھ یوسف علیہ السلام بھی کنویں سے باہر نکل آئے تو وہاں یہ بھائی بھی موجود تھے، تاہم انہوں نے اصل حقیقت کو چھپانے رکھا، یہ نہیں کہا کہ یہ ہمارا بھائی ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی قتل کے اندیشے سے اپنا بھائی ہونا ظاہر نہیں کیا بلکہ بھائیوں نے انہیں فروختی قرار دیا تو خاموش رہے اور اپنا فروخت ہونا پسند کر لیا۔ چنانچہ اس وارد نے اہل قافلہ کو خوش خبری سنائی کہ ایک بچہ فروخت ہو رہا ہے۔ مگر یہ بات سیاق سے میل کھاتی نظر نہیں آتی۔ ان کے برخلاف امام شوکانی نے اَسْرُوءٌ کا فاعل وارد اور اس کے ساتھیوں کو قرار دیا ہے کہ انہوں نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ یہ بچہ کنویں سے نکلا ہے کیونکہ اس طرح تمام اہل قافلہ اس ”سامان تجارت“ میں شریک ہو جاتے بلکہ اہل قافلہ کو انہوں نے جا کر یہ بتلایا کہ کنویں کے مالکوں نے یہ بچہ ان کے سپرد کیا ہے تاکہ اسے وہ مصر جا کر بیچ دیں۔ مگر اقرب ترین بات یہ ہے کہ اہل قافلہ نے بچے کو سامان تجارت قرار دے کر چھپا لیا کہ کہیں اس کے عزیز و اقارب اس کی تلاش میں نہ آجائیں۔ اور یوں لینے کے دینے پڑ جائیں کیونکہ بچہ ہونا اور کنویں میں پایا جانا، اس بات کی علامت ہے کہ وہ کہیں قریب ہی کا رہنے والا ہے اور کھیلنے کو دتے آگرا ہے۔

وہ کر رہے (۱) تھے۔ (۱۹)

اور انہوں نے اسے بہت ہی ہلکی قیمت پر گنتی کے چند درہموں پر ہی بیچ ڈالا، وہ تو یوسف کے بارے میں بہت ہی بے رغبت تھے۔ (۲۰) (۳)

مصر والوں میں سے جس نے اسے خریدا تھا اس نے اپنی بیوی (۳) سے کہا کہ اسے بہت عزت و احترام کے ساتھ رکھو، بہت ممکن ہے کہ یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا اسے ہم اپنا بیٹا ہی بنا لیں، یوں ہم نے مصر کی سرزمین میں یوسف کا قدم جما (۵) دیا، کہ ہم اسے خواب کی تعبیر کا کچھ علم سکھا دیں۔ اللہ اپنے ارادے پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ بے علم ہوتے ہیں۔ (۲۱)

اور جب (یوسف) پختگی کی عمر کو پہنچ گئے ہم نے اسے

وَسَرَّوْهُ يَتِيمًا يُخْرَجُ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۰

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِامْرَاَتِهِ الْاَكْرَمٰى مَثْوٰىهُ عَلٰى اَنْ يَنْفَعَنَا اَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا وَكَذٰلِكَ مَكَتَ الْيُوسُفُ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنَاهُ الْاِحَادِيْثَ وَاللّٰهُ عَلِيْبٌ عَلٰى اَمْرِهِ وَاٰتَيْنَا النَّاسَ الْاَعْمٰمُونَ ۝۳۱

وَلَمَّا بَلَغَ اَشَدَّ عَتٰىهُ حُمًا وَعِلْمًا وَكَذٰلِكَ

(۱) یعنی یوسف علیہ السلام کے ساتھ یہ جو کچھ ہو رہا تھا، اللہ کو اس کا علم تھا۔ لیکن اللہ نے یہ سب کچھ اس لیے ہونے دیا کہ تقدیر الہی ہونے کا آئے۔ علاوہ ازیں اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اشارہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو بتلا رہا ہے کہ آپ کی قوم کے لوگ یقیناً ایذا پہنچا رہے ہیں اور میں انہیں اس سے روکنے پر قادر بھی ہوں۔ لیکن میں اسی طرح انہیں مہلت دے رہا ہوں جس طرح برادران یوسف علیہ السلام کو مہلت دی تھی۔ اور پھر بالآخر میں نے یوسف علیہ السلام کو مصر کے تخت پر جا بٹھایا اور اس کے بھائیوں کو عاجز و لاچار کر کے اس کے دربار میں کھڑا کر دیا۔ اسے پیغمبر ایک وقت آئے گا کہ آپ بھی اسی طرح سرخرو ہوں گے اور یہ سرداران قریش آپ کے اشارہ ابرو اور جنبش لب کے منتظر ہوں گے۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر یہ وقت جلد ہی آپہنچا۔

(۲) بھائیوں یا دوسری تفسیر کی رو سے اہل قافلہ نے بیچا۔

(۳) کیونکہ گری بڑی چیز انسان کو یوں ہی بغیر کسی محنت کے مل جاتی ہے، اس لیے چاہے وہ کتنی بھی قیمتی ہو، اس کی صحیح قدر و قیمت انسان پر واضح نہیں ہوتی۔

(۴) کہا جاتا ہے کہ مصر پر اس وقت ریان بن ولید حکمران تھا، اور یہ عزیز مصر، جس نے یوسف علیہ السلام کو خریدا، اس کا وزیر خزانہ تھا، اس کی بیوی کانام بعض نے راعیل اور بعض نے زینحاً بتلایا ہے، واللہ اعلم۔

(۵) یعنی جس طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کو کنوئیں سے ظالم بھائیوں سے نجات دی، اسی طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کو سرزمین مصر میں ایک معقول اچھا ٹھکانہ عطا کیا۔

تَجْرِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۲۲﴾

قوت فیصلہ اور علم دیا،^(۱) ہم نیک کاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ (۲۲)

اس عورت نے جس کے گھر میں یوسف تھے، یوسف کو بھلا بنا پھیلانا شروع کیا کہ وہ اپنے نفس کی نگرانی چھوڑ دے اور دروازے بند کر کے کہنے لگی لو آجاؤ۔ یوسف نے کہا اللہ کی پناہ! وہ میرا رب ہے، مجھے اس نے بہت اچھی طرح رکھا ہے۔ بے انصافی کرنے والوں کا بھلا نہیں ہوتا۔^(۲) (۲۳)

اس عورت نے یوسف کی طرف کا قصد کیا اور یوسف اس کا قصد کرتے اگر وہ اپنے پروردگار کی دلیل نہ

وَرَادَدْتُهُ اِنِّي هُوَ رَبِّي بِئِبْرَاهِيمَ عَنْ نَفْسِهِ وَعَقَلَتِ الْاَنْوَابَ
وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهُ رَبِّيْ اَحْسَنُ مِمَّا
يُرِيكَ اِنَّهُ لَكُلُّهُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ

(۱) یعنی نبوت یا نبوت سے قبل کی دانائی اور قوت فیصلہ۔

(۲) یہاں سے حضرت یوسف علیہ السلام کا ایک نیا امتحان شروع ہوا۔ عزیز مصر کی بیوی، جس کو اس کے خاوند نے ناکید کی تھی کہ یوسف علیہ السلام کو اکرام و احترام کے ساتھ رکھے، وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گئی اور انہیں دعوت گناہ دینے لگی، جسے حضرت یوسف علیہ السلام نے ٹھکرادیا۔

(۳) بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ﴿لَوْلَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ کا تعلق ما قبل یعنی ﴿وَهَمَّ بِهَا﴾ سے نہیں بلکہ اس کا جواب محذوف ہے یعنی "لَوْلَا اَنْ رَأَى بُرْهَانَ رَبِّهٖ لَفَعَلَ مَا هَمَّ بِهٖ" ترجمہ یہ ہو گا کہ اگر یوسف علیہ السلام اللہ کی دلیل نہ دیکھتے تو جس چیز کا قصد کیا تھا وہ کر گزرتے۔ یہ ترجمہ اکثر مفسرین کی تفسیر کے مطابق ہے۔ اور جن لوگوں نے اسے لَوْلَا کے ساتھ جوڑ کر یہ معنی بیان کئے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے قصد ہی نہیں کیا، ان مفسرین نے اسے عربی اسلوب کے خلاف قرار دیا ہے۔ اور یہ معنی بیان کئے ہیں کہ قصد تو یوسف علیہ السلام نے بھی کر لیا تھا لیکن ایک تو یہ اختیاری نہیں تھا بلکہ عزیز مصر کی بیوی کی ترغیب اور دباؤ اس میں شامل تھا۔ دوسرے، یہ کہ گناہ کا قصد کر لینا عصمت کے خلاف نہیں ہے، اس پر عمل کرنا عصمت کے خلاف ہے (فتح القدر، ابن کثیر) مگر محققین اہل تفسیر نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ یوسف علیہ السلام بھی اس کا قصد کر لیتے۔ اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھے ہوتے۔ یعنی انہوں نے اپنے رب کی برہان دیکھ رکھی تھی۔ اس لیے عزیز مصر کی بیوی کا قصد ہی نہیں کیا۔ بلکہ دعوت گناہ ملتے ہی پکار اٹھے ﴿مَعَاذَ اللّٰهِ﴾ الخ، البتہ قصد نہ کرنے کے یہ معنی نہیں کہ نفس میں بیجان اور تحریک ہی پیدا نہیں ہوئی۔ بیجان اور تحریک پیدا ہو جانا الگ بات ہے۔ اور قصد کر لینا الگ بات ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر سرے سے بیجان اور تحریک ہی پیدا نہ ہو تو ایسے شخص کا گناہ سے بچ جانا کوئی کمال نہیں۔ کمال تو تب ہی ہے کہ نفس کے اندر داعیہ اور تحریک پیدا ہو اور پھر انسان اس پر کنٹرول کرے اور گناہ سے بچ جائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اسی کمال صبر و ضبط کا بے مثال نمونہ پیش فرمایا۔

كَذَلِكَ لِنَصْرَفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ إِنَّهُ مِنْ
عِبَادِنَا الْمُتَّخِصِنِينَ ﴿۲۴﴾

دیکھتے،^(۱) یونہی ہوا اس واسطے کہ ہم اس سے برائی اور
بے حیائی دور کر دیں۔^(۲) بیشک وہ ہمارے پنے ہوئے
بندوں میں سے تھا۔ (۲۴)

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَالْفَتْيَا
سَيِّدَةً هَذَا كَذَا الْبَابُ قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ آذَا يَأْتِيكَ
سُوءٌ إِلَّا أَنْ يُسَخَّرَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۲۵﴾

دونوں دروازے کی طرف دوڑے^(۳) اور اس عورت
نے یوسف کا کرتا پیچھے کی طرف سے کھینچ کر پھاڑ ڈالا اور
دروازے کے پاس ہی عورت کا شوہر دونوں کو مل گیا، تو
کہنے لگی جو شخص تیری بیوی کے ساتھ برا ارادہ کرے
بس اس کی سزایابی ہے کہ اسے قید کر دیا جائے یا اور کوئی
دردناک سزا دی جائے۔^(۴) (۲۵)

قَالَ هِيَ رَاوَدْتَنِي عَنْ نَفْسِي وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ أَهْلِهَا

یوسف نے کہا یہ عورت ہی مجھے پھسلا رہی تھی،^(۵) اور
عورت کے قبیلے ہی کے ایک شخص نے گواہی^(۶) دی کہ

(۱) یہاں پہلی تفسیر کی بناء پر لولا کا جواب محذوف ہے، لَفَعَلَ مَا هَمَّ بِهِ، یعنی اگر یوسف علیہ السلام رب کی برہان نہ
دیکھتے تو جو قصد کیا تھا، کر گزرتے۔ یہ برہان کیا تھی؟ اس میں مختلف اقوال ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ رب کی طرف سے کوئی
ایسی چیز آپ کو دکھائی گئی کہ اسے دیکھ کر آپ نفس کے داعیے کے دبانے اور رد کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ
اپنے پیغمبروں کی اسی طرح حفاظت فرماتا ہے۔

(۲) یعنی جس طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کو برہان دکھا کر، برائی یا اس کے ارادے سے بچالیا، اسی طرح ہم نے اسے
ہر معاملے میں برائی اور بے حیائی کی باتوں سے دور رکھنے کا اہتمام کیا۔ کیونکہ وہ ہمارے پنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔
(۳) جب حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ عورت برائی کے ارتکاب پر مصر ہے، تو وہ باہر نکلنے کے لیے
دروازے کی طرف دوڑے، یوسف علیہ السلام کے پیچھے انہیں پکڑنے کے لیے عورت بھی دوڑی۔ یوں دونوں
دروازے کی طرف لپکے اور دوڑے۔

(۴) یعنی خاوند کو دیکھتے ہی خود معصوم بن گئی اور مجرم تمام تر یوسف علیہ السلام کو قرار دے کر ان کے لیے سزا بھی تجویز
کر دی۔ حالانکہ صورت حال اس کے برعکس تھی، مجرم خود تھی جب کہ حضرت یوسف علیہ السلام بالکل بے گناہ اور اس
برائی سے بچنے کے خواہش مند اور اس کے لیے کوشاں تھے۔

(۵) حضرت یوسف علیہ السلام نے جب دیکھا کہ وہ عورت تمام الزام ان پر دھر رہی ہے تو صورت حال واضح کر دی اور
کہا کہ مجھے برائی پر مجبور کرنے والی یہی ہے۔ میں اس سے بچنے کے لیے باہر دروازے کی طرف بھاگتا ہوا آیا ہوں۔

(۶) یہ انہی کے خاندان کا کوئی سمجھ دار آدمی تھا جس نے یہ فیصلہ کیا۔ فیصلے کو یہاں شہادت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، کیوں

اگر اس کا کرتا آگے سے پھٹا ہوا ہو تو عورت سچی ہے اور یوسف جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔ (۲۶)
 اور اگر اس کا کرتا پیچھے کی جانب سے پھاڑا گیا ہے تو عورت جھوٹی ہے اور یوسف سچوں میں سے ہے۔ (۲۷)
 خاوند نے جو دیکھا کہ یوسف کا کرتا پیٹھ کی جانب سے پھاڑا گیا ہے تو صاف کہہ دیا کہ یہ تو تم عورتوں کی چال بازی ہے، بیشک تمہاری چال بازی بہت بڑی ہے۔ (۲۸)^(۱)

یوسف اب اس بات کو آتی جاتی کرو^(۲) اور (اے عورت) تو اپنے گناہ سے توبہ کر، بیشک تو گنہگاروں میں سے ہے۔ (۲۹)^(۳)

اور شرکی عورتوں میں چرچا ہونے لگا کہ عزیز کی بیوی اپنے (جوان) غلام کو اپنا مطلب نکالنے کے لیے بھلائے پھسلانے میں لگی رہتی ہے، ان کے دل میں یوسف کی محبت بٹھ گئی ہے، ہمارے خیال میں تو وہ صریح گمراہی میں ہے۔ (۳۰)^(۴)

۵۱) إِنْ كَانَ قَبِيضُهُ قُدَّ مِنْ قَبْلِ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَذَّابِينَ

وَإِنْ كَانَ قَبِيضُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَّابَتْ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۵۲)

فَلَمَّا رَأَى قَبِيضَهُ قُدًّا مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كِبِدَىٰ كُنَّ اِبْنِ كِبِدَىٰ كُنَّ عَظِيمَةً ۵۳)

يُوسُفُ اعْرِضْ عَنْ هَذَا وَاسْتَغْفِرِي لِذَنبِكِ إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِينَ ۵۴)

وَقَالَ زَيْمُوَّةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ شَرَاؤُكَ كَشَفَا عَنْ نَفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۵۵)

کہ معاملہ ابھی تحقیق طلب تھا۔ شیر خوار بچے کی شہادت والی بات مستند روایات سے ثابت نہیں۔ صحیحین میں تین شیر خوار بچوں کے بات کرنے کی حدیث ہے جن میں یہ چوتھا نہیں ہے جس کا ذکر اس مقام پر کیا جاتا ہے۔

(۱) یہ عزیز مہر کا قول ہے جو اس نے اپنی بیوی کی حرکت قبیحہ دیکھ کر عورتوں کی بابت کہا۔ یہ نہ اللہ کا قول ہے اور نہ ہر عورت کے بارے میں صحیح۔ اس لیے اسے ہر عورت پر چسپاں کرنا اور اس بنیاد پر عورت کو مکرو فریب کا پتلا باور کرانا، قرآن کا ہرگز منشا نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ اس جملے سے عورت کے بارے میں یہ تاثر دیتے ہیں۔

(۲) یعنی اس کا چرچا مت کرو۔

(۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیز مہر حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی واضح ہو گئی تھی۔

(۴) جس طرح خوشبو کو پردوں سے چھپایا نہیں جاسکتا، عشق و محبت کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ گو عزیز مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اسے نظر انداز کرنے کی تلقین کی اور یقیناً آپ کی زبان مبارک پر اس کا کبھی ذکر بھی نہیں آیا ہو گا، اس کے باوجود یہ واقعہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا اور زنان مصر میں اس کا چرچا عام ہو گیا، عورتیں تعجب کرنے لگیں کہ عشق کرنا ہی تھا تو کسی پیکر حسن و جمال سے کیا جاتا، یہ کیا ہے غلام پر زینح فریفتہ ہو گئی، یہ تو اس کی بہت ہی نادانی ہے۔

اس نے جب ان کی اس پر فریب غیبت کا حال سنا تو انہیں بلوا بھیجا^(۱) اور ان کے لیے ایک مجلس مرتب^(۲) کی اور ان میں سے ہر ایک کو چھری دی۔ اور کہا اے یوسف! ان کے سامنے چلے آؤ،^(۳) ان عورتوں نے جب اسے دیکھا تو بہت بڑا جانا اور اپنے ہاتھ کاٹ لیے،^(۴) اور زبان سے نکل گیا کہ حاشا للہ! یہ انسان تو ہرگز نہیں، یہ تو یقیناً کوئی بہت ہی بزرگ فرشتہ ہے۔^(۵) (۳۱)

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُكْرًا
وَأَتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سَبِيحًا وَقَالَتِ اسْرُجْنَ عَلَيْهِنَّ يُوسُفَ
رَأَيْتُهُنَّ أَكْزَبَتَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا لَكُنَّ بِرَأْيِ
إِن هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ﴿۳۱﴾

(۱) زنان مصر کی عاتبانہ باتوں اور طعن و ملامت کو مکر سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کی وجہ بعض مفسرین نے یہ بیان کی ہے کہ ان عورتوں کو بھی یوسف کے بے مثال حسن و جمال کی اطلاعات پہنچ چکی تھیں۔ چنانچہ وہ اس پیکر حسن کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ وہ اپنے اس مکر (خفیہ تدبیر) میں کامیاب ہو گئیں اور امراة العزیز نے یہ بتلانے کے لیے کہ میں جس پر فریفتہ ہوئی ہوں، محض ایک غلام یا عام آدمی نہیں ہے بلکہ ظاہر و باطن کے ایسے حسن سے آراستہ ہے کہ اسے دیکھ کر نقد دل و جان ہار جانا کوئی انسانی بات نہیں، ان عورتوں کی ضیافت کا اہتمام کیا اور انہیں دعوت طعام دی۔

(۲) یعنی ایسی نشست گاہیں بنائیں جن میں تکیے لگے ہوئے تھے، جیسا کہ آج کل بھی عربوں میں ایسی فرشی نشست گاہیں عام ہیں حتیٰ کہ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں بھی ان کا اہتمام ہے۔

(۳) یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کو پہلے چھپائے رکھا، جب سب عورتوں نے ہاتھوں میں چھریاں پکڑ لیں تو امراة العزیز (زلیخا) نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مجلس میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔

(۴) یعنی حسن یوسف علیہ السلام کی جلوہ آرائی دیکھ کر ایک تو ان کی عظمت و جلال شان کا اعتراف کیا اور دوسرے ان پر بے خودی و وارفتگی کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ چھریاں اپنے ہی ہاتھوں پر چلا لیں، جس سے ان کے ہاتھ زخمی اور خون آلودہ ہو گئے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو نصف حسن دیا گیا ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الإیمان باب الإسرائء)

(۵) اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ فرشتے شکل و صورت میں انسان سے بہتر یا افضل ہیں۔ کیونکہ فرشتوں کو تو انسانوں نے دیکھا ہی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں انسان کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں صراحت کی ہے کہ ہم نے اسے احسن تقویم (بہترین انداز) میں پیدا کیا ہے۔ ان عورتوں نے بشریت کی نفی محض اس لیے کی کہ انہوں نے حسن و جمال کا ایک ایسا پیکر دیکھا تھا جو انسانی شکل میں کبھی ان کی نظروں سے نہیں گزرا تھا اور انہوں نے فرشتہ اس لیے قرار دیا کہ عام انسان یہی سمجھتا ہے کہ فرشتے ذات و صفات کے لحاظ سے ایسی شکل رکھتے ہیں جو انسانی شکل سے بالاتر ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ انبیا کی غیر معمولی خصوصیات و امتیازات کی بناء پر انہیں انسانیت سے نکال کر نورانی مخلوق قرار دینا، ہر دور کے ایسے لوگوں کا شیوہ رہا ہے جو نبوت اور اس کے مقام سے نا آشنا ہوتے ہیں۔

اس وقت عزیز مصر کی بیوی نے کہا، 'میری ہیں جن کے بارے میں تم مجھے طعنے دے رہی تھیں' (۱) میں نے ہر چند اس سے اپنا مطلب حاصل کرنا چاہا لیکن یہ بال بال بچا رہا، اور جو کچھ میں اس سے کہہ رہی ہوں اگر یہ نہ کرے گا تو یقیناً یہ قید کر دیا جائے گا اور بیشک یہ بہت ہی بے عزت ہو گا۔ (۳۲) (۲)

یوسف علیہ السلام نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! جس بات کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں اس سے تو مجھے جیل خانہ بہت پسند ہے، اگر تو نے ان کا فن فریب مجھ سے دور نہ کیا تو میں تو ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور بالکل نادانوں میں جا ملوں گا۔ (۳۳) (۳)

اس کے رب نے اس کی دعا قبول کر لی اور ان عورتوں کے داؤ بیچ اس سے پھیر دیے، یقیناً وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (۳۴)

پھر ان تمام نشانیوں کے دیکھ لینے کے بعد بھی انہیں یہی مصلحت معلوم ہوئی کہ یوسف کو کچھ مدت کے لیے قید

قَالَتْ ذَلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنِّي فِيهِ وَقَدْ رَأَوْنَهُ عَنْ نَفْسِهِ
فَانصَبْنَهُمْ وَلَكِنْ لَمْ نَعْمَلْ مَا نُرَاءُ لِيُنَجِّنَ
وَلِيَكُونَ مِنَ الصَّغِيرِينَ ۝۳۲

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ وَمَا كُنْتُ مُؤْمِنًا بِالْيَهُودِ
وَالْأَنْصَارِ عَرَفْتُ كَيْدَهُنَّ لَأَصُوبَ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنَّ
مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝۳۳

فَأَسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَوَّفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ إِنَّهُ هُوَ
السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝۳۴

كُنْتُمْ أَهْلًا لَهَا قَبْلَ مَا رَأَوُا آلِئِنَّ لِي لَبِئْسَ جُنَّةً فَحَتَّى حَبِطَ ۝۳۵

(۱) جب امراۃ العزیز نے دیکھا کہ اس کی چال کامیاب رہی ہے اور عورتیں یوسف علیہ السلام کے جلوہ حسن آراء سے مبسوت و مدہوش ہو گئیں تو کہنے لگی کہ اس کی ایک جھلک سے تمہارا یہ حال ہو گیا ہے تو کیا تم اب بھی مجھے اس کی محبت میں گرفتار ہونے پر طعنہ زنی کرو گی؟ یہی وہ غلام ہے جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کرتی ہو۔

(۲) عورتوں کی یہ مدہوشی دیکھ کر اس کو مزید حوصلہ ہو گیا اور شرم و حیا کے سارے حجاب دور کر کے اس نے اپنے برے ارادے کا ایک مرتبہ پھر اظہار کیا۔

(۳) حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دعا اپنے دل میں کی۔ اس لیے کہ ایک مومن کے لیے دعا بھی ایک ہتھیار ہے۔ حدیث میں آتا ہے، 'سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ قیامت والے دن عرش کا سایہ عطا فرمائے گا۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے جسے ایک ایسی عورت دعوت گناہ دے جو حسن و جمال سے بھی آراستہ ہو اور جاہ و منصب کی بھی حامل ہو۔ لیکن وہ اس کے جواب میں یہ کہہ دے کہ میں تو "اللہ سے ڈرتا ہوں"۔' (صحیح بخاری۔ کتاب الأذان، باب من جلس فی

المسجد ينتظر الصلوة وفضل المساجد وفضل الزکوة باب فضل إخفاء الصدقة)

خانہ میں رکھیں۔^(۱) (۳۵)

اس کے ساتھ ہی دو اور جوان بھی جیل خانے میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے خواب میں اپنے آپ کو شراب پھونکتے دیکھا ہے، اور دوسرے نے کہا میں نے اپنے آپ کو دیکھا ہے کہ میں اپنے سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں جسے پرندے کھا رہے ہیں، ہمیں آپ اس کی تعبیر بتائیے، ہمیں تو آپ خوابوں والے شخص دکھائی دیتے ہیں۔^(۲) (۳۶)

یوسف نے کہا تمہیں جو کھانا دیا جاتا ہے اس کے تمہارے پاس پہنچنے سے پہلے ہی میں تمہیں اس کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ سب اس علم کی بدولت ہے جو مجھے میرے رب نے سکھایا ہے،^(۳) میں نے ان لوگوں کا مذہب چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّبْعَ فَيَنْبَغِي قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ خَمْرًا
وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَانِي أَعْطَى طَيْرًا مِمَّنْ يَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ
يَبْسُطُهَا بِأُذُنَيْهِ أَفَأَنْتَ تَكْفُرُ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۳۶﴾

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقِينَ إِلَّا نَبَأُكُمَا بِتِلْكَ لَيْلَةٍ
قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ذَلِكُمْ مِمَّا عَمِلْتُمْ رَبِّي إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ
قَوْمِ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ كَافِرُونَ ﴿۳۷﴾

(۱) عفت و پاک دامنی واضح ہو جانے کے باوجود یوسف علیہ السلام کو حوالہ زنداں کرنے میں یہی مصلحت ان کے پیش نظر ہو سکتی تھی کہ عزیز مصر حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی بیوی سے دور رکھنا چاہتا ہو گا تاکہ وہ دوبارہ یوسف علیہ السلام کو اپنے دام میں پھنسانے کی کوشش نہ کرے جیسا کہ وہ ایسا ارادہ رکھتی تھی۔

(۲) یہ دونوں نوجوان شاہی دربار سے متعلق تھے۔ ایک شراب پلانے پر مامور تھا اور دوسرا نان بائی تھا۔ کسی حرکت پر دونوں کو پس دیوار زنداں کر دیا گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام اللہ کے پیغمبر تھے، دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ عبادت و ریاضت تقویٰ و راست بازی اور اخلاق و کردار کے لحاظ سے جیل میں دیگر تمام قیدیوں سے ممتاز تھے۔ علاوہ ازیں خوابوں کی تعبیر کا خصوصی علم اور ملکہ اللہ نے ان کو عطا فرمایا تھا۔ ان دونوں نے خواب دیکھا تو قدرتی طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف انہوں نے رجوع کیا اور کہا ہمیں آپ محسنین میں سے نظر آتے ہیں۔ ہمیں ہمارے خوابوں کی تعبیر بتلائیں۔ محسن کے ایک معنی بعض نے یہ بھی کئے ہیں کہ خواب کی تعبیر آپ اچھی کر لیتے ہیں۔

(۳) یعنی میں جو تعبیر بتاؤں گا، وہ کاہنوں اور نجومیوں کی طرح ظن و تخمین پر مبنی نہیں ہوگی، جس میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ بلکہ میری تعبیر یقینی علم پر مبنی ہوگی جو اللہ کی طرف سے مجھے عطا کیا گیا ہے، جس میں غلطی کا امکان ہی نہیں ہے۔

منکر ہیں۔^(۱) (۳۷)

میں اپنے باپ دادوں کے دین کا پابند ہوں، یعنی ابراہیم و اسحاق اور یعقوب کے دین کا،^(۲) ہمیں ہرگز یہ سزاوار نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو بھی شریک کریں،^(۳) ہم پر اور تمام اور لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل ہے، لیکن اکثر لوگ ناشکری کرتے

ہیں۔ (۳۸)

اے میرے قید خانے کے ساتھیو! ^(۴) کیا متفرق کئی ایک پروردگار بہتر ہیں؟ ^(۵) یا ایک اللہ زبردست طاقت ور؟ (۳۹)

اس کے سوا تم جن کی پوجا پاٹ کر رہے ہو وہ سب نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے خود ہی گھڑ لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی،^(۱) فرمانروائی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، اس کا

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نَشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ذَلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۳۷﴾

يُصَاحِبِي السَّجْنِ، أَرَأَيْتَ مُتَّفَرِّقُونَ خَيْرًا مِمَّا لِلَّهِ
الْوَالِدِ الْقَهَّارِ ﴿۳۸﴾

مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءُ سَبَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ
وَأَبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنْ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ
أَمْرًا أَلْتَعْبُدُوا وَالْآيَاتُ ذَلِكَ لِلَّذِينَ الْفَقِيهُو وَلَكِنَّ أَكْثَرَ

(۱) یہ الہام اور علم الہی (جن سے آپ کو نوازا گیا) کی وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ میں نے ان لوگوں کا مذہب چھوڑ دیا جو اللہ اور آخرت پر یقین نہیں رکھتے، اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ کے یہ انعامات مجھ پر ہوئے۔

(۲) اجداد کو بھی آباء کہا، اس لیے کہ وہ بھی آباء ہی ہیں۔ پھر ترتیب میں بھی جد اعلیٰ (ابراہیم علیہ السلام) پھر جد اقرب (اسحاق علیہ السلام) اور پھر باپ (یعقوب علیہ السلام) کا ذکر کیا۔ یعنی پہلے، پہلی اصل، پھر دوسری اصل اور پھر تیسری اصل بیان کی۔

(۳) وہی توحید کی دعوت اور شرک کی تردید ہے جو ہر نبی کی بنیادی اور اولین تعلیم اور دعوت ہوتی تھی۔

(۴) قید خانے کے ساتھی، اس لیے قرار دیا کہ یہ سب ایک عرصے سے جیل میں مجبوس چلے آ رہے تھے۔

(۵) تفرق ذات، صفات اور عدد کے لحاظ سے ہے۔ یعنی وہ رب، جو ذات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے متفرق، صفات میں ایک دوسرے سے مختلف ---- اور تعداد میں باہم متفانی ہیں۔ وہ بہتر ہیں یا وہ اللہ، جو اپنی ذات و صفات میں متفرد ہے، جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور وہ سب پر غالب اور حکمران ہے؟

(۶) اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ان کا نام معبود تم نے خود ہی رکھ لیا ہے، دراصل حاکم وہ معبود ہیں نہ ان کی بابت کوئی دلیل اللہ نے اتاری ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ان معبودوں کے جو مختلف نام تم نے تجویز کر رکھے ہیں، مثلاً خواجہ

التَّائِسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥﴾

فرمان ہے کہ تم سب سوائے اس کے کسی اور کی عبادت نہ کرو، یہی دین درست ^(۱) ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ^(۲) (۳۰)

اے میرے قید خانے کے رفیقو! ^(۳) تم دونوں میں سے ایک تو اپنے بادشاہ کو شراب پلانے پر مقرر ہو جائے گا، ^(۴) لیکن دوسرا سولی پر چڑھایا جائے گا اور پرندے اس کا سر نوچ نوچ کھائیں گے، ^(۵) تم دونوں جس کے بارے میں تحقیق کر رہے تھے اس کام کا فیصلہ کر دیا گیا۔ ^(۶) (۳۱)

اور جس کی نسبت یوسف کا گمان تھا کہ ان دونوں میں سے یہ چھوٹ جائے گا اس سے کہا کہ اپنے بادشاہ سے میرا ذکر بھی کر دینا، پھر اسے شیطان نے اپنے بادشاہ سے

يُصَاحِبِي السَّجِينِ أَمَا أَحَدُكُمْ مَا فَيْسِقِي رَبِّيَ حَمْرًا
وَأَمَا الْآخَرُ فَيُصَلِّبُ فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَأْسِهِ فَتُضَيِّ
الْأَمْرَ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِينِ ﴿٥﴾

وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِنْدَ
رَبِّكَ فَأَنَسَ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَبِثَ فِي السَّجِينِ

غریب نواز، گنج بخش، کرنی والا، کرماں والا وغیرہ یہ سب تمہارے خود ساختہ ہیں، ان کی کوئی دلیل اللہ نے نہیں اتاری۔
(۱) یہی دین، جس کی طرف میں تمہیں بلا رہا ہوں، جس میں صرف ایک اللہ کی عبادت ہے، درست اور قیم ہے جس کا حکم اللہ نے دیا ہے۔

(۲) جس کی وجہ سے اکثر لوگ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں، ﴿وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَهُمْ يُشْرِكُونَ﴾ (سورۃ یوسف - ۱۰۶)
”ان میں سے اکثر لوگ باوجود اللہ پر ایمان رکھنے کے بھی مشرک ہی ہیں۔“ اور فرمایا ﴿وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ﴾ (سورۃ یوسف - ۱۰۳) ”اے پیغمبر تیری خواہش کے باوجود اکثر لوگ اللہ پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔“

(۳) توحید کا وعظ کرنے کے بعد اب حضرت یوسف علیہ السلام ان کے بیان کردہ خوابوں کی تعبیر بیان فرما رہے ہیں۔
(۴) یہ وہ شخص ہے جس نے خواب میں اپنے کو انگور کا شیرہ تیار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ تاہم آپ نے دونوں میں سے کسی ایک کی تعیین نہیں کی تاکہ مرنے والا پہلے ہی غم و حزن میں مبتلا نہ ہو جائے۔
(۵) یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے سر پر خواب میں رونیاں اٹھائے دیکھا تھا۔

(۶) یعنی تقدیر الہی میں پہلے سے یہ بات ثبت ہے اور جو تعبیر میں نے بتلائی ہے، لامحالہ واقع ہو کر رہے گی۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”خواب“ جب تک اس کی تعبیر نہ کی جائے، پرندے کے پاؤں پر ہے۔ جب اس کی تعبیر کر دی جائے تو وہ واقع ہو جاتا ہے۔“ (مسند أحمد، بحوالہ ابن کثیر)

ذکر کرنا بھلا دیا اور یوسف نے کئی سال قید خانے میں ہی
کاٹے۔^(۱) (۳۲)

بادشاہ نے کہا، میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سات
موٹی تازی فریبہ گائیں ہیں جن کو سات لاغر دلی پتلی
گائیں کھا رہی ہیں اور سات بالیاں ہیں ہری ہری اور
دوسری سات بالکل خشک۔ اے دربارو! میرے اس
خواب کی تعبیر بتلاؤ اگر تم خواب کی تعبیر دے سکتے
ہو۔ (۳۳)

انہوں نے جواب دیا کہ یہ تو اڑتے اڑاتے پریشان خواب
ہیں اور ایسے شوریدہ پریشان خوابوں کی تعبیر جاننے والے
ہم نہیں۔^(۲) (۳۴)

ان دو قیدیوں میں سے جو رہا ہوا تھا اسے مدت کے بعد یاد
آگیا اور کہنے لگا میں تمہیں اس کی تعبیر بتلا دوں گا مجھے
جانے کی اجازت دیجئے۔^(۳) (۳۵)

بِضْعَ سِنِينَ ۝

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلْنَ
سَبْعَ عِجَافٍ وَسَبْعَ سُوءِ بِلَابٍ خُضِرٍ وَأَخْرَجْتُ يَا أَيُّهَا
الْمَلِكُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِنَّ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ ۝

قَالُوا أَضْغَاثٌ أَحْلَامٍ وَمَا عَنَّا بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ عَلِيمِينَ ۝

وَقَالَ الَّذِي نَجَّاهُمَا وَادَّكَّرَ بَعْدَ آيَاتِنَا لَمَّا بَوَّأُوهُ
قَارِئِينَ ۝

(۱) بَضْعَ كالفظ تین سے لے کر نو تک کے عدد کے لیے بولا جاتا ہے۔ وہب بن منبہ کا قول ہے۔ حضرت ایوب علیہ
السلام آزمائش میں اور یوسف علیہ السلام قید خانے میں سات سال رہے اور بخت نصر کا عذاب بھی سات سال رہا۔ اور
بعض کے نزدیک بارہ سال اور بعض کے نزدیک چودہ سال قید خانے میں رہے۔ واللہ اعلم۔

(۲) أَضْغَاثٌ ضِعْفٌ کی جمع ہے جس کے معنی گھاس کے گٹھے کے ہیں۔ أَحْلَامٍ حِلْمٌ (معنی خواب) کی جمع ہے۔ اضغاث
احلام کے معنی ہوں گے خواب ہائے پریشان، یا خیالات منتشرہ، جن کی کوئی تعبیر نہ ہو۔ یہ خواب اس بادشاہ کو آیا، عزیز
مصر جس کا وزیر تھا۔ اللہ تعالیٰ کو اس خواب کے ذریعے سے یوسف علیہ السلام کی رہائی عمل میں لانی تھی۔ چنانچہ بادشاہ
کے درباریوں، کانہوں اور نجومیوں نے اس خواب پریشاں کی تعبیر بتلانے سے بجز کا اظہار کر دیا۔ بعض کہتے ہیں کہ
نجومیوں کے اس قول کا مطلب مطلقاً علم تعبیر کی نفی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ علم تعبیر سے وہ بے خبر نہیں تھے نہ اس کی
انہوں نے نفی کی، انہوں نے صرف اس خواب کی تعبیر بتلانے سے لاعلمی کا اظہار کیا۔

(۳) یہ قید کے دو ساتھیوں میں سے ایک نجات پانے والا تھا جسے حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا کہ اپنے آقا سے
میرا ذکر کرنا، تاکہ میری بھی رہائی کی صورت بن سکے۔ اسے اچانک یاد آیا اور اس نے کہا کہ مجھے مہلت دو، میں تمہیں آکر

اے یوسف! اے بہت بڑے بچے یوسف! آپ ہمیں اس خواب کی تعبیر بتلائیے کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں جنہیں سات دبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات بالکل سبز خوشے ہیں اور سات ہی دوسرے بھی بالکل خشک ہیں، تاکہ میں واپس جا کر ان لوگوں سے کہوں کہ وہ سب جان لیں۔ (۳۶)

یوسف نے جواب دیا کہ تم سات سال تک پے درپے لگاتار حسب عادت غلہ بویا کرنا، اور فصل کاٹ کر اسے بایوں سمیت ہی رہنے دینا سوائے اپنے کھانے کی تھوڑی سی مقدار کے۔ (۳۷)

اس کے بعد سات سال نہایت سخت قحط کے آئیں گے وہ اس غلہ کو کھا جائیں گے، جو تم نے ان کے لیے ذخیرہ رکھ چھوڑا تھا،^(۱) سوائے اس تھوڑے سے کہ جو تم روک رکھتے ہو۔^(۲) (۳۸)

اس کے بعد جو سال آئے گا اس میں لوگوں پر خوب بارش برساتی جائے گی اور اس میں (شیرہ انگور بھی) خوب

يُوسُفُ اِنَّهَا الصِّدْقُ اَقْبَتَانِي سَمِعَ بَقَرَاتٍ سَبْعًا
يَا كَاهِنُنَّ سَمِعَ عَجَلًا وَسَمِعَ سُبُلَاتٍ خُضْرًا وَآخَرَ
يُيَسِّرُ لَعَلَّ ارْجِعَ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۳۶﴾

قَالَ ارْزُقُونَنِّي سَبْعَ سِنِينَ دَابًّا فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ
فِي سُنْبُلِهِ اَلَا قَلِيلًا مِمَّا تَكْتُمُونَ ﴿۳۷﴾

ثُمَّ يَا نِي مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ سَمِعْتُ شِدَادًا يَأْكُلُنَّ مَا وَكَنْتُمْ لَهُنَّ
اَلَا قَلِيلًا مِمَّا تَخْتُمُونَّ ﴿۳۸﴾

ثُمَّ يَا نِي مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامَةٌ فِيْهِ يُغَاكُّ النَّاسُ وَفِيْهِ
يَعْبُرُونَ ﴿۳۹﴾

اس کی تعبیر بتلا تا ہوں۔ چنانچہ وہ نکل کر سیدھا یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا، اور خواب کی تفصیل بتلا کر اس کی تعبیر کی بابت پوچھا۔

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے علم تعبیر سے بھی نوازا تھا۔ اس لیے وہ اس خواب کی یہ تک فوراً پہنچ گئے۔ انہوں نے موٹی تازہ سات گایوں سے ایسے سات سال مراد لیے جن میں خوب پیداوار ہوگی، اور سات دبلی پتلی گایوں سے اس کے برعکس سات سال خشک سالی کے۔ اسی طرح سات سبز خوشوں سے مراد لیا کہ زمین خوب پیداوار دے گی اور سات خشک خوشوں کا مطلب یہ ہے کہ ان سات سالوں میں زمین کی پیداوار نہیں ہوگی۔ اور پھر اس کے لیے تدبیر بھی بتلائی کہ سات سال تم متواتر کاشتکاری کرو اور جو غلہ تیار ہو، اسے کاٹ کر بایوں سمیت ہی سنبھال کر رکھو تاکہ ان میں غلہ زیادہ محفوظ رہے، پھر جب سات سال قحط کے آئیں گے تو یہ غلہ تمہارے کام آئے گا جس کا ذخیرہ تم اب کرو گے۔

(۲) مِمَّا تَخْتُمُونَّ سے مراد وہ دانے ہیں جو دوبارہ کاشت کے لیے محفوظ کر لیے جاتے ہیں۔

نچوڑیں گے۔^(۱) (۳۹)

اور بادشاہ نے کہا یوسف کو میرے پاس لاؤ،^(۲) جب قاصد یوسف کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا، اپنے بادشاہ کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا حقیقی واقعہ کیا ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے^(۳) تھے؟ ان کے حیلے کو (صحیح طور پر) جاننے والا میرا پروردگار ہی ہے۔ (۵۰)

بادشاہ نے پوچھا اے عورتو! اس وقت کا صحیح واقعہ کیا ہے جب تم داؤ فریب کر کے یوسف کو اس کی دلی منشا سے برکاتا چاہتی تھیں، انہوں نے صاف جواب دیا کہ معاذ اللہ ہم نے یوسف میں کوئی برائی نہیں^(۴) پائی، پھر تو عزیز کی بیوی بھی بول اٹھی کہ اب تو سچی بات نھر آئی۔ میں نے ہی اسے ورغلا یا تھا، اس کے جی سے، اور یقیناً وہ بچوں میں

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أرى فِيكَ مَآبَأَ الْمَسَوِّئَاتِ الَّتِي كُتِبَتْ عَلَيْكَ ۚ إِنَّ رَبِّي لَبَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۵۰﴾

قَالَ مَا خَطْبُكِ إِنَّ إِذَا وَدِدْتُ يُوْسُفَ عَنْ نَفْسِهِ قُلْتُ حَسَّ بَلَى مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ إِنَّ حِصْحَصَ الْحَقِّ أَنَا وَوَدَّتُّهُ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۵۱﴾

(۱) یعنی قحط کے سات سال گزرنے کے بعد پھر خوب بارش ہوگی، جس کے نتیجے میں کثرت سے پیداوار ہوگی اور تم انگوروں سے اس کا شیرہ نچوڑو گے، زیتون سے تیل نکالو گے اور جانوروں سے دودھ دوہو گے۔ خواب کی اس تعبیر کو خواب سے کیسی لطیف مناسبت حاصل ہے، جسے صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ ایسا صحیح وجدان، ذوق سلیم اور ملکہ راسخ عطا فرمادے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا۔

(۲) مطلب یہ ہے کہ جب وہ شخص تعبیر دریافت کر کے بادشاہ کے پاس گیا اور اسے تعبیر بتلائی تو وہ اس تعبیر سے اور حضرت یوسف علیہ السلام کی بتلائی ہوئی تدبیر سے بڑا متاثر ہوا اور اس نے یہ اندازہ لگا لیا کہ یہ شخص، جسے ایک عرصے سے حوالہ زنداں کیا ہوا ہے، غیر معمولی علم و فضل اور اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے انہیں دربار میں پیش کرنے کا حکم دیا۔

(۳) حضرت یوسف علیہ السلام نے جب دیکھا کہ بادشاہ اب مائل بہ کرم ہے، تو انہوں نے اس طرح محض عنایت خسروانہ سے جیل سے نکلنے کو پسند نہیں فرمایا، بلکہ اپنے کردار کی رفعت اور پاک دامنی کے اثبات کو ترجیح دی تاکہ دنیا کے سامنے آپ کے کردار کا حسن اور اس کی بلندی واضح ہو جائے۔ کیونکہ داعی الی اللہ کے لیے یہ عفت و پاک بازی اور رفعت کردار بہت ضروری ہے۔

(۴) بادشاہ کے استفسار پر تمام عورتوں نے یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کا اعتراف کیا۔

سے ہے۔^(۱) (۵۱)

(یوسف علیہ السلام نے کہا) یہ اس واسطے کہ (عزیز) جان لے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی^(۲) اور یہ بھی کہ اللہ وغائبوں کے ہتھکنڈے چلنے نہیں دیتا۔^(۳) (۵۲)

ذَلِّلْ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿۵۲﴾

(۱) اب امرأۃ العزیز (زلیخا) کے لیے بھی یہ اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں رہا کہ یوسف علیہ السلام بے قصور ہے اور یہ پیش دستی میری ہی طرف سے ہوئی تھی، اس فرشتہ صفت انسان کا اس لغزش سے کوئی تعلق نہیں۔

(۲) جب جیل میں حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ ساری تفصیل بتلائی گئی تو اسے سن کر یوسف علیہ السلام نے یہ کہا اور بعض کہتے ہیں کہ بادشاہ کے پاس جا کر انہوں نے یہ کہا اور بعض مفسرین کے نزدیک یہ بھی زلیخا کا ہی قول ہے اور مطلب یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کی غیر موجودگی میں بھی اسے غلط طور پر متمم کر کے خیانت کا ارتکاب نہیں کرتی بلکہ امانت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف کرتی ہوں، یا یہ مطلب ہے کہ میں نے اپنے خاندان کی خیانت نہیں کی اور کسی بڑے گناہ میں واقع نہیں ہوئی۔ امام ابن کثیر نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔

(۳) کہ وہ اپنے مکرو فریب میں ہمیشہ کامیاب ہی رہیں۔ بلکہ ان کا اثر محدود اور عارضی ہوتا ہے۔ بالآخر جیت حق اور اہل حق ہی کی ہوتی ہے، گو عارضی طور پر اہل حق کو آزمائشوں سے گزرنا پڑے۔

میں اپنے نفس کی پاکیزگی بیان نہیں کرتا۔^(۱) بیشک نفس تو برائی پر ابھارنے والا ہی ہے،^(۲) مگر یہ کہ میرا پروردگار ہی اپنا رحم کرے،^(۳) یقیناً میرا پالنے والا بڑی بخشش کرنے والا اور بہت مہربانی فرمانے والا ہے۔ (۵۳)

بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ کہ میں اسے اپنے خاص کاموں کے لیے مقرر کر لوں،^(۴) پھر جب اس سے بات چیت کی تو کہنے لگا کہ آپ ہمارے ہاں آج سے ذی عزت اور امانت دار ہیں۔^(۵) (۵۴)

(یوسف نے) کہا آپ مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے،^(۶)

وَمَا آتَيْنِي إِلَّا
مَا رَحِمَ رَبِّي إِنَّ رَبِّيَ غَفُورٌ ذَرِيمٌ ﴿۵۳﴾

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أُنْزِلُ بِهَا وَسْتَكْبِلُهَا لِنَفْسِي فَلْيَتَكَلَّمْهُ
قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ﴿۵۴﴾

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْهَا ﴿۵۵﴾

(۱) اسے اگر حضرت یوسف علیہ السلام کا قول تسلیم کیا جائے تو بطور کسر نفسی کے ہے، ورنہ صاف ظاہر ہے کہ ان کی پاک دامنی ہر طرح سے ثابت ہو چکی تھی۔ اور اگر یہ عزیزہ مصر کا قول ہے (جیسا کہ امام ابن کثیر کا خیال ہے) تو یہ حقیقت پر مبنی ہے کیونکہ اس نے اپنے گناہ کا اور یوسف علیہ السلام کو بھلائے اور پھسلانے کا اعتراف کر لیا۔

(۲) یہ اس نے اپنی غلطی کی توجیہ یا اس کی علت بیان کی کہ انسان کا نفس ہی ایسا ہے کہ اسے برائی پر ابھارتا اور اس پر آمادہ کرتا ہے۔

(۳) یعنی نفس کی شرارتوں سے وہی بچتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بچالیا۔

(۴) جب بادشاہ (ریان بن ولید) پر یوسف علیہ السلام کے علم و فضل کے ساتھ ان کے کردار کی رفعت اور پاک دامنی بھی واضح ہو گئی، تو اس نے حکم دیا کہ انہیں میرے سامنے پیش کرو، میں انہیں اپنے لیے منتخب کرنا یعنی اپنا مصاحب اور مشیر خاص بنانا چاہتا ہوں۔

(۵) مَكِينٌ مرتبہ والا، أَمِينٌ رموز مملکت کا رازدان۔

(۶) خَزَائِنُ - خِزَانَةٌ کی جمع ہے۔ خزانہ ایسی جگہ کو کہتے ہیں جس میں چیزیں محفوظ کی جاتی ہیں۔ زمین کے خزانوں سے مراد وہ گودام ہیں جہاں غلہ جمع کیا جاتا تھا۔ اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کی خواہش اس لیے ظاہر کی کہ مستقبل قریب میں (خواب کی تعبیر کی رو سے) جو قحط سالی کے ایام آنے والے ہیں، اس سے نمٹنے کے لیے مناسب انتظامات کئے جا سکیں اور غلے کی معقول مقدار بچا کر رکھی جا سکے۔ عام حالات میں اگرچہ عمدہ و منصب کی طلب جائز نہیں ہے۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے اس اقدام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاص حالات میں اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ قوم اور ملک کو جو خطرات درپیش ہیں اور ان سے نمٹنے کی اچھی صلاحیتیں میرے اندر موجود ہیں جو دوسروں میں نہیں ہیں، تو وہ اپنی

میں حفاظت کرنے والا اور باخبر ہوں۔ (۵۵)^(۱)

اسی طرح ہم نے یوسف (علیہ السلام) کو ملک کا قبضہ دے دیا۔ کہ وہ جہاں کہیں چاہے رہے سے،^(۲) ہم جسے چاہیں اپنی رحمت پہنچا دیتے ہیں۔ ہم نیکو کاروں کا ثواب ضائع نہیں کرتے۔^(۳) (۵۶)

یقیناً ایمان داروں اور پرہیزگاروں کا اخروی اجر بہت ہی بہتر ہے۔ (۵۷)

یوسف کے بھائی آئے اور یوسف کے پاس گئے تو اس نے انہیں پہچان لیا اور انہوں نے اسے نہ پہچانا۔ (۵۸)^(۴)

وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَدَّبُرُوا مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ
نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۵﴾

وَلَا نُجْرِمُ الْأَخْرَجَةَ خَيْرًا لِّلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿۵۶﴾

وَجَاءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ
لَمْ يُعْتَرَفُوا ﴿۵۷﴾

اہلیت کے مطابق اس مخصوص عہدے اور منصب کی طلب کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت یوسف علیہ السلام نے تو سرے سے عہدہ و منصب طلب ہی نہیں کیا، البتہ جب بادشاہ مصر نے انہیں اس کی پیشکش کی تو پھر ایسے عہدے کی خواہش کی جس میں انہوں نے ملک اور قوم کی خدمت کا پہلو نمایاں دیکھا۔

(۱) حَفِيفٌ میں اس کی اس طرح حفاظت کروں گا کہ اسے کسی بھی غیر ضروری مصرف میں خرچ نہیں کروں گا، عَلِيمٌ اس کو جمع کرنے اور خرچ کرنے اور اس کے رکھنے اور نکالنے کا بخوبی علم رکھتا ہوں۔

(۲) یعنی ہم نے یوسف علیہ السلام کو زمین میں ایسی قدرت و طاقت عطا کی کہ بادشاہ وہی کچھ کرتا جس کا حکم حضرت یوسف علیہ السلام کرتے، اور سرزمین مصر میں اس طرح تصرف کرتے جس طرح انسان اپنے گھر میں کرتا ہے اور جہاں چاہتے، وہ رہتے، پورا مصران کے زیر نگیں تھا۔

(۳) یہ گویا اجر تھا ان کے اس صبر کا جو بھائیوں کے ظلم و ستم پر انہوں نے کیا اور اس ثابت قدمی کا جو زیلجنا کی دعوت گناہ کے مقابلے میں اختیار کی اور اس اولوالعزمی کا جو قید خانے کی زندگی میں اپنائے رکھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ منصب وہی تھا جس پر اس سے پہلے وہ عزیز مصر فائز تھا، جس کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ورغلانے کی مذموم سعی کی تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ بادشاہ حضرت یوسف علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ سے مسلمان ہو گیا تھا۔ اسی طرح بعض نے یہ کہا ہے کہ عزیز مصر، جس کا نام اطفیر تھا، فوت ہو گیا تو اس کے بعد زیلجنا کا نکاح حضرت یوسف علیہ السلام سے ہو گیا اور دو بچے بھی ہوئے، ایک کا نام افرانیم اور دوسرے کا نام میثا تھا، افرانیم ہی یوشع بن نون اور حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی رحمت کے والد تھے۔ (تفسیر ابن کثیر) لیکن یہ بات کسی مستند روایت سے ثابت نہیں اس لیے نکاح والی بات صحیح معلوم نہیں ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اس عورت سے جس کردار کا مظاہرہ ہوا، اس کے ہوتے ہوئے ایک نبی کے حرم سے اس کی وابستگی، نہایت نامناسب بات لگتی ہے۔

(۴) یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب خوش حالی کے سات سال گزرنے کے بعد قحط سالی شروع ہو گئی جس نے ملک مصر

جب انہیں ان کا اسباب مہیا کر دیا تو کہا کہ تم میرے پاس اپنے اس بھائی کو بھی لانا جو تمہارے باپ سے ہے، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ میں پورا ناپ کر دیتا ہوں اور میں ہوں بھی بہترین میزبانی کرنے والوں میں۔^(۱) (۵۹)

پس اگر تم اسے لے کر پاس نہ آئے تو میری طرف سے تمہیں کوئی ناپ بھی نہ ملے گا بلکہ تم میرے قریب بھی نہ پھلنا۔^(۲) (۶۰)

انہوں نے کہا اچھا ہم اس کے باپ کو اس کی بابت پھلسائیں گے اور پوری کوشش کریں گے۔^(۳) (۶۱)

اپنے خدمت گاروں سے کہا کہ ان کی پونجی انہی کی

وَلَمَّا حَزَنُوا جَاهِلُوا قَوْلَ الْكَاذِبِينَ يَا نُوحُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ وَالِدًا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَمَّا كَانُوا فِي كَيْدِ الْكَافِرِينَ ۝۵۹

فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِي وَلَا تَقْرَبُونِ ۝۶۰

قَالُوا سُبْحَانَ اللَّهِ عَنَّا وَإِنَّ اللَّهَ لَوَاقِعُونَ ۝۶۱

وَقَالَ لِيَتَيْنِيهِ اجْعَلُوا بِصَاحِبَتِهِمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ

کے تمام علاقوں اور شہروں کو اپنی پیٹ میں لے لیا، حتیٰ کہ کنعان تک بھی اس کے اثرات جا پہنچے، جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی رہائش پذیر تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے حسن تدبیر سے اس قحط سالی سے نمٹنے کے جو انتظامات کیے تھے، وہ کام آئے اور ہر طرف سے لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس غلہ لینے کے لیے آرہے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ شہرت کنعان تک بھی پہنچی کہ مصر کا بادشاہ اس طرح غلہ فروخت کر رہا ہے، چنانچہ باپ کے حکم پر یہ برادران یوسف علیہ السلام بھی گھر کی پونجی لے کر غلے کے حصول کے لیے دربار شاہی میں پہنچ گئے، جہاں حضرت یوسف علیہ السلام تشریف فرما تھے۔ جنہیں یہ بھائی تو نہ پہچان سکے لیکن یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو پہچان لیا۔

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام نے انجان بن کر جب اپنے بھائیوں سے باتیں پوچھیں تو انہوں نے جہاں اور سب کچھ بتایا، یہ بھی بتا دیا کہ ہم دس بھائی اس وقت یہاں موجود ہیں۔ لیکن ہمارے دو علاقائی بھائی (یعنی دو سری ماں سے) اور بھی ہیں، ان میں سے ایک تو جنگل میں ہلاک ہو گیا اور اس کے دوسرے بھائی کو والد نے اپنی تسلی کے لیے اپنے پاس رکھا ہے، اسے ہمارے ساتھ نہیں بھیجا۔ جس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ آئندہ اسے بھی ساتھ لے کر آنا۔ دیکھتے نہیں کہ میں ناپ بھی پورا دیتا ہوں اور مہمان نوازی اور خاطر مدارت بھی خوب کرتا ہوں۔

(۲) ترغیب کے ساتھ یہ دھمکی ہے کہ اگر گیارہویں بھائی کو ساتھ نہ لائے تو نہ تمہیں غلہ ملے گا نہ میری طرف سے اس خاطر مدارت کا اہتمام ہوگا۔

(۳) یعنی ہم اپنے باپ کو اس بھائی کو لانے کے لیے پھلسائیں گے اور ہمیں امید ہے کہ ہم اس میں کامیاب ہوں گے۔

(۴) فِتْنَانٌ (نوجوانوں) سے مراد یہاں وہ نوکر چاکر اور خادم و غلام ہیں جو دربار شاہی میں مامور تھے۔

بوریوں میں رکھ دو^(۱) کہ جب لوٹ کر اپنے اہل و عیال میں جائیں اور پونجیوں کو پہچان لیں تو بہت ممکن ہے کہ یہ پھر لوٹ کر آئیں۔ (۶۲)

جب یہ لوگ لوٹ کر اپنے والد کے پاس گئے تو کہنے لگے کہ ہم سے تو غلہ کا ناپ روک لیا گیا۔^(۲) اب آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیجئے کہ ہم بیانا بھر کر لائیں ہم اس کی نگہبانی کے ذمہ دار ہیں۔ (۶۳)

(یعقوب علیہ السلام نے) کہا کہ مجھے تو اس کی بابت تمہارا بس ویسا ہی اعتبار ہے جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی کے بارے میں تھا^(۳) بس اللہ ہی بہترین حافظ ہے اور وہ سب مہربانوں سے بڑا مہربان ہے۔^(۴) (۶۴)

جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا تو اپنا سرمایہ موجود پایا جو ان کی جانب لوٹا دیا گیا تھا۔ کہنے لگے اے ہمارے باپ ہمیں اور کیا چاہیے۔^(۵) دیکھئے تو یہ ہمارا سرمایہ بھی ہمیں

يَعْرِفُونَهَا إِذْ انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَنَهُمُ الرَّجْعُونَ ﴿٦٢﴾

فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ
فَأَرْسِلْ مَعَنَا خَازِنًا لِّنُكَلِّلَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿٦٣﴾

قَالَ هَلْ أُسئَلُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا مَا آتَيْنَاكُمْ عَلَىٰ أَخْيَارٍ مِّنْ بَيْنِ
يَدَيْهِ خَيْرٌ حِفْظًا وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّحِيمِينَ ﴿٦٤﴾

وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ
قَالُوا يَا أَبَانَا مَا نَبْغِي هَذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا وَنَبْغِي

(۱) اس سے مراد وہ پونجی ہے جو غلہ خریدنے کے لیے برادران یوسف علیہ السلام ساتھ لائے تھے (حَالٌ کَبَاوے) سے مراد ان کا سامان ہے۔ پونجی، چپکے سے ان کے سامانوں میں اس لیے رکھوادی کہ ممکن ہے دوبارہ آنے کے لیے ان کے پاس مزید پونجی نہ ہو تو یہی پونجی لے کر آجائیں۔

(۲) مطلب یہ ہے کہ آئندہ کے لیے غلہ بنیامین کے بھیجنے کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر یہ ساتھ نہیں جائے گا تو غلہ نہیں ملے گا۔ اس لیے اسے ضرور ساتھ بھیجیں تاکہ ہمیں دوبارہ بھی اسی طرح غلہ مل سکے، جس طرح اس دفعہ ملا ہے۔ اور اس طرح کا اندیشہ نہ کریں جو یوسف علیہ السلام کو بھیجتے ہوئے کیا تھا، ہم اس کی حفاظت کریں گے۔

(۳) یعنی تم نے یوسف علیہ السلام کو بھی ساتھ لے جاتے وقت اسی طرح حفاظت کا وعدہ کیا تھا لیکن جو کچھ ہوا، وہ سامنے ہے۔ اب میں تمہارا کس طرح اعتبار کروں؟

(۴) تاہم چونکہ غلے کی ضرورت شدید تھی، اس لیے اندیشے کے باوجود بنیامین کو ساتھ بھیجنے سے انکار مناسب نہیں سمجھا اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اسے بھیجنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

(۵) یعنی بادشاہ کے اس حسن سلوک کے بعد، کہ اس نے ہماری خاطر تواضع بھی خوب کی اور ہماری پونجی بھی واپس کر دی، اور ہمیں کیا چاہیے؟

واپس لوٹا دیا گیا ہے۔ ہم اپنے خاندان کو رسد لادیں گے اور اپنے بھائی کی نگرانی رکھیں گے اور ایک اونٹ کے بوجھ کا غلہ زیادہ لائیں گے۔^(۱) یہ ناپ تو بہت آسان ہے۔^(۲) (۶۵)

یعقوب (علیہ السلام) نے کہا! میں تو اسے ہرگز ہرگز تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا جب تک کہ تم اللہ کو بیچ میں رکھ کر مجھے قول و قرار نہ دو کہ تم اسے میرے پاس پہنچا دو گے، سوائے اس ایک صورت کے کہ تم سب گرفتار کر لیے جاؤ۔^(۳) جب انہوں نے پکا قول و قرار دے دیا تو انہوں نے کہا کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں اللہ اس پر نگہبان ہے۔ (۶۶)

اور (یعقوب علیہ السلام) نے کہا اے میرے بچو! تم سب ایک دروازے سے نہ جانا بلکہ کئی جدا جدا دروازوں میں سے داخل ہونا۔^(۴) میں اللہ کی طرف سے آنے والی کسی

أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانًا وَنَزِدُ إِلَيْكُمُ الْبَيْتَ الَّذِي كُنْتُمْ فِيهِ ۝

قَالَ لَنْ أُرْسِلَكَ مَعَكُمْ حَتَّى تُؤْتُونِي مَوْثِقًا مِنَ اللَّهِ لَتَأْتُنَّنِي بِهِ إِلَّا أَنْ يُحَاطَبَكُمْ فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ نَفْسِي وَلَئِن لَّمْ يَأْتُواكُم مِّمَّنْ فِي الدُّنْيَا فَمَا يَأْتِكُم مِّنْ أَرْضٍ مَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ يَأْتِيَكُمُ الْبَيْتَ الَّذِي كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝

وَقَالَ يَبْنَئِي لَأَتَنَّ خُلُوفًا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ وَمَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ إِنَّ الْحَكْمَ لِلَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

(۱) کیونکہ فی کس ایک اونٹ جتنا بوجھ اٹھا سکتا تھا غلہ دیا جاتا تھا، بنیامین کی وجہ سے ایک اونٹ کے بوجھ بھر غلہ مزید ملتا۔
(۲) اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ بادشاہ کے لئے ایک بار شتر غلہ کوئی مشکل بات نہیں ہے، آسان ہے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ ذلک کا اشارہ اس غلے کی طرف ہے جو ساتھ لائے تھے اور یَسِيرًا بمعنی قَلِيلًا ہے۔ یعنی جو غلہ ہم ساتھ لائے ہیں، قلیل ہے، بنیامین کے ساتھ جانے سے ہمیں کچھ غلہ اور مل جائے گا تو اچھی ہی بات ہے، ہماری ضرورت زیادہ بہتر طریقے سے پوری ہو سکے گی۔

(۳) یعنی تمہیں اجتماعی مصیبت پیش آجائے یا تم سب ہلاک یا گرفتار ہو جاؤ، جس سے خلاصی پر تم قادر نہ ہو، تو اور بات ہے، اس صورت میں تم معذور ہو گے۔

(۴) جب بنیامین سمیت گیارہ بھائی مصر جانے لگے، تو یہ ہدایت دی، کیونکہ ایک ہی باپ کے گیارہ بیٹے جو قد و قامت اور شکل و صورت میں بھی ممتاز ہوں، جب اکٹھے ایک ہی جگہ یا ایک ساتھ کہیں سے گزریں تو عموماً انہیں لوگ تعجب یا حسد کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہی چیز نظر لگنے کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ انہیں نظرد سے بچانے کے لیے بطور تدبیر یہ حکم دیا۔ ”نظر کا لگ جانا حق ہے۔“ جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے بھی صحیح احادیث سے ثابت ہے مثلاً الْعَيْنُ حَقٌّ ”نظر کا لگ جانا حق ہے۔“ صحیح بخاری، کتاب الطب، باب العين حق۔ و صحیح مسلم، کتاب السلام، باب الطب والمرض والرقي، اور آپ ﷺ نے نظرد سے بچنے کے لیے دعائیہ کلمات بھی اپنی امت کو بتلائے ہیں۔ مثلاً فرمایا کہ

الْمَوْتُونَ ﴿۳۵﴾

چیز کو تم سے ٹال نہیں سکتا۔ حکم صرف اللہ ہی کا چلتا ہے۔^(۱) میرا کامل بھروسہ اسی پر ہے اور ہر ایک بھروسہ

کرنے والے کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ (۶۷)

جب وہ انہی راستوں سے جن کا حکم ان کے والد نے انہیں دیا تھا، گئے۔ کچھ نہ تھا کہ اللہ نے جو بات مقرر کر دی ہے وہ اس سے انہیں ذرا بھی بچالے۔ مگر یعقوب (علیہ السلام) کے دل میں ایک خیال (پیدا ہوا) جسے اس نے پورا کر لیا،^(۲) بلاشبہ وہ ہمارے سکھلائے ہوئے علم کا عالم تھا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔^(۳) (۶۸)

یہ سب جب یوسف کے پاس پہنچ گئے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس بٹھالیا اور کہا کہ میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں، پس یہ جو کچھ کرتے رہے اس کا کچھ رنج نہ کر۔^(۴) (۶۹)

وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ مَا كَانَ يُغَيِّبُ عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةٌ فِي نَفْسٍ يَعْقُوبَ قَضَاهَا وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۵﴾

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَمَنَّسْ بِمَا كَانُوا يَمْعَلُونَ ﴿۳۵﴾

جب تمہیں کوئی چیز اچھی لگے تو «بَارَكَ اللَّهُ» کہو۔ (موطا امام مالک، باب الوضوء من العين۔ تعلیقات مشکوٰۃ، البانی۔ نمبر ۱۳۸۶) جس کی نظر لگے، اس کو کہا جائے کہ غسل کرے اور اس کے غسل کا یہ پانی اس شخص کے سر اور جسم پر ڈالا جائے جس کو نظر لگی ہو، (حوالہ مذکور) اسی طرح ﴿ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ﴾ پڑھنا قرآن سے ثابت ہے، (سورہ کہف - ۳۹) ﴿ قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾ اور ﴿ قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴾ نظر کے لیے بطور دم پڑھنا چاہیے۔ (جامع

ترمذی ابواب الطب، باب ماجاء فی الرقیۃ بالمعوذتین)

(۱) یعنی یہ تاکید بطور ظاہری اسباب، احتیاط اور تدبیر کے ہے جسے اختیار کرنے کا انسانوں کو حکم دیا گیا ہے۔ تاہم اس سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر و قضا میں تبدیلی نہیں آسکتی، ہو گا وہی، جو اس کی قضا کے مطابق اس کا حکم ہو گا۔

(۲) یعنی اس تدبیر سے اللہ کی تقدیر کو ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔ تاہم حضرت یعقوب علیہ السلام کے جی میں جو (نظر بد لگ جانے کا) اندیشہ تھا، اس کے پیش نظر انہوں نے ایسا کہا۔

(۳) یعنی یہ تدبیر وحی الہی کی روشنی میں تھی اور یہ عقیدہ بھی کہ حذر (احتیاطی تدبیر) قدر کو نہیں بدل سکتی، اللہ تعالیٰ کے سکھلائے ہوئے علم پر مبنی تھا، جس سے اکثر لوگ بے بہرہ ہیں۔

(۴) بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دو دو آدمیوں کو ایک ایک کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ یوں بنیامین جب اکیلے رہ گئے تو یوسف علیہ السلام نے انہیں تنہا لگ ایک کمرے میں رکھا اور پھر خلوت میں ان سے باتیں کیں اور انہیں پچھلی باتیں بتلا کر کہا کہ ان بھائیوں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا، اس پر رنج نہ کرو اور بعض کہتے ہیں کہ بنیامین کو روکنے کے لیے جو حیلہ اختیار کرنا تھا، اس سے بھی انہیں آگاہ کر دیا تھا تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔ (ابن کثیر)

پھر جب انہیں ان کا سامان اسباب ٹھیک ٹھاک کر کے دیا تو اپنے بھائی کے اسباب میں پانی پینے کا پیالہ ^(۱) رکھ دیا۔ پھر ایک آواز دینے والے نے پکار کر کہا کہ اے قافلے ^(۲) والو! تم لوگ تو چور ہو۔ ^(۳) (۷۰)

انہوں نے ان کی طرف منہ پھیر کر کہا کہ تمہاری کیا چیز کھوئی گئی ہے؟ (۷۱)

جواب دیا کہ شاہی پیانہ گم ہے جو اسے لے آئے اسے ایک اونٹ کے بوجھ کا غلہ ملے گا۔ اس وعدے کا میں ضامن ہوں۔ ^(۴) (۷۲)

انہوں نے کہا اللہ کی قسم! تم کو خوب علم ہے کہ ہم ملک میں فساد پھیلانے کے لیے نہیں آئے اور نہ ہم چور ہیں۔ ^(۵) (۷۳)

انہوں نے کہا اچھا چور کی کیا سزا ہے اگر تم جھوٹے ہو؟ ^(۶) (۷۴)

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَّازِهِمْ جَعَلَ التَّيَّابِيَةَ فِي رَحْلِ
أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَتَتْهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسُرِقُونَ ۝

قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقَدُونَ ۝

قَالُوا نَفَقْدُ صُوعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ
بَعِيرٍ وَأَنَّىٰ يُرْزَعُهُ ۝

قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا جِئْنَا لِنَفِيسَ فِي الْأَرْضِ وَمَا
كُنَّا سُرِقِينَ ۝

قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ لَئِن كُنْتُمْ كٰذِبِينَ ۝

(۱) مفسرین نے بیان کیا ہے کہ یہ سقاہ (پانی پینے کا برتن) سونے یا چاندی کا تھا پانی پینے کے علاوہ غلہ نانپنے کا کام بھی اس سے لیا جاتا تھا۔ اسے چپکے سے بیانیں کے سامان میں رکھ دیا گیا۔

(۲) اَلْعِير اصلاً ان اونٹوں، گدھوں یا خچروں کو کہا جاتا ہے جن پر غلہ لاد کر لے جایا جاتا ہے۔ یہاں مراد اصحاب العیر یعنی قافلے والے ہیں۔

(۳) چوری کی یہ نسبت اپنی جگہ صحیح تھی کیونکہ منادی حضرت یوسف علیہ السلام کے اس سوچے سمجھے منصوبے سے آگاہ نہیں تھا یا اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارا حال تو چوروں کا سا ہے کہ بادشاہ کا پیالہ، بادشاہ کی رضامندی کے بغیر تمہارے سامان کے اندر ہے۔

(۴) یعنی میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ تفتیش سے قبل ہی جو شخص یہ جام شاہی ہمارے حوالے کر دے گا تو اسے انعام یا اجرت کے طور پر اتنا غلہ دیا جائے گا جو ایک اونٹ اٹھا سکے۔

(۵) برادران یوسف علیہ السلام چونکہ اس منصوبے سے بے خبر تھے جو حضرت یوسف علیہ السلام نے تیار کیا تھا اس لیے قسم کھا کر انہوں نے اپنے چور ہونے کی اور زمین میں فساد برپا کرنے کی نفی کی۔

(۶) یعنی اگر تمہارے سامان میں وہ شاہی پیالہ مل گیا تو پھر اس کی کیا سزا ہوگی؟

جواب دیا کہ اس کی سزا یہی ہے کہ جس کے اسباب میں سے پایا جائے وہی اس کا بدلہ ہے۔^(۱) ہم تو ایسے ظالموں کو یہی سزا دیا کرتے ہیں۔^(۲) (۷۵)

پس یوسف نے ان کے سامان کی تلاش شروع کی، اپنے بھائی کے سامان کی تلاشی سے پہلے، پھر اس پیمانہ کو اپنے بھائی کے سامان (زنہیل) سے نکالا۔^(۳) ہم نے یوسف کے لیے اسی طرح یہ تدبیر کی۔^(۴) اس بادشاہ کے قانون کی رو سے یہ اپنے بھائی کو نہ لے سکتا تھا^(۵) مگر یہ کہ اللہ کو منظور ہو۔ ہم جس کے چاہیں درجے بلند کر دیں،^(۶) ہر ذی علم پر فوقیت رکھنے والا دوسرا ذی علم موجود ہے۔^(۷) (۷۶)

انہوں نے کہا کہ اگر اس نے چوری کی (تو کوئی تعجب کی بات نہیں) اس کا بھائی بھی پہلے چوری کر چکا ہے۔^(۸)

قَالُوا جَزَاءُ مَنْ وَجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ كَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٧٥﴾

فَبَدَأَ بِأَوْعِيَّتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ آخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ آخِيهِ كَذَلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ تَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَن تَشَاءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلَيْهِ ﴿٧٦﴾

قَالُوا إِنْ يَسِرَّنَّ قَدَمًا سَرَقَ أَخْرَأْنَاهُ مِنْ قَبْلِ قَاتَلْنَا مَا يُؤَسِّفُ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ قَالَ أَنْتُمْ شَرُّ مَكِيدِينَ

(۱) یعنی چور کو کچھ عرصے کے لیے اس شخص کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ جس کی اس نے چوری کی ہوتی تھی۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں سزا تھی، جس کے مطابق یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے یہ سزا تجویز کی۔

(۲) یہ قول بھی برادران یوسف علیہ السلام ہی کا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ یوسف علیہ السلام کے مصاحبین کا قول ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم بھی ظالموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ لیکن آیت کا اگلا ٹکڑا کہ ”بادشاہ کے دین میں وہ اپنے بھائی کو پکڑ نہ سکتے تھے“ اس قول کی نفی کرتا ہے۔

(۳) پہلے بھائیوں کے سامان کی تلاشی کی، آخر میں بنیامین کا سامان دیکھا تاکہ انہیں شبہ نہ ہو کہ یہ کوئی سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ (۴) یعنی ہم نے وحی کے ذریعے سے یوسف علیہ السلام کو یہ تدبیر سمجھائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی صحیح غرض کے لیے ایسا طریقہ اختیار کرنا جس کی ظاہری صورت حیلہ اور کید کی ہو، جائز ہے بشرطیکہ وہ طریقہ کسی نص شرعی کے خلاف نہ ہو۔ (فتح القدر)

(۵) یعنی بادشاہ کا مصر میں جو قانون اور دستور رائج تھا، اس کی رو سے بنیامین کو اس طرح روکنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے اہل قافلہ سے ہی پوچھا کہ بتلاؤ! اس جرم کی کیا سزا ہو؟

(۶) جس طرح یوسف علیہ السلام کو اپنی عنایات اور مہربانیوں سے بلند مرتبہ عطا کیا۔

(۷) یعنی ہر عالم سے بڑھ کر کوئی نہ کوئی عالم ہوتا ہے اس لیے کوئی صاحب علم اس دھوکے میں مبتلا نہ ہو کہ میں ہی اپنے وقت کا سب سے بڑا عالم ہوں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر صاحب علم کے اوپر ایک علیم یعنی اللہ تعالیٰ ہے۔

(۸) یہ انہوں نے اپنی پاکیزگی و شرافت کے انظار کے لیے کہا۔ کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین، ان کے گئے

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا نَصِفُونَ ﴿۷۷﴾

یوسف (علیہ السلام) نے اس بات کو اپنے دل میں رکھ لیا اور ان کے سامنے بالکل ظاہر نہ کیا۔ کہا کہ تم بدتر جگہ میں ہو،^(۱) اور جو تم بیان کرتے ہو اسے اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ (۷۷)

انہوں نے کہا کہ اے عزیز مصر! اس کے والد بہت بڑی عمر کے بالکل بوڑھے شخص ہیں۔ آپ اس کے بدلے ہم میں سے کسی کو لے لیجئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ بڑے نیک نفس ہیں۔^(۲) (۷۸)

یوسف (علیہ السلام) نے کہ ہم نے جس کے پاس اپنی چیز پائی ہے اس کے سوا دوسرے کی گرفتاری کرنے سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں، ایسا کرنے سے تو ہم یقیناً ناانصافی کرنے والے ہو جائیں گے۔^(۳) (۷۹)

جب یہ اس سے مایوس ہو گئے تو تہائی میں بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے۔^(۵) ان میں جو سب سے بڑا تھا اس نے کہا

قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ آبَاءً شَبِيحًا كَيْبَرًا فَخُذْ أَحَدًا مَا مَكَانَهُ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۷۸﴾

قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ أَنْ نَأْخُذَ إِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعًا عِنْدَهُ إِتْرَادًا أَكْثَرًا ﴿۷۹﴾

فَلَمَّا اسْتَمْتَعُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا قَالَ كَبِيرُهُمْ

اور حقیقی بھائی نہیں تھے، علاقائی بھائی تھے۔ بعض مفسرین نے یوسف علیہ السلام کی چوری کے لیے دور از کار باتیں نقل کی ہیں جو کسی مستند ماخذ پر مبنی نہیں ہیں۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے کو تو نہایت بااخلاق اور باکردار باور کرایا اور یوسف علیہ السلام اور بنیامین کو کمزور کردار کا اور دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے، انہیں چور اور بے ایمان ثابت کرنے کی کوشش کی۔

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یوسف علیہ السلام کی طرف چوری کے انتساب میں صریح کذب بیانی کا ارتکاب کیا۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر اس لیے کہا کہ اس وقت اصل اختیارات حضرت یوسف علیہ السلام ہی کے پاس تھے، بادشاہ صرف برائے نام ہی فرماں روائے مصر تھا۔

(۳) باپ تو یقیناً بوڑھے ہی تھے، لیکن یہاں ان کا اصل مقصد بنیامین کو چھڑانا تھا۔ ان کے ذہن میں وہی یوسف علیہ السلام والی بات تھی کہ کہیں ہمیں پھر دوبارہ بنیامین کے بغیر باپ کے پاس نہ جانا پڑے اور باپ ہم سے کہیں کہ تم نے میرے بنیامین کو بھی یوسف علیہ السلام کی طرح کہیں گم کر دیا۔ اس لیے یوسف علیہ السلام کے احسانات کے حوالے سے یہ بات کی کہ شاید وہ یہ احسان بھی کر دیں کہ بنیامین کو تو چھوڑ دیں اور اس کی جگہ کسی اور بھائی کو رکھ لیں۔

(۴) یہ جواب اس لیے دیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا اصل مقصد تو بنیامین ہی کو روکنا تھا۔

(۵) کیونکہ بنیامین کو چھوڑ کر جانا ان کے لیے نہایت کٹھن مرحلہ تھا، وہ باپ کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے تھے۔ اس

تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے والد نے تم سے اللہ کی قسم لے کر پختہ قول قرار لیا ہے اور اس سے پہلے یوسف کے بارے میں تم کو تاہی کر چکے ہو۔ پس میں تو اس سرزمین سے نہ ٹلوں گا جب تک کہ والد صاحب خود مجھے اجازت نہ دیں ^(۱) یا اللہ تعالیٰ میرے اس معاملے کا فیصلہ کر دے، وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ ^(۲) (۸۰)

تم سب والد صاحب کی خدمت میں واپس جاؤ اور کہو کہ اباجی! آپ کے صاحبزادے نے چوری کی اور ہم نے وہی گواہی دی تھی جو ہم جانتے تھے۔ ^(۳) ہم کچھ غیب کی حفاظت کرنے والے نہ تھے۔ ^(۴) (۸۱)

آپ اس شر کے لوگوں سے دریافت فرمائیں جہاں ہم تھے اور اس قافلہ سے بھی پوچھ لیں جس کے ساتھ ہم آئے ہیں، اور یقیناً ہم بالکل سچے ہیں۔ ^(۵) (۸۲)

أَلَمْ نَعْلَمْوَأَنَّ أَبَاكُمْ قَدْ أَخَذَ عَلَيْكَ مَوْثِقًا مِنَ اللَّهِ وَمَنْ قَبْلَ مَا قَوَّطْتُمْ فِي يُوسُفَ قَدْ لَبَّيْنَا مِنَ الْأَرْضِ حَتَّىٰ يَأْتِيَٰنَا بِآيَاتِنَا أَوْ يَحْكُمَنَّ اللَّهُ لِي وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ۝

إِرْجِعُوا إِلَىٰ آبَائِكُمْ فَقُولُوا يَا أَبَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلَّمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حَافِظِينَ ۝

وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعَجْرَةَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝

لیے یا ہم مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کیا جائے؟

(۱) اس بڑے بھائی نے اس صورت حال میں باپ کا سامنے کرنے کی اپنے اندر سکت اور بہت نہیں پائی، تو صاف کہہ دیا کہ میں تو یہاں سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک خود والد صاحب تفتیش کر کے میری بے گناہی کا یقین نہ کر لیں اور مجھے آنے کی اجازت نہ دیں۔

(۲) اللہ میرے لیے معاملہ فیصلہ کر دے۔ کا مطلب یہ ہے کہ کسی طرح یوسف علیہ السلام (عزیز مصر) بنیامین کو چھوڑ دے اور میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دے، یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اتنی قوت عطا کر دے کہ میں بنیامین کو تلوار یعنی طاقت کے ذریعے سے چھڑوا کر اپنے ساتھ لے جاؤں۔

(۳) یعنی ہم نے جو عہد کیا تھا کہ ہم بنیامین کو بہ حفاظت واپس لے آئیں گے، تو یہ ہم نے اپنے علم کے مطابق عہد کیا تھا، بعد میں جو واقعہ پیش آ گیا اور جس کی وجہ سے بنیامین کو ہمیں چھوڑنا پڑا، یہ تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم نے چوری کی جو سزا بیان کی تھی کہ چور کو یہی چوری کے بدلے میں رکھ لیا جائے، تو یہ سزا ہم نے اپنے علم کے مطابق ہی تجویز کی تھی، اس میں کسی قسم کی بدینتی شامل نہیں تھی۔ لیکن پھر یہ اتفاق کی بات تھی کہ جب سامان کی تلاشی لی گئی تو مسروقہ کٹورا بنیامین کے سامان سے نکل آیا۔

(۴) یعنی مستقبل میں پیش آنے والے واقعات سے ہم بے خبر تھے۔

(۵) الْقَرْيَةَ سے مراد مصر ہے، جہاں وہ غلہ لینے گئے تھے، مطلب اہل مصر ہیں۔ اسی طرح وَالْعَجْرَةَ مراد اصحاب العیر یعنی

یعقوب علیہ السلام نے) کہا یہ تو نہیں، بلکہ تم نے اپنی طرف سے بات بنالی،^(۱) پس اب صبر ہی بہتر ہے۔ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو میرے پاس ہی پہنچا دے۔^(۲) وہ ہی علم و حکمت والا ہے۔ (۸۳)

پھر ان سے منہ پھیر لیا اور کہا ہائے یوسف! ان کی آنکھیں بوجہ رنج و غم کے سفید ہو چکی تھیں^(۳) اور وہ غم کو دہائے ہوئے تھے۔ (۸۴)

بیٹوں نے کہا واللہ! آپ ہمیشہ یوسف کی یاد ہی میں لگے رہیں گے یہاں تک کہ گھل جائیں یا ختم ہی ہو جائیں۔^(۵) (۸۵) انہوں نے کہا کہ میں تو اپنی پریشانیوں اور رنج کی فریاد اللہ ہی سے کر رہا ہوں، مجھے اللہ کی طرف سے وہ باتیں

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبِرُوا بِهِ صَبِيرَةً
عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ
الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۸۳﴾

وَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسْفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ وَإِذْ بَصَّطْتِ
عَيْنَهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ﴿۸۴﴾

قَالُوا تَاللَّهِ تَفَسَّوْنَا أَتَىٰ كُرُيُوسُفَ حَتَّىٰ تَكُونَ حَرَضًا
أَوْ تَكُونَ مِنَ الْهَالِكِينَ ﴿۸۵﴾
قَالَ إِنَّمَا أَشْكُوا بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ وَأَعْلَمُ مِنَ
اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۸۶﴾

اہل قافلہ ہیں۔ آپ مصر جا کر اہل مصر سے اور اس قافلے والوں سے، جو ہمارے ساتھ آیا ہے، پوچھ لیں کہ ہم جو کچھ بیان کر رہے ہیں، وہ سچ ہے، اس میں جھوٹ کی کوئی آمیزش نہیں ہے۔

(۱) حضرت یعقوب علیہ السلام چونکہ حقیقت حال سے بے خبر تھے اور اللہ تعالیٰ نے بھی وحی کے ذریعے سے انہیں حقیقت واقعہ سے آگاہ نہیں فرمایا۔ اس لیے وہ یہی سمجھے کہ میرے ان بیٹوں نے جس طرح اس سے قبل یوسف علیہ السلام کے معاملے میں اپنی طرف سے بات گھڑ کر بیان کی تھی، اب پھر اسی طرح انہوں نے اپنی طرف سے بات بنالی ہے۔ بنیامین کے ساتھ انہوں نے کیا معاملہ کیا ہے؟ اس کا یقینی علم تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس نہیں تھا، تاہم یوسف علیہ السلام کے واقعے پر قیاس کرتے ہوئے ان کی طرف سے حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل میں بجا طور پر شکوک و شبہات تھے۔

(۲) اب پھر سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں تھا، تاہم صبر کے ساتھ امید کا دامن بھی نہیں چھوڑا، جیسا سے مراد یوسف علیہ السلام، بنیامین اور وہ بڑا بیٹا ہے جو مارے شرم کے وہیں مصر میں رک گیا تھا کہ یا تو والد صاحب مجھے اسی طرح آنے کی اجازت دے دیں یا پھر میں کسی طریقے سے بنیامین کو ساتھ لے کر آؤں گا۔

(۳) یعنی اس تازہ صدمے نے یوسف علیہ السلام کی جدائی کے قدیم صدمے کو بھی تازہ کر دیا۔

(۴) یعنی آنکھوں کی سیاہی، مارے غم کے، سفیدی میں بدل گئی تھی۔

(۵) حَرَضٌ اس جسمانی عارضے یا ضعف عقل کو کہتے ہیں جو بڑھاپے، عشق یا پے درپے صدمات کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتا ہے، یوسف علیہ السلام کے ذکر سے بھائیوں کی آتش حسد پھر بھڑک اٹھی، اور اپنے باپ کو یہ کہا۔

معلوم ہیں جو تم نہیں جانتے۔^(۱) (۸۶)

میرے پیارے بچو! تم جاؤ اور یوسف (علیہ السلام) کی اور اس کے بھائی کی پوری طرح تلاش کرو^(۲) اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ یقیناً رب کی رحمت سے ناامید وہی ہوتے ہیں جو کافر ہوتے ہیں۔^(۳) (۸۷)

پھر جب یہ لوگ یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے^(۴) تو کہنے لگے کہ اے عزیز! ہم کو اور ہمارے خاندان کو دکھ پہنچا ہے۔^(۵) ہم حقیر پونجی لائے ہیں پس آپ ہمیں پورے غلہ کا ناپ دیجئے^(۶) اور ہم پر خیرات کیجئے،^(۷) اللہ تعالیٰ خیرات کرنے والوں کو بدلہ دیتا ہے۔ (۸۸)

یوسف نے کہا جانتے بھی ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ اپنی نادانی کی حالت میں کیا کیا؟^(۸) (۸۹)

يَبْتِي اذْهَبُوا فَتَحَسُّوا مِنْ يُوْسُفَ وَآخِيهِ وَلَا تَاْتِيُوْا
مِنْ دُوْرِ اللهِ اِنَّهٗ لَا يَأْتِيْشُ مِنْ دُوْرِ اللهِ اِلَّا الْقَوْمُ
الْكَافِرُوْنَ ۝

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يَا اَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاهْلَنَا
الضَّرُّ وَجِئْنَا بِضَاعَةٍ مُّزْجَجَةٍ قَاوِي لَنَا الْكَيْلَ
وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ۝

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَآخِيهِ
اِذْ اَنْتُمْ جَاهِلُوْنَ ۝

(۱) اس سے مراد یہ تو وہ خواب ہے جس کی بابت انیس یقین تھا کہ اس کی تعبیر ضرور سامنے آئے گی اور وہ یوسف علیہ السلام کو سجدہ کریں گے یا ان کا یہ یقین تھا کہ یوسف علیہ السلام زندہ موجود ہیں اور اس سے زندگی میں ضرور ملاقات ہوگی۔

(۲) چنانچہ اسی یقین سے سرشار ہو کر انہوں نے اپنے بیٹوں کو یہ حکم دیا۔

(۳) جس طرح دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَمَنْ يَّقْنُظْ مِنْ ذِمَّةِ رَبِّهٖ اِلَّا الصَّالُوْنَ﴾ (الحجر: ۵۰) ”مگر وہ لوگ ہی اللہ کی رحمت سے ناامید ہوتے ہیں“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کو سخت سے سخت حالات میں بھی صبر و رضا کا اور اللہ کی رحمت و اسامیہ کی امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔

(۴) یہ تیسری مرتبہ ان کا مصر جانا ہے۔

(۵) یعنی غلہ لینے کے لیے ہم جو شمن (قیمت) لے کر آئے ہیں، وہ نہایت قلیل اور حقیر ہے۔

(۶) یعنی ہماری حقیر پونجی کو نہ دیکھیں، ہمیں اس کے بدلے میں پورا ناپ دیں۔

(۷) یعنی ہماری حقیر پونجی قبول کر کے ہم پر احسان اور خیرات کریں۔ اور بعض مفسرین نے اس کے معنی کیے ہیں کہ ہمارے بھائی بنیامین کو آزاد کر کے ہم پر احسان فرمائیں۔

(۸) جب انہوں نے نہایت عاجزی کے انداز میں صدقہ و خیرات یا بھائی کی رہائی کی اپیل کی تو ساتھ ہی باپ کے بردہ پاپے، ضعف اور بیٹے کی جدائی کے صدمے کا بھی ذکر کیا، جس سے یوسف علیہ السلام کا دل بھر آیا، آنکھیں نمناک ہو گئیں اور انکشاف حال پر مجبور ہو گئے۔ تاہم بھائیوں کی زیادتیوں کے ذکر کے ساتھ ہی اخلاق کریمانہ کا بھی اظہار فرمادیا کہ یہ کام تم نے ایسی حالت میں کیا جب تم جاہل اور نادان تھے۔

انہوں نے کہا کیا (واقعی) تو ہی یوسف (علیہ السلام) ہے۔^(۱) جواب دیا کہ ہاں میں یوسف (علیہ السلام) ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر فضل و کرم کیا۔ بات یہ ہے کہ جو بھی پرہیزگاری اور صبر کرے تو اللہ تعالیٰ کسی نیکو کار کا اجر ضائع نہیں کرتا۔^(۲) (۹۰)

انہوں نے کہا اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے تجھے ہم پر برتری دی ہے اور یہ بھی بالکل سچ ہے کہ ہم خطا کرتے تھے۔^(۳) (۹۱) جواب دیا آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔^(۴) اللہ تمہیں بخشے، وہ سب مہربانوں سے بڑا مہربان ہے۔ (۹۲)

میرا یہ کرتا تم لے جاؤ اور اسے میرے والد کے منہ پر ڈال دو کہ وہ دیکھنے لگیں،^(۵) اور آجائیں اور اپنے تمام

قَالُوا إِنَّكَ لَمِنَ الْيُوسُفِ قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَذَا أَخِي قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَكُضِيئُهُمْ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۹۰﴾

قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ اشْرَكَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَإِنْ كُنَّا لَخٰطِبِينَ ﴿۹۱﴾

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿۹۲﴾

إِذْ هَبُوا بَقِيْعِيْ هَذَا فَالْقُوْهُ عَلَىٰ وَجْهِ اِيْنِ يٰٓأَيُّهَا بَصِيْرًا ۗ وَاتَّوْبُوْا يٰٓأَهْلِيْكُمْ اٰجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾

(۱) بھائیوں نے جب عزیز مصر کی زبان سے اس یوسف علیہ السلام کا تذکرہ سنا، جسے انہوں نے بچپن میں کنعان کے ایک تاریک کنویں میں پھینک دیا تھا، تو وہ حیران بھی ہوئے اور غور سے دیکھنے پر مجبور بھی کہ کہیں ہم سے ہم کلام بادشاہ، یوسف علیہ السلام ہی تو نہیں؟ ورنہ یوسف علیہ السلام کے قصے کا اسے کس طرح علم ہو سکتا ہے؟ چنانچہ انہوں نے سوال کیا کہ کیا تو یوسف علیہ السلام ہی تو نہیں؟

(۲) سوال کے جواب میں اقرار و اعتراف کے ساتھ، اللہ کے احسان کا ذکر اور صبر و تقویٰ کے نتائج حسنہ بھی بیان کر کے بتلادیا کہ تم نے تو مجھے ہلاک کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ کنویں سے نجات عطا فرمائی، بلکہ مصر کی فرماں روئی بھی عطا فرمادی اور یہ نتیجہ ہے اس صبر اور تقویٰ کا جس کی توفیق اللہ تعالیٰ نے مجھے دی۔

(۳) بھائیوں نے جب یوسف علیہ السلام کی یہ شان دیکھی تو اپنی غلطی اور کوتاہی کا اعتراف کر لیا۔

(۴) حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی پیغمبرانہ عفو و درگزر سے کام لیتے ہوئے فرمادیا کہ جو ہوا، سو ہوا۔ آج تمہیں کوئی سرزنش اور ملامت نہیں کی جائے گی۔ فتح مکہ والے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مکہ کے ان کفار اور سرداران قریش کو، جو آپ کے خون کے پیاسے تھے اور آپ کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی تھیں، یہی الفاظ ارشاد فرما کر انہیں معاف فرمادیا تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۵) قیص کے چہرے پر پڑنے سے آنکھوں کی بینائی کا بحال ہونا، ایک اعجاز اور کرامت کے طور پر تھا۔

خاندان کو میرے پاس لے آؤ۔^(۱) (۹۳)
 جب یہ قافلہ جدا ہوا تو ان کے والد نے کہا کہ مجھے تو
 یوسف کی خوشبو آ رہی ہے اگر تم مجھے سٹھیایا ہوا قرار نہ
 دو۔^(۲) (۹۴)
 وہ کہنے لگے کہ واللہ آپ اپنے اسی پرانے خبط^(۳) میں
 مبتلا ہیں۔ (۹۵)

جب خوشخبری دینے والے نے پہنچ کر ان کے منہ پر وہ
 کرتا ڈالا اسی وقت وہ پھر سے بیٹا ہو گئے۔^(۴) کہا! کیا میں تم
 سے نہ کہا کرتا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا
 ہوں جو تم نہیں جانتے۔^(۵) (۹۶)

انہوں نے کہا ابا جی! آپ ہمارے لیے گناہوں کی بخشش
 طلب کیجئے بیشک ہم قصور وار ہیں۔ (۹۷)
 کہا اچھا میں جلد ہی تمہارے لیے اپنے پروردگار سے
 بخشش مانگوں گا،^(۶) وہ بہت بڑا بخشنے والا اور نہایت مہربانی

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ
 يُوسُفَ لَوْلَا أَن تَقْدِرُونَ ﴿۹۳﴾

قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَعْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا ضَالِّينَ ﴿۹۴﴾

فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْفَهُ عَلَى وَجْهِهِ فَاتَتْكَ بَصِيرًا
 قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۹۵﴾

قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَعْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا ضَالِّينَ ﴿۹۶﴾

قَالَ سَوْفَ اسْتَعْفِرُ لَكُمْ رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۹۷﴾

(۱) یہ یوسف علیہ السلام نے اپنے پورے خاندان کو مصر آنے کی دعوت دی۔

(۲) ادھر یہ قیص لے کر قافلہ مصر سے چلا اور ادھر حضرت یعقوب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعجاز کے طور پر
 حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو آنے لگ گئی۔ یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اللہ کے پیغمبر کو بھی؛ جب تک اللہ تعالیٰ
 کی طرف سے اطلاع نہ پہنچے، پیغمبر بے خبر ہوتا ہے؛ چاہے بیٹا اپنے شہر کے کسی کنویں ہی میں کیوں نہ ہو؟ اور جب اللہ
 انتظام فرمادے تو پھر مصر جیسے دور دراز کے علاقے سے بھی بیٹے کی خوشبو آجاتی ہے۔

(۳) ضلّال سے مراد؛ دالمانہ محبت کی وہ وارفتگی ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے بیٹے یوسف علیہ السلام کے
 ساتھ تھی۔ بیٹے کہنے لگے؛ ابھی تک آپ اسی پرانی غلطی یعنی یوسف علیہ السلام کی محبت میں گرفتار ہیں۔ اتنا طویل عرصہ
 گزر جانے کے باوجود یوسف علیہ السلام کی محبت دل سے نہیں گئی۔

(۴) یعنی جب وہ خوش خبری دینے والا آیا اور آکر وہ قیص حضرت یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈال دی؛ تو اس سے
 معجزانہ طور پر ان کی بینائی بحال ہو گئی۔

(۵) کیونکہ میرے پاس ایک ذریعہ علم وحی بھی ہے جو تم میں سے کسی کے پاس نہیں ہے۔ اس وحی کے ذریعے سے اللہ
 تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو حالات سے حسب مشیت و مصلحت آگاہ کرتا رہتا ہے۔

(۶) فی الفور مغفرت کی دعا کرنے کے بجائے دعا کرنے کا وعدہ فرمایا؛ مقصد یہ تھا کہ رات کے پچھلے پہر میں؛ جو اللہ کے

کرنے والا ہے۔ (۹۸)

جب یہ سارا گھرانہ یوسف کے پاس پہنچ گیا تو یوسف نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی^(۱) اور کہا کہ اللہ کو منظور ہے تو آپ سب امن و امان کے ساتھ مصر میں آؤ۔ (۹۹)

اور اپنے تخت پر اپنے ماں باپ^(۲) کو اونچا بٹھایا اور سب اس کے سامنے سجدے میں گر گئے۔^(۳) تب کہا کہ اباجی! یہ میرے پہلے کے خواب کی تعبیر ہے^(۴) میرے رب نے اسے سچا کر دکھایا، اس نے میرے ساتھ بڑا احسان کیا جب کہ مجھے جیل خانے سے نکالا^(۵) اور آپ لوگوں کو صحرا سے لے آیا^(۶) اس اختلاف کے بعد جو شیطان نے

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَدَّى إِلَيْهِمْ وَوَقَالَ ادْخُلُوا
مَعْرَلَنَا إِنَّمَا أَسَاءْتُ إِلَيْكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَتَذَكَّرُ أُولَٰئِكَ

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا ۖ وَقَالَ
يَأَيُّتُ هَذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلْتُ رَبِّي
حَقًّا وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ
بِكُمُ مِنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ أَنْ نَزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي
وَبَيْنَ إِخْوَتِي ۚ إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِمَا يَشَاءُ إِنَّهُ هُوَ

خاص بندوں کا اللہ کی عبادت کرنے کا خاص وقت ہوتا ہے، اللہ سے ان کی مغفرت کی دعا کروں گا۔ دوسری بات یہ کہ بھائیوں کی زیادتی یوسف علیہ السلام پر تھی۔ ان سے مشورہ لینا ضروری تھا۔ اس لئے انہوں نے تاخیر کی اور فوراً مغفرت کی دعائیں کی۔

(۱) یعنی عزت و احترام کے ساتھ انہیں اپنے پاس جگہ دی اور ان کا خوب اکرام کیا۔

(۲) بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ سوتیلی ماں اور سگی خالہ تھیں کیونکہ یوسف علیہ السلام کی حقیقی ماں بنیامین کی ولادت کے بعد فوت ہو گئی تھیں، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کی وفات کے بعد اس کی ہمشیرہ سے نکاح کر لیا تھا۔ یہی خالہ اب حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ مصر گئی تھیں (فتح القدير) لیکن امام ابن جریر طبری نے اس کے برعکس یہ کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی والدہ فوت نہیں ہوئی تھیں اور وہی حقیقی والدہ ساتھ تھیں۔ (ابن کثیر)

(۳) بعض نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ ادب و تعظیم کے طور پر یوسف علیہ السلام کے سامنے جھک گئے۔ لیکن ﴿ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا ﴾ کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ وہ زمین پر یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہوئے۔ یعنی یہ سجدہ، سجدہ ہی کے معنی میں ہے۔ تاہم یہ سجدہ، سجدہ تعظیمی ہے سجدہ عبادت نہیں اور سجدہ تعظیمی حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں جائز تھا۔ اسلام میں شرک کے سدباب کے لیے سجدہ تعظیمی کو بھی حرام کر دیا گیا ہے اور اب سجدہ تعظیمی بھی کسی کے لیے جائز نہیں۔

(۴) یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے جو خواب دیکھا تھا۔ اتنی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد بالآخر اس کی یہ تعبیر سامنے آئی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو تخت شاہی پر بٹھایا اور والدین سمیت تمام بھائیوں نے انہیں سجدہ کیا۔

(۵) اللہ کے احسانات میں کنویں سے نکلنے کا ذکر نہیں کیا تاکہ بھائی شرمندہ نہ ہوں۔ یہ اخلاق نبوی ہے۔

(۶) مصر جیسے متمدن علاقے کے مقابلے میں کنعان کی حیثیت ایک صحرا کی تھی، اس لیے اسے بدؤ سے تعبیر کیا۔

الْعَلِيمِ الْحَكِيمِ ۝

مجھ میں اور میرے بھائیوں میں ڈال دیا تھا۔^(۱) میرا رب جو چاہے اس کے لیے بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔ اور وہ بہت علم و حکمت والا ہے۔ (۱۰۰)

اے میرے پروردگار! تو نے مجھے ملک عطا فرمایا^(۲) اور تو نے مجھے خواب کی تعبیر سکھائی۔^(۳) اے آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا و آخرت میں میرا ولی (دوست) اور کارساز ہے، تو مجھے اسلام کی حالت میں فوت کر اور نیکیوں میں ملا دے۔^(۴) (۱۰۱)

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں۔ آپ ان کے پاس نہ تھے جب کہ انہوں نے اپنی بات ٹھان لی تھی اور وہ فریب کرنے لگے تھے۔^(۵) (۱۰۲)

رَبِّ قَدَانْتَبَيْتِي مِنَ الْمَلِكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ
الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنْتَ وَرَبِّي الدُّنْيَا
وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحَقْنِي بِالصَّالِحِينَ ۝

ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ
كُدِّيهِمْ إِيَّاجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ ۝

(۱) یہ بھی اخلاق کریمانہ کا ایک نمونہ ہے کہ بھائیوں کو ذرا مورد الزام نہیں ٹھہرایا اور شیطان کو اس کا رستنی کا باعث قرار دیا۔

(۲) یعنی ملک مصر کی فرمانروائی عطا فرمائی، جیسا کہ تفصیل گزری۔

(۳) حضرت یوسف علیہ السلام اللہ کے پیغمبر تھے، جن پر اللہ کی طرف سے وحی کا نزول ہوتا اور خاص خاص باتوں کا علم انہیں عطا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس علم نبوت کی روشنی میں پیغمبر خوابوں کی تعبیر بھی صحیح طور پر کر لیتے تھے، تاہم معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اس فن تعبیر میں خصوصی ملکہ حاصل تھا، جیسا کہ قید کے ساتھیوں کے خواب کی اور سات موٹی گایوں کے خواب کی تعبیر پہلے گزری۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام پر جو احسانات کیے، انہیں یاد کر کے اور اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات کا تذکرہ کر کے دعا فرما رہے ہیں کہ جب مجھے موت آئے تو اسلام کی حالت میں آئے اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔ اس سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے آبا و اجداد، حضرت ابراہیم و اسحاق علیہما السلام وغیرہ مراد ہیں۔ بعض لوگوں کو اس دعا سے یہ شبہ پیدا ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے موت کی دعا مانگی۔ حالانکہ یہ موت کی دعا نہیں ہے، آخر وقت تک اسلام پر استقامت کی دعا ہے۔

(۵) یعنی یوسف علیہ السلام کے ساتھ، جب کہ انہیں کنویں میں پھینک آئے یا مراد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں یعنی ان کو یہ کہہ کر کہ یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا کھا گیا ہے اور یہ اس کی قمیص ہے، جو خون میں لت پت ہے۔ ان کے ساتھ فریب کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر بھی اس بات کی نفی فرمائی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کا علم تھا۔ لیکن یہ نفی مطلق علم کی نہیں ہے کیونکہ اللہ نے وحی کے ذریعے سے آپ کو آگاہ فرمایا۔ یہ نفی مشاہدے کی ہے کہ اس

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رُسُلٍ إِلَّا مِثْلَ مَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا نَجْمِ الْعَالَمِينَ ۝۵۰

گو آپ لاکھ چاہیں لیکن اکثر لوگ ایمان دار نہ ہوں گے۔^(۱) (۱۰۳)

آپ ان سے اس پر کوئی اجرت طلب نہیں کر رہے ہیں۔^(۲) یہ تو تمام دنیا کے لیے نری نصیحت ہی نصیحت ہے۔^(۳) (۱۰۳)

آسمانوں اور زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ جن سے یہ منہ موڑے گزر جاتے ہیں۔^(۴) (۱۰۵)
ان میں سے اکثر لوگ باوجود اللہ پر ایمان رکھنے کے بھی مشرک ہی ہیں۔^(۵) (۱۰۶)

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلٍ إِلَّا يَأْتِيهِمْ آيَاتُنَا وَمَا يَحْتَشِرُونَ ۝۵۱

وَمَا يَحْتَشِرُونَ ۝۵۱

وَمَا يَحْتَشِرُونَ ۝۵۱

وقت آپ وہاں موجود نہیں تھے۔ اسی طرح ایسے لوگوں سے بھی آپ کا رابطہ و تعلق نہیں رہا ہے جن سے آپ نے سنا ہو۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے آپ کو اس واقعہ غیب کی خبر دی ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اللہ کے سچے نبی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اور بھی کئی مقامات پر اسی طرح علم غیب اور مشاہدے کی نفی فرمائی ہے۔ (مثلاً ملاحظہ ہو، سورہ آل عمران ۷، ۳۴، ۳۵، ۳۶، سورہ ص ۶۹-۷۰)

(۱) یعنی اللہ تعالیٰ آپ کو پچھلے واقعات سے آگاہ فرما رہا ہے تاکہ لوگ ان سے عبرت پکڑیں اور اللہ کے پیغمبروں کا راستہ اختیار کر کے نجات ابدی کے مستحق بن جائیں لیکن اس کے باوجود لوگوں کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں ہے کیونکہ وہ گزشتہ قوموں کے واقعات تو سنتے ہیں لیکن عبرت پذیری کے لیے نہیں، صرف دلچسپی اور لذت کے لئے۔ اس لیے وہ ایمان سے محروم ہی رہتے ہیں۔

(۲) کہ جس سے ان کو یہ شبہ ہو کہ یہ دعوائے نبوت تو صرف پیسے جمع کرنے کا بہانہ ہے۔

(۳) تاکہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کریں اور اپنی دنیا و آخرت سنوار لیں۔ اب دنیا کے لوگ اگر اس سے آنکھیں پھیرے رکھیں اور اس سے ہدایت حاصل نہ کریں تو لوگوں کا قصور اور ان کی بد قسمتی ہے، قرآن تو فی الواقع اہل دنیا کی ہدایت اور نصیحت ہی کے لیے آیا ہے۔

گر نہ بیند بروز شہو چشم چشم آفتاب را چہ گناہ

(۴) آسمان و زمین کی پیدائش اور ان میں بے شمار چیزوں کا وجود، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ایک خالق و صانع ہے جس نے ان چیزوں کو وجود بخشا ہے اور ایک مدبر ہے جو ان کا ایسا انتظام کر رہا ہے کہ صدیوں سے یہ نظام چل رہا ہے اور ان میں کبھی آپس میں ٹکراؤ اور تصادم نہیں ہوا ہے۔ لیکن لوگ ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے یوں ہی گزر جاتے ہیں ان پر غور و فکر کرتے ہیں اور نہ ان سے رب کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔

(۵) یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن نے بڑی وضاحت کے ساتھ متعدد جگہ بیان فرمایا ہے کہ یہ مشرکین یہ تو مانتے ہیں کہ

أَفَأَمْوَأَنَّ تَأْتِيهِمْ غَائِبَةً مِّنْ عَذَابِ اللَّهِ
أَوْ تَأْتِيهِمْ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝۱۳

کیا وہ اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان کے پاس اللہ کے عذابوں میں سے کوئی عام عذاب آجائے یا ان پر اچانک قیامت ٹوٹ پڑے اور وہ بے خبر ہی ہوں۔ (۱۰۷)

آپ کہہ دیجئے میری راہ یہی ہے۔ میں اور میرے متبعین اللہ کی طرف بلا رہے ہیں، پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ۔^(۱) اور اللہ پاک ہے^(۲) اور میں مشرکوں میں نہیں۔ (۱۰۸)

آپ سے پہلے ہم نے بستی والوں میں جتنے رسول بھیجے ہیں سب مردہی تھے جن کی طرف ہم وحی نازل فرماتے گئے۔^(۳) کیا زمین میں چل پھر کر انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کے لوگوں کا کیسا کچھ انجام ہوا؟ یقیناً آخرت کا گھر پر ہیز گاروں کے لیے بہت ہی بہتر ہے، کیا پھر بھی تم نہیں سمجھتے۔ (۱۰۹)

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعِيَ ۚ وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝۱۴

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّحْيِي إِلَيْهِمْ مِنَ أَهْلِ الْقُرَىٰ
أَقَلُّهُمُ يَسِيرُونَ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ
مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝۱۴

آسمان و زمین کا خالق، مالک، رازق اور مدبر صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود عبادت میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک ٹھہرا لیتے ہیں اور یوں اکثر لوگ مشرک ہیں۔ یعنی ہر دور میں لوگ توحید ربوبیت کے تو قائل رہے ہیں لیکن توحید الوہیت ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ آج کے قبر پرستوں کا شرک بھی یہی ہے کہ وہ قبروں میں مدفون بزرگوں کو صفات الوہیت کا حامل سمجھ کر انہیں مدد کے لیے پکارتے بھی ہیں اور عبادت کے کئی مراسم بھی ان کے لیے بجا لاتے ہیں۔ اَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ۔

(۱) یعنی یہ توحید کی راہ یہ میری راہ ہے بلکہ ہر پیغمبر کی راہ یہی ہے، اسی کی طرف میں اور میرے پیرو کار پورے یقین اور دلائل شرعی کے ساتھ لوگوں کو بلا رہے ہیں۔

(۲) یعنی میں اس کی تزیین و تقدیس بیان کرتا ہوں اس بات سے کہ اس کا کوئی شریک، نظیر، مثل یا وزیر و مشیر یا اولاد اور بیوی ہو۔ وہ ان تمام چیزوں سے پاک ہے۔

(۳) یہ آیت اس بات پر نص ہے کہ تمام نبی مردہی ہوئے ہیں، عورتوں میں سے کسی کو نبوت کا مقام نہیں ملا، اسی طرح ان کا تعلق قریب سے تھا، جو قصبہ دیہات اور شہر سب کو شامل ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اہل بادیہ (صحرا نشینوں) میں سے نہیں تھا۔ کیونکہ اہل بادیہ نسبتاً طبیعت کے سخت اور اخلاق کے کھردرے ہوتے ہیں اور شہری ان کی نسبت نرم، دھیمے اور بااخلاق ہوتے ہیں اور یہ خوبیاں نبوت کے لیے ضروری ہیں۔

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَرَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُنُوا جَاءَهُمْ
نَصْرًا مِّنْ رَبِّهِمْ لَأَنزَلْنَا إِلَيْهِمُ الْمُنِيرَ ۝۱۰۰

یہاں تک کہ جب رسول ناامید ہونے لگے ^(۱) اور وہ (قوم کے لوگ) خیال کرنے لگے کہ انہیں جھوٹ کہا گیا۔ ^(۲) فوراً ہی ہماری مدد ان کے پاس آ پہنچی ^(۳) جسے ہم نے چاہا اسے نجات دی گئی۔ ^(۴) بات یہ ہے کہ ہمارا عذاب گناہ گاروں سے واپس نہیں کیا جاتا۔ (۱۱۰)

ان کے بیان میں عقل والوں کے لیے یقیناً نصیحت اور عبرت ہے، یہ قرآن جھوٹ بنائی ہوئی بات نہیں بلکہ یہ تصدیق ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے کی ہیں، کھول کھول کر بیان کرنے والا ہے ہر چیز کو اور ہدایت اور رحمت ہے ایمان دار لوگوں کے لیے۔ ^(۵) (۱۱۱)

لَقَدْ كَانَ فِي قَصصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصَدِّقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَوَقَدْ نَصَّبْنَا كُلَّ شَيْءٍ وَهَدَىٰ وَرَحْمَةً لِّعَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝۱۱۱

(۱) یہ مایوسی اپنی قوم کے ایمان لانے کے سلسلے میں ہوئی۔

(۲) قراءات کے اعتبار سے اس آیت کی کئی مفہوم بیان کئے گئے ہیں لیکن سب سے مناسب مفہوم یہ ہے کہ ظَنُّوا کا فاعل قوم یعنی کفار کو قرار دیا جائے یعنی کفار عذاب کی دھمکی پر پہلے تو ڈرے لیکن جب زیادہ تاخیر ہوئی تو خیال کیا کہ عذاب تو آتا نہیں ہے، (جیسا کہ پیغمبر کی طرف سے دعویٰ ہو رہا ہے) اور نہ آتا نظر ہی آتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ نبیوں سے بھی یوں ہی جھوٹا وعدہ کیا گیا ہے۔ مطلب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ آپ کی قوم پر عذاب میں جو تاخیر ہو رہی ہے، اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پچھلی قوموں پر بھی عذاب میں بڑی بڑی تاخیر روا رکھی گئی ہے اور اللہ کی مشیت و حکمت کے مطابق انہیں خوب خوب مہلت دی گئی، حتیٰ کہ رسول اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو گئے اور لوگ یہ خیال کرنے لگے کہ شاید انہیں عذاب کا یوں ہی جھوٹ موٹ کہہ دیا گیا ہے۔

(۳) اس میں دراصل اللہ تعالیٰ کے اس قانون مہلت کا بیان ہے، جو وہ نافرمانوں کو دیتا ہے، حتیٰ کہ اس بارے میں وہ اپنے پیغمبروں کی خواہش کے برعکس بھی زیادہ سے زیادہ مہلت عطا کرتا ہے، جلدی نہیں کرتا، یہاں تک کہ بعض دفعہ پیغمبر کے ماننے والے بھی عذاب سے مایوس ہو کر یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ ان سے یوں ہی جھوٹ موٹ کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ محض ایسے وسوسے کا پیدا ہو جانا ایمان کی منافی نہیں ہے۔

(۴) یہ نجات پانے والے اہل ایمان ہی ہوتے تھے۔

(۵) یعنی یہ قرآن، جس میں یہ قصہ یوسف علیہ السلام اور دیگر قوموں کے واقعات بیان کیے گئے ہیں، کوئی گھڑا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ یہ پچھلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور اس میں دین کے بارے میں ساری ضروری باتوں کی تفصیل ہے اور ایمان داروں کے لیے ہدایت و رحمت۔

سورہ رعد مدنی ہے اور اس میں تینتالیس آیات اور
چھ رکوع ہیں۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑا
رحم والا ہے۔

الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَخًا مِمَّا بَيْنَ يَدَيْهِ
وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَخًا مِمَّا بَيْنَ يَدَيْهِ
وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱﴾

ال م ر۔ یہ قرآن کی آیتیں ہیں، اور جو کچھ آپ کی
طرف آپ کے رب کی جانب سے اتارا جاتا ہے، سب
حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ (۱)

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے بلند کر رکھا
ہے کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ پھر وہ عرش پر قرار پکڑے
ہوئے ہے (۱) اسی نے سورج اور چاند کو ماتحتی میں لگا رکھا
ہے۔ ہر ایک ميعاد معين پر گشت کر رہا ہے، (۲) وہی کام کی

أَلَلَهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ أَسْتَوَىٰ عَلَى
الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلًّا يَجْرِئُ لِجَهْلِ مَسْئَلِهِ
يُدْبِرُونَ الْكَوْكَبَ بِمَقَادِيرِ الْوَقْتِ وَالْقَمَرَ بِمَقَادِيرِ الْوَقْتِ ﴿۲﴾

(۱) استواء علی العرش کا مفہوم اس سے قبل بیان ہو چکا ہے۔ کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا عرش پر قرار پکڑنا ہے۔ محدثین کا
یہی مسلک ہے وہ اس کی تاویل نہیں کرتے، جیسے بعض دوسرے گروہ اس میں اور دیگر صفات الہی میں تاویل کرتے ہیں۔
تاہم محدثین کہتے ہیں کہ اس کی کیفیت نہ بیان کی جاسکتی ہے اور نہ اسے کسی چیز کے ساتھ تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ لیس
﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴾ (الشوریٰ : ۱۱)

(۲) اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ یہ ایک وقت مقرر تک یعنی قیامت تک اللہ کے حکم سے چلتے رہیں گے، جیسا کہ فرمایا
﴿ وَالشَّمْسُ بَجْرِئٍ لِّسَعْتِكُمْ مَا تَكْفُرُونَ فَأَتَتْ بَدُؤَ الْغَيْمِ وَالْعِزَّةِ الْعَالِيَةِ ﴾ (یسس - ۳۸) ”اور سورج اپنے ٹھہرنے کے وقت تک چل رہا
ہے۔“ دوسرے معنی یہ ہیں کہ چاند اور سورج دونوں اپنی اپنی منزلوں پر رواں دواں رہتے ہیں، سورج اپنا
دورہ ایک سال میں اور چاند ایک ماہ میں مکمل کر لیتا ہے۔ جس طرح فرمایا ﴿ وَالْقَمَرَ قَدْرًا مِّمَّا تَزَالُ ﴾ (یسس - ۳۹) ”ہم نے
چاند کی منزلیں مقرر کر دی ہیں۔“ سات بڑے بڑے سیارے ہیں جن میں سے دو چاند اور سورج ہیں۔ یہاں صرف ان دو
کا ذکر کیا ہے کیونکہ یہی دو سب سے زیادہ بڑے اور اہم ہیں۔ جب یہ دونوں بھی اللہ کے حکم کے تابع ہیں تو دوسرے
سیارے تو بطریق اولیٰ اس کے تابع ہونگے۔ اور جب یہ اللہ کے حکم کے تابع ہیں تو یہ معبود نہیں ہو سکتے، معبود تو وہی ہے
جس نے ان کو مخر کیا ہوا ہے۔ اس لیے فرمایا ﴿ لَا تَسْبُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْمُ اللَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴾
(حم السجدہ : ۳۷) ”سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو، اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا،
اگر تم صرف اس کی عبادت کرنا چاہتے ہو۔“ ﴿ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَمَسْجِدُكَ يَا أُمِّ الْقُرْبَىٰ ﴾ (الأعراف - ۵۳) ”سورج،
چاند اور تارے، سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔“

تدبیر کرتا ہے وہ اپنے نشانات کھول کھول کر بیان کر رہا ہے
کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کر لو۔ (۲)

اسی نے زمین پھیلا کر بچھادی ہے اور اس میں پہاڑ اور
نہریں پیدا کر دی ہیں۔^(۱) اور اس میں ہر قسم کے پھلوں
کے جوڑے دوہرے دوہرے پیدا کر دیے ہیں،^(۲) وہ
رات کو دن سے چھپا دیتا ہے۔ یقیناً غور و فکر کرنے والوں
کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ (۳)

اور زمین میں مختلف نکلے ایک دوسرے سے لگتے
لگاتے ہیں^(۳) اور انگوروں کے باغات ہیں اور کھیت
ہیں اور کھجوروں کے درخت ہیں، شاخ دار اور بعض
ایسے ہیں^(۴) جو بے شاخ ہیں سب ایک ہی پانی پلائے
جاتے ہیں۔ پھر بھی ہم ایک کو ایک پر پھلوں میں برتری
دیتے ہیں^(۵) اس میں عقل مندوں کے لیے بہت سی
نشانیاں ہیں۔ (۴)

وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا وَمِنْ
كُلِّ الْأُمَمِ جَعَلَ لَهَا رُحْمًا وَأَنْهَارًا يُغِيثُ الْبَلَّ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا
إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۲﴾

وَفِي الْأَرْضِ قَطْعٌ وَجُعْدٌ وَجَنَّتْ مِنَ الْأَعْنَابِ وَزَيْتُونٌ وَنَخِيلٌ
صِنَوَانٌ وَعَرِصُونَ يَأْتِيهِمْ مَاءٌ وَاحِدٌ وَنُقُطٌ بَعْضُهَا
عَلَى بَعْضٍ فِي الْأَكْلِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۳﴾

(۱) زمین کے طول و عرض کا اندازہ بھی عام لوگوں کے لیے مشکل ہے اور بلند و بالا پہاڑوں کے ذریعے سے زمین میں گویا
میخیں گاڑی ہیں، نہروں، دریاؤں اور چشموں کا ایسا سلسلہ قائم کیا کہ جس سے انسان خود بھی سیراب ہوتے ہیں اور اپنے
کھیتوں کو بھی سیراب کرتے ہیں جن سے انواع و اقسام کے غلے اور پھل پیدا ہوتے ہیں، جن کی شکلیں بھی ایک
دوسرے سے مختلف اور ذائقے بھی جداگانہ ہوتے ہیں۔

(۲) اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ نہ زراعت اور نہ دونوں بنائے۔ جیسا کہ موجودہ تحقیقات نے بھی اس کی تصدیق کر دی ہے۔
دوسرا مطلب (جوڑے جوڑے کا) یہ ہے کہ میٹھا اور کھٹا، سرد اور گرم، سیاہ اور سفید اور ذائقہ دار و بد ذائقہ، اس طرح
ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد قسمیں پیدا کیں۔

(۳) مِتَّجُونَاتٌ۔ ایک دوسرے کے قریب اور متصل یعنی زمین کا ایک حصہ شاداب اور زرخیز ہے۔ خوب پیداوار دیتا ہے۔
اس کے ساتھ ہی زمین شور ہے، جس میں کسی قسم کی بھی پیداوار نہیں ہوتی۔

(۴) صِنَوَانٌ کے ایک معنی ملے ہوئے اور غَبِيْرٌ صِنَوَانٌ کے جدا جدا کیے گئے ہیں۔ دوسرا معنی 'صِنَوَانٌ' ایک درخت، جس کی
کئی شاخیں اور تنے ہوں، جیسے انار، انجیر اور بعض کھجوریں۔ اور غَبِيْرٌ صِنَوَانٌ جو اس طرح نہ ہو بلکہ ایک ہی تنے والا ہو۔

(۵) یعنی زمین بھی ایک، پانی، ہوا بھی ایک۔ لیکن پھل اور غلہ مختلف قسم کے اور ان کے ذائقے اور شکلیں بھی ایک
دوسرے سے مختلف۔

اگر تجھے تعجب ہو تو واقعی ان کا یہ کتنا عجیب ہے کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئی پیدائش میں ہوں گے؟^(۱) یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار سے کفر کیا۔ یہی ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہوں گے۔ اور یہی ہیں جو جنم کے رہنے والے ہیں جو اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ (۵)

اور جو تجھ سے (سزا کی طلبی میں) جلدی کر رہے ہیں راحت سے پہلے ہی یقیناً ان سے پہلے سزائیں (بطور مثال) گزر چکی ہیں،^(۲) اور بیشک تیرا رب البتہ بخشنے والا ہے لوگوں کے بے جا ظلم پر بھی۔^(۳) اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ تیرا رب بڑی سخت سزادینے والا بھی ہے۔^(۴) (۶)

وَأِنْ كُنْتُمْ كٰفِرِيْنَ ۙ اِنَّ عَذٰبَ الْاٰلِ الْاٰخِرَةِ لَظٰلِمٌ ۙ
بَدِيْءٌ ۙ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهٖمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَقْلٰمُ فِيْ
اَعْتٰقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۶

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسِّيْءَةِ قَبْلَ الْحُسْنٰى ۚ وَذٰلِكَ مِنْ
قَبْلِهِمُ الْمَكْتٰبُ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى
ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۶

(۱) یعنی جس ذات نے پہلی مرتبہ پیدا کیا، اس کے لئے دوبارہ اس چیز کا بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ لیکن کفار یہ عجیب بات کہتے ہیں کہ دوبارہ ہم کیسے پیدا کیے جائیں گے؟

(۲) یعنی عذاب الہی سے قوموں اور بستیوں کی تباہی کی کئی مثالیں پہلے گزر چکی ہیں، اس کے باوجود یہ عذاب جلدی مانگتے ہیں؟ یہ کفار کے جواب میں کہا گیا جو کہتے تھے کہ اے پیغمبر! اگر تو سچا ہے تو وہ عذاب ہم پر لے آ، جس سے تو ہمیں ڈراتا رہتا ہے۔

(۳) یعنی لوگوں کے ظلم و معصیت کے باوجود وہ عذاب میں جلدی نہیں کرتا بلکہ مہلت دیتا ہے اور بعض دفعہ تو اتنی تاخیر کرتا ہے کہ معاملہ قیامت پر چھوڑ دیتا ہے۔ یہ اس کے حلم و کرم اور غفور و رزگزر کا نتیجہ ہے ورنہ اگر وہ فوراً مؤاخذہ کرنے اور عذاب دینے پر آجائے تو روئے زمین پر کوئی انسان ہی باقی نہ رہے۔ ﴿وَلَوْ كُنُوْا اِحْذٰ اِنَّ اللّٰهَ النَّاسَ بِمَا كٰنُوْا مَا تَزَكٰٓءَ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۙ اِنَّ دَآبِرَهُمْ ۙ﴾ (سورۃ فاطر- ۳۵) ”اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کے اعمال کے سبب دارو گیر فرمانے لگتا تو روئے زمین پر ایک تنفس کو نہ چھوڑتا۔“

(۴) یہ اللہ کی دوسری صفت کا بیان ہے تاکہ انسان صرف ایک ہی پہلو پر نظر نہ رکھے، اس کے دوسرے پہلو کو بھی دیکھتا رہے۔ کیونکہ ایک ہی رخ اور ایک ہی پہلو کو مسلسل دیکھتے رہنے سے بہت سی چیزیں اوجھل رہ جاتی ہیں۔ اسی لیے قرآن کریم میں جمال اللہ کی صفت رحیمی و غفوری کا بیان ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کی دوسری صفت قناری و جباری کا بیان بھی ملتا ہے، جیسا کہ یہاں بھی ہے تاکہ رجا (امید) اور خوف، دونوں پہلو سامنے رہیں، کیونکہ اگر امید ہی امید سامنے رہے تو انسان مصیبت الہی پر دلیر ہو جاتا ہے اور اگر خوف ہی خوف ہر وقت دل و دماغ پر مسلط رہے تو اللہ کی رحمت سے مایوسی ہو جاتی ہے اور دونوں ہی باتیں غلط اور انسان کے لیے تباہ کن ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے «الْاِيْمَانُ

اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی (معجزہ) کیوں نہیں اتاری گئی۔ بات یہ ہے کہ آپ تو صرف آگاہ کرنے والے ہیں^(۱) اور ہر قوم کے لیے ہادی ہے۔^(۲) (۷)

مادہ اپنے شکم میں جو کچھ رکھتی ہے اسے اللہ بخوبی جانتا ہے^(۳) اور پیٹ کا گھٹنا بڑھنا بھی^(۴) ہر چیز اس کے پاس اندازے سے ہے۔^(۵) (۸)

ظاہر و پوشیدہ کا وہ عالم ہے (سب سے) بڑا اور (سب سے) بلند و بالا۔ (۹)

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ
إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ وَإِلَىٰ قَوْمِهِ مَتَابُ ۝

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ
وَمَا تَزِيدُ إِلَّا قَلْبًا مَلَأًا بَغِيًّا ۝

عَلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرِ الْمُتَعَالِ ۝

بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ ”ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے“ یعنی دونوں باتوں کے درمیان اعتدال و توازن کا نام ایمان ہے۔ انسان اللہ کے عذاب کے خوف سے بے پرواہ ہو اور نہ اس کی رحمت سے مایوس۔ (اس مضمون کے ملاحظہ کے لیے دیکھئے سورۃ الأنعام، ۳۷- سورۃ الأعراف، ۱۶، سورۃ الحجر، ۳۹-۵۰۔)

(۱) ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے حالات و ضروریات اور اپنی مشیت و مصلحت کے مطابق کچھ نشانیاں اور معجزات عطا فرمائے۔ لیکن کافر اپنے حسبِ فضا معجزات کے طالب ہوتے رہے ہیں۔ جیسے کفار مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے کہ کوہ صفا کو سونے کا بنا دیا جائے یا پہاڑوں کی جگہ نرس اور چشمے جاری ہو جائیں، وغیرہ وغیرہ جب ان کی خواہش کے مطابق معجزہ صادر کر کے نہ دکھایا جاتا تو کہتے کہ اس پر کوئی نشان (معجزہ) نازل کیوں نہیں کیا گیا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اے پیغمبر! تیرا کام صرف انذار و تبلیغ ہے۔ وہ تو کرتارہ۔ کوئی مانے نہ مانے، اس سے تجھے کوئی غرض نہیں، اس لیے کہ ہدایت دینا یہ ہمارا کام ہے۔ تیرا کام راستہ دکھانا ہے، اس راستے پر چلا دینا، یہ تیرا نہیں، ہمارا کام ہے۔

(۲) یعنی ہر قوم کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہادی ضرور بھیجا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قوموں نے ہدایت کا راستہ اپنایا یا نہیں اپنایا۔ لیکن سیدھے راستے کی نشاندہی کرنے کے لیے پیغمبر ہر قوم کے اندر ضرور آیا ﴿وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾ (ہاسطو: ۲۳) ”ہر امت میں ایک نذیر ضرور آیا ہے۔“

(۳) رحم مادر میں کیا ہے، نر ہے یا مادہ، خوب صورت ہے یا بد صورت، نیک ہے یا بد، طویل العمر ہے یا قصیر العمر؟ یہ سب باتیں صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

(۴) اس سے مراد حمل کی مدت ہے جو عام طور پر ۹ تو ۱۰ مہینے ہوتی ہے لیکن گھٹی بڑھتی بھی ہے، کسی وقت یہ مدت ۱۰ مہینے اور کسی وقت ۸ مہینے ہو جاتی ہے، اس کا علم بھی اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔

(۵) یعنی کسی کی زندگی کتنی ہے؟ اسے رزق سے کتنا حصہ ملے گا؟ اس کا پورا اندازہ اللہ کو ہے۔

تم میں سے کسی کا اپنی بات کو چھپا کر کہنا اور آواز بلند اسے کہنا اور جو رات کو چھپا ہوا ہو اور جو دن میں چل رہا ہو، سب اللہ پر برابر و یکساں ہیں۔ (۱۰)

اس کے پہرے دار (۱) انسان کے آگے پیچھے مقرر ہیں، جو اللہ کے حکم سے اس کی نمکبانی کرتے ہیں۔ کسی قوم کی حالت اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اسے نہ بدلیں جو ان کے دلوں میں ہے۔ (۲) اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی سزا کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ بدلا نہیں کرتا اور سوائے اس کے کوئی بھی ان کا کارساز نہیں۔ (۱۱)

وہ اللہ ہی ہے جو تمہیں بجلی کی چمک ڈرانے اور امید دلانے کے لیے دکھاتا ہے (۳) اور بھاری بادلوں کو پیدا کرتا ہے۔ (۱۲) (۳)

گرج اس کی تسبیح و تعریف کرتی ہے اور فرشتے بھی اس کے خوف سے۔ (۵) وہی آسمان سے بجلیاں گراتا ہے اور جس پر چاہتا ہے اس پر ڈالتا ہے (۶) کفار اللہ کی پابت لڑ جھگڑ رہے ہیں اور اللہ سخت قوت والا ہے۔ (۷) (۱۳)

سَوَاءٌ أَمْرُهُمْ مِنْ أَمْرِ الْقَوْلِ وَمَنْ جَهَرِيهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفِيٌّ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ ۝

لَهُ الْمُعَقَّبَاتُ مِنَ الْبَيْنِ يَدِيهِ وَمَنْ حَلْفُهُ يَحْفَظُونَ لَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُعَذِّبُهُمْ حَتَّى يُعَذِّبُوا مَا يَأْتِيهِمْ وَإِذْ أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءَ فَلَا مَرَدَّ لَهُ وَمَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَاوِلٍ ۝

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنزِلُ السَّحَابَ الْغِيَاثَ ۝

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَايِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ وَهُوَ شَدِيدُ الْحِسَابِ ۝

(۱) مُعَقَّبَاتُ، مُعَقَّبَةٌ کی جمع ہے۔ ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے، مراد فرشتے ہیں جو باری باری ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں۔ دن کے فرشتے جاتے ہیں تو شام کے آجاتے ہیں شام کے جاتے ہیں تو دن کے آجاتے ہیں۔

(۲) اس کی تشریح کے لیے دیکھئے سورۃ انفال آیت ۵۳ کا حاشیہ۔

(۳) جس سے راہ گیر مسافر ڈرتے ہیں اور گھروں میں مقیم کسان اور کاشت کار اس کی برکت و منفعت کی امید رکھتے ہیں۔

(۴) بھاری بادلوں سے مراد وہ بادل ہیں جن میں بارش کا پانی ہوتا ہے۔

(۵) جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَلَنْ تَنْصُرُنَّهُمُ الْإِنْسِيَةُ يَوْمَئِذٍ﴾ (بنی اسرائیل: ۳۴) ”ہر چیز اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔“

(۶) یعنی اس کے ذریعے سے جس کو چاہتا ہے، ہلاک کر ڈالتا ہے۔

(۷) محال کے معنی قوت، مؤاخذہ اور تدبیر وغیرہ کے کیے گئے ہیں۔ یعنی وہ بڑی قوت والا نہایت مؤاخذہ کرنے والا اور تدبیر کرنے والا ہے۔

اسی کو پکارنا حق ہے۔^(۱) جو لوگ اوروں کو اس کے سوا پکارتے ہیں وہ ان (کی پکار) کا کچھ بھی جواب نہیں دیتے مگر جیسے کوئی شخص اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوئے ہو کہ اس کے منہ میں پڑ جائے حالانکہ وہ پانی اس کے منہ میں پہنچنے والا نہیں،^(۲) ان منکروں کی جتنی پکار ہے سب گمراہی میں ہے۔^(۳) (۱۳)

اللہ ہی کے لیے زمین اور آسمانوں کی سب مخلوق خوشی اور ناخوشی سے سجدہ کرتی ہے اور ان کے سائے بھی صبح و شام۔^(۴) (۱۵)

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْمَعُونَ
لَهُمْ شَيْءٌ إِلَّا كَيْبُطٌ لَّهُمْ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَهُ قَاهُ وَمَا هُوَ
بِالْعِيبَةِ وَمَا دَعَاءُ الْكٰفِرِينَ إِلَّا فِي ضَلٰلٍ ۝۱۵

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا
وَوَظَلُّهُمْ بِالْعُدُوِّ وَالْاَصٰلِ ۝۱۵

(۱) یعنی خوف اور امید کے وقت اسی ایک اللہ کو پکارنا صحیح ہے کیونکہ وہی ہر ایک کی پکار سنتا اور قبول فرماتا ہے یا دعوت، عبادت کے معنی میں ہے یعنی اسی کی عبادت حق اور صحیح ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، کیونکہ کائنات کا خالق، مالک اور مدبر صرف وہی ہے اس لیے عبادت بھی صرف اسی کا حق ہے۔

(۲) یعنی جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص دور سے پانی کی طرف اپنی دونوں ہتھیلیاں پھیلا کر پانی سے لے لے کہ تو میرے منہ تک آجا، ظاہر بات ہے کہ پانی جامد چیز ہے، اسے پتہ ہی نہیں کہ ہتھیلیاں پھیلانے والے کی حاجت کیا ہے؟ اور نہ اسے یہ پتہ ہے کہ وہ مجھ سے اپنے منہ تک پہنچنے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اور نہ اس میں یہ قدرت ہے کہ اپنی جگہ سے حرکت کر کے اس کے ہاتھ یا منہ تک پہنچ جائے۔ اسی طرح یہ مشرک، اللہ کے سوا، جن کو پکارتے ہیں، انہیں نہ یہ پتہ ہے کہ کوئی انہیں پکار رہا ہے اور اس کی فلاں حاجت ہے۔ اور نہ اس حاجت روائی کی ان میں قدرت ہی ہے۔

(۳) اور بے فائدہ بھی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کو کوئی نفع نہیں ہو گا۔

(۴) اس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت کا بیان ہے کہ ہر چیز پر اس کا غلبہ ہے اور ہر چیز اس کے ماتحت اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہے، چاہے مومنوں کی طرح خوشی سے کرے یا مشرکوں کی طرح ناخوشی سے۔ اور ان کے سائے بھی صبح و شام سجدہ کرتے ہیں۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا — ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا لِي مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَّبِعُوْنَ اِطْلَافًا عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَاوٰلِ سٰجِدًا لِلّٰهِ وَهُمْ ذٰخِرُوْنَ﴾ (سورۃ النحل، ۴۸) ”کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے جو چیز بھی پیدا کی ہے، ان کے سائے داہنے اور بائیں سے اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے ڈھلتے ہیں اور وہ عاجزی کرتے ہیں۔“ اس سجدے کی کیفیت کیا ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ یا دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ کافر سمیت تمام مخلوق اللہ کے حکم کے تابع ہے، کسی میں اس سے سرتابی کی مجال نہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کو صحت دے، بیمار کرے، غنی کر دے یا فقیر بنا دے، زندگی دے یا موت سے

آپ پوچھئے کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے؟ کہہ دیجئے! اللہ۔^(۱) کہہ دیجئے! کیا تم پھر بھی اس کے سوا اوروں کو حمایتی بنا رہے ہو جو خود اپنی جان کے بھی بھلے برے کا اختیار نہیں رکھتے۔^(۲) کہہ دیجئے کہ کیا اندھا اور بینا برابر ہو سکتا ہے؟ یا کیا اندھیریاں اور روشنی برابر ہو سکتی ہے۔^(۳) کیا جنہیں یہ اللہ کے شریک ٹھہرا رہے ہیں انہوں نے بھی اللہ کی طرح مخلوق پیدا کی ہے کہ ان کی نظر میں پیدائش مشتبہ ہو گئی ہو، کہہ دیجئے کہ صرف اللہ ہی تمام چیزوں کا خالق ہے وہ اکیلا ہے^(۴) اور زبردست غالب ہے۔ (۱۶)

اسی نے آسمان سے پانی برسایا پھر اپنی اپنی وسعت کے مطابق نالے بسہ نکلے۔^(۵) پھر پانی کے ریلے نے اوپر

قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ قُلِ اللَّهُ قُلْ أَفَاتَخَذْتُمْ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ لَا يَمْلِكُونَ لِأَنفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ①

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّبِيلُ زَبَدًا ثَابِتًا وَمِمَّا يُوقِدُونَ

ہمکنار کرے۔ ان ٹکوینی احکام میں کسی کافر کو بھی مجال انکار نہیں۔

- (۱) یہاں تو پیغمبر کی زبان سے اقرار ہے۔ لیکن قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے کہ مشرکین کا جواب بھی یہی ہو تا تھا۔
- (۲) یعنی جب تمہیں اقرار و اعتراف ہے کہ آسمان و زمین کا رب اللہ ہے جو تمام اختیارات کا بلا شرکت غیر مالک ہے تو پھر تم اسے چھوڑ کر ایسوں کو کیوں اپنا دوست اور حمایتی سمجھتے ہو جو اپنی بابت بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتے۔
- (۳) یعنی جس طرح اندھا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے، اسی طرح موحد اور مشرک برابر نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ موحد کا دل توحید کی بصیرت سے معمور ہے، جب کہ مشرک اس سے محروم ہے۔ موحد کی آنکھیں ہیں، وہ توحید کا نور دیکھتا ہے اور مشرک کو یہ نور توحید نظر نہیں آتا، اس لیے وہ اندھا ہے۔ اسی طرح، جس طرح اندھیریاں اور روشنی برابر نہیں ہو سکتی۔ ایک اللہ کا پجاری، جس کا دل نورانیت سے بھرا ہوا ہے، اور ایک مشرک، جو جہالت و توہمات کے اندھیروں میں بھٹک رہا ہے، برابر نہیں ہو سکتے؟

- (۴) یعنی ایسی بات نہیں ہے کہ یہ کسی شے کا شکار ہو گئے ہوں بلکہ یہ مانتے ہیں کہ ہر چیز کا خالق صرف اور صرف اللہ ہی ہے۔
- (۵) يَقْدَرُهَا (وسعت کے مطابق) کا مطلب ہے۔ نالے یعنی وادی (دو پہاڑوں کے درمیان کی جگہ) تنگ ہو تو کم پانی، کشادہ ہو تو زیادہ پانی اٹھاتی ہے۔ یعنی نزول قرآن کو، جو ہدایت اور بیان کا جامع ہے، بارش کے نزول سے تشبیہ دی ہے۔ اس لیے کہ قرآن کا نفع بھی بارش کے نفع کی طرح عام ہے۔ اور وادیوں کو تشبیہ دی ہے دلوں کے ساتھ۔ اس لیے کہ وادیوں (نالوں) میں پانی جا کر ٹھہرتا ہے، جس طرح قرآن اور ایمان مومنوں کے دلوں میں قرار پکڑتا ہے۔

چڑھے جھاگ کو اٹھالیا،^(۱) اور اس چیز میں بھی جس کو آگ میں ڈال کر پتاتے ہیں زیور یا ساز و سامان کے لیے اسی طرح کے جھاگ ہیں،^(۲) اسی طرح اللہ تعالیٰ حق و باطل کی مثال بیان فرماتا ہے،^(۳) اب جھاگ تو ناکارہ ہو کر چلا جاتا ہے^(۴) لیکن جو لوگوں کو نفع دینے والی چیز ہے وہ زمین میں ٹھہری رہتی ہے،^(۵) اللہ تعالیٰ اسی طرح مثالیں بیان فرماتا ہے۔^(۶) (۱۷)

جن لوگوں نے اپنے رب کے حکم کی بجا آوری کی ان کے لیے بھلائی ہے اور جن لوگوں نے اس کی حکم برداری نہ کی اگر ان کے لیے زمین میں جو کچھ ہے سب کچھ ہو اور اسی کے ساتھ ویسا ہی اور بھی ہو تو وہ سب

عَلَيْهِۥ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ جَلْبِئَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُ
كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا
الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۚ وَأَمَّا مَا يَمْسُكُ اللَّهُ التَّنَاسُ
فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ۝

لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ الْعُسْتُنَىٰ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِيُتْرَقُ
لَهُمْ فِي الْأَرْضِ جَوِيدًا وَيَمْلَأُ مَعَهُ الْفِتْرَةَ وَبِأُولَٰئِكَ لَهُمْ
سُوءُ الْحِسَابِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُجْرِمُونَ ۝

(۱) اس جھاگ سے، جو پانی کے اوپر آجاتا ہے اور جو مضحل اور ختم ہو جاتا ہے اور ہوائیں جسے اڑالے جاتی ہیں کفر مراد ہے، جو جھاگ ہی کی طرح اڑ جانے والا اور ختم ہو جانے والا ہے۔

(۲) یہ دوسری مثال ہے کہ تانبے، پیتل، سیسے یا سونے چاندی کو زیور یا سامان وغیرہ بنانے کے لیے آگ میں تپایا جاتا ہے تو اس پر بھی جھاگ آجاتا ہے۔ اس جھاگ سے مراد میل پیکل ہے جو ان دھاتوں کے اندر ہوتا ہے۔ آگ میں تپانے سے وہ جھاگ کی شکل میں اوپر آجاتا ہے۔ پھر یہ جھاگ بھی دیکھتے دیکھتے ختم ہو جاتا ہے اور دھات اصلی شکل میں باقی رہ جاتی ہے۔

(۳) یعنی جب حق اور باطل کا آپس میں اجتماع اور ٹکراؤ ہوتا ہے تو باطل کو اسی طرح ثبات اور دوام نہیں ہوتا، جس طرح سیلابی ریلے کا جھاگ پانی کے ساتھ، دھاتوں کا جھاگ، جن کو آگ میں تپایا جاتا ہے، دھاتوں کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ بلکہ مضحل اور ختم ہو جاتا ہے۔

(۴) یعنی اس سے کوئی نفع نہیں ہوتا، کیوں کہ جھاگ پانی یا دھات کے ساتھ باقی رہتا ہی نہیں ہے بلکہ آہستہ آہستہ بیٹھ جاتا ہے یا ہوائیں اسے اڑالے جاتی ہیں۔ باطل کی مثال بھی جھاگ ہی کی طرح ہے۔

(۵) یعنی پانی اور سونا چاندی، تانبہ، پیتل وغیرہ یہ چیزیں باقی رہتی ہیں جن سے لوگ متمتع اور فیض یاب ہوتے ہیں۔ اسی طرح حق باقی رہتا ہے جس کے وجود کو بھی زوال نہیں اور جس کا نفع بھی دائمی ہے۔

(۶) یعنی بات کو سمجھانے اور ذہن نشین کرانے کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے، جیسے یہاں دو مثالیں بیان فرمائیں اور اسی طرح سورہ بقرہ کے آغاز میں منافقین کے لیے مثالیں بیان فرمائیں۔ اسی طرح سورہ نور، آیات ۳۹، ۴۰ میں کافروں کے لیے دو مثالیں بیان فرمائیں اور احادیث میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مثالوں کے ذریعے سے لوگوں کو بہت سی

کچھ اپنے بدلے میں دے دیں۔^(۱) یہی ہیں جن کے لیے برا حساب ہے^(۲) اور جن کا ٹھکانہ جہنم ہے جو بہت بری جگہ ہے۔ (۱۸)

کیا وہ ایک شخص جو یہ علم رکھتا ہو کہ آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے جو اتارا گیا ہے وہ حق ہے، اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھا ہو^(۳) نصیحت تو وہی قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہوں۔ (۱۹)^(۴)

جو اللہ کے عہد (وہیمان) کو پورا کرتے ہیں^(۵) اور قول و قرار کو توڑتے نہیں۔^(۶) (۲۰)

اور اللہ نے جن چیزوں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے وہ اسے جوڑتے ہیں^(۷) اور وہ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور حساب کی سختی کا اندیشہ رکھتے ہیں۔ (۲۱)

أَمْ مَنْ يَعْلَمُ أَمْرَ الْإِنزَالِ الْيَقِينُ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ لَمْ يَكُنْ هُوَ أَخْفَىٰ
لَأَمْ يَأْتِيكَ الْوَالِدُ وَالْأَلْبَابُ ۝

الَّذِينَ يُؤْتُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنْقُضُونَ الْعَيْثَ ۝

وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ
وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ ۝

باتیں سمجھائیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے تفسیر ابن کثیر)

(۱) یہ مضمون اس سے قبل بھی دو تین جگہ گزر چکا ہے۔

(۲) کیونکہ ان سے ہر چھوٹے بڑے عمل کا حساب لیا جائے گا اور ان کا معاملہ مَنْ نُوقِشَ الْحِسَابَ عَذَبَ (جس سے حساب میں جرح کی گئی اس کا بچنا مشکل ہو گا، وہ عذاب سے دوچار ہو کر رہے گا) کا آئینہ دار ہو گا۔ اسی لیے آگے فرمایا اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

(۳) یعنی ایک وہ شخص جو قرآن کی حقانیت و صداقت پر یقین رکھتا ہو اور دوسرا اندھا ہو یعنی اسے قرآن کی صداقت میں شک ہو، کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ استفہام، انکار کے لیے ہے یعنی یہ دونوں اسی طرح برابر نہیں ہو سکتے، جس طرح جھاگ اور پانی یا سونا، تانبا اور اس کی میل پکیل برابر نہیں ہو سکتے۔

(۴) یعنی جن کے پاس قلب سلیم اور عقل صحیح نہ ہو اور جنہوں نے اپنے دلوں کو گناہوں کے زنگ سے آلودہ اور اپنی عقول کو خراب کر لیا ہو، وہ اس قرآن سے نصیحت حاصل ہی نہیں کر سکتے۔

(۵) یہ اہل دانش کی صفات بیان کی جا رہی ہیں۔ اللہ کے عہد سے مراد اس کے احکام (او امر و نواہی) ہیں جنہیں وہ بجا لاتے ہیں۔ یا وہ عہد ہے، جو عہدِ اَلْسِنَتِ کَلَمَاتِہِ، جس کی تفصیل سورہ اعراف میں گزر چکی ہے۔

(۶) اس سے مراد وہ باہمی معاہدے اور وعدے ہیں جو انسان آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں یا وہ جو ان کے اور ان کے رب کے درمیان ہیں۔

(۷) یعنی رشتوں اور قرابتوں کو توڑتے نہیں ہیں، بلکہ ان کو جوڑتے اور صلہ رحمی کرتے ہیں۔

اور وہ اپنے رب کی رضامندی کی طلب کے لیے صبر کرتے ہیں،^(۱) اور نمازوں کو برابر قائم رکھتے ہیں^(۲) اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اسے چھپے کھلے خرچ کرتے ہیں^(۳) اور برائی کو بھی بھلائی سے ٹالتے ہیں،^(۴) ان ہی کے لیے عاقبت کا گھر ہے۔^(۵) (۲۲)

ہمیشہ رہنے کے باغات^(۱) جہاں یہ خود جائیں گے اور ان کے باپ دادوں اور بیویوں اور اولادوں میں سے بھی جو نیکو کار ہوں گے،^(۲) ان کے پاس فرشتے ہر دروازے سے آئیں گے۔ (۲۳)

وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِعَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُسْرًا وَعَلَانِيَةً يَدْعُونَ بِالنِّسْبَةِ السَّيِّئَةِ
أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَقَبَى الْكَوَادِرِ ﴿۲۲﴾

جَبَّتْ عَدْنٌ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ
وَذُرِّيَّتِهِمُ وَاللَّيْئَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾

(۱) اللہ کی نافرمانیوں اور گناہوں سے بچتے ہیں۔ یہ صبر کی ایک قسم ہے۔ تکلیفوں اور آزمائشوں پر صبر کرتے ہیں۔ یہ دوسری قسم ہے۔ اہل دانش دونوں قسم کا صبر کرتے ہیں۔

(۲) ان کی حدود و مواعیت، خشوع و خضوع اور اعتدال ارکان کے ساتھ۔ نہ کہ اپنے من مانے طریقے سے۔

(۳) یعنی جہاں جہاں اور جب جب بھی، خرچ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اپنی اور بیگانوں میں اور خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں۔

(۴) یعنی ان کے ساتھ کوئی برائی سے پیش آتا ہے تو وہ اس کا جواب اچھائی سے دیتے ہیں یا غصہ و درگزر اور صبر جمیل سے کام لیتے ہیں۔ جس طرح دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿لَا تَقْرَبُوا مَنَاسِكَ الْكَلْبَةِ وَلَا تَقْرَبُوا مَنَاسِكَ الْكَلْبَةِ وَلَا تَقْرَبُوا مَنَاسِكَ الْكَلْبَةِ﴾ (حم السجدة: ۳۳) ”برائی کا جواب ایسے طریقے سے دو جو اچھا ہو (اگر تم ایسا کرو گے) تو وہ شخص جو تمہارا دشمن ہے، ایسا ہو جائے گا گویا وہ تمہارا گمراہ دوست ہے“

(۵) یعنی جو ان اعلیٰ اخلاق کے حامل اور مذکورہ خوبیوں سے منصف ہوں گے، ان کے لیے عاقبت کا گھر ہے۔

(۶) عدن کے معنی ہیں اقامت۔ یعنی ہمیشہ رہنے والے باغات۔

(۷) یعنی اس طرح نیک قربت داروں کو آپس میں جمع کر دے گا تاکہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں حتیٰ کہ اونٹی درجے کے جنتی کو اعلیٰ درجہ عطا فرما دے گا تاکہ وہ اپنے قربت دار کے ساتھ جمع ہو جائے۔ فرمایا ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَبْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ﴾ (الطور: ۲۱)

”اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی تو ہم ملا دیں گے ان کے ساتھ ان کی اولاد کو اور ان کے عملوں سے ہم کچھ گھٹائیں گے نہیں۔“ اس سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ نیک رشتے داروں کو اللہ تعالیٰ جنت میں جمع فرما دے گا، وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی کے پاس ایمان اور عمل صالح کی پونجی نہیں ہوگی، تو وہ جنت میں نہیں جائے گا، چاہے اس کے دوسرے نہایت قریبی رشتے دار جنت میں چلے گئے ہوں۔ کیونکہ جنت میں داخلہ

سَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِمَا صَدَقْتُمْ فَيَغْمِ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۳۵﴾

کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو، صبر کے بدلے، کیا ہی اچھا
(بدلہ) ہے اس دارِ آخرت کا۔ (۳۴)

اور جو اللہ کے عہد کو اس کی مضبوطی کے بعد توڑ دیتے
ہیں اور جن چیزوں کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے
انہیں توڑتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، ان
کے لیے لعنتیں ہیں اور ان کے لیے برا گھر ہے۔ (۳۵) ^(۱)

اللہ تعالیٰ جس کی روزی چاہتا ہے بڑھاتا ہے اور
گھٹاتا ہے ^(۲) یہ تو دنیا کی زندگی میں مست ہو گئے۔ ^(۳)
حالانکہ دنیا آخرت کے مقابلے میں نہایت (حقیر) پونجی
ہے۔ (۳۶) ^(۴)

وَالَّذِينَ يَتَّقُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِمْ وَيَقْطَعُونَ
مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِمْ فَان يَفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ
لَهُمُ الْعَذَابُ وَاللَّهُ مُؤْتِي الدَّارِ ﴿۳۵﴾

أَلَمْ يَسْخَرِ اللَّهُ مِنْهُمْ لَمَّا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ وَفِي حُجُوبِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْأَرْضِ وَالْآخِرَةِ ﴿۳۶﴾

حسب نسب کی بنیاد پر نہیں، ایمان و عمل کی بنیاد پر ہو گا « مَنْ بَطَأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ » (صحیح مسلم)
کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن، جسے اس کا عمل پیچھے چھوڑ گیا، اس کا نسب اسے
آگے نہیں بڑھائے گا۔

(۱) یہ نیکوں کے ساتھ بروں کا حشر بیان فرما دیا تاکہ انسان اس حشر سے بچنے کی کوشش کرے۔
(۲) جب کافروں اور مشرکوں کے لیے یہ کہا کہ ان کے لیے برا گھر ہے، تو ذہن میں یہ اشکال آسکتا ہے کہ دنیا میں تو
انہیں ہر طرح کی آسائشیں اور سہولتیں مہیا ہیں۔ اس کے ازالے کے لیے فرمایا کہ دنیوی اسباب اور رزق کی کمی بیشی یہ
اللہ کے اختیار میں ہے وہ اپنی حکمت و مشیت، جس کو صرف وہی جانتا ہے، کے مطابق کسی کو زیادہ دیتا ہے کسی کو کم۔
رزق کی فراوانی، اس بات کی دلیل نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہے اور کسی کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر
ناراض ہے۔

(۳) کسی کو اگر دنیا کا مال زیادہ مل رہا ہے، باوجودیکہ وہ اللہ کا نافرمان ہے تو یہ مقام فرحت و مسرت نہیں، کیوں کہ یہ
استدراج ہے، مہلت ہے پتہ نہیں کب یہ مہلت ختم ہو جائے اور اللہ کی پکڑ کے شکنجے میں آجائے۔

(۴) حدیث میں آتا ہے کہ دنیا کی حیثیت، آخرت کے مقابلے میں اس طرح ہے جیسے کوئی شخص اپنی انگلی سمندر میں
ڈال کر نکالے، تو دیکھے سمندر کے پانی کے مقابلے میں اس کی انگلی میں کتنا پانی آیا ہے؟ (صحیح مسلم، کتاب
الجنة، باب فناء الدنيا وبيان الحشر يوم القيامة)، ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کا گزر بکری کے ایک مردہ بیچے کے پاس سے ہوا، تو اسے دیکھ کر آپ نے فرمایا، اللہ کی قسم دنیا، اللہ کے نزدیک اس سے
بھی زیادہ حقیر ہے جتنا یہ مردہ، اپنے مالکوں کے نزدیک اس وقت حقیر تھا جب انہوں نے اسے پھینکا۔ (صحیح مسلم،

کافر کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشانی (معجزہ) کیوں نازل نہیں کیا گیا؟ جو اب دے دیجئے کہ جسے اللہ گمراہ کرنا چاہے کر دیتا ہے اور جو اس کی طرف بھٹکے اسے راستہ دکھا دیتا ہے۔ (۲۷)

جو لوگ ایمان لائے ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ یاد رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو تسلی حاصل ہوتی ہے۔ (۲۸)^(۱)

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام بھی کیے ان کے لیے خوشحالی ہے^(۲) اور بہترین ٹھکانا۔ (۲۹)

اسی طرح ہم نے آپ کو اس امت میں بھیجا ہے^(۳) جس سے پہلے بہت سی امتیں گزر چکی ہیں کہ آپ انہیں ہماری طرف سے جو وحی آپ پر اترتی ہے پڑھ کر سنائیے یہ اللہ رحمن کے منکر ہیں،^(۴) آپ کہہ دیجئے کہ میرا پالنے والا تو وہی ہے اس کے سوا درحقیقت کوئی بھی لائق عبادت نہیں،^(۵) اسی کے اوپر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی جانب میرا رجوع ہے۔ (۳۰)

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّمَا اللَّهُ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَرَادَ ۝

الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ۝

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ ۝

كَذَٰلِكَ أَرْسَلْنَا فِي آيَاتِنَا أَنْتَ مِنْ قَبْلِهِ آمَمًا لِنَبِّئَهُمْ عَلَيْهِمُ الذِّكْرَ أَوْحِينَآ إِلَيْهِمْ هُمْ يَكْفُرُونَ يَا رَحْمَنُ قُلْ هُوَ يَرْزُقُ الْآلَةَ اللَّهُ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابٍ ۝

(۱) اللہ کے ذکر سے مراد اس کی توحید کا بیان ہے جس سے مشرکوں کے دلوں میں انتہا پس پیدا ہو جاتا ہے، یا اس کی عبادت، تلاوت قرآن، نوافل اور دعا و مناجات ہے جو اہل ایمان کے دلوں کی خوراک ہے یا اس کے احکام و فرامین کی اطاعت و بجا آوری ہے، جس کے بغیر اہل ایمان و تقویٰ بے قرار رہتے ہیں۔

(۲) طُوبَىٰ کے مختلف معانی بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً خیر، حسنی، کرامت، رشک، جنت میں مخصوص درخت یا مخصوص مقام وغیرہ۔ مفہوم سب کا ایک ہی ہے یعنی جنت میں اچھا مقام اور اس کی نعمتیں اور لذتیں۔

(۳) جس طرح ہم نے آپ کو تبلیغ رسالت کے لیے بھیجا ہے، اسی طرح آپ سے پہلی امتوں میں بھی رسول بھیجے تھے، ان کی بھی اسی طرح تکذیب کی گئی جس طرح آپ کی کی گئی اور جس طرح تکذیب کے نتیجے میں وہ قومیں عذاب الہی سے دوچار ہوئیں، انہیں بھی اس انجام سے بے فکر نہیں رہنا چاہیے۔

(۴) مشرکین مکہ رحمن کے لفظ سے بڑا بدکتے تھے، صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی جب بسم اللہ الرحمن الرحیم کے الفاظ لکھے گئے تو انہوں نے کہا یہ رحمن رحیم کیا ہے؟ ہم نہیں جانتے۔ (ابن کثیر)

(۵) یعنی رحمن، میرا وہ رب ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اگر (بافتراض) کسی قرآن (آسمانی کتاب) کے ذریعہ پہاڑ چلا دیے جاتے یا زمین ٹکڑے ٹکڑے کر دی جاتی یا مردوں سے باتیں کرا دی جاتیں (پھر بھی وہ ایمان نہ لاتے) بات یہ ہے کہ سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہے،^(۱) تو کیا ایمان والوں کو اس بات پر دل جمعی نہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تمام لوگوں کو ہدایت دے دے۔ کفار کو تو ان کے کفر کے بدلے ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی سخت سزا پہنچتی رہے گی یا ان کے مکانوں کے قریب نازل ہوتی رہے گی^(۲) تا وقتیکہ وعدہ الہی آپنچے۔^(۳) یقیناً اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ (۳۱)

یقیناً آپ سے پہلے کے پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا تھا اور میں نے بھی کافروں کو ڈھیل دی تھی پھر انہیں پکڑ لیا تھا، پس میرا عذاب کیسا رہا؟^(۴) (۳۲)

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِعَتْ بِهِ الْأَرْضُ
أَوْ خُلِجَ بِهِ الْهَوَىٰ بَلْ يَلْعَنُ أَلَمَ جَمِيعًا أَفَلَمْ يَلْمِزِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنْ
لَوْ شَاءَ اللَّهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا وَلَا لَكُنَّا أَهْلًا لَكُرْهُ أَفَتُؤْتِيهِمْ
مَاصِئُوا قَارِعَةً أَتَوَعَّلَ قُرْبَانًا فِي الْأَرْحَامِ وَاللَّهُ بِأَنَّ
اللَّهُ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ ۗ ﴿۳۱﴾

وَلَقَدْ آسَفْنَاهُ بِنُوحٍ إِذْ أَوْفَىٰ أَهْلًا لِّدِينِهِ لَكُفْرًا وَوَعَدَهُ
أَخَذْنَاهُمْ وَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۗ ﴿۳۲﴾

(۱) امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ہر آسمانی کتاب کو قرآن کہا جاتا ہے، جس طرح کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ”حضرت داؤد علیہ السلام، جانور کو تیار کرنے کا حکم دیتے اور اتنی دیر میں ایک مرتبہ قرآن کا ورد کر لیتے۔“ (صحیح بخاری۔ کتاب الأنبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ وآتینا داؤد زبوراً) یہاں ظاہر بات ہے قرآن سے مراد زبور ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ اگر پہلے کوئی آسمانی کتاب ایسی نازل ہوئی ہوتی کہ جسے سن کر پہاڑ رواں دواں ہو جاتے یا زمین کی مسافت طے ہو جاتی یا مردے بول اٹھتے، تو قرآن کریم کے اندر یہ خصوصیت بدرجہ اولیٰ موجود ہوتی، کیونکہ یہ اعجاز و بلاغت میں کچھلی تمام کتابوں سے فائق ہے۔ اور بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اگر اس قرآن کے ذریعے سے یہ معجزات ظاہر ہوتے، تب بھی یہ کفار ایمان نہ لاتے، کیوں کہ ایمان لانانہ لانا یہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے، معجزوں پر نہیں۔ اسی لیے فرمایا، سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

(۲) جو ان کے مشاہدے یا علم میں ضرور آئے گی تاکہ وہ عبرت پکڑ سکیں۔

(۳) یعنی قیامت واقع ہو جائے، یا اہل اسلام کو قطعی فتح و غلبہ حاصل ہو جائے۔

(۴) حدیث میں بھی آتا ہے «إِنَّ اللَّهَ يَمْلِكُ لِلظَّالِمِ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُغْلَبْهُ»، ”اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دے دیتا ہے حتیٰ کہ جب اسے پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں۔“ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی

آیا وہ اللہ جو تمہاری کرنے والا ہے ہر شخص کی، اس کے کیے ہوئے اعمال پر،^(۱) ان لوگوں نے اللہ کے شریک ٹھہرائے ہیں کہہ دیجئے ذرا ان کے نام تو لو،^(۲) کیا تم اللہ کو وہ باتیں بتاتے ہو جو وہ زمین میں جانتا ہی نہیں، یا صرف اوپری اوپری باتیں بتا رہے^(۳) ہو، بات اصل یہ ہے کہ کفر کرنے والوں کے لئے ان کے مکر سجادینے گئے ہیں،^(۴) اور وہ صحیح راہ سے روک دیئے گئے ہیں، اور جس کو اللہ گمراہ کر دے اس کو راہ دکھانے والا کوئی نہیں۔^(۵) (۳۳)

أَمَّنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَجَعَلْنَا لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا
قُلْ سَأَوَدُّ أَحَدًا عَلَى الْآخَرِ إِنِّي أَبْغِضُ الَّذِينَ يَبْغِضُونَ اللَّهَ
بَلْ نُبِذَ الَّذِينَ كَفَرُوا كَذَرِّ قَوْمٍ وَمِنَ الْفُضَيْلِ
يُضِلُّ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۝

﴿ وَكَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرْآنَ مِنْ رَبِّكَ وَبِهِ ظَالِمٌ لِّالْبِغَاءِ لَئِن أَخَذُوكَ بِالْبِغَاءِ سَيَدِينُهُ ﴾ [سورة هود- ۱۰۲]، اسی طرح تیرے رب کی پکڑ ہے جب وہ ظلم کی مرتکب ہستیوں کو پکڑتا ہے۔ یقیناً اس کی پکڑ بہت ہی الم ناک اور سخت ہے۔“ (صحیح بخاری تفسیر

سورة هود و مسلم، کتاب البر، باب تحريم الظلم)

(۱) یہاں اس کا جواب محذوف ہے۔ یعنی کیا اللہ رب العزت اور وہ معبودان باطل برابر ہو سکتے ہیں جن کی یہ عبادت کرتے ہیں، جو کسی کو نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ نقصان پہنچانے پر، نہ وہ دیکھتے ہیں اور نہ عقل و شعور سے بہرہ ور ہیں۔
(۲) یعنی ہمیں بھی بتاؤ تاکہ انہیں پہچان سکیں اس لیے کہ ان کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ اس لیے آگے فرمایا۔ کیا تم اللہ کو وہ باتیں بتاتے ہو جو وہ زمین میں جانتا ہی نہیں، یعنی ان کا وجود ہی نہیں۔ اس لیے کہ اگر زمین میں ان کا وجود ہوتا تو اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ضرور ہوتا، اس پر تو کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

(۳) یہاں ظاہر ظن کے معنی میں ہے یعنی یا یہ صرف ان کی ظنی باتیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم ان بتوں کی عبادت اس گمان پر کرتے ہو کہ یہ نفع نقصان پہنچا سکتے ہیں اور تم نے ان کے نام بھی معبود رکھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ”یہ تمہارے اور تمہارے باپوں کے رکھے ہوئے نام ہیں، جن کی کوئی دلیل اللہ نے نہیں اتاری۔ یہ صرف گمان اور خواہش نفس کی پیروی کرتے ہیں۔“ (النجم- ۲۲)

(۴) مکر سے مراد، ان کے وہ غلط عقائد و اعمال ہیں جن میں شیطان نے ان کو پھنسا رکھا ہے، شیطان نے گمراہیوں پر بھی حسین غلاف چڑھا رکھے ہیں۔

(۵) جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿ وَمَنْ يُؤْمِرِ اللَّهُ فَنُصِبْهُ قُلْنَا نَبِيِّكَ لَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ﴾ [سورة المائدة- ۳۱]، جس کو اللہ گمراہ کرنے کا ارادہ کر لے تو اللہ سے اس کے لیے کچھ اختیار نہیں رکھتا، اور فرمایا ﴿ إِنْ تَخِضُّوا عَلَىٰ هَذَا مِمَّنْ لَّيَنَّ اللَّهُ لَأَذِيدَنَّكُمْ مِنْ بُضَيْلٍ وَمِمَّا لَهُمْ مِنْ لُصُيُونٍ ﴾ [سورة النحل- ۳۷] ”اگر تم ان کی ہدایت کی خواہش رکھتے ہو تو (یا درکھو) اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دیتا جسے وہ گمراہ کرتا ہے اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔“

ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی عذاب ہے،^(۱) اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی زیادہ سخت ہے۔^(۲) انہیں اللہ کے غضب سے بچانے والا کوئی بھی نہیں۔ (۳۴)

اس جنت کی صفت، جس کا وعدہ پرہیزگاروں کو دیا گیا ہے یہ ہے کہ اس کے نیچے سے نہریں بہ رہی ہیں۔ اس کا میوہ بیشکی والا ہے اور اس کا سایہ بھی۔ یہ ہے انجام پرہیزگاروں کا،^(۳) اور کافروں کا انجام کار دوزخ ہے۔ (۳۵)

جنہیں ہم نے کتاب دی ہے^(۴) وہ تو جو کچھ آپ پر اتارا جاتا ہے اس سے خوش ہوتے ہیں^(۵) اور دوسرے فرتے اس کی بعض باتوں کے منکر ہیں۔^(۶) آپ اعلان کر دیجئے کہ مجھے تو صرف یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ شریک نہ کروں، میں اسی کی طرف بلا رہا ہوں اور اسی کی جانب میرا لوٹنا ہے۔ (۳۶)

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَعَذَابٌ الْآخِرَةِ أَشَقُّ وَمَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِن وَّاقٍ ﴿۳۴﴾

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ ۚ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ كُلُّهَا دَائِمٌ وَظِلُّهَا تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوْا وَعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

وَالَّذِينَ آمَنُوا لَهُمُ الْكِتَابُ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمِنَ الْأَنْبَاءِ مَنْ يُبْكَرُ بَعْضُهُمْ لِنِسَاءِ امْرَأَتِهِ إِن لَعَنَ اللَّهُ الْكُفْرَانَ وَالْأَشْرَكَ بِهٖ لِيَكُنَّ أَدْعُوًّا لِلَّهِ مَا ب ۙ ﴿۳۶﴾

(۱) اس سے مراد قتل اور اسیری ہے جو مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں ان کافروں کے حصے میں آتی ہے۔

(۲) جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لعان کرنے والے جوڑے سے فرمایا تھا «إِنَّ عَذَابَ الدُّنْيَا أَهْوَنُ مِنْ عَذَابِ الْآخِرَةِ» (صحیح مسلم۔ کتاب اللعان) ”دنیا کا عذاب، عذاب آخرت سے بہت ہلکا ہے“ علاوہ ازیں دنیا کا عذاب (جیسا کچھ اور جتنا کچھ بھی ہو) عارضی اور فانی ہے اور آخرت کا عذاب دائمی ہے، اسے زوال و فنا نہیں۔ مزید برآں جہنم کی آگ، دنیا کی آگ کی نسبت ۶۹ گنا تیز ہے۔ اور اسی طرح دوسری چیزیں ہیں۔ اس لیے عذاب کے سخت ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

(۳) اہل کفار کے انجام بد کے ساتھ اہل ایمان کا حسن انجام بیان فرما دیا تاکہ جنت کے حصول میں رغبت اور شوق پیدا ہو، اس مقام پر امام ابن کثیر نے جنت کی نعمتوں، لذتوں اور ان کی خصوصی کیفیات پر مشتمل احادیث بیان فرمائی ہیں، جنہیں وہاں ملاحظہ کر لیا جائے۔

(۴) اس سے مراد مسلمان ہیں اور مطلب ہے جو قرآن کے متقنا پر عمل کرتے ہیں۔

(۵) یعنی قرآن کے صدق کے دلائل و شواہد دیکھ کر مزید خوش ہوتے ہیں۔

(۶) اس سے مراد یہود و نصاریٰ اور کفار و مشرکین ہیں۔ بعض کے نزدیک کتاب سے مراد، تورات و انجیل ہے، ان میں سے جو مسلمان ہوئے، وہ خوش ہوتے ہیں اور انکار کرنے والے وہ یہود و نصاریٰ ہیں جو مسلمان نہیں ہوئے۔

اسی طرح ہم نے اس قرآن کو عربی زبان کا فرمان اتارا ہے۔^(۱) اگر آپ نے ان کی خواہشوں^(۲) کی پیروی کر لی اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے^(۳) تو اللہ (کے عذابوں) سے آپ کو کوئی حمایت ملے گا اور نہ بچانے والا۔^(۴) (۳۷)

ہم آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ہم نے ان سب کو بیوی بچوں والا بنایا تھا،^(۵) کسی رسول سے نہیں ہو سکتا کہ کوئی نشانی بغیر اللہ کی اجازت کے لے

وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا وَلَئِنْ اصَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ
بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ لَمَأَلَك مِنَ اللَّهِ مِنْ وَبِيلٍ
وَلَا وَاقٍ ۝

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا
وَذُرِّيَّةً وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ
اللَّهِ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ۝

(۱) یعنی جس طرح آپ سے پہلے رسولوں پر کتابیں مقامی زبانوں میں نازل کیں، اسی طرح آپ پر قرآن ہم نے عربی زبان میں اتارا، اس لیے کہ آپ کے مخاطب اولین اہل عرب ہیں، جو صرف عربی زبان ہی جانتے ہیں۔ اگر یہ قرآن کسی اور زبان میں نازل ہوتا تو ان کی سمجھ سے بالا ہوتا اور قبول ہدایت میں ان کے لیے عذر بن جاتا۔ ہم نے قرآن کو عربی میں اتار کر یہ عذر بھی دور کر دیا۔

(۲) اس سے مراد اہل کتاب کی بعض وہ خواہشیں ہیں جو وہ چاہتے تھے کہ پیغمبر آخر الزمان انہیں اختیار کریں۔ مثلاً بیت المقدس کو ہمیشہ کے لیے قبلہ بنانے رکھنا اور ان کے معتقدات کی مخالفت نہ کرنا وغیرہ۔

(۳) اس سے مراد وہ علم ہے جو وحی کے ذریعے سے آپ کو عطا کیا گیا جس میں اہل کتاب کے معتقدات کی حقیقت بھی آپ پر واضح کر دی گئی۔

(۴) یہ دراصل امت کے اہل علم کو تنبیہ ہے کہ وہ دنیا کے عارضی مفادات کی خاطر قرآن و حدیث کے واضح احکام کے مقابلے میں لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ لگیں، اگر وہ ایسا کریں گے تو انہیں اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔

(۵) یعنی آپ سمیت جتنے بھی رسول اور نبی آئے، سب بشر ہی تھے، جن کا اپنا خاندان اور قبیلہ تھا اور بیوی بچے تھے، وہ فرشتے تھے نہ انسانی شکل میں کوئی نوری مخلوق۔ بلکہ جنس بشر ہی میں سے تھے۔ کیونکہ اگر وہ فرشتے ہوتے تو انسانوں کے لیے ان سے مانوس ہونا اور ان کے قریب ہونا ناممکن تھا، جس سے ان کو بھیجنے کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا اور اگر وہ فرشتے، بشری جامے میں آتے، تو دنیا میں نہ ان کا خاندان اور قبیلہ ہوتا اور نہ ان کے بیوی بچے ہوتے۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ تمام انبیاء بہ حیثیت جنس کے، بشری تھے، بشری شکل میں فرشتے یا کوئی نوری مخلوق نہیں تھے، مذکورہ آیت میں آزا و اجاسے رہبانیت کی تردید اور ذُرِّيَّةً سے خاندانی منصوبہ بندی کی تردید بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ ذُرِّيَّةً جمع ہے کم از کم تین ہوں گے۔

آئے،^(۱) ہر مقررہ وعدے کی ایک لکھت ہے۔^(۲) (۳۸)
 اللہ جو چاہے مٹا دے اور جو چاہے ثابت رکھے، لوح
 محفوظ اسی کے پاس ہے۔^(۳) (۳۹)

ان سے کیے ہوئے وعدوں میں سے کوئی اگر ہم آپ کو
 دکھادیں یا آپ کو ہم فوت کر لیں تو آپ پر تو صرف پہنچا
 دینا ہی ہے۔ حساب تو ہمارے ذمہ ہی ہے۔ (۴۰)
 کیا وہ نہیں دیکھتے؟ کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے

يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُنشِئُ مَا يَشَاءُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ ﴿۳۸﴾

وَإِن مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ
 فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاءُ وَمَا لَنَا بِالْحِسَابِ ﴿۳۹﴾

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا وَإِنَّهَا لَكِنَّا

(۱) یعنی معجزات کا صدور، رسولوں کے اختیار میں نہیں کہ جب ان سے مطالبہ کیا جائے تو وہ اسے صادر کر کے دکھا دیں
 بلکہ یہ کلیتاً اللہ کے اختیار میں ہے وہ اپنی حکمت و مشیت کے مطابق فیصلہ کرتا ہے کہ معجزے کی ضرورت ہے یا نہیں؟
 اور اگر ہے تو کس طرح اور کب دکھایا جائے؟

(۲) یعنی اللہ نے جس چیز کا بھی وعدہ کیا ہے، اس کا ایک وقت مقرر ہے، اس وقت موعود پر اس کا وقوع ہو کر رہے گا
 اس لیے کہ اللہ کا وعدہ خلاف نہیں ہوتا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اصل عبارت لِكُلِّ كِتَابٍ
 آجَلٌ ہے۔ اور مطلب ہے کہ ہر وہ امر جسے اللہ نے لکھ رکھا ہے، اس کا ایک وقت مقرر ہے۔ یعنی معاملہ کفار کے
 ارادے اور فحشا پر نہیں بلکہ صرف اور صرف اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔

(۳) اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ وہ جس حکم کو چاہے منسوخ کر دے اور جسے چاہے باقی رکھے۔ دوسرے معنی ہیں کہ
 اس نے جو تقدیر لکھ رکھی ہے، اس میں وہ محو و اثبات کرتا رہتا ہے، اسی کے پاس لوح محفوظ ہے۔ اس کی تائید بعض
 احادیث و آثار سے ہوتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں آتا ہے کہ ”آدمی گناہوں کی وجہ سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے“
 دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے اور صلہ رحمی سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے“ (مسند احمد جلد ۵، ص ۲۷۷) بعض صحابہ سے یہ
 دعا منقول ہے «اللَّهُمَّ إِنْ كُنْتَ كَتَبْتَنَا مُشْقِيَاءَ فَأَمَحُنَا وَأَكْتَبْنَا سَعْدَاءَ، وَإِنْ كُنْتَ كَتَبْتَنَا سَعْدَاءَ فَأَكْتَبْنَا،
 فَإِنَّكَ تَمْحُو مَا تَشَاءُ وَتُنشِئُ وَعِنْدَكَ أُمُّ الْكِتَابِ». حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ وہ دوران طواف روتے
 ہوئے یہ دعا پڑھتے «اللَّهُمَّ إِنْ كُنْتَ كَتَبْتَ عَلَيَّ شِقْوَةً أَوْ ذَنْبًا فَأَمَحْنُهَا، فَإِنَّكَ تَمْحُو مَا تَشَاءُ وَتُنشِئُ، وَعِنْدَكَ
 أُمُّ الْكِتَابِ، فَاجْعَلْهُ سَعَادَةً وَمَغْفِرَةً» (ابن کثیر) ”اے اللہ اگر تو نے مجھ پر بد بختی اور گناہ لکھا ہے تو اسے مٹا دے، اس
 لیے کہ تو جو چاہے مٹائے اور جو چاہے باقی رکھے، تیرے پاس ہی لوح محفوظ ہے، پس تو بد بختی کو سعادت اور مغفرت سے
 بدل دے۔“ اس مفہوم پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ حدیث میں تو آتا ہے «جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَاتِبٌ» (صحیح بخاری۔ نمبر
 ۵۰۷۶) ”جو کچھ ہونے والا ہے، قلم اسے لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔“ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ محو و اثبات بھی منجملہ قضا و
 تقدیر ہی کے ہے۔ (فتح القدیر)

گھٹاتے چلے آرہے ہیں،^(۱) اللہ حکم کرتا ہے کوئی اس کے احکام پیچھے ڈالنے والا نہیں،^(۲) وہ جلد حساب لینے والا ہے۔ (۳۱)

ان سے پہلے لوگوں نے بھی اپنی مکاری میں کمی نہ کی تھی، لیکن تمام تدبیریں اللہ ہی کی ہیں،^(۳) جو شخص جو کچھ کر رہا ہے اللہ کے علم میں ہے۔^(۴) کافروں کو ابھی معلوم ہو جائے گا کہ (اس) جہان کی جزا کس کے لئے ہے؟ (۳۲)

یہ کافر کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول نہیں۔ آپ جواب دیجئے کہ مجھ میں اور تم میں اللہ گواہی دینے والا کافی ہے^(۵) اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔^(۶) (۳۳)

سورۃ ابراہیم کی ہے اور اس کی باون آیتیں اور سات رکوع ہیں

شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے۔

لَا مَعْشَرَ لِحَكِيمِهِ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا يَعْلَمُ مَا تَكْتُمُ كُلُّ نَفْسٍ وَنَسِيعَكُمْ الْكُفْرَ لِمَنْ عَقَبَى الدَّارِ ۝

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا أَلَسْتُمْ مُسْلِمِينَ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ۝



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

(۱) یعنی عرب کی سرزمین مشرکین پر بتدریج تنگ ہو رہی ہے اور اسلام کو غلبہ و عروج حاصل ہو رہا ہے۔

(۲) یعنی کوئی اللہ کے حکموں کو رد نہیں کر سکتا۔

(۳) یعنی مشرکین مکہ سے قبل بھی لوگ رسولوں کے مقابلے میں مکر کرتے رہے ہیں، لیکن اللہ کی تدبیر کے مقابلے میں ان کی کوئی تدبیر اور حیلہ کارگر نہیں ہوا، اسی طرح آئندہ بھی ان کا کوئی مکر اللہ کی مشیت کے سامنے نہیں ٹھہر سکے گا۔

(۴) وہ اس کے مطابق جزا اور سزا دے گا، نیک کو اس کی نیکی کی جزا اور بد کو اس کی بدی کی سزا۔

(۵) پس وہ جانتا ہے کہ میں اس کا سچا رسول اور اس کے پیغام کا داعی ہوں اور تم جھوٹے ہو۔

(۶) کتاب سے مراد جنس کتاب ہے اور مراد تورات اور انجیل کا علم ہے۔ یعنی اہل کتاب میں سے وہ لوگ جو مسلمان ہو گئے ہیں، جیسے عبداللہ بن سلام، سلمان فارسی اور تمیم داری وغیرہم رضی اللہ عنہم یعنی یہ بھی جانتے ہیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ عرب کے مشرکین اہم معاملات میں اہل کتاب کی طرف رجوع کرتے اور ان سے پوچھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی رہنمائی فرمائی کہ اہل کتاب جانتے ہیں، ان سے تم پوچھ لو۔ بعض کہتے ہیں کہ کتاب سے مراد قرآن ہے اور حاملین علم کتاب، مسلمان ہیں۔ اور بعض نے کتاب سے مراد لوح محفوظ لی ہے۔ یعنی جس کے پاس لوح محفوظ کا علم ہے یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ۔ مگر پہلا مفہوم زیادہ درست ہے۔

الراہیہ عالی شان کتاب ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے کہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے اجالے کی طرف لائیں، ان کے پروردگار کے حکم (۲) سے، زبردست اور تعریفوں والے اللہ کی طرف۔ (۱)

جس اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور کافروں کے لیے تو سخت عذاب کی خرابی ہے۔ (۲) جو آخرت کے مقابلے میں دنیوی زندگی کو پسند رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں ٹیڑھ پن پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ (۳) یہی لوگ پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں۔ (۳)

ہم نے ہر نبی کو اس کی قومی زبان میں ہی بھیجا ہے تاکہ ان کے سامنے وضاحت سے بیان کر دے۔ (۵) اب اللہ جسے چاہے گمراہ کر دے، اور جسے چاہے راہ دکھادے، وہ

الرَّسُولَ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ①

اللَّهُ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَوَيْلٌ لِّلْكَٰفِرِيْنَ مِنْ عٰذٰبِ شَرِيْٓدٍ ②
لَا يَذِيْبُ يَمِيْنًا يَمِيْنُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلٰى الْآٰخِرَةِ وَبِصَدٰقَتِنَا عَن سَبِيْلِ اللّٰهِ وَبِعٰوْنِهَا عٰوَجًا وَّلٰمَكًا فِىْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ③

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسٰنٍ قَوْمِهٖ يُبَيِّنُ لَہُمْ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ④

(۱) جس طرح دوسرے مقام پر بھی اللہ نے فرمایا۔ ﴿هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَى عَبْدٍ آٰيَاتٍ يَتَّبِعُنَّهَا لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ (سورۃ الحديد-۹) ”وہی ذات ہے جو اپنے بندے پر واضح آیات نازل فرماتی ہے تاکہ وہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لائے۔“ ﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ (البقرۃ -۲۵۷) ”اللہ ایمان داروں کا دوست ہے، وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے۔“

(۲) یعنی پیغمبر کا کام ہدایت کا راستہ دکھانا ہے لیکن اگر کوئی اس راستے کو اختیار کر لیتا ہے تو یہ صرف اللہ کے حکم اور مشیت سے ہوتا ہے کیونکہ اصل ہادی وہی ہے۔ اس کی مشیت اگر نہ ہو، تو پیغمبر کتنا بھی وعظ و نصیحت کر لے، لوگ ہدایت کا راستہ اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتے، جس کی متعدد مثالیں انبیائے سابقین میں موجود ہیں اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم باوجود شدید خواہش کے اپنے مہربان چچا ابوطالب کو مسلمان نہ کر سکے۔

(۳) اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں لوگوں کو بدظن کرنے کے لیے مین میکہ نکالتے اور انہیں مسخ کر کے پیش کرتے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اپنی اغراض و خواہشات کے مطابق اس میں تبدیلی کرنا چاہتے ہیں۔

(۴) اس لیے کہ ان میں مذکورہ متعدد خرابیاں جمع ہو گئی ہیں۔ مثلاً آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دینا، اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکنا اور اسلام میں کجی تلاش کرنا۔

(۵) پھر جب اللہ تعالیٰ نے اہل دنیا پر یہ احسان فرمایا کہ ان کی ہدایت کے لیے کتابیں نازل کیں اور رسول بھیجے، تو اس احسان کی تکمیل اس طرح فرمائی کہ ہر رسول کو قومی زبان میں بھیجا تاکہ کسی کو ہدایت کا راستہ سمجھنے میں دقت نہ ہو۔

غلبہ اور حکمت والا ہے۔^(۱) (۳)

(یاد رکھو جب کہ) ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ تو اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی میں نکال^(۲) اور انہیں اللہ کے احسانات یاد دلا۔^(۳) اس میں نشانیاں ہیں ہر ایک صبر شکر کرنے والے کے لیے۔^(۴) (۵)

جس وقت موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کے وہ احسانات یاد کرو جو اس نے تم پر کیے ہیں، جبکہ اس نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی جو تمہیں بڑے دکھ پہنچاتے تھے۔ تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ چھوڑتے تھے، اس میں تمہارے رب کی طرف سے تم پر بہت بڑی آزمائش^(۵) تھی۔ (۶)

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَذَكِّرْهُمْ بِآيَاتِهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ۝

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِذْ كُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَخْرَجَكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ السُّوءِ أَلْقَى بِكُمُ الْيَهُودَ وَأَنبَاءَهُمْ وَنِسَاءَهُمْ وَإِن فِي ذَلِكَ لَبَلَاءٌ لِّمَنْ رَزَقْتُمْ عَظِيمَةً ۝

(۱) لیکن اس بیان و تشریح کے باوجود ہدایت اسے ملے گی جسے اللہ چاہے گا۔

(۲) یعنی جس طرح اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو اپنی قوم کی طرف بھیجا اور کتاب نازل کی، تاکہ آپ اپنی قوم کو کفر و شرک کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی روشنی کی طرف لائیں۔ اسی طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو معجزات و دلائل دے کر ان کی قوم کی طرف بھیجا۔ تاکہ وہ انہیں کفر و جہل کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی روشنی عطا کریں۔ آیات سے مراد وہ معجزات ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیے گئے تھے، یا وہ نو معجزات ہیں جن کا ذکر سورہ بنی اسرائیل میں کیا گیا ہے۔

(۳) آیات اللہ سے مراد اللہ کے وہ احسانات ہیں جو بنی اسرائیل پر کیے گئے جن کی تفصیل پہلے کئی مرتبہ گزر چکی ہے۔ یا ایام و قائلع کے معنی میں ہے یعنی وہ واقعات ان کو یاد دلا، جن سے وہ گزر چکے ہیں جن میں ان پر اللہ تعالیٰ کے خصوصی انعامات ہوئے۔ جن میں سے بعض کا تذکرہ یہاں بھی آ رہا ہے۔

(۴) صبر اور شکر یہ دو بڑی خوبیاں ہیں اور ایمان کا دار ان پر ہے۔ اس لیے یہاں صرف ان دو کا تذکرہ کیا گیا ہے دونوں مبالغے کے صیغے ہیں۔ صبار، بہت صبر کرنے والا۔ شکور، بہت شکر کرنے والا۔ اور صبر کو شکر پر مقدم کیا ہے۔ اس لیے کہ شکر، صبر ہی کا نتیجہ ہے۔ حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”مومن کا معاملہ بھی عجب ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے جس امر کا بھی فیصلہ کرے، وہ اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے، اگر اسے تکلیف پہنچے اور وہ صبر کرے تو یہ بھی اس کے حق میں بہتر ہے اور اگر اسے کوئی خوشی پہنچے، وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرے تو یہ بھی اس کے حق میں بہتر ہے۔“

(صحیح مسلم، کتاب الزہد، باب ”المؤمن أمرہ کلہ خیر“)

(۵) یعنی جس طرح یہ ایک بہت بڑی آزمائش تھی اسی طرح اس سے نجات اللہ کا بہت بڑا احسان تھا۔ اسی لیے بعض مترجمین نے بلاء کا ترجمہ آزمائش اور بعض نے احسان کیا ہے۔

اور جب تمہارے پروردگار نے تمہیں آگاہ^(۱) کر دیا کہ اگر تم شکرگزاری کرو گے تو بیشک میں تمہیں زیادہ^(۲) دوں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو یقیناً میرا عذاب بہت سخت ہے۔^(۳) (۷)

موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کہ اگر تم سب اور روئے زمین کے تمام انسان اللہ کی ناشکری کریں تو بھی اللہ بے نیاز اور تعریفوں^(۴) والا ہے۔ (۸)

کیا تمہارے پاس تم سے پہلے کے لوگوں کی خبریں نہیں

وَاذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَیْنِ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَیْنِ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابَیْ لَشَدِيْدٌ ۝

وَقَالَ مُوسَىٰ اِنْ تَكْفُرُوْا اَنْتُمْ وَاَنْتُمْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝

اَلَمْ یَاۤءِظْمُ نَبُوْا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ فَاَوْفَوْا بِوَعْدِ اللّٰهِ

(۱) تَأَذَّنَ کے معنی اَعْلَمَكُمْ بُوْعْدِهِ لَكُمْ اس نے اپنے وعدے سے تمہیں آگاہ اور خبردار کر دیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ قسم کے معنی میں ہو یعنی جب تمہارے رب نے اپنی عزت و جلال اور کبریائی کی قسم کھا کر کہا۔ (ابن کثیر)

(۲) نعمت پر شکر کرنے پر مزید انعامات سے نوازوں گا۔

(۳) اس کا مطلب یہ ہوا کہ کفرانِ نعمت (ناشکری) اللہ کو سخت ناپسند ہے جس پر اس نے سخت عذاب کی وعید بیان فرمائی ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا کہ عورتوں کی اکثریت اپنے خاندانوں کی ناشکری کرنے کی وجہ سے جہنم میں جائے گی۔ (صحیح مسلم، العیدین، أوائل کتاب الصلوٰۃ)

(۴) مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ کی شکرگزاری کرے گا تو اس میں اسی کا فائدہ ہے۔ ناشکری کرے گا تو اللہ کا اس میں کیا نقصان ہے؟ وہ تو بے نیاز ہے۔ سارا جہان ناشکر گزار ہو جائے تو اس کا کیا بگڑے گا؟ جس طرح حدیث قدسی میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے 'يَاعِبَادِي! لَوْ اَنَّ اَوْلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ، وَاِنْسَكُمْ، وَاِنْسَكُمْ، كَانُوْا عَلٰی اَنْفِیْ قَلْبِ رَجُلٍ وَاَحِدٍ مِنْكُمْ، مَا زَادَ ذٰلِكَ فِیْ مُلْكِیْ سَيِّئًا، يَاعِبَادِي! لَوْ اَنَّ اَوْلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ، وَاِنْسَكُمْ، وَاِنْسَكُمْ، كَانُوْا عَلٰی اَفْجَرٍ قَلْبِ رَجُلٍ وَاَحِدٍ مِنْكُمْ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ فِیْ مُلْكِیْ سَيِّئًا، يَاعِبَادِي! لَوْ اَنَّ اَوْلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ، وَاِنْسَكُمْ، وَاِنْسَكُمْ، فَاَمَّا فِیْ صَعِيْدٍ وَاَحِدٍ، فَسَاۤءَ لُوْنِیْ فَاَعْطَيْتُ كُلَّ اِنْسَانٍ مَسْاَلَتَهُ، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُلْكِیْ سَيِّئًا، اِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ اِذَا اُدْخِلَ فِی الْبَحْرِ'. (صحیح مسلم، کتاب البس، باب تحريم الظلم) "اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور آخر اور اسی طرح تمام انسان اور جن، اس ایک آدمی کے دل کی طرح ہو جائیں، جو تم میں سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو (یعنی کوئی بھی نافرمان نہ رہے) تو اس سے میری حکومت اور بادشاہی میں اضافہ نہیں ہو گا۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول و آخر اور تمام انسان اور جن اس ایک آدمی کے دل کی طرح ہو جائیں، جو تم میں سب سے بڑا نافرمان اور فاجر ہو تو اس سے میری حکومت اور بادشاہی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول و آخر اور انسان و جن، سب ایک میدان میں جمع ہو جائیں اور مجھ سے سوال کریں، پس میں ہر انسان کو اس کے مطابق عطا کروں تو اس سے میرے خزانے اور بادشاہی میں اتنی ہی کمی ہوگی جتنی سوئی کے سمندر میں ڈبو کر نکالنے سے سمندر کے پانی میں ہوتی ہے"۔ فَسُبْحٰنَهُ وَتَعَالٰی الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ

آئیں؟ یعنی قوم نوح کی اور عاد و ثمود کی اور ان کے بعد والوں کی جنہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا، ان کے پاس ان کے رسول مجزے لائے، لیکن انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں دبالیے^(۱) اور صاف کہہ دیا کہ جو کچھ تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے ہم اس کے منکر ہیں اور جس چیز کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو ہمیں تو اس میں بڑا بھاری شبہ^(۲) ہے (۹)

ان کے رسولوں نے انہیں کہا کہ کیا حق تعالیٰ کے بارے میں تمہیں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے وہ تو تمہیں اس لیے بلا رہا ہے کہ تمہارے تمام گناہ معاف فرما دے،^(۳) اور ایک مقرر وقت تک تمہیں مہلت عطا فرمائے، انہوں نے کہا کہ تم تو ہم جیسے ہی انسان ہو^(۴) تم چاہتے ہو کہ ہمیں ان خداؤں کی عبادت سے روک دو جن کی عبادت ہمارے باپ

وَصَوَدَةٌ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَمَا يَعْلَمُوهُ
إِلَّا اللَّهُ حَاجَّةٌ تَهْمُرُ رُسُلَهُمْ يَا بَيِّنَاتٍ فَرُدُّو
أَيْدِيَهُمْ فِي أَقْوَابِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُمْ
بِهِ وَإِنَّا لَعَلَىٰ شَيْكٍ مِمَّا تَدْعُونَ إِنَّا لَنَرِيكُمْ مُؤْتَبِرًا ①

قَالَتْ رُسُلُهُمْ إِنِّي اللَّهُ شَيْكٌ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضِ يَدْعُوكُمْ لِيُبْعَثَ لَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّتِكُمْ
وَيُؤَخَّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى قَالُوا إِنَّا أَنْتُمْ
إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّوا عَمَّا
كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا قَالُوا نَبْسُلُنِ مُبْتَلِينَ ②

(۱) مفسرین نے اس کے مختلف معانی بیان کیے ہیں۔ ۱- مثلاً انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں رکھ لیے اور کہا کہ ہمارا تو صرف ایک ہی جواب ہے کہ ہم تمہاری رسالت کے منکر ہیں۔ ۲- انہوں نے اپنی انگلیوں سے اپنے مونہوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ خاموش رہو اور یہ جو پیغام لے کر آئے ہیں ان کی طرف توجہ مت کرو۔ ۳- انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں پر استہزا اور تعجب کے طور پر رکھ لیے جس طرح کوئی شخص ہنسی ضبط کرنے کے لیے ایسا کرتا ہے۔ ۴- انہوں نے اپنے ہاتھ رسولوں کے مونہوں پر رکھ کر کہا خاموش رہو۔ ۵- بطور غیظ و غضب کے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں لے لیے۔ جس طرح منافقین کی بابت دوسرے مقام پر آتا ہے۔ ﴿عَصَا عَنكِكُمُ الْكَاذِبِينَ مِنَ الْغَيْظِ﴾ (آل عمران۔ ۱۱۹) ”وہ تم پر اپنی انگلیاں غیظ و غضب سے کالتے ہیں“۔ امام شوکانی اور امام طبری نے اسی آخری معنی کو ترجیح دی ہے۔

(۲) مُرْتَبٌ، یعنی ایسا شک کہ جس سے نفس سخت قلق اور اضطراب میں مبتلا ہے۔

(۳) یعنی تمہیں اللہ کے بارے میں شک ہے، جو آسمان و زمین کا خالق ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایمان و توحید کی دعوت بھی صرف اس لیے دے رہا ہے کہ تمہیں گناہوں سے پاک کر دے۔ اس کے باوجود تم اس خالق ارض و سما کو ماننے کے لیے تیار نہیں اور اس کی دعوت سے تمہیں انکار ہے؟

(۴) یہ وہی اشکال ہے جو کافروں کو پیش آتا رہا کہ انسان ہو کر کس طرح کوئی وحی الہی اور نبوت و رسالت کا مستحق ہو سکتا ہے؟

دادا کرتے رہے۔^(۱) اچھا تو ہمارے سامنے کوئی کھلی دلیل پیش کرو۔^(۲) (۱۰)

ان کے پیغمبروں نے ان سے کہا کہ یہ تو سچ ہے کہ ہم تم جیسے ہی انسان ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنا فضل کرتا ہے۔^(۳) اللہ کے حکم کے بغیر ہماری مجال نہیں کہ ہم کوئی معجزہ تمہیں لا دکھائیں^(۴) اور ایمان والوں کو صرف اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔^(۵) (۱۱)

آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر بھروسہ نہ رکھیں جبکہ اسی نے ہمیں ہماری راہیں بھائی ہیں۔ واللہ جو ایذا نہیں تم ہمیں دو گئے ہم ان پر صبر ہی کریں گے۔ توکل کرنے والوں کو یہی لائق ہے کہ اللہ ہی پر توکل کریں۔^(۶) (۱۲) کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تمہیں ملک بدر

قَالَتْ لَهُمْ رَسُولُهُمْ لَنْ نَسْأَلَكُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَنْزِلُ عَلَيَّ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَعَلَى اللَّهِ قَلْبَتُوْكَلِّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۱

وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَّوَكَّلَ عَلَى اللَّهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا وَلَنْ يُفْلِتِيَ عَلَيَّ مَا أَذَيْتُمُونَا وَعَلَى اللَّهِ قَلْبَتُوْكَلِّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝۱۲

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُصْرَتُنَا مِن آٰضِنَا أَوْ

(۱) یہ دوسری رکاوٹ ہے کہ ہم ان معبودوں کی عبادت کس طرح چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے آبا و اجداد کرتے رہے ہیں؟ جب کہ تمہارا مقصد ہمیں ان کی عبادت سے ہٹا کر الہ واحد کی عبادت پر لگانا ہے۔

(۲) دلائل و معجزات تو ہر نبی کے ساتھ ہوتے تھے، اس سے مراد ایسی دلیل یا معجزہ ہے جس کے دیکھنے کے وہ آرزو مند ہوتے تھے، جیسے مشرکین مکہ نے حضور ﷺ سے مختلف قسم کے معجزات طلب کیے تھے، جس کا تذکرہ سورہ بنی اسرائیل میں آئے گا۔

(۳) رسولوں نے پہلے اشکال کا جواب دیا کہ یقیناً ہم تمہارے جیسے بشر ہی ہیں۔ لیکن تمہارا یہ سمجھنا غلط ہے کہ بشر رسول نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت کے لیے انسانوں میں سے ہی بعض انسانوں کو وحی و رسالت کے لیے چن لیتا ہے اور تم سب میں سے یہ احسان اللہ نے ہم پر فرمایا ہے۔

(۴) ان کے حسب فشا معجزے کے سلسلے میں رسولوں نے جواب دیا کہ معجزے کا صدور ہمارے اختیار میں نہیں، یہ صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔

(۵) یہاں مومنین سے مراد اولاً خود انہی ہیں، یعنی ہمیں سارا بھروسہ اللہ پر ہی رکھنا چاہیے۔ جیسا کہ آگے فرمایا ”آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ پر بھروسہ نہ رکھیں۔“

(۶) کہ وہی کفار کی شرارتوں اور سفاحتوں سے بچانے والا ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہم سے معجزات طلب نہ کریں، اللہ پر توکل کریں، اس کی مشیت ہوگی تو معجزہ ظاہر فرمادے گا ورنہ نہیں۔

کر دیں گے یا تم پھر سے ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ۔ تو ان کے پروردگار نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہی عارت کر دیں گے۔ (۱۳)^(۱)

اور ان کے بعد ہم خود تمہیں اس زمین میں بسائیں گے۔ (۲) یہ ہے ان کے لیے جو میرے سامنے کھڑے ہونے کا ڈر رکھیں اور میری وعید سے خوفزدہ رہیں۔ (۳)^(۳)

اور انہوں نے فیصلہ طلب کیا (۴)^(۴) اور تمام سرکش ضدی لوگ نامراد ہو گئے۔ (۱۵)

اس کے سامنے دوزخ ہے جہاں وہ پیپ کا پانی پلایا جائے

لَتَعُوذَنَّ فِي مَا كَلِمَاتٍ، فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَتَمَلِكَنَّ
الظَّالِمِينَ ﴿۱۳﴾

وَلَتَسْلُكَنَّهُمُ الْأَرْضُ مِنَ بَعْدِهِمْ ذَلِكَ لِمَنْ خَافَ
مَعَانِيَ وَعَادَ وَعَدِيدًا ﴿۱۴﴾

وَأَسْتَغْفِرُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿۱۵﴾

مِنْ ذُنُوبِهِمْ جَهَنَّمَ وَيُسْقَوْنَ مِنْ مَّاءٍ صَدِيدٍ ﴿۱۶﴾

(۱) جیسے اور بھی کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلَقَدْ سَبَّحْتَ كَلِمَاتًا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ﴾ ﴿إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمُرْسَلُونَ﴾ ﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرثُهَا عِبَادِيَ
الظَّالِمُونَ﴾ ﴿الأنبياء، ۱۰۵﴾ ”ہم نے لکھ دیا زبور میں، نصیحت کے پیچھے کہ آخر زمین کے وارث ہوں گے
میرے نیک بندے۔“ (مزید دیکھئے سورۃ الاعراف ۱۳۸، ۱۳۷) چنانچہ اس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ
وسلم کی مدد فرمائی، آپ کو بادل نخواستہ کے سے نکلنا پڑا لیکن چند سالوں کے بعد ہی آپ فاتحانہ مکہ میں داخل ہوئے اور
آپ کو نکلنے پر مجبور کرنے والے ظالم مشرکین سر جھکائے، کھڑے آپ کے اشارہ ابرو کے منتظر تھے۔ لیکن آپ ﷺ
نے خلق عظیم کا مظاہرہ کرتے ہوئے لَا تَقْرَبُ عَلَيْهِمْ كَمَا كَرَسَبُ كَوْمَعَفٍ فرمایا۔ صَلَوَاتُ اللَّهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ .

(۲) یہ مضمون بھی اللہ نے کئی مقامات پر بیان فرمایا ہے مثلاً ﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرثُهَا عِبَادِيَ
الظَّالِمُونَ﴾ ﴿الأنبياء، ۱۰۵﴾ ”ہم نے لکھ دیا زبور میں، نصیحت کے پیچھے کہ آخر زمین کے وارث ہوں گے
میرے نیک بندے۔“ (مزید دیکھئے سورۃ الاعراف ۱۳۸، ۱۳۷) چنانچہ اس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ
وسلم کی مدد فرمائی، آپ کو بادل نخواستہ کے سے نکلنا پڑا لیکن چند سالوں کے بعد ہی آپ فاتحانہ مکہ میں داخل ہوئے اور
آپ کو نکلنے پر مجبور کرنے والے ظالم مشرکین سر جھکائے، کھڑے آپ کے اشارہ ابرو کے منتظر تھے۔ لیکن آپ ﷺ
نے خلق عظیم کا مظاہرہ کرتے ہوئے لَا تَقْرَبُ عَلَيْهِمْ كَمَا كَرَسَبُ كَوْمَعَفٍ فرمایا۔ صَلَوَاتُ اللَّهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ .

(۳) جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ﴾ ﴿فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ﴾ ﴿النازعات، ۴۰﴾ ”جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اپنے نفس کو خواہش سے روکے رکھا، یقیناً جنت
اس کا ٹھکانہ ہے۔“ ﴿وَلَمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَمِيلًا﴾ ﴿الرحمن، ۳۶﴾ ”جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا، اس
کے لیے دو جنتیں ہیں۔“

(۴) اس کا فاعل ظالم مشرک بھی ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے بالآخر اللہ سے فیصلہ طلب کیا۔ یعنی اگر یہ رسول چچے ہیں تو یا
اللہ ہم کو اپنے عذاب کے ذریعے سے ہلاک کر دے جیسے مشرکین مکہ نے کہا۔ ﴿اللَّهُمَّ إِنَّكَ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ
عِنْدِكَ فَأَمَطْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ وَأَوْدِعْنَا بَعْدَ آيَاتِكَ الْيَوْمِ﴾ ﴿سورۃ الأنفال، ۳۲﴾ ”اور جب کہ ان لوگوں نے کہا، اے
اللہ! اگر یہ قرآن آپ کی طرف سے واقعی ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسایا ہم پر کوئی دردناک عذاب واقع کر دے۔“ یا

گا۔^(۱)

جسے بمشکل گھونٹ گھونٹ پئے گا۔ پھر بھی اسے گلے سے اتار نہ سکے گا اور اسے ہر جگہ سے موت آتی دکھائی دے گی لیکن وہ مرنے والا نہیں۔^(۲) پھر اس کے پیچھے بھی سخت عذاب ہے۔ (۱۷)

ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اپنے پالنے والے سے کفر کیا، ان کے اعمال مثل اس راہک کے ہیں جس پر تیز ہوا آندھی والے دن چلے۔^(۳) جو بھی انہوں نے کیا اس میں سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے، یہی دور کی گمراہی ہے۔ (۱۸)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو بہترین تدبیر کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور نئی مخلوق لائے۔ (۱۹)

اللہ پر یہ کام کچھ بھی مشکل نہیں۔^(۴) سب کے سب اللہ کے سامنے روبرو کھڑے ہوں گے۔^(۵) اس وقت کمزور لوگ بڑائی والوں سے کہیں گے کہ ہم تو

يَجْمَعُهُمْ وَيَكَادِبُهُمْ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُمْ بِبِصِيرِينَ ۝ وَإِلَيْهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَإِعْتَادَهُمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُمْ كُرْسِيًّا مَشِيدًا ۝ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ يَوْمَ حَالِصِينَ لَا يَقْدِرُونَ وَمَا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ۝ ذَلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ۝

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَمْدِ إِنَّ يَشَاءُ يَنْزِعُهُمْ وَيَأْتِي بِعَذَابٍ جَدِيدٍ ۝

وَمَا ذَلِكَ عَلَىٰ اللَّهِ بِعَزِيزٍ ۝ وَرَوَّادِ اللَّهِ جَمِيعًا فَقَالَ الضُّعْفُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ مُقْتُونَ عِثْمَانًا وَعَذَابِ اللَّهِ مِنْ

جس طرح جنگ بدر کے موقع پر بھی مشرکین مکہ نے اسی قسم کی آرزو کی تھی جس کا ذکر اللہ نے (الأنفال-۱۹) میں کیا ہے۔ یا اس کا فاعل رسول ہوں کہ انہوں نے اللہ سے فتح و نصرت کی دعائیں کیں، جنہیں اللہ نے قبول کیا۔

(۱) صَدِيدٌ پِيب اور خون جو جہنیوں کے گوشت اور ان کی کھالوں سے بہا ہو گا۔ بعض احادیث میں اسے «عَصَاةٌ» اهل النار (مسند احمد جلد-۵، صفحہ-۱۷۱) (جہنیوں کے جسم سے نچوڑا ہوا) اور بعض احادیث میں ہے کہ یہ صدید اتنا گرم اور کھولتا ہوا ہو گا کہ ان کے منہ کے قریب پہنچتے ہی ان کے چہرے کی کھال جھلس کر گر پڑے گی اور اس کا ایک گھونٹ پیتے ہی ان کے پیٹ کی آنتیں پاخانے کے راستے باہر نکل پڑیں گی۔ «أَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ» .

(۲) یعنی انواع و اقسام کے عذاب چھک چھک کر وہ موت کی آرزو کرے گا۔ لیکن 'موت وہاں کہاں؟ وہاں تو اسی طرح دائمی عذاب ہو گا۔

(۳) قیامت والے دن کافروں کے عملوں کا بھی یہی حال ہو گا کہ اس کا کوئی اجر و ثواب انہیں نہیں ملے گا۔

(۴) یعنی اگر تم نافرمانیوں سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ وہ تمہیں ہلاک کر کے، تمہاری جگہ نئی مخلوق پیدا کر دے۔ (یہی مضمون اللہ نے سورۃ فاطر-۱۵، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰ میں بھی بیان کیا ہے۔)

(۵) یعنی سب میدان محشر میں اللہ کے روبرو ہوں گے، کوئی کہیں چھپ نہ سکے گا۔

تمہارے تابعدار تھے، تو کیا تم اللہ کے عذابوں میں سے کچھ عذاب ہم سے دور کر سکتے والے ہو؟ وہ جواب دیں گے کہ اگر اللہ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم بھی ضرور تمہاری رہنمائی کرتے، اب تو ہم پر بے قراری کرنا اور صبر کرنا دونوں ہی برابر ہے ہمارے لیے کوئی چھکارا نہیں۔^(۱) (۲۱)

جب اور کام کا فیصلہ کر دیا جائے گا تو شیطان^(۲) کے گاکہ اللہ نے تو تمہیں سچا وعدہ دیا تھا اور میں نے تم سے جو وعدے کیے تھے ان کا خلاف کیا،^(۳) میرا تم پر کوئی دباؤ تو تھا ہی نہیں،^(۴) ہاں میں نے تمہیں پکارا اور تم نے میری مان لی،^(۵) پس تم مجھے الزام نہ لگاؤ بلکہ خود اپنے آپ کو

بَشَرًا مِّمَّنْ خَلَقْنَا اللَّهُ سَاءَ لَكُمْ هَدًى يَسْتَأْذِنُ بَعْضُهُم مِّنْ بَعْضٍ لَّيْسَ بِيَدِهِمُ الْغَوْظُ وَمَا يَأْمُرُكُمْ إِلَّا لِتَتَّقُوا وَاللَّهُ يَتَّقُوا لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۲۱﴾

وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعَدَ الْحَقُّ وَعَدَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُمُونِي وَلَا مَوْلَايَ أَنفُسَكُمْ مَا أَنَا بِمُصَوِّرِكُمْ وَمَا أَنْتُمْ بِمُصَوِّرِي إِنْ تَلُمْتُمْ إِنَّمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۲۲﴾

(۱) بعض کہتے ہیں کہ جنسی آپس میں کہیں گے کہ جنتیوں کو جنت اس لیے ملی کہ وہ اللہ کے سامنے روتے اور گڑ گڑاتے تھے، آؤ ہم بھی اللہ کی بارگاہ میں آہ و زاری کریں چنانچہ وہ روئیں گے اور خوب آہ و زاری کریں گے۔ لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا، پھر کہیں گے کہ جنتیوں کو جنت ان کے صبر کرنے کی وجہ سے ملی، چلو ہم بھی صبر کرتے ہیں، پھر وہ صبر کا بھرپور مظاہرہ کریں گے، لیکن اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا، پس اس وقت وہ کہیں گے کہ ہم صبر کریں یا جزع و فزع، اب چھکارے کی کوئی صورت نہیں۔ یہ ان کی باہمی گفتگو جنم کے اندر ہو گی۔ قرآن کریم میں اس کو اور بھی کئی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ مومن ۴۷-۴۸، سورہ اعراف ۳۸-۳۹، سورہ الاحزاب ۶۶-۶۸۔ اس کے علاوہ وہ آپس میں جھگڑیں گے بھی اور ایک دوسرے پر گمراہ کرنے کا الزام دھریں گے۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ جھگڑا میدان محشر میں ہو گا۔ اس کی مزید تفصیل اللہ تعالیٰ نے سورہ سبأ ۳۱-۳۳ میں بیان فرمائی ہے۔

(۲) یعنی اہل ایمان جنت میں اور اہل کفر و شرک جنم میں چلے جائیں گے تو شیطان جنمیوں سے کہے گا۔

(۳) اللہ نے جو وعدے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے کہے تھے کہ نجات میرے پیغمبروں پر ایمان لانے میں ہے، وہ حق تھے ان کے مقابلے میں میرے وعدے تو سراسر دھوکہ اور فریب تھے۔ جس طرح اللہ نے فرمایا ﴿يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا﴾ (النساء: ۱۲۰) ”شیطان ان سے وعدے کرتا اور آرزوئیں دلاتا ہے لیکن شیطان کے یہ وعدے محض دھوکہ ہیں۔“

(۴) دوسرا یہ کہ میری باتوں میں کوئی دلیل و حجت نہیں ہوتی تھی، نہ میرا کوئی دباؤ ہی تم پر تھا۔

(۵) ہاں میری صرف دعوت اور پکار تھی، تم نے میری بے دلیل پکار کو تو مان لیا اور پیغمبروں کی دلیل و حجت سے بھرپور باتوں کو رد کر دیا۔

عَدَابِ الْيَوْمِ ۳۲

ملا مت کرو،^(۱) نہ میں تمہارا فریاد رس اور نہ تم میری فریاد کو پہنچنے والے،^(۲) میں تو سرے سے مانتا ہی نہیں کہ تم مجھے اس سے پہلے اللہ کا شریک مانتے رہے،^(۳) یقیناً ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔^(۴) (۲۲)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہ ان جنتوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے چشمے جاری ہیں جہاں انہیں ہیشگی ہوگی اپنے رب کے حکم سے۔^(۵) جہاں ان کا خیر مقدم سلام سے ہوگا۔^(۶) (۲۳)

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ بات کی مثال کس طرح بیان فرمائی، مثل ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑ مضبوط ہے اور جس کی ٹہنیاں آسمان میں ہیں۔ (۲۴)

جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت اپنے پھل لاتا^(۷)

وَأُدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ يَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا يَذُوقُونَ مِنْهَا مِمَّا حَبِطَتْ فِيهَا سُلُوفٌ ۳۳

الَّذِي تَرَكَيْتَ فَرَجَ اللَّهُ مِثْلًا مِثْلَ كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ كَتَجْرَةً طَيِّبَةً أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۳۴

تُؤْتِي أَكْثَرَهَا ثَمَرًا يَأْذُنُونَ لَهَا وَيُضْرَبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ

(۱) اس لیے کہ قصور سارا تمہارا اپنا ہی ہے، تم نے عقل و شعور سے ذرا کام نہ لیا، دلائل واضح کو تم نے نظر انداز کر دیا، اور مجرد دعوے کے پیچھے لگے رہے، جس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں تھی۔

(۲) یعنی نہ میں تمہیں اس عذاب سے نکلوا سکتا ہوں جس میں تم مبتلا ہو اور نہ تم اس قہر و غضب سے مجھے بچا سکتے ہو جو اللہ کی طرف سے مجھ پر ہے۔

(۳) مجھے اس بات سے بھی انکار ہے کہ میں اللہ کا شریک ہوں، اگر تم مجھے یا کسی اور کو اللہ کا شریک گردانتے رہے تو تمہاری اپنی غلطی اور نادانی تھی، جس اللہ نے ساری کائنات بنائی تھی اور اس کی تدبیر بھی وہی کرتا رہا، بھلا اس کا کوئی شریک کیوں کر ہو سکتا تھا؟

(۴) بعض کہتے ہیں کہ یہ جملہ بھی شیطان ہی کا ہے اور یہ اس کے مذکورہ خطبے کا تتمہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ شیطان کا کلام من قبل پر ختم ہو گیا، یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

(۵) یہ اہل شقاوت و اہل کفر کے مقابلے میں اہل سعادت اور اہل ایمان کا تذکرہ ہے۔ ان کا ذکر ان کے ساتھ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کے اندر اہل ایمان والا کردار اپنانے کا شوق و رغبت پیدا ہو۔

(۶) یعنی آپس میں ان کا تحفہ ایک دوسرے کو سلام کرنا ہوگا۔ علاوہ ازیں فرشتے بھی ہر دروازے سے داخل ہو کر انہیں سلام عرض کریں گے۔

(۷) اس کا مطلب ہے کہ مومن کی مثال اس درخت کی طرح ہے، جو گرمی ہو یا سردی ہر وقت پھل دیتا ہے۔ اسی طرح مومن کے اعمال صالحہ شب و روز کے لمحات میں ہر آن اور ہر گھڑی آسمان کی طرف لے جائے جاتے ہیں۔ کَلِمَةً طَيِّبَةً سے

ہے، اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ (۲۵)

اور ناپاک بات کی مثال گندے درخت جیسی ہے جو زمین کے کچھ ہی اوپر سے اکھاڑ لیا گیا۔ اسے کچھ ثبات تو ہے نہیں۔^(۱) (۲۶)

ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کی بات کے ساتھ مضبوط رکھتا ہے، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی،^(۲) ہاں ناانصاف لوگوں کو اللہ برکا دیتا ہے اور اللہ جو چاہے کر گزرے۔ (۲۷)

لِنَاسٍ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۵﴾

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ ۖ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۗ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ﴿۲۷﴾

اسلام، یا لا الہ الا اللہ اور شجرہ طیبہ سے کھجور کا درخت مراد ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الفہم فی العلم ومسلم، کتاب صفة القيامة، باب مثل المؤمن مثل النخلة)

(۱) کلمہ خبیثہ سے مراد کفر اور شجرہ خبیثہ سے حنظل (اندرائن) کا درخت مراد ہے۔ جس کی جڑ زمین کے اوپر ہی ہوتی ہے اور ذرا سے اشارے سے اکھڑ جاتی ہے۔ یعنی کافر کے اعمال بالکل بے حیثیت ہیں۔ نہ وہ آسمان پر چڑھتے ہیں، نہ اللہ کی بارگاہ میں وہ قبولیت کا درجہ پاتے ہیں۔

(۲) اس کی تفسیر حدیث میں اس طرح آتی ہے کہ ”موت کے بعد قبر میں جب مسلمان سے سوال کیا جاتا ہے، تو وہ جواب میں اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ پس یہی مطلب ہے اللہ کے اس فرمان ﴿يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ کا (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ ابراہیم، صحیح مسلم، کتاب الجنۃ و صفة نعیمہا، باب عرض مقعد المیت علیہ واثبات عذاب القبر) ایک اور حدیث میں ہے کہ ”جب بندے کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی چلے جاتے ہیں اور وہ ان کے جو توں کی آہٹ سنتا ہے۔ پس اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے اٹھا کر اس سے پوچھتے ہیں کہ اس شخص کے بارے میں تیری کیا رائے ہے، وہ مومن ہوتا ہے تو جواب دیتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ فرشتے اسے جنم کا ٹھکانہ دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ نے اس کی جگہ تیرے لیے جنت میں ٹھکانہ بنا دیا ہے۔ پس وہ دونوں ٹھکانے دیکھتا ہے اور اس کی قبر ستر ہاتھ کشادہ کر دی جاتی ہے اور اس کی قبر کو قیامت تک نعمتوں سے بھر دیا جاتا ہے۔“ (صحیح مسلم، باب مذکور) ایک اثر میں ہے، اس سے پوچھا جاتا ہے مَنْ رَبُّكَ؟ مَا دِينُكَ؟ مَنْ نَبِيُّكَ؟ تیرا رب کون ہے، تیرا دین کیا ہے اور تیرا پیغمبر کون ہے؟ پس اللہ تعالیٰ اسے ثابت قدمی عطا فرماتا ہے اور وہ جواب دیتا ہے رَبِّيَ اللَّهُ (میرا رب اللہ ہے) وَدِينِيَّ الْإِسْلَامَ (میرا دین اسلام ہے) وَنَبِيِّيَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (اور میرے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں)۔ (تفسیر ابن کثیر)

کیا آپ نے ان کی طرف نظر نہیں ڈالی جنہوں نے اللہ کی نعمت کے بدلے ناشکری کی اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لا آتارا۔^(۱) (۲۸)

یعنی دوزخ میں جس میں یہ سب جائیں گے، جو بدترین ٹھکانا ہے۔ (۲۹)

انہوں نے اللہ کے ہمسربنا لیے کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے ہٹائیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ خیر مزے کرو تمہاری بازگشت تو آخر جہنم ہی ہے۔ (۳۰)^(۲)

میرے ایمان والے بندوں سے کہہ دیجئے کہ نمازوں کو قائم رکھیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے رہیں اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی نہ دوستی اور محبت۔ (۳۱)^(۳)

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور آسمانوں سے بارش برسا کر اس کے ذریعے سے تمہاری روزی کے لیے پھل نکالے ہیں اور کشتیوں کو تمہارے بس

أَلَمْ نَرِ الْآذِينَ بَدَلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَكَلُوا قَوْمَهُمْ
دَارَ الْبُورِ ۝

جَعَلَهُمْ قِصَّةً وَمَثَلًا لِّلْقَارِئِ ۝

وَجَعَلُوا لِلَّهِ انْدَادًا لِّلضَّلَاطِ عَن سَبِيلِهِ ۝

قُل تَسْبِعُوا فَإِن مَّصِيْرَكُمْ إِلَى النَّارِ ۝

قُل لِّعِبَادِي الَّذِينَ آمَنُوا قِيَمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا زَكَاةَ

وَمَذَرُوا قَوْمَهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَهُمْ

يَوْمَ لَا يَصْعُقُ فِيهِ وُجُوهُكُمْ ۝

أَلَمْ نَكْنِزْ لِّلَّذِينَ آمَنُوا خِزْيَانًا مِّن بَدْرٍ وَأَنزَلْنَا

مِن السَّمَاءِ مَاءً فَاصْوَاهُ بِمَن السَّمَوَاتِ رِيًّا قَالُوا

وَسَحَابٌ مَّرْكُومٌ ۝ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ يَا مُوسَىٰ ۝ وَسَخَّرْنَا

(۱) اس کی تفسیر صحیح بخاری میں ہے کہ اس سے مراد کفار مکہ ہیں؛ (بخاری - تفسیر سورۃ ابراہیم) جنہوں نے رسالت محمدیہ کا انکار کر کے اور جنگ بدر میں مسلمانوں سے لڑ کر اپنے لوگوں کو ہلاک کروایا؛ تاہم اپنے مفہوم کے اعتبار سے یہ عام ہے اور مطلب یہ ہو گا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے رحمت للعالمین اور لوگوں کے لیے نعمت الہیہ بنا کر بھیجا؛ پس جس نے اس نعمت کی قدر کی، اسے قبول کیا، اس نے شکر ادا کیا، وہ جنتی ہو گیا اور جس نے اس نعمت کو رد کر دیا اور کفر اختیار کیے رکھا، وہ جہنمی قرار پایا۔

(۲) یہ تہدید و توہیح ہے کہ دنیا میں تم جو کچھ چاہو کرو، مگر کب تک؟ بالآخر تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے۔

(۳) نماز کو قائم کرنے کا مطلب ہے کہ اسے اپنے وقت پر اور تعدیل ارکان کے ساتھ اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کیا جائے؛ جس طرح کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اتفاق کا مطلب ہے کہ زکوٰۃ ادا کی جائے؛ اقارب کے ساتھ صلہ رحمی کی جائے اور دیگر ضرورت مندوں پر احسان کیا جائے۔ یہ نہیں کہ صرف اپنی ذات اور اپنی ضروریات پر تو بلا دریغ خوب خرچ کیا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی جگہوں پر خرچ کرنے سے گریز کیا جائے۔ قیامت کا دن ایسا ہو گا کہ جہاں نہ خرید و فروخت ممکن ہوگی نہ کوئی دوستی ہی کسی کے کام آئے گی۔

میں کر دیا ہے کہ دریاؤں میں اس کے حکم سے چلیں پھرں۔ اسی نے ندیاں اور نہریں تمہارے اختیار میں کر دی ہیں۔^(۱) (۳۲)
 اسی نے تمہارے لیے سورج چاند کو مسخر کر دیا ہے کہ برابر ہی چل رہے ہیں^(۲) اور رات دن کو بھی تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔^(۳) (۳۳)
 اسی نے تمہیں تمہاری منہ مانگی کل چیزوں میں سے دے رکھا ہے۔^(۴) اگر تم اللہ کے احسان گننا چاہو تو انہیں پورے گن بھی نہیں سکتے۔^(۵) یقیناً انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔^(۶) (۳۴)

لَكُمْ الْآخِرَ ۞

وَسَخَّرَ لَكُمْ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِمَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمْ

الْيَمَّ وَالنَّهَارَ ۞

وَأَنْتُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ

لَأَنْتُمْ بِهَا آتِنَ الْإِنْسَانَ لَقَلِئًا مِمَّا كَفَّارًا ۞

(۱) اللہ تعالیٰ نے مخلوقات پر جو انعامات کئے ہیں، ان میں سے بعض کا تذکرہ یہاں کیا جا رہا ہے۔ فرمایا آسمان کو چھت اور زمین کو بچھو نا بنایا۔ آسمان سے بارش نازل فرما کر مختلف قسم کے درخت اور فصلیں اگائیں، جن میں لذت و قوت کے لیے میوے اور فروٹ بھی ہیں اور انواع و اقسام کے غلے بھی، جن کے رنگ اور شکلیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ذائقے، خوشبو اور فوائد بھی مختلف ہیں۔ کشتیوں اور جہازوں کو خدمت میں لگا دیا کہ وہ تلاطم خیز موجوں پر چلتے ہیں، انسانوں کو بھی ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچاتے ہیں اور سامان تجارت بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے ہیں۔ زمینوں اور پہاڑوں سے چشمے اور نہریں جاری کر دیں تاکہ تم بھی سیراب ہو اور اپنے کھیتوں کو بھی سیراب کرو۔

(۲) یعنی مسلسل چلتے رہتے ہیں، کبھی ٹھہرتے نہیں رات کو، نہ دن کو۔ علاوہ ازیں ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہیں لیکن کبھی ان کا باہمی تصادم اور ٹکراؤ نہیں ہوتا۔

(۳) رات اور دن، ان کا باہمی تفاوت جاری رہتا ہے۔ کبھی رات، دن کا کچھ حصے لے کر لمبی ہو جاتی ہے اور کبھی دن، رات کا کچھ حصہ لے کر لمبا ہو جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ ابتدائے کائنات سے چل رہا ہے، اس میں یک سر مو فرق نہیں آیا۔
 (۴) یعنی اس نے تمہاری ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کیں جو تم اس سے طلب کرتے ہو۔ اور بعض کہتے ہیں جسے تم طلب کرتے ہو، وہ بھی دیتا ہے اور جسے نہیں مانگتے، لیکن اسے پتہ ہے کہ وہ تمہاری ضرورت ہے، وہ بھی دیتا ہے۔ غرض تمہیں زندگی گزارنے کی تمام سہولتیں فراہم کرتا ہے۔

(۵) یعنی اللہ کی نعمتیں ان گنت ہیں انہیں کوئی حیطہ شمار میں ہی نہیں لاسکتا۔ چہ جائیکہ کوئی ان نعمتوں کے شکر کا حق ادا کر سکے۔ ایک اثر میں حضرت داؤد علیہ السلام کا قول نقل کیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا ”اے رب! میں تیرا شکر کس طرح ادا کروں؟ جب کہ شکر بجائے خود تیری طرف سے مجھ پر ایک نعمت ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اے داؤد! اب تو نے میرا شکر ادا کر دیا جب کہ تو نے یہ اعتراف کر لیا کہ یا اللہ میں تیری نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہوں۔“ (تفسیر ابن کثیر)

(۶) اللہ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے سے غفلت کی وجہ سے انسان اپنے نفس کے ساتھ ظلم اور بے انصافی کرتا ہے۔ بالخصوص کافر، جو بالکل ہی اللہ سے غافل ہے۔

ابراہیم کی یہ دعا بھی یاد کرو) جب انہوں نے کہا کہ اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن والا بنا دے،^(۱) اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے پناہ دے۔ (۳۵)

اے میرے پالنے والے معبود! انہوں نے بہت سے لوگوں کو راہ سے بھٹکا دیا ہے۔^(۲) پس میری تابعداری کرنے والا میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بہت ہی معاف اور کرم کرنے والا ہے۔ (۳۶)

اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد^(۳) اس بے کھیتی کی وادی میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسائی ہے۔ اے ہمارے پروردگار! یہ اس لیے کہ وہ نماز قائم رکھیں،^(۴) پس تو کچھ لوگوں^(۵) کے دلوں کو ان کی طرف

وَأَذِقَ آلَ إِبْرَاهِيمَ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا
وَأَجْنِبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ ﴿۳۵﴾

رَبِّ إِنَّهُمْ أَضَلُّونَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ ۖ فَمَنْ
تَجَعَّبَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ
رَّحِيمٌ ﴿۳۶﴾

رَبِّ تَالِقِ اسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي
زُرْعَةٍ وَعِنْدَ سَيْمِيكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا
الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَجْدَدًا مِّنَ النَّاسِ تَهْوَى إِلَيْهِمْ

(۱) ”اس شہر“ سے مراد مکہ ہے۔ دیگر دعاؤں سے قبل یہ دعا کی کہ اسے امن والا بنا دے، اس لیے کہ امن ہو گا تو لوگ دوسری نعمتوں سے بھی صحیح معنوں میں متبہ ہو سکیں گے، ورنہ امن و سکون کے بغیر تمام آسائشوں اور سہولتوں کے باوجود، خوف اور دہشت کے سائے انسان کو مضطرب اور پریشان رکھتے ہیں۔ جیسے آج کل کے عام معاشروں کا حال ہے۔ سوائے سعودی عرب کے۔ وہاں اس دعا کی برکت سے اور اسلامی حدود کے نفاذ سے آج بھی ایک مثالی امن قائم ہے صَافَهَا اللَّهُ عَنِ الشُّرُورِ وَالْفِتَنِ يَسِئَ الْإِنْعَامِ إِلَيْهِ كَظَمْنٍ مِّنْ أَسْمَانٍ فَرَمَا كَرَامًا شَارَهُ كَرِيحًا جَمَالَ اللَّهُ دَكِّغًا نِعَامَاتٍ مِّنْ غَافِلِينَ ۖ اس خصوصاً انعام سے بھی غافل ہیں کہ اس نے انہیں مکہ جیسے امن والے شہر کا باشندہ بنایا۔

(۲) گمراہ کرنے کی نسبت ان پتھر کی مورتیوں کی طرف کی جن کی مشرکین عبادت کرتے تھے، باوجود اس بات کے کہ وہ غیر عاقل ہیں، کیونکہ وہ گمراہی کا باعث تھیں اور ہیں۔

(۳) مِنْ ذُرِّيَّتِي میں مِنْ تبہیض کے لیے ہے یعنی بعض اولاد۔ کہتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آٹھ صلبی بیٹے تھے، جن میں سے صرف حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہاں بسایا۔ (فتح القدیر)

(۴) عبادات میں سے صرف نماز کا ذکر کیا، جس سے نماز کی اہمیت واضح ہے۔

(۵) یہاں بھی مِنْ تبہیض کے لیے ہے۔ کہ کچھ لوگ، مراد اس سے مسلمان ہیں۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ کس طرح دنیا بھر کے مسلمان مکہ مکرمہ میں جمع ہوتے ہیں اور حج کے علاوہ بھی سارا سال یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام آفِنْدَةَ النَّاسِ (لوگوں کے دلوں) کہتے تو عیسائی، یہودی، مجوسی اور دیگر تمام لوگ مکہ بچھڑتے۔ مِنْ النَّاسِ کے مِنْ نے اس دعا کو مسلمانوں تک محدود کر دیا۔ (ابن کثیر)

مائل کر دے۔ اور انہیں پھلوں کی روزیاں عنایت فرما^(۱)
 تاکہ یہ شکرگزاری کریں۔ (۳۷)

اے ہمارے پروردگار! تو خوب جانتا ہے جو ہم چھپائیں
 اور جو ظاہر کریں۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ پر پوشیدہ
 نہیں۔^(۲) (۳۸)

اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیل و
 اسحاق (علیہما السلام) عطا فرمائے۔ کچھ شک نہیں کہ میرا
 پالنہار اللہ دعاؤں کا سننے والا ہے۔ (۳۹)

اے میرے پالنے والے! مجھے نماز کا پابند رکھ اور میری اولاد
 سے بھی،^(۳) اے ہمارے رب میری دعا قبول فرما۔ (۴۰)

اے ہمارے پروردگار! مجھے بخش دے اور میرے ماں
 باپ کو بھی بخش^(۴) اور دیگر مومنوں کو بھی بخش جس دن

وَأَرْسَلْنَا قُرْآنًا مِّنَ السَّمَاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۳۷﴾

رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ وَمَا يَخْفَىٰ
 عَلَى اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ﴿۳۸﴾

أَلْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ
 وَإِسْحَاقَ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿۳۹﴾

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي رَبَّنَا
 وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ ﴿۴۰﴾

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ
 يَقُومُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾

(۱) اس دعا کی تاثیر بھی دیکھ لی جائے کہ مکہ جیسی بے آب و گیاہ سرزمین میں جہاں کوئی پھل دار درخت نہیں، دنیا بھر
 کے پھل اور میوے نہایت فراوانی کے ساتھ مہیا ہیں اور حج کے موقع پر بھی، جب کہ لاکھوں افراد مزید وہاں پہنچ جاتے
 ہیں، پھلوں کی فراوانی میں کوئی کمی نہیں آتی — وَهَذَا مِنْ لُطْفِ اللَّهِ تَعَالَى وَكَرَمِهِ وَرَحْمَتِهِ وَبَرَكَاتِهِ، اَسْتَجَابَةً
 لِخَلِيلِهِ اِبْرَاهِيمَ - عَلَيْهِ السَّلَام - کہا جاتا ہے کہ یہ دعا خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد مانگی، جب کہ پہلی دعا (امن والا بنا
 دے) اس وقت مانگی، جب اپنی اہلیہ اور شیرخوار بچے اسماعیل کو اللہ تعالیٰ کے حکم پر وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ (ابن کثیر)
 (۲) مطلب یہ ہے کہ میری دعا کے مقصد کو تو بخوبی جانتا ہے، اس شہروالوں کے لیے دعا سے اصل مقصد تیری رضا ہے تو
 تو ہر چیز کی حقیقت کو خوب جانتا ہے، آسمان و زمین کی کوئی چیز تجھ سے مخفی نہیں۔

(۳) اپنے ساتھ اپنی اولاد کے لیے بھی دعا مانگی، جیسے اس سے قبل بھی اپنے ساتھ اپنی اولاد کے لیے بھی یہ دعا مانگی کہ
 انہیں پتھر کی مورتیوں کو پوجنے سے بچا کر رکھنا۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ کے دین کے داعیوں کو اپنے گھر والوں کی
 ہدایت اور ان کی دینی تعلیم و تربیت سے غافل نہیں رہنا چاہیے بلکہ تبلیغ و دعوت میں انہیں اولیت دینی چاہیے۔ جیسا
 کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم دیا ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾
 (الشعراء-۲۱۳) ”اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے!“۔

(۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا اس وقت کی جب کہ ابھی ان پر اپنے باپ کا عَدُوُّ اللہ ہونا واضح نہیں ہوا تھا،
 جب یہ واضح ہو گیا کہ میرا باپ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے اظہار براءت کر دیا۔ اس لیے کہ مشرکین کے لیے دعا کرنا جائز
 نہیں چاہے وہ قرابت قریبہ ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔

حساب ہونے لگے۔ (۴۱)

ناانصافوں کے اعمال سے اللہ کو غافل نہ سمجھ وہ تو انہیں اس دن تک مہلت دے رہے ہوں گے جس دن آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ (۴۲)

وہ اپنے سراو پر اٹھائے دوڑ بھاگ کر رہے ہوں گے، (۴) خود اپنی طرف بھی ان کی نگاہیں نہ لوٹیں گی اور ان کے دل خالی اور اڑے ہوئے ہوں گے۔ (۴۳)

لوگوں کو اس دن سے ہوشیار کر دے جب کہ ان کے پاس عذاب آجائے گا، اور ظالم کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہمیں بہت تھوڑے قریب کے وقت تک کی ہی مہلت دے کہ ہم تیری تبلیغ مان لیں اور تیرے پیغمبروں کی تابعداری میں لگ جائیں۔ کیا تم اس سے پہلے بھی قسمیں نہیں کھا رہے تھے؟ کہ تمہارے لیے دنیا سے ملنا ہی نہیں۔ (۴۴)

اور کیا تم ان لوگوں کے گھروں میں رہتے سستے تھے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور کیا تم پر وہ معاملہ کھلا نہیں کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کچھ کیا۔ ہم نے (تو تمہارے سمجھانے کو) بہت سی مثالیں بیان کر دی تھیں۔ (۴۵)

وَلَا تَصْبِرَنَّ اللَّهُ عَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ ۝
إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ ﴿۴۱﴾

مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُؤُوسِهِمْ لَا يَرْجِعُونَ إِلَيْهِمْ
ظُرْفُهُمْ وَأَقْبَدَتْهُمُ هَوَاءٌ ﴿۴۲﴾

وَأَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَا بُنَيَّهَا الْعَذَابُ الَّذِي قِيلُ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ نَحْنُ بِدَعْوَتِكَ وَنَعْتِجُكَ
الرُّسُلَ وَأَلْمُؤُنَا وَنُؤَاؤُنَا قَسَمْنَاهُمْ مِنْ قَبْلِ الْآلَمِينَ نَزُولًا ﴿۴۳﴾

وَسَلَّمْتُمْ فِي مَسَاكِينِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ وَبَيْنَ أَلْمُؤِنِينَ
فَعَلَّمْنَا بَرِيئًا وَصَرَّفْنَا الْآلَمَانَ ﴿۴۴﴾

(۱) یعنی قیامت کی ہولناکیوں کی وجہ سے۔ اگر دنیا میں اللہ نے کسی کو زیادہ مہلت دے دی اور اس کے مرنے تک اس کا مؤاخذہ نہیں کیا تو قیامت کے دن تو وہ مؤاخذہ الہی سے نہیں بچ سکے گا، جو کافروں کے لیے اتنا ہولناک دن ہو گا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔

(۲) مُهْطِعِينَ۔ تیزی سے دوڑ رہے ہوں گے۔ دوسرے مقام پر فرمایا ﴿مُهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ﴾ (القمر۔ ۸) ”بلانے والے کی طرف دوڑیں گے“ مُقْنِعِي رُؤُوسِهِمْ حیرت سے ان کے سراٹھے ہوئے ہوں گے۔

(۳) جو ہولناکیاں وہ دیکھیں گے اور جو فکر اور خوف اپنے بارے میں انہیں ہو گا، ان کے پیش نظر ان کی آنکھیں ایک لحظہ کے لیے بھی پست نہیں ہوں گی اور کثرت خوف سے ان کے دل گرے ہوئے اور خالی ہوں گے۔

(۴) یعنی دنیا میں تم قسمیں کھا کھا کر کما کرتے تھے کہ کوئی حساب کتاب اور جنت و دوزخ نہیں، اور دوبارہ کے زندہ ہونا ہے۔

(۵) یعنی عبرت کے لیے ہم نے تو ان پچھلی قوموں کے واقعات بیان کر دیئے ہیں، جن کے گھروں میں اب تم آباد ہو اور

یہ اپنی اپنی چالیں چل رہے ہیں اور اللہ کو ان کی تمام چالوں کا علم ہے ^(۱) اور ان کی چالیں ایسی نہ تھیں کہ ان سے پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔ ^(۲) (۳۶)

آپ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ اللہ اپنے نبیوں سے وعدہ خلافی کرے گا، ^(۳) اللہ بڑا ہی غالب اور بدلہ لینے والا ہے۔ ^(۴) (۳۷)

جس دن زمین اس زمین کے سوا اور ہی بدل دی جائے گی اور آسمان ^(۵) بھی، اور سب کے سب اللہ واحد غلبے والے کے روبرو ہوں گے۔ (۳۸)

آپ اس دن گناہ گاروں کو دیکھیں گے کہ زنجیروں میں ملے جلے ایک جگہ جکڑے ہوئے ہوں گے۔ (۳۹)

وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۳۶﴾

فَلَا تَحْسَبَنَّ لِلَّهِ غُفْلَةً وَعِدَّةَ اللَّهِ سُلْطَانٌ لَّيْسَ يَكْفُرُ ۗ ﴿۳۷﴾

يَوْمَ تَبْدُلُ الْأَرْضَ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتِ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۳۸﴾

وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّبِينَ فِي الْأَسْجَادِ ﴿۳۹﴾

ان کے کھنڈرات بھی تمہیں دعوت غور و فکر دے رہے ہیں۔ اگر تم ان سے عبرت نہ لکھو اور ان کے انجام سے بچنے کی فکر نہ کرو تو تمہاری مرضی۔ پھر تم بھی اسی انجام کے لیے تیار رہو۔

(۱) یہ جملہ حالیہ ہے کہ ہم نے ان کے ساتھ جو کیا وہ کیا، دراصل حالیکہ انہوں نے باطل کے اثبات اور حق کے رد کرنے کے لیے مقدر و بھرپور اور مکر کیے اور اللہ کو ان تمام چالوں کا علم ہے یعنی اس کے پاس درج ہے جس کی وہ ان کو سزا دے گا۔

(۲) کیونکہ اگر پہاڑ ٹل گئے ہوتے تو اپنی جگہ برقرار نہ ہوتے، جب کہ سب پہاڑ اپنی اپنی جگہ ثابت اور برقرار ہیں۔ یہ ان نافیہ کی صورت میں ہے۔ دوسرے معنی **إِنْ مُخَفَّفَةً مِنَ الْمُنْقَلَةِ** کے لیے گئے ہیں۔ یعنی یقیناً ان کے مکر تو اتنے بڑے

تھے کہ پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جاتے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، جس نے ان کے مکروں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ جیسے مشرکین کے شرک کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَذَّابْتِ الْمَوْتِ يَنْظُرُونَ وَمِنَ الْأَرْضِ يَنْشَقُّ الْجِبَالُ هُبَالًا * أَنْ دَعَوْا لِلْإِخْمَانِ وَلَكُلًّا ﴾

(سورۃ مريم: ۹۰) قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں اس بات پر کہ انہوں نے کہا اللہ رحمن کی اولاد ہے۔

(۳) یعنی اللہ نے اپنے رسولوں سے دنیا اور آخرت میں مدد کرنے کا جو وعدہ کیا ہے، وہ یقیناً سچا ہے، اس سے وعدہ خلافی ممکن نہیں۔

(۴) یعنی اپنے دوستوں کے لیے اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے والا ہے۔

(۵) امام شوکانی فرماتے ہیں کہ آیت میں دونوں احتمال ہیں کہ یہ تبدیلی صفات کے لحاظ سے ہو یا ذات کے لحاظ سے۔ یعنی یہ آسمان و زمین اپنے صفات کے اعتبار سے بدل جائیں گے یا ویسے ہی ذاتی طور پر یہ تبدیلی آئے گی۔ نہ یہ زمین رہے گی

نہ یہ آسمان۔ زمین بھی کوئی اور ہوگی اور آسمان بھی کوئی اور۔ حدیث میں آتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ان کے لباس گندھک کے ہوں گے^(۱) اور آگ ان کے چروں پر بھی چڑھی ہوئی ہوگی۔ (۵۰)

یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کے کیے ہوئے اعمال کا بدلہ دے، بیشک اللہ تعالیٰ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگنے کی۔ (۵۱)

یہ قرآن^(۲) تمام لوگوں کے لیے اطلاع نامہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے وہ ہوشیار کر دیے جائیں اور بخوبی معلوم کر لیں کہ اللہ ایک ہی معبود ہے اور تاکہ ٹھکانہ لوگ سوچ سمجھ لیں۔ (۵۲)

سورہ حجر کی ہے اور اس کی ننانوے آیتیں ہیں اور
چھ رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان
بزار رحم والا ہے۔

الر، یہ کتاب الہی کی آیتیں ہیں اور کھلے اور روشن قرآن
کی۔^(۳)
(۱)

سَرَابٍ مُّهِمٍّ مِّنْ قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهُهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾

لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾

هَذَا بَلَاغٌ لِلنَّاسِ وَلِيُنذِرُوا بِهِ وَيَلْعَلُوا آمَنُوا لَهُ الْوَاحِدُ
وَلِيَذِّكُرُوا لَوْلَا الْكَلْبَابِ ﴿۵۲﴾



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴿۱﴾

الرَّحْمَةُ تَلَفُّ الْإِثْمِ الْكَثِيرِ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ ﴿۱﴾

«يُنَشِّرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ أَرْضٍ بَيْضَاءَ عَفْرَاءَ، كَقَرْصَةِ النَّعْمِيِّ لَيْسَ فِيهَا عَلَمٌ لِأَحَدٍ». (صحیح مسلم، صفة القيامة، باب فی البعث والنشور) "قیامت والے دن لوگ سفید بھوری زمین پر اکٹھے ہوں گے جو میدہ کی روٹی کی طرح ہوگی۔ اس میں کسی کا کوئی جھنڈا (یا علامتی نشان) نہیں ہوگا۔" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ جب یہ آسمان و زمین بدل دیے جائیں گے تو پھر لوگ اس دن کہاں ہوں گے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "صراط پر" یعنی پل صراط پر۔ (حوالہ مذکور) ایک یہودی کے استفسار پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "لوگ اس دن پل کے قریب اندھیرے میں ہوں گے۔" (صحیح مسلم، کتاب الحيض، باب بيان صفة منى الرجل)

(۱) جو آگ سے فوراً بھڑک اٹھتی ہے۔ علاوہ ازیں آگ نے ان کے چروں کو بھی ڈھانکا ہوا ہوگا۔

(۲) یہ اشارہ قرآن کی طرف ہے، یا پچھلی تفصیلات کی طرف، جو ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ عَاقِلًا﴾ سے بیان کی گئی ہیں۔

(۳) کتاب اور قرآن مبین سے مراد قرآن کریم ہی ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ جس طرح ﴿فَإِن جَاءَكَ مِنَ اللَّهِ تُورَةٌ فَاتَّبِعُهَا﴾ (المائدة: ۱۵) میں نور اور کتاب دونوں سے مراد قرآن کریم ہی ہے۔ قرآن کریم کی تکمیل عظیم شان کے لیے ہے یعنی یہ قرآن کامل اور نہایت عظمت و شان والا ہے۔

وہ بھی وقت ہو گا کہ کافر اپنے مسلمان ہونے کی آرزو کریں گے۔^(۱) (۲)

آپ انہیں کھاتا، نفع اٹھاتا اور (جھوٹی) امیدوں میں مشغول ہوتا چھوڑ دیجئے یہ خود بھی جان لیں گے۔^(۲) (۳)

کسی بستی کو ہم نے ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ اس کے لیے مقررہ نوشتہ تھا۔^(۳) (۴)

کوئی گروہ اپنی موت سے نہ آگے بڑھتا ہے نہ پیچھے رہتا ہے۔^(۳) (۵)

انہوں نے کہا کہ اے وہ شخص جس پر قرآن اتارا گیا ہے یقیناً تو کوئی دیوانہ ہے۔^(۶) (۶)

اگر تو سچا ہی ہے تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتا۔^(۳) (۷)

ہم فرشتوں کو حق کے ساتھ ہی اتارتے ہیں اور اس وقت وہ مہلت دیے گئے نہیں ہوتے۔^(۵) (۸)

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَو كَانُوا مُسْلِمِينَ ۝

ذَرَّهُمْ يَأْكُلُوا وَيَمْتَعُوا وَيُلْهِمُوا الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ ۝

مَا تَشِيقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ۝

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نَزَّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ۝

لَوْ مَا نَأْتِينَا بِالْمَلَكِ لَكِن مَنَّتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝

مَا نَنْزِلُ الْمَلَكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُنظَرِينَ ۝

(۱) یہ آرزو کب کریں گے؟ موت کے وقت؛ جب فرشتے انہیں جہنم کی آگ دکھاتے ہیں یا جب جہنم میں چلے جائیں گے یا اس وقت جب گناہ گار ایمانداروں کو کچھ عرصہ بطور سزا، جہنم میں رکھنے کے بعد جہنم سے نکالا جائے گا یا میدان محشر میں، جہاں حساب کتاب ہو رہا ہو گا اور کافر دیکھیں گے کہ مسلمان جنت میں جا رہے ہیں تو آرزو کریں گے کہ کاش وہ بھی مسلمان ہوتے۔ رُبَمَا اصل میں تو تکثیر کے لیے ہے لیکن کبھی تکلیل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی طرف سے یہ آرزو ہر موقع پر ہوتی رہے گی لیکن اس کا انہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

(۲) یہ تمہید و توتیخ ہے کہ یہ کافر و مشرک اپنے کافر و مشرک سے باز نہیں آرہے ہیں تو انہیں چھوڑ دیجئے، یہ دنیاوی لذتوں سے محظوظ ہو لیں اور اپنی امیدیں برلائیں۔ عنقریب انہیں اپنے کافر و مشرک کا انجام معلوم ہو جائے گا۔

(۳) جس بستی کو بھی نافرمانی کی وجہ سے ہلاک کرتے ہیں، تو فوراً ہلاک نہیں کر ڈالتے، بلکہ ہم ایک وقت مقرر کئے ہوئے ہیں، اس وقت تک اس بستی والوں کو مہلت دے دی جاتی ہے لیکن جب وہ مقررہ وقت آجاتا ہے تو انہیں ہلاک کر دیا جاتا ہے پھر وہ اس سے آگے یا پیچھے نہیں ہوتے۔

(۴) یہ کافروں کے کفر و عناد کا بیان ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیوانہ کہتے اور کہتے کہ اگر تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سچا ہے تو اپنے اللہ سے کہہ کہ وہ فرشتے ہمارے پاس بھیجے تاکہ وہ تیری رسالت کی تصدیق کریں یا ہمیں ہلاک کر دیں۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرشتے ہم حق کے ساتھ ہی بھیجتے ہیں یعنی جب ہماری حکمت و مشیت عذاب بھیجنے کی مقتضی

ہم نے ہی اس قرآن کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔^(۹)

ہم نے آپ سے پہلے اگلی امتوں میں بھی اپنے رسول (برابر) بھیجے۔^(۱۰)

اور (لیکن) جو بھی رسول آتا وہ اس کا مذاق اڑاتے۔^(۱۱)
گناہ گاروں کے دلوں میں ہم اسی طرح یہی رچا دیا کرتے ہیں۔^(۱۲)

وہ اس پر ایمان نہیں لاتے اور یقیناً اگلوں کا طریقہ گزرا ہوا ہے۔^(۱۳)

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِلَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿۹﴾

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۰﴾

وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿۱۱﴾

كَذَلِكَ نَسْلُكُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ﴿۱۲﴾

لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةَ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۳﴾

ہوتی ہے تو پھر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے اور پھر وہ مہلت نہیں دیے جاتے، فوراً ہلاک کر دیے جاتے ہیں۔

(۱) یعنی اس کو دست برد زمانہ سے اور تحریف و تغیر سے بچانا یہ ہمارا کام ہے۔ چنانچہ قرآن آج تک اسی طرح محفوظ ہے جس طرح یہ اترا تھا، گمراہ فرتے اپنے اپنے گمراہانہ عقائد کے اثبات کے لیے اس کی آیات میں معنوی تحریف تو کرتے رہے ہیں اور آج بھی کرتے ہیں لیکن پچھلی کتابوں کی طرح یہ لفظی تحریف اور تغیر سے محفوظ ہے۔ علاوہ ازیں اہل حق کی ایک جماعت بھی تحریفات معنوی کا پردہ چاک کرنے کے لیے ہر دور میں موجود رہی ہے، جو ان کے گمراہانہ عقائد اور غلط استدلالات کے تار و پود بکھیرتی رہی ہے اور آج بھی وہ اس محاذ پر سرگرم عمل ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کو یہاں ”ذکر“ (نسیحت) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے اہل جہان کے لیے ”ذکر“ (یاد دہانی اور نسیحت ہونے) کے پہلو کو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے تابندہ نقوش اور آپ کے فرمودات کو بھی محفوظ کر کے، قیامت تک کے لیے باقی رکھا گیا ہے۔ گویا قرآن کریم اور سیرت نبوی ﷺ کے حوالے سے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کا راستہ ہمیشہ کے لیے کھلا ہوا ہے۔ یہ شرف اور محفوظیت کا مقام پچھلی کسی بھی کتاب اور رسول کو حاصل نہیں ہوا۔

(۲) یہ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ صرف آپ ہی کی تکذیب نہیں کی گئی، ہر رسول کے ساتھ اس کی قوم نے یہی معاملہ کیا ہے۔

(۳) یعنی کفر اور رسولوں کا استہزا، مجرموں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں یا رچا دیتے ہیں، یہ نسبت اللہ نے اپنی طرف اس لیے کی کہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے گو ان کا یہ فعل ان کی مسلسل معصیت کے نتیجے میں اللہ کی مشیت سے رونما ہوا۔

(۴) یعنی ان کے ہلاک کرنے کا وہی طریقہ ہے جو اللہ نے پہلے سے مقرر کر رکھا ہے کہ تکذیب و استہزا کے بعد وہ قوموں کو ہلاک کرتا رہا ہے۔

اور اگر ہم ان پر آسمان کا دروازہ کھول بھی دیں اور یہ وہاں چڑھنے بھی لگ جائیں (۱۳)

تب بھی یہی کہیں گے کہ ہماری نظر بندی کر دی گئی ہے بلکہ ہم لوگوں پر جادو کر دیا گیا ہے۔ (۱۵)

یقیناً ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں (۲) اور دیکھنے والوں کے لیے اسے سجادیا گیا ہے۔ (۱۶)

اور اسے ہر مردود شیطان سے محفوظ رکھا ہے۔ (۱۷)

ہاں مگر جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرے اس کے پیچھے

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ﴿۱۳﴾

لَقَالُوا إِنَّمَا سَكُوتٌ لِّبَصَائِنَا بَلْ عَن قَوْمٍ مُّسْرِفُونَ ﴿۱۵﴾

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَرَازِبَةً لِّالنَّظِيرِينَ ﴿۱۶﴾

وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَّجُومٍ ﴿۱۷﴾

إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاتَّبَعَهُ يَشْهَابٌ مِّمَّيْنٍ ﴿۱۸﴾

(۱) یعنی ان کا کفر و عناد اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ فرشتوں کا نزول تو رہا ایک طرف، اگر خود ان کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جائیں اور یہ ان دروازوں سے آسمان پر آئیں جائیں، تب بھی انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آئے اور رسولوں کی تصدیق نہ کریں بلکہ یہ کہیں کہ ہماری نظر بندی کر دی گئی ہے یا ہم پر جادو کر دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے ہم ایسا محسوس کر رہے ہیں کہ ہم آسمان پر آ جا رہے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

(۲) بُرُوجُ بُرُوجِ كِي تَجْعَلُ، جس کے معنی ظہور کے ہیں۔ اسی سے تَبْرُوجُ ہے جو عورت کے اظہار زینت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں آسمان کے ستاروں کو بُرُوجِ كَمَا تَجْعَلُ ہے کیوں کہ وہ بھی بلند اور ظاہر ہوتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ بُرُوجُ سے مراد شمس و قمر اور دیگر سیاروں کی منزلیں ہیں، جو ان کے لیے مقرر ہیں۔ اور یہ ۱۲ ہیں، حمل، ثور، جوزاء، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو، حوت۔ عرب ان سیاروں کی منزلوں اور ان کے ذریعے سے موسم کا حال معلوم کرتے تھے۔ اس میں کوئی قباحت نہیں البتہ ان سے تغیر پذیر ہونے والے واقعات و حوادث جاننے کا دعویٰ کرنا، جیسے آج کل بھی جاہلوں میں اس کا خاصا چرچا ہے۔ اور لوگوں کی قسمتوں کو ان کے ذریعے سے دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ ان کا کوئی تعلق دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات و حوادث سے نہیں ہوتا، جو کچھ بھی ہوتا ہے، صرف مشیت الہی ہی سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان برجوں یا ستاروں کا ذکر اپنی قدرت اور بے مثال صنعت کے طور پر کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ واضح کیا ہے کہ یہ آسمان کی زینت بھی ہیں۔

(۳) رَجِيمٌ مَّرْجُومٌ کے معنی میں ہے۔ رَجْمٌ کے معنی سنگسار کرنے یعنی پتھر مارنے کے ہیں۔ شیطان کو رَجِيمٌ اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ جب آسمان کی طرف جانے کی کوشش کرتا تو آسمان سے شہاب ثاقب اس پر ٹوٹ کر گرتے۔ پھر رَجِيمٌ ملعون و مردود کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، کیوں کہ جسے سنگسار کیا جاتا ہے اسے ہر طرف سے لعنت ملامت بھی کی جاتی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے کہ ہم نے آسمانوں کی حفاظت فرمائی ہر شیطان رَجِيمٌ سے۔ یعنی ان ستاروں کے ذریعے سے، کیوں کہ یہ شیطان کو مار کر بھاگنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

دھکتا ہوا (کھلا شعلہ) لگتا ہے۔ (۱۸)

اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا ہے اور اس پر (اٹل) پھاڑ ڈال دیئے ہیں، اور اس میں ہم نے ہر چیز ایک معین مقدار سے اگادی ہے۔ (۱۹)

اور اسی میں ہم نے تمہاری روزیاں بنا دی ہیں (۳) اور جنہیں تم روزی دینے والے نہیں ہو۔ (۲۰)

اور جتنی بھی چیزیں ہیں ان سب کے خزانے ہمارے پاس ہیں، (۵) اور ہم ہر چیز کو اس کے مقررہ انداز سے اتارتے ہیں۔ (۲۱)

وَالْأَرْضُ مَدَدًا لَهَا وَالْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْزُونٍ ﴿۱۸﴾

وَجَعَلْنَا الْكُرُوفَ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرِزْقَيْنَ ﴿۱۹﴾

وَلَنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا أَعِنَدْنَا خَازِنُهُ وَمَا نُنزِلُهُ إِلَّا بِالْقَدَرِ مَعْلُومٍ ﴿۲۰﴾

(۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ شیاطین آسمانوں پر باتیں سننے کے لیے جاتے ہیں، جن پر شہاب ثاقب ٹوٹ کر گرتے ہیں، جن سے کچھ تو جل مر جاتے ہیں اور کچھ بچ جاتے ہیں اور بعض سن آتے ہیں۔ حدیث میں اس کی تفسیر اس طرح آتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ”جب اللہ تعالیٰ آسمان پر کوئی فیصلہ فرماتا ہے، تو فرشتے اسے سن کر اپنے پر یا بازو پھیر پھراتے ہیں، (مجزو مسکت کے اظہار کے طور پر) گویا وہ کسی چٹان پر زنجیر کی آواز ہے۔ پھر جب فرشتوں کے دلوں سے اللہ کا خوف دور ہوتا ہے تو وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں، تمہارے رب نے کیا کیا؟ وہ کہتے ہیں، اس نے جو کما، حق کما اور وہ بلند اور بڑا ہے (اس کے بعد اللہ کا وہ فیصلہ اوپر سے نیچے تک کیے بعد دیگرے سنایا جاتا ہے۔) اس موقع پر شیطان چوری چھپے بات سنتے ہیں۔ اور یہ چوری چھپے بات سننے والے شیطان، تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں اور وہ ایک آدھ کلمہ سن کر اپنے دوست نجومی یا کاہن کے کان میں پھونک دیتے ہیں، وہ اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا کر لوگوں کو بیان کرتا ہے“ (طہاً۔ صحیح بخاری تفسیر سورہ حجر)

(۲) مَوْزُونٌ: بمعنی مَعْلُومٌ یا بہ اندازہ یعنی حسب ضرورت۔

(۳) مَعَايِشَ، مَعِيْشَةٌ کی جمع ہے۔ یعنی زمین میں تمہاری معیشت اور گزران کے لیے بیشمار اسباب و وسائل پیدا کر دیے۔

(۴) اس سے مراد نوکر چاکر، غلام اور جانور ہیں۔ یعنی جانوروں کو تمہارے تابع کر دیا ہے، جن پر تم سواری بھی کرتے ہو، سامان بھی لاد کر لے جاتے ہو اور انہیں ذبح کر کے کھا بھی لیتے ہو۔ غلام لونڈیاں ہیں جن سے تم خدمت گزاری کا کام لیتے ہو۔ یہ اگرچہ سب تمہارے ماتحت ہیں اور تم ان کے چارے اور خوراک وغیرہ کا انتظام بھی کرتے ہو لیکن حقیقت میں ان کا رازق اللہ تعالیٰ ہے، تم نہیں ہو۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ تم ان کے رازق ہو، اگر تم انہیں کھانا نہیں دو گے تو بھوکے مرجائیں گے۔

(۵) بعض نے خزان سے مراد بارش لی ہے کیونکہ بارش ہی پیداوار کا ذریعہ ہے لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد تمام کائنات کے خزانے ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ حسب مشیت و ارادہ عدم سے وجود میں لاتا رہتا ہے۔

اور ہم بھیجتے ہیں جو جھل ہو انیس،^(۱) پھر آسمان سے پانی برسا کر وہ تمہیں پلاتے ہیں اور تم اس کا ذخیرہ کرنے والے نہیں ہو۔^(۲) (۲۲)

ہم ہی جلاتے اور مارتے ہیں اور ہم ہی (بالآخر) وارث ہیں۔ (۲۳)

اور تم میں سے آگے بڑھنے والے اور پیچھے ہٹنے والے بھی ہمارے علم میں ہیں۔ (۲۴)

آپ کا رب سب لوگوں کو جمع کرے گا یقیناً وہ بڑی حکمتوں والا بڑے علم والا ہے۔ (۲۵)

یقیناً ہم نے انسان کو کالی اور سڑی ہوئی کھٹکھٹاتی مٹی سے پیدا فرمایا ہے۔^(۳) (۲۶)

اور اس سے پہلے جنات کو ہم نے لو والی آگ^(۴) سے پیدا کیا۔ (۲۷)

وَأَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا لَكُمْ بِهِ وَمَا أَنْتُمْ لَهُ بِخَدِرِينَ ﴿۲۲﴾

وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِيهِمْ وَنُمِيتُهُمْ وَعَنْهُمُ الْوَارِثُونَ ﴿۲۳﴾

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْتَدِمِينَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ﴿۲۴﴾

وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۲۵﴾

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمِإٍ مَسْنُونٍ ﴿۲۶﴾

وَالْبَعَانَ خَلَقْتَهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ تَرَابِ السُّمُورِ ﴿۲۷﴾

(۱) ہواؤں کو جو جھل، اس لیے کہا کہ یہ ان بادلوں کو اٹھاتی ہیں جن میں پانی ہوتا ہے۔ جس طرح لَفْحَةٌ حاملہ اونٹنی کو کہا جاتا ہے جو بیٹ میں بچہ اٹھائے ہوتی ہے۔

(۲) یعنی یہ پانی جو ہم اتارتے ہیں، اسے تم ذخیرہ کر کے رکھنے پر بھی قادر نہیں ہو۔ یہ ہماری ہی قدرت و رحمت ہے کہ ہم اس پانی کو چشموں، نونوں اور نہروں کے ذریعے سے محفوظ رکھتے ہیں، ورنہ اگر ہم چاہیں تو پانی کی سطح اتنی نیچی کر دیں کہ چشموں اور کنوؤں سے پانی لینا تمہارے لیے ممکن نہ رہے، جس طرح بعض علاقوں میں اللہ تعالیٰ بعض دفعہ اپنی قدرت کا نمونہ دکھاتا ہے اللَّهُمَّ أَحْفَظْنَا مِنْهُ۔

(۳) مٹی کی مختلف حالتوں کے اعتبار سے اس کے مختلف نام ہیں۔ خشک مٹی، تراب، بھگی ہوئی طین، گوندھی ہوئی بدبودار ﴿حَمِإٍ مَسْنُونٍ﴾ یہ حَمِإٍ مَسْنُونٍ خشک ہو کر کھن کھن بولنے لگے تو صَلْصَالٍ اور جب اسے آگ میں پکالیا جائے تو فَخَّارٌ (ٹھیکری) کہلاتی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا جس طرح تذکرہ فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم خاکی کا پتلا حَمِإٍ مَسْنُونٍ (گوندھی ہوئی، سڑی ہوئی، بدبودار) مٹی سے بنایا گیا، جب وہ سوکھ کر کھن کھن کرنے لگا (یعنی صلصال) ہو گیا۔ تو اس میں روح پھونکی گئی، اسی صَلْصَالٍ کو قرآن میں دوسری جگہ كَالْفَخَّارِ (فخاری کی مانند) کہا گیا ہے۔ ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ (الرحمن۔ ۱۳) ”پیدا کیا انسان کو کھٹکھٹاتی مٹی سے جیسے ٹھیکری“

(۴) جن کو جن اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ سورہ رحمن میں جنات کی تخلیق ﴿يَا رَحْمَنُ مَنْ تَلَا﴾

وَاذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقُ بَشَرٍ مِّنْ صَلٰوٰتٍ مِّنْ حَمٰٓئِیْنٍ ﴿۳۸﴾

اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں ایک انسان کو کالی اور سڑی ہوئی کھکھنائی مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ (۲۸)

وَ اٰذْ اَسْوٰتُہٗ وَ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَفَعَلُوْا لَہٗ سٰجِدٰٓیْنَ ﴿۳۹﴾

تو جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے لیے سجدے میں گر پڑنا۔ (۳۹)

چنانچہ تمام فرشتوں نے سب کے سب نے سجدہ کر لیا۔ (۳۰) مگر ابلیس کے۔ کہ اس نے سجدہ کرنے والوں میں شمولیت کرنے سے (صاف) انکار کر دیا۔ (۳۱)

(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا اے ابلیس تجھے کیا ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا؟ (۳۲)

وہ بولا کہ میں ایسا نہیں کہ اس انسان کو سجدہ کروں جسے تو نے کالی اور سڑی ہوئی کھکھنائی مٹی سے پیدا کیا ہے۔ (۳۳)

فرمایا اب تو ہمیشہ سے نکل جا کیوں کہ تو رائدہ درگاہ ہے۔ (۳۴)

اور تجھ پر میری پھینکار ہے قیامت کے دن تک۔ (۳۵)

فَسٰجِدِ الْمَلٰٓئِکَۃَ کَلٰٓمًا جَمْعًا ﴿۴۰﴾

اِلَّا اِبْلِیْسَ اِنِّیْ اَنْ یُّکُوْنَ مَعَ السَّٰجِدِیْنَ ﴿۴۱﴾

قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا لَکَ الْاِنْتَاۤیْنَ مَعَ السَّٰجِدِیْنَ ﴿۴۲﴾

قَالَ لَہٗ اَنْ اَسْجُدَ لِیَسِّرْ خَلْقَتَہٗ مِنْ صَلٰوٰتٍ مِّنْ حَمٰٓئِیْنٍ ﴿۴۳﴾

قَالَ فَاخْرِجُوْہَا فَاِنَّکَ رَٰجِعٌ ﴿۴۴﴾

وَ اِنَّ عَلَیْکَ اللَّعْنَۃَ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ﴿۴۵﴾

سے بتلائی گئی ہے اور صحیح مسلم کی ایک حدیث میں یہی کہا گیا ہے، « خُلِقَتِ الْمَلٰٓئِکَةُ مِنْ نُورٍ وَ خُلِقَ الْجَانُّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَّارٍ وَ خُلِقَ اٰدَمُ مِمَّا وُصِفَ لَکُمْ » (کتاب الزہد، باب فی احادیث متفرقة) اس اعتبار سے لودالی آگ یا آگ کے شعلے کا ایک ہی مطلب ہو گا۔

(۱) سجدے کا یہ حکم بطور تعظیم کے تھا، عبادت کے طور پر نہیں۔ اور یہ چونکہ اللہ کا حکم تھا، اس لیے اس کے وجوب میں کوئی شک نہیں۔ تاہم شریعت محمدیہ میں بطور تعظیم بھی کسی کے لیے سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔

(۲) شیطان نے انکار کی وجہ حضرت آدم علیہ السلام کا خاکی اور بشر ہونا بتلایا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اور بشر کو اس کی بشریت کی بنا پر حقیر اور کم تر سمجھنا یہ شیطان کا فلسفہ ہے، جو اہل حق کا عقیدہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اہل حق انبیاء علیہم السلام کی بشریت کے منکر نہیں، اس لیے کہ ان کی بشریت کو خود قرآن کریم نے وضاحت سے بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں بشریت سے ان کی عظمت اور شان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿۳۶﴾

قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ﴿۳۷﴾

إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿۳۸﴾

قَالَ رَبِّ بِمَا أَتَوَيْتَنِي لِأَلَذَّنَنِي لَهُمْ فَنِي

الْأَرْضِ وَلَا أُخَوِّبُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۳۹﴾

الْأَعْبَادَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ ﴿۴۰﴾

قَالَ هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَوِيمٌ ﴿۴۱﴾

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَنٌ إِلَّا مَنِ

اشْتَبَكَ مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿۴۲﴾

وَأَنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۴۳﴾

لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُومٌ ﴿۴۴﴾

کہنے لگا کہ اے میرے رب! مجھے اس دن تک کی ذہیل دے کہ لوگ دوبارہ اٹھا کھڑے کیے جائیں۔ (۳۶)

فرمایا کہ اچھا تو ان میں سے ہے جنہیں مہلت ملی ہے۔ (۳۷)

روز مقرر کے وقت تک کی۔ (۳۸)

(شیطان نے) کہا کہ اے میرے رب! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے مجھے بھی قسم ہے کہ میں بھی زمین میں ان کے لئے معاصی کو مزین کروں گا اور ان سب کو برکازوں گا بھی۔ (۳۹)

سوائے تیرے ان بندوں کے جو منتخب کر لیے گئے ہیں۔ (۴۰)

ارشاد ہوا کہ ہاں یہی مجھ تک پہنچنے کی سیدھی راہ ہے۔ (۴۱)

میرے بندوں پر تجھے کوئی غلبہ نہیں، (۴۲) لیکن ہاں جو گمراہ لوگ تیری پیروی کریں۔ (۴۳)

یقیناً ان سب کے وعدے کی جگہ جہنم ہے۔ (۴۴) جس کے سات دروازے ہیں۔ ہر دروازے کے لیے ان

(۱) یعنی تم سب کو بلا آخر میرے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے، جنہوں نے میرا اور میرے رسولوں کا اتباع کیا ہوگا، میں انہیں اچھی جزا دوں گا اور جو شیطان کے پیچھے لگ کر گمراہی کے راستے پر چلتا رہا ہوگا اسے سخت سزا دوں گا جو جہنم کی صورت میں تیار ہے۔

(۲) یعنی میرے نیک بندوں پر تیرا دواؤ نہیں چلے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سے کوئی گناہ ہی سرزد نہیں ہوگا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان سے ایسا گناہ نہیں ہوگا کہ جس کے بعد وہ نادم اور تائب نہ ہوں کیوں کہ وہی گناہ انسان کی ہلاکت کا باعث ہے کہ جس کے بعد انسان کے اندر ندامت کا احساس اور توبہ و انابت الی اللہ کا داعیہ پیدا نہ ہو۔ ایسے گناہ کے بعد ہی انسان گناہ پر گناہ کرتا چلا جاتا ہے، اور بلا آخر دامنِ تباہی و ہلاکت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ اور اہل ایمان کی صفت یہ ہے کہ گناہ پر اصرار نہیں کرتے بلکہ فوراً توبہ کر کے آئندہ کے لیے اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۳) یعنی جتنے بھی تیرے پیروکار ہوں گے، سب جہنم کا عید ہن نہیں گے۔

کا ایک حصہ بنا ہوا ہے۔^(۱) (۳۴)

پر ہیز گار جنتی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں
گے۔^(۲) (۳۵)

(ان سے کہا جائے گا) سلامتی اور امن کے ساتھ اس میں
داخل ہو جاؤ۔^(۳) (۳۶)

ان کے دلوں میں جو کچھ رنجش و کینہ تھا، ہم سب کچھ
نکال دیں گے،^(۴) وہ بھائی بھائی بنے ہوئے ایک

دوسرے کے آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔ (۳۷)

نہ تو وہاں انہیں کوئی تکلیف چھو سکتی ہے اور نہ وہ وہاں
سے کبھی نکالے جائیں گے۔ (۳۸)

میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت ہی بخشنے والا اور
بڑا ہی مہربان ہوں۔ (۳۹)

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿۳۴﴾

أَدْخُلُوهَا يَسْلَمِينَ ﴿۳۵﴾

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَى

سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ ﴿۳۶﴾

لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴿۳۷﴾

يَوْمَ عِبَادِي أُنزِلَ آتَا الْعُقُورِ الرَّحِيمِ ﴿۳۸﴾

(۱) یعنی ہر دروازہ مخصوص قسم کے لوگوں کے لیے خاص ہو گا۔ مثلاً ایک دروازہ مشرکوں کے لیے، ایک دہریوں کے لیے، ایک زندیقوں کے لیے، ایک زانیوں، سو خوروں، چوروں اور ڈاکوؤں کے لیے وغیرہ وغیرہ۔ یا سات دروازوں سے مراد سات طبق اور درجے ہیں۔ پہلا طبق یا درجہ جہنم ہے، دوسرا نلی، پھر حطم، پھر سعیر، پھر سقر، پھر جیم، پھر باویہ، سب سے اوپر والا درجہ موحدین کے لیے ہو گا۔ جنہیں کچھ عرصہ سزا دینے کے بعد یا سفارش پر نکال لیا جائے گا۔ دوسرے میں یہودی، تیسرے میں عیسائی، چوتھے میں صابی، پانچویں میں مجوسی، چھٹے میں مشرکین اور ساتویں میں منافقین، ہوں گے۔ سب سے اوپر والے درجے کا نام جہنم ہے اس کے بعد اسی ترتیب سے نام ہیں۔ (فتح القدر)

(۲) جہنم اور اہل جہنم کے بعد جنت اور اہل جنت کا تذکرہ کیا جا رہا ہے تاکہ جنت میں جانے کی ترغیب ہو۔ متقین سے مراد شرک سے بچنے والے موحدین ہیں اور بعض کے نزدیک وہ اہل ایمان جو تمام معاصی سے بچتے رہے۔ جَنَاتٍ سے مراد باغات اور عُيُونٍ سے نہریں مراد ہیں۔ یہ باغات اور نہریں یا تو تمام متقین کے لیے مشترک ہوں گی، یا ہر ایک کے لیے الگ الگ باغات اور نہریں یا ایک ایک باغ اور نہر ہوگی۔

(۳) سلامتی ہر قسم کی آفات سے اور امن ہر قسم کے خوف سے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو یا فرشتے اہل جنت کو سلامتی کی وعادیں گے۔ یا اللہ کی طرف سے ان کی سلامتی اور امن کا اعلان ہو گا۔

(۴) دنیا میں ان کے درمیان جو آپس میں حسد اور بغض و عداوت کے جذبات رہے ہوں گے، وہ ان کے سینوں سے نکال دیے جائیں گے اور ایک دوسرے کے بارے میں ان کے دل آئینے کی طرح صاف اور شفاف ہوں گے۔

وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ﴿۵۰﴾

وَيَذَلُّهُمْ عَنْ صَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ﴿۵۱﴾

إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ إِنَّا أَنَاكُمْ وَجِلُونَ ﴿۵۲﴾

قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا ننبؤُكَ بِبُحُلُوِّ عَلَيْهِمُ ﴿۵۳﴾

قَالَ ابْشِرْ كُفُؤُنِي عَلَىٰ أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِئْرَءٍ

تُبَيِّرُونَ ﴿۵۴﴾

قَالُوا بَشْرُكَ يَا لِحَقِّ فَلَاتَكُنْ مِنَ الْفٰطِنِينَ ﴿۵۵﴾

قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّي إِلَّا الضَّالُّونَ ﴿۵۶﴾

قَالَ مَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿۵۷﴾

قَالُوا إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ ﴿۵۸﴾

اور ساتھ ہی میرے عذاب بھی نہایت دردناک ہیں۔ (۵۰)

انہیں ابراہیم کے ممانوں کا (بھی) حال سنا دو۔ (۵۱)

کہ جب انہوں نے ان کے پاس آکر سلام کہا تو انہوں

نے کہا کہ ہم کو تو تم سے ڈر لگتا ہے۔ (۵۲) ^(۱)

انہوں نے کہا ڈرو نہیں، ہم تجھے ایک صاحب علم فرزند

کی بشارت دیتے ہیں۔ (۵۳)

کہا، کیا اس بڑھاپے کے آجانے کے بعد تم مجھے خوشخبری

دیتے ہو! یہ خوشخبری تم کیسے دے رہے ہو؟ (۵۴)

انہوں نے کہا ہم آپ کو بالکل سچی خوشخبری سناتے ہیں

آپ مایوس لوگوں میں شامل نہ ہوں۔ (۵۵) ^(۲)

کہا اپنے رب تعالیٰ کی رحمت سے ناامید تو صرف گمراہ

اور نیکے ہوئے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ (۵۶) ^(۳)

پوچھا کہ اللہ کے بھیجے ہوئے (فرشتوں) تمہارا ایسا کیا اہم

کام ہے؟ (۵۷) ^(۴)

انہوں نے جواب دیا کہ ہم مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے

ہیں۔ (۵۸)

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان فرشتوں سے ڈر اس لیے محسوس ہوا کہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تیار کردہ بھنا ہوا پھنچڑا نہیں کھایا، جیسا کہ سورہ ہود میں تفصیل گزری۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبروں کو بھی غیب کا علم نہیں ہوتا، اگر پیغمبر عالم الغیب ہوتے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ جاتے کہ آنے والے ممان فرشتے ہیں اور ان کے لیے کھانا تیار کرنے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ فرشتے انسانوں کی طرح کھانے پینے کے محتاج نہیں ہیں۔

(۲) کیونکہ یہ اللہ کا وعدہ ہے جو خلاف نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں وہ ہر بات پر قادر ہے، کوئی بات اس کے لیے ناممکن نہیں۔

(۳) یعنی اولاد کے ہونے پر میں جو تعجب اور حیرت کا اظہار کر رہا ہوں تو صرف اپنے بڑھاپے کی وجہ سے کر رہا ہوں یہ بات نہیں ہے کہ میں اپنے رب کی رحمت سے ناامید ہوں۔ رب کی رحمت سے ناامید تو گمراہ لوگ ہی ہوتے ہیں۔

(۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان فرشتوں کی گفتگو سے اندازہ لگا لیا کہ یہ صرف اولاد کی بشارت دینے ہی نہیں آئے ہیں بلکہ ان کی آمد کا اصل مقصد کوئی اور ہے۔ چنانچہ انہوں نے پوچھا۔

إِلَّا آلَ لُوطٍ إِنَّا كُنَّا جُحُومًا أَجْمَعِينَ ﴿۵۹﴾

إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَرْنَا نَحْنُ الْغَايِبُونَ ﴿۶۰﴾

فَلَمَّا جَاءَ آلَ لُوطٍ الْمُرْسَلُونَ ﴿۶۱﴾

قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّتَكَبِّرُونَ ﴿۶۲﴾

قَالُوا بَلْ جُنَّتْ بِكُمَا كَلُوفِيهِمْ يَتَدَرُونَ ﴿۶۳﴾

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ يَا لُوطُ وَأِنَّا لَالصَّادِقُونَ ﴿۶۴﴾

فَأَنصَرَفْنَا إِلَيْكَ بِنَصْلِهِ لَنَبَيِّنَ الْبَيِّنَاتِ وَأَنصَبُؤُا دَبَابَكُمْ

وَلَا يَلْتَمِعُونَ مِنْكُمْ أَحَدًا وَآمُضُوا حَيْثُ تُؤْمَرُونَ ﴿۶۵﴾

وَقَصَيْنَا لَكُمُ الْقِصَّةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا لُوطًا بِمَا كَفَرْنَا وَإِنَّا لَمُطَّوِّرُونَ

مُضْجِعِينَ ﴿۶۶﴾

وَجَاءَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿۶۷﴾

مگر خاندان لوط کہ ہم ان سب کو تو ضرور بچالیں گے۔ (۵۹)
سوائے اس (لوط) کی بیوی کے کہ ہم نے اسے رکنے اور
باقی رہ جانے والوں میں مقرر کر دیا ہے۔ (۶۰)

جب بھیجے ہوئے فرشتے آل لوط کے پاس پہنچے۔ (۶۱)
تو انہوں (لوط علیہ السلام) نے کہا تم لوگ تو کچھ انجان
سے معلوم ہو رہے ہو۔ (۶۲)

انہوں نے کہا نہیں بلکہ ہم تیرے پاس وہ چیز لائے ہیں
جس میں یہ لوگ شک شبہ کر رہے تھے۔ (۶۳)

ہم تو تیرے پاس (صریح) حق لائے ہیں اور ہیں بھی بالکل
سچے۔ (۶۴)

اب تو اپنے خاندان سمیت اس رات کے کسی حصہ میں
چل دے اور آپ ان کے پیچھے رہنا، (۶۵) اور (خبردار) تم
میں سے کوئی (پیچھے) مڑ کر بھی نہ دیکھے اور جہاں کا تمہیں
حکم کیا جا رہا ہے وہاں چلے جانا۔ (۶۵)

اور ہم نے اس کی طرف اس بات کا فیصلہ کر دیا کہ صبح ہوتے
ہوتے ان لوگوں کی جڑیں کلٹ دی جائیں گی۔ (۶۶)
اور شہروالے خوشیاں مناتے ہوئے آئے۔ (۶۷)

(۱) یہ فرشتے حسین نوجوانوں کی شکل میں آئے تھے اور حضرت لوط علیہ السلام کے لیے بالکل انجان تھے، اس لیے انہوں نے ان سے اجنبیت اور بیگانگی کا اظہار کیا۔

(۲) یعنی عذاب الہی۔ جس میں تیری قوم کو شک ہے کہ وہ ابھی سکتا ہے؟

(۳) اس صریح حق سے بھی عذاب مراد ہے جس کے لیے وہ بھیجے گئے تھے، اس لیے انہوں نے کہا ہم ہیں بھی بالکل سچے۔ یعنی عذاب کی جو بات ہم کر رہے ہیں۔ اس میں سچے ہیں۔ اب اس قوم کی تباہی کا وقت بالکل قریب آپہنچا ہے۔

(۴) تاکہ کوئی مومن پیچھے نہ رہے، تو ان کو آگے کرتا رہے۔

(۵) یعنی لوط علیہ السلام کو وحی کے ذریعے سے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا کہ صبح ہونے تک ان لوگوں کی جڑیں کلٹ دی جائیں گی، یا دابہ سے مراد وہ آخری آدمی ہے جو باقی رہ جائے گا، فرمایا، وہ بھی صبح ہونے تک ہلاک کر دیا جائے گا۔

(۶) ادھر تو حضرت لوط علیہ السلام کے گھر میں قوم کی ہلاکت کا یہ فیصلہ ہو رہا تھا۔ ادھر قوم لوط کو پتہ چلا کہ لوط علیہ السلام

قَالَ إِنَّ هَؤُلَاءِ ضَلُّوا فَلَا تَفْضَحُون ۝۳۹

(لوط علیہ السلام نے) کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں تم مجھے رسوا نہ کرو۔^(۱) (۶۸)

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزِبُوهُ ۝۴۰

اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو۔ (۶۹)
وہ بولے کیا ہم نے تجھے دنیا بھر (کی ٹھیکیداری) سے منع نہیں کر رکھا؟^(۲) (۷۰)

قَالُوا أَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعَالَمِينَ ۝۴۱

(لوط علیہ السلام نے) کہا اگر تمہیں کرنا ہی ہے تو یہ میری بچیاں موجود ہیں۔^(۳) (۷۱)

قَالَ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ۝۴۲

تیری عمر کی قسم! وہ تو اپنی بد مستی میں سرگرداں تھے۔^(۴) (۷۲)

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝۴۳

پس سورج نکلنے نکلنے انہیں ایک بڑے زور کی آواز نے

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِينَ ۝۴۴

کے گھر میں خوش شکل نوجوان مہمان آئے ہیں تو اپنی امد پرستی کی وجہ سے بڑے خوش ہوئے اور خوشی خوشی حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے اور مطالبہ کیا کہ ان نوجوانوں کو ان کے سپرد کیا جائے تاکہ وہ ان سے بے حیائی کا ارتکاب کر کے اپنی تسکین کر سکیں۔

(۱) حضرت لوط علیہ السلام نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ مہمان ہیں انہیں میں کس طرح تمہارے سپرد کر سکتا ہوں، اس میں تو میری رسوائی ہے۔

(۲) انہوں نے ڈھٹائی اور بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ اے لوط! تو ان اجنبیوں کا کیا لگتا ہے؟ اور کیوں ان کی حمایت کرتا ہے؟ کیا ہم نے تجھے منع نہیں کیا ہے کہ اجنبیوں کی حمایت نہ کیا کر، یا ان کو اپنا مہمان نہ بنایا کر! یہ ساری گفتگو اس وقت ہوئی جب کہ حضرت لوط علیہ السلام کو یہ علم نہیں تھا کہ یہ اجنبی مہمان اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں اور وہ اسی ناانبار قوم کو تباہ کرنے کے لیے آئے ہیں جو ان فرشتوں کے ساتھ بد فعلی کے لیے مصر تھی، جیسا کہ سورہ ہود میں یہ تفصیل گزر چکی ہے۔ یہاں ان کے فرشتے ہونے کا ذکر پہلے آ گیا ہے۔

(۳) یعنی ان سے تم نکاح کر لو یا پھر اپنی قوم کی عورتوں کو اپنی بیٹیاں کہا، یعنی تم عورتوں سے نکاح کر دیا جن کے حبار عقد میں عورتیں ہیں، وہ ان سے اپنی خواہش پوری کریں۔

(۴) اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرما کر، ان کی زندگی کی قسم کھا رہا ہے، جس سے آپ کا شرف و فضل واضح ہے۔ تاہم کسی اور کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی قسم کھانا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تو حاکم مطلق ہے، وہ جس کی چاہے قسم کھائے، اس سے کون پوچھنے والا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس طرح شراب کے نشے میں دھت انسان کی عقل ماؤف ہو جاتی ہے، اسی طرح یہ اپنی بد مستی اور گمراہی میں اتنے سرگرداں تھے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی اتنی معقول بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آ پائی۔

پکڑ لیا۔^(۱) (۷۳)

بالآخر ہم نے اس شہر کو اوپر تلے کر دیا^(۲) اور ان لوگوں پر
کنکر والے پتھر^(۳) برسائے۔ (۷۴)

بلاشبہ بعصرت والوں کے لیے^(۴) اس میں بہت سی
نشانیاں ہیں۔ (۷۵)

یہ بستی ایسی راہ پر ہے جو برابر چلتی رہتی (عام گذرگاہ)
ہے۔^(۵) (۷۶)

اور اس میں ایمان والوں کے لیے بڑی نشانی ہے۔ (۷۷)
ایک بستی کے رہنے والے بھی بڑے ظالم تھے۔^(۶) (۷۸)

فَجَعَلْنَا عَلَيْهِمُ سَائِبًا وَهَٰؤُلَاءِ آمَنُوا عَلَيْهِمْ حَجَارَةً
مِّنْ سِجِّيلٍ ۝

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّمُنْتَسِمِينَ ۝

وَأَنَّهَا لَلسَّبِيلِ مَعْقُودَةٌ ۝

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّمُنْتَسِمِينَ ۝

وَأَنَّكَ كَانَ أَضْعَبَ الْأَيْدِيَةَ الظَّالِمِينَ ۝

(۱) ایک چنگھاڑنے، جب کہ سورج طلوع ہو چکا تھا، ان کا خاتمہ کر دیا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ زوردار آواز حضرت جبرائیل
علیہ السلام کی تھی۔

(۲) کہا جاتا ہے کہ ان کی بستیوں کو زمین سے اٹھا کر اوپر آسمان پر لے جایا گیا اور وہاں سے ان کو اٹا کر زمین پر پھینک دیا
گیا۔ یوں اوپر والا حصہ نیچے اور نچلا حصہ اوپر کر کے تہ و بالا کر دیا گیا، اور کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد محض اس بستی کا
پھتوس سمیت زمین بوس ہو جانا ہے۔

(۳) اس کے بعد ان پر کنکر قسم کے مخصوص پتھر برسائے گئے۔ اس طرح گویا تین قسم کے عذابوں سے انہیں دوچار کر
کے نشان عبرت بنا دیا گیا۔

(۴) گہری نظر سے جائزہ لینے اور غور و فکر کرنے والوں کو مُنْتَسِمِينَ کہا جاتا ہے۔ مُنْتَسِمِينَ کے لیے اس واقعے میں
عبرت کے پہلو اور نشانیاں ہیں۔

(۵) مراد شاہراہ عام ہے۔ یعنی قوم لوط کی بستیاں مدینے سے شام کو جاتے ہوئے راستے میں پڑتی ہیں۔ ہر آنے جانے والے
کو انہی بستیوں سے گزر کر جانا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں یہ پانچ بستیاں تھیں۔ سَدُومُ (یہ مرکزی بستی تھی) صَعْبَةُ، صَعُودَةُ
عَشْرَةُ اور دُومَا کہا جاتا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے اپنے بازو پر انہیں اٹھایا اور آسمان پر چڑھ گئے حتیٰ کہ آسمان والوں
نے ان کے کتوں کے بھونکنے اور مرغوں کے بولنے کی آوازیں سُنیں اور پھر ان کو زمین پر دے مارا (ابن کثیر) مگر اس بات
کی کوئی سند نہیں ہے۔

(۶) آيَةُ گھنے درخت کو کہتے ہیں۔ اس بستی میں گھنے درخت ہوں گے۔ اس لیے انہیں أَضْحَابُ الْآيَةِ (بن یا جنگل
والے) کہا گیا ہے۔ مراد اس سے قوم شعیب ہے اور ان کا زمانہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد ہے اور ان کا علاقہ حجاز اور
شام کے درمیان قوم لوط کی بستیوں کے قریب ہی تھا۔ اسے مدین کہا جاتا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے یا پوتے

فَلْتَعْنَأْ مِنْهُمْ وَإِنَّهُمْ لِيَأْمُرُونَ مُبِينٌ ۝

وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ النَّجْرِ الْمُرْسَلِينَ ۝

وَاتَيْنَهُمُ الْيَتِيمَاتِ فَكَانُوا عَمَهَا مَعْرِضِينَ ۝

وَكَا أَنْوَابِنَحْوُونَ مِنَ الْجِبَالِ يُوْوَاتَا أَمْسِينَ ۝

فَلَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ ۝

فَمَا أَعْنَى عَنْهُمْ مَتَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا الْحَقِّقَ

وَرَأَى السَّاعَةَ لَآتِيَةً فَاصْصِ الصَّعَةِ الْمُبِينِ ۝

جن سے (آخر) ہم نے انتقام لے ہی لیا۔ یہ دونوں شر
کھلے (عام) راستے پر ہیں۔ (۷۹) (۱)

اور حجر والوں نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔ (۸۰) (۲)

اور ہم نے ان کو اپنی نشانیاں بھی عطا فرمائیں (لیکن)
تاہم وہ ان سے روگردانی ہی کرتے رہے۔ (۸۱) (۳)

یہ لوگ پہاڑوں کو تراش تراش کر گھر بناتے تھے، بے
خوف ہو کر۔ (۸۲) (۴)

آخر انہیں بھی صبح ہوتے ہوتے چنگھاڑنے آدو چا۔ (۸۳) (۵)

پس ان کی کسی تدبیر و عمل نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔ (۸۳) (۶)

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان کی سب
چیزوں کو حق کے ساتھ ہی پیدا فرمایا ہے، (۸۴) اور قیامت

کا نام تھا اور اسی کے نام پر بستی کا نام پڑ گیا تھا۔ ان کا ظلم یہ تھا کہ اللہ کے ساتھ شرک کرتے تھے، رہنئی ان کا شیوہ
اور کم تو لانا اور کم پانا ان کا طیرہ تھا، ان پر جب عذاب آیا تو ایک تو بادل ان پر سایہ لگن ہو گیا پھر چنگھاڑ اور بھونچال نے
مل کر ان کو ہلاک کر دیا۔

(۱) اِمَامِ مُبِينٍ کے معنی بھی شاہراہ عام کے ہیں، جہاں سے شب و روز لوگ گزرتے ہیں۔ دونوں شر سے مراد قوم لوط کا
شہر اور قوم شعیب کا مسکن۔ مدین۔ مراد ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہی تھے۔

(۲) حجر حضرت صالح علیہ السلام کی قوم۔ ثمود۔ کی بستیوں کا نام تھا۔ انہیں اَصْحَابُ النَّجْرِ (حجر والے) کہا گیا ہے۔ یہ بستی
مدینہ اور تبوک کے درمیان تھی۔ انہوں نے اپنے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا۔ لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا
”انہوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا، یہ اس لیے کہ ایک پیغمبر کی تکذیب ایسے ہی ہے جیسے سارے پیغمبروں کی تکذیب۔“

(۳) ان نشانوں میں وہ انوشی بھی تھی جو ان کے کہنے پر ایک چٹان سے بطور معجزہ ظاہر کی گئی تھی، لیکن ظالموں نے
اسے بھی قتل کر ڈالا۔

(۴) یعنی بغیر کسی خوف یا احتیاج کے پہاڑ تراش لیا کرتے تھے۔ ۹ ہجری میں تبوک جاتے ہوئے جب رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم اس بستی سے گزرے تو آپ ﷺ نے سر پر کپڑا لپیٹ لیا اور اپنی سواری کو تیز کر لیا اور صحابہ سے فرمایا کہ
روتے ہوئے اور اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اس بستی سے گزرو (ابن کثیر) صحیح بخاری و مسلم میں بھی یہ روایت
ہے۔ نمبر ۳۳۳، مسلم نمبر ۲۲۸۵۔

(۵) حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں کہا کہ تین دن کے بعد تم پر عذاب آجائے گا چنانچہ چوتھے روز ان پر یہ عذاب آ گیا۔

(۶) حق سے مراد وہ فوائد و مصالح ہیں جو آسمان و زمین کی پیدائش سے مقصود ہیں۔ یا حق سے مراد محسن (نیو کار) کو اس

ضرور ضرور آنے والی ہے۔ پس تو حسن و خوبی (اور اچھائی) سے درگزر کر لے۔ (۸۵)

یقیناً تیرا پروردگار ہی پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے۔ (۸۶)

یقیناً ہم نے آپ کو سات آیتیں دے رکھی ہیں (۱) کہ دہرائی جاتی ہیں اور عظیم قرآن بھی دے رکھا ہے۔ (۸۷) آپ ہرگز اپنی نظریں اس چیز کی طرف نہ دوڑائیں، جس سے ہم نے ان میں سے کئی قسم کے لوگوں کو بہرہ مند کر رکھا ہے، نہ ان پر آپ افسوس کریں اور مومنوں کے لیے اپنے بازو جھکائے رہیں۔ (۸۸) (۲)

اور کہہ دیجئے کہ میں تو کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔ (۸۹) جیسے کہ ہم نے ان تقسیم کرنے والوں پر اتارا۔ (۹۰) (۳)

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلْقُ الْعَلِيمُ ﴿۸۵﴾

وَلَعَلَّآ تَتَذَكَّرُ الْآيَاتِ الْكَلِمَاتِ وَالْقُرْآنِ الْعَظِيمِ ﴿۸۶﴾

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْتُمَا بِآزْوَاجِهِمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَخَفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۸۷﴾

وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ﴿۸۸﴾

كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ ﴿۸۹﴾

کی نیکی کا اور بدکار کو اس کی برائی کا بدلہ دینا ہے۔ جس طرح ایک دوسرے مقام پر فرمایا ”اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے تاکہ وہ بروں کو ان کی برائیوں کا اور نیکیوں کو ان کی نیکی کا بدلہ دے (النجم-۳۱) (۱) سَبْعُ مِثَاقِينَ سے مراد کیا ہے؟ اس میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد سورہ فاتحہ ہے۔ یہ سات آیتیں ہیں اور جو ہر نماز میں بار بار پڑھی جاتی ہیں (مثانی کے معنی بار بار دہرانے کے کیے گئے ہیں) حدیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ یہ سببِ مِثَاقِينَ وَالْقُرْآنِ الْعَظِيمِ (حوالہ مذکور) سورہ فاتحہ قرآن کا ایک جزء ہے اس لیے قرآن عظیم کا ذکر بھی ساتھ ہی کیا گیا ہے۔

(۲) یعنی ہم نے سورہ فاتحہ اور قرآن عظیم جیسی نعمتیں آپ کو عطا کی ہیں، اس لیے دنیا اور اس کی زمینیں اور ان مختلف قسم کے اہل دنیا کی طرف نظر نہ دوڑائیں جن کو دنیائے فانی کی عارضی چیزیں ہم نے دی ہیں اور وہ جو آپ کی تکذیب کرتے ہیں، اس پر غم نہ کھائیں اور مومنوں کے لیے اپنے بازو جھکائے رہیں، یعنی ان کے لیے نرمی اور محبت کا رویہ اپنائیں۔ اس محاورہ کی اصل یہ ہے کہ جب پرندہ اپنے بچوں کو اپنے سایہ شفقت میں لیتا ہے تو ان کو اپنے بازوؤں یعنی پروں میں لے لیتا ہے۔ یوں یہ ترکیب نرمی، پارو محبت کا رویہ اپنانے کے مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔

(۳) بعض مفسرین کے نزدیک أَنْزَلْنَا کا مفعول الْعَذَابِ مَحذُوفٌ ہے۔ معنی یہ ہیں کہ میں تمہیں کھول کر ڈرانے والا

جنہوں نے اس کتاب الہی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ (۹۱)
قسم ہے تیرے پالنے والے کی! ہم ان سب سے ضرور باز
پرس کریں گے۔ (۹۲)

ہر اس چیز کی جو وہ کرتے تھے۔ (۹۳)
پس آپ ^(۱) اس حکم کو جو آپ کو کیا جا رہا ہے کھول کر سنا
دیتے اور مشرکوں سے منہ پھیر لیجئے۔ (۹۴)
آپ سے جو لوگ مسخر اپن کرتے ہیں ان کی سزا کے لیے
ہم کافی ہیں۔ (۹۵)

جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود مقرر کرتے ہیں انہیں
عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ (۹۶)
ہمیں خوب علم ہے کہ ان کی باتوں سے آپ کا دل تنگ
ہوتا ہے۔ (۹۷)

آپ اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بیان کرتے رہیں اور
سجدہ کرنے والوں میں شامل ہو جائیں۔ (۹۸)
اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں یہاں تک کہ آپ
کو موت آجائے۔ ^(۲) (۹۹)

الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ ۝
قُورِكَ لَتَسَنَّاهُمْ أَجْمَعِينَ ۝۱۶

عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝۱۷

فَأَصْدَعُ يُمَازُومُوا أَعْرُضَ عَنِ الْفُشْرِيِّينَ ۝۱۸

إِنَّا كَافِيكَ الْمُتَشَفِّعِينَ ۝۱۹

الَّذِينَ يَبْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝۲۰

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرَكَ بِمَا يَقُولُونَ ۝۲۱

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ۝۲۲

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ۝۲۳

ہوں عذاب سے، مثل اس عذاب کے جو مُفْتَسِّمِينَ پر نازل ہوا مُفْتَسِّمِينَ کون ہیں؟ جنہوں نے کتاب الہی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے قریش کی قوم مراد ہے جنہوں نے اللہ کی کتاب کو تقسیم کر دیا، اس کے بعض حصے کو شعر، بعض کو سحر (جادو) بعض کو کمانت اور بعض کو اساطیر الاولین (پہلوں کی کمانیاں) قرار دیا۔ بعض کہتے ہیں کہ مُفْتَسِّمِينَ سے اہل کتاب اور قرآن سے مراد تورات و انجیل ہیں۔ انہوں نے ان آسمانی کتابوں کو متفرق اجزا میں بانٹ دیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ہے جنہوں نے آپس میں قسم کھائی تھی کہ صالح علیہ السلام اور ان کے گھر والوں کو رات کے اندھیرے میں قتل کر دیں گے۔ ﴿فَتَقَسَّمُوا لِلَّهِ لَنْ يُبَيِّنَنَّكَ وَ أَهْلَكَ﴾ (النمل: ۴۹) اور آسمانی کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ عِضِينَ کے ایک معنی یہ بھی کیے گئے ہیں کہ اس کی بعض باتوں پر ایمان رکھنا اور بعض کے ساتھ کفر کرنا۔

(۱) اَصْدَعُ کے معنی ہیں کھول کر بیان کرنا، اس آیت کے نزول سے قبل آپ چھپ کر تبلیغ فرماتے تھے، اس کے بعد آپ نے کھلم کھلا تبلیغ شروع کر دی۔ (فتح القدیر)

(۲) مشرکین آپ کو ساحر، مجنون، کاہن وغیرہ کہتے جس سے بشری جبلت کی وجہ سے آپ کبیدہ خاطر ہوتے، اللہ تعالیٰ

سورہ نحل کی ہے اور اس کی ایک سواٹھا میں آیتیں اور
سولہ رکوع ہیں۔



شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑا
رحم والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اللہ تعالیٰ کا حکم آپہنچا، اب اس کی جلدی نہ مچاؤ۔^(۱) تمام
پاکی اس کے لیے ہے وہ برتر ہے ان سب سے جنہیں یہ
اللہ کے نزدیک شریک بتلاتے ہیں۔^(۱)

اِنِّیْ اَمْرٌ لِّلّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ سُبْحٰنَہٗ وَتَعَلٰی عَمَّا
یُشْرٰکُوْنَ ۝

وہی فرشتوں کو اپنی وحی^(۲) دے کر اپنے حکم سے اپنے
بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے^(۳) اتارتا ہے کہ تم
لوگوں کو آگاہ کر دو کہ میرے سوا اور کوئی معبود نہیں، پس
تم مجھ سے ڈرو۔^(۲)

یٰۤاَيُّهَا الْمَلٰٓئِکَۃُ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ
مِّنْ عِبَادِہٖ اَنْ اَنْذِرُوْا اَہْلَ الْاَنْۢبِیَآءِ اَقَاتُوْنَ ۝

اسی نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا^(۳) وہ
اس سے بری ہے جو مشرک کرتے ہیں۔^(۳)

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ تَعَلٰی عَمَّا یُشْرٰکُوْنَ ۝

نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ آپ حمد و ثنا کریں، نماز پڑھیں اور اپنے رب کی عبادت کریں، اس سے آپ کو قلبی سکون
بھی ملے گا اور اللہ کی مدد بھی حاصل ہوگی، سجدے سے یہاں نماز اور یقین سے مراد موت ہے۔

(۱) اس سے مراد قیامت ہے، یعنی وہ قیامت قریب آگئی ہے جسے تم دور سمجھتے تھے، پس جلدی نہ مچاؤ، یا وہ عذاب مراد ہے جسے
مشرکین طلب کرتے تھے۔ اسے مستقبل کے بجائے ماضی کے صیغے سے بیان کیا، کیوں کہ اس کا وقوع یقینی ہے۔

(۲) رُوح سے مراد وحی ہے جیسا کہ قرآن مجید کے دوسرے مقام پر ہے۔ ﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحٰیۤنَاۤ اِلَیْكَ رُوحًا مِّنْ اَمْرِنَا لَمَّا کُنْتَ تَدْرِیْ
نَا لَکِنَّاۤ اِنَّا لَاۤ اِنۡشَآءُ ﴿ (الشوریٰ: ۵۲) ”اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے وحی کی، اس سے پہلے آپ کو علم نہیں
تھا کہ کتاب کیا ہے، اور ایمان کیا ہے۔“

(۳) مراد انبیاء علیہم السلام ہیں جن پر وحی نازل ہوتی ہے۔ جس طرح اللہ نے فرمایا ﴿ اِنَّہٗ اَعْلَمُ حَیثُ یُجْعَلُ رِسَالَتُہٗ ﴿
(الأنعام: ۱۱۳) ”اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کہاں اپنی رسالت رکھے۔“ ﴿ یُنۢفِخُ الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ لَیُنۢذِرَ
یَوْمَ النَّفٰثٰتِ ﴿ (المؤمن: ۱۵) ”وہ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں جس پر چاہتا ہے وحی ڈالتا یعنی نازل فرماتا ہے تاکہ وہ
ملاقات والے (قیامت کے) دن سے لوگوں کو ڈرائے۔“

(۴) یعنی محض تماشے اور کھیل کود کے طور پر نہیں پیدا کیا بلکہ ایک مقصد پیش نظر ہے اور وہ ہے جزا و سزا، جیسا کہ ابھی
تفصیل گزری۔

اس نے انسان کو نطفے سے پیدا کیا پھر وہ صریح جھگڑا لو بن بیٹھا۔^(۱) (۳)

اسی نے چوپائے پیدا کیے جن میں تمہارے لیے گرمی کے لباس ہیں اور بھی بہت سے نفع ہیں^(۲) اور بعض تمہارے کھانے کے کام آتے ہیں۔ (۵)

اور ان میں تمہاری رونق بھی ہے جب چرا کر لاؤ تب بھی اور جب چرانے لے جاؤ تب بھی۔^(۳) (۶)

اور وہ تمہارے بوجھ ان شہروں تک اٹھالے جاتے ہیں جہاں تم بغیر آدمی جان کیے پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔ یقیناً تمہارا رب بڑا ہی شفیق اور نہایت مہربان ہے۔ (۷)

گھوٹوں کو، خچروں کو، گدھوں کو اس نے پیدا کیا کہ تم ان کی سواری لو اور وہ باعث زینت بھی ہیں۔^(۴) اور بھی

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ۝

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ

وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ۝

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۝

وَتَحْمِلُ أَوْعَالَكُمْ إِلَىٰ مَكَادٍ مُّبِينَةٍ وَإِلَىٰ مَشَاقِقِ

الْأَنْفُسِ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرؤُوفٌ رَّحِيمٌ ۝

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ۝

(۱) یعنی ایک جلد چیز سے جو ایک جاندار کے اندر سے نکلتی ہے، جسے منی کہا جاتا ہے۔ اسے مختلف اطوار سے گزار کر ایک مکمل صورت دی جاتی ہے، پھر اس میں اللہ تعالیٰ روح پھونکتا ہے اور ماں کے پیٹ سے نکال کر اس دنیا میں لاتا ہے جس میں وہ زندگی گزارتا ہے لیکن جب اسے شعور آتا ہے تو اسی رب کے معاملے میں جھگڑتا، اس کا انکار کرتا یا اس کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے۔

(۲) اسی احسان کے ساتھ دوسرے احسان کا ذکر فرمایا کہ چوپائے (اونٹ، گائے اور بکریاں) بھی اسی نے پیدا کیے، جن کے بالوں اور اون سے تم گرم کپڑے تیار کر کے گرمی حاصل کرتے ہو۔ اسی طرح ان سے دیگر منافع حاصل کرتے ہو، مثلاً ان سے دودھ حاصل کرتے ہو، ان پر سواری کرتے اور سامان لاتے ہو، ان کے ذریعے سے ہل چلاتے اور کھیتوں کو سیراب کرتے ہو، وغیرہ وغیرہ۔

(۳) تَرِيحُونَ جب شام کو چراگاہوں سے چرا کر گھراؤ تَسْرَحُونَ جب صبح چرانے کے لیے لے جاؤ، ان دونوں وقتوں میں یہ لوگوں کی نظروں میں آتے ہیں جس سے تمہارے حسن و جمال میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان دونوں اوقات کے علاوہ وہ نظروں سے اوجھل رہتے یا باڑوں میں بند رہتے ہیں۔

(۴) یعنی ان کی پیدائش کا اصل مقصد اور فائدہ تو ان پر سواری کرنا ہے تاہم یہ زینت کا بھی باعث ہیں۔ گھوڑے، خچر، اور گدھوں کے الگ ذکر کرنے سے بعض فقہانے استدلال کیا ہے کہ گھوڑا بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح گدھا اور خچر۔ علاوہ ازیں کھانے والے چوپایوں کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ اس لیے اس آیت میں جن تین جانوروں کا ذکر ہے، یہ صرف

وہ ایسی بہت چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم بھی نہیں۔^(۸)

اور اللہ پر سیدھی راہ کا بتا دینا ہے^(۹) اور بعض ٹیڑھی راہیں ہیں، اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو راہ راست پر لگا دیتا۔^(۱۰)

وہی تمہارے فائدے کے لیے آسمان سے پانی برساتا ہے جسے تم پیتے بھی ہو اور اسی سے آگے ہوئے درختوں کو تم اپنے جانوروں کو چراتے ہو۔ (۱۰)

وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ①

وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمَا يَجَاهِدُونَ وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ②

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ

وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ ③

رکوب (سواری) کے لیے ہے۔ لیکن یہ استدلال اس لیے صحیح نہیں کہ صحیح احادیث سے گھوڑے کی حلت ثابت ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑوں کا گوشت کھانے کی اجازت دی ہے۔ اَدْنٌ فِيهِ لُحُومِ الْخَيْلِ (صحیح بخاری، کتاب الذبائح، باب لحوم الخيل۔ ومسلم كتاب الصيد، باب في أكل لحوم الخيل)، علاوہ ازیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں خیبر اور مدینہ میں گھوڑا ذبح کر کے اس کا گوشت پکایا اور کھلایا۔ آپ ﷺ نے منع نہیں فرمایا (ملاحظہ ہو صحیح مسلم، باب مذکور، ومسند أحمد، ج ۳، ص ۳۵۶، أبو داود، کتاب الأطعمه، باب في أكل لحوم الخيل) اسی لیے جمہور علماء اور سلف و خلف کی اکثریت گھوڑے کی حلت کی قائل ہے۔ (تفسیر ابن کثیر) یہاں گھوڑے کا ذکر محض سواری کے ضمن میں اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کا غالب ترین استعمال اسی مقصد کے لیے ہے، وہ ساری دنیا میں ہمیشہ اتنا گراں اور قیمتی ہوا کرتا ہے کہ خوراک کے طور پر اس کا استعمال بہت ہی نادر ہے۔ بھیڑ بکری کی طرح اس کو خوراک کے لیے ذبح نہیں کیا جاتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کو بلا دلیل حرام ٹھہرا دیا جائے۔

(۱) زمین کے زیریں حصے میں، اسی طرح سمندر میں، اور بے آب و گیہ صحراؤں اور جنگلوں میں اللہ تعالیٰ مخلوق پیدا فرماتا رہتا ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں اور اسی میں انسان کی بنائی ہوئی وہ چیزیں بھی آجاتی ہیں جو اللہ کے دیئے ہوئے دماغ اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اسی کی پیدا کردہ چیزوں کو مختلف انداز میں جوڑ کر وہ تیار کرتا ہے، مثلاً بس، کار، ریل گاڑی، جہاز اور ہوائی جہاز اور اس طرح کی بے شمار چیزیں اور جو مستقبل میں متوقع ہیں۔

(۲) اس کے ایک دوسرے معنی ہیں ”اور اللہ ہی پر ہے سیدھی راہ“ یعنی اس کا بیان کرنا۔ چنانچہ اس نے اسے بیان فرما دیا اور ہدایت اور ضلالت دونوں کو واضح کر دیا، اسی لیے آگے فرمایا کہ بعض راہیں ٹیڑھی ہیں یعنی گمراہی کی ہیں۔

(۳) لیکن اس میں چوں کہ جبر ہوتا اور انسان کی آزمائش نہ ہوتی، اس لیے اللہ نے اپنی مشیت سے سب کو مجبور نہیں کیا، بلکہ دونوں راستوں کی نشاندہی کر کے، انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی دی ہے۔

اسی سے وہ تمہارے لیے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے بے شک ان لوگوں کے لیے تو اس میں بڑی نشانی ہے^(۱) جو غورو فکر کرتے ہیں۔ (۱۱)

اسی نے رات دن اور سورج چاند کو تمہارے لیے تابع کر دیا ہے اور ستارے بھی اسی کے حکم کے ماتحت ہیں۔ یقیناً اس میں عقلمند لوگوں کے لیے کئی ایک نشانیاں موجود ہیں۔ (۱۲)^(۲)

اور بھی بہت سی چیزیں طرح طرح کے رنگ روپ کی اس نے تمہارے لیے زمین پر پھیلا رکھی ہیں۔ بیشک نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے اس میں بڑی بھاری نشانی ہے۔ (۱۳)^(۳)

اور دریا بھی اسی نے تمہارے بس میں کر دیے ہیں کہ تم اس میں سے (نکلا ہوا) تازہ گوشت کھاؤ اور اس میں سے اپنے پینے کے زیورات نکال سکو اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں اس میں پانی چیرتی ہوئی (چلتی) ہیں اور اس لیے بھی کہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور ہو سکتا ہے کہ تم شکر گزاری بھی کرو۔ (۱۴)^(۴)

يُنَبِّئُكُمْ بِهِ الرُّزُقَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ
وَالْأَعْنَابَ وَمَنْ كُلَّ الثَّمَرَاتِ إِنَّ فِي ذَلِكَ
لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْتَبِرُونَ ﴿۱۱﴾

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْيَمِينَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ
وَالنَّجْمُومُ مَسْحُورَاتٍ إِنَّمَا فِي ذَلِكَ آيَاتٍ
لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۱۲﴾

وَمَا ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ إِنَّ فِي
ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَذَكَّرُونَ ﴿۱۳﴾

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لَكُمْ لَازِغًا وَغَاطِرًا
وَسَخَّرَ لَكُمْ مِنْهُ حُلِيًّا تَلْبَسُونَ لَهَا وَتَرَى
الْفُلُوكَ مَوَاجِرًا فِيهِ وَلَبِئْسَ أَقْوَامٌ فَضَّلُوا
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۴﴾

(۱) اس میں بارش کے وہ فوائد بیان کیے گئے ہیں، جو ہر شخص کے مشاہدے اور تجربے کا حصہ ہیں وہ محتاج وضاحت نہیں۔ نیز ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

(۲) کس طرح رات اور دن چھوٹے بڑے ہوتے ہیں، چاند اور سورج کس طرح اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں دواں رہتے ہیں اور ان میں کبھی فرق واقع نہیں ہوتا، ستارے کس طرح آسمان کی زینت اور رات کے اندھیروں میں بھٹکے ہوئے مسافروں کے لیے دلیل راہ ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور سلطنت عظیمہ پر دلالت کرتے ہیں۔

(۳) یعنی زمین میں اللہ نے جو معدنیات، نباتات، جمادات اور حیوانات اور ان کے منافع اور خواص پیدا کیے ہیں، ان میں بھی نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

(۴) اس میں سمندر کی تلاطم خیز موجوں کو انسان کے تابع کر دینے کے بیان کے ساتھ، اس کے تین فوائد بھی ذکر کیے

اور اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے ہیں تاکہ تمہیں لے کر پہلے نہ،^(۱) اور نہریں اور راہیں بنا دیں تاکہ تم منزل مقصود کو پہنچو۔^(۲) (۱۵)

اور بھی بہت سی نشانیاں مقرر فرمائیں۔ اور ستاروں سے بھی لوگ راہ حاصل کرتے ہیں۔ (۱۶)

تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اس جیسا ہے جو پیدا نہیں کر سکتا؟ کیا تم بالکل نہیں سوچتے؟^(۳) (۱۷)

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو تم اسے نہیں کر سکتے۔ بیشک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ (۱۸)

اور جو کچھ تم چھپاؤ اور ظاہر کرو اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے۔^(۴) (۱۹)

اور جن جن کو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ وہ خود پیدا کیے ہوئے

وَالْقَلْبِ فِي الْأَرْضِ رَوَايَا أَنْ يَسْبُدَّ بِكُمْ فَأَنْهَرَا وَاسْبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵﴾

وَعَلَّمَتْنَاهَا وَإِلَّا لَجُنُودُهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿۱۶﴾

أَفَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۱۷﴾

وَأَنْ تَعْبُدُوا لِلَّهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۸﴾

وَاللَّهُ بِعَلْمِ غَايِبَاتِكُمْ شَهِيدٌ ﴿۱۹﴾

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخَلَقُونَ ﴿۲۰﴾

ہیں۔ ایک یہ کہ تم اس سے مچھلی کی شکل میں تازہ گوشت کھاتے ہو (اور مچھلی مردہ بھی ہو تب بھی حلال ہے۔ علاوہ ازیں حالت احرام میں بھی اس کو شکار کرنا حلال ہے)۔ دوسرے، اس سے تم موتی، سیپیاں اور جواہر نکالتے ہو، جن سے تم زیور بناتے ہو۔ تیسرے، اس میں تم کشتیاں اور جہاز چلاتے ہو، جن کے ذریعے سے تم ایک ملک سے دوسرے ملک میں جاتے ہو، تجارتی سامان بھی لاتے، لے جاتے ہو، جس سے تمہیں اللہ کا فضل حاصل ہوتا ہے جس پر تمہیں اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

(۱) یہ پہاڑوں کا فائدہ بیان کیا جا رہا ہے اور اللہ کا ایک احسان عظیم بھی، کیونکہ اگر زمین ہلتی رہتی تو اس میں سکونت ممکن ہی نہ رہتی۔ اس کا اندازہ ان زلزلوں سے کیا جا سکتا ہے جو چند سیکنڈوں اور لمحوں کے لیے آتے ہیں، لیکن کس طرح وہ بڑی بڑی مضبوط عمارتوں کو پیوند زمین اور شہروں کو کھنڈروں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

(۲) شہروں کا سلسلہ بھی عجیب ہے، کہاں سے وہ شروع ہوتی ہیں اور کہاں کہاں، دائیں بائیں، شمال جنوب، مشرق و مغرب ہر جہت کو سیراب کرتی ہیں۔ اسی طرح راستے بنائے، جن کے ذریعے سے تم منزل مقصود پر پہنچتے ہو۔

(۳) ان تمام نعمتوں سے توحید کی اہمیت کو اجاگر فرمایا کہ اللہ تو ان تمام چیزوں کا خالق ہے، لیکن اس کو چھوڑ کر جن کی تم عبادت کرتے ہو، انہوں نے بھی کچھ پیدا کیا ہے؟ نہیں، بلکہ وہ تو خود اللہ کی مخلوق ہیں۔ پھر بھلا خالق اور مخلوق کس طرح برابر ہو سکتے ہیں؟ جبکہ تم نے انہیں معبود بنا کر اللہ کا برابر ٹھہرا رکھا ہے۔ کیا تم ذرا نہیں سوچتے؟

(۴) اور اس کے مطابق وہ قیامت والے دن جزا اور سزا دے گا۔ نیک کو نیکی کی جزا اور بد کو اس کی بدی کی سزا۔

ہیں۔^(۱) (۲۰)

مردے ہیں زندہ نہیں،^(۲) انہیں تو یہ بھی شعور نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔^(۳) (۲۱)

تم سب کا معبود صرف اللہ تعالیٰ اکیلا ہے اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل منکر ہیں اور وہ خود تکبر سے بھرے ہوئے ہیں۔^(۴) (۲۲)

بے شک و شبہ اللہ تعالیٰ ہر اس چیز کو جسے وہ لوگ چھپاتے ہیں اور جسے ظاہر کرتے ہیں، بخوبی جانتا ہے۔ وہ غور کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔^(۵) (۲۳)

ان سے جب دریافت کیا جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار

أَمْوَاتٌ غَيْرَ أَحْيَاءٍ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴿۲۰﴾

اللَّهُمَّ إِلَهٌ وَاحِدٌ قَالَتِ الْبَنَاتُ لِكُلِّ مُمْتِنٍ يَا الْآخِرَةَ
قُلُوبُهُمْ مُنْكَرٌ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ﴿۲۱﴾

لَا حَرَمَ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسْرُونَ وَمَا يَعْلَنُونَ
إِنَّهُ لَكَيْفُ الْمُسْتَكْبِرِينَ ﴿۲۲﴾

وَلَا إِقْبَالَ لَهُمْ مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا أَسَاطِيرُ

(۱) اس میں ایک چیز کا اضافہ ہے یعنی صفت کمال (خالقیت) کی نفی کے ساتھ نقصان یعنی کمی (عدم خالقیت) کا اثبات۔ (فتح القدير)

(۲) مردے سے مراد وہ جماد (پتھر) بھی ہیں جو بے جان اور بے شعور ہیں۔ اور فوت شدہ صالحین بھی ہیں۔ کیوں کہ مرنے کے بعد اٹھایا جاتا (جس کا انہیں شعور نہیں) وہ تو جماد کے بجائے صالحین ہی پر صادق آسکتا ہے۔ ان کو صرف مردہ ہی نہیں کہا بلکہ مزید وضاحت فرمادی کہ ”وہ زندہ نہیں ہیں“ اس سے قبر پرستوں کا بھی واضح رد ہو جاتا ہے، جو کہتے ہیں کہ قبروں میں مدفون مردہ نہیں، زندہ ہیں۔ اور ہم زندوں کو ہی پکارتے ہیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ موت وارد ہونے کے بعد، دنیوی زندگی کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی نہ دنیا سے ان کا کوئی تعلق ہی باقی رہتا ہے۔

(۳) پھر ان سے نفع کی اور ثواب و جزا کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے؟

(۴) یعنی ایک الہ کا ماننا منکرین اور مشرکین کے لیے بہت مشکل ہے۔ وہ کہتے ہیں ﴿يَجْعَلُ اللَّهُ لَهُمُ آيَاتًا فَهُمْ لَا يَتَذَكَّرُونَ﴾ (ص-۵) ”اس نے تمام معبودوں کو ایک ہی معبود کر دیا ہے یہ تو بڑی ہی عجیب بات ہے“۔ دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَلَا تُدْرِكُهُ الْبَصَرُ وَلَا دُرُورُهُ إِشْرَافَاتُ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ لَا يَأْمَنُونَ بِالْآخِرَةِ وَلَا يُذَكِّرُ الَّذِينَ مِنْ دُونِهَا إِذْ هُمْ يُسْتَبَشِرُونَ﴾ (الزمر-۵) ”جب ایک اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو منکرین آخرت کے دل تنگ ہو جاتے ہیں اور جب اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو خوش ہوتے ہیں“۔

(۵) آئینتِ نباء کا مطلب ہوتا ہے اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے صحیح اور حق بات کا انکار کر دینا اور دوسروں کو حقیر و کمتر سمجھنا۔ کبر کی یہی تعریف حدیث میں بیان کی گئی۔ (صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب تحریم الکبر و بیانہ) یہ کبر و غرور اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ حدیث میں ہے کہ ”وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ایک ذرے کے برابر بھی کبر ہو گا“۔ (حوالہ مذکور)

الْأَقْلَبِينَ ﴿۳۰﴾

نے کیا نازل فرمایا ہے؟ تو جواب دیتے ہیں کہ اگلوں کی کمائیاں ہیں۔^(۱) (۲۳)

اسی کا نتیجہ ہو گا کہ قیامت کے دن یہ لوگ اپنے پورے بوجھ کے ساتھ ہی ان کے بوجھ کے بھی حصے دار ہوں گے جنہیں بے علمی سے گمراہ کرتے رہے۔ دیکھو تو کیسا برا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔^(۲) (۲۵)

ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی مکر کیا تھا، (آخر) اللہ نے (ان کے منصوبوں) کی عمارتوں کو جڑوں سے اکھیڑ دیا اور ان (کے سروں) پر (ان کی) چھتیں اوپر سے گر پڑیں،^(۳) اور ان کے پاس عذاب وہاں سے آگیا جہاں کا انہیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔^(۴) (۲۶)

پھر قیامت والے دن بھی اللہ تعالیٰ انہیں رسوا کرے گا اور فرمائے گا کہ میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کے

لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ أَوْزَارَ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ أَلِيسَاءَ مَا يَزْمُرُونَ ﴿۳۱﴾

فَدَمَكِرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَعَ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۳۲﴾

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخَذُّوهُمْ وَيَقُولُ آيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَشْفِقُونَ فِيهِمْ قَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ لَنْ يُغْنِي

(۱) یعنی اعراض اور استہزا کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ مکذبین جواب دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو کچھ نہیں اتارا، اور یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں جو پڑھ کر سنا تا ہے، وہ تو پہلے لوگوں کی کمائیاں ہیں جو کہیں سے سن کر بیان کرتا ہے۔

(۲) یعنی ان کی زبانوں سے یہ بات اللہ تعالیٰ نے نکلائی تاکہ وہ اپنے بوجھوں کے ساتھ دوسروں کا بوجھ بھی اٹھائیں۔ جس طرح کہ حدیث میں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جس نے لوگوں کو ہدایت کی طرف بلایا تو اس شخص کو ان تمام لوگوں کا اجر بھی ملے گا جو اس کی دعوت پر ہدایت کا راستہ اپنائیں گے اور جس نے گمراہی کی طرف بلایا تو اس کو ان تمام لوگوں کے گناہوں کا بار بھی اٹھانا پڑے گا جو اس کی دعوت پر گمراہ ہوئے۔“ (ابوداؤد کتاب السنۃ، باب لزوم السنۃ)

(۳) بعض مفسرین اسرائیلی روایات کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ اس سے مراد نمودیا بخت نصر ہے، جنہوں نے آسمان پر کسی طرح چڑھ کر اللہ کے خلاف مکر کیا، لیکن وہ ناکام واپس آئے اور بعض مفسرین کے خیال میں یہ ایک تمثیل ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ کے ساتھ کفر اور شرک کرنے والوں کے عمل اسی طرح برباد ہوں گے جس طرح کسی کے مکان کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں اور وہ چھت سمیت گر پڑے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مقصود ان قوموں کے انجام کی طرف اشارہ کرنا ہے، جن قوموں نے پیغمبروں کی تکذیب پر اصرار کیا اور بالآخر عذاب الہی میں گرفتار ہو کر اپنے گھروں سمیت تباہ ہو گئے، مثلاً قوم عاد و قوم لوط وغیرہ۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ﴾ (المحشر۔۲)

(۴) ”پس اللہ (کا عذاب) ان کے پاس ایسی جگہ سے آیا جہاں سے ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔“

الْيَوْمَ وَالشَّوْءَ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝

بارے میں تم لڑتے بھگڑتے تھے،^(۱) جنہیں علم دیا گیا تھا وہ پکارا اٹھیں گے^(۲) کہ آج تو کافروں کو رسوائی اور برائی چمٹ گئی۔ (۲۷)

وہ جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں، فرشتے جب ان کی جان قبض کرنے لگتے ہیں اس وقت وہ جھک جاتے ہیں کہ ہم برائی نہیں کرتے تھے۔^(۳) کیوں نہیں؟ اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو کچھ تم کرتے تھے۔^(۴) (۲۸)

پس اب تو بیٹھکی کے طور پر تم جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ،^(۵) پس کیا ہی برا ٹھکانا ہے غرور کرنے والوں کا۔ (۲۹)

الَّذِينَ تَتَوَفَّوهُمْ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيۡنَ اَنْفُسِهِمْ ۗ قَالُوا تَاللّٰهِ لَسْتُمْ مَّا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ شَوْءٍ اَنْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۭ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوۡنَ ۝

فَاَدْخَلُوۡا الْاَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا فَاَلَيْسَ مَعۡنَا الَّذِيۡنَ كُنَّا يَدۡعُوۡنَ ۝

(۱) یعنی یہ تو وہ عذاب تھے جو دنیا میں ان پر آئے اور قیامت والے دن اللہ تعالیٰ انہیں اس طرح ذلیل و رسوا کرے گا کہ ان سے پوچھے گا، تمہارے وہ شریک کہاں ہیں جو تم نے میرے لیے ٹھہرا رکھے تھے، اور جن کی وجہ سے تم مومنوں سے لڑتے بھگڑتے تھے۔

(۲) یعنی جن کو دین کا علم تھا وہ دین کے پابند تھے وہ جواب دیں گے۔

(۳) یہ مشرک ظالموں کی موت کے وقت کی کیفیت بیان کی جا رہی ہے جب فرشتے ان کی روحمیں قبض کرتے ہیں تو وہ صلح کی بات ڈالتے ہیں یعنی سح و طاعت اور عاجزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم تو برائی نہیں کرتے تھے۔ جس طرح میدان محشر میں اللہ کے روبرو بھی جھوٹی قسمیں کھائیں گے اور کہیں گے — ﴿وَاللّٰهُ يَتَّبِعُ الْمٰٓكِلٰٓئِیۡنَ﴾ (الأنعام: ۲۳) ”اللہ کی قسم، ہم مشرک نہیں تھے“ دوسرے مقام پر فرمایا ”جس دن اللہ تعالیٰ ان سب کو اٹھا کر اپنے پاس جمع کرے گا تو اللہ کے سامنے بھی یہ اسی طرح (جھوٹی) قسمیں کھائیں گے جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں۔ (المجادلہ: ۱۸)

(۴) فرشتے جواب دیں گے کیوں نہیں؟ یعنی تم جھوٹ بولتے ہو، تمہاری تو ساری عمر ہی برائیوں میں گزری ہے اور اللہ کے پاس تمہارے سارے عملوں کا ریکارڈ محفوظ ہے، تمہارے اس انکار سے اب کیا بنے گا؟

(۵) امام ابن کثیر فرماتے ہیں، ان کی موت کے فوراً بعد ان کی روحمیں جہنم میں چلی جاتی ہیں اور ان کے جسم قبر میں رہتے ہیں (جہاں اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے جسم و روح میں بعد کے باوجود، ان میں ایک گونہ تعلق پیدا کر کے ان کو عذاب دیتا ہے، اور صبح و شام ان پر آگ پیش کی جاتی ہے) پھر جب قیامت برپا ہوگی تو ان کی روحمیں ان کے جسموں میں لوٹ آئیں گی اور ہمیشہ کے لیے یہ جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے۔

اور پرہیز گاروں سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے کیا نازل فرمایا ہے؟ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اچھے سے اچھا۔ جن لوگوں نے بھلائی کی ان کے لیے اس دنیا میں بھلائی ہے، اور یقیناً آخرت کا گھر تو بہت ہی بہتر ہے، اور

کیا ہی خوب پرہیز گاروں کا گھر ہے۔ (۳۰)

ہنگامی والے باغات جہاں وہ جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، جو کچھ یہ طلب کریں گے وہاں ان کے لیے موجود ہوگا۔ پرہیز گاروں کو اللہ تعالیٰ اسی طرح بدلے عطا فرماتا ہے۔ (۳۱)

وہ جن کی جانیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک صاف ہوں کہتے ہیں کہ تمہارے لیے سلامتی ہی سلامتی ہے،^(۱) جاؤ جنت میں اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم کرتے تھے۔^(۲) (۳۲)

کیا یہ اسی بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آجائیں یا تیرے رب کا حکم آجائے؟^(۳) ایسا ہی

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنْزَلَكُمْ رَبُّكُمُ مِنَ السَّمَاءِ
لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَكَذَلِكَ يُرَى الَّذِينَ
خَيْرًا وَلَيْسَ ذَلِكَ لِلْمُنْتَقِينَ ﴿۳۰﴾

جَدَّتْ عَدْنٌ يَدْخُلُونَهَا مَجْرُبٌ مُّجْتَرِبٌ مِنْ نَحْوِهَا أَلْأَنْزَلُهُمْ فِيهَا
مَا يَشَاءُونَ كَذَلِكَ يَجْزِي اللَّهُ الْمُتَّقِينَ ﴿۳۱﴾

الَّذِينَ تَتَّقُوا لَهُمُ الْمَلَائِكَةُ مُقْبِلِينَ يُؤْتُونَ سَلَامًا عَلَيْهِمْ
ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۲﴾

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرٌ رَبِّكَ
كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنَ الْقَبْلِهِمْ وَتَظَاهَرْتُمْ اللَّهُ وَلَكِنْ

(۱) ان آیات میں ظالم مشرکوں کے مقابلے میں اہل ایمان و تقویٰ کا کردار اور ان کا حسن انجام بیان فرمایا گیا ہے۔
جَعَلْنَا اللَّهُ مِنْهُمْ، آمِينَ يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ.

(۲) سورۃ اعراف کی آیت ۴۳ کے تحت یہ حدیث گزر چکی ہے کہ کوئی شخص بھی محض اپنے عمل سے جنت میں نہیں جائے گا؛ جب تک اللہ کی رحمت نہیں ہوگی۔ لیکن یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ تم اپنے عملوں کے بدلے جنت میں داخل ہو جاؤ، تو ان میں دراصل کوئی منافات نہیں۔ کیونکہ اللہ کی رحمت کے حصول کے لیے اعمال صالحہ ضروری ہیں۔ گویا عمل صالح، اللہ کی رحمت کا ذریعہ ہے، اس لیے عمل کی اہمیت بھی بجائے خود مسلم ہے، اس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا، اس کے بغیر آخرت میں اللہ کی رحمت مل ہی نہیں سکتی۔ اس لیے حدیث مذکور کا مفہوم بھی اپنی جگہ صحیح ہے اور عمل کی اہمیت بھی اپنی جگہ برقرار ہے۔ اسی لیے ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُورَتِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ (صحیح مسلم، کتاب البر، باب تحریم ظلم المسلم.....)

(۳) یعنی کیا یہ بھی اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب فرشتے ان کی روحیں قبض کریں گے یا رب کا حکم (یعنی عذاب یا قیامت) آجائے۔

كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۳۱﴾

ان لوگوں نے بھی کیا تھا جو ان سے پہلے تھے۔^(۱) ان پر اللہ تعالیٰ نے کوئی ظلم نہیں کیا^(۲) بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔^(۳) (۳۳)

پس ان کے برے اعمال کے نتیجے انہیں مل گئے اور جس کی ہنسی اڑاتے تھے اس نے ان کو گھیر لیا۔^(۴) (۳۴)

مشرک لوگوں نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اس کے سوا کسی اور کی عبادت ہی نہ کرتے، نہ اس کے فرمان کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے۔ یہی فعل ان سے پہلے کے لوگوں کا رہا۔ تو رسولوں پر تو صرف کھلم کھلا پیغام کا پہنچا دینا ہے۔^(۵) (۳۵)

فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿۳۲﴾

وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَمْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنَ الْقَبْلِهِمْ قَهْلًا عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ﴿۳۳﴾

(۱) یعنی اس طرح سرکشی اور معصیت، ان سے پہلے لوگوں نے اختیار کیے رکھی، جس پر وہ غضب الہی کے مستحق بنے۔
(۲) اس لیے کہ اللہ نے تو ان کے لیے کوئی عذر ہی باقی نہیں چھوڑا۔ رسولوں کو بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر ان پر حجت تمام کر دی۔

(۳) یعنی رسولوں کی مخالفت اور ان کی تکذیب کر کے خود ہی انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔
(۴) یعنی جب رسول ان سے کہتے کہ اگر تم ایمان نہیں لاؤ گے تو اللہ کا عذاب آجائے گا۔ تو یہ استہزاء کے طور پر کہتے کہ جا اپنے اللہ سے کہہ وہ عذاب بھیج کر ہمیں تباہ کر دے۔ چنانچہ اس عذاب نے انہیں گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے، پھر اس سے بچاؤ کا کوئی راستہ ان کے پاس نہیں رہا۔

(۵) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے ایک وہم اور مغالطے کا ازالہ فرمایا ہے وہ کہتے تھے کہ ہم جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی عبادت کرتے ہیں یا اس کے حکم کے بغیر ہی کچھ چیزوں کو حرام کر لیتے ہیں، اگر ہماری یہ باتیں غلط ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے ہمیں ان چیزوں سے روک کیوں نہیں دیتا، وہ اگر چاہے تو ہم ان کاموں کو کر ہی نہیں سکتے۔ اگر وہ نہیں روکتا تو اس کا مطلب ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، اس کی مشیت کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس شیعے کا ازالہ ”رسولوں کا کام صرف پہنچا دینا ہے“ کہہ کر فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا یہ گمان صحیح نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس سے روکا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو تمہیں ان مشرکانہ امور سے بڑی سختی سے روکا ہے۔ اسی لیے وہ ہر قوم میں رسول بھیجتا اور کتابیں نازل کرتا رہا ہے اور ہر نبی نے آکر سب سے پہلے اپنی قوم کو شرک ہی سے بچانے کی کوشش کی ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ لوگ شرک کریں کیونکہ اگر اسے یہ پسند ہوتا تو اس کی تردید کے لیے وہ رسول کیوں بھیجتا؟ لیکن اس کے باوجود اگر تم نے رسولوں کی تکذیب کر کے شرک کا

ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمام مجبوروں سے بچو۔ پس بعض لوگوں کو تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور بعض پر گمراہی ثابت ہو گئی،^(۱) پس تم خود زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا کچھ ہوا؟ (۳۶)

گو آپ ان کی ہدایت کے خواہش مند رہے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دیتا جسے گمراہ کر دے اور نہ ان کا کوئی مددگار ہوتا ہے۔^(۲) (۳۷)

وہ لوگ بڑی سخت سخت قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ مردوں کو اللہ تعالیٰ زندہ نہیں کرے گا۔^(۳) کیوں نہیں ضرور زندہ کرے گا یہ تو اس کا برحق لازمی وعدہ ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔^(۴) (۳۸)

وَلَقَدْ بَعَدْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنْ أَعْبُدُوا اللَّهَ
وَلْيَجْتَنِبُوا الصَّاغُوتَ فَمَا نُهُمْ عَنْ هَذَى اللَّهِ وَمِنْهُمْ
مَنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ فَيُتْرَكُ فِي الْأَرْضِ قَانِظِرًا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكذِّبِينَ ﴿۳۶﴾

إِنْ تَحْرِضْ عَلَى هَذَا مُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ
وَمَا لَهُمْ مِنْ لُصُوفٍ ﴿۳۷﴾

ذُوقُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَمَرَهُمْ كَمَا بَعَثَ اللَّهُ مَنْ يَمُوتُ
بَلَى وَعَدَّ عَلَيْهِمْ حَقًّا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۸﴾

راستہ اختیار کیا اور اللہ نے اپنی مشیت تکوینیہ کے تحت قرآوجرا تمہیں اس سے نہیں روکا، تو یہ تو اس کی اس حکمت و مصلحت کا ایک حصہ ہے، جس کے تحت اس نے انسانوں کو ارادہ و اختیار کی آزادی دی ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر ان کی آزمائش ممکن ہی نہ تھی۔ ہمارے رسول ہمارا پیغام تم تک پہنچا کر یہی سمجھاتے رہے کہ اس آزادی کا غلط استعمال نہ کرو بلکہ اللہ کی رضا کے مطابق اسے استعمال کرو! ہمارے رسول یہی کچھ کر سکتے تھے، جو انہوں نے کیا۔ اور تم نے شرک کر کے آزادی کا غلط استعمال کیا جس کی سزا دائمی عذاب ہے۔

(۱) مذکورہ شبہ کے ازالے کے لیے مزید فرمایا کہ ہم نے تو ہر امت میں رسول بھیجا اور یہ پیغام ان کے ذریعے سے پہنچایا کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرو۔ لیکن جن پر گمراہی ثابت ہو چکی تھی، انہوں نے اس کی پروا ہی نہ کی۔
(۲) اس میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے۔ اے پیغمبر! تیری خواہش یقیناً یہی ہے کہ یہ سب ہدایت کا راستہ اپنائیں لیکن تو انہیں انہی کے تحت جو گمراہ ہو گئے ہیں، ان کو تو ہدایت کے راستے پر نہیں چلا سکتا، یہ تو اپنے آخری انجام کو پہنچ کر ہی رہیں گے، جہاں ان کا کوئی مددگار نہیں ہو گا۔

(۳) کیوں کہ مٹی میں مل جانے کے بعد ان کا دوبارہ جی اٹھنا، انہیں مشکل اور ناممکن نظر آتا تھا۔ اسی لیے رسول جب انہیں بعث بعد الموت کی بات کہتا ہے تو اسے جھٹلاتے ہیں، اس کی تصدیق نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس یعنی دوبارہ زندہ نہ ہونے پر قسمیں کھاتے ہیں، قسمیں بھی بڑی تاکید اور یقین کے ساتھ۔

(۴) اسی جہالت اور بے علمی کی وجہ سے رسولوں کی تکذیب و مخالفت کرتے ہوئے دریائے کفر میں ڈوب جاتے ہیں۔

اس لیے بھی کہ یہ لوگ جس چیز میں اختلاف کرتے تھے اسے اللہ تعالیٰ صاف بیان کر دے اور اس لیے بھی کہ خود کافر اپنا جھوٹا ہونا جان لیں۔ (۳۹)^(۱)

ہم جب کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو صرف ہمارا یہ کہہ دینا ہوتا ہے کہ ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے۔ (۴۰)^(۲)

جن لوگوں نے ظلم برداشت کرنے کے بعد اللہ کی راہ میں ترک وطن کیا ہے (۳)، ہم انہیں بہتر سے بہتر ٹھکانا دنیا میں عطا فرمائیں گے (۴) اور آخرت کا ثواب تو بہت ہی بڑا ہے، (۵) کاش کہ لوگ اس سے واقف ہوتے۔ (۴۱)

لِيَمَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يُخَلِّفُونَ فِيهِ وَيَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا
أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ ﴿۳۹﴾

إِنَّمَا هُوَ إِلَهُ الْوَالِدِينَ إِذَا رَدَّوهُ أَنْ يُعْوَلُ لَكُنْ فَيَكُونُ ﴿۴۰﴾

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا لَنَنبُؤَنَّهُمْ
فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَوَلَكُمْ فِي الْآخِرَةِ أَكْبَرَ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۴۱﴾

(۱) یہ وقوع قیامت کی حکمت و علت بیان کی جا رہی ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ ان چیزوں میں فیصلہ فرمائے گا جن میں لوگ دنیا میں اختلاف کرتے تھے اور اہل حق اور اہل تقویٰ کو اچھی جزا اور اہل کفر و فسق کو ان کے برے عملوں کی سزا دے گا۔ نیز اس دن اہل کفر پر بھی یہ بات واضح ہو جائے گی کہ وہ قیامت کے عدم وقوع پر جو قسمیں کھاتے تھے، ان میں وہ جھوٹے تھے۔

(۲) یعنی لوگوں کے نزدیک قیامت کا ہونا، کتنا بھی مشکل یا ناممکن ہو، مگر اللہ کے لیے تو کوئی مشکل نہیں اسے زمین و آسمان ڈھانے کے لیے مزدوروں، انجینئروں اور مستریوں اور دیگر آلات و وسائل کی ضرورت نہیں۔ اسے تو صرف لفظ کن کہنا ہے اس کے لفظ کن سے پلک جھپکتے میں قیامت برپا ہو جائے گی ﴿ وَمَا أَمَرَ السَّمْعَاءَ إِلَّا تَكْمِيهِ الْبَصِيرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ ﴾ (النحل۔ ۷۷) ”قیامت کا معاملہ پلک جھپکتے یا اس سے بھی کم مدت میں واقع ہو جائے گا“۔

(۳) ہجرت کا مطلب ہے اللہ کے دین کے لیے اللہ کی رضا کی خاطر اپنا وطن، اپنے رشتے دار اور دوست احباب چھوڑ کر ایسے علاقے میں چلے جانا جہاں آسانی سے اللہ کے دین پر عمل ہو سکے۔ اس آیت میں ان ہی مہاجرین کی فضیلت بیان فرمائی گئی ہے، یہ آیت عام ہے جو تمام مہاجرین کو شامل ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ان مہاجرین کے بارے میں نازل ہوئی ہو جو اپنی قوم کی ایذاؤں سے تنگ آکر حبشہ ہجرت کر گئے تھے۔ ان کی تعداد عورتوں سمیت ایک سو یا اس سے زیادہ تھی، جن میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ - دختر رسول ﷺ - حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔

(۴) اس سے رزق طیب اور بعض نے مدینہ مراد لیا ہے، جو مسلمانوں کا مرکز بنا۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ دونوں قولوں میں منافات نہیں ہے۔ اس لیے کہ جن لوگوں نے اپنے کاروبار اور گھریلو چھوڑ کر ہجرت کی تھی، اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہی انہیں ان کا نعم البدل عطا فرمادیا۔ رزق طیب بھی دیا اور پورے عرب پر انہیں اقتدار و حکم عطا فرمایا۔

(۵) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب مہاجرین و انصار کے وظیفے مقرر کیے تو ہر مہاجر کو وظیفہ دیتے ہوئے فرمایا۔ هَذَا مَا وَعَدَكَ

وہ جنہوں نے دامن صبر نہ چھوڑا اور اپنے پالنے والے ہی پر بھروسہ کرتے رہے۔ (۳۲)

آپ سے پہلے بھی ہم مردوں کو ہی بھیجتے رہے، جن کی جانب وحی اتارا کرتے تھے پس اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کر لو۔^(۱) (۳۳)

دیلیوں اور کتابوں کے ساتھ، یہ ذکر (کتاب) ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے کہ لوگوں کی جانب جو نازل فرمایا گیا ہے آپ اسے کھول کھول کر بیان کر دیں، شاید کہ وہ غور و فکر کریں۔ (۳۴)

بدترین داؤ تپچ کرنے والے کیا اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں دھنسا دے یا ان کے پاس ایسی جگہ سے عذاب آجائے جہاں کا انہیں وہم گمان بھی نہ ہو۔ (۳۵)

یا انہیں چلتے پھرتے پکڑ لے۔^(۲) یہ کسی صورت میں اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ (۳۶)

الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۳۲﴾

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رَجُلًا نُوحِيَ إِلَيْهِمْ فَهُمْ أَعْتَقُوا ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْتِيَهُمْ مَّا يَشَاءُونَ ﴿۳۳﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَنْبِيَاءَ الَّذِينَ نَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْكِتَابَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْتِيَهُمْ مَّا يَشَاءُونَ ﴿۳۴﴾

أَقَامِينَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالسَّيِّئَاتِ أَنْ يَتَحَفَّفُوا اللَّهُ بِمُكْرَمَاتِهِمْ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْتِيَهُمْ الْعَذَابَ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۳۵﴾

أَوْ يَأْخُذَهُمْ فِي تَقَابُضِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۳۶﴾

اللَّهُ فِي الدُّنْيَا ”یہ وہ ہے جس کا اللہ نے دنیا میں وعدہ کیا ہے“ وَمَا أَدَّخَرَ لَكَ فِي الْآخِرَةِ أَفْضَلَ ”اور آخرت میں تیرے لیے جو ذخیرہ ہے، وہ اس سے کہیں بہتر ہے“ (ابن کثیر)

(۱) أَهْلُ الذِّكْرِ سے مراد اہل کتاب ہیں جو پچھلے انبیاء اور ان کی تاریخ سے واقف تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے، وہ انسان ہی تھے اس لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اگر انسان ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں کہ تم ان کی بشریت کی وجہ سے ان کی رسالت کا انکار کرو۔ اگر تمہیں شک ہے تو اہل کتاب سے پوچھ لو کہ پچھلے انبیاء بشر تھے یا ملائکہ؟ اگر وہ فرشتے تھے تو پھر بے شک انکار کر دینا، اگر وہ بھی سب انسان ہی تھے تو پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا محض بشریت کی وجہ سے انکار کیوں؟

(۲) اس کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں، مثلاً ۱۔ جب تم تجارت اور کاروبار کے لیے سفر پر جاؤ ۲۔ جب تم کاروبار کو فروغ دینے کے لیے مختلف حیلے اور طریقے اختیار کرو ۳۔ یا رات کو آرام کرنے کے لیے اپنے بستروں پر جاؤ۔ یہ تَقَابُضُ کے مختلف مفہوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے ان صورتوں میں بھی تمہارا مؤاخذہ کر سکتا ہے۔

یا انیس ڈرا دھکا کر پکڑ لے،^(۱) پس یقیناً تمہارا پروردگار
اعلیٰ شفقت اور انتہائی رحم والا ہے۔^(۲) (۴۷)

کیا انہوں نے اللہ کی مخلوق میں سے کسی کو بھی نہیں
دیکھا؟ کہ اس کے سائے دائیں بائیں جھک جھک کر اللہ
تعالیٰ کے سامنے سر بسجود ہوتے اور عاجزی کا اظہار کرتے
ہیں۔^(۳) (۴۸)

یقیناً آسمان و زمین کے کل جاندار اور تمام فرشتے اللہ
تعالیٰ کے سامنے سجدے کرتے ہیں اور ذرا بھی تکبر نہیں
کرتے۔^(۴) (۴۹)

اور اپنے رب سے جو ان کے اوپر ہے، پکپکاتے رہتے ہیں^(۵)
اور جو حکم مل جائے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔^(۶) (۵۰)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرما چکا ہے کہ دو معبود نہ بناؤ۔ معبود تو
صرف وہی اکیلا ہے،^(۷) پس تم سب صرف میرا ہی ڈر
خوف رکھو۔ (۵۱)

أَوْ يَأْخُذْهُمْ عَلَىٰ عُنُقِهِم مِّنْ سَمَوَاتٍ فَإِنَّ رَبَّهُم لَذَوِي عَذَابٍ مُّهِينٍ ﴿۴۷﴾

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَّبِعُهُ الظَّالِمَةُ عَنِ
الْيَمِينِ وَالشَّمَالِ سَجْدًا لِلَّهِ وَهُمْ ذَخِرُونَ ﴿۴۸﴾

وَلِلَّهِ سُجْدًا مِّنَ السَّمَوَاتِ وَمِنَ الْأَرْضِ وَمَن دَابَّةٍ
وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿۴۹﴾

يَعْبُدُونَ رَبَّهُمْ مِّنْ قُدْرَتِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴿۵۰﴾

وَقَالَ اللَّهُ لَأَتَّخِذَنَّ آلَ الْهَبَرِ الْآتِينَ إِنَّمَا هُوَ إِلَهُ الْوَاحِدِ
فَأَيُّ قَوْمٍ قَاهِبُونَ ﴿۵۱﴾

(۱) تَخَوَّفَ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے سے ہی دل میں عذاب اور مؤاخذے کا ڈر ہو۔ جس طرح بعض دفعہ
انسان کسی بڑے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے، تو خوف محسوس کرتا ہے کہ کہیں اللہ میری گرفت نہ کر لے چنانچہ بعض دفعہ
اس طرح بھی مؤاخذہ ہوتا ہے۔

(۲) کہ وہ گناہوں پر فوراً مؤاخذہ نہیں کرتا بلکہ مہلت دیتا ہے اور اس مہلت سے بہت سے لوگوں کو توبہ و استغفار کی
توفیق بھی نصیب ہو جاتی ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور اس کی جلالت شان کا بیان ہے کہ ہر چیز اس کے سامنے جھکی ہوئی اور مطیع ہے۔
بہادرات ہوں یا حیوانات یا جن و انسان اور ملائکہ۔ ہر وہ چیز جس کا سایہ ہے اور اس کا سایہ دائیں بائیں جھکتا ہے تو وہ صبح و
شام اپنے سائے کے ساتھ اللہ کو سجدہ کرتی ہے۔ امام مجاہد فرماتے ہیں جب سورج ڈھلتا ہے تو ہر چیز اللہ کے سامنے سجدہ
ریز ہو جاتی ہے۔

(۴) اللہ کے خوف سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔

(۵) اللہ کے حکم سے سرتابی نہیں کرتے بلکہ جس کا حکم دیا جاتا ہے، بجالاتے ہیں، جس سے منع کیا جاتا ہے، اس سے
دور رہتے ہیں۔

(۶) کیوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود ہے ہی نہیں۔ اگر آسمان و زمین میں دو معبود ہوتے تو نظام عالم قائم ہی نہیں رہ سکتا

آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور اسی کی عبادت لازم ہے،^(۱) کیا پھر تم اس کے سوا اوروں سے ڈرتے ہو؟ (۵۲)

تمہارے پاس جتنی بھی نعمتیں ہیں سب اسی کی دی ہوئی ہیں،^(۲) اب بھی جب تمہیں کوئی مصیبت پیش آجائے تو اسی کی طرف نالہ و فریاد کرتے ہو۔^(۳) (۵۳)

اور جہاں اس نے وہ مصیبت تم سے دفع کر دی تم میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگ جاتے ہیں۔ (۵۴)

کہ ہماری دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کریں۔^(۴) اچھا کچھ فائدہ اٹھا لو آخر کار تمہیں معلوم ہو ہی جائے گا۔^(۵) (۵۵)

وَلَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الَّذِيْنَ وَاٰصِبًا
اَقْبِرَ اللّٰهُ تَتَمَوَّنَ ﴿۵۲﴾

وَمَا يَكُفُّمْ مِّنْ نَّعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ فَاِذَا مَسَّكُمُ الضَّرَبُ اِلَيْهِمْ
تَجَسَّوْنَ ﴿۵۳﴾

فَاِذَا كُفَّتْ اَنْعَامُهُمْ نَبَتْ اِلٰى اٰفْرَاقِيْنَ مِنْكُمْ يَوْمَ الْيَوْمِ ﴿۵۴﴾

لِيَكْفُرُوا بِمَا اٰتَيْنَاهُمْ فَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ يَتَمَتَّعُوْنَ ﴿۵۵﴾

تھا، یہ فساد اور خرابی کا شکار ہو چکا ہوتا ﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَا الْاِلٰهَ الْاِلٰهَ لَقَسَدٰتَا﴾ ﴿الانبیاء-۲۲﴾ اس لیے ثنویت (دو خداؤں) کا عقیدہ، جس کے مجوسی حامل رہے ہیں یا تعدد الہ (بہت سارے معبودوں) کا عقیدہ، جس کے اکثر مشرکین قائل رہے ہیں۔ یہ سب باطل ہیں۔ جب کائنات کا خالق ایک ہے اور وہی بلا شرکت غیرے تمام کائنات کا نظم و نسق چلا رہا ہے تو معبود بھی صرف وہی ہے جو اکیلا ہے۔ دو یا دو سے زیادہ نہیں ہیں۔

(۱) اسی کی عبادت و اطاعت دائمی اور لازم ہے وَاٰصِبٌ کے معنی بھیگی کے ہیں ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ ﴿الصفات-۹﴾ ان کے لیے عذاب ہے ہمیشہ کا اور اس کا وہی مطلب ہے جو دوسرے مقامات پر بیان کیا گیا ہے — ﴿فَاَعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّيْنَ﴾ ﴿الذمر-۳۰﴾ ”پس اللہ کی عبادت کرو، اسی کے لیے بندگی کو خالص کرتے ہوئے، خردوار! اسی کے لیے خالص بندگی ہے۔“

(۲) جب سب نعمتوں کا دینے والا صرف ایک اللہ ہے تو پھر عبادت کسی اور کی کیوں؟

(۳) اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ایک ہونے کا عقیدہ قلب و وجدان کی گہرائیوں میں راسخ ہے جو اس وقت ابھر کر سامنے آجاتا ہے جب ہر طرف سے مایوسی کے بادل گہرے ہو جاتے ہیں۔

(۴) لیکن انسان بھی کتنا ناشکرا ہے کہ تکلیف (بیاری، تنگ دستی اور نقصان وغیرہ) کے دور ہوتے ہی وہ پھر رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے۔

(۵) یہ اس طرح ہی ہے جیسے اس سے قبل فرمایا تھا ﴿قُلْ تَتَّبِعُوا اِنَّا مَصِيْبِكُمْ اِلَى النَّارِ﴾ ﴿ابراہیم-۳۰﴾ ”چند روزہ زندگی میں فائدہ اٹھا لو! بالآخر تمہارا ٹھکانا جہنم ہے۔“

اور جسے جانتے بوجھتے بھی نہیں اس کا حصہ ہماری دی ہوئی روزی میں سے مقرر کرتے ہیں،^(۱) واللہ تمہارے اس بہتان کا سوال تم سے ضرور ہی کیا جائے گا۔^(۲) (۵۶)

اور وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے لیے لڑکیاں مقرر کرتے ہیں اور اپنے لیے وہ جو اپنی خواہش کے مطابق ہو۔^(۳) (۵۷)

ان میں سے جب کسی کو لڑکی ہونے کی خبر دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور دل ہی دل میں گھٹنے لگتا ہے۔ (۵۸)

اس بری خبر کی وجہ سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرتا ہے۔ سوچتا ہے کہ کیا اس کو ذلت کے ساتھ لئے ہوئے ہی رہے یا اسے مٹی میں دبا دے، آہ! کیا ہی برے فیصلے کرتے ہیں؟^(۴) (۵۹)

وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَصْلَهُونَ نَصِيبًا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ تَأْتِلُهِمْ
لَتَسْتَلْنَ عَمَّا كُنْتُمْ تَقْتَرُونَ ﴿۵۶﴾

وَيَجْعَلُونَ بِلَدِّهِ الْبَنَاتِ حُبًّا لَهُمْ وَيَأْتِيَهُنَّ
وَالَّذِي بَدَأَهُمْ بِالْأُنثَىٰ ظَلًّا وَهَؤُلَاءِ مَسْؤُومَةٌ ﴿۵۷﴾

وَيَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُدِي لَهُنَّ وَيَكْفُرْنَ
بِئْسَ فِي الْكُرْبِ الْأَسْمَاءُ يَكْتُمُونَ ﴿۵۸﴾

يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُدِي لَهُنَّ عَلَيَّ هُنَّ أُمَّ
يَدُشْنَ فِي الْكُرْبِ الْأَسْمَاءُ يَكْتُمُونَ ﴿۵۹﴾

(۱) یعنی جن کو یہ حاجت روا، مشکل کشا اور معبود سمجھتے ہیں، وہ پتھر کی مورتیاں ہیں یا جنات و شیاطین ہیں، جن کی حقیقت کا ان کو علم ہی نہیں۔ اسی طرح قبروں میں مدفون لوگوں کی حقیقت بھی کوئی نہیں جانتا کہ ان کے ساتھ وہاں کیا معاملہ ہو رہا ہے؟ وہ اللہ کے پسندیدہ افراد میں ہیں یا کسی دوسری فہرست میں؟ ان باتوں کو کوئی نہیں جانتا لیکن ان ظالم لوگوں نے ان کی حقیقت سے نا آشنا ہونے کے باوجود، انہیں اللہ کا شریک ٹھہرا رکھا ہے اور اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے ان کے لیے بھی (نذر و نیاز کے طور پر) حصہ مقرر کرتے ہیں بلکہ اللہ کا حصہ رہ جائے تو بیکٹ رہ جائے، ان کے حصے میں کمی نہیں کرتے جیسا کہ سورۃ الأنعام-۱۳۶ میں بیان کیا گیا ہے۔

(۲) تم جو اللہ پر افترا کرتے ہو کہ اس کا شریک یا شرکا ہیں، اس کی بابت قیامت والے دن تم سے پوچھا جائے گا۔

(۳) عرب کے بعض قبیلے (خرزاع اور کرناذ) فرشتوں کی عبادت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ یعنی ایک ظلم تو یہ کیا کہ اللہ کی اولاد قرار دی، جب کہ اس کی کوئی اولاد نہیں۔ پھر اولاد بھی مونث، جسے وہ اپنے لیے پسند ہی نہیں کرتے اللہ کے لیے اسے پسند کیا، جسے دوسرے مقام پر فرمایا — ﴿الَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ الْأُنثَىٰ﴾ * تِلْكَ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ ﴿السمجم ۲۱، ۲۲﴾ "کیا تمہارے لیے بیٹے اور اس کے لیے بیٹیاں؟ یہ تو بڑی بھونڈی تقسیم ہے۔" یہاں فرمایا کہ تم تو یہ خواہش رکھتے ہو کہ بیٹے ہوں، بیٹی کوئی نہ ہو۔

(۴) یعنی لڑکی کی ولادت کی خبر سن کر ان کا تو یہ حال ہوتا ہے جو مذکور ہوا، اور اللہ کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔ کیسا

آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کی ہی بری مثال ہے،^(۱) اللہ کے لیے تو بہت ہی بلند صفت ہے، وہ بڑا ہی غالب اور باحکمت ہے۔^(۲) (۶۰)

اگر لوگوں کے گناہ پر اللہ تعالیٰ ان کی گرفت کرتا تو روئے زمین پر ایک بھی جاندار باقی نہ رہتا،^(۳) لیکن وہ تو انہیں ایک وقت مقرر تک ڈھیل دیتا ہے،^(۴) جب ان کا وہ وقت آجاتا ہے تو وہ ایک ساعت نہ پیچھے رہ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ (۶۱)

لَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوۡءِ وَلِلَّهِ الْمَثَلُ
الْأَعْلَىٰ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ﴿۶۰﴾

وَلَوْ يَأْخُذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَوْا عَلِيمًا مِنْ دَابَّةٍ وَلَكِنْ
يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ
سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِرُونَ ﴿۶۱﴾

برایہ فیصلہ کرتے ہیں؟ یہاں یہ نہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ بھی لڑکوں کے مقابلے میں لڑکی کو حقیر اور کم تر سمجھتا ہے۔ نہیں، اللہ کے نزدیک لڑکے لڑکی میں کوئی تمیز نہیں ہے نہ جنس کی بنیاد پر حقارت اور برتری کا تصور اس کے ہاں ہے۔ یہاں تو صرف عربوں کی اس ناانسانی اور سراسر غیر معقول رویے کی وضاحت مقصود ہے، جو انہوں نے اللہ کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ ہاں حالانکہ اللہ کی برتری اور فوقیت کے وہ بھی قائل تھے۔ جس کا منطقی نتیجہ تو یہ تھا کہ جو چیز یہ اپنے لیے پسند نہیں کرتے، اللہ کے لیے بھی اسے تجویز نہ کرتے لیکن انہوں نے اس کے برعکس کیا۔ یہاں صرف اسی ناانسانی کی وضاحت کی گئی ہے۔

(۱) یعنی کافروں کے برے اعمال بیان کیے گئے ہیں انہی کے لیے بری مثال یا صفت ہے یعنی جمل اور کفر کی صفت۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی جو بیوی اور اولاد یہ ٹھہراتے ہیں، یہ بری مثال ہے جو یہ منکرین آخرت اللہ کے لیے بیان کرتے ہیں۔

(۲) یعنی اس کی ہر صفت، مخلوق کے مقابلے میں اعلیٰ و برتر ہے، مثلاً اس کا علم و سمیع ہے، اس کی قدرت لامتناہی ہے، اس کی جو دو عطا ہے نظیر ہے۔ و علیٰ ہذا القیاس یا یہ مطلب ہے کہ وہ قادر ہے، خالق ہے، رازق اور سمیع و بصیر ہے وغیرہ (فتح القدر) یا بری مثال کا مطلب نقص، کوتاہی ہے اور مثل اعلیٰ کا مطلب، کمال مطلق، ہر لحاظ سے اللہ کے لیے ہے۔ (ابن کثیر)

(۳) یہ اس کا علم ہے اور اس کی حکمت و مصلحت کا تقاضا کہ وہ اپنی نافرمانیاں دیکھتا ہے لیکن پھر بھی وہ اپنی نعمتیں سلب کرتا ہے نہ فوری مؤاخذہ ہی کرتا ہے حالانکہ اگر ارتکاب معصیت کے ساتھ ہی وہ مؤاخذہ کرنا شروع کر دے تو ظلم و معصیت اور کفر و شرک اتنا عام ہے کہ روئے زمین پر کوئی جاندار باقی نہ رہے کیوں کہ جب برائی عام ہو جائے تو پھر عذاب عام میں نیک لوگ بھی ہلاک کر دیئے جاتے ہیں تاہم آخرت میں وہ عند اللہ سرخرو رہیں گے جیسا کہ حدیث میں وضاحت آتی ہے۔ (ملاحظہ ہو صحیح بخاری، نمبر ۲۱۱۸، مسلم، نمبر ۲۲۰۶ و ۲۲۱۰)

(۴) یہ اس حکمت کا بیان ہے جس کے تحت وہ ایک خاص وقت تک مہلت دیتا ہے تاکہ ایک تو ان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔ دوسرے، ان کی اولاد میں سے کچھ ایماندار نکل آئیں۔

اور وہ اپنے لیے جو ناپسند رکھتے ہیں اللہ کے لیے ثابت کرتے ہیں^(۱) اور ان کی زبانیں جھوٹی باتیں بیان کرتی ہیں کہ ان کے لیے خوبی ہے۔^(۲) انہیں نہیں، دراصل ان کے لیے آگ ہے اور یہ دوزخیوں کے پیش رو ہیں۔^(۳) (۶۲)

واللہ! ہم نے تجھ سے پہلے کی امتوں کی طرف بھی اپنے رسول بھیجے لیکن شیطان نے ان کے اعمال بدان کی نگاہوں میں آراستہ کر دیئے،^(۴) وہ شیطان آج بھی ان کا رفیق بنا ہوا ہے^(۵) اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (۶۳)

اس کتاب کو ہم نے آپ پر اس لیے اتارا ہے کہ آپ ان کے لیے ہر اس چیز کو واضح کر دیں جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں^(۶) اور یہ ایمان داروں کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے۔ (۶۴)

اور اللہ آسمان سے پانی برسا کر اس سے زمین کو اس کی

وَجَعَلُونَ لِلَّهِ مَآئِدُهُمْ وَنَسُوا اللَّهَ الَّذِي تَوَكَّلُوا عَلَيْهِمْ وَأَنِتَلُوا لَعْنَةُ اللَّهِ الْخَالِدِينَ ﴿۶۲﴾

ثُمَّ لَمَّا رَوَّيْتُمُ الْمَاءَ فَسَبَّوهُ فَجَبَلْنَاهُمْ حُمْرًا مُّسْتَبْرَأً ۗ لَعْنَةُ اللَّهِ الْفٰسِقِينَ ﴿۶۳﴾

وَمَا آتَيْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا الَّتِي بَيْنَ يَدَيْهِ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْفٰسِقِينَ ﴿۶۴﴾

وَاللَّهُ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَآخَضَ بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ فِي

(۱) یعنی بیٹیاں۔ یہ تکرار تاکید کے لیے ہے۔

(۲) یہ ان کی دوسری خرابی کا بیان ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ ناانصافی کا معاملہ کرتے ہیں ان کی زبانیں یہ جھوٹ بولتی ہیں کہ ان کا انجام اچھا ہے، ان کے لئے بھلائیاں ہیں اور دنیا کی طرح ان کی آخرت بھی اچھی ہوگی۔

(۳) یعنی یقیناً ان کا انجام ”اچھا“ ہے۔ اور وہ ہے جہنم کی آگ۔ جس میں وہ دوزخیوں کے پیش رو یعنی پہلے جانے والے ہوں گے۔ قرطہ کے یہی معنی حدیث سے بھی ثابت ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَنَا قَرَطُكُمْ عَلَى النَّحْوِصِ» (صحیح بخاری، نمبر ۶۵۸۳، 'مسلم' نمبر ۱۷۴۹۳) ”میں حوض کوثر پر تمہارا پیش رو ہوں گا“۔ ایک دوسرے معنی مُفْرَطُونَ کے یہ کیے گئے ہیں کہ انہیں جہنم میں ڈال کر فراموش کر دیا جائے گا۔

(۴) جس کی وجہ سے انہوں نے بھی رسولوں کی تکذیب کی جس طرح اے پیغمبر قریش مکہ تیری تکذیب کر رہے ہیں۔

(۵) الْيَوْمَ سے یا تو زمانہ دنیا مراد ہے، جیسا کہ ترجمے سے واضح ہے، یا اس سے مراد آخرت ہے کہ وہاں بھی یہ ان کا ساتھی ہو گا۔ یا وَلِيَّهُمْ میں هُمْ کا مرجع کفار مکہ ہیں۔ یعنی یہی شیطان جس نے پچھلی امتوں کو گمراہ کیا، آج وہ ان کفار مکہ کا دوست ہے اور انہیں تکذیب رسالت پر مجبور کر رہا ہے۔

(۶) اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منصب بیان کیا گیا کہ عقائد و احکام شرعیہ کے سلسلے میں یہود و نصاریٰ کے درمیان اور اسی طرح مجوسیوں اور مشرکین کے درمیان اور دیگر اہل ادیان کے درمیان جو باہم اختلاف ہے، اس کی اس طرح تفصیل بیان فرمائیں کہ حق اور باطل واضح ہو جائے تاکہ لوگ حق کو اختیار اور باطل سے اجتناب کریں۔

موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو سب سے (۶۵) تمہارے لیے تو چوپایوں (۱) میں بھی بڑی عبرت ہے کہ ہم تمہیں اس کے پیٹ میں جو کچھ ہے اسی میں سے گوبر اور لو کے درمیان سے خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے سستا پچتا ہے۔ (۶۶) (۲)

اور کھجور اور انگور کے درختوں کے پھلوں سے تم شراب بنا لیتے ہو (۳) اور عمدہ روزی بھی۔ جو لوگ عقل رکھتے ہیں ان کے لیے تو اس میں بہت بڑی نشانی ہے۔ (۶۷)

آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات (۳) ڈال دی کہ پاڑوں میں درختوں اور لوگوں کی بنائی ہوئی اونچی اونچی ٹیوں میں اپنے گھر (چھتے) بنا۔ (۶۸) اور ہر طرح کے میوے کھا اور اپنے رب کی آسان راہوں میں چلتی پھرتی رہ، ان کے پیٹ سے رنگ برنگ

ذٰلِكَ لَآيَةٌ لِّلَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ﴿۶۵﴾

وَ اِنَّ لِكُلِّ فِى الْاَنْعَامِ لَآيَةً لِّمَنْ يُّنظِرُهَا مِنْ بَيْنِ قَوْمٍ وَ دَمْرٌ لِّبَنَاتِنَا خَالِصًا سَالِمًا لِّلَّذِيْنَ يَرِىْنَ ﴿۶۶﴾

وَ مَن ذَكَرَتِ الرَّحْمٰلَةُ اَلْحَمْدَ لِرَبِّهَا وَ مَن مِّنْهُ سَكَرًا وَ رَزَقًا حَسَنًا اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَآيَةً لِّلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ ﴿۶۷﴾

وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَكْتُمُوْنَ ﴿۶۸﴾

تَعْمَلُ مِنْ كُلِّ شَجَرَةٍ فَتَأْسِكُ سُبُلَ رَبِّكَ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ مِنْ بُطُوْنِهَا تُسْرَبُ وَ تُخْتَلِفُ اَلْوَانُ فَیَدْرُسْنَ اَللَّاسَ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ

(۱) اَنْعَامٌ (چوپائے) سے اونٹ، گائے، بکری (اور بھیڑ، دنبہ) مراد ہوتے ہیں۔

(۲) یہ چوپائے جو کچھ کھاتے ہیں، معدے میں جاتا ہے، اسی خوراک سے دودھ، خون، گوبر اور پیشاب بنتا ہے۔ خون، رگوں میں اور دودھ تھنوں میں اسی طرح گوبر اور پیشاب اپنے اپنے مخرج میں منتقل ہو جاتا ہے اور دودھ میں نہ خون کی رنگت شامل ہوتی ہے نہ گوبر پیشاب کی بدبو۔ سفید اور شفاف دودھ باہر آتا ہے جو نہایت آسانی سے حلق سے نیچے اتر جاتا ہے۔

(۳) یہ آیت اس وقت اتری تھی جب شراب حرام نہیں تھی، اس لیے حلال چیزوں کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے لیکن اس میں سکرًا کے بعد رزقًا حَسَنًا ہے، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شراب رزق حسن نہیں ہے۔ نیز یہ سورت مکی ہے۔ جس میں شراب کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار ہے۔ پھر مدنی سورتوں میں بتدریج اس کی حرمت نازل ہو گئی۔

(۴) وَحٰی سے مراد الہام اور وہ سمجھ بوجھ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی طبعی ضروریات کی تکمیل کے لیے حیوانات کو بھی عطا کی ہے۔

لَا يَدْرِي لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝

کا مشروب نکلتا ہے،^(۱) جس کے رنگ مختلف ہیں^(۲) اور جس میں لوگوں کے لیے شفا^(۳) ہے غورو فکر کرنے

والوں کے لیے اس میں بھی بہت بڑی نشانی ہے۔ (۶۹)

اللہ تعالیٰ نے ہی تم سب کو پیدا کیا ہے وہی پھر تمہیں

فوت کرے گا، تم میں ایسے بھی ہیں جو بدترین عمر کی

طرف لوٹائے جاتے ہیں کہ بہت کچھ جانے بوجھنے کے بعد

بھی نہ جانیں۔^(۴) بیشک اللہ دانا اور توانا ہے۔ (۷۰)

وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَوَفِّقُكُمْ وَيُمَيِّزُكُمْ مِنْ بَيْنِ إِلَىٰ آذَانِ
الْعُمَلَىٰ لِكَيْ تَعْلَمُوا بَعْدَ مَا نَسِيْنَا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ۝

(۱) شہد کی مکھی پہلے پھاڑوں میں، درختوں میں انسانی عمارتوں کی بلندیوں پر اپنا سمدس خانہ اور بھتہ اس طرح بناتی ہے کہ درمیان میں کوئی شکاف نہیں رہتا۔ پھر وہ بانگوں، جنگلوں، وادیوں اور پھاڑوں میں گھومتی پھرتی ہے اور ہر قسم کے پھلوں کا جو اس اپنے پیٹ میں جمع کرتی ہے اور پھر انہی راہوں سے، جہاں جہاں سے وہ گزرتی ہے، واپس لوٹتی ہے اور اپنے چھتے میں آکر بیٹھ جاتی ہے، جہاں اس کے منہ یا دبر سے وہ شہد نکلتا ہے جسے قرآن نے ”شراب“ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی مشروب روح افزا۔

(۲) کوئی سرخ، کوئی سفید، کوئی نیلا اور کوئی زرد رنگ کا۔ جس قسم کے پھلوں اور کھیتوں سے وہ خوراک حاصل کرتی ہے، اسی حساب سے اس کا رنگ اور ذائقہ بھی مختلف ہوتا ہے۔

(۳) شفاءً میں تنحییر تعظیم کے لیے ہے۔ یعنی بہت سے امراض کے لیے شہد میں شفا ہے۔ یہ نہیں کہ مطلقاً ہر بیماری کا علاج ہے۔ علمائے طب نے بھی صراحت کی ہے کہ شہد یقیناً ایک شفا بخش قدرتی مشروب ہے۔ لیکن مخصوص بیماریوں کے لیے نہ کہ ہر بیماری کے لیے۔

حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حلوا (میٹھی چیز) اور شہد پسند تھا۔ (صحیح بخاری، کتاب الأشریۃ، باب شراب الحلواء والعسل) ایک دوسری روایت میں ہے آپ نے فرمایا ”تین چیزوں میں شفا ہے۔ فصد کھلوانے (چھپنے لگانے) میں، شہد کے پینے میں اور آگ سے دانغے میں۔ لیکن میں اپنی امت کو داغ لگوانے سے منع کرتا ہوں“ (بخاری، باب الدواء بالعسل) حدیث میں ایک واقعہ بھی آتا ہے۔ ”اسمال (دست) کے مرض میں آپ ﷺ نے شہد استعمال کرنے کا مشورہ دیا، جس سے دستوں میں اضافہ ہو گیا، آکر تھلایا گیا، تو دوبارہ آپ ﷺ نے شہد پلانے کا مشورہ دیا، جس سے مزید فضلات خارج ہوئے اور گھروالے سمجھے کہ شاید مرض میں اضافہ ہو گیا ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ فرمایا اللہ سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، جا اور اسے شہد پلا! چنانچہ تیسری مرتبہ میں اسے شفا کے کاملہ حاصل ہو گئی۔ (بخاری، باب دواء المبطون و المسلم، کتاب السلام، باب التداوی بسقی العسل)

(۴) جب انسان طبعی عمر سے تجاوز کر جاتا ہے تو پھر اس کا حافظہ بھی کمزور ہو جاتا اور بعض دفعہ عقل بھی ماؤف، اور وہ

اللہ تعالیٰ ہی نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر روزی میں زیادتی دے رکھی ہے، پس جنہیں زیادتی دی گئی ہے وہ اپنی روزی اپنے ماتحت غلاموں کو نہیں دیتے کہ وہ اور یہ اس میں برابر ہو جائیں،^(۱) تو کیا یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کے منکر ہو رہے ہیں؟^(۲) (۷۱)

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تم میں سے ہی تمہاری بیویاں پیدا کیں اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لیے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کیے اور تمہیں اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دیں۔ کیا پھر بھی لوگ باطل پر ایمان لائیں گے؟^(۳) اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کریں گے؟ (۷۲)

اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین سے انہیں کچھ بھی تو روزی نہیں دے سکتے اور نہ کچھ قدرت رکھتے ہیں۔^(۴) (۷۳)

پس اللہ تعالیٰ کے لیے مثالیں مت بناؤ،^(۵) اللہ تعالیٰ

وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرِزْقِهِمْ يُوقَظُونَ عَلَىٰ مَالِكِهِمْ سَوْداً وَآذِنًا عَدُوًّا
اللَّهُ يَجْحَدُونَ ①

وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ بَيْنًا وَبَيْنًا وَوَضَعَا وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ
أَقْبَالًا طِيلَ يُؤْمِنُونَ وَبِعَمَتِ اللَّهِ هُمْ يَكْفُرُونَ ②

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِنَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ شَيْئًا وَلَا يَسْتَطِيعُونَ ③
فَلَا تَضْرِبُوا لِلَّهِ الْأَمْثَالَ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ

نادان بچے کی طرح ہو جاتا ہے۔ یہی ارذل العر ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پناہ مانگی ہے۔

(۱) یعنی جب تم اپنے غلاموں کو اتنا مال اور اسباب دنیا نہیں دیتے کہ وہ تمہارے برابر ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کب یہ پسند کرے گا کہ تم کچھ لوگوں کو جو اللہ ہی کے بندے اور غلام ہیں اللہ کا شریک اور اس کے برابر قرار دے دو، اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ معاشی لحاظ سے انسانوں میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے فطری نظام کے مطابق ہے۔ اسے جبری قوانین کے ذریعہ ختم نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ اشتراکی نظام میں ہے۔ یعنی معاشی مساوات کی غیر فطری کوشش کے بجائے ہر کسی کو معاشی میدان میں کسب معاش کے لیے مساوی طور پر دوڑ دھوپ کے مواقع میسر ہونے چاہئیں۔

(۲) کہ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے غیر اللہ کے لیے نذر نیاز نکالتے ہیں اور یوں کفرانِ نعمت کرتے ہیں۔

(۳) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے ان انعامات کا تذکرہ کر کے جو آیت میں مذکور ہیں، سوال کر رہا ہے کہ سب کچھ دینے والا تو اللہ ہے، لیکن یہ اسے چھوڑ کر دوسروں کی عبادت کرتے ہیں اور دوسروں کا ہی کسنا مانتے ہیں۔

(۴) یعنی اللہ کو چھوڑ کر عبادت بھی ایسے لوگوں کی کرتے ہیں جن کے پاس کسی چیز کا اختیار نہیں ہے۔

(۵) جس طرح مشرکین مثالیں دیتے ہیں کہ بادشاہ سے ملنا ہو یا اس سے کوئی کام ہو تو کوئی براہ راست بادشاہ سے نہیں

لَا تَعْلَمُونَ ﴿۷۴﴾

وَصَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَمْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَمَن رَّزَقْنَاهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَجَهْرًا هَلْ يَسْتَوُونَ ۗ لَئِن لَّمْ يَلْعَبُوا بِلَدُنُورِهِمْ لَآتَيْنَهُمْ مِّنَّا جَذَابًا مُّهِينًا ﴿۷۵﴾

وَصَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا تَجَلِّينَ أَحَدَهُمَا أَبْكُ لَا يَقْدِرُ

عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَىٰ مَوْلَاهُ أَيْنَمَا يُوَجِّههُ لَأَيِّاتٍ بَاطِنَةٍ هَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَن يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۷۵﴾

خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (۷۴)
اللہ تعالیٰ ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک غلام ہے دوسرے کی ملکیت کا، جو کسی بات کا اختیار نہیں رکھتا اور ایک اور شخص ہے جسے ہم نے اپنے پاس سے معقول روزی دے رکھی ہے، جس میں سے وہ چھپے کھلے خرچ کرتا ہے۔ کیا یہ سب برابر ہو سکتے ہیں؟ (۱) اللہ تعالیٰ ہی کے لیے سب تعریف ہے، بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ (۷۵)
اللہ تعالیٰ ایک اور مثال بیان فرماتا ہے، (۲) دو شخصوں کی، جن میں سے ایک تو گونگا ہے اور کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا بلکہ وہ اپنے مالک پر بوجھ ہے کہیں بھی اسے بھیجے وہ کوئی بھلائی نہیں لاتا، کیا یہ اور وہ جو عدل کا حکم دیتا ہے (۳) اور

مل سکتا، اسے پہلے بادشاہ کے مقررین سے رابطہ کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر بادشاہ تک اس کی رسائی ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ کی ذات بھی بہت اعلیٰ اور اونچی ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے ہم ان معبودوں کو ذریعہ بناتے ہیں یا بزرگوں کا وسیلہ پکڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، تم اللہ کو اپنے پر قیاس مت کرو نہ اس قسم کی مثالیں دو۔ اس لیے کہ وہ تو واحد ہے، اس کی کوئی مثال ہی نہیں ہے۔ پھر بادشاہ نہ تو عالم الغیب ہے، نہ حاضر و ناظر، نہ سمیع و بصیر۔ کہ وہ بغیر کسی ذریعے کے رعایا کے حالات و ضروریات سے آگاہ ہو جائے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ تو ظاہر و باطن اور حاضر و غائب ہر چیز کا علم رکھتا ہے، رات کی تاریکیوں میں ہونے والے کاموں کو بھی دیکھتا ہے اور ہر ایک کی فریاد سننے پر بھی قادر ہے۔ بھلا ایک انسانی بادشاہ اور حاکم کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا تقابل اور موازنہ؟

(۱) بعض کہتے ہیں کہ یہ غلام اور آزاد کی مثال ہے کہ پہلا شخص غلام اور دوسرا آزاد ہے۔ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مومن اور کافر کی مثال ہے۔ پہلا کافر اور دوسرا مومن ہے۔ یہ برابر نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اصنام (معبودان باطلہ) کی مثال ہے، پہلے سے مراد اصنام اور دوسرے سے اللہ ہے۔ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ مطلب یہی ہے کہ ایک غلام اور آزاد، باوجود اس بات کہ دونوں انسان ہیں، دونوں اللہ کی مخلوق ہیں اور بھی بہت سی چیزیں دونوں کے درمیان مشترک ہیں، اس کے باوجود رتبہ و شرف اور فضل و منزلت میں تم دونوں کو برابر نہیں سمجھتے۔ تو اللہ تعالیٰ اور پتھر کی ایک مورتی یا قبر کی ڈھیری، یہ دونوں کس طرح برابر ہو سکتے ہیں؟

(۲) یہ ایک اور مثال ہے جو پہلے سے زیادہ واضح ہے۔

(۳) اور ہر کام کرنے پر قادر ہے کیوں کہ ہر بات بولتا اور سمجھتا ہے اور ہے بھی سیدھی راہ پر یعنی دین تویم اور سیرت صالحہ پر۔ یعنی افراط و تفریط سے پاک۔ جس طرح یہ دونوں برابر نہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ اور وہ چیزیں، جن کو لوگ اللہ کا

ہے بھی سیدھی راہ پر برابر ہو سکتے ہیں؟ (۷۶)

آسمانوں اور زمین کا غیب صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔^(۱) اور قیامت کا امر تو ایسا ہی ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا، بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔^(۲) (۷۷)

اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا ہے کہ اس وقت تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے،^(۳) اسی نے تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے^(۴) کہ تم شکر گزاری کرو۔^(۵) (۷۸)

وَاللَّهُ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا أَسْرَأُ السَّاعَةَ إِلَّا كَلِمَةٍ الْبَصِيرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۷۶﴾

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۷۸﴾

شریک ٹھہراتے ہیں، برابر نہیں ہو سکتے۔

(۱) یعنی آسمان و زمین میں جو چیزیں غائب ہیں اور وہ بے شمار ہیں اور انہی میں قیامت کا علم ہے۔ ان کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ اس لیے عبادت کے لائق بھی صرف ایک اللہ ہے نہ کہ وہ اصنام یا فوت شدہ اشخاص جن کو کسی چیز کا علم نہیں نہ وہ کسی کو نفع نقصان پہنچانے پر ہی قادر ہیں۔

(۲) یعنی اس کی قدرت کاملہ کی دلیل ہے کہ یہ وسیع و عریض کائنات اس کے حکم سے پلک جھپکنے میں بلکہ اس سے بھی کم لمبے میں تباہ و برباد ہو جائے گی۔ یہ بات بطور مبالغہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت واقعہ ہے کیونکہ اس کی قدرت غیر متناہی ہے جس کا ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے، اس کے ایک لفظ کُن سے وہ سب کچھ ہو جاتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ تو یہ قیامت بھی اس کے کُن (ہو جا) کہنے سے برپا ہو جائے گی۔

(۳) شَيْئًا، نکرہ ہے تم کچھ نہیں جانتے تھے، نہ سعادت و شقاوت کو، نہ فائدے اور نقصان کو۔

(۴) تاکہ کانوں کے ذریعے سے تم آوازیں سنو، آنکھوں کے ذریعے سے چیزوں کو دیکھو اور دل، یعنی عقل (کیوں کہ عقل کا مرکز دل ہے) دی، جس سے چیزوں کے درمیان تمیز کر سکو اور نفع و نقصان پہچان سکو، جوں جوں انسان بڑا ہوتا ہے، ان قوی و حواس میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے، حتیٰ کہ جب انسان شعور اور بلوغت کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کی یہ صلاحیتیں بھی قوی ہو جاتی ہیں، حتیٰ کہ پھر کمال کو پہنچ جاتی ہیں۔

(۵) یعنی یہ صلاحیتیں اور قوتیں اللہ تعالیٰ نے اس لیے عطا کی ہیں کہ انسان ان اعضاء و جوارح کو اس طرح استعمال کرے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے۔ ان سے اللہ کی عبادت و اطاعت کرے۔ یہی اللہ کی ان نعمتوں کا عملی شکر ہے۔ حدیث میں آتا ہے ”میرا بندہ جن چیزوں کے ذریعے سے میرا قرب حاصل کرتا ہے ان میں سب سے محبوب وہ چیزیں ہیں جو میں نے اس پر فرض کی ہیں۔ علاوہ ازیں نوافل کے ذریعے سے بھی وہ میرا زیادہ قرب حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے،

کیا ان لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا جو تابع فرمان ہو کر فضا میں ہیں، جنہیں بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی اور تھامے ہوئے نہیں،^(۱) بیشک اس میں ایمان لانے والے لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ (۷۹)

اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تمہارے گھروں میں سکونت کی جگہ بنا دی ہے اور اسی نے تمہارے لیے چوپایوں کی کھالوں کے گھر بنا دیے ہیں، جنہیں تم ہلکا پھلکا پاتے ہو اپنے کوچ کے دن اور اپنے ٹھرنے کے دن بھی،^(۲) اور ان کی اون اور روؤں اور بالوں سے بھی اس نے بہت سے سامان اور ایک وقت مقررہ تک کے لیے فائدہ کی چیزیں بنائیں۔^(۳) (۸۰)

أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوِّ السَّمَاءِ مَا يَتَّبِعُنَّ
إِلَّا اللَّهَ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝

وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ جُلُودِ
الْأَنْعَامِ بُيُوتًا تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ رِقَاكُمْ ۗ
وَمِنْ أَمْوَالِكُمْ أَوْبَارًا وَأَشْعَارَهَا أَتَأْتُوا مَتَاعًا
إِلَىٰ حَبِيبٍ ۝

حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں۔ اور جب میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں، تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اور اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں اور مجھ سے کسی چیز سے پناہ طلب کرتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔ (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع)

اس حدیث کا بعض لوگ غلط مفہوم لے کر اولیاء اللہ کو خدائی اختیارات کا حامل باور کراتے ہیں۔ حالانکہ حدیث کا واضح مطلب یہ ہے کہ جب بندہ اپنی اطاعت و عبادت اللہ کے لیے خالص کر لیتا ہے تو اس کا ہر کام صرف اللہ کی رضا کے لیے ہوتا ہے، اپنے کانوں سے وہی بات سنتا اور اپنی آنکھوں سے وہی چیز دیکھتا ہے جس کی اللہ نے اجازت دی ہے، جس چیز کو ہاتھ سے پکڑتا ہے یا بیروں سے چل کر اس کی طرف جاتا ہے تو وہ وہی چیز ہوتی ہے جس کو شریعت نے روا رکھا ہے۔ وہ ان کو اللہ کی نافرمانی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ صرف اطاعت میں استعمال کرتا ہے۔

(۱) یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے پرندوں کو اس طرح اڑنے کی اور ہواؤں کو انہیں اپنے دوش پر اٹھائے رکھنے کی طاقت بخشی۔

(۲) یعنی چڑے کے خیمے، جنہیں تم سفر میں آسانی کے ساتھ اٹھائے پھرتے ہو، اور جہاں ضرورت پڑتی ہے اسے تان کر موسم کی شدتوں سے اپنے کو محفوظ کر لیتے ہو۔

(۳) اَصْوَافٌ، صُوفٌ کی جمع۔ بیھڑکی اون اَوْبَارٌ، وَبَرٌ کی جمع، اونٹ کے بال، اَشْعَارٌ، شَعْرٌ کی جمع۔ دنبے اور بکری کے بال۔ ان سے کئی قسم کی چیزیں تیار ہوتی ہیں، جن سے انسان کو مال بھی حاصل ہوتا ہے اور ان سے ایک وقت تک فائدہ بھی اٹھاتا ہے۔

اللہ ہی نے تمہارے لیے اپنی پیدا کردہ چیزوں میں سے سائے بنائے ہیں^(۱) اور اسی نے تمہارے لیے پہاڑوں میں غار بنائے ہیں اور اسی نے تمہارے لیے کرتے بنائے ہیں جو تمہیں گرمی سے بچائیں اور ایسے کرتے بھی جو تمہیں لڑائی کے وقت کام آئیں۔^(۲) وہ اسی طرح اپنی پوری پوری نعمتیں دے رہا ہے کہ تم حکم بردار بن جاؤ۔ (۸۱)

پھر بھی اگر یہ منہ موڑے رہیں تو آپ پر صرف کھول کر تبلیغ کرونا ہی ہے۔ (۸۲)

یہ اللہ کی نعمتیں جاننے پہنچاتے ہوئے بھی ان کے منکر ہو رہے ہیں، بلکہ ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں۔^(۳) (۸۳)

اور جس دن ہم ہر امت میں سے گواہ کھڑا کریں گے^(۴) پھر کافروں کو نہ اجازت دی جائے گی اور نہ ان سے توبہ کرنے کو کہا جائے گا۔ (۸۴)

وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِمَّا خَلَقَ ظِلَالًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْجِبَالِ الْكُنَاثَ وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيلَ تَقِيكُمُ بِالْأَسْفَلِ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۸۱﴾

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ﴿۸۲﴾

يَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللَّهِ ثُمَّ يُنْكِرُونَهَا وَأَكْفُرُوهَا
الْكَافِرُونَ ﴿۸۳﴾

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا اشْهَدُوا لَكُمْ
لِيُذَمَّنَ الْكَافِرُ لَكُمْ وَأُولَاهُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿۸۴﴾

(۱) یعنی درخت جن سے سایہ حاصل کیا جاتا ہے۔

(۲) یعنی اون اور روٹی کے کرتے جو عام پینے میں آتے ہیں اور لوہے کی زرہیں اور خود جو جنگوں میں پہنی جاتی ہیں۔

(۳) یعنی اس بات کو جانتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ ساری نعمتیں پیدا کرنے والا اور ان کو استعمال میں لانے کی صلاحیتیں عطا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، پھر بھی اللہ کا انکار کرتے ہیں اور اکثر ناشکری کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی عبادت کرتے ہیں۔

(۴) یعنی ہر امت پر اس امت کا پیغمبر گواہی دے گا کہ انہیں اللہ کا پیغام پہنچا دیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ ان کافروں کو عذر پیش کرنے کی اجازت بھی نہیں دی جائے گی، اس لیے کہ ان کے پاس حقیقت میں کوئی عذریا جمت ہوگی ہی نہیں۔ نہ ان سے رجوع یا عتاب دور کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا۔ کیوں کہ اس کی ضرورت بھی اس وقت پیش آتی ہے جب کسی کو گنہگار دینا مقصود ہو لَا يُسْتَعْتَبُونَ کے ایک دوسرے معنی یہ کیے گئے کہ انہیں اپنے رب کو راضی کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ کیوں کہ وہ موقع تو ان کو دنیا میں دیا جا چکا ہے جو دارالعمل ہے۔ آخرت تو دارالعمل نہیں، وہ تو دارالجزا ہے، وہاں تو اس چیز کا بدلہ ملے گا جو انسان دنیا سے کر کے گیا ہو گا، وہاں کچھ کرنے کا موقع کسی کو نہیں ملے گا۔

اور جب یہ ظالم عذاب دیکھ لیں گے پھر نہ تو ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ وہ ڈھیل دیے جائیں گے۔ (۸۵) (۱)

اور جب مشرکین اپنے شریکوں کو دیکھ لیں گے تو کہیں گے اے ہمارے پروردگار! یہی ہمارے وہ شریک ہیں جنہیں ہم تجھے چھوڑ کر پکارا کرتے تھے، پس وہ انہیں جواب دیں گے کہ تم بالکل ہی جھوٹے ہو۔ (۸۶) (۲)

اس دن وہ سب (عاجز ہو کر) اللہ کے سامنے اطاعت کا اقرار پیش کریں گے اور جو ہستان بازی کیا کرتے تھے وہ سب ان سے گم ہو جائے گی۔ (۸۷)

وَلَا ذَارَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿۸۵﴾

وَإِذَا رَأَوْا الَّذِينَ أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَؤُلَاءِ شُرَكَائُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُو مِنْ دُونِكَ قَالِقُوا إِلَهُهُمْ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكُنْتُمْ أَكْذٰبًا ﴿۸۶﴾

وَالْقَوْمَ إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ وَسَلَّمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۸۷﴾

(۱) ہلکانہ کرنے کا مطلب، درمیان میں کوئی وقفہ نہیں ہوگا، عذاب اور مسلسل بلا تو وقفہ عذاب ہو گا۔ اور نہ ڈھیل ہی دیے جائیں گے یعنی، ان کو فوراً لنگاموں سے پکڑ کر اور زنجیروں میں جکڑ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا یا توبہ کا موقع نہیں دیا جائے گا، کیوں کہ آخرت عمل کی جگہ نہیں، جزا کا مقام ہے۔

(۲) معبودان باطلہ کی پوجا کرنے والے اپنے اس دعوے میں جھوٹے تو نہیں ہوں گے۔ لیکن وہ شرکا جن کو یہ اللہ کا شریک گردانتے تھے، کہیں گے یہ جھوٹے ہیں۔ یہ یا تو شرکت کی نفی ہے یعنی ہمیں اللہ کا شریک ٹھہرانے میں یہ جھوٹے ہیں، بھلا اللہ کا شریک کون ہو سکتا ہے؟ یا اس لیے انہیں جھوٹا قرار دیں گے کہ وہ ان کی عبادت سے بالکل بے خبر تھے۔ جس طرح قرآن کریم نے متعدد جگہ اس بات کو بیان فرمایا ہے۔ مثلاً ﴿فَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَيُنكَرُونَ إِنَّكُمْ لَعَنْتُمْ عَنْ أَعْيُنِكُمْ قَوْمَ يَعْتَبِرُونَ﴾ (سورۃ یونس: ۳۹) "ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ بطور گواہ کافی ہے کہ ہم اس بات سے بے خبر تھے کہ تم ہماری عبادت کرتے تھے" (مزید دیکھئے سورۃ الاحقاف آیت ۵، ۶، سورۃ مریم ۸۱-۸۲، سورۃ العنکبوت، ۲۵، سورۃ الکہف، ۵۲۔ وَعَذِبُوا مِنَ الْآيَاتِ اِذَا كَانُوا فِيهَا لَا يَعْقِلُونَ) یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے تمہیں اپنی عبادت کرنے کے لیے کبھی نہیں کہا تھا، اس لیے تم ہی جھوٹے ہو۔ یہ شرکا اگر حجرو شجر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں قوت گویائی عطا فرمائے گا جنات و شیاطین ہوں گے تو کوئی اشکال ہی نہیں ہے اور اگر اللہ کے نیک بندے ہوں گے، جس طرح کہ متعدد صلحاء و اتقیاء اور اولیاء اللہ کو لوگ مدد کے لیے پکارتے ہیں، ان کے نام کی نذر نیا ز دیتے ہیں اور ان کی قبروں پر جا کر ان کی اسی طرح تعظیم کرتے ہیں جس طرح کسی معبود کی، خوف و رجا کے جذبات کے ساتھ، کی جاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کو میدان محشر میں ہی بری فرمادے گا اور ان کی عبادت کرنے والوں کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا سوال اور ان کا جواب سورۃ مائدہ کے آخر میں مذکور ہے۔

جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا ہم انہیں عذاب پر عذاب بڑھاتے جائیں گے،^(۱) یہ بدلہ ہو گا ان کی فتنہ پردازیوں کا۔ (۸۸)

اور جس دن ہم ہر امت میں انہی میں سے ان کے مقابلے پر گواہ کھڑا کریں گے اور تجھے ان سب پر گواہ بنا کر لائیں گے^(۲) اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل فرمائی ہے جس میں ہر چیز کا شافی بیان ہے،^(۳) اور ہدایت اور رحمت اور خوشخبری ہے مسلمانوں کے لیے۔ (۸۹)

اللہ تعالیٰ عدل کا، بھلائی کا اور قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی کے کاموں، ناشائستہ حرکتوں اور ظلم و زیادتی سے روکتا ہے،^(۴) وہ خود تمہیں نصیحتیں کر رہا ہے کہ تم نصیحت حاصل کرو۔ (۹۰)

الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ذُوهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ
فَوَقَّ عَذَابَ بَمَا كَانُوا يَفْسِدُونَ ﴿۸۸﴾

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِنْ أَنْفُسِهِمْ
وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلٰى هَؤُلَاءِ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ
بَيِّنَاتٍ لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى
لِّلْمُسْلِمِينَ ﴿۸۹﴾

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَايَ ذِي
الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۹۰﴾

(۱) جس طرح جنت میں اہل ایمان کے درجات مختلف ہوں گے، اسی طرح جہنم میں کفار کے عذاب میں تفاوت ہو گا۔ جو گمراہ ہونے کے ساتھ دوسروں کی گمراہی کا سبب بنے ہوں گے، ان کا عذاب دوسروں کی نسبت شدید تر ہو گا۔

(۲) یعنی ہر نبی اپنی امت پر گواہی دے گا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے لوگ انبیاء کی بابت گواہی دیں گے کہ یہ سچے ہیں، انہوں نے، یقیناً تیرا پیغام پہنچا دیا تھا۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ النساء)

(۳) کتاب سے مراد اللہ کی کتاب اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات (احادیث) ہیں۔ اپنی احادیث کو بھی اللہ کے رسول نے ”کتاب اللہ“ قرار دیا ہے، جیسا کہ قصہ عیث وغیرہ میں ہے (ملاحظہ ہو صحیح بخاری، کتاب المحاربین باب هل یأمر الإمام رجلاً فیضرب الحد غائباً عنه، کتاب الصلوٰۃ، باب ذکر البیع والشراء علی المنبر فی المسجد اور ہر چیز کا مطلب ہے، ماضی اور مستقبل کی وہ خبریں جن کا علم ضروری اور مفید ہے۔ اسی طرح حرام و حلال کی تفصیلات اور وہ باتیں جن کے دین و دنیا اور معاش و معاد کے معاملات میں انسان محتاج ہیں۔ قرآن و حدیث دونوں میں یہ سب چیزیں واضح کر دی گئی ہیں۔

(۴) عدل کے مشور معنی انصاف کرنے کے ہیں۔ یعنی اپنوں اور بیگانوں سب کے ساتھ انصاف کیا جائے، کسی کے ساتھ دشمنی یا عناد یا محبت یا قرابت کی وجہ سے، انصاف کے تقاضے مجروح نہ ہوں۔ ایک دوسرے معنی اعتدال کے ہیں یعنی کسی

اور اللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم آپس میں قول و قرار کرو اور قسموں کو ان کی پختگی کے بعد مت توڑو، حالانکہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنا ضامن ٹھہرا چکے ہو،^(۱) تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کو بخوبی جان رہا ہے۔ (۹۱)

وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ
بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا إِنَّ اللَّهَ
يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ﴿۹۱﴾

معاملے میں بھی افراط یا تفریط کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ حتیٰ کہ دین کے معاملے میں بھی۔ کیوں کہ دین میں افراط کا نتیجہ غلو ہے، جو سخت مذموم ہے اور تفریط، دین میں کوتاہی ہے یہ بھی ناپسندیدہ ہے۔

احسان کے ایک معنی حسن سلوک، عفو و درگزر اور معاف کر دینے کے ہیں۔ دوسرے معنی متفضل کے ہیں یعنی حق واجب سے زیادہ دینا یا عمل واجب سے زیادہ عمل کرنا۔ مثلاً کسی کام کی مزدوری سو روپے ملے ہے لیکن دیتے وقت ۲۰، ۱۰ روپے زیادہ دے دینا، ملے شدہ سو روپے کی ادائیگی حق واجب ہے اور یہ عدل ہے۔ مزید ۲۰، ۱۰ روپے یہ احسان ہے۔ عدل سے بھی معاشرے میں امن قائم ہوتا ہے لیکن احسان سے مزید خوش گواری اور اپنائیت و فدائیت کے جذبات نشوونما پاتے ہیں۔ اور فرائض کی ادائیگی کے ساتھ نوافل کا اہتمام، عمل واجب سے زیادہ عمل ہے جس سے اللہ کا قرب خصوصی حاصل ہوتا ہے۔ احسان کے ایک تیسرے معنی اخلاص عمل اور حسن عبادت ہے، جس کو حدیث میں «أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ» (اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ «إِنْتَاءِ ذِي الْقُرْنَيْنِ» (رشتے داروں کا حق ادا کرنا یعنی ان کی امداد کرنا ہے) اسے حدیث میں صلہ رحمی کہا گیا ہے اور اس کی نہایت تائید احادیث میں بیان کی گئی ہے۔ عدل و احسان کے بعد، اس کا الگ سے ذکر، یہ بھی صلہ رحمی کی اہمیت کو واضح کر رہا ہے۔ فَخَشَاءُ سے مراد بے حیائی کے کام ہیں۔ آج کل بے حیائی اتنی عام ہو گئی ہے کہ اس کا نام تہذیب، ترقی اور آرٹ قرار دیا گیا ہے، یا ”تفریح“ کے نام پر اس کا جواز تسلیم کر لیا گیا ہے۔ تاہم محض خوشنالیوں لگا لینے سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدل سکتی، اسی طرح شریعت اسلامیہ نے زنا اور اس کے مقدمات کو، رقص و سرود، بے پردگی اور فیشن پرستی کو اور مرد و زن کے بے باکانہ اختلاط اور مخلوط معاشرت اور دیگر اس قسم کی خرافات کو بے حیائی ہی قرار دیا ہے، ان کا کتنا بھی اچھا نام رکھ لیا جائے، مغرب سے در آمد شدہ یہ خباثیں جائز قرار نہیں پاسکتیں۔ مُنْكَرٌ ہر وہ کام ہے جسے شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے اور بَغْيٌ کا مطلب ظلم و زیادتی کا ارتکاب۔ ایک حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ قطع رحمی اور بغی، یہ دونوں جرم اللہ کو اتنے ناپسند ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے (آخرت کے علاوہ) دنیا میں بھی ان کی فوری سزا کا امکان غالب رہتا ہے۔ (ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب البغی)

(۱) قَسَمٌ ایک تو وہ ہے جو کسی عہد و پیمانے کے وقت، اسے مزید پختہ کرنے کے لیے کھائی جاتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو انسان اپنے طور پر کسی وقت کھا لیتا ہے کہ میں فلاں کام کروں گا یا نہیں کروں گا۔ یہاں آیت میں اول الذکر قسم مراد ہے کہ تم نے قسم کھا کر اللہ کو ضامن بنا لیا ہے۔ اب اسے نہیں توڑنا بلکہ اس عہد و پیمانے کو پورا کرنا ہے جس پر تم نے قسم

اور اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنا سوت مضبوط کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر کے توڑ ڈالا،^(۱) اس کے تم اپنی قسموں کو آپس کے مکر کا باعث ٹھہراؤ،^(۲) اس لیے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے بڑھا چڑھا ہو جائے۔^(۳) بات صرف یہی ہے کہ اس عہد سے اللہ تمہیں آزما رہا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے لیے قیامت کے دن ہر اس چیز کو کھول کر بیان کر دے گا جس میں تم اختلاف کر رہے تھے۔ (۹۲)

اگر اللہ چاہتا تم سب کو ایک ہی گروہ بنا دیتا لیکن وہ جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت دیتا ہے، یقیناً تم جو کچھ کر رہے ہو اس کے بارے میں باز پرس کی جانے والی ہے۔ (۹۳)

اور تم اپنی قسموں کو آپس کی دغا بازی کا ہمانہ نہ بناؤ۔ پھر تو تمہارے قدم اپنی مضبوطی کے بعد ڈگمگا جائیں گے اور تمہیں سخت سزا برداشت کرنا پڑے گی

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَقَصَتْ غُرْلَهُمَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ
 أَنْكَرَ كَمَا تَصَدُّونَ آيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ
 تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ إِنَّمَا يَبُذُّ لَكُمْ اللَّهُ يَدَهُ وَيَكَيْفَ يَنْزِلُ
 لَكُمْ رُحْمًا الْعِزَّةَ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۹۲﴾

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ يُضِلُّ
 مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَلِكُنْتُمْ عَنْ
 كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۹۳﴾

وَلَا تَتَّخِذُوا آيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌ بَعْدَ
 ثُبُوتِهَا وَتَذُوقُوا الشُّوْبَ بِمَا صَدَقْتُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ

کھائی ہے۔ کیوں کہ ثانی الذکر قسم کی بابت تو حدیث میں حکم دیا گیا ہے کہ ”کوئی شخص کسی کام کی بابت قسم کھالے، پھر وہ دیکھے کہ زیادہ خیر دوسری چیز میں ہے (یعنی قسم کے خلاف کرنے میں ہے) تو وہ بہتری والے کام کو اختیار کرے اور قسم کو توڑ کر اس کا کفارہ ادا کرے۔“ (صحیح مسلم۔ نمبر ۱۲۷۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی یہی تھا۔ (صحیح بخاری۔ نمبر ۶۱۲۳، مسلم، نمبر ۱۲۶۹)

(۱) یعنی مؤکد بہ حلف عہد کو توڑ دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی عورت سوت کاتنے کے بعد اسے خود ہی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ یہ تمثیل ہے۔

(۲) یعنی دھوکہ اور فریب دینے کا ذریعہ بناؤ۔

(۳) اُزبئی کے معنی اکثر کے ہیں یعنی جب تم دیکھو کہ اب تم زیادہ ہو گئے ہو تو اپنے زعم کثرت میں حلف توڑ دو، جب کہ قسم اور معاہدے کے وقت وہ گروہ کمزور تھا، لیکن کمزوری کے باوجود وہ مطمئن تھا کہ معاہدے کی وجہ سے ہمیں نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ لیکن تم غرر اور نقض عہد کر کے نقصان پہنچاؤ۔ زمانہ جاہلیت میں اخلاقی پستی کی وجہ سے اس قسم کی عہد شکنی عام تھی، مسلمانوں کو اس اخلاقی پستی سے روکا گیا ہے۔

وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۹۵﴾

کیونکہ تم نے اللہ کی راہ سے روک دیا اور تمہیں بڑا سخت عذاب ہو گا۔ (۹۵)

وَلَا تَتَّبِعُوا مَنَافِعَ اللَّهِ تَمَنًّا فَمَا كَانَ يَدُومَ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ لِّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۹۶﴾

تم اللہ کے عہد کو تھوڑے مول کے بدلے نہ پیچ دیا کرو۔ یاد رکھو اللہ کے پاس کی چیز ہی تمہارے لیے بہتر ہے بشرطیکہ تم میں علم ہو۔ (۹۶)

مَاعِنْدَكُمْ يَبْعُدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۷﴾

تمہارے پاس جو کچھ ہے سب فانی ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے باقی ہے۔ اور صبر کرنے والوں کو ہم بھلے اعمال کا بہترین بدلہ ضرور عطا فرمائیں گے۔ (۹۷)

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّاهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً، وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۸﴾

جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت، لیکن باایمان ہو تو ہم اسے یقیناً نہایت بہتر زندگی عطا فرمائیں گے۔ (۹۸) اور ان کے نیک اعمال کا بہتر بدلہ بھی انہیں ضرور ضرور دیں گے۔ (۹۸)

وَإِذَا قُرَأَتِ الْقُرْآنُ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۹﴾

قرآن پڑھنے کے وقت راندے ہوئے شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کرو۔ (۹۹)

(۱) مسلمانوں کو دوبارہ مذکورہ عمدہ نشانی سے روکا جا رہا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری اس اخلاقی پستی سے کسی کے قدم ڈگلا جائیں اور کافر تمہارا یہ رویہ دیکھ کر قبول اسلام سے رک جائیں اور یوں تم لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنے کے مجرم اور سزا کے مستحق بن جاؤ۔ بعض مفسرین نے اِيْمَانًا يَمِيْنًا (بمعنی قسم) کی جمع سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت مراد لی ہے۔ یعنی نبی کی بیعت توڑ کر پھر مرتد نہ ہو جانا، تمہارے ارتداد کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی قبول اسلام سے رک جائیں گے اور یوں تم دگے عذاب کے مستحق قرار پاؤ گے۔ (فتح القدر)

(۲) حیات طیبہ (بہتر زندگی) سے مراد دنیا کی زندگی ہے، اس لیے کہ آخرت کی زندگی کا ذکر اگلے جملے میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایک مومن باکردار کو صالحانہ اور متقیانہ زندگی گزارنے اور اللہ کی عبادت و اطاعت اور زہد و قناعت میں جو لذت و حلاوت محسوس ہوتی ہے، وہ ایک کافر اور نافرمان کو دنیا بھر کی آسائشوں اور سہولتوں کے باوجود میسر نہیں آتی، بلکہ وہ ایک گونہ قلق و اضطراب کا شکار رہتا ہے۔ ﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَاِنَّ لَهُ مَوْجِئَةً مِّنْ عَذَابِنَا﴾ (طلہ۔ ۱۲۳) ”جس نے میری یاد سے اعراض کیا۔ اس کا گزاران تنگی والا ہو گا۔“

(۳) خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن مخاطب ساری امت ہے۔ یعنی تلاوت کے آغاز میں اَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھا جائے۔

ایمان والوں اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھنے والوں پر
اس کا زور مطلقاً نہیں چلتا۔ (۹۹)

ہاں اس کا غلبہ ان پر یقیناً ہے جو اسی سے رفاقت کریں
اور اسے اللہ کا شریک ٹھہرائیں۔ (۱۰۰)

اور جب ہم کسی آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے
ہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نازل فرماتا ہے اسے وہ خوب
جاتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ تو تو بہتان باز ہے۔ بات یہ ہے
کہ ان میں سے اکثر جانتے ہی نہیں۔^(۱) (۱۰۱)

کہہ دیجئے کہ اسے آپ کے رب کی طرف سے جبرائیل
حق کے ساتھ لے کر آئے ہیں^(۲) تاکہ ایمان والوں کو
اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائے^(۳) اور مسلمانوں کی
رہنمائی اور بشارت ہو جائے۔^(۴) (۱۰۲)

ہمیں بخوبی علم ہے کہ یہ کافر کہتے ہیں کہ اسے تو ایک

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ
يَتَوَكَّلُونَ ﴿۹۹﴾

إِنَّمَا سُلْطٰنُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَكَّلُونَهُ وَالَّذِينَ
هُم بِهِ مُشْرِكُونَ ﴿۱۰۰﴾

وَلَا ذٰلِكُمْ لِنَأْيِ مَكَانِ الْيَوْمِ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا يَتَزَلَّلُونَ
قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مُفْتِرٌ بِنِ الْكُفْرِهِمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۰۱﴾

فَلَنَنْزِلُهُ مَوْجًا مَّادِيًّا مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُنَبِّئَتْ
الَّذِينَ آمَنُوا وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿۱۰۲﴾

وَلَقَدْ تَعَلَّمُوا أَنَّهُمْ يَعْبُدُونَ إِنَّمَا يَعْبُدُهُمْ بَشَرٌ لِّسَانِ الَّذِي

(۱) یعنی ایک حکم منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم نازل کرتے ہیں، جس کی حکمت و مصلحت اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے
اور اس کے مطابق وہ احکام میں رد و بدل فرماتا ہے، تو کافر کہتے ہیں کہ یہ کلام اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) تیرا اپنا گھڑا
ہوا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ تو اس طرح نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کے اکثر لوگ بے علم ہیں، اس لیے یہ نسخ
کی حکمتیں اور مصلحتیں کیا جائیں۔ (مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو، سورہ بقرہ، آیت ۱۰۶ کا حاشیہ)

(۲) یعنی یہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا گھڑا ہوا نہیں ہے بلکہ اسے حضرت جبریل علیہ السلام جیسے پاکیزہ ہستی نے،
سچائی کے ساتھ رب کی طرف سے اتارا ہے۔ جیسے دوسرے مقام پر ہے، ﴿ تَنزِيلَهُ الْوَحْيُ الْكَافِرُونَ * عَلَىٰ قَلْبِكَ ﴾
(الشعراء۔ ۱۹۳-۱۹۴) ”اسے الروح الامین (جبریل علیہ السلام) نے تیرے دل پر اتارا ہے۔“

(۳) اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ نسخ اور منسوخ دونوں رب کی طرف سے ہیں۔ علاوہ ازیں نسخ کے مصالح بھی جب ان
کے سامنے آتے ہیں تو ان کے اندر مزید ثابت قدمی اور ایمان میں رسوخ پیدا ہوتا ہے۔

(۴) اور یہ قرآن مسلمانوں کے لیے ہدایت اور بشارت کا ذریعہ ہے، کیوں کہ قرآن بھی بارش کی طرح ہے، جس سے
بعض زمینیں خوب شاداب ہوتی ہیں اور بعض میں خار و خش کے سوا کچھ نہیں آگتا۔ مومن کا دل طاہر اور شفاف ہے جو
قرآن کی برکت سے اور ایمان کے نور سے منور ہو جاتا ہے اور کافر کا دل زمین شور کی طرح ہے جو کفر و ضلالت کی
تاریکیوں سے بھرا ہوا ہے، جہاں قرآن کی نیا پاشیاں بھی بے اثر رہتی ہیں۔

آدمی کھاتا ہے ^(۱) اس کی زبان جس کی طرف یہ نسبت کر رہے ہیں عجمی ہے اور یہ قرآن تو صاف عربی زبان میں ہے۔ ^(۲) (۱۰۳)

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے انہیں اللہ کی طرف سے بھی رہنمائی نہیں ہوتی اور ان کے لیے المناک عذاب ہیں۔ (۱۰۴)

جھوٹ افترا تو وہی باندھتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر ایمان نہیں ہوتا۔ یہی لوگ جھوٹے ہیں۔ ^(۳) (۱۰۵)

جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ سے کفر کرے۔ بجز اس کے جس پر جبر کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر برقرار ہو، ^(۴) مگر جو لوگ کھلے دل سے کفر کریں تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور انہی کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ ^(۵) (۱۰۶)

يُجَادُونَ إِلَيْهِ أَعْمَىٰ ۖ وَهَذَا لِيَسَانِ عَرَبِيًّا مُّبِينٌ ۝

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ لَا يَهْدِيَهُمُ اللَّهُ وَلَا يُمْسِكُهُمْ عَذَابُ الْعَذَابِ ۝

إِنَّمَا يَتَّبِعُونَ الْكُذْبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَذِبُونَ ۝

مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أَكْرَهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

(۱) بعض غلام تھے جو تورات و انجیل سے واقف تھے، پہلے وہ عیسائی یا یہودی تھے، پھر مسلمان ہو گئے ان کی زبان بھی غیر فصیح تھی۔ مشرکین مکہ کہتے تھے کہ فلاں غلام محمد کو قرآن سکھاتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ یہ جس آدمی یا آدمیوں کا نام لیتے ہیں وہ تو عربی زبان بھی فصاحت کے ساتھ نہیں بول سکتے، جب کہ قرآن تو ایسی صاف عربی زبان میں ہے جو فصاحت و بلاغت اور اعجاز بیان میں بے نظیر ہے اور چیخ کے باوجود اس کی مثل ایک سورت بھی بنا کر پیش نہیں کی جاسکتی، دنیا بھر کے فصحا و بلخاس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ عرب اس شخص کو عجمی (گوٹکا) کہتے تھے جو فصیح و بلیغ زبان بولنے سے قاصر ہوتا تھا اور غیر عربی کو بھی عجمی کہا جاتا ہے کہ عجمی زبانیں بھی فصاحت و بلاغت میں عربی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

(۳) اور ہمارا پیغمبر تو ایمانداروں کا سردار اور ان کا قائد ہے، وہ کس طرح اللہ پر افترا باندھ سکتا ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے اس پر نازل نہ ہوئی ہو اور وہ یوں ہی کہہ دے کہ یہ کتاب مجھ پر اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ اس لیے جھوٹا ہمارا پیغمبر نہیں، یہ خود جھوٹے ہیں جو قرآن کے منزل من اللہ ہونے کے منکر ہیں۔

(۴) اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ جس شخص کو کفر پر مجبور کیا جائے اور وہ جان بچانے کے لیے قولاً یا فعلاً کفر کا ارتکاب کر لے، جب کہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو، تو وہ کافر نہیں ہو گا، نہ اس کی بیوی اس سے جدا ہوگی اور نہ اس پر دیگر احکام کفر لاگو ہوں گے قَالَ الْقُرْطُبِيُّ: (فتح القدیر)

(۵) یہ ارتداد کی سزا ہے کہ وہ غضب الہی اور عذاب عظیم کے مستحق ہوں گے اور اس کی دنیوی سزا قتل ہے جیسا کہ

یہ اس لیے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت سے زیادہ محبوب رکھا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راہ راست نہیں دکھاتا۔^(۱) (۱۰۷)

یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اور جن کے کانوں پر اور جن کی آنکھوں پر اللہ نے مهر لگا دی ہے اور یہی لوگ غافل ہیں۔^(۲) (۱۰۸)

کچھ شک نہیں کہ یہی لوگ آخرت میں سخت نقصان اٹھانے والے ہیں۔ (۱۰۹)

جن لوگوں نے فتنوں میں ڈالے جانے کے بعد ہجرت کی پھر جہاد کیا اور صبر کا ثبوت دیا بیشک تیرا پروردگار ان باتوں کے بعد انہیں بخشنے والا اور مہربانیاں کرنے والا ہے۔^(۳) (۱۱۰)

جس دن ہر شخص اپنی ذات کے لیے لڑتا جھگڑتا آئے^(۴) اور

ذٰلِكَ يَأْتِيهِمْ اسْتَحْيُوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلٰى الْآخِرَةِ ۗ
وَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ ۝۱۰۷

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمِعُوْهُمْ وَاَبْصَرَهُمْ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝۱۰۸

لَا حِبْرَةَ اَنْتُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمْ الْخٰسِرُوْنَ ۝۱۰۹

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا قُتِلُوْا
ثُمَّ جَهِدُوْا وَاَصْبَرُوْا اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا
لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۱۰

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا وَتُوَفَّى

حدیث میں ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ، آیت ۲۱۷ اور آیت ۲۵۶ کا حاشیہ)

(۱) یہ ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے (مرد ہو جانے) کی علت ہے کہ انہیں ایک تو دنیا محبوب ہے۔ دوسرے اللہ کے ہاں یہ ہدایت کے قابل ہی نہیں ہیں۔

(۲) پس یہ وعظ و نصیحت کی باتیں سنتے ہیں نہ انہیں سمجھتے ہیں اور نہ وہ نشانیاں ہی دیکھتے ہیں جو انہیں حق کی طرف لے جانے والی ہیں۔ بلکہ یہ ایسی غفلت میں مبتلا ہیں جس نے ہدایت کے راستے ان کے لیے مسدود کر دیے ہیں۔

(۳) یہ مکے کے ان مسلمانوں کا تذکرہ ہے جو کمزور تھے اور قبول اسلام کی وجہ سے کفار کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے رہے۔

بالآخر انہیں ہجرت کا حکم دیا گیا تو اپنے خویش و اقارب، وطن مالوف اور مال و جائیداد سب کچھ چھوڑ کر حبشہ یا مدینہ چلے گئے، پھر جب کفار کے ساتھ معرکہ آرائی کا مرحلہ آیا تو مردانہ وار لڑے اور جہاد میں بھرپور حصہ لیا اور پھر اس کی راہ کی شدتوں اور الم نایوں کو صبر کے ساتھ برداشت کیا۔ ان تمام باتوں کے بعد یقیناً تیرا رب ان کے لیے غفور و رحیم ہے یعنی رب کی مغفرت و رحمت کے حصول کے لیے ایمان اور اعمال صالحہ کی ضرورت ہے، جیسا کہ مذکورہ مہاجرین نے ایمان و عمل کا عمدہ نمونہ پیش کیا تو رب کی رحمت و مغفرت سے وہ شاد کام ہوئے۔ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ.

(۴) یعنی کوئی اور کسی کی حمایت میں آگے نہیں آئے گا نہ باپ، نہ بھائی، نہ بیٹا، نہ بیوی نہ کوئی اور۔ بلکہ ایک دوسرے سے بھاگیں گے۔ بھائی بھائی سے، بیٹے، ماں باپ سے، خاوند، بیوی سے بھاگے گا۔ ہر شخص کو صرف اپنی فکر ہوگی جو اسے

كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهِيَ لَا تَظُنُّوْنَ ۝۱۱

وَصَرََبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرِيَةً كَانَتْ اِمْنَةً لِّمُهَلْبِيَّةٍ
يَاۤ اِيۤنِهَارِزْقَهَا رَعْدًا مِّنْ جِبِّ مَكَّانٍ فَكَلَمَتْ بِاَنۡعَمَ
اللّٰهُ فَاَذۡاَقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوۤبِۤءِ وَالْخَوۡفِ بِمَا كَانُوۤا
يَصۡنَعُوۡنَ ۝۱۲

وَلَقَدْ جَاۤءَهُمۡ رُسُوۡلٌ مِّنۡهُمۡ فَاذۡبُوۡا فَاخۡذَهُمُ
العَذَابُ وَهَمَّ ظٰلِمُوۡنَ ۝۱۳

ہر شخص کو اس کے کیے ہوئے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا
اور لوگوں پر (مطلقاً) ظلم نہ کیا جائے گا۔ (۱۱)

اللہ تعالیٰ اس بستی کی مثال بیان فرماتا ہے جو پورے امن
و اطمینان سے تھی اس کی روزی اس کے پاس با فراغت
ہر جگہ سے چلی آرہی تھی۔ پھر اس نے اللہ تعالیٰ کی
نعتوں کا کفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے بھوک اور ڈر کا مزہ
چکھایا جو بدلہ تھا ان کے کرتوتوں کا۔ (۱۲)

ان کے پاس انہی میں سے رسول پہنچا پھر بھی انہوں نے
اسے جھٹلایا پس انہیں عذاب نے آدھوچا (۱۳) اور وہ تھے
ہی ظالم۔ (۱۳)

دوسرے سے بے پرواہ کر دے گی ﴿لِجِبِّ امْرِئٍ مِّنۡهُمۡ يَوْمَئِذٍ شَدِيدٍ يُفۡسِدُ بِهٖ﴾ (عبس: ۳۷) ”ان میں سے ہر ایک کو اس
دن ایک ایسا مشغلہ ہو گا جو اسے مشغول رکھنے کے لیے کافی ہو گا۔“

(۱) یعنی نیکی کے ثواب میں کمی کر دی جائے اور برائی کے بدلے میں زیادتی کر دی جائے۔ ایسا نہیں ہو گا۔ کسی پر ادنیٰ سا
ظلم بھی نہیں ہو گا۔ برائی کا اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنا کسی برائی کا ہو گا۔ البتہ نیکی کی جزا اللہ تعالیٰ خوب بڑھا چڑھا کر دے گا اور
یہ اس کے فضل و کرم کا مظاہرہ ہو گا جو قیامت والے دن اہل ایمان کے لیے ہو گا۔ جَعَلْنَا اللّٰهُ مِنْهُم

(۲) اکثر مفسرین نے اس قریہ (بستی) سے مراد مکہ لیا ہے۔ یعنی اس میں مکہ اور اہل مکہ کا حال بیان کیا گیا ہے اور یہ اس
وقت ہوا جب اللہ کے رسول نے ان کے لیے بددعا فرمائی۔ «اللّٰهُمَّ اشۡدُدْ وَطَأۡتَكَ عَلٰی مُصَرٍّ، وَاجۡعَلۡهَا عَلَیۡہِم
سِنِیۡنَۃً کَسِیۡنَۃً یُّوسُفَ» (بخاری۔ نمبر۔ ۳۸۲۱۔ مسلم۔ نمبر۔ ۲۱۵۶) ”اے اللہ (مصر (قیلیے) پر اپنی سخت گرفت فرما اور
ان پر اس طرح قحط سالی مسلط کر دے، جس طرح حضرت یوسف کے زمانے میں مصر میں ہوئی۔“ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے
کے امن کو خوف سے اور خوش حالی کو بھوک سے بدل دیا۔ حتیٰ کہ ان کا یہ حال ہو گیا کہ ہڈیاں اور درختوں کے پتے کھا
کر انہیں گزارہ کرنا پڑا۔ اور بعض مفسرین کے نزدیک یہ غیر معین بستی ہے اور تمثیل کے طور پر یہ بات بیان کی گئی ہے۔
کہ کفرانِ نعمت کرنے والے لوگوں کا یہ حال ہو گا، وہ جہاں بھی ہوں اور جب بھی ہوں۔ اس کے اس عموم سے جمہور
مفسرین کو بھی انکار نہیں ہے، گو نزول کا سبب ان کے نزدیک خاص ہے۔ الْعِزَّةُ بِعُمُوۡمِ اللَّفۡظِ لَا بِخُصُوۡصِ
السَّبَبِ.

(۳) اس عذاب سے مراد وہی عذابِ خوف و بھوک ہے جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں ہے، یا اس سے مراد کافروں
کا وہ قتل ہے جو جنگِ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا۔

جو کچھ حلال اور پاکیزہ روزی اللہ نے تمہیں دے رکھی ہے اسے کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔^(۱) (۱۱۳)

تم پر صرف مردار اور خون اور سورا کا گوشت اور جس چیز پر اللہ کے سوا دوسرے کا نام پکارا جائے حرام ہیں،^(۲) پھر

فَكُلُوا مِمَّا ذَرَعَ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا ۖ وَأَشْكُرُوا
بِعَمَلِكُمُ الْيَوْمَ ۗ إِنَّكُمْ لَرَّاٰهُ تَعْبُدُونَ ﴿۱۱۳﴾

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ
وَمَا أُهْلِلَ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ۚ فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ

(۱) اس کا مطلب یہ ہوا کہ حلال و طیب چیزوں سے تجاوز کر کے حرام اور خبیث چیزوں کا استعمال اور اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کرنا، یہ اللہ کی نعمتوں کی ناشکری ہے۔

(۲) یہ آیت اس سے قبل تین مرتبہ پہلے بھی گزر چکی ہے۔ سورۃ البقرہ ۱۷۳-۱۷۴، المائدہ ۳، الانعام ۱۴۵ میں۔ یہ چوتھا مقام ہے جہاں اللہ نے اسے پھر بیان فرمایا ہے۔ اس میں لفظ 'إِنَّمَا' حصر کے لیے ہے۔ لیکن یہ حصر حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے یعنی مخاطبین کے عقیدے اور خیال کو سامنے رکھتے ہوئے حصر لایا گیا ہے۔ ورنہ دوسرے جانور اور درندے وغیرہ بھی حرام ہیں، البتہ ان آیات سے یہ واضح ہے کہ ان میں جن چار محرمات کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ ان سے مسلمانوں کو نہایت تاکید کے ساتھ بچانا چاہتا ہے۔ اس کی ضروری تشریح گزشتہ مقالات پر کی جا چکی ہے، تاہم اس میں ﴿وَمَا أُهْلِلَ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ﴾ (جس چیز پر اللہ کے سوا دوسرے کا نام پکارا جائے) جو چوتھی قسم ہے۔ اس کے مفہوم میں تاویلات رکھیں اور توجیہات بعیدہ سے کام لے کر شرک کے لیے چور دروازہ تلاش کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کی مزید وضاحت پیش خدمت ہے۔

جو جانور غیر اللہ کے لیے نامزد کر دیا جائے، اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ غیر اللہ کے تقرب اور اس کی خوشنودی کے لیے اسے ذبح کیا جائے اور ذبح کرتے وقت نام بھی اسی بت یا بزرگ کا لیا جائے، بزعم خویش جس کو راضی کرنا مقصود ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مقصود تو غیر اللہ کا تقرب ہی ہو لیکن ذبح اللہ کے نام پر ہی کیا جائے جس طرح کہ قبر پرستوں میں یہ سلسلہ عام ہے۔ وہ جانوروں کو بزرگوں کے لیے نامزد تو کرتے ہیں۔ مثلاً یہ بکرا فلاں پیر کا ہے، یہ گائے فلاں پیر کی ہے، یہ جانور گیارہویں کے لیے یعنی شیخ عبدالقادر جیلانی کے لیے ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور ان کو وہ پستو اللہ پڑھ کر ہی ذبح کرتے ہیں۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ پہلی صورت تو یقیناً حرام ہے لیکن یہ دوسری صورت حرام نہیں، بلکہ جائز ہے کیوں کہ یہ غیر اللہ کے نام پر ذبح نہیں کیا گیا ہے اور یوں شرک کا راستہ کھول دیا گیا ہے۔ حالاں کہ فقہانے اس دوسری صورت کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ یہ بھی ﴿وَمَا أُهْلِلَ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ﴾ میں داخل ہے۔ چنانچہ حاشیہ بیضاوی میں ہے ”ہر وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے، حرام ہے، اگرچہ ذبح کے وقت اس پر اللہ ہی کا نام لیا جائے۔ اس لیے کہ علما کا اتفاق ہے کہ کوئی مسلمان اگر غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی غرض سے جانور ذبح کرے گا تو وہ مرد ہو جائے گا اور اس کا زیچہ مرد کا زیچہ ہو گا“ اور فقہ حنفی کی مشہور کتاب درمختار میں ہے ”کسی حاکم اور کسی طرح کسی بڑے کی آمد پر (حسن خلق یا شرعی ضیافت کی نیت سے نہیں بلکہ اس کی رضامندی اور اس کی تعظیم کے طور پر) جانور ذبح کیا

فَإِنَّ اللَّهَ عَمُوسٌ دَجِيْبٌ ﴿۱۱۵﴾

اگر کوئی شخص بے بس کر دیا جائے نہ وہ خواہشمند ہو اور نہ حد سے گزرنے والا ہو تو یقیناً اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (۱۱۵)

کسی چیز کو اپنی زبان سے جھوٹ موٹ نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھ لو،^(۱) سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ پر بہتان بازی کرنے والے کامیابی سے محروم ہی رہتے ہیں۔ (۱۱۶)

انہیں بہت معمولی فائدہ ملتا ہے اور ان کے لیے ہی دردناک عذاب ہے۔ (۱۱۷)

وَلَا تَعْمَلُوا لِيَا مَنَّا صَعْتَ أَلَيْسَ لَكُمُ الْكَذِبُ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ لَتَعْمُرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يَفْلِحُونَ ﴿۱۱۶﴾

مَتَاعٌ قَلِيلٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۱۷﴾

جائے تو وہ حرام ہو گا، اس لیے کہ ﴿أَهْلٌ لِّغَيْرِ اللَّهِ﴾ میں داخل ہے اگرچہ اس پر اللہ ہی کا نام لیا گیا ہو اور علامہ شامی نے اس کی تائید کی ہے "کتاب الذبائح طبع قدیم ۱۲۷۷ھ ص ۲۷۷-۲۷۸ فتاویٰ شامی ج ۵ ص ۲۰۳ مطبع مینیا، مصر) البتہ بعض فقہاء اس دوسری صورت کو ﴿وَمَا أَوْلَىٰ لِّغَيْرِ اللَّهِ﴾ کا مدلول اور اس میں داخل نہیں سمجھتے اور اشتراک علت (تقرب لغیر اللہ) کی وجہ سے اسے حرام سمجھتے ہیں۔ گویا حرمت میں کوئی اختلاف نہیں۔ صرف استدلال و احتجاج کے طریقے میں اختلاف ہے۔ علاوہ ازیں یہ دوسری صورت ﴿وَمَا ذُو عَلَى الثُّبَيْ﴾ (جو بتوں کے پاس یا تھانوں پر ذبح کیے جائیں) میں بھی داخل ہے، جسے سورۃ المائدہ میں محرمات میں ذکر کیا گیا ہے اور احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آستانوں، درباروں اور تھانوں پر ذبح کیے گئے جانور حرام ہیں، اس لیے کہ وہاں ذبح کرنے کا یا وہاں لے جا کر تقسیم کرنے کا مقصد تَقَرُّبٌ لِّغَيْرِ اللَّهِ (اللہ کے سوا دوسروں کی رضا اور تقرب حاصل کرنا) ہی ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔ "ایک شخص نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں نے نذر مانی ہے کہ میں بوانہ جگہ میں اونٹ ذبح کروں گا۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا وہاں زمانہ جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی بت تھا جس کی پرستش کی جاتی تھی؟ لوگوں نے بتلایا نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ وہاں ان کی عیدوں میں سے کوئی عید تو نہیں منائی جاتی تھی؟ لوگوں نے اس کی بھی نفی کی، تو آپ ﷺ نے سائل کو نذر پوری کرنے کا حکم دیا۔" (ابوداؤد، کتاب الايمان والنذور، باب ما یؤمر به من وهاء النذر) اس سے معلوم ہوا کہ بتوں کے ہٹائے جانے کے بعد بھی غیر آباد آستانوں پر جا کر جانور ذبح کرنا جائز نہیں ہے چہ جائیکہ ان آستانوں اور درباروں پر جا کر ذبح کیے جائیں جو پرستش اور نذرونیاز کے لیے مرجع عوام ہیں۔ اَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ .

(۱) یہ اشارہ ہے ان جانوروں کی طرف جو وہ بتوں کے نام وقف کر کے ان کو اپنے لیے حرام کر لیتے تھے، جیسے بحیرہ، سائبہ، وسیلہ اور حام وغیرہ۔ (دیکھئے المائدہ ۱۱۰۳ اور الانعام ۱۳۹-۱۴۱ کے حواشی۔)

اور یہودیوں پر جو کچھ ہم نے حرام کیا تھا اسے ہم پہلے ہی سے آپ کو سنا چکے ہیں،^(۱) ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ (۱۱۸)

جو کوئی جماعت سے برے عمل کر لے پھر توبہ کر لے اور اصلاح بھی کر لے تو پھر آپ کا رب بلاشک و شبہ بڑی بخشش کرنے والا اور نہایت ہی مہربان ہے۔ (۱۱۹)

بیشک ابراہیم پیشوا^(۲) اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور ایک طرفہ مخلص تھے۔ وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔ (۱۲۰)

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، اللہ نے انہیں اپنا برگزیدہ کر لیا تھا اور انہیں راہ راست بجا دی تھی۔ (۱۲۱)

ہم نے اسے دنیا میں بھی بہتری دی تھی اور بیشک وہ آخرت میں بھی نیکو کاروں میں ہیں۔ (۱۲۲)

پھر ہم نے آپ کی جانب وحی بھیجی کہ آپ ملت ابراہیم حنیف کی پیروی کریں،^(۳) جو مشرکوں میں سے نہ تھے۔ (۱۲۳)

ہفتے کے دن کی عظمت تو صرف ان لوگوں کے ذمے

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَمًا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۱۱۸﴾

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا الشُّرُوكَ جَهَنَّمَ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَسْلَمُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَعَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۱۹﴾

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَاكْرَمًا مِنْ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۲۰﴾

شَاكِرًا لِلْإِعْتِمَادِ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۱۲۱﴾

وَأَنْتَ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَأَنْتَ فِي الْآخِرَةِ لَبُورٌ الصَّالِحِينَ ﴿۱۲۲﴾

ثُمَّ آوَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ إِنَّ اتَّبَعُوا مِلَّةَ آبَائِهِمْ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۲۳﴾

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا عَلَيْهِ وَإِنَّ رَبَّكَ

(۱) دیکھئے سورۃ الانعام، ۱۳۶ کا حاشیہ، نیز سورۃ نساء، ۱۲۰ میں بھی اس کا ذکر ہے۔

(۲) اُمَّة کے معنی پیشوا اور قائد کے بھی ہیں، جیسا کہ ترجمے سے واضح ہے اور امت بمعنی امت بھی ہے، اس اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وجود ایک امت کے برابر تھا۔ (امت کے معانی کے لیے سورۃ ہود، ۸ کا حاشیہ دیکھئے)

(۳) مِلَّة کے معنی ہیں، ایسا دین جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی نبی کے ذریعے لوگوں کے لیے مشروع اور ضروری قرار دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس بات کے کہ آپ تمام انبیاء سمیت اولاد آدم کے سردار ہیں، آپ کو ملت ابراہیمی کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے، جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امتیازی اور خصوصی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ ویسے اصول میں تمام انبیاء کی شریعت اور ملت ایک ہی رہی ہے جس میں رسالت کے ساتھ توحید و معاد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

ہی ضروری کی گئی تھی جنہوں نے اس میں اختلاف کیا تھا،^(۱) بات یہ ہے کہ آپ کا پروردگار خود ہی ان میں ان کے اختلاف کا فیصلہ قیامت کے دن کرے گا۔ (۱۲۳)

اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلائیے اور ان سے بہترین طریقے سے گفتگو کیجئے،^(۲) یقیناً آپ کا رب اپنی راہ سے بہکنے والوں کو بھی بخوبی جانتا ہے اور وہ راہ یافتہ لوگوں سے بھی پورا واقف ہے۔^(۳) (۱۲۵)

اور اگر بدلہ لو بھی تو بالکل اتنا ہی جتنا صدمہ تمہیں پہنچایا گیا ہو اور اگر صبر کرو تو توبے شک صابروں کے لیے یہی

لِيَجْزِيَٰ بِهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۲۳﴾

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ
وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ
بِمَنْ صَلَّى عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۱۲۵﴾

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوِبْتُمْ بِهِ وَإِنْ
صَبَرْتُمْ لَهِيَ خَيْرٌ لِلضَّالِّينَ ﴿۱۲۵﴾

(۱) اس اختلاف کی نوعیت کیا ہے؟ اس کی تفصیل میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لیے جمعہ کا دن مقرر فرمایا تھا، لیکن بنو اسرائیل نے ان سے اختلاف کیا اور ہفتے کا دن تعظیم و عبادت کے لیے پسند کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، موسیٰ! انہوں نے جو دن پسند کیا ہے، وہی دن ان کے لئے رہنے دو۔ بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا کہ تعظیم کے لیے ہفتے میں کوئی ایک دن متعین کر لو۔ جس کے تعین میں ان کے درمیان اختلاف ہوا۔ پس یہود نے اپنے اجتماع کی بنیاد پر ہفتے کا دن اور نصاریٰ نے اتوار کا دن مقرر کر لیا۔ اور جمعہ کے دن کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے مخصوص کر دیا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ نصاریٰ نے اتوار کا دن یہودیوں کی مخالفت کے جذبے سے اپنے لیے مقرر کیا تھا، اسی طرح عبادت کے لیے انہوں نے اپنے کو یہودیوں سے الگ رکھنے کے لیے حجرہ بیت المقدس کی شرقی جانب کو بطور قبلہ اختیار کیا۔ جمعہ کا دن اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے مقرر کیے جانے کا ذکر حدیث میں موجود ہے (ملاحظہ ہو۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعة، باب ہدایۃ هذه الأمة لیوم الجمعة۔ و مسلم کتاب و باب مذکور)

(۲) اس میں تبلیغ و دعوت کے اصول بیان کیے گئے ہیں جو حکمت، موعظہ حسنہ اور رفق و ملامت پر مبنی ہیں۔ جدال بالاحسن، درشتی اور تلخی سے بچتے ہوئے نرم و شفقانہ لب و لہجہ اختیار کرنا ہے۔

(۳) یعنی آپ کا کام مذکورہ اصولوں کے مطابق وعظ و تبلیغ ہے، ہدایت کے راستے پر چلا دینا، یہ صرف اللہ کے اختیار میں ہے، اور وہ جانتا ہے کہ ہدایت قبول کرنے والا کون ہے اور کون نہیں؟

ہمتر ہے۔^(۱) (۱۳۶)

آپ صبر کریں بغیر توفیق الہی کے آپ صبر کر ہی نہیں سکتے اور ان کے حال پر رنجیدہ نہ ہوں اور جو کمزور فریب یہ کرتے رہتے ہیں ان سے تنگ دل نہ ہوں۔^(۲) (۱۳۷)

یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ پر ہیز گاروں اور نیک کاروں کے ساتھ ہے۔ (۱۳۸)

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ
فِي ضَلِيلٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ﴿۱۳۶﴾

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ ﴿۱۳۷﴾

(۱) اس میں اگرچہ بدلہ لینے کی اجازت ہے بشرطیکہ تجاوز نہ ہو، ورنہ یہ خود ظالم ہو جائے گا، تاہم معاف کر دینے اور صبر اختیار کرنے کو زیادہ ہمتر قرار دیا گیا ہے۔

(۲) اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے کمزوروں کے مقابلے میں اہل ایمان و تقویٰ اور محسنین کے ساتھ ہے اور جس کے ساتھ اللہ ہو، اسے اہل دنیا کی سازشیں نقصان نہیں پہنچا سکتیں، جیسا کہ مابعد کی آیت میں ہے۔



سورہ بنی اسرائیل کی ہے اور اس کی ایک سو گیارہ آیتیں
اور بارہ رکوع ہیں۔

بڑے مہربان اور سب سے زیادہ رحم کرنے والے اللہ
کے نام سے شروع کر رہا ہوں۔

پاک ہے ^(۱) وہ اللہ تعالیٰ جو اپنے بندے ^(۲) کو رات ہی
رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ ^(۳) تک لے گیا جس
کے آس پاس ہم نے برکت دے ^(۴) رکھی ہے، اس لیے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بُرِّیْنَا حَوْلَہٗ لِلّٰہِ فِیْ
ہٰذِہٖ لَآئِلَآءٌ مِّنْ عِتَابِکَ یَا کَرِیْمُ

☆ یہ سورت کی ہے۔ اسے سورۃ الاسراء بھی کہتے ہیں، اس لیے کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسراء (رات کو
مسجد اقصیٰ لے جانے) کا ذکر ہے۔ صحیح بخاری میں ہے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مرفوعاً فرماتے ہیں کہ سورۃ کنف
مریم اور بنی اسرائیل یہ عتاق اول میں سے ہیں اور میرے تلامذ میں سے ہیں " (تفسیر مسودۃ بنی اسرائیل، عتاق
عتیق، (قدیم) کی جمع ہے اور تِلَادٌ تَالِدٌ کی جمع ہے۔ تالد بھی قدیم مال کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سورتیں ان قدیم
سورتوں میں سے ہیں جو کہ میں اول اول نازل ہوئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات کو بنی اسرائیل اور سورۃ
زمر کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ (مسند احمد، جلد ۶، ص ۶۸، ۱۲۲، ترمذی، نمبر ۲۹۲، ۳۲۰۵۔ و صحیحہ الالبانی فی
الصحیحۃ نمبر ۶۳، جلد ۴)

(۱) سُبْحَانَ ، سَبَّحَ یَسْبُحُ کا مصدر ہے۔ معنی ہیں اَنْزَلَهُ اللّٰهُ تَنْزِیْہًا یعنی میں اللہ کی ہر نقص سے تنزیہ اور براءت
کرتا ہوں۔ عام طور پر اس کا استعمال ایسے موقعوں پر ہوتا ہے جب کسی عظیم الشان واقعے کا ذکر ہو۔ مطلب یہ ہوتا ہے
کہ لوگوں کے نزدیک ظاہری اسباب کے اعتبار سے یہ واقعہ کتنا بھی محال ہو، اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں، اس لیے کہ
وہ اسباب کا پابند نہیں۔ وہ تو لفظ کُنْ سے پلک جھپکتے میں جو چاہے کر سکتا ہے۔ اسباب تو انسانوں کے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
ان پابندیوں اور کوتاہیوں سے پاک ہے۔

(۲) اسْرَآءٌ کے معنی ہوتے ہیں، رات کو لے جانا۔ آگے لَبَّأٌ اس لیے ذکر کیا گیا ہے تاکہ رات کی قلت واضح ہو جائے،
اسی لیے وہ نکرہ ہے۔ یعنی رات کے ایک حصے یا تھوڑے سے حصے میں۔ یعنی چالیس راتوں کا یہ دور دراز کا سفر پوری
رات میں بھی نہیں بلکہ رات کے ایک قلیل حصے میں طے ہوا۔

(۳) اَقْصٰی، دور کو کہتے ہیں بیت المقدس، جو القدس یا ایلیاء (قدیم نام) شہر میں ہے اور فلسطین میں واقع ہے، مکے سے
القدس تک مسافت ۴۰ دن کی ہے، اس اعتبار سے مسجد حرام کے مقابلے میں بیت المقدس کو مسجد اقصیٰ (دور کی مسجد) کہا گیا ہے۔

(۴) یہ علاقہ قدرتی نہروں اور پھلوں کی کثرت اور انبیاء کا مسکن و مدفن ہونے کے لحاظ سے ممتاز ہے، اس لیے اسے
بارکت قرار دیا گیا ہے۔

اَيَّتِنَا لَأَنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ①

وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ

أَلَّا تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِي دِكْرًا ②

ذُرِّيَّةً مِّنْ حَمَلِنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا لَّشَكُورًا ③

کہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں،^(۱)
یقیناً اللہ تعالیٰ ہی خوب سننے دیکھنے والا ہے۔ (۱)
ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے
ہدایت بنا دیا کہ تم میرے سوا کسی کو اپنا کارساز نہ بنانا۔ (۲)
اے ان لوگوں کی اولاد! جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ
سوار کر دیا تھا، وہ ہمارا بڑا ہی شکر گزار بندہ تھا۔ (۳)^(۲)

(۱) یہ اس سیر کا مقصد ہے تاکہ ہم اپنے اس بندے کو عجائبات اور آیات کبریٰ دکھائیں۔ جن میں سے ایک آیت اور معجزہ یہ سفر بھی ہے کہ اتنا لمبا سفر رات کے ایک قلیل حصے میں ہو گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معراج ہوئی یعنی آسمانوں پر لے جایا گیا، وہاں مختلف آسمانوں پر انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوئیں اور سدرۃ المنتہیٰ پر جو عرش سے نیچے ساتویں آسمان پر ہے، اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے نماز اور دیگر بعض چیزیں عطا کیں۔ جس کی تفصیلات صحیح احادیث میں بیان ہوئی ہیں اور صحابہ و تابعین سے لے کر آج تک امت کے اکثر علماء و فقہاء اس بات کے قائل چلے آ رہے ہیں کہ یہ معراج بِحَسْبِهِ الْعُنْصُرِيّٰ حالت بیداری میں ہوئی ہے۔ یہ خواب یا روحانی سیر اور مشاہدہ نہیں ہے، بلکہ عینی مشاہدہ ہے جو اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے اپنے پیغمبر کو کرایا ہے۔ اس معراج کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ اسراء کہلاتا ہے، جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے اور جو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر کا نام ہے، یہاں پہنچنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء کی امامت فرمائی۔ بیت المقدس سے پھر آپ کو آسمانوں پر لے جایا گیا، یہ اس سفر کا دوسرا حصہ ہے جسے معراج کہا جاتا ہے۔ اس کا کچھ تذکرہ سورہ نجم میں کیا گیا ہے اور باقی تفصیلات احادیث میں بیان کی گئی ہیں۔ عام طور پر اس پورے سفر کو ”معراج“ سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے۔ معراج، میڑھی کو کہتے ہیں یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ عُرْجِ بِيْ اِلَى السَّمَاءِ (مجھے آسمان پر لے جایا جا چڑھایا گیا) سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ اس سفر کا یہ دوسرا حصہ پہلے سے بھی زیادہ اہم اور عظیم الشان ہے، اس لیے معراج کا لفظ ہی زیادہ مشہور ہو گیا۔ اس کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ تاہم اس میں اتفاق ہے کہ یہ ہجرت سے قبل کا واقعہ ہے۔ بعض کہتے ہیں ایک سال قبل اور بعض کہتے ہیں کئی سال قبل یہ واقعہ پیش آیا۔ اسی طرح مینے اور اس کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ کوئی ربیع الاول کی ۱۷ یا ۲ کوئی رجب کی ۲ اور بعض کوئی اور مینہ اور اس کی تاریخ بتلاتے ہیں۔ (فتح القدیر)

(۲) طوفان نوح علیہ السلام کے بعد نسل انسانی نوح علیہ السلام کے ان بیٹوں کی نسل سے ہے جو کشتی نوح علیہ السلام میں سوار ہوئے تھے اور طوفان سے بچ گئے تھے۔ اس لیے بنو اسرائیل کو خطاب کر کے کہا گیا کہ تمہارا باپ، نوح علیہ السلام۔ اللہ کا بہت شکر گزار بندہ تھا۔ تم بھی اپنے باپ کی طرح شکر گزاری کا راستہ اختیار کرو اور ہم نے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا ہے، ان کا انکار کر کے کفرانِ نعمت مت کرو!

ہم نے بنو اسرائیل کے لیے ان کی کتاب میں صاف فیصلہ کر دیا تھا کہ تم زمین میں دو بار فساد برپا کرو گے اور تم بڑی زبردست زیادتیاں کرو گے۔ (۳)

ان دونوں وعدوں میں سے پہلے کے آتے ہی ہم نے تمہارے مقابلہ پر اپنے بندے بھیج دیئے جو بڑے ہی لڑاکے تھے۔ پس وہ تمہارے گھروں کے اندر تک پھیل گئے اور اللہ کا یہ وعدہ پورا ہونا ہی تھا۔ (۵)^(۱)

پھر ہم نے ان پر تمہارا غلبہ دے کر تمہارے دن پھیرے اور مال اور اولاد سے تمہاری مدد کی اور تمہیں بڑے جتھے والا بنا دیا۔ (۶)^(۲)

اگر تم نے اچھے کام کیے تو خود اپنے ہی فائدہ کے لیے، اور اگر تم نے برائیاں کیں تو بھی اپنے ہی لیے، پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا (تو ہم نے دوسرے بندوں کو بھیج دیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور پہلی دفعہ کی طرح پھر اسی مسجد میں گھس جائیں۔ اور جس جس چیز پر قابو پائیں تو پھوڑ کر جڑ سے اکھاڑ دیں۔ (۷)^(۳)

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ بَيْتِ لُقْمَانَ فِي الْكِتَابِ لِنُقْسِدَنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنٍ وَلَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۳﴾

فَإِذَا حَآءَ وَعَدَا أُولَئِمَّا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَنَا أُولَىٰ بَأْسٍ شَدِيدًا فَجَاءُوا خِلَالَ اللَّيْلِ وَكَانَ وَعْدًا مَفْعُولًا ﴿۵﴾

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ﴿۶﴾

لَإِن أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لَا نَفْسِيكُمْ وَإِن أَسَأْتُمْ فَلَهَا ﴿۷﴾
فَإِذَا حَآءَ وَعَدَا الْخِزْيَةَ لَيْسُوا أُولَئِمَّا فَجَاءُوا خِلُولًا
السَّجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أُولَىٰ مَرَّةً وَلِيُنذِرُوا مَا عَلَّمْنَا بُيُوتًا ﴿۵﴾

(۱) یہ اشارہ ہے اس زلت و تباہی کی طرف جو بابل کے فرماں روا بخت نصر کے ہاتھوں، حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً چھ سو سال قبل، یہودیوں پر یروشلیم میں نازل ہوئی۔ اس نے بے دریغ یہودیوں کو قتل کیا اور ایک بڑی تعداد کو غلام بنا لیا اور یہ اس وقت ہوا جب انہوں نے اللہ کے نبی حضرت شعیب علیہ السلام کو قتل یا حضرت ارمیا علیہ السلام کو قید کیا اور تورات کے احکام کی خلاف ورزی اور معاصی کا ارتکاب کر کے فساد فی الارض کے مجرم بنے۔ بعض کہتے ہیں کہ بخت نصر کے بجائے جالوت کو اللہ تعالیٰ نے بطور سزا ان پر مسلط کیا، جس نے ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے۔ حتیٰ کہ طاہرات کی قیادت میں حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کیا۔

(۲) یعنی بخت نصر یا جالوت کے قتل کے بعد ہم نے تمہیں پھر مال اور دولت، بیٹوں اور جاہ و حشمت سے نوازا، جب کہ یہ ساری چیزیں تم سے چھن چکی تھیں۔ اور تمہیں پھر زیادہ جتھے والا اور طاقت ور بنا دیا۔

(۳) یہ دوسری مرتبہ انہوں نے فساد برپا کیا کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو قتل کر دیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی قتل کرنے کے درپے رہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمان پر اٹھا کر ان سے بچالیا۔ اس کے نتیجے میں پھر رومی بادشاہ ٹیٹس کو اللہ نے ان پر

امید ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم کرے۔ ہاں اگر تم پھر بھی وہی کرنے لگے تو ہم بھی دوبارہ ایسا ہی کریں^(۱) گے اور ہم نے منکروں کا قید خانہ جہنم کو بنا رکھا ہے۔^(۲) (۸)

یقیناً یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو بہت ہی سیدھا ہے اور ایمان والوں کو جو نیک اعمال کرتے ہیں اس بات کی خوشخبری دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ (۹)

اور یہ کہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔^(۱۰)

اور انسان برائی کی دعائیں مانگنے لگتا ہے بالکل اس کی اپنی بھلائی کی دعا کی طرح، انسان ہے ہی بڑا جلد باز۔^(۱۱) (۱۱)

ہم نے رات اور دن کو اپنی قدرت کی نشانیاں بنائی ہیں، رات کی نشانی کو تو ہم نے بے نور کر دیا ہے اور دن کی نشانی کو روشن بنایا ہے تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کر

عَلَىٰ رَبِّكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ وَإِنْ عَذَبْتُمْ عَذَابًا وَسِعْنَا جَهَنَّمَ
لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا ﴿۱۰﴾

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّذِي هُوَ أَقْوَمُ وَيُنَبِّئُ الْمُؤْمِنِينَ
الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ﴿۱۱﴾

وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۱۰﴾

وَيَذُرُّ الْإِنْسَانَ بِالْقَفْرِ ذُمًّا ۖ وَالْخَيْرُ ذُو كَانَ الْإِنْسَانُ مَجْرُولًا ﴿۱۱﴾

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَاتٍ لِّمَنْ آمَنَ ۖ وَجَعَلْنَا آيَةَ
النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّمَنْ تَبِعْتُمْ أَفْضَلًا مِّنْ رَبِّكُمْ وَلَتَعْلَمُوا أَعْدَدَ السَّيِّئِينَ

مسلط کر دیا، اس نے یروشلم پر حملہ کر کے ان کے کشتے کے پتے لگا دیئے اور بہت سوں کو قیدی بنا لیا، ان کے اموال لوٹ لیے، مذہبی صحیفوں کو پاؤں تلے روند اور بیت المقدس اور جیکل سلیمانی کو تاراج کیا اور انہیں ہمیشہ کے لیے بیت المقدس سے جلا وطن کر دیا۔ اور یوں ان کی ذلت و رسوائی کا خوب خوب سامان کیا۔ یہ تباہی ۷۰ ع میں ان پر آئی۔

(۱) یہ انہیں تنبیہ کی کہ اگر تم نے اصلاح کرنی تو اللہ کی رحمت کے مستحق ہو گے۔ جس کا مطلب دنیا و آخرت کی سرخ روئی اور کامیابی ہے اور اگر دوبارہ اللہ کی نافرمانی کا راستہ اختیار کر کے تم نے فساد فی الارض کا ارتکاب کیا تو ہم پھر تمہیں اسی طرح ذلت و رسوائی سے دوچار کر دیں گے جیسے اس سے قبل دو مرتبہ ہم تمہارے ساتھ یہ معاملہ کر چکے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، یہ یہود اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے اور وہی کردار رسالت محمدی کے بارے میں دہرایا جو رسالت موسوی اور رسالت عیسوی میں ادا کر چکے تھے، جس کے نتیجے میں یہ یہودی تیسری مرتبہ مسلمانوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوئے اور بصد رسوائی انہیں مدینے اور خیبر سے نکلنا پڑا۔

(۲) یعنی اس دنیا کی رسوائی کے بعد آخرت میں جہنم کی سزا اور اس کا عذاب الگ ہے جو وہاں انہیں بھگھتنا ہو گا۔

(۳) انسان چونکہ جلد باز اور بے حوصلہ ہے، اس لیے جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو اپنی ہلاکت کے لیے اسی طرح بددعا کرتا ہے جس طرح بھلائی کے لیے اپنے رب سے دعائیں کرتا ہے۔ یہ تو رب کا فضل و کرم ہے کہ وہ اس کی بددعاؤں کو قبول نہیں کرتا۔ یہی مضمون سورہ یونس آیت ۱۱ میں گزر چکا ہے۔

وَالْحَسَابُ وَكُلُّ شَيْءٍ فَضْلُهُ تَقْصِيْلًا ﴿۱۲﴾

سکو اور اس لیے بھی کہ برسوں کا شمار اور حساب معلوم کر سکو^(۱) اور ہر چیز کو ہم نے خوب تفصیل سے بیان فرما دیا ہے۔^(۲) (۱۲)

ہم نے ہر انسان کی برائی بھلائی کو اس کے گلے لگا دیا ہے^(۳) اور بروز قیامت ہم اس کے سامنے اس کا نامہ اعمال نکالیں گے جسے وہ اپنے اوپر کھلا ہوا پالے گا۔ (۱۳)

لے! خود ہی اپنی کتاب آپ پڑھ لے۔ آج تو تو آپ ہی اپنا خود حساب لینے کو کافی ہے۔ (۱۴)

جو راہ راست حاصل کر لے وہ خود اپنے ہی بھلے کے لیے راہ یافتہ ہوتا ہے اور جو بھٹک جائے اس کا بوجھ اسی کے اوپر ہے، کوئی بوجھ والا کسی اور کا بوجھ اپنے اوپر نہ لادے گا^(۴) اور ہماری سنت نہیں کہ رسول بھیجنے سے پہلے ہی

وَكُلُّ إِنْسَانٍ أَلَمْنَهُ لَأَنَّهُ فِي عُرْوَةٍ وَنَجْوَاهُ يَوْمَهُ
الْعِيْمَةِ يَوْمَتْ بِأَنْفُسِهِمْ مَشْهُورًا ﴿۱۳﴾

إِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ﴿۱۴﴾

مِنَ الْهِنْدِيِّ وَالْإِنْدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ صَلَّى فَأَتَمَّ يَصِلُ عَلَيْهَا
وَلَا تَزِدُ وَازِدَةً وَذُنُودُهُمْ وَأَمَّا كَمَا مَعِدَّ بَيْنَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ

(۱) یعنی رات کو بے نور یعنی تاریک کر دیا تاکہ تم آرام کر سکو اور تمہاری دن بھر کی تھکاوٹ دور ہو جائے اور دن کو روشن بنایا تاکہ کسب معاش کے ذریعے سے تم رب کا فضل تلاش کرو۔ علاوہ ازیں رات اور دن کا ایک دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح ہفتوں، مہینوں اور برسوں کا شمار اور حساب تم کو سکو، اس حساب کے بھی بے شمار فوائد ہیں۔ اگر رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات نہ آتی بلکہ ہمیشہ رات ہی رات یا دن ہی دن رہتا تو تمہیں آرام و سکون کا یا کاروبار کرنے کا موقع نہ ملتا اور اسی طرح مہینوں اور سالوں کا حساب بھی ممکن نہ رہتا۔

(۲) یعنی انسان کے لیے دین اور دنیا کی ضروری باتیں سب کھول کر ہم نے بیان کر دی ہیں تاکہ ان سے انسان فائدہ اٹھائیں، اپنی دنیا بھی سنواریں اور آخرت کی بھی فکر اور اس کے لیے تیاری کریں۔

(۳) طَائِفَةٌ کا معنی پرنڈے کے ہیں اور عُنُقُ کے معنی گردن کے۔ امام ابن کثیر نے طائر سے مراد انسان کے عمل لیے ہیں۔ فِي عُنُقِهِ کا مطلب ہے، اس کے پیچھے یا برے عمل، جس پر اس کو اچھی یا بری جزا دی جائے گی، گلے کے ہار کی طرح اس کے ساتھ ہوں گے۔ یعنی اس کا ہر عمل لکھا جا رہا ہے، اللہ کے ہاں اس کا پورا ریکارڈ محفوظ ہو گا۔ قیامت والے دن اس کے مطابق اس کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اور امام شوکانی نے طائر سے مراد انسان کی قسمت لی ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے مطابق پہلے سے لکھ دی ہے، جسے سعادت مند اور اللہ کا مطیع ہونا تھا وہ اللہ کو معلوم تھا اور جسے نافرمان ہونا تھا، وہ بھی اس کے علم میں تھا، یہی قسمت (سعادت مندی یا بد بختی) ہر انسان کے ساتھ گلے کے ہار کی طرح چسپی ہوئی ہے۔ اسی کے مطابق اس کے عمل ہوں گے اور قیامت والے دن اسی کے مطابق فیصلے ہوں گے۔

(۴) البتہ جو ضال (گمراہ) مضل (گمراہ کرنے والے) بھی ہوں گے، انہیں اپنی گمراہی کے بوجھ کے ساتھ، ان کے گناہوں کا

رَسُولًا ⑤

وَأَذِّنْ لِّدُنَا أَنْ نُهَلَكَ قَرِيْبَةً أَمْرًا مَّتْرَفِيْهَا فَفَسَّقُوْا فِيْهَا
فَحَقَّقْ عَلَيْهَا الْعَوْلَ فَدَمَّرْنَا تَارَةً مِّثْرًا ⑥

عذاب کرنے لگیں۔^(۱) (۱۵)

اور جب ہم کسی بستی کی ہلاکت کا ارادہ کر لیتے ہیں تو وہاں کے خوشحال لوگوں کو (کچھ) حکم دیتے ہیں اور وہ اس بستی میں کھلی نافرمانی کرنے لگتے ہیں تو ان پر (عذاب کی) بات ثابت ہو جاتی ہے پھر ہم اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔^(۲) (۱۶)

بار بھی (بغیر ان کے گناہوں میں کمی کیے) اٹھانا پڑے گا جو ان کی کوششوں سے گمراہ ہوئے ہوں گے، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات اور احادیث سے واضح ہے۔ یہ دراصل ان کے اپنے ہی گناہوں کا بار ہو گا جو دوسروں کو گمراہ کر کے انہوں نے کمایا ہو گا۔

(۱) بعض مفسرین نے اس سے صرف دنیوی عذاب مراد لیا ہے۔ یعنی آخرت کے عذاب سے مستثنیٰ نہیں ہوں گے، لیکن قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں سے پوچھے گا کہ کیا تمہارے پاس میرے رسول نہیں آئے تھے؟ جس پر وہ اثبات میں جواب دیں گے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارسال رسل اور انزال کتب کے بغیر وہ کسی کو عذاب نہیں دے گا۔ تاہم اس کا فیصلہ کہ کس قوم یا کس فرد تک اس کا پیغام نہیں پہنچا، قیامت والے دن وہ خود ہی فرمائے گا، وہاں یقیناً کسی کے ساتھ ظلم نہیں ہو گا۔ اسی طرح ہر 'پاکل' فاتر العقل اور زمانہ فترت یعنی دو نبیوں کے درمیانی زمانے میں فوت ہونے والے لوگوں کا مسئلہ ہے، ان کی بابت بعض روایات میں آتا ہے کہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ ان کی طرف فرشتے بھیجے گا اور وہ انہیں کہیں گے کہ جہنم میں داخل ہو جاؤ، اگر وہ اللہ کے اس حکم کو مان کر جہنم میں داخل ہو جائیں گے تو جہنم ان کے لیے گل و گلزار بن جائے گی، بصورت دیگر انہیں گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا (مسند أحمد، ج ۳، ص ۲۳، وابن حبان، ج ۹، ص ۲۲۶۔ علامہ البانی نے صحیح الجامع الصغیر (نمبر ۸۸۱) میں اسے ذکر کیا ہے) چھوٹے بچوں کی بابت اختلاف ہے۔ مسلمانوں کے بچے تو جنت میں ہی جائیں گے، البتہ کفار و مشرکین کے بچوں میں اختلاف ہے، کوئی توقف کا، کوئی جنت میں جانے کا اور کوئی جہنم میں جانے کا قائل ہے، امام ابن کثیر نے کہا ہے کہ میدان محشر میں ان کا امتحان لیا جائے گا، جو اللہ کے حکم کی اطاعت اختیار کرے گا، وہ جنت میں اور جو نافرمانی کرے گا، جہنم میں جائے گا، امام ابن کثیر نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ اس سے متضاد روایات میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے (تفصیل کے لیے تفسیر ابن کثیر ملاحظہ کیجئے) مگر صحیح بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کے بچے بھی جنت میں جائیں گے۔ دیکھئے صحیح بخاری (۳ : ۱۲۲۵۱ : ۳۳۸) مع الفتح

(۲) اس میں وہ اصول بتلایا گیا ہے جس کی رو سے قوموں کی ہلاکت کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ان کا خوش حال طبقہ اللہ کے حکموں کی نافرمانی شروع کر دیتا ہے اور انہی کی تقلید پھر دوسرے لوگ کرتے ہیں، یوں اس قوم میں اللہ کی نافرمانی عام ہو جاتی ہے اور وہ مستحق عذاب قرار پا جاتی ہے۔

ہم نے نوح کے بعد بھی بہت سی قومیں ہلاک کیں^(۱) اور تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے کافی خردوار اور

خوب دیکھنے بھالنے والا ہے۔ (۱۷)

جس کا ارادہ صرف اس جلدی والی دنیا (فوری فائدہ) کا ہی ہو اسے ہم یہاں جس قدر جس کے لیے چاہیں سردست دیتے ہیں بالآخر اس کے لیے ہم جہنم مقرر کر دیتے ہیں جہاں وہ بُرے حالوں دھتکارا ہوا داخل ہوگا۔ (۱۸)^(۲)

اور جس کا ارادہ آخرت کا ہو اور جیسی کوشش اس کے لیے ہونی چاہیے، وہ کرتا بھی ہو اور وہ بالیمان بھی ہو، پس یہی لوگ ہیں جن کی کوشش کی اللہ کے ہاں پوری قدر دانی کی جائے گی۔ (۱۹)^(۳)

ہر ایک کو ہم بہم پہنچائے جاتے ہیں انہیں بھی اور انہیں بھی تیرے پروردگار کے انعامات میں سے۔ تیرے پروردگار کی بخشش رکی ہوئی نہیں ہے۔ (۲۰)^(۴)

دیکھ لے کہ ان میں ایک کو ایک پر ہم نے کس طرح فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت تو درجوں میں اور بھی بڑھ کر ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے۔ (۲۱)^(۵)

وَكَلَّمَ اهْلَكَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ بَعْدِ نُوحٍ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ
يَذُنُ نُوحًا عِبَادًا ۗ فَجَاءُ بِالصَّبْرِ ۝۱۷

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ ۗ جَعَلْنَا آلَهُ فِيهَا مَأْتِنًا لِمَنْ يُرِيدُ ۖ ثُمَّ جَعَلْنَا
لَهُ جَهَنَّمَ سَلَامًا مِمَّا دُمُوا مَمْدُوحُونَ ۝۱۸

وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ
سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ۝۱۹

كَلَّا ۚ يَذُنُكَ وَأُولَٰئِكَ مِنْ سَعَاءِ رِبِّكَ ۖ وَمَا كَانَ عَطَاؤُنَاكَ
مَحْطُورًا ۝۲۰

أَنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ وَلِالْآخِرَةِ الْكِبْرُ دَرَجَاتٌ
وَأُولَٰئِكَ تَفْضِيلًا ۝۲۱

(۱) وہ بھی اسی اصول ہلاکت کے تحت ہی ہلاک ہوئیں۔

(۲) یعنی دنیا کے ہر طالب کو دنیا نہیں ملتی، صرف اسی کو ملتی ہے جس کو ہم چاہیں، پھر اس کو بھی اتنی دنیا نہیں ملتی جتنی وہ چاہتا ہے بلکہ اتنی ہی ملتی ہے جتنی ہم اس کے لیے فیصلہ کریں۔ لیکن اس دنیا طلبی کا نتیجہ جہنم کا دائمی عذاب اور اس کی رسوائی ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے ہاں قدر دانی کے لیے تین چیزیں یہاں بیان کی گئی ہیں۔ ارادہ آخرت، یعنی اخلاص اور اللہ کی رضا جوئی ۲۔ ایسی کوشش جو اس کے لائق ہو۔ یعنی سنت کے مطابق ۳۔ ایمان۔ کیونکہ اس کے بغیر تو کوئی عمل بھی قابلِ التفات نہیں۔ یعنی قبولیت عمل کے لیے ایمان کے ساتھ اخلاص اور سنت نبوی کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

(۴) یعنی دنیا کا رزق اور اس کی آسائشیں ہم بلا تفریق مومن اور کافر، طالب دنیا اور طالب آخرت سب کو دیتے ہیں۔ اللہ کی نعمتیں کسی سے بھی روکی نہیں جاتیں۔

(۵) تاہم دنیا کی یہ چیزیں کسی کو کم، کسی کو زیادہ ملتی ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق یہ روزی تقسیم فرماتا

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا غَيْرَ مَعَهُ مَذْمُومًا مَعْدُودًا ﴿۲۱﴾

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا آيَاتُهُ وَيَالِ الَّذِينَ إِحْسَانًا إِنَّا لِلَّهِ غَيْرٌ
عِنْدَكَ الْكِبَرِ أَحَدُهُمْ أَوْ كَثَرُهُمْ لَا تَقْضِ لَهُمْ آيَاتٌ وَلَا تَنْتَهَرُ مِنْهَا
وَقُلْ لَهُمْ أَقْوَالٌ كَرِيمًا ﴿۲۲﴾

وَإِخْفِضْ أَلْجَانَتَا الذَّلِيلِ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ اجْعَلْهُمَا
كَامْرَأَتِي صَافِيًا ﴿۲۳﴾

اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ ٹھہرا کہ آخرش تو برے
حالوں بے کس ہو کر بیٹھ رہے گا۔ (۲۲)

اور تیرا پروردگار صاف صاف حکم دے چکا ہے کہ تم اس
کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ
احسان کرنا۔ اگر تیری موجودگی میں ان میں سے ایک یا یہ
دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے آگے اف تک نہ
کہنا، نہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرنا بلکہ ان کے ساتھ ادب و
احترام سے بات چیت کرنا۔ (۲۳) (۱)

اور عاجزی اور محبت کے ساتھ ان کے سامنے تواضع کا
بازو پست رکھے رکھنا (۲) اور دعا کرتے رہنا کہ اے میرے
پروردگار! ان پر ویسا ہی رحم کر جیسا انہوں نے میرے
بچپن میں میری پرورش کی ہے۔ (۲۳)

ہے۔ تاہم آخرت میں درجات کا یہ تقاضل زیادہ واضح اور نمایاں ہو گا اور وہ اس طرح کہ اہل ایمان جنت میں اور اہل کفر
جہنم میں جائیں گے۔

(۱) اس آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد دوسرے نمبر پر والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا
ہے، جس سے والدین کی اطاعت، ان کی خدمت اور ان کے ادب و احترام کی اہمیت واضح ہے۔ گویا ربوبیت الہی کے
تقاضوں کے ساتھ اطاعت والدین کے تقاضوں کی ادائیگی ضروری ہے۔ احادیث میں بھی اس کی اہمیت اور تاکید کو خوب
واضح کر دیا گیا ہے، پھر بڑھاپے میں بطور خاص ان کے سامنے ”ہوں“ تک کہنے اور ان کو ڈانٹنے ڈپٹنے سے منع کیا ہے،
کیونکہ بڑھاپے میں والدین تو کمزور، بے بس اور لاچار ہو جاتے ہیں، جب کہ اولاد جوان اور وسائل معاش پر قابض و
متصرف ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں جوانی کے دیوانی جذبات اور بڑھاپے کے سرد و گرم چشیدہ تجربات میں تصادم ہوتا ہے۔ ان
حالات میں والدین کے ادب و احترام کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا بہت ہی مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ تاہم اللہ کے ہاں سرخ رو
وہی ہو گا جو ان تقاضوں کو ملحوظ رکھے گا۔

(۲) پرندہ جب اپنے بچوں کو اپنے سایہ شفقت میں لیتا ہے تو ان کے لیے اپنے بازو پست کر دیتا ہے، یعنی تو بھی والدین
کے ساتھ اسی طرح اچھا اور پر شفقت معاملہ کرنا اور ان کی اسی طرح کفالت کر جس طرح انہوں نے بچپن میں تیری کی۔ یا
یہ معنی ہیں کہ جب پرندہ اڑنے اور بلند ہونے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے بازو پھیلا لیتا اور جب نیچے اترتا ہے تو بازوؤں کو
پست کر لیتا ہے۔ اس اعتبار سے بازوؤں کے پست کرنے کے معنی، والدین کے سامنے تواضع اور عاجزی کا اظہار کرنے
کے ہوں گے۔

جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے تمہارا رب بخوبی جانتا ہے اگر تم نیک ہو تو وہ تو رجوع کرنے والوں کو بخشنے والا ہے۔ (۲۵)

اور رشتے داروں کا اور مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرتے رہو^(۱) اور اسراف اور بیجا خرچ سے بچو۔ (۲۶)

بیجا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔ اور شیطان اپنے پروردگار کا برا ہی ناشکرا ہے۔^(۲) (۲۷)

اور اگر تجھے ان سے منہ پھیر لینا پڑے اپنے رب کی اس رحمت کی جستجو میں، جس کی تو امید رکھتا ہے تو بھی تجھے چلپیے کہ عمدگی اور نرمی سے انہیں سمجھا دے^(۳) (۲۸)

رَبِّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي قُلُوبِكُمْ إِن تَكُونُوا صٰلِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلذَّٰكِرِينَ عَفْوَراً ﴿۲۵﴾

وَإِذِ الْقُرْبٰنِ حَقَّهُ وَالْيٰسِيْنَ وَابْنَ الْمَسِيْنِ
وَلَا تَبْذُرُوْا رِيْبَكُمْ يٰۤاٰمِرًا ﴿۲۶﴾

اِنَّ الْمُبْتَدِيْنَ كَانُوْا اٰخْوَانَ الشَّيْطٰنِ وَاَنَّ الشَّيْطٰنَ لِرَبِّهٖ لَفُوْرًا ﴿۲۷﴾

وَاِنَّكُمْ مِّنْ عِنْدِ رَبِّكُمْ لَرٰجِعُوْنَ
فَعَلَّ لَهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾

(۱) قرآن کریم کے ان الفاظ سے معلوم ہوا کہ غریب رشتے داروں، مسکین اور ضرورت مند مسافروں کی امداد کر کے، ان پر احسان نہیں جتلانا چاہیے، کیونکہ یہ ان پر احسان نہیں ہے، بلکہ مال کا وہ حق ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اصحاب مال کے مالوں میں مذکورہ ضرورت مندوں کا رکھا ہے، اگر صاحب مال یہ حق ادا نہیں کرے گا تو عند اللہ مجرم ہو گا۔ گویا یہ حق کی ادائیگی ہے، نہ کہ کسی پر احسان۔ علاوہ ازیں رشتے داروں کے پہلے ذکر سے ان کی اولیت اور اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔ رشتے داروں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو، صلہ رحمی کہا جاتا ہے، جس کی اسلام میں بڑی تاکید ہے۔

(۲) تَبْذِيْرُکُمْ کی اصل بذر (بذ) ہے، جس طرح زمین میں بیج ڈالتے ہوئے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ صحیح جگہ پر پڑ رہا ہے یا اس سے ادھر ادھر۔ بلکہ کسان بیج ڈالے جلا جاتا ہے۔ تَبْذِيْرٌ (فضول خرچی) بھی یہی ہے کہ انسان اپنا مال بیج کی طرح اڑاتا پھرے اور خرچ کرنے میں حد شرعی سے تجاوز کرے اور بعض کہتے ہیں کہ تبذیر کے معنی ناجائز امور میں خرچ کرنا ہیں چاہے تھوڑا ہی ہو۔ ہمارے خیال میں دونوں ہی صورتیں تبذیر میں آجاتی ہیں۔ اور یہ اتنا برا عمل ہے کہ اس کے مرتکب کو شیطان سے مماثلت نامہ ہے اور شیطان کی مماثلت سے بچنا، چاہے وہ کسی ایک ہی خصلت میں ہو، انسان کے لیے واجب ہے۔ پھر شیطان کو كَفُوْرٌ (بست ناشکرا) کہہ کر مزید بچنے کی تاکید کر دی ہے کہ اگر تم شیطان کی مماثلت اختیار کرو گے تو تم بھی اس کی طرح كَفُوْرٌ قرار دے دیئے جاؤ گے۔ (فتح القدر)

(۳) یعنی مالی استطاعت کے فقدان کی وجہ سے، جس کے دور ہونے کی اور کشائش رزق کی تو اپنے رب سے امید رکھتا ہے۔ اگر تجھے غریب رشتے داروں، مسکینوں اور ضرورت مندوں سے اعراض کرنا یعنی اظہار معذرت کرنا پڑے تو نرمی اور عمدگی کے ساتھ معذرت کر، یعنی جواب بھی دیا جائے تو نرمی اور پیار و محبت کے لہجے میں نہ کہ ترشی اور بداخلاقی کے ساتھ، جیسا کہ عام طور پر لوگ ضرورت مندوں اور غریبوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے کہ پھر ملامت کیا ہو اور ماندہ بیٹھ جائے۔^(۱) (۲۹)

یقیناً تیرا رب جس کے لیے چاہے روزی کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہے تنگ۔^(۲) یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر اور خوب دیکھنے والا ہے۔ (۳۰)

اور مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو نہ مار ڈالو، ان کو اور تم کو ہم ہی روزی دیتے ہیں۔ یقیناً ان کا قتل کرنا کبیرہ گناہ ہے۔^(۳) (۳۱)

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ
تَقَعُدَ مَوْتًا مَّحْتَمِلًا ۝

إِنَّ ذَٰلِكَ بِمَنْظُورٍ لِّمَنْ يَشَاءُ وَيَعْدِلُ إِنَّهُ كَانَ بِحُجُوبِهِ
خَبِيرًا بَصِيرًا ۝

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ مِّنْ رَّزْقٍ مُّعْ
وَيَا لظُلْمِ إِنَّهُمْ كَانُوا خُطَاةً كَبِيرًا ۝

(۱) گزشتہ آیت میں انکار کرنے کا ادب بیان فرمایا اب انفاق کا ادب بیان کیا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان نہ بخل کرے کہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات پر بھی خرچ نہ کرے اور نہ فضول خرچی ہی کرے کہ اپنی وسعت اور گنجائش دیکھے بغیر ہی بے دریغ خرچ کرتا رہے۔ بخل کا نتیجہ یہ ہو گا کہ انسان لوم، یعنی قابل ملامت و مذمت قرار پائے گا اور فضول خرچی کے نتیجے میں محسور (تھکا ہارا اور پچھتانے والا) محسور، اس جانور کو کہتے ہیں جو چل چل کر تھک چکا اور چلنے سے عاجز ہو چکا ہو۔ فضول خرچی کرنے والا بھی بالآخر خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ، یہ کنایہ ہے بخل سے اور ”نہ اسے بالکل ہی کھول دے“ یہ کنایہ ہے فضول خرچی سے۔ مَلُومًا مَّخْسُورًا لَفَّ نَشْرٌ مُّرْتَبٌ ہے یعنی لوم، بخل کا اور محسور فضول خرچی کا نتیجہ ہے۔

(۲) اس میں اہل ایمان کے لیے تسلی ہے کہ ان کے پاس وسائل رزق کی فراوانی نہیں ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کے ہاں ان کا مقام نہیں ہے بلکہ یہ رزق کی وسعت یا کمی، اس کا تعلق اللہ کی حکمت و مصلحت سے ہے جسے صرف وہی جانتا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کو قارون بنا دے اور اپنوں کو اتنا ہی دے کہ جس سے بہ مشکل وہ اپنا گزارہ کر سکیں۔ یہ اس کی مشیت ہے۔ جس کو وہ زیادہ دے، وہ اس کا محبوب نہیں اور قوت لایموت کا مالک اس کا مبغوض نہیں۔

(۳) یہ آیت سورۃ الأنعام، ۱۵۱ میں بھی گزر چکی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے بعد جس گناہ کو سب سے بڑا قرار دیا وہ یہی ہے کہ «أَنَّ تَقْتُلَ وَلَدَكَ خَشْيَةَ أَنْ يَطْعَمَ مَعَكَ». (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ البقرۃ، و کتاب الأدب، مسلم، کتاب التوحید، باب فلا تجعلوا لله أنداداً) ”کہ تو اپنی اولاد کو اس ڈر سے قتل کر دے کہ وہ تیرے ساتھ کھائے گی۔“ آج کل قتل اولاد کا گناہ عظیم نہایت منظم طریقے سے اور خاندانی منصوبہ بندی کے حسین عنوان سے پوری دنیا میں ہو رہا ہے اور مرد حضرات ”بہتر تعلیم و تربیت“ کے نام پر اور خواتین اپنے ”حسن“ کو برقرار رکھنے کے لیے اس جرم کا عام ارتکاب کر رہی ہیں أَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ .

وَلَا تَقْرُبُوا الزَّيْنَىٰ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ۝

وَلَا تَقْرُبُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَنْ فَعَلِ
مُظْلَمًا فَاعْتَدُوا جَعَلْنَا لِيَلِدِيَهٗ سُلْطٰنًا فَاكْتَرِفْ فِي الْقَتْلِ
إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا ۝

وَلَا تَقْرُبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالْحَقِّ هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ
أَشُدَّهُ وَذُو قُوَّةٍ بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ۝

خبردار زنا کے قریب بھی نہ پھٹکنا کیوں کہ وہ بڑی بے حیائی
ہے اور بہت ہی بری راہ ہے۔ (۳۲)

اور کسی جان کو جس کا مارنا اللہ نے حرام کر دیا ہے ہرگز
ناحق قتل نہ کرنا (۳) اور جو شخص مظلوم ہونے کی صورت
میں مار ڈالا جائے ہم نے اس کے وارث کو طاقت دے
رکھی ہے پس اسے چاہیے کہ مار ڈالنے میں زیادتی نہ
کرے بیشک وہ مدد کیا گیا ہے۔ (۳۳)

اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ بجز اس طریقہ کے
جو بہت ہی بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ اپنی بلوغت کو پہنچ
جائے (۳) اور وعدے پورے کرو کیونکہ قول و قرار کی باز

(۱) اسلام میں زنا چونکہ بہت بڑا جرم ہے، اتنا بڑا کہ کوئی شادی شدہ مرد یا عورت اس کا ارتکاب کر لے تو اسے اسلامی
معاشرے میں زندہ رہنے کا ہی حق نہیں ہے۔ پھر اسے تلوار کے ایک وار سے مار دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ حکم ہے کہ پتھر
مار مار کر اس کی زندگی کا خاتمہ کیا جائے تاکہ وہ معاشرے میں نشانِ عبرت بن جائے۔ اس لیے یہاں فرمایا کہ زنا کے قریب
مت جاؤ، یعنی اس کے دواعی اور اسباب سے بھی بچ کر رہو، مثلاً غیر محرم عورت کو دیکھنا، ان سے اختلاط و کلام کی راہیں
پیدا کرنا، اسی طرح عورتوں کا بے پردہ اور بن سنور کر گھروں سے باہر نکلنا وغیرہ ان تمام امور سے اجتناب ضروری ہے
تاکہ اس بے حیائی سے بچا جاسکے۔

(۲) حق کے ساتھ قتل کرنے کا مطلب قصاص میں قتل کرنا ہے، جس کو انسانی معاشرے کی زندگی اور امن و سکون کا
باعث قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح شادی شدہ زانی اور مرتد کو قتل کرنے کا حکم ہے۔

(۳) یعنی مقتول کے وارثوں کو یہ حق یا غلبہ یا طاقت دی گئی ہے کہ وہ قاتل کو حاکم وقت کے شرعی فیصلہ کے بعد قصاص
میں قتل کر دیں یا اس سے دیت لے لیں یا معاف کر دیں۔ اور اگر قصاص ہی لینا ہے تو اس میں زیادتی نہ کریں کہ ایک
کے بدلے میں دو یا تین چار کو مار دیں، یا اس کا مثلہ کر کے یا عذاب دے دے کر ماریں، مقتول کا وارث، منصور ہے یعنی
امراد حکام کو اس کی مدد کرنے کی نایید کی گئی ہے، اس لیے اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے نہ یہ کہ زیادتی کا ارتکاب کر
کے اللہ کی ناشکری کرے۔

(۴) کسی کی جان کو ناجائز طریقے سے ضائع کرنے کی ممانعت کے بعد، اتلاف مال (مال کے ضائع کرنے) سے روکا جا رہا
ہے اور اس میں یتیم کا مال سب سے زیادہ اہم ہے، اس لیے فرمایا کہ یتیم کے مال ہونے تک اس کے مال کو ایسے طریقے
سے استعمال کرو، جس میں اس کا فائدہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ سوچے سمجھے بغیر ایسے کاروبار میں لگا دو کہ وہ ضائع یا خسارے سے
دوچار ہو جائے۔ یا عمر شعور سے پہلے تم اسے اڑا ڈالو۔

پرس ہونے والی ہے۔^(۱) (۳۳)

اور جب ناپنے لگو تو بھرپور پیمانے سے ناپو اور سیدھی ترازو سے تولو کرو۔ یہی بہتر ہے^(۲) اور انجام کے لحاظ سے بھی بہت اچھا ہے۔ (۳۵)

جس بات کی تجھے خبر ہی نہ ہو اس کے پیچھے مت^(۳) پڑ۔ کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے پوچھ گچھ کی جانے والی ہے۔^(۴) (۳۶)

اور زمین میں اڑ کر نہ چل کہ نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ لمبائی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتا ہے۔^(۵) (۳۷)

ان سب کاموں کی برائی تیرے رب کے نزدیک (سخت) ناپسند ہے۔^(۶) (۳۸)

یہ بھی منجملہ اس وحی کے ہے جو تیری جانب تیرے رب نے حکمت سے اتاری ہے تو اللہ کے ساتھ کسی اور کو

وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَرَدُّوا الْقِطَاسَ الْمُسْتَقِيمَ
ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عِنْدَهُ مُسْتَوْسِلًا ۝

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ۝

كُلُّ ذَلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا ۝

ذَلِكَ وَمِمَّا أَوْحَى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ

- (۱) عمد سے وہ میثاق بھی مراد ہے جو اللہ اور اس کے بندے کے درمیان ہے اور وہ بھی جو انسان آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ دونوں قسم کے عمدوں کا پورا کرنا ضروری ہے اور نقص عمد کی صورت میں باظہر ہوگی۔
- (۲) اجر و ثواب کے لحاظ سے بہتر ہے، علاوہ ازیں لوگوں کے اندر اعتماد پیدا کرنے میں بھی ناپ تول میں دیانت داری مفید ہے۔
- (۳) فَمَا يَقْفُوْا کے معنی ہیں پیچھے لگنا۔ یعنی جس چیز کا علم نہیں، اس کے پیچھے مت لگو، یعنی بدگمانی مت کرو، کسی کی ٹوہ میں مت رہو، اسی طرح جس چیز کا علم نہیں، اس پر عمل مت کرو۔
- (۴) یعنی جس چیز کے پیچھے تم پڑو گے اس کے متعلق کان سے سوال ہو گا کہ کیا اس نے سنا تھا، آنکھ سے سوال ہو گا کہ کیا اس نے دیکھا تھا اور دل سے سوال ہو گا کیا اس نے جانا تھا؟ کیوں کہ یہی تینوں علم کا ذریعہ ہیں۔ یعنی ان اعضا کو اللہ تعالیٰ قیامت والے دن قوت گویائی عطا فرمائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا۔
- (۵) اترا کرو اور اڑ کر چلنا، اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ قارون کو اسی بنا پر اس کے گھر اور خزانوں سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا۔ (القصص- ۸۱) حدیث میں آتا ہے ”ایک شخص دو چادریں پنے اڑ کر چل رہا تھا کہ اس کو زمین میں دھنسا دیا گیا اور وہ قیامت تک دھنستا چلا جائے گا“۔ (صحیح مسلم، کتاب اللباس، باب تحریم التبخر فی الممشی مع إصحابہ بشیابہ) اللہ تعالیٰ کو تواضع اور عاجزی پسند ہے۔
- (۶) یعنی جو باتیں مذکور ہوئیں، ان میں جو بری ہیں، جن سے منع کیا گیا ہے، وہ ناپسندیدہ ہیں۔

اللَّهُ الْخَرَفَتَلْفِي فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا مَدْحُورًا ۝

معبود نہ بنانا کہ ملامت خوردہ اور راندہ درگاہ ہو کر دوزخ میں ڈال دیا جائے۔ (۳۹)

کیا بیٹوں کے لیے تو اللہ نے تمہیں چھانٹ لیا اور خود اپنے لیے فرشتوں کو لڑکیاں بنا لیں؟ بیشک تم بہت بڑا بول بول رہے ہو۔ (۴۰)

ہم نے تو اس قرآن میں ہر طرح بیان^(۱) فرما دیا کہ لوگ سمجھ جائیں لیکن اس سے انہیں تو نفرت ہی بڑھتی ہے۔ (۴۱)

کہہ دیجئے! کہ اگر اللہ کے ساتھ اور معبود بھی ہوتے جیسے کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو ضرور وہ اب تک مالک عرش کی جانب راہ ڈھونڈ نکالتے۔^(۲) (۴۲)

جو کچھ یہ کہتے ہیں اس سے وہ پاک اور بالاتر بہت دور اور بہت بلند ہے۔^(۳) (۴۳)

ساتوں آسمان اور زمین اور جو بھی ان میں ہے اسی کی تسبیح کر رہے ہیں۔ ایسی کوئی چیز نہیں جو اسے پاکیزگی اور تعریف کے

أَفَأَصْفُكُمْ رَبُّكُم بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا إِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ قَوْلًا عَظِيمًا ۝

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا وَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا ۝

قُلْ لَوْ كَانُ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذْ لَا يَتَّبِعُونَ إِلَّا مَا نَزَّلْنَا مِنَ الْقُرْآنِ سَبِيلًا ۝

سُبْحَانَهُ وَوَعَلَىٰ عِزِّيَاقُولُونَ عَلَاقًا كَبِيرًا ۝

تُسَبِّحُهُ السَّمَوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ وَإِن مِّن شَيْءٍ

(۱) ہر طرح کا مطلب ہے، وعظ و نصیحت، دلائل و بینات ترغیب و ترہیب اور امثال و واقعات، ہر طریقے سے بار بار سمجھایا گیا ہے تاکہ وہ سمجھ جائیں، لیکن وہ کفر و شرک کی تاریکیوں میں اس طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ وہ حق کے قریب ہونے کی بجائے، اس سے اور زیادہ دور ہو گئے ہیں۔ اس لیے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ قرآن جادو، کمانت اور شاعری ہے، پھر وہ اس قرآن سے کس طرح راہ یاب ہوں؟ کیونکہ قرآن کی مثال بارش کی ہے کہ اچھی زمین پر پڑے تو وہ بارش سے شاداب ہو جاتی ہے اور اگر وہ گندی ہے تو بارش سے بدبو میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۲) اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جس طرح ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ پر لشکر کشی کر کے غلبہ و قوت حاصل کر لیتا ہے، اسی طرح یہ دوسرے معبود بھی اللہ پر غلبے کی کوئی راہ ڈھونڈ نکالتے۔ اور اب تک ایسا نہیں ہوا، جب کہ ان معبودوں کو پوختے ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود ہی نہیں، کوئی با اختیار ہستی ہی نہیں، کوئی نافع و ضار ہی نہیں۔ دوسرے معنی ہیں کہ وہ اب تک اللہ کا قرب حاصل کر چکے ہوتے اور یہ مشرکین جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے ذریعے سے وہ اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں، انہیں بھی وہ اللہ کے قریب کر چکے ہوتے۔

(۳) یعنی واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کی بابت جو کہتے ہیں کہ اسکے شریک ہیں، اللہ تعالیٰ ان باتوں سے پاک اور بہت بلند ہے۔

اَلَّذِيْ سُبْحَانَ سُبْحٰتِهِۦ وَلٰكِنْ لَا تَقْفُوْنَ تَسْبِيْحَهُۥ اِنَّهٗ كَانَ
جَلِيْلًا عَزِيْزًا ﴿۳۴﴾

وَإِذْ أَقْرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ
لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مِّنْهُنَّ ﴿۳۵﴾

وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْا وَاِذْ اَنزَلْنَاهُمْ وَحْمًا وَاِذَا
ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدًا وَلَوَّاعًا لَّا ادْبَارَهُمْ نُفُوْرًا ﴿۳۶﴾

ساتھ یاد نہ کرتی ہو۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ تم اس کی تسبیح سمجھ
نہیں سکتے۔^(۱) وہ بڑا بردبار اور بخشنے والا ہے۔ (۳۴)
تو جب قرآن پڑھتا ہے ہم تیرے اور ان لوگوں کے
درمیان جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے ایک پوشیدہ حجاب
ڈال دیتے ہیں۔^(۲) (۳۵)

اور ان کے دلوں پر ہم نے پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ
اسے سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ اور جب تو
صرف اللہ ہی کا ذکر اس کی توحید کے ساتھ، اس قرآن
میں کرتا ہے تو وہ روگردانی کرتے پیٹھ پھیر کر بھاگ

(۱) یعنی سب اسی کے مطیع اور اپنے اپنے انداز میں اس کی تسبیح و تحمید میں مصروف ہیں۔ گو ہم ان کی تسبیح و تحمید کو نہ
سمجھ سکیں۔ اس کی تائید بعض اور آیات قرآنی سے بھی ہوتی ہے مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے۔
﴿ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَبَثِ وَالْاَشْرَاقِ ﴾ (سورۃ ص-۱۱۸) ”ہم نے پہاڑوں کو داؤد علیہ السلام کے تابع کر دیا“
بس وہ شام کو اور صبح کو اس کے ساتھ اللہ کی تسبیح (پاکی) بیان کرتے ہیں۔“ بعض پتھروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے
فرمایا ﴿ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَنْ اَيُّظْطَرُّنَ خَشْيَةَ اللّٰهِ ﴾ (البقرۃ-۷۴) ”اور بعض اللہ تعالیٰ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔“ بعض صحابہ
رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ انہوں نے کھانے سے تسبیح کی
آواز سنی، (صحیح بخاری۔ کتاب المناقب نمبر ۳۵۷۹) ایک اور حدیث سے ثابت ہے کہ چیونٹیاں اللہ کی تسبیح
کرتی ہیں۔ (بخاری۔ نمبر ۳۰۱۹۔ مسلم۔ نمبر ۱۷۵۹) اسی طرح جس تے کے ساتھ نیک لگا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، جب کلڑی کا منبر بن گیا اور اسے آپ ﷺ نے چھوڑ دیا تو سچے کی طرح اس سے
رونے کی آواز آتی تھی۔ (بخاری۔ نمبر ۳۵۸۳) کے میں ایک پتھر تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا کرتا تھا۔
(صحیح مسلم۔ نمبر ۱۷۸۲) ان آیات و صحیح احادیث سے واضح ہے کہ جمادات و نباتات کے اندر بھی ایک مخصوص
قسم کا شعور موجود ہے، جسے گو ہم نہ سمجھ سکیں، مگر وہ اس شعور کی بنا پر اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے
مراد تسبیح دلالت ہے یعنی یہ چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ تمام کائنات کا خالق اور ہر چیز پر قادر صرف اللہ تعالیٰ
ہے۔“

وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَّهٗ اٰيَةٌ * تَذُلُّ عَلٰى اَنَّهُ وَاٰحِذْ

”ہر چیز اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے“ لیکن صحیح بات پہلی ہی ہے کہ تسبیح اپنے حقیقی معنی میں ہے۔“

(۲) ”مسنوؤ“، بمعنی سناپت (مانع اور حائل) ہے یا مستور عن الابصار (آنکھوں سے اوچھل) پس وہ اسے دیکھتے نہیں۔ اس کے
باوجود ان کے اور ہدایت کے درمیان حجاب ہے۔

کھڑے ہوتے ہیں۔^(۱) (۳۶)

جس غرض سے وہ لوگ اسے سنتے ہیں ان (کی نیتوں) سے ہم خوب آگاہ ہیں، جب یہ آپ کی طرف کان لگائے ہوئے ہوتے ہیں تب بھی اور جب یہ مشورہ کرتے ہیں تب بھی جب کہ یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم اس کی تابعداری میں لگے ہوئے ہو جن پر جادو^(۲) کر دیا گیا ہے۔ (۳۷)

دیکھیں تو سہمی، آپ کے لیے کیا کیا مثالیں بیان کرتے ہیں، پس وہ ہسک رہے ہیں۔ اب تو راہ پانا ان کے بس میں نہیں رہا۔^(۳) (۳۸)

انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور (مٹی ہو کر) ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کر کے پھر دوبارہ اٹھا کر کھڑے کر دیئے جائیں گے۔ (۳۹)

جواب دیجئے کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا۔^(۴) (۵۰)

یا کوئی اور ایسی خلقت جو تمہارے دلوں میں بہت ہی سخت معلوم ہو،^(۵) پھر وہ یہ پوچھیں کہ کون ہے جو دوبارہ ہماری زندگی لوٹائے؟ آپ جواب دے دیں کہ وہی

عَنْ أَعْلَمُ بِمَا يَسْتَعِينُونَ بِهَذَا يَسْمَعُونَ إِلَيْكَ وَإِذْ هُمْ يَخُوفُونَ
إِذْ يَقُولُ الظَّالِمُونَ إِنَّا تَعْبُدُونَ إِلَّا جَلَسًا مَحْزُورًا ﴿۳۶﴾

أَنْظُرْ كَيْفَ صَرَّفُوا إِلَيْكَ الْكَيْفَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْمَعُونَ سَبِيلًا ﴿۳۷﴾

وَمَا أُولَٰئِكَ إِلَّا عِظَامًا وَرِقَاقًا وَأَنَا الْمُبْعُوثُونَ
خَلْقًا حَبِيدًا ﴿۳۸﴾

قُلْ مَن ذُو نُفُسٍ مَّا يَكْفُرُ فِي صُدُورِهِمْ فَيَسْمَعُ أَلْوَنًا مِّنْ
أَوْخَلِقَاتِهَا مِمَّا يَكْفُرُ فِي صُدُورِهِمْ فَيَسْمَعُ أَلْوَنًا مِّنْ
يُعِيدُ تَأْوِيلَ الَّذِي فَطَرَكَ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَيَسْمَعُ غَضُوبَ إِلَيْكَ

(۱) اَكْتَنَةً، كِنَانًا کی جمع ہے، ایسا پردہ جو دلوں پر پڑ جائے۔ و فَرَّ كَانُونَ میں ایسا ثقل یا ڈاٹ جو قرآن کے سننے میں مانع ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے دل قرآن کے سمجھنے سے قاصر اور کان قرآن سن کر ہدایت قبول کرنے سے عاجز ہیں۔ اور اللہ کی توحید سے تو انہیں اتنی نفرت ہے کہ اسے سن کر تو بھاگ ہی کھڑے ہوتے ہیں، ان افعال کی نسبت اللہ کی طرف بہ اعتبار خلق کے ہے۔ ورنہ ہدایت سے یہ محرومی ان کے جو دو عناد ہی کا نتیجہ تھا۔

(۲) یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سحر زدہ سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہوئے قرآن سنتے اور آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں، اس لیے ہدایت سے محروم ہی رہتے ہیں۔

(۳) کبھی ساحر، کبھی مسحور، کبھی مجنون اور کبھی کاہن کہتے ہیں، پس اس طرح گمراہ ہو رہے ہیں، ہدایت کا راستہ انہیں کس طرح ملے؟

(۴) جو مٹی اور ہڈیوں سے زیادہ سخت ہے اور جس میں زندگی کے آثار پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے۔

(۵) یعنی اس سے بھی زیادہ سخت چیز، جو تمہارے علم میں ہو، وہ بن جاؤ اور پھر پوچھو کہ کون زندہ کرے گا؟

اللہ جس نے تمہیں اول بار پیدا کیا، اس پر وہ اپنے سر ہلایا^(۱) کر آپ سے دریافت کریں گے کہ اچھا یہ ہے کب؟ تو آپ جواب دے دیں کہ کیا عجب کہ وہ (ساعت) قریب ہی آن لگی ہو۔^(۲) (۵۱)

جس دن وہ تمہیں^(۳) بلائے گا تم اس کی تعریف کرتے ہوئے تعیل ارشاد کرو گے اور گمان کرو گے کہ تمہارا رہنا بہت ہی تھوڑا ہے۔^(۴) (۵۲)

اور میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ وہ بہت ہی اچھی بات منہ سے نکالا کریں^(۵) کیونکہ شیطان آپس میں فساد ڈلواتا ہے۔^(۶) بیشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ (۵۳)

رُؤُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هُوَ قَوْلٌ عَلٰیٰٓ اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾

يَوْمَ يَدْعُوهُمْ فَتَسْتَجِيبُوْنَ بِحَمْدِہٖ وَتَقُوْلُوْنَ اِنْ لَّيْسَتْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوْا الَّذِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزِعُ

بَيْنَهُمْ وَالنَّاسَ كَانَ لِلشَّيْطٰنِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۵۳﴾

(۱) اَنْغَضَ يَنْغَضُ کے معنی ہیں، سر ہلانا۔ یعنی استہزاء کے طور پر سر ہلا کر وہ کہیں گے کہ یہ دوبارہ زندگی کب ہوگی؟
(۲) قریب کا مطلب ہے، ہونے والی چیز کُلُّ مَا هُوَ اَتَتْ فَهِيَ قَرِيْبٌ ”ہر وقوع پذیر ہونے والی چیز قریب ہے“ اور عسی بھی قرآن میں یقین اور واجب الوقوع کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی قیامت کا وقوع یقینی اور ضروری ہے۔
(۳) ”بلائے گا“ کا مطلب ہے قبروں سے زندہ کر کے اپنی بارگاہ میں حاضر کرے گا، تم اس کی حمد کرتے ہوئے تعیل ارشاد کرو گے یا اسے پچھاتے ہوئے اس کے پاس حاضر ہو جاؤ گے۔

(۴) وہاں یہ دنیا کی زندگی بالکل تھوڑی معلوم ہوگی، ﴿كَانَ لَكُمْ يَوْمَ تَرَوْهَا لَمَّ يَبْتَسُوْا اِلَّا عَشِيْرَةً اَوْ مَضْمَانًا﴾ (الناسعات: ۳۶) ”جب قیامت کو دیکھ لیں گے، تو دنیا کی زندگی انہیں ایسے لگے گی گویا اس میں ایک شام یا ایک صبح رہے ہیں۔“ اسی مضمون کو دیگر مقامات میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ طہ، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، الروم، ۵۵، المؤمنون، ۱۱۳، ۱۱۴۔ بعض کہتے ہیں کہ پہلا نغفہ ہو گا، تو سب مردے قبروں میں زندہ ہو جائیں گے۔ پھر دوسرے نغفے پر میدان محشر میں حساب کتاب کے لیے اکٹھے ہوں گے۔ دونوں نغفوں کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہو گا اور اس فاصلے میں انہیں کوئی عذاب نہیں دیا جائے گا، وہ سو جائیں گے۔ دوسرے نغفے پر انھیں گے تو کہیں گے۔ ”افسوس، ہمیں ہماری خواب گاہوں سے کس نے اٹھایا ہے؟“ (سورہ یٰسین، ۵۲) (فتح القدیر) پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

(۵) یعنی آپس میں گفتگو کرتے وقت زبان کو احتیاط سے استعمال کریں، اچھے کلمات بولیں، اسی طرح کفار و مشرکین اور اہل کتاب سے اگر مخالفت کی ضرورت پیش آجائے تو ان سے بھی مشفقانہ اور نرم لہجے میں گفتگو کریں۔

(۶) زبان کی ذرا سی بے اعتدالی سے شیطان، جو تمہارا کھلا اور ازلی دشمن ہے، تمہارے درمیان آپس میں فساد ڈلوا سکتا ہے، یا کفار و مشرکین کے دلوں میں تمہارے لیے زیادہ بغض و عناد پیدا کر سکتا ہے۔ حدیث میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

تمہارا رب تم سے بہ نسبت تمہارے بہت زیادہ جاننے والا ہے، وہ اگر چاہے تو تم پر رحم کر دے یا اگر وہ چاہے تمہیں عذاب دے۔^(۱) ہم نے آپ کو ان کا ذمہ دار ٹھہرا کر نہیں بھیجا۔^(۲) (۵۴)

آسمانوں و زمین میں جو بھی ہے آپ کا رب سب کو بخوبی جانتا ہے۔ ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر بہتری اور برتری دی ہے۔^(۳) اور داد و کوزور ہم نے عطا فرمائی ہے۔ (۵۵)

کہہ دیجئے کہ اللہ کے سوا جنہیں تم معبود سمجھ رہے ہو انہیں پکارو لیکن نہ تو وہ تم سے کسی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں اور نہ بدل سکتے ہیں۔ (۵۶)

جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں خود وہ اپنے رب کے تقرب کی جستجو میں رہتے ہیں کہ ان میں سے کون زیادہ نزدیک ہو جائے وہ خود اس کی رحمت کی امید رکھتے اور اس کے عذاب سے خوفزدہ رہتے ہیں،^(۴) (بات بھی یہی ہے) کہ

رَبِّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا إِنَّ يَسْأَلُكُمْ أُولَئِكَ يَسْأَلُونَكُمْ وَمَا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿۵۴﴾

وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَى بَعْضٍ وَاتَّيْنَاكَ أَتَادِدًا وَتَعْوِذًا ﴿۵۵﴾

قُلْ ادْعُوا الَّذِينَ رَعَيْتُمْ مِنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا ﴿۵۶﴾

أُولَئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَى رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَ اللَّهِ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ

نے فرمایا۔ ”تم میں سے کوئی شخص، اپنے بھائی (مسلمان) کی طرف، ہتھیار کے ساتھ اشارہ نہ کرے، اس لیے کہ وہ نہیں جانتا کہ شیطان شاید اس کے ہاتھ سے وہ ہتھیار چلوا دے (اور وہ اس مسلمان بھائی کو جا لگے، جس سے اس کی موت واقع ہو جائے) پس وہ جہنم کے گڑھے میں جا کرے۔“ (صحیح بخاری کتاب الفتن، باب من حمل علينا السلاح

فليس منا. صحیح مسلم، کتاب الجبر، باب النهی عن الإشارة بالسلاح)

(۱) اگر خطاب مشرکین سے ہو تو رحم کے معنی قبول اسلام کی توفیق کے ہوں گے اور عذاب سے مراد شرک پر ہی موت ہے، جس پر وہ عذاب کے مستحق ہوں گے اور اگر خطاب مومنین سے ہو تو رحم کے معنی ہوں گے کہ وہ کفار سے تمہاری حفاظت فرمائے گا اور عذاب کا مطلب ہے کفار کا مسلمانوں پر غلبہ و تسلط۔

(۲) کہ آپ انہیں ضرور کفر کی دلیل سے نکالیں یا ان کے کفر پر جتے رہنے پر آپ سے باز پرس ہو۔

(۳) یہ مضمون ﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ ﴾ میں بھی گزر چکا ہے۔ یہاں دوبارہ کفار مکہ کے جواب میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے، جو کہتے تھے کہ کیا اللہ کو رسالت کے لیے یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی ملا تھا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کسی کو رسالت کے لیے منتخب کرنا اور کسی ایک نبی کو دوسرے پر فضیلت دینا، یہ اللہ کے ہی اختیار میں ہے۔

(۴) مذکورہ آیت میں مِنْ دُونِ اللَّهِ سے مراد فرشتوں اور بزرگوں کی وہ تصویریں اور مجسمے ہیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے، یا

تیرے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہی ہے۔ (۵۷)
 جتنی بھی بستیاں ہیں ہم قیامت کے دن سے پہلے پہلے یا تو
 انہیں ہلاک کر دینے والے ہیں یا سخت تر سزا دینے
 والے ہیں۔ یہ تو کتاب میں لکھا جا چکا ہے۔ (۵۸)^(۱)
 ہمیں نشانات (معجزات) کے نازل کرنے سے روک
 صرف اسی کی ہے کہ اگلے لوگ انہیں جھٹلا چکے ہیں۔^(۲)
 ہم نے ثمودیوں کو بطور بصیرت کے اونٹنی دی لیکن

كَانَ مَعَهُمْ وَإِذَا
 وَلَّيْتُمْ مِنْ قَرِيْبَةٍ اِلَّا عَنُّ مَهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ
 اَوْ مَعَذِبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا لِّمَآكُنَّ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۷﴾
 وَمَا مَنَعْنٰ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْآيٰتِ اِلَّا اَنْ كَذَّبَ بِهَا الَّذِيْنَ
 وَاٰتَيْنٰهُمُ الدَّلٰلٰةَ مُبِيْنَةً فَظَلَمُوْا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ

حضرت عزیر و مسیح علیہما السلام ہیں جنہیں یہودی اور عیسائی ابن اللہ کہتے اور انہیں الوہی صفات کا حامل مانتے تھے یا وہ جنات
 ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے اور مشرکین ان کی عبادت کرتے تھے۔ اس لیے کہ اس آیت میں بتلایا جا رہا ہے کہ یہ تو خود اپنے رب
 کا قرب تلاش کرنے کی جستجو میں رہتے اور اس کی رحمت کی امید رکھتے اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور یہ صفت
 جمادات (پتھروں) میں نہیں ہو سکتی۔ اس آیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اللّٰهِ کے سوا جن کی عبادت کی جاتی رہی
 ہے (وہ صرف پتھر کی مورتیاں ہی نہیں تھیں، بلکہ اللہ کے وہ بندے بھی تھے جن میں سے کچھ فرشتے، کچھ صالحین، کچھ انبیاء اور
 کچھ جنات تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کی بابت فرمایا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے، نہ کسی سے تکلیف دور کر سکتے ہیں نہ کسی کی حالت بدل
 سکتے ہیں۔ ”اپنے رب کے تقرب کی جستجو میں رہتے ہیں“ کا مطلب اعمال صالحہ کے ذریعے سے اللہ کا قرب ڈھونڈتے ہیں۔ یہی
 الوہیلتہ ہے جسے قرآن نے بیان کیا ہے۔ وہ نہیں ہے جسے قبر پرست بیان کرتے ہیں کہ فوت شدہ اشخاص کے نام کی نذر نیا زود
 ان کی قبروں پر غلاف چڑھاؤ اور میلے ٹھیلے جماؤ اور ان سے استمداد و استغاثہ کرو۔ کیونکہ یہ وسیلہ نہیں، یہ تو ان کی عبادت ہے
 جو شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔

(۱) کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات طے شدہ ہے، جو لوح محفوظ میں
 لکھی ہوئی ہے کہ ہم کافروں کی ہر بستی کو یا تو موت کے ذریعے سے ہلاک کر دیں گے اور بستی سے مراد، بستی کے
 باشندگان ہیں اور ہلاکت کی وجہ ان کا کفر و شرک اور ظلم و طغیان ہے۔ علاوہ ازیں یہ ہلاکت قیامت سے قبل وقوع پذیر
 ہوگی، ورنہ قیامت کے دن تو بلا تفریق ہر بستی ہی ٹھکست و ریخت کا شکار ہو جائے گی۔

(۲) یہ آیت اس وقت اتری جب کفار مکہ نے مطالبہ کیا کہ کوہ صفا کو سونے کا بنا دیا جائے یا ککے کے پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹا
 دیئے جائیں تاکہ وہاں کاشت کاری ممکن ہو سکے، جس پر اللہ تعالیٰ نے جبریل کے ذریعے سے پیغام بھیجا کہ ان کے
 مطالبات ہم پورے کرنے کے لیے تیار ہیں، لیکن اگر اس کے بعد بھی وہ ایمان نہ لائے تو پھر ان کی ہلاکت یقینی ہے۔ پھر
 انہیں مہلت نہیں دی جائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی بات کو پسند فرمایا کہ ان کا مطالبہ پورا نہ کیا جائے تاکہ
 یہ یقینی ہلاکت سے بچ جائیں۔ (مسند احمد، ج ۱ ص ۲۵۸۔ وقال أحمد شاکرفی تعلیقہ علی المسند (۲۳۳)
 إسناده صحیح) اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی مضمون بیان فرمایا ہے کہ ان کی خواہش کے مطابق نشانیاں اتار

بِالَّذِي لَا تَخْوِفُنَا ⑤

انہوں نے اس پر ظلم کیا ^(۱)، ہم تو لوگوں کو دھمکانے کے لیے ہی نشانیاں بھیجتے ہیں۔ (۵۹)

اور یاد کرو جب کہ ہم نے آپ سے فرمایا کہ آپ کے رب نے لوگوں کو گھیر لیا ہے۔ ^(۲) جو رویا (یعنی رؤیت) ہم نے آپ کو دکھائی تھی وہ لوگوں کے لیے صاف آزمائش ہی تھی اور اسی طرح وہ درخت بھی جس سے قرآن میں اظہار نفرت کیا گیا ہے۔ ^(۳) ہم انہیں ڈرا رہے ہیں لیکن یہ انہیں اور بڑی سرکشی میں بدھا رہا ہے۔ ^(۴) (۶۰)

جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے کیا، اس نے کہا کہ کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ (۶۱)

وَاذْكُرْنَا الَّذِي نَنبَأُكَ بِآخِلَاتِ النَّاسِ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي آتَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ وَنُحُوتَهُمْ فَأَيُّ زَيْدٍ يُكْفَرُونَ ⑥

وَاذْكُرْنَا الَّذِي نَنبَأُكَ بِآخِلَاتِ النَّاسِ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي آتَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ وَنُحُوتَهُمْ فَأَيُّ زَيْدٍ يُكْفَرُونَ ⑥

دینا ہمارے لیے کوئی مشکل نہیں۔ لیکن ہم اس سے گریز اس لیے کر رہے ہیں کہ پہلی قوموں نے بھی اپنی خواہش کے مطابق نشانیاں مانگیں جو انہیں دکھادی گئیں، لیکن اس کے باوجود انہوں نے محمدیہ کی اور ایمان نہ لائیں، جس کے نتیجے میں وہ ہلاک کر دی گئیں۔

(۱) قوم ثمود کا بطور مثال تذکرہ کیا کیونکہ ان کی خواہش پر پتھر کی چٹان سے اونٹنی ظاہر کر کے دکھائی گئی تھی، لیکن ان ظالموں نے ایمان لانے کے بجائے اس اونٹنی ہی کو مار ڈالا، جس پر تین دن کے بعد ان پر عذاب آیا۔

(۲) یعنی لوگ اللہ کے غلبہ و تصرف میں ہیں اور جو اللہ چاہے گا وہی ہو گا نہ کہ وہ جو وہ چاہیں گے، یا مراد اہل مکہ ہیں کہ وہ اللہ کے زیر اقتدار ہیں، آپ بے خوفی سے تبلیغ رسالت کیجئے، وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، ہم ان سے آپ کی حفاظت فرمائیں گے۔ یا جنگ بدر اور فتح مکہ کے موقع پر جس طرح اللہ نے کفار مکہ کو عبرت ناک شکست سے دوچار کیا، اس کو واضح کیا جا رہا ہے۔

(۳) صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم نے اس روایاتی تفسیر یعنی روایت سے کی ہے اور مراد اس سے معراج کا واقعہ ہے، جو بہت سے کمزور لوگوں کے لیے فتنے کا باعث بن گیا اور وہ مرتد ہو گئے۔ اور درخت سے مراد زقوم (تھوہر) کا درخت ہے، جس کا مشاہدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج، جہنم میں کیا۔ اَلْمَلْعُونَةُ سے مراد کھانے والوں پر یعنی جہنمیوں پر لعنت۔ جیسے دوسرے مقام پر ﴿ اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقْوْمِ طَعَامٌ لِّلْاَشْقِيَاءِ ﴿۱۰۳﴾ (الدخان ۱۰۳، ۱۰۴) ”زقوم کا درخت گناہ گاروں کا کھانا ہے۔“

(۴) یعنی کافروں کے دلوں میں جو خبث و عناد ہے، اس کی وجہ سے، نشانیاں دیکھ کر ایمان لانے کے بجائے، ان کی سرکشی و طغیانی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

اچھا دیکھ لے اسے تو نے مجھ پر بزرگی تو دی ہے، لیکن اگر مجھے بھی قیامت تک تو نے ڈھیل دی تو میں اس کی اولاد کو بجز بہت تھوڑے لوگوں کے، اپنے بس^(۱) میں کر لوں گا۔ (۶۲)

ارشاد ہوا کہ جا ان میں سے جو بھی تیرا تابعدار ہو جائے گا تو تم سب کی سزا جنم ہے جو پورا پورا بدلہ ہے۔ (۶۳)
ان میں سے تو جسے بھی اپنی آواز سے برکا سکے برکا^(۲) لے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھالا^(۳) اور ان کے مال اور اولاد میں سے اپنا بھی سا جھا لگا^(۴) اور انہیں (جھوٹے) وعدے دے لے۔^(۵) ان سے جتنے بھی وعدے شیطان کے ہوتے ہیں سب کے سب سراسر فریب ہیں۔^(۶) (۶۴)

قَالَ رَبِّكَ هَذَا الَّذِي كُفِّتَ عَلَيْهِ الْأَعْرَافُ لِلْيَوْمِ
الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا ۝۱۱

قَالَ أَذْهَبَ فَمَنْ يَبْعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَاءُكُمْ
جَزَاءً مَوْجُوزًا ۝۱۲
وَأَسْتَفْزِزُ مَنْ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ
عَلَيْهِمْ بِخَيْبِكَ وَرَجْلِكَ وَشَارِكُهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ
وَعَدَّ لَهُمْ دَعَائِدُهُمُ الشَّيْطَانُ الْأَعْرُورًا ۝۱۳

(۱) یعنی اس پر غلبہ حاصل کر لوں گا اور اسے جس طرح چاہوں گا گمراہ کر لوں گا۔ البتہ تھوڑے سے لوگ میرے داؤد سے بچ جائیں گے۔ آدم علیہ السلام و ابلیس کا یہ قصہ اس سے قبل سورہ بقرہ، اعراف اور حجر میں گزر چکا ہے۔ یہاں چوتھی مرتبہ اسے بیان کیا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں سورہ کہف، طہ اور سورہ ص میں بھی اس کا ذکر آئے گا۔
(۲) آواز سے مراد پر فریب و عوت یا گانے، موسیقی اور لہو لعلب کے دیگر آلات ہیں، جن کے ذریعے سے شیطان بکثرت لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔

(۳) ان لشکروں سے مراد انسانوں اور جنوں کے وہ سوار اور پیادے لشکر ہیں جو شیطان کے چیلے اور اس کے بیروکار ہیں اور شیطان ہی کی طرح انسانوں کو گمراہ کرتے ہیں، یا مراد ہے ہر ممکن ذرائع جو شیطان گمراہ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔
(۴) مال میں شیطان کی مشارکت کا مطلب حرام ذریعے سے مال کمانا اور حرام طریقے سے خرچ کرنا ہے اور اسی طرح موسیٰ کو بتوں کے ناموں پر وقف کر دینا مثلاً بحیرہ، سائبہ وغیرہ۔ اور اولاد میں شرکت کا مطلب، زنا کاری، عبد اللات و عبد العزیٰ وغیرہ نام رکھنا، غیر اسلامی طریقے سے ان کی تربیت کرنا کہ وہ برے اخلاق و کردار کے حامل ہوں، ان کو تنگ دستی کے خوف سے ہلاک یا زندہ درگور کر دینا، اولاد کو مجوسی، یہودی و نصرانی وغیرہ بنانا اور بغیر مسنون دعا پڑھے بیوی سے ہم بستری کرنا وغیرہ ہے۔ ان تمام صورتوں میں شیطان کی شرکت ہو جاتی ہے۔

(۵) کہ کوئی جنت دوزخ نہیں ہے، یا مرنے کے بعد دوبارہ زندگی نہیں ہے وغیرہ۔

(۶) غُرُورٌ (فریب) کا مطلب ہوتا ہے غلط کام کو اس طرح مزین کر کے دکھانا کہ وہ اچھا اور درست لگے۔

میرے سچے بندوں پر تیرا کوئی قابو اور بس نہیں۔^(۱) تیرا رب کارسازی کرنے والا کافی ہے۔^(۲) (۶۵)

تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے لیے دریا میں کشتیاں چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو۔ وہ تمہارے اوپر بہت ہی مہربان ہے۔^(۳) (۶۶)

اور سمندروں میں مصیبت پہنچنے ہی جنہیں تم پکارتے تھے سب گم ہو جاتے ہیں صرف وہی اللہ باقی رہ جاتا ہے۔ پھر جب وہ تمہیں خشکی کی طرف بچلاتا ہے تو تم منہ پھیر لیتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔^(۴) (۶۷)

تو کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ تمہیں خشکی کی طرف (لے جا کر زمین) میں دھنسا دے یا تم پر پتھروں کی آندھی بھیج دے۔^(۵) پھر تم اپنے لیے کسی نگہبان کو نہ پا سکو۔ (۶۸)

کیا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ اللہ تعالیٰ پھر تمہیں دوبارہ دریا کے سفر میں لے آئے اور تم پر تیز و تند

إِنَّ جِبَدِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَيْلًا ۝
رَبُّوَالَّذِي يُزَيِّجُ لَكُمُ الْمَالَك فِي الْبَحْرِ لِيَتَّخِذُوا مِنْ فَضْلِهِ
إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝

وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ مُسِكًا مِّن تَدْعُونَ الْآيَاتِ
فَلَمَّا بَلَغْتُم مَّوَالِي الْبَحْرِ مَعْرَضْتُم مَّا كَانَ الْإِنْسَانُ لَعَفُوًّا ۝

أَقَامْتُمْ أَن تَخْشَفَ بِكُم مَّجَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ
عَلَيْكُم حَاصِبًا ثُمَّ لَا يَجِدُ الْكُفْرَ وَيْلًا ۝

أَمْ أَمْسَتْمْ أَن يُعِيدَكُم يَوْمَ تَأْرَهُ الْآخِرَىٰ فَيُرْسِلَ

(۱) بندوں کی نسبت اپنی طرف کی، یہ بطور شرف اور اعزاز کے ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے خاص بندوں کو شیطان بہکانے میں ناکام رہتا ہے۔

(۲) یعنی جو صحیح معنوں میں اللہ کا بندہ بن جاتا ہے، اسی پر اعتماد اور توکل کرتا ہے تو اللہ بھی اس کا دوست اور کارساز بن جاتا ہے۔

(۳) یہ اس کا فضل اور رحمت ہی ہے کہ اس نے سمندر کو انسانوں کے تابع کر دیا ہے اور وہ اس پر کشتیاں اور جہاز چلا کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں آتے جاتے اور کاروبار کرتے ہیں، نیز اس نے ان چیزوں کی طرف رہنمائی بھی فرمائی جن میں بندوں کے لیے منافع اور مصالح ہیں۔

(۴) یہ مضمون پہلے بھی کئی جگہ گزر چکا ہے۔

(۵) یعنی سمندر سے نکلنے کے بعد تم جو اللہ کو بھول جاتے ہو تو کیا تمہیں معلوم نہیں کہ وہ خشکی میں بھی تمہاری گرفت کر سکتا ہے، تمہیں وہ زمین میں دھنسا سکتا ہے یا پتھروں کی بارش کر کے تمہیں ہلاک کر سکتا ہے، جس طرح بعض گزشتہ قوموں کو اس نے اس طرح ہلاک کیا۔

عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرَّيْحِ فَيَعْرِقُكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ
ثُمَّ لَأَعْتَدُ لَكُمْ عَذَابًا بَشِيمًا ۝

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَجَعَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ رُزُقًا فَهُمْ مِّنَ
الطَّيِّبَاتِ وَقَضَيْنَاهُمْ عَلَىٰ كَيْفِهِمْ مَّا شَاءُوا ۝

ہواؤں کے جھونکے بھیج دے اور تمہارے کفر کے باعث
تمہیں ڈبو دے۔ پھر تم اپنے لیے ہم پر اس کا دعویٰ (پہنچا)
کرنے والا کسی کو نہ پاؤ گے۔^(۱) (۶۹)
یقیناً ہم نے اولاد آدم کو بڑی عزت دی^(۲) اور انہیں
خشکی اور تری کی سواریاں^(۳) دیں اور انہیں پاکیزہ چیزوں
کی روزیاں^(۴) دیں اور اپنی بہت سی مخلوق پر انہیں
فضیلت عطا فرمائی۔^(۵) (۷۰)

(۱) قَاصِفٌ ایسی تند و تیز سمندری ہوا جو کشتیوں کو توڑ دے اور انہیں ڈبو دے۔ تَبِيْعًا انتقام لینے والا، پہنچا کرنے والا، یعنی تمہارے ڈوب جانے کے بعد ہم سے پوچھے کہ تو نے ہمارے بندوں کو کیوں ڈبویا؟ مطلب یہ ہے کہ ایک مرتبہ سمندر سے بہ خیریت نکلنے کے بعد، کیا تمہیں دوبارہ سمندر میں جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی؟ اور وہاں وہ تمہیں گرداب بلا میں نہیں پھنسا سکتا؟

(۲) یہ شرف اور فضل، بہ حیثیت انسان کے، ہر انسان کو حاصل ہے چاہے مومن ہو یا کافر۔ کیونکہ یہ شرف دوسری مخلوقات، حیوانات، جمادات و نباتات وغیرہ کے مقابلے میں ہے۔ اور یہ شرف متعدد اعتبار سے ہے۔ جس طرح کی شکل و صورت، قد و قامت اور ہیئت اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہے، وہ کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں۔ جو عقل انسان کو دی گئی ہے، جس کے ذریعے سے اس نے اپنے آرام و راحت کے لیے بے شمار چیزیں ایجاد کیں، حیوانات وغیرہ اس سے محروم ہیں۔ علاوہ ازیں اسی عقل سے وہ غلط و صحیح، مفید و مضر اور حسین و قبیح کے درمیان تمیز کرنے پر قادر ہے۔ اسی عقل کے ذریعے سے وہ اللہ کی دیگر مخلوقات سے فائدہ اٹھاتا اور انہیں اپنے تابع رکھتا ہے۔ اسی عقل و شعور سے وہ ایسی عمارتیں تعمیر کرتا، ایسے لباس ایجاد کرتا اور ایسی چیزیں تیار کرتا ہے، جو اسے گرمی کی حرارت سے اور سردی کی برودت سے اور موسم کی دیگر شدتوں سے محفوظ رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں کائنات کی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت پر لگا رکھا ہے۔ چاند، سورج، ہوا، پانی اور دیگر بے شمار چیزیں ہیں جن سے انسان فیض یاب ہو رہا ہے۔

(۳) خشکی میں وہ گھوڑوں، خچروں، گدھوں، اونٹوں اور اپنی تیار کردہ سواریوں (رہلیں، گاڑیاں، بسیں، ہوائی جہاز، سائیکل اور موٹر سائیکل وغیرہ) پر سوار ہوتا ہے اور اسی طرح سمندر میں کشتیاں اور جہاز ہیں جن پر وہ سوار ہوتا ہے اور سامان لاتا لے جاتا ہے۔

(۴) انسان کی خوراک کے لیے جو غلہ جات، میوے اور پھل اس نے پیدا کیے ہیں اور ان میں جو جو لذتیں ڈالتے اور قوتیں رکھیں ہیں۔ انواع و اقسام کے یہ کھانے، یہ لذیذ و مرغوب پھل اور یہ قوت بخش اور مفرح مرکبات و مشروبات اور خمیرے اور عجونات، انسان کے علاوہ اور کس مخلوق کو حاصل ہیں؟

(۵) مذکورہ تفصیل سے انسان کی، بہت سی مخلوقات پر، فضیلت اور برتری واضح ہے۔

جس دن ہم ہر جماعت کو اس کے پیشوا سمیت^(۱) بلائیں گے۔ پھر جن کا بھی اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دے دیا گیا وہ تو شوق سے اپنا نامہ اعمال پڑھنے لگیں گے اور دھاگے کے برابر ذرہ برابر بھی ظلم نہ کیے جائیں گے۔^(۲) (۷۱) اور جو کوئی اس جہان میں اندھا رہا، وہ آخرت میں بھی اندھا اور راستے سے بہت ہی بھٹکا ہوا رہے گا۔^(۳) (۷۲) یہ لوگ آپ کو اس وحی سے جو ہم نے آپ پر اتاری ہے برکاتا چاہتے کہ آپ اس کے سوا کچھ اور ہی ہمارے نام سے گھر گھرائیں، تب تو آپ کو یہ لوگ اپنا ولی دوست بنا لیتے۔ (۷۳) اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو بہت ممکن تھا کہ ان کی طرف قدرے قلیل مائل ہو ہی جاتے۔^(۴) (۷۴) پھر تو ہم بھی آپ کو دو ہر اعذاب دنیا کا کرتے اور دو ہر ای موت کا،^(۵) پھر آپ تو اپنے لیے ہمارے مقابلے میں کسی کو مددگار بھی نہ پاتے۔ (۷۵)

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنثَىٰ بِمَا بِمَنِّهِنَّ أَفَتُكْتَبُنَّ بِيَمِينِهِ
فَأُولَٰئِكَ يَفْرَهُونَ كِتَابَهُمْ وَلَا يَتْلُونَ فِتْيَانًا ۝۱۷

وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ
وَأَضَلُّ سَبِيلًا ۝۱۸

فَلَنْ كَذَّبَ الْيَقِينُ نَتَّكُفُّ عَنْ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ
لِنَعْتَبِرَنَّهُ عَيْنًا غَيْرَةً وَلَوْلَا إِذْ كُنَّا ذَاكَ خَلِيلًا ۝۱۹

وَلَوْلَا أَنْ تَبَتُّنَا لَقَد كُنَّا تَتَّكُفُّنَ الْيَقِينُ عَيْنًا غَيْرَةً ۝۲۰

إِذْ كُنَّا ذَاكَ نَضَعُ الْحَوِيَّةَ فِي صَفِّ الْمَنَاتِ ثُمَّ لَا يَجِدُ لَكَ
عَلَيْنَا نَصِيرًا ۝۲۱

(۱) اِمَام کے معنی پیشوا، لیڈر اور قائد کے ہیں، یہاں اس سے کیا مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد پیغمبر ہے یعنی ہر امت کو اس کے پیغمبر کے حوالے سے پکارا جائے گا۔ بعض کہتے ہیں، اس سے آسانی کتاب مراد ہے جو انبیاء کے ساتھ نازل ہوتی رہیں۔ یعنی اے اہل تورات! اے اہل انجیل! اور اے اہل قرآن! وغیرہ کہہ کے پکارا جائے گا۔ بعض کہتے ہیں یہاں ”امام“ سے مراد نامہ اعمال ہے یعنی ہر شخص کو جب بلایا جائے گا تو اس کا نامہ اعمال اس کے ساتھ ہو گا اور اس کے مطابق اس کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اسی رائے کو امام ابن کثیر اور امام شوکانی نے ترجیح دی ہے۔

(۲) فِتْيَانُ اس جہلی یا تانگے کو کہتے ہیں جو کھجور کی کھھلی میں ہوتا ہے یعنی ذرہ برابر ظلم نہیں ہو گا۔

(۳) اَعْمَىٰ (اندھا) سے مراد دل کا اندھا ہے یعنی جو دنیا میں حق نہ دیکھنے، سمجھنے اور اسے قبول کرنے سے محروم رہا، وہ آخرت میں اندھا اور رب کے خصوصی فضل و کرم سے محروم رہے گا۔

(۴) اس میں اس عصمت کا بیان ہے جو اللہ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مشرکین اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتے تھے، لیکن اللہ نے آپ ﷺ کو ان سے بچایا اور آپ ﷺ ذرا بھی ان کی طرف نہیں بھٹکے۔

(۵) اس سے معلوم ہوا کہ سزا قدر و منزلت کے مطابق ہوتی ہے۔

وَلَنْ كَادُوا لِيَسْتَوِيُوْا نَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْهُ مِنْهَا
وَاذْا الْاَلِيْبَتُوْنَ خِطْفَكَ الْاَوْوِيْلَا ①

یہ تو آپ کے قدم اس سرزمین سے اکھاڑنے ہی لگے
تھے کہ آپ کو اس سے نکال دیں۔^(۱) پھر یہ بھی آپ کے
بعد بہت ہی کم ٹھہر پاتے۔^(۲) (۷۶)

سُنَّةٌ مِّنْ قَدَا رَسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَحِدُ اَلْحَدِيْتِنَا تَحْوِيْلًا ②

ایسا ہی دستور ان کا تھا جو آپ سے پہلے رسول ہم نے
بھیجے^(۳) اور آپ ہمارے دستور میں کبھی رو بدل نہ
پائیں گے۔^(۴) (۷۷)

اَعْرِضْ الصَّلَاةَ لِلدُّلُوْلِ الشَّيْءِ اِلَى عَسَقِ الْاَيْلِ وَقُرْآنَ النَّجْوِي
اِنَّ قُرْآنَ النَّجْوِي كَانَ مَشْهُوْدًا ③

نماز کو قائم کریں آفتاب کے ڈھلنے سے لے کر رات کی
تاریکی تک^(۵) اور فجر کا قرآن پڑھنا بھی یقیناً فجر کے وقت
کا قرآن پڑھنا حاضر کیا گیا ہے۔^(۶) (۷۸)

(۱) یہ اس سازش کی طرف اشارہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکے سے نکالنے کے لیے قریش مکہ نے تیار کی تھی،
جس سے اللہ نے آپ کو بچالیا۔

(۲) یعنی اگر اپنے منصوبے کے مطابق یہ آپ کو مکے سے نکال دیتے تو یہ بھی اس کے بعد زیادہ دیر نہ رہتے یعنی عذاب
الہی کی گرفت میں آجاتے۔

(۳) یعنی یہ دستور پرانا چلا آ رہا ہے جو آپ ﷺ سے پہلے رسولوں کے لیے بھی برتا جاتا رہا ہے کہ جب ان کی قوموں
نے انہیں اپنے وطن سے نکال دیا یا انہیں نکلنے پر مجبور کر دیا تو پھر وہ قومیں بھی اللہ کے عذاب سے محفوظ نہ رہیں۔

(۴) چنانچہ اہل مکہ کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے ڈھڈھ سال بعد ہی میدان بدر
میں وہ عبرت ناک زلّت و شکست سے دوچار ہوئے اور چھ سال بعد ۸ ہجری میں مکہ ہی فتح ہو گیا اور اس زلّت و ہزیمت
کے بعد وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔

(۵) دُلُوْدُ کے معنی زوال (آفتاب ڈھلنے) کے اور عَسَقِ کے معنی تاریکی کے ہیں۔ آفتاب کے ڈھلنے کے بعد، ظہر اور عصر
کی نماز اور رات کی تاریکی تک سے مراد مغرب اور عشاء کی نمازیں ہیں اور قرآن الفجر سے مراد فجر کی نماز ہے۔ قرآن
نماز کے معنی میں ہے۔ اس کو قرآن سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ فجر میں قراءت لمبی ہوتی ہے۔ اس طرح اس آیت میں
پانچوں فرض نمازوں کا اجمالی ذکر آ جاتا ہے۔ جن کی تفصیلات احادیث میں ملتی ہیں اور جو امت کے عملی توازن سے بھی
ثابت ہیں۔

(۶) یعنی اس وقت فرشتے حاضر ہوتے ہیں بلکہ دن کے فرشتوں اور رات کے فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث
میں ہے (صحیح بخاری، تفسیر سورہ بنی اسرائیل) ایک اور حدیث میں ہے کہ رات والے فرشتے جب اللہ کے پاس جاتے
ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے حالانکہ وہ خود خوب جانتا ہے ”تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟“ فرشتے

وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ بِحَمْدِهِ نَافِلَةً لَكَ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّخْمُومًا ﴿۸۰﴾

وَقُلْ رَبِّ اجْعَلْ لِي مَدْخَلَ صِدْقِي وَأَخْرَجِي بِعَزَّةٍ صِدْقِي
وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا ﴿۸۱﴾

رات کے کچھ حصے میں تہجد کی نماز میں قرآن کی تلاوت کریں^(۱) یہ زیادتی آپ کے لیے^(۲) ہے عنقریب آپ کا رب آپ کو مقام محمود میں کھڑا کرے گا۔^(۳) (۷۹)

اور دعا کیا کریں کہ اے میرے پروردگار مجھے جہاں لے جا اچھی طرح لے جا اور جہاں سے نکال اچھی طرح نکال اور میرے لیے اپنے پاس سے غلبہ اور امداد مقرر فرمادے۔^(۴) (۸۰)

کہتے ہیں کہ ”جب ہم ان کے پاس گئے تھے اس وقت بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان کے پاس سے آئے ہیں تو انہیں نماز پڑھتے ہوئے ہی چھوڑ کر آئے ہیں۔“ (البخاری کتاب المواقیب، باب فضل صلوة العصر ومسلم باب فضل صلائی الصبح والعصر والمحافظة علیہما)

(۱) بعض کہتے ہیں تہجد امداد میں سے ہے جس کے معنی سونے کے بھی ہیں اور نیند سے بیدار ہونے کے بھی۔ اور یہاں یہی دوسرے معنی ہیں کہ رات کو سو کر اٹھیں اور نوافل پڑھیں۔ بعض کہتے ہیں کہ جہود کے اصل معنی تو رات کے سونے کے ہی ہیں، لیکن باب تفعل میں جانے سے اس میں تجنب کے معنی پیدا ہو گئے۔ جیسے تَأْتَمُّمٌ کے معنی ہیں اس نے گناہ سے اجتناب کیا، یا بچا۔ اسی طرح تہجد کے معنی ہوں گے، سونے سے بچنا اور مُتَهَجِّدٌ وہ ہو گا جو رات کو سونے سے بچا اور قیام کیا۔ بہر حال تہجد کا مفہوم رات کے پچھلے پراٹھہ کر نوافل پڑھنا ہے۔ ساری رات قیام اللیل کرنا خلاف سنت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کے پہلے حصے میں سوتے اور پچھلے حصے میں اٹھ کر تہجد پڑھتے۔ یہی طریقہ سنت ہے۔

(۲) بعض نے اس کے معنی کیے ہیں یہ ایک زائد فرض ہے جو آپ کے لیے خاص ہے، اس طرح وہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تہجد بھی اسی طرح فرض تھی، جس طرح پانچ نمازیں فرض تھیں۔ البتہ امت کے لیے تہجد کی نماز فرض نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ نَافِلَةٌ (زائد) کا مطلب یہ ہے کہ یہ تہجد کی نماز آپ ﷺ کے رفع درجات کے لیے زائد چیز ہے، کیونکہ آپ ﷺ تو مغفور الذنب ہیں، جب کہ امتیوں کے لیے یہ اور دیگر اعمال خیر کفارة سینات ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ نَافِلَةٌ نافلة ہی ہے یعنی نہ آپ ﷺ پر فرض تھی نہ آپ ﷺ کی امت پر۔ یہ ایک زائد عبادت ہے جس کی فضیلت یقیناً بہت ہے اور اس وقت اللہ اپنی عبادت سے بڑا خوش ہوتا ہے، تاہم یہ نماز فرض و واجب نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تھی اور نہ آپ ﷺ کی امت پر ہی فرض ہے۔

(۳) یہ وہ مقام ہے جو قیامت والے دن اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائے گا اور اس مقام پر ہی آپ ﷺ وہ شفاعت عظمیٰ فرمائیں گے، جس کے بعد لوگوں کا حساب کتاب ہو گا۔

(۴) بعض کہتے ہیں کہ یہ ہجرت کے موقع پر نازل ہوئی جب کہ آپ کو مدینے میں داخل ہونے اور مکے سے نکلنے کا مسئلہ درپیش تھا، بعض کہتے ہیں اس کے معنی ہیں مجھے سچائی کے ساتھ موت دینا اور سچائی کے ساتھ قیامت والے دن

اور اعلان کر دے کہ حق آپکا اور ناحق نابود ہو گیا۔ یقیناً باطل تھا بھی نابود ہونے والا۔^(۱) (۸۱)

یہ قرآن جو ہم نازل کر رہے ہیں مومنوں کے لیے تو سرا سر شفا اور رحمت ہے۔ ہاں ظالموں کو بجز نقصان کے اور کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔^(۲) (۸۲)

اور انسان پر جب ہم اپنا انعام کرتے ہیں تو وہ منہ موڑ لیتا ہے اور کروٹ بدل لیتا ہے اور جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے۔^(۳) (۸۳)

کہہ دیجئے! کہ ہر شخص اپنے طریقہ پر عامل ہے جو پوری ہدایت کے راستے پر ہیں انہیں تمہارا رب ہی بخوبی جاننے والا ہے۔^(۴) (۸۴)

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَذَهَبَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ ذَهُوًّا ۝

وَنَزَّلْنَا مِنَ الْقُرْآنِ مَاهُوشَفَاءً وَرَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا كِبْرًا ۝

وَإِذَا أَعْمَتْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ وَإِذَا مَسَّهُ الضَّرُّ كَانَ يَكُفِّرًا ۝

قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكْرِهِ فَرِيقًا أَعْلَمُ بِمَن مَّوَاهِدِي سَبِيلًا ۝

اٹھانا۔ بعض کہتے ہیں کہ مجھے قبر میں سچا داخل کرنا اور قیامت کے دن جب قبر سے اٹھائے تو سچائی کے ساتھ قبر سے نکالنا وغیرہ۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ دعا ہے اس لیے اس کے عموم میں یہ سب باتیں آجاتی ہیں۔

(۱) حدیث میں آتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو وہاں تین سو ساٹھ بت تھے آپ ﷺ کے ہاتھ میں چھری تھی، آپ ﷺ چھری کی نوک سے ان بتوں کو مارتے جاتے اور ﴿جَاءَ الْحَقُّ وَذَهَبَ الْبَاطِلُ﴾ اور ﴿جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبَدِي الْبَاطِلُ وَمَا يُعِينُهُ﴾ پڑھتے جاتے (صحیح بخاری، تفسیر بنی اسرائیل و کتاب المظالم، باب هل تكسر الدنان التي فيها الخمر، و مسلم، الجهاد، باب إزالة الأصنام من حول الكعبة)

(۲) اس مفہوم کی آیت سورہ یونس۔ ۵۷ میں گزر چکی ہے، اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمایا جائے۔

(۳) اس میں انسان کی اس حالت و کیفیت کا ذکر ہے جس میں وہ عام طور پر خوش حالی کے وقت اور تکلیف کے وقت مبتلا ہوتا ہے۔ خوش حالی میں وہ اللہ کو بھول جاتا ہے اور تکلیف میں مایوس ہو جاتا ہے۔ لیکن اہل ایمان کا معاملہ دونوں حالتوں میں اس سے مختلف ہوتا ہے۔ دیکھئے سورہ ہود کی آیات ۹-۱۱ کے حواشی۔

(۴) اس میں مشرکین کے لیے تہدید و وعید ہے اور اس کا وہی مفہوم ہے جو سورہ ہود کی آیت ۱۲۱-۱۲۲ کا ہے ﴿وَقُلْ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ أَعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِهِمْ اِنَّهُمْ لَا كَالْمُؤْمِنِينَ﴾ شَاكِلَةٌ کے معنی نیت، دین، طریقے اور مزاج و طبیعت کے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس میں کافر کے لیے ذم اور مومن کے لیے مدح کا پہلو ہے، کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ ہر انسان ایسا عمل کرتا ہے جو اس کے اس اخلاق و کردار پر مبنی ہوتا ہے جو اس کی عادت و طبیعت ہوتی ہے۔

اور یہ لوگ آپ سے روح کی بابت سوال کرتے ہیں، آپ جواب دے دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمہیں بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔ (۸۵)^(۱)

اور اگر ہم چاہیں تو جو وحی آپ کی طرف ہم نے اتاری ہے سب سلب کر لیں،^(۲) پھر آپ کو اس کے لیے ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی میسر نہ آسکے۔ (۸۶)^(۳)

سوائے آپ کے رب کی رحمت کے،^(۴) یقیناً آپ پر اس کا بڑا ہی فضل ہے۔ (۸۷)

کہہ دیجئے کہ اگر تمام انسان اور کل جنات مل کر اس قرآن کے مثل لانا چاہیں تو ان سب سے اس کے مثل لانا ناممکن ہے گو وہ (آپس میں) ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔ (۸۸)^(۵)

ہم نے تو اس قرآن میں لوگوں کے سمجھنے کے لیے ہر طرح سے تمام مثالیں بیان کر دی ہیں، مگر اکثر لوگ انکار

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الزُّجُجِ قُلِ الزُّجُجُ مِنْ أَمْوَالِنَا
وَمَا وَدَّعِينَا مِنْ الْعَالَمِ الْأَوَّلِيَّةِ ۝

وَلَكِنْ يَشْتَأْنَهُ الَّذِينَ هَاهُنَا بِالذِّمَىٰ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ فَذُ
لِاقْبُدْ لَكَ بِهِ عَلَيْنَا وَكَيْلًا ۝

إِلْحَصَابُهُ مِنَ رَبِّكَ إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَيْكَ كَافٍ ۝

قُلْ لَيْسَ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا
الْقُرْآنِ لَآ يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ كَافٍ ۝

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ
قَالُوا كَذَّبُوا بِالنَّاسِ الْأَكْفَرِ ۝

(۱) روح، وہ لطیف شیء ہے جو کسی کو نظر تو نہیں آتی لیکن ہر جاندار کی قوت و توانائی اسی روح کے اندر مضمر ہے۔ اس کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ یہودیوں نے بھی ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی بابت پوچھا تو یہ آیت اتری، (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ بنی اسرائیل و مسلم، کتاب صفۃ القیامہ و الجنة والنار، باب سؤال اليهود النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الروح) آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا علم، اللہ کے علم کے مقابلے میں قلیل ہے، اور یہ روح، جس کے بارے میں تم پوچھ رہے ہو، اس کا علم تو اللہ نے انبیاسمیت کسی کو بھی نہیں دیا ہے۔ بس اتنا سمجھو کہ یہ میرے رب کا امر (حکم) ہے۔ یا میرے رب کی شان میں سے ہے جس کی حقیقت کو صرف وہی جانتا ہے۔

(۲) یعنی وحی کے ذریعے سے جو تھوڑا بہت علم دیا گیا ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے بھی سلب کر لے یعنی دل سے محو کر دے یا کتاب سے ہی مٹا دے۔

(۳) جو دو بارہ اس وحی کو آپ کی طرف لوٹا دے۔

(۴) کہ اس نے نازل کردہ وحی کو سلب نہیں کیا یا وحی الہی سے آپ ﷺ کو مشرف فرمایا۔

(۵) قرآن مجید سے متعلق یہ چیلنج اس سے قبل بھی کئی جگہ گزر چکا ہے۔ یہ چیلنج آج تک تشنہ جواب ہے۔

سے باز نہیں آتے۔^(۱) (۸۹)
انہوں نے کہا^(۲) کہ ہم آپ پر ہرگز ایمان لانے کے نہیں
تاؤفتیکہ آپ ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ
کر دیں۔ (۹۰)

یا خود آپ کے لیے ہی کوئی باغ ہو کھجوروں اور انگوروں
کا اور اس کے درمیان آپ بہت سی نہریں جاری کر
دکھائیں۔ (۹۱)

یا آپ آسمان کو ہم پر کلڑے کلڑے کر کے گرا دیں جیسا
کہ آپ کا گمان ہے یا آپ خود اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں کو
ہمارے سامنے لاکھڑا کریں۔^(۳) (۹۲)

یا آپ کے اپنے لیے کوئی سونے^(۴) کا گھر ہو جائے یا آپ
آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم تو آپ کے چڑھ جانے کا بھی
اس وقت تک ہرگز یقین نہیں کریں گے جب تک کہ آپ
ہم پر کوئی کتاب نہ اتار لائیں جسے ہم خود پڑھ لیں،^(۵) آپ
جو اب دے دیں کہ میرا پروردگار پاک ہے میں تو صرف
ایک انسان ہی ہوں جو رسول بنایا گیا ہوں۔^(۶) (۹۳)

وَقَالُوا إِن لَّبُؤْسٍ لَكَ حَتَّى نَنصُرَكَ مِنَ الْأَرْضِ يٰمُوسَىٰ ۝

أَوْ تَكُونُ لَكَ جَهَنَّمٌ مِّنْ حَيْثُ كَانَ وَعَيْنٌ مِّنْجَرٍ

الْأَنْهَارِ خَلَلَهَا تَفْعِيلًا ۝

أَوْ نُظِفَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمَتْ عَلَيْهَا كَسْفًا أَوْ تَأْتِي يَا لَلهِ

وَالْمَلَائِكَةُ قَبِيلًا ۝

أَوْ تَكُونُ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَكُنْ تَدْمِينٌ

لِقَوْمِكَ حَتَّىٰ نُنزِلَ عَلَيْكَ آيَاتِنَا فَتَرَوْهُ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيَ هَلْ

كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلُكُمْ ۝

(۱) یہ آیت اسی سورت کے شروع میں بھی گزر چکی ہے۔

(۲) ایمان لانے کے لیے قریش مکہ نے یہ مطالبات پیش کیے۔

(۳) یعنی ہمارے روہرو آکر کھڑے ہو جائیں اور ہم انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

(۴) زُخْرُف کے اصل معنی زینت کے ہیں مَزْرُخْرُفُ مزین چیز کو کہتے ہیں۔ لیکن یہاں اس کے معنی سونے کے ہیں۔

(۵) یعنی ہم میں سے ہر شخص اسے صاف صاف خود پڑھ سکتا ہو۔

(۶) مطلب یہ ہے کہ میرے رب کے اندر تو ہر طرح کی طاقت ہے، وہ چاہے تو تمہارے مطالبے آن واحد میں لفظ

”کُنْ“ سے پورے فرمادے۔ لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو (تمہاری طرح) ایک بشر ہی ہوں۔ کیا کوئی بشر ان چیزوں

پر قادر ہے؟ جو مجھ سے ان کا مطالبہ کرتے ہو۔ ہاں، اس کے ساتھ میں اللہ کا رسول بھی ہوں۔ لیکن رسول کا کام صرف

اللہ کا پیغام پہنچانا ہے، سو وہ میں نے پہنچا دیا اور پہنچا رہا ہوں۔ لوگوں کے مطالبات پر معجزات ظاہر کر کے دکھانا یہ رسالت کا

حصہ نہیں ہے۔ البتہ اگر اللہ چاہے تو صدق رسالت کے لیے ایک آدھ معجزہ دکھایا جاتا ہے لیکن لوگوں کی خواہشات پر

لوگوں کے پاس ہدایت پہنچ چکنے کے بعد ایمان سے روکنے والی صرف یہی چیز رہی کہ انہوں نے کہا کیا اللہ نے ایک انسان کو ہی رسول بنا کر بھیجا؟^(۱) (۹۴)

آپ کہہ دیں کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے اور رہتے بستے ہوتے تو ہم بھی ان کے پاس کسی آسمانی فرشتے ہی کو رسول بنا کر بھیجتے۔^(۲) (۹۵)

کہہ دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ کا گواہ ہونا کافی ہے۔^(۳) وہ اپنے بندوں سے خوب آگاہ اور بخوبی دیکھنے والا ہے۔ (۹۶)

اللہ جس کی رہنمائی کرے وہ تو ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ راہ سے بھٹکا دے ناممکن ہے کہ تو اس کا مددگار اس کے سوا کسی اور کو پائے،^(۴) ایسے لوگوں کا ہم بروز قیامت اوندھے منہ حشر کریں گے،^(۵) درال حالیکہ وہ

وَمَا مَنَعَهُ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِرُوا بِإِذْعَانِهِمْ الْهَدَىٰ ۖ لَآ أَكُنْ
قَالُوا أَجَعَلَ اللَّهُ بَنِيَّ رَسُولًا ۖ ﴿۹۴﴾

قُلْ لَوْ كُنَّا فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَتَمَشَّوْنَ مِثْلَ نَسُوتِنَا
عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ لَمَا كُنَّا رَسُولًا ۖ ﴿۹۵﴾

قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ إِنَّهُ كَانَ بِمَا
فَعَلُوا بَصِيرًا ۖ ﴿۹۶﴾

وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۖ وَمَنْ يُضِلِّ فَلَنْ يَجِدَ لَهُمْ
أَوْلِيَاءَ يَنْصُرُونَ ۖ وَنَحْنُ نُقِيمُ الْعِقَابَ عَلَيْهِمْ لِمُحْوَاهُمْ عَمِيًّا
وَلَقَدْ مَآءُؤْمِنًا وَأَنْهَارًا وَجَهَنَّمَ كَمَا خَبَّرْتَ بِهَا نَارًا ۖ ﴿۹۷﴾

اگر معجزے دکھانے شروع کر دیے جائیں تو یہ سلسلہ تو کہیں بھی جا کر نہیں رک سکے گا، ہر آدمی اپنی خواہش کے مطابق نیا معجزہ دیکھنے کا آرزو مند ہو گا اور رسول پھر اسی کام پر لگا رہے گا، تبلیغ و دعوت کا اصل کام ٹھپ ہو جائے گا۔ اس لیے معجزات کا صدور صرف اللہ کی مشیت سے ہی ممکن ہے اور اس کی مشیت اس حکمت و مصلحت کے مطابق ہوتی ہے، جس کا علم اس کے سوا کسی کو نہیں۔ میں بھی اس کی مشیت میں دخل اندازی کا مجاز نہیں۔

(۱) یعنی کسی انسان کا رسول ہونا، کفار و مشرکین کے لیے سخت تعجب کی بات تھی، وہ یہ بات مانتے ہی نہیں تھے کہ ہمارے جیسا انسان، جو ہماری طرح چلتا پھرتا ہے، ہماری طرح کھاتا پیتا ہے، ہماری طرح انسانی رشتوں میں منسلک ہے، وہ رسول بن جائے۔ یہی استعجاب ان کے ایمان میں مانع رہا۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب زمین میں انسان بستے ہیں تو ان کی ہدایت کے لیے رسول بھی انسان ہی ہوں گے۔ غیر انسان رسول، انسانوں کی ہدایت کا فریضہ انجام دے ہی نہیں سکتا۔ ہاں اگر زمین میں فرشتے بستے ہوتے تو ان کے لیے رسول بھی یقیناً فرشتے ہی ہوتے۔

(۳) یعنی میرے ذمے جو تبلیغ و دعوت تھی، وہ میں نے پہنچادی، اس بارے میں میرے اور تمہارے درمیان اللہ کا گواہ ہونا کافی ہے، کیونکہ ہر چیز کا فیصلہ اسی کو کرنا ہے۔

(۴) میری تبلیغ و دعوت سے کون ایمان لاتا ہے، کون نہیں، یہ بھی اللہ کے اختیار میں ہے، میرا کام صرف تبلیغ ہی ہے۔

(۵) حدیث میں آتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تعجب کا اظہار کیا کہ اوندھے منہ کس طرح حشر ہو گا؟ نبی صلی اللہ علیہ

اندھے گوئگے اور بہرے ہوں گے،^(۱) ان کا ٹھکانا جہنم ہو گا۔ جب کبھی وہ بچھنے لگے گی، ہم ان پر اسے اور بھڑکا دیں گے۔ (۹۷)

یہ سب ہماری آیتوں سے کفر کرنے اور اس کفر کرنے کا بدلہ ہے کہ کیا جب ہم بڑیاں اور ریزے ریزے ہو جائیں گے پھر ہم نئی پیدائش میں اٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟ (۹۸)

کیا انہوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ جس اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے وہ ان جیسوں کی پیدائش پر پورا قادر ہے،^(۲) اسی نے ان کے لیے ایک ایسا وقت مقرر کر رکھا ہے جو شک شبہ سے یکسر خالی ہے،^(۳) لیکن ظالم لوگ انکار کیے بغیر رہتے ہی نہیں۔ (۹۹)

ذٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِآيٰتِنَا وَقَالُوْا عَزٰۤا كُنَّا عِطَمًا
وَرَقًا اَءَاۤا اِنَّا الْمَبْعُوْتُوْنَ خَلْقًا حٰدِثًا ۝۹۷

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قٰدِرٌ عَلٰۤى
اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ قٰلِى الْظٰلِمُوْنَ
اِلَّا لَعُوْرًا ۝۹۸

و سلم نے فرمایا ”جس اللہ نے ان کو پیروں سے چلنے کی قوت عطا کی ہے، وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ انہیں منہ کے بل چلا دے“ (صحیح بخاری، سورۃ الفرقان، مسلم، صفة القيامة والجنة والنار، باب يحشر الكافر على وجهه)

(۱) یعنی جس طرح وہ دنیا میں حق کے معاملے میں اندھے، بہرے اور گوئگے بنے رہے، قیامت والے دن بطور جزا اندھے، بہرے اور گوئگے ہوں گے۔

(۲) یعنی جہنم کی یہ سزا ان کو اس لیے دی جائے گی کہ انہوں نے ہماری نازل کردہ آیات کی تصدیق نہیں کی اور کائنات میں پھیلی ہوئی تکوینی آیات پر غور و فکر نہیں کیا، جس کی وجہ سے انہوں نے وقوع قیامت اور بعث بعد الموت کو محال خیال کیا اور کہا کہ بڑیاں اور ریزے ریزے ہو جانے کے بعد ہمیں ایک نئی پیدائش کس طرح مل سکتی ہے؟

(۳) اللہ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ جو اللہ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، وہ ان جیسوں کی پیدائش یا دوبارہ انہیں زندگی دینے پر بھی قادر ہے، کیونکہ یہ تو آسمان و زمین کی تخلیق سے زیادہ آسان ہے، ﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَکْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ﴾ (المؤمن - ۵۷) ”آسمان اور زمین کی پیدائش، انسانوں کی تخلیق سے زیادہ بڑا اور مشکل کام ہے۔“ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحقاف - ۳۳ میں اور سورۃ یاسین - ۸۱-۸۲ میں بھی بیان فرمایا ہے۔

(۴) اس اجل (وقت مقرر) سے مراد موت یا قیامت ہے۔ یہاں سیاق کلام کے اعتبار سے قیامت مراد لینا زیادہ صحیح ہے، یعنی ہم نے انہیں دوبارہ زندہ کر کے قبور سے اٹھانے کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ ﴿وَمَا نُؤَخِّرُهُ اِلَّا لِحٰجِبٍ مُّعْتَدٍ﴾ (ہود - ۱۰۳) ”ہم ان کے معاملے کو ایک وقت مقرر تک کے لیے ہی مؤخر کر رہے ہیں۔“

کہہ دیجئے کہ اگر بالفرض تم میرے رب کی رحمتوں کے خزانوں کے مالک بن جاتے تو تم اس وقت بھی اس کے خرچ ہو جانے^(۱) کے خوف سے اس کو روکے رکھتے اور انسان ہے ہی تنگ دل۔ (۱۰۰)

ہم نے موسیٰ کو نو معجزے^(۲) بالکل صاف صاف عطا فرمائے، تو خود ہی بنی اسرائیل سے پوچھ لے کہ جب وہ ان کے پاس پہنچے تو فرعون بولا کہ اے موسیٰ! میرے خیال میں تو تجھ پر جادو کر دیا گیا ہے۔ (۱۰۱)

قُلْ لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَدْرُسُونَ حَزْرًا بِنَاصِيَةٍ رَدَّيْنَا إِذَا لَمْ تَسْأَلْنَاكُمْ
خَشِيَةَ الْإِنْفَاقِ وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُورًا ۝

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ قَسَمَ بِيَّ اسْرَائِيلَ أَنُحَاكُم
فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ إِنِّي لَأَكْفُؤَنَّكَ يَوْمَئِذٍ مَسْحُورًا ۝

(۱) خَشِيَةَ الْإِنْفَاقِ کا مطلب ہے خَشِيَةَ أَنْ يَنْفِقُوا فَيَنْتَقِمُوا "اس خوف سے کہ خرچ کر کے ختم کر ڈالیں گے" اس کے بعد فقیر ہو جائیں گے۔" حالانکہ یہ خزانہ الہی ہے جو ختم ہونے والا نہیں۔ لیکن چونکہ انسان تنگ دل واقع ہوا ہے، اس لیے بخل سے کام لیتا ہے۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَمَّا لَهُمْ فَصِيبٌ مِّنَ الْمَلِكِ فَآذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيْرًا﴾ — (النساء: ۵۲) یعنی "ان کو اگر اللہ کی بادشاہی میں سے کچھ حصہ مل جائے تو یہ لوگوں کو کچھ نہ دیں" نقیر کھجور کی گھٹلی میں جو گڑھا ہوتا ہے اس کو کہتے ہیں، یعنی تل برابر بھی کسی کو نہ دیں۔ یہ تو اللہ کی مہربانی اور اس کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنے خزانوں کے منہ لوگوں کے لیے کھولے ہوئے ہیں۔ جس طرح حدیث میں ہے "اللہ کے ہاتھ بھرے ہوئے ہیں۔ وہ رات دن خرچ کرتا ہے، لیکن اس میں کوئی کمی نہیں آتی۔ ذرا دیکھو تو سہی، جب سے آسمان و زمین اس نے پیدا کیے ہیں، کس قدر خرچ کیا ہو گا۔ لیکن اس کے ہاتھ میں جو کچھ ہے اس میں کمی نہیں۔" (وہ بھرے کے بھرے ہیں) (البخاری۔ کتاب التوحید، باب وکان عرشہ علی الماء۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی النفقة وبتشیر المنفق بالخلف)

(۲) وہ نو معجزے ہیں۔ ہاتھ، لاشعی، قحط سالی، نقص ثمرات، طوفان، جراد (مڈی دل) قمل (کھٹل، جو نہیں) ضفادع (مینڈک) اور خون۔ امام حسن بصری کہتے ہیں، کہ قحط سالی اور نقص ثمرات ایک ہی چیز ہے اور نواں معجزہ لاشعی کا جادو گروں کی شعبہ بازی کو نکل جانا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے علاوہ بھی معجزات دیئے گئے تھے مثلاً لاشعی کا پتھر پر مارنا، جس سے بارہ چشمے ظاہر ہو گئے تھے۔ بادلوں کا سایہ کرنا، من و سلوئی وغیرہ۔ لیکن یہاں آیات تسعہ سے صرف وہی نو معجزات مراد ہیں، جن کا مشاہدہ فرعون اور اس کی قوم نے کیا۔ اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اَنْفِلَاقُ بَخْرٍ (سندر کا پھٹ کر راستہ بن جانا) کو بھی ان نو معجزات میں شمار کیا ہے اور قحط سالی اور نقص ثمرات کو ایک معجزہ شمار کیا ہے۔ ترمذی کی ایک روایت میں آیات تسعہ کی تفصیل اس سے مختلف بیان کی گئی ہے۔ لیکن سند اوہ روایت ضعیف ہے، اس لیے آیات تسعہ سے مراد یہی مذکورہ معجزات ہیں۔

موسیٰ نے جواب دیا کہ یہ تو تجھے علم ہو چکا ہے کہ آسمان و زمین کے پروردگار ہی نے یہ معجزے دکھانے، سمجھانے کو نازل فرمائے ہیں، اے فرعون! میں تو سمجھ رہا ہوں کہ تو یقیناً برباد و ہلاک کیا گیا ہے۔ (۱۰۲)

آخر فرعون نے پختہ ارادہ کر لیا کہ انہیں زمین سے ہی اکھڑ دے تو ہم نے خود اسے اور اس کے تمام ساتھیوں کو غرق کر دیا۔ (۱۰۳)

اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے فرما دیا کہ اس سرزمین^(۱) پر تم رہو سو-ہاں جب آخرت کا وعدہ آئے گا ہم تم سب کو سمیٹ اور لپیٹ کر لے آئیں گے۔ (۱۰۴)

اور ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ اتارا اور یہ بھی حق کے ساتھ اترا۔^(۲) ہم نے آپ کو صرف خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا^(۳) بنا کر بھیجا ہے۔ (۱۰۵)

قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اس لیے اتارا^(۴) ہے کہ آپ اسے بہ مہلت لوگوں کو سنائیں اور ہم نے خود بھی اسے بتدریج نازل فرمایا۔ (۱۰۶)

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمُ الْكُتُبَ وَالْأَنْبِيَاءَ بِمَا كَفَرْتُمْ
وَأَنَّا لَا نَلْمُكُمْ عَلَىٰ بُرْءِكُمْ مِّنْ قَبْلِهِمْ ۖ

فَأَرَادَ أَنْ يَنْتَقِمَ مِنْهُمْ مِنَ الْأَرْضِ فَأَكْرَمْنَاهُمْ مِنْ مَّعَهُ جَبِيصًا ۖ

وَكَلَّمْنَا مِنْ بَعْدِهِ لِبَنِي إِسْرَائِيلَ إِسْمٰكُتًا ۖ وَقَالَ آجَاءُ
وَعَدَّا الْإِسْرَافَ جَمِئًا بِكُلِّ بَيْتَانَا ۖ

وَالْحَقِّ اتْرَافًا ۚ وَبِالْحَقِّ نَزَّلْنَا وَمَا أَكْسَمْنَاكُمُ الْكُفْرَ بِنِزَارًا ۖ

وَقَرَأْنَا قُرْآنَهُ لِنَتَقَرَّ بِهِ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ حِكْمَةٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا ۖ

(۱) بظاہر اس سرزمین سے مراد مصر ہے، جس سے فرعون نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نکالنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر تاریخ بنی اسرائیل کی شہادت یہ ہے کہ وہ مصر سے نکلنے کے بعد دوبارہ مصر نہیں گئے، بلکہ چالیس سال میدان تیرہ میں گزار کر فلسطین میں داخل ہوئے۔ اس کی شہادت سورہ اعراف وغیرہ میں قرآن کے بیان سے بھی ملتی ہے۔ اس لیے صحیح یہی ہے کہ اس سے مراد فلسطین کی سرزمین ہے۔

(۲) یعنی بہ حفاظت آپ تک پہنچ گیا، اس میں راستے میں کوئی کمی بیشی اور کوئی تبدیلی اور آمیزش نہیں کی گئی۔ اس لیے کہ اس کو لانے والا فرشتہ شَدِيدُ الْقُوَى، الْأَمِينُ، الْأَمِينُ اور الْمَطْعَامُ فِي الْمَلَا الْأَعْلَى ہے۔ یہ وہ صفات ہیں جو حضرت جبریل علیہ السلام کے متعلق قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔

(۳) مُبَشِّرٌ، اطاعت گزار مومن کے لیے اور نَذِيرٌ نافرمان کے لیے۔

(۴) فَرَقْنَاهُ کے ایک دوسرے معنی بَيِّنَاتٌ وَأَوْضَحْنَاهُ (یعنی اسے کھول کر کیا وضاحت سے بیان کر دیا ہے) بھی کیے گئے ہیں۔

کہہ دیجئے! تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، جنہیں اس سے پہلے علم دیا گیا ہے ان کے پاس تو جب بھی اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔^(۱) (۱۰۷)

اور کہتے ہیں کہ ہمارا رب پاک ہے، ہمارے رب کا وعدہ بلاشک و شبہ پورا ہو کر رہنے^(۲) والا ہی ہے۔ (۱۰۸)

وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور یہ قرآن ان کی عاجزی اور خشوع اور خضوع بڑھا دیتا ہے۔^(۳) (۱۰۹)

کہہ دیجئے کہ اللہ کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو تمام اچھے نام اسی کے ہیں۔^(۴) نہ تو تو اپنی نماز بہت بلند آواز سے پڑھ اور نہ بالکل پوشیدہ بلکہ اس کے درمیان کا راستہ تلاش کر لے۔^(۵) (۱۱۰)

قُلْ لِمُؤْمِنِي أَوْ لِمُؤْمِنَاتِكُمُ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْآذِقَانِ سُجَّدًا ۝

وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ۝

وَيَخِرُّونَ لِلْآذِقَانِ يَسْبُكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ۝

قُلْ اذْعُبُوا اللَّهَ وَأُوذِعُوا الرَّحْمَنَ إِنَّهُ كَانَ تَعْوَابًا رَاحِمًا ۝

الْحَسْبِيَ وَلَا يَجْعَلُهُمُ بَصَلَاتِكَ وَلَا يَخَافُ بِهَا

وَأَيَّتَهُ بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا ۝

(۱) یعنی وہ علماء جنہوں نے نزول قرآن سے قبل کتب سابقہ پڑھی ہیں اور وہ وحی کی حقیقت اور رسالت کی علامات سے واقف ہیں، وہ سجدہ ریز ہوتے ہیں، اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہ انہیں آخری رسول ﷺ کی پہچان کی توفیق دی اور قرآن و رسالت پر ایمان لانے کی سعادت نصیب فرمائی۔

(۲) مطلب یہ ہے کہ یہ کفار مکہ جو ہر چیز سے ناواقف ہیں، اگر یہ ایمان نہیں لاتے، تو آپ پر و انہ کریں اس لیے کہ جو اہل علم ہیں اور وحی و رسالت کی حقیقت سے آشنا ہیں وہ اس پر ایمان لے آئے ہیں بلکہ قرآن سن کر وہ بارگاہ الہی میں سجدہ ریز ہو گئے ہیں۔ اور اس کی پاکیزگی بیان کرتے اور رب کے وعدوں پر یقین رکھتے ہیں۔

(۳) ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑنے کا دوبارہ ذکر کیا، کیونکہ پہلا سجدہ اللہ کی تعظیم و تزیین کے لیے اور بطور شکر تھا اور قرآن سن کر جو خشیت و رقت ان پر طاری ہوئی اور اس کی تاثیر و اعجاز سے جس درجہ وہ متاثر ہوئے، اس نے دوبارہ انہیں سجدہ ریز کر دیا۔

(۴) جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے کہ مشرکین مکہ کے لیے اللہ کا صفتی نام ”رحمن“ یا ”رحیم“ نامانوس تھا اور بعض آثار میں آتا ہے کہ بعض مشرکین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یا رحمن و رحیم کے الفاظ سنے تو کہا کہ ہمیں تو یہ کتا ہے کہ صرف ایک اللہ کو پکارو اور خود دو معبودوں کو پکار رہا ہے۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی (ابن کثیر)

(۵) اس کی شان نزول میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ کلمے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھپ

اور یہ کہہ دیجئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے نہ اپنی بادشاہت میں کسی کو شریک و ساجھی رکھتا ہے اور نہ وہ کمزور ہے کہ اسے کسی حمایت کی ضرورت ہو اور تو اس کی پوری پوری بڑائی بیان کرتا رہے۔ (۱۱۱)

سورہ کف کی ہے اور اس میں ایک سو دس آیات اور بارہ رکوع ہیں۔

بڑے مہربان اور سب سے زیادہ رحم کرنے والے اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں۔

تمام تعریفیں اسی اللہ کے لیے سزاوار ہیں جس نے اپنے بندے پر یہ قرآن اتارا اور اس میں کوئی کسر باقی نہ

وَقُلِ الصَّادِقُ الَّذِي لَمْ يَخُنْ وَاَلَمْ يَكُنْ لَكُمْ شَرِيكًا
فِي الْمُلْكِ وَاَلَمْ يَكُنْ لَهُ دُلِيٌّ مِنَ الذُّلِّ وَكَلِمَةً كَلِيمًا ۝۱۱۱



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهٖ الْكِتٰبَ وَوَلَّمْ یُعْجَلْ
لَهٗ عِوَجًا ۝۱۱۱

کر رہتے تھے، جب اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھاتے تو آواز قدرے بلند فرمائیے، مشرکین قرآن سن کر قرآن کو اور اللہ کو سب و شتم کرتے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اپنی آواز کو اتنا اونچا نہ کرو کہ مشرکین سن کر قرآن کو برا بھلا کہیں اور نہ آواز اتنی پست کرو کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی نہ سن سکیں۔ (البخاری۔ الصوحد۔ باب قول اللہ تعالیٰ اَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ وَالْمَلَائِكَةُ يَشْهَدُونَ۔ ومسلم 'الصلاة'۔ باب التوسط فی القراءة) خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ ہے کہ ایک رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہوا تو دیکھا کہ وہ پست آواز سے نماز پڑھ رہے ہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا تو وہ اونچی آواز سے نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سے پوچھا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں جس سے مصروف مناجات تھا، وہ میری آواز سن رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میرا مقصد سو توں کو جگانا اور شیطان کو بھگانا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا، اپنی آواز قدرے بلند کرو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا، اپنی آواز کچھ پست رکھو (مشکوٰۃ۔ باب صلوة اللیل۔ بحوالہ ابو داؤد ترمذی) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ آیت دعا کے بارے میں نازل ہوئی ہے (بخاری و مسلم، بحوالہ فتح القدیر)

☆ کف کے معنی غار کے ہیں۔ اس میں اصحاب کف کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، اس لیے اسے سورہ کف کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی دس آیات اور آخری دس آیات کی فضیلت احادیث میں بیان کی گئی ہے کہ جو ان کو یاد کرے اور پڑھے گا، وہ قنہ و جال سے محفوظ رہے گا، (صحیح مسلم، فضل سورۃ الکہف) اور جو اس کی تلاوت جمعے کے دن کرے گا تو آئندہ جمعے تک اس کے لیے ایک خاص نور کی روشنی رہے گی، (مستدرک حاکم، ۲/۳۶۸ و صحیحہ الألبانی)

چھوڑی۔^(۱)

بلکہ ہر طرح سے ٹھیک ٹھاک رکھا تاکہ اپنے^(۲) پاس کی سخت سزا سے ہوشیار کر دے اور ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبریاں سنا دے کہ ان کے لیے بہترین بدلہ ہے۔ (۲)

جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ (۳)

اور ان لوگوں کو بھی ڈرا دے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے۔^(۳)

درحقیقت نہ تو خود انہیں اس کا علم ہے نہ ان کے باپ دادوں کو۔ یہ تمہت^(۴) بڑی بری ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے وہ نرا جھوٹ بک رہے ہیں۔ (۵)

پس اگر یہ لوگ اس بات^(۵) پر ایمان نہ لائیں تو کیا آپ ان کے پیچھے اسی رنج میں اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے؟ (۶)

يَسْمَعُ الْيَتِيمَ الَّذِي يَدْعُوهُ يَتَذَكَّرُ لَّهُ وَ يُعِيذُ الْمُضَلِّينَ
الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنْ لَهُمْ أَجْرٌ حَسَنًا ﴿۱﴾

مَا كَيْفَ يَنْفَعُهُمْ فِيهِ وَابْتَدَأُ ﴿۲﴾

وَيَسْتَدِينُ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ﴿۳﴾

مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِآبَائِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً
تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنَّ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ﴿۴﴾

فَلَعَلَّكَ بَاحِثٌ خَفِيٍّ عَلَىٰ آثارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا

بِهَذَا الْحَدِيثِ أَنْعَمًا ﴿۵﴾

فی صحیح الجامع الصغیر نمبر ۷۴۷۰ اس کے پڑھنے سے گھر میں سکینت و برکت نازل ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے سورہ کف پڑھی گھر میں ایک جانور بھی تھا، وہ بدکنا شروع ہو گیا، انہوں نے غور سے دیکھا کہ کیا بات ہے؟ تو انہیں ایک بادل نظر آیا، جس نے انہیں ڈھانپ رکھا تھا، صحابیؓ نے اس واقعے کا ذکر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا، اسے پڑھا کرو۔ قرآن پڑھتے وقت سکینت نازل ہوتی ہے۔ (صحیح بخاری،

فضل سورۃ الکہف۔ مسلم 'کتاب الصلوٰۃ' باب نزول السکینۃ بقراءۃ القرآن)

(۱) یا کوئی کچی اور راہ اعتدال سے انحراف اس میں نہیں رکھا بلکہ اسے قیم یعنی سیدھا رکھا۔ یا قیم کے معنی، بندوں کے دینی و دنیوی مصالح کی رعایت و حفاظت کرنے والی کتاب۔

(۲) مِنْ لَدُنْهُ جو اس اللہ کی طرف سے صادر یا نازل ہونے والا ہے۔

(۳) جیسے یودیوں، عیسائیوں اور بعض مشرکین (فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں) کا عقیدہ ہے۔

(۴) اس کلمہ (تمہت) سے مراد یہی ہے کہ اللہ کی اولاد ہے جو نرا جھوٹ ہے۔

(۵) بِهَذَا الْحَدِيثِ (اس بات) سے مراد قرآن کریم ہے۔ کفار کے ایمان لانے کی جتنی شدید خواہش آپ ﷺ رکھتے تھے اور ان کے اعراض و گریز سے آپ ﷺ کو جو سخت تکلیف ہوتی تھی، اس میں آپ ﷺ کی اسی کیفیت اور جذبے کا اظہار ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لِّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ
أَحْسَنُ عَمَلًا ۝

وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُؤًا ۝

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيِّو كَانُوا مِن
إِلٰهِنَا عِجَابًا ۝

إِذْ أَدَّى الْقَبِيَّةَ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا مِن
كُنُوزِكَ رَحْمَةً وَهَيِّتْ لَنَا مِن أَمْرِنَا رَشَدًا ۝

روئے زمین پر جو کچھ ^(۱) ہے ہم نے اسے زمین کی رونق
کا باعث بنایا ہے کہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سے
کون نیک اعمال والا ہے۔ (۷)

اس پر جو کچھ ہے ہم اسے ایک ہموار صاف میدان کر
ڈالنے والے ہیں۔ ^(۸)

کیا تو اپنے خیال میں غار اور کتبے والوں کو ہماری نشانیوں
میں سے کوئی بہت عجیب نشانی سمجھ رہا ہے؟ ^(۹)

ان چند نوجوانوں نے جب غار میں پناہ لی تو دعا کی کہ
اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنے پاس سے رحمت
عطا فرما اور ہمارے کام میں ہمارے لیے راہ یابی کو
آسان کر دے۔ ^(۱۰)

(۱) روئے زمین پر جو کچھ ہے، حیوانات، جمادات، نباتات، معدنیات اور دیگر مدفون خزانے، یہ سب دنیا کی زینت اور
اس کی رونق ہیں۔

(۲) صَعِيدًا صاف میدان، جُرُؤًا بالکل ہموار، جس میں کوئی درخت وغیرہ نہ ہو۔ یعنی ایک وقت آئے گا کہ یہ دنیا اپنی
تمام تر رونقوں سمیت فنا ہو جائے گی اور روئے زمین ایک چٹیل اور ہموار میدان کی طرح ہو جائے گی، اس کے بعد ہم
نیک و بد کو ان کے عملوں کے مطابق جزا دیں گے۔

(۳) یعنی یہ واحد بڑی اور عجیب نشانی نہیں ہے۔ بلکہ ہماری ہر نشانی ہی عجیب ہے۔ یہ آسمان و زمین کی پیدائش اور اس کا
نظام، شمس و قمر اور کواکب کی تسخیر، رات اور دن کا آنا جانا اور دیگر بے شمار نشانیاں، کیا کم تعجب انگیز ہیں کھف، اس غار
کو کہتے ہیں جو پہاڑ میں ہوتا ہے۔ رقیم، بعض کے نزدیک اس بستی کا نام ہے جہاں سے یہ نوجوان گئے تھے، بعض کہتے ہیں
اس پہاڑ کا نام ہے جس میں غار واقع تھا بعض کہتے ہیں رَقِيمٌ بمعنی مَرْقُومٌ ہے اور یہ ایک تختی ہے لوہے یا سیسے کی، جس
میں اصحاب کف کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ اسے رقیم اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس پر نام تحریر ہیں۔ حالیہ تحقیق سے معلوم
ہوا کہ پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ جس پہاڑ میں یہ غار واقع ہے اس کے قریب ہی ایک آبادی ہے جسے اب الرقیب کہا جاتا
ہے جو مرور زمانہ کے سبب الرقیم کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

(۴) یہ وہی نوجوان ہیں جنہیں اصحاب کف کہا گیا، (تفصیل آگے آرہی ہے) انہوں نے جب اپنے دین کو بچاتے ہوئے
غار میں پناہ لی تو یہ دعا مانگی۔ اصحاب کف کے اس قصے میں نوجوانوں کے لیے بڑا سبق ہے، آج کل کے نوجوانوں کا بیشتر
وقت فضولیات میں برباد ہوتا ہے اور اللہ کی طرف کوئی توجہ نہیں۔ کاش! آج کے مسلمان نوجوان اپنی جوانیوں کو اللہ کی
عبادت میں صرف کریں۔

پس ہم نے ان کے کانوں پر گنتی کے کئی سال تک اسی غار میں پردے ڈال دیے۔ (۱۱)

پھر ہم نے انہیں اٹھا کھڑا کیا کہ ہم یہ معلوم کر لیں کہ دونوں گروہ میں سے اس انتہائی مدت کو جو انہوں نے گزاری کس نے زیادہ (۱۲) یاد رکھی ہے۔ (۱۳)

ہم ان کا صحیح واقعہ تیرے سامنے بیان فرما رہے ہیں۔ یہ چند نوجوان (۱۴) اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں ترقی دی تھی۔ (۱۳)

ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیے (۱۴) تھے جبکہ یہ اٹھ

فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ۝

ثُمَّ بَدَّلْنَا لَمْ تَمُرُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي كَانُوا فِيهِ ۝

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُم بِالْحَقِّ إِنَّهُمْ فِتْنَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ
وَرَزَقْنَاهُمْ هُدًى ۝

وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَوَاتِ

(۱) یعنی کانوں پر پردے ڈال کر ان کے کانوں کو بند کر دیا تاکہ باہر کی آوازوں سے ان کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے انہیں گہری نیند سلا دیا۔

(۲) ان دو گروہوں سے مراد اختلاف کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ یا تو اسی دور کے لوگ تھے جن کے درمیان ان کی بابت اختلاف ہوا، یا بعد رسالت کے مومن و کافر مراد ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اصحاب کف ہی ہیں ان کے دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ ہم اتنا عرصہ سوئے رہے۔ دوسرا، اس کی نفی کرتا اور فریق اول سے کم و بیش مدت بتلاتا۔

(۳) اب اجمال کے بعد تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔ یہ نوجوان، بعض کہتے ہیں عیسائیت کے پیروکار تھے اور بعض کہتے ہیں کہ ان کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ کہتے ہیں ایک بادشاہ تھا، دقیانوس، جو لوگوں کو بتوں کی عبادت کرنے اور ان کے نام کی نذر نیاز دینے کی ترغیب دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان چند نوجوانوں کے دلوں میں یہ بات ڈال دی کہ عبادت کے لائق تو صرف ایک اللہ ہی ہے جو آسمان و زمین کا خالق اور کائنات کا رب ہے۔ فِتْنَةٌ جمع قلت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد ۹ یا اس سے بھی کم تھی۔ یہ الگ ہو کر کسی ایک جگہ اللہ واحد کی عبادت کرتے آہستہ آہستہ لوگوں میں ان کے عقیدہ توحید کا چرچا ہوا، تو بادشاہ تک بات پہنچ گئی اور اس نے انہیں اپنے دربار میں طلب کر کے ان سے پوچھا، تو وہاں انہوں نے برملا اللہ کی توحید بیان کی۔ بالآخر پھر بادشاہ اور اپنی مشرک قوم کے ڈر سے اپنے دین کو بچانے کے لیے آبادی سے دور ایک پہاڑ کے غار میں پناہ گزین ہو گئے، جہاں اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند مسلط کر دی اور وہ تین سو نو (۳۰۹) سال وہاں سوئے رہے۔

(۴) یعنی ہجرت کرنے کی وجہ سے اپنے خویش و اقارب کی جدائی اور عیش و راحت کی زندگی سے محرومی کا جو صدمہ انہیں اٹھانا پڑا، ہم نے ان کے دل کو مضبوط کر دیا تاکہ وہ ان شدائد کو برداشت کر لیں۔ نیز حق گوئی کا فریضہ بھی جرات اور حوصلے سے ادا کر سکیں۔

کھڑے ہوئے^(۱) اور کہنے لگے کہ ہمارا پروردگار تو وہی ہے جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے، ناممکن ہے کہ ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو پکاریں اگر ایسا کیا تو ہم نے نہایت ہی غلط بات کہی۔^(۲) (۱۳)

یہ ہے ہماری قوم جس نے اس کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں۔ ان کی خدائی کی یہ کوئی صاف دلیل کیوں پیش نہیں کرتے اللہ پر جھوٹ افترا باندھنے والے سے زیادہ ظالم کون ہے؟ (۱۵)

جبکہ تم ان سے اور اللہ کے سوا ان کے اور معبودوں سے کنارہ کش ہو گئے تو اب تم کسی غار میں^(۳) جا بیٹھو، تمہارا رب تم پر اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے لیے تمہارے کام میں سہولت مہیا کر دے گا۔ (۱۶)

آپ دیکھیں گے کہ آفتاب بوقت طلوع ان کے غار سے دائیں جانب کو جھک جاتا ہے اور بوقت غروب ان کے بائیں جانب کترا جاتا ہے اور وہ اس غار کی کشادہ جگہ میں ہیں۔^(۴) یہ اللہ کی نشانیوں میں سے

وَالْأَرْضِ لَنُؤْتِيَنَّهَا مِنْ دُونِهَا وَلَهَا قَلْبًا وَإِنَّا لَنَاطِقُوا

هَؤُلَاءِ قَوْمًا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لَوْ لَآ يَأْتُونَ عَلَيْهِمْ
بِسُلْطٰنٍ بَيِّنٍ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلٰى اللّٰهِ كَذِبًا ۝

وَإِذْ اعْتزَلْتُمُوهُمْ وَمَاعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأَلَّا إِلَى الْكَهْفِ
يَسْتَرْكُمُ رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيُهَيِّئُ لَكُمْ مِنْ أَمْرِهِ مَرَجًا ۝

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَوْرِعُنَ مِنْ مَكْنَعِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ
وَإِذَا غَرَبَتْ تَقَرَّبُ مِنْ ذَاتِ الشَّمَالِ وَهُمْ فِي كَفْوٍ وَتَمَّتْ ذٰلِكَ
مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ لَعَلَّ مَنْ يَهْتَدِي اللّٰهُ هُوَ الْمُهْتَدٰى وَمَنْ يُضَلِّ

(۱) اس قیام سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک وہ ظلی ہے، جو بادشاہ کے دربار میں ان کی ہوئی اور بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر انہوں نے توحید کا یہ وعظ بیان کیا، بعض کہتے ہیں کہ شہر سے باہر آپس میں ہی کھڑے، ایک دوسرے کو توحید کی وہ بات سنائی، جو فرداً فرداً اللہ کی طرف سے ان کے دلوں میں ڈالی گئی اور یوں اہل توحید باہم اکٹھے ہو گئے۔

(۲) سَطَطًا کے معنی جھوٹ کے یا حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔

(۳) یعنی جب تم نے اپنی قوم کے معبودوں سے کنارہ کشی کر لی ہے، تو اب جسمانی طور پر بھی ان سے علیحدگی اختیار کر لو۔ یہ اصحاب کف نے آپس میں کہا۔ چنانچہ اس کے بعد وہ ایک غار میں جا چھپے، جب ان کے غائب ہونے کی خبر مشہور ہوئی تو تلاش کیا گیا، لیکن وہ اسی طرح ناکام رہے، جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں کفار مکہ غار ثور تک پہنچ جانے کے باوجود، جس میں آپ ﷺ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ موجود تھے، ناکام رہے تھے۔

(۴) یعنی سورج طلوع کے وقت دائیں جانب کو اور غروب کے وقت بائیں جانب کو کترا کے نکل جاتا اور یوں دونوں وقتوں میں ان پر دھوپ نہ پڑتی، حالانکہ وہ غار میں کشادہ جگہ پر محو استراحت تھے۔ فَجَوِّدَ کے معنی ہیں کشادہ جگہ۔

فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّرْسِدًا ۝

ہے۔^(۱) اللہ تعالیٰ جس کی رہبری فرمائے وہ راہ راست پر ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے ناممکن ہے کہ آپ اس کا کوئی کارساز اور رہنما پاسکیں۔^(۲) (۱۷)

آپ خیال کرتے کہ وہ بیدار ہیں، حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے،^(۳) خود ہم ہی انہیں دائیں بائیں کروٹیں دلایا کرتے تھے،^(۴) ان کا کتا بھی چوکھٹ پر اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔ اگر آپ جھانک کر انہیں دیکھنا چاہتے تو ضرور اٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور ان کے رعب سے آپ پر دہشت چھا جاتی۔^(۵) (۱۸)

اسی طرح ہم نے انہیں جگا کر اٹھادیا^(۶) کہ آپس میں پوچھ گچھ کر لیں۔ ایک کہنے والے نے کہا کہ کیوں بھی تم کتنی دیر ٹھہرے رہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایک دن یا ایک دن سے بھی کم۔^(۷) کہنے لگے کہ تمہارے ٹھہرے

وَتَحْسَبُهُمْ آيَاتًا وَهُمْ رُجُودٌ ۖ وَنَعْلَمُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ
وَذَاتَ الشِّمَالِ ۗ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَيْبِ ۖ لَوِ اتَّخَذَتِ
عَلَيْهِمْ لَوْكَيْتَ ۖ مِنْهُمْ فِرَارًا وَكَلِمَاتٍ مِنْهُمْ رُغْبًا ۝

وَكَذَلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ
كَمْ لَيْلَتُمْ قَالُوا لَيْلَتَيْنِ يَوْمًا أَوْ بَعْضُ يَوْمٍ قَالُوا رُبَّمَا
أَعْلَمُ بِمَا لَيْسْتُمْ قَابِعْتُمْ أَحَدَكُمْ بَورِقِكُمْ هُنَا ۖ

(۱) یعنی سورج کا اس طرح نکل جانا کہ باوجود کھلی جگہ ہونے کے وہاں دھوپ نہ پڑے، اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔

(۲) جیسے دقیا نوس بادشاہ اور اس کے پیروکار ہدایت سے محروم رہے تو کوئی انہیں راہ یاب نہیں کر سکا۔

(۳) اَيْقَاطٌ، يَقِطُّ کی جمع اور رُجُودٌ، رَاقِدٌ کی جمع ہے وہ بیدار اس لیے محسوس ہوتے تھے کہ ان کی آنکھیں کھلی ہوتی تھیں، جس طرح جاگنے والے شخص کی ہوتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ زیادہ کروٹیں بدلنے کی وجہ سے وہ بیدار بیدار نظر آتے تھے۔

(۴) تاکہ ان کے جسموں کو مٹی نہ کھا جائے۔

(۵) یہ ان کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انتظام تھا تاکہ کوئی ان کے قریب نہ جاسکے۔

(۶) یعنی جس طرح ہم نے انہیں اپنی قدرت سے سلا دیا تھا، اسی طرح تین سو نو سال کے بعد ہم نے انہیں اٹھادیا اور اس حال میں اٹھادیا کہ ان کے جسم اسی طرح صحیح تھے، جس طرح تین سو سال قبل سوئے وقت تھے، اسی لیے آپس میں ایک دوسرے سے انہوں نے سوال کیا۔

(۷) گویا جس وقت وہ غار میں داخل ہوئے، صبح کا پہلا پھر تھا اور جب بیدار ہوئے تو دن کا آخری پھر تھا، یوں وہ سمجھے کہ شاید ہم ایک دن یا اس سے بھی کم، دن کا کچھ حصہ سوئے رہے۔

رہنے کا بخوبی علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔^(۱) اب تو تم اپنے میں سے کسی کو اپنی یہ چاندی دے کر شر بھیجو وہ خوب دیکھ بھال لے کہ شر کا کون سا کھانا پاکیزہ تر ہے،^(۲) پھر اسی میں سے تمہارے کھانے کے لیے لے آئے، اور وہ بہت احتیاط اور نرمی برتتے اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔^(۳) (۱۹)

اگر یہ کافر تم پر غلبہ پالیں تو تمہیں سنسار کر دیں گے یا تمہیں پھر اپنے دین میں لوٹالیں گے اور پھر تم کبھی بھی کامیاب نہ ہو سکو گے۔^(۴) (۲۰)

ہم نے اس طرح لوگوں کو ان کے حال سے آگاہ کر^(۵) دیا کہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ بالکل سچا ہے اور

إِلَى الْمَدِينَةِ فَلَیُنظَرُنَّهَا أَزْکٰی طَعَامًا فَلْيَأْكُلُوهُ بِرِزْقِ
بَيْنَهُ وَلَیْسَتْ أَكْلُفٌ وَلَا یُشْعِرُونَ بِكُمْ أَحَدًا ۝۱۹

إِنَّمُورَانِ یُظْهِرُوا عَلَیْكُمْ بِرِجْمُوتِهِمْ أَوْ یُعِیْدُوا كَلِمًا
فِی سَلْبَتِهِمْ وَلٰكِنْ تُفْلِحُوا إِذْ أَبَدْنَا ۝۲۰

وَكَذٰلِكَ أَعْتَرْنَا عَلَیْهِمْ لَیْلَعَلْمُوا أَنَّهُ وَعَدَّا اللّٰهُ حَقًّا
وَإِنَّ السَّاعَةَ لَآ رَبِّیْبٌ فِیْهَا لَأَذِیْتَتَأَذَعُونَ

(۱) تاہم کثرت نوم کی وجہ سے وہ سخت ترس میں رہے اور بالآخر معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا کہ وہی صحیح مدت جانتا ہے۔
(۲) بیدار ہونے کے بعد، خوراک جو انسان کی سب سے اہم ضرورت ہے، اس کا سرو سامان کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔
(۳) احتیاط اور نرمی کی تاکید اسی اندیشے کے پیش نظر کی، جس کی وجہ سے وہ شر سے نکل کر ایک ویرانے میں آئے تھے۔ اسے تاکید کی کہ کہیں اس کے رویے سے شر والوں کو ہمارا علم نہ ہو جائے اور کوئی نئی افتاد ہم پر نہ آ پڑے، جیسا کہ اگلی آیت میں ہے۔

(۴) یعنی آخرت کی جس کامیابی کے لیے ہم نے یہ صعوبت، مشقت برداشت کی، ظاہر بات ہے کہ اگر اہل شر نے ہمیں مجبور کر کے پھر آہائی دین کی طرف لوٹا دیا، تو ہمارا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا، ہماری محنت بھی برباد جائے گی اور ہم نہ دین کے رہیں گے نہ دنیا کے۔

(۵) یعنی جس طرح ہم نے انہیں سلا یا اور جگایا، اسی طرح ہم نے لوگوں کو ان کے حال سے آگاہ کر دیا۔ بعض روایت کے مطابق یہ آگاہی اس طرح ہوئی کہ جب اصحاب کف کا ایک ساتھی چاندی کا وہ سکہ لے کر شر گیا، جو تین سو سال قبل کے بادشاہ دقیانوس کے زمانے کا تھا اور وہ سکہ اس نے ایک دکاندار کو دیا، تو وہ حیران ہوا، اس نے ساتھ کی دکان والے کو دکھایا، وہ بھی دیکھ کر حیران ہوا، جب کہ اصحاب کف کا ساتھی یہ کتنا رہا کہ میں اسی شر کا باشندہ ہوں اور کل ہی یہاں سے گیا ہوں، لیکن اس ”کل“ کو تین صدیاں گزر چکی تھیں، لوگ کس طرح اس کی بات مان لیتے؟ لوگوں کو شبہ گزرا کہ کہیں اس شخص کو مد فون ترزا نہ ملا ہو۔ شدہ شدہ بات بادشاہ یا حاکم مجاز تک پہنچی اور اس ساتھی کی مدد سے وہ غار تک پہنچا اور اصحاب کف سے ملاقات کی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں پھر وہیں وقت دیدی (ابن کثیر)

قیامت میں کوئی شک و شبہ نہیں۔^(۱) جبکہ وہ اپنے امر میں آپس میں اختلاف کر رہے^(۲) تھے کئے گئے ان کے غار پر ایک عمارت بنا لو۔^(۳) ان کا رب ہی ان کے حال کا زیادہ عالم^(۴) ہے۔ جن لوگوں نے ان کے بارے میں غلبہ پایا وہ کئے گئے کہ ہم تو ان کے آس پاس مسجد بنا لیں گے۔^(۵) (۲۱)

کچھ لوگ تو کہیں گے کہ اصحاب کف تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ کچھ کہیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا،^(۶) غیب کی باتوں میں انکل (کے تیرتکے)

بَيَّنَّهُمْ أَمْرُهُمْ قَالُوا إِنَّمَا عَلَيْنَا دِينُ اللَّهِ مِثْلَ قَوْمِ آلِ فِرْعَوْنَ هُمْ عَلَىٰ آلِهِمْ عَلَىٰ غَيْرِ مَا عَلِمُوا لَمْ يُؤْمِنُوا
أَعْمَهُمْ يَوْمَهُمْ قَالَ الَّذِينَ عَذَّبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ
لَنَنْتَحِدَنَّ عَلَيْهِمْ مَسْجِدًا ①

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّاغِبُونَ إِلَىٰ آلِهِمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ
سَاءَ مَا كَفَبَهُمْ رَبِّمَا بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَنَأْمُومُهُمْ

(۱) یعنی اصحاب کف کے اس واقعے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قیامت کے وقوع اور بعث بعد الموت کا وعدہ الہی سچا ہے۔ منکرین کے لیے اس واقعے میں اللہ کی قدرت کا ایک نمونہ موجود ہے۔

(۲) اِذْ يَا تُوَظَّرُفَ هَۡ اَعَزَّنَا كَا، یعنی ہم نے انہیں اس وقت ان کے حال سے آگاہ کیا، جب وہ بعث بعد الموت یا وقوع قیامت کے بارے میں آپس میں جھگڑ رہے تھے یا یہاں اَذْكُرْ مَحْذُوفَ هَۡ، یعنی وہ وقت یاد کرو، جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

(۳) یہ کہنے والے کون تھے، بعض کہتے ہیں کہ اس وقت کے اہل ایمان تھے، بعض کہتے ہیں کہ بادشاہ اور اس کے ساتھی تھے، جب جا کر انہوں نے ملاقات کی اور اس کے بعد اللہ نے انہیں پھر سلا دیا، تو بادشاہ اور اس کے ساتھیوں نے کہا کہ ان کی حفاظت کے لیے ایک عمارت بنا دی جائے۔

(۴) جھگڑا کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی بابت صحیح علم صرف اللہ ہی کو ہے۔

(۵) یہ غلبہ حاصل کرنے والے اہل ایمان تھے یا اہل کفر و شرک؟ شوکانی نے پہلی رائے کو ترجیح دی ہے اور ابن کثیر نے دوسری رائے کو۔ کیونکہ صالحین کی قبروں پر مسجدیں تعمیر کرنا اللہ کو پسند نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا «لَعَنَ اللَّهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيهِمْ مَسَاجِدَ» (البخاری، کتاب الجنائز، باب ما یکرہ من اتخاذا المساجد علی القبور۔ ومسلم، کتاب المساجد واتخاذا الصور فیہا) «اللہ تعالیٰ یوروو نصاریٰ پر لعنت فرمائے، جنہوں نے اپنے پیغمبروں اور صالحین کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا» حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت میں عراق میں حضرت دانیال علیہ السلام کی قبر دریافت ہوئی تو آپ نے حکم دیا کہ اسے چھپا کر عام قبروں جیسا کر دیا جائے۔ تاکہ لوگوں کے علم میں نہ آئے کہ فلاں قبر فلاں پیغمبر کی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

(۶) یہ کہنے والے اور ان کی مختلف تعداد بتلانے والے عمد رسالت کے مؤمن اور کافر تھے، خصوصاً اہل کتاب جو کتب سلویہ سے آگاہی اور علم کا دعویٰ رکھتے تھے۔

چلاتے ہیں، (۱) کچھ کہیں گے کہ وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا (۲) ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ میرا پروردگار ان کی تعداد کو بخوبی جاننے والا ہے، انہیں بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں۔ پس آپ ان کے مقدمے میں صرف سرسری گفتگو ہی کریں (۳) اور ان میں سے کسی سے ان کے بارے میں پوچھ گچھ بھی نہ کریں۔ (۴) (۲۲)

اور ہرگز ہرگز کسی کام پر یوں نہ کہنا کہ میں اسے کل کروں گا۔ (۲۳)

مگر ساتھ ہی انشاء اللہ کہہ لینا۔ (۴) اور جب بھی بھولے،

كَلِمَهُمْ ۗ قُلْ رَبِّيَ اعْلَمُ بَعْدَ تَيْبَتِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ
فَلَا تَمَارِقِيهِمْ الْاَوْرَاءُ ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ
فِيهِمْ وَنَهْمُ احَدًا ۙ

وَلَا تَعْوَلْنَ لِبَشَائِرِ اٰنِي فَاعِلٌ ذٰلِكَ عَذَابُ ۙ

اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ ۗ وَاذْكُرْ رَبَّكَ اِذَا نَسِيتَ ۗ وَقُلْ عَنِّي

(۱) یعنی علم، ان میں سے کسی کے پاس نہیں ہے، جس طرح بغیر دیکھے کوئی پتھر مارے، یہ بھی اسی طرح اٹکل پچو باتیں کر رہے ہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے صرف تین قول بیان فرمائے، پہلے دو قولوں کو رَجْمًا بِالْغَيْبِ (ظن و تخمین) کہہ کر ان کو کمزور رائے قرار دیا اور اس تیسرے قول کا ذکر اس کے بعد کیا جس سے بعض اہل تفسیر نے یہ استدلال کیا ہے کہ یہ انداز اس قول کی صحت کی دلیل ہے اور فی الواقع ان کی اتنی ہی تعداد تھی (ابن کثیر)

(۳) بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ وہ کہتے تھے میں بھی ان کم لوگوں میں سے ہوں جو یہ جانتے ہیں کہ اصحاب کف کی تعداد کتنی تھی؟ وہ صرف سات تھے جیسا کہ تیسرے قول میں بتلایا گیا ہے (ابن کثیر)

(۴) یعنی صرف ان ہی باتوں پر اکتفاء کریں جن کی اطلاع آپ کو وحی کے ذریعے سے کر دی گئی ہے۔ یا تعین عدد میں بحث و تکرار نہ کریں، صرف یہ کہہ دیں کہ اس تعین کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۵) یعنی بحث کرنے والوں سے ان کی بابت کچھ نہ پوچھیں، اس لیے کہ جس سے پوچھا جائے، اس کو پوچھنے والے سے زیادہ علم ہونا چاہیے، جب کہ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تو پھر بھی یقینی علم کا ایک ذریعہ۔ وحی۔ موجود ہے، جب کہ دوسروں کے پاس فنون و ادہام کے سوا کچھ نہیں۔

(۶) مفسرین کہتے ہیں کہ یہودیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تین باتیں پوچھی تھیں، روح کی حقیقت کیا ہے اور اصحاب کف اور ذوالقرنین کون تھے؟ کہتے ہیں کہ یہی سوالات اس سورت کے نزول کا سبب بنے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں تمہیں کل جواب دوں گا، لیکن اس کے بعد ۱۵ دن تک جبریل وحی لے کر نہیں آئے۔ پھر جب آئے تو اللہ تعالیٰ نے

أَنْ يَهْدِيَنِّي رَبِّي لِاقْرَبَ مِنْ هَذَا رَشَدًا ۝

اپنے پروردگار کی یاد کر لیا کرنا^(۱) اور کہتے رہنا کہ مجھے پوری امید ہے کہ میرا رب مجھے اس سے بھی زیادہ ہدایت کے قریب کی بات کی رہبری کرے۔^(۲) (۲۳)
وہ لوگ اپنے غار میں تین سو سال تک رہے اور نو سال اور زیادہ گزارے۔^(۳) (۲۵)

وَإِسْوَافٍ كُفُوهٍ ۚ تِلْكَ آيَاتُ الْقُرْآنِ وَإِنَّا ذُكِّرْتُمَا ۝

آپ کہہ دیں اللہ ہی کو ان کے ٹھہرے رہنے کی مدت کا بخوبی علم ہے، آسمانوں اور زمینوں کا غیب صرف اسی کو حاصل ہے وہ کیا ہی اچھا دیکھنے سننے والا ہے۔^(۴) سوائے اللہ کے ان کا کوئی مددگار نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ (۲۶)

قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَيْسُوا لَهُ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَبْصُرُهُ وَأَسْمِعُ مِمَّا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ قَلِيلٍ
وَلَا يُشِيرُونَ فِي حِكْمِهِ أَحَدًا ۝

تیری جانب جو تیرے رب کی کتاب وحی کی گئی ہے اسے

وَأَنْتَ مَا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا يُبَدِّلُ لِكَلِمَاتِهِ

ان شاء اللہ کہنے کا یہ حکم دیا۔ آیت میں کل (غد) سے مراد مستقبل ہے یعنی جب بھی مستقبل قریب یا بعید میں کوئی کام کرنے کا عزم کرو تو ان شاء اللہ ضرور کما کرو۔ کیونکہ انسان کو تو پتہ نہیں کہ وہ جس بات کا عزم ظاہر کر رہا ہے، اس کی توفیق بھی اسے اللہ کی مشیت سے ملنی ہے یا نہیں؟

(۱) یعنی اگر کلام یا وعدہ کرتے وقت ان شاء اللہ کہنا بھول جاؤ، تو جس وقت بھی یاد آجائے ان شاء اللہ کہہ لو، یا پھر رب کو یاد کرنے کا مطلب، اس کی تسبیح و تحمید اور اس سے استغفار ہے۔

(۲) یعنی میں جس کا عزم ظاہر کر رہا ہوں، ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ بہتر اور مفید کام کی طرف میری رہنمائی فرمادے۔

(۳) جمہور مفسرین نے اسے اللہ کا قول قرار دیا ہے۔ شمسی حساب سے ۳۰۰ اور قمری حساب سے ۳۰۹ سال بنتے ہیں۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ یہ انہی لوگوں کا قول ہے جو ان کی مختلف تعداد بتلاتے تھے، جس کی دلیل اللہ کا یہ قول ہے ”اللہ ہی کو ان کے ٹھہرے رہنے کی مدت کا بخوبی علم ہے“ جس کا مطلب وہ مذکورہ مدت کی نفی لیتے ہیں۔ لیکن جمہور کی تفسیر کے مطابق اس کا مفہوم یہ ہے کہ اہل کتاب یا کوئی اور، اس بتلائی ہوئی مدت سے اختلاف کرے، تو آپ ان سے کہہ دیں کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ جب اس نے تین سو نو سال مدت بتلائی ہے تو یہی صحیح ہے کیونکہ وہی جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت غار میں رہے؟

(۴) یہ اللہ کی صفت علم و خبری کی مزید وضاحت ہے۔

پڑھتا رہ،^(۱) اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں تو اس کے سوا ہرگز ہرگز کوئی پناہ کی جگہ نہ پائے گا۔^(۲) (۲۷)

اور اپنے آپ کو انہیں کے ساتھ رکھا کر جو اپنے پروردگار کو صبح شام پکارتے ہیں اور اسی کے چہرے کے ارادے رکھتے ہیں (رضامندی چاہتے ہیں) 'خبردار! تیری نگاہیں ان سے نہ ہٹنے پائیں'^(۳) کہ دنیوی زندگی کے ٹھاٹھ کے ارادے میں لگ جا۔ دیکھ اس کا کہنا نہ ماننا جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہش کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور جس کا کام حد سے گزر چکا ہے۔^(۵) (۲۸)

وَلٰكِنْ يَّحَدِّثُ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا ۝

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدْوَةِ
وَالْعَيْشِيِّ بَرِيْدًا وَّوَجْهًا ۚ وَلَا تَعْدُ عَيْنُكَ عَنْهُمْ
تُرِيْدُ رِيْبَةَ الْعِيْبَةِ الدُّنْيَا ۗ وَلَا تَطْلُمَنَّ
عَنْ دِكْرِنَا ۚ وَاتَّبِعْ هَوَاهُ ۗ وَكَانَ اَمْرًا فُتُوْطًا ۝

(۱) ویسے تو یہ حکم عام ہے کہ جس چیز کی بھی وحی آپ ﷺ کی طرف کی جائے، اس کی تلاوت فرمائیں اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں۔ لیکن اصحاب کف کے قصے کے خاتمے پر اس حکم سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اصحاب کف کے بارے میں لوگ جو چاہیں، کہتے پھریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں اپنی کتاب میں جو کچھ اور جتنا کچھ بیان فرما دیا ہے، وہی صحیح ہے، وہی لوگوں کو پڑھ کر سنا دیجئے، اس سے زیادہ، دیگر باتوں کی طرف دھیان نہ دیجئے۔

(۲) یعنی اگر اسے بیان کرنے سے گریز و انحراف کیا، یا اس کے کلمات میں تغیر و تبدیلی کی کوشش کی، تو اللہ سے آپ کو بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔ خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اصل مخاطب امت ہے۔

(۳) یہ وہی حکم ہے جو اس سے قبل سورۃ الأنعام، ۵۲ میں گزر چکا ہے۔ مراد ان سے وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جو غریب اور کمزور تھے، جن کے ساتھ بیٹھنا اشراف قریش کو گوارا نہ تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم چھ آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، میرے علاوہ بلال، ابن مسعود، ایک ہڈی اور دو صحابہ رضی اللہ عنہم اور تھے۔ قریش مکہ نے خواہش ظاہر کی کہ ان لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹا دو تاکہ ہم آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کی بات سنیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں آیا کہ چلو شاید میری بات سننے سے ان کے دلوں کی دنیا بدل جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے سختی کے ساتھ ایسا کرنے سے منع فرما دیا (صحیح مسلم۔ فضائل الصحابة، باب فضل سعد بن ابی وقاص)

(۴) یعنی ان کو دور کر کے آپ اصحاب شرف و اہل غنی کو اپنے قریب کرنا چاہتے ہیں؟

(۵) فُتُوْطًا: اگر افراط سے ہو تو معنی ہوں گے حد سے تجاوز اور اگر تفریط سے ہو تو معنی ہوں گے کہ ان کا کام تفریط پر مبنی ہے، جس کا نتیجہ ضیاع اور ہلاکت ہے۔

اور اعلان کر دے کہ یہ سراسر برحق قرآن تمہارے رب کی طرف سے ہے۔ اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ ظالموں کے لیے ہم نے وہ آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قاتمیں انہیں گھیر لیں گی۔ اگر وہ فریادری چاہیں گے تو ان کی فریادری اس پانی سے کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہو گا جو چہرے بھون دے گا، بڑا ہی برا پانی ہے اور بڑی بری آرام گاہ (دوزخ) ہے۔ (۲۹)

یقیناً جو لوگ ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں تو ہم کسی نیک عمل کرنے والے کا ثواب ضائع نہیں کرتے۔^(۱) (۳۰)

ان کے لیے ہمیشگی والی جنتیں ہیں، ان کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، وہاں یہ سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے^(۲) اور سبز رنگ کے نرم و باریک اور موٹے ریشم کے لباس پہنیں گے،^(۳) وہاں تختوں کے اوپر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے۔ کیا خوب بدلہ ہے، اور کس قدر عمدہ آرام گاہ ہے۔ (۳۱)

اور انہیں ان دو شخصوں کی مثال بھی سنا دے^(۴) جن میں

وَقِيلَ اسْقُ مِنْ رَيْكُم مِّمَّنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ اِنَّا نَاظِرِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهَمَّ سُرَادِهَا وَانْ يَسْتَعِيْبُوا يَمَانًا ثَوَابِهَا كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ لِيُشَّ الشَّرَابُ وَسَاءَتْ مُرْتَقَقًا ﴿۳۰﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۱﴾

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنَّتٌ عَدْنٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَكُوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرٍ مِنْ ذَهَبٍ وَيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خَضْرَآءٍ مِنْ سُندُسٍ وَّاسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِيْنَ فِيْهَا عَلِ الْاَرَآئِكِ نَعْمَ الثَّوَابُ وَحَسْبَتْ مُرْتَقَقًا ﴿۳۱﴾

وَاٰمِرٌۢ بِهِمْ مَّمْلٰكٌ رَّجُلِيْنٌ جَعَلْنَا الْاَحَدِيْهِمَا جَنَّتِيْنِ

(۱) قرآن کے انداز بیان کے مطابق جہنمیوں کے ذکر کے بعد اہل جنت کا تذکرہ ہے تاکہ لوگوں کے اندر جنت حاصل کرنے کا شوق و رغبت پیدا ہو۔

(۲) زمانہ نزول قرآن اور اس سے ما قبل رواج تھا کہ بادشاہ، رؤسا اور سرداران قبائل اپنے ہاتھوں میں سونے کے کڑے پہنتے تھے، جس سے ان کی امتیازی حیثیت نمایاں ہوتی تھی۔ اہل جنت کو بھی جنت میں کڑے پہنائے جائیں گے۔

(۳) سندس، باریک ریشم اور استبرق موٹا ریشم۔ دنیا میں مردوں کے لیے سونا اور ریشمی لباس ممنوع ہیں، جو لوگ اس حکم پر عمل کرتے ہوئے دنیا میں ان محرمات سے اجتناب کریں گے، انہیں جنت میں یہ ساری چیزیں میسر ہوں گی۔ وہاں کوئی چیز ممنوع نہیں ہوگی بلکہ اہل جنت جس چیز کی خواہش کریں گے، وہ موجود ہوگی۔ ﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهُۥٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدْعُوْنَ﴾ ”جس چیز کو تمہارا جی چاہے اور جو کچھ تم مانگو سب جنت میں موجود ہے“

(۴) مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ دو شخص کون تھے؟ اللہ تعالیٰ نے تقسیم کے لیے بطور مثال ان کا تذکرہ کیا ہے

سے ایک کو ہم نے دو باغ انگوروں کے دے رکھے تھے اور جنہیں کھجوروں کے درختوں سے ہم نے گھیر رکھا^(۱) تھا اور دونوں کے درمیان کھیتی لگا رکھی تھی۔^(۲) (۳۲)

دونوں باغ اپنا پھل خوب لائے اور اس میں کسی طرح کی کمی نہ کی^(۳) اور ہم نے ان باغوں کے درمیان نرجاری کر رکھی تھی۔^(۴) (۳۳)

الغرض اس کے پاس میوے تھے، ایک دن اس نے باتوں ہی باتوں میں اپنے ساتھی^(۵) سے کہا کہ میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور جتنے^(۶) کے اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط ہوں۔ (۳۴)

اور یہ اپنے باغ میں گیا اور تھا اپنی جان پر ظلم کرنے والا۔ کہنے لگا کہ میں خیال نہیں کر سکتا کہ کسی وقت بھی یہ برباد ہو جائے۔ (۳۵)

اور نہ میں قیمت کو قائم ہونے والی خیال کرتا ہوں اور اگر (بالغرض) میں اپنے رب کی طرف لوٹا یا بھی گیا تو یقیناً

مِنْ عَنَابٍ وَحَقْفَةٍ مَّا سَخِلَ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَبَدًا ﴿۳۲﴾

كَلَّمَا الْجَنَّتَيْنِ أَنْتَ أَكْلُهُمَا وَلَوْ نَظَلَّمْ مِنْهُ شَيْئًا وَفَجَّرْنَا خِلْفَهُمَا نَهْرًا ﴿۳۳﴾

وَكَانَ لَهُ شَمْرٌ فَقَالَ لِمَ صَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَادِرُكَ أَأَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَأَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾

وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ قَالَ مَا أَظُنُّ أَنْ تَبِيدَ هَذِهِ أَبَدًا ﴿۳۵﴾

وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِنْ رُودْتُ إِلَىٰ رَبِّي لَأَكِيدَنَّ

یا واقعی دو شخص ایسے تھے؟ اگر تھے تو یہ بنی اسرائیل میں گزرے ہیں یا اہل مکہ میں سے تھے، ان میں ایک مؤمن اور دوسرا کافر تھا۔

(۱) جس طرح چار دیواری کے ذریعے سے حفاظت کی جاتی ہے، اس طرح ان باغوں کے چاروں طرف کھجوروں کے درخت تھے، جو باڑ اور چار دیواری کا کام دیتے تھے۔

(۲) یعنی دونوں باغوں کے درمیان کھیتی تھی جن سے غلہ جات کی فصلیں حاصل کی جاتی تھیں۔ یوں دونوں باغ غلے اور میووں کے جامع تھے۔

(۳) یعنی اپنی پیداوار میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے بلکہ بھرپور پیداوار دیتے تھے۔

(۴) تاکہ باغوں کو سیراب کرنے میں کوئی انقطاع واقع نہ ہو۔ یا بارانی علاقوں کی طرح بارش کے محتاج نہ رہیں۔

(۵) یعنی باغوں کے مالک نے، جو کافر تھا، اپنے ساتھی سے کہا جو مؤمن تھا۔

(۶) نَفَرٌ (جتنے) سے مراد اولاد اور نوکر چاکر ہیں۔

حَيَّرْنَا مِنْهَا مَنَعَلِبًا ﴿٦﴾

میں (اس لوٹنے کی جگہ) اس سے بھی زیادہ ^(۱) بہتر
پاؤں گا۔ (۳۶)

اس کے ساتھی نے اس سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ کیا
تو اس (معبود) سے کفر کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا
کیا۔ پھر نطفے سے پھر تجھے پورا آدمی بنا دیا۔ ^(۲) (۳۷)

لیکن میں تو عقیدہ رکھتا ہوں کہ وہی اللہ میرا پروردگار
ہے میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروں
گا۔ ^(۳) (۳۸)

قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي
خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ نَطَعَهُ ثُمَّ سَوَّكَ رَجُلًا ﴿٦﴾

لَيْكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ﴿٧﴾

(۱) یعنی وہ کافر عجب اور غرور میں ہی مبتلا نہیں ہوا بلکہ اس کی مدہوشی اور مستقبل کی حسین اور لمبی امیدوں نے اسے
اللہ کی گرفت اور مکافات عمل سے بالکل غافل کر دیا۔ علاوہ ازیں اس نے قیامت کا ہی انکار کر دیا، پھر ڈھٹائی کا مظاہرہ
کرتے ہوئے کہا کہ اگر قیامت برپا ہوئی بھی تو وہاں بھی حسن انجام میرا مقدر ہو گا۔ جن کافرو طغیان حد سے تجاوز کرتا
ہے، وہ مست مئے پندار ہو کر ایسے ہی متکبرانہ دعوے کرتے ہیں۔ جیسے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلَكِنْ نُّحِثُّ
إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي عِنْدَهُ الْخُسْفَىٰ﴾ (حلم السجدہ: ۵۰) ”اگر مجھے رب کی طرف لوٹنا پڑے تو وہاں بھی میرے لیے اچھائیاں
ہی ہیں۔“ ﴿أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُؤْتِيَنَّكَ مَالًا فَوَدَّعَا﴾ (مریم: ۷۷) ”کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے
ہماری آیتوں کے ساتھ کفر کیا اور دعویٰ کیا کہ آخرت میں بھی مجھے مال و اولاد سے نوازا جائے گا۔“

(۲) اس کی یہ باتیں سن کر اس کے مومن ساتھی نے اس کو وعظ و تبلیغ کے انداز میں سمجھایا کہ تو اپنے خالق کے ساتھ
کفر کا ارتکاب کر رہا ہے، جس نے تجھے مٹی اور قطرہ پانی (منی) سے پیدا کیا۔ ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام چونکہ مٹی
سے بنائے گئے تھے، اس لیے انسانوں کی اصل مٹی ہی ہوئی۔ پھر قرہی سبب وہ نطفہ بنا جو باپ کی صلب سے نکل کر رحم
مادر میں گیا، وہاں نو مینے اس کی پرورش کی۔ پھر اسے پورا انسان بنا کر ماں کے پیٹ سے نکالا۔ بعض کے نزدیک مٹی سے
پیدا ہونے کا مطلب ہے کہ انسان جو خوراک کھاتا ہے، وہ سب زمین سے یعنی مٹی سے ہی حاصل ہوتی ہے، اسی
خوراک سے وہ نطفہ بنتا ہے جو عورت کے رحم میں جا کر انسان کی پیدائش کا ذریعہ بنتا ہے۔ یوں بھی ہر انسان کی اصل
مٹی ہی قرار پاتی ہے۔ ناشکرے انسان کو اس کی اصل یاد دلا کر اسے اس کے خالق اور رب کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے
کہ تو اپنی حقیقت اور اصل پر غور کر، اور پھر رب کے ان احسانات کو دیکھ، کہ تجھے اس نے کیا کچھ بنا دیا اور اس عمل
تخلیق میں کوئی اس کا شریک اور مددگار نہیں ہے، یہ سب کچھ کرنے والا صرف اور صرف وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے، جس کو
ماننے کے لیے تو تیار نہیں ہے۔ آہ، کس قدر یہ انسان ناشکرا ہے؟

(۳) یعنی میں تیری طرح کی بات نہیں کروں گا بلکہ میں تو اللہ کی ربوبیت اور اس کی وحدانیت کا اقرار و اعتراف کرتا

تو نے اپنے باغ میں جاتے وقت کیوں نہ کہا کہ اللہ کا چاہا ہونے والا ہے، کوئی طاقت نہیں مگر اللہ کی مدد^(۱) سے، اگر تو مجھے مال و اولاد میں اپنے سے کم دیکھ رہا ہے۔ (۳۹) بہت ممکن ہے کہ میرا رب مجھے تیرے اس باغ سے بھی بہتر دے^(۲) اور اس پر آسمانی عذاب بھیج دے تو یہ چٹیل اور چکنا میدان بن جائے۔^(۳) (۴۰)

یا اس کا پانی نیچے اتر جائے اور تیرے بس میں نہ رہے کہ تو اسے ڈھونڈھ لائے۔^(۴) (۴۱)

اور اس کے (سارے) پھل گھیر لیے گئے،^(۵) پس وہ اپنے اس خرچ پر جو اس نے اس میں کیا تھا اپنے ہاتھ ملنے^(۶) لگا اور وہ باغ تو اوندھا الٹا پڑا تھا^(۷) اور (وہ شخص) یہ کہہ

وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ
إِنْ تَرَىٰ أَنَا أَعْلَمُ مِنْكَ مَالًا وَوَلَدًا ﴿۳۹﴾

فَعَلَىٰ سَرَبٍ إِن يُّؤْتِيَنِي خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلْ
عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاءِ فَتُصْبِحُ صَعِيدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾

أَوْ يُصْبِحَ مَاءً وَّهَآءُ عُرْوَرًا لَّكُن تَتَذَكَّرُ لَهَا ﴿۴۱﴾

وَأُحْصِطِرْ بِشَرِبِهِ فَاصْبِرْ يُعَذِّبُكَ عَلَىٰ مَا أَنتَفَقَ فِيهَا
وَهُيَ خَادِيَةٌ عَلَىٰ عُرْوَشِهَا وَيَقُولُ يَتْلِيَتَنِي

ہوں۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا ساتھی مشرک ہی تھا۔

(۱) اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا طریقہ بتلاتے ہوئے کہا کہ باغ میں داخل ہوتے وقت سرکشی اور غرور کا مظاہرہ کرنے کے بجائے یہ کہا ہوتا، مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ یعنی جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے، وہ چاہے تو اسے باقی رکھے اور چاہے تو فنا کر دے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ جس کو کسی کا مال، اولاد یا حال اچھا لگے تو اسے مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ پڑھنا چاہیے۔ (تفسیر ابن کثیر۔ بحوالہ مسند أبویعلیٰ)

(۲) دنیا میں یا آخرت میں۔ یا دنیا اور آخرت دونوں جگہوں میں۔

(۳) حُسْبَانًا، غُفْرَانًا کے وزن پر۔ حساب سے ہے یعنی ایسا عذاب، جو کسی کے کرتوتوں کے نتیجے میں آئے۔ یعنی آسمانی عذاب کے ذریعے سے وہ محاسبہ کر لے۔ اور یہ جگہ جمال اس وقت سرسبز و شاداب باغ ہے، چٹیل اور چکنا میدان بن جائے۔

(۴) یا درمیان میں جو نہر ہے جو باغ کی شادابی اور زرخیزی کا باعث ہے، اس کے پانی کو اتنا گرا کر دے کہ اس سے پانی کا حصول ہی ناممکن ہو جائے۔ اور جمال پانی زیادہ گرائی میں چلا جائے تو پھر وہاں بڑے بڑے ہارس پاور کی موٹریں اور مشینیں بھی پانی کو اوپر کھینچ لانے میں ناکام رہتی ہیں۔

(۵) یہ کنایہ ہے ہلاکت و فنا سے۔ یعنی اس کا سارا باغ ہلاک کر ڈالا گیا۔

(۶) یعنی باغ کی تعمیر و اصلاح اور کاشت کاری کے اخراجات پر کف افسوس ملنے لگا۔ ہاتھ ملنا کنایہ ہے ندامت سے۔

(۷) یعنی جن چھتوں، چھپروں پر انگوروں کی بیلیں تھیں، وہ سب زمین پر آ رہیں اور انگوروں کی ساری فصل تباہ ہو گئی۔

رہا تھا کہ کاش! میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرتا۔^(۱) (۳۲)

اس کی حمایت میں کوئی جماعت نہ^(۲) اٹھی کہ اللہ سے اس کا کوئی بچاؤ کرتی اور نہ وہ خود ہی بدلہ لینے والا بن سکا۔ (۳۳) یہیں سے (ثابت ہے) کہ اختیارات^(۳) اللہ برحق کے لیے ہیں وہ ثواب دینے اور انجام کے اعتبار سے بہت^(۴) ہی بہتر ہے۔ (۳۴)

ان کے سامنے دنیا کی زندگی کی مثال (بھی) بیان کرو جیسے پانی جسے ہم آسمان سے اتارتے ہیں اس سے زمین کا سبزہ ملا جلا (نکلا) ہے، پھر آخر کار وہ چورا چورا ہو جاتا ہے جسے ہوائیں اڑائے لیے پھرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔^(۵) (۳۵)

لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا ۝

وَلَمْ يَكُنْ لَهُ فِتْنَةٌ يَتَّبِعُونَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ
وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا
وَخَيْرٌ عُقْبًا ۝

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَا أَنْزَلْنَاهُ
مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ
هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيْحُ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ
مُقْتَدِرًا ۝

(۱) اب اسے احساس ہوا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، اس کی نعمتوں سے فیض یاب ہو کر اس کے احکام کا انکار کرنا اور اس کے مقابلے میں سرکشی، کسی طرح بھی ایک انسان کے لیے زیبا نہیں، لیکن اب حسرت و افسوس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، اب بچھتاے کیا ہوت، جب چیزیاں چک گئیں کھیت۔

(۲) جس جتنے پر اس کو ناز تھا، وہ بھی اس کے کام نہیں آیا نہ وہ خود ہی اللہ کے عذاب سے بچنے کا کوئی انتظام کر سکا۔

(۳) وِلَايَةُ کے معنی موالات اور نصرت کے ہیں، یعنی اس مقام پر ہر مومن و کافر کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی کسی کی مدد کرنے پر اور اس کے عذاب سے بچانے پر قادر نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ پھر اس موقع پر بڑے بڑے سرکش اور جبار بھی اظہار ایمان پر مجبور ہو جاتے ہیں، گو اس وقت کا ایمان نافع اور مقبول نہیں۔ جس طرح قرآن نے فرعون کی بابت نقل کیا ہے کہ جب وہ غرق ہونے لگا تو کہنے لگا، ﴿مَنْتَ أَكْبَرُ لَالَهُ إِلَّا الْوَالِدُ الَّذِي كَفَرْتُ بِهِ بِنُؤْمَانِي وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ (سورہ یونس، ۹۰) ”میں اس اللہ پر ایمان لایا جس پر بنو اسرائیل ایمان رکھتے ہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔“ دوسرے کفار کی بابت فرمایا گیا جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہا، ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور جن کو ہم اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے، ان کا انکار کرتے ہیں“ (سورہ المؤمن، ۸۴) اگر ولایت، واؤ کے کسرے کے ساتھ ہو تو پھر اس کے معنی حکم اور اختیارات کے ہیں، جیسا کہ ترجمے میں بھی معنی اختیار کیے گئے ہیں (ابن کثیر)

(۴) یعنی وہی اپنے دوستوں کو بہتر بدلہ دینے والا اور حسن عاقبت سے مشرف کرنے والا ہے۔

(۵) اس آیت میں دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کو کھیتی کی ایک مثال کے ذریعے سے واضح کیا گیا ہے کہ کھیتی میں لگے

مال و اولاد تو دنیا کی ہی زینت ہے،^(۱) اور (ہاں) البتہ باقی رہنے والی نیکیاں^(۲) تیرے رب کے نزدیک از روئے ثواب اور (آئندہ کی) اچھی توقع کے بہتر ہیں۔ (۳۶) اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے^(۳) اور زمین کو تو صاف کھلی ہوئی دیکھے گا اور تمام لوگوں کو ہم اکٹھا کریں گے ان میں سے ایک کو بھی باقی نہ چھوڑیں گے۔ (۴۷)^(۴)

الْمَالُ وَ النَّبُوتَ زِينَةَ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَ خَيْرًا مَّمْلًا ۝
وَيَوْمَ نَسُفُ الْجِبَالَ وَ تَرَى الْأَرْضَ بَلَدًا وَ وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نَغَادِرْ لَهُمْ أَحَدًا ۝

ہوئے پودوں اور درختوں پر جب آسمان سے بارش برستی ہے تو پانی سے مل کر کھیتی لعلما اٹھتی ہے، پودے اور درخت حیات نو سے شاداب ہو جاتے ہیں۔ لیکن پھر ایک وقت آتا ہے کہ کھیتی سوکھ جاتی ہے۔ پانی کے عدم دستیابی کی وجہ سے یا فصل پک جانے کے سبب۔ تو پھر ہوائیں اس کو اڑائے پھرتی ہیں۔ ہوا کا ایک جھونکا کبھی اسے دائیں جانب اور کبھی بائیں جانب جھکا دیتا ہے۔ دنیا کی زندگی بھی ہوا کے ایک جھونکے یا پانی کے بلبلے یا کھیتی ہی کی طرح ہے، جو اپنی چند روزہ بہار دکھا کر فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔ اور یہ سارے تصرفات اس ہستی کے ہاتھ میں ہیں جو ایک ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی یہ مثال قرآن مجید میں متعدد جگہ بیان فرمائی ہے۔ (مثلاً سورہ یونس، ۲۵، سورہ زمر، ۲۱، سورہ حدید، ۵۰ وغیر ما من الآیات۔)

(۱) اس میں ان اہل دنیا کا رہے جو دنیا کے مال و اسباب، قبیلہ و خاندان اور آل اولاد پر فخر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، یہ چیزیں تو دنیا کے فانی کی عارضی زینت ہیں۔ آخرت میں یہ چیزیں کچھ کام نہیں آئیں گی۔ اسی لیے اس سے آگے فرمایا کہ آخرت میں کام آنے والے عمل تو وہ ہیں جو باقی رہنے والے ہیں۔

(۲) باقیات صالحات (باقی رہنے والی نیکیاں) کون سی یا کون کون سی ہیں؟ کسی نے نماز کو، کسی نے تحمید و تسبیح اور تکبیر و تہلیل کو اور کسی نے بعض اور اعمال خیر کو اس کا مصداق قرار دیا۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ عام ہے اور تمام نیکیوں کو شامل ہے۔ تمام فرائض و واجبات اور سنن و نوافل سب باقیات صالحات ہیں بلکہ منہیات سے اجتناب بھی ایک عمل صالح ہے، جس پر عند اللہ اجر و ثواب کی امید ہے۔

(۳) یہ قیامت کی ہولناکیوں اور بڑے بڑے واقعات کا بیان ہے۔ پہاڑوں کو چلائیں گے کا مطلب، پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے اور دھنی ہوئی روٹی کی طرح اڑ جائیں گے۔ ﴿وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنفُوشِ﴾ — (الفارعة ۵۰) اور پہاڑ ایسے ہوں گے جیسے دھکی ہوئی رنگین اون، مزید دیکھئے سورہ طور، ۹، ۱۰، سورہ نمل، ۸۸، سورہ طہ، ۱۰۵، ۱۰۷، زمین سے جب پہاڑ جیسی مضبوط چیزیں ختم ہو جائیں گی، تو مکانات، درخت اور اسی طرح کی دیگر چیزیں کس طرح اپنا وجود برقرار رکھ سکیں گی؟ اسی لیے آگے فرمایا ”تو زمین کو صاف کھلی ہوئی دیکھے گا۔“

(۴) یعنی اولین و آخرین، چھوٹے بڑے، کافر و مؤمن سب کو جمع کریں گے، کوئی زمین کی تہ میں پڑا نہ رہ جائے گا اور نہ قبر سے نکل کر کسی جگہ چھپ سکے گا۔

اور سب کے سب تیرے رب کے سامنے صف بستہ ^(۱) حاضر کیے جائیں گے۔ یقیناً تم ہمارے پاس اسی طرح آئے جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا لیکن تم تو اسی خیال میں رہے کہ ہم ہرگز تمہارے لیے کوئی وعدے کا وقت مقرر کریں گے بھی نہیں۔ (۳۸)

اور نامہ اعمال سامنے رکھ دیئے جائیں گے۔ پس تو دیکھے گا کہ گنہگار اس کی تحریر سے خوفزدہ ہو رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے ہائے ہماری خرابی یہ کیسی کتاب ہے جس نے کوئی چھوٹا بڑا بغیر گھیرے کے باقی ہی نہیں چھوڑا، اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا سب موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم و ستم نہ کرے گا۔ (۳۹)

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ تم آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا، یہ جنوں میں سے تھا، ^(۲) اس نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی، ^(۳) کیا پھر بھی تم

وَعَرِضُوا عَلَىٰ رَبِّكَ صَفًّا لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ
أَوَّلَ مَرَّةٍ بَلْ زَعَمْتُمْ أَلَّنْ نَجْعَلَ لَكُمْ مَوْعِدًا ۝

وَوَضِعَ الْكِتَابَ فَتَرَىٰ الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ
مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يُوبِئْتَنَا مَا لَ هَذَا الْكِتَابِ
لَا يَخْبَرُ ذَرْبِهِ وَلَا كَبِيرُهُ إِلَّا أَعْصَمْنَا وَوَجَدُوا
مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۚ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ۝

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا
إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ

(۱) اس کے معنی ہیں کہ ایک ہی صف میں اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے، یا صفوں کی شکل میں بارگاہ الہی میں حاضر ہوں گے۔

(۲) قرآن کی اس صراحت نے واضح کر دیا کہ شیطان فرشتہ نہیں تھا، فرشتہ اگر ہوتا تو حکم الہی سے سرتابی کی اسے مجال ہی نہ ہوتی، کیونکہ فرشتوں کی صفت اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے کہ ﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ (الصحریم: ۶) ”وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔“ اس صورت میں یہ اشکال رہتا ہے، اگر وہ فرشتہ نہیں تھا تو پھر اللہ کے حکم کا وہ مخاطب ہی نہیں تھا، کیونکہ اس کے مخاطب تو فرشتے تھے، انہیں کو سجدے کا حکم دیا گیا تھا، صاحب روح المعانی نے کہا ہے کہ وہ فرشتہ یقیناً نہیں تھا، لیکن وہ فرشتوں کے ساتھ ہی رہتا تھا اور ان ہی میں شمار ہوتا تھا، اس لیے وہ بھی اسجدوا لآدم کے حکم کا مخاطب تھا۔ اور سجدہ آدم کے حکم کے ساتھ اس کا مخاطب کیا جانا قطعی ہے۔ ارشاد باری ہے ﴿مَا مَنَعَكَ آلَا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْنَاكَ﴾ ”جب میں نے تجھے حکم دے دیا تو پھر تو نے سجدہ کیوں نہ کیا۔“

(۳) فَسَقَ کے معنی ہوتے ہیں نکلنا، چوہا جب اپنے بل سے نکلتا ہے تو کہتے ہیں فَسَقَتِ الْفَأْرَةُ مِنَ جُحْرِهَا شیطان بھی سجدہ تعظیم و تہیہ کا انکار کر کے رب کی اطاعت سے نکل گیا۔

أَفَتَتَّخِذُونَ وُدَّيْبَةَ أَوْلِيَاءَ مَنْ دُونِي وَهُمْ
لَكُمْ عَدُوٌّ يَبْسُ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا ۝

اسے اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر اپنا دوست بنا رہے
ہو؟ حالانکہ وہ تم سب کا دشمن ہے۔^(۱) ایسے ظالموں کا کیا
ہی براب دل ہے۔^(۲) (۵۰)

میں نے انہیں آسمانوں و زمین کی پیدائش کے وقت
موجود نہیں رکھا تھا اور نہ خود ان کی اپنی پیدائش
میں،^(۳) اور میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار بنانے
والا بھی نہیں۔^(۴) (۵۱)

اور جس دن وہ فرمائے گا کہ تمہارے خیال میں جو میرے
شریک تھے انہیں پکارو یا یہ پکاریں گے لیکن ان میں سے
کوئی بھی جواب نہ دے گا ہم ان کے درمیان ہلاکت کا
سلمان کر دیں گے۔^(۵) (۵۲)

مَا أَشْهَدُهُمْ خَلْقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَا خَلَقَ
أَنْفُسَهُمْ وَمَا لَنْتُمْ مُخَذَّ الْمُنْضِلِينَ عَصَدًا ۝

وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَائِيَ الَّذِينَ دَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ
فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُم مَّوْبِقًا ۝

(۱) یعنی کیا تمہارے لیے یہ صحیح ہے کہ تم ایسے شخص کو اور اس کی ذریت کو دوست بناؤ جو تمہارے باپ آدم علیہ السلام
کا دشمن، تمہارا دشمن اور تمہارے رب کا دشمن ہے اور اللہ کو چھوڑ کر اس شیطان کی اطاعت کرو؟
(۲) ایک دوسرا ترجمہ اس کا یہ کیا گیا ہے ”ظالموں نے کیا ہی براب دل اختیار کیا ہے۔“ یعنی اللہ کی اطاعت اور اسکی دوستی کو چھوڑ
کر شیطان کی اطاعت اور اسکی دوستی جو اختیار کی ہے تو یہ بہت ہی براب دل ہے، جسے ان ظالموں نے اپنایا ہے۔

(۳) یعنی آسمان و زمین کی پیدائش اور اس کی تدبیر میں، بلکہ خود ان شیاطین کی پیدائش میں ہم نے ان سے یا ان میں
سے کسی ایک سے کوئی مدد حاصل نہیں کی، یہ تو اس وقت موجود بھی نہیں تھے۔ پھر تم اس شیطان اور اس کی ذریت کی
پوجا یا ان کی اطاعت کیوں کرتے ہو؟ اور میری عبادت و اطاعت سے تمہیں گریز کیوں ہے؟ جب کہ یہ مخلوق ہیں اور
میں ان سب کا خالق ہوں۔

(۴) اور بفرض محال اگر میں کسی کو مددگار بنا تا بھی تو ان کو کیسے بناتا؟ جب کہ یہ میرے بندوں کو گمراہ کر کے میری جنت
اور میری رضا سے روکتے ہیں۔

(۵) مَوْبِقٌ کے ایک معنی تجاب (پردے اور آڑ) کے ہیں۔ یعنی ان کے درمیان پردہ اور فاصلہ کر دیا جائے گا، کیونکہ ان
کے مابین آپس میں عداوت ہوگی۔ نیز اس لیے کہ عرصہ محشر میں یہ ایک دوسرے کو نہ مل سکیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ جہنم
میں پیپ اور خون کی مخصوص وادی ہے۔ اور بعض نے اس کا ترجمہ ملک کیا ہے جیسا کہ ترجمے سے واضح ہے یعنی یہ
مشرک اور ان کے مزعومہ معبود، یہ ایک دوسرے کو مل ہی نہیں سکیں گے کیوں کہ ان کے درمیان ہلاکت کا سامان اور
ہولناک چیزیں ہوں گی۔

اور گنہگار جنم کو دیکھ کر سمجھ لیں گے کہ وہ اسی میں جھونکے جانے والے ہیں لیکن اس سے بچنے کی جگہ نہ پائیں گے۔^(۱) (۵۳)

ہم نے اس قرآن میں ہر ہر طریقے سے تمام کی تمام مثالیں لوگوں کے لیے بیان کر دی ہیں لیکن انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔^(۲) (۵۴)

لوگوں کے پاس ہدایت آچکنے کے بعد انہیں ایمان لانے اور اپنے رب سے استغفار کرنے سے صرف اسی چیز نے روکا کہ اگلے لوگوں کا سامنا نہ انہیں بھی پیش آئے^(۳) یا ان کے سامنے کھلم کھلا عذاب آمو جو وہ جائے۔^(۴) (۵۵)

ہم تو اپنے رسولوں کو صرف اس لیے بھیجتے ہیں کہ وہ خوشخبریاں سنا دیں اور ڈرا دیں۔ کافر لوگ باطل کے سارے جھگڑتے ہیں اور (چاہتے ہیں کہ) اس سے حق کو لڑکھڑادیں، انہوں نے میری آیتوں کو اور جس چیز سے ڈرایا جائے اسے مذاق بنا ڈالا ہے۔^(۵) (۵۶)

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے؟ جسے اس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی جائے وہ پھر بھی منہ موڑے رہے

وَرَأَى الْمُجْرِمُونَ النَّارَ فَظَنُّوا أَنَّهُمْ مُوَاعِنُوهَا وَلَمْ يَجِدُوا عَنْهَا مَصْرِفًا ۝

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۝

وَمَا نَمُنَّ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَيَسْتَغْفِرُوا رَبَّهُمْ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمْ سُوءُ الْآيَاتِ أَوْ يُاتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۝

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۚ وَيَعَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوا آيَاتِنَا وَمَا نُنذِرُوا هُزُوًا ۝

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدَاؤُهُ إِنَّا جَعَلْنَا عَاقِلِ الْغُلُوبِ كَذِبًا ۝

(۱) جس طرح بعض روایات میں ہے کہ کافر ابھی چالیس سال کی مسافت پر ہو گا کہ یقین کر لے گا کہ جہنم ہی اس کا ٹھکانا ہے (مسند احمد، جلد ۳، ص ۷۵)

(۲) یعنی ہم نے انسانوں کو حق کا راستہ سمجھانے کے لیے قرآن میں ہر طریقہ استعمال کیا ہے، وعظ و تذکیر، امثال و واقعات اور دلائل و براہین، علاوہ ازیں انہیں بار بار اور مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ لیکن انسان چونکہ سخت جھگڑالو ہے، اس لیے وعظ و نصیحت کا اس پر اثر ہوتا ہے اور نہ دلائل و براہین اس کے لیے کارگر۔

(۳) یعنی تکذیب کی صورت میں ان پر بھی اسی طرح عذاب آئے، جیسے پہلے لوگوں پر آیا۔

(۴) یعنی یہ اہل مکہ ایمان لانے کے لیے ان دو باتوں میں سے کسی ایک کے منتظر ہیں۔ لیکن ان عقل کے اندھوں کو یہ پتہ نہیں کہ اس کے بعد ایمان کی کوئی حیثیت ہی نہیں یا اس کے بعد ایمان لانے کا ان کو موقع ہی کب ملے گا؟

(۵) اور اللہ کی آیتوں کا مذاق اڑانا، یہ تکذیب کی بدترین قسم ہے۔ اسی طرح جدال بالباطل کے ذریعے سے (یعنی باطل

اور جو کچھ اس کے ہاتھوں نے آگے بھیج رکھا ہے اسے بھول جائے، بیشک ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ اسے (نہ) سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی ہے، گو تو انہیں ہدایت کی طرف بلاتا رہے، لیکن یہ کبھی بھی ہدایت نہیں پانے^(۱) کے۔ (۵۷)

تیرا پروردگار بہت ہی بخشش والا اور مہربانی والا ہے وہ اگر ان کے اعمال کی سزا میں پکڑے تو بیشک انہیں جلد ہی عذاب کر دے، بلکہ ان کے لیے ایک وعدہ کی گھڑی مقرر ہے جس سے وہ سرکنے کی ہرگز جگہ نہیں پائیں گے۔^(۲) (۵۸)

یہ ہیں وہ بستیاں جنہیں ہم نے ان کے مظالم کی بنا پر غارت کر دیا اور ان کی تباہی کی بھی ہم نے ایک میعاد

أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا وَإِنْ تَدْعُهُمْ
إِلَى الْهُدَى فَلَنْ يُهْتَدُوا إِذْ أَبَدْنَا ۝

وَرَبِّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ لَوْ يُؤْخَذُ لَهُمْ بِمَا كَسَبُوا
لَعَجَلَ لَهُمُ الْعَذَابَ بَلْ لَهُمْ مَوْعِدٌ أَنْ يَجِدُوا
مِنْ دُونِهِ مَوْيلاً ۝

وَتِلْكَ الْقُرَى الَّتِي كَانَتْ لَهُمْ لَنَا طَلُوًا مِمَّا عَدَدْنَا لَهُمُ الْيَوْمَ مَوْعِدًا ۝

طریقے اختیار کر کے) حق کو باطل ثابت کرنے کی سعی کرنا بھی نہایت مذموم حرکت ہے۔ اسی مجادلہ بالباطل کی ایک صورت یہ ہے جو کافر رسولوں کو یہ کہہ کر ان کی رسالت کا انکار کر دیتے رہے کہ تم تو ہمارے جیسے ہی انسان ہو، مَا أَنْتُمْ إِلَّا الْآجِنَةُ مِمَّنَّا ﴿۱۵﴾ ہم تمہیں رسول کس طرح تسلیم کر لیں؟ دَحْضُ کے اصل معنی پھسلنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے دَحَضْتُ رَجُلَهُ (اس کا پیر پھسل گیا) یہاں سے یہ کسی چیز کے زوال (ٹلنے) اور بطلان کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ کہتے ہیں۔ دَحَضْتُ حُجَّتَهُ دَحُوضًا أَي بَطَلْتُ (اس کی حجت باطل ہو گئی) اس لحاظ سے أَدْحَضُ يُدْحِضُ کے معنی ہوں گے باطل کرنا (فتح القدیر)

(۱) یعنی ان کے اس ظلم عظیم کی وجہ سے کہ انہوں نے رب کی آیات سے اعراض کیا اور اپنے کرتوتوں کو بھولے رہے، ان کے دلوں پر ایسے پردے اور ان کے کانوں پر ایسے بوجھ ڈال دیئے گئے ہیں، جس سے قرآن کا سمجھنا، سننا اور اس سے ہدایت قبول کرنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ ان کو کتنا بھی ہدایت کی طرف بلاؤ، یہ کبھی بھی ہدایت کا راستہ اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔

(۲) یعنی یہ تو رب غفور کی رحمت ہے کہ وہ گناہ پر فوراً گرفت نہیں فرماتا، بلکہ مہلت دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پاداش عمل میں ہر شخص ہی عذاب الہی کے شکنجے میں کسا ہوتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے اور ہلاکت کا وہ وقت آجاتا ہے، جو اللہ تعالیٰ مقرر کئے ہوتا ہے تو پھر فرار کا کوئی راستہ اور بچاؤ کی کوئی سبیل ان کے لیے نہیں رہتی۔ مَوْئِلٌ کے معنی ہیں جانے پناہ، راہ فرار۔

مقرر کر رکھی تھی۔^(۱) (۵۹)
 جبکہ موسیٰ نے اپنے نوجوان^(۲) سے کہا کہ میں تو چلتا ہی
 رہوں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے^(۳) سنگم پر پہنچوں،
 خواہ مجھے سالہا سال چلنا پڑے۔^(۴) (۶۰)
 جب وہ دونوں دریا کے سنگم پر پہنچے، وہاں اپنی مچھل
 بھول گئے جس نے دریا میں سرنگ جیسا اپنا راستہ
 بنا لیا۔ (۶۱)

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَتْلِهِ إِكْرَاهًا حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ
 أَوْ آمَظِي حُقْبًا ۝

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنَهُمَا نَبَيْضًا حَوْكُهُمَا فَاتَّخَذَا سَبِيلًا
 فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ۝

(۱) اس سے مراد عاد، ثمود اور حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام وغیرہ کی توہین ہیں جو اہل حجاز کے
 قریب اور ان کے راستوں میں ہی تھیں۔ انہیں بھی اگرچہ ان کے ظلم کے سبب ہی ہلاک کیا گیا لیکن ہلاکت سے پہلے
 انہیں پورا موقع دیا گیا اور جب یہ بات واضح ہو گئی کہ ان کا ظلم و طغیان اس حد کو پہنچ گیا ہے، جہاں سے ہدایت کے
 راستے بالکل مسدود ہو جاتے ہیں اور ان سے خیر اور بھلائی کی امید باقی نہیں رہی، تو پھر ان کی مہلت عمل ختم اور تباہی کا
 وقت شروع ہو گیا۔ پھر انہیں حرف غلط کی طرح مٹا دیا گیا۔ یا اہل دنیا کے لیے عبرت کا نمونہ بنا دیا گیا۔ یہ دراصل اہل مکہ کو
 سمجھایا جا رہا ہے کہ تم ہمارے آخری پیغمبر اور اشرف المرسل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کر
 رہے ہو، تم یہ نہ سمجھنا کہ تمہیں جو مہلت مل رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں بلکہ یہ
 مہلت تو سنت اللہ ہے جو ایک وقت موعود تک ہر فرد، گروہ اور قوم کو وہ عطا کرتا ہے۔ جب یہ مدت ختم ہو جائے گی اور
 تم اپنے کفر و عناد سے باز نہیں آؤ گے تو پھر تمہارا حشر بھی اس سے مختلف نہیں ہو گا جو تم سے پہلی قوموں کا ہو چکا ہے۔

(۲) نوجوان سے مراد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے جانشین بنے۔
 (۳) اس مقام کی تعیین کسی یقینی ذریعہ سے نہیں ہو سکی ہے تاہم قرآن کا اقتضایہ ہے کہ اس سے مراد صحرائے سینا کا وہ
 جنوبی راس ہے جہاں طلیح عقبہ اور طلیح سویس دونوں آکر ملتے اور بحر احمر میں ضم ہو جاتے ہیں۔ دوسرے مقامات جن کا
 ذکر مفسرین نے کیا ہے ان پر سرے سے مجمع البحرین کی تعبیر ہی صادق نہیں آتی۔

(۴) حُقْبًا کے ایک معنی ۷۰ یا ۸۰ سال اور دوسرے معنی غیر معین مدت کے ہیں۔ یہاں یہی دوسرا معنی مراد ہے۔ یعنی
 جب تک میں مجمع البحرین (جہاں دونوں سمندر ملتے ہیں) نہیں پہنچ جاؤں گا، چلتا رہوں گا اور سفر جاری رکھوں گا، چاہے
 کتنا بھی عرصہ لگ جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس سفر کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ انہوں نے ایک موقع پر
 ایک سائل کے جواب میں یہ کہہ دیا کہ اس وقت مجھ سے بڑا عالم کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ جملہ پسند نہیں آیا اور
 وحی کے ذریعے سے انہیں مطلع کیا کہ ہمارا ایک بندہ (خضر) ہے جو تجھ سے بھی بڑا عالم ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے
 پوچھا کہ یا اللہ اس سے ملاقات کس طرح ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جہاں دونوں سمندر ملتے ہیں، وہیں ہمارا وہ

جب یہ دونوں وہاں سے آگے بڑھے تو موسیٰ نے اپنے نوجوان سے کہا کہ لاہمارا کھانا دے ہمیں تو اپنے اس سفر

سے سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ (۶۲)

اس نے جواب دیا کہ کیا آپ نے دیکھا بھی؟ جبکہ ہم پتھر سے ٹیک لگا کر آرام کر رہے تھے وہیں میں مچھلی بھول گیا تھا، دراصل شیطان نے ہی مجھے بھلا دیا کہ میں آپ سے اس کا ذکر کروں۔ اس مچھلی نے ایک انوکھے طور پر دریا^(۱) میں اپنا راستہ بنا لیا۔ (۶۳)

موسیٰ نے کہا یہی تھا جس کی تلاش میں ہم تھے چنانچہ وہیں سے اپنے قدموں کے نشان ڈھونڈتے ہوئے واپس^(۲) لوٹے۔ (۶۴)

پس ہمارے بندوں میں سے ایک بندے^(۳) کو پایا، جسے

فَلَمَّا جَاؤَا قَالِ لِقَتْلِهِ إِنَّمَا عدَاءُ قَاتِلَيْنَا مِن سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا ۝۱۵

قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْخُبْرَةَ وَفِي الْكَيْفِ نَسِيتُهَا وَفِي الْبَحْرِ جَبَابًا ۝۱۶

قَالَ ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِي ۚ فَارْتَدَّا عَلَى آثَارِهِمَا قَصَصًا ۝۱۷

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عَيْنِنَا وَعَلَّمْنَاهُ

بندہ بھی ہو گا۔ نیز فرمایا کہ مچھلی ساتھ لے جاؤ، جہاں مچھلی تمہاری نوکری (زنبیل) سے نکل کر غائب ہو جائے تو سمجھ لینا کہ یہی مقام ہے (بخاری، سورہ کہف) چنانچہ اس حکم کے مطابق انہوں نے ایک مچھلی لی اور سفر شروع کر دیا۔

(۱) یعنی مچھلی زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے سمندر میں سرنگ کی طرح راستہ بنا دیا۔ حضرت یوشع علیہ السلام نے مچھلی کو سمندر میں جاتے اور راستہ بنتے ہوئے دیکھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتلانا بھول گئے۔ حتیٰ کہ آرام کر کے وہاں سے پھر سفر شروع کر دیا، اس دن اور اس کے بعد رات سفر کر کے، جب دوسرے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تھکاوٹ اور بھوک محسوس ہوئی، تو اپنے جوان ساتھی سے کہا کہ لاؤ بھئی کھانا، کھانا کھا لیں۔ اس نے کہا، مچھلی تو، جہاں ہم نے پتھر سے ٹیک لگا کر آرام کیا تھا، وہاں زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی تھی اور وہاں عجب طریقے سے اس نے اپنا راستہ بنایا تھا، جس کا میں آپ سے تذکرہ کرنا بھول گیا۔ اور شیطان نے مجھے بھلا دیا۔

(۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا، اللہ کے بندے! جہاں مچھلی زندہ ہو کر غائب ہوئی تھی، وہی تو ہمارا مطلوبہ مقام تھا، جس کی تلاش میں ہم سفر کر رہے ہیں۔ چنانچہ اپنے نشانات قدم دیکھتے ہوئے پیچھے لوٹے اور اسی مجمع البحرین پر واپس آگئے۔ قَصَصًا کے معنی ہیں پیچھے لگنا، پیچھے پیچھے چلنا۔ یعنی نشانات قدم کو دیکھتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔

(۳) اس بندے سے مراد حضرت خضر ہیں، جیسا کہ صحیح احادیث میں صراحت ہے۔ خضر کے معنی سرسبز اور شاداب کے ہیں، یہ ایک مرتبہ سفید زمین پر بیٹھے تو وہ حصہ زمین ان کے نیچے سے سرسبز ہو کر لہلہانے لگا، اسی وجہ سے ان کا نام خضر پڑ گیا (صحیح بخاری، تفسیر سورہ کہف)

ہم نے اپنے پاس کی خاص رحمت^(۱) عطا فرما رکھی تھی اور اسے اپنے پاس سے خاص^(۲) علم سکھا رکھا تھا۔ (۶۵)

اس سے موسیٰ نے کہا کہ میں آپ کی تابعداری کروں؟ کہ آپ مجھے اس نیک علم کو سکھادیں جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔ (۶۶)

اس نے کہا آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ (۶۷) اور جس چیز کو آپ نے اپنے علم میں^(۳) نہ لیا ہو اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں؟ (۶۸)

موسیٰ نے جواب دیا کہ ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے اور کسی بات میں میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا۔ (۶۹)

اس نے کہا اچھا اگر آپ میرے ساتھ ہی چلنے پر اصرار کرتے ہیں تو یاد رہے کسی چیز کی نسبت مجھ سے کچھ نہ پوچھنا جب تک کہ میں خود اس کی نسبت کوئی تذکرہ نہ کروں۔ (۷۰)

مِنَ اللَّذُنَا عَلِمْنَا ۝

قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ آتَيْتُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِي

وَمَا عَلَّمْتَهُ رُشْدًا ۝

قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ۝

قَالَ سَتَجِدُنِي إِِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا ۝

قَالَ فَإِنِ اشْتَعَيْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ

لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۝

(۱) رَحْمَةً سے بعض مفسرین نے وہ خصوصی انعامات مراد لیے ہیں جو اللہ نے اپنے اس خاص بندے پر فرمائے اور اکثر مفسرین نے اس سے مراد نبوت لی ہے۔

(۲) اس سے علم نبوت کے علاوہ جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی بہرہ ور تھے، بعض تکوینی امور کا علم ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت خضر کو نوازا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھی وہ علم نہیں تھا۔ اس سے استدلال کرتے ہوئے بعض صوفیاد عوئی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو جو نبی نہیں ہوتے، علم لدنی سے نوازتا ہے، جو بغیر استاد کے محض مبداء فیض کی کرم گستری کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ باطنی علم، شریعت کے ظاہری علم سے، جو قرآن و حدیث کی صورت میں موجود ہے، مختلف بلکہ بعض دفعہ اس کے مخالف اور معارض ہوتا ہے لیکن یہ استدلال اس لیے صحیح نہیں کہ حضرت خضر کی بابت تو اللہ تعالیٰ نے خود ان کو علم خاص دینے جانے کی صراحت کر دی ہے، جب کہ کسی اور کے لیے ایسی صراحت کہیں نہیں اگر اس کو عام کر دیا جائے تو پھر ہر شعبہ ہذا اس قسم کا دعویٰ کر سکتا ہے، چنانچہ اس طبقے میں یہ دعوے عام ہی ہیں۔ اس لیے ایسے دعوؤں کی کوئی حیثیت نہیں۔

(۳) یعنی جس کا پورا علم نہ ہو۔

پھر وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ ایک کشتی میں سوار ہوئے، تو اس نے کشتی کے تختے توڑ دیئے، موسیٰ نے کہا کیا آپ اسے توڑ رہے ہیں تاکہ کشتی والوں کو ڈبو دیں، یہ تو آپ نے بڑی (خطرناک) بات کر دی۔^(۱) (۷۱)

اس نے جواب دیا کہ میں نے تو پہلے ہی تجھ سے کہہ دیا تھا کہ تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکے گا۔ (۷۲)

موسیٰ نے جواب دیا کہ میری بھول پر مجھے نہ پکڑیئے اور مجھے اپنے کام میں تنگی میں نہ ڈالیے۔^(۲) (۷۳)

پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ ایک لڑکے کو پایا، اس نے اسے مار ڈالا، موسیٰ نے کہا کہ کیا آپ نے ایک پاک جان کو بغیر کسی جان کے عوض مار ڈالا؟ بیشک آپ نے تو بڑی ناپسندیدہ حرکت کی۔^(۳) (۷۴)

فَانطَلَقَا حَتَّىٰ إِذْ رَاكَ بَانِي السَّفِينَةِ حَرَمَهَا قَالَ أَرَأَيْتَ إِذَا أَعْرَفْتُمَا لِشُعْرَىٰ أَهْلَكُمَا لَقَدْ جِئْتُمَا شَيْئًا مُّسْتَرًا ۝۱

قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝۲

قَالَ لَا تَأْخُذْ بَعِيَّتِي وَلَا تَأْخُذْ بَعِيَّتِي مِنْ أَمْرِي عُمْرًا ۝۳

فَانطَلَقَا حَتَّىٰ إِذْ أَلْقَىٰ عُلَمَاؤُا فَعَتَاكُهُ قَالَ أَقْتَلْتُمْ نَفْسًا زَكِيَّةً بِمَعْرِفَةٍ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا مُّكْرَمًا ۝۴

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ اس علم خاص کی خبر نہیں تھی جس کی بنا پر خضر نے کشتی کے تختے توڑ دیئے تھے، اس لیے صبر نہ کر سکے اور اپنے علم و فہم کے مطابق اسے نہایت ہولناک کام قرار دیا۔ انرا کے معنی ہیں الذَّاهِبَةُ الْعَظِيمَةُ ”بڑا ہیبت ناک کام“۔

(۲) یعنی میرے ساتھ میرا معاملہ کریں، سختی کا نہیں۔

(۳) غلام سے مراد بالغ جوان بھی ہو سکتا ہے اور نابالغ بچہ بھی۔

(۴) نُكْرًا، فَطِنًا مُنْكَرًا لَا يُعْرَفُ فِي الشَّنْعِ، ایسا بڑا برا کام، جس کی شریعت میں گنجائش نہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں أَنْكُرُ مِنَ الْأَمْرِ الْأَوَّلِ پہلے کام (کشتی کے تختے توڑنے) سے زیادہ برا کام۔ اس لیے کہ قتل، ایسا کام ہے جس کا تدارک اور ازالہ ممکن نہیں۔ جب کہ کشتی کے تختے اکھیڑ دینا، ایسا کام ہے جس کا تدارک اور ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ بعض نے اس کے معنی کیے ہیں، پہلے کام سے کم تر اقلٌ مِنَ الْأَمْرِ اس لیے کہ ایک جان کو قتل کرنا، سارے کشتی والوں کو ڈبو دینے سے کم تر ہے۔ (فتح القدر) لیکن پہلا مفہوم ہی انبہ ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو علم شریعت حاصل تھا، اس کی رو سے حضرت خضر کا یہ کام بہر حال خلاف شرع تھا، جس کی وجہ سے انہوں نے اعتراض کیا اور اسے نہایت برا کام قرار دیا۔

وہ کہنے لگے کہ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ہمراہ رہ کر ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ (۷۵)

موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا اگر اب اس کے بعد میں آپ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کروں تو بیشک آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا، یقیناً آپ میری طرف سے (حد) عذر^(۱) کو پہنچ چکے۔ (۷۶)

پھر دونوں چلے ایک گاؤں والوں کے پاس آکر ان سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے ان کی مہمانداری سے صاف انکار کر دیا،^(۲) دونوں نے وہاں ایک دیوار پائی جو گراہی چاہتی تھی، اس نے اسے ٹھیک اور درست^(۳) کر دیا، موسیٰ (علیہ السلام) کہنے لگے اگر آپ چاہتے تو اس پر اجرت لے لیتے۔^(۴) (۷۷)

اس نے کہا بس یہ جدائی ہے میرے اور تیرے درمیان،^(۵)

قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝

قَالَ إِنْ سَأَلْتِكُمْ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَ هَذَا فَلْيُصَلِّبْنِي قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَدُنِّي عُذْرًا ۝

فَانظُرْنَا سَخَىٰ إِذْ أَتَىٰ أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَ أَهْلُهَا فَأَتَوْا نَ يُصَيِّفُوهَا فَوَجَدَ فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَ فَأَقَامَهُ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَهَكَّدْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۝

قَالَ هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ سَأَأْتِكَ مِنْ تَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ

(۱) یعنی اب اگر سوال کروں تو اپنی مصاحبت کے شرف سے مجھے محروم کر دیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا، اس لیے کہ آپ کے پاس معقول عذر ہو گا۔

(۲) یعنی یہ بخیلوں اور لٹموں کی بستی تھی کہ مہمانوں کی مہمان نوازی سے ہی انکار کر دیا، دراصل حالیکہ مسافروں کو کھانا کھلانا اور مہمان نوازی کرنا ہر شریعت کی اخلاقی تعلیمات کا اہم حصہ رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مہمان نوازی اور آکرام ضیعت کو ایمان کا تقاضا قرار دیا ہے۔ فرمایا «مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ» (فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، ۲۰۹/۵) ”جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ مہمان کی عزت و تکریم کرے۔“

(۳) حضرت خضر نے اس دیوار کو ہاتھ لگایا اور اللہ کے حکم سے وہ معجزانہ طور پر سیدھی ہو گئی۔ جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت سے واضح ہے۔

(۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام، جو اہل بستی کے رویے سے پہلے ہی کبیدہ خاطر تھے، حضرت خضر کے اس بلا معاوضہ احسان پر خاموش نہ رہ سکے اور بول پڑے کہ جب ان بستی والوں نے ہماری مسافرت، ضرورت مندی اور شرف و فضل کسی چیز کا بھی لحاظ نہیں کیا تو یہ لوگ کب اس لائق ہیں کہ ان کے ساتھ احسان کیا جائے؟

(۵) حضرت خضر نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام، یہ تیسرا موقع ہے کہ تو صبر نہیں کر سکا اور اب خود تیرے کہنے کے مطابق میں تجھے ساتھ رکھنے سے معذور ہوں۔

عَلَيْهِ صَبْرًا ۝

اب میں تھے ان باتوں کی اصلیت بھی بتا دوں گا جس پر تجھ سے صبر نہ ہو سکا۔^(۷۸)

کشتی تو چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں کام کاج کرتے تھے۔ میں نے اس میں کچھ توڑ پھوڑ کرنے کا ارادہ کر لیا کیونکہ ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر ایک (صحیح سالم) کشتی کو جبراً ضبط کر لیتا تھا۔ (۷۹)

اور اس لڑکے کے ماں باپ ایمان والے تھے۔ ہمیں خوف ہوا کہ کہیں یہ انہیں اپنی سرکشی اور کفر سے عاجز و پریشان نہ کر دے۔ (۸۰)

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرْسَلْنَا
أَن نَّجِيهَا وَكَانَ وِزْرَهُمْ ثِقَلًا يُحْدِلُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ۝

وَأَمَّا الْعُلَمَاءُ فَكَانَ آيَةُ الْمُؤْمِنِينَ فَخَشِينَا أَن يُرَاهِمَا طَغْيَانًا
وَكَلَّفْنَا ۝

(۱) لیکن جدائی سے قبل حضرت خضر نے تینوں واقعات کی حقیقت سے انہیں آگاہ اور باخبر کرنا ضروری خیال کیا تاکہ موسیٰ علیہ السلام کسی مغالطے کا شکار نہ رہیں اور وہ یہ سمجھ لیں کہ علم نبوت اور ہے، جس سے انہیں نوازا گیا ہے اور بعض تکوینی امور کا علم اور ہے جو اللہ کی حکمت و مشیت کے تحت، حضرت خضر کو دیا گیا ہے اور اسی کے مطابق انہوں نے ایسے کام کیے جو علم شریعت کی رو سے جائز نہیں تھے اور اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام بجا طور پر ان پر خاموش نہیں رہ سکے تھے۔ انہی تکوینی امور کی انجام دہی کی وجہ سے بعض اہل علم کی رائے ہے کہ حضرت خضر انسانوں میں سے نہیں تھے اور اسی لیے وہ ان کی نبوت و رسالت یا ولایت کی بحث میں نہیں پڑتے کیوں کہ یہ سارے مناصب تو انسانوں کے ساتھ ہی خاص رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ فرشتے تھے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ اپنے کسی نبی کو بعض تکوینی امور سے مطلع کر کے ان کے ذریعے سے وہ کام کروالے، تو اس میں بھی کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ جب وہ صاحب وحی خود اس امر کی وضاحت کر دے کہ میں نے یہ کام اللہ کے حکم سے ہی کیے ہیں تو گویا ہر وہ خلاف شریعت ہی نظر آتے ہوں، لیکن جب ان کا تعلق ہی تکوینی امور سے ہے تو وہاں جواز اور عدم جواز کی بحث ہی غیر ضروری ہے۔ جیسے تکوینی احکامات کے تحت کوئی بیمار ہوتا ہے، کوئی مرتا ہے، کسی کا کاروبار تباہ ہو جاتا ہے، قوموں پر عذاب آتا ہے، ان میں سے بعض کام بعض دفعہ بہ اذن الہی فرشتے ہی کرتے ہیں، تو جس طرح یہ امور آج تک کسی کو خلاف شریعت نظر نہیں آئے۔ اسی طرح حضرت خضر کے ذریعے سے وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا تعلق بھی چوں کہ امور تکوینیہ سے ہے اس لیے انہیں شریعت کی ترازو میں تولنا ہی غیر صحیح ہے۔ البتہ اب وحی و نبوت کا سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد کسی شخص کا اس قسم کا دعویٰ ہرگز صحیح اور قابل تسلیم نہیں ہو گا جیسا کہ حضرت خضر سے منقول ہے کیوں کہ حضرت خضر کا معاملہ تو نص قرآنی سے ثابت ہے، اس لیے مجال انکار نہیں۔ لیکن اب جو بھی اس قسم کا دعویٰ یا عمل کرے گا، اس کا انکار لازمی اور ضروری ہے کیوں کہ اب وہ یقینی ذریعہ علم موجود نہیں ہے جس سے اس کے دعوے اور عمل کی حقیقت واضح ہو سکے۔

اس لیے ہم نے چاہا کہ انہیں ان کا پروردگار اس کے بدلے اس سے بہتر یا کیزگی والا اور اس سے زیادہ محبت اور پیار والا بچہ عنایت فرمائے۔ (۸۱)

دیوار کا قصہ یہ ہے کہ اس شہر میں دو یتیم بچے ہیں جن کا خزانہ ان کی اس دیوار کے نیچے دفن ہے، ان کا باپ بڑا نیک شخص تھا تو تیرے رب کی چاہت تھی کہ یہ دونوں یتیم اپنی جوانی کی عمر میں آکر اپنا یہ خزانہ تیرے رب کی مہربانی اور رحمت سے نکال لیں، میں نے اپنی رائے سے کوئی کام نہیں کیا،^(۱) یہ تھی اصل حقیقت ان واقعات کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔ (۸۲)

آپ سے ذوالقرنین کا واقعہ یہ لوگ دریافت کر رہے ہیں،^(۲) آپ کہہ دیجئے کہ میں ان کا تھوڑا سا حال تمہیں پڑھ کر سناتا ہوں۔ (۸۳)

فَاذْرَاكَانَ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا ۝

وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزُهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْرِجَا كَنْزَهُمَا رِجْمَةً مِّنْ رَبِّكَ وَمَا عَلَّمَهُ عَن أَمْرِ ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۝

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ ذَوِي الْقُرْنَيْنِ قُلْ سَأَتْلُوا عَلَيْكُم مِّنْهُ ذِكْرًا ۝

(۱) حضرت خضر کی نبوت کے قائلین کی یہ دوسری دلیل ہے جس سے وہ نبوت خضر کا اثبات کرتے ہیں۔ کیونکہ کسی بھی غیر نبی کے پاس اس قسم کی وحی نہیں آتی کہ وہ اتنے اتنے اہم کام کی اشارہ نہیں پر کر دے، نہ کسی غیر نبی کا ایسا اشارہ نبی قابل عمل ہی ہے۔ نبوت خضر کی طرح حیات خضر بھی ایک حلقے میں مختلف فیہ ہے اور حیات خضر کے قائلین بہت سے لوگوں کی ملاقاتیں حضرت خضر سے ثابت کرتے ہیں اور پھر ان سے ان کے اب تک زندہ ہونے پر استدلال کرتے ہیں لیکن جس طرح حضرت خضر کی زندگی پر کوئی نص شرعی نہیں ہے، اسی طریقے سے لوگوں کے مکاشفات یا حالت بیداری یا نوم میں حضرت خضر سے ملنے کے دعوے بھی قابل تسلیم نہیں۔ جب ان کا حلیہ ہی مستند ذریعے سے منقول نہیں ہے تو ان کی شناخت کس طرح ممکن ہے؟ اور کیوں کر یقین کیا جاسکتا ہے، کہ جن بزرگوں نے ملنے کے دعوے کیے ہیں، واقعی ان کی ملاقات خضر موسیٰ علیہ السلام سے ہی ہوئی ہے، خضر کے نام سے انہیں کسی نے دھوکہ اور فریب میں مبتلا نہیں کیا۔

(۲) یہ مشرکین کے اس تیسرے سوال کا جواب ہے جو یہودیوں کے کہنے پر انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے تھے۔ ذوالقرنین کے لفظی معنی دو سینگوں والے کے ہیں۔ یہ نام اس لیے پڑا کہ نبی الواقع اس کے سر پر دو سینگ تھے یا اس لیے کہ اس نے مشرق و مغرب دنیا کے دونوں کناروں پر پہنچ کر سورج کے قرن یعنی اس کی شعاع کا مشاہدہ کیا، بعض کہتے ہیں کہ اس کے سر پر بالوں کی دو لٹیں تھیں، قرن بالوں کی لٹ کو بھی کہتے ہیں۔ یعنی دولٹوں یا دو مینڈھیوں یا، دو زلفوں والا۔ قدیم مفسرین نے بالعموم اس کا مصداق سکندر رومی کو قرار دیا ہے جس کی فتوحات کا دائرہ مشرق و مغرب تک پھیلا

ہم نے اسے زمین میں قوت عطا فرمائی تھی اور اسے ہر چیز کے (۱) سامان بھی عنایت کر دیے تھے۔ (۸۴)

وہ ایک راہ کے پیچھے لگا۔ (۸۵) (۲)

یہاں تک کہ سورج ڈوبنے کی جگہ پہنچ گیا اور اسے ایک دلدل کے چشمے میں غروب ہوتا ہوا پایا (۳) اور اس چشمے

إِنَّا مَكْنَانًا لِّدُنِّي الْأَرْضِ وَإِنِّي مُنْجِلٌ لِّكُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝

فَاتَّبِعْ سَبَبًا ۝

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَرْوَبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَرْوَبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ

ہوا تھا۔ لیکن جدید مفسرین جدید تاریخی معلومات کی روشنی میں اس سے اتفاق نہیں کرتے بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اس پر جو داد تحقیق دی ہے اور اس شخص کی دریافت میں جو محنت و کاوش کی ہے، وہ نہایت قابل قدر ہے۔ ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ اس ذوالقرنین کی بابت قرآن نے صراحت کی ہے کہ وہ ایسا حکمران تھا جس کو اللہ نے اسباب و وسائل کی فراوانی سے نوازا تھا۔ وہ مشرقی اور مغربی ممالک کو فتح کرتا ہوا، ایک ایسے پہاڑی درے پر پہنچا جس کی دوسری طرف یاجوج اور ماجوج تھے۔ ۳- اس نے وہاں یاجوج ماجوج کا راستہ بند کرنے کے لیے ایک نہایت محکم بند تعمیر کیا ۴- ۵- وہ عادل، اللہ کو ماننے والا اور آخرت پر ایمان رکھنے والا تھا۔ ۶- وہ نفس پرست اور مال و دولت کا حریص نہیں تھا۔ مولانا مرحوم فرماتے ہیں کہ ان خصوصیات کا حامل صرف فارس کا وہ عظیم حکمران ہے جسے یونانی سائرس، عبرانی خورس، اور عرب کینخروس کے نام سے پکارتے ہیں، اس کا دور حکمرانی ۵۳۹، قبل مسیح ہے۔ نیز فرماتے ہیں ۸۳۸ء میں سائرس کے ایک مجتھے کا بھی انکشاف ہوا جس میں سائرس کا جسم، اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اس کے دونوں طرف عقاب کی طرح پر نکلے ہوئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر ”ترجمان القرآن“ ج ۱، ص ۳۹۹-۴۰۰، طبع قدیم) واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) سَبَبٌ کے اصلی معنی رسی کے ہیں، اس کا اطلاق ایسے ذریعے اور وسیلے پر ہوتا ہے جو حصول مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس اعتبار سے سَبَبًا کے معنی ہیں، ہم نے اسے ایسے ساز و سامان اور وسائل مہیا کیے، جن سے کام لے کر اس نے فتوحات حاصل کیں، دشمنوں کا غرور خاک میں ملایا اور ظالم حکمرانوں کو نیست و نابود کیا۔

(۲) دوسرے سبب کے معنی راستے کے کیے گئے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے وسائل سے مزید وسائل تیار اور مہیا کیے، جس طرح اللہ کے پیدا کردہ لوہے سے مختلف قسم کے ہتھیار اور اسی طرح دیگر خام مواد سے بہت سی اشیاء بنائی جاتی ہیں۔

(۳) عَيْنٌ سے مراد چشمہ یا سمندر ہے۔ حَمِئَةٌ، کچھڑ، دلدل، وَجَدَهَا دیکھا یا محسوس کیا۔ مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین جب مغربی جہت میں ملک پر ملک فتح کرتا ہوا، اس مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں آخری آبادی تھی وہاں گد لے پانی کا چشمہ یا سمندر تھا جو نیچے سے سیاہ معلوم ہوتا تھا اسے ایسا محسوس ہوا کہ گویا سورج اس چشمے میں ڈوب رہا ہے۔ ساحل سمندر سے یا دور سے، جس کے آگے حد نظر تک کچھ نہ ہو، غروب شمس کا نظارہ کرنے والوں کو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ سورج سمندر میں یا زمین میں ڈوب رہا ہے حالانکہ وہ اپنے مقام آسمان پر ہی ہوتا ہے۔

وَوَجَدَعِنْدَهَا قَوْمًا قُلْنَا يَا الْقَوْمِ ائِمَّا اَنْ
تُعَذِّبَ وَاِمَّا اَنْ تَحْمَدَ فِيهِمْ حُسْنًا ۝

قَالَ اِمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ
عَذَابًا مُّكْرًا ۝

وَاِمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَاءٌ اِلٰى حُسْنٰی ۙ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ
مِنْ اٰمِرًا يُؤْتِرًا ۝

ثُمَّ اَتٰهُمْ سَبَبًا ۝

حَتّٰى اِذَا بَلَغَ اَطْلَمَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ يَجْعَلْ
لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سَبَبًا ۝

كَذٰلِكَ وَقَدْ اَحْطٰنَا بِمَا لَدَيْهِمْ خُبْرًا ۝

کے پاس ایک قوم کو بھی پایا، ہم نے فرمایا (۱) کہ اے
ذوالقرنین! یا تو تو انہیں تکلیف پہنچائے یا ان کے
بارے میں تو کوئی بہترین روش اختیار کرے۔ (۸۶) (۳)
اس نے کہا کہ جو ظلم کرے گا اسے تو ہم بھی اب سزا دیں
گے، (۳) پھر وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا جائے گا اور
وہ اسے سخت تر عذاب دے گا۔ (۸۷)

ہاں جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرے اس کے لیے تو
بدلے میں بھلائی ہے اور ہم اسے اپنے کام میں بھی
آسانی ہی کا حکم دیں گے۔ (۸۸)

پھر وہ اور راہ کے پیچھے لگا۔ (۸۹) (۳)

یہاں تک کہ جب سورج نکلنے کی جگہ تک پہنچا تو اسے
ایک ایسی قوم پر نکلتا پایا کہ ان کے لیے ہم نے اس سے
اور کوئی اوٹ نہیں بنائی۔ (۹۰) (۵)

واقعہ ایسا ہی ہے اور ہم نے اس کے پاس کی کل خبروں کا
احاطہ (۱) کر رکھا ہے۔ (۹۱)

(۱) قُلْنَا (ہم نے کہا) بذریعہ وحی، اسی سے بعض علما نے ان کی نبوت پر استدلال کیا ہے۔ اور جو ان کی نبوت کے قائل
نہیں ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس وقت کے پیغمبر کے ذریعے سے ہم نے اس سے کہا۔

(۲) یعنی ہم نے اس قوم پر غلبہ دے کر اختیار دے دیا کہ چاہے تو اسے قتل کرے اور قیدی بنا لے یا فدیہ لے کر یا بطور
احسان چھوڑ دے۔

(۳) یعنی جو کفر و شرک پر جمار ہے گا، اسے ہم سزا دیں گے یعنی پچھلی غلطیوں پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔

(۴) یعنی اب مغرب سے مشرق کی طرف سفر اختیار کیا۔

(۵) یعنی ایسی جگہ پہنچ گیا جو مشرقی جانب کی آخری آبادی تھی، اسی کو مطلع الشمس کہا گیا ہے۔ جہاں اس نے ایسی قوم
دیکھی جو مکانوں میں رہنے کی بجائے میدانوں اور صحراؤں میں بیراکیے ہوئے، لباس سے بھی آزاد تھی۔ یہ مطلب ہے
ان کے اور سورج کے درمیان کوئی پردہ اور اوٹ نہیں تھی۔ سورج ان کے ننگے جسموں پر طلوع ہوتا۔

(۶) یعنی ذوالقرنین کی بابت ہم نے جو بیان کیا ہے وہ اسی طرح ہے کہ پہلے وہ منہائے مغرب اور پھر منہائے مشرق میں
پہنچا اور ہمیں اس کی تمام صلاحیتوں، اسباب و وسائل اور دیگر تمام باتوں کا پورا علم ہے۔

وہ پھر ایک سفر کے سامان میں لگا۔^(۱) (۹۲)
یہاں تک کہ جب دو دیواروں^(۲) کے درمیان پہنچا ان
دونوں کے پرے اس نے ایک ایسی قوم پائی جو بات سمجھنے
کے قریب بھی نہ تھی۔^(۳) (۹۳)

انہوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین!^(۴) یا جوج ماجوج اس
ملک میں (بڑے بھاری) فساد ہی ہیں،^(۵) تو کیا ہم آپ کے
لیے کچھ خرچ کا انتظام کر دیں؟ (اس شرط پر کہ) آپ
ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دیں۔ (۹۴)

اس نے جواب دیا کہ میرے اختیار میں میرے پروردگار
نے جو دے رکھا ہے وہی بہتر ہے، تم صرف قوت^(۶)
طاقت سے میری مدد کرو۔ (۹۵)

میں تم میں اور ان میں مضبوط حجاب بنا دیتا ہوں۔ مجھے
لوہے کی چادریں لا دو۔ یہاں تک کہ جب ان دونوں
پہاڑوں کے درمیان دیوار برابر کر دی^(۷) تو حکم دیا کہ
آگ تیز جلاؤ تا وقتیکہ لوہے کی ان چادروں کو بالکل

فَمَا تَجِبَرَسَبَا ۝۱۲
حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا قَوْمًا لَّا يَخَدُّونَ
يَفْقَهُونَ قَوْلًا ۝۱۳

قَالُوا لَيْدَا الْقُرْنَيْنِ إِنَّ يَا جُوجَ وَمَا جُوجَ مُعْسِدُونَ فِي
الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَنَا
وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝۱۴

قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ
وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝۱۵

أَتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انضَحُوا
حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ أَتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝۱۶

(۱) یعنی اب اس کا رخ کسی اور طرف کو ہو گیا۔

(۲) اس سے مراد دو پہاڑ ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل تھے، ان کے درمیان کھائی تھی، جس سے یا جوج و ماجوج ادھر
آبادی میں آجاتے اور ادھر چماتے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتے۔

(۳) یعنی اپنی زبان کے سوا کسی اور کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔

(۴) ذوالقرنین سے یہ خطاب یا تو کسی ترہمان کے ذریعے ہوا ہو گا یا اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو جو خصوصی اسباب و
وسائل مہیا فرمائے تھے، انہی میں مختلف زبانوں کا علم بھی ہو سکتا ہے اور یوں یہ خطاب براہ راست بھی ہو سکتا ہے۔

(۵) یا جوج و ماجوج یہ دو قومیں ہیں اور حدیث صحیح کے مطابق نسل انسانی میں سے ہیں اور ان کی تعداد، دو سری انسانی
نسلوں کے مقابلے میں زیادہ ہوگی اور انہی سے جہنم زیادہ بھرے گی (صحیح بخاری۔ تفسیر سورۃ الحج۔ والرقاق)

باب إن زلزلة الساعة شىء عظيم۔ ومسلم۔ کتاب الإيمان، باب "قوله يقول الله لآدم أخرج بعث النار"
(۶) قوت سے مراد یعنی تم مجھے تعمیراتی سامان اور رجال کا مہیا کرو۔

(۷) بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ یعنی دونوں پہاڑوں کے سروں کے درمیان جو خلا تھا، اسے لوہے کی چھوٹی چھوٹی چادروں سے پر کر دیا۔

آگ کر دیا، تو فرمایا میرے پاس لاؤ اس پر پگھلا ہوا
تانا ڈال دوں۔^(۱) (۹۶)

پس تو ان میں اس دیوار کے اوپر چڑھنے کی طاقت تھی
اور نہ اس میں کوئی سوراخ کر سکتے تھے۔ (۹۷)

کہا یہ صرف میرے رب کی مہربانی ہے ہاں جب میرے
رب کا وعدہ آئے گا تو اسے زمین بوس کر دے گا،^(۲)
بیشک میرے رب کا وعدہ سچا اور حق ہے۔ (۹۸)

فَمَا اسْتَطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ۝

قَالَ هَذَا صِرَاطٌ مِّنْ رَبِّي فَأَدْبَأْ وَعَدُّ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَاةً
وَكَانَ وَعَدُّ رَبِّي حَقًّا ۝

(۱) قَطْرًا۔ پگھلا ہوا سیسہ، یا لوہا یا تانبا۔ یعنی لوہے کی چادروں کو خوب گرم کر کے ان پر پگھلا ہوا لوہا، تانبا یا سیسہ ڈالنے سے
وہ پہاڑی درہ یا راستہ ایسا مضبوط ہو گیا کہ اسے عبور کر کے یا توڑ کر یا جوج و ماجوج کا ادھر دوسری انسانی آبادیوں میں آنا
ناممکن ہو گیا۔

(۲) یعنی یہ دیوار اگرچہ بڑی مضبوط بنا دی گئی جس کے اوپر چڑھ کر یا اس میں سوراخ کر کے یا جوج و ماجوج کا ادھر آنا
ممکن نہیں ہے لیکن جب میرے رب کا وعدہ آجائے گا، تو وہ اسے ریزہ ریزہ کر کے زمین کے برابر کر دے گا، اس وعدے
سے مراد قیامت کے قریب یا جوج و ماجوج کا ظہور ہے جیسا کہ احادیث میں ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ
وسلم نے اس دیوار میں تھوڑے سے سوراخ کو فتنے کے قریب ہونے سے تعبیر فرمایا (صحیح بخاری، نمبر ۳۳۶۳، و مسلم،
نمبر ۲۲۰۸) ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ وہ ہر روز اس دیوار کو کھودتے ہیں اور پھر کل کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن
جب اللہ کی مشیت ان کے خروج کی ہوگی تو پھر وہ کہیں گے کل ان شاء اللہ اس کو کھودیں گے اور پھر دوسرے دن وہ
اس سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ زمین میں فساد پھیلائیں گے حتیٰ کہ لوگ قلعہ بند ہو جائیں گے، یہ آسمانوں پر
تیر پھینکیں گے جو خون آلودہ لوٹیں گے، بالآخر اللہ تعالیٰ ان کی گدیوں پر ایسا کیزرا پیدا فرمادے گا جس سے ان کی ہلاکت
واقع ہو جائے گی۔ (مسند أحمد ۱۲ / ۵۱۱، جامع ترمذی نمبر ۲۱۵۳، والأحادیث الصحيحة للآلبانی۔ نمبر
۱۱۷۳۵ صحیح مسلم میں نواس بن معان رضی اللہ عنہ کی روایت میں صراحت ہے کہ یا جوج و ماجوج کا ظہور حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کے نزول کے بعد ان کی موجودگی میں ہو گا، (کتاب المغنن وأشرط الساعة، باب ذکر الدجال،) جس سے ان حضرات
کی تردید ہو جاتی ہے، جو کہتے ہیں کہ تاتاریوں کا مسلمانوں پر حملہ، یا منگول ترک جن میں سے چنگیز بھی تھا یا روسی یا چینی
قومیں یہی یا جوج و ماجوج ہیں، جن کا ظہور ہو چکا۔ یا مغربی قومیں ان کا مصداق ہیں کہ پوری دنیا میں ان کا غلبہ و تسلط ہے۔
یہ سب باتیں غلط ہیں کیوں کہ ان کے غلبے سے سیاسی غلبہ مراد نہیں ہے بلکہ قتل و غارت گری اور شر و فساد کا وہ عارضی
غلبہ ہے جس کا مقابلہ کرنے کی طاقت مسلمانوں میں نہیں ہوگی، تاہم پھر وہابی مرض سے سب کے سب آن واحد میں
لقمۃ اجل بن جائیں گے۔

اس دن ہم انہیں آپس میں ایک دوسرے میں گڈھ ہوتے ہوئے چھوڑ دیں گے اور صور پھونک دیا جائے گا پس سب کو اکٹھا کر کے ہم جمع کر لیں گے۔ (۹۹)

اس دن ہم جنم کو (بھی) کافروں کے سامنے لا کھڑا کر دیں گے۔ (۱۰۰)

جن کی آنکھیں میری یاد سے پردے میں تھی اور (امر حق) سن بھی نہیں سکتے تھے۔ (۱۰۱)

کیا کافر یہ خیال کیے بیٹھے ہیں؟ کہ میرے سوا وہ میرے بندوں کو اپنا حمایتی بنا لیں گے؟ (سنو) ہم نے تو ان کفار کی مہمانی کے لیے جہنم کو تیار کر رکھا ہے۔ (۱۰۲)^(۱)

کہہ دیجئے کہ اگر (تم کہو تو) میں تمہیں بتا دوں کہ باعتبار اعمال سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ (۱۰۳)

وہ ہیں کہ جنکی دنیوی زندگی کی تمام ترکوششیں بیکار ہو گئیں اور وہ اسی گمان میں رہے کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں۔ (۱۰۳)^(۲)

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں اور اس کی ملاقات سے کفر کیا،^(۳) اس لیے ان کے اعمال

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوتُ فِي بَعْضٍ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ
فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ۙ ﴿۹۹﴾

وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكَافِرِينَ عَرْضًا ۙ ﴿۱۰۰﴾

لَا يَذَرِينَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ عَن ذِكْرِي وَكَانُوا
لَا يَسْتَبِيعُونَ سَمْعًا ۙ ﴿۱۰۱﴾

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنْ يَّخْلُقُوْا عِبَادًا يُّمِِنُ
دُوْنِيْ اَوْلِيَاءَ اِنَّا اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِّلْكَافِرِيْنَ نَزْلًا ۙ ﴿۱۰۲﴾

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۙ ﴿۱۰۳﴾

الَّذِيْنَ ضَلَّ سَبِيْلَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ
اَنْهُمْ مُّجْتَبٰوْنَ صُنْعًا ۙ ﴿۱۰۳﴾

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِآيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقٰٓئِهِ فَحَبَّطُوْا

(۱) حَسِبَ، بمعنی ظَنَّ ہے اور عِبَادِي (میرے بندوں) سے مراد ملائکہ، مسج علیہ السلام اور دیگر صالحین ہیں، جن کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جاتا ہے، اسی طرح شیاطین و جنات ہیں جن کی عبادت کی جاتی ہے۔ اور استفہام زجر و توبخ کے لیے ہے۔ یعنی غیر اللہ کے یہ بچاری کیا یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مجھے چھوڑ کر اور میرے بندوں کی عبادت کر کے ان کی حمایت سے میرے عذاب سے بچ جائیں گے؟ یہ ناممکن ہے، ہم نے تو ان کافروں کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے جس میں جانے سے ان کو وہ بندے نہیں روک سکیں گے جن کی یہ عبادت کرتے اور ان کو اپنا حمایتی سمجھتے ہیں۔

(۲) یعنی اعمال ان کے ایسے ہیں جو اللہ کے ہاں ناپسندیدہ ہیں، لیکن بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں۔ اس سے مراد کون ہیں؟ بعض کہتے ہیں، یہود و نصاریٰ ہیں، بعض کہتے ہیں خوارج اور دیگر اہل بدعت ہیں، بعض کہتے ہیں کہ مشرکین ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ آیت عام ہے جس میں ہر وہ فرد اور گروہ شامل ہے جس کے اندر مذکورہ صفات ہوں گی۔ آگے ایسے ہی لوگوں کی بابت مزید وعیدیں بیان کی جا رہی ہیں۔

(۳) رب کی آیات سے مراد توحید کے وہ دلائل ہیں جو کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ آیات تشریحی ہیں جو اس نے

أَعْمَالَهُمْ فَلَا يُقِيمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَرَبَّنَا ۝

غارت ہو گئے پس قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن قائم نہ کریں گے۔^(۱) (۱۰۵)

ذَلِكَ جَزَاءُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَأَتَّخَذُوا الْيَتِيمَ الَّذِي هُوَ رُحْمًا ۝

حال یہ ہے کہ ان کا بدلہ جہنم ہے کیونکہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیتوں اور میرے رسولوں کو مذاق میں اڑایا۔ (۱۰۶)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے کام بھی اچھے کیے یقیناً ان کے لیے الفردوس^(۲) کے باغات کی مسمانی ہے۔ (۱۰۷)

خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَدْخُمُونَ فِيهَا الْعَاثِرُونَ ۝

جہاں وہ ہمیشہ رہا کریں گے جس جگہ کو بدلنے کا کبھی بھی ان کا ارادہ ہی نہ ہو گا۔^(۳) (۱۰۸)

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِلًّا وَالْجِبَالُ مِلًّا لَفِدَا الْبَعْرُفِينَ أَنْ سَفَعَتْ

کہہ دیجئے کہ اگر میرے پروردگار کی باتوں کے^(۴) لکھنے کے لیے سمندر سیاہی بن جائے تو وہ بھی میرے رب کی

اپنی کتابوں میں نازل کیں اور پیغمبروں نے ان کی تبلیغ و توضیح کی۔ اور رب کی ملاقات سے کفر کا مطلب آخرت کی زندگی اور دوبارہ جی اٹھنے سے انکار ہے۔

(۱) یعنی ہمارے ہاں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی یا یہ مطلب ہے کہ ہم ان کے لیے میزان کا اہتمام ہی نہیں کریں گے کہ جس میں ان کے اعمال تولے جائیں، اس لیے کہ اعمال تو ان موحدین کے تولے جائیں گے جن کے نامہ اعمال میں نیکیاں اور برائیاں دونوں ہوں گی، جب کہ ان کے نامہ اعمال، حسنت سے بالکل خالی ہوں گے جس طرح حدیث میں آتا ہے کہ ”قیامت والے دن موٹا تازہ آدمی آئے گا، اللہ کے ہاں اس کا اتنا وزن نہیں ہو گا جتنا چھمکے پر کا ہوتا ہے“ پھر آپ ﷺ نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی۔ (صحیح بخاری۔ سورۃ الکہف)

(۲) جنت الفردوس، جنت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے، اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”جب بھی تم اللہ سے جنت کا سوال کرو تو الفردوس کا سوال کرو“ اس لیے کہ وہ جنت کا اعلیٰ حصہ ہے اور وہیں سے جنت کی نہریں پھوٹی ہیں۔

(البخاری کتاب التوحید، باب وکان عرشہ علی الماء)

(۳) یعنی اہل جنت، جنت اور اس کی نعمتوں سے کبھی نہ اکتائیں گے کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور جگہ منتقل ہونے کی خواہش ظاہر کریں۔

(۴) کَلِمَاتٍ سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم محیط، اس کی حکمتیں اور وہ دلائل و براہین ہیں جو اس کی وحدانیت پر دال ہیں۔ انسانی عقلیں ان سب کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور دنیا بھر کے درختوں کے قلم بن جائیں اور سارے سمندر بلکہ ان کی مثل اور بھی سمندر ہوں، وہ سب سیاہی میں بدل جائیں، قلم گھس جائیں گے اور سیاہی ختم ہو جائے گی، لیکن رب کے کلمات اور اس کی حکمتیں ضبط تحریر میں نہیں آسکیں گی۔

كَلِمَاتٍ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْتُم بِبَيِّنَاتٍ مِّنْ دُونِىْ ۝

قُلْ اِنَّ اَكْبَرَكُمْ لِيَوْمِ الْاَمْتِ الْهَلْهُوْا وَ اِحْدَهُمْ كَانَ
رِيْجُوْلًا قَاذِرًا فَبِئْسَ لِقَاؤُهُمْ فَاَلَمْ يَلْعَنُوْا لِمَا اُوْلٰئِكَ رُوْا يِعْبَادُوْا رَبَّهٗ اَحَدًا ۝

باتوں کے ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا، گو ہم
اسی جیسا اور بھی اس کی مدد میں لے آئیں۔ (۱۰۹)
آپ کہہ دیجئے کہ میں تو تم جیسا ہی ایک انسان
ہوں۔^(۱) (ہاں) میری جانب وحی کی جاتی ہے کہ سب کا
معبود صرف ایک ہی معبود ہے،^(۲) تو جسے بھی اپنے
پروردگار سے ملنے کی آرزو ہو اسے چاہیے کہ نیک
اعمال کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت^(۳) میں کسی کو
بھی شریک نہ کرے۔ (۱۱۰)

سورہ مریم کی ہے اور اس میں اٹھانویں آیتیں اور
چھ رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں میں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔
کمیصص۔ (۱) یہ ہے تیرے پروردگار کی اس مہربانی کا ذکر
جو اس نے اپنے بندے زکریا^(۲) پر کی تھی۔ (۲)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

كَهَيِّص ۝ ذِكْرُ حَمِيَّتِ رَبِّكَ عَبْدًا ذَكْرًا ۝

(۱) اس لیے میں بھی رب کی باتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

(۲) البتہ مجھے یہ امتیاز حاصل ہے کہ مجھ پر وحی الہی آتی ہے۔ اسی وحی کی بدولت میں نے اصحاب کف اور ذوالقرنین کے
متعلق اللہ کی طرف سے نازل کردہ وہ باتیں بیان کی ہیں جن پر مرور ایام کی دبیز تمہیں پڑی ہوئی تھیں یا ان کی حقیقت
افسانوں میں گم ہو گئی تھی۔ علاوہ ازیں اس وحی میں سب سے اہم حکم یہ دیا گیا ہے کہ تم سب کا معبود صرف ایک ہے۔

(۳) عمل صالح وہ ہے جو سنت کے مطابق ہو، یعنی جو اپنے رب کی ملاقات کا یقین رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ ہر عمل
سنت نبوی کے مطابق کرے۔ اور دوسرے، اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اس لیے کہ بدعت اور شرک
دونوں ہی جبط اعمال کا سبب ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔

☆ ہجرت حبشہ کے واقعات میں بیان کیا گیا ہے کہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور اسکے مصاحبین اور امرا کے سامنے جب سورہ
مریم کا ابتدائی حصہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے پڑھ کر سنایا تو ان سب کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں اور نجاشی
نے کہا کہ یہ قرآن اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو لے کر آئے ہیں، یہ سب ایک ہی مشعل کی کرنیں ہیں (فتح القدیر)

(۳) حضرت زکریا علیہ السلام، انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ یہ بڑھی تھے اور یہی پیشہ ان کا ذریعہ آمدنی تھا۔

اِذْ نَادَى رَبَّهُ يَدَاؤُا حَتِيْبًا ۝

قَالَ رَبِّ اِنِّى وَهَمَّ اَلْعَظْمُ مِغْنٰى وَاشْتَعَلَ الرَّاسُ حَتِيْبًا وَاَلْوَالِدُ

يَدُ اَعْلٰىكَ رَبِّ سَمِيْعًا ۝

وَاِنِّى خِفْتُ اَلْمَوَالِىَ مِنْ وَاوَالِىِّى وَكَانَتْ اَمْرًا نِى عَاقِرًا

فَهَبْ لِىْ مِنْ لَدُنْكَ وَلَدًا ۝

يٰرَبِّىْ وَرَبِّتِىْ مِنْ اِلٰى يَعْقُوْبَ وَاَجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيْعًا ۝

بِذِكْرِكَ اِنَّا نَشْكُرُكَ بِحَمْدِكَ سَمِيْعًا لَمْ نَجْعَلْ لَهُ مِنْ قَبْلُ

سَمِيْعًا ۝

قَالَ رَبِّ اِنِّى يٰكُوْنُ لىْ عُلْمًا وَكَانَتْ اَمْرًا نِى عَاقِرًا

(صحیح مسلم، باب من فضائل زکریا)

(۱) خفیہ دعا اس لیے کی کہ ایک تو یہ اللہ کو زیادہ پسند ہے کیوں کہ اس میں تقضع و اناہت اور خشوع و خضوع زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ انہیں بیوقوف نہ قرار دیں کہ یہ بڑھا ہا بڑھا پاپے میں اولاد مانگ رہا ہے جب کہ اولاد کے تمام ظاہری امکانات ختم ہو چکے ہیں۔

(۲) یعنی جس طرح کلڈی آگ سے بھڑک اٹھتی ہے اسی طرح میرا سربالوں کی سفیدی سے بھڑک اٹھا ہے مراد ضعف و کبر (بڑھاپے) کا اظہار ہے۔

(۳) اور اسی لیے ظاہری اسباب کے فقدان کے باوجود تجھ سے اولاد مانگ رہا ہوں۔

(۴) اس ڈر سے مراد یہ ہے کہ اگر میرا کوئی وارث میری مسند و عظ و ارشاد نہیں سنبھالے گا تو میرے قرابت داروں میں اور تو کوئی اس مسند کا اہل نہیں ہے۔ نتیجتاً میرے قرابت دار بھی تیرے راستے سے گریز و انحراف نہ اختیار کر لیں۔

(۵) ”اپنے پاس سے“ کا مطلب یہی ہے کہ گو ظاہری اسباب اس کے ختم ہو چکے ہیں، لیکن تو اپنے فضل خاص سے مجھے اولاد سے نواز دے۔

(۶) اللہ تعالیٰ نے نہ صرف دعا قبول فرمائی بلکہ اس کا نام بھی تجویز فرما دیا۔

جبکہ اس نے اپنے رب سے چپکے چپکے دعا کی تھی۔^(۱) (۳)

کہ اے میرے پروردگار! میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اور سر بڑھاپے کی وجہ سے بھڑک اٹھا ہے،^(۲) لیکن میں کبھی بھی تجھ سے دعا کر کے محروم نہیں رہا۔^(۳) (۴)

مجھے اپنے مرنے کے بعد اپنے قرابت والوں کا ڈر ہے،^(۴) میری بیوی بھی بانجھ ہے پس تو مجھے اپنے پاس سے

وارث عطا فرما۔ (۵)

جو میرا بھی وارث ہو اور یعقوب (علیہ السلام) کے خاندان کا بھی جائنیں اور میرے رب! تو اسے مقبول

بندہ بنا لے۔ (۶)

اے زکریا! ہم تجھے ایک بچے کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے، ہم نے اس سے پہلے اس کا ہم نام بھی کسی کو نہیں کیا۔^(۱) (۷)

زکریا (علیہ السلام) کہنے لگے میرے رب! میرے ہاں لڑکا

وَقَدْ بَلَّغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝

کیسے ہو گا، جب کہ میری بیوی بانجھ اور میں خود بڑھاپے کے انتہائی ضعف کو پہنچ چکا ہوں۔^(۸)

قَالَ كَذَلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلِيمٌ هَدِيدٌ وَقَدْ خَلَقْتُكَ

ارشاد ہوا کہ وعدہ اسی طرح ہو چکا، تیرے رب نے فرما دیا ہے کہ مجھ پر تو یہ بالکل آسان ہے اور تو خود جبکہ کچھ نہ تھا میں تجھے پیدا کر چکا ہوں۔^(۹)

مِنْ قَبْلِ وَاكْرَمْتُكَ سَيِّئًا ۝

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً قَالَ اِنَّكَ اَلَا تُحْجِمُ النَّاسَ

کننے لگے میرے پروردگار میرے لیے کوئی علامت مقرر فرما دے، ارشاد ہوا کہ تیرے لیے علامت یہ ہے کہ باوجود بھلا چنگا ہونے کے تو تین راتوں تک کسی شخص سے بول نہ سکے گا۔^(۱۰)

تِلْكَ لَيَالٍ سَيِّئًا ۝

اب زکریا (علیہ السلام) اپنے حجرے^(۱۱) سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آکر انہیں اشارہ کرتے ہیں کہ تم صبح و شام

فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَدْعَىٰ اَلَيْهٖمُ اَنْ سَمِعُوْا

(۱) عَاقِرٌ: اس عورت کو بھی کہتے ہیں جو بڑھاپے کی وجہ سے اولاد جننے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہو اور اس کو بھی کہتے ہیں جو شروع سے ہی بانجھ ہو۔ یہاں یہ دوسرے معنی میں ہی ہے۔ جو کڑی سوکھ جائے، اسے عِتِيًّا کہتے ہیں۔ مراد بڑھاپے کا آخری درجہ ہے جس میں ہڈیاں اکڑ جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میری بیوی تو جوانی سے ہی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے کے انتہائی آخری درجے پر پہنچ چکا ہوں، اب اولاد کیسے ممکن ہے؟ کہا جاتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی اہلیہ کا نام اشاع بنت فاقود بن میل ہے اور یہ حضرت خذ (والدہ مریم) کی بہن ہیں۔ لیکن زیادہ صحیح قول یہ لگتا ہے کہ اشاع بھی حضرت عمران کی دختر ہیں جو حضرت مریم کے والد تھے۔ یوں حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپس میں خالہ زاد بھائی ہیں۔ حدیث صحیح سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ (فتح القدر)

(۲) فرشتوں نے حضرت زکریا کا تعجب دور کرنے کے لیے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے بیٹا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے جس کے مطابق یقیناً تجھے بیٹا ملے گا، اور یہ اللہ کے لیے قطعاً مشکل کام نہیں ہے کیوں کہ جب وہ تجھے نیست سے ہست کر سکتا ہے تو تجھے ظاہری اسباب سے ہٹ کر بیٹا بھی دے سکتا ہے۔

(۳) راتوں سے مراد، دن اور رات ہیں اور سَوِيًّا کا مطلب ہے بالکل ٹھیک ٹھاک، تندرست، یعنی ایسی کوئی بیماری نہیں ہوگی جو تجھے بولنے سے روک دے۔ لیکن اس کے باوجود تیری زبان سے گفتگو نہ ہو سکے تو سمجھ لینا کہ خوش خبری کے دن قریب آگئے ہیں۔

(۴) مِحْرَابٌ سے مراد وہ حجرہ ہے جس میں وہ اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ یہ حَرَبٌ سے ہے جس کے معنی لڑائی کے ہیں۔ گویا عبادت گاہ میں رہ کر اللہ کی عبادت کرنا ایسے ہے گویا وہ شیطان سے لڑ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرو۔^(۱) (۱۱)
 ”اے نبی! میری کتاب^(۲) کو مضبوطی سے تھام لے“ اور
 ہم نے اسے لڑکپن ہی سے دانائی عطا فرمادی۔^(۳) (۱۲)
 اور اپنے پاس سے شفقت اور پاکیزگی بھی^(۴)، وہ پرہیزگار
 شخص تھا۔ (۱۳)
 اور اپنے ماں باپ سے نیک سلوک کرنے والا تھا وہ
 سرکش اور گناہ گار نہ تھا۔^(۵) (۱۴)
 اس پر سلام ہے جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ
 مرے اور جس دن وہ زندہ کر کے اٹھایا جائے۔^(۶) (۱۵)
 اس کتاب میں مریم کا بھی واقعہ بیان کر۔ جبکہ وہ اپنے گھر

بُكْرَةً وَعَشِيًّا ۝
 يَمِينِي خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝
 وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا وَزَكَاةً وَكَانَ تَقِيًّا ۝
 وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمَّا كُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝
 وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝
 وَادْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ اتَّخَذَتْ مِن آهْلِهَا مَكَانًا

- (۱) صبح و شام اللہ کی تسبیح سے مراد عصر اور فجر کی نماز ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ان دو وقتوں میں اللہ کی تسبیح و تحمید اور تنزیہ کا خصوصی اہتمام کرو۔
- (۲) یعنی اللہ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو نبی علیہ السلام عطا فرمایا اور جب وہ کچھ بڑا ہوا تو ابھی بچہ ہی تھا، اسے اللہ نے کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے یعنی اس پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ کتاب سے مراد تورات ہے یا ان پر مخصوص نازل کردہ کوئی کتاب ہے جس کا اب ہمیں علم نہیں۔
- (۳) حُكْمٌ سے مراد دانائی، عقل، شعور، کتاب میں درج احکام دینیہ کی سمجھ، علم و عمل کی جامعیت یا نبوت مراد ہے۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ اس امر میں کوئی مانع نہیں ہے کہ حکم میں یہ ساری ہی چیزیں داخل ہوں۔
- (۴) حَنَانًا، شفقت، مہربانی، یعنی ہم نے اس کو والدین اور اقربا پر شفقت و مہربانی کرنے کا جذبہ اور اسے نفس کی آلائشوں اور گناہوں سے پاکیزگی و طہارت بھی عطا کی۔
- (۵) یعنی اپنے ماں باپ کی یا اپنے رب کی نافرمانی کرنے والا نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے دل میں والدین کے لیے شفقت و محبت کا اور ان کی اطاعت و خدمت اور حسن سلوک کا جذبہ اللہ تعالیٰ پیدا فرمادے تو یہ اس کا خاص فضل و کرم ہے اور اس کے برعکس جذبہ یا رویہ، یہ اللہ تعالیٰ کے فضل خاص سے محرومی کا نتیجہ ہے۔
- (۶) تین مواقع انسان کے لیے سخت و وحشت ناک ہوتے ہیں، ۱- جب انسان رحم مادر سے باہر آتا ہے، ۲- جب موت کا شکنجہ اسے اپنی گرفت میں لیتا ہے، ۳- اور جب اسے قبر سے زندہ کر کے اٹھایا جائے گا تو وہ اپنے کو میدان محشر کی ہولناکیوں میں گھرا ہوا پائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان تینوں جگہوں میں اس کے لیے ہماری طرف سے سلامتی اور امان ہے۔ بعض اہل بدعت اس آیت سے یوم ولادت پر ”عید میلاد“ کا جواز ثابت کرتے ہیں۔ لیکن کوئی ان سے پوچھے تو پھر یوم وفات پر ”عید وفات“ یا

سَرِيْعًا ۝

فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا ۗ فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا
فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝

قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝

قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ۝

قَالَتْ أَنَّى يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ
أَلْبَسْ عِيًّا ۝

کے لوگوں سے علیحدہ ہو کر مشرقی جانب آئیں۔ (۱۶)
اور ان لوگوں کی طرف سے پردہ کر لیا،^(۱) پھر ہم نے اس
کے پاس اپنی روح (جبرائیل علیہ السلام) کو بھیجا پس وہ
اس کے سامنے پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا۔^(۲) (۱۷)
یہ کہنے لگیں میں تجھ سے رحمن کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو
کچھ بھی اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ (۱۸)
اس نے جواب دیا کہ میں تو اللہ کا بھیجا ہوا قاصد ہوں،
تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دینے آیا ہوں۔ (۱۹)
کہنے لگیں بھلا میرے ہاں بچہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے تو کسی
انسان کا ہاتھ تک نہیں لگا اور نہ میں بدکار ہوں۔ (۲۰)

”عید ممت“ بھی منانی ضروری ہوئی۔ کیوں کہ جس طرح یوم ولادت کے لیے ”سلام“ ہے یوم وفات کے لیے بھی سلام ہے۔
اگر محض لفظ ”سلام“ سے ”عید میلاد“ کا اثبات ممکن ہے تو پھر اسی لفظ سے ”عید وفات“ کا بھی اثبات ہوتا ہے۔ لیکن یہاں
وفات کی عید تو کجا، سرے سے وفات و ممت ہی کا انکار ہے۔ یعنی وفات نبوی ﷺ کا انکار کر کے نص قرآنی کا تو انکار کرتے ہی
ہیں، خود اپنے استدلال کی رو سے بھی آیت کے ایک جز کو تو مانتے ہیں، اور اسی آیت کے دوسرے جز سے ان ہی کے استدلال
کی روشنی میں، جو ثابت ہوتا ہے، اس کا انکار ہے۔ ﴿ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ﴾ (البقرہ: ۸۵) ”کیا بعض
احکام پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟“

(۱) یہ علیحدگی اور حجاب (پردہ) اللہ کی عبادت کی غرض سے تھا تاکہ انہیں کوئی نہ دیکھے اور یکسوئی حاصل رہے یا طہارت
حیض کے لیے۔ اور مشرقی مکان سے مراد بیت المقدس کی مشرقی جانب ہے۔

(۲) ذُوْحٌ سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں، جنہیں کامل انسانی شکل میں حضرت مریم کی طرف بھیجا گیا، حضرت
مریم نے جب دیکھا کہ ایک شخص بے دھڑک اندر آ گیا ہے تو ڈر گئیں کہ یہ بری نیت سے نہ آیا ہو۔ حضرت جبرائیل علیہ
السلام نے کہا میں وہ نہیں ہوں جو تو گمان کر رہی ہے بلکہ تیرے رب کا قاصد ہوں اور یہ خوش خبری دینے آیا ہوں کہ
اللہ تعالیٰ تجھے لڑکا عطا فرمائے گا، بعض قراء توں میں لِيَهَبَ صِيْنَةً غَائِبَ ہے۔ متکلم کا صیغہ (جو موجودہ قراءت میں ہے)
اس لیے بولا کہ ظاہری اسباب کے لحاظ سے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ان کے گریبان میں پھونک ماری تھی جس
سے باذن اللہ ان کو حمل ٹھہر گیا تھا۔ اس لیے بہرہ کا انتساب اپنی طرف کر لیا۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کا قول ہو
اور یہاں حکایتاً نقل ہوا ہو۔ اس اعتبار سے تقدیر کلام یوں ہو گی، اُرْسَلْنِي، يَقُوْلُ لَكَ اُرْسَلْتُ رَسُوْلِي اِلَيْكَ لِأَهَبَ
لَكَ (ایسر العفاسیر) یعنی ”اللہ نے مجھے تیرے لیے یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ میں نے تیری طرف اپنا قاصد یہ

اس نے کہا بات تو یہی ہے،^(۱) لیکن تیرے پروردگار کا ارشاد ہے کہ وہ مجھ پر بہت ہی آسان ہے ہم تو اسے لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دیں^(۲) گے اور اپنی خاص رحمت،^(۳) یہ تو ایک طے شدہ بات ہے۔^(۴)

پس وہ حمل سے ہو گئیں اور اسی وجہ سے وہ یکسو ہو کر ایک دور کی جگہ چلی گئیں۔ (۲۲)

پھر دروزہ اسے ایک کھجور کے تنے کے نیچے لے آیا، بولی کاش! میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی اور لوگوں کی یاد سے بھی بھولی برسی ہو جاتی۔^(۵) (۲۳)

اتنے میں اسے نیچے سے ہی آواز دی کہ آزرده خاطر نہ ہو، تیرے رب نے تیرے پاؤں تلے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے۔ (۲۴)

اور اس کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلا، یہ تیرے سامنے

قَالَ كَذَلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلِيمٌ هَدِيدٌ وَلَنَجْعَلَنَّ آيَةً
لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِنَّا وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ①

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَدَّتْ بِهِ مَكَانًا قَاصِيًّا ②

فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يَلَيْتَنِي مَثٌ
قَبْلَ هَذَا وَكُذْتُ نَسِيًّا مَنَسِيًّا ③

فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا أَلَا تَحْزَنِينَ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ
تَحْتَكِ سَرِيًّا ④

وَهَزِيحِي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَِّعُ عَلَيْكِ

بتلانے کے لیے بھیجا ہے کہ میں تجھے ایک پاکیزہ بچہ عطا کروں گا۔ اس طرح حذف اور تقدیر کلام قرآن میں کئی جگہ ہے۔ (۱) یعنی یہ بات تو صحیح ہے کہ تجھے مرد سے مقاربت کا کوئی موقعہ نہیں ملا ہے، جائز طریقے سے نہ ناجائز طریقے سے۔ جب کہ حمل کے لیے عادتاً یہ ضروری ہے۔

(۲) یعنی میں اسباب عادیہ کا محتاج نہیں ہوں، میرے لیے یہ بالکل آسان ہے اور ہم اسے اپنی قدرت تخلیق کے لیے نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے قبل ہم نے تمہارے باپ آدم کو مرد اور عورت کے بغیر، اور تمہاری ماں حوا کو صرف مرد سے پیدا کیا اور اب عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کر کے چوتھی شکل میں بھی پیدا کرنے پر اپنی قدرت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں اور وہ ہے صرف عورت کے بطن سے، بغیر مرد کے پیدا کر دینا۔ ہم تخلیق کی چاروں صورتوں پر قادر ہیں۔

(۳) اس سے مراد نبوت ہے، جو اللہ کی رحمت خاص ہے اور ان کے لیے بھی جو اس نبوت پر ایمان لائیں گے۔ (۴) یہ اسی کلام کا تتمہ ہے، جو جبرائیل علیہ السلام نے اللہ کی طرف سے نقل کیا ہے۔ یعنی یہ اعجازی تخلیق۔ تو اللہ کے علم اور اس کی قدرت و مشیت میں مقدر ہے۔

(۵) موت کی آرزو اس ڈر سے کی کہ میں بچے کے مسئلے پر لوگوں کو کس طرح مطمئن کر سکوں گی، جب کہ میری بات کی کوئی تصدیق کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہو گا۔ اور یہ تصور بھی روح فرسا تھا کہ کہاں میری شہرت ایک عابدہ و زاہدہ کے طور پر ہے اور اس کے بعد لوگوں کی نظروں میں بدکار ٹھہروں گی۔

رُطَبًا جَذِيًّا ۝

فَكُلْ وَاشْرَبْ وَفَرِّمْ عَيْنًا فَمَا تَرَيْنَ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا
فَقَوْلًا اِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَكُنْ اَكْلًا لِّيَوْمِ اِنشِيَا ۝

فَاَتَتْ بِهٖ حَمَلًا حَمِيْلَةً ۚ قَالُوْا لِمَ اِيْمُرُكُمْ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا فَرِيًّا ۝

يَا خُتْلُوْا لَهْرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكُمْ اَمْرًا سُوْءًا وَّمَا كَانَتْ اُمَّكُمْ اَبِيًّا ۝

فَاَشَارَتْ اِلَيْهٖةٖ قَالُوْا كَيْفَ نَحْمِلُهٗ مِنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝

قَالَ اِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ اِنشِي الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۝

تروتازہ پکی کھجوریں گرا دے گا۔ (۲۵)

اب چین سے کھاپی اور آنکھیں ٹھنڈی رکھ، (۲) اگر تجھے کوئی انسان نظر پڑ جائے تو کہہ (۳) دینا کہ میں نے اللہ رحمن کے نام کا روزہ مان رکھا ہے۔ میں آج کسی شخص سے بات نہ کروں گی۔ (۲۶)

اب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو لیے ہوئے وہ اپنی قوم کے پاس آئیں۔ سب کہنے لگے مریم تو نے بڑی بری حرکت کی۔ (۲۷)

اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھی۔ (۲۸)

مریم نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ سب کہنے لگے کہ لو بھلا ہم گود کے بچے سے باتیں کیسے کریں؟ (۲۹)

بچہ بول اٹھا کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے اپنا پیغمبر بنایا (۳۰) ہے۔ (۳۰)

(۱) سَرِيًّا چھوٹی نہریا پانی کا چشمہ۔ یعنی بطور کرامت اور خرق عادت، اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کے پاؤں تلے، پینے کے لیے پانی کا اور کھانے کے لیے ایک سوکھے ہوئے درخت میں پکی ہوئی تازہ کھجوروں کا انتظام کر دیا۔ ندا دینے والے حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے، جنہوں نے وادی کے نیچے سے آواز دی اور کہا جاتا ہے کہ سَرِيًّا بمعنی سردار ہے اور اس سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور انہی نے حضرت مریم کو نیچے سے آواز دی تھی۔

(۲) یعنی کھجوریں کھا، چشمے کا پانی پی اور بچے کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کر۔

(۳) یہ کہنا بھی اشارے سے تھا، زبان سے نہیں، علاوہ ازیں ان کے ہاں روزے کا مطلب ہی کھانے اور بولنے سے پرہیز تھا۔

(۴) ہارون سے مراد ممکن ہے ان کا کوئی یعنی یا علاقائی بھائی ہو، یہ بھی ممکن ہے ہارون سے مراد ہارون رسول (برادر موسیٰ علیہ السلام) ہی ہوں اور عربوں کی طرح ان کی نسبت اخوت ہارون کی طرف کر دی، جیسے کہا جاتا ہے يَا اَخَاتِنِيْمِ! يَا اَخَا الْعَرَبِ وغیرہ یا تقویٰ و پاکیزگی اور عبادت میں حضرت ہارون علیہ السلام کی طرح انہیں سمجھتے ہوئے، انہیں مثبتیت اور مشابہت میں اخت ہارون کہا ہو، اس کی مثالیں قرآن کریم میں بھی موجود ہیں (السر التفسیر و ابن کثیر)

(۵) یعنی قضا و قدر ہی میں اللہ نے میرے لیے فیصلہ کیا ہوا ہے کہ وہ مجھے کتاب اور نبوت سے نوازے گا۔

اور اس نے مجھے باہر کت کیا ہے (۱) جہاں بھی میں ہوں،
اور اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک بھی
میں زندہ رہوں۔ (۳۱)

اور اس نے مجھے اپنی والدہ کا خدمت گزار بنایا ہے (۲)
مجھے سرکش اور بد بخت نہیں کیا۔ (۳۲)

اور مجھ پر میری پیدائش کے دن اور میری موت کے دن
اور جس دن کہ میں دوبارہ زندہ کھڑا کیا جاؤں گا سلام ہی
سلام ہے۔ (۳۳)

یہ ہے صحیح واقعہ عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کا یہی ہے وہ
حق بات جس میں لوگ شک و شبہ میں مبتلا ہیں۔ (۳۳)
اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کا ہونا لائق نہیں، وہ تو بالکل پاک
ذات ہے، وہ تو جب کسی کام کے سرانجام دینے کا ارادہ
کرتا ہے تو اسے کہہ دیتا ہے کہ ہو جا، وہ اسی وقت ہو جاتا

وَجَعَلَنِي مُبْرَأًا مِّنْ مَّا كُنْتُ وَأَوْصِيَنِ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ
مَا كُنْتُ حَيًّا ۝۱

وَبَرًّا بِوَالِدَاتِي وَكَلِمَةً يَّجْعَلُنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ۝۲

وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ
حَيًّا ۝۳

ذَٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ۝۴

مَا كَانُوا يَلْقَوْنَ فِيهَا قَوْلَ مَوْلَايَ فَكُلُوا مِن مَّا رِزَقْتُمُوهَا إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا
فَأَنبَأَ قَوْمًا بِأَفْعَالِهِمْ ۝۵

(۱) اللہ کے دین میں ثابت قدم یا ہر چیز میں زیادتی، علو اور کامیابی میرا مقدر ہے یا لوگوں کے لیے نافع، معلم خیر یا
معروف کا حکم دینے والا اور برائی سے روکنے والا۔ (فتح القدر)

(۲) صرف والدہ کے ساتھ حسن سلوک کے ذکر سے بھی واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بغیر باپ کے
ایک اعجازی شان کی حامل ہے، ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی، حضرت یحییٰ علیہ السلام کی طرح بَرًّا بِوَالِدَاتِهِ (ماں باپ
کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا) کہتے، یہ نہ کہتے کہ میں ماں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا ہوں۔

(۳) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ماں باپ کا خدمت گزار اور اطاعت شعار نہیں ہوتا، اس کی فطرت میں سرکشی اور
تعمت میں بد بختی لکھی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ساری گفتگو ماضی کے صیغوں میں کی ہے حالانکہ ان تمام
باتوں کا تعلق مستقبل سے تھا، کیوں کہ ابھی تو وہ شیر خوار بچے ہی تھے۔ یہ اس لیے کہ یہ اللہ کی تقدیر کے ایسے اٹل فیصلے
تھے کہ گواہی یہ معرض ظہور میں نہیں آئے تھے لیکن ان کا وقوع اسی طرح یقینی تھا جس طرح ماضی کے گزرے ہوئے
واقعات، شک و شبہ سے بالا ہوتے ہیں۔

(۴) یعنی یہ ہیں وہ صفات، جن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام متصف تھے نہ کہ ان صفات کے حامل، جو نصاریٰ نے غلو کر
کے ان کے بارے میں باور کرائیں اور نہ ایسے، جو یہودیوں نے تفریط و تنقیص سے کام لیتے ہوئے ان کی بابت کہا۔ اور
یہی حق بات ہے جس میں لوگ خواہ مخواہ شک کرتے ہیں۔

ہے۔^(۱) (۳۵)

میرا اور تم سب کا پروردگار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ تم سب اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔ (۳۶)

پھر یہ فرقے آپس میں اختلاف کرنے لگے،^(۲) پس کافروں کے لیے ”ویل“ ہے ایک بڑے سخت دن کی حاضری سے۔^(۳) (۳۷)

کیا خوب دیکھنے سننے والے ہوں گے اس دن جبکہ ہمارے سامنے حاضر ہوں گے،^(۴) لیکن آج تو یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ (۳۸)

تو انہیں اس رنج و افسوس کے دن^(۵) کا ڈر سناوے جبکہ کام انجام کو پہنچایا جائے گا،^(۶) اور یہ لوگ غفلت اور

وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ فَأَعْبُدُوا هَذَا صِرَاطَ مُسْتَقِيمٍ ﴿۳۵﴾

فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ قَوْلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا وَإِنَّمَا شَهَادَةُ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۳۶﴾

أَسْمِعُ بِهِمْ وَأَبُورُ يَوْمَ يَأْتُونا لَكِنَ الظَّالِمُونَ الْيَوْمَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۳۷﴾

وَأَنْذَرُهُمْ يَوْمَ الْحِسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ

(۱) جس اللہ کی یہ شان اور قدرت ہو اسے بھلا اولاد کی کیا ضرورت ہے؟ اور اسی طرح اس کے لیے بغیر باپ کے پیدا کر دینا کون سا مشکل امر ہے۔ گویا جو اللہ کے لیے اولاد ثابت کرتے ہیں یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اعجازی ولادت سے انکار کرتے ہیں، وہ دراصل اللہ کی قدرت و طاقت کے منکر ہیں۔

(۲) یہاں الاحزاب سے مراد اہل کتاب کے فرقے اور خود عیسائیوں کے فرقے ہیں۔ جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں باہم اختلاف کیا۔ یہود نے کہا کہ وہ جادوگر اور ولد الزنا۔ یعنی یوسف نجار کے بیٹے ہیں نصاریٰ کے منظر میں (پروٹسٹنٹ) فرقے نے کہا کہ وہ ابن اللہ ہیں، ملکیہ یا سلطانیہ (کیتھولک) فرقے نے کہا وہ ثَالِثُ ثَلَاثَةِ (تین خداؤں میں سے تیسرے) ہیں اور تیسرے فرقے یعقوبیہ (آرتھوڈوکس) نے کہا وہ اللہ ہیں۔ پس یہودیوں نے تفریط اور تقصیر کی عیسائیوں نے افراط و غلو (ایسرالفا سیر، فتح القدر)

(۳) ان کافروں کے لیے جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اس طرح اختلاف اور افراط و تفریط کا ارتکاب کیا، قیامت والے دن جب وہاں حاضر ہوں گے، ہلاکت ہے۔

(۴) یہ تعجب کے صیغے ہیں یعنی دنیا میں تو یہ حق کے دیکھنے اور سننے سے اندھے اور بہرے رہے لیکن آخرت میں یہ کیا خوب دیکھنے اور سننے والے ہوں گے؟ لیکن وہاں یہ دیکھنا سننا کس کام کا؟

(۵) روز قیامت کو یوم حسرت کہا اس لیے کہ اس روز سب ہی حسرت کریں گے۔ بدکار حسرت کریں گے کہ کاش انہوں نے برائیاں نہ کی ہوتیں اور نیکو کار اس بات پر حسرت کریں گے کہ انہوں نے اور زیادہ نیکیاں کیوں نہیں کمائیں؟

(۶) یعنی حساب کتاب کر کے صحیفے لپیٹ دیے جائیں گے اور جنتی جنت میں اور جہنمی، جہنم میں چلے جائیں گے۔ حدیث

لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۳۹﴾

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِيهِمُ وَإِنَّا نَمُوتُهُمْ وَاللَّهُ لَمُبْصِرٌ وَحَكِيمٌ ﴿۴۰﴾

بے ایمانی میں ہی رہ جائیں گے۔ (۳۹)

خود زمین کے اور تمام زمین والوں کے وارث ہم ہی ہوں گے اور سب لوگ ہماری ہی طرف لوٹا کر لائے جائیں گے۔ (۴۰)

اس کتاب میں ابراہیم (علیہ السلام) کا قصہ بیان کر، بیشک وہ بڑی سچائی والے پیغمبر تھے۔^(۱) (۴۱)

جبکہ انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان! آپ ان کی پوجا پاٹ کیوں کر رہے ہیں جو نہ سنیں نہ دیکھیں؟ نہ آپ کو کچھ بھی فائدہ پہنچا سکیں۔ (۴۲)

میرے مہربان باپ! آپ دیکھیے میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس آیا ہی نہیں،^(۲) تو آپ میری ہی مانیں میں بالکل سیدھی راہ کی طرف آپ کی رہبری

وَأَذْكُرُ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِذْ كَانَ صَادِقًا نَبِيًّا ﴿۴۱﴾

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَبْصُرُ وَلَا يَسْمَعُ وَلَا يُعْزِقُ عَنْكَ شَيْئًا ﴿۴۲﴾

يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْوَالِدِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي

أَهْدِيكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾

میں آتا ہے کہ اس کے بعد موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا اور جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑا کر دیا جائے گا، جنتیوں اور دوزخیوں دونوں سے پوچھا جائے گا، اسے پہچانتے ہو، یہ کیا ہے؟ وہ کہیں گے، ہاں یہ موت ہے پھر ان کے سامنے اسے زخ کر دیا جائے گا اور اعلان کر دیا جائے گا کہ اے اہل جنت! تمہارے لیے جنت کی زندگی ہیشہ کے لیے ہے، اب موت نہیں آئے گی۔ دوزخیوں سے کہا جائے گا اے دوزخیو! تمہارے لیے یہ دوزخ کا عذاب دائمی ہے، اب موت نہیں آئے گی۔ (صحیح بخاری۔ سورۃ مریم، ومسلم، کتاب الجنۃ، باب النار یدخلہا الجبارون.....)

(۱) صِدِّيقٌ صِدْقٌ (سچائی) سے مبالغے کا صیغہ ہے۔ بہت راست باز، یعنی جس کے قول و عمل میں مطابقت اور راست بازی اس کا شعار ہو۔ صدیقیت کا یہ مقام، نبوت کے بعد سب سے اعلیٰ ہے ہر نبی اور رسول بھی اپنے وقت کا سب سے بڑا راست باز اور صداقت شعار ہوتا ہے، اس لیے وہ صدیق بھی ہوتا ہے۔ تاہم ہر صدیق، نبی نہیں ہوتا۔ قرآن کریم میں حضرت مریم کو صدیقہ کہا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تقویٰ و طہارت اور راست بازی میں بہت اونچے مقام پر فائز تھیں تاہم نبیہ نہیں تھیں۔ امت محمدیہ میں بھی صدیقین ہیں۔ اور ان میں سرفہرست حضرت ابو بکر صدیقؓ ہیں جو انبیاء کے بعد امت میں خیر البشر تسلیم کیے گئے ہیں۔ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ

(۲) جس سے مجھے اللہ کی معرفت اور اس کا یقین حاصل ہوا، بعث بعد الموت اور غیر اللہ کے پجاریوں کے لیے دائمی عذاب کا علم ہوا۔

کروں گا۔^(۱) (۴۳)

میرے اباجان آپ شیطان کی پرستش سے باز آجائیں شیطان تو رحم و کرم والے اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی نافرمان ہے۔^(۲) (۴۴)

اباجان! مجھے خوف لگا ہوا ہے کہ کہیں آپ پر کوئی عذاب الہی نہ آ پڑے کہ آپ شیطان کے ساتھی بن جائیں۔^(۳) (۴۵)

اس نے جواب دیا کہ اے ابراہیم! کیا تو ہمارے معبودوں سے روگردانی کر رہا ہے۔ سن اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے پتھروں سے مار ڈالوں گا، جا ایک مدت دراز تک مجھ سے الگ رہ۔^(۴) (۴۶)

کہا اچھا تم پر سلام ہو،^(۵) میں تو اپنے پروردگار سے

يَا بَتِّ اَلْعَبْدُ الشَّيْطَانِ اِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَمِيًّا ۝۳۱

يَا بَتِّ اِنَّ اَخَافُ اَنْ يَّمْسَكَ عَذَابِيْنَ الرَّحْمٰنِ
فَتَكُوْنُ لِلشَّيْطٰنِ وَاِيًّا ۝۳۲

قَالَ الرَّحْمٰنُ اَنْتَ عَنِ الْهَقِيْ يٰ اِبْرٰهِيْمُ لِيْنِ لَمْ نُنَدِهٖ اِلَّا رَحْمَةً
وَاَهْرٰبِيْنَ بَلِيًّا ۝۳۳

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَبِيْبًا ۝۳۴

(۱) جو آپ کو سعادت ابدی اور نجات سے ہٹانے کے ارادے سے ہٹا کر دے گی۔

(۲) یعنی شیطان کے وسوسے اور اس کے بہکاوے سے آپ جو ایسے بتوں کی پرستش کرتے ہیں جو سننے دیکھنے کی طاقت رکھتے ہیں نہ نفع نقصان پہنچانے کی قدرت، تو یہ دراصل شیطان ہی کی پرستش ہے۔ جو اللہ کا نافرمان ہے اور دوسروں کو بھی اللہ کا نافرمان بنا کر ان کو اپنے جیسا ہی بنانے پر تیار رہتا ہے۔

(۳) اگر آپ اپنے شرک و کفر پر باقی رہے اور اسی حال میں آپ کو موت آگئی تو عذاب الہی سے آپ کو کوئی نہیں بچا سکے گا۔ یا دنیا میں ہی آپ عذاب کا شکار نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر ہمیشہ کے لیے راندہ بارگاہ الہی ہو جائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باپ کے ادب و احترام کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت شفقت اور پیار کے لہجے میں باپ کو توحید کا وعظ سنایا۔ لیکن توحید کا یہ سبق کتنے ہی شیریں اور نرم لہجے میں بیان کیا جائے، مشرک کے لیے ناقابل برداشت ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ مشرک باپ نے اس نرمی اور پیار کے جواب میں نہایت درشتی اور تلخی کے ساتھ یہ بیٹے کو کہا کہ اگر تو میرے معبودوں سے، اگر کوئی کہنے سے باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔

(۴) مَلِيًّا، دراز مدت، ایک عرصہ۔ دوسرے معنی اس کے صحیح و سالم کے کئے گئے ہیں۔ یعنی مجھے میرے حال پر چھوڑ دے، کہیں مجھ سے اپنے ہاتھ پیر نہ تڑوا لینا۔

(۵) یہ سلام تحیہ نہیں ہے جو ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو کرتا ہے بلکہ ترک مخالفت کا اظہار ہے جیسے —
﴿وَلَا تَخَاطَبُهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ (الفرقان-۲۳) ”جب بے علم لوگ ان سے باتیں کرتے ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ

تمہاری بخشش کی دعا کرتا رہوں گا،^(۱) وہ مجھ پر حد درجہ مہربان ہے۔ (۴۷)

میں تو تمہیں بھی اور جن جن کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہو انہیں بھی سب کو چھوڑ رہا ہوں۔ صرف اپنے پروردگار کو پکارتا رہوں گا، مجھے یقین ہے کہ میں اپنے پروردگار سے دعا مانگ کر محروم نہ رہوں گا۔ (۳۸)

جب ابراہیم (علیہ السلام) ان سب کو اور اللہ کے سوا ان کے سب معبودوں کو چھوڑ چکے تو ہم نے انہیں اسحاق و یعقوب (علیہما السلام) عطا فرمائے،^(۲) اور دونوں کو نبی بنا دیا۔ (۳۹)

اور ان سب کو ہم نے اپنی بہت سی رحمتیں^(۳) عطا فرمائیں اور ہم نے ان کے ذکر جمیل کو بلند درجے کا کر دیا۔^(۴) (۵۰)

وَاَعْتَزِلْكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَاَدْعُرَنِيَّ عَسَىٰ اَلَّا اَكُوْنَ بِدُعَاؤِيَّ سَعِيًّا ۝

فَلَمَّا اعْتَزَلْتَهُمْ وَمَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗ اِسْمٰحَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَاَكْرَجَعَلْنَا يَسِيًّا ۝

وَوَهَبْنَا لَهُم مِّن رَّحْمَتِنَا وَاَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۝

سلام ہے۔“ میں اہل ایمان اور بندگان الہی کا طریقہ بتلایا گیا ہے۔

(۱) یہ اس وقت کہا تھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مشرک کے لیے مغفرت کی دعا کرنے کی ممانعت کا علم نہیں تھا، جب یہ علم ہوا تو آپ نے دعا کا سلسلہ موقوف کر دیا (التوبۃ: ۱۱۳)

(۲) حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر بھی بیٹے کے ساتھ اور بیٹے ہی کی طرح کیا۔ مطلب یہ ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام توحید الہی کی خاطر باپ کو گھر کو اور اپنے وطن مالوف کو چھوڑ کر دیارِ قدس کی طرف ہجرت کر گئے، تو ہم نے انہیں اسحاق و یعقوب علیہما السلام سے نوازا تاکہ ان کی انس و محبت، باپ کی جدائی کا صدمہ بھلا دے۔

(۳) یعنی نبوت کے علاوہ بھی اور بہت سی رحمتیں ہم نے انہیں عطا کیں، مثلاً مال، مزید اولاد اور پھر اسی سلسلہ نسب میں عرصہ دراز تک نبوت کے سلسلے کو جاری رکھنا، یہ سب سے بڑی رحمت تھی، جو ان پر ہوئی۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام ابوالانبیاء کہلاتے ہیں۔

(۴) لِسَانَ صِدْقٍ سے مراد ثنائے حسن اور ذکر جمیل ہے۔ لسان کی اضافت، صدق کی طرف کی اور پھر اس کا وصف علو بیان کیا، جس سے اس طرف اشارہ کر دیا کہ بندوں کی زبانوں پر جو ان کا ذکر جمیل رہتا ہے، تو وہ واقعی اس کے مستحق ہیں۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ تمام ادیان ساویہ کو ماننے والے بلکہ مشرکین بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا تذکرہ

اس قرآن میں موسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر بھی کر، جو چنا ہوا^(۱) اور رسول اور نبی تھا۔ (۵۱)
ہم نے اسے طور کی دائیں جانب سے ندا کی اور رازگوئی کرتے ہوئے اسے قریب کر لیا۔ (۵۲)
اور اپنی خاص مہربانی سے اس کے بھائی کو نبی بنا کر عطا فرمایا۔ (۵۳)

اس کتاب میں اسماعیل (علیہ السلام) کا واقعہ بھی بیان کر، وہ بڑا ہی وعدے کا سچا تھا اور تھا بھی رسول اور نبی۔ (۵۴)
وہ اپنے گھر والوں کو برابر نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا، اور تھا بھی اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پسندیدہ اور مقبول۔ (۵۵)
اور اس کتاب میں ادریس (علیہ السلام) کا بھی ذکر کر، وہ بھی نیک کردار پیغمبر تھا۔ (۵۶)

ہم نے اسے بلند مقام پر اٹھالیا۔^(۲) (۵۷)
یہی وہ انبیاء ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے فضل و کرم کیا جو اولاد آدم میں سے ہیں اور ان لوگوں کی نسل سے ہیں جنہیں

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوسَىٰ إِتْمَعْنَاكَ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ۝

وَوَدَّعَيْنَاهُ مِنَ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا ۝

وَوَهَبْنَا لَهُ مِنْ رَحْمَتِنَا أَخَاهُ هَارُونَ نَبِيًّا ۝

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِتْمَعْنَاكَ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ

وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ۝

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا ۝

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيْسَ إِتْمَعْنَاكَ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا ۝

وَقَرَّبْنَاهُ مَكَانًا عَرِيًّا ۝

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّةِ
آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُورٍ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ

بڑے اچھے الفاظ میں اور نہایت ادب و احترام سے کرتے ہیں۔ یہ نبوت و اولاد کے بعد ایک اور انعام ہے جو ہجرت فی سبیل اللہ کی وجہ سے انہیں حاصل ہوا۔

(۱) مُخْلِصٌ، مُصْطَفَىٰ، مُجْتَبَىٰ اور مُخْتَارٌ چاروں الفاظ کا مفہوم ایک ہے۔ یعنی رسالت و پیامبری کے لیے چنا ہوا، پسندیدہ شخص، رسول، بمعنی مرسل ہے (بھیجا ہوا) اور نبی کے معنی، اللہ کا پیغام لوگوں کو سنانے والا، واجبی الہی کی خبر دینے والا، تاہم مفہوم دونوں کا ایک ہے کہ اللہ جس بندے کو لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے چن لیتا ہے اور اسے اپنی وحی سے نوازتا ہے، اسے رسول اور نبی کہا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم سے اہل علم میں ایک بحث یہ چلی آ رہی ہے کہ آیا ان دونوں میں فرق ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ فرق کرنے والے بالعموم کہتے ہیں کہ، صاحب شریعت یا صاحب کتاب کو رسول اور نبی کہا جاتا ہے اور جو پیغمبر اپنے سابقہ پیغمبر کی کتاب یا شریعت کے مطابق ہی لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچاتا رہا، وہ صرف نبی ہے، رسول نہیں۔ تاہم قرآن کریم میں ان کا اطلاق ایک دوسرے پر بھی ہوا ہے اور بعض جگہ متقابل بھی آئے ہیں۔ مثلاً سورۃ الحج آیت ۵۲ میں۔

(۲) حضرت ادریس علیہ السلام، کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے نبی تھے اور حضرت نوح علیہ السلام کے

ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ کشتی میں چڑھا لیا تھا، اور اولاد ابراہیم و یعقوب سے اور ہماری طرف سے راہ یافتہ اور ہمارے پسندیدہ لوگوں میں سے۔ ان کے سامنے جب اللہ رحمان کی آیتوں کی تلاوت کی جاتی تھی یہ سجدہ کرتے اور روتے گڑگڑاتے گر پڑتے تھے۔^(۱) (۵۸)

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے کہ انہوں نے نماز ضائع کر دی اور نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے، سو ان کا نقصان ان کے آگے آئے گا۔^(۲) (۵۹)

بجز ان کے جو توبہ کر لیں اور ایمان لائیں اور نیک عمل کریں۔ ایسے لوگ جنت میں جائیں گے اور ان کی ذرا سی بھی حق تلفی نہ کی جائے گی۔^(۳) (۶۰)

السجدة

وَمَنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا إِذِ اتَّخَذَ عَلَيْهِمُ الْبُتُ الرِّحْمَانُ خَوْذًا سَبْدًا وَابْتِغَاءً ۝

فَخَلَفَ مِنْ بَدْهِمْ خَلْفًا أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ فَسُوفَ يَلْقَوْنَ عَذَابًا ۝

إِلَّا مَنِ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا قَدْ خَلَّوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُلَاقُونَ فِيهَا ۝

یا ان کے والد کے دادا تھے، انہوں نے ہی سب سے پہلے کپڑے سیئے، رفعت مکان سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے اس کا مفہوم رُفِعَ إِلَى السَّمَاءِ سمجھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح انہیں بھی آسمان پر اٹھایا گیا۔ لیکن قرآن کے الفاظ اس مفہوم کے لیے صریح نہیں ہیں اور کسی صحیح حدیث میں بھی یہ بیان نہیں ہوا۔ البتہ اسرائیلی روایات میں ان کے آسمان پر اٹھائے جانے کا ذکر ملتا ہے جو اس مفہوم کے اثبات کے لیے کافی نہیں۔ اس لیے زیادہ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد مرتبت کی وہ بلندی ہے جو نبوت سے سرفراز کر کے انہیں عطا کی گئی۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔

(۱) - گویا اللہ کی آیات کو سن کر رقت اور ربا کی کیفیت کا طاری ہو جانا اور عظمت الہی کے آگے سجدہ ریز ہو جانا، بندگان الہی کی خاص علامت ہے۔ سجدہ تلاوت کی مسنون دعایہ ہے اسجَدَ وَجْهِي لِلَّذِي خَلَقَهُ، وَصَوَّرَهُ، وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ، بِحَوْلِهِ وَقُوَّتِهِ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی۔ بحوالہ مشکوٰۃ، باب سجود القرآن) بعض روایات میں اضافہ ہے۔ فَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ (عون المعبود، ج ۱، ص ۵۳۳)

(۲) انعام یافتہ بندگان الہی کا تذکرہ کرنے کے بعد ان لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے، جو ان کے برعکس اللہ کے احکام سے غفلت و اعراض کرنے والے ہیں۔ نماز کے ضائع کرنے سے مراد یا تو بالکل نماز کا ترک ہے جو کفر ہے یا ان کے اوقات کو ضائع کرنا ہے یعنی وقت پر نماز نہ پڑھنا، جب جی چاہا نماز پڑھ لی یا بلا عذر اکٹھی کر کے پڑھنا یا کبھی دو، کبھی چار، کبھی ایک اور کبھی پانچوں نمازیں۔ یہ بھی تمام صورتیں نماز کو ضائع کرنے کی ہیں جس کا مرتکب سخت گناہ گار اور آیت میں بیان کردہ وعید کا سزاوار ہو سکتا ہے۔ غُيَا کے معنی ہلاکت، انجام بد کے ہیں یا جنم کی ایک وادی کا نام ہے۔

(۳) یعنی جو توبہ کر کے ترک صلوة اور اتباع شہوات سے باز آجائیں اور ایمان و عمل صالح کے تقاضوں کا اہتمام کر لیں

پیشگی والی جنتوں میں جن کا غائبانہ وعدہ ^(۱) اللہ مہربان نے اپنے بندوں سے کیا ہے۔ بیشک اس کا وعدہ پورا ہونے والا ہی ہے۔ (۶۱)

وہ لوگ وہاں کوئی لغو بات نہ سنیں گے صرف سلام ہی سلام سنیں ^(۲) گے، ان کے لیے وہاں صبح شام ان کا رزق ہو گا۔ ^(۳) (۶۲)

یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے انہیں بناتے ہیں جو متقی ہوں۔ (۶۳)

ہم بغیر تیرے رب کے حکم کے اتر نہیں سکتے، ^(۴) ہمارے آگے پیچھے اور ان کے درمیان کی کل چیزیں اسی کی ملکیت میں ہیں، تیرا پروردگار بھولنے والا نہیں۔ (۶۴)

آسمانوں کا، زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب

جَدَّتِ عَذْرَاءُ يَأْتِيَنَّ وَعَدَّ الرَّحْمَنُ عِبَادَهُ بِالْعَيْبِيَّةِ
إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًا ۝

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا وَلَهُمْ فِيهَا رِزْقُهُمْ فِيهَا
بُكْرَةٌ وَعِشْيَاءٌ ۝

بِذَلِكَ الْحَبِيبَةِ الَّتِي نُوْرِيَتْ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ۝

وَمَا نُنَزِّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا
وَمَا بَيْنَ ذَلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَالْعَبُدُوْهُ

تو ایسے لوگ مذکورہ انجام بد سے محفوظ اور جنت کے مستحق ہوں گے۔

(۱) یعنی یہ ان کے ایمان و یقین کی پیشگی ہے کہ انہوں نے جنت کو دیکھا بھی نہیں، صرف اللہ کے غائبانہ وعدے پر ہی اس کے حصول کے لیے ایمان و تقویٰ کا راستہ اختیار کیا۔

(۲) یعنی فرشتے بھی انہیں ہر طرف سے سلام کریں گے اور اہل جنت بھی آپس میں ایک دوسرے کو کثرت سے سلام کیا کریں گے۔

(۳) امام احمد نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ جنت میں رات اور دن نہیں ہوں گے، صرف اجالا ہی اجالا اور روشنی ہی روشنی ہوگی۔ حدیث میں ہے ”جنت میں داخل ہونے والے پہلے گروہ کی شکلیں چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوں گی، وہاں انہیں تھوک آنے کا نہ رینٹ اور نہ بول و براز۔ ان کے برتن اور کنگھیاں سونے کی ہوں گی، ان کا بخور، خوشبودار (لکڑی) ہوگی۔ ان کا پسینہ کستوری (کی طرح) ہوگا۔ ہر جنتی کی دو بیویاں ہوں گی، ان کی پنڈلیوں کا گودا ان کے گوشت کے پیچھے سے نظر آئے گا، ان کے حسن و جمال کی وجہ سے۔ ان میں باہم بغض اور اختلاف نہیں ہوگا، ان کے دل، ایک دل کی طرح ہوں گے، صبح و شام اللہ کی تسبیح کریں گے (صحیح بخاری۔ بدء الخلق، باب ماجاء فی صفة الجنة وإبہا مخلوقة ومسلم، کتاب الجنة، باب فی صفات الجنة وأهلها)

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ جبرائیل علیہ السلام سے زیادہ اور جلدی جلدی ملاقات کی خواہش ظاہر فرمائی، جس پر یہ آیت اتری (صحیح بخاری، تفسیر سورہ مریم)

وَأَصْطَلِبُ لِعِبَادَتِهِ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَيِّئَاتٌ ۝

کارب وہی ہے تو اسی کی بندگی کر اور اس کی عبادت پر
جم جا۔ کیا تیرے علم میں اس کا ہنمام ہم پلہ کوئی اور بھی
ہے؟^(۱) (۶۵)

وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ إِذَا أَمِثْتُ لِمَوْءُؤْمِرٍ حَيًّا ۝

انسان کہتا^(۲) ہے کہ جب میں مر جاؤں گا تو کیا پھر زندہ کر
کے نکالا جاؤں گا؟^(۳) (۶۶)

أَوَلَمْ يَذْكُرُوا الْإِنْسَانَ إِذَا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ۝

کیا یہ انسان اتنا بھی یاد نہیں رکھتا کہ ہم نے اسے اس
سے پہلے پیدا کیا حالانکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔^(۴) (۶۷)

فَوَرَبِّكَ لَنَحْضُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينُ لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَ حَوْلَ جَهَنَّمَ

تیرے پروردگار کی قسم! ہم انہیں اور شیطانوں کو جمع کر
کے ضرور ضرور جنم کے ارد گرد گھنٹوں کے بل گرے
ہوئے حاضر کر دیں گے۔^(۵) (۶۸)

جَحِيْمًا ۝

(۱) یعنی نہیں ہے، جب اس کی مثل کوئی اور نہیں تو پھر عبادت بھی کسی اور کی جائز نہیں۔

(۲) انسان سے مراد یہاں کافر بہ حیثیت جنس کے ہے، جو قیامت کے وقوع اور بعث بعد الموت کے قائل نہیں۔

(۳) استفہام، انکار کے لیے ہے۔ یعنی جب میں بوسیدہ اور مٹی میں رل مل جاؤں گا تو مجھے دوبارہ کس طرح نیا وجود عطا
کر دیا جائے گا؟ یعنی ایسا ممکن نہیں۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ جب پہلی مرتبہ بغیر نمونے کے ہم نے انسان کو پیدا کر دیا، تو دوبارہ پیدا کرنا ہمارے لیے
کیوں کر مشکل ہو گا؟ پہلی مرتبہ پیدا کرنا مشکل ہے یا دوبارہ اسے پیدا کرنا؟ انسان کتنا نادان اور خود فراموش ہے؟ اسی
خود فراموشی نے اسے خدا فراموش بنا دیا ہے۔

(۵) جِحِيْمٌ، جَاثِ كِي جَع هِي جَحَا يَجْحُوْنَ س۔ جَاثِ كِهْنُوْنَ كِي بَل كِرْنِي وَاَلِي كُو كِتِي هِي۔ يِي كَال هِي۔ يِنِي هِي
دوبارہ انہیں کو نہیں بلکہ ان شیاطین کو بھی زندہ کریں گے جنہوں نے ان کو گمراہ کیا تھا یا جن کی وہ عبادت کرتے تھے۔ پھر
ہم ان سب کو اس حال میں جنم کے گرد جمع کر دیں گے کہ یہ محشر کی ہولناکیوں اور حساب کے خوف سے گھنٹوں کے بل
بیٹھے ہوں گے۔ حدیث قدسی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ابن آدم میری تکذیب کرتا ہے۔ حالانکہ یہ اس کے لائق
نہیں۔ ابن آدم مجھے ایذا پہنچاتا ہے حالانکہ اسے یہ زیب نہیں دیتا۔ اس کا میری تکذیب کرنا تو یہ ہے کہ وہ میری بابت یہ
کہتا ہے کہ اللہ ہرگز مجھے اس طرح دوبارہ زندہ نہیں کرے گا جس طرح اس نے مجھے پہلی مرتبہ پیدا کیا حالانکہ میرے
لیے پہلی مرتبہ پیدا کرنا دوسری مرتبہ پیدا کرنے سے زیادہ آسان نہیں ہے (یعنی مشکل اگر ہے تو پہلی مرتبہ پیدا کرنا ہے نہ
کہ دوسری مرتبہ) اور اس کا مجھے ایذا پہنچانا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے میری اولاد ہے، حالانکہ میں ایک ہوں، بے نیاز ہوں،
نہ میں نے کسی کو جنا اور نہ خود جنا گیا ہوں اور میرا کوئی ہمسر نہیں ہے۔“ (صحیح بخاری، تفسیر سورہ اخلاص)

ہم پھر ہر ہر گروہ سے انہیں الگ نکال کھڑا کریں گے جو اللہ رحمن سے بہت اکڑے اکڑے پھرتے تھے۔^(۱) (۶۹)
پھر ہم انہیں بھی خوب جانتے ہیں جو جنم کے داخلے کے زیادہ سزاوار ہیں۔^(۲) (۷۰)

تم میں سے ہر ایک وہاں ضرور وارد ہونے والا ہے، یہ تیرے پروردگار کے ذمے قطعی، فیصل شدہ امر ہے۔ (۷۱)
پھر ہم پرہیزگاروں کو تو بچالیں گے اور نافرمانوں کو اسی میں گھنٹوں کے بل گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔^(۳) (۷۲)
جب ان کے سامنے ہماری روشن آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو کافر مسلمانوں سے کہتے ہیں بتاؤ ہم تم دونوں جماعتوں میں سے کس کا مرتبہ زیادہ ہے؟ اور کس کی مجلس شاندار ہے؟^(۴) (۷۳)

لَمْ لَنْ نُوَعِّنْ مِنْ كُلِّ شَيْعَةٍ اُولِيْهِمْ اَسَدٌ عَلٰى الرَّجْحَنِ عَيْنِيَا ۝

لَمْ لَنْ نُوَعِّنْ اَعْلَمُ يَا اَذِيْنَ لُهُمْ اَوْلٰى بِهَا صَلِيًّا ۝

وَلَنْ مِنْكُمْ اِلَّا وَاوَدُّهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝

لَمْ نُتَبِّحْ اِلَّا الَّذِيْنَ اتَّعَاوَدُوا زَلٰلِيْنَ فِيْهَا حَيْثِيَا ۝

وَ اِذْ اُنْتَلٰ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ

اٰمَنُوْا اِنَّا لَفِيْ قَوْمِيْنَ خَيْرٌ مَّقَامًا وَاَحْسَنُ نَدِيًّا ۝

(۱) عَيْنِيَا، بھی عتّا، يَعْتُوْا سے عَاتِ کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں بہت سرکش اور متمرد۔ مطلب یہ ہے کہ ہر گروہ فرقے کے بڑے بڑے سرکشوں اور لیڈروں کو ہم الگ کر لیں گے اور ان کو اکٹھا کر کے جنم میں پھینک دیں گے۔ کیوں کہ یہ قائدین دوسرے جنمیوں کے مقابلے میں سزا و عقوبت کے زیادہ سزاوار ہیں۔ جیسا کہ اگلی آیت میں ہے۔
(۲) صَلِيًّا، مصدر سماعی ہے صَلَّيْنَا بِصَلِيْنِ، معنی ہیں داخل ہونا۔ یعنی جنم میں داخل ہونے اور اس میں جلنے کے کون زیادہ مستحق ہیں، ہم ان کو خوب جانتے ہیں۔

(۳) اس کی تفسیر صحیح احادیث میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جنم کے اوپر پل بنایا جائے گا، جس میں سے ہر مومن و کافر کو گزرنا ہو گا۔ مومن تو اپنے اپنے اعمال کے مطابق جلد یا بدیر گزر جائیں گے، کچھ تو پلک جھپکتے میں، کچھ بجلی اور ہوا کی طرح، کچھ پرندوں کی طرح اور کچھ عمدہ گھوڑوں اور دیگر سواریوں کی طرح گزر جائیں گے یوں کچھ بالکل صحیح سالم، کچھ زخمی تاہم پل عبور کر لیں گے کچھ جنم میں گر پڑیں گے جنہیں بعد میں شفاعت کے ذریعے سے نکال لیا جائے گا۔ لیکن کافر اس پل کو عبور کرنے میں کامیاب نہیں ہوں گے اور سب جنم میں گر پڑیں گے۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آتا ہے کہ ”جس کے تین بچے بلوغت سے پہلے وفات پا گئے، اسے آگ نہیں چھوئے گی، مگر صرف قسم حلال کرنے کے لیے۔“ (البخاری۔ کتاب الجنائز، و مسلم کتاب البسر) یہ قسم وہی ہے جسے اس آیت میں حَتْمًا مَّقْضِيًّا (قطعی فیصل شدہ امر) کہا گیا ہے۔ یعنی اس کا ورود جنم میں صرف پل پر سے گزرنے کی حد تک ہی ہو گا۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے ابن کثیر و ایر التفاسیر)

(۴) یعنی قرآنی دعوت کا مقابلہ یہ کفار مکہ فقرا مسلمین اور اغنیائے قریش اور ان کی مجلسوں اور مکانوں کے باہمی

ہم تو ان سے پہلے بہت سی جماعتوں کو غارت کر چکے ہیں جو ساز و سامان اور نام و نمود میں ^(۱) ان سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ (۷۴)

کہہ دیجئے! جو گمراہی میں ہوتا اللہ رحمن اس کو خوب لمبی مہلت دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ ان چیزوں کو دیکھ لیں جن کا وعدہ کیے جاتے ہیں یعنی عذاب یا قیامت کو، اس وقت ان کو صحیح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ کون برے مرتبے والا اور کس کا جتھا کمزور ہے۔ (۷۵)

اور ہدایت یافتہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت میں بڑھاتا ہے، ^(۲) اور باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے نزدیک ثواب کے لحاظ سے اور انجام کے لحاظ سے بہت ہی بہتر ہیں۔ (۷۶)

کیا تو نے اسے بھی دیکھا جس نے ہماری آیتوں سے کفر کیا اور کہا کہ مجھے تو مال و اولاد ضرور ہی دی جائے گی۔ (۷۷)

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَتَانَا اَوْ رَمِيَا ۝۱۹

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْهُ الرَّحْمٰنُ مَنًّا ۗ حَتّٰى اِذَا دَاوٰا مَآئِدُهُمْ وَاِنَّمَا الْعَذَابُ وَآلِمًا السَّاعَةِ فَيَسْعٰهُمُ مِّنْ هُوْبَةٍ مِّمَّا كَانُوْا اَضْعَفُ جُنْدًا ۝۲۰

وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اِهْتَدٰوْا هُدًى وَّالْبَيْعٰتِ الضّٰلِحٰتِ خَيْرٌ مِّنْ عِبَادِكَ تَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ۝۲۱

اَقْرَبٰتِ الَّذِيْ كَفَرَ بِالْاِيْمٰنِ وَاَقَالَ لَآؤِيْعِيْنَ مَآلًا وَّلٰكِنَّا ۝۲۲

موازنے سے کرتے ہیں، کہ مسلمانوں میں عمار، بلال، صہیب رضی اللہ عنہم جیسے فقیر لوگ ہیں، ان کا دارالاشوری دار ارقم ہے۔ جب کہ کافروں میں ابو جہل، نضر بن حارث، عقبہ، شیبہ وغیرہ جیسے رئیس اور ان کی عالی شان کوٹھیاں اور مکانات ہیں، ان کی اجتماع گاہ (دارالندوہ) بہت عمدہ ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے فرمایا، دنیا کی یہ چیزیں ایسی نہیں ہیں کہ ان پر فخر و ناز کیا جائے، یا ان کو دیکھ کر حق و باطل کا فیصلہ کیا جائے۔ یہ چیزیں تو تم سے پہلی امتوں کے پاس تھیں، لیکن تکذیب حق کی پاداش میں انہیں ہلاک کر دیا گیا، دنیا کا یہ مال و اسباب انہیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکا۔

(۲) علاوہ ازیں یہ چیزیں گمراہوں اور کافروں کو مہلت کے طور پر بھی ملتی ہیں، اس لیے یہ کوئی معیار نہیں۔ اصل اچھے برے کا پتہ تو اس وقت چلے گا، جب مہلت عمل ختم ہو جائے گی اور اللہ کا عذاب انہیں آگہیرے گا یا قیامت برپا ہو جائے گی۔ لیکن اس وقت کا علم، کوئی فائدہ نہیں دے گا، کیوں کہ وہاں ازالے اور تدارک کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

(۳) اس میں ایک دوسرے اصول کا ذکر ہے کہ جس طرح قرآن سے، جن کے دلوں میں کفر و شرک اور ضلالت کا روگ ہے، ان کی شقاوت و ضلالت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، اسی طرح اہل ایمان کے دل ایمان و ہدایت میں اور پختہ ہو جاتے ہیں۔

(۴) اس میں فقرا مسلمین کو تسلی ہے کہ کفار و مشرکین جن مال و اسباب پر فخر کرتے ہیں، وہ سب فنا کے گھاٹ اتر

کیا وہ غیب پر مطلع ہے یا اللہ کا کوئی وعدہ لے چکا ہے؟ (۷۸)
 ہرگز نہیں، یہ جو بھی کہہ رہا ہے ہم اسے ضرور لکھ لیں گے،
 اور اس کے لیے عذاب بڑھائے چلے جائیں گے۔ (۷۹)
 یہ جن چیزوں کو کہہ رہا ہے اسے ہم اس کے بعد
 لے لیں گے۔ اور یہ تو بالکل اکیلا ہی ہمارے سامنے
 حاضر ہوگا۔^(۱) (۸۰)

انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں کہ وہ
 ان کے لیے باعث عزت ہوں۔ (۸۱)
 لیکن ایسا ہرگز ہونا نہیں۔ وہ تو ان کی پوجا سے منکر ہو جائیں
 گے، اور انہیں ان کے دشمن^(۲) بن جائیں گے۔ (۸۲)
 کیا تو نے نہیں دیکھا کہ ہم کافروں کے پاس شیطانوں کو

اَقْلَمَ الْغَيْبِ اَمْ اَتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۙ
 كَلَّا سَتَكُنُّنَّ مَائِقُوْلٌ وَّعَدْلٰهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًا ۙ

وَتَوْرٰثُهُ مَا يُقُوْلُ وَيٰٓاَيُّهَا فِرْدٰۗؤُا ۙ

وَ اَتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِلٰهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عَزٰۗءًا ۙ

كَلَّا سَيَكْفُرُوْنَ بِمَا اَدَّبْتَهُمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضَعْفًا ۙ

اَللّٰهُرَّاكَ اَوْ سَلْنَا الشَّيْطٰنِ عَلَ الْكٰفِرِيْنَ تَوٰۗرٰثُهُمْ اَزٰۗءًا ۙ

جائیں گے اور تم جو نیک اعمال کرتے ہو، یہ ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں جن کا اجر و ثواب تمہیں اپنے رب کے ہاں ملے گا
 اور ان کا بہترین صلہ اور نفع تمہاری طرف لوٹے گا۔

(۱) ان آیات کی شان نزول میں بتلایا گیا ہے۔ کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، کا والد عاص بن وائل، جو اسلام کے شدید
 دشمنوں میں سے تھا۔ اس کے زے حضرت خباب بن ارت کا قرضہ تھا جو آہن گری کا کام کرتے تھے۔ حضرت خباب
 رضی اللہ عنہ نے اس سے اپنی رقم کا مطالبہ کیا تو اس نے کہا کہ جب تک تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کفر نہیں کرے گا،
 میں تجھے تیری رقم نہیں دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ یہ کام تو تو مر کر دوبارہ زندہ ہو جائے تب بھی نہیں کروں گا۔ اس نے
 کہا، اچھا پھر ایسے ہی سہی، جب مجھے مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جائے گا اور وہاں بھی مجھے مال و اولاد سے نوازا جائے گا تو
 وہاں میں یہ رقم ادا کروں گا (صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب ذکر القین والحداد، وتفسیر سورۃ مریم۔
 مسلم، صفة القيامة، باب سؤال اليهود عن الروح) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ جو دعویٰ کر رہا ہے کیا اس کے پاس
 غیب کا علم ہے کہ وہاں بھی اس کے پاس مال اور اولاد ہوگی؟ یا اللہ سے اس کا کوئی عہد ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ
 صرف تعلق اور آیات الہی کا استہزاء و تمسخر ہے، یہ جس مال و اولاد کی بات کر رہا ہے اس کے وارث تو ہم ہیں یعنی مرنے
 کے ساتھ ہی ان سے اس کا تعلق ختم ہو جائے گا اور ہماری بارگاہ میں یہ اکیلا آئے گا، نہ مال ساتھ ہو گا نہ اولاد اور نہ کوئی
 جتھہ۔ البتہ عذاب ہو گا جو اس کے لیے اور ان جیسے دیگر لوگوں کے لیے ہم بڑھاتے رہیں گے۔

(۲) عَزًّا کا مطلب ہے یہ معبود ان کے لیے عزت کا باعث اور مددگار ہوں گے اور ضِدًّا کے معنی ہیں، دشمن، جھٹلانے
 والے اور ان کے خلاف دوسروں کے مددگار۔ یعنی یہ معبود ان کے گمان کے برعکس ان کے حمایتی ہونے کی بجائے، ان
 کے دشمن، ان کو جھٹلانے والے اور ان کے خلاف ہوں گے۔

بھیجتے ہیں جو انہیں خوب آکساتے ہیں۔^(۸۳)
 تو ان کے بارے میں جلدی نہ کر، ہم تو خود ہی ان کے
 لیے مدت شماری کر رہے ہیں۔^(۸۳)
 جس دن ہم پر ہیز گاروں کو اللہ رحمان کی طرف بطور
 مہمان کے جمع کریں گے۔ (۸۵)
 اور گناہ گاروں کو سخت پیاس کی حالت میں جہنم کی طرف
 ہانک لے جائیں گے۔^(۸۶)
 کسی کو شفاعت کا اختیار نہ ہو گا سوائے ان کے جنہوں نے
 اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی قول قرار لے لیا ہے۔^(۸۷)
 ان کا قول تو یہ ہے کہ اللہ رحمن نے بھی اولاد اختیار کی
 ہے۔ (۸۸)

یقیناً تم بہت بری اور بھاری چیز لائے ہو۔ (۸۹)
 قریب ہے کہ اس قول کی وجہ سے آسمان پھٹ جائیں
 اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزے ریزے ہو
 جائیں۔ (۹۰)
 کہ وہ رحمان کی اولاد ثابت کرنے بیٹھے۔^(۹۱)

فَلَا تَعْهَلْ عَلَيْهِمْ إِنَّمَا نَعْتَدُ لَهُمْ عَذَابًا ۝

يَوْمَ نَحْضُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَنِ وَفْدًا ۝

وَلَسَوْقَ الْمُجْرِمِينَ إِلَى جَهَنَّمَ وِرْدًا ۝

لِكَيْلِ لَوْكُنَ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مِنَ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا ۝

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا ۝

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ۝

نَكَادُ السَّمَوَاتُ يَتَّقَطْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ
 هَكَا ۝

أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمَنِ وَلَدًا ۝

(۱) یعنی گمراہ کرتے، بہکاتے اور معصیت کی طرف کھینچ کر لے جاتے ہیں۔

(۲) اور جب وہ مہلت ختم ہو جائے گی تو عذاب الہی کے موروث بن جائیں گے۔ آپ کو جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۳) وَفْدًا، وَافِدًا کی جمع ہے جیسے زَكْبٌ، زَاكِبٌ کی جمع ہے، مطلب یہ ہے کہ انہیں اونٹوں، گھوڑوں پر سوار کرا کے نہایت عزت و احترام سے جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ وَدَدًا کے معنی پیاسے۔ اس کے برعکس مجرمین کو بھوکا پیاسا جہنم میں ہانک دیا جائے گا۔

(۴) قول و قرار (عہد) کا مطلب ایمان و تقویٰ ہے۔ یعنی اہل ایمان و تقویٰ میں سے جن کو اللہ شفاعت کرنے کی اجازت دے گا، وہی شفاعت کریں گے، ان کے سوا کسی کو شفاعت کرنے کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔

(۵) إِدًّا کے معنی بہت بھیاںک معاملہ اور ذاہیتہ (بھاری چیز اور بڑی مصیبت) کے ہیں۔ یہ مضمون پہلے بھی گزر چکا ہے کہ اللہ کی اولاد قرار دینا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس سے آسمان و زمین پھٹ سکتے ہیں اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو سکتے ہیں۔

وَالَّذِينَ لِلرَّحْمَنِ أَنْ يَتَّخِذُوا كَلِمًا ①

إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا الْوَالِدُ الرَّحْمَنُ عَبْدًا ②

لَقَدْ أَحْضَرْتَهُمْ وَعَدَّاهُمْ عَدًّا ③

وَكَلَّمَهُمْ آيَاتِهِ يَوْمَ الرِّيمَةِ قُرْآنًا ④

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ اللَّهُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ
وُدًّا ⑤

فَأَنصَبْنَا سُرَّتَهُ لِبَلْسَانَكَ لِنُبَيِّنَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَنُنذِرَ

شانِ رَحْمَنِ كَ لَاتِقِ نَمِيسِ كَ وَهَ اُولَادِ رَكْهِي- (۹۲)

آسمان و زمین میں جو بھی ہیں سب کے سب اللہ کے غلام
بن کر ہی آنے والے ہیں۔ (۹۳) (۱)

ان سب کو اس نے گھیر رکھا ہے اور سب کو پوری طرح
گن بھی رکھا ہے۔ (۹۴) (۲)

یہ سارے کے سارے قیامت کے دن اکیلے اس کے
پاس حاضر ہونے والے ہیں۔ (۹۵) (۳)

بیشک جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے شائستہ اعمال کیے
ہیں ان کے لیے اللہ رحمنِ محبت پیدا کر دے گا۔ (۹۶) (۴)

ہم نے اس قرآن کو تیری زبان میں بہت ہی آسان کر دیا
ہے (۵) کہ تو اس کے ذریعہ سے پرہیزگاروں کو خوشخبری

(۱) جب سب اللہ کے غلام اور اس کے عاجز بندے ہیں تو پھر اسے اولاد کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور یہ اس کے لائق بھی نہیں ہے۔

(۲) یعنی آدم سے لے کر صبحِ قیامت تک جتنے بھی انسان، جن ہیں، سب کو اس نے گن رکھا ہے، سب اس کے قابو اور گرفت میں ہیں، کوئی اس سے مخفی ہے نہ مخفی رہ ہی سکتا ہے۔

(۳) یعنی کوئی کسی کا مددگار نہیں ہوگا، نہ مال ہی وہاں کچھ کام آئے گا۔ ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ﴾ (الشعراء-۸۸) ”اس دن نہ مال نفع دے گا، نہ بیٹے“ ہر شخص کو تمنا اپنا اپنا حساب دینا پڑے گا اور جن کی بابت انسان دنیا میں یہ سمجھتا ہے کہ یہ میرے وہاں حمایتی اور مددگار ہوں گے، وہاں سب غائب ہو جائیں گے۔ کوئی کسی کی مدد کے لیے حاضر نہیں ہوگا۔

(۴) یعنی دنیا میں لوگوں کے دلوں میں اس کی نیکی اور پارسائی کی وجہ سے محبت پیدا کر دے گا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے ”جب اللہ تعالیٰ کسی (نیک) بندے کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے تو اللہ جبرائیل علیہ السلام کو کتا ہے، میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر۔ پس جبرائیل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنی شروع کر دیتے ہیں پھر جبرائیل علیہ السلام آسمان میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں آدمی سے محبت کرتا ہے، پس تمام آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر زمین میں اس کے لیے قبولیت اور پذیرائی رکھ دی جاتی ہے“ (صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب المقت من اللہ تعالیٰ)

(۵) قرآن کو آسان کرنے کا مطلب اس زبان میں اتارنا ہے جس کو پیغمبر جانتا تھا یعنی عربی زبان میں، پھر اس کے مضمون کا کھلا ہوا، واضح اور صاف ہونا ہے۔

يَه قَوْمًا لَّدَا ۝

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَوْمٍ هَلَّ لِحُسْنٌ وَمِنْهُمْ مَنْ أَحَادٍ
أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْوًا ۝

دے اور جھگڑالو^(۱) لوگوں کو ڈرادے۔ (۹۷)

ہم نے ان سے پہلے بہت سی جماعتیں تباہ کر دی ہیں، کیا ان میں سے ایک کی بھی آہٹ تو پاتا ہے یا ان کی آواز کی بھٹک بھی تیرے کان میں پڑتی ہے؟ (۹۸)^(۲)

سورہ طہ کی ہے اور اس میں ایک سو پینتیس آیتیں اور آٹھ رکوع ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

طہ ۱ مَا تَرْتَأَتُنَا بِكَ الْغُرَابُ لِشَقِي ۝

طہ۔ (۱) ہم نے یہ قرآن تجھ پر اس لیے نہیں اتارا کہ تو مشقت میں پڑ جائے۔^(۳)

بلکہ اس کی فصاحت کے لیے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔^(۳) اس کا اتارنا اس کی طرف سے ہے جس نے زمین کو اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا ہے۔^(۳)

إِلَّا تَذَكَّرُ لِمَنْ يُحْسِنُ ۝

تَنْزِيلًا وَمَنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمَوَاتِ الْعُلَى ۝

(۱) لَّدَا، (الَّذِي جَمَعَ) کے معنی جھگڑالو کے ہیں مراد کفار و مشرکین ہیں۔

(۲) احساس کے معنی ہیں الْإِدْرَاكُ بِالْحِسِّ، حس کے ذریعے سے ادراک حاصل کرنا۔ یعنی کیا تو ان کو آنکھوں سے دیکھ سکتا یا ہاتھوں سے چھو سکتا ہے؟ استفہام انکاری ہے۔ یعنی ان کا وجود ہی دنیا میں نہیں ہے کہ تو انہیں دیکھ یا چھو سکے رِکْوًا صوت خفی کو کہتے ہیں یا ان کی ہلکی سی آواز بھی تجھے کہیں سے سنائی دے سکے۔

☆ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے قبول اسلام کے متعدد اسباب بیان کئے گئے ہیں۔ بعض تاریخ و سیر کی روایات میں اپنی بہن اور بہنوئی کے گھر میں سورہ طہ کا سننا اور اس سے متاثر ہونا بھی مذکور ہے (فتح القدر)

(۳) اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو اس لیے نہیں اتارا کہ تو ان کے کفر پر فرط تأسف اور ان کے عدم ایمان پر حسرت سے اپنے آپ کو مشقت میں ڈال لے اور غم میں پڑ جائے جیسا کہ اس آیت میں اشارہ ہے۔ ﴿ فَكَلَّمْنَا بَاطِلًا لِّتَسْمَعُ عَلَىٰ أَكْرَاهٍ لَّنَا وَمَا يُؤْمِرُ بِهُ الْعَادِيُّ اسْمًا ﴾ (الکہف ۶۰) ”پس اگر یہ لوگ اس بات پر ایمان نہ لائیں تو کیا ان کے پیچھے اسی رنج میں اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے“ بلکہ ہم نے تو قرآن کو فصاحت اور یاد دہانی کے لیے اتارا ہے تاکہ ہر انسان کے تحت الشعور میں ہماری توحید کا جو جذبہ چھپا ہوا ہے، واضح اور نمایاں ہو جائے۔ گویا یہاں شَقَاةٌ عِنَاةٌ اور تَعَبٌ کے معنی میں ہے یعنی تکلیف اور تھکاوٹ۔

جو رحمن ہے، عرش پر قائم ہے۔^(۱) (۵)
 جس کی ملکیت آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے
 درمیان اور (کرۃ خاک) کے نیچے کی ہر ایک چیز پر
 ہے۔^(۲) (۶)
 اگر تو اونچی بات کہے تو وہ تو ہر ایک پوشیدہ، بلکہ پوشیدہ
 سے پوشیدہ تر چیز کو بھی بخوبی جانتا ہے۔^(۳) (۷)
 وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بہترین نام اسی
 کے ہیں۔^(۴) (۸)
 تجھے موسیٰ (علیہ السلام) کا قصہ بھی معلوم ہے؟^(۵) (۹)
 جبکہ اس نے آگ دیکھ کر اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم
 ذرا سی دیر ٹھہر جاؤ مجھے آگ دکھائی دی ہے۔ بہت ممکن
 ہے کہ میں اس کا کوئی انگارا تمہارے پاس لاؤں یا آگ
 کے پاس سے راستے کی اطلاع پاؤں۔^(۶) (۱۰)

أَلَتَحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى ۝
 لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا
 وَمَا تَحْتَ الثَّرَى ۝
 وَلَا تَجْعَزُ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهُ يَعْلَمُ الْسِّرَ وَالْخَفَى ۝
 اِنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنَى ۝
 وَهَلْ اَنْتَ حَدِيْثٌ مُّوسَى ۝
 اِذْ رَا نَارًا فَتَلٰٓءَلٰ اِلَيْهِ اِنْكُرًا لِّيَ اَنْتَ نَارُ الْعَلَى
 اِنِّيْنَا مِنْهَا بِاَعْيُنٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝

- (۱) بغیر کسی حد بندی اور کیفیت بیان کرنے کے، جس طرح کہ اس کی شان کے لائق ہے یعنی اللہ تعالیٰ عرش پر قائم ہے،
 لیکن کس طرح اور کیسے؟ یہ کیفیت کسی کو معلوم نہیں۔
- (۲) ثَرَى کے معنی ہیں اسفل السافلین یعنی زمین کا سب سے نچلا حصہ۔
- (۳) یعنی اللہ کا ذکر یا اس سے دعا اونچی آواز میں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ تو پوشیدہ سے پوشیدہ تر
 بات کو بھی جانتا ہے یا اَخْفَى کے معنی ہیں کہ اللہ تو ان باتوں کو بھی جانتا ہے جن کو اس نے تقدیر میں لکھ دیا اور ابھی تک
 لوگوں سے اس کو مخفی رکھا ہے۔ یعنی قیامت تک وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا اسے علم ہے۔
- (۴) یعنی معبود بھی وہی ہے جو مذکورہ صفات سے متصف ہے اور بہترین نام بھی اسی کے ہیں جن سے اس کو پکارا جاتا ہے۔ نہ
 معبود اس کے سوا کوئی اور ہے اور نہ اس کے سے اسمائے حسنیٰ ہی کسی کے ہیں۔ پس اسی کی صحیح معرفت حاصل کر کے اسی سے
 ڈرایا جائے، اسی سے محبت رکھی جائے اسی پر ایمان لایا جائے اور اسی کی اطاعت کی جائے۔ تاکہ انسان جب اس کی بارگاہ میں
 واپس جائے تو وہاں شرمسار نہ ہو بلکہ اس کی رحمت و مغفرت سے شاد کام اور اس کی رضا سے سعادت مند ہو۔
- (۵) یہ اس وقت کا واقعہ ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام مدین سے اپنی بیوی کے ہمراہ (جو ایک قول کے مطابق حضرت
 شعیب علیہ السلام کی دختر نیک اختر تھیں) اپنی والدہ کی طرف واپس جا رہے تھے، اندھیری رات تھی اور راستہ بھی
 نامعلوم۔ اور بعض مفسرین کے بقول بیوی کی زچگی کا وقت بالکل قریب تھا اور انہیں حرارت کی ضرورت تھی۔ یا سردی

فَلَمَّا آتَمَّ هَاؤُدَىٰ يَوْمَئِذٍ ۝۱۱

إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاصْلَحْ لَعَلَّكَ تَكَلِّمُكَ بِأَلْوَادِ الْمُتَكَدِّسِ

طُؤَىٰ ۝۱۲

وَإِنَّا اخْتَرْنَاكَ فَاسْتَيْمِرْ لِمَا يُؤَخَّرِي ۝۱۳

إِنِّي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ

لِيَذْكُرَنِي ۝۱۴

جب وہ وہاں پہنچے تو آواز دی گئی (۱۱) اے موسیٰ!

یقیناً میں ہی تیرا پروردگار ہوں تو اپنی جوتیاں اتار

دے، (۱۲) کیونکہ تو پاک میدان طوئی میں ہے۔ (۱۲)

اور میں نے تجھے منتخب کر لیا ہے (۱۳) اب جو وحی کی جائے

اسے کان لگا کر سن۔ (۱۳)

پیشک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا عبادت کے لائق اور

کوئی نہیں پس تو میری ہی عبادت کر، (۱۴) اور میری یاد

کے لیے نماز قائم رکھ۔ (۱۴)

کی وجہ سے گرمی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اتنے میں دور سے انہیں آگ کے شعلے بلند ہوتے ہوئے نظر آئے۔ گھر والوں سے یعنی بیوی سے (یا بعض کہتے ہیں خادم اور بچہ بھی تھا اسی لیے جمع کا لفظ استعمال فرمایا) کہا تم یہاں ٹھہرو! شاید میں آگ کا کوئی شعلہ وہاں سے لے آؤں یا کم از کم وہاں سے راستے کی نشان دہی ہی ہو جائے۔

(۱) موسیٰ علیہ السلام جب آگ والی جگہ پر پہنچے تو وہاں ایک درخت سے (جیسا کہ سورہ قصص، ۳۰ میں صراحت ہے) آواز آئی۔

(۲) جوتیاں اتارنے کا حکم اس لیے دیا کہ اس میں تواضع کا اظہار اور شرف و تکریم کا پہلو زیادہ ہے، بعض کہتے ہیں کہ وہ ایسے گدھے کی کھال کی بنی ہوئی تھیں جو غیر مدبوغ تھی۔ کیوں کہ جانور کی کھال دباغت کے بعد ہی پاک ہوتی ہے، مگر یہ قول محل نظر ہے۔ دباغت کے بغیر جوتیاں کیوں کر بن سکتی ہیں؟ یا وادی کی پاکیزگی اس کا سبب تھا جیسا کہ قرآن کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے۔ تاہم اس کے دو پہلو ہیں۔ یہ حکم وادی کی تقظیم کے لیے تھا یا اس لیے کہ وادی کی پاکیزگی کے اثرات ننگے پیر ہونے کی صورت میں موسیٰ علیہ السلام کے اندر زیادہ جذب ہو سکیں۔ واللہ اعلم۔

(۳) طوئی وادی کا نام ہے، اسے بعض نے منصرف اور بعض نے غیر منصرف کہا ہے۔ (فتح القدر)

(۴) یعنی نبوت و رسالت اور بہکلامی کے لیے۔

(۵) یعنی تکلیفات شرعیہ میں یہ سب سے پہلا اور سب سے اہم حکم ہے جس کا ہر انسان مکلف ہے۔ علاوہ ازیں جب الوہیت کا مستحق بھی وہی ہے تو عبادت بھی صرف اسی کا حق ہے۔

(۶) عبادت کے بعد نماز کا خصوصی حکم دیا۔ حلال کہ عبادت میں نماز بھی شامل تھی، تاکہ اس کی وہ اہمیت واضح ہو جائے جیسے کہ اس کی ہے۔ لِيَذْكُرَنِي کا ایک مطلب یہ ہے کہ تو مجھے یاد کرے، اس لیے کہ یاد کرنے کا طریقہ عبادت ہے اور عبادت میں نماز کو خصوصی اہمیت و فضیلت حاصل ہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب بھی میں تجھے یاد آ جاؤں نماز پڑھ۔ یعنی اگر کسی وقت غفلت، زہول یا نیند کا غلبہ ہو تو اس کیفیت سے نکلنے ہی اور میری یاد آتے ہی نماز پڑھ۔ جس طرح کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جو نماز سے سو جائے یا بھول جائے، تو اس کا کفارہ یہی ہے کہ جب بھی اسے یاد آئے

قیامت یقیناً آنے والی ہے جسے میں پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر شخص کو وہ بدلہ دیا جائے جو اس نے کوشش کی ہو۔ (۱۵)

پس اب اس کے یقین سے تجھے کوئی ایسا شخص روک نہ دے جو اس پر ایمان نہ رکھتا ہو اور اپنی خواہش کے پیچھے پڑا ہو، ورنہ تو ہلاک ہو جائے گا۔ (۱۶)

اے موسیٰ! تیرے اس دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ (۱۷)

جواب دیا کہ یہ میری لاشمی ہے، جس پر میں نیک لگا تا ہوں اور جس سے میں اپنی بکریوں کے لیے پتے بھاڑ لیا کرتا ہوں اور بھی اس میں مجھے بہت سے فائدے ہیں۔ (۱۸)

فرمایا اے موسیٰ! اسے ہاتھ سے نیچے ڈال دے۔ (۱۹)

ڈالتے ہی وہ سانپ بن کر دوڑنے لگی۔ (۲۰)

فرمایا بے خوف ہو کر اسے پکڑ لے، ہم اسے اسی پہلی سی صورت میں دوبارہ لا دیں گے۔ (۲۱)

اور اپنا ہاتھ اپنی بغل میں ڈال لے تو وہ سفید چمکتا ہوا ہو کر نکلے گا، لیکن بغیر کسی عیب (اور روگ) کے (۲۲)

دوسرا معجزہ ہے۔ (۲۳)

یہ اس لیے کہ ہم تجھے اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھانا چاہتے ہیں۔ (۲۴)

إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِيُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ ۝

فَلَا يَصُدُّكَ عَنْهَا مَنْ لُدًّا مِنْ بَنِي إِدْرِيمَ هُوَ الَّذِي فَتَرَدَّىٰ ۝

وَأَمَّا نَبِيَّكَ بِمُؤْمِنِي ۝

قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَمِّي وَلِي بَيْنَنَا مَوَازِبٌ أُخْرَىٰ ۝

قَالَ آلِهَتُهُ الْيَهُودِيَّةُ ۝

فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَىٰ ۝

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَحْتَفِ بِسُنْعِيْدُهَا سَيَرَّتْهَا الْأُوَلَىٰ ۝

وَلَقَدْ مَرَرْنَاكَ إِلَىٰ جَنَّتِكَ نَعُودُ بِبَيْضَاءَ مِنْ عَيْرٍ سَوَاءَ آيَةً أُخْرَىٰ ۝

لِيُرِيكَ مِنَ الْآيَاتِ الْكُبْرَىٰ ۝

پڑھ لے۔“ (صحیح بخاری، کتاب المواقیف، باب من نسی صلوة فليصل إذا ذكرها، ومسلم، كتاب المساجد باب قضاء الصلوة الفائتة)

(۱) اس لیے کہ آخرت پر یقین کرنے سے یا اس کے ذکر و مراقبہ سے گریز، دونوں ہی باتیں ہلاکت کا باعث ہیں۔

(۲) یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معجزہ عطا کیا گیا جو عصائے موسیٰ علیہ السلام کے نام سے مشہور ہے۔

(۳) بغیر عیب اور روگ کے، کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھ کا اس طرح سفید اور چمک دار ہو کر نکلنا، کسی بیماری کی وجہ سے نہیں ہے جیسا کہ برص کے مریض کی چمڑی سفید ہو جاتی ہے۔ بلکہ یہ دوسرا معجزہ ہے، جو ہم تجھے عطا کر رہے ہیں۔ جس طرح دوسرے مقام پر ان دونوں معجزوں کا ذکر کر کے فرمایا ﴿ فَذَرِكُنَّ الْبَنِي مِنْ رَبِّكَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ ﴾

(القصص ۳۲) ”پس یہ دو دلیل ہیں تیرے پروردگار کی طرف سے، فرعون اور اس کے سرداروں کے لیے۔“

اب تو فرعون کی طرف جا اس نے بڑی سرکشی مچا رکھی ہے۔^(۱) (۲۳)

موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے میرے پروردگار! میرا سینہ میرے لیے کھول دے۔ (۲۵)

اور میرے کام کو مجھ پر آسان کر دے۔ (۲۶)

اور میری زبان کی گرہ بھی کھول دے۔ (۲۷)

تاکہ لوگ میری بات اچھی طرح سمجھ سکیں۔ (۲۸)

اور میرا وزیر میرے کنبے میں سے کر دے۔ (۲۹)

یعنی میرے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو۔ (۳۰)

تو اس سے میری کمر کس دے۔ (۳۱)

اور اسے میرا شریک کار کر دے۔^(۲) (۳۲)

اِذْ هَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰى ﴿۲۳﴾

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ﴿۲۵﴾

وَوَسِّعْ لِي فَرْجِي ﴿۲۶﴾

وَاجْلِدْ عُنُقَ قَوْمِي لِيَسْمَعُوْا ﴿۲۷﴾

يَقَعُوْا قَوْلِي ﴿۲۸﴾

وَاجْعَلْ لِّيْ وِزِيْرًا مِّنْ اٰهْلِ بَيْتِي ﴿۲۹﴾

مِنْ ذُرِّيَّتِي ﴿۳۰﴾

اَسْتَدْرِجْنِيْ بِهٖ اَنْزِلْنِيْ سِدْرًا مِّنْ سَمَوٰتٍ ﴿۳۱﴾

وَاَجْعَلْ لِّيْ شَرِيْكًَا مِّنْ اٰهْلِ بَيْتِي ﴿۳۲﴾

(۱) فرعون کا ذکر اس لیے کیا کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا اور اس پر طرح طرح کے ظلم روا رکھتا تھا۔ علاوہ ازیں اس کی سرکشی و طغیانی بھی بہت بڑھ گئی تھی حتیٰ کہ وہ دعویٰ کرنے لگا تھا ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الرَّحْمٰنُ﴾ ”میں تمہارا بلند تر رب ہوں۔“

(۲) کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام جب فرعون کے شاہی محل میں زیر پرورش تھے تو کھجور یا موتی کے بجائے آگ کا انگارہ منہ میں ڈال لیا تھا جس سے ان کی زبان جل گئی اور اس میں کچھ لکنت پیدا ہو گئی۔ (ابن کثیر) جب اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ فرعون کے پاس جا کر میرا پیغام پہنچاؤ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں دو باتیں آئیں، ایک تو یہ کہ وہ بڑا جاہل اور متکبر بادشاہ ہے بلکہ رب ہونے تک کا دعویٰ دار ہے۔ دوسرا یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں اس کی قوم کا ایک آدمی مارا گیا تھا اور جس کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی جان بچانے کے لیے وہاں سے نکلنا پڑا تھا۔ یعنی ایک فرعون کی عظمت و جباریت کا خوف اور دوسرا، اپنے ہاتھوں ہونے والے واقعہ کا اندیشہ۔ اور ان دونوں پر زائد تیسری بات، زبان میں لکنت۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی کہ یا اللہ! ”میرا سینہ کھول دے تاکہ میں رسالت کا بوجھ اٹھا سکوں، میرے کام کو آسان فرمادے یعنی جو مہم مجھے درپیش ہے اس میں میری مدد فرما اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ فرعون کے سامنے میں پوری وضاحت سے تیرا پیغام پہنچا سکوں اور اگر ضرورت پیش آئے تو اپنا دفاع بھی کر سکوں۔ اس کے ساتھ یہ دعا بھی کی کہ میرے بھائی ہارون علیہ السلام کو (کہتے ہیں کہ یہ میرے بھائی ہارون علیہ السلام سے بڑے تھے) بطور معین اور مددگار میرا وزیر اور شریک کار بنا دے۔ وِزِيْرًا مُّوَاَزِرًا مِّنْ اٰهْلِ بَيْتِي ﴿۲۹﴾ یعنی بوجھ اٹھانے والا۔ جس طرح ایک وزیر بادشاہ کا بوجھ اٹھاتا ہے اور امور مملکت میں اس کا مشیر ہوتا ہے۔ اسی طرح ہارون علیہ السلام میرا مشیر اور بوجھ اٹھانے والا ساتھی ہو۔

تاکہ ہم دونوں بکثرت تیری تسبیح بیان کریں۔ (۳۳)
 اور بکثرت تیری یاد کریں۔ (۳۴)^(۱)
 بیشک تو ہمیں خوب دیکھنے بھالنے والا ہے۔ (۳۵)^(۲)
 جناب باری تعالیٰ نے فرمایا موسیٰ تیرے تمام سوالات
 پورے کر دیے گئے۔ (۳۶)^(۳)
 ہم نے تو تجھ پر ایک بار اور بھی بڑا احسان کیا ہے۔ (۳۷)^(۴)
 جبکہ ہم نے تیری ماں کو وہ المام کیا جس کا ذکر اب کیا
 جا رہا ہے۔ (۳۸)
 کہ تو اسے صندوق میں بند کر کے دریا میں چھوڑ دے،
 پس دریا اسے کنارے لا ڈالے گا اور میرا اور خود اس کا
 دشمن اسے لے لے گا،^(۵) اور میں نے اپنی طرف کی
 خاص محبت و مقبولیت تجھ پر ڈال دی۔ تاکہ تیری

كَيْ نَسْتَحِكَ كَثِيرًا ۝
 وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا ۝
 إِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيرًا ۝
 قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَىٰ ۝
 وَلَقَدْ مَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ ۝
 إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمَمِكَ مَا يُؤْمِنُ ۝

أَنْ أَقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ فَآذِنِي فِيهِ فِي الْيَوْمِ فَلْيَلْقِهِ الْيَوْمَ
 بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوِّي وَعَدُوْلَهُ فَوَلِّتْ عَلَيكَ عَجَبَةً
 مِّيْقِي ۚ وَلِنُصْنَعَنَّ عَلَىٰ عَيْنِي ۝

- (۱) یہ دعاؤں کی علت بیان کی کہ اس طرح ہم تبلیغ رسالت کے ساتھ ساتھ تیری تسبیح اور تیرا ذکر بھی زیادہ کر سکیں۔
 (۲) یعنی تجھے سارے حالات کا علم ہے اور بچپن میں جس طرح تو نے ہم پر احسان کیے، اب بھی اپنے احسانات سے ہمیں محروم نہ رکھ۔
 (۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان کی لکنت کو بھی دور فرما دیا ہو گا۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے چون کہ پوری لکنت دور کرنے کی دعا نہیں کی تھی، اس لیے کچھ باقی رہ گئی تھی۔ باقی رہا فرعون کا یہ کہنا ﴿وَلَا يَجِدُ يُبِينُ﴾ (الزخرف-۵۲) ”یہ تو صاف بول بھی نہیں سکتا“ یہ ان کی تنقیص گزشتہ کیفیت کے اعتبار سے ہے (البر التفسیر)
 (۴) قبولیت دعا کی خوشخبری کے ساتھ، مزید تسلی اور حوصلے کے لیے اللہ تعالیٰ بچپن کے اس احسان کا ذکر فرما رہا ہے، جب موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے قتل کے اندیشے سے اللہ کے حکم سے (یعنی القائے الہی) سے انہیں، جب وہ شیر خوار بچے تھے، تابوت میں ڈال کر دریا کے سپرد کر دیا تھا۔
 (۵) مراد فرعون ہے جو اللہ کا بھی دشمن اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی دشمن تھا۔ یعنی لکڑی کا وہ تابوت تیرا ہوا جب شاہی محل کے کنارے پہنچا تو اسے باہر نکال کر دیکھا گیا، تو اس میں ایک معصوم بچہ تھا، فرعون نے اپنی بیوی کی خواہش پر پرورش کے لیے شاہی محل میں رکھ لیا۔
 (۶) یعنی فرعون کے دل میں ڈال دی عام لوگوں کے دلوں میں تیری محبت ڈال دی۔

پرورش میری آنکھوں کے سامنے (۱) کی جائے۔ (۳۹)
 (یاد کر) جبکہ تیری بہن چل رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ
 اگر تم کہو تو میں اسے بتا دوں جو اس کی نگہبانی کرے، (۲)
 اس تدبیر سے ہم نے تجھے پھر تیری ماں کے پاس پہنچایا کہ
 اس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ غمگین نہ ہو۔ اور تو
 نے ایک شخص کو مار ڈالا تھا (۳) اس پر بھی ہم نے تجھے غم
 سے بچالیا، غرض ہم نے تجھے اچھی طرح آزمایا۔ (۴) پھر تو
 کئی سال تک مدین کے لوگوں میں ٹھہرا رہا، (۵) پھر تقدیر

اِذْ نَسِيْتِي اٰخْتِكَ فَتَمَوَّلَ هَلْ اَذَلُّكُمْ عَلٰی مَنْ يٰكْفُلُهُ
 فَرَجَحْتِكِ اِلٰى اٰمِكِ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۗ ذٰلِكَ مَتَّ
 نَفْسًا فَجَيَّبْنٰكَ مِنَ الْعَمْرِ وَقَدْ نَكَّرْنَا ۗ فَاَوَاةٌ فَلَيْدَتٌ سَيِّئِن
 فِيْ اَهْلِ مَدِيْنَةٍ لَّا تَمُوْجِبُ عَلٰی قَدَدٍ يُّمُوْسٰى ﴿۳۹﴾

(۱) چنانچہ اللہ کی قدرت کا اور اس کی حفاظت و نگہبانی کا کمال اور کرشمہ دیکھئے کہ جس بچے کی خاطر فرعون بے شمار
 بچوں کو قتل کروا چکا ہے، تاکہ وہ زندہ نہ رہے، اسی بچے کو اللہ تعالیٰ اس کی گود میں پلوا رہا ہے، اور ماں اپنے بچے کو دودھ
 پلا رہی ہے، لیکن اس کی اجرت بھی موسیٰ علیہ السلام کے اسی دشمن فرعون سے وصول کر رہی ہے۔ « فُسْبِحَانَ ذِي
 الْجَبْرَوْتِ وَالْمَلَكُوْتِ وَالْكَبِيْرِيَّاتِ وَالْعَظْمَةِ ».

(۲) یہ اس وقت ہوا، جب ماں نے تابوت سمندر میں پھینک دیا تو بیٹی سے کہا، ذرا دیکھتی رہو، یہ کہاں کنارے لگتا ہے
 اور کیا معاملہ اس کے ساتھ ہوتا ہے؟ جب اللہ کی مشیت سے موسیٰ علیہ السلام فرعون کے محل میں پہنچ گئے، شیر خوارگی
 کا عالم تھا، چنانچہ دودھ پلانے والی عورتوں اور آیاؤں کو بلایا گیا۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام کسی کا دودھ نہ پیتے۔ موسیٰ علیہ
 السلام کی بہن خاموشی سے سارا منظر دیکھ رہی تھی، بالآخر اس نے کہا میں تمہیں ایسی عورت بتلاتی ہوں جو تمہاری یہ
 مشکل دور کر دے گی، انہوں نے کہا ٹھیک ہے، چنانچہ وہ اپنی ماں کو، جو موسیٰ علیہ السلام کی بھی ماں تھی، بلا لائی۔ جب ماں
 نے بیٹے کو چھاتی سے لگایا تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی تدبیر و مشیت سے غٹا غٹ دودھ پینا شروع کر دیا۔

(۳) یہ ایک دوسرے احسان کا ذکر ہے، جب موسیٰ علیہ السلام سے غیر ارادی طور پر ایک فرعونی صرف گھونسہ مارنے
 سے مر گیا، جس کا ذکر سورہ قصص میں آئے گا۔

(۴) فُتُوْنٌ، دخول اور خروج کی طرح مصدر ہے یعنی اَبْتَلَيْنَاكَ اَبْتَلَاءً یعنی ہم نے تجھے خوب آزمایا۔ یا یہ جمع ہے فتنہ
 کی۔ جیسے حَجْرَةٌ کی حُجُوْرٌ اور بَذْرَةٌ کی بُذُوْرٌ جمع ہے۔ یعنی ہم نے تجھے کئی مرتبہ یا بار بار آزمایا یا آزمائشوں سے نکالا۔ مثلاً
 جو سال بچوں کے قتل کا تھا، تجھے پیدا کیا، تیری ماں نے تجھے سمندر کی موجوں کے سپرد کر دیا، تمام دایاؤں کا دودھ تجھ پر
 حرام کر دیا، تو نے فرعون کی داڑھی پکڑ لی تھی، جس پر اس نے تیرے قتل کا ارادہ کر لیا تھا، تیرے ہاتھوں قبلی کا قتل ہو
 گیا، وغیرہ ان تمام مواقع آزمائش میں ہم ہی تیری مدد اور چارہ سازی کرتے رہے۔

(۵) یعنی فرعونی کے غیر ارادی قتل کے بعد تو یہاں سے نکل کر مدین چلا گیا اور وہاں کئی سال رہا۔

الہی کے مطابق اے ^(۱) موسیٰ! تو آیا۔ (۳۰)
 اور میں نے تجھے خاص اپنی ذات کے لیے پسند فرمایا۔ (۳۱)
 اب تو اپنے بھائی سمیت میری نشانیاں ہمراہ لیے ہوئے
 جاؤ اور خبردار میرے ذکر میں سستی نہ کرنا۔ ^(۲) (۳۲)
 تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ انے بڑی سرکشی کی ہے۔ (۳۳)
 اسے نرمی ^(۳) سے سمجھاؤ کہ شاید وہ سمجھ لے یا ڈر
 جائے۔ (۳۴)

دونوں نے کہا اے ہمارے رب! ہمیں خوف ہے کہ
 کہیں فرعون ہم پر کوئی زیادتی نہ کرے یا اپنی سرکشی میں
 بڑھ نہ جائے۔ (۳۵)

جواب ملا کہ تم مطلقاً خوف نہ کرو میں تمہارے ساتھ
 ہوں اور سنتا دیکھتا رہوں گا۔ ^(۴) (۳۶)

تم اس کے پاس جا کر کہو کہ ہم تیرے پروردگار کے پیغمبر
 ہیں تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے، ان کی
 سزائیں موقوف کر۔ ہم تو تیرے پاس تیرے رب کی
 طرف سے نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی اسی کے
 لیے ہے جو ہدایت کا پابند ^(۵) ہو جائے۔ (۳۷)

وَاصْطَمْتُمْكَ لِنَفْسِي ۝

إِذْ هَبَّ آتَمَ وَأَخْرَجَ بِأَيْمِي وَلَا تَنبِيَانِي ذِكْرِي ۝

إِذْ هَبَّ آتَمَ فِي رُوعُونَ إِنَّهُ طَغَى ۝

فَعَوْلَا لَهُ قَوْلًا لِنَبِيِّ الْعَالَمِ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَهْتَفِي ۝

قَالَ رَبَّنَا إِنَّا نَخَافُ أَنْ يُفْرَطَ عَلَيْكَ أَوْ أَنْ يُطْغَى ۝

قَالَ لَا تَخَافَا إِنِّي مَعَكُمْ أَسْمَعُ وَأَرَى ۝

فَأَنبِيَهُ فَعَوْلَا إِنَّا رَسُولُ رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي

إِسْرَائِيلَ وَلَا نُعَذِّبُهُمْ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَاتٍ مِنْ رَبِّكَ

وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنْ اتَّبَعَ الْهُدَى ۝

(۱) یعنی ایسے وقت میں تو آیا جو وقت میں نے اپنے فیصلے اور تقدیر میں تجھ سے ہم کلامی اور نبوت کے لیے لکھا ہوا تھا۔ یا
 قَدَر سے مراد عمر ہے یعنی عمر کے اس مرحلے میں آیا جو نبوت کے لیے موزوں ہے یعنی چالیس سال کی عمر میں۔

(۲) اس میں داعیان الی اللہ کے لیے بڑا سبق ہے کہ انہیں کثرت سے اللہ کا ذکر کرنا چاہیے۔

(۳) یہ وصف بھی داعیان کے لیے بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ سختی سے لوگ بدکتے اور دور بھاگتے ہیں اور نرمی سے
 قریب آتے اور متاثر ہوتے ہیں اگر وہ ہدایت قبول کرنے والے ہوتے ہیں۔

(۴) تم فرعون کو جا کر جو کہو گے اور اس کے جواب میں جو وہ کہے گا، میں وہ سنتا اور تمہارے اور اس کے طرز عمل کو دیکھتا
 رہوں گا۔ اس کے مطابق میں تمہاری مدد اور اس کی چالوں کو ناکام کروں گا، اس لیے اس کے پاس جاؤ، ترددی کوئی ضرورت نہیں۔

(۵) یہ سلام تحیہ نہیں ہے، بلکہ امن و سلامتی کی طرف دعوت ہے۔ جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روم کے بادشاہ
 ہرقل کے نام مکتوب میں لکھا تھا، «أَسْلِمْنَا نَسْلَمَ» (اسلام قبول کر لے، سلامتی میں رہے گا) اسی طرح مکتوب کے شروع

ہماری طرف وحی کی گئی ہے کہ جو جھٹلائے اور روگردانی کرے اس کے لیے عذاب ہے۔ (۴۸)

فرعون نے پوچھا کہ اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ (۴۹)

جواب دیا کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر ایک کو اس کی خاص صورت، شکل عنایت فرمائی پھر راہ بچھا دی۔^(۱) (۵۰)

اس نے کہا اچھا یہ تو بتاؤ اگلے زمانے والوں کا حال کیا ہونا ہے۔^(۲) (۵۱)

جواب دیا کہ ان کا علم میرے رب کے ہاں کتاب میں موجود ہے، نہ تو میرا رب غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے۔^(۳) (۵۲)

اسی نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا ہے اور اس میں تمہارے چلنے کے لیے راستے بنائے ہیں اور آسمان سے

اِنَّا قَدْ اَوْحٰی اِلَیْنا اَنْ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ کَذَّبَ وَتَوَلٰی ﴿۴۸﴾

قَالَ مِمَّنْ رَبُّكُمْ اَلَمْ یُوسٰی ﴿۴۹﴾

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰی ﴿۵۰﴾

قَالَ قَبَالَ الْعَرُوْبُ الْاُوْلٰی ﴿۵۱﴾

قَالَ عَلِمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ کِتٰبٍ لَا یُضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسِی ﴿۵۲﴾

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهَدًا وَاَوْسَلَ لَکُمُ وِیَاطَ السُّبُلٰ

میں آپ نے ﴿وَاللَّهُ عَلٰی مَنَاقِبِ الْهٰدِی﴾ بھی تحریر فرمایا، (ابن کثیر) اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی غیر مسلم کو مکتوب یا مجلس میں مخاطب کرنا ہو تو اسے انہی الفاظ میں سلام کہا جائے، جو مشروط ہے ہدایت کے اپنانے کے ساتھ۔

(۱) مثلاً جو شکل و صورت انسان کے مناسب حال تھی، وہ اسے۔ جو جانوروں کے مطابق تھی، وہ جانوروں کو عطا فرمائی۔ ”راہ بچائی“ کا مطلب ہر مخلوق کو اس کی طبعی ضروریات کے مطابق رہن سہن، کھانے پینے اور بودوباش کا طریقہ سمجھا دیا، اس کے مطابق ہر مخلوق سامان زندگی فراہم کرتی اور حیات مستعار کے دن گزارتی ہے۔

(۲) فرعون نے بات کا رخ دوسری طرف پھیرنے کے لیے یہ سوال کیا، یعنی پہلے لوگ جو غیر اللہ کی عبادت کرتے ہوئے دنیا سے چلے گئے، ان کا حال کیا ہو گا؟

(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا، ان کا علم نہ تجھے ہے نہ مجھے۔ البتہ ان کا علم میرے رب کو ہے، جو اس کے پاس کتاب میں موجود ہے، وہ اس کے مطابق ان کو جزا و سزا دے گا، پھر اس کا علم اس طرح ہر چیز کو محیط ہے کہ اس کی نظر سے کوئی چھوٹی بڑی چیز او جمل نہیں ہو سکتی، نہ اسے نسیان ہی لاحق ہو تا ہے۔ جب کہ مخلوق کے علم میں دونوں نقص موجود ہیں۔ ایک تو ان کا علم محیط کل نہیں، بلکہ ناقص ہے۔ دوسرے، علم کے بعد وہ بھول بھی سکتے ہیں، میرا رب ان دونوں نقصوں سے پاک ہے۔ آگے، رب کی مزید صفات بیان کی جا رہی ہیں۔

پانی بھی وہی برساتا ہے، پھر اس برسات کی وجہ سے مختلف قسم کی پیداوار بھی ہم ہی پیدا کرتے ہیں۔ (۵۳)

تم خود کھاؤ اور اپنے چوپایوں کو بھی چراؤ۔^(۱) کچھ شک نہیں کہ اس میں عقلمندوں کے لیے^(۲) بہت سی نشانیاں ہیں۔ (۵۴)

اسی زمین میں سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اسی میں پھر واپس لوٹائیں گے اور اسی سے پھر دوبارہ تم سب کو نکال کھڑا کریں گے۔ (۵۵)

ہم نے اسے اپنی سب نشانیاں دکھادیں لیکن پھر بھی اس نے جھٹلایا اور انکار کر دیا۔ (۵۶)

کنے لگا اے موسیٰ! کیا تو اسی لیے آیا ہے کہ ہمیں اپنے جادو کے زور سے ہمارے ملک سے باہر نکال دے۔^(۳) (۵۷)

اچھا، ہم بھی تیرے مقابلے میں اسی جیسا جادو ضرور لائیں

وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْ تَحْتِ السَّجَّاتِ ۝۱

كُلُوا وَارْعُوا الْعَامَلَكُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَلآيَاتِ لَأُولِي النُّعْمِ ۝۲

مِنَهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُحْيِيكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى ۝۳

وَلَقَدْ آتَيْنَاهُ الْبَيِّنَاتِ كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَى ۝۴

قَالَ أَجْعَلْنَا لَكَ آيَاتٍ مِّنْ آيَاتِنَا يَعْصِيكَ يَا مُوسَى ۝۵

فَلَمَّا كَذَّبْنَاكَ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ فَاَجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ

(۱) یعنی ان انواع و اقسام کی پیداوار میں کچھ چیزیں تمہاری خوراک اور لذت و فرحت کا سامان ہیں اور کچھ تمہارے چوپایوں اور جانوروں کے لیے ہیں۔

(۲) نُھیۃ، نُھیۃ کی جمع ہے، بمعنی عقل، أُولُو النُّھی، عقل والے۔ عقل کو نُھیۃ اور عقل مند کو ذُو نُھیۃ، اس لیے کہا جاتا ہے کہ بالآخر انہی کی رائے پر معاملہ انتہا پذیر ہوتا ہے، یا اس لیے کہ یہ نفس کو گناہوں سے روکتے ہیں، یَنْهَوْنَ النَّفْسَ عَنِ الْفَوَاحِشِ (فتح القدیر)

(۳) بعض روایات میں دفنانے کے بعد تین مٹھیاں (یا کبے) مٹی ڈالتے وقت اس آیت کا پڑھنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ لیکن سند آبیہ روایات ضعیف ہیں۔ تاہم آیت کے بغیر تین لپیں ڈالنے والی روایت، جو ابن ماجہ میں ہے، صحیح ہے، اس لیے دفنانے کے بعد دونوں ہاتھوں سے تین تین مرتبہ مٹی ڈالنے کو علما نے مستحب قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب الجمانز صفحہ ۱۵۲ اور اراء الغلیل۔ نمبر ۲۵۱، ج ۳، ص ۲۰۰، (کلاہما للألبانی)

(۴) جب فرعون کو دلائل واضحہ کے ساتھ وہ معجزات بھی دکھلائے گئے، جو عصا اور ید بیضا کی صورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیے گئے تھے، تو فرعون نے اسے جادو کا کرتب سمجھا اور کہنے لگا، اچھا تو ہمیں اس جادو کے زور سے ہماری زمین سے نکالنا چاہتا ہے؟

مَوْعِدًا لِّلْمُخَلَّفِينَ عَنْهُ وَعَنْ أَوْلِيَانِهِ مَكَانًا سُوءًا ۝

گے، پس تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وعدے کا وقت مقرر کر لے، (۱) کہ نہ ہم اس کا خلاف کریں اور نہ تو، صاف میدان میں مقابلہ ہو۔ (۵۸) (۲)

موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ زینت اور جشن کے دن (۳) کا وعدہ ہے اور یہ کہ لوگ دن چڑھے ہی جمع ہو جائیں۔ (۵۹)

پس فرعون لوٹ گیا اور اس نے اپنے ہتھکنڈے جمع کیے پھر آگیا۔ (۶۰) (۴)

موسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے کہا تمہاری شامت آچکی، اللہ تعالیٰ پر جھوٹ اور افترا نہ باندھو کہ وہ تمہیں عذابوں سے ملیا میٹ کر دے، یاد رکھو وہ کبھی کامیاب نہ ہو گا جس نے جھوٹی بات گھڑی۔ (۶۱) (۵)

پس یہ لوگ آپس کے مشوروں میں مختلف رائے ہو گئے اور چھپ کر چپکے چپکے مشورہ کرنے لگے۔ (۶۲) (۶)

کہنے لگے یہ دونوں محض جادو گر ہیں اور ان کا پختہ ارادہ ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمَ الزَّيْنَةِ وَأَنْ يُغَيِّرَ النَّاسَ ضَمِيًّا ۝

فَتَوَلَّى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهُ ثُمَّ أَتَى ۝

قَالَ لَهُمُ مُوسَىٰ رَبِّكُمْ لَا تُغَيِّرُوا وُجْهَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تَكْفُرُونَ

فَيَسْجُدْكُمْ بِعَذَابٍ وَقَدْ خَابَ مِنْ آفَاتِي ۝

فَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ بَرَقًا فَالَّذِينَ كَفَرُوا هُمْ بِآيَاتِهِ لَا يُؤْمِنُونَ

قَالُوا إِنْ هَذَا إِلَّا لِحِينٌ لِّبَنِينَ أَنْ يُخْرِجَكُم مِّنْ

(۱) مَوْعِدٌ مصدر ہے یا اگر ظرف ہے تو زمان اور مکان دونوں مراد ہو سکتے ہیں کہ کوئی جگہ اور دن مقرر کر لے۔

(۲) مَكَانًا سُوءًا۔ صاف ہموار جگہ، جہاں ہونے والے مقابلے کو ہر شخص آسانی سے دیکھ سکے یا ایسی برابر کی جگہ، جہاں فریقین سمولت سے پہنچ سکیں۔

(۳) اس سے مراد نوروز یا کوئی اور سالانہ میلے یا جشن کا دن ہے جسے وہ عید کے طور پر مناتے تھے۔

(۴) یعنی مختلف شہروں سے ماہر جادو گروں کو جمع کر کے اجتماع گاہ میں آگیا۔

(۵) جب فرعون اجتماع گاہ میں جادو گروں کو مقابلے کی ترغیب دے رہا اور ان کو انعامات اور قرب خصوصی سے نوازنے کا اظہار کر رہا تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی مقابلے سے پہلے انہیں وعظ کیا اور ان کے موجودہ رویے پر انہیں عذاب الہی سے ڈرایا۔

(۶) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وعظ سے ان میں باہم کچھ اختلاف ہوا اور بعض چپکے چپکے کہنے لگے کہ یہ واقعی اللہ کا نبی ہی نہ ہو، اس کی گفتگو تو جادو گروں والی نہیں بیغیرانہ لگتی ہے۔ بعض نے اس کے برعکس رائے کا اظہار کیا۔

باہر کریں اور تمہارے بہترین مذہب کو برباد کریں۔^(۱) (۶۳)
 تو تم بھی اپنا کوئی داؤ اٹھانہ رکھو، پھر صف بندی کر کے
 آؤ۔ جو آج غالب آگیا وہی بازی لے گیا۔ (۶۴)
 کہنے لگے کہ اے موسیٰ! یا تو پہلے ڈال یا ہم پہلے ڈالنے
 والے بن جائیں۔ (۶۵)

جواب دیا کہ نہیں تم ہی پہلے ڈالو۔^(۲) اب تو موسیٰ (علیہ
 السلام) کو یہ خیال گزرنے لگا کہ ان کی رسیاں اور لکڑیاں
 ان کے جادو کے زور سے دوڑ بھاگ رہی ہیں۔^(۳) (۶۶)
 پس موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے دل ہی دل میں ڈر
 محسوس کیا۔ (۶۷)

ہم نے فرمایا کچھ خوف نہ کر یقیناً تو ہی غالب اور برتر رہے

أَرْضَكُمْ يَسْخَرُونَ هَذَا وَهَذَا بَطْرَيْنِ كَمَا الْمَثَلُ ⑤
 فَأَجْبِعُوا كَيْدَكُمْ فَاتُوا صَافًا وَقَدْ أَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلَى ⑥

قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِمَّا أَنْ تُلْقِيَ وَإِمَّا أَنْ نَلْقُوَنَّكَ أَوَّلَ مَنْ الْفَى ⑦

قَالَ بَلِ الْقَوْمُ أَفْذَىٰ أَجَابَ اللَّهُ وَعَصِيَّتُهُمْ يُجْتَلَىٰ الْيَوْمَ مِنْ بَعْدِهِمْ
 أَكْفَاهُ اسْتَعْلَى ⑧

فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةَ مُوسَىٰ ⑨

فَلَمَّا لَاقَتْكَ إِنَّكَ أَنْتَ الرَّاحِلُ ⑩

(۱) مَثَلِي، طَرِيقَةُ کی صفت ہے۔ یہ اَمَثَلُ کی تائید ہے، افضل کے معنی میں مطلب یہ ہے کہ اگر یہ دونوں بھائی
 اپنے ”جادو“ کے زور سے غالب آگئے، تو سادات و اشراف اس کی طرف مائل ہو جائیں گے، جس سے ہمارا اقتدار
 خطرے میں اور ان کے اقتدار کا امکان بڑھ جائے گا۔ علاوہ ازیں ہمارا بہترین طریقہ یا مذہب، اسے بھی یہ ختم کر دیں گے۔
 یعنی اپنے مشرکانہ مذہب کو بھی انہوں نے ”بہترین“ قرار دیا۔ جیسا کہ آج بھی ہر باطل مذہب اور فرقے کے پیروکار اسی
 زعم فاسد میں مبتلا ہیں۔ سچ فرمایا اللہ نے ﴿كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ يُفْرِقُونَ﴾ (الروم: ۳۲) ”ہر فرقہ جو اس کے پاس ہے، اس
 پر ریجھ رہا ہے۔“

(۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں پہلے اپنا کرتب دکھانے کے لیے کہا، تاکہ ان پر یہ واضح ہو جائے کہ وہ جادو گروں
 کی اتنی بڑی تعداد سے، جو فرعون جمع کر کے لے آیا ہے، اور اسی طرح ان کے ساحرانہ کمال اور کرتبوں سے خوف زدہ
 نہیں ہیں۔ دوسرے، ان کی ساحرانہ شعبہ بازیاں، جب معجزۃ الہی سے چشمِ زدن میں ہبَاءَ مَسْنُونًا ہو جائیں گی، تو اس کا
 بہت اچھا اثر پڑے گا اور جادو گر یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ یہ جادو نہیں ہے، واقعی اسے اللہ کی تائید حاصل ہے
 کہ آن واحد میں اس کی ایک لامٹی ہمارے سارے کرتبوں کو نگل گئی؟

(۳) قرآن کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسیاں اور لاشعیاں حقیقتاً سانپ نہیں بنی تھیں، بلکہ جادو کے زور سے
 ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے مسمریزم کے ذریعے سے نظر بندی کر دی جاتی ہے۔ تاہم اس کا اثر یہ ضرور ہوتا ہے کہ عارضی
 اور وقتی طور پر دیکھنے والوں پر ایک دہشت طاری ہو جاتی ہے، گو شے کی حقیقت تبدیل نہ ہو۔ دوسری بات یہ معلوم
 ہوئی کہ جادو کتنا بھی اونچے درجے کا ہو، وہ شے کی حقیقت تبدیل نہیں کر سکتا۔

گ۔^(۱) (۶۸)

اور تیرے دائیں ہاتھ میں جو ہے اسے ڈال دے کہ ان کی تمام کاریگری کو وہ نکل جائے، انہوں نے جو کچھ بنایا ہے یہ صرف جادو گروں کے کرتب ہیں اور جادو گر کہیں سے بھی آئے کامیاب نہیں ہوتا۔ (۶۹)

اب تو تمام جادو گر سجدے میں گر پڑے اور پکار اٹھے کہ ہم تو ہارون اور موسیٰ (علیہما السلام) کے رب پر ایمان لائے۔ (۷۰)

فرعون کہنے لگا کہ کیا میری اجازت سے پہلے ہی تم اس پر ایمان لے آئے؟ یقیناً یہی تمہارا وہ بڑا بزرگ ہے جس نے

وَالَّذِي مَاتِي بِمِيزَانِكَ تَلَقَّفْنَا مَا صَنَعُوا كَيْدًا سِجْرًا
وَلَا نُصَلِّهِ السَّائِرَ حَيْثُ كَانُوا ۝

فَالَّذِي السَّعْرَةَ سَجَدًا قَالُوا الْمُنْكَرُ رَبُّهُرُودُونَ وَمُوسَىٰ ۝

قَالَ ائْتِمُّوْهُ قَبْلَ اَنْ اَذِنَ لَكُمْ اِنَّهُ لَيَكِيْرٌ الَّذِي عَلَّمَكُمُ

(۱) اس دہشت ناک منظر کو دیکھ کر اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خوف محسوس کیا، تو یہ ایک طبعی چیز تھی، جو کمال نبوت کے متافی ہے نہ عصمت کے۔ کیوں کہ نبی بھی بشری ہو تا ہے اور بشریت کے طبعی تقاضوں سے نہ وہ بالا ہوتا ہے نہ وہ سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس طرح انبیاء کو دیگر انسانی عوارض لاحق ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں، اسی طرح وہ جادو سے بھی متاثر ہو سکتے ہیں، جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہودیوں نے جادو کیا تھا، جس کے کچھ اثرات آپ محسوس کرتے تھے، اس سے بھی منصب نبوت پر کوئی حرف نہیں آتا، کیوں کہ اس سے کار نبوت متاثر نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ نبی کی حفاظت فرماتا ہے اور جادو سے وحی یا فریضہ رسالت کی ادائیگی کو متاثر نہیں ہونے دیتا۔ اور ممکن ہے کہ یہ خوف اس لیے ہو کہ میری لامٹھی ڈالنے سے قبل ہی کہیں لوگ ان کرتبوں اور شعبہ بازیوں سے متاثر نہ ہو جائیں، لیکن اغلب ہے کہ یہ خوف اس لیے ہوا کہ ان جادو گروں نے بھی جو کرتب دکھایا، وہ لامٹھیوں کے ذریعے سے ہی دکھایا، جب کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھی لامٹھی ہی تھی جسے انھیں زمین پر پھینکنا تھا، موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خیال آیا کہ دیکھنے والے اس سے شہبے اور مغالطے میں نہ پڑ جائیں اور وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ دونوں نے ایک ہی قسم کا جادو پیش کیا، اس لیے یہ فیصلہ کیسے ہو کہ کون سا جادو ہے کون سا معجزہ؟ کون غالب ہے کون مغلوب؟ گویا جادو اور معجزے کا جو فرق واضح کرنا مقصود ہے، وہ مذکورہ مغالطے کی وجہ سے حاصل نہ ہو سکے گا، اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کو بسا اوقات یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ ان کے ہاتھ پر کس نوعیت کا معجزہ ظہور پذیر ہونے والا ہے۔ خود معجزہ کو ظاہر کرنے پر قدرت تو دور کی بات ہے، یہ تو محض اللہ کا کام ہے کہ وہ انبیاء کے ہاتھ پر معجزات ظاہر فرمائے، بہر حال موسیٰ علیہ السلام کے اس اندیشے اور خوف کو دور کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا، موسیٰ (علیہ السلام) کسی بھی لحاظ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، تو ہی غالب رہے گا، اس جملے سے طبعی خوف اور دیگر اندیشوں، سب کا ہی ازالہ فرمادیا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، جیسا کہ اگلی آیات میں ہے۔

تم سب کو جادو سکھایا ہے، (من لو) میں تمہارے ہاتھ پاؤں لٹے سیدھے (۱) کھنوا کر تم سب کو کھجور کے تنوں میں سولی پر لٹکوا دوں گا، اور تمہیں پوری طرح معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں سے کس کی مار زیادہ سخت اور دیرپا ہے۔ (۷۱)

انہوں نے جواب دیا کہ ناممکن ہے کہ ہم تجھے ترجیح دیں ان دلیلوں پر جو ہمارے سامنے آچکیں اور اس اللہ پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے (۲) اب تو جو کچھ کرنے والا ہے کر گزر، تو جو کچھ بھی حکم چلا سکتا ہے وہ اسی دنیوی (۳) زندگی میں ہی ہے۔ (۷۲)

ہم (اس امید سے) اپنے پروردگار پر ایمان لائے کہ وہ ہماری خطائیں معاف فرمادے اور (خاص کر) جادوگری (گاگناہ) جس پر تم نے ہمیں مجبور کیا ہے، (۴) اللہ ہی بہتر

الْبَيْحُ فَلَا فَيْضَ لَكُمْ وَأَرْجُلُكُمْ مِنْ خِلَافٍ وَلَا تَصِلُكُمْ
فِي جُذُوعِ النَّخْلِ وَتَعْلَمُونَ إِنَّمَا شَدُّ عَدَاؤِ أَبِي قُحَيْفٍ ①

قَالُوا لَنْ نُؤْمِرَكَ عَلَىٰ مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيْحِ وَالَّذِي فَطَرَنَا
فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ إِنَّمَا تَقْفِي هُدًى مِنَ الْعَذَابِ الَّذِي آتَىٰ ②

إِنَّمَا كُنَّا بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْبَيْحِ كُنَّا خَطِيئَتِنَا وَمَا آذَوْهُنَّ عَلَيْنَهُ
مِنَ الْبَيْحِ وَاللَّهُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ③

(۱) مِنْ خِلَافٍ (لٹے سیدھے) کا مطلب ہے سیدھا ہاتھ تو بایاں پاؤں یا بایاں ہاتھ تو سیدھا پاؤں۔

(۲) یہ ترجمہ اس صورت میں ہے جب وَالَّذِي فَطَرَنَا کا عطف مَا جَاءَنَا پر ہو۔ اور یہ بھی صحیح ہے۔ تاہم بعض مفسرین نے اسے قسم قرار دیا ہے۔ یعنی قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا، ہم تجھے ان دلیلوں پر ترجیح نہیں دیں گے جو ہمارے سامنے آچکیں۔

(۳) یعنی تیرے بس میں جو کچھ ہے، وہ کر لے، ہمیں معلوم ہے کہ تیرا بس صرف اس دنیا میں ہی چل سکتا ہے۔ جب کہ ہم جس پروردگار پر ایمان لائے ہیں اس کی حکمرانی تو دنیا و آخرت دونوں جگہوں پر ہے۔ مرنے کے بعد ہم تیری حکمرانی اور تیرے ظلم و ستم سے تونج جائیں گے، کیوں کہ جسموں سے روح کے نکل جانے کے بعد تیرا اختیار ختم ہو جائے گا۔ لیکن اگر ہم اپنے رب کے نافرمان رہے، تو ہم مرنے کے بعد بھی رب کے اختیار سے باہر نہیں نکل سکتے، وہ ہمیں سخت عذاب دینے پر قادر ہے۔ رب پر ایمان لانے کے بعد ایک مومن کی زندگی میں جو عظیم انقلاب آتا اور دنیا کی بے باقی اور آخرت کی دائمی زندگی پر جس طرح یقین ہونا چاہیے اور پھر اس عقیدہ و ایمان پر جو تکلیفیں آئیں، انہیں جس حوصلہ و صبر اور عزم و استقامت سے برداشت کرنا چاہیے، جادو گروں نے اس کا ایک بہترین نمونہ پیش کیا کہ ایمان لانے سے قبل کس طرح وہ فرعون سے انعامات اور دنیاوی جاہ و منصب کے طالب تھے، لیکن ایمان لانے کے بعد کوئی ترغیب و تحریض انہیں متزلزل کر سکی، نہ تشدید و تعذیب کی دھمکیاں انہیں ایمان سے منحرف کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

(۴) دوسرا ترجمہ اس کا یہ ہے کہ ”ہماری وہ غلطیاں بھی معاف فرمادے جو موسیٰ (علیہ السلام) کے مقابلے میں تیرے

اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔^(۱) (۷۳)

بات یہی ہے کہ جو بھی گنہگار بن کر اللہ تعالیٰ کے ہاں حاضر ہو گا اس کے لیے دوزخ ہے؛ جہاں نہ موت ہوگی اور نہ زندگی۔^(۲) (۷۳)

اور جو بھی اس کے پاس ایمان کی حالت میں حاضر ہو گا اور اس نے اعمال بھی نیک کیے ہوں گے اس کے لیے بلند و بالا درجے ہیں۔ (۷۵)

ہیشگی والی جنتیں جن کے نیچے نہریں لہریں لے رہی ہیں جہاں وہ ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے۔ یہی انعام ہے ہر اس شخص کا جو پاک ہوا۔^(۳) (۷۶)

ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف وحی نازل فرمائی کہ تو راتوں رات میرے بندوں کو لے چل،^(۴) اور ان کے لیے دریا میں خشک راستہ بنا لے،^(۵) پھر نہ تجھے کسی کے

إِنَّهُ مَنْ يَأْتِ رَبَّهُ مُجِئًا فَإِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ۝

وَمَنْ يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَىٰ ۝

جَدَّتْ عَدْنٌ يَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَكَّىٰ ۝

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَن أَسْرِ بِعَبَادِي فَاصْرِفْ لَهُمْ طَرِيقًا إِلَى الْبَحْرِ يَبَسًا لَا تَخَفْ دَرَكَاؤُا وَلَا تَخْشَىٰ ۝

مجبور کرنے پر ہم نے عملِ جادو کی صورت میں کہیں۔ اس صورت میں ما اٰخِزْهِنَّا كَاعْطَفَ خَطَايَانَا پر ہوگا۔

(۱) یہ فرعون کے الفاظ، ﴿ وَكُنْتُمْ لَنَا آيَاتًا لَّنُكْفِيَ الْوَابِغِي ۙ ﴾ کا جواب ہے کہ اے فرعون! تو جو سخت ترین عذاب کی ہمیں دھمکی دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمیں اجر و ثواب ملے گا، وہ اس سے کہیں زیادہ بہتر اور پائیدار ہے۔

(۲) یعنی عذاب سے نکل آکر موت کی آرزو کریں گے، تو موت نہیں آئے گی اور رات دن عذاب میں مبتلا رہنا، کھانے پینے کو زقوم جیسا تلخ درخت اور جنمیوں کے جسموں سے نچڑا ہوا خون اور پیپ ملنا، یہ کوئی زندگی ہوگی؟ اَللّٰهُمَّ اَجِرْنَا مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ۔

(۳) جنمیوں کے مقابلے میں اہل ایمان کو جو جنت کی پر آسائش زندگی ملے گی، اس کا ذکر فرمایا اور واضح کر دیا کہ اس کے مستحق وہ لوگ ہوں گے جو ایمان لانے کے بعد اس کے تقاضے بھی پورے کریں گے یعنی اعمالِ صالحہ اختیار اور اپنے نفس کو گناہوں کی آلودگی سے پاک کریں گے۔ اس لیے کہ ایمان زبان سے صرف چند کلمات ادا کر دینے کا نام نہیں ہے بلکہ عقیدہ و عمل کے مجموعے کا نام ہے۔

(۴) جب فرعون ایمان بھی نہیں لایا اور بنی اسرائیل کو بھی آزاد کرنے پر آمادہ نہیں ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا۔

(۵) اس کی تفصیل سورۃ الشعراء میں آئے گی کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے سمندر میں لاشعی ماری، جس سے

آپکڑنے کا خطرہ ہو گا نہ ڈر۔^(۱) (۷۷)

فرعون نے اپنے لشکروں سمیت ان کا تعاقب کیا پھر تو دریا

ان سب پر چھا گیا جیسا کچھ چھاجانے والا تھا۔^(۲) (۷۸)

فرعون نے اپنی قوم کو گمراہی میں ڈال دیا اور سیدھا

راستہ نہ دکھایا۔^(۳) (۷۹)

اے بنی اسرائیل! دیکھو ہم نے تمہیں تمہارے دشمن

سے نجات دی اور تم سے کوہ طور کی دائیں طرف کا

وعدہ^(۴) کیا اور تم پر من و سلوئی اتارا۔^(۵) (۸۰)

تم ہماری دی ہوئی پاکیزہ روزی کھاؤ، اور اس میں حد سے

آگے نہ بڑھو،^(۶) ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہو گا، اور

فَاتَّبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُمْ مِنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿٧٨﴾

وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَهْدَىٰ ﴿٧٩﴾

يٰۤاَيُّهَا اِسْرَائِيْلُ قَدْ اٰجَمَيْنٰكُمْ مِنْ عَدُوِّكُمْ وَعَدْنَاكُمْ

جَانِبَ الطُّورِ الْاَيْمَنِ وَكُنَّا عَلٰيكُمْ الْمَنَّٰنَ وَالسَّلٰوِي ۝ ﴿٨٠﴾

كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَطْعَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ

عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحِلِّلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ

سمندر میں گزرنے کے لیے خشک راستہ بن گیا۔

(۱) خطرہ فرعون اور اس کے لشکر کا اور ڈر پانی میں ڈوبنے کا۔

(۲) یعنی اس خشک راستے پر جب فرعون اور اس کا لشکر چلنے لگا، تو اللہ نے سمندر کو حکم دیا کہ حسب سابق رواں دواں

ہو جا، چنانچہ وہ خشک راستہ چشمِ زدن میں پانی کی موجوں میں تبدیل ہو گیا اور فرعون سمیت سارا لشکر غرق ہو گیا،

غَشِيَهُمْ کے معنی ہیں علاؤہم وَأَصَابَهُمْ سمندر کا پانی ان پر غالب آگیا۔ مَا غَشِيَهُمْ، یہ تکرار تعظیم و تمویل یعنی

ہولناکی کے بیان کے لیے ہے۔ یا اس کے معنی ہیں ”جو کہ مشہور و معروف ہے۔“

(۳) اس لیے کہ سمندر میں غرق ہونا ان کا مقدر تھا۔

(۴) وَوَاعَدْنَاكُمْ میں ضمیر جمع مخاطب کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تمہیں یعنی تمہارے

نمائندے بھی ساتھ لے کر آئیں، تاکہ تمہارے سامنے ہی ہم موسیٰ علیہ السلام سے ہمکلام ہوں، یا ضمیر جمع اس لیے لائی

گئی کہ کوہ طور پر موسیٰ علیہ السلام کو بلانا، بنی اسرائیل ہی کی خاطر اور انہی کی ہدایت و رہنمائی کے لیے تھا۔

(۵) مَنْ وَّ سَلَوٰی کے نزول کا واقعہ، سورہ بقرہ کے آغاز میں گزر چکا ہے۔ مَنْ کوئی میٹھی چیز تھی جو آسمان سے نازل ہوتی

تھی اور سَلَوٰی سے مراد ٹیبر پرندے ہیں جو کثرت سے ان کے پاس آتے اور وہ حسب ضرورت انہیں پکڑ کر پکاتے اور

کھالیتے۔ (ابن کثیر)

(۶) طُغْيَانًا کے معنی ہیں تجاوز کرنا۔ یعنی حلال اور جائز چیزوں کو چھوڑ کر حرام اور ناجائز چیزوں کی طرف تجاوزت کرو، یا

اللہ کی نعمتوں کا انکار کر کے یا کفرانِ نعمت کا ارتکاب کر کے یا منعم کی نافرمانی کر کے حد سے تجاوز نہ کرو، ان تمام مفہومات

پر طُغْيَان کا لفظ صادق آتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ طُغْيَان کا مفہوم ہے، ضرورت و حاجت سے زیادہ پرندے پکڑنا۔

یعنی حاجت کے مطابق پرندے پکڑو اور اس سے تجاوزت کرو۔

جس پر میرا غضب نازل ہو جائے وہ یقیناً تباہ ہوا۔^(۸۱) ہاں بیشک میں انہیں بخش دینے والا ہوں جو توبہ کریں ایمان لائیں نیک عمل کریں اور راہ راست پر بھی رہیں۔^(۸۲)

اے موسیٰ! تجھے اپنی قوم سے (غافل کر کے) کون سی چیز جلدی لے آئی؟^(۸۳)

کہا کہ وہ لوگ بھی میرے پیچھے ہی پیچھے ہیں، اور میں نے اے رب! تیری طرف جلدی اس لیے کی کہ تو خوش ہو جائے۔^(۸۴)

فرمایا! ہم نے تیری قوم کو تیرے پیچھے آزمائش میں ڈال دیا اور انہیں سامری نے بہکا دیا ہے۔^(۸۵) پس موسیٰ (علیہ السلام) سخت غضبناک ہو کر رنج کے ساتھ واپس لوٹے، اور کہنے لگے کہ اے میری قوم! لو! کیا تم سے

فَقَدْ هَمُوتُ ۝

وَإِنِّي لَخَشِيٌّ لِّمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا

كُنْتُمْ أَهْتَابِي ۝

وَمَا أَعْجَلَكَ عَنِ قَوْمِكَ يَمُوتُ ۝

قَالَ هُمْ أَوْلَاءُ عَلَىٰ أَشْرِي وَعَجَلْتُ إِلَيْكَ

رَبِّ لِتَرْضَىٰ ۝

قَالَ فَإِنَّا لَنَدْفِنُكَ مِثْلَ نَدْفِ قَوْمِكَ

وَأَضَلُّهُمْ السَّامِرِيُّ ۝

فَرَجَعَهُ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا قَالَ يَقُولُونَ

(۱) دوسرے معنی یہ بیان کیے گئے ہیں کہ وہ ہادیہ یعنی جنم میں گرا۔ ہادیہ جنم کا نچلا حصہ ہے یعنی جنم کی گہرائی والے حصے کا مستحق ہو گیا۔

(۲) یعنی مغفرت الہی کا مستحق بننے کے لیے چار چیزیں ضروری ہیں۔ کفر و شرک اور معاصی سے توبہ، ایمان، عمل صالح اور راہ راست پر چلنے رہنا یعنی استقامت حتیٰ کہ ایمان ہی پر اسے موت آئے، ورنہ ظاہر بات ہے کہ توبہ و ایمان کے بعد اگر اس نے پھر شرک و کفر کا راستہ اختیار کر لیا، حتیٰ کہ موت بھی اسے کفر و شرک پر ہی آئے تو مغفرت الہی کے بجائے، عذاب کا مستحق ہو گا۔

(۳) سمندر پار کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے سربر آوردہ لوگوں کو ساتھ لے کر کوہ طور کی طرف چلے، لیکن رب کے شوق ملاقات میں تیز رفتاری سے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ کر اکیلے ہی طور پر پہنچ گئے، سوال کرنے پر جواب دیا، مجھے تو تیری رضائی طلب اور اس کی جلدی تھی۔ وہ لوگ میرے پیچھے ہی آ رہے ہیں۔ بعض کہتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے پیچھے آ رہے ہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ میرے پیچھے کوہ طور کے قریب ہی ہیں اور وہاں میری واپسی کا منتظر ہیں۔

(۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد سامری نامی شخص نے بنی اسرائیل کو پھڑپھڑا پونے پر لگا دیا، جس کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے طور پر موسیٰ علیہ السلام کو دی کہ سامری نے تو تیری قوم کو گمراہ کر دیا ہے۔ فتنے میں ڈالنے کی نسبت اللہ نے اپنی طرف بہ حیثیت خالق کے کی ہے، ورنہ اس گمراہی کا سبب تو سامری ہی تھا جیسا کہ أَضَلُّهُمْ السَّامِرِيُّ سے واضح ہے۔

تمہارے پروردگار نے نیک وعدہ نہیں کیا^(۱) تھا؟ کیا اس کی مدت تمہیں لمبی معلوم ہوئی؟^(۲) بلکہ تمہارا ارادہ ہی یہ ہے کہ تم پر تمہارے پروردگار کا غضب نازل ہو؟ کہ تم نے میرے وعدے کا خلاف کیا۔^(۳) (۸۶)

انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے اختیار سے آپ کے ساتھ وعدے کا خلاف نہیں کیا۔^(۴) بلکہ ہم پر زیورات قوم کے جو بوجھ لاد دیے گئے تھے انہیں ہم نے ڈال دیا، اور اسی طرح سامری نے بھی ڈال دیے۔ (۸۷)

پھر اس نے لوگوں کے لیے ایک پچھڑا نکال کھڑا کیا یعنی پچھڑے کابت، جس کی گائے کی سی آواز بھی تھی پھر کہنے لگے کہ یہی تمہارا بھی معبود ہے^(۵) اور موسیٰ کا بھی، لیکن موسیٰ بھول گیا ہے۔ (۸۸)

کیا یہ گمراہ لوگ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ وہ تو ان کی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا اور نہ ان کے کسی برے بھلے

الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَدَا حَسَنًا أَقْتَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ
أَمْرًا دُشْمًا أَنْ يَعِيلَ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَبِّكُمْ
فَأَخْلَفْتُمُو عَهْدِي ۝

قَالُوا إِنَّا أَخْلَفْنَا مَعِدَكَ بِمَا كُنَّا مَحْمِلًا وَأَوْزَارًا مِّنْ زِينَةِ
الْقَوْمِ فَقَدْ فُتِنَّا لَكَ الْفَى السَّامِرِيُّ ۝

فَأَخْرَجَهُمْ مِجْلًا جَسَدًا آلِهَةً خُورًا فَقَالُوا هَذَا إِلَهُهُمْ
وَأَلِلَهُمْ مُوسَىٰ هُنْتَنِي ۝

أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَّ يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمِينُكَ
لَهُمْ صَرًا وَلَا نَفْعًا ۝

(۱) اس سے مراد جنت کا یافتح و ظفر کا وعدہ ہے اگر وہ دین پر قائم رہے یا تورات عطا کرنے کا وعدہ ہے، جس کے لیے طور پر انہیں بلایا گیا تھا۔

(۲) کیا اس عہد کو مدت دراز گزر گئی تھی کہ تم بھول گئے، اور پچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔

(۳) قوم نے موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی طور سے واپسی تک وہ اللہ کی اطاعت و عبادت پر قائم رہیں گے، یا یہ وعدہ تھا کہ ہم بھی طور پر آپ کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ لیکن راستے میں ہی رک کر انہوں نے گوسالہ پرستی شروع کر دی۔

(۴) یعنی ہم نے اپنے اختیار سے یہ کام نہیں کیا بلکہ یہ غلطی ہم سے اضطرابی طور پر ہو گئی، آگے اس کی وجہ بیان کی۔

(۵) زینت سے، زیورات اور القوم سے قوم فرعون مراد ہے۔ کہتے ہیں یہ زیورات انہوں نے فرعونوں سے عاریتاً لیے تھے، اسی لیے انہیں اوزار و وزر (بوجھ) کی جمع کہا گیا ہے، کیوں کہ یہ ان کے لیے جائز نہیں تھے، چنانچہ انہیں جمع کر کے ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا، سامری نے بھی (جو مسلمانوں کے بعض گمراہ فرقوں کی طرح) گمراہ تھا، کچھ ڈالا، (اور وہ مٹی تھی جیسا کہ آگے صراحت ہے) پھر اس نے تمام زیورات کو تپا کر ایک طرح کا پچھڑا بنا دیا کہ جس میں ہوا کے اندر باہر آنے جانے سے ایک قسم کی آواز پیدا ہوتی تھی۔ اس آواز سے اس نے بنی اسرائیل کو گمراہ کیا کہ موسیٰ علیہ السلام تو گمراہ ہو گئے ہیں کہ وہ اللہ سے ملنے کے لیے طور پر گئے ہیں، جب کہ تمہارا اور موسیٰ علیہ السلام کا معبود تو یہ ہے۔

کا اختیار رکھتا ہے۔^(۱) (۸۹)

اور ہارون (علیہ السلام) نے اس سے پہلے ہی ان سے کہہ دیا تھا اے میری قوم والو! اس پھڑے سے تو صرف تمہاری آزمائش کی گئی ہے، تمہارا حقیقی پروردگار تو اللہ رحمن ہی ہے، پس تم سب میری تابعداری کرو۔ اور میری بات ماننے چلے جاؤ۔^(۲) (۹۰)

انہوں نے جواب دیا کہ موسیٰ (علیہ السلام) کی واپسی تک تو ہم اسی کے مجاور بنے بیٹھے رہیں گے۔^(۳) (۹۱)

موسیٰ (علیہ السلام) کہنے لگے اے ہارون! انہیں گمراہ ہوتا ہوا دیکھتے ہوئے تجھے کس چیز نے روکا تھا۔ (۹۲)

کہ تو میرے پیچھے نہ آیا۔ کیا تو بھی میرے فرمان کا نافرمان بن بیٹھا۔^(۴) (۹۳)

ہارون (علیہ السلام) نے کہا اے میرے ماں جائے بھائی! میری داڑھی نہ پکڑ، اور سر کے بال نہ کھینچ، مجھے تو صرف یہ خیال دامن گیر ہوا کہ کہیں آپ یہ (نہ) فرمائیں^(۵) کہ تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ مِنْ قَبْلُ يَقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَاِنَّ رَبَّكُمْ الرَّحْمٰنُ فَاَنْتَبِعُوْنِيْ وَاَطِيعُوْا اَمْرِيْ ۝۱۰

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوسٰى ۝۱۱

قَالَ يٰهٰرُوْنَ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْا ۝۱۲

اَلَا تَتَّبِعُنِ اَفْصَيْتَ اَمْرِيْ ۝۱۳

قَالَ يٰمُوسٰى مَا تَاخُذُ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَأْسِيْ اِنِّىْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فِرْقَةٌ بَيْنَ بَنِيْ اِسْرٰٓءِيْلَ وَكَلِمَةٌ تَرْفَعُنِيْ ۝۱۴

(۱) اللہ تعالیٰ نے ان کی جہالت و نادانی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ان عقل کے اندھوں کو اتنا بھی نہیں پتہ چلا کہ یہ پھڑا کوئی جواب دے سکتا ہے، نہ نفع نقصان پہنچانے پر قادر ہے۔ جب کہ معبود تو وہی ہو سکتا ہے جو ہر ایک کی فریاد سننے پر، نفع و نقصان پہنچانے پر اور حاجت برآری پر قادر ہو۔

(۲) حضرت ہارون علیہ السلام نے یہ اس وقت کہا جب یہ قوم سامری کے پیچھے لگ کر پھڑے کی عبادت میں لگ گئی۔

(۳) اسرائیلیوں کو یہ گوسالہ اتنا اچھا لگا کہ ہارون علیہ السلام کی بات کی بھی پروا نہیں کی اور اس کی تعظیم و عبادت چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

(۴) یعنی اگر انہوں نے تیری بات ماننے سے انکار کر دیا تھا، تو تجھ کو فوراً میرے پیچھے کوہ طور پر آکر مجھے بتلانا چاہیے تھا۔ تو نے بھی میرے حکم کی پروا نہیں کی۔ یعنی جانشینی کا صحیح حق ادا نہیں کیا۔

(۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو شرک کی گمراہی میں دیکھ کر سخت غضب ناک تھے اور سمجھتے تھے کہ شاید اس میں ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کی، جن کو وہ اپنا خلیفہ بنا کر گئے تھے، مداخلت کا بھی دخل ہو، اس لیے سخت غصے میں ہارون

میری بات کا انتظار نہ کیا۔^(۱) (۹۳)

موسیٰ (علیہ السلام) نے پوچھا سامری تیرا کیا معاملہ ہے۔ (۹۵)

اس نے جواب دیا کہ مجھے وہ چیز دکھائی دی جو انہیں دکھائی نہیں دی، تو میں نے فرستادہ الہی کے نقش قدم سے ایک مٹھی بھر لی اسے اس میں ڈال دیا^(۲) اسی طرح میرے دل نے یہ بات میرے لیے بھلی بنا دی۔ (۹۶)

کما اچھا جا دنیا کی زندگی میں تیری سزا یہی ہے کہ تو کتنا رہے کہ مجھے نہ چھوٹا،^(۳) اور ایک اور بھی وعدہ تیرے

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ ۝

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً
مِنْ أَكْرَمِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي ۝

قَالَ فَادْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ ۖ

علیہ السلام کی داڑھی اور سر پکڑ کر انہیں جھجھوڑنا اور پوچھنا شروع کیا، جس پر حضرت ہارون علیہ السلام نے انہیں اتنا سخت رویہ اپنانے سے روکا۔

(۱) سورۃ اعراف میں حضرت ہارون علیہ السلام کا جواب یہ نقل ہوا ہے کہ ”قوم نے مجھے کمزور خیال کیا اور میرے قتل کے درپے ہو گئی“ (آیت-۱۳۲) جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنی ذمہ داری پوری طرح نبھائی اور انہیں سمجھانے اور گوسالہ پرستی سے روکنے میں مدد دینے اور کوتاہی نہیں کی۔ لیکن معاملے کو اس حد تک نہیں جانے دیا کہ خانہ جنگی شروع ہو جائے کیونکہ ہارون علیہ السلام کے قتل کا مطلب پھر ان کے حامیوں اور مخالفوں میں آپس میں خونی تصادم ہوتا اور بنی اسرائیل واضح طور پر دو گروہوں میں بٹ جاتے، جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام چوں کہ خود وہاں موجود نہ تھے، اس لیے اس صورت حال کی نزاکت سے بے خبر تھے، اسی بنا پر حضرت ہارون علیہ السلام کو انہوں نے سخت ست کہا۔ لیکن پھر وضاحت پر وہ اصل مجرم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس لیے یہ استدلال صحیح نہیں (جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں) کہ مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کی خاطر شرمیہ امور اور باطل چیزوں کو بھی برداشت کر لینا چاہیے۔ کیوں کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے نہ ایسا کیا یہی ہے، نہ ان کے قول کا یہ مطلب ہی ہے۔

(۲) جمہور مفسرین نے الرَّسُولِ سے مراد جبرائیل علیہ السلام لیے ہیں اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام کے گھوڑے کو گزرتے ہوئے سامری نے دیکھا اور اس کے قدموں کے نیچے کی مٹی اس نے سنبھال کر رکھ لی، جس میں کچھ خرق عادت اثرات تھے۔ اس مٹی کی مٹھی اس نے پگھلے ہوئے زیورات یا پھڑے میں ڈالی تو اس میں سے ایک قسم کی آواز نکلنی شروع ہو گئی جو ان کے فتنے کا باعث بن گئی۔

(۳) یعنی عمر بھر تو یہی کتا رہے گا کہ مجھ سے دور رہو، مجھے نہ چھوٹا، اس لیے کہ اسے چھوتے ہی چھوٹنے والا بھی اور یہ سامری بھی دونوں بخار میں مبتلا ہو جاتے۔ اس لیے جب یہ کسی انسان کو دیکھتا تو فوراً چیخ اٹھتا کہ لَا مِسَاسَ کما جاتا ہے کہ

ساتھ ہے جو تجھ سے ہرگز نہ ملے گا،^(۱) اور اب تو اپنے اس معبود کو بھی دیکھ لینا جس کا اعتراف کیے ہوئے تھا کہ ہم اسے جلا کر دریا میں ریزہ ریزہ اڑا دیں گے۔^(۲) (۹۷)

اصل بات یہی ہے کہ تم سب کا معبود حق صرف اللہ ہی ہے اس کے سوا کوئی پرستش کے قابل نہیں۔ اس کا علم تمام چیزوں پر حاوی ہے۔ (۹۸)

اسی طرح ہم تیرے^(۳) سامنے پہلے کی گزری ہوئی وارداتیں بیان فرما رہے ہیں اور یقیناً ہم تجھے اپنے پاس سے نصیحت عطا فرما چکے ہیں۔^(۴) (۹۹)

اس سے جو منہ پھیر لے گا^(۵) وہ یقیناً قیامت کے دن اپنا بھاری بوجھ لادے ہوئے ہو گا۔^(۶) (۱۰۰)

وَأَنَّ لَكَ مَوْعِدًا أَنْ تَخْلُقَنَّهُ وَأَنْظُرَ إِلَى الْهَيْكَلِ الَّذِي كَلَّمْتَ عَلَيْهِ عَاكِفَ الْمَعْرِفَةِ ثُمَّ لَنْ نَسْفَعَهُ فِي الرَّيِّ نَسْفَعًا ۝

إِنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝

كَذَلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ مَا قَدْ سَبَقَ وَقَدْ آتَيْنَاكَ مِنْ لَدُنَّا ذِكْرًا ۝

مَنْ أَعْرَضَ عَنْهُ فَإِنَّهُ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وِزْرًا ۝

پھر یہ انسانوں کی ہستی سے نکل کر جنگل میں چلا گیا، جہاں جانوروں کے ساتھ اس کی زندگی گزری اور یوں عبرت کا نمونہ بنا رہا۔ گویا لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے جو شخص جتنا زیادہ حیلہ و فن اور سکرو فریب اختیار کرے گا، دنیا و آخرت میں اس کی سزا بھی اسی حساب سے شدید تر اور نہایت عبرت ناک ہوگی۔

(۱) یعنی آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے جو ہر صورت بگھلتا پڑے گا۔

(۲) اس سے معلوم ہوا کہ شرک کے آثار ختم کرنا بلکہ ان کا نام و نشان تک مٹا ڈالنا، چاہے ان کی نسبت کتنی ہی مقدس ہستیوں کی طرف ہو، تو یقین نہیں، جیسا کہ اہل بدعت، قہر پرست اور تعزیر پرست باور کراتے ہیں، بلکہ یہ توحید کا فضا اور دینی غیرت کا تقاضا ہے۔ جیسے اس واقعے میں اس اَنْزَرَ الرَّسُولِ کو نہیں دیکھا گیا، جس سے ظاہری طور پر روحانی برکات کا مشاہدہ بھی کیا گیا، اس کے باوجود اس کی پروا نہیں کی گئی، اس لیے کہ وہ شرک کا ذریعہ بن گیا تھا۔

(۳) یعنی جس طرح ہم نے فرعون و موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کیا ہے، اسی طرح انبیائے مابقی کے حالات ہم آپ پر بیان کر رہے ہیں تاکہ آپ ان سے باخبر ہوں، اور ان میں جو عبرت کے پہلو ہوں، انہیں لوگوں کے سامنے نمایاں کریں تاکہ لوگ اس کی روشنی میں صحیح رویہ اختیار کریں۔

(۴) نصیحت (ذکر) سے مراد قرآن عظیم ہے۔ جس سے بندہ اپنے رب کو یاد کرتا، ہدایت اختیار کرتا اور نجات و سعادت کا راستہ اپناتا ہے۔

(۵) یعنی اس پر ایمان نہیں لائے گا اور اس میں جو کچھ درج ہے، اس پر عمل نہیں کرے گا۔

(۶) یعنی گناہ عظیم اس لیے کہ اس کا نامہ اعمال، نیکیوں سے خالی اور برائیوں سے پر ہو گا۔

خَلِدِينَ فِيهِ وَسَاءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِمْلًا ۝

جس میں ہمیشہ ہی رہے گا،^(۱) اور ان کے لیے قیامت کے

دن (بڑا) برا بوجھ ہے۔ (۱۰۱)

جس دن صور^(۲) پھونکا جائے گا اور گناہ گاروں کو ہم اس

دن (دہشت کی وجہ سے) نیلی پیلی آنکھوں کے ساتھ گھیر

لائیں گے۔ (۱۰۲)

وہ آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے^(۳) ہوں گے کہ ہم تو دنیا

میں صرف دس دن ہی رہے۔ (۱۰۳)

جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس کی حقیقت سے ہم باخبر ہیں

ان میں سب سے زیادہ اچھی راہ^(۴) والا کہہ رہا ہو گا کہ

تم تو صرف ایک ہی دن رہے۔ (۱۰۴)

وہ آپ سے پہاڑوں کی نسبت سوال کرتے ہیں، تو آپ

کہہ دیں کہ انہیں میرا رب ریزہ ریزہ کر کے اڑا دے

گا۔ (۱۰۵)

اور زمین کو بالکل ہموار صاف میدان کر کے

چھوڑے گا۔ (۱۰۶)

جس میں تو نہ کہیں موڑ توڑ دیکھے گا نہ اونچ نیچ (۱۰۷)

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ نَحْمُرُ الْمُجْرِمِينَ يَوْمَ هُمْ ذُرْقًا ۝

يَتَعَاذُونَ بَيْنَهُمْ إِنْ يَسْتَمِعُوا إِلَّا عِثْرًا ۝

عَنْ أَعْلَمِهِمْ يَقُولُونَ إِنْ يُقُولُ أَمْثَلُهُمْ طَرِيقَةً إِنْ

يَسْتَمِعُوا إِلَّا ابْوَءًا ۝

وَيَسْتَأْذِنُ بَعْضُنَ الْبَاطِلِ عَلَىٰ بَعْضٍ لَّئِنْ نَسُوا ۝

قِيَدًا لِّهَا قَاعًا مَصْفُوعًا ۝

لَّاتَرَىٰ فِيهَا عِجَابًا وَلَا تُحْسِنُ ۝

(۱) جس سے وہ بچ نہ سکے گا نہ بھاگ ہی سکے گا۔

(۲) صُور سے مراد وہ قرن (زنگا) ہے، جس میں اسرائیل علیہ السلام اللہ کے حکم سے پھونک ماریں گے، تو قیامت برپا

ہو جائے گی، (مسند احمد - ۲ / ۱۹۱) ایک اور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اسرائیل علیہ السلام نے قرن کا

لقمہ بنایا ہوا ہے، (یعنی اسے منہ لگائے کھڑا ہے) پیشانی بھکائی یا موڑی ہوئی ہے، رب کے حکم کے انتظار میں ہے کہ کب

اسے حکم دیا جائے اور وہ اس میں پھونک مار دے“ (ترمذی، أبواب صفة القيامة، باب ماجاء في الصور) حضرت

اسرائیل علیہ السلام کے پہلے نفعی سے سب پر موت طاری ہو جائے گی، اور دوسرے نفعی سے بحکم الہی سب زندہ اور

میدان محشر میں جمع ہو جائیں گے۔ آیت میں یہی دوسرا نفع مراد ہے۔

(۳) شدت ہول اور دہشت کی وجہ سے ایک دوسرے سے چپکے چپکے باتیں کریں گے۔

(۴) یعنی سب سے زیادہ عاقل اور سمجھ دار۔ یعنی دنیا کی زندگی انہیں چند دن بلکہ گھڑی دو گھڑی کی محسوس ہوگی۔ جس

طرح دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَيَوْمَ نَقُومُ السَّاعَةَ يُخَسِرُ الْمُجْرِمُونَ لَدَا لَيْلُوا قِيَامًا ۝﴾ (الروم: ۵۵)

يَوْمَئِذٍ يَتَّبِعُونَ الدَّاعِيَ لِمَ كَرِهَتْ لَهُ وَسَخَّتْ

الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمَنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ۝

جس دن لوگ پکارنے والے کے پیچھے چلیں^(۱) گے۔ جس میں کوئی کبھی نہ ہو گی^(۲) اور اللہ رحمن کے سامنے تمام آوازیں پست ہو جائیں گی سوائے کھسر پھسر کے تجھے کچھ بھی سنائی نہ دے گا۔^(۳) (۱۰۸)

اس دن سفارش کچھ کام نہ آئے گی مگر جسے رحمن حکم دے اور اس کی بات کو پسند فرمائے۔^(۴) (۱۰۹)

جو کچھ ان کے آگے پیچھے ہے اسے اللہ ہی جانتا ہے مخلوق کا علم اس پر حاوی نہیں ہو سکتا۔^(۵) (۱۱۰)

تمام چہرے اس زندہ اور قائم دائم مدبر اللہ کے سامنے

يَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا لِمَنْ اِذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَرَضِيَ

لَهُ قَوْلًا ۝

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهَا ۝

وَعَدَّتْ الْجَنُودُ لِلْجِيِّ الْقَبُورِ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ۝

”جس دن قیامت برپا ہو گی، کافر قسمیں کھا کر کہیں گے کہ وہ (دنیا میں) ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔“ یہی مضمون اور بھی متعدد جگہ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ فاطر ۷۳-۳، سورہ المؤمنون ۱۱۲-۱۱۳، سورہ النازعات وغیرہ۔ مطلب یہی ہے کہ فانی زندگی کو باقی رہنے والی زندگی پر ترجیح نہ دی جائے۔

(۱) یعنی جس دن اونچے، نیچے پہاڑ، وادیاں، فلک بوس عمارتیں، سب صاف ہو جائیں گی، سمندر اور دریا خشک ہو جائیں گے، اور ساری زمین صاف چٹیل میدان ہو جائے گی۔ پھر ایک آواز آئے گی، جس کے پیچھے سارے لوگ لگ جائیں گے یعنی جس طرف وہ داعی بلائے گا، جائیں گے۔

(۲) یعنی اس داعی سے ادھر ادھر نہیں ہوں گے۔

(۳) یعنی مکمل سناٹا ہو گا سوائے قدموں کی آہٹ اور کھسر پھسر کے کچھ سنائی نہیں دے گا۔

(۴) یعنی اس دن کسی کی سفارش کسی کو فائدہ نہیں پہنچائے گی، سوائے ان کے جن کو رحمن شفاعت کرنے کی اجازت دے گا، اور وہ بھی ہر کسی کی سفارش نہیں کریں گے بلکہ صرف ان کی سفارش کریں گے جن کی بابت سفارش کو اللہ پسند فرمائے گا۔ اور یہ کون لوگ ہوں گے؟ صرف اہل توحید، جن کے حق میں اللہ تعالیٰ سفارش کرنے کی اجازت دے گا۔ یہ مضمون قرآن میں متعدد جگہ بیان فرمایا گیا ہے۔ مثلاً سورہ نجم ۲۶-۲۸، سورہ انبیاء ۲۸-۲۳، سورہ سبأ ۲۳-۳۸ اور آیت الکرسی۔

(۵) گزشتہ آیت میں شفاعت کے لیے جو اصول بیان فرمایا گیا ہے، اس میں اس کی وجہ اور علت بیان کر دی گئی ہے کہ چونکہ اللہ کے سوا کسی کو بھی کسی کی بابت پورا علم نہیں ہے کہ کون کتنا بڑا مجرم ہے؟ اور وہ اس بات کا مستحق ہے بھی یا نہیں، کہ اس کی سفارش کی جاسکے؟ اس لیے اس بات کا فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ ہی فرمائے گا کہ کون کون لوگ انبیاء و صلحا کی سفارش کے مستحق ہیں؟ کیوں کہ ہر شخص کے جرائم کی نوعیت و کیفیت کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور نہ جان ہی سکتا ہے۔

کمال عاجزی سے جھکے ہوئے ہوں گے، یقیناً وہ برباد ہوا جس نے ظلم لاد لیا۔^(۱) (۱۱۱)

اور جو نیک اعمال کرے اور ایمان والا بھی ہو تو نہ اسے بے انصافی کا کھٹکا ہو گا نہ حق تلفی کا۔^(۲) (۱۱۲)

اسی طرح ہم نے تجھ پر عربی قرآن نازل فرمایا ہے اور طرح طرح سے اس میں ڈر کا بیان سنایا ہے تاکہ لوگ پرہیزگار بن جائیں یا ان کے دل میں سوچ سمجھ تو پیدا کرے۔^(۳) (۱۱۳)

پس اللہ عالی شان والا سچا اور حقیقی بادشاہ^(۴) ہے۔ تو قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کر اس سے پہلے کہ تیری طرف جو وحی کی جاتی ہے وہ پوری کی جائے،^(۵) ہاں یہ دعا

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الظُّلُمَاتِ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهُكُمْ فَلَيْسَ ظُلْمًا وَلَا يَهْتَمُّ ۝۱۱۱

وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا وَصَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَوْ يُحَدِّثُ آلَهُمْ شَيْئًا ۝۱۱۲

فَتَعَلَى اللَّهِ الْمَلِكُ الْحَقُّ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا ۝۱۱۳

(۱) اس لیے کہ اس روز اللہ تعالیٰ مکمل انصاف فرمائے گا اور ہر صاحب حق کو اس کا حق دلائے گا۔ حتیٰ کہ اگر ایک سینگ والی بکری نے بغیر سینگ والی بکری پر ظلم کیا ہو گا تو اس کا بھی بدلہ دلایا جائے گا۔ (صحیح مسلم، کتاب البر، مسند أحمد، ج ۲، ص ۲۳۵) اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حدیث میں یہ بھی فرمایا ہے، «لَتَوَدَّ الْحُقُوقُ إِلَىٰ أَهْلِهَا» ”ہر صاحب حق کو اس کا حق دے دو“ ورنہ قیامت کو دینا پڑے گا۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا «إِنَّا كُنْمُ وَالظُّلْمُ؛ فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلْمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»۔ (صحیح مسلم، کتاب مذکور، باب تحریم الظلم) ”ظلم سے بچو اس لیے کہ ظلم قیامت کے دن اندھیروں کا باعث ہو گا“ سب سے نامراد وہ شخص ہو گا جس نے شرک کا بوجھ بھی اپنے اوپر لاد رکھا ہو گا، اس لیے کہ شرک ظلم عظیم بھی ہے اور ناقابل معافی بھی۔

(۲) بے انصافی یہ ہے کہ اس پر دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی ڈال دیا جائے اور حق تلفی یہ ہے کہ نیکیوں کا اجر کم دیا جائے۔ یہ دونوں باتیں وہاں نہیں ہوں گی۔

(۳) یعنی گناہ، محرمات اور فواحش کے ارتکاب سے باز آجائیں۔

(۴) یعنی اطاعت اور قرب حاصل کرنے کا شوق یا پچھلی امتوں کے حالات و واقعات سے عبرت حاصل کرنے کا جذبہ ان کے اندر پیدا کر دے۔

(۵) جس کا وعدہ اور وعید حق ہے، جنت و دوزخ حق ہے اور اس کی ہر بات حق ہے۔

(۶) جبرائیل علیہ السلام جب وحی لے کر آتے اور سناتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی جلدی جلدی ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے، کہ کہیں کچھ حصہ بھول نہ جائیں، اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا اور تاکید کی کہ غور سے، پہلے وحی کو سنیں، اس

کر کہ پروردگار! میرا علم بڑھا۔ (۱۱۳)

ہم نے آدم کو پہلے ہی تاکید حکم دے دیا تھا لیکن وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں کوئی عزم نہیں پایا۔ (۱۱۵)
اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے کیا، اس نے صاف انکار کر دیا۔ (۱۱۶)

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلِ قَنُوبِ فَنَسَىٰ وَلَمْ نُجِدْ لَهُ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ ﴿۱۱۶﴾

کو یاد کرانا اور دل میں بٹھادینا یہ ہمارا کام ہے جیسا کہ سورۃ قیامت میں آئے گا۔

(۱) یعنی اللہ تعالیٰ سے زیادتی علم کی دعا فرماتے رہیں۔ اس میں علما کے لیے بھی نصیحت ہے کہ وہ فتویٰ میں پوری تحقیق اور غور سے کام لیں، جلد بازی سے بچیں اور علم میں اضافے کی صورتیں اختیار کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ علاوہ ازیں علم سے مراد قرآن و حدیث کا علم ہے۔ قرآن میں اسی کو علم سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کے حاملین کو علماء دیگر چیزوں کا علم، جو انسان کسب معاش کے لیے حاصل کرتا ہے، وہ سب فن ہیں، ہنر ہیں اور صنعت و حرفت ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس علم کے لیے دعا فرماتے تھے، وہ وحی و رسالت ہی کا علم ہے جو قرآن و حدیث میں محفوظ ہے، جس سے انسان کا ربط و تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوتا، اس کے اخلاق و کردار کی اصلاح ہوتی اور اللہ کی رضا و عدم رضا کا پتہ چلتا ہے۔ ایسی دعاؤں میں ایک دعا یہ بھی ہے جو آپ پڑھا کرتے تھے — «اللَّهُمَّ أَنْفَعْنِي بِمَا عَلَّمْتَنِي، وَعَلِّمْنِي مَا يَنْفَعُنِي، وَزِدْنِي عِلْمًا، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَىٰ كُلِّ حَالٍ» (ابن ماجہ، باب الانتفاع بالعلم والعمل المقدمۃ)

(۲) نسیان (بھول جانا) ہر انسان کی سرشت میں داخل ہے اور ارادے کی کمزوری یعنی فقدان عزم۔ یہ بھی انسانی طبائع میں بالعموم پائی جاتی ہے۔ یہ دونوں کمزوریاں ہی شیطان کے وسوسوں میں پھنس جانے کا باعث بنتی ہیں۔ اگر ان کمزوریوں میں اللہ کے حکم سے بغاوت و سرکشی کا جذبہ اور اللہ کی نافرمانی کا عزم مصمم شامل نہ ہو، تو بھول اور ضعف ارادہ سے ہونے والی غلطی عصمت و کمال نبوت کے منافی نہیں، کیوں کہ اس کے بعد انسان فوراً نامد ہو کر اللہ کی بارگاہ میں جھک جاتا اور توبہ و استغفار میں مصروف ہو جاتا ہے۔ (جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے بھی کیا) حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے سمجھایا تھا کہ شیطان تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے، یہ تمہیں جنت سے نہ نکلوادے۔ یہی وہ بات ہے جسے یہاں عمد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آدم علیہ السلام اس عمد کو بھول گئے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ایک درخت کے قریب جانے یعنی اس سے کچھ کھانے سے منع فرمایا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں یہ بات تھی کہ وہ اس درخت کے قریب نہیں جائیں گے۔ لیکن جب شیطان نے اللہ کی قسمیں کھا کر انہیں یہ باور کرایا کہ اس کا پھل تو یہ تاثیر رکھتا ہے کہ جو کھا لیتا ہے، اسے زندگی جاوداں اور دائمی بادشاہت مل جاتی ہے۔ تو ارادے پر قائم نہ رہ سکے اور اس فقدان عزم کی وجہ سے شیطانی وسوسے کا شکار ہو گئے۔

تو ہم نے کہا اے آدم! یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے
(خیال رکھنا) ایسا نہ ہو کہ وہ تم دونوں کو جنت سے نکلوا
دے کہ تو مصیبت میں پڑ جائے۔^(۱) (۱۱۷)

یہاں تو تجھے یہ آرام ہے کہ نہ تو بھوکا ہوتا ہے نہ تنگ۔ (۱۱۸)
اور نہ تو یہاں پیاسا ہوتا ہے نہ دھوپ سے تکلیف اٹھاتا
ہے۔ (۱۱۹)

لیکن شیطان نے اسے وسوسہ ڈالا، کہنے لگا کہ کیا میں تجھے
داغی زندگی کا درخت اور بادشاہت بتلاؤں کہ جو کبھی
پرانی نہ ہو۔ (۱۲۰)

چنانچہ ان دونوں نے اس درخت سے کچھ کھا لیا پس ان
کے ستر کھل گئے اور بہشت کے پتے اپنے اوپر ٹانگنے
لگے۔ آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب کی نافرمانی کی پس
ہمک گیا۔^(۲) (۱۲۱)

پھر اس کے رب نے نوازا، اس کی توبہ قبول کی اور اس
کی رہنمائی کی۔^(۳) (۱۲۲)

فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هَذَا عَدُوُّكَ وَاذْهَبْكَ فَكَارِهْ جَنَّتَنَا
مِنَ الْجَنَّةِ فَمَتْنَفِي ۝

إِنَّ لَكَ الْأَشْيُوعَ دِيهَا وَلَا تَعْرَى ۝

وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَصْفَى ۝

فَوَسَّسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا لِمَ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةِ
الْغَدْرِ وَمَلَكَ لِرَيْبِلِ ۝

فَاكَلَا مِمَّا قَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْضَعْنَ عَلَيْهِمَا
مِنَ وَرَقِ الْجَنَّةِ وَعَصَى أَمْرُ رَبِّهِ فَتَعْرَى ۝

ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَاهُ ۝

(۱) یہ شفا، محنت و مشقت کے معنی میں ہے، یعنی جنت میں کھانے پینے، لباس اور مسکن کی جو سہولتیں بغیر کسی محنت کے
حاصل ہیں۔ جنت سے نکل جانے کی صورت میں ان چاروں چیزوں کے لیے محنت و مشقت کرنی پڑے گی، جس طرح کہ
ہر انسان کو دنیا میں ان بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لیے محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ علاوہ ازیں صرف آدم علیہ السلام سے
کہا گیا کہ تو محنت و مشقت میں پڑ جائے گا۔ دونوں کو نہیں کہا گیا حالانکہ درخت کا پھل کھانے والے آدم علیہ السلام و
حواد دونوں ہی تھے۔ اس لیے کہ اصل مخاطب آدم ہی تھے۔ نیز بنیادی ضروریات کی فراہمی بھی مرد ہی کی ذمہ داری ہے،
عورت کی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو اس محنت و مشقت سے بچا کر گھر کی ملکہ کا اعزاز عطا فرمایا ہے۔ لیکن آج عورت
کو یہ "اعزاز الہی" "طوق غلامی" نظر آتا ہے، جس سے آزاد ہونے کے لیے وہ بے قرار اور مصروف جمد ہے آہ!
انغوائے شیطانی بھی کتنا موثر اور اس کا جال بھی کتنا حسین اور دل فریب ہے۔

(۲) یعنی درخت کا پھل کھا کر نافرمانی کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مطلوب یا راہ راست سے ہمک گیا۔

(۳) اس سے بعض لوگ استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے مذکورہ عصیان کا صدور، نبوت
سے قبل ہوا، اور نبوت سے اس کے بعد آپ کو نوازا گیا۔ لیکن ہم نے گزشتہ صفحے میں اس "معصیت" کی جو حقیقت

فرمایا، تم دونوں یہاں سے اتر جاؤ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو، اب تمہارے پاس جب کبھی میری طرف سے ہدایت پہنچے تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے نہ تو وہ بنسکے گانہ تکلیف میں پڑے گا۔ (۱۲۳)

اور (ہاں) جو میری یاد سے روگردانی کرے گا اس کی زندگی تنگی میں رہے گی،^(۱) اور ہم اسے بروز قیامت اندھا کر کے اٹھائیں گے۔^(۲) (۱۲۴)

وہ کہے گا کہ الہی! مجھے تو نے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا؟ حالانکہ میں تو دیکھتا بھالتا تھا۔ (۱۲۵)

(جواب ملے گا کہ) اسی طرح ہونا چاہیے تھا تو میری آئی ہوئی آیتوں کو بھول گیا تو آج تو بھی بھلا دیا جاتا ہے۔ (۱۲۶)

ہم ایسا ہی بدلہ ہر اس شخص کو دیا کرتے ہیں جو حد سے گزر جائے اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان نہ لائے، اور بیشک آخرت کا عذاب نہایت ہی سخت اور باقی رہنے والا ہے۔ (۱۲۷)

قَالَ اِهْبِطَا مِنْهَا جَبِيحًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَاَمَّا يَا بَنِي كَنْعَانَ فَمَتَىٰ هَذِي ۚ فَمِنْ اَنْتُمْ هٰذٰى فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْفِي ۝۲۳

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝۲۴

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْ اَعْمٰى وَاَقَد كُنْتُ بَصِيْرًا ۝۲۵

قَالَ كَذٰلِكَ اَنْتَ كَذٰلِكَ اَلَيْسَ فَا نَسِيْتَهَا وَا كَذٰلِكَ الْيَوْمَ نُنذِي ۝۲۶

وَا كَذٰلِكَ نَجْزِي مَنْ اَسْرَفَ وَا لَمْ يُؤْمِنْ بِالْاٰيٰتِ رَبِّهِ وَا لَعْنٰ اٰبِ الْاَحْزَابِ اَشَدُّ وَا نْفٰى ۝۲۷

بیان کی ہے، وہ عصمت کے منافی نہیں رہتی۔ کیوں کہ ایسا سمو و نسیان، جس کا تعلق تبلیغ رسالت اور تشریح سے نہ ہو، بلکہ ذاتی افعال سے ہو اور اس میں بھی اس کا سبب ضعف ارادہ ہو تو یہ دراصل وہ معصیت ہی نہیں ہے، جس کی بنا پر انسان غضب الہی کا مستحق بنتا ہے۔ اس پر جو معصیت کا اطلاق کیا گیا ہے تو محض ان کی عظمت شان اور مقام بلند کی وجہ سے کہ بڑوں کی معمولی غلطی کو بھی بڑا سمجھ لیا جاتا ہے، اس لیے آیت کا مطلب یہ نہیں کہ ہم نے اس کے بعد اسے نبوت کے لیے چن لیا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ندامت اور توبہ کے بعد ہم نے اسے پھر مقام اجتناب پر فائز کر دیا، جو پہلے انہیں حاصل تھا۔ ان کو زمین پر اتارنے کا فیصلہ، ہماری مشیت اور حکمت و مصلحت پر مبنی تھا، اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ ہمارا عتاب ہے جو آدم پر نازل ہوا ہے۔

(۱) اس تنگی سے بعض نے عذاب قبر اور بعض نے وہ قلق و اضطراب، بے چینی اور بے کلی مراد لی ہے جس میں اللہ کی یاد سے غافل بڑے بڑے دولت مند مبتلا رہتے ہیں۔

(۲) اس سے مراد فی الواقع آنکھوں سے اندھا ہونا ہے یا پھر بصیرت سے محرومی مراد ہے یعنی وہاں اس کو کوئی ایسی دلیل نہیں سوجھے گی جسے پیش کر کے وہ عذاب سے چھوٹ سکے۔

کیا ان کی رہبری اس بات نے بھی نہیں کی کہ ہم نے ان سے پہلے بہت سی بستیاں ہلاک کر دی ہیں جن کے رہنے سہنے کی جگہ یہ چل پھر رہے ہیں۔ یقیناً اس میں عقلمندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ (۱۲۸)

اگر تیرے رب کی بات پہلے ہی سے مقرر شدہ اور وقت معین کردہ نہ ہوتا تو اسی وقت عذاب آچھتا۔^(۱) (۱۲۹)

پس ان کی باتوں پر صبر کرو اور اپنے پروردگار کی تسبیح اور تعریف بیان کرتا رہ، سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے، رات کے مختلف وقتوں میں بھی اور دن کے حصوں میں بھی تسبیح کرتا رہ،^(۲) بہت ممکن ہے کہ تو راضی ہو جائے۔^(۳) (۱۳۰)

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمَا هُمْ كَمَا تَقْبَلُهُمْ مِنَ الْفُرُوقِ يَسْتَوُونَ
فِي مَسْجِدِهِمْ اِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۲۸﴾

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَكَانَ لِزِمَامِ وَاٰجِلٍ مُّتَعَمَّرٍ ﴿۱۲۹﴾

فَاَصْبِرْ عَلٰى مَا يَأْتِيَنَّكَ مِنْ وِسْوَعِ الْمُجْرِمِيْنَ
وَقَبْلِ عُرُوْبِهِمْ اَوْ مِنْ اِنْتَابِ الْاَيْلِ قَبِيْعَةٍ وَاَطْرَافِ النَّهَارِ
لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾

(۱) یعنی یہ مکذبین اور مشرکین مکہ دیکھتے نہیں کہ ان سے پہلے کئی امتیں گزر چکی ہیں، جن کے یہ جانئین ہیں اور ان کی رہائش گاہوں سے گزر کر آگے جاتے ہیں انہیں ہم اسی تکذیب کی وجہ سے ہلاک کر چکے ہیں، جن کے عبرت ناک انجام میں اہل عقل و دانش کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ لیکن یہ اہل مکہ ان سے آنکھیں بند کئے ہوئے انہی کی روش اپنائے ہوئے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے سے یہ فیصلہ نہ کیا ہوتا کہ وہ اتمام حجت کے بغیر اور اس مدت کے آنے سے پہلے جو وہ مہلت کے لیے کسی قوم کو عطا فرماتا ہے، کسی کو ہلاک نہیں کرتا۔ تو فوراً انہیں عذاب الہی آچھتا اور یہ ہلاکت سے دوچار ہو چکے ہوتے۔ مطلب یہ ہے کہ تکذیب رسالت کے باوجود اگر ان پر اب تک عذاب نہیں آیا تو یہ نہ سمجھیں کہ آئندہ بھی نہیں آئے گا بلکہ ابھی ان کو اللہ کی طرف سے مہلت ملی ہوئی ہے، جیسا کہ وہ ہر قوم کو دیتا ہے۔ مہلت عمل ختم ہو جانے کے بعد ان کو عذاب الہی سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

(۲) بعض مفسرین کے نزدیک تسبیح سے مراد نماز ہے اور وہ اس سے پانچ نمازیں مراد لیتے ہیں۔ طلوع شمس سے قبل فجر، غروب سے قبل، عصر، رات کی گھڑیوں سے مغرب و عشا اور اطراف النہار سے ظہر کی نماز مراد ہے کیوں کہ ظہر کا وقت، یہ نہار اول کا طرف آخر اور نہار آخر کا طرف اول ہے۔ اور بعض کے نزدیک ان اوقات میں ویسے ہی اللہ کی تسبیح و تحمید ہے جس میں نماز، تلاوت، ذکر اذکار، دعا و مناجات اور نوافل سب داخل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ان مشرکین کی تکذیب سے بدل نہ ہوں۔ اللہ کی تسبیح و تحمید کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے گا ان کی گرفت فرمائے گا۔

(۳) یہ متعلق ہے فسْتَبِيْح سے۔ یعنی ان اوقات میں تسبیح کریں، یہ امید رکھتے ہوئے کہ اللہ کے ہاں آپ کو وہ مقام و درجہ حاصل ہو جائے گا جس سے آپ کافس راضی ہو جائے۔

اور اپنی نگاہیں ہرگز ان چیزوں کی طرف نہ دوڑانا جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو آرائش دنیا کی دے رکھی ہیں تاکہ انہیں اس میں آزمائیں^(۱) تیرے رب کا دیا ہوا ہی (ہست) بہتر اور بہت باقی رہنے والا ہے۔^(۲) (۱۳۱)

اپنے گھرانے کے لوگوں پر نماز کی تاکید رکھ اور خود بھی اس پر ہمارے،^(۳) ہم تجھ سے روزی نہیں مانگتے، بلکہ ہم خود تجھے روزی دیتے ہیں، آخر میں بول بالا پر بیزگاری ہی کا ہے۔ (۱۳۲)

انہوں نے کہا کہ یہ نبی ہمارے پاس اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں لایا؟^(۴) کیا ان کے پاس اگلی کتابوں کی واضح دلیل نہیں پہنچی؟^(۵) (۱۳۳)

وَلَا تَسْأَلْ عَنِّيكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنَّمْ زَهْرَةَ
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْسِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْغَىٰ ۝۱۳۱

وَأَمْزَأْتِكُ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۚ لَا تَسْأَلُكَ
رِزْقًا لِّغَنٍّ تَرِزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ ۝۱۳۲

وَقَالُوا لَوْلَا آيَاتُنَا بِآيَاتِهِ مِّن رَّبِّهِ أَوَّلَتْ تَأْتِيهِمْ بَيِّنَةٌ
مِّنَ الضُّعْفِ الْأُولَىٰ ۝۱۳۳

(۱) یہ وہی مضمون ہے جو اس سے قبل سورۃ آل عمران ۱۹۶-۱۹۷، سورۃ الحجر ۸۷-۸۸ اور سورۃ الکہف ۷۱ وغیرہ میں بیان ہوا ہے۔

(۲) اس سے مراد آخرت کا اجر و ثواب ہے جو دنیا کے مال و اسباب سے بہتر بھی ہے اور اس کے مقابلے میں باقی رہنے والا بھی۔ حدیث ایلاء میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، دیکھا کہ آپ ایک کھری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور بے سرو سامانی کا یہ عالم کہ گھر میں چمڑے کی دو چیزوں کے علاوہ کچھ نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، عمر کیا بات ہے، روتے کیوں ہو؟ عرض کیا یا رسول اللہ! قیصر و کسریٰ، کس طرح آرام و راحت کی زندگی گزار رہے ہیں اور آپ کا باوجود اس بات کے کہ آپ افضل الخلق ہیں، یہ حال ہے؟ فرمایا، عمر کیا تم اب تک شک میں ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو ان کے آرام کی چیزیں دنیا میں ہی دے دی گئی ہیں۔ یعنی آخرت میں ان کے لیے کچھ نہیں ہو گا۔ (بخاری، سورۃ التحريم۔ مسلم، باب الإیلاء)

(۳) اس خطاب میں ساری امت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہے۔ یعنی مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود بھی نماز کی پابندی کرے اور اپنے گھروالوں کو بھی نماز کی تاکید کرتا رہے۔

(۴) یعنی ان کی خواہش کے مطابق نشانی، جیسے شہود کے لیے اونٹنی ظاہر کی گئی تھی۔

(۵) ان سے مراد تورات، انجیل اور زبور وغیرہ ہیں۔ یعنی کیا ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات موجود نہیں ہیں، جن سے ان کی نبوت کی تصدیق ہوتی ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ کیا ان کے پاس پچھلی قوموں کے یہ حالات نہیں پہنچے کہ

وَلَوْ أَنَّمَا أَهْلَكَ نُهُمْ بِعَذَابٍ مِّن قَبْلِهِ لَفَالَتُوا
رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْنَا إِلَيْنَا رَسُولًا فَتُنذِرَ الْبَنِيَّ
مِن قَبْلِ أَنْ نُنذِرَ لَكَ وَنَحْنُ ۝۱۶

اور اگر ہم اس سے ^(۱) پہلے ہی انہیں عذاب سے ہلاک کر
دیتے تو یقیناً یہ کہہ اٹھتے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے
ہمارے پاس اپنا رسول کیوں نہ بھیجا؟ کہ ہم تیری آیتوں
کی تابعداری کرتے اس سے پہلے کہ ہم ذلیل و رسوا
ہوتے۔ (۱۳۴)

کہہ دیجئے! ہر ایک انجام کا منتظر ^(۲) ہے پس تم بھی انتظار
میں رہو۔ ابھی ابھی قطعاً جان لو گے کہ راہ راست
والے کون ہیں اور کون راہ یافتہ ہیں۔ ^(۳) (۱۳۵)

قُلْ كُلٌّ مِّنْ أُمَّتٍ مَّصُوفَ فَتَرْجِعُوا فَمَا تَعْلَمُونَ
مَنْ أَحْصَى الصِّرَاطَ السَّوِيَّ وَمِنْ أَهْدَى ۝۱۷

انہوں نے جب اپنی حسب خواہش معجزے کا مطالبہ کیا اور وہ انہیں دکھا دیا گیا لیکن اس کے باوجود وہ ایمان نہیں لائے، تو
انہیں ہلاک کر دیا گیا۔

(۱) مراد آخر الزماں پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

(۲) یعنی مسلمان اور کافروں اس انتظار میں ہیں کہ دیکھو کفر غالب رہتا ہے یا اسلام غالب آتا ہے؟

(۳) اس کا علم تمہیں اس سے ہو جائے گا کہ اللہ کی مدد سے کامیاب اور سرخرو کون ہوتا ہے؟ چنانچہ یہ کامیابی
مسلمانوں کے حصے میں آئی، جس سے واضح ہو گیا کہ اسلام ہی سیدھا راستہ اور اس کے حاملین ہی ہدایت یافتہ ہیں۔

سورۂ انبیاء کی ہے اور اس میں ایک سو بارہ آیتیں اور سات رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

لوگوں کے حساب کا وقت قریب آگیا ^(۱) پھر بھی وہ بے خبری میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ ^(۲) (۱)

ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے جو بھی نئی نصیحت آتی ہے اسے وہ کھیل کود میں ہی سنتے ہیں۔ ^(۳) (۲)

ان کے دل بالکل غافل ہیں اور ان ظالموں نے چپکے چپکے سرگوشیاں کیں کہ وہ تم ہی جیسا انسان ہے، پھر کیا وجہ ہے جو تم آنکھوں دیکھتے جادو میں آجاتے ہو۔ ^(۴) (۳)

پیغمبر نے کہا میرا پروردگار ہر اس بات کو جو زمین و آسمان میں ہے بخوبی جانتا ہے، وہ بہت ہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ^(۵) (۴)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ

مُعْرِضُونَ ①

مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ مُّحَدِّثٍ إِلَّا انصَمَوْا

وَهُمْ يَلْعَنُونَ ②

لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ وَأَسْرَأَ السُّعُورِ الَّذِينَ ظَلَمُوا هَلْ هَذَا

إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السَّحَرَةَ وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ ③

قُلْ رَبِّي يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ④

(۱) وقت حساب سے مراد قیامت ہے جو ہر گھڑی قریب سے قریب تر ہو رہی ہے۔ اور وہ ہر چیز جو آنے والی ہے، قریب ہے۔ اور ہر انسان کی موت بجائے خود اس کے لیے قیامت ہے۔ علاوہ ازیں گزرے ہوئے زمانے کے لحاظ سے بھی قیامت قریب ہے کیونکہ جتنا زمانہ گزر چکا ہے۔ باقی رہ جانے والا زمانہ اس سے کم ہے۔

(۲) یعنی اس کی تیاری سے غافل، دنیا کی زینتوں میں گم اور ایمان کے تقاضوں سے بے خبر ہیں۔

(۳) یعنی قرآن جو وقتاً فوقتاً حسب حالات و ضروریات نیا نیا اترتا رہتا ہے، وہ اگرچہ انہی کی نصیحت کے لیے اترتا ہے، لیکن وہ اسے اس طرح سنتے ہیں جیسے وہ اس سے استنزا و مذاق اور کھیل کر رہے ہوں یعنی اس میں تدبر و غور و فکر نہیں کرتے۔

(۴) یعنی نبی کا بشر ہونا ان کے لیے ناقابل قبول ہے پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ تم دیکھ نہیں رہے کہ یہ تو جادو گر ہے، تم اس کے جادو میں دیکھتے بھالتے کیوں چھنتے ہو؟

(۵) وہ تمام بندوں کی باتیں سنتا ہے اور سب کے اعمال سے واقف ہے، تم جو جھوٹ بکتے ہو، اسے سن رہا ہے اور میری سچائی کو اور جو دعوت تمہیں دے رہا ہوں، اس کی حقیقت کو خوب جانتا ہے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ یہ تو کہتے ہیں کہ یہ قرآن پر آگندہ خوابوں کا مجموعہ ہے بلکہ اس نے از خود اسے گھڑ لیا ہے بلکہ یہ شاعر^(۱) ہے، ورنہ ہمارے سامنے یہ کوئی ایسی نشانی لاتے جیسے کہ اگلے پیغمبر بھیجے گئے تھے۔^(۲) (۵)

ان سے پہلے جتنی بستیاں ہم نے اجازیں سب ایمان سے خالی تھیں۔ تو کیا اب یہ ایمان لائیں گے۔^(۳) (۶)

تجھ سے پہلے بھی جتنے پیغمبر ہم نے بھیجے سبھی مرد تھے^(۴) جن کی طرف ہم وحی اتارتے تھے پس تم اہل کتاب سے پوچھ لو اگر خود تمہیں علم نہ ہو۔^(۵) (۷)

بَلْ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ بَلْ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ غُلِيْبٌ تَتَابَعُوا

يَا أَيُّهَا كَمَا أَرْسِلَ الْأَوَّلُونَ ۝

مَا آمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَهْلَهُمْ يُؤْمِنُونَ ۝

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ فَهُمْ لَكَاؤُاهْلٍ

الَّذِينَ إِنْ كُنْتُمْ لِآتَاكُمْ نُونٌ ۝

(۱) ان سرگوشی کرنے والے ظالموں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ کہا کہ یہ قرآن تو پریشان خواب کی طرح پر آگندہ افکار کا مجموعہ، بلکہ اس کا اپنا گھڑا ہوا ہے، بلکہ یہ شاعر ہے اور یہ قرآن کتاب ہدایت نہیں، شاعری ہے۔ یعنی کسی ایک بات پر ان کو قرار نہیں ہے۔ ہر روز ایک نیا پینتر بدلتے اور نئی سے نئی الزام تراشی کرتے ہیں۔

(۲) یعنی جس طرح حمود کے لیے اونٹنی، موسیٰ علیہ السلام کے لیے عصا اور یدریضا وغیرہ۔

(۳) یعنی ان سے پہلے جتنی بستیاں ہم نے ہلاک کیں، یہ نہیں ہوا کہ ان کی حسب خواہش معجزہ دکھلانے پر وہ ایمان لے آئی ہوں، بلکہ معجزہ دیکھ لینے کے باوجود وہ ایمان نہیں لائیں، جس کے نتیجے میں ہلاکت ان کا مقدر بنی۔ تو کیا اگر اہل مکہ کو ان کی خواہش کے مطابق کوئی نشانی دکھلا دی جائے، تو وہ ایمان لے آئیں گے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ بھی تکذیب و عناد کے راستے پر ہی بدستور گامزن رہیں گے۔

(۴) یعنی تمام نبی مرد انسان تھے، نہ کوئی غیر انسان کبھی نبی آیا اور نہ غیر مرد، گویا نبوت انسانوں کے ساتھ اور انسانوں میں بھی مردوں کے ساتھ ہی خاص رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی عورت نبی نہیں بنی۔ اس لیے کہ نبوت بھی ان فرائض میں سے ہے جو عورت کے طبعی اور فطری دائرہ عمل سے خارج ہے۔

(۵) أَهْلَ الذِّكْرِ (اہل علم) سے مراد اہل کتاب ہیں، جو سابقہ آسمانی کتابوں کا علم رکھتے تھے، ان سے پوچھ لو کہ پچھلے انبیاء جو ہو گزرے ہیں، وہ انسان تھے یا غیر انسان؟ وہ تمہیں بتلائیں گے کہ تمام انبیاء انسان ہی تھے۔ اس سے بعض حضرات ”تقلید“ کا اثبات کرتے ہیں۔ جو غلط ہے۔ ”تقلید یہ ہے کہ ایک معین شخص، اور اس کی طرف منسوب ایک معین فقہ کو مرجع بنایا جائے اور اسی پر عمل کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ بغیر دلیل کے اس بات کو تسلیم کیا جائے جب کہ آیت میں اہل الذکر سے مراد کوئی متعین شخص نہیں ہے۔ بلکہ ہر وہ عالم ہے جو تورات و انجیل کا علم رکھتا تھا۔ اس سے تو تقلید شخص کی نفی ہوتی ہے؟ اس میں تو علما کی طرف رجوع کرنے کی تاکید ہے، جو عوام کے لیے ناگزیر ہے، جس سے کسی کو

وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا اَلِيًّا كَلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا

خَلِيْدِيْنَ ۝

لَمْ يَصِدُّوْهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجِبْنَهُمْ وَمَنْ نُّشَاءُ وَاهْلَكْنَا

الْمُتَسْرِفِيْنَ ۝

لَعَدُوْا اَنْزَلْنَا الْبَيِّنَاتِ بَايْنَهُمْ وَذُرُوْكُمْ اَقْلَامًا تَعْقِلُوْنَ ۝

وَكَمْ فَصَصْنَا مِنْ قُرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا

قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝

فَلَمَّا اَحْسَبُوْا اِلَّا سَبًا اِذَا هُمْ بِهَا يَوْمٌ مَّكُوْنَ ۝

ہم نے ان کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے۔ (۸)

پھر ہم نے ان سے کیے ہوئے سب وعدے سچے کیے انہیں اور جن جن کو ہم نے چاہا نجات عطا فرمائی اور حد سے نکل جانے والوں کو عارت کر دیا۔ (۹)

یقیناً ہم نے تمہاری جانب کتاب نازل فرمائی ہے جس میں تمہارے لیے ذکر ہے، کیا پھر بھی تم عقل نہیں رکھتے؟ (۱۰)

اور بہت سی بستیاں ہم نے تباہ کر دیں (۳) جو ظالم تھیں اور ان کے بعد ہم نے دوسری قوم کو پیدا کر دیا۔ (۱۱)

جب انہوں نے ہمارے عذاب کا احساس کر لیا تو لگے اس سے بھاگنے۔ (۱۲)

جہاں انکار نہیں ہے۔ نہ کہ کسی ایک ہی شخصیت کا دامن پکڑ لینے کا حکم۔ علاوہ ازیں تورات و انجیل، مخصوص کتابیں تھیں یا انسانوں کی خود ساختہ تفسیر؟ اگر وہ آسمانی کتابیں تھیں تو مطلب یہ ہوا کہ علما کے ذریعے سے نصوص شریعت معلوم کریں، جو آیت کا صحیح مفہوم ہے۔

(۱) بلکہ وہ کھانا بھی کھاتے تھے اور موت سے ہم کنار ہو کر راہ گیران عالم بقا بھی ہوئے، یہ انبیاء کی بشریت ہی کی دلیل دی جا رہی ہے۔

(۲) یعنی وعدے کے مطابق نبیوں کو اور اہل ایمان کو نجات عطا کی اور حد سے تجاوز کرنے والے یعنی کفار و مشرکین کو ہم نے ہلاک کر دیا۔

(۳) فَصَّصَ کے معنی ہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دینا اور کَمَّ صیغہ تکثیر ہے۔ یعنی کتنی ہی بستیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا، توڑ پھوڑ کر رکھ دیا، جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ”قوم نوح کے بعد ہم نے کتنی ہی بستیاں ہلاک کر دیں“۔ (سورۃ بنی اسرائیل-۷۷)

(۴) احساس کے معنی ہیں، حواس کے ذریعے سے ادراک کر لینا۔ یعنی جب انہوں نے عذاب یا اس کے آثار کو آتے ہوئے آنکھوں سے دیکھ لیا، یا کڑک گرج کی آواز سن کر معلوم کر لیا، تو اس سے بچنے کے لیے راہ فرار ڈھونڈنے لگے۔ ذَخَضَ کے معنی ہوتے ہیں کہ آدمی گھوڑے وغیرہ پر بیٹھ کر اس کو دوڑانے کے لیے ایڑ لگائے۔ ہمیں سے یہ بھاگنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

لَا تَرْكُضُوا وَاذْجِعُوا آلِي مَا آتَرْتُمْ فِيهِ وَوَسِّكِيكُمْ
لَعَلَّكُمْ تُسْتَلُونَ ﴿۱۵﴾

فَالْوَالِدِينَ الَّذِينَ آتَاكَ اللَّهُ طَلِبِينَ ﴿۱۶﴾

فَمَا زِلْتَ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خُمُودٍ ﴿۱۷﴾

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَابَيْنَهُمَا الْعِيبِينَ ﴿۱۸﴾

لَوْ أَرَادْنَا أَنْ نَنْتَحِدَ لَهَوًا لَآتَيْنَاكَ مِنْ لَدُنَّا آيَاتِنَا لَمَّا
فُوعِلِينَ ﴿۱۹﴾

بھاگ دوڑ نہ کرو ^(۱) اور جہاں تمہیں آسودگی دی گئی تھی
وہیں واپس لوٹو اور اپنے مکانات کی طرف ^(۲) جاؤ تاکہ تم
سے سوال تو کر لیا جائے۔ ^(۳) (۱۳)

کننے لگے ہائے ہماری خرابی! بیشک ہم ظالم تھے۔ (۱۳)
پھر تو ان کا یہی قول رہا ^(۴) یہاں تک کہ ہم نے
انہیں جڑ سے کٹی ہوئی کھیتی اور بھی پڑی آگ کی
طرح کر دیا۔ ^(۵) (۱۵)

ہم نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو
کھیلنے ہوئے نہیں بنایا۔ ^(۶) (۱۶)
اگر ہم یوں ہی کھیل تماشے کا ارادہ کرتے تو اسے
اپنے پاس سے ہی بنا ^(۷) لیتے، اگر ہم کرنے والے
ہی ہوتے۔ ^(۸) (۱۷)

(۱) یہ فرشتوں نے ندادی یا مومنوں نے استہزا کے طور پر کہا۔

(۲) یعنی جو نعمتیں اور آسائشیں تمہیں حاصل تھیں جو تمہارے کفر اور سرکشی کا باعث تھیں اور وہ مکانات جن میں تم
رہتے تھے اور جن کی خوبصورتی اور پائیداری پر فخر کرتے تھے ان کی طرف پلٹو۔

(۳) اور عذاب کے بعد تمہارا حال احوال تو پوچھ لیا جائے کہ تم پر یہ کیا بنتی، کس طرح بنتی اور کیوں بنتی؟ یہ سوال بطور
ظفر اور مذاق کے ہے، ورنہ ہلاکت کے شکنجے میں کسے جانے کے بعد وہ جواب دینے کی پوزیشن میں ہی کب رہتے تھے؟

(۴) یعنی جب تک زندگی کے آثار ان کے اندر رہے، وہ اعتراف ظلم کرتے رہے۔

(۵) حَصِيدٌ، کٹی ہوئی کھیتی کو اور خُمُودٌ آگ کے بجھ جانے کو کہتے ہیں۔ یعنی بالآخر وہ کٹی ہوئی کھیتی اور بھی ہوئی
آگ کی طرح راکھ کا ڈھیر ہو گئے، کوئی تاب و توانائی اور حس و حرکت ان کے اندر نہ رہی۔

(۶) بلکہ اس کے کئی مقاصد اور حکمتیں ہیں، مثلاً بندے میرا ذکر و شکر کریں، نیکوں کو نیکیوں کی جزا اور بدوں کو بدیوں کی
سزا دی جائے۔ وغیرہ۔

(۷) یعنی اپنے پاس سے ہی کچھ چیزیں کھیل کے لیے بنا لیتے اور اپنا شوق پورا کر لیتے۔ اتنی لمبی چوڑی کائنات بنانے کی
اور پھر اس میں ذی روح اور ذی شعور مخلوق بنانے کی کیا ضرورت تھی؟

(۸) ”اگر ہم کرنے والے ہی ہوتے۔“ عربی اسلوب کے اعتبار سے یہ زیادہ صحیح ہے بہ نسبت اس ترجمہ کے کہ ”ہم
کرنے والے ہی نہیں“ (فتح القدیر)

بَلْ تَقْتَدِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ قَيْدًا مَعَهُ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ
وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا نَصَبْتُمْ ۝

وَلَا مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ عِنْدَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ
عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۝

يَسْتَعِزُّوْنَ بِاللَّهْمَا زَلٰيْفًا تُرَوْنَ ۝

اِرٰعٰنًا وَاللّٰهَ مِنَ الْاَرْضِ هُمْ يَبْتَعِدُوْنَ ۝

لَوْ كَانَتْ فِيْهَا اِلٰهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ
الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝

بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر پھینک مارتے ہیں پس سچ جھوٹ کا
سر توڑ دیتا ہے اور وہ اسی وقت نابود ہو جاتا ہے، تم جو
باتیں بناتے ہو وہ تمہارے لیے باعث خرابی ہیں۔ (۱۸)^(۲)
آسمانوں اور زمین میں جو ہے اسی اللہ کا ہے^(۳) اور جو
اس کے پاس ہیں^(۴) وہ اس کی عبادت سے نہ سرکش
کرتے ہیں اور نہ تھمتے ہیں۔ (۱۹)

وہ دن رات تسبیح بیان کرتے ہیں اور ذرا سی بھی سستی
نہیں کرتے۔ (۲۰)

کیا ان لوگوں نے زمین (کی مخلوقات میں) سے جنہیں
معبود بنا رکھا ہے وہ زندہ کر دیتے ہیں۔ (۲۱)^(۵)

اگر آسمان و زمین میں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور بھی معبود
ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو جاتے،^(۶) پس اللہ تعالیٰ

(۱) یعنی تخلیق کائنات کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ ہے کہ یہاں حق و باطل کی جو معرکہ آرائی اور خیر و شر کے
درمیان جو تصادم ہے، اس میں ہم حق اور خیر کو غالب اور باطل اور شر کو مغلوب کریں۔ چنانچہ ہم حق کو باطل پر یا سچ کو
جھوٹ پر یا خیر کو شر پر مارتے ہیں، جس سے باطل، جھوٹ اور شر کا بیج نکل جاتا ہے اور چشمِ زدن میں وہ نابود ہو جاتا
ہے۔ دماغِ سر کی ایسی چوٹ کو کہتے ہیں جو دماغ تک پہنچ جائے۔ زہق کے معنی، ختم یا ہلاک و تلف ہو جانے کے ہیں۔

(۲) یعنی رب کی طرف تم جو بے سرو پا باتیں منسوب کرتے یا اس کی بابت باور کراتے ہو، (مثلاً یہ کائنات ایک کھیل
ہے، ایک کھلنڈرے کا شوقِ فضول ہے وغیرہ) یہ تمہاری ہلاکت کا باعث ہے۔ کیونکہ اسے کھیل تماشہ سمجھنے کی وجہ سے
تم حق سے گریز اور باطل کو اختیار کرنے میں کوئی تامل اور خوف محسوس نہیں کرتے، جس کا نتیجہ بالآخر تمہاری بربادی
اور ہلاکت ہی ہے۔

(۳) سب اسی کی ملک اور اسی کے غلام ہیں۔ پھر جب تم کسی غلام کو اپنا بیٹا اور کسی لونڈی کو بیوی بنانے کے لیے تیار
نہیں ہوتے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے مملوکیں اور غلاموں میں سے بعض کو بیٹا اور بعض کو بیوی کس طرح بنا سکتا ہے؟

(۴) اس سے مراد فرشتے ہیں، وہ بھی اس کے غلام اور بندے ہیں، ان الفاظ سے ان کا شرف و اکرام بھی ظاہر ہو رہا ہے
کہ وہ اس کی بارگاہ کے مقربین ہیں۔ اس کی بیٹیاں نہیں ہیں جیسا کہ مشرکین کا عقیدہ تھا۔

(۵) استفہام انکاری ہے یعنی نہیں کر سکتے۔ پھر وہ ان کو، جو کسی چیز کی قدرت نہیں رکھتے، اللہ کا شریک کیوں ٹھہراتے
اور ان کی عبادت کیوں کرتے ہیں؟

(۶) یعنی اگر واقعی آسمان و زمین میں دو معبود ہوتے تو کائنات میں تصرف کرنے والی دو ہستیاں ہوتیں، دو کاراۓہ و شعور

عرش کا رب ہر اس وصف سے پاک ہے جو یہ مشرک بیان کرتے ہیں۔ (۲۲)

وہ اپنے کاموں کے لیے (کسی کے آگے) جواب دہ نہیں اور سب (اس کے آگے) جواب دہ ہیں۔ (۲۳)

کیا ان لوگوں نے اللہ کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں، ان سے کہہ دو لاؤ اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ ہے میرے ساتھ والوں کی کتاب اور مجھ سے اگلوں کی دلیل۔^(۱) بات یہ ہے کہ ان میں کے اکثر لوگ حق کو نہیں جانتے اسی وجہ سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ (۲۴)

تجھ سے پہلے بھی جو رسول ہم نے بھیجا اس کی طرف یہی وحی نازل فرمائی کہ میرے سوا کوئی معبود برحق نہیں پس تم سب میری ہی عبادت کرو۔^(۲) (۲۵)

(مشرک لوگ) کہتے ہیں کہ رحمن اولاد والا ہے (غلط ہے) اس کی ذات پاک ہے، بلکہ وہ سب اس کے باعزت بندے ہیں۔ (۲۶)

کسی بات میں اللہ پر پیش دستی نہیں کرتے بلکہ اس کے

لَا يَسْتَعْلَمُ غَيْبَاتَهُمْ وَيَوْمَ يَقُولُ لِمَ كُفِرْتُمْ ۝

أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْ دُونِهِ اللَّهُ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ ۚ هَذَا إِذْ كُفِرْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ الْحَقَّ فَهُمْ مُعْرِضُونَ ۝

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِيَ إِلَيْهِ أَنْكَرُ الْإِلَهِ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ۝

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا ۗ سُبْحَانَ اللَّهِ ۗ بَلْ عِبَادٌ مُتَكَبِّرُونَ ۝

لَا يَسْتَفِئُونَ بِالْقَوْلِ ۗ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ۝

اور مرضی کار فرما ہوتی اور جب دو ہستیوں کا ارادہ اور فیصلہ کائنات میں چلتا تو یہ نظم کائنات اس طرح قائم رہ ہی نہیں سکتا تھا جو ابتدائے آفرینش سے، بغیر کسی ادنیٰ توقف کے، قائم چلا آ رہا ہے۔ کیونکہ دونوں کا ارادہ ایک دوسرے سے ٹکراتا، دونوں کی مرضی کا آپس میں تصادم ہوتا، دونوں کے اختیارات ایک دوسرے کی مخالف سمت میں استعمال ہوتے۔ جس کا نتیجہ اہتری اور فساد کی صورت میں رونما ہوتا۔ اور اب تک ایسا نہیں ہوا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ کائنات میں صرف ایک ہی ہستی ہے جس کا ارادہ و مشیت کار فرما ہے، جو کچھ بھی ہوتا ہے، صرف اور صرف اسی کے حکم پر ہوتا ہے، اس کے دیئے ہوئے کو کوئی روک نہیں سکتا اور جس سے وہ اپنی رحمت روک لے، اس کو دینے والا کوئی نہیں۔

(۱) ذِكْرُ مَنْ مَعِيَ سے قرآن اور دوسرے ذکر سے سابقہ کتب آسمانی مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن میں اور اس سے قبل کی دیگر کتابوں میں، سب میں صرف ایک ہی معبود کی الوہیت و ربوبیت کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن یہ مشرکین اس حق کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اور بدستور اس توحید سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔

(۲) یعنی تمام پیغمبر بھی یہی توحید کا پیغام لے کر آئے۔

فرمان پر کار بند ہیں۔ (۲۷) ^(۱)

وہ ان کے آگے پیچھے کے تمام امور سے واقف ہے وہ کسی کی بھی سفارش نہیں کرتے۔ بجز ان کے جن سے اللہ خوش ہو ^(۲) وہ تو خود ہیبت الہی سے لرزاں و ترساں ہیں۔ (۲۸)

ان میں سے اگر کوئی بھی کہہ دے کہ اللہ کے سوا میں لائق عبادت ہوں تو ہم اسے دوزخ کی سزا دیں ^(۳) ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ (۲۹)

کیا کافر لوگوں نے یہ نہیں دیکھا ^(۴) کہ آسمان و زمین باہم ملے جلے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کیا ^(۵) اور ہر زندہ چیز کو ہم

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَاَلَيْسَ مَعْنُوۡنًا

الَّذِيۡنَ ارْتَضٰۤى وَهُمْ مِّنۡ خَشْيَتِهٖ مُسْتَقِيۡمُوۡنٌ ﴿۲۸﴾

وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنَّ اِلٰهَ مِنۡ دُوۡنِهٖ فَاَنذِرْهُ بِعَذٰبِنَا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا

كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۲۹﴾

اَوَلَمْ يَرَوْا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

(۱) اس میں مشرکین کا رد ہے جو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔ فرمایا، وہ بیٹیاں نہیں، اس کے ذی عزت بندے اور اس کے فرماں بردار ہیں۔ علاوہ ازیں بیٹے، بیٹیوں کی ضرورت، اس وقت پڑتی ہے جب عالم پیری میں ضعف و اضمحلال کا آغاز ہو جاتا ہے تو اس وقت اولاد سہارا بن جاتی ہے، اسی لیے اولاد کو عصائے پیری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن بڑھاپا، ضعف و اضمحلال، ایسے عوارض ہیں جو انسان کو لاحق ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات ان تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں سے پاک ہے۔ اس لیے اسے اولاد کی یا کسی بھی سہارے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بار بار اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی اولاد نہیں ہے۔

(۲) اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء صالحین کے علاوہ فرشتے بھی سفارش کریں گے۔ حدیث صحیح سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے لیکن یہ سفارش انہی کے حق میں ہوگی جن کے لیے اللہ تعالیٰ پسند فرمائے گا۔ اور ظاہر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ سفارش اپنے نافرمان بندوں کے لیے نہیں، صرف گناہ گار مگر فرماں بردار بندوں یعنی اہل ایمان و توحید ہی کے لیے پسند فرمائے گا۔ (۳) یعنی ان فرشتوں میں سے بھی اگر کوئی الہ ہونے کا دعویٰ کر دے تو ہم اسے بھی جہنم میں پھینک دیں گے۔ یہ شرطیہ کلام ہے، جس کا وقوع ضروری نہیں۔ مقصد، شرک کی تردید اور توحید کا اثبات ہے۔ جیسے ﴿فَلَاۤ اِنَّ كَانَ لِلّٰهِ حُكْمٌ وَّلٰكِنَّا اَوَّلَ الْغٰثِيۡنَ﴾ (الزخرف: ۸۱) ”اگر بالفرض رحمن کی اولاد ہو تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرنے والوں میں سے ہوں گا۔“ ﴿لَیۡنۡ اَشْرٰکُکَ لِیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ﴾ (الزمر: ۲۵) ”اے پیغمبر! اگر تو بھی شرک کرے تو تیرے عمل برباد ہو جائیں گے۔“ یہ سب مشروط ہیں جن کا وقوع غیر ضروری ہے۔

(۳) اس سے روایت یعنی نہیں، روایت قلبی مراد ہے یعنی کیا انہوں نے غور و فکر نہیں کیا؟ یا انہوں نے جانا نہیں؟ (۵) رَتَقَ کے معنی، بند کے اور فَنَقَّ کے معنی پھاڑنے، کھولنے اور الگ الگ کرنے کے ہیں۔ یعنی آسمان و زمین ابتدائے امر ہیں، باہم ملے ہوئے اور ایک دوسرے کے ساتھ بیوست تھے۔ ہم نے ان کو ایک دوسرے سے الگ کیا،

كَانَتْ رَاقًا فَفَقَّقَهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيًّا

اَقْلَابِيُونُونَ ﴿۳۰﴾

وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيًا أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيهَا
جِبَالًا سُبُلًا لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿۳۱﴾

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَفْفًا مَحْفُوظًا لَعَلَّهُمْ عَن

لَيْتَامُؤْمِنُونَ ﴿۳۲﴾

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ الْاَيْلَانَ وَالْهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلًّا

فِي فَلَاقٍ يُسَبِّحُونَ ﴿۳۳﴾

نے پانی سے پیدا کیا^(۱) کیا یہ لوگ پھر بھی ایمان نہیں
لاتے۔ (۳۰)

اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنا دیئے تاکہ وہ مخلوق کو بلانہ
سکے،^(۲) اور ہم نے اس^(۳) میں کشادہ راہیں بنا دیں تاکہ
وہ راستہ حاصل کریں۔ (۳۱)

آسمان کو محفوظ چھت^(۴) بھی ہم نے ہی بنایا ہے۔ لیکن لوگ
اسکی قدرت کے نمونوں پر دھیان ہی نہیں دھرتے۔ (۳۲)

وہی اللہ ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند
کو پیدا کیا ہے۔^(۵) ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار
میں تیرتے پھرتے ہیں۔^(۱) (۳۳)

آسمانوں کو اوپر کر دیا جس سے بارش برستی ہے اور زمین کو اپنی جگہ پر رہنے دیا، تاہم وہ پیداوار کے قابل ہو گئی۔

(۱) اس سے مراد اگر بارش اور چشموں کا پانی ہے، تب بھی واضح ہے کہ اس سے روئیدگی ہوتی اور ہر ذی روح کو حیات
نولتی ہے اور اگر مراد نطفہ ہے، تو اس میں بھی کوئی اشکال نہیں کہ ہر زندہ چیز کے وجود کے باعث وہ قطرہ آب ہے جو
کی صلب سے نکلتا اور مادہ کے رحم میں جا کر قرار پکڑتا ہے۔

(۲) یعنی اگر زمین پر یہ بڑے بڑے پہاڑ نہ ہوتے تو زمین میں جنبش اور لرزش ہوتی رہتی، جس کی وجہ سے انسانوں اور
حیوانوں کے لیے زمین مسکن اور مستقر بننے کی صلاحیت سے محروم رہتی۔ ہم نے پہاڑوں کا بوجھ اس پر ڈال کر اسے ڈانوا
ڈول ہونے سے محفوظ کر دیا۔

(۳) اس سے مراد زمین یا پہاڑ ہیں، یعنی زمین میں کشادہ راستے بنا دیئے یا پہاڑوں میں درے رکھ دیئے، جس سے ایک
علاقے سے دوسرے علاقے میں آنا جانا آسان ہو گیا۔ يَهْتَدُونَ کا ایک دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے تاکہ وہ ان کے
ذریعے سے اپنی معاش کے مصالح و مفادات حاصل کر سکیں۔

(۴) سَفْفًا مَحْفُوظًا، زمین کے لیے محفوظ چھت، جس طرح خیمے اور قبے کی چھت ہوتی ہے۔ یا اس معنی میں محفوظ
کہ ان کو زمین پر گرنے سے روک رکھا ہے، ورنہ آسمان زمین پر گر پڑیں تو زمین کا سارا نظام تہ و بالا ہو سکتا ہے۔ یا
شیاطین سے محفوظ۔ جیسے فرمایا ﴿وَحَفِظْنَاهُمْ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ﴾ (الحجر: ۱۷)

(۵) یعنی رات کو آرام اور دن کو معاش کے لیے بنایا، سورج کو دن کی نشانی چاند کو رات کی نشانی بنایا، تاکہ مہینوں اور
سالوں کا حساب کیا جاسکے، جو انسان کی اہم ضروریات میں سے ہے۔

(۶) جس طرح پیراک سطح آب پر تیرتا ہے، اسی طرح چاند اور سورج اپنے اپنے مدار پر تیرتے یعنی رواں دواں رہتے ہیں۔

وَمَا جَعَلْنَا الْبَشَرَ مِنْ بَيْنِكَ الْغُلْدَاءُ أَقَابِنَ مَبِثَّ
فَهُمُ الْغُلْدَاءُ ۝۲۷

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبَلُّوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ
فِدْنَةً وَمَا كُنَّا نُرْجِعُكُم ۝۲۸

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَتَّبِعُونَكَ إِلَّا الضُّلَّاءُ وَالْمُهَذَّبًا
الَّذِي يَذْكُرُ الْعِتَابَ وَهُمْ يَذْكُرُ الرَّحْمَنَ هُمْ كَفِرُونَ ۝۲۹

خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ سَأُورِيكَ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلْنِي ۝۳۰

آپ سے پہلے کسی انسان کو بھی ہم نے بیٹھگی نہیں
دی، کیا اگر آپ مر گئے تو وہ ہمیشہ کے لیے رہ
جائیں گے۔ (۳۳)

ہر جان دار موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔ ہم بطریق امتحان تم
میں سے ہر ایک کو برائی بھلائی میں مبتلا کرتے ہیں (۳۴) اور
تم سب ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ (۳۵)

یہ منکرین تجھے جب بھی دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق ہی
اڑاتے ہیں کہ کیا یہی وہ ہے جو تمہارے محبوبوں کا ذکر
برائی سے کرتا ہے، اور وہ خود ہی رحمن کی یاد کے بالکل
ہی منکر ہیں۔ (۳۶)

انسان جلد باز مخلوق ہے۔ میں تمہیں اپنی نشانیاں ابھی ابھی
دکھاؤں گا تم مجھ سے جلد بازی نہ کرو۔ (۳۷)

(۱) یہ کفار کے جواب میں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت کہتے تھے کہ ایک دن اسے مر ہی جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،
موت تو ہر انسان کو آتی ہے اور اس اصول سے یقیناً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مستثنیٰ نہیں۔ کیونکہ وہ بھی انسان
ہی ہیں اور ہم نے کسی انسان کے لیے بھی دوام اور بیٹھگی نہیں رکھی ہے۔ لیکن کیا یہ بات کہنے والے خود نہیں مریں
گے؟ اس سے صنم پرستوں کی بھی تردید ہو گئی جو دیوتاؤں کی اور انبیاء و اولیاء کی زندگی کے قائل ہیں اور اسی بنیاد پر ان کو
حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے ہیں۔ فَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ هَذِهِ الْعَقِيدَةِ الْفَاسِدَةِ الَّتِي تَعَارَضُ الْقُرْآنَ.

(۲) یعنی کبھی مصائب و آلام سے دوچار کر کے اور کبھی دنیا کے وسائل فراوان سے بہرہ ور کر کے۔ کبھی صحت و فراخی
کے ذریعے سے اور کبھی تنگی و بیماری کے ذریعے سے، کبھی تو نگری دے کر اور کبھی فقروفاقت میں مبتلا کر کے ہم آزماتے
ہیں۔ تاکہ ہم دیکھیں کہ شکر گزاری کون کرتا ہے اور ناشکری کون؟ صبر کون کرتا ہے اور ناصبری کون؟ شکر اور صبر، یہ
رضائے الہی کا اور کفران نعمت اور ناصبری غضب الہی کا موجب ہے۔

(۳) وہاں تمہارے عملوں کے مطابق چھی یا بری جزا دیں گے۔ اول الذکر لوگوں کے لیے بھلائی اور دوسروں کے لیے برائی۔

(۴) اس کے باوجود یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استہزا و مذاق اڑاتے ہیں۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا —
﴿وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ يَتَّبِعُونَكَ إِلَّا الضُّلَّاءُ وَالْمُهَذَّبًا﴾ (الفرقان: ۳۱) ”جب اے پیغمبر! یہ کفار مکہ تجھے دیکھتے ہیں

تو تیرا مذاق اڑانے لگ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہی وہ شخص ہے جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟“

(۵) یہ کفار کے مطالبہ عذاب کے جواب میں ہے کہ چونکہ انسان کی فطرت میں عجلت اور جلد بازی ہے۔ اس لیے وہ

کہتے ہیں کہ اگر سچے ہو تو بتا دو کہ یہ وعدہ کب ہے۔ (۳۸)

کاش! یہ کافر جانتے کہ اس وقت نہ تو یہ کافر آگ کو اپنے چروں سے ہٹا سکیں گے اور نہ اپنی پٹھوں سے اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ (۳۹)

(ہاں ہاں!) وعدے کی گھڑی ان کے پاس اچانک آجائے گی اور انہیں ہکا بکا کر دے گی، پھر نہ تو یہ لوگ اسے ٹال سکیں گے اور نہ ذرا سی بھی مہلت دیئے جائیں گے۔ (۴۰)

اور تجھ سے پہلے رسولوں کے ساتھ بھی ہنسی مذاق کیا گیا پس ہنسی کرنے والوں کو ہی اس چیز نے گھیر لیا جس کی وہ ہنسی اڑاتے تھے۔ (۴۱)

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدَانِ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۸﴾

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينًا لَّيَكْفُرُونَ عَنْ وُجُوهِهِمُ
النَّارَ وَلَا عَنْ لُحُومِهِمْ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿۳۹﴾

بَلْ تَأْتِيهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ
رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿۴۰﴾

وَلَقَدْ اسْتَهْزَيْتُمْ بِرُسُلِ تَن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا
مِنْهُمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۴۱﴾

پیغمبر سے بھی جلدی مطالبہ کرنے لگ جاتا ہے کہ اپنے اللہ سے کہہ کر ہم پر فوراً عذاب نازل کروادے۔ اللہ نے فرمایا، جلدی مت کرو، میں عنقریب اپنی نشانیاں تمہیں دکھاؤں گا۔ ان نشانیوں سے مراد عذاب بھی ہو سکتا ہے اور صداقت رسول ﷺ کے دلائل و براہین بھی۔

(۱) اس کا جواب محذوف ہے، یعنی اگر یہ جان لیتے تو پھر عذاب کا جلدی مطالبہ نہ کرتے یا یقیناً جان لیتے کہ قیامت آنے والی ہے یا کفر پر قائم نہ رہتے بلکہ ایمان لے آتے۔

(۲) یعنی انہیں کچھ بھائی نہیں دے گا کہ وہ کیا کریں؟

(۳) کہ وہ توبہ و اعتذار کا اہتمام کر لیں۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ مشرکین کے استہزاء اور تکذیب سے بدلہ نہ ہوں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، تجھ سے پہلے آنے والے پیغمبروں کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا گیا، بالآخر وہی عذاب ان پر الٹ پڑا، یعنی اس نے انہیں گھیر لیا، جس کا وہ استہزاء و مذاق اڑایا کرتے تھے اور جس کا وقوع ان کے نزدیک مستبعد تھا۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا۔ ﴿وَلَقَدْ كَذَّبْتَ رَسُولًا مِنْ قَبْلِكَ فَاصْبِرْ إِنَّ مَآكِلَ نَارٍ لَّيُؤْتُونَ بِهَا وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (الانعام: ۳۳) ”تجھ سے پہلے بھی رسول جھٹلائے گئے، پس انہوں نے تکذیب پر اور ان تکلیفوں پر جو انہیں دی گئیں، صبر کیا، یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آگئی۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے ساتھ کفار و مشرکین کے لیے اس میں تہدید و وعید بھی ہے۔

ان سے پوچھئے کہ رحمن سے 'دن اور رات تمہاری حفاظت کون کر سکتا ہے؟' (۱) بات یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے رب کے ذکر سے پھرے ہوئے ہیں۔ (۴۲)

کیا ہمارے سوا ان کے اور معبود ہیں جو انہیں مصیبتوں سے بچالیں۔ کوئی بھی خود اپنی مدد کی طاقت نہیں رکھتا اور نہ کوئی ہماری طرف سے رفاقت دیا جاتا ہے۔ (۴۳) (۲)

بلکہ ہم نے انہیں اور ان کے باپ دادوں کو زندگی کے سرو سامان دیئے یہاں تک کہ ان کی مدت عمر گزر گئی۔ (۳) کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آ رہے ہیں (۴) اب کیا وہی غالب ہیں؟ (۴۴) (۵)

کہہ دیجئے! میں تو تمہیں اللہ کی وحی کے ذریعہ آگاہ کر رہا ہوں مگر بہرے لوگ بات نہیں سنتے جبکہ انہیں آگاہ کیا جائے۔ (۴۵) (۶)

قُلْ مَنْ يَبْتَغِي بَأْسِي وَآلِيَّ وَالَّذِينَ مِنَ الرَّحْمٰنِ بَيْنَ يَدَيْهِمْ
ذُكِّرْتَهُمْ مَعْرُضُونَ ﴿۴۲﴾

اَمْ لَهُمُ الْهِيَاةُ تَتَّبِعُهُمْ مِنْ دُونِنَا لَا يَسْتَشْفِعُونَ نَصْرًا
اَنْفُسِهِمْ وَلَا لَهُمْ وِيَالٌ يَصْحُبُونَ ﴿۴۳﴾

بَلْ مَتَّعْنَا هَؤُلَاءِ وَاٰبَاءَهُمْ حَيٰطًا عَلَيْهِمُ الْعَمْرُ
اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا اٰتٰنَا الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَهْلٰهَا
اَفَلَمْ اَنْصِبْهُمْ ﴿۴۴﴾

قُلْ اِنَّمَا اَنْذَرْتُكُمْ بِالْحَقِّ وَلَا تَسْمَعُ الضَّمَّةَ الدَّعٰةَ
اِذْ اَمَّا يَنْتَدُوْنَ ﴿۴۵﴾

(۱) یعنی تمہارے جو کروت ہیں، وہ تو ایسے ہیں کہ دن یا رات کی کسی بھی گھڑی میں تم پر عذاب آسکتا ہے؟ اس عذاب سے دن اور رات تمہاری کون حفاظت کرتا ہے؟ کیا اللہ کے سوا بھی کوئی اور ہے جو عذاب الہی سے تمہاری حفاظت کر سکے؟

(۲) اس کے معنی ہیں وَلَا هُمْ يَبْتَغُونَ مِنْ عَذَابِنَا "نہ وہ ہمارے عذاب سے ہی محفوظ ہیں۔" یعنی وہ خود اپنی مدد پر اور اللہ کے عذاب سے بچنے پر قادر نہیں ہیں، پھر ان کی طرف سے ان کی مدد کیا ہوتی ہے اور وہ انہیں عذاب سے کس طرح بچا سکتے ہیں؟

(۳) یعنی ان کی یا ان کے آبا و اجداد کی زندگیاں اگر عیش و راحت میں گزر گئیں تو کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ صحیح راستے پر ہیں؟ اور آئندہ بھی انہیں کچھ نہیں ہوگا؟ نہیں، بلکہ یہ چند روزہ زندگی کا آرام تو ہمارے اصول مہلت کا ایک حصہ ہے، اس سے کسی کو دھوکہ اور فریب میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔

(۴) یعنی ارض کفر بند رہن گھٹ رہی ہے اور دولت اسلام وسعت پذیر ہے۔ کفر کے پیروں تلے سے زمین کھسک رہی ہے اور اسلام کا غلبہ بڑھ رہا ہے اور مسلمان علاقے پر علاقہ فتح کرتے چلے جا رہے ہیں۔

(۵) یعنی کفر کو سستا اور اسلام کو بڑھتا ہوا دیکھ کر بھی، کیا وہ کافر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ غالب ہیں؟ استفہام انکاری ہے۔ یعنی وہ غالب نہیں، مغلوب ہیں۔ فاتح نہیں، مفتوح ہیں۔ معزز و سرفراز نہیں، ذلت و خواری ان کا مقدر ہے۔

(۶) یعنی قرآن سا کر انہیں وعظ و نصیحت کر رہا ہوں اور یہی میری ذمہ داری اور منصب ہے۔ لیکن جن لوگوں کے کانوں

اگر انہیں تیرے رب کے کسی عذاب کا جھونکا بھی لگ جائے تو پکار اٹھیں کہ ہائے ہماری بدبختی! یقیناً ہم گنہگار تھے۔^(۱) (۳۶)

قیامت کے دن ہم درمیان میں لا رکھیں گے ٹھیک ٹھیک تو لنے والی ترازو کو۔ پھر کسی پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔ اور اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی عمل ہو گا ہم اسے لا حاضر کریں گے، اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔^(۲) (۳۷)

یہ بالکل سچ ہے کہ ہم نے موسیٰ و ہارون کو فیصلے کرنے والی نورانی اور پرہیزگاروں کے لیے وعظ و نصیحت والی

وَلَيْنَ مَسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ يُوَيْسًا
إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۳۶﴾

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ
شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا
بِهَا وَكُنْ بِنَاحِسِينَ ﴿۳۷﴾

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً
وَذِكْرًا لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۳۸﴾

کو اللہ نے حق کے سننے سے بہرا کر دیا، آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور دلوں پر مہر لگا دی، ان پر اس قرآن کا اور وعظ و نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

(۱) یعنی عذاب کا ایک ہلکا سا چھینا اور تھوڑا حصہ بھی پہنچے گا تو پکار اٹھیں گے اور اعتراف ظلم کرنے لگ جائیں گے۔
(۲) مَوَازِينُ، مِيزَانُ (ترازو) کی جمع ہے۔ وزن اعمال کے لیے قیامت والے دن یا تو کئی ترازو نہیں ہوں گی یا ترازو تو ایک ہی ہو گی، محض تخفیف شان کے لیے یا تعدد اعمال کے اعتبار سے جمع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ انسان کے اعمال تو اعراض ہیں یعنی ان کا کوئی ظاہری وجود یا جسم تو ہے نہیں، پھر وزن کس طرح ہو گا؟ یہ سوال آج سے قبل تک تو شاید کوئی اہمیت رکھتا ہو۔ لیکن آج سائنسی ایجادات نے اسے ممکن بنا دیا ہے، اب ان ایجادات کے ذریعے سے اعراض کا اور بے وزن چیزوں کا وزن بھی تو لا جانے لگا ہے۔ جب انسان اس بات پر قادر ہو گیا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے لیے ان اعمال کا جو اعراض ہیں وزن کرنا کون سا مشکل امر ہے، اس کی تو شان ہی عَلَيَّ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ممکن ہے کہ انسانوں کو دکھلانے کے لیے ان اعراض کو وہ اجسام میں بدل دے اور پھر وزن کرے، جیسا کہ احادیث میں بعض اعمال کے مجسم ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً صاحب قرآن کے لیے قرآن ایک خوش شکل نوجوان کی شکل میں آئے گا، وہ پوچھے گا، تو کون ہے؟ وہ کہے گا کہ میں قرآن ہوں جسے تو راتوں کو (قیام اللیل میں) بیدار رہ کر اور دن کو پیا سارہ کر پڑھا کرتا تھا۔ (مسند احمد ۵/۳۳۸، ۳۵۲، وابن ماجہ، کتاب الأدب، باب ثواب القرآن) اسی طرح مومن کی قبر میں عمل صالح ایک خوش رنگ اور معطر نوجوان کی شکل میں آئے گا اور کافر و منافق کے پاس اس کے برعکس شکل میں۔ (مسند احمد ۵/۲۸۷) اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھئے سورۃ الأعراف، ۷ کا حاشیہ۔ الْقِسْطُ، مصدر اور الْمَوَازِينُ کی صفت ہے۔ معنی ہیں ذَوَاتِ قِسْطٍ انصاف کرنے والی ترازو یا ترازوئیں۔

کتاب عطا فرمائی ہے۔^(۱) (۴۸)

وہ لوگ جو اپنے رب سے بن دیکھے خوف کھاتے ہیں اور قیامت (کے تصور) سے کانپتے رہتے ہیں۔^(۲) (۴۹)
اور یہ نصیحت و برکت والا قرآن بھی ہمیں نے نازل فرمایا ہے کیا پھر بھی تم اس کے منکر ہو۔^(۳) (۵۰)
یقیناً ہم نے اس سے پہلے ابراہیم کو اسکی سمجھ بوجھ بخشی تھی اور^(۴) ہم اسکے احوال سے بخوبی^(۵) واقف تھے۔ (۵۱)
جبکہ اس نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ مورتیاں جن کے تم مجاور بنے بیٹھے ہو کیا ہیں؟^(۶) (۵۲)

الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ ﴿۵۰﴾

وَهَذَا إِذْ كَرَّمْنَا بَرَكًا أَنْزَلْنَاهُ أَفَأَنْتُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ ﴿۵۱﴾

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ

عَلِيمِينَ ﴿۵۲﴾

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا هَذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا

عِبَادُونَ ﴿۵۳﴾

(۱) یہ تورات کی صفات بیان کی گئی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی۔ اس میں بھی متقین کے لیے ہی نصیحت تھی، جیسے قرآن کریم کو بھی ﴿هُدًى لِلْمُتَّقِينَ﴾ (البقرة: ۲۰) کہا گیا ہے، کیونکہ جن کے دلوں میں اللہ کا تقویٰ نہیں ہوتا، وہ اللہ کی کتاب کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، تو آسمانی کتاب ان کے لیے نصیحت اور ہدایت کا ذریعہ کس طرح بنے؟ نصیحت یا ہدایت کے لیے تو ضروری ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے اور اس میں غور و فکر کیا جائے۔
(۲) یہ متقین کی صفات ہیں، جیسے سورہ بقرہ کے آغاز میں اور دیگر مقامات پر بھی متقین کی صفات کا تذکرہ ہے۔
(۳) یہ قرآن، جو یاد دہانی حاصل کرنے والے کے لیے ذکر اور نصیحت اور خیر و برکت کا حامل ہے، اسے بھی ہم نے ہی اتارا ہے۔ تم اس کے مُنْزَلٌ مِّنَ اللَّهِ ہونے سے کیوں انکار کرتے ہو، جب کہ تمہیں اعتراف ہے کہ تورات اللہ کی طرف سے ہی نازل کردہ کتاب ہے۔

(۴) مِّن قَبْلُ سے مراد یا تو یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو رشد (ہدایت یا ہوش مندی) دینے کا واقعہ، موسیٰ علیہ السلام کو ایتائے تورات سے پہلے کا ہے، یا یہ مطلب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو نبوت سے قبل ہی ہوش مندی عطا کر دی تھی۔
(۵) یعنی ہم جانتے تھے کہ وہ اس رشد کا اہل ہے اور وہ اس کا صحیح استعمال کرے گا۔

(۶) تَمَاتِيلُ، تَمَاتِيلُ، تَمَاتِيلُ کی جمع ہے۔ یہ اصل میں کسی چیز کی ہو، ہوسو نقل کو کہتے ہیں۔ جیسے پتھر کا مجسمہ یا کانگڑا اور دیوار وغیرہ پر کسی کی تصویر۔ یہاں مراد وہ مورتیاں ہیں جو قوم ابراہیم علیہ السلام نے اپنے معبودوں کی بنا رکھی تھیں اور جن کی وہ عبادت کرتے تھے۔ عَاكِفٌ، عَاكِفٌ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، جس کے معنی کسی چیز کو لازم پکڑنے اور اس پر جھک کر، جم کر بیٹھ رہنے کے ہیں۔ اسی سے اَعْتَكَفَ ہے، جس میں انسان اللہ کی عبادت کے لیے جم کر بیٹھتا اور یکسوئی اور انہماک سے اس کی طرف لو لگاتا ہے۔ یہاں اس سے مراد بتوں کی تعظیم و عبادت اور ان کے تھانوں پر مجاور بن کر بیٹھنا ہے۔ یہ تمثالیں (مورتیاں اور تصویریں) قبر پرستوں اور پیر پرستوں میں بھی آج کل عام ہیں اور ان کو بڑے اہتمام سے گھروں

قَالُوا وَجَدْنَا ابَاءَنَا لَهَا عِبِدِينَ ﴿۵۰﴾

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاَبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۵۱﴾

قَالُوا اِحْسِنَا يَا لِحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللَّعِينِينَ ﴿۵۲﴾

قَالَ بَلْ زُرْتُمْ رَبَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِي

قَطَرْتُمْ ۗ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِنَ الشَّٰهِدِينَ ﴿۵۳﴾

وَتَاللّٰهِ لَآكِيْدًا اَصَمًا مَّكْمُومًا بَعْدَ اَنْ تُؤْتُوْا مَدِيْنَةً ﴿۵۴﴾

فَجَعَلَهُمْ جُنُودًا اِلَّا كِيْبًا اِنَّهُمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۵﴾

سب نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو انہی کی عبادت کرتے ہوئے پایا۔ (۵۳)

آپ نے فرمایا! پھر تو تم اور تمہارے باپ دادا سبھی یقیناً کھلی گمراہی میں مبتلا رہے۔ (۵۴)

کننے لگے کیا آپ ہمارے پاس سچ مچ حق لائے ہیں یا یوں ہی مذاق کر رہے ہیں۔ (۵۵)

آپ نے فرمایا نہیں درحقیقت تم سب کا پروردگار تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے، میں تو اسی بات کا گواہ اور قائل ہوں۔ (۵۶)

اور اللہ کی قسم میں تمہارے ان معبودوں کے ساتھ جب تم علیحدہ بیٹھ پھیر کر چل دو گے ایک چال چلوں گا۔ (۵۷)

پس اس نے ان سب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہاں صرف بڑے بت کو چھوڑ دیا یہ بھی اس لیے کہ وہ سب اس کی طرف ہی لوٹیں۔ (۵۸)

اور دو کانوں میں بطور تبرک آویزاں کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں سمجھ عطا فرمائے۔

(۱) جس طرح آج بھی جمالت و خرافات میں پھنسنے ہوئے مسلمانوں کو بدعات و رسومات جاہلیہ سے روکا جائے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم انہیں کس طرح چھوڑیں، جب کہ ہمارے آباؤ اجداد بھی یہی کچھ کرتے رہے ہیں۔ اور یہی جواب وہ حضرات دیتے ہیں جو نصوص کتاب و سنت سے اعراض کر کے علماء و مشائخ کے آراء و افکار سے چٹے رہنے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

(۲) یہ اس لیے کہا کہ انہوں نے اس سے قبل توحید کی یہ آواز ہی نہیں سنی تھی انہوں نے سوچا، پتہ نہیں، ابراہیم علیہ السلام ہمارے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہا ہے؟

(۳) یعنی میں مذاق نہیں کر رہا، بلکہ ایک ایسی چیز پیش کر رہا ہوں جس کا علم و یقین (مشاہدہ) مجھے حاصل ہے اور وہ یہ کہ تمہارا معبود یہ مورتیاں نہیں، بلکہ وہ رب ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک اور ان کا پیدا کرنے والا ہے۔

(۴) یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دل میں عزم کیا، بعض کہتے ہیں کہ آہستہ سے کہا، جس سے مقصود بعض لوگوں کو سنانا تھا۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔ سجد (تدبیر) سے مراد یہاں وہ عملی سعی ہے جو وہ زبانی وعظ کے بعد تغیر منکر کے عملی اہتمام کی شکل میں کرنا چاہتے تھے، یعنی بتوں کی توڑ پھوڑ۔

(۵) چنانچہ وہ جس دن اپنی عید یا کوئی جشن مناتے تھے، ساری قوم اس کے لیے باہر چلی گئی اور ابراہیم علیہ السلام نے

کہنے لگے کہ ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کس نے کیا؟
ایسا شخص تو یقیناً ظالموں میں سے ہے۔^(۱) (۵۹)
بولے ہم نے ایک نوجوان کو ان کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا
تھا جسے ابراہیم (علیہ السلام) کہا جاتا ہے۔^(۲) (۶۰)
سب نے کہا اچھا اسے مجمع میں لوگوں کی نگاہوں کے
سامنے لاؤ تاکہ سب دیکھیں۔^(۳) (۶۱)
کہنے لگے! اے ابراہیم (علیہ السلام) کیا تو نے ہی ہمارے
خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے۔ (۶۲)
آپ نے جواب دیا بلکہ اس کام کو ان کے بڑے نے کیا
ہے تم اپنے خداؤں سے ہی پوچھ لو اگر یہ بولتے چالتے
ہوں۔^(۴) (۶۳)

قَالُوا مَنْ فَعَلَ هَذَا بِالْهَيْتَةِ اِنَّهٗ لَمِنَ الظَّالِمِيْنَ ۝۵۹
قَالُوْا سَبْعًا نَّفَاۗتِيْ يَدُّوْهُمْ يَقَالُ لَهٗ اِبْرٰهِيْمُ ۝۶۰
قَالُوْا فَاَنْتَاۗوَابِهٖ عَلٰى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ۝۶۱
قَالُوْا بَرَّآۗنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِالْهَيْتَةِ يَا اِبْرٰهِيْمُ ۝۶۲
قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا قَتَلُوْهُم
اِنْ كَانُوْا يَبْطِئُوْنَ ۝۶۳

موقع غنیمت جان کر انہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ صرف ایک بڑا بت چھوڑ دیا، بعض کہتے ہیں کہ کلباڑی اس کے ہاتھ میں
پکڑا دی، تاکہ وہ اس سے پوچھیں۔
(۱) یعنی جب وہ جشن سے فارغ ہو کر آئے تو دیکھا کہ معبود تو ٹوٹے پڑے ہیں، تو کہنے لگے، یہ کوئی بڑا ہی ظالم شخص ہے
جس نے یہ حرکت کی ہے۔
(۲) ان میں سے بعض نے کہا کہ وہ نوجوان ابراہیم (علیہ السلام) ہے تاہم ہمارے بتوں کے خلاف باتیں کرتا ہے، معلوم
ہو تا ہے یہ اسی کی کارستانی ہے۔
(۳) یعنی اس کو سزا ملتی ہوئی دیکھیں تاکہ آئندہ کوئی اور یہ کام نہ کرے۔ یا یہ معنی ہیں کہ لوگ اس بات کی گواہی دیں
کہ انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کو بت توڑتے ہوئے دیکھا یا ان کے خلاف باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔
(۴) چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مجمع عام میں لایا گیا اور ان سے پوچھا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا
کہ یہ کام تو اس بڑے بت نے کیا ہے، اگر یہ (ٹوٹے ہوئے بت) بول کر بتلا سکتے ہیں تو ذرا ان سے پوچھو تو سہی۔ یہ بطور
تعریض اور تمکیت کے انہوں نے کہا تاکہ وہ یہ بات جان لیں کہ جو نہ بول سکتا ہو نہ کسی چیز سے آگاہی کی صلاحیت رکھتا
ہو، وہ معبود نہیں ہو سکتا۔ نہ اس پر الہ کا اطلاق ہی صحیح ہے۔ ایک حدیث صحیح میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول
بَلْ فَعَلَهُ كَبِيْرُهُمْ كُوْلَفْظِ كَذِبٍ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام نے تین جھوٹ بولے، دو اللہ کے لیے، ایک
اِنِّيْ سَفِيْمٌ اور دوسرا یہی۔ اور تیسرا حضرت سارہ اپنی بیوی کو بہن کہنا، (صحیح بخاری۔ کتاب الانبیاء، باب
واتخذ الله ابراهيم خلیلاً) زمانہ حال کے بعض مفسرین نے اس حدیث صحیح کو قرآن کے خلاف باور کر کے اس کا

پس یہ لوگ اپنے دلوں میں قائل ہو گئے اور کہنے لگے
واقعی ظالم تو تم ہی ہو۔^(۱) (۶۳)
پھر اپنے سروں کے بل اوندھے ہو گئے (اور کہنے
لگے کہ) یہ تو تجھے بھی معلوم ہے کہ یہ بولنے چالنے
والے نہیں۔^(۲) (۶۵)

اللہ کے خلیل نے اسی وقت فرمایا افسوس! کیا تم اللہ کے

فَرَجَعُوا إِلَىٰ أَنفُسِهِمْ فَقَالُوا لَوْلَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ لَنُؤْمِنَنَّ بِهِ ۖ

لَمْ نَكُ سِوَا عِبَادٍ لِّدُونِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتُمْ

مَا هَؤُلَاءِ يَنطَفِقُونَ ۝

قَالَ اَلَمْتَّبِعُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ مَا لَآ يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا

انکار کر دیا ہے اور اس کی صحت پر اصرار کو غلو اور روایت پرستی قرار دیا ہے۔ لیکن ان کی یہ رائے صحیح نہیں۔ یقیناً حقیقت کے اعتبار سے انہیں جھوٹ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن ظاہری شکل کے لحاظ سے ان کو کذب سے خارج بھی نہیں کیا جاسکتا۔ گو یہ کذب اللہ کے ہاں قابل مؤاخذہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اللہ ہی کے لیے بولے گئے ہیں۔ دراصل حاکم کوئی گناہ کا کام اللہ کے لیے نہیں ہو سکتا۔ اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ ظاہری طور پر کذب ہونے کے باوجود وہ حقیقتاً کذب نہ ہو، جیسے حضرت آدم علیہ السلام کے لیے عَصَىٰ اور غَوْبَىٰ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، حالانکہ خود قرآن میں ہی ان کے فعل اکل شجر کو نسیان اور ارادے کی کمزوری کا نتیجہ بھی بتلایا گیا ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کسی کام کے دو پہلو بھی ہو سکتے ہیں۔ من وجہ اس میں استحسان اور من وجہ ظاہری قباحت کا پہلو ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول اس پہلو سے ظاہری طور پر کذب ہی ہے کہ یہ واقعے کے خلاف تھا، بتوں کو انہوں نے خود توڑا تھا۔ لیکن اس کا انتساب بڑے بت کی طرف کیا۔ لیکن چونکہ مقصد ان کا تعریض اور اثبات توحید تھا اس لیے حقیقت کے اعتبار سے ہم اسے جھوٹ کے بجائے اتمام حجت کا ایک طریق اور مشرکین کی بے عقلی کے اثبات و اظہار کا ایک انداز کہیں گے، علاوہ ازیں حدیث میں ان کذبات کا ذکر جس ضمن میں آیا ہے، وہ بھی قابل غور ہے اور وہ ہے میدان محشر میں اللہ کے روبرو جا کر سفارش کرنے سے اس لیے گریز کرنا کہ ان سے دنیا میں تین موقعوں پر لغزش کا صدور ہوا ہے۔ دراصل حاکم وہ لغزشیں نہیں ہیں یعنی حقیقت اور مقصد کے اعتبار سے وہ جھوٹ نہیں ہیں۔ مگر وہ اللہ کی عظمت و جلال کی وجہ سے اتنے خوف زدہ ہوں گے کہ یہ باتیں جھوٹ کے ساتھ ظاہری مماثلت کی وجہ سے قابل گرفت نظر آئیں گی۔ گویا حدیث کا مقصد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جھوٹا ثابت کرنا ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کیفیت کا اظہار ہے جو قیامت والے دن، خشیت الہی کی وجہ سے ان پر طاری ہوگی۔

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس جواب سے وہ سوچ میں پڑ گئے اور ایک دوسرے کو لاجواب ہو کر، کہنے لگے، واقعی ظالم تو تم ہی ہو، جو اپنی جان سے دفع مضرت پر اور نقصان پہنچانے والے کا ہاتھ پکڑنے پر قادر نہیں، وہ مستحق عبادت کیوں کر ہو سکتا ہے؟ بعض نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ معبودوں کی عدم حفاظت پر ایک دوسرے کو ملامت کی اور ترک حفاظت پر ایک دوسرے کو ظالم کہا۔

(۲) پھر اے ابراہیم (علیہ السلام) تو ہمیں یہ کیوں کہہ رہا ہے کہ ان سے پوچھو، اگر یہ بول سکتے ہیں، جب کہ تو اچھی طرح

علاوہ ان کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہیں کچھ بھی نفع پہنچا
سکیں نہ نقصان۔ (۶۶)

تف ہے تم پر اور ان پر جن کی تم اللہ کے سوا عبادت
کرتے ہو۔ کیا تمہیں اتنی سی عقل بھی نہیں؟ (۶۷)
کہنے لگے کہ اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو اگر
تمہیں کچھ کرنا ہی ہے۔ (۶۸)^(۲)

ہم نے فرما دیا اے آگ! تو ٹھنڈی پڑ جا اور ابراہیم (علیہ
السلام) کے لیے سلامتی (اور آرام کی چیز) بن جا! (۶۹)
گو انہوں نے ابراہیم (علیہ السلام) کا برا چاہا، لیکن ہم نے
انہیں ناکام بنا دیا۔ (۷۰)

اور ہم ابراہیم اور لوط کو بچا کر اس زمین کی طرف لے
چلے جس میں ہم نے تمام جہان والوں کے لیے برکت
رکھی تھی۔ (۷۱)^(۳)

وَلَا يَصُورُكُمْ ۝

اِنَّ لَكُمْ وِلْمًا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ

اَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

قَالُوا حَرِّقُوْهُ وَانصُرُوْا الهِنْتَ كُمْ اِنْ كُنْتُمْ فَعِلِيْنَ ۝

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَاَسْلَمَا عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ ۝

وَ اٰمَرَّاوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمْ الْاَخْسَرِيْنَ ۝

وَوَجَّيْنٰهُ وَ نُوْحًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِي بَرَكْنَا

فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ۝

جاننا ہے کہ یہ بولنے کی طاقت سے محروم ہیں۔

(۱) یعنی جب وہ خود ان کی بے بسی کے اعتراف پر مجبور ہو گئے تو پھر ان کی بے عقلی پر افسوس کرتے ہوئے کہا کہ اللہ کو
چھوڑ کر ایسے بے بسوں کی تم عبادت کرتے ہو؟

(۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب یوں اپنی حجت تمام کر دی اور ان کی ضلالت و سفاہت کو ایسے طریقے سے ان پر
واضح کر دیا کہ وہ لاجواب ہو گئے۔ تو چونکہ وہ توفیق ہدایت سے محروم تھے اور کفر و شرک نے ان کے دلوں کو بے نور کر دیا
تھا۔ اس لیے بجائے اس کے کہ وہ شرک سے تائب ہوتے، النابراہیم علیہ السلام کے خلاف سخت اقدام کرنے پر آمادہ ہو
گئے اور اپنے معبودوں کی دہائی دیتے ہوئے انہیں آگ میں جھونک دینے کی تیاری شروع کر دی۔ چنانچہ آگ کا ایک بہت
بڑا لاؤ تیار کیا گیا اور اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کما جاتا ہے کہ معنیق کے ذریعے سے پھینکا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے
آگ کو حکم دیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے لیے برد و سلامتی بن جا۔ علما کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ، ٹھنڈی کے ساتھ
”سلامتی“ نہ فرماتا تو اس کی ٹھنڈک ابراہیم علیہ السلام کے لیے ناقابل برداشت ہوتی۔ بہر حال یہ ایک بہت بڑا معجزہ ہے
جو آسمان سے باتیں کرتی ہوئی دیکتی آگ کے گل و گلزار بن جانے کی صورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے اللہ
کی مشیت سے ظاہر ہوا۔ اس طرح اللہ نے اپنے بندے کو دشمنوں کی سازش سے بچالیا۔

(۳) اس سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک ملک شام ہے۔ جسے شادابی اور پھولوں اور نہروں کی کثرت نیز انبیا علیہم السلام

اور ہم نے اسے اسحاق عطا فرمایا اور یعقوب اس پر مزید-^(۱)
اور ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا۔ (۷۲)

اور ہم نے انہیں پیشوا بنا دیا کہ ہمارے حکم سے لوگوں کی
رہبری کریں اور ہم نے ان کی طرف نیک کاموں کے
کرنے اور نمازوں کے قائم رکھنے اور زکوٰۃ دینے کی
وحی (تلقین) کی، اور وہ سب کے سب ہمارے عبادت
گزار بندے تھے۔ (۷۳)

ہم نے لوط (علیہ السلام) کو بھی حکم اور علم دیا اور اسے
اس بستی سے نجات دی جہاں کے لوگ گندے کاموں
میں جھٹلاتے۔ اور تھے بھی وہ بدترین گنہگار۔ (۷۴)

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو اپنی رحمت میں داخل کر
لیا بے شک وہ نیکو کار لوگوں میں سے تھا۔^(۲) (۷۵)

نوح کے اس وقت کو یاد کیجئے جبکہ اس نے اس سے پہلے
دعا کی، ہم نے اس کی دعا قبول فرمائی اور اسے اور اس کے
گھر والوں کو بڑے کرب سے نجات دی۔ (۷۶)

اور جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلا رہے تھے ان کے

وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً، وَكُلًّا جَعَلْنَا
صَالِحِينَ ﴿۷۲﴾

وَجَعَلْنَاهُمْ آيَةً يُعَذِّبُونَ بِآيَاتِنَا وَأُوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فَعَلُوا
الْخَيْرَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَكَلَّمُوا الْقَائِمِينَ ﴿۷۳﴾

وَلُوطَ الْتَيْنَهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِي
كَانَتْ تَعْمَلُ الْخَبِيثَاتِ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا سَوِيًّا فَيَقِينُ ﴿۷۴﴾

وَأَدْخَلْنَاهُ فِي رَحْمَتِنَا إِنَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۷۵﴾

وَنُوحًا إِذْ نَادَى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَنَجَّيْنَاهُ
وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ﴿۷۶﴾

وَدَصَّرْنَاهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا

کامسکن ہونے کے لحاظ سے بابرکت کہا گیا ہے۔

(۱) نَافِلَةٌ: زائد کو کہتے ہیں، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو صرف بیٹے کے لیے دعا کی تھی، ہم نے بغیر دعا کے مزید
پوتا بھی عطا کر دیا۔

(۲) حضرت لوط علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے برادر زاد (بھتیجے) اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لانے
والے اور ان کے ساتھ عراق سے ہجرت کر کے شام جانے والوں میں سے تھے۔ اللہ نے ان کو بھی علم و حکمت یعنی نبوت
سے نوازا۔ یہ جس علاقے میں نبی بنا کر بھیجے گئے، اسے عمورہ اور سدوم کہا جاتا ہے۔ یہ فلسطین کے بحیرہ مردار سے متصل
بجانب اردن ایک شاداب علاقہ تھا۔ جس کا بڑا حصہ اب بحیرہ مردار کا جزو ہے۔ ان کی قوم لوطت جیسے فعل شنیع، گزر
گاہوں پر بیٹھ کر آنے جانے والوں پر آوازے کسنا اور انہیں تنگ کرنا خرف ریزے پھینکانا وغیرہ میں ممتاز تھی، جسے اللہ
نے یہاں خبائث (پلید کاموں) سے تعبیر فرمایا ہے۔ بالآخر حضرت لوط علیہ السلام کو اپنی رحمت میں داخل کر کے یعنی انہیں
اور ان کے متبعین کو بچا کر قوم کو تباہ کر دیا گیا۔

مقابلے میں ہم نے اس کی مدد کی، یقیناً وہ برے لوگ تھے
پس ہم نے ان سب کو ڈبو دیا۔ (۷۷)

اور داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) کو یاد کیجئے جبکہ وہ کھیت
کے معاملہ میں فیصلہ کر رہے تھے کہ کچھ لوگوں کی بکریاں
رات کو اس میں چر چک گئی تھیں، اور ان کے فیصلے میں
ہم موجود تھے۔ (۷۸)

ہم نے اس کا صحیح فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا۔^(۱) ہاں ہر ایک
کو ہم نے حکم و علم دے رکھا تھا اور داؤد کے تابع ہم نے
پھاڑ کر دیئے تھے جو تسبیح کرتے^(۲) تھے اور پرند^(۳) بھی۔

إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمَ سَوْءٍ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ۝

وَدَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمُونَ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَخَتْ

فِيهِ غَمَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ ۝

فَفَقَّهْنَاهَا سُلَيْمَانَ، وَكُلًّا آتَيْنَاهُمْ آيَاتِنَا وَعَلَّمْنَا أَسْحَارًا

مِمَّا دَاوُدَ الْجَبَّالِ يُسَبِّحُهَا وَالطَّيْرِ وَكُنَّا فَاعِلِينَ ۝

(۱) مفسرین نے یہ قصہ اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ایک شخص کی بکریاں، دوسرے شخص کے کھیت میں رات کو جا گھسیں
اور اس کی کھیتی چر چک گئیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے، جو پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ، حکمران بھی تھے۔ فیصلہ دیا کہ
بکریاں، کھیت والے لے تاکہ اس کے نقصان کی تلافی ہو جائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس فیصلے سے اختلاف
کیا اور یہ فیصلہ دیا کہ بکریاں کچھ عرصے کے لیے کھیتی کے مالک کو دے دی جائیں، وہ ان سے انتفاع کرے اور کھیتی بکری
والے کے سپرد کر دی جائے تاکہ وہ کھیتی کی آب پاشی اور دیکھ بھال کر کے، اسے صحیح کرے، جب وہ اس حالت میں
آجائے جو بکریوں کے چرنے سے پہلے تھی تو کھیتی، کھیتی والے کو اور بکریاں، بکری والے کو واپس کر دی جائیں۔ پہلے
فیصلے کے مقابل میں دوسرا فیصلہ اس لحاظ سے زیادہ بہتر تھا کہ اس میں کسی کو بھی اپنی چیز سے محروم ہونا نہیں پڑا۔ جب کہ
پہلے فیصلے میں بکری والے اپنی بکریوں سے محروم کر دیئے گئے تھے۔ تاہم اللہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی بھی تعریف کی
اور فرمایا کہ ہم نے ہر ایک کو (یعنی داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام دونوں کو) علم و حکمت سے نوازا تھا۔ بعض لوگ
اس سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہر مجتہد، مصیب ہوتا ہے۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ یہ دعویٰ صحیح نہیں۔ کسی
ایک معاملے میں دو الگ الگ (متضاد) فیصلہ کرنے والے دو مجتہد، بیک وقت دونوں مصیب نہیں ہو سکتے، ان میں
ضرور ایک مصیب (درست فیصلہ کرنے والا) ہو گا اور دوسرا غلطی غلط فیصلہ کرنے والا، البتہ یہ الگ بات ہے کہ مجتہد غلطی
عند اللہ گناہ گار نہیں ہو گا، بلکہ اسے ایک اجر ملے گا۔ کمافی الحدیث (فتح القدیر)

(۲) اس سے مراد یہ نہیں کہ پھاڑ ان کی تسبیح کی آواز سے گونج اٹھتے تھے (کیونکہ اس میں تو کوئی اعجاز باقی نہیں رہتا)
ہر کہ و مہ کی اونچی آواز سے پھاڑوں میں گونج پیدا ہو سکتی ہے۔ بلکہ مطلب حضرت داؤد علیہ السلام کی تسبیح کے ساتھ
پھاڑوں کا بھی تسبیح پڑھنا ہے۔ نیز یہ مجازاً نہیں حقیقتاً تھا۔

(۳) یعنی پرندے بھی داؤد علیہ السلام کی پرسوز آواز سن کر اللہ کی تسبیح کرنے لگتے۔ وَالطَّيْرِ يَا تَوْفِيقًا مِّنْهُ فَهُوَ يَنْزِلُ فِي الْبُيُوتِ
الْمُؤْمِنِينَ لِيُخْرِجَهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ تَوَفِّيقًا ۝

ہم کرنے والے ہی تھے۔ (۷۹)

اور ہم نے اسے تمہارے لیے لباس بنانے کی کارگیری سکھائی تاکہ لڑائی کے ضرر سے تمہارا بچاؤ ہو۔ (۲) کیا تم شکر گزار بنو گے؟ (۸۰)

ہم نے تندوتیز ہوا کو سلیمان (علیہ السلام) کے تابع کر دیا (۳) جو اس کے فرمان کے مطابق اس زمین کی طرف چلتی تھی جہاں ہم نے برکت دے رکھی تھی اور ہم ہر چیز سے باخبر اور دانایں۔ (۸۱)

اسی طرح سے بہت سے شیاطین بھی ہم نے اس کے تابع کیے تھے جو اس کے فرمان سے غوطے لگاتے تھے اور اس کے سوا بھی بہت سے کام کرتے تھے، (۴) ان کے نگہبان ہم ہی تھے۔ (۵) (۸۲)

وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُؤٍ لِّكُمْ لِيُحْصِنَكُمْ
مِّنْ بَأْسِكُمْ فَهَلْ أَنْتُمْ شَاكِرُونَ ﴿۷۹﴾

وَلَسَلِمْنَ مِنَ الرِّيحِ عَاصِفَةٍ تَنفِيئِي بِالرِّيحِ إِلَى الْأَرْضِ
الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمِينَ ﴿۸۰﴾

وَمِنَ الشَّيْطَانِ مَن يَفْضُونَ لَكَ وَيَعْمَلُونَ عَمَلًا
دُونَ ذَلِكَ وَكُنَّا لَهُمْ حَافِظِينَ ﴿۸۱﴾

عطف الْجِبَالِ پر ہے یا پھر یہ مرفوع ہے اور خبر محذوف کا مبتدا ہے یعنی وَالطَّيْرُ مُسَخَّرَاتٌ۔ مطلب یہ ہے کہ پرندے بھی داود علیہ السلام کے لیے مسخر کر دیئے گئے تھے (فتح القدیر)

(۱) یعنی یہ تفہیم، ایتائے حکم اور تسخیر، ان سب کے کرنے والے ہم ہی تھے، اس لیے ان میں کسی کو تعجب کرنے کی یا انکار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔

(۲) یعنی لوہے کو ہم نے داود علیہ السلام کے لیے نرم کر دیا تھا، وہ اس سے جنگی لباس، لوہے کی زرہیں تیار کرتے تھے، جو جنگ میں تمہاری حفاظت کا ذریعہ ہیں۔ حضرت قتادہ روایت فرماتے ہیں کہ حضرت داود علیہ السلام سے پہلے بھی زرہیں بنتی تھیں لیکن وہ سادہ بغیر کندوں اور بغیر حلقوں کے ہوتی تھیں۔ حضرت داود علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے کندے دار اور حلقے والی زرہیں بنائیں۔ (ابن کثیر)

(۳) یعنی جس طرح پہاڑ اور پرندے حضرت داود علیہ السلام کے لیے مسخر کر دیئے گئے تھے، اسی طرح ہوا حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دی گئی تھی۔ وہ اپنے اعیان سلطنت سمیت تخت پر بیٹھ جاتے تھے اور جہاں چاہتے، مینوں کی مسافت، لمحوں اور ساعتوں میں طے کر کے وہاں پہنچ جاتے، ہوا آپ کے تخت کو اڑا کر لے جاتی۔ بابرکت زمین سے مراد شام کا علاقہ ہے۔

(۴) جنات بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع تھے جو ان کے حکم سے سمندروں میں غوطے لگاتے اور موتی اور جواہر نکال لاتے، اسی طرح دیگر عمارتی کام، جو آپ چاہتے، کرتے تھے۔

(۵) یعنی جنوں کے اندر جو سرکشی اور فساد کا مادہ ہے، اس سے ہم نے سلیمان علیہ السلام کی حفاظت کی اور وہ ان کے

ایوب (علیہ السلام) کی اس حالت کو یاد کرو جبکہ اس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ مجھے یہ بیماری لگ گئی ہے اور تو رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ (۸۳)

تو ہم نے اس کی سن لی اور جو دکھ انہیں تھا اسے دور کر دیا اور اس کو اہل و عیال عطا فرمائے بلکہ ان کے ساتھ ویسے ہی اور، اپنی خاص مہربانی^(۱) سے تاکہ سچے بندوں کے لیے سبب نصیحت ہو۔ (۸۴)

اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل،^(۲) (علیم السلام) یہ سب صابر لوگ تھے۔ (۸۵)

ہم نے انہیں اپنی رحمت میں داخل کر لیا۔ یہ سب لوگ نیک تھے۔ (۸۶)

مچھلی والے^(۳) (حضرت یونس علیہ السلام) کو یاد کرو! جبکہ

وَإِيُوبَ إِذْ نَادَى رَبَّهُ أِنِّي مَسِيئٌ ضَالٌّ وَأَنْتَ
أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿۸۳﴾

فَأَسْمَعْنَا لَهُ فَكَلَّمْنَا مَائِيَهُ مِنْ ضُرِّهِ وَابْتَدَأْنَا أَهْلَهُ
وَإِنَّمَا نَحْنُ بِمَعَهُمْ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَذِكْرَى
لِلْعَالَمِينَ ﴿۸۴﴾

وَأِسْمَاعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِنَ الصَّابِرِينَ ﴿۸۵﴾

وَأَدْخَلْنَاهُمْ فِي رَحْمَتِنَا إِنَّهُمْ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۸۶﴾

وَذَا النُّونِ إِذْ ذُهِبَ مُغَاضِبًا أَفْقَرًا أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ

آگے سرتابی کی مجال نہیں رکھتے تھے۔

(۱) قرآن مجید میں حضرت ایوب علیہ السلام کو صابر کہا گیا ہے، (سورہ ص۔ ۴۴) اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں سخت آزمائشوں میں ڈالایا جن میں انہوں نے صبر و شکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ یہ آزمائشیں اور تکلیفیں کیا تھیں، اس کی مستند تفصیل تو نہیں ملتی۔ تاہم قرآن کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مال و دولت دینا اور اولاد وغیرہ سے نوازا ہوا تھا، بطور آزمائش اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ سب نعمتیں چھین لیں، حتیٰ کہ جسمانی صحت سے بھی محروم اور بیماریوں میں گھر کر رہ گئے۔ بالآخر کہا جاتا ہے کہ ۱۸ سال کی آزمائشوں کے بعد بارگاہ الہی میں دعا کی، اللہ نے دعا قبول فرمائی اور صحت کے ساتھ مال و اولاد، پلے سے دو گنا عطا فرمائے۔ (اس کی کچھ تفصیل صحیح ابن حبان کی ایک روایت میں ملتی ہے۔ ج۔ ۳، ص ۲۴۴، و مجمع الزوائد ۸/ ۲۰۸) شکوہ شکایت اور جزع فزع صبر کے منافی ہے، جس کا اظہار حضرت ایوب علیہ السلام نے کبھی نہیں کیا۔ البتہ دعا صبر کے منافی نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ”ہم نے قبول کر لی“ کے الفاظ استعمال فرمائے۔

(۲) ذوالکفل کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ نبی تھے یا نہیں؟ بعض ان کی نبوت کے اور بعض ولایت کے قائل ہیں۔ امام ابن جریر نے ان کی بابت توقف اختیار کیا ہے، امام ابن کثیر فرماتے ہیں، قرآن میں نبیوں کے ساتھ ان کا ذکر ان کے نبی ہونے کو ظاہر کرتا ہے، وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔

(۳) مچھلی والے سے مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں جو اپنی قوم سے ناراض ہو کر اور انہیں عذاب الہی کی دھمکی دے

وہ غصہ سے چل دیا اور خیال کیا کہ ہم اسے نہ پکڑ سکیں گے۔ بالآخر وہ اندھیروں^(۱) کے اندر سے پکار اٹھا کہ الہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے، بیشک میں ظالموں میں ہو گیا۔ (۸۷)

تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور اسے غم سے نجات دے دی اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح بچالیا کرتے ہیں۔ (۸۸)^(۲)

اور زکریا (علیہ السلام) کو یاد کرو جب اس نے اپنے رب سے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! مجھے تہمانہ چھوڑ، تو سب سے بہتر وارث ہے۔ (۸۹)

ہم نے اس کی دعا کو قبول فرما کر اسے بچی (علیہ السلام) عطا فرمایا^(۳) اور ان کی بیوی کو ان کے لیے درست کر دیا۔^(۴) یہ بزرگ لوگ نیک کاموں کی طرف جلدی کرتے تھے اور ہمیں لالچ طمع اور ڈر خوف سے پکارتے تھے۔ اور ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے۔ (۹۰)^(۵)

فَتَنَادَى فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَوْلَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ
إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۸۷﴾

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْعَمَىٰ وَكَذَٰلِكَ
نُصْعِي الْمُؤْمِنِينَ ﴿۸۸﴾
وَرَكَعًا يُدْعَىٰ رَبَّهُ رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا
وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ ﴿۸۹﴾

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ
إِنَّهُمْ كَانُوا يُسْرِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا
رِعْبًا وَرَهْبًا وَكَانُوا آتَاخِضِينَ ﴿۹۰﴾

کر، اللہ کے حکم کے بغیر ہی وہاں سے چل دیئے تھے، جس پر اللہ نے ان کی گرفت فرمائی اور انہیں مچھلی کا لقمہ بنا دیا، اس کی کچھ تفصیل سورہ یونس میں گزر چکی ہے اور کچھ سورہ صافات میں آئے گی۔

(۱) ظُلُمَاتٌ، ظلمت کی جمع ہے، یعنی اندھیرا۔ حضرت یونس علیہ السلام متعدد اندھیروں میں گھر گئے۔ رات کا اندھیرا، سمندر کا اندھیرا، اور مچھلی کے پیٹ کا اندھیرا۔

(۲) ہم نے یونس علیہ السلام کی دعا قبول کی اور اسے اندھیروں سے اور مچھلی کے پیٹ سے نجات دی اور جو بھی مومن ہمیں اس طرح شہداء اور مصیبتوں میں پکارے گا، ہم اسے نجات دیں گے۔ حدیث میں بھی آتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جس مسلمان نے بھی اس دعا کے ساتھ کسی معاملے کے لیے دعا مانگی تو اللہ نے اسے قبول فرمایا ہے۔“

(جامع ترمذی۔ نمبر ۳۵۰۶ و صحیحہ الالبانی)

(۳) حضرت زکریا علیہ السلام کا بڑھاپے میں اولاد کے لیے دعا کرنا اور اللہ کی طرف سے اس کا عطا کیا جانا، اس کی ضروری تفصیل سورہ آل عمران اور سورہ طہ میں گزر چکی ہے۔ یہاں بھی اس کی طرف اشارہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

(۴) یعنی وہ بانجھ اور ناقابل اولاد تھی، ہم نے اس کے اس نقص کا ازالہ فرما کر اسے نیک بچہ عطا فرمایا۔

(۵) گویا قبولیت دعا کے لیے ضروری ہے کہ ان باتوں کا اہتمام کیا جائے جن کا بطور خاص یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً الخراج و

اور وہ پاک دامن بی بی جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی ہم نے اس کے اندر اپنی روح سے پھونک دی اور خود انہیں اور ان کے لڑکے کو تمام جہان کے لیے نشانی بنا دیا۔^(۹۱)

یہ تمہاری امت ہے جو حقیقت میں ایک ہی امت ہے،^(۹۲) اور میں تم سب کا پروردگار ہوں پس تم میری ہی عبادت کرو۔ (۹۲)

مگر لوگوں نے آپس میں اپنے دین میں فرقہ بندیوں کر لیں، سب کے سب ہماری ہی طرف لوٹنے والے ہیں۔^(۹۳) پھر جو بھی نیک عمل کرے اور وہ مومن (بھی) ہو تو اس کی کوشش کی بے قدری نہیں کی جائے گی۔ ہم تو اس کے لکھنے والے ہیں۔ (۹۴)

اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا اس پر لازم ہے کہ وہاں کے لوگ پلٹ کر نہیں آئیں گے۔^(۹۵)

وَالَّتِي أَحْصَدَتْ قَرْحَهَا فَفَعَّخْنَا فِيهَا مِنْ دُوْحِنَا
وَجَعَلْنَا وَابِنَهَا آيَةً لِلْعَالَمِينَ ﴿۹۱﴾

إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً
وَإَنَا نَكُمُ الْعَابِدُونَ ﴿۹۲﴾

وَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ كُلُّ إِلَهِنَا مَعْبُودٌ ﴿۹۳﴾

فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَنْفِرَنَّ
لِسَعْيِهِ وَإِنَّا لَهُ كَاتِبُونَ ﴿۹۴﴾

وَحَرَّمَ عَلَى قَرَبِيٍّ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿۹۵﴾

زاری کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں دعا و مناجات، نیکی کے کاموں میں سبقت، خوف و طمع کے ملے جلے جذبات کے ساتھ رب کو پکارنا اور اس کے سامنے عاجزی اور خشوع خضوع کا اظہار۔

(۱) یہ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ ملیحما السلام کا تذکرہ ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔

(۲) اُمَّةً سے مراد یہاں دین یا ملت ہے یعنی تمہارا دین یا ملت ایک ہی ہے اور وہ دین ہے دین توحید، جس کی دعوت تمام انبیاء نے دی اور ملت، ملت اسلام ہے جو تمام انبیاء کی ملت رہی ہے۔ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ہم انبیاء کی جماعت اولاد علالت ہیں“ (جن کا باپ ایک اور مائیں مختلف ہوں) ہمارا دین ایک ہی ہے۔“ (ابن کثیر)

(۳) یعنی دین توحید اور عبادت رب کو چھوڑ کر مختلف فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ تو مشرکین اور کفار کا ہو گیا اور انبیاء و رسل کے ماننے والے بھی احزاب بن گئے، کوئی یہودی ہو گیا، کوئی عیسائی، کوئی کچھ اور۔ اور بد قسمتی سے یہ فرقہ بندیوں خود مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گئیں اور یہ بھی بیسیوں فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان سب کا فیصلہ، جب یہ بارگاہ الہی میں لوٹ کر جائیں گے۔ تو وہیں ہو گا۔

(۴) حَرَامٌ، واجب کے معنی میں ہے، جیسا کہ ترجمے سے واضح ہے۔ یا پھر لَا يَرْجِعُونَ میں لَا زَائِدٌ ہے، یعنی جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا، اس کا دنیا میں پلٹ کر آنا حرام ہے۔

یہاں تک کہ یاجوج اور ماجوج کھول دیئے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے دوڑتے ہوئے آئیں گے۔^(۱) (۹۶)

اور سچا وعدہ قریب آگے گا اس وقت کافروں کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی،^(۲) کہ ہائے افسوس! ہم اس حال سے غافل تھے بلکہ فی الواقع ہم قصور وار تھے۔ (۹۷)

تم اور اللہ کے سوا جن جن کی تم عبادت کرتے ہو، سب دوزخ کا ایندھن بنو گے، تم سب دوزخ میں جانے والے ہو۔^(۳) (۹۸)

اگر یہ (سچے) معبود ہوتے تو جہنم میں داخل نہ ہوتے، اور سب کے سب اسی میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔^(۴) (۹۹)

حَتَّىٰ اِنَّا فُتِحَتْ يٰۤاٰجُوۡجُ وَمَا جُوۡجُ وَهُمْ مِّنۢ بَلَدٍ
حَدِيۡبٍ يَّبۡسُوۡنَ ﴿۹۶﴾
وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبۡصَاۡرَ الَّذِيۡنَ
كَفَرُوۡا وَاِيۡوِيۡنَا قَدۡ كُنَّا فِيۡ غَفۡلَةٍ مِّنۡ هٰذَا بَلۡ
كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۹۷﴾
اِنَّكُمْ وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ
اَنْتُمْ لَهَا وُودُوۡنَ ﴿۹۸﴾
لَوْ كَانَ هَؤُلَآءَ الٰهَةً مَا وُودُوۡهُمۡ وَكُلٌّ فِيۡهَا
خٰلِدُوۡنَ ﴿۹۹﴾

(۱) یاجوج و ماجوج کی ضروری تفصیل سورہ کف کے آخر میں گزر چکی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں قیامت کے قریب ان کا ظہور ہو گا اور اتنی تیزی اور کثرت سے یہ ہر طرف پھیل جائیں گے کہ ہر اونچی جگہ سے یہ دوڑتے ہوئے محسوس ہوں گے۔ ان کی فساد انگیزیوں اور شرارتوں سے اہل ایمان تنگ آجائیں گے حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اہل ایمان کو ساتھ لے کر کوہ طور پر پناہ گزین ہو جائیں گے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بددعا سے یہ ہلاک ہو جائیں گے۔ ان کی لاشوں کی سڑاند اور بدبو ہر طرف پھیلی ہوگی، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ پرندے بھیجے گا جو ان کی لاشوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں گے۔ پھر ایک زوردار بارش نازل فرمائے گا، جس سے ساری زمین صاف ہو جائے گی۔ (یہ ساری تفصیلات صحیح احادیث میں بیان کی گئی ہیں۔ تفصیل کے لیے تفسیر ابن کثیر ملاحظہ ہو)

(۲) یعنی یاجوج و ماجوج کے خروج کے بعد قیامت کا وعدہ، جو برحق ہے، بالکل قریب آجائے گا اور جب یہ قیامت برپا ہو گی تو شدت ہولناکی کی وجہ سے کافروں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔

(۳) یہ آیت مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو لات و منات اور عزلی و مہل کی پوجا کرتے تھے۔ یہ سب پتھر کی مورتیاں تھیں۔ جو جمادات یعنی غیر عاقل تھیں، اسی لیے آیت میں مَا تَعْبُدُوۡنَ کے الفاظ ہیں اور عربی میں ”مَا“ غیر عاقل کے لیے آتا ہے۔ یعنی کہا جا رہا ہے کہ تم بھی اور تمہارے یہ معبود بھی جن کی مورتیاں بنا کر تم نے عبادت کے لیے رکھی ہوئی ہیں، سب جہنم کا ایندھن ہیں۔ پتھر کی مورتیوں کا اگرچہ کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ وہ تو غیر عاقل اور بے شعور ہیں۔ لیکن انہیں پجاریوں کے ساتھ جہنم میں صرف مشرکوں کو مزید ذلیل و رسوا کرنے کے لیے ڈالا جائے گا کہ جن معبودوں کو تم اپنا سارا سمجھتے تھے، وہ بھی تمہارے ساتھ ہی جہنم میں، جہنم کا ایندھن ہیں۔

(۴) یعنی اگر یہ واقعی معبود ہوتے تو بااختیار ہوتے اور تمہیں جہنم میں جانے سے روک لیتے۔ لیکن وہ تو خود بھی جہنم میں بطور

وہ وہاں چلا رہے ہوں گے اور وہاں کچھ بھی نہ سن سکیں گے۔^(۱۰۰)

البتہ بے شک جن کے لیے ہماری طرف سے نیکی پہلے ہی ٹھہر چکی ہے۔ وہ سب جہنم سے دور ہی رکھے جائیں گے۔^(۱۰۱)

وہ تو دوزخ کی آہٹ تک نہ سنیں گے اور اپنی من بھاتی چیزوں میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔^(۱۰۲)

وہ بڑی گھبراہٹ^(۳) (بھی) انہیں غمگین نہ کر سکے گی اور فرشتے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے، کہ یہی تمہارا وہ دن ہے جس کا تم وعدہ دیئے جاتے رہے۔^(۱۰۳)

جس دن ہم آسمان کو یوں لپیٹ لیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیئے جاتے ہیں،^(۴) جیسے کہ ہم نے اول

لَهُمْ فِيهَا زُفَيْرٌ وَهُمْ فِيهَا لَا يُسْمَعُونَ ﴿۱۰۰﴾

إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ﴿۱۰۱﴾

لَا يُسْمَعُونَ حَيْثُمَا هُمْ وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنفُسُهُمْ خَالِدُونَ ﴿۱۰۲﴾

لَا يَخَظُّهُمْ الْقَزَعُ الْكَبِيرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ هَذَا يَوْمُكُمْ الَّذِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۱۰۳﴾

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِ لِلْكُتُبِ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ

عبرت کے جارہے ہیں۔ تمہیں جانے سے کس طرح روک سکتے ہیں۔ نتیجتاً عابد و معبود دونوں ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

(۱) یعنی سارے کے سارے شدت غم و الم سے چیخ اور چلا رہے ہوں گے، جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی آواز بھی نہیں سن سکیں گے۔

(۲) بعض لوگوں کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو سکتا تھا یا مشرکین کی طرف سے پیدا کیا جاسکتا تھا، جیسا کہ فی الواقع کیا جاتا ہے کہ عبادت تو حضرت عیسیٰ و عزیر علیہما السلام، فرشتوں اور بہت سے صالحین کی بھی کی جاتی ہے۔ تو کیا یہ بھی اپنے عابدین کے ساتھ جہنم میں ڈالے جائیں گے؟ اس آیت میں اس کا ازالہ کر دیا گیا ہے کہ یہ لوگ تو اللہ کے نیک بندے تھے جن کی نیکیوں کی وجہ سے اللہ کی طرف سے ان کے لیے نیکی یعنی سعادت ابدی یا بشارت جنت ٹھہرائی جا چکی ہے۔ یہ جہنم سے دور ہی رہیں گے۔ انہی الفاظ سے یہ مفہوم بھی واضح طور پر نکلتا ہے کہ جو لوگ دنیا میں یہ خواہش رکھتے ہوں گے کہ ان کی قبروں پر بھی تہہ نہیں اور لوگ انہیں قاضی الحاجات سمجھ کر ان کے نام کی نذر و نیاز دیں اور ان کی پرستش کریں، یہ بھی پتھر کی مورتیوں کی طرح جہنم کا بندھن ہوں گے، کیونکہ غیر اللہ کی پرستش کے داعی سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ میں یقیناً نہیں آتے۔

(۳) بڑی گھبراہٹ سے موت یا صور اسرائیل مراد ہے یا وہ لمحہ جب دوزخ اور جنت کے درمیان موت کو ذبح کر دیا جائے گا۔ دوسری بات یعنی صور اسرائیل اور قیام قیامت سیاق کے زیادہ قریب ہے۔

(۴) یعنی جس طرح کاتب لکھنے کے بعد اوراق یا رجسٹر لپیٹ کر رکھ دیتا ہے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَالْتَمِثْ﴾

خَلَقَ تَمِيْدًا وَعَدَا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۲۰﴾

دفعہ پیدائش کی تھی اسی طرح دوبارہ کریں گے۔ یہ ہمارے ذمے وعدہ ہے اور ہم اسے ضرور کر کے (ہی) رہیں گے۔ (۱۰۳)

ہم زبور میں پند و نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے^(۱) (ہی) ہوں گے۔ (۱۰۵)

عبادت گزار بندوں کے لیے تو اس میں ایک بڑا پیغام ہے۔^(۲) (۱۰۶)

اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزُّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الْمَدِّ الْكِرٰنِ اَنْ اَرْضُ

يَرْضٰهَا عِبَادِي الصّٰلِحُوْنَ ﴿۲۱﴾

اِنَّ فِيْ هٰذَا الْبَلٰغٰتِ لَقُوْمٌ عٰبِدِيْنَ ﴿۲۲﴾

وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾

مَطْوُوْرٰتِۙ بِسْمِيْنٰہِ ﴿ (الزمر۔ ۱۷) ”آسان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے“ سِبْجَلٌ کے معنی صحیفہ یا رجسٹر ہیں۔ لِّلْكِتٰبِ کے معنی ہیں عَلٰی الْكِتٰبِ بِمَعْنٰی الْمَكْتُوْبِ (تفسیر ابن کثیر) مطلب یہ ہے کہ کاتب کے لیے لکھے ہوئے کاغذات کو لپیٹ لینا جس طرح آسان ہے، اسی طرح اللہ کے لیے آسان کی وسعتوں کو اپنے ہاتھ میں سمیٹ لینا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔

(۱) زُبُوْر سے مراد یا تو زبور ہی ہے اور ذکر سے مراد پند و نصیحت، جیسا کہ ترجمہ میں درج ہے یا پھر زبور سے مراد گزشتہ آسمانی کتابیں اور ذکر سے مراد لوح محفوظ ہے۔ یعنی پہلے تو لوح محفوظ میں یہ بات درج ہے اور اس کے بعد آسمانی کتابوں میں بھی یہ بات لکھی جاتی رہی ہے کہ زمین کے وارث نیک بندے ہوں گے۔ زمین سے مراد بعض مفسرین کے نزدیک جنت ہے اور بعض کے نزدیک ارض کفار۔ یعنی اللہ کے نیک بندے زمین میں اقتدار کے مالک ہوں گے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان جب تک اللہ کے نیک بندے رہے، وہ دنیا میں بااقتدار اور سرخرو رہے اور آئندہ بھی جب کبھی وہ اس صفت کے حامل ہوں گے، اس وعدہ الہی کے مطابق، زمین کا اقتدار انہی کے پاس ہو گا۔ اس لیے مسلمانوں کی محرومی اقتدار کی موجودہ صورت، کسی اشکال کا باعث نہیں بننی چاہیے۔ یہ وعدہ مشروط ہے صالحیت عباد کے ساتھ۔ اور اِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوْطُ کے مطابق جب مسلمان اس خوبی سے محروم ہو گئے تو اقتدار سے بھی محروم کر دیئے گئے۔ اس میں گویا حصول اقتدار کا طریقہ بتلایا گیا ہے اور وہ ہے صالحیت، یعنی اللہ رسول کے احکامات کے مطابق زندگی گزارنا اور اس کے حدود و ضابطوں پر کاربند رہنا۔

(۲) فِيْ هٰذَا سے مراد، وہ وعظ و تنبیہ ہے جو اس سورت میں مختلف انداز سے بیان کی گئی ہے۔ بلاغ سے مراد کفایت و منفعت ہے، یعنی وہ کافی اور مفید ہے۔ یا اس سے مراد قرآن مجید ہے جس میں مسلمانوں کے لیے منفعت اور کفایت ہے۔ عابدین سے مراد، خشوع خضوع سے اللہ کی عبادت کرنے والے، اور شیطان اور خواہشات نفس پر اللہ کی اطاعت کو ترجیح دینے والے ہیں۔

ہی بھیجا ہے۔^(۱) (۱۰۷)

کہہ دیجئے میرے پاس تو پس وحی کی جاتی ہے کہ تم سب کا معبود ایک ہی ہے، تو کیا تم بھی اس کی فرمانبرداری کرنے والے ہو؟^(۲) (۱۰۸)

پھر اگر یہ منہ موڑ لیں تو کہہ دیجئے کہ میں نے تمہیں یکساں طور پر خبردار کر دیا ہے۔^(۳) مجھے علم نہیں کہ جس کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا دور۔^(۴) (۱۰۹)

البتہ اللہ تعالیٰ تو کھلی اور ظاہرات کو بھی جانتا ہے اور جو تم چھپاتے ہو اسے بھی جانتا ہے۔ (۱۱۰)

قُلْ اِنَّمَا يُوحِي اِلَيَّ اَنَّمَا الْهَكْمُ اِلَهُ وَاحِدٌ فَهَلْ اَنْتُمْ سٰئِلُوْنَ ۝

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاَقْبَلْ اَذْنَابَكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ وَاَنْ اَدْرِىَ اَقْرَبُ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تَوْعَدُوْنَ ۝

اِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ۝

(۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان لے آئے گا، اس نے گویا اس رحمت کو قبول کر لیا اور اللہ کی اس نعمت کا شکر ادا کیا، نتیجتاً دنیا و آخرت کی سعادتوں سے ہم کنار ہو گا اور چونکہ آپ ﷺ کی رسالت پورے جہان کے لیے ہے، اس لیے آپ ﷺ پورے جہان کے لیے رحمت بن کر یعنی اپنی تعلیمات کے ذریعے سے دین و دنیا کی سعادتوں سے ہم کنار کرنے کے لیے آئے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس اعتبار سے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جہان والوں کے لیے رحمت قرار دیا ہے کہ آپ ﷺ کی وجہ سے یہ امت، بالکلہ تباہی و بربادی سے محفوظ کر دی گئی۔ جیسے پچھلی توہین اور امتیں حرف غلط کی طرح مٹا دی جاتی رہیں، امت محمدیہ (جو امت اجابت اور امت دعوت کے اعتبار سے پوری نوع انسانی پر مشتمل ہے) پر اس طرح کا کلی عذاب نہیں آئے گا۔ اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کے لیے بددعا نہ کرنا، یہ بھی آپ ﷺ کی رحمت کا ایک حصہ تھا۔ اِنِّي لَمْ اُبْعَثْ لِعٰنَا وَاِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً (صحیح مسلم نمبر ۲۰۰۶) اسی طرح غصے میں کسی مسلمان کو لعنت یا سب و شتم کرنے کو بھی قیامت والے دن رحمت کا باعث قرار دینا، آپ ﷺ کی رحمت کا حصہ ہے۔ (مسند أحمد ۵/ ۳۳۷، أبو داؤد نمبر ۳۶۵۹۔ والاحادیث الصحیحة للالبانی نمبر ۱۱۷۵۸) اسی لیے ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: اِنَّمَا اَنَا رَحْمَةٌ مُّهْدَاةٌ (صحیح الجامع الصغیر نمبر ۲۳۳۵) "میں رحمت مجسم بن کر آیا ہوں، جو اللہ کی طرف سے اہل جہان کے لیے ایک ہدیہ ہے۔"

(۲) اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اصل رحمت توحید کو اپنالینا اور شرک سے بچ جانا ہے۔

(۳) یعنی جس طرح میں جانتا ہوں کہ تم میری دعوت توحید و اسلام سے منہ موڑ کر میرے دشمن ہو، اسی طرح تمہیں بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میں بھی تمہارا دشمن ہوں اور ہماری تمہاری آپس میں کھلی جنگ ہے۔

(۴) اس وعدے سے مراد قیامت ہے یا غلبہ اسلام و مسلمین کا وعدہ یا وہ وعدہ جب اللہ کی طرف سے تمہارے خلاف جنگ کرنے کی مجھے اجازت دی جائے گی۔

مجھے اس کا بھی علم نہیں، ممکن ہے یہ تمہاری آزمائش ہو اور ایک مقررہ وقت تک کا فائدہ (بچپانا) ہے۔ (۱۱۱)

خود نبی نے کہا^(۱) اے رب! انصاف کے ساتھ فیصلہ فرما اور ہمارا رب بڑا مہربان ہے جس سے مدد طلب کی جاتی ہے ان باتوں پر جو تم بیان کرتے ہو۔ (۱۱۲)^(۲)

سورہ حج مدنی ہے اور اس کی اٹھتر آیتیں اور دس رکوع ہیں۔

سب سے زیادہ مہربان بہت رحم والے اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں

لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو! بلاشبہ قیامت کا زلزلہ بہت ہی بڑی چیز ہے۔ (۱)

جس دن تم اسے دیکھ لو گے ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور تمام حمل والیوں کے حمل گر جائیں گے اور تو دیکھے گا کہ لوگ مدہوش دکھائی دیں گے، حالانکہ درحقیقت وہ متوالے نہ ہوں گے لیکن اللہ کا عذاب بڑا ہی سخت ہے۔ (۲)^(۳)

بعض لوگ اللہ کے بارے میں باتیں بناتے ہیں اور وہ

(۱) یعنی اس وعدہ الہی میں تاخیر میں نہیں جانتا کہ تمہاری آزمائش کے لیے ہے یا ایک خاص وقت تک فائدہ اٹھانے کے لیے مہلت دینا ہے۔

(۲) یعنی میری بابت جو تم مختلف باتیں کرتے رہتے ہو، یا اللہ کے لیے اولاد ٹھہراتے ہو، ان سب باتوں کے مقابلے میں وہ رب ہی مہربانی کرنے والا اور وہی مدد کرنے والا ہے۔

☆ اس کے کئی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ اس کا کچھ حصہ کئی اور کچھ مدنی ہے۔ قائلہ القُرْطُبِيُّ (فتح القدير) یہ قرآن کریم کی واحد سورت ہے جس میں دو سجدے ہیں۔

(۳) آیت مذکورہ میں جس زلزلے کا ذکر ہے، جس کے نتائج دو سری آیت میں بتلائے گئے ہیں۔ جس کا مطلب لوگوں پر سخت خوف، دہشت اور گھبراہٹ کا طاری ہونا ہے، یہ قیامت سے قبل ہو گا اور اس کے ساتھ ہی دنیا فنا ہو جائے گی۔ یا یہ قیامت کے بعد اس وقت ہو گا جب لوگ قبروں سے اٹھ کر میدانِ محشر میں جمع ہوں گے۔ بہت سے مفسرین پہلی رائے

وَلَنْ أَدْرِي أَعَلَّه فُتِنَهُ لَكُمْ وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ۝

قُلْ رَبِّ احْكُم بِالْحَقِّ وَرَبُّنَا الرَّحْمَنُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا نَصِفُونَ ۝



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ۝

يَوْمَ تَرَوْهُوَ تَدَاهُلٌ كُلُّ مَرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُمُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَرَىٰ وَمَا هُمْ بِسُكَرَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيدٌ ۝

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّبِعُهُ

كُلَّ شَيْطَانٍ يَكْرِيهِ ۝

بھی بے علمی کے ساتھ اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔^(۱) (۳)

جس پر (قضائے الہی) لکھ دی گئی ہے کہ جو کوئی اس کی رفاقت کرے گا وہ اسے گمراہ کر دے گا اور اسے آگ کے عذاب کی طرف لے جائے گا۔^(۲)

لوگو! اگر تمہیں مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے تو سوچو ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پھر خون بستے سے پھر گوشت کے لو تھڑے سے جو صورت دیا گیا تھا اور بے نقشہ تھا۔^(۳) یہ ہم تم پر ظاہر کر دیتے

كُتِبَ عَلَيْهِ أَنَّهُ مَنْ تَوَلَّاهُ فَإِنَّهُ يُضَلُّ وَيَهْدِيهِ إِلَى عَذَابِ السَّعِيرِ ۝

يَأْتِيهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نَرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ مُخْلَقَةٍ وَغَيْرِ مُخْلَقَةٍ لِنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقَرُّو

کے قائل ہیں۔ جب کہ بعض مفسرین دوسری رائے کے۔ اور اس کی تائید میں وہ احادیث پیش کرتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو حکم دے گا کہ وہ اپنی ذریت میں سے ہزار میں سے ۹۹۹ جنم کے لیے نکال دے۔ یہ بات سن کر حمل والیوں کے حمل گر جائیں گے، بچے بوڑھے ہو جائیں گے اور لوگ مدہوش سے نظر آئیں گے حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے، صرف عذاب کی شدت ہوگی۔ یہ بات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بڑی گراں گزری، ان کے چہرے متغیر ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا؛ (گھبراؤ نہیں) یہ ۹۹۹ یا جوج و ما جوج میں سے ہوں گے اور تم میں سے صرف ایک ہوگا، تمہاری (تعداد) لوگوں میں اس طرح ہوگی جیسے سفید رنگ کے بیل کے پہلو میں، کالے بال یا کالے رنگ کے بیل کے پہلو میں سفید بال ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ اہل جنت میں تم چوتھائی، یا تہائی یا نصف ہو گے، جسے سن کر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بطور مسرت کے اللہ اکبر کا نعرو بلند کیا؛ (صحیح بخاری تفسیر مسورۃ الحج) پہلی رائے بھی بے وزن نہیں ہے۔ بعض ضعیف احادیث سے ان کی بھی تائید ہوتی ہے۔ اس لیے زلزلہ اور اس کی کیفیات سے مراد اگر فزع اور ہولناکی کی شدت ہے (اور بظاہر یہی ہے) تو سخت گھبراہٹ اور ہولناکی کی یہ کیفیت دونوں موقعوں پر ہی ہوگی۔ اس لیے دونوں ہی رائیں صحیح ہو سکتی ہیں، کیونکہ دونوں موقعوں پر لوگوں کی کیفیت ایسی ہوگی، جیسی اس آیت میں اور صحیح بخاری کی روایت میں بیان کی گئی ہے۔

(۱) مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے، یا اس کی اولاد ہے وغیرہ وغیرہ۔

(۲) یعنی شیطان کی بابت تقدیر الہی میں یہ بات ثابت ہے۔

(۳) یعنی نطفہ (قطرہ منی) سے چالیس روز کے بعد عَلَقَةٌ گاڑھا خون اور عَلَقَةٌ سے مُضْغَةٌ گوشت کا لو تھڑا بن جاتا ہے مُخْلَقَةٌ سے، وہ بچہ مراد ہے جس کی پیدائش واضح اور شکل و صورت نمایاں ہو جائے ایسے بچے میں روح پھونک دی جاتی ہے اور تکمیل کے بعد اس کی ولادت ہو جاتی ہے اور غیر مخلوقہ، اس کے برعکس، جس کی شکل و صورت

فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَأُ إِلَىٰ آجِلٍ نُّسَمِّي نَفْسًا
نُحْرَجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشَدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَنْ
يُتَوَفَّىٰ وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا
يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا وَسَرَىٰ الْأَمْرَاضَ
هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ
وَرَبَّتْ وَانبَسَّتْ مِنْ كُلِّ رُوحٍ بَهِيحٌ ۝

ہیں، اور ہم جسے چاہیں ایک ٹھہرائے ہوئے وقت تک
رحمِ مادر میں رکھتے ہیں (۲) پھر تمہیں بچپن کی حالت میں دنیا
میں لاتے ہیں پھر تاکہ تم اپنی پوری جوانی کو پہنچو، تم میں سے
بعض تو وہ ہیں جو فوت کر لیے جاتے ہیں (۳) اور بعض بے
غرض عمر کی طرف پھر سے لوٹا دیے جاتے ہیں کہ وہ ایک چیز
سے باخبر ہونے کے بعد پھر بے خبر ہو جائے۔ (۴) تو دیکھتا ہے
کہ زمین (نجر اور) خشک ہے پھر جب ہم اس پر بارشیں
برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے اور پھولتی ہے اور ہر قسم
کی رونق دار نباتات اگاتی ہے۔ (۵) (۵)

واضح نہ ہو، نہ اس میں روح پھونکی جائے اور قبل از وقت ہی وہ ساقط ہو جائے۔ صحیح احادیث میں بھی رحمِ مادر کی ان
کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ نطفہ چالیس دن کے بعد عَلَقِيَّة (گاڑھا خون) بن جاتا ہے، پھر
چالیس دن کے بعد یہ مُضْغَةٌ (لوٹھڑا یا گوشت کی بوٹی) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ
آتا ہے، جو اس میں روح پھونکتا ہے۔ یعنی چار مہینے کے بعد نَفْحُ رُوحِ ہوتا ہے اور بچہ ایک واضح شکل میں ڈھل جاتا ہے۔
(صحیح بخاری کتاب الأنبياء و کتاب القدر، مسلم کتاب القدر، باب كيفية الخلق الأدمي)

(۱) یعنی اس طرح ہم اپنا کمال قدرت و تخلیق تمہارے لیے بیان کرتے ہیں۔

(۲) یعنی جس کو ساقط کرنا نہیں ہوتا۔

(۳) یعنی عمر اشد سے پہلے ہی۔ عمر اشد سے مراد بلوغت یا کمال عقل و کمال قوت و تمیز کی عمر ہے، جو ۳۰ سے ۴۰ سال
کے درمیان کی عمر ہے۔

(۴) اس سے مراد بڑھاپے میں قوائے انسانی میں ضعف و انحطاط کے ساتھ عقل و حافظہ کا کمزور ہو جانا اور یادداشت
اور عقل و فہم میں بچے کی طرح ہو جانا ہے، جسے سورۃ یٰسین میں ﴿ وَ مِمَّنْ تَعْبُرُهُا كُنُوزٌ فِي الْغَلَقِ ﴾ اور سورۃ تین میں
﴿ تَرَوْنَهَا تَأْسَفُ سَعِيلِينَ ﴾ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۵) یہ احیائے موتی (مردوں کے زندہ کرنے) پر اللہ تعالیٰ کے قادر ہونے کی دوسری دلیل ہے۔ پہلی دلیل جو مذکور
ہوئی، یہ تھی کہ جو ذات ایک حقیر قطرہ پانی سے اس طرح ایک انسانی پیکر تراش سکتا اور ایک حسین وجود عطا کر سکتا ہے،
علاوہ ازیں وہ اسے مختلف مراحل سے گزارتا ہوا بڑھاپے کے ایسے اسٹیج پر پہنچا سکتا ہے جہاں اس کے جسم سے لے کر
اس کی ذہنی و دماغی صلاحیتیں تک، سب ضعف و انحطاط کا شکار ہو جائیں۔ کیا اس کے لیے اسے دوبارہ زندگی عطا کر دینا
مشکل ہے؟ یقیناً جو ذات انسان کو ان مراحل سے گزار سکتی ہے، وہی ذات مرنے کے بعد بھی اسے دوبارہ زندہ کر کے
ایک نیا قالب اور نیا وجود بخش سکتی ہے دوسری دلیل یہ دی ہے کہ دیکھو زمین نجر اور مردہ ہوتی ہے لیکن بارش کے بعد

یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہی مردوں کو جلاتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ (۶)

اور یہ کہ قیامت قطعاً آنے والی ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں اور یقیناً اللہ تعالیٰ قبروں والوں کو دوبارہ زندہ فرمائے گا۔ (۷)

بعض لوگ اللہ کے بارے میں بغیر علم کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر روشن کتاب کے جھگڑتے ہیں۔ (۸)

جو اپنی پہلو موڑنے والا بن کر^(۱) اس لیے کہ اللہ کی راہ سے ہٹا دے، اسے دنیا میں بھی رسوائی ہوگی اور قیامت کے دن بھی، ہم اسے جہنم میں جلنے کا عذاب چکھائیں گے۔ (۹)

یہ ان اعمال کی وجہ سے جو تیرے ہاتھوں نے آگے بھیج رکھے تھے۔ یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ (۱۰)

بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ ایک کنارے پر (کھڑے) ہو

ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُعْجِي الْمَوْتَىٰ
وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٦﴾
وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا وَإِنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَنْ
فِي الْقُبُورِ ﴿٧﴾

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى
وَلَا كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴿٨﴾

ثَانِيًا عَطَفَهُ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَهُ فِي الدُّنْيَا
خِزْيٌ وَنَذِيرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَذَابَ الْعَرِينِ ﴿٩﴾

ذَلِكَ بِمَا قَاتَلْتُم مَّت يَدُكُمْ وَإِنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَالِمٍ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿١٠﴾

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْبَدُ اللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ فَإِنْ أَصَابَهُ

یہ کس طرح زندہ اور شاداب اور انواع و اقسام کے غلے، میوہ جات اور رنگ برنگ کے پھولوں سے مالا مال ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت والے دن انسانوں کو بھی ان کی قبروں سے اٹھا کھڑا کرے گا۔ جس طرح حدیث میں ہے۔ ایک صحابی جو بیٹھنے لگا پوچھا اللہ تعالیٰ انسانوں کو جس طرح پیدا فرمائے گا، اس کی کوئی نشانی مخلوقات میں سے بیان فرمائیے! نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تمہارا گزر ایسی وادی سے ہوا ہے جو خشک اور بخر ہو، پھر دوبارہ اسے لہلہاتا ہوا دیکھا ہو؟ اس نے کہا۔ ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا، بس اسی طرح انسانوں کا جی اٹھنا ہو گا۔ (مسند أحمد جلد ۳۔ ص ۱۱۔ ابن ماجہ المقدمة، حدیث نمبر ۱۸۰)

(۱) ثانیاً، اسم فاعل ہے۔ موڑنے والا۔ عطف کے معنی پہلو کے ہیں۔ یہ یُجَادِلُ سے حال ہے۔ اس میں اس شخص کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو بغیر کسی عقلی اور نقلی دلیل کے اللہ کے بارے میں جھگڑتا ہے کہ وہ تکبر اور اعراض کرتے ہوئے اپنی گردن موڑتے ہوئے پھرتا ہے جیسے دوسرے مقالات پر اس کیفیت کو ان الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے۔ — ﴿وَلِي مُّسْتَكْبِرًا كَانُ لَمْ يَسْمَعْهَا﴾ — ﴿لِقَمَانِ ۷﴾ ﴿لَوَارِثُ وَاوْسَمُ﴾ ﴿الْمَنَافِقُونَ ۵﴾ ﴿أَعْرَضَ وَنَأَمَّنَا بَنِي﴾ ﴿بَنِي

خَيْرُ اِيْمَانٍ بِهِ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ اِنْقَلَبَ عَلٰى
وَجْهِهِ بِحَسْرَةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ذَلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ
الْمُبِينُ ⑪

کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اگر کوئی نفع مل گیا تو دلچسپی
لینے لگتے ہیں اور اگر کوئی آفت آگئی تو اسی وقت منہ پھیر
لیتے ہیں،^(۱۱) انہوں نے دونوں جہان کا نقصان اٹھالیا۔
واقعی یہ کھلا نقصان ہے۔ (۱۱)

يَذْعُوْنَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْصُرُهُمْ وَا لَا يَنْفَعُهُمْ ذَلِكَ هُوَ
الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ⑫
يَذْعُوْنَ لِمَنْ هُوَ اَقْرَبُ مِنْ نَفْعِهِمْ لَيْسَ الْمَوْلٰى
وَلَيْسَ الْعَشِيرُ ⑬

اللہ کے سوا انہیں پکارا کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچا
سکیں نہ نفع۔ یہی تو دور دراز کی گمراہی ہے۔ (۱۲)
اسے پکارتے ہیں جس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ
قریب ہے، یقیناً برے والی ہیں اور برے ساتھی۔ (۱۳)^(۱۲)

(۱) حَزَفُ کے معنی ہیں کنارہ۔ ان کناروں پر کھڑا ہونے والا، غیر مستقر ہوتا ہے یعنی اسے قرار و ثبات نہیں ہوتا۔ اسی
طرح جو شخص دین کے بارے میں شک و ریب اور تذبذب کا شکار رہتا ہے، اس کا حال بھی یہی ہے، اسے دین پر
استقامت نصیب نہیں ہوتی کیونکہ اس کی نیت صرف دنیوی مفادات کی رہتی ہے، ملتے رہیں تو ٹھیک ہے بصورت دیگر
وہ پھر دین آباہی یعنی کفر و شرک کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو سچے مسلمان ہوتے اور ایمان و یقین سے
سرشار ہوتے ہیں۔ وہ عمرو دیر کو دیکھے بغیر دین پر قائم رہتے ہیں، نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں تو شکر ادا کرتے اور
تکلیفوں سے دوچار ہوتے ہیں تو صبر کرتے ہیں۔ اس کی شان نزول میں ایک مذہب شخص کا طریقہ بھی اسی طرح کا بیان
کیا گیا۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الحج) کہ ایک شخص مدینے آتا، اگر اس کے گھر بچے ہوتے، اسی طرح
جانوروں میں برکت ہوتی، تو کہتا، یہ دین اچھا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کہتا، یہ دین برا ہے۔ بعض روایات میں یہ وصف
نو مسلم اعرابیوں کا بیان کیا گیا ہے۔ (فتح الباری، باب مذکور)

(۲) بعض مفسرین کے نزدیک یدعو، یقول کے معنی میں ہے۔ یعنی غیر اللہ کا پجاری قیامت والے دن کے گاکہ جس کا
نقصان، اس کے نفع سے قریب تر ہے، وہ والی اور ساتھی یقیناً برا ہے۔ یعنی اپنے معبودوں کے بارے میں یہ کہے گاکہ
وہاں اس کی امیدوں کے محل ڈھے جائیں گے اور یہ معبود، جن کی بابت اس کا خیال تھا کہ وہ اللہ کے عذاب سے اسے
بچائیں گے، اس کی شفاعت کریں گے، وہاں خود وہ معبود بھی، اس کے ساتھ ہی جنم کا ایندھن بنے ہوں گے۔ مولیٰ کے
معنی ولی اور مددگار کے اور عَشِيرَةُ کے معنی ہم نشین، ساتھی اور قرابت دار کے ہیں۔ مددگار اور ساتھی تو وہ ہوتا ہے جو
مصیبت کے وقت کام آئے، لیکن یہ معبود خود گرفتار عذاب ہوں گے یہ کسی کے کیا کام آئیں گے؟ اس لیے انہیں برا
والی اور برا ساتھی کہا گیا۔ ان کی عبادت ضروری ضرر ہے، نفع کا تو اس میں کوئی حصہ ہی نہیں ہے، پھر یہ جو کہا گیا ہے کہ
ان کا نقصان، ان کے نفع سے قریب تر ہے، تو یہ ایسے ہی ہے جیسے دوسرے مقام پر فرمایا گیا ﴿وَإِنَّا كَاتِبَاتٌ لِّعَلِّمْ هٰذِي
أَوْفِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (سبأ- ۲۴) ”بے شک ہم (یعنی اللہ کے ماننے والے) یا تم (اس کا انکار کرنے والے) ہدایت پر ہیں، یا

ایمان اور نیک اعمال والوں کو اللہ تعالیٰ لہریں لیتی ہوئی
سُوروں والی جنتوں میں لے جائے گا۔ اللہ جو ارادہ کرے
اسے کر کے رہتا ہے۔ (۱۴)

جس کا یہ خیال ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی مدد دونوں
جہان میں نہ کرے گا وہ اونچائی پر ایک رسہ باندھ کر
(اپنے حلق میں پھندا ڈال کر اپنا گلا گھونٹ لے) پھر دیکھ
لے کہ اس کی چالاکیوں سے وہ بات ہٹ جاتی ہے جو
اسے تڑپا^(۱) رہی ہے؟ (۱۵)

ہم نے اسی طرح اس قرآن کو واضح آیتوں میں اتارا ہے۔
جسے اللہ چاہے ہدایت نصیب فرماتا ہے۔ (۱۶)

بیشک اہل ایمان اور یہودی اور صابلی اور نصرانی اور مجوسی^(۲)
اور مشرکین^(۳) ان سب کے درمیان قیامت کے دن

إِنَّ اللَّهَ يَدْعُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿۱۴﴾

مَنْ كَانَ يَظُنُّ أَنْ لَنْ يَنصُرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا
وَالْآخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ
فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدَهُ مَا يَغِيظُ ﴿۱۵﴾

وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ آيَاتٍ يُبَيِّنَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۱۶﴾

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّالِفِينَ وَالنَّاصِرِي
وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ أَتَوْا آتَانَ اللَّهَ يَقُولُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

کھلی گراہی میں“۔ ظاہر بات ہے کہ ہدایت پر وہی ہیں جو اللہ کو ماننے والے ہیں۔ لیکن اسے واضح الفاظ میں کہنے کی
 بجائے کنائے اور استفہام کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جو سامع کے لیے زیادہ موثر اور بلیغ ہوتا ہے۔ یا اس کا تعلق دنیا
 سے ہے اور مطلب یہ ہو گا کہ غیر اللہ کو پکارنے سے فوری نقصان تو اس کا یہ ہوا کہ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھا، یہ اقرب
 نقصان ہے۔ اور آخرت میں تو اس کا نقصان محقق ہی ہے۔

(۱) اس کے ایک معنی تو یہ کیے گئے ہیں کہ ایسا شخص، جو یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر ﷺ کی مدد نہ کرے، کیونکہ
 اس کے غلبہ و فح سے اسے تکلیف ہوتی ہے، تو وہ اپنے گھر کی چھت پر رسی لٹکا کر اور اپنے گلے میں اس کا پھندا لے کر
 اپنا گلا گھونٹ لے، شاید یہ خودکشی اسے غیظ و غضب سے بچالے جو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ
 کو دیکھ کر اپنے دل میں پاتا ہے۔ اس صورت میں سماء سے مراد گھر کی چھت ہوگی۔ دوسرے معنی ہیں کہ وہ ایک رسہ لے
 کر آسمان پر چڑھ جائے اور آسمان سے جو وحی یا مدد آتی ہے، اس کا سلسلہ ختم کر دے، (اگر وہ کر سکتا ہے) اور دیکھے کہ کیا
 اس کے بعد اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا ہے؟ امام ابن کثیر نے پہلے مفہوم کو اور امام شوکانی نے دوسرے مفہوم کو زیادہ پسند کیا
 ہے اور سیاق سے یہی دو سرا مفہوم زیادہ قریب لگتا ہے۔

(۲) مجوس سے مراد ایران کے آتش پرست ہیں جو دو خداؤں کے قائل ہیں، ایک ظلمت کا خالق ہے، دوسرا نور کا، جسے
 وہ اہرمین اور یزدان کہتے ہیں۔

(۳) ان میں مذکورہ گمراہ فرقوں کے علاوہ جتنے بھی اللہ کے ساتھ شرک کا ارتکاب کرنے والے ہیں، سب آگئے۔

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿۱۵﴾

خود اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دے گا،^(۱) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے۔^(۲) (۱۷)

کیا تو نہیں دیکھ رہا کہ اللہ کے سامنے سجدے میں ہیں سب آسمانوں والے اور سب زمینوں والے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور^(۳)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالْدَّابَّاتُ وَكثيرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ وَمَنْ يُؤْمِن

(۱) ان میں سے حق پر کون ہے، باطل پر کون؟ یہ تو ان دلائل سے واضح ہو جاتا ہے جو اللہ نے اپنے قرآن میں نازل فرمائے ہیں اور اپنے آخری پیغمبر کو بھی اسی مقصد کے لیے بھیجا تھا، ﴿يُظهِرُكَ عَلَى الَّذِينَ كُفَرُوا﴾ (الفتح-۳۸) یہاں فیصلے سے مراد وہ سزا ہے جو اللہ تعالیٰ باطل پرستوں کو قیامت والے دن دے گا، اس سزا سے بھی واضح ہو جائے گا کہ دنیا میں حق پر کون تھا اور باطل پر کون کون؟

(۲) یہ فیصلہ محض حاکمانہ اختیارات کے زور پر نہیں ہوگا، بلکہ عدل و انصاف کے مطابق ہوگا، کیونکہ وہ باخبر ہستی ہے، اسے ہر چیز کا علم ہے۔

(۳) بعض مفسرین نے اس سجدے سے ان تمام چیزوں کا احکام الہی کے تابع ہونا مراد لیا ہے، کسی میں مجال نہیں کہ وہ حکم الہی سے سرتابی کر سکے۔ ان کے نزدیک وہ سجدہ اطاعت و عبادت مراد نہیں جو صرف عقلا کے ساتھ خاص ہے۔ جب کہ بعض مفسرین نے اسے حجاز کے بجائے حقیقت پر محمول کیا ہے کہ ہر مخلوق اپنے اپنے انداز سے اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ مثلاً مَنْ فِي السَّمَوَاتِ سے مراد فرشتے ہیں وَمَنْ فِي الْأَرْضِ سے ہر قسم کے حیوانات، انسان، جنات، چوپائے اور پرندے اور دیگر اشیا ہیں۔ یہ سب اپنے اپنے انداز سے سجدہ اور تسبیح الہی کرتی ہیں۔ ﴿وَلَمَّا قَسَىٰ آلَ الْيَتِيمَ يُحَدِّثْ﴾ (بنی اسرائیل-۴۴) سورج، چاند اور ستاروں کا بطور خاص اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ مشرکین ان کی عبادت کرتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا، تم ان کو سجدہ کرتے ہو، یہ تو اللہ کو سجدہ کرنے والے اور اس کے ماتحت ہیں اس لیے تم انہیں سجدہ مت کرو، اس ذات کو سجدہ کرو جو ان کا خالق ہے۔ (حُم السجدة-۳۷) صحیح حدیث میں ہے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، جانتے ہو، سورج کہاں جاتا ہے؟ میں نے کہا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا سورج جاتا ہے اور عرش کے نیچے جا کر سجدہ ریز ہو جاتا ہے، پھر اسے (طلوع ہونے کا) حکم دیا جاتا ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ اسے کہا جائے گا، واپس لوٹ جا یعنی جہاں سے آیا وہیں چلا جا۔ (صحیح بخاری، بدء الخلق، باب صفة الشمس والقمر بحسبان۔ مسلم، کتاب الإيمان، باب بیان الزمن الذي لا يقبل فيه الإيمان) اسی طرح ایک صحابی کا واقعہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے خواب میں اپنے ساتھ درخت کو سجدہ کرتے دیکھا۔ (ترمذی، أبواب السفر، باب ماجاء مايقول في سجود القرآن تحفة الأحرؤی، جلد ۱، صفحہ ۴۰۲، ابن ماجہ نمبر ۱۰۵۳) اور پہاڑوں اور درختوں کے سجدے میں ان کے سایوں کا دائیں بائیں پھرنایا جھکتا بھی شامل ہے، جس کی طرف اشارہ سورۃ الرعد ۱۵ اور النحل ۳۸، ۳۹ میں بھی کیا گیا ہے۔

اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُكْرِمٍ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ﴿۱۸﴾

۱۸

اور بہت سے انسان بھی۔^(۱) ہاں بہت سے وہ بھی ہیں جن پر عذاب کا مقولہ ثابت ہو چکا ہے،^(۲) جسے رب ذلیل کر دے اسے کوئی عزت دینے والا نہیں،^(۳) اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ (۱۸)

یہ دونوں اپنے رب کے بارے میں اختلاف کرنے^(۴) والے ہیں، پس کافروں کے لیے تو آگ کے کپڑے بیونت کر کاٹے جائیں گے، اور ان کے سروں کے اوپر سے سخت کھوتا ہوا پانی بہایا جائے گا۔ (۱۹)

جس سے ان کے پیٹ کی سب چیزیں اور کھالیں گلا دی جائیں گی۔ (۲۰)

اور ان کی سزا کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہیں۔ (۲۱) یہ جب بھی وہاں کے غم سے نکل بھاگنے کا ارادہ کریں گے وہیں لوٹا دیئے جائیں گے اور (کما جائے گا) جلنے کا عذاب چکھو! (۲۲)

هَذَانِ حَصْمَنِ اِخْتَصَمُوا فِي رَبِّهِمْ فَالَّذِينَ كَفَرُوا قُطِعَتْ لُهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ تَارٍ يُصَدُّ مِّنْ قُوَىٰ دُرُوبِهِمُ الحُمَيْمِ ﴿۱۹﴾

يُضْطَرُّ بِهَا مَائِي يُطَوَّنُهُمْ وَالْجَاوِدِ ﴿۲۰﴾

وَالَهُمْ مَقَامِعٌ مِّنْ حَدِيدٍ ﴿۲۱﴾

كَلِمًا آرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا فِيهَا وَدُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿۲۲﴾

(۱) یہ سجدہ اطاعت و عبادت ہی ہے جس کو انسانوں کی ایک بڑی تعداد کرتی ہے اور اللہ کی رضا کی مستحق قرار پاتی ہے۔
(۲) یہ وہ ہیں جو سجدہ اطاعت سے انکار کر کے کفر اختیار کرتے ہیں؛ ورنہ تکوینی احکام یعنی سجدہ انقیاد میں تو انہیں بھی مجال انکار نہیں۔

(۳) کفر اختیار کرنے کا نتیجہ زلت و رسوائی اور آخرت کا دائمی عذاب ہے؛ جس سے بچا کر کافروں کو عزت دینے والا کوئی نہیں ہو گا۔

(۴) هَذَانِ حَصْمَنِ 'یہ دونوں تشنیہ کے صیغے ہیں۔ بعض نے اس سے مراد مذکورہ گمراہ فرقہ اور اس کے مقابلے میں دوسرا فرقہ مسلمان کو لیا ہے۔ یہ دونوں اپنے رب کے بارے میں جھگڑتے ہیں، مسلمان تو اس کی وحدانیت اور اس کی قدرت علی البعث کے قائل ہیں، جب کہ دوسرے اللہ کے بارے میں مختلف گمراہیوں میں مبتلا ہیں۔ اس ضمن میں جنگ بدر میں لڑنے والے مسلمان اور کافر بھی آجاتے ہیں؛ جس کے آغاز میں مسلمانوں میں ایک طرف حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہم تھے اور دوسری طرف ان کے مقابلے میں کافروں میں عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ تھے (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الحج) امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ دونوں ہی مفہوم صحیح اور آیت کے مطابق ہیں۔

(۵) اس میں جنہیوں کے عذاب کی کچھ تفصیل بیان کی گئی ہے جو انہیں وہاں بھگتنا ہو گا۔

ایمان والوں اور نیک کام والوں کو اللہ تعالیٰ ان جنتوں میں لے جائے گا جن کے درختوں تلے سے نہریں لہریں لے رہی ہیں، جہاں وہ سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سچے موتی بھی۔ وہاں ان کا لباس خالص ریشم ہوگا۔^(۱) (۲۳)

ان کو پاکیزہ بات کی رہنمائی کر دی گئی^(۲) اور قابلِ صد تعریف راہ کی ہدایت کر دی گئی۔^(۳) (۲۴)

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکنے لگے اور اس حرمت والی مسجد سے^(۴) بھی جسے ہم نے تمام لوگوں کے لیے مساوی کر دیا ہے وہیں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے ہوں،^(۵) جو بھی ظلم کے ساتھ وہاں الحاد کا ارادہ

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ﴿۲۳﴾

وَهُدًى وَإِلَى الْكَلْبِيبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدًى وَإِلَى صِرَاطٍ الْمُسْتَقِيمِ ﴿۲۴﴾

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّوْنَ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِيَةِ وَمَنْ يُؤَدِّبْ فِيهِ بِالْحَادِ يُظَلِّمْ نَذْرًا مِنْ عَذَابِ

(۱) جہنیوں کے مقابلے میں یہ اہل جنت کا اور ان نعمتوں کا تذکرہ ہے جو اہل ایمان کو میا کی جائیں گی۔

(۲) یعنی جنت ایسی جگہ ہے جہاں پاکیزہ باتیں ہی ہوں گی، وہاں بے ہودہ اور گناہ کی بات نہیں ہوگی۔

(۳) یعنی ایسی جگہ کی طرف جہاں ہر طرف اللہ کی حمد اور اس کی تسبیح کی صدائے دل نواز گونج رہی ہوگی۔ اگر اس کا تعلق دنیا سے ہو تو مطلب قرآن اور اسلام کی طرف رہنمائی ہے جو اہل ایمان کے حصے میں آتی ہے۔

(۴) روکنے والوں سے مراد کفار مکہ ہیں جنہوں نے ۶ ہجری میں مسلمانوں کو مکہ جا کر عمرہ کرنے سے روک دیا تھا، اور مسلمانوں کو حدیبیہ سے واپس آنا پڑا تھا۔

(۵) اس میں اختلاف ہے کہ مسجد حرام سے مراد خاص مسجد (خانہ کعبہ) ہی ہے یا پورا حرم مکہ۔ کیونکہ قرآن میں بعض جگہ پورے حرم مکی کے لیے بھی مسجد حرام کا لفظ بولا گیا ہے، یعنی جز بول کر کل مراد لیا گیا ہے۔ جہاں تک خاص مسجد حرام کا تعلق ہے، اس کی بابت تو یہ بات متفقہ ہے کہ اس میں مقیم وغیر مقیم، مکی اور آفاقی سب کا حصہ مساوی ہے یعنی بلا تخصیص و تفریق ہر شخص رات اور دن کے کسی بھی حصے میں عبادت کر سکتا ہے۔ کسی کے لیے بھی کسی مسلمان کو عبادت سے روکنے کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ جن علمائے مسجد حرام سے مراد پورا حرم لیا ہے، ان کے ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ پورا حرم مکی سب مسلمانوں کے لیے یکساں حیثیت رکھتا ہے اور اس کے مکانوں اور زمینوں کا کوئی مالک نہیں۔ اسی لیے ان کی خرید و فروخت اور ان کو کرائے پر دینا ان کے نزدیک جائز نہیں۔ جو شخص بھی کسی جگہ سے حج یا عمرے کے لیے مکہ جائے تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ جہاں چاہے ٹھہر جائے، وہاں رہنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھروں میں ٹھہرنے سے کسی کو نہ روکیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ مکانات اور زمینیں ملک خاص ہو سکتی ہیں اور ان

الْبَعْدِ ⑤

وَأَذْبَحْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا
وَوَطَّهَرْنَا لِيَتَّبِعُنِي لِلْعَالَمِينَ وَالْعَالَمِينَ وَالزُّكُمَ الشُّجُودِ ⑥

کرے^(۱) ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔ (۲۵)
اور جبکہ ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو کعبہ کے مکان کی
جگہ مقرر کر دی^(۲) اس شرط پر کہ میرے ساتھ کسی کو
شریک^(۳) نہ کرنا اور میرے گھر کو طواف قیام رکوع سجدہ
کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھنا۔ (۲۶)^(۵)

میں مالکنہ تصرفات یعنی بیچنا، کرائے پر دینا جائز ہے۔ البتہ وہ مقامات جن کا تعلق مناسک حج سے ہے، مثلاً منیٰ، مزدلفہ اور عرفات کے میدان یہ وقف عام ہیں۔ ان میں کسی کی ملکیت جائز نہیں۔ یہ مسئلہ قدیم فقہاء کے درمیان خاصا مختلف فیہ رہا ہے۔ تاہم آج کل تقریباً تمام کے تمام علما ہی ملکیت خاص کے قائل ہو گئے ہیں۔ اور یہ مسئلہ سرے سے اختلافی ہی نہیں رہا۔ مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم نے بھی امام ابوحنیفہ اور فقہا کا مسلک مختار اسی کو قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ”معارف القرآن جلد ۶، صفحہ ۲۵۳)

(۱) اِنْحَادَ کے لفظی معنی تو کج روی کے ہیں۔ یہاں یہ عام ہے، کفر و شرک سے لے کر ہر قسم کے گناہ کے لیے۔ حتیٰ کہ بعض علما الفاظ قرآنی کے پیش نظر اس بات تک کے قائل ہیں کہ حرم میں اگر کسی گناہ کا ارادہ بھی کر لے گا (چاہے اس پر عمل نہ کر سکے) تو وہ بھی اس وعید میں شامل ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ محض ارادے پر مؤاخذہ نہیں ہو گا، جیسا کہ دیگر نصوص سے واضح ہے۔ تاہم ارادہ اگر عزم مصمم کی حد تک ہو تو پھر قابل گرفت ہو سکتا ہے۔ (فتح القدیر)

(۲) یہ بدلہ ہے ان لوگوں کا جو مذکورہ گناہوں کے مرتکب ہوں گے۔

(۳) یعنی بیت اللہ کی جگہ بتلادی اور وہاں ہم نے ذریت ابراہیم علیہ السلام کو جاٹھرایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان نوح علیہ السلام کی ویرانی کے بعد خانہ کعبہ کی تعمیر سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں سے ہوئی ہے، جیسا کہ صحیح حدیث سے بھی ثابت ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ”سب سے پہلی مسجد جو زمین میں بنائی گئی، مسجد حرام ہے، اور اس کے چالیس سال بعد مسجد اقصیٰ تعمیر ہوئی۔“ (مسند أحمد ۵ / ۱۵۰-۱۶۶-۱۶۷) و مسلم کتاب المساجد)

(۴) یہ خانہ کعبہ کی تعمیر کی غرض بیان کی کہ اس میں صرف میری عبادت کی جائے۔ اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ مشرکین نے اس میں جو بت سجا رکھے ہیں، جن کی وہ یہاں آکر عبادت کرتے ہیں۔ یہ ظلم صریح ہے کہ جہاں صرف اللہ کی عبادت کرنی چاہیے تھی، وہاں بتوں کی عبادت کی جاتی ہے۔

(۵) کفر، بت پرستی اور دیگر گندگیوں اور نجاستوں سے۔ یہاں ذکر صرف نماز پڑھنے والوں اور طواف کرنے والوں کا کیا ہے، کیونکہ یہ دونوں عبادات خانہ کعبہ کے ساتھ خاص ہیں۔ نماز میں رخ اسی کی طرف ہوتا ہے اور طواف صرف اسی کے گرد کیا جاتا ہے۔ لیکن اہل بدعت نے اب بت سی قبروں کا طواف بھی ایجاد کر لیا ہے اور بعض نمازوں کے لیے ”قبلہ“ بھی کوئی اور۔ اَعَادْنَا اللَّهُ مِنْهُمَا

اور لوگوں میں حج کی منادی کر دے لوگ تیرے پاس پیادہ بھی آئیں گے اور دبلے پتلے اونٹوں پر بھی (۱) دور دراز کی تمام راہوں سے آئیں (۲) گے۔ (۲۷)

اپنے فائدے حاصل کرنے کو آجائیں (۳) اور ان مقررہ دنوں میں اللہ کا نام یاد کریں ان چوپایوں پر جو پالتو ہیں۔ (۴)

پس تم آپ بھی کھاؤ اور بھوکے فقیروں کو بھی کھاؤ۔ (۲۸) پھر وہ اپنا میل کچیل دور کریں (۵) اور اپنی نذریں پوری کریں (۶) اور اللہ کے قدیم گھر کا طواف کریں۔ (۲۹)

وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ﴿۲۷﴾

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ

مَعْلُومَاتٍ عَلَى مَا رَزَقَهُم مِّنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ﴿۲۸﴾

ثُمَّ لِيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلِيُوفُوا نُدُورَهُمْ

وَلِيُطُوفُوا بِالْبَيْتِ الْعَرَبِيِّ ﴿۲۹﴾

(۱) جو چارے کی قلت اور سفر کی دوری اور تھکاوٹ سے لاغر اور کمزور ہو جائیں گے۔

(۲) یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ مکہ کے پہاڑ کی چوٹی سے بلند ہونے والی یہ نحیف سی صدا، دنیا کے کونے کونے تک پہنچ گئی، جس کا مشاہدہ حج اور عمرے میں ہر حاجی اور معتمر کرتا ہے۔

(۳) یہ فائدے دینی بھی ہیں کہ نماز، طواف اور مناسک حج و عمرہ کے ذریعے سے اللہ کی مغفرت و رضا حاصل کی جائے۔ اور دنیوی بھی کہ تجارت اور کاروبار سے مال و اسباب دنیا بھی میسر آجائے۔

(۴) بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ (پالتو چوپایوں) سے مراد اونٹ، گائے، بکری (اور بھیڑ دے) ہیں، ان پر اللہ کا نام لینے کا مطلب ان کو ذبح کرنا ہے جو اللہ کا نام لے کر ہی کیا جاتا ہے اور ایام معلومات سے مراد ذبح کے ایام، 'ایام تشریق' ہیں، جو یوم النحر (۱۰ ذوالحجہ) اور تین دن اس کے بعد ہیں۔ یعنی ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ ذوالحجہ تک قربانی کی جاسکتی ہے۔ عام طور پر ایام معلومات سے عشرہ ذوالحجہ اور ایام معدودات سے ایام تشریق مراد لیے جاتے ہیں۔ تاہم یہاں 'معلومات' جس سیاق میں آیا ہے، اس سے یہی معلوم ہو تا ہے کہ یہاں ایام تشریق مراد ہیں۔ واللہ اعلم۔

(۵) یعنی ۱۰ ذوالحجہ کو حجرہ کبرئیی (یا عقبہ) کو کنکریاں مارنے کے بعد حاجی کو تحلل اول (یا اصغر) حاصل ہو جاتا ہے، جس کے بعد وہ احرام کھول دیتا ہے اور بیوی سے مباشرت کے سوا، دیگر وہ تمام کام اس کے لیے جائز ہو جاتے ہیں، جو حالت احرام میں ممنوع ہوتے ہیں۔ میل کچیل دور کرنے کا مطلب یہی ہے کہ پھر وہ بالوں، ناخنوں وغیرہ کو صاف کر لے، تیل، خوشبو استعمال کر لے اور کلمے ہوئے کپڑے پہن لے وغیرہ۔

(۶) اگر کوئی مانی ہوئی ہو، جیسے لوگ مان لیتے ہیں کہ اگر اللہ نے ہمیں اپنے مقدس گھر کی زیارت نصیب فرمائی، تو ہم فلاں نیکی کا کام کریں گے۔

(۷) عَمِيقٌ کے معنی قدیم کے ہیں، مراد خانہ کعبہ ہے کہ حلق یا تقصیر کے بعد طواف افاضہ کر لے، جسے طواف زیارت بھی کہتے ہیں، اور یہ حج کا رکن ہے جو وقوف عرفہ اور حجرہ عقبہ (یا کبرئیی) کو کنکریاں مارنے کے بعد کیا جاتا ہے۔ جب کہ

یہ ہے اور جو کوئی اللہ کی حرمتوں^(۱) کی تعظیم کرے اس کے اپنے لیے اس کے رب کے پاس بہتری ہے۔ اور تمہارے لیے چوپائے جانور حلال کر دیئے گئے۔ بجز ان کے جو تمہارے سامنے^(۲) بیان کیے گئے ہیں پس تمہیں بتوں کی گندگی سے بچتے رہنا چاہیے^(۳) اور جھوٹی بات سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔^(۴) (۳۰)

اللہ کی توحید کو مانتے ہوئے^(۵) اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے ہوئے۔ سنو! اللہ کے ساتھ شریک کرنے والا گویا آسمان سے گر پڑا، اب یا تو اسے پرندے اچک

ذٰلِكَ وَمَنْ يُعْظَمْ حُرْمَتِ اللّٰهِ فَهُوَ حَيْرَانٌ وَعِنْدَ رَبِّهِمْ
وَاجَلَّتْ لَكُمْ الْاَنْعَامُ الْاِمَامِيْنِ عَلَيَكُمْ فَاجْتَنِبُوْا
الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝

حُفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَانَ كَمَا
كَانَ حَزْوِنَ السَّمَآءِ فَتُخْطَفُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوٰى بِهٖ الرِّیْحُ فُرُقًا

طوافِ قدوم بعض کے نزدیک واجب اور بعض کے نزدیک سنت ہے اور طوافِ وداع سنت مؤکدہ (یا واجب) ہے۔ جو اکثر اہل علم کے نزدیک عذر سے ساقط ہو جاتا ہے، جیسے حائضہ عورت سے بلا اتفاق ساقط ہو جاتا ہے (البر التفسیر) (۱) ان حرمتوں سے مراد وہ مناسک حج ہیں جن کی تفصیل ابھی گزری۔ ان کی تعظیم کا مطلب، ان کی اس طرح ادائیگی ہے جس طرح بتلایا گیا ہے۔ یعنی ان کی خلاف ورزی کر کے ان حرمتوں کو پامال نہ کرے۔

(۲) ”جو بیان کیے گئے ہیں“ کا مطلب ہے جن کا حرام ہونا بیان کر دیا گیا ہے، جیسے آیت ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالذَّمْرُ ﴿۱﴾ الْآيَةَ میں تفصیل ہے۔

(۳) رجس کے معنی گندگی اور پلیدی کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد لکڑی، لوہے یا کسی اور چیز کے بنے ہوئے بت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کرنا، یہ نجاست ہے اور اللہ کے غضب اور عدم رضا کا باعث، اس سے بچو!

(۴) جھوٹی بات میں، جھوٹی بات کے علاوہ جھوٹی قسم بھی ہے، (جس کو حدیث میں شرک اور حقوق والدین کے بعد تیسرے نمبر پر کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا ہے) اور سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ اللہ جن چیزوں سے پاک ہے، وہ اس کی طرف منسوب کی جائیں، مثلاً اللہ کی اولاد ہے، فلاں بزرگ اللہ کے اختیارات میں شریک ہے، یا فلاں کام پر اللہ کس طرح قادر ہو گا! جیسے کفار بعث بعد الموت پر تعجب کا اظہار کرتے رہے ہیں اور کرتے ہیں۔ یا اپنی طرف سے اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام اور حرام چیزوں کو حلال کر لینا، جیسے مشرکین بجز سائبہ، ویدلہ اور حام جانوروں کو اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے، یہ سب جھوٹ ہیں، ان سے اجتناب ضروری ہے۔

(۵) حُفَاءَ، حَبِيْنٌ کی جمع ہے۔ جس کے مصدری معنی ہیں مائل ہونا، ایک طرف ہونا، یک رخا ہونا۔ یعنی شرک سے توحید کی طرف اور کفر و باطل سے اسلام اور دین حق کی طرف مائل ہوتے ہوئے۔ یا ایک طرف ہو کر خالص اللہ کی عبادت کرتے ہوئے۔

لے جائیں گے یا ہوا کسی دور دراز کی جگہ پھینک دے
گی۔^(۱) (۳۱)

یہ سن لیا اب اور سنو! اللہ کی نشانیوں کی جو عزت و
حرمت کرے اس کے دل کی پرہیزگاری کی وجہ سے یہ
ہے۔^(۲) (۳۲)

ان میں تمہارے لیے ایک مقرر وقت تک کا فائدہ ہے^(۳)
پھر ان کے حلال ہونے کی جگہ خانہ کعبہ ہے۔^(۴) (۳۳)

مَكَانٍ سَجَّيْقٍ ①

ذٰلِكَ وَمَنْ يُعْظَمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهٗم مِّنْ تَقْوٰى الْقُلُوْبِ ②

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعٌ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا اِلَى الْبَيْتِ
الْعَتِيْقِ ③

(۱) یعنی جس طرح بڑے پرندے، چھوٹے جانوروں کو نہایت تیزی سے جھپٹا مار کر انہیں نوج کھاتے ہیں یا ہوائیں کسی کو دور دراز جگہوں پر پھینک دیں اور کسی کو اس کا سراغ نہ ملے۔ دونوں صورتوں میں تباہی اس کا مقدر ہے۔ اسی طرح وہ انسان جو صرف ایک اللہ کی عبادت کرتا ہے، وہ سلامت فطرت اور طہارت نفس کے اعتبار سے طہر و صفا کی بلندی پر فائز ہوتا ہے اور جوں ہی وہ شرک کا ارتکاب کرتا ہے تو گویا اپنے کو بلندی سے پستی میں اور صفائی سے گندگی اور کچھڑ میں پھینک لیتا ہے۔

(۲) شَعَائِرُ، شَعِيْرَةُ کی جمع ہے جس کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں، جیسے جنگ میں ایک شعار (مخصوص لفظ بطور علامت) اختیار کر لیا جاتا ہے، جس سے وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ اس اعتبار سے شعائر اللہ وہ ہیں، جو اعلام دین یعنی اسلام کے نمایاں امتیازی احکام ہیں، جن سے ایک مسلمان کا امتیاز اور تشخص قائم ہوتا ہے اور دوسرے اہل مذاہب سے الگ پہچان لیا جاتا ہے۔ صفا، مروہ پہاڑیوں کو بھی اسی لیے شعائر اللہ کہا گیا ہے کہ مسلمان حج و عمرے میں ان کے درمیان سعی کرتے ہیں۔ یہاں حج کے دیگر مناسک، خصوصاً قربانی کے جانوروں کو شعائر اللہ کہا گیا ہے۔ ان کی تعظیم کا مطلب ان کا استحسان اور استئمان ہے یعنی عمدہ اور موٹا تازہ جانور قربان کرنا۔ اس تعظیم کو دل کا تقویٰ قرار دیا گیا ہے یعنی یہ دل کے ان افعال سے ہیں جن کی بنیاد تقویٰ ہے۔

(۳) وہ فائدہ، سواری، دودھ، مزید نسل اور اون وغیرہ کا حصول ہے۔ وقت مقرر سے مراد نحر (ذبح کرنا) ہے یعنی ذبح ہونے تک تمہیں ان سے مذکورہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ قربانی کے جانور سے، جب تک وہ ذبح نہ ہو جائے، فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ صحیح حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ایک آدمی ایک قربانی کا جانور اپنے ساتھ ہانکے لے جا رہا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا، اس پر سوار ہو جا، اس نے کہا یہ حج کی قربانی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا، اس پر سوار ہو جا۔ (صحیح بخاری، کتاب الحج، باب رکوب البدن)

(۴) حلال ہونے سے مراد جہاں ان کا ذبح کرنا حلال ہوتا ہے۔ یعنی یہ جانور، مناسک حج کی ادائیگی کے بعد، بیت اللہ اور حرم مکی میں پہنچتے ہیں اور وہاں اللہ کے نام پر ذبح کر دیئے جاتے ہیں، پس مذکورہ فوائد کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ ایسے ہی حرم کے لیے ہدی ہوتے ہیں، تو حرم میں پہنچتے ہی ذبح کر دیئے جاتے ہیں اور فقراء مکہ میں ان کا گوشت تقسیم

اور ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کے طریقے مقرر فرمائے ہیں تاکہ وہ ان چوپائے جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے انہیں دے رکھے ہیں۔^(۱) سمجھ لو کہ تم سب کا معبود برحق صرف ایک ہی ہے تم اسی کے تابع فرمان ہو جاؤ عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیجئے! (۳۴)

انہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے ان کے دل تھرا جاتے ہیں، انہیں جو برائی پہنچے اس پر صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرنے والے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے وہ اس میں سے بھی دیتے رہتے ہیں۔ (۳۵)

قربانی کے اونٹ^(۲) ہم نے تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی نشانیاں مقرر کر دی ہیں ان میں تمہیں نفع ہے۔ پس انہیں کھڑا کے ان پر اللہ کا نام لو،^(۳) پھر جب ان کے پہلو

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةٍ الْأَنْعَامِ ۚ فَالْهَكْمُ لِلَّهِ وَاحِدٌ ۗ فَكَلِمَةَ اسْلِمُوا وَبَشِيرِ الْمُخْبِتِينَ ﴿۳۴﴾

الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَّت قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا آصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿۳۵﴾

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا حَبِيرٌ ۚ فَادْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافٍ ۚ فَإِذَا وَجِدْتُمْ جُنُوبَهَا

کر دیا جاتا ہے۔

(۱) مَنْسِكٌ، نَسَكٌ کا مصدر ہے، معنی ہیں اللہ کے تقرب کے لیے قربانی کرنا ذَبِيحَةٌ (ذبح شدہ جانور) کو بھی نَسِيحَةٌ کہا جاتا ہے، جس کی جمع نُسُكٌ ہے۔ اس کے معنی اطاعت و عبادت کے بھی ہیں۔ کیونکہ رضائے الہی کے لیے جانور کی قربانی کرنا بھی عبادت ہے۔ اسی لیے غیر اللہ کے نام پر یا ان کی خوشنودی کے لیے جانور ذبح کرنا غیر اللہ کی عبادت ہے۔ یا مَنْسِكٌ (سین کی فتح یا کسرے کے ساتھ) اسم طرف ہے۔ مَوْضِعٌ نَحْرٍ (ذبح کرنے کی جگہ) یا مَوْضِعٌ عِبَادَةٍ۔ اسی سے مناسک حج ہے یعنی وہ جگہیں، جہاں حج کے اعمال و ارکان ادا کیے جاتے ہیں، جیسے عرفات، مزدلفہ، منیٰ اور مکہ۔ مطلق ارکان و اعمال حج کو بھی مناسک کہہ لیا جاتا ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ ہم پہلے بھی ہر مذہب والوں کے لیے ذبح کا یا عبادت کا طریقہ مقرر کرتے آئے ہیں تاکہ وہ اس کے ذریعے سے اللہ کا قرب حاصل کرتے رہیں۔ اور اس میں حکمت یہ ہے کہ وہ ہمارا نام لیں، یعنی بسم اللہ واللہ اکبر کہہ کر ذبح کریں یا ہمیں یاد رکھیں۔

(۲) بُدْنٌ، بَدَنَةٌ کی جمع ہے یہ جانور عام طور پر موٹا تازہ ہوتا ہے۔ اس لیے بَدَنَةٌ کہا جاتا ہے۔ قرہ جانور۔ اہل لغت نے اسے صرف اونٹوں کے ساتھ خاص کیا ہے لیکن حدیث کی رو سے گائے پر بھی بَدَنَةٌ کا اطلاق صحیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اونٹ اور گائے، جو قربانی کے لیے لے جائیں، یہ بھی شعائر اللہ، یعنی اللہ کے ان احکام میں سے ہیں جو مسلمانوں کے لیے خاص اور ان کی علامت ہیں۔

(۳) صَوَافٍ مَصْفُوفَةٌ (صف بستہ یعنی کھڑے ہوئے) معنی میں ہے۔ اونٹ کو اسی طرح کھڑے کھڑے نحر کیا جاتا ہے کہ پایاں ہاتھ پاؤں اس کا بندھا ہوا اور تین پاؤں پر وہ کھڑا ہوتا ہے۔

زمین سے لگ جائیں^(۱) اسے (خود بھی) کھاؤ^(۲) اور مسکین سوال سے رکنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھاؤ^(۳) اسی طرح ہم نے چوپایوں کو تمہارے

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطِعُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَصِمَ كَذَلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۷﴾

(۱) یعنی سارا خون نکل جائے اور وہ بے روح ہو کر زمین پر گر جائے۔ تب اسے کائنا شروع کرو۔ کیونکہ جی دار جانور کا گوشت کٹ کر کھانا ممنوع ہے۔ مَا قُطِعَ مِنَ الْبُهَيْمَةِ وَهِيَ حَيَّةٌ، فَهِيَ مَيْتَةٌ (ابوداؤد، کتاب الصيد، باب فی صید قطع منه قطعة۔ ترمذی، أبواب الصيد، باب ماجاء ما قطع من الحي فهو ميت، وابن ماجه) ”جس جانور سے اس حال میں گوشت کائنا جائے کہ وہ زندہ ہو تو وہ (کائنا ہوا گوشت) مردہ ہے۔“

(۲) بعض علما کے نزدیک یہ امر وجوب کے لیے ہے یعنی قربانی کا گوشت کھانا، قربانی کرنے والے کے لیے واجب یعنی ضروری ہے اور اکثر علما کے نزدیک یہ امر استحباب یا جواز کے لیے ہے یعنی اس امر کا مقصد صرف جواز کا اثبات یا استحباب ہے یعنی اگر کھایا جائے تو جائز یا مستحب (پسندیدہ) ہے اور اگر کوئی نہ کھائے بلکہ سب کاسب تقسیم کر دے تو کوئی گناہ نہیں ہے۔

(۳) قَانِعُ کے ایک معنی سائل کے اور دوسرے معنی قناعت کرنے والے کے کیے گئے ہیں یعنی وہ سوال نہ کرے اور مُعْتَصِمٌ کے معنی بعض نے بغیر سوال کے سامنے آنے والے کے کیے ہیں۔ اور بعض نے قانِع کے معنی سائل اور معتر کے معنی زائر یعنی ملاقاتی کے کیے ہیں۔ بہر حال اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ قربانی کے گوشت کے تین حصے کیے جائیں۔ ایک اپنے لیے، دوسرا ملاقاتیوں اور رشتے داروں کے لیے اور تیسرا سائلین اور معاشرے کے ضرورت مند افراد کے لیے۔ جس کی تائید میں یہ حدیث بھی پیش کی جاتی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”میں نے تمہیں (پہلے) تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت ذخیرہ کر کے رکھنے سے منع کیا تھا لیکن اب تمہیں اجازت ہے کہ کھاؤ اور جو مناسب سمجھو، ذخیرہ کرو۔“ دوسری روایت کے الفاظ ہیں ”پس کھاؤ، ذخیرہ کرو اور صدقہ کرو“ ایک اور روایت کے الفاظ اس طرح ہیں ”پس کھاؤ، کھاؤ اور صدقہ کرو“ (البخاری، کتاب الأضاحی۔ مسلم، کتاب الأضاحی۔ باب بیان ماکان من النهی عن أكل لحوم الأضاحی بعد ثلاث... والسنة) بعض علما دوسرے کرنے کے قائل ہیں۔ نصف اپنے لیے اور نصف صدقے کے لیے، وہ اس سے ما قبل گزرنے والی آیت ﴿ذَكَاةً وَمِنْهَا لَكُمْ مِمَّا فَوَّضْنَا إِلَى الْفُقَرَاءِ﴾ سے استدلال کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت کسی بھی آیت یا حدیث سے اس طرح کے دو یا تین حصوں میں تقسیم کرنے کا حکم نہیں نکلتا بلکہ ان میں مطلقاً کھانے کھلانے کا حکم ہے۔ اس لیے اس اطلاق کو اپنی جگہ برقرار رہنا چاہیے اور کسی تقسیم کا پابند نہیں بنانا چاہیے۔ البتہ قربانی کی کھالوں کی بابت اتفاق ہے کہ اسے یا تو اپنے استعمال میں لاؤ یا صدقہ کرو، اسے بیچنے کی اجازت نہیں ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے، (مسند احمد، ۴/۱۵) تاہم بعض علماء نے کھال خود بیچ کر اس کی قیمت فقراء پر تقسیم کرنے کی رخصت دی ہے، (ابن کثیر) ایک ضروری وضاحت:- قرآن کریم میں یہاں قربانی کا ذکر مسائل حج کے ضمن میں آیا ہے، جس سے منکرین حدیث یہ استدلال کرتے ہیں کہ قربانی صرف حاجیوں کے

ماتحت کر دیا ہے کہ تم شکر گزاری کرو۔ (۳۶)

اللہ تعالیٰ کو قربانیوں کے گوشت نہیں پہنچتے نہ ان کے خون بلکہ اسے تو تمہارے دل کی پرہیزگاری پہنچتی ہے۔ اسی طرح اللہ نے ان جانوروں کو تمہارا مطہج کر دیا ہے کہ تم اس کی رہنمائی کے شکرے میں اس کی بڑائیاں بیان کرو، اور نیک لوگوں کو خوشخبری سنا دیجئے! (۳۷)

سن رکھو! یقیناً سچے مومنوں کے دشمنوں کو خود اللہ تعالیٰ ہٹا دیتا ہے۔ (۱) کوئی خیانت کرنے والا ناشکرا اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں۔ (۳۸)

جن (مسلمانوں) سے (کافر) جنگ کر رہے ہیں انہیں بھی مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔ (۳)

لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لُحُومَهَا وَلَا دِمَاؤَهَا وَلَكِنَّ يَنَالَهُ
التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ كَذَلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتَكْبُرُوا اللَّهَ عَلَىٰ
مَا هَدَاكُمْ وَيُبَيِّرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۳۶﴾

إِنَّ اللَّهَ يُدْفِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفٰسِقِينَ
تَحَوَّنَ كَفُورًا ﴿۳۷﴾

أُوذِنَ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ يَا أَنَّهُمْ ظَلَمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِم
لَقَدِيرٌ ﴿۳۸﴾

لیے ہی ہے۔ دیگر مسلمانوں کے لیے یہ ضروری نہیں۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ قربانی کرنے کا مطلق حکم بھی دوسرے مقام پر موجود ہے، ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَقْ﴾ (الکوثر۔ ۲) ”اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر“ اس کی تبيين و تشریح (عملی) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی کہ آپ ﷺ خود مدینے میں ہر سال ۱۰ اذوا الحج کو قربانی کرتے رہے اور مسلمانوں کو بھی قربانی کرنے کی تاکید کرتے رہے۔ چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی کرتے رہے۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ نے قربانی کی بابت جہاں دیگر ہمت سی ہدایات دیں، وہاں یہ بھی فرمایا کہ ۱۰ اذوا الحج کو ہم سب سے پہلے (عید کی) نماز پڑھیں اور اس کے بعد جا کر جانور ذبح کریں، فرمایا، ”جس نے نماز (عید) سے قبل اپنی قربانی کر لی، اس نے گوشت کھانے میں جلدی کی، اس کی قربانی نہیں ہوئی“ (صحیح بخاری، کتاب العیدین، باب التکبیر إلى العید، ومسلم، کتاب الأضاحی، باب... وقتها)، اس سے بھی واضح ہے کہ قربانی کا حکم ہر مسلمان کے لیے ہے وہ جہاں بھی ہو۔ کیوں کہ حاجی تو عید الاضحیٰ کی نماز ہی نہیں پڑھتے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حکم غیر حاجیوں کے لیے ہی ہے۔ تاہم یہ واجب نہیں ہے۔ سنت مؤکدہ ہے۔ اسی طرح دکھلاوے کی نیت سے کئی کئی قربانیاں کرنے کا رواج بھی خلاف سنت ہے۔ حدیث کے مطابق پورے گھر کے افراد کی طرف سے ایک جانور کی قربانی کافی ہے۔ صحابہ کا عمل اسی کے مطابق تھا، (ترمذی، أبواب الأضاحی، باب ماجاء أن الشاة الواحدة تجزئ عن أهل البيت، وابن ماجہ)

(۱) جس طرح ۶ ہجری میں کافروں نے اپنے غلبے کی وجہ سے مسلمانوں کو مکہ جا کر عمرہ نہیں کرنے دیا، اللہ تعالیٰ نے دو سال کے بعد ہی کافروں کے اس غلبے کو ختم فرما کر مسلمانوں سے ان کے دشمنوں کو ہٹا دیا اور مسلمانوں کو ان پر غالب کر دیا۔ (۲) اکثر سلف کا قول ہے کہ اس آیت میں سب سے پہلے جہاد کا حکم دیا گیا ہے، جس کے دو مقصد یہاں بیان کیے گئے ہیں۔ مظلومیت کا خاتمہ اور اعلائے کلمۃ اللہ۔ اس لیے کہ مظلومین کی مدد اور ان کی دادرسی نہ کی جائے تو پھر دنیا میں زور

بیشک ان کی مدد پر اللہ قادر ہے۔ (۳۹)

یہ وہ ہیں جنہیں ناحق اپنے گھروں سے نکالا گیا، صرف ان کے اس قول پر کہ ہمارا پروردگار فقط اللہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو عبادت خانے اور گرجے اور مسجدیں اور یہودیوں کے معبد اور وہ مسجدیں بھی ڈھادی جاتیں جہاں اللہ کا نام بہ کثرت لیا جاتا ہے۔ جو اللہ کی مدد کرے گا اللہ بھی ضرور اس کی مدد کرے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ بڑی قوتوں والا بڑے غلبے والا ہے۔ (۴۰)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جما دیں تو یہ پوری پابندی سے نمازیں قائم کریں اور زکوٰتیں دیں اور اچھے کاموں کا حکم کریں اور برے کاموں سے منع کریں۔^(۱) تمام کاموں کا انجام اللہ کے

لَا يَزِيْنُ اٰخِرُ حُوْمٍ وَّ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ يَقُوْلُوْا رَبَّنَا اللّٰهُ
وَلَوْ لَادَفَعُ اللّٰهُ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهَادِمَت
صَوَامِعُ وَبِيْعٌ وَصَلُوْتُ وَمَسْجِدًا يُذَكَّرُ فِيْهَا السَّمِ اللّٰهُ كَثِيْرًا
وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَنْصُرُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۳۹﴾

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَنَّكَهُمْ فِي الدُّرْحٰنِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَتَوْا الزَّكٰوةَ
وَاَمْرًا يٰۤاَيُّهَا الْمَعْرُوْفُ وَهٰوَا عَيْنِ الْمُنْتَكِرِ وَاَللّٰهُ عٰجِبُ
الْمُرُوْرِ ﴿۴۰﴾

آور کمزوروں کو اور باوسائل بے وسیلہ لوگوں کو جیسے ہی نہ دیں جس سے زمین فساد سے بھر جائے۔ اسی طرح اعلیٰ کلمۃ اللہ کے لیے کوشش نہ کی جائے اور باطل کی سرکوبی نہ کی جائے تو باطل کے غلبے سے بھی دنیا کا امن و سکون اور اللہ کا نام لینے والوں کے لیے کوئی عبادت خانہ باقی نہ رہے (مزید تشریح کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ، آیت ۲۵۱ کا حاشیہ)۔ صَوَامِعُ صَوْمَعَةٌ کی جمع) سے چھوٹے گرجے اور بِيْعٌ (بَيْعَةٌ کی جمع) سے بڑے گرجے، صَلَوَاتُ سے یہودیوں کے عبادت خانے اور مساجد سے مسلمانوں کی عبادت گاہیں مراد ہیں۔

(۱) اس آیت میں اسلامی حکومت کے بنیادی اہداف اور اغراض و مقاصد بیان کیے گئے ہیں، جنہیں خلافت راشدہ اور قرن اول کی دیگر اسلامی حکومتوں میں بروئے کار لایا گیا اور انہوں نے اپنی ترجیحات میں ان کو سرفہرست رکھا۔ تو ان کی بدولت ان حکومتوں میں امن و سکون بھی رہا، رفاہیت و خوش حالی بھی رہی اور مسلمان سر بلند اور سرفراز بھی رہے۔ آج بھی سعودی عرب کی حکومت میں بحمد اللہ ان چیزوں کا اہتمام ہے، تو اس کی برکت سے وہ اب بھی امن و خوش حالی کے اعتبار سے دنیا کی بہترین اور مثالی مملکت ہے، آج کل اسلامی ملکوں میں فلاحی مملکت کے قیام کا بڑا غلغلہ اور شور ہے اور ہر آنے جانے والا حکمران اس کے دعوے کرتا ہے۔ لیکن ہر اسلامی ملک میں بدامنی، فساد، قتل و غارت اور ارباب و پستی اور زیوں حالی روز افزوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سب اللہ کے بتلائے ہوئے راستے کو اختیار کرنے کے بجائے مغرب کے جمہوری اور لادینی نظام کے ذریعے سے فلاح و کامرانی حاصل کرنا چاہتے ہیں، جو آسمان میں تھگی لگانے اور ہوا کو مٹھی

اختیار میں ہے۔^(۱) (۳۱)

اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلائیں (تو کوئی تعجب کی بات نہیں)

تو ان سے پہلے نوح کی قوم اور عاد اور ثمود۔ (۳۲)

اور قوم ابراہیم اور قوم لوط۔ (۳۳)

اور مدین والے بھی اپنے اپنے نبیوں کو جھٹلا چکے ہیں۔

موسیٰ (علیہ السلام) بھی جھٹلائے جا چکے ہیں پس میں نے

کافروں کو یوں ہی سی مہلت دی پھر دھر دیا،^(۲) پھر میرا

عذاب کیسا ہوا؟^(۳) (۳۴)

بہت سی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے تہ و بالا کر دیا اس لیے

کہ وہ ظالم تھے پس وہ اپنی چھتوں کے بل اوندھی ہوئی

پڑی ہیں اور بہت سے آباد کنوئیں بیکار پڑے ہیں اور

بہت سے کپے اور بلند محل ویران پڑے ہیں۔ (۳۵)

کیا انہوں نے زمین میں سیر و سیاحت نہیں کی جو ان کے

دل ان باتوں کے سمجھنے والے ہوتے یا کانوں سے ہی ان

وَإِنْ يَكْفُرْ بُولَدُكَ فَقَدْ كَذَّبْتَ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَقَوْمُ عَادٍ وَقَوْمُ ثَمُودٍ ﴿۳۱﴾

وَقَوْمُ إِبْرَاهِيمَ وَقَوْمُ لُوطٍ ﴿۳۲﴾

وَأَصْحَابُ مَدْيَنَ وَكَذَّبَ مُوسَىٰ فَأَمَلَيْتَ لِلْكَافِرِينَ لَعْنًا

أَخَذُوا مِنْهُمْ كَيْفَ كَانَ يَكْفُرُونَ ﴿۳۳﴾

فَكَانَتْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ لِيَوْمِهَا نَزَّلْنَا طُوفَانًا مِنْ سَمَائِنَا

وَجَعَلْنَا لِقَوْمِهَا كِسْفَ مَطَارٍ مِثْلُ النُّجُومِ لَيْلًا مِمَّا بَيْنَ الْأَافَاقِ ﴿۳۴﴾

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونُوا لَهُمْ نُجُومًا لِيَعْتَدُونَ يَا أَيُّهَا

أَذَانٌ يَسْمَعُونَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَعْنَةُ اللَّهِ الْوَاصِلِينَ ﴿۳۵﴾

میں لینے کے مترادف ہے۔ جب تک مسلمان مملکتیں قرآن کے بتلائے ہوئے اصول کے مطابق اقامتِ صلوٰۃ و زکوٰۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام نہیں کریں گی اور اپنی ترجیحات میں ان کو سرفہرست نہیں رکھیں گی، وہ فلاحی مملکت کے قیام میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گی۔

(۱) یعنی ہر بات کا مرجع اللہ کا حکم اور اس کی تدبیر ہی ہے اس کے حکم کے بغیر کائنات میں کوئی پتہ بھی نہیں ہلتا۔ چہ جائیکہ کوئی اللہ کے احکام اور ضابطوں سے انحراف کر کے حقیقی فلاح و کامیابی سے ہمکنار ہو جائے۔

(۲) اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ یہ کفار مکہ اگر آپ کی تکذیب کر رہے ہیں تو یہ نئی بات نہیں ہے۔ پچھلی قومیں بھی اپنے پیغمبروں کے ساتھ یہی کچھ کرتی رہی ہیں اور میں بھی انہیں مہلت دیتا رہا۔ پھر جب ان کا وقت مہلت ختم ہو گیا تو انہیں تباہ و برباد کر دیا گیا۔ اس میں تعریض و کنایہ ہے مشرکین مکہ کے لیے کہ تکذیب کے باوجود تم ابھی تک مؤاخذہ الٰہی سے بچے ہو تو یہ نہ سمجھ لینا کہ ہمارا کوئی مؤاخذہ کرنے والا نہیں۔ بلکہ یہ اللہ کی طرف سے مہلت ہے، جو وہ ہر قوم کو دیا کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اطاعت و انقیاد کا راستہ اختیار نہیں کرتی، تو پھر اسے ہلاک یا مسلمانوں کے ذریعے سے مغلوب اور ذلت و رسوائی سے دوچار کر دیا جاتا ہے۔

(۳) یعنی کس طرح میں نے انہیں اپنی نعمتوں سے محروم کر کے عذاب و ہلاکت سے دوچار کر دیا۔

تَعَمَّى الْقُلُوبَ الْبِئْسَ فِي الضُّوْرِ ۝

(واقعات) کو سن لیتے، بات یہ ہے کہ صرف آنکھیں ہی اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔^(۱) (۳۶)

اور عذاب کو آپ سے جلدی طلب کر رہے اللہ ہرگز اپنا وعدہ نہیں ٹالے گا۔ ہاں البتہ آپ کے رب کے نزدیک ایک دن تمہاری گنتی کے اعتبار سے ایک ہزار سال کا ہے۔^(۲) (۳۷)

بہت سی ظلم کرنے والی بستیوں کو میں نے ڈھیل دی پھر آخر انہیں پکڑ لیا، اور میری ہی طرف لوٹ کر آتا ہے۔^(۳) (۳۸)

اعلان کر دو کہ لوگو! میں تمہیں کھلم کھلا چوکنا کرنے والا ہی ہوں۔^(۴) (۳۹)

وَيَسْتَعِجُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ ۝

وَكَايُنَ مِنْ قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ لُتَمَّ لَعَدُؤُهَا ۝
وَلَأَيُّ النَّصِيرِ ۝

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ نُبَيِّنُ لَكُمْ آيَاتِنَا فَتَنْبَهُوا ۝

(۱) اور جب کوئی قوم ضلالت کے اس مقام پر پہنچ جائے کہ عبرت پذیری کی صلاحیت بھی کھو بیٹھے، تو ہدایت کے بجائے، گزشتہ قوموں کی طرح تباہی ہی اس کا بھی مقدر بن کر رہتی ہے۔ آیت میں فعل تعقل کا متاسب دل کی طرف کیا گیا ہے، جس سے استدلال کیا گیا ہے کہ عقل کا محل، قلب ہے۔ اور بعض کہتے ہیں محل عقل دماغ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان دونوں باتوں میں کوئی منافات نہیں، اس لیے کہ فہم و ادراک کے حصول میں عقل اور دماغ دونوں کا آپس میں بڑا گہرا ربط و تعلق ہے۔ (فتح القدر، ایسر التفاسیر)

(۲) اس لیے یہ لوگ تو اپنے حساب سے جلدی کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے حساب میں ایک دن بھی ہزار سال کا ہے۔ اس اعتبار سے وہ اگر کسی کو ایک دن (۲۴ گھنٹے) کی مہلت دے تو ہزار سال، نصف یوم کی مہلت تو پانچ سو سال، ۶ گھنٹے (جو ۲۴ گھنٹے کا چوتھائی ہے) مہلت دے تو ڈھائی سو سال کا عرصہ عذاب کے لیے درکار ہے، وَهَلُمَّ جَزَاءً اس طرح اللہ کی طرف سے کسی کو ایک گھنٹے کی مہلت مل جانے کا مطلب کم و بیش چالیس سال کی مہلت ہے، (ایسر التفاسیر) ایک دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی قدرت میں ایک دن اور ہزار سال برابر ہیں، اس لیے تقدیم و تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ جلدی مانگتے ہیں، وہ دیر کرتا ہے، تاہم یہ بات تو یقینی ہے کہ وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کر کے رہے گا۔ اور بعض نے اسے آخرت پر محمول کیا ہے کہ شدت ہولناکی کی وجہ سے قیامت کا ایک دن ہزار سال بلکہ بعض کو پچاس ہزار سال کا لگے گا۔ اور بعض نے کہا کہ آخرت کا دن واقعی ہزار سال کا ہو گا۔

(۳) اسی لیے یہاں قانون مہلت کو پھر بیان کیا ہے کہ میری طرف سے عذاب میں کتنی ہی تاخیر کیوں نہ ہو جائے، تاہم میری گرفت سے کوئی بچ نہیں سکتا، نہ کہیں فرار ہو سکتا ہے۔ اسے لوٹ کر بالآخر میرے ہی پاس آتا ہے۔

(۴) یہ کفار و مشرکین کے مطالبہ عذاب پر کہا جا رہا ہے کہ میرا کام تو انذار و تبشیر ہے۔ عذاب بھیجنا، یہ اللہ کا کام ہے، وہ

فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ

وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿۵۰﴾

وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعْجِزِينَ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
الْجَحِيمِ ﴿۵۱﴾

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا آتَانَا نَفْقًا

أَلْفَى الشَّيْطَانُ فِي أُمَّتَيْهِمْ فَبَشَّرَهُ اللَّهُ مَا لَيْقَى الشَّيْطَانُ

ثُمَّ رَحِمَهُ اللَّهُ إِنَّهُ وَالدُّهُ عَلَيْهِمْ حَكِيمٌ ﴿۵۲﴾

پس جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں

ان ہی کے لیے بخشش ہے اور عزت والی روزی۔ (۵۰)

اور جو لوگ ہماری نشانیوں کو پست کرنے کے درپے

رہتے ہیں ^(۱) وہی دوزخی ہیں۔ (۵۱)

ہم نے آپ سے پہلے جس رسول اور نبی کو بھیجا اس کے

ساتھ یہ ہوا کہ جب وہ اپنے دل میں کوئی آرزو کرنے لگا

شیطان نے اس کی آرزو میں کچھ ملادیا، پس شیطان کی

ملاوٹ کو اللہ تعالیٰ دور کر دیتا ہے پھر اپنی باتیں سچی کر دیتا

ہے۔ ^(۲) اللہ تعالیٰ دانا اور با حکمت ہے۔ (۵۲)

جلدی گرفت فرمائے یا اس میں تاخیر کرے، وہ اپنی حسب مشیت و مصلحت یہ کام کرتا ہے۔ جس کا علم بھی اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ اس خطاب کے اصل مخاطب اگرچہ اہل مکہ ہیں لیکن چونکہ آپ پوری نوع انسانی کے لیے رہبر اور رسول بن کر آئے تھے، اس لیے خطاب بآئینہا النَّاسِ کے الفاظ سے کیا گیا ہے، اس میں قیامت تک ہونے والے وہ کفار و مشرکین آگئے جو اہل مکہ کا سا رویہ اختیار کریں گے۔

(۱) مُعْجِزِينَ کا مطلب ہے یہ گمان کرتے ہوئے کہ ہمیں عاجز کر دیں گے، تمہکا دیں گے اور ہم ان کی گرفت کرنے پر قادر نہیں ہو سکیں گے۔ اس لیے کہ وہ بحث بعد الموت اور حساب کتاب کے منکر تھے۔

(۲) تَمَعْنَى کے ایک معنی ہیں آرزو کی یاد دل میں خیال کیا۔ دوسرے معنی ہیں پڑھایا تلاوت کی۔ اسی اعتبار سے اُمْنِيَّة کا

ترجمہ آرزو، خیال یا تلاوت ہو گا۔ پہلے معنی کے اعتبار سے مفہوم ہو گا، اس کی آرزو میں شیطان نے رکاوٹیں ڈالیں تاکہ

وہ پوری نہ ہوں۔ اور رسول و نبی کی آرزو یہی ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ایمان لے آئیں، شیطان رکاوٹیں ڈال

کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ایمان سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مفہوم ہو گا کہ جب بھی اللہ کا

رسول یا نبی وحی شدہ کلام پڑھتا اور اس کی تلاوت کرتا ہے تو شیطان اس کی قراءت و تلاوت میں اپنی باتیں ملانے کی

کوشش کرتا ہے یا اس کی بابت لوگوں کے دلوں میں شبہ ڈالتا اور میں شیخ ڈالتا اور میں شیخ نکالتا ہے۔ اللہ تعالیٰ شیطان کی رکاوٹوں کو دور

فرما کر یا تلاوت میں ملاوٹ کی کوشش کو ناکام فرما کر یا شیطان کے پیدا کردہ شکوک و شبہات کا ازالہ فرما کر اپنی بات کو یا اپنی

آیات کو محکم (پکا) فرما دیتا ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ شیطان کی یہ کارستانیوں صرف

آپ ﷺ کے ساتھ ہی نہیں ہیں، آپ ﷺ سے پہلے جو رسول اور نبی آئے، سب کے ساتھ ہی یہی کچھ کرنا آیا ہے۔

تاہم آپ ﷺ گھبرائیں نہیں، شیطان کی ان شرارتوں اور سازشوں سے، جس طرح ہم پچھلے انبیاء علیہم السلام کو بچاتے

رہے ہیں، یقیناً آپ ﷺ بھی محفوظ رہیں گے اور شیطان کے علی الرغم اللہ تعالیٰ اپنی بات کو پکا کر کے رہے گا۔ یہاں

یہ اس لیے کہ شیطانی ملاوٹ کو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی آزمائش کا ذریعہ بنا دے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل سخت ہیں۔^(۱) بیشک ظالم لوگ گہری مخالفت میں ہیں۔ (۵۳)

اور اس لیے بھی کہ جنہیں علم عطا فرمایا گیا ہے وہ یقین کر لیں کہ یہ آپ کے رب ہی کی طرف سے سراسر حق ہی ہے پھر وہ اس پر ایمان لائیں اور ان کے دل اس کی طرف جھک جائیں۔^(۲) یقیناً اللہ تعالیٰ ایمان داروں کو راہ راست کی طرف رہبری کرنے والا ہی^(۳) ہے۔ (۵۴)

کافراں وحی الہی میں ہمیشہ شک شبہ ہی کرتے رہیں گے حتیٰ کہ اچانک ان کے سروں پر قیامت آجائے یا ان کے پاس اس دن کا عذاب آجائے جو منحوس ہے۔^(۴) (۵۵)

لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَفِي شِقَاقِ بَعِيدٍ ﴿۵۳﴾

وَالَّذِينَ الَّذِينَ آمَنُوا أَلَمَّا أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ يَقُولُوهَا وَهُمْ يَدْعُونَ لَهَا وَلَئِن لَّمْ يَؤْمِنُوا بِهَا لَأَسْتَفْتِيَهُمْ ﴿۵۴﴾

وَالَّذِينَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مَرْيَمَةَ مِنَّا حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً ءَوَىٰ تَتَذَكَّرُ يَوْمَ عَذَابِهِمْ ﴿۵۵﴾

بعض مفسرین نے غرائق علیٰ کا قصہ بیان کیا ہے جو محققین کے نزدیک ثابت ہی نہیں ہے۔ اس لیے اسے یہاں پیش کرنے کی ضرورت ہی سرے سے نہیں سمجھی گئی ہے۔

(۱) یعنی شیطان یہ حرکتیں اس لیے کرتا ہے کہ لوگوں کو گمراہ کرے اور اس کے جال میں وہ لوگ پھنس جاتے ہیں جن کے دلوں میں کفر و نفاق کا روگ ہوتا ہے یا گناہ کر کے ان کے دل سخت ہو چکے ہوتے ہیں۔

(۲) یعنی یہ القائے شیطانی جو دراصل اغوائے شیطانی ہے، اگر اہل نفاق و شک اور اہل کفر و شرک کے حق میں فتنے کا ذریعہ ہے تو دوسری طرف جو علم و معرفت کے حامل ہیں، ان کے ایمان و یقین میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ سمجھ جاتے ہیں کہ اللہ کی نازل کردہ بات یعنی قرآن حق ہے، جس سے ان کے دل بارگاہ الہی میں جھک جاتے ہیں۔

(۳) دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں اس طرح کی ان کی رہنمائی حق کی طرف کر دیتا ہے اور اس کے قبول اور اتباع کی توفیق سے بھی نواز دیتا ہے۔ باطل کی سمجھ بھی ان کو دے دیتا ہے اور اس سے انہیں بچا بھی لیتا ہے اور آخرت میں سیدھے راستے کی رہنمائی یہ ہے کہ انہیں جنم کے عذاب الیم و عظیم سے بچا کر جنت میں داخل فرمائے گا اور وہاں اپنی نعمتوں اور دیدار سے انہیں نوازے گا۔ اللّٰهُمَّ! اجْعَلْنَا مِنْهُمْ.

(۴) یَوْمِ عَقَابِهِم (بانجھ دن) سے مراد بھی قیامت کا دن ہے۔ اسے عقیم اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے بعد کوئی دن نہیں ہو گا، جس طرح عقیم اس کو کہا جاتا ہے جس کی اولاد نہ ہو۔ یا اس لیے کہ کافروں کے لیے اس دن کوئی رحمت نہیں ہو گی، گویا ان کے لیے خیر سے خالی ہو گا۔ جس طرح باد تند کو، جو بطور عذاب کے آتی رہی ہے الرِّيحُ الْعَقِيمَةُ کہا گیا ہے، ﴿إِذَا سُلِّطْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحُ الْعَقِيمَةُ﴾ (الذاریات: ۴۱) ”جب ہم نے ان پر بانجھ ہوا بھیجی“ یعنی ایسی ہوا جس میں کوئی خیر تھی

الْمَلِكُ يَوْمَئِذٍ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فَالَّذِينَ

آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي حَيَاتِهِمْ ۝۵۱

اس دن صرف اللہ ہی کی بادشاہت ہوگی (۱) وہی ان میں فیصلے فرمائے گا۔ ایمان اور نیک عمل والے تو نعمتوں سے بھری جنتوں میں ہوں گے۔ (۵۱)

اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا ان کے لیے ذلیل کرنے والے عذاب ہیں۔ (۵۷)

اور جن لوگوں نے راہ خدا میں ترک وطن کیا پھر وہ شہید کر دیئے گئے یا اپنی موت مر (۲) گئے اللہ تعالیٰ انہیں بہترین رزق عطا فرمائے گا۔ (۳) اور بیشک اللہ تعالیٰ روزی دینے والوں میں سب سے بہتر ہے۔ (۵۸) (۳)

انہیں اللہ تعالیٰ ایسی جگہ پہنچائے گا کہ وہ اس سے راضی ہو جائیں گے، (۵) بیشک اللہ تعالیٰ علم اور بردباری والا ہے۔ (۵۹)

وَالَّذِينَ كَفَرُوا ذُوقُوا بِأَلْبَتِنَا فَاُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۝۵۷

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ قَاتَلُوا أَوْ مَاتُوا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللَّهُ رِزْقًا حَسَنًا وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۝۵۸

لَيُدْخِلَنَّهُمُ اللَّهُ جَنَّاتٍ يَدْخُلُونَهَا مِنْ أَبْوَابٍ وَأَنَّهُمْ فِيهَا كَالَّذِينَ كَانُوا يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ اللَّهِ يَوْمَئِذٍ ۝۵۹

نہ بارش کی نوید۔

(۱) یعنی دنیا میں تو عارضی طور پر بطور انعام یا بطور امتحان لوگوں کو بھی بادشاہتیں اور اختیار و اقتدار مل جاتا ہے۔ لیکن آخرت میں کسی کے پاس بھی کوئی بادشاہت اور اختیار نہیں ہوگا۔ صرف ایک اللہ کی بادشاہی اور اس کی فرماں روائی ہوگی، اسی کا مکمل اختیار اور غلبہ ہوگا، ﴿الْمَلِكُ يَوْمَئِذٍ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي حَيَاتِهِمْ﴾ (الفرقان: ۲۶) ”بادشاہی اس دن ثابت ہے واسطے رحمن کے اور یہ دن کافروں پر سخت بھاری ہوگا۔“ ﴿لَعَلَّ الْمَلِكُ الْيَوْمَ إِلَهُ الْوَالِدِ الْعَقَلَارِ﴾ (المؤمن: ۶۰) اللہ تعالیٰ پوچھے گا۔ ”آج کس کی بادشاہی ہے؟“ پھر خود ہی جواب دے گا ”ایک اللہ غالب کی۔“

(۲) یعنی اسی ہجرت کی حالت میں موت آگئی یا شہید ہو گئے۔

(۳) یعنی جنت کی نعمتیں جو ختم ہوں گی نہ فنا۔

(۴) کیونکہ وہ بغیر حساب کے بغیر استحقاق کے اور بغیر سوال کے دیتا ہے۔ علاوہ ازیں انسان بھی جو ایک دوسرے کو دیتے ہیں تو اسی کے دینے ہوئے میں سے دیتے ہیں، اس لیے اصل رازق وہی ہے۔

(۵) کیونکہ جنت کی نعمتیں ایسی ہوں گی، مَا لَآعِينَ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا حَظْرٌ عَلَىٰ قَلْبٍ بَشَرٍ جنہیں آج تک نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا۔ اور دیکھنا سنانا تو کجا، کسی انسان کے دل میں ان کا وہم و گمان بھی نہیں گزرا۔“

بھلا ایسی نعمتوں سے بہرہ یاب ہو کر کون خوش نہیں ہوگا؟

(۶) ”عَلَيْكُمْ“ وہ نیک عمل کرنے والوں کے درجات اور ان کے مراتب استحقاق کو جانتا ہے۔ کفر و شرک کرنے والوں کی

بات یہی ہے،^(۱) اور جس نے بدلہ لیا اسی کے برابر جو اس کے ساتھ کیا گیا تھا پھر اگر اس سے زیادتی کی جائے تو یقیناً اللہ تعالیٰ خود اس کی مدد فرمائے گا۔^(۲) بیشک اللہ درگزر کرنے والا بخشنے والا ہے۔^(۳) (۶۰)

یہ اس لیے کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے^(۴) اور بیشک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ (۶۱)

یہ سب اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے^(۵) اور اس کے سوا جسے بھی یہ پکارتے ہیں وہ باطل ہے اور بیشک اللہ ہی بلندی والا کبریائی والا ہے۔ (۶۲)

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی

ذٰلِكَ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوِّبَ بِهِ كُوِّفِيَ عَلَيْهِ لِكَيْتَرَكَهُ اللهُ اِنَّ اللهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿۶۰﴾

ذٰلِكَ يٰۤاَنۡتَ اللهُ يُؤَلِّجُ الۡلَيۡلَ فِي النَّهۡرِ وَيُوَلِّجُ النَّهۡرَ فِي الۡلَيۡلِ وَاَنَّ اللهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ﴿۶۱﴾

ذٰلِكَ يٰۤاَنۡتَ اللهُ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدَّعُوْنَ مِنْ دُوۡنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۶۲﴾

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصۡبِحُ

گستاخیوں اور نافرمانیوں کو دیکھتا ہے لیکن ان کا فوری مواخذہ نہیں کرتا۔

(۱) یعنی یہ کہ مہاجرین سے بطور خاص شہادت یا طبعی موت پر ہم نے جو وعدہ کیا ہے، وہ ضرور پورا ہو گا۔

(۲) عقوبت، اس سزا یا بدلے کو کہتے ہیں جو کسی فعل کی جزا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ کسی نے اگر کسی کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے تو جس سے زیادتی کی گئی ہے، اسے بقدر زیادتی بدلہ لینے کا حق ہے۔ لیکن اگر بدلہ لینے کے بعد، جب کہ ظالم اور مظلوم دونوں برابر سرابر ہو چکے ہوں، ظالم، مظلوم پر پھر زیادتی کرے تو اللہ تعالیٰ اس مظلوم کی ضرور مدد فرماتا ہے۔ یعنی یہ شبہ نہ ہو کہ مظلوم نے معاف کر دینے کے بجائے بدلہ لے کر غلط کام کیا ہے، نہیں، بلکہ اس کی بھی اجازت اللہ ہی نے دی ہے، اس لیے آئندہ بھی وہ اللہ کی مدد کا مستحق رہے گا۔

(۳) اس میں پھر معاف کر دینے کی ترغیب دی گئی ہے کہ اللہ درگزر کرنے والا ہے، تم بھی درگزر سے کام لو۔ ایک دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ بدلہ لینے میں۔ جو بقدر ظلم ظالم ہو گا۔ جتنا ظلم کیا جائے گا، اس کی اجازت چونکہ اللہ کی طرف سے ہے، اس لیے اس پر مواخذہ نہیں ہو گا، بلکہ وہ معاف ہے۔ بلکہ اسے ظلم اور شیتہ بطور مشکلات کے کہا جاتا ہے، ورنہ انتقام یا بدلہ سرے سے ظلم یا شیتہ ہی نہیں ہے۔

(۴) یعنی جو اللہ اس طرح کام کرنے پر قادر ہے، وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ اس کے جن بندوں پر ظلم کیا جائے ان کا بدلہ وہ ظالموں سے لے۔

(۵) اس لیے اس کا دین حق ہے، اس کی عبادت حق ہے اس کے وعدے حق ہیں، اس کا اپنے اولیاء کی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں مدد کرنا حق ہے، وہ اللہ عزوجل اپنی ذات میں، اپنی صفات میں اور اپنے افعال میں حق ہے۔

برساتا ہے، پس زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ مہربان اور باخبر ہے۔^(۱) (۶۳)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے^(۲) اور یقیناً اللہ وہی ہے بے نیاز تعریفوں والا۔ (۶۴)

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی نے زمین کی تمام چیزیں تمہارے لئے مسخر کر دی ہیں^(۳) اور اس کے فرمان سے پانی میں چلتی ہوئی کشتیاں بھی۔ وہی آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ زمین پر اس کی اجازت کے بغیر گرنہ پڑے،^(۴) بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر شفقت و نرمی کرنے والا اور مہربان ہے۔ (۶۵)

اسی نے تمہیں زندگی بخشی، پھر وہی تمہیں مار ڈالے گا پھر وہی تمہیں زندہ کرے گا، بے شک انسان البتہ ناشکرا ہے۔^(۶) (۶۶)

الْأَرْضُ مُخَضَّرَةٌ إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ ۝

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۝

وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَمِيدُ ۝

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مِمَّا فِي الْأَرْضِ وَاللَّذٰلِكَ تَعْبٰرٌ

فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ وَيُنسِكُ السَّمَآءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ

إِلَّا بِإِذْنِهِ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

وَهُوَ الَّذِي أَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ

إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ۝

(۱) لَطِيفٌ (باریک بین) ہے، اس کا علم ہر چھوٹی بڑی چیز کو محیط ہے یا لطف کرنے والا ہے یعنی اپنے بندوں کو روزی پہنچانے میں لطف و کرم سے کام لیتا ہے۔ خَبِيرٌ، وہ ان باتوں سے باخبر ہے جن میں اس کے بندوں کے معاملات کی تدبیر اور اصلاح ہے۔ یا ان کی ضروریات و حاجات سے آگاہ ہے۔

(۲) پیدائش کے لحاظ سے بھی، ملکیت کے اعتبار سے بھی اور تصرف کرنے کے اعتبار سے بھی۔ اس لیے سب مخلوق اس کی محتاج ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ کیوں کہ وہ غنی یعنی بے نیاز ہے۔ اور جو ذات سارے کمالات اور اختیارات کا منبع ہے، ہر حال میں تعریف کی مستحق بھی وہی ہے۔

(۳) مثلاً جانور، نہریں، درخت اور دیگر بے شمار چیزیں، جن کے منافع سے انسان بہرہ ور اور لذت یاب ہوتا ہے۔ (۴) یعنی اگر وہ چاہے تو آسمان زمین پر گر پڑے، جس سے زمین پر موجود ہر چیز تباہ ہو جائے۔ ہاں قیامت والے دن اس کی مشیت سے آسمان بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔

(۵) اسی لیے اس نے مذکورہ چیزوں کو انسان کے تابع کر دیا ہے اور آسمان کو بھی ان پر گرنے نہیں دیتا۔ تابع (مسخر) کرنے کا مطلب ہے کہ ان تمام چیزوں سے انتفاع اس کے لیے ممکن یا آسان کر دیا گیا ہے۔

(۶) یہ بحیثیت جنس کے ہے۔ بعض افراد کا اس ناشکری سے نکل جانا اس کے منافی نہیں، کیونکہ انسانوں کی اکثریت میں یہ کفر و جحود پایا جاتا ہے۔

ہر امت کے لیے ہم نے عبادت کا ایک طریقہ مقرر کر دیا ہے، جسے وہ بجالانے والے^(۱) ہیں پس انہیں اس امر میں آپ سے جھگڑنا نہ کرنا چاہیے^(۲) آپ اپنے پروردگار کی طرف لوگوں کو بلائیے۔ یقیناً آپ ٹھیک ہدایت پر ہی ہیں۔^(۳) (۶۷)

پھر بھی اگر یہ لوگ آپ سے الجھنے لگیں تو آپ کہہ دیں کہ تمہارے اعمال سے اللہ بخوبی واقف ہے۔ (۶۸) بیشک تمہارے سب کے اختلاف کا فیصلہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ آپ کرے گا۔^(۴) (۶۹)

کیا آپ نے نہیں جانا کہ آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے۔ یہ سب لکھی ہوئی کتاب میں محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ پر تو یہ امر بالکل آسان ہے۔^(۵) (۷۰)

لِحَىٰ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنَسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُبَارِكُ فِي
الْأَمْوَادِ إِلَّا لِرَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَّ هُدًى مُّسْتَقِيمًا ۝۴۰

وَأَنْ جَادِلُواكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝۴۱

اللَّهُ يَخْتَصِمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝۴۲

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ

إِنَّ ذَلِكَ فِي كِتَابٍ وَإِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝۴۳

(۱) یعنی ہر زمانے میں ہم نے لوگوں کے لیے ایک شریعت مقرر کی، جو بعض چیزوں میں سے ایک دوسرے سے مختلف بھی ہوتی، جس طرح تورات، امت موسیٰ علیہ السلام کے لیے، انجیل امت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے شریعت تھی اور اب قرآن امت محمدیہ کے لیے شریعت اور ضابطہ حیات ہے۔

(۲) یعنی اللہ نے آپ کو جو دین اور شریعت عطا کی ہے، یہ بھی مذکورہ اصول کے مطابق ہی ہے، ان سابقہ شریعت والوں کو چاہیے کہ اب آپ ﷺ کی شریعت پر ایمان لے آئیں، نہ کہ اس معاملے میں آپ ﷺ سے جھگڑیں۔

(۳) یعنی آپ ﷺ ان کے جھگڑے کی پروا نہ کریں، بلکہ ان کو اپنے رب کی طرف دعوت دیتے رہیں، کیونکہ اب صراط مستقیم پر صرف آپ ہی گامزن ہیں۔ یعنی پچھلی شریعتیں منسوخ ہو گئی ہیں۔

(۴) یعنی بیان اور اظہار حجت کے بعد بھی اگر یہ جدال و منازعت سے باز نہ آئیں تو ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں کہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارے اختلافات کا فیصلہ قیامت والے دن فرمائے گا، پس اس دن واضح ہو جائے گا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ کیونکہ وہ اس کے مطابق سب کو جزا دے گا۔

(۵) اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال علم اور مخلوقات کے احاطے کا ذکر فرمایا ہے۔ یعنی اس کی مخلوقات کو جو کچھ کرنا تھا، اس کو اس کا علم پہلے سے ہی تھا۔ جن بندوں کو اپنے اختیار و ارادے سے نیکی کا راستہ اور جنہیں اپنے اختیار سے برائی کا راستہ اپنانا تھا، وہ ان کو جانتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے علم سے یہ باتیں پہلے ہی لکھ دیں۔ اور لوگوں کو یہ بات چاہے، کتنی ہی مشکل معلوم ہو، اللہ کے لیے بالکل آسان ہے۔ یہ وہی تقدیر کا مسئلہ ہے، اس پر ایمان رکھنا ضروری ہے، جسے

اور یہ اللہ کے سوا ان کی عبادت کر رہے ہیں۔ جس کی کوئی خدائی دلیل نازل نہیں ہوئی نہ وہ خود ہی اس کا کوئی علم رکھتے ہیں۔^(۱) ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ (۷۱)

جب ان کے سامنے ہمارے کلام کی کھلی ہوئی آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو آپ کافروں کے چروں پر ناخوشی کے صاف آثار پہچان لیتے ہیں۔ وہ تو قریب ہوتے ہیں کہ ہماری آیتیں سنانے والوں پر حملہ کر بیٹھیں،^(۲) کہہ دیجئے کہ کیا میں تمہیں اس سے بھی زیادہ بدتر خبر دوں۔ وہ آگ ہے، جس کا وعدہ اللہ نے کافروں سے کر رکھا ہے،^(۳) اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔ (۷۲)

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَمْ يَنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا
وَمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهِ عِلْمٌ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ ①

وَإِذْ اسْتُلْتُمْ عَلَيْهِمُ الِيتِنَاتِ بِأَنْتُمْ تَعْرِفُونَ فِي وُجُوهِ الَّذِينَ
كَفَرُوا وَالْمُنْكَرُ كَمَا دُونُ سَيْطُونٍ بِالَّذِينَ يَشْتَاؤُونَ عَلَيْهِمْ
الِيتِنَاتِ قُلْ أَفَأَنْتُمْ بِبَشِيرٍ مِنْ ذَلِكَُمْ أَتَّارُونَ عَدَا
اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَأَوْبَسُوا الْهَيْصُ ②

حدیث میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے۔ ”اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کی پیدائش سے پچاس ہزار سال پہلے، جب کہ اس کا عرش پانی پر تھا، مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی تھیں۔“ (صحیح مسلم، کتاب القدر، باب حجاج آدم و موسیٰ) اور سنن کی روایت میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم پیدا فرمایا، اور اس کو کہا ”لکھ“ اس نے کہا ”کیا لکھوں؟“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جو کچھ ہونے والا ہے، سب لکھ دے۔ چنانچہ اس نے اللہ کے حکم سے قیامت تک جو کچھ ہونے والا تھا، سب لکھ دیا۔“ (ابوداؤد، کتاب السنہ، باب فی القدر، ترمذی، ابواب القدر و تفسیر سورۃ ن، مسند احمد ۵/۳۱۷)

(۱) یعنی ان کے پاس نہ کوئی نقلی دلیل ہے، جسے کسی آسمانی کتاب سے یہ دکھاسکیں، نہ عقلی دلیل ہے جسے غیر اللہ کی عبادت کے اثبات میں پیش کر سکیں۔

(۲) اپنے ہاتھوں سے دست درازی کر کے یا بد زبانی کے ذریعے سے۔ یعنی مشرکین اور اہل ضلالت کے لیے اللہ کی توحید اور رسالت و معاد کا بیان ناقابل برداشت ہوتا ہے، جس کا اظہار، ان کے چہرے سے اور بعض دفعہ ہاتھوں اور زبانوں سے ہوتا ہے۔ یہی حال آج کے اہل بدعت اور گمراہ فرقوں کا ہے، جب ان کی گمراہی، قرآن و حدیث کے دلائل سے واضح کی جاتی ہے تو ان کا رویہ بھی آیات قرآنی اور دلائل حدیثیہ کے مقابلے میں ایسا ہی ہوتا ہے، جس کی وضاحت اس آیت میں کی گئی ہے۔ (فتح القدر)

(۳) یعنی ابھی تو آیات الہیٰ سن کر صرف تمہارے چہرے ہی متغیر ہوتے ہیں۔ ایک وقت آئے گا، اگر تم نے اپنے اس رویے سے توبہ نہیں کی، کہ اس سے کہیں زیادہ بدتر حالات سے تمہیں دوچار ہونا پڑے گا، اور وہ ہے جہنم کی آگ میں جلنا، جس کا وعدہ اللہ نے اہل کفر و شرک سے کر رکھا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُربَ مَثَلٍ فَاستَمِعُوا لَهُ إِنَّ الَّذِينَ
تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَا يُكْوِنُوا
اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِنْ يَسئَلْهُمْ الذُّبَابُ سَيَسئَلُهُمْ لَمَّا شَرَعُوا
مِنْهُ صَعَفَ الظَّالِمِ وَالْمَطْلُوبِ ①

مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِنَّ اللَّهَ لَعَزِيزٌ ②

لوگو! ایک مثال بیان کی جا رہی ہے، ذرا کان لگا کر سن لو! اللہ کے سوا جن جن کو تم پکارتے رہے ہو وہ ایک مکھی بھی تو پیدا نہیں کر سکتے، گو سارے کے سارے ہی جمع ہو جائیں،^(۱) بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز لے بھاگے تو یہ تو اسے بھی اس سے چھین نہیں سکتے،^(۲) بڑا بودا ہے طلب کرنے والا اور بڑا بودا ہے^(۳) وہ جس سے طلب کیا جا رہا ہے۔ (۷۳)

انہوں نے اللہ کے مرتبہ کے مطابق اس کی قدر جانی ہی نہیں،^(۴) اللہ تعالیٰ بڑا ہی زور و قوت والا اور غالب و زبردست ہے۔ (۷۴)

(۱) یعنی یہ معبودان باطل، جن کو تم، اللہ کو چھوڑ کر، مدد کے لیے پکارتے ہو، یہ سارے کے سارے جمع ہو کر ایک نہایت حقیر سی مخلوق مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں، تو نہیں کر سکتے۔ اس کے باوجود بھی تم انہی کو اپنا حاجت روا سمجھو، تو تمہاری عقل قابل ماتم ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا جن کی عبادت کی جاتی رہی ہے، وہ صرف پتھر کی بے جان مورتیاں ہی نہیں ہوتی تھیں، (جیسا کہ آج کل قبر پرستی کا جواز پیش کرنے والے لوگ باور کراتے ہیں) بلکہ یہ عقل و شعور رکھنے والی چیزیں بھی تھیں۔ یعنی اللہ کے نیک بندے بھی تھے، جن کے مرنے کے بعد لوگوں نے ان کو اللہ کا شریک ٹھہرا لیا، اسی لیے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہ سب اکٹھے بھی ہو جائیں تو ایک حقیر ترین شے مکھی، بھی پیدا نہیں کر سکتے، محض پتھر کی مورتیوں کو یہ چیلنج نہیں دیا جاسکتا۔

(۲) یہ ان کی مزید بے بسی اور لاچارگی کا اظہار ہے کہ پیدا کرنا تو کجا، یہ تو مکھی کو پکڑ کر اس کے منہ سے اپنی وہ چیز بھی واپس نہیں لے سکتے، جو وہ ان سے چھین کر لے جائے۔

(۳) طالب سے مراد، خود ساختہ معبود اور مطلوب سے مراد مکھی یا بعض کے نزدیک طالب سے، پجاری اور مطلوب سے اس کا معبود مراد ہے۔ حدیث قدسی میں معبودان باطل کی بے بسی کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو میری طرح پیدا کرنا چاہتا ہے اگر کسی میں واقعی یہ قدرت ہے تو وہ ایک ذرہ یا ایک جوہی پیدا کر کے دکھادے۔“ (صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب لا تدخل الملائكة بيتا فيه كلب ولا صورة)

(۴) یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کی بے بس مخلوق کو اس کا ہمسرا اور شریک قرار دے لیتے ہیں۔ اگر ان کو اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت، اس کی قدرت و طاقت اور اس کی بے پناہی کا صحیح صحیح اندازہ اور علم ہو تو وہ کبھی اس کی خدائی میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔

فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے پیغام پہنچانے والوں کو اللہ ہی چھانٹ لیتا ہے،^(۱) بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ (۷۵)

وہ بخوبی جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے، اور اللہ ہی کی طرف سب کام لوٹائے جاتے ہیں۔ (۷۶)^(۲)

اے ایمان والو! رکوع سجدہ کرتے رہو^(۳) اور اپنے پروردگار کی عبادت میں لگے رہو اور نیک کام کرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ (۷۷)^(۴)

اور اللہ کی راہ میں ویسایہ جہاد کرو جیسے جہاد کا حق ہے۔^(۵) اسی نے تمہیں برگزیدہ بنایا ہے اور تم پر دین کے بارے میں

اللَّهُ يَصْطَلِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ
إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ﴿۷۵﴾

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ
الْأُمُورُ ﴿۷۶﴾



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا مَا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ
وَأَعْلُوا الصَّوَابَ لَكُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۷۷﴾

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا
جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مَمْلُوءَةً لَكُمْ

(۱) رُسُلٌ رُسُلٌ (فرستادہ، بھیجا ہوا قاصد) کی جمع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے بھی رسالت کا یعنی پیغام رسانی کا کام لیا ہے، جیسے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اپنی وحی کے لیے منتخب کیا کہ وہ رسولوں کے پاس وحی پہنچائیں۔ یا عذاب لے کر قوموں کے پاس جائیں اور لوگوں میں سے بھی، جنہیں چاہا، رسالت کے لیے چن لیا اور انہیں لوگوں کی ہدایت و رہنمائی پر مامور فرمایا۔ یہ سب اللہ کے بندے تھے، گو منتخب اور چنیدہ تھے۔ لیکن کس لیے؟ خدائی اختیارات میں شرکت کے لیے؟ جس طرح کہ بعض لوگوں نے انہیں اللہ کا شریک گردان لیا۔ نہیں، بلکہ صرف اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے۔

(۲) وہ بندوں کے اقوال سننے والا ہے اور بصیر ہے یعنی یہ جانتا ہے کہ رسالت کا مستحق کون ہے؟ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا، ﴿اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ — (الأنعام: ۱۲۳) ”اس موقع کو تو اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کہاں وہ اپنی پیغمبری رکھے۔“

(۳) جب تمام معاملات کا مرجع اللہ ہی ہے تو پھر انسان اس کی نافرمانی کر کے کہاں جا سکتا اور اس کے عذاب سے کیوں کر بچ سکتا ہے؟ کیا اس کے لیے یہ بہتر نہیں ہے کہ وہ اس کی اطاعت اور فرماں برداری کا راستہ اختیار کر کے اس کی رضا حاصل کرے؟ چنانچہ اگلی آیت میں اس کی صراحت کی جا رہی ہے۔

(۴) یعنی اس نماز کی پابندی کرو جو شریعت میں مقرر کی گئی ہے۔ آگے عبادت کا بھی حکم آرہا ہے۔ جس میں نماز بھی شامل تھی، لیکن اس کی اہمیت و افضلیت کے پیش نظر اس کا خصوصی حکم دیا۔

(۵) یعنی فلاح (کامیابی) اللہ کی عبادت اور اطاعت یعنی افعال خیر اختیار کرنے میں ہے، نہ کہ اللہ کی عبادت و اطاعت سے گریز کر کے محض مادی اسباب و وسائل کی فراہمی اور فراوانی میں، جیسا کہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں۔

(۶) اس جہاد سے مراد، بعض نے وہ جہاد اکبر لیا ہے جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کفار و مشرکین سے کیا جاتا ہے اور بعض

کوئی تنگی نہیں ڈالی،^(۱) دین اپنے باپ ابراہیم^(۲) علیہ السلام کا قائم رکھو، اسی اللہ^(۳) نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ اس قرآن سے پہلے اور اس میں بھی تاکہ پیغمبر تم پر گواہ ہو جائے اور تم تمام لوگوں کے گواہ بن جاؤ۔^(۴) پس تمہیں چاہیے کہ نمازیں قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کو مضبوط تھام لو، وہی تمہارا ولی اور مالک ہے۔ پس کیا ہی اچھا مالک ہے اور کتنا ہی بہتر مددگار ہے۔ (۷۸)

إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَلَمَةُ الْمُسْلِمِينَ لِمَنْ قَبِلَ وَفِي هَذَا
لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَيَكُونُوا شَهِدًا عَلَى
النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا
بِأَلَدِهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴿۷۸﴾

نے ادا مرالی کی بجا آوری کہ اس میں بھی نفس امارہ اور شیطان کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اور بعض نے ہر وہ کوشش مراد لی ہے جو حق و صداقت کے غلبے اور باطل کی سرکوبی اور مغلوبیت کے لیے کی جائے۔

(۱) یعنی ایسا حکم نہیں دیا جس کا متحمل نفس انسانی نہ ہو، (ورنہ تھوڑی بہت محنت و مشقت تو ہر کام میں ہی اٹھانی پڑتی ہے) بلکہ پچھلی شریعتوں کے بعض سخت احکام بھی اس نے منسوخ کر دیئے۔ علاوہ ازیں بہت سی آسانیاں مسلمانوں کو عطا کر دیں، جو پچھلی شریعتوں میں نہیں تھیں۔

(۲) عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے تھے، اس اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام عربوں کے باپ تھے اور غیر عرب بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک بزرگ شخصیت کے طور پر اس طرح احترام کرتے تھے، جس طرح بیٹے باپ کا احترام کرتے ہیں، اس لیے وہ تمام ہی لوگوں کے باپ تھے، علاوہ ازیں پیغمبر اسلام کے (عرب ہونے کے ناطے سے) حضرت ابراہیم علیہ السلام باپ تھے، اس لیے امت محمدیہ کے بھی باپ ہوئے۔ اس لیے کہا گیا، یہ دین اسلام، جسے اللہ نے تمہارے لیے پسند کیا ہے، تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے، اسی کی پیروی کرو۔

(۳) ہو کا مرجع بعض کے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں یعنی نزول قرآن سے پہلے تمہارا نام مسلم بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نے رکھا ہے اور بعض کے نزدیک، مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ یعنی اس نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔

(۴) یہ گواہی، قیامت والے دن ہوگی، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ ملاحظہ ہو سورۃ بقرہ، آیت ۱۲۳ کا حاشیہ۔



سورہ مؤمنون مکی ہے اور اس کی ایک سو اٹھارہ آیتیں ہیں اور چھ رکوع۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

یقیناً ایمان والوں نے فلاح حاصل کر لی۔ (۱)
جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں۔ (۲)
جو لغویات سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ (۳)
جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں۔ (۴)
جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ (۵)

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝
الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝
وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝
وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ۝
وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝

(۱) فَلَاحَ کے لغوی معنی ہیں، چیرنا، کاٹنا، کاشت کار کو بھی فَلَاحَ کہا جاتا ہے کہ وہ زمین کو چر بھاڑ کر اس میں بیج بوتا ہے۔ مُنْفَلِحٌ (کامیاب) بھی وہ ہوتا ہے جو صعوبتوں کو قطع کرتے ہوئے مطلوب تک پہنچ جاتا ہے، یا کامیابی کی راہیں اس کے لیے کھل جاتی ہیں، اس پر بند نہیں ہوتیں۔ شریعت کی نظر میں کامیاب وہ ہے جو دنیا میں رہ کر اپنے رب کو راضی کر لے اور اس کے بدلے میں آخرت میں اللہ کی رحمت و مغفرت کا مستحق قرار پا جائے۔ اس کے ساتھ دنیا کی سعادت و کامرانی بھی میسر آجائے تو سبحان اللہ۔ ورنہ اصل کامیابی تو آخرت ہی کی کامیابی ہے۔ گو دنیا والے اس کے برعکس دنیوی آسائشوں سے بہرہ ور کو ہی کامیاب سمجھتے ہیں۔ آیت میں ان مؤمنوں کو کامیابی کی نوید سنائی گئی ہے جن میں ذیل کی صفات ہوں گی۔ مثلاً اگلی آیات ملاحظہ ہوں۔

(۲) خُشُوعٌ سے مراد، قلب و جوارح کی یکسوئی اور انہماک ہے۔ قلبی یکسوئی یہ ہے کہ نماز کی حالت میں بہ قصد خیالات و وساوس کے جہوم سے دل کو محفوظ رکھے اور اللہ کی عظمت و جلالت کا نقش اپنے دل پر بٹھانے کی سعی کرے۔ اعضاء و جوارح کی یکسوئی یہ ہے کہ ادھر ادھر نہ دیکھے، کھیل کود نہ کرے۔ بالوں اور کپڑوں کو سنوارنے میں نہ لگا رہے۔ بلکہ خوف و خشیت اور عاجزی و فروتنی کی ایسی کیفیت طاری ہو، جیسے عام طور پر بادشاہ یا کسی بڑے شخص کے سامنے ہوتی ہے۔

(۳) لَغْوٌ، ہر وہ کام اور ہر وہ بات ہے جس کا کوئی فائدہ نہ ہو یا اس میں دینی یا دنیوی نقصانات ہوں۔ ان سے اعراض کا مطلب ہے کہ ان کی طرف التفات بھی نہ کیا جائے۔ چہ جائیکہ انہیں اختیار یا ان کا ارتکاب کیا جائے۔

(۴) اس سے مراد بعض کے نزدیک زکوٰۃ مفروضہ ہے، (جس کی تفصیلات یعنی اس کا نصاب اور زکوٰۃ کی شرح گو مدینہ میں بتلائی گئی تاہم) اس کا حکم مکہ میں ہی دے دیا گیا تھا اور بعض کے نزدیک ایسے افعال کا اختیار کرنا ہے، جس سے نفس کا تزکیہ اور اخلاق و کردار کی تطہیر ہو۔

بجز اپنی بیویوں اور ملکیت کی لونڈیوں کے یقیناً یہ ملامتوں میں سے نہیں ہیں۔ (۶)
 جو اس کے سوا کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کر جانے والے ہیں۔ (۷)^(۱)
 جو اپنی امانتوں اور وعدے کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ (۸)^(۲)
 جو اپنی نمازوں کی نگہبانی کرتے ہیں۔ (۹)^(۳)
 یہی وارث ہیں۔ (۱۰)
 جو فروس کے وارث ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ (۱۱)^(۴)
 یقیناً ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ (۱۲)^(۵)

إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝
 فَمَنْ يَتَّبِعِ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعُدْوَنَ ۝
 وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رِعُونَ ۝
 وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝
 أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۝
 الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْعَوْنَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝
 وَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ۝

(۱) اس سے معلوم ہوا کہ متعہ کی اسلام میں قطعاً اجازت نہیں ہے اور جنسی خواہش کی تسکین کے لیے صرف دو ہی جائز طریقے ہیں۔ بیوی سے مباشرت کر کے یا لونڈی سے ہم بستری کر کے۔ بلکہ اب صرف بیوی ہی اس کام کے لیے رہ گئی ہے کیونکہ اصطلاحی لونڈی کا وجود فی الحال ختم ہے تاہم جب کبھی بھی حالات نے اسے دوبارہ وجود پذیر کیا تو بیوی ہی کی طرح اس سے مباشرت جائز ہوگی۔

(۲) اَمَانَات سے مراد مفوضہ ذیوئی کی ادا کیگی، رازدارانہ باتوں اور مالی امانتوں کی حفاظت ہے اور رعایت عہد میں اللہ سے کیے ہوئے میثاق اور بندوں سے کیے عہد و پیمان دونوں شامل ہیں۔

(۳) آخر میں پھر نمازوں کی حفاظت کو فلاح کے لیے ضروری قرار دیا، جس سے نماز کی اہمیت و فضیلت واضح ہے۔ لیکن آج مسلمان کے نزدیک دوسرے اعمال صالحہ کی طرح اس کی بھی کوئی اہمیت سرے سے باقی نہیں رہ گئی ہے۔ فَإِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

(۴) ان صفات مذکورہ کے حامل مومن ہی فلاح یاب ہوں گے جو جنت کے وارث یعنی حق دار ہوں گے۔ جنت بھی جنت الفردوس، جو جنت کا اعلیٰ حصہ ہے۔ جہاں سے جنت کی نمریں جاری ہوتی ہیں۔ (صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب درجات المجاہدین فی سبیل اللہ۔ و کتاب التوحید، باب وکان عرشہ علی السماء)

(۵) مٹی سے پیدا کرنے کا مطلب، ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی سے پیدائش ہے یا انسان جو خوراک بھی کھاتا ہے، وہ سب مٹی سے ہی پیدا ہوتی ہیں، اس اعتبار سے اس نطفے کی اصل، جو خلقت انسانی کا باعث بنتا ہے، مٹی ہی ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نَظْفَةً لِّمَن يَرَاتُهَا ۝۱۳

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا

الْمُضْغَةَ عِظْمًا لَكَسْرًا لِّظَمِّ لِسْمَانِ ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا

آخَرَ فَبَرَكْنَا بِكَ اللَّهُ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ۝۱۴

ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ ۝۱۵

ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تَبْعُونَ ۝۱۶

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ وَأَنفُسَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ يُومًا لِّكُلِّ مَاهِنٍ الْمُعْتَدِينَ ۝۱۷

پھر اسے نظفہ بنا کر محفوظ جگہ میں قرار دے دیا۔ (۱۳)

پھر نظفہ کو ہم نے جما ہوا خون بنا دیا، پھر اس خون کے

لو تھڑے کو گوشت کا ٹکڑا کر دیا۔ پھر گوشت کے ٹکڑے کو

ہڈیاں بنا دیں، پھر ہڈیوں کو ہم نے گوشت پسندایا، پھر

دوسری بناوٹ میں اس کو پیدا کر دیا۔ (۱۴) برکتوں والا ہے

وہ اللہ جو سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے۔ (۱۴)

اس کے بعد پھر تم سب یقیناً مرجانے والے ہو۔ (۱۵)

پھر قیامت کے دن بلاشبہ تم سب اٹھائے جاؤ گے۔ (۱۶)

ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان بنائے ہیں (۱۷) اور ہم

(۱) محفوظ جگہ سے مراد رحم مادر ہے، جہاں نو مہینے بچہ بڑی حفاظت سے رہتا اور پرورش پاتا ہے۔

(۲) اس کی کچھ تفصیل سورہ حج کے شروع میں گزر چکی ہے۔ یہاں اسے پھر بیان کیا گیا ہے۔ تاہم وہاں مُخَلَّقَةً کا جو

ذکر تھا، یہاں اس کی وضاحت، مُضْغَةً کو ہڈیوں میں تبدیل کرنے اور ہڈیوں کو گوشت پسندانے سے کر دی ہے۔ مُضْغَةً

گوشت کو ہڈیوں میں تبدیل کرنے سے مقصد، انسانی ڈھانچے کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنا ہے۔ کیونکہ محض گوشت میں تو

کوئی صلابت اور سختی نہیں ہوتی، پھر اگر اسے ترا ہڈیوں کا ڈھانچہ ہی رکھا جاتا، تو انسان میں وہ حسن و رعنائی نہ آتی، جو ہر

انسان کے اندر موجود ہے۔ اس لیے ان ہڈیوں پر ایک خاص تناسب اور مقدار سے گوشت چڑھا دیا گیا کہیں کم کہیں

زیادہ۔ تاکہ اس کے قد و قامت میں غیر موزونیت اور بھدا پن پیدا نہ ہو۔ بلکہ وہ حسن و جمال کا ایک پیکر اور قدرت کی

تحقیق کا ایک شاہ کار ہو۔ اسی چیز کو قرآن نے ایک دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا، ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ (سورۃ التین) ”ہم نے انسان کو احسن تقویم یعنی بہت اچھی ترکیب یا بہت اچھے ڈھانچے میں بنایا۔“

(۳) اس سے مراد وہ بچہ ہے جو نو مہینے کے بعد ایک خاص شکل و صورت لے کر ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے اور

حرکت و اضطراب کے ساتھ سمع و بصر اور ادراک کی قوتیں بھی اس کے ساتھ ہوتی ہیں۔

(۴) خَالِقِينَ، یہاں ان صانعین کے معنی میں ہے، جو خاص خاص مقداروں میں اشیا کو جوڑ کر کوئی ایک چیز تیار کرتے

ہیں۔ یعنی ان تمام صنعت گروں میں اللہ جیسا بھی کوئی صنعت گر ہے جو اس طرح کی صنعت کاری کا نمونہ پیش کر سکے جو

اللہ تعالیٰ نے انسانی پیکر کی صورت میں پیش کیا ہے۔ پس سب سے زیادہ خیر و برکت والا وہ اللہ ہی ہے، جو تمام صنعت

کاروں سے بڑا اور سب سے اچھا صنعت کار ہے۔

(۵) طَرَائِقَ، طَرِيقَةَ کی جمع ہے مراد آسمان ہیں۔ عرب، اوپر تلے چیز کو بھی طریقہ کہتے ہیں۔ آسمان بھی اوپر تلے ہیں اس

لیے انہیں طرائق کہا۔ یا طریقہ، بمعنی راستہ ہے، آسمان ملائکہ کے آنے جانے یا ستاروں (کو اکب) کی گزر گاہ ہے، اس لیے

انہیں طرائق قرار دیا۔

مخلوقات سے غافل نہیں ہیں۔^(۱) (۱۷)

ہم ایک صحیح انداز سے آسمان سے پانی برساتے ہیں،^(۲) پھر اسے زمین میں ٹھہرا دیتے ہیں،^(۳) اور ہم اس کے لے جانے پر یقیناً قادر ہیں۔^(۴) (۱۸)

اسی پانی کے ذریعہ سے ہم تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغات پیدا کر دیتے ہیں، کہ تمہارے لیے ان میں بہت سے میوے ہوتے ہیں انہی میں سے تم کھاتے بھی ہو۔^(۵) (۱۹)

اور وہ درخت جو طور سینا پہاڑ سے نکلتا ہے جو تیل نکالتا ہے اور کھانے والے کے لیے سالن ہے۔^(۶) (۲۰)

وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنْتُمُ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّا عَلَىٰ ذَهَابٍ بِهِنَّ لَقَادِرُونَ ﴿۱۷﴾

فَأَنْشَأْنَا لَكُمْ بِهِ جَنَّاتٍ مِّنْ تَحْتِهَا أَعْنَابٌ لَّكُمْ فِيهَا مَعْوَاكِلٌ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿۱۸﴾

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُورِ سَيْنَاءَ تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِلْأَعْيُنِ ﴿۱۹﴾

(۱) خلق سے مراد مخلوق ہے۔ یعنی آسمانوں کو پیدا کر کے ہم اپنی زمینی مخلوق سے غافل نہیں ہو گئے بلکہ ہم نے آسمانوں کو زمین پر گرنے سے محفوظ رکھا ہے تاکہ مخلوق ہلاک نہ ہو۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہم مخلوق کے مصالح اور ان کی ضروریات زندگی سے غافل نہیں ہو گئے بلکہ ہم اس کا انتظام کرتے ہیں، (فتح القدر) اور بعض نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ زمین سے جو کچھ نکلتا یا داخل ہوتا، اسی طرح آسمان سے جو اترتا اور چڑھتا ہے، سب اس کے علم میں ہے اور ہر چیز پر وہ نظر رکھتا ہے اور ہر جگہ وہ اپنے علم کے لحاظ سے تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ (ابن کثیر)

(۲) یعنی نہ زیادہ کہ جس سے تباہی پھیل جائے اور نہ اتنا کم کہ پیداوار اور دیگر ضروریات کے لیے کافی نہ ہو۔

(۳) یعنی یہ انتظام بھی کیا کہ سارا پانی برس کر فوراً بہ نہ جائے اور ختم نہ ہو جائے بلکہ ہم نے چشموں، نہروں، دریاؤں اور تالابوں اور کنوؤں کی شکل میں اسے محفوظ بھی کیا ہے، (کیوں کہ ان سب کی اصل بھی آسمانی بارش ہی ہے) تاکہ ان ایام میں جب بارشیں نہ ہوں، یا ایسے علاقے میں جہاں بارش کم ہوتی ہے اور پانی کی ضرورت زیادہ ہے، ان سے پانی حاصل کر لیا جائے۔

(۴) یعنی جس طرح ہم نے اپنے فضل و کرم سے پانی کا ایسا وسیع انتظام کیا ہے، وہیں ہم اس بات پر بھی قادر ہیں کہ پانی کی سطح ہم اتنی نیچی کر دیں کہ تمہارے لیے پانی کا حصول ناممکن ہو جائے۔

(۵) یعنی ان باغوں میں انگور اور کھجور کے علاوہ اور بہت سے پھل ہوتے ہیں، جن سے تم لذت اندوز ہوتے ہو اور کچھ کھاتے ہو۔

(۶) اس سے زیتون کا درخت مراد ہے، جس کا روغن تیل کے طور پر اور پھل سالن کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ سالن

تمہارے لیے چوپایوں میں بھی بڑی بھاری عبرت ہے۔ ان کے پیٹوں میں سے ہم تمہیں دودھ پلاتے ہیں اور بھی بہت سے نفع تمہارے لیے ان میں ہیں ان میں سے بعض بعض کو تم کھاتے بھی ہو۔ (۲۱)

اور ان پر اور کشتیوں پر تم سوار کرائے جاتے ہو۔ (۲۲)^(۱)
یقیناً ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا، اس نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، کیا تم (اس سے) نہیں ڈرتے۔ (۲۳)

اس کی قوم کے کافر سرداروں نے صاف کہہ دیا کہ یہ تو تم جیسا ہی انسان ہے، تم پر فضیلت اور بڑائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ (۲۴)^(۲) اگر اللہ ہی کو منظور ہوتا تو کسی فرشتے کو اتارتا، (۲۵)^(۳) ہم نے تو اسے اپنے اگلے باپ دادوں کے زمانے میں سنا ہی نہیں۔ (۲۴)^(۴)

یقیناً اس شخص کو جنون ہے، پس تم اسے ایک وقت مقرر تک ڈھیل دو۔ (۲۵)^(۵)

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً لِمِمَّا فِي بُطُونِهَا وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ وَمِمَّا تَأْكُلُونَ ﴿۲۱﴾

وَلِيَّهَا وَمَوْلَىٰ أُولَٰئِكَ يُجَادُونَ ﴿۲۲﴾
وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ لِقَوْمِ أَعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَهُ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿۲۳﴾

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا هَذَا إِلَّا آيَاتُ مُرْسَلِكُمْ يُرِيدُونَ أَنْ يَسْفُضَ عَلَيْكُمْ وَنِسَاءَ اللَّهِ لَكُنَّ مَلَائِكَةً ۗ تَأْسَبُ عَنِ اهْتِدَاءِ إِبْنِ أَبِي بَاتَةَ الْأَوَّلِينَ ﴿۲۴﴾

إِنَّ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ بِهِ جِنَّةٌ فَمَا تَصَوَّبُوهُ حَتَّىٰ جِنِينَ ﴿۲۵﴾

کو صنیغ رنگ کہا ہے کیوں کہ روٹی، سالن میں ڈبو کر گویا رنگی جاتی ہے۔ طورِ سینینا (پھاڑ) اور اس کا قرب و جوار خاص طور پر اس کی عمدہ قسم کی پیداوار کا علاقہ ہے۔

(۱) یعنی رب کی ان ان نعمتوں سے تم فیض یاب ہوتے ہو، کیا وہ اس لائق نہیں کہ تم اس کا شکر ادا کرو اور صرف اسی ایک کی عبادت اور اطاعت کرو۔

(۲) یعنی یہ تو تمہارے جیسا ہی انسان ہے، یہ کس طرح نبی اور رسول ہو سکتا ہے؟ اور اگر یہ نبوت و رسالت کا دعویٰ کر رہا ہے، تو اس کا اصل مقصد اس سے تم پر فضیلت اور برتری حاصل کرنا ہے۔

(۳) اور اگر واقعی اللہ اپنے رسول کے ذریعے سے ہمیں یہ سمجھانا چاہتا کہ عبادت کے لائق صرف وہی ہے، تو وہ کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتا نہ کہ کسی انسان کو، وہ ہمیں آکر توحید کا مسئلہ سمجھاتا۔

(۴) یعنی اس کی دعوت توحید، ایک نرالی دعوت ہے، اس سے پہلے ہم نے اپنے باپ دادوں کے زمانے میں تو یہ سنی ہی نہیں۔

(۵) یہ ہمیں اور ہمارے باپ دادوں کو بتوں کی عبادت کرنے کی وجہ سے، بے وقوف اور کم عقل سمجھتا اور کہتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۖ يَا مُوسَىٰ ۖ إِنَّا جَاءْنَا بِكَ آيَاتٍ بَاطِنَةٍ ۖ لَقَدْ جَاءْنَاكَ الْكَلْبُومُ ۖ

فَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ أَنِ اصْنَعِ الْفُلَ ۖ يَا عِيسَىٰ ابْنَ مَرْيَمَ ۖ اقْنُتِي لِمَا تَأْمُرُكَ وَلَا تَمْنَعِي لِحُكْمِ رَبِّكَ ۚ كَذَّبَتْ عَادَ إِذْ أَتَاهَا آيَاتُنَا ۖ فَاذْهَبَتْ وَتَارَةً الْخَالِدِينَ ۚ أَمْ يَتَّبِعُونَ آلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَنْ يَتَّبِعْ آلَ فِرْعَوْنَ ۖ فَهُوَ مِنَ الْغَالِبِينَ ۚ

وَجَعَلْنَا الشُّجْرَةَ إِهْلَاقًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا ۖ فَاذْهَبُوا وَتَارَةً ۚ أَمْ يَتَّبِعُونَ آلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَنْ يَتَّبِعْ آلَ فِرْعَوْنَ ۖ فَهُوَ مِنَ الْغَالِبِينَ ۚ

فَإِنَّ السَّاعِيَةَ آتَتْ وَمَنْ مَعَكَ عَلَى الْفُلِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي يَخْتَصِمَانِ الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝

نوح (علیہ السلام) نے دعا کی اے میرے رب! ان کے جھٹلانے پر تو میری مدد کر۔ (۲۶)

تو ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنا۔ جب ہمارا حکم آجائے (۲) اور تور اہل پڑے (۳) تو تو ہر قسم کا ایک ایک جوڑا اس میں رکھ لے (۴) اور اپنے اہل کو بھی، مگر ان میں سے جن کی بابت ہماری بات پہلے گزر چکی ہے۔ (۵) خبردار جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے بارے میں مجھ سے کچھ کلام نہ کرنا وہ تو سب ڈبوئے جائیں گے۔ (۶)

جب تو اور تیرے ساتھی کشتی پر باطمینان بیٹھ جاؤ تو کہنا کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہی ہے جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات عطا فرمائی۔ (۲۸)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود ہی دیوانہ ہے۔ اسے ایک وقت تک ڈھیل دو، موت کے ساتھ ہی اس کی دعوت بھی ختم ہو جائے گی۔ یا ممکن ہے اس کی دیوانگی ختم ہو جائے اور اس دعوت کو ترک کر دے۔

(۱) ساڑھے نو سو سال کی تبلیغ و دعوت کے بعد، بالآخر رب سے دعا کی، ﴿فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانتَصِرْ﴾ (القمر-۱۰) ”نوح علیہ السلام نے رب سے دعا کی، میں مغلوب اور کمزور ہوں میری مدد کر۔“ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور حکم دیا کہ میری نگرانی اور ہدایت کے مطابق کشتی تیار کرو۔

(۲) یعنی ان کو ہلاکت کا حکم آجائے۔

(۳) تور پر حاشیہ سورہ ہود میں گزر چکا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد ہمارے ہاں کا معروف تور نہیں، جس میں روٹی پکائی جاتی ہے، بلکہ روئے زمین مراد ہے کہ ساری زمین ہی چشمے میں تبدیل ہو گئی۔ نیچے زمین سے پانی چشموں کی طرح اہل پڑا۔ نوح علیہ السلام کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ جب پانی زمین سے اہل پڑے.....

(۴) یعنی حیوانات، نباتات اور ثمرات ہر ایک میں سے ایک ایک جوڑا (نرا و مادہ) کشتی میں رکھ لے تاکہ سب کی نسل باقی رہے۔

(۵) یعنی جن کی ہلاکت کا فیصلہ، ان کے کفر و طغیان کی وجہ سے ہو چکا ہے، جیسے زوجہ نوح علیہ السلام اور ان کا پسر۔

(۶) یعنی جب عذاب کا آغاز ہو جائے تو ان ظالموں میں سے کسی پر رحم کھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ تو کسی کی سفارش کرنی شروع کر دے۔ کیونکہ ان کے غرق کرنے کا قطعی فیصلہ کیا جا چکا ہے۔

وَقُلْ رَبِّ أَنْزِلْنِي مُزْلِمًا مُبْرَكًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ﴿۱۶﴾

اور کہنا کہ اے میرے رب! مجھے بابرکت اتارنا اتار اور تو ہی بہتر ہے اتارنے والوں میں۔ (۱۶)^(۲)
یقیناً اس میں بڑی بڑی نشانیاں ہیں (۱۷)^(۳) اور ہم بیشک آزمائش کرنے والے ہیں۔ (۳۰)^(۴)

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ وَإِن كُنَّا لَلْبَاقِلِينَ ﴿۱۷﴾

ان کے بعد ہم نے اور بھی امت پیدا کی۔ (۳۱)^(۵)
پھر ان میں خود ان میں سے (ہی) رسول بھی بھیجا (۱)^(۶) کہ تم سب اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، (۷)^(۷) تم کیوں نہیں ڈرتے؟ (۳۲)^(۸)
اور سرداران قوم (۸)^(۹) نے جواب دیا، جو کفر کرتے تھے

كُنَّا نَشَاءُ لَكُمْ مِنْ بَعْدِهِمْ قُرُونًا آخَرِينَ ﴿۱۸﴾

فَأَنْزَلْنَا فِيهِمْ رَسُولًا مِمَّنْ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَاللَّهُ مَالِكُ مِنَ الْعَوَاقِبِ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿۱۹﴾

وَقَالَ الْمَلَائِكَةُ قَوْمَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا الْآخِرَةَ

(۱) کشتی میں بیٹھ کر اللہ کا شکر ادا کرنا کہ اس نے ظالموں کو بلا خر غرق کر کے، ان سے نجات عطا فرمائی اور کشتی کے خیر و عافیت کے ساتھ کنارے پر لگنے کی دعا کرنا۔ ﴿ رَبِّ أَنْزِلْنِي مُزْلِمًا مُبْرَكًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ﴾
(۲) اس کے ساتھ وہ دعائی پڑی جائے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم، سواری پر بیٹھے وقت پڑھا کرتے تھے۔ اللہ أَكْبَرُ، اللہ أَكْبَرُ، اللہ أَكْبَرُ. ﴿ مَبْعُوثِ الْوَيْسُكَرِ لَهَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِبِينَ * وَإِنَّا إِلَى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ ﴾ (الزخرف-۱۳، ۱۴)
(۳) یعنی اس سرگزشت نوح علیہ السلام میں کہ اہل ایمان کو نجات اور کافروں کو ہلاک کر دیا گیا، نشانیاں ہیں اس امر پر کہ انبیاء جو کچھ اللہ کی طرف سے لے کر آتے ہیں، ان میں وہ سچے ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر اور کھٹکھٹا حق و باطل میں ہر بات سے آگاہ ہے اور وقت آنے پر اس کا نوٹس لیتا ہے اور اہل باطن کی پھر اس طرح گرفت کرتا ہے کہ اس کے شیعے سے کوئی نکل نہیں سکتا۔

(۴) اور ہم انبیاء و رسل کے ذریعے سے یہ آزمائش کرتے رہے ہیں۔

(۵) اکثر مفسرین کے نزدیک قوم نوح کے بعد، جس قوم کو اللہ نے پیدا فرمایا اور ان میں رسول بھیجا، وہ قوم عاد ہے کیوں کہ اکثر مقامات پر قوم نوح کے جانشین کے طور پر عاد ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ قوم ثمود ہے کیوں کہ آگے چل کر ان کی ہلاکت کے ذکر میں کہا گیا ہے کہ صَنِيعَةُ (زبردست چیخ) نے ان کو پکڑ لیا، اور یہ عذاب قوم ثمود پر آیا تھا۔ بعض کے نزدیک یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم اہل مدین ہیں کہ ان کی ہلاکت بھی چیخ کے ذریعے سے ہوئی تھی۔
(۶) یہ رسول بھی ہم نے انہی میں سے بھیجا، جس کی نشوونما ان کے درمیان ہی ہوئی تھی، جس کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے، اس کے خاندان، مکان اور مولد ہر چیز سے واقف تھے۔

(۷) اس نے اگر سب سے پہلے وہی توحید کی دعوت دی جو ہر نبی کی دعوت و تبلیغ کا سرنامہ رہی ہے۔

(۸) یہ سرداران قوم ہی ہر دور میں انبیاء و رسل اور اہل حق کی تکذیب میں سرگرم رہے ہیں، جس کی وجہ سے قوم کی

اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلاتے تھے اور ہم نے انہیں دنیوی زندگی میں خوشحال کر رکھا تھا،^(۱) کہ یہ تو تم جیسا ہی انسان ہے، تمہاری ہی خوراک یہ بھی کھاتا ہے اور تمہارے پینے کا پانی ہی یہ بھی پیتا ہے۔^(۲) (۳۳)

اگر تم نے اپنے جیسے ہی انسان کی تابعداری کر لی تو بے شک تم سخت خسارے والے ہو۔^(۳) (۳۴)

کیا یہ تمہیں اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مر کر صرف خاک اور ہڈی رہ جاؤ گے تو تم پھر زندہ کیے جاؤ گے۔ (۳۵) نہیں نہیں دور اور بہت دور ہے وہ جس کا تم وعدہ دیئے جاتے ہو۔^(۴) (۳۶)

(زندگی) تو صرف دنیا کی زندگی ہے ہم مرتے جیتے رہتے ہیں اور یہ نہیں کہ ہم پھر اٹھائے جائیں گے۔ (۳۷) یہ تو بس ایسا شخص ہے جس نے اللہ پر جھوٹ (بہتان) باندھ لیا ہے،^(۵) ہم تو اس پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ (۳۸)

وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا نَاهِدًا إِلَّا بَشِيرًا مِّثْلَكُمُ يَا كُلُّ مِثْلًا كَلِمَاتٍ مِّنْهُ وَيَتْرَبُ مِمَّا تَتْرَبُونَ ﴿۳۳﴾

وَلَكِن كَلِمَاتٍ مِّثْرًا مِّثْلَكُمُ إِنَّكُمْ إِذَا أَلْحِزُّوْنَ ﴿۳۴﴾

أَيُّدِكُمْ أَكْثَرُ إِذَا أَيْدِيكُمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَكْثَرُ مَعْرُجُونَ ﴿۳۵﴾

هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ ﴿۳۶﴾

إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ﴿۳۷﴾

إِنْ هُوَ إِلَّا جَهْلٌ لِّفَتْرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِينَ ﴿۳۸﴾

اکثریت ایمان لانے سے محروم رہتی۔ کیونکہ یہ نہایت بااثر لوگ ہوتے تھے، قوم انہی کے پیچھے چلنے والی ہوتی تھی۔

(۱) یعنی عقیدہ آخرت پر عدم ایمان اور دنیوی آسائشوں کی فراوانی، یہ دو بنیادی سبب تھے، اپنے رسول پر ایمان نہ لانے کے۔ آج بھی اہل باطل انہی اسباب کی بنا پر اہل حق کی مخالفت اور دعوت حق سے گریز کرتے ہیں۔

(۲) چنانچہ انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ تو ہماری ہی طرح کھاتا پیتا ہے۔ یہ اللہ کا رسول کس طرح ہو سکتا ہے؟ جیسے آج بھی بہت سے مدعیان اسلام کے لیے رسول کی بشریت کا تسلیم کرنا نہایت گراں ہے۔

(۳) وہ خسارہ ہی ہے کہ اپنے ہی جیسے انسان کو رسول مان کر تم اس کی فضیلت و برتری کو تسلیم کر لو گے، جب کہ ایک بشر، دوسرے بشر سے افضل کیوں کر ہو سکتا ہے؟ یہی وہ مغالطہ ہے جو منکرین بشریت رسول کے دماغوں میں رہا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ جس بشر کو رسالت کے لیے چن لیتا ہے، تو وہ اس وحی و رسالت کی وجہ سے دوسرے تمام غیر نبی انسانوں سے شرف و فضل میں بہت بالا اور نہایت ارفع ہو جاتا ہے۔

(۴) ہَيْهَاتَ، جس کے معنی دور کے ہیں، دو مرتبہ تاکید کے لیے ہے۔

(۵) یعنی دوبارہ زندہ ہونے کا وعدہ، یہ ایک افترا ہے جو یہ شخص اللہ پر باندھ رہا ہے۔

نبی نے دعا کی کہ پروردگار! ان کے جھٹلانے پر تو میری مدد کر۔^(۱) (۳۹)

جواب ملا کہ یہ تو بہت ہی جلد اپنے کیے پر بچھتانے لگیں گے۔^(۲) (۴۰)

بالآخر عدل کے تقاضے کے مطابق جج^(۳) نے پکڑ لیا اور ہم نے انہیں کوڑا کرکٹ کر ڈالا،^(۴) آپس ظالموں کے لیے دوری ہو۔ (۴۱)

ان کے بعد ہم نے اور بھی بہت سی امتیں پیدا کیں۔^(۵) (۴۲)

نہ تو کوئی امت اپنے وقت مقررہ سے آگے بڑھی اور نہ پیچھے رہی۔^(۶) (۴۳)

قَالَ رَبِّ انصُرْنِي بِمَا كُنْتُ فِيهِ ۝

قَالَ عَنَّا قَلِيلٌ لِّیُصِیْحُنَّ لِدِیْنِ ۝

فَاَخَذَ نُوْحٌ مِّنْ الصَّیْحَةِ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غُتَّاءَ ۚ فَبَعَثْنَا الْقَوْمَ الظَّالِمِیْنَ ۝

لَمَّا اَنْشَاْنَا مَنَّا مِنْۢ بَعْدِهِمْ فُرُوْۤا اٰخِرِیْنَ ۝

مَا تَسْبِقُ مِنْۢ اُمَّةٍ اٰجَلَهَا وَمَا یَسْتَاخِرُوْنَ ۝

(۱) بالآخر، حضرت نوح علیہ السلام کی طرح، اس پیغمبر نے بھی بارگاہ الہی میں، مدد کے لیے، دست دعا دراز کر دیا۔
(۲) عَمَّا، میں مازاندہ ہے جو جار مجرور کے درمیان، قلت زمان کی تاکید کے لیے آیا ہے۔ جیسے ﴿فِیْمَا دَخَلْتُمُوْنَ اَللّٰهُ﴾ (آل عمران-۱۵۹) میں مازاندہ ہے۔ یعنی بہت جلد عذاب آنے والا ہے، جس پر یہ بچھتائیں گے۔ لیکن اس وقت یہ بچھتانا ان کے کچھ کام نہ آئے گا۔

(۳) یہ جج، کہتے ہیں کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی جج تھی، بعض کہتے ہیں کہ ویسے ہی سخت جج تھی، جس کے ساتھ باد صرصر بھی تھی۔ دونوں نے مل کر ان کو چشم زدن میں فنا کے گھاٹ اتار دیا۔

(۴) غُتَّاءَ اس کوڑے کرکٹ کو کہتے ہیں جو سیلابی پانی کے ساتھ ہوتا ہے، جس میں درختوں کے کھوکھلے، خشک تنے، تنکے، اور اسی طرح کی چیزیں ہوتی ہیں۔ جب پانی کا زور ختم ہو جاتا ہے تو یہ بھی خشک ہو کر بیکار پڑے ہوتے ہیں۔ یہی حال ان مکذبین اور منکبرین کا ہوا۔

(۵) اس سے مراد حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام کی قومیں ہیں۔ کیوں کہ سورہ اعراف اور سورہ ہود میں اسی ترتیب سے ان کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ بعض کے نزدیک بنو اسرائیل مراد ہیں فُرُوْۤا، قُرُوْۤا کی جمع ہے اور یہاں بمعنی امت استعمال ہوا ہے۔

(۶) یعنی یہ سب امتیں بھی قوم نوح اور عاد کی طرح، جب ان کی ہلاکت کا وقت موعود آگیا، تو تباہ و برباد ہو گئیں۔ ایک لمحہ آگے، پیچھے نہ ہوئیں، جیسے فرمایا ﴿اِذْ اٰجَاۤءَ اٰجَلُهُمْ فَلَا یَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَعْمِدُوْنَ﴾ (یونس-۳۹)

پھر ہم نے لگاتار رسول^(۱) بھیجے، جب جب جس امت کے پاس اس کا رسول آیا اس نے جھٹلایا، پس ہم نے ایک کو دوسرے کے پیچھے لگادیا^(۲) اور انہیں افسانہ^(۳) بنا دیا۔ ان لوگوں کو دوری ہے جو ایمان قبول نہیں کرتے۔ (۴۴)

پھر ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اور اس کے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو اپنی آیتوں اور کھلی دلیل^(۴) کے ساتھ بھیجا۔ (۴۵)

فرعون اور اس کے لشکروں کی طرف، پس انہوں نے تکبر کیا اور تھے ہی وہ سرکش لوگ۔^(۵) (۴۶)

کننے لگے کہ کیا ہم اپنے جیسے دو شخصوں پر ایمان لائیں؟ حالانکہ خود ان کی قوم (بھی) ہمارے ماتحت^(۶) ہے۔ (۴۷) پس انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا آخر وہ بھی ہلاک شدہ لوگوں میں مل گئے۔ (۴۸)

ہم نے تو موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (بھی) دی کہ لوگ

نُرِّسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا ۖ اَلَمْ يَكُنْ جَاءَهُمُ التَّوْحِيدُ ۗ كَذَّبُوهُ
فَاتَّبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا ۖ وَجَعَلْنَاهُمْ اَحَادِيثًا
مَبْعُودًا ۗ الْقَوْمُ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۴۴﴾

نُرِّسَلْنَا مُوسٰى وَاَخَاهُ هٰرُونَ ۙ ذٰلِیْنٰ
وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۴۵﴾

اِلٰی فِرْعَوْنَ وَوَلَدِیْهِ فَاسْتَکْبَرُوْا ۗ وَكَانُوْا قَوْمًا عٰلِیْنَ ﴿۴۶﴾

فَقَالُوْا اِنَّا نُرِیْنٰکُمْ اٰیٰتِنَا وَنَحْنُ اَعْبٰدٌ ﴿۴۷﴾

فَلَنْ یُّؤْمِنُوْا ۗ فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلٰکِیْنَ ﴿۴۸﴾

وَلَقَدْ اٰتٰیْنَا مُوسٰى الْکِتٰبَ لَعَلَّہُمْ یَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾

(۱) تَتْرًا کے معنی ہیں۔ یکے بعد دیگرے۔ متواتر لگاتار۔

(۲) ہلاکت و بربادی میں۔ یعنی جس طرح یکے بعد دیگرے رسول آئے، اسی طرح تکذیب رسالت پر یہ قومیں یکے بعد دیگرے عذاب سے دوچار ہو کر ہست سے نیست ہوتی رہیں۔

(۳) جس طرح اَعَاجِبٌ، اَعْجُوْبَةٌ کی جمع ہے (تعب انگیز چیز یا بات) اسی طرح اَحَادِیْثُ اُحْدُوْثٌ کی جمع ہے بمعنی زبان زد خلاق واقعات و قصص۔

(۴) آیات سے مراد وہ آیات ہیں، جن کا ذکر سورہ اعراف میں ہے، جن کی وضاحت گزر چکی ہے اور سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ سے مراد حجت واضح اور دلیل برہان ہے، جس کا کوئی جواب فرعون اور اس کے درباریوں سے نہ بن پڑا۔

(۵) استکبار اور اپنے کو بڑا سمجھنا، اس کی بنیادی وجہ بھی وہی عقیدہ آخرت سے انکار اور اسباب دنیا کی فراوانی ہی تھی، جس کا ذکر پچھلی قوموں کے واقعات میں گزرا۔

(۶) یہاں بھی انکار کے لیے دلیل انہوں نے حضرت موسیٰ و ہارون ملیحما السلام کی ”بشریت“ ہی پیش کی اور اسی بشریت کی تائید کے لیے انہوں نے کہا کہ یہ دونوں اسی قوم کے افراد ہیں جو ہماری غلام ہے۔

راہ راست پر آجائیں۔^(۱) (۳۹)

ہم نے ابن مریم اور اس کی والدہ کو ایک نشانی بنایا^(۲) اور ان دونوں کو بلند صاف قرار والی اور جاری پانی^(۳) والی جگہ میں پناہ دی۔ (۵۰)

اسے پیغمبروا! حلال چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو^(۴) تم جو

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ مَّعِينٍ ﴿۵۰﴾

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُّ مَنَّانٍ الْكَلِيمَاتِ وَاعْمَلُوا الصَّالِحَاتِ إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿۵۱﴾

(۱) امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات، فرعون اور اس کی قوم کو غرق کرنے کے بعد دی گئی۔ اور نزول تورات کے بعد اللہ نے کسی قوم کو عذاب عام سے ہلاک نہیں کیا۔ بلکہ مومنوں کو یہ حکم دیا جاتا رہا کہ وہ کافروں سے جہاد کریں۔

(۲) کیوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بغیر باپ کے ہوئی، جو رب کی قدرت کی ایک نشانی ہے، جس طرح آدم علیہ السلام کو بغیر ماں اور باپ کے اور حوا کو بغیر مادہ کے حضرت آدم علیہ السلام سے اور دیگر تمام انسانوں کو ماں اور باپ سے پیدا کرنا اس کی نشانیوں میں سے ہے۔

(۳) رَبْوَةٌ (بلند جگہ) سے بیت المقدس اور مَعِين (چشمہ جاری) سے وہ چشمہ مراد ہے جو ایک قول کے مطابق ولادت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت اللہ نے بطور خرق عادت، حضرت مریم کے پیروں کے نیچے سے جاری فرمایا تھا۔ جیسا کہ سورہ مریم میں گزرا۔

(۴) طَيِّبَات سے مراد پاکیزہ اور لذت بخش چیزیں ہیں، بعض نے اس کا ترجمہ حلال چیزیں کیا ہے۔ دونوں ہی اپنی جگہ صحیح ہیں کیوں کہ ہر پاکیزہ چیز اللہ نے حلال قرار دی ہے اور ہر حلال چیز پاکیزہ اور لذت بخش ہے۔ خباث کو اللہ نے اسی لیے حرام کیا ہے کہ وہ اثرات و نتائج کے لحاظ سے پاکیزہ نہیں ہیں۔ گو خباث خور قوموں کو اپنے ماحول اور عادت کی وجہ سے ان میں ایک گونہ لذت ہی محسوس ہوتی ہو۔ عمل صالح وہ ہے جو شریعت یعنی قرآن و حدیث کے موافق ہو، نہ کہ وہ جسے لوگ اچھا سمجھیں کیوں کہ لوگوں کو تو بدعات بھی بہت اچھی لگتی ہیں بلکہ اہل بدعت کے ہاں جتنا اہتمام بدعات کا ہے، اتنا فرائض اسلام اور سنن و مستحبات کا بھی نہیں ہے۔ اکل حلال کے ساتھ عمل صالح کی تاکید سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور یہ ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ اکل حلال سے عمل صالح آسان اور عمل صالح انسان کو اکل حلال پر آمادہ اور اسی پر قناعت کرنے کا سبق دیتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے تمام پیغمبروں کو ان دونوں باتوں کا حکم دیا۔ چنانچہ تمام پیغمبر محنت کر کے حلال کی روزی کمانے اور کھانے کا اہتمام کرتے رہے، جس طرح حضرت داود علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے كَانْ يَأْكُلُ مِنْ كَسْبِ يَدِهِ (صحیح بخاری، البیوع، باب کسب الرجل وعمله بیدہ) ”اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے“ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں، میں بھی اہل مکہ کی بکریاں چند قراریط کے عوض چراتا رہا ہوں“۔ (صحیح بخاری، کتاب الإجازة، باب رعی الغنم علی

کچھ کر رہے ہو اس سے میں بخوبی واقف ہوں۔ (۵۱)
یقیناً تمہارا یہ دین ایک ہی دین ہے (۱) اور میں ہی تم سب
کارب ہوں، پس تم مجھ سے ڈرتے رہو۔ (۵۲)
پھر انہوں نے خود (ہی) اپنے امر (دین) کے آپس میں
کلمے کلمے کر لیے، ہر گروہ جو کچھ اس کے پاس ہے
اسی پر اترا رہا ہے۔ (۵۳)
پس آپ (بھی) انہیں ان کی غفلت میں ہی کچھ مدت پڑا
رہنے دیں۔ (۲) (۵۴)
کیا یہ (یوں) سمجھ بیٹھے ہیں؟ کہ ہم جو بھی ان کے مال و
اولاد بڑھا رہے ہیں۔ (۵۵)
وہ ان کے لیے بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں (نہیں
نہیں) بلکہ یہ سمجھتے ہی نہیں۔ (۵۶)
یقیناً جو لوگ اپنے رب کی ہیبت سے ڈرتے ہیں۔ (۵۷)
اور جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ (۵۸)

وَأَنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ﴿۵۱﴾

فَمَقَطَعُوا أَلْسِنَهُمْ لِيَلْهُمْ زَبْرًا، كُلُّ حِزْبٍ بِمَا
لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿۵۲﴾

فَدَرَأَهُمْ فِي غَمَرَاتِهِمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿۵۳﴾

الْمُحْسِبُونَ أَلَمَّا يَذُوقُهُمْ مِنْ قَالٍ وَنَبِينٍ ﴿۵۴﴾

نَسَاءُ لَّهُمْ فِي الْغَيْرِ بَلَّ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۵۵﴾

إِنَّ الَّذِينَ هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ ﴿۵۶﴾

وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ﴿۵۷﴾

قراریط، آج کل بلیک میلوں، سمگلروں، رشوت و سود خوروں اور دیگر حرام خوروں نے محنت مزدوری کر کے حلال
روزی کھانے والوں کو حقیر اور پست طبقہ بنا کر رکھ دیا ہے دراصل حالیکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایک اسلامی معاشرے
میں حرام خوروں کے لیے عزت و شرف کا کوئی مقام نہیں، چاہے وہ قارون کے خزانوں کے مالک ہوں، احترام و تکریم
کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو محنت کر کے حلال کی روزی کھاتے ہیں چاہے روکھی روکھی ہی ہو۔ اس لیے نبی صلی اللہ
علیہ وسلم نے اس کی بڑی تاکید فرمائی ہے اور فرمایا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ حرام کمائی والے کا صدقہ قبول فرماتا ہے نہ اس کی
دعا ہی“ (صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب قبول الصدقة من الکسب الطیب)

(۱) أُمَّةً سے مراد دین ہے، اور ایک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سب انبیاء نے ایک اللہ کی عبادت ہی کی دعوت پیش کی
ہے۔ لیکن لوگ دین تو حید چھوڑ کر الگ الگ فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے اور ہر گروہ اپنے عقیدہ و عمل پر خوش
ہے۔ چاہے وہ حق سے کتنا بھی دور ہو۔

(۲) غَمَرَةٌ، ماء کثیر کو کہتے ہیں جو زمین کو ڈھانپ لیتا ہے۔ گمراہی کی تاریکیاں بھی اتنی گہبیر ہوتی ہیں کہ اس میں گھرے
ہوئے انسان کی نظروں سے حق او جھل ہی رہتا ہے۔ غمرۃ سے مراد حیرت، غفلت اور ضلالت ہے۔ آیت میں بطور تہدید
ان کو چھوڑنے کا حکم ہے، مقصود وعظ و نصیحت سے روکنا نہیں ہے۔

اور جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔ (۵۹)

اور جو لوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل کپکپاتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔^(۱) (۶۰)

یہی ہیں جو جلدی جلدی بھلائیاں حاصل کر رہے ہیں اور یہی ہیں جو ان کی طرف دوڑ جانے والے ہیں۔ (۶۱)
ہم کسی نفس کو اسکی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے،^(۲) اور ہمارے پاس ایسی کتاب ہے جو حق کے ساتھ بولتی ہے، ان کے اوپر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔ (۶۲)

بلکہ ان کے دل اس طرف سے غفلت میں ہیں اور ان کے لیے اس کے سوا بھی بہت سے اعمال ہیں جنہیں^(۳) وہ کرنے والے ہیں۔ (۶۳)

یہاں تک کہ جب ہم نے ان کے آسودہ حال لوگوں کو عذاب میں پکڑ لیا^(۴) تو وہ بلبلانے لگے۔ (۶۴)

وَالَّذِينَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ ﴿۵۹﴾

وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَاؤْا فُلُوبُهُمْ وَجِلَةً أَنَّهُمْ
إِلَىٰ رَبِّهِمْ أَجْمُونَ ﴿۶۰﴾

أُولَٰئِكَ يُسْرِعُونَ فِي الْمَخِرَاتِ وَهُمْ لَهَا غِبُونَ ﴿۶۱﴾

وَلَا يَخْلِفُ نَفْسًا إِلَّا أَوْ سَعَهَا وَلَدَيْنَا مَكْتُوبٌ بِمَا يَلْقَىٰ
وَهُمْ لَا يَظُنُّونَ ﴿۶۲﴾

بَلْ نُلْقِيهِمْ فِي عَذَابٍ مُّتَنَبِّئِينَ هَٰذَا وَأَلَّهُمَّ أَعْمَالٌ مِّنْ دُونِ
ذَٰلِكَ هُمْ لَهَا غِلْوُونَ ﴿۶۳﴾

حَتَّىٰ إِذَا أَخَذْنَا مُتْرَفِيهِم بِالْعَذَابِ إِذَا هُمْ يَجْتَرُونَ ﴿۶۴﴾

(۱) یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں لیکن اللہ سے ڈرتے بھی رہتے ہیں کہ کسی کو تاہی کی وجہ سے ہمارا عمل یا صدقہ نامقبول قرار نہ پائے۔ حدیث میں آتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا ”ڈرنے والے کون ہیں؟ وہ جو شراب پیتے، بدکاری کرتے اور چوریاں کرتے ہیں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نہیں، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز پڑھتے، روزہ رکھتے اور صدقہ و خیرات کرتے ہیں لیکن ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں یہ نامقبول نہ ٹھہریں۔“ (ترمذی، تفسیر مسودہ

المؤمنون۔ مسند أحمد ۶/ ۱۹۵ و ۲۰)

(۲) ایسی ہی آیت سورہ بقرہ کے آخر میں گزر چکی ہے۔

(۳) یعنی شرک کے علاوہ دیگر کبائر یا وہ اعمال مراد ہیں، جو مومنوں کے اعمال (خشیت الہی، ایمان بالتوحید وغیرہ) کے برعکس ہیں۔ تاہم مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔

(۴) مُتْرَفِينَ سے مراد آسودہ حال (مُتَنَبِّئِينَ) ہیں۔ عذاب تو آسودہ اور غیر آسودہ حال دونوں کو ہی ہوتا ہے۔ لیکن آسودہ حال لوگوں کا نام خصوصی طور پر شاید اس لیے لیا گیا ہے کہ قوم کی قیادت بالعموم انہی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، وہ

لَا تَحْزَنُوا الْيَوْمَ أَعْمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۚ ﴿٦٥﴾

آج مت بلبلاؤ یقیناً تم ہمارے مقابلہ پر مدد نہ کیے جاؤ گے۔^(۱) (۶۵)

میری آیتیں تو تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں^(۲) پھر بھی تم اپنی ایڑیوں کے بل لٹے بھاگتے تھے۔^(۳) (۶۶)

اکڑتے اٹپٹھتے^(۴) افسانہ گوئی کرتے اسے چھوڑ دیتے تھے۔^(۵) (۶۷)

ذَٰكَانَتْ الَّتِي تُمْتَلِ عَلَيْكُمْ فَلْنَدِمَنَّ عَلَىٰ آعْيَابِكُمْ ۖ تَكْفُرُونَ ﴿٦٦﴾

مُسْتَكْبِرِينَ تَكْبَرُ بِهِ سُبُحَانَ اللَّهِ ۗ هَٰؤُلَاءِ جُحُودُونَ ﴿٦٧﴾

کیا انہوں نے اس بات میں غور و فکر ہی نہیں کیا؟^(۶) بلکہ

أَفَلَمْ يَرَوْا بُرُوقَ الْقَوْلِ ۖ أَمْ جَاءَهُمْ مَّا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمْ الْأَوَّلِينَ ﴿٦٨﴾

جس طرف چاہیں، قوم کا رخ پھیر سکتے ہیں۔ اگر وہ اللہ کی نافرمانی کا راستہ اختیار کریں اور اس پر ڈٹے رہیں تو انہی کی دیکھا دیکھی قوم بھی ٹس سے مس نہیں ہوتی اور توبہ و ندامت کی طرف نہیں آتی۔ یہاں مترفین سے مراد وہ کفار ہیں، جنہیں مال و دولت کی فراوانی اور اولاد و احفاد سے نواز کر مہلت دی گئی۔ جس طرح کہ چند آیات قبل ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ یا مراد چودھری اور سردار قسم کے لوگ ہیں۔ اور عذاب سے مراد اگر دنیوی ہے، تو جنگ بدر میں جو کفار مکہ مارے گئے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کے نتیجے میں بھوک اور قحط سالی کا جو عذاب مسلط ہوا تھا، وہ مراد ہے یا پھر مراد آخرت کا عذاب ہے۔ مگر یہ سیاق سے بعید ہے۔

(۱) یعنی دنیا میں عذاب الہی سے دوچار ہو جانے کے بعد کوئی چیخ پکار اور جزع فزع انہیں اللہ کی گرفت سے چھڑا نہیں سکتی۔ اسی طرح عذاب آخرت سے بھی انہیں چھڑانے والا یا مدد کرنے والا، کوئی نہیں ہو گا۔

(۲) یعنی قرآن مجید یا احکام الہی، جن میں پیغمبر کے فرمودات بھی شامل ہیں۔

(۳) نُكُوضُ کے معنی ہیں رَجَعَتْ فَهَقَرَتْ (لٹے پاؤں لوٹنا) لیکن بطور استعارہ اعراض اور روگردانی کے معنی و مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی آیات و احکام الہی سن کر تم منہ پھیر لیتے تھے اور ان سے بھاگتے تھے۔

(۴) بہ کا مرجع جمہور مفسرین نے الْبَيْتِ الْعَتِيقِ (خانہ کعبہ) یا حرم لیا ہے۔ یعنی انہیں اپنی تولیت خانہ کعبہ اور اس کا خادم و مگران ہونے کا جو غرور تھا، اس کی بنا پر آیات الہی کا انکار کیا اور بعض نے اس کا مرجع قرآن کو بنایا ہے اور مطلب یہ ہے کہ قرآن سن کر ان کے دل میں کبر و نخوت پیدا ہو جاتی جو انہیں قرآن پر ایمان لانے سے روک دیتی۔

(۵) سَمَرٌ کے معنی ہیں رات کی گفتگو یہاں اس کے معنی خاص طور پر ان باتوں کے ہیں جو قرآن کریم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں وہ کرتے تھے اور اس کی بنا پر وہ حق کی بات سننے اور اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے یعنی چھوڑ دیتے۔ اور بعض نے ہجر کے معنی ہزیان گوئی اور بعض نے فحش گوئی کے کیے ہیں۔ یعنی راتوں کی گفتگو میں تم قرآن کی شان میں ہزیان بکتے ہو یا بے ہودہ اور فحش باتیں کرتے ہو جن میں کوئی بھلائی نہیں، (فتح القدير، ایسر التفسیر)

(۶) بات سے مراد قرآن کریم ہے۔ یعنی اس میں غور کر لیتے تو انہیں اس پر ایمان لانے کی توفیق نصیب ہو جاتی۔

ان کے پاس وہ آیا جو ان کے اگلے باپ دادوں کے پاس
نہیں آیا تھا؟^(۱) (۶۸)

یا انہوں نے اپنے پیغمبر کو پہچانا نہیں کہ اس کے منکر ہو
رہے ہیں؟^(۲) (۶۹)

یا یہ کہتے ہیں کہ اسے جنون ہے؟^(۳) بلکہ وہ تو ان کے
پاس حق لایا ہے۔ ہاں ان میں اکثر حق سے چڑنے والے
ہیں۔^(۴) (۷۰)

اگر حق ہی ان کی خواہشوں کا پیرو ہو جائے تو زمین و
آسمان اور ان کے درمیان کی ہر چیز درہم برہم ہو
جائے۔^(۵) حق تو یہ ہے کہ ہم نے انہیں ان کی نصیحت
پہنچا دی ہے لیکن وہ اپنی نصیحت سے منہ موڑنے والے
ہیں۔ (۷۱)

کیا آپ ان سے کوئی اجرت چاہتے ہیں؟ یاد رکھیے کہ

أَمْ يَرْجُونَ أَنِ نَأْتِيَهُم بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا يُرْسِلُونَ ﴿۶۸﴾

أَمْ يَقُولُونَ بِهِ جِنَّةٌ بَلْ جَاءَهُم بِالْحَقِّ وَأَكْذَبُوا الْحَقَّ ﴿۶۹﴾

وَلَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا إِذْ أُنزِلَتْ السَّمَوَاتُ مِنَ الْأَرْضِ وَمَنْ فِيهِنَّ ﴿۷۰﴾
بَلْ آتَيْنَاهُم بِالْحَقِّ وَأَكْذَبُوا الْحَقَّ عَنْ دُورِهِمْ مَعْزُومِينَ ﴿۷۱﴾

أَمْ تَسْأَلُهُمْ خَرْجًا فَأَنْزَلْنَاهُمْ رِزْقًا وَهُمْ مُنْتَزِعِينَ ﴿۷۱﴾

(۱) یہ آم منقطع یا انتقالی یعنی بل کے معنی میں ہے یعنی ان کے پاس وہ دین اور شریعت آئی ہے جس سے ان کے آباؤ
اجداد، زمانہ جاہلیت میں محروم رہے۔ جس پر انہیں اللہ کا شکر ادا کرنا اور دین اسلام کو قبول کر لینا چاہیے تھا۔

(۲) یہ بطور توہین کے ہے، کیونکہ وہ پیغمبر کے نسب، خاندان اور اسی طرح اس کی صداقت و امانت، راست بازی اور
اخلاق و کردار کی بلندی کو جانتے تھے اور اس کا اعتراف کرتے تھے۔

(۳) یہ بھی زبرد توہین کے طور پر ہی ہے یعنی اس پیغمبر نے ایسا قرآن پیش کیا ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے دنیا قاصر
ہے، اسی طرح اس کی تعلیمات نوع انسانی کے لیے رحمت اور امن و سکون کا باعث ہیں۔ کیا ایسا قرآن اور ایسی تعلیمات
ایسا شخص بھی پیش کر سکتا ہے جو دیوانہ اور جنون ہو؟

(۴) یعنی ان کے اعراض اور استکبار کی اصل وجہ حق سے ان کی کراہت (ناپسندیدگی) ہے جو عرصہ دراز سے باطل کو
اختیار کیے رکھنے کی وجہ سے ان کے اندر پیدا ہو گئی ہے۔

(۵) حق سے مراد دین اور شریعت ہے۔ یعنی اگر دین ان کی خواہشات کے مطابق اترے تو ظاہر بات ہے کہ زمین و
آسمان کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو جائے۔ مثلاً وہ چاہتے ہیں کہ ایک معبود کے بجائے متعدد معبود ہوں، اگر فی الواقع ایسا
ہو، تو کیا نظام کائنات ٹھیک رہ سکتا ہے؟ وَعَلَىٰ هَذَا الْقِيَاسِ دگر ان کی خواہشات ہیں۔

آپ کے رب کی اجرت بہت ہی بہتر ہے اور وہ سب سے بہتر روزی رساں ہے۔ (۷۲)

یقیناً آپ تو انہیں راہ راست کی طرف بلا رہے ہیں۔ (۷۳)

پیشک جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ سیدھے راستے سے مڑ جانے والے ہیں۔ (۷۴)^(۱)

اور اگر ہم ان پر رحم فرمائیں اور ان کی تکلیفیں دور کر دیں تو یہ تو اپنی اپنی سرکشی میں جم کر اور بھٹکنے لگیں۔ (۷۵)^(۲)

اور ہم نے انہیں عذاب میں بھی پکڑا تاہم یہ لوگ نہ تو اپنے پروردگار کے سامنے جھکے اور نہ ہی عاجزی اختیار کی۔ (۷۶)^(۳)

یہاں تک کہ جب ہم نے ان پر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیا تو اسی وقت فوراً مایوس ہو گئے۔ (۷۷)^(۴)

وَأَنَّكَ لَتَدْعُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۷۲﴾

وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَعَنِ الصَّوْطُ لِلْكَافِرِينَ ﴿۷۳﴾

وَلَوْ رَحِمْنَاهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِنْ ضُرٍّ لَلْجَوَانِي طَعَيْنَاهُمْ يَعْمَهُونَ ﴿۷۴﴾

وَلَقَدْ أَخَذْنَا لَهُم بِالْعَذَابِ فَمَا اسْكَاؤُا لِلرِّيَاسِمْ وَيَا بَصَّرَعُمُونَ ﴿۷۵﴾

حَتَّىٰ إِذَا فُتِنَا عَلَيْهِمْ بِآبَاءِ أَعْدَابِ سَدِيدٍ إِذْ أَهْرَفِيهِمْ مُبِيلُونَ ﴿۷۶﴾

(۱) یعنی صراط مستقیم سے ان کے انحراف کی وجہ آخرت پر عدم ایمان ہے۔

(۲) اسلام کے خلاف ان کے دلوں میں جو بغض و عناد تھا اور کفر و شرک کی دلدل میں جس طرح وہ پھنسے ہوئے تھے، اس میں ان کا بیان ہے۔

(۳) عذاب سے مراد یہاں وہ شکست ہے جو جنگ بدر میں کفار مکہ کو ہوئی، جس میں ان کے ستر آدمی بھی مارے گئے تھے یا وہ قحط سالی کا عذاب ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کے نتیجے میں ان پر آیا تھا۔ آپ ﷺ نے دعا فرمائی تھی «اللَّهُمَّ أَعْنِي عَلَيْهِمْ بِسَبْعِ كَسْبَعِ يُوسُفَ». (البخاری۔ کتاب الدعوات، باب الدعاء، علی المشركين، ومسلم، کتاب المساجد، باب استحباب القنوت فی جمیع الصلاة إذا نزلت بالمسلمین نازلة) ”اے اللہ، جس طرح حضرت یوسف کے زمانے میں سات سال قحط رہا، اسی طرح قحط سالی میں انہیں مبتلا کر کے ان کے مقابلے میں میری مدد فرما“۔ چنانچہ کفار مکہ اس قحط سالی میں مبتلا کیے گئے جس پر حضرت ابوسفیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہیں اللہ کا اور رشتہ داری کا واسطہ دے کر کہا کہ اب تو ہم جانوروں کی کھالیں اور خون تک کھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ جس پر آیت نازل ہوئی۔ (ابن کثیر)

(۴) اس سے دنیا کا عذاب بھی مراد ہو سکتا ہے اور آخرت کا بھی، جہاں وہ تمام راحت اور خیر سے مایوس اور محروم ہوں گے اور تمام امیدیں منقطع ہو جائیں گی۔

وہ اللہ ہے جس نے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل پیدا کیے، مگر تم بہت (ہی) کم شکر کرتے ہو۔^(۷۸)
اور وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کر کے زمین میں پھیلا دیا
اور اسی کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے۔^(۷۹)

اور یہ وہی ہے جو جلاتا اور مارتا ہے اور رات دن
کے ردوبدل^(۸۰) کا مختار بھی وہی ہے۔ کیا تم کو سمجھ
بوجھ نہیں؟^(۸۰)

بلکہ ان لوگوں نے بھی ویسی ہی بات کہی جو اگلے کتے چلے
آئے۔^(۸۱)

کہ کیا جب ہم مر کر مٹی اور ہڈی ہو جائیں گے کیا پھر بھی
ہم ضرور اٹھائے جائیں گے؟^(۸۲)

ہم سے اور ہمارے باپ دادوں سے پہلے ہی سے یہ وعدہ
ہوتا چلا آیا ہے کچھ نہیں یہ تو صرف اگلے لوگوں کے
افسانے ہیں۔^(۸۳)

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا
مَّا تَشْكُرُونَ ﴿۷۸﴾

وَهُوَ الَّذِي ذَمَّرَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُعْشَرُونَ ﴿۷۹﴾

وَهُوَ الَّذِي يُعَيِّ وَيُحْيِي وَلَهُ اسْتِخْلَافُ النَّيْلِ
وَالنَّهَارِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۸۰﴾

بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالِ الْأَوَّلُونَ ﴿۸۱﴾

قَالُوا إِنْ رَأَوْا آيَاتِنَا وَذُنُوبَنَا وَعِظَامَنَا لَتُبْعُونَنَا ﴿۸۲﴾

لَعَدُوْعِدُنَا عَنَّا وَإِنَّا وَنَاهَذَا مِنْ جَعَلِ إِنْ هَذَا
إِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۸۳﴾

(۱) یعنی عقل و فہم اور سننے کی یہ صلاحیتیں عطا کیں تاکہ ان کے ذریعے سے وہ حق کو پہچانیں، سنیں اور اسے قبول
کریں۔ یہی ان نعمتوں کا شکر ہے۔ مگر یہ شکر کرنے والے یعنی حق کو اپنانے والے کم ہی ہیں۔

(۲) اس میں اللہ کی قدرت عظیمہ کا بیان ہے کہ جس طرح اس نے تمہیں پیدا کر کے مختلف اطراف میں پھیلا دیا ہے،
تمہارے رنگ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں، زبانیں بھی مختلف اور عادات و رسومات بھی مختلف۔ پھر ایک وقت
آئے گا کہ تم سب کو زندہ کر کے وہ اپنی بارگاہ میں جمع فرمائے گا۔

(۳) یعنی رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کا آنا، پھر رات اور دن کا چھوٹا بڑا ہونا۔

(۴) جس سے تم یہ سمجھ سکو کہ یہ سب کچھ اس ایک اللہ کی طرف سے ہے جو ہر چیز پر غالب ہے اور اس کے سامنے ہر
چیز جھکی ہوئی ہے۔

(۵) آسَاطِيرُ، اَسْطُورَةٌ کی جمع ہے یعنی مُسَطَّرَةٌ مَكْتُوبَةٌ لکھی ہوئی حکایتیں، کہانیاں۔ یعنی دوبارہ جی اٹھنے کا وعدہ کب
سے ہوتا چلا آ رہا ہے، ہمارے آبا و اجداد سے! لیکن ابھی تک رو بہ عمل تو نہیں ہوا، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ
کہانیاں ہیں جو پہلے لوگوں نے اپنی کتابوں میں لکھ دی ہیں جو نقل در نقل ہوتی چلی آ رہی ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں۔

پوچھئے تو سہی کہ زمین اور اس کی کل چیزیں کس کی ہیں؟
بتلاؤ اگر جانتے ہو؟ (۸۳)

فوراً جواب دیں گے کہ اللہ کی، کہہ دیجئے کہ پھر تم
نصیحت کیوں نہیں حاصل کرتے۔ (۸۵)

دریافت کیجئے کہ ساتوں آسمانوں کا اور بہت باعظمت عرش
کارب کون ہے؟ (۸۶)

وہ لوگ جواب دیں گے کہ اللہ ہی ہے۔ کہہ دیجئے کہ پھر
تم کیوں نہیں ڈرتے؟ (۸۷)

پوچھئے کہ تمام چیزوں کا اختیار کس کے ہاتھ میں ہے؟ جو
پناہ دیتا ہے (۲) اور جس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں
دیا جاتا، (۳) اگر تم جانتے ہو تو بتلا دو؟ (۸۸)

یہی جواب دیں گے کہ اللہ ہی ہے۔ کہہ دیجئے پھر تم کدھر
سے جاو کر دیئے جاتے ہو؟ (۸۹)

حق یہ ہے کہ ہم نے انہیں حق پہنچا دیا ہے اور یہ بیشک
جھوٹے ہیں۔ (۹۰)

قُلْ لَيْسَ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيهَا اَنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۸۳﴾

سَيَقُولُونَ بَلٰى قُلْ اَقْلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۸۴﴾

قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۵﴾

سَيَقُولُونَ بَلٰى قُلْ اَقْلَا تَتَّقُونَ ﴿۸۶﴾

قُلْ مَنْ مِّنْ بِيَدِهِ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ

عَلَيْهِمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۸۷﴾

سَيَقُولُونَ بَلٰى قُلْ فَاَلَيْ تَحْزَنُونَ ﴿۸۸﴾

بَلْ اَتَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ ﴿۸۹﴾

(۱) یعنی جب تمہیں تسلیم ہے کہ زمین کا اور اس میں موجود تمام اشیا کا خالق بھی ایک اللہ ہی ہے اور آسمان اور عرش
عظیم کا مالک بھی وہی ہے، تو پھر تمہیں یہ تسلیم کرنے میں تامل کیوں ہے کہ عبادت کے لائق بھی صرف وہی ایک اللہ
ہے، پھر تم اس کی وحدانیت کو تسلیم کر کے اس کے عذاب سے بچنے کا اہتمام کیوں نہیں کرتے؟

(۲) یعنی جس کی وہ حفاظت کرنا چاہے اور اسے اپنی پناہ میں لے لے، کیا اسے کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے؟

(۳) یعنی جس کو وہ نقصان پہنچانا چاہے، کیا کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ایسی ہستی ہے کہ وہ اسے نقصان سے بچالے اور
اللہ کے مقابلے میں اپنی پناہ میں لے لے؟

(۴) یعنی پھر تمہاری عقلوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اس اعتراف اور علم کے باوجود تم دو سروں کو اس کی عبادت میں شریک
کرتے ہو؟ قرآن کریم کی اس صراحت سے واضح ہے کہ مشرکین مکہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، اس کی خالقیت و مالکیت اور
رزاقیت کے منکر نہیں تھے بلکہ وہ یہ سب باتیں تسلیم کرتے تھے، انہیں صرف توحید الوہیت سے انکار تھا۔ یعنی عبادت
صرف ایک اللہ کی نہیں کرتے تھے بلکہ اس میں دو سروں کو بھی شریک کرتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ آسمان و زمین کی
خلق یا اس کی تدبیر میں کوئی اور بھی شریک ہے بلکہ صرف اور صرف اس مغالطے کی بنا پر کہ یہ بھی اللہ کے نیک بندے

نہ تو اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا اور نہ اس کے ساتھ اور کوئی معبود ہے، ورنہ ہر معبود اپنی مخلوق کو لیے لیے پھرتا اور ہر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتا۔ جو اوصاف یہ بتلاتے ہیں ان سے اللہ پاک (اور بے نیاز) ہے۔ (۹۱)

وہ غائب حاضر کا جاننے والا ہے اور جو شرک یہ کرتے ہیں اس سے بالاتر ہے۔ (۹۲)

آپ دعا کریں کہ اے میرے پروردگار! اگر تو مجھے وہ دکھائے جس کا وعدہ انہیں دیا جا رہا ہے۔ (۹۳)

تو اے رب! تو مجھے ان ظالموں کے گروہ میں نہ کرنا۔^(۱) (۹۴)

ہم جو کچھ وعدے انہیں دے رہے ہیں سب آپ کو دکھا دینے پر یقیناً قادر ہیں۔ (۹۵)

مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ الْوَالِدِ أَذْهَبَ كُلُّ الْوَالِدِ مَا خَلَقَ وَلَعَلَّ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ ﴿۹۱﴾

عَلِيمُ الْغَيْبِ وَاللَّهِ يَهْدِي قَوْمًا لِيُثِرُونَ ﴿۹۲﴾

قُلْ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لِذَاتِي مَأْيُوعًا وَرَبِّ

رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِي فِي الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۹۳﴾

وَرَبِّ اعْلَمْ أَنِّي لَا أَشْرِكُ بِكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقَدْ وُودُوا ﴿۹۴﴾

تھے، ان کو بھی اللہ نے کچھ اختیارات دے رکھے ہیں اور ہم ان کے ذریعے سے اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ یہی مغالطہ آج کل کے مردہ پرست اہل بدعت کو ہے جس کی بنیاد پر وہ فوت شدگان کو مدد کے لیے پکارتے، ان کے نام کی نذر نیاز دیتے اور ان کو اللہ کی عبادت میں شریک گردانتے ہیں۔ حالانکہ اللہ نے کہیں بھی یہ نہیں فرمایا کہ میں نے کسی فوت شدہ بزرگ، ولی یا نبی کو اختیارات دے رکھے ہیں، تم ان کے ذریعے سے میرا قرب حاصل کرو، یا انہیں مدد کے لیے پکارو یا ان کے نام کی نذر نیاز دو۔ اسی لیے اللہ نے آگے فرمایا کہ ہم نے انہیں حق پہنچا دیا۔ یعنی یہ اچھی طرح واضح کر دیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور یہ اگر اللہ کی عبادت میں دوسروں کو شریک کر رہے ہیں، تو اس لیے نہیں کہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے، نہیں، بلکہ محض دوسرے کی دیکھا دیکھی اور آبا پرستی کی وجہ سے اس شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ورنہ حقیقت میں یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے نہ اس کا کوئی شریک اگر ایسا ہوتا، تو ہر شریک اپنے حصے کی مخلوق کا انتظام اپنی مرضی سے کرتا اور ہر ایک شریک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتا۔ اور جب ایسا نہیں ہے اور نظام کائنات میں ایسی کشمکش نہیں ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں سے پاک اور برتر ہے، جو مشرکین اس کی بابت باور کراتے ہیں۔

(۱) چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے تھے ”وَإِذَا أَرَدْتَ بِقَوْمٍ فِتْنَةً فَتَوَفَّنِي إِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُونٍ“ (ترمذی، تفسیر سورۃ ص و مسند احمد، جلد ۵، ص ۲۳۳) ”اے اللہ جب تو کسی قوم پر آزمائش یا عذاب بھیجے گا فیصلہ کرے تو اس سے پہلے پہلے مجھے دنیا سے اٹھالے۔“

برائی کو اس طریقے سے دور کریں جو سراسر بھلائی والا ہو،^(۱) جو کچھ یہ بیان کرتے ہیں ہم بخوبی واقف ہیں۔ (۹۶)
اور دعا کریں کہ اے میرے پروردگار! میں شیطانوں کے
وسوسوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔^(۲) (۹۷)

اور اے رب! میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے پاس
آجائیں۔^(۳) (۹۸)

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آنے لگتی ہے تو
کتابے اے میرے پروردگار! مجھے واپس لوٹادے۔ (۹۹)
کہ اپنی چھوڑی ہوئی دنیا میں جا کر نیک اعمال کر
لوں،^(۴) ہرگز ایسا نہیں ہوگا،^(۵) یہ تو صرف ایک قول

إِذْ قُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَأَصْفَاؤُنَّ ۖ

وَ قُلْ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ ۚ

وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونِ ۙ

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ۙ

لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا إِنَّمَا يُرَكَّبُ كَلَّاهُ لَا يَأْمُرُهُمْ إِلَّا لَهُمَ ۙ

وَمِنْ ذُلِّ أَيْهَمٍ يَرْتَدَّ إِلَيْهِ ۚ

(۱) جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ”برائی ایسے طریقے سے دور کرو جو اچھا ہو“ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہارا دشمن بھی
تمہارا اگر دوست بن جائے گا۔ (۳۵-۳۳- الحکم السجدة)۔

(۲) چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شیطان سے اس طرح استعاذہ کرتے «أَعُوذُ بِاللَّهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ
الرَّجِيمِ مِنْ هَمَزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْتِهِ» (ابوداؤد، کتاب الصلوة، باب ما يستفتح به الصلوة من الدعاء۔
ترمذی، باب ما يقول عند افتتاح الصلوة)

(۳) اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ ہر اہم کام کی ابتدا اللہ کے نام سے کرو یعنی بسم اللہ پڑھ کر۔ کیوں
کہ اللہ کی یاد، شیطان کو دور کرنے والی چیز ہے۔ اسی لیے آپ یہ دعا بھی مانگتے تھے «اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ النَّهْمِ
وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْهَذْمِ، وَمِنَ الْغَرَقِ، وَأَعُوذُ بِكَ أَنْ يَخْتَلِطَنِي الشَّيْطَانُ عِنْدَ الْمَوْتِ» (ابوداؤد، کتاب الوتر، باب
فی الاستعاذة) رات کو گھبراہٹ میں آپ یہ دعا بھی پڑھتے تھے۔ «بِاسْمِ اللَّهِ، أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ الثَّمَاةِ مِنْ
غَضَبِهِ، وَعِقَابِهِ، وَمِنْ شَرِّ عِبَادِهِ، وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَنْ يَخْضُرُونَ» (مسند احمد ۲/۱۸۱- ابوداؤد
کتاب الطب، باب کیف الرقی۔ ترمذی، أبواب الدعوات)

(۴) یہ آرزو، ہر کافر موت کے وقت دوبارہ اٹھائے جانے کے وقت، بارگاہ الہی میں قیام کے وقت اور جنم میں دھکیل
دینے جانے کے وقت کرتا ہے اور کرے گا، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ قرآن کریم میں اس مضمون کو متعدد جگہ
بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ منافقون ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴،
۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲،

ہے جس کا یہ قائل^(۱) ہے، ان کے پس پشت تو ایک حجاب ہے، ان کے دوبارہ جی اٹھنے کے دن تک۔^(۲) (۱۰۰) پس جب کہ صورت پھونک دیا جائے گا اس دن نہ تو آپس کے رشتے ہی رہیں گے، نہ آپس کی پوچھ گچھ۔^(۳) (۱۰۱) جن کی ترازو کا پلہ بھاری ہو گیا وہ تو نجات والے ہو گئے۔ (۱۰۲)

اور جن کے ترازو کا پلہ ہلکا ہو گیا یہ ہیں وہ جنہوں نے اپنا نقصان آپ کر لیا جو ہمیشہ کے لیے جنم واصل ہوئے۔ (۱۰۳) ان کے چروں کو آگ جھلستی رہے گی^(۴) اور وہ وہاں

وَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ
وَلَا يَسْمَعُونَ ﴿۱۰۰﴾

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۰۱﴾

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ
فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ﴿۱۰۲﴾

تَلْفَهُمْ وَجْوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ ﴿۱۰۳﴾

(۱) اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ ایسی بات ہے کہ جو ہر کافر نزع (جائگی) کے وقت کہتا ہے۔ دوسرے معنی ہیں کہ یہ صرف بات ہی بات ہے عمل نہیں، اگر انہیں دوبارہ بھی دنیا میں بھیج دیا جائے تو ان کا یہ قول، قول ہی رہے گا، عمل صالح کی توفیق انہیں پھر بھی نصیب نہیں ہوگی۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا۔ ﴿وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ﴾ (الأنعام: ۲۸) ”اگر انہیں دنیا میں لوٹا دیا جائے تو یہ پھر وہی کام کریں گے جن سے انہیں منع کیا گیا تھا“۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، کافر کی اس آرزو میں ہمارے لیے بڑا سبق ہے، کافر دنیا میں اپنے خاندان اور قبیلے کے پاس جانے کی آرزو نہیں کرے گا، بلکہ عمل صالح کے لیے دنیا میں آنے کی آرزو کرے گا۔ اس لیے زندگی کے لمحات کو غنیمت جانتے ہوئے زیادہ سے زیادہ عمل صالح کر لیے جائیں تاکہ کل قیامت کو یہ آرزو کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے (ابن کثیر)

(۲) دو چیزوں کے درمیان حجاب اور آڑ کو برزخ کہا جاتا ہے۔ دنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی کے درمیان جو وقفہ ہے، اسے یہاں برزخ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیوں کہ مرنے کے بعد انسان کا تعلق دنیا کی زندگی سے ختم ہو جاتا ہے اور آخرت کی زندگی کا آغاز اس وقت ہو گا جب تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ یہ درمیان کی زندگی، جو قبر میں یا پرندے کے پیٹ میں یا جلا ڈالنے کی صورت میں مٹی کے ذرات میں گزرتی ہے، برزخ کی زندگی ہے۔ انسان کا یہ وجود جہاں بھی اور جس شکل میں بھی ہو گا۔ بظاہر وہ مٹی میں مل کر مٹی بن چکا ہو گا یا راکھ بنا کر ہواؤں میں اڑا دیا یا دریاؤں میں بہا دیا گیا ہو گا یا کسی جانور کی خوراک بن گیا ہو گا، مگر اللہ تعالیٰ سب کو ایک نیا وجود عطا فرما کر میدانِ محشر میں جمع فرمائے گا۔

(۳) محشر کی ہولناکیوں کی وجہ سے ابتداء ایسا ہو گا۔ بعد میں وہ ایک دوسرے کو پچھانیں گے بھی اور ایک دوسرے سے پوچھ گچھ بھی کریں گے۔

(۴) چہرے کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ یہ انسانی وجود کا سب سے اہم اور اشرف حصہ ہے، ورنہ جنم کی آگ تو پورے جسم کو ہی محیط ہوگی۔

بد شکل بنے ہوئے ہوں گے۔^(۱) (۱۰۳)

کیا میری آیتیں تمہارے سامنے تلاوت نہیں کی جاتی تھیں؟ پھر بھی تم انہیں جھٹلاتے تھے۔ (۱۰۵)

کہیں گے کہ اے پروردگار! ہماری بد بختی ہم پر غالب آگئی (واقعی) ہم تھے ہی گمراہ۔ (۱۰۶)

اے ہمارے پروردگار! ہمیں یہاں سے نجات دے اگر اب بھی ہم ایسا ہی کریں تو بیشک ہم ظالم ہیں۔ (۱۰۷)

اللہ تعالیٰ فرمائے گا پھینکارے ہوئے ہمیں پڑے رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو۔ (۱۰۸)

میرے بندوں کی ایک جماعت تھی جو برابر یہی کہتی رہی کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لا چکے ہیں تو ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما تو سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ (۱۰۹)

(لیکن) تم انہیں مذاق میں ہی اڑاتے رہے یہاں تک کہ (اس مشغلے نے) تم کو میری یاد (بھی) بھلا دی اور تم ان سے مذاق ہی کرتے رہے۔ (۱۱۰)

میں نے آج انہیں ان کے اس صبر کا بدلہ دے دیا ہے کہ وہ خاطر خواہ اپنی مراد کو پہنچ چکے ہیں۔^(۳) (۱۱۱)

أَلَمْ يَكُنْ لِيَ يَوْمَئِذٍ شُعْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَلَكُمُ يَوْمَئِذٍ كَيْدٌ بُونٌ ۝۱۰۳

قَالُوا رَبَّنَا عَلَّمَكُم مَّا عَلَّمْنَا وَلَا نُلَمُّكَ ۝۱۰۴

رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِن عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ ۝۱۰۵

قَالَ اخْسَوْا مِنِّي وَلَا تَكْفُرُوا ۝۱۰۶

إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا

فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ ۝۱۰۷

فَاتَّخَذَتْهُمْ سِيخْرِيًا حَتَّىٰ آسَوْا كُرْسِيًّا وَكُنتُمْ مِنْهُمْ

تَضْحَكُونَ ۝۱۰۹

إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ الْفَٰكِرُونَ ۝۱۱۱

(۱) کَلَجَ کے معنی ہوتے ہیں ہونٹ سکر کر دانت ظاہر ہو جائیں۔ ہونٹ گویا دانتوں کا لباس ہیں؛ جب یہ جہنم کی آگ سے سمٹ اور سکر جائیں گے تو دانت ظاہر ہو جائیں گے؛ جس سے انسان کی صورت بد شکل اور ڈراؤنی ہو جائے گی۔

(۲) لذات اور شہوات کو؛ جو انسان پر غالب رہتی ہیں؛ یہاں بد بختی سے تعبیر کیا ہے کیوں کہ ان کا نتیجہ؛ دائمی بد بختی ہے۔

(۳) دنیا میں اہل ایمان کے لیے ایک صبر آزما مرحلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ جب دین و ایمان کے متفقین پر عمل کرتے ہیں تو دین سے نا آشنا اور ایمان سے بے خبر لوگ انہیں استہزا و ملامت کا نشانہ بنا لیتے ہیں۔ کتنے ہی کمزور ایمان والے ہیں کہ وہ ان ملامتوں سے ڈر کر بہت سے احکام الہیہ پر عمل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ جیسے داڑھی ہے؛ پردے کا مسئلہ

قُلْ كَمْ كُنْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ﴿۱۱۲﴾

اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ تم زمین میں باعتبار برسوں کی گنتی کے کس قدر رہے؟ (۱۱۲)

وہ کہیں گے ایک دن یا ایک دن سے بھی کم، گنتی گننے والوں سے بھی پوچھ لیجئے۔ (۱۱۳)

اللہ تعالیٰ فرمائے گا فی الواقع تم وہاں بہت ہی کم رہے ہو اے کاش! تم اسے پہلے ہی سے جان لیتے؟ (۱۱۴)

کیا تم یہ گمان کیے ہوئے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بیکار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے ہی نہ جاؤ گے۔ (۱۱۵)

اللہ تعالیٰ سچا بادشاہ ہے وہ بڑی بلندی والا ہے، (۱۱۶) اس کے سوا کوئی معبود نہیں؛ وہی بزرگ عرش کا مالک ہے۔ (۱۱۷)

قَالُوا الْيَوْمَ نَأْتِيهِمْ فَمَا يُبَدِّلُ يَوْمَهُمْ فَسَلِّ الْعَادِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا لَّأُولَٰئِكَ كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۱۳﴾

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ﴿۱۱۴﴾

قَتَلَى اللَّهُ الْمَلِكَ الْحَقَّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ ﴿۱۱۵﴾

ہے، شادی بیاہ کی ہندوانہ رسومات سے اجتناب ہے، وغیرہ وغیرہ۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو کسی بھی ملامت کی پروا نہیں کرتے اور اللہ و رسول کی اطاعت سے کسی بھی موقع پر انحراف نہیں کرتے ﴿وَلَا يَخِيفُ الْوَمَةَ لَآئِحِهِ﴾ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن انہیں اس کی بہترین جزا عطا فرمائے گا اور انہیں کامیابی سے سرفراز کرے گا۔ جیسا کہ اس آیت سے واضح ہے۔ اللّٰهُمَّ! اجْعَلْنَا مِنْهُمْ۔

(۱) اس سے مراد فرشتے ہیں، جو انسانوں کے اعمال اور عمریں لکھنے پر مامور ہیں یا وہ انسان مراد ہیں جو حساب کتاب میں مہارت رکھتے ہیں۔ قیامت کی ہولناکیاں ان کے ذہنوں سے دنیا کی عیش و عشرت کو محو کر دیں گی اور دنیا کی زندگی انہیں ایسے لگے گی جیسے دن یا آدھا دن۔ اس لیے وہ کہیں گے کہ ہم تو ایک دن یا اس سے بھی کم وقت دنیا میں رہے۔ بے شک تو فرشتوں سے یا حساب جاننے والوں سے پوچھ لے۔

(۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کی دائمی زندگی کے مقابلے میں یقیناً دنیا کی زندگی بہت ہی قلیل ہے۔ لیکن اس نکتے کو دنیا میں تم نے نہیں جانا۔ کاش تم دنیا میں اس حقیقت سے دنیا کی بے ثباتی سے آگاہ ہو جاتے، تو آج تم بھی اہل ایمان کی طرح کامیاب و کامران ہوتے۔

(۳) یعنی وہ اس سے بہت بلند ہے کہ وہ تمہیں بغیر کسی مقصد کے یوں ہی ایک کھیل کے طور پر بے کار پیدا کرے۔ اور تم جو چاہو کرو، تم سے اس کی کوئی باز پرس ہی نہ ہو۔ بلکہ اس نے تمہیں ایک خاص مقصد کے تحت پیدا کیا ہے اور وہ ہے اس کی عبادت کرنا۔ اسی لیے آگے فرمایا کہ وہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

(۴) عرش کی صفت کریم بیان فرمائی کہ وہاں سے رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔

جو شخص اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارے جس کی کوئی دلیل اس کے پاس نہیں، پس اس کا حساب تو اس کے رب کے اوپر ہی ہے۔ بیشک کافر لوگ نجات سے محروم ہیں۔^(۱) (۱۷۷)

اور کہو کہ اے میرے رب! تو بخش اور رحم کر اور تو سب مہربانوں سے بہتر مہربانی کرنے والا ہے۔ (۱۱۸)

سورۃ نور مدنی ہے اور اس کی چونسٹھ آیتیں اور نور کوغ ہیں۔

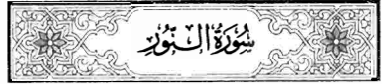
شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

یہ ہے وہ سورت جو ہم نے نازل فرمائی ہے^(۲) اور مقرر کر دی ہے اور جس میں ہم نے کھلی آیتیں (احکام) اتارے ہیں تاکہ تم یاد رکھو۔^(۱)

زنکار عورت و مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔^(۳) ان پر اللہ کی شریعت کی حد جاری کرتے ہوئے

وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَكَيْفٌ لَّكَرِيمٌ ﴿۱۷۷﴾

وَقُلْ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّحِيمِينَ ﴿۱۱۸﴾



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

سُورَةٌ أَنْزَلْنَاهَا قُرْآنًا وَفَرَضْنَاهَا وَأَنْزَلْنَا فِيهَا آيَاتٍ لَّيِّنَاتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۱﴾

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا آفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنَّكُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

(۱) اس سے معلوم ہوا کہ فلاح اور کامیابی آخرت میں عذاب الہی سے بچ جانا ہے، محض دنیا کی دولت اور آسائشوں کی فراوانی، کامیابی نہیں، یہ تو دنیا میں کافروں کو بھی حاصل ہے لیکن اللہ تعالیٰ ان سے فلاح کی نفی فرما رہا ہے، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اصل فلاح آخرت کی فلاح ہے جو اہل ایمان کے حصے میں آئے گی، نہ کہ دنیوی مال و اسباب کی کثرت، جو کہ بلا تفریق مومن و کافر سب کو ہی حاصل ہوتی ہے۔

☆ سورۃ نور، احزاب اور نساء یہ تینوں سورتیں ایسی ہیں، جن میں عورتوں کے خصوصی مسائل اور معاشرتی زندگی کی بابت اہم تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

(۲) قرآن کریم کی ساری ہی سورتیں اللہ کی نازل کردہ ہیں، لیکن اس سورت کی بابت جو یہ کہا تو اس سے اس سورت میں بیان کردہ احکام کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔

(۳) بدکاری کی ابتدائی سزا، جو اسلام میں عبوری طور پر بتلائی گئی تھی، وہ سورۃ النساء، آیت ۱۵ میں گزر چکی ہے، اس

وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَلَيَشْهَدُنَا عَدَاؤُهُمَا طَائِفَةٌ

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ⑤

تمہیں ہرگز ترس نہ کھانا چاہیے، اگر تمہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہو۔^(۱) ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہیے۔^(۲) زانی مرد بجز زانیہ یا مشرکہ عورت کے اور سے نکاح نہیں کرتا اور زنا کار عورت بھی بجز زانیہ یا مشرکہ مرد کے اور نکاح نہیں کرتی اور ایمان والوں پر یہ حرام کر دیا گیا۔^(۳)

الَّذِينَ لَا يَنْكِحُوا الزَّانِيَةَ أَوْ الْمُشْرِكَةَ وَالزَّانِيَةَ لَا يَنْكِحُهُمُ
الَّذَانِ أَوْ الْمُشْرِكُ وَخُورَ ذَلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ⑥

میں کہا گیا تھا کہ اس کے لیے جب تک مستقل سزا مقرر نہ کی جائے، ان بدکار عورتوں کو گھروں میں بند رکھو! پھر جب سورہ نور کی یہ آیت نازل ہوئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا تھا، اس کے مطابق بدکار مرد و عورت کی مستقل سزا مقرر کر دی گئی ہے، وہ تم مجھ سے سیکھ لو، اور وہ ہے کنوارے (غیر شادی شدہ) مرد اور عورت کے لیے سو سو کوڑے اور شادی شدہ مرد و عورت کو سو سو کوڑے اور سنگساری کے ذریعے سے مار دینا۔ (صحیح مسلم، کتاب الحدود باب حد الزانی والسنن) پھر آپ نے شادی شدہ زانیوں کو عملاً سزائے رجم دی اور سو کوڑے (جو چھوٹی سزا ہے) بڑی سزا میں مدغم ہو گئے اور اب شادی شدہ زانیوں کے لیے سزا صرف رجم (سنگساری) ہے۔ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین اور عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی یہی سزا دی گئی اور بعد میں تمام امت کے فقہاء و علمائے اسی کے قائل رہے اور آج تک قائل ہیں۔ صرف خوارج نے اس سزا کا انکار کیا برصغیر میں اس وقت بھی کچھ ایسے افراد ہیں جو اس سزا کے منکر ہیں۔ اس انکار کی اصل بنیادی انکار حدیث پر ہے۔ کیونکہ رجم کی سزا صحیح اور نہایت قوی احادیث سے ثابت ہے اور اس کے روایت کرنے والے بھی اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ علمائے اسے متواتر روایات میں شمار کیا ہے۔ اس لیے حدیث کی حجیت کا اور دین میں اس کے ماخذ شرعی ہونے کا قائل شخص رجم کا انکار نہیں کر سکتا۔

(۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ ترس کھا کر سزا دینے سے گریز مت کرو، ورنہ طبعی طور پر ترس کا آنا، ایمان کے منافی نہیں، منجملہ خواص طبائع انسانی میں سے ہے۔

(۲) تاکہ سزا کا اصل مقصد کہ لوگ اس سے عبرت پکڑیں، زیادہ وسیع پیمانے پر حاصل ہو سکے۔ بد قسمتی سے آج کل برسرعام سزا کو انسانی حقوق کے خلاف باور کرایا جا رہا ہے۔ یہ سراسر جہالت، احکام الہی سے بغاوت اور بزم خویش اللہ سے بھی زیادہ انسانوں کا ہمدرد اور خیر خواہ بننا ہے۔ دراصل حالیکہ اللہ سے زیادہ رؤف رحیم کوئی نہیں۔

(۳) اس کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں پھر چار گواہ نہ پیش کر سکیں تو انہیں اسی کوڑے لگاؤ اور کبھی بھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔ یہ فاسق لوگ ہیں۔ (۱) (۳) ہاں جو لوگ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں (۲) تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربانی کرنے والا ہے۔ (۵) جو لوگ اپنی بیویوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں اور ان کا

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَا يَأْتُوانَ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَإِذْ لَمْ يَكُنَّ لَهُنَّ شُهَدَاءُ لَأَكْفُرْنَ بِاللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۱﴾
إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۲﴾
وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا

۱- بعض کہتے ہیں کہ یہ غالب احوال کے اعتبار سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ عام طور پر بدکار قسم کے لوگ نکاح کے لیے اپنے ہی جیسے لوگوں کی طرف رجوع کرتے ہیں، چنانچہ زانیوں کی اکثریت زانیوں کے ساتھ ہی نکاح کرنا پسند کرتی ہے اور مقصود اس سے اہل ایمان کو متنبہ کرنا ہے کہ جس طرح زنا ایک نہایت قبیح اور بڑا گناہ ہے، اسی طرح زنا کاروں کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات قائم کرنا بھی منع اور حرام ہے۔ امام شوکانی نے اس مفہوم کو راجح قرار دیا ہے اور احادیث میں اس کا جو سبب نزول بیان کیا گیا ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے بدکار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت طلب کی، جس پر یہ آیت نازل ہوئی، یعنی انہیں ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔ اسی سے استدلال کرتے ہوئے علما نے کہا ہے کہ ایک شخص نے جس عورت سے یا عورت نے جس مرد سے بدکاری کی ہو۔ ان کا آپس میں نکاح جائز نہیں۔ ہاں اگر وہ خالص توبہ کر لیں تو پھر ان کے درمیان نکاح جائز ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

۲- بعض کہتے ہیں کہ یہاں نکاح سے مراد معروف نکاح نہیں ہے بلکہ یہ جماع کے معنی میں ہے اور مقصد زنا کی شہادت و قباحت بیان کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بدکار مرد اپنی جنسی خواہش کی ناجائز طریقے سے تسکین کے لیے بدکار عورت کی طرف اور اسی طرح بدکار عورت بدکار مرد کی طرف رجوع کرتی ہے، مومنوں کے لیے ایسا کرنا یعنی زنا کاری حرام ہے۔ اور مشرک مرد و عورت کا ذکر اس لیے کر دیا کہ مشرک بھی زنا سے ملتا جلتا گناہ ہے، جس طرح مشرک اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کے در پر جھکتا ہے اسی طرح ایک زنا کار اپنی بیوی کو چھوڑ کر یا بیوی اپنے خاوند کو چھوڑ کر فیروں سے اپنا منہ کالا کرتی ہے۔ یوں مشرک اور زانی کے درمیان ایک عجیب معنوی مناسبت پائی جاتی ہے۔

(۱) اس میں تقدف (بہتان تراشی) کی سزا بیان کی گئی ہے کہ جو شخص کسی پاک دامن عورت یا مرد پر زنا کی تہمت لگائے (اسی طرح جو عورت کسی پاک دامن مرد یا عورت پر زنا کی تہمت عائد کرے) اور وہ بطور ثبوت چار گواہ پیش نہ کر سکے تو اس کے لیے تین حکم بیان کیے گئے ہیں۔ (۱) انہیں اسی کوڑے لگائے جائیں، (۲) ان کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے، (۳) وہ عند اللہ وعند الناس فاسق ہیں۔

(۲) توبہ سے کوڑوں کی سزا تو معاف نہیں ہوگی، وہ تائب ہو جائے یا اصرار کرے، یہ سزا تو بہر حال ملے گی۔ البتہ دوسری

کوئی گواہ۔ بجز خود ان کی ذات کے نہ ہو تو ایسے لوگوں میں سے ہر ایک کا ثبوت یہ ہے کہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ وہ بچوں میں سے ہیں۔ (۶)

اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو۔ (۷)

اور اس عورت سے سزا اس طرح دور ہو سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ یقیناً اس کا مرد جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔ (۸)

اور پانچویں دفعہ کہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہو اگر اس کا خاوند بچوں میں سے ہو۔ (۹)

أَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ أَنَّهُ لَيِّنٌ الضَّادِ قِيَمٌ ①

وَالْخَامِسَةَ أَنَّ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ②

وَيَذَرُ أَهْلَهَا عَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعًا شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ أَنَّهُ لَيِّنٌ الْكَاذِبِينَ ③

وَالْخَامِسَةَ أَنَّ غَضَبَ اللَّهِ عَلَيْهَا إِنْ كَانَ مِنَ الضَّادِ قِيَمٌ ④

دو باتیں جو ہیں، مردود الشہادۃ اور فاسق ہونا، اس کے بارے میں اختلاف ہے، بعض علماء اس استثناء کو فسق تک محدود رکھتے ہیں یعنی توبہ کے بعد وہ فاسق نہیں رہے گا۔ اور بعض مفسرین دونوں جملوں کو اس میں شامل سمجھتے ہیں، یعنی توبہ کے بعد مقبول الشہادۃ بھی ہو جائے گا۔ امام شوکانی نے اسی دوسری رائے کو ترجیح دی ہے اور آبدًا کا مطلب بیان کیا ہے مَا دَامَ قَازِفًا یعنی جب تک وہ بہتان تراشی پر قائم رہے جس طرح کہا جائے کہ کافر کی شہادت کبھی قبول نہیں، تو یہاں ”کبھی“ کا مطلب یہی ہو گا کہ جب تک وہ کافر ہے۔

(۱) اس میں لعان کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مرد نے اپنی بیوی کو اپنی آنکھوں سے کسی غیر کے ساتھ بدکاری کرتے ہوئے دیکھا، جس کا وہ خود تو یعنی گواہ ہے لیکن چونکہ زنا کی حد کے اثبات کے لیے چار مردوں کی یعنی گواہی ضروری ہے، اس لیے جب تک وہ اپنے ساتھ مزید تین یعنی گواہ پیش نہ کرے، اس کی بیوی پر زنا کی حد نہیں لگ سکتی۔ لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد ایسی بدچلن بیوی کو برداشت کرنا بھی اس کے لیے ناممکن ہے۔ شریعت نے اس کا حل یہ پیش کیا ہے کہ یہ شخص عدالت میں یا حاکم مجاز کے سامنے چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ وہ اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگانے میں سچا ہے یا یہ بچہ یا حمل اس کا نہیں ہے۔ اور پانچویں مرتبہ کہے گا کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر اللہ کی لعنت۔

(۲) یعنی اگر خاوند کے جواب میں بیوی چار مرتبہ قسم کھا کر کہہ دے کہ وہ جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر اس کا خاوند سچا ہے (اور میں جھوٹی ہوں) تو مجھ پر اللہ کا غضب نازل ہو۔ تو اس صورت میں وہ زنا کی سزا سے بچ جائے گی۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے جدائی ہو جائے گی۔ اسے لعان اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں دونوں ہی اپنے آپ کو جھوٹا ہونے کی صورت میں مستحق لعنت قرار دیتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایسے بعض واقعات پیش آئے، جن کی تفصیل احادیث میں موجود ہے، وہی واقعات ان آیات کے نزول کا سبب بنے۔

اگر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تم پر نہ ہوتا^(۱) (تو تم پر مشقت اترتی) اور اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا باحکمت ہے۔ (۱۰)

جو لوگ یہ بہت بڑا بہتان باندھ لائے ہیں^(۲) یہ بھی تم

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ حَكِيمٌ ﴿۱۰﴾

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّمَّاكُمْ، لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُمَّ

(۱) اس کا جواب محذوف ہے، تو تم میں سے جھوٹے پر فوراً اللہ کا عذاب نازل ہو جاتا۔ لیکن چونکہ وہ توباب ہے اور حکیم بھی، اس لیے ایک تو اس نے ستر پوشی کر دی، تاکہ اس کے بعد اگر کوئی سچے دل سے توبہ کر لے تو وہ اسے اپنے دامانِ رحمت میں ڈھانپ لے گا اور حکیم بھی ہے کہ اس نے لعان جیسا مسئلہ بیان کر کے غیور مردوں کے لیے ایک نہایت معقول اور آسان تجویز مہیا کر دی ہے۔

(۲) اِفْكِ سے مراد وہ واقعہ اِفْک ہے جس میں منافقین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے دامنِ عفت و عزت کو داغ دار کرنا چاہا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت نازل فرما کر ان کی پاک دامنی اور عفت کو واضح تر کر دیا۔ مختصراً یہ واقعہ یوں ہے کہ حکمِ حجاب کے بعد غزوہ بنی المصطلق (مربیع) سے واپسی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مدینہ کے قریب ایک جگہ قیام فرمایا، صبح کو جب وہاں سے روانہ ہوئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہودج بھی، جو خالی تھا، اہل قافلہ نے یہ سمجھ کر اونٹ پر رکھ دیا کہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا اس کے اندر ہی ہوں گی۔ اور وہاں سے روانہ ہو گئے، درانِ حایکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے ہار کی تلاش میں باہر گئی ہوئی تھیں، جب واپس آئیں تو دیکھا کہ قافلہ چلا گیا۔ تو یہ سوچ کر وہیں لیٹ رہیں کہ جب ان کو میری غیر موجودگی کا علم ہو گا تو تلاش کے لیے واپس آئیں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد صفوان بن معطل سلمیؓ آگئے، جن کی ذمہ داری یہی تھی کہ قافلہ کی رہ جانے والی چیزیں سنبھال لیں۔ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حکمِ حجاب سے پہلے دیکھا ہوا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اِنَّا لِلَّهِ اِلْحِ پڑھا اور سمجھ گئے کہ قافلہ غلطی سے یا بے علمی میں حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کو ہمیں چھوڑ کر آگے چلا گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے انہیں اپنے اونٹ پر بٹھایا اور خود نکیل تھا سے پیدل چلتے قافلہ کو جا ملے۔ منافقین نے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس طرح بعد میں اکیلے حضرت صفوانؓ کے ساتھ آتے دیکھا تو اس موقع کو بہت غنیمت جانا اور رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی نے کہا کہ یہ تمہاری اور علیحدگی بے سبب نہیں اور یوں انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضرت صفوانؓ کے ساتھ مطعون کر دیا، درانِ حایکہ دونوں ان باتوں سے یکسر بے خبر تھے۔ بعض مخلص مسلمان بھی منافقین کے اس پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے، مثلاً حضرت حسان، مطح بن اثاثة اور حمہ بنت جحش رضی اللہ عنہم (اس واقعہ کی پوری تفصیل صحیح احادیث میں موجود ہے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم پورے ایک مہینے تک، جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے براءت نازل نہیں ہوئی، سخت پریشان رہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو علمی میں اپنی جگہ بے قرار و مضطرب۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اسی واقعے کو اختصار و جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ اِفْكِ کے معنی ہیں کسی چیز کو الٹا

میں سے ہی ایک گروہ^(۱) ہے۔ تم اسے اپنے لیے برانہ سمجھو، بلکہ یہ تو تمہارے حق میں بہتر ہے۔^(۲) ہاں ان میں سے ہر ایک شخص پر اتنا گناہ ہے جتنا اس نے کمایا ہے اور ان میں سے جس نے اس کے بہت بڑے حصے کو سرا نجام دیا ہے اس کے لیے عذاب بھی بہت ہی بڑا ہے۔^(۳) (۱۱)

اسے سنتے ہی مومن مردوں عورتوں نے اپنے حق میں نیک گمانی کیوں نہ کی اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ تو کھلم کھلا صریح بہتان ہے۔^(۴) (۱۲)

وہ اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے؟ اور جب گواہ نہیں لائے تو یہ بہتان باز لوگ یقیناً اللہ کے نزدیک محض جھوٹے ہیں۔ (۱۳)

اگر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تم پر دنیا اور آخرت میں نہ ہوتا تو یقیناً تم نے جس بات کے چرچے شروع کر رکھے

بَلْ هُوَ خَيْرٌ لِّكُمْ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ وَالَّذِي تَوَلَّى كِبْرَهُ يَتَّخِذْهُ عُذَابًا عَظِيمًا ①

لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَذَا أَفْكٌ مِّثْيِينٌ ②

لَوْلَا جَاءَ وَعَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشَّهَادَةِ فَأُولَئِكَ عِنْدَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ③

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَسْتُمْ فِي مَآفَظِكُمْ عَذَابًا عَظِيمًا ④

دینا۔ اس واقعے میں بھی چونکہ منافقین نے معاملے کو الٹا دیا تھا یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، تو ثناء و تعریف کی مستحق تھیں، عالی نسب اور رفعت کردار کی مالک تھیں نہ کہ قذف کی۔ لیکن ظالموں نے اس پیکرِ عفت کو اس کے برعکس طعن اور بہتان تراشی کا ہدف بنا لیا۔

(۱) ایک گروہ اور جماعت کو عصبیت کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کی تقویت اور عصبیت کا باعث ہوتے ہیں۔
(۲) کیونکہ اس سے ایک تو تمہیں کرب اور صدمے کے سبب ثوابِ عظیم ملے گا، دوسرے آسمانوں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت سے ان کی عظمت شان اور ان کے خاندان کا شرف و فضل نمایاں تر ہو گیا، علاوہ ازیں اہل ایمان کے لیے اس میں عبرت و مواعظت کے اور کئی پہلو ہیں۔

(۳) اس سے مراد عبد اللہ بن ابی منافق ہے جو اس سازش کا سرغنہ تھا۔

(۴) یہاں سے تربیت کے ان پہلوؤں کو نمایاں کیا جا رہا ہے جو اس واقعے میں مضمحل ہیں۔ ان میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اہل ایمان ایک جان کی طرح ہیں، جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اتہام طرازی کی گئی تو تم نے اپنے پر قیاس کرتے ہوئے فوراً اس کی تردید کیوں نہ کی اور اسے بہتان صریح کیوں قرار نہیں دیا؟

تھے اس بارے میں تمہیں بہت بڑا عذاب پہنچتا۔ (۱۴)
 جبکہ تم اسے اپنی زبانوں سے نقل در نقل کرنے لگے اور
 اپنے منہ سے وہ بات نکالنے لگے جس کی تمہیں مطلق خبر
 نہ تھی، گو تم اسے ہلکی بات سمجھتے رہے لیکن اللہ تعالیٰ
 کے نزدیک وہ بہت بڑی بات تھی۔ (۱۵)
 تم نے ایسی بات کو سنتے ہی کیوں نہ کہہ دیا کہ ہمیں ایسی
 بات منہ سے نکالنی بھی لائق نہیں۔ یا اللہ! تو پاک ہے، یہ
 تو بہت بڑا بہتان ہے اور تممت ہے۔ (۱۶) ^(۱)

إِنَّ تَكْفُوتَهُ بِالْأَيْدِي نِيَامٌ وَتَقُولُونَ يَا أَوَّاهُ كَمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ
 عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيْبَتًا وَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمٌ ﴿۱۵﴾

وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ نَأْيُكُمُنَا لَنَا إِنَّا نَنكُرُ بِهِذَا نَسْجِدَكَ
 هَذَا بُهْتَانًا عَظِيمًا ﴿۱۶﴾

(۱) دوسری بات اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ بتلائی کہ اس بہتان پر انہوں نے ایک گواہ بھی پیش نہیں کیا۔ جب کہ اس
 کے لیے چار گواہ ضروری تھے، اس کے باوجود تم نے ان بہتان تراشوں کو جھوٹا نہیں کہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان آیات کے
 نزول کے بعد حضرت حسان، مطح اور حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہم کو حد قذف لگائی گئی۔ (مسند احمد، جلد ۶،
 ص ۳۰۔ ترمذی نمبر ۳۱۸۱، ابوداؤد، نمبر ۴۳۳۳، ابن ماجہ، نمبر ۲۵۶۷) عبد اللہ بن ابی کو سزا اس لیے نہیں دی گئی کہ
 اس کے لیے آخرت کے عذاب عظیم کو ہی کافی سمجھ لیا گیا اور مومنوں کو سزا دے کر دنیا میں ہی پاک کر دیا گیا۔ دوسرے،
 اس کے پیچھے ایک پورا جتھہ تھا، اس کو سزا دینے کی صورت میں کچھ ایسے خطرات تھے کہ جن سے نمٹنا اس وقت
 مسلمانوں کے لیے مشکل تھا، اس لیے مصلحتاً اسے سزا دینے سے گریز کیا گیا۔ (فتح القدر)

تیسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اللہ کا فضل و احسان تم پر نہ ہوتا تو تمہارا یہ رویہ کہ تم نے بلا تحقیق اس افواہ کو آگے
 پھیلانا شروع کر دیا۔ عذاب عظیم کا باعث تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ افواہ سازی اور اس کی نشرو اشاعت بھی جرم عظیم
 ہے جس پر انسان عذاب عظیم کا مستحق قرار پا سکتا ہے۔

چوتھی بات، کہ یہ معاملہ براہ راست حرم رسول ﷺ اور ان کی عزت و آبرو کا تھا لیکن تم نے اسے قرار واقعی اہمیت
 نہیں دی، اور اسے ہلکا سمجھا۔ اس سے بھی یہ سمجھانا مقصود ہے کہ محض آبروریزی ہی بڑا جرم نہیں ہے کہ جس کی حد سو
 کوڑے یا رجم ہے بلکہ کسی کی عزت و آبرو پر اس طرح حملہ کرنا اور کسی عفت مآب خاندان کی تذلیل و ابانت کا
 سرو سامان کرنا بھی اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے، اسے ہلکا مت سمجھو۔ اسی لیے آگے پھر مزید تاکید کرتے ہوئے کہا کہ
 تم نے سنتے ہی یہ کیوں نہیں کہا کہ ہمیں ایسی بات منہ سے نکالنی بھی لائق نہیں۔ یہ یقیناً بہتان عظیم ہے۔ اسی لیے امام
 مالک فرماتے ہیں کہ جو نام نہاد مسلمان حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بے حیائی کا الزام عائد کرے وہ کافر ہے کیوں کہ وہ اللہ کی
 اور قرآن کی تکذیب کرتا ہے (الایران القاسمیر)

اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ پھر کبھی بھی ایسا کام نہ کرنا اگر تم سچے مومن ہو۔ (۱۷)

اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے اپنی آیتیں بیان فرما رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ علم و حکمت والا ہے۔ (۱۸)

جو لوگ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلانے کے آرزو مند رہتے ہیں ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہیں،^(۱) اللہ سب کچھ جانتا ہے اور تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ (۱۹)

اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ بڑی شفقت رکھنے والا مہربان ہے۔^(۲) (تم پر عذاب اتر جاتا)۔ (۲۰)

ایمان والو! شیطان کے قدم بقدم نہ چلو۔ جو شخص شیطانی قدموں کی پیروی کرے تو وہ تو بے حیائی اور برے کاموں

يَعْلَمُكُمُ اللَّهُ أَنْ تَعُودُوا بِالْبَغْيَةِ أَبَدًا إِنَّ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٧﴾

وَيَتَّبِعِنَ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيُعَلِّمُهُمُ كَيْدَهُمْ ﴿١٨﴾

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٩﴾

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ زَوَّجَ نَحْوَهُ ﴿٢٠﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ وَمَنْ يَتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ

(۱) فَاحِشَةٌ کے معنی بے حیائی کے ہیں اور قرآن نے بد کاری کو بھی فاحشہ قرار دیا ہے، (بنی اسرائیل) اور یہاں بد کاری کی ایک جھوٹی خبر کی اشاعت کو بھی اللہ تعالیٰ نے بے حیائی سے تعبیر فرمایا ہے اور اسے دنیا و آخرت میں عذاب الیم کا باعث قرار دیا ہے، جس سے بے حیائی کے بارے میں اسلام کے مزاج کا اور اللہ تعالیٰ کی منشا کا اندازہ ہوتا ہے کہ محض بے حیائی کی ایک جھوٹی خبر کی اشاعت عند اللہ اتنا بڑا جرم ہے تو جو لوگ رات دن ایک مسلمان معاشرے میں اخبارات، ریڈیو، ٹی وی اور فلموں ڈراموں کے ذریعے سے بے حیائی پھیلا رہے ہیں اور گھر گھر اسے پینچا رہے ہیں، اللہ کے ہاں یہ لوگ کتنے بڑے مجرم ہوں گے؟ اور ان اداروں میں کام کرنے والے ملازمین کیوں کر اشاعت فاحشہ کے جرم سے بری الذمہ قرار پائیں گے؟ اسی طرح اپنے گھروں میں ٹی وی لا کر رکھنے والے، جس سے ان کی آئندہ نسلوں میں بے حیائی پھیل رہی ہے، وہ بھی اشاعت فاحشہ کے مجرم کیوں نہیں ہوں گے؟ اور یہی معاملہ فواحش اور منکرات سے بھرپور روزنامہ اخبارات کا ہے کہ ان کا بھی گھروں کے اندر آنا، اشاعت فاحشہ کا ہی سبب ہے، یہ بھی عند اللہ جرم ہو سکتا ہے۔ کاش مسلمان اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں اور اس بے حیائی کے طوفان کو روکنے کے لیے اپنی مقدور بھرسعی کریں۔

(۲) جواب محذوف ہے، تو پھر اللہ کا عذاب تمہیں اپنی گرفت میں لے لیتا۔ یہ محض اس کا فضل اور اس کی شفقت و رحمت ہے کہ اس نے تمہارے اس جرم عظیم کو معاف فرمادیا۔

کا ہی حکم کرے گا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی بھی کبھی بھی پاک صاف نہ ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ جسے پاک کرنا چاہے، کر دیتا ہے۔^(۱) اور اللہ سب سننے والا سب جاننے والا ہے۔ (۲۱)

تم میں سے جو بزرگی اور کشادگی والے ہیں انہیں اپنے قربات داروں اور مسکینوں اور مہاجرین کو فی سبیل اللہ دینے سے قسم نہ کھالینی چاہیے، بلکہ معاف کر دینا اور درگزر کر لینا چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف فرما دے؟^(۲) اللہ قصوروں کو

وَرَحْمَتُهُ مَازَالِي مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلَكِنَّ اللَّهَ يُؤْتِي مَنْ يَشَاءُ
وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۱﴾

وَلَا يَأْتِلُ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ
وَالْمَسْكِينِ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ أُولُو الْبُصُولِ
أَلَا تَشْعُرُونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۲۲﴾

(۱) اس مقام پر شیطان کی پیروی سے ممانعت کے بعد یہ فرمانا کہ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی پاک صاف نہ ہوتا، اس سے یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مذکورہ واقعہ اٹک میں ملوث ہونے سے بچ گئے، یہ محض اللہ کا فضل و کرم ہے جو ان پر ہوا، ورنہ وہ بھی اسی رو میں بہ جاتے، جس میں بعض مسلمان بہ گئے تھے۔ اس لیے شیطان کے داؤ اور فریب سے بچنے کے لیے ایک تو ہر وقت اللہ سے مدد طلب کرتے اور اس کی طرف رجوع کرتے رہو اور دوسرے جو لوگ اپنے نفس کی کمزوری سے شیطان کے فریب کا شکار ہو گئے ہیں، ان کو زیادہ ہدف ملامت مت بناؤ، بلکہ خیر خواہانہ طریقے سے ان کی اصلاح کی کوشش کرو۔

(۲) حضرت مسطح، جو واقعہ اٹک میں ملوث ہو گئے تھے، فقراء مہاجرین میں سے تھے، رشتے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خالہ زاد تھے، اسی لیے ابو بکر رضی اللہ عنہ ان کے کفیل اور معاش کے ذمے دار تھے، جب یہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف مہم میں شریک ہو گئے تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سخت صدمہ پہنچا، جو ایک فطری امر تھا چنانچہ نزول براءت کے بعد غصے میں انہوں نے قسم کھالی کہ وہ آئندہ مسطح کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائیں گے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ قسم، جو اگرچہ انسانی فطرت کے مطابق ہی تھی، تاہم مقام صدیقیت، اس سے بلند تر کردار کا متقاضی تھا، اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آئی اور یہ آیت نازل فرمائی، جس میں بڑے پیار سے ان کے اس عاجلانہ بشری اقدام پر انہیں متنبہ فرمایا کہ تم سے بھی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں اور تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری غلطیاں معاف فرماتا رہے۔ تو پھر تم بھی دوسروں کے ساتھ اسی طرح معافی اور درگزر کا معاملہ کیوں نہیں کرتے؟ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری غلطیاں معاف فرمادے؟ یہ انداز بیان اتنا موثر تھا کہ اسے سننے ہی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بے ساختہ پکار اٹھے ”کیوں نہیں اے ہمارے رب! ہم ضرور یہ چاہتے ہیں کہ تو ہمیں معاف فرما دے“ اس کے بعد انہوں نے اپنی قسم کا کفارہ ادا کر کے حسب سابق مسطح کی مالی سرپرستی شروع فرمادی (فتح القدر، ابن کثیر)

معاف فرمانے والا مہربان ہے۔ (۲۲)

جو لوگ پاک دامن بھولی بھالی باایمان عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں وہ دنیا و آخرت میں ملعون ہیں اور ان کے لیے بڑا بھاری عذاب ہے۔^(۱) (۲۳)

جبکہ ان کے مقابلے میں ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔^(۲) (۲۴)

اس دن اللہ تعالیٰ انہیں پورا پورا بدلہ حق و انصاف کے ساتھ دے گا اور وہ جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے (اور وہی) ظاہر کرنے والا ہے۔ (۲۵)

خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لائق ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لائق ہیں اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لائق ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لائق ہیں۔^(۳) ایسے پاک لوگوں کے متعلق جو کچھ بکواس

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْفُؤَادَاتِ لُعُنُوا
فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۲۲﴾

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَيْدِيهِمْ وَأَيْتَانُهُمْ بِمَا كَانُوا يُعْلَمُونَ ﴿۲۳﴾

يَوْمَ يَدْعُؤُهُمْ اللَّهُ دِينَهُمُ السَّعَىٰ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ
الَّذِي يُبَيِّنُ ﴿۲۴﴾

الْمُحْصِنَاتِ الْفَاضِلَاتِ وَالْمُحْصِنُونَ الْفَاضِلُونَ
وَالْمُحْصِنُونَ الْفَاضِلُونَ أُولَئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ
لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿۲۵﴾

(۱) بعض مفسرین نے اس آیت کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ خاص قرار دیا ہے کہ اس آیت میں بطور خاص ان پر تہمت لگانے کی سزا بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کے لیے توبہ نہیں ہے۔ اور بعض مفسرین نے اسے عام ہی رکھا ہے اور اس میں وہی حد قذف بیان کی گئی ہے، جو پہلے گزر چکی ہے۔ اگر تہمت لگانے والا مسلمان ہے تو لعنت کا مطلب ہو گا کہ وہ قابل حد ہے اور مسلمانوں کے لیے نفرت اور بعد کا مستحق۔ اور اگر کافر ہے، تو مفہوم واضح ہی ہے کہ وہ دنیا و آخرت میں ملعون یعنی رحمت الہی سے محروم ہے۔

(۲) جیسا کہ قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر بھی اور احادیث میں بھی یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔

(۳) اس کا ایک مفہوم تو یہی بیان کیا گیا ہے جو ترجمے سے واضح ہے۔ اس صورت میں ﴿الَّذِينَ لَا يَدْعُونَ إِلَى الْإِسْلَامِ﴾ کے ہم معنی آیت ہوگی، اور نبیثات اور خبیثون سے زانی مرد و عورت اور طیبات اور طیبون سے مراد پاک دامن عورت اور مرد ہوں گے۔ دوسرے معنی اس کے ہیں کہ ناپاک باتیں ناپاک مردوں کے لیے اور ناپاک مرد ناپاک باتوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ باتیں پاکیزہ مردوں کے لیے اور پاکیزہ مرد پاکیزہ باتوں کے لیے ہیں اور مطلب یہ ہو گا کہ ناپاک باتیں وہی مرد و عورت کرتے ہیں جو ناپاک ہیں اور پاکیزہ باتیں کرتا پاکیزہ مردوں اور عورتوں کا شیوہ ہے۔ اس میں اشارہ ہے، اس بات کی طرف کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر ناپاکی کا الزام عائد کرنے والے ناپاک اور ان سے اس کی براءت کرنے والے پاک ہیں۔“

(ہستان باز) کر رہے ہیں وہ ان سے بالکل بری ہیں، ان کے لیے بخشش ہے اور عزت والی روزی۔^(۱) (۲۶)

اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں نہ جاؤ جب تک کہ اجازت نہ لے لو اور وہاں کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو،^(۲) یہی تمہارے لیے سراسر بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔^(۳) (۲۷)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا
وَسَلِّمُوا عَلَيْهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۲۶﴾

(۱) اس سے مراد جنت کی روزی ہے جو اہل ایمان کو نصیب ہوگی۔

(۲) گزشتہ آیات میں زنا اور قذف اور ان کی حدوں کا بیان گزرا، اب اللہ تعالیٰ گھروں میں داخل ہونے کے آداب بیان فرما رہا ہے تاکہ مرد و عورت کے درمیان اختلاط نہ ہو جو عام طور پر زنا یا قذف کا سبب بنتا ہے۔ اَسْتِئْذِنَاتُ کے معنی ہیں، معلوم کرنا، یعنی جب تک تمہیں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اندر کون ہے اور اس نے تمہیں اندر داخل ہونے کی اجازت دے دی ہے، اس وقت تک داخل نہ ہو۔ بعض نے تَسْتَأْذِنُوا کے معنی تَسْتَأْذِنُوا کے کیے ہیں، جیسا کہ ترجمے سے واضح ہے۔ آیت میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرنے کا ذکر پہلے اور سلام کرنے کا ذکر بعد میں ہے۔ لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سلام کرتے اور پھر داخل ہونے کی اجازت طلب کرتے۔ اسی طرح آپ ﷺ کا یہ معمول بھی تھا کہ تین مرتبہ آپ ﷺ اجازت طلب فرماتے، اگر کوئی جواب نہیں آتا تو آپ ﷺ واپس لوٹ آتے۔ اور یہ بھی آپ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ اجازت طلبی کے وقت آپ ﷺ دروازے کے دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہوتے، تاکہ ایک دم سامنا نہ ہو جس میں بے پردگی کا امکان رہتا ہے (ملاحظہ ہو صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب التسليم والاستئذان ثلاثا۔ مسند أحمد ۳/۱۳۸، أبو داؤد، کتاب الأدب، باب کم مرة یسلم الرجل فی الاستئذان) اسی طرح آپ ﷺ نے دروازے پر کھڑے ہو کر اندر جھانکنے سے بھی نہایت سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے حتیٰ کہ اگر کسی شخص نے جھانکنے والے کی آنکھ پھوڑ دی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس پر کوئی گناہ نہیں۔ (البخاری، کتاب الديات، باب من اطلع فی بیت قوم ففقأوا عینہ فلابد لہ مسلم، کتاب الأدب، باب تحريم النظر فی بیت غیرہ) آپ ﷺ نے اس بات کو بھی ناپسند فرمایا کہ جب اندر سے صاحب بیت پوچھے، کون ہے؟ تو اس کے جواب میں ”میں“ میں“ میں“ کہا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نام لے کر اپنا تعارف کرائے۔ (صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب إذا قال من ذا؟ قال أنا۔ ومسلم، کتاب الأدب، باب کراهة قول المستأذن أنا إذا قبل من هذا؟ وأبو داؤد، کتاب الأدب)

(۳) یعنی عمل کرو، مطلب یہ ہے کہ اجازت طلبی اور سلام کرنے کے بعد گھر کے اندر داخل ہونا، دونوں کے لیے اچانک داخل ہونے سے بہتر ہے۔

اگر وہاں تمہیں کوئی بھی نہ مل سکے تو پھر اجازت ملے بغیر اندر نہ جاؤ۔ اور اگر تم سے لوٹ جانے کو کہا جائے تو تم لوٹ ہی جاؤ، یہی بات تمہارے لیے پابزیرہ ہے، جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ (۲۸)

ہاں غیر آباد گھروں میں جہاں تمہارا کوئی فائدہ یا اسباب ہو، جانے میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔^(۱) تم جو کچھ بھی ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے۔^(۲) (۲۹)

مسلمان مردوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں،^(۳) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت رکھیں۔^(۴) یہی انکے لیے پابیزگی ہے، لوگ جو کچھ کریں اللہ تعالیٰ سب سے خبردار ہے۔ (۳۰)

مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت میں فرق نہ آنے دیں^(۵) اور اپنی زینت

فَإِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُوا حَقِّي يُؤَدِّنْ لَكُمْ وَلَنْ يَكُونَ
لَكُمْ إِجْعَالٌ فَأَجْعَلُوا أَكْلِي لَكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ۝۳۰

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَكُمْ
وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ۝۳۱

قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَعْضُونَ مِنْ أَصَابِهِمْ وَيَعْضُونَ فُرُوجَهُمْ ذَلِكَ
أَكْلِي لَكُمْ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَصْنَعُونَ ۝۳۲

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَعْضْنَ مِنْ أَسَابِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ
وَأَلْبَسِينَ زِينَتَهُنَّ الْأَمَاظْهُرَ مِنْهَا وَالْبِضْرَةَ بَخْمُرِهِنَّ عَلَى

(۱) اس سے مراد کون سے گھر ہیں، جن میں بغیر اجازت لیے داخل ہونے کی اجازت دی جا رہی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ گھر ہیں، جو بطور خاص مہمانوں کے لیے الگ تیار یا مخصوص کر دیئے گئے ہوں۔ ان میں صاحب خانہ کی پہلی مرتبہ اجازت کافی ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد سرائے ہیں، جو مسافروں کے لیے ہی ہوتی ہیں یا تجارتی گھر ہیں، متاع کے معنی، منفعت کے ہیں یعنی جن میں تمہارا فائدہ ہو۔

(۲) اس میں ان لوگوں کے لیے وعید ہے جو دوسروں کے گھروں میں داخل ہوتے وقت مذکورہ آداب کا خیال نہیں رکھتے۔

(۳) جب کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے اجازت لینے کو ضروری قرار دیا تو اس کے ساتھ ہی غض (بصر) آنکھوں کو پست رکھنے یا بند رکھنے کا حکم دے دیا تاکہ اجازت طلب کرنے والا بھی بالخصوص اپنی نگاہوں پر کنٹرول رکھے۔

(۴) یعنی ناجائز استعمال سے اس کو بچائیں یا انہیں اس طرح چھپا کر رکھیں کہ ان پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ اس کے یہ دونوں مفہوم صحیح ہیں کیوں کہ دونوں ہی مطلوب ہیں۔ علاوہ ازیں نظروں کی حفاظت کا پہلے ذکر کیا کیونکہ اس میں بے احتیاطی ہی، حفظ فروج سے غفلت کا سبب بنتی ہے۔

(۵) عورتیں بھی اگرچہ بصر اور حفظ فروج کے پہلے حکم میں داخل تھیں، جو تمام مومنین کو دیا گیا ہے اور مومنین میں

کو ظاہر نہ کریں،^(۱) سوائے اسکے جو ظاہر ہے^(۲) اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رہیں،^(۳) اور اپنی آرائش کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں،^(۴) سوائے اپنے خاوندوں کے^(۵) یا اپنے والد کے یا اپنے خسر کے

جُوبُونَ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أُولَآئِهِنَّ
بُعُولَتُهُنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءَهُنَّ أَوْ إِخْوَانَهُنَّ أَوْ
إِخْوَانَهُنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ
أَوْ التَّيْبِينَ عَنِ أُولَى الْأَرْبَابَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الْوَالِدِ الْكَافِرِ

مومن عورتیں بھی بالعموم شامل ہی ہوتی ہیں لیکن ان مسائل کی اہمیت کے پیش نظر عورتوں کو بھی بطور خاص دوبارہ وہی حکم دیا جا رہا ہے جس سے مقصود تاکید ہے بعض علما نے اس سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ جس طرح مردوں کے لیے عورتوں کو دیکھنا ممنوع ہے اسی طرح عورتوں کے لیے مردوں کو دیکھنا مطلقاً ممنوع ہے۔ اور بعض نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حبشوں کا کھیل دیکھنے کا ذکر ہے (صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ، باب أصحاب الحراب فی المسجد، بغیر شہوت کے مردوں کی طرف دیکھنے کی عورتوں کو اجازت دی ہے۔

(۱) زینت سے مراد وہ لباس اور زیور ہے جو عورتیں اپنے حسن و جمال میں مزید نکھار پیدا کرنے کے لیے پہنتی ہیں، جسکی تاکید انہیں اپنے خاوندوں کے لیے کی گئی ہے۔ جب لباس اور زیور کا اظہار غیر مردوں کے سامنے عورت کے لیے ممنوع ہے تو جسم کو عریاں اور نمایاں کرنے کی اجازت اسلام میں کب ہو سکتی ہے؟ یہ تو بطریق اولیٰ حرام اور ممنوع ہو گا۔

(۲) اس سے مراد وہ زینت اور حصہ جسم ہے جس کا چھپانا اور پردہ کرنا ممکن نہ ہو۔ جیسے کسی کو کوئی چیز پکڑاتے یا اس سے لیتے ہوئے تھیلیوں کا، یا دیکھتے ہوئے آنکھوں کا ظاہر ہو جانا۔ اس ضمن میں ہاتھ میں جو انگوٹھی پہنی ہوئی یا مندی لگی ہو، آنکھوں میں سرمہ، کاجل ہو یا لباس اور زینت کو چھپانے کے لیے جو برقعہ یا چادر لی جاتی ہے، وہ بھی ایک زینت ہی ہے۔ تاہم یہ ساری زینتیں ایسی ہیں، جن کا اظہار بوقت ضرورت یا بوجہ ضرورت مباح ہے۔

(۳) تاکہ سر، گردن، سینے اور چھاتی کا پردہ ہو جائے، کیونکہ انہیں بھی بے پردہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔
(۴) یہ وہی زینت (سنگھار) یا آرائش ہے جسے ظاہر کرنے کی ممانعت اس سے پہلے کی گئی تھی۔ یعنی لباس اور زیور وغیرہ کی، جو چادر یا برقعہ کے نیچے ہوتی ہے۔ یہاں اس کا ذکر اب اشتنا کے ضمن میں آیا ہے۔ یعنی ان ان لوگوں کے سامنے اس زینت کا اظہار جائز ہے۔

(۵) ان میں سرفہرست خاوند ہے۔ اسی لیے خاوند کو سب پر مقدم بھی کیا گیا ہے۔ کیونکہ عورت کی ساری زینت خاوند ہی کے لیے ہوتی ہے، اور خاوند کے لیے تو عورت کا سارا بدن ہی حلال ہے۔ اس کے علاوہ جن محارم اور دیگر بعض افراد کا ہر وقت گھر میں آنا جانا رہتا ہے اور قربت اور رشتہ داری کی وجہ سے یا دیگر وجوہ سے طبی طور پر ان کی طرف جنسی میلان بھی نہیں ہو تا جس سے فتنے میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو۔ تو شریعت نے ایسے لوگوں کے سامنے، جن سے کوئی خطرہ نہ ہو اور تمام محارم کے سامنے زینت ظاہر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ اس مقام پر ماموں اور چچا کا ذکر نہیں کیا

یا اپنے لڑکوں کے یا اپنے خاوند کے لڑکوں کے یا اپنے بھائیوں کے یا اپنے بھتیجیوں کے یا اپنے بھانجوں کے^(۱) یا اپنے میل جول کی عورتوں کے^(۲) یا غلاموں کے^(۳) یا ایسے نوکر چاکر مردوں کے جو شہوت والے نہ ہوں^(۴) یا ایسے بچوں کے جو عورتوں کے پردے کی باتوں سے مطلع نہیں۔^(۵) اور اس طرح زور زور سے پاؤں مار کر نہ چلیں کہ ان کی پوشیدہ زینت معلوم

لَمْ يَظْهَرُوا عَلَى عَوْرَتِ الْيَسَاءِ وَلَا يَصْرِيحْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ
لِيَعْلَمَ مَا خْفَيْنَ مِنْ زِينَتِهِنَّ وَتُؤْتُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا آيَاتِهِ
الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۲۴﴾

گیا ہے۔ جمہور علما کے نزدیک یہ بھی ان محارم میں سے ہیں جن کے سامنے اظہار زینت کی اجازت دی گئی ہے اور بعض کے نزدیک یہ محارم میں سے نہیں ہیں (فتح القدر)

(۱) باپ میں دادا، پردادا، پرنانا اور اس سے اوپر سب شامل ہیں۔ اسی طرح خسر میں خسر کا باپ، دادا، پردادا، اوپر تک۔ بیٹوں میں پوتا، پرپوتا، نواسہ، پر نواسہ نیچے تک۔ خاوندوں کے بیٹوں میں پوتے، پرپوتے، نیچے تک، بھائیوں میں بیٹوں، بیٹوں کے بھائی (یعنی، خانی اور علاقائی) اور ان کے بیٹے، پوتے، پرپوتے، نواسے، نیچے تک۔ بھتیجیوں میں ان کے بیٹے، نیچے تک اور بھانجوں میں بیٹوں، بیٹوں کی بہنوں کی اولاد شامل ہے۔

(۲) ان سے مراد مسلمان عورتیں ہیں جن کو اس بات سے منع کر دیا گیا ہے کہ وہ کسی عورت کی زینت، اس کا حسن و جمال اور جسمانی خدو خال اپنے خاوند کے سامنے بیان کریں۔ ان کے علاوہ کسی بھی کافر عورت کے سامنے اظہار زینت منع ہے یہی رائے حضرت عمرو عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما و مجاہد اور امام احمد بن حنبل سے منقول ہے۔ بعض نے اس سے وہ مخصوص عورتیں مراد لی ہیں، جو خدمت وغیرہ کے لیے ہر وقت ساتھ رہتی ہیں، جن میں باندیاں (لونڈیاں) بھی شامل ہیں۔

(۳) بعض نے اس سے مراد صرف لونڈیاں اور بعض نے صرف غلام لیے ہیں اور بعض نے دونوں ہی۔ حدیث میں بھی صراحت ہے کہ غلام سے پردے کی ضرورت نہیں ہے۔ (ابوداؤد۔ کتاب اللباس باب فی العبد ینظر الی شعر مولاتہ) اسی طرح بعض نے اسے عام رکھا ہے جس میں مومن اور کافر دونوں غلام شامل ہیں۔

(۴) بعض نے ان سے صرف وہ افراد مراد لیے ہیں جن کا گھر میں رہنے سے، کھانے پینے کے سوا کوئی اور مقصد نہیں۔ بعض نے بے وقوف، بعض نے نامرد اور خصی اور بعض نے بالکل بوڑھے مراد لیے ہیں۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ جن کے اندر بھی قرآن کی بیان کردہ صفت پائی جائے گی، وہ سب اس میں شامل اور دوسرے خارج ہوں گے۔

(۵) ان سے ایسے بچے خارج ہوں گے جو بالغ ہوں یا بلوغت کے قریب ہوں کیونکہ وہ عورتوں کے پردوں کی باتوں سے واقف ہوتے ہیں۔

ہو جائے،^(۱) اے مسلمانو! تم سب کے سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو تاکہ تم نجات پاؤ۔^(۳۱)

تم میں سے جو مرد عورت بے نکاح کے ہوں ان کا نکاح کر دو^(۳۲) اور اپنے نیک بخت غلام اور لونڈیوں کا بھی۔^(۳۳) اگر وہ مفلس بھی ہوں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے غنی بنا دے گا۔^(۵) اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علم والا ہے۔^(۳۴)

وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالضَّالِّجِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ لَنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُعْطِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۱﴾

(۱) تاکہ پانزیوں کی جھنکار سے مرد اس کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ اسی میں اونچی اڑی کے وہ سینڈل بھی آجاتے ہیں جنہیں عورت پن کر چلتی ہے تو تک تک کی آواز، زیور کی جھنکار سے کم نہیں ہوتی۔ اسی طرح احادیث میں آتا ہے کہ عورت کے لیے خوشبو لگا کر گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں، جو عورت ایسا کرتی ہے، وہ بدکار ہے (ترمذی، أبواب الاستئذان، أبو داؤد، کتاب الترجل)

(۲) یہاں پردے کے احکام میں توبہ کا حکم دینے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ان احکام کی جو خلاف ورزی بھی تم کرتے رہے ہو، وہ چونکہ اسلام سے قبل کی باتیں ہیں، اس لیے اگر تم نے سچے دل سے توبہ کر لی اور ان احکام مذکورہ کے مطابق پردے کا صحیح اہتمام کر لیا تو فلاح و کامیابی اور دنیا و آخرت کی سعادت تمہارا مقدر ہے۔

(۳) آیامی، ایتیم کی جمع ہے۔ ایتیم ایسی عورت کو کہا جاتا ہے جس کا خاوند نہ ہو، جس میں کنواری، بیوہ اور مطلقہ تینوں آجاتی ہیں۔ اور ایسے مرد کو بھی ایتیم کہتے ہیں جس کی بیوی نہ ہو۔ آیت میں خطاب اولیا سے ہے کہ نکاح کر دو، یہ نہیں فرمایا کہ نکاح کر لو، کہ مخاطب نکاح کرنے والے مرد و عورت ہوتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت ولی کی اجازت اور رضامندی کے بغیر از خود اپنا نکاح نہیں کر سکتی۔ جس کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح امر کے صیغے سے بعض نے استدلال کیا ہے کہ نکاح کرنا واجب ہے، جب کہ بعض نے اسے مباح اور بعض نے مستحب قرار دیا ہے۔ تاہم استطاعت رکھنے والے کے لیے یہ سنت موکدہ بلکہ بعض حالات میں واجب ہے اور اس سے اعراض سخت و عید کا باعث ہے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے «مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي» (البخاری، نمبر ۵۰۱۳ و مسلم، نمبر ۱۰۲۰) ”جس نے میری سنت سے اعراض کیا، وہ مجھ سے نہیں۔“

(۴) یہاں صالحیت سے مراد ایمان ہے، اس میں اختلاف ہے کہ مالک اپنے غلام اور لونڈیوں کو نکاح کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں یا نہیں؟ بعض اکراہ کے قائل ہیں، بعض نہیں۔ تاہم اندیشہ ضرر کی صورت میں شرعاً مجبور کرنا جائز ہے۔ بصورت دیگر غیر مشروع (ایسر التقاسیر)

(۵) یعنی محض غربت اور تنگ دستی نکاح میں مانع نہیں ہونی چاہیے۔ ممکن ہے نکاح کے بعد اللہ ان کی تنگ دستی کو اپنے فضل سے وسعت و فراخی میں بدل دے۔ حدیث میں آتا ہے۔ تین شخص ہیں جن کی اللہ ضرور مدد فرماتا ہے۔ ۱۔ نکاح

اور ان لوگوں کو پاک دامن رہنا چاہیے جو اپنا نکاح کرنے کا مقدر نہیں رکھتے^(۱) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے مالدار بنا دے، تمہارے غلاموں میں سے جو کوئی کچھ تمہیں دے کر آزادی کی تحریر کرانی چاہے تو تم ایسی تحریر انہیں کر دیا کرو اگر تم کو ان میں کوئی بھلائی نظر آتی ہو^(۲) اور اللہ نے جو مال تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے انہیں بھی^(۳) دو، تمہاری جو لونڈیاں پاک دامن رہنا چاہتی ہیں انہیں دنیا کی زندگی کے

وَلَيْسَتُغْفِرَ الَّذِينَ لَا يَحْذَرُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْفِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ
فَصَلِّهِمْ وَالَّذِينَ يَبْتغُونَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكُلُوا مِنْهُم
إِنْ عَمِلْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا لَّوَأْتَوْهُم مِّنْ مَّالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ وَلَا
تُكْرَهُوا فَتُتْبِعُوا عَلَى الْبِعَارِ إِنْ أَرَدْتُمْ تَحْصِينَ السِّلَعِ أَعْرَضَ الصَّيْغَةُ
الذُّنْيَا وَمَنْ يَكْرِهْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ مِنْ بَعْدِ الْكُرْهِمْ غَفُورٌ
رَّحِيمٌ ﴿۳۰﴾

کرنے والا؛ جو پاک دامن کی نیت سے نکاح کرتا ہے۔ ۲- (مکاتب غلام؛ جو ادائیگی کی نیت رکھتا ہے ۳- اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا (ترمذی۔ أبواب فضائل الجهاد؛ باب ما جاء في المجاهد؛ والمكاتب والنكاح)

(۱) حدیث میں پاک دامن کے لیے، جب تک شادی کی استطاعت حاصل نہ ہو جائے، نفلی روزے رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ فرمایا 'اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جو شادی کی طاقت رکھتا ہے، اسے (اپنے وقت پر) شادی کر لینی چاہیے، اس لیے کہ اس سے آنکھوں اور شرم گاہ کی حفاظت ہو جاتی ہے اور جو شادی کی طاقت نہیں رکھتا، اسے چاہیے کہ وہ (کثرت سے نفلی) روزے رکھے، روزے اس کی جنسی خواہش کو قابو میں رکھیں گے' البخاری۔ کتاب الصوم؛ باب الصوم لمن خاف على نفسه العزوبة۔ مسلم أول کتاب النکاح)

(۲) مَكَاتِبُ، اس غلام کو کہا جاتا ہے جو اپنے مالک سے معاہدہ کر لیتا ہے کہ میں اتنی رقم جمع کر کے ادا کروں گا تو آزادی کا مستحق ہو جاؤں گا۔ 'بھلائی نظر آنے' کا مطلب ہے، اس کے صدق و امانت پر تمہیں یقین ہو یا کسی حرفت و صنعت سے وہ آگاہی رکھتا ہو۔ تاکہ وہ محنت کر کے کمائے اور رقم ادا کر دے۔ اسلام نے چونکہ زیادہ سے زیادہ غلامی کی حوصلہ شکنی کی پالیسی اپنائی تھی، اس لیے یہاں بھی مالکوں کو تاکید کی گئی کہ مکاتبت کے خواہش مند غلاموں سے معاہدہ کرنے میں تاہل نہ کرو بشرطیکہ تمہیں ان کے اندر ایسی بات معلوم ہو کہ جس سے تمہاری رقم کی ادائیگی بھی ممکن ہو۔ بعض علما کے نزدیک یہ امر وجوب کے لیے اور بعض کے نزدیک استحباب کے لیے ہے۔

(۳) اس کا مطلب ہے کہ غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اس نے جو معاہدہ کیا ہے اور اب وہ رقم کا ضرورت مند ہے تاکہ معاہدے کے مطابق وہ رقم ادا کر دے تو تم بھی اس کے ساتھ مالی تعاون کرو، اگر اللہ نے تمہیں صاحب حیثیت بنایا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے جو مصارف ثنائیہ (التوبۃ۔ ۶۰ میں) بیان فرمائے ہیں، ان میں ایک وَفِي الرِّقَابِ بھی ہے جس کے معنی ہیں 'گردنیں آزاد کرانے میں' یعنی غلاموں کی آزادی پر بھی زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے۔

فائدے کی غرض سے بدکاری پر مجبور نہ کرو^(۱) اور جو انہیں مجبور کر دے تو اللہ تعالیٰ ان پر جبر کے بعد بخش دینے والا اور مہربانی کرنے والا ہے۔^(۲) (۳۳)

ہم نے تمہاری طرف کھلی اور روشن آیتیں اتار دی ہیں اور ان لوگوں کی کہاوتیں جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت۔ (۳۴)

اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا،^(۳) اس کے نور کی مثال مثل ایک طاق کے ہے جس میں چراغ ہو اور چراغ شیشہ کی قدیل میں ہو اور شیشہ مثل چمکتے ہوئے روشن ستارے کے ہو وہ چراغ ایک بابرکت درخت زیتون کے تیل سے جلایا جاتا ہو جو درخت نہ مشرقی ہے نہ مغربی خود وہ تیل

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَاتٍ مُّبِينَاتٍ وَمَثَلًا لِّلَّذِينَ آمَنُوا خَلْقًا مِّن مَّوَدِّعَةٍ وَوَعُودَةٍ لَّيْسَ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٣٤﴾

اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مِثْلُ نُورِهِ كَمِثْلِهَا فِيهَا وَضِيَاءُ الْيُسْبَاءِ فِي زُجَّاجَةٍ الرُّجُلُجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِن شَجَرَةٍ تُدْرِكُهُ زَيْتُونَةٌ كَأَنَّهَا شَرْيَاطَةٌ وَلَا عَرَبِيَّةٌ يَبْكَادُزِيهَا يَبْقَىٰ وُلُوهُ تَمَسُّهُ تَالُومُ صِلَ تُوِي وَيَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَن يَشَاءُ وَيُضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ

(۱) زمانہ جاہلیت میں لوگ محض دنیوی مال کے لیے اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور کرتے تھے۔ چنانچہ خواہی خواہی انہیں یہ داغِ ذلت برداشت کرنا پڑتا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسا کرنے سے منع فرمادیا *إِنْ أَرَادْتُمْ غَالِبِ أحوال کے اعتبار سے ہے۔ ورنہ مقصد یہ نہیں ہے کہ اگر وہ بدکاری کو پسند کریں تو پھر تم ان سے یہ کام کروا لیا کرو۔ بلکہ حکم دینا یہ مقصود ہے کہ لونڈیوں سے، دنیا کے تھوڑے سے مال کے لیے، یہ کام مت کرواؤ، اس لیے کہ اس طرح کہ کمائی ہی حرام ہے۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔*

(۲) یعنی جن لونڈیوں سے جبراً یہ بے حیائی کا کام کروایا جائے گا تو گناہ گار مالک ہو گا یعنی جبر کرنے والا، نہ کہ لونڈی جو مجبور ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ ”میری امت سے، خطا، نسیان اور ایسے کام جو جبر سے کرائے گئے ہوں، معاف ہیں۔“ (ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب طلاق المکروہ والناسی)

(۳) یعنی اگر اللہ نہ ہو تا تو نہ آسمان میں نور ہو تا نہ زمین میں، نہ آسمان و زمین میں کسی کو ہدایت ہی نصیب ہوتی۔ پس وہ اللہ تعالیٰ ہی آسمان و زمین کو روشن کرنے والا ہے اس کی کتاب نور ہے، اس کا رسول (بہ حیثیت صفات کے) نور ہے۔ یعنی ان دونوں کے ذریعے سے زندگی کی تاریکیوں میں رہنمائی اور روشنی حاصل کی جاتی ہے، جس طرح چراغ اور بلب سے انسان روشنی حاصل کرتا ہے۔ حدیث سے بھی اللہ کا نور ہونا ثابت ہے۔ *وَلَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيهِنَّ* (البخاری، باب التهجید باللیل، ومسلم، کتاب صلوة المسافرین باب الدعاء فی صلاة اللیل، پس اللہ، اس کی ذات نور ہے، اس کا حجاب نور ہے اور ہر ظاہری اور معنوی نور کا خالق، اس کا عطا کرنے والا اور اس کی طرف ہدایت کرنے والا صرف ایک اللہ ہے) (ایسر التفاسیر)

وَاللَّهُ يَخْتِمْ سَعْيَكُمْ يَوْمَئِذٍ ﴿٥٠﴾

قریب ہے کہ آپ ہی روشنی دینے لگے اگرچہ اسے آگ نہ بھی چھوئے، نور پر نور ہے،^(۱) اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف رہنمائی کرتا ہے جسے چاہے،^(۲) لوگوں (کے سمجھانے) کو یہ مثالیں اللہ تعالیٰ بیان فرما رہا ہے،^(۳) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کے حال سے بخوبی واقف ہے۔ (۳۵)

ان گھروں میں جن کے بلند کرنے، اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے^(۴) وہاں صبح و شام

قِي يَوْمَئِذٍ أَكُفْرًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا وَلَمْ يُؤْمِرُوا بِإِلَهِهِمْ إِلَّا بِالْعَدُوِّ وَالْأَصْلَاحِ ﴿٥١﴾

(۱) یعنی جس طرح ایک طاق میں ایسا چراغ ہو، جو شیشے کی قدیل میں ہو، اس میں ایک بابرکت درخت کا ایسا خاص تیل ڈالا گیا ہو کہ وہ آگ (دیا سلائی) دکھائے بغیر ہی بذات خود روشن ہو جانے کے قریب ہو۔ یوں یہ ساری روشنیاں ایک طاق میں مجتمع ہو گئیں اور وہ بقعہ نور بن گیا۔ اسی طرح اللہ کے نازل کردہ دلائل و براہین کی حیثیت ہے کہ وہ واضح بھی ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر بھی یعنی نور علی نور جو مشرقی ہے، نہ مغربی کا مطلب ہے، وہ درخت ایسے کھلے میدان اور صحرا میں ہے کہ اس پر دھوپ صرف سورج کے چڑھنے کے وقت یا غروب کے وقت ہی نہیں پڑتی، بلکہ سارا دن وہ دھوپ میں رہتا ہے اور ایسے درخت کا پھل بہت عمدہ ہوتا ہے اور مراد اس سے زیتون کا درخت ہے جس کا پھل اور تیل سالن کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے اور چراغ میں تیل کے طور پر بھی۔

(۲) نُور سے مراد ایمان و اسلام ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جن کے اندر ایمان کی رغبت اور اس کی طلب دیکھتا ہے، ان کی اس نور کی طرف رہنمائی فرمادیتا ہے، جس سے دین و دنیا کی سعادتوں کے دروازے ان کے لیے کھل جاتے ہیں۔

(۳) جس طرح اللہ نے یہ مثال بیان فرمائی، جس میں اس نے ایمان کو اور اپنے مومن بندے کے دل میں اس کے راسخ ہونے اور بندوں کے احوال قلوب کا علم رکھنے کو واضح فرمایا کہ کون ہدایت کا اہل ہے اور کون نہیں۔

(۴) جب اللہ تعالیٰ نے قلب مومن کو اور اس میں جو ایمان و ہدایت اور علم ہے، اس کو ایسے چراغ سے تشبیہ دی جو شیشے کی قدیل میں ہو اور جو صاف شفاف تیل سے روشن ہو۔ تو اب اس کا محل بیان کیا جا رہا ہے کہ یہ قدیل ایسے گھروں میں ہیں، جن کی بابت حکم دیا گیا ہے کہ انہیں بلند کیا جائے اور ان میں اللہ کا ذکر کیا جائے۔ مراد مسجدیں ہیں، جو اللہ کو زمین کے حصوں میں سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ بلندی سے مراد محض سنگ و خشت کی بلندی نہیں ہے بلکہ اس میں مسجدوں کو گندگی، لغویات اور غیر مناسب اقوال و افعال سے پاک رکھنا بھی شامل ہے۔ ورنہ محض مسجدوں کی عمارتوں کو عالی شان اور فلک بوس بنا دینا، مطلوب نہیں ہے بلکہ احادیث میں مسجدوں کو زنگار اور زیادہ آراستہ و پیراستہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور ایک حدیث میں تو اسے قرب قیامت کی علامات میں سے بتلایا گیا ہے۔ (ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ،

اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔^(۱) (۳۶)

ایسے لوگ^(۲) جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز کے قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی۔^(۳) (۳۷)

اس ارادے سے کہ اللہ انہیں ان کے اعمال کا بہترین بدلہ دے بلکہ اپنے فضل سے اور کچھ زیادتی عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہے بے شمار روزیاں دیتا ہے۔^(۴) (۳۸)

اور کافروں کے اعمال مثل اس چمکتی ہوئی ریت کے ہیں

يَجَالُ لَا تُلْمِهِمْ بِيَعَارَةِ وَلَا يَبِيعُ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَقَالَ الصَّلَاةُ
وَأَيْتَاءُ الْكُوفَةِ يَنْجَاؤُنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُتُوبُ
وَالْأَبْصَارُ ﴿۳۷﴾

يَجْزِيهِمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَيَزِيدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهِ وَاللَّهُ بِرِزْقِهِ
مَن يَشَاءُ أَعْرَبُ حَسَابٍ ﴿۳۸﴾

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَعَمَلُهُمْ كَسَرَابٍ يَتْبَعُهُ يَتَّخِذُ الظَّمْآنُ

باب فی بناء المساجد، علاوہ ازیں، جس طرح مسجدوں میں تجارت و کاروبار اور شور و شغب ممنوع ہیں کیونکہ یہ مسجد کے اصل مقصد، عبادت کے منافی ہیں۔ اسی طرح اللہ کا ذکر کرنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ صرف ایک اللہ کا ذکر کیا جائے، اسی کی عبادت کی جائے اور صرف اسی کو مدد کے لیے پکارا جائے ﴿وَإِنِ التَّسْجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا﴾ (سورۃ جن: ۱۸) ”مسجدیں اللہ کے لیے ہیں، پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔“

(۱) تسبیح سے مراد نماز ہے۔ اَصْلًا، اَصِيلٌ کی جمع ہے بمعنی شام۔ یعنی اہل ایمان، جن کے دل ایمان و ہدایت کے نور سے روشن ہوتے ہیں، صبح و شام مسجدوں میں اللہ کی رضا کے لیے نماز پڑھتے اور اس کی عبادت کرتے ہیں۔

(۲) اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ اگرچہ عورتوں کا مسجدوں میں جا کر نماز پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ وہ نہایت سادہ لباس میں، بغیر خوشبو لگائے اور باپردہ جائیں، جس طرح کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں عورتیں مسجد نبوی میں نماز کے لیے حاضر ہوتی تھیں۔ تاہم ان کے لیے گھر میں نماز پڑھنا زیادہ بہتر اور افضل ہے۔ حدیث میں بھی اس چیز کو بیان کیا گیا ہے۔ (ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب التشدید فی ذلك، مسند أحمد، ۶/۳۰۱، ۲۹۷)

(۳) یعنی شدت فزع اور ہولناکی کی وجہ سے۔ جس طرح دوسرے مقام پر ہے۔ ﴿وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْأَلَاقَةِ إِذْ يَفْتَتَبُونَ لَدَى الْحُنُوجِ كَالْظُلُمِئِ﴾ (سورۃ المؤمن: ۱۸) ”ان کو قیامت والے دن سے ڈراؤ، جس دن دل، گلوں کے پاس آجائیں گے، غم سے بھرے ہوئے۔“ ابتداً دلوں کی یہ کیفیت سب کی ہی ہوگی، مومن کی بھی اور کافر کی بھی۔

(۴) قیامت والے دن اہل ایمان کو ان کی نیکیوں کا بدلہ اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً (کئی کئی گنا) کی صورت میں دیا جائے گا اور بہت سوں کو بے حساب ہی جنت میں داخل کر دیا جائے گا اور وہاں رزق کی فراوانی اور اس میں جو تنوع و تلذذ ہو گا، اس کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔

جو چٹیل میدان میں ہو جسے پیاسا شخص دور سے پانی سمجھتا ہے لیکن جب اس کے پاس پہنچتا ہے تو اسے کچھ بھی نہیں پاتا، ہاں اللہ کو اپنے پاس پاتا ہے جو اس کا حساب پورا پورا چکا دیتا ہے۔^(۱) اللہ بہت جلد حساب کر دینے والا ہے۔ (۳۹)

یا مثل ان اندھیروں کے ہے جو نہایت گہرے سمندر کی تہ میں ہوں جسے اوپر تلے کی موجوں نے ڈھانپ رکھا ہو، پھر اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں۔ الغرض اندھیریاں ہیں جو اوپر تلے پے در پے ہیں۔ جب اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی قریب ہے کہ نہ دیکھ سکے،^(۲) اور (بات یہ ہے کہ) جسے اللہ تعالیٰ ہی نور نہ دے اس کے پاس کوئی روشنی نہیں ہوتی۔^(۳) (۴۰)

مَا حَقِّي إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْ كَشَيْبًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ
قَوْلَهُ حِسَابَهُ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾

أَوْ كَلَّمَلِي فِي بَحْرِ لَيْلِي يَنْقُضُهُ مَوْجٌ مِّنْ قَوْلِهِ مَوْجٌ مِّنْ قَوْلِهِ
سَرَابٌ ظَلَمْتُ بَعْضَهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجْتَهُ لَمْ يَكُنْ
يُرِيهَا وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ ﴿۴۰﴾

(۱) أَعْمَالٌ سے مراد وہ اعمال ہیں جنہیں کافر و مشرک نیکیاں سمجھ کر کرتے ہیں، جیسے صدقہ و خیرات، صلہ رحمی، بیت اللہ کی تعمیر اور حاجیوں کی خدمت وغیرہ۔ سَرَابٌ، اس چمکتی ہوئی ریت کو کہتے ہیں، جو دور سے سورج کی شعاعوں کی وجہ سے پانی نظر آتی ہے۔ سَرَابٌ کے معنی ہی چلنے کے ہیں۔ وہ ریت، چلتے ہوئے پانی کی طرح نظر آتی ہے قَبِيْعَةٌ، قَاعِ کی جمع ہے، زمین کا نشیبی حصہ، جس میں پانی ٹھہر جاتا ہے یا چٹیل میدان۔ یہ کافروں کے عملوں کی مثال ہے کہ جس طرح سراب دور سے پانی نظر آتا ہے حالانکہ وہ ریت ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح کافر کے عمل عدم ایمان کی وجہ سے اللہ کے ہاں بالکل بے وزن ہوں گے، ان کا کوئی صلہ انہیں نہیں ملے گا۔ ہاں جب وہ اللہ کے پاس جائے گا تو وہ اس کے عملوں کا پورا پورا حساب چکالے گا۔

(۲) یہ دوسری مثال ہے کہ انکے اعمال اندھیروں کی طرح ہیں، یعنی انہیں سراب سے تشبیہ دے لویا اندھیروں سے۔ یا گزشتہ مثال کافر کے اعمال کی تھی اور یہ اس کے کفر کی مثال ہے جس میں کافر ساری زندگی گھرا رہتا ہے، کفر و ضلالت کی اندھیری، اعمالِ بیٹہ و عقائدِ مشرکانہ کی اندھیری اور رب سے اور اسکے عذابِ اخروی سے عدم واقفیت کی اندھیری۔ یہ اندھیریاں اسے راہ ہدایت کی طرف نہیں آنے دیتیں۔ جس طرح اندھیرے میں انسان کو اپنا ہاتھ بھی بھانجی نہیں دیتا۔

(۳) یعنی دنیا میں ایمان و اسلام کی روشنی نصیب نہیں ہوتی اور آخرت میں بھی اہل ایمان کو ملنے والے نور سے وہ محروم رہیں گے۔

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آسمانوں اور زمین کی کل مخلوق اور پر پھیلائے^(۱) اڑنے والے کل پرند اللہ کی تسبیح میں مشغول ہیں۔ ہر ایک کی نماز اور تسبیح اسے معلوم ہے،^(۲) لوگ جو کچھ کریں اس سے اللہ بخوبی واقف ہے۔^(۳) (۳۱)

زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کی ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔^(۴) (۳۲)

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ بادلوں کو چلاتا ہے، پھرا نہیں ملاتا ہے پھرا نہیں تہ بہ تہ کر دیتا ہے، پھر آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے درمیان میں سے مینہ برستا ہے۔ وہی آسمان کی جانب سے اولوں کے پہاڑ میں سے اولے برساتا ہے،^(۵) پھر جنہیں چاہے ان کے پاس انہیں

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْئُرُهُ مَن فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالظَّالِمُ
صَلَفًا كُلُّ قَدْرٍ عِلْمَ صَلَاتِهِ وَسَيِّئِهِ وَاللَّهُ عَلَيْهِمْ بِأَفْعَالِهِمْ ۝

وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِلَّهِ الْغَيْبُ ۝

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُرْسِلُ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكًا فَتَوَدَّى
الْوَدَىٰ غَيْرُ مَن يَخْلُوهُ وَيُنزِلُ مِنَ السَّمَاءِ مَن جِبَالٍ فِيهَا مِن
بَرَدٍ فَيُصِيبُ بِهِ مَن يَشَاءُ وَصَوْفُهَا عَن سُحُبٍ مُّشَاءٍ يَنزِلُ
سَنَايِرًا يَذُوبُ بِالْأَبْصَارِ ۝

(۱) صَافَاتُ کے معنی ہیں بِاسْطَاتِ اور اس کا مفعول أَجْنَحَتْهَا محذوف ہے۔ اپنے پر پھیلائے ہوئے۔ ﴿ مَن فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ﴾ میں پرندے بھی شامل تھے۔ لیکن یہاں ان کا ذکر الگ سے کیا، اس لیے کہ پرندے تمام حیوانات میں ایک نہایت ممتاز مخلوق ہیں، جو اللہ کی قدرت کاملہ سے آسمان و زمین کے درمیان فضا میں اڑتے ہوئے اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔ یہ مخلوق اڑنے پر بھی قدرت رکھتی ہے جس سے دیگر تمام حیوانات محروم ہیں اور زمین پر چلنے پھرنے کی قدرت بھی رکھتی ہے۔

(۲) یعنی اللہ نے ہر مخلوق کو یہ علم الہام والقا کیا ہے کہ وہ اللہ کی تسبیح کس طرح کرے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بخت و اتفاق کی بات نہیں بلکہ آسمان و زمین کی ہر چیز کا تسبیح کرنا اور نماز ادا کرنا یہ بھی اللہ ہی کی قدرت کا ایک مظہر ہے، جس طرح ان کی تخلیق اللہ کی ایک صنعت بدیع ہے، جس پر اللہ کے سوا کوئی قادر نہیں۔

(۳) یعنی اہل زمین و اہل آسمان جس طرح اللہ کی اطاعت اور اس کی تسبیح کرتے ہیں، سب اس کے علم میں ہے، یہ گویا انسانوں اور جنوں کو تنبیہ ہے کہ تمہیں اللہ نے شعور اور ارادے کی آزادی دی ہے تو تمہیں تو دوسری مخلوقات سے زیادہ اللہ کی تسبیح و تحمید اور اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ دیگر مخلوقات تو تسبیح الہی میں مصروف ہیں۔ لیکن شعور اور ارادہ سے بہرہ ور مخلوق اس میں کوتاہی کا ارتکاب کرتی ہے۔ جس پر یقیناً وہ اللہ کی گرفت کی مستحق ہوگی۔

(۴) پس وہی اصل حاکم ہے، جس کے حکم کا کوئی تعاقب کرنے والا نہیں اور وہی معبود برحق ہے، جس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں۔ اسی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے، جہاں وہ ہر ایک کے بارے میں عدل و انصاف کے مطابق فیصلہ فرمائے گا۔

(۵) اس کا ایک مطلب تو یہی ہے جو ترجمے میں اختیار کیا گیا ہے کہ آسمان میں اولوں کے پہاڑ ہیں جن سے وہ اولے

برسائے اور جن سے چاہے ان سے انہیں ہٹا دے۔^(۱)
 بادل ہی سے نکلنے والی بجلی کی چمک ایسی ہوتی ہے کہ گویا
 اب آنکھوں کی روشنی لے چلی۔^(۲) (۳۳)
 اللہ تعالیٰ ہی دن اور رات کو ردوبدل کرتا رہتا ہے^(۳)
 آنکھوں والوں کے لیے تو اس میں یقینا بڑی بڑی عبرتیں
 ہیں۔ (۳۴)

تمام کے تمام چلتے پھرنے والے جانداروں کو اللہ تعالیٰ ہی
 نے پانی سے پیدا کیا ہے ان میں سے بعض تو اپنے پیٹ
 کے بل چلتے ہیں،^(۴) بعض دو پاؤں پر چلتے ہیں۔^(۵)
 بعض چار پاؤں پر چلتے ہیں،^(۶) اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا
 کرتا ہے۔^(۷) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۳۵)

يُقَلِّبُ اللَّهُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ﴿۳۳﴾

وَاللَّهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِّن مَّا يَخْتُمُّهُنَّ مِّن مَّن يَنْشِئُ عَلٰى ظُهُوبِهِمْ وَمِمَّا مَن
 مِّن يَنْشِئُ عَلٰى رِجْلَيْهِمْ وَمِمَّا مَن يَنْشِئُ عَلٰى اَرْبَعٍ يَخْلُقُ اللَّهُ مَا
 يَشَاءُ اِنَّ اللَّهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۳۴﴾

برساتا ہے۔ (ابن کثیر) دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ سماء بلندی کے معنی میں ہے اور جہاں کے معنی ہیں بڑے بڑے
 ٹکڑے، پہاڑوں جیسے، یعنی اللہ تعالیٰ آسمانوں سے بارش ہی نہیں برساتا بلکہ بلندیوں سے جب چاہتا ہے برف کے بڑے
 بڑے ٹکڑے بھی نازل فرماتا ہے، (فتح القدیر) یا پہاڑ جیسے بڑے بڑے بادلوں سے اولے برساتا ہے۔

(۱) یعنی وہ اولے اور بارش بطور رحمت جنہیں چاہتا ہے، پہنچاتا ہے اور جنہیں چاہتا ہے ان سے محروم رکھتا ہے۔ یا یہ
 مطلب ہے کہ ڈالہ باری (اولے) کے عذاب سے جسے چاہتا ہے دوچار کر دیتا ہے، جس سے ان کی فضلیں تباہ اور کھیتیاں
 برباد ہو جاتی ہیں اور جن پر اپنی رحمت کرنا چاہتا ہے ان کو اس سے بچا لیتا ہے۔

(۲) یعنی بادلوں میں چمکنے والی بجلی، جو عام طور پر بارش کی نوید جاں فرما ہوتی ہے اس میں اتنی شدت کی چمک ہوتی ہے کہ
 وہ آنکھوں کی بصارت لے جانے کے قریب ہو جاتی ہے۔ یہ بھی اس کی ضامی کا ایک نمونہ ہے۔

(۳) یعنی کبھی دن بڑے، راتیں چھوٹی اور کبھی اس کے برعکس۔ یا کبھی دن کی روشنی، کو بادلوں کی تاریکیوں سے اور
 رات کے اندھیروں کو چاند کی روشنی سے بدل دیتا ہے۔

(۴) جس طرح سانپ، مچھلی اور دیگر حشرات الارض کیڑے مکوڑے ہیں۔

(۵) جیسے انسان اور پرند ہیں۔

(۶) جیسے تمام چوپائے اور دیگر حیوانات ہیں۔

(۷) یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ بعض حیوانات ایسے بھی ہیں جو چار سے بھی زیادہ پاؤں رکھتے ہیں، جیسے کیڑا،

بلاشک و شبہ ہم نے روشن اور واضح آیتیں اتار دی ہیں
اللہ تعالیٰ جسے چاہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔^(۱) (۳۶)

اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور رسول پر ایمان لائے اور
فرماں بردار ہوئے، پھر ان میں سے ایک فرقہ اس کے بعد
بھی پھر جاتا ہے۔ یہ ایمان والے ہیں (ہی) نہیں۔^(۲) (۳۷)

جب یہ اس بات کی طرف بلائے جاتے ہیں کہ اللہ اور
اس کا رسول ان کے جھگڑے چکا دے تو بھی ان کی ایک
جماعت منہ موڑنے والی بن جاتی ہے۔ (۳۸)

ہاں اگر انہی کو حق پہنچتا ہو تو مطیع و فرماں بردار ہو کر اس
کی طرف چلے آتے ہیں۔^(۳) (۳۹)

کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے؟ یا یہ شک و شبہ میں
پڑے ہوئے ہیں؟ یا انہیں اس بات کا ڈر ہے کہ اللہ
تعالیٰ اور اس کا رسول ان کی حق تلفی نہ کریں؟ بات یہ
ہے کہ یہ لوگ خود ہی بڑے ظالم ہیں۔^(۴) (۵۰)

لَقَدْ أَنْزَلْنَا آيَاتٍ مُّبِينَاتٍ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى
صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۳۶﴾

وَيَعْبُدُونَ أُمَّتًا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَاهُمْ يَتَوَلَّى فِرْعَوْنُ
مِنْهُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۷﴾

وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ
مِّنْهُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۳۸﴾

وَلَنْ يَكُنَّ لَهُمُ الْغَالِبِينَ إِلَّا يَأْتُوهُمُ الْمُدْعَيْنُ ﴿۳۹﴾

أَفِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ أَمْ ادْتَابُوا أَلْمَ يَعْلَمُونَ أَنَّ كَيْفِيَّةَ اللَّهِ
عَلَيْهِمْ رَسُولُهُ لَنْ يُلَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۵۰﴾

مکڑی اور بہت سے زینبی کیڑے۔

(۱) آیات مُّبِينَاتٌ سے مراد قرآن کریم ہے جس میں ہر اس چیز کا بیان ہے جس کا تعلق انسان کے دین و اخلاق سے ہے
جس پر اس کی فلاح و سعادت کا انحصار ہے۔ ﴿ مَا كُفِّرْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ (الأُنْعَام۔ ۳۸)، ہم نے کتاب میں کسی چیز
کے بیان میں کو تاہی نہیں کی۔ جسے ہدایت نصیب ہونی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اسے نظر صحیح اور قلب صادق عطا فرما دیتا ہے
جس سے اس کے لیے ہدایت کا راستہ کھل جاتا ہے۔ صراط مستقیم سے مراد یہی ہدایت کا راستہ ہے جس میں کوئی کبھی
نہیں، اسے اختیار کر کے انسان اپنی منزل مقصود جنت تک پہنچ جاتا ہے۔

(۲) یہ منافقین کا بیان ہے جو زبان سے اسلام کا اظہار کرتے تھے لیکن دلوں میں کفر و عناد تھا یعنی اعتقاد صحیح سے محروم
تھے۔ اس لیے زبان سے اظہار ایمان کے باوجود ان کے ایمان کی نفی کی گئی۔

(۳) کیوں کہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ عدالت نبوی ﷺ سے جو فیصلہ صادر ہوگا اس میں کسی کی رورعایت نہیں ہوگی، اس
لیے وہاں اپنا مقدمہ لے جانے سے ہی گریز کرتے ہیں۔ ہاں اگر وہ جانتے ہیں کہ مقدمے میں وہ حق پر ہیں اور ان ہی کے حق میں
فیصلہ ہونے کا غالب امکان ہے، تو پھر خوشی خوشی وہاں آتے ہیں اِذْعَانٌ کے معنی ہوتے ہیں، اقرار اور انقیاد و اطاعت کے۔

(۴) جب فیصلہ ان کے خلاف ہونے کا امکان ہوتا ہے تو اس سے اعراض و گریز کی وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ یا تو ان

ایمان والوں کا قول تو یہ ہے کہ جب انہیں اس لیے بلایا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان میں فیصلہ کر دے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔^(۱) یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ (۵۱)

جو بھی اللہ تعالیٰ کی، اس کے رسول کی فرماں برداری کریں، خوف الہی رکھیں اور اس کے عذابوں سے ڈرتے رہیں، وہی نجات پانے والے ہیں۔^(۲) (۵۲)

بڑی چٹنگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں^(۳) کہ آپ کا حکم ہوتے ہی نکل کھڑے ہوں گے۔ کہہ دیجئے کہ بس قسمیں نہ کھاؤ (تمہاری اطاعت کی حقیقت) معلوم ہے۔^(۴) جو کچھ تم کر رہے

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۵۱﴾

وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿۵۲﴾

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ أَمَرْتَهُمْ لَيَعْبُرْنَ قُلُوبَهُمْ قُلْ لَا تُفْسِمُوا عِلْمَ اللَّهِ مَعْرُوفَةٌ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۵۳﴾

کے دلوں میں کفر و نفاق کا روگ ہے یا انہیں نبوت محمدی میں شک ہے یا انہیں اس بات کا اندیشہ ہے کہ ان پر اللہ اور اس کا رسول ﷺ ظلم کرے گا، حالانکہ ان کی طرف سے ظلم کا کوئی امکان ہی نہیں، بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ خود ہی ظالم ہیں۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ جب قضا و فیصلے کے لیے ایسے حاکم و قاضی کی طرف بلایا جائے جو عادل اور قرآن و سنت کا عالم ہو، تو اس کے پاس جانا ضروری ہے۔ البتہ اگر وہ قاضی کتاب و سنت کے علم اور ان کے دلائل سے بے بہرہ ہو تو اس کے پاس فیصلے کے لیے جانا ضروری نہیں۔

(۱) یہ اہل کفر و نفاق کے مقابلے میں اہل ایمان کے کردار و عمل کا بیان ہے۔

(۲) یعنی فلاح و کامیابی کے مستحق صرف وہ لوگ ہوں گے جو اپنے تمام معاملات میں اللہ اور رسول کے فیصلے کو خوش دلی سے قبول کرتے اور انہی کی اطاعت کرتے ہیں اور خشیت الہی اور تقویٰ سے متصف ہیں، نہ کہ دوسرے لوگ، جو ان صفات سے محروم ہیں۔

(۳) جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ میں جَهْدُ فعل محذوف کا مصدر ہے جو بطور تاکید کے ہے، يَجْهَدُونَ أَيْمَانَهُمْ جَهْدًا یا یہ حال کی وجہ سے منصوب ہے یعنی مُجْتَهِدِينَ فِي أَيْمَانِهِمْ مطلب یہ ہے کہ اپنی وسعت بھر قسمیں کھا کر کہتے ہیں (فتح القدیر)

(۴) اور وہ یہ ہے کہ جس طرح تم قسمیں جھوٹی کھاتے ہو، تمہاری اطاعت بھی نفاق پر مبنی ہے۔ بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ تمہارا معاملہ طاعت معروفہ ہونا چاہیے۔ یعنی معروف میں بغیر کسی قسم کے حلف کے اطاعت، جس طرح مسلمان کرتے ہیں، پس تم بھی ان کی مثل ہو جاؤ۔ (ابن کثیر)

ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔^(۱) (۵۳)

کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم مانو، رسول اللہ کی اطاعت کرو، پھر بھی اگر تم نے روگردانی کی تو رسول کے ذمے تو صرف وہی ہے جو اس پر لازم کر دیا گیا ہے^(۲) اور تم پر اس کی جو ادائیگی ہے جو تم پر رکھا گیا ہے^(۳) ہدایت تو تمہیں اسی وقت ملے گی جب رسول کی ماتحتی کرو۔^(۴) سنو رسول کے ذمے تو صرف صاف طور پر پہنچا دینا ہے۔^(۵) (۵۴)

تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کیے ہیں اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا ہے کہ انہیں ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسے کہ ان لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے اور یقیناً ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوطی کے ساتھ محکم کر کے جمادے گا جسے ان کے لیے وہ پسند فرما چکا ہے اور ان کے اس خوف و خطر کو وہ امن و امان سے بدل دے گا،^(۶) وہ میری عبادت کریں

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ وَإِن تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴿۵۴﴾

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۵۵﴾

(۱) یعنی وہ تمہارے سب کے حالات سے باخبر ہے۔ کون فرماں بردار ہے اور کون نافرمان؟ پس حلف اٹھا کر اطاعت کے اظہار کرنے سے، جب کہ تمہارے دل میں اس کے خلاف عزم ہو، تم اللہ کو دھوکہ نہیں دے سکتے، اس لیے کہ وہ پوشیدہ ہے، پوشیدہ تر بات کو بھی جانتا ہے اور وہ تمہارے سینوں میں پلٹنے والے رازوں سے بھی آگاہ ہے اگرچہ تم زبان سے اس کے خلاف اظہار کرو!

(۲) یعنی تبلیغ و دعوت، جو وہ ادا کر رہا ہے۔

(۳) یعنی اس کی دعوت کو قبول کر کے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا اور ان کی اطاعت کرنا۔

(۴) اس لیے کہ وہ صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دیتا ہے۔

(۵) کوئی اس کی دعوت کو مانے یا نہ مانے جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا، ﴿فَأَنصُرْكَ بِكُلِّ بَلَدَةٍ وَنَكْمُك بِنَصَابٍ﴾ (الرعد۔۳۰) ”اے پیغمبر! تیرا کام صرف (ہمارے احکام) پہنچا دینا ہے (کوئی مانتا ہے یا نہیں) یہ حساب ہماری ذمہ داری ہے۔“

(۶) بعض نے اس وعدہ الہی کو صحابہ کرام کے ساتھ یا خلفائے راشدین کے ساتھ خاص قرار دیا ہے لیکن اس کی تخصیص کی کوئی دلیل نہیں۔ قرآن کے الفاظ عام ہیں اور ایمان و عمل صالح کے ساتھ مشروط ہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے

گے میرے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرائیں گے۔^(۱)
اس کے بعد بھی جو لوگ ناشکری اور کفر کریں وہ
یقیناً فاسق ہیں۔^(۲) (۵۵)

نماز کی پابندی کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ تعالیٰ کے
رسول کی فرمانبرداری میں لگے رہو تاکہ تم پر رحم کیا
جائے۔^(۳) (۵۶)

وَاقْبِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاطِيعُوا الرِّسَالَ لَعَلَّكُمْ
تُحْمَمُونَ ﴿۵۵﴾

کہ عہد خلافت راشدہ اور عہد خیر القرون میں، اس وعدہ الہی کا ظور ہوا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو زمین میں غلبہ عطا فرمایا، اپنے پسندیدہ دین اسلام کو عروج دیا اور مسلمانوں کے خوف کو، امن سے بدل دیا۔ پہلے مسلمان کفار عرب سے ڈرتے تھے، پھر اس کے برعکس معاملہ ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جو پیش گوئیاں فرمائی تھیں، وہ بھی اس عہد میں پوری ہوئیں۔ مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ حیرہ سے ایک عورت تن تنہا ایلی چلے گی اور بیت اللہ کا آکر طواف کرے گی، اسے کوئی خوف اور خطرہ نہیں ہو گا۔ کسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں میں ڈھیر ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الإسلام، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا «إِنَّ اللَّهَ زَوَى لِي الْأَرْضَ، فَزَأَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا، وَإِنَّ أُمَّتِي سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا زُوِيَ لِي مِنْهَا» صحیح مسلم کتاب الفتن وأشراف الساعة۔ باب هلاك هذه الأمة بعضهم بعض» اللہ تعالیٰ نے زمین کو میرے لیے سکیڑ دیا، پس میں نے اس کے مشرقی اور مغربی حصے دیکھے، عنقریب میری امت کا دائرہ اقتدار وہاں تک پہنچے گا، جہاں تک میرے لیے زمین سکیڑ دی گئی۔“ حکمرانی کی یہ وسعت بھی مسلمانوں کے حصے میں آئی، اور فارس و شام اور مصر و افریقہ اور دیگر دور دراز کے ممالک فتح ہوئے اور کفر و شرک کی جگہ توحید و سنت کی مشعلیں ہر جگہ روشن ہو گئیں۔ اور اسلامی تہذیب و تمدن کا پھر پورا چار دانگ عالم میں لہرا گیا۔ لیکن یہ وعدہ چونکہ مشروط تھا، جب مسلمان ایمان میں کمزور اور عمل صالح میں کوتاہی کے مرتکب ہوئے تو اللہ نے ان کی عزت کو ذلت میں، ان کے اقتدار اور غلبے کو غلامی میں اور ان کے امن و استحکام کو خوف اور دہشت میں بدل دیا۔

(۱) یہ بھی ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ایک اور بنیادی شرط ہے جس کی وجہ سے مسلمان اللہ کی مدد کے مستحق، اور اس وصف توحید سے عاری ہونے کے بعد وہ اللہ کی مدد سے محروم ہو جائیں گے۔

(۲) اس کفر سے مراد، وہی ایمان، عمل صالح اور توحید سے محروم ہے، جس کے بعد ایک انسان اللہ کی اطاعت سے نکل جاتا اور کفر و فسق کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔

(۳) یہ گویا مسلمانوں کو تاکید کی گئی کہ اللہ کی رحمت اور مدد حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے جس پر چل کر صحابہ کرام کو یہ رحمت اور مدد حاصل ہوئی۔

یہ خیال آپ کبھی بھی نہ کرنا کہ منکر لوگ زمین میں (ادھر ادھر بھاگ کر) ہمیں ہرا دینے والے ہیں،^(۱) ان کا اصلی ٹھکانا تو جنم ہے جو یقیناً بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ (۵۷)

ایمان والو! تم سے تمہاری ملکیت کے غلاموں کو اور انہیں بھی جو تم میں سے بلوغت کو نہ پہنچے ہوں (اپنے آنے کی) تین وقتوں میں اجازت حاصل کرنی ضروری ہے۔ نماز فجر سے پہلے اور ظہر کے وقت جب کہ تم اپنے کپڑے اتار رکھتے ہو اور عشا کی نماز کے بعد،^(۲) یہ تینوں وقت تمہاری (خلوت) اور پردہ کے ہیں۔^(۳) ان وقتوں کے ماسوا نہ تو تم پر کوئی گناہ ہے نہ ان پر۔^(۴) تم سب آپس میں ایک دوسرے کے پاس بکثرت آنے جانے والے ہو^(۵) (ہی)؛ اللہ اس طرح کھول کھول کر

لَا تَحْصِبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ
لِئْتَارِ وَلَيْسَ الْمَوْصِيؤُ ⑤

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنُوا الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ
وَالَّذِينَ لَهُمْ يَتَلَعُوا الْحَلْمَ مِنْكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِنْ قَبْلِ
صَلَاةِ الْعَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّهِيرَةِ
وَمِنْ بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ ثَلَاثَ عَوْرَاتٍ لَكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ
وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَ ذَلِكَ مِنْكُمْ وَلَا يُؤْنَسُ عَلَيْكُمْ وَعَضُّكُمْ عَلَى
بَعْضِكُمْ كَذَلِكَ بَيْنَ يَدَيْهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ⑥

(۱) یعنی آپ کے مخالفین اور کذبین اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ ان کی گرفت کرنے پر ہر طرح قادر ہے۔

(۲) غلاموں سے مراد باندیاں اور غلام دونوں ہیں ثلاث مَرَّاتٍ کا مطلب اوقات، تین وقت ہیں۔ یہ تینوں اوقات ایسے ہیں کہ انسان گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ بہ کار خاص مصروف، یا ایسے لباس میں ہو سکتا ہے کہ جس میں کسی کا ان کو دیکھنا جائز اور مناسب نہیں۔ اس لیے ان اوقات ثلاثہ میں گھر کے ان خدمت گزاروں کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ بغیر اجازت طلب کیے گھر کے اندر داخل ہوں۔

(۳) عَوْرَاتٍ عَوْرَةُ کی جمع ہے؛ جس کے اصل معنی خلل اور نقص کے ہیں۔ پھر اس کا اطلاق ایسی چیز پر کیا جانے لگا جس کا ظاہر کرنا اور اس کو دیکھنا پسندیدہ نہ ہو۔ خاتون کو بھی اسی لیے عورت کہا جاتا ہے کہ اس کا ظاہر اور عریاں ہونا اور دیکھنا شرعاً ناپسندیدہ ہے۔ یہاں مذکورہ تین اوقات کو عورات کہا گیا ہے یعنی یہ تمہارے پردے اور خلوت کے اوقات ہیں جن میں تم اپنے مخصوص لباس اور ہیئت کو ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے۔

(۴) یعنی ان اوقات ثلاثہ کے علاوہ گھر کے مذکورہ خدمت گزاروں کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اجازت طلب کیے بغیر گھر کے اندر آ جاسکتے ہیں۔

(۵) یہ وہی وجہ ہے جو حدیث میں بلی کے پاک ہونے کی بیان کی گئی ہے۔ «إِنَّهَا لَيَسْتَبْنَجِسُ بَنَجْسٍ؛ إِنَّهَا مِنَ الطَّوَّافِينَ عَلَيْكُمْ أَوْ الطَّوَّافَاتِ» «بلی ناپاک نہیں ہے اس لیے کہ وہ بکثرت تمہارے پاس (گھر کے اندر) آنے جانے والی ہے۔» (أبو داؤد) «کتاب الطہارۃ باب سؤد الہرۃ» ترمذی «کتاب وباب مذکور وغیرہ» خادم اور مالک، ان کو بھی آپس میں ہر

اپنے احکام تم سے بیان فرما رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ پورے علم اور کامل حکمت والا ہے۔ (۵۸)

اور تمہارے بچے (بھی) جب بلوغت کو پہنچ جائیں تو جس طرح انکے اگلے لوگ اجازت مانگتے ہیں انہیں بھی اجازت مانگ کر آنا چاہیے،^(۱) اللہ تعالیٰ تم سے اسی طرح اپنی آیتیں بیان فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی علم و حکمت والا ہے۔ (۵۹)

بڑی بوڑھی عورتیں جنہیں نکاح کی امید (اور خواہش ہی) نہ رہی ہو وہ اگر اپنے کپڑے اتار رکھیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ وہ اپنا بناؤ سنگھار ظاہر کرنے والیاں نہ ہوں،^(۲) تاہم اگر ان سے بھی احتیاط رکھیں تو ان کے لیے بہت افضل ہے،^(۳) اور اللہ تعالیٰ سنتا جانتا ہے۔ (۶۰)

اندھے پر، لنگڑے پر، بیمار پر اور خود تم پر (مطلقاً) کوئی

وَأَذَانُ الْأَطْفَالِ مِنْكُمُ الْحَلْمُ فَلْيَسْتَأْذِنُوا كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۵۹﴾

وَالْعَوَامِدُ مِنَ النِّسَاءِ الَّتِي لَا يَرْمُونَنَّ بَخَاحًا فَلْيَسْ عَلَيَّوْنَ جُنَاحًا أَنْ يَضَعْنَ يَدِيَّاهُنَّ غَيْرَ مُتَبَيِّنَاتٍ بِرِيْزِيَّةٍ وَأَنْ يَسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۶۰﴾

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ

وقت ایک دوسرے سے ملنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اسی ضرورت عامہ کے پیش نظر اللہ نے یہ اجازت مرحمت فرما دی، کیونکہ وہ علیم ہے، لوگوں کی ضروریات اور حاجات کو جانتا ہے اور حکیم ہے، اسکے ہر حکم میں بندوں کے مفادات اور محبتیں ہیں۔

(۱) ان بچوں سے مراد احرار بچے ہیں، بلوغت کے بعد ان کا حکم عام مردوں کا سا ہے، اس لیے ان کے لیے ضروری ہے کہ جب بھی کسی کے گھر آئیں تو پہلے اجازت طلب کریں۔

(۲) ان سے مراد وہ بوڑھی اور ازکار رفتہ عورتیں ہیں جن کو حیض آنا بند ہو گیا ہو اور ولادت کے قابل نہ رہی ہوں۔ اس عمر میں بالعموم عورت کے اندر مرد کے لیے فطری طور پر جو جنسی کشش ہوتی ہے، وہ ختم ہو جاتی ہے، نہ وہ کسی مرد سے نکاح کی خواہش مند ہوتی ہیں، نہ مرد ہی ان کے لیے ایسے جذبات رکھتے ہیں۔ ایسی عورتوں کو پردے میں تخفیف کی اجازت دے دی گئی ہے ”کپڑے اتار دیں“ سے وہ کپڑا مراد ہے جو شلوار قمیص کے اوپر عورت پردے کے لیے بڑی چادر یا برقعہ وغیرہ کی شکل میں لیتی ہے بشرطیکہ مقصد اپنی زینت اور بناؤ سنگھار کا اظہار نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی عورت اپنی جنسی کشش کھو جانے کے باوجود اگر بناؤ سنگھار کے ذریعے سے اپنی ”جنسیت“ کو نمایاں کرنے کے مرض میں مبتلا ہو تو اس تخفیف پر وہ کے حکم سے وہ مستثنیٰ ہوگی اور اس کے لیے مکمل پردہ کرنا ضروری ہوگا۔

(۳) یعنی مذکورہ بوڑھی عورتیں بھی پردے میں تخفیف نہ کریں بلکہ بدستور بڑی چادر یا برقعہ بھی استعمال کرتی رہیں تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتر ہے۔

حرج نہیں کہ تم اپنے گھروں سے کھا لویا اپنے باپوں کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے^(۱) یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا ان گھروں سے جن کی کنجیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوستوں کے گھروں سے۔ تم پر اس میں بھی کوئی گناہ نہیں کہ تم سب ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ یا الگ الگ۔^(۲) پس جب تم گھروں میں جانے لگو تو اپنے گھر

وَلَا عَلَى الْمَرْفِضِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى أَنْفُسِكُمْ أَنْ تَأْكُلُوا
مِنْ بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ
أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ
أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَّاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُخْوَالِكُمْ
أَوْ بُيُوتِ خَلِيْقِكُمْ أَوْ مَا مَلَكَتُمْ فِي قِيَامِكُمْ أَوْ صَدِيقِكُمْ
لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا
فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ هِيَ مِنْ
عِنْدِ اللَّهِ مُبْرَكَةٌ طَيِّبَةٌ كَذَلِكَ بَيِّنَاتٌ لِلَّذِينَ
لَهُ الْآيَاتُ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۱۸﴾

(۱) اس کا ایک مطلب تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ جماد میں جاتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، آیت میں مذکور معذورین کو اپنے گھروں کی چابیاں دے جاتے اور انہیں گھر کی چیزیں بھی کھانے پینے کی اجازت دے دیتے۔ لیکن یہ معذور صحابہ رضی اللہ عنہم اس کے باوجود مالکوں کی غیر موجودگی میں، وہاں سے کھانا پینا جائز نہ سمجھتے، اللہ نے فرمایا کہ مذکورہ افراد کے لیے اپنے اقارب کے گھروں سے یا جن گھروں کی چابیاں ان کے پاس ہیں، ان سے کھانے پینے میں کوئی حرج (گناہ) نہیں ہے۔ اور بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ تندرست صحابہ رضی اللہ عنہم، معذور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیٹھ کر کھانا، اس لیے ناپسند کرتے کہ وہ معذوری کی وجہ سے کم کھائیں گے اور یہ زیادہ کھا جائیں گے، اس طرح ان کے ساتھ کھانے میں ظلم کا ارتکاب نہ ہو جائے۔ اسی طرح خود معذور صحابہ رضی اللہ عنہم بھی، دیگر لوگوں کے ساتھ کھانا اس لیے پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگ ان کے ساتھ کھانے میں کراہت محسوس نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کے لیے وضاحت فرمادی کہ اس میں کوئی گناہ والی بات نہیں ہے۔

(۲) تاہم بعض علمائے صراحت کی ہے کہ اس سے وہ عام قسم کا کھانا مراد ہے جس کے کھانے سے کسی کو گرانی محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ ایسی عمدہ چیزیں جو مالکوں نے خصوصی طور پر الگ چھپا کر رکھی ہوں تاکہ کسی کی نظر ان پر نہ پڑے، اسی طرح ذخیرہ شدہ چیزیں، ان کا کھانا اور ان کو اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں۔ (البر التماسیر) اسی طرح یہاں بیٹوں کے گھر انسان کے اپنے ہی گھر ہیں، جس طرح حدیث میں ہے أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبْنِكَ (ابن ماجہ نمبر ۲۲۹۱۔ مسند أحمد ۲/ ۱۶۹، ۲۰۳، ۲۱۳) ”تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔“ دو سری حدیث ہے وَلِدُ الرَّجُلِ مِنْ كِسْبِهِ (ابن ماجہ۔ نمبر ۲۱۳۷، ابوداؤد نمبر ۳۵۲۸، وصحیحہ الألبانی) ”آدمی کی اولاد، اس کی کمائی سے ہے۔“

(۳) اس میں ایک اور تنگی کا ازالہ فرمادیا گیا ہے۔ بعض لوگ اکیلے کھانا پسند نہیں کرتے تھے، اور کسی کو ساتھ بٹھا کر کھانا ضروری خیال کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اکٹھے کھا لویا الگ الگ، دونوں طرح جائز ہیں، گناہ کسی میں نہیں۔ البتہ

والوں کو سلام کر لیا کرو^(۱) دعائے خیر ہے جو بابرکت اور پاکیزہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ، یوں ہی اللہ تعالیٰ کھول کھول کر تم سے اپنے احکام بیان فرما رہا ہے تاکہ تم سمجھ لو۔ (۶۱)

باایمان لوگ تو وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر یقین رکھتے ہیں اور جب ایسے معاملہ میں جس میں لوگوں کے جمع ہونے کی ضرورت ہوتی ہے نبی کے ساتھ ہوتے ہیں تو جب تک آپ سے اجازت نہ لیں کہیں نہیں جاتے۔ جو لوگ ایسے موقع پر آپ سے اجازت لے لیتے ہیں حقیقت میں یہی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں۔^(۲) پس جب ایسے لوگ آپ سے اپنے کسی کام کے لیے اجازت طلب کریں تو آپ ان میں سے جسے چاہیں اجازت دے دیں اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش کی دعا مانگیں، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۶۲)

تم اللہ تعالیٰ کے نبی کے بلانے کو ایسا بلاؤ نہ کہ لو جیسا کہ آپس میں ایک دوسرے کو ہوتا^(۳) ہے۔ تم میں سے انہیں اللہ خوب جانتا ہے جو نظر بچا کر چپکے سے سرک

لَيْسَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأَذَنَ لِمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۶۱﴾

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ مِنْكُمْ إِذَا أَقْبَلْتُمُوهُمُ لِيُخَالِفُوا عَنِ أَمْرِ اللَّهِ أَنْ يَضِلُّوا فِي سَبِيلِهِمْ أَوْ يُضِلُّوهُمُ

اکٹھے ہو کر کھانا زیادہ باعث برکت ہے، جیسا کہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے (ابن کثیر)

(۱) اس میں اپنے گھروں میں داخل ہونے کا ادب بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ داخل ہوتے وقت اہل خانہ کو سلام عرض کرو، آدمی کے لیے اپنی بیوی یا اپنے بچوں کو سلام کرنا بالعموم گراں گزرتا ہے۔ لیکن اہل ایمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق ایسا کریں۔ آخر اپنے بیوی بچوں کو سلامتی کی دعا سے کیوں محروم رکھا جائے۔

(۲) یعنی جمعہ و عیدین کے اجتماعات میں یا داخلی و بیرونی مسئلے پر مشاورت کے لیے بلائے گئے اجلاس میں اہل ایمان تو حاضر ہوتے ہیں، اسی طرح اگر وہ شرکت سے معذور ہوتے ہیں تو اجازت طلب کرتے ہیں۔ جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ منافقین ایسے اجتماعات میں شرکت سے اور آپ ﷺ سے اجازت مانگنے سے گریز کرتے ہیں۔

(۳) اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جس طرح تم ایک دوسرے کو نام لے کر پکارتے ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح مت پکارو۔ مثلاً یا محمد ﷺ نہیں بلکہ یا رسول اللہ، یا نبی اللہ وغیرہ کہو۔ (یہ آپ کی زندگی کے لیے تھا جب کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ضرورت پیش آتی تھی کہ آپ سے مخاطب ہوں) دوسرے معنی یہ ہیں کہ رسول کی بددعا کو دوسروں کی

عَذَابُ الْيَوْمِ ۝۶۳

جاتے ہیں۔^(۱) سنو جو لوگ حکم رسول کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں ان پر کوئی زبردست آفت نہ آ پڑے^(۲) یا انہیں دردناک عذاب نہ پہنچے۔ (۶۳) آگاہ ہو جاؤ کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ تعالیٰ ہی کا^(۳) ہے۔ جس روش پر تم ہو وہ اسے بخوبی جانتا ہے،^(۴) اور جس دن یہ سب اس کی طرف لوٹائے جائیں گے اس دن ان کو ان کے کیے سے وہ خبردار کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے۔ (۶۳)

أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قَدْ يَعْلَمُ مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ وَاَيُّومٍ يُّرِجَعُونَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا وَاللّٰهُ بِحٰجِلِ عَمَلِهِۦٓ عَلِيْمٌ ۝۶۳

بد دعا کی طرح مت سمجھو، اس لیے کہ آپ کی دعا تو قبول ہوتی ہے۔ اس لیے نبی کی بد دعا مت لو، تم ہلاک ہو جاؤ گے۔
(۱) یہ منافقین کا رویہ ہوتا تھا کہ اجتماع مشاورت سے چپکے سے کھسک جاتے۔

(۲) اس آفت سے مراد دلوں کی وہ کجی ہے جو انسان کو ایمان سے محروم کر دیتی ہے۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سے سرتابی اور ان کی مخالفت کرنے کا نتیجہ ہے۔ اور ایمان سے محرومی اور کفر پر خاتمہ، جہنم کے دائمی عذاب کا باعث ہے۔ جیسا کہ آیت کے اگلے جملے میں فرمایا۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہاج، طریقے اور سنت کو ہر وقت سامنے رکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ جو اقوال و اعمال اس کے مطابق ہوں گے، وہی بارگاہ الہی میں مقبول اور دوسرے سب مردود ہوں گے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ (البخاری۔ کتاب الصلح، باب إذا اصطلحو علی صلح جور۔ ومسلم، کتاب الأقضية، باب نقض الأحکام الباطلة ورد محدثات الأمور۔ والسنن) ”جس نے ایسا کام کیا، جو ہمارے طریقے پر نہیں ہے، وہ مردود ہے۔“

(۳) خلق کے اعتبار سے بھی، ملک کے اعتبار سے بھی اور ماتحتی کے اعتبار سے بھی۔ وہ جس طرح چاہے تصرف کرے اور جس چیز کا چاہے، حکم دے۔ پس اس کے رسول ﷺ کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ رسول کے کسی حکم کی مخالفت نہ کی جائے اور جس سے اس نے منع کر دیا ہے، اس کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ رسول ﷺ کے بھیجے کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

(۴) یہ مخالفین رسول ﷺ کو تنبیہ ہے کہ جو کچھ حرکات تم کر رہے ہو، یہ نہ سمجھو کہ وہ اللہ سے مخفی رہ سکتی ہیں۔ اس کے علم میں سب کچھ ہے اور وہ اس کے مطابق قیامت والے دن جزا و سزا دے گا۔

سورۂ فرقان کی ہے اور اس میں ستر آیتیں اور
چھ رکوع ہیں۔

سُورَةُ الْفُرْقَانِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

ہست بابرکت ہے وہ اللہ تعالیٰ جس نے اپنے بندے پر
فرقان^(۱) اتارا تاکہ وہ تمام لوگوں کے^(۲) لیے آگاہ کرنے
والا بن جائے۔ (۱)

اسی اللہ کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی^(۳) اور وہ
کوئی اولاد نہیں رکھتا،^(۴) نہ اس کی سلطنت میں کوئی اس
کا ساجھی ہے^(۵) اور ہر چیز کو اس نے پیدا کر کے ایک
مناسب اندازہ ٹھہرا دیا^(۶) ہے۔ (۲)

ان لوگوں نے اللہ کے سوا جنہیں اپنے معبود ٹھہرا رکھے
ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود پیدا کئے
جاتے ہیں، یہ تو اپنی جان کے نقصان نفع کا بھی اختیار

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لَیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ﴿۱﴾

لِلَّذِیْ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَا ذَلَمَ یَكْفُرْ
تَهْتِكُ فِی الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ قَعَقَدَةً مَّعْدُیْرًا ﴿۲﴾

وَالَّذِیْ دَاوَمَ مِنْ دُوْنِهٖ اِلٰهَةً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّهُمْ یُخْلَعُوْنَ
وَلَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِكُوْنَ مَوْتًا
وَّلَا حَیٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ﴿۳﴾

(۱) فرقان کے معنی ہیں حق و باطل، توحید و شرک اور عدل و ظلم کے درمیان فرق کرنے والا، اس قرآن نے کھول کر
ان امور کی وضاحت کر دی ہے، اس لیے اسے فرقان سے تعبیر کیا۔

(۲) اس سے بھی معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عالم گیر ہے اور آپ تمام انسانوں اور جنوں کے لیے ہادی
و رہنما بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿كُلٌّ يَأْتِيهَا النَّاسُ لِرَآئِیْ رَسُولِ اللّٰهِ الْيَوْمِ جَمِیْعًا﴾
(الأعراف: ۱۵۸) اور حدیث میں بھی فرمایا بُعِثْتُ اِلَى الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ (صحیح مسلم، کتاب المساجد، كَانَ
النَّبِیُّ یُبْعَثُ اِلَى قَوْمِهٖ خَاصَّةً، وَیُبْعَثُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً صحیح بخاری، کتاب التمیم و مسلم کتاب
المساجد) مجھے احمد و اسود سب کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ ”پہلے نبی کسی ایک قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اور
میں تمام لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“ رسالت و نبوت کے بعد، توحید کا بیان کیا جا رہا ہے۔ یہاں اللہ کی چار
صفات بیان کی گئی ہیں۔

(۳) یہ پہلی صفت ہے یعنی کائنات میں متصرف صرف وہی ہے، کوئی اور نہیں۔

(۴) اس میں نصاریٰ، یہود اور بعض ان عرب قبائل کا رد ہے جو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔

(۵) اس میں صنم پرست مشرکین اور شویت (دو خداؤں شر اور خیر، ظلمت اور نور کے خالق) کے قائلین کا رد ہے۔

(۶) ہر چیز کا خالق صرف وہی ہے اور اپنی حکمت و مشیت کے مطابق اس نے اپنی مخلوقات کو ہر وہ چیز بھی مہیا کی ہے جو

نہیں رکھتے اور نہ موت و حیات کے اور نہ دوبارہ جی اٹھنے کے وہ مالک ہیں۔^(۱) (۳)

اور کافروں نے کہا یہ تو بس خود اسی کا گھڑا گھڑایا جھوٹ ہے جس پر اور لوگوں نے بھی اس کی مدد کی^(۲) ہے، دراصل یہ کافر بڑے ہی ظلم اور سرتاسر جھوٹ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ (۴)

اور یہ بھی کہا کہ یہ تو انگوں کے افسانے ہیں جو اس نے لکھا رکھے ہیں بس وہی صبح و شام اس کے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔ (۵)

کہہ دیجئے کہ اسے تو اس اللہ نے اتارا ہے جو آسمان و زمین کی تمام پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔^(۳) بیشک وہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان^(۴) ہے۔ (۶)

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا إِفْتَاءٌ لِأَعْتَابِهِ
وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَزُورًا ۝

وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝ كَتَبَهَا فِيهِمْ ثُمِّلَ عَلَيْهِمْ
بُكْرَةً وَأَوْصِيانًا ۝

قُلْ أَنْزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ
كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

اس کے مناسب حال ہے یا ہر چیز کی موت اور روزی اس نے پہلے سے ہی مقرر کر دی ہے۔

(۱) لیکن ظالموں نے ایسے ہمہ صفات موصوف رب کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کو رب بنا لیا ہے جو اپنے بارے میں بھی کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتے چہ جائیکہ وہ کسی اور کے لیے کچھ کر سکنے کے اختیارات سے بہرہ ور ہوں۔ اس کے بعد منکرین نبوت کے شہادت کا ازالہ کیا جا رہا ہے۔

(۲) مشرکین کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ کتاب گھڑنے میں یہود سے یا ان کے بعض موالی (مثلاً ابو کلیبہ یسار، عداس اور جبر و غیر ہم) سے مدد لی ہے۔ جیسا کہ سورۃ النحل، آیت ۱۰۳ میں اس کی ضروری تفصیل گزر چکی ہے۔ یہاں قرآن نے اس الزام کو ظلم اور جھوٹ سے تعبیر کیا ہے، بھلا ایک امی شخص دو سرور کی مدد سے ایسی کتاب پیش کر سکتا ہے جو فصاحت و بلاغت اور اعجاز کلام میں بے مثال ہو، حقائق و معارف بیانی میں بھی مجرنگار ہو، انسانی زندگی کے لیے احکام و قوانین کی تفصیلات میں بھی لاجواب ہو اور اخبار ماضیہ اور مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی نشاندہی اور وضاحت میں بھی اس کی صداقت مسلم ہو۔

(۳) یہ ان کے جھوٹ اور افتراء کے جواب میں کہا کہ قرآن کو تو دیکھو، اس میں کیا ہے؟ کیا اس کی کوئی بات غلط اور خلاف واقعہ ہے؟ یقیناً نہیں ہے۔ بلکہ ہر بات بالکل صحیح اور سچی ہے، اس لیے کہ اس کو اتارنے والی ذات وہ ہے جو آسمان و زمین کی پوشیدہ بات کو جانتا ہے۔

(۴) اس لیے وہ عفو و درگزر سے کام لیتا ہے۔ ورنہ ان کا قرآن سازی کا الزام بڑا سخت ہے جس پر وہ فوری طور پر

اور انہوں نے کہا کہ یہ کیسا رسول ہے؟ کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا^(۱) ہے، اس کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا جاتا؟ کہ وہ بھی اس کے ساتھ ہو کر ڈرانے والا بن جاتا۔^(۲) (۷)

یا اس کے پاس کوئی خزانہ ہی ڈال دیا^(۳) جاتا یا اس کا کوئی باغ ہی ہوتا جس میں سے یہ کھاتا۔^(۴) اور ان ظالموں نے کہا کہ تم ایسے آدمی کے پیچھے ہو لیے ہو جس پر جادو کر دیا گیا ہے۔^(۵) (۸)

خیال تو کیجئے! کہ یہ لوگ آپ کی نسبت کیسی کیسی باتیں بناتے ہیں۔ پس جس سے خود ہی بہک رہے ہیں اور کسی طرح راہ پر نہیں آسکتے۔^(۶) (۹)

اللہ تعالیٰ تو ایسا بابرکت ہے کہ اگر چاہے تو آپ کو بہت سے ایسے باغات عنایت فرمادے جو ان کے کئے ہوئے باغ سے بہت ہی بہتر ہوں جن کے نیچے نہریں لہریں لے رہی ہوں

وَقَالُوا مَالِ هَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَنْتَهِي فِي الْأَسْوَاقِ لَوْلَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونُ مَعَهُ نَذِيرًا ۝

أَوَلَيْقَىٰ لِلَّهِ كِتَابٌ يُدْعَوْنَ لَكُمُ حِجَّةً يَأْكُلُ مِنْهَا وَقَالَ الظَّالِمُونَ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مُّسَوِّرًا ۝

أَنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا ۝

تَبَارَكَ الَّذِي إِن شَاءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِنْ ذَلِكَ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَيَجْعَلُ لَكَ فُضُورًا ۝

عذاب الہی کی گرفت میں آسکتے ہیں۔

(۱) قرآن پر طعن کرنے کے بعد رسول پر طعن کیا جا رہا ہے اور یہ طعن رسول کی بشریت پر ہے۔ کیوں کہ ان کے خیال میں بشریت، عظمت رسالت کی متحمل نہیں۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ یہ تو کھاتا پیتا اور بازاروں میں آتا جاتا ہے۔ اور ہمارے ہی جیسا بشر ہے۔ حالانکہ رسول کو تو بشر نہیں ہونا چاہیے۔

(۲) مذکورہ اعتراض سے نیچے اتر کر کہا جا رہا ہے کہ چلو کچھ اور نہیں تو ایک فرشتہ ہی اس کے ساتھ ہو جو اس کا معاون اور مصدق ہو۔

(۳) تاکہ طلب رزق سے وہ بے نیاز ہوتا۔

(۴) تاکہ اس کی حیثیت تو ہم سے کچھ ممتاز ہو جاتی۔

(۵) یعنی جس کی عقل و فہم سحرزدہ اور مختل ہے۔

(۶) یعنی اے پیغمبر! آپ کی نسبت یہ اس قسم کی باتیں اور بہتان تراشی کرتے ہیں، کبھی ساحر کہتے ہیں، کبھی مسحور و مجنون اور کبھی کذاب و شاعر۔ حالانکہ یہ ساری باتیں باطل ہیں اور جن کے پاس ذرہ برابر بھی عقل و فہم ہے، وہ ان کا جھوٹا ہونا جانتے ہیں، پس یہ ایسی باتیں کر کے خود ہی راہ ہدایت سے دور ہو جاتے ہیں، انہیں راہ راست کس طرح نصیب ہو سکتی ہے؟

اور آپ کو بہت سے (پختہ) محل بھی دے دے۔^(۱۰)
 بات یہ ہے کہ یہ لوگ قیامت کو جھوٹ سمجھتے ہیں^(۱۱) اور
 قیامت کے جھٹلانے والوں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی
 آگ تیار کر رکھی ہے۔^(۱۱)

جب وہ انہیں دور سے دیکھے گی تو یہ اس کا غصے سے پھرنا
 اور دھاڑنا سنیں گے۔^(۱۲)

اور جب یہ جنم کی کسی تنگ جگہ میں مشکلیں کس کر
 پھینک دیئے جائیں گے تو وہاں اپنے لیے موت ہی موت
 پکاریں گے۔^(۱۳)

(ان سے کہا جائے گا) آج ایک ہی موت کو نہ پکارو بلکہ
 بہت سی اموات کو پکارو۔^(۱۳)

آپ کہہ دیجئے کہ کیا یہ بہتر ہے^(۱۴) یا وہ بھنگی والی جنت

بَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ وَأَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ
 بِالسَّاعَةِ سَعِيرًا ۝

إِذَا رَأَوْهُم مِّنْ مَّكَانٍ يَبِينُ سَوْمُوا لَهُمْ أَنْتُمْ يَوْمًا وَرَبُّوهُمُ ۝

وَإِذَا الْقَوْمُ مِنَّهَا كَانَ مَا يُضِيقُهَا مَنَعَرِينَ دَعَوْا
 هُنَا لَكَ لُبُورًا ۝

لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ مُبْرًا تَدْعُوا حِجَابًا وَأَدْعُوا شُبُورًا كَذِبًا ۝

ثُمَّ أَذِلَّكَ خَيْرٌ أَمْ حِجَّةُ الْخُلْدِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ

(۱) یعنی یہ آپ کے لیے جو مطالبے کرتے ہیں، اللہ کے لیے ان کا کر دینا کوئی مشکل نہیں ہے، وہ چاہے تو ان سے بہتر
 باغات اور محلات دنیا میں آپ کو عطا کر سکتا ہے جو ان کے دماغوں میں ہیں۔ لیکن ان کے مطالبے تو تکذیب و عناد کے طور
 پر ہیں نہ کہ طلب ہدایت اور تلاش نجات کے لیے۔

(۲) قیامت کا یہ جھٹلانا ہی تکذیب رسالت کا بھی باعث ہے۔

(۳) یعنی جنم ان کافروں کو دور سے میدان محشر میں دیکھ کر ہی غصے سے کھول اٹھے گی اور ان کو اپنے دامن غضب میں
 لینے کے لیے چلائے گی اور جھیلانے گی، جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿ إِذَا الْقَوْمُ مِنَّهَا سَمِعُوا لَهَا سَهِيقًا وَهِيَ تَفُورُ *
 نَكَالًا لِّمَن كَانَ يَكْفُرُ ۝﴾ (سورۃ الملک: ۸) ”جب جنمی، جنم میں ڈالے جائیں گے تو اس کا دھاڑنا سنیں گے اور وہ
 (جوش غضب سے) اچھلتی ہوگی، ایسے لگے گا کہ وہ غصے سے پھٹ پڑے گی۔“ جنم کا دیکھنا اور چلانا، ایک حقیقت ہے،
 استعارہ نہیں۔ اللہ کے لیے اس کے اندر احساس و ادراک کی قوت پیدا کر دینا، مشکل نہیں ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

آخر قوت گویائی بھی تو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرمائے گا اور وہ ﴿ هَلْ مِنْ مَّزِيدٍ ﴾ کی صدا بلند کرے گی (سورۃ ق: ۳۰)

(۴) یعنی جنمی جب جنم کے عذاب سے تنگ آکر آرزو کریں گے کہ کاش انہیں موت آجائے، وہ فنا کے گھاٹ اتر
 جائیں۔ تو ان سے کہا جائے گا کہ اب ایک موت نہیں کئی موتوں کو پکارو۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمہاری قسمت میں ہمیشہ
 کے لیے انواع و اقسام کے عذاب ہیں یعنی موتیں ہی موتیں ہیں، تم کہاں تک موت کا مطالبہ کرو گے!

(۵) ”یہ“ اشارہ ہے جنم کے مذکورہ عذابوں کی طرف، جن میں جنمی جکڑ بند ہو کر جٹلا ہوں گے۔ کہ یہ بہتر ہے جو

جس کا وعدہ پر ہمیزگاروں سے کیا گیا ہے؛ جو ان کا بدلہ ہے اور ان کے لوٹنے کی اصلی جگہ ہے۔ (۱۵)

وہ جو چاہیں گے ان کے لیے وہاں موجود ہو گا؛ ہمیشہ رہنے والے۔ یہ تو آپ کے رب کے ذمے وعدہ ہے جو قابل طلب ہے۔ (۱۶)^(۱)

اور جس دن اللہ تعالیٰ انہیں اور سوائے اللہ کے جنہیں یہ پوجتے رہے، انہیں جمع کر کے پوچھے گا کہ کیا میرے ان بندوں کو تم نے گمراہ کیا یا یہ خود ہی راہ سے گم ہو گئے۔ (۱۷)^(۲)

وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ذات ہے خود ہمیں ہی یہ زبانا نہ تھا کہ تیرے سوا اوروں کو اپنا کارساز بناتے^(۳) بات یہ ہے کہ تو نے انہیں اور ان کے باپ دادوں کو آسودگیوں عطا فرمائیں یہاں تک کہ وہ نصیحت بھلا بیٹھے،

كَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً وَصِيْبًا ۝

لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ خَالِدِينَ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدًا مَسْئُورًا ۝

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ مِمَّا يَبْدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَيَقُولُوا اِنَّا كُنَّا اَمْثَلًا اَضَلَلْتُمْ عِبَادِيْ مَوْلَاةً اَمْ لَهُمْ صُلُوٰلُ السَّبِيْلِ ۝

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ لِشَيْءٍ لَّنَا اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَاۡءَ وَاٰلِهٰنَا هُمْ حَتّٰى نَسْمُوَ الدِّيْكُوْكَ اَوْ نَكُوْنَا قَوْمًا يُّوْرًا ۝

کفر و شرک کا بدلہ ہے یا وہ جنت؛ جس کا وعدہ متقین سے ان کے تقویٰ و اطاعت الہی پر کیا گیا ہے۔ یہ سوال جنہم میں کیا جائے گا لیکن اسے یہاں اس لیے نقل کیا گیا ہے کہ شاید جنہیوں کے اس انجام سے عبرت پکڑ کر لوگ تقویٰ و اطاعت کا راستہ اختیار کر لیں اور اس انجام بد سے بچ جائیں؛ جس کا نقشہ یہاں کھینچا گیا ہے۔

(۱) یعنی ایسا وعدہ؛ جو یقیناً پورا ہو کر رہے گا؛ جیسے قرض کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ نے اپنے ذمے یہ وعدہ واجب کر لیا ہے جس کا اہل ایمان اس سے مطالبہ کر سکتے ہیں۔ یہ محض اس کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اہل ایمان کے لیے اس حسن جزا کو اپنے لیے ضروری قرار دے لیا ہے۔

(۲) دنیا میں اللہ کے سوا جن کی عبادت کی جاتی رہی ہے اور کی جاتی رہے گی۔ ان میں جمادات (پتھر، لکڑی اور دیگر دھاتوں کی بنی ہوئی مورتیاں) بھی ہیں؛ جو غیر عاقل ہیں اور اللہ کے نیک بندے بھی ہیں جو عاقل ہیں مثلاً حضرت عزیر؛ حضرت مسیح علیہما السلام اور دیگر بہت سے نیک بندے۔ اسی طرح فرشتے اور جنات کے پجاری بھی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ غیر عاقل جمادات کو بھی شعور و ادراک اور گویائی کی قوت عطا فرمائے گا۔ اور ان سب معبودین سے پوچھے گا کہ بتلاؤ؛ تم نے میرے بندوں کو اپنی عبادت کرنے کا حکم دیا تھا یا یہ اپنی مرضی سے تمہاری عبادت کر کے گمراہ ہوئے تھے؟

(۳) یعنی جب ہم خود تیرے سوا کسی کو کارساز نہیں سمجھتے تھے تو پھر ہم اپنی بابت کس طرح لوگوں کو کہہ سکتے تھے کہ تم اللہ کے بجائے ہمیں اپنا ولی اور کارساز سمجھو۔

یہ لوگ تھے ہی ہلاک ہونے والے۔ (۱۸)
تو انہوں نے تو تمہیں تمہاری تمام باتوں میں جھٹلایا، اب
نہ تو تم میں عذابوں کے پھیرنے کی طاقت ہے، نہ مدد
کرنے کی، تم میں سے جس جس نے ظلم کیا ہے (۳)
ہم اسے برا عذاب چکھائیں گے۔ (۱۹)

ہم نے آپ سے پہلے جتنے رسول بھیجے سب کے سب کھانا
بھی کھاتے تھے (۴) اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے
تھے (۵) اور ہم نے تم میں سے ہر ایک کو دوسرے کی
آزمائش کا ذریعہ بنا دیا۔ (۶) کیا تم صبر کرو گے؟ تیرا رب
سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ (۷) (۲۰)

فَعَدَّ كَذِّبُوهُمْ بِمَا قَالُوا لَنْ نَمَسَّ نَفْسَ يَوْمٍ صَرَفًا
وَلَا نَصْرًا وَمَنْ يَظْلِمْ لِنَفْسِهِ نَذَابًا كَبِيرًا ﴿۵﴾

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا أَنْهَهُمْ لِيَأْكُلُوا
الطَّعَامَ وَيَشْرَبُوا فِي الْأَسْوَاقِ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ
لِبَعْضٍ فِتْنَةً أَنْتُمْ لِرَبِّكُمْ بِصِيرًا ﴿۶﴾

(۱) یہ شرک کی علت ہے کہ دنیا کے مال و اسباب کی فراوانی نے انہیں تیری یاد سے غافل کر دیا اور ہلاکت و تباہی ان کا
مقدر بن گئی۔

(۲) یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے جو مشرکین سے مخاطب ہو کر اللہ تعالیٰ کے گاکہ تم جن کو اپنا معبود گمان کرتے تھے، انہوں
نے تو تمہیں تمہاری باتوں میں جھوٹا قرار دے دیا ہے اور تم نے دیکھ لیا ہے کہ انہوں نے تم سے براءت کا اعلان کر دیا
ہے۔ گویا جن کو تم اپنا مدگار سمجھتے تھے، وہ مدگار ثابت نہیں ہوئے۔ اب کیا تمہارے اندر یہ طاقت ہے کہ تم میرے
عذاب کو اپنے سے پھیر سکو اور اپنی مدد کر سکو؟

(۳) ظلم سے مراد وہی شرک ہے، جیسا کہ سیاق سے بھی واضح ہے اور قرآن میں دوسرے مقام پر شرک کو ظلم عظیم
سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ﴿ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴾ (القمان-۱۳)
(۴) یعنی وہ انسان تھے اور غذا کے محتاج۔

(۵) یعنی رزق حلال کی فراہمی کے لیے کسب و تجارت بھی کرتے تھے۔ مطلب اس سے یہ ہے کہ یہ چیزیں منصب
نبوت کے منافی نہیں، جس طرح کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔

(۶) یعنی ہم نے ان انبیاء کی اور ان کے ذریعے سے ان پر ایمان لانے والوں کی بھی آزمائش کی، تاکہ کھرے کھوٹے کی تمیز ہو
جائے، جنہوں نے آزمائش میں صبر کا دامن پکڑے رکھا، وہ کامیاب اور دوسرے ناکام رہے۔ اسی لیے آگے فرمایا ”کیا تم صبر کرو
گے؟“

(۷) یعنی وہ جانتا ہے کہ وحی و رسالت کا مستحق کون ہے اور کون نہیں؟ ﴿ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ﴾
(الألعمام-۱۳۲) حدیث میں بھی آتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا کہ بادشاہ نبی
بنوں یا بندہ رسول؟ میں نے بندہ رسول بننا پسند کیا (ابن کثیر)

اور جنہیں ہماری ملاقات کی توقع نہیں انہوں نے کہا کہ ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے؟^(۱) یا ہم اپنی آنکھوں سے اپنے رب کو دیکھ لیتے؟^(۲) ان لوگوں نے اپنے آپ کو ہی بہت بڑا سمجھ رکھا ہے اور سخت سرکشی کر لی ہے۔^(۳) جس دن یہ فرشتوں کو دیکھ لیں گے اس دن ان گناہ گاروں کو کوئی خوشی نہ ہو گی^(۴) اور کہیں گے یہ محروم ہی محروم کیے۔ گئے۔^(۵) اور انہوں نے جو جو اعمال کیے تھے ہم نے ان کی طرف

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يُرْمُونَ لِقَاءَنَا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْنَا الْمَلَائِكَةُ أَوْ نُنزِلُ رَبَّنَا لَقَدِ اسْتَكْبَرُوا فِي أَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيرًا ﴿۱﴾
يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلَائِكَةَ لَا بُشْرَىٰ يَوْمَئِذٍ لِلْمُجْرِمِينَ وَ يَقُولُونَ حَجْرًا مَّحْجُورًا ﴿۲﴾
وَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَلَجَعَلْنَاهُمْ مَثَلًا لِّلَّذِينَ آمَنُوا ﴿۳﴾

(۱) یعنی کسی انسان کو رسول بنا کر بھیجنے کے بجائے، کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجا جاتا۔ یا یہ مطلب ہے کہ پیغمبر کے ساتھ فرشتے بھی نازل ہوتے، جنہیں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور وہ اس بشر رسول کی تصدیق کرتے۔

(۲) یعنی رب آکر ہمیں کتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا رسول ہے اور اس پر ایمان لانا تمہارے لیے ضروری ہے۔
(۳) اسی استکبار اور سرکشی کا نتیجہ ہے کہ وہ اس قسم کے مطالبے کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو ایمان بالغیب کے ذریعے سے انسانوں کو آزماتا ہے۔ اگر وہ فرشتوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے اتار دے یا آپ خود زمین پر نزول فرمائے تو اس کے بعد ان کی آزمائش کا پہلو ہی ختم ہو جائے اس لیے اللہ تعالیٰ ایسا کام کیوں کر کر سکتا ہے جو اس کی حکمت تخلیق اور مشیت تکوینی کے خلاف ہے؟

(۴) اس دن سے مراد موت کا دن ہے یعنی یہ کافر فرشتوں کو دیکھنے کی آرزو تو کرتے ہیں لیکن موت کے وقت جب یہ فرشتوں کو دیکھیں گے تو ان کے لیے کوئی خوشی اور مسرت نہیں ہوگی، اس لیے کہ فرشتے انہیں اس موقع پر عذاب جنہم کی وعید سناتے ہیں اور کہتے ہیں اے خبیث روح خبیث جسم سے نکل، جس سے روح دوڑتی اور بھاگتی ہے، جس پر فرشتے اسے مارتے اور کوٹتے ہیں جیسا کہ سورۃ الأنفال، ۵۰، سورۃ الأنعام، ۹۳ میں ہے۔ اس کے برعکس مومن کا حال وقت احتضار (جان کنی کے وقت) یہ ہوتا ہے کہ فرشتے اسے جنت اور اس کی نعمتوں کی نوید جاں فرماتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ حم السجدة، ۳۰-۳۲ میں ہے اور حدیث میں بھی آتا ہے کہ ”فرشتے مومن کی روح سے کہتے ہیں، اے پاک روح، جو پاک جسم میں تھی، نکل! اور ایسی جگہ چل جہاں اللہ کی نعمتیں ہیں اور وہ رب ہے جو تجھ سے راضی ہے۔“ (تفصیل کے لیے دیکھئے مسند احمد ۲/۳۶۳-۳۶۵) اس ماجہ کتاب الزہد، باب ذکر الموت (بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ دونوں ہی قول صحیح ہیں۔ اس لیے کہ دونوں ہی دن ایسے ہیں کہ فرشتے مومن اور کافروں کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں۔ مومنوں کو رحمت و رضوان الہی کی خوش خبری اور کافروں کو ہلاکت و خسران کی خبر دیتے ہیں۔

(۵) حَجْرٌ مَعْنَىٰ هُوَ مَنعٌ كَرْنًا، رُوكٌ وَدِيَانًا، جِسْمٌ طَرَفٌ قَاضِيٌ كَسَىٰ كَوَاسٍ كِى بَعْدَ وَتَوْنِي يَاصْفَرُ سِنِي كِي وَجْهٍ سَعِ اس

بڑھ کر انہیں پر آگندہ ذروں کی طرح کر دیا۔^(۱) (۲۳)
 البتہ اس دن جنتیوں کا ٹھکانا بہتر ہو گا اور خواب گاہ بھی
 عمدہ ہوگی۔^(۲) (۲۴)
 اور جس دن آسمان بادل سمیت پھٹ جائے گا^(۳) اور
 فرشتے لگاتار اتارے جائیں گے۔ (۲۵)
 اس دن صبح طور پر ملک صرف رحمن کا ہی ہو گا اور یہ
 دن کافروں پر بڑا بھاری ہو گا۔ (۲۶)

أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَأَحْسَنُ مَقِيلًا ﴿۲۴﴾
 وَيَوْمَ تَشَقُّقُ السَّمَاءُ بِآلِ غَامٍ مُّزِيلًا ﴿۲۵﴾
 أَلَمَلِكُ يَوْمَئِذٍ رَّحْمَنٌ لِّلرَّحْمٰنِ وَكَانَ يَوْمًا عَلٰى
 الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾

کے اپنے مال میں تصرف کرنے سے روک دے تو کہتے ہیں حَجَرَ الْفَاضِي عَلٰى فَلَانٍ قَاضِي نَے فلاں کو تصرف کرنے سے روک دیا ہے۔ اسی مفہوم میں خانہ کعبہ کے اس حصے (حطیم) کو حجر کہا جاتا ہے جسے قریش مکہ نے خانہ کعبہ میں شامل نہیں کیا تھا۔ اس لیے طواف کرنے والوں کے لیے اس کے اندر سے طواف کرنا منع ہے۔ طواف کرتے وقت اس کے بیرون حصے سے گزرنا چاہیے جسے دیوار سے ممتاز کر دیا گیا ہے۔ اور عقل کو بھی حجر کہا جاتا ہے، اس لیے کہ عقل بھی انسانوں کو ایسے کاموں سے روکتی ہے جو انسان کے لائق نہیں ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ فرشتے کافروں کو کہتے ہیں کہ تم ان چیزوں سے محروم ہو جن کی خوش خبری متیقن کو دی جاتی ہے۔ یعنی یہ حَرَامًا مَحْرَمًا عَلَیْكُمْ کے معنی میں ہے۔ آج جنت الفردوس اور اس کی نعمتیں تم پر حرام ہیں، اس کے مستحق صرف اہل ایمان و تقویٰ ہوں گے۔

(۱) هَبَاءٌ ان باریک ذروں کو کہتے ہیں جو کسی سوراخ سے گھر کے اندر داخل ہونے والی سوریج کی کرن میں محسوس ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی انہیں ہاتھ میں پکڑنا چاہے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ کافروں کے عمل بھی قیامت والے دن ان ہی ذروں کی طرح بے حیثیت ہوں گے۔ کیوں کہ وہ ایمان و اخلاص سے بھی خالی ہوں گے اور موافقت شریعت سے بھی عاری۔ جب کہ عند اللہ قبولیت کے لیے دونوں شرطیں ضروری ہیں۔ ایمان و اخلاص بھی اور شریعت اسلامیہ کی مطابقت بھی۔ یہاں کافروں کے اعمال کو جس طرح بے حیثیت ذروں کی مثل کہا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے مقامات پر کہیں راکھ سے، کہیں سراب سے اور کہیں صاف چکنے پتھر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ ساری تشبیہات پہلے گزر چکی ہیں ملاحظہ ہو سورۃ البقرۃ ۲۶۴، سورۃ ابراہیم ۱۱۸ اور سورۃ النور ۲۹۔

(۲) بعض نے اس سے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ اہل ایمان کے لیے قیامت کا یہ ہولناک دن اتنا مختصر اور ان کا حساب اتنا آسان ہو گا کہ قبولے کے وقت تک یہ فارغ ہو جائیں گے اور جنت میں یہ اپنے اہل خاندان اور حور عین کے ساتھ دوپہر کو استراحت فرما ہوں گے، جس طرح حدیث میں ہے کہ مومن کے لیے یہ دن اتنا ہلکا ہو گا کہ جتنے میں دنیا میں ایک فرض نماز ادا کر لینا۔ (مسند احمد ۳/۷۵)

(۳) اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمان پھٹ جائے گا اور بادل سایہ لگن ہو جائیں گے، اللہ تعالیٰ فرشتوں کے جلو میں میدان محشر

اور اس دن ظالم شخص اپنے ہاتھوں کو چاچا کر کے گاہے کاش کہ میں نے رسول (ﷺ) کی راہ اختیار کی ہوتی۔ (۲۷)

ہائے افسوس کاش کہ میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ (۲۸)^(۱)

اس نے تو مجھے اس کے بعد گمراہ کر دیا کہ نصیحت میرے پاس آچھنی تھی اور شیطان تو انسان کو (وقت پر) دغا دینے والا ہے۔ (۲۹)

اور رسول کے گاکہ اے میرے پروردگار! بیشک میری امت نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔ (۳۰)^(۲)

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بعض گناہ گاروں کو بنا دیا ہے۔ (۳)^(۳) اور تیرا رب ہی ہدایت کرنے والا اور مدد کرنے والا کافی ہے۔ (۳۱)^(۴)

اور کافروں نے کہا کہ اس پر قرآن سارا کا سارا ایک ساتھ

وَيَوْمَ نَبْصُ الظَّالِمِ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُولُ يَلَيْتَنِي اَتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾

يُوَلِّيْتُنِي لَيْتَنِي لِمَ اَتَّخَذْتُ فَلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾

لَقَدْ اَضَلَّكُم مِّنَ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَاءْتَنِيۤ- وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَدُوْلًا ﴿۲۹﴾

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يَرْبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هٰدِيًا وَنَصِيْرًا ﴿۳۱﴾

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَالْوَلٰٓئِيْٓؤُا لَعَلِيْهِمُ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً

میں، جہاں ساری مخلوق جمع ہوگی، حساب کتاب کے لیے جلوہ فرما ہوگا، جیسا کہ سورہ بقرہ، آیت ۲۱۰ سے بھی واضح ہے۔

(۱) اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نافرمانوں سے دوستی اور وابستگی نہیں رکھنی چاہیے، اس لیے کہ صحبت صالح سے انسان اچھا اور صحبت طالح سے انسان برا بنتا ہے۔ اکثر لوگوں کی گمراہی کی وجہ غلط دوستوں کا انتخاب اور صحبت بد اختیار کرنا ہی ہے۔ اسی لیے حدیث میں بھی صالحین کی صحبت کی تاکید اور بری صحبت سے اجتناب کو ایک بہترین مثال سے واضح کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو مسلم، کتاب البر والصلة، باب استحباب مجالسة الصالحين.....)

(۲) مشرکین قرآن پڑھے جانے کے وقت خوب شور کرتے تاکہ قرآن نہ سنا جاسکے، یہ بھی بھران ہے، اس پر ایمان نہ لانا اور عمل نہ کرنا بھی بھران ہے، اس پر غور و فکر نہ کرنا اور اس کے اوامر پر عمل اور نواہی سے اجتناب نہ کرنا بھی بھران ہے۔ اسی طرح اس کو چھوڑ کر کسی اور کتاب کو ترجیح دینا، یہ بھی بھران ہے یعنی قرآن کا ترک اور اس کا چھوڑ دینا ہے، جس کے خلاف قیامت والے دن اللہ کے پیغمبر اللہ کی بارگاہ میں استغاثہ دائر فرمائیں گے۔

(۳) یعنی جس طرح اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) تیری قوم میں سے وہ لوگ تیرے دشمن ہیں جنہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا، اسی طرح گزشتہ امتوں میں بھی تھا، یعنی ہر نبی کے دشمن وہ لوگ ہوتے تھے جو گناہ گار تھے، وہ لوگوں کو گمراہی کی طرف بلاتے تھے سورہ الأنعام، آیت ۱۱۲ میں بھی یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔

(۴) یعنی یہ کافر لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں لیکن تیرا رب جس کو ہدایت دے، اس کو ہدایت سے کون

ہی کیوں نہ اتارا گیا^(۱) اسی طرح ہم نے (تھوڑا تھوڑا کر کے) اتارا تاکہ اس سے ہم آپ کا دل قوی رکھیں، ہم نے اسے ٹھہر ٹھہر کر ہی پڑھ سنایا ہے۔ (۳۲)^(۲)

یہ آپ کے پاس جو کوئی مثال لائیں گے ہم اس کا سچا جواب اور عمدہ توجیہ آپ کو بتادیں گے۔ (۳۳)^(۳)

جو لوگ اپنے منہ کے بل جنم کی طرف جمع کیے جائیں گے۔ وہی بدتر مکان والے اور گمراہ تر راستے والے ہیں۔ (۳۴)

اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور ان کے ہمراہ ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر بنا دیا۔ (۳۵)

اور کہہ دیا کہ تم دونوں ان لوگوں کی طرف جاؤ جو ہماری آیتوں کو جھٹلا رہے ہیں۔ پھر ہم نے انہیں بالکل ہی پامال کر دیا۔ (۳۶)

اور قوم نوح نے بھی جب رسولوں کو جھوٹا کہا تو ہم نے انہیں غرق کر دیا اور لوگوں کے لیے انہیں نشان عبرت بنا دیا۔ اور ہم نے ظالموں کے لیے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ (۳۷)

وَاحِدَةً كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلاً ﴿۳۲﴾

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴿۳۳﴾

الَّذِينَ يُضِرُّونَ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ إِلَىٰ جَهَنَّمَ أُولَٰئِكَ سَنُدْخِلُهُمْ فِي النَّارِ وَأَصْلُ سَبِيلًا ﴿۳۴﴾

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَا مَعَآخِرَ آيَاتِهِ هَارُونَ وَدَاوُدَ ﴿۳۵﴾

فَعَلْنَا ذَٰلِكَ بِأَلِي الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَإِنَّهُمْ فِي سَبِيلٍ مُّبِينًا ﴿۳۶﴾

وَقَوْمِ نُوحٍ إِذْ أَتَوْا الرُّسُلَ بِغُرُوحِهِمْ وَجَعَلْنَاهُمْ لِلنَّاسِ

آيَةً وَأَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۳۷﴾

روک سکتا ہے؟ اصل ہادی اور مددگار تو تیرا رب ہی ہے۔

(۱) جس طرح تورات، انجیل اور زبور وغیرہ کتابیں بیک مرتبہ نازل ہوئیں۔

(۲) اللہ نے جواب میں فرمایا کہ ہم نے حالات و ضروریات کے مطابق اس قرآن کو ۲۳ سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا تاکہ اسے پیغمبر ﷺ! تیرا اور اہل ایمان کا دل مضبوط ہو اور ان کے خوب ذہن نشین ہو جائے۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ حُكْمٍ مُّبِينٍ لِنُذَكِّرَ لَهُمُ الْآيَاتِ﴾ (سورۃ بنی اسرائیل - ۱۰۶) ”اور قرآن“ اس کو ہم نے جدا جدا کیا“ تاکہ تو اسے لوگوں پر رک رک کر پڑھے اور ہم نے اس کو وقفے وقفے سے اتارا“ اس قرآن کی مثال بارش کی طرح ہے۔ بارش جب بھی نازل ہوتی ہے، مردہ زمین میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور یہ فائدہ بالعموم اسی وقت ہوتا ہے جب بارش وقتاً فوقتاً نازل ہو، نہ کہ ایک ہی مرتبہ ساری بارش کے نزول سے۔

(۳) یہ قرآن کے وقفے وقفے سے اتارے جانے کی حکمت و علت بیان کی جا رہی ہے کہ یہ مشرکین جب بھی کوئی مثال یا اعتراض اور شبہ پیش کریں گے تو قرآن کے ذریعے سے ہم اس کا جواب یا وضاحت پیش کر دیں گے اور یوں انہیں لوگوں کو گمراہ کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔

اور عادیوں اور شمدیوں اور کنوئیں والوں کو^(۱) اور ان کے درمیان کی بہت سی امتوں کو^(۲) (ہلاک کر دیا)۔ (۳۸)
اور ہم نے ان کے سامنے مثالیں بیان کیں^(۳) پھر ہر ایک کو بالکل ہی تباہ و برباد کر دیا۔ (۳۹)^(۴)

یہ لوگ اس بستی کے پاس سے بھی آتے جاتے ہیں جن پر بری طرح کی بارش برسائی گئی۔^(۵) کیا یہ پھر بھی اسے دیکھتے نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ انہیں مرکز جی اٹھنے کی امید ہی نہیں۔^(۶) (۴۰)
اور تمہیں جب کبھی دیکھتے ہیں تو تم سے مسخر اپن کرنے لگتے ہیں۔ کہ کیا یہی وہ شخص ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔^(۷) (۴۱)

(وہ تو کہیں) کہ ہم اس پر سچے رہے ورنہ انہوں نے تو

وَعَادًا اَوْ شَمُوْدًا وَاَصْحَابَ الرَّيْسِ وَقُرُوْنَا الْبَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾

وَكُلًّا صَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ وَكُلَّمَا كَرِهْنَا نَدَّبْنَا بِهَا ﴿۳۹﴾

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا عَلٰی الْفَرٰثِيَةِ الْاَمْطَرَ السَّوْدَ اَقْلَمَ يَكُوْنُوْنَ اَبْرًا وَّهَآءِ بَلْ كَانُوْا اِلَّا يَجُوْنُوْنَ نَشُوْرًا ﴿۴۰﴾

وَاِذَا رَاوْكَ اِنْ يَنْبَغِيْكَ الْاَاهْرُوْا اِهْذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾

اِنْ كَاذِبًا لِّصَلْتِنَا عَنْ الْهَيْبَتِنَا لَوْ اَلَّا اَنْ صَبَرْنَا عَلَیْهَا وَسَوْفَ

- (۱) رَسْ کے معنی کنوئیں کے ہیں اَصْحَابُ الرَّيْسِ، کنوئیں والے۔ اس کی تعین میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے؛ امام ابن جریر طبری نے کہا ہے کہ اس سے مراد اصحاب الاخدود ہیں جن کا ذکر سورۃ البروج میں ہے (ابن کثیر)
(۲) قَوْمِ کے صحیح معنی ہیں؛ ہم عصر لوگوں کا ایک گروہ۔ جب ایک نسل کے لوگ ختم ہو جائیں تو دوسری نسل دوسرا قرن کہلائے گی۔ (ابن کثیر) اس معنی میں ہر نبی کی امت بھی ایک قرن ہو سکتی ہے۔
(۳) یعنی دلائل کے ذریعے سے ہم نے حجت قائم کر دی۔
(۴) یعنی اتمام حجت کے بعد۔

- (۵) بستی سے؛ قوم لوط کی بستیاں سدوم اور عموره وغیرہا مراد ہیں اور بری بارش سے پتھروں کی بارش مراد ہے۔ ان بستیوں کو الٹ دیا گیا تھا اور اس کے بعد ان پر کنکر پتھروں کی بارش کی گئی تھی جیسا کہ سورۃ ہود۔ ۸۲ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ بستیاں شام و فلسطین کے راستے میں پڑتی ہیں؛ جن سے گزر کر ہی اہل مکہ آتے جاتے تھے۔
(۶) اس لیے ان تباہ شدہ بستیوں اور ان کے کھنڈرات دیکھنے کے باوجود عبرت نہیں پکڑتے۔ اور آیات الہی اور اللہ کے رسول کی تکذیب سے باز نہیں آتے۔

- (۷) دوسرے مقام پر اس طرح فرمایا ﴿ اِهْذَا الَّذِيْ يَنْذِكُوْا الْهَيْبَتَكُمْ ﴾ (الانبياء۔ ۳۶) ”کیا یہی وہ شخص ہے جو تمہارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے؟“ یعنی ان کی بات کہتا ہے کہ وہ کچھ اختیار نہیں رکھتے۔ اس حقیقت کا اظہار ہی مشرکین کے نزدیک ان کے معبودوں کی توہین تھی؛ جیسے آج بھی قبر پرستوں کو کہا جائے کہ قبروں میں مدفون بزرگ کائنات میں تصرف کرنے کا اختیار نہیں رکھتے، تو کہتے ہیں کہ یہ اولیاء اللہ کی شان میں گستاخی کر رہے ہیں۔

ہمیں ہمارے معبودوں سے برکھا دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔^(۱) اور یہ جب عذابوں کو دیکھیں گے تو انہیں صاف معلوم ہو جائے گا کہ پوری طرح راہ سے بھٹکا ہوا کون تھا؟^(۲) (۳۲)

کیا آپ نے اسے بھی دیکھا جو اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہے کیا آپ اسکے ذمہ دار ہو سکتے ہیں؟^(۳) (۳۳)

کیا آپ اسی خیال میں ہیں کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں۔ وہ تو نرے چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے۔^(۴) (۳۴)

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے سایے کو کس

يَعْلَمُونَ حِينَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ أَصْلُ سَيْبِلًا ۝

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكَيْلًا ۝

أَمْ عَسَىٰ أَنْ أَكْفَرَهُمْ سَعُورًا أَوْ يَعْتَلُونَ إِنَّهُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَصْلُ سَيْبِلًا ۝

أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا ثُمَّ

(۱) یعنی ہم ہی اپنے آبا و اجداد کی تقلید اور روایتی مذہب سے وابستگی کی وجہ سے غیر اللہ کی عبادت سے باز نہیں آئے ورنہ اس پیغمبر ﷺ نے تو ہمیں گمراہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کا یہ قول نقل فرمایا کہ کس طرح وہ شرک پر جتھے ہوئے ہیں کہ اس پر فخر کر رہے ہیں۔

(۲) یعنی اس دنیا میں تو ان مشرکین اور غیر اللہ کے پجاریوں کو اہل توحید گمراہ نظر آتے ہیں لیکن جب یہ اللہ کی بارگاہ میں پہنچیں گے اور وہاں انہیں شرک کی وجہ سے عذاب الہی سے دوچار ہونا پڑے گا تو پتہ لگے گا کہ گمراہ کون تھا؟ ایک اللہ کی عبادت کرنے والے یا درود پر اپنی جنینیں جھکانے والے؟

(۳) یعنی جو چیز اس کے نفس کو اچھی لگی، اسی کو اپنا دین و مذہب بنا لیا، کیا ایسے شخص کو تو راہ یاب کر سکتا ہے یا اللہ کے عذاب سے چھڑا سکے گا؟ اس کو دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا ”کیا وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل مزین کر دیا گیا، پس وہ اسے اچھا سمجھتا ہے، پس اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہ یاب۔ پس تو ان پر حسرت و افسوس نہ کر“ (طہ ۸۰)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں آدمی ایک عرصے تک سفید پتھر کی عبادت کرتا رہتا، جب اسے اس سے اچھا پتھر نظر آجاتا تو وہ پہلے پتھر کو چھو ڈ کر دوسرے پتھر کی پوجا شروع کر دیتا (ابن کثیر) مطلب یہ ہے کہ ایسے اشخاص، جو عقل و فہم سے اس طرح عاری اور محض خواہش نفس کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہیں۔ اے پیغمبر کیا تو ان کو ہدایت کے راستے پر لگا سکتا ہے؟ یعنی نہیں لگا سکتا۔

(۴) یعنی یہ چوپائے جس مقصد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اسے وہ سمجھتے ہیں۔ لیکن انسان، جسے صرف ایک اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا تھا، وہ رسولوں کی یاد دہانی کے باوجود اللہ کے ساتھ شرک کا ارتکاب کرتا اور درود پر اپنا مانتا نیتا پھرتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ یقیناً چوپائے سے بھی زیادہ بدتر اور گمراہ ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيهِم مِّنْ آيَاتِنَا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ
إِلَّا كَفُورًا ۝۱۰

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَاكَ آيَاتٍ مِّنْ سَمَوَاتِنَا وَلَٰكِن لَّا تُؤْمِنُ ۝۱۱

لَا تُطِيعُ الْكُفْرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جَهَادًا كَبِيرًا ۝۱۲

وَهُوَ الَّذِي مَرَّ بِالْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذَابٌ قَاتِلٌ وَهَذَا مِلْحٌ
أُجَابٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا ۝۱۳

اور بیشک ہم نے اسے ان کے درمیان طرح طرح سے
بیان کیا تاکہ ^(۱) وہ نصیحت حاصل کریں، مگر پھر بھی اکثر
لوگوں نے سوائے ناشکری کے مانا نہیں۔ ^(۲) (۵۰)
اگر ہم چاہتے تو ہر ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج
دیتے۔ (۵۱)

پس آپ کافروں کا کتنا نہ مانیں اور قرآن کے ذریعہ ان
سے پوری طاقت سے بڑا جہاد کریں۔ ^(۳) (۵۲)
اور وہی ہے جس نے دو سمندر آپس میں ملا رکھے
ہیں، یہ ہے بیٹھا اور مزیدار اور یہ ہے کھاری کڑوا، ^(۴)
اور ان دونوں کے درمیان ایک حجاب اور مضبوط

جیسے وضو کے پانی کو وضو اور ایندھن کو وود کہا جاتا ہے، اس معنی میں پانی طاہر (خود بھی پاک) اور مطہر (دوسروں کو پاک
کرنے والا) بھی ہے۔ حدیث میں بھی ہے «إِنَّ الْمَاءَ طَهُورٌ لَا يَنْجَسُهُ شَيْءٌ» (ابوداؤد، الترمذی، نمبر ۶۶، النسائی و
ابن ماجہ و صحیحہ الألبانی فی السنن) ”پانی پاک ہے، اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی“ ہاں اگر اس کا رنگ یا بو یا
ذائقہ بدل جائے تو ایسا پانی ناپاک ہے۔ کما فی الحدیث۔

(۱) یعنی قرآن کریم کو۔ اور بعض نے صَرَّفْنَا میں ہا کا مرجع بارش قرار دیا ہے، جس کا مطلب یہ ہو گا کہ بارش کو ہم پھیر پھیر
کر برساتے ہیں یعنی کبھی ایک علاقے میں، کبھی دوسرے علاقے میں۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی ایک ہی شہر کے
ایک حصے میں بارش ہوتی ہے، دوسروں میں نہیں ہوتی اور کبھی دوسرے حصوں میں ہوتی ہے، پہلے حصے میں نہیں ہوتی یہ اللہ کی حکمت
و مشیت ہے، وہ جس طرح چاہتا ہے، کہیں بارش برساتا ہے اور کہیں نہیں اور کبھی کسی علاقے میں اور کبھی کسی اور علاقے میں۔

(۲) اور ایک کفر اور ناشکری یہ بھی ہے کہ بارش کو مشیت الہی کی بجائے ستاروں کی گردش کا نتیجہ قرار دیا جائے، جیسا
کہ اہل جاہلیت کہا کرتے تھے۔ كَمَا فِي الْحَدِيثِ .

(۳) لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا اور صرف آپ کو ہی تمام بستیوں بلکہ تمام انسانوں کے لیے نذر بنا کر بھیجا ہے۔

(۴) جَاهِدْهُمْ بِهِ میں ہا کا مرجع قرآن ہے یعنی اس قرآن کے ذریعے سے جہاد کریں، یہ آیت کلی ہے، ابھی جہاد کا حکم
نہیں ملا تھا۔ اس لیے مطلب یہ ہوا کہ قرآن کے اوامر و نواہی کھول کھول کر بیان کریں اور اہل کفر کے لیے جو زبر و توخ
اور وعیدیں ہیں، وہ واضح کریں۔

(۵) آب شیریں کو فرات کہتے ہیں، فُرَاتُ کے معنی ہیں کلاٹ دینا، تو ڈرنا، بیٹھا پانی پیاس کو کلاٹ دیتا ہے یعنی ختم کر دینا
ہے۔ أُجَابٌ سخت کھاری یا کڑوا۔

اوٹ کر دی۔^(۱) (۵۳)

وہ ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اسے نسب والا اور سسرالی رشتوں والا کر دیا۔^(۲) بلاشبہ آپ کا

پروردگار (ہر چیز پر) قادر ہے۔ (۵۳)

یہ اللہ کو چھوڑ کر انکی عبادت کرتے ہیں جو نہ تو انہیں کوئی نفع دے سکیں نہ کوئی نقصان پہنچا سکیں، اور کافر تو ہے ہی

اپنے رب کے خلاف (شیطان کی) مدد کرنے والا۔ (۵۵)

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا
وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ۝

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ
وَكَانَ الْكَافِرُ عَلَىٰ رَبِّهِ ظَهِيرًا ۝

(۱) جو ایک دوسرے سے ملنے نہیں دیتی۔ بعض نے حجرتاً منججوداً کے معنی کیے ہیں حَرَامًا مَحْرَمًا ان پر حرام کر دیا گیا ہے کہ بیٹھاپانی کھاری یا کھاری پانی میٹھا ہو جائے۔ اور بعض مفسرین نے مَرَجَ الْبَخْرَيْنِ کا ترجمہ کیا ہے، خَلَقَ الْمَاءَيْنِ 'دوپانی پیدا کیے' ایک میٹھا اور دو سرا کھاری۔ بیٹھاپانی تو وہ ہے جو نہروں، چشموں اور کونوؤں کی شکل میں آبادیوں کے درمیان پایا جاتا ہے جس کو انسان اپنی ضروریات کے لیے استعمال کرتا ہے اور کھاری پانی وہ ہے جو مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے بڑے بڑے سمندروں میں ہے، جو کتے ہیں کہ زمین کا تین چوتھائی حصہ ہیں اور ایک چوتھائی حصہ خشکی کا ہے جس میں انسانوں اور حیوانوں کا بئیرا ہے۔ یہ سمندر ساکن ہیں۔ البتہ ان میں مدوجزر ہوتا رہتا اور موجود کلاطم جاری رہتا ہے۔ سمندر روں پانی کے کھاری رکھنے میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمت ہے۔ بیٹھاپانی زیادہ دیر تک کہیں ٹھہرا رہے تو وہ خراب ہو جاتا ہے، اس کے ذائقے، رنگ یا بو میں تبدیلی آجاتی ہے۔ کھاری پانی خراب نہیں ہوتا، نہ اس کا ذائقہ بدلتا ہے نہ رنگ اور بو۔ اگر ان ساکن سمندر روں کا پانی بھی میٹھا ہوتا، تو اس میں بدبو پیدا ہو جاتی، جس سے انسانوں اور حیوانوں کا زمین میں رہنا مشکل ہو جاتا۔ اس میں مرنے والے جانوروں کی سڑانہ اس پر مستزاد۔ اللہ کی حکمت تو یہ ہے کہ ہزاروں برس سے یہ سمندر موجود ہیں اور ان میں ہزاروں جانور مرتے ہیں اور انہی میں گل سڑ جاتے ہیں۔ لیکن اللہ نے ان میں ملاحت (نملیات) کی اتنی مقدار رکھ دی ہے کہ وہ اس کے پانی میں ذرا بھی بدبو پیدا نہیں ہونے دیتی۔ ان سے اٹھنے والی ہوائیں بھی صحیح ہیں اور ان کا پانی بھی پاک ہے حتیٰ کہ ان کا مردار بھی حلال ہے۔ کمانی الحدیث۔ (موطا امام مالک، ابن ماجہ، أبو داؤد، الترمذی، کتاب الطہارۃ، النسائی، کتاب المیاء) تفسیر ابن کثیر۔

(۲) نسب سے مراد وہ رشتے داریاں ہیں جو باپ یا ماں کی طرف سے ہوں اور صہر سے مراد وہ قرابت مندی ہے جو شادی کے بعد بیوی کی طرف سے ہو، جس کو ہماری زبان میں سسرالی رشتے کہا جاتا ہے۔ ان دونوں رشتے داریوں کی تفصیل آیت ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ﴾ (النساء، ۲۳) اور ﴿وَلَا تَنْكِحُوا آبَاءَكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ﴾ (النساء، ۲۲) میں بیان کر دی گئی ہے۔ اور رضاعی رشتے داریاں حدیث کی رو سے نسبی رشتوں میں شامل ہے۔ جیسا کہ فرمایا یَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ

ہم نے تو آپ کو خوشخبری اور ڈر سنانے والا (نبی) بنا کر بھیجا ہے۔ (۵۶)

کہہ دیجئے کہ میں قرآن کے پہنچانے پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر جو شخص اپنے رب کی طرف راہ پکڑنا چاہے۔ (۵۷)

اس ہمیشہ زندہ رہنے والے اللہ تعالیٰ پر توکل کریں جسے کبھی موت نہیں اور اسکی تعریف کے ساتھ پاکیزگی بیان کرتے رہیں، وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے کافی خبردار ہے۔ (۵۸)

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کو چھ دن میں پیدا کر دیا ہے، پھر عرش پر مستوی ہوا، وہ رحمن ہے، آپ اس کے بارے میں کسی خبردار سے پوچھ لیں۔ (۵۹)

ان سے جب بھی کہا جاتا ہے کہ رحمن کو سجدہ کرو تو جواب دیتے ہیں رحمن ہے کیا؟ کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کا تو ہمیں حکم دے رہا ہے اور اس (تبلیغ) نے ان کی نفرت میں مزید اضافہ کر دیا۔ (۶۰)

بابرکت ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے (۶۱) اور

وَمَا أَسْأَلُكَ إِلَّا الْبَيْتَ وَأَوْدِيَّتَهُ ۝۱۹

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ

أَنْ يَخْدَنَا إِلَى رَبِّهِ سَبِيلًا ۝۲۰

وَوَجَّهَ عَلَى الْحَقِّ الَّذِي لَمْ يَكُنْ لِي وَبِهِ يَصْطَبُ ۝ وَكُنْ بِهِ

يَذُوقُ عَذَابَ حَيْبَرًا ۝۲۱

الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝۲۲

الَّذِي

وَلَدَّاقِيلَ لَهُمْ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَنِ قَالُوا وَمَا

الرَّحْمَنُ أَنْعْبُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُورًا ۝۲۳

تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا

(۱) یعنی یہی میرا اجر ہے کہ رب کا راستہ اختیار کر لو۔

(۲) رَحْمَن، رَحِيم اللہ کی صفات اور اسمائے حسنیٰ میں سے ہیں لیکن اہل جاہلیت، اللہ کو ان ناموں سے نہیں پہچانتے تھے۔ جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدے کے آغاز پر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھوایا، تو مشرکین مکہ نے کہا، ہم رحمن و رحیم کو نہیں جانتے۔ بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ! لکھو۔ (سیرت ابن ہشام، ۲/۳۱۷) مزید دیکھئے سورہ بنی اسرائیل، ۱۱۰-۱۱۱-۱۱۲۔

(۳) بُرُوج بُرُج کی جمع ہے، سلف کی تفسیر میں بروج سے مراد بڑے بڑے ستارے لیے گئے ہیں۔ اور اسی مراد پر کلام کا نظم واضح ہے کہ بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے اور سورج اور چاند بنائے۔ بعد کے مفسرین نے اس سے اہل نجوم کے مصطلح بروج مراد لے لیے۔ اور یہ بارہ برج ہیں۔ حمل، ثور، جوزاء، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت۔ اور یہ برج سات بڑے سیاروں کی منزلیں ہیں۔ جن کے نام ہیں، مریخ، زہرہ، عطارد، قمر، شمس، مشتری اور زحل۔ یہ کوکب (سیارے) ان برجوں میں اس طرح اترتے ہیں، جیسے یہ ان کے لیے

يَسْرِعًا وَكَمَرًا تُنِيرُوا ⑩

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنۢ أَرَادَ أَن يَذَّكَّرَ

أَوْ أَرَادَ شُكُورًا ⑪

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِينَ يَتَّقُونَ عَلَى الْاَرْضِ هَوًا وَإِذَا اَخَاطَبَهُمُ

الْحٰجِلُونَ قَالُوا سَلٰمًا ⑫

وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ لِآرِبِهِمْ سُبْحٰنًا وَقِيٰمًا ⑬

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ

اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ⑭

اس میں آفتاب بنایا اور منور مستاب بھی۔ (۶۱)

اور اسی نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے
جانے والا بنایا ^(۱) اس شخص کی نصیحت کے لیے جو نصیحت

حاصل کرنے یا شکرگزاری کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ (۶۲)

رحمن کے (سچے) بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ
چلتے ہیں اور جب بے علم لوگ ان سے باتیں کرنے لگتے ہیں

تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ سلام ہے۔ ^(۲) (۶۳)

اور جو اپنے رب کے سامنے سجدے اور قیام کرتے

ہوئے راتیں گزار دیتے ہیں۔ (۶۴)

اور جو یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم سے

دوزخ کا عذاب پرے ہی پرے رکھ، کیونکہ اس کا عذاب

چمٹ جانے والا ہے۔ ^(۳) (۶۵)

عالی شان محل ہیں (الیر التفاسیر)

(۱) یعنی رات جاتی ہے تو دن آجاتا ہے اور دن آتا ہے تو رات چلی جاتی ہے۔ دونوں بیک وقت جمع نہیں ہوتے، اس کے
فوائد و مصالح محتاج وضاحت نہیں۔ بعض نے خِلْفَةَ کے معنی ایک دوسرے کے مخالف کے کیے ہیں یعنی رات تاریک ہے
تو دن روشن۔

(۲) اسلام سے مراد یہاں اعراض اور ترک بحث و مجادلہ ہے۔ یعنی اہل ایمان، اہل جہالت و اہل سفاہت سے الجھتے نہیں
ہیں بلکہ ایسے موقعوں پر اعراض و گریز کی پالیسی اختیار کرتے ہیں اور بے فائدہ بحث نہیں کرتے۔

(۳) اس سے معلوم ہوا کہ رحمن کے بندے وہ ہیں جو ایک طرف راتوں کو اٹھ کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور دوسری
طرف وہ ڈرتے بھی ہیں کہ کہیں کسی غلطی یا کوتاہی پر اللہ کی گرفت میں نہ آجائیں، اس لیے وہ عذاب جنم سے بھی پناہ
طلب کرتے ہیں۔ گویا اللہ کی عبادت و اطاعت کے باوجود اللہ کے عذاب اور اس کے مؤاخذے سے انسان کو بے خوف
اور اپنی عبادت و طاعات الہی پر کسی غرور اور گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ اسی مفہوم کو دوسرے مقام پر اس طرح
بیان فرمایا گیا ہے ﴿ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتٰوْا فَلَؤَ اِنَّهُمْ لَخِلْفَةٌ لِّرَبِّهِمْ لَا يُحْمَلُوْنَ ﴾ (المؤمنون - ۶۰) اور وہ لوگ کہ
جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل ڈرتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ”ڈر صرف اسی بات کا نہیں
کہ انہیں بارگاہ الہی میں حاضر ہونا ہے، بلکہ اس کے ساتھ، اس کا بھی کہ ان کا صدقہ و خیرات قبول ہوتا ہے یا نہیں؟
حدیث میں آیت کی تفسیر میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کی

إِنهَآ سَاءَتٌ مُّسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ۝

بے شک وہ ٹھہرنے اور رہنے کے لحاظ سے بدترین جگہ ہے۔ (۶۶)

اور جو خرچ کرتے وقت بھی نہ تو اسراف کرتے ہیں نہ بخیلی، بلکہ ان دونوں کے درمیان معتدل طریقے پر خرچ کرتے ہیں^(۱) (۶۷)

اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور کسی ایسے شخص کو جسے قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا ہو وہ بجز حق کے قتل نہیں کرتے،^(۲) نہ وہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں^(۳) اور جو کوئی یہ کام کرے وہ اپنے اوپر سخت وبال لائے گا۔ (۶۸)

اسے قیامت کے دن دو ہرا عذاب کیا جائے گا اور وہ ذلت

وَالَّذِينَ إِذَا أَفْقَعُوا أَلْمُ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا ۝

وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَتَامًا ۝

يُضْعَفُ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدُ فِيهِ مُهَانًا ۝

بابت پوچھا کہ کیا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے اور چوری کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا، 'نہیں' اے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی بیٹی! بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے، نماز پڑھتے اور صدقہ کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کے یہ اعمال نامقبول نہ ہو جائیں۔ (الترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ المؤمنون)

(۱) اللہ کی نافرمانی میں خرچ کرنا اسراف اور اللہ کی اطاعت میں خرچ نہ کرنا بخیلی اور اللہ کے احکام و اطاعت کے مطابق خرچ کرنا قوام ہے (فتح القدیر) اسی طرح نفقات واجبہ اور مباحات میں حد اعتدال سے تجاوز بھی اسراف میں آسکتا ہے، اس لیے وہاں بھی احتیاط اور میانہ روی نہایت ضروری ہے۔

(۲) اور حق کے ساتھ قتل کرنے کی تین صورتیں ہیں، 'اسلام کے بعد کوئی دوبارہ کفر اختیار کرے' جسے ارتداد کہتے ہیں، یا شادی شدہ ہو کر بدکاری کا ارتکاب کرے یا کسی کو قتل کر دے۔ ان صورتوں میں قتل کیا جائے گا۔

(۳) حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا، 'کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟' آپ ﷺ نے فرمایا، 'یہ کہ تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے دراصل حالیکہ اس نے تجھے پیدا کیا۔ اس نے کہا، اس کے بعد کون سا گناہ بڑا ہے؟' فرمایا، 'اپنی اولاد کو اس خوف سے قتل کرنا کہ وہ تیرے ساتھ کھائے گی، اس نے پوچھا، پھر کون سا؟' آپ ﷺ نے فرمایا، 'یہ کہ تو اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان باتوں کی تصدیق اس آیت سے ہوتی ہے۔ پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ (البخاری، تفسیر سورۃ البقرۃ، 'مسلم' کتاب الإیمان، باب کون الشریک أفسح الذنوب)

و خواری کے ساتھ ہمیشہ اسی میں رہے گا۔ (۶۹)

سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کریں اور ایمان لائیں اور نیک کام کریں،^(۱) ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دیتا ہے،^(۲) اللہ بخشنے والا مہربانی کرنے والا ہے۔ (۷۰)

اور جو شخص توبہ کرے اور نیک عمل کرے وہ تو (حقیقتاً) اللہ تعالیٰ کی طرف سچا رجوع کرتا ہے۔^(۳) (۷۱)

اور جو لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے^(۴) اور جب

إِلَٰمِن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ
اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿۶۹﴾

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ﴿۷۰﴾

وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا ﴿۷۱﴾

(۱) اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں خالص توبہ سے ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے، چاہے وہ کتنا ہی بڑا ہو۔ اور سورہ نساء کی آیت ۹۳ میں جو مومن کے قتل کی سزا جہنم بتلائی گئی ہے، تو وہ اس صورت پر محمول ہوگی، جب قاتل نے توبہ نہ کی ہو اور بغیر توبہ کیے ہی فوت ہو گیا ہو۔ ورنہ حدیث میں آتا ہے کہ سو آدمی کے قاتل نے بھی خالص توبہ کی تو اللہ نے اسے معاف فرما دیا (صحیح مسلم، کتاب التوبۃ)

(۲) اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا حال تبدیل فرما دیتا ہے، اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ برائیاں کرتا تھا، اب نیکیاں کرتا ہے، پہلے شرک کرتا تھا، اب صرف الہ واحد کی عبادت کرتا ہے، پہلے کافروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑتا تھا، اب مسلمانوں کی طرف سے کافروں سے لڑتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے معنی ہیں کہ اس کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیا جاتا ہے۔ اس کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”میں اس شخص کو جانتا ہوں، جو سب سے آخر میں جنت میں داخل ہونے والا اور سب سے آخر میں جہنم سے نکلنے والا ہو گا۔ یہ وہ آدمی ہو گا کہ قیامت کے دن اس پر اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ پیش کیے جائیں گے، بڑے گناہ ایک طرف رکھ دیئے جائیں گے۔ اس کو کہا جائے گا کہ تو نے فلاں فلاں دن فلاں فلاں کام کیا تھا؟ وہ اثبات میں جواب دے گا، انکار کی اسے طاقت نہ ہوگی، علاوہ ازیں وہ اس بات سے بھی ڈر رہا ہو گا کہ ابھی تو بڑے گناہ بھی پیش کیے جائیں گے۔ کہ اتنے میں اس سے کہا جائے گا کہ جا، تیرے لیے ہر برائی کے بدلے ایک نیکی ہے۔ اللہ کی یہ مہربانی دیکھ کر وہ کہے گا کہ ابھی تو میرے بہت سے اعمال ایسے ہیں کہ میں انہیں یہاں نہیں دیکھ رہا، یہ بیان کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے دانت ظاہر ہو گئے، (صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب اُدْنَىٰ أَهْلِ الْجَنَّةِ مَنْزِلَةٌ فِيهَا)

(۳) پہلی توبہ کا تعلق کفر و شرک سے ہے۔ اس توبہ کا تعلق دیگر معاصی اور گناہوں سے ہے۔

(۴) زور کے معنی جھوٹ کے ہیں۔ ہر باطل چیز بھی جھوٹ ہے، اس لیے جھوٹی گواہی سے لے کر کفر و شرک اور ہر طرح کی غلط چیزیں مثلاً لہو و لعب، گانا اور دیگر بیہودہ جاہلانہ رسوم و افعال، سب اس میں شامل ہیں اور عباد الرحمن کی یہ صفت

کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہوتا ہے تو شرافت سے گزر جاتے ہیں۔ (۷۲)^(۱)

اور جب انہیں ان کے رب کے کلام کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ اندھے بہرے ہو کر ان پر نہیں گرتے۔ (۷۳)^(۲)

اور یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما^(۳) اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔ (۷۴)^(۳)

یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے صبر کے بدلے جنت کے بلند و بالا خانے دیئے جائیں گے جہاں انہیں دعا سلام پہنچایا جائے گا۔ (۷۵)

اس میں یہ ہمیشہ رہیں گے، وہ بہت ہی اچھی جگہ اور عمدہ مقام ہے۔ (۷۶)

کہہ دیجئے! اگر تمہاری دعا التجا (پکارنا) نہ ہوتی تو میرا رب تمہاری مطلق پروا نہ کرتا،^(۵) تم تو جھٹلا چکے اب عنقریب اس کی سزا تمہیں چٹ جانے والی ہوگی۔ (۷۷)^(۶)

وَالَّذِينَ إِذَا دُكِرُوا بِآيَاتِنَا بِهِمْ وَاطَّاعُوا أَمْرًا وَهُمْ يَكْفُرُونَ ۝

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ۝

أُولَئِكَ يُجْزَوْنَ الْعُقُوبَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا مَنَازِلَ وَسْلَامًا ۝

خَالِدِينَ فِيهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ۝

قُلْ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّاكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا ۝

بھی ہے کہ وہ کسی بھی جھوٹ میں اور جھوٹ کی مجلسوں میں حاضر نہیں ہوتے۔

(۱) لغو ہر وہ بات اور کام ہے، جس میں شرعاً کوئی فائدہ نہیں۔ یعنی ایسے کاموں اور باتوں میں بھی وہ شرکت نہیں کرتے بلکہ خاموشی کے ساتھ عزت و وقار سے گزر جاتے ہیں۔

(۲) یعنی وہ ان سے اعراض و غفلت نہیں برتتے؛ جیسے وہ بہرے ہوں کہ سنیں ہی نہیں یا اندھے ہوں کہ دیکھیں ہی نہیں۔ بلکہ وہ غور اور توجہ سے سنتے اور انہیں آویزہ گوش اور حرز جان بناتے ہیں۔

(۳) یعنی انہیں اپنا بھی فرماں بردار بنا اور ہمارا بھی اطاعت گزار؛ جس سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

(۴) یعنی ایسا اچھا نمونہ کہ خیر میں وہ ہماری اقتدار کریں۔

(۵) دعا و التجا کا مطلب، اللہ کو پکارنا اور اس کی عبادت کرنا ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمہارا مقصد تخلیق اللہ کی عبادت ہے، اگر یہ نہ ہو تو اللہ کو تمہاری کوئی پروا نہ ہو۔ یعنی اللہ کے ہاں انسان کی قدر و قیمت، اس کے اللہ پر ایمان لانے اور اس کی عبادت کرنے کی وجہ سے ہے۔

(۶) اس میں کافروں سے خطاب ہے کہ تم نے اللہ کو جھٹلایا ہے، سو اب اس کی سزا بھی لازماً تمہیں چکھنی ہے۔ چنانچہ دنیا میں یہ

سورہ شعراء کی ہے اور اس میں دو سو ستائیس آیتیں اور
گیارہ رکوع ہیں۔

سُورَةُ الشُّعْرَاءِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

طسّٰ ۱ ۱ تَلٰكِ اٰیٰتِ الْكِتٰبِ الْبَیِّنِ ۲

تَلٰكِ بَاخِعٍ نَّفْسِكَ اَلَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ۳

اِنْ تَنْتٰهُنَّزَلَ عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَةٌ فَظَلَكْتَ

اَعْنَآفُهُمْ لَهَا خٰضِعِیْنَ ۴

وَمَا یَأْتِیْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحَدِّثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْتَهُ

مُعْرِضِیْنَ ۵

فَقَدْ كَذَّبُوْا فِیْ سَآئِیَاتِهِمْ اَنْتٰهُنَّ اَمَا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۶

اَوْلٰئِكَ یُرُوْا اِلٰی الْاَرْضِ كَمَا اَنْتٰنَا فِیْهَا مِنْ قَبْلِ ذٰلِكَ كُوْنُوْهُ ۷

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

طسم (۱) یہ آیتیں روشن کتاب کی ہیں۔ (۲)

ان کے ایمان نہ لانے پر شاید آپ تو اپنی جان کھودیں
گے۔ (۳)

اگر ہم چاہتے تو ان پر آسمان سے کوئی ایسی نشانی اتارتے
کہ جس کے سامنے ان کی گردنیں خم ہو جاتیں۔ (۴)
اور ان کے پاس رحمن کی طرف سے جو بھی نئی نصیحت
آئی یہ اس سے روگردانی کرنے والے بن گئے۔ (۵)

ان لوگوں نے جھٹلایا ہے اب انکے پاس جلدی سے اسکی
خبریں آجائیں گی جسکے ساتھ وہ مسخرین کر رہے ہیں۔ (۶)
کیا انہوں نے زمین پر نظریں نہیں ڈالیں؟ کہ ہم نے اس
میں ہر طرح کے نفیس جوڑے کس قدر اگائے ہیں؟ (۷)

سزا برد میں شکست کی صورت میں انہیں ملی اور آخرت میں جہنم کے دائمی عذاب سے بھی انہیں دوچار ہونا پڑے گا۔

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانیت سے جو ہمدردی اور ان کی ہدایت کے لیے جو تڑپ تھی، اس میں اس کا اظہار ہے۔
(۲) یعنی جسے مانے اور جس پر ایمان لائے بغیر چارہ نہ ہو تا۔ لیکن اس طرح جبر کا پہلو شامل ہو جاتا، جب کہ ہم نے انسان
کو ارادہ و اختیار کی آزادی دی ہے تاکہ اس کی آزمائش کی جائے۔ اس لیے ہم نے ایسی نشانی بھی اتارنے سے گریز کیا،
جس سے ہمارا یہ قانون متاثر ہو۔ اور صرف انبیاء و رسل بھیجے اور کتابیں نازل کرنے پر ہی اکتفا کیا۔

(۳) یعنی تکذیب کے نتیجے میں ہمارا عذاب عنقریب انہیں اپنی گرفت میں لے لے گا، جسے وہ ناممکن سمجھ کر استہزا و
مذاق کرتے ہیں۔ یہ عذاب دنیا میں بھی ممکن ہے، جیسا کہ کئی قومیں تباہ ہوئیں، بصورت دیگر آخرت میں تو اس سے کسی
صورت چھکارا نہیں ہو گا۔ ماکانوا عنہ معترضین نہیں کہا بلکہ ماکانوا بہ يستهزؤن کہا۔ کیوں کہ استہزا ایک تو
اعراض و تکذیب کو بھی مستلزم ہے۔ دوسرے، یہ اعراض و تکذیب سے زیادہ بڑا جرم ہے (فتح القدیر)

(۴) ذوق کے دوسرے معنی یہاں صنف اور نوع کے کیے گئے ہیں۔ یعنی ہر قسم کی چیزیں ہم نے پیدا کیں جو کریم ہیں

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ①

وَأَنَّ رَبَّكَ لَهْوَالْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ②

وَإِذْ تَأَذَىٰ رَبُّكَ مُوسَىٰ أَنْ اتَّخَذَ الْقَوْمُ الظَّالِمِيْنَ ③

قَوْمًا فَزَعَوْا عَلَىٰ آلِهَتِهِمْ ④

قَالَ رَبِّ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَيِّدَ بِي ⑤

وَيُضَيِّقْ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي فَأَنصِبْ إِلَىٰ هَؤُلَاءِ ⑥

وَأَهْوِئْ لِي ذَنْبًا فَلَاحِقَ أَنْ يَنْتَلُوْنِي ⑦

بیشک اس میں یقیناً نشانی ہے^(۱) اور ان میں کے اکثر لوگ
مومن نہیں ہیں۔^(۲) (۸)

اور تیرا رب یقیناً وہی غالب اور مہربان ہے۔^(۳) (۹)

اور جب آپ کے رب نے موسیٰ (علیہ السلام) کو آواز
دی کہ تو ظالم قوم کے پاس جا۔^(۴) (۱۰)

قوم فرعون کے پاس، کیا وہ پرہیزگاری نہ کریں گے۔^(۱۱)
موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا میرے پروردگار! مجھے تو خوف
ہے کہ کہیں وہ مجھے جھٹلا نہ دیں۔^(۱۲) (۱۱)

اور میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے^(۱۳) میری زبان چل نہیں
رہی^(۱۴) پس تو ہارون کی طرف بھی (وحی) بھیج۔^(۱۵) (۱۳)

اور ان کا مجھ پر میرے ایک قصور کا (دعویٰ) بھی ہے مجھے
ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھے مار نہ ڈالیں۔^(۱۶) (۱۳)

یعنی انسان کے لیے بہتر اور فائدے مند ہیں جس طرح غلہ جات ہیں، پھل میوے ہیں اور حیوانات وغیرہ ہیں۔

(۱) یعنی جب اللہ تعالیٰ مردہ زمین سے یہ چیزیں پیدا کر سکتا ہے، تو کیا وہ انسانوں کو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا۔

(۲) یعنی اس کی یہ عظیم قدرت دیکھنے کے باوجود اکثر لوگ اللہ اور رسول کی تکذیب ہی کرتے ہیں، ایمان نہیں لاتے۔

(۳) یعنی ہر چیز پر اس کا غلبہ اور انتقام لینے پر وہ ہر طرح قادر ہے لیکن چونکہ وہ رحیم بھی ہے اس لیے فوراً گرفت نہیں
فرماتا بلکہ پوری مہلت دیتا ہے اور اس کے بعد مؤاخذہ کرتا ہے۔

(۴) یہ رب کی اس وقت کی ندا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے اپنی اہلیہ کے ہمراہ واپس آرہے تھے، راستے میں
انہیں حرارت حاصل کرنے کے لیے آگ کی ضرورت محسوس ہوئی تو آگ کی تلاش میں کوہ طور پہنچ گئے، جہاں ندائے نبوی
نے ان کا استقبال کیا اور انہیں نبوت سے سرفراز کر دیا گیا اور ظالموں کو اللہ کا پیغام پہنچانے کا فریضہ انکو سونپ دیا گیا۔

(۵) اس خوف سے کہ وہ نہایت سرکش ہے، میری تکذیب کرے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ طبعی خوف انبیاء کو بھی لاحق
ہو سکتا ہے۔

(۶) یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام زیادہ فصیح اللسان نہیں تھے۔ یا اس طرف کہ زبان پر
انگاہ رکھنے کی وجہ سے کلمت پیدا ہو گئی تھی، جسے اہل تفسیر بیان کرتے ہیں۔

(۷) یعنی ان کی طرف جبرائیل علیہ السلام کو وحی دے کر بھیج اور انہیں بھی وحی و نبوت سے سرفراز فرما کر میرا معاون بنا۔

(۸) یہ اشارہ ہے اس قتل کی طرف، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے غیر ارادی طور پر ہو گیا تھا اور مقتول قبلی یعنی

قَالَ كَلَاهُ فَاذْهَبْ يَا بِلَيْتِنَا اَنَا مَعَكُمْ مُتَسِعُونَ ﴿۱۵﴾

جناب باری نے فرمایا! ہرگز ایسا نہ ہوگا، تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ^(۱) ہم خود سننے والے تمہارے ساتھ ہیں۔^(۲) (۱۵)

فَأَيُّهَا فِرْعَوْنُ فَقَوْلًا اِنَّا رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶﴾

تم دونوں فرعون کے پاس جا کر کہو کہ بلاشبہ ہم رب العالمین کے بھیجے ہوئے ہیں۔ (۱۶)

اِنَّ اَنْبِيَا مَعَنَا بِنِي اِسْرَائِيْلَ ﴿۱۷﴾

کہ تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو روانہ کر دے۔ (۱۷)^(۳) فرعون نے کہا کہ کیا ہم نے تجھے تیرے بچپن کے زمانہ میں اپنے ہاں نہیں پالا تھا؟^(۴) اور تو نے اپنی عمر کے بہت سے سال ہم میں نہیں گزارے؟^(۵) (۱۸)

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فَبِمَا كَلَّمْنَا مِنْ عُنُقِكَ بِسَبِّئِنَّ ﴿۱۸﴾

فرعون کی قوم سے تھا، اس لیے فرعون اس کے بدلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنا چاہتا تھا، جس کی اطلاع پا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے مدین چلے گئے تھے۔ اس واقعے پر اگرچہ کئی سال گزر چکے تھے، مگر فرعون کے پاس جانے میں واقعی یہ امکان موجود تھا کہ فرعون ان کو اس جرم میں پکڑ کر قتل کی سزا دینے کی کوشش کرے۔ اس لیے یہ خوف بھی بلا جواز نہیں تھا۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ تم دونوں جاؤ، میرا پیغام اس کو پہنچاؤ، تمہیں جو اندیشے لاحق ہیں ان سے ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔ آیات سے مراد وہ دلائل و براہین ہیں جن سے ہر پیغمبر کو آگاہ کیا جاتا ہے یا وہ معجزات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے تھے، جیسے ید بیضا اور عصا۔

(۲) یعنی تم جو کچھ کہو گے اور اس کے جواب میں وہ جو کچھ کہے گا، ہم سن رہے ہوں گے۔ اس لیے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تمہیں فریضہ رسالت سونپ کر تمہاری حفاظت سے بے پرواہ نہیں ہو جائیں گے۔ بلکہ ہماری مدد تمہارے ساتھ ہے۔ معیت کا مطلب مصاحبت نہیں، بلکہ نصرت و معاونت ہے۔

(۳) یعنی ایک بات یہ کہو کہ ہم تیرے پاس اپنی مرضی سے نہیں آئے ہیں بلکہ رب العالمین کے نمائندے اور اس کے رسول کی حیثیت سے آئے ہیں اور دوسری بات یہ کہ تو نے (چار سو سال سے) بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے، ان کو آزاد کر دے تاکہ میں انہیں شام کی سرزمین پر لے جاؤں، جس کا اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہوا ہے۔

(۴) فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور مطالبے پر غور کرنے کے بجائے، ان کی تحقیر و تنقیص کرنی شروع کر دی اور کہا کہ کیا تو وہی نہیں ہے جو ہماری گود میں اور ہمارے گھر میں پلا، جب کہ ہم بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کر ڈالتے تھے؟

(۵) بعض کہتے ہیں کہ ۱۸ سال فرعون کے محل میں بسر کیے، بعض کے نزدیک ۳۰ اور بعض کے نزدیک چالیس سال۔ یعنی اتنی عمر ہمارے پاس گزارنے کے بعد، چند سال ادھر ادھر رہ کر اب تو نبوت کا دعویٰ کرنے لگا ہے؟

پھر تو اپنا وہ کام کر گیا جو کر گیا اور تو ناشکروں میں ہے۔^(۱۹)

(حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ میں نے اس کام کو اس وقت کیا تھا جبکہ میں راہ بھولے ہوئے لوگوں میں سے تھا۔^(۲۰)

پھر تم سے خوف کھا کر میں تم میں سے بھاگ گیا، پھر مجھے میرے رب نے حکم و علم عطا فرمایا اور مجھے اپنے پیغمبروں میں سے کر دیا۔^(۲۱)

مجھ پر تیرا کیا یہی وہ احسان ہے؟ جسے تو جتا رہا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔^(۲۲)

فرعون نے کہا رب العالمین کیا (چیز) ہے؟^(۲۳) (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا وہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا رب ہے، اگر تم یقین رکھنے والے ہو۔^(۲۴)

فرعون نے اپنے اردگرد والوں سے کہا کہ کیا تم سن نہیں رہے؟^(۲۵)

وَقَعَلْتَ فَعَلْتَك الْبِئْسَ مَا كُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۹

قَالَ فَعَلْتَهَا اِذَا وَاَنَا مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۲۰

فَقَرَّرْتُ وَاَنْتُمْ لَمْ تَخْفَوْهُ رَبِّيْ رَفِيْ حُكْمًا وَّوَجَعَلْنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۲۱

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ مِّنْهُمَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدتَّ بَنِيْ اِسْرٰٓءِيْلَ ۝۲۲

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا بِيْ الْعُلٰٓمِيْنَ ۝۲۳

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَبْوَابِهِنَّ اَنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۲۴

قَالَ لِيْنِ حَوْلَةَ الْاَسْمٰٓءِ مَعُوْنَ ۝۲۵

(۱) پھر ہمارا ہی کھا کر ہماری ہی قوم کے ایک آدمی کو قتل کر کے ہماری ناشکری بھی کی۔

(۲) یعنی یہ قتل ارادتا نہیں تھا بلکہ ایک گھونٹہ ہی تھا جو اسے مارا گیا تھا، جس سے اس کی موت ہی واقع ہو گئی۔ علاوہ ازیں یہ واقعہ بھی نبوت سے قبل کا ہے جب کہ مجھ کو علم کی یہ روشنی نہیں دی گئی تھی۔

(۳) یعنی پہلے جو کچھ ہوا، اپنی جگہ، لیکن اب میں اللہ کا رسول ہوں، اگر میری اطاعت کرے گا تو بچ جائے گا، بصورت دیگر ہلاکت تیرا مقدر ہوگی۔

(۴) یعنی یہ اچھا احسان ہے جو تو مجھے جتلا رہا ہے کہ مجھے تو یقیناً تو نے غلام نہیں بنایا اور آزاد چھوڑے رکھا لیکن میری پوری قوم کو غلام بنا رکھا ہے۔ اس ظلم عظیم کے مقابلے میں اس احسان کی آخر حیثیت کیا ہے؟

(۵) یہ اس نے بطور استغنام کے نہیں، بلکہ استکبار اور استکبار کے طور پر کہا، کیونکہ اس کا دعویٰ تو یہ تھا ﴿ مَا كُنْتُمْ لَكُمْ رِبٰٓءًا ۝۱۸ ﴾ (القصاص ۳۸) ”میں اپنے سوا تمہارے لیے کوئی اور معبود جانتا ہی نہیں۔“

(۶) یعنی کیا تم اس کی بات پر تعجب نہیں کرتے کہ میرے سوا بھی کوئی اور معبود ہے؟

قَالَ رَبُّكَ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ﴿۳۵﴾

قَالَ إِنَّ رَسُولَكَ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ ﴿۳۶﴾

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِيِّ وَالْمَغْرِبِيِّ مَا بَيْنَهُمَا لَنْ نُشْرَكَ بِعُقُوبِنَا ﴿۳۷﴾

قَالَ لَيْنَ اتَّخَذْتَ إِلَّا هَذَا يُورِثُكَ إِنَّا كَجَمَلِكَ مِنَ الْمَسْجُورِينَ ﴿۳۸﴾

قَالَ أَوَلَوْ كُنْتُمْ بِبَنِي إِسْرَائِيلَ

قَالَ فَايَ يَوْمٍ إِنْ كُنْتُمْ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۳۹﴾

فَأَلْقَى عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُبِينٌ ﴿۴۰﴾

وَنَزَّيْدَةٌ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّظِيرِينَ ﴿۴۱﴾

(حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا وہ تمہارا اور

تمہارے اگلے باپ دادوں کا پروردگار ہے۔ (۲۶)

فرعون نے کہا (لوگو!) تمہارا یہ رسول جو تمہاری طرف

بھیجا گیا ہے یہ تو یقیناً دیوانہ ہے۔ (۲۷)

(حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا! وہی مشرق و

مغرب کا اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا رب

ہے، اگر تم عقل رکھتے ہو۔ (۲۸)

فرعون کہنے لگا سن لے! اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو

معبود بنایا تو میں تجھے قیدیوں میں ڈال دوں گا۔ (۲۹)

موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اگرچہ میں تیرے پاس کوئی کھلی

چیز لے آؤں؟ (۳۰)

فرعون نے کہا اگر تو چچوں میں سے ہے تو اسے پیش

کر۔ (۳۱)

آپ نے (اسی وقت) اپنی لاشی ڈال دی جو اچانک کھلم

کھلا (زبردست) اژدہا بن گئی۔ (۳۲)

اور اپنا ہاتھ کھینچ نکالا تو وہ بھی اسی وقت ہر دیکھنے والے کو

(۱) یعنی جس نے مشرق کو مشرق بنایا، جس سے کواکب طلوع ہوتے ہیں اور مغرب کو مغرب بنایا جس میں کواکب غروب

ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان کے درمیان جو کچھ ہے، ان سب کا رب اور ان کا انتظام کرنے والا بھی وہی ہے۔

(۲) فرعون نے جب دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام مختلف انداز سے رب العالمین کی ربوبیت کا کلمہ کی وضاحت کر رہے ہیں،

جس کا کوئی معقول جواب اس سے نہیں بن پارہا ہے۔ تو اس نے دلائل سے صرف نظر کر کے دھمکی دینی شروع کر دی

اور موسیٰ علیہ السلام کو حوالہ زندان کرنے سے ڈرایا۔

(۳) یعنی ایسی کوئی چیز یا معجزہ جس سے واضح ہو جائے کہ میں سچا اور واقعی اللہ کا رسول ہوں، تب بھی تو میری صداقت کو

تسلیم نہیں کرے گا؟

(۴) بعض جگہ ثُعْبَانٌ کو حَيَّةٌ اور بعض جگہ جَبَانٌ کہا گیا ہے۔ ثُعْبَانٌ وہ سانپ ہوتا ہے جو بڑا ہو اور جَبَانٌ چھوٹے

سانپ کو کہتے ہیں اور حَيَّةٌ چھوٹے بڑے دونوں قسم کے سانپوں پر بولا جاتا ہے۔ (فتح القدر) گویا لاشی نے پہلے چھوٹے

سانپ کی شکل اختیار کی پھر دیکھتے دیکھتے اژدہا بن گئی۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔

سفید چمکیلا نظر آنے لگا۔^(۱) (۳۳)

فرعون اپنے آس پاس کے سرداروں سے کہنے لگا بھی یہ تو کوئی بڑا دانا جادوگر ہے۔^(۲) (۳۴)

یہ تو چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہاری سرزمین سے ہی نکال دے، بتاؤ اب تم کیا حکم دیتے ہو۔^(۳) (۳۵)

ان سب نے کہا آپ اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دیجئے اور تمام شہروں میں ہر کارے بھیج دیجئے۔^(۴) (۳۶)
جو آپ کے پاس ذی علم جادوگروں کو لے آئیں۔^(۵) (۳۷)
پھر ایک مقرر دن کے وعدے پر تمام جادوگر جمع کیے گئے۔^(۵) (۳۸)

قَالَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنَّ هَذَا السَّجِرُ عَلِيمٌ ﴿۳۳﴾

يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ وَيَجْعَلْ هَذَا تَابِعًا لِمَنْ يُرِيدُ ﴿۳۴﴾

قَالُوا أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَإِعْتَصِمِي فِي الْمَنَاجِينِ خَيْرِينَ ﴿۳۵﴾

يَأْتُوكَ بِحُلٍّ سَخَالَ عَلَيْهِ ﴿۳۶﴾

تَجْمِعُ الشَّعْرَةَ فَلْيَبْقَاتِ يَوْمَ مَعْلُومٍ ﴿۳۷﴾

(۱) یعنی گریبان سے ہاتھ نکالا تو وہ چاند کے ٹکڑے کی طرح چمکتا تھا۔ یہ دو سرا معجزہ موسیٰ علیہ السلام نے پیش کیا۔

(۲) فرعون بجائے اس کے کہ ان معجزات کو دیکھ کر، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرتا اور ایمان لاتا، اس نے تکذیب و عناد کا راستہ اختیار کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بابت کہا کہ یہ تو کوئی بڑا فن کار جادوگر ہے۔

(۳) پھر اپنی قوم کو مزید بھڑکانے کے لیے کہا کہ وہ ان شعبہ بازیوں کے ذریعے سے تمہیں یہاں سے نکال کر خود اس پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ اب بتاؤ؟ تمہاری کیا رائے ہے؟ یعنی اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟

(۴) یعنی ان دونوں کو فی الحال اپنے حال پر چھوڑ دو، اور تمام شہروں سے جادوگروں کو جمع کر کے ان کا باہمی مقابلہ کیا جائے تاکہ ان کے کرتب کا جواب اور تیری تائید و نصرت ہو جائے۔ اور یہ اللہ ہی کی طرف سے تکوینی انتظام تھا تاکہ لوگ ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں اور ان دلائل و براہین کا یہ چشم سر خود مشاہدہ کریں، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائے تھے۔

(۵) چنانچہ جادوگروں کی ایک بہت بڑی تعداد مصر کے اطراف و جوانب سے جمع کر لی گئی، ان کی تعداد ۱۴ ہزار، ۱۷ ہزار، ۱۹ ہزار، ۳۰ ہزار اور ۸۰ ہزار (مختلف اقوال کے مطابق) بتلائی جاتی ہے۔ اصل تعداد اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کیوں کہ کسی مستند ماخذ میں تعداد کا ذکر نہیں ہے۔ اس کی تفصیلات اس سے قبل سورۃ اعراف، سورۃ طہ میں بھی گزر چکی ہیں۔ گویا فرعون کی قوم، 'قط' نے اللہ کے نور کو اپنے مومنوں سے بھگانا چاہا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے نور کو پورا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ کفر و ایمان کے معرکے میں ہوشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ جب بھی کفر ختم ٹھونک کر ایمان کے مقابلے میں آتا ہے، تو ایمان کو اللہ تعالیٰ سرخروئی اور غلبہ عطا فرماتا ہے۔ جس طرح فرمایا، ﴿بَلْ نَقْضُ الْبَاطِلِ عَلَى الْبَاطِلِ قَيْدًا مَعَهُ فَاذْهَبْ وَاهِبًا﴾

وَقَلِيلٌ لِّلنَّاسِ هَلْ أَنتُمْ مُجْتَمِعُونَ ﴿۳۸﴾

لَعَلَّكَ نَتَّبِعُكَ السَّحَرَةَ إِن كَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ ﴿۳۹﴾

فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالُوا لِّلرَّعُونَ أَيَّنَ لَنَا الْكِبْرُ إِن كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ ﴿۴۰﴾

قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذًا لَّبِئِن الْمُقَرَّبِينَ ﴿۴۱﴾

قَالَ لَهُم مُّوسَى الْقَوْمَ إِنَّمَا أَنتُمْ مُقْتُونَ ﴿۴۲﴾

فَأَلْقَوْا حِجَابَهُمْ وَعَصَبَهُمْ وَقَالُوا لِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ
إِنَّا لَنَنصَحُ الْغَالِبِينَ ﴿۴۳﴾

فَأَلْفَىٰ مُوسَىٰ عَصَاهُ إِذْ أَدْرَاهِي تَلْقَفَ مَا يَأْبَىٰ فُؤَادُكَ ﴿۴۴﴾

اور عام لوگوں سے بھی کہہ دیا گیا کہ تم بھی مجمع میں حاضر ہو جاؤ گے؟ (۳۸)

تاکہ اگر جادوگر غالب آجائیں تو ہم ان ہی کی پیروی کریں۔ (۳۹)

جادوگر آکر فرعون سے کہنے لگے کہ اگر ہم جیت گئے تو ہمیں کچھ انعام بھی ملے گا؟ (۴۰)

فرعون نے کہا ہاں! (بڑی خوشی سے) بلکہ ایسی صورت میں تم میرے خاص درباری بن جاؤ گے۔ (۴۱)

(حضرت موسیٰ علیہ السلام) نے جادوگروں سے فرمایا جو کچھ تمہیں ڈالنا ہے ڈال دو۔ (۴۲)

انہوں نے اپنی رسیاں اور لائٹھیاں ڈال دیں اور کہنے لگے عزت فرعون کی قسم! ہم یقیناً غالب ہی رہیں گے۔ (۴۳)

اب (حضرت موسیٰ علیہ السلام) نے بھی اپنی لائٹھی

(الانبیاء: ۱۸) بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر کھینچ مارتے ہیں، پس وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے اور جھوٹ اسی وقت نابود ہو جاتا ہے۔“

(۱) یعنی عوام کو بھی تاکید کی جا رہی ہے کہ تمہیں بھی یہ معرکہ دیکھنے کے لیے ضرور حاضر ہونا ہے۔

(۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے جادوگروں کو پہلے اپنے کرتب دکھانے کے لیے کہنے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ ایک تو ان پر یہ واضح ہو جائے کہ اللہ کا پیغمبر اتنی بڑی تعداد میں نامی گرامی جادوگروں کے اجتماع اور ان کی ساحرانہ شعبہہ بازیوں سے خوف زدہ نہیں ہے۔ دوسرا یہ مقصد بھی ہو سکتا ہے کہ جب بعد میں اللہ کے حکم سے یہ ساری شعبہہ بازیوں آن واحد میں ختم ہو جائیں گی تو دیکھنے والوں پر اس کے اچھے اثرات مرتب ہوں گے اور شاید اس طرح زیادہ لوگ اللہ پر ایمان لے آئیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، بلکہ جادوگر ہی سب سے پہلے ایمان لے آئے۔ جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

(۳) جیسا کہ سورۃ اعراف اور ط میں گزرا کہ ان جادوگروں نے اپنے خیال میں بہت بڑا جادو پیش کیا ﴿سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْتَبْهُمُ وَجَاءُوا بِسِحْرِ عَجَبٍ﴾ (سورۃ الأعراف: ۱۱۶) حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے دل میں خوف محسوس کیا ﴿فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ﴾ (طلہ: ۶۷) چنانچہ ان جادوگروں کو اپنی کامیابی اور برتری کا بڑا یقین تھا، جیسا کہ یہاں ان الفاظ سے ظاہر ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تسلی دی، کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ذرا اپنی لائٹھی زمین پر پھینکو اور پھر دیکھو۔ چنانچہ لائٹھی کا زمین پر پھینکنا تھا کہ اس نے ایک خوفناک اثر دھسے کی شکل اختیار کر لی اور ایک ایک کر کے ان کے سارے کرتبوں کو وہ نکل گیا۔ جیسا کہ اگلی آیت میں ہے۔

میدان میں ڈال دی جس نے اسی وقت ان کے جھوٹ
موٹ کے کرتب کو نکلنا شروع کر دیا۔ (۳۵)

یہ دیکھتے ہی جادو گر بے اختیار سجدے میں گر گئے۔ (۳۶)
اور انہوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم تو اللہ رب العالمین پر
ایمان لائے۔ (۳۷)

یعنی موسیٰ (علیہ السلام) اور ہارون کے رب پر۔ (۳۸)
فرعون نے کہا کہ میری اجازت سے پہلے تم اس پر ایمان
لے آئے؟ یقیناً یہی تمہارا وہ بڑا (سردار) ہے جس نے تم
سب کو جادو سکھایا ہے،^(۱) سو تمہیں ابھی ابھی معلوم ہو
جائے گا، قسم ہے میں ابھی تمہارے ہاتھ پاؤں الٹے طور
پر کٹ دوں گا اور تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا۔ (۳۹)^(۲)
انہوں نے کہا کوئی حرج نہیں،^(۳) ہم تو اپنے رب کی
طرف لوٹنے والے ہیں ہی۔ (۵۰)

اس بنا پر کہ ہم سب سے پہلے ایمان والے بنے ہیں^(۴)
ہمیں امید پڑتی ہے کہ ہمارا رب ہماری سب خطائیں
معاف فرمادے گا۔ (۵۱)

قَالُوا لَيْسَ بِالسَّحَرَةِ لِحْيَتُهُمْ ۖ

قَالُوا الْمَكَارِبِ الْعَالِيَيْنِ ۖ

رَبِّ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ۖ

قَالَ امْنُتُمْ لَهُ قَبْلَ أَنْ أَدْنَا لَكُمْ إِلَيْكُمْ الَّذِي عَمَلْتُمْ

السَّحَرَةَ لَسَوْفَ تَعْلَمُونَ لَا تَقْطَعْنَ أَيْدِيَهُمْ وَأَرْجُلَهُمْ

مَنْ خَلَّافٍ وَلَا تُصَلِّبُوا أَجْسَادَهُمْ ۖ

قَالُوا الرَّاصِبِينَ إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا مُنْقَلِبُونَ ۖ

إِنَّا نَتَّقِيكُمْ إِنَّا نَعْلَمُ أَنَّكُمْ أَوْلَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۖ

(۱) فرعون کے لیے یہ واقعہ بڑا عجیب اور نہایت حیرت ناک تھا کہ جن جادو گروں کے ذریعے سے وہ فتح و غلبے کی آس
لگائے بیٹھا تھا، وہی نہ صرف مغلوب ہو گئے بلکہ موقع پر ہی وہ اس رب پر ایمان لے آئے، جس نے حضرت موسیٰ و
ہارون علیہما السلام کو دلائل و معجزات دے کر بھیجا تھا۔ لیکن بجائے اس کے کہ فرعون بھی غور و فکر سے کام لیتا اور ایمان
لاتا، اس نے مکابہ اور عناد کا راستہ اختیار کیا اور جادو گروں کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا اور کہا کہ تم سب اسی کے شاگرد
لگتے ہو اور تمہارا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سازش کے ذریعے سے تم ہمیں یہاں سے بے دخل کر دو، ﴿لَئِنْ
هَذَا الْبُرْهَانُ كَذُوبٌ لَفِي الْمَدِينَةِ لِيُشْجِرُوا مِنْهَا أَهْلَهَا﴾ (الأعراف: ۱۳۳)

(۲) الٹے طور پر ہاتھ پاؤں کاٹنے کا مطلب، دایاں ہاتھ اور بایاں پیر یا بایاں ہاتھ اور دایاں پیر ہے۔ اس پر سولی مستزاد۔
یعنی ہاتھ پیر کاٹنے سے بھی اس کی آتش غضب ٹھنڈی نہ ہوئی، مزید اس نے سولی پر لٹکانے کا اعلان کیا۔

(۳) لَاصِبِينَ کوئی حرج نہیں یا ہمیں کوئی پروا نہیں۔ یعنی اب جو سزا چاہے دے لے، ایمان سے نہیں پھر سکتے۔

(۴) أَوْلَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ اس اعتبار سے کہا کہ فرعون کی قوم مسلمان نہیں ہوئی اور انہوں نے قبول ایمان میں سبقت کی۔

اور ہم نے موسیٰ کو جی کی کہ راتوں رات میرے بندوں کو نکال لے چل تم سب پیچھا کیے جاؤ گے۔^(۱) (۵۲)

فرعون نے شہروں میں ہر کاروں کو بھیج دیا۔ (۵۳)

کہ یقیناً یہ گروہ بہت ہی کم تعداد میں ہے۔^(۲) (۵۴)

اور اس پر یہ ہمیں سخت غضب ناک کر رہے ہیں۔^(۳) (۵۵)

اور یقیناً ہم بڑی جماعت ہیں ان سے چوکننا رہنے والے۔^(۴) (۵۶)

بالآخر ہم نے انہیں باغات سے اور چشموں سے۔ (۵۷)

اور خزانوں سے۔ اور اچھے اچھے مقامات سے نکال باہر کیا۔^(۵) (۵۸)

اسی طرح ہوا اور ہم نے ان (تمام) چیزوں کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا۔^(۶) (۵۹)

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي إِلَيْكُمْ فَتُبْعُونَ ﴿۵۲﴾

فَأَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَائِنِ خُشُوعًا ﴿۵۳﴾

إِنَّ هَؤُلَاءِ لَشِرْذِمَةٌ وَّجِيلُونَ ﴿۵۴﴾

وَأَلَّهُمْ لَنَا الْعِغَابُونَ ﴿۵۵﴾

وَأَنَا لَجَمِيعٌ حَازِمُونَ ﴿۵۶﴾

فَأَخْرَجْنَاهُمْ مِنْ جَدَّتِ وَعْيُونًا ﴿۵۷﴾

وَأَنْزَلْنَاهُمْ مَقَالَهُ كُورِيًّا ﴿۵۸﴾

كَذَلِكَ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿۵۹﴾

(۱) جب بلاد مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قیام لمبا ہو گیا اور ہر طرح سے انہوں نے فرعون اور اس کے درباریوں پر حجت قائم کر دی۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایمان لانے پر تیار نہیں ہوئے، تو اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ انہیں عذاب و نکال سے دو چار کر کے سامانِ عبرت بنا دیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ راتوں رات بنی اسرائیل کو لے کر یہاں سے نکل جائیں، اور فرمایا کہ فرعون تمہارے پیچھے آئے گا، گھبرانا نہیں۔

(۲) یہ بطور تحقیر کے کہا، ورنہ ان کی تعداد چھ لاکھ بتلائی جاتی ہے۔

(۳) یعنی میری اجازت کے بغیر ان کا یہاں سے فرار ہونا ہمارے لیے غیظ و غضب کا باعث ہے۔

(۴) اس لیے ان کی اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے ہمیں مستعد ہونے کی ضرورت ہے۔

(۵) یعنی فرعون اور اس کا لشکر بنی اسرائیل کے تعاقب میں کیا نکلا کہ پھر پلٹ کر اپنے گھروں اور باغات میں آنا نصیب ہی نہیں ہوا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت و مشیت سے انہیں تمام نعمتوں سے محروم کر کے ان کا وارث دو سروں کو بنا دیا۔

(۶) یعنی جو اقتدار اور بادشاہت فرعون کو حاصل تھی، وہ اس سے چھین کر ہم نے بنی اسرائیل کو عطا کر دی۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد مصر جیسا اقتدار اور دنیوی جاہ و جلال ہم نے بنی اسرائیل کو بھی عطا کیا۔ کیونکہ بنی اسرائیل، مصر سے نکل جانے کے بعد مصر واپس نہیں آئے۔ نیز سورہ دخان میں فرمایا گیا ہے ﴿وَأَنْزَلْنَاهُمْ مَقَالَهُمْ خِزْيَانًا﴾ کہ ”ہم نے اس کا وارث کسی دو سری قوم کو بنایا“ (المیر التفاسیر) اول الذکر اہل علم کہتے ہیں کہ قوماً آخرین میں قوم کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن یہاں سورہ شعراء میں جب بنی اسرائیل کو وارث بنانے کی صراحت آگئی ہے، تو اس سے مراد بھی قوم بنی اسرائیل

فَأَتَتْهُمْ شُرُكِيئِهِمْ ۝

پس فرعونؑی سورج نکلتے ہی ان کے تعاقب میں نکلے۔^(۱) (۶۰)

فَلَمَّا تَرَأَتْهُ الْبُحَيْرَانِ قَالَ أَصْحَابُ مُوسَىٰ إِنَّا لَمَرَدٌ مِّمَّنْ كَا۞نَ ۝

پس جب دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا، تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا، ہم تو یقیناً پکڑ لیے گئے۔^(۲) (۶۱)

قَالَ كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝

موسیٰ نے کہا، ہرگز نہیں۔ یقین مانو، میرا رب میرے ساتھ ہے جو ضرور مجھے راہ دکھائے گا۔^(۳) (۶۲)

فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ اصْرِبْ يَعْصَاكَ الْبَحْرُ ۖ فَانْفِلْ فَكَانَ

ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ دریا پر اپنی لاشی مار،^(۴) پس اسی وقت دریا پھٹ گیا اور ہر ایک حصہ پانی کا مثل بڑے پہاڑ کے ہو گیا۔^(۵) (۶۳)

كُلٌّ زُجْرٌ كَالظُّوْدِ الْعُظْمِ ۝

اور ہم نے اسی جگہ دوسروں کو نزدیک لاکھڑا کر

وَأَوْلَيْنَا لَهُمُ الْآخَرِينَ ۝

ہی ہو گی۔ مگر خود قرآن کی صراحت کے مطابق مصر سے نکلنے کے بعد بنو اسرائیل کو ارض مقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا۔ اور ان کے انکار پر چالیس سال کے لیے یہ داخلہ موخر کر کے میدان تیبہ میں بھٹکایا گیا۔ پھر وہ ارض مقدس میں داخل ہوئے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر، حدیث اسراء کے مطابق بیت المقدس کے قریب ہی ہے۔ اس لیے صحیح معنی میں یہی ہے کہ جیسی نعمتیں آل فرعون کو مصر میں حاصل تھیں، ویسی ہی نعمتیں اب بنو اسرائیل کو عطا کی گئیں۔ لیکن مصر میں نہیں بلکہ فلسطین میں، وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔

(۱) یعنی جب صبح ہوئی اور فرعون کو پتہ چلا کہ بنی اسرائیل راتوں رات یہاں سے نکل گئے ہیں، تو اس کے پندار اقتدار کو بڑی ٹھیس پہنچی۔ اور سورج نکلتے ہی ان کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔

(۲) یعنی فرعون کے لشکر کو دیکھتے ہی وہ گھبرا اٹھے کہ آگے سمندر ہے اور پیچھے فرعون کا لشکر، اب بچاؤ کس طرح ممکن ہے؟ اب پھر دوبارہ وہی فرعون اور اس کی غلامی ہو گی۔

(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی کہ تمہارا اندیشہ صحیح نہیں، اب دوبارہ تم فرعون کی گرفت میں نہیں جاؤ گے۔ میرا رب یقیناً نجات کے راستے کی نشاندہی فرمائے گا

(۴) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ رہنمائی اور نشاندہی فرمائی کہ اپنی لاشی سمندر پر مارو، جس سے دائیں طرف کا پانی دائیں اور بائیں طرف کا بائیں طرف رک گیا اور دونوں کے بیچ میں راستہ بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بارہ قبیلوں کے حساب سے بارہ راستے بن گئے تھے، واللہ اعلم۔

(۵) فریق: قطعہ بحر، سمندر کا حصہ، طوڈ، پہاڑ، یعنی پانی کا ہر حصہ بڑے پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزے کا صدور ہوا تاکہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم فرعون سے نجات پالے، اس تائید الہی کے بغیر فرعون سے نجات ممکن نہیں تھی۔

دیا۔^(۱) (۶۳)
 اور موسیٰ (علیہ السلام) کو اور اس کے تمام ساتھیوں کو
 نجات دے دی۔ (۶۵)
 پھر اور سب دوسروں کو ڈبو دیا۔^(۲) (۶۶)
 یقیناً اس میں بڑی عبرت ہے اور ان میں کے اکثر لوگ
 ایمان والے نہیں۔^(۳) (۶۷)
 اور بیشک آپ کارب بڑا ہی غالب و مہربان ہے۔ (۶۸)
 انہیں ابراہیم (علیہ السلام) کا واقعہ بھی سنا دو۔ (۶۹)
 جبکہ انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے فرمایا کہ تم
 کس کی عبادت کرتے ہو؟ (۷۰)
 انہوں نے جواب دیا کہ عبادت کرتے ہیں بتوں کی، ہم تو
 برابر ان کے مجاور بنے بیٹھے ہیں۔^(۴) (۷۱)
 آپ نے فرمایا کہ جب تم انہیں پکارتے ہو تو کیا وہ سنتے
 بھی ہیں؟ (۷۲)
 یا تمہیں نفع نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔^(۵) (۷۳)
 انہوں نے کہا یہ (ہم) کچھ نہیں جانتے، ہم نے تو اپنے باپ
 دادوں کو اسی طرح کرتے پایا۔^(۶) (۷۴)

وَلَقِينَا مُوسَىٰ وَمَنْ مَعَهُ أَجْمَعِينَ ﴿۶۳﴾
 لَقِينَا مُوسَىٰ وَالْآخَرِينَ ﴿۶۵﴾
 إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ كَانَ الذِّكْرَ هُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۶۶﴾
 وَإِنَّ رَبَّكَ لَهوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۶۸﴾
 وَأَتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ ﴿۶۹﴾
 إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ﴿۷۰﴾
 قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظُنُّهَا كَالْعِبَادِينَ ﴿۷۱﴾
 قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ﴿۷۲﴾
 أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ﴿۷۳﴾
 قَالُوا بَلَىٰ وَجَدْنَا نَايَأًا مَّا كُنَّا نَدْعُو لَكَ يَفْعَلُونَ ﴿۷۴﴾

(۱) اس سے مراد فرعون اور اس کا لشکر ہے یعنی ہم نے دو سردوں کو سمندر کے قریب کر دیا۔

(۲) موسیٰ علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کو ہم نے نجات دی اور فرعون اور اس کا لشکر جب انہی راستوں سے گزرنے لگا تو ہم نے سمندر کو دو بارہ حسب دستور رواں کر دیا، جس سے فرعون اپنے لشکر سمیت غرق ہو گیا۔

(۳) یعنی اگرچہ اس واقعے میں، جو اللہ کی نصرت و معونت کا واضح مظہر ہے، بڑی نشانی ہے لیکن اس کے باوجود اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں۔

(۴) یعنی رات دن ان کی عبادت کرتے ہیں۔

(۵) یعنی اگر تم ان کی عبادت ترک کر دو تو کیا وہ تمہیں نقصان پہنچاتے ہیں؟

(۶) جب وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکے تو یہ کہہ کر چھٹکارا حاصل کر لیا۔ جیسے آج بھی لوگوں کو قرآن و حدیث کی بات بتلائی جائے تو یہی عذر پیش کیا جاتا ہے کہ ہمارے خاندان میں تو ہمارے آباؤ

قَالَ أَفَرَأَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ﴿۵﴾

آپ نے فرمایا کچھ خبر بھی ہے ^(۱) جنہیں تم پوج رہے ہو؟ (۷۵)

أَنْتُمْ وَأَبَاؤُكُمْ الْأَقْدَامُونَ ﴿۶﴾

تم اور تمہارے اگلے باپ دادا، وہ سب میرے دشمن ہیں۔ (۷۶) ^(۲)

وَأَقْهَمَ عَدُوِّيَ الْأَرْدَبَ الْعَلَمِينَ ﴿۷﴾

بجز سچے اللہ تعالیٰ کے جو تمام جہان کا پالنہار ہے۔ (۷۷) ^(۳)

الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يُهْدِينِ ﴿۸﴾

جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی میری رہبری فرماتا ہے۔ (۷۸) ^(۴)

وَ الَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ﴿۹﴾

وہی ہے جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ (۷۹) ^(۵)

وَإِذَا أَرِمْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ﴿۱۰﴾

اور جب میں بیمار پڑ جاؤں تو مجھے شفا عطا فرماتا ہے۔ (۸۰) ^(۶)

وَ الَّذِي يُبَيِّنُ لِي نَجْمِي لِلَّيْلِ ﴿۱۱﴾

اور وہی مجھے مار ڈالے گا پھر زندہ کر دے گا۔ (۸۱) ^(۷)

وَ الَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ ﴿۱۲﴾

اور جس سے امید بندھی ہوئی ہے کہ وہ روزِ جزا میں میرے گناہوں کو بخش دے گا۔ (۸۲) ^(۸)

اجداد سے یہی کچھ ہوتا آ رہا ہے، ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے۔

(۱) أَفَرَأَيْتُمْ؟ کے معنی ہیں فَهَلْ أَبْصَرْتُمْ وَتَفَكَّرْتُمْ؟ کیا تم نے غور و فکر کیا؟

(۲) اس لیے کہ تم سب اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی عبادت کرنے والے ہو۔ بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جن کی تم اور تمہارے باپ دادا عبادت کرتے رہے ہیں، وہ سب معبود میرے دشمن ہیں یعنی میں ان سے بیزار ہوں۔

(۳) یعنی وہ دشمن نہیں، بلکہ وہ تو دنیا و آخرت میں میرا ولی اور دوست ہے۔

(۴) یعنی دین و دنیا کے مصالح اور منافع کی طرف۔

(۵) یعنی انواع و اقسام کے رزق پیدا کرنے والا اور جو پانی ہم پیتے ہیں، اسے مہیا کرنے والا بھی وہی اللہ ہے۔

(۶) بیماری کو دور کر کے شفا عطا کرنے والا بھی وہی ہے۔ یعنی دواؤں میں شفا کی تاثیر بھی اسی کے حکم سے ہوتی ہے۔

ورنہ دوائیں بھی بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔ بیماری بھی اگرچہ اللہ کے حکم اور مشیت سے ہی آتی ہے۔ لیکن اس کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی۔ بلکہ اپنی طرف کی۔ یہ گویا اللہ کے ذکر میں اس کے ادب و احترام کے پہلو کو ملحوظ رکھا۔

(۷) یعنی قیامت والے دن، جب وہ سارے لوگوں کو زندہ فرمائے گا، مجھے بھی زندہ کرے گا۔

(۸) یہاں امید، یقین کے معنی میں ہے۔ کیونکہ کسی بڑی شخصیت سے امید، یقین کے مترادف ہی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ تو کائنات کی سب سے بڑی ہستی ہے، اس سے وابستہ امید، یقین کیوں نہیں ہوگی۔ اسی لیے مفسرین کہتے ہیں کہ قرآن میں

جہاں بھی اللہ کے لیے عَسَىٰ كَالْفِطْرِ اسْتِعْمَالُ ہوا ہے وہ یقین ہی کے مفہوم میں ہے۔ حَطِيطِيَّةٌ، حَطِيطَةٌ وَاحِدٌ كَاصِيْنَةٌ

اے میرے رب! مجھے قوت فیصلہ^(۱) عطا فرما اور مجھے نیک لوگوں میں ملا دے۔ (۸۳)

اور میرا ذکر خیر پچھلے لوگوں میں بھی باقی رکھ۔ (۸۴)^(۲)

مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں سے بنا دے۔ (۸۵)

اور میرے باپ کو بخش دے یقیناً وہ گمراہوں میں سے تھا۔ (۸۶)^(۳)

اور جس دن کہ لوگ دوبارہ جلائے جائیں مجھے رسوا نہ کر۔ (۸۷)^(۴)

جس دن کہ مال اور اولاد کچھ کام نہ آئے گی۔ (۸۸)

لیکن فائدہ والا وہی ہو گا جو اللہ تعالیٰ کے سامنے بے عیب دل لے کر جائے۔ (۸۹)^(۵)

رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَأَلْحِقْ بِالظَّالِمِينَ ﴿۸۳﴾

وَاجْعَلْ لِي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ ﴿۸۴﴾

وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ ﴿۸۵﴾

وَاعْمُرْ لِي زَوْجَاتِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۸۶﴾

وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ ﴿۸۷﴾

يَوْمَ لَا يُنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿۸۸﴾

إِلَّا مَنْ آتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿۸۹﴾

ہے لیکن خطایا (جمع) کے معنی میں ہے۔ انبیا علیہم السلام اگرچہ معصوم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سے کسی بڑے گناہ کا صدور ممکن نہیں۔ پھر بھی اپنے بعض افعال کو کوتاہی پر محمول کرتے ہوئے بارگاہ الہی میں غفوی طلب ہوں گے۔

(۱) حکم یا حکمت سے مراد علم و فہم، قوت فیصلہ، یا نبوت و رسالت یا اللہ کے حدود و احکام کی معرفت ہے۔

(۲) یعنی جو لوگ میرے بعد قیامت تک آئیں گے، وہ میرا ذکر اچھے لفظوں میں کرتے رہیں، اس سے معلوم ہوا کہ نیکوں کی جزا اللہ تعالیٰ دنیا میں ذکر جمیل اور ثنائے حسن کی صورت میں بھی عطا فرماتا ہے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر خیر ہر مذہب کے لوگ کرتے ہیں، کسی کو بھی ان کی عظمت و تکریم سے انکار نہیں ہے۔

(۳) یہ دعائے وقت کی تھی، جب ان پر یہ واضح نہیں تھا کہ مشرک (اللہ کے دشمن) کے لیے دعائے مغفرت جائز نہیں، جب اللہ نے یہ واضح کر دیا، تو انہوں نے اپنے باپ سے بھی بیزاری کا اظہار کر دیا (التوبة: ۱۱۳)

(۴) یعنی تمام مخلوق کے سامنے میرا مؤاخذہ کر کے یا عذاب سے دوچار کر کے حدیث میں آتا ہے کہ قیامت والے دن، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کو برے حال میں دیکھیں گے، تو ایک مرتبہ پھر اللہ کی بارگاہ میں ان کے لیے مغفرت کی درخواست کریں گے اور فرمائیں گے یا اللہ! اس سے زیادہ میرے لیے رسوائی اور کیا ہوگی؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے جنت کافروں پر حرام کر دی ہے۔ پھر ان کے باپ کو نجاست میں لتھڑے ہوئے بچو کی شکل میں جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (صحیح بخاری، سورۃ الشعراء و کتاب الأسماء، باب قول اللہ واتخذ اللہ إبراہیم خلیلاً)

(۵) قلب سلیم یا بے عیب دل سے مراد وہ دل ہے جو شرک سے پاک ہو۔ یعنی قلب مومن۔ اس لیے کہ کافر اور منافق کا دل مریض ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں، بدعت سے خالی اور سنت پر مطمئن دل، بعض کے نزدیک، دنیا کے مال و متاع کی

اور پرہیزگاروں کے لیے جنت بالکل نزدیک لادی جائے گی۔ (۹۰)

وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۹۰﴾

اور گمراہ لوگوں کے لیے جہنم ظاہر کر دی جائے گی۔ (۹۱)^(۱)
اور ان سے پوچھا جائے گا کہ جن کی تم پوجا کرتے رہے وہ کہاں ہیں؟ (۹۲)

وَيُزَيَّرُ الْجَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ ﴿۹۱﴾

وَقِيلَ لَهُمْ أَيُّكُمْ يَتَّبِعُونَ ﴿۹۲﴾

جو اللہ تعالیٰ کے سوا تھے، کیا وہ تمہاری مدد کرتے ہیں؟ یا کوئی بدلہ لے سکتے ہیں۔ (۹۳)^(۲)

مِنْ دُونِ اللَّهِ هَلْ يَنْصُرُونَكُمُ أَوْ يُنصِرُونَ ﴿۹۳﴾

پس وہ سب اور کل گمراہ لوگ جہنم میں اوندھے منہ ڈال دیے جائیں گے۔ (۹۴)^(۳)

فَلْيَكْفُرُوا فِيهَا هُمْ وَالْكَافِرُونَ ﴿۹۴﴾

اور ابلیس کے تمام کے تمام لشکر^(۴) بھی وہاں۔ (۹۵)

وَجُنُودَ ابْلِيسَ أَجْمَعُونَ ﴿۹۵﴾

آپس میں لڑتے جھگڑتے ہوئے کہیں گے۔ (۹۶)

قَالُوا وَهُمْ فِيهَا يَتْتَفِشُونَ ﴿۹۶﴾

کہ قسم اللہ کی! یقیناً ہم تو کھلی غلطی پر تھے۔ (۹۷)

تَأْتِلُهُمْ كُذَّابٌ يَصْلُونُ ﴿۹۷﴾

جبکہ تمہیں رب العالمین کے برابر سمجھ بیٹھے تھے۔ (۹۸)^(۵)

إِذْ سَوْىٰ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۹۸﴾

اور ہمیں تو سوا ان بدکاروں کے کسی اور نے گمراہ نہیں کیا تھا۔ (۹۹)^(۶)

وَمَا أَضَلْنَا آلَ الْمُجْرِمِينَ ﴿۹۹﴾

اب تو ہمارا کوئی سفارشی بھی نہیں۔ (۱۰۰)

فَمَا لَنَا مِنَ شُفْعَائِهِمْ ﴿۱۰۰﴾

محبت سے پاک دل اور بعض کے نزدیک، جہالت کی تاریکیوں اور اخلاقی رذالتوں سے پاک دل۔ یہ سارے مفہوم بھی صحیح ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ قلب مومن مذکورہ تمام ہی برائیوں سے پاک ہوتا ہے۔

(۱) مطلب یہ ہے کہ جنت اور دوزخ میں دخول سے پہلے ان کو سامنے کر دیا جائے گا۔ جس سے کافروں کے غم میں اور اہل ایمان کے سرور میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔

(۲) یعنی تم سے عذاب ٹال دیں یا خود اپنے نفس کو اس سے بچالیں۔

(۳) یعنی معبودین اور عابدین سب کو مال ڈنگر کی طرح ایک دوسرے کے اوپر ڈال دیا جائے گا۔

(۴) اس سے مراد وہ لشکر ہیں جو لوگوں کو گمراہ کرتے تھے۔

(۵) دنیا میں تو ہر ترشا ہوا پتھر اور قبر پر بنا ہوا خوش مناجتہ، مشرکوں کو خدائی اختیارات کا حامل نظر آتا ہے۔ لیکن قیامت کو پتہ چلے گا کہ یہ تو کھلی گمراہی تھی کہ وہ انہیں رب کے برابر سمجھتے رہے۔

(۶) یعنی وہاں جا کر احساس ہو گا کہ ہمیں دوسرے مجرموں نے گمراہ کیا۔ دنیا میں انہیں متوجہ کیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں کام

اور نہ کوئی (سچا) غم خوار دوست - (۱۰۱)^(۱)
 اگر کاش کہ ہمیں ایک مرتبہ پھر جانا ملتا تو ہم پکے پکے سچے
 مومن بن جاتے - (۱۰۲)^(۲)
 یہ ماجرا یقیناً ایک زبردست نشانی ہے (۳) ان میں سے اکثر
 لوگ ایمان لانے والے نہیں - (۱۰۳)^(۳)
 یقیناً آپ کا پروردگار ہی غالب مہربان ہے - (۱۰۴)
 قوم نوح نے بھی نبیوں کو جھٹلایا - (۱۰۵)^(۴)
 جبکہ ان کے بھائی (۱) نوح (علیہ السلام) نے کہا کہ کیا
 تمہیں اللہ کا خوف نہیں! (۱۰۶)
 سنو! میں تمہاری طرف اللہ کا امانتدار رسول
 ہوں - (۱۰۷)^(۵)
 پس تمہیں اللہ سے ڈرنا چاہیے اور میری بات ماننی

وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ ۝
 فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةٌ فَنَتُوكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝
 إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ۝
 وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُو الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝
 كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ۝
 إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝
 إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝
 فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا أَمْرًا

گمراہی ہے، بدعت ہے، شرک ہے تو نہیں مانتے، نہ غورو فکر سے کام لیتے ہیں کہ حق و باطل ان پر واضح ہو سکے۔
 (۱) گناہ گارا اہل ایمان کی سفارش تو اللہ کی اجازت کے بعد انبیاء و صلحاء بالخصوص حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے۔
 لیکن کافروں اور مشرکوں کے لیے سفارش کرنے کی کسی کو اجازت ہوگی نہ حوصلہ، اور نہ وہاں کوئی دوستی ہی کام آئے گی۔
 (۲) اہل کفر و شرک، قیامت کے روز دوبارہ دنیا میں آنے کی آرزو کریں گے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر کے اللہ کو
 خوش کر لیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا ہے کہ اگر انہیں دوبارہ بھی دنیا میں بھیج دیا جائے تو وہی کچھ کریں
 گے جو پہلے کرتے رہے تھے۔
 (۳) یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بتوں کے بارے میں اپنی قوم سے مناظرہ و مجاہد اور اللہ کی توحید کے دلائل یہ
 اس بات کی واضح نشانی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔
 (۴) بعض نے اس کا مرجع مشرکین مکہ یعنی قریش کو قرار دیا ہے یعنی ان کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں۔
 (۵) قوم نوح علیہ السلام نے اگرچہ صرف اپنے پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب کی تھی۔ مگر چونکہ ایک نبی کی تکذیب،
 تمام نبیوں کی تکذیب کے مترادف اور اس کو مستلزم ہے۔ اس لیے فرمایا کہ قوم نوح علیہ السلام نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔
 (۶) بھائی اس لیے کہا کہ حضرت نوح علیہ السلام ان ہی کی قوم کے ایک فرد تھے۔
 (۷) یعنی اللہ نے جو پیغام دے کر مجھے بھیجا ہے، وہ بلا کم و کاست تم تک پہنچانے والا ہوں، اس میں کسی بیشی نہیں کرتا۔

چاہیے۔^(۱) (۱۰۸)

میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں چاہتا، میرا بدلہ تو صرف رب العالمین کے ہاں ہے۔^(۲) (۱۰۹)

پس تم اللہ کا خوف رکھو اور میری فرمانبرداری کرو۔^(۳) (۱۱۰)
قوم نے جواب دیا کہ کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں! تیری تابعداری تو رذیل لوگوں نے کی ہے۔^(۴) (۱۱۱)

آپ نے فرمایا! مجھے کیا خبر کہ وہ پہلے کیا کرتے رہے؟^(۵) (۱۱۲)

ان کا حساب تو میرے رب کے ذمہ^(۶) ہے اگر تمہیں شعور ہو تو۔ (۱۱۳)

میں ایمان والوں کو دھکے دینے والا نہیں۔^(۷) (۱۱۴)

میں تو صاف طور پر ڈرا دینے والا ہوں۔^(۸) (۱۱۵)

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۰۸﴾

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَالطَّيِّعُونَ ﴿۱۰۹﴾

قَالُوا أَنْتُمْ أَلَدُّوا نَبْعَكَ الْإِذْءَلُونَ ﴿۱۱۰﴾

قَالَ وَمَا عَلِمْتُ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۱۱﴾

إِنْ حِسَابُهُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّي لَوْ تَشْعُرُونَ ﴿۱۱۲﴾

وَمَا أَنَا بِطَّالِقٍ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۱۳﴾

إِن آتَاكَ الْإِنذَارُ فَرُؤْمِيئِينَ ﴿۱۱۴﴾

(۱) یعنی میں تمہیں جو ایمان باللہ اور شرک نہ کرنے کی دعوت دے رہا ہوں، اس میں میری اطاعت کرو۔

(۲) میں تمہیں جو تبلیغ کر رہا ہوں، اس کا کوئی اجر تم سے نہیں مانگتا، بلکہ اس کا اجر رب العالمین ہی کے ذمے ہے جو قیامت کو وہ عطا فرمائے گا۔

(۳) یہ تاکید کے طور پر بھی ہے اور الگ الگ سبب کی بنا پر بھی، پہلے اطاعت کی دعوت، امانت داری کی بنیاد پر تھی اور اب یہ دعوت اطاعت عدم طمع کی وجہ سے ہے۔

(۴) الْإِذْءَلُونَ، اَزْدَلُّوا کی جمع ہے۔ جاہ و مال نہ رکھنے والے، اور اس کی وجہ سے معاشرے میں کمتر سمجھے جانے والے اور ان ہی میں وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو حقیر سمجھے جانے والے پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۵) یعنی مجھے اس بات کا مکلف نہیں ٹھہرایا گیا ہے کہ میں لوگوں کے حسب و نسب، امارت و غربت اور ان کے پیشوں کی تفتیش کروں بلکہ میری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ ایمان کی دعوت دوں اور جو اسے قبول کر لے، چاہے وہ کسی حیثیت کا حامل ہو، اسے اپنی جماعت میں شامل کر لوں۔

(۶) یعنی ان کے ضماں اور اعمال کی تفتیش یہ اللہ کا کام ہے۔

(۷) یہ ان کی اس خواہش کا جواب ہے کہ کمتر حیثیت کے لوگوں کو اپنے سے دور کر دے، پھر ہم تیری جماعت میں شامل ہو جائیں گے۔

(۸) پس جو اللہ سے ڈر کر میری اطاعت کرے گا، وہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں، چاہے دنیا کی نظر میں وہ شریف ہو یا

قَالُوا لَئِن كُنْتُمْ نَبِيًّا فَمَا بُدِّئَكُمْ مَوْلًى وَلَا جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ فَاتَّخَذْتُمْ لِكُلِّ قَوْمٍ هَبْطًا مَعِينًا ﴿۱۱۶﴾

انہوں نے کہا کہ اے نوح! اگر تو بازنہ آیا تو یقیناً تجھے سنگسار کر دیا جائے گا۔ (۱۱۶)

قَالَ رَبِّ إِنَّ قَوْمِي كَذَّابُونَ ﴿۱۱۷﴾

آپ نے کہا اے میرے پروردگار! میری قوم نے مجھے جھٹلادیا۔ (۱۱۷)

فَأَنصَحْتَنِي وَبَيَّنَّاهُمْ قَتْلَ أَخِيهِمْ وَمَنْ مَعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۱۸﴾

پس تو مجھ میں اور ان میں کوئی قطعی فیصلہ کر دے اور مجھے اور میرے بالیمان ساتھیوں کو نجات دے۔ (۱۱۸)

فَأَعْيَيْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي الْمَالِكِ الشُّعْرُونَ ﴿۱۱۹﴾

چنانچہ ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو بھری ہوئی کشتی میں (سوار کرا کر) نجات دے دی۔ (۱۱۹)

ثُمَّ أَعْرَفْنَا بَعْدَ الْبَأْسِ قَوْمَهُ ﴿۱۲۰﴾

بعد ازاں باقی کے تمام لوگوں کو ہم نے ڈبو دیا۔ (۱۲۰)

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۲۱﴾

یقیناً اس میں بہت بڑی عبرت ہے۔ ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے تھے بھی نہیں۔ (۱۲۱)

وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۱۲۲﴾

اور بیشک آپ کا پروردگار البتہ وہی ہے زبردست رحم کرنے والا۔ (۱۲۲)

كَذَّبَتْ عَادٌ بِالْمُرْسَلِينَ ﴿۱۲۳﴾

عادیوں نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔ (۱۲۳)

إِذْ قَالَ لَهُمُ ابْنُ مَرْيَمَ لَأَمْلَأَنَّ صُورَكُمْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۖ وَإِنْ تَنْتَهُبُوا فَتَيَبُوا بِهِ ۖ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحِيمُ ﴿۱۲۴﴾

جبکہ ان سے ان کے بھائی ہود نے کہا کہ کیا تم ڈرتے

رذیل، جلیل ہو یا حقیر۔

(۱) یہ تفصیلات کچھ پہلے بھی گزر چکی ہیں اور کچھ آئندہ بھی آئیں گی کہ حضرت نوح علیہ السلام کی ساڑھے نو سو سالہ تبلیغ کے باوجود ان کی قوم کے لوگ بد اخلاقی اور اعراض پر قائم رہے، بالآخر حضرت نوح علیہ السلام نے بد دعا کی، اللہ تعالیٰ نے کشتی بنانے کا اور اس میں مومن انسانوں، جانوروں اور ضروری سازو سامان رکھنے کا حکم دیا اور یوں اہل ایمان کو تو بچالیا گیا اور باقی سب لوگوں کو، حتیٰ کہ بیوی اور بیٹے کو بھی، جو ایمان نہیں لائے تھے، غرق کر دیا گیا۔

(۲) عاد، ان کے جد اعلیٰ کا نام تھا، جس کے نام پر قوم کا نام پڑ گیا۔ یہاں عاد کو قبیلہ تصور کر کے کَذَّبَتْ (صیغہ مونث) لایا گیا ہے۔

(۳) ہود علیہ السلام کو بھی عاد کا بھائی اسی لیے کہا گیا ہے کہ ہر نبی اسی قوم کا ایک فرد ہوتا تھا، جس کی طرف اسے مبعوث کیا جاتا تھا اور اسی اعتبار سے انہیں اس قوم کا بھائی قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ آگے بھی آئے گا اور انبیا و رسل کی یہ

”بشریت“ بھی ان کی قوموں کے ایمان لانے میں رکاوٹ بنی رہی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ نبی کو بشر نہیں، مانوق البشر ہونا

چاہیے۔ آج بھی اس مسلمہ حقیقت سے بے خبر لوگ پیغمبر اسلام حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مانوق البشر باور

کرانے پر تلے رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی خاندان قریش کے ایک فرد تھے جن کی طرف اولاً ان کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا۔

نہیں؟ (۱۲۳)

میں تمہارا امانتدار پیغمبر ہوں۔ (۱۲۵)

پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو! (۱۲۶)

میں اس پر تم سے کوئی اجرت طلب نہیں کرتا، میرا

ثواب تو تمام جہان کے پروردگار کے پاس ہی ہے۔ (۱۲۷)

کیا تم ایک ایک ٹیلے پر بطور کھیل تماشایا دگار (عمارت) بنا

رہے ہو۔ (۱۲۸)

اور بڑی صنعت والے (مضبوط محل تعمیر) کر رہے ہو، گویا

کہ تم ہمیشہ یہیں رہو گے۔ (۱۲۹)

اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو سختی اور ظلم سے پکڑتے

ہو۔ (۱۳۰)

اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔ (۱۳۱)

اس سے ڈرو جس نے ان چیزوں سے تمہاری امداد کی

جنہیں تم جانتے ہو۔ (۱۳۲)

اس نے تمہاری مدد کی مال سے اور اولاد سے۔ (۱۳۳)

باغات سے اور چشموں سے۔ (۱۳۴)

مجھے تو تمہاری نسبت بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿۱۲۳﴾

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ﴿۱۲۴﴾

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۲۵﴾

أَتَبْنُونَ بِحُلِّ رَبَعٍ لِيَاثِمَ مَعَٰبِدُونَ ﴿۱۲۶﴾

وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلَدُونَ ﴿۱۲۷﴾

وَإِذَا بَطِشْتُمْ بَطِشْتُمْ جَبَّارِينَ ﴿۱۲۸﴾

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ﴿۱۲۹﴾

وَاتَّقُوا الَّذِي أَمَّاكُمْ بِمَا تَمْلِكُونَ ﴿۱۳۰﴾

أَمْ كَلُمَٰتُ بِلُغَمٍ أَوْ بَنِينَ ﴿۱۳۱﴾

وَجَبَّتْ وَعْيُونُ ﴿۱۳۲﴾

إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۱۳۳﴾

(۱) رِبْعٌ، رِبْعَةٌ کی جمع ہے۔ ٹیلے، بلند جگہ، پہاڑ، درہ یا گھائی یہ ان گزرگاہوں پر کوئی عمارت تعمیر کرتے جو ارتفاع اور علو میں ایک نشانی یعنی ممتاز ہوتی۔ لیکن اس کا مقصد اس میں رہنا نہیں ہوتا بلکہ صرف کھیل کود ہوتا تھا۔ حضرت ہود علیہ السلام نے منع فرمایا کہ یہ تم ایسا کام کرتے ہو، جس میں وقت اور وسائل کا بھی ضیاع ہے اور اس کا مقصد بھی ایسا ہے جس سے دین اور دنیا کو کوئی مفاد وابستہ نہیں۔ بلکہ اس کے بیکار محض اور عبث ہونے میں کوئی شک نہیں۔

(۲) اسی طرح وہ بڑی مضبوط اور عالی شان رہائشی عمارتیں تعمیر کرتے تھے، جیسے وہ ہمیشہ انہی محلات میں رہیں گے۔

(۳) یہ ان کے ظلم و تشدد اور قوت و طاقت کی طرف اشارہ ہے۔

(۴) جب ان کے اوصاف قبیحہ بیان کیے جو ان کے دنیا میں انہماک اور ظلم و سرکشی پر دلالت کرتے ہیں تو پھر انہیں

دوبارہ تقویٰ اور اپنی اطاعت کی دعوت دی۔

ہے۔^(۱) (۱۳۵)

انہوں نے کہا کہ آپ وعظ کہیں یا وعظ کرنے والوں میں نہ ہوں ہم پر یکساں ہے۔ (۱۳۶)

یہ تو بس پرانے لوگوں کی عادت ہے۔ (۱۳۷)

اور ہم ہرگز عذاب نہیں دیے جائیں گے۔ (۱۳۸)

چونکہ عاد یوں نے حضرت ہود کو جھٹلایا، اس لیے ہم نے انہیں تباہ کر دیا،^(۲) یقیناً اس میں نشانی ہے اور ان میں سے اکثر بے ایمان تھے۔ (۱۳۹)

پیشک آپ کرب وہی ہے غالب مہربان۔ (۱۴۰)

قَالُوا سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَوَّعْتَ أَمْ لَمْ تَكُنْ مِنَ الْوَعَّيِّينَ ﴿۱۳۵﴾

إِنَّ هَذَا إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۳۶﴾

وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴿۱۳۷﴾

فَلَذَّذُوا بِهِ فَاهْتَدَوْا بِهِ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّمَن كَانَ

الْكَوْثَرُ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۳۸﴾

وَأَنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۱۳۹﴾

(۱) یعنی اگر تم نے اپنے کفر پر اصرار جاری رکھا اور اللہ نے تمہیں جو یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان کا شکر ادا نہیں کیا، تو تم عذاب الہی کے مستحق قرار پا جاؤ گے۔ یہ عذاب دنیا میں بھی آسکتا ہے اور آخرت تو ہے ہی عذاب و ثواب کے لیے۔ وہاں تو عذاب سے چھٹکارا ممکن ہی نہیں ہو گا۔

(۲) یعنی وہی باتیں ہیں جو پہلے بھی لوگ کرتے آئے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ ہم جس دین اور عادات و روایات پر قائم ہیں، وہ وہی ہیں جن پر ہمارے آباؤ اجداد کا رہنمائی ہے، مطلب دونوں صورتوں میں یہ ہے کہ ہم آباؤی مذہب کو نہیں چھوڑ سکتے۔

(۳) جب انہوں نے اس امر کا اظہار کیا کہ ہم تو اپنا آباؤی دین نہیں چھوڑیں گے، تو اس میں عقیدہ آخرت کا انکار بھی تھا۔ اس لیے انہوں نے عذاب میں مبتلا ہونے کا بھی انکار کیا۔ کیونکہ عذاب الہی کا اندیشہ تو اسے ہوتا ہے جو اللہ کو مانتا اور روز جزا کو تسلیم کرتا ہے۔

(۴) قوم عاد، دنیا کی مضبوط ترین اور قوی ترین قوم تھی، جس کی بابت اللہ نے فرمایا ہے: ﴿الَّذِينَ لَمْ يَخْلُقْنَا وَمَثَلًا فَايَ الْبِلَادِ﴾ (الفجر) ”اس جیسی قوم پیدا ہی نہیں کی گئی“ یعنی جو قوت اور شدت و جبروت میں اس جیسی ہو۔ اسی لیے یہ کہا کرتی تھی ﴿مَنْ أَشَدُّ مَتَابُوتًا﴾ (حلم السجدة: ۱۵) ”کون قوت میں ہم سے زیادہ ہے؟“ لیکن جب اس قوم نے بھی کفر کا راستہ چھوڑ کر ایمان و تقویٰ اختیار نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے سخت ہوا کی صورت میں ان پر عذاب نازل فرمایا جو مکمل سات راتیں اور آٹھ دن ان پر مسلط رہا۔ باد تند آتی اور آدمی کو اٹھا کر فضا میں بلند کرتی اور پھر زور سے سر کے بل زمین پر بیخ دیتی۔ جس سے اس کا دماغ پھٹ اور ٹوٹ جاتا اور بغیر سر کے ان کے لاشے اس طرح زمین پر پڑے ہوتے گویا وہ کھجور کے کھوکھلے تنے ہیں۔ انہوں نے پہاڑوں، کھوؤں اور غاروں میں بڑی بڑی مضبوط عمارتیں بنا رکھی تھیں، پینے کے لیے گہرے کنوئیں کھود رکھے تھے، باغات کی کثرت تھی۔ لیکن جب اللہ کا عذاب آیا تو کوئی چیز ان کے کام نہ آئی اور انہیں صفحہ ہستی سے مٹا کر رکھ دیا گیا۔

شمودیوں^(۱) نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا۔ (۱۳۱)
 ان کے بھائی صالح نے ان سے فرمایا کہ کیا تم اللہ سے
 نہیں ڈرتے؟ (۱۳۲)
 میں تمہاری طرف اللہ کا امانت دار پیغمبر ہوں۔ (۱۳۳)
 تو تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہا کرو۔ (۱۳۴)
 میں اس پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا، میری اجرت تو
 بس پروردگار عالم پر ہی ہے۔ (۱۳۵)
 کیا ان چیزوں میں جو میاں ہیں تم امن کے ساتھ چھوڑ
 دیے جاؤ گے۔ (۱۳۶)^(۲)
 یعنی ان باغوں اور ان چشموں۔ (۱۳۷)
 اور ان کھیتوں اور ان کھجوروں کے باغوں میں جن کے
 شگوفے نرم و نازک ہیں۔ (۱۳۸)^(۳)
 اور تم پہاڑوں کو تراش تراش کر پر تکلف مکانات بنا
 رہے ہو۔ (۱۳۹)^(۴)

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَيْهِمْ ۖ ﴿١٣١﴾
 إِذْ قَالَ لَهُمُ أُخُوهُمْ حَلِيقَةُ الْإِثْمُونَ ۖ ﴿١٣٢﴾
 إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۖ ﴿١٣٣﴾
 فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا أَمْرًا ۖ ﴿١٣٤﴾
 وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا هَلْ رِبَا عَلَّامِينَ ۖ ﴿١٣٥﴾
 أَن تَدْرِكُونَ فِي ظُلْمِهِنَا أَمِينِينَ ۖ ﴿١٣٦﴾
 فِي جَنَّتٍ وَعَيْبُونَ ۖ ﴿١٣٧﴾
 وَدُدُّوعٌ وَعِجْلٌ حَلِيقًا هَاضِمِينَ ۖ ﴿١٣٨﴾
 وَتَحْسَبُونَ مِنَ الْجِبَالِ مِنَ بُيُوتٍ مَأْمُونَةٍ ۖ ﴿١٣٩﴾

(۱) ثمود کا مسکن حجر تھا جو حجاز کے شمال میں ہے، آج کل اسے مدائن صالح کہتے ہیں۔ (ایسرالتفسیر) یہ عرب تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تبوک جاتے ہوئے ان بستیوں سے گزر کر گئے تھے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

(۲) یعنی یہ نعمتیں کیا تمہیں ہمیشہ حاصل رہیں گی، نہ تمہیں موت آئے گی نہ عذاب؟ استفہام انکاری اور توہنجی ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہو گا بلکہ عذاب یا موت کے ذریعے سے، جب اللہ چاہے گا، تم ان نعمتوں سے محروم ہو جاؤ گے۔ اس میں ترغیب ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو اور اس پر ایمان لاؤ اور تہیب ہے کہ اگر ایمان و شکر کا راستہ اختیار نہیں کیا تو پھر تباہی و بربادی تمہارا مقدر ہے۔

(۳) یہ ان نعمتوں کی تفصیل ہے جن سے وہ بہرہ ور تھے، 'حلق' کھجور کے اس شگوفے کو کہتے ہیں جو پہلے پہل نکلتا یعنی طلوع ہوتا ہے، اس کے بعد کھجور کا یہ پھل 'حلق' پھر 'بسر' پھر 'رطب' اور اس کے بعد تھر کھلاتا ہے۔ (ایسرالتفسیر) باغات میں دیگر پھلوں کے ساتھ کھجور کا پھل بھی آجاتا ہے۔ لیکن عربوں میں چونکہ کھجور کی بڑی اہمیت ہے، اس لیے اس کا خصوصی طور پر بھی ذکر کیا۔ 'هَضِيمٌ' کے اور بھی کئی معانی بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً 'لطیف' اور 'نرم و نازک'۔ تہ بہ تہ وغیرہ۔

(۴) 'فَارِهِينَ' یعنی ضرورت سے زیادہ تسخ، تکلف اور فن کارانہ مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یا اتراتے اور فخر و غرور

فَأَنكَبُوا إِلَى اللَّهِ وَأَلِيمُونَ ﴿۱۰﴾

وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۱﴾

الَّذِينَ يُقْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿۱۲﴾

قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمَسْحُورِينَ ﴿۱۳﴾

مَا أَنْتَ إِلَّا كَبْرٌ مِثْلُنَا فَأَنْتَ يَا بَلِيَّةُ أَنْ لَمْ تَمَنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۱۴﴾

قَالَ هَذِهِ نَاقَةٌ لَهَا شِرْكٌ وَالَّذِينَ يُدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ

وَلَا تَسْتَوْهَىٰ هِيَ وَلَا يَأْخُذُكُمْ عَنْهَا يَوْمَ عَظِيمٍ ﴿۱۵﴾

فَعَقَرُوهَا فَاصْبِرُوا إِنَّا مُبِينٌ ﴿۱۶﴾

پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ (۱۵۰)

بے باک حد سے گزر جانے والوں کی (۱) اطاعت سے باز آ جاؤ۔ (۱۵۱)

جو ملک میں فساد پھیلا رہے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔ (۱۵۲)

وہ بولے کہ بس تو ان میں سے ہے جن پر جادو کر دیا گیا ہے۔ (۱۵۳)

تو تو ہم جیسا ہی انسان ہے۔ اگر تو سچوں سے ہے تو کوئی معجزہ لے آ۔ (۱۵۴)

آپ نے فرمایا یہ ہے اونٹنی، پانی پینے کی ایک باری اس کی اور ایک مقررہ دن کی باری پانی پینے کی تمہاری۔ (۱۵۵) (۲)

خبردار! اسے برائی سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ ایک بڑے بھاری دن کا عذاب تمہاری گرفت کر لے گا۔ (۱۵۶) (۳)

پھر بھی انہوں نے اس کی کوچیں کٹ ڈالیں، بس وہ

کرتے ہوئے۔ جیسے آج کل لوگوں کا حال ہے۔ آج بھی عمارتوں پر بھی غیر ضروری آرائشوں اور فن کارانہ مہارتوں کا خوب خوب مظاہرہ ہو رہا ہے اور اس کے ذریعے سے ایک دوسرے پر برتری اور فخر و غرور کا اظہار بھی۔

(۱) مُسْرِفِينَ سے مراد وہ رؤسا اور سردار ہیں جو کفر و شرک کے داعی اور مخالفت حق میں پیش پیش تھے۔

(۲) یہ وہی اونٹنی تھی جو ان کے مطالبے پر پتھر کی ایک چٹان سے بطور معجزہ ظاہر ہوئی تھی۔ ایک دن اونٹنی کے لیے اور ایک دن ان کے لیے پانی مقرر کر دیا گیا تھا، اور ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ جو دن تمہارا پانی لینے کا ہو گا، اونٹنی گھاٹ پر نہیں آئے گی اور جو دن اونٹنی کے پانی پینے کا ہو گا، تمہیں گھاٹ پر آنے کی اجازت نہیں ہے۔

(۳) دوسری بات انہیں یہ کہی گئی کہ اس اونٹنی کو کوئی بری نیت سے ہاتھ نہ لگائے، نہ اسے نقصان پہنچایا جائے۔ چنانچہ یہ اونٹنی اسی طرح ان کے درمیان رہی۔ گھاٹ سے پانی پیتی اور گھاس چارہ کھا کر گزارہ کرتی۔ اور کہا جاتا ہے کہ قوم ثمود اس کا دودھ دہتی تھی اور اس سے فائدہ اٹھاتی۔ لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد انہوں نے اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔

(۴) یعنی باوجود اس بات کے کہ وہ اونٹنی، اللہ کی قدرت کی ایک نشانی اور پیغمبر کی صداقت کی دلیل تھی، قوم ثمود ایمان نہیں لائی اور کفر و شرک کے راستے پر گامزن رہی اور اس کی سرکشی یہاں تک بڑھی کہ بالآخر قدرت کی زندہ نشانی

پشیمان ہو گئے۔^(۱) (۱۵۷)

اور عذاب نے انہیں آدلوچا۔^(۲) بیشک اس میں عبرت ہے۔ اور ان میں سے اکثر لوگ مومن نہ تھے۔ (۱۵۸)

اور بیشک آپ کا رب بڑا زبردست اور مہربان ہے۔ (۱۵۹)
قوم لوط^(۳) نے بھی نبیوں کو جھٹلایا۔ (۱۶۰)

ان سے ان کے بھائی لوط (علیہ السلام) نے کہا کیا تم اللہ کا خوف نہیں رکھتے؟ (۱۶۱)

میں تمہاری طرف امانت دار رسول ہوں۔ (۱۶۲)

پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ (۱۶۳)
میں تم سے اس پر کوئی بدلہ نہیں مانگتا میرا اجر تو صرف اللہ تعالیٰ پر ہے جو تمام جہان کا رب ہے۔ (۱۶۴)

کیا تم جہان والوں میں سے مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو۔ (۱۶۵)

اور تمہاری جن عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے تمہارا جوڑ بنایا ہے ان کو چھوڑ دیتے ہو،^(۴) بلکہ تم ہو ہی حد سے گزر

فَاعَذَّبْنَاهُمُ الْعَذَابَ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۵۷﴾

وَلَئِن رَّبَّكَ لَهَوَّ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۱۵۸﴾

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۵۹﴾

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطُ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿۱۶۰﴾

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿۱۶۱﴾

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا أَمْرًا

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶۲﴾

أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶۳﴾

وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لَكُمْ

أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ﴿۱۶۴﴾

”اونٹنی“ کی کوجیس کاٹ ڈالیں یعنی اس کے ہاتھوں اور پیروں کو زخمی کر دیا، جس سے وہ بیٹھ گئی اور پھر اسے قتل کر دیا۔
(۱) یہ اس وقت ہوا جب اونٹنی کے قتل کے بعد حضرت صالح علیہ السلام نے کہا کہ اب تمہیں صرف تین دن کی مہلت ہے، چوتھے دن تمہیں ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد جب واقعی عذاب کی علامتیں ظاہر ہونی شروع ہو گئیں، تو پھر ان کی طرف سے بھی اظہارِ ندامت ہونے لگا۔ لیکن علاماتِ عذاب دیکھ لینے کے بعد ندامت اور توبہ کا کوئی فائدہ نہیں۔

(۲) یہ عذاب زمین سے بھونچال (زلزلے) اور اوپر سے سخت چنگھاڑ کی صورت میں آیا، جس سے سب کی موت واقع ہو گئی۔

(۳) حضرت لوط علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی ہار ان بن آزر کے بیٹے تھے۔ ان کو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی زندگی میں نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ ان کی قوم ”سدوم“ اور ”عمورہ“ میں رہتی تھی۔ یہ بیتیں شام کے علاقے میں تھیں۔

(۴) یہ قوم لوط کی سب سے بری عادت تھی، جس کی ابتدا اسی قوم سے ہوئی تھی، اسی لیے اس فعل بد کو لواطت سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی وہ بد فعلی جس کا آغاز قوم لوط سے ہوا لیکن اب یہ بد فعلی پوری دنیا میں عام ہے بلکہ یورپ میں تو اسے قانوناً جائز تسلیم کر لیا گیا ہے یعنی ان کے ہاں اب یہ سرے سے گناہ ہی نہیں ہے۔ جس قوم کا مذاق اتنا بگڑ گیا ہو کہ مرد و عورت کا ناجائز جنسی ملاپ (بشرطیکہ باہمی رضامندی سے ہو) ان کے نزدیک جرم نہ ہو، تو وہاں دو مردوں کا آپس

جانے والے۔^(۱) (۱۶۶)

انہوں نے جواب دیا کہ اے لوط! اگر تو باز نہ آیا تو یقیناً نکال دیا جائے گا۔^(۲) (۱۶۷)

آپ نے فرمایا، میں تمہارے کام سے سخت ناخوش ہوں۔^(۳) (۱۶۸)

میرے پروردگار! مجھے اور میرے گھرانے کو اس (دوبل) سے بچالے جو یہ کرتے ہیں۔ (۱۶۹)

پس ہم نے اسے اور اسکے متعلقین کو سب کو بچالیا۔ (۱۷۰)

بجز ایک بڑھیا کے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں ہو گئی۔^(۴) (۱۷۱)

پھر ہم نے باقی اور سب کو ہلاک کر دیا۔ (۱۷۲)

اور ہم نے ان پر ایک خاص قسم کا مینہ برسایا، پس بہت ہی برا مینہ تھا جو ڈرائے گئے ہوئے لوگوں پر برسا۔^(۵) (۱۷۳)

قَالُوا لَنْ نَمُوتَ نَحْنُ وَلَا نَكُونُ مِنَ الْمُتَحَرِّجِينَ ﴿۱۶۶﴾

قَالَ إِنِّي لَعَلِّكُمْ مِنَ الْقَالِينَ ﴿۱۶۷﴾

رَبِّ جِبْتِي وَأَهْلِي وَإِنِّي مَتَّاعُونَ ﴿۱۶۸﴾

فَتَيَيَّنُّهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ ﴿۱۶۹﴾

إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَدِيرِ ﴿۱۷۰﴾

ثُمَّ دَمَرْنَا الْآخَرِينَ ﴿۱۷۱﴾

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا مُسَاءً مَطَرًا مُنْتَدِرِينَ ﴿۱۷۲﴾

میں بد فعلی کرنا کیونکر گناہ اور ناجائز ہو سکتا ہے؟ أَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ

(۱) عَادُونَ، عَادِ کی جمع ہے۔ عربی میں عَادِ کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنے والا۔ یعنی حق کو چھوڑ کر باطل کو اور حلال کو چھوڑ کر حرام کو اختیار کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ نے نکاح شرعی کے ذریعے سے عورت کی فرج سے اپنی جنسی خواہش کی تسکین کو حلال قرار دیا ہے اور اس کام کے لیے مرد کی دبر کو حرام۔ قوم لوط نے عورتوں کی شرم گاہوں کو چھوڑ کر مردوں کی دبر اس کام کے لیے استعمال کی اور یوں اس نے حد سے تجاوز کیا۔

(۲) یعنی حضرت لوط علیہ السلام کے وعظ و نصیحت کے جواب میں اس نے کہا کہ تو بڑا پاک باز بنا پھرتا ہے۔ یاد رکھنا اگر تو باز نہ آیا تو ہم اپنی بستی میں تجھے رہنے ہی نہیں دیں گے۔ آج بھی بدیوں کا اتنا غلبہ اور بدوں کا اتنا زور ہے کہ نیکی منہ چھپائے پھرتی ہے۔ اور نیکوں کے لیے عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا ہے۔

(۳) یعنی میں اسے پسند نہیں کرتا اور اس سے سخت بیزار ہوں۔

(۴) اس سے مراد حضرت لوط علیہ السلام کی بوڑھی بیوی ہے جو مسلمان نہیں ہوئی تھی، چنانچہ وہ بھی اپنی قوم کے ساتھ ہی ہلاک کر دی گئی۔

(۵) یعنی نشان زدہ کنکر پتھروں کی بارش سے ہم نے ان کو ہلاک کیا اور ان کی بستیوں کو ان پر الٹ دیا گیا، جیسا کہ سورہ

إِنِّي فِي ذَلِكَ لَكَايَةٌ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۰﴾

وَلَنْ نَبَكَ لَهُوَ الْعَوْنُ الرَّحِيمُ ﴿۱۱﴾

كَذَّابٌ أَصْحَابُ لَيْلَةَ الْمُوسَىٰ ﴿۱۲﴾

إِذْ قَالَ لَهُمْ مُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿۱۳﴾

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿۱۴﴾

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ﴿۱۵﴾

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَتَيْتُمُ الْوَاعِلِينَ ﴿۱۶﴾

أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ﴿۱۷﴾

یہ ماجرا بھی سراسر عبرت ہے۔ ان میں سے بھی اکثر مسلمان نہ تھے۔ (۱۷۴)

بیشک تیرا پروردگار وہی ہے غلبے والا مہربانی والا۔ (۱۷۵)

ایکے والوں^(۱) نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔ (۱۷۶)

جبکہ ان سے شعیب (علیہ السلام) نے کہا کہ کیا تمہیں ڈر خوف نہیں؟ (۱۷۷)

میں تمہاری طرف امانت دار رسول ہوں۔ (۱۷۸)

اللہ کا خوف کھاؤ اور میری فرمانبرداری کرو۔ (۱۷۹)

میں اس پر تم سے کوئی اجرت نہیں چاہتا، میرا اجر تمام جہانوں کے پالنے والے کے پاس ہے۔ (۱۸۰)

ناپ پورا بھرا کرو کم دینے والوں میں شمولیت نہ کرو۔^(۲) (۱۸۱)

(۱) آيَةَ: جنگل کو کہتے ہیں۔ اس سے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم اور بستی ”مدین“ کے اطراف کے باشندے مراد ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ ایک کے معنی ہیں گھنا درخت اور ایسا ایک درخت مدین کی نواحی آبادی میں تھا۔ جس کی پوجا پات ہوتی تھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام کا دائرہ نبوت اور حدود دعوت و تبلیغ، مدین سے لے کر اس نواحی آبادی تک تھا، جہاں ایک درخت کی پوجا ہوتی تھی۔ وہاں کے رہنے والوں کو اصحاب الایکہ کہا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اصحاب الایکہ اور اہل مدین کے پیغمبر ایک ہی یعنی حضرت شعیب علیہ السلام تھے اور یہ ایک ہی پیغمبر کی امت تھی۔ ایک، چونکہ قوم نہیں، بلکہ درخت تھا۔ اس لیے اخوت نسبی کا یہاں ذکر نہیں کیا، جس طرح کہ دوسرے انبیاء کے ذکر میں ہے۔ البتہ جہاں مدین کے ضمن میں حضرت شعیب علیہ السلام کا نام لیا گیا ہے، وہاں ان کے اخوت نسبی کا ذکر بھی ملتا ہے، کیونکہ مدین، قوم کا نام ہے۔ ﴿وَالَّذِينَ مَدِينًا لِحَاثِمِهِمْ شُعَيْبًا﴾ (الأعراف: ۸۵) بعض مفسرین نے اصحاب الایکہ اور مدین کو الگ الگ بستیاں قرار دے کر کہا ہے کہ یہ مختلف دو امتیں ہیں، جن کی طرف باری باری حضرت شعیب علیہ السلام کو بھیجا گیا۔ ایک مرتبہ مدین کی طرف اور دوسری مرتبہ اصحاب الایکہ کی طرف۔ لیکن امام ابن کثیر نے فرمایا ہے کہ صحیح بات یہی ہے کہ یہ ایک ہی امت ہے، ﴿أَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ﴾ کا جو وعظ اہل مدین کو کیا گیا، یہی وعظ یہاں اصحاب الایکہ کو کیا جا رہا ہے، جس سے صاف واضح ہے کہ یہ ایک ہی امت ہے، دو نہیں۔

(۲) یعنی جب تم لوگوں کو ناپ کرو تو اسی طرح پورا دو، جس طرح لیتے وقت تم پورا ناپ کر لیتے ہو۔ لینے اور دینے کے پیمانے الگ الگ مت رکھو، کہ دیتے وقت کم دو اور لیتے وقت پورا لو!

اور سیدھی صحیح ترازو سے تولا کرو۔^(۱) (۱۸۲)
 لوگوں کو ان کی چیزیں کمی سے نہ دو،^(۲) بے باکی کے
 ساتھ زمین میں فساد چلاتے نہ پھرو۔^(۳) (۱۸۳)
 اس اللہ کا خوف رکھو جس نے خود تمہیں اور اگلی مخلوق
 کو پیدا کیا ہے۔^(۴) (۱۸۴)
 انہوں نے کہا تو ان میں سے ہے جن پر جادو کر دیا جاتا
 ہے۔ (۱۸۵)
 اور تو تو ہم ہی جیسا ایک انسان ہے اور ہم تو تجھے جھوٹ
 بولنے والوں میں سے ہی سمجھتے ہیں۔^(۵) (۱۸۶)
 اگر تو سچے لوگوں میں سے ہے تو ہم پر آسمان کے ٹکڑے
 گرا دے۔^(۶) (۱۸۷)
 کہا کہ میرا رب خوب جاننے والا ہے جو کچھ تم کر رہے
 ہو۔^(۷) (۱۸۸)

وَرَبُّوْا بِالصَّلٰتِ الْمُنْقِيَةِ ۝
 وَلَا تَبْخَسُوْا النَّاسَ اَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَبُوْا فِي الْاَرْضِ مُعْسِدِيْنَ ۝
 وَاعْتَوِا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْحَيٰةَ الْاُولٰٓئِيْنَ ۝
 قَالُوْا لَئِنَّمَا اَنْتُمْ مِنَ الْمُنۢجِبِيْنَ ۝
 وَمَا اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝
 فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَافًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝
 قَالَ رَبِّيْۤ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

(۱) اسی طرح تول میں ڈنڈی مت مارو، بلکہ پورا صحیح تول کرو!

(۲) یعنی لوگوں کو دیتے وقت ناپ یا تول میں کمی مت کرو۔

(۳) یعنی اللہ کی نافرمانی مت کرو، اس سے زمین میں فساد پھیلتا ہے۔ بعض نے اس سے مراد وہ رہزنی لی ہے، جس کا ارتکاب بھی یہ قوم کرتی تھی۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ہے: ﴿وَلَا تَعْتَدُوا بِحُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ﴾ (الأعراف: ۸۲) ”راستوں میں لوگوں کو ڈرانے کے لیے مت بیٹھو“۔ (ابن کثیر)

(۴) جبلّۃ اور جبلّ، مخلوق کے معنی میں ہے، جس طرح دوسرے مقام پر شیطان کے بارے میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اَضَلَّ وَمَنكُم مِّثْلُ مَا يَكْفُرُوْنَ﴾ (سورۃ یونس: ۱۳۰) ”اس نے تم میں سے بہت ساری مخلوق کو گمراہ کیا“ اس کا استعمال بڑی جماعت کے لیے ہوتا ہے۔ وَهُوَ الْجَمْعُ ذُو الْعَدَدِ الْكَثِيْرِ مِنَ النَّاسِ (فتح القدیر)

(۵) یعنی تو جو دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے اللہ نے وحی و رسالت سے نوازا ہے، ہم تجھے اس دعوے میں جھوٹا سمجھتے ہیں، کیونکہ تو بھی ہم جیسا ہی انسان ہے۔ پھر تو اس شرف سے مشرف کیونکر ہو سکتا ہے؟

(۶) یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی تہدید کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر تو واقعی سچا ہے تو جا ہم تجھے نہیں مانتے، ہم پر آسمان کا ٹکڑا گرا کر دکھا!

(۷) یعنی تم جو کفر و شرک کر رہے ہو، سب اللہ کے علم میں ہے اور وہی اس کی جزا تمہیں دے گا، اگر چاہے گا تو دنیا میں

چونکہ انہوں نے اسے جھٹلایا تو انہیں ساتیان والے دن کے عذاب نے پکڑ لیا۔^(۱) وہ بڑے بھاری دن کا عذاب تھا۔ (۱۸۹)

یقیناً اس میں بڑی نشانی ہے اور ان میں کے اکثر مسلمان نہ تھے۔ (۱۹۰)

اور یقیناً تیرا پروردگار البتہ وہی ہے غلبے والا مہربانی والا۔ (۱۹۱)
اور بیشک وہ شبہ یہ (قرآن) رب العالمین کا نازل فرمایا ہوا ہے۔ (۱۹۲)

اسے امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔^(۲) (۱۹۳)
آپ کے دل پر اترا ہے^(۳) کہ آپ آگاہ کر دینے والوں

كَذَّبُوهُ فَآخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظَّلَامَةِ إِنَّكَ كَانَ عَذَابَ
يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۱۹﴾

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۹﴾

وَأَنَّ رَبَّكَ لَهوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۲۰﴾

وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۲۱﴾

نَزَّلَ بِهِ الْوُحُوحَ الْوَعِيدِينَ ﴿۲۲﴾

عَلَى قَلْبِكَ لِيَتَكُونَنَّ مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿۲۳﴾

بھی دے دے گا، یہ عذاب اور سزا اس کے اختیار میں ہے۔

(۱) انہوں نے بھی کفار مکہ کی طرح آسمانی عذاب مانگا تھا، اللہ نے اس کے مطابق ان پر عذاب نازل فرمادیا اور وہ اس طرح کہ بعض روایات کے مطابق سات دن تک ان پر سخت گرمی اور دھوپ مسلط کر دی، اس کے بعد بادلوں کا ایک سایہ آیا اور یہ سب گرمی اور دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے اس سائے تلے جمع ہو گئے اور کچھ سکھ کا سانس لیا۔ لیکن چند لمحے بعد ہی آسمان سے آگ کے شعلے برسنے شروع ہو گئے، زمین زلزلے سے لرزاٹھی اور ایک سخت چنگھاڑنے انہیں ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا۔ یوں تین قسم کا عذاب ان پر آیا اور یہ اس دن آیا جس دن ان پر بادل سایہ لگن ہوا، اس لیے فرمایا کہ سائے والے دن کے عذاب نے انہیں پکڑ لیا۔

○ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تین مقامات پر قوم شعیب علیہ السلام کی ہلاکت کا ذکر کیا ہے اور تینوں جگہ موقع کی مناسبت سے الگ الگ عذاب کا ذکر کیا ہے۔ سورہ اعراف، ۸۸ میں زلزلہ کا ذکر ہے، سورہ ہود، ۹۳ میں صَبِيحَةٌ (چیخ) کا اور یہاں شعراء میں آسمان سے نکلے گرانے کا۔ یعنی تین قسم کا عذاب اس قوم پر آیا۔

(۲) کفار مکہ نے قرآن کے وحی الہی اور منزل من اللہ ہونے کا انکار کیا اور اسی بنا پر رسالت محمدیہ اور دعوت محمدیہ کا انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کر کے یہ واضح کیا کہ یہ قرآن یقیناً وحی الہی ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے سچے رسول ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ پیغمبر جو پڑھ سکتا ہے نہ لکھ سکتا ہے گزشتہ انبیاء اور قوموں کے واقعات کس طرح بیان کر سکتا تھا؟ اس لیے یہ قرآن یقیناً اللہ رب العالمین ہی کی طرف سے نازل کردہ ہے جسے ایک امانت دار فرشتہ یعنی جبرائیل علیہ السلام لے کر آئے۔

(۳) دل کا بطور خاص اس لیے ذکر فرمایا کہ حواس باطن میں دل ہی سب سے زیادہ ادراک اور حفظ کی قوت رکھتا ہے۔

میں سے ہو جائیں۔^(۱) (۱۹۴)

صاف عربی زبان میں ہے۔ (۱۹۵)

اگلے نبیوں کی کتابوں میں بھی اس قرآن کا تذکرہ ہے۔^(۲) (۱۹۶)

کیا انہیں یہ نشانی کافی نہیں کہ حقانیت قرآن کو تو بنی اسرائیل کے علماء بھی جانتے ہیں۔^(۳) (۱۹۷)

اور اگر ہم اسے کسی عجمی شخص پر نازل فرماتے۔ (۱۹۸)

پس وہ ان کے سامنے اس کی تلاوت کرتا تو یہ اسے باور کرنے والے نہ ہوتے۔^(۴) (۱۹۹)

اسی طرح ہم نے گنہگاروں کے دلوں میں اس انکار کو داخل کر دیا ہے۔^(۵) (۲۰۰)

وہ جب تک دردناک عذابوں کو ملاحظہ نہ کر لیں ایمان نہ لائیں گے۔ (۲۰۱)

پس وہ عذاب ان کو ناگماں آجائے گا انہیں اس کا شعور بھی نہ ہوگا۔ (۲۰۲)

يَلْسَانِ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ﴿۱۹۴﴾

وَلَا تَلْعَلْ يُدْرِي الْأَوَّلِينَ ﴿۱۹۵﴾

أَوَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ آيَةٌ أَنْ يَعْلَمَهُ عُلَمَاءُ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿۱۹۶﴾

وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَىٰ بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ ﴿۱۹۷﴾

فَقَرَأَهُ عَلَيْهِمْ مَا كَانُوا بِهِ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۹۸﴾

كَذَلِكَ سَلَكْنَاهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ﴿۱۹۹﴾

لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ حَتَّىٰ يَرُوا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿۲۰۰﴾

فَيَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۲۰۱﴾

(۱) یہ نزول قرآن کی علت ہے۔

(۲) یعنی جس طرح پیغمبر آخر الزماں ﷺ کے ظہور و بعثت کا اور آپ ﷺ کی صفات جلیلہ کا تذکرہ پچھلی کتابوں میں ہے، اسی طرح اس قرآن کے نزول کی خوشخبری بھی صحف سابقہ میں دی گئی تھی۔ ایک دوسرے معنی یہ کیے گئے ہیں کہ یہ قرآن مجید، بہ اعتبار ان احکام کے، جن پر تمام شریعتوں کا اتفاق رہا ہے، پچھلی کتابوں میں بھی موجود رہا ہے۔

(۳) کیونکہ ان کتابوں میں آپ ﷺ کا ذکر موجود ہے۔ یہ کفار مکہ، مذہبی معاملات میں یہود کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس اعتبار سے فرمایا کہ کیا ان کا یہ جاننا اور بتلانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کے سچے رسول اور یہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ پھر یہ یہود کی اس بات کو مانتے ہوئے پیغمبر پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟

(۴) یعنی کسی عجمی زبان میں نازل کرتے تو یہ کہتے کہ یہ تو ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ جیسے تم الحجۃ ۳۳ میں ہے۔

(۵) یعنی سَلَكْنَاهُ میں ضمیر کا مرجع کفر و تکذیب اور مجھو و عناد ہے۔

اس وقت کہیں گے کہ کیا ہمیں کچھ مہلت دی جائے گی؟ (۱) (۲۰۳)

پس کیا یہ ہمارے عذاب کی جلدی چارہ ہے؟ (۲) (۲۰۴)
اچھا یہ بھی بتاؤ کہ اگر ہم نے انہیں کئی سال بھی فائدہ اٹھانے دیا۔ (۲۰۵)

پھر انہیں وہ عذاب آگاہ جن سے یہ دھمکائے جاتے تھے۔ (۲۰۶)

تو جو کچھ بھی یہ برتتے رہے اس میں سے کچھ بھی فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ (۳) (۲۰۷)

ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا ہے مگر اسی حال میں کہ اس کے لیے ڈرانے والے تھے۔ (۲۰۸)

نصیحت کے طور پر اور ہم ظلم کرنے والے نہیں ہیں۔ (۴) (۲۰۹)
اس قرآن کو شیطان نہیں لائے۔ (۲۱۰)

نہ وہ اس کے قابل ہیں، نہ انہیں اس کی طاقت ہے۔ (۲۱۱)
بلکہ وہ تو سننے سے بھی محروم کر دیئے گئے ہیں۔ (۵) (۲۱۲)

فَيَقُولُوا هَلْ عَنَّا مَنظُورٌ ﴿۱﴾

أَفِعَدَا إِنَّا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿۲﴾

أَفَرَأَيْتَ إِنَّا مَتَّعْنَاهُمْ سِنِينَ ﴿۳﴾

ثُمَّ جَاءَهُمْ مَا كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿۴﴾

مَا عَافَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَسْتَعْوُونَ ﴿۵﴾

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَوْمٍ إِلَّا لَهَا مُنْذِرُونَ ﴿۶﴾

يَذُكَّرُ شَأْنًا كَمَا ظَلَمُوا ﴿۷﴾

وَمَا تَنَزَّلُ بِهِ الشَّيْطَانُ ﴿۸﴾

وَمَا يَنْبَغِي لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿۹﴾

إِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعَزُونَ ﴿۱۰﴾

(۱) لیکن مشاہدہ عذاب کے بعد مہلت نہیں دی جاتی، نہ اس وقت کی توبہ ہی مقبول ہے، ﴿فَكَذَّبْتَ وَيَنْتَعِمُ

إِنَّهَا لَهُمْ لِمَا رَأَوْا بَأْسًا﴾ (المؤمن-۸۵)

(۲) یہ اشارہ ہے ان کے مطالبے کی طرف جو اپنے پیغمبر سے کرتے رہے ہیں کہ اگر تو سچا ہے تو عذاب لے آ۔

(۳) یعنی اگر ہم انہیں مہلت دے دیں اور پھر انہیں اپنے عذاب کی گرفت میں لیں، تو کیا دنیا کا مال و متاع ان کے کچھ

کام آئے گا؟ یعنی انہیں عذاب سے بچا سکے گا؟ نہیں، یقیناً نہیں۔ ﴿وَمَا هُوَ بِمُخْرِجُهُ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ﴾ (البقرہ

۱۱۶) ﴿وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّى﴾ (اللیل-۱۱)

(۴) یعنی ارسال رسل اور انذار کے بغیر اگر ہم کسی بستی کو ہلاک کر دیتے تو یہ ظلم ہوتا، ہم نے ایسا ظلم نہیں کیا بلکہ

عدل کے تقاضوں کے مطابق ہم نے پہلے ہر بستی میں رسول بھیجے، جنہوں نے اہل قریہ کو عذاب الہی سے ڈرایا اور اس

کے بعد جب انہوں نے پیغمبر کی بات نہیں مانی، تو ہم نے انہیں ہلاک کیا۔ یہی مضمون بنی اسرائیل ۱۵ اور قصص-۵۹

وغیرہ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

(۵) ان آیات میں قرآن کی شیطانی دخل اندازیوں سے، محفولیت کا بیان ہے۔ ایک تو اس لیے کہ شیاطین کا قرآن لے

پس تو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکار کہ تو بھی سزا پانے والوں میں سے ہو جائے۔ (۲۱۳)
 اپنے قریبی رشتہ والوں کو ڈرادے۔ (۲۱۳)^(۱)
 اس کے ساتھ فروتنی سے پیش آ، جو بھی ایمان لانے والا ہو کر تیری تابعداری کرے۔ (۲۱۵)
 اگر یہ لوگ تیری نافرمانی کریں تو تو اعلان کر دے کہ میں ان کاموں سے بیزار ہوں جو تم کر رہے ہو۔ (۲۱۶)
 اپنا پورا بھروسہ غالب مہربان اللہ پر رکھ۔ (۲۱۷)
 جو تجھے دیکھتا رہتا ہے جبکہ تو کھڑا ہوتا ہے۔ (۲۱۸)

فَلَا تَذُمَّ مَعَ اللَّهِ الْخَرَفَةَ كُنْ مِنَ الْمُعَذِّبِينَ ﴿٢١٣﴾
 وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴿٢١٤﴾
 وَأَخِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢١٥﴾
 فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٢١٦﴾
 وَذَكِّرْ عَلَى الْعَرَبِ الرَّحِيمِ ﴿٢١٧﴾
 الَّذِي يَرِيكَ حِينَ تَقُومُ ﴿٢١٨﴾

کر نازل ہونا، ان کے لائق نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا مقصد شرف و فساد اور منکرات کی اشاعت ہے، جب کہ قرآن کا مقصد نیکی کا حکم اور فروغ اور منکرات کا سدباب ہے۔ گویا دونوں ایک دوسرے کی ضد اور باہم منافی ہیں۔ دوسرے یہ کہ شیاطین اس کی طاقت بھی نہیں رکھتے، تیسرے، نزول قرآن کے وقت شیاطین اس کے سننے سے دور اور محروم رکھے گئے، آسمانوں پر ستاروں کو چوکیدار بنا دیا گیا تھا اور جو بھی شیطان اوپر جاتا یہ ستارے اس پر برقِ ظالم بن کر گرتے اور بھسم کر دیتے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کو شیاطین سے بچانے کا خصوصی اہتمام فرمایا۔

(۱) پیغمبر کی دعوت صرف رشتہ داروں کے لیے نہیں، بلکہ پوری قوم کے لیے ہوتی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو پوری نسل انسانی کے لیے ہادی اور رہبر بن کر آئے تھے۔ قریبی رشتہ داروں کو دعوت ایمان، دعوت عام کے منافی نہیں، بلکہ اسی کا ایک حصہ یا اس کا ایک ترجمی پہلو ہے۔ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی سب سے پہلے اپنے باپ آزر کو توحید کی دعوت دی تھی۔ اس حکم کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم صفا پھاڑی پر چڑھ گئے اور یا صَبَّاحَا کہہ کر آواز دی۔ یہ کلمہ اس وقت بولا جاتا ہے جب دشمن اچانک حملہ کر دے، اس کے ذریعے سے قوم کو خردا رکھا جاتا ہے۔ یہ کلمہ سن کر لوگ جمع ہو گئے، آپ نے قریش کے مختلف قبیلوں کے نام لے لے کر فرمایا، تلاؤ اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر دشمن کا لشکر موجود ہے جو تم پر حملہ آور ہوا چاہتا ہے، تو کیا تم مانو گے؟ سب نے کہا ہاں، یقیناً ہم تصدیق کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ نے نذیر بنا کر بھیجا ہے، میں تمہیں ایک سخت عذاب سے ڈراتا ہوں، اس پر ابولہب نے کہا تَبَّ لَكَ أَمَا دَعَوْتَنَا إِلَّا لِهَذَا تَبَّرَ لَكَ عَذَابُكَ؟ کیا تو نے ہمیں اسی لیے بلایا تھا؟ اس کے جواب میں سورہ تبت نازل ہوئی (صحیح بخاری، تفسیر سورہ المسد) آپ ﷺ نے اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا اور اپنی چھوٹی بہن حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو بھی فرمایا، تم اللہ کے ہاں بچاؤ کا بندوبست کر لو، میں وہاں تمہارے کام نہیں آسکوں گا۔ (صحیح مسلم کتاب الإيمان، باب وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ)

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ﴿١٩﴾

إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٢٠﴾

هَلْ أُنبِئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَدْعُوا الشَّيْطِينَ ﴿٢١﴾

تَدْعُوا عَلَىٰ كُلِّ آثَانٍ أَتَوْا ﴿٢٢﴾

يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْتَرَهُمْ كِبْرًا هُمْ يَتَّبِعُونَ ﴿٢٣﴾

وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ﴿٢٤﴾

أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَمُؤِنُونَ ﴿٢٥﴾

وَأَنَّهُمْ يَتَّبِعُونَ مَا لَا يُفْعَلُونَ ﴿٢٦﴾

اور سجدہ کرنے والوں کے درمیان تیرا گھومنا پھرنا بھی۔ (۲۱۹)^(۱)

وہ بڑا ہی سننے والا اور خوب ہی جاننے والا ہے۔ (۲۲۰)

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں۔ (۲۲۱)

وہ ہر ایک جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں۔ (۲۲۲)^(۲)

(اچھی) ہوئی سنی سنائی پہنچا دیتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں۔ (۲۲۳)^(۳)

شاعروں کی پیروی وہ کرتے ہیں جو بے ہوش ہوں۔ (۲۲۴)

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ شاعر ایک ایک بیابان میں سر ٹکراتے پھرتے ہیں۔ (۲۲۵)

اور وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔ (۲۲۶)^(۴)

(۱) یعنی جب تو تہا ہوتا ہے، تب بھی اللہ دیکھتا ہے اور جب لوگوں میں ہوتا ہے تب بھی۔

(۲) یعنی اس قرآن کے نزول میں شیطان کا کوئی دخل نہیں ہے، کیونکہ شیطان تو جھوٹوں اور گناہ گاروں (یعنی کاہنوں) نجومیوں وغیرہ) پر اترتے ہیں نہ کہ انبیاء و صالحین پر۔

(۳) یعنی ایک آدھ بات، جو کسی طرح وہ سننے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، ان کاہنوں کو آکر بتلا دیتے ہیں، جن کے ساتھ وہ جھوٹی باتیں اور ملا لیتے ہیں (جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے)۔ ملاحظہ ہو (صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قراءة الفاجر والمنافق وبدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب تحريم الكهانة وإتيان الكهان) يُلْقُونَ السَّمْعَ - شياطين آسمان سے سنی ہوئی بعض باتیں کاہنوں کو پہنچا دیتے ہیں، اس صورت میں سمع کے معنی سموع کے ہوں گے۔ لیکن اگر اس کا مطلب حاسہ ساعت (کان) ہے، تو مطلب ہو گا کہ شياطين آسمانوں پر جا کر کان لگا کر چوری چھپے بعض باتیں سن آتے ہیں اور پھر انہیں کاہنوں تک پہنچا دیتے ہیں۔

(۴) شاعروں کی اکثریت چوتک ایسی ہوتی ہے کہ وہ مدح و ذم میں، اصول و ضابطے کے بجائے، ذاتی پسند و ناپسند کے مطابق اظہار رائے کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں غلو اور مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں اور شاعرانہ تخيلات میں کبھی ادھر اور کبھی ادھر بھٹکتے ہیں، اس لیے فرمایا کہ ان کے پیچھے لگنے والے بھی گمراہ ہیں۔ اسی قسم کے اشعار کے لیے حدیث میں بھی فرمایا گیا ہے کہ ”پیٹ کو لو پیپ سے بھر جانا، جو اسے خراب کر دے، شعر سے بھر جانے سے بہتر ہے۔“ (ترمذی، أبواب الآداب و مسلم وغیرہ) یہاں اس کے بیان کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا پیغمبر کاہن ہے نہ شاعر۔ اس لیے کہ یہ دونوں ہی جھوٹے ہیں۔ چنانچہ دوسرے مقامات پر بھی آپ ﷺ کے شاعر ہونے کی نفی کی گئی ہے مثلاً سورہ یٰسین، ۶۹، سورہ الحاقة، ۴۰، ۴۳۔

سوائے ان کے جو ایمان لائے^(۱) اور نیک عمل کیے اور بکثرت اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا اور اپنی مظلومی کے بعد انتقام لیا،^(۲) جنہوں نے ظلم کیا ہے وہ بھی ابھی جان لیں گے کہ کس کروٹ لٹتے ہیں۔^(۳) (۲۲۷)

سورہ نمل کی ہے اور اس کی ترانے آیتیں اور سات رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

طس، یہ آیتیں ہیں قرآن کی (یعنی واضح) اور روشن کتاب کی۔ (۱)

ہدایت اور خوشخبری ایمان والوں کے لیے۔ (۲)
جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ كَذِكْرٍ
وَأَنصَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا
أَيُّ مَنقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ﴿۳﴾



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

طس ت تِلْكَ آيَاتُ الْقُرْآنِ وَكِتَابٍ مُبِينٍ ﴿۱﴾

هُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۲﴾

الَّذِينَ يُعِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ

(۱) اس سے ان شاعروں کو متشبیٰ فرما دیا گیا، جن کی شاعری صداقت اور حقائق پر مبنی ہے اور اشتنا ایسے الفاظ سے فرمایا جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایماندار، عمل صالح پر کاربند اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والا شاعر غلط شاعری، جس میں جھوٹ، غلو اور افراط و تفریط ہو، کر ہی نہیں سکتا۔ یہ ان ہی لوگوں کا کام ہے جو مومنانہ صفات سے عاری ہوں۔

(۲) یعنی ایسے مومن شاعر، ان کافر شعراء کا جواب دیتے ہیں، جس میں انہوں نے مسلمانوں کی ججو (برائی) کی ہو۔ جس طرح حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، کافروں کی ججو یہ شاعری کا جواب دیا کرتے تھے اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو فرماتے کہ ”ان (کافروں) کی ججو بیان کرو، جرائیل علیہ السلام بھی تمہارے ساتھ ہیں۔“ (صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکة، مسلم، فضائل الصحابة، باب فضائل حسان بن ثابت، اس سے معلوم ہوا کہ ایسی شاعری جائز ہے جس میں کذب و مبالغہ نہ ہو اور جس کے ذریعے سے مشرکین و کفار اور مبتدعین و اہل باطل کو جواب دیا جائے اور مسلک حق اور توحید و سنت کا اثبات کیا جائے۔

(۳) یعنی آئی مَرَجِعَ يَرْجِعُونَ یعنی کون سی جگہ وہ لوٹتے ہیں؟ اور وہ جہنم ہے۔ اس میں ظالموں کے لیے سخت وعید ہے۔ جس طرح حدیث میں بھی فرمایا گیا ہے ”تم ظلم سے بچو! اس لیے کہ ظلم قیامت والے دن اندھیروں کا باعث ہو گا۔“ (صحیح مسلم، کتاب البر، باب تحريم الظلم)

○ نمل، چوٹی کو کہتے ہیں۔ اس سورت میں چوٹیوں کا ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے اس کو سورہ نمل کہا جاتا ہے۔

هُمْ يُؤْمِنُونَ ①

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ
فَهُمْ يَتَّبِعُونَ ②

أُولَئِكَ الَّذِينَ لَهُمْ سُوءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ
هُمْ الْأَخْسَرُونَ ③

وَأَنَّكَ لِلشَّامِ الْغُرَّانُ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ ④

إِذْ قَالَ مُوسَى لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَائِغَةً فِيهَا عِصْيَانٌ أُولَئِكَ
يَشْهَابٌ مَقْبُورِينَ أَعْلَمُكُمْ تَصْطَلُونَ ⑤

فَلَمَّا جَاءَهَا مُوسَىٰ أَنْ يُورِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا

پر یقین رکھتے ہیں۔^(۱) (۳)

جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے ہم نے انہیں ان کے
کرتوت زینت دار کر دکھائے^(۲) ہیں، پس وہ بھٹکتے
پھرتے ہیں۔^(۳) (۴)

یہی لوگ ہیں جن کے لیے برا عذاب ہے اور آخرت میں
بھی وہ سخت نقصان یافتہ ہیں۔ (۵)
بیشک آپ کو اللہ حکیم و علیم کی طرف سے قرآن سکھایا جا
رہا ہے۔ (۶)

(یاد ہو گا) جبکہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے گھروالوں سے
کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے، میں وہاں سے یا تو کوئی خبر
لے کر یا آگ کا کوئی سلگتا ہوا انگارا لے کر ابھی تمہارے
پاس آ جاؤں گا تاکہ تم سینک تپ کر لو۔^(۳) (۷)

جب وہاں پہنچے تو آواز دی گئی کہ با برکت ہے وہ جو اس آگ

(۱) یہ مضمون متعدد جگہ گزر چکا ہے کہ قرآن کریم ویسے تو پوری نسل انسانی کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے لیکن اس
سے حقیقتاً راہ یاب وہی ہوں گے جو ہدایت کے طالب ہوں گے، جو لوگ اپنے دل و دماغ کی کھڑکیوں کو حق کے دیکھنے
اور سننے سے بند یا اپنے دلوں کو گناہوں کی تاریکیوں سے مسخ کر لیں گے، قرآن انہیں کس طرح سیدھی راہ پر لگا سکتا
ہے؟ ان کی مثال اندھوں کی طرح ہے جو سورج کی روشنی سے فیض یاب نہیں ہو سکتے، دران حالیکہ سورج کی روشنی
پورے عالم کی درخشانی کا سبب ہے۔

(۲) یہ گناہوں کا وبال اور بدلہ ہے کہ برائیاں ان کو اچھی لگتی ہیں اور آخرت پر عدم ایمان اس کا بنیادی سبب ہے۔ اس
کی نسبت اللہ کی طرف اس لیے کی گئی ہے کہ ہر کام اس کی مشیت سے ہی ہوتا ہے، تاہم اس میں بھی اللہ کا وہی اصول
کار فرما ہے کہ نیکیوں کے لیے نیکی کا راستہ اور بدوں کے لیے بدی کا راستہ آسان کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں سے
کسی ایک راستے کا اختیار کرنا یہ انسان کے اپنے ارادے پر منحصر ہے۔

(۳) یعنی گمراہی کے جس راستے پر وہ چل رہے ہوتے ہیں، اس کی حقیقت سے وہ آشنا نہیں ہوتے اور صحیح راستے کی
طرف رہنمائی نہیں پاتے۔

(۴) یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر واپس آرہے تھے، رات کو
اندھیرے میں راستے کا علم نہیں تھا اور سردی سے بچاؤ کے لیے آگ کی ضرورت تھی۔

وَسُبِّحَ اللَّهُ رَبَّ الْعَالَمِينَ ①

يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ②

وَأَلْقَى عَصَاهُ فَلَمَّا رَآهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّى مُدْبِرًا

وَأَكْرَهْتُمْ يُبْسَى لَأَتَّخِفَنَّ إِنِّي لَأُخِيفُ لَدُنِّي

الْمُرْسَلُونَ ③

إِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلْ حِسَابَهُ بَعْدَ نِسْوَةٍ لَأَنِ اتَّقَى عَفْوَرٌ رَحِيمٌ ④

میں ہے اور برکت دیا گیا ہے وہ جو اسکے آس پاس ہے (۱) اور پاک ہے اللہ جو تمام جانوں کا پالنے والا ہے۔ (۸) (۳)

موسیٰ! سن بات یہ ہے کہ میں ہی اللہ ہوں غالب (۳) باحکمت۔ (۹)

تو اپنی لاشھی ڈال دے، موسیٰ نے جب اسے ہلتا جلتا دیکھا اس طرح کہ گویا وہ ایک سانپ ہے تو منہ موڑے ہوئے پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پلٹ کر بھی نہ دیکھا، اے موسیٰ! خوف نہ کھا، (۳) میرے حضور میں پیغمبر ذرا نہیں کرتے۔ (۱۰)

لیکن جو لوگ ظلم کریں (۵) پھر اس کے عوض نیکی کریں اس برائی کے پیچھے تو میں بھی بخشنے والا مہربان ہوں۔ (۱۱) (۱)

(۱) دور سے جہاں آگ کے شعلے لپکتے نظر آئے، وہاں پہنچنے یعنی کوہ طور پر، تو دیکھا کہ ایک سرسبز درخت سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ یہ حقیقت میں آگ نہیں تھی، اللہ کا نور تھا، جس کی تجلی آگ کی طرح محسوس ہوتی تھی من فی النار میں من سے مراد اللہ تبارک و تعالیٰ اور نار سے مراد اس کا نور ہے اور مَنْ حَوَّلَهَا (اس کے ارد گرد) سے مراد موسیٰ اور فرشتے، حدیث میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے جناب، (پر دے) کو نور (روشنی) اور ایک روایت میں نار (آگ) سے تعبیر کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ ”اگر اپنی ذات کو بے نقاب کر دے تو اس کا جلال تمام مخلوقات کو جلا کر رکھ دے۔“ (صحیح مسلم۔ کتاب الإیمان باب إن اللہ لا ینام... تفصیل کے لئے دیکھیں فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۵ ص ۳۵۹ - ۳۶۳)

(۲) یہاں اللہ کی تنزیہ و تقدیس کا مطلب یہ ہے کہ اس ندائے غیبی سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس آگ یا درخت میں اللہ طول کئے ہوئے ہے، جس طرح کہ بہت سے مشرک سمجھتے ہیں بلکہ یہ مشاہدہ حق کی ایک صورت ہے جس سے نبوت کے آغاز میں انبیاء علیہم السلام کو بالعموم سرفراز کیا جاتا ہے۔ کبھی فرشتے کے ذریعے سے اور کبھی خود اللہ تعالیٰ اپنی تجلی اور ہمکلامی سے جیسے یہاں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ معاملہ پیش آیا۔

(۳) درخت سے ندا کا آنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے باعث تعجب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، موسیٰ! تعجب نہ کریں ہی اللہ ہوں۔

(۴) اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر عالم الغیب نہیں ہوتے، ورنہ موسیٰ علیہ السلام اپنے ہاتھ کی لاشھی سے نہ ڈرتے۔ دوسرا، طبعی خوف پیغمبر کو بھی لاحق ہو سکتا ہے کیونکہ وہ بھی بالآخر انسان ہی ہوتے ہیں۔

(۵) یعنی ظالم کو تو خوف ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کی گرفت نہ فرمالے۔

(۶) یعنی ظالم کی توبہ بھی قبول کر لیتا ہوں۔

اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال، وہ سفید چمکیلا ہو کر نکلے گا بغیر کسی عیب کے،^(۱) تو نو نشانیاں لے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف جا،^(۲) یقیناً وہ بدکاروں کا گروہ ہے۔ (۱۳)

پس جب ان کے پاس آنکھیں کھول دینے والے^(۳) ہمارے معجزے پہنچے تو وہ کہنے لگے یہ تو صریح جادو ہے۔ (۱۳)

انہوں نے انکار کر دیا حالانکہ ان کے دل یقین کر چکے تھے صرف ظلم اور تکبر کی بنا پر۔^(۴) پس دیکھ لیجئے کہ ان فتنہ پرداز لوگوں کا انجام کیسا کچھ ہوا۔ (۱۳)

اور ہم نے یقیناً داود اور سلیمان کو علم دے رکھا تھا^(۵) اور دونوں نے کہا، تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں اپنے بہت سے ایمان دار بندوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ (۱۵)

اور داود کے وارث سلیمان ہوئے^(۶) اور کہنے لگے لوگو! ہمیں

وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجَ بَيْضًا مِنْ غَيْرِ سَوْءٍ
فِي تَسْمِ الْيَتِ إِلَى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ إِنَّهُمْ كَانُوا

قَوْمًا فَاسِقِينَ ﴿۱۳﴾

فَلَمَّا جَاءَهُمْ آيَاتُنَا مَبْصُرَةً قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُؤْتَمِنٌ ﴿۱۴﴾

وَحَدَّوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا فَانظُرْ كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿۱۵﴾

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا وَقَالَ الْغَالِبُ إِنَّهُ لَأَكْبَرُ

فَلَمَّا عَلَىٰ كَيْفَ بَيْنَ عِبَادِي الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۶﴾

وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِمْنَا مَنْطِقَ

(۱) یعنی بغیر برص وغیرہ کی بیماری کے۔ یہ لائشی کے ساتھ دو سرا معجزہ انہیں دیا گیا۔

(۲) فِی تَسْمِ الْيَتِ آیات یعنی یہ دو معجزے ان ۹ نشانیوں میں سے ہیں، جن کے ذریعے سے میں نے تیری مدد کی ہے۔ انہیں لے کر فرعون اور اس کی قوم کے پاس جا، ان ۹ نشانیوں کی تفصیل کے لیے دیکھئے، سورۃ بنی اسرائیل، آیت ۱۰۱ کا حاشیہ۔

(۳) مُبْصِرَةً واضح اور روشن یا یہ اسم فاعل مفعول کے معنی میں ہے۔

(۴) یعنی علم کے باوجود جو انہوں نے انکار کیا تو اس کی وجہ ان کا ظلم اور استکبار تھا۔

(۵) سورت کے شروع میں فرمایا گیا تھا کہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے سکھایا جاتا ہے، اس کی دلیل کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ مختصراً بیان فرمایا اور اب دو سری دلیل حضرت داود علیہ السلام و سلیمان علیہ السلام کا یہ قصہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے یہ واقعات اس بات کی دلیل ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں۔ علم سے مراد نبوت کے علم کے علاوہ وہ علم ہے جن سے حضرت داود علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کو بطور خاص نوازا گیا تھا جیسے حضرت داود علیہ السلام کو لوہے کی صنعت کا علم اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو جانوروں کی بولیوں کا علم عطا کیا گیا تھا۔ ان دونوں باپ بیٹوں کو اور بھی بہت کچھ عطا کیا گیا تھا، لیکن یہاں صرف علم کا ذکر کیا گیا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ علم اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

(۶) اس سے مراد نبوت اور بادشاہت کی وراثت ہے، جس کے وارث صرف سلیمان علیہ السلام قرار پائے۔ ورنہ

پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے^(۱) اور ہم سب کچھ میں سے
دیئے گئے ہیں۔^(۲) بیشک یہ بالکل کھلا ہوا فضل الہی ہے۔ (۱۶)

سلیمان کے سامنے ان کے تمام لشکر جنات اور انسان اور
پرند میں سے جمع کیے گئے^(۳) (ہر ہر قسم کی) الگ الگ
درجہ بندی کر دی گئی۔^(۴) (۱۷)

جب وہ چیونٹیوں کے میدان میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا
اے چیونٹیو! اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ، ایسا نہ ہو کہ
بیخبری میں سلیمان اور اس کا لشکر تمہیں روند ڈالے۔^(۵) (۱۸)

الْكَلْبُ وَالْوَيْتَانُ كُلُّ شَيْءٍ إِنَّ هَذَا لَهُ الْفَضْلُ الْبِئْسَ

وَجِبْرَائِيلُ مِنْ جُنُودِ هَارُونَ وَالْحِجَابُ وَالْإِنْسُ وَالْكَافِرُونَ يُؤْتُونَ

حَتَّى إِذَا اتَّوَعَلَى وَادِ التَّمَلُّعِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا

مَسْكِنَتَكُمْ كَرَّحِطْطِكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ

حضرت داود علیہ السلام کے اور بھی بیٹے تھے جو اس وراثت سے محروم رہے۔ ویسے بھی انہی کی وراثت علم میں ہی ہوتی ہے، جو مال و اسباب وہ چھوڑ جاتے ہیں، وہ صدقہ ہوتا ہے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ (البخاری کتاب الفرائض، و المسلم، کتاب الجہاد)

(۱) بولیاں تو تمام جانوروں کی سکھائی گئی تھیں لیکن پرندوں کا ذکر بطور خاص اس لیے کیا ہے کہ پرندے سائے کے لیے ہر وقت ساتھ رہتے تھے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ صرف پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی تھیں اور چیونٹیاں بھی منجملہ پرندوں کے ہیں۔ (فتح القدیر)

(۲) جس کی ان کو ضرورت تھی، جیسے علم، نبوت، حکمت، مال، جن، و انس اور طیور و حیوانات کی تسخیر وغیرہ۔

(۳) اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی اس انفرادی خصوصیت و فضیلت کا ذکر ہے، جس میں وہ پوری تاریخ انسانیت میں ممتاز ہیں کہ ان کی حکمرانی صرف انسانوں پر ہی نہیں تھی بلکہ جنات، حیوانات اور چرند و پرند حتیٰ کہ ہوا تک ان کے ماتحت تھی، اس میں کہا گیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے تمام لشکر یعنی جنوں، انسانوں اور پرندوں سب کو جمع کیا گیا۔ یعنی کہیں جانے کے لیے یہ لاؤ لشکر جمع کیا گیا۔

(۴) یہ ترجمہ (توزیع بمعنی تفریق) کے اعتبار سے ہے۔ یعنی سب کو الگ الگ گروہوں میں تقسیم (قسم وار) کر دیا جاتا تھا، مثلاً انسانوں، جنوں کا گروہ، پرندوں اور حیوانات کے گروہ۔ وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے معنی اس کے ”پس وہ روکے جایا کرتے تھے“ یعنی یہ لشکر اتنی بڑی تعداد میں ہوتا تھا کہ راستے میں روک کر ان کو درست کیا جاتا تھا کہ شاہی لشکر بد نظمی اور انتشار کا شکار نہ ہو یہ وَزَعٌ يَنْزِعُ سے ہے، جس کے معنی روکنے کے ہیں۔ اسی مادے میں ہمزہ سلب کا اضافہ کر کے أَوْزَعِيْنِ بنایا گیا ہے جو اگلی آیت نمبر ۱۹ میں آرہا ہے یعنی ایسی چیزیں مجھ سے دور فرمادے، جو مجھے تیری نعمتوں پر تیرا شکر کرنے سے روکتی ہیں۔ اس کو اردو میں ہم الامام و توفیق سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ (فتح القدیر، ایسر التفاسیر و ابن کثیر)

(۵) اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ حیوانات میں بھی ایک خاص قسم کا شعور موجود ہے۔ گو وہ انسانوں سے بہت کم اور

اس کی اس بات سے حضرت سلیمان مسکرا کر ہنس دیئے اور دعا کرنے لگے کہ اے پروردگار! تو مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر بجلاؤں جو تو نے مجھ پر انعام کی ہیں^(۱) اور میرے ماں باپ پر اور میں ایسے نیک اعمال کرتا رہوں جن سے تو خوش رہے مجھے اپنی رحمت سے نیک بندوں میں شامل کر لے۔^(۲) (۱۹)

آپ نے پرندوں کا جائزہ لیا اور فرمانے لگے یہ کیا بات ہے کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھتا؟ کیا واقعی وہ غیر حاضر ہے؟^(۳) (۲۰) یقیناً میں اسے سخت سزا دوں گا، یا اسے ذبح کر ڈالوں گا، یا میرے سامنے کوئی صریح دلیل بیان کرے۔^(۴) (۲۱) کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ آکر اس نے کہا میں ایک ایسی چیز کی خبر لایا ہوں کہ تجھے اس کی خبر ہی نہیں،^(۵) میں

فَمَنْتُمْ صَاحِبَاتِنِ قَوْلَهَا وَقَالَ رَبِّ أَوْعِظِي أَنْ تَشْكُرِي
نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا
تَرْضَاهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۹﴾

وَقَفَّكَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ إِنْ كَانَ
مِنَ الْغَائِبِينَ ﴿۲۰﴾

لَأَعَذِّبَنَّكَ عَبْدًا بِاشْتِدَادِكِ الْوَالِدَ الَّذِي أَنْعَمْتَ عَلَيْهِ
يُنَظِّمِينَ ﴿۲۱﴾

فَمَنْكَ غَيْرَ بَعِيدٍ فَقَالَ أَحَطَّتْ بِمَا لَمْ يُحِطُّ بِهِ

مختلف ہے۔ دوسرا، یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اتنی عظمت و فضیلت کے باوجود عالم الغیب نہیں تھے، اسی لیے چیونٹیوں کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں بے خبری میں ہم روند نہ دیئے جائیں۔ تیسرا، یہ کہ حیوانات بھی اسی عقیدہ صحیح سے بہرہ ور تھے اور ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں۔ جیسا کہ آگے آنے والے ہدہد کے واقعے سے بھی اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔ چوتھا، یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں کے علاوہ دیگر جانوروں کی بولیاں بھی سمجھتے تھے۔ یہ علم بطور اعجاز اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا تھا، جس طرح تسخیر جنات وغیرہ اعجازی شان تھی۔

(۱) چیونٹی جیسی حقیر مخلوق کی گفتگو سن کر سمجھ لینے سے حضرت سلیمان کے دل میں شکرگزاری کا احساس پیدا ہوا کہ اللہ نے مجھ پر کتنا انعام فرمایا ہے۔

(۲) اس سے معلوم ہوا کہ جنت، مومنوں ہی کا گھر ہے، اس میں کوئی بھی اللہ کی رحمت کے بغیر داخل نہیں ہو سکے گا۔ اسی لیے حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”سیدھے سیدھے اور حق کے قریب رہو اور یہ بات جان لو کہ کوئی شخص بھی صرف اپنے عمل سے جنت میں نہیں جائے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ہاں، میں بھی اس وقت تک جنت میں نہیں جاؤں گا، جب تک اللہ کی رحمت مجھے اپنے دامن میں

نہیں ڈھانک لے گی۔“ (صحیح بخاری، نمبر ۶۳۶۷، مسلم، نمبر ۳۱۷۷)

(۳) یعنی موجود تو ہے، مجھے نظر نہیں آ رہا یہاں موجود ہی نہیں ہے۔

(۴) احاطہ کے معنی ہیں کسی چیز کی بابت مکمل علم اور معرفت حاصل کرنا۔

سبا^(۱) کی ایک سچی خبر تیرے پاس لایا ہوں۔ (۲۲)
میں نے دیکھا کہ ان کی بادشاہت ایک عورت کر رہی
ہے^(۲) جسے ہر قسم کی چیز سے کچھ نہ کچھ دیا گیا ہے اور
اس کا تخت بھی بڑی عظمت والا ہے۔ (۲۳)^(۳)
میں نے اسے اور اس کی قوم کو، اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر
سورج کو سجدہ کرتے ہوئے پایا، شیطان نے ان کے کام
انہیں بھلے کر کے دکھلا کر صحیح راہ سے روک دیا ہے^(۴)
پس وہ ہدایت پر نہیں آتے۔ (۲۴)
کہ اسی اللہ کے لیے سجدے کریں جو (۵) آسمانوں اور

وَجَنَّتْكَ مِنْ سَبَائِكُنَّ الْيَقِينِ ﴿۲۲﴾
إِنِّي وَجَدْتُ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ
وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ﴿۲۳﴾
وَجَدْتُهُمْ قَوْمًا يَسْبُدُونَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ
الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ﴿۲۴﴾
الَّذِينَ جُذِبُوا إِلَيْهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْأَ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ

(۱) سبأ ایک شخص کے نام پر ایک قوم کا نام بھی تھا اور ایک شہر کا بھی۔ یہاں شہر مراد ہے۔ یہ صنعاء (یمن) سے تین دن کے فاصلے پر ہے اور مارب یمن کے نام سے معروف ہے (فتح القدر)

(۲) یعنی ہدہد کے لیے بھی یہ امر باعث تعجب تھا کہ سبائیں ایک عورت حکمران ہے۔ لیکن آج کل کہا جاتا ہے کہ عورتیں بھی ہر معاملے میں مردوں کے برابر ہیں۔ اگر مرد حکمران ہو سکتا ہے تو عورت کیوں نہیں ہو سکتی؟ حالانکہ یہ نظریہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ بعض لوگ ملکہ سبا (بلیقیس) کے اس ذکر سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عورت کی سربراہی جائز ہے۔ حالانکہ قرآن نے ایک واقعے کے طور پر اس کا ذکر کیا ہے، اس سے اس کے جواز یا عدم جواز کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ عورت کی سربراہی کے عدم جواز پر قرآن وحدیث میں واضح دلائل موجود ہیں۔

(۳) کہا جاتا ہے کہ اس کا طول ۸۰ ہاتھ عرض ۴۰ ہاتھ اور اونچائی ۳۰ ہاتھ تھی اور اس میں موتی، سرخ یا قوت اور سبز زمرہ جڑے ہوئے تھے، واللہ اعلم۔ (فتح القدر) ویسے یہ قول مبالغے سے خالی نہیں معلوم ہوتا۔ یمن میں بلیقیس کا جو محل ٹوٹی پھوٹی شکل میں موجود ہے اس میں اتنے بڑے تخت کی گنجائش نہیں۔

(۴) اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح پرندوں کو یہ شعور ہے کہ غیب کا علم انبیا بھی نہیں جانتے، جیسا کہ ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو کہا کہ میں ایک ایسی اہم خبر لایا ہوں جس سے آپ بھی بے خبر ہیں، اسی طرح وہ اللہ کی وحدانیت کا احساس وشعور بھی رکھتے ہیں۔ اسی لیے یہاں ہدہد نے حیرت واستعجاب کے انداز میں کہا کہ یہ ملکہ اور اس کی قوم اللہ کے بجائے، سورج کی پجاری ہے اور شیطان کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ جس نے ان کے لیے سورج کی عبادت کو بھلا کر کے دکھلایا ہوا ہے۔

(۵) أَلَّا يَسْجُدُوا اس کا تعلق بھی زین کے ساتھ ہے۔ یعنی شیطان نے یہ بھی ان کے لیے مزین کر دیا ہے کہ وہ اللہ کو سجدہ نہ کریں۔ یا اس میں لَا يَهْتَدُونَ عامل ہے اور لازماً ہے۔ یعنی ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سجدہ صرف اللہ

زمینوں کی پوشیدہ چیزوں کو باہر نکالتا ہے،^(۱) اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اور ظاہر کرتے ہو وہ سب کچھ جانتا ہے۔ (۲۵)
 اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں وہی عظمت والے عرش کا مالک ہے۔ (۲۶)
 سلیمان^(۲) نے کہا، اب ہم دیکھیں گے کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹا ہے۔ (۲۷)
 میرے اس خط کو لے جا کر انہیں دے دے پھر ان کے پاس سے ہٹ آ اور دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ (۲۸)^(۳)
 وہ کہنے لگی اے سردارو! میری طرف ایک باوقعت خط ڈالا گیا ہے۔ (۲۹)
 جو سلیمان کی طرف سے ہے اور جو بخشش کرنے والے مہربان اللہ کے نام سے شروع ہے۔ (۳۰)
 یہ کہ تم میرے سامنے سرکشی نہ کرو اور مسلمان بن کر میرے پاس آ جاؤ۔ (۳۱)^(۴)



وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ﴿۲۵﴾

أَلَمْ يَلِكْ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿۲۶﴾

قَالَ سَنَنْظُرُ أَصَدَقْتَ أَمْ كُذِّبْتَ مِنَ الْكٰذِبِينَ ﴿۲۷﴾

إِذْ هَبَّتْ يَكْتُمِي لَهَا فَاثَقَّةُ الْبَيْتِ لَمَّا تَوَلَّوْا عَنْهُمْ فَأَنْظُرْ مَا ذَا بَرٍّ جَوْنٌ ﴿۲۸﴾

قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأَى الْأَعْيُنَ إِلَىٰ كَيْفَ كُنْتُمْ كٰوْنُوۥا ﴿۲۹﴾

إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۳۰﴾

أَلَا تَتْلُو عَلٰی وَاٰتُوۡنِیْ مُسْلِمِیۡنَ ﴿۳۱﴾

کو کریں۔ (فتح القدر)

- (۱) یعنی آسمان سے بارش برساتا اور زمین سے اس کی مخفی چیزیں نباتات، معدنیات اور دیگر زمینی خزانے ظاہر فرماتا اور نکالتا ہے۔ حَبّ مصدر ہے مفعول مَخْبُوءٌ (چھپی ہوئی چیز) کے معنی ہیں۔
- (۲) مالک تو اللہ تعالیٰ کائنات کی ہر چیز کا ہے لیکن یہاں صرف عرش عظیم کا ذکر کیا، ایک تو اس لیے کہ عرش الہی کائنات کی سب سے بڑی چیز اور سب سے برتر ہے۔ دوسرے، یہ واضح کرنے کے لیے کہ ملکہ سبا کا تخت شاہی بھی، گو بہت بڑا ہے لیکن اسے اس عرش عظیم سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ جس پر اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق مستوی ہے۔ پد پد نے چونکہ توحید کا وعظ اور شرک کا رد کیا ہے اور اللہ کی عظمت و شان کو بیان کیا ہے، اس لیے حدیث میں آتا ہے ”چار جانوروں کو قتل مت کرو۔ چوئی، شمش کی کبھی، پد پد اور سرد یعنی لثورا۔“ (مسند احمد ۱/۳۲۲۔ ابو داؤد، کتاب الأدب، باب فی قتل الذر و ابن ماجہ، کتاب الصيد، باب ما ینہی عن قتله، سرد (لثورا) اس کا سر بڑا، پیٹ سفید اور پیٹہ سبز ہوتی ہے، یہ چھوٹے چھوٹے پرندوں کو شکار کرتا ہے (حاشیہ ابن کثیر)
- (۳) یعنی ایک جانب ہٹ کر چھپ جا اور دیکھ کہ وہ آپس میں کیا گفتگو کرتے ہیں۔
- (۴) جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بادشاہوں کو خطوط لکھے تھے، جن میں انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت

اس نے کہا اے میرے سردارو! تم میرے اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو۔ میں کسی امر کا قطعی فیصلہ جب تک تمہاری موجودگی اور رائے نہ ہو نہیں کیا کرتی۔ (۳۲)

ان سب نے جواب دیا کہ ہم طاقت اور قوت والے سخت لڑنے بھڑنے والے ہیں۔ (۱) آگے آپ کو اختیار ہے آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ ہمیں آپ کیا کچھ حکم فرمائی ہیں۔ (۲) (۳۳)

اس نے کہا کہ بادشاہ جب کسی بستی میں گھستے ہیں (۳) تو اسے اجاڑ دیتے ہیں اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ (۴) اور یہ لوگ بھی ایسا ہی کریں گے۔ (۵) (۳۴)

میں انہیں ایک ہدیہ بھیجنے والی ہوں، پھر دیکھ لوں گی کہ قاصد کیا جواب لے کر لوٹتے ہیں۔ (۱) (۳۵)

پس جب قاصد حضرت سلیمان کے پاس پہنچا تو آپ نے فرمایا کیا تم مال سے مجھے مدد دینا چاہتے ہو؟ (۲) مجھے تو میرے

قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ الْأَثْمُونُ فِي أَمْوَالِي مَا كُنْتُ قَاطِعَةً أَمْراً حَتَّى تَشْهَدُونِ ﴿۳۲﴾

قَالُوا مَعْنُ أُولَئِكَ قَوْمٌ أَوْلُوا بَابِئِنَّ سَيِّئَةً وَالْأَمْوَالِيكَ قَانظُرِي مَاذَا تَأْمُرِينَ ﴿۳۳﴾

قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا آيَةً أَهْلِهَا آذِلَّةً هُوَ كَذَلِكَ يَفْعَلُونَ ﴿۳۴﴾

وَأَتَى مُرْسَلَةً إِلَيْهِمْ يَهْدِيَةً فَنظَرُوا بِعَمْرِجِهِ الْمُرْسَلُونَ ﴿۳۵﴾

فَلَمَّا جَاءَ سَلِيمَانَ قَالَ أَتَيْتُكُمْ بِمَالٍ مِمَّا آتَيْنِي اللَّهُ

دی گئی تھی۔ اسی طرح سلیمان علیہ السلام نے بھی اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت بذریعہ خط دی۔ آج کل مکتوب الیہ کا نام خط میں پہلے لکھا جاتا ہے۔ لیکن سلف کا طریقہ یہی تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اختیار کیا کہ پہلے اپنا نام تحریر کیا۔ (۱) یعنی ہمارے پاس قوت اور اسلحہ بھی ہے اور لڑائی کے وقت نہایت پامردی سے لڑنے والے بھی ہیں، اس لیے بھگنے اور دہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) اس لیے کہ ہم تو آپ کے تابع ہیں، جو حکم ہو گا، بجالائیں گے۔

(۳) یعنی طاقت کے ذریعے سے فتح کرتے ہوئے۔

(۴) یعنی قتل و غارت گری کر کے اور قیدی بنا کر۔

(۵) بعض مفسرین کے نزدیک یہ اللہ کا قول ہے جو ملکہ سبا کی تائید میں ہے اور بعض کے نزدیک یہ بلیقہس ہی کا کلام اور اس کا تہہ ہے اور یہی سیاق کے زیادہ قریب ہے۔

(۶) اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ سلیمان علیہ السلام کوئی دنیا دار بادشاہ ہے یا نبی مرسل، جس کا مقصد اللہ کے دین کا غلبہ ہے۔ اگر ہدیہ قبول نہیں کیا تو یقیناً اس کا مقصد دین کی اشاعت و سرپرستی ہے، پھر ہمیں بھی اطاعت کیے بغیر چارہ نہیں ہو گا۔

(۷) یعنی تم دیکھ نہیں رہے، کہ اللہ نے مجھے ہر چیز سے نوازا ہوا ہے۔ پھر تم اپنے اس ہدیے سے میرے مال و دولت میں

خَيْرِ مِمَّا أَنْتُمْ بِكُمْ أَنْتُمْ يَوْمَ تَقْرَحُونَ ﴿۳۶﴾

إِزْجِعِ إِلَيْهِمْ فَلَنْ أَتَيْتَهُمْ بِجُنُودٍ لَّا قِبَلُ لَهُمْ بِهَا وَنُخْرِجَهُمْ
مِنْهَا آذِلَّةً وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴿۳۷﴾

قَالَ يَا أَيُّهَا الْمَثَلِيُّ يَا أَيْدِي بَعْرِيَّةَ مَا قَبْلُ أَنْ يَا تُوتِرِي
مُسْلِمِينَ ﴿۳۸﴾

قَالَ عَفْرِيَّتُ مِنَ الْبَعْرِ أَتَايْتِكَ بِهِ قَبْلُ أَنْ تَقُومِي
مَعَ امْرَأَتِكَ يَا أَيُّهَا الْقَوِيُّ أَمِينٌ ﴿۳۹﴾

رب نے اس سے بہت بہتر دے رکھا ہے جو اس نے تمہیں
دیا ہے پس تم ہی اپنے تحفے سے خوش رہو۔ (۳۶)^(۱)
جان کی طرف واپس لوٹ جا، ہم ان (کے مقابلہ) پر
وہ لشکر لائیں گے جنکے سامنے پڑنے کی ان میں طاقت
نہیں اور ہم انہیں ذلیل و پست کر کے وہاں سے نکال باہر
کریں گے۔ (۳۷)^(۲)

آپ نے فرمایا اے سردارو! تم میں سے کوئی ہے جو اسکے
مسلمان ہو کر پہنچنے سے پہلے ہی اس کا تخت مجھے لاوے۔ (۳۸)^(۳)
ایک قوی ہیکل جن کہنے لگا آپ اپنی اس مجلس سے
اٹھیں اس سے پہلے ہی پہلے میں اسے آپ کے پاس لا
دیتا ہوں، یقین مانئے کہ میں اس پر قادر ہوں اور

کیا اضافہ کر سکتے ہو؟ یہ استفہام انکاری ہے۔ یعنی کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔

(۱) یہ بطور تویح کے کہا کہ تم ہی اس ہدیے پر فخر کرو اور خوش ہو، میں تو اس سے خوش ہونے سے رہا، اس لیے کہ ایک
تو دنیا میرا مقصود ہی نہیں ہے۔ دوسرے اللہ نے مجھے وہ کچھ دیا ہے جو پورے جہان میں کسی کو نہیں دیا۔ تیسرے، مجھے
نبوت سے بھی سرفراز کیا گیا ہے۔

(۲) یہاں صیغہ واحد سے مخاطب کیا، جب کہ اس سے قبل صیغہ جمع سے خطاب کیا تھا۔ کیونکہ خطاب میں کبھی پوری
جماعت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کبھی امیر کو۔

(۳) حضرت سلیمان علیہ السلام نرے بادشاہ ہی نہیں تھے، اللہ کے پیغمبر بھی تھے۔ اس لیے ان کی طرف سے تو لوگوں کو
ذلیل و خوار کیا جانا ممکن نہیں تھا، لیکن جنگ و قتال کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کیونکہ جنگ نام ہی کشت و خون اور اسیری کا ہے
اور ذلت و خواری سے یہی مراد ہے، ورنہ اللہ کے پیغمبر لوگوں کو خواہ مخواہ ذلیل و خوار نہیں کرتے۔ جس طرح نبی صلی
اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل اور اسوۂ حسنہ جنگوں کے موقع پر رہا۔

(۴) حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس جواب سے ملکہ نے اندازہ لگا لیا کہ وہ سلیمان علیہ السلام کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔
چنانچہ انہوں نے مطیع و منقاد ہو کر آنے کی تیاری شروع کر دی۔ سلیمان علیہ السلام کو بھی انکی آمد کی اطلاع مل گئی تو آپ نے
انہیں مزید اپنی اعجازی شان دکھانے کا پروگرام بنایا اور انکے پہنچنے سے قبل ہی اس کا تخت شاہی اپنے پاس منگوانے کا بندوبست کیا۔

(۵) اس سے وہ مجلس مراد ہے، جو مقدمات کی سماعت کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام صبح سے نصف النہار تک منعقد فرماتے تھے۔

(۶) اس سے معلوم ہوا کہ وہ یقیناً ایک جن ہی تھا جنہیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مقابلے میں غیر معمولی قوتوں سے

ہوں بھی امانت دار۔ (۳۹) ^(۱)

جس کے پاس کتاب کا علم تھا وہ بول اٹھا کہ آپ پلک جھپکائیں اس سے بھی پہلے میں اسے آپ کے پاس پہنچا سکتا ہوں۔ جب آپ نے اسے اپنے پاس موجود پایا تو فرمانے لگے یہی میرے رب کا فضل ہے، تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکرگزاری کرتا ہوں یا ناشکری، شکر گزار اپنے ہی نفع کے لیے شکرگزاری کرتا ہے اور جو ناشکری کرے تو میرا پروردگار (بے پروا اور بزرگ) غنی اور کریم ہے۔ (۴۰)

حکم دیا کہ اس کے تحت میں کچھ پھیر بدل کر ^(۳) دو تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ راہ پالیتی ہے یا ان میں سے ہوتی

قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ قَالَ هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ سَوَآتِي عَسَىٰ يَرِيهَا ۝

قَالَ يَكْفُرُوا هَاعَرَضْتَهَا تَنْظُرًا فَهَتَدَتِي أَمْ تَكُونُ

نوازا ہے۔ کیونکہ کسی انسان کے لیے چاہے وہ کتنا ہی زور آور ہو، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ بیت المقدس سے آرب یمن (سبا) جائے اور پھر وہاں سے تخت شاہی اٹھالائے۔ اور ڈیڑھ ہزار میل کا یہ فاصلہ جسے دو طرفہ شمار کیا جائے تو تین ہزار میل بنتا ہے، ۳، ۴ گھنٹے میں طے کر لے۔ ایک طاقت ور سے طاقت ور انسان بھی اول تو اتنے بڑے تخت کو اٹھا ہی نہیں سکتا اور اگر وہ مختلف لوگوں یا چیزوں کا سہارا لے کر اٹھوا بھی لے تو اتنی قلیل مدت میں اتنا سفر کیوں کر ممکن ہے۔

(۱) یعنی میں اسے اٹھا کر لا بھی سکتا ہوں اور اس کی کسی چیز میں ہیرا پھیری بھی نہیں کروں گا۔

(۲) یہ کون شخص تھا جس نے یہ کہا؟ یہ کتاب کون سی تھی؟ اور یہ علم کیا تھا؟ جس کے زور پر یہ دعویٰ کیا گیا؟ اس میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ ان تینوں کی پوری حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ یہاں قرآن کریم کے الفاظ سے جو معلوم ہوتا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ وہ کوئی انسان ہی تھا، جس کے پاس کتاب الہی کا علم تھا، اللہ تعالیٰ نے کرامت اور اعجاز کے طور پر اسے یہ قدرت دے دی کہ پلک جھپکتے میں وہ تخت لے آیا۔ کرامت اور معجزہ نام ہی ایسے کاموں کا ہے جو ظاہری اسباب اور امور عادیہ کے یسر خلاف ہوں۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس لیے نہ شخصی قوت قابل تعجب ہے اور نہ اس علم کے سراغ لگانے کی ضرورت، جس کا ذکر یہاں ہے، کیونکہ یہ تو اس شخص کا تعارف ہے جس کے ذریعے سے یہ کام ظاہری طور پر انجام پایا، ورنہ حقیقت میں تو یہ مشیت الہی ہی کی کار فرمائی ہے جو چشم زدن میں، جو چاہے، کر سکتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے، اس لیے جب انہوں نے دیکھا کہ تخت موجود ہے تو اسے فضل ربی سے تعبیر کیا۔

(۳) یعنی اس کے رنگ روپ یا وضع و ہیئت میں تبدیلی کر دو۔

مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ ⑥

فَلَمَّا جَاءَتْ قَبِيلُ أَهْلِكََا عَرَشِكََا قَالَتْ كَأَنَّهُ

هُوَ وَأُوذَيْنَا الْعِلْمُ مِن قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْتَلِيمِينَ ⑦

وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تُعْبُدُ مِن دُونِ اللَّهِ إِنَّهَا كَانَتْ

مِن قَوْمٍ كَافِرِينَ ⑧

قَبِيلُ كَأَنَّهُ ادْخُلِي الصَّوْحُ فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبْتَهُ لِبَجَّةٍ

وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقِهَا قَالَتْ إِنَّهُ صَوْمٌ مُّسَدَّدٌ مِّن قَوَارِيرَةٍ

ہے جو راہ نہیں پاتے۔^(۱) (۳۱)

پھر جب وہ آگئی تو اس سے کہا (دریافت کیا) گیا کہ ایسا ہی تیرا (بھی) تخت ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ گویا وہی ہے،^(۲) ہمیں اس سے پہلے ہی علم دیا گیا تھا اور ہم مسلمان تھے۔^(۳) (۳۲)

اسے انہوں نے روک رکھا تھا جن کی وہ اللہ کے سوا پرستش کرتی رہی تھی، یقیناً وہ کافروں میں سے تھی۔^(۴) (۳۳)

اس سے کہا گیا کہ محل میں چلی چلو، جسے دیکھ کر یہ سمجھ کر کہ یہ حوض ہے اس نے اپنی پنڈلیاں کھول دیں،^(۵) فرمایا یہ تو

(۱) یعنی وہ اس بات سے آگاہ ہوتی ہے کہ یہ تخت اسی کا ہے یا اس کو سمجھ نہیں پاتی؟ دوسرا مطلب ہے کہ وہ راہ ہدایت پاتی ہے یا نہیں؟ یعنی اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر بھی اس پر راہ ہدایت واضح ہوتی ہے یا نہیں؟

(۲) ردوبدل سے چونکہ اس کی وضع و ہیئت میں کچھ تبدیلی آگئی تھی، اس لیے اس نے صاف الفاظ میں اس کے اپنے ہونے کا اقرار بھی نہیں کیا اور ردوبدل کے باوجود انسان پھر بھی اپنی چیز کو پہچان ہی لیتا ہے، اس لیے اپنے ہونے کی نفی بھی نہیں کی۔ اور یہ کہا ”یہ گویا وہی ہے“ اس میں اقرار ہے نہ نفی۔ بلکہ نہایت محتاط جواب ہے۔

(۳) یعنی یہاں آنے سے قبل ہی ہم سمجھ گئے تھے کہ آپ اللہ کے نبی ہیں اور آپ کے مطیع و منقاد ہو گئے تھے۔ لیکن امام ابن کثیر و شوکانی وغیرہ نے اسے حضرت سلیمان علیہ السلام کا قول قرار دیا ہے کہ ہمیں پہلے ہی یہ علم دے دیا گیا تھا کہ ملکہ سبا تابع فرمان ہو کر حاضر خدمت ہو گی۔

(۴) یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے اور صَدَّهَا كَأَنَّهُ ادْخُلِي الصَّوْحُ مَا كَانَتْ تُعْبُدُ ہے یعنی اسے اللہ کی عبادت سے جس چیز نے روک رکھا تھا، وہ غیر اللہ کی عبادت تھی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا تعلق ایک کافر قوم سے تھا، اس لیے توحید کی حقیقت سے بے خبر رہی بعض نے صَدَّهَا كَأَنَّهُ ادْخُلِي الصَّوْحُ کو اور بعض نے سلیمان علیہ السلام کو قرار دیا ہے۔ یعنی اللہ نے یا اللہ کے حکم سے سلیمان علیہ السلام نے اسے غیر اللہ کی عبادت سے روک دیا۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے (فتح القدر)

(۵) یہ محل شیشے کا بنا ہوا تھا جس کا صحن اور فرش بھی شیشے کا تھا۔ لُبَّةٌ گہرے پانی یا حوض کو کہتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی نبوت کے اعجازی مظاہر دکھانے کے بعد مناسب سمجھا کہ اسے اپنی اس دنیوی شان و شوکت کی بھی ایک جھلک دکھلا دی جائے جس میں اللہ نے انہیں تاریخ انسانیت میں ممتاز کیا تھا۔ چنانچہ اس محل میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا، جب وہ داخل ہونے لگی تو اس نے اپنے پانچے چڑھالیے۔ شیشے کا فرش اسے پانی معلوم ہوا جس سے اپنے کپڑوں کو بچانے کے لیے اس نے کپڑے سمیٹ لیے۔

شیشے سے منڈھی ہوئی عمارت ہے، کہنے لگی میرے پروردگار! میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ اب میں سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کی مطیع اور فرمانبردار بنتی ہوں۔^(۱) (۳۳)

یقیناً ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا کہ تم سب اللہ کی عبادت کرو پھر بھی وہ دو فریق بن کر آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔^(۲) (۳۵)

آپ نے فرمایا اے میری قوم کے لوگو! تم نیکی سے پہلے برائی کی جلدی کیوں مچا رہے^(۳) ہو؟ تم اللہ تعالیٰ سے استغفار کیوں نہیں کرتے تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔^(۴) (۳۶)

وہ کہنے لگے ہم تو تیری اور تیرے ساتھیوں کی بدشگونی لے رہے^(۵) ہیں؟ آپ نے فرمایا تمہاری بدشگونی اللہ کے ہاں^(۵)

قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَاسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٣٣﴾

وَلَقَدْ اسَلْنَا إِلَىٰ نَمُودَآءِ خَاهُمْ صَالِحًا أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ فَإِذَا هُمْ فَرِيقَانِ يَخْتَصِمُونَ ﴿٣٥﴾

قَالَ يَا قَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُونَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُونَ اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٣٦﴾

قَالُوا أَكَلْنَا نَبَاتِكَ وَبِئْسَ مَا كُنَّا نَمَعَّكَ قَالَ ظَلِمْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ

(۱) یعنی جب اس پر فرش کی حقیقت واضح ہوئی تو اپنی کوتاہی اور غلطی کا بھی احساس ہو گیا اور اعتراف قصور کرتے ہوئے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ صاف چکنے گھڑے ہوئے پتھروں کو مَمَرٌ د کہا جاتا ہے۔ اسی سے امر دہے جو اس خوش شکل بچے کو کہا جاتا ہے جس کے چہرے پر ابھی داڑھی موچھ نہ ہو۔ جس درخت پر پتے نہ ہوں اسے شجرۃ مرداء کہا جاتا ہے۔ (فتح القدیر) لیکن یہاں یہ تعبیر بڑاؤ کے معنی میں ہے۔ یعنی شیشوں کا بنا ہوا یا بڑا ہوا محل۔

ملحوظہ: ملکہ سبا (بلیقہ) کے مسلمان ہونے کے بعد کیا ہوا؟ قرآن میں یا کسی صحیح حدیث میں اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ تفسیری روایات میں یہ ضرور ملتا ہے کہ ان کا باہم نکاح ہو گیا تھا۔ لیکن جب قرآن و حدیث اس صراحت سے خاموش ہیں تو اس کی بابت خاموشی ہی بہتر ہے۔ وَاللَّهِ أَغْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

(۲) ان سے مراد کافر اور مؤمن ہیں، جھگڑنے کا مطلب ہر فریق کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ حق پر ہے۔

(۳) یعنی ایمان قبول کرنے کے بجائے، تم کفر ہی پر کیوں اصرار کر رہے ہو، جو عذاب کا باعث ہے۔ علاوہ ازیں اپنے عناد و سرکشی کی وجہ سے کہتے بھی تھے کہ ہم پر عذاب لے آ۔ جس کے جواب میں حضرت صالح علیہ السلام نے یہ کہا۔

(۴) أَطَّيَّرْنَا اصل میں تَطَيَّرْنَا ہے۔ اس کی اصل طیر (اڑنا) ہے۔ عرب جب کسی کام کا یا سفر کا ارادہ کرتے تو پرندے کو اڑاتے اگر وہ دائیں جانب اڑتا تو اسے نیک شگون سمجھتے اور وہ کام کر گزرتے یا سفر پر روانہ ہو جاتے اور اگر بائیں جانب اڑتا تو اسے بدشگون سمجھتے اور اس کام یا سفر سے رک جاتے (فتح القدیر) اسلام میں یہ شگون اور نیک شگون جازز نہیں ہے البتہ تَفَاوُل جازز ہے۔

(۵) یعنی اہل ایمان نحوست کا باعث نہیں ہیں جیسا کہ تم سمجھتے ہو بلکہ اس کا اصل سبب اللہ ہی کے پاس ہے، کیونکہ قضا

ہے، بلکہ تم فتنے میں پڑے ہوئے لوگ ہو۔^(۱) (۳۷)
 اس شہر میں نو سردار تھے جو زمین میں فساد پھیلاتے رہتے
 تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔ (۳۸)
 انہوں نے آپس میں بڑی قسمیں کھا کھا کر عہد کیا کہ
 رات ہی کو صالح اور اس کے گھروالوں پر ہم چھاپہ ماریں
 گے،^(۲) اور اس کے وارثوں سے صاف کہہ دیں گے کہ
 ہم اس کے اہل کی ہلاکت کے وقت موجود نہ تھے اور ہم
 بالکل سچے ہیں۔^(۳) (۳۹)
 انہوں نے مکر (خفیہ تدبیر) کیا^(۴) اور ہم نے بھی^(۵) اور وہ
 اسے سمجھتے ہی نہ تھے۔^(۱) (۵۰)
 (اب) دیکھ لے ان کے مکر کا انجام کیسا کچھ ہوا؟ کہ ہم
 نے ان کو اور ان کی قوم کو سب کو عارت کر دیا۔^(۴) (۵۱)

بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّفْتَنُونَ ﴿۳۷﴾
 وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ بَعْضٌ رَّهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ
 وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿۳۸﴾
 قَالُوا اقْسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ
 مَا نَكْفُرُ بِمَا تَعْمَلُكَ أَهْلِيهِ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿۳۹﴾
 وَمَكْرُؤًا مَّا كُرُوا وَمَكْرُؤًا مَّا كُرُوا وَهُمْ لَا يُشْعُرُونَ ﴿۴۰﴾
 فَأَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مُكْرِمِهِمْ أَكَادِمَرْمِهِمْ
 وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۴۱﴾

و تقدیر اسی کے اختیار میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہیں جو نحوست (قحط وغیرہ) پہنچی ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے اور
 اس کا سبب تمہارا کفر ہے (فتح القدیر)
 (۱) یا گمراہی میں ڈھیل دے کر تمہیں آزمایا جا رہا ہے۔
 (۲) یعنی صالح علیہ السلام کو اور اس کے گھروالوں کو قتل کر دیں گے، یہ قسمیں انہوں نے اس وقت کھائیں، جب
 اونٹنی کے قتل کے بعد حضرت صالح علیہ السلام نے کہا کہ تین دن کے بعد تم پر عذاب آجائے گا۔ انہوں نے کہا کہ
 عذاب کے آنے سے قبل ہی ہم صالح علیہ السلام اور ان کے گھروالوں کا صفایا کر دیں۔
 (۳) یعنی ہم قتل کے وقت وہاں موجود نہ تھے نہ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ کون انہیں قتل کر گیا ہے۔
 (۴) ان کا مکر یہی تھا کہ انہوں نے باہم حلف اٹھایا کہ رات کی تاریکی میں اس منصوبہ قتل کو بروئے کار لائیں اور تین
 دن پورے ہونے سے پہلے ہی ہم صالح علیہ السلام اور ان کے گھروالوں کو ٹھکانے لگا دیں۔
 (۵) یعنی ہم نے ان کی اس سازش کا بدلہ دیا اور انہیں ہلاک کر دیا۔ اسے بھی مَكْرًا مَكْرًا سے مشابہت کے طور پر
 تعبیر کیا گیا ہے۔
 (۶) اللہ کی اس تدبیر (مکر) کو سمجھتے ہی نہ تھے۔
 (۷) یعنی ہم نے مذکورہ ۹ سرداروں کو ہی نہیں، بلکہ ان کی قوم کو بھی مکمل طور پر ہلاک کر دیا۔ کیونکہ وہ قوم ہلاکت کے اصل

فَخَلَّكَ بِبُنُوتِهِمْ خَاوِيَةً يَبْتَاطِلُونَ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً
لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٥٢﴾

وَأَجْمَعْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا لِيَكْفُرُونَ ﴿٥٣﴾

وَلَوْ طَآءُذٌ قَالَ لِقَوْمِهِ آتَانُونَ الْفَآءِشَةَ
وَأَنْتُمْ تَبْصُرُونَ ﴿٥٤﴾

أَيُّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِنْ دُونِ النِّسَاءِ بَلْ
أَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ﴿٥٥﴾

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُو آلَ
لُوطٍ مِنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أَنَاسٌ يَبْطِغُوهُونَ ﴿٥٦﴾

فَأَنْجَيْنَاهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ فَدَدَرْنَاهَا مِنَ الْخَيْرِينَ ﴿٥٧﴾

یہ ہیں ان کے مکانات جو ان کے ظلم کی وجہ سے اجڑے
پڑے ہیں، جو لوگ علم رکھتے ہیں ان کے لیے اس میں
بڑی نشانی ہے۔ (۵۲)

ہم نے ان کو جو ایمان لائے تھے اور پرہیزگار تھے بال بال
بچالیا۔ (۵۳)

اور لوط کا (ذکر کر) جبکہ ^(۱) اس نے اپنی قوم سے کہا کہ کیا باوجود
دیکھنے بھالنے کے پھر بھی تم بد کاری کر رہے ہو؟ (۵۴)

یہ کیا بات ہے کہ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس
شہوت سے آتے ہو؟ ^(۲) حق یہ ہے کہ تم بڑی ہی نادانی
کر رہے ہو۔ (۵۵)

قوم کا جواب، بجز اس کہنے کے اور کچھ نہ تھا کہ آل لوط کو اپنے
شر سے شرمندہ کر دو، یہ تو بڑے پاکباز بن رہے ہیں۔ ^(۳) (۵۶)

پس ہم نے اسے اور اس کے اہل کو، بجز اس کی بیوی کے
سب کو بچالیا، اس کا اندازہ تو باقی رہ جانے والوں میں ہم
لگا ہی چکے تھے۔ ^(۴) (۵۷)

سب کفر و جود میں مکمل طور پر ان کے ساتھ شریک تھی اور گویا لوط ان کے منصوبہ قتل میں شریک نہ ہو سکی تھی۔ کیونکہ یہ
منصوبہ خفیہ تھا۔ لیکن ان کی مفاہور دلی آرزو کے عین مطابق تھا اس لیے وہ بھی گویا اس مکرم شریک تھی جو ۱۹ افراد نے حضرت
صلح علیہ السلام اور ان کے اہل کے خلاف تیار کیا تھا۔ اس لیے پوری قوم ہی ہلاکت کی مستحق قرار پائی۔

(۱) یعنی لوط علیہ السلام کا قصہ یاد کرو، جب لوط علیہ السلام نے کہا یہ قوم عموماً اور سدوم بستیوں میں رہائش پذیر تھی۔

(۲) یعنی یہ جاننے کے باوجود کہ یہ بے حیائی کا کام ہے۔ یہ بصارت قلب ہے۔ اور اگر بصارت ظاہری یعنی آنکھوں سے دیکھنا مراد
ہو تو معنی ہوں گے کہ نظروں کے سامنے یہ کام کرتے ہو، یعنی تمہاری سرکشی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ چھپنے کا تکلف بھی نہیں کرتے ہو۔

(۳) یہ حکمران تو بیخ کے لیے ہے کہ یہ بے حیائی وہی لواطت ہے جو تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے غیر طبعی شہوت رانی
کے طور پر کرتے ہو۔

(۴) یا اس کی حرمت سے یا اس معصیت کی سزا سے تم بے خبر ہو۔ ورنہ شاید یہ کام نہ کرتے۔

(۵) یہ بطور طنز اور استہزاء کے کہا۔

(۶) یعنی پہلے ہی اس کی بابت یہ اندازہ یعنی تقدیر الہی میں تھا کہ وہ انہی پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی جو عذاب سے

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا غَسَّاءً مَطَرًا الْمُنذَرِينَ ﴿٥٨﴾

قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَىٰ ۗ اللَّهُ خَيْرٌ مَّا يُشْرِكُونَ ﴿٥٩﴾

اور ان پر ایک (خاص قسم کی) بارش برسا دی،^(۱) پس ان دھمکائے ہوئے لوگوں پر بری بارش ہوئی۔^(۲) (۵۸)
تو کہہ دے کہ تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے برگزیدہ بندوں پر سلام ہے۔^(۳) کیا اللہ تعالیٰ بہتر ہے یا وہ جنہیں یہ لوگ شریک ٹھہرا رہے ہیں۔^(۴) (۵۹)

دو چار ہوں گے۔

(۱) ان پر جو عذاب آیا، اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے کہ ان کی بستیوں کو ان پر الٹ دیا گیا اور اس کے بعد ان پر تہ بتہ کنکر پتھروں کی بارش ہوئی۔

(۲) یعنی جنہیں پیغمبروں کے ذریعے سے ڈرایا گیا اور ان پر جنت قائم کر دی گئی۔ لیکن وہ تکذیب و انکار سے باز نہیں آئے۔

(۳) جن کو اللہ نے رسالت اور بندوں کی رہنمائی کے لیے چنا تا کہ لوگ صرف ایک اللہ کی عبادت کریں۔

(۴) یہ استہمام تقریری ہے۔ یعنی اللہ ہی کی عبادت بہتر ہے کیونکہ جب خالق، رازق اور مالک وہی ہے تو عبادت کا مستحق کوئی دوسرا کیوں کر ہو سکتا ہے؟ جو نہ کسی چیز کا خالق ہے نہ رازق اور مالک۔ سخیب! اگرچہ تفضیل کا صیغہ ہے لیکن یہاں تفضیل کے معنی میں نہیں ہے، مطلق بہتر کے معنی میں ہے، اس لیے کہ معبودان باطلہ میں تو سرے سے کوئی خیر ہے ہی نہیں۔

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ
السَّمَاءِ مَاءً فَأَبْتَسْنَا بِهِ فَخَالَتْهُ إِذَاتَ الْوَهَجِ ۖ مَا كَانَتْ
لَكُمْ أَنْ تُبَدِّلُوهُ إِلَّا مَعَ إِذْنِ اللَّهِ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ مُّضِلُّونَ ﴿۲۰﴾

بھلا بتاؤ تو؟ کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ کس نے آسمان سے بارش برسائی؟ پھر اس سے ہرے بھرے بارونق باغات اگا دیئے؟ ان باغوں کے درختوں کو تم ہرگز نہ اگا سکتے،^(۱) کیا اللہ کے ساتھ اور کوئی معبود بھی ہے؟^(۲) بلکہ یہ لوگ ہٹ جاتے ہیں^(۳)

(سیدھی راہ سے) (۲۰)

کیا وہ جس نے زمین کو قرار گاہ بنایا^(۴) اور اس کے درمیان نہریں جاری کر دیں اور اس کے لیے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان روک بنا دی^(۵) کیا اللہ کے ساتھ اور کوئی معبود بھی ہے؟ بلکہ ان میں سے اکثر

أَمَّنْ جَعَلَ الْوُحُوشَ قَرَارًا وَجَعَلَ خَلْفَهَا أَنْهَارًا وَجَعَلَ
لَهَا ذَوَابِحًا ۚ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الْعَادِلِينَ

(۱) یہاں سے پچھلے جملے کی تشریح اور اس کے دلائل دیئے جا رہے ہیں کہ وہی اللہ پیدا کن، رزق اور تدبیر وغیرہ میں متفرد ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ فرمایا آسمانوں کو اتنی بلندی اور خوبصورتی کے ساتھ بنانے والا، ان میں درختوں کو اکب، روشن ستارے اور گردش کرنے والے افلاک بنانے والا۔ اسی طرح زمین اور اس میں پہاڑ، نہریں، چشمے، سمندر، اشجار کھیتیاں اور انواع و اقسام کے طیور و حیوانات وغیرہ پیدا کرنے والا اور آسمان سے بارش برساکر اس کے ذریعے سے بارونق باغات اگانے والا کون ہے؟ کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جو زمین سے درخت ہی اگا کر دکھادے؟ ان سب کے جواب میں مشرکین بھی کہتے اور اعتراف کرتے تھے کہ یہ سب کچھ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، جیسا کہ قرآن میں دوسرے مقام پر ہے۔ (مثلاً سورۃ العنکبوت۔ ۶۳)

(۲) یعنی ان سب حقیقتوں کے باوجود کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی ہستی ایسی ہے، جو عبادت کے لائق ہو؟ یا جس نے ان میں سے کسی چیز کو پیدا کیا ہو؟ یعنی کوئی ایسا نہیں جس نے کچھ بنایا ہو یا عبادت کے لائق ہو۔ امن کا ان آیات میں مفہوم یہ ہے کہ کیا وہ ذات جو ان تمام چیزوں کو بنانے والی ہے، اس شخص کی طرح ہے جو ان میں سے کسی چیز پر قادر نہیں؟ (ابن کثیر)

(۳) اس کا دوسرا ترجمہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کا ہمسرا اور نظیر ٹھہراتے ہیں۔

(۴) یعنی ساکن اور ثابت، نہ ہلتی ہے، نہ ڈولتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو زمین پر رہنا ممکن ہی نہ ہوتا۔ زمین پر بڑے بڑے پہاڑ بنانے کا مقصد بھی زمین کو حرکت کرنے سے اور ڈولنے سے روکنا ہی ہے۔

(۵) اس کی تشریح کے لیے دیکھیں سورۃ الفرقان، ۵۳ کا حاشیہ۔

بَلْ أَكْتَرْتُمْ أَنْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۱﴾

أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَّرَّ إِذَا دَعَاكَ وَيَكْشِفُ السُّوءَ

وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ ۚ إِنَّ اللَّهَ

قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿۲۲﴾

أَمَّنْ يَهْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُرْسِلُ

الرِّيحَ نَبْشًا الْبَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ

تَعَلَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۲۳﴾

أَمَّنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنْ

السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۚ إِنَّ اللَّهَ قَلِيلًا مَّا يُذَكَّرُ

کچھ جانتے ہی نہیں۔ (۲۱)

بے کس کی پکار کو جب کہ وہ پکارے، کون قبول کر کے
تختی کو دور کر دیتا ہے؟^(۱) اور تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا
ہے،^(۲) کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور معبود ہے؟ تم بہت کم

نصیحت و عبرت حاصل کرتے ہو۔ (۲۲)

کیا وہ جو تمہیں خشکی اور تری کی تاریکیوں میں راہ دکھاتا
ہے^(۳) اور جو اپنی رحمت سے پہلے ہی خوشخبریاں دینے
والی ہوا نہیں چلاتا ہے،^(۴) کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور
معبود بھی ہے جنہیں یہ شریک کرتے ہیں ان سب سے

اللہ بلند و بالا تر ہے۔ (۲۳)

کیا وہ جو مخلوق کی اول دفعہ پیدائش کرتا ہے پھر اسے
لوٹائے گا^(۵) اور جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزیاں
دے رہا ہے،^(۶) کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے کہہ

(۱) یعنی وہی اللہ ہے جسے شدائد کے وقت پکارا جاتا اور مصیبتوں کے وقت جس سے امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں مُضْطَّرًّا

(لاچار) اس کی طرف رجوع کرتا اور برائی کو وہی دور کرتا ہے۔ مزید ملاحظہ ہو۔ سورۃ الاسراء، ۶۷، سورۃ النمل، ۵۳۔

(۲) یعنی ایک امت کے بعد دوسری امت، ایک قوم کے بعد دوسری قوم اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل پیدا کرتا
ہے۔ ورنہ اگر وہ سب کو ایک ہی وقت میں وجود بخش دیتا تو زمین بھی تنگ دامانی کا شکوہ کرتی، اکتساب معیشت میں بھی
دشواریاں پیدا ہوتیں اور یہ سب ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں ہی مصروف و سرگرداں رہتے۔ یعنی یکے بعد دیگرے
انسانوں کو پیدا کرنا اور ایک کو دوسرے کا جانشین بنانا، یہ بھی اس کی کمال مہربانی ہے۔

(۳) یعنی آسمانوں پر ستاروں کو درخشانی عطا کرنے والا کون ہے؟ جن سے تم تاریکیوں میں راہ پاتے ہو۔ پہاڑوں اور
وادیوں کا پیدا کرنے والا کون ہے جو ایک دوسرے کے لیے سرحدوں کا کام بھی دیتے ہیں اور راستوں کی نشاندہی کا بھی۔

(۴) یعنی بارش سے پہلے ٹھنڈی ہوائیں، جو بارش کی پیامبر ہی نہیں ہوتیں، بلکہ ان سے خشک سال کے مارے ہوئے
لوگوں میں خوشی کی لہر بھی دوڑ جاتی ہے۔

(۵) یعنی قیامت والے دن تمہیں دوبارہ زندگی عطا فرمائے گا۔

(۶) یعنی آسمان سے بارش نازل فرما کر، زمین سے اس کے مخفی خزانے (غلہ جات اور میوے) پیدا فرماتا ہے اور یوں

اِنَّ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶﴾

قُلْ لَّا اَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ
وَمَا يَشْعُرُوْنَ اِيَّانَ يَبْعَثُوْنَ ﴿۱۷﴾

دیتے تھے کہ اگر سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ۔ (۶۳)
کہہ دیتے تھے کہ آسمانوں والوں میں سے زمین والوں میں
سے سوائے اللہ کے کوئی غیب نہیں جانتا،^(۱) انہیں تو یہ
بھی نہیں معلوم کہ کب اٹھا کھڑے کیے جائیں
گے؟ (۶۵)
بلکہ آخرت کے بارے میں ان کا علم ختم ہو چکا ہے،^(۲)

بَلِ الَّذِيْ عَلَّمَهُمْ فِي الْاَرْضِ قَوْلًا بَلْ هُمْ فِي سَبَقٍ

آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔

(۱) یعنی جس طرح مذکورہ معاملات میں اللہ تعالیٰ متفرد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی طرح غیب کے علم میں بھی وہ
متفرد ہے۔ اس کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں۔ نبیوں اور رسولوں کو بھی اتنا ہی علم ہوتا ہے جتنا اللہ تعالیٰ وحی و الامام کے
ذریعے سے انہیں بتلا دیتا ہے اور جو علم کسی کے بتلانے سے حاصل ہو، اس کے عالم کو عالم الغیب نہیں کہا جاتا۔ عالم
الغیب تو وہ ہے جو بغیر کسی واسطے اور ذریعے کے ذاتی طور پر ہر چیز کا علم رکھے، ہر حقیقت سے باخبر ہو اور مخفی سے مخفی چیز
بھی اس کے دائرہ علم سے باہر نہ ہو۔ یہ صفت صرف اور صرف اللہ کی ہے اس لیے صرف وہی عالم الغیب ہے۔ اس کے
سوا کائنات میں کوئی عالم الغیب نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جو شخص یہ گمان رکھتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ
وسلم آئندہ کل کو پیش آنے والے حالات کا علم رکھتے ہیں، اس نے اللہ پر بہت بڑا ہمتان باندھا اس لیے کہ وہ تو فرما رہا
ہے کہ ”آسمان و زمین میں غیب کا علم صرف اللہ کو ہے۔“ (صحیح بخاری نمبر ۳۸۵۵، صحیح مسلم نمبر ۲۸۷
الترمذی نمبر ۳۰۶۸) حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ستارے تین مقصد کے لیے بنائے ہیں۔ آسمان کی
زینت، رہنمائی کا ذریعہ اور شیطان کو سنسکار کرنا۔ لیکن اللہ کے احکام سے بے خبر لوگوں نے ان سے غیب کا علم حاصل
کرنے (کہانت) کا ڈھونگ رچا لیا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں جو فلاں فلاں ستارے کے وقت نکاح کرے گا تو یہ یہ ہو گا فلاں فلاں
ستارے کے وقت سفر کرے گا تو ایسا ایسا ہو گا، فلاں فلاں ستارے کے وقت پیدا ہو گا تو ایسا ایسا ہو گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب
ڈھکولے ہیں۔ ان کے قیاسات کے خلاف اکثر ہوتا رہتا ہے۔ ستاروں، پرندوں اور جانوروں سے غیب کا علم کس طرح
حاصل ہو سکتا ہے؟ جب کہ اللہ کا فیصلہ تو یہ ہے کہ آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔ (ابن کثیر)

(۲) یعنی ان کا علم آخرت کے وقوع کا وقت جاننے سے عاجز ہے۔ یا ان کا علم آخرت کے بارے میں برابر ہے جیسے نبی
صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے استفسار پر فرمایا تھا کہ ”قیامت کے بارے میں مسئول عنما (نبی
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) بھی سائل (حضرت جبرائیل علیہ السلام) سے زیادہ علم نہیں رکھتے“ یا یہ معنی ہیں کہ ان کا علم
مکمل ہو گیا، اس لیے کہ انہوں نے قیامت کے بارے میں کیے گئے وعدوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، گو یہ علم اب ان
کے لیے نافع نہیں ہے کیونکہ دنیا میں وہ اسے جھٹلاتے رہے تھے جیسے فرمایا ﴿اَسْمِعُوهُمْ وَاَنْجِبُوهُمْ يَوْمَ لَا تُؤْتِنَا لٰكِنَ الظَّالِمُوْنَ

بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں۔ بلکہ یہ اس سے اندھے ہیں۔^(۱) (۶۶)

کافروں نے کہا کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے اور ہمارے باپ دادا بھی کیا ہم پھر نکالے جائیں گے۔ (۶۷) ہم اور ہمارے باپ دادا کو بہت پہلے سے یہ وعدے دیے جاتے رہے۔ کچھ نہیں یہ تو صرف اگلوں کے افسانے ہیں۔^(۲) (۶۸)

کہہ دیجئے کہ زمین میں چل پھر کر ذرا دیکھو تو سہی کہ گنہگاروں کا کیسا انجام ہوا؟^(۳) (۶۹) آپ ان کے بارے میں غم نہ کریں اور ان کے داؤں گھات سے تنگ دل نہ ہوں۔ (۷۰)

کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہے اگرچے ہو تو بتلا دو۔ (۷۱) جواب دیجئے! کہ شاید بعض وہ چیزیں جن کی تم جلدی مچا رہے ہو تم سے بہت ہی قریب ہو گئی ہوں۔^(۴) (۷۲) یقیناً آپ کا پروردگار تمام لوگوں پر بڑے ہی فضل والا ہے لیکن اکثر لوگ ناشکری کرتے ہیں۔^(۵) (۷۳)

مِمَّنْ أَمَّلَ هُمْ مِنْهَا عَمُونَ ﴿۶۶﴾

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِذَا كُنَّا تُرَابًا وَآبًا وَنَا أَنَا لَمُعْرَجُونَ ﴿۶۷﴾

لَقَدْ وَعَدْنَا مَا هَذَا نَحْنُ وَالْآبَاءُ مِن قَبْلِنَا إِنَّ هَذَا إِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۶۸﴾

قُلْ يَسِّرُوا فِي الْأَرْضِ فَأَنْظِرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ﴿۶۹﴾

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ﴿۷۰﴾

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۷۱﴾

قُلْ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ رَدْفٌ لَّكُمْ بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ ﴿۷۲﴾

وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۷۳﴾

الْيَوْمَ نَبِيٌّ ضَلِيلٌ مُّبِينٌ ﴿ (سورة مريم- ۳۸)

(۱) یعنی دنیا میں آخرت کے بارے میں شک میں ہیں بلکہ اندھے ہیں کہ اختلال عقل و بصیرت کی وجہ سے آخرت پر یقین سے محروم ہیں۔

(۲) یعنی اس میں حقیقت کوئی نہیں، بس ایک دوسرے سے سن کر یہ کہتے چلے آ رہے ہیں۔

(۳) یہ ان کافروں کے قول کا جواب ہے کہ بچھلی قوموں کو دیکھو کہ کیا ان پر اللہ کا عذاب نہیں آیا؟ جو پیغمبروں کی صداقت کی دلیل ہے۔ اسی طرح قیامت اور اس کی زندگی کے بارے میں بھی ہمارے رسول جو کہتے ہیں، یقیناً سچ ہے۔

(۴) اس سے مراد جنگ بدر کا وہ عذاب ہے جو قتل اور اسیری کی شکل میں کافروں کو پہنچایا یا عذاب قبر ہے رَدْفٌ، قرب کے معنی میں ہے، جیسے سواری کی عقبی نشست پر بیٹھنے والے کو ردیف کہا جاتا ہے۔

(۵) یعنی عذاب میں تاخیر، یہ بھی اللہ کے فضل و کرم کا ایک حصہ ہے، لیکن لوگ پھر بھی اس سے اعراض کر کے ناشکری

بیشک آپ کا رب ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جنہیں ان کے سینے چھپا رہے ہیں اور جنہیں ظاہر کر رہے ہیں۔ (۷۳)

آسمان و زمین کی کوئی پوشیدہ چیز بھی ایسی نہیں جو روشن اور کھلی کتاب میں نہ ہو۔^(۱) (۷۵)

یقیناً یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے ان اکثر چیزوں کا بیان کر رہا ہے جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔^(۲) (۷۶)

اور یہ قرآن ایمان والوں کے لیے یقیناً ہدایت اور رحمت ہے۔^(۳) (۷۷)

آپ کا رب ان کے درمیان اپنے حکم سے سب فیصلے کر دے گا،^(۴) وہ بڑا ہی غالب اور دانائے۔ (۷۸)

پس آپ یقیناً اللہ ہی پر بھروسہ رکھیے، یقیناً آپ سچے اور کھلے دین پر ہیں۔^(۵) (۷۹)

وَرَأَىٰ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿۷۴﴾

وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴿۷۵﴾

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَفْضُلُ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۷۶﴾

وَإِنَّهُ لَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿۷۷﴾

إِنَّا سَرَبْنَاكَ يَقْضِي بَيْنَهُم بِحُكْمِهِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ﴿۷۸﴾

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ ﴿۷۹﴾

کرتے ہیں۔

(۱) اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔ ان ہی غائب چیزوں میں اس عذاب کا علم بھی ہے جس کے لیے یہ کفار جلدی چھاتے ہیں۔ لیکن اس کا وقت بھی اللہ نے لوح محفوظ میں لکھ رکھا ہے جسے صرف وہی جانتا ہے اور جب وہ وقت آجاتا ہے جو اس نے کسی قوم کی تباہی کے لیے لکھ رکھا ہوتا ہے، تو پھر اسے تباہ کر دیتا ہے۔ یہ مقررہ وقت آنے سے پہلے جلدی کیوں کرتے ہیں؟

(۲) اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ مختلف فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ان کے عقائد بھی ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تنقیص اور توہین کرتے تھے اور عیسائی ان کی شان میں غلو۔ حتیٰ کہ انہیں، اللہ یا اللہ کا بیٹا قرار دے دیا۔ قرآن کریم نے ان کے حوالے سے ایسی باتیں بیان فرمائیں، جن سے حق واضح ہو جاتا ہے اور اگر وہ قرآن کے بیان کردہ حقائق کو مان لیں تو ان کے عقائد کی اختلافات ختم اور ان کا تفرق و انتشار کم ہو سکتا ہے۔

(۳) مومنوں کا اختصاص اس لیے کہ وہی قرآن سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ انہی میں وہ بنی اسرائیل بھی ہیں جو ایمان لے آئے تھے۔

(۴) یعنی قیامت میں ان کے اختلافات کا فیصلہ کر کے حق کو باطل سے ممتاز کر دے گا اور اس کے مطابق جزا و سزا کا اہتمام فرمائے گا۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں جو تحریفات کی ہیں، دنیا میں ہی ان کا پردہ چاک کر کے ان کے درمیان فیصلہ فرمادے گا۔

(۵) یعنی اپنا معاملہ اسی کے سپرد کر دیں اور اسی پر اعتماد کریں، وہی آپ کا مددگار ہے۔ ایک تو اس لیے کہ آپ دین حق پر

بیشک آپ نہ مردوں کو سنا سکتے ہیں اور نہ بہروں کو اپنی
پکار سنا سکتے ہیں،^(۱) جبکہ وہ پیٹھ پھیرے روگرداں جا رہے
ہوں۔^(۲) (۸۰)

اور نہ آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے ہٹا کر رہنمائی کر سکتے
ہیں^(۳) آپ تو صرف انہیں سنا سکتے ہیں جو ہماری آیتوں پر
ایمان لائے ہیں پھر وہ فرمانبردار ہو جاتے ہیں۔ (۸۱)

جب ان کے اوپر عذاب کا وعدہ ثابت ہو جائے گا،^(۴) ہم
زمین سے ان کے لیے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے
باتیں کرتا ہوگا^(۵) کہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں

إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تَسْمِعُ الْقُمْمَ الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا
وَكُومًا مُّذَبِّحِينَ ۝

وَمَا أَنْتَ بِهَادِي الْعُمْيٰ عَنْ صَلَاتِهِمْ ۚ إِنَّ تَسْمِعُهُمْ إِلَّا
مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُّسْمِعُونَ ۝

وَإِذَا وَقَعَتِ الْفُتُورُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ
الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا

ہیں، دوسری وجہ آگے آرہی ہے۔

(۱) یہ ان کافروں کی پروانہ کرنے اور صرف اللہ پر بھروسہ رکھنے کی دوسری وجہ ہے کہ یہ لوگ مردہ ہیں جو کسی کی بات سن کر
فائدہ نہیں اٹھا سکتے یا بہرے ہیں جو سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں اور نہ راہ یاب ہونے والے ہیں۔ گویا کافروں کو مردوں سے تشبیہ دی
جن میں حس ہوتی ہے نہ عقل اور بہروں سے، جو عجز و فصاحت سنتے ہیں نہ دعوت الی اللہ قبول کرتے ہیں۔

(۲) یعنی وہ حق سے مکمل طور پر گریزاں اور متنفر ہیں کیونکہ بہرہ آدمی رودر رو بھی کوئی بات نہیں سن پاتا چہ جائیکہ اس
وقت سن سکے جب وہ منہ موڑ لے اور پیٹھ پھیرے ہوئے ہو۔ قرآن کریم کی اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سماع
موتی کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے۔ مردے کسی کی بات نہیں سن سکتے۔ البتہ اس سے صرف وہ صورتیں مستثنیٰ ہوں گی
جہاں سماعت کی صراحت کسی نص سے ثابت ہوگی۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ مردے کو جب دفنا کر واپس جاتے ہیں تو
وہ ان کے جوتوں کی آہٹ سنتا ہے (صحیح بخاری نمبر ۳۲۸، صحیح مسلم نمبر ۲۲۰۱) یا جنگ بدر میں کافر
مقتولین کو جو قلب بدر میں پھینک دیئے گئے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب فرمایا، جس پر صحابہ نے کہا ”آپ
ﷺ بے روح جسموں سے گفتگو فرما رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ تم سے زیادہ میری بات سن رہے ہیں۔ یعنی
معجزانہ طور پر اللہ تعالیٰ نے آپ کی بات مردہ کافروں کو سنا دی (صحیح بخاری نمبر ۳۲۰۷)

(۳) یعنی جن کو اللہ تعالیٰ حق سے اندھا کر دے، آپ ان کی اس طرح رہنمائی نہیں فرما سکتے جو انہیں مطلوب یعنی ایمان
تک پہنچا دے۔

(۴) یعنی جب نیکی کا حکم دینے والا اور برائی سے روکنے والا نہیں رہ جائے گا۔

(۵) یہ دابہ وہی ہے جو قرب قیامت کی علامات میں سے ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۸۱﴾

وَيَوْمَ نَخْشِرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ قَوْمًا مِّنْهُمْ
يُكَذِّبُ بِالَّذِينَ هُمْ يُؤْمِنُونَ ﴿۸۲﴾

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ وَقَالَ لَكَ بِكُمْ يَا لَيْتِي وَكَمْ ضَلَّوْا سُبُلًا
عَلَمًا أَمَا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۸۳﴾

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنْطَفِقُونَ ﴿۸۴﴾

الَّذِينَ آمَنُوا أَكُنَّا لِنَكْفُرُ بِهِمْ وَاللَّهُ الْمُبْتَدِئُ

کرتے تھے۔^(۱) (۸۲)

اور جس دن ہم ہر امت میں سے ان لوگوں کے گروہ کو
جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے گھیر گھار کر لائیں گے پھر
وہ سب کے سب الگ کر دیئے جائیں گے۔^(۲) (۸۳)

جب سب کے سب آپہنچیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ
تم نے میری آیتوں کو باوجودیکہ تمہیں ان کا پورا علم نہ
تھا کیوں جھٹلایا؟^(۳) اور یہ بھی بتلاؤ کہ تم کیا کچھ کرتے
رہے؟^(۴) (۸۴)

بسبب اس کے کہ انہوں نے ظلم کیا تھا ان پر بات جم
جائے گی اور وہ کچھ بول نہ سکیں گے۔^(۵) (۸۵)

کیا وہ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ ہم نے رات کو اس لیے

”قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو، ان میں ایک جانور کا نکلنا ہے۔ (صحیح مسلم کتاب الفتن، باب فی الآيات التي تكون قبل الساعة، والسنن) دو سری روایت میں ہے ”سب سے پہلی نشانی جو ظاہر ہوگی، وہ ہے سورج کا مشرق کی بجائے، مغرب سے طلوع ہونا اور چاشت کے وقت جانور کا نکلنا۔ ان دونوں میں سے جو پہلے ظاہر ہوگی، دو سری اس کے فوراً بعد ہی ظاہر ہو جائے گی (صحیح مسلم، باب فی خروج الدجال و مکشہ فی الأرض)

(۱) یہ جانور کے نکلنے کی علت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی یہ نشانی اس لیے دکھلائے گا کہ لوگ اللہ کی نشانیوں یا آیتوں (احکام) پر یقین نہیں رکھتے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ جملہ وہ جانور اپنی زبان سے ادا کرے گا۔ تاہم اس جانور کے لوگوں سے کلام کرنے میں تو کوئی شک نہیں کیونکہ قرآن نے اس کی صراحت کی ہے۔

(۲) یا قسم قسم کر دیئے جائیں گے۔ یعنی زانیوں کا ٹولہ، شرابیوں کا ٹولہ وغیرہ۔ یا یہ معنی ہیں کہ ان کو روکا جائے گا۔ یعنی ان کو ادھر ادھر اور آگے پیچھے ہونے سے روکا جائے گا اور سب کو ترتیب وار لاکر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

(۳) یعنی تم نے میری توحید اور دعوت کے دلائل سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور اس کے بغیر ہی میری آیتوں کو جھٹلاتے رہے۔

(۴) کہ جس کی وجہ سے تمہیں میری باتوں پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

(۵) یعنی ان کے پاس کوئی عذر نہیں ہوگا کہ جسے وہ پیش کر سکیں۔ یا قیامت کی ہولناکیوں کی وجہ سے بولنے کی قدرت سے ہی محروم ہوں گے اور بعض کے نزدیک۔ اس وقت کی کیفیت کا بیان ہے جب ان کے مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۳۱﴾

بنایا ہے کہ وہ اس میں آرام حاصل کر لیں اور دن کو ہم نے دکھانے والا بنایا ہے،^(۱) یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو ایمان و یقین رکھتے ہیں۔ (۸۶)

جس دن صور پھونکا جائے گا تو سب کے سب آسمانوں والے اور زمین والے گھبرا اٹھیں گے^(۲) مگر جسے اللہ تعالیٰ چاہے،^(۳) اور سارے کے سارے عاجز و پست ہو کر اس کے سامنے حاضر ہوں گے۔ (۸۷)

اور آپ پہاڑوں کو دیکھ کر اپنی جگہ جتے ہوئے خیال کرتے ہیں لیکن وہ بھی بادل کی طرح اڑتے پھریں گے،^(۴) یہ ہے صنعت اللہ کی جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا ہے،^(۵) جو کچھ تم کرتے ہو اس سے وہ باخبر ہے۔ (۸۸)

جو لوگ نیک عمل لائیں گے انھیں اس سے بہتر بدلہ ملے گا اور وہ اس دن کی گھبراہٹ سے بے خوف ہوں

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَنُزِعَ مِنَ فِي السَّمَوَاتِ
وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ
وَكُلٌّ أَتَوْكَ دُخَانًا ۝ ﴿۳۲﴾

وَيَوْمَ يُجْبَلُ تُحْسِبُهَا جَمَادًا وَهِيَ تَدْرَمَةٌ
السَّحَابِ صُغْرًا اللَّهُ الَّذِي أَنْتَفَنَ كُلَّ شَيْءٍ إِنَّهُ
خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ ﴿۳۳﴾

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِّمَّا وَهُمْ مِنْ قُرْبَىٰ

(۱) تاکہ وہ اس میں کسب معاش کے لیے دوڑ دھوپ کر سکیں۔

(۲) صور سے مراد وہی قرن ہے جس میں اسرافیل علیہ السلام اللہ کے حکم سے پھونک ماریں گے۔ یہ نفعی دو یاد سے زیادہ ہوں گے۔ پہلے نفعی (پھونک) میں ساری دنیا گھبرا کر بے ہوش اور دوسرے نفعی میں موت سے ہمکنار ہو جائے گی۔ تیسرے نفعی میں سب لوگ قبروں سے زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور بعض کے نزدیک ایک اور چوتھا نفعی ہو گا جس سے سب لوگ میدان محشر میں اکٹھے ہو جائیں گے۔ یہاں کون سا نفعی مراد ہے؟ امام ابن کثیر کے نزدیک یہ پہلا نفعی اور امام شوکانی کے نزدیک تیسرا نفعی ہے جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے۔

(۳) یہ مستثنیٰ لوگ کون ہوں گے۔ بعض کے نزدیک انبیاء و شہداء، بعض کے نزدیک فرشتے اور بعض کے نزدیک سب اہل ایمان ہیں۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ تمام مذکورین ہی اس میں شامل ہوں کیونکہ اہل ایمان حقیقی گھبراہٹ سے محفوظ ہوں گے (جیسا کہ آگے آ رہا ہے)

(۴) یہ قیامت والے دن ہو گا کہ پہاڑ اپنی جگہوں پر نہیں رہیں گے بلکہ بادلوں کی طرح چلیں گے اور اڑیں گے۔

(۵) یعنی یہ اللہ کی عظیم قدرت سے ہو گا جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا ہے۔ لیکن وہ ان مضبوط چیزوں کو بھی روٹی کے گالوں کی طرح کر دینے پر قادر ہے۔

گے۔^(۱) (۸۹)

اور جو برائی لے کر آئیں گے وہ اوندھے منہ آگ میں جھونک دیئے جائیں گے۔ صرف وہی بدلہ دیئے جاؤ گے جو تم کرتے رہے۔ (۹۰)

مجھے تو بس یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے پروردگار کی عبادت کرتا رہوں جس نے اسے حرمت والا بنایا ہے،^(۲) جس کی ملکیت ہر چیز ہے اور مجھے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ میں فرماں برداروں میں ہو جاؤں۔ (۹۱)

اور میں قرآن کی تلاوت کرتا رہوں، جو راہ راست پر آجائے وہ اپنے نفع کے لیے راہ راست پر آئے گا۔ اور جو ہمک جائے تو کمہ دیجئے! کہ میں تو صرف ہوشیار کرنے والوں میں سے ہوں۔^(۳) (۹۲)

کمہ دیجئے، کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کو سزاوار ہیں^(۴) وہ عنقریب اپنی نشانیاں دکھائے گا جنہیں تم (خود) پہچان لو گے۔^(۵) اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے آپ کا رب

يَوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾

وَمَنْ جَاءَ بِالسَّبِيَّةِ فَكَبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ هٰذَا مُجْرِمُوْنَ اِلَّا مَا كَانَتْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۰﴾

اِنَّمَا اُفْرُتْ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلَدِ الَّذِيْ حَرَمَهَا وَلِهٰذَا كُنْتُ مِّنْ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۱﴾

وَاِنْ اَنْتُمْ اَلْتُمُوْا الْقُرْاٰنَ فَمِنْ اِهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَعَلٰى اِنَّمَا اَنَا مِنَ الْمُنذِرِيْنَ ﴿۹۲﴾

وَقُلِ الْعَمْدُ لِلّٰهِ سُبْحٰنَ رَبِّهِ مَعْرُوفُوْهَا وَمَا رَبِّيْكَ

(۱) یعنی حقیقی اور بڑی گھبراہٹ سے وہ محفوظ ہوں گے۔ ﴿لَا يَحْزَنُهُمُ الْعَرْزُ الْاَكْبَرُ﴾ (الانبیاء-۱۱۳)

(۲) اس سے مراد مکہ شہر ہے اس کا بطور خاص اس لیے ذکر کیا ہے کہ اسی میں خانہ کعبہ ہے اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سب سے زیادہ محبوب تھا۔ ”حرمت والا“ کا مطلب ہے اس میں خون ریزی کرنا، ظلم کرنا، شکار کرنا، درخت کاٹنا حتیٰ کہ کاٹنا توڑنا بھی منع ہے۔ (بخاری کتاب الجنائز، مسلم کتاب الحج باب تحریم مکة وصیڈھا، والسنن)

(۳) یعنی میرا کام صرف تبلیغ ہے۔ میری دعوت و تبلیغ سے جو مسلمان ہو جائے گا، اس میں اسی کا فائدہ ہے کہ اللہ کے عذاب سے بچ جائے گا، اور جو میری دعوت کو نہیں مانے گا، تو میرا کیا؟ اللہ تعالیٰ خود ہی اس سے حساب لے لے گا اور اسے جہنم کے عذاب کا مزہ چکھائے گا۔

(۴) کہ جو کسی کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک حجت قائم نہیں کر دیتا۔

(۵) دوسرے مقام پر فرمایا ﴿سُبْحٰنَهُمُ الْبِيْتَانِ الْاَفَاقِ وَرَبِّ الْاَقْصٰمِ حَتّٰى يَبْيَكُنَ لَهُمُ الْاُكْحٰبُ﴾ (سورۃ حنم السجدة-۵۳)

يَعَاذِلْ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۲۰﴾

غافل نہیں۔^(۱) (۹۳)

سورہ قصص کی ہے اور اس میں اٹھاسی آیتیں اور نو رکوع ہیں۔

سُورَةُ الْقَصَصِ ﴿۲۰﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۱﴾

طَسَمَ ﴿۱﴾ تِلْكَ اِلْتِ الْكُتُبِ الْبُیِّنِ ﴿۲﴾

طسم۔ (۱) یہ آیتیں ہیں روشن کتاب کی۔ (۲)

ہم آپ کے سامنے موسیٰ اور فرعون کا صحیح واقعہ بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔^(۳) (۳)

یقیناً فرعون نے زمین میں سرکشی کر رکھی تھی^(۴) اور

وہاں کے لوگوں کو گروہ بنا رکھا تھا^(۵) اور ان میں

سے ایک فرقہ کو کمزور کر رکھا تھا^(۶) اور ان کے لڑکوں کو

توزخ کر ڈالتا تھا^(۷) اور ان کی لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔

تَنَلُّوْا عَلَیْكَ مِنْ بَنِي مُوسٰی وَفِرْعَوْنَ یٰۤاَحْمَقِ

لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳﴾

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِیْعًا

یَسْتَضَعِفُ طُلَآئِفًا مِنْهُمْ یُدْبِرُ اَبْنَاءَهُمْ وَیَسْتَكْفِی

”ہم انہیں آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھلائیں گے تاکہ ان پر حق واضح ہو جائے۔“ اگر زندگی میں یہ نشانیاں دیکھ کر ایمان نہیں لاتے تو موت کے وقت تو ان نشانیوں کو دیکھ کر ضرور پہچان لیتے ہیں۔ لیکن اس وقت کی معرفت کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی، اس لیے کہ اس وقت ایمان مقبول نہیں۔

(۱) بلکہ ہر چیز کو وہ دیکھ رہا ہے۔ اس میں کافروں کے لیے ترہیب شدید اور تہدید عظیم ہے۔

(۲) یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں کیونکہ وحی الہی کے بغیر صدیوں قبل کے واقعات بالکل اس طریقے سے بیان کر دینا جس طرح وہ پیش آئے، ناممکن ہے۔ تاہم اس کے باوجود اس سے فائدہ اہل ایمان ہی کو ہو گا، کیونکہ وہی آپ کی باتوں کی تصدیق کریں گے۔

(۳) یعنی ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا تھا اور اپنے کو بڑا معبود کہلاتا تھا۔

(۴) جن کے ذمے الگ الگ کام اور ڈیوٹیاں تھیں۔

(۵) اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں، جو اس وقت کی افضل ترین قوم تھی لیکن ابتلا و آزمائش کے طور پر فرعون کی غلام اور اس کی ستم رانیوں کا تختہ مشق بنی ہوئی تھی۔

(۶) جس کی وجہ بعض نجومیوں کی یہ پیش گوئی تھی کہ بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے ایک بچے کے ہاتھوں فرعون کی

نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُقْسِدِينَ ﴿۶﴾

وَرَبِّدْ أَنْ تَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتَضَعُوا فِي الْأَرْضِ
وَنَجْعَلَهُمْ آيَةً وَنَجْعَلَهُمُ الْآيَاتِ ۝ ﴿۷﴾

وَأَمَّا لَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَيَرْبَىٰ فِرْعَوْنُ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا
مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ ﴿۸﴾

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ آلِ إِبْرَاهِيمَ أَنْ أَطِيعُوا قَوْلَ أَخِيكَ عَلَيْهِ
سَلَامٌ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْكَافِرُ ﴿۹﴾

بیشک و شبہ وہ تھا ہی مفسدوں میں سے۔ (۴)
پھر ہماری چاہت ہوئی کہ ہم ان پر کرم فرمائیں جنہیں
زمین میں بے حد کمزور کر دیا گیا تھا، اور ہم انہیں کو پیشوا
اور (زمین) کا وارث بنائیں۔ (۵)

اور یہ بھی کہ ہم انہیں زمین میں قدرت و اختیار
دیں (۲) اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ
دکھائیں جس سے وہ ڈر رہے ہیں۔ (۳)
ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی ماں کو وحی کی (۴) کہ اسے دودھ
پلاتی رہ اور جب تجھے اس کی نسبت کوئی خوف معلوم ہو تو

ہلاکت اور اس کی سلطنت کا خاتمہ ہو گا۔ جس کا حل اس نے یہ نکالا کہ ہر پیدا ہونے والا اسرائیلی بچہ قتل کر دیا جائے۔
حالانکہ اس احمق نے یہ نہیں سوچا کہ اگر کاہن سچا ہے تو ایسا یقیناً ہو کر رہے گا چاہے وہ بچے قتل کروا تا رہے۔ اور اگر وہ
جھوٹا ہے تو قتل کروانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ (فتح القدر) بعض کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے
یہ خوشخبری منتقل ہوتی چلی آ رہی تھی کہ ان کی نسل سے ایک بچہ ہو گا جس کے ہاتھوں سلطنت مصر کی تباہی ہو گی۔
قبیلوں نے یہ بشارت بنی اسرائیل سے سنی اور فرعون کو اس سے آگاہ کر دیا جس پر اس نے بنی اسرائیل کے بچوں کو
مروانا شروع کر دیا۔ (ابن کثیر)

(۱) چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس کمزور اور غلام قوم کو مشرق و مغرب کا وارث (مالک و حکمران) بنا دیا
(الأعراف-۱۳۷) نیز انہیں دین کا پیشوا اور امام بھی بنا دیا۔

(۲) یہاں زمین سے مراد ارض شام ہے جہاں وہ کنعانیوں کی زمین کے وارث بنے کیونکہ مصر سے نکلنے کے بعد بنی
اسرائیل مصر واپس نہیں گئے، واللہ اعلم۔

(۳) یعنی انہیں جو اندیشہ تھا کہ ایک اسرائیلی کے ہاتھوں فرعون کی اور اس کے ملک و لشکر کی تباہی ہو گی، ان کے اس
اندیشے کو ہم نے حقیقت کر دکھایا۔

(۴) وحی سے مراد یہاں دل میں بات ڈالنا ہے، وہ وحی نہیں ہے، جو انبیاء پر فرشتے کے ذریعے سے نازل کی جاتی تھی اور
اگر فرشتے کے ذریعے سے بھی آئی ہو، تب بھی اس ایک وحی سے ام موسیٰ علیہ السلام کا نبی ہونا ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ
فرشتے بعض دفعہ عام انسانوں کے پاس بھی آجاتے ہیں۔ جیسے حدیث میں اقرع، ابرص اور امی کے پاس فرشتوں کا آنا
ثابت ہے (متفق علیہ، بخاری، کتاب احادیث الانبیاء)

اسے دریا میں بہا دینا اور کوئی ڈر خوف یا رنج غم نہ کرنا،^(۱) ہم یقیناً اسے تیری طرف لوٹانے والے ہیں^(۲) اور اسے اپنے پیغمبروں میں بنانے والے ہیں۔ (۷)

آخر فرعون کے لوگوں نے اس بچے کو اٹھالیا^(۳) کہ آخر کار یہی بچہ ان کا دشمن ہوا اور ان کے رنج کا باعث بنا،^(۴) کچھ شک نہیں کہ فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر تھے ہی خطا کار۔ (۸)^(۵)

اور فرعون کی بیوی نے کہا یہ تو میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کرو،^(۶) بہت ممکن ہے کہ یہ ہمیں

وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝

فَالنَّظْفَةَ آلَ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا إِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُودَهُمَا كَانُوا خَاطِبِينَ ۝

وَقَالَتِ امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ قَوِّتِي عَيْنِي إِنَّي لَأَتَقَاتِلَنَّهُ لَوْ كُنْتُ عَلِيمًا ۝

(۱) یعنی دریا میں ڈوب جانے یا ضائع جانے سے نہ ڈرنا اور اس کی جدائی کا غم نہ کرنا۔

(۲) یعنی ایسے طریقے سے کہ جس سے اس کی نجات یقینی ہو، کہتے ہیں کہ جب قتل اولاد کا یہ سلسلہ زیادہ ہوا تو فرعون کی قوم کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں بنی اسرائیل کی نسل ہی ختم نہ ہو جائے اور پھر مشقت والے کام ہمیں نہ کرنے پڑیں۔ اس اندیشے کا ذکر انہوں نے فرعون سے کیا، جس پر نیا حکم جاری کر دیا گیا کہ ایک سال بچے قتل کئے اور ایک سال چھوڑ دیئے جائیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس میں بچے قتل نہیں کیے جاتے تھے، جب کہ موسیٰ علیہ السلام قتل والے سال میں پیدا ہوئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کا سروسامان اس طرح پیدا فرمایا کہ ایک تو ان کی والدہ پر حمل کے آثار اس طرح ظاہر نہیں فرمائے، جس سے وہ فرعون کی چھوڑی ہوئی دائیوں کی نگاہ میں آجائیں۔ اس لیے ولادت کا مرحلہ تو خاموشی کے ساتھ ہو گیا اور یہ واقعہ حکومت کے منصوبہ بندوں کے علم میں نہیں آیا، لیکن ولادت کے بعد قتل کا اندیشہ موجود تھا، جس کا حل خود اللہ تعالیٰ نے وحی والقا کے ذریعے سے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو سمجھا دیا۔ چنانچہ انہوں نے اسے تابوت میں لٹا کر دریائے نیل میں ڈال دیا۔ (ابن کثیر)

(۳) یہ تابوت بہتا بہتا فرعون کے محل کے پاس پہنچ گیا، جو لب دریا ہی تھا اور وہاں فرعون کے نوکروں چاکروں نے پکڑ کر باہر نکال لیا۔

(۴) یہ لام عاقبت کے لیے ہے۔ یعنی انہوں نے تو اسے اپنا بچہ اور آنکھوں کی ٹھنڈک بنا کر لیا تھا نہ کہ دشمن سمجھ کر۔ لیکن انجام ان کے اس فعل کا یہ ہوا کہ وہ ان کا دشمن اور رنج و غم کا باعث ثابت ہوا۔

(۵) یہ ما قبل کی تغلیل ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ان کے لیے دشمن کیوں ثابت ہوئے؟ اس لیے کہ وہ سب اللہ کے نافرمان اور خطا کار تھے، اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر ان کے پروردہ کو ہی ان کی ہلاکت کا ذریعہ بنا دیا۔

(۶) یہ اس وقت کہا جب تابوت میں ایک حسین و جمیل بچہ انہوں نے دیکھا۔ بعض کے نزدیک یہ اس وقت کا قول ہے

وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ⑩

کوئی فائدہ پہنچائے یا ہم اسے اپنا ہی بیٹا بنالیں^(۱) اور یہ لوگ شعور ہی نہ رکھتے تھے۔^(۲) (۹)

موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا دل بے قرار ہو گیا،^(۳) قریب تھیں کہ اس واقعہ کو بالکل ظاہر کر دیتیں اگر ہم ان کے دل کو ڈھارس نہ دے دیتے یہ اس لیے کہ وہ یقین کرنے والوں میں رہے۔^(۴) (۱۰)

موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ نے اس کی بہن^(۵) سے کہا کہ تو اس کے پیچھے پیچھے جا، تو وہ اسے دور ہی دور سے دیکھتی رہی^(۶) اور فرعونیوں کو اس کا علم بھی نہ ہوا۔ (۱۱)

ان کے بیچنے سے پہلے ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) پر دایوں کا دودھ حرام کر دیا تھا۔^(۷) یہ کہنے لگی کہ کیا میں تمہیں^(۸) ایسا گھرانا بتاؤں جو اس بچہ کی تمہارے لیے

وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فَرِغَانًا كَادَتْ لَسْبَدُ بِبِهِ لَوْلَا أُنزِلْنَا عَلَىٰ قَلْبِهَا لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ⑪

وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ ذَبَحْتُهُ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ⑫

وَحَرَّمَ مَنَا عَلَيَّهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ أَهْلِ بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُ لَكُمْ وَهُمْ لَهُ نَاصِحُونَ ⑬

جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی داڑھی کے بال نوج لیے تھے تو فرعون نے ان کو قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ (ایسر التفاسیر) جمع کا صیغہ یا تو اکیلے فرعون کے لیے بطور تعظیم کے کہا یا ممکن ہے وہاں اس کے کچھ درباری موجود رہے ہوں۔

(۱) کیوں کہ فرعون اولاد سے محروم تھا۔

(۲) کہ یہ بچہ جسے وہ اپنا بچہ بنا رہے ہیں، یہ تو وہی بچہ ہے جس کو مارنے کے لیے سینکڑوں بچوں کو موت کی نیند سلا دیا گیا ہے۔

(۳) یعنی ان کا دل ہر چیز اور فکر سے فارغ (خالی) ہو گیا اور ایک ہی فکر یعنی موسیٰ علیہ السلام کا غم دل میں سما گیا، جس کو اردو میں بے قراری سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۴) یعنی شدت غم سے یہ ظاہر کر دیتیں کہ یہ ان کا بچہ ہے لیکن اللہ نے ان کے دل کو مضبوط کر دیا جس پر انہوں نے صبر کیا اور یقین کر لیا کہ اللہ نے اس موسیٰ علیہ السلام کو بخیریت واپس لوٹانے کا جو وعدہ کیا ہے، وہ پورا ہو گا۔

(۵) خواہر موسیٰ علیہ السلام کا نام مریم بنت عمران تھا جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ مریم بنت عمران تھیں۔ نام اور ولدیت دونوں میں اتحاد تھا۔

(۶) چنانچہ وہ دریا کے کنارے کنارے دیکھتی رہی تھی، حتیٰ کہ اس نے دیکھ لیا کہ اس کا بھائی فرعون کے محل میں چلا گیا ہے۔

(۷) یعنی ہم نے اپنی قدرت اور نکتوئی حکم کے ذریعے سے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی ماں کے علاوہ کسی اور انا کا دودھ پینے سے منع کر دیا، چنانچہ بسیار کوشش کے باوجود کوئی انا انہیں دودھ پلانے اور چپ کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

(۸) یہ سب مظنرات کی ہمیشہ خاموشی کے ساتھ دیکھ رہی تھیں، بالآخر بول پڑیں کہ میں تمہیں ”ایسا گھرانا بتاؤں جو اس

پرورش کرے اور ہوں بھی وہ اس بچے کے خیر خواہ۔ (۱۲)
پس ہم نے اسے اس کی ماں کی طرف واپس پہنچایا،^(۱)
تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور آزرده خاطر نہ ہو
اور جان لے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے^(۲) لیکن
اکثر لوگ نہیں جانتے۔^(۳) (۱۳)

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) اپنی جوانی کو پہنچ گئے اور
پورے توانا ہو گئے ہم نے انہیں حکمت و علم عطا فرمایا،^(۴)

فَرَدَدْنَاهُ إِلَىٰ أُمِّهِ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَكَلَّا تَحْزَنَ ۚ وَلِتَعْلَمَ
أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَاجِلُونَ ﴿۱۲﴾

وَلَقَدْ بَلَّغْنَا آدَمَ هُدَاهُ وَاسْتَوَىٰ إِلَيْهِ حَكِيمًا وَعِلْمًا وَكُنَّا ذَاكًا

بچہ کی تمہارے لیے پرورش کرے۔“

(۱) چنانچہ انہوں نے ہشیرۃ موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ جا اس عورت کو لے آ چنانچہ وہ دوڑی دوڑی گئی اور اپنی ماں کو،
جو موسیٰ علیہ السلام کی بھی ماں تھی، ساتھ لے آئی۔

(۲) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی والدہ کا دودھ پی لیا، تو فرعون نے والدہ موسیٰ سے محل میں رہنے کی استدعا
کی تاکہ بچے کی صحیح پرورش اور نگہداشت ہو سکے۔ لیکن انہوں نے کہا کہ میں اپنے خاندان اور بچوں کو چھوڑ کر یہاں نہیں
رہ سکتی۔ بالآخر یہ طے پایا کہ بچے کو وہ اپنے ساتھ ہی اپنے گھر لے جائیں اور وہیں اس کی پرورش کریں اور اس کی
اجرت انہیں شاہی خزانے سے دی جائے گی، سبحان اللہ! اللہ کی قدرت کے کیا کئے، دودھ اپنے بچے کو پلائیں اور تنخواہ
فرعون سے وصول کریں، رب نے موسیٰ علیہ السلام کو واپس لوٹانے کا وعدہ کس احسن طریقے سے پورا فرمایا۔
﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ اللَّهِ الَّذِي يَبْدَأُ الْمَلَكُوتَ كُلَّ نَفْسٍ﴾ ایک مرسل روایت میں ہے۔ ”اس کا ریگر کی مثال“ جو اپنی بنائی ہوئی چیز
میں ثواب اور خیر کی نیت بھی رکھتا ہے، موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرح ہے جو اپنے ہی بچے کو دودھ پلاتی ہے اور اس کی
اجرت بھی وصول کرتی ہے۔“ (مراہیل اُبی داؤد)

(۳) یعنی بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے انجام کی حقیقت سے اکثر لوگ بے علم ہوتے ہیں لیکن اللہ کو اس کے
حسن انجام کا علم ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا (ہو سکتا ہے جس چیز کو تم برا سمجھو، اس میں تمہارے لیے خیر ہو اور جس
چیز کو تم پسند کرو، اس میں تمہارے لیے شر کا پھلو ہو) (البقرۃ-۲۱۶) دوسرے مقام پر فرمایا (ہو سکتا ہے تم کسی چیز کو برا
سمجھو، اور اللہ اس میں تمہارے لیے خیر کثیر پیدا فرمادے) (النساء-۱۹) اس لیے انسان کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ اپنی پسند
و ناپسند سے قطع نظر ہر معاملے میں اللہ اور رسول کے احکام کی پابندی کر لے کہ اسی میں اس کے لیے خیر اور حسن انجام
ہے۔

(۴) حکم اور علم سے مراد اگر نبوت ہے تو اس مقام تک کس طرح پہنچے، اس کی تفصیل اگلی آیات میں ہے۔ بعض
مفسرین کے نزدیک اس سے مراد نبوت نہیں بلکہ عقل و دانش اور وہ علوم ہیں جو انہوں نے اپنے آبائی اور خاندانی ماحول
میں رہ کر سیکھے۔

نیکی کرنے والوں کو ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ (۱۳)

اور موسیٰ (علیہ السلام) ایک ایسے وقت شہر میں آئے جبکہ شہر کے لوگ غفلت میں تھے۔^(۱) یہاں دو شخصوں کو لڑتے ہوئے پایا، یہ ایک تو اس کے رفیقوں میں سے تھا اور یہ دوسرا اس کے دشمنوں میں سے،^(۲) اس کی قوم والے نے اس کے خلاف جو اس کے دشمنوں میں سے تھا اس سے فریاد کی، جس پر موسیٰ (علیہ السلام) نے اس کے مکارا مارا جس سے وہ مر گیا موسیٰ (علیہ السلام) کہنے لگے یہ تو شیطانی کام ہے،^(۳) یقیناً شیطان دشمن اور کھلے طور پر بہکانے والا ہے۔^(۴) (۱۵)

پھر دعا کرنے لگے کہ اے پروردگار! میں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا، تو مجھے معاف فرما دے،^(۵) اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا، وہ بخشش اور بہت مہربانی کرنے والا ہے۔ (۱۶)

کہنے لگے اے میرے رب! جیسے تو نے مجھ پر یہ کرم فرمایا میں بھی اب ہرگز کسی گنہگار کا مددگار نہ بنوں گا۔^(۶) (۱۷)

نَجْوَى الْمُحْسِنِينَ ۝
وَدَخَلَ الْمَدْيَنَةَ عَلَىٰ جَمِيعِ غَفْلَتِهِمْ مِنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَذَا مِنْ شِيعَةِ هَذَا وَهَذَا مِنْ عَدُوِّ هَذَا فَاسْتَعَاذَهُ الَّذِي مِنْ شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ فَوَكَرَهُ مُوسَىٰ وَقَضَىٰ عَلَيْهِمَا قَالَ هَذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ۝

قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهُ إِنَّهُ هُوَ الْعَفُوفُ الرَّحِيمُ ۝

قَالَ رَبِّ بِمَا أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِلْمُجْرِمِينَ ۝

(۱) اس سے بعض نے مغرب اور عشا کے درمیان کا وقت اور بعض نے نصف النہار مراد لیا ہے۔ جب لوگ آرام کر رہے ہوتے ہیں۔

(۲) یعنی فرعون کی قوم قبط میں سے تھا۔

(۳) اسے شیطانی فعل اس لیے قرار دیا کہ قتل ایک نہایت سنگین جرم ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقصد اسے ہرگز قتل کرنا نہیں تھا۔

(۴) جس کی انسان سے دشمنی بھی واضح ہے اور انسان کو گمراہ کرنے کے لیے وہ جو جتن کرتا ہے، وہ بھی مخفی نہیں۔

(۵) یہ اتفاقاً قتل اگرچہ کبیرہ گناہ نہیں تھا، کیونکہ کبائر سے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کی حفاظت فرماتا ہے۔ تاہم یہ بھی ایسا گناہ نظر آتا تھا جس کے لیے بہت بخشش انہوں نے ضروری سمجھی۔ دوسرے، انہیں خطرہ تھا کہ فرعون کو اس کی اطلاع ملی تو اس کے بدلے انہیں قتل نہ کر دے۔

(۶) یعنی جو کافر اور تیرے مکھوں کا مخالف ہو گا، تو نے مجھ پر جو انعام کیا ہے، اس کے سبب میں اس کا مددگار نہیں ہوں گا۔

صبح ہی صبح ڈرتے^(۱) اندیشہ کی حالت میں خبریں لینے کو شہر میں گئے، کہ اچانک وہی شخص جس نے کل ان سے مدد طلب کی تھی ان سے فریاد کر رہا ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے اس سے کہا کہ اس میں شک نہیں تو تو صریح بے راہ ہے۔^(۲) (۱۸)

پھر جب اپنے اور اس کے دشمن کو پکڑنا چاہا^(۳) وہ فریادی کہنے لگا کہ^(۴) موسیٰ (علیہ السلام) کیا جس طرح تو نے کل ایک شخص کو قتل کیا ہے مجھے بھی مار ڈالنا چاہتا ہے، تو تو ملک میں ظالم و سرکش ہونا ہی چاہتا ہے اور تیرا یہ ارادہ ہی نہیں کہ ملاپ کرنے والوں میں سے ہو۔ (۱۹)

شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا^(۵) اور کہنے لگا اے موسیٰ! یہاں کے سردار تیرے

فَأَصْبَحَ فِي الْمَدِينَةِ خَائِفًا يَتَرَقَّبُ فَإِذَا الْكَلْبِيُّ اسْتَنْصَرَهُ بِالْأَمْسِ يَسْتَصْرِخُهُ قَالَ لَهُ مُوسَىٰ إِنَّكَ لَعَوِيُّ شَيْدٍ ۝

فَلَمَّا أَنْ آرَادَ أَنْ يَبْطِشَ بِالَّذِي هُوَ عَدُوٌّ لَهُمَا قَالَ يٰمُوسَىٰ أَيُرِيدُ أَنْ نَقْتُلُكَ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا يٰأَيُّ الْمَسِيئِينَ ۝ إِنَّ يُرِيدُ إِلَّا أَنْ تَكُونَ جَبَّارًا فِي الْأَرْضِ وَمَا يُرِيدُ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمَصْلِحِينَ ۝

وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ يَسْمَعِي قَالَ يٰمُوسَىٰ إِنَّ الْمَلِكَ يُأْتِعُوكَ بِكَ لِتَقْتُلُوهُ فَأَخْرَجْتُكَ لَكَ

بعض نے اس انعام سے مراد اس گناہ کی معافی لی ہے جو غیر ارادی طور پر قبلی کے قتل کی صورت میں ان سے صادر ہوا۔

(۱) خائفنا کے معنی ڈرتے ہوئے يَتَرَقَّبُ 'ادھر ادھر جھانکتے اور اپنے بارے میں اندیشوں میں مبتلا۔

(۲) یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو ڈانٹا کہ تو کل بھی لڑتا ہوا پایا گیا تھا اور آج پھر تو کسی سے دست بہ گریبان ہے، تو تو صریح بے راہ یعنی بھگڑا ہوا ہے۔

(۳) یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چاہا کہ قبلی کو پکڑ لیں، کیونکہ وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا دشمن تھا، تاکہ لڑائی زیادہ نہ بڑھے۔

(۴) فریادی (اسرائیلی) سمجھا کہ موسیٰ علیہ السلام شاید اسے پکڑنے لگے ہیں تو وہ بول اٹھا کہ اے موسیٰ! اُنُرِيدُ أَنْ نَقْتُلُكَ..... جس سے قبلی کے علم میں یہ بات آگئی کہ کل جو قتل ہوا تھا، اس کا قاتل موسیٰ علیہ السلام ہے، اس نے جا کر فرعون کو بتلادیا جس پر فرعون نے اس کے بدلے میں موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا عزم کر لیا۔

(۵) یہ آدمی کون تھا؟ بعض کے نزدیک یہ فرعون کی قوم سے تھا جو درپردہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خیر خواہ تھا۔ اور ظاہر ہے سرداروں کے مشورے کی خبر ایسے ہی آدمی کے ذریعے آنا زیادہ قرین قیاس ہے۔ بعض کے نزدیک یہ موسیٰ علیہ السلام کا قریبی رشتے دار اور اسرائیلی تھا۔ اور اقصائے شہر سے مراد منف ہے جہاں فرعون کا محل اور دار الحکومت تھا اور یہ شہر کے آخری کنارے پر تھا۔

قتل کا مشورہ کر رہے ہیں، پس تو بہت جلد چلا جا مجھے اپنا خیر خواہ مان۔ (۲۰)

پس موسیٰ (علیہ السلام) وہاں سے خوفزدہ ہو کر دیکھتے بھالتے نکل کھڑے ہوئے،^(۱) کتنے لگے اے پروردگار! مجھے ظالموں کے گروہ سے بچالے۔^(۲) (۲۱)

اور جب مدین کی طرف متوجہ ہوئے تو کتنے لگے مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے سیدھی راہ لے چلا گا۔^(۳) (۲۲)

مدین کے پانی پر جب آپ پہنچے تو دیکھا کہ لوگوں کی ایک جماعت وہاں پانی پلا رہی ہے^(۴) اور دو عورتیں الگ کھڑی اپنے (جانوروں کو) روکتی ہوئی دکھائی دیں، پوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے،^(۵) وہ بولیں کہ جب تک یہ

مِنَ الصَّحْبِ ۝

فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي
مِنَ الْعَوْمِ الْعَالِيَيْنِ ۝

وَلَمَّا تَوَجَّهَ بَلَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَمَلَى رَبِّيَ إِنِّي
سَوَاءٌ السَّبِيلِ ۝

وَلَمَّا وُودَ مَاءَ مَدْيَنَ وَوَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ
يَسْتَقُونَهُ وَوَجَدَ مِنْ دُونِهِمُ امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ قَالَ
مَا خَطْبُكُمَا قَالَتَا لَا نَسْتَفِي حَتَّىٰ يَصْدَرَ الرَّعَاءُ وَأَبُونَا

(۱) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم میں یہ بات آئی تو وہاں سے نکل کھڑے ہوئے تاکہ فرعون کی گرفت میں نہ آسکیں۔

(۲) یعنی فرعون اور اس کے درباریوں سے، جنہوں نے باہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا مشورہ کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوئی علم نہ تھا کہ کہاں جانا ہے؟ کیوں کہ مصر چھوڑنے کا یہ حادثہ بالکل اچانک پیش آیا، پہلے سے کوئی خیال یا منصوبہ نہیں تھا، چنانچہ اللہ نے گھوڑے پر ایک فرشتہ بھیج دیا، جس نے انہیں راستے کی نشاندہی کی، وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔ (ابن کثیر)

(۳) چنانچہ اللہ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی اور ایسے سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی فرمادی جس سے ان کی دنیا بھی سنور گئی اور آخرت بھی یعنی وہ ہادی بھی بن گئے اور مہدی بھی، خود بھی ہدایت یافتہ اور دوسروں کو بھی ہدایت کا راستہ بتلانے والے۔

(۴) یعنی جب مدین پہنچے تو اس کے کنویں پر دیکھا کہ لوگوں کا ہجوم ہے جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہا ہے۔ مدین یہ قبیلے کا نام تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے تھا، جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل سے تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے (حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے) تھے۔ یوں اہل مدین اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان نسبی تعلق بھی تھا (ایسر النقاہیر) اور یہی حضرت شعیب علیہ السلام کا مسکن و مبعث بھی تھا۔

(۵) دو عورتوں کو اپنے جانور روکے، کھڑے دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں رحم آیا اور ان سے پوچھا، کیا

تَمِيحًا كَبِيرًا ①

چرواہے واپس نہ لوٹ جائیں ہم پانی نہیں پلاتیں^(۱) اور ہمارے والد بہت بڑی عمر کے بوڑھے ہیں۔^(۲) (۲۳)

پس آپ نے خود ان جانوروں کو پانی پلا دیا پھر سائے کی طرف ہٹ آئے اور کہنے لگے اے پروردگار! تو جو کچھ بھلائی میری طرف اتارے میں اس کا محتاج ہوں۔^(۳) (۲۴)

اتنے میں ان دونوں عورتوں میں سے ایک ان کی طرف شرم و حیا سے چلتی ہوئی آئی،^(۴) کہنے لگی کہ میرے باپ آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے (جانوروں) کو جو پانی پلایا ہے اس کی اجرت دیں،^(۵) جب

مَنْعَى لَهُمَّا تَوَلَّىٰ إِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ ②

فِي آيَاتِهِ إِحْدَاهُمَا تَتَّبِعُنِي عَلَىٰ رِجْلَيْهَا قَالَتْ إِنَّ ابْنِي يَذْهَبُ لِيُغَيِّرَ لَكَ أَحْرَامًا سَعِدْتُ لَكَ إِنَّا كَلِمَاتُ جَاءَهُ وَوَقَّضَ عَلَيْهِ الْقَصَصَ

بات ہے تم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلاتیں؟

(۱) تاکہ مردوں سے ہمارا اختلاط نہ ہو۔ رُعَاءٌ رَاعٍ (چرواہا) کی جمع ہے۔

(۲) اس لیے وہ خود گھٹا پر پانی پلانے کے لیے نہیں آسکتے۔

(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام اتنا لمبا سفر کر کے مصر سے مدین پہنچے تھے، کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا، جب کہ سفر کی تکان اور بھوک سے نڈھال تھے۔ چنانچہ جانوروں کو پانی پلا کر ایک درخت کے سائے تلے آکر مصروف دعا ہو گئے۔ خیر کنی چیزوں پر بولا جاتا ہے، کھانے پر، امور خیر اور عبادات پر، قوت و طاقت پر اور مال پر (ایسر التفاسیر) یہاں اس کا اطلاق کھانے پر ہوا ہے۔ یعنی میں اس وقت کھانے کا ضرورت مند ہوں۔

(۴) اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور دونوں میں سے ایک لڑکی انہیں بلائے آگئی۔ لڑکی کی شرم و حیا کا قرآن نے بطور خاص ذکر کیا ہے کہ یہ عورت کا اصل زیور ہے۔ اور مردوں کی طرح حیا و حجاب سے بے نیازی اور بے باکی عورت کے لیے شرعاً ناپسندیدہ ہے۔

(۵) بچیوں کو باپ کون تھا؟ قرآن کریم نے صراحت سے کسی کا نام نہیں لیا ہے۔ مفسرین کی اکثریت نے اس سے مراد حضرت شعیب علیہ السلام کو لیا ہے جو اہل مدین کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ امام شوکانی نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ لیکن امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام کا زمانہ نبوت، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے کا ہے۔ اس لیے یہاں حضرت شعیب علیہ السلام کا برادر زادہ یا کوئی اور قوم شعیب علیہ السلام کا شخص مراد ہے، واللہ اعلم۔ بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بچیوں کے ساتھ جو ہمدردی اور احسان کیا، وہ بچیوں نے جا کر بوڑھے باپ کو بتلایا، جس سے باپ کے دل میں بھی داعیہ پیدا ہوا کہ احسان کا بدلہ احسان کے ساتھ دیا جائے یا اس کی محنت کی اجرت ہی ادا کر دی جائے۔

قَالَ لَا تَحْفَظْ حَيَاتِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ⑤

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ان کے پاس پہنچے اور ان سے اپنا سارا حال بیان کیا تو وہ کہنے لگے اب نہ ڈر تو نے ظالم قوم سے نجات پائی۔^(۱) (۲۵)

ان دونوں میں سے ایک نے کہا کہ اباجی! آپ انہیں مزدوری پر رکھ لیجئے، کیونکہ جنہیں آپ اجرت پر رکھیں ان میں سے سب سے بہتر وہ ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔^(۲) (۲۶)

اس بزرگ نے کہا میں اپنی ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کو آپ کے نکاح میں دینا چاہتا ہوں^(۳) اس (مہر پر) کہ آپ آٹھ سال تک میرا کام کاج کریں۔^(۴) ہاں اگر آپ دس سال پورے کریں تو یہ آپ کی طرف سے بطور احسان کے ہے میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ کو

قَالَتْ اِحْذِمْ يَا بَتَّ اسْتَأْجِرُهُ اِنَّ خَيْرَ مِّنْ اسْتَأْجَرْتِ الْقَوِيَّ الرَّامِيْنَ ⑥

قَالَ اِنِّي اُرِيدُ اَنْ اُنْكَحَكَ اِحْذِيْ اِبْنَتِيْ هَتَيْنِ عَلَيَّ اَنْ تَاْتُوْنِيْ ثَمَانِيْ جَبِيْحٍ وَاَنْ اَتَمَّتْ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ وَاَاُرِيدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ سَمْعُدِيْ اِنْ شَاءَ اللهُ

(۱) یعنی اپنے مصر کی سرگزشت اور فرعون کے ظلم و ستم کی تفصیل سنائی جس پر انہوں نے کہا کہ یہ علاقہ فرعون کی حدود حکمرانی سے باہر ہے اس لیے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ نے ظالموں سے نجات عطا فرمادی ہے۔

(۲) بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ باپ نے بچیوں سے پوچھا تمہیں کس طرح معلوم ہے کہ یہ طاقت ور بھی ہے اور امانت دار بھی۔ جس پر بچیوں نے بتلایا کہ جس کنوئیں سے پانی پلایا، اس پر اتنا بھاری پتھر رکھا ہوتا ہے کہ اسے اٹھانے کے لیے دس آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہم نے دیکھا کہ اس شخص نے وہ پتھر اکیلے ہی اٹھالیا اور پھر بعد میں رکھ دیا۔ اسی طرح جب میں اس کو بلا کر اپنے ساتھ لا رہی تھی، تو چونکہ راستے کا علم مجھے ہی تھا، میں آگے آگے چل رہی تھی اور یہ پیچھے پیچھے۔ لیکن ہوا سے میری چادر اڑ جاتی تھی تو اس شخص نے کہا کہ تو پیچھے چل، میں آگے آگے چلتا ہوں تاکہ میری نگاہ تیرے جسم کے کسی حصے پر نہ پڑے۔ راستے کی نشاندہی کے لیے پیچھے سے پتھر، ٹنگری مار دیا کر، وَاللّٰهُ اعْلَمُ بِحَالَ صِحَّتِيْ۔ (ابن کثیر)

(۳) ہمارے ملک میں کسی لڑکی والے کی طرف سے نکاح کی خواہش کا اظہار معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن شریعت الہیہ میں یہ مذموم نہیں ہے۔ صفات محمودہ کا حامل لڑکا اگر مل جائے تو اس سے یا اس کے گھر والوں سے اپنی لڑکی کے لیے رشتے کی بابت بات چیت کرنا برا نہیں ہے، بلکہ محمود اور پسندیدہ ہے۔ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بھی یہی طریقہ تھا۔

(۴) اس سے علمائے اجارے کے جواز پر استدلال کیا ہے یعنی کرائے اور اجرت پر مرد کی خدمات حاصل کرنا جائز ہے۔

مِنَ الطَّيِّبِينَ ﴿۲۰﴾

کسی مشقت میں ڈالوں،^(۱) اللہ کو منظور ہے تو آگے چل کر آپ مجھے بھلا آدمی پائیں گے۔^(۲) (۲۷)

موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا، خیر تو یہ بات میرے اور آپ کے درمیان پختہ ہو گئی، میں ان دونوں مدتوں میں سے جسے پورا کروں مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو،^(۳) ہم یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر اللہ (گواہ اور) کارساز ہے۔^(۴) (۲۸)

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدت^(۵) پوری کر لی اور اپنے گھر والوں کو لے کر چلے^(۶) تو کوہ طور کی طرف آگ دیکھی۔ اپنی بیوی سے کہنے لگے ٹھہرو! میں نے آگ دیکھی ہے بہت ممکن ہے کہ میں وہاں سے کوئی خبر لاؤں یا آگ کا کوئی انگارہ لاؤں تاکہ تم سینک لو۔ (۲۹)

پس جب وہاں پہنچے تو اس باہرکت زمین کے میدان کے دائیں کنارے کے درخت میں سے آواز دیئے گئے^(۷)

قَالَ ذَلِكَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ أَيَّمَا الْأَجَلِينَ فَصَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا نَعْمُونَ ذُكِّيْلٌ ﴿۲۱﴾

فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَىٰ الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ آنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ نَارًا قَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَعَلِّي آتِيكُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ جَذْوَةٍ مِنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ﴿۲۰﴾

فَلَمَّا آتَتْهَا نُودِيَ مِنْ شَاطِئِ الْأُودِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ

(۱) یعنی مزید دو سال کی خدمت میں مشقت اور ایذا محسوس کریں تو آٹھ سال کے بعد جانے کی اجازت ہوگی۔

(۲) نہ جھگڑا کروں گا نہ اذیت پہنچاؤں گا، نہ سختی سے کام لوں گا۔

(۳) یعنی آٹھ سال کے بعد یا دس سال کے بعد جانا چاہوں تو مجھ سے مزید رہنے کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

(۴) یہ بعض کے نزدیک شعیب علیہ السلام یا برادر زاوۃ شعیب علیہ السلام کا قول ہے اور بعض کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا۔ ممکن ہے دونوں ہی کی طرف سے ہو۔ کیونکہ جمع کا صیغہ ہے گویا دونوں نے اس معاملے پر اللہ کو گواہ ٹھہرایا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کی لڑکی اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان رشتہ ازدواج قائم ہو گیا۔ باقی تفصیلات اللہ نے ذکر نہیں کی ہیں۔ ویسے اسلام میں طرفین کی رضامندی کے ساتھ صحت نکاح کے لیے دو عادل گواہ بھی ضروری ہیں۔

(۵) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس مدت سے دس سالہ مدت مراد لی ہے، کیونکہ یہی اکمل اور اطمینان (یعنی خسر موسیٰ علیہ السلام کے لیے خوشگوار اور مرغوب) تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کریمانہ اخلاق نے اپنے بوڑھے خسر کی دلی خواہش کے خلاف کرنا پسند نہیں کیا (فتح الساری کتاب الشہادات، باب من أمر بالإنجاز الوعد)

(۶) اس سے معلوم ہوا کہ خاوند اپنی بیوی کو جہاں چاہے لے جاسکتا ہے۔

(۷) یعنی آواز وادی کے کنارے سے آ رہی تھی، جو مغربی جانب سے پہاڑ کے دائیں طرف تھی، یہاں درخت سے

اے موسیٰ! یقیناً میں ہی اللہ ہوں سارے جمانوں کا پروردگار۔^(۱) (۳۰)

اور یہ (بھی آواز آئی) کہ اپنی لاشھی ڈال دے۔ پھر جب اسے دیکھا کہ وہ سانپ کی طرح پھن پھننا رہی ہے تو پیٹھ پھیر کر واپس ہو گئے اور مڑ کر رخ بھی نہ کیا، ہم نے کہا اے موسیٰ! آگے آؤر مت، یقیناً تو ہر طرح امن والا ہے۔^(۲) (۳۱)

اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈال وہ بغیر کسی قسم کے روگ کے چمکتا ہوا نکلے گا بالکل سفید^(۳) اور خوف سے (بچنے کے لیے) اپنے بازو اپنی طرف ملا لے،^(۴) پس یہ دونوں معجزے تیرے لیے تیرے رب کی طرف سے ہیں

الْمُبْرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ أَنْ يَتُوسَلَّىٰ إِلَىٰ آتَا اللَّهُ رَبَّ الْعَالَمِينَ ﴿۳۰﴾

وَأَنْ أَلْقَىٰ عَصَاكَ فَلَمَّا رَآهَا تُهَمُّزُ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلِي مُدِيرٌ وَأَوَّلَهُ يُتُوسَلَّىٰ أَقْبَلُ وَلَا تَخَفْ
إِنَّكَ مِنَ الرَّاغِبِينَ ﴿۳۱﴾

أَسْلَمَكَ يَدُكَ فِي جَبْنِكَ تَخْرُجُ بَيْضًا مِنْ غَيْرِ سَوْءٍ
وَأَوَّلَهُ أَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذَلِيزِلْهُنَّ مِنَ الرَّيْبِ

آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے جو دراصل رب کی تجلی کا نور تھا۔

(۱) یعنی اے موسیٰ! تجھ سے جو اس وقت مخاطب اور ہم کلام ہے، وہ میں اللہ ہوں رب العالمین۔

(۲) یہ موسیٰ علیہ السلام کا وہ معجزہ ہے جو کہ طور پر، نبوت سے سرفراز کیے جانے کے بعد ان کو ملا۔ چونکہ معجزہ خرق عادت معاطے کو کہا جاتا ہے یعنی جو عام عادات اور اسباب ظاہری کے خلاف ہو۔ ایسا معاملہ چونکہ اللہ کے حکم اور مشیت سے ظاہر ہوتا ہے کسی بھی انسان کے اختیار سے نہیں۔ چاہے وہ جلیل القدر تینہ۔ راور نبی مقرب ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے جب موسیٰ علیہ السلام کے اپنے ہاتھ کی لاشھی، زمین پر پھینکنے سے حرکت کرتی اور دوڑتی پھنکارتی سانپ بن گئی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ڈر گئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے بتلایا اور تسلی دی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خوف دور ہوا اور یہ واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی صداقت کے لیے بطور دلیل یہ معجزہ انہیں عطا فرمایا ہے۔

(۳) یہ یَدٌ بَيْضَاءٌ دو سرا معجزہ تھا جو انہیں عطا کیا گیا۔ کَمَا مَرَّ۔

(۴) لاشھی کے اٹھوہا بن جانے کی صورت میں جو خوف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لاحق ہوتا تھا، اس کا حل بتلا دیا گیا کہ اپنا بازو اپنی طرف ملا لیا کر یعنی بغل میں دبایا کر، جس سے خوف جاتا رہا کرے گا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ عام ہے کہ جب بھی کسی سے کوئی خوف محسوس ہو تو اس طرح کرنے سے خوف دور ہو جائے گا۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اقتدا میں جو شخص بھی گھبراہٹ کے موقع پر اپنے دل پر ہاتھ رکھے گا، تو اس کے دل سے خوف جاتا رہے گا یا کم از کم ہلکا ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ۔

إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَائِكَةٍ إِذْ أَنبَأَهُمُ اللَّهُ بِمَا كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ﴿۳۱﴾

قَالَ رَبِّ إِنِّي مَنَعْتُهُمُ نَفْسًا فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ﴿۳۲﴾

وَإِنِّي هَارُونَ هُوَ أَضْمُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُبَكِّدُونِ ﴿۳۳﴾

قَالَ سَتَشِدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَجَعَلْتُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا بِأَلِيَّتِنَا أَن نَّهْمَا وَمِن

فرعون اور اس کی جماعت کی طرف، یقیناً وہ سب کے سب بے حکم اور نافرمان لوگ ہیں۔ (۳۲)

موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا پروردگار! میں نے ان کا ایک آدمی قتل کر دیا تھا۔ اب مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے بھی قتل کر ڈالیں۔ (۳۳)

اور میرا بھائی ہارون (علیہ السلام) مجھ سے بہت زیادہ فصیح زبان والا ہے تو اسے بھی میرا مددگار بنا کر میرے ساتھ بھیج (۳۳) کہ وہ مجھے سچا مانے، مجھے تو خوف ہے کہ وہ سب مجھے جھٹلا دیں گے۔ (۳۳)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تیرے بھائی کے ساتھ تیرا بازو مضبوط کر دیں گے (۳۳) اور تم دونوں کو غلبہ دیں گے فرعون تم تک پہنچ ہی نہ سکیں گے، (۵) بسبب ہماری نشانیوں کے، تم دونوں اور تمہاری تابعداری کرنے

(۱) یعنی فرعون اور اس کی جماعت کے سامنے یہ دونوں معجزے اپنی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کرو۔ یہ لوگ اللہ کی اطاعت سے نکل چکے ہیں اور اللہ کے دین کے مخالف ہیں۔

(۲) یہ وہ خطرہ تھا جو واقعی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جان کو لاحق تھا، کیونکہ ان کے ہاتھوں ایک قبلی کا قتل ہو چکا تھا۔

(۳) اسرائیلی روایات کی رو سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت تھی، جس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے آگ کا انگارہ اور کھجور یا موتی رکھے گئے تو آپ نے انگارہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا تھا جس سے آپ کی زبان جل گئی۔ یہ وجہ صحیح ہے یا نہیں؟ تاہم قرآن کریم کی اس نص سے یہ تو ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں حضرت ہارون علیہ السلام فصیح اللسان تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں گرہ تھی۔ جس کے کھولنے کی دعا انہوں نے نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد کی۔ رذءاً کے معنی ہیں معین، مددگار، تقویت پہنچانے والا۔ یعنی ہارون علیہ السلام اپنی فصاحت لسانی سے مجھے مدد اور تقویت پہنچائیں گے۔

(۴) یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول کر لی گئی اور ان کی سفارش پر حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت سے سرفراز فرما کر ان کا ساتھی اور مددگار بنا دیا گیا۔

(۵) یعنی ہم تمہاری حفاظت فرمائیں گے، فرعون اور اس کے حوالی موالی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔

اَسْبَعَكُمَا الْغُلَامُونَ ﴿۳۵﴾

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُوسَى بِآيَاتِنَا يَبْتَغِي قَالُوا مَا هَذَا إِلَّا رِجْسٌ
مُفْتَرَىٰ وَمَا سَعَيْنَا بِهِدًا إِلَىٰ آيَاتِنَا إِلَّا الْأُولَٰئِينَ ﴿۳۶﴾

وَقَالَ مُوسَىٰ رَبِّيَ اٰمَلَمْ يَمَنَّ جَاءَهُ بِالْهُدَىٰ مِنْ عِنْدِ
رَبِّهِ لَعَلَّكَ تَالِي الْآيَاتِ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳۷﴾

والے ہی غالب رہیں گے۔^(۱) (۳۵)

پس جب ان کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) ہمارے دیے ہوئے کھلے معجزے لے کر پہنچے تو وہ کہنے لگے یہ تو صرف گھڑا گھڑایا جادو ہے ہم نے اپنے اگلے باپ دادوں کے زمانہ میں کبھی یہ نہیں سنا^(۲)۔ (۳۶)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کہنے لگے میرا رب تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے جو اس کے پاس کی ہدایت لے کر آتا ہے^(۳) اور جس کے لیے آخرت کا (اچھا) انجام ہوتا ہے۔^(۴) یقیناً بے انصافوں کا بھلا نہ ہو گا۔^(۵) (۳۷)

(۱) یہ وہی مضمون ہے جو قرآن کریم میں متعدد جگہ بیان کیا گیا مثلاً، المائدہ-۶۷، الاعزاب-۳۹، المجادلہ-۲۱ المؤمن-۵۱، ۵۲۔

(۲) یعنی یہ دعوت کہ کائنات میں صرف ایک ہی اللہ اس کے لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ ہمارے لیے بالکل نئی ہے۔ یہ ہم نے سنی ہے نہ ہمارے باپ دادا اس توحید سے واقف تھے۔ مشرکین مکہ نے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت کہا تھا ﴿ اَسْجَلُ الْاٰلِهَةِ اَلْاَوْ اَلْحَدَاثِ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ مُّجْتَبَاٌ ﴾ (ص-۵) ”اس نے تو تمام معبودوں کو (ختم کر کے) ایک ہی معبود بنا دیا ہے؟ یہ تو بڑی ہی عجیب بات ہے۔“

(۳) یعنی مجھ سے اور تم سے زیادہ ہدایت کا جاننے والا اللہ ہے، اس لیے جو بات اللہ کی طرف سے آئے گی، وہ صحیح ہوگی یا تمہارے اور تمہارے باپ دادوں کی؟

(۴) اچھے انجام سے مراد آخرت میں اللہ کی رضامندی اور اس کی رحمت و مغفرت کا مستحق قرار پا جانا ہے اور یہ استحقاق صرف اہل توحید کے حصے میں آئے گا۔

(۵) ظالم سے مراد مشرک اور کافر ہیں۔ کیونکہ ظلم کے معنی ہیں وَضَعُ الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَحَلِّهِ کسی چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا کر کسی اور جگہ رکھ دینا۔ مشرک بھی چونکہ اللہ الوہیت کے مقام پر ایسے لوگوں کو بٹھادیتے ہیں جو اس کے مستحق نہیں ہوتے۔ اسی طرح کافر بھی رب کے اصل مقام سے نا آشنا ہی رہتے ہیں۔ اس لیے یہ لوگ سب سے بڑے ظالم ہیں اور یہ کامیابی سے یعنی آخرت میں اللہ کی رحمت و مغفرت سے محروم رہیں گے۔ اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ اصل کامیابی آخرت ہی کی کامیابی ہے۔ دنیا میں خوش حالی اور مال و اسباب کی فراوانی حقیقی کامیابی نہیں ہے، اس لیے کہ یہ عارضی کامیابی اہل کفر و شرک کو بھی دنیا میں مل جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان سے کامیابی کی نفی فرما رہا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حقیقی کامیابی آخرت ہی کی کامیابی ہے نہ کہ دنیا کی چند روزہ عارضی خوش حالی و فراوانی۔

فرعون کہنے لگا اے درباریو! میں تو اپنے سوا کسی کو تمہارا معبود نہیں جانتا۔ سن اے ہامان! تو میرے لیے مٹی کو آگ سے پکوا^(۱) پھر میرے لیے ایک محل تعمیر کر تو میں موسیٰ کے معبود کو جھانک لوں^(۲) اسے میں تو جھوٹوں میں سے ہی گمان کر رہا ہوں۔^(۳) (۳۸)

اس نے اور اس کے لشکروں نے ناحق طریقے پر ملک میں تکبر کیا^(۴) اور سمجھ لیا کہ وہ ہماری جانب لوٹائے ہی نہ جائیں گے۔ (۳۹)

بالآخر ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑ لیا اور دریا برد کر دیا،^(۵) اب دیکھ لے کہ ان گنہگاروں کا انجام کیسا کچھ ہوا؟۔ (۴۰)

اور ہم نے انہیں ایسے امام بنا دیئے کہ لوگوں کو جہنم کی طرف بلائیں^(۶) اور روز قیامت مطلق مدد نہ کیے جائیں۔ (۴۱)

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُمَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنَ إِلَهِ غَيْرِي
فَأَوْقَدْ بِي يَهَامُنُ عَلَى الطِّينِ فَأَجْعَلْ لِي صَرْحًا
تَعَلَىٰ أَكْطَلِ إِلَىٰ إِلَهِ مُوسَىٰ وَإِنِّي لَأَكْفُرُهُ
مِنَ الْكَذِبِ ۖ

وَأَسْتَكْبِرُ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا
أَنَّهُم إِلَهَانَا لَا يُرْجَعُونَ

فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ فَاظْفَرَكَفَت
كَانَ عَابِقَةَ الظَّالِمِينَ

وَجَعَلْنَاهُمْ آيَةً يَذْعَبُونَ إِلَىٰ النَّارِ وَرِثَومَ الْقِيَمَةِ
لَا يُبْصَرُونَ

(۱) یعنی مٹی کو آگ میں تپا کر اینٹیں تیار کر۔ ہامان، فرعون کا وزیر، مشیر اور اس کے معاملات کا انتظام کرنے والا تھا۔

(۲) یعنی ایک اونچا اور مضبوط محل تیار کر، جس پر چڑھ کر میں آسمان پر یہ دیکھ سکوں کہ وہاں میرے سوا کوئی اور رب ہے؟

(۳) یعنی موسیٰ (علیہ السلام) جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ آسمانوں پر رب ہے جو ساری کائنات کا پالنا ہے، میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں۔

(۴) زمین سے مراد ارض مصر ہے جہاں فرعون حکمران تھا اور استکبار کا مطلب، بغیر استحقاق کے اپنے کو بڑا سمجھنا ہے۔ یعنی ان کے پاس کوئی دلیل ایسی نہیں تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے دلائل و معجزات کا رد کر سکتی لیکن استکبار بلکہ عدوان کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے ہٹ دھرمی اور انکار کا راستہ اختیار کیا۔

(۵) یعنی جب ان کا کفر و طغیان حد سے بڑھ گیا اور کسی طرح بھی وہ ایمان لانے پر آمادہ نہیں ہوئے تو بالآخر ایک صبح ہم نے انہیں دریا میں غرق کر دیا (جس کی تفصیل سورہ شعراء میں گزر چکی ہے)

(۶) یعنی جو بھی ان کے بعد ایسے لوگ ہوں گے جو اللہ کی توحید یا اس کے وجود کے منکر ہوں گے، تو ان کا امام و پیشوا یہی فرعون سمجھے جائیں گے جو جہنم کے داعی ہیں۔

اور ہم نے اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے اپنی لعنت لگا دی اور قیامت کے دن بھی وہ بد حال لوگوں میں سے ہوں گے۔^(۱) (۳۲)

اور ان اگلے زمانہ والوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو ایسی کتاب عنایت فرمائی^(۲) جو لوگوں کے لیے دلیل اور ہدایت و رحمت ہو کر آئی تھی تاکہ وہ نصیحت حاصل کر لیں۔^(۳) (۳۳)

اور طور کے مغربی جانب جب کہ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم احکام کی وحی پہنچائی تھی نہ تو تو موجود تھا اور نہ تو دیکھنے والوں میں سے تھا۔^(۴) (۳۴)

لیکن ہم نے بہت سی نسلیں پیدا کیں^(۵) جن پر لمبی مدتیں

وَأَنْبَعَثْنَهُمْ فِي هَذِهِ الدُّنْيَا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝۲۰
وَمِنَ الْمَقْبُوحِينَ ۝۲۱

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَى بَصَائِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝۲۲

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْعَرَبِ إِذْ قَضَيْنَا إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ ۝۲۳

وَلَكِنَّا أَنْشَأْنَا قُرُونًا فَتَطَاوَلَتْ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ تَأْوِيلًا

(۱) یعنی دنیا میں بھی ذلت و رسوائی ان کا مقدر بنی اور آخرت میں بھی وہ بد حال ہوں گے۔ یعنی چہرے سیاہ اور آنکھیں نیلگوں۔ جیسا کہ جنسیوں کے تذکرے میں آتا ہے۔

(۲) یعنی فرعون اور اس کی قوم یا قوم نوح و عاد و ثمود وغیرہ کی ہلاکت کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (تورات) دی۔

(۳) جس سے وہ حق کو پہچان لیں اور اسے اختیار کریں اور اللہ کی رحمت کے مستحق قرار پائیں۔

(۴) یعنی اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کریں اور اللہ پر ایمان لائیں اور اس کے پیغمبروں کی اطاعت کریں جو انہیں خیر و رشد اور فلاح حقیقی کی طرف بلاتے ہیں۔

(۵) یعنی کوہ طور پر جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور اسے وحی و رسالت سے نوازا، اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) تو نہ وہاں موجود تھا اور نہ یہ منظر دیکھنے والوں میں سے تھا۔ بلکہ یہ غیب کی وہ باتیں ہیں جو ہم وحی کے ذریعے سے تجھے بتا رہے ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ تو اللہ کا سچا پیغمبر ہے۔ کیونکہ نہ تو نے یہ باتیں کسی سے سیکھی ہیں نہ خود ہی ان کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہ مضمون اور بھی متعدد جگہ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ آل عمران - ۳۴، سورۃ ہود - ۱۰۰، سورۃ یوسف - ۱۰۲، سورۃ طہ - ۹۹، وَغَيْرَهَا مِنَ الْآيَاتِ .

(۶) قُرُونٌ، قُرُونٌ کی جمع ہے، زمانہ۔ لیکن یہاں امتوں کے معنی میں ہے یعنی اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان جو زمانہ ہے اس میں ہم نے کئی امتیں پیدا کیں۔

فِي أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُو عَلَيْهِمُ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا

مُرْسِلِينَ ﴿۳۵﴾

وَمَا كُنْتُمْ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا وَلَكِنْ رَحْمَةً مِّنَ

رَبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَنتَ مِنْهُمْ نَذِيرٌ مِّن قَبْلِكَ

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۳۶﴾

وَلَوْلَا أَن تُصِيبَهُمُ مُّصِيبَةٌ يُمَاقِدَتَّمَتِ أَيْدِيهِمْ

فَيَقُولُوا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنُذِّقَهُ الْبَيِّنَاتِ

گزر گئیں،^(۱) اور نہ تو مدین کے رہنے والوں میں سے تھا^(۲) کہ ان کے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت کرتا بلکہ ہم ہی رسولوں کے بھیجنے والے رہے۔^(۳) (۳۵)

اور نہ تو طور کی طرف تھا جب کہ ہم نے آواز دی بلکہ یہ تیرے پروردگار کی طرف سے ایک رحمت ہے،^(۴) اس لیے کہ تو ان لوگوں کو ہوشیار کر دے جن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا،^(۵) کیا عجب کہ وہ نصیحت حاصل کر لیں۔ (۳۶)

اگر یہ بات نہ ہوتی کہ انہیں ان کے اپنے ہاتھوں آگے بھیجے ہوئے اعمال کی وجہ سے کوئی مصیبت پہنچتی تو یہ کہہ اٹھتے کہ اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی

(۱) یعنی مرور ایام سے شرائع و احکام بھی متغیر ہو گئے اور لوگ بھی دین کو بھول گئے، جس کی وجہ سے انہوں نے اللہ کے حکموں کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے عہد کو فراموش کر دیا اور یوں اس کی ضرورت پیدا ہو گئی کہ ایک نئے نبی کو مبعوث کیا جائے یا یہ مطلب ہے کہ طول زمان کی وجہ سے عرب کے لوگ نبوت و رسالت کو بالکل ہی بھلا بیٹھے، اس لیے آپ کی نبوت پر انہیں تعجب ہو رہا ہے اور اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

(۲) جس سے آپ خود اس واقعے کی تفصیلات سے آگاہ ہو جاتے۔

(۳) اور اسی اصول سے ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور پچھلے حالات و واقعات سے آپ کو باخبر کر رہے ہیں۔

(۴) یعنی اگر آپ رسول برحق نہ ہوتے تو موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعے کا علم بھی آپ کو نہ ہوتا۔

(۵) یعنی آپ کا یہ علم، مشاہدہ و روایت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ آپ کے پروردگار کی رحمت ہے کہ اس نے آپ کو نبی بنایا اور وحی سے نوازا۔

(۶) اس سے مراد اہل مکہ اور عرب ہیں جن کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی نبی نہیں آیا، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد نبوت کا سلسلہ خاندان ابراہیمی ہی میں رہا اور ان کی بعثت بنی اسرائیل کی طرف ہی ہوتی رہی۔ بنی اسماعیل یعنی عربوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے نبی تھے اور سلسلہ نبوت کے خاتم تھے۔ ان کی طرف نبی بھیجنے کی ضرورت اس لیے نہیں سمجھی گئی ہوگی کہ دوسرے انبیاء کی دعوت اور ان کا پیغام ان کو پہنچتا رہا ہو گا۔ کیونکہ اس کے بغیر ان کے لیے کفر و شرک پر جتنے رہنے کا عذر موجود رہے گا اور یہ عذر اللہ نے کسی کے لیے باقی نہیں چھوڑا ہے۔

وَتَكُونُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۷﴾

رسول کیوں نہ بھیجا؟ کہ ہم تیری آیتوں کی تابعداری کرتے اور ایمان والوں میں سے ہو جاتے۔ (۳۷)

پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آپہنچا تو کہتے ہیں کہ یہ وہ کیوں نہیں دیا گیا جیسے دیئے گئے تھے موسیٰ (علیہ السلام) (۳) اچھا تو کیا موسیٰ (علیہ السلام) کو جو کچھ دیا گیا تھا اس کے ساتھ لوگوں نے کفر نہیں کیا تھا، (۳)

صاف کہا تھا کہ یہ دونوں جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور ہم تو ان سب کے منکر ہیں۔ (۳۸)

کہہ دے کہ اگر سچے ہو تو تم بھی اللہ کے پاس سے کوئی ایسی کتاب لے آؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت والی ہو میں اسی کی پیروی کروں گا۔ (۳۹)

فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا لَوْلَا آؤُتِي
مِثْلَ مَا آؤُتِي مُوسَىٰ أَوْ لَمْ يَكْفُرُوا بِمَا آؤُتِي مُوسَىٰ
مِنْ قَبْلُ قَالُوا سِحْرَانِ تَكْذَافًا وَسَوَّالُوا
إِنَّا لَبِئْسَ لَكُم مِّنْ كَافِرُونَ ﴿۳۸﴾

قُلْ فَأَنظُرُوا يَكْفُرُونَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ مِنْهُمْ إِنَّا نَبِئُهُمْ
إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۹﴾

(۱) یعنی ان کے اسی عذر کو ختم کرنے کے لیے ہم نے آپ کو ان کی طرف نبی بنا کر بھیجا ہے۔ کیونکہ طول زمانی کی وجہ سے گزشتہ انبیاء کی تعلیمات مسخ اور ان کی دعوت فراموش ہو چکی ہے اور ایسے ہی حالات کسی نئے نبی کی ضرورت کے متقاضی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات (قرآن و حدیث) کو مسخ ہونے اور تغیر و تحریف سے محفوظ رکھا ہے اور ایسا کنوینی انتظام فرمادیا ہے جس سے آپ کی دعوت دنیا کے کونے کونے تک پہنچ گئی ہے اور مسلسل پہنچ رہی ہے تاکہ کسی نئے نبی کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ اور جو شخص اس ”ضرورت“ کا دعویٰ کرے کہ نبوت کا ڈھونگ رچاتا ہے، وہ جھوٹا اور دجال ہے۔

(۲) یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سے معجزات، جیسے لاشعی کا سانپ بن جانا اور ہاتھ کا چمکنا وغیرہ۔

(۳) یعنی مطلوبہ معجزات، اگر دکھا بھی دیئے جائیں تو کیا فائدہ؟ جنسین ایمان نہیں لاتا ہے، وہ ہر طرح کی نشانیاں دیکھنے کے باوجود بھی ایمان سے محروم ہی رہیں گے۔ کیا موسیٰ علیہ السلام کے مذکورہ معجزات دیکھ کر فرعونی مسلمان ہو گئے تھے، انہوں نے کفر نہیں کیا؟ یا یٰ کُفْرُوا کی ضمیر قریش مکہ کی طرف ہے یعنی کیا انہوں نے نبوت محمدیہ سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کفر نہیں کیا؟

(۴) پہلے مضموم کے اعتبار سے دونوں سے مراد حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام ہوں گے اور سِحْرَانِ بمعنی سِحْرَانِ ہو گا۔ اور دوسرے مضموم میں اس سے قرآن اور تورات مراد ہوں گے یعنی دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور ہم سب کے یعنی موسیٰ علیہ السلام اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منکر ہیں۔ (فتح القدیر)

(۵) یعنی اگر تم اس دعوے میں سچے ہو کہ قرآن مجید اور تورات دونوں جادو ہیں، تو تم کوئی اور کتاب الٰہی پیش کر دو، جو

پھر اگر یہ تیری نہ مانیں ^(۱) تو تو یقین کر لے کہ یہ صرف اپنی خواہش کی پیروی کر رہے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر بھکا ہوا کون ہے؟ جو اپنی خواہش کے پیچھے بڑا ہوا ہو ^(۲) بغیر اللہ کی رہنمائی کے، بیشک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ^(۳) (۵۰)

اور ہم برابر پے در پے لوگوں کے لیے اپنا کلام بھیجتے رہے ^(۴) تاکہ وہ نصیحت حاصل کر لیں۔ ^(۵) (۵۱)

جس کو ہم نے اس سے پہلے کتاب عنایت فرمائی وہ تو اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ ^(۶) (۵۲)

اور جب اس کی آیتیں ان کے پاس پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ اس کے ہمارے رب کی طرف سے حق ہونے پر ہمارا ایمان ہے ہم تو اس سے پہلے ہی

فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا يُؤْمِنُونَ أَهْوَاءَهُمْ
وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ إِنَّ
اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۵۰﴾

وَلَقَدْ وَصَلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۵۱﴾

الَّذِينَ آمَنُوا كَتَبْنَا لَهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهِ هُمْ بِهِ يُؤْمِنُونَ ﴿۵۲﴾

وَإِذْ آتَيْنَا آلِ إِبْرَاهِيمَ قَالُوا أَمْكُنَّا لَهُ أَتَاهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّنَا إِنَّكَ كُنَّا
مِنْ قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ ﴿۵۰﴾

ان سے زیادہ ہدایت والی ہو، میں اس کی پیروی کر لوں گا۔ کیونکہ میں تو ہدایت کا طالب اور پیرو ہوں۔

(۱) یعنی قرآن و تورات سے زیادہ ہدایت والی کتاب پیش نہ کر سکیں اور یقیناً نہیں کر سکیں گے۔

(۲) یعنی اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہدایت کو چھوڑ کر خواہش نفس کی پیروی کرنا یہ سب سے بڑی گمراہی ہے اور اس لحاظ سے یہ قریش مکہ سب سے بڑے گمراہ ہیں جو اسی حرکت کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

(۳) اس میں اللہ کی اسی سنت (طریقے) کا بیان ہے جو ظالموں کے لیے اس کے ہاں مقرر ہے کہ وہ ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔ اس لیے کہ انبیاء کی کھذیب، آیات الہی سے اعراض اور مسلسل کفر و عناد ایسا جرم ہے کہ جس سے قبول حق کی استعداد اور اثر پذیری کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد انسان ظلم و عیسیان اور کفر و شرک کی تاریکیوں میں ہی بھٹکتا پھرتا ہے، اسے ایمان کی روشنی نصیب نہیں ہوتی۔

(۴) یعنی ایک رسول کے بعد دوسرا رسول، ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب ہم بھیجتے رہے اور اس طرح مسلسل، لگاتار ہم اپنی بات لوگوں تک پہنچاتے رہے۔

(۵) مقصد اس سے یہ تھا کہ لوگ پچھلے لوگوں کے انجام سے ڈر کر اور ہماری باتوں سے نصیحت حاصل کر کے ایمان لے آئیں۔

(۶) اس سے مراد وہ یہودی ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے، جیسے عبد اللہ بن سلام، بلالہ وغیرہ۔ یا وہ عیسائی ہیں جو حبشہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تھے اور آپ کی زبان مبارک سے قرآن کریم سن کر مسلمان ہو گئے تھے۔ (ابن کثیر)

مسلمان ہیں۔^(۱) (۵۳)

یہ اپنے کیے ہوئے صبر کے بدلے دوہرا دوہرا اجر دیئے جائیں گے۔^(۲) یہ نیکی سے بدی کو ٹال دیتے ہیں^(۳) اور ہم نے جو انہیں دے رکھا ہے اس میں سے دیتے رہتے ہیں۔ (۵۴)

اور جب یہودہ بات^(۴) کان میں پڑتی ہے تو اس سے کنارہ کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے عمل ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم پر سلام ہو،^(۵) ہم جاہلوں سے (الجھنا) نہیں چاہتے۔ (۵۵)
آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جسے

أُولَئِكَ يُؤْتُونَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَإِذْ رَدُّوْنَ
بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿۵۳﴾

وَأِذْ أَسْمِعُوا اللُّغُوَاعْرُضُواعْنَهُ وَقَالُوا إِنَّا عَمِلْنَا
وَأَلَّكُمْ أَعْمَالَكُمْ سَلَامًا عَلَيْكُمْ لَا تَبْعِي الْجَاهِلِينَ ﴿۵۴﴾

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي

(۱) یہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جسے قرآن کریم میں کئی جگہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر دور میں اللہ کے پیغمبروں نے جس دین کی دعوت دی، وہ اسلام ہی تھا اور ان نبیوں کی دعوت پر ایمان لانے والے مسلمان ہی کہلاتے تھے۔ یہود یا نصاریٰ وغیرہ کی اصطلاحیں لوگوں کی اپنی خود ساختہ ہیں جو بعد میں ایجاد ہوئیں۔ اسی اعتبار سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے اہل کتاب (یہود یا عیسائیوں) نے کہا کہ ہم تو پہلے سے ہی مسلمان چلے آ رہے ہیں۔ یعنی سابقہ انبیاء کے پیروکار اور ان پر ایمان رکھنے والے ہیں۔

(۲) صَبْر سے مراد ہر قسم کے حالات میں انبیاء اور کتاب الہی پر ایمان اور اس پر ثابت قدمی سے قائم رہنا ہے۔ پہلی کتاب آئی تو اس پر اس کے بعد دوسری پر ایمان رکھا۔ پہلے نبی پر ایمان لائے، اس کے بعد دوسرا نبی آگیا تو اس پر ایمان لائے۔ ان کے لیے دوہرا اجر ہے، حدیث میں بھی ان کی یہ فضیلت بیان کی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تین آدمیوں کے لئے دوہرا اجر ہے، ان میں ایک وہ اہل کتاب ہے جو اپنے نبی پر ایمان رکھتا تھا اور پھر مجھ پر ایمان لے آیا۔ (صحیح بخاری، کتاب العلم، باب تعلیم الرجل أمته وأهله۔ مسلم، کتاب الإیمان، باب وجوب الإیمان برسالة نبینا صلی اللہ علیہ وسلم)

(۳) یعنی برائی کا جواب برائی سے نہیں دیتے، بلکہ معاف کر دیتے اور درگزر سے کام لیتے ہیں۔

(۴) یہاں لغو سے مراد وہ سب و شتم اور دین کے ساتھ استہزاء ہے جو مشرکین کرتے تھے۔

(۵) یہ سلام، سلام تحیہ نہیں بلکہ سلام متار کہ ہے یعنی ہم تم جیسے جاہلوں سے بحث اور گفتگو کے روادار ہی نہیں۔ جیسے اردو میں بھی کہتے ہیں، جاہلوں کو دور ہی سے سلام، ظاہر ہے سلام سے مراد ترک مخاطبت ہی ہے۔

مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿٥٦﴾

چاہے ہدایت کرتا ہے۔ ہدایت والوں سے وہی خوب آگاہ ہے۔^(۱) (۵۶)

کتنے لگے اگر ہم آپ کے ساتھ ہو کر ہدایت کے تابع دار بن جائیں تو ہم تو اپنے ملک سے اچک لیے جائیں،^(۲) کیا ہم نے انہیں امن و امان اور حرمت والے حرم میں جگہ نہیں دی؟^(۳) جہاں تمام چیزوں کے پھل کھچے چلے آتے ہیں جو ہمارے پاس بطور رزق کے ہیں،^(۴) لیکن ان میں سے اکثر کچھ نہیں جانتے۔ (۵۷)

اور ہم نے بہت سی وہ بستیاں تباہ کر دیں جو اپنی عیش و عشرت میں اترانے لگی تھیں، یہ ہیں ان کی رہائش کی

وَقَالُوا لَنْ نَبْتَدِعَ الْهُدَىٰ مَعَكَ نَنْخَطِفُ مِنْ أَذْيَبِنَا
أَوْ لَوْ نُمَكِّنُ لَهُمْ حَرَمًا أَوْ مَنَاجِيًّا إِلَيْهِ تَصْرُفُ كَيْلَ نَسْتَفِي
رَبَّنَا قَاتِلْهُمْ لَئِن لَّا تَأْوِلْنَاهُمْ لَا يَكُونُوا لَنَا حَمِيمًا ﴿٥٧﴾

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ لَبَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتَبَاتَكَ سَنَلِكُهُمْ

(۱) یہ آیت اس وقت نازل ہوئی، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمدرد اور غم گسار چچا جناب ابوطالب کا انتقال ہونے لگا تو آپ ﷺ نے کوشش فرمائی کہ چچا اپنی زبان سے ایک مرتبہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہہ دیں تاکہ قیامت والے دن میں اللہ سے ان کی مغفرت کی سفارش کر سکوں۔ لیکن وہاں دوسرے رؤسائے قریش کی موجودگی کی وجہ سے ابوطالب قبول ایمان کی سعادت سے محروم رہے اور کفر پر ہی ان کا خاتمہ ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا بڑا قلق اور صدمہ تھا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر واضح کیا کہ آپ کا کام صرف تبلیغ و دعوت اور رہنمائی ہے۔ لیکن ہدایت کے راستے پر چلا دینا، یہ ہمارا کام ہے، ہدایت اسے ہی ملے گی جسے ہم ہدایت سے نوازا جاہیں نہ کہ اسے جسے آپ ہدایت پر دیکھنا پسند کریں۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورة القصص، مسلم، کتاب الإيمان، باب أول الإيمان، قول لا إله إلا الله)

(۲) یعنی ہم جہاں ہیں، وہاں ہمیں رہنے نہ دیا جائے گا اور ہمیں اذیتوں سے یا مخالفین سے جنگ و بیکار سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یہ بعض کفار نے ایمان نہ لانے کا عذر پیش کیا۔ اللہ نے جواب دیا...

(۳) یعنی ان کا یہ عذر غیر معقول ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو، جس میں یہ رہتے ہیں، امن والا بنایا ہے۔ جب یہ شہر ان کے کفر و شرک کی حالت میں ان کے لیے امن کی جگہ ہے تو کیا اسلام قبول کر لینے کے بعد وہ ان کے لیے امن کی جگہ نہیں رہے گا؟

(۴) یہ کئے کی وہ خصوصیت ہے جس کا مشاہدہ لاکھوں حاجی اور عمرہ کرنے والے ہر سال کرتے ہیں کہ مکے میں پیداوار نہ ہونے کے باوجود نہایت فراوانی سے ہر قسم کا پھل بلکہ دنیا بھر کا سامان ملتا ہے۔

جگمیس جو ان کے بعد بہت ہی کم آباد کی گئیں^(۱) اور ہم ہی ہیں آخر سب کچھ کے وارث۔^(۲) (۵۸)

تیرا رب کسی ایک بستی کو بھی اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک کہ ان کی کسی بڑی بستی میں اپنا کوئی پیغمبر نہ بھیج دے جو انہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سنا دے^(۳)

اور ہم بستیوں کو اسی وقت ہلاک کرتے ہیں جب کہ وہاں والے ظلم و ستم پر کمر کس لیں۔^(۴) (۵۹)

اور تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے وہ صرف زندگی دنیا کا سامان اور اسی کی رونق ہے، ہاں اللہ کے پاس جو ہے وہ بہت ہی بہتر اور دیرپا ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے۔^(۵) (۶۰)

کیا وہ شخص جس سے ہم نے نیک وعدہ کیا ہے جسے وہ قطعاً

لَمْ تَسْئَلْنَاهُمْ مِّنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا وَّلَئِن لَّمْ تَدْعُوا لِنُورِنَا ۝

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمَمَةٍ نَّوْلًا فَيُسَلِّطُوا عَلَيْهِمُ الْيَتِيمَٰتِ وَأَمْأَتًا مُّهْلِكِي الْقُرَىٰ ۚ أَلَا وَهَلْ كَانُوا ظَالِمِينَ ۝

وَمَا أَوْتَيْنَاهُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَدَتَا عَاقِبَةَ الدُّنْيَا وَرَبِّتَهُمَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْغَىٰ ۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝

أَمَّنْ وَعَدْنَاهُ وَعَدًا حَسَنًا فَهَوْلَاجِيهِ لَكُمْ مَن مَّتَّعْنَاهُ مَتَاعًا

(۱) یہ اہل مکہ کو ڈرایا جا رہا ہے کہ تم دیکھتے نہیں کہ اللہ کی نعمتوں سے فیض یاب ہو کر اللہ کی ناشکری کرنے اور سرکشی کرنے والوں کا انجام کیا ہوا؟ آج ان کی بیشتر آبادیاں کھنڈ رینی ہوئی ہیں یا صرف صفحات تاریخ پر ان کا نام رہ گیا ہے۔ اور اب آتے جاتے مسافر ہی ان میں کچھ دیر کے لیے سستالیں تو سستالیں، ان کی نحوست کی وجہ سے کوئی بھی ان میں مستقل رہنا پسند نہیں کرتا۔

(۲) یعنی ان میں سے تو کوئی بھی باقی نہ رہا جو ان کے مکانوں اور مال و دولت کا وارث ہوتا۔

(۳) یعنی اتمام حجت کے بغیر کسی کو ہلاک نہیں کرتا۔ اُنہما (بڑی بستی) کے لفظ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر چھوٹے بڑے علاقے میں نبی نہیں آیا، بلکہ مرکزی مقامات پر نبی آتے رہے اور چھوٹے علاقے اس کے ذیل میں آجاتے رہے ہیں۔

(۴) یعنی نبی بھیجنے کے بعد وہ بستی والے ایمان نہ لاتے اور کفر و شرک پر اپنا اصرار جاری رکھتے تو پھر انہیں ہلاک کر دیا جاتا۔ یہی مضمون سورہ ہود، ۷۱ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

(۵) یعنی کیا اس حقیقت سے بھی تم بے خبر ہو کہ یہ دنیا اور اس کی رونقیں عارضی بھی ہیں اور حقیر بھی؛ جب کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لیے اپنے پاس جو نعمتیں، آسائشیں اور سہولتیں تیار کر رکھی ہیں، وہ دائمی بھی ہیں اور عظیم بھی۔ حدیث میں ہے ”اللہ کی قسم دنیا، آخرت کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے تم میں سے کوئی شخص اپنی انگلی سمندر میں ڈبو کر نکال لے، دیکھے کہ سمندر کے مقابلے میں انگلی میں کتنا پانی ہو گا؟“ (صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب فناء

پانے والا ہے مثل اس شخص کے ہو سکتا ہے؟ جسے ہم نے زندگانی دنیا کی کچھ یونہی سی منفعت دے دی پھر بالآخر وہ قیامت کے روز پکڑا باندھا حاضر کیا جائے گا۔^(۱) (۶۱)
 اور جس دن اللہ تعالیٰ انہیں پکار کر فرمائے گا کہ تم جنہیں اپنے گمان میں میرا شریک ٹھہرا رہے تھے کہاں ہیں۔^(۲) (۶۲)
 جن پر بات آچکی وہ جواب دیں گے^(۳) کہ اے ہمارے پروردگار! یہی وہ ہیں جنہیں ہم نے برکرا رکھا^(۴) تھا، ہم نے انہیں اسی طرح برکرا کیا جس طرح ہم ہمکے تھے،^(۵) ہم تیری سرکار میں اپنی دست برداری کرتے ہیں،^(۶) یہ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔^(۷) (۶۳)

الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝۱۰

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ اَيْنَ شُرَكَآءِ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝۱۱

قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ اَعْوَيْنَا اَعْوَيْنَهُمْ كَمَا كُوْنِيْنَ اَتَّبَعْنَا اِلَيْكَ مَا كَانُوْا اِيَّاكَ يَعْبُدُوْنَ ۝۱۲

(۱) یعنی سزا اور عذاب کا مستحق ہو گا۔ مطلب ہے اہل ایمان، وعدۃ الہی کے مطابق نعمتوں سے بہرہ ور اور نافرمان عذاب سے دوچار۔ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟

(۲) یعنی وہ اصنام یا اشخاص ہیں، جن کو تم دنیا میں میری الوہیت میں شریک گردانتے تھے، انہیں مدد کے لیے پکارتے تھے اور ان کے نام کی نذر نیازدیتے تھے، آج کہاں ہیں؟ کیا وہ تمہاری مدد کر سکتے اور تمہیں میرے عذاب سے چھڑا سکتے ہیں؟ یہ تفریح و توجیح کے طور پر اللہ تعالیٰ ان سے کہے گا، ورنہ وہاں اللہ کے سامنے کس کو مجال دم زدنی ہو گی؟ یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے سورۃ الأنعام، آیت ۹۴ اور دیگر بہت سے مقامات پر بیان فرمایا ہے۔

(۳) یعنی جو عذاب الہی کے مستحق قرار پائے ہوں گے، مثلاً سرکش شیاطین اور داعیان کفر و شرک وغیرہ، وہ کہیں گے۔

(۴) یہ ان جاہل عوام کی طرف اشارہ ہے جن کو داعیان کفر و ضلال نے اور شیاطین نے گمراہ کیا تھا۔

(۵) یعنی ہم تو تھے ہی گمراہ لیکن ان کو بھی اپنے ساتھ گمراہ کیے رکھا۔

مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان پر کوئی جبر نہیں کیا تھا، بس ہمارے ادنیٰ سے اشارے پر ہماری طرح ہی انہوں نے بھی گمراہی اختیار کر لی۔

(۶) یعنی ہم ان سے بیزار اور الگ ہیں، ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہاں یہ تابع اور متبوع، چیلے اور گرو ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔

(۷) بلکہ درحقیقت اپنی ہی خواہشات کی پیروی کرتے تھے۔ یعنی وہ معبودین، جن کی لوگ دنیا میں عبادت کرتے تھے، اس بات سے ہی انکار کر دیں گے کہ لوگ ان کی عبادت کرتے تھے۔ اس مضمون کو قرآن کریم میں کئی جگہ بیان کیا گیا ہے۔

مثلاً سورۃ الأنعام ۳۹، سورۃ مریم ۸۱، سورۃ الأحقاف ۲۵، سورۃ العنکبوت ۲۵، سورۃ البقرۃ ۱۶۲، ۱۶۷ وغیرہا من الآیات۔

کہا جائے گا کہ اپنے شریکوں کو بلاؤ،^(۱) وہ بلائیں گے لیکن انہیں وہ جواب تک نہ دیں گے اور سب عذاب دیکھ لیں گے،^(۲) کاش یہ لوگ ہدایت پالیتے۔^(۳) (۶۳)
اس دن انہیں بلا کر پوچھے گا کہ تم نے نبیوں کو کیا جواب دیا؟^(۴) (۶۵)

پھر تو اس دن ان کی تمام دلیلیں گم ہو جائیں گی اور ایک دوسرے سے سوال تک نہ کریں گے۔^(۵) (۶۶)
ہاں جو شخص تو یہ کر لے ایمان لے آئے اور نیک کام کرے یقین ہے کہ وہ نجات پانے والوں میں سے ہو جائے گا۔ (۶۷)
اور آپ کا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے، ان میں سے کسی کو کوئی اختیار نہیں،^(۶)

وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ فَذَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ
وَرَأَوْا الْعَذَابَ لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَهْتَدُونَ ﴿۶۳﴾

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ﴿۶۵﴾

فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَاءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَاءَلُونَ ﴿۶۶﴾

فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَالْمَنْ وَعَدِلَ فَلَهُ أَجْرٌ
يُؤْتُونَ مِنَ الْمَغْفِلِينَ ﴿۶۷﴾

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَكُمْ الْاِخْتِيَارُ ﴿۶۸﴾

(۱) یعنی ان سے مدد طلب کرو، جس طرح دنیا میں کرتے تھے۔ کیا وہ تمہاری مدد کرتے ہیں؟ پس وہ پکاریں گے۔ لیکن وہاں کس کو یہ جرات ہوگی کہ جو یہ کہے کہ ہاں، ہم تمہاری مدد کرتے ہیں؟
(۲) یعنی یقین کر لیں گے کہ ہم سب جہنم کا بندھن بننے والے ہیں۔
(۳) یعنی عذاب دیکھ لینے کے بعد آرزو کریں گے کہ کاش دنیا میں ہدایت کا راستہ اپنالیتے تو آج وہ اس حشر سے بچ جاتے۔ سورۃ الکہف- ۵۲، ۵۳ میں بھی یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔

(۴) اس سے پہلے کی آیات میں توحید سے متعلق سوال تھا، یہ ندائے ثانی رسالت کے بارے میں ہے، یعنی تمہاری طرف ہم نے رسول بھیجے تھے، تم نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا، ان کی دعوت قبول کی تھی؟ جس طرح قبر میں سوال ہوتا ہے، تیرا پیغمبر کون ہے؟ اور تیرا دین کون سا ہے؟ مومن تو صحیح جواب دے دیتا ہے۔ لیکن کافر کہتا ہے ہا ہا ہا لا اؤدرنی مجھے تو کچھ معلوم نہیں، اسی طرح قیامت والے دن انہیں اس سوال کا کوئی جواب نہیں سونجھے گا۔ اسی لیے آگے فرمایا ”ان پر تمام خبریں اندھی ہو جائیں گی۔“ یعنی کوئی دلیل ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی جسے وہ پیش کر سکیں۔ یہاں دلائل کو اخبار سے تعبیر کر کے اس طرف اشارہ فرما دیا کہ ان کے باطل عقائد کے لیے حقیقت میں ان کے پاس کوئی دلیل ہے ہی نہیں، صرف قصص و حکایات ہیں۔ جیسے آج بھی قبر پرستوں کے پاس من گھڑت کراماتی قصوں کے سوا کچھ نہیں۔

(۵) کیونکہ انہیں یقین ہو چکا ہو گا کہ سب جہنم میں داخل ہونے والے ہیں۔

(۶) یعنی اللہ تعالیٰ مختار کل ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی کو سرے سے کوئی اختیار ہی نہیں، چہ جائیکہ کوئی مختار کل ہو۔

اللَّهُ وَتَعْلَىٰ عَائِدَتُهُمْ ۝۱۰

اللہ ہی کے لیے پائی ہے وہ بلند تر ہے ہر اس چیز سے کہ لوگ شریک کرتے ہیں۔ (۶۸)

وَرَبِّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ۝۱۱

ان کے سینے جو کچھ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں آپ کا رب سب کچھ جانتا ہے۔ (۶۹)

وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝۱۲

وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، دنیا اور آخرت میں اسی کی تعریف ہے۔ اسی کے لیے فرمانروائی ہے اور اسی کی طرف تم سب پھیرے جاؤ گے۔ (۷۰)

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ الْبَيْتَ سَرْمَدًا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَهُ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِيضَاءٍ أَوْ لَظْلَمَةٍ تَسْمَعُون ۝۱۳

کہہ دیجئے! کہ دیکھو تو سہی اگر اللہ تعالیٰ تم پر رات ہی رات قیامت تک برابر کر دے تو سوائے اللہ کے کون معبود ہے جو تمہارے پاس دن کی روشنی لائے؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ (۷۱)

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ الْبَيْتَ سَرْمَدًا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَهُ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِيضَاءٍ أَوْ لَظْلَمَةٍ تَسْمَعُون ۝۱۳

پوچھئے! کہ یہ بھی بتا دو کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ قیامت تک دن ہی دن رکھے تو بھی سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی معبود ہے جو تمہارے پاس رات لے آئے؟ جس میں تم آرام حاصل کرو، کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو؟ (۷۲)

وَمَنْ كَفَرْتَهُ جَعَلَ لَكُمْ الْبَيْتَ لَسْتُمْ لَكُمْ فِيهِ ۝۱۴

اسی نے تو تمہارے لیے اپنے فضل و کرم سے دن رات مقرر کر دیے ہیں کہ تم رات میں آرام کرو اور دن میں اس کی بھیجی ہوئی روزی تلاش کرو،^(۱) یہ اس لیے کہ تم

وَمَنْ كَفَرْتَهُ جَعَلَ لَكُمْ الْبَيْتَ لَسْتُمْ لَكُمْ فِيهِ ۝۱۴

اس کی بھیجی ہوئی روزی تلاش کرو،^(۱) یہ اس لیے کہ تم

وَمَنْ كَفَرْتَهُ جَعَلَ لَكُمْ الْبَيْتَ لَسْتُمْ لَكُمْ فِيهِ ۝۱۴

اس کی بھیجی ہوئی روزی تلاش کرو،^(۱) یہ اس لیے کہ تم

وَمَنْ كَفَرْتَهُ جَعَلَ لَكُمْ الْبَيْتَ لَسْتُمْ لَكُمْ فِيهِ ۝۱۴

اس کی بھیجی ہوئی روزی تلاش کرو،^(۱) یہ اس لیے کہ تم

وَمَنْ كَفَرْتَهُ جَعَلَ لَكُمْ الْبَيْتَ لَسْتُمْ لَكُمْ فِيهِ ۝۱۴

اس کی بھیجی ہوئی روزی تلاش کرو،^(۱) یہ اس لیے کہ تم

وَمَنْ كَفَرْتَهُ جَعَلَ لَكُمْ الْبَيْتَ لَسْتُمْ لَكُمْ فِيهِ ۝۱۴

(۱) دن اور رات، یہ دونوں اللہ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ رات کو تاریک بنایا تاکہ سب لوگ آرام کر سکیں۔ اس

اندھیرے کی وجہ سے ہر مخلوق سونے اور آرام کرنے پر مجبور ہے۔ ورنہ اگر آرام کرنے اور سونے کے اپنے اپنے اوقات ہوتے تو کوئی بھی مکمل طریقے سے سونے کا موقع نہ پاتا، جب کہ معاشی تنگ و دو اور کاروبار جہاں کے لیے نیند کا

پورا کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر توانائی بحال نہیں ہوتی۔ اگر کچھ لوگ سو رہے ہوتے اور کچھ جاگ کر مصروف تنگ و تاز ہوتے، تو سونے والوں کے آرام و راحت میں خلل پڑتا، نیز لوگ ایک دوسرے کے تعاون سے بھی محروم

رہتے، جب کہ دنیا کا نظام ایک دوسرے کے تعاون و تناصر کا محتاج ہے اس لیے اللہ نے رات کو تاریک کر دیا تاکہ ساری مخلوق بیک وقت آرام کرے اور کوئی کسی کی نیند اور آرام میں خلل نہ ہو سکے۔ اسی طرح دن کو روشن بنایا تاکہ روشنی

وَلْيَتَّبِعُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵۰﴾

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ

كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿۵۱﴾

وَتَزْعُمَانِمْ جُلُ أُمَّةٍ شَهِيدًا فَقُلْنَا هَاتُوا بُرْهَانَ كُنتُمْ

فَعَلِمُوا أَنَّ الْحَقَّ لِلَّهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۵۲﴾

إِنَّ قَادُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَى فَبَعَثَ عَلَيْهِمْ ذَاتِئِنَّهُ

شکرا داکرو۔ (۱) (۷۳)

اور جس دن انہیں پکار کر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جنہیں تم

میرے شریک خیال کرتے تھے وہ کہاں ہیں؟ (۷۴)

اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ الگ کر لیں گے کہ اپنی

دلیلیں پیش کرو (۳) پس اس وقت جان لیں گے کہ حق اللہ

تعالیٰ کی طرف ہے، (۴) اور جو کچھ افترا وہ جوڑتے تھے سب

ان کے پاس سے کھو جائے گا۔ (۵) (۷۵)

قارون تھا تو قوم موسیٰ سے، لیکن ان پر ظلم کرنے لگا تھا (۶)

ہم نے اسے (اس قدر) خزانے دے رکھے تھے کہ کئی کئی

میں انسان اپنا کاروبار بہتر طریقے سے کر سکے۔ دن کی یہ روشنی نہ ہوتی تو انسان کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا، اسے ہر شخص باسانی سمجھتا اور اس کا ادراک رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی ان نعمتوں کے حوالے سے اپنی توحید کا اثبات فرمایا ہے کہ بتلاؤ اگر اللہ تعالیٰ دن اور رات کا یہ نظام ختم کر کے ہمیشہ کے لیے تم پر رات ہی مسلط کر دے۔ تو کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود ایسا ہے جو تمہیں دن کی روشنی عطا کر دے؟ یا اگر وہ ہمیشہ کے لیے دن ہی رکھے تو کیا کوئی تمہیں رات کی تاریکی سے بہرہ ور کر سکتا ہے، جس میں تم آرام کر سکو؟ نہیں۔ یقیناً نہیں۔ یہ صرف اللہ کی کمال مہربانی ہے کہ اس نے دن اور رات کا ایسا نظام قائم کر دیا ہے کہ رات آتی ہے تو دن کی روشنی ختم ہو جاتی ہے اور تمام مخلوق آرام کر لیتی ہے اور رات جاتی ہے تو دن کی روشنی سے کائنات کی ہر چیز نمایاں اور واضح تر ہو جاتی ہے اور انسان کسب و محنت کے ذریعے سے اللہ کا فضل (روزی) تلاش کرتا ہے۔

(۱) یعنی اللہ کی حمد و ثنا بھی بیان کرو (یہ زبانی شکر ہے) اور اللہ کی دی ہوئی دولت، صلاحیتوں اور توانائیوں کو اس کے احکام و ہدایات کے مطابق استعمال کرو۔ (یہ عملی شکر ہے)

(۲) اس گواہ سے مراد پیغمبر ہے۔ یعنی ہر امت کے پیغمبر کو اس امت سے الگ کھڑا کر دیں گے۔

(۳) یعنی دنیا میں میرے پیغمبروں کی دعوت توحید کے باوجود تم جو میرے شریک ٹھہراتے تھے اور میرے ساتھ ان کی بھی عبادت کرتے تھے، اس کی دلیل پیش کرو۔

(۴) یعنی وہ حیران اور ساکت کھڑے ہوں گے، کوئی جواب اور دلیل انہیں نہیں سوجھے گی۔

(۵) یعنی ان کے کام نہیں آئے گا۔

(۶) اپنی قوم بنی اسرائیل پر اس کا ظلم یہ تھا کہ اپنے مال و دولت کی فراوانی کی وجہ سے ان کا استخفاف کرتا تھا۔ بعض کہتے

ہیں کہ فرعون کی طرف سے یہ اپنی قوم بنی اسرائیل پر عامل مقرر تھا اور ان پر ظلم کرتا تھا۔

طاقت و رلوگ بہ مشکل اس کی کنجیاں اٹھا سکتے تھے،^(۱) ایک بار اس کی قوم نے اس سے کہا کہ اتر امت!^(۲) اللہ تعالیٰ اترنے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔^(۳) (۷۶)

اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تجھے دے رکھا ہے اس میں سے آخرت کے گھر کی تلاش بھی رکھ^(۴) اور اپنے دنیوی حصے کو بھی نہ بھول^(۵) اور جیسے کہ اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی اچھا سلوک کر^(۶) اور ملک میں فساد کا خواہاں نہ ہو،^(۷) یقین مان کہ اللہ مفسدوں کو ناپسند رکھتا ہے۔ (۷۷)

قارون نے کہا یہ سب کچھ مجھے میری اپنی سمجھ کی بنا پر ہی دیا گیا ہے،^(۸) کیا اسے اب تک یہ نہیں معلوم کہ

مِنَ الْكُفُورِ مَا إِنَّ مَتَاعَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولَى الْقُوَّةِ
إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۝۵۱

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ
مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ
الْفُسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝۵۲

قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي ۗ أَوَلَمْ يَعْلَم أَنَّ اللَّهَ قَدَّ

(۱) تَنُوءُ کے معنی ہیں تمیل (بھلنا) یعنی جس طرح کوئی شخص ہماری چیز اٹھاتا ہے تو بوجھ کی وجہ سے ادھر ادھر لڑکھڑاتا ہے، اس کی چابیوں کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ ایک طاقت ور جماعت بھی اسے اٹھاتے ہوئے دقت اور گرانی محسوس کرتی تھی۔

(۲) یعنی مال و دولت پر فخر اور غرور مت کرو، بعض نے بخل، معنی کیے ہیں، بخل مت کر۔

(۳) یعنی تکبر اور غرور کرنے والوں کو یا بخل کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(۴) یعنی اپنے مال کو ایسی جگہوں اور راہوں پر خرچ کر، جہاں اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے، اس سے تیری آخرت سنورے گی اور وہاں اس کا تجھے اجر و ثواب ملے گا۔

(۵) یعنی دنیا کے مباحات پر بھی اعتدال کے ساتھ خرچ کر۔ مباحات دنیا کیا ہیں؟ کھانا پینا، لباس، گھر اور نکاح وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح تجھ پر تیرے رب کا حق ہے، اسی طرح تیرے اپنے نفس کا، بیوی بچوں کا اور مہمانوں وغیرہ کا بھی حق ہے، ہر حق والے کو اس کا حق دے۔

(۶) اللہ نے تجھے مال دے کر تجھ پر احسان کیا ہے تو مخلوق پر خرچ کر کے ان پر احسان کر۔

(۷) یعنی تیرا مقصد زمین میں فساد پھیلانا نہ ہو۔ اسی طرح مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کے بجائے بد سلوکی مت کر، نہ معصیتوں کا ارتکاب کر کہ ان تمام باتوں سے فساد پھیلتا ہے۔

(۸) ان نصیحتوں کے جواب میں اس نے یہ کہا۔ اس کا مطلب ہے کہ مجھے کسب و تجارت کا جو فن آتا ہے، یہ دولت تو اس کا نتیجہ اور ثمر ہے، اللہ کے فضل و کرم سے اس کا کیا تعلق ہے؟ دوسرے معنی یہ کیے گئے ہیں کہ اللہ نے مجھے یہ مال

اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے بہت سے بستی والوں کو غارت کر دیا جو اس سے بہت زیادہ قوت والے اور بہت بڑی جمع پونجی والے تھے۔^(۱) اور گنہگاروں سے ان کے گناہوں کی باز پرس ایسے وقت نہیں کی جاتی۔ (۷۸)^(۲)

پس قارون پوری آرائش کے ساتھ اپنی قوم کے مجمع میں نکلا،^(۳) تو دنیاوی زندگی کے متوالے کہنے لگے 'کاش کہ ہمیں بھی کسی طرح وہ مل جاتا جو قارون کو دیا گیا ہے۔ یہ تو بڑا ہی قسمت کا دھنی ہے۔ (۷۹)

ذی علم لوگ انہیں سمجھانے لگے کہ افسوس! بہتر چیز تو وہ

أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَآلَتْهُ جَعًا وَلَا يَمْتَنِعُ عَنْ ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ ﴿۷۸﴾

فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا لِيَلْبَسُنَا وَمِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَكُدُورٌ حَظًا عَظِيمًا ﴿۷۹﴾

وَقَالَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْعِلْمَ وَيَلِكُوا تَوَابَ اللَّهِ حَيْرَاتٍ لِمَنْ

دیا ہے تو اس نے اپنے علم کی وجہ سے دیا ہے کہ میں اس کا مستحق ہوں اور میرے لیے اس نے یہ پسند کیا ہے۔ جیسے دوسرے مقام پر انسانوں کا ایک اور قول اللہ نے نقل فرمایا ہے "جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے، پھر جب ہم اسے اپنی نعمت سے نواز دیتے ہیں تو کہتا ہے ﴿إِنَّمَا أُفَيْتُنِي عَلَىٰ عِلْمٍ﴾ (القصص ۷۸) آئی: عَلَيَّ عِلْمٌ مِنَ اللَّهِ یعنی مجھے یہ نعمت اس لیے ملی ہے کہ اللہ کے علم میں میں اس کا مستحق تھا۔" ایک مقام پر ہے "جب ہم انسان پر تکلیف کے بعد اپنی رحمت کرتے ہیں تو کہتا ہے ﴿هَذَا لِي﴾ (حلم السجدۃ ۵۰) آئی: هَذَا أَسْتَحِقُّهُ یہ تو میرا استحقاق ہے (ابن کثیر) بعض کہتے ہیں کہ قارون کو کیا (سونا بنانے کا) علم آتا تھا، یہاں یہی مراد ہے اسی کی کیا گری سے اس نے اتنی دولت کمائی تھی۔ لیکن امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ علم سراسر جھوٹ، فریب اور دھوکہ ہے۔ کوئی شخص اس بات پر قادر نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کی ماہیت تبدیل کر دے۔ اس لیے قارون کے لیے بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ دوسری دھاتوں کو تبدیل کر کے سونا بنالیا کرتا اور اس طرح دولت کے انبار جمع کر لیتا۔

(۱) یعنی قوت اور مال کی فراوانی، یہ فضیلت کا باعث نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو پچھلی قومیں تباہ و برباد نہ ہوتیں۔ اس لیے قارون کا اپنی دولت پر گھمنڈ کرنے اور اسے باعث فضیلت گردانے کا کوئی جواز نہیں۔

(۲) یعنی جب گناہ اتنی زیادہ تعداد میں ہوں کہ ان کی وجہ سے وہ مستحق عذاب قرار دے دیئے گئے ہوں تو پھر ان سے باز پرس نہیں ہوتی، بلکہ اچانک ان کا مواخذہ کر لیا جاتا ہے۔

(۳) یعنی زینت و آرائش اور خدم و حشم کے ساتھ۔

(۴) یہ کہنے والے کون تھے؟ بعض کے نزدیک ایمان والے ہی تھے جو اس کی امارت و شوکت کے مظاہر سے متاثر ہو گئے تھے اور بعض کے نزدیک کافر تھے۔

ہے جو بطور ثواب انہیں ملے گی جو اللہ پر ایمان لائیں اور نیک عمل کریں^(۱) یہ بات انہی کے^(۲) دل میں ڈالی جاتی ہے جو صبر و سہار والے ہوں۔ (۸۰)

(آخر کار) ہم نے اسے اس کے محل سمیت زمین میں دھنسا دیا^(۳) اور اللہ کے سوا کوئی جماعت اس کی مدد کے لیے تیار نہ ہوئی نہ وہ خود اپنے بچانے والوں میں سے ہو سکا۔ (۸۱)

اور جو لوگ کل اس کے مرتبہ پر پہنچنے کی آرزو مندیاں کر رہے تھے وہ آج کہنے لگے کہ کیا تم نہیں دیکھتے^(۴) کہ

الْمَنْ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلِقُهُمْ إِلَّا الضُّيُورُ ۝

فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُ مِنْ دُونِهَا يَنصُرُونَهُ

مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنصُرِينَ ۝

وَأَصْحَابَ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكَاذِبُونَ وَيُمَارُونَ

(۱) یعنی جن کے پاس دین کا علم تھا اور دنیا اور اس کے مظاہر کی اصل حقیقت سے باخبر تھے، انہوں نے کہا کہ یہ کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ اللہ نے اہل ایمان اور اعمال صالحہ بجالانے والوں کے لیے جو اجر و ثواب رکھا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ جیسے حدیث قدسی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی ایسی چیزیں تیار کر رکھی ہیں جنہیں کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، کسی کان نے نہیں سنا اور نہ کسی کے وہم و گمان میں ان کا گزر ہوا۔“ (البخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ یریدون أن یبدلوا کلام اللہ، و مسلم، کتاب الإیمان، باب أذنی أهل الجنة منزلة)

(۲) یعنی یَلْقَاهَا میں ہا کا مرجع، کلمہ ہے اور یہ قول اللہ کا ہے۔ اور اگر اسے اہل علم ہی کے قول کا تہمہ قرار دیا جائے تو ہا کا مرجع جنت ہوگی یعنی جنت کے مستحق وہ صابر ہی ہوں گے جو دنیاوی لذتوں سے کنارہ کش اور آخرت کی زندگی میں رغبت رکھنے والے ہوں گے۔

(۳) یعنی قارون کو اس کے تکبر کی وجہ سے اس کے محل اور خزانوں سمیت زمین میں دھنسا دیا۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”یک آدمی اپنی ازار زمین پر لٹکائے جا رہا تھا (اللہ کو اس کا یہ تکبر پسند نہیں آیا) اور اسے زمین میں دھنسا دیا گیا، پس وہ قیامت تک زمین میں دھنستا چلا جائے گا“ (البخاری، کتاب اللباس، باب من جربوه من الخیلاء)

(۴) مکان سے مراد وہ دنیاوی مرتبہ و منزلت ہے جو دنیا میں کسی کو عارضی طور پر ملتا ہے۔ جیسے قارون کو ملا تھا، اس گزشتہ کل کو کہتے ہیں۔ مطلب زمانہ قریب ہے۔ وَیُکَاذِبُونَ اصل میں ”وَيَلْغَمُونَ“ ہے اس کو مخفف کر کے وَیُکَاذِبُونَ بنا دیا گیا ہے، یعنی وَیَلْغَمُونَ۔ یعنی افسوس یا تعجب ہے، تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ..... بعض کے نزدیک یہ آلم تَرَ کے معنی

اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہے روزی کشادہ کر دیتا ہے اور تنگ بھی؟ اگر اللہ تعالیٰ ہم پر فضل نہ کرتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا،^(۱) کیا دیکھتے نہیں ہو کہ ناشکروں کو کبھی کامیابی نہیں ہوتی؟^(۲) (۸۲)

آخرت کا یہ بھلا گھر ہم ان ہی کے لیے مقرر کر دیتے ہیں جو زمین میں اونچائی برائی اور فخر نہیں کرتے نہ فساد کی چاہت رکھتے ہیں۔ پرہیزگاروں کے لیے نہایت ہی عمدہ انجام ہے۔^(۳) (۸۳)

جو شخص نیکی لائے گا سے اس سے بہتر ملے گا^(۴) اور جو برائی لے کر آئے گا تو ایسے بد اعمالی کرنے والوں کو ان کے انہی اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ کرتے تھے۔^(۵) (۸۴)

يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَوْ لَأَن مِّنْ
اللَّهِ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا وَيُنَازِنَهُ لَأَيُّكُمْ الْكٰفِرُونَ ﴿۸۲﴾

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِمَن يَشَاءُ لِمَن يَشَاءُ لِمَن يَشَاءُ
فِي الْاَرْضِ وَلَا فِسَادًا اَوْ الْعَالِيَةِ لِلَّذِينَ ﴿۸۳﴾

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ مِثْمَالٍ وَمَنْ جَاءَ بِالْاِسْفَةِ فَلَا
يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾

میں ہے، (ابن کثیر) جیسا کہ ترجمے سے واضح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قارون کی سی دولت و حشمت کی آرزو کرنے والوں نے جب قارون کا عبرت ناک حشر دیکھا تو کہا کہ مال و دولت، اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس صاحب مال سے راضی بھی ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو مال زیادہ دے دیتا ہے اور کسی کو کم۔ اس کا تعلق اس کی مشیت اور حکمت بالغہ سے ہے جسے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، مال کی فراوانی اس کی رضا کی اور مال کی کمی اس کی ناراضی کی دلیل نہیں ہے نہ یہ معیار فضیلت ہی ہے۔

(۱) یعنی ہم بھی اسی حشر سے دوچار ہوتے جس سے قارون دوچار ہوا۔

(۲) یعنی قارون نے دولت پا کر شکر گزاری کے بجائے ناشکری اور مصیبت کا راستہ اختیار کیا تو دیکھ لو اس کا انجام بھی کیا ہوا؟ دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو۔

(۳) عُلُوٌّ کا مطلب ہے ظلم و زیادتی، لوگوں سے اپنے کو بڑا اور برتر سمجھنا اور باور کرنا، تکبر اور فخر و غرور کرنا اور فساد کے معنی ہیں ناحق لوگوں کا مال، ہتھیانا یا نافرمانیوں کا ارتکاب کرنا کہ ان دونوں باتوں سے زمین میں فساد پھیلتا ہے۔ فرمایا کہ متقین کا عمل و اخلاق ان برائیوں اور کوتاہیوں سے پاک ہوتا ہے اور تکبر کے بجائے ان کے اندر تواضع، فروتنی اور معصیت کیشی کی بجائے اطاعت کیشی ہوتی ہے اور آخرت کا گھر یعنی جنت اور حسن انجام انہی کے حصے میں آئے گا۔

(۴) یعنی کم از کم ہر نیکی کا بدلہ دس گنا تو ضرور ہی ملے گا، اور جس کے لیے اللہ چاہے گا، اس سے بھی زیادہ، کہیں زیادہ، عطا فرمائے گا۔

(۵) یعنی نیکی کا بدلہ تو بڑھا چڑھا کر دیا جائے گا لیکن برائی کا بدلہ برائی کے برابر ہی ملے گا۔ یعنی نیکی کی جزا میں اللہ کے

جس اللہ نے آپ پر قرآن نازل فرمایا ہے^(۱) وہ آپ کو دوبارہ پہلی جگہ لانے والا ہے،^(۲) کہہ دیجئے! کہ میرا رب اسے بھی بخوبی جانتا ہے جو ہدایت لایا ہے اور اسے بھی جو کھلی گمراہی میں ہے۔^(۳) (۸۵)

آپ کو تو کبھی اس کا خیال بھی نہ گزرا تھا کہ آپ کی طرف کتاب نازل فرمائی جائے گی^(۴) لیکن یہ آپ کے رب کی مہربانی سے اترا۔^(۵) اب آپ کو ہرگز کافروں کا مددگار نہ ہونا چاہیے۔^(۶) (۸۶)

خیال رکھیے کہ یہ کفار آپ کو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی تبلیغ

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَأْدُكَ إِلَى مَعَادٍ
كُلِّ دِينٍ أَعَمُّ مَنْ جَاءَ بِالْهُدَى وَمَنْ
هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

وَمَا كُنْتَ تَرْجُو أَنْ يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً
مِّن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِلْكَافِرِينَ ۝

وَلَا تَصُدُّكَ عَنِ آيَةِ اللَّهِ بَعْدَ إِذْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ

فضل و کرم کا اور بدی کی جزا میں اس کے عدل کا مظاہرہ ہو گا۔

(۱) یا اس کی تلاوت اور اس کی تبلیغ و دعوت آپ پر فرض کی ہے۔

(۲) یعنی آپ کے مولد مکہ، جہاں سے آپ نکلنے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح بخاری میں اس کی یہی تفسیر نقل ہوئی ہے۔ چنانچہ ہجرت کے آٹھ سال بعد اللہ کا یہ وعدہ پورا ہو گیا اور آپ ۸ ہجری میں فاتحانہ طور پر مکہ میں دوبارہ تشریف لے گئے۔ بعض نے معاد سے مراد قیامت لی ہے۔ یعنی قیامت والے دن آپ کو اپنی طرف لوٹائے گا اور تبلیغ رسالت کے بارے میں پوچھے گا۔

(۳) یہ مشرکین کے اس جواب میں ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے آبائی اور روایتی مذہب سے انحراف کی بنا پر گمراہ سمجھتے تھے۔ فرمایا ”میرا رب خوب جانتا ہے کہ گمراہ میں ہوں، جو اللہ کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہوں یا تم ہو، جو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کو قبول نہیں کر رہے ہو؟“

(۴) یعنی نبوت سے قبل آپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آپ کو رسالت کے لیے چنا جائے گا اور آپ پر کتاب الہی کا نزول ہو گا۔

(۵) یعنی یہ نبوت و کتاب سے سرفرازی، اللہ کی خاص رحمت کا نتیجہ ہے جو آپ پر ہوئی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ نبوت کوئی کبھی چیز نہیں ہے، جسے محنت اور سعی و کاوش سے حاصل کیا جاسکتا رہا ہو۔ بلکہ یہ سرا سرائیک و وہی چیز تھی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا رہا، نبوت و رسالت سے مشرف فرماتا رہا۔ حتیٰ کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سلسلہ الذہب کی آخری کڑی قرار دے کر اسے موقوف فرمایا گیا۔

(۶) اب اس نعمت اور فضل الہی کا شکر آپ اس طرح ادا کریں کہ کافروں کی مدد اور ہمنوائی نہ کریں۔

سے روک نہ دیں^(۱) اس کے بعد کہ یہ آپ کی جانب اتاری گئیں، تو اپنے رب کی طرف بلا تے رہیں اور شرک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔ (۸۷)

اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارنا^(۲)۔ بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی اور معبود نہیں، ہر چیز فنا ہونے والی ہے مگر اسی کا منہ۔^(۳) (اور ذات) اسی کے لیے فرمانروائی ہے^(۴) اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔^(۵) (۸۸)

سورہ عنکبوت کی ہے اور اس کی انتہر آیتیں اور سات رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الم (۱) کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ان کے صرف اس دعوے پر کہ ہم ایمان لائے ہیں ہم انہیں بغیر

وَادْعُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۸۷﴾

وَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَيَأْتِيهِ سُجُودٌ ﴿۸۸﴾



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْعَمَّ ۝ أَحْسَبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا إِنَّا نَكْفُرُ ۚ

(۱) یعنی ان کافروں کی باتیں، ان کی ایذا رسانی اور ان کی طرف سے تبلیغ و دعوت کی راہ میں رکاوٹیں، آپ کو قرآن کی تلاوت اور اس کی تبلیغ سے نہ روک دیں۔ بلکہ آپ پوری تن دہی اور یکسوئی سے رب کی طرف بلا تے رہیں۔

(۲) یعنی کسی اور کی عبادت نہ کرنا، نہ دعا کے ذریعے سے، نہ نذر و نیاز کے ذریعے سے، نہ ہی قربانی کے ذریعے سے کہ یہ سب عبادات ہیں جو صرف ایک اللہ کے لیے خاص ہیں۔ قرآن میں ہر جگہ غیر اللہ کی عبادت کو پکارنے سے تعبیر کیا گیا ہے، جس سے مقصود اسی نکتے کی وضاحت ہے کہ غیر اللہ کو مافوق الاسباب طریقے سے پکارنا، ان سے استمداد و استغاثہ کرنا، ان سے دعائیں اور التجائیں کرنا یہ ان کی عبادت ہی ہے جس سے انسان مشرک بن جاتا ہے۔

(۳) وَجْهَهُ (اس کا منہ) سے مراد اللہ کی ذات ہے جو وجہ (چہرہ) سے متصف ہے۔ یعنی اللہ کے سوا ہر چیز ہلاک اور فنا ہو جانے والی ہے۔ ﴿كُلُّ شَيْءٍ مِّنْ عِنْدِهَا قَانٍ ۖ وَيَسْتَفِئِي وَجْهَ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ (الرحمن ۲۱: ۲۲)

(۴) یعنی اسی کا فیصلہ، جو وہ چاہے، نافذ ہوتا ہے اور اسی کا حکم، جس کا وہ ارادہ کرے، چلتا ہے۔

(۵) تاکہ وہ نیکیوں کو ان کی نیکیوں کی جزا اور بدوں کو ان کی بدیوں کی سزا دے۔

لَا يُفْتَنُونَ ﴿٢﴾

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ

الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ﴿٣﴾

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ أَنْ يَسْبِقُونَا

سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿٤﴾

آزمائے ہوئے ہی چھوڑ دیں گے؟ (۲)

ان سے انگلوں کو بھی ہم نے خوب جانچا۔ (۲) یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں بھی جان لے گا جو سچ کہتے ہیں اور انہیں بھی معلوم کر لے گا جو جھوٹے ہیں۔ (۳)

کیا جو لوگ برائیاں کر رہے ہیں انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں گے، (۳) یہ لوگ کیسی بری تجویزیں کر رہے ہیں۔ (۴)

(۱) یعنی یہ گمان کہ صرف زبان سے ایمان لانے کے بعد، بغیر امتحان لیے، انہیں چھوڑ دیا جائے گا، صحیح نہیں۔ بلکہ انہیں جان و مال کی تکالیف اور دیگر آزمائشوں کے ذریعے سے جانچا پرکھا جائے گا تاکہ کھرے کھوٹے کا، سچے جھوٹے کا اور مومن و منافق کا پتہ چل جائے۔

(۲) یعنی یہ سنت الہیہ ہے جو پہلے سے چلی آرہی ہے۔ اس لیے وہ اس امت کے مومنوں کی بھی آزمائش کرے گا، جس طرح پہلی امتوں کی آزمائش کی گئی۔ ان آیات کی شان نزول کی روایات میں آتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس ظلم و ستم کی شکایت کی جس کا نشانہ وہ کفار مکہ کی طرف سے بنے ہوئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کی تاکہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”یہ تشدد و ایذا تو اہل ایمان کی تاریخ کا حصہ ہے۔ تم سے پہلے بعض مومنوں کا یہ حال کیا گیا کہ انہیں ایک گڑھا کھود کر اس میں کھڑا کر دیا گیا اور پھر ان کے سروں پر آرا چلا دیا گیا، جس سے ان کے جسم دو حصوں میں تقسیم ہو گئے، اسی طرح لوہے کی کنگھیاں ان کے گوشت پر پڑیوں تک پھیری گئیں۔ لیکن یہ ایذائیں انہیں دین حق سے پھیرنے میں کامیاب نہیں ہوئیں۔“ (صحیح بخاری، کتاب أحادیث الأئسیاء، باب علامات النبوة فی الإسلام) حضرت عمار، ان کی والدہ حضرت سمیہ اور والد حضرت یاسر، حضرت صہیب، بلال و مقداد وغیرہم رضوان اللہ علیہم اجمعین پر اسلام کے ابتدائی دور میں جو ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے، وہ صفحات تاریخ میں محفوظ ہیں۔ یہ واقعات ہی ان آیات کے نزول کا سبب بنے۔ تاہم عموم الفاظ کے اعتبار سے قیامت تک کے اہل ایمان اس میں داخل ہیں۔

(۳) یعنی ہم سے بھاگ جائیں گے اور ہماری گرفت میں نہ آسکیں گے۔

(۴) یعنی اللہ کے بارے میں کس ظن فاسد میں یہ مبتلا ہیں، جب کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور ہر بات سے باخبر بھی۔ پھر اس کی نافرمانی کر کے اس کے مؤاخذہ و عذاب سے بچنا کیوں کر ممکن ہے؟

مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ اللَّهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللَّهِ لَآتٍ
وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ①

جسے اللہ کی ملاقات کی امید ہو پس اللہ کا ٹھہرایا ہوا وقت یقیناً آنے والا ہے،^(۱) وہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔^(۲) (۵)

اور ہر ایک کو شش کرنے والا اپنے ہی بھلے کی کوشش کرتا ہے۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ تمام جہان والوں سے بے نیاز ہے۔^(۳) (۶)

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے مطابق سنت کام کیے ہم ان کے تمام گناہوں کو ان سے دور کر دیں گے اور انہیں ان کے نیک اعمال کے بہترین بدلے دیں گے۔^(۴) (۷)

ہم نے ہر انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی نصیحت کی ہے^(۵) ہاں اگر وہ یہ کوشش کریں کہ

وَمَنْ جَاهِدْ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ
عَنِ الْعَالَمِينَ ②

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ
سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ③

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهِدَاكَ

(۱) یعنی جسے آخرت پر یقین ہے اور وہ اجر و ثواب کی امید پر اعمال صالحہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی امیدیں برلائے گا اور اسے اس کے عملوں کی مکمل جزا عطا فرمائے گا، کیونکہ قیامت یقیناً برپا ہو کر رہے گی اور اللہ کی عدالت ضرور قائم ہوگی۔

(۲) وہ بندوں کی باتوں اور دعاؤں کا سننے والا اور ان کے چھپے اور ظاہر سب عملوں کو جاننے والا ہے۔ اس کے مطابق وہ جزا و سزا بھی یقیناً دے گا۔

(۳) اس کا مطلب وہی ہے جو ﴿مَنْ عَمِلْ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ﴾ (الجاثیہ-۱۵) کا ہے یعنی جو نیک عمل کرے گا، اس کا فائدہ اسی کو ہو گا۔ ورنہ اللہ تعالیٰ تو بندوں کے افعال سے بے نیاز ہے۔ اگر سارے کے سارے متقی بن جائیں تو اس سے اس کی سلطنت میں قوت و اضافہ نہیں ہو گا اور سب نافرمان ہو جائیں تو اس سے اس کی بادشاہی میں کمی نہیں ہوگی۔ الفاظ کی مناسبت سے اس میں جہاد مع الکفار بھی شامل ہے کہ وہ بھی من جملہ اعمال صالحہ ہی ہے۔

(۴) یعنی باوجود اس بات کے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق سے بے نیاز ہے، وہ محض اپنے فضل و کرم سے اہل ایمان کو ان کے عملوں کی بہترین جزا عطا فرمائے گا۔ اور ایک ایک نیکی پر کئی کئی گنا اجر و ثواب دے گا۔

(۵) قرآن کریم کے متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید و عبادت کا حکم دینے کے ساتھ والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے جس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ ربوبیت (الہ واحد) کے تقاضوں کو صحیح طریقے سے وہی سمجھ سکتا اور انہیں ادا کر سکتا ہے جو والدین کی اطاعت و خدمت کے تقاضوں کو سمجھتا اور ادا کرتا ہے۔ جو شخص یہ بات سمجھنے سے قاصر ہے کہ دنیا میں اس کا وجود والدین کی باہمی قربت کا نتیجہ اور اس کی تربیت و پرداخت، ان کی غایت مہربانی

لِعَشْرِكَ بِنِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۗ اَللّٰهُ
مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي
الطَّيِّبِينَ ۝

وَمِنَ النَّاسِ مَنُ يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ فَإِذَا أُوذِيَ
فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةً لِلنَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ وَلَٰكِنَّ

آپ میرے ساتھ اسے شریک کر لیں جس کا آپ کو علم
نہیں تو ان کا کمانہ مانجیے،^(۱) تم سب کا لوٹنا میری ہی طرف
ہے پھر میں ہر اس چیز سے جو تم کرتے تھے تمہیں خبر دوں گا۔ (۸)
اور جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور نیک کام کیے انہیں
میں اپنے نیک بندوں میں شمار کر لوں گا۔^(۲) (۹)

اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو زبانی کہتے ہیں کہ
ہم ایمان لائے ہیں لیکن جب اللہ کی راہ میں
کوئی مشکل آن پڑتی ہے تو لوگوں کی ایذا دہی کو
اللہ تعالیٰ کے عذاب کی طرح بنا لیتے ہیں،^(۳)

اور شفقت کا ثمرہ ہے۔ اس لیے مجھے ان کی خدمت میں کوئی کوتاہی اور ان کی اطاعت سے سرتابی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ
یقیناً خالق کائنات کو سمجھنے اور اس کی توحید و عبادت کے تقاضوں کی ادائیگی سے بھی قاصر رہے گا۔ اسی لیے احادیث میں
بھی والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بڑی تاکید آئی ہے۔ ایک حدیث میں والدین کی رضامندی کو اللہ کی رضا اور ان کی
ناراضی کو رب کی ناراضی کا باعث قرار دیا گیا ہے۔

(۱) یعنی والدین اگر شرک کا حکم دیں (اور اسی میں دیگر معاصی کا حکم بھی شامل ہے) اور اس کے لیے خاص کوشش بھی کریں۔
(جیسا کہ مجاہدہ کے لفظ سے واضح ہے) تو ان کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ «لَا طَاعَةَ لَآحَدٍ فِي مَعْصِيَةِ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَ
تَعَالَىٰ» (مسند أحمد ۶/۶۶۷ والصحيحه للآلبانی 'نمبر ۱۷۹۰) «اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں»۔

اس آیت کی شان نزول میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما کا واقعہ آتا ہے کہ ان کے مسلمان ہونے پر ان کی والدہ نے
کہا کہ میں نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی، یہاں تک کہ مجھے موت آجائے یا پھر تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کا انکار کر
دے، بالآخر یہ اپنی والدہ کو زبردستی منہ کھول کر کھلاتے، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (صحیح مسلم، ترمذی،
تفسیر سورۃ العنکبوت)

(۲) یعنی اگر کسی کے والدین مشرک ہوں گے تو مومن بیٹا نیکیوں کے ساتھ ہو گا، والدین کے ساتھ نہیں۔ اس لیے کہ گو
والدین دنیا میں اس کے بہت قریب رہے ہوں گے لیکن اس کی محبت دینی اہل ایمان ہی کے ساتھ تھی بنا بریں اَلْمَرْءُ مَعَ
مَنْ أَحَبَّ کے تحت وہ زمرہ صالحین میں ہو گا۔

(۳) اس میں اہل نفاق یا کمزور ایمان والوں کا حال بیان کیا گیا ہے کہ ایمان کی وجہ سے انہیں ایذا پہنچتی ہے تو عذاب الہی
کی طرح وہ ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ نتیجتاً وہ ایمان سے پھر جاتے اور دین عوام کو اختیار کر لیتے ہیں۔

ہاں اگر اللہ کی مدد آجائے^(۱) تو پکار اٹھتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھی ہی ہیں^(۲) کیا دنیا جہان کے سینوں میں جو کچھ ہے اس سے اللہ تعالیٰ دانا نہیں ہے؟^(۳) (۱۰)
جو لوگ ایمان لائے اللہ انہیں بھی ظاہر کر کے رہے گا اور منافقوں کو بھی ظاہر کر کے رہے گا۔^(۴) (۱۱)

کافروں نے ایمان والوں سے کہا کہ تم ہماری راہ کی تابعداری کرو تمہارے گناہ ہم اٹھالیں گے،^(۵) حالانکہ وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی نہیں اٹھانے والے، یہ

جَاءَ نَصْرُ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ أَوْ لَيْسَ
اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ ۝

وَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنَافِقِينَ ۝

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا سَابِلَنَا
وَلْتَحْمِلْ كَفَرْتَكُمْ وَهُمْ حَطِيبِينَ ۝ مَنْ خَلَّيْهُ مِنْ شَيْءٍ

(۱) یعنی مسلمانوں کو فتح و غلبہ نصیب ہو جائے۔

(۲) یعنی تمہارے دینی بھائی ہیں۔ یہ وہی مضمون ہے جو دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ ”وہ لوگ تمہیں دیکھتے رہتے ہیں، اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح ملتی ہے، تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ اور اگر حالات کافروں کے لیے کچھ سازگار ہوتے ہیں تو کافروں سے جا کر کہتے ہیں کہ کیا ہم نے تم کو گھیر نہیں لیا تھا اور مسلمانوں سے تم کو نہیں بچایا تھا۔“ (النساء-۱۳۱)

(۳) یعنی کیا اللہ ان باتوں کو نہیں جانتا جو تمہارے دلوں میں ہے اور تمہارے ضمیروں میں پوشیدہ ہے۔ گو تم زبان سے مسلمانوں کا ساتھی ہونا ظاہر کرتے ہو۔

(۴) اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ خوشی اور تکلیف دے کر آزمائے گا تاکہ منافق اور مومن کی تمیز ہو جائے جو دونوں حالتوں میں اللہ کی اطاعت کرے گا، وہ مومن ہے اور جو صرف خوشی اور راحت میں اطاعت کرے گا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ صرف اپنے حظ نفس کا مطیع ہے، اللہ کا نہیں۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَلَتَبْلُوكُمْ حَتَّىٰ تَقْتُلُوهُمْ أَوْ تُسَبِّحُوا لَهُمْ مَسْجِدًا وَصَلُّوا فِيهِ وَتَكْبِرُوا لِلَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (سورۃ محمد - ۳۱) ”ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے، تاکہ ہم جان لیں تم میں مجاہد اور صابر کون ہیں اور تمہارے دیگر حالات بھی جانچیں گے۔“ جنگ احد کے بعد، جس میں مسلمان اختیار و امتحان کی بھٹی سے گزرے گئے تھے، فرمایا ﴿مَا كَانَ اللَّهُ لِيُذَيِّدَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَكْتُمُ عَلَيْهِمْ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ (سورۃ آل عمران-۱۱۷) ”نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ وہ چھوڑ دے مومنوں کو، اس حالت پر جس پر کہ تم ہو، یہاں تک کہ وہ جدا کر دے ناپاک کو پاک سے“

(۵) یعنی تم اسی آبائی دین کی طرف لوٹ آؤ، جس پر ہم ابھی تک قائم ہیں، اس لیے کہ وہی دین صحیح ہے۔ اگر اس روایتی مذہب پر عمل کرنے سے تم گناہ گار ہو گے تو اس کے ذمے دار ہم ہیں، وہ بوجہ ہم اپنی گردنوں پر اٹھائیں گے۔

إِنَّمَا لِكُلِّ لِقْوٍ ⑫

وَيَعْبُدُونَ أَتْقَانَهُمْ وَأَتْقَانَ لَمَسَةِ أَتْقَانِهِمْ وَيَكْتُمُونَ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ⑬

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ
إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا فَأَخَذَهُمُ الطُّوفَانُ وَهُمْ ظَالِمُونَ ⑭

فَأَنْجَيْنَاهُ وَأَصْحَابَ السَّفِينَةِ وَجَعَلْنَاهَا آيَةً لِلْعَالَمِينَ ⑮

وَأَبْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ ذَلِكُمْ

تو محض جھوٹے ہیں۔^(۱) (۱۳)

البتہ یہ اپنے بوجھ ڈھولیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ
ہی اور بوجھ بھی۔^(۲) اور جو کچھ افترا پر دازیاں کر رہے ہیں
ان سب کی بابت ان سے باز پرس کی جائے گی۔ (۱۳)

اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف بھیجا
وہ ان میں ساڑھے نو سو سال تک رہے،^(۳) پھر تو انہیں
طوفان نے دھر پکڑا اور وہ تھے بھی ظالم۔ (۱۴)

پھر ہم نے انہیں اور کشتی والوں کو نجات دی اور اس واقعہ
کو ہم نے تمام جہان کے لیے عبرت کا نشان بنا دیا۔ (۱۵)
اور ابراہیم (علیہ السلام) نے بھی اپنی قوم سے فرمایا کہ

(۱) اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ جھوٹے ہیں۔ قیامت کا دن تو ایسا ہو گا کہ وہاں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ﴿ وَلَا تَحْزُرُوا لِقْوَةَ
يَوْمَئِذٍ ﴾ وہاں تو ایک دوست، دوسرے دوست کو نہیں پوچھے گا چاہے ان کے درمیان نہایت گہری دوستی ہو۔
﴿ وَلَا تَسْتَلْ حَيْثُ حَبِيبًا ﴾ (المعارج: ۱۰) حتیٰ کہ رشتے دار ایک دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائیں گے ﴿ وَلَا تَنْتَهِمْ عَنِ
إِلٰهِمْ لِيُحْمَلُوهُ مِنْهُ بَعْدَ إِذْ حُرُّوا ﴾ (سورۃ فاطر: ۱۸) اور یہاں بھی اس بوجھ کے اٹھانے کی نفی فرمائی۔

(۲) یعنی یہ ائمہ کفر اور داعیان ضلال اپنا ہی بوجھ نہیں اٹھائیں گے، بلکہ ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی ان پر ہو گا جو
ان کی سعی و کوشش سے گمراہ ہوئے تھے۔ یہ مضمون سورۃ النحل آیت ۲۵ میں بھی گزر چکا ہے۔ حدیث میں ہے: جو ہدایت
کی طرف بلاتا ہے، اس کے لیے اپنی نیکیوں کے اجر کے ساتھ ان لوگوں کی نیکیوں کا اجر بھی ہو گا جو اس کی وجہ سے
قیامت تک ہدایت کی پیروی کریں گے، بغیر اس کے کہ ان کے اجر میں کوئی کمی ہو۔ اور جو گمراہی کا داعی ہو گا، اس کے
لیے اپنے گناہوں کے علاوہ ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی ہو گا جو قیامت تک اس کی وجہ سے گمراہی کا راستہ اختیار
کرنے والے ہوں گے، بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کمی ہو۔ (ابوداؤد، کتاب السنۃ، باب لزوم السنۃ۔ ابن
ماجہ، المقدمة، باب من سن سنۃ حسنۃ أو سئیۃ، اسی اصول سے قیامت تک ظلم سے قتل کیے جانے والوں
کے خون کا گناہ آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے (قابیل) پر ہو گا۔ اس لیے کہ سب سے پہلے اسی نے ناحق قتل کیا تھا۔ مسند
أحمد ۱/۳۸۳ وقد أخرجہ الجماعة سوى أبي داود من طرق)

(۳) قرآن کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی دعوت و تبلیغ کی عمر ہے۔ ان کی پوری عمر کتنی تھی؟ اس کی
صراحت نہیں کی گئی۔ بعض کہتے ہیں چالیس سال نبوت سے قبل اور ساٹھ سال طوفان کے بعد، اس میں شامل کر لیے
جائیں۔ اور بھی کئی اقوال ہیں، واللہ أعلم بالصواب۔

حَيَّرَ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۱﴾

اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرتے رہو، اگر تم میں دانائی ہے تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ (۱۱)

تم تو اللہ تعالیٰ کے سوا بتوں کی پوجا پٹ کر رہے ہو اور جھوٹی باتیں دل سے گھڑ لیتے ہو۔^(۱) سنو! جن جنکی تم اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا پٹ کر رہے ہو وہ تو تمہاری روزی کے مالک نہیں پس تمہیں چاہیے کہ تم اللہ تعالیٰ ہی سے روزیاں طلب کرو اور اسی کی عبادت کرو اور اسی کی شکر گزاری کرو^(۲) اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔^(۳) (۱۷)

اور اگر تم جھٹلاؤ تو تم سے پہلے کی امتوں نے بھی جھٹلایا ہے،^(۴)

إِنَّمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا وَتَخْلُقُونَ إِفْكًا إِنَّ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَمَا يَلْبَسُونَ لَكُمُ رِيًّا قَالُوا أَتَعْبُدُوا إِلَهًا اللَّهُ الرَّزْقِ وَاعْبَادُهُ وَإِسْكَرُؤَالَهُ إِلَيْهِ شُرَعُونَ ﴿۱۲﴾
وَإِنْ كُنْتُمْ يُؤَاقِدُونَ كَذَّبَ أَمْرٌ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَا

(۱) اَوْثَانٌ: وثن کی جمع ہے۔ جس طرح اَصْنَامٌ، صَنَمٌ کی جمع ہے۔ دونوں کے معنی بت کے ہیں۔ بعض کہتے ہیں صنم، سونے، چاندی، پیتل اور پتھر کی مورت کو اور وثن مورت کو بھی اور چونے کے پتھر وغیرہ کے بنے ہوئے آستانوں کو بھی کہتے ہیں۔ تَخْلُقُونَ إِفْكًا کے معنی ہیں تَخْذِبُونَ كَذِبًا، جیسا کہ متن کے ترجمہ سے واضح ہے۔ دوسرے معنی ہیں تَعْمَلُونَهَا وَتَنْحَتُونَهَا لِلْإِفْكِ، جھوٹے مقصد کے لیے انہیں بناتے اور گھڑتے ہو۔ مفہوم کے اعتبار سے دونوں ہی معنی صحیح ہیں۔ یعنی اللہ کو چھوڑ کر تم جن بتوں کی عبادت کرتے ہو، وہ تو پتھر کے بنے ہوئے ہیں جو بن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں، نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع۔ اپنے دل سے ہی تم نے انہیں گھڑ لیا ہے کوئی دلیل تو ان کی صداقت کی تمہارے پاس نہیں ہے۔ یا یہ بت تو وہ ہیں جنہیں تم خود اپنے ہاتھوں سے تراشتے اور گھڑتے ہو اور جب ان کی ایک خاص شکل و صورت بن جاتی ہے تو تم سمجھتے ہو کہ اب ان میں خدائی اختیارات آگئے ہیں اور ان سے تم امیدیں وابستہ کر کے انہیں حاجت روا اور مشکل کشا پاور کر لیتے ہو۔

(۲) یعنی جب یہ بت تمہاری روزی کے اسباب و وسائل میں سے کسی بھی چیز کے مالک نہیں ہیں، نہ بارش برسا سکتے ہیں، نہ زمین میں درخت اگا سکتے ہیں اور نہ سورج کی حرارت پہنچا سکتے ہیں اور نہ تمہیں وہ صلاحیتیں دے سکتے ہیں، جنہیں بروئے کار لا کر تم قدرت کی ان چیزوں سے فیض یاب ہوتے ہو، تو پھر تم روزی اللہ ہی سے طلب کرو، اسی کی عبادت اور اسی کی شکر گزاری کرو۔

(۳) یعنی مرکز اور پھر دوبارہ زندہ ہو کر جب اسی کی طرف لوٹنا ہے، اسی کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے تو پھر اس کا در چھوڑ کر دوسروں کے در پر اپنی جبین نیاز کیوں جھکاتے ہو؟ اس کے بجائے دوسروں کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ اور دوسروں کو حاجت روا اور مشکل کشا کیوں سمجھتے ہو؟

(۴) یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول بھی ہو سکتا ہے، جو انہوں نے اپنی قوم سے کہا۔ یا اللہ تعالیٰ کا قول ہے جس میں

عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغَ الْمُبِينُ ﴿۱۸﴾

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ

إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿۱۹﴾

فَلْيَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ

الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنثِيهِ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ إِنَّ

اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۰﴾

يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَشَاءُ وَإِلَيْهِ تُعْجَبُونَ ﴿۲۱﴾

رسول کے ذمہ تو صرف صاف طور پر پہنچانا ہی ہے۔ (۱۸)^(۱)
کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ مخلوق کی ابتدا کس طرح اللہ
نے کی پھر اللہ اس کا اعادہ کرے گا،^(۲) یہ تو اللہ تعالیٰ پر
بست ہی آسان ہے۔ (۱۹)^(۳)

کہہ دیجئے! کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو تو سہی^(۴) کہ کس
طرح اللہ تعالیٰ نے ابتداءً پیدائش کی۔ پھر اللہ تعالیٰ ہی
دوسری نئی پیدائش کرے گا، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲۰)
جسے چاہے عذاب کرے جس پر چاہے رحم کرے، سب
اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ (۲۱)^(۵)

اہل مکہ سے خطاب ہے اور اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ کفار مکہ اگر آپ کو جھٹلا رہے ہیں تو
اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پیغمبروں کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے۔ پہلی امتیں بھی رسولوں کو جھٹلاتی اور اس کا
نتیجہ بھی وہ ہلاکت و تباہی کی صورت میں بھگتی رہی ہیں۔

(۱) اس لیے آپ بھی تبلیغ کا کام کرتے رہیے۔ اس سے کوئی راہ یاب ہوتا ہے یا نہیں؟ اس کے ذمے دار آپ نہیں
ہیں، نہ آپ سے اس کی بات پوچھا ہی جائے گا، کیونکہ ہدایت دینا نہ صرف اللہ کے اختیار میں ہے، جو اپنی سنت
کے مطابق، جس میں ہدایت کی طلب صادق دیکھتا ہے، اس کو ہدایت سے نواز دیتا ہے۔ دوسروں کو ضلالت کی تاریکیوں
میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔

(۲) توحید و رسالت کے اثبات کے بعد، یہاں سے معاد (آخرت) کا اثبات کیا جا رہا ہے جس کا کفار انکار کرتے تھے۔ فرمایا
پہلی مرتبہ پیدا کرنے والا بھی وہی ہے جب تمہارا سرے سے وجود ہی نہیں تھا، پھر تم دیکھنے سننے اور سمجھنے والے بن گئے
اور پھر جب مر کر تم مٹی میں مل جاؤ گے، بظاہر تمہارا نام و نشان تک نہیں رہے گا، اللہ تعالیٰ تمہیں دوبارہ زندہ فرمائے گا۔
(۳) یعنی یہ بات چاہے تمہیں کتنی ہی مشکل لگے، اللہ کے لیے بالکل آسان ہے۔

(۴) یعنی آفاق میں پھیلی ہوئی اللہ کی نشانیاں دیکھو زمین پر غور کرو، کس طرح اسے بچھایا، اس میں پہاڑ، وادیاں، نہریں
اور سمندر بنائے، اسی سے انواع و اقسام کی روزیاں اور پھل پیدا کیے۔ کیا یہ سب چیزیں اس بات پر دلالت نہیں کرتیں
کہ انہیں بنایا گیا ہے اور ان کا کوئی بنانے والا ہے؟

(۵) یعنی وہی اصل حاکم اور متصرف ہے، اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا۔ تاہم اس کا عذاب یا رحمت، یوں ہی اللہ شپ
نہیں ہوگی، بلکہ ان اصولوں کے مطابق ہوگی جو اس نے اس کے لیے طے کر رکھے ہیں۔

تم نہ تو زمین میں اللہ تعالیٰ کو عاجز کر سکتے ہو نہ آسمان میں اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی والی ہے نہ مددگار۔ (۲۲)

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور اس کی ملاقات کو بھلاتے ہیں وہ میری رحمت سے ناامید ہو جائیں^(۱) اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (۲۳)

ان کی قوم کا جواب بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ کہنے لگے کہ اسے مار ڈالو یا اسے جلا دو۔^(۲) آخرش اللہ نے انہیں

وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ دَلِيلٍ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۲۲﴾

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَلِقَائِهِ أُولَئِكَ يَكْفُرُونَ وَمَنْ تَحْتَتَىٰ وَأُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۲۳﴾

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ

(۱) اللہ تعالیٰ کی رحمت، دنیا میں عام ہے جس سے کافر اور مومن، منافق اور مخلص اور نیک اور بد سب یکساں طور پر مستفیض ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو دنیا کے وسائل، آسائشیں اور مال و دولت عطا کر رہا ہے یہ رحمت الہی کی وہ وسعت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (الأعراف: ۱۵۶) ”میری رحمت نے ہر چیز کو گیر لیا ہے۔“ لیکن آخرت چونکہ دارالجزا ہے، انسان نے دنیا کی کھیتی میں جو کچھ بویا ہو گا، اسی کی فصل اسے وہاں کاٹنی ہو گی، جیسے عمل کیے ہوں گے، اسی کی جزا اسے وہاں ملے گی۔ اللہ کی بارگاہ میں بے لاگ فیصلے ہوں گے۔ دنیا کی طرح اگر آخرت میں بھی نیک و بد کے ساتھ یکساں سلوک ہو اور مومن و کافروں ہی رحمت الہی کے مستحق قرار پائیں تو اس سے ایک تو اللہ تعالیٰ کی صفت عدل پر حرف آتا ہے، دوسرے قیامت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ قیامت کا دن تو اللہ نے رکھا ہی اس لیے ہے کہ وہاں نیکیوں کو ان کی نیکیوں کے صلے میں جنت اور بدوں کو ان کی بدیوں کی جزا میں جہنم دی جائے۔ اس لیے قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کی رحمت صرف اہل ایمان کے لیے خاص ہو گی۔ جسے یہاں بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ آخرت اور معاد کے ہی منکر ہوں گے وہ میری رحمت سے ناامید ہوں گے یعنی ان کے حصے میں رحمت الہی نہیں آئے گی۔ سورہ اعراف میں اس کو ان الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ ﴿فَمَا كَفَرْنَا بِالَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزُّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا لِيُؤْمِنُوا﴾ (الأعراف: ۱۵۶) ”میں یہ رحمت (آخرت میں) ان لوگوں کے لیے لکھوں گا جو متقی، زکوٰۃ ادا کرنے والے اور ہماری آیتوں پر ایمان رکھنے والے ہوں گے۔“

(۲) ان آیات سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان ہو رہا تھا، اب پھر اس کا بقیہ بیان کیا جا رہا ہے۔ درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر اللہ کی توحید اور اس کی قدرت و طاقت کو بیان کیا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے وعظ کا حصہ ہے، جس میں انہوں نے توحید و معاد کے اثبات میں دلائل دیئے ہیں، جن کا کوئی جواب جب ان کی قوم سے نہیں بنا تو انہوں نے اس کا جواب ظلم و تشدد کی اس کارروائی سے دیا، جس کا ذکر اس آیت میں ہے کہ اسے قتل کر دیا جلا ڈالو۔ چنانچہ انہوں نے آگ کا ایک بست بڑا ڈال دیا اور تیار کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجلیق کے ذریعے سے اس میں پھینک دیا۔

فَأَنجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ
مُّؤْمِنُونَ ﴿۲۳﴾

وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ
بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ
بَعْضُكُم بَعْضًا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم
مِن نَّاصِرِينَ ﴿۲۴﴾

فَأَمَّنْ لَهُ لَوْظَةٌ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَى رَبِّي إِنَّكَ
هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۲۵﴾

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ

آگ سے بچالیا،^(۱) اس میں ایمان والے لوگوں کے لیے
تو بہت سی نشانیاں ہیں۔ (۲۳)

(حضرت ابراہیم علیہ السلام نے) کہا کہ تم نے جن بتوں
کی پرستش اللہ کے سوا کی ہے انہیں تم نے اپنی آپس کی
دنوی دوستی کی بنا ٹھہرائی ہے،^(۲) تم سب قیامت کے
دن ایک دوسرے سے کفر کرنے لگو گے اور ایک
دوسرے پر لعنت کرنے لگو گے۔^(۳) اور تمہارا سب کا
ٹھکانہ دوزخ ہو گا اور تمہارا کوئی مددگار نہ ہو گا۔ (۲۴)

پس حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر حضرت لوط (علیہ السلام)
ایمان لائے^(۴) اور کہنے لگے کہ میں اپنے رب کی طرف
ہجرت کرنے والا ہوں۔^(۵) وہ بڑا ہی غالب اور حکیم ہے۔ (۲۵)
اور ہم نے انہیں (ابراہیم کو) اسحاق و یعقوب (علیہما السلام)
عطا کیے اور ہم نے نبوت اور کتاب ان کی اولاد میں ہی کر دی^(۶)

(۱) یعنی اللہ نے اس آگ کو گزار کی صورت میں بدل کر اپنے بندے کو بچالیا، جیسا کہ سورہ انبیاء میں گزرا۔

(۲) یعنی یہ تمہارے قومی بت ہیں جو تمہاری اجتماعیت اور آپس کی دوستی کی بنیاد ہیں۔ اگر تم ان کی عبادت چھوڑ دو تو
تمہاری قومیت اور دوستی کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

(۳) یعنی قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار اور دوستی کے بجائے ایک دوسرے پر لعنت کرو گے اور تابع، متبوع
کو ملامت اور متبوع، تابع سے بیزاری کا اظہار کریں گے۔

(۴) حضرت لوط علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے برادر زادے تھے، یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لائے، بعد
میں ان کو بھی ”سدوم“ کے علاقے میں نبی بنا کر بھیجا گیا۔

(۵) یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا اور بعض کے نزدیک حضرت لوط علیہ السلام نے۔ اور بعض کہتے ہیں دونوں نے
ہی ہجرت کی۔ یعنی جب ابراہیم علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے لوط علیہ السلام کے لیے اپنے علاقے، ”سکونی“
میں، جو حران کی طرف جاتے ہوئے کوفہ کی ایک بستی تھی، اللہ کی عبادت کرنی مشکل ہو گئی تو وہاں سے ہجرت کر کے
شام کے علاقے میں چلے گئے۔ تیسری، ان کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ سارہ تھیں۔

(۶) یعنی حضرت اسحاق علیہ السلام سے یعقوب علیہ السلام ہوئے، جن سے بنی اسرائیل کی نسل چلی اور انہی میں سارے
انبیاء ہوئے، اور کتابیں آئیں۔ آخر میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے

الْثُّبُوءَ وَالْكُثْبَ وَالْتَيْنَةَ أَجْرًا فِي الذُّبَابِ وَرَائِهِ
فِي الْآخِرَةِ لِمَنِ الظَّالِمِينَ ۝

وَلَوْ طَآرِدًا قَالَ لِقَوْمِهِ إِنِّي لَأَتُونُ الْفَاحِشَةَ
مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ ۝

إِنِّي لَأَتُونُ الْجِبَالَ وَقَطْعُونَ السَّيْلَ وَتَأْتُونَ

اور ہم نے دنیا میں بھی اسے ثواب دیا^(۱) اور آخرت میں تو وہ
صالح لوگوں میں سے ہے۔^(۲) (۲۷)

اور حضرت لوط (علیہ السلام) کا بھی ذکر کرو جب کہ انہوں
نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم تو اس بدکاری پر اتر آئے ہو^(۳)

جسے تم سے پہلے دنیا بھر میں سے کسی نے نہیں کیا۔ (۲۸)
کیا تم مردوں کے پاس بد فعلی کے لیے آتے ہو^(۴) اور
راستے بند کرتے ہو^(۵) اور اپنی عام مجلسوں میں بے

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے نبی ہوئے اور آپ ﷺ پر قرآن نازل ہوا۔

(۱) اس اجر سے مراد رزق دنیا بھی ہے اور ذکر خیر بھی۔ یعنی دنیا میں ہر مذہب کے لوگ (عیسائی، یہودی وغیرہ حتیٰ کہ
مشرکین بھی) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عزت و تکریم کرتے ہیں اور مسلمان تو ہیں ہی ملت ابراہیمی کے پیرو، ان کے
باں وہ محترم کیوں نہ ہوں گے؟

(۲) یعنی آخرت میں بھی وہ بلند درجات کے حامل اور زمرہ صالحین میں ہوں گے۔ اسی مضمون کو دوسرے مقام پر اس
طرح بیان فرمایا ﴿وَالتَّيْنَةَ فِي الذُّبَابِ حَسَنَةً وَرَائِهِ فِي الْآخِرَةِ لِمَنِ الظَّالِمِينَ﴾ (سورۃ النحل: ۱۲۲)

(۳) اس بدکاری سے مراد وہی لواط ہے جس کا ارتکاب قوم لوط علیہ السلام نے ہی سب سے پہلے کیا، جیسا کہ قرآن
نے صراحت کی ہے۔

(۴) یعنی تمہاری شہوت پرستی اس انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ اس کے لیے طبعی طریقے تمہارے لیے ناکافی ہو گئے ہیں اور غیر
طبعی طریقہ تم نے اختیار کر لیا ہے۔ جنسی شہوت کی تسکین کے لیے طبعی طریقہ اللہ تعالیٰ نے بیویوں سے مباشرت کی
صورت میں رکھا ہے۔ اسے چھوڑ کر اس کام کے لیے مردوں کی دبر استعمال کرنا غیر فطری اور غیر طبعی طریقہ ہے۔

(۵) اس کے ایک معنی تو یہ کیے گئے ہیں کہ آنے جانے والے مسافروں، نوواردوں اور گزرنے والوں کو زبردستی پکڑ پکڑ
کر تم ان سے بے حیائی کا کام کرتے ہو، جس سے لوگوں کے لیے راستوں سے گزرنا مشکل ہو گیا اور لوگ گھروں میں
بیٹھے رہنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔ دوسرے معنی ہیں کہ تم آنے جانے والوں کو لوٹ لیتے اور قتل کر دیتے ہو یا ازراہ
شرارت انہیں کنکریاں مارتے ہو۔ تیسرے معنی کیے گئے ہیں کہ سرراہ ہی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو جس سے وہاں
سے گزرتے ہوئے لوگ شرم محسوس کرتے ہیں۔ ان تمام صورتوں سے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ امام شوکانی فرماتے ہیں
کہ کسی ایک خاص سبب کی تعین تو مشکل ہے تاہم وہ ایسا کام ضرور کرتے تھے، جس سے عملاً راستہ بند ہو جاتا تھا۔ قطع
طریق کے ایک معنی قطع نسل کے بھی کیے گئے ہیں۔ یعنی عورتوں کی شرم گاہوں کو استعمال کرنے کے بجائے مردوں کی
دبر استعمال کر کے تم اپنی نسل بھی منقطع کرنے میں لگے ہوئے ہو۔ (فتح القدیر)

حیائیوں کا کام کرتے ہو؟^(۱) اس کے جواب میں اس کی قوم نے بجز اس کے اور کچھ نہیں کہا کہ بس^(۲) جا اگر سچا ہے تو ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کا عذاب لے آ۔ (۲۹)

حضرت لوط (علیہ السلام) نے دعا کی^(۳) کہ پروردگار! اس مفسد قوم پر میری مدد فرما۔ (۳۰)

اور جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس بشارت لے کر پہنچے کہنے لگے کہ اس بستی والوں کو ہم ہلاک کرنے والے ہیں،^(۴) یقیناً یہاں کے رہنے والے گنہگار ہیں۔ (۳۱)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا اس میں تو لوط (علیہ السلام) ہیں، فرشتوں نے کہا یہاں جو ہیں ہم انہیں بخوبی جانتے ہیں۔^(۵) لوط (علیہ السلام) کو اور اس کے خاندان کو سوائے اس کی بیوی کے ہم بچالیں گے، البتہ وہ عورت پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔^(۶) (۳۲)

فِي نَادِيكُمُ الْمُنْكَرَ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا اسْتَبْرَأْ عَنَّا يَا اللَّهُ إِنَّ كُنُوتَ مِنَ الضَّالِّينَ ۝

قَالَ رَبِّ انصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِينَ ۝

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ قَالُوا إِنَّا مُهْلِكُوا أَهْلَ هَذِهِ الْقَرْيَةِ إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوا ظَالِمِينَ ۝

قَالَ إِنَّ فِيهَا لُوطًا قَالُوا مَنْ أَعْلَمُ بِمَنْ فِيهَا لَنَنْجِيَنَّهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ۝

(۱) یہ بے حیائی کیا تھی؟ اس میں بھی مختلف اقوال ہیں، مثلاً لوگوں کو کنکریاں مارنا، اجنبی مسافر کا استہزاء و استخفاف، مجلسوں میں پادارنا، ایک دوسرے کے سامنے اظلام بازی، شطرنج وغیرہ قسم کی قمار بازی، رنگے ہوئے کپڑے پہننا، وغیرہ۔ امام شوکانی فرماتے ہیں ”کوئی بعید نہیں کہ وہ یہ تمام ہی منکرات کرتے رہے ہوں۔“

(۲) حضرت لوط علیہ السلام نے جب انہیں ان منکرات سے منع کیا تو اس کے جواب میں کہا...

(۳) یعنی جب حضرت لوط علیہ السلام قوم کی اصلاح سے ناامید ہو گئے تو اللہ سے مدد کی دعا فرمائی...

(۴) یعنی حضرت لوط علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی گئی اور اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو ہلاک کرنے کے لیے بھیج دیا۔ وہ فرشتے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس گئے اور انہیں اسحاق علیہ السلام و یعقوب علیہ السلام کی خوش خبری دی اور ساتھ ہی بتلایا کہ ہم لوط علیہ السلام کی بستی ہلاک کرنے آئے ہیں۔

(۵) یعنی ہمیں علم ہے کہ اختیار اور مومن کون ہیں اور اشرار کون؟

(۶) یعنی ان پیچھے رہ جانے والوں میں سے، جن کو عذاب کے ذریعے سے ہلاک کیا جاتا ہے وہ چونکہ مومنہ نہیں تھی بلکہ اپنی قوم کی طرف دار تھی، اس لیے اسے بھی ہلاک کر دیا گیا۔

پھر جب ہمارے قاصد لوط (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو وہ ان کی وجہ سے غمگین ہوئے اور دل ہی دل میں رنج کرنے لگے۔^(۱) قاصدوں نے کہا آپ نہ خوف کھائیے نہ آزرده ہوں، ہم آپ کو مع آپ کے متعلقین کے بچالیں گے مگر آپ کی بیوی^(۲) کی وہ عذاب کے لیے باقی رہ جانے والوں میں سے ہوگی۔ (۳۳)

ہم اس بستی والوں پر آسمانی عذاب نازل کرنے والے ہیں^(۳) اس وجہ سے کہ یہ بے حکم ہو رہے ہیں۔ (۳۴) البتہ ہم نے اس بستی کو صریح عبرت کی نشانی بنا دیا^(۴) ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔ (۳۵)^(۵)

وَلَمَّا أَنْ جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيقَىٰ إِلَيْهِمْ وَصَاقَ بِهِمْ دُرْعًا وَقَالُوا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ إِنَّا نَأْتِيكَ بِمَنْجُوتٍ مَّا وَهَلَكُ إِلَّا أُمَّرَاتُكَ كَانَتْ مِنَ الْغَائِبِينَ ﴿۳۳﴾

إِنَّا نُنزِّلُ الْوَيْلَ عَلَىٰ أَهْلِ هَذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۳۴﴾
وَلَقَدْ زَكَّيْنَاهَا آيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۳۵﴾

(۱) سِيقَىٰ بِهِمْ کے معنی ہیں۔ ان کے پاس ایسی چیز آئی جو انہیں بری لگی اور اس سے ڈر گئے۔ اس لیے کہ لوط علیہ السلام نے ان فرشتوں کو، جو انسانی شکل میں آئے تھے، انسان ہی سمجھا۔ ڈرے اپنی قوم کی عادت بد اور سرکشی کی وجہ سے کہ ان خوبصورت مہمانوں کی آمد کا علم اگر انہیں ہو گیا تو وہ ان سے زبردستی بے حیائی کا ارتکاب کریں گے، جس سے میری رسوائی ہو گی۔ صَاقَ بِهِمْ دُرْعًا یہ کنایہ ہے عاجزی سے۔ جیسے صَاقَتْ يَدُهُ (ہاتھ کا ٹنگ ہونا) کنایہ ہے فقر سے۔ یعنی ان خوش شکل مہمانوں کو بد خصلت قوم سے بچانے کی کوئی تدبیر انہیں نہیں سوجھی، جس کی وجہ سے وہ غمگین اور دل ہی دل میں پریشان تھے۔ (۲) فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی اس پریشانی اور غم و حزن کی کیفیت کو دیکھا تو انہیں تسلی دی، اور کہا کہ آپ کوئی خوف اور حزن نہ کریں، ہم اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔ ہمارا مقصد آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو، سوائے آپ کی بیوی کے، نجات دلانا ہے۔

(۳) اس آسمانی عذاب سے وہی عذاب مراد ہے جس کے ذریعے سے قوم لوط کو ہلاک کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے ان کی بستیوں کو زمین سے اٹھایا آسمان کی بلندیوں تک لے گئے، پھر ان کو ان ہی پر لٹا دیا گیا، اس کے بعد کھنگر پتھروں کی بارش ان پر ہوئی اور اس جگہ کو سخت بدبودار بحیرہ (چھوٹے سمندر) میں تبدیل کر دیا گیا۔ (ابن کثیر) (۴) یعنی پتھروں کے وہ آثار، جن کی بارش ان پر ہوئی سیاہ بدبودار پانی اور لٹی ہوئی بستیاں، یہ سب عبرت کی نشانیاں ہیں۔ مگر کن کے لیے؟ دانش مندوں کے لیے۔

(۵) اس لیے کہ وہی معلومات پر غور کرتے، اسباب و عوامل کا تجزیہ کرتے اور نتائج و آثار کو دیکھتے ہیں لیکن جو لوگ عقل و شعور سے بے بہرہ ہوتے ہیں، انہیں ان چیزوں سے کیا تعلق؟ وہ تو ان جانوروں کی طرح ہیں جنہیں ذبح کے لیے بوجھ خانے لے جایا جاتا ہے لیکن انہیں اس کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اس میں مشرکین مکہ کے لیے بھی تعریض ہے کہ وہ بھی تکذیب کا مظاہرہ کر رہے ہیں جو عقل و دانش سے بے بہرہ لوگوں کا ولیہ ہے۔

اور مدین کی طرف ^(۱) ہم نے ان کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو بھیجا انہوں نے کہا اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو قیامت کے دن کی توقع رکھو ^(۲) اور زمین میں فساد نہ کرتے پھرو۔ ^(۳) (۳۶)

پھر بھی انہوں نے انہیں جھٹلایا آخرش انہیں زلزلے نے پکڑ لیا اور وہ اپنے گھروں میں بیٹھے کے بیٹھے مردہ ہو کر رہ گئے۔ ^(۴) (۳۷)

اور ہم نے عادیوں اور ثمودیوں کو بھی عارت کیا جن کے بعض مکانات تمہارے سامنے ظاہر ہیں ^(۵) اور شیطان نے انہیں انکی بد اعمالیاں آراستہ کر دکھائی تھیں اور انہیں راہ سے روک دیا تھا باوجودیکہ یہ آنکھوں والے اور ہوشیار تھے۔ ^(۶) (۳۸)

اور قارون اور فرعون اور ہامان کو بھی، ان کے پاس

وَالْمَدِينِ أَخَاهُ شُعَيْبًا أَتَّكَلَّ بِقَوْمِهِ إِعْتِبَارًا وَكَانَ يُنذِرُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْمُنَادِ وَتَوَسَّوْا فِي الرِّضَىٰ مُعْتَدِينَ ۝

فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جِثِيمِينَ ۝

وَعَادَ أَصْحَابَ عَادٍ وَإِنَّمَا كُنَّا مِنْ عِبَادِنَا مُنذِرِينَ ۝ وَذَرَيْنَ لَهُمُ الثَّمَلَاتِ لَئِن لَّمْ يَظْهَرِ لَهُنَّ الْآيَاتُ لَهُنَّ الْعَذَابُ لَشَدِيدٌ ۝

وَقَارُونَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مُّوسَىٰ

(۱) مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کا نام تھا، بعض کے نزدیک یہ ان کے پوتے کا نام ہے، بیٹے کا نام میان تھا۔ ان ہی کے نام پر اس قبیلے کا نام پڑ گیا، جو ان ہی کی نسل پر مشتمل تھا۔ اسی قبیلہ مدین کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ مدین شہر کا نام تھا، یہ قبیلہ یا شہر لوط علیہ السلام کی بستی کے قریب ہی تھا۔

(۲) اللہ کی عبادت کے بعد، انہیں آخرت کی یاد دہانی کرائی گئی یا تو اس لیے کہ وہ آخرت کے منکر تھے یا اس لیے کہ وہ اسے فراموش کیے ہوئے تھے اور معصیتوں میں مبتلا تھے اور جو قوم آخرت کو فراموش کر دے، وہ گناہوں میں دلیر ہوتی ہے۔ جیسے آج مسلمانوں کی اکثریت کا حال ہے۔

(۳) ناپ تول میں کمی اور لوگوں کو کم دینا، یہ بیماری ان میں عام تھی اور ارتکاب معاصی میں بھی انہیں باک نہیں تھا، جس سے زمین فساد سے بھر گئی تھی۔

(۴) حضرت شعیب علیہ السلام کے وعظ و نصیحت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا بالآخر بادلوں کے سائے والے دن، جبرائیل علیہ السلام کی ایک سخت چیخ سے زمین زلزلے سے لرز اٹھی، جس سے ان کے دل ان کی آنکھوں میں آگئے اور ان کی موت واقع ہو گئی اور وہ گھنٹوں کے بل بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔

(۵) قوم عاد کی بستی۔ احقاف، حضرموت (یمن) کے قریب اور ثمود کی بستی، حجر، جسے آج کل مدائن صالح کہتے ہیں، حجاز کے شمال میں ہے۔ ان علاقوں سے عربوں کے تجارتی قافلے آتے جاتے تھے، اس لیے یہ بستیاں ان کے لیے انجان نہیں، بلکہ ظاہر تھیں۔

(۶) یعنی تھے وہ عقل مند اور ہوشیار۔ لیکن دین کے معاملے میں انہوں نے اپنی عقل و بصیرت سے کچھ کام نہیں لیا، اس لیے یہ عقل اور سمجھ ان کے کام نہ آئی۔

يَا بَلَدِيَّتِ قَا سْتَكْبِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَمَا كَا نُوْا سٰٓئِقِيْنَ ﴿٣٩﴾

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کھلے کھلے معجزے لے کر آئے تھے^(۱) پھر بھی انہوں نے زمین میں تکبر کیا لیکن ہم سے آگے بڑھنے والے نہ ہو سکے۔^(۲) (۳۹)

پھر تو ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ کے وبال میں گرفتار کر لیا،^(۳) ان میں سے بعض پر ہم نے پتھروں کا مینہ برسایا^(۴) اور ان میں سے بعض کو زوردار سخت آواز نے دبوچ لیا^(۵) اور ان میں سے بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا^(۶) اور ان میں سے بعض کو ہم نے ڈبو دیا،^(۷)

فَاٰخِذْ اَحَدًا بِيَدَيْهِ فَيَقْبِضُوْهُم مِّنْ اَرْضِنَا عَلَيْهِ حٰصِبًا
وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذْنَاهُ الصَّيْحَةَ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَسَفْنَا
يَدَهُ الْاَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخْرَجْنَاهُ وَمَا كَانَ اللّٰهُ

(۱) یعنی دلائل و معجزات کا کوئی اثر ان پر نہیں ہوا، اور بدستور تکبر بنے رہے یعنی ایمان و تقویٰ اختیار کرنے سے گریز کیا۔
(۲) یعنی ہماری گرفت سے بچ کر نہیں جاسکے اور ہمارے عذاب کے شکنجے میں آکر رہے۔ ایک دوسرا ترجمہ ہے کہ ”یہ کفر میں سبقت کرنے والے نہیں تھے“ بلکہ ان سے پہلے بھی بہت سی امتیں گزر چکی ہیں جنہوں نے اسی طرح کفر و عناد کا راستہ اختیار کیے رکھا تھا۔

(۳) یعنی ان مذکورین میں سے ہر ایک کی، ان کے گناہوں کی پاداش میں، ہم نے گرفت کی۔
(۴) یہ قوم عادت تھی، جس پر نہایت تندوتیز ہوا کا عذاب آیا۔ یہ ہوا زمین سے کنکریاں اڑا اڑا کر ان پر برساتی، بالآخر اس کی شدت اتنی بڑھی کہ انہیں اچک کر آسمان تک لے جاتی اور انہیں سر کے بل زمین پر دے مارتی، جس سے ان کا سر الگ اور دھڑلگ ہو جاتا گویا کہ وہ سمجھور کے کھوکھلے تھے ہیں۔ (ابن کثیر)
بعض مفسرین نے حاصبا کا مصداق قوم لوط علیہ السلام کو ٹھہرایا ہے۔ لیکن امام ابن کثیر نے اسے غیر صحیح اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب قول کو منقطع قرار دیا ہے۔

(۵) یہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم، ثمود ہے۔ جنہیں ان کے کہنے پر ایک چٹان سے اونٹنی نکال کر دکھائی گئی۔ لیکن ان ظالموں نے ایمان لانے کے بجائے اس اونٹنی کو ہی مار ڈالا۔ جس کے تین دن بعد ان پر سخت چٹکھاڑ کا عذاب آیا، جس نے ان کی آوازوں اور حرکتوں کو خاموش کر دیا۔

(۶) یہ قارون ہے، جسے مال و دولت کے خزانے عطا کیے گئے تھے، لیکن یہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو گیا کہ یہ مال و دولت اس بات کی دلیل ہے کہ میں اللہ کے ہاں معزز و محترم ہوں۔ مجھے موسیٰ علیہ السلام کی بات ماننے کی کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ اسے اس کے خزانوں اور محلات سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا۔

(۷) یہ فرعون ہے، جو ملک مصر کا حکمران تھا، لیکن حد سے تجاوز کر کے اس نے اپنے بارے میں الوہیت کا دعویٰ بھی کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے اور ان کی قوم بنی اسرائیل کو، جس کو اس نے غلام بنا رکھا تھا، آزاد کرنے

يُظْلِمُهُمْ وَلَكِنَّ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۳۰﴾

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ

العنكبوت: اتَّخَذَتْ بَنِيَّائُوْا اِنْ اَوْهَنْ اَلْبِيُوْتِ

كَبِيْتِ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۱﴾

اِنَّ اِلٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ مِنْ شَيْءٍ وَهُوَ

العزير: الْعَزِيْرُ الْعَيْبُوْرُ ﴿۳۲﴾

وَتَعْلَمُ اَلْمَثَالُ نَصْرُ بَعْضِ اللَّيَّاسِ وَمَا يَعْلَمُهَآ

اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾

حَقَّقَ اِلٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بِالْحَقِّ اِنَّ فِيْ

ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۴﴾

اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ ان پر ظلم کرے بلکہ یہی لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ (۳۰)

جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کارساز مقرر کر رکھے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ وہ بھی ایک گھر بنا لیتی ہے، حالانکہ تمام گھروں سے زیادہ بودا گھر مکڑی کا گھر ہی ہے، (۳) کاش! وہ جان لیتے۔ (۳۱)

اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کو جانتا ہے جنہیں وہ اس کے سوا پکار رہے ہیں، وہ زبردست اور ذی حکمت ہے۔ (۳۲) ہم ان مثالوں کو لوگوں کے لیے بیان فرما رہے ہیں (۳) انہیں صرف علم والے ہی سمجھتے ہیں۔ (۳۳)

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو مصلحت اور حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، (۵) ایمان والوں کے لیے تو اس میں بڑی بھاری دلیل ہے۔ (۳۴)

سے انکار کر دیا۔ بالآخر ایک صبح اس کو اس کے پورے لشکر سمیت دریائے قلزم میں غرق کر دیا گیا۔

(۱) یعنی اللہ کی شان نہیں کہ وہ ظلم کرے۔ اس لیے پچھلی قومیں، جن پر عذاب آیا، محض اس لیے ہلاک ہوئیں کہ کفر و شرک اور تکذیب و معاصی کا ارتکاب کر کے انہوں نے خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا۔

(۲) یعنی جس طرح مکڑی کا جالا (گھر) نہایت بودا، کمزور اور ناپائیدار ہوتا ہے، ہاتھ کے ادنیٰ سے اشارے سے وہ نابود ہو جاتا ہے۔ اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا معبود، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنا بھی بالکل ایسا ہی، یعنی بالکل بے فائدہ ہے، کیونکہ وہ بھی کسی کے کام نہیں آسکتے۔ اس لیے غیر اللہ کے سارے بھی مکڑی کے جالے کی طرح یکسر ناپائیدار ہیں۔ اگر یہ پائیدار یا نفع بخش ہوتے تو یہ معبود گزشتہ اقوام کو تباہی سے بچا لیتے۔ لیکن دنیائے دیکھ لیا کہ وہ انہیں نہیں بچا سکے۔

(۳) یعنی انہیں خواب غفلت سے بیدار کرنے، شرک کی حقیقت سے آگاہ کرنے اور ہدایت کا راستہ بھاننے کے لیے۔ (۴) اس علم سے مراد اللہ کا، اس کی شریعت کا اور ان آیات و دلائل کا علم ہے جن پر غور و فکر کرنے سے انسان کو اللہ کی معرفت حاصل ہوتی اور ہدایت کا راستہ ملتا ہے۔

(۵) یعنی عبث اور بے مقصد نہیں۔

(۶) یعنی اللہ کے وجود کی، اس کی قدرت اور علم و حکمت کی۔ اور پھر اسی دلیل سے وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کائنات میں اس کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی حاجت روا اور مشکل کشا نہیں۔

اُنْتُ مَا أَوْجِي إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ
 إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ
 وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ ﴿۲۹﴾

جو کتاب آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اسے پڑھئے^(۱)
 اور نماز قائم کریں،^(۲) یقیناً نماز بے حیائی اور برائی
 سے روکتی ہے،^(۳) بیشک اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز

(۱) قرآن کریم کی تلاوت متعدد مقاصد کے لیے مطلوب ہے۔ محض اجر و ثواب کے لیے، اس کے معانی و مطالب پر تدبر و تفکر کے لیے، تعلیم و تدریس کے لیے، اور وعظ و نصیحت کے لیے، اس حکم تلاوت میں ساری ہی صورتیں شامل ہیں۔
 (۲) کیوں کہ نماز سے (بشرطیکہ نماز ہو) انسان کا تعلق خصوصی اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے، جس سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہوتی ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر اس کے عزم و ثبات کا باعث، اور ہدایت کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں کہا گیا ہے ”اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو“ (البقرہ - ۱۵۳) نماز اور صبر کوئی مرئی چیز تو ہے نہیں کہ انسان ان کا سہارا پکڑ کر ان سے مدد حاصل کر لے۔ یہ تو غیر مرئی چیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ذریعے سے انسان کا اپنے رب کے ساتھ جو خصوصی ربط و تعلق پیدا ہوتا ہے وہ قدم قدم پر اس کی دستگیری اور رہنمائی کرتا ہے اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کی تنہائی میں تہجد کی نماز بھی پڑھنے کی تاکید کی گئی، کیوں کہ آپ ﷺ کے ذمے جو عظیم کام سونپا گیا تھا، اس میں آپ ﷺ کو اللہ کی مدد کی بہت زیادہ ضرورت تھی اور یہی وجہ ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جب کوئی اہم مرحلہ درپیش ہوتا تو آپ ﷺ نماز کا اہتمام فرماتے «إِذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ فَنَزَعَ إِلَى الصَّلَاةِ» (مسند احمد و ابوداؤد)

(۳) یعنی، بے حیائی اور برائی کے روکنے کا سبب اور ذریعہ بنتی ہے جس طرح دواؤں کی مختلف تاثیرات ہیں اور کہا جاتا ہے کہ فلاں دوا فلاں بیماری کو روکتی ہے اور واقعاً ایسا ہوتا ہے لیکن کب؟ جب دو باتوں کا التزام کیا جائے۔ ایک دوائی کو پابندی کے ساتھ اس طریقے اور شرائط کے ساتھ استعمال کیا جائے جو حکیم اور ڈاکٹر بتلائے۔ دوسرا پرہیز، یعنی ایسی چیزوں سے اجتناب کیا جائے جو اس دوائی کے اثرات کو زائل کرنے والی ہوں۔ اسی طرح نماز کے اندر بھی یقیناً اللہ نے ایسی روحانی تاثیر رکھی ہے کہ یہ انسان کو بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے لیکن اسی وقت، جب نماز کو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ان آداب و شرائط کے ساتھ پڑھا جائے جو اس کی صحت و قبولیت کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً اس کے لیے پہلی چیز اخلاص ہے، ثانیاً طہارت قلب، یعنی نماز میں اللہ کے سوا کسی اور کی طرف التفات نہ ہو، ثالثاً باجماعت اوقات مقررہ پر اس کا اہتمام۔ رابعاً ارکان صلوة (قراءت، رکوع، قومہ، سجدہ وغیرہ) میں اعتدال و اطمینان، خامساً خشوع و خضوع اور رقت کی کیفیت۔ سادساً مواظبت یعنی پابندی کے ساتھ اس کا التزام، سابعاً رزق حلال کا اہتمام۔ ہماری نمازیں ان آداب و شرائط سے عاری ہیں، اس لیے ان کے وہ اثرات بھی ہماری زندگی میں ظاہر نہیں ہو رہے ہیں، جو قرآن کریم میں بتلائے گئے ہیں۔ بعض نے اس کے معنی امر کے کیے ہیں۔ یعنی نماز پڑھنے والے کو چاہیے کہ بے حیائی کے کاموں سے اور برائی سے رک جائے۔

ہے،^(۱) تم جو کچھ کر رہے ہو اس سے اللہ خبردار ہے۔ (۳۵) اور اہل کتاب کے ساتھ بحث و مباحثہ نہ کرو مگر اس طریقہ پر جو عمدہ ہو،^(۲) مگر ان کے ساتھ جو ان میں ظالم ہیں^(۳) اور صاف اعلان کر دو کہ ہمارا تو اس کتاب پر بھی ایمان ہے جو ہم پر اتاری گئی ہے اور اس پر بھی جو تم پر اتاری گئی،^(۴) ہمارا تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ ہم سب اسی کے حکم بردار ہیں۔ (۳۶)

اور ہم نے اسی طرح آپ کی طرف اپنی کتاب نازل فرمائی ہے، پس جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں^(۵) اور ان (مشرکین) میں سے بعض اس پر ایمان رکھتے ہیں^(۶) اور ہماری آیتوں کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں۔ (۳۷)

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا أَمْثًا يَا لَيْدِي ۖ أَنْزِلْ إِلَيْنَا وَأَنْزِلِ الْيَقِينَ وَالْهَذَا وَاللَّهُمَّ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿۳۵﴾

وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ ۚ وَالَّذِينَ أُنْتَهَىٰ الْكِتَابُ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمِنْ هَؤُلَاءِ مَنْ يُؤْمِنُ بِهِ وَمَا يَجْحَدُ بِالَّذِينَ إِلَّا الْكُفْرُونَ ﴿۳۶﴾

(۱) یعنی بے حیائی اور برائی سے روکنے میں اللہ کا ذکر، اقامتِ صلوٰۃ سے بھی زیادہ موثر ہے۔ اس لیے کہ آدمی جب تک نماز میں ہوتا ہے، برائی سے رکارتا ہے۔ لیکن بعد میں اس کی تاثیر کمزور ہو جاتی ہے، اس کے برعکس ہر وقت اللہ کا ذکر اس کے لیے ہر وقت برائی میں مانع رہتا ہے۔

(۲) اس لیے کہ وہ اہل علم و فہم ہیں، بات کو سمجھنے کی صلاحیت و استعداد رکھتے ہیں۔ بنا بریں ان سے بحث و گفتگو میں تلخی اور تندی مناسب نہیں۔

(۳) یعنی جو بحث و مجادلہ میں افراط سے کام لیں تو تمہیں بھی سخت لب و لہجہ اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ بعض نے پہلے گروہ سے مراد وہ اہل کتاب لیے ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے اور دوسرے گروہ سے وہ اشخاص جو مسلمان نہیں ہوئے بلکہ یہودیت و نصرانیت پر قائم رہے اور بعض نے ظَلَمُوا مِنْهُمْ کا مصداق ان اہل کتاب کو لیا ہے جو مسلمانوں کے خلاف جارحانہ عزائم رکھتے تھے اور جدال و قتال کے بھی مرتکب ہوتے تھے۔ ان سے تم بھی قتال کرو تا آنکہ مسلمان ہو جائیں، یا جزیہ دیں۔

(۴) یعنی تورات و انجیل پر۔ یعنی یہ بھی اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہیں اور یہ کہ یہ شریعتِ اسلامیہ کے قیام اور بعثتِ محمدیہ تک شریعتِ الہیہ ہیں۔

(۵) اس سے مراد عبداللہ بن سلام، حبیبؓ وغیرہ ہیں۔ ایتائے کتاب سے مراد اس پر عمل ہے۔ گویا اس پر جو عمل نہیں کرتے، انہیں یہ کتاب دی ہی نہیں گئی۔

(۶) ان سے مراد اہل مکہ ہیں جن میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئے تھے۔

اس سے پہلے تو آپ کوئی کتاب پڑھتے نہ تھے^(۱) اور نہ کسی کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھتے^(۲) تھے کہ یہ باطل پرست لوگ شک و شبہ میں پڑتے۔^(۳) (۳۸)

بلکہ یہ (قرآن) تو روشن آیتیں ہیں جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں، ہماری آیتوں کا منکر۔ مجرظالموں کے اور کوئی نہیں۔ (۳۹)

انہوں نے کہا کہ اس پر کچھ نشانیاں (معجزات) اس کے رب کی طرف سے کیوں نہیں اتارے گئے۔ آپ کہہ دیجئے کہ نشانیاں تو سب اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں^(۵) میں تو صرف کھلم کھلا آگاہ کر دینے والا ہوں۔ (۵۰)

کیا انہیں یہ کافی نہیں؟ کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل فرما دی جو ان پر پڑھی جا رہی ہے،^(۶) اس میں رحمت (بھی) ہے اور نصیحت (بھی) ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔^(۷) (۵۱)

وَمَا كُنْتُمْ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخْطَوْنَ كَيْتَابًا
إِذْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ الْعَرَبِيَّ ۝۳۸

بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ
بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ ۝۳۹

وَقَالُوا لَوْلَا أَنْزَلْ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ
وَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مُّبِينٌ ۝۴۰

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ
لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝۴۱

(۱) اس لیے کہ ان پڑھ تھے۔

(۲) اس لیے کہ لکھنے کے لیے بھی علم ضروری ہے، جو آپ نے کسی سے حاصل ہی نہیں کیا تھا۔

(۳) یعنی اگر آپ ﷺ پڑھے لکھے ہوتے یا کسی استاد سے کچھ سیکھا ہوتا تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ قرآن مجید فلاں کی مدد سے یا اس سے تعلیم حاصل کرنے کا نتیجہ ہے۔

(۴) یعنی قرآن مجید کے حافظوں کے سینوں میں۔ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ قرآن مجید لفظ بہ لفظ سینے میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

(۵) یعنی یہ نشانیاں اس کی حکمت و مشیت، جن بندوں پر اتارنے کی مقتضی ہوتی ہے، وہاں وہ اتارتا ہے، اس میں اللہ کے سوا کسی کا اختیار نہیں ہے۔

(۶) یعنی وہ نشانیاں طلب کرتے ہیں۔ کیا ان کے لیے بطور نشانی یہ قرآن کافی نہیں ہے جو ہم نے آپ پر نازل کی ہے اور جس کی بابت انہیں چیلنج دیا گیا ہے کہ اس جیسا قرآن لا کر دکھائیں یا کوئی ایک سورت ہی بنا کر پیش کر دیں۔ جب قرآن کی اس معجزہ نمائی کے باوجود یہ قرآن پر ایمان نہیں لا رہے ہیں تو حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کی طرح انہیں معجزے دکھا بھی دیئے جائیں، تو اس پر یہ کون سا ایمان لے آئیں گے؟

(۷) یعنی ان لوگوں کے لیے جو اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے آیا ہے، کیوں کہ وہی اس

قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ بَدِيئًا وَبَيْنَكُمْ وَسَيِّئًا كَيْفَ تَعْبُدُونَ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَيْرُونَ ﴿۵۱﴾

وَيَسْتَعِزُّونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَئِن آجَلَ نَسَمَىٰ بِمَا لَهُمُ الْعَذَابُ وَلَئِن آتَيْتَهُمْ بَعْتَهُ وَهُمْ لَا يُشْعُرُونَ ﴿۵۲﴾

يَسْتَعِزُّونَكَ بِالْعَذَابِ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿۵۳﴾

يَوْمَ يُغْضِبُهُمُ الْعَذَابُ مِنْ قُودِهِمْ وَمِنْ نَحْتِ آرْسِهِمْ

کہہ دیجئے کہ مجھ میں اور تم میں اللہ تعالیٰ گواہ ہونا کافی ہے^(۱) وہ آسمان وزمین کی ہر چیز کا عالم ہے، جو لوگ باطل کے ماننے والے اور اللہ تعالیٰ سے کفر کرنے والے^(۲) ہیں وہ زبردست نقصان اور گھاٹے میں ہیں۔^(۳) (۵۲)

یہ لوگ آپ سے عذاب کی جلدی کر رہے ہیں۔^(۴) اگر میری طرف سے مقرر کیا ہوا وقت نہ ہوتا تو ابھی تک ان کے پاس عذاب آچکا ہوتا،^(۵) یہ یقینی بات ہے کہ اچانک ان کی بے خبری میں ان کے پاس عذاب آپنچے گا۔^(۶) (۵۳) یہ عذاب کی جلدی مچا رہے ہیں اور (تسلی رکھیں) جہنم کافروں کو گھیر لینے والی ہے۔^(۷) (۵۴)

اس دن انکے اوپر تلے سے انہیں عذاب ڈھانپ رہا ہو گا اور

سے متمتع اور فیض یاب ہوتے ہیں۔

(۱) اس بات پر کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور جو کتاب مجھ پر نازل ہوئی ہے، یقیناً منجانب اللہ ہے۔

(۲) یعنی غیر اللہ کو عبادت کا مستحق ٹھہراتے ہیں اور جوئی الواقع مستحق عبادت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ، اس کا انکار کرتے ہیں۔

(۳) کیوں کہ یہی لوگ فساد عقلی اور سوء فہم میں مبتلا ہیں، اسی لیے انہوں نے جو سودا کیا ہے کہ ایمان کے بدلے کفر اور ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی ہے، اس میں یہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

(۴) یعنی پیغمبر کی بات ماننے کے بجائے، کہتے ہیں کہ اگر تو سچا ہے تو ہم پر عذاب نازل کروادے۔

(۵) یعنی ان کے اعمال و اقوال تو یقیناً اس لائق ہیں کہ انہیں فوراً صفحہ ہستی سے ہی مٹا دیا جائے۔ لیکن ہماری سنت ہے

کہ ہر قوم کو ایک وقت خاص تک مہلت دیتے ہیں، جب وہ مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے تو ہمارا عذاب آجاتا ہے۔

(۶) یعنی جب عذاب کا وقت مقرر آجائے گا تو اس طرح اچانک آئے گا کہ انہیں پینہ بھی نہیں چلے گا۔ یہ وقت مقرر وہ ہے جو اس نے اہل مکہ کے لیے لکھ رکھا تھا، یعنی جنگ بدر میں اسارت و قتل، یا پھر قیامت کا وقوع ہے جس کے بعد کافروں کے لیے عذاب ہی عذاب ہے۔

(۷) پہلا یَسْتَعِزُّونَكَ بطور خبر کے تھا اور یہ دوسرا بطور تعجب کے ہے یعنی یہ امر تعجب انگیز ہے کہ عذاب کی جگہ (جہنم) ان کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ پھر بھی یہ عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟ حالاں کہ ہر آنے والی چیز قریب ہی ہوتی ہے، اسے دور کیوں سمجھتے ہیں؟ یا پھر یہ تکرار بطور تاکید کے ہے۔

اللہ تعالیٰ^(۱) فرمائے گا کہ اب اپنے (بد) اعمال کا مزہ چکھو۔ (۵۵)
 اے میرے ایمان والے بندو! میری زمین بہت کشادہ
 ہے سو تم میری ہی عبادت کرو۔^(۲) (۵۶)
 ہر جاندار موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور تم سب ہماری ہی
 طرف لوٹائے جاؤ گے۔^(۳) (۵۷)

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے انہیں ہم یقیناً
 جنت کے ان بالا خانوں میں جگہ دیں گے جن کے نیچے
 چشمے بہ رہے ہیں^(۴) جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے،^(۵) کام
 کرنے والوں کا کیا ہی اچھا اجر ہے۔ (۵۸)
 وہ جنہوں نے صبر کیا^(۶) اور اپنے رب تعالیٰ پر بھروسہ
 رکھتے ہیں۔^(۷) (۵۹)
 اور بہت سے^(۸) جانور ہیں جو اپنی روزی اٹھائے نہیں

وَيَقُولُ دُوْعًا اَنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۵۵﴾
 لِيُعْبَادِيَ الَّذِينَ اٰمَنُوا اَرْضًا وَّاسِعَةً فَاَيُّهَا فَاَعْبُدُونِ ﴿۵۶﴾

كُلُّ نَفْسٍ ذٰلِقَةُ الْمَوْتِ ۗ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ﴿۵۷﴾
 وَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا
 تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۵۸﴾

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلَىٰ رِبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾
 وَكَانَ مِنْ دَابَّةٍ لَا يَحْمِلُ رِيْضًا ۗ وَاللّٰهُ يَرُدُّهَا وَاِلٰى اٰنٰهٖ

(۱) يَقُولُ، کا فاعل اللہ ہے یا فرشتے، یعنی جب چاروں طرف سے ان پر عذاب ہو رہا ہو گا تو کہا جائے گا۔
 (۲) اس میں ایسی جگہ سے، جہاں اللہ کی عبادت کرنی مشکل ہو اور دین پر قائم رہنا دو بھر ہو رہا ہو، ہجرت کرنے کا حکم
 ہے۔ جس طرح مسلمانوں نے پہلے مکہ سے حبشہ کی طرف اور پھر بعد میں مدینہ کی طرف ہجرت کی۔
 (۳) یعنی موت کا جبر علیٰ تلخ تو لا محالہ ہر ایک کو پینا ہے، ہجرت کرو گے تب بھی اور نہ کرو گے تب بھی، اس لیے تمہارے لیے
 وطن کا، رشتے داروں کا، اور دوست احباب کا چھوڑنا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ موت تو تم جہاں بھی ہو گے آجائے گی۔ البتہ اللہ
 کی عبادت کرتے ہوئے مرو گے تو تم اخروی نعمتوں سے شاد کام ہو گے، اس لیے کہ مر کر تو اللہ ہی کے پاس جانا ہے۔
 (۴) یعنی اہل جنت کے مکانات بلند ہوں گے، جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ یہ نہریں پانی، شراب، شہد اور دودھ
 کی ہوں گی، علاوہ ازیں انہیں جس طرف پھیرنا چاہیں گے، ان کا رخ اسی طرف ہو جائے گا۔
 (۵) ان کے زوال کا خطرہ ہو گا، نہ انہیں موت کا اندیشہ نہ کسی اور جگہ پھر جانے کا خوف۔
 (۶) یعنی دین پر مضبوطی سے قائم رہے، ہجرت کی تکلیفیں برداشت کیں، اہل و عیال اور عزیز و اقربا سے دوری کو محض
 اللہ کی رضا کے لیے گوارا کیا۔

(۷) دین اور دنیا کے ہر معاملے اور حالات میں۔

(۸) کتابین میں کاف تشبیہ کا ہے اور معنی ہیں کتنے ہی یا بہت سے۔

وَهُوَ السَّيِّعُ الْعَلِيمُ ①

پھرتے،^(۱) ان سب کو اور تمہیں بھی اللہ تعالیٰ ہی روزی دیتا ہے،^(۲) وہ بڑا ہی سننے جاننے والا ہے۔^(۳) (۶۰)

وَلَكِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَحَمَلَ النَّجْمَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولَنَّ اللَّهُ فَاَنَّى يُؤْتُونَ ②

اور اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ زمین و آسمان کا خالق اور سورج چاند کو کام میں لگانے والا کون ہے؟ تو ان کا جواب یہی ہو گا کہ اللہ تعالیٰ،^(۳) پھر کہہ لائے جا رہے ہیں۔^(۵) (۶۱)

أَلَمْ يَسْطِطِ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ إِنَّ اللَّهَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ عَالِيمٌ ③

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے فراخ روزی دیتا ہے اور جسے چاہے تنگ۔^(۶) یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کا

(۱) کیوں کہ اٹھا کر لے جانے کی ان میں ہمت ہی نہیں ہوتی، اسی طرح وہ ذخیرہ بھی نہیں کر سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ رزق کسی خاص جگہ کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ اللہ کا رزق اپنی مخلوق کے لیے عام ہے وہ جو بھی ہو اور جہاں بھی ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہجرت کو جانے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پہلے سے کہیں زیادہ وسیع اور پاکیزہ رزق عطا فرمایا، نیز تھوڑے ہی عرصے کے بعد انہیں عرب کے متعدد علاقوں کا حکمران بنا دیا۔ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ أَجْمَعِينَ۔

(۲) یعنی کوئی کمزور ہے یا طاقت ور، اسباب و وسائل سے بہرہ ور ہے یا بے بہرہ، اپنے وطن میں ہے یا مہاجر اور بے وطن، سب کا روزی رسال وہی اللہ ہے جو چوٹی کو زمین کے کونوں کھدروں میں، پرندوں کو ہواؤں میں اور مچھلیوں اور دیگر آبی جانوروں کو سمندر کی گہرائیوں میں روزی پہنچاتا ہے۔ اس موقع پر مطلب یہ ہے کہ فقر و فاقہ کا ڈر ہجرت میں رکاوٹ نہ بنے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اور تمام مخلوقات کی روزی کا ذمہ دار ہے۔

(۳) وہ جاننے والا ہے تمہارے اعمال و افعال کو اور تمہارے ظاہر و باطن کو، اس لیے صرف اسی سے ڈرو، اس کے سوا کسی سے مت ڈرو! اسی کی اطاعت میں سعادت و کمال ہے اور اس کی معصیت میں شقاوت و نقصان۔

(۴) یعنی یہ مشرکین، جو مسلمانوں کو محض توحید کی وجہ سے ایذا نہیں پہنچا رہے ہیں، ان سے اگر پوچھا جائے کہ آسمان و زمین کو عدم سے وجود میں لانے والا اور سورج اور چاند کو اپنے اپنے مدار پر چلانے والا کون ہے؟ تو وہاں یہ اعتراف کیے بغیر انہیں چارہ نہیں ہوتا کہ یہ سب کچھ کرنے والا اللہ ہے۔

(۵) یعنی دلائل و اعتراف کے باوجود حق سے یہ اعراض اور گریز باعث تعجب ہے۔

(۶) یہ مشرکین کے اعتراض کا جواب ہے جو وہ مسلمانوں پر کرتے تھے کہ اگر تم حق پر ہو تو پھر غریب اور کمزور کیوں ہو؟ اللہ نے فرمایا کہ رزق کی کشادگی اور کمی اللہ کے اختیار میں ہے وہ اپنی حکمت و مشیت کے مطابق جس کو چاہتا ہے کم یا زیادہ دیتا ہے، اس کا تعلق اس کی رضامندی یا غضب سے نہیں ہے۔

جاننے والا ہے۔^(۱) (۶۲)

اور اگر آپ ان سے سوال کریں کہ آسمان سے پانی اتار کر زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کس نے کیا؟ تو یقیناً ان کا جواب یہی ہو گا اللہ تعالیٰ نے۔ آپ کہہ دیں کہ ہر تعریف اللہ ہی کے لیے سزاوار ہے، بلکہ ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔^(۲) (۶۳)

اور دنیا کی یہ زندگانی تو محض کھیل تماشا ہے^(۳) البتہ آخرت کے گھر کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے،^(۴) کاش! یہ جانتے ہوتے۔^(۵) (۶۴)

پس یہ لوگ جب کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں اس کے لیے عبادت کو خالص کر کے پھر جب وہ انہیں خشکی کی طرف بچالاتا ہے تو اسی وقت شرک کرنے لگتے ہیں۔^(۶) (۶۵)

وَلَكِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ مَنَعُكَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَتُلِيَا بِهِ الْأَرْضَ
مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِمْ لِيَقُولَنَّ اللَّهُ فُلُ السَّمَاءِ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ
لَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٢﴾

وَمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَوَجْهٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ
لَإِهيَ الْحَيَاةِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٦٣﴾

فَإِذَا نَكَبُوا فِي الْفُلِكِ دَعَوْا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ؕ فَلَمَّا
نَجَّوهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ﴿٦٤﴾

(۱) اس کو بھی وہی جانتا ہے کہ زیادہ رزق کس کے لیے بہتر ہے اور کس کے لیے نہیں؟

(۲) کیوں کہ عقل ہوتی تو اپنے رب کے ساتھ پتھروں کو اور مردوں کو رب نہ بناتے۔ نہ ان کے اندر یہ تناقض ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی خالقیت و ربوبیت کے اعتراف کے باوجود، بتوں کو حاجت روا اور لائق عبادت سمجھ رہے ہیں۔

(۳) یعنی جس دنیا نے انہیں آخرت سے اندھا اور اس کے لیے توشہ جمع کرنے سے غافل رکھا ہے، وہ ایک کھیل کود سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، کافر دنیا کے کاروبار میں مشغول رہتا ہے، اس کے لیے شب و روز محنت کرتا ہے لیکن جب مرتا ہے تو خالی ہاتھ ہوتا ہے۔ جس طرح بچے سارا دن مٹی کے گھروندوں سے کھیلتے ہیں، پھر خالی ہاتھ گھروں کو لوٹ جاتے ہیں، سوئے تھکاؤ کے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

(۴) اس لیے ایسے عمل صالح کرنے چاہئیں جن سے آخرت کا یہ گھر سنور جائے۔

(۵) کیوں کہ اگر وہ یہ بات جان لیتے تو آخرت سے بے پروا ہو کر دنیا میں مگن نہ ہوتے۔ اس لیے ان کا علاج علم ہے، علم شریعت۔

(۶) مشرکین کے اس تناقض کو بھی قرآن کریم میں متعدد جگہ بیان فرمایا گیا ہے۔ اس تناقض کو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سمجھ گئے تھے جس کی وجہ سے انہیں قبول اسلام کی توفیق حاصل ہو گئی۔ ان کے متعلق آتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد یہ مکہ سے فرار ہو گئے تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گرفت سے بچ جائیں۔ یہ جشہ جانے کے لیے ایک کشتی میں بیٹھے، کشتی گرداب میں پھنس گئی، تو کشتی میں

تاکہ ہماری دی ہوئی نعمتوں سے مکر تے رہیں اور برتتے رہیں۔^(۱) ابھی ابھی پتہ چل جائے گا۔ (۶۶)

کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے حرم کو با من بنا دیا ہے حالانکہ ان کے ارد گرد سے لوگ اچک لیے جاتے ہیں،^(۲) کیا یہ باطل پر تو یقین رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر ناشکری کرتے ہیں۔^(۳) (۶۷)

اور اس سے بڑا ظالم کون ہو گا؟ جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے^(۴) یا جب حق اس کے پاس آجائے وہ اسے^(۵) جھٹلائے، کیا ایسے کافروں کا ٹھکانا جنم میں نہ ہو گا؟ (۶۸)

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ وَيُكْفِرُوا بِهِمْ وَيَتَعَمَّوْا بِهِمْ وَيَسُوْفَ يَكْفُرُونَ ﴿۶۶﴾

اَوْ لَمْ يَبْرُوا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا مِّنَ الْمَاءِ وَيَنْظِفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ اَهْلًا بِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَيَنْعِمَةُ اللّٰهُ يَكْفُرُونَ ﴿۶۷﴾

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَيْدًا وَكَذَّبَ بِالْحَقِّ لَتَأْتِيَ آةُ الْاَلْبَسِ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوٰى لِّلْكَافِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

سوار لوگوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ پورے خلوص سے رب سے دعائیں کرو، اس لیے کہ یہاں اس کے علاوہ کوئی نجات دینے والا نہیں ہے۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر کہا کہ اگر یہاں سمندر میں اس کے سوا کوئی نجات نہیں دے سکتا تو خشکی میں بھی اس کے سوا کوئی نجات نہیں دے سکتا۔ اور اسی وقت اللہ سے عہد کر لیا کہ اگر میں یہاں سے بحیریت ساحل پر پہنچ گیا تو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا یعنی مسلمان ہو جاؤں گا۔ چنانچہ یہاں سے نجات پا کر انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ رضی اللہ عنہ (ابن کثیر، بحوالہ سیرت محمد بن اسحاق)

(۱) یہ لام گی ہے جو علت کے لیے ہے۔ یعنی نجات کے بعد ان کا شرک کرنا، اس لیے ہے کہ وہ کفران نعمت کریں اور دنیا کی لذتوں سے متمتع ہوتے رہیں۔ کیوں کہ اگر وہ یہ ناشکری نہ کرتے تو اخلاص پر قائم رہتے اور صرف اللہ کو ہی ہمیشہ پکارتے۔ بعض کے نزدیک یہ لام عاقبت کے لیے ہے، یعنی گواں کا مقصد کفر کرنا نہیں ہے لیکن دوبارہ شرک کے ارتکاب کا نتیجہ بہر حال کفر ہی ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ اس احسان کا تذکرہ فرما رہا ہے جو اہل مکہ پر اس نے کیا کہ ہم نے ان کے حرم کو امن والا بنایا جس میں اس کے باشندے قتل و غارت، اسیری، لوٹ مار وغیرہ سے محفوظ ہیں۔ جب کہ عرب کے دوسرے علاقے اس امن و سکون سے محروم ہیں قتل و غارت گری ان کے ہاں معمول اور آئے دن کا مشغلہ ہے۔

(۳) یعنی کیا اس نعمت کا شکر بھی ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائیں، اور جھوٹے معبودوں اور بتوں کی پرستش کرتے رہیں۔ اس احسان کا اقتضا تو یہ تھا کہ وہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرتے اور اس کے پیغمبر ﷺ کی تصدیق کرتے۔

(۴) یعنی دعویٰ کرے کہ مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے دراصل حالیکہ ایسا نہ ہو یا کوئی یہ کہے کہ میں بھی وہ چیز اتار سکتا ہوں جو اللہ نے اتاری ہے۔ یہ افترا ہے اور مدعی مفتری۔

(۵) یہ تکذیب ہے اور اس کا مرتکب مذنب۔ افترا اور تکذیب دونوں کفر ہیں جس کی سزا جنم ہے۔

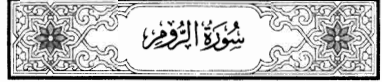
اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں^(۱) ہم انہیں اپنی راہیں ضرور دکھادیں گے۔^(۲) یقیناً اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کا ساتھی ہے۔^(۳) (۶۹)

سورہ روم کی ہے اور اس میں ساٹھ آیتیں اور چھ رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الم۔ (۱) رومی مغلوب ہو گئے ہیں۔ (۲)
نزدیک کی زمین پر اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آجائیں گے۔ (۳)
چند سال میں ہی۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی اختیار اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ اس روز مسلمان شادمان ہوں گے۔ (۳)
اللہ کی مدد سے،^(۳) وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَكَنَّمَّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵﴾



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴿۱﴾

الْم ﴿۱﴾ عَلِمَتِ الرُّومُ ﴿۱﴾

فِي آذَانِ الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَلَيْهِمْ سَبْعُونَ ﴿۲﴾

فِي بَضْعِ سِنِينَ ۚ إِنَّهُ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ

وَيَوْمَئِذٍ يَفْسَرُحُ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۳﴾

يَنْصُرِ اللَّهُ يَنْصُرُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۴﴾

(۱) یعنی دین پر عمل کرنے میں جو دشواریاں، آزمائشیں اور مشکلات پیش آتی ہیں۔

(۲) اس سے مراد دنیا و آخرت کے وہ راستے ہیں جن پر چل کر انسان کو اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔

(۳) احسان کا مطلب ہے اللہ کو حاضر ناظر جان کر ہر نیکی کے کام کو اخلاص کے ساتھ کرنا، سنت نبوی ﷺ کے مطابق کرنا، برائی کے بدلے میں برائی کے بجائے حسن سلوک کرنا، اپنا حق چھوڑ دینا اور دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دینا۔ یہ سب احسان کے مفہوم میں شامل ہیں۔

(۴) عمد رسالت میں دو بڑی طاقتیں تھیں۔ ایک فارس (ایران) کی، دوسری روم کی۔ اول الذکر حکومت آتش پرست اور دوسری عیسائی یعنی اہل کتاب تھی۔ مشرکین مکہ کی ہمدردیاں فارس کے ساتھ تھیں کیوں کہ دونوں غیر اللہ کے پجاری تھے، جب کہ مسلمانوں کی ہمدردیاں روم کی عیسائی حکومت کے ساتھ تھیں، اس لیے کہ عیسائی بھی مسلمانوں کی طرح اہل کتاب تھے اور وحی و رسالت پر یقین رکھتے تھے۔ ان کی آپس میں ٹھنی رہتی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے چند سال بعد ایسا ہوا کہ فارس کی حکومت عیسائی حکومت پر غالب آگئی، جس پر مشرکوں کو خوشی اور مسلمانوں کو غم ہوا، اس موقع پر قرآن کریم کی یہ آیات نازل ہوئیں، جن میں یہ پیش گوئی کی گئی کہ بَضْعِ سِنِينَ کے اندر رومی پھر

اصل غالب اور مہربان وہی ہے۔ (۵)
 اللہ کا وعدہ ہے،^(۱) اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کا خلاف نہیں
 کرتا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (۶)
 وہ تو (صرف) دنیوی زندگی کے ظاہر کو (ہی) جانتے ہیں اور
 آخرت سے تو بالکل ہی بے خبر ہیں۔^(۲) (۷)
 کیا ان لوگوں نے اپنے دل میں یہ غور نہیں کیا؟ کہ اللہ
 تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ
 ہے سب کو بہترین قرینے^(۳) سے مقرر وقت تک کے

وَعَدَ اللّٰهُ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
 يَعْلَمُوْنَ ①
 يَعْلَمُوْنَ ظٰهَرَ اٰمِنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ عَنِ
 الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ②
 اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
 وَمَا بَيْنَهُمَا اَلَّا يَخْتِجُوْا وَاَجَلَ سَاعَتِهِمْ ۚ وَاِنْ كَثِيْرًا مِّنْ

غالب آجائیں گے اور غالب، مغلوب اور مغلوب غالب ہو جائیگی۔ بظاہر اسباب یہ پیش گوئی ناممکن العمل نظر آتی تھی۔
 تاہم مسلمانوں کو اللہ کے اس فرمان کی وجہ سے یقین تھا کہ ایسا ضرور ہو کر رہے گا۔ اسی لیے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ
 عنہ نے ابو جہل سے یہ شرط باندھ لی کہ رومی پانچ سال کے اندر دوبارہ غالب آجائیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ
 بات آئی تو فرمایا کہ بضع کا لفظ تین سے دس تک کے عدد کے لیے استعمال ہوتا ہے تم نے ۵ سال کی مدت کم رکھی ہے،
 اس میں اضافہ کر لو۔ چنانچہ آپ ﷺ کی ہدایت کے مطابق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس مدت میں اضافہ کروا لیا۔ اور پھر
 ایسا ہی ہوا کہ رومی ۹ سال کی مدت کے اندر اندر یعنی ساتویں سال دوبارہ فارس پر غالب آگئے، جس سے یقیناً
 مسلمانوں کو بڑی خوشی ہوئی، (ترمذی، تفسیر سورۃ الروم) بعض کہتے ہیں کہ رومیوں کو یہ فتح اس وقت ہوئی، جب بدر میں
 مسلمانوں کو کافروں پر غلبہ حاصل ہوا، اور مسلمان اپنی فتح پر خوش ہوئے۔ رومیوں کی یہ فتح قرآن کریم کی صداقت کی
 ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ نزدیک کی زمین سے مراد، عرب کی زمین کے قریب کے علاقے ہیں، یعنی شام و فلسطین وغیرہ،
 جہاں عیسائیوں کی حکومت تھی۔

(۱) یعنی اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم آپ کو جو خبر دے رہے ہیں کہ عنقریب رومی، فارس پر دوبارہ غالب آجائیں
 گے، یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے جو مدت موعود کے اندر یقیناً پورا ہو کر رہے گا۔
 (۲) یعنی اکثر لوگوں کو دنیوی معاملات کا خوب علم ہے۔ چنانچہ وہ ان میں تو اپنی چابک دستی اور مہارت فن کا مظاہرہ کرتے
 ہیں جن کا فائدہ عارضی اور چند روزہ ہے لیکن آخرت کے معاملات سے یہ غافل ہیں جن کا نفع مستقل اور پائیدار ہے۔
 یعنی دنیا کے امور کو خوب پہچانتے ہیں اور دین سے بالکل بے خبر ہیں۔

(۳) یا ایک مقصد اور حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، بے مقصد اور بیکار نہیں۔ اور وہ مقصد ہے کہ نیکیوں کو ان کی نیکیوں کی
 جزا اور بدوں کو ان کی بدی کی سزا دی جائے۔ یعنی کیا وہ اپنے وجود پر غور نہیں کرتے کہ کس طرح انھیں نیست سے
 ہست کیا اور پانی کے ایک حقیر قطرے سے ان کی تخلیق کی۔ پھر آسمان و زمین کا ایک خاص مقصد کے لیے وسیع و عریض

النَّاسِ بِلِقَائِي رَبِّهِمْ لَكُمْ وَاوَنَ ۝

لیے (ہی) پیدا کیا ہے، ہاں اکثر لوگ یقیناً اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔^(۸)

کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر یہ نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے لوگوں کا انجام کیسا (برا) ہوا؟^(۳) وہ ان سے بہت زیادہ توانا (اور طاقتور) تھے^(۴) اور انہوں نے (بھی) زمین بوئی جوتی تھی اور^(۵) ان سے زیادہ آباد کی تھی^(۶) اور ان کے پاس ان کے رسول روشن دلائل لے کر آئے تھے۔^(۷) یہ تو ناممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ ان^(۸) پر ظلم کرتا لیکن (دراصل) وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔^(۹)

پھر آخرش برا کرنے والوں کا بہت ہی برا انجام ہوا،^(۱۰)

اَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ كَانُوا اسْتَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَاَنَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوهَا اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوها وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

لَمْ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ اسَاءُوا الشُّرَاىِ اَنْ كَذَّبُوْا

سلسلہ قائم کیا، نیز ان سب کے لیے ایک خاص وقت مقرر کیا یعنی قیامت کا دن۔ جس دن یہ سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ان باتوں پر غور کرتے تو یقیناً اللہ کے وجود اس کی ربوبیت والوہیت اور اس کی قدرت مطلقہ کا انہیں ادراک و احساس ہو جاتا اور اس پر ایمان لے آتے۔

(۱) اور اس کی وجہ وہی کائنات میں غور و فکر کا فقدان ہے ورنہ قیامت کے انکار کی کوئی معقول بنیاد نہیں ہے۔

(۲) یہ آثار و کھنڈرات اور نشانات عبرت پر غور و فکر نہ کرنے پر توبیح کی جارہی ہے۔ مطلب ہے کہ چل پھر کر وہ مشاہدہ کر چکے ہیں۔

(۳) یعنی ان کافروں کا، جن کو اللہ نے ان کے کفر باللہ، حق کے انکار اور رسولوں کی تکذیب کی وجہ سے ہلاک کیا۔

(۴) یعنی قریش اور اہل مکہ سے زیادہ۔

(۵) یعنی اہل مکہ تو کھیتی باڑی سے نا آشنا ہیں لیکن پھیلی قومیں اس وصف میں بھی ان سے بڑھ کر تھیں۔

(۶) اس لیے کہ ان کی عمریں بھی زیادہ تھیں، جسمانی قوت میں بھی زیادہ تھے اسباب معاش بھی ان کو زیادہ حاصل تھے، پس انہوں نے عمارتیں بھی زیادہ بنائیں، زراعت و کاشتکاری بھی کی اور وسائل رزق بھی زیادہ مسیا کیے۔

(۷) لیکن وہ ان پر ایمان نہیں لائے۔ نتیجتاً تمام تر قوتوں، ترقیوں اور فراغت و خوش حالی کے باوجود ہلاکت ان کا مقدر بن کر رہی۔

(۸) کہ انہیں بغیر گناہ کے عذاب میں مبتلا کر دیتا۔

(۹) یعنی اللہ کا انکار اور رسولوں کی تائید کر کے۔

(۱۰) سُؤاىِ، بروزن فُعْلَمَىِ، سُؤاىِ سے اَسْوَأُ کی تائید ہے جیسے حُسْنَىِ، اَحْسَنُ کی تائید ہے۔ یعنی ان کا جو انجام ہوا،

بدترین انجام تھا۔

بَابِ اللّٰهِ وَكَانُوا يَلْمِزُوْنَ ①

اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان کی ہنسی اڑاتے تھے۔ (۱۰)

اللہ تعالیٰ ہی مخلوق کی ابتدا کرتا ہے پھر وہی اسے دوبارہ پیدا کرے (۱) گا پھر تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ (۲) (۱۱)

اور جس دن قیامت قائم ہوگی تو گنہگار حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ (۱۲) (۱۳)

اور ان کے تمام تر شریکوں میں سے ایک بھی ان کا سفارشی نہ ہو گا (۴) اور (خود یہ بھی) اپنے شریکوں کے منکر ہو جائیں گے۔ (۵) (۱۳)

اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن (جماعتیں) الگ الگ ہو جائیں گی۔ (۱) (۱۳)

اَللّٰهُ يَبْدُؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ②

وَيَوْمَ نَقُومُ السَّاعَةَ يُنْبِئُ الْمُنْجِرُونَ ③

وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ مِنْ شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاؤُا وَكَانُوا بِشُرَكَائِهِمْ كُفِرِينَ ④

وَيَوْمَ نَقُومُ السَّاعَةَ يُؤْمِنُ الَّذِينَ كَفَرُوا ⑤

(۱) یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ پہلی مرتبہ پیدا کرنے پر قادر ہے، وہ مرنے کے بعد دوبارہ انہیں زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ اس لیے کہ دوبارہ پیدا کرنا، پہلی مرتبہ سے زیادہ مشکل نہیں ہے۔

(۲) یعنی میدان محشر اور موقف حساب میں، جہاں وہ عدل و انصاف کا اہتمام فرمائے گا۔

(۳) اِنْبِئُؤُسُ کے معنی ہیں، اپنے موقف کے اثبات میں کوئی دلیل پیش نہ کر سکتا اور حیران و سکت کھڑے رہنا۔ اسی کو نامیدی کے مفہوم سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ اس اعتبار سے مُنْبِئُؤُسُ وہ ہو گا جو نامید ہو کر خاموش کھڑا ہو اور اسے کوئی دلیل نہ سوجھ رہی ہو، قیامت والے دن کافروں اور مشرکوں کا یہی حال ہو گا یعنی معاینہ عذاب کے بعد وہ ہر خبر سے مایوس اور دلیل و حجت پیش کرنے سے قاصر ہوں گے۔ مجرموں سے مراد کافر و مشرک ہیں جیسا کہ اگلی آیت سے واضح ہے۔

(۴) شریکوں سے مراد وہ معبودان باطلہ ہیں جن کی مشرکین، یہ سمجھ کر عبادت کرتے تھے کہ یہ اللہ کے ہاں ان کے سفارشی ہوں گے، اور انہیں اللہ کے عذاب سے بچالیں گے۔ لیکن اللہ نے یہاں وضاحت فرمادی کہ اللہ کے ساتھ شرک کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے اللہ کے ہاں کوئی سفارشی نہیں ہو گا۔

(۵) یعنی وہاں ان کی الوہیت کے منکر ہو جائیں گے کیوں کہ وہ دیکھ لیں گے کہ یہ تو کسی کو کوئی فائدہ پہنچانے پر قادر نہیں ہیں۔ (فتح القدیر) دوسرے معنی ہیں کہ یہ معبود اس بات سے انکار کر دیں گے کہ یہ لوگ انہیں اللہ کا شریک گردان کر ان کی عبادت کرتے تھے۔ کیوں کہ وہ تو ان کی عبادت سے ہی بے خبر ہیں۔

(۶) اس سے مراد ہر فرد کا دوسرے فرد سے الگ ہونا نہیں ہے۔ بلکہ مطلب مومنوں کا اور کافروں کا الگ الگ ہونا ہے۔

جو ایمان لا کر نیک اعمال کرتے رہے وہ توجنت میں خوش و خرم کر دیئے جائیں گے۔^(۱۱) (۱۵)

اور جنہوں نے کفر کیا تھا اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو جھوٹا ٹھہرایا تھا وہ سب عذاب میں پکڑ کر حاضر رکھے جائیں گے۔^(۱۲) (۱۶)

پس اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھا کرو جب کہ تم شام کرو اور جب صبح کرو۔ (۱۷)

تمام تعریفوں کے لائق آسمان و زمین میں صرف وہی ہے تیسرے پہر کو اور ظہر کے وقت بھی (اس کی پاکیزگی بیان کرو)۔^(۱۳) (۱۸)

(وہی) زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔^(۱۴)

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُحْبَبُوْنَ ۝

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِآيٰتِنَا وَلِقَايِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحَضَّرُوْنَ ۝

فَسَبِّحْ لِلّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تَصْبِحُوْنَ ۝

وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَوَجِيْنَ تَنْظُرُوْنَ ۝

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ

اہل ایمان جنت میں اور اہل کفر و شرک جہنم میں چلے جائیں گے اور ان کے درمیان دائمی جدائی ہو جائے گی، یہ دونوں پھر کبھی اکٹھے نہیں ہوں گے یہ حساب کے بعد ہو گا۔ چنانچہ اسی علیحدگی کی وضاحت اگلی آیات میں کی جا رہی ہے۔

(۱) یعنی انہیں جنت میں اکرام و انعام سے نوازا جائے گا، جن سے وہ مزید خوش ہوں گے۔

(۲) یعنی ہمیشہ اللہ کے عذاب کی گرفت میں رہیں گے۔

(۳) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی ذات مقدسہ کے لیے تسبیح و تحمید ہے، جس سے مقصد اپنے بندوں کی رہنمائی ہے کہ ان اوقات میں جو ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اور جو اس کے کمال قدرت و عظمت پر دلالت کرتے ہیں، اس کی تسبیح و تحمید کیا کرو۔ شام کا وقت، رات کی تاریکی کا پیش خیمہ اور سپیدہ سحر دن کی روشنی کا پیا مبر ہوتا ہے۔ عشاء، شدت تاریکی کا اور ظہر، خوب روشن ہو جانے کا وقت ہے۔ پس وہ ذات پاک ہے جو ان سب کی خالق ہے اور جس نے ان تمام اوقات میں الگ الگ فوائد رکھے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ تسبیح سے مراد نماز ہے اور دونوں آیات میں مذکور اوقات پانچ نمازوں کے اوقات ہیں۔ تُمْسُوْنَ میں مغرب و عشاء، تَنْصَبِحُوْنَ میں نماز فجر، عَشِيًّا (سہ پہر) میں عصر اور تَنْظُرُوْنَ میں نماز ظہر آجاتی ہے، (فتح القدیر) ایک ضعیف حدیث میں ان دونوں آیات کو صبح و شام پڑھنے کی یہ فضیلت بیان ہوئی ہے کہ اس سے شب و روز کی کوتاہیوں کا ازالہ ہوتا ہے۔ (ابوداؤد، کتاب الأدب، باب ما یقول إذا أصبح)

(۴) جیسے انڈے کو مرغی سے، مرغی کو انڈے سے۔ انسان کو نطفے سے، نطفے کو انسان سے اور مومن کو کافر سے، کافر کو مومن سے پیدا فرماتا ہے۔

اور وہی زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے اس طرح تم (بھی) نکالے جاؤ گے۔^(۱) (۱۹)

اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر اب انسان بن کر (چلتے پھرتے) پھیل رہے ہو۔^(۲) (۲۰)

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں^(۳) تاکہ تم ان سے آرام پاؤ^(۴) اس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی قائم کر دی،^(۵) یقیناً

وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذَلِكَ تُخْرَجُونَ ﴿۱۹﴾

وَمِنَ الْآيَاتِ أَنْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُونَ ﴿۲۰﴾

وَمِنَ الْآيَاتِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ

(۱) یعنی قبروں سے زندہ کر کے۔

(۲) إِذَا فُجِّئْتُمْ ہے۔ مقصود اس سے ان اطوار کی طرف اشارہ ہے جن سے گزر کر بچہ پورا انسان بنتا ہے جس کی تفصیل قرآن میں دوسرے مقامات پر بیان کی گئی ہے۔ تَنْتَشِرُونَ سے مراد انسان کا کسب معاش اور دیگر حاجات و ضروریات بشریہ کے لیے چلنا پھرنا ہے۔

(۳) یعنی تمہاری ہی جنس سے عورتیں پیدا کیں تاکہ وہ تمہاری بیویاں بنیں اور تم جوڑا جوڑا ہو جاؤ ذَوْجُ عَرَبِيٍّ میں جوڑے کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے مرد عورت کے لیے اور عورت مرد کے لیے زوج ہے۔ عورتوں کے جنس بشر ہونے کا مطلب ہے کہ دنیا کی پہلی عورت۔ حضرت حوا۔ کو حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا۔ پھر ان دونوں سے نسل انسانی کا سلسلہ چلا۔

(۴) مطلب یہ ہے کہ اگر مرد اور عورت کی جنس ایک دوسرے سے مختلف ہوتی، مثلاً عورتیں جنات یا حیوانات میں سے ہوتیں، تو ان سے وہ سکون کبھی حاصل نہ ہوتا جو اس وقت دونوں کے ایک ہی جنس سے ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ ایک دوسرے سے نفرت و وحشت ہوتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کمال رحمت ہے کہ اس نے انسانوں کی بیویاں انسان ہی بنائیں۔

(۵) مَوَدَّةٌ یہ ہے کہ مرد بیوی سے بے پناہ پیار کرتا ہے اور ایسے ہی بیوی شوہر سے۔ جیسا کہ عام مشاہدہ ہے۔ ایسی محبت جو میاں بیوی کے درمیان ہوتی ہے، دنیا میں کسی بھی دو شخصوں کے درمیان نہیں ہوتی۔ اور رحمت یہ ہے کہ مرد بیوی کو ہر طرح کی سہولت اور آسائش بہم پہنچاتا ہے، جس کا مکلف اسے اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے اور ایسے ہی عورت بھی اپنے قدرت و اختیار کے دائرہ میں۔ تاہم انسان کو یہ سکون اور باہمی پیار انہی جوڑوں سے حاصل ہوتا ہے جو قانون شریعت کے مطابق باہم نکاح سے قائم ہوتے ہیں اور اسلام انہی کو جوڑا قرار دیتا ہے۔ غیر قانونی جوڑوں کو وہ جوڑا ہی تسلیم نہیں کرتا بلکہ انہیں زانی اور بدکار قرار دیتا اور ان کے لیے سخت سزا تجویز کرتا ہے۔ آج کل مغربی تہذیب کے علم بردار

لَا يَتْلُوَنَّ الْقَوْمَ وَيَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۱﴾

غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں

ہیں۔ (۲۱)

اس (کی قدرت) کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور رنگتوں کا اختلاف (بھی) ہے،^(۱) دانش مندوں کے لیے اس میں یقیناً بڑی

نشانیاں ہیں۔ (۲۲)

اور (بھی) اس کی (قدرت کی) نشانی تمہاری راتوں اور دن کی نیند میں ہے اور اس کے فضل (یعنی روزی) کو تمہارا تلاش کرنا بھی^(۲) ہے۔ جو لوگ (کان لگا کر) سننے کے عادی

ہیں ان کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ (۲۳)

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ أَلْسِنَتِكُمْ
وَآلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ ﴿۲۲﴾

وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَبِلَوْنِكُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ ﴿۲۳﴾

شیاطین ان مذموم کوششوں میں مصروف ہیں کہ مغربی معاشروں کی طرح اسلامی ملکوں میں بھی نکاح کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے بدکار مرد و عورت کو ”جوڑا“ (COUPLE) تسلیم کروا دیا جائے اور ان کے لیے سزا کے بجائے، وہ حقوق منوائے جائیں، جو ایک قانونی جوڑے کو حاصل ہوتے ہیں۔ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّى يُؤْفَكُونَ۔

(۱) دنیا میں اتنی زبانوں کا پیدا کر دینا بھی اللہ کی قدرت کی ایک بہت بڑی نشانی ہے، عربی ہے، ترکی ہے، انگریزی ہے، اردو، ہندی ہے، پشتو، فارسی، سندھی، بلوچی وغیرہ ہے۔ پھر ایک ایک زبان کے مختلف لہجے اور اسلوب ہیں۔ ایک انسان ہزاروں اور لاکھوں کے مجمع میں اپنی زبان اور اپنے لہجے سے پہچان لیا جاتا ہے کہ یہ شخص فلاں ملک اور فلاں علاقہ کا ہے۔ صرف زبان ہی اس کا مکمل تعارف کرا دیتی ہے۔ اسی طرح ایک ہی ماں باپ (آدم و حوا علیہما السلام) سے ہونے کے باوجود رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کوئی کالا ہے، کوئی گورا، کوئی نیلگوں ہے تو کوئی گندمی رنگ کا، پھر کالے اور سفید رنگ میں بھی اتنے درجات رکھ دیئے ہیں کہ بیشتر انسانی آبادی دو رنگوں میں تقسیم ہونے کے باوجود ان کی بیسیوں قسمیں ہیں اور ایک دوسرے سے یکسر الگ اور ممتاز۔ پھر ان کے چہروں کے خدو خال، جسمانی ساخت اور قد و قامت میں ایسا فرق رکھ دیا گیا ہے کہ ایک ایک ملک کا انسان الگ سے پہچان لیا جاتا ہے۔ یعنی باوجود اس بات کے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے نہیں ملتا، حتیٰ کہ ایک بھائی دوسرے بھائی سے مختلف ہے لیکن اللہ کی قدرت کا کمال ہے کہ پھر بھی کسی ایک ہی ملک کے باشندے، دوسرے ملک کے باشندوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔

(۲) نیند کا باعث سکون و راحت ہونا چاہے وہ رات کو ہو یا بوقت قیلولہ، اور دن کو تجارت و کاروبار کے ذریعے سے اللہ کا فضل تلاش کرنا، یہ مضمون کئی جگہ گزر چکا ہے۔

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ (بھی) ہے کہ وہ تمہیں ڈرانے اور امید وار بنانے کے لیے بجلیاں دکھاتا^(۱) ہے اور آسمان سے بارش برساتا ہے اور اس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے، اس میں (بھی) عقلمندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ (۲۴)

اس کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ آسمان و زمین اسی کے حکم سے قائم ہیں، پھر جب وہ تمہیں آواز دے گا صرف ایک باری کی آواز کے ساتھ ہی تم سب زمین سے نکل آؤ گے۔^(۲) (۲۵)

اور زمین و آسمان کی ہر ہر چیز اسی کی ملکیت ہے اور ہر ایک اس کے فرمان کے ماتحت ہے۔^(۳) (۲۶)

وہی ہے جو اول بار مخلوق کو پیدا کرتا ہے پھر سے دوبارہ پیدا کرے گا اور یہ تو اس پر بہت ہی آسان ہے۔ اسی کی بہترین اور اعلیٰ صفت ہے،^(۴) آسمانوں میں اور زمین میں بھی اور وہی غلبے والا حکمت والا ہے۔ (۲۷)

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ایک مثال خود تمہاری ہی بیان فرمائی، جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے کیا اس میں تمہارے غلاموں میں سے بھی کوئی تمہارا شریک

وَمِنَ الْآيَاتِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْقًا وَطَمَعًا وَيُنزِلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِي بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۲۴﴾

وَمِنَ الْآيَاتِ أَنْ نَقُومَ السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ بِأَمْرٍ ثُمَّ إِذْ دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْأَرْضِ إِذْ أَنْتُمْ تَخْرُجُونَ ﴿۲۵﴾

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ كُلِّ لَهٗ فَنُتَوٰنَ ﴿۲۶﴾

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ۗ وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۲۷﴾

ضَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِّنْ أَنْفُسِكُمْ هَلْ لَكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءٍ فِي مَادَرَتُمْ أَفْئِدَتُمْ فَأَنْتُمْ بِنِعْمَةِ سَٰوَأٍ

(۱) یعنی آسمان میں بجلی چمکتی اور بادل کڑکتے ہیں، تو تم ڈرتے بھی ہو کہ کہیں بجلی گرنے یا زیادہ بارش ہونے کی وجہ سے کھیتیاں برباد نہ ہو جائیں اور امیدیں بھی وابستہ کرتے ہو کہ بارشیں ہوں گی تو فصل اچھی ہوگی۔

(۲) یعنی جب قیامت برپا ہوگی تو آسمان و زمین کا یہ سارا نظام، جو اس وقت اس کے حکم سے قائم ہے، درہم برہم ہو جائے گا اور تمام انسان قبروں سے زندہ ہو کر باہر نکل آئیں گے۔

(۳) یعنی اس کے کنوینی حکم کے آگے سب بے بس اور لاچار ہیں۔ جیسے موت و حیات، صحت و مرض، ذلت و عزت وغیرہ میں۔

(۴) یعنی اتنے کمالات اور عظیم قدرتوں کا مالک، تمام مثالوں سے اعلیٰ اور برتر ہے۔ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

ہے؟ کہ تم اور وہ اس میں برابر درجے کے ہو؟^(۱) اور تم ان کا ایسا خطرہ رکھتے ہو جیسا خود اپنوں کا،^(۲) ہم عقل رکھنے والوں کے لیے اسی طرح کھول کھول کر آیتیں بیان کر دیتے ہیں۔^(۳) (۲۸)

بلکہ بات یہ ہے کہ یہ ظالم تو بغیر علم کے^(۴) خواہش پرستی کر رہے ہیں، اسے کون راہ دکھائے جسے اللہ تعالیٰ راہ سے ہٹا دے،^(۵) ان کا ایک بھی مددگار نہیں۔^(۶) (۲۹)

پس آپ ایک سو ہو کر اپنا منہ دین کی طرف متوجہ کر دیں۔^(۷) اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو

تَخَافُوهُمْ كَخِيفَتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۳۰﴾

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهْوَاءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَمَنْ يَهْدِي مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ وَمَا لَهُمْ مِنْ مُصِيرِينَ ﴿۳۱﴾

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ

(۱) یعنی جب تم یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہارے غلام اور نوکر چاکر، جو تمہارے ہی جیسے انسان ہیں، وہ تمہارے مال و دولت میں شریک اور تمہارے برابر ہو جائیں تو پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ کے بندے، چاہے وہ فرشتے ہوں، پیغمبر ہوں، اولیاء و صلحاء ہوں یا شجر و حجر کے بنائے ہوئے معبود، وہ اللہ کے ساتھ شریک ہو جائیں جب کہ وہ بھی اللہ کے غلام اور اس کی مخلوق ہیں؟ یعنی جس طرح پہلی بات نہیں ہو سکتی، دوسری بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اللہ کے ساتھ دوسروں کی بھی عبادت کرنا اور انہیں بھی حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنا بیکسر غلط ہے۔

(۲) یعنی کیا تم اپنے غلاموں سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح تم (آزاد لوگ) آپس میں ایک دوسرے سے ڈرتے ہو۔ یعنی جس طرح مشرک کہ کاروبار یا جائیداد میں سے خرچ کرتے ہوئے ڈر محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے شریک باز پرس کریں گے۔ کیا تم اپنے غلاموں سے اس طرح ڈرتے ہو؟ یعنی نہیں ڈرتے۔ کیوں کہ تم انہیں مال و دولت میں شریک قرار دے کر اپنا ہم مرتبہ بنا ہی نہیں سکتے تو اس سے ڈر بھی کیسا؟

(۳) کیوں کہ وہ اپنی عقلوں کو استعمال میں لا کر اور غور و فکر کا اہتمام کر کے آیات تشریحیہ اور تکوینیہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور جو ایسا نہیں کرتے، ان کی سمجھ میں توحید کا مسئلہ بھی نہیں آتا جو بالکل صاف اور نہایت واضح ہے۔

(۴) یعنی اس حقیقت کا انہیں ادراک ہی نہیں ہے کہ وہ علم سے بے بہرہ اور ضلالت کا شکار ہیں اور اسی بے علمی اور گمراہی کی وجہ سے وہ اپنی عقل کو کام میں لانے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور اپنی نفسانی خواہشات اور آرائے فاسدہ کے پیرو کار ہیں۔

(۵) کیوں کہ اللہ کی طرف سے ہدایت اسے ہی نصیب ہوتی ہے جس کے اندر ہدایت کی طلب اور آرزو ہوتی ہے، جو اس طلب صادق سے محروم ہوتے ہیں، انہیں گمراہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

(۶) یعنی ان گمراہوں کا کوئی مددگار نہیں جو انہیں ہدایت سے بہرہ ور کر دے یا ان سے عذاب کو پھیر دے۔

(۷) یعنی اللہ کی توحید اور اس کی عبادت پر قائم رہیں اور ادیان باطلہ کی طرف التفات ہی نہ کریں۔

الْقِيَمَةُ وَاللِّبَاءُ وَالنَّفْسُ وَالْاَيْمُنُ وَالصَّلَاةُ وَلَا تَكُونُوا

مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

مِنَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ اٰيَاتِنَا وَيُبْهَهُمْ وَكَانُوا شَيْعًا كُلِّ حِزْبٍ بِنَا
لَدَيْهِمْ فِرْعَوْنُ ۝

پیدا کیا ہے،^(۱) اللہ تعالیٰ کے بنائے کو بدلنا نہیں،^(۲) یہی
سیدھا دین ہے^(۳) لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔^(۴) (۳۰)
(لوگو!) اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر اس سے
ڈرتے رہو اور نماز کو قائم رکھو اور مشرکین میں
سے نہ ہو جاؤ۔^(۵) (۳۱)

ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے
ٹکڑے کر دیا اور خود بھی گروہ گروہ ہو گئے^(۶) ہر گروہ
اس چیز پر جو اس کے پاس ہے مگن ہے۔^(۷) (۳۲)

(۱) فطرت کے اصل معنی خلقت (پیدائش) کے ہیں۔ یہاں مراد ملت اسلام (و توحید) ہے مطلب یہ ہے کہ سب کی
پیدائش، بغیر مسلم و کافر کی تفریق کے۔ اسلام اور توحید پر ہوتی ہے، اس لیے توحید ان کی فطرت یعنی جبلت میں شامل ہے
جس طرح کہ عہد الست سے واضح ہے۔ بعد میں بہت سوں کو ماحول یا دیگر عوارض، فطرت کی اس آواز کی طرف نہیں
آنے دیتے، جس کی وجہ سے وہ کفر پر ہی باقی رہتے ہیں جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے ”ہر پچہ فطرت پر
پیدا ہوتا ہے، لیکن پھر اس کے ماں باپ، اس کو یہودی، عیسائی اور مجوسی وغیرہ بنا دیتے ہیں۔“ (صحیح بخاری،
تفسیر سورۃ الروم۔ مسلم کتاب القدر، باب معنی کل مولود یولد علی الفطرۃ)
(۲) یعنی اللہ کی اس خلقت (فطرت) کو تبدیل نہ کرو بلکہ صحیح تربیت کے ذریعے اس کی نشوونما کرو تاکہ ایمان و
توحید بچوں کے دل و دماغ میں راسخ ہو جائے۔ یہ خبر بمعنی انشاء یعنی نفی، نہی کے معنی میں ہے۔
(۳) یعنی وہ دین جس کی طرف یکسو اور متوجہ ہونے کا حکم ہے، یا جو فطرت کا تقاضا ہے وہ یہی دین قیم ہے۔
(۴) اسی لیے وہ اسلام اور توحید سے ناآشنا رہتے ہیں۔

(۵) یعنی ایمان و تقویٰ اور اقامت صلوٰۃ سے گریز کر کے، مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔
(۶) یعنی اصل دین کو چھوڑ کر یا اس میں من مانی تبدیلیاں کر کے الگ الگ فرقوں میں بٹ گئے، جیسے کوئی یہودی، کوئی
نصرانی، کوئی مجوسی وغیرہ ہو گیا۔

(۷) یعنی ہر فرقہ اور گروہ سمجھتا ہے کہ وہ حق پر ہے اور دوسرے باطل پر، اور جو سارے انہوں نے تلاش کر رکھے
ہیں، جن کو وہ دلائل سے تعبیر کرتے ہیں، ان پر خوش اور مطمئن ہیں، بد قسمتی سے ملت اسلامیہ کا بھی یہی حال ہوا کہ وہ
بھی مختلف فرقوں میں بٹ گئی اور ان کا بھی ہر فرقہ اسی زعم باطل میں مبتلا ہے کہ وہ حق پر ہے، حالانکہ حق پر صرف ایک
ہی گروہ ہے جس کی پہچان نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دی ہے کہ میرے اور میرے صحابہ کے طریقے پر چلنے والا ہو گا۔

لوگوں کو جب کبھی کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو اپنے رب کی طرف (پوری طرح) رجوع ہو کر دعائیں کرتے ہیں، پھر جب وہ اپنی طرف سے رحمت کا ڈالنا لگتا ہے تو ان میں سے ایک جماعت اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتی ہے۔ (۳۳)

تاکہ وہ اس چیز کی ناشکری کریں جو ہم نے انہیں دی ہے (۱) اچھا تم فائدہ اٹھا لو ابھی ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ (۳۳) کیا ہم نے ان پر کوئی دلیل نازل کی ہے جو اسے بیان کرتی ہے جسے یہ اللہ کے ساتھ شریک کر رہے ہیں۔ (۳۵) (۲)

اور جب ہم لوگوں کو رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ خوب خوش ہو جاتے ہیں اور اگر انہیں ان کے ہاتھوں کے کر توت کی وجہ سے کوئی برائی پہنچے تو ایک دم وہ محض ناامید ہو جاتے ہیں۔ (۳۶) (۳)

کیا انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے کشادہ روزی دیتا ہے اور جسے چاہے تنگ، (۴) اس میں بھی ان

وَإِذْ آمَسَّ النَّاسُ فَذُودُوا هَهُمْ يُتَنَبِّئِينَ إِلَىٰ سَعَةٍ إِذْ كَا
أَذَقَهُمْ مِثْلَهُ دَحْضَةً إِذْ أَلْفَيْتُمْ أَنفُسَكُمْ بِرِءَاءِ يَشْرِكُونَ ﴿۳۳﴾

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ فَتَمْتَعُوا حَتَّىٰ تَعْلَمُونَ ﴿۳۴﴾

أَمْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمُنْجَمَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۳۵﴾

وَإِذْ أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا وَإِنَّا تُصِيبُهُمْ سَيِّئَةٌ يُمَاقِدَتَّمُ
أَبْيُومَ إِذْ هُمْ يَقْتُلُونَ ﴿۳۶﴾

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّ فِي
ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۳۷﴾

(۱) یہ وہی مضمون ہے جو سورہ عنکبوت کے آخر میں گزرا۔

(۲) یہ استفہام انکاری ہے۔ یعنی یہ جن کو اللہ کا شریک گردانتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں، یہ بلا دلیل ہے۔ اللہ نے اس کی کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی۔ بھلا اللہ تعالیٰ شرک کے اثبات و جواز کے لیے کس طرح کوئی دلیل اتار سکتا تھا جب کہ اس نے سارے پیغمبر بھی ہی اس لیے تھے کہ وہ شرک کی تردید اور توحید کا اثبات کریں۔ چنانچہ ہر پیغمبر نے اگر سب سے پہلے اپنی قوم کو توحید ہی کا وعظ کیا۔ اور آج اہل توحید مسلمانوں کو بھی نام نہاد مسلمانوں میں توحید و سنت کا وعظ کرنا پڑ رہا ہے۔ کیوں کہ مسلمان عوام کی اکثریت شرک و بدعت میں مبتلا ہے۔ هَذَا هُمُ اللَّهُ تَعَالَىٰ .

(۳) یہ وہی مضمون ہے جو سورہ ہود میں گزرا اور جو انسانوں کی اکثریت کا شیوہ ہے کہ راحت میں وہ اترانے لگتے ہیں اور مصیبت میں ناامید ہو جاتے ہیں۔ البتہ اہل ایمان اس سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ تکلیف میں صبر اور راحت میں اللہ کا شکر یعنی عمل صالح کرتے ہیں۔ یوں دونوں حالتیں ان کے لیے خیر اور اجر و ثواب کا باعث بنتی ہیں۔

(۴) یعنی اپنی حکمت و مصلحت سے وہ کسی کو مال و دولت زیادہ اور کسی کو کم دیتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ عقل و شعور میں

لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں نشانیاں ہیں۔ (۳۷) پس قرابت دار کو مسکین کو مسافر کو ہر ایک کو اس کا حق دیتے،^(۱) یہ انکے لیے بہتر ہے جو اللہ تعالیٰ کا منہ دیکھنا چاہتے ہوں،^(۲) ایسے ہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔ (۳۸) تم جو سود پر دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں بڑھتا رہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نہیں بڑھتا۔^(۳) اور جو کچھ صدقہ زکوٰۃ

قَاتِ ذَٰلِ الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَ الْيَسِيْرِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَرْيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَ اَوْلٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۷﴾
وَمَا تَنْتَفِعُوْنَ مِنْ رِّبَا لَيْزٍ يُؤْتٰۤى فِىْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْيُوْنَ

اور ظاہری اسباب و وسائل میں دو انسان ایک جیسے ہی محسوس ہوتے ہیں، ایک جیسا ہی کاروبار بھی شروع کرتے ہیں۔ لیکن ایک کے کاروبار کو خوب فروغ ملتا ہے اور اس کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں، جب کہ دوسرے شخص کا کاروبار محدود ہی رہتا ہے اور اسے وسعت نصیب نہیں ہوتی۔ آخر یہ کون ہستی ہے، جس کے پاس تمام اختیارات ہیں اور وہ اس قسم کے تصرفات فرماتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ کبھی دولت فراواں کے مالک کو محتاج اور محتاج کو مال و دولت سے نواز دیتا ہے۔ یہ سب اسی ایک اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

(۱) جب وسائل رزق تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہیں اور وہ جس پر چاہے اس کے دروازے کھول دیتا ہے تو اسباب ثروت کو چاہیے کہ وہ اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے ان کا وہ حق ادا کرتے رہیں جو ان کے مال میں ان کے مستحق رشتے داروں، مسکین اور مسافروں کا رکھا گیا ہے۔ رشتے دار کا حق اس لیے مقدم کیا کہ اس کی فضیلت زیادہ ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ غریب رشتے دار کے ساتھ احسان کرنا دو ہرے اجر کا باعث ہے۔ ایک صدقے کا اجر اور دو سراصلہ رحمی کا۔ علاوہ ازیں اسے حق سے تعبیر کر کے اس طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ امداد کر کے ان پر تم احسان نہیں کرو گے بلکہ ایک حق کی ہی ادائیگی کرو گے۔

(۲) یعنی جنت میں اس کے دیدار سے مشرف ہونا۔

(۳) یعنی سود سے بظاہر اضافہ معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا، بلکہ اس کی نحوست بالآخر دنیا و آخرت میں تباہی کا باعث ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور متعدد صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم نے اس آیت میں ربّنا سے مراد سود (بیاج) نہیں، بلکہ وہ ہدیہ اور تحفہ لیا ہے جو کوئی غریب آدمی کسی مال دار کو یا رعایا کا کوئی فرد بادشاہ یا حکمران کو اور ایک خادم اپنے مخدوم کو اس نیت سے دیتا ہے کہ وہ اس کے بدلے میں مجھے اس سے زیادہ دے گا۔ اسے دیا سے اسی لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ دیتے وقت اس میں زیادتی کی نیت ہوتی ہے۔ یہ اگرچہ مباح ہے تاہم اللہ کے ہاں اس پر اجر نہیں ملے گا ﴿ فَلَا يَرْيُوْنَ اِحْسٰنًا لِلّٰهِ ﴾ سے اسی اخروی اجر کی نفی ہے۔ اس صورت میں ترجمہ ہو گا ”جو تم عطیہ دو، اس نیت سے کہ واپسی کی صورت میں زیادہ ملے، پس اللہ کے ہاں اس کا ثواب نہیں۔“ (ابن کثیر، امیر التفاسیر)

عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يَتَّبِعُونَ مِنْ ذِكْوٰةٍ قُرْبٰى وَّوَجْهَ اللّٰهِ
قَالُوْا لَيْكُمُ الْمَضْعُوْنَ ۝۵۹

اللّٰهُ الَّذِى خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُعِيْبِكُمْ ثُمَّ يُعِيْبِكُمْ
هَلْ مِنْ شُرَكَآءِكُمْ مَّنْ يَفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ مِّمَّنْجَنَّةٍ
وَلَعَلَّ نَمَّآ يُشْرِكُوْنَ ۝۶۰

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَتَبْتَ اٰيٰتِى النَّاسِ
لِيُبَيِّنَ لَهُمْ بَعْضَ الَّذِى عَمِلُوْا عَلَيْهِمْ لِيَرْجِعُوْنَ ۝۶۱

تم اللہ تعالیٰ کا منہ دیکھنے (اور خوشنودی کے لیے) دو تو ایسے لوگ ہی ہیں اپنا دو چند کرنے والے ہیں۔ (۳۹)^(۱)
اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر روزی دی پھر مار ڈالے گا پھر زندہ کر دے گا بتاؤ تمہارے شریکوں میں سے کوئی بھی ایسا ہے جو ان میں سے کچھ بھی کر سکتا ہو۔
اللہ تعالیٰ کے لیے پاپی اور برتری ہے ہر اس شریک سے جو یہ لوگ مقرر کرتے ہیں۔ (۴۰)

خشکی اور تری میں لوگوں کی بد اعمالیوں کے باعث فساد پھیل گیا۔ اس لیے کہ انہیں ان کے بعض کرتوتوں کا پھل اللہ تعالیٰ چکھادے (ہمت) ممکن ہے کہ وہ باز آجائیں۔ (۴۱)^(۲)

(۱) زکوٰۃ و صدقات سے ایک تو روحانی و معنوی اضافہ ہوتا ہے یعنی بقیہ مال میں اللہ کی طرف سے برکت ڈال دی جاتی ہے۔ دوسرے، قیامت والے دن اس کا اجر و ثواب کئی کئی گنا ملے گا، جس طرح حدیث میں ہے کہ حلال کمائی سے ایک کھجور کے برابر صدقہ بڑھ بڑھ کر احد پہاڑ کے برابر ہو جائے گا۔ (صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ)

(۲) خشکی سے مراد، انسانی آبادیاں اور تری سے مراد سمندر، سمندری راستے اور ساحلی آبادیاں ہیں۔ فساد سے مراد ہر وہ بگاڑ ہے جس سے انسانوں کے معاشرے اور آبادیوں میں امن و سکون نہ وبالا اور ان کے عیش و آرام میں خلل واقع ہو۔ اس لیے اس کا اطلاق معاصی و سینات پر بھی صحیح ہے کہ انسان ایک دوسرے پر ظلم کر رہے ہیں، اللہ کی حدوں کو پامال اور اخلاقی ضابطوں کو توڑ رہے ہیں اور قتل و خونریزی عام ہو گئی ہے اور ان ارضی و سماوی آفات پر بھی اس کا اطلاق صحیح ہے۔ جو اللہ کی طرف سے بطور سزا و تنبیہ نازل ہوتی ہیں۔ جیسے قحط، کثرت موت، خوف اور سیلاب وغیرہ مطلب یہ ہے کہ جب انسان اللہ کی نافرمانیوں کو اپنا وطیرہ بنا لیں تو پھر مکافات عمل کے طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے اعمال و کردار کا رخ برائوں کی طرف پھرتا ہے اور زمین فساد سے بھر جاتی ہے امن و سکون ختم اور اس کی جگہ خوف و دہشت، سلب و منب اور قتل و غارت گری عام ہو جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ بعض دفعہ آفات ارضی و سماوی کا بھی نزول ہوتا ہے۔ مقصد اس سے یہی ہوتا ہے کہ اس عام بگاڑ یا آفات الہیہ کو دیکھ کر شاید لوگ گناہوں سے باز آجائیں، توبہ کر لیں اور ان کا رجوع اللہ کی طرف ہو جائے۔

اس کے برعکس جس معاشرے کا نظام اطاعت الہی پر قائم ہو اور اللہ کی حدیں نافذ ہوں، ظلم کی جگہ عدل کا دور دورہ ہو۔ وہاں امن و سکون اور اللہ کی طرف سے خیر و برکت کا نزول ہوتا ہے۔ جس طرح ایک حدیث میں آتا ہے ”زمین میں اللہ کی ایک حد کا قائم کرنا، وہاں کے انسانوں کے لیے چالیس روز کی بارش سے بہتر ہے۔“ (النسائی، کتاب قطع بد

زمین میں چل پھر کر دیکھو تو سہی کہ اگلوں کا انجام کیا ہوا۔
جن میں اکثر لوگ مشرک تھے۔^(۱) (۳۲)

پس آپ اپنا رخ اس سچے اور سیدھے دین کی طرف ہی
رکھیں قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس کا نل جانا اللہ
تعالیٰ کی طرف سے ہے ہی نہیں،^(۲) اس دن سب
متفرق^(۳) ہو جائیں گے۔ (۳۳)

کفر کرنے والوں پر ان کے کفر کا وبال ہو گا اور نیک کام
کرنے والے اپنی ہی آرام گاہ سنوار رہے ہیں۔^(۴) (۳۴)
ناکہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے جزا دے جو ایمان
لائے اور نیک^(۵) اعمال کیے وہ کافروں کو دوست نہیں
رکھتا ہے۔ (۳۵)

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ
مِن قَبْلُ كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُشْرِكِينَ ﴿۳۲﴾

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَدِيمِ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمَ لَا مَرَدَّ
لَهُ مِنَ اللَّهِ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۳۳﴾

مَنْ لَقِيَ فَعَلَيْهِ لَقْرُهُ أَوْ مِن عَمَلٍ صَالِحًا فَلَا نُقْسِمُ بِكُمْ
بِئِهْمُونَ ﴿۳۴﴾

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِن فَضْلِهِ إِنَّهُ
لَذُو حُبٍّ الْكَلْبِيِّنَ ﴿۳۵﴾

السارق، باب الشرغيب فى إقامة الحد۔ وابن ماجه) اسی طرح یہ حدیث ہے کہ ”جب ایک بدکار (فاجر) آدمی
فوت ہو جاتا ہے تو بندے ہی اس سے راحت محسوس نہیں کرتے شہر بھی اور درخت اور جانور بھی آرام پاتے ہیں۔“
(صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب سكرات الموت۔ مسلم، کتاب الجنائز، باب ماجاء فى مستريح و
مستراح منه)

(۱) شرک کا خاص طور پر ذکر کیا کہ یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔ علاوہ ازیں اس میں دیگر سیئات و معاصی بھی آجاتی ہیں۔
کیونکہ ان کا ارتکاب بھی انسان اپنے نفس کی بندگی ہی اختیار کر کے کرتا ہے، اسی لیے اسے بعض لوگ عملی شرک
سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۲) یعنی اس دن کے آنے کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اس لیے اس دن (قیامت) کے آنے سے پہلے پہلے اطاعت الہی کا
راستہ اختیار کر لیں اور نیکیوں سے اپنا دامن بھر لیں۔

(۳) یعنی دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے، ایک مومنوں کا دوسرا کافروں کا۔

(۴) مہذب کے معنی ہیں راستہ ہموار کرنا، فرش بچھانا، یعنی یہ عمل صالح کے ذریعے سے جنت میں جانے اور وہاں اعلیٰ
منازل حاصل کرنے کے لیے راستہ ہموار کر رہے ہیں۔

(۵) یعنی محض نیکیاں دخول جنت کے لیے کافی نہیں ہوں گی، جب تک ان کے ساتھ اللہ کا فضل بھی شامل حال نہ ہو گا۔
پس وہ اپنے فضل سے ایک ایک نیکی کا اجر دس سے سات سو گنا تک بلکہ اس سے زیادہ بھی دے گا۔

اس کی نشانیوں میں سے خوشخبریاں دینے والی (۱) ہواؤں کو چلانا بھی ہے اس لیے کہ تمہیں اپنی رحمت سے لطف اندوز کرے، (۲) اور اس لیے کہ اس کے حکم سے کشتیاں چلیں (۳) اور اس لیے کہ اس کے فضل کو تم ڈھونڈو (۴) اور اس لیے کہ تم شکرگزار ہو کرو۔ (۵) (۳۶)

اور ہم نے آپ سے پہلے بھی اپنے رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا وہ ان کے پاس دلیلیں لائے۔ پھر ہم نے گناہ گاروں سے انتقام لیا۔ ہم پر مومنوں کی مدد کرنا لازم ہے۔ (۶) (۳۷)

وَمِنَ الْآيَاتِ أَنْ يُرْسِلَ الرِّيحَ مَبْثُورَاتٍ لَّا يُدْرِكُهُنَّ وَلَئِنَّ لَكُمْ مِنْهُنَّ ذُرِّيَّتًا وَلَئِنَّ لَكُمْ مِنْهُنَّ أَفْئَاتًا يَأْتِرُهُنَّ وَلَئِنَّ لَكُمْ مِنْهُنَّ فُضْلًا
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۳۶﴾

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَى قَوْمِهِمْ فَجَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَاسْتَمْتَنُوا مِنَ الَّذِينَ مِنْ آجُرُمُوا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْهِمْ نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۷﴾

(۱) یعنی یہ ہوائیں بارش کی پیامبر ہوتی ہیں۔

(۲) یعنی بارش سے انسان بھی لذت و سرور محسوس کرتا ہے اور فصلیں بھی لہلہا اٹھتی ہیں۔

(۳) یعنی ان ہواؤں کے ذریعے سے کشتیاں بھی چلتی ہیں۔ مراد بادبانی کشتیاں ہیں۔ اب انسان نے اللہ کی دی ہوئی دماغی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال سے دوسری کشتیاں اور جہاز ایجاد کر لیے ہیں جو مشینوں کے ذریعے سے چلتے ہیں۔ تاہم ان کے لیے بھی موافق اور مناسب ہوائیں ضروری ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی طوفانی موجوں کے ذریعے سے غرق آب کر دینے پر قادر ہے۔

(۴) یعنی ان کے ذریعے سے مختلف ممالک میں آجا کر تجارت و کاروبار کر کے۔

(۵) ان ظاہری و باطنی نعمتوں پر، جن کا کوئی شمار ہی نہیں۔ یعنی یہ ساری سہولتیں اللہ تعالیٰ تمہیں اس لیے بہم پہنچاتا ہے کہ تم اپنی زندگی میں ان سے فائدہ اٹھاؤ اور اللہ کی بندگی و اطاعت بھی کرو!

(۶) یعنی اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) جس طرح ہم نے آپ کو رسول بنا کر آپ کی قوم کی طرف بھیجا ہے، اسی طرح آپ سے پہلے بھی رسول ان کی قوموں کی طرف بھیجے، ان کے ساتھ دلائل اور معجزات بھی تھے، لیکن قوموں نے ان کی تکذیب کی، ان پر ایمان نہیں لائے۔ بالآخر ان کے اس جرم تکذیب اور ارتکاب معصیت پر ہم نے انہیں اپنی سزا و تعزیر کا نشانہ بنایا اور اہل ایمان کی نصرت و تائید کی جو ہم پر لازم ہے۔ یہ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والے مسلمانوں کو تسلی دی جا رہی ہے کہ کفار و مشرکین کی روش تکذیب سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر نبی کے ساتھ اس کی قوم نے یہی معاملہ کیا ہے۔ نیز کفار کو تنبیہ ہے کہ اگر وہ ایمان نہ لائے تو ان کا حشر بھی وہی ہو گا جو گزشتہ قوموں کا ہو چکا ہے۔ کیوں کہ اللہ کی مدد تو بالآخر مومنوں ہی کو حاصل ہوگی، جس میں پیغمبر اور اس

اللہ تعالیٰ ہوا میں چلاتا ہے وہ ابر کو اٹھاتی ہیں^(۱) پھر اللہ تعالیٰ اپنی منشا کے مطابق اسے آسمان میں پھیلا دیتا ہے^(۲) اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے^(۳) پھر آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر سے قطرے نکلتے ہیں^(۴) اور جنہیں اللہ چاہتا ہے ان بندوں پر وہ پانی برساتا ہے تو وہ خوش خوش ہو جاتے ہیں۔ (۳۸)

یقین ماننا کہ بارش ان پر برسنے سے پہلے پہلے تو وہ ناامید ہو رہے تھے۔ (۳۹)

پس آپ رحمت الہی کے آثار دیکھیں کہ زمین کی موت کے بعد کس طرح اللہ تعالیٰ اسے زندہ کر دیتا ہے؟ کچھ شک نہیں کہ وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے^(۵) اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۵۰)

اور اگر ہم باد تند چلا دیں اور یہ لوگ انہی کھیتوں کو (مرحمتی ہوئی) زرد پڑی ہوئی دیکھ لیں تو پھر اس کے بعد ناشکری کرنے لگیں۔^(۶) (۵۱)

اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيْحَ فَتَحْمِلُ السَّحَابَ يَابِسْتُمْ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَنْشَأُ وَيَجْعَلُهُ كِسْفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ ۚ فَإِذَا أَصَابَ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿۳۸﴾

وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ يُنْزَلَ عَلَيْهِمْ مِنَ قَبْلِهِ لَكٰفِرِينَ ﴿۳۹﴾

فَانظُرْ إِلَى الْأَرْضِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُغِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ إِنَّ ذَلِكَ لَمُنْعِي الْمَوْتَىٰ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۵۰﴾

وَإِذْ أَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَأَوْهُ مُصْفَرًّا طَلُوعًا مِنْ بَعْدِ ۙ يَوْمَئِذٍ ﴿۵۱﴾

پر ایمان لانے والے سب شامل ہیں۔ حَقًّا کان کی خبر ہے، جو مقدم ہے نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ اس کا اسم ہے۔

(۱) یعنی وہ بادل جہاں بھی ہوتے ہیں، وہاں سے ہوائیں ان کو اٹھا کر لے جاتی ہیں۔

(۲) کبھی چلا کر، کبھی ٹھہرا کر، کبھی تہ بہ تہ کر کے، کبھی دور دراز تک۔ یہ آسمان پر بادلوں کی مختلف کیفیتیں ہوتی ہیں۔

(۳) یعنی ان کو آسمان پر پھیلانے کے بعد، کبھی ان کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

(۴) وَدْقٌ کے معنی بارش کے ہیں، یعنی ان بادلوں سے اللہ اگر چاہتا ہے تو بارش ہو جاتی ہے، جس سے بارش کے ضرورت مند خوش ہو جاتے ہیں۔

(۵) آثار رحمت سے مراد وہ غلہ جات اور میوے ہیں جو بارش سے پیدا ہوتے اور خوش حالی و فراغت کا باعث ہوتے ہیں۔ دیکھنے سے مراد نظر عبرت سے دیکھنا ہے تاکہ انسان اللہ کی قدرت کا اور اس بات کا قائل ہو جائے کہ وہ قیامت والے دن اسی طرح مردوں کو زندہ فرمادے گا۔

(۶) یعنی ان ہی کھیتوں کو، جن کو ہم نے بارش کے ذریعے سے شاداب کیا تھا، اگر سخت (گرم یا ٹھنڈی) ہوائیں چلا کر ان

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ اِلَّا مَا كَرِهَ اَلَا تَرَىٰ
وَلَوْ اَمَّا يَذَّبِيْنَ ۝۲۱

بیشک آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے ^(۱) اور نہ بہروں کو
(اپنی) آواز سنا سکتے ہیں ^(۲) جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر مڑ گئے
ہوں۔ ^(۳) (۵۲)

اور نہ آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے ہدایت کرنے
والے ^(۴) ہیں آپ تو صرف ان ہی لوگوں کو سناتے ہیں جو
ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ^(۵) ہیں پس وہی اطاعت
کرنے والے ہیں۔ ^(۶) (۵۳)

اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمہیں کمزوری کی حالت ^(۷) میں
پیدا کیا پھر اس کمزوری کے بعد توانائی ^(۸) دی، پھر اس توانائی

وَمَا اَنْتَ بِهٰدِيَ الْعُنٰى عَن صَلٰوةِہِمْ اِنَّ تُسْمِعُ اِلَّا مَنۢ يُؤْمِنُ
بِاٰیٰتِنَا فَهَمَّ مُّسْلِمُوْنَ ۝۲۲

اِنَّہٗ الَّذِیۡ خَلَقَکُمْ مِّنۢ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنۢ بَعْدِ ضَعْفٍ
قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَشِبَّہَۃً یَّخْلُقُ مَا

کی ہر حالی کو زردی میں بدل دیں۔ یعنی تیار فصل کو تباہ کر دیں تو یہی بارش سے خوش ہونے والے اللہ کی ناشکری پر اتر
آئیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کو نہ ماننے والے صبر اور حوصلے سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ ذرا سی بات پر مارے خوشی
کے پھولے نہیں سماتے اور ذرا سی ابتلا پر فوراً ناامید اور گریہ کنناں ہو جاتے ہیں۔ اہل ایمان کا معاملہ دونوں حالتوں میں
ان سے مختلف ہوتا ہے جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہے۔

(۱) یعنی جس طرح مردے فم و شعور سے عاری ہوتے ہیں، اسی طرح یہ آپ ﷺ کی دعوت کو سمجھنے اور اسے قبول
کرنے سے قاصر ہیں۔

(۲) یعنی آپ ﷺ کا وعظ و نصیحت ان کے لیے بے اثر ہے جس طرح کوئی بہرا ہو، اسے تم اپنی بات نہیں سنا سکتے۔

(۳) یہ ان کے اعراض و انحراف کی مزید وضاحت ہے کہ مردہ اور بہرہ ہونے کے ساتھ وہ پیٹھ پھیر کر جانے والے ہیں،
حق کی بات ان کے کانوں میں کس طرح پڑ سکتی اور کیوں کر ان کے دل و دماغ میں سما سکتی ہے؟

(۴) اس لیے کہ یہ آنکھوں سے کماحقہ فائدہ اٹھانے سے یا بصیرت (دل کی بینائی) سے محروم ہیں۔ یہ گمراہی کی جس دلدل
میں پھنسے ہوئے ہیں، اس سے کس طرح نکلیں؟

(۵) یعنی یہی سن کر ایمان لانے والے ہیں، اس لیے کہ یہ اہل تفکر و تدبر ہیں اور آثار قدرت سے موثر حقیقی کی معرفت
حاصل کر لیتے ہیں۔

(۶) یعنی حق کے آگے سر تسلیم خم کر دینے والے اور اس کے پیرو کار۔

(۷) یہاں سے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا ایک اور کمال بیان فرما رہا ہے اور وہ ہے مختلف اطوار سے انسان کی تخلیق۔
ضعف (کمزوری کی حالت) سے مراد نطفہ یعنی قطرہ آب ہے یا عالم طفولیت۔

(۸) یعنی جوانی، جس میں تواریخ عقلی و جسمانی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

کے بعد کمزوری اور بڑھاپا دیا^(۱) جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے،^(۲) وہ سب سے پورا واقف اور سب پر پورا قادر ہے۔ (۵۴)
 اور جس دن قیامت^(۳) برپا ہو جائے گی گناہ گار لوگ
 قسمیں کھائیں گے کہ (دنیا میں) ایک گھڑی کے سوا نہیں
 ٹھہرے،^(۴) اسی طرح یہ بہکے ہوئے ہی رہے۔ (۵۵)^(۵)
 اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا وہ جواب دیں گے^(۶)

يَسَاءَلُوهُ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْقَدِيرُ ۝

وَيَوْمَ نَقُومُ السَّاعَةَ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ مَا لَبِئْنَا غَيَاةَ سَاعَةٍ
 كَذَلِكَ كَانُوا يُؤْمِنُونَ ۝

وَقَالَ الَّذِينَ اٰتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ اٰتَيْنَاهُمْ

(۱) کمزوری سے مراد کمولت کی عمر ہے جس میں عقلی و جسمانی قوتوں میں نقصان کا آغاز ہو جاتا ہے اور بڑھاپے سے مراد شیخوخت کا وہ دور ہے جس میں ضعف بڑھ جاتا ہے۔ ہمت پست، ہاتھ پیروں کی حرکت اور گرفت کمزور، بال سفید اور تمام ظاہری و باطنی صفات متغیر ہو جاتی ہیں۔ قرآن نے انسان کے یہ چار بڑے اطوار بیان کیے ہیں۔ بعض علمائے دیگر چھوٹے چھوٹے اطوار بھی شمار کر کے انہیں قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے جو قرآن کے اجمال کی توضیح اور اس کے اعجاز بیان کی شرح ہے مثلاً امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ انسان کے بعد دیگرے ان حالات و اطوار سے گزرتا ہے۔ اس کی اصل مٹی ہے۔ یعنی اس کے باپ آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی۔ یا انسان جو کچھ کھاتا ہے، جس سے وہ منی پیدا ہوتی ہے جو رحم مادر میں جا کر اس کے وجود و تخلیق کا باعث بنتی ہے، وہ سب مٹی ہی کی پیداوار ہے پھر وہ نطفہ، نطفہ سے ملتے، پھر مغز، پھر ہڈیاں، جنہیں گوشت کا لباس پہنایا جاتا ہے۔ پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ پھر ماں کے پیٹ سے اس حال میں نکلتا ہے کہ نحیف و نزار اور نہایت نرم و نازک ہوتا ہے۔ پھر بتدریج نشوونما پاتا، بچپن، بلوغت اور جوانی کو پہنچتا ہے اور پھر بتدریج رجعت مقررگی کا عمل شروع ہو جاتا ہے، کمولت، شیخوخت اور پھر کبر سنی (بڑھاپا) آتا تکہ موت اسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔

(۲) انہی اشیاء میں ضعف و قوت بھی ہے۔ جس سے انسان گزرتا ہے جیسا کہ ابھی تفصیل بیان ہوئی ہے۔

(۳) ساعت کے معنی ہیں گھڑی، لمحہ، مراد قیامت ہے، اس کو ساعت اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کا وقوع جب اللہ چاہے گا، ایک گھڑی میں ہو جائے گا۔ یا اس لیے کہ یہ اس گھڑی میں ہوگی جو دنیا کی آخری گھڑی ہوگی۔

(۴) دنیا میں یا قبروں میں۔ یہ اپنی عادت کے مطابق جھوٹی قسم کھائیں گے، اس لیے کہ دنیا میں وہ جتنا عرصہ رہے ہوں گے، ان کے علم میں ہی ہو گا اور اگر مراد قبر کی زندگی ہے تو ان کا حلف جہالت پر ہو گا کیوں کہ وہ قبر کی مدت نہیں جانتے ہوں گے۔ بعض کہتے ہیں کہ آخرت کے شدائد اور ہولناک احوال کے مقابلے میں دنیا کی زندگی انہیں گھڑی کی طرح ہی لگے گی۔

(۵) اَفَلَا الرَّجُلُ کے معنی ہیں۔ سچ سے پھر گیا، مطلب ہو گا، اسی پھرنے کے مثل وہ دنیا میں پھرتے رہے یا بہکے رہے۔

(۶) جس طرح یہ علما دنیا میں بھی سمجھاتے رہے تھے۔

فِي كِتَابِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ الْبَعْثِ ۖ فَهَذَا يَوْمُ الْبَعْثِ
وَلِكُلِّكُمْ كُنُفٌ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۵۶﴾

فَبِمَا نَسَاوُا مَا كَانُوا وَعَدُورُهُمْ وَأَلَّهُمْ
يَتَسَمَّبُونَ ﴿۵۷﴾

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ وَلَكِنْ
جَعَلْنَاهُمْ بِلَايَةِ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ أَنْتُمْ
إِلَّا مُبْطِلُونَ ﴿۵۸﴾

كَذَلِكَ يُطِيعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۵۹﴾

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفُّكَ الَّذِينَ

تم تو جیسا کہ کتاب اللہ میں ^(۱) ہے یوم قیامت تک ٹھہرے
رہے۔ ^(۲) آج کا یہ دن قیامت ہی کا دن ہے لیکن تم تو یقین
ہی نہیں مانتے تھے۔ ^(۳) (۵۶)

پس اس دن ظالموں کو ان کا عذر رہمانہ کچھ کام نہ آئے گا اور
نہ ان سے توبہ اور عمل طلب کیا جائے گا۔ ^(۴) (۵۷)

بیشک ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے سامنے کل مثالیں
بیان کر دی ہیں۔ ^(۵) آپ ان کے پاس کوئی بھی نشانی
لائیں، ^(۶) یہ کافر تو یہی کہیں گے کہ تم (بے ہودہ گو)
بالکل جھوٹے ہو۔ ^(۷) (۵۸)

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے دلوں پر جو سمجھ نہیں رکھتے یوں
ہی مہر کر دیتا ہے۔ (۵۹)

پس آپ صبر کریں ^(۸) یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ آپ کو وہ

(۱) کِتَابِ اللَّهِ سے مراد اللہ کا علم اور اس کا فیصلہ ہے یعنی لوح محفوظ

(۲) یعنی پیدائش کے دن سے قیامت کے دن تک۔

(۳) کہ وہ آئے گی بلکہ استہزا اور تکذیب کے طور پر اس کا تم مطالبہ کرتے تھے۔

(۴) یعنی انہیں دنیا میں بھیج کر یہ موقع نہیں دیا جائے گا کہ وہاں توبہ و اطاعت کے ذریعے سے عتاب الہی کا ازالہ کر لو۔

(۵) جن سے اللہ کی توحید کا اثبات اور رسولوں کی صداقت واضح ہوتی ہے اور اسی طرح شرک کی تردید اور اس کا
بطلان نمایاں ہوتا ہے۔

(۶) وہ قرآن کریم کی پیش کردہ کوئی دلیل ہو یا ان کی خواہش کے مطابق کوئی معجزہ وغیرہ۔

(۷) یعنی جادو وغیرہ کے پیروکار۔ مطلب یہ ہے کہ بڑی سے بڑی نشانی اور واضح سے واضح دلیل بھی اگر وہ دیکھ لیں، تب
بھی ایمان بہر حال نہیں لائیں گے، کیوں؟ اس کی وجہ آگے بیان کر دی گئی ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے
جو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ ان کا کفر و طغیان اس آخری حد کو پہنچ گیا ہے جس کے بعد حق کی طرف واپسی کے
تمام راستے ان کے لیے مسدود ہیں۔

(۸) یعنی ان کی مخالفت و عناد پر اور ان کی تکلیف دہ باتوں پر، اس لیے کہ اللہ نے آپ سے مدد کا جو وعدہ کیا ہے، وہ یقیناً
حق ہے جو ہر صورت پورا ہو گا۔

لَا يُؤْتُونَ ﴿١﴾

لوگ ہلکا بے صبرا) نہ کریں^(۱) جو یقین نہیں رکھتے۔ (۶۰)

سورہ لقمان کی ہے اور اس میں چونتیس آیتیں اور چار رکوع ہیں۔

سُورَةُ الْقِسْمَانِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الم^(۲) (۱) یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔ (۲) جو نیکو کاروں کے^(۳) لیے رہبر اور (سراسر) رحمت ہے۔ (۳)

اللّٰهُ ۱ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ ۲ هٰذٰی وَرَحْمَةٌ لِّلْمُحْسِنِیْنَ ۳

جو لوگ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر (کامل) یقین رکھتے ہیں۔ (۳)

الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُوْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ یُوقِنُوْنَ ۴

(۱) یعنی آپ کو غضب ناک کر کے صبر و حلم ترک کرنے یا مدہانت پر مجبور نہ کر دیں بلکہ آپ اپنے موقف پر ڈٹے رہیں اور اس سے سرمو انحراف نہ کریں۔

(۲) اس کے آغاز میں بھی یہ حروف مقطعات ہیں، جن کے معنی و مراد کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ تاہم بعض مفسرین نے اس کے دو فوائد بڑے اہم بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ قرآن اسی قسم کے حروف مقطعات سے ترتیب و تالیف پایا ہے جس کے مثل تالیف پیش کرنے سے عرب عاجز آگئے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قرآن اللہ ہی کا نازل کردہ ہے اور جس پیغمبر پر یہ نازل ہوا ہے وہ سچا رسول ہے، جو شریعت وہ لے کر آیا ہے، انسان اس کا محتاج ہے اور اس کی اصلاح اور سعادت کی تکمیل اسی شریعت سے ممکن ہے۔ دوسرا یہ کہ مشرکین اپنے ساتھیوں کو اس قرآن کے سننے سے روکتے تھے کہ مبادا وہ اس سے متاثر ہو کر مسلمان ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف سورتوں کا آغاز ان حروف مقطعات سے فرمایا تاکہ وہ اس کے سننے پر مجبور ہو جائیں کیوں کہ یہ انداز بیان نیا اور اچھوتا تھا۔ (امیر القاسم) واللہ اعلم۔

(۳) مُحْسِنِیْنَ، مُعْسِنٌ کی جمع ہے۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں احسان کرنے والا، والدین کے ساتھ، رشتے داروں کے ساتھ، مستحقین اور ضرورت مندوں کے ساتھ۔ دوسرے معنی ہیں، نیکیاں کرنے والا، یعنی برائیوں سے مجتنب اور نیکو کار۔ تیسرے معنی ہیں اللہ کی عبادت نہایت اخلاص اور خشوع و خضوع کے ساتھ کرنے والا۔ جس طرح حدیث جبرائیل علیہ السلام میں ہے، اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ... قرآن ویسے تو سارے جہاں کے لیے ہدایت اور رحمت کا ذریعہ ہے لیکن اس سے اصل فائدہ چونکہ صرف محسنین اور متقیین ہی اٹھاتے ہیں، اس لیے یہاں اس طرح فرمایا۔

(۴) نماز، زکوٰۃ اور آخرت پر یقین۔ یہ تینوں نہایت اہم ہیں، اس لیے ان کا بطور خاص ذکر کیا، ورنہ محسنین و متقیین تمام

یہی لوگ ہیں جو اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔^(۱) (۵)
 اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو لغو باتوں کو مول لیتے ہیں^(۲) کہ بے علمی کے ساتھ لوگوں کو اللہ کی راہ سے ہٹائیں اور اسے ہنسی بنائیں،^(۳) یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔^(۴) (۶)

جب اس کے سامنے ہماری آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو تکبر کرتا ہوا اس طرح منہ پھیر لیتا ہے گویا اس نے سنا ہی نہیں گویا کہ اس کے دونوں کانوں میں ڈاٹ لگے ہوئے ہیں،^(۵) آپ اسے دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔ (۷)

اُولٰٓئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّنَ رَبِّهِمْ ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۵﴾

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۗ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿۶﴾

وَإِذَا تُلِيَ عَلَيْهِ اِلْمَاتَاوَالِي مُتَّبِعًا ۗ اِذَا كَانَ لَمْ يَسْمَعْهَا كَانَ فِيْٓ اَذْنَيْهِ وَقَوْلًا قَبِيْرًا ۗ بَعْدَ اٰبِ اَيْلٰهٍ ﴿۷﴾

فرائض و سنن بلکہ مستحبات تک کی پابندی کرتے ہیں۔
 (۱) فلاح کے مفہوم کے لیے دیکھئے سورہ بقرہ اور مومنوں کا آغاز۔

(۲) اہل سعادت، جو کتاب الہی سے راہ یاب اور اس کے سماع سے فیض یاب ہوتے ہیں، ان کے ذکر کے بعد ان اہل شقاوت کا بیان ہو رہا ہے جو کلام الہی کے سننے سے تو اعراض کرتے ہیں۔ البتہ ساز و موسیقی، نغمہ و سرود اور گانے وغیرہ خوب شوق سے سنتے اور ان میں دلچسپی لیتے ہیں۔ خریدنے سے مراد یہی ہے کہ آلات طرب شوق سے اپنے گھروں میں لاتے اور پھر ان سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔ نَهَوُ الْحَدِيثِ سے مراد گانا بجانا، اس کا ساز و سامان اور آلات ساز و موسیقی اور ہر وہ چیز ہے جو انسانوں کو خیر اور معروف سے غافل کر دے۔ اس میں قصے، کہانیاں، افسانے، ڈرامے، ناول اور جنسی اور سنسنی خیز لٹریچر، رسالے اور بے حیائی کے پرچارک اخبارات سب ہی آجاتے ہیں اور جدید ترین ایجادات ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر، ویڈیو فلمیں وغیرہ بھی۔ عمد رسالت میں بعض لوگوں نے گانے بجانے والی لونڈیاں بھی اسی مقصد کے لیے خریدی تھیں کہ وہ لوگوں کا دل گانے سنا کر ہلاتی رہیں تاکہ قرآن و اسلام سے وہ دور رہیں۔ اس اعتبار سے اس میں گلو کارائیں بھی آجاتی ہیں، جو آج کل فن کار، فلمی ستارہ اور ثقافتی سفیر اور پتہ نہیں کیسے کیسے مہذب، خوش نما اور دل فریب ناموں سے پکاری جاتی ہیں۔

(۳) ان تمام چیزوں سے یقیناً انسان اللہ کے راستے سے گمراہ ہو جاتے ہیں اور دین کو استہزا و تمسخر کا نشانہ بھی بناتے ہیں۔
 (۴) ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرنے والے ارباب حکومت، ادارے، اخبارات کے مالکان، اہل قلم اور نیچر نگار بھی اسی عذاب مہین کے مستحق ہوں گے۔ اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ۔

(۵) یہ اس شخص کا حال ہے جو مذکورہ لمو لوبع کی چیزوں میں مگن رہتا ہے، وہ آیات قرآنیہ اور اللہ و رسول کی باتیں

بیشک جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور کام بھی نیک (مطابق سنت) کیے ان کے لیے نعمتوں والی جنتیں

ہیں۔ (۸)

جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کا سچا وعدہ ہے،^(۱) وہ بہت بڑی عزت و غلبہ والا اور کامل حکمت والا ہے۔ (۹)

اسی نے آسمانوں کو بغیر ستون کے پیدا کیا ہے تم انہیں دیکھ رہے ہو اور اس نے زمین میں پہاڑوں کو ڈال دیا تاکہ وہ تمہیں جنبش نہ دے^(۲) سکے اور ہر طرح کے جاندار زمین میں پھیلا دیئے۔^(۳) اور ہم نے آسمان سے پانی برساکر زمین میں ہر قسم کے نفیس جوڑے اگا دیئے۔^(۴) (۱۰)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَعَدَدُ اللّٰهِ حَقًّا ۗ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۰

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَّرَوْنَهَا ۗ وَالْغٰلِي فِي الْاَرْضِ رَوٰسِي ۗ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبِكُلِّ ذٰلِكُمْ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمٰوٰءِ مَآءً ۗ كَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ حَرِيْبٍ ۝۱۱

سن کر بہرا بن جاتا ہے حلال کہ وہ بہرا نہیں ہوتا اور اس طرح منہ پھیر لیتا ہے گویا اس نے سنا ہی نہیں کیوں کہ اس کے سننے سے وہ ایذا محسوس کرتا ہے، اس لیے اس سے اس کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ وقرآن کے معنی ہیں کانوں میں ایسا بوجھ جو اسے سننے سے محروم کر دے۔

(۱) یعنی یہ یقیناً پورا ہو گا، اس لیے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ وَاللّٰهُ لَا يُخْلِفُ الْمِعْثٰدَ.

(۲) تَرَوْنَهَا اگر عَمَد کی صفت ہو تو معنی ہوں گے ایسے ستونوں کے بغیر جنہیں تم دیکھ سکو۔ یعنی آسمان کے ستون ہیں لیکن ایسے کہ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔

(۳) رَوٰسِي، رَاسِيۃ کی جمع ہے جس کے معنی ثَابِتۃ کے ہیں۔ یعنی پہاڑوں کو زمین پر اس طرح بھاری بوجھ بنا کر رکھ دیا ہے کہ جن سے زمین ثابت رہے یعنی حرکت نہ کرے۔ اسی لیے آگے فرمایا: اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ بِغَيْرِ كَرَاهَةٍ اَنْ تَمِيْدَ (تَمِيْل) بِكُمْ اَوْ لِيْتَلَّ تَمِيْدَ یعنی اس بات کی ناپسندیدگی سے کہ زمین تمہارے ساتھ ادھر ادھر ڈولے، یا اس لیے کہ زمین ادھر ادھر نہ ڈولے۔ جس طرح ساحل پر کھڑے بحری جہازوں میں بڑے بڑے لنگر ڈال دیئے جاتے ہیں تاکہ جہاز نہ ڈولے زمین کے لیے پہاڑوں کی بھی یہی حیثیت ہے۔

(۴) یعنی انواع و اقسام کے جانور زمین میں ہر طرف پھیلا دیئے جنہیں انسان کھاتا بھی ہے، سواری اور بار برداری کے لیے بھی استعمال کرتا ہے اور بطور زینت اور آرائش کے بھی اپنے پاس رکھتا ہے۔

(۵) رَوٰجِ یہاں صِنْفِ کے معنی میں ہے یعنی ہر قسم کے غلے اور میوے پیدا کیے۔ ان کی صفت کریم، ان کے حسن لون اور کثرت منافع کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

یہ ہے اللہ کی مخلوق ^(۱) اب تم مجھے اس کے سوا دوسرے کسی کی کوئی مخلوق تو دکھاؤ ^(۲) (کچھ نہیں) بلکہ یہ ظالم کھلی گمراہی میں ہیں۔ (۱۱)

اور ہم نے یقیناً لقمان کو حکمت دی ^(۳) تھی کہ تو اللہ تعالیٰ کا شکر کر ^(۴) ہر شکر کرنے والا اپنے ہی نفع کے لیے شکر کرتا ہے جو بھی ناشکری کرے وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز اور تعریفوں والا ہے۔ (۱۲)

اور جب کہ لقمان نے وعظ کہتے ہوئے اپنے لڑکے سے فرمایا کہ میرے پیارے بیٹے! اللہ کے ساتھ شریک نہ کرنا ^(۵) بیشک شرک بڑا بھاری ظلم ہے۔ ^(۶) (۱۳)

هٰذَا خَلَقَ اللهُ فَاَرَوْنِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ بَلِ الظّٰلِمُونَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ﴿۱۱﴾

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اِذْ اَشْكُرُ لِلّٰهِ وَمَنْ يَشْكُرْ فَاتِمَّ بِنِعْمَتِ رَبِّهِ لِيُنْفِسْهُ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾

وَإِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنَيْهِ وَمَا يَعْظُهُ يَدْعٰى لَا تَسْرِكُوا بِاللّٰهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾

(۱) ہذا (یہ) اشارہ ہے اللہ کی ان پیدا کردہ چیزوں کی طرف جن کا گزشتہ آیات میں ذکر ہوا۔

(۲) یعنی جن کی تم عبادت کرتے اور انہیں مدد کے لیے پکارتے ہو، انہوں نے آسمان و زمین میں کون سی چیز پیدا کی ہے؟ کوئی ایک چیز تو بتلاؤ؟ مطلب یہ ہے کہ جب ہر چیز کا خالق صرف اور صرف اللہ ہے، تو عبادت کا مستحق بھی صرف وہی ہے۔ اس کے سوا کائنات میں کوئی ہستی اس لائق نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے اور اسے مدد کے لیے پکارا جائے۔

(۳) حضرت لقمان، اللہ کے نیک بندے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے حکمت یعنی عقل و فہم اور دینی بصیرت میں ممتاز مقام عطا فرمایا تھا۔ ان سے کسی نے پوچھا تمہیں یہ فہم و شعور کس طرح حاصل ہوا؟ انہوں نے فرمایا، راست بازی، امانت کے اختیار کرنے اور بے فائدہ باتوں سے اجتناب اور خاموشی کی وجہ سے۔ ان کا حکمت و دانش پر مبنی ایک واقعہ یہ بھی مشہور ہے کہ یہ غلام تھے، ان کے آقا نے کہا کہ بکری ذبح کر کے اس کے سب سے بہترین دو حصے لاؤ، چنانچہ وہ زبان اور دل نکال کر لے گئے۔ ایک دوسرے موقع پر آقا نے ان سے کہا کہ بکری ذبح کر کے اس کے سب سے بدترین حصے لاؤ۔ وہ پھر وہی زبان اور دل لے کر چلے گئے۔ پوچھنے پر انہوں نے بتلایا کہ زبان اور دل، اگر صحیح ہوں تو یہ سب سے بہتر ہیں اور اگر یہ بگڑ جائیں تو ان سے بدتر کوئی چیز نہیں۔ (ابن کثیر)

(۴) شکر کا مطلب ہے، اللہ کی نعمتوں پر اس کی حمد و ثنا اور اس کے احکام کی فرماں برداری۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان کی سب سے پہلی وصیت یہ نقل فرمائی کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو شرک سے منع فرمایا، جس سے یہ واضح ہوا کہ والدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اولاد کو شرک سے بچانے کی سب سے زیادہ کوشش کریں۔

(۶) یہ بعض کے نزدیک حضرت لقمان ہی کا قول ہے اور بعض نے اسے اللہ کا قول قرار دیا ہے اور اس کی تائید میں وہ

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۚ إِنَّهُ أُنْثَىٰ وَهَنَا عُلَىٰ وَهَيْنًا
وَفَضْلُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ۖ إِنَّ الْمَكِيدِينَ ﴿۱۴﴾

ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق نصیحت کی (۱) ہے، اس کی ماں نے دکھ پر دکھ اٹھا کر (۲) اسے حمل میں رکھا اور اس کی دودھ چھڑائی دو برس میں ہے (۳) تم کو میری اور اپنے ماں باپ کی شکرگزاری کر (تم سب کو) میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ (۱۴)

اور اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کا دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شریک کرے جس کا تجھے علم نہ ہو تو تو ان کا کہنا نہ ماننا، ہاں دنیا میں ان کے ساتھ اچھی طرح بسر کرنا اور اس کی راہ چلنا جو میری طرف جھکا ہوا ہو (۴) تمہارا سب کا لوٹنا میری ہی طرف ہے تم جو کچھ کرتے ہو اس سے پھر میں تمہیں خبردار کر دوں گا۔ (۵) (۱۵)

وَأَنَّ جَهَنَّمَ عَلَىٰ أَنْ تَشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطْعِمُهُمَا وَصَالِحُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَأَنْتَبِعْ سَبِيلَ مَنْ آتَاكَ إِلَهُ تَعَالَىٰ ۚ إِنَّ تَعَالَىٰ فَايْتَنَّاكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۵﴾

حدیث پیش کی ہے جو ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ — کے نزول کے تعلق سے وارد ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہاں ظلم سے مراد ظلم عظیم ہے اور آیت ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَكُفْرٌ عَظِيمٌ﴾ کا حوالہ دیا۔ (صحیح بخاری، نمبر ۴۷۶۲) مگر درحقیقت اس سے اللہ کا قول ہونے کی نہ تائید ہوتی ہے نہ تردید۔

- (۱) توحید و عبادت الہی کے ساتھ ہی والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تائید سے اس نصیحت کی اہمیت واضح ہے۔
- (۲) اس کا مطلب ہے کہ رحم مادر میں بچہ جس حساب سے بڑھتا جاتا ہے، ماں پر بوجھ بڑھتا جاتا ہے جس سے عورت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ماں کی اس مشقت کے ذکر سے اس طرف بھی اشارہ نکلتا ہے کہ والدین کے ساتھ احسان کرتے وقت ماں کو مقدم رکھا جائے، جیسا کہ حدیث میں بھی ہے۔
- (۳) اس سے معلوم ہوا کہ مدت رضاعت دو سال ہے، اس سے زیادہ نہیں۔
- (۴) یعنی مومنین کی راہ۔

(۵) یعنی میری طرف رجوع کرنے والوں (اہل ایمان) کی پیروی اس لیے کرو کہ بالآخر تم سب کو میری ہی بارگاہ میں آنا ہے، اور میری ہی طرف سے ہر ایک کو اس کے (اچھے یا برے) عمل کی جزا ملنی ہے۔ اگر تم میرے راستے کی پیروی کرو گے اور مجھے یاد رکھتے ہوئے زندگی گزارو گے تو امید ہے کہ قیامت والے روز میری عدالت میں سرخ رو ہو گے بصورت دیگر میرے عذاب میں گرفتار ہو گے۔ سلسلہ کلام حضرت لقمان کی وصیتوں سے متعلق تھا۔ اب آگے بھرو، وہی وصیتیں بیان کی جا رہی ہیں جو لقمان نے اپنے بیٹے کو کی تھیں۔ درمیان کی دو آیتوں میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے جملہ معترضہ کے طور پر ماں باپ کے ساتھ احسان کی

يُذَيِّرُ اَنْهَارًا تَنْكُ بِمُقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ حَرْدَلٍ فَتَكُنْ
فِي صَفْرَةٍ اَوْ فِي السَّلْمُوتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَأْتِ رِيحًا
اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَكَيْفٌ حَيِيْرٌ ۝

پیارے بیٹے! اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر ہو
پھر وہ (بھی) خواہ کسی چٹان میں ہو یا آسمانوں میں ہو یا
زمین میں ہو اسے اللہ تعالیٰ ضرور لائے گا اللہ تعالیٰ بڑا
باریک بین اور خبردار ہے۔ (۱۶)

اے میرے پیارے بیٹے! تو نماز قائم رکھنا، اچھے کاموں
کی نصیحت کرتے رہنا، برے کاموں سے منع کیا کرنا اور جو
مصیبت تم پر آجائے صبر کرنا (۲) (یقین مان) کہ یہ بڑے
تاکیدی کاموں میں سے ہے۔ (۳) (۱۷)

يُذَيِّرُ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاَمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ وَاَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَاَصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ ۙ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

تاکید فرمائی، جس کی ایک وجہ تو یہ بیان کی گئی ہے۔ کہ لقمان نے یہ وصیت اپنے بیٹے کو نہیں کی تھی کیونکہ اس میں ان کا اپنا ذاتی
مفاد بھی تھا۔ دوسرا یہ واضح ہو جائے کہ اللہ کی توحید و عبادت کے بعد والدین کی خدمت و اطاعت ضروری ہے۔ تیسرا یہ کہ
شرک اتنا بڑا گناہ ہے کہ اگر اس کا حکم والدین بھی دیں تو ان کی بات نہیں مانتی چاہئے۔

(۱) اِنْ تَنْكَ كَامْرَجٍ حَظِيْنَةٌ هُوَ تَوْ مَطْلَبُ گناہ اور اللہ کی نافرمانی والا کام ہے اور اگر اس کا مرجع حَصَلَةٌ هُوَ تَوْ مَطْلَبُ
اچھائی یا برائی کی خصلت ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اچھا یا برا کام کتنا بھی چھپ کر کرے، اللہ سے مخفی نہیں رہ سکتا،
قیامت والے دن اللہ تعالیٰ اسے حاضر کر لے گا۔ یعنی اس کی جزا دے گا، اچھے عمل کی اچھی جزا، برے عمل کی بری جزا۔
رائی کے دانے کی مثال اس لیے دی کہ وہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ جس کا وزن محسوس ہوتا ہے نہ توں میں وہ ترازو کے
پلے کو جھکا سکتا ہے۔ اسی طرح چٹان (آبادی سے دور جنگل، پہاڑ میں) مخفی ترین اور محفوظ ترین جگہ ہے۔ یہ مضمون
حدیث میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا ”اگر تم میں سے کوئی شخص بے سوراخ کے پتھر میں بھی عمل کرے گا، جس کا کوئی
دروازہ ہو نہ کھڑکی، اللہ تعالیٰ اسے لوگوں پر ظاہر فرمادے گا، چاہے وہ کیسا ہی عمل ہو“۔ (مسند احمد، ۲۸/۳) اس لیے کہ
وہ لطیف (باریک بین) ہے، اس کا علم مخفی ترین چیز تک محیط ہے، اور خبیر ہے، اندھیری رات میں چلنے والی چوٹی کی
حرکت و سکنات سے بھی وہ باخبر ہے۔

(۲) اِقَامَةُ صَلَاةٍ، اَمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ، نَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ اور مصائب پر صبر کا اس لیے ذکر کیا کہ یہ تینوں اہم ترین
عبادات اور امور خیر کی بنیاد ہیں۔

(۳) یعنی مذکورہ باتیں ان کاموں میں سے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی ہے اور بندوں پر انہیں فرض قرار دیا
ہے۔ یا یہ ترغیب ہے عزم و ہمت پیدا کرنے کی کیوں کہ عزم و ہمت کے بغیر طاعات مذکورہ پر عمل ممکن نہیں۔ بعض
مفسرین کے نزدیک ذَلِكْ کا مرجع صبر ہے۔ اس سے پہلے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وصیت ہے اور اس راہ میں
شداًند و مصائب اور طعن و ملامت ناگزیر ہے، اس لیے اس کے فوراً بعد صبر کی تلقین کر کے واضح کر دیا کہ صبر کا دامن

لوگوں کے سامنے اپنے گال نہ پھلا^(۱) اور زمین پر اترا کر نہ چل۔^(۲) کسی تکبر کرنے والے شیخی خورے کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔ (۱۸)

اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کر،^(۳) اور اپنی آواز پست کر^(۴) یقیناً آوازوں میں سب سے بدتر آواز گدھوں کی آواز ہے۔ (۱۹)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی ہر چیز

وَلَا تَصْرَعْ حَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَكَبِيبٌ كُلِّ مُخْتَالٍ فَخُورٌ ﴿۱۸﴾

وَأَقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاعْظُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَبِيرِ ﴿۱۹﴾

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ تَأَنِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ

تھامے رکھنا کہ یہ عزم و ہمت کے کاموں میں سے ہے اور اہل عزم و ہمت کا ایک بڑا ہتھیار۔ اس کے بغیر فریضہ تبلیغ کی ادائیگی ممکن نہیں۔

(۱) یعنی تکبر نہ کر کہ لوگوں کو حقیر سمجھے اور جب وہ تجھ سے ہم کلام ہوں تو تو ان سے منہ پھیر لے۔ یا گنگو کے وقت اپنا منہ پھیرے رکھے۔ صغریٰ بیماری ہے جو اونٹ کے سر یا گردن میں ہوتی ہے۔ جس سے اس کی گردن مڑ جاتی ہے۔ یہاں بطور تکبر منہ پھیر لینے کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے (ابن کثیر)

(۲) یعنی ایسی چال یا رویہ، جس سے مال و دولت یا جاہ و منصب یا قوت و طاقت کی وجہ سے فخر و غرور کا اظہار ہوتا ہو، یہ اللہ کو ناپسند ہے، اس لیے کہ انسان ایک بندۂ عاجز و حقیر ہے، اللہ تعالیٰ کو یہی پسند ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق عاجزی و انکساری ہی اختیار کیے رکھے اس سے تجاوز کر کے بڑائی کا اظہار نہ کرے کہ بڑائی صرف اللہ ہی کے لیے زیبا ہے جو تمام اختیارات کا مالک اور تمام خوبیوں کا منبع ہے۔ اسی لیے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ”وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا“ جس کے دل میں ایک رائی کے دانے کے برابر بھی کبر ہو گا۔ (مسند احمد ۱/۳۱۲، ترمذی، أبواب البس، ماجاء فی الکبیر) جو تکبر کے طور پر اپنے کپڑے کو کھینچنے (گھینٹنے) ہوئے چلے گا، اللہ اس کی طرف (قیامت والے دن) نہیں دیکھے گا۔“ (مسند أحمد ۵/۱۰۹، وانظر البخاری، کتاب اللباس) تاہم تکبر کا اظہار کیے بغیر اللہ کے انعامات کا ذکر یا اچھا لباس اور خوراک وغیرہ کا استعمال جائز ہے۔

(۳) یعنی چال اتنی ست نہ ہو جیسے کوئی بیمار ہو اور نہ اتنی تیز ہو کہ شرف و وقار کے خلاف ہو۔ اسی کو دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا ﴿يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هُونَ﴾ (الفرقان- ۱۳) ”اللہ کے بندے زمین پر وقار اور سکونت کے ساتھ چلتے ہیں۔“

(۴) یعنی چیخ یا چلا کر بات نہ کر، اس لیے کہ زیادہ اونچی آواز سے بات کرنا پسندیدہ ہوتا تو گدھے کی آواز سب سے اچھی سمجھی جاتی لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ گدھے کی آواز سب سے بدتر اور کریہ ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ ”گدھے کی آواز سنو تو شیطان سے پناہ مانگو“ (بخاری، کتاب بدء الخلق اور مسلم وغیرہ)

کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے^(۱) اور تمہیں اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں بھرپور دے رکھی ہیں،^(۲) بعض لوگ اللہ کے بارے میں بغیر علم کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر روشن کتاب کے جھگڑا کرتے ہیں۔^(۳) (۲۰)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی وحی کی تابعداری کرو تو کہتے ہیں کہ ہم نے تو جس طریق^(۴) پر اپنے باپ دادوں کو پایا ہے اسی کی تابعداری کریں گے، اگرچہ شیطان ان کے بڑوں کو دوزخ کے عذاب کی طرف بلاتا ہو (۲۱)

اور جو (شخص) اپنے آپ کو اللہ کے تابع کر دے^(۵) اور ہو بھی وہ میکو کار^(۶) یقیناً اس نے مضبوط کڑا تھام لیا،^(۷)

عَلَيْكُمْ نِعْمَةٌ ظَاهِرَةٌ وَبَاطِنَةٌ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُنِيرٍ ﴿۲۰﴾

وَ إِذْ قَبِلْتُمْ لَهْمُ السَّيِّئَاتِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَنْبَغُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا قَالُوا كَانِ الشَّيْطَانُ يُدْعُوهُمْ إِلَى عَذَابِ السَّعِيرِ ﴿۲۱﴾

وَمَنْ يُسَلِّمْ وَجْهَهُ إِلَى اللَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ وَإِلَى اللَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ﴿۲۰﴾

(۱) تسخیر کا مطلب ہے اشفاق (فائدہ اٹھانا) جس کو ”یہاں کام سے لگا دیا“ سے تعبیر کیا گیا ہے جیسے آسمانی مخلوق، چاند، سورج، ستارے وغیرہ ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے ایسے ضابطوں کا پابند بنا دیا ہے کہ یہ انسانوں کے لیے کام کر رہے ہیں اور انسان ان سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ دوسرا مطلب تسخیر کا تابع بنا دینا ہے۔ چنانچہ بہت سی زمینی مخلوق کو انسان کے تابع بنا دیا گیا ہے جنہیں انسان اپنی حسب منشا استعمال کرتا ہے جیسے زمین اور حیوانات وغیرہ ہیں۔ گویا تسخیر کا مفہوم یہ ہوا کہ آسمان و زمین کی تمام چیزیں انسانوں کے فائدے کے لیے کام میں لگی ہوئی ہیں، چاہے وہ انسان کے تابع اور اس کے زیر تصرف ہوں یا اس کے تصرف اور تابعت سے بالا ہوں۔ (فتح القدر)

(۲) ظاہری سے وہ نعمتیں مراد ہیں جن کا ادراک عقل، حواس وغیرہ سے ممکن ہو اور باطنی نعمتیں وہ جن کا ادراک و احساس انسان کو نہیں۔ یہ دونوں قسم کی نعمتیں اتنی ہیں کہ انسان ان کو شمار بھی نہیں کر سکتا۔

(۳) یعنی اس کے باوجود لوگ اللہ کی بابت جھگڑتے ہیں، کوئی اس کے وجود کے بارے میں، کوئی اس کے ساتھ شریک گردانے میں اور کوئی اس کے احکام و شرائع کے بارے میں۔

(۴) یعنی طریق یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی عقلی دلیل ہے، نہ کسی ہادی کی ہدایت اور نہ کسی صحیفہ آسمانی سے کوئی ثبوت، گویا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔

(۵) یعنی صرف اللہ کی رضا کے لیے عمل کرے، اس کے حکم کی اطاعت اور اس کی شریعت کی پیروی کرے۔

(۶) یعنی مامور بہ چیزوں کا اتباع اور منہیات کو ترک کرنے والا۔

(۷) یعنی اللہ سے اس نے مضبوط عہد لے لیا کہ وہ اس کو عذاب نہیں کرے گا۔

تمام کاموں کا انجام اللہ کی طرف ہے۔ (۲۲)
 کافروں کے کفر سے آپ رنجیدہ نہ ہوں،^(۱) آخر ان
 سب کا لوٹنا تو ہماری جانب ہی ہے پھر ہم ان کو بتائیں گے
 جو انہوں نے کیا ہے، بے شک اللہ سینوں^(۲) کے
 بھیدوں^(۳) تک سے واقف ہے۔ (۲۳)

ہم انہیں گو کچھ یونہی سافائدہ دے دیں لیکن (بالآخر) ہم
 انہیں نہایت پیچاریگی کی حالت میں سخت عذاب کی طرف
 ہنکالے جائیں گے۔^(۴) (۲۴)

اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ آسمان و زمین کا خالق
 کون ہے؟ تو یہ ضرور جواب دیں گے کہ اللہ،^(۵) تو کہہ
 دیجئے کہ سب تعریفوں کے لائق اللہ ہی ہے،^(۶) لیکن ان
 میں کے اکثر بے علم ہیں۔ (۲۵)

آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ ہی کا
 ہے^(۷) یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بڑا بے نیاز^(۸) اور سزاوار
 حمد و ثنا ہے۔^(۹) (۲۶)

وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزَنكَ كُفْرُهُ الْيَوْمَ مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُم بِمَا
 عَمِلُوا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ⑤

نُنَبِّئُهُمْ فَلْيَلَاذَنَّهُ نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ غَلِيظٍ ⑥

وَلَكِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ قُلِ
 الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ⑦

يَذُوقُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَفِيُّ الْمُبِيدُ ⑧

(۱) اس لیے کہ ایمان کی سعادت ان کے نصیب میں ہی نہیں ہے۔ آپ کی کوششیں اپنی جگہ بجا اور آپ کی خواہش بھی
 قابل قدر لیکن اللہ کی تقدیر اور مشیت سب پر غالب ہے۔

(۲) یعنی ان کے عملوں کی جزا دے گا۔

(۳) پس اس پر کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی۔

(۴) یعنی دنیا میں آخر تک رہیں گے اور اس کی لذتوں اور نعمتوں سے کہاں تک شاد کام ہوں گے؟ یہ دنیا اور اس
 کی لذتیں تو چند روزہ ہیں، اس کے بعد ان کے لیے سخت عذاب ہی عذاب ہے۔

(۵) یعنی ان کو اعتراف ہے کہ آسمان و زمین کا خالق اللہ ہے نہ کہ وہ معبود جن کی وہ عبادت کرتے ہیں۔

(۶) اس لیے کہ ان کے اعتراف سے ان پر حجت قائم ہو گئی۔

(۷) یعنی ان کا خالق بھی وہی ہے، مالک بھی وہی اور مدبر و متصرف کائنات بھی وہی۔

(۸) بے نیاز ہے اپنے ماسوا سے، یعنی ہر چیز اس کی محتاج ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں۔

(۹) اپنی تمام پیدا کردہ چیزوں میں۔ پس اس نے جو کچھ پیدا کیا اور جو احکام نازل فرمائے، اس پر آسمان و زمین میں سزاوار

روئے زمین کے (تمام) درختوں کے اگر قلمیں ہو جائیں اور تمام سمندروں کی سیاہی ہو اور ان کے بعد سات سمندر اور ہوں تاہم اللہ کے کلمات ختم نہیں ہو سکتے،^(۱) بیشک اللہ تعالیٰ غالب اور با حکمت ہے۔ (۲۷)

تم سب کی پیدائش اور مرنے کے بعد جلانا ایسا ہی ہے جیسے ایک جی کا،^(۲) بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ (۲۸)

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ رات کو دن میں اور دن کو رات میں کھپا دیتا ہے،^(۳) سورج چاند کو اسی نے فرماں بردار کر رکھا ہے کہ ہر ایک مقررہ وقت تک چلتا رہے،^(۴) اللہ تعالیٰ ہر اس چیز سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔ (۲۹)

وَلَوْ اَنَّآ فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمْدُ هٗ
مِنْ بَعْدِ هٗ سَبْعَةُ اُبْحُرٍ مَّا نَقِدَتْ كَلِمَاتِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ
عَزِيزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۷﴾

مَا خَلَقْنَاكُمْ لَتَبْعَكُمْ اَلَا كُنْتُمْ وَاٰحِدًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ﴿۲۸﴾

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوَلِّجُ النُّجُوْمَ فِي النَّهَارِ وَيُوَلِّجُ النُّجُوْمَ فِي الْاَيْلِ
وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلَّ يَوْمٍ اِلَىٰ اَجَلٍ مُّسَمًّى وَاَنَّ اللّٰهَ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۹﴾

حمد و ثنا؛ صرف اسی کی ذات ہے۔

(۱) اس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی، جلالت شان، اس کے اسمائے حسنیٰ اور صفات علیا اور اس کے وہ کلمات جو اس کی عظمتوں پر دلالت کتائیں بیان ہیں کہ وہ اتنے ہیں کہ کسی کے لیے ان کا احاطہ یا ان سے آگاہی یا ان کی کنہ اور حقیقت تک پہنچنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی ان کو شمار کرنا اور حیضہ تحریر میں لانا چاہے، تو دنیا بھر کے درختوں کے قلم گھس جائیں، سمندروں کے پانی کی بنائی ہوئی سیاہی ختم ہو جائے، لیکن اللہ کی معلومات، اس کی تخلیق و صنعت کے عجائبات اور اس کی عظمت و جلالت کے مظاہر کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ سات سمندر بطور مبالغہ ہے، حصر مراد نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ کی آیات و کلمات کا حصر و احصا ممکن ہی نہیں ہے (ابن کثیر) اسی مفہوم کی آیت سورہ کف کے آخر میں گزر چکی ہے۔

(۲) یعنی اس کی قدرت اتنی عظیم ہے کہ تم سب کا پیدا کرنا یا قیامت والے دن زندہ کرنا، ایک نفس کے زندہ کرنے یا پیدا کرنے کی طرح ہے۔ اس لیے کہ وہ جو چاہتا ہے لفظ کُن سے پلک جھپکتے میں معرض وجود میں آجاتا ہے۔

(۳) یعنی رات کا کچھ حصہ لے کر دن میں شامل کر دیتا ہے، جس سے دن بڑا اور رات چھوٹی ہو جاتی ہے۔ جیسے گرمیوں میں ہوتا ہے، اور پھر دن کا کچھ حصہ لے کر رات میں شامل کر دیتا ہے، جس سے رات بڑی اور دن چھوٹا ہو جاتا ہے۔ جیسے سردیوں میں ہوتا ہے۔

(۴) ”مقررہ وقت تک“ سے مراد قیامت تک ہے یعنی سورج اور چاند کے طلوع و غروب کا یہ نظام، جس کا اللہ نے ان

یہ سب (انتظامات) اس وجہ سے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حق ہے اور اس کے سوا جن جن کو لوگ پکارتے ہیں سب باطل ہیں ^(۱) اور یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بلندیوں والا اور بڑی شان والا ہے۔ ^(۲) (۳۰)

کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ دریا میں کشتیاں اللہ کے فضل سے چل رہی ہیں اس لیے کہ وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھائے، ^(۳) یقیناً اس میں ہر ایک صبر و شکر کرنے

ذٰلِكَ يٰۤاَنۡاَ اللّٰهُ هُوَ الْحَقُّ وَاَنْ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبٰطِلُ
وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيْمُ الْكَبِيْرُ ﴿۳۰﴾

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلۡكَ تَحۡوِي فِي الْبَحۡرِ بِنِعۡمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيۡكَ مِنْ
اٰيٰتِهٖۤ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبّٰرٍ شٰكُوْرٍ ﴿۳۱﴾

کو پابند کیا ہوا ہے، قیامت تک یوں ہی قائم رہے گا دوسرا مطلب ہے ”ایک متعین منزل تک“ یعنی اللہ نے ان کی گردش کے لیے ایک منزل اور ایک دائرہ متعین کیا ہوا ہے جہاں ان کا سفر ختم ہوتا ہے اور دوسرے روز پھر وہاں سے شروع ہو کر پہلی منزل پر آکر ٹھہر جاتا ہے۔ ایک حدیث سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا، جانتے ہو، یہ سورج کہاں جاتا (غروب ہوتا) ہے؟ ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں نے کہا ”اللہ اور اس کے رسول ﷺ خوب جانتے ہیں“ فرمایا، اس کی آخری منزل عرش الہی ہے یہ وہاں جاتا ہے اور زیر عرش سجدہ ریز ہوتا ہے پھر (وہاں سے نکلنے کی) اپنے رب سے اجازت مانگتا ہے ایک وقت آئے گا کہ اس کو کہا جائے گا۔ ارجعی من حیث جئت ”تو جہاں سے آیا ہے وہیں لوٹ جا“ تو وہ مشرق سے طلوع ہونے کے بجائے مغرب سے طلوع ہو گا۔ جیسا کہ قرب قیامت کی علامات میں آتا ہے (صحیح بخاری، کتاب التوحید، و مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان الزمن الذی لا یقبل فیہ الإیمان) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ”سورج رہٹ کی طرح ہے، دن کو آسمان پر اپنے مدار پر چلتا رہتا ہے، جب غروب ہو جاتا ہے، تو رات کو زمین کے نیچے اپنے مدار پر چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ مشرق سے طلوع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح چاند کا معاملہ ہے۔“ (ابن کثیر)

(۱) یعنی یہ انتظامات یا نشانیاں، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے ظاہر کرتا ہے تاکہ تم سمجھ لو کہ کائنات کا نظام چلانے والا صرف ایک اللہ ہے، جس کے حکم اور مشیت سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے، اور اس کے سوا سب باطل ہے یعنی کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے بلکہ سب اس کے محتاج ہیں کیوں کہ سب اس کی مخلوق اور اس کے ماتحت ہیں، ان میں سے کوئی بھی ایک ذرے کو بھی ہلانے کی قدرت نہیں رکھتا۔

(۲) اس سے برتر شان والا کوئی ہے نہ اس سے بڑا کوئی۔ اس کی عظمت شان، علو مرتبت اور بڑائی کے سامنے ہر چیز حقیر اور پست ہے۔

(۳) یعنی سمندر میں کشتیوں کا چلنا، یہ بھی اس کے لطف و کرم کا ایک مظہر اور اس کی قدرت تسخیر کا ایک نمونہ ہے۔ اس نے ہوا اور پانی دونوں کو ایسے مناسب انداز سے رکھا کہ سمندر کی سطح پر کشتیاں چل سکیں، ورنہ وہ چاہے تو ہوا کی

والے^(۱) کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ (۳۱)
 اور جب ان پر موجیں سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہیں تو وہ (نہایت) خلوص کے ساتھ اعتقاد کر کے اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں۔^(۲) پھر جب وہ (باری تعالیٰ) انہیں نجات دے کر خشکی کی طرف پہنچاتا ہے تو کچھ ان میں سے اعتدال پر رہتے ہیں،^(۳) اور ہماری آیتوں کا انکار صرف وہی کرتے ہیں جو بد عمد اور ناشکرے ہوں۔^(۴) (۳۲)
 لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اس دن کا خوف کرو جس دن باپ اپنے بیٹے کو کوئی نفع نہ پہنچا سکے گا اور نہ بیٹا اپنے باپ کا ذرا سا بھی نفع کرنے والا ہو گا^(۵) (یاد رکھو) اللہ کا

وَادَّاعِيَهُمْ مَّوْجًا كَالظَّلِيلِ دَعَا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۱﴾

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي مَخْلَعُكُمْ وَيَوْمًا تَكْفُرُونَ اِلَيْهِ عَن وَّلَدِكُمْ ؕ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَائِزٌ عَن وَّلَدِكُمْ شَيْئًا اِنَّ وَعْدَ

تندی اور موجوں کی طغیانی سے کشتیوں کا چلنا ناممکن ہو جائے۔

(۱) تکلیفوں میں صبر کرنے والے، راحت اور خوشی میں اللہ کا شکر کرنے والے۔

(۲) یعنی جب ان کی کشتیاں ایسی طوفانی موجوں میں گھر جاتی ہیں جو بادلوں اور پہاڑوں کی طرح ہوتی ہیں اور موت کا آہنی پنجہ انہیں اپنی گرفت میں لیتا نظر آتا ہے تو پھر سارے زمینی معبودان کے ذہنوں سے نکل جاتے ہیں اور صرف ایک آسمانی الہ کو پکارتے ہیں جو واقعی اور حقیقی معبود ہے۔

(۳) بعض نے مُّقْتَصِدٌ کے معنی بیان کیے ہیں عمد کو پورا کرنے والا، یعنی بعض ایمان، توحید اور اطاعت کے اس عمد پر قائم رہتے ہیں جو موج گرداب میں انہوں نے کیا تھا۔ ان کے نزدیک کلام میں حذف ہے، تقدیر کلام یوں ہو گا۔ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ كٰفِرٌ ”پس بعض ان میں سے مومن اور بعض کافر ہوتے ہیں۔“ (فتح القدیر) دوسرے مفسرین کے نزدیک اس کے معنی ہیں اعتدال پر رہنے والا اور یہ باب انکار سے ہو گا۔ یعنی اتنے ہولناک حالات اور پھر وہاں رب کی اتنی عظیم آیات کا مشاہدہ کرنے اور اللہ کے اس احسان کے باوجود کہ اس نے وہاں سے نجات دی، انسان اب بھی اللہ کی مکمل عبادت و اطاعت نہیں کرتا؟ اور متوسط راستہ اختیار کرتا ہے، جب کہ وہ حالات، جن سے گزر کر آیا ہے، مکمل بندگی کا تقاضا کرتے ہیں، نہ کہ اعتدال کا۔ (ابن کثیر) مگر پہلا مفہوم سیاق کے زیادہ قریب ہے۔

(۴) ختّار۔ عذار کے معنی میں ہے۔ بد عمدی کرنے والا، کفّوْر ناشکری کرنے والا۔

(۵) جَائِز اسم فاعل ہے جَزَىٰ بِجَزَائِهِ سے، بدلہ دینا، مطلب یہ ہے کہ اگر باپ چاہے کہ بیٹے کو بچانے کے لیے اپنی جان کا بدلہ، یا بیٹا باپ کے لیے اپنی جان بطور معاوضہ پیش کر دے، تو وہاں یہ ممکن نہیں ہو گا۔ ہر شخص کو اپنے کیے کی سزا

اللَّهُ حَقٌّ فَلَا تَعْرَفُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَلَا يُعْرَفُكُمْ
بِاللَّهِ الْعَزُورُ ۝۳۱

وعدہ سچا ہے (دیکھو) تمہیں دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ
ڈالے اور نہ دھوکے باز (شیطان) تمہیں دھوکے میں
ڈال دے۔ (۳۳)

بے شک اللہ تعالیٰ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے وہی
بارش نازل فرماتا ہے اور ماں کے پیٹ میں جو ہے اسے
جانتا ہے۔ کوئی (بھی) نہیں جانتا کہ کل کیا (کچھ) کرے گا؟
نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ کس زمین میں مرے گا۔^(۱) (یاد
رکھو) اللہ تعالیٰ ہی پورے علم والا اور صحیح خبروں والا
ہے۔ (۳۳)

إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنزِلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا
فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا
تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝۳۱

بھگتی ہو گی۔ جب باپ بیٹا ایک دوسرے کے کام نہ آسکیں گے تو دیگر رشتے داروں کی کیا حیثیت ہو گی؟ اور وہ کیوں
ایک دوسرے کو نفع پہنچاسکیں گے؟

(۱) حدیث میں بھی آتا ہے کہ پانچ چیزیں مفاجئ الغیب ہیں، جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (صحیح بخاری،
تفسیر سورۃ لقمان و کتاب الاستسقاء باب لا یدری متى یجىء المطر إلا اللہ)۔ ۱۔ قرب قیامت کی علامات تو
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں لیکن قیامت کے وقوع کا یقینی علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، کسی فرشتے کو، نہ
کسی نبی مرسل کو۔ ۲۔ بارش کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ آثار و علامات سے تخمینہ تو لگایا جاتا اور لگایا جاسکتا ہے لیکن یہ بات ہر
مخض کے تجربہ و مشاہدے کا حصہ ہے کہ یہ تخمینہ کبھی صحیح نکلتے ہیں اور کبھی غلط۔ حتیٰ کہ محکمہ موسمیات کے اعلانات بھی
بعض دفعہ صحیح ثابت نہیں ہوتے۔ جس سے صاف واضح ہے کہ بارش کا بھی یقینی علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ ۳۔ رحم
مادر میں مشینی ذرائع سے جنسیت کا ناقص اندازہ تو شاید ممکن ہے کہ بچہ ہے یا بچی؟ لیکن ماں کے پیٹ میں نشوونما پانے
والا یہ بچہ نیک بخت ہے یا بد بخت ناقص ہو گیا کامل، خوب رو ہو گا کہ بد شکل، کالا ہو گا یا گورا، وغیرہ باتوں کا علم اللہ کے
سوا کسی کے پاس نہیں۔ ۴۔ انسان کل کیا کرے گا؟ وہ دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا؟ کسی کو آنے والے کل کے بارے میں علم
نہیں ہے کہ وہ اس کی زندگی میں آئے گا بھی یا نہیں؟ اور اگر آئے گا تو وہ اس میں کیا کچھ کرے گا؟ ۵۔ موت کہاں آئے
گی؟ گھر میں یا گھر سے باہر، اپنے وطن میں یا دیار غیر میں، جوانی میں آئے گی یا بڑھاپے میں، اپنی آرزوؤں اور خواہشات
کی تکمیل کے بعد آئے گی یا اس سے پہلے؟ کسی کو معلوم نہیں۔

سورہ سجدہ کی ہے اور اس میں تیس آیتیں اور
تین رکوع ہیں۔

سُورَةُ السَّجْدَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نمائت رحم والا ہے۔

الْعَزِیْمُ ۝ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

الم۔ (۱) بلاشبہ اس کتاب کا اتارنا تمام جمانوں کے پروردگار
کی طرف سے ہے۔ (۲)

اَمْ یَقُولُوْنَ اَفْتَرٰنُهٗۙ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَۙ اِشْنٰذُ قُوٰمًاۙ مَا
اٰتٰهُمْ مِنْ نَبِیٍّۙ مِنْ قَبْلِكَۙ لَعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ ۝

کیا یہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے گھڑ لیا ہے۔ (۳) (نہیں
نہیں) بلکہ یہ تیرے رب تعالیٰ کی طرف سے حق ہے
تاکہ آپ انہیں ڈرائیں جنکے پاس آپ سے پہلے کوئی
ڈرانے والا نہیں آیا (۳) تاکہ وہ راہ راست پر
آجائیں۔ (۳)

اِنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَاۙ فِیْ سِتَّةِ اَیَّٰتٍ
تَعْدِیۡمٍۙ عَلٰی الْعَرْشِۙ مَا لَکُمْ مِنْ دُوْنِهٖۙ مِنْ وَّیْلِیٍّۙ وَلَا سَفِیْحٍۙ

اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان
کے درمیان ہے سب کو چھ دن میں پیدا کر دیا پھر عرش پر

حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن فجر کی نماز میں اَلَمَّ السَّجْدَةَ (اور دوسری رکعت میں) ﴿هٰذَا اَنْی
عَلَى الْاِنْسَانِ﴾ (سورہ دہر) پڑھا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری و مسلم کتاب الجمعة، باب ما یقرأ فی صلوة
الفجر یوم الجمعة) اسی طرح یہ بھی صحیح سند سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کو سونے سے قبل سورہ
الم السجدہ اور سورہ ملک پڑھا کرتے تھے۔ (ترمذی، نمبر ۸۹۲ و مسند احمد ۳/۳۴۰)

(۱) مطلب یہ ہے کہ یہ جھوٹ، جادو، کمانت اور من گھڑت قصے کہانیوں کی کتاب نہیں ہے بلکہ رب العالمین کی طرف
سے صحیفہ ہدایت ہے۔

(۲) یہ بطور توخ ہے کہ کیا رب العالمین کے نازل کردہ اس کلام بلاغت نظام کی بابت یہ کہتے ہیں کہ اسے خود (محمد صلی
اللہ علیہ وسلم نے) گھڑ لیا ہے؟

(۳) یہ نزول قرآن کی علت ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوا (جیسا کہ پہلے بھی وضاحت گزر چکی ہے) کہ عربوں میں نبی صلی
اللہ علیہ وسلم پہلے نبی تھے۔ بعض لوگوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کو بھی عربوں میں مبعوث نبی قرار دیا ہے۔ واللہ
اعلم۔ اس اعتبار سے قوم سے مراد پھر خاص قریش ہوں گے جن کی طرف کوئی نبی آپ ﷺ سے پہلے نہیں آیا۔

قائم ہوا،^(۱) تمہارے لیے اس کے سوا کوئی مددگار اور سفارشی نہیں۔^(۲) کیا پھر بھی تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔^(۳)

وہ آسمان سے لے کر زمین تک (ہر) کام کی تدبیر کرتا ہے^(۴) پھر (وہ کام) ایک ایسے دن میں اس کی طرف چڑھ جاتا ہے جس کا اندازہ تمہاری گنتی کے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔^(۵) یہی ہے چھپے کھلے کا جاننے والا، زبردست غالب بہت ہی مہربان۔ (۶)

أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ﴿۱﴾

يُدِيرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يُعَوِّجُ السُّبُوحِ يَوْمِ
كَانَ مَقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَنْعَهُ دُونَ ﴿۲﴾

ذَلِكَ ظِلْمُ الْعَقِيبِ وَالشَّهَادَةُ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ﴿۳﴾

(۱) اس کے لیے دیکھئے سورۃ اعراف ۵۴ کا حاشیہ۔ یہاں اس مضمون کو دہرانے سے مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت اور عجائب صنعت کے ذکر سے شاید وہ قرآن کو سنیں اور اس پر غور کریں۔

(۲) یعنی وہاں کوئی ایسا دوست نہیں ہو گا جو تمہاری مدد کر سکے اور تم سے اللہ کے عذاب کو ٹال دے، نہ وہاں کوئی سفارشی ہی ایسا ہو گا جو تمہاری سفارش کر سکے۔

(۳) یعنی اے غیر اللہ کے پجاریو اور دوسروں پر بھروسہ رکھنے والو! کیا پھر بھی تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟

(۴) آسمان سے، جہاں اللہ کا عرش اور لوح محفوظ ہے، اللہ تعالیٰ زمین پر احکام نازل فرماتا یعنی تدبیر کرتا اور زمین پر ان کا نفاذ ہوتا ہے۔ جیسے موت اور زندگی، صحت اور مرض، عطا اور منع، غنا اور فقر، جنگ اور صلح، عزت اور ذلت، وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر سے اپنی تقدیر کے مطابق یہ تدبیریں اور تصرفات کرتا ہے۔

(۵) یعنی پھر اس کی یہ تدبیر یا امر اس کی طرف واپس لوٹتا ہے ایک ہی دن میں، جسے فرشتے لے کر جاتے ہیں اور صعود (چڑھنے) کا یا آنے جانے کا فاصلہ اتنا ہے کہ غیر فرشتہ ہزار سال میں طے کرے۔ یا اس سے قیامت کا دن مراد ہے کہ اس دن انسانوں کے سارے اعمال اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوں گے۔ اس ”یوم“ کی تعیین و تفسیر میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ امام شوکانی نے ۱۵، ۱۶، ۱۷ اقوال اس ضمن میں ذکر کیے ہیں اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے بارے میں توقف کو پسند فرمایا اور اس کی حقیقت کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ صاحب المیزان التفسیر کہتے ہیں کہ قرآن میں یہ تین مقامات پر آیا ہے اور تینوں جگہ الگ الگ دن مراد ہے۔ سورۃ حج (آیت ۷۷-۷۸) میں ”یوم“ کا لفظ عبارت ہے اس زمانہ اور مدت سے جو اللہ کے ہاں ہے اور سورۃ معارج میں، جہاں یوم کی مقدار پچاس ہزار سال بتلائی گئی ہے، یوم حساب مراد ہے اور اس مقام (زیر بحث) میں یوم سے مراد دنیا کا آخری دن ہے، جب دنیا کے تمام معاملات فنا ہو کر اللہ کی طرف لوٹ جائیں گے

جس نے نہایت خوب بنائی جو چیز بھی بنائی^(۱) اور انسان کی بناوٹ مٹی سے شروع کی۔^(۲) (۷)

پھر اس کی نسل ایک بے وقعت پانی کے نچوڑ سے چلائی۔^(۳) (۸)

جسے ٹھیک ٹھاک کر کے اس میں اپنی روح پھونکی،^(۴) اسی نے تمہارے کان آنکھیں اور دل بنائے^(۵) (اس پر بھی) تم بہت ہی تھوڑا احسان مانتے ہو۔^(۶) (۹)

اور انہوں نے کہا کیا جب ہم زمین میں رل مل جائیں^(۷) گے کیا پھر نئی پیدائش میں آجائیں گے؟ بلکہ (بات یہ ہے) کہ وہ لوگ اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں۔^(۸) (۱۰)

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ۝

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ۝

ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُّوحِنَا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝

وَقَالُوا إِنَّمَا أَصْلَنَا فِي الْأَرْضِ مَاءٌ لَّيْفَىٰ خَلْقِ جَدِيدٍ ۝

بَلْ هُمْ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ كَفِرُونَ ۝

(۱) یعنی جو چیز بھی اللہ نے بنائی ہے، وہ چوں کہ اس کی حکمت و مصلحت کا اقتضا ہے، اس لیے اس میں اپنا ایک حسن اور انفرادیت ہے۔ یوں اس کی بنائی ہوئی ہر چیز حسین ہے اور بعض نے أَحْسَنَ کے معنی أَنْفَنَ وَأَحْكَمَ کے کیے ہیں، یعنی ہر چیز مضبوط اور پختہ بنائی۔ بعض نے اسے آلہم کے مفہوم میں لیا ہے، یعنی ہر مخلوق کو ان چیزوں کا الامام کر دیا جس کی وہ محتاج ہے۔

(۲) یعنی انسان اول ”آدم علیہ السلام“ کو مٹی سے بنایا، جن سے انسانوں کا آغاز ہوا۔ اور اس کی زوجہ حضرت حوا کو آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا کر دیا جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

(۳) یعنی منی کے قطرے سے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک انسانی جوڑا بنانے کے بعد، اس کی نسل کے لیے ہم نے یہ طریقہ مقرر کر دیا کہ مرد اور عورت آپس میں نکاح کریں، ان کے جنسی ملاپ سے جو قطرہ آب، عورت کے رحم میں جائے گا، اس سے ہم ایک انسانی پیکر تراش کر باہر بھیجتے رہیں گے۔

(۴) یعنی اس بچے کی ماں کے پیٹ میں نشوونما کرتے، اس کے اعضا بناتے، سنوارتے ہیں اور پھر اس میں روح پھونکتے ہیں۔

(۵) یعنی یہ ساری چیزیں پیدا کیں تاکہ وہ اپنی تخلیق کی تکمیل کر دے، پس تم ہر سننے والی بات کو سن سکو، دیکھنے والی چیز کو دیکھ سکو اور ہر عقل و فہم میں آنے والی بات کو سمجھ سکو۔

(۶) یعنی اتنے احسانات کے باوجود انسان اتنا ناشکرا ہے کہ وہ اللہ کا شکر بہت ہی کم ادا کرتا ہے یا شکر کرنے والے آدمی بہت تھوڑے ہیں۔

(۷) جب کسی چیز پر کوئی دوسری چیز غالب آجائے اور پہلی کے تمام اثرات مٹ جائیں تو اس کو ضلالت (گم ہو جانے) سے تعبیر کرتے ہیں ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ کے معنی ہوں گے کہ جب مٹی میں مل کر ہمارا وجود زمین میں غائب ہو جائے گا۔

کہہ دیجئے! کہ تمہیں موت کا فرشتہ فوت کرے گا جو تم پر مقرر کیا گیا ہے (۱) پھر تم سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ (۱۱)

کاش کہ آپ دیکھتے جب کہ گناہ گار لوگ اپنے رب تعالیٰ کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہوں گے، کہیں گے اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا اب (۲) تو ہمیں واپس لوٹا دے ہم نیک اعمال کریں گے ہم یقین کرنے والے ہیں۔ (۱۲)

اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت نصیب (۵) فرمادیتے، لیکن میری یہ بات بالکل حق ہو چکی ہے کہ میں ضرور ضرور جہنم کو انسانوں اور جنوں سے پر کر دوں گا۔ (۱۳)

اب تم اپنے اس دن کی ملاقات کے فراموش کر دینے کا مزہ چکھو، ہم نے بھی تمہیں بھلا دیا (۴) اور اپنے کیے ہوئے اعمال (کی شامت) سے ابدی عذاب کا مزہ چکھو۔ (۱۴)

ہماری آیتوں پر وہی ایمان لاتے ہیں (۸) جنہیں جب کبھی ان

قُلْ يَتَوَكَّلْ عَلَىٰ مَلِكِ الْمَوْتِ الَّذِي يُكَلِّمُ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ﴿۱۱﴾

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُرْسَلُونَ كَانُوا مُؤْتَسِرِينَ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَانْرٰصِنَا لِنَعْمَلَ صَالِحًا اِلَّا الْمَوْثِقُونَ ﴿۱۲﴾

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدًىٰ وَكَلَّا لَكِنَ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۳﴾

فَنذُوقُوا يَمَّا تَسِبْتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا اَلَا تَابِيْبِنَاكُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْعَذَابِ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۴﴾

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِالْآيَاتِ الْاَلْوَدِيْنِ اِذَا دُكِرُوا بِهَا حُرُوْدًا سُجَّدًا اَوْ سُبْحًا

(۱) یعنی اس کی ڈیوٹی ہی یہ ہے کہ جب تمہاری موت کا وقت آجائے تو وہ آکر روح قبض کر لے۔

(۲) یعنی اپنے کفر و شرک اور معصیت کی وجہ سے مارے ندامت کے۔

(۳) یعنی جس کی تکذیب کرتے تھے، اسے دیکھ لیا، جس کا انکار کرتے تھے، اسے سن لیا۔ یا تیری وعیدوں کی سچائی کو دیکھ لیا اور پیغمبروں کی تصدیق کو سن لیا لیکن اس وقت کا دیکھنا، سنانا کے کچھ کام نہیں آئے گا۔

(۴) لیکن اب یقین کیا تو کس کام کا؟ اب تو اللہ کا عذاب ان پر ثابت ہو چکا جسے بھگتنا ہو گا۔

(۵) یعنی دنیا میں، لیکن یہ ہدایت جبری ہوتی، جس میں امتحان کی گنجائش نہ ہوتی۔

(۶) یعنی انسانوں کی دو قسموں میں سے جو جہنم میں جانے والے ہیں، ان سے جہنم کو بھرنے والی میری بات سچ ثابت ہو گئی۔

(۷) یعنی جس طرح تم ہمیں دنیا میں بھلائے رہے، آج ہم بھی تم سے ایسا ہی معاملہ کریں گے ورنہ ظاہر بات ہے کہ اللہ تو بھولنے والا نہیں ہے۔

(۸) یعنی تصدیق کرتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

يَعْبُدُ رَبَّهُمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿٥﴾

تَعْبُدُ رَبَّهُمْ

سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں^(۱) اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح پڑھتے ہیں^(۲) اور تکبر نہیں کرتے ہیں۔^(۳) (۱۵)

ان کی کروٹیں اپنے بستروں سے الگ رہتی ہیں^(۴) اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے^(۵) ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے وہ خرچ کرتے ہیں۔^(۶) (۱۶)

کوئی نفس نہیں جانتا جو کچھ ہم نے ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لیے پوشیدہ کر رکھی ہے،^(۷) ہے جو کچھ

تَعْبَأَنِي جُؤُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا
وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٥﴾

فَلَا تَمْلِكُ نَفْسٌ مَّا أَلْحَقْنَا لَمْ يَمُنْ فَتَرَىٰ أَعْيُنًا عِزًّا أَرَادْنَا أَن نَّوَدَّ
يَعْمَلُونَ ﴿٥﴾

(۱) یعنی اللہ کی آیات کی تعظیم اور اس کی سطوت و عذاب سے ڈرتے ہوئے۔

(۲) یعنی رب کو ان چیزوں سے پاک قرار دیتے ہیں جو اس کی شان کے لائق نہیں ہیں اور اس کے ساتھ اس کی نعمتوں پر اس کی حمد کرتے ہیں جن میں سب سے بڑی اور کامل نعمت ایمان کی ہدایت ہے۔ یعنی وہ اپنے سجدوں میں «سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ» یا «سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَىٰ وَبِحَمْدِهِ» وغیرہ کلمات پڑھتے ہیں۔

(۳) یعنی اطاعت و انقیاد کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ جاہلوں اور کافروں کی طرح تکبر نہیں کرتے۔ اس لیے کہ اللہ کی عبادت سے تکبر کرنا، جہنم میں جانے کا سبب ہے۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ ذُخْرًا﴾ (سورۃ المؤمن ۲۰) اس لیے اہل ایمان کا معاملہ ان کے برعکس ہوتا ہے، وہ اللہ کے سامنے ہر وقت عاجزی، ذلت و مسکینی اور خشوع و خضوع کا اظہار کرتے ہیں۔

(۴) یعنی راتوں کو اٹھ کر نوافل (تہجد) پڑھتے توبہ و استغفار، تسبیح و تحمید اور دعا و الخاح و زاری کرتے ہیں۔

(۵) یعنی اس کی رحمت اور فضل و کرم کی امید بھی رکھتے ہیں اور اس کے عتاب و غضب اور مٹواؤ خذہ و عذاب سے ڈرتے بھی ہیں۔ محض امید ہی امید نہیں رکھتے کہ عمل سے بے پرواہ ہو جائیں (جیسے بے عمل اور بد عمل لوگوں کا شیوہ ہے اور نہ عذاب کا اتنا خوف طاری کر لیتے ہیں کہ اللہ کی رحمت سے ہی مایوس ہو جائیں کہ یہ مایوسی بھی کفر و ضلالت ہے۔

(۶) اتفاق میں صدقات و واجبہ (زکوٰۃ) اور عام صدقہ و خیرات دونوں شامل ہیں۔ اہل ایمان دونوں کا حسب استطاعت اہتمام کرتے ہیں۔

(۷) نفس، نکرہ ہے جو عموم کا فائدہ دیتا ہے یعنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان نعمتوں کو جو اس نے مذکورہ اہل ایمان کے لیے چھپا کر رکھی ہیں جن سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ اس کی تفسیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث قدسی بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، کسی

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ ﴿۱۷﴾

کرتے تھے یہ اس کا بدلہ ہے۔^(۱) (۱۷)
کیا وہ جو مومن ہو مثل اس کے ہے جو فاسق ہو؟^(۲) یہ
برابر نہیں ہو سکتے۔ (۱۸)

اِنَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ قَلِيْلٌ جَنَّتُ الْمَادِي
نُزُلًا يَسِيْرًا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور نیک اعمال بھی کیے ان
کے لیے بھیجی والی جنتیں ہیں، ممانداری ہے ان کے
اعمال کے بدلے جو وہ کرتے تھے۔ (۱۹)

وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَا لَهُمْ النَّارُ كَمَا اَرَادُوْا اَنْ يَخْرُجُوْا
مِنْهَا اَنْعِيْبًا وَّرٰفِيْهَا وَاَقْبَلُ لَهُمْ دُوْرُ الْعَذَابِ النَّارِ الَّذِي
كُنْتُمْ بِهٖ تَكْتَبُوْنَ ﴿۱۹﴾

لیکن جن لوگوں نے حکم عدولی کی ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔
جب کبھی اس سے باہر نکلنا چاہیں گے اسی میں لوٹا دیے
جائیں گے۔^(۳) اور کہہ دیا جائے گا کہ^(۴) اپنے جھٹلانے
کے بدلے آگ کا عذاب چکھو۔ (۲۰)

وَلَنْذِيْقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْرَ الْعَذَابِ
الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۰﴾

بالیقین ہم انہیں قریب کے چھوٹے سے بعض عذاب^(۵)
اس بڑے عذاب کے سوا چکھائیں گے تاکہ وہ لوٹ

کان نے نہیں سنا، نہ کسی انسان کے وہم و گمان میں ان کا گزر ہوا۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ السجدہ)

(۱) اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی رحمت کا مستحق بننے کے لیے اعمال صالحہ کا اہتمام ضروری ہے۔

(۲) یہ استغمام انکاری ہے یعنی اللہ کے ہاں مومن اور کافر برابر نہیں ہیں بلکہ ان کے درمیان بڑا فرق و تفاوت ہو گا
مومن اللہ کے سمان ہوں گے اور اعرّاز و اکرام کے مستحق اور فاسق و کافر تعزیر و عقوبت کی بیزیوں میں جکڑے ہوئے
جنم کی آگ میں جھلسیں گے۔ اس مضمون کو دوسرے مقامات پر بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ جاثیہ ۲۱،
سورہ ص ۲۸، سورہ حشر ۲۰، وغیرہا۔

(۳) یعنی جنم کے عذاب کی شدت اور ہولناکی سے گھبرا کر باہر نکلنا چاہیں گے تو فرشتے انہیں پھر جنم کی گہرائیوں میں
دھکیل دیں گے۔

(۴) یہ فرشتے کہیں گے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آئے گی، بہر حال اس میں مکذبین کی ذلت و رسوائی کا جو سامان ہے،
وہ مخفی نہیں۔

(۵) عذاب ادنیٰ (چھوٹے سے یا قریب کے بعض عذاب) سے دنیا کا عذاب یا دنیا کی مصیبتیں اور بیماریاں وغیرہ مراد ہیں۔
بعض کے نزدیک وہ قتل اس سے مراد ہے، جس سے جنگ بدر میں کافر دوزخ چار ہوئے یا وہ قحط سالی ہے جو اہل مکہ پر مسلط
کی گئی تھی۔ امام شوکانی فرماتے ہیں، تمام صورتیں ہی اس میں شامل ہو سکتی ہیں۔

آئیں۔^(۱) (۳۱)

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے وعظ کیا گیا پھر بھی اس نے ان سے منہ پھیر لیا،^(۲) یقین مانو کہ ہم بھی گنہ گاروں سے انتقام لینے والے ہیں۔ (۲۳)

بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، پس آپ کو ہرگز اس کی ملاقات میں شک^(۳) نہ کرنا چاہیے اور ہم نے اسے^(۴) بنی اسرائیل کی ہدایت کا ذریعہ بنایا۔ (۲۳)

اور جب ان لوگوں نے صبر کیا تو ہم نے ان میں سے ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے تھے، اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔^(۵) (۲۳)

آپ کا رب ان (سب) کے درمیان ان (تمام) باتوں کا فیصلہ قیامت کے دن کرے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔^(۶) (۲۵)

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ دُكِرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا
إِنَّا مِنَ الْعَجِيزِينَ مُنْتَبِهُونَ ﴿۳۱﴾

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ
مِّنْ لِّقَابِهِ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿۳۲﴾

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ آيَةً يَهْتَدُونَ يَا مَعْرِبُ النَّاصِرُونَ
وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُؤْتُونَ ﴿۳۳﴾

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا
فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۳۴﴾

- (۱) یہ آخرت کے بڑے عذاب سے پہلے جھوٹے عذاب بھیجنے کی علت ہے کہ شاید وہ کفر و شرک اور معصیت سے باز آجائیں۔
- (۲) یعنی اللہ کی آیتیں سن کر جو ایمان و اطاعت کی موجب ہیں، جو شخص ان سے اعراض کرتا ہے، اس سے بڑا ظالم کون ہے؟ یعنی یہی سب سے بڑا ظالم ہے۔
- (۳) کہا جاتا ہے کہ یہ اشارہ ہے اس ملاقات کی طرف جو معراج کی رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان ہوئی، جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نمازوں میں تخفیف کرانے کا مشورہ دیا تھا۔
- (۴) ”اے“ سے مراد کتاب (تورات) ہے یا خود حضرت موسیٰ علیہ السلام۔
- (۵) اس آیت سے صبر کی فضیلت واضح ہے۔ صبر کا مطلب ہے اللہ کے اوامر کے بحالانے اور ترک زواجر میں اور اللہ کے رسولوں کی تصدیق اور ان کے اتباع میں جو تکلیفیں آئیں، انہیں خندہ پیشانی سے جھیلانا۔ اللہ نے فرمایا، ان کے صبر کرنے اور آیات الہی پر یقین رکھنے کی وجہ سے ہم نے ان کو دینی امامت اور پیشوائی کے منصب پر فائز کیا۔ لیکن جب انہوں نے اس کے برعکس تبدیل و تحریف کا ارتکاب شروع کر دیا، تو ان سے یہ مقام سلب کر لیا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے، پھر ان کا عمل صالح رہا اور نہ ان کا اعتقاد صحیح۔
- (۶) اس سے وہ اختلاف مراد ہے جو اہل کتاب میں باہم برپا تھا، ضمناً وہ اختلافات بھی آجاتے ہیں۔ جو اہل ایمان اور اہل

کیا اس بات نے بھی انہیں ہدایت نہیں دی کہ ہم نے ان سے پہلے بہت سی امتوں کو ہلاک کر دیا جن کے مکانوں میں یہ چل پھر رہے ہیں۔^(۱) اس میں تو (بڑی) بڑی نشانیاں ہیں۔ کیا پھر بھی یہ نہیں سنتے؟ (۲۶)

کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم پانی کو بنجر (غیر آباد) زمین کی طرف بہا کر لے جاتے ہیں پھر اس سے ہم کھیتیاں نکالتے ہیں جسے ان کے چوپائے اور یہ خود کھاتے ہیں،^(۲) کیا پھر بھی یہ نہیں دیکھتے؟ (۲۷)

اور کہتے ہیں کہ یہ فیصلہ کب ہو گا؟ اگر تم سچے ہو (تو بتلاؤ)^(۳) (۲۸)

جواب دے دو کہ فیصلے والے دن ایمان لانا بے ایمانوں کو کچھ کام نہ آئے گا اور نہ انہیں ڈھیل دی جائے گی۔^(۴) (۲۹)

اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمَا هَدَكُنَا مِن قَبْلِهِمْ مِنَ الْقُرُونِ يَستَوْنَ فِي مَسْئِلِهِمْ اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ۝

اَوَلَمْ يَرَوْا كَاٰنَسُوْا الْمٰءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزَ فَمُنْحَرِبٌ يَّهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ اَفَلَا يَبْصُرُوْنَ ۝

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الْكٰفِرُ اِنْ كَفَرَ اَلَيْسَ لَهُمْ وَا لَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝

کفر، اہل حق اور اہل باطل اور اہل توحید و اہل شرک کے درمیان دنیا میں رہے اور ہیں چونکہ دنیا میں تو ہر گروہ اپنے دلائل پر مطمئن اور اپنی ڈگر پر قائم رہتا ہے۔ اس لیے ان اختلافات کا فیصلہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ ہی فرمائے گا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل حق کو جنت میں اور اہل کفر و باطل کو جہنم میں داخل فرمائے گا۔

(۱) یعنی پچھلی امتیں جو تکذیب اور عدم ایمان کی وجہ سے ہلاک ہوئیں، کیا یہ نہیں دیکھتے کہ آج ان کا وجود دنیا میں نہیں ہے، البتہ ان کے مکانات ہیں جن کے یہ وارث بنے ہوئے ہیں۔ مطلب اس سے اہل مکہ کو تنبیہ ہے کہ تمہارا حشر بھی یہی ہو سکتا ہے، اگر ایمان نہ لائے۔

(۲) پانی سے مراد آسمانی بارش اور چشموں نالوں اور وادیوں کا پانی ہے، جسے اللہ تعالیٰ ارض جرز (بنجر اور بے آباد علاقوں کی طرف بہا کر لے جاتا ہے اور اس سے پیداوار ہوتی ہے جو انسان کھاتے ہیں اور جو بھوسی یا چارہ ہوتا ہے، وہ جانور کھا لیتے ہیں۔ اس سے مراد کوئی خاص زمین یا علاقہ مراد نہیں ہے بلکہ عام ہے۔ جو ہر بے آباد، بنجر اور چھیل زمین کو شامل ہے۔

(۳) اس فیصلے (فتح) سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ عذاب ہے جو کفار مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے طلب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) تیرے اللہ کی مدد تیرے لیے کب آئے گی؟ جس سے تو ہمیں ڈراتا رہتا ہے۔ فی الحال تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ تجھ پر ایمان لانے والے چھپے پھرتے ہیں۔

(۴) اس یوم الفتح سے مراد آخرت کے فیصلے کا دن ہے، جہاں ایمان مقبول ہو گا اور نہ مملت دی جائے گی۔ فتح مکہ کا دن

اب آپ ان کا خیال چھوڑ دیں^(۱) اور منتظر رہیں۔^(۲) یہ بھی منتظر ہیں۔^(۳) (۳۰)

سورہ احزاب مدنی ہے اور اس میں تتر آیتیں اور نو رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اے نبی! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا^(۴) اور کافروں اور منافقوں کی باتوں میں نہ آجانا، اللہ تعالیٰ بڑے علم والا اور

فَاعْرِضْ عَنْهُمْ وَاَنْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُنْتَضِرُونَ ﴿۳۰﴾

سُورَةُ الْاِحْزَابِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۱﴾

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۲﴾

مراد نہیں ہے کیوں کہ اس دن تو ملقاء کا اسلام قبول کر لیا گیا تھا، جن کی تعداد تقریباً دو ہزار تھی۔ (ابن کثیر) ملقاء سے مراد وہ اہل مکہ ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ والے دن، سزا و تعزیر کے بجائے معاف فرمادیا تھا اور یہ کہہ کر آزاد کر دیا تھا کہ آج تم سے تمہاری پچھلی ظالمانہ کارروائیوں کا بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ چنانچہ ان کی اکثریت مسلمان ہو گئی تھی۔

(۱) یعنی ان مشرکین سے اعراض کر لیں اور تبلیغ و دعوت کا کام اپنے انداز سے جاری رکھیں، جو وحی آپ ﷺ کی طرف نازل کی گئی ہے، اس کی پیروی کریں۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿لَا تَتَّبِعُوا الْاَعْيُنَ وَمَا يَنْشُرُونَ بِكَ مِنَ الظَّالِمَاتِ﴾ (سورہ الانعام: ۱۰۶) ”آپ خود اس طریقت پر چلتے رہئے جس کی وحی آپ کے رب تعالیٰ کی طرف سے آپ کے پاس آئی ہے اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور مشرکین کی طرف خیال نہ کیجئے۔“

(۲) یعنی اللہ کے وعدے کا کہ وہ پورا ہوتا ہے اور تیرے مخالفوں پر تجھے غلبہ عطا فرماتا ہے؟ وہ یقیناً پورا ہو کر رہے گا۔

(۳) یعنی یہ کافر منتظر ہیں کہ شاید یہ پیغمبر ہی گردشوں کا شکار ہو جائے اور اس کی دعوت ختم ہو جائے۔ لیکن دنیائے دیکھ لیا کہ اللہ نے اپنے نبی کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو پورا فرمایا اور آپ پر گردشوں کے منتظر مخالفوں کو ذلیل و خوار کیا یا ان کو آپ کا غلام بنا دیا۔

(۴) آیت میں تقویٰ پر مدامت اور تبلیغ و دعوت میں استقامت کا حکم ہے۔ طلق بن حبیب کہتے ہیں، تقویٰ کا مطلب ہے کہ تو اللہ کی اطاعت اللہ کی دی ہوئی روشنی کے مطابق کرے اور اللہ سے ثواب کی امید رکھے اور اللہ کی معصیت اللہ کی دی ہوئی روشنی کے مطابق ترک کر دے، اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے۔ (ابن کثیر)

بڑی حکمت والا ہے۔^(۱)

جو کچھ آپ کی جانب آپ کے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے^(۲) اس کی تابعداری کریں (یقین مانو) کہ اللہ تمہارے ہر ایک عمل سے باخبر ہے۔^(۳)
آپ اللہ ہی پر توکل رکھیں،^(۴) وہ کارسازی کے لیے کافی ہے۔^(۵)

کسی آدمی کے سینے میں اللہ تعالیٰ نے دو دل نہیں رکھے،^(۶) اور اپنی جن بیویوں کو تم ماں کہہ بیٹھتے ہو انہیں اللہ نے

وَالَّذِي مَلَأَ بطنِي الْيَتِيمَ مِنَ رِيكِ ۝ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝

مَا جَعَلَ اللَّهُ لِلرَّجُلِ مِنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ وَمَا جَعَلَ أَرْوَاحَكُمْ إِلَّا أَنْظُهُرًا مِنْهُنَّ أَنَّهِنَّ وَأَجَلٌ لِذِي آئَاتٍ أَنْبَاءُكُمْ

(۱) پس وہی اس بات کا حق دار ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اس لیے کہ عواقب کو وہی جانتا ہے اور اپنے اقوال و افعال میں وہ حکیم ہے۔

(۲) یعنی قرآن کی اور احادیث کی بھی، اس لیے کہ احادیث کے الفاظ گو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ہیں لیکن ان کے معانی و مفہام من جانب اللہ ہی ہیں۔ اسی لیے ان کو وحی خفی یا وحی غیر متلو کہا جاتا ہے۔

(۳) پس اس سے تمہاری کوئی بات مخفی نہیں رہ سکتی۔

(۴) اپنے تمام معاملات اور احوال میں۔

(۵) ان لوگوں کے لیے جو اس پر بھروسہ رکھتے، اور اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

(۶) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک منافق یہ دعویٰ کرتا تھا کہ اس کے دو دل ہیں۔ ایک دل مسلمانوں کے

ساتھ ہے اور دوسرا دل کفر اور کافروں کے ساتھ ہے۔ (مسند أحمد ۱/۲۶۷) یہ آیت اس کی تردید میں نازل ہوئی۔ مطلب

یہ ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک دل میں اللہ کی محبت اور اس کے دشمنوں کی اطاعت جمع ہو جائے۔ بعض کہتے ہیں

کہ مشرکین مکہ میں سے ایک شخص جمیل بن معمر فری تھا، جو بڑا ہشیار، مکار اور نہایت تیز طرار تھا، اس کا دعویٰ تھا کہ

میرے تو دو دل ہیں جن سے میں سوچتا سمجھتا ہوں۔ جب کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک ہی دل ہے۔ یہ آیت اس کے

رد میں نازل ہوئی۔ (المیر القاسم) بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آگے جو دو مسئلے بیان کیے جا رہے ہیں، یہ ان کی تفسیر ہے یعنی

جس طرح ایک شخص کے دو دل نہیں ہو سکتے، اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے ظہار کر لے یعنی یہ کہہ دے کہ

تیری پشت میرے لیے ایسے ہی ہے جیسے میری ماں کی پشت۔ تو اس طرح کہنے سے اس کی بیوی، اس کی ماں نہیں بن

جائے گی۔ یوں اس کی دو ماںیں نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح کوئی شخص کسی کو اپنا بیٹا (لے پالک) بنا لے تو وہ اس کا حقیقی بیٹا

نہیں بن جائے گا، بلکہ وہ بیٹا تو اپنے باپ ہی کا رہے گا، اس کے دو باپ نہیں ہو سکتے۔ (ابن کثیر)

ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ يٰۤاَقْرَابَهُمْ وَاللّٰهُ يَفْعُلُ الْحَقَّ وَهُوَ
يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝

تمہاری (بچ بچ کی) مائیں نہیں ^(۱) بنایا، اور نہ تمہارے لے
پالک لڑکوں کو (واقعی) تمہارے بیٹے بنایا ہے، ^(۲) یہ تو
تمہارے اپنے منہ کی باتیں ہیں، ^(۳) اللہ تعالیٰ حق بات فرماتا
ہے اور وہ (سیدھی) راہ بھجاتا ہے۔ ^(۴)

لے پالکوں کو ان کے (حقیقی) باپوں کی طرف نسبت کر
کے بلاؤ اللہ کے نزدیک پورا انصاف یہی ^(۵) ہے۔ پھر اگر
تمہیں ان کے (حقیقی) باپوں کا علم ہی نہ ہو تو وہ تمہارے
دینی بھائی اور دوست ہیں، ^(۶) تم سے بھول چوک میں جو
کچھ ہو جائے اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں، ^(۷) البتہ گناہ وہ

اَدْعُوهُمْ لِاَبَائِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِن لَّمْ تَعْلَمُوْا
اَبَاءَهُمْ فَاَحْزَابِكُمْ فِى الدِّيْنِ وَمَا لَكُمْ اَوْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ
جُنَاحٌ فِيمَا اَخْتَلَفْتُمْ بِهِ وَلٰكِنْ تَالَعْتُمْ تِلْكَ لَوْلَا كُمْ وَاَنَّ
اللّٰهَ عَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(۱) یہ مسئلہ ظہار کہلاتا ہے، اس کی تفصیل سورہ مجادلہ میں آئے گی۔

(۲) اس کی تفصیل اسی سورت میں آگے چل کر آئے گی۔ اَدْعِيَّۃٌ، دَعِيٌّ کی جمع ہے۔ منہ بولا بیٹا۔

(۳) یعنی کسی کو ماں کہہ دینے سے وہ ماں نہیں بن جائے گی، نہ بیٹا کہنے سے وہ بیٹا بن جائے گا، یعنی ان پر امتوت اور
بنوت کے شرعی احکام جاری نہیں ہوں گے۔

(۴) اس لیے اس کا اتباع کرو اور ظہار والی عورت کو ماں اور لے پالک کو بیٹا مت کہو، خیال رہے کہ کسی کو پیار اور
محبت میں بیٹا کہنا اور بات ہے اور لے پالک کو حقیقی بیٹا تصور کر کے بیٹا کہنا اور بات ہے۔ پہلی بات جائز ہے، یہاں مقصود
دوسری بات کی ممانعت ہے۔

(۵) اس حکم سے اس رواج کی ممانعت کر دی گئی جو زمانہ جاہلیت سے چلا آ رہا تھا اور ابتدائے اسلام میں بھی رائج تھا کہ
لے پالک بیٹوں کو حقیقی بیٹا سمجھا جاتا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیان فرماتے ہیں کہ ہم زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو (جنہیں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کر کے بیٹا بنایا تھا) زید بن محمد رضی اللہ عنہ کہہ کر پکارا کرتے تھے، حتیٰ کہ قرآن کریم کی آیت
﴿اَدْعُوهُمْ لِاَبَائِهِمْ﴾ نازل ہو گئی۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورہ الاحزاب) اس آیت کے نزول کے بعد حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ
کے گھر میں بھی ایک مسئلہ پیدا ہو گیا، جنہوں نے سالم کو بیٹا بنایا ہوا تھا جب منہ بولے بیٹوں کو حقیقی بیٹا سمجھنے سے روک
دیا گیا تو اس سے پردہ کرنا ضروری ہو گیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کی بیوی کو کہا کہ اسے دودھ پلا کر
اپنا رضاعی بیٹا بنا لو کیوں کہ اس طرح تم اس پر حرام ہو جاؤ گی۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ (صحیح مسلم، کتاب
الرضاع، باب رضاعۃ الکبیر، ابو داؤد، کتاب النکاح، باب فیمن حرم بہ)

(۶) یعنی جن کے حقیقی باپوں کا علم ہے۔ اب دوسری نسبتیں ختم کر کے انہیں کی طرف انہیں منسوب کرو۔ البتہ جن کے
باپوں کا علم نہ ہو سکے تو تم انہیں اپنا بھائی اور دوست سمجھو، بیٹا مت سمجھو۔

(۷) اس لیے کہ خطا و نسیان معاف ہے، جیسا کہ حدیث میں بھی صراحت ہے۔

ہے جس کا تم ارادہ دل سے کرو۔^(۱) اللہ تعالیٰ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔ (۵)

پیغمبر مومنوں پر خود ان سے بھی زیادہ حق رکھنے والے^(۲) ہیں اور پیغمبر کی بیویاں مومنوں کی مائیں ہیں^(۳) اور رشتے دار کتاب اللہ کی رو سے بہ نسبت دوسرے مومنوں اور مہاجرین کے آپس میں زیادہ حق دار ہیں^(۴) (ہاں مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہو۔^(۵) یہ حکم کتاب (الہی) میں لکھا ہوا ہے۔^(۶))

الَّذِي أُولَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ نَفْسِهِمْ وَأُولَٰئِكَ أُمَّتُهُمْ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَٰكُمْ مَعْرُوفًا كَانَ ذَلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا ۝

(۱) یعنی جو جان بوجھ کر غلط انتساب کرے گا وہ سخت گناہ گار ہوگا۔ حدیث میں آتا ہے۔ ”جس نے جانتے بوجھتے اپنے کو غیر باپ کی طرف منسوب کیا۔ اس نے کفر کا ارتکاب کیا۔“ (صحیح بخاری، کتاب المناقب باب نسبة الیمن الی اسماعیل علیہ السلام)

(۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لیے جتنے شفیق اور خیر خواہ تھے، محتاج وضاحت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اس شفقت اور خیر خواہی کو دیکھتے ہوئے اس آیت میں آپ ﷺ کو مومنوں کے اپنے نفوس سے بھی زیادہ حق دار، آپ ﷺ کی محبت کو دیگر تمام محبتوں سے فائق تر اور آپ ﷺ کے حکم کو اپنی تمام خواہشات سے اہم تر قرار دیا ہے۔ اس لیے مومنوں کے لیے ضروری ہے کہ آپ ﷺ ان کے جن مالوں کا مطالبہ۔ اللہ کے لیے کریں، وہ آپ ﷺ پر نچھاور کر دیں چاہے انہیں خود کتنی ہی ضرورت ہو، آپ ﷺ سے اپنے نفوس سے بھی زیادہ محبت کریں۔ (جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ ہے) آپ ﷺ کے حکم کو سب پر مقدم اور آپ ﷺ کی اطاعت کو سب سے اہم سمجھیں۔

جب تک یہ خود پردگی نہیں ہوگی ﴿فَلَا وَرَيْتَ لَأَيُّ مُمْنُونَ...﴾ (النساء: ۶۵) کے مطابق آدمی مومن نہیں ہوگا۔ اسی طرح جب تک آپ کی محبت، تمام محبتوں پر غالب نہیں ہوگی لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ... کی رو سے مومن نہیں، ٹھیک اسی طرح اطاعت رسول ﷺ میں کو تاہی بھی ﴿لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ هُوَ أَحَبُّ إِلَيْهِمْ لِمَا جُنْتُ بِهِ﴾ کا مصداق بنا دے گی۔

(۳) یعنی احترام و تکریم میں اور ان سے نکاح نہ کرنے میں۔ مومن مردوں اور مومن عورتوں کی مائیں بھی ہیں۔

(۴) یعنی اب مہاجرت، اخوت اور موروثات کی وجہ سے وراثت نہیں ہوگی۔ اب وراثت صرف قرہبی رشتہ کی بنیاد پر ہی ہوگی۔

(۵) ہاں تم غیر رشتے داروں کے لیے احسان اور بروصلہ کا معاملہ کر سکتے ہو، نیز انکے لیے ایک تنائی مال میں سے وصیت بھی کر سکتے ہو۔

(۶) یعنی لوح محفوظ میں اصل حکم یہی ہے، گو عارضی طور پر مصلحتاً دوسروں کو بھی وارث قرار دے دیا گیا تھا، لیکن اللہ کے علم میں تھا کہ یہ منسوخ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اسے منسوخ کر کے پہلا حکم بحال کر دیا گیا ہے۔

جب کہ ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا اور (بالخصوص) آپ سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ سے، اور ہم نے ان سے (پکا اور) پختہ عہد لیا۔^(۷)

ناکہ اللہ تعالیٰ بچوں سے ان کی سچائی کے بارے میں دریافت فرمائے،^(۸) اور کافروں کے لیے ہم نے المناک عذاب تیار کر رکھے ہیں۔ (۸)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو احسان تم پر کیا سے یاد کرو جبکہ تمہارے مقابلے کو فوجوں پر فوجیں آئیں پھر ہم نے ان پر تیز و تند آندھی اور ایسے لشکر بھیجے جنہیں تم نے دیکھا ہی نہیں،^(۹) اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھتا ہے۔ (۹)

وَاذْخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ
وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ وَآخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ مَعِظَةً ۙ

لِيَتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي هُوَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا لِيُذَاقُوا ۙ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ
فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللَّهُ بِالْمُحْسِنِينَ
بَصِيرًا ۙ

(۱) اس عہد سے کیا مراد ہے؟ بعض کے نزدیک یہ وہ عہد ہے جو ایک دوسرے کی مدد اور تصدیق کا انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا تھا جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت ۸۱ میں ہے۔ بعض کے نزدیک یہ وہ عہد ہے، جس کا ذکر شوریٰ کی آیت ۱۳ میں ہے کہ دین قائم کرنا اور اس میں تفرقہ مت ڈالنا۔ یہ عہد اگرچہ تمام انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا تھا لیکن یہاں بطور خاص پانچ انبیاء علیہم السلام کا نام لیا گیا ہے جن سے ان کی اہمیت و عظمت واضح ہے اور ان میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سب سے پہلے ہے دراصل حالیکہ نبوت کے لحاظ سے آپ ﷺ سب سے متاخر ہیں، اس سے آپ ﷺ کی عظمت اور شرف کا جس طرح اظہار ہو رہا ہے، محتاج وضاحت نہیں۔

(۲) یہ لَام کنی ہے۔ یعنی یہ عہد اس لیے لیا تاکہ اللہ سچے نبیوں سے پوچھے کہ انہوں نے اللہ کا پیغام اپنی قوموں تک ٹھیک طریقے سے پہنچا دیا تھا؟ یا دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ انبیاء سے پوچھے کہ تمہاری قوموں نے تمہاری دعوت کا جواب کس طرح دیا؟ مثبت انداز میں یا منفی طریقے سے؟ جس طرح کہ دوسرے مقام پر ہے کہ ”ہم ان سے بھی پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور رسولوں سے بھی پوچھیں گے۔“ (الأعراف-۶) اس میں درعیان حق کے لیے بھی تمہیہ ہے کہ وہ دعوت حق کا فریضہ پوری تن دہی اور اخلاص سے ادا کریں تاکہ بارگاہ الہی میں سرخرو ہو سکیں، اور ان لوگوں کے لیے بھی وعید ہے جن کو حق کی دعوت پہنچائی جائے کہ اگر وہ اسے قبول نہیں کریں گے تو عند اللہ مجرم اور مستوجب سزا ہوں گے۔

(۳) ان آیات میں غزوہٴ احزاب کی کچھ تفصیل ہے جو ۵ ہجری میں پیش آیا۔ اسے احزاب اس لیے کہتے ہیں کہ اس

اِذْ جَاءَ وَكُفْرًا مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلِ مَعْنِكُمْ وَاِذْ زَلَّاتِ
الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَنَظُنُّونَ بِاللَّهِ

جب کہ دشمن تمہارے پاس اور سے اور نیچے سے
چڑھ آئے^(۱) اور جب کہ آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ

موفقیے پر تمام اسلام دشمن گروہ جمع ہو کر مسلمانوں کے مرکز ”مدینہ“ پر حملہ آور ہوئے تھے۔ احزاب حزب (گروہ) کی جمع ہے۔ اسے جنگ خندق بھی کہتے ہیں، اس لیے کہ مسلمانوں نے اپنے پچاؤ کے لیے مدینے کے اطراف میں خندق کھودی تھی تاکہ دشمن مدینے کے اندر نہ آسکیں۔ اس کی مختصر تفصیل اس طرح ہے کہ یہودیوں کے قبیلے بنو نضیر، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مسلسل بد عمدی کی وجہ سے مدینے سے جلا وطن کر دیا تھا، یہ قبیلہ خیبر میں جا آباد ہوا، اس نے کفار مکہ کو مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار کیا، اسی طرح غطفان وغیرہ قبائل نجد کو بھی امداد کا یقین دلا کر آمادہ قتال کیا اور یوں یہ یہودی اسلام اور مسلمانوں کے تمام دشمنوں کو اکٹھا کر کے مدینے پر حملہ آور ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ مشرکین مکہ کی قیادت ابوسفیان کے پاس تھی، انہوں نے احد کے آس پاس پڑاؤ ڈال کر تقریباً مدینے کا محاصرہ کر لیا، ان کی مجموعی تعداد ۱۰ ہزار تھی، جب کہ مسلمان تین ہزار تھے۔ علاوہ ازیں جنوبی رخ پر یہودیوں کا تیسرا قبیلہ بنو قریظہ آباد تھا، جس سے ابھی تک مسلمانوں کا معاہدہ قائم اور وہ مسلمانوں کی مدد کرنے کا پابند تھا۔ لیکن اسے بھی بنو نضیر کے یہودی سردار جہی بن اخطب نے ورغلا کر مسلمانوں پر کاری ضرب لگانے کے حوالے سے، اپنے ساتھ ملا لیا۔ یوں مسلمان چاروں طرف سے دشمن کے زرعے میں گھر گئے۔ اس موقع پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے خندق کھودی گئی، جس کی وجہ سے دشمن کا لشکر مدینے کے اندر نہیں آسکا اور مدینے کے باہر قیام پزیر رہا۔ تاہم مسلمان اس محاصرے اور دشمن کی متحدہ یلغار سے سخت خوفزدہ تھے۔ کم و بیش ایک مہینے تک یہ محاصرہ قائم رہا اور مسلمان سخت خوف اور اضطراب کے عالم میں مبتلا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے پردہ غیب سے مسلمانوں کی مدد فرمائی ان آیات میں ان ہی سراسیمہ حالات اور امداد نہیں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ پہلے جُنُودٌ سے مراد کفار کی فوجیں ہیں، جو جمع ہو کر آئی تھیں۔ تیز و تند ہوا سے مراد وہ ہوا ہے جو سخت طوفان اور آندھی کی شکل میں آئی، جس نے ان کے خیموں کو اکھاڑ پھینکا، جانور رسیاں تڑا کر بھاگ کھڑے ہوئے، ہانڈیاں الٹ گئیں اور سب بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ وہی ہوا تھی جس کی بابت حدیث میں آتا ہے،

نُصِرْتُ بِالصَّبَاِ وَاهْلِكْتُ عَادًا بِالذَّبْوْرِ (صحیح بخاری) کتاب الاستسقاء۔ باب نصرت بالصبا، مسلم

باب فی ریح الصبا والذبون ”میری مدد صبا (شرقی ہوا) سے کی گئی اور عاد دبور (پچھمی) ہوا سے ہلاک کیے گئے۔“

﴿وَيَجُودُ الْاَكْفَرُ تَوَدَّ﴾ سے مراد فرشتے ہیں، جو مسلمانوں کی مدد کے لیے آئے۔ انہوں نے دشمن کے دلوں پر ایسا خوف اور

دہشت طاری کر دی کہ انہوں نے وہاں سے جلد بھاگ جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

(۱) اس سے مراد یہ ہے کہ ہر طرف سے دشمن آگئے یا اوپر سے مراد غطفان، ہوازن اور دیگر نجد کے مشرکین ہیں اور نیچے کی سمت سے قریش اور ان کے اعوان و انصار۔

الْمُؤْتَا ۱۰

کو آگئے اور تم اللہ تعالیٰ کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔^(۱۰)

یہیں مومن آزمائے گئے اور پوری طرح وہ مجھجوڑ دیے گئے۔^(۱۱)

اور اس وقت منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں (شک کا) روگ تھا کہنے لگے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ہم سے محض دھوکا فریب کا ہی وعدہ کیا تھا۔^(۱۲)

ان ہی کی ایک جماعت نے ہانک لگائی کہ اے مدینہ والو! تمہارے لیے ٹھکانہ نہیں چلو لوٹ چلو،^(۱۳) اور ان کی ایک اور جماعت یہ کہہ کر نبی (ﷺ) سے اجازت مانگنے لگی کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں،^(۱۴) حالانکہ وہ (کھلے ہوئے اور) غیر محفوظ نہ تھے (لیکن) ان کا پختہ ارادہ بھاگ کھڑے ہونے کا تھا۔^(۱۵)

اور اگر مدینے کے اطراف سے ان پر (لشکر) داخل کیے جاتے پھر ان سے فتنہ طلب کیا جاتا تو یہ ضرور اسے برپا کر

هٰذَا لِكِ اٰبِطِي الْمُوْمِنُوْنَ وَذُوْا لِيْزَالِ الْاَشِدِّيْنَ ۝۱۰

وَاذِ قَالَتْ خَلِيفَةٌ مِنْهُمْ يَا اَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا وَيَسْتَاذِنُ فَرِيْقٌ مِنْهُمْ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بِيْتَنَا عُوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعُوْرَةٍ اِنْ شَرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝۱۱

وَاذِ قَالَتْ خَلِيفَةٌ مِنْهُمْ يَا اَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا وَيَسْتَاذِنُ فَرِيْقٌ مِنْهُمْ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بِيْتَنَا عُوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعُوْرَةٍ اِنْ شَرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝۱۱

وَلَوْ دَخَلَتْ عَلَيْهِمْ مِنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سَبَّوْا الْفِتْنَةَ

(۱) یہ مسلمانوں کی اس کیفیت کا اظہار ہے جس سے اس وقت دوچار تھے۔

(۲) یعنی مسلمانوں کو خوف، قتال، بھوک اور محاصرے میں مبتلا کر کے ان کو جانچا کر کھا گیا تاکہ منافق الگ ہو جائیں۔

(۳) یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کا وعدہ ایک فریب تھا۔ یہ تقریباً ستر منافقین تھے جن کی زبانوں پر وہ بات آگئی جو دلوں میں تھی۔

(۴) یثرب اس پورے علاقے کا نام تھا، مدینہ اسی کا ایک حصہ تھا، جسے یہاں یثرب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا نام یثرب اس لیے پڑا کہ کسی زمانے میں عمالقمہ میں سے کسی نے یہاں پڑاؤ کیا تھا جس کا نام یثرب بن عمیل تھا۔ (فتح القدیر)

(۵) یعنی مسلمانوں کے لشکر میں رہنا تو سخت خطرناک ہے، اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاؤ۔

(۶) یعنی بنو قریظہ کی طرف سے حملے کا خطرہ ہے یوں اہل خانہ کی جان و مال اور آبرو خطرے میں ہے۔

(۷) یعنی جو خطرہ وہ ظاہر کر رہے ہیں، نہیں ہے وہ اس بہانے سے راہ فرار چاہتے ہیں۔ عُوْرَةٌ کے لغوی اور معروف معنی کے لیے دیکھئے، سورہ نور، آیت ۵۸ کا حاشیہ۔

لَا تَوْهَا وَمَا تَلْبَثُوا فِيهَا إِلَّا سَيْرًا ﴿۱۰﴾

وَلَقَدْ كَانُوا عَاكِفًا عَلَىٰ مَكَانٍ ذُو عُرْفٍ وَإِن تَرَوْهُوَ فَقُلُوا هَٰذَا مَا كُنَّا نَمُوتُ وَإِن تَرَوْهُ فَقُلُوا هَٰذَا مَا كُنَّا نَمُوتُ وَإِن تَرَوْهُ فَقُلُوا هَٰذَا مَا كُنَّا نَمُوتُ وَإِن تَرَوْهُ فَقُلُوا هَٰذَا مَا كُنَّا نَمُوتُ ﴿۱۱﴾

قُلْ لَنْ يَنْفَعَكُمْ الْفِرَارُ اِنْ قَرَرْتُمْ مِنَ الْمَوْتِ اَوْ الْقَتْلِ وَاِذَا كَلِمَتُهُمْ اِلَّا قَلِيلًا ﴿۱۲﴾

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُمْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْءًا وَاَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً وَّلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا اَنْصِيْرًا ﴿۱۳﴾

فَلْيَعْلَمِ اللّٰهُ الْمَعْرُوفِيْنَ مِنْكُمْ وَاَلْقَابِلِيْنَ لِيُخَوِّضَهُمْ هَلْ اَلَيْنَا وَاَلَيْنَا وَاَلَيْنَا وَاَلَيْنَا ﴿۱۴﴾

دیتے اور نہ لڑتے مگر تھوڑی مدت - (۱۳)

اس سے پہلے تو انہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ پیٹھ نہ پھیریں گے، (۱۲) اور اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے وعدہ کی باز پرس ضرور (۱۳) ہوگی۔ (۱۵)

کہہ دیجئے کہ گو تم موت سے یا خوف قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہیں کچھ بھی کام نہ آئے گا اور اس وقت تم بہت ہی کم فائدہ اٹھاؤ گے۔ (۱۲)

پوچھئے! تو کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی برائی پہنچانا چاہے یا تم پر کوئی فضل کرنا چاہے تو کون ہے جو تمہیں بچا سکے (یا تم سے روک سکے؟) (۱۳) اپنے لیے بجز اللہ تعالیٰ کے نہ کوئی حمایتی پائیں گے نہ مددگار۔ (۱۴)

اللہ تعالیٰ تم میں سے انہیں (بخوبی) جانتا ہے جو دوسروں کو روکتے ہیں اور اپنے بھائی بندوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس (۱۴) چلے آؤ۔ اور کبھی کبھی ہی لڑائی میں

(۱) یعنی مدینے یا ان کے گھروں میں چاروں طرف سے دشمن داخل ہو جائیں اور ان سے مطالبہ کریں کہ تم کفر و شرک کی طرف دوبارہ واپس آ جاؤ، تو یہ ذرا توقف نہ کریں گے اور اس وقت گھروں کے غیر محفوظ ہونے کا عذر بھی نہیں کریں گے بلکہ فوراً مطالبہ شرک کے سامنے جھک جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ کفر و شرک ان کو مرغوب ہے اور اس کی طرف یہ لپکتے ہیں۔

(۲) بیان کیا جاتا ہے کہ یہ منافقین جنگ بدر تک مسلمان نہیں ہوئے۔ لیکن جب مسلمان فاتح ہو کر اور مال غنیمت لے کر واپس آئے تو انہوں نے نہ صرف یہ کہ اسلام کا اظہار کیا بلکہ یہ عہد بھی کیا کہ آئندہ جب بھی کفار سے معرکہ پیش آیا تو وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر ضرور لڑیں گے، یہاں ان کو وہی عہد یاد کرایا گیا ہے۔

(۳) یعنی اسے پورا کرنے کا ان سے مطالبہ کیا جائے گا اور عدم وفا پر سزا کے وہ مستحق ہوں گے۔ (۳) یعنی موت سے تو کوئی صورت مفر نہیں ہے۔ اگر میدان جنگ سے بھاگ کر آجھی جاؤ گے، تو کیا فائدہ؟ کچھ عرصے بعد موت کا پیالہ تو پھر بھی پینا ہی پڑے گا۔

(۵) یعنی تمہیں ہلاک کرنا، بیمار کرنا، یا مال و جائیداد میں نقصان پہنچانا یا قحط سالی میں مبتلا کرنا چاہے، تو کون ہے جو تمہیں اس سے بچا سکے؟ یا اپنا فضل و کرم کرنا چاہے تو وہ روک سکے؟

(۶) یہ کہنے والے منافقین تھے، جو اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے سے روکتے تھے۔

آجاتے ہیں۔^(۱) (۱۸)

تمہاری مدد میں (پورے) بخیل ہیں،^(۲) پھر جب خوف و ہشت کا موقعہ آجائے تو آپ انہیں دیکھیں گے کہ آپ کی طرف نظریں جمادیتے ہیں اور ان کی آنکھیں اس طرح گھومتی ہیں جیسے اس شخص کی جس پر موت کی غشی طاری ہو۔^(۳) پھر جب خوف جاتا رہتا ہے تو تم پر اپنی تیز زبانوں سے بڑی باتیں بناتے ہیں^(۴) مال کے بڑے ہی حریص ہیں،^(۵) یہ ایمان لائے ہی نہیں ہیں^(۶) اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام اعمال ناپوہ کر دیئے ہیں،^(۷) اور اللہ تعالیٰ پر یہ بہت ہی آسان ہے۔^(۸) (۱۹)

أَشْحَةً عَلَيْهِمْ وَقَآئِبًا آءَ الْخَوْفِ رَأَيْتَهُمْ يُنظَرُونَ إِلَيْكَ
تَدْوُرًا أَعْيُنُهُمْ كَالَّذِي يُغْطَى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ إِذَآ ذَهَبَ
الْخَوْفُ سَلَقُوهُمْ بِاللَّيْنَةِ جَدًا إِذْ أَشْحَهُ عَلَى الْخَيْرِ أُولَئِكَ
لَوْ يُؤْمِنُونَ فَأَحْبَطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۝۱۹

(۱) کیوں کہ وہ موت کے خوف سے پیچھے ہی رہتے تھے۔

(۲) یعنی تمہارے ساتھ خندق کھود کر تم سے تعاون کرنے میں یا اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں یا تمہارے ساتھ مل کر لڑنے میں بخیل ہیں۔

(۳) یہ ان کی بزدلی اور پست ہمتی کی کیفیت کا بیان ہے۔

(۴) یعنی اپنی شجاعت و مردانگی کی بابت ڈینگیں مارتے ہیں، جو سراسر جھوٹ پر مبنی ہوتی ہیں، یا غنیمت کی تقسیم کے وقت اپنی زبان کی تیزی و طراری سے لوگوں کو متاثر کر کے زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، غنیمت کی تقسیم کے وقت یہ سب سے زیادہ بخیل اور سب سے زیادہ بڑا حصہ لینے والے اور لڑائی کے وقت سب سے زیادہ بزدل اور ساتھیوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ جانے والے ہیں۔

(۵) یا دوسرا مفہوم ہے کہ خیر کا جذبہ بھی ان کے اندر نہیں ہے۔ یعنی مذکورہ خرابیوں اور کوتاہیوں کے ساتھ خیر اور بھلائی سے بھی وہ محروم ہیں۔

(۶) یعنی دل سے، بلکہ یہ منافق ہیں، کیوں کہ ان کے دل کفر و عناد سے بھرے ہوئے ہیں۔

(۷) اس لیے کہ وہ مشرک اور کافر ہی ہیں اور کافر و مشرک کے اعمال باطل ہیں، جن پر کوئی اجر و ثواب نہیں۔ یا أَحْبَطَ أَظْهَرَ کے معنی میں ہے، یعنی ان کے عملوں کے بطلان کو ظاہر کر دیا، اس لیے کہ ان کے اعمال ایسے ہیں ہی نہیں کہ وہ ثواب کے متقاضی ہوں اور اللہ ان کو باطل کر دے۔ (فتح القدير)

(۸) ان کے اعمال کا برباد کر دینا، یا ان کا نفاق۔

سمجھتے ہیں کہ اب تک لشکر چلے نہیں گئے،^(۱) اور اگر فوجیں آجائیں تو تمنائیں کرتے ہیں کہ کاش! وہ صحرا میں بادیہ نشینوں کے ساتھ ہوتے کہ تمہاری خبریں دریافت کیا کرتے،^(۲) اگر وہ تم میں موجود ہوتے (تو بھی کیا؟) نہ لڑتے مگر رائے نام۔^(۳) (۲۰)

یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے،^(۴) ہر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے اور بکفرت اللہ تعالیٰ کی یاد کرتا ہے۔^(۵) (۲۱)

يَسْتَبُونَ الْخَزَابَ لَمْ يَذْهَبُوا اِنَّ يَأْتِ الْخَزَابَ بِوَدُوٍّ
لَوْ اَلَّهُمْ يَادُونَ فِي الْخَزَابِ يَسْأَلُونَ عَنْ اَنْبِيَائِهِمْ
وَلَوْ كَانُوا فِيكُمْ مَا قَتَلُوا الْاَقْلِيَالَ ۝

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ اَسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا
اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيْرًا ۝

(۱) یعنی ان منافقین کی بزدلی، دوں بہتی اور خوف و دہشت کا یہ حال ہے کہ کافروں کے گروہ اگرچہ ناکام و نامراد واپس جا چکے ہیں۔ لیکن یہ اب تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ ابھی تک اپنے مورچوں اور خمیوں میں موجود ہیں۔
(۲) یعنی بالفرض اگر کفار کی ٹولیاں دوبارہ لڑائی کی نیت سے واپس آجائیں تو منافقین کی خواہش یہ ہوگی کہ وہ مدینہ شہر کے اندر رہنے کے بجائے، باہر صحرا میں بادیہ نشینوں کے ساتھ ہوں اور وہاں لوگوں سے تمہاری بابت پوچھتے رہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ساتھی ہلاک ہوئے یا نہیں؟ یا لشکر کفار کامیاب رہا یا ناکام؟
(۳) شخص عار کے ڈر سے یا ہم وطنی کی محبت کی وجہ سے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے سخت وعید ہے جو جماد سے گریز کرتے یا اس سے پیچھے رہتے ہیں۔

(۴) یعنی اے مسلمانو! اور منافقو! تم سب کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے اندر بہترین نمونہ ہے، پس تم جماد میں اور مبروثات میں اسی کی پیروی کرو۔ ہمارا یہ پیغمبر جماد میں بھوکا رہا حتیٰ کہ اسے پیٹ پر پتھر باندھنے پڑے، اس کا چہرہ زخمی ہو گیا، اس کا رباعی دانت ٹوٹ گیا، خندق اپنے ہاتھوں سے کھودی اور تقریباً ایک مہینہ دشمن کے سامنے سینہ پر رہا۔ یہ آیت اگرچہ جنگ احزاب کے ضمن میں نازل ہوئی ہے جس میں جنگ کے موقع پر بطور خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کو سامنے رکھنے اور اس کی اقتدا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن یہ حکم عام ہے یعنی آپ ﷺ کے تمام اقوال، افعال اور احوال میں مسلمانوں کے لیے آپ ﷺ کی اقتدا ضروری ہے چاہے ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاشرت سے، معیشت سے، سیاست سے۔ زندگی کے ہر شعبے میں آپ کی ہدایات واجب الاتباع ہیں۔ ﴿وَمَا لَكُمْ اَلِ الرَّسُوْلِ مَخْرَدَةٌ﴾ الآية (الحشر) اور ﴿اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَعِبْرًا ۗ لَعَلَّكُمْ تَخْشَوْنَ اللَّهَ﴾ الآية (آل عمران ۳۱) کامفاد بھی یہی ہے۔

(۵) اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اسوہ رسول ﷺ کو وہی اپنائے گا جو آخرت میں اللہ کی ملاقات پر یقین رکھتا اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ آج مسلمان بھی بالعموم ان دونوں وصفوں سے محروم ہیں، اس لیے اسوہ رسول ﷺ کی بھی

اور ایمان داروں نے جب (کفار کے) لشکروں کو دیکھا (بے ساختہ) کہہ اٹھے؛ کہ انہیں کا وعدہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے دیا تھا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا،^(۱) اور اس (چیز) نے ان کے ایمان میں اور شیوہ فرماں برداری میں اور اضافہ کر دیا۔^(۲) (۲۲)

مومنوں میں (ایسے) لوگ بھی ہیں جنہوں نے جو عہد اللہ تعالیٰ سے کیا تھا انہیں سچا کر دکھایا،^(۳) بعض نے تو اپنا عہد پورا کر^(۴) دیا اور بعض (موقعہ کے) منتظر ہیں اور انہوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔^(۵) (۲۳)

وَلَقَاتَرَا الْمُؤْمِنُونَ الْاَحْزَابَ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَاَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَتَسْلِيمًا ﴿۲۲﴾

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِمْ فَمَنْهُمْ مَّنْ خَضِيَ نَجْبَهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَتَّقُوهُ وَمَا يَبْدَلُوْا بَدَلًا ﴿۲۳﴾

کوئی اہمیت ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ ان میں جو اہل دین ہیں ان کے پیشوا، پیر اور مشائخ ہیں اور جو اہل دنیا و اہل سیاست ہیں ان کے مرشد و رہنما آقا یان مغرب ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے عقیدت کے زبانی دعوے بڑے ہیں، لیکن آپ ﷺ کو مرشد اور پیشوا ماننے کے لیے ان میں سے کوئی بھی آمادہ نہیں ہے۔ فَاِلٰى اللّٰهِ الْمُنْتَهٰى۔
(۱) یعنی منافقین نے تو دشمن کی کثرت تعداد اور حالات کی سنگینی دیکھ کر کہا تھا کہ اللہ اور رسول (ﷺ) کے وعدے فریب تھے، ان کے برعکس اہل ایمان نے کہا کہ اللہ اور رسول نے جو وعدہ کیا ہے کہ اتلا و امتحان سے گزارنے کے بعد تمہیں فتح و نصرت سے ہمکنار کیا جائے گا، وہ سچا ہے۔

(۲) یعنی حالات کی شدت اور ہولناکی نے ان کے ایمان کو متزلزل نہیں کیا، بلکہ ان کے ایمان میں جذبہ اطاعت و انقیاد اور تسلیم و رضا میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں اور ان کے مختلف احوال کے اعتبار سے ایمان اور اس کی قوت میں کمی بیشی ہوتی ہے جیسا کہ محدثین کا مسلک ہے۔

(۳) یہ آیت ان بعض صحابہ اللہ علیہم السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جنہوں نے اس موقع پر جاں نثاری کے عجیب و غریب جو ہر دکھائے تھے اور انہیں میں وہ صحابہ اللہ علیہم السلام بھی شامل ہیں جو جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے لیکن انہوں نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ اب آئندہ کوئی معرکہ پیش آیا، تو جہاد میں بھرپور حصہ لیں گے، جیسے نصر بن انس وغیرہ اللہ علیہم السلام، جو بالآخر لڑتے ہوئے جنگ احد میں شہید ہوئے۔ ان کے جسم پر تلوار، نیزے اور تیروں کے ۸۰ سے اوپر زخم تھے، شہادت کے بعد ان کی ہمشیرہ نے انہیں ان کی انگلی کے پورے پچپانا، (مسند احمد، ج ۳، ص ۱۹۳)

(۴) نَحْبُ کے معنی عہد، نذر اور موت کے کیے گئے ہیں۔ مطلب ہے کہ ان صادقین میں سے کچھ نے تو اپنا عہد یا نذر پوری کرتے ہوئے جام شہادت نوش کر لیا ہے۔

(۵) اور دوسرے وہ ہیں جو ابھی تک عروس شہادت سے ہمکنار نہیں ہوئے ہیں تاہم اس کے شوق میں شریک جماد

تاکہ اللہ تعالیٰ سچوں کو ان کی سچائی کا بدلہ دے اور اگر چاہے تو منافقوں کو سزا دے یا ان کی توبہ قبول فرمائے،^(۱) اللہ تعالیٰ بڑا ہی بخشنے والا بہت ہی مہربان ہے۔ (۲۴)

اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کو غصے میں بھرے ہوئے ہی (نامراد) لوٹا دیا انہوں نے کوئی فائدہ نہیں پایا،^(۲) اور اس جنگ میں اللہ تعالیٰ خود ہی مومنوں کو کافی ہو گیا^(۳) اللہ تعالیٰ بڑی قوتوں والا اور غالب ہے۔ (۲۵)

اور جن اہل کتاب نے ان سے سازباز کر لی تھی انہیں (بھی) اللہ تعالیٰ نے ان کے قلعوں سے نکال دیا اور ان کے دلوں میں (بھی) رعب بھر دیا کہ تم ان کے ایک گروہ کو قتل کر رہے ہو اور ایک گروہ کو قیدی بنا رہے ہو۔ (۲۶)

اور اس نے تمہیں ان کی زمینوں کا اور ان کے گھر بار کا اور ان کے مال کا وارث کر دیا^(۴) اور اس زمین کا بھی

لِيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ
إِنْ سَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿۲۴﴾

وَرَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا آخِرًا وَكَفَى اللَّهُ
الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ قَوِيًّا عَزِيمًا ﴿۲۵﴾

وَأَنْزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوا مِنْهُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ صَيَاصِيهِمْ
وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ قَرِيبًا مِمَّا قَتَلُوا ۚ وَتَأْتِيهِمْ
قُرَيْبًا ﴿۲۶﴾

وَأَوْزَنَكُمْ أَرْضَهُمْ وَأَرْضَكُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَمْوَالَكُمْ نَظْمًا

ہوتے ہیں اور شہادت کی سعادت کے آرزو مند ہیں، اپنی اس نذریا عہد میں انہوں نے تبدیلی نہیں کی۔

(۱) یعنی انہیں قبول اسلام کی توفیق دے دے۔

(۲) یعنی مشرک جو مختلف جہات سے جمع ہو کر آئے تھے تاکہ مسلمانوں کا نشان مٹادیں۔ اللہ نے انہیں اپنے غیظ و غضب سمیت واپس لوٹا دیا۔ نہ دنیا کا مال و متاع ان کے ہاتھ لگا اور نہ آخرت میں وہ اجر و ثواب کے مستحق ہوں گے، کسی بھی قسم کی خیر انہیں حاصل نہیں ہوئی۔

(۳) یعنی مسلمانوں کو ان سے لڑنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہوا اور فرشتوں کے ذریعے سے اپنے مومن بندوں کی مدد کا سامان بہم پہنچایا۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا «لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ، صَدَقَ وَعْدُهُ، وَنَصَرَ عَبْدَهُ، وَأَعَزَّ جُنْدَهُ، وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ، فَلَا شَيْءَ بَعْدَهُ»۔ (صحیح بخاری کتاب العمرة 'باب ما يقول إذا قفل من سفر الحج وغيره) "ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد کی، اپنے لشکر کو سرخرو کیا، اور تمام گروہوں کو اکیلے اس نے ہی شکست دے دی، اس کے بعد کوئی شے نہیں"۔ یہ دعاء، عمرہ، جماد اور سفر سے واپسی پر بھی پڑھنی چاہیے۔

(۴) اس میں غزوہ بنی قریظہ کا ذکر ہے جیسا کہ پہلے گزرا کہ اس قبیلے نے قلعہ عہد کر کے جنگ احزاب میں مشرکوں اور

جس کو تمہارے قدموں نے روندنا نہیں،^(۱) اللہ تعالیٰ ہر

چیز پر قادر ہے۔ (۲۷)

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم زندگانی دینا اور
زینت دینا چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا دوں اور
تمہیں اچھائی کے ساتھ رخصت کر دوں۔ (۲۸)

اور اگر تمہاری مراد اللہ اور اس کا رسول اور آخرت کا
گھر ہے تو (یقین مانو کہ) تم میں سے نیک کام کرنے
والیوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت زبردست اجر رکھ
چھوڑے ہیں۔^(۲) (۲۹)

وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ﴿۲۷﴾

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِن كُنْتُمْ تُؤَدُّونَ الْعَيْثُوهَ الدُّنْيَا
وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأَسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴿۲۸﴾

وَلَئِن كُنْتُمْ تُرِيدُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالذَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ
اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنِينَ مِنكُمْ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۲۹﴾

دوسرے یہودیوں کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ جنگ احزاب سے واپس آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی غسل ہی فرما سکے
تھے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آگے اور کہا کہ آپ ﷺ نے ہتھیار رکھ دیے؟ ہم فرشتوں نے تو نہیں رکھے ہیں۔
چلئے، اب بنو قریظہ کے ساتھ نمٹنا ہے، مجھے اللہ نے اسی لیے آپ ﷺ کی طرف بھیجا ہے۔ چنانچہ آپ نے مسلمانوں میں
اعلان فرما دیا بلکہ ان کو تاکید کر دی کہ عصر کی نماز وہاں جا کر پڑھنی ہے۔ ان کی آبادی مدینے سے چند میل کے فاصلے پر
تھی۔ یہ اپنے قلعوں میں بند ہو گئے، باہر سے مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا جو کم و بیش پچیس روز جاری رہا۔ بالآخر
انہوں نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو اپنا حکم (عالم) تسلیم کر لیا کہ وہ جو فیصلہ ہماری بابت دیں گے، ہمیں منظور ہو گا۔ چنانچہ
انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ ان میں سے لڑنے والے لوگوں کو قتل اور بچوں، عورتوں کو قیدی بنا لیا جائے اور ان کا مال
مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ سن کر فرمایا کہ یہی فیصلہ آسمانوں کے اوپر اللہ تعالیٰ کا
بھی ہے۔ اس کے مطابق ان کے جنگ جو افراد کی گردنیں اڑادی گئیں۔ اور مدینے کو ان کے تپاک وجود سے پاک کر دیا
گیا۔ (دیکھئے صحیح بخاری، باب غزوة خندق) اَنْزَلَ قَلْعُوْنَ سِيْنَةَ اَتَادِيَا، ظَاهِرٌ وَهُمْ كَافِرُوْنَ كِي اَنْهَوْنَ سِيْنَةَ مَدِيْنَةَ۔

(۱) بعض نے اس سے خیبر کی زمین مراد لی ہے کیوں کہ اس کے بعد ہی ۶ ہجری میں صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں نے خیبر
فتح کیا ہے۔ بعض نے کہا کہ مکہ ہے اور بعض نے ارض فارس و روم کو اس کا مصداق قرار دیا ہے اور بعض کے نزدیک
تمام وہ زمینیں ہیں جو قیامت تک مسلمان فتح کریں گے۔ (فتح القدر)

(۲) فتوحات کے نتیجے میں جب مسلمانوں کی حالت پہلے کی نسبت کچھ بہتر ہو گئی تو انصار و مہاجرین کی عورتوں کو دیکھ کر
ازواج مطہرات نے بھی نان نفقہ میں اضافے کا مطالبہ کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ نہایت سادگی پسند تھے، اس لیے
ازواج مطہرات کے اس مطالبے پر سخت کبیدہ خاطر ہوئے اور یہودیوں سے علیحدگی اختیار کر لی جو ایک مہینے تک جاری رہی

اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو بھی کھلی بے حیائی (کا ارتکاب) کرے گی اسے دوہرا دوہرا عذاب دیا جائے گا،^(۱) اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بہت ہی سہل (سی بات) ہے۔ (۳۰)

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ مَنْ يَأْتِ مِنْكَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيَّنَةٍ يُضَعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۝

بالآخر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی۔ اس کے بعد سب سے پہلے آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ آیت سنا کر انہیں اختیار دیا تاہم انہیں کہا کہ اپنے طور پر فیصلہ کرنے کے بجائے اپنے والدین سے مشورے کے بعد کوئی اقدام کرنا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کے بارے میں مشورہ کروں؟ بلکہ میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند کرتی ہوں۔ یہی بات دیگر ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے بھی کہی اور کسی نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر دنیا کے عیش و آرام کو ترجیح نہیں دی (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الأحزاب) اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواز عقد میں ۹ بیویاں تھیں، پانچ قریش میں سے تھیں۔ حضرت عائشہ، حفصہ، ام حبیبہ، سودہ اور ام سلمہ۔ رضی اللہ عنہن اور چار ان کے علاوہ، یعنی حضرت صفیہ، میمونہ، زینب اور جویریہ تھیں۔ رضی اللہ عنہن۔ بعض لوگ مرد کی طرف سے اختیار علیحدگی کو طلاق قرار دیتے ہیں، لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ اختیار علیحدگی کے بعد اگر عورت علیحدگی کو پسند کر لے، پھر تو یقیناً طلاق ہو جائے گی (اور یہ طلاق بھی رجعی ہوگی نہ کہ بانئہ، جیسا کہ بعض علما کا مسلک ہے) تاہم اگر عورت علیحدگی کو اختیار نہیں کرتی تو پھر طلاق نہیں ہوگی، جیسے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے علیحدگی کے بجائے حرم رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہی رہنا پسند کیا تو اس اختیار کو طلاق شمار نہیں کیا گیا۔ (صحیح بخاری، کتاب

الطلاق، باب من خیر نساءہ۔ مسلم، باب بیان أن تخییر امرأته لا یكون طلاقاً إلا بالنیة)

(۱) قرآن میں الفاحشۃ (مُعْرَفٌ بِاللَّأَمِ) کو زنا کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے لیکن فاحشۃ (نکرہ) کو برائی کے لیے، جیسے یہاں ہے۔ یہاں اس کے معنی بد اخلاقی اور نامناسب رویے کے ہیں۔ کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بد اخلاقی اور نامناسب رویہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانا ہے جس کا ارتکاب کفر ہے۔ علاوہ ازیں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن خود بھی مقام بلند کی حامل تھیں اور بلند مرتبت لوگوں کی معمولی غلطیاں بھی بڑی شمار ہوتی ہیں، اس لیے انہیں دوگنے عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

اور تم میں سے جو کوئی اللہ کی اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گی اور نیک کام کرے گی ہم اسے اجر (بھی) دوہرا دیں گے^(۱) اور اس کے لیے ہم نے بہترین روزی تیار کر رکھی ہے۔ (۳۱)

اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو،^(۲) اگر تم پر ہیزگاری اختیار کرو تو نرم لہجے سے بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہو وہ کوئی برا خیال کرے^(۳) اور ہاں قاعدے کے مطابق کلام کرو۔^(۴) (۳۲)

وَمَنْ يَفْعَلْهُ وَمَنْ يَفْعَلْهُ وَمَنْ يَفْعَلْهُ وَمَنْ يَفْعَلْهُ وَمَنْ يَفْعَلْهُ
تَوْبَتُهَا أَجْرُهَا مَرَّتَيْنِ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ جَزَاءً كَرِيمًا ۝

يُنِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ إِنَّ أَعْيُنُكُمْ
فَلَا تَصْخَبْنَ لَهُ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَنَهُ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ
وَأُولَئِكَ هُمُ الْعَرُوفَاتُ ۝

(۱) یعنی جس طرح گناہ کا وبال دگنا ہو گا، نیکیوں کا اجر بھی دوہرا ہو گا۔ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ إِذْ أَلَاذِقْنَاكَ ضَعْفَ الْحَبِيدِ وَضَعْفَ النَّبَاتِ ﴾ (بنی اسرائیل ۷۵) ”پھر تو ہم بھی آپ کو دوہرا عذاب دینا کرتے اور دوہرا ہی موت کا۔“

(۲) یعنی تمہاری حیثیت اور مرتبہ عام عورتوں کا سا نہیں ہے۔ بلکہ اللہ نے تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کا جو شرف عطا فرمایا ہے، اس کی وجہ سے تمہیں ایک امتیازی مقام حاصل ہے اور رسول ﷺ کی طرح تمہیں بھی امت کے لیے ایک نمونہ بنا ہے چنانچہ انہیں ان کے مقام و مرتبے سے آگاہ کر کے انہیں کچھ ہدایات دی جا رہی ہیں۔ اس کی مخاطب اگرچہ ازواج مطہرات ہیں جنہیں امہات المؤمنین قرار دیا گیا ہے، لیکن انداز بیان سے صاف واضح ہے کہ مقصد پوری امت مسلمہ کی عورتوں کو سمجھانا اور متنبہ کرنا ہے۔ اس لیے یہ ہدایات تمام مسلمان عورتوں کے لیے ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے جس طرح عورت کے وجود کے اندر مرد کے لیے جنسی کشش رکھی ہے (جس کی حفاظت کے لیے بھی خصوصی ہدایات دی گئی ہیں تاکہ عورت مرد کے لیے فتنے کا باعث نہ بنے) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی آواز میں بھی فطری طور پر دلکشی، نرمی اور نزاکت رکھی ہے جو مرد کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بنا بریں اس آواز کے لیے بھی یہ ہدایت دی گئی کہ مردوں سے گفتگو کرتے وقت قصداً ایسا لب و لہجہ اختیار کرو کہ نرمی اور لطافت کی جگہ قدرے سختی اور روکھاپن ہو۔ تاکہ کوئی بدباطن لہجے کی نرمی سے تمہاری طرف مائل نہ ہو اور اس کے دل میں برا خیال پیدا نہ ہو۔

(۴) یعنی یہ روکھاپن، صرف لہجے کی حد تک ہی ہو، زبان سے ایسا لفظ نہ نکالنا جو معروف قاعدے اور اخلاق کے منافی ہو۔ اِنْ أَتَقَيْنَنَّ کہہ کر اشارہ کر دیا کہ یہ بات اور دیگر ہدایات، جو آگے آرہی ہیں، متقی عورتوں کے لیے ہیں، کیونکہ انہیں ہی یہ فکر ہوتی ہے کہ ان کی آخرت برباد نہ ہو جائے۔ جن کے دل خوف الہی سے عاری ہیں، انہیں ان ہدایات سے کیا تعلق؟ اور وہ کب ان ہدایات کی پروا کرتی ہیں؟

اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو^(۱) اور قدیم جاہلیت کے زمانے کی طرح اپنے بناؤ کا اظہار نہ کرو^(۲) اور نماز ادا کرتی رہو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت گزاری کرو۔^(۳) اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ اسے نبی کی گھر والیو! تم سے وہ (ہر قسم کی) گندگی کو دور کر دے اور تمہیں خوب پاک کر دے۔ (۳۳)

وَمَنْ فِي بُيُوتِكُمْ ذَاتُ بَيْنٍ مِنَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ
وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتَيْنَ الزَّكَاةَ وَأَطَعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ
إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ
وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴿۳۳﴾

(۱) یعنی ٹک کر ہو اور بغیر ضروری حاجت کے گھر سے باہر نہ نکلو۔ اس میں وضاحت کر دی گئی کہ عورت کا دائرہ عمل امور سیاست و جہانپانی نہیں، معاشی جھیلے بھی نہیں، بلکہ گھر کی چار دیواری کے اندر رہ کر امور خانہ داری سرانجام دینا ہے۔

(۲) اس میں گھر سے باہر نکلنے کے آداب بتلا دیئے کہ اگر باہر جانے کی ضرورت پیش آئے تو بناؤ سنگھار کر کے یا ایسے انداز سے، جس سے تمہارا بناؤ سنگھار ظاہر ہو، مت نکلو۔ جیسے بے پردہ ہو کر، جس سے تمہارا سر، چہرہ، بازو اور چھاتی وغیرہ لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے۔ بلکہ بغیر خوشبو لگائے، سادہ لباس میں ملبوس اور باپردہ باہر نکلو تَبْرُجْ بے پردگی اور زیب و زینت کے اظہار کو کہتے ہیں۔ قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ یہ تبرج، جاہلیت ہے، جو اسلام سے پہلے تھی اور آئندہ بھی، جب کبھی اسے اختیار کیا جائے گا، یہ جاہلیت ہی ہوگی، اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، چاہے اس کا نام کتنا ہی خوش نما، دل فریب رکھ لیا جائے۔

(۳) بچھیلی ہدایات، برائی سے اجتناب سے متعلق تھیں، یہ ہدایات نیکی اختیار کرنے سے متعلق ہیں۔
(۴) اہل بیت سے کون مراد ہیں؟ اس کی تعیین میں کچھ اختلاف ہے۔ بعض نے ازواجِ مطہرات کو مراد لیا ہے، جیسا کہ یہاں قرآن کریم کے سیاق سے واضح ہے۔ قرآن نے یہاں ازواجِ مطہرات ہی کو اہل البیت کہا ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات پر بھی بیوی کو اہل بیت کہا گیا ہے۔ مثلاً سورہ ہود، آیت-۴۳ میں۔ اس لیے ازواجِ مطہرات کا اہل بیت ہونا نص قرآنی سے واضح ہے۔ بعض حضرات، بعض روایات کی رو سے اہل بیت کا مصداق صرف حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو مانتے ہیں اور ازواجِ مطہرات کو اس سے خارج سمجھتے ہیں؛ جبکہ اول الذکر، ان اصحابِ اربعہ کو اس سے خارج سمجھتے ہیں۔ تاہم اعتدال کی راہ اور نقطہ متوسطہ یہ ہے کہ دونوں ہی اہل بیت ہیں۔ ازواجِ مطہرات تو اس نص قرآنی کی وجہ سے اور داماد و اولاد ان روایات کی رو سے جو صحیح سند سے ثابت ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی چادر میں لے کر فرمایا کہ اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں، جس کا مطلب یہ ہو گا کہ یہ بھی میرے اہل بیت سے ہیں یا یہ دعا ہے کہ یا اللہ ان کو بھی ازواجِ مطہرات کی طرح، میرے اہل بیت میں شامل فرما دے۔ اس طرح تمام دلائل میں بھی تطبیق ہو جاتی ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھئے فتح القدر، لشوکانی)

وَأَذْكُرْنَ مَا يُشْتَلَى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ
وَإِحْكَمَةٌ إِنَّ اللَّهَ كَانَ كَاطِفًا خَيْرًا ۝

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ
وَالْعَفِيفِينَ وَالْعَنِيتِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّادِقِينَ
وَالصَّابِرَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالْخَشِيعَاتِ وَالْخَشِيعَاتِ
وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ
فُرُوجَهُمْ وَالْحَفِظَاتِ وَالذَّاكِرَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهُ كَثِيرًا
وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ۝

اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور رسول کی جو
احادیث پڑھی جاتی ہیں ان کا ذکر کرتی رہو،^(۱) یقیناً اللہ
تعالیٰ لطف کرنے والا خبردار ہے۔ (۳۳)

بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں^(۲) مومن مرد اور
مومن عورتیں فرماں برداری کرنے والے مرد اور
فرمانبردار عورتیں راست باز مرد اور راست باز عورتیں
صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، عاجزی
کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں، خیرات
کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں،
روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں
اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت
کرنے والیاں بکثرت اللہ کا ذکر کرنے والے اور ذکر

(۱) یعنی ان پر عمل کرو۔ حکمت سے مراد، احادیث ہیں۔ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے بعض علما نے کہا ہے کہ
حدیث بھی قرآن کی طرح ثواب کی نیت سے پڑھی جاسکتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ آیت بھی ازواجِ مطہرات کے اہل بیت
ہونے پر دلالت کرتی ہے، اس لیے کہ وحی کا نزول، جس کا ذکر اس آیت میں ہے، ازواجِ مطہرات کے گھروں میں ہی ہوتا
تھا، بالخصوص حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں۔ جیسا کہ احادیث میں ہے۔

(۲) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور بعض دیگر صحابیات نے کہا کہ کیا بات ہے، اللہ تعالیٰ ہر جگہ مردوں سے ہی خطاب فرماتا
ہے، عورتوں سے نہیں، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (مسند احمد ۶/۳۰۱، ترمذی، نمبر ۳۲۱۱) اس میں عورتوں کی دل داری
کا اہتمام کر دیا گیا ہے ورنہ تمام احکام میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شامل ہیں سوائے ان مخصوص احکام کے جو
صرف عورتوں کے لیے ہیں۔ اس آیت اور دیگر آیات سے واضح ہے کہ عبادت و اطاعت الہی اور اخروی درجات و
فضائل میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔ دونوں کے لیے یکساں طور پر یہ میدان کھلا ہے اور دونوں
زیادہ سے زیادہ نیکیاں اور اجر و ثواب کما سکتے ہیں۔ جنس کی بنیاد پر اس میں کمی بیشی نہیں کی جائے گی۔ علاوہ ازیں مسلمان
اور مومن کا الگ الگ ذکر کرنے سے واضح ہے کہ ان دونوں میں فرق ہے۔ ایمان کا درجہ اسلام سے بڑھ کر ہے جیسا کہ
قرآن و حدیث کے دیگر دلائل بھی اس پر دلالت کرتے ہیں۔

کرنے والیاں ان (سب کے) لیے اللہ تعالیٰ نے (وسیع) مغفرت اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے۔ (۳۵)

اور (دیکھو) کسی مومن مرد و عورت کو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کے بعد اپنے کسی امر کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا،^(۱) (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جو بھی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں پڑے گا۔ (۳۶) (یاد کرو) جب کہ تو اس شخص سے کہہ رہا تھا جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور تو نے بھی کہ تو اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور اللہ سے ڈر اور تو اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھا جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تو لوگوں سے خوف کھاتا تھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار تھا کہ تو اس سے ڈرے،^(۲) پس جب کہ زید نے اس عورت

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ وَجَّهَ لِنَفْسِهِ ۝

وَأَذِّنْ لِلَّذِينَ آمَنُوا مِنَ النِّسَاءِ أَنْ يَضَعُوا حُجُوبَهُنَّ إِذَا تَوَلَّوْا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْحَقِّ ۚ وَلَا يَجْرِمُنَّكَ عَلَىٰ فِتْنَتِكُمْ لِضَعْفِكُمْ ۚ بِذَلِكَ نُنزِّلُ الْكِتَابَ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝

(۱) یہ آیت حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کے سلسلے میں نازل ہوئی تھی۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جو اگرچہ اصلاً عرب تھے، لیکن کسی نے انہیں بیچن میں زبردستی پکڑ کر بطور غلام بیچ دیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آزاد کر کے اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نکاح کے لیے اپنی چھوٹی بہن زاد بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو نکاح کا پیغام بھیجا، جس پر انہیں اور ان کے بھائی کو خاندانی وجاہت کی بناء پر تامل ہوا کہ زید رضی اللہ عنہ ایک آزاد کردہ غلام ہیں اور ہمارا تعلق ایک اونچے خاندان سے ہے۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے فیصلے کے بعد کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنا اختیار بروئے کار لائے۔ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سر تسلیم خم کر دے۔ چنانچہ یہ آیت سننے کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا وغیرہ نے اپنی رائے پر اصرار نہیں کیا اور ان کا باہم نکاح ہو گیا۔

(۲) لیکن چونکہ ان کے مزاج میں فرق تھا، بیوی کے مزاج میں خاندانی نسب و شرف رچا ہوا تھا، جب کہ زید رضی اللہ عنہ کے دامن پر غلامی کا داغ تھا، ان کی آپس میں ان بن رہتی تھی جس کا تذکرہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے رہتے تھے اور طلاق کا عندیہ بھی ظاہر کرتے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دینے سے روکتے اور نباہ کرنے کی تلقین فرماتے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پیش گوئی سے بھی آگاہ فرما دیا تھا کہ زید رضی اللہ عنہ کی

سے اپنی غرض پوری کر لی^(۱) ہم نے اسے تیرے نکاح میں دے دیا^(۲) تاکہ مسلمانوں پر اپنے لے پالکوں کی بیویوں کے بارے میں کسی طرح کی تنگی نہ رہے جب کہ وہ اپنی غرض ان سے پوری کر لیں،^(۳) اللہ کا (یہ) حکم تو ہو کر ہی رہنے والا تھا۔^(۴) (۳۷)

جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لیے مقرر کی ہیں ان میں نبی پر کوئی حرج نہیں،^(۵) (یہی) اللہ کا دستور ان میں بھی رہا جو پہلے ہوئے^(۶) اور اللہ تعالیٰ کے کام اندازے پر

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ فَعْلًا مَعْقُودًا ﴿۳۷﴾

طرف سے طلاق واقع ہو کر رہے گی اور اس کے بعد زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح آپ سے کر دیا جائے گا تاکہ جاہلیت کی اس رسم تینت پر ایک کاری ضرب لگا کر واضح کر دیا جائے کہ منہ بولا بیٹا، احکام شرعیہ میں حقیقی بیٹے کی طرح نہیں ہے اور اس کی مطلقہ سے نکاح جائز ہے۔ اس آیت میں انہی باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ پر اللہ کا انعام یہ تھا کہ انہیں قبول اسلام کی توفیق دی اور غلامی سے نجات دلائی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان ان پر یہ تھا کہ ان کی دینی تربیت کی۔ ان کو آزاد کر کے اپنا بیٹا قرار دیا اور اپنی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی لڑکی سے ان کا نکاح کر دیا۔ دل میں چھپانے والی بات یہی تھی جو آپ کو حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کی بابت بذریعہ وحی بتلائی گئی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ڈرتے اس بات سے تھے کہ لوگ کہیں گے اپنی بہو سے نکاح کر لیا۔ حالانکہ جب اللہ کو آپ کے ذریعے سے اس رسم کا خاتمہ کرانا تھا تو پھر لوگوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خوف اگرچہ فطری تھا، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ فرمائی گئی۔ ظاہر کرنے سے مراد یہی ہے کہ یہ نکاح ہو گا، جس سے یہ بات سب کے ہی علم میں آجائے گی۔

(۱) یعنی نکاح کے بعد طلاق دی اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا عدت سے فارغ ہو گئیں۔
(۲) یعنی یہ نکاح معروف طریقے کے برعکس صرف اللہ کے حکم سے نکاح قرار پائے گا، نکاح خوانی، ولایت، حق مراد و گواہوں کے بغیر ہی۔

(۳) یہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کی علت ہے کہ آئندہ کوئی مسلمان اس بارے میں تنگی محسوس نہ کرے اور حسب ضرورت اقتضائے پالک بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح کیا جاسکے۔

(۴) یعنی پہلے سے ہی تقدیر الہی میں تھا جو بہر صورت ہو کر رہتا تھا۔

(۵) یہ اسی واقعہ نکاح زینب رضی اللہ عنہا کی طرف اشارہ ہے، چونکہ یہ نکاح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال تھا، اس لیے اس میں کوئی گناہ اور تنگی والی بات نہیں ہے۔

(۶) یعنی گزشتہ انبیاء علیہم السلام بھی ایسے کاموں کے کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے جو اللہ کی طرف سے

مقرر کیے ہوئے ہیں۔^(۱) (۳۸)

یہ سب ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچایا کرتے تھے اور اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے،^(۲) اور اللہ تعالیٰ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔^(۳) (۳۹)

(لوگو! تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں^(۴) لیکن آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں کے ختم کرنے والے،^(۵) اور اللہ تعالیٰ

لَاذِينَ يَلْعَنُونَ رَسَلَتِ اللَّهُ وَمَيِّسُونَهُ وَلَا يَجْتَنُونَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهُ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ﴿۳۹﴾

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿۴۰﴾

ان پر فرض قرار دیئے جاتے تھے چاہے قومی اور عوامی رسم و رواج ان کے خلاف ہی ہوتے۔

(۱) یعنی خاص حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں، دنیوی حکمرانوں کی طرح وقتی اور فوری ضرورت پر مشتمل نہیں ہوتے، اسی طرح ان کا وقت بھی مقرر ہوتا ہے جس کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

(۲) اس لیے کسی کا ڈر یا سطوت انہیں اللہ کا پیغام پہنچانے میں مانع بنتا تھا نہ طعن و ملامت کی انہیں پروا ہوتی تھی۔

(۳) یعنی ہر جگہ وہ اپنے علم اور قدرت کے لحاظ سے موجود ہے، اس لیے وہ اپنے بندوں کی مدد کے لیے کافی ہے اور اللہ کے دین کی تبلیغ و دعوت میں انہیں جو مشکلات آتی ہیں، ان میں وہ ان کی چارہ سازی فرماتا اور دشمنوں کے مذموم ارادوں اور سازشوں سے انہیں بچاتا ہے۔

(۴) اس لیے وہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بھی باپ نہیں ہیں، جس پر انہیں مورد طعن بنایا جاسکے کہ انہوں نے اپنی بہو سے نکاح کیوں کر لیا؟ بلکہ ایک زید رضی اللہ عنہ ہی کیا، وہ تو کسی بھی مرد کے باپ نہیں ہیں۔ کیونکہ زید رضی اللہ عنہ تو حارثہ کے بیٹے تھے، آپ رضی اللہ عنہ نے تو انہیں منہ بولا بیٹا بنایا ہوا تھا اور جاہلی دستور کے مطابق انہیں زید بن محمد کہا جاتا تھا۔ حقیقتاً وہ آپ رضی اللہ عنہ کے صلیبی بیٹے نہیں تھے۔ اسی لیے ﴿أَذْعُوهُمْ لِأَنَّهُمْ هُرَ﴾ کے نزول کے بعد انہیں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہی کہا جاتا تھا، علاوہ

ازیں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ رضی اللہ عنہ کے تین بیٹے، قاسم، طاہر، طیب ہوئے اور ایک ابراہیم بچہ ماریہ قطیبہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہوا۔ لیکن یہ سب کے سب بچپن میں ہی فوت ہو گئے، ان میں سے کوئی بھی عمر جو لیت کو نہیں پہنچا۔ بنا بریں آپ رضی اللہ عنہ کی صلیبی اولاد میں سے بھی کوئی مرد نہیں بنا کہ جس کے آپ باپ ہوں (ابن کثیر)

(۵) خاتمہ مہر کو کہتے ہیں اور مہر آخری عمل ہی کو کہا جاتا ہے۔ یعنی آپ رضی اللہ عنہ پر نبوت و رسالت کا خاتمہ کر دیا گیا، آپ رضی اللہ عنہ کے بعد جو بھی نبوت کا دعویٰ کرے گا، وہ نبی نہیں کذاب و دجال ہو گا۔ احادیث میں اس مضمون کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور اس پر پوری امت کا جماع و اتفاق ہے۔ قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہو گا، جو

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ۝

ذَكَرْتُمْ بَكَرَةً وَأَصْبَلًا ۝

هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُحَيِّضَكُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى

النُّورِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ۝

يَحْيِيَنَّهُمْ يَوْمَ يَقُوتُهُمْ سَلَاطٌ وَأَعَدَّ لَهُمْ أَجْرًا كَرِيمًا ۝

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝

وَدَاعِبًا إِلَى اللَّهِ بِآذِنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝

ہر چیز کا (بخوبی) جاننے والا ہے۔ (۳۰)

مسلمانو! اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت زیادہ کرو۔ (۳۱)

اور صبح و شام اس کی پائیزگی بیان کرو۔ (۳۲)

وہی ہے جو تم پر اپنی رحمتیں بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے

(تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں) تاکہ وہ تمہیں

اندھیروں سے اجالے کی طرف لے جائے اور اللہ تعالیٰ

مومنوں پر بہت ہی مہربان ہے۔ (۳۳)

جس دن یہ (اللہ سے) ملاقات کریں گے ان کا تحفہ سلام

ہو گا،^(۱) ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے باعزت اجرتیاری رکھا

ہے۔ (۳۴)

اے نبی! یقیناً ہم نے ہی آپ کو (رسول بنا کر) گواہیاں

دیئے والا،^(۲) خوشخبریاں سنانے والا، آگاہ کرنے والا بھیجا

ہے۔ (۳۵)

اور اللہ کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا اور روش

چراغ۔^(۳) (۳۶)

صحیح اور متواتر روایات سے ثابت ہے، تو وہ نبی کی حیثیت سے نہیں آئیں گے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی بن کر آئیں گے، اس لیے ان کا نزول عقیدہ ختم نبوت کے منافی نہیں ہے۔

(۱) یعنی جنت میں فرشتے اہل ایمان کو یا مومن آپس میں ایک دوسرے کو سلام کریں گے۔

(۲) بعض لوگ شاہد کے معنی حاضر و ناظر کے کرتے ہیں جو قرآن کی تحریف ممنوعی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت

کی گواہی دیں گے، ان کی بھی جو آپ ﷺ پر ایمان لائے اور ان کی بھی جنہوں نے تکذیب کی۔ آپ ﷺ قیامت

والے دن اہل ایمان کو ان کے اعضائے وضو سے پہچان لیں گے جو چمکتے ہوں گے، اسی طرح آپ ﷺ دیگر انبیاء علیہم

السلام کی گواہی دیں گے کہ انہوں نے اپنی اپنی قوموں کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا تھا اور یہ گواہی اللہ کے دیئے ہوئے یقینی علم

کی بنیاد پر ہو گی۔ اس لیے نہیں کہ آپ ﷺ تمام انبیاء علیہم السلام کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے ہیں، یہ عقیدہ تو

نصوص قرآنی کے خلاف ہے۔

(۳) جس طرح چراغ سے اندھیرے دور ہو جاتے ہیں، اسی طرح آپ ﷺ کے ذریعے سے کفر و شرک کی تاریکیاں

وَيَسِّرِ الْمُؤْمِنِينَ يَا أَيُّهَا اللَّهُ فَضْلًا كَثِيرًا ۝

وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَذَرِكُوهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ
وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَقْتُمُوهُنَّ
مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ
تَعْتَدُونَهَا فَمَتَّعُوهُنَّ وَسَرَخُوهُنَّ سَرَاحًا جَبِيلًا ۝

آپ مومنوں کو خوشخبری سنا دیجئے! کہ ان کے لیے اللہ
کی طرف سے بہت بڑا فضل ہے۔ (۳۷)

اور کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مانیئے! اور جو ایذا (ان کی
طرف سے پہنچے) اس کا خیال بھی نہ کیجئے اللہ پر بھروسہ
کیے رہیں، اور کافی ہے اللہ تعالیٰ کام بنانے والا۔ (۳۸)

اے مومنو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو پھر
ہاتھ لگانے سے پہلے (ہی) طلاق دے دو تو ان پر تمہارا
کوئی حق عدت کا نہیں جسے تم شمار کرو،^(۱) پس تم کچھ
نہ کچھ انہیں دے دو^(۲) اور بھلے طریق پر انہیں

دور ہو گئیں۔ علاوہ ازیں اس چراغ سے کسب فیض کر کے جو کمال و سعادت حاصل کرنا چاہے، کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ
چراغ قیامت تک روشن ہے۔

(۱) نکاح کے بعد جن عورتوں سے ہم بستری کی جا چکی ہو اور وہ ابھی جوان ہوں، ایسی عورتوں کو طلاق مل جائے تو ان کی
عدت تین حیض ہے۔ (البقرة-۲۳۸) یہاں ان عورتوں کا حکم بیان کیا جا رہا ہے کہ جن سے نکاح ہوا ہے لیکن میاں بیوی
کے درمیان ہم بستری نہیں ہوئی۔ ان کو اگر طلاق ہو جائے تو کوئی عدت نہیں ہے یعنی ایسی غیر مدخولہ مطلقہ بغیر عدت
گزارے فوری طور پر کہیں نکاح کرنا چاہے، تو کر سکتی ہے، البتہ اگر ہم بستری سے قبل خاوند فوت ہو جائے تو پھر اسے ۴
مہینے ۱۰ دن ہی عدت گزارنی پڑے گی۔ (فتح القدیر، ابن کثیر) چھوٹا یا ہاتھ لگانا، یہ کنایہ ہے جماع (ہم بستری) سے۔ نکاح کا لفظ
خاص جماع اور عقد زواج دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں عقد کے معنی میں ہے۔ اسی آیت سے استدلال کرتے
ہوئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ نکاح سے پہلے طلاق نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہاں نکاح کے بعد طلاق کا ذکر ہے۔ اس لیے جو
فقہا اس بات کے قائل ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اگر فلاں عورت سے میں نے نکاح کیا تو اسے طلاق، تو ان کے
نزدیک اس عورت سے نکاح ہوتے ہی طلاق واقع ہو جائے گی۔ اسی طرح بعض جو یہ کہتے ہیں کہ اگر وہ یہ کہے کہ میں
نے کسی بھی عورت سے نکاح کیا تو اسے طلاق، تو جس عورت سے بھی نکاح کرے گا، طلاق واقع ہو جائے گی۔ یہ بات صحیح
نہیں ہے۔ حدیث میں بھی وضاحت ہے۔ «لَا طَلَّاقَ قَبْلَ نِكَاحٍ» (ابن ماجہ) «لَا طَلَّاقَ لِإِبْنِ آدَمَ فِيمَا لَا يَمْلِكُ»
(أبو داؤد) «باب فی الطلاق قبل النکاح» ترمذی، ابن ماجہ و مسند أحمد ۱۱۸۹/۲ اس سے واضح ہے کہ نکاح سے قبل
طلاق، ایک فعل عبث ہے جس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔

(۲) یہ متعہ، اگر مہر مقرر کیا گیا ہو تو نصف مہر ہے ورنہ حسب توفیق کچھ دے دیا جائے۔

رخصت کر دو۔^(۱) (۳۹)

اے نبی! ہم نے تیرے لیے تیری وہ بیویاں حلال کر دی ہیں جنہیں تو ان کے مردے چکا ہے^(۲) اور وہ لونڈیاں بھی جو اللہ تعالیٰ نے غنیمت میں تجھے دی ہیں^(۳) اور تیرے چچا کی لڑکیاں اور پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور تیری خالادوں کی بیٹیاں بھی جنہوں نے تیرے ساتھ ہجرت کی ہے،^(۴) اور وہ بالیمان عورت جو اپنا نفس نبی کو بہہ کر دے یہ اس صورت میں کہ خود نبی بھی اس سے نکاح کرنا چاہے،^(۵) یہ خاص طور پر صرف تیرے لیے ہی ہے اور مومنوں کے لیے نہیں،^(۶) ہم اسے بخوبی جانتے ہیں جو ہم نے ان پر ان کی

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ الَّتِي كَانَتْ
أُجُورَ مَنْ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا آتَاكَ اللَّهُ عَلَيْكَ
وَبَنَاتِ عَنكِ وَبَنَاتِ عَمَّتِكَ وَبَنَاتِ خَالَكِ وَبَنَاتِ
خَلِيَّتِكَ الَّتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ وَأُمَّرَاءَ مُؤْمِنَةً
إِنْ وَهَبَتْ نَفْسَهُنَّ لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَنْ
يَسْتَكْفِفَهُنَّ خَالِصَةً لَكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ قَدْ جَاءَنَا
مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِنَّ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ
لِيَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

(۱) یعنی انہیں عزت و احترام سے، بغیر کوئی ایذا پہنچائے علیحدہ کر دیا جائے۔

(۲) بعض احکام شرعیہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو امتیاز حاصل تھا، جنہیں آپ ﷺ کی خصوصیات کہا جاتا ہے۔ مثلاً اہل علم کی ایک جماعت کے بقول قیام اللیل (تہجد) آپ ﷺ پر فرض تھا، صدقہ آپ ﷺ پر حرام تھا، اسی طرح کی بعض خصوصیات کا ذکر قرآن کریم کے اس مقام پر کیا گیا ہے جن کا تعلق نکاح سے ہے۔ ۱۔ جن عورتوں کو آپ ﷺ نے مردیا ہے، وہ حلال ہیں چاہے تعداد میں وہ کتنی ہی ہوں اور آپ ﷺ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اور جویریہ رضی اللہ عنہا کا مہر ان کی آزادی کو قرار دیا تھا، ان کے علاوہ بصورت نقد سب کو مہر ادا کیا تھا۔ صرف ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا مہر نجاشی نے اپنی طرف سے دیا تھا۔

(۳) چنانچہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اور جویریہ رضی اللہ عنہا ملکیت میں آئیں جنہیں آپ ﷺ نے آزاد کر کے نکاح کر لیا، اور رضمانہ رضی اللہ عنہا اور ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا یہ بطور لونڈی آپ کے پاس رہیں۔

(۴) اس کا مطلب ہے جس طرح آپ ﷺ نے ہجرت کی، اسی طرح انہوں نے بھی مکہ سے مدینہ ہجرت کی۔ کیونکہ آپ ﷺ کے ساتھ تو کسی عورت نے بھی ہجرت نہیں کی تھی۔

(۵) یعنی نبی کریم ﷺ کو اپنا آپ بہہ کرنے والی عورت، اگر آپ ﷺ اس سے نکاح کرنا پسند فرمائیں تو بغیر مہر کے آپ ﷺ کے لیے اسے اپنے نکاح میں رکھنا جائز ہے۔

(۶) یہ اجازت صرف آپ ﷺ کے لیے ہے۔ دیگر مومنوں کے لیے تو ضروری ہے کہ وہ حق مہر ادا کریں، تب نکاح جائز ہو گا۔

بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں (احکام) مقرر کر رکھے ہیں،^(۱) یہ اس لیے کہ تجھ پر حرج واقع نہ ہو،^(۲) اللہ تعالیٰ بہت بخشنے اور بڑے رحم والا ہے۔ (۵۰)

ان میں سے جسے تو چاہے دور رکھ دے اور جسے چاہے اپنے پاس رکھ لے،^(۳) اور اگر تو ان میں سے بھی کسی کو اپنے پاس بلا لے جنہیں تو نے الگ کر رکھا تھا تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں،^(۴) اس میں اس بات کی زیادہ توقع ہے کہ ان عورتوں کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں اور جو کچھ بھی تو انہیں دیدے اس پر سب کی سب راضی رہیں،^(۵)

تُرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُحِبِّي إِلَيْكَ مَنْ تَنَالَهُ وَمَنِ ابْتَعَيْتَ وَمَنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ذَلِكَ إِذْ بَدَأْتَ بَعْضَ عِبَادِكُمْ وَلَا يَجُزَىٰ وَيَرِضُ بِمَا آتَيْتَهُمْ كُفْرًا وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَلِيمًا ﴿۵۰﴾

(۱) یعنی عقد کے جو شرائط اور حقوق ہیں جو ہم نے فرض کیے ہیں کہ مثلاً چار سے زیادہ عورتیں بیک وقت کوئی شخص اپنے نکاح میں نہیں رکھ سکتا، نکاح کے لیے ولی گواہ اور حق مرضوری ہے۔ البتہ لونڈیاں جتنی کوئی چاہے، رکھ سکتا ہے، تاہم آج کل لونڈیوں کا مسئلہ تو ختم ہے۔

(۲) اس کا تعلق اِنَّا اَحْلَلْنَا سے ہے یعنی مذکورہ تمام عورتوں کی آپ ﷺ کے لیے حلت اس لیے ہے تاکہ آپ ﷺ کو تنگی محسوس نہ ہو اور آپ ﷺ ان میں سے کسی کے ساتھ نکاح میں گناہ نہ سمجھیں۔

(۳) اس میں آپ ﷺ کی ایک اور خصوصیت کا بیان ہے، وہ یہ کہ بیویوں کے درمیان باریاں مقرر کرنے میں آپ ﷺ کو اختیار دے دیا گیا تھا آپ ﷺ جس کی باری چاہیں موقوف کر دیں، یعنی اسے نکاح میں رکھتے ہوئے اس سے مباشرت نہ کریں اور جس سے چاہیں یہ تعلق قائم رکھیں۔

(۴) یعنی جن بیویوں کی باریاں موقوف کر رکھی تھیں اگر آپ ﷺ چاہیں کہ ان سے بھی مباشرت کا تعلق قائم کیا جائے، تو یہ اجازت بھی آپ ﷺ کو حاصل ہے۔

(۵) یعنی باری موقوف ہونے اور ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کے باوجود وہ خوش ہوں گی، غمگین نہیں ہوں گی اور جتنا کچھ آپ ﷺ کی طرف سے انہیں مل جائے گا، اس پر مطمئن رہیں گی۔ کیوں؟ اس لیے کہ انہیں معلوم ہے کہ پیغمبر ﷺ یہ سب کچھ اللہ کے حکم اور اجازت سے کر رہے ہیں اور یہ ازواج مطہرات اللہ کے فیصلے پر راضی اور مطمئن ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اختیار ملنے کے باوجود آپ ﷺ نے اسے استعمال نہیں کیا اور سوائے حضرت سوہہ رضی اللہ عنہا کے (کہ انہوں نے اپنی باری خود ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے بہہ کر دی تھی) آپ ﷺ نے

تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے اللہ (خوب) جانتا ہے۔^(۱)
اللہ تعالیٰ بڑا ہی علم اور حلم والا ہے۔ (۵۱)

اس کے بعد اور عورتیں آپ کے لیے حلال نہیں اور نہ
یہ (درست ہے) کہ ان کے بدلے اور عورتوں سے
(نکاح کرے) اگرچہ ان کی صورت اچھی بھی لگتی ہو^(۲)
مگر جو تیری مملوکہ ہوں۔^(۳) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا (پورا)

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدِ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ
مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَحَبَبْتَكَ حَسَنَهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ
يَمِينُكَ وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ رَؤُوفًا ۝

تمام ازواج مطہرات کی باریاں برابر برابر مقرر کر رکھی تھیں، اسی لیے آپ ﷺ نے مرض الموت میں ازواج مطہرات سے اجازت لے کر بیماری کے ایام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گزارے ﴿أَنْ تَعْتَمِدَ عَلَيْهِنَّ﴾ کا تعلق آپ ﷺ کے اسی طرز عمل سے ہے کہ آپ ﷺ پر تقسیم اگرچہ (دوسرے لوگوں کی طرح) واجب نہیں تھی، اس کے باوجود آپ ﷺ نے تقسیم کو اختیار فرمایا، تاکہ آپ ﷺ کی بیویوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں اور آپ ﷺ کے اس حسن سلوک اور عدل و انصاف سے خوش ہو جائیں کہ آپ ﷺ نے خصوصی اختیار استعمال کرنے کے بجائے ان کی دلجوئی اور دلداری کا اہتمام فرمایا۔

(۱) یعنی تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے، ان میں یہ بات بھی یقیناً ہے کہ سب بیویوں کی محبت دل میں یکساں نہیں ہے۔ کیوں کہ دل پر انسان کا اختیار ہی نہیں ہے۔ اس لیے بیویوں کے درمیان مساوات باری میں، نان و نفقہ اور دیگر ضروریات زندگی اور آسائشوں میں ضروری ہے، جس کا اہتمام انسان کر سکتا ہے۔ دلوں کے میلان میں مساوات چونکہ اختیار ہی میں نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اس پر گرفت بھی نہیں فرمائے گا بشرطیکہ دل محبت کسی ایک بیوی سے امتیازی سلوک کا باعث نہ ہو۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے ”یا اللہ یہ میری تقسیم ہے جو میرے اختیار میں ہے، لیکن جس چیز پر تیرا اختیار ہے، میں اس پر اختیار نہیں رکھتا، اس میں مجھے ملامت نہ کرنا“۔ (ابوداؤد، باب القسم فی النساء، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند أحمد ۶/۱۳۳)

(۲) آیت تنجیر کے نزول کے بعد ازواج مطہرات نے دنیا کے اسباب عیش و راحت کے مقابلے میں عسرت کے ساتھ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنا پسند کیا تھا، اس کا صلہ اللہ نے یہ دیا کہ آپ ﷺ کو ان ازواج کے علاوہ (جن کی تعداد اس وقت ۹ تھی) دیگر عورتوں سے نکاح کرنے یا ان میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ کسی اور سے نکاح کرنے سے منع فرمایا۔ بعض کہتے ہیں کہ بعد میں آپ ﷺ کو یہ اختیار دے دیا گیا تھا، لیکن آپ ﷺ نے کوئی نکاح نہیں کیا۔ (ابن کثیر)

(۳) یعنی لونڈیاں رکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ بعض نے اس کے عموم سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ کافر لونڈی بھی رکھنے کی آپ ﷺ کو اجازت تھی اور بعض نے ﴿وَلَا تَمْسِكُوا بِهِنَّ الْكُوفِرَ﴾ (الممتحنہ ۱۰) کے پیش

نگہبان ہے۔ (۵۲)

اے ایمان والو! جب تک تمہیں اجازت نہ دی جائے تم نبی کے گھروں میں نہ جایا کرو کھانے کے لیے ایسے وقت میں کہ اس کے پکنے کا انتظار کرتے رہو بلکہ جب بلایا جائے جاؤ اور جب کھا چکو نکل کھڑے ہو؛ وہیں باتوں میں مشغول نہ ہو جایا کرو۔ نبی کو تمہاری اس بات سے تکلیف ہوتی ہے۔ تو وہ لحاظ کر جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ (بیان) حق میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا،^(۱) جب تم نبی کی بیویوں سے کوئی چیز طلب کرو تو پردے کے پیچھے سے طلب کرو،^(۲) تمہارے اور ان کے دلوں کے لیے کامل پاکیزگی یہی ہے،^(۳) نہ تمہیں یہ جائز ہے کہ تم رسول اللہ کو تکلیف

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُدْعُونَكُمْ إِلَى طَعَامٍ غَيْرٍ نَظِيرِهَا إِنَّهُ وَلَكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا اطعمتم فَأَنْتُمْ قَانِتُمْ رُوَا وَلَا مُسْتَأْنِئِينَ بِحَدِيثِ نَبِيِّ ذَلِكُمْ كَانَ يُدْعَى النَّبِيُّ فَيَسْتَجِيبُ مِنْكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَجِيبُ مِنَ الْحَقِّ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَائِهِنَّ بِطَوَافٍ وَلَا تَطْعَمُوا لَهُنَّ كَمَا تَطْعَمُونَ وَقُلُوا هُنَّ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تُنْكِرُوا آيَاتِهِ مِنْ بَعْدِهَا إِنَّهُ كَانَ ذَلِكُمْ كَانٍ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمًا ۝

نظرا سے آپ ﷺ کے لیے حلال نہیں سمجھا۔ (فتح القدير)

(۱) اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے دلچسپی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تشریف لائے جن میں سے بعض کھانے کے بعد بھی بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے جس سے آپ ﷺ کو خاص تکلیف ہوئی، تاہم حیا و اخلاق کی وجہ سے آپ ﷺ نے انہیں جانے کے لیے کہا نہیں۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورة الأحزاب) چنانچہ اس آیت میں دعوت کے آداب بتلا دیئے گئے کہ ایک تو اس وقت جاؤ؛ جب کھانا تیار ہو چکا ہو؛ پہلے سے ہی جا کر دھرنا مار کر نہ بیٹھ جاؤ۔ دوسرا، کھاتے ہی اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ؛ وہاں بیٹھے ہوئے باتیں مت کرتے رہو۔ کھانے کا ذکر تو سبب نزول کی وجہ سے ہے؛ ورنہ مطلب یہ ہے کہ جب بھی تمہیں بلایا جائے چاہے کھانے کے لیے یا کسی اور کام کے لیے، اجازت کے بغیر گھر کے اندر داخل مت ہو۔

(۲) یہ حکم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خواہش پر نازل ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! آپ کے پاس اچھے برے ہر طرح کے لوگ آتے ہیں، کاش آپ اممات المؤمنین کو پردے کا حکم دیں تو کیا اچھا ہو۔ جس پر اللہ نے یہ حکم نازل فرما دیا۔ (صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ و تفسیر سورة البقرة - مسلم، باب فضائل عمر بن الخطاب)

(۳) یہ پردے کی حکمت اور علت ہے کہ اس سے مرد اور عورت دونوں کے دل ریب و شک سے اور ایک دوسرے کے ساتھ فتنے میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہیں گے۔

(۱) دو اور نہ تمہیں یہ حلال ہے کہ آپ کے بعد کسی وقت بھی آپ کی بیویوں سے نکاح کرو۔ (یاد رکھو) اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ (۵۳)^(۲)
 تم کسی چیز کو ظاہر کرو یا مخفی رکھو اللہ تو ہر چیز کا بخوبی علم رکھنے والا ہے۔ (۵۳)

ان عورتوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے باپوں اور اپنے بیٹوں اور بھائیوں اور بھتیجیوں اور بھانجیوں اور اپنی (میل جول کی) عورتوں اور ملکیت کے ماتحتوں (لونڈی، غلام) کے سامنے ہوں۔ (عورتو!) اللہ سے ڈرتی رہو۔ اللہ تعالیٰ یقیناً ہر چیز پر شاہد ہے۔ (۵۵)^(۳)
 اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔

إِنَّ بُنْدُؤًا مِّنَ آوَانِمْ أَوْ تَعْفُوهُ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ يَحْكُمُ مِّنْ عِلْمًا ۝۵۳

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِمْ فِي آبَائِهِمْ وَلَا أَبْنَائِهِمْ وَلَا إِخْوَانِهِمْ وَلَا بَنَاتِهِمْ وَلَا إِخْوَانِهِمْ وَلَا بَنَاتِهِمْ وَلَا مَمْلُوكَاتِهِمْ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ۝۵۵

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

(۱) چاہے وہ کسی بھی لحاظ سے ہو۔ آپ ﷺ کے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونا، آپ ﷺ کی خواہش کے بغیر گھر میں بیٹھے رہنا اور بغیر حجاب کے ازواج مطہرات سے گفتگو کرنا، یہ امور بھی ایذا کے باعث ہیں، ان سے بھی اجتناب کرو۔
 (۲) یہ حکم ان ازواج مطہرات کے بارے میں ہے جو وفات کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حجازہ عقد میں تھیں۔ تاہم جن کو آپ ﷺ نے ہم بستری کے بعد زندگی میں طلاق دے کر اپنے سے علیحدہ کر دیا ہو، وہ اس کے عموم میں داخل ہیں یا نہیں؟ اس میں دو رائے ہیں۔ بعض ان کو بھی شامل سمجھتے ہیں اور بعض نہیں۔ لیکن آپ ﷺ کی ایسی کوئی بیوی تھی ہی نہیں۔ اس لیے یہ محض ایک فرضی شکل ہے۔ علاوہ ازیں ایک تیسری قسم ان عورتوں کی ہے جن سے آپ ﷺ کا نکاح ہوا لیکن ہم بستری سے قبل ہی ان کو آپ ﷺ نے طلاق دے دی۔ ان سے دوسرے لوگوں کا نکاح درست ہونے میں کوئی نزاع معلوم نہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

(۳) جب عورتوں کے لیے پردے کا حکم نازل ہوا تو پھر گھر میں موجود اقارب یا ہر وقت آنے جانے والے رشتے داروں کی بابت سوال ہوا کہ ان سے پردہ کیا جائے یا نہیں؟ چنانچہ اس آیت میں ان اقارب کا ذکر کر دیا گیا جن سے پردے کی ضرورت نہیں۔ اس کی تفصیل سورہ نور کی آیت ۳۱ ﴿وَالَّذِينَ يَدْعُونَ﴾ میں بھی گزر چکی ہے، اسے ملاحظہ فرمایا جائے۔

(۴) اس مقام پر عورتوں کو تقویٰ کا حکم دے کر واضح کر دیا کہ اگر تمہارے دلوں میں تقویٰ ہو گا تو پردے کا جو اصل مقصد، قلب و نظر کی طہارت اور عصمت کی حفاظت ہے، وہ یقیناً تمہیں حاصل ہو گا، ورنہ حجاب کی ظاہری پابندیاں تمہیں گناہ میں ملوث ہونے سے نہیں بچا سکیں گی۔

اے ایمان والو! تم (بھی) ان پر درود بھیجو اور خوب سلام
(بھی) بھیجتے رہا کرو۔ (۵۶) (۱)

صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۵۶

(۱) اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مرتبہ و منزلت کا بیان ہے جو ملاً علی (آسمانوں) میں آپ ﷺ کو حاصل ہے اور وہ یہ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ فرشتوں میں آپ ﷺ کی ثنا و تعریف کرتا اور آپ ﷺ پر رحمتیں بھیجتا ہے اور فرشتے بھی آپ ﷺ کی بلندی درجات کی دعا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے عالم سفلی (اہل زمین) کو حکم دیا کہ وہ بھی آپ ﷺ پر صلوة و سلام بھیجیں تاکہ آپ ﷺ کی تعریف میں علوی اور سفلی دونوں عالم متحد ہو جائیں۔ حدیث میں آتا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ! سلام کا طریقہ تو ہم جانتے ہیں (یعنی التیمات میں السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ! پڑھتے ہیں) ہم درود کس طرح پڑھیں؟ اس پر آپ ﷺ نے وہ درود ابراہیمی بیان فرمایا جو نماز میں پڑھا جاتا ہے۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورة الاحزاب) علاوہ ازیں احادیث میں درود کے اور بھی صفیہ آتے ہیں، جو پڑھے جاسکتے ہیں۔ نیز مختصراً صلی اللہ علی رسول اللہ وسلم بھی پڑھا جاسکتا ہے تاہم الصَّلَوَةُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! پڑھنا اس لیے صحیح نہیں کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے اور یہ صفیہ نبی کریم سے عام درود کے وقت منقول نہیں ہے اور تہیات میں السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ! چونکہ آپ ﷺ سے منقول ہے اس وجہ سے اس وقت میں پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں مزید برآں اس کا پڑھنے والا اس فاسد عقیدے سے پڑھتا ہے کہ آپ ﷺ اسے براہ راست سنتے ہیں۔ یہ عقیدہ فاسدہ قرآن و حدیث کے خلاف ہے اور اس عقیدے سے مذکورہ خانہ ساز درود پڑھنا بھی غیر صحیح ہے۔ اسی طرح اذان سے قبل اسے پڑھنا بھی بدعت ہے، جو ثواب نہیں، گناہ ہے۔ احادیث میں درود کی بڑی فضیلت وارد ہے۔ نماز میں اس کا پڑھنا واجب ہے یا سنت؟ جمہور علماء اسے سنت سمجھتے ہیں اور امام شافعی اور بہت سے علماء واجب۔ اور احادیث سے اس کے وجوب ہی کی تائید ہوتی ہے۔ اسی طرح احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آخری تشہد میں درود پڑھنا واجب ہے، پہلے تشہد میں بھی درود پڑھنے کی وہی حیثیت ہے۔ اس لیے نماز کے دونوں تشہد میں درود پڑھنا ضروری ہے۔

اس کے دلائل مختصراً حسب ذیل ہیں۔

ایک دلیل یہ ہے کہ مسند احمد میں صحیح سند سے مروی ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے سوال کیا، یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ پر سلام کس طرح پڑھنا ہے؟ یہ تو ہم نے جان لیا (کہ ہم تشہد میں السَّلَامُ عَلَيْكَ پڑھتے ہیں) لیکن جب ہم نماز میں ہوں تو آپ ﷺ پر درود کس طرح پڑھیں؟ تو آپ ﷺ نے درود ابراہیمی کی تلقین فرمائی (الفتح الربانی، ج ۴، ص ۲۰-۲۱) مسند احمد کے علاوہ یہ روایت صحیح ابن حبان، سنن کبریٰ بیہقی، مستدرک حاکم اور ابن خزیمہ میں بھی ہے۔ اس میں صراحت ہے کہ جس طرح سلام نماز میں پڑھا جاتا ہے یعنی تشہد میں، اسی طرح یہ سوال بھی نماز کے اندر درود پڑھنے سے متعلق تھا، نبی ﷺ نے درود ابراہیمی پڑھنے کا حکم فرمایا۔ جس سے معلوم ہوا کہ نماز میں سلام

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا
وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُهِينًا ﴿۵۷﴾

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بَغْيًا وَتَبْخَعًا

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں ان پر دنیا
اور آخرت میں اللہ کی پھٹکار ہے اور ان کے لیے نہایت
رسوا کن عذاب ہے۔ (۱) (۵۷)

اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا دیں
بغیر کسی جرم کے جو ان سے سرزد ہوا ہو، وہ (بڑے ہی)

کے ساتھ درود بھی پڑھنا چاہیے، اور اس کا مقام تشہد ہے۔ اور حدیث میں یہ عام ہے، اسے پہلے یا دوسرے تشہد کے
ساتھ خاص نہیں کیا گیا ہے جس سے یہ استدلال کرنا صحیح ہے کہ (پہلے اور دوسرے) دونوں تشہد میں سلام اور درود پڑھا
جائے۔ اور جن روایات میں تشہد اول کا بغیر درود کے ذکر ہے، انہیں سورۃ احزاب کی آیت صَلُّوا عَلَيْنَا وَسَلِّمُوا كَلَّا
نَزُولٍ سے پہلے پر محمول کیا جائے گا۔ لیکن اس آیت کے نزول یعنی ۵ ہجری کے بعد جب نبی ﷺ نے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے
استفسار پر درود کے الفاظ بھی بیان فرمادئے تو اب نماز میں سلام کے ساتھ صلوٰۃ (درود شریف) کا پڑھنا بھی ضروری ہو
گیا، چاہے وہ پہلا تشہد ہو یا دوسرا۔ اس کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے بیان فرمایا کہ نبی ﷺ
(بعض دفعہ) رات کو ۹ رکعات ادا فرماتے، آٹھویں رکعت میں تشہد بیٹھے تو اس میں اپنے رب سے دعا کرتے اور اس کے
پیغمبر ﷺ پر درود پڑھتے، پھر سلام پھیرے بغیر کھڑے ہو جاتے اور نویں رکعت پوری کر کے تشہد میں بیٹھے تو اپنے رب
سے دعا کرتے اور اس کے پیغمبر پر درود پڑھتے اور پھر دعا کرتے، پھر سلام پھیر دیتے (السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۲
ص ۷۰۳، طبع جدید سنن النسائی مع التعلیقات السلفية، کتاب قیام اللیل، ج ۱ ص ۲۰۲۔ مزید ملاحظہ ہو،
صفة صلوٰۃ النبی ﷺ، للآلبانی، صفحہ ۱۳۵) اس میں بالکل صراحت ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی رات کی نماز میں
پہلے اور آخری دونوں تشہد میں درود پڑھا ہے۔ یہ اگرچہ نقلی نماز کا واقعہ ہے لیکن مذکورہ عمومی دلائل کی آپ ﷺ
کے اس عمل سے تائید ہو جاتی ہے، اس لیے اسے صرف نقلی نماز تک محدود کر دینا صحیح نہیں ہو گا۔

(۱) اللہ کو ایذا دینے کا مطلب ان افعال کا ارتکاب ہے جسے وہ ناپسند فرماتا ہے۔ ورنہ اللہ کو ایذا پہنچانے پر کون قادر ہے؟
جیسے مشرکین، یہود اور نصاریٰ وغیرہ اللہ کے لیے اولاد ثابت کرتے ہیں۔ یا جس طرح حدیث قدسی میں ہے، اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے ”ابن آدم مجھے ایذا دیتا ہے، زمانے کو گالی دیتا ہے، حالانکہ میں ہی زمانہ ہوں اس کے رات اور دن کی گردش
میرے ہی حکم سے ہوتی ہے۔“ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الجاثیہ، ومسلم، کتاب الألفاظ من الأدب،
باب النهی عن سب الدھر، یعنی یہ کہنا کہ زمانے نے یا فلک کج رفتار نے ایسا کر دیا، یہ صحیح نہیں، اس لیے کہ افعال
اللہ کے ہیں، زمانے یا فلک کے نہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کو ایذا پہنچانا، آپ ﷺ کی تکذیب، آپ ﷺ کو شاعر،
کذاب، ساحر وغیرہ کہنا ہے۔ علاوہ ازیں بعض احادیث میں صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کو ایذا پہنچانے اور ان کی تنقیص و اہانت کو
بھی آپ ﷺ نے ایذا قرار دیا ہے۔ لعنت کا مطلب، اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی ہے۔

اَحْتَلُوا اِيْمَانًا وَ اِيْمَانِيْنَا ۝

ہستان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔^(۱) (۵۸)

اے نبی! اپنی بیویوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکالیا کریں،^(۲) اس سے بہت جلد ان کی شناخت

(۱) یعنی ان کو بدنام کرنے کے لیے ان پر بہتان باندھنا، ان کی ناجائز تنقیص و توہین کرنا۔ جیسے روافض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر سب و شتم کرتے اور ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جن کا ارتکاب انہوں نے نہیں کیا۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں ”رافضی منکوس القلوب ہیں، ممدوح اشخاص کی مذمت کرتے اور مذموم لوگوں کی مدح کرتے ہیں۔“

(۲) جَلَابِیْبُ، جِلْبَابُ کی جمع ہے، جو ایسی بڑی چادر کو کہتے ہیں جس سے پورا بدن ڈھک جائے۔ اپنے اوپر چادر لٹکانے سے مراد اپنے چہرے پر اس طرح گھونگٹ نکالنا ہے کہ جس سے چہرے کا بیشتر حصہ بھی چھپ جائے اور نظریں جھکا کر چلنے سے راستہ بھی نظر آتا جائے۔ پاک و ہند یا دیگر اسلامی ممالک میں برقعے کی جو مختلف صورتیں ہیں، عمد رسالت میں یہ برقعے عام نہیں تھے، پھر بعد میں معاشرت میں وہ سادگی نہیں رہی جو عمد رسالت اور صحابہ و تابعین کے دور میں تھی، عورتیں نہایت سادہ لباس پہنتی تھیں، بناؤ سنگھار اور زیب و زینت کے انہماک کو کوئی جذبہ ان کے اندر نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ایک بڑی چادر سے بھی پردے کے تقاضے پورے ہو جاتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ سادگی نہیں رہی، اس کی جگہ تجمل اور زینت نے لے لی اور عورتوں کے اندر زرق برق لباس اور زیورات کی نمائش عام ہو گئی، جس کی وجہ سے چادر سے پردہ کرنا مشکل ہو گیا اور اس کی جگہ مختلف انداز کے برقعے عام ہو گئے۔ گواہی سے بعض دفعہ عورت کو بالخصوص سخت گرمی میں، کچھ وقت بھی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن یہ ذرا سی تکلیف شریعت کے تقاضوں کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ تاہم جو عورت برقعے کے بجائے پردے کے لیے بڑی چادر استعمال کرتی ہے اور پورے بدن کو ڈھانکتی اور چہرے پر صحیح معنوں میں گھونگٹ نکالتی ہے، وہ یقیناً پردے کے حکم کو بجالاتی ہے، کیونکہ برقعہ ایسی لازمی شئی نہیں ہے جسے شریعت نے پردے کے لئے لازمی قرار دیا ہو۔ لیکن آج کل عورتوں نے چادر کو بے پردگی اختیار کرنے کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ پہلے وہ برقعے کی جگہ چادر اوڑھنا شروع کرتی ہیں۔ پھر چادر بھی غائب ہو جاتی ہے، صرف دوپٹہ رہ جاتا ہے اور بعض عورتوں کے لیے اس کا لینا بھی گراں ہوتا ہے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے کتنا پڑتا ہے کہ اب برقع کا استعمال ہی صحیح ہے کیوں کہ جب سے برقعے کی جگہ چادر نے لے لی ہے، بے پردگی عام ہو گئی ہے بلکہ عورتیں نیم برہنگی پر بھی فخر کرنے لگی ہیں فَايَا اللَّهُ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاٰجِعُونَ۔ ہر حال اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں، بیٹیوں اور عام مومن عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے وقت پردے کا حکم دیا گیا ہے، جس سے واضح ہے کہ پردے کا حکم علما کا ایجاد کردہ نہیں ہے، جیسا کہ آج کل بعض لوگ باور کراتے ہیں، یا اس کو قرار واقعی اہمیت نہیں دیتے، بلکہ یہ اللہ کا حکم ہے جو

فَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آلِهِمْ وَاقْدَارِيهِمْ يَمُدُّونَ ۝۱۰

ہو جایا کرے گی پھر نہ ستائی جائیں گی، (۱) اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۵۹)

اگر (اب بھی) یہ منافق اور وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور وہ لوگ جو مدینہ میں غلط افواہیں اڑانے والے ہیں (۲) باز نہ آئے تو ہم آپ کو ان (کی تباہی) پر مسلط کر دیں گے پھر تو وہ چند دن ہی آپ کے ساتھ اس (شہر) میں رہ سکیں گے۔ (۶۰)

ان پر پھینکار برسائی گئی، جہاں بھی مل جائیں پکڑے جائیں اور خوب ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ (۶۱) (۳)

ان سے اگلوں میں بھی اللہ کا یہی دستور جاری رہا۔ اور تو اللہ کے دستور میں ہرگز رد و بدل نہ پائے گا۔ (۶۲)

لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے! کہ اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے، آپ کو کیا خبر بہت ممکن ہے قیامت بالکل ہی قریب ہو۔ (۶۳)

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ سَأَلْتَهُ طَرَفًا لِكُلِّ قَوْمٍ مَقَدَّرْتُمْ ۝۱۱

لَا تَلْعَابُونَ فِي الْأُمُورِ وَإِنَّ قُدْرَةَ اللَّهِ عِنْدَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَلِيمَةٌ ۝۱۲

سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكُفَّارِ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ۝۱۳

يَسْأَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللَّهِ وَمَا يُذِيرُكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا ۝۱۴

قرآن کریم کی نص سے ثابت ہے، اس سے اعراض، انکار اور بے پردگی پر اصرار کفر تک پہنچا سکتا ہے۔ دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بیٹی نہیں تھی جیسا کہ رافضیوں کا عقیدہ ہے، بلکہ آپ ﷺ کی ایک سے زائد بیٹیاں تھیں جیسا کہ نص قرآنی سے واضح ہے اور یہ چار تھیں جیسا کہ تاریخ و سیر اور احادیث کی کتابوں سے ثابت ہے۔

(۱) یہ پردے کی حکمت اور اس کے فائدے کا بیان ہے کہ اس سے ایک شریف زادی اور باحیا عورت اور بے شرم اور بدکار عورت کے درمیان پہچان ہوگی۔ پردے سے معلوم ہو گا کہ یہ خاندانی عورت ہے جس سے چھیڑ چھاڑ کی جرات کسی کو نہیں ہوگی، اس کے برعکس بے پردہ عورت اوباشوں کی نگاہوں کا مرکز اور ان کی بوالہوسی کا نشانہ بنے گی۔

(۲) مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کے لیے منافقین افواہیں اڑاتے رہتے تھے کہ مسلمان فلاں علاقے میں مغلوب ہو گئے، یاد دشمن کا لشکر جرار حملہ آور ہونے کے لیے آرہا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

(۳) یہ حکم نہیں ہے کہ ان کو پکڑ کر مار ڈالا جائے، بلکہ بددعا ہے کہ اگر وہ اپنے نفاق اور ان حرکتوں سے باز نہ آئے تو ان کا نہایت عبرت ناک حشر ہو گا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حکم ہے۔ لیکن یہ منافقین نزول آیت کے بعد اپنی حرکتوں سے باز آگئے تھے، اس لیے ان کے خلاف یہ کارروائی نہیں کی گئی جس کا حکم اس آیت میں دیا گیا تھا۔ (فتح القدر)

إِنَّ اللَّهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴿۶۳﴾

اللہ تعالیٰ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ (۶۳)

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا لَا يَخْرُجُوْنَ وَاُولٰٓئِكَ نَصِيْرًا ﴿۶۴﴾

جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ وہ کوئی حامی و مددگار نہ پائیں گے۔ (۶۴)

يَوْمَ تُنْفَخُ الْوُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يَا لَيْتَنَا اَطَعْنَا اللَّهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلًا ﴿۶۵﴾

اس دن ان کے چہرے آگ میں الٹ پلٹ کیے جائیں گے۔ (حسرت و افسوس سے) کہیں گے کہ کاش ہم اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت کرتے۔ (۶۵)

وَقَالُوْا رَبَّنَا اٰطَعْنَا سَادَتَنَا وَرَبَّنَا فَاغْوٰنَا السَّئِْلًا ﴿۶۶﴾

اور کہیں گے اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی مانی جنہوں نے ہمیں راہ راست سے بھٹکا دیا^(۱) (۶۶)

رَبَّنَا اِنْتَهُمُ ضَعُفِيْنَ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنَمُ لَعْنَا كَبِيْرًا ﴿۶۷﴾

پروردگار تو انہیں دگنا عذاب دے اور ان پر بہت بڑی لعنت نازل فرما۔ (۶۷)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذُوْا مُوْسٰى فَبَرَاۤءَ اللّٰهُ مِنَّمَا قَالُوْا وَاكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴿۶۸﴾

اے ایمان والو! ان لوگوں جیسے نہ بن جاؤ جنہوں نے موسیٰ کو تکلیف دی پس جو بات انہوں نے کہی تھی اللہ نے انہیں اس سے بری فرما دیا،^(۲) اور وہ اللہ کے نزدیک

(۱) یعنی ہم نے تیرے پیغمبروں اور داعیان دین کے بجائے اپنے ان بڑوں اور بزرگوں کی پیروی کی، لیکن آج ہمیں معلوم ہوا کہ انہوں نے ہمیں تیرے پیغمبروں سے دور رکھ کر راہ راست سے بھٹکائے رکھا۔ آپا پرستی اور تقلید فرنگ آج بھی لوگوں کی گمراہی کا باعث ہے۔ کاش مسلمان آیات الہی پر غور کر کے ان گنڈنڈیوں سے نکلیں اور قرآن و حدیث کی صراط مستقیم کو اختیار کر لیں کہ نجات صرف اور صرف اللہ اور رسول کی پیروی میں ہی ہے۔ نہ کہ مشائخ و اکابر کی تقلید میں یا آبا و اجداد کے فرسودہ طریقوں کے اختیار کرنے میں۔

(۲) اس کی تفسیر حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہایت باحیاط تھے، چنانچہ اپنا جسم انہوں نے کبھی لوگوں کے سامنے ننگا نہیں کیا۔ بنو اسرائیل کہنے لگے کہ شاید موسیٰ علیہ السلام کے جسم میں برص کے داغ یا کوئی اس قسم کی آفت ہے جس کی وجہ سے یہ ہر وقت لباس میں ڈھکا چھپا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تمنائی میں غسل کرنے لگے، کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھ دیئے۔ پتھر (اللہ کے حکم سے) کپڑے لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے پیچھے پیچھے دوڑے، حتیٰ کہ بنی اسرائیل کی ایک مجلس میں پہنچ گئے، انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام

باعزت تھے۔ (۶۹)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سیدھی سیدھی
(سچی) باتیں کیا کرو۔ (۷۰)

تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے کام سنوار دے اور تمہارے گناہ
معاف فرمادے، (۲) اور جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی
تابعداری کرے گا اس نے بڑی مراد پائی۔ (۷۱)

ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں پر زمین پر اور پہاڑوں پر
پیش کیا لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا
اور اس سے ڈر گئے (مگر انسان نے اسے اٹھالیا، (۳) وہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَفُؤُوا قَوْلَ سَيِّدِكُمْ ۖ

يُضِلُّكُمْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ
وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ
فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ

کو ننگا دیکھا تو ان کے سارے شہادت دور ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نہایت حسین و جمیل اور ہر قسم کے داغ اور عیب
سے پاک تھے۔ یوں اللہ تبارک و تعالیٰ نے معجزانہ طور پر پتھر کے ذریعے سے ان کی اس الزام اور شہبے سے براءت کر دی
جو بنی اسرائیل کی طرف سے ان پر کیا جاتا تھا (صحیح بخاری، کتاب الأنبیاء) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے
سے اہل ایمان کو سمجھایا جا رہا ہے کہ تم ہمارے پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بنی اسرائیل کی طرح ایذا
مت پہنچاؤ اور آپ ﷺ کی بابت ایسی بات مت کرو جسے سن کر آپ ﷺ قلق اور اضطراب محسوس کریں، جیسے ایک
موتے پر مال غنیمت کی تقسیم میں ایک شخص نے کہا کہ اس میں عدل و انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔ جب آپ ﷺ تک
یہ الفاظ پہنچے تو غضب ناک ہوئے حتیٰ کہ آپ ﷺ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا آپ ﷺ نے فرمایا ”موسیٰ علیہ السلام پر
اللہ کی رحمت ہو، انہیں اس سے کہیں زیادہ ایذا پہنچائی گئی، لیکن انہوں نے صبر کیا۔“ (بخاری، کتاب الأنبیاء،
مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب إعطاء المؤلفۃ قلوبہم علی الإسلام.....)

(۱) یعنی ایسی بات جس میں کجی اور انحراف ہو، نہ دھوکہ اور فریب۔ بلکہ سچ اور حق ہو۔ سَدِّیْنِدْ، تَسَدِّیْنِدْ السَّهْمِ سے
ہے، یعنی جس طرح تیر کو سیدھا کیا جاتا ہے تاکہ ٹھیک نشانے پر لگے۔ اسی طرح تمہاری زبان سے نکلی ہوئی بات اور
تمہارا کردار راستی پر مبنی ہو، حق و صداقت سے بال برابر انحراف نہ ہو۔

(۲) یہ تقویٰ اور قول سدید کا نتیجہ ہے کہ تمہارے عملوں کی اصلاح ہوگی اور مزید توفیق مرضیات سے نوازے جاؤ گے
اور کچھ کمی کو تہی رہ جائے گی، تو اسے اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا۔

(۳) جب اللہ تعالیٰ نے اہل اطاعت کا اجر و ثواب اور اہل معصیت کا وبال اور عذاب بیان کر دیا تو اب شرعی احکام اور
اس کی صعوبت کا تذکرہ فرما رہا ہے۔ امانت سے وہ احکام شرعیہ اور فرائض و واجبات مراد ہیں جن کی ادائیگی پر ثواب اور

إِنَّهٗ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝

لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ

وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ

وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

بڑا ہی ظالم جاہل ہے۔^(۱) (۷۲)

(یہ اس لیے) کہ اللہ تعالیٰ منافق مردوں عورتوں اور
مشرک مردوں عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں
عورتوں کی توبہ قبول فرمائے،^(۲) اور اللہ تعالیٰ بڑا ہی بخشنے
والا اور مہربان ہے۔ (۷۳)

سورہ سبأ کی ہے اور اس میں چون آیتیں اور
چھ رکوع ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

ان سے اعراض و انکار پر عذاب ہو گا۔ جب یہ تکالیف شرعیہ آسمان و زمین اور پہاڑوں پر پیش کی گئیں تو وہ ان کے اٹھانے سے ڈر گئے۔ لیکن جب انسان پر یہ چیز پیش کی گئی تو وہ اطاعت الہی (امانت) کے اجر و ثواب اور اس کی فضیلت کو دیکھ کر اس بارگراں کو اٹھانے پر آمادہ ہو گیا۔ احکام شرعیہ کو امانت سے تعبیر کر کے اشارہ فرما دیا کہ ان کی ادائیگی انسانوں پر اسی طرح واجب ہے، جس طرح امانت کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ پیش کرنے کا مطلب کیا ہے؟ اور آسمان و زمین اور پہاڑوں نے کس طرح اس کا جواب دیا؟ اور انسان نے اسے کس وقت قبول کیا؟ اس کی پوری کیفیت نہ ہم جان سکتے ہیں نہ اسے بیان کر سکتے ہیں۔ ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ نے اپنی ہر مخلوق میں ایک خاص قسم کا احساس و شعور رکھا ہے، گو ہم اس کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ تو ان کی بات سمجھنے پر قادر ہے، اس نے ضرور اس امانت کو ان پر پیش کیا ہو گا جسے قبول کرنے سے انہوں نے انکار کر دیا۔ اور یہ انکار انہوں نے سرکشی و بغاوت کی بنا پر نہیں کیا بلکہ اس میں یہ خوف کار فرما تھا کہ اگر ہم اس امانت کے تقاضے پورے نہ کر سکے تو اس کی سخت سزا ہمیں بھگتنی ہو گی۔ انسان چونکہ جلد باز ہے، اس نے عقوبت و تعزیر کے پہلو پر زیادہ غور نہیں کیا اور حصول فضیلت کے شوق میں اس زے داری کو قبول کر لیا۔

(۱) یعنی یہ بارگراں اٹھا کر اس نے اپنے نفس پر ظلم کا ارتکاب اور اس کے مقصدیات سے اعراض یا اس کی قدر و قیمت سے غفلت کر کے جمالت کا مظاہرہ کیا۔

(۲) اس کا تعلق حَمَلَهَا سے ہے یعنی انسان کو اس امانت کا ذمے دار بنانے سے مقصد یہ ہے کہ اہل نفاق و اہل شرک کا نفاق و شرک اور اہل ایمان کا ایمان ظاہر ہو جائے اور پھر اس کے مطابق انہیں جزا و سزا دی جائے۔

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے سزاوار ہیں جس کی ملکیت میں وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے^(۱) آخرت میں بھی تعریف اسی کے لیے ہے،^(۲) وہ (بڑی) حکمتوں والا اور (پورا) خبردار ہے۔^(۱) جو زمین میں جائے^(۳) اور جو اس سے نکلے جو آسمان سے اترے^(۳) اور جو چڑھ کر اس میں جائے^(۵) وہ سب سے باخبر ہے۔ اور وہ مہربان نہایت بخشش والا ہے۔^(۲) کفار کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہیں آئیگی۔ آپ کہہ دیجئے! کہ مجھے میرے رب کی قسم! جو عالم الغیب ہے کہ وہ یقیناً تم پر آئے گی^(۱) اللہ تعالیٰ سے ایک ذرے کے برابر کی چیز بھی پوشیدہ نہیں^(۷) نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں بلکہ اس سے بھی چھوٹی اور بڑی ہر چیز کھلی

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَلَهُ
الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْحَمِيْدُ ①

يَعْلَمُ مَا يَلِيْجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ
مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَصْرِعُ فِيْهَا وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ②

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَأْتِيْنَا السَّاعَةُ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي
لَتَأْتِيَنَّكُمْ عَلٰمُ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي
السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَا اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْبَرُ اِلَّا
فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ③

(۱) یعنی اسی کی ملکیت اور تصرف میں ہے، اسی کا ارادہ اور فیصلہ اس میں نافذ ہوتا ہے۔ انسان کو جو نعمت بھی ملتی ہے، وہ اسی کی پیدا کردہ ہے اور اسی کا احسان ہے، اسی لیے آسمان و زمین کی ہر چیز کی تعریف دراصل ان نعمتوں پر اللہ ہی کی حمد و تعریف ہے جن سے اس نے اپنی مخلوق کو نوازا ہے۔

(۲) یہ تعریف قیامت والے دن اہل ایمان کریں گے مثلاً ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِيْ صَدَقْتَنَا وَوَعَدَنَا﴾ (سورۃ الزمر۔ ۷۳) ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِيْ هَدٰنَا لِهٰذَا﴾ (سورۃ الأعراف۔ ۳۳) ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِيْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ﴾ (فاطر۔ ۳۴) وَغَيْرَهَا مِنَ الْاٰیٰتِ تَاہِمِ دُنْيَا مِیْلِ اللّٰهِ كِیْ حَمْدِ وَتَعْرِیْفِ عِبَادَتِ هِیْ جِس كَا مَكْلَفِ اِنْسَانِ كُو بِنَایَا گِیَا هِیْ اَوْر اٰخِرَتِ مِیْلِ یِهْ اِہْلِ اِیْمَانِ كِی رُوْحَانِی خُوْرَاكِ هُوْگِیْ جِس سِے اِنْسِیْلِ لَذتِ وَفِرْحَتِ مَحْسُوسِ هُوَا كِرِے گِی۔ (فتح القدیر)

(۳) مثلاً بارش، خزانہ اور دینہ وغیرہ۔

(۴) بارش، اولے، گرج، بجلی اور برکات الہی وغیرہ، نیز فرشتوں اور آسمانی کتابوں کا نزول۔

(۵) یعنی فرشتے اور بندوں کے اعمال۔

(۶) قسم بھی کھائی اور صیغہ بھی تاکید کا اور اس پر مزید لام تاکید یعنی قیامت کیوں نہیں آئے گی؟ وہ تو ہر صورت یقیناً آئے گی۔

(۷) لَا یَعْزُبُ، غائب اور پوشیدہ اور دور نہیں۔ یعنی جب آسمان و زمین کا کوئی ذرہ اس سے غائب اور پوشیدہ نہیں، تو پھر تمہارے اجزائے منتشرہ کو، جو مٹی میں مل گئے ہوں گے، جمع کر کے دوبارہ تمہیں زندہ کر دینا کیوں ناممکن ہو گا؟

کتاب میں موجود ہے۔^(۱) (۳)

تاکہ وہ ایمان والوں اور نیکو کاروں کو بھلا بدلہ عطا فرمائے،^(۲) یہی لوگ ہیں جن کے لیے مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔ (۴)

اور ہماری آیتوں کو نچا دکھانے کی جنموں نے کوشش کی ہے^(۳) یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے۔ (۵)

اور جنہیں علم ہے وہ دیکھ لیں گے کہ جو کچھ آپ کی جانب آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے وہ (سراسر) حق^(۴) ہے اور اللہ غالب خوبیوں والے کی راہ کی رہبری کرتا ہے۔^(۵) (۶)

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ
مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَرِيمٌ ۝

وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي الْبَيْتِ الْمُبِينِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
مِّنْ رَّجْزٍ أَلِيمٌ ۝

وَيَرَى الَّذِينَ أَذْنَبُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ
هُوَ الْحَقُّ يُؤْتِيهِ إِلَىٰ صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝

(۱) یعنی وہ لوح محفوظ میں موجود اور درج ہے۔

(۲) یہ وقوع قیامت کی علت ہے یعنی قیامت اس لیے برپا ہوگی اور تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ اس لیے دوبارہ زندہ فرمائے گا کہ وہ نیکوں کو ان کی نیکیوں کی جزا عطا فرمائے، کیونکہ جزا کے لیے ہی اس نے یہ دن رکھا ہے۔ اگر یہ یوم جزا نہ ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہو گا کہ نیک و بد دونوں یکساں ہیں۔ اور یہ بات عدل و انصاف کے قطعاً منافی اور بندوں بالخصوص نیکوں پر ظلم ہو گا۔ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ۔

(۳) یعنی ہماری ان آیتوں کے بطلان اور تکذیب کی جو ہم نے اپنے پیغمبروں پر نازل کیں۔ مُعْجِزِينَ، یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم ان کی گرفت سے عاجز ہوں گے، کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد جب ہم مٹی میں مل جائیں گے تو ہم کس طرح دوبارہ زندہ ہو کر کسی کے سامنے اپنے کیے دھرے کی جواب دہی کریں گے؟ ان کا یہ سمجھنا گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمارا مؤاخذہ کرنے پر قادر ہی نہیں ہو گا، اس لیے قیامت کا خوف ہمیں کیوں ہو؟

(۴) یہاں روایت سے مراد روایت قلبی یعنی علم یقینی ہے، محض روایت بصری (آنکھ کا دیکھنا) نہیں۔ اہل علم سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، یا مومنین اہل کتاب یا تمام ہی مومنین ہیں یعنی اہل ایمان اس بات کو جانتے اور اس پر یقین رکھتے ہیں۔

(۵) یہ عطف ہے حق پر، یعنی وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ قرآن کریم اس راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو اس اللہ کا راستہ ہے جو کائنات میں سب پر غالب ہے اور اپنی مخلوق میں محمود (قابل تعریف) ہے۔ اور وہ راستہ کیا ہے؟ توحید کا راستہ جس کی طرف تمام انبیا علیہم السلام اپنی اپنی قوموں کو دعوت دیتے رہے۔

اور کافروں نے کہا ^(۱) (آؤ) ہم تمہیں ایک ایسا شخص بتلائیں ^(۲) جو تمہیں یہ خبر پہنچا رہا ہے ^(۳) کہ جب تم بالکل ہی ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو تم پھر سے ایک نئی پیدائش میں آؤ گے۔ ^(۴) (۷)

(ہم نہیں کہہ سکتے) کہ خود اس نے (ہی) اللہ پر جھوٹ باندھ لیا ہے یا اسے دیوانگی ہے ^(۵) بلکہ (حقیقت یہ ہے) کہ آخرت پر یقین نہ رکھنے والے ہی عذاب میں اور دور کی گمراہی میں ہیں۔ ^(۶) (۸)

کیا پس وہ اپنے آگے پیچھے آسمان و زمین کو دیکھ نہیں رہے ہیں؟ ^(۷) اگر ہم چاہیں تو انہیں زمین میں دھنسا دیں یا ان پر

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُبَشِّرُكُمْ
إِذَا مَرِضْتُمْ كَمَا يُبَشِّرُكُمْ لَئِي خَلِقَ خَلْقًا جَدِيدًا ۝

أَفَتَدْرِي عَلَىٰ اللَّهِ كَيْدًا بِأَمْرِهِ إِنَّهُ يُبَشِّرُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ
بِالْآخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالسَّلْبِ الْبَعِيدِ ۝

أَفَلَمْ يَرَوْا لِلَّهِ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَوَأَخْلَفَهُمُ مِنَ السَّمَاءِ
وَالْأَرْضِ إِنَّهُمْ لَشَائِقِيْمٌ بِهِمُ الْأَرْضَ وَأَوْسَقَطُ عَلَيْهِمْ كَيْفًا

(۱) یہ اہل ایمان کے مقابلے میں منکرین آخرت کا قول ہے جو آپس میں انہوں نے ایک دوسرے سے کہا۔

(۲) اس سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو ان کی طرف اللہ کے نبی بن کر آئے تھے۔

(۳) یعنی عجب و غریب خبر، ناقابل فہم خبر۔

(۴) یعنی مرنے کے بعد جب تم مٹی میں مل کر ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے، تمہارا ظاہری وجود ناپید ہو جائے گا، تمہیں قبروں سے دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور دوبارہ وہی شکل و صورت تمہیں عطا کر دی جائے گی جس میں تم پہلے تھے۔ یہ گفتگو انہوں نے آپس میں استہزا اور مذاق کے طور پر کی۔

(۵) یعنی دو باتوں میں سے ایک بات تو ضرور ہے، کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے اور اللہ کی طرف سے وحی و رسالت کا دعویٰ ہے، اس کا اللہ پر افترا ہے۔ یا پھر اس کا دماغ چل گیا ہے اور دیوانگی میں ایسی باتیں کر رہا ہے جو غیر معقول ہیں۔

(۶) اللہ تعالیٰ نے فرمایا، بات اس طرح نہیں ہے، جس طرح یہ گمان کر رہے ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ عقل و فہم اور ادراک حقائق سے یہی لوگ قاصر ہیں، جس کی وجہ سے یہ آخرت پر ایمان لانے کے بجائے اس کا انکار کر رہے ہیں، جس کا نتیجہ آخرت کا دائمی عذاب ہے اور یہ آج ایسی گمراہی میں مبتلا ہیں جو حق سے غایت درجہ دور ہے۔

(۷) یعنی اس پر غور نہیں کرتے؟ اللہ تعالیٰ ان کی زبردستی تو بخ کرتے ہوئے فرما رہا ہے کہ آخرت کا یہ انکار، آسمان و زمین کی پیدائش میں غور و فکر نہ کرنے کا نتیجہ ہے، ورنہ جو ذات آسمان جیسی چیز، جس کی بلندی اور وسعت ناقابل بیان ہے اور زمین جیسی چیز، جس کا طول و عرض بھی ناقابل فہم ہے، پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے لیے اپنی ہی پیدا کردہ چیز کا دوبارہ پیدا کر دینا اور اسے دوبارہ اسی حالت میں لے آنا، جس میں وہ پہلے تھے، کیوں کر ناممکن ہے؟

آسمان کے ٹکڑے گرا دیں،^(۱) یقیناً اس میں پوری دلیل ہے
 ہر اس بندے کے لیے جو (دل سے) متوجہ ہو۔ (۹)
 اور ہم نے داود پر اپنا فضل کیا،^(۲) اے پہاڑو! اس کے ساتھ
 رغبت سے تسبیح پڑھا کرو اور پرندوں کو بھی^(۳) (یہی حکم
 ہے) اور ہم نے اس کے لیے لوہا نرم کر دیا۔^(۴) (۱۰)
 کہ تو پوری پوری زرہیں بنا^(۵) اور جوڑوں میں اندازہ
 رکھ^(۶) تم سب نیک کام کیا کرو۔^(۷) (یقین مانو) کہ میں

مِنَ السَّمَاوَاتِ فِي ذَلِكَ لآيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ۝

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَمُوسَىٰ قَصْدًا لِّيُبَيِّنَ لِقَوْمِهِمْ وَأَلطِّبِيهِمْ
 وَالنَّكَالَةَ الْحَدِيدَ ۝

أَنْ أَعْمَلَ سَلِيبًا وَقَدَّرَ فِي السَّرْوِ وَأَعْمَلُوا صَالِحًا

(۱) یعنی یہ آیت دو باتوں پر مشتمل ہے، ایک اللہ کے کمال قدرت کا بیان جو ابھی مذکور ہوا، دوسری کفار کے لیے
 تمہید و تہدید کہ جو اللہ آسمان و زمین کی تخلیق پر اس طرح قادر ہے کہ ان پر اور ان کے مابین ہر چیز پر اس کا تصرف
 اور غلبہ ہے، وہ جب چاہے ان پر اپنا عذاب بھیج کر ان کو تباہ کر سکتا ہے۔ زمین میں دھنسا کر بھی، جس طرح قارون کو
 دھنسا یا آسمان کے ٹکڑے گرا کر، جس طرح اصحاب الایکہ کو ہلاک کیا گیا۔

(۲) یعنی نبوت کے ساتھ بادشاہت اور کئی امتیازی خوبیوں سے نوازا۔

(۳) ان میں سے ایک حسن صوت کی نعمت تھی، جب وہ اللہ کی تسبیح پڑھتے تو پتھر کے ٹھوس پہاڑ بھی تسبیح خوانی میں مصروف ہو
 جاتے، اڑتے پرندے ٹھہر جاتے اور زمزمہ خواں ہو جاتے آدینے کے معنی ہیں تسبیح دہراؤ۔ یعنی پہاڑوں اور پرندوں کو ہم نے
 کہا، چنانچہ یہ بھی داود علیہ السلام کے ساتھ مصروف تسبیح ہو جاتے وَالطَّبِيْرَ كَاعْطَفَ يَاجِبَالُ اس لیے کہ جِبَالُ
 تقدیر منصوب ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے نَادَيْنَا الْجِبَالَ وَالطَّبِيْرَ (ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو پکارا) یا پھر اس کا
 عطف فضلاً پر ہے اور معنی ہوں گے وَسَخَّرْنَا لَهُ الطَّبِيْرَ (اور ہم نے پرندے ان کے تابع کر دیئے)۔ (فتح القدر)

(۴) یعنی لوہے کو آگ میں تپائے اور ہتھوڑی سے کوٹے بغیر، اسے موم، گوندھے ہوئے آٹے اور گیلی مٹی کی طرح،
 جس طرح چاہتے موڑ لیتے، بٹ لیتے اور جو چاہتے بنا لیتے۔

(۵) سَابِغَاتٍ محذوف موصوف کی صفت ہے دُرُوْعًا سَابِغَاتٍ یعنی پوری لمبی زرہیں، جو لڑنے والے کے پورے جسم
 کو صحیح طریقے سے ڈھانک لیں اور اسے دشمن کے وار سے محفوظ رکھیں۔

(۶) ناکہ چھوٹی بڑی نہ ہوں، یا سخت یا نرم نہ ہوں یعنی کڑیوں کے جوڑنے میں کیل اتنے باریک نہ ہوں کہ جو حرکت
 کرتے رہیں اور ان میں قرار و ثبات نہ آئے اور نہ اتنے موٹے ہوں کہ اسے توڑ ہی ڈالیں یا جس سے حلقہ تنگ ہو
 جائے اور اسے پہنانا نہ جاسکے۔ یہ زرہ بانی کی صنعت کے بارے میں حضرت داود علیہ السلام کو ہدایات دی گئیں۔

(۷) یعنی ان نعمتوں کے بدلے میں عمل صالح کا اہتمام کرو تاکہ میرا عملی شکر بھی ہوتا رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس

تمہارے اعمال دیکھ رہا ہوں۔ (۱۱)

اور ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا کہ صبح کی منزل اس کی مہینہ بھر کی ہوتی تھی اور شام کی منزل بھی (۱) اور ہم نے ان کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا۔ (۲) اور اس کے رب کے حکم سے بعض جنات اس کی ماتحتی میں اس کے سامنے کام کرتے تھے اور ان میں سے جو بھی ہمارے حکم سے سر تابی کرے ہم اسے بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ (۳) (۱۳)

جو کچھ سلیمان چاہتے وہ جنات تیار کر دیتے مثلاً قلعے اور مجتے اور حوضوں کے برابر لگن اور چولہوں پر جہی ہوئی مضبوط دیکھیں، (۴) اے آل داود اس کے شکر یہ میں نیک

إِنِّي بَمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ①

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَزَاذًا مِّنْهُ وَرَوَّا حِمَا سَهْرًا ۚ وَاسْلَمْنَا لَهُ
عَيْنَ الْقَطْرِ وَوَمِنَ الْجِبْنَ مَنْ يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَمَنْ
يَبْغِزْهُمْ نُفَعْنَا عَنْ أَمْوَالِنَا فَهُوَ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ ②

يَعْمَلُونَ لَكُم مَّا يَشَاءُونَ مِنْ مَّحَارِبٍ وَتَمَاثِيلَ وَصِفَانَ كَالْجَوَابِ
وَعُدُوذٍ لِّسَيْتِ إِعْمَالِ دَاوُدَ شُكْرًا ۚ وَكَلِيلٍ مِّنْ

کو اللہ تعالیٰ دنیوی نعمتوں سے سرفراز فرمائے، اسے اسی حساب سے اللہ کا شکر بھی ادا کرنا چاہیے اور شکر میں بنیادی چیز یہی ہے کہ منعم کو راضی رکھنے کی بھرپور سعی کی جائے یعنی اس کی اطاعت کی جائے۔ اور نافرمانی سے بچا جائے۔

(۱) یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام مع اعیان سلطنت اور لشکر، تخت پر بیٹھ جاتے، اور جدھر آپ کا حکم ہوتا ہوا نہیں اسے اتنی رفتار سے لے جاتیں کہ ایک مہینے جتنی مسافت، صبح سے دوپہر تک کی ایک منزل میں طے ہو جاتی اور پھر اسی طرح دوپہر سے رات تک، ایک مہینے جتنی مسافت طے ہو جاتی۔ اس طرح ایک دن میں دو مہینوں کی مسافت طے ہو جاتی۔

(۲) یعنی جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا نرم کر دیا گیا تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے تانبے کا چشمہ ہم نے جاری کر دیا تاکہ تانبے کی دھات سے وہ جو چاہیں، بنا سکیں۔

(۳) اکثر مفسرین کے نزدیک یہ سزا قیامت والے دن دی جائے گی۔ لیکن بعض کے نزدیک یہ دنیوی سزا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ مقرر فرما دیا تھا جس کے ہاتھ میں آگ کا سونٹا ہوا تھا۔ جو جن حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے سر تابی کرتا، فرشتہ وہ سونٹا اسے مارتا، جس سے وہ جل کر بھسم ہو جاتا۔ (فتح القدیر)

(۴) مَحَارِبٌ، مِخْرَابٌ کی جمع ہے، بلند جگہ یا اچھی عمارت، مطلب ہے بلند محلات، عالی شان عمارتیں یا مساجد و معابد تَمَائِيلُ، تَمَائِيلُ کی جمع ہے، تصویر۔ یہ تصویریں غیر حیوان چیزوں کی ہوتی تھیں، بعض کہتے ہیں کہ انبیا و صلحا کی تصاویر مسجدوں میں بنائی جاتی تھیں تاکہ انہیں دیکھ کر لوگ بھی عبادت کریں۔ یہ معنی اس صورت میں صحیح ہے جب تسلیم کیا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں تصویر سازی کی اجازت تھی۔ جو صحیح نہیں۔ تاہم اسلام میں تو

عِبَادِي السَّكُورِ ①

عمل کرو، میرے بندوں میں سے شکر گزار بندے کم ہی ہوتے ہیں۔ (۱۳)

پھر جب ہم نے ان پر موت کا حکم بھیج دیا تو ان کی خبر جنت کو کسی نے نہ دی سوائے گھن کے کیڑے کے جو ان کی عصا کو کھا رہا تھا۔ پس جب (سلیمان) گر پڑے اس وقت جنوں نے جان لیا کہ اگر وہ غیب دان ہوتے تو اس زلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔^(۱) (۱۳)

قوم سب کے لیے اپنی بستیوں میں (قدرت الہی کی) نشانی تھی^(۲) ان کے دائیں بائیں دو باغ تھے^(۳) (ہم نے ان

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّو كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِئُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ②

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكِنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالِهِ

نمایت تھی کے ساتھ اس کی ممانعت ہے۔ جَفَانٌ، جَفَنَةٌ کی جمع ہے، لگن جَوَابٌ، جَابِيَةٌ کی جمع ہے، حوض، جس میں پانی جمع کیا جاتا ہے۔ یعنی حوض جتنے بڑے بڑے لگن، قُدُوْرٌ دیکھیں، رَاسِيَاتٌ جمی ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دیکھیں پہاڑوں کو تراش کر بنائی جاتی تھیں۔ جنہیں ظاہر ہے اٹھا کر ادھر ادھر نہیں لے جایا جاسکتا تھا، اس میں بیک وقت ہزاروں افراد کا کھانا پک جاتا تھا۔ یہ سارے کام جنت کرتے تھے۔

(۱) حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جنت کے بارے میں مشہور ہو گیا تھا کہ یہ غیب کی باتیں جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کے ذریعے سے اس عقیدے کے فساد کو واضح کر دیا۔

(۲) سَبَابٌ، وہی قوم تھی، جس کی ملکہ سب مشہور ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں مسلمان ہو گئی تھی۔ قوم ہی کے نام پر ملک کا نام بھی سب تھا، آج کل یمن کے نام سے یہ علاقہ معروف ہے۔ یہ بڑا خوش حال ملک تھا، یہ ملک بری و بحری تجارت میں بھی ممتاز تھا اور زراعت و باغبانی میں بھی نمایاں۔ اور یہ دونوں ہی چیزیں کسی ملک اور قوم کی خوش حالی کا باعث ہوتی ہیں۔ اسی مال و دولت کی فراوانی کو یہاں قدرت الہی کی نشانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۳) کہتے ہیں کہ شہر کے دونوں طرف پہاڑ تھے، جن سے چشموں اور نالوں کا پانی بہہ بہہ کر شہر میں آتا تھا، ان کے حکمرانوں نے پہاڑوں کے درمیان پٹھے تعمیر کر دیئے اور ان کے ساتھ باغات لگا دیئے گئے، جس سے پانی کا رخ بھی متعین ہو گیا اور باغوں کو بھی سیرابی کا ایک قدرتی ذریعہ میسر آ گیا۔ انہی باغات کو، دائیں بائیں دو باغوں، سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں، جَنَّتَيْنِ سے دو باغ نہیں، بلکہ دائیں بائیں کی دو جنتیں مراد ہیں اور مطلب باغوں کی کثرت ہے کہ جدھر نظر اٹھا کر دیکھیں، باغات، ہریالی اور شادابی ہی نظر آتی تھی۔ (فتح القدیر)

کو حکم دیا تھا کہ) اپنے رب کی دی ہوئی روزی کھاؤ^(۱)
اور اس کا شکر ادا کرو،^(۲) یہ عمدہ شہر^(۳) اور وہ بخشے والا
رب ہے۔^(۴) (۱۵)

لیکن انہوں نے روگردانی کی تو ہم نے ان پر زور کے
سیلاب (کاپانی) بھیج دیا اور ہم نے ان کے (ہرے بھرے)
باغوں کے بدلے دو (ایسے) باغ دیئے جو بد مزہ میووں
والے اور (بکثرت) جھاؤ اور کچھ پیری کے درختوں والے
تھے۔^(۵) (۱۶)

ہم نے ان کی ناشکری کا یہ بدلہ انہیں دیا۔ ہم (ایسی) سخت
سزا بڑے بڑے ناشکروں ہی کو دیتے ہیں۔ (۱۷)
اور ہم نے ان کے اور ان بستیوں کے درمیان جن میں
ہم نے برکت دے رکھی تھی چند بستیاں اور (آباد) رکھی

كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ بَلَدًا طَيِّبَةً وَرَبِّ
عَفُورٌ ۝

فَاعْرَضُوا فَاذْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ
جَنَّتَيْنِ ذَوَاتِ اٰكُلٍ حَمِيْطٍ وَاَنْثِلْ وَاَنْثِلْ وَاَنْثِلْ ۝

ذٰلِكَ جَزٰۤءُ بٰۤءِ كَفْرًا وَاَهْلَ اٰلِ الْكَفُوْرِ ۝

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرٰى الَّتِي بَرَكْنَا فِيْهَا قُرٰى ظٰلِمَةً

(۱) یہ ان کے پیغمبروں کے ذریعے سے کھلوا یا گیا مطلب ان نعمتوں کا بیان ہے، جن سے ان کو نوازا گیا تھا۔

(۲) یعنی منعم و محسن کی اطاعت کرو اور اس کی نافرمانی سے اجتناب۔

(۳) یعنی باغوں کی کثرت اور پھلوں کی فراوانی کی وجہ سے یہ شہر عمدہ ہے۔ کہتے ہیں کہ آب و ہوا کی عمدگی کی وجہ سے یہ
شہر کھسی، مچھر اور اس قسم کے دیگر موذی جانوروں سے بھی پاک تھا؛ واللہ اعلم۔

(۴) یعنی اگر تم رب کا شکر کرتے رہو گے تو وہ تمہارے گناہ بھی معاف فرمادے گا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ انسان
توبہ کرتے رہیں تو پھر گناہ ہلاکت عام اور سلب انعام کا سبب نہیں بنتے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ عفو و درگزر سے کام لیتا ہے۔

(۵) یعنی انہوں نے پہاڑوں کے درمیان پشتے اور بند تعمیر کر کے پانی کی جو رکاوٹ کی تھی اور اسے زراعت و باغبانی کے
کام میں لاتے تھے، ہم نے تند و تیز سیلاب کے ذریعے سے ان بندوں اور پشتوں کو توڑ ڈالا اور شاداب اور پھل دار باغوں
کو ایسے باغوں سے بدل دیا جن میں صرف قدرتی جھاڑ جھکاڑ ہوتے ہیں؛ جن میں اول تو کوئی پھل لگتا ہی نہیں اور کسی
میں لگتا بھی ہے تو سخت کڑوا؛ کیسلا اور بد مزہ جنہیں کوئی کھا ہی نہیں سکتا۔ البتہ کچھ پیری کے درخت تھے جن میں بھی
کانٹے زیادہ اور بکیر تھے عَرِمٌ، عَرِمَةٌ کی جمع ہے، پشتے یا بند۔ یعنی ایسا زور کاپانی بھیجا جس نے اس بند میں شکاف ڈال دیا
اور پانی شہر میں بھی آگیا، جس سے ان کے مکانات ڈوب گئے اور باغوں کو بھی اجاڑ کر ویران کر دیا۔ یہ بند سد مارب کے
نام سے مشہور ہے۔

تھیں جو برسر راہ ظاہر تھیں،^(۱) اور ان میں چلنے کی منزلیں مقرر کر دی تھیں^(۲) ان میں راتوں اور دنوں کو بہ امن و امان چلتے پھرتے رہو۔^(۳) (۱۸)

لیکن انہوں نے پھر کہا کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے سفر دور دراز کر دے^(۴) چونکہ خود انہوں نے اپنے ہاتھوں اپنا برا کیا اس لیے ہم نے انہیں (گزشتہ) فسانوں کی صورت میں کر دیا^(۵) اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیئے،^(۶) بلاشبہ ہر ایک صبر و شکر کرنے والے کے لیے

وَقَدَرْنَا فِيهَا السَّبِيحَ وَيُؤَدِّيهِمَا إِلَيْنَا يَا أَيُّهَا الْمُنِيرِينَ ۝

فَقَالُوا رَبَّنَا بَعْدَ بَيِّنَاتِنَا أَضَلُّنَا وَأَعْمَأُنَا فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمُزَقِّنَهُمْ كُلَّ مُسَوِّقٍ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَكَلِمَةً لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ۝

(۱) برکت والی بستیوں سے مراد شام کی بستیاں ہیں۔ یعنی ہم نے ملک سبا (یمن) اور شام کے درمیان لب سزک بستیاں آباد کی ہوئی تھیں، بعض نے ظاہرۃ کے معنی مِتَوَاصِلَةً، ایک دوسرے سے پوسٹ اور مسلسل کے کیے ہیں۔ مفسرین نے ان بستیوں کی تعداد ۴ ہزار سات سو بتلائی ہے۔ یہ ان کی تجارتی شاہراہ تھی جو مسلسل آباد تھی، جس کی وجہ سے ایک تو ان کے کھانے پینے اور آرام کرنے کے لیے زادراہ ساتھ لینے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ دوسرے، ویرانی کی وجہ سے لوٹ مار اور قتل و غارت کا جو اندیشہ ہوتا ہے، وہ نہیں ہوتا تھا۔

(۲) یعنی ایک آبادی سے دوسری آبادی کا فاصلہ متعین اور معلوم تھا، اور اس کے حساب سے وہ بہ آسانی اپنا سفر طے کر لیتے تھے۔ مثلاً صبح سفر کا آغاز کرتے تو دوپہر تک کسی آبادی اور قریے تک پہنچ جاتے، وہاں کھاپی کر قیلولہ کرتے اور پھر سرگرم سفر ہو جاتے تو رات کو کسی آبادی میں جا بچتے۔

(۳) یہ ہر قسم کے خطرے سے محفوظ اور زادراہ کی مشقت سے بے نیاز ہونے کا بیان ہے کہ رات اور دن کی جس گھڑی میں تم سفر کرنا چاہو، کرو نہ جان و مال کا کوئی اندیشہ نہ راستے کے لیے سامان سفر ساتھ لینے کی ضرورت۔

(۴) یعنی جس طرح لوگ سفر کی صعوبتوں، خطرات اور موسم کی شدتوں کا تذکرہ کرتے ہیں، ہمارے سفر بھی اسی طرح دور دور کر دے، مسلسل آبادیوں کے بجائے درمیان میں سنسان و ویران جنگلات اور صحراؤں سے ہمیں گزرنا پڑے، گرمیوں میں دھوپ کی شدت اور سردیوں میں سختی ہو جائے، ہمیں پریشان کریں اور راستے میں بھوک اور پیاس اور موسم کی سختیوں سے بچنے کے لیے ہمیں زادراہ کا بھی انتظام کرنا پڑے۔ ان کی یہ دعا اسی طرح کی ہے، جیسے بنی اسرائیل نے من و سلویٰ اور دیگر سولتوں کے مقابلے میں دالوں اور سبزیوں وغیرہ کا مطالبہ کیا تھا۔ یا پھر زبان حال سے ان کی یہ دعا تھی۔

(۵) یعنی انہیں اس طرح تاپید کیا کہ ان کی ہلاکت کا قصہ زبان زد خلق ہو گیا۔ اور مجلسوں اور محفلوں کا موضوع گفتگو بن گیا۔

(۶) یعنی انہیں متفرق اور منتشر کر دیا، چنانچہ سبائیں آباد مشہور قبیلے مختلف جگہوں پر جا آباد ہوئے، کوئی ٹیڑب و مکہ آیا،

اس (ماجرے) میں بہت سی عبرتیں ہیں۔ (۱۹)
اور شیطان نے ان کے بارے میں اپنا گمان سچا کر دکھایا یہ
لوگ سب کے سب اس کے تابعدار بن گئے سوائے
مومنوں کی ایک جماعت کے۔ (۲۰)

شیطان کا ان پر کوئی زور (اور دباؤ) نہ تھا مگر اس لیے کہ
ہم ان لوگوں کو جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ظاہر کر دیں
ان لوگوں میں سے جو اس سے شک میں ہیں۔ اور آپ کا
رب (ہر چیز پر نگہبان ہے۔ (۲۱)

کہہ دیجئے! کہ اللہ کے سوا جن جن کا تمہیں گمان ہے
(سب) کو پکار لو،^(۱) نہ ان میں سے کسی کو آسمانوں اور
زمینوں میں سے ایک ذرہ کا اختیار ہے^(۲) نہ ان کا ان
میں کوئی حصہ ہے^(۳) نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار
ہے۔^(۴) (۲۲)

شفاعت (سفرارش) بھی اس کے پاس کچھ نفع نہیں دیتی
بجز ان کے جن کے لیے اجازت ہو جائے۔^(۵) یہاں تک
کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کر دی جاتی ہے

وَلَقَدْ صَدَقَ عَلَيْهِمْ اٰیٰتُنَا فَانْتَبَهُوا۟ اِلَّا قَرِيۡنًا
مِّنَ الْمُؤْمِنِيۡنَ ﴿۲۰﴾

وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُؤْمِنُ
بِالْآخِرَةِ وَمَنْ هُوَ مِنْهَا فِيۡ شَكٍّ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ حٰفِیظٌ ﴿۲۱﴾

قُلْ اَدْعُوۡا الَّذِيۡنَ رَعٰىتُمْ مِّنْ دُوۡنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوۡنَ وِثْقَالَ
ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِیۡهَا مِنْ شَرِّ لِّدِ
وَمَا لَهُ مِنْهُم مِّنْ ظٰلِمٍ ﴿۲۲﴾

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنۡدَہٗ اِلَّا لِمَنۡ اٰذِنَ لَہٗ حَتّٰی اِذَا فُزِعَ
عَنۡ قُلُوۡبِهِمۡ قَالُوۡا مَاۤ اِذَا قَالُ رَبُّکُمْ قَالُوۡا الْحَمْدُ وَہُوَ الْعَلِیُّ

کوئی شام کے علاقے میں چلا گیا کوئی کہیں اور کوئی کہیں۔

(۱) یعنی معبود ہونے کا۔ یہاں زَعَمْتُمْ کے دو مفعول محذوف ہیں۔ زَعَمْتُمْوَهُم اِلٰہَةٌ، یعنی جن جن کو تم معبود گمان کرتے ہو۔

(۲) یعنی انہیں نہ خیر پر کوئی اختیار ہے نہ شر پر۔ کسی کو فائدہ پہنچانے کی قدرت ہے، نہ نقصان سے بچانے کی۔ آسمان و زمین کا ذکر عموم کے لیے ہے، کیوں کہ تمام خارجی موجودات کے لیے یہی طرف ہیں۔

(۳) نہ پیدائش میں، نہ ملکیت میں اور نہ تصرف میں۔

(۴) جو کسی معاملے میں بھی اللہ کی مدد کرتا ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی بلا شرکت غیرے تمام اختیارات کا مالک ہے اور کسی کے تعاون کے بغیر ہی سارے کام کرتا ہے۔

(۵) ”جن کے لیے اجازت ہو جائے“ کا مطلب ہے انبیا اور ملائکہ وغیرہ یعنی یہی سفارش کر سکیں گے، کوئی اور نہیں۔ اس لیے کہ کسی اور کی سفارش فائدے مند ہی ہوگی، نہ انہیں اجازت ہی ہوگی۔ دوسرا مطلب ہے، مستحقین شفاعت۔

تو پوچھتے ہیں تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ جواب دیتے ہیں کہ حق فرمایا ^(۱) اور وہ بلند و بالا اور بہت بڑا ہے۔ (۲۳)

پوچھئے کہ تمہیں آسمانوں اور زمین سے روزی کون پہنچاتا ہے؟ (خود) جواب دیجئے! کہ اللہ تعالیٰ - (سنو) ہم یا تم - یا تو یقیناً ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں ہیں؟ ^(۲) (۲۴)

کہہ دیجئے! کہ ہمارے کیے ہوئے گناہوں کی بابت تم سے کوئی سوال نہ کیا جائے گا نہ تمہارے اعمال کی باز پرس ہم سے کی جائے گی۔ (۲۵)

انہیں خبر دے دیجئے کہ ہم سب کو ہمارا رب جمع کر کے پھر ہم میں سچے فیصلے کر دے گا۔ ^(۳) وہ فیصلے چکانے والا

الْكَبِيرُ ۝

فَلَمَنْ يَرْزُقْكُمْ مِنَ السَّمَوتِ وَالْأَرْضِ قُلِ اللهُ وَ إِنَّا أَوْلِيَاكُمْ لَعَلَّ هُدًى آؤفِي صَلَاتِ مُبِينٍ ۝

فَلَا تَسْتَسْتَوُونَ عَمَّا أَجْمَعُوا وَالَّذِينَ تَسْتَعْتُونَ ۝

فَلْيَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبَّنَا ثُمَّ يَفْتَحْ بَيْنَنَا لِنُحِقِّ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ ۝

یعنی انبیاء علیہم السلام و ملائکہ اور صالحین صرف انہی کے حق میں سفارش کر سکیں گے جو مستحقین شفاعت ہوں گے کیوں کہ اللہ کی طرف سے انہی کے حق میں سفارش کرنے کی اجازت ہوگی، کسی اور کے لیے نہیں۔ (فتح القدیر) مطلب یہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام، ملائکہ اور صالحین کے علاوہ وہاں کوئی سفارش نہیں کر سکے گا اور یہ حضرات بھی سفارش اہل ایمان گناہ گاروں کے لیے ہی کر سکیں گے، کافر و مشرک اور اللہ کے باغیوں کے لیے نہیں۔ قرآن کریم نے دوسرے مقام پر ان دونوں نکتوں کی وضاحت فرمادی ہے۔ ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَآلَاٰلِهَادِيْنَ؟﴾ (البقرہ - ۲۵۵) اور ﴿وَلَا يَشْفَعُونَ اِلَّا لِيَعْنِ اِذْ تَقْضٰى﴾ (الانبیاء - ۲۸)

(۱) اس کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ ابن جریر اور ابن کثیر نے حدیث کی روشنی میں اس کی یہ تفسیر بیان کی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی امر کی بابت کلام (وحی) فرماتا ہے تو آسمان پر موجود فرشتے ہیبت اور خوف سے کانپ اٹھتے ہیں اور ان پر بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ہوش آنے پر وہ پوچھتے ہیں تو عرش بردار فرشتے دوسرے فرشتوں کو، اور وہ اپنے سے نیچے والے فرشتوں کو بتلاتے ہیں اور اس طرح خبر پہلے آسمان کے فرشتوں تک پہنچ جاتی ہے۔ (ابن کثیر) فزع میں سلب ناخذ ہے یعنی جب گھبراہٹ دور کر دی جاتی ہے۔

(۲) ظاہر بات ہے گمراہی پر وہی ہو گا جو ایسی چیزوں کو معبود سمجھتا ہے جن کا آسمان و زمین سے روزی پہنچانے میں کوئی حصہ نہیں ہے، نہ وہ بارش برسا سکتے ہیں، نہ کچھ اگا سکتے ہیں۔ اس لیے حق پر یقیناً اہل توحید ہی ہیں، نہ کہ دونوں۔

(۳) یعنی اس کے مطابق جڑا دے گا، نیکیوں کو جنت میں اور بدوں کو جہنم میں داخل فرمائے گا۔

ہے اور دانا۔ (۲۶)

کہہ دیجئے! کہ اچھا مجھے بھی تو انہیں دکھا دو جنہیں تم اللہ کا شریک ٹھہرا کر اس کے ساتھ ملا رہے ہو، ایسا ہرگز نہیں،^(۱) بلکہ وہی اللہ ہے غالب باحکمت۔ (۲۷)

ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبریاں سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے ہاں مگر (یہ صحیح ہے) کہ لوگوں کی اکثریت بے علم ہے۔^(۲) (۲۸)

پوچھتے ہیں کہ وہ وعدہ ہے کب؟ سچے ہو تو بتا دو۔^(۳) (۲۹)

قُلْ أَرُونِي الَّذِينَ أَنْحَفْتُمْ بِهِ شُرَكَاءَ كَلَّا بَلْ هُوَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ۝۲۶

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَاكُؤًا لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝۲۷

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدَانِ إِنَّا كُنَّا مُصَدِّقِينَ ۝۲۸

(۱) یعنی اس کا کوئی نظیر ہے نہ ہم سر، بلکہ وہ ہر چیز پر غالب ہے اور اس کے ہر کام اور قول میں حکمت ہے۔

(۲) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عامہ کا بیان فرمایا ہے کہ آپ ﷺ کو پوری نسل انسانیت کا بادی اور رہنما بنا کر بھیجا گیا ہے۔ دوسرا، یہ بیان فرمایا کہ اکثر لوگ آپ ﷺ کی خواہش اور کوشش کے باوجود ایمان سے محروم رہیں گے۔ ان دونوں باتوں کی وضاحت اور بھی دوسرے مقامات پر فرمائی ہے۔ مثلاً آپ ﷺ کی رسالت کے ضمن میں فرمایا، ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ (الأعراف: ۱۵۸) ﴿تَبَرَّكَ الَّذِي نَزَّلَ الْقُرْآنَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيُثَبِّتَ لِلنَّاسِ فِي ذَٰلِكَ أَلْوَانًا مِّنْ دُونِهِ﴾ (سورة الفرقان: ۱۰) ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ ۱- مینے کی مسافت پر دشمن کے دل میں میری دھاک بٹھانے سے میری مدد فرمائی گئی ہے۔ ۲- تمام روئے زمین میرے لیے مسجد اور پاک ہے، جہاں بھی نماز کا وقت آجائے، میری امت وہاں نماز ادا کر دے۔ ۳- مال غنیمت میرے لیے حلال کر دیا گیا، جو مجھ سے قبل کسی کے لیے حلال نہیں تھا۔ ۴- مجھے شفاعت کا حق دیا گیا ہے۔ ۵- پہلے نبی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا، مجھے کائنات کے تمام انسانوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب التمیم۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد) ایک اور حدیث میں فرمایا بَعَثْتُ إِلَى الْأَخْمَرِ وَالْأَسْوَدِ (صحیح مسلم، کتاب المساجد) احمد و اسود سے مراد بعض نے جن و انس اور بعض نے عرب و عجم لیے ہیں۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں، دونوں ہی معنی صحیح ہیں۔ اسی طرح اکثریت کی بے علمی اور گمراہی کی وضاحت فرمائی۔ ﴿وَمَا أَكْثَرَ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ﴾ (سورة يوسف: ۱۰۳) ”آپ ﷺ کی خواہش کے باوجود اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے“ ﴿وَأَن تَطْمَئِنَّ الْكَافِرُونَ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (سورة الأنعام: ۱۱۶) ”اگر آپ اہل زمین کی اکثریت کے پیچھے چلیں گے تو وہ آپ کو گمراہ کر دیں گے“ جس کا مطلب یہی ہوا کہ اکثریت گمراہوں کی ہے۔ (۳) یہ بطور استہزاء کے پوچھتے تھے کیوں کہ اس کا وقوع ان کے نزدیک مستبعد اور ناممکن تھا۔

قُلْ لَكُمْ مِيعَادٌ يَوْمَ لَا تَسْتَأْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً
وَلَا تَسْتَعْتَبُونَ ﴿۳۰﴾

جواب دیجئے کہ وعدے کا دن ٹھیک معین ہے جس
سے ایک ساعت نہ تم پیچھے ہٹ سکتے ہو نہ آگے
بڑھ سکتے ہو۔ (۳۰) (۱)

اور کافروں نے کہا کہ ہم ہرگز نہ تو اس قرآن کو مانیں نہ
اس سے پہلے کی کتابوں کو! (۲) اے دیکھنے والے کاش کہ
تو ان ظالموں کو اس وقت دیکھتا جبکہ یہ اپنے رب کے
سامنے کھڑے ہوئے ایک دوسرے کو الزام دے رہے
ہوں گے (۳) کمزور لوگ بڑے لوگوں سے کہیں گے (۴)
اگر تم نہ ہوتے تو ہم تو مومن ہوتے۔ (۵) (۳۱)

یہ بڑے لوگ ان کمزوروں کو جواب دیں گے کہ کیا
تمہارے پاس ہدایت آپکنے کے بعد ہم نے تمہیں اس
سے روکا تھا؟ (نہیں) بلکہ تم (خود) ہی مجرم تھے۔ (۶) (۳۲)

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِهَذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي
بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَا نَرَىٰ فِي الظُّلُمُونَ مَوْفُوتُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ
بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ لِّلْقَوْلِ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتَضَعِفُوا الَّذِينَ
اسْتَكْبَرُوا الْوَلَا أَنْتُمْ لَكِنَّا مُؤْمِنِينَ ﴿۳۱﴾

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا الَّذِينَ اسْتَضَعِفُوا أَتَعْزَبُوا عَنْ
الْهُدَىٰ بَعْدَ إِجَاءِ الْكُرْبَىٰ لَنْتُمْ مُعْجِرِينَ ﴿۳۲﴾

(۱) یعنی اللہ نے قیامت کا ایک دن مقرر کر رکھا ہے جس کا علم صرف اسی کو ہے، تاہم جب وہ وقت موعود آجائے گا تو
ایک ساعت بھی آگے، پیچھے نہیں ہوگا۔ ﴿إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ﴾ (سوح ۴)

(۲) جیسے تورات، زبور اور انجیل وغیرہ، بعض نے بَيْنَ يَدَيْهِ سے مراد دارِ آخرت لیا ہے۔ اس میں کافروں کے عناد و
طغیان کا بیان ہے کہ وہ تمام تردلائل کے باوجود قرآن کریم اور دارِ آخرت پر ایمان لانے سے گریزاں ہیں۔

(۳) یعنی دنیا میں یہ کفر و شرک میں ایک دوسرے کے ساتھی اور اس ناطے سے ایک دوسرے سے محبت کرنے والے
تھے، لیکن آخرت میں یہ ایک دوسرے کے دشمن اور ایک دوسرے کو مورد الزام بنائیں گے۔

(۴) یعنی دنیا میں یہ لوگ، جو سوچے سمجھے بغیر، روش عام پر چلنے والے ہوتے ہیں، اپنے ان لیڈروں سے کہیں گے جن
کے وہ دنیا میں پیروکار بنے رہے تھے۔

(۵) یعنی تم ہی نے ہمیں پیغمبروں اور داعیانِ حق کے پیچھے چلنے سے روک رکھا تھا، اگر تم اس طرح نہ کرتے تو ہم یقیناً
ایمان والے ہوتے۔

(۶) یعنی ہمارے پاس کون سی طاقت تھی کہ ہم تمہیں ہدایت کے راستے سے روکتے، تم نے خود ہی اس پر غور نہیں کیا
اور اپنی خواہشات کی وجہ سے ہی اسے قبول کرنے سے گریزاں رہے، اور آج مجرم ہمیں بنا رہے ہو؟ حالانکہ سب کچھ
تم نے خود ہی اپنی مرضی سے کیا، اس لیے مجرم بھی تم خود ہی ہو نہ کہ ہم۔

(اس کے جواب میں) یہ کمزور لوگ ان منکبروں سے کہیں گے، (نہیں نہیں) بلکہ دن رات مکرو فریب سے ہمیں اللہ کے ساتھ کفر کرنے اور اس کے شریک مقرر کرنے کا تمہارا حکم دینا ہماری بے ایمانی کا باعث ہوا،^(۱) اور عذاب کو دیکھتے ہی سب کے سب دل میں پشیمان ہو رہے ہوں گے،^(۲) اور کافروں کی گردنوں میں ہم طوق ڈال دیں گے^(۳) انہیں صرف ان کے کیے کرائے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔^(۴) (۳۳)

اور ہم نے تو جس بستی میں جو بھی آگاہ کرنے والا بھیجا وہاں کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا کہ جس چیز کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے ساتھ کفر کرنے^(۵) والے ہیں۔ (۳۳)

وَقَالَ الَّذِينَ اسْتَضَعُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا بَلْ مَكْرُؤُ الْيَهُودِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَأْمُرُوْنَآَنْ نَّكْفُرَ بِآٰلِهَةِ وَاٰتِآٰهَا وَنَجْعَلَ لَهٗ اٰتِآٰهَا وَآٰتِآٰهَا السَّنَامَةَ لَنَارِآَا وَاَلْعَذَابِ وَجَعَلْنَا الْاَذْخَالَ فِيْٓ اَعْنَاقِ الْاٰمِيْنَ كَقَرِّ وَاَهْلِ يَجْرُونَ الْاِمَا كَا تُوْا يَحْمِلُوْنَ ۝۳۳

وَمَا اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالُ مَفْرُوْهُمَا اِنَّا بَايَآ اُنۡسِلۡنَا بِهٖ كُفْرُوْنَ ۝۳۳

(۱) یعنی ہم مجرم تو تہ ہوتے، جب ہم اپنی مرضی سے پیغمبروں کی تکذیب کرتے، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ تم رات دن ہمیں گمراہ کرنے پر اور اللہ کے ساتھ کفر کرنے اور اس کا شریک ٹھہرانے پر آمادہ کرتے رہے، جس سے بالآخر ہم تمہارے پیچھے لگ کر ایمان سے محروم رہے۔

(۲) یعنی ایک دوسرے پر الزام تراشی تو کریں گے لیکن دل میں دونوں ہی فریق اپنے اپنے کفر پر شرمندہ ہوں گے۔ لیکن شامت اعدا کی وجہ سے ظاہر کرنے سے گریز کریں گے۔

(۳) یعنی ایسی زنجیریں جو ان کے ہاتھوں کو ان کی گردنوں کے ساتھ باندھیں گی۔

(۴) یعنی دونوں کو ان کے عملوں کی سزا ملے گی، لیڈروں کو ان کے مطابق، اور ان کے پیچھے چلنے والوں کو ان کے مطابق، جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿ اِنْجِلْ ضَعُفٌ وَّلٰكِنْ اَلْعٰلَمُوْنَ ﴾ ﴿ الاعراف ۳۸﴾ یعنی ”ہر ایک کو دگنا عذاب ہو گا۔“

(۵) یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ ککے کے رؤساء اور چودھری آپ ﷺ پر ایمان نہیں لا رہے ہیں اور آپ ﷺ کو ایذا نہیں پہنچا رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر دور کے اکثر خوش حال لوگوں نے پیغمبروں کی تکذیب ہی کی ہے اور ہر پیغمبر پر ایمان لانے والے پہلے پہل معاشرے کے غریب اور نادار قسم کے لوگ ہی ہوتے تھے۔ جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے اپنے پیغمبر سے کہا، ﴿ اَنْتُمْ لَكَوْا اٰتِآٰتِكَ الْاٰرۡثَ لَوۡنَ ﴾ ﴿ الشعراء ۱۱۱﴾

”کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں جب کہ تیرے پیروکار کیسے لوگ ہیں“ — ﴿ وَمَا تَزِدُّكَ اٰتِآٰتِكَ اِلَّا الْاٰمِيْنَ هُمۡ اَرَادُوۡنَا بِاٰوٰی الرَّاٰی ﴾ ﴿ ہود ۲۷﴾ دوسرے پیغمبروں کو بھی ان کی قوموں نے یہی کہا، ملاحظہ ہو۔ سورة الاعراف ۷۵۔ الانعام ۵۳، ۱۳۳۔

اور کہا ہم مال و اولاد میں بہت بڑھے ہوئے ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم عذاب دیئے جائیں۔^(۱) (۳۵)

کہہ دیجئے! کہ میرا رب جس کے لیے چاہے روزی کشادہ کر دیتا ہے اور تنگ بھی کر دیتا ہے،^(۲) لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (۳۶)

اور تمہارے مال اور اولاد ایسے نہیں کہ تمہیں ہمارے پاس (مرتبوں سے) قریب کر دیں^(۳) ہاں جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں^(۴) ان کے لیے ان کے اعمال کا دوہرا اجر ہے^(۵) اور وہ نڈر و بے خوف ہو کر بالا خانوں میں رہیں گے۔ (۳۷)

وَقَالُوا مَنَّا الْكُفْرُ وَالْأَوْلَادُ وَأَمَّا مَنَّا بِمَعْدِنَا ۝

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَلَئِن كُنَّا لَأَكْثَرَ النَّاسِ لَا نَعْلَمُونَ ۝

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالْبُغْيِ تُغْنِيَنَّكُمْ عِنْدَنَا زُلْفَىٰ إِلَّا مَنَ أَمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا قَدْ لَيْكَ لَهُمْ جِزَاءُ الصَّعُونَ بِمَا عَمِلُوا وَهُمْ فِي الْعُرْفَةِ أَيْمُونُونَ ۝

سورہ بنی اسرائیل ۱۲ وغیرہا۔ مُتْرَفُونَ کے معنی ہیں، 'اصحاب ثروت و ریاست۔

(۱) یعنی جب اللہ نے ہمیں دنیا میں مال و اولاد کی کثرت سے نوازا ہے، تو قیامت بھی اگر برپا ہوئی تو ہمیں عذاب نہیں ہو گا۔ گویا انہوں نے دارِ آخرت کو بھی دنیا پر قیاس کیا کہ جس طرح دنیا میں کافر و مومن سب کو اللہ کی نعمتیں مل رہی ہیں، آخرت میں بھی اسی طرح ہو گا، حالانکہ آخرت تو دارالجزا ہے، وہاں تو دنیا میں کیے گئے عملوں کی جزا ملتی ہے، اچھے عملوں کی جزا اچھی اور برے عملوں کی بری۔ جب کہ دنیا دارالامتحان ہے، یہاں اللہ تعالیٰ بطور آزمائش سب کو دنیاوی نعمتوں سے سرفراز فرماتا ہے۔ یا انہوں نے دنیاوی مال و اسباب کی فراوانی کو رضائے الہی کا مظہر سمجھا، حالانکہ ایسا بھی نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو تا تو اللہ تعالیٰ اپنے فرماں بردار بندوں کو سب سے زیادہ مال و اولاد سے نوازتا۔

(۲) اس میں کفار کے مذکورہ مغالطے اور شبہے کا ازالہ کیا جا رہا ہے کہ رزق کی کشادگی اور تنگی اللہ کی رضایا عدم رضایا کا مظہر نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اللہ کی حکمت و مشیت سے ہے۔ اس لیے وہ مال اس کو بھی دیتا ہے جس کو وہ پسند کرتا ہے اور اس کو بھی جس کو ناپسند کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے غنی کرتا ہے، جس کو چاہتا ہے فقیر رکھتا ہے۔

(۳) یعنی یہ مال اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ہمیں تم سے محبت ہے اور ہماری بارگاہ میں تمہیں خاص مقام حاصل ہے۔

(۴) یعنی ہماری محبت اور قرب حاصل کرنے کا ذریعہ تو صرف ایمان اور عمل صالح ہے جس طرح حدیث میں فرمایا "اللہ تعالیٰ تمہاری شکلیں اور تمہارے مال نہیں دیکھتا، وہ تو تمہارے دلوں اور عملوں کو دیکھتا ہے"۔ (صحیح مسلم)

کتاب البر: باب تحریم ظلم المسلم

(۵) بلکہ کئی کئی گنا، ایک نیکی کا اجر کم از کم دس گنا مزید سات سو گنا بلکہ اس سے زیادہ تک۔

اور جو لوگ ہماری آیتوں کے مقابلہ کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں یہی ہیں جو عذاب میں پکڑ کر حاضر رکھے جائیں گے۔ (۳۸)

کہہ دیجئے! کہ میرا رب اپنے بندوں میں جس کے لیے چاہے روزی کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہے تنگ کر دیتا^(۱) ہے، تم جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اللہ اس کا (پورا پورا) بدلہ دے گا^(۲) اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔ (۳۹)^(۳)

اور ان سب کو اللہ اس دن جمع کر کے فرشتوں سے دریافت فرمائے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے۔ (۴۰)^(۴)

وَالَّذِينَ يَسْعَوْنَ فِي آلِبَيْتِنَا مُعْجِزِينَ أُولَٰئِكَ فِي الْعَذَابِ مُخَصَّرُونَ ﴿۳۸﴾

قُلْ إِنْ رِزْقِي يَسْطُرُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِي ۖ وَيَقْدِرُ لَهُ ۖ وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿۳۹﴾

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَبَابِمَا نَدَّبُوا بِآلِهَتِهِمْ ۖ لِيَكْسِبُوا أَهْلَآئَهُمْ ۖ إِنَّكَ كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿۴۰﴾

(۱) پس وہ کبھی کافر کو بھی خوب مال دیتا ہے، لیکن کس لیے؟ استدراج کے طور پر، اور کبھی مومن کو تنگ دست رکھتا ہے، کس لیے؟ اس کے اجر و ثواب میں اضافے کے لیے۔ اس لیے مجرد مال کی فراوانی اس کی رضای اور اس کی کمی اس کی ناراضی کی دلیل نہیں ہے۔ یہ تکرار بطور تاکید کے ہے۔

(۲) اختلاف کے معنی ہیں، عوض اور بدلہ دینا۔ یہ بدلہ دنیا میں بھی ممکن ہے اور آخرت میں تو یقینی ہے۔ حدیث قدسی میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ أَنْفَقَ أَنْفَقَ عَلَيْكَ (صحیح بخاری، سودة ہود) ”تو خرچ کر، میں تجھ پر خرچ کروں گا“ (یعنی بدلہ دوں گا) دو فرشتے ہر روز اعلان کرتے ہیں، ایک کہتا ہے «اللَّهُمَّ! أَعْطِ مُنْسِكًا تَلْفًا» (یا اللہ نہ خرچ کرنے والے کے مال کو ضائع کر دے) دو سرا کہتا ہے، «اللَّهُمَّ! أَعْطِ مُنْفِقًا خَلْفًا» (اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بدلہ عطا فرما)۔ (البخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب فأما من أعطى واتقى)

(۳) کیونکہ ایک بندہ اگر کسی کو کچھ دیتا ہے تو اس کا یہ دینا اللہ تعالیٰ کی توفیق و تیسیر اور اس کی تقدیر سے ہی ہے۔ حقیقت میں دینے والا اس کا رازق نہیں ہے، جس طرح بچوں کا باپ، بچوں کا یا بادشاہ اپنے لشکر کا کفیل کہلاتا ہے حالانکہ امیر اور مامور بچے اور بڑے سب کا رازق حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب کا خالق بھی ہے۔ اس لیے جو شخص اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے کسی کو کچھ دیتا ہے تو وہ ایسے مال میں تصرف کرتا ہے جو اللہ ہی نے اسے دیا ہے، پس درحقیقت رازق بھی اللہ ہی ہوا۔ تاہم یہ اس کا مزید فضل و کرم ہے کہ اس کے دیئے ہوئے مال میں اس کی مرضی کے مطابق تصرف (خرچ کرنے) پر وہ اجر و ثواب بھی عطا فرماتا ہے۔

(۴) یہ مشرکین کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھے گا، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے

وہ کہیں گے تیری ذات پاک ہے اور ہمارا ولی تو تو ہے نہ کہ یہ (۱) بلکہ یہ لوگ جنوں کی عبادت کرتے تھے، ان (۲) میں کے اکثر کاخی پر ایمان تھا۔ (۳۱)

پس آج تم میں سے کوئی (بھی) کسی کے لیے (بھی) کسی قسم کے نفع نقصان کا مالک نہ ہو گا۔ (۳) اور ہم ظالموں (۴) سے کہہ دیں گے کہ اس آگ کا عذاب چکھو جسے تم جھلاتے رہے۔ (۳۲)

اور جب ان کے سامنے ہماری صاف صاف آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ ایسا شخص ہے (۵) جو تمہیں تمہارے باپ دادا کے معبودوں سے روک دینا چاہتا ہے

قَالُوا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيْنَا مَنْ دُوْنِهِمْ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ
الْبٰحِنَ الَّذِيْ كَفَرُوْا بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۝

قَالُوْا لِمَ لَا يَنْصُرُوْنَكُمْ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفَعًا وَّلَا ضَرًّا وَّلَا نَقُوْلُ
لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا دُوْدًا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكْفِرُوْنَ ۝

وَ اِذَا تَشَلَّىٰ عَلَيْهِمْ الْيَتْمٰنُ الْيَتِيْمَ قَالُوْا مَا هٰذَا اِلَّا رَجُلٌ
يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَنْ مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ اَبَاؤَكُمْ وَقَالُوْا مَا هٰذَا

میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے بھی پوچھے گا ”کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں (مریم) کو اللہ کے سوا‘ معبود بنا لیتا؟“ (المائدہ-۱۱۶) حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے ”یا اللہ تو پاک ہے، جس کا مجھے حق نہیں تھا، وہ بات میں کیوں کر کہہ سکتا تھا؟“ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرشتوں سے بھی پوچھے گا، جیسا کہ سورۃ الفرقان (آیت-۱۷) میں بھی گزرا۔ کہ کیا یہ تمہارے کہنے پر تمہاری عبادت کرتے تھے؟

(۱) یعنی فرشتے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کر کے اظہار براءت کریں گے اور کہیں گے کہ ہم تو تیرے بندے ہیں اور تو ہمارا ولی ہے، ہمارا ان سے کیا تعلق؟

(۲) جن سے مراد شیاطین ہیں۔ یعنی یہ اصل میں شیطانوں کے پجاری ہیں کیونکہ وہی ان کو بتوں کی عبادت پر لگاتے اور انہیں گمراہ کرتے تھے۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿ اِنْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ اِلَّا اِنْسًا وَاِنْ يَدْعُوْنَ اِلَّا سَیْطٰنًا مُّرِيْدًا ۙ﴾ (النساء-۱۱۷)

(۳) یعنی دنیا میں تم یہ سمجھ کر ان کی عبادت کرتے تھے کہ یہ تمہیں فائدہ پہنچائیں گے، تمہاری سفارش کریں گے اور اللہ کے عذاب سے تمہیں نجات دلوائیں گے۔ جیسے آج بھی پیر پرستوں اور قبر پرستوں کا حال ہے لیکن، آج دیکھ لو کہ یہ لوگ کسی بات پر قادر نہیں۔

(۴) ظالموں سے مراد، غیر اللہ کے پجاری ہیں، کیونکہ شرک ظلم عظیم ہے اور مشرکین سب سے بڑے ظالم۔

(۵) شخص سے مراد، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ باپ دادا کا دین، ان کے نزدیک صحیح تھا، اس لیے انہوں نے آپ ﷺ کا ”جرم“ یہ بیان کیا کہ یہ تمہیں ان معبودوں سے روکنا چاہتا ہے جن کی تمہارے آبا عبادت کرتے رہے۔

(اس کے سوا کوئی بات نہیں) اور کہتے ہیں کہ یہ تو گھڑا ہوا جھوٹ ہے (۱) اور حق ان کے پاس آچکا پھر بھی کافر یہی کہتے رہے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ (۳۳) (۲)

اور ان (مکہ والوں) کو نہ تو ہم نے کتابیں دے رکھی ہیں جنہیں یہ پڑھتے ہوں نہ ان کے پاس آپ سے پہلے کوئی آگاہ کرنے والا آیا۔ (۳۳) (۳)

اور ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی ہماری باتوں کو جھٹلایا تھا اور انہیں ہم نے جو دے رکھا تھا یہ تو اس کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچے، پس انہوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا، پھر دیکھ کہ میرا عذاب کیسا سخت تھا۔ (۳۵) (۴) کہہ دیجئے! کہ میں تمہیں صرف ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم اللہ کے واسطے (ضد چھوڑ کر) دودو مل کر یا تنہا تنہا کھڑے ہو کر سوچو تو سہی، تمہارے اس رفیق کو کوئی جنون نہیں، (۵) وہ تو تمہیں ایک بڑے (سخت)

الْاَفَاكُ مُفْتَرِي وَاَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَنَا
جَاہِمُهٗنَّ هٰذَا الْاَصْحٰرُ مَبِيْنٌ ﴿۳۳﴾

وَمَا اَتَيْنٰهُمْ مِنْ كِتٰبٍ يَدْرُسُوْنَهَا وَمَا اَرْسَلْنَا اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ
مِنْ تَنْذِيْرٍ ﴿۳۴﴾

وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَاَبَاغَوْا مَعْشٰرًا مَّا اَتَيْنٰهُمْ
تَكْذٰبًا وَّارْسَلْنَا فَلَكَیْفَ كَانَ نَكِيْرٌ ﴿۳۵﴾

قُلْ اِنَّمَا اَعْظَمُكُمْ بِوَاحِدٍ اَنْ تَقُوْا مَوْلٰی اللّٰهِ مَنٰثِقًا
وَقُرٰدٰی سَخِرَ سَتَقَفُوْا وَاَصْحٰبِ كِبٰرٍ مِّنْ جَنّٰتٍ
اِنَّ هُوَ الْاَلَدِیْزُ لَكُمْ بَيْنَ يَدٰی عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿۳۶﴾

(۱) اس دوسرے ہذا سے مراد قرآن کریم ہے، اسے انہوں نے تراشا ہوا بہتان یا گھڑا ہوا جھوٹ قرار دیا۔

(۲) قرآن کو پہلے گھڑا ہوا جھوٹ کہا اور یہاں کھلا جادو۔ پہلے کا تعلق قرآن کے مفہوم و مطالب سے ہے اور دوسرے کا تعلق قرآن کے معجزانہ نظم و اسلوب اور اعجاز و بلاغت سے۔ (فتح القدیر)

(۳) اس لیے وہ آرزو کرتے تھے کہ ان کے پاس بھی کوئی پیغمبر آئے اور کوئی صحیفہ آسمانی نازل ہو۔ لیکن جب یہ چیزیں آئیں تو انکار کر دیا۔

(۴) یہ کفار مکہ کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تم نے تکذیب و انکار کا جو راستہ اختیار کیا ہے، وہ نہایت خطرناک ہے۔ تم سے پچھلی امتیں بھی، اس راستے پر چل کر تباہ و برباد ہو چکی ہیں۔ حالانکہ یہ امتیں مال و دولت، قوت و طاقت اور عمروں کے لحاظ سے تم سے بڑھ کر تھیں، تم تو ان کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچتے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اللہ کے عذاب سے نہیں بچ سکیں۔ اسی مضمون کو سورہ احقاف کی آیت ۲۶ میں بیان فرمایا گیا ہے۔

(۵) یعنی میں تمہیں تمہارے موجودہ طرز عمل سے ڈراتا اور ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ تم ضد اور اتانیت چھوڑ کر صرف اللہ کے لیے ایک ایک دودو ہو کر میری بابت سوچو کہ میری زندگی تمہارے اندر گزری ہے اور

عذاب کے آنے سے پہلے ڈرانے والا ہے۔^(۱) (۳۶)

کہہ دیجئے! کہ جو بدلہ میں تم سے مانگوں وہ تمہارے لیے ہے^(۲) میرا بدلہ تو اللہ تعالیٰ ہی کے ذمے ہے۔ وہ ہر چیز سے باخبر (اور مطلع) ہے۔ (۳۷)

کہہ دیجئے! کہ میرا رب حق (سچی وحی) نازل فرماتا ہے وہ^(۳) ہر غیب کا جاننے والا ہے۔ (۳۸)

کہہ دیجئے! کہ حق آپ کا باطل نہ تو پہلے کچھ کر سکا ہے اور نہ کر سکے گا۔^(۴) (۳۹)

قُلْ مَا سَأَلْتُمْ مِنْ آجِرٍ فَهُوَ لَكُمْ إِنَّ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿۳۶﴾

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَعْذِبُ يَا لِحَقِّ عَاكُمُ الْغُيُوبِ ﴿۳۷﴾

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبَدِي الْبَاطِلُ وَمَا يُعِينُ ﴿۳۸﴾

اب بھی جو دعوت میں تمہیں دے رہا ہوں کیا اس میں کوئی ایسی بات ہے کہ جس سے اس بات کی نشاندہی ہو کہ میرے اندر دیوا لگی ہے؟ تم اگر عصبیت اور خواہش نفس سے بالا ہو کر سوچو گے تو یقیناً تم سمجھ جاؤ گے کہ تمہارے رفیق کے اندر کوئی دیوا لگی نہیں ہے۔

(۱) یعنی وہ تو صرف تمہاری ہدایت کے لیے آیا ہے تاکہ تم اس عذاب شدید سے بچ جاؤ جو ہدایت کا راستہ نہ اپنانے کی وجہ سے تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن صفا پھاڑی پر چڑھ گئے اور فرمایا ”یا صباہ“ جسے سن کر قریش جمع ہو گئے، آپ ﷺ نے فرمایا ”بتلاؤ“ اگر میں تمہیں خبر دوں کہ دشمن صبح یا شام کو تم پر حملہ آور ہونے والا ہے، تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟“ انہوں نے کہا ”کیوں نہیں“ آپ ﷺ نے فرمایا ”تو پھر سن لو کہ میں تمہیں سخت عذاب آنے سے پہلے ڈراتا ہوں“ یہ سن کر ابو لہب نے کہا تَبَّ لَكَ! اَلِهَذَا جَمَعْتَنَا“ تیرے لیے ہلاکت ہو، کیا اس لیے تو نے ہمیں جمع کیا تھا؟“ جس پر اللہ تعالیٰ نے سورہ بَنَاتٍ يَدَّ اٰبِي لَهَبٍ نازل فرمائی۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورہ سبَا)

(۲) اس میں اپنی بے غرضی اور دنیا کے مال و متاع سے بے رغبتی کا مزید اظہار فرمادیا تاکہ ان کے دلوں میں اگر یہ شک و شبہ پیدا ہو کہ اس دعوئے نبوت سے اس کا مقصد کس دنیا کمانا تو نہیں، تو وہ دور ہو جائے۔

(۳) فَذَفَ کے معنی، تیرا اندازی اور خشت باری کے بھی ہیں اور کلام کرنے کے بھی۔ یہاں اس کے دوسرے معنی ہی ہیں یعنی وہ حق کے ساتھ گفتگو فرماتا، اپنے رسولوں پر وحی نازل فرماتا اور ان کے ذریعے سے لوگوں کے لیے حق واضح فرماتا ہے۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿يُلْقِي الرُّسُومَ مِنْ أَمْرِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾ ﴿المؤمن ۱۵﴾ یعنی ”اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، فرشتے کے ذریعے سے اپنی وحی سے نوازتا ہے۔“

(۴) حق سے مراد قرآن اور باطل سے مراد کفر و شرک ہے۔ مطلب ہے اللہ کی طرف سے اللہ کا دین اور اس کا قرآن

کہہ دیجئے کہ اگر میں ہمک جاؤں تو میرے بکنے (کا وبال) مجھ پر ہی ہے اور اگر میں راہ ہدایت پر ہوں تو بہ سبب اس وحی کے جو میرا پروردگار مجھے کرتا^(۱) ہے وہ بڑا ہی سننے والا اور بہت ہی قریب ہے۔^(۲) (۵۰)

اور اگر آپ (وہ وقت) ملاحظہ کریں جبکہ یہ کفار گھبرائے پھریں گے پھر نکل بھاگنے کی کوئی صورت نہ ہوگی^(۳) اور قریب کی جگہ سے گرفتار کر لیے جائیں گے۔ (۵۱)

اس وقت کہیں گے کہ ہم اس قرآن پر ایمان لائے لیکن اس قدر دور جگہ سے (مطلوبہ چیز) کیسے ہاتھ^(۴) آسکتی ہے۔ (۵۲)

قُلْ إِنْ صَلَّيْتُ فَأَيْمًا أَضِلُّ عَلَى نَفْسِي وَإِنْ اهْتَدَيْتُ فِيمَا يُحِبُّ إِلَيَّ رَبِّي إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ ۝

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ فُتِنُوا لَأَقُولُ وَخُذُوا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ ۝

وَقَالُوا آمَنَّا بِهِ وَإِنَّا لَلْمُتَنَادِسُونَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ ۝

آگیا ہے، جس سے باطل مضعل اور ختم ہو گیا ہے، اب وہ سراٹھانے کے قابل نہیں رہا، جس طرح فرمایا ﴿بَلْ تَقْنُتُ بِالْبَاطِلِ عَلَى الْبَاطِلِ قَبِيحٌ مَعَهُ قَادًا هُوَ ذَاهِقٌ﴾ (سورۃ الانبیاء: ۱۸) حدیث میں آتا ہے کہ جس دن مکہ فتح ہوا، نبی ﷺ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے، چاروں طرف بت نصب تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کمان کی نوک سے ان بتوں کو مارتے جاتے اور یہ آیت اور سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ﴿وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَدَفَعْنَا الْبَاطِلَ﴾ پڑھتے جاتے تھے۔ (صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب ازالة الأصنام من حول الکعبۃ)

(۱) یعنی بھلائی سب اللہ کی طرف سے ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جو وحی اور حق مبین نازل فرمایا ہے، اس میں رشد و ہدایت ہے، صحیح راستہ لوگوں کو اسی سے ملتا ہے۔ پس جو گمراہ ہوتا ہے، تو اس میں انسان کی اپنی ہی کوتاہی اور ہوائے نفس کا دخل ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا وبال بھی اسی پر ہوگا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما جب کسی سائل کے جواب میں اپنی طرف سے کچھ بیان فرماتے تو ساتھ کہتے، «أَقُولُ فِيهَا بَرَأَيْتُ؛ فَإِنْ يَكُنْ صَوَابًا فَمِنْ اللَّهِ، وَإِنْ يَكُنْ خَطَأً فَمِنِّي وَمِنَ الشَّيْطَانِ، وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ بَرِيئَانِ مِنْهُ» (ابن کثیر)

(۲) جس طرح حدیث میں فرمایا اِنْكُنُمْ لَا تَدْعُونَ اَصَمًّا وَلَا غَائِبًا، اِنَّمَا تَدْعُونَ سَمِيعًا قَرِيبًا مُجِيبًا (بخاری، کتاب الدعاء، باب الدعاء اذا علا عقبه، ”تم بھری اور غائب ذات کو نہیں پکار رہے ہو بلکہ اس کو پکار رہے ہو جو سننے والا، قریب اور قبول کرنے والا ہے۔“

(۳) فَلَا فُتُونٌ کہیں بھاگ نہیں سکیں گے؟ کیونکہ وہ اللہ کی گرفت میں ہوں گے، یہ میدان محشر کا بیان ہے۔

(۴) تَنَاوَسُوا کے معنی تناول یعنی پکڑنے کے ہیں یعنی اب آخرت میں انہیں ایمان کس طرح حاصل ہو سکتا ہے جب کہ دنیا میں اس سے گریز کرتے رہے گویا آخرت ایمان کے لیے، دنیا کے مقابلے میں دور کی جگہ ہے، جس طرح دور سے

اس سے پہلے تو انہوں نے اس سے کفر کیا تھا اور دور دراز سے بن دیکھے ہی پھینکتے رہے۔^(۱) (۵۳)

ان کی چاہتوں اور ان کے درمیان پردہ حائل کر دیا گیا^(۲) جیسے کہ اس سے پہلے بھی ان جیسوں کے ساتھ کیا گیا،^(۳) وہ بھی (انہی کی طرح) شک و تردد میں (پڑے ہوئے) تھے۔^(۴) (۵۳)

سورۃ فاطر کی ہے اور اس میں چونتالیس آیتیں ہیں اور پانچ رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اس اللہ کے لیے تمام تعریفیں سزاوار ہیں جو (ابتداءً) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا^(۵) اور دو دو تین تین چار چار پروں والے فرشتوں کو اپنا پیغمبر (قاصد) بنانے

وَقَدْ كَفَرْنَا بِهِ مِنْ قَبْلُ وَيَسْتَخْفُونَ بِالْغَيْبِ
مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ ﴿۵۳﴾

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ كَافِئًا لِيُخَالِفُوا عَنِ قَبْلِ
إِلَهُكُمْ كَمَا تَوَلَّى تَسَاءُلُهُمْ رَبُّهُمْ ﴿۵۴﴾



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةَ رُسُلًا
اُولٰٓئِکَ اَخْبِیۡتَ مَنۡشٰی وَرَدَّعۡزِیۡرِیۡنِیۡنِیۡ الْخٰلِقِ مَا یَشَآءُ لَیۡلَیۡنِ اللّٰهِ

کسی چیز کو پکڑنا ممکن نہیں، آخرت میں ایمان لانے کی گنجائش نہیں۔

(۱) یعنی اپنے گمان سے کہتے رہے کہ قیامت اور حساب کتاب نہیں۔ یا قرآن کے بارے میں کہتے رہے کہ یہ جادو گھڑا ہوا جھوٹ اور پہلوں کی کمائیاں ہیں یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتے رہے کہ یہ جادو گر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے یا مجنون ہے۔ جب کہ کسی بات کی بھی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں تھی۔

(۲) یعنی آخرت میں وہ چاہیں گے کہ ان کا ایمان قبول کر لیا جائے، عذاب سے ان کی نجات ہو جائے، لیکن ان کے درمیان اور ان کی اس خواہش کے درمیان پردہ حائل کر دیا یعنی اس خواہش کو رو کر دیا جائے گا۔

(۳) یعنی پچھلے امتوں کا ایمان بھی اس وقت قبول نہیں کیا گیا جب وہ عذاب کے معاننے کے بعد ایمان لائیں۔

(۴) اس لیے اب معاندانہ عذاب کے بعد ان کا ایمان بھی کس طرح قبول ہو سکتا ہے؟ حضرت قتادہ فرماتے ہیں ”ریب و شک سے بچو، جو شک کی حالت میں فوت ہو گا، اسی حالت میں اٹھے گا اور جو یقین پر مرے گا، قیامت والے دن یقین پر ہی اٹھے گا۔“ (ابن کثیر)

(۵) فاطر کے معنی ہیں مخترع، پہلے پہل ایجاد کرنے والا، یہ اشارہ ہے اللہ کی قدرت کی طرف کہ اس نے آسمان و زمین پہلے پہل بغیر نمونے کے بنائے، تو اس کے لیے دوبارہ انسانوں کو پیدا کرنا کون سا مشکل ہے؟

عَلَىٰ شَيْءٍ قَدِيرٌ ①

والا ہے، ^(۱) مخلوق میں جو چاہے زیادتی کرتا ہے ^(۲) اللہ تعالیٰ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔ (۱)

اللہ تعالیٰ جو رحمت لوگوں کے لیے کھول دے سوا اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں اور جس کو بند کر دے سوا اس کے بعد اس کا کوئی جاری کرنے والا نہیں ^(۳) اور وہی غالب حکمت والا ہے۔ (۲)

لوگو! تم پر جو انعام اللہ تعالیٰ نے کیے ہیں انہیں یاد کرو۔ کیا اللہ کے سوا اور کوئی بھی خالق ہے جو تمہیں آسمان و زمین سے روزی پہنچائے؟ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس تم کہاں لٹے جاتے ہو؟ ^(۳) (۳)

اور اگر یہ آپ کو جھٹلائیں تو آپ سے پہلے کے تمام رسول بھی جھٹلائے جا چکے ہیں۔ تمام کام اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ ^(۵) (۳)

بِأَمْرِ اللَّهِ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهُمْ وَاللَّيْسَ فَلَاحُ مُمْسِكٍ لَهُمْ مِنْ بَعْدِهِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ②

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرِ اللَّهِ يُرْزِقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ قَاتِلُوا كَافِرِينَ ③

طَلَّ نَجْدًا بُرُودًا هَذَا كَذَّبَتْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَآلِ اللَّهِ مُرْسِجُ الْاُمُورِ ④

(۱) مراد جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل فرشتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ انبیاء کی طرف یا مختلف مہمات پر قاصد بنا کر بھیجتا ہے۔ ان میں سے کسی کے دو، کسی کے تین اور کسی کے چار پر ہیں، جن کے ذریعے سے وہ زمین پر آتے اور زمین سے آسمان پر جاتے ہیں۔

(۲) یعنی بعض فرشتوں کے اس سے بھی زیادہ پر ہیں، جیسے حدیث میں آتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں نے معراج کی رات جبرائیل علیہ السلام کو اصلی صورت میں دیکھا، اس کے چھ سو پر تھے (صحیح بخاری، تفسیر مسودۃ النجم، باب، فکان قاب قوسین أو أدنی) بعض نے اس کو عام رکھا ہے، جس میں آنکھ، چہرہ، ناک اور منہ ہر چیز کا حسن داخل ہے۔

(۳) ان ہی نعمتوں میں سے ارسال رسل اور انزال کتب بھی ہے۔ یعنی ہر چیز کا دینے والا بھی وہی ہے، اور واپس لینے یا روک لینے والا بھی وہی۔ اس کے سوا نہ کوئی معنی اور نعم ہے اور نہ مانع و قابض۔ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔ «اللَّهُمَّ! لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيٍّ لِمَا مَنَعْتَ».

(۴) یعنی اس بیان و وضاحت کے بعد بھی تم غیر اللہ کی عبادت کرتے ہو؟ تُوَفِّكُونَ أَمْ أَنْفَکَ سے ہو تو معنی ہوں گے پھرنا، تم کہاں پھرے جاتے ہو؟ اور اگر اِنْفَکَ سے ہو تو معنی ہیں جھوٹ، جو ج سے پھرنے کا نام ہے۔ مطلب ہے کہ تمہارے اندر توحید اور آخرت کا انکار کہاں سے آگیا، جب کہ تم مانتے ہو کہ تمہارا خالق اور رازق اللہ ہے۔ (فتح القدیر)

(۵) اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ آپ ﷺ کو جھٹلا کر یہ کہاں جائیں گے؟ بالآخر تمام معاملات کا فیصلہ

يَابَيْهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ
الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغُرُورُ ﴿٥﴾

إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا إِنَّمَا يَفْخَرُ بِمَا يُكُونُ
مِنَ الْأَعْضَابِ السَّعِيرِ ﴿٦﴾

الَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا
الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿٧﴾

أَعْمَنَ زَيْنٌ لَهُ وَسَوْءَ عَلَيْهِمْ أَفْرَأُ حَسَنًا فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ

لوگو! اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے (۱) تمہیں زندگی دنیا
دھوکے میں نہ ڈالے، (۲) اور نہ دھوکے باز شیطان
تمہیں غفلت میں ڈالے۔ (۳) (۵)

یاد رکھو! شیطان تمہارا دشمن ہے، تم اسے دشمن
جانو (۴) وہ تو اپنے گروہ کو صرف اس لیے ہی بلاتا ہے کہ
وہ سب جہنم واصل ہو جائیں۔ (۶)

جو لوگ کافر ہوئے ان کے لیے سخت سزا ہے اور جو لوگ
ایمان لائے اور نیک اعمال کیے ان کے لیے بخشش ہے
اور (بہت بڑا اجر ہے)۔ (۷)

کیا پس وہ شخص جس کے لیے اس کے برے اعمال مزین
کردیئے گئے ہیں پس وہ انہیں اچھا سمجھتا (۸) ہے (کیا وہ

تو ہمیں ہی کرنا ہے۔ جس طرح کھچلی امتوں نے اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا، تو انہیں سوائے بربادی کے کیا ملا؟ اس لیے یہ بھی
اگر باز نہ آئے، تو ان کو بھی ہلاک کرنا ہمارے لیے مشکل نہیں ہے۔

(۱) کہ قیامت برپا ہوگی اور نیک و بد کو ان کے عملوں کی جزا و سزا دی جائے گی۔

(۲) یعنی آخرت کی ان نعمتوں سے غافل نہ کر دے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں اور رسولوں کے پیروکاروں کے
لیے تیار کر رکھی ہیں۔ پس اس دنیا کی عارضی لذتوں میں کھو کر آخرت کی دائمی راحتوں کو نظر انداز نہ کرو۔

(۳) یعنی اس کے داؤ اور فریب سے بچ کر رہو، اس لیے کہ وہ بہت دھوکے باز ہے اور اس کا مقصد ہی تمہیں دھوکے
میں مبتلا کر کے اور رکھ کے جنت سے محروم کرنا ہے۔ یہی الفاظ سورہ لقمان-۳۳ میں بھی گزر چکے ہیں۔

(۴) یعنی اس سے سخت عداوت رکھو، اس کے دجل و فریب اور ہتھکنڈوں سے بچو، جس طرح دشمن سے بچاؤ کے لیے
انسان کرتا ہے۔ دوسرے مقام پر اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا گیا ہے۔ ﴿ اَتَمَتَّحُونَ وَنَهَ وَذَرِيَّتَهُ اُولِيَاءَهُ مِنْ دُونِي وَهُمْ لَكُمْ

عَدُوٌّ لِيَمَّشُّ بِالظَّالِمِينَ بَدَلًا ﴾ «الکھف-۵۰» ”کیا تم اس شیطان اور اس کی ذریت کو، مجھے چھوڑ کر، اپنا دوست بناتے
ہو؟ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔ ظالموں کے لیے برابر لہ ہے۔“

(۵) یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے دیگر مقامات کی طرح ایمان کے ساتھ، عمل صالح کو بیان کر کے اس کی اہمیت کو واضح کر دیا
ہے تاکہ اہل ایمان عمل صالح سے کسی وقت بھی غفلت نہ برتیں، کہ مغفرت اور اجر کبیر کا وعدہ اس ایمان پر ہی ہے جس
کے ساتھ عمل صالح ہو گا۔

(۶) جس طرح کفار و فجار ہیں، وہ کفر و شرک اور فسق و فجور کرتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ وہ اچھا کر رہے ہیں۔ پس ایسا

ہدایت یافتہ شخص جیسا ہے) 'یقین مانو کہ اللہ جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے راہ راست دکھاتا ہے۔^(۱)
پس آپ کو ان پر غم کھا کھا کر اپنی جان ہلاکت میں نہ ڈالنی چاہیے،^(۲) یہ جو کچھ کر رہے ہیں اس سے یقیناً اللہ تعالیٰ بخوبی واقف ہے۔^(۳) (۸)

اور اللہ ہی ہوائیں چلاتا ہے جو بادلوں کو اٹھاتی ہیں پھر ہم بادلوں کو خشک زمین کی طرف لے جاتے ہیں اور اس سے اس زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح دوبارہ جی اٹھنا (بھی) ہے۔^(۴) (۹)

جو شخص عزت حاصل کرنا چاہتا ہو تو اللہ تعالیٰ ہی کی ساری عزت ہے،^(۵) تمام تر ستھرے کلمات اسی کی طرف چڑھتے

وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۖ فَلَا تَذْهَبْ عَنْكَ عَلَيْهِمْ حَرِيْرَاتٌ اِنَّ
اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝

وَاللّٰهُ الَّذِي اَرْسَلَ الرِّيْحَ مُثْبِتًا صَحَابًا لِّمَا قَعْنُوْهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيْمَنٍ
فَاَحْيٰى بَارِيَهُ الْاَرْضَۢ بَعْدَ مَوْتِهَا ۗ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا اَلَيْسَ بِصَعْدِ الْكَلْبِ الْكَلْبِيْبُ

شخص، جس کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہو، اس کے بچاؤ کے لیے آپ کے پاس کوئی حیلہ ہے؟ یا یہ اس شخص کے برابر ہے جسے اللہ نے ہدایت سے نوازا ہے؟ جو اب نفی میں ہی ہے، نہیں یقیناً نہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ اپنے عدل کی رو سے، اپنی سنت کے مطابق اس کو گمراہ کرتا ہے جو مسلسل اپنے کرتوتوں سے اپنے کو اس کا مستحق ٹھہرا چکنا ہے اور ہدایت اپنے فضل و کرم سے اسے دیتا ہے جو اس کا طالب ہوتا ہے۔

(۲) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام حکمت پر اور علم تام پر مبنی ہے، اس لیے کسی کی گمراہی پر اتنا افسوس نہ کریں کہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال لیں۔

(۳) یعنی اس سے ان کا کوئی قول یا فعل مخفی نہیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ کا ان کے ساتھ معاملہ ایک علیم و خیر اور ایک حکیم کی طرح کا ہے۔ عام بادشاہوں کی طرح کا نہیں ہے جو اپنے اختیارات کا اللٹ استعمال کرتے ہیں، کبھی سلام کرنے سے بھی ناراض ہو جاتے ہیں اور کبھی دشنام پر ہی خلعتوں سے نواز دیتے ہیں۔

(۴) یعنی جس طرح بادلوں سے بارش برسا کر خشک (مرده) زمین کو ہم شاداب (زندہ) کر دیتے ہیں، اسی طریقے سے قیامت والے دن تمام مرده انسانوں کو بھی ہم زندہ کر دیں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ”انسان کا سارا جسم بوسیدہ ہو جاتا ہے، صرف ریڑھ کی ہڈی کا ایک چھوٹا سا حصہ محفوظ رہتا ہے، اسی سے اس کی دوبارہ تخلیق و ترکیب ہو گی۔“ «كُلُّ جَسَدٍ

ابنِ اٰدَمَ يَبْلَى، اِلَّا عَجَبَ الذَّنْبِ، مِنْهُ خُلِقَ، وَمِنْهُ يُرَكَّبُ» (البخاری، تفسیر سورۃ عم۔ مسلم، کتاب الفتن، باب ما بین النّفخین)

(۵) یعنی جو چاہتا ہے کہ اسے دنیا اور آخرت میں عزت ملے، تو وہ اللہ کی اطاعت کرے، اس سے اسے یہ مقصود حاصل

ہیں اور نیک عمل ان کو بلند کرتا ہے،^(۳) جو لوگ برائیوں کے داؤں گھات میں لگے رہتے ہیں ان کے لیے سخت تر عذاب ہے، اور ان کا یہ مکر برباد ہو جائے گا۔^(۴)

لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں مٹی سے پھر نطفہ سے پیدا کیا ہے،^(۵) پھر تمہیں جوڑے جوڑے (مرد و عورت) بنا دیا ہے، عورتوں کا حاملہ ہونا اور بچوں کا تولد ہونا سب اس کے علم سے ہی ہے،^(۶) اور جو بڑی عمر والا عمر دیا جائے

وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ رِزْقُهُ وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ الشَّيْءَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُؤًا لَّهُمْ يَبُورُ ۝

وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ أَزْوَاجًا ۚ وَالْحَمِيلَ مِنَ الْأُنْثَىٰ وَالْأَصْغَرُ الْأَكْبَرُ لَهُ ۚ وَالْمَأْتَمِرُونَ مُعْتَمِرٌ ۚ وَلَا يَنْقُصُ مِنْ عُمرِهِ إِلَّا مَن كَانَ ذَلِكُمْ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝

ہو جائے گا۔ اس لیے کہ دنیا و آخرت کا مالک اللہ ہی ہے، ساری عزتیں اسی کے پاس ہیں وہ جس کو عزت دے، وہی عزیز ہو گا، جس کو وہ ذلیل کر دے، اسے دنیا کی کوئی طاقت عزت نہیں دے سکتی۔ دوسرے مقام پر فرمایا۔ ﴿الَّذِينَ يَمْكُرُونَ

الْكُفْرَ مِنَ الْأَوْلِيَاءِ مِنْ ذُنُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لَا يَنْتَعُونَ عَنْهُمْ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا﴾ (النساء: ۱۳۹)

(۱) اَلْكَفْرُ، کَلِمَةُ کی جمع ہے، ستمرے کلمات سے مراد اللہ کی تسبیح و تحمید، تلاوت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ چڑھتے ہیں کا مطلب، قبول کرنا ہے۔ یا فرشتوں کا انہیں لے کر آسمانوں پر چڑھنا ہے تاکہ اللہ ان کی جزا دے۔

(۲) يَزْنَعُهُ، میں ضمیر کا مرجع کون ہے؟ بعض کہتے اَلْكَفْرُ الطَّيِّبُ ہے۔ یعنی عمل صالح کلمات طیبات کو اللہ کی طرف بلند کرتا ہے۔ یعنی محض زبان سے اللہ کا ذکر (تسبیح و تحمید) کچھ نہیں، جب تک اس کے ساتھ عمل صالح یعنی احکام و فرائض کی ادائیگی بھی نہ ہو۔ بعض کہتے ہیں يَزْنَعُهُ میں فاعل کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے۔ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ عمل صالح کو کلمات طیبات پر بلند فرماتا ہے اس لیے کہ عمل صالح سے ہی اس بات کا تحقق ہوتا ہے کہ اس کا مرتکب فی الواقع اللہ کی تسبیح و تحمید میں مخلص ہے (فتح القدر) گویا قول، عمل کے بغیر اللہ کے ہاں بے حیثیت ہے۔

(۳) خفیہ طریقے سے کسی کو نقصان پہنچانے کی تدبیر کو مکر کہتے ہیں کفر و شرک کا ارتکاب بھی مکر ہے کہ اس طرح اللہ کے راستہ کو نقصان پہنچایا جاتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ و سلم کے خلاف قتل وغیرہ کی جو سازشیں کفار مکہ کرتے رہے، وہ بھی مکر ہے، ریا کاری بھی مکر ہے۔ یہاں یہ لفظ عام ہے، مکر کی تمام صورتوں کو شامل ہے۔

(۴) یعنی ان کا مکر بھی برباد ہو گا اور اس کا وبال بھی انہی پر پڑے گا جو اس کا ارتکاب کرتے ہیں، جیسے فرمایا۔ ﴿وَلَا يَجِئُكَ الْمَكْرُ اللَّيْتِيُّ إِلَّا يَأْتِيهِ﴾ (فاطر: ۳۲)

(۵) یعنی تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو مٹی سے اور پھر اس کے بعد تمہاری نسل کو قائم رکھنے کے لیے انسان کی تخلیق کو نطفے سے وابستہ کر دیا، جو مرد کی پشت سے نکل کر عورت کے رحم میں جاتا ہے۔

(۶) یعنی اس سے کوئی چیز مخفی نہیں، حتیٰ کہ زمین پر گرنے والے پتے کو اور زمین کی تاریکیوں میں نشوونما پانے والے

اور جس کسی کی عمر گھٹے وہ سب کتاب میں لکھا ہوا ہے۔^(۱) اللہ تعالیٰ پر یہ بات بالکل آسان ہے۔ (۱۱)
 اور برابر نہیں دو دریا یہ بیٹھا ہے پیاس بجھاتا پینے میں خوشگوار اور یہ دو سرا کھاری ہے کڑوا، تم ان دونوں میں سے تازہ گوشت کھاتے ہو اور وہ زیورات نکالتے ہو جنہیں تم پہنتے ہو۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ بڑی بڑی کشتیاں پانی کو چیرنے پھاڑنے^(۲) والی ان دریاؤں میں ہیں تاکہ تم اس کا فضل ڈھونڈو اور تاکہ تم اس کا شکر کرو۔ (۱۲)

وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور آفتاب و ماہتاب کو اسی نے کام میں لگا دیا ہے۔ ہر ایک میعاد معین پر چل رہا ہے۔ یہی ہے اللہ^(۳) تم سب کا پالنے والا اسی کی سلطنت ہے۔ جنہیں تم اس کے سوا پکار رہے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں۔ (۱۳)^(۳)

وَمَا يَتَّبِعُوهُ الْبَحْرُونَ هَذَا عَذَابٌ مُّزْمَلٌ لِّمَنْ كَفَرَ بِهِ
 وَ هَذَا مِثْلُ مَا جَاءَ مِنْ قَبْلِهِ تَأْكُلُونَ لَحْمَهَا طَرِبًا وَ تَقْتَتِرُونَ
 حَلِيَةً تَلْبَسُونَهَا وَ تَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَازِيرًا تَتَّبِعُوا مِنْ
 فَضْلِهِ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۱﴾

يُؤَيِّدُ الْكَيْلَ فِي الْبَحْرِ وَ يُؤَيِّدُ الْبَارَ فِي الْكَيْلِ وَ سَخَّرَ الْقَوْمَ
 وَالْقَوْمَ كُلَّ يَجْرِي لِجَلِّ شَيْءٍ ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ
 وَ الَّذِي تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ ﴿۱۲﴾

بچ کو بھی وہ جانتا ہے۔ (الأنعام-۵۹)

(۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ عمر کی طوالت اور اس کی تقصیر (کم ہونا) اللہ کی تقدیر و قضا سے ہے۔ علاوہ ازیں اس کے اسباب بھی ہیں جس سے عمر لمبی یا چھوٹی ہوتی ہے، طوالت کے اسباب میں صلہ رحمی وغیرہ ہے، جیسا کہ احادیث میں ہے اور تقصیر کے اسباب میں کثرت سے معاصی کا ارتکاب ہے۔ مثلاً کسی آدمی کی عمر ۷۰ سال ہے لیکن کبھی اسباب زیادت کی وجہ سے اللہ اس میں اضافہ فرمادیتا ہے اور کبھی اس میں کمی کردیتا ہے جب وہ اسباب نقصان اختیار کرتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس نے لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ اس لیے عمر میں یہ کمی بیشی ﴿فَلَمَّا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَاقِيَتَا خَيْرُونَ سَاعَةً وَلَا يَتَّبِعُونَ﴾ کے منافی نہیں ہے۔ اس کی تائید اللہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے ﴿يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ مَا يُرِيدُ وَ وَعْدُ اللَّهِ أَمْرًا لَيْكِنٌ﴾ (سورۃ الرعد-۳۹) ”جو چاہتا ہے، مٹاتا اور ثبت کرتا ہے اور اس کے پاس لوح محفوظ ہے۔“ (فتح القدیر)

(۲) مواخر وہ کشتیاں جو آتے جاتے پانی کو چیرتی ہوئی گزرتی ہیں، آیت میں بیان کردہ دو سری چیزوں کی وضاحت سورۃ الفرقان میں گزر چکی ہے۔

(۳) یعنی مذکورہ تمام افعال کا فاعل ہے۔

(۴) یعنی اتنی حقیر چیز کے بھی مالک نہیں، نہ اسے پیدا کرنے پر ہی قادر ہیں۔ قِطْمِيرٍ اس جھلی کو کہتے ہیں جو کھجور اور

اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار سنتے ہی نہیں^(۱) اور اگر (بالفرض) سن بھی لیں تو فریاد سی نہیں کریں گے،^(۲) بلکہ قیامت کے دن تمہارے اس شرک کا صاف انکار کر جائیں گے۔^(۳) آپ کو کوئی بھی حق تعالیٰ جیسا خبردار خبریں نہ دے گا۔^(۴) (۱۳)

اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو^(۵) اور اللہ بے نیاز^(۶) خویوں والا ہے۔^(۷) (۱۵)

اگر وہ چاہے تو تم کو فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق پیدا کر دے۔^(۸) (۱۶)

اور یہ بات اللہ کو کچھ مشکل نہیں۔ (۱۷)

لَنْ تَدْعُوهُمْ لَاسْمَعُوا دَعَاءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بَشِرْ كُفْرًا وَلَا تَيْبَتُكَ مِنْ غَيْرِ ۝

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝

إِنْ يَشَاءُ يُغْنِكُمْ وَيَأْتِي بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ۝

وَمَا ذَلِك عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ۝

اس کی گھٹلی کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ پتلا سا چھلکا گھٹلی پر لفافے کی طرح چڑھا ہوا ہوتا ہے۔

- (۱) یعنی اگر تم انہیں مصائب میں پکارو تو وہ تمہاری پکار سنتے ہی نہیں ہیں، کیونکہ وہ جمادات ہیں یا منوں مٹی کے نیچے مدفون۔
- (۲) یعنی اگر بالفرض وہ سن بھی لیں تو بے فائدہ، اس لیے کہ وہ تمہاری التجاؤں کے مطابق تمہارا کام نہیں کر سکتے۔
- (۳) اور کہیں گے ﴿ مَا كُنْتُمْ يَا نَاعِبُونَ ﴾ ﴿ (یونس: ۲۸) ”تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے“ ﴿ إِنَّ كُفْرًا لَعَنَ جِبَادَتَكُمْ لَخَلْفَيْنِ ﴾ ﴿ (یونس: ۲۹) ”ہم تو تمہاری عبادت سے بے خبر تھے“۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن کی اللہ کے سوا عبادت کی جاتی ہے، وہ سب پتھر کی مورتیاں ہی نہیں ہوں گی، بلکہ ان میں عاقل (ملائکہ، جن، شیاطین اور صالحین) بھی ہوں گے۔ تب ہی تو یہ انکار کریں گے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کی حاجت براری کے لیے پکارنا شرک ہے۔
- (۴) اس لیے کہ اس جیسا کامل علم کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ وہی تمام امور کی کنہ اور حقیقت سے پوری طرح باخبر ہے جس میں ان پکارے جانے والوں کی بے اختیاری، پکار کو نہ سنا اور قیامت کے دن اس کا انکار کرنا بھی شامل ہے۔
- (۵) ناس کا لفظ عام ہے جس میں عوام و خواص، حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام و صلحاسب آجاتے ہیں۔ اللہ کے در کے سب ہی محتاج ہیں۔ لیکن اللہ کسی کا محتاج نہیں۔

(۶) وہ اتنا بے نیاز ہے کہ سب لوگ اگر اس کے نافرمان ہو جائیں تو اس سے اس کی سلطنت میں کوئی کمی اور سب اس کے اطاعت گزار بن جائیں، تو اس سے اس کی قوت میں زیادتی نہیں ہوگی۔ بلکہ نافرمانی سے انسانوں کا اپنا ہی نقصان ہے اور اس کی عبادت و اطاعت سے انسانوں کا اپنا ہی فائدہ ہے۔

- (۷) یعنی محمود ہے اپنی نعمتوں کی وجہ سے۔ پس نہ نعمت، جو اس نے بندوں پر کی ہے، اس پر وہ حمد و شکر کا مستحق ہے۔
- (۸) یہ بھی اس کی شان بے نیازی ہی کی ایک مثال ہے کہ اگر وہ چاہے تو تمہیں فنا کے گھاٹ اتار کے تمہاری جگہ ایک

کوئی بھی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا،^(۱) اگر کوئی گراں بار دوسرے کو اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے بلائے گا تو وہ اس میں سے کچھ بھی نہ اٹھائے گا گو قرابت دار ہی ہو۔^(۲) تو صرف انہی کو آگاہ کر سکتا ہے جو عاتبانہ طور پر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نمازوں کی پابندی کرتے ہیں^(۳) اور جو بھی پاک ہو جائے وہ اپنے ہی نفع کے لیے پاک ہوگا۔^(۴) لو ثناء اللہ ہی کی طرف ہے۔ (۱۸)

اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں۔ (۱۹)

اور نہ تاریکی اور روشنی۔^(۵) (۲۰)

اور نہ چھاؤں اور نہ دھوپ۔^(۶) (۲۱)

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ وَإِن تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ جِهْمَاهَا
لَا يُغْنِيَنَّ مِنْهَا شَيْءٌ ۚ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۚ إِنَّمَا تُنذِرُ
الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ ۚ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ
وَمِن مَّنْزَلِي ۚ فَإِنَّمَا يَتَذَكَّرُ لِنَفْسِهِ ۚ وَإِلَىٰ اللَّهِ الْمَصِيرُ ۝

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۝

وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ۝

وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ۝

نئی مخلوق پیدا کر دے، جو اس کی اطاعت گزار ہو، اس کی نافرمان نہیں یا یہ مطلب ہے کہ ایک نئی مخلوق اور نیا عالم پیدا کر دے جس سے تم نا آشنا ہو۔

(۱) ہاں جس نے دوسروں کو گمراہ کیا ہو گا، وہ اپنے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ ان کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائے گا، جیسا کہ آیت ﴿ وَيُحِبُّونَ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ ﴾ [العنکبوت-۱۳] اور حدیث مِّنْ سَنِّ سُنَّةٍ سَبِيَّةٍ كَانَ عَلَيْهِ وَزْرُهَا وَوَزْرٌ مِّنْ عَمَلٍ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ (صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی الصدقة...) سے واضح ہے لیکن یہ دوسروں کا بوجھ بھی درحقیقت ان کا اپنا ہی بوجھ ہے کہ ان ہی نے ان دوسروں کو گمراہ کیا تھا۔

(۲) مُثْقَلَةٌ، آئی: نَفْسٌ مُثْقَلَةٌ، ایسا شخص جو گناہوں کے بوجھ سے لدا ہو گا، وہ اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے اپنے رشتے دار کو بھی بلائے گا تو وہ آمادہ نہیں ہوگا۔

(۳) یعنی تیرے انذار و تبلیغ کا فائدہ انہی لوگوں کو ہو سکتا ہے، گویا تو انہی کو ڈرتا ہے، ان کو نہیں جن کو انذار سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا، ﴿ إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ مَّن يَخْشَىٰ ﴾ [النساء-۳۵] اور ﴿ إِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمَنَ يَ الْغَيْبِ ﴾ [بین-۱۱]

(۴) تَطَهَّرٌ اور تَزَيُّجِي کے معنی ہیں شرک اور فواحش کی آلودگیوں سے پاک ہونا۔

(۵) اندھے سے مراد کافر اور آنکھوں والا سے مومن، اندھیروں سے باطل اور روشنی سے حق مراد ہے۔ باطل کی بے شمار انواع ہیں، اس لیے اس کے لیے جمع کا اور حق چونکہ متعدد نہیں ایک ہے، اس لیے اس کے لیے واحد کا صیغہ استعمال کیا۔

(۶) یہ ثواب و عقاب یا جنت و دوزخ کی تمثیل ہے۔

اور زندے اور مردے برابر نہیں ہو سکتے،^(۱) اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے سنا دیتا ہے،^(۲) اور آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں ہیں۔^(۳) (۲۲)
 آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں۔^(۴) (۲۳)
 ہم نے ہی آپ کو حق دے کر خوشخبری سنانے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈر سنانے والا نہ گزرا ہو۔ (۲۴)
 اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلا دیں تو جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں انہوں نے بھی جھٹلایا تھا ان کے پاس بھی ان کے پیغمبر معجزے اور صحیفے اور روشن کتابیں لے کر آئے تھے۔^(۵) (۲۵)

پھر میں نے ان کافروں کو پکڑ لیا سو میرا عذاب کیسا ہوا۔^(۶) (۲۶)
 کیا آپ نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ نے

وَمَا يَسْتَوِي الْكَيْفَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَنْ يُشَاءُ ۚ
 وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ ۗ

إِنَّ أَنْتَ إِلَّا نَذِيرٌ ۗ

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ
 إِلَّا خَلَا بِهَا نَذِيرٌ ۗ

وَأَن يَكِيدَ بُولُوكُمْ فَفَعَلْنَا كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ جَاءَتْهُمْ
 رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ۗ

ثُمَّ أَخَذْتُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ۗ

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ

(۱) اَحْيَاءَ سے مومن اور اَمْوَاتُ سے کافر یا علما اور جاہل یا عقل مند اور غیر عقل مند مراد ہیں۔

(۲) یعنی جسے اللہ ہدایت سے نوازنے والا ہوتا ہے اور جنت اس کے لیے مقدر ہوتی ہے، اسے حجت و دلیل سننے اور پھر اسے قبول کرنے کی توفیق دے دیتا ہے۔

(۳) یعنی جس طرح قبروں میں مردہ اشخاص کو کوئی بات نہیں سنائی جاسکتی، اسی طرح جن کے دلوں کو کفر نے موت سے ہسٹنا کر دیا ہے، اے پیغمبر ﷺ تو انہیں حق کی بات نہیں سنا سکتا۔ مطلب یہ ہوا کہ جس طرح مرنے اور قبر میں دفن ہونے کے بعد مردہ کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اسی طرح کافر و مشرک جن کی قسمت میں بد بختی لکھی ہے، دعوت و تبلیغ سے انہیں فائدہ نہیں ہوتا۔

(۴) یعنی آپ ﷺ کا کام صرف دعوت و تبلیغ ہے۔ ہدایت اور ضلالت یہ اللہ کے اختیار میں ہے۔

(۵) تاکہ کوئی قوم یہ نہ کہہ سکے کہ ہمیں تو ایمان و کفر کا پتہ ہی نہیں، اس لیے کہ ہمارے پاس کوئی پیغمبر ہی نہیں آیا۔

تاہم اللہ نے ہر امت میں نبی بھیجا، جس طرح دوسرے مقام پر بھی فرمایا ﴿وَلِيُخْلِصَ قَوْمَهُمْ هَٰذَا﴾ ﴿الرعد-۷﴾ ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا﴾ ﴿الانبیاء-۱۰۷﴾

(۶) یعنی کیسے سخت عذاب کے ساتھ میں نے ان کی گرفت کی اور انہیں تباہ و برباد کر دیا۔

آسمان سے پانی اتارا پھر ہم نے اس کے ذریعہ سے مختلف رنگتوں کے پھل نکالے^(۱) اور پہاڑوں کے مختلف حصے ہیں سفید اور سرخ کہ ان کی بھی رنگتیں مختلف ہیں اور بہت گہرے سیاہ۔^(۲) (۲۷)

اور اسی طرح آدمیوں اور جانوروں اور چوپایوں میں بھی بعض ایسے ہیں کہ ان کی رنگتیں مختلف ہیں،^(۳) اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں^(۴) واقعی اللہ تعالیٰ زبردست بڑا بخشنے والا ہے۔^(۵) (۲۸)

جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں^(۶) اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں^(۷) اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے

ثُمَّ رُبَّمَا نَسْتَلِمْ أَلْوَانَهَا وَمِنْ أَلْبَابِ جُدَدٍ بَيْضٍ
وَحُمْرٍ مُّخْتَلِفٍ أَلْوَانُهَا وَعَرَابِيٌّ سُودٌ ۝

وَمِنَ النَّاسِ وَالنَّوَابِ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ
كَذَلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ
إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ عَلِيمٌ ۝

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ
وَأَنفَعُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ

(۱) یعنی جس طرح مومن اور کافر، صالح اور فاسد دونوں قسم کے لوگ ہیں، اسی طرح دیگر مخلوقات میں بھی تفاوت اور اختلاف ہے۔ مثلاً پھلوں کے رنگ بھی مختلف ہیں اور ذائقے، لذت اور خوشبو میں بھی ایک دوسرے سے مختلف۔ حتیٰ کہ ایک ایک پھل کے بھی کئی کئی رنگ اور ذائقے ہیں جیسے کھجور ہے، انگور ہے، سیب ہے اور دیگر بعض پھل ہیں۔

(۲) اسی طرح پہاڑ اور اس کے حصے یا راستے اور خطوط مختلف رنگوں کے ہیں، سفید، سرخ اور بہت گہرے سیاہ، جُدَدٌ جُدَدٌ کی جمع ہے، راستہ یا لکیر۔ عَرَابِيٌّ، غَرَبِيٌّ کی جمع اور سُودٌ، أَسْوَدٌ (سیاہ) کی جمع ہے۔ جب سیاہ رنگ کے گہرے پن کو ظاہر کرنا ہو تو اسود کے ساتھ غریب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اسود غریب، جس کے معنی ہوتے ہیں، بہت گہرا سیاہ۔

(۳) یعنی انسان اور جانور بھی سفید، سرخ، سیاہ اور زرد رنگ کے ہوتے ہیں۔

(۴) یعنی اللہ کی ان قدرتوں اور اس کے کمال صنای کو وہی جان اور سمجھ سکتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں، اس علم سے مراد کتاب و سنت اور اسرار الہیہ کا علم ہے اور جتنی انہیں رب کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اتنا ہی وہ رب سے ڈرتے ہیں، گویا جن کے اندر خشیت الہی نہیں ہے، سمجھ لو کہ علم صحیح سے بھی وہ محروم ہیں سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ علما کی تین قسمیں ہیں۔ عالم باللہ اور عالم بامر اللہ، یہ وہ ہے جو اللہ سے ڈرتا اور اس کے حدود و فرائض کو جانتا ہے۔ دوسرا صرف عالم باللہ، جو اللہ سے تو ڈرتا ہے لیکن اس کے حدود و فرائض سے بے علم ہے۔ تیسرا، صرف عالم بامر اللہ، جو حدود و فرائض سے باخبر ہے لیکن خشیت الہی سے عاری ہے (ابن کثیر)

(۵) یہ رب سے ڈرنے کی علت ہے کہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ نافرمان کو سزا دے اور توبہ کرنے والے کے گناہ معاف فرمادے۔

(۶) کتاب اللہ سے مراد قرآن کریم ہے ”تلاوت کرتے ہیں“ یعنی پابندی سے اس کا اہتمام کرتے ہیں۔

(۷) اقامت صلوٰۃ کا مطلب ہوتا ہے، نماز کی اس طرح ادا کیگی جو مطلوب ہے، یعنی وقت کی پابندی، اعتدال ارکان اور

تَجَارَةً لَّنْ نَّبُورًا ۝

اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں^(۱) وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی خسارہ میں نہ ہوگی۔^(۲) (۲۹) تاکہ ان کو ان کی اجرتیں پوری دے اور ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ دے^(۳) بیشک وہ بڑا بخشنے والا قدر دان ہے۔^(۴) (۳۰)

اور یہ کتاب جو ہم نے آپ کے پاس وحی کے طور پر بھیجی ہے یہ بالکل ٹھیک^(۵) ہے جو کہ اپنے سے پہلی کتابوں کی بھی تصدیق کرتی ہے۔^(۶) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی پوری خبر رکھنے والا خوب دیکھنے والا ہے۔^(۷) (۳۱) پھر ہم نے ان لوگوں کو (اس) کتاب^(۸) کا وارث بنایا جن کو

لِيُؤْتِيَهُمْ أَجْرَهُمْ وَيَزِيدَهُمْ مِنْ فَضْلِهِ إِنَّهُ غَفُورٌ شَكُورٌ ۝

وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ إِنَّ اللَّهَ بِمَا عَمِلْتُمْ لَخَبِيرٌ بَصِيرٌ ۝

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا

خشوع و خضوع کے اہتمام کے ساتھ پڑھنا۔

(۱) یعنی رات دن، علانیہ اور پوشیدہ دونوں طریقوں سے حسب ضرورت خرچ کرتے ہیں، بعض کے نزدیک پوشیدہ سے نقلی صدقہ اور علانیہ سے صدقہ واجبہ (زکوٰۃ) مراد ہے۔

(۲) یعنی ایسے لوگوں کا اجر اللہ کے ہاں یقینی ہے، جس میں مندے اور کمی کا امکان نہیں۔

(۳) لِيُؤْتِيَهُمْ، متعلق ہے۔ لَّنْ نَّبُورًا، یعنی یہ تجارت مندے سے اس لیے محفوظ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال صالحہ پر پورا اجر عطا فرمائے گا۔ یا پھر فعل محذوف کے متعلق ہے کہ وہ یہ نیک اعمال اس لیے کرتے ہیں یا اللہ نے انہیں ان کی طرف ہدایت کی تاکہ وہ انہیں اجر دے۔

(۴) یہ تَوْفِيقًا اور زیادت کی علت ہے کہ وہ اپنے مومن بندوں کے گناہ معاف کرنے والا ہے بشرطیکہ خلوص دل سے وہ توبہ کریں، ان کے جذبہ اطاعت و عمل صالح کا قدر دان ہے، اسی لیے وہ صرف اجر ہی نہیں دے گا بلکہ اپنے فضل و کرم سے مزید بھی دے گا۔

(۵) یعنی جس پر تیرے لیے اور تیری امت کے لیے عمل کرنا ضروری ہے۔

(۶) تورات اور انجیل وغیرہ کی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کریم اس اللہ کا نازل کردہ ہے جس نے پچھلی کتابیں نازل کی تھیں، جب ہی تو دونوں ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرتی ہیں۔

(۷) یہ اس کے علم و خبر ہی کا نتیجہ ہے کہ اس نے نئی کتاب نازل فرمادی، کیونکہ وہ جانتا ہے، پچھلی کتابیں تحریف و تغیر کا شکار ہو گئی ہیں اور اب وہ ہدایت کے قابل نہیں رہی ہیں۔

(۸) کتاب سے قرآن اور پنے ہوئے بندوں سے مراد امت محمدیہ ہے۔ یعنی اس قرآن کا وارث ہم نے امت محمدیہ کو

ہم نے اپنے بندوں میں سے پسند فرمایا۔ پھر بعضے تو ان میں اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں^(۱) اور بعضے ان میں متوسط درجے کے ہیں^(۲) اور بعضے ان میں اللہ کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کیے چلے جاتے ہیں۔^(۳) یہ بڑا فضل ہے۔^(۴) (۳۲)

وہ باغات میں ہمیشہ رہنے کے جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے سونے^(۵) کے کنگن اور موتی پہنائے جاویں گے۔ اور پوشاک ان کی وہاں ریشم کی ہوگی۔^(۶) (۳۳)

اور کہیں گے کہ اللہ کالا کلاہ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے غم

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ
بِالْخَيْرَاتِ يُادِرُ اللَّهُ ذَلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿۳۲﴾

جَعَلْنَا مَدِينٍ يَدْخُلُونَهَا يُحَلِّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ
ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا وَكُلًّا مِمَّا فِيهَا وَيُرَوْنَ ﴿۳۳﴾

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ إِنَّ رَبَّنَا

بنایا ہے جسے ہم نے دوسری امتوں کے مقابلے میں چن لیا اور اسے شرف و فضل سے نوازا۔ یہ تقریباً وہی مفہوم ہے جو آیت ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لَكُمْ آيَةً وَسَطًا لَّتَكُونُوا تَأْتُونَ عَلَى النَّاسِ﴾ (البقرة-۱۱۳) کا ہے۔

(۱) امت محمدیہ کی تین قسمیں بیان فرمائیں۔ یہ پہلی قسم ہے، جس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو بعض فرائض میں کوتاہی اور بعض محرمات کا ارتکاب کر لیتے ہیں یا بعض کے نزدیک وہ ہیں جو صغائر کا ارتکاب کرتے ہیں۔ انہیں اپنے نفس پر ظلم کرنے والا اس لیے کہا کہ وہ اپنی کچھ کوتاہیوں کی وجہ سے اپنے کو اس اعلیٰ درجے سے محروم کر لیں گے جو باقی دو قسموں کو حاصل ہوں گے۔

(۲) یہ دوسری قسم ہے۔ یعنی ملے جلے عمل کرتے ہیں یا بعض کے نزدیک وہ ہیں جو فرائض کے پابند، محرمات کے تارک تو ہیں لیکن کبھی مستحبات کا ترک اور بعض محرمات کا ارتکاب بھی ان سے ہو جاتا ہے یا وہ ہیں جو نیک تو ہیں لیکن پیش پیش نہیں ہیں۔

(۳) یہ وہ ہیں جو دین کے معاملے میں پچھلے دونوں سے سبقت کرنے والے ہیں۔

(۴) یعنی کتاب کا وارث کرنا اور شرف و فضل میں ممتاز (مصطفیٰ) کرنا۔

(۵) بعض کہتے ہیں کہ جنت میں صرف سابقون جائیں گے، لیکن یہ صحیح نہیں۔ قرآن کا سیاق اس امر کا متقاضی ہے کہ تینوں قسمیں جنتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ سابقین بغیر حساب کتاب کے اور مقتصدین آسان حساب کے بعد اور ظالمین شفاعت سے یا سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جائیں گے۔ جیسا کہ احادیث سے واضح ہے۔ محمد بن حنفیہ کا قول ہے ”یہ امت مرحومہ ہے، ظالم یعنی گناہگار کی مغفرت ہو جائے گی، مقتصد، اللہ کے ہاں جنت میں ہو گا اور سابق بالخیرات درجات عالیہ پر فائز ہو گا۔“ (ابن کثیر)

(۶) حدیث میں آتا ہے کہ ”ریشم اور دیباچ دنیا میں مت پہنو، اس لیے کہ جو اسے دنیا میں پہنے گا، وہ اسے آخرت میں نہیں پہنے گا۔“ (صحیح بخاری، وصحیح مسلم، کتاب اللباس)

لَقَفُورٌ شُكُورٌ ﴿۳۴﴾

دور کیا۔ بیشک ہمارا پروردگار بڑا بخشنے والا بڑا قدردان ہے۔ (۳۴)

جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اتارا جہاں نہ ہم کو کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ ہم کو کوئی حسرتی پہنچے گی۔ (۳۵)

اور جو لوگ کافر ہیں انکے لیے دوزخ کی آگ ہے نہ تو انکی قضای آئے گی کہ مر ہی جائیں اور نہ دوزخ کا عذاب ہی ان سے ہلکا کیا جائے گا۔ ہم ہر کافر کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ (۳۶)

اور وہ لوگ اس میں چلائیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو نکال لے، ہم اچھے کام کریں گے برخلاف ان کاموں کے جو کیا کرتے تھے،^(۱) (اللہ کہے گا) کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی کہ جس کو سمجھنا ہوتا^(۲) وہ سمجھ سکتا اور تمہارے پاس ڈرانے والا بھی پہنچا تھا،^(۳) سومرہ چکھو کہ (ایسے) ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ (۳۷)

بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے آسمانوں اور زمین کی

الَّذِي أَحْكَمَا دَارَ الْعَامَةِ مِنْ فَضْلِهِ لَكِنَّمَا فَتِنَا فِيهَا نَسَبٌ وَلَا مَسْنَا فِيهَا الْغُوبُ ﴿۳۵﴾

وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فِيمَؤُنَا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِنْ عَذَابِنَا كَذَلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَفُورٍ ﴿۳۶﴾

وَهُمْ يَصْطَرِّحُونَ فِيهَا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَن تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ الْآيَاتُ فَمَا اللَّغْلِبِينَ مِنْ تَصْوِيرٍ ﴿۳۷﴾

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ غَيْبِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ

(۱) یعنی غیروں کی بجائے تیری عبادت اور معصیت کی بجائے اطاعت کریں گے۔

(۲) اس سے مراد کتنی عمر ہے؟ مفسرین نے مختلف عمریں بیان کی ہیں۔ بعض نے بعض احادیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ ۶۰ سال کی عمر مراد ہے۔ (ابن کثیر) لیکن ہمارے خیال میں عمر کی تعیین صحیح نہیں، اس لیے کہ عمریں مختلف ہوتی ہیں، کوئی جوانی میں، کوئی کولت میں اور کوئی بڑھاپے میں فوت ہوتا ہے، پھر یہ ادوار بھی لمحہ گزر ان کی طرح مختصر نہیں ہوتے، بلکہ ہر دور خاصا ممتد (لسبا) ہوتا ہے۔ مثلاً جوانی کا دور، بلوغت سے کولت تک اور کولت کا دور شیخوخت بڑھاپے تک اور بڑھاپے کا دور موت تک رہتا ہے۔ کسی کو سوچ بچار، نصیحت نیزی اور اثر پذیر ی کے لیے چند سال، کسی کو اس سے زیادہ اور کسی کو اس سے بھی زیادہ سال ملتے ہیں اور سب سے یہ سوال کرنا صحیح ہو گا کہ ہم نے تجھے اتنی عمر دی تھی کہ اگر توجہ کو سمجھنا چاہتا تو سمجھ سکتا تھا، پھر تونے حق کو سمجھنے اور اسے اختیار کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟

(۳) اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یعنی یاد دہانی اور نصیحت کے لیے پیغمبر ﷺ اور اس کے منبر و محراب کے وارث علماء و دعاۃ تیرے پاس آئے، لیکن تونے اپنی عقل و فہم سے کام لیا نہ داعیان حق کی باتوں کی طرف دھیان کیا۔

الضُّمُورِ ۵۰

پوشیدہ چیزوں کا،^(۱) بیشک وہی جاننے والا ہے سینوں کی باتوں کا۔^(۲) (۳۸)

وہی ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں آباد کیا، سو جو شخص کفر کرے گا اس کے کفر کا وبال اسی پر پڑے گا۔ اور کافروں کے لیے ان کا کفر ان کے پروردگار کے نزدیک ناراضی ہی بڑھنے کا باعث ہوتا ہے، اور کافروں کے لیے ان کا کفر خسارہ ہی بڑھنے کا باعث ہوتا ہے۔^(۳) (۳۹)

آپ کہیں! کہ تم اپنے قرارداد شریکوں کا حال تو بتلاؤ جن کو تم اللہ کے سوا پوجا کرتے ہو۔ یعنی مجھ کو یہ بتلاؤ کہ انہوں نے زمین میں سے کون سا (جزو) بنایا ہے یا ان کا آسمانوں میں کچھ سا جھا ہے یا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے کہ یہ اس کی دلیل پر قائم ہوں،^(۴) بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے سے نرے دھوکے کی باتوں کا وعدہ کرتے آتے ہیں۔^(۵) (۴۰)

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ الْكُفْرَ إِلَّا مَقْتًا وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرَهُمْ إِلَّا خَسَارًا ۝

قُلْ أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَوَاتِ أَمْ آتَيْنَهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَى بَيِّنَاتٍ بَلْ إِنَّ يَعِدُ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا ۝

(۱) یہاں یہ بیان کرنے سے یہ مقصد بھی ہو سکتا ہے کہ تم دوبارہ دنیا میں جانے کی آرزو کر رہے ہو اور دعویٰ کر رہے ہو کہ اب نافرمانی کی جگہ اطاعت اور شرک کی جگہ توحید اختیار کرو گے۔ لیکن ہمیں علم ہے کہ تم ایسا نہیں کرو گے۔ تمہیں اگر دنیا میں دوبارہ بھیج بھی دیا جائے، تو تم وہی کچھ کرو گے جو پہلے کرتے رہے ہو۔ جیسے دوسرے مقام پر اللہ نے فرمایا ﴿وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ﴾ (الأنعام: ۳۸) ”اگر انہیں دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تو وہی کام کریں گے جن سے انہیں منع کیا گیا تھا“۔

(۲) یہ بچھلی بات کی تعلیل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو آسمان اور زمین کی پوشیدہ باتوں کا علم کیوں نہ ہو، جب کہ وہ سینوں کی باتوں اور رازوں سے بھی واقف ہے جو سب سے زیادہ مخفی ہوتے ہیں۔

(۳) یعنی اللہ کے ہاں کفر کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا، بلکہ اس سے اللہ کے غضب اور ناراضی میں بھی اضافہ ہو گا اور انسان کے اپنے نفس کا خسارہ بھی زیادہ۔

(۴) یعنی ہم نے ان پر کوئی کتاب نازل کی ہو، جس میں یہ درج ہو کہ میرے بھی کچھ شریک ہیں جو آسمان و زمین کی تخلیق میں حصے دار اور شریک ہیں۔

(۵) یعنی ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ بلکہ یہ آپس میں ہی ایک دوسرے کو گمراہ کرتے آئے ہیں۔ ان کے لیڈر

مَا زَادَهُمُ الْإِنْفُورًا ①

کے پاس ایک پیغمبر آئیے (۱) تو بس ان کی نفرت ہی میں
اضافہ ہوا۔ (۳۲)

دنیا میں اپنے کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے، (۲) اور ان کی بری
تدبیروں کی وجہ سے (۳) اور بری تدبیروں کا وبال ان تدبیر
والوں ہی پر پڑتا ہے، (۴) سو کیا یہ اسی دستور کے منتظر ہیں
جو اگلے لوگوں کے ساتھ ہوتا رہا (۵) ہے۔ سو آپ اللہ کے
دستور کو کبھی بدلتا ہوا نہ پائیں گے، (۶) اور آپ اللہ کے
دستور کو کبھی منتقل ہوتا ہوا نہ پائیں گے۔ (۷) (۳۳)

اور کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں جس میں دیکھتے
بھالتے کہ جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کا
انجام کیا ہوا؟ حالانکہ وہ قوت میں ان سے بڑھے ہوئے
تھے، اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز اس کو ہرا دے نہ
آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ وہ بڑے علم والا بڑی

لَيْسَ كِبَارًا فِي الْأَرْضِ وَمَكَرُ السَّيِّئِ وَلَا يَجِئُ الْمَكْرُ
السَّيِّئِ إِلَّا بِأَهْلِهِ فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّمَاءَ الْأُولَىٰ
فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ
اللَّهِ تَحْوِيلًا ②

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكُنْتُمْ أَنْتُمْ مِنْهُمْ قَوْمًا وَمَا
كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ
إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا ③

(۱) یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس نبی بن کر آگئے جن کے لیے وہ تمنا کرتے تھے۔

(۲) یعنی آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لانے کے بجائے، انکار و مخالفت کا راستہ محض استکبار اور سرکشی کی وجہ سے اختیار کیا۔

(۳) اور بری تدبیر یعنی حیلہ، دھوکہ اور عمل قبیح کی وجہ سے کیا۔

(۴) یعنی لوگ کمزور ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ بری تدبیر کا انجام برا ہی ہوتا ہے اور اس کا وبال بالآخر کمزور حیلہ
کرنے والوں پر ہی پڑتا ہے۔

(۵) یعنی کیا یہ اپنے کفر و شرک، رسول ﷺ کی مخالفت اور مومنوں کو ایذا نہیں پہنچانے پر مصر رہ کر اس بات کے منتظر
ہیں کہ انہیں بھی اس طرح ہلاک کیا جائے، جس طرح پچھلی قومیں ہلاکت سے دوچار ہوئیں؟

(۶) بلکہ یہ اسی طرح جاری ہے اور ہر مکتب (جھٹلانے والے) کا مقدر ہلاکت ہے یا بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی
شخص اللہ کے عذاب کو رحمت سے بدلنے پر قادر نہیں ہے۔

(۷) یعنی کوئی اللہ کے عذاب کو دور کرنے والا یا اس کا رخ پھیرنے والا نہیں ہے یعنی جس قوم کو اللہ عذاب سے دوچار کرنا
چاہے، کوئی اس کا رخ کسی اور قوم کی طرف پھیر دے، کسی میں یہ طاقت نہیں ہے۔ مطلب اس سنت اللہ کی وضاحت سے
مشرکین عرب کو ڈرانا ہے کہ ابھی بھی وقت ہے، وہ کفر و شرک چھوڑ کر ایمان لے آئیں، ورنہ وہ اس سنت الہی سے بچ نہیں
سکتے، دیر سویر اس کی زد میں آکر رہیں گے، کوئی اس قانون الہی کو بدلنے پر قادر ہے اور نہ عذاب الہی کو پھیرنے پر۔

قدرت والا ہے۔ (۳۴)

اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کے اعمال کے سبب داروگیر فرمانے لگتا تو روئے زمین پر ایک جاندار کو نہ چھوڑتا،^(۱) لیکن اللہ تعالیٰ ان کو ایک میعاد معین تک مہلت دے رہا ہے، سو جب ان کی وہ میعاد آ پہنچے گی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آپ دیکھ لے گا۔ (۳۵)^(۲)

سورہ یٰسین کی ہے اور اس میں تراسی آیتیں اور
پانچ رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

یٰسین^(۳) (۱) قسم ہے قرآن باحکمت کی۔ (۲)

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِهِمَا
مِنَ الدّٰبِئَةِ وَالدّٰبِئَةُ يُؤَخِّرُهُمْ لِىَ اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ
فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهِ بَصِيْرًا ۝

سُورَةُ يٰسِينَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

يٰسَ ۝ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيْمِ ۝

(۱) انسانوں کو تو ان کے گناہوں کی پاداش میں اور جانوروں کو انسانوں کی نحوست کی وجہ سے۔ یا مطلب ہے کہ تمام اہل زمین کو ہلاک کر دیتا، انسانوں کو بھی اور جن جانوروں اور روزیوں کے وہ مالک ہیں، ان کو بھی۔ یا مطلب ہے کہ آسمان سے بارشوں کا سلسلہ منقطع فرمادیتا، جس سے زمین پر چلنے والے سب دابتہ مر جاتے۔

(۲) یہ میعاد معین دنیا میں بھی ہو سکتی ہے اور یوم قیامت تو ہے ہی۔

(۳) یعنی اس دن ان کا محاسبہ کرے گا اور ہر شخص کو اس کے عملوں کا پورا بدلہ دے گا۔ اہل ایمان و اطاعت کو اجر و ثواب اور اہل کفر و معصیت کو عتاب و عقاب۔ اس میں مومنوں کے لیے تسلی ہے اور کافروں کے لیے وعید۔

☆ سورہ یٰسین کے فضائل میں بہت سی روایات مشہور ہیں۔ مثلاً یہ کہ قرآن کا دل ہے، اسے قریب المرگ شخص پر پڑھو، وغیرہ۔ لیکن سند کے لحاظ سے کوئی روایت بھی درجہ صحت کو نہیں پہنچتی۔ بعض بالکل موضوع ہیں یا پھر ضعیف ہیں۔ قلب قرآن والی روایت کو شیخ البانی نے موضوع قرار دیا ہے۔ (الضعیفہ۔ حدیث نمبر۔ ۱۶۹)

(۴) بعض نے اس کے معنی یا رجل یا انسان کے کیے ہیں۔ بعض نے اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اور بعض نے اسے اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں سے بتلایا ہے۔ لیکن یہ سب اقوال بلا دلیل ہیں۔ یہ بھی ان حروف مقطعات میں سے ہی ہے۔ جن کا معنی و مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

(۵) یا قرآن محکم کی، جو نظم و معنی کے لحاظ سے محکم یعنی پختہ ہے۔ واؤ قسم کے لیے ہے۔ آگے جواب قسم ہے۔

- ۱) إِنَّكَ لَمِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱﴾
 عَلَى صَوَابٍ مُّسْتَبِينٍ ﴿۲﴾
 تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ﴿۳﴾
- کہ بے شک آپ پیغمبروں میں سے ہیں۔ (۱)
 سیدھے راستے پر ہیں۔ (۲)
 یہ قرآن اللہ زبردست مہربان کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ (۳)
- ۲) لِيُنذِرَ قَوْمًا مَّا أُنذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ ﴿۱﴾
 لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَىٰ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۲﴾
- تاکہ آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے باپ دادے نہیں ڈرائے گئے تھے، سو (اسی وجہ سے) یہ غافل ہیں۔ (۱)
 ان میں سے اکثر لوگوں پر بات ثابت ہو چکی ہے سو یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے۔ (۲)

(۱) مشرکین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں شک کرتے تھے، اس لیے آپ ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے اور کہتے تھے ﴿لَسْتَ مُسْلِمًا﴾ (الرعد-۳۲) ”تو تو پیغمبر ہی نہیں ہے۔“ اللہ نے ان کے جواب میں قرآن حکیم کی قسم کھا کر کہا کہ آپ ﷺ یقیناً اس کے پیغمبروں میں سے ہیں۔ اس میں آپ ﷺ کے شرف و فضل و اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی رسول کی رسالت کے لئے قسم نہیں کھائی یہ بھی آپ ﷺ کے امتیازات اور خصائص میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی رسالت کے اثبات کے لیے قسم کھائی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۲) یہ اِنِّكَ کی دوسری خبر ہے۔ یعنی آپ ﷺ ان پیغمبروں کے راستے پر ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں۔ یا ایسے راستے پر ہیں جو سیدھا اور مطلوب منزل (جنت) تک پہنچانے والا ہے۔

(۳) یعنی اس اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے جو عزیز ہے یعنی اس کا انکار اور اس کے رسول کی تکذیب کرنے والے سے انتقام لینے پر قادر ہے رحیم ہے یعنی جو اس پر ایمان لائے گا اور اس کا بندہ بن کر رہے گا، اس کے لیے نہایت مہربان ہے۔

(۴) یعنی آپ ﷺ کو رسول اس لیے بنایا ہے اور یہ کتاب اس لیے نازل کی ہے تاکہ آپ ﷺ اس قوم کو ڈرائیں جن میں آپ ﷺ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، اس لیے ایک مدت سے یہ لوگ دین حق سے بے خبر ہیں۔ یہ مضمون پہلے بھی کئی جگہ گزر چکا ہے کہ عربوں میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے براہ راست کوئی نبی نہیں آیا۔ یہاں بھی اسی چیز کو بیان کیا گیا ہے۔

(۵) جیسے ابو جہل، عتبہ، شیبہ وغیرہ۔ بات ثابت ہونے کا مطلب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ ”میں جنم کو جنوں اور انسانوں سے بھروں گا۔“ (الم السجدہ-۱۱۳) شیطان سے بھی خطاب کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا تھا ”میں جنم کو تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے بھروں گا۔“ (ص-۸۳) یعنی ان لوگوں نے شیطان کے پیچھے لگ کر اپنے آپ کو جنم کا مستحق قرار دے لیا، کیونکہ اللہ نے تو ان کو اختیار و حریت ارادہ سے نوازا تھا، لیکن انہوں نے اس کا استعمال غلط کیا اور یوں جنم کا بندہ بن گئے۔ یہ نہیں کہ اللہ نے جبراً ان کو ایمان سے محروم رکھا، کیونکہ جبری صورت میں تو وہ عذاب کے مستحق ہی قرار نہ پاتے۔

ہم نے انکی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں پھر وہ ٹھوڑیوں تک ہیں، جس سے انکے سراپر کو الٹ گئے ہیں۔^(۸)

اور ہم نے ایک آثران کے سامنے کردی اور ایک آثران کے پیچھے کردی،^(۹) جس سے ہم نے ان کو ڈھانک دیا^(۱۰) سو وہ نہیں دیکھ سکتے۔^(۱۱)

اور آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں دونوں برابر ہیں، یہ ایمان نہیں لائیں گے۔^(۱۲)

بس آپ تو صرف ایسے شخص کو ڈرا سکتے ہیں^(۱۳) جو نصیحت پر چلے اور رحمن سے بے دیکھے ڈرے، سو آپ اس کو مغفرت اور باوقار اجر کی خوش خبریاں سنا دیجئے۔^(۱۴)

بیشک ہم مردوں کو زندہ کریں گے،^(۱۵) اور ہم لکھتے جاتے ہیں وہ اعمال بھی جن کو لوگ آگے بھیجتے ہیں^(۱۶) اور ان

إِنَّا جَعَلْنَا فِي آعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهَبِي إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُم مُّقْمَحُونَ ۝

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ۝

وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

إِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمَنَ الْعَلِيمَ ۝ قَبَسَتْهُ بِمَعْرِفَةٍ وَأَجْرٌ كَرِيمٌ ۝

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ ۝

(۱) جس کی وجہ سے وہ ادھر ادھر دیکھ سکتے ہیں، نہ سر جھکا سکتے ہیں، بلکہ وہ سراپر اٹھائے اور نگاہیں نیچی کیے ہوئے ہیں۔ یہ ان کے عدم قبول حق کی اور عدم انفاق کی تمثیل ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ان کی سزائے جنم کی کیفیت کا بیان ہو۔ (السر القاسیر)

(۲) یعنی دنیا کی زندگی ان کے لیے مزین کر دی گئی، یہ گویا ان کے سامنے کی آڑ ہے، جس کی وجہ سے وہ لہذا دنیا کے علاوہ کچھ نہیں دیکھتے اور یہی چیز ان کے اور ایمان کے درمیان مانع اور حجاب ہے اور آخرت کا تصور ان کے ذہنوں میں ناممکن الوقوع کر دیا گیا، یہ گویا ان کے پیچھے کی آڑ ہے جس کی وجہ سے وہ توبہ کرتے ہیں نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں، کیونکہ آخرت کا کوئی خوف ہی ان کے دلوں میں نہیں ہے۔

(۳) یا ان کی آنکھوں کو ڈھانک دیا یعنی رسول ﷺ سے عداوت اور اس کی دعوت حق سے نفرت نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی یا انہیں اندھا کر دیا ہے جس سے وہ دیکھ نہیں سکتے۔ یہ ان کے حال کی دوسری تمثیل ہے۔

(۴) یعنی جو اپنے کرتوتوں کی وجہ سے گمراہی کے اس مقام پر پہنچ جائیں، ان کے لیے انذار بے فائدہ رہتا ہے۔

(۵) یعنی انذار سے صرف اس کو فائدہ پہنچتا ہے۔

(۶) یعنی قیامت والے دن۔ یہاں احیائے موتی کے ذکر سے یہ اشارہ کرنا بھی مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں میں سے جس کا دل چاہتا ہے، زندہ کر دیتا ہے جو کفر و ضلالت کی وجہ سے مردہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ پس وہ ہدایت اور ایمان کو اپنالیتے ہیں۔

(۷) مَا قَدَّمُوا سے وہ اعمال مراد ہیں جو انسان خود اپنی زندگی میں کرتا ہے اور آثَارَهُمْ سے وہ اعمال جن کے عملی نمونے (اجتہ)

وَكُلُّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِيْٓ اِمَامًا مُّبِيْنًا ﴿۱۶﴾

وَاصْرَبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحَابَ الْقَرْيَةِ اِذْ جَاءَهَا
الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۷﴾

اِذْ اَرْسَلْنَا اِلَيْهِمُ اثْنَيْنَ فَاذَّٰبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِتَالِثِ

کے وہ اعمال بھی جن کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں، اور ہم نے
ہر چیز کو ایک واضح کتاب میں ضبط کر رکھا ہے۔ (۱۶)^(۱)
اور آپ ان کے سامنے ایک مثال (یعنی ایک) بستی
والوں کی مثال (اس وقت کا) بیان کیجئے جبکہ اس بستی میں
(کئی) رسول آئے۔ (۱۷)^(۲)

جب ہم نے ان کے پاس دو کو بھیجا سوان لوگوں نے (اول)
دونوں کو جھٹلایا پھر ہم نے تیسرے سے تائید کی سوان تینوں

یا برے) وہ دنیا میں چھوڑ جاتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کی اقتدا میں لوگ وہ اعمال بجالاتے ہیں۔ جس طرح حدیث میں
ہے ”جس نے اسلام میں کوئی نیک طریقہ جاری کیا، اس کے لیے اس کا اجر بھی ہے اور اس کا بھی ہے جو اس کے بعد اس پر عمل
کرے گا۔ بغیر اس کے کہ ان میں سے کسی کے اجر میں کمی ہو اور جس نے کوئی برا طریقہ جاری کیا، اس پر اس کے اپنے گناہ کا بھی
بوجھ ہو گا اور اس کا بھی جو اس کے بعد اس پر عمل کرے گا، بغیر اس کے کہ ان میں سے کسی کے بوجھ میں کمی ہو۔ (صحیح
مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی الصدقة ولو بشق تمرۃ) اسی طرح یہ حدیث ہے ”جب انسان مر جاتا ہے تو
اس کے عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ سوائے تین چیزوں کے۔ ایک علم، جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں (۳) نیک اولاد جو مرنے
والے کے لیے دعا کرے (۴) یا صدقہ جاریہ، جس سے اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ فیض یاب ہوں (صحیح مسلم،
کتاب الوصیۃ، باب ما یلحق الإنسان من الشواب بعد وفاته) دو سرا مطلب اَنَّا رُحْمُہُمْ کا نشانات قدم ہے۔ یعنی انسان
نیکی یا بدی کے لیے جو سفر کرتا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے تو قدموں کے یہ نشانات بھی لکھے جاتے ہیں۔ جیسے عمد
رسالت میں مسجد نبوی کے قریب کچھ جگہ خالی تھی تو بنو سلمہ نے ادھر منتقل ہونے کا ارادہ کیا، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے
علم میں یہ بات آئی تو آپ ﷺ نے انہیں مسجد کے قریب منتقل ہونے سے روک دیا اور فرمایا دِیَارُكُمْ تَنْکُتُ اَنَّا رُحْمُكُمْ (دو
مرتبہ فرمایا) یعنی ”تمہارے گھر اگرچہ دور ہیں، لیکن وہیں رہو، جتنے قدم تم چل کر آتے ہو، وہ لکھے جاتے ہیں۔“ (صحیح
مسلم، کتاب المساجد، باب فضل کثرة الخطیٰ الی المساجد) امام ابن کثیر فرماتے ہیں۔ دونوں مفہوم اپنی جگہ
صحیح ہیں، ان کے درمیان منافات نہیں ہے۔ بلکہ اس دوسرے مفہوم میں سخت تشبیہ ہے، اس لیے کہ جب قدموں کے
نشانات تک لکھے جاتے ہیں، تو انسان جو اچھایا برا نمونہ چھوڑ جائے جس کی لوگ بعد میں پیروی کریں تو وہ بطریق اولیٰ لکھے
جائیں گے۔

(۱) اس سے مراد لوح محفوظ ہے اور بعض نے صحائف اعمال مراد لیے ہیں۔

(۲) تاکہ اہل مکہ سے سمجھ لیں کہ آپ کوئی انوکھے رسول نہیں ہیں، بلکہ رسالت و نبوت کا یہ سلسلہ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔

نے کہا کہ ہم تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں۔^(۱۳)
 ان لوگوں نے کہا کہ تم تو ہماری طرح معمولی آدمی ہو اور
 رخصت نے کوئی چیز نازل نہیں کی۔ تم نراجھوٹ بولتے ہو۔ (۱۵)
 ان (رسولوں) نے کہا ہمارا پروردگار جانتا ہے کہ بیشک ہم
 تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں۔ (۱۶)

اور ہمارے ذمہ تو صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے۔ (۱۷)
 انہوں نے کہا کہ ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں۔^(۱۸) اگر تم
 باز نہ آئے تو ہم پتھروں سے تمہارا کام تمام کر دیں گے
 اور تم کو ہماری طرف سے سخت تکلیف پہنچے گی۔ (۱۸)

ان رسولوں نے کہا کہ تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہی
 لگی ہوئی^(۱۹) ہے، کیا اس کو نحوست سمجھتے ہو کہ تم کو نصیحت
 کی جائے بلکہ تم حد سے نکل جانے والے لوگ ہو۔ (۱۹)
 اور ایک شخص (اس) شہر کے آخری حصے سے دوڑتا ہوا آیا
 کہنے لگا کہ اے میری قوم! ان رسولوں کی راہ پر چلو^(۲۰)
 ایسے لوگوں کی راہ پر چلو جو تم سے کوئی معاوضہ نہیں
 مانگتے اور وہ راہ راست پر ہیں۔ (۲۱)

فَقَالُوا إِنَّا إِلَهُكُمْ مُرْسَلُونَ ﴿۱۳﴾
 قَالُوا مَا آتَانَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۗ وَمَا نَزَّلَ الرَّحْمٰنُ
 مِنْ شَيْءٍ ۗ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا كَذِبُونَ ﴿۱۴﴾
 قَالُوا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّا إِلَهُكُمْ لَمُرْسَلُونَ ﴿۱۵﴾

وَمَا عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴿۱۶﴾
 قَالُوا إِنَّا نَطَّيَّرُ بِأَلِهَتِنَا لِمَنْ كَفَرَ بِنَهْمِهِ لَمَرْجُؤُهُمْ
 وَمَا سَنَعُكُمْ مِنَّا عَذَابٌ إِلَيْهِ ﴿۱۷﴾

قَالُوا طَائِفُكُمْ مَعَكُمْ ۗ أَيْنَ ذُكِرْتُمْ بَلَىٰ أَنْتُمْ
 قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ﴿۱۸﴾

وَجَاءَ مِنْ أَقْصَا الْمَدْيَنَةِ رَجُلٌ يُسْمَىٰ قَالَ يَٰقَوْمِ
 اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۹﴾

اتَّبِعُوا مَنْ لَا يَسْئَلُكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مُّهْتَدُونَ ﴿۲۰﴾

(۱) یہ تین رسول کون تھے؟ مفسرین نے ان کے مختلف نام بیان کیے ہیں، لیکن نام مستند ذریعے سے ثابت نہیں ہیں۔
 بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرستادہ تھے، جو انہوں نے اللہ کے حکم سے ایک بستی میں
 تبلیغ و دعوت کے لیے بھیجے تھے۔ بستی کا نام انطاکیہ تھا۔

(۲) ممکن ہے کچھ لوگ ایمان لے آئے ہوں اور ان کی وجہ سے قوم دو گروہوں میں بٹ گئی ہو، جس کو انہوں نے رسولوں کی
 نعوذ باللہ نحوست قرار دیا۔ یا پارش کا سلسلہ موقوف رہا ہو، تو وہ سمجھے ہوں کہ یہ ان رسولوں کی نحوست ہے۔ نعوذ باللہ
 مِنْ ذَلِكَ، جیسے آج کل بھی بد نما اور دین و شریعت سے بے بہرہ لوگ، اہل ایمان و تقویٰ کو ہی ”منحوس“ سمجھتے ہیں۔

(۳) یعنی وہ تو تمہارے اپنے اعمال بد کا نتیجہ ہے جو تمہارے ساتھ ہی ہے نہ کہ ہمارے ساتھ۔

(۴) یہ شخص مسلمان تھا، جب اسے پتہ چلا کہ قوم پیغمبروں کی دعوت کو نہیں اپناتی ہے، تو اس نے اگر رسولوں کی
 حمایت اور ان کے اتباع کی ترغیب دی۔

اور مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں۔ جس نے مجھے پیدا کیا اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔^(۱) (۲۲)

کیا میں اسے چھوڑ کر ایسوں کو معبود بناؤں کہ اگر (اللہ) رحمن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی سفارش مجھے کچھ بھی نفع نہ پہنچا سکے اور نہ وہ مجھے بچا سکیں۔^(۲) (۲۳)
پھر تو میں یقیناً کھلی گمراہی میں ہوں۔^(۳) (۲۴)
میری سنو! میں تو (سچے دل سے) تم سب کے رب پر ایمان لاچکا۔^(۴) (۲۵)

(اس سے) کہا گیا کہ جنت میں چلا جا، کتنے لگا کاش! میری قوم کو بھی علم ہو جاتا۔ (۲۶)
کہ مجھے میرے رب نے بخش دیا اور مجھے باعزت لوگوں

وَمَا لِي لَا أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۲﴾

أَلَيْسَ لِي عِندَ اللَّهِ مِنْ دُونِهِ آلِهَةٌ إِنْ يُرِيدِ الرَّحْمَنُ يَضْرِبْ لَكَ مَنْ عِشَىٰ شَفَاعَةً لَهُمْ سَيِّئًا وَلَا يُنْفَعُونَ ﴿۲۳﴾

إِنِّي إِذْ أَتَيْتُ ضَلِيلٌ مُّبِينٍ ﴿۲۴﴾

إِنِّي آمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمِعُونِ ﴿۲۵﴾

فِيلٍ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ لِيَبْتَغِي عَمِي يَعْلَمُونَ ﴿۲۶﴾

بِمَا عَفَىٰ رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرِمِينَ ﴿۲۷﴾

(۱) اپنے مسلک توحید کی وضاحت کی، جس سے مقصد اپنی قوم کی خیر خواہی اور ان کی صحیح رہنمائی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی قوم نے اس سے کہا ہو کہ کیا تو بھی اس معبود کی عبادت کرتا ہے، جس کی طرف یہ مرسلین ہمیں بلا رہے ہیں اور ہمارے معبودوں کو تو بھی چھوڑ بیٹھا ہے؟ جس کے جواب میں اس نے یہ کہا۔ مفسرین نے اس شخص کا نام حبیب نجار بتلایا ہے، واللہ اعلم۔

(۲) یہ ان معبودان باطلہ کی بے بسی کی وضاحت ہے جن کی عبادت اس کی قوم کرتی تھی اور شرک کی اس گمراہی سے نکلنے کے لیے رسول ان کی طرف بھیجے گئے تھے۔ نہ بچا سکیں کا مطلب ہے کہ اللہ اگر مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو یہ بچا نہیں سکتے۔

(۳) یعنی اگر میں بھی تمہاری طرح، اللہ کو چھوڑ کر ایسے بے اختیار اور بے بس معبودوں کی عبادت شروع کر دوں، تو میں بھی کھلی گمراہی میں جا کروں گا۔ یا ضلال، یہاں خیران کے معنی میں ہے، یعنی یہ تو نہایت واضح خسارے کا سودا ہے۔

(۴) اس کی دعوت توحید اور اقرار توحید کے جواب میں قوم نے اسے قتل کرنا چاہا تو اس نے پیغمبروں سے خطاب کر کے یہ کہا، مقصد اپنے ایمان پر ان پیغمبروں کو گواہ بنانا تھا۔ یا اپنی قوم سے خطاب کر کے کہا جس سے مقصود دین حق پر اپنی صلابت اور استقامت کا اظہار تھا کہ تم جو چاہو کرو، لیکن اچھی طرح سن لو کہ میرا ایمان اسی رب پر ہے، جو تمہارا بھی رب ہے۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کو مار ڈالا اور کسی نے ان کو اس سے نہیں روکا۔ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَىٰ

میں سے کر دیا۔^(۱) (۲۷)

اس کے بعد ہم نے اس کی قوم پر آسمان سے کوئی لشکر نہ اتارا،^(۲) اور نہ اس طرح ہم اتارا کرتے ہیں۔^(۳) (۲۸)

وہ تو صرف ایک زور کی چیخ تھی کہ یکایک وہ سب کے سب بچھ بچھ گئے۔^(۴) (۲۹)

(ایسے) بندوں پر افسوس! ^(۵) کبھی بھی کوئی رسول ان کے پاس نہیں آیا جس کی ہنسی انہوں نے نہ اڑائی ہو۔ (۳۰)

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ان کے پہلے بہت سی قوموں کو ہم نے غارت کر دیا کہ وہ ان ^(۶) کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ (۳۱)

اور نہیں ہے کوئی جماعت مگر یہ کہ وہ جمع ہو کر ہمارے

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَىٰ قَوْمِهِ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ جُنْدٍ مِنَ السَّمَاءِ
وَمَا كُنَّا أَنْزِلِينَ ﴿۲۷﴾

إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ خُمُودٌ ﴿۲۸﴾

يَعْسُرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ
يَسْتَهْزِئُونَ ﴿۲۹﴾

أَلَمْ يَرَوْا كَمَا هَلَكْنَا أَقْبَلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ
لَا يَرْجِعُونَ ﴿۳۰﴾

وَأَنْ كُلُّ لِقَا جَمِيعٍ لَدَيْنَا مُخَضَّرُونَ ﴿۳۱﴾

(۱) یعنی جس ایمان اور توحید کی وجہ سے مجھے رب نے بخش دیا، کاش میری قوم اس بات کو جان لے تاکہ وہ بھی ایمان و توحید کو اپنا کر اللہ کی مغفرت اور اس کی نعمتوں کی مستحق ہو جائے۔ اس طرح اس شخص نے مرنے کے بعد بھی اپنی قوم کی خیر خواہی کی۔ ایک مومن صادق کو ایسا ہی ہونا چاہیے کہ وہ ہر وقت لوگوں کی خیر خواہی ہی کرے، بد خواہی نہ کرے۔ ان کی صحیح رہنمائی کرے، گمراہ نہ کرے، بیشک لوگ اسے جو چاہے کہیں اور جس قسم کا سلوک چاہیں کریں، حتیٰ کہ اسے مار ڈالیں۔

(۲) یعنی حبیب نجاہ کے قتل کے بعد ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے آسمان سے فرشتوں کا کوئی لشکر نہیں اتارا۔ یہ اس قوم کی تحقیر شان کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) یعنی جس قوم کی ہلاکت کسی دوسرے طریقے سے لکھی جاتی ہے تو وہاں ہم فرشتے نازل بھی نہیں کرتے۔

(۴) کہتے ہیں کہ جبرائیل علیہ السلام نے ایک چیخ ماری، جس سے سب کے جسموں سے روحمیں نکل گئیں اور وہ بچھی آگ کی طرح ہو گئے۔ گویا زندگی، شعلہ فروزاں ہے اور موت، اس کا بچھ کر رکھ کا ڈھیر ہو جانا۔

(۵) حسرت و ندامت کا یہ اظہار خود اپنے نفسوں پر، قیامت والے دن، عذاب دیکھنے کے بعد کریں گے کہ کاش انہوں نے اللہ کے بارے میں کوتاہی نہ کی ہوتی یا اللہ تعالیٰ بندوں کے رویے پر افسوس کر رہا ہے کہ ان کے پاس جب بھی کوئی رسول آیا انہوں نے اس کے ساتھ استنزا ہی کیا۔

(۶) اس میں اہل مکہ کے لیے تمبیہ ہے کہ مخذیب رسالت کی وجہ سے جس طرح بچھلی قومیں تباہ ہوئیں یہ بھی تباہ ہو سکتے ہیں۔

سامنے حاضر کی جائے گی۔^(۱) (۳۲)

اور ان کے لیے ایک نشانی^(۲) (خشک) زمین ہے جس کو ہم نے زندہ کر دیا اور اس سے غلہ نکالا جس میں سے وہ کھاتے ہیں۔ (۳۳)

اور ہم نے اس میں کھجوروں کے اور انگور کے باغات پیدا کر دیئے،^(۳) اور جن میں ہم نے چشمے بھی جاری کر دیئے ہیں۔ (۳۴)

تاکہ (لوگ) اس کے پھل کھائیں،^(۴) اور اس کو ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا۔^(۵) پھر کیوں شکر گزاری نہیں کرتے۔ (۳۵)

وہ پاک ذات ہے جس نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے

وَأَيُّ لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ الْمَيْتَةِ؟ أَحْيَيْنَاهَا وَأَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا
فَيَنْهَ يَأْكُلُونَ ﴿۳۲﴾

وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِنْ جَنِينٍ وَاعْنَابٍ وَفَجْرًا بِأَنْهَامِمْ
الْعُيُونِ ﴿۳۳﴾

لِيَأْكُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿۳۴﴾

مُبْصِنِ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُخْتَمُ الْأَرْضُ وَمِنْ

(۱) اس میں ان نافیہ ہے اور لَمَّا؛ اِلَّا کے معنی میں۔ مطلب یہ ہے کہ تمام لوگ گزشتہ بھی اور آئندہ آنے والے بھی سب اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے جہاں ان کا حساب کتاب ہو گا۔

(۲) یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود اس کی قدرت تامہ اور مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر نشانی۔

(۳) یعنی مردہ زمین کو زندہ کر کے ہم اس سے ان کی خوراک کے لیے صرف غلہ ہی نہیں اگاتے بلکہ ان کے کام و دہن کی لذت کے لیے انواع و اقسام کے پھل بھی کثرت سے پیدا کرتے ہیں، یہاں صرف دو پھلوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ یہ کثیر المنافع بھی ہیں اور عربوں کو مرغوب بھی، نیز ان کی پیداوار بھی عرب میں زیادہ ہے۔ پھر غلے کا ذکر پہلے کیا کیونکہ اس کی پیداوار بھی زیادہ ہے اور خوراک کی حیثیت سے اس کی اہمیت بھی مسلمہ۔ جب تک انسان روٹی یا چاول وغیرہ خوراک سے اپنا پیٹ نہیں بھرتا، محض پھل فروٹ سے اس کی غذائی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔

(۴) یعنی بعض جگہ چشمے بھی جاری کرتے ہیں، جس کے پانی سے پیدا ہونے والے پھل لوگ کھائیں۔

(۵) امام ابن جریر کے نزدیک یہاں ما نافیہ ہے یعنی غلوں اور پھلوں کی یہ پیداوار، اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے جو وہ اپنے بندوں پر کرتا ہے۔ اس میں ان کی سعی و محنت، کدو کاوش اور تصرف کا دخل نہیں ہے۔ پھر بھی یہ اللہ کی ان نعمتوں پر اس کا شکر کیوں نہیں کرتے؟ اور بعض کے نزدیک "ما موصولہ ہے جو اللہ ہی کے معنی میں ہے یعنی تاکہ وہ اس کا پھل کھائیں اور ان چیزوں کو جن کو ان کے ہاتھوں نے بنایا۔ ہاتھوں کا عمل ہے، زمین کو ہموار کر کے بیج بونا، اسی طرح پھلوں کے کھانے کے مختلف طریقے ہیں، مثلاً انہیں چھوڑ کر ان کا رس پینا، مختلف فروٹوں کو ملا کر چاٹ بنانا، وغیرہ۔

أَنفُسِهِمْ وَمَا لَا يَحْتَسِبُونَ ﴿۳۶﴾

خواہ وہ زمین کی اگائی ہوئی چیزیں ہوں، خواہ خود ان کے نفوس ہوں خواہ وہ (چیزیں) ہوں جنہیں یہ جانتے بھی نہیں۔^(۱) (۳۶)

اور ان کے لیے ایک نشانی رات ہے جس سے ہم دن کو کھینچ دیتے ہیں تو وہ یکایک اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔^(۲) (۳۷)

اور سورج کے لیے جو مقررہ راہ ہے وہ اسی پر چلتا رہتا ہے۔^(۳) یہ ہے مقرر کردہ غالب، با علم اللہ تعالیٰ کا۔ (۳۸) اور چاند کی ہم نے منزلیں مقرر کر رکھی ہیں،^(۴) یہاں تک

وَاللَّمْسُ تَحْمِيْرٌ لِّمُسْتَقَرٍّ لَهَا ذَلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۳۷﴾

وَالْقَمَرَ قَدَّارْنَهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ الْغُرُوْحُونَ الْأَقْدِيْمِ ﴿۳۸﴾

(۱) یعنی انسانوں کی طرح زمین کی ہر پیدوار میں بھی ہم نے نر اور مادہ دونوں پیدا کیے ہیں۔ علاوہ ازیں آسمانوں میں اور زمین کی گہرائیوں میں بھی جو چیزیں تم سے غائب ہیں، جن کا علم تم نہیں رکھتے، ان میں بھی زوجیت (نر اور مادہ) کا یہ نظام ہم نے رکھا ہے۔ پس تمام مخلوق جو ژا جو ژا ہے، نباتات میں بھی نر اور مادے کا یہی نظام ہے۔ حتیٰ کہ آخرت کی زندگی، دنیا کی زندگی کے لیے بمنزلہ زوج ہے اور یہ حیات آخرت کے لیے ایک عقلی دلیل بھی ہے۔ صرف ایک اللہ کی ذات ہے جو مخلوق کی اس صفت سے اور دیگر تمام کو تا ہیوں سے پاک ہے۔ وہ وتر (فرد) ہے، زوج نہیں۔

(۲) یعنی اللہ کی قدرت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ دن کو رات سے الگ کر دیتا ہے، جس سے فوراً اندھیرا چھا جاتا ہے۔ سحیح کے معنی ہوتے ہیں جانور کی کھال کا اس کے جسم سے علیحدہ کرنا، جس سے اس کا گوشت ظاہر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ دن کو رات سے الگ کر دیتا ہے۔ اظلم کے معنی ہیں، اندھیرے میں داخل ہونا۔ جیسے اصبَح اور اَمْسَى اور اَظْهَرَ کے معنی ہیں، صبح، شام اور ظہر کے وقت میں داخل ہونا۔

(۳) یعنی اپنے اس مدار (فلک) پر چلتا رہتا ہے، جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے، اسی سے اپنی سیر کا آغاز کرتا ہے اور وہیں پر ختم کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے ذرا ادھر ادھر نہیں ہوتا، کہ کسی دوسرے سیارے سے ٹکرا جائے۔ دوسرے معنی ہیں ”اپنے ٹھہرنے کی جگہ تک“ اور اس کا یہ مقام قرار عرش کے نیچے ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے جو صفحہ ۹۱۶ پر گزر چکی ہے کہ سورج روزانہ غروب کے بعد عرش کے نیچے جا کر سجدہ کرتا ہے اور پھر وہاں سے طلوع ہونے کی اجازت طلب کرتا ہے (صحیح بخاری، تفسیر سورہ یسین) دونوں مفہوم کے اعتبار سے لِمُسْتَقَرٍّ میں لام، علت کے لیے ہے۔ اُنَّی: لِأَجْلِ مُسْتَقَرٍّ لَهَا بعض کہتے ہیں کہ لام، اُنَّی کے معنی میں ہے، پھر مستقر یوم قیامت ہو گا۔ یعنی سورج کا یہ چلنا قیامت کے دن تک ہے، قیامت والے دن اس کی حرکت ختم ہو جائے گی۔ یہ تینوں مفہوم اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ (۴) چاند کی ۲۸ منزلیں ہیں، روزانہ ایک منزل طے کرتا ہے، پھر دو راتیں غائب رہ کر تیسری رات کو نکل آتا ہے۔

کہ وہ لوٹ کر پرانی ٹہنی کی طرح ہو جاتا ہے۔^(۱) (۳۹)
 نہ آفتاب کی یہ مجال ہے کہ چاند کو پکڑے^(۲) اور نہ
 رات دن پر آگے بڑھ جانے والی ہے،^(۳) اور سب کے
 سب آسمان میں تیرتے پھرتے ہیں۔^(۴) (۴۰)
 اور ان کے لیے ایک نشانی (یہ بھی) ہے کہ ہم نے ان کی
 نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔^(۵) (۴۱)
 اور ان کے لیے اسی جیسی اور چیزیں پیدا کیں جن پر یہ
 سوار ہوتے ہیں۔^(۶) (۴۲)
 اور اگر ہم چاہتے تو انہیں ڈبو دیتے۔ پھر نہ تو کوئی ان کا

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ
 وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿۳۹﴾

وَأَنبَأْنَاهُمْ أَنَّا كَامِلُنَا ۖ ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلِكِ الْمَسْجُونِ ﴿۴۰﴾

وَخَلَقْنَا لَهُم مِّن مِّثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ ﴿۴۱﴾

وَإِن نَّشَاءْ نُغَرِّقْهُمْ فَلَا صَرِيحَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنقَدُونَ ﴿۴۲﴾

(۱) یعنی جب آخری منزل پر پہنچتا ہے تو بالکل باریک اور چھوٹا ہو جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی ہو، جو سوکھ کر ٹیڑھی
 ہو جاتی ہے۔ چاند کی انہی گردشوں سے مکان ارض اپنے دنوں، مہینوں اور سالوں کا حساب اور اپنے اوقات عبادات کا
 تعین کرتے ہیں۔

(۲) یعنی سورج کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے جس سے اس کی روشنی ختم ہو جائے بلکہ دونوں کا اپنا
 اپنا راستہ اور الگ الگ حد ہے۔ سورج دن ہی کو اور چاند رات ہی کو طلوع ہوتا ہے اس کے برعکس کبھی نہیں ہوا، جو
 ایک مدبر کائنات کے وجود پر ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

(۳) بلکہ یہ بھی ایک نظام میں بندھے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں۔

(۴) کُلٌّ سے سورج، چاند یا اس کے ساتھ دوسرے کو اکب مراد ہیں، سب اپنے اپنے مدار پر گھومتے ہیں، ان کا باہمی
 ٹکراؤ نہیں ہوتا۔

(۵) اس میں اللہ تعالیٰ اپنے اس احسان کا تذکرہ فرما رہا ہے کہ اس نے تمہارے لیے سمندر میں کشتیوں کا چلانا آسان فرما
 دیا، حتیٰ کہ تم اپنے ساتھ بھری ہوئی کشتیوں میں اپنے بچوں کو بھی لے جاتے ہو۔ دوسرے معنی یہ کیے گئے ہیں کہ ذُرِّيَّةٌ
 سے مقصود آباؤ ذریت ہیں۔ اور کشتی سے مراد کشتی نوح علیہ السلام ہے۔ یعنی سفینۂ نوح علیہ السلام میں ان لوگوں کو
 بٹھایا جن سے بعد میں نسل انسانی چلی۔ گویا نسل انسانی کے آبا اس میں سوار تھے۔

(۶) اس سے مراد ایسی سواریاں ہیں جو کشتی کی طرح انسانوں اور سامان تجارت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی
 ہیں، اس میں قیامت تک پیدا ہونے والی چیزیں آگئیں۔ جیسے ہوائی جہاز، بحری جہاز، ریلیں، بسیں، کاریں اور دیگر نقل و
 حمل کی اشیا۔

فریاد رس ہو تا نہ وہ بچائے جائیں۔ (۴۳)
 لیکن ہم اپنی طرف سے رحمت کرتے ہیں اور ایک مدت
 تک کے لیے انہیں فائدے دے رہے ہیں۔ (۴۴)
 اور ان سے جب (کبھی) کہا جاتا ہے کہ اگلے پچھلے
 (گناہوں) سے بچو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (۴۵)
 اور ان کے پاس تو ان کے رب کی نشانیوں میں سے
 کوئی نشانی ایسی نہیں آتی جس سے یہ بے رخی نہ
 برتتے ہوں۔^(۱) (۴۶)

اور ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے
 میں سے کچھ خرچ کرو،^(۲) تو یہ کفار ایمان والوں کو جواب
 دیتے ہیں کہ ہم انہیں کیوں کھلائیں؟ جنہیں اگر اللہ تعالیٰ
 چاہتا تو خود کھلا پلا دیتا،^(۳) تم تو ہو ہی کھلی گمراہی میں۔^(۴) (۴۷)
 وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہو گا، سچے ہو تو بتلاؤ۔ (۴۸)

انہیں صرف ایک سخت چیخ کا انتظار ہے جو انہیں آپکڑے
 گی اور یہ باہم لڑائی جھگڑے میں ہی ہوں گے۔^(۵) (۴۹)

إِلَّا رَحْمَةً مِنَّا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ﴿۴۳﴾

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّقُوا مَا بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۴۴﴾

وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِنَا إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿۴۵﴾

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْطَعِمُكَ مَنْ كُفِرَ بِكَ وَاللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنَّا أَنْعَمْنَا عَلَىٰ الْكَافِرِينَ ﴿۴۶﴾

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدَانِ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۴۷﴾

مَا يَنْظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِضِعُونَ ﴿۴۸﴾

(۱) یعنی توحید اور صداقت رسول کی جو نشانی بھی ان کے سامنے آتی ہے، اس میں یہ غور ہی نہیں کرتے کہ جس سے ان کو فائدہ ہو، ہر نشانی سے اعراض ان کا شیوہ ہے۔

(۲) یعنی غریبا و مساکین اور ضرورت مندوں کو دو۔

(۳) یعنی اللہ چاہتا تو ان کو غریب ہی نہ کرتا، ہم ان کو دے کر اللہ کی مشیت کے خلاف کیوں کریں۔

(۴) یعنی یہ کہہ کر کہ، غریبا کی مدد کرو، کھلی غلطی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ یہ بات تو ان کی صحیح تھی کہ غربت و ناداری اللہ کی مشیت ہی سے تھی، لیکن اس کو اللہ کے حکم سے اعراض کا جواز بنا لینا غلط تھا، آخر ان کی امداد کرنے کا حکم دینے والا بھی تو اللہ ہی تھا، اس لیے اس کی رضا تو اسی میں ہے کہ غریبا و مساکین کی امداد کی جائے۔ اس لیے کہ مشیت اور چیز ہے اور رضا اور چیز۔ مشیت کا تعلق امور تکوینی سے ہے جس کے تحت جو کچھ بھی ہوتا ہے، اس کی حکمت و مصلحت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور رضا کا تعلق امور تشریحی سے ہے، جن کو بجالانے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے تاکہ ہمیں اس کی رضا حاصل ہو۔

(۵) یعنی لوگ بازاروں میں خرید و فروخت اور حسب عادت بحث و تکرار میں مصروف ہوں گے کہ اچانک صور پھونک

اس وقت نہ تو یہ وصیت کر سکیں گے اور نہ اپنے اہل کی طرف لوٹ سکیں گے۔ (۵۰)

تو صور کے پھونکے جاتے ہی سب^(۱) کے سب اپنی قبروں سے اپنے پروردگار کی طرف (تیز تیز) چلنے لگیں گے۔ (۵۱)

کہیں گے ہائے ہائے! ہمیں ہماری خواب گاہوں سے کس نے اٹھادیا۔^(۲) یہی ہے جس کا وعدہ رحمن نے دیا تھا اور رسولوں نے سچ سچ کہا دیا تھا۔ (۵۲)

یہ نہیں ہے مگر ایک چیخ کہ یکایک سارے کے سارے ہمارے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے۔ (۵۳)

پس آج کسی شخص پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا اور تمہیں نہیں بدلہ دیا جائے گا، مگر صرف ان ہی کاموں کا جو تم کیا کرتے تھے۔ (۵۴)

جنتی لوگ آج کے دن اپنے (دلچسپ) مشغلوں میں ہشاش بشاش ہیں۔^(۳) (۵۵)

وہ اور ان کی بیویاں سایوں میں مسہریوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ (۵۶)

ان کے لیے جنت میں ہر قسم کے میوے ہوں گے اور بھی جو کچھ وہ طلب کریں۔ (۵۷)

فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ ﴿٥٠﴾

﴿٥١﴾ وَنُفَعِرُ فِي الصُّورِ قَادَاتِهِمْ مِنَ الْجَبَابِثِ إِلَىٰ نَفْسِهِمْ يَنْسِلُونَ ﴿٥١﴾

قَالُوا لَيْتَنَا مَنَّمَا بَعَدْنَا مِنْ مَرَقَدِنَا هَذَا مَا وَعَدَ

الرَّحْمَنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ ﴿٥٢﴾

﴿٥٣﴾ إِنَّ كَانَتْ لِالْأَيْعَةِ وَاجِدَةٌ قَادَاتِهِمْ جَمِيعَةً لَكِنَّا مَحْضَرُونَ ﴿٥٣﴾

﴿٥٤﴾ قَالِیَوْمَ لَا نُظَلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا نُخَيَّرُونَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٥٤﴾

﴿٥٥﴾ إِنَّ أَصْعَبَ الْجَنَّةِ الْیَوْمَ نَفْسٌ شُغِلَ فِیْهَا فِیْهِمْ ﴿٥٥﴾

﴿٥٦﴾ هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِی ظِلِّی عَلَی الْأَرْدَائِكِ مُتَّكِلُونَ ﴿٥٦﴾

﴿٥٧﴾ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ وَاللَّهُمَّ مَا لَيْدُونَ ﴿٥٧﴾

دیا جائے گا اور قیامت برپا ہو جائے گی یہ نفعزد اولیٰ ہو گا جسے نفعزد فرع بھی کہتے ہیں کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد دو سرا نفعزد ہو گا۔ نَفْعَةُ الصَّعِقِ جس سے اللہ تعالیٰ کے سوا سب موت کی آغوش میں چلے جائیں گے۔

(۱) پہلے قول کی بنا پر یہ نفعزد معانیہ اور دوسرے قول کی بنا پر یہ نفعزد ماہہ ہو گا جسے نَفْعَةُ النَّبْعِ وَالنَّشُورِ کہتے ہیں اس سے لوگ قبروں سے زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ (ابن کثیر)

(۲) قبر کو خواب گاہ سے تعبیر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قبر میں ان کو عذاب نہیں ہو گا بلکہ بعد میں جو ہو لناک مناظر اور عذاب کی شدت دیکھیں گے اس کے مقابلے میں انہیں قبر کی زندگی ایک خواب ہی محسوس ہوگی۔

(۳) فَالْكِهِونَ کے معنی ہیں فَرِحُونَ خوش، مسرت بلنار۔

مہربان پروردگار کی طرف سے انہیں ”سلام“ کہا جائے گا۔^(۱) (۵۸)

اے گناہ گارو! آج تم الگ ہو جاؤ۔^(۲) (۵۹)

اے اولاد آدم! کیا میں نے تم سے قول قرار نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا،^(۳) وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔^(۴) (۶۰)

اور میری ہی عبادت کرنا۔^(۵) سیدھی راہ یہی ہے۔^(۶) (۶۱)
شیطان نے تو تم میں سے بہت ساری مخلوق کو بہکا دیا۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے۔^(۷) (۶۲)

سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبِّكَ يُبَيِّنُ ۝

وَأَمَّا زُورًا الْيَوْمَ إِنَّا الْعَمْرِيُّونَ ۝

أَلَمْ نَعْمَدُ لَكَ بِبَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّكَ كُنْتَ عَدُوًّا مُّبِينًا ۝

وَأَنْ اعْبُدُونِي هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝

وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ۝

(۱) اللہ کا یہ سلام، فرشتے اہل جنت کو پہنچائیں گے۔ بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خود سلام سے نوازے گا۔

(۲) یعنی اہل ایمان سے الگ ہو کر کھڑے ہو۔ یعنی میدان محشر میں اہل ایمان و اطاعت اور اہل کفر و معصیت الگ الگ کر دیئے جائیں گے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿يَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُنْفَخُونَ﴾ (الرہوم: ۱۱۳) ﴿يَوْمَ هُمْ بِنُؤُوسِهِمْ مَّقَامُهُمْ﴾ (الرہوم: ۳۳) آئی: یَصْبِرُونَ صِدْعِينَ فِرْقَتَيْنِ ”اس دن لوگ دو گروہوں میں بٹ جائیں گے۔“ دوسرا مطلب ہے کہ مجربین ہی کو مختلف گروہوں میں الگ الگ کر دیا جائے گا۔ مثلاً یہودیوں کا گروہ، عیسائیوں کا گروہ، صابین اور مجوسیوں کا گروہ، زانیوں کا، شرابیوں کا گروہ وغیرہ وغیرہ۔

(۳) اس سے مراد عداوت ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکلنے کے وقت لیا گیا تھا یا وہ وصیت ہے جو پیغمبروں کی زبان لوگوں کو کی جاتی رہی۔ اور بعض کے نزدیک وہ دلائل عقلیہ ہیں جو آسمان و زمین میں اللہ نے قائم کیے ہیں۔ (فتح القدیر)

(۴) یہ اس کی علت ہے کہ تمہیں شیطان کی عبادت اور اس کے سوسے قبول کرنے سے اس لیے روکا گیا تھا کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور اس نے تمہیں ہر طرح گمراہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔

(۵) یعنی یہ بھی عداوت تھا کہ تمہیں صرف میری ہی عبادت کرنی ہے، میری عبادت میں کسی کو شریک نہیں کرنا۔

(۶) یعنی صرف ایک اللہ کی عبادت کرنا، یہی وہ سیدھا راستہ ہے، جس کی طرف تمام انبیاء لوگوں کو بلا تے رہے اور یہی منزل مقصود یعنی جنت تک پہنچانے والا ہے۔

(۷) یعنی اتنی عقل بھی تمہارے اندر نہیں کہ شیطان تمہارا دشمن ہے، اس کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے۔ اور میں تمہارا رب ہوں، میں ہی تمہیں روزی دیتا ہوں اور میں ہی تمہاری رات دن حفاظت کرتا ہوں لہذا تمہیں میری نافرمانی نہیں کرنی

هٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۶۳﴾

اٰصْلُوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾

یہی وہ دوزخ ہے جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا تھا۔ (۶۳)
اپنے کفر کا بدلہ پانے کے لیے آج اس میں داخل ہو
جاؤ۔ (۶۴) (۱)

ہم آج کے دن ان کے منہ پر مہریں لگا دیں گے اور ان
کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں
گواہیاں دیں گے، ان کاموں کی جو وہ کرتے
تھے۔ (۶۵)

اگر ہم چاہتے تو ان کی آنکھیں بے نور کر دیتے پھر یہ
رستے کی طرف دوڑتے پھرتے لیکن انہیں کیسے دکھائی
دیتا؟ (۶۶) (۲)

اور اگر ہم چاہتے تو ان کی جگہ ہی پر ان کی صورتیں مسخ
کر دیتے پھر نہ وہ چل پھر سکتے اور نہ لوٹ سکتے۔ (۶۷) (۳)
اور جسے ہم بوڑھا کرتے ہیں اسے پیدا کنی حالت کی طرف

الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰٓ اَفْوَاهِهِمْ وَنُخَلِّمُنَا اٰيٰتِيْهِمْ وَنَشْهَدُوْنَ اَرْجُلَهُمْ
بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿۶۵﴾

وَلَوْ نَشَاۤءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اٰبْعِيْنِهِمْ فَاَسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ لَوْلَا
بِيْعُوْنَ ﴿۶۶﴾

وَلَوْ نَشَاۤءُ لَمَسَخْنَاهُمْ عَلٰٓى مَكَاتِبِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا
وَاٰكِرِيْعُوْنَ ﴿۶۷﴾

وَمَنْ نُعْبِرْهُ يُعْبِرْهُ فِى الْخَلْقِ اَفَلَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

چاہیے۔ تم شیطان کی عداوت کو اور میرے حق عبادت کو نہ سمجھ کر نہایت بے عقلی اور نادانی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔

(۱) یعنی اب اس بے عقلی کا نتیجہ بھگتو اور اپنے کفر کے سبب سے جہنم کی سختیوں کا مزہ چکھو۔

(۲) یہ مرگانے کی ضرورت اس لیے پیش آئے گی کہ ابتداءً مشرکین قیامت والے دن بھی جھوٹ بولیں گے اور کہیں

گے ﴿وَاللّٰهُ رَیْبَانَا اِنَّا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾ ﴿الانعام-۳۳﴾ ”اللہ کی قسم، جو ہمارا رب ہے، ہم مشرک نہیں تھے۔“ چنانچہ اللہ تعالیٰ

ان کے مومنوں پر مرگادے گا، جس سے وہ خود تو بولنے کی طاقت سے محروم ہو جائیں گے، البتہ اللہ تعالیٰ اعضائے

انسانی کو قوت گویائی عطا فرمادے گا، ہاتھ بولیں گے کہ ہم سے اس نے فلاں فلاں کام کیا تھا اور پاؤں اس پر گواہی دیں

گے۔ یوں گویا اقرار اور شہادت، دونوں مرحلے طے ہو جائیں گے۔ علاوہ ازیں ناطق کے مقابلے میں غیر ناطق چیزوں کا

بول کر گواہی دینا، حجت و استدلال میں زیادہ بلیغ ہے کہ اس میں ایک اعجازی شان پائی جاتی ہے۔ (فتح القدیر) اس مضمون کو

احادیث میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو صحیح مسلم، کتاب الزہد)

(۳) یعنی بینائی سے محرومی کے بعد انہیں راستہ کس طرح دکھائی دیتا؟ لیکن یہ تو ہمارا حلم و کرم ہے کہ ہم نے ایسا نہیں کیا۔

(۴) یعنی نہ آگے جاسکتے، نہ پیچھے لوٹ سکتے، بلکہ پتھر کی طرح ایک جگہ پڑے رہتے۔ مسخ کے معنی پیدائش میں تبدیلی کے

ہیں، یعنی انسان سے پتھریا جانور کی شکل میں تبدیل کر دینا۔

پھر الٹ دیتے^(۱) ہیں کیا پھر بھی وہ نہیں سمجھتے۔^(۲) (۶۸)
 نہ تو ہم نے اس پیغمبر کو شعر سکھائے اور نہ یہ اس کے لائق
 ہے۔ وہ تو صرف نصیحت اور واضح قرآن ہے۔^(۳) (۶۹)

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ ﴿۶۸﴾

(۱) یعنی جس کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں، اس کی پیدائش کو بدل کر برعکس حالت میں کر دیتے ہیں۔ یعنی جب وہ بچہ ہوتا ہے تو اس کی نشوونما جاری رہتی ہے اور اس کی عقلی اور بدنی قوتوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ جوانی اور کولت کو پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے برعکس اس کے قوائے عقلیہ و بدنیہ میں ضعف و انحطاط کا عمل شروع ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ وہ ایک بچے کی طرح ہو جاتا ہے۔

(۲) کہ جو اللہ اس طرح کر سکتا ہے، کیا وہ دوبارہ انسانوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں؟

(۳) مشرکین مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے لیے مختلف قسم کی باتیں کہتے رہتے تھے، ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ آپ شاعر ہیں اور یہ قرآن پاک آپ کی شاعرانہ تک بندی ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نفی فرمائی۔ کہ آپ شاعر ہیں اور نہ قرآن شعری کلام کا مجموعہ ہے بلکہ یہ تو صرف نصیحت اور موعظت ہے۔ شاعری میں بالعموم مبالغہ، افراط و تفریط اور محض تخیلات کی ندرت کاری ہوتی ہے، یوں گویا اس کی بنیاد جھوٹ پر ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں شاعر محض گفتار کے غازی ہوتے ہیں، کردار کے نہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے نہ صرف یہ کہ اپنے پیغمبر کو شعر نہیں سکھلائے، نہ اشعار کی اس پروہی کی، بلکہ اس کے مزاج و طبیعت کو ایسا بنایا کہ شعر سے اس کو کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کبھی کسی کا شعر پڑھتے تو اکثر صحیح نہ پڑھ پاتے اور اس کا وزن ٹوٹ جاتا۔ جس کی مثالیں احادیث میں موجود ہیں۔ یہ احتیاط اس لیے کی گئی کہ منکرین پر اتمام حجت اور ان کے شبہات کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اور وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ یہ قرآن اس کی شاعرانہ تک بندی کا نتیجہ ہے، جس طرح آپ کی امیت بھی قطع شبہات کے لیے تھی تاکہ لوگ قرآن کی بابت یہ نہ کہہ سکیں کہ یہ تو اس نے فلاں سے سیکھ پڑھ کر اس کو مرتب کر لیا ہے۔ البتہ بعض مواقع پر آپ کی زبان مبارک سے ایسے الفاظ کا نکل جانا، جو مصرعوں کی طرح ہوتے اور شعری اوزان و بحر کے بھی مطابق ہوتے، آپ کے شاعر ہونے کی دلیل نہیں بن سکتے۔ کیونکہ ایسا آپ کے قصد و ارادہ کے بغیر ہوا اور ان کا شعری قالب میں ڈھل جانا ایک اتفاق تھا، جس طرح حنین والے دن آپ کی زبان پر بے اختیار یہ رجز جاری ہو گیا

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبَ - أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ .

ایک اور موقع پر آپ ﷺ کی انگلی زخمی ہو گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا

هَلْ أَنْتَ إِلَّا إِضْبَعُ دَمِيَّتِ

وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ مَا لَقِينَتِ

(صحیح بخاری و مسلم، کتاب الجہاد)

تاکہ وہ ہر اس شخص کو آگاہ کر دے جو زندہ ہے،^(۱) اور کافروں پر حجت ثابت ہو جائے۔^(۲) (۷۰)

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے اپنے ہاتھوں بنائی^(۳) ہوئی چیزوں میں سے ان کے لیے چوپائے^(۴) (بھی) پیدا کر دیئے، جن کے یہ مالک ہو گئے ہیں۔^(۵) (۷۱)

اور ان مویشیوں کو ہم نے ان کا تابع فرمان بنا دیا ہے^(۶) جن میں سے بعض تو ان کی سواریاں ہیں اور بعض کا گوشت کھاتے ہیں۔ (۷۲)

انہیں ان سے اور بھی بہت سے فائدے ہیں،^(۷) اور پینے کی چیزیں۔ کیا پھر (بھی) یہ شکر ادا نہیں کریں گے؟^(۸) (۷۳)

اور وہ اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بناتے ہیں تاکہ وہ مدد کئے جائیں۔^(۹) (۷۴)

لِيُنذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَجِئَ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٧٠﴾

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مَا عَمِلُوا أَيْدِيئَانَا أَنْ تَأْكُمُوهَا أَفَلَا يَلْمِزُونَ ﴿٧١﴾

وَذَلَّلْنَا مَا بَالِغًا لَّهُمْ قُوَّةً إِنَّا كُونُومُهُمْ وَمِنَّا مَا يَأْكُلُونَ ﴿٧٢﴾

وَلَهُمْ فِيهَا مَنَاقِبُ وَمَشَارِبٌ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿٧٣﴾

وَأَعْتَدُومِنْ دُونِ اللّٰهِ إِلَهَةً لِّعَالَمٍ يَبْصُرُونَ ﴿٧٤﴾

(۱) یعنی جس کا دل صحیح ہے، حق کو قبول کرتا اور باطل سے انکار کرتا ہے۔

(۲) یعنی جو کفر پر مصر ہو، اس پر عذاب والی بات ثابت ہو جائے۔ لِيُنذِرَ میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔

(۳) اس سے غیروں کی شرکت کی نفی ہے، انکو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے، کسی اور کا لکے بنانے میں حصہ نہیں ہے۔

(۴) أَنْعَامُ، نَعَم کی جمع ہے۔ اس سے مراد چوپائے یعنی اونٹ، گائے، بکری (اور بھیڑ، دنبہ) ہیں۔

(۵) یعنی جس طرح چاہتے ہیں ان میں تصرف کرتے ہیں، اگر ہم ان کے اندر وحشی پن رکھ دیتے (جیسا کہ بعض جانوروں میں ہے) تو یہ چوپائے ان سے دور بھاگتے اور وہ ان کی ملکیت اور قبضے میں ہی نہ آسکتے۔

(۶) یعنی ان جانوروں سے وہ جس طرح کا بھی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، وہ انکار نہیں کرتے، حتیٰ کہ وہ انہیں ذبح بھی کر دیتے ہیں اور چھوٹے بچے بھی انہیں کھینچے پھرتے ہیں۔

(۷) یعنی سواری اور کھانے کے علاوہ بھی ان سے بہت سے فوائد حاصل کیے جاتے ہیں مثلاً ان کی اون اور بالوں سے کئی چیزیں بنتی ہیں، ان کی چربی سے تیل حاصل ہوتا ہے اور یہ بار برداری اور کھیتی باڑی کے بھی کام آتے ہیں۔

(۸) یہ ان کے کفرانِ نعت کا اظہار ہے کہ مذکورہ نعمتیں، جن سے یہ فائدہ اٹھاتے ہیں، سب اللہ کی پیدا کردہ ہیں۔ لیکن یہ بجائے اس کے کہ یہ اللہ کی ان نعمتوں پر اس کا شکر ادا کریں یعنی ان کی عبادت و اطاعت کریں، یہ غیروں سے امیدیں وابستہ کرتے اور انہیں معبود بناتے ہیں۔

لَا يَسْتَوِي عَمَلُهُمْ وَتَمْرَهُمْ وَجَدُّهُمْ خُضْرُونَ ﴿٥٥﴾

فَلَا يَخْتَفِرُ فِيكَ قَوْلُهُمْ إِنَّا نَعْلَمُ رَائِدِيُونَ وَبَالِغُونَ ﴿٥٦﴾

أَلَمْ تَرَ الْإِنْسَانَ إِذَا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ حَمِيمٌ مُّبِينٌ ﴿٥٧﴾

وَوَرَبَّ لَنَا مِثْلَ مَا وَسَّيَ خَلَقَهُ قَالَ مَنْ مَعِيَ الْعِظَامُ وَهِيَ وَوَيْدُهُ ﴿٥٨﴾

مَنْ مَعِيَ يَا الذِّئْبُ أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ حَمْلٌ حَلِيمٌ عَلِيمٌ ﴿٥٩﴾

لَا الذِّئْبُ جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْعِظَامِ الرِّجْلَ نَبَا لَأَنَّا إِذَا نَسَخْنَاهُ

نُفُودُونَ ﴿٦٠﴾

أَوَلَيْسَ الذِّئْبُ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ يُفْقِدُ عَلَى أَنْ يَخْلُقَ

(حالانکہ) ان میں انکی مدد کی طاقت ہی نہیں، (لیکن) پھر بھی

(مشرکین) ان کے لیے حاضرِ ماش لشکری ہیں۔ (۷۵)

پس آپ کو ان کی بات غمناک نہ کرے، ہم ان کی

پوشیدہ اور علانیہ سب باتوں کو (بخوبی) جانتے ہیں۔ (۷۶)

کیا انسان کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ ہم نے اسے نطفے سے

پیدا کیا ہے؟ پھر کیا ایک وہ صریح جھگڑا لو بن بیٹھا۔ (۷۷)

اور اس نے ہمارے لیے مثال بیان کی اور اپنی (اصل)

پیدائش کو بھول گیا، کہنے لگا ان گلی سڑی ہڈیوں کو کون

زندہ کر سکتا ہے؟ (۷۸)

آپ جواب دیجئے! کہ انہیں وہ زندہ کرے گا جس نے

انہیں اول مرتبہ پیدا کیا ہے، (۳) جو سب طرح کی پیدائش

کا بخوبی جاننے والا ہے۔ (۷۹)

وہی جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کر

دی جس سے تم یکا یک آگ سلاگتے ہو۔ (۸۰)

جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے کیا وہ ان

(۱) جُنْدُ سے مراد بتوں کے حمایتی اور ان کی طرف سے مدافعت کرنے والے، مُخَضَّرُونَ دنیا میں ان کے پاس حاضر ہونے

والے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جن بتوں کو معبود سمجھتے ہیں، وہ ان کی مدد کیا کریں گے؟ وہ تو خود اپنی مدد کرنے سے بھی قاصر ہیں۔

انہیں کوئی برا کہے، ان کی مذمت کرے، تو یہی ان کی حمایت و مدافعت میں سرگرم ہوتے ہیں، نہ کہ خود ان کے وہ معبود۔

(۲) یعنی جو اللہ تعالیٰ انسان کو ایک حقیر نطفے سے پیدا کرتا ہے، وہ دوبارہ اس کو زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے؟ اس کی

قدرت احیائے موتی کا ایک واقعہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے مرتے وقت وصیت کی کہ مرنے کے بعد

اسے جلا کر اس کی آدھی راکھ سمندر میں اور آدھی راکھ تیز ہوا والے دن خشکی میں اڑا دی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ساری

راکھ جمع کر کے اسے زندہ فرمایا اور اس سے پوچھا تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے کہا، تیرے خوف سے۔ چنانچہ اللہ نے اسے

معاف فرمادیا۔ (صحیح بخاری، الأنبياء، والرفاق، باب الخوف من الله)

(۳) کہتے ہیں عرب میں دودرخت ہیں مرخ اور عفار۔ ان کی دو لکڑیاں آپس میں رگڑی جائیں تو آگ پیدا ہوتی ہے، سبز

درخت سے آگ پیدا کرنے کے حوالے سے اسی طرف اشارہ مقصود ہے۔

جیوں^(۱) کے پیدا کرنے پر قادر نہیں، بے شک قادر ہے۔ اور وہی تو پیدا کرنے والا دانا (بینا) ہے۔ (۸۱)
 وہ جب کبھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے اتنا فرمادینا (کافی ہے) کہ ہو جاوے وہ اسی وقت ہو جاتی ہے۔ (۸۲)^(۲)
 پس پاک ہے وہ اللہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے اور^(۳) جس کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے۔ (۸۳)^(۳)

سورہ صافات کی ہے اور اس میں ایک سو بیسی آیاتیں اور پانچ رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

قسم ہے صف باندھنے والے (فرشتوں) کی۔ (۱)
 پھر پوری طرح ڈانٹنے والوں کی۔ (۲)
 پھر ذکر اللہ کی تلاوت کرنے والوں کی۔ (۳)
 یقیناً تم سب کا معبود ایک ہی ہے۔ (۴)^(۵)

وَمَا لِي بِنِي وَهُوَ الْخَلْقُ الْعَلِيمُ ①

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذْ أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ②

فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ③



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ④

وَالصَّفَاتِ صَفًا ①

فَالرَّحُوتِ رَحْبًا ②

فَالثَّيْبِ ذِكْرًا ③

إِنَّ إِلَهَكُمْ لَوَاحِدٌ ④

(۱) یعنی انسانوں جیسے۔ مطلب، انسانوں کا دوبارہ پیدا کرنا ہے جس طرح انہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ آسمان و زمین کی پیدائش سے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنے پر استدلال کیا ہے۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿لَخَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْكَرِيمِ خَلْقِ الْإِنْسَانِ﴾ (المؤمن۔ ۵۷) ”آسمان و زمین کی پیدائش (لوگوں کے نزدیک) انسانوں کی پیدائش سے زیادہ مشکل کام ہے۔“ سورہ اتحاف۔ ۳۳ میں بھی یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔

(۲) یعنی اس کی شان تو یہ ہے، پھر اس کے لیے سب انسانوں کا زندہ کر دینا کون سا مشکل معاملہ ہے؟

(۳) ملک اور ملکوت دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، بادشاہی، جیسے رَحْمَةٌ اور رَحْمَتٌ رَهْبَةٌ اور رَهْبَتٌ، جَبْرٌ اور جَبْرٌ وغیرہ ہیں۔ (ابن کثیر) بعض اس کو مبالغے کا صیغہ قرار دیتے ہیں۔ (فتح القدر) یعنی مَلَكُوتٌ مُلْكٌ کا مبالغہ ہے۔

(۴) یعنی یہ نہیں ہو گا کہ مٹی میں رل مل کر تمہارا وجود ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے، نہیں، بلکہ اسے دوبارہ وجود عطا کیا جائے گا۔ یہ بھی نہیں ہو گا کہ تم بھاگ کر کسی اور کے پاس پناہ طلب کر لو۔ تمہیں بہر حال اللہ ہی کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہو گا، جہاں وہ مملوکوں کے مطابق اچھی یا بری جزا دے گا۔

(۵) صَفَاتٌ، رَاجِرَاتٌ، تَالِيَاتٌ فرشتوں کی صفات ہیں۔ آسمانوں پر اللہ کی عبادت کے لیے صف باندھنے والے، یا اللہ

آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں اور
مشرقوں کا رب وہی ہے۔^(۱) (۵)

ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے آراستہ
کیا۔ (۶)

اور حفاظت کی سرکش شیطان سے۔^(۲) (۷)
عالم بالا کے فرشتوں (کی باتوں) کو سننے کے لیے وہ کان بھی
نہیں لگا سکتے، بلکہ ہر طرف سے وہ مارے جاتے ہیں۔ (۸)
بھگانے کے لیے اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔ (۹)
مگر جو کوئی ایک آدھ بات اچک لے بھاگے تو (نور آہی)
اس کے پیچھے دھکتا ہوا شعلہ لگ جاتا ہے۔ (۱۰)

رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا رَبُّ الْمَشْرِقِ ۝

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا زِينَةً لِّلْكَوْكِبِ ۝

وَجَعَلْنَا مِنَ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّرَدًّا ۝

لَا يَسْمَعُونَ إِلَى الْمَلَأِ الْأَعْلَى وَيَقْدِرُونَ مِنْ حَيْثُ يَأْتِيهِمْ ۝

ذُخْرًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

إِلَّا مَنْ حَفِظَ النَّطْفَةَ فَاتَّبَعْنَاهُ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۝

کے حکم کے انتظار میں صف بستہ، وعظ و نصیحت کے ذریعے سے لوگوں کو ڈانٹنے والے یا بادلوں کو، جہاں اللہ کا حکم ہو، وہاں ہانک کر لے جانے والے۔ اللہ کے ذکریا قرآن کی تلاوت کرنے والے۔ ان فرشتوں کی قسم کھا کر اللہ تعالیٰ نے مضمون یہ بیان فرمایا کہ تمام انسانوں کا معبود ایک ہی ہے۔ متعدد نہیں، جیسا کہ مشرکین بنائے ہوئے ہیں۔ عرف عام میں قسم تاکید اور شک دور کرنے کے لیے کھائی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے یہاں قسم اسی شک کو دور کرنے کے لیے کھائی ہے جو مشرکین اس کی وحدانیت والوہیت کے بارے میں پھیلاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہر چیز اللہ کی مخلوق اور مملوک ہے، اس لیے وہ جس چیز کو بھی گواہ بنا کر اس کی قسم کھائے، اس کے لیے جائز ہے۔ لیکن انسانوں کے لیے اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھانا بالکل ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ قسم میں، جس کی قسم کھائی جاتی ہے، اسے گواہ بنانا مقصود ہوتا ہے۔ اور گواہ اللہ کے سوا کوئی نہیں بن سکتا، کہ عالم الغیب صرف وہی ہے، اس کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں۔

(۱) مطلب ہے مشارق و مغارب کا رب۔ جمع کالفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ، بعض کہتے ہیں کہ سال کے دنوں کی تعداد کے برابر مشرق و مغرب ہیں۔ سورج ہر روز ایک مشرق سے نکلتا اور ایک مغرب میں غروب ہوتا ہے اور سورہ رحمن میں مَشْرِقَيْنِ اور مَغْرِبَيْنِ، تنزیہ کے ساتھ ہیں یعنی دو مشرق اور دو مغرب۔ اس سے مراد وہ مشرقین اور مغربین ہیں جن سے سورج گرمی اور سردی میں طلوع و غروب ہوتا ہے یعنی ایک انتہائی آخری مشرق و مغرب اور دو سرا مختصراً قریب ترین مشرق و مغرب اور جہاں مشرق و مغرب کو مفرد ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد وہ جہت ہے جس سے سورج طلوع یا غروب ہوتا ہے (فتح القدر)

(۲) یعنی آسمان دنیا پر، زینت کے علاوہ، ستاروں کا دو سرا مقصد یہ ہے کہ سرکش شیاطین سے حفاظت ہو۔ چنانچہ شیطان آسمان پر کوئی بات سننے کے لیے جاتے ہیں تو ستارے ان پر ٹوٹ کر گرتے ہیں جس سے بالعموم شیطان جل جلالہ نہیں۔ جیسا کہ اگلی

ان کافروں سے پوچھو تو کہ آیا ان کا پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا (ان کا) جنمیں ہم نے (ان کے علاوہ) پیدا کیا؟^(۱) ہم نے (انسانوں) کو لیس دار مٹی سے پیدا کیا ہے؟^(۲) (۱۱) بلکہ تو تعجب کر رہا ہے اور یہ مسخرپن کر رہے ہیں۔^(۳) (۱۲) اور جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے یہ نہیں مانتے۔ (۱۳) اور جب کسی معجزے کو دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں۔ (۱۴)

اور کہتے ہیں کہ یہ تو بالکل کھلم کھلا جادو ہی ہے۔^(۱۵) (۱۵) کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک اور بڑی ہو جائیں گے پھر کیا (بچ سچ) ہم اٹھائے جائیں گے؟ (۱۶) کیا ہم سے پہلے کے ہمارے باپ دادا بھی؟ (۱۷) آپ جواب دیجئے! کہ ہاں ہاں اور تم ذلیل (بھی) ہوؤ گے۔^(۱۸) (۱۸)

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أُخْلِقُوا مِثْلَ مَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۱۱﴾

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ ﴿۱۲﴾

وَلَا ذِكْرُكَ إِلَّا فِي كُتُوبٍ ﴿۱۳﴾

وَلَا ذِكْرُكَ إِلَّا فِي سِتْرَتِنَا ﴿۱۴﴾

وَمَا لَكُمْ لِمَا كُنْتُمْ يَكْفُرُونَ ﴿۱۵﴾

مَا لَكُمْ لِمَا كُنْتُمْ يَكْفُرُونَ ﴿۱۶﴾

أَوَابَاءُ آبَائِكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ يُخَالِفُونَ ﴿۱۷﴾

فَلْيَعْلَمُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كُفْرًا ﴿۱۸﴾

آیات اور احادیث سے واضح ہے۔ ستاروں کا ایک تیسرا مقصد رات کی تاریکیوں میں رہنمائی بھی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں دوسرے مقام پر بیان فرمایا گیا ہے۔ ان مقاصد سے گانہ کے علاوہ ستاروں کا اور کوئی مقصد بیان نہیں کیا گیا ہے۔

(۱) یعنی ہم نے جو زمین، ملائکہ اور آسمان جیسی چیزیں بنائی ہیں جو اپنے حجم اور وسعت کے لحاظ سے نہایت انوکھی ہیں۔ کیا ان لوگوں کی پیدائش اور دوبارہ ان کو زندہ کرنا، ان چیزوں کی تخلیق سے زیادہ سخت اور مشکل ہے؟ یقیناً نہیں۔

(۲) یعنی ان کے باپ آدم علیہ السلام کو تو ہم نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ انسان آخرت کی زندگی کو اتنا مستعد کیوں سمجھتے ہیں درال حالیکہ ان کی پیدائش ایک نہایت ہی حقیر اور کمزور چیز سے ہوئی ہے۔ جب کہ خلقت میں ان سے زیادہ قوی، عظیم اور کامل و اتم چیزوں کی پیدائش کا ان کو انکار نہیں۔ (فتح القدر)

(۳) یعنی آپ کو تو منکرین آخرت کے انکار پر تعجب ہو رہا ہے کہ اس کے امکان بلکہ وجوب کے اتنے واضح دلائل کے باوجود وہ اسے مان کر نہیں دے رہے اور وہ آپ کے دعوائے قیامت کا مذاق اڑا رہے ہیں کہ یہ کیوں کر ممکن ہے؟

(۴) یعنی یہ ان کا شیوہ ہے کہ نصیحت قبول نہیں کرتے اور کوئی واضح دلیل یا معجزہ پیش کیا جائے تو استہرا کرتے اور انہیں جادو باور کراتے ہیں۔

(۵) جس طرح دوسرے مقام پر بھی فرمایا ﴿وَكُلُّ أُمَّةٍ كَانَتْ أَجْمَعًا ذُرِّيَّتًا﴾ (النمل۔ ۸۷) ”سب اس کی بارگاہ میں ذلیل ہو کر آئیں گے۔“ ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ ذُرِّيَّتًا﴾ (المؤمن ۶۰) ”جو لوگ میری عبادت سے

وہ تو صرف ایک زور کی جھڑکی ہے^(۱) کہ یکایک یہ دیکھنے لگیں گے۔^(۲) (۱۹)

اور کہیں گے کہ ہائے ہماری خرابی یہی جزا (سزا) کا دن ہے۔ (۲۰)

یہی فیصلہ کا دن ہے جسے تم جھٹلاتے رہے۔^(۳) (۲۱)
ظالموں کو^(۴) اور ان کے ہمراہیوں کو^(۵) اور (جن) جن کی وہ اللہ کے علاوہ پرستش کرتے تھے۔^(۶) (۲۲)

(ان سب کو) جمع کر کے انہیں دوزخ کی راہ دکھا دو۔ (۲۳)
اور انہیں ٹھہرا لو،^(۷) (اس لیے) کہ ان سے (ضروری) سوال کیے جانے والے ہیں۔ (۲۴)

فَاتَّاهَى زَجْرَهُ وَالْوَدَّ فَآذَاهُمْ يَنْظُرُونَ ﴿۱۹﴾

وَقَالُوا يَا وَيْلَنَا هَذَا يَوْمُ الَّذِي كُنَّا نُوعِدُكُم بِهِ ؕ وَإِنَّا لَمُتُّونَ ﴿۲۰﴾

هَذَا يَوْمُ الْقِسْمِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَكْفُرُونَ ﴿۲۱﴾
أَحْسَرُوا الَّذِينَ كَلَّمُوا وَإِنَّا لَهُمْ مَوَآكِلٌ وَأَنَّا لَمُؤْتِدُونَ ﴿۲۲﴾

مِنْ دُونِ اللَّهِ قَاهِنُوا وَهُمْ عَلَى صِرَاطٍ مُّبِينٍ ﴿۲۳﴾

وَقَتْلُهُمْ إِنَّمَا يُسْأَلُونَ ﴿۲۴﴾

انکار کرتے ہیں، عقرب وہ جنم میں ذلیل و خوار ہو کر داخل ہوں گے۔

(۱) یعنی وہ اللہ کے ایک ہی حکم اور اسرافیل علیہ السلام کی ایک ہی پھونک (نغمہ خانہ) سے قبروں سے زندہ ہو کر نکل کھڑے ہوں گے۔

(۲) یعنی ان کے سامنے قیامت کے ہولناک مناظر اور میدان محشر کی سختیاں ہوں گی جنہیں وہ دیکھیں گے۔ نغمہ یا چیخ کو زجرہ (ڈانٹ) سے تعبیر کیا، کیونکہ اس سے مقصود ڈانٹ ہی ہے۔

(۳) وَيْلٌ كَالْفُظْ بِلَاكْتِ كَيْفَ مَوْجِعٍ پُورِلا جاتا ہے، یعنی معاینۂ عذاب کے بعد انہیں اپنی ہلاکت صاف نظر آرہی ہوگی اور اس سے مقصود ندامت کا اظہار اور اپنی کوتاہیوں کا اعتراف ہے لیکن اس وقت ندامت اور اعتراف کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اسی لیے ان کے جواب میں فرشتے اور اہل ایمان کہیں گے کہ یہ وہی فیصلے کا دن ہے جسے تم مانتے نہیں تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو کہیں گے۔

(۴) یعنی جنہوں نے کفر و شرک اور معاصی کا ارتکاب کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا۔

(۵) اس سے مراد کفر و شرک اور تکذیب رسل کے ساتھی یا بعض کے نزدیک جنات و شیاطین ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ وہ بیویاں ہیں جو کفر و شرک میں ان کی ہمنوا تھیں۔

(۶) مَا، عام ہے، تمام معبودین کو چاہے، وہ مورتیاں ہوں یا اللہ کے نیک بندے، سب کو ان کی تذلیل کے لیے جمع کیا جائے گا۔ تاہم نیک لوگوں کو تو اللہ جنم سے دور ہی رکھے گا، اور دوسرے معبودوں کو ان کے ساتھ ہی جنم میں ڈال دیا جائے گا تاکہ وہ دیکھ لیں کہ یہ کسی کو نفع نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہیں۔

(۷) یہ حکم جنم میں لے جانے سے قبل ہوگا کیونکہ حساب کے بعد ہی وہ جنم میں جائیں گے۔

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ (اس وقت) تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔ (۲۵)

بلکہ وہ (سب کے سب) آج فرمانبردار بن گئے۔ (۲۶)
وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر سوال و جواب کرنے لگیں گے۔ (۲۷)

کہیں گے کہ تم تو ہمارے پاس ہماری دائیں طرف سے آتے تھے۔^(۱) (۲۸)

وہ جواب دیں گے کہ نہیں بلکہ تم ہی ایمان دار نہ تھے۔^(۲) (۲۹)

اور کچھ ہمارا زور تو تم پر تھا (ہی) نہیں۔ بلکہ تم (خود) سرکش لوگ تھے۔^(۳) (۳۰)

اب تو ہم (سب) پر ہمارے رب کی یہ بات ثابت ہو چکی کہ ہم (غذاب) چکھنے والے ہیں۔ (۳۱)
پس ہم نے تمہیں گمراہ کیا ہم تو خود بھی گمراہ ہی تھے۔^(۴) (۳۲)

مَا لَكُمْ لَا تَنصُرُونَ ﴿۲۵﴾

بَلْ هُمْ آلِيَوْمٍ مِّنْهُمْ لَمَنَ ﴿۲۶﴾

وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿۲۷﴾

قَالُوا لَكُم مَّا تَوَدَّوْنَ أَنَّا لَمِنَ الْيَمِينِ ﴿۲۸﴾

قَالُوا بَلْ لَمِنَ الْيَمِينِ ﴿۲۹﴾

وَأَكَانَ لَنَا عَلَيْكُم مِّنْ سُلْطٰنٍ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيّٰنَ ﴿۳۰﴾

فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَا إِنَّا لَأَنۢبِئُونَ ﴿۳۱﴾

فَأَعۡوَجِبۡنَاكَ إِنَّا كُنَّا طٰغِيّٰنَ ﴿۳۲﴾

(۱) اس کا مطلب ہے کہ دین اور حق کے نام سے آتے تھے یعنی باور کراتے تھے کہ یہی اصل دین اور حق ہے۔ اور بعض کے نزدیک مطلب ہے، ہر طرف سے آتے تھے، وَالشَّمَالِ مَحذوف ہے۔ جس طرح شیطان نے کہا تھا ”میں ان کے آگے پیچھے سے، ان کے دائیں بائیں سے ہر طرف سے ان کے پاس آؤں گا اور انہیں گمراہ کروں گا (الأعراف-۱۷)

(۲) لیڈر کہیں گے کہ ایمان تم اپنی مرضی سے نہیں لائے اور آج ذمے دار ہمیں ٹھہرا رہے ہو؟

(۳) تابعین اور متبوعین کی یہ باہمی تکرار قرآن کریم میں کئی جگہ بیان کی گئی ہے۔ ان کی ایک دوسرے کو یہ ملامت عرصہ قیامت (میدان محشر) میں بھی ہو گی اور جہنم میں جانے کے بعد جہنم کے اندر بھی۔ ملاحظہ ہو۔ المؤمن-۴۷، ۴۸، ۴۹۔ سبا-۳۱، ۳۲۔ الأعراف-۶۷، ۶۸۔ الأعراف-۳۸، ۳۹۔ وَغَيَّرَهَا مِنَ الْآيَاتِ .

(۴) یعنی جس بات کی پہلے، انہوں نے نفی کی، کہ ہمارا تم پر کون سا زور تھا کہ تمہیں گمراہ کرتے۔ اب اس کا یہاں اعتراف ہے کہ ہاں واقعی ہم نے تمہیں گمراہ کیا تھا۔ لیکن یہ اعتراف اس تہمید کے ساتھ کیا کہ ہمیں اس ضمن میں مورد طعن مت بناؤ، اس لیے کہ ہم خود بھی گمراہ ہی تھے، ہم نے تمہیں بھی اپنے جیسا ہی بنانا چاہا اور تم نے آسانی سے ہماری راہ اپنال۔ جس طرح شیطان بھی اس روز کے گا۔ ﴿وَمَا كَانَ لِيَٰ عَلَيۡكُم مِّنۡ سُلۡطٰنٍۭ ۗ اِلَّا اَنۡ دَعَوۡنَا فَاسۡتَجَبۡتُمۡ لِيۡۤ اَنۡ تَكُوۡفِرُوۡا وَلۡمُوۡءَا

اَنۡتُمۡ سٰكِرٰٓتٌ ﴿۱۰۱﴾ (ابراہیم-۲۲)

يَا نَهْمُ يَوْمَ يَدْرِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ﴿۳۳﴾

سو اب آج کے دن تو (سب کے سب) عذاب میں شریک ہیں۔ (۳۳)^(۱)

إِنَّا كَذَلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ﴿۳۴﴾

ہم گناہ گاروں کے ساتھ اسی طرح کیا کرتے ہیں۔ (۳۴)^(۲)
یہ وہ (لوگ) ہیں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو یہ سرکشی کرتے تھے۔ (۳۵)^(۳)

أَنْتُمْ كَانُوا إِذْ أُنزِلَ لَهُمُ الْآيَاتُ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ ﴿۳۵﴾

اور کہتے تھے کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک دیوانے شاعر کی بات پر چھوڑ دیں؟ (۳۶)^(۴)

وَيَقُولُونَ إِنَّمَا نَحْنُ وَإِنَّا لَشَاعِرٌ مُّجْتَبُونَ ﴿۳۶﴾

(نہیں نہیں) بلکہ (نبی) تو حق (سچا دین) لائے ہیں اور سب رسولوں کو سچا جانتے ہیں۔ (۳۷)^(۵)

بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۳۷﴾

یقیناً تم دردناک عذاب (کا مزہ) چکھنے والے ہو۔ (۳۸)^(۶)

إِنَّمَا كَذَّبْنَا بِعَذَابِ الْآلِيمِينَ ﴿۳۸﴾

تمہیں اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے تھے۔ (۳۹)^(۷)

وَمَا نَجْزِيكَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۹﴾

(۱) اس لیے کہ ان کا جرم بھی مشترک ہے، شرک، معصیت اور شر و فساد ان سب کا وطیرہ تھا۔

(۲) یعنی ہر قسم کے گناہ گاروں کے ساتھ ہمارا یہی معاملہ ہے اور اب وہ سب ہمارا عذاب بھگتیں گے۔

(۳) یعنی دنیا میں، جب ان سے کہا جاتا تھا کہ جس طرح مسلمانوں نے یہ کلمہ پڑھ کر شرک و معصیت سے توبہ کر لی ہے، تم بھی یہ پڑھ لو، تاکہ تم دنیا میں بھی مسلمانوں کے قہر و غضب سے بچ جاؤ اور آخرت میں بھی عذاب الہی سے تمہیں دوچار ہونا نہ پڑے، تو وہ تکبر کرتے اور انکار کرتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ أَمِرْتُ أَنْ أُفَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَقُولُوا: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، فَمَنْ قَالَ: (لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ) فَقَدْ عَصَمَ مِنِّي مَالَهُ وَنَفْسَهُ، (متفق علیہ، مشکوٰۃ، کتاب الإیمان بحوالہ ابن کثیر) ”مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے قتال کروں جب تک وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار نہ کر لیں۔ جس نے یہ اقرار کر لیا، اس نے اپنی جان اور مال کی حفاظت کر لی۔“

(۴) یعنی انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر اور مجنون کہا اور آپ کی دعوت کو جنون (دیوانگی) اور قرآن کو شعر سے تعبیر کیا اور کہا کہ ایک دیوانے کی دیوانگی پر ہم اپنے معبودوں کو کیوں چھوڑ دیں؟ حالانکہ یہ دیوانگی نہیں، فرزاگی تھی، شاعری نہیں، حقیقت تھی اور اس دعوت کے اپنانے میں ان کی ہلاکت نہیں، نجات تھی۔

(۵) یعنی تم ہمارے پیغمبر کو شاعر اور مجنون کہتے ہو، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ لایا اور پیش کر رہا ہے، وہ سچ ہے اور وہی چیز ہے جو اس سے قبل تمام انبیاء بھی پیش کرتے رہے ہیں۔ کیا یہ کام کسی دیوانے کا کیا شاعر کے تخیلات کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟

(۶) یہ جہنمیوں کو اس وقت کہا جائے گا جب وہ کھڑے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں گے اور ساتھ ہی وضاحت کر

مگر اللہ تعالیٰ کے خالص برگزیدہ بندے۔^(۱) (۳۰)
 انہیں کے لیے مقررہ روزی ہے۔ (۳۱)
 (ہر طرح کے) میوے، اور وہ باعزت و اکرام ہونگے۔ (۳۲)
 نعمتوں والی جنتوں میں۔ (۳۳)
 تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے (بیٹھے) ہوں گے۔ (۳۴)
 جاری شراب کے جام کا ان پر دور چل رہا ہو گا۔ (۳۵)^(۲)
 جو صاف شفاف اور پینے میں لذیذ ہو گی۔ (۳۶)^(۳)
 نہ اس سے دوسرے ہو اور نہ اس کے پینے سے ہمیں۔ (۳۷)^(۴)
 اور ان کے پاس نیچی نظروں، بڑی بڑی آنکھوں والی
 حوریں) ہوں گی۔ (۳۸)^(۵)
 ایسی جیسے چھپائے ہوئے انڈے۔ (۳۹)^(۶)
 (جنتی) ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے پوچھیں
 گے۔ (۴۰)^(۷)

إِلَىٰ عِبَادِ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ۝
 أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ۝
 قَوَائِدُهُ وَهُمْ مُكْرَمُونَ ۝
 فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝
 عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ۝
 يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكُلِّ فَاكِهَةٍ مِّنْ مَّعِينٍ ۝
 بَيْضَاءَ لَدَىٰ لُثْرٍ أَيْسَرَ ۝
 لَا يَسْمَعُونَ دَلِيلًا يَدَّبُّ عَلَيْهِمْ يُدْعُونَ
 وَعِنْدَهُمْ قُصُوفٌ أُخْضِرُوا لَهَا عِذْرَانِ ۝
 كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ لِّلْكَلْبِ ۝
 فَاقْبَلْ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝

دی جائے گی کہ یہ ظلم نہیں ہے بلکہ عین عدل ہے کیونکہ یہ سب تمہارے اپنے عملوں کا بدلہ ہے۔
 (۱) یعنی یہ عذاب سے محفوظ ہوں گے، ان کی کوتاہیوں سے بھی درگزر کر دیا جائے گا، اگر کچھ ہوں گی اور ایک ایک نیکی
 کا اجر انہیں کئی کئی گنا دیا جائے گا۔
 (۲) کائنات، شراب کے بھرے ہوئے جام کو اور قدرح خالی جام کو کہتے ہیں۔ معین کے معنی ہیں۔ جاری چشمہ۔ مطلب یہ
 ہے کہ جاری چشمے کی طرح، جنت میں شراب ہر وقت میسر رہے گی۔
 (۳) دنیا میں شراب عام طور پر بد رنگ ہوتی ہے، جنت میں وہ جس طرح لذیذ ہوگی خوش رنگ بھی ہوگی۔
 (۴) یعنی دنیا کی شراب کی طرح اس میں تے، سردرد، بد مستی اور بہکنے کا اندیشہ نہیں ہو گا۔
 (۵) بڑی اور موٹی آنکھیں حسن کی علامت ہے یعنی حسین آنکھیں ہوں گی۔
 (۶) یعنی شتر مرغ اپنے پروں کے نیچے چھپائے ہوئے ہوں، جس کی وجہ سے وہ ہوا اور گردوغبار سے محفوظ ہوں گے۔
 کہتے ہیں شتر مرغ کے انڈے بہت خوش رنگ ہوتے ہیں، جو زردی مائل سفید ہوتے ہیں اور ایسا رنگ حسن و جمال کی
 دنیا میں سب سے عمدہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ تشبیہ، صرف سفیدی میں نہیں ہے بلکہ خوش رنگی اور حسن و
 رعنائی میں ہے۔
 (۷) جنتی، جنت میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے ہوئے، دنیا کے واقعات یاد کریں گے اور ایک دوسرے کو سنائیں گے۔

قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَوْمٌ ﴿۵۱﴾

ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا ایک ساتھی تھا۔ (۵۱)

يَقُولُ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِينَ ﴿۵۲﴾

جو (مجھ سے) کہا کرتا تھا کہ کیا تو (قیامت کے آنے کا) یقین کرنے والوں میں سے ہے؟ (۵۲)

إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا إِنَّكَ لَأَنْتَ الَّذِي تُبْنُونُ ﴿۵۳﴾

کیا جب کہ ہم مر کر مٹی اور ہڈی ہو جائیں گے کیا اس وقت ہم بزا دیئے جانے والے ہیں؟ (۵۳)

قَالَ هَلْ أَنْتُمْ مُظْلِمُونَ ﴿۵۴﴾

کے گاتم چاہتے ہو کہ جھانک کر دیکھ لو؟ (۵۴)

فَأظْلَمَ قَوَائِمِي سَوَاءَ الْجَحِيمِ ﴿۵۵﴾

جھانکتے ہی اسے پتوں بیچ جنم میں (جلتا ہوا) دیکھے گا۔ (۵۵)

قَالَ تَاللَّهِ إِنْ كُنْتُ لَأَتْرَدِي ﴿۵۶﴾

کے گا واللہ! قریب تھا کہ تو مجھے (بھی) برباد کر دے۔ (۵۶)

وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّي لَكُنْتُ مِنَ الْمُخْضَرِّينَ ﴿۵۷﴾

اگر میرے رب کا احسان نہ ہوتا تو میں بھی دوزخ میں حاضر کئے جانے والوں میں ہوتا۔ (۵۷)

أَفَمَنْ حَصَّنَ يَتِيمِينَ ﴿۵۸﴾

کیا (یہ صحیح ہے) کہ ہم مرنے والے ہی نہیں؟ (۵۸)

الْأَمْوَاتِ تَتَنَّى الْأَوْلَادِ وَيَأْتِيهِمْ الْبُعْدَاءُ ﴿۵۹﴾

بجز پہلی ایک موت کے، (۵۹) اور نہ ہم عذاب کیے جانے

(۱) یعنی یہ بات وہ استہزا اور مذاق کے طور پر کہا کرتا تھا، مقصد اس کا یہ تھا کہ یہ تو ناممکن ہے کیا ایسی ناممکن الوقوع بات پر تو یقین رکھتا ہے؟

(۲) یعنی ہمیں زندہ کر کے ہمارا حساب لیا جائے گا اور پھر اس کے مطابق جزا دی جائے گی؟

(۳) یعنی وہ جنتی، اپنے جنت کے ساتھیوں سے کہے گا کہ کیا تم پسند کرتے ہو کہ ذرا جنم میں جھانک کر دیکھیں، شاید مجھے یہ باتیں کہنے والا وہاں نظر آجائے تو تمہیں بتلاؤں کہ یہ شخص تھا جو یہ باتیں کرتا تھا۔

(۴) یعنی جھانکنے پر اسے جنم کے وسط میں وہ شخص نظر آجائے گا اور اسے یہ جنتی کہے گا کہ مجھے بھی تو گمراہ کر کے ہلاکت میں ڈالنے لگا تھا، یہ تو مجھ پر اللہ کا احسان ہوا، ورنہ آج میں بھی تیرے ساتھ جنم میں ہوتا۔

(۵) جنمیوں کا حشر دیکھ کر جنتی کے دل میں رشک کا جذبہ مزید بیدار ہو جائے گا اور کہے گا کہ ہمیں جو جنت کی زندگی اور اس کی نعمتیں ملی ہیں، کیا یہ دائمی نہیں؟ اور اب ہمیں موت آنے والی نہیں ہے؟ یہ استفہام تقریری ہے یعنی اب یہ

زندگیاں دائمی ہیں، جنتی ہمیشہ جنت میں اور جنمی ہمیشہ جنم میں رہیں گے، نہ انہیں موت آئے گی کہ جنم کے عذاب سے چھوٹ جائیں اور نہ ہمیں کہ جنت کی نعمتوں سے محروم ہو جائیں، جس طرح حدیث میں آتا ہے کہ موت کو ایک

میزھے کی شکل میں جنت اور دوزخ کے درمیان لاکر ذبح کر دیا جائے گا کہ اب کسی کو موت نہیں آئے گی۔

(۶) جو دنیا میں آچکی، اب ہمارے لیے موت ہے نہ عذاب۔

والے ہیں۔ (۵۹)

پھر تو (ظاہرات ہے کہ) یہ بڑی کامیابی ہے۔^(۱) (۶۰)
 ایسی (کامیابی) کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا
 چاہیے۔^(۲) (۶۱)
 کیا یہ مسمانی اچھی ہے یا سینڈھ (زقوم) کا درخت؟^(۳) (۶۲)
 جسے ہم نے ظالموں کے لیے سخت آزمائش بنا رکھا
 ہے۔^(۴) (۶۳)
 بے شک وہ درخت جنم کی جڑ میں سے نکلتا ہے۔^(۵) (۶۴)
 جسکے خوشے شیطانوں کے سروں جیسے ہوتے ہیں۔^(۶) (۶۵)
 (جنمی) اسی درخت میں سے کھائیں گے اور اسی سے
 پیٹ بھریں گے۔^(۷) (۶۶)

إِنَّ هَذَا الْقَوْمَ الْعَظِيمَ ۝

لِيُعْزِلَ هَذَا فَلَئِمَّ الْعَبِلُونَ ۝

أَذَلِكْ خَيْرٌ لَّكُمْ مِمَّا سَجَرَةُ الزُّقُومِ ۝

إِنَّا جَعَلْنَا آيَاتِنَا لِلْظَّالِمِينَ ۝

إِنهَا سَجَرَةٌ تُخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ۝

كُلَّهَا كَانَتْهُ رُوسُ الشَّيْطَانِ ۝

فَاتَّقُوا لَكُمْ لَكُمْ وَمَنْهَا فَمَا لِيُونَ وَمَنْهَا الْبَطُونَ ۝

(۱) اس لیے کہ جنم سے بچ جانے اور جنت کی نعمتوں کا مستحق قرار پانے سے بڑھ کر اور کیا کامیابی ہوگی؟

(۲) یعنی اس جیسی نعمت اور اس جیسے فضل عظیم ہی کے لیے محنت کرنے والوں کو محنت کرنی چاہیے، اس لیے کہ یہی سب سے نفع بخش تجارت ہے۔ نہ کہ دنیا کے لیے جو عارضی ہے۔ اور خسارے کا سودا ہے۔

(۳) زقوم، تزقّم سے مشتق ہے، جس کے معنی بدبودار اور کریمہ چیز کے نکلنے کے ہیں۔ اس درخت کا پھل بھی کھانا اہل جنم کے لیے سخت ناگوار ہو گا۔ کیوں کہ یہ سخت بدبودار، کڑوا اور نہایت کریمہ ہو گا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ دنیا کے درختوں میں سے ہے اور عربوں میں متعارف ہے، یہ قطرب درخت ہے جو تمامہ میں پایا جاتا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ کوئی دنیاوی درخت نہیں ہے، اہل دنیا کے لیے یہ غیر معروف ہے۔ (فتح القدیر) لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اور یہ وہی درخت ہے جسے اردو میں سینڈھ یا تھوہر کہتے ہیں۔

(۴) آزمائش، اس لیے کہ اس کا پھل کھانا بجائے خود ایک بہت بڑی آزمائش ہے۔ بعض نے اسے اس اعتبار سے آزمائش کہا کہ اس کے وجود کا انہوں نے انکار کیا کہ جنم میں جب ہر طرف آگ ہی آگ ہوگی تو وہاں درخت کس طرح موجود رہ سکتا ہے؟ یہاں ظالمین سے مراد وہ اہل جنم ہیں جن پر جنم واجب ہوگی۔

(۵) یعنی اس کی جڑ جنم کی گرائی میں ہوگی البتہ اس کی شاخیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہوں گی۔

(۶) اسے شجاعت و قہاحت میں شیطانوں کے سروں سے تشبیہ دی، جس طرح اچھی چیز کے بارے میں کہتے ہیں گویا کہ وہ فرشتے ہیں۔

(۷) یہ انہیں نہایت کراہت سے کھانا پڑے گا جس سے ظاہرات ہے پیٹ بوجھل ہی ہوں گے۔

تَعْرَانَ لَهُمْ عَلَيْهِمُ النَّوَابِئُ مِنْ حَمِيمٍ ۝۵

تَعْرَانَ مَرَّحِمَهُمْ إِلَى الْجَحِيمِ ۝۶

إِنَّهُمْ الْعَوَابَاءُ هُمْ ضَالِّينَ ۝۷

فَعَمَّ عَلَى الشَّرِيعَةِ يُفَرِّخُونَ ۝۸

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ أَكْثَرُ الْأَوَّلِينَ ۝۹

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِمْ مُنذِرِينَ ۝۱۰

فَأَنْظَرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُؤَذِّرِينَ ۝۱۱

إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ۝۱۲

وَلَقَدْ تَادَّسْنَا نَوحًا فَلَنِعْمَ الْمُجِيبُونَ ۝۱۳

پھر اس پر گرم جلتے جلتے پانی کی ملونی ہوگی۔^(۱) (۶۷)
پھر ان سب کا لوٹنا جنم کی (آگ کے ڈھیر کی)
طرف ہو گا۔^(۲) (۶۸)

یقین مانو! کہ انہوں نے اپنے باپ دادا کو بہکا ہوا پایا۔ (۶۹)
اور یہ انہی کے نشان قدم پر دوڑتے رہے۔^(۳) (۷۰)
ان سے پہلے بھی بہت سے اگلے بہک چکے ہیں۔^(۴) (۷۱)
جن میں ہم نے ڈرانے والے (رسول) بھیجے تھے۔^(۵) (۷۲)
اب تو دیکھ لے کہ جنہیں دھمکایا گیا تھا ان کا انجام کیسا
کچھ ہوا۔ (۷۳)

سوائے اللہ کے برگزیدہ بندوں کے۔^(۶) (۷۴)
اور ہمیں نوح (علیہ السلام) نے پکارا تو (دیکھ لو) ہم کیسے
اچھے دعا قبول کرنے والے ہیں۔^(۷) (۷۵)

(۱) یعنی کھانے کے بعد انہیں پانی کی طلب ہوگی تو کھولتا ہوا گرم پانی انہیں دیا جائے گا، جس کے پینے سے ان کی انتڑیاں

کٹ جائیں گی (سورہ محمد-۱۵)

(۲) یعنی زقوم کے کھانے اور گرم پانی کے پینے کے بعد انہیں دوبارہ جنم میں پھینک دیا جائے گا۔

(۳) یہ جنم کی مذکورہ سزاؤں کی علت ہے کہ اپنے باپ دادوں کو گمراہی پر پانے کے باوجود یہ انہی کے نقش قدم پر چلتے رہے اور دلیل و حجت کے مقابلے میں تقلید کو اپنائے رکھا؛ اِهْرَاعٌ اِسْرَاعٌ کے معنی میں ہے یعنی دوڑنا اور نہایت شوق سے اور لپک کر پکڑنا اور اختیار کرنا۔

(۴) یعنی یہی گمراہ نہیں ہوئے، ان سے پہلے لوگ بھی اکثر گمراہی ہی کے راستے پر چلنے والے تھے۔

(۵) یعنی ان سے پہلے لوگوں میں انہوں نے حق کی پیغام پہنچایا اور عدم قبول کی صورت میں انہیں اللہ کے عذاب سے ڈرایا، لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا نتیجتاً انہیں تباہ کر دیا گیا، جیسا کہ اگلی آیت میں ان کے عبرت ناک انجام کی طرف اشارہ فرمایا۔

(۶) یعنی عبرت ناک انجام سے صرف وہ محفوظ رہے جن کو اللہ نے ایمان و توحید کی توفیق سے نواز کر بچا لیا۔
مُخْلَصِينَ، وہ لوگ جو عذاب سے بچے رہے، مُنذِرِينَ (تباہ ہونے والی قوموں) کے اجمالی ذکر کے بعد اب چند
مُنذِرِينَ (بیغیروں) کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

(۷) یعنی ساڑھے نو سو سال کی تبلیغ کے باوجود جب قوم کی اکثریت نے ان کی تکذیب ہی کی اور انہوں نے محسوس کر لیا کہ

وَجَبَّيْنَاهُ وَأَهْلَكَ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ﴿۷۰﴾

ہم نے اسے اور اس کے گھر والوں کو ^(۱) اس زبردست مصیبت سے بچالیا۔ (۷۰)

وَجَعَلْنَا دُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ ﴿۷۱﴾

اور اس کی اولاد کو ہم نے باقی رہنے والی بنا دی۔ (۷۱)

وَتَوَكَّلْنَا عَلَىٰ يَوْمِ الْآخِرِينَ ﴿۷۲﴾

اور ہم نے اس کا (ذکر خیر) بچھلوں میں باقی رکھا۔ (۷۲)

سَلَّمَ عَلٰی نُوْحٍ فِي الْعُلَمِيْنَ ﴿۷۳﴾

نوح (علیہ السلام) پر تمام جانوں میں سلام ہو۔ (۷۳)

إِنَّا كُنَّا لَكَ بِحُجْرَى الْمُحْسِنِينَ ﴿۷۴﴾

ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح بدلے دیتے ہیں۔ (۷۴)

إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿۷۵﴾

وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں سے تھا۔ (۷۵)

ثُمَّ آخَرْنَا الْآخَرِينَ ﴿۷۶﴾

پھر ہم نے دوسروں کو ڈبو دیا۔ (۷۶)

وَلَٰنَ مِنْ شِيعَتِهِ لَآبْرَهِيمَ ﴿۷۷﴾

اور اس (نوح علیہ السلام کی) تابعداری کرنے والوں میں سے (ہی) ابراہیم (علیہ السلام بھی) تھے۔ (۷۷)

ایمان لانے کی کوئی امید نہیں ہے تو اپنے رب کو پکارا۔ ﴿فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانتَصِرْ﴾ (سورۃ القمر ۱۰) ”یا اللہ میں مغلوب ہوں، میری مدد فرما؟“ چنانچہ ہم نے نوح علیہ السلام کی دعا قبول کی اور ان کی قوم کو طوفان بھیج کر ہلاک کر دیا۔

(۱) اہل سے مراد، حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے ہیں، جن میں ان کے گھر کے افراد بھی ہیں جو مومن تھے۔ بعض مفسرین نے ان کی کل تعداد ۸۰ بتلائی ہے۔ اس میں آپ کی بیوی اور ایک لڑکا شامل نہیں، جو مومن نہیں تھے، وہ بھی طوفان میں غرق ہو گئے۔ کرب عظیم (زبردست مصیبت) سے مراد وہی سیلاب عظیم ہے جس میں یہ قوم غرق ہوئی۔

(۲) اکثر مفسرین کے قول کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے۔ حام، سام، یافث۔ انہی سے بعد کی نسل انسانی چلی۔ اسی لیے حضرت نوح علیہ السلام کو آدم ثانی بھی کہا جاتا ہے یعنی آدم علیہ السلام کی طرح، آدم علیہ السلام کے بعد یہ دوسرے ابوالبشر ہیں۔ سام کی نسل سے عرب، فارس، روم اور یہود و نصاریٰ ہیں۔ حام کی نسل سے سوڈان (مشرق سے مغرب تک) یعنی سندھ، ہند، نوب، ننج، حبشہ، قبط اور بربر وغیرہم ہیں اور یافث کی نسل سے عقابہ، ترک، خزر اور یاجوج و ماجوج وغیرہم ہیں۔ (فتح القدر) واللہ اعلم

(۳) یعنی قیامت تک آنے والے اہل ایمان میں ہم نے نوح علیہ السلام کا ذکر خیر باقی چھوڑ دیا ہے اور وہ سب نوح علیہ السلام پر سلام بھیجتے ہیں اور بھیجتے رہیں گے۔

(۴) یعنی جس طرح نوح علیہ السلام کی دعا قبول کر کے، ان کی ذریت کو باقی رکھ کے اور بچھلوں میں ان کا ذکر خیر باقی رکھ کے ہم نے نوح علیہ السلام کو عزت و تکریم بخشی۔ اسی طرح جو بھی اپنے اقوال و افعال میں محسن اور اس باب میں راسخ اور معروف ہو گا، اس کے ساتھ ہی ہم ایسا معاملہ کریں گے۔

(۵) شیعتہ کے معنی گروہ اور پیروکار کے ہیں۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام بھی اہل دین و اہل توحید کے اسی گروہ سے ہیں

جبکہ اپنے رب کے پاس بے عیب دل لائے۔ (۸۴)
 انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ تم کیا پوج
 رہے ہو؟ (۸۵)
 کیا تم اللہ کے سوا گھڑے ہوئے معبود چاہتے
 ہو؟^(۱) (۸۶)
 تو یہ (بتلاؤ کہ) تم نے رب العالمین کو کیا سمجھ رکھا
 ہے؟^(۲) (۸۷)
 اب ابراہیم (علیہ السلام) نے ایک نگاہ ستاروں کی طرف
 اٹھائی۔ (۸۸)
 اور کہا میں تو بیمار ہوں۔^(۳) (۸۹)
 اس پر وہ سب اس سے منہ موڑے ہوئے واپس چلے
 گئے۔ (۹۰)

إِذْ جَاءَ رَبُّكَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ۝
 إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَاذَا عَبَدُونَ ۝
 أَنْفَكَ اللَّهُ ذُونَ الْمَلِكِ يُرِيدُونَ ۝
 فَمَا أَتَاكُمْ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝
 فَتَنَّا نَظْرَهُ فِي الثُّجُومِ ۝
 فَقَالَ إِنِّي سَعِيدٌ ۝
 فَتَوَكَّلْ أَعْتَهُ مُدْبِرِينَ ۝

جن کو نوح علیہ السلام ہی کی طرح انابت الی اللہ کی توفیق خاص نصیب ہوئی۔

(۱) یعنی اپنی طرف سے ہی جھوٹ گھڑ کے کہ یہ معبود ہیں، تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہو، دراصل حاکم یہ پتھر اور مورتیاں ہیں۔
 (۲) یعنی اتنی قبیح حرکت کرنے کے باوجود کیا وہ تم پر ناراض نہیں ہو گا اور تمہیں سزا نہیں دے گا۔
 (۳) آسمان پر غور و فکر کے لیے دیکھا جیسا کہ بعض لوگ ایسا کرتے ہیں۔ یا اپنی قوم کے لوگوں کو مغالطے میں ڈالنے کے لیے ایسا کیا، جو کہ ستاروں کی گردش کو حادث زمانہ میں مؤثر مانتے تھے۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے کہ جب ان کی قوم کا وہ دن آیا، جسے وہ باہر جا کر بطور عید اور قومی تہوار منایا کرتی تھی۔ قوم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ لیکن ابراہیم علیہ السلام تمنا کی اور موقع کی تلاش میں تھے، تاکہ ان کے بتوں کا تیا ناچہ کیا جاسکے۔ چنانچہ انہوں نے یہ موقع غنیمت جانا کہ کل ساری قوم باہر میلے میں چل جائے گی تو میں اپنا منصوبہ بروئے کار لے آؤں گا۔ اور کہہ دیا کہ میں بیمار ہوں یا آسمانوں کی گردش بتلاتی ہے کہ میں بیمار ہونے والا ہوں۔ یہ بات بالکل جھوٹی تو نہیں تھی، ہر انسان کچھ نہ کچھ بیمار ہوتا ہی ہے، علاوہ ازیں قوم کا شرک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل کا ایک مستقل روگ تھا، جسے دیکھ کر وہ کڑھتے رہتے تھے۔ یوں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعریض اور توریے کا اظہار فرمایا جو اگرچہ جھوٹ نہیں ہوتا لیکن مخاطب اس کے متبادر مفہوم سے مغالطے کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے حدیث ثلاث کذبات میں اسے جھوٹ سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ اس کی ضروری تفصیل سورہ انبیاء ۶۳ میں گزر چکی ہے۔

قَرَأَ لِي الْبَيْتَ فَقَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ﴿٩١﴾

مَا لَكُمْ لَا تَنْطُقُونَ ﴿٩٢﴾

قَرَأَ عَلَيْهِمْ صُورًا بِالنِّبِيِّ ﴿٩٣﴾

فَأَقْبَلُوا إِلَيْهِ يَرْفُوفُونَ ﴿٩٤﴾

قَالَ أَتَعْبُدُونَ مَا تَحْمِلُونَ ﴿٩٥﴾

وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْفَوْهُ بِالْحَافِيَةِ ﴿٩٧﴾

فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْقَلِينَ ﴿٩٨﴾

آپ (چپ چپاتے) ان کے معبودوں کے پاس گئے اور فرمانے لگے تم کھاتے کیوں نہیں؟ (۹۱)

تمہیں کیا ہو گیا کہ بات تک نہیں کرتے ہو۔ (۹۲)

پھر تو (پوری قوت کے ساتھ) دائیں ہاتھ سے انہیں مارنے پر پل پڑے۔ (۹۳)

وہ (بت پرست) دوڑے بھاگے آپ کی طرف متوجہ (۳) ہوئے۔ (۹۴)

تو آپ نے فرمایا تم انہیں پوجتے ہو جنہیں (خود) تم تراشتے ہو۔ (۹۵)

حالانکہ تمہیں اور تمہاری بنائی ہوئی چیزوں کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔ (۹۶)

وہ کہنے لگے اس کے لیے ایک مکان بناؤ اور اس (دہکتی ہوئی) آگ میں اسے ڈال دو۔ (۹۷)

انہوں نے تو اس (ابراہیم علیہ السلام) کے ساتھ مکر کرنا

(۱) یعنی جو حلویات بطور تبرک وہاں پڑی ہوئی تھیں، وہ انہیں کھانے کے لیے پیش کیں، جو ظاہرات ہے انہیں نہ کھانی تھیں نہ کھائیں بلکہ وہ جواب دینے پر بھی قادر نہ تھے، اس لیے جواب بھی نہیں دیا۔

(۲) رَاغ کے معنی ہیں، مَال، ذَهَب، أَفْبَل، یہ سب متقارب المعنی ہیں، ان کی طرف متوجہ ہوئے صَرْبٌ بِالنِّبِيِّنِ کا مطلب ہے ان کو زور سے مار مار کر توڑ ڈالنا۔

(۳) يَرْفُوفُونَ، يُسْرِعُونَ کے معنی میں ہے، دوڑتے ہوئے آئے۔ یعنی جب میلے سے آئے تو دیکھا کہ ان کے معبود ٹوٹے پھوٹے پڑے ہیں تو فوراً ان کا ذہن ابراہیم علیہ السلام کی طرف گیا، کہ یہ کام اسی نے کیا ہو گا، جیسا کہ سورہ انبیاء میں تفصیل گزر چکی ہے چنانچہ انہیں پکار کر عوام کی عدالت میں لے آئے۔ وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس بات کا موقع مل گیا کہ وہ ان پر ان کی بے عقلی اور ان کے معبودوں کی بے اختیاری واضح کریں۔

(۴) یعنی وہ مورتیاں اور تصویریں بھی جنہیں تم اپنے ہاتھوں سے بناتے اور انہیں معبود سمجھتے ہو، یا مطلق تمہارا عمل جو بھی تم کرتے ہو، ان کا خالق بھی اللہ ہے۔ اس سے واضح ہے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ ہی ہے، جیسا کہ اہل سنت کا عقیدہ ہے۔

وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿۹۸﴾

چاہا لیکن ہم نے انہی کو نیچا کر دیا۔^(۱) (۹۸)
اور اس (ابراہیم علیہ السلام) نے کہا میں تو ہجرت کر کے
اپنے پروردگار کی طرف جانے والا ہوں۔^(۲) وہ ضرور
میری رہنمائی کرے گا۔ (۹۹)

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۰۰﴾

اے میرے رب! مجھے نیک بخت اولاد عطا فرما۔ (۱۰۰)
تو ہم نے اسے ایک بردبار بچے کی بشارت دی۔^(۳) (۱۰۱)
پھر جب وہ (بچہ) اتنی عمر کو پہنچا کہ اس کے ساتھ چلے
پھرے،^(۴) تو اس (ابراہیم علیہ السلام) نے کہا میرے
پیارے بچے! میں خواب میں اپنے آپ کو تجھے ذبح کرتے
ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اب تو بتا کہ تیری کیا رائے ہے؟^(۵)
بیٹے نے جواب دیا کہ ابا! جو حکم ہوا ہے اسے بجالائیے ان
شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ (۱۰۲)
غرض جب دونوں مطہج ہو گئے اور اس نے (باپ نے)
اس کو (بیٹے کو) پیشانی^(۶) کے بل گرا دیا۔ (۱۰۳)

فَبَشِّرْنَاهُ بِعَلْقَابٍ حَلِيمٍ ﴿۱۰۱﴾

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَبْنَؤُا إِنِّي أَنزَىٰ فِي الْمَنَازِلِ
أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَأْتِي قَالَ يَا بَتِ أِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ
سَيِّدِي إِنِّي شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۱۰۲﴾

فَلَمَّا آسَمَآ وَتَلَّآ لِلْحَبِيبِ ﴿۱۰۳﴾

(۱) یعنی آگ کو گلزار بنا کر ان کے مکرو حیلے کو ناکام بنا دیا، پس پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندوں کی چارہ سازی فرماتا ہے،
اور آزمائش کو عطا میں اور شر کو خیر میں بدل دیتا ہے۔

(۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ واقعہ بابل (عراق) میں پیش آیا، بالآخر یہاں سے ہجرت کی اور شام چلے گئے اور وہاں
جا کر اولاد کے لیے دعا کی (فتح القدیر)

(۳) حلیم کہہ کر اشارہ فرما دیا کہ بچہ بڑا ہو کر بردبار ہو گا۔

(۴) یعنی دو ڈھوپ کے لائق ہو گیا یا بلوغت کے قریب پہنچ گیا، بعض کہتے ہیں کہ اس وقت یہ بچہ ۱۳ سال کا تھا۔

(۵) پیغمبر کا خواب، وحی اور حکم الہی ہی ہوتا ہے۔ جس پر عمل ضروری ہوتا ہے۔ بیٹے سے مشورے کا مقصد یہ معلوم کرنا
تھا کہ بیٹا بھی امتثال امر الہی کے لیے کس حد تک تیار ہے؟

(۶) ہر انسان کے منہ (چہرے) پر دو جبینیں (دائیں اور بائیں) ہوتی ہیں اور درمیان میں پیشانی (جَبْهَةٌ)
اس لیے لِلْحَبِيبِ کا زیادہ صحیح ترجمہ ”کروٹ پر“ ہے یعنی اس طرح کروٹ پر لٹالیا، جس طرح جانور کو ذبح
کرتے وقت قبلہ رخ کروٹ پر لٹالیا جاتا ہے۔ ”پیشانی یا منہ کے بل لٹانے کا“ ترجمہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ

وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا اِبْرَاهِيمَ ﴿۱۰۳﴾
فَدَا صِدْقًا ذَاتَ الرَّؤْفَةِ يَا اِرْنَا كَذَلِكَ تَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۰۴﴾

إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْبَالُو الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱۰۵﴾

وَوَدَّيْنَاهُ بِذَبْحٍ عَظِيمٍ ﴿۱۰۶﴾

وَوَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ﴿۱۰۷﴾

سَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿۱۰۸﴾

كَذَلِكَ تَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۰۹﴾

إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۱۰﴾

وَبَشِّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ يَتِيمًا مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۱۱﴾

تو ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیم! (۱۰۳)
یقیناً تو نے اپنے خواب کو سچا کر دکھایا، (۱) بیشک ہم نیکی
کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں۔ (۱۰۵)
درحقیقت یہ کھلا امتحان تھا۔ (۲) (۱۰۶)
اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے فدیہ میں دے
دیا۔ (۳) (۱۰۷)

اور ہم نے ان کا ذکر خیر پچھلوں میں باقی رکھا۔ (۱۰۸)
ابراہیم (علیہ السلام) پر سلام ہو۔ (۱۰۹)
ہم نیکو کاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ (۱۱۰)
بیشک وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں سے تھا۔ (۱۱۱)
اور ہم نے اس کو اسحاق (علیہ السلام) نبی کی بشارت دی
جو صالح لوگوں میں سے ہو گا۔ (۳) (۱۱۲)

مشہور ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے وصیت کی کہ انہیں اس طرح لٹایا جائے کہ چہرہ سامنے نہ رہے جس سے پیار و شفقت کا جذبہ امر الہی پر غالب آنے کا امکان نہ رہے۔

(۱) یعنی دل کے پورے ارادے سے بچنے کو ذبح کرنے کے لیے زمین پر لٹا دینے سے ہی تو نے اپنا خواب سچا کر دکھایا ہے، کیونکہ اس سے واضح ہو گیا کہ اللہ کے حکم کے مقابلے میں تجھے کوئی چیز بھی عزیز تر نہیں ہے، حتیٰ کہ اکلوتا بیٹا بھی۔

(۲) یعنی لاڈلے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم، یہ ایک بڑی آزمائش تھی جس میں تو سرخرو ہوا۔

(۳) یہ بڑا ذبیحہ ایک مینڈھا تھا جو اللہ تعالیٰ نے جنت سے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے سے بھیجا۔ (ابن کثیر) اسماعیل علیہ السلام کی جگہ اسے ذبح کیا گیا اور پھر اس سنت ابراہیمی کو قیامت تک قرب الہی کے حصول کا ایک ذریعہ اور عید الاضحیٰ کا سب سے پسندیدہ عمل قرار دے دیا گیا۔

(۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذکورہ واقعے کے بعد اب ایک بیٹے اسحاق علیہ السلام کی اور اس کے نبی ہونے کی خوش خبری دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، وہ اسماعیل علیہ السلام تھے۔ جو اس وقت ابراہیم علیہ السلام کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اسحاق علیہ السلام کی ولادت ان کے بعد ہوئی ہے۔ مفسرین کے درمیان اس کی بابت اختلاف ہے کہ ذبح کون ہے، اسماعیل علیہ السلام یا اسحاق علیہ السلام؟ امام ابن جریر نے حضرت اسحاق علیہ السلام کو اور ابن کثیر اور اکثر مفسرین نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح قرار دیا ہے اور یہی بات صحیح ہے۔ امام شوکانی نے اس میں توقف اختیار کیا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے تفسیر فتح القدر اور تفسیر ابن کثیر)

اور ہم نے ابراہیم و اسحاق (علیہما السلام) پر برکتیں نازل فرمائیں،^(۱) اور ان دونوں کی اولاد میں بعضے تو نیک بخت ہیں اور بعض اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والے ہیں۔^(۲) (۱۱۳)

یقیناً ہم نے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) پر بڑا احسان کیا۔^(۳) (۱۱۴)

اور انہیں اور ان کی قوم کو بہت بڑے دکھ درد سے نجات دے دی۔^(۴) (۱۱۵)

اور ان کی مدد کی تو وہی غالب رہے۔ (۱۱۶)

اور ہم نے انہیں (واضح اور) روشن کتاب دی۔ (۱۱۷)

اور انہیں سیدھے راستے پر قائم رکھا۔ (۱۱۸)

اور ہم نے ان دونوں کے لیے پیچھے آنے والوں میں یہ بات باقی رکھی۔ (۱۱۹)

کہ موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) پر سلام ہو۔ (۱۲۰)

وَلَوْ كُنَّا عَلَيْنِهِ وَعَلَىٰ رِجْلَيْهِ وَوَدَّعَيْنَاهُمَا خَيْرًا مِّنْ ذَٰلِكَ وَمَا نَحْنُ بِذٰلِكَ بِمُعَذِّبِينَ ﴿۱۱۳﴾

وَلَقَدْ مَنَّا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿۱۱۴﴾

وَجَدِينَاهُمَا قَوْمَهُمَا مِنَ الذَّكَرِ الْعَظِيمِ ﴿۱۱۵﴾

وَلَقَدْ نَزَّلْنَاهُمْ نَكَاوَاهُمْ الْعُلْيَا ﴿۱۱۶﴾

وَإِنِّي مَأْتِيَهُمَا الْكِتَابَ الْمُنِيرَ ﴿۱۱۷﴾

وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿۱۱۸﴾

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْآخِرِينَ ﴿۱۱۹﴾

سَلَامٌ عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿۱۲۰﴾

(۱) یعنی ان دونوں کی اولاد کو بہت پھیلایا اور انبیا و رسل کی زیادہ تعداد انہی کی نسل سے ہوئی۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے یعقوب علیہ السلام ہوئے، جن کے بارہ بیٹوں سے بنی اسرائیل کے ۱۲ قبیلے بنے اور ان سے بنی اسرائیل کی قوم بڑھی اور پھیلی اور اکثر انبیا ان ہی میں سے ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے اسماعیل علیہ السلام سے عربوں کی نسل چلی اور ان میں آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے۔

(۲) شرک و معصیت اور ظلم و فساد کا ارتکاب کر کے۔ خاندان ابراہیمی میں برکت کے باوجود نیک و بد کے ذکر سے اس طرف اشارہ کر دیا کہ خاندان اور آبا کی نسبت، اللہ کے ہاں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ وہاں تو ایمان اور عمل صالح کی اہمیت ہے۔ یہود و نصاریٰ اگرچہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اسی طرح مشرکین عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ لیکن ان کے جو اعمال ہیں وہ کھلی گمراہی یا شرک و معصیت پر مبنی ہیں۔ اس لیے یہ اونچی نسبتیں ان کے لیے عمل کا بدل نہیں ہو سکتیں۔

(۳) یعنی انہیں نبوت و رسالت اور دیگر انعامات سے نوازا۔

(۴) یعنی فرعون کی غلامی اور اس کے ظلم و استبداد سے۔

بے شک ہم نیک لوگوں کو اسی طرح بدلے دیا کرتے ہیں۔ (۱۲۱)

یقیناً یہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔ (۱۲۲)
بے شک الیاس (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے تھے۔^(۱) (۱۲۳)

جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم اللہ سے ڈرتے نہیں ہو۔؟^(۲) (۱۲۴)

کیا تم بعل (نامی بت) کو پکارتے ہو؟ اور سب سے بہتر خالق کو چھوڑ دیتے ہو؟ (۱۲۵)

اللہ جو تمہارا اور تمہارے اگلے تمام باپ دادوں کا رب ہے۔^(۳) (۱۲۶)

لیکن قوم نے انہیں جھٹلایا، پس وہ ضرور (عذاب میں) حاضر رکھے^(۴) جائیں گے؛ (۱۲۷)

سوائے اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کے۔ (۱۲۸)
ہم نے (الیاس علیہ السلام) کا ذکر خیر پچھلوں میں بھی باقی رکھا۔ (۱۲۹)

کہ الیاس پر سلام ہو۔^(۵) (۱۳۰)

إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۲۱﴾

إِنَّهُمْ أَمِنَ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۲۲﴾

وَإِنَّا الْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۲۳﴾

إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ آلَاتِنَعُونَ ﴿۱۲۴﴾

أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ﴿۱۲۵﴾

اللَّهُ رَبُّكُمْ رَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۲۶﴾

فَلَذِكْرُهُمْ فَإِنَّهُمْ كَذِبُونَ ﴿۱۲۷﴾

إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿۱۲۸﴾

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ﴿۱۲۹﴾

سَلَامٌ عَلَىٰ آلِ يَاسِينَ ﴿۱۳۰﴾

(۱) یہ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک اسرائیلی نبی تھے۔ یہ جس علاقے میں بھیجے گئے تھے اس کا نام بعلبک تھا، بعض کہتے ہیں اس جگہ کا نام ساموہ ہے جو فلسطین کا مغربی وسطی علاقہ ہے۔ یہاں کے لوگ بعل نامی بت کے پجاری تھے۔ (بعض کہتے ہیں یہ دیوی کا نام تھا)

(۲) یعنی اس کے عذاب اور گرفت سے کہ اسے چھوڑ کر تم غیر اللہ کی عبادت کرتے ہو۔

(۳) یعنی اس کی عبادت و پرستش کرتے ہو، اس کے نام کی نذر نیاز دیتے اور اس کو حاجت روا سمجھتے ہو، جو پتھر کی صورتی ہے اور جو ہر چیز کا خالق اور اگلوں پچھلوں سب کا رب ہے، اس کو تم نے فراموش کر رکھا ہے۔

(۴) یعنی توحید و ایمان سے انکار کی پاداش میں جہنم کی سزا بھگتیں گے۔

(۵) الیاسین، الیاس علیہ السلام ہی کا ایک تلفظ ہے، جیسے طور سینا کو طور سینین بھی کہتے ہیں۔ حضرت الیاس علیہ

إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۳۱﴾

إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۲﴾

وَلَئِنْ لَوُطَ لَأَيُّومَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۳۳﴾

إِذْ جَاءَتْهُمْ وَأَهْلُكُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۳۴﴾

إِلَّا يَجُوزُ فِي الْغَيْرِينَ ﴿۳۵﴾

ثُمَّ دَمَرْنَا الْأَرْضِينَ ﴿۳۶﴾

وَلَا تَكْفُرُ لَكُمْ يُهْرُونَ عَلَيْكُمْ مُضِحِينَ ﴿۳۷﴾

وَبِالْأَيْكُلِ أَقْلًا تَعْلُونَ ﴿۳۸﴾

وَلَئِنْ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۳۹﴾

ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ (۱۳۱)
 بیشک وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں سے تھے۔ (۱۳۲)^(۱)
 بیشک لوط (علیہ السلام بھی) پیغمبروں میں سے تھے۔ (۱۳۳)
 ہم نے انہیں اور ان کے گھر والوں کو سب کو نجات
 دی۔ (۱۳۴)

بجز اس بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں رہ
 گئی۔ (۱۳۵)^(۲)

پھر ہم نے اوروں کو ہلاک کر دیا۔ (۱۳۶)
 اور تم تو صبح ہونے پر ان کی بستیوں کے پاس سے گزرتے
 ہو۔ (۱۳۷)

اور رات کو بھی، کیا پھر بھی نہیں سمجھتے؟ (۱۳۸)^(۳)
 اور بلاشبہ یونس (علیہ السلام) نبیوں میں سے تھے۔ (۱۳۹)

السلام کو دو سری کتابوں میں ”ایلیا“ بھی کہا گیا ہے۔

(۱) قرآن نے نبیوں اور رسولوں کا ذکر کر کے، ان کے لیے اکثر جگہ یہ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ جس سے دو مقصد ہیں۔ ایک ان کے اخلاق و کردار کی رفعت کا اظہار جو ایمان کا لازمی جز ہے۔ تاکہ ان لوگوں کی تردید ہو جائے جو بہت سے پیغمبروں کے بارے میں اخلاقی کمزوریوں کا اثبات کرتے ہیں، جیسے تورات وانجیل کے موجودہ نسخوں میں متعدد پیغمبروں کے بارے میں ایسے من گھڑت قصے کہانیاں درج ہیں۔ دوسرا مقصد ان لوگوں کی تردید ہے جو بعض انبیاء کی شان میں غلو کر کے ان کے اندر الہی صفات و اختیارات ثابت کرتے ہیں۔ یعنی وہ پیغمبر ضرور تھے لیکن تھے بہر حال اللہ کے بندے اور اس کے غلام نہ کہ الہ یا اس کے جز یا اس کے شریک۔

(۲) اس سے مراد حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی ہے جو کافرہ تھی، یہ اہل ایمان کے ساتھ اس بستی سے باہر نہیں گئی تھی، کیونکہ اسے اپنی قوم کے ساتھ ہلاک ہونا تھا، چنانچہ وہ بھی ہلاک کر دی گئی۔

(۳) یہ اہل مکہ سے خطاب ہے جو تجارتی سفر میں ان تباہ شدہ علاقوں سے آتے جاتے، گزرتے تھے۔ ان کو کہا جا رہا ہے کہ تم صبح کے وقت بھی اور رات کے وقت بھی ان بستیوں سے گزرتے ہو، جمال اب مردار بچیرہ ہے، جو دیکھنے میں بھی نہایت کریہ ہے اور سخت متعفن اور بدبودار۔ کیا تم انہیں دیکھ کر یہ بات نہیں سمجھتے کہ مکذیب رسل کی وجہ سے ان کا یہ بد انجام ہوا، تو تمہاری اس روش کا انجام بھی اس سے مختلف کیوں کر ہو گا؟ جب تم بھی وہی کام کر رہے ہو، جو انہوں نے کیا تو پھر تم اللہ کے عذاب سے کیوں کر محفوظ رہو گے؟

جب بھاگ کر پہنچے بھری کشتی پر۔ (۱۳۰)
 پھر قرعہ اندازی ہوئی تو یہ مغلوب ہو گئے۔ (۱۳۱)
 تو پھر انہیں مچھلی نے نگل لیا اور وہ خود اپنے آپ کو
 ملامت^(۱) کرنے لگ گئے۔ (۱۳۲)
 پس اگر یہ پاکی بیان کرنے والوں میں سے نہ
 ہوتے۔ (۱۳۳)
 تو لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک اس کے پیٹ
 میں ہی رہتے۔^(۲) (۱۳۴)
 پس انھیں ہم نے چٹیل میدان میں ڈال دیا اور وہ اس
 وقت بیمار تھے۔^(۳) (۱۳۵)

إِذْ أُنزِلَ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ﴿١٣٠﴾
 فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ ﴿١٣١﴾
 فَالْتَمَسَهُ لُنُوتٌ وَهُوَ مُلِيمٌ ﴿١٣٢﴾
 فَكَوَلَا أَيْمَنَهُكَ الْفُلْكَانَ مِنَ الْمَشْحُونِ ﴿١٣٣﴾
 لَكَيْتَ فِي بَطْنِهِ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿١٣٤﴾
 فَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِيمٌ ﴿١٣٥﴾

(۱) حضرت یونس علیہ السلام عراق کے علاقے نینوی (موجودہ موصل) میں نبی بنا کر بھیجے گئے تھے، یہ آشوریوں کا پایہ تخت تھا، انہوں نے ایک لاکھ بنو اسرائیلیوں کو قیدی بنایا ہوا تھا، چنانچہ ان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف حضرت یونس علیہ السلام کو بھیجا، لیکن یہ قوم آپ پر ایمان نہیں لائی۔ بالآخر اپنی قوم کو ڈرایا کہ عنقریب تم عذاب الہی کی گرفت میں آ جاؤ گے۔ عذاب میں تاخیر ہوئی تو اللہ کی اجازت کے بغیر ہی اپنے طور پر وہاں سے نکل گئے اور سمندر پر جا کر ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ اپنے علاقے سے نکل کر جانے کو ایسے لفظ سے تعبیر کیا جس طرح ایک غلام اپنے آقا سے بھاگ کر چلا جاتا ہے۔ کیونکہ آپ بھی اللہ کی اجازت کے بغیر ہی اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ کشتی سواروں اور سامانوں سے بھری ہوئی تھی۔ کشتی سمندر کی موجوں میں گھر گئی اور کھڑی ہو گئی۔ چنانچہ اس کا وزن کم کرنے کے لیے ایک آدھ آدمی کو کشتی سے سمندر میں پھینکنے کی تجویز سامنے آئی تاکہ کشتی میں سوار دیگر انسانوں کی جائیں بچ جائیں۔ لیکن یہ قربانی دینے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔ اس لیے قرعہ اندازی کرنی پڑی، جس میں حضرت یونس علیہ السلام کا نام آیا۔ اور وہ مغلوبین میں سے ہو گئے، یعنی طوعاً و کرہاً اپنے کو بھاگے ہوئے غلام کی طرح سمندر کی موجوں کے سپرد کرنا پڑا۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو حکم دیا کہ وہ انہیں ثابت نگل لے اور یوں حضرت یونس علیہ السلام اللہ کے حکم سے مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے۔

(۲) یعنی توبہ و استغفار اور اللہ کی تسبیح بیان نہ کرتے، (جیسا کہ انہوں نے ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ الانبیاء۔ ۸۷) کو قیامت تک وہ مچھلی کے پیٹ میں ہی رہتے۔

(۳) جیسے ولادت کے وقت بچہ یا جانور کا چوزہ ہوتا ہے، مضمحل، کمزور اور ناتواں۔

وَأَبْتَعْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّفْعَلِينَ ﴿۱۹﴾

اور ان پر سایہ کرنے والا ایک تیل دار درخت (۱) ہم نے
اگادیا۔ (۱۳۶)

وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ زَيْدُونَ ﴿۲۰﴾

اور ہم نے انھیں ایک لاکھ بلکہ اور زیادہ آدمیوں کی
طرف بھیجا۔ (۱۳۷)

فَأَمَّاؤَاكُم مِّنْهُمْ إِلَىٰ جَبْنَ ۖ ﴿۲۱﴾

پس وہ ایمان لائے، (۲) اور ہم نے انہیں ایک زمانہ تک
عیش و عشرت دی۔ (۱۳۸)

فَأَسْتَفْهِمُ الرِّبَاكَ الْبَنَاتِ وَلَهُمُ الْبَنُونَ ﴿۲۲﴾

ان سے دریافت کیجئے! کہ کیا آپ کے رب کی تو بیٹیاں
ہیں اور ان کے بیٹے ہیں؟ (۱۳۹)

أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ ﴿۲۳﴾

یا یہ اس وقت موجود تھے جبکہ ہم نے فرشتوں کو مؤنث
پیدا کیا۔ (۱۴۰)

أَلَا إِنَّهُمْ مِّنْ إِفْكِهِمْ لَيَقُولُونَ ﴿۲۴﴾

آگاہ رہو! کہ یہ لوگ صرف اپنی افترا پر دازی سے کہہ
رہے ہیں۔ (۱۴۱)

وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ لَكَنُذُوبُونَ ﴿۲۵﴾

کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے۔ یقیناً یہ محض جھوٹے ہیں۔ (۱۴۲)

أَصْطَفَىٰ الْبَنَاتِ عَلَىٰ الْبَنِينَ ﴿۲۶﴾

کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے بیٹیوں کو بیٹوں پر ترجیح
دی۔ (۱۴۳)

مَا لَكُمْ سَمِعْتُمْ نَكَالَهُمْ ﴿۲۷﴾

تمہیں کیا ہو گیا ہے کیسے حکم لگاتے پھرتے ہو؟ (۱۴۴)

أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۲۸﴾

کیا تم اس قدر بھی نہیں سمجھتے؟ (۱۴۵)

(۱) يَفْعَلِينَ ہر اس تیل کو کہتے ہیں جو اپنے تنے پر کھڑی نہیں ہوتی، جیسے لوکی، کدو وغیرہ کی تیل۔ یعنی اس چمیل میدان میں جہاں کوئی درخت تھانہ عمارت۔ ایک سایہ دار تیل اگا کر ہم نے ان کی حفاظت فرمائی۔

(۲) ان کے ایمان لانے کی کیفیت کا بیان سورہ یونس ۹۸ میں گزر چکا ہے۔

(۳) یعنی فرشتوں کو جو یہ اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں تو کیا جب ہم نے فرشتے پیدا کیے تھے، یہ اس وقت وہاں موجود تھے اور انہوں نے فرشتوں کے اندر عورتوں والی خصوصیات کا مشاہدہ کیا تھا۔

(۴) جب کہ یہ خود اپنے لیے بیٹیاں نہیں، بیٹے پسند کرتے ہیں۔

(۵) کہ اگر اللہ کی اولاد ہوتی تو ذکر ہوتی، جس کو تم بھی پسند کرتے اور بہتر سمجھتے ہو، نہ کہ بیٹیاں، جو تمہاری نظروں میں کمتر اور حقیر ہیں۔

أَمَّا لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾

فَاْتُوْا بَيِّنٰتِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

وَجَعَلُوْا اٰيٰتِهٖ وَبَيِّنٰتِهٖ سَبِيْٓا- وَلَقَدْ عَلِمْتِ الْاٰيٰتِهٖ
اِنَّهُمْ لَمُحْضَوْنَ ﴿۱۵۸﴾

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلِصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾

فَاَتْلُوْهُ وَمَا تُعْبَدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾

مَا اَلَّكُمْ عَلَيْهِ يٰۤاٰنِسِيْنَ ﴿۱۶۲﴾

اِلَّا مَنْ هُوَ صٰلِحٌ جَدِيْرٌ ﴿۱۶۳﴾

وَمَا يَمُنُّ اِلَّا اِلٰهَهُمْ مَّعٰلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾

یا تمہارے پاس اس کی کوئی صاف دلیل ہے۔ (۱۵۶)

تو جاؤ اگر سچے ہو تو اپنی ہی کتاب لے آؤ۔ (۱۵۷)

اور ان لوگوں نے تو اللہ کے اور جنات کے درمیان بھی
قرابت داری ٹھہرائی (۳) ہے، اور حالانکہ خود جنات کو
معلوم ہے کہ وہ (اس عقیدہ کے لوگ عذاب کے
سامنے) پیش کیے جائیں گے۔ (۱۵۸)

جو کچھ یہ (اللہ کے بارے میں) بیان کر رہے ہیں اس سے
اللہ تعالیٰ بالکل پاک ہے۔ (۱۵۹)

سوائے! اللہ کے مخلص بندوں کے۔ (۱۶۰)

یقین مانو کہ تم سب اور تمہارے معبودان (باطل)۔ (۱۶۱)

کسی ایک کو بھی بہکا نہیں سکتے۔ (۱۶۲)

بجز اس کے جو جنسی ہی ہے۔ (۱۶۳)

(فرشتوں کا قول ہے کہ) ہم میں سے تو ہر ایک کی جگہ

(۱) یعنی عقل تو اس عقیدے کی صحت کو تسلیم نہیں کرتی کہ اللہ کی اولاد ہے اور وہ بھی مؤنث، چلو کوئی نقلی دلیل ہی دکھا
دو، کوئی کتاب جو اللہ نے اتاری ہو، اس میں اللہ کی اولاد کا اعتراف یا حوالہ ہو؟

(۲) یہ اشارہ ہے مشرکین کے اس عقیدے کی طرف کہ اللہ نے جنات کے ساتھ رشتہ ازدواج قائم کیا، جس سے لڑکیاں پیدا
ہوئیں۔ یہی بنات اللہ، فرشتے ہیں۔ یوں اللہ تعالیٰ اور جنوں کے درمیان قرابت داری (سسرالی رشتہ) قائم ہو گیا۔

(۳) حالانکہ یہ بات کیوں کر صحیح ہو سکتی ہے؟ اگر ایسا ہو تا تو اللہ تعالیٰ جنات کو عذاب میں کیوں ڈالتا؟ کیا وہ اپنی قرابت
داری کا لحاظ نہ کرتا؟ اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ خود جنات بھی جانتے ہیں کہ انہیں عقاب و عذاب الہی بھگتنے کے لیے
ضرور جہنم میں جانا ہو گا تو پھر اللہ اور جنوں کے درمیان قرابت داری کس طرح ہو سکتی ہے؟

(۴) یعنی یہ اللہ کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کہتے جن سے وہ پاک ہے۔ یہ مشرکین ہی کا شیوہ ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ
جہنم میں جنات اور مشرکین ہی حاضر کیے جائیں گے، اللہ کے مخلص (بچنے ہوئے) بندے نہیں۔ ان کے لیے تو اللہ نے
جنت تیار کر رکھی ہے۔ اس صورت میں یہ لَمُحْضَرُوْنَ سے استثناء ہے اور تسبیح جملہ معترضہ ہے۔

(۵) یعنی تم اور تمہارے معبودان باطلہ کسی کو گمراہ کرنے پر قادر نہیں ہیں، سوائے ان کے جو اللہ کے علم میں پہلے ہی
جنسی ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ کفر و شرک پر مصر ہیں۔

مقرر ہے۔^(۱) (۱۶۳)

اور ہم تو (بندگی الہی میں) صف بستہ کھڑے ہیں۔ (۱۶۵)
اور اس کی تسبیح بیان کر رہے ہیں۔^(۲) (۱۶۶)
کفار تو کہا کرتے تھے۔ (۱۶۷)
کہ اگر ہمارے سامنے اگلے لوگوں کا ذکر ہوتا۔ (۱۶۸)
تو ہم بھی اللہ کے چیدہ بندے بن جاتے۔^(۳) (۱۶۹)
لیکن پھر اس قرآن کے ساتھ کفر کر گئے،^(۴) پس اب
عنقریب جان لیں گے۔^(۵) (۱۷۰)

اور البتہ ہمارا وعدہ پہلے ہی اپنے رسولوں کے لیے صادر
ہو چکا ہے۔ (۱۷۱)

کہ یقیناً وہ ہی مدد کیے جائیں گے۔ (۱۷۲)
اور ہمارا ہی لشکر غالب (اور برتر) رہے گا۔^(۶) (۱۷۳)
اب آپ کچھ دنوں تک ان سے منہ پھیر لیجئے۔^(۷) (۱۷۴)
اور انہیں دیکھتے رہیے،^(۸) اور یہ بھی آگے چل کر دیکھ

وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّٰقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

وَاِنَّا لَنَعْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

وَ اِنَّا كَاُوْلِيَ الْعَوْلُوْنَ ﴿۱۶۵﴾

لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَقْلَمِيْنَ ﴿۱۶۶﴾

لَلْكَتٰبِ اَدَّ اللّٰهُ الْفٰلْصِيْنَ ﴿۱۶۷﴾

فَلْكَفَرُوْا بِهٖ سَوَآءٌ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۸﴾

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۶۹﴾

اِنَّهُمْ لَوَالِ الْمَصْرُوْمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

وَ اِنَّا جُنْدٌ لَّكُمْ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

فَقَوْلٌ عَلَيْهِمْ حَتّٰى جِيْنَ ﴿۱۷۲﴾

وَ اَبْعَدُكُمْ فَسَوْفَ يَجْعَلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

(۱) یعنی اللہ کی عبادت کے لیے۔ یہ فرشتوں کا قول ہے۔

(۲) مطلب یہ ہے کہ فرشتے بھی اللہ کی مخلوق اور اس کے خاص بندے ہیں جو ہر وقت اللہ کی عبادت میں اور اس کی تسبیح و تقدیس میں مصروف رہتے ہیں، نہ کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں جیسا کہ مشرکین کہتے ہیں۔

(۳) ذکر سے مراد کوئی کتاب الہی یا پیغمبر ہے۔ یعنی یہ کفار نزول قرآن سے پہلے کہا کرتے تھے کہ ہمارے پاس بھی کوئی آسمانی کتاب ہوتی، جس طرح پہلے لوگوں پر تورات وغیرہ نازل ہوئیں۔ یا کوئی ہادی اور منذر ہمیں وعظ و نصیحت کرنے والا ہوتا، تو ہم بھی اللہ کے خالص بندے بن جاتے۔

(۴) یعنی ان کی آرزو کے مطابق جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہادی بن کر آگئے، قرآن مجید بھی نازل کر دیا گیا تو ان پر ایمان لانے کے بجائے، ان کا انکار کر دیا۔

(۵) یہ تمہید و وعید ہے کہ اس تکذیب کا انجام عنقریب ان کو معلوم ہو جائے گا۔

(۶) جیسے دوسرے مقام پر فرمایا، ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لِكُلِّ نَفْسٍ مِّنْهَا مِيزٰنًا ﴿۱۰۱﴾ (المجادلة: ۱۰۱)

(۷) یعنی ان کی باتوں اور ایذاؤں پر صبر کیجئے۔

(۸) کہ کب ان پر اللہ کا عذاب آتا ہے؟

لیں گے۔ (۱۷۵)

کیا یہ ہمارے عذاب کی جلدی مچا رہے ہیں؟ (۱۷۶)
سنو! جب ہمارا عذاب ان کے میدان میں اتر آئے گا اس
وقت ان کی جن کو متنبہ کر دیا گیا تھا^(۱) بڑی بری صبح ہو
گی۔ (۱۷۷)

آپ کچھ وقت تک ان کا خیال چھوڑ دیجئے۔ (۱۷۸)
اور دیکھتے رہئے یہ بھی ابھی ابھی دیکھ لیں گے۔ (۱۷۹)^(۲)
پاک ہے آپ کا رب جو بہت بڑی عزت والا ہے ہر اس
چیز سے (جو مشرک) بیان کرتے ہیں۔ (۱۸۰)^(۳)
پیغمبروں پر سلام ہے۔ (۱۸۱)^(۴)
اور سب طرح کی تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے
جہان کا رب ہے۔ (۱۸۲)^(۵)

أَفَعَدَّآيَاتِنَا تَعَجُّلُونَ ﴿۱۷۵﴾

فَإِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنذَرِينَ ﴿۱۷۶﴾

وَقَوْلِ عَنَّا هُمْ حَظِي حِينَ ﴿۱۷۷﴾

وَأَبْصُرُ سَوْفَ يُبْصِرُونَ ﴿۱۷۸﴾

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿۱۷۹﴾

وَسَلِّمْ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۸۰﴾

وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۸۱﴾

(۱) مسلمان جب خیر پر حملہ کرنے گئے، تو یہودی انہیں دیکھ کر گھبرا گئے، جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ اکبر کہہ کر فرمایا تھا۔ «خَرَبْتُ خَيْبَرَ، إِنَّا إِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنذَرِينَ» (صحیح بخاری، کتاب الصلاة، باب ما یذکر فی الفخذ، مسلم، کتاب الجہاد، باب غزوة خیبر)

(۲) یہ بطور تاکید دوبارہ فرمایا۔ یا پہلے جملے سے مراد دنیا کا وہ عذاب ہے جو اہل مکہ پر بدر و احد اور دیگر جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں کافروں کے قتل و سلب کی صورت میں آیا۔ اور دوسرے جملے میں اس عذاب کا ذکر ہے جس سے یہ کفار و مشرکین آخرت میں دوچار ہوں گے۔

(۳) اس میں عیوب و نقائص سے اللہ کے پاکیزہ ہونے کا بیان ہے جو مشرکین اللہ کے لیے بیان کرتے ہیں، مثلاً اس کی اولاد ہے، یا اس کا کوئی شریک ہے۔ یہ کو تاہمیاں بندوں کے اندر ہیں اور اولاد یا شریکوں کے ضرورت مند بھی وہی ہیں، اللہ ان سب باتوں سے بہت بلند اور پاک ہے۔ کیونکہ وہ کسی کا محتاج ہی نہیں ہے کہ اسے اولاد کی یا کسی شریک کی ضرورت پیش آئے۔

(۴) کہ انہوں نے اللہ کا پیغام اہل دنیا کی طرف پہنچایا، جس پر یقیناً وہ سلام و تبریک کے مستحق ہیں۔

(۵) یہ بندوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، پیغمبر بھیجے، کتابیں نازل کیں اور پیغمبروں نے تمہیں اللہ کا پیغام پہنچایا، اس لیے تم اللہ کا شکر ادا کرو۔ بعض کہتے ہیں کہ کافروں کو ہلاک کر کے اہل ایمان اور پیغمبروں کو بچایا، اس پر شکر الہی کرو۔ حمد کے معنی ہیں بہ قصد تعظیم ثناء جمیل، ذکر خیر اور عظمت شان بیان کرنا۔

سورہ ص کی ہے اور اس میں اٹھای آیتیں اور
پانچ رکوع ہیں۔

سُورَةُ ص

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نمائت رحم والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ص! اس نصیحت والے قرآن کی قسم۔^(۱)
بلکہ کفار غرور و مخالفت میں پڑے ہوئے ہیں۔^(۲)
ہم نے ان سے پہلے بھی بہت سی امتوں کو تباہ کر ڈالا^(۳)
انہوں نے ہر چند حجج پکار کی لیکن وہ وقت چھٹکارے کا نہ
تھا۔^(۴)

ص وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ

بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ

كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَوْمٍ قَتَلْنَا وَآوَلَدَاتٍ جِئْنَ مَنَاصٍ

اور کافروں کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ان ہی میں سے
ایک انہیں ڈرانے والا آگیا^(۵) اور کہنے لگے کہ یہ تو
جادوگر اور جھوٹا ہے۔^(۴)

وَعَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنذِرٌ مِنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُونَ هٰذَا سِحْرٌ
كٰذِبٌ

(۱) جس میں تمہارے لیے ہر قسم کی نصیحت اور ایسی باتیں ہیں، جن سے تمہاری دنیا بھی سنور جائے اور آخرت بھی۔
بعض نے ذی الذکر کا ترجمہ شان اور مرتبت والا، کیے ہیں۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں۔ دونوں معنی صحیح ہیں۔ اس لیے کہ
قرآن عظمت شان کا حامل بھی ہے اور اہل ایمان و تقویٰ کے لیے نصیحت اور درس عبرت بھی۔ اس قسم کا جواب
مخدوف ہے کہ بات اس طرح نہیں ہے جس طرح کفار مکہ کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ساحر، شاعر یا کاذب ہیں۔
بلکہ وہ اللہ کے سچے رسول ہیں جن پر یہ ذی شان قرآن نازل ہوا۔

(۲) یعنی یہ قرآن تو یقیناً شک سے پاک اور ان کے لیے نصیحت ہے جو اس سے عبرت حاصل کریں البتہ ان کافروں کو
اس سے فائدہ اس لیے نہیں پہنچ رہا ہے کہ ان کے دماغوں میں استکبار اور غرور ہے اور دلوں میں مخالفت و عناد۔ عزت
کے معنی ہوتے ہیں، حق کے مقابلے میں اکرنا۔

(۳) جو ان سے زیادہ مضبوط اور قوت والے تھے لیکن کفر و تکذیب کی وجہ سے برے انجام سے دوچار ہوئے۔

(۴) یعنی انہوں نے عذاب دیکھ کر مدد کے لیے پکارا اور توبہ پر آمادگی کا اظہار کیا لیکن وہ وقت توبہ کا تھا نہ فرار کا۔ اس
لیے نہ ان کا ایمان نافع ہوا اور نہ وہ بھاگ کر عذاب سے بچ سکے لآت، لآہی ہے جس میں ت کا اضافہ ہے جیسے نَمَّ کو
نَمَّةً بھی بولتے ہیں مَنَاصٌ، نَاصٌ یُنَوِّصُ کا مصدر ہے، جس کے معنی بھاگنے اور پیچھے ہٹنے کے ہیں۔

(۵) یعنی انہی کی طرح کا ایک انسان رسول کس طرح بن گیا۔

اجْعَلِ اللَّهُ لَهُمْ آيَاتٍ فَهُمْ يُبْصِرُونَ هَذَا الَّذِي يُعَذِّبُ ۝

وَأَنْطَلِقَ الْمَلَائِكَةُ مِنْ أَشْوَاقٍ وَأَصْبِرُوا عَلَىٰ الْعَذَابِ إِنَّ هَذَا لَكُنِّي يَوْمَئِذٍ ۝

مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي الْمَلَأَةِ الْأَخْرَافِ إِنَّ هَذَا لَآلِ
اِحْتِلَافٍ ۝

أَنْزَلَ عَلَيْهِ الذِّكْرَ مِنْ بَيْنَ أَيْدِي مُنْبِقَاتِ سَحَابٍ مَتَّوِّجَاتٍ
يُوَلِّوْنَ يَمِينًا وَهُوَ عَذَابٌ ۝

کیا اس نے اتنے سارے معبودوں کا ایک ہی معبود کر دیا
واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔ (۵)

ان کے سردار یہ کہتے ہوئے چلے کہ چلو جی اور اپنے
معبودوں پر جئے رہو، (۲) یقیناً اس بات میں تو کوئی غرض
ہے۔ (۳) (۶)

ہم نے تو یہ بات بچھلے دین میں بھی نہیں سنی، (۳) کچھ
نہیں یہ تو صرف گھڑت ہے۔ (۴) (۷)

کیا ہم سب میں سے اسی پر کلام الہی نازل کیا گیا ہے؟ (۶)
دراصل یہ لوگ میری وحی کی طرف سے شک میں
ہیں، (۴) بلکہ (صحیح یہ ہے کہ) انہوں نے اب تک میرا
عذاب چکھا ہی نہیں۔ (۸)

(۱) یعنی ایک ہی اللہ ساری کائنات کا نظام چلانے والا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اسی طرح عبادت اور نذر و نیاز کا
مستحق بھی صرف وہی ایک ہے؟ یہ ان کے لیے تعجب انگیز بات تھی۔

(۲) یعنی اپنے دین پر جئے رہو اور بتوں کی عبادت کرتے رہو، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات پر کان مت دھرو!

(۳) یعنی یہ ہمیں ہمارے معبودوں سے چھڑا کر دراصل ہمیں اپنے پیچھے لگانا اور اپنی قیادت و سیادت منوانا چاہتا ہے۔

(۴) بچھلے دین سے مراد یا تو ان کا ہی دین قریش ہے، یا پھر دین نصاریٰ۔ یعنی یہ جس توحید کی دعوت دے رہا ہے، اس کی
بابت تو ہم نے کسی بھی دین میں نہیں سنا۔

(۵) یعنی یہ توحید صرف اس کی اپنی من گھڑت ہے، ورنہ عیسائیت میں بھی اللہ کے ساتھ دو سروں کو الوہیت میں شریک
تسلیم کیا گیا ہے۔

(۶) یعنی مکے میں بڑے بڑے چودھری اور رئیس ہیں، اگر اللہ کسی کو نبی بنانا ہی چاہتا تو ان میں سے کسی کو بناتا۔ ان سب کو
چھوڑ کر وحی و رسالت کے لیے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انتخاب بھی عجیب ہے؟ یہ گویا انہوں نے اللہ کے انتخاب میں کیڑے
نکالے۔ سچ ہے خوتے بد راہمانہ بسیار۔ دوسرے مقام پر بھی یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ زخرف - ۳۱-۳۲۔

(۷) یعنی ان کا انکار اس لیے نہیں ہے کہ انہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا علم نہیں ہے یا آپ کی سلامت
عقل سے انہیں انکار ہے بلکہ یہ اس وحی کے بارے میں ہی ریب و شک میں مبتلا ہیں جو آپ پر نازل ہوئی، جس میں
سب سے نمایاں توحید کی دعوت ہے۔

(۸) کیونکہ عذاب کا مزہ کچھ لیتے تو اتنی واضح چیز کی تکذیب نہ کرتے۔ اور جب یہ اس تکذیب کا واقعی مزہ چکھیں گے تو

یا کیا ان کے پاس تیرے زبردست فیاض رب کی رحمت کے خزانے ہیں۔^(۱) (۹)

یا کیا آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی ہر چیز کی بادشاہت ان ہی کی ہے، تو پھر یہ رسیاں تان کر چڑھ جائیں۔^(۲) (۱۰)
یہ بھی (بڑے بڑے) لشکروں میں سے شکست پایا ہوا (چھوٹا سا) لشکر ہے۔^(۳) (۱۱)

ان سے پہلے بھی قوم نوح اور عاد اور میمون والے فرعون^(۴) نے جھٹلایا تھا۔ (۱۲)
اور ثمود نے اور قوم لوط نے اور ایکہ کے رہنے والوں^(۵) نے بھی، یہی (بڑے) لشکر تھے۔ (۱۳)

أَمْ جُنْدُهُمْ خَزَائِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيزِ الْوَهَّابِ ۝۹

أَمْ لَهُمْ مَثَلُ الثَّمُودِ وَالْأَنْدَالِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَكَيْفَ تَتَّقُوا
فِي الْكُتُبِ ۝۱۰

جُنْدُ مَا هَذَا لَكُمْ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ ۝۱۱

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ ذُو الْأَوْتَارِ ۝۱۲

وَتَمُودُ وَقَوْمُ لُوطٍ وَأَصْحَابُ لَيْلَىٰ أُولَٰئِكَ الْأَحْزَابُ ۝۱۳

وہ وقت ایسا ہو گا کہ پھر نہ تصدیق کام آئے گی، نہ ایمان ہی فائدہ دے گا۔

(۱) کہ یہ جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں، انہی خزانوں میں نبوت بھی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے، بلکہ رب کے خزانوں کا مالک وہی وہاب ہے جو بہت دینے والا ہے، تو پھر انہیں نبوت محمدی سے انکار کیوں ہے؟ جسے اس نوازنے والے رب نے اپنی رحمت خاص سے نوازا ہے۔

(۲) یعنی آسمان پر چڑھ کر اس وحی کا سلسلہ منقطع کر دیں جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوتی ہے۔ اسباب، سبب کی جمع ہے۔ اس کے لغوی معنی ہر اس چیز کے ہیں جس کے ذریعے سے مطلوب تک پہنچا جائے، چاہے وہ کوئی سی بھی چیز ہو۔ اس لیے اس کے مختلف معنی کیے گئے ہیں۔ رسیوں کے علاوہ ایک ترجمہ دروازے کا بھی کیا گیا ہے، جن سے فرشتے زمین پر اترتے ہیں۔ یعنی میڑھیوں کے ذریعے سے آسمان کے دروازوں تک پہنچ جائیں اور وحی بند کر دیں۔ (فتح القدیر)

(۳) جُنْدٌ، مبتدا محذوف، ہُنْم کی خبر ہے اور مَا بطور تاکید تعظیم یا تحقیر کے لیے ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد اور کفار کی شکست کا وعدہ ہے۔ یعنی کفار کا یہ لشکر جو باطل کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے، بڑا ہے۔ یا تحقیر، اس کی قطعاً پروا نہ کریں نہ اس سے خوف کھائیں، شکست اس کا مقدر ہے۔ هُنَالِكَ مکان بعید کی طرف اشارہ ہے جو جنگ بدر اور یوم فتح مکہ کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں کافر عبرت ناک شکست سے دوچار ہوئے۔

(۴) فرعون کو میمون والا اس لیے کہا کہ وہ ظالم جب کسی پر غضب ناک ہوتا تو اس کے ہاتھوں، پیروں اور سر میں میخیں گاڑ دیتا، یا اس سے مقصد بطور استعارہ اس کی قوت و شوکت اور مضبوط حکومت کا اظہار ہے، یعنی میمونوں سے جس طرح کسی چیز کو مضبوط کر دیا جاتا ہے، اس کا لشکر جرار اور اس کے پیروکار بھی اس کی سلطنت کی قوت و استحکام کا باعث تھے۔

(۵) أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ کے لیے دیکھئے سورہ شعراء ۶۱-۷۶ کا حاشیہ۔

إِنْ كُنْ مِنَ الْكَذَّابِ الرَّسُولِ فَحَقِّ عِقَابٍ ①

وَمَا يَنْظُرُهُمْ إِلَّا صَيْحَةٌ وَاجِدَةٌ مَا لَهَا

مِنْ قَوْلٍ ②

وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّلْ لَنَا قِطْعَانَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ③

إِضْرِبْ عَلَيَّ مَا يَقُولُونَ وَأَذِكُرْ عَبْدَكَ دَاوُدَ إِذْ

أَلَيْدًا إِنَّكَ أَدَّابٌ ④

إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحُنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإشْرَاقِ ⑤

وَالظَّيْرِ مَخْمُورَةً لَعَلَّ لَكَ آذَابٌ ⑥

ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے رسولوں کی

تکذیب نہ کی ہو پس میری سزا ان پر ثابت ہوگی۔ (۱۳)

انہیں صرف ایک چیخ کا انتظار^(۱) ہے جس میں کوئی توقف

(اور ڈھیل) نہیں ہے۔ (۱۵)^(۲)

اور انہوں نے کہا کہ اے ہمارے رب! ہماری سرنوشت

تو ہمیں روز حساب سے پہلے ہی دے دے۔ (۱۶)^(۳)

آپ ان کی باتوں پر صبر کریں اور ہمارے بندے داود

(علیہ السلام) کو یاد کریں جو بڑی قوت والا تھا،^(۴) یقیناً وہ

بہت رجوع کرنے والا تھا۔ (۱۷)

ہم نے پہاڑوں کو اس کے تابع کر رکھا تھا کہ اس کے

ساتھ شام کو اور صبح کو تسبیح خوانی کریں۔ (۱۸)

اور پرندوں کو بھی جمع ہو کر سب کے سب اس کے زیر

(۱) یعنی صور پھونکنے کا جس سے قیامت برپا ہو جائے گی۔

(۲) دودھ دوہنے والا ایک مرتبہ کچھ دودھ دوہ کر بچے کو اونٹنی یا گائے بھینس کے پاس چھوڑ دیتا ہے تاکہ اس کے دودھ

پینے سے تھنوں میں دودھ اتر آئے، چنانچہ تھوڑی دیر بعد بچے کو زبردستی پیچھے ہٹا کر خود دودھ دوہنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ

دو مرتبہ دودھ دوہنے کے درمیان کا جو وقفہ ہے، یہ نواق کھلاتا ہے۔ یعنی صور پھونکنے کے بعد اتنا وقفہ بھی نہیں ملے گا،

بلکہ صور پھونکنے کی دیر ہوگی کہ قیامت کا زلزلہ برپا ہو جائے گا۔

(۳) قِطْعٌ کے معنی ہیں، حصہ، مراد یہاں نامہٴ عمل یا سرنوشت ہے۔ یعنی ہمارے نامہٴ اعمال کے مطابق ہمارے حصے میں

اچھی یا بری سزا جو بھی ہے، یوم حساب کے آنے سے پہلے ہی ہمیں دنیا میں دے دے۔ یہ یَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ

والی بات ہی ہے۔ یہ وقوع قیامت کو ناممکن سمجھتے ہوئے انہوں نے استہزا اور تمسخر کے طور پر کہا۔

(۴) یہ اُنَيْدٌ، یَنْدٌ (ہاتھ) کی جمع نہیں ہے۔ بلکہ یہ اَذْ یَنْیِدُ کا مصدر اُنَيْدٌ ہے، قوت و شدت۔ اسی سے تَأْنِیدُ بمعنی تقویت

ہے۔ اس قوت سے مراد دینی قوت و صلاحیت ہے، جس طرح حدیث میں آتا ہے ”اللہ کو سب سے زیادہ محبوب نماز، داود

علیہ السلام کی نماز اور سب سے زیادہ محبوب روزے، داود علیہ السلام کے روزے ہیں، وہ نصف رات سوتے، پھر اٹھ کر

رات کا تہائی حصہ قیام کرتے اور پھر اس کے چھٹے حصے میں سو جاتے۔ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن نافرمان کرتے اور

جنگ میں فرار نہ ہوتے، (صحیح بخاری، کتاب الأنبیاء، باب وآتینا داود ذبوراً۔ ومسلم، کتاب الصیام، باب

النہی عن صوم الدھر)

فرمان رہتے۔^(۱۹)

اور ہم نے اس کی سلطنت کو مضبوط کر دیا تھا^(۲۰) اور اسے حکمت دی تھی^(۲۱) اور بات کا فیصلہ کرنا۔^(۲۲) اور اسے دیوار پھاند کر محراب میں آگئے۔^(۲۳)

جب یہ (حضرت) داؤد (علیہ السلام) کے پاس پہنچے، پس یہ ان سے ڈر گئے،^(۲۴) انہوں نے کہا خوف نہ کیجئے! ہم دو فریق مقدمہ ہیں، ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے، پس آپ ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجئے اور نا انصافی نہ کیجئے اور ہمیں سیدھی راہ بتا دیجئے۔^(۲۵)

(سنیے) یہ میرا بھائی ہے^(۲۶) اس کے پاس نناوے دنبیاں

وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَأَتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَضَّلْنَا الْإِسْرَافَ ۝

وَهَلْ أَتَاكَ نَبَأُ الْخَصْمِ إِذْ تَسُوَّرُوا بِالْعِرَاقِ ۝

إِذْ خَلَاوْا عَلَى دَاوُدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوا لَا تَعْصَفْ خَصْمِينَ بَنِي بَعْضُنَا عَلَى بَعْضٍ فَأَخْلَمَ بَيْنَنَا وَالْحَقَّ وَلَا تَشْطِطْ وَاهْدِنَا إِلَى سَوَاءِ الصِّرَاطِ ۝

إِنَّ هَذَا أَخِي وَمَعَا لَيْسَعُ وَتَسْعُونَ نَجْعَةٌ وَلِي نَجْعَةٌ وَاحِدَةٌ ۝

(۱) یعنی اشراق کے وقت اور آخر دن کو پہاڑ بھی داؤد علیہ السلام کے ساتھ مصروف تسبیح ہوتے اور اڑتے جانور بھی زبور کی قراءت سن کر ہوا ہی میں جمع ہو جاتے اور ان کے ساتھ اللہ کی تسبیح کرتے۔ محشورۃ کے معنی مجموعتہ ہیں۔

(۲) ہر طرح کے مادی اور روحانی اسباب کے ذریعے سے۔

(۳) یعنی نبوت، اصابت، رائے، قول سداد اور فعل صواب۔

(۴) یعنی مقدمات کے فیصلے کرنے کی صلاحیت، بصیرت و فقہ اور استدلال و بیان کی قوت۔

(۵) میخرا بے سے مراد کمرہ ہے جس میں سب سے علیحدہ ہو کر یکسوئی کے ساتھ اللہ کی عبادت کرتے۔ دروازے پر پہرے دار ہوتے، تاکہ کوئی اندر آکر عبادت میں مغل نہ ہو۔ جھگڑا کرنے والے پیچھے سے دیوار پھاند کر اندر آگئے۔

(۶) ڈرنے کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ایک تو وہ دروازے کے بجائے عقب سے دیوار چڑھ کر اندر آئے۔ دوسرے انہوں نے اتنا بڑا اقدام کرتے ہوئے بادشاہ وقت سے کوئی خوف محسوس نہیں کیا۔ ظاہری اسباب کے مطابق خوف والی چیز سے خوف کھانا، انسان کا ایک طبعی تقاضا ہے۔ یہ منصب و کمال نبوت کے خلاف ہے نہ توحید کے منافی۔ توحید کے منافی غیر اللہ کا وہ خوف ہے جو مارے اسباب ہو۔

(۷) آنے والوں نے تسلی دی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے درمیان ایک جھگڑا ہے، ہم آپ سے فیصلہ کرانے آئے ہیں، آپ حق کے ساتھ فیصلہ بھی فرمائیں اور سیدھے راستے کی طرف ہماری رہنمائی بھی۔

(۸) بھائی سے مراد دینی بھائی یا شریک کار و بار یا دوست ہے۔ سب پر بھائی کا اطلاق صحیح ہے۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتُمْ لِي فِي الْخَطَابِ ﴿۳۱﴾

ہیں اور میرے پاس ایک ہی دہی ہے لیکن یہ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اپنی یہ ایک بھی مجھ ہی کو دے دے (۱) اور مجھ پر بات میں بڑی سختی برتا ہے۔ (۲۳) (۲)

آپ نے فرمایا! اس کا اپنی دہیوں کے ساتھ تیری ایک دہی ملا لینے کا سوال بیشک تیرے اوپر ایک ظلم ہے اور اکثر حصہ دار اور شریک (ایسے ہی ہوتے ہیں کہ) ایک دوسرے پر ظلم کرتے (۳) ہیں، سوائے ان کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں (۴) اور (حضرت) داؤد (علیہ السلام) سمجھ گئے کہ ہم نے انہیں آزمایا ہے، پھر تو اپنے رب سے استغفار کرنے لگے اور عاجزی کرتے ہوئے گر پڑے (۵) اور (پوری طرح) رجوع کیا۔ (۲۳)

پس ہم نے بھی ان کا وہ (قصور) معاف کر دیا، (۶) یقیناً وہ

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتُمْ لِي فِي الْخَطَابِ ﴿۳۱﴾
الْخُلَطَاءُ لِيَعْنِي بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا
الصَّالِحَاتِ وَلَقِيلَ لَهُمْ مَا ظَنُّكُمْ لِدَاؤِكُمْ أَنْفُسَكُمْ فَمَا تَسْتَغْفِرُونَ
رَبَّكُمْ وَتَعَزَّوْا بِمَا آتَاكُمْ رَبُّكُمْ ﴿۳۲﴾

۳۱

فَقَعَزَّوْا لَهُ ذَلِكَ وَإِنْ لَهُ عِندَنَا لَزُلْفَىٰ

(۱) یعنی یہ ایک دہی بھی میری دہیوں میں شامل کر دے تاکہ میں ہی اس کا بھی ضامن اور کفیل ہو جاؤں۔

(۲) دوسرا ترجمہ ہے ”اور یہ گفتگو میں مجھ پر غالب آ گیا ہے“ یعنی جس طرح اس کے پاس مال زیادہ ہے، زبان کا بھی مجھ سے زیادہ تیز ہے اور اس تیزی و طراری کی وجہ سے لوگوں کو قائل کر لیتا ہے۔

(۳) یعنی انسانوں میں یہ کوتاہی عام ہے کہ ایک شریک دوسرے پر زیادتی کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ دوسرے کا حصہ بھی خود ہی ہڑپ کر جائے۔

(۴) البتہ اس اخلاقی کوتاہی سے اہل ایمان محفوظ ہیں، کیونکہ ان کے دلوں میں اللہ کا خوف ہوتا ہے اور عمل صالح کے وہ پابند ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی پر زیادتی کرنا اور دوسروں کا مال ہڑپ کر جانے کی سعی کرنا، ان کے مزاج میں شامل نہیں ہوتا۔ وہ تو دینے والے ہوتے ہیں، لینے والے نہیں۔ تاہم ایسے بلند کردار لوگ تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔

(۵) ﴿وَتَعَزَّوْا بِمَا آتَاكُمْ رَبُّكُمْ﴾ کا مطلب یہاں سجدے میں گر پڑنا ہے۔

(۶) حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ کام کیا تھا جس پر انہیں کوتاہی کا اور توبہ و ندامت کے اظہار کا احساس ہوا، اور اللہ نے اسے معاف فرما دیا۔ قرآن کریم میں اس اجمال کی تفصیل نہیں ہے اور کسی مستند حدیث میں بھی اس کی بابت کوئی وضاحت نہیں ہے۔ اس لیے بعض مفسرین نے تو اسرائیلی روایات کو بنیاد بنا کر ایسی باتیں بھی لکھ دی ہیں، جو ایک نبی کی

وَحَسَنَ مَا يَ ⑤

ہمارے نزدیک بڑے مرتبہ والے اور بہت اچھے ٹھکانے والے ہیں۔ (۲۵)

اے داود! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنا دیا تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی، یقیناً جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے

يٰۤاٰدُوۤا اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاٰخِذْ بِذِي النّٰسِ
بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّ
الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ لّٰمًا

شان سے فروتر ہیں۔ بعض مفسرین مثلاً ابن کثیر نے یہ موقف اختیار کیا کہ جب قرآن و حدیث اس معاملے میں خاموش ہیں تو ہمیں بھی اس کی تفصیلات کی کرید میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مفسرین کا ایک تیسرا گروہ ہے جو اس واقعے کی بعض جزئیات اور تفصیلات بیان کرتا ہے تاکہ قرآن کے اجمال کی کچھ توضیح ہو جائے۔ تاہم یہ کسی ایک بیان پر متفق نہیں ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت داود علیہ السلام نے ایک فوجی کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور یہ اس زمانے کے عرف میں معیوب بات نہیں تھی۔ حضرت داود علیہ السلام کو اس عورت کی خوبیوں اور کمالات کا علم ہوا تھا، جس کی بنا پر ان کے اندر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس عورت کو تو ملکہ ہونا چاہیے نہ کہ ایک عام سی عورت۔ تاکہ اس کی خوبیوں اور کمالات سے پورا ملک فیض یاب ہو۔ یہ خواہش کتنے بھی اچھے جذبے کی بنیاد پر ہو، لیکن ایک تو متعدد بیویوں کی موجودگی میں یہ نامناسب سی بات لگتی ہے۔ دوسرے بادشاہ وقت کی طرف سے اس کے اظہار میں جبر کا پہلو بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اس لیے حضرت داود علیہ السلام کو ایک تشلیلی واقعے سے اس کے نامناسب ہونے کا احساس دلایا گیا اور انہیں فی الواقع اس پر تنبیہ ہو گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ آنے والے یہ دو شخص فرشتے تھے جو ایک فرضی مقدمہ لے کر حاضر ہوئے، حضرت داود علیہ السلام سے کو تاہی یہ ہوئی کہ مدعی کا بیان سن کر ہی اپنی رائے کا اظہار کر دیا اور مدعا علیہ کی بات سننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے رفع درجات کے لیے اس آزمائش میں انہیں ڈالا، اس غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ سمجھ گئے کہ یہ آزمائش تھی جو اللہ کی طرف سے ان پر آئی اور بارگاہ الہی میں بھٹک گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ آنے والے فرشتے نہیں تھے، انسان ہی تھے اور یہ فرضی واقعہ نہیں، ایک حقیقی جھگڑا تھا، جس کے فیصلے کے لیے وہ آئے تھے اور اس طرح ان کے صبر و تحمل کا امتحان لیا گیا، کیونکہ اس واقعے میں ناگواری اور اشتعال طبع کے کئی پہلو تھے، ایک تو بلا اجازت دیوار پھاند کر آنا۔ دوسرے، عبادت کے مخصوص اوقات میں آکر مخل ہونا۔ تیسرے، ان کا طرز تکلم بھی آپ کی حاکمانہ شان سے فروتر تھا (کہ زیادتی نہ کرنا وغیرہ) لیکن اللہ نے آپ کو توفیق دی کہ مشتعل نہیں ہوئے اور کمال صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ لیکن دل میں جو طبعی ناگواری کا ہلکا سا احساس بھی پیدا ہوا، اس کو بھی اپنی کو تاہی پر محمول کیا، یعنی یہ اللہ کی طرف سے آزمائش تھی، اس لیے یہ طبعی انقباض بھی نہیں ہونا چاہیے تھا، جس پر انہوں نے توبہ و استغفار کا اہتمام کیا۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصّٰوَابِ .

يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿٢٦﴾

ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اس لیے کہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا ہے۔ (۲۶)

اور ہم نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو ناحق پیدا نہیں کیا،^(۱) یہ گمان تو کافروں کا ہے سو کافروں کے لیے خرابی ہے آگ کی۔ (۲۷)

کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کے برابر کر دیں گے جو (ہیشہ) زمین میں فساد مچاتے رہے، یا پرہیزگاروں کو بدکاروں جیسا کر دیں گے؟ (۲۸) یہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف اس لیے نازل فرمایا ہے کہ لوگ اس کی آیتوں پر غور و فکر کریں اور عقلمند اس سے نصیحت حاصل کریں۔ (۲۹)

اور ہم نے داود کو سلیمان (نامی فرزند) عطا فرمایا، جو بڑا اچھا بندہ تھا اور بے حد رجوع کرنے والا تھا۔ (۳۰) جب ان کے سامنے شام کے وقت تیز رو خاصے گھوڑے پیش کیے گئے۔^(۲) (۳۱)

تو کہنے لگے میں نے اپنے پروردگار کی یاد پر ان گھوڑوں کی محبت کو ترجیح دی، یہاں تک کہ (آفتاب) چھپ گیا۔ (۳۲) ان (گھوڑوں) کو دوبارہ میرے سامنے لاؤ! پھر تو پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔^(۳) (۳۳)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بِلَهْلَهٍ ذَلِكَ كُنْهٌ
الَّذِينَ كَفَرُوا وَهُمْ فِي أَهْوَابِنَا الَّذِينَ يَبْهَتُونَ بِهَا لَئِن كَانُوا إِلَّا رِجَالًا مَّعْتَدِينَ ﴿٢٧﴾

أَمْ يَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ
أَمْ يَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ ﴿٢٨﴾

كُنُوزٍ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبْرَكًا لِيُبَيِّنَ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ وَاللَّيْلِ وَالنَّجْمِ
أُولَئِكَ نَزَّلْنَا بِهَا الْقُرْآنَ ﴿٢٩﴾

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ دُسُلَيْنَ يَخُومُ الْعَبْدَانِ أَتَابًا ﴿٣٠﴾

إِذْ عُوِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصُّفُوفُ الْجِيَادِ ﴿٣١﴾

فَقَالَ إِنِّي أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْلِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّي حَتَّى
تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿٣٢﴾

رُدُّوْهَا عَلَيَّ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْتَابِ ﴿٣٣﴾

(۱) بلکہ ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور وہ یہ کہ میرے بندے میری عبادت کریں، جو ایسا کرے گا، میں اسے بہترین جزا سے نوازوں گا اور جو میری عبادت و اطاعت سے سرتابی کرے گا، اس کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔

(۲) صَافِنَاتٌ، صَافِنٌ یا صَافِنَةٌ کی جمع ہے، وہ گھوڑے جو تین ٹانگوں پر کھڑے ہوں۔ جِيَادٌ جَوَادٌ کی جمع ہے جو تیز رو گھوڑے کو کہتے ہیں۔ یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام نے بغرض جہاد جو گھوڑے پالے ہوئے تھے، وہ عمدہ اصل تیز رو گھوڑے حضرت سلیمان علیہ السلام پر معاینے کے لیے پیش کیے گئے۔ عَشِيٌّ، ظہر یا عصر سے لے کر آخر دن تک کے وقت کو کہتے ہیں، جسے ہم شام سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۳) اس ترجمے کی رو سے أَحْبَبْتُ، بمعنی آهَنْتُ (ترجیح دینا) اور عَنِ، بمعنی عَلَيَّ ہے۔ اور تَوَارَتْ کا مرجع شَمْسٌ ہے جو

اور ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کی آزمائش کی اور ان کے تخت پر ایک جسم ڈال دیا پھر^(۱) اس نے رجوع کیا۔ (۳۳)

کہا کہ اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسا ملک عطا فرما جو میرے سوا کسی (شخص) کے لائق نہ ہو،^(۲) تو بڑا ہی

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَأَلْقَيْنَا عَلَيَّ كُرْسِيًّا مِّنَ السَّمَاءِ
أَنَابَ ۝۳۳

قَالَ رَبِّ اغْنِنِي وَهَبْ لِي مُلْكًا آيَاتِكَ لِيُحَدِّثَ
بِعَدَّتِي إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۳۴

آیت میں پہلے مذکور نہیں ہے، لیکن قرینہ اس پر دال ہے۔ اس تفسیر کی رو سے اگلی آیت میں - ﴿مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْكَفَّاتِي﴾ کا ترجمہ بھی ذبح کرنا ہو گا یعنی مَسْحًا بِالسُّوقِ کا مفہوم۔ مطلب ہو گا کہ گھوڑوں کے معاینہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی عصر کی نماز یا وظیفہ خاص رہ گیا جو اس وقت وہ کرتے تھے۔ جس پر انہیں سخت صدمہ ہوا اور کہنے لگے کہ میں گھوڑوں کی محبت میں اتنا وارفتہ اور گم ہو گیا کہ سورج پر وہ مغرب میں چھپ گیا اور اللہ کی یاد، نماز یا وظیفے سے غافل رہا۔ چنانچہ اس کی تلافی اور ازالے کے لیے انہوں نے سارے گھوڑے اللہ کی راہ میں قتل کر ڈالے۔ امام شوکانی اور ابن کثیر وغیرہ نے اس تفسیر کو ترجیح دی ہے۔ دیگر بعض مفسرین نے اس کی دوسری تفسیر کی ہے۔ اس کی رو سے عَنْ أَجَلٍ کے معنی میں ہے آئی: لِأَجْلِ ذِكْرِ رَبِّي، یعنی رب کی یاد کی وجہ سے میں ان گھوڑوں سے محبت رکھتا ہوں۔ یعنی اس کے ذریعے سے اللہ کی راہ میں جہاد ہوتا ہے۔ پھر ان گھوڑوں کو دوڑایا حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ انہیں دوبارہ طلب کیا اور پیار و محبت سے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ قرآن میں مال کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں یہ لفظ گھوڑوں کے لیے آیا ہے۔ تَوَارِثَ کا مرجع گھوڑے ہیں۔ امام ابن جریر طبری نے اس دوسری تفسیر کو ترجیح دی ہے اور یہی تفسیر متعدد وجوہ سے صحیح لگتی ہے۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ.

(۱) یہ آزمائش کیا تھی، کرسی پر ڈالا گیا جسم کس چیز کا تھا؟ اور اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کی بھی کوئی تفصیل قرآن کریم یا حدیث میں نہیں ملتی۔ البتہ بعض مفسرین نے صحیح حدیث سے ثابت ایک واقعے کو اس پر چسپاں کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک مرتبہ کہا کہ میں آج کی رات اپنی تمام بیویوں سے (جن کی تعداد ۷۰ یا ۹۰ تھی) بہبستری کروں گا تاکہ ان سے شاہ سوار پیدا ہوں جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ اور اس پر ان شاء اللہ نہیں کہا (یعنی صرف اپنی ہی تدبیر سارا اعتماد کیا) نتیجہ یہ ہوا کہ سوائے ایک بیوی کے کوئی بیوی حاملہ نہیں ہوئی۔ اور حاملہ بیوی نے بھی جو بچہ جتا، وہ ناقص یعنی آدھا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر سلیمان علیہ السلام ان شاء اللہ کہہ لیتے تو سب سے مجاہد پیدا ہوتے۔ (صحیح بخاری، کتاب الأنبياء، صحیح مسلم، کتاب الإيمان، باب الاستثناء، ان مفسرین کے خیال میں شاید ان شاء اللہ نہ کہنا یا صرف اپنی تدبیر پر اعتماد کرنا یہی فتنہ ہو، جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام مبتلا ہوئے اور کرسی پر ڈالا جانے والا جسم یہی ناقص الخلق بچہ ہو۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ.

(۲) یعنی شاہ سواروں کی فوج پیدا ہونے کی آرزو، تیری حکمت و مشیت کے تحت پوری نہیں ہوئی، لیکن اگر مجھے ایسی

دینے والا ہے۔ (۳۵)

پس ہم نے ہوا کو ان کے ماتحت کر دیا وہ آپ کے حکم سے
جہاں آپ چاہتے نرمی سے پہنچا دیا کرتی تھی۔ (۳۶)^(۱)

اور (طاقت ور) جنات کو بھی (ان کا ماتحت کر دیا) ہر
عمارت بنانے والے کو اور غوطہ خور کو۔ (۳۷)

اور دوسرے جنات کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے
رہتے۔ (۳۸)^(۲)

یہ ہے ہمارا عطیہ اب تو احسان کر یا روک رکھ، کچھ
حساب نہیں۔ (۳۹)^(۳)

ان کے لیے ہمارے پاس بڑا تقرب ہے اور بہت اچھا
ٹھکانا ہے۔ (۴۰)^(۴)

اور ہمارے بندے ایوب (علیہ السلام) کا (بھی) ذکر کر،
جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے شیطان نے رنج
اور دکھ پہنچایا ہے (۴۱)^(۵)

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ وَأَوْحَيْنَا أَصَابَ ۝

وَالشَّيْطَانِ كُلِّ بَنَاءٍ وَعَوَاصٍ ۝

وَأَخْرَجْنَا مَقْرِنَيْنِ مِنِّي الْأَصْفَادِ ۝

هَذَا عَطَاؤُنَا أَنَا مُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

وَأَنَّ لَهُ عِنْدَنَا لُزُومًا لِّغِيٍّ وَحَسَنَ مَّآبٍ ۝

وَأَذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَى رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ

بِنُصُوبٍ وَعَذَابٍ ۝

باختیار بادشاہت عطا کر دے کہ ویسی بادشاہت میرے سوا یا میرے بعد کسی کے پاس نہ ہو، تو پھر اولاد کی ضرورت ہی
نہیں رہے گی۔ یہ دعا بھی اللہ کے دین کے غلبے کے لیے ہی تھی۔

(۱) یعنی ہم نے سلیمان علیہ السلام کی یہ دعا قبول کر لی اور ایسی بادشاہی عطا کی کہ جس میں ہوا بھی ان کے ماتحت تھی،
یہاں ہوا کو نرمی سے چلنے والا بتایا ہے، جب کہ دوسرے مقام پر اسے تند و تیز کہا ہے، (الانبیاء-۸۱) جس کا مطلب یہ ہے
کہ ہوا پیدائشی قوت کے لحاظ سے تند ہے۔ لیکن سلیمان علیہ السلام کے لیے اسے نرم کر دیا گیا، یا حسب ضرورت وہ کبھی
تند ہوتی کبھی نرم، جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام چاہتے۔ (فتح القدیر)

(۲) جنات میں سے جو سرکش یا کافر ہوتے، انہیں بیڑیوں میں جکڑ دیا جاتا، تاکہ وہ اپنے کفر یا سرکشی کی وجہ سے سرتابی نہ کر سکیں۔
(۳) یعنی تیری دعا کے مطابق ہم نے تجھے عظیم بادشاہی سے نوازا دیا، اب انسانوں میں سے جس کو تو چاہے دے، جسے
چاہے نہ دے، تجھ سے ہم حساب بھی نہیں لیں گے۔

(۴) یعنی دنیوی جاہ و مرتبت عطا کرنے کے باوجود آخرت میں بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو قرب خاص اور مقام
خاص حاصل ہو گا۔

(۵) حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری اور اس میں ان کا صبر مشہور ہے۔ جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اہل و مال کی

أُرْكَضُ بِرَحْلِكَ هَذَا مُعْتَسِلٌ بِلِدِّ وَشَرَابٌ ۝

اپنا پاؤں مارو، یہ نہانے کا ٹھنڈا اور پینے کا پانی ہے۔^(۱) (۳۲)

وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِنَّا وَذِكْرًا

اور ہم نے اسے اس کا پورا کنبہ عطا فرمایا بلکہ اتنا ہی اور بھی اسی کے ساتھ اپنی (خاص) رحمت سے،^(۲) اور عقلمندوں کی نصیحت کے لیے۔^(۳) (۳۳)

لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۝

اور اپنے ہاتھ میں تنکوں کا ایک مٹھا (جھاڑو) لے کر مار دے اور قسم کا خلاف نہ کر،^(۴) سچ تو یہ ہے کہ ہم نے

وَحُدُودَ بَيْدِكَ ضَعْفًا فَاصْرَبْ بِهِ وَلَا تَحْتَدِثْ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا

تباہی اور بیماری کے ذریعے سے ان کی آزمائش کی، جس میں وہ کئی سال مبتلا رہے۔ حتیٰ کہ صرف ایک بیوی ان کے ساتھ رہ گئی جو صبح و شام ان کی خدمت بھی کرتی اور ان کو کہیں کام کاج کر کے بقدر کفایت رزق کا انتظام بھی کرتی۔ یہاں پر متعدد تفسیری روایات کا ذکر کیا جاتا ہے، مگر اس میں سے کتنا کچھ صحیح ہے اور کتنا نہیں، اسے معلوم کرنے کا کوئی مستند ذریعہ نہیں۔ نضب سے جسمانی تکالیف اور عذاب سے مالی ابتلا مراد ہے۔ اس کی نسبت شیطان کی طرف اس لیے کی گئی ہے دریاں حالیکہ سب کچھ کرنے والا صرف اللہ ہی ہے، کہ ممکن ہے شیطان کے وسوسے ہی کسی ایسے عمل کا سبب بنے ہوں جس پر یہ آزمائش آئی یا پھر بطور ادب کے ہے کہ خیر کو اللہ تعالیٰ کی طرف اور شر کو اپنی یا شیطان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور ان سے کہا کہ زمین پر پیر مارو، جس سے ایک چشمہ جاری ہو گیا۔ اس کے پانی پینے سے اندرونی بیماریاں اور غسل کرنے سے ظاہری بیماریاں دور ہو گئیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ دو چشمے تھے، ایک سے غسل فرمایا اور دوسرے سے پانی پیا۔ لیکن قرآن کے الفاظ سے پہلی بات کی تائید ہوتی ہے۔ یعنی ایک ہی چشمہ تھا۔

(۲) بعض کہتے ہیں کہ پہلا کنبہ جو بطور آزمائش ہلاک کر دیا گیا تھا، اسے زندہ کر دیا گیا اور اس کے مثل اور مزید کنبہ عطا کر دیا گیا۔ لیکن یہ بات کسی مستند ذریعے سے ثابت نہیں ہے۔ زیادہ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ نے پہلے سے زیادہ مال و اولاد سے انہیں نواز دیا جو پہلے سے دو گنا تھا۔

(۳) یعنی ایوب علیہ السلام کو یہ سب کچھ ہم نے جو دوبارہ عطا کیا، تو اپنی رحمت خاص کے اظہار کے علاوہ اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ اہل دانش اس سے نصیحت حاصل کریں اور وہ بھی ابتلا و شدائد پر اسی طرح صبر کریں جس طرح ایوب علیہ السلام نے کیا۔

(۴) بیماری کے ایام میں خدمت گزار بیوی کو کسی بات سے ناراض ہو کر حضرت ایوب علیہ السلام نے اسے سو کوڑے مارنے کی قسم کھالی تھی، صحت یاب ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کہ سو تنکوں والی جھاڑو لے کر ایک مرتبہ اسے مار

اسے بڑا صابر بندہ پایا، وہ بڑا نیک بندہ تھا اور بڑی ہی
رغبت رکھنے والا۔ (۳۴)

ہمارے بندوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) کا
بھی لوگوں سے ذکر کرو جو ہاتھوں اور آنکھوں والے^(۱)
تھے۔ (۳۵)

ہم نے انہیں ایک خاص بات یعنی آخرت کی یاد کے
ساتھ مخصوص کر دیا تھا۔^(۲) (۳۶)

یہ سب ہمارے نزدیک برگزیدہ اور بہترین لوگ
تھے۔ (۳۷)

اسماعیل، یسع اور ذوالکفل (علیہم السلام) کا بھی ذکر کر
دیجئے۔ یہ سب بہترین لوگ تھے۔^(۳) (۳۸)

یہ نصیحت ہے اور یقین مانو کہ پرہیزگاروں کی بڑی اچھی
جگہ ہے۔ (۳۹)

نِعْمَ الْعِمْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ ﴿۳۴﴾

وَأَذْكُرُ عَبْدَنَا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي
وَالْأَبْصَارِ ﴿۳۵﴾

إِنَّا أَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ ذُكِّرَى الْغَدْرِ ﴿۳۶﴾

وَأَنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ ﴿۳۷﴾

وَأَذْكُرُ إِسْمَاعِيلَ وَاليَسَعَ وَذَالِ الْكُفْلِ وَكُلًّا مِّنَ الْأَخْيَارِ ﴿۳۸﴾

هَذَا ذِكْرٌ وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَّآبٍ ﴿۳۹﴾

دے، تیری قسم پوری ہو جائے گی۔ اس امر میں علما کا اختلاف ہے کہ یہ رعایت صرف حضرت ایوب علیہ السلام کے ساتھ
خاص ہے یا دوسرا کوئی شخص بھی اس طرح سو کوڑوں کی جگہ سو تنکوں والی جھاڑو مار کر حاشٹ ہونے سے بچ سکتا ہے؟
بعض پہلی رائے کے قائل ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ اگر نیت ضرب شدید کی نہ کی ہو تو اس طرح عمل کیا جاسکتا ہے۔
(فتح القدیر) ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک معذور کمزور زانی کو سو کوڑوں کی جگہ
سو تنکوں والی جھاڑو مار کر سزا دی۔ (مسند أحمد ۵/ ۲۲۲۔ ابن ماجہ، کتاب الحدود، باب الکبیر والمریض یجب
علیہ الحد، صحیحہ الألبانی) جس سے مخصوص صورتوں میں اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

(۱) یعنی عبادت الہی اور نصرت دین میں بڑے قوی اور دینی و علمی بصیرت میں ممتاز تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ آئینی بمعنی
نعم ہے۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام و احسان ہوا یا یہ لوگوں پر احسان کرنے والے تھے۔

(۲) یعنی ہم نے ان کو آخرت کی یاد کے لیے چن لیا تھا، چنانچہ آخرت ہر وقت ان کے سامنے رہتی تھی (آخرت کا ہر
وقت استحضار، یہ بھی اللہ کی ایک بڑی نعمت اور زہد و تقویٰ کی بنیاد ہے) یا وہ لوگوں کو آخرت اور اللہ کی طرف بلانے میں
کوشاں رہتے تھے۔

(۳) یسع علیہ السلام کہتے ہیں، حضرت الیاس علیہ السلام کے جانشین تھے، ال تعریف کے لیے ہے اور عجمی نام ہے،
ذوالکفل کے لیے دیکھئے سورۃ الانبیاء، آیت ۸۵ کا حاشیہ۔ اخیاز، خبیر یا خبیر کی جمع ہے جیسے میت کی جمع أموات ہے۔

جَدِبَ عَدْنٍ مُفْتَحَةً لَكُمْ الْاَنْبَابِ ۝

(یعنی بھینگی والی) جنتیں جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ (۵۰)

جن میں با فراغت تکیے لگائے بیٹھے ہوئے طرح طرح کے میوے اور قسم قسم کی شرابوں کی فرمائشیں کر رہے ہیں۔ (۵۱)

اور ان کے پاس نیچی نظروں والی ہم عمر حوریں ہوں گی۔ (۵۲)^(۱)

یہ ہے جس کا وعدہ تم سے حساب کے دن کے لیے کیا جاتا تھا۔ (۵۳)

بیشک روزیاں (خاص) ہمارا عطیہ ہیں جن کا کبھی خاتمہ ہی نہیں۔ (۵۴)^(۲)

یہ تو ہوئی جزا،^(۳) (یاد رکھو کہ) سرکشوں کے لیے^(۴) بڑی بری جگہ ہے۔ (۵۵)

دوزخ ہے جس میں وہ جائیں گے (آہ) کیا ہی برا بچھونا ہے۔ (۵۶)

یہ ہے، پس اسے پکھیں، گرم پانی اور پیپ۔ (۵۷)^(۵)

مُنَكِّبِينَ فِيهَا يَدْعُونَ فِيهَا بِغَاكِهِمْ كَثِيرَةً وَنَسْرَابِ ۝

وَعِنْدَهُمْ نَصْرُهُنَّ الْمَطْرُوفَاتُ ۝

هَذَا مَا وَعَدُونَا لِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝

إِنَّ هَذَا لَرِزْقًا مَّا لَهُ مِنْ تَقَادِرٍ ۝

هَذَا اَوْرَانٍ لِلظَّالِمِينَ لَشَرِّ مَا بِ ۝

جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا فَيَكْسِرُوا الْعِهَادَ ۝

هَذَا فُلَيْدٌ وَقُوَّةٌ حَمِيمٌ وَعَسَاقُ ۝

(۱) یعنی جن کی نگاہیں اپنے خاوندوں سے متجاوز نہیں ہوں گی اَنْبَابِ، تَنْزُبُ کی جمع ہے، ہم عمر یا لازوال حسن و جمال کی حامل۔ (فتح القدير)

(۲) رزق، بمعنی عطیہ ہے اور ہَذَا سے ہر قسم کی مذکور نعمتیں اور وہ اکرام و اعزاز مراد ہے جن سے اہل جنت بہرہ یاب ہوں گے۔ نفاذ کے معنی انتطاع اور خاتمے کے ہیں۔ یہ نعمتیں بھی غیر فانی ہوں گی اور اعزاز و اکرام بھی دائمی۔

(۳) ہَذَا، مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی الْأَمْرُ هَذَا یا هَذَا مبتدا ہے، اس کی خبر محذوف ہے یعنی هَذَا كَمَا ذُكِرَ یعنی مذکور اہل خیر کا معاملہ ہوا۔ اس کے بعد اہل شرک کا انجام بیان کیا جا رہا ہے۔

(۴) طَاغِينَ، جنہوں نے اللہ کے احکام سے سرکشی اور رسولوں کی تکذیب کی۔ يَصْلَوْنَ کے معنی ہیں يَدْخُلُونَ، داخل ہوں گے۔

(۵) حَمِيمٌ وَعَسَاقُ، ہَذَا کی خبر ہے یعنی هَذَا حَمِيمٌ وَعَسَاقُ فَلَيْدٌ وَقُوَّةٌ یہ ہے گرم پانی اور پیپ، اسے پکھو۔

وَأَخْرَجْنَا مِنْ شَجَلَةٍ أَسْوَجٍ ۝

هَذَا قَوْمٌ مُّتَنَبِّهُونَ مَعْلَمَةٌ لِّمَرْحَبَائِهِمْ إِنَّهُمْ صَالُوا النَّارَ ۝

اس کے علاوہ اور طرح طرح کے عذاب۔^(۱) (۵۸)

یہ ایک قوم ہے جو تمہارے ساتھ (آگ میں) جانے والی ہے،^(۲) کوئی خوش آمدید ان کے لیے نہیں ہے^(۳) یہی تو جہنم میں جانے والے ہیں۔^(۴) (۵۹)

وہ کہیں گے بلکہ تم ہی ہو جن کے لیے کوئی خوش آمدید نہیں ہے تم ہی نے تو اسے پہلے ہی سے ہمارے سامنے لا رکھا تھا،^(۵) پس رہنے کی بڑی بری جگہ ہے۔^(۶)

وہ کہیں گے اے ہمارے رب! جس نے (کفری رسم) ہمارے لیے پہلے سے نکالی ہو^(۱) اس کے حق میں جہنم کی دگنی سزا کر دے۔^(۲)

اور جہنمی کہیں گے کیا بات ہے کہ وہ لوگ ہمیں دکھائی نہیں

قَالُوا بَلْ أَنْتُمْ لَأَمْرَجَائِكُمْ أَنْتُمْ قَدْ مَاتُمْوه لَنَا فَيَسِّرْ
الْقَارِئَ ۝

قَالُوا رَبَّنَا مَنْ كَذَّبَ لَنَا هَذَا فِرْزُهُ عَذَابًا يُصْعَقَانِي النَّارَ ۝

وَقَالُوا مَا لَنَا لَكَ تَرَى رِجَالًا كَانُوا نَعُدُّهُمْ مِنَ الْأَشْرَارِ ۝

حَمِيمٌ، گرم کھولتا ہو پانی، جو ان کی آنتوں کو کاٹ ڈالے گا۔ غَسَّاقٌ، جہنمیوں کی کھالوں سے جو پیپ اور گند ابو نکلے گا۔ یا سخت ٹھنڈا پانی، جس کا پینا نہایت مشکل ہو گا۔

(۱) شَجَلَةٍ اس جیسے اَزْوَاجِ انواع و اقسام یعنی حمیم و غساق جیسے اور بہت سی قسم کے دوسرے عذاب ہوں گے۔
(۲) جہنم کے دروازوں پر کھڑے فرشتے، ائمہ کفر اور پیشوایان ضلالت سے کہیں گے، جب پیروکار قسم کے کافر جہنم میں جائیں گے۔ یا ائمہ کفر و ضلالت آپس میں یہ بات، پیروکاروں کی طرف اشارہ کر کے کہیں گے۔

(۳) یہ لیڈر، جہنم میں داخل ہونے والے کافروں کے لیے، فرشتوں کے جواب میں یا آپس میں کہیں گے۔ رَحْبَةٌ معنی وسعت و فراخی کے ہیں۔ مرحبا یہ کَلِمَةٌ تَرْحِيبٌ یعنی خیر مقدمی الفاظ ہیں جو آنے والے مہمان کے استقبال کے وقت کہے جاتے ہیں۔ لَا مَرْحَبًا اس کے برعکس ہے۔

(۴) یہ ان کا خیر مقدم نہ کرنے کی علت ہے۔ یعنی ان کے اور ہمارے مابین کوئی وجہ امتیاز نہیں ہے، یہ بھی ہماری طرح جہنم میں داخل ہو رہے ہیں اور جس طرح ہم عذاب کے مستحق ٹھہرے ہیں، یہ بھی عذاب جہنم کے مستحق قرار پائے ہیں۔

(۵) یعنی تم ہی کفر و ضلالت کے راستے کو ہمارے سامنے مزین کر کے پیش کرتے تھے، یوں گویا اس عذاب جہنم کے پیش کار تو تم ہی ہو۔ یہ پیروکار، اپنے مقتداؤں کو کہیں گے۔

(۶) یعنی جنہوں نے ہمیں کفر کی دعوت دی اور اسے حق و صواب باور کرایا۔ یا جنہوں نے ہمیں کفر کی طرف بلا کر ہمارے لیے یہ عذاب آگے بھیجا۔

(۷) یہ وہی بات ہے جسے اور بھی کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورة الأعراف، ۳۸، سورة الأخراب، ۶۸۔

دیتے جنہیں ہم برے لوگوں میں شمار کرتے تھے۔^(۱) (۶۲)
 کیا ہم نے ہی ان کا مذاق بنا رکھا تھا^(۲) یا ہماری نگاہیں ان
 سے ہٹ گئی ہیں۔^(۳) (۶۳)
 یقین جانو کہ دو زینوں کا یہ جھگڑا ضرور ہی ہو گا۔^(۴) (۶۴)
 کہہ دیجئے! کہ میں تو صرف خبردار کرنے والا ہوں^(۵) اور
 بجز اللہ واحد غالب کے اور کوئی لائق عبادت نہیں۔ (۶۵)
 جو پروردگار ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے
 درمیان ہے، وہ زبردست اور بڑا بخشنے والا ہے۔ (۶۶)
 آپ کہہ دیجئے کہ یہ بہت بڑی خبر ہے۔^(۶) (۶۷)
 جس سے تم بے پروا ہو رہے ہو۔ (۶۸)
 مجھے ان بلند قدر فرشتوں کی (بات چیت کا) کوئی علم ہی
 نہیں جبکہ وہ تکرار کر رہے تھے۔^(۷) (۶۹)
 میری طرف فقط یہی وحی کی جاتی ہے کہ میں تو صاف
 صاف آگاہ کر دینے والا ہوں۔^(۸) (۷۰)

أَفَنذَرْتُهُمْ بَعْضَ يَوْمٍ زَلَمْتُمْ لَهُمْ الْكُفْرَانَ ۝
 إِنَّ ذَلِكَ لَحَقٌّ تَخَافُ أَهْلَ النَّارِ ۝
 قُلْ إِنَّمَا أَنَا مُنذِرٌ وَمَنْ يُلَاقِ الْوِلْدَانَ اللَّهُ
 الْوَالِدَ الْقَهَّارَ ۝
 رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ ۝
 قُلْ هُوَ تَبَوُّعُ عِظْمِهِ ۝
 أَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ ۝
 مَا كَانَ لِي مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَائِكَةِ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ۝
 إِنَّ يَوْمَئِذٍ لِيَ الْآلَاءُ كَمَا أَنْزَلْنَا يُرْمِيُونَ ۝

(۱) اَشْرَازَ سے مراد فقراء مومنین ہیں۔ جیسے عمار، خباب، صہب، بلال و سلمان وغیرہم۔ رضی اللہ عنہم، انہیں رؤسائے
 مکہ ازراہ خبث ”برے لوگ“ کہتے تھے اور اب بھی اہل باطل حق پر چلنے والوں کو بنیاد پرست، دہشت گرد، انتہا پسند
 وغیرہ القاب سے نوازتے ہیں۔

(۲) یعنی دنیا میں، جہاں ہم غلطی پر تھے؟

(۳) یا وہ بھی ہمارے ساتھ ہی ہمیں کہیں ہیں، ہماری نظریں انہیں نہیں دیکھ پارہی ہیں؟

(۴) یعنی آپس میں ان کی تکرار اور ایک دوسرے کو مورد طعن بنانا، ایک ایسی حقیقت ہے، جس میں تخلف نہیں ہو گا۔

(۵) یعنی جو تم گمان کرتے ہو، میں وہ نہیں ہوں بلکہ تمہیں اللہ کے عذاب اور اس کے عتاب سے ڈرانے والا ہوں۔

(۶) یعنی میں تمہیں جس عذاب اخروی سے ڈرا رہا اور توحید کی دعوت دے رہا ہوں یہ بڑی خبر ہے، جس سے اعراض و
 غفلت نہ برتو، بلکہ اس پر توجہ دینے اور سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(۷) ملا اعلیٰ سے مراد فرشتے ہیں، یعنی وہ کس بات پر بحث کر رہے ہیں؟ میں نہیں جانتا۔ ممکن ہے، اس اختصام (بحث و
 تکرار) سے مراد وہ گفتگو ہو جو تخلیق آدم علیہ السلام کے وقت ہوئی۔ جیسا کہ آگے اس کا ذکر آ رہا ہے۔

(۸) یعنی میری ذمہ داری یہی ہے کہ میں وہ فرائض و سنن تمہیں بتا دوں جن کے اختیار کرنے سے تم عذاب الہی سے

جبکہ آپ کے رب نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا (۱) کہ میں مٹی سے انسان کو پیدا کرنے والا ہوں۔ (۷۱)
 سو جب میں اسے ٹھیک ٹھاک کر لوں (۳) اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، (۴) تو تم سب اس کے سامنے سجدے میں گر پڑنا۔ (۵) (۷۲)
 چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ (۶) (۷۳)

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝۱

فَاِذَا سَوَّيْتُهُ وَكُنَّتُ فِيْهِ مِنْ رُّوحِيْ فَسَعُوْا لَهٗ لِيَّسِدْنَ ۝۲

فَسَجَدَ الْمَلٰئِكَةُ كُلُّهُمْ اٰمِعُوْنَ ۝۳

بیچ جاؤ گے اور ان محرمات و معاصی کی وضاحت کر دوں جن کے اجتناب سے تم رضائے الہی کے اور بصورت دیگر اس کے غضب و عقاب کے مستحق قرار پاؤ گے۔ یہی وہ انذار ہے جس کی وحی میری طرف کی جاتی ہے۔

(۱) یہ قصہ اس سے قبل سورہ بقرہ، سورہ اعراف، سورہ حجر، سورہ بنی اسرائیل اور سورہ کہف میں بیان ہو چکا ہے۔ اب اسے یہاں بھی اجمالاً بیان کیا جا رہا ہے۔

(۲) یعنی ایک جسم، جنس بشر سے بنانے والا ہوں۔ انسان کو بشر زمین سے اس کی مباشرت کی وجہ سے کہا۔ یعنی زمین سے ہی اس کی ساری وابستگی ہے اور وہ سب کچھ اسی زمین پر کرتا ہے۔ یا اس لیے کہ وہ بادی البشر ہے۔ یعنی اس کا جسم یا چہرہ ظاہر ہے۔

(۳) یعنی اسے انسانی پیکر میں ڈھال لوں اور اس کے تمام اجزا درست اور برابر کر لوں۔

(۴) یعنی وہ روح، جس کا میں ہی مالک ہوں، میرے سوا اس کا کوئی اختیار نہیں رکھتا اور جس کے پھونکتے ہی یہ پیکر خاکی، زندگی، حرکت اور توانائی سے بہرہ یاب ہو جائے گا۔ انسان کے شرف و عظمت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اس میں وہ روح پھونکی گئی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی روح قرار دیا ہے۔

(۵) یہ سجدہ تحیہ یا سجدہ تعظیم ہے، سجدہ عبادت نہیں۔ یہ تعظیمی سجدہ پہلے جائز تھا، اسی لیے اللہ نے آدم علیہ السلام کے لیے فرشتوں کو اس کا حکم دیا۔ اب اسلام میں تعظیمی سجدہ بھی کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ حدیث میں آتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر یہ جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاندان کو سجدہ کرے۔ (مشکوٰۃ، کتاب النکاح،

باب عشرة النساء، بحوالہ ترمذی وقال الألبانی، وهو حدیث صحیح لشواہده)

(۶) یہ انسان کا دوسرا شرف ہے کہ اسے مسجود ملائک بنایا۔ یعنی فرشتے جیسی مقدس مخلوق نے اسے تعظیماً سجدہ کیا۔ کُلُّهُمْ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک فرشتہ بھی سجدہ کرنے میں پیچھے نہیں رہا۔ اس کے بعد اَجْمَعُوْنَ کہہ کر یہ واضح کر دیا کہ سجدہ بھی سب نے بیک وقت ہی کیا۔ مختلف اوقات میں نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ تاکید در تاکید تعظیم میں مبالغے کے لیے ہے۔ (فتح القدر)

إِلَّا إِبْلِيسَ اسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿۷۳﴾

قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ

أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ ﴿۷۴﴾

قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ

مِنْ طِينٍ ﴿۷۵﴾

قَالَ فَارْجِعْ إِلَىٰ آيَاتِكَ فَجِدْ

وَرَانَ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ﴿۷۶﴾

قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿۷۷﴾

قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ﴿۷۸﴾

إِلَىٰ يَوْمِ الْوَعْتِ الْمَعْلُومِ ﴿۷۹﴾

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لأُخَوِّبَهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۸۰﴾

مگر ابلیس نے (نہ کیا) اس نے تکبر کیا (۱) اور وہ تھا کافروں میں سے۔ (۷۳)

(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا اے ابلیس! تجھے اسے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا۔ (۳) کیا تو کچھ گھمنڈ میں آگیا ہے؟ یا تو بڑے درجے والوں میں سے ہے۔ (۷۵)

اس نے جواب دیا کہ میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے بنایا، اور اسے مٹی سے بنایا ہے۔ (۷۶)

ارشاد ہوا کہ تو یہاں سے نکل جا تو مردود ہوا۔ (۷۷) اور تجھ پر قیامت کے دن تک میری لعنت پھینکا رہے۔ (۷۸) کہنے لگا میرے رب مجھے لوگوں کے اٹھ کھڑے ہونے کے دن تک مہلت دے۔ (۷۹)

(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا تو مہلت والوں میں سے ہے۔ (۸۰) متعین وقت کے دن تک۔ (۸۱)

کہنے لگا پھر تو تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو یقیناً بربک

(۱) اگر ابلیس کو صفات ملائکہ سے متصف مانا جائے تو یہ استثنا متصل ہو گا یعنی ابلیس اس حکم سجدہ میں داخل ہو گا، بصورت دیگر یہ استثنا منقطع ہے یعنی وہ اس حکم میں داخل نہیں تھا لیکن آسمان پر رہنے کی وجہ سے اسے بھی حکم دیا گیا۔ مگر اس نے تکبر کی وجہ سے انکار کر دیا۔

(۲) یہ کان صَآرَ کے معنی میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت اور اس کی اطاعت سے استکبار کی وجہ سے وہ کافر ہو گیا۔ یا اللہ کے علم میں وہ کافر تھا۔

(۳) یہ بھی انسان کے شرف و عظمت کے اظہار ہی کے لیے فرمایا، ورنہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے۔

(۴) یعنی شیطان نے اپنے زعم فاسد میں یہ سمجھا کہ آگ کا عنصر مٹی کے عنصر سے بہتر ہے۔ حالانکہ یہ سب جو اہر متجانس (ہم جنس یا قریب قریب ایک درجے میں) ہیں۔ ان میں سے کسی کو، دوسرے پر شرف کسی عارض (خارجی سبب) ہی کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اور یہ عارض، آگ کے مقابلے میں، مٹی کے حصے میں آیا، کہ اللہ نے اسی سے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے بنایا، پھر اس میں اپنی روح پھونکی۔ اس لحاظ سے مٹی ہی کو آگ کے مقابلے میں شرف و عظمت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں آگ کا کام جلا کر خاستہ کر دینا ہے، جب کہ مٹی اس کے برعکس انواع و اقسام کی پیداوار کا مأخذ ہے۔

دوں گ۔ (۸۲)

بجز تیرے ان بندوں کے جو چیدہ اور پسندیدہ ہوں۔ (۸۳)

فرمایا سچ تو یہ ہے، اور میں سچ ہی کہا کرتا ہوں۔ (۸۳)

کہ تجھ سے اور تیرے تمام ماننے والوں سے میں (بھی)

جنم کو بھر دوں گ۔ (۸۵)

کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی بدلہ طلب نہیں کرتا^(۱)

اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں۔^(۲) (۸۶)

یہ تو تمام جہان والوں کے لیے سراسر نصیحت (و عبرت)

ہے۔^(۳) (۸۷)

یقیناً تم اس کی حقیقت کو کچھ ہی وقت کے بعد (صحیح طور

پر) جان لو گے۔^(۴) (۸۸)

إِلْعِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ ﴿۸۲﴾

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقُّ أَقْوَلُ ﴿۸۳﴾

لَا مَكْتَبَ لِي جَهَنَّمَ وَمَنْكَ وَمِمَّنْ يَبْعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۸۵﴾

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ ﴿۸۶﴾

إِنَّ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ﴿۸۷﴾

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ ﴿۸۸﴾

(۱) یعنی اس دعوت و تبلیغ سے میرا مقصد صرف امتثال امر الہی ہے؛ دنیا کمانا نہیں۔

(۲) یعنی اپنی طرف سے گھڑ کر اللہ کی طرف ایسی بات منسوب کر دوں جو اس نے نہ کہی ہو یا میں تمہیں ایسی بات کی طرف

دعوت دوں جس کا حکم اللہ نے مجھے نہ دیا ہو۔ بلکہ کوئی کمی بیشی کیے بغیر میں اللہ کے احکام تم تک پہنچا رہا ہوں۔ حضرت عبد اللہ

ابن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے تھے، جس کو کسی بات کا علم نہ ہو، اس کی بابت اسے کہہ دینا چاہیے، اللہ اعلم یہ کتنا بھی علم ہی ہے، اس

لیے کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو کہا، فرمادیجئے ﴿وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ﴾ (ابن کثیر) علاوہ ازیں اس سے عام معاملات زندگی میں بھی

تکلف و تصنع سے اجتناب کا حکم معلوم ہوتا ہے۔ جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (نُهِنَا عَنِ التَّكَلُّفِ). (صحیح

بخاری۔ نمبر ۷۲۹۳) ”ہمیں تکلف سے منع کیا گیا ہے“ حضرت سلیمان رضی اللہ عنہما کہتے ہیں (نَهَانَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

وَسَلَّمَ أَنْ نَتَكَلَّفَ لِلضَّنْبِ). (صحیح الجامع الصغیر للألبانی ۱۹۸۱) ”ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

مہمان کے لیے تکلف کرنے سے منع فرمایا ہے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ لباس، خوراک، رہائش اور دیگر معاملات میں تکلفات،

جو آج کل معیار زندگی بلند کرنے کے عنوان سے، اصحاب حیثیت کا شعار اور وطن و بن چکا ہے، اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

اسلام میں سادگی اور بے تکلفی اختیار کرنے کی تلقین و ترغیب ہے۔

(۳) یعنی یہ قرآن، یا وحی یا وہ دعوت، جو میں پیش کر رہا ہوں، دنیا بھر کے انسانوں اور جنات کے لیے نصیحت ہے۔

بشرطیکہ کوئی اس سے نصیحت حاصل کرنے کا قصد کرے۔

(۴) یعنی قرآن نے جن چیزوں کو بیان کیا ہے، جو وعدے و وعید ذکر کیے ہیں، ان کی حقیقت و صداقت بہت جلد تمہارے سامنے

سورۂ زممر کی ہے اور اس میں پچھتر آیتیں اور
آٹھ رکوع ہیں۔



شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اس کتاب کا اتارنا اللہ تعالیٰ غالب با حکمت کی طرف سے
ہے۔ (۱)

تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ۝

یقیناً ہم نے اس کتاب کو آپ کی طرف حق کے ساتھ^(۱)
نازل فرمایا ہے پس آپ اللہ ہی کی عبادت کریں، اسی کے
لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔^(۲) (۲)

اِنَّا اَنْزَلْنَا لَكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا
لِّهٖ الدِّیْنَ ۝

خبردار! اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خالص عبادت کرنا ہے^(۳) اور
جن لوگوں نے اس کے سوا اولیا بنا رکھے ہیں (اور کہتے ہیں)
کہ ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ
(بزرگ) اللہ کی نزدیکی کے مرتبہ تک ہماری رسائی کرا

اَللّٰهُ الَّذِیْنَ الْمُخْلِصُوْنَ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖ اَوْلِیَآءَ
مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰی اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ

آجائے گی۔ چنانچہ اس کی صداقت یوم بدر کو واضح ہوئی، فتح مکہ کے دن ہوئی یا پھر موت کے وقت تو سب پر ہی واضح ہو جاتی ہے۔

☆ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ زممر کی تلاوت فرماتے
تھے۔ (صحیحہ الألبانی فی صحیحہ الترمذی)

(۱) یعنی اس میں توحید و رسالت، معاد اور احکام و فرائض کا جو اثبات کیا گیا ہے، وہ سب حق ہے اور انہی کے ماننے اور
اختیار کرنے میں انسان کی نجات ہے۔

(۲) دین کے معنی یہاں عبادت اور اطاعت کے ہیں اور اخلاص کا مطلب ہے صرف اللہ کی رضا کی نیت سے نیک عمل
کرنا۔ آیت 'نیت کے وجود اور اس کے اخلاص پر دلیل ہے۔ حدیث میں بھی اخلاص نیت کی اہمیت یہ کہہ کر واضح کر
دی گئی ہے کہ 'اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ' "عملوں کا دار و مدار نیتوں پر ہے" یعنی جو عمل خیر اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے
گا، (بشرطیکہ وہ سنت کے مطابق ہو) وہ مقبول اور جس عمل میں کسی اور جذبے کی آمیزش ہوگی، وہ نامقبول ہوگا۔

(۳) یہ اسی اخلاص عبادت کی تاکید ہے جس کا حکم اس سے پہلی آیت میں ہے کہ عبادت و اطاعت صرف ایک اللہ ہی کا
حق ہے، نہ اس کی عبادت میں کسی کو شریک کرنا جائز ہے۔ نہ اطاعت ہی کا اس کے علاوہ کوئی حق دار ہے۔ البتہ رسول
ﷺ کی اطاعت کو چونکہ خود اللہ نے اپنی ہی اطاعت قرار دیا ہے اس لیے رسول ﷺ کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت

دیں،^(۱) یہ لوگ جس بارے میں اختلاف کر رہے ہیں اس کا (سچا) فیصلہ اللہ (خود) کرے گا۔^(۲) جھوٹے اور ناشکرے (لوگوں) کو اللہ تعالیٰ راہ نہیں دکھاتا۔^(۳)

اگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ اولاد ہی کا ہوتا تو اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا جن لیتا۔ (لیکن) وہ تو پاک ہے، وہ^(۴) وہی اللہ تعالیٰ ہے یگانہ اور قوت والا۔^(۵)

نہایت اچھی تدبیر سے اس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر پلٹ دیتا ہے^(۵) اور

يَبْتِئُهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ وَيَخْتَلِفُونَ ذَٰلِكَ إِنَّ اللَّهَ لَكَنُهَا يُؤْتِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ ﴿۱﴾

لَوْ أَرَادَ اللَّهُ أَنْ يَخْلُقَ وَلَدًا لَأَصْطَفَىٰ مِنْ بَيْنِ مَنْ خَلَقَ مَا يَشَاءُ ۗ سُبْحٰنَهُ هُوَ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۲﴾

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يَكُوِّرُ اَلْيَلِ عَلَى الْنَهَارِ

ہے، کسی غیر کی نہیں۔ تاہم عبادت میں یہ بات بھی نہیں۔ اس لیے عبادت اللہ کے سوا، کسی بڑے سے بڑے رسول کی بھی جائز نہیں ہے۔ چہ جائیکہ عام افراد و اشخاص کی، جنہیں لوگوں نے اپنے طور پر خدائی اختیارات کا حامل قرار دے رکھا ہے۔ ﴿مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ﴾ اللہ کی طرف سے اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۱) اس سے واضح ہے کہ مشرکین مکہ اللہ تعالیٰ ہی کو خالق، رازق اور مدبر کائنات مانتے تھے۔ پھر وہ دوسروں کی عبادت کیوں کرتے تھے؟ اس کا جواب وہ یہ دیتے تھے جو قرآن نے یہاں نقل کیا ہے کہ شاید ان کے ذریعے سے ہمیں اللہ کا قرب حاصل ہو جائے یا اللہ کے ہاں یہ ہماری سفارش کر دیں۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا۔ ﴿هُؤٰلَاءِ شَمَعَاؤُنَا عِندَ اللّٰهِ﴾ (یونس: ۱۸) ”یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔“

(۲) کیوں کہ دنیا میں تو کوئی بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ وہ شرک کا ارتکاب کر رہا ہے یا وہ حق پر نہیں ہے۔ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ ہی فیصلہ فرمائے گا اور اس کے مطابق جزا و سزا دے گا۔

(۳) یہ جھوٹ ہی ہے کہ ان معبودان باطلہ کے ذریعے سے ان کی اللہ تک رسائی ہو جائے گی یا یہ ان کی سفارش کریں گے اور اللہ کو چھوڑ کر بے اختیار لوگوں کو معبود سمجھنا بھی بہت بڑی ناشکری ہے۔ ایسے جھوٹوں اور ناشکروں کو ہدایت کس طرح نصیب ہو سکتی ہے؟

(۴) یعنی پھر اس کی اولاد لڑکیاں ہی کیوں ہوتیں؟ جس طرح کہ مشرکین کا عقیدہ تھا۔ بلکہ وہ اپنی مخلوق میں سے جس کو پسند کرتا، وہ اس کی اولاد ہوتی، نہ کہ وہ جن کو وہ باور کراتے ہیں، لیکن وہ تو اس نقص سے ہی پاک ہے۔ (ابن کثیر)

(۵) نَکُوْرُوْا کے معنی ہیں ایک چیز کو دوسری چیز پر پلٹ دینا، رات کو دن پر پلٹ دینے کا مطلب، رات کا دن کو ڈھانپنا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی روشنی ختم ہو جائے اور دن کو رات پر پلٹ دینے کا مطلب، دن کا رات کو ڈھانپنا ہے حتیٰ کہ اس کی تاریکی ختم ہو جائے۔ یہ وہی مطلب ہے جو ﴿يُغْشِي الْاٰیٰتِ الْقَهَّارِ﴾ (الأعراف: ۵۲) کا ہے۔

اس نے سورج چاند کو کام پر لگا رکھا ہے۔ ہر ایک مقررہ مدت تک چل رہا ہے یقین مانو کہ وہی زبردست اور گناہوں کا بخشنے والا ہے۔ (۵)

اس نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے، (۱) پھر اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا (۲) اور تمہارے لیے چوپایوں میں سے (آٹھ ز و مادہ) اتارے (۳) وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں ایک بناوٹ کے بعد دوسری بناوٹ پر بناتا (۴) ہے تین تین اندھیروں (۵) میں، یہی اللہ تعالیٰ تمہارا رب ہے اسی کے لیے بادشاہت ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر تم کہاں بہک رہے ہو۔ (۶) (۱)

اگر تم ناشکری کرو تو (یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ تم (سب سے) بے نیاز ہے، (۷) اور وہ اپنے بندوں کی ناشکری سے خوش

وَيُكْوِذُ الظَّالِمِينَ عَلَى الْبَيْتِ وَالصَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ وَالْعَمَلِ وَالْجَبَلِ
لِأَجْلِ سَمْعِي آلَهِ الْعَزِيزِ الْعَقَّارُ ۝

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمَجَعَلْ مِنْهَا زُجُجًا وَأَنْزَلَ لَكُمْ
مِنْهَا الْأَنْعَامَ كُنُيَةً أَزْوَاجًا لِتَعْلَمُوا فِي بَنَاتِهِنَّ مَا كُنَّ
بِعَدِّ خَلْقِنَ فِي ظُلْمَتٍ نَكْتَةٍ ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمُ لَهُ الْمُلْكُ لَا إِلَهَ إِلَّا
هُوَ قَاتِي نَصْرُونَ ۝

إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ عَنِي وَعَنْكُمْ وَلَا يَرْضَى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ

(۱) یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے، جن کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا اور اپنی طرف سے اس میں روح پھونکی تھی۔
(۲) یعنی حضرت حوا کو حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پبلی سے پیدا فرمایا اور یہ بھی اس کا کمال قدرت ہے کیونکہ حضرت حوا کے علاوہ کسی بھی عورت کی تخلیق، کسی آدمی کی پبلی سے نہیں ہوئی۔ یوں یہ تخلیق امر عادی کے خلاف اور اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے۔

(۳) یہ وہی چار قسم کے جانوروں کا بیان ہے بھیڑ، بکری، اونٹ، گائے، جو زور و مادہ مل کر آٹھ ہو جاتے ہیں، جن کا ذکر سورہ انعام، آیت ۱۴۳، ۱۴۴ میں گزر چکا ہے۔ أَنْزَلَ بِمَعْنَى خَلَقَ ہے یا ایک روایت کے مطابق، پہلے اللہ نے انہیں جنت میں پیدا فرمایا اور پھر انہیں نازل کیا، پس یہ انزال حقیقی ہو گا۔ یا أَنْزَلَ کا اطلاق مجازاً ہے اس لیے کہ یہ جانور چارے کے بغیر نہیں رہ سکتے اور چارہ کی روئیدگی کے لیے پانی ناگزیر ہے۔ جو آسمان سے ہی بارش کے ذریعے سے اترتا ہے۔ یوں گویا یہ چوپائے آسمان سے اتارے ہوئے ہیں، (فتح القدیر)

(۴) یعنی رحم مادر میں مختلف اطوار سے گزارتا ہے، پہلے نطفہ، پھر عَلَقَةٌ، پھر مُضْغَةٌ، پھر پھڑپھڑیوں کا ڈھانچہ، جس کے اوپر گوشت کا لباس۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد انسان کامل تیار ہوتا ہے۔

(۵) ایک ماں کے پیٹ کا اندھیرا، دوسرا رحم مادر کا اندھیرا اور تیسرا شہد کا اندھیرا، وہ جہلی یا پردہ جس کے اندر بچہ پلٹا ہوا ہوتا ہے۔

(۶) یا کیوں تم حق سے باطل کی طرف اور ہدایت سے گمراہی کی طرف پھر رہے ہو؟

(۷) اس کی تشریح کے لیے دیکھئے سورہ ابراہیم آیت ۸ کا حاشیہ۔

نہیں اور اگر تم شکر کرو تو وہ اسے تمہارے لیے پسند کرے گا۔^(۱) اور کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا پھر تم سب کا لوٹنا تمہارے رب ہی کی طرف ہے۔ تمہیں وہ بتلا دے گا جو تم کرتے تھے۔ یقیناً وہ دلوں تک کی باتوں کا واقف ہے۔ (۷)

اور انسان کو جب کبھی کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ خوب رجوع ہو کر اپنے رب کو پکارتا ہے، پھر جب اللہ تعالیٰ اسے اپنے پاس سے نعت عطا فرمادیتا ہے تو وہ اس سے پہلے جو دعا کرتا تھا اسے (بالکل) بھول جاتا ہے^(۲) اور اللہ تعالیٰ کے شریک مقرر کرنے لگتا ہے جس سے (اوروں کو بھی) اس کی راہ سے بہکائے، آپ کہہ دیجئے! کہ اپنے کفر کا فائدہ کچھ دن اور اٹھا لو، (آخر) تو دوزخیوں میں ہونے والا ہے۔ (۸)

بھلا جو شخص راتوں کے اوقات سجدے اور قیام کی حالت میں (عبادت میں) گزارتا ہو، آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا^(۳) ہو، (اور جو اس

وَلَنْ تَشْكُرُوا بِرِضَاكُمْ لَكُمْ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۗ ثُمَّ إِلَهُ رَبِّكُمْ فَأَعْبُدُوهُمَ كَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِنْهُ لَمْ يَقُلْ مَا كَانُ يُدْعُوهُ إِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ ۚ وَجَعَلْ لِلَّهِ آذَانَ الْيَاسْرِ ۚ عَنْ سَبِيلِهِ قُلْ تَمَتَّعُوا بِالْكَفَرِ كَمَا قَلِيلًا ۚ إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ ۝

أَمَّنْ هُوَ قَوْلُكَ إِنَّا أَنَا الْبَيْتُ سَاجِدٌ أَوْ قَالِمَا يَجِدُرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُوا رَحْمَةً رَبِّهِ ۚ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

(۱) یعنی کفر اگرچہ انسان اللہ کی مشیت ہی سے کرتا ہے، کیونکہ اس کی مشیت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا نہ ہی ہو سکتا ہے۔ تاہم کفر کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔ اس کی رضا حاصل کرنے کا راستہ تو شکر ہی کا راستہ ہے نہ کہ کفر کا۔ یعنی اس کی مشیت اور چیز ہے اور اس کی رضا اور چیز ہے، جیسا کہ پہلے بھی اس نکتے کی وضاحت بعض مقامات پر کی جا چکی ہے۔ دیکھئے صفحہ ۱۰۹۔

(۲) یا اس تکلیف کو بھول جاتا ہے جس کو دوسرے کرنے کے لیے وہ دوسروں کو چھوڑ کر، اللہ سے دعا کرتا تھا یا اس رب کو بھول جاتا ہے، جسے وہ پکارتا تھا اور اس کے سامنے تضرع کرتا تھا، اور پھر شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

(۳) مطلب یہ ہے کہ ایک یہ کافر و مشرک ہے جس کا یہ حال ہے جو ابھی مذکور ہوا اور دوسرا وہ شخص ہے جو تنگی اور خوشی میں، رات کی گھڑیاں اللہ کے سامنے عاجزی اور فرماں برداری کا اظہار کرتے ہوئے، سجدہ و قیام میں گزارتا ہے۔ آخرت کا خوف بھی اس کے دل میں ہے اور رب کی رحمت کا امیدوار بھی ہے۔ یعنی خوف و رجاء دونوں کیفیتوں سے وہ سرشار ہے، جو اصل ایمان ہے۔ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ نہیں، یقیناً نہیں۔ خوف و رجاء کے بارے میں حدیث ہے،

وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَخْذَعُونَ أَوْلِيَاءَ الْأَعْمَى ۝

کے برعکس ہو برابر ہو سکتے ہیں) بتاؤ تو علم والے اور بے علم کیا برابر کے ہیں؟^(۱) یقیناً نصیحت وہی حاصل کرتے ہیں جو عقلمند ہوں۔ (اپنے رب کی طرف سے)^(۲) (۹)

کہہ دو کہ اے میرے ایمان والے بندو! اپنے رب سے ڈرتے رہو،^(۳) جو اس دنیا میں نیکی کرتے ہیں ان کے لیے نیک بدلہ ہے^(۴) اور اللہ تعالیٰ کی زمین بہت کشادہ ہے^(۵) صبر کرنے والوں ہی کو ان کا پورا پورا بے شمار اجر

قُلْ يُعْبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِينَ أَحْسَبُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَأَرْضَ اللَّهِ وَاسِعَةٌ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرِينَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے پاس گئے جب کہ اس پر سکرات الموت کی کیفیت طاری تھی، آپ ﷺ نے اس سے پوچھا ”تو اپنے آپ کو کیسے پاتا ہے؟“ اس نے کہا ”میں اللہ سے امید رکھتا ہوں اور اپنے گناہوں کی وجہ سے ڈرتا بھی ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اس موقع پر جس بندے کے دل میں یہ دونوں باتیں جمع ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اسے وہ چیز عطا فرمادیتا ہے جس کی وہ امید رکھتا ہے اور اس سے اسے بچا لیتا ہے جس سے وہ ڈرتا ہے۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب ذکر الموت والاستعداد لہ)

(۱) یعنی وہ جو جانتے ہیں کہ اللہ نے ثواب و عقاب کا جو وعدہ کیا ہے، وہ حق ہے اور وہ جو اس بات کو نہیں جانتے۔ یہ دونوں برابر نہیں۔ ایک عالم ہے اور ایک جاہل۔ جس طرح علم و جبل میں فرق ہے، اسی طرح عالم و جاہل برابر نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عالم و غیر عالم کی مثال سے یہ سمجھانا مقصود ہو کہ جس طرح یہ دونوں برابر نہیں، اللہ کا فرماں بردار اور اس کا نافرمان، دونوں برابر نہیں۔ بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ عالم سے مراد وہ شخص ہے جو علم کے مطابق عمل بھی کرتا ہے۔ کیوں کہ وہی علم سے فائدہ حاصل کرنے والا ہے اور جو عمل نہیں کرتا وہ گویا ایسے ہی ہے کہ اسے علم ہی نہیں ہے۔ اس اعتبار سے یہ عالم اور غیر عالم کی مثال ہے کہ یہ دونوں برابر نہیں۔

(۲) اور یہ اہل ایمان ہی ہیں، نہ کہ کفار۔ گو وہ اپنے آپ کو صاحب دانش و بصیرت ہی سمجھتے ہوں۔ لیکن جب وہ اپنی عقل و دانش کو استعمال کر کے غور و تدبر ہی نہیں کرتے اور عبرت و نصیحت ہی حاصل نہیں کرتے تو ایسے ہی ہے گویا وہ چوپایوں کی طرح عقل و دانش سے محروم ہیں۔

(۳) اس کی اطاعت کر کے، معاصی سے اجتناب کر کے اور عبادت و اطاعت کو اس کے لیے خالص کر کے۔

(۴) یہ تقویٰ کے فوائد ہیں۔ نیک بدلے سے مراد جنت اور اس کی ابدی نعمتیں ہیں۔ بعض فی ہذہ الدنیا کو حسنۃ سے متعلق مان کر ترجمہ کرتے ہیں ”جو نیکی کرتے ہیں، ان کے لیے دنیا میں نیک بدلہ ہے“ یعنی اللہ انہیں دنیا میں صحت و عافیت، کامیابی اور نغمیت وغیرہ عطا فرماتا ہے۔ لیکن پہلا مفہوم ہی زیادہ صحیح ہے۔

(۵) یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اگر اپنے وطن میں ایمان و تقویٰ پر عمل مشکل ہو، تو وہاں رہنا پسندیدہ نہیں، بلکہ

دیا جاتا ہے۔^(۱۰)

آپ کہہ دیجئے! کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کروں کہ اسی کے لیے عبادت کو خالص کر لوں۔^(۱۱)

اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا فرماں بردار بن جاؤں۔^(۱۲)

کہہ دیجئے! کہ مجھے تو اپنے رب کی نافرمانی کرتے ہوئے بڑے دن کے عذاب کا خوف لگتا ہے۔^(۱۳)

کہہ دیجئے! کہ میں تو خالص کر کے صرف اپنے رب ہی کی عبادت کرتا ہوں۔^(۱۴)

تم اس کے سوا جس کی چاہو عبادت کرتے رہو کہہ دیجئے! کہ حقیقی زیاں کار وہ ہیں جو اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو قیامت کے دن نقصان میں ڈال دیں گے، یاد رکھو کہ کھلم کھلا نقصان یہی ہے۔^(۱۵)

انہیں نیچے اوپر سے آگ کے (شعلے مثل) ساتباں (کے)

قُلْ إِنِّي أَمَرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ۚ

وَأَمَرْتُ لِأَنْ أَكُونَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ ۝

قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝

قُلْ اللَّهُ أَعْبَدُ مُخْلِصًا لَهُ دِينِي ۝

فَأَعْبُدُوا مَا شِئْتُمْ مِنْ دُونِهِ قُلْ إِنَّ الْخَيْرَ مِنَ الدِّينِ

حَسْرًا وَأَنْفُسُهُمْ وَآهْلِهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَلَدَلِكَ

هُوَ الْخَيْرُ مِنَ الْبَيْتِ ۝

أَلَمْ تَرَ مِنْ قَوْمِهِمْ طَلْفًا مِنْ الْتَارِ وَرِصَ عَجْوِهِمْ ظُلْمًا ذَلِكَ يُخَوِّفُ

وہاں سے ہجرت اختیار کر کے ایسے علاقے میں چلا جانا چاہیے جہاں انسان احکام الہی کے مطابق زندگی گزار سکے اور جہاں ایمان و تقویٰ کی راہ میں رکاوٹ نہ ہو۔

(۱) اسی طرح ایمان و تقویٰ کی راہ میں مشکلات بھی ناگزیر اور شہوات و لذات نفس کی قربانی بھی لا بدی ہے، جس کے لیے صبر کی ضرورت ہے۔ اس لیے صابرین کی فضیلت بھی بیان کر دی گئی ہے، کہ ان کو ان کے صبر کے بدلے میں اس طرح پورا پورا اجر دیا جائے گا کہ اسے حساب کے پیمانوں سے ناپنا ممکن ہی نہیں ہو گا۔ یعنی ان کا اجر غیر متناہی ہو گا۔ کیوں کہ جس چیز کا حساب ممکن ہو، اس کی تو ایک حد ہوتی ہے اور جس کی کوئی حد اور انتہا نہ ہو، وہ وہی ہوتی ہے جس کو شمار کرنا ممکن نہ ہو۔ صبر کی یہ وہ عظیم فضیلت ہے جو ہر مسلمان کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ جزع فرغ اور بے صبری سے نازل شدہ مصیبت ٹل نہیں جاتی، جس خیر اور فائدے سے محرومی ہو گئی ہے، وہ حاصل نہیں ہو جاتا اور جو ناگوار صورت حال پیش آچکی ہوتی ہے، اس کا ازالہ ممکن نہیں۔ جب یہ بات ہے تو انسان صبر کر کے وہ اجر عظیم کیوں نہ حاصل کرے جو صابرین کے لیے اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔

(۲) پہلا اس معنی میں کہ آباؤی دین کی مخالفت کر کے توحید کی دعوت سب سے پہلے آپ ہی نے پیش کی۔

اللَّهُ بِهِ عِبَادَةُ يُمَادٍ فَالْعَوْنُ ۝

ڈھانک رہے ہوں گے۔^(۱) یہی (عذاب) ہے جن سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈرا رہا ہے،^(۲) اے میرے بندو! پس مجھ سے ڈرتے رہو۔ (۱۶)

اور جن لوگوں نے طاغوت کی عبادت سے پرہیز کیا اور (ہمہ تن) اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے وہ خوش خبری کے مستحق ہیں، میرے بندوں کو خوشخبری سنا دیجئے۔ (۱۷) جو بات کو کان لگا کر سنتے ہیں۔ پھر جو بہترین بات ہو^(۳) اس کی اتباع کرتے ہیں۔ یہی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے اور یہی عقلمند بھی ہیں۔ (۱۸)^(۴)

بھلا جس شخص پر عذاب کی بات ثابت ہو چکی ہے،^(۵) تو کیا آپ اسے جو دوزخ میں ہے چھڑا سکتے ہیں۔ (۱۹)^(۶) ہاں وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے رہے ان کے لیے

وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الضَّلَاعَاتِ اَنْ يَّعْبُدُوَهَا وَاكَابُوا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُخْرٰى فَتَيِّبٰٓءُ ۝

الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰٓءَ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَالِدُ الْاٰتِبِ ۝

اَمَنْ سَخٰى عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ اَفَاَنْتَ تُؤْمِنُ فِي النَّارِ ۝

لٰكِن الَّذِيْنَ اتَّقَوْا لَكُمْ غُفُوٰتٌ مِّنْ قُوَّةٍ هٰذَا غُفُوٰتٌ مِّنْ يَّجُوْنِ

(۱) ظُلْمٌ، ظُلْمٌ کی جمع ہے، سایہ۔ یہاں اطباق النار مراد ہیں، یعنی ان کے اوپر نیچے آگ کے طبق ہوں گے، جو ان پر بھڑک رہے ہوں گے۔ (فتح القدر)

(۲) یعنی یہی مذکور خسران بعین اور عذاب نلال ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے تاکہ وہ اطاعت الہی کا راستہ اختیار کر کے اس انجام بد سے بچ جائیں۔

(۳) أَحْسَنُ سے مراد محکم اور پختہ بات، یا مامورات میں سے سب سے اچھی بات، یا عزیمت و رخصت میں سے عزیمت یا عقوبت کے مقابلے میں غفو و درگزر اختیار کرتے ہیں۔

(۴) کیوں کہ انہوں نے اپنی عقل سے فائدہ اٹھایا ہے، جب کہ دوسروں نے اپنی عقلوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

(۵) یعنی قضا و تقدیر کی رو سے اس کا استحقاق عذاب ثابت ہو چکا ہے، اس طرح کہ کفر و ظلم اور جرم و عدوان میں وہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا، جہاں سے اس کی واپسی ممکن نہیں رہی۔ جیسے ابو جہل اور عاص بن وائل وغیرہ اور گناہوں نے اس کو پوری طرح گھیر لیا اور وہ جنسی ہو گیا۔

(۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اس بات کی شدید خواہش رکھتے تھے کہ آپ کی قوم کے سب لوگ ایمان لے آئیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی اور آپ کو بتلایا کہ آپ کی خواہش اپنی جگہ بالکل صحیح اور بجا ہے لیکن جس پر اس کی تقدیر غالب آگئی اور اللہ کا کلمہ اس کے حق میں ثابت ہو گیا، اسے آپ جہنم کی آگ سے بچانے پر قادر نہیں ہیں۔

مِنْ هَهَذَا الْأَنْفُورِ وَعَدَا اللَّهُ لِيُخَيِّفَ اللَّهُ الْبَيْعَادَ ①

بالاخانے ہیں جن کے اوپر بھی بنے بنائے بالاخانے ہیں^(۱)
(اور ان کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔ رب کا وعدہ ہے
اور وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ ۲۰)

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی اتارتا
ہے اور اسے زمین کی سوتوں میں پھنچاتا^(۳) ہے، پھر اسی
کے ذریعہ سے مختلف قسم کی کھیتیاں اگاتا^(۴) ہے پھر وہ
خشک ہو جاتی ہیں اور آپ انہیں زرد رنگ دیکھتے ہیں پھر
انہیں ریزہ ریزہ کر دیتا^(۵) ہے، اس میں عقل مندوں کے
لیے بہت زیادہ نصیحت ہے۔^(۶) (۲۱)

الْقُرْآنَ اللَّهُ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ
لِيُخَيِّبَ بِهِ زُرْعًا فَنَحْنُ نَأْتِيهِم بِالْمُؤْتَرِ مُصَفًّوًا ثُمَّ يَجْعَلُهُ
حُطَامًا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا لِمَنْ أَلْبَابُ ②

(۱) اس کا مطلب ہے کہ جنت میں درجات ہوں گے، ایک کے اوپر ایک۔ جس طرح یہاں کثیر المنازل عمارتیں ہیں،
جنت میں بھی درجات کے حساب سے ایک دوسرے کے اوپر بالاخانے ہوں گے، جن کے درمیان سے اہل جنت کی
خواہش کے مطابق دودھ، شہد، پانی اور شراب کی نہریں چل رہی ہوں گی۔

(۲) جو اس نے اپنے مومن بندوں سے کیا ہے اور جو یقیناً پورا ہو گا، کہ اللہ سے وعدہ خلافی ممکن نہیں۔

(۳) يَنَابِيعَ، يَنْبُوعُ کی جمع ہے، سوتے، چشے، یعنی بارش کے ذریعے سے پانی آسمان سے اترتا ہے، پھر وہ زمین میں
جذب ہو جاتا ہے اور پھر چشموں کی صورت میں نکلتا ہے یا تالابوں اور نہروں میں جمع ہو جاتا ہے۔
(۴) یعنی اس پانی سے، جو ایک ہوتا ہے، انواع و اقسام کی چیزیں پیدا فرماتا ہے، جن کا رنگ، ذائقہ، خوشبو ایک دوسرے
سے مختلف ہوتی ہے۔

(۵) یعنی شادابی اور تروتازگی کے بعد وہ کھیتیاں سوکھ جاتی اور زرد ہو جاتی ہیں اور پھر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں۔ جس طرح
کڑی کی شبنیاں خشک ہو کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہیں۔

(۶) یعنی اہل دانش اس سے سمجھ لیتے ہیں کہ دنیا کی مثال بھی اسی طرح ہے، وہ بھی بہت جلد زوال و فنا سے ہم کنار ہو
جائے گی۔ اس کی رونق و بہجت، اس کی شادابی و زینت اور اس کی لذتیں اور آسائشیں عارضی ہیں، جن سے انسان کو
دل نہیں لگانا چاہیے۔ بلکہ اس موت کی تیاری میں مشغول رہنا چاہیے جس کے بعد کی زندگی دائمی ہے، جسے زوال
نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ قرآن اور اہل ایمان کے سینوں کی مثال ہے اور مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے
قرآن اتارا، جسے وہ مومنوں کے دلوں میں داخل فرماتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے دین باہر نکالتا ہے جو ایک دوسرے
سے بہتر ہوتا ہے، پس مومن تو ایمان و یقین میں زیادہ ہو جاتا ہے اور جس کے دل میں روگ ہوتا ہے، وہ اس طرح
خشک ہو جاتا ہے جس طرح کھیتی خشک ہو جاتی ہے۔ (فتح القدیر)

أَقْنَمَ سَرَّ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِنْ رَبِّهِ فَوَيْلٌ
لِلنَّبِيَّةِ قُلُوبُهُمْ مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ أُولَئِكَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿۲۲﴾

کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے پس وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک نور پر ہے (۱) اور ہلاکی ہے ان پر جن کے دل یاد الہی سے (اثر نہیں لیتے بلکہ) سخت ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ صریح گمراہی میں (بتلا) ہیں۔ (۲۲)

اللَّهُ نَزَلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَابًا فَمَتَّعْنَا بِهِ
جُلُودَ الَّذِينَ يَخْتَفُونَ رَبَّهُمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۲۳﴾
إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ ذَلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ
يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿۲۴﴾

اللہ تعالیٰ نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے جو ایسی کتاب ہے کہ آپس میں ملتی جلتی اور بار بار دہرائی ہوئی آیتوں کی ہے، (۲) جس سے ان لوگوں کے روٹنے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب کا خوف رکھتے ہیں (۳) آخر میں ان کے جسم اور دل اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف نرم ہو جاتے ہیں، (۴) یہ ہے اللہ تعالیٰ کی ہدایت جس کے ذریعہ جسے چاہے راہ راست پر لگا دیتا ہے۔ اور جسے اللہ تعالیٰ ہی راہ بھلا دے اس کا ہادی کوئی نہیں۔ (۲۳)

أَقْنَمَ يَتَّبِعِي يُوَجِّهُهُ مَوَّءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَقِيلَ
لِلظَّالِمِينَ ذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿۲۴﴾

بھلا جو شخص قیامت کے دن کے بدترین عذاب کی سپر (ڈھال) اپنے منہ کو بنائے گا۔ (ایسے) ظالموں سے کہا

(۱) یعنی جس کو قبول حق اور خیر کا راستہ اپنانے کی توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل جائے پس وہ اس شرح صدر کی وجہ سے رب کی روشنی پر ہو، کیا یہ اس جیسا ہو سکتا ہے جس کا دل اسلام کے لئے سخت اور اس کا سینہ تنگ ہو اور وہ گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹک رہا ہو۔

(۲) أَحْسَنُ الْحَدِيثِ سے مراد قرآن مجید ہے، ملتی جلتی کا مطلب، اس کے سارے حصے حسن کلام، اعجاز و بلاغت، صحت معانی وغیرہ خوبیوں میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ یا یہ بھی سابقہ کتب آسمانی سے ملتا ہے یعنی ان کے مشابہ ہے۔ مثانی، جس میں قصص و واقعات اور مواعظ و احکام کو بار بار دہرایا گیا ہے۔

(۳) کیونکہ وہ ان وعیدوں کو اور تخویف و تہدید کو سمجھتے ہیں جو نافرمانوں کے لیے اس میں ہے۔

(۴) یعنی جب اللہ کی رحمت اور اس کے لطف و کرم کی امید ان کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے تو ان کے اندر سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اللہ کے ذکر میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس میں اولیاء اللہ کی صفت بیان کی گئی ہے کہ اللہ کے خوف سے ان کے دل کانپ اٹھتے، ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں اور ان کے دلوں کو اللہ کے ذکر سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ مدہوش اور حواس باختہ ہو جائیں اور عقل و

جائے گا کہ اپنے کیے کا (وبال) چکھو۔^(۱) (۲۳)
 ان سے پہلے والوں نے بھی جھٹلایا، پھر ان پر وہاں سے
 عذاب آپڑا جہاں سے ان کو خیال بھی نہ تھا۔^(۲) (۲۵)
 اور اللہ تعالیٰ نے انہیں زندگانی دنیا میں رسوائی کا مزہ
 چکھایا^(۳) اور ابھی آخرت کا تو بڑا بھاری عذاب ہے کاش
 کہ یہ لوگ سمجھ لیں۔ (۲۶)
 اور یقیناً ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثالیں
 بیان کر دی ہیں کیا عجب کہ وہ نصیحت حاصل کر لیں۔^(۴) (۲۷)
 قرآن ہے عربی میں جس میں کوئی کجی نہیں ہو سکتا ہے
 کہ وہ پرہیزگاری اختیار کر لیں۔^(۵) (۲۸)

كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَآتَهُمُ الْعَذَابُ
 مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۲۵﴾
 فَآذَاهُمْ اللَّهُ الْعَذَابُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۗ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ
 أَكْبَرُ ۗ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۲۶﴾
 وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ
 لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۷﴾
 قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ ۗ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۲۸﴾

ہوش باقی نہ رہے، کیونکہ یہ بدعتیوں کی صفت ہے اور اس میں شیطان کا دخل ہوتا ہے۔ (ابن کثیر) جیسے آج بھی بدعتیوں کی قوالی میں اس طرح کی شیطانی حرکتیں عام ہیں، جسے وہ ”وجد و حال یا سکرو مستی“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں، اہل ایمان کا معاملہ اس بارے میں کافروں سے بوجہ مختلف ہے۔ ایک یہ کہ اہل ایمان کا سماع، قرآن کریم کی تلاوت ہے، جب کہ کفار کا سماع، بے حیا معنیات کی آوازوں میں گانا بجانا، سننا ہے۔ (جیسے اہل بدعت کا سماع مشرکانہ غلو پر مبنی قوالیاں اور نعتیں ہیں) دوسرے، یہ کہ اہل ایمان قرآن سن کر ادب و خشیت سے رجا و محبت سے اور علم و فہم سے رو پڑتے ہیں اور سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ جب کہ کفار شور کرتے اور کھیل کود میں مصروف رہتے ہیں۔ تیسرے، اہل ایمان سماع قرآن کے وقت ادب و تواضع اختیار کرتے ہیں، جیسے صحابہ کرام کی عادت مبارک تھی، جس سے ان کے روگنے کھڑے ہو جاتے اور ان کے دل اللہ کی طرف جھک جاتے تھے (ابن کثیر)

(۱) یعنی کیا یہ شخص، اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو قیامت والے دن بالکل بے خوف اور امن میں ہو گا؟ یعنی محذوف عبارت ملا کر اس کا یہ مفہوم ہو گا۔
 (۲) اور انہیں ان عذابوں سے کوئی نہیں بچا سکا۔

(۳) یہ کفار مکہ کو تنبیہ ہے کہ گزشتہ قوموں نے پیغمبروں کو جھٹلایا، تو ان کا یہ حال ہوا، اور تم اشرف الرسل اور افضل الناس کی تکذیب کر رہے ہو، تمہیں بھی اس تکذیب کے انجام سے ڈرنا چاہیے۔

(۴) یعنی لوگوں کو سمجھانے کے لیے ہر طرح کی مثالیں بیان کی ہیں تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں باتیں بیٹھ جائیں اور وہ نصیحت حاصل کریں۔

(۵) یعنی قرآن واضح عربی زبان میں ہے، جس میں کوئی کجی، انحراف اور التباس نہیں ہے تاکہ لوگ اس میں بیان کردہ

اللہ تعالیٰ مثال بیان فرما رہا ہے ایک وہ شخص جس میں بہت سے باہم ضد رکھنے والے ساجھی ہیں، اور دو سراوہ شخص جو صرف ایک ہی کا (غلام) ہے، کیا یہ دونوں صفت میں یکساں ہیں،^(۱) اللہ تعالیٰ ہی کے لیے سب تعریف ہے۔ بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں۔^(۲) (۲۹)

یقیناً خود آپ کو بھی موت آئے گی اور یہ سب بھی مرنے والے ہیں۔ (۳۰)

پھر تم سب کے سب قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے بھگرو گے۔^(۳) (۳۱)

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا زُجُلًا بَيْنَهُ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِمُونَ وَذُجُلًا سَلَمًا لِّلرَّجُلِ مَلٍ يَّتَوَيَّنُ مَثَلًا لِّلْحَمْدِ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۹﴾

إِنَّا كُنَّا بِبَيْتِكَ وَإِنَّا لَهُمْ يَتِيمُونَ ﴿۳۰﴾

ثُمَّ إِنَّا كُنَّا يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ رَبِّكَ وَتَخْتَصِمُونَ ﴿۳۱﴾

وعیدوں سے ڈریں اور اس میں بیان کیے گئے وعدوں کا مصداق بننے کے لیے عمل کریں۔

(۱) اس میں مشرک (اللہ کا شریک ٹھہرانے والے) اور مخلص (صرف ایک اللہ کے لیے عبادت کرنے والے) کی مثال بیان کی گئی ہے۔ یعنی ایک غلام ہے جو کئی شخصوں کے درمیان مشترک ہے، چنانچہ وہ آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں اور ایک غلام ہے، جس کا مالک صرف ایک ہی شخص ہے، اس کی ملکیت میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ کیا یہ دونوں غلام برابر ہو سکتے ہیں؟ نہیں، یقیناً نہیں۔ اسی طرح وہ مشرک جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبودوں کی بھی عبادت کرتا ہے۔ اور وہ مخلص مومن جو صرف ایک اللہ کی عبادت کرتا ہے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ برابر نہیں ہو سکتے۔

(۲) اس بات پر کہ اس نے حجت قائم کر دی۔

(۳) اسی لیے اللہ کے ساتھ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔

(۴) یعنی اے پیغمبر! آپ بھی اور آپ کے مخالف بھی، سب موت سے ہم کنار ہو کر اس دنیا سے ہمارے پاس آخرت میں آئیں گے۔ دنیا میں تو توحید اور شرک کا فیصلہ تمہارے درمیان نہیں ہو سکا اور تم اس بارے میں جھگڑتے ہی رہے۔ لیکن یہاں میں اس کا فیصلہ کروں گا اور مخلص موحدین کو جنت میں اور مشرکین و جاہدین اور مکذبین کو جہنم میں داخل کروں گا۔ اس آیت سے بھی وفات النبی ﷺ کا اثبات ہوتا ہے، جس طرح کہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۴۴ سے بھی ہوتا ہے اور انہی آیات سے استدلال کرتے ہوئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی لوگوں میں آپ ﷺ کی موت کا تحقق فرمایا تھا۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات یہ عقیدہ رکھنا کہ آپ کو برزخ میں بالکل اسی طرح زندگی حاصل ہے جس طرح دنیا میں حاصل تھی، قرآن کی نصوص کے خلاف ہے۔ آپ ﷺ پر بھی دیگر انسانوں ہی کی طرح موت طاری ہوئی، اسی لیے آپ کو دفن کیا گیا، قبر میں آپ کو برزخی زندگی تو یقیناً حاصل ہے، جس کی کیفیت کا ہمیں علم نہیں، لیکن دوبارہ قبر میں آپ کو دنیوی زندگی عطا نہیں کی گئی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولے؟^(۱) اور سچا دین جب اس کے پاس آئے تو اسے جھوٹا بتائے؟^(۲) کیا ایسے کفار کے لیے جہنم ٹھکانا نہیں ہے؟^(۳)

اور جو سچے دین کو لائے^(۴) اور جس نے اس کی تصدیق کی^(۵) یہی لوگ پارسا ہیں۔ (۳۳)
ان کے لیے ان کے رب کے پاس (ہر) وہ چیز ہے جو یہ چاہیں،^(۵) نیک لوگوں کا یہی بدلہ ہے۔ (۳۳)^(۶)
تاکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے برے عملوں کو دور کر دے اور جو نیک کام انہوں نے کیے ہیں ان کا اچھا بدلہ عطا

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللَّهِ وَكَذَبَ بِالصِّدْقِ
إِذْ جَاءَهُ الْبَيِّنَاتُ فِي جَهَنَّمَ مَتَوًى لِّلْكَافِرِينَ ۝

وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَٰئِكَ
هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝

لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذَلِكَ
جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ۝

يُكَفِّرُ اللَّهُ عَنْهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي عَمِلُوا وَيَجْزِيَهُمْ
أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

(۱) یعنی دعویٰ کرے کہ اللہ کی اولاد ہے یا اس کا شریک ہے یا اس کی بیوی ہے اور اسے وہ ان سب چیزوں سے پاک ہے۔
(۲) جس میں توحید ہے، احکام و فرائض ہیں، عقیدہ بعث و نشور ہے، محرمات سے اجتناب ہے، مومنین کے لیے خوش خبری اور کافروں کے لیے وعیدیں ہیں۔ یہ دین و شریعت جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، اسے وہ جھوٹا بتلائے۔

(۳) اس سے پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں جو سچا دین لے کر آئے۔ بعض کے نزدیک یہ عام ہے اور اس سے ہر وہ شخص مراد ہے جو توحید کی دعوت دیتا اور اللہ کی شریعت کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔
(۴) بعض اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مراد لیتے ہیں، جنہوں نے سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی اور ان پر ایمان لائے۔ بعض نے اسے بھی عام رکھا ہے، جس میں سب مومن شامل ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں اور آپ کو سچا مانتے ہیں۔

(۵) یعنی اللہ تعالیٰ ان کے گناہ بھی معاف فرمادے گا، ان کے درجے بھی بلند فرمائے گا، کیونکہ ہر مسلمان کی اللہ سے یہی خواہش ہوتی ہے علاوہ ازیں جنت میں جانے کے بعد ہر مطلوب چیز بھی ملے گی۔

(۶) مُحْسِنِينَ کا ایک مفہوم تو یہ ہے جو نیکیاں کرنے والے ہیں۔ دوسرا وہ جو اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرتے ہیں، جیسے حدیث میں ”احسان“ کی تعریف کی گئی ہے، أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَنْجُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ ”تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر یہ تصور ممکن نہ ہو تو یہ ضرور ذہن میں رہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔“ تیسرا جو لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ چوتھا، ہر نیک عمل کو اچھے طریقے سے خشوع و خضوع سے اور سنت نبوی ﷺ کے مطابق کرتے ہیں۔ کثرت کے بجائے اس میں ”حسن“ کا خیال رکھتے ہیں۔

فرمائے۔ (۳۵)

کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں؟^(۱) یہ لوگ آپ کو اللہ کے سوا اوروں سے ڈرا رہے ہیں اور جسے اللہ گمراہ کر دے اس کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں۔^(۲) (۳۶)

اور جسے وہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں^(۳) کیا، اللہ تعالیٰ غالب اور بدلہ لینے والا نہیں ہے؟^(۴) (۳۷)

اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یقیناً وہ یہی جواب دیں گے کہ اللہ نے۔ آپ ان سے کہیں کہ اچھا یہ تو بتاؤ جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو اگر اللہ تعالیٰ مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو کیا یہ اس کے نقصان کو ہٹا سکتے ہیں؟ یا اللہ تعالیٰ مجھ پر مہربانی کا ارادہ کرے تو کیا یہ اس کی مہربانی کو روک سکتے ہیں؟ آپ کہہ دیں کہ اللہ مجھے کافی ہے،^(۵) تو کل کرنے والے اسی

أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ وَيُخَوِّفُونَكَ بِالَّذِينَ مِنْ دُونِهِ؟
وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۖ ﴿٣٥﴾

وَمَنْ يُهْدِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُضِلٍّ ۗ أَلَيْسَ اللَّهُ بِعَزِيزٍ
ذِي انْتِقَامٍ ۙ ﴿٣٦﴾

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ
اللَّهُ مَثَلُ آفَرَةٍ تَتَّبِعُ مَتَابِدَ عَوْنٍ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ
أَرَادَنِيَ اللَّهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ ضُرِّيهِ أَوْ أَرَادَنِي
بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكَتُ رَحْمَتِهِ قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ
عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿٣٧﴾

(۱) اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ عام ہے، تمام انبیاء علیہم السلام اور مومنین اس میں شامل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کو غیر اللہ سے ڈراتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ جب آپ کا حامی و ناصر ہو تو آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ ان سب کے مقابلے میں آپ کو کافی ہے۔

(۲) جو اس گمراہی سے نکال کر ہدایت کے راستے پر لگا دے۔

(۳) جو اس کو ہدایت سے نکال کر گمراہی کے گڑھے میں ڈال دے۔ یعنی ہدایت اور گمراہی اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے گمراہ کر دے اور جس کو چاہے ہدایت سے نوازے۔

(۴) کیوں نہیں، یقیناً ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ لوگ کفر و عناد سے باز نہ آئے، تو یقیناً وہ اپنے دوستوں کی حمایت میں ان سے انتقام لے گا اور انہیں عبرت ناک انجام سے دوچار کرے گا۔

(۵) بعض کہتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ سوال ان کے سامنے پیش کیا، تو انہوں نے کہا کہ واقعی وہ اللہ کی تقدیر کو نہیں ٹال سکتے، البتہ وہ سفارش کریں گے، جس پر یہ ٹکڑا نازل ہوا کہ مجھے تو میرے معاملات میں اللہ ہی کافی ہے۔

پر توکل کرتے ہیں۔^(۱) (۳۸)

کہہ دیجیے کہ اے میری قوم! تم اپنی جگہ پر عمل کیے جاؤ میں بھی عمل کر رہا ہوں،^(۲) ابھی ابھی تم جان لو گے۔ (۳۹)

کہ کس پر رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے^(۳) اور کس پر دائمی مار اور بھیگی کی سزا ہوتی ہے۔^(۴) (۴۰)

آپ پر ہم نے حق کے ساتھ یہ کتاب لوگوں کے لیے نازل فرمائی ہے، پس جو شخص راہ راست پر آجائے اس کے اپنے لیے نفع ہے اور جو گمراہ ہو جائے اس کی گمراہی کا (وہال) اسی پر ہے، آپ ان کے ذمہ دار نہیں۔^(۵) (۴۱)

قُلْ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝۶۰

مَنْ يَأْتِ بِخَيْرٍ فَلَهُ عَاقِبَةُ حَسَنَةٍ ۚ وَالَّذِي لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ فَلَهُ عَاقِبَةُ شَرٍّ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝۶۱

إِنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ ۚ وَمَنْ ضَلَّٰ فَمَا لِلضَّالِّينَ عَلَيْهَا ۚ وَأَنْتَ عَلَيْهِمْ بِرَبِّكَ إِلَهٌ ۝۶۲

(۱) جب سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے تو پھر دوسروں پر بھروسہ کرنے کا کیا فائدہ؟ اس لیے اہل ایمان صرف اس پر توکل کرتے ہیں، اس کے سوا کسی پر ان کا اعتماد نہیں۔

(۲) یعنی اگر تم میری اس دعوت کو توحید کو قبول نہیں کرتے جس کے ساتھ اللہ نے مجھے بھیجا ہے، تو ٹھیک ہے، تمہاری مرضی، تم اپنی اس حالت پر قائم رہو جس پر تم ہو، میں اس حالت پر رہتا ہوں جس پر مجھے اللہ نے رکھا ہے۔

(۳) جس سے واضح ہو جائے گا کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون؟ اس سے مراد دنیا کا عذاب ہے جیسا کہ جنگ بدر میں ہوا۔ کافروں کے ستر آدمی قتل اور ستر ہی آدمی قید ہوئے۔ حتیٰ کہ فوج مکہ کے بعد غلبہ و یمن بھی مسلمانوں کو حاصل ہو گیا، جس کے بعد کافروں کے لیے سوائے ذلت و رسوائی کے کچھ باقی نہ رہا۔

(۴) اس سے مراد عذاب جہنم ہے جس میں کافر ہمیشہ جتلا رہیں گے۔

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل مکہ کا کفر پر اصرار بڑا گراں گزرتا تھا، اس میں آپ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ ﷺ کا کام صرف اس کتاب کو بیان کر دینا ہے جو ہم نے آپ ﷺ پر نازل کی ہے، ان کی ہدایت کے آپ ﷺ مکلف نہیں ہیں۔ اگر وہ ہدایت کا راستہ اپنائیں گے تو اس میں انہی کا فائدہ ہے اور اگر ایسا نہیں کریں گے تو خود ہی نقصان اٹھائیں گے۔ وکیل کے معنی مکلف اور ذمے دار کے ہیں۔ یعنی آپ ﷺ ان کی ہدایت کے ذمے دار نہیں ہیں۔ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی ایک قدرت بالغہ اور صنعت عجیبہ کا تذکرہ فرما رہا ہے جس کا مشاہدہ ہر روز انسان کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب وہ سو جاتا ہے تو اس کی روح اللہ کے حکم سے گویا نکل جاتی ہے، کیوں کہ اس کے احساس و ادراک کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ اور جب وہ بیدار ہوتا ہے تو روح اس میں گویا دوبارہ بھیج دی جاتی ہے، جس سے اس کے حواس بحال ہو جاتے ہیں۔ البتہ جس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہوتے ہیں، اس کی روح واپس نہیں آتی اور وہ موت سے

اللہ ہی روحوں کو ان کی موت کے وقت (۱) اور جن کی موت نہیں آئی انہیں ان کی نیند کے وقت قبض کر لیتا ہے، (۲) پھر جن پر موت کا حکم لگ چکا ہے انہیں تو روک لیتا ہے (۳) اور دوسری (روحوں) کو ایک مقرر وقت تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ (۴) غور کرنے والوں کے لیے اس میں یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔ (۵) (۳۲)

کیا ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا (اوروں کو) سفارشی مقرر کر رکھا ہے؟ آپ کہہ دیجئے! کہ گو وہ کچھ بھی اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ عقل رکھتے ہوں۔ (۱) (۳۳)

کہہ دیجئے! کہ تمام سفارش کا مختار اللہ ہی ہے۔ (۲) تمام آسمانوں اور زمین کا راج اسی کے لیے ہے تم سب اسی کی طرف پھیرے جاؤ گے۔ (۳۴)

اللَّهُ يَتَوَكَّلُ الْإِنْسُ جِئِن مَوْتِهَا وَآلِئِي لَمْ تَمُتْ
فِي مَنَامِهَا فَيَكْسِبُكَ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ
الْأَخْرَىٰ إِلَىٰ آجِلٍ مُّسْمًى إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ
يَتَفَكَّرُونَ ﴿۳۲﴾

أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ۚ قُلْ أَوْلُوا كَانُوا
لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۳﴾

قُلْ بَلَىٰ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا ۗ لَمْ يَلِكْ السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضِ ثَمَرٌ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴿۳۴﴾

ہمکنار ہو جاتا ہے۔ اس کو بعض مفسرین نے وفات کبریٰ اور وفات صغریٰ سے بھی تعبیر کیا ہے۔

(۱) یہ وفات کبریٰ ہے کہ روح قبض کر لی جاتی ہے، واپس نہیں آتی۔

(۲) یعنی جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا، تو سونے کے وقت ان کی روح بھی قبض کر کے انہیں وفات صغریٰ سے دوچار کر دیا جاتا ہے۔

(۳) یہ وہی وفات کبریٰ ہے، جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں روح روک لی جاتی ہے۔

(۴) یعنی جب تک ان کا وقت موعود نہیں آتا، اس وقت تک کے لیے ان کی روحمیں واپس ہوتی رہتی ہیں، یہ وفات صغریٰ ہے، یہی مضمون سورۃ الأنعام ۶۰-۶۱ میں بیان کیا گیا ہے، تاہم وہاں وفات صغریٰ کا ذکر پہلے اور وفات کبریٰ کا بعد میں ہے۔ جب کہ یہاں اس کے برعکس ہے۔

(۵) یعنی یہ روح کا قبض اور اس کا ارسال اور توفیٰ اور احیاء، اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور قیامت والے دن وہ مردوں کو بھی یقیناً زندہ فرمائے گا۔

(۶) یعنی شفاعت کا اختیار تو کیا، انہیں تو شفاعت کے معنی و مفہوم کا بھی پتہ نہیں، کیوں کہ وہ پتھر ہیں یا بے خبر۔

(۷) یعنی شفاعت کی تمام اقسام کا مالک صرف اللہ ہی ہے، اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش ہی نہیں کر سکے گا، پھر صرف ایک اللہ ہی کی عبادت کیوں نہ کی جائے تاکہ وہ راضی ہو جائے اور شفاعت کے لیے کوئی سہارا ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔

جب اللہ اکیلے کا ذکر کیا جائے تو ان لوگوں کے دل نفرت کرنے لگتے ہیں^(۱) جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے اور جب اس کے سوا (اور کا) ذکر کیا جائے تو ان کے دل کھل کر خوش ہو جاتے ہیں۔^(۲) (۳۵)

آپ کہہ دیجئے! کہ اے اللہ! آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، چھپے کھلے کے جاننے والے تو ہی اپنے بندوں میں ان امور کا فیصلہ فرمائے گا جن میں وہ الجھ رہے تھے۔^(۳) (۳۶)

اگر ظلم کرنے والوں کے پاس وہ سب کچھ ہو جو روئے زمین پر ہے اور اس کے ساتھ اتنا ہی ہو، تو بھی بدترین سزا کے بدلے میں قیامت کے دن یہ سب کچھ دے دیں،^(۴) اور ان کے سامنے اللہ کی طرف سے وہ

وَأَذْكُرُ اللَّهُ وَحْدَهُ شَمَأَتْ قُلُوبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ
بِالْآخِرَةِ وَأَذَا ذُكْرِ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ
يَسْتَبْشِرُونَ ﴿۳۵﴾

قُلِ اللَّهُ فَاطِرُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ عَلَيْهِ الْغَيْبُ
وَالشَّهَادَةُ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِي مَا كَانُوا
فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۳۶﴾

وَلَوْ أَنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ
مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ مِنْ سُوءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
وَبَدَأَ اللَّهُ مِنَ اللَّهِ مَا لَهُمْ لِيُؤْتُوا بِمَعْتَبِرُونَ ﴿۳۷﴾

(۱) یا کفر اور استکبار، یا انقباض محسوس کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ مشرکین سے جب یہ کہا جائے کہ معبود صرف ایک ہی ہے تو ان کے دل یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

(۲) ہاں جب یہ کہا جائے کہ فلاں فلاں بھی معبود ہیں، یا وہ بھی آخر اللہ کے نیک بندے ہیں، وہ بھی کچھ اختیار رکھتے ہیں، وہ بھی مشکل کشائی اور حاجت روائی کر سکتے ہیں، تو پھر مشرکین بڑے خوش ہوتے ہیں۔ مخرفین کا یہی حال آج بھی ہے۔ جب ان سے کہا جائے کہ صرف ”یا اللہ مدد“ کو، کیونکہ اس کے سوا کوئی مدد کرنے پر قادر نہیں ہے، تو سچ پا ہو جاتے ہیں، یہ جملہ ان کے لیے سخت ناگوار ہوتا ہے۔ لیکن جب ”یا علی مدد“ یا ”یا رسول اللہ مدد“ کہا جائے، اسی طرح دیگر مرووں سے استمداد و استغاثہ کیا جائے مثلاً ”یا شیخ عبدالقادر شیشا اللہ“ وغیرہ تو پھر ان کے دل کی کلیاں کھل اٹھتی ہیں۔ فَتَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ.

(۳) حدیث میں آتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تہجد کی نماز کے آغاز میں یہ پڑھا کرتے تھے «اللَّهُمَّ اربَّ جبریلَ وَمِکائیلَ وَإِسْرَافیلَ، فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ، عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ، أَهْدِنِي لِمَا اخْتَلَفَ فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ، إِنَّكَ تَهْدِي مَنْ تَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ» (صحیح مسلم، کتاب صلوة المسافرین باب الدعاء فی صلوة اللیل وقیامہ)

(۴) لیکن پھر بھی وہ قبول نہیں ہوگا، جیسا کہ دوسرے مقام پر وضاحت ہے ﴿فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ سَلٌ إِلَّا دَهْبًا﴾ (۳) ﴿لَوْ اذْنَعْتُمْ دِيَارَهُمْ﴾ (آل عمران-۹۱) ”وہ زمین بھر سونا بھی بدلے میں دے دیں، تو وہ قبول نہیں کیا جائے گا“۔ اس لیے کہ

ظاہر ہو گا جس کا گمان بھی انہیں نہ تھا۔^(۱) (۳۷)
 جو کچھ انہوں نے کیا تھا اس کی برائیاں ان پر کھل
 پڑیں گی^(۲) اور جس کا وہ مذاق کرتے تھے وہ انہیں
 آگھیرے گا۔^(۳) (۳۸)

انسان کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارنے لگتا
 ہے،^(۴) پھر جب ہم اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا
 فرمادیں تو کہنے لگتا ہے کہ اسے تو میں محض اپنے علم کی
 وجہ سے دیا گیا ہوں،^(۵) بلکہ یہ آزمائش ہے^(۶) لیکن ان
 میں سے اکثر لوگ بے علم ہیں۔^(۷) (۳۹)

ان سے اگلے بھی یہی بات کہہ چکے ہیں پس ان کی
 کارروائی ان کے کچھ کام نہ آئی۔^(۸) (۵۰)
 پھر ان کی تمام برائیاں^(۹) ان پر آپڑیں اور ان میں سے بھی

وَبَدَّ اللَّهُ سَيِّئَاتِكَ مَا كُنْتَ بَوَّاحًا بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ
 يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۳۷﴾

فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا نَشْرًا إِذَا حَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً
 مِنَّا قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ نَبِيٌّ مِّمَّنِّي ﴿۳۸﴾
 وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۹﴾

قَدْ قَالَهَا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ
 مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۵۰﴾
 فَاصَابَهُمُ سَيِّئَاتِكَ مَا كُنْتَ بَوَّاحًا وَالَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ

﴿وَلَا يُفَعِّلُونَهَا عَذَابًا﴾ (البقرة: ۳۸) ”وہاں معاوضہ قبول نہیں کیا جائے گا“۔

- (۱) یعنی عذاب کی شدت اور اس کی ہولناکیاں اور اس کی انواع و اقسام ایسی ہوں گی کہ کبھی ان کے گمان میں نہ آئی ہوں گی۔
- (۲) یعنی دنیا میں جن محارم و مآثم کا وہ ارتکاب کرتے رہے تھے، اس کی سزا ان کے سامنے آجائے گی۔
- (۳) وہ عذاب انہیں گھیر لے گا جسے وہ دنیا میں ناممکن سمجھتے تھے، اس لیے اس کا استہزاء کیا کرتے تھے۔
- (۴) یہ انسان کا بے اعتبار جنس، ذکر ہے۔ یعنی انسانوں کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ جب ان کو بیماری، فقر و فاقہ یا کوئی اور تکلیف پہنچتی ہے تو اس سے نجات پانے کے لیے اللہ سے دعائیں کرتا اور اس کے سامنے گڑگڑاتا ہے۔
- (۵) یعنی نعمت ملنے ہی سرکشی اور طغیان کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس میں اللہ کا کیا احسان؟ یہ تو میری اپنی دانائی کا نتیجہ ہے۔ یا جو علم و ہنر میرے پاس ہے، اس کی بدولت یہ نعمتیں حاصل ہوئی ہیں یا مجھے معلوم تھا کہ دنیا میں یہ چیزیں مجھے ملیں گی کیوں کہ اللہ کے ہاں میرا بہت مقام ہے۔
- (۶) یعنی بات وہ نہیں ہے جو تو سمجھ رہا یا بیان کر رہا ہے، بلکہ یہ نعمتیں تیرے لیے امتحان اور آزمائش ہیں کہ تو شکر کرتا ہے یا کفر؟
- (۷) اس بات سے کہ یہ اللہ کی طرف سے استدراج اور امتحان ہے۔
- (۸) جس طرح قارون نے بھی کہا تھا، لیکن بالآخر وہ اپنے خزانوں سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا۔ فَمَا أَغْنَىٰ مِنْ مَا اسْتَفْهَمَ یہ بھی ہو سکتا ہے اور نافیہ بھی۔ دونوں طرح معنی صحیح ہے۔
- (۹) برائیوں سے مراد ان کی برائیوں کی جزا ہے، ان کو مشاکلت کے اعتبار سے سیئات کہا گیا ہے، ورنہ برائی کی جزا

جو گناہ گار ہیں ان کی کی ہوئی برائیاں بھی اب ان پر آپڑیں گی یہ (ہمیں) ہرا دینے والے نہیں۔^(۱) (۵۱)

کیا انہیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہے روزی کشادہ کر دیتا ہے اور تنگ (بھی) ایمان لانے والوں کے لیے اس میں (بڑی بڑی) نشانیاں ہیں۔^(۲) (۵۲)

(میری جانب سے) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بالیقین اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے، واقعی وہ بڑی بخشش بڑی رحمت والا ہے۔^(۳) (۵۳)

هُؤُلَاءِ سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَإِنَّمَا هُمْ بِمَعْرِفَتِهِمْ
أُولَئِكَ يَعْلَمُونَ إِنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ
إِن فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٥١﴾

كُلُّ لِيُعْبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَآتَقْتُلُوا
مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا
إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٥٢﴾

برائی نہیں ہے۔ جیسے ﴿وَحِزَابٌ مِّنْهُ مَثَلًا﴾ میں ہے۔ (فتح القدیر)

(۱) یہ کفار مکہ کو تنبیہ ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، یہ بھی گزشتہ قوموں کی طرح قتل، قتل و اسارت وغیرہ سے دوچار ہوئے، اللہ کی طرف سے آئے ہوئے ان عذابوں کو یہ روک نہیں سکے۔

(۲) یعنی رزق کی کشادگی اور تنگی میں بھی اللہ کی توحید کے دلائل ہیں یعنی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں صرف اسی کا حکم و تصرف چلتا ہے، اسی کی تدبیر مؤثر اور کارگر ہے، اسی لیے وہ جس کو چاہتا ہے، رزق فراوان سے نواز دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے فقرو تنگ دستی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس کے ان فیصلوں میں، جو اس کی حکمت و مشیت پر مبنی ہوتے ہیں، کوئی دخل انداز ہو سکتا ہے نہ ان میں رد و بدل کر سکتا ہے۔ تاہم یہ نشانیاں صرف اہل ایمان ہی کے لیے ہیں کیوں کہ وہی ان پر غور و فکر کر کے ان سے فائدہ اٹھاتے اور اللہ کی مغفرت حاصل کرتے ہیں۔

(۳) اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی مغفرت کی وسعت کا بیان ہے۔ اسراف کے معنی ہیں گناہوں کی کثرت اور اس میں افراط۔ ”اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو“ کا مطلب ہے کہ ایمان لانے سے قبل یا توبہ و استغفار کا احساس پیدا ہونے سے پہلے کتنے بھی گناہ کیے ہوں، انسان یہ نہ سمجھے کہ میں توبہ سے زیادہ گناہ گار ہوں، مجھے اللہ تعالیٰ کیوں نہ معاف کرے گا؟ بلکہ سچے دل سے اگر ایمان قبول کر لے گا یا توبہ النصوح کر لے گا تو اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف فرما دے گا۔ شان نزول کی روایت سے بھی یہی مفہوم ثابت ہوتا ہے۔ کچھ کافر و مشرک تھے جنہوں نے کثرت سے قتل اور زنا کاری کا ارتکاب کیا تھا، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ آپ ﷺ کی دعوت، صحیح ہے لیکن ہم لوگ بہت زیادہ خطا کار ہیں، اگر ہم ایمان لے آئیں تو کیا وہ سب معاف ہو جائیں گے، جس پر اس آیت کا نزول ہوا۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورہ زمر) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ کی رحمت و مغفرت کی امید پر خوب گناہ کیے جاؤ، اس کے احکام و

تم (سب) اپنے پروردگار کی طرف جھک پڑو اور اس کی حکم برداری کیے جاؤ اس سے قبل کہ تمہارے پاس عذاب آجائے اور پھر تمہاری مدونہ کی جائے۔ (۵۴)

اور بیروی کرو اس بہترین چیز کی جو تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل کی گئی ہے، اس سے پہلے کہ تم پر اچانک عذاب آجائے اور تمہیں اطلاع بھی نہ ہو۔ (۵۵)

(ایسا نہ ہو کہ) کوئی شخص کسے ہائے افسوس! اس بات پر کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے حق میں کوتاہی کی (۲) بلکہ میں تو مذاق اڑانے والوں میں ہی رہا۔ (۵۶)

یا کسے کہ اگر اللہ مجھے ہدایت کرتا تو میں بھی پارسا لوگوں میں ہوتا۔ (۵۷)

وَأَنبِئُوا آلَ رَبِّكُمُ اللَّيْلَ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ۗ لَمْ تَنْصُرُوهُنَّ ۝

وَأَنبِئُوا أَحْسَنَ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُمُ مِنْ رَبِّكُم مِّن قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ۝

أَنْ تَقُولَ نَفْسٌ لِّمَنْ يُحْسِنُ عَلٰى مَا فَعَلْتُ فِي جَنَّةِ اللَّهِ وَإِنْ كُنْتُ لَمِنَ السَّخِرِينَ ۝

أَوْ تَقُولَ لَوْ أَنَّ اللَّهَ هَدَانِي لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ۝

فرائض کی مطلق پروا نہ کرو اور اس کے حدود اور ضابطوں کو بے دردی سے پامال کرو۔ اس طرح اس کے غضب و انتقام کو دعوت دے کر اس کی رحمت و مغفرت کی امید رکھنا نہایت نادانش مندی اور خام خیالی ہے۔ یہ تخم حنظل بو کر ثمرات و فواکہ کی امید رکھنے کے مترادف ہے۔ ایسے لوگوں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ جہاں اپنے بندوں کے لیے غَفُورٌ رَحِيمٌ ہے، وہاں وہ نافرمانوں کے لیے عَزِيزٌ ذُو انتقام بھی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں متعدد جگہ ان دونوں پہلوؤں کو ساتھ ساتھ بیان کیا گیا، مثلاً ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَلْبَسُوْا لِبَاسًا مِّنْ عِبَادَةِ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾ (الحجر-۲۰، ۵۰) غالباً یہی وجہ ہے کہ یہاں آیت کا آغاز بِاِعْبَادِيٍّ (میرے بندوں) سے فرمایا، جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو ایمان لا کر یا سچی توبہ کر کے صحیح معنوں میں اس کا بندہ بن جائے گا، اس کے گناہ اگر سمندر کے جھاگ کے برابر بھی ہوں گے تو وہ معاف فرما دے گا، وہ اپنے بندوں کے لیے یقیناً غفور رحیم ہے۔ جیسے حدیث میں سو آدمیوں کے قاتل کے توبہ کا واقعہ ہے، (صحیح بخاری، کتاب الأنبياء، مسلم، کتاب التوبة، باب قبول توبة القتال وإن كفر قتلته)۔

(۱) یعنی عذاب آنے سے قبل توبہ اور عمل صالح کا اہتمام کر لو، کیوں کہ جب عذاب آئے گا تو اس کا تمہیں علم و شعور بھی نہیں ہو گا، اس سے مراد نبوی عذاب ہے۔

(۲) فِي جَنَّةِ اللَّهِ کا مطلب اللہ کی اطاعت یعنی قرآن اور اس پر عمل کرنے میں کوتاہی ہے۔ یا جَنَّةِ کے معنی قرب اور جوار کے ہیں۔ یعنی اللہ کا قرب اور اس کا جوار (یعنی جنت) طلب کرنے میں کوتاہی کی۔

(۳) یعنی اگر اللہ مجھے ہدایت دے دیتا تو میں شرک اور معاصی سے بچ جاتا۔ یہ اس طرح ہی ہے جیسے دوسرے مقام پر

یا عذاب کو دیکھ کر کہے کاش! کہ کسی طرح میرا لوٹ جانا ہو جاتا تو میں بھی نیکو کاروں میں ہو جاتا۔ (۵۸)

ہاں (ہاں) بیشک تیرے پاس میری آیتیں پہنچ چکی تھیں جنہیں تو نے جھٹلایا اور غرور و تکبر کیا اور تو تھا ہی کافروں میں۔^(۱) (۵۹)

اور جن لوگوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ قیامت کے دن ان کے چہرے سیاہ ہو گئے ہوں گے^(۲) کیا تکبر کرنے والوں کا ٹھکانا جنہم میں نہیں؟^(۳) (۶۰)

اور جن لوگوں نے پرہیز گاری کی انہیں اللہ تعالیٰ ان کی کامیابی کے ساتھ بچا^(۴) لے گا، انہیں کوئی دکھ چھو بھی نہ سکے گا اور نہ وہ کسی طرح غمگین ہوں گے۔^(۵) (۶۱)

اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے۔^(۶) (۶۲)

أَوْتَقُولُ جِئْنَا مِنَ الْعَذَابِ لَوْ أَنَّ لَنَا كُوَّةً فَمَّا كُنَّا مِنَ الْمُحْسِنِينَ ۝

بَلْ قَدْ جَاءَكَ الْبَيِّنَاتُ فَكَلِّبْنَا بِهَا مَا اسْكَبْتُمْ وَكُنْتُمْ مِنَ الْكَافِرِينَ ۝

وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللَّهِ وُجُوهُهُم مُّسْوَدَّةٌ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ ۝

وَيُنْفِخُ فِي أُنُوفِهِمُ الْوَيْحَ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مَعَاذَ رَبِّهِمْ لَا يَسْمَعُهُمُ السَّمْعُ وَلَا هُمْ يَسْمَعُونَ ۝

اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ۝

مشرکین کا قول نقل کیا گیا ہے، ﴿لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا آتَيْنَاكُمْ﴾ (الأُنْعَام-۱۳۸) ”اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے“ ان کا یہ قول کَلِمَةً حَقًّا أَرِيدَ بِهَا الْبَاطِلُ... کا مصداق ہے (فتح القدير)۔

(۱) یہ اللہ تعالیٰ ان کی خواہش کے جواب میں فرمائے گا۔

(۲) جس کی وجہ عذاب کی ہولناکیاں اور اللہ کے غضب کا مشاہدہ ہو گا۔

(۳) حدیث میں ہے «الْكِبْرُ بَطْرُ الْحَقِّ وَغَمَطُ النَّاسِ» ”حق کا انکار اور لوگوں کو حقیر سمجھنا، کبر ہے“ یہ استفہام تقریری ہے۔ یعنی اللہ کی اطاعت سے تکبر کرنے والوں کا ٹھکانا جنہم ہے۔

(۴) مَفَاذَةٌ، مصدر میسی ہے۔ یعنی فَوْزٌ (کامیابی) شتر سے بچ جانا اور خیر اور سعادت سے ہم کنار ہو جانا، مطلب ہے، اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کو اس فوز و سعادت کی وجہ سے نجات عطا فرمادے گا، جو اللہ کے ہاں ان کے لیے پہلے سے ثبت ہے۔

(۵) وہ دنیا میں جو کچھ چھوڑ آئے ہیں، اس پر انہیں کوئی غم نہیں ہو گا، وہ چونکہ قیامت کی ہولناکیوں سے محفوظ ہوں گے، اس لیے انہیں کسی بات کا غم نہ ہو گا۔

(۶) یعنی ہر چیز کا خالق بھی وہی ہے اور مالک بھی وہی، وہ جس طرح چاہے، تصرف اور تدبیر کرے۔ ہر چیز اس کے ماتحت اور زیر تصرف ہے۔ کسی کو سرباہی یا انکار کی مجال نہیں۔ وکیل، بمعنی محافظ اور مدبر۔ ہر چیز اس کے سپرد ہے اور وہ بغیر کسی کی مشارکت کے ان کی حفاظت اور تدبیر کر رہا ہے۔

آسمانوں اور زمین کی کنجیوں کا مالک وہی ہے،^(۱) جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا وہی خسارہ پانے والے ہیں۔^(۲) (۶۳)

آپ کہہ دیجئے اے جاہلو! کیا تم مجھ سے اللہ کے سوا اوروں کی عبادت کو کہتے ہو۔^(۳) (۶۳)

یقیناً تیری طرف بھی اور تجھ سے پہلے (کے تمام نبیوں) کی طرف بھی وحی کی گئی ہے کہ اگر تو نے شرک کیا تو بلاشبہ تیرا عمل ضائع ہو جائے گا اور بالیقین تو زیاں کاروں میں سے ہو جائے گا۔^(۴) (۶۵)

بلکہ تو اللہ ہی کی عبادت کر^(۵) اور شکر کرنے والوں میں سے ہو جا۔ (۶۶)

اور ان لوگوں نے جیسی قدر اللہ تعالیٰ کی کرنی چاہیے تھی نہیں کی،^(۶) ساری زمین قیامت کے دن اس کی مٹھی

لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۶۳﴾

قُلْ أَفَعْبُدُونَ تَأْمُرُونِي أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجَاهِلُونَ ﴿۶۴﴾

وَلَقَدْ أَوْحَىٰ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكَ ؕ لَئِن أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۶۵﴾

بَلِ اللَّهِ قَاعِبَدُوا وَلَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ شُكْرًا ﴿۶۶﴾

وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ؕ وَالْأَرْضُ جَمِيعًا بِيَمِينِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالتَّمْلُوتُ مَطْوِيَةً بِيَمِينِهِ سُبْحٰنَهُ وَتَعٰلٰى

(۱) مَقَالِيدُ، مِفْلَيْدُ اور مِقْلَادُ کی جمع ہے۔ (فتح القدر) بعض نے اس کا ترجمہ ”چابیاں“ اور بعض نے ”خزانے“ کیا ہے، مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ تمام معاملات کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے۔

(۲) یعنی کامل خسارہ۔ کیونکہ اس کفر کے نتیجے میں وہ جہنم میں چلے گئے۔

(۳) یہ کفار کی اس دعوت کے جواب میں ہے جو وہ پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے کہ اپنے آبائی دین کو اختیار کر لیں، جس میں بتوں کی عبادت تھی۔

(۴) ”اگر تو نے شرک کیا“ کا مطلب ہے، اگر موت شرک پر آئی اور اس سے توبہ نہ کی۔ خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جو شرک سے پاک بھی تھے اور آئندہ کے لیے محفوظ بھی۔ کیونکہ پیغمبر اللہ کی حفاظت و عصمت میں ہوتا ہے، ان سے ارتکاب شرک کا کوئی امکان نہیں تھا، لیکن یہ دراصل امت کے لیے تعریض اور اس کو سمجھانا مقصود ہے۔

(۵) اِيَّاكَ تَعْبُدُ کی طرح یہاں بھی مفعول (اللہ) کو مقدم کر کے حصر کا مفہوم پیدا کر دیا گیا کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرو!

(۶) کیونکہ اس کی بات بھی نہیں مانی، جو اس نے پیغمبروں کے ذریعے سے ان تک پہنچائی تھی اور عبادت بھی اس کے لیے خالص نہیں کی بلکہ دوسروں کو بھی اس میں شریک کر لیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک یہودی عالم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا کہ ہم اللہ کی بات (کتابوں میں) یہ بات پاتے ہیں کہ وہ (قیامت والے دن) آسمانوں کو ایک انگلی پر، زمینوں کو ایک انگلی پر، درختوں کو ایک انگلی پر، پانی اور شری (تری) کو ایک انگلی پر اور تمام مخلوقات کو ایک انگلی پر رکھے گا اور

عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۵﴾

میں ہوگی اور تمام آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے،^(۱) وہ پاک اور برتر ہے ہر اس چیز سے جسے لوگ اس کا شریک بنائیں۔ (۶۷)

اور صور پھونک دیا جائے گا پس آسمانوں اور زمین والے سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے^(۲) جسے اللہ چاہے،^(۳) پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا پس وہ ایک دم کھڑے ہو کر دیکھنے لگ جائیں گے۔^(۴) (۶۸)

اور زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھے گی،^(۵) نامہ اعمال حاضر کیے جائیں گے نبیوں اور گواہوں کو لایا

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَوَّبَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ ثُمَّ نُفِخَ بِهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ بِعِظَمٍ يَتَرْظَوْنَ ﴿۵﴾

وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَوَضِعَتِ الْكُتُبَ وَجِئَتْ بِالرَّبِّينَ وَالشَّهَادَةِ وَوُضِعَ بَيْنَهُمُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۵﴾

فرمائے گا، میں بادشاہ ہوں۔“ آپ ﷺ نے مسکرا کر اس کی تصدیق فرمائی اور آیت وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ كِي تَلَاوَت فرمائی۔ (صحیح بخاری تفسیر سورہ زمر) محدثین اور سلف کا عقیدہ ہے کہ اللہ کی جن صفات کا ذکر قرآن اور احادیث صحیحہ میں ہے، (جس طرح اس آیت میں ہاتھ کا اور حدیث میں انگلیوں کا اثبات ہے) ان پر بلا کیف و تشبیہ اور بغیر تاویل و تحریف کے ایمان رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے یہاں بیان کردہ حقیقت کو مجرد غلبہ و قوت کے مفہوم میں لینا صحیح نہیں ہے۔

(۱) اس کی بابت بھی حدیث میں آتا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا أَنَا الْمَلِكُ، أَيْنَ مُلُوكِ الْأَرْضِ ”میں بادشاہ ہوں۔ زمین کے بادشاہ (آج) کہاں ہیں؟ (حوالہ مذکورہ)

(۲) بعض کے نزدیک (نفخہ فزع کے بعد) یہ نفخہ ثانیہ یعنی نفخہ معق ہے، جس سے سب کی موت واقع ہو جائے گی۔ بعض کے نزدیک یہ نفخہ اولیٰ ہی ہے، اسی سے اولاً سخت گھبراہٹ طاری ہوگی اور پھر سب کی موت واقع ہو جائے گی۔ بعض نے ان نفحات کی ترتیب اس طرح بیان کی ہے۔ پہلا نَفْحَةُ الْفَنَاءِ - دوسرا نَفْحَةُ الْبَعْثِ - تیسرا نَفْحَةُ الصَّعْقِ - چوتھا نَفْحَةُ الْقِيَامِ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ۔ (المفسر التفاسیر) بعض کے نزدیک صرف دہوی نَفْحَةُ الْمَوْتِ اور نَفْحَةُ الْبَعْثِ اور بعض کے نزدیک تین۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔

(۳) یعنی جن کو اللہ چاہے گا، ان کو موت نہیں آئے گی، جیسے جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل۔ بعض کہتے ہیں رضوان فرشتہ، حَمَلَةُ الْعَرْشِ (عرش اٹھانے والے فرشتے) اور جنت و جہنم پر مقرر داروئے۔ (فتح القدیر)

(۴) چار نفخوں کے قائلین کے نزدیک یہ چوتھا، تین کے قائلین کے نزدیک تیسرا اور دو کے قائلین کے نزدیک یہ دوسرا نفخہ ہے۔ بہر حال اس نَفْحَةِ سے سب زندہ ہو کر میدان محشر میں رب العالمین کی بارگاہ میں حاضر ہو جائیں گے، جہاں حساب کتاب ہوگا۔

(۵) اس نور سے بعض نے عدل اور بعض نے حکم مراد لیا ہے لیکن اسے حقیقی معنوں پر محمول کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے، کیونکہ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (قَالَ الشُّوْكَانِيُّ فِي فَتْحِ الْقَدِيرِ)

جائے گا^(۱) اور لوگوں کے درمیان حق حق فیصلے کر دیئے جائیں گے اور وہ ظلم نہ کیے جائیں گے۔^(۲) (۶۹)

اور جس شخص نے جو کچھ کیا ہے بھرپور دے دیا جائے گا؛ جو کچھ لوگ کر رہے ہیں وہ بخوبی جاننے والا ہے۔^(۳) (۷۰)

کافروں کے غول کے غول جنم کی طرف ہٹکائے جائیں گے،^(۴) جب وہ اس کے پاس پہنچ جائیں گے اس کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے جائیں گے،^(۵) اور وہاں کے نگہبان ان سے سوال کریں گے کہ کیا تمہارے پاس تم میں سے رسول نہیں آئے تھے؟ جو تم پر تمہارے رب کی آیتیں پڑھتے تھے اور تمہیں اس دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے؟ یہ جواب دیں گے کہ ہاں درست^(۶)

وَوَقَّيْتُ لِكُلِّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿۶۹﴾

وَسَيُنْفِقُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُمْ فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمُ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا قَالُوا بَلَىٰ وَلَكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿۷۰﴾

(۱) نبیوں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے میرا پیغام اپنی اپنی امتوں کو پہنچا دیا تھا؟ یا یہ پوچھا جائے گا کہ تمہاری امتوں نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا؟ اسے قبول کیا یا اس کا انکار کیا؟ امت محمدیہ کو بطور گواہ لایا جائے گا جو اس بات کی گواہی دے گی کہ تیرے پیغمبروں نے تیرا پیغام اپنی اپنی قوم یا امت کو پہنچا دیا تھا، جیسا کہ تو نے ہمیں اپنے قرآن کے ذریعے سے ان امور پر مطلع فرمایا تھا۔

(۲) یعنی کسی کے اجر و ثواب میں کمی نہیں ہوگی اور کسی کو اس کے جرم سے زیادہ سزا نہیں دی جائے گی۔

(۳) یعنی اس کو کسی کاتب، حساب اور گواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اعمال نامے اور گواہ صرف بطور حجت اور قطع معذرت کے ہوں گے۔

(۴) زُمَرًا زَمْرًا سے مشتق ہے بمعنی آواز، ہر گروہ یا جماعت میں شور اور آوازیں ضرور ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ جماعت اور گروہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، مطلب ہے کہ کافروں کو جنم کی طرف گروہوں کی شکل میں لے جایا جائے گا، ایک گروہ کے پیچھے ایک گروہ۔ علاوہ ازیں انہیں مار دھکیل کر جانوروں کے ریوڑ کی طرح ہٹکایا جائے گا۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿يَوْمَ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ تِلْكَ آيَاتِهِمْ دَعْوًا﴾ (الطور: ۱۳) یعنی انہیں جنم کی طرف سختی سے دھکیلا جائے گا۔

(۵) یعنی ان کے پیچھے ہی فوراً جنم کے ساتوں دروازے کھول دیئے جائیں گے تاکہ سزا میں تاخیر نہ ہو۔

(۶) یعنی جس طرح دنیا میں بحث و تکرار اور جدل و مناظرہ کرتے تھے، وہاں سب کچھ آنکھوں کے سامنے آجانے کے بعد، بحث و جدال کی گنجائش ہی باقی نہ رہے گی، اس لیے اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں ہوگا۔

ہے لیکن عذاب کا حکم کافروں پر ثابت ہو گیا۔^(۱) (۷۱)
 کہا جائے گا کہ اب جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ
 جہاں ہمیشہ رہیں گے، پس سرکشوں کا ٹھکانا بہت ہی برا
 ہے۔ (۷۲)

اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے ان کے گروہ کے
 گروہ جنت کی طرف روانہ کیے جائیں گے^(۲) جہاں تک
 کہ جب اس کے پاس آجائیں گے اور دروازے کھول
 دیئے جائیں گے^(۳) اور وہاں کے نگہبان ان سے کہیں
 گے تم پر سلام ہو، تم خوش حال رہو تم اس میں ہمیشہ کے

قِيلَ ادْخُلُوا الْاَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا لَيْسَ مَخْرُجًا
 الْمُنْكَرِينَ ﴿۷۲﴾

وَيَسْبِقُ الَّذِينَ اَنْتَعَمُوا بِهِمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمْرًا حَتَّىٰ اِذَا
 جَاءُوَهَا وَقَفَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا
 سَلِّمُوا عَلَيْنَا وَلِيُنَظَّرَكُمْ فَاذْخُلُوْهَا خَالِدِيْنَ ﴿۷۳﴾

(۱) یعنی ہم نے پیغمبروں کی تکذیب اور مخالفت کی، اس شقاوت کی وجہ سے جس کے ہم مستحق تھے، جب کہ ہم نے حق
 سے گریز کر کے باطل کو اختیار کیا، اس مضمون کو سورۃ الملک ۸-۱۰ میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

(۲) اہل ایمان و تقویٰ بھی گروہوں کی شکل میں جنت کی طرف لے جائے جائیں گے، پہلے مقررین، پھر برابر اس طرف
 درجہ بدرجہ، ہر گروہ ہم مرتبہ لوگوں پر مشتمل ہو گا۔ مثلاً انبیاء علیہم السلام، انبیاء علیہم السلام کے ساتھ، صدیقین، شہداء اپنے
 ہم جنسوں کے ساتھ، علمائے قرآن کے ساتھ، یعنی ہر صنف اپنی ہی صنف یا اس کی مثل کے ساتھ ہو گی۔ (ابن کثیر)

(۳) حدیث میں آتا ہے، جنت کے آٹھ دروازے ہیں، ان میں سے ایک ریان ہے، جس سے صرف روزے وارد اخل ہوں
 گے۔ (صحیح بخاری، نمبر ۲۲۵-۲۲۶، مسلم، نمبر ۸۰۸) اسی طرح دوسرے دروازوں کے بھی نام ہوں گے، جیسے باب الصلوٰۃ، باب
 الصدقتہ، باب الجھاد وغیرہ (صحیح بخاری، کتاب الصیام، مسلم، کتاب الزکوٰۃ، ہر دروازے کی چوڑائی چالیس سال
 کی مسافت کے برابر ہو گی، اس کے باوجود یہ بھرے ہوئے ہوں گے۔ (صحیح مسلم، کتاب الزہد) سب سے پہلے جنت کا
 دروازہ کھٹکھٹانے والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ (مسلم، کتاب الإیمان، باب انا اول الناس بشیخ، جنت میں
 سب سے پہلے جانے والے گروہ کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح اور دوسرے گروہ کے چہرے آسمان پر چمکنے والے
 ستاروں میں سے روشن ترین ستارے کی طرح چمکتے ہوں گے۔ جنت میں وہ بول و براز اور تھوک، بلغم سے پاک ہوں گے، ان
 کی کنکھیاں سونے کی اور پینہ کستوری ہو گا، ان کی انگلیٹیھیوں میں خوشبودار لکڑی ہو گی، ان کی بیویاں الحور العین ہوں گی، ان
 کا قد آدم علیہ السلام کی طرح ساتھ ہاتھ ہو گا۔ (صحیح بخاری، اول کتاب الانبیاء، صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری روایت
 سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مومن کو دو بیویاں ملیں گی، ان کے حسن و جمال کا یہ حال ہو گا کہ ان کی پنڈلی کا گودا گوشت کے پیچھے
 سے نظر آئے گا۔ (کتاب بدء الخلق، باب ماجاء فی صفة الجنة) بعض نے کہا یہ دو بیویاں حوروں کے علاوہ دنیا کی
 عورتوں میں سے ہوں گی۔ لیکن چونکہ ۷۲ حوروں والی روایت سنداً صحیح نہیں۔ اس لیے بظاہر یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ

لیے چلے جاؤ۔ (۷۳)

یہ کہیں گے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ہمیں اس زمین کا وارث بنا دیا کہ جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں پس عمل کرنے والوں کا کیا ہی اچھا بدلہ ہے۔ (۷۴)

اور تو فرشتوں کو اللہ کے عرش کے ارد گرد حلقہ باندھے ہوئے اپنے رب کی حمد و تسبیح کرتے ہوئے دیکھے گا^(۱) اور ان میں انصاف کا فیصلہ کیا جائے گا اور کہہ دیا جائے گا کہ ساری خوبی اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جانوں کا پالتار ہے۔ (۷۵)^(۲)

سورہ مؤمن مکی ہے اور اس میں پچاسی آیتیں اور نور کو ع ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَمْدٌ ۙ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۙ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

حم! (۱) اس کتاب کا نازل فرمانا^(۳) اس اللہ کی طرف سے ہے جو غالب اور دانائے۔ (۲)^(۴)

ہر جنتی کی کم از کم حور سمیت دو بیویاں ہوں گی۔ تاہم وَلَهُمْ فِيهَا مَا يَشْتَهُونَ کے تحت زیادہ بھی ممکن ہیں۔ واللہ اعلم (مزید دیکھے فتح الباری۔ باب مذکور)

(۱) قضائے الہی کے بعد جب اہل ایمان جنت میں اور اہل کفر و شرک جہنم میں چلے جائیں گے، آیت میں اس کے بعد کا نقشہ بیان کیا گیا ہے کہ فرشتے عرش الہی کو گھیرے ہوئے تسبیح و تحمید میں مصروف ہوں گے۔

(۲) یہاں حمد کی نسبت کسی ایک مخلوق کی طرف نہیں کی گئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز (ناطق و غیر ناطق) کی زبان پر حمد الہی کے ترانے ہوں گے۔

☆ اس سورت کو سورۃ عافرا اور سورۃ الطول بھی کہتے ہیں۔

(۳) یا تَنْزِيلٌ، مَنْزِلٌ کے معنی میں ہے، یعنی اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے جس میں جھوٹ نہیں۔

(۴) جو غالب ہے، اس کی قوت اور غلبے کے سامنے کوئی پر نہیں مار سکتا۔ علیم ہے، اس سے کوئی ذرہ تک پوشیدہ نہیں

گناہ کا بخشنے والا اور توبہ کا قبول فرمانے والا^(۱) سخت عذاب والا^(۲) انعام و قدرت والا^(۳) جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کی طرف واپس لوٹنا ہے۔ (۳)

اللہ تعالیٰ کی آیتوں میں وہی لوگ جھگڑتے ہیں جو کافر ہیں^(۴) پس ان لوگوں کا شہروں میں چلنا پھرنا آپ کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ (۵)^(۳)

قوم نوح نے اور ان کے بعد کے گروہوں نے بھی جھٹلایا تھا۔ اور ہر امت نے اپنے رسول کو گرفتار کر لینے کا ارادہ

غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي الْقَوْلِ
الْوَالِيَةِ إِلَهُهُ إِلَهُهُ الصَّيْرُ ۝

مَا يَأْتِيهِمْ فِي الْبَيْتِ اللَّهُ إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَا يَنْفِرُونَ
تَعْلَمُهُمْ فِي الْبِلَادِ ۝

كَذَبَتْ بَنَاتُهُمْ قَوْمٌ شُرُوبُ وَ الْأَحْزَابِ مِنْ بَعْدِهِمْ
وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ وَجَادِلُوا

چاہے وہ کتنے بھی کثیف پردوں میں چھپا ہو۔

(۱) گزشتہ گناہوں کو معاف کرنے والا اور مستقبل میں ہونے والی کوتاہیوں پر توبہ قبول کرنے والا ہے۔ یا اپنے دوستوں کے لیے غافر ہے اور کافر و مشرک اگر توبہ کریں تو ان کی توبہ قبول کرنے والا ہے۔

(۲) ان کے لیے جو آخرت پر دنیا کو ترجیح دیں اور تہمید و طغیان کا راستہ اختیار کریں یہ اللہ کے اس قول کی طرح ہی ہے۔ ﴿يَتَّبِعُوا بَنَاتِي أَنْتَا الْعَفْوَ الرَّحِيمُ * وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ﴾ — (الحجر، ۵۰-۴۹) ”میرے بندوں کو بتلا دو کہ میں غفور و رحیم ہوں اور میرا عذاب بھی نہایت دردناک ہے“ قرآن کریم میں اکثر جگہ یہ دونوں وصف ساتھ ساتھ بیان کیے گئے ہیں تاکہ انسان خوف اور رجا کے درمیان رہے۔ کیونکہ محض خوف ہی خوف، انسان کو رحمت و مغفرت الہی سے مایوس کر سکتا ہے اور نری امید گناہوں پر دلیر کر دیتی ہے۔

(۳) طَوَّلُ کے معنی فراخی اور تونگری کے ہیں، یعنی وہی فراخی اور تونگری عطا کرنے والا ہے۔ بعض کہتے ہیں اس کے معنی ہیں، انعام اور تفضل۔ یعنی اپنے بندوں پر انعام اور فضل کرنے والا ہے۔

(۴) اس جھگڑے سے مراد ناجائز اور باطل جھگڑا (جدال) ہے جس کا مقصد حق کی تکذیب اور اس کی تردید و تظلیل ہے۔ ورنہ جس جدال (بحث و مناظرہ) کا مقصد ایضاً حق، ابطال باطل اور منکرین و معترضین کے شہادت کا ازالہ ہو، وہ مذموم نہیں نہایت محمود و مستحسن ہے۔ بلکہ اہل علم کو تو اس کی تاکید کی گئی ہے، ﴿لَتَكْفِيَنَّكَ لِلنَّاسِ لَأَن تَأْتِيَهُمْ وَتَأْتِيَهُمْ﴾ (آل عمران، ۱۸۷) ”تم اسے لوگوں کے سامنے ضرور بیان کرنا، اسے چھپانا نہیں۔“ بلکہ اللہ کی نازل کردہ کتاب کے دلائل و براہین کو چھپانا اتنا سخت جرم ہے کہ اس پر کائنات کی ہر چیز لعنت کرتی ہے، (البقرہ، ۱۵۹)۔

(۵) یعنی یہ کافر و مشرک جو تجارت کرتے ہیں، اس کے لیے مختلف شہروں میں آتے جاتے اور کثیر منافع حاصل کرتے ہیں، یہ اپنے کفر کی وجہ سے جلد ہی مواخذہ الہی میں آجائیں گے، یہ مہلت ضرور دیئے جا رہے ہیں لیکن انہیں مہمل نہیں چھوڑا جائے گا۔

بِالْبَاطِلِ لِيُدْخِلَهُنَّ فِي الْعَذَابِ فَأَخَذْنَهُنَّ كَلَيْفَ
كَانَ عِقَابٍ ۝

وَلَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ
أَصْحَابُ النَّارِ ۝

الَّذِينَ يَخْمَلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ
رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا
وَسِعَتْ كُلُّ شَيْءٍ رَحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا
وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۝

رَبَّنَا وَأَدْخِلْهُمْ جَنَّاتٍ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدْتَهُمْ وَمَنْ صَلَحَ
مِنْ آبَائِهِمْ وَوَدَّعْتَهُمُ الرِّبَا نَأْتِ الْعَرْشِ

کیا^(۱) اور باطل کے ذریعہ کج بحثیاں کیں، تاکہ ان سے
حق کو بگاڑ دیں^(۲) پس میں نے ان کو پکڑ لیا، سو میری
طرف سے کیسی سزا ہوئی۔^(۳) (۵)

اور اسی طرح آپ کے رب کا حکم کافروں پر ثابت ہو گیا
کہ وہ دوزخی ہیں۔^(۴) (۶)

عرش کے اٹھانے والے اور اس کے اس پاس کے (فرشتے)
اپنے رب کی تسبیح حمد کے ساتھ ساتھ کرتے ہیں اور اس پر
ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لیے استغفار کرتے
ہیں، کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے ہر چیز کو اپنی
بخشش اور علم سے گھیر رکھا ہے، پس تو انہیں بخش دے جو
توبہ کریں اور تیری راہ کی پیروی کریں اور تو انہیں دوزخ
کے عذاب سے بھی بچالے۔^(۵) (۷)

اے ہمارے رب! تو انہیں بھیگلی والی جنتوں میں لے جا
جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے باپ دادوں

(۱) تاکہ اسے قیدیا قتل کر دیں یا سزا دیں۔

(۲) یعنی اپنے رسولوں سے انہوں نے بھگڑا لیا، جس سے مقصود حق بات میں کیرے نکالنا اور اسے کمزور کرنا تھا۔

(۳) چنانچہ میں نے ان حامیان باطل کو اپنے عذاب کی گرفت میں لے لیا، پس تم دیکھ لو ان کے حق میں میرا عذاب کس
طرح آیا اور کیسے انہیں حرف غلط کی طرح مٹا دیا گیا انہیں نشان عبرت بنا دیا گیا۔

(۴) مقصد اس سے اس بات کا اظہار ہے کہ جس طرح پچھلی امتوں پر تیرے رب کا عذاب ثابت ہوا اور وہ تباہ کر دی
گئیں، اگر یہ اہل مکہ بھی تیری محذوب اور مخالفت سے باز نہ آئے اور جدال بالباطل کو ترک نہ کیا تو یہ بھی اسی طرح
عذاب الہی کی گرفت میں آجائیں گے، پھر کوئی انہیں بچانے والا نہیں ہو گا۔

(۵) اس میں ملائکہ مقربین کے ایک خاص گروہ کا تذکرہ اور وہ جو کچھ کرتے ہیں، اس کی وضاحت ہے، یہ گروہ ہے ان
فرشتوں کا جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو عرش کے ارد گرد ہیں۔ ان کا ایک کام یہ ہے کہ یہ اللہ کی تسبیح و تحمید
کرتے ہیں، یعنی نقائص سے اس کی تنزیہ، کمالات اور خوبیوں کا اس کے لیے اثبات اور اس کے سامنے عجز و تذلل یعنی
(ایمان) کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسرا کام ان کا یہ ہے کہ یہ اہل ایمان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ عرش
کو اٹھانے والے فرشتے چار ہیں، مگر قیامت والے دن ان کی تعداد آٹھ ہو گی۔ (ابن کثیر)

الْحَكِيمِ ۝

وَقِهِمُ السَّيِّئَاتِ وَمَنْ تَقِ السَّيِّئَاتِ يَوْمَئِذٍ
فَعَدَّ رَجْمَتَهُ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْعَزْمُ الْعَظِيمُ ۝

إِنَّ الْإِذِينَ كَفَرُوا يُبَادُونَ لَمَقَّتْ اللَّهُ أَبْصَارُ
مَنْ يَمُوتُ أَفْسُكُوا إِذْ تُدْعَوْنَ إِلَى الْإِيمَانِ
فَتَكْفُرُونَ ۝

قَالُوا رَبَّنَا آمَنَّا الْفِتْنَةَ وَأَحْيَيْنَا الْمُتَنَبِّئِينَ فَأَعْتَرَفْنَا

اور بیویوں اور اولاد میں سے (بھی) ان (سب) کو جو نیک
عمل ہیں۔^(۱) یقیناً تو تو غالب و باحکمت ہے۔ (۸)
انہیں برائیوں سے بھی محفوظ رکھ،^(۲) حق تو یہ ہے کہ
اس دن تو نے جسے برائیوں سے بچالیا اس پر تو نے
رحمت کر دی اور بہت بڑی کامیابی تو یہی ہے۔^(۳) (۹)
بے شک جن لوگوں نے کفر کیا انہیں یہ آواز دی جائے
گی کہ یقیناً اللہ کا تم پر غصہ ہونا اس سے بہت زیادہ ہے جو
تم غصہ ہوتے تھے اپنے جی سے، جب تم ایمان کی طرف
بلائے جاتے تھے پھر کفر کرنے لگتے تھے۔^(۴) (۱۰)
وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دوبار مارا

(۱) یعنی ان سب کو جنت میں جمع فرما دے تاکہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ اس مضمون کو
دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا گیا ہے، ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ
شَيْئًا ۚ﴾ (الطہور: ۳۱) ”وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہی کی پیروی ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ کی۔ ملا دیا ہم نے ان کے
ساتھ ان کی اولاد کو اور ہم نے ان کے عملوں میں سے کچھ کم نہیں کیا۔“ یعنی سب کو جنت میں اس طرح یکساں مرتبہ
دے دیا کہ ادنیٰ کو بھی اعلیٰ مقام عطا کر دیا۔ یہ نہیں کیا کہ اعلیٰ مقام میں کمی کر کے انہیں ادنیٰ مقام پر لے آئے، بلکہ ادنیٰ کو
اٹھا کر اعلیٰ کر دیا اور اس کے عمل کی کمی کو اپنے فضل و کرم سے پورا کر دیا۔

(۲) سینات سے مراد سماں عقوبات ہیں یا پھر جزا محذوف ہے یعنی انہیں آخرت کی سزاؤں سے یا برائیوں کی جزا سے بچانا۔

(۳) یعنی آخرت کے عذاب سے بچ جانا اور جنت میں داخل ہو جانا، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اس لیے کہ اس
جیسی کوئی کامیابی نہیں اور اس کے برابر کوئی نجات نہیں۔ ان آیات میں اہل ایمان کے لیے دو عظیم خوش خبریاں ہیں،
ایک تو یہ کہ فرشتے ان کے لیے غائبانہ دعا کرتے ہیں۔ (جس کی حدیث میں بڑی فضیلت وارد ہے) دوسری یہ کہ اہل
ایمان کے خاندان جنت میں اکٹھے ہو جائیں گے۔ جَعَلْنَا اللَّهُ مِنَ الَّذِينَ يُنَٰلِحُهُمُ اللَّهُ بِآبَائِهِمُ الصَّالِحِينَ۔

(۴) مَفْتَحُ، سخت ناراضی کو کہتے ہیں۔ اہل کفر جو اپنے کو جہنم کی آگ میں جھلتے دیکھیں گے، تو اپنے آپ پر سخت ناراض
ہوں گے، اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ دنیا میں جب تمہیں ایمان کی دعوت دی جاتی تھی اور تم انکار کرتے تھے، تو
اللہ تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ تم پر ناراض ہوتا تھا جتنا تم آج اپنے آپ پر ہو رہے ہو۔ یہ اللہ کی اس ناراضی ہی کا نتیجہ
ہے کہ آج تم جہنم میں ہو۔

يَذُوقُونَ أَهْلَ إِلَىٰ حُرُوفٍ مِّنْ سَبِيلٍ ⑪

ذَلِكُمْ بِأَنَّهُ إِذَا دُعِيَ اللَّهُ وَحْدًا كَفَرْتُمْ وَلَنْ نُّبَدِّلَ بِهِ
تُؤْمِنُوا فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ ⑫

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ آيَاتِهِ وَيُنَزِّل لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ رِزْقًا
وَمَا تَبْتَدُونَ إِلَّا مَن يُنِيبُ ⑬

اور دو بار ہی جلایا،^(۱) اب ہم اپنے گناہوں کے اقراری
ہیں،^(۲) تو کیا اب کوئی راہ نکلنے کی بھی ہے؟^(۳) ⑪

یہ (عذاب) تمہیں اس لیے ہے کہ جب صرف اکیلے اللہ
کا ذکر کیا جاتا تو تم انکار کر جاتے تھے اور اگر اس کے ساتھ
کسی کو شریک کیا جاتا تھا تو تم مان لیتے^(۴) تھے پس اب
فیصلہ اللہ بلند و بزرگ ہی کا ہے۔^(۵) ⑫

وہی ہے جو تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور تمہارے
لیے آسمان سے روزی اتارتا ہے،^(۶) نصیحت تو صرف

(۱) جمہور مفسرین کی تفسیر کے مطابق، دو موتوں میں سے پہلی موت تو وہ نطفہ ہے جو باپ کی پشت میں ہوتا ہے۔ یعنی اس
کے وجود (ہست) سے پہلے اس کے عدم وجود (نہست) کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور دوسری موت وہ ہے جس سے
انسان اپنی زندگی گزار کر ہمنکار ہوتا اور اس کے بعد قبر میں دفن ہوتا ہے اور دو زندگیوں میں سے پہلی زندگی، یہ دنیوی
زندگی ہے، جس کا آغاز ولادت سے اور اختتام، وفات پر ہوتا ہے۔ اور دوسری زندگی وہ ہے جو قیامت والے دن قبروں
سے اٹھنے کے بعد حاصل ہوگی۔ انہی دو موتوں اور دو زندگیوں کا تذکرہ ﴿وَكُنْتُمْ أََمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ﴾
(البقرة: ۲۸) میں بھی کیا گیا ہے۔

(۲) یعنی جہنم میں اعتراف کریں گے، جہاں اعتراف کا کوئی فائدہ نہیں اور وہاں پشیمان ہونگے جہاں پشیمانی کی کوئی حیثیت نہیں۔

(۳) یہ وہی خواہش ہے جس کا تذکرہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے کہ ہمیں دوبارہ زمین پر بھیج دیا جائے،
ناکہ ہم نیکیاں کما کر لائیں۔

(۴) یہ ان کے جہنم سے نہ نکلے جانے کا سبب بیان فرمایا کہ تم دنیا میں اللہ کی توحید کے منکر تھے اور شرک تمہیں
مرغوب تھا، اس لیے اب جہنم کے دائمی عذاب کے سوا تمہارے لیے کچھ نہیں۔

(۵) اسی ایک اللہ کا حکم ہے کہ اب تمہارے لیے جہنم کا عذاب ہمیشہ کے لیے ہے اور اس سے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں۔
جو علیؑ یعنی ان باتوں سے بلند ہے کہ اس کی ذات یا صفات میں کوئی اس جیسا ہو اور کبیرؑ یعنی ان باتوں سے بہت بڑا
ہے کہ اس کی کوئی مثل ہو یا بیوی اور اولاد ہو یا شریک ہو۔

(۶) یعنی پانی جو تمہارے لیے تمہاری روزیوں کا سبب ہے یہاں اللہ تعالیٰ نے اظہار آیات کو انزال رزق کے ساتھ جمع
فرما دیا ہے۔ اس لیے کہ آیات قدرت کا اظہار، ادیان کی بنیاد ہے اور روزیاں ابدان کی بنیاد ہیں۔ یوں یہاں دونوں
بنیادوں کو جمع فرما دیا گیا ہے۔ (فتح القدیر)

وہی حاصل کرتے ہیں جو (اللہ کی طرف) رجوع کرتے ہیں۔^(۱) (۱۳)

تم اللہ کو پکارتے رہو اس کے لیے دین کو خالص کر کے گو کافر برائیاں۔^(۲) (۱۴)

بلند درجوں والا عرش کا مالک وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے وحی نازل فرماتا ہے،^(۳) تاکہ وہ ملاقات کے دن سے ڈرائے۔ (۱۵)

جس دن سب لوگ ظاہر ہو جائیں گے،^(۴) ان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گی۔ آج کس کی بادشاہی ہے؟^(۵) فقط اللہ واحد و تبارک۔^(۶) (۱۶)

آج ہر نفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے گا۔ آج (کسی قسم کا) ظلم نہیں، یقیناً اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب کرنے

فَادْعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ﴿۱۳﴾

رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ

عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿۱۴﴾

يَوْمَ هُمْ بَارِزُونَ لَا يَخْفَى عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ لِيْلِينَ

الْمَلِكِ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَلِجِدِ الْعَقَابِرِ ﴿۱۵﴾

أَيُّومَ نُجْزِي كُلَّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظَلَمَ الْيَوْمَ مِنَ اللَّهِ

سَرِيرَةً الْجَسَابِ ﴿۱۶﴾

(۱) اللہ کی اطاعت کی طرف، جس سے ان کے دلوں میں آخرت کا خوف پیدا ہوتا ہے اور احکام و فرائض الہی کی پابندی کرتے ہیں۔

(۲) یعنی جب سب کچھ اللہ ہی اکیلا کرنے والا ہے تو کافروں کو چاہے، کتنا بھی ناگوار گزرے، صرف اسی ایک اللہ کو پکارو، اس کے لیے عبادت و اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔

(۳) رُوح سے مراد وحی ہے جو وہ بندوں میں سے ہی کسی کو رسالت کے لیے چن کر، اس پر نازل فرماتا ہے، وحی کو روح سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ جس طرح روح میں انسانی زندگی کی بقا و سلامتی کا راز مضمر ہے۔ اسی طرح وحی سے بھی ان انسانی قلوب میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے جو پہلے کفر و شرک کی وجہ سے مردہ ہوتے ہیں۔

(۴) یعنی زندہ ہو کر قبروں سے باہر نکل کھڑے ہوں گے۔

(۵) یہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ پوچھے گا، جب سارے انسان اس کے سامنے میدان محشر میں جمع ہوں گے، ”اللہ تعالیٰ زمین کو اپنی مٹھی میں اور آسمان کو اپنے دائیں ہاتھ میں لپیٹ لے گا، اور کسے گامیں بادشاہ ہوں، زمین کے بادشاہ کہاں ہیں؟ (صحیح بخاری، سورۃ زمر)

(۶) جب کوئی نہیں بولے گا تو یہ جواب اللہ تعالیٰ خود ہی دے گا۔ بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک فرشتہ منادی کرے گا، جس کے ساتھ ہی تمام کافر اور مسلمان بیک آواز یہی جواب دیں گے۔ (فتح القدیر)

والا ہے۔ (۱۷) (۱)

اور انہیں بہت ہی قریب آنے والی (۲) (قیامت سے) آگاہ کر دیجئے، جب کہ دل حلق تک پہنچ جائیں گے اور سب خاموش ہوں گے، (۳) ظالموں کا نہ کوئی دلی دوست ہو گا نہ سفارشی، کہ جس کی بات مانی جائے گی۔ (۱۸)

وہ آنکھوں کی خیانت کو اور سینوں کی پوشیدہ باتوں کو (خوب) جانتا ہے۔ (۱۹) (۳)

اور اللہ تعالیٰ ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا اس کے سوا جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ نہیں کر سکتے، (۵) بیشک اللہ تعالیٰ خوب سنتا خوب دیکھتا ہے۔ (۲۰)

کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا نتیجہ کیسا کچھ ہوا؟ وہ باعتبار

وَأَنْذَرْتَهُمْ يَوْمَ الْأَرْفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاطْمِينَةٍ
مَالِ الظَّالِمِينَ مِنْ حَيْبِهِمْ وَلَا شَفِيعَ لَهُمْ ۗ يُطَاءُ ۝

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ۝

وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ
لَا يَقْضُونَ بَشَيْءَ إِنَّ اللَّهَ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الَّذِينَ كَانُوا مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً

(۱) اس لیے کہ اسے بندوں کی طرح غور و فکر کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

(۲) آرِفَةٌ کے معنی ہیں قریب آنے والی۔ یہ قیامت کا نام ہے، اس لیے کہ وہ بھی قریب آنے والی ہے۔

(۳) یعنی اس دن خوف کی وجہ سے دل اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے۔ كَاطْمِينِينَ غم سے بھرے ہوئے، یا روتے ہوئے، یا خاموش، اس کے تینوں معنی کیے گئے ہیں۔

(۴) اس میں اللہ تعالیٰ کے علم کامل کا بیان ہے کہ اسے تمام اشیا کا علم ہے۔ چھوٹی ہو یا بڑی، باریک ہو یا موٹی، اعلیٰ مرتبے کی ہو یا چھوٹے مرتبے کی۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ جب اس کے علم و احاطہ کا یہ حال ہے تو اس کی نافرمانی سے اجتناب اور صحیح معنوں میں اس کا خوف اپنے اندر پیدا کرے۔ آنکھوں کی خیانت یہ ہے کہ دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا جائے۔ جیسے راہ چلتے کسی حسین عورت کو کنکھیوں سے دیکھنا۔ دینوں کی باتوں میں (وہ وسوسے بھی آجاتے ہیں جو انسان کے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، وہ جب تک وسوسے ہی رہتے ہیں یعنی ایک لمحہ گزراں کی طرح آتے اور ختم ہو جاتے ہیں، تب تک تو وہ قابلِ مواخذہ نہیں ہوں گے۔ لیکن جب وہ عزائم کا روپ دھار لیں تو پھر ان کا مواخذہ ہو سکتا ہے، چاہے ان پر عمل کرنے کا انسان کو موقع نہ ملے۔

(۵) اس لیے کہ انہیں کسی چیز کا علم ہے نہ کسی پر قدرت، وہ بے خبر بھی ہیں اور بے اختیار بھی، جب کہ فیصلے کے لیے علم و اختیار دونوں چیزوں کی ضرورت ہے اور یہ دونوں خوبیاں صرف اللہ کے پاس ہیں، اس لیے صرف اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ فیصلہ کرے اور وہ یقیناً حق کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا، کیونکہ اسے کسی کا خوف ہو گا نہ کسی سے حرص و طمع۔

قوت و طاقت کے اور باعتبار زمین میں اپنی یادگاروں کے ان سے بہت زیادہ تھے، پس اللہ نے انہیں ان کے گناہوں پر پکڑ لیا اور کوئی نہ ہوا جو انہیں اللہ کے عذاب سے بچا لیتا۔^(۲۱)

یہ اس وجہ سے کہ ان کے پاس ان کے پیغمبر معجزے لے لے کر آتے تھے تو وہ انکار کر دیتے تھے،^(۲) پس اللہ انہیں پکڑ لیتا تھا۔ یقیناً وہ طاقتور اور سخت عذاب والا ہے۔^(۲۲)

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی آیتوں اور کھلی دلیلوں کے ساتھ بھیجا۔^(۲۳)

فرعون ہامان اور قارون کی طرف تو انہوں نے کہا (یہ تو) جادوگر اور جھوٹا ہے۔^(۲۴)

وَإِنَّا إِنَّا فِي الْأَرْضِ فَاخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِن وَّاقٍ ۝

ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَكَفَرُوا فَاخَذَهُمُ اللَّهُ إِنَّهُ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ۝

إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُونَ فَقَالُوا سِحْرٌ كَذَّابٌ ۝

(۱) گزشتہ آیات میں احوال آخرت کا بیان تھا، اب دنیا کے احوال سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ ذرا زمین میں چل پھر کر ان قوموں کا انجام دیکھیں، جو ان سے پہلے اس جرم مکذیب میں ہلاک کی گئیں، جس کا ارتکاب یہ کر رہے ہیں۔ دراصل ہا ایک گزشتہ قومیں قوت و آثار میں ان سے کہیں بڑھ کر تھیں، لیکن جب ان پر اللہ کا عذاب آیا تو انہیں کوئی نہیں بچا سکا۔ اسی طرح تم پر بھی عذاب آسکتا ہے، اور اگر یہ آگیا تو پھر کوئی تمہارا پشت پناہ نہ ہو گا۔

(۲) یہ ان کی ہلاکت کی وجہ بیان کی گئی ہے، اور وہ ہے اللہ کی آیتوں کا انکار اور پیغمبروں کی مکذیب۔ اب سلسلہ نبوت و رسالت تو بند ہے تاہم آفاق و انفس میں بے شمار آیات الہی، کھری اور پھیلی ہوئی ہیں۔ علاوہ ازیں وعظ و تذکیر اور دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے علماء اور داعیان حق ان کی وضاحت اور نشاندہی کے لیے موجود ہیں۔ اس لیے آج بھی جو آیات الہی سے اعراض اور دین و شریعت سے غفلت کرے گا، اس کا انجام مکذبین اور منکرین رسالت سے مختلف نہیں ہو گا۔

(۳) آیت سے مراد وہ نشانیاں بھی ہو سکتی ہیں جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، یا عصا اور ید بیضا والے دو بڑے واضح معجزات بھی سُلْطٰنٍ مُّبِينٍ سے مراد قوی دلیل اور حجت واضح، جس کا کوئی جواب ان کی طرف سے ممکن نہیں تھا، بجز ڈھٹائی اور بے شرمی کے۔

(۴) فرعون، مصر میں آباد قبط کا بادشاہ تھا، بڑا ظالم و جاہل اور رب اعلیٰ ہونے کا دعوے دار۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا اور اس پر طرح طرح کی سختیاں کرتا تھا، جیسا کہ قرآن کے متعدد مقامات پر اس کی تفصیل ہے۔ ہامان، فرعون کا وزیر اور مشیر خاص تھا۔ قارون اپنے وقت کا مال دار ترین آدمی تھا، ان سب نے پہلے لوگوں کی طرح

پس جب ان کے پاس (موسیٰ علیہ السلام) ہماری طرف سے (دین) حق کو لے کر آئے تو انہوں نے کہا کہ اس کے ساتھ جو ایمان والے ہیں ان کے لڑکوں کو تو مار ڈالو اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھو^(۱) اور کافروں کی جو حیلہ سازی ہے وہ غلطی میں ہی ہے۔^(۲) (۲۵)

اور فرعون نے کہا مجھے چھوڑو کہ میں موسیٰ (علیہ السلام) کو مار ڈالوں اور^(۳) اسے چاہیے کہ اپنے رب کو پکارے،^(۴) مجھے تو ڈر ہے کہ یہ کہیں تمہارا دین نہ بدل ڈالے یا ملک میں کوئی (بہت بڑا) فساد برپا نہ کر دے۔^(۵) (۲۶)

فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّنَا قَالُوا أَتَأْتِلُوا أَتْيَاءَ
الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ وَاسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ وَمَا كَيْدُ الْكَافِرِينَ
إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذُرِّيَّتِي أَقْتُلْ مُوسَى وَلْيَدْعُ رَبَّهُ إِنِّي
أَخَافُ أَنْ يُبَدِّلَ دِينَكُمْ أَوْ أَنْ يُظْهِرَ فِي
الْأَرْضِ الْفَسَادَ ۝

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی اور انہیں جا دو گرا اور کذاب کہا۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا گیا ﴿كَذَلِكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاءَ مَا يَدْعُونَ ۝﴾ (سورۃ الذاریات: ۵۲-۵۳) ”اسی طرح جو لوگ ان سے
پہلے گزرے ہیں، ان کے پاس جو بھی نبی آیا۔ انہوں نے کہہ دیا کہ یا تو یہ جا دو گرا ہے یا دیوانہ ہے۔ کیا یہ اس بات کی ایک
دوسرے کو وصیت کرتے گئے ہیں؟ نہیں بلکہ یہ سب کی سب سرکش ہیں۔“

(۱) فرعون یہ کام پہلے بھی کر رہا تھا تاکہ وہ بچہ پیدا نہ ہو، جو نجومیوں کی پیش گوئی کے مطابق، اس کی بادشاہت کے لیے
خطرے کا باعث تھا۔ یہ دوبارہ حکم اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تذلیل و اہانت کے لیے دیا، نیز تاکہ بنی اسرائیل
موسیٰ علیہ السلام کے وجود کو اپنے لیے مصیبت اور نحوست کا باعث سمجھیں، جیسا کہ فی الواقع انہوں نے کہا ﴿وَأُوذِيَ نِسَاؤُهُمْ
قَبْلَ أَنْ تَأْتِيَنَّهُنَّ وَرِمْنَ بِغِدَابٍ مَلْحُومًا﴾ (الأعراف: ۱۲۹) ”اے موسیٰ (علیہ السلام)! تیرے آنے سے قبل بھی ہم اذیتوں سے
دوچار تھے اور تیرے آنے کے بعد بھی ہمارا یہی حال ہے“

(۲) یعنی اس سے جو مقصد وہ حاصل کرنا چاہتا تھا کہ بنی اسرائیل کی قوت میں اضافہ اور اس کی عزت میں کمی نہ ہو۔ یہ اسے
حاصل نہیں ہوا، بلکہ اللہ نے فرعون اور اس کی قوم کو یہی غرق کر دیا اور بنی اسرائیل کو بابرکت زمین کا وارث بنا دیا۔

(۳) یہ غالباً فرعون نے ان لوگوں سے کہا جو اسے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے سے منع کرتے تھے۔
(۴) یہ فرعون کی دیدہ دلیری کا اظہار ہے کہ میں دیکھوں گا، اس کا رب اسے کیسے بچاتا ہے، اسے پکار کر دیکھ لے۔ یا رب
ہی کا انکار ہے کہ اس کا کون سا رب ہے جو بچالے گا، کیونکہ رب تو وہ اپنے آپ کو کتا تھا۔

(۵) یعنی غیر اللہ کی عبادت سے ہٹا کر ایک اللہ کی عبادت پر نہ لگا دے یا اس کی وجہ سے فساد نہ پیدا ہو جائے۔ مطلب یہ
تھا کہ اس کی دعوت اگر میری قوم کے کچھ لوگوں نے قبول کر لی، تو وہ نہ قبول کرنے والوں سے بحث و تکرار کریں گے
جس سے ان کے درمیان لڑائی جھگڑا ہو گا جو فساد کا ذریعہ بنے گا یوں دعوت توحید کو اس نے فساد کا سبب اور اہل توحید کو

موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا میں اپنے اور تمہارے رب کی پناہ میں آتا ہوں ہر اس تکبر کرنے والے شخص (کی برائی) سے جو روز حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔^(۱) (۲۷)

اور ایک مومن شخص نے، جو فرعون کے خاندان میں سے تھا اور اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا، کہا کہ کیا تم ایک شخص کو محض اس بات پر قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے اور تمہارے رب کی طرف سے دلیلیں لے کر آیا ہے،^(۲) اگر وہ جھوٹا ہو تو اس کا جھوٹ اسی پر ہے اور اگر وہ سچا ہو، تو جس (عذاب) کا وہ تم سے وعدہ کر رہا ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ تو تم پر آ پڑے گا،^(۳) اللہ تعالیٰ اس کی رہبری نہیں کرتا جو حد سے گزر جانے والے اور جھوٹے ہوں۔^(۴) (۲۸)

وَقَالَ مُوسَىٰ إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ مِنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَا يُؤْمِنُ بَيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾

وَقَالَ نَجِبٌ مُؤْمِنٌ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ ۚ وَإِنْ يَكْفُرْ بِمَا فَتَحْنَا لَكَ مِنْهُ ۖ وَإِنْ يَكْ صَادِقًا يُصِيبْكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾

فسادی قرار دیا۔ دراصل حالیکہ فسادی وہ خود تھا اور غیر اللہ کی عبادت ہی فساد کی جڑ ہے۔

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم میں جب یہ بات آئی کہ فرعون مجھے قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو انہوں نے اللہ سے اس کے شر سے بچنے کے لیے دعا مانگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دشمن کا خوف ہوتا تو یہ دعا پڑھتے «اللَّهُمَّ إِنَّا نَجْعَلُكَ فِي نُحُورِهِمْ وَنَعُوذُ بِكَ مِنْ شُرُورِهِمْ» (مسند أحمد ۴/۳۱۵) ”اے اللہ! ہم تجھ کو ان کے مقابلے میں کرتے ہیں اور ان کی شرارتوں سے تیری پناہ طلب کرتے ہیں۔“

(۲) یعنی اللہ کی ربوبیت پر وہ ایمان یوں ہی نہیں رکھتا، بلکہ اس کے پاس اپنے اس موقف کی واضح دلیلیں ہیں۔
(۳) یہ اس نے بطور تمیز کے کہا، کہ اگر اس کے دلائل سے تم مطمئن نہیں اور اس کی صداقت اور اس کی دعوت کی صحت تم پر واضح نہیں ہوئی، تب بھی عقل و دانش اور احتیاط کا تقاضا ہے کہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے، اس سے تعرض نہ کیا جائے۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو اللہ تعالیٰ خود ہی اسے اس جھوٹ کی سزا دینا و آخرت میں دے دے گا۔ اور اگر وہ سچا ہے اور تم نے اسے ایذا نہیں پہنچائیں تو پھر یقیناً وہ تمہیں جن عذابوں سے ڈراتا ہے، تم پر ان میں سے کوئی عذاب آسکتا ہے۔

(۴) اس کا مطلب ہے کہ اگر وہ جھوٹا ہوتا (جیسا کہ تم باور کراتے ہو) تو اللہ تعالیٰ اسے دلائل و معجزات سے نہ نوازتا، جب کہ اس کے پاس یہ چیزیں موجود ہیں۔ دوسرا مطلب ہے کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اللہ تعالیٰ خود ہی اسے ذلیل اور ہلاک کر دے گا، تمہیں اس کے خلاف کوئی اقدام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اے میری قوم کے لوگو! آج تو بادشاہت تمہاری ہے کہ اس زمین پر تم غالب^(۱) ہو لیکن اگر اللہ کا عذاب ہم پر آگیا تو کون ہماری مدد کرے گا؟^(۲) فرعون بولا، میں تو تمہیں وہی رائے دے رہا ہوں جو خود دیکھ رہا ہوں اور میں تو تمہیں بھلائی کی راہ ہی بتلا رہا ہوں۔^(۳) (۲۹)

اس مومن نے کہا اے میری قوم! (کے لوگو) مجھے تو اندیشہ ہے کہ تم پر بھی ویسا ہی روز (بد عذاب) نہ آئے جو اور امتوں پر آیا۔ (۳۰)

جیسے امت نوح اور عاد و ثمود اور ان کے بعد والوں کا (حال ہوا)،^(۴) اللہ اپنے بندوں پر کسی طرح کا ظلم کرنا نہیں چاہتا۔^(۵) (۳۱)

اور مجھے تم پر ہانک پکار کے دن کا بھی ڈر ہے۔^(۶) (۳۲)

يَقَوْمِ لَكُمْ الْمُنْتَلِكُ الْيَوْمَ ظَهَرْنَا فِي الْأَرْضِ قَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنْ بَأْسِ اللَّهِ إِنْ جَاءَنَا مَا قَالَ فِرْعَوْنُ مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَرَىٰ وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّسُولِ ۝

وَقَالَ الَّذِينَ آمَنُوا يَقَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ ۝

مِثْلَ ذَابِ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظَلْمًا لِلْوَمَانِ ۝

وَيَقَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۝

(۱) یعنی یہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ تمہیں زمین پر غلبہ عطا فرمایا اس کا شکر ادا کرو! اور اس کے رسول کی تکذیب کر کے اللہ کی ناراضی مول نہ لو۔

(۲) یہ فوجی اور لشکر تمہارے کچھ کام نہ آئیں گے، نہ اللہ کے عذاب ہی کو ٹال سکیں گے اگر وہ آگیا۔ یہاں تک اس مومن کا کلام تھا جو ایمان چھپائے ہوئے تھا۔

(۳) فرعون نے اپنے دنیوی جاہ و جلال کی بنیاد پر جھوٹ بولا اور کہا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں، وہی تمہیں بتلا رہا ہوں اور میری بتلائی ہوئی راہ ہی صحیح ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ ﴿وَمَا أَمْضُوْنَ إِلَّا فِي سَبِيلِنَا﴾ (ہود-۱۷)

(۴) یہ اس مومن آدمی نے دوبارہ اپنی قوم کو ڈرایا کہ اگر اللہ کے رسول کی تکذیب پر ہم اڑے رہے، تو خطرہ ہے کہ گزشتہ قوموں کی طرح عذاب الہی کی گرفت میں آجائیں گے۔

(۵) یعنی اللہ نے جن کو بھی ہلاک کیا، ان کے گناہوں کی پاداش میں اور رسولوں کی تکذیب و مخالفت کی وجہ سے ہی ہلاک کیا، ورنہ وہ شفیق و رحیم رب اپنے بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ ہی نہیں کرتا۔ گویا قوموں کی ہلاکت، یہ ان پر اللہ کا ظلم نہیں ہے بلکہ قانون مکافات کا ایک لازمی نتیجہ ہے جس سے کوئی قوم اور فرد مستثنیٰ نہیں۔

از مکافات عمل غافل مشو - گندم از گندم بروید جو از جو

(۶) تناد یعنی کے معنی ہیں۔ ایک دوسرے کو پکارنا، قیامت کو «يَوْمَ التَّنَادِ» اس لیے کہا گیا ہے کہ اس دن ایک دوسرے کو

جس دن تم پیٹھ پھیر کر لوٹو گے،^(۱) تمہیں اللہ سے پجانے والا کوئی نہ ہو گا اور جسے اللہ گمراہ کر دے اس کا ہادی کوئی نہیں۔^(۲) (۳۳)

اور اس سے پہلے تمہارے پاس (حضرت) یوسف دلیلیں لے کر آئے،^(۳) پھر بھی تم ان کی لائی ہوئی (دلیل) میں شک و شبہ ہی کرتے رہے^(۴) یہاں تک کہ جب ان کی وفات^(۵) ہو گئی تو کہنے لگے ان کے بعد تو اللہ کسی رسول کو بھیجے گا ہی نہیں،^(۶) اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے ہر اس شخص کو جو حد سے بڑھ جانے والا شک و شبہ کرنے والا ہو۔^(۷) (۳۳)

يَوْمَ تُولٰٓئِن مُّذٰبٍ مِّنْ مَّا لَكُم مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عٰلِمٍۭ وَمَنْ يُّضِلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۝۳۳

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلِ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَاكٍۭ مِّمَّا جَاءَكُمْ رَبُّهُ حَقًّۭیْۤ اِذَا هَلَكَ لَكُمْ مِّنْ يُّبْعَثُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهِۦٓ ۝۳۳۴ سُوْرَةُ اٰلِ اِيْمَانٍ ۝۳۳۴

پکاریں گے۔ اہل جنت اہل نار کو اور اہل نار اہل جنت کو ندائیں دیں گے۔ (الأعراف-۳۸، ۳۹) بعض کہتے ہیں کہ میزان کے پاس ایک فرشتہ ہو گا، جس کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہو گا، اس کی بد بختی کا یہ فرشتہ چیخ کر اعلان کرے گا، بعض کہتے ہیں کہ عملوں کے مطابق لوگوں کو پکارا جائے گا جیسے اہل جنت کو اے جنتیو! اور اہل جہنم کو اے جہنمیو! امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام بغوی کا یہ قول بہت اچھا ہے کہ ان تمام باتوں ہی کی وجہ سے یہ نام رکھا گیا ہے۔

(۱) یعنی موقف (میدان محشر) سے جہنم کی طرف جاؤ گے، یا حساب کے بعد وہاں سے بھاگو گے۔

(۲) جو اسے ہدایت کا راستہ بتا سکے یعنی اس پر چلا سکے۔

(۳) یعنی اے اہل مصر! حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل تمہارے اسی علاقے میں، جس میں تم آباد ہو، حضرت یوسف علیہ السلام بھی دلائل و براہین کے ساتھ آئے تھے۔ جس میں تمہارے آباؤ اجداد کو ایمان کی دعوت دی گئی تھی یعنی جآءَکُمْ سے مراد جآءَ اِلَیْ اَبَانِکُمْ ہے یعنی تمہارے آباؤ اجداد کے پاس آئے۔

(۴) لیکن تم ان پر بھی ایمان نہیں لائے اور ان کی دعوت میں شک و شبہ ہی کرتے رہے۔

(۵) یعنی یوسف علیہ السلام پیغمبر کی وفات ہو گئی۔

(۶) یعنی تمہارا شیوہ چونکہ ہر پیغمبر کی تکذیب اور مخالفت ہی رہا ہے، اس لیے سمجھتے تھے کہ اب کوئی رسول ہی نہیں آئے گا، یا یہ مطلب ہے کہ رسول کا آنا یا نہ آنا، تمہارے لیے برابر ہے یا یہ مطلوب ہے کہ اب ایسا با عظمت انسان کہاں پیدا ہو سکتا ہے جو رسالت سے سرفراز ہو۔ گویا بعد از مرگ حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت کا اعتراف تھا۔ اور بہت سے لوگ ہر اہم ترین انسان کی وفات کے بعد یہی کہتے ہیں۔

(۷) یعنی اس واضح گمراہی کی طرح، جس میں تم مبتلا ہو، اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو بھی گمراہ کرتا ہے جو نہایت کثرت سے

جو بغیر کسی سند کے جو ان کے پاس آئی ہو اللہ کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں،^(۱) اللہ کے نزدیک اور مومنوں کے نزدیک یہ تو بہت بڑی ناراضگی کی چیز ہے،^(۲) اللہ تعالیٰ اسی طرح ہر ایک مغرور سرکش کے دل پر مہر کر دیتا ہے۔^(۳) (۳۵)

فرعون نے کہا اے ہامان! میرے لیے ایک بالاخانہ^(۴) بنا شاید کہ میں آسمان کے جو دروازے ہیں۔^(۵) (۳۶)

(ان) دروازوں تک پہنچ جاؤں اور موسیٰ کے معبود کو جھانک لوں^(۶) اور بیشک میں سمجھتا ہوں وہ جھوٹا ہے^(۷) اور اسی طرح فرعون کی بدکرداریاں اسے بھلی دکھائی گئیں^(۸) اور راہ سے روک دیا گیا^(۸) اور فرعون کی (ہر) حیلہ سازی تباہی میں ہی رہی۔^(۹) (۳۷)

لَا يَذِينَ مُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِدِينِ مُسْلِمْ أَنَّهُمْ كَرَمَاتًا
عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ
قَلْبٍ مُّكِبٍ وَجَبَلٍ ۝

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا لَأَنبَاءِ ابْنِ بَنِي صَرَاحَةَ الْكَلْبِ الْآبِلَةُ الْكَلْبَابِ ۝

أَسْبَابُ الصَّلَاحِ فَطَلَبَهُ إِلَىٰ الرَّسُولِ مَا فِي كَلْبَتِهِ كَاذِبًا
وَكَذَلِكَ يُذِينَ لِفِرْعَوْنَ مَوَدَّةً عَلَيْهِمْ وَصَدَّ عَنِ السَّبِيلِ وَمَا
كَيْدُ فِرْعَوْنَ إِلَّا فِي تَبَابٍ ۝

- گناہوں کا ارتکاب کرتا اور اللہ کے دین، اس کی وحدانیت اور اس کے وعدوں و وعیدوں میں شک کرتا ہے۔
- (۱) یعنی اللہ کی طرف سے اتاری ہوئی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں ہے، اس کے باوجود اللہ کی توحید اور اس کے احکام میں جھگڑتے ہیں، جیسا کہ ہر دور کے اہل باطل کا وطیرہ رہا ہے۔
- (۲) یعنی ان کی اس حرکت شیعہ سے اللہ تعالیٰ ہی ناراض نہیں ہوتا، اہل ایمان بھی اس کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔
- (۳) یعنی جس طرح ان مجادلین کے دلوں پر مرگادی گئی ہے، اسی طرح ہر اس شخص کے دل پر مرگادی جاتی ہے، جو اللہ کی آیتوں کے مقابلے میں تکبر اور سرکشی کا اظہار کرتا ہے، جس کے بعد معروف، ان کو معروف اور منکر، منکر نظر نہیں آتا بلکہ بعض دفعہ منکر، ان کے ہاں معروف اور معروف، منکر قرار پاتا ہے۔
- (۴) یہ فرعون کی سرکشی اور تمرد کا بیان ہے کہ اس نے اپنے وزیر ہامان کو ایک بلند عمارت بنانے کا حکم دیا تاکہ اس کے ذریعے سے وہ آسمان کے دروازوں تک پہنچ جائے۔ اسباب کے معنی دروازے، یا راستے کے ہیں۔ مزید دیکھیے القصص، آیت- ۲۸
- (۵) یعنی دیکھو کہ آسمانوں پر کیا واقعی کوئی اللہ ہے؟
- (۶) اس بات میں کہ آسمان پر اللہ ہے جو آسمان وزمین کا خالق اور ان کا مدبر ہے۔ یا اس بات میں کہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہے۔
- (۷) یعنی شیطان نے اس طرح اسے گمراہ کیے رکھا اور اس کے برے عمل اسے اچھے نظر آتے رہے۔
- (۸) یعنی حق اور صواب (درست) راستے سے اسے روک دیا گیا اور وہ گمراہیوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا۔
- (۹) تَبَابٌ - خسارہ، ہلاکت۔ یعنی فرعون نے جو تدبیر اختیار کی، اس کا نتیجہ اس کے حق میں برا ہی نکلا۔ اور بالآخر اپنے لشکر سمیت پانی میں ڈبو دیا گیا۔

اور اس مومن شخص نے کہا کہ اے میری قوم! (کے لوگو) تم (سب) میری پیروی کرو میں نیک راہ کی طرف تمہاری رہبری کروں گا۔^(۱) (۳۸)

اے میری قوم! یہ حیات دنیا متاع فانی ہے،^(۲) یقین مانو کہ (قرار) اور ہمیشگی کا گھر تو آخرت ہی ہے۔^(۳) (۳۹)
جس نے گناہ کیا ہے اسے تو برابر برابر کا بدلہ ہی ہے^(۴) اور جس نے نیکی کی ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان والا ہو تو یہ لوگ^(۵) جنت میں جائیں گے اور وہاں بے شمار روزی پائیں گے۔^(۶) (۴۰)

اے میری قوم! یہ کیا بات ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف بلا رہا ہوں^(۷) اور تم مجھے دوزخ کی طرف بلا رہے ہو۔^(۸) (۴۱)

وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَقُولُوا الشُّعُونَ أَهْدَيْتُمْ سُبُلَ الرَّشَادِ ۝

يَقُولُوا إِنَّمَا هَذِهِ الصُّبُلُ الَّتِي بَيَّنَّا مَتَاعَ الدُّنْيَا مَتَاعًا فَنِيًّا وَالْآخِرَةُ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ۝

مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا تَبْتَغِ زَكَرًا وَأَنْتُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ قَدْ لَبَّيكَ

يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْمَوْنَ فِيهَا بِعَبْرٍ حَسَابٍ ۝

وَيَقُولُ مَالِي أَدْعُوكُمْ إِلَى الْعِبْرَةِ وَتَدْعُونَنِي إِلَى النَّارِ ۝

(۱) فرعون کی قوم میں سے ایمان لانے والا پھر بولا۔ اور کہا کہ دعویٰ تو فرعون بھی کرتا ہے کہ میں تمہیں سیدھے راستے پر چلا رہا ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فرعون بھٹکا ہوا ہے، میں جس راستے کی نشاندہی کر رہا ہوں، وہ سیدھا راستہ ہے اور وہ وہی راستہ ہے، جس کی طرف تمہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام دعوت دے رہے ہیں۔

(۲) جس کی زندگی چند روزہ ہے۔ اور وہ بھی آخرت کے مقابلے میں صبح یا شام کی ایک گھڑی کے برابر۔

(۳) جس کو زوال اور فنا نہیں، نہ وہاں سے انتقال اور کوچ ہو گا۔ کوئی جنت میں جائے یا جہنم میں، دونوں کی زندگیاں ابدی ہوں گی۔ ایک راحت اور آرام کی زندگی۔ دوسری شقاوت اور عذاب کی زندگی۔ موت اہل جنت کو آئے گی نہ اہل جہنم کو۔

(۴) یعنی برائی کی مثل ہی جزا ہوگی، زیادہ نہیں۔ اور اس کے مطابق ہی عذاب ہو گا۔ جو عدل و انصاف کا آئینہ دار ہو گا۔

(۵) یعنی وہ جو ایمان دار بھی ہوں گے اور اعمال صالحہ کے پابند بھی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اعمال صالحہ کے بغیر محض ایمان یا ایمان کے بغیر اعمال صالحہ کی حیثیت اللہ کے ہاں کچھ نہیں ہوگی، عند اللہ کامیابی کے لیے ایمان کے ساتھ عمل صالح اور عمل صالح کے ساتھ ایمان ضروری ہے۔

(۶) یعنی بغیر اندازے اور حساب کے نعمتیں ملیں گی اور ان کے ختم ہونے کا بھی کوئی اندیشہ نہیں ہو گا۔

(۷) اور وہ یہ کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرو جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور اس کے اس رسول کی تصدیق کرو، جو اس نے تمہاری ہدایت اور رہنمائی کے لیے بھیجا ہے۔

(۸) یعنی توحید کے بجائے شرک کی دعوت دے رہے ہو جو انسان کو جہنم میں لے جانے والا ہے، جیسا کہ اگلی آیت میں

تم مجھے یہ دعوت دے رہے ہو کہ میں اللہ کے ساتھ کفر کروں اور اس کے ساتھ شرک کروں جس کا کوئی علم مجھے نہیں اور میں تمہیں غالب بخشے والے (موجود) کی طرف دعوت دے رہا ہوں۔^(۱) (۳۲)

یہ یقینی امر ہے^(۲) کہ تم مجھے جس کی طرف بلا رہے ہو وہ تو نہ دنیا میں پکارے جانے کے قابل ہے^(۳) نہ آخرت میں^(۴) اور یہ (بھی یقینی بات ہے) کہ ہم سب کالوٹنا اللہ کی طرف ہے^(۵) اور حد سے گزر جانے والے ہی (یقیناً) اہل دوزخ ہیں۔^(۶) (۳۳)

تَدْعُونِي لِأَكْفُرَ بِاللَّهِ وَأَشْرِكَ بِهِ مَا لَيْسَ بِهِ عِلْمٌ
وَأَنَا دَعُوهُ إِلَى الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿۳۲﴾

لَا جَرَمَ أَنَّمَا تَدْعُونِي إِلَيْهِ لَيْسَ لَهُ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا
وَلَا فِي الْآخِرَةِ وَأَنْ مَرَدًّا إِلَى اللَّهِ وَأَنَّ الْمُسْرِفِينَ
هُمُ أَصْحَابُ النَّارِ ﴿۳۳﴾

وضاحت ہے۔

(۱) عَزِيزٌ (غالب) جو کافروں سے انتقام لینے اور ان کو عذاب دینے پر قادر ہے۔ غَفَّارٌ اپنے ماننے والوں کی غلطیوں کو تائبیوں کو معاف کر دینے والا اور ان کی پردہ پوشی کرنے والا۔ جب کہ تم جن کی عبادت کرنے کی طرف مجھے بلا رہے ہو، وہ بالکل حقیر اور کم تر چیزیں ہیں، نہ وہ سن سکتی ہیں نہ جواب دے سکتی ہیں، کسی کو نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ نقصان پہنچانے پر۔

(۲) لَا جَرَمَ یہ بات یقینی ہے، یا اس میں جھوٹ نہیں ہے۔

(۳) یعنی وہ کسی کی پکار سننے کی استعداد ہی نہیں رکھتے کہ کسی کو نفع پہنچاسکیں یا الوہیت کا استحقاق انہیں حاصل ہو۔ اس کا تقریباً وہی مفہوم ہے جو اس آیت اور اس جیسی دیگر متعدد آیات میں بیان کیا گیا ہے، ﴿وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَوْمَ نَدْعَاهُمْ غَضُوبًا﴾ (الأحقاف-۵) ﴿إِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دَعْوَانَكُمْ قَدْ ضَلُّوا أَمَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ﴾ (طاطر-۱۳) ”اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار سننے ہی نہیں اور اگر بالفرض سن بھی لیں تو قبول نہیں کر سکتے۔“

(۴) یعنی آخرت میں ہی وہ پکار سن کر کسی کو عذاب سے چھڑانے پر یا شفاعت ہی کرنے پر قادر ہوں؟ یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ ایسی چیزیں بھلا اس لائق ہو سکتی ہیں کہ وہ معبود بینیں اور ان کی عبادت کی جائے؟

(۵) جہاں ہر ایک کا حساب ہو گا اور عمل کے مطابق اچھی یا بری جزا دی جائے گی۔

(۶) یعنی کافر و مشرک، جو اللہ کی نافرمانی میں ہر حد سے تجاوز کرتے ہیں، اس طرح جو بہت زیادہ گناہ گار مسلمان ہوں گے، جن کی نافرمانیاں ”اسراف“ کی حد تک پہنچی ہوئی ہوں گی، انہیں بھی کچھ عرصہ جہنم کی سزا بھگتنی ہوگی۔ تاہم بعد میں شفاعت رسول ﷺ یا اللہ کی مشیت سے ان کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

پس آگے چل کر تم میری باتوں کو یاد کرو گے^(۱) میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں،^(۲) یقیناً اللہ تعالیٰ بندوں کا نگران ہے۔^(۳) (۴۴)

پس اسے اللہ تعالیٰ نے تمام بدیوں سے محفوظ رکھ لیا جو انہوں نے سوچ رکھی تھیں^(۴) اور فرعون والوں پر بری طرح کا عذاب الٹ پڑا۔^(۵) (۴۵)

آگ ہے جس کے سامنے یہ ہر صبح شام لائے جاتے ہیں^(۱) اور جس دن قیامت قائم ہوگی (فرمان ہو گا کہ) فرعونیوں کو سخت ترین عذاب میں ڈالو۔^(۲) (۴۶)

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ وَكَفَرَ وَكَلَّمَ الْكُفْرَانَ إِثْمًا وَأَقْرَبَ إِلَى اللَّهِ إِلًا
اللَّهُ بِصِيرَةٍ يَابِغِيًا ۝

فَوَسَّخْنَا اللَّهُ سَيِّئَاتِ مِمَّا كُفَرُوا وَوَضَعْنَا يَالَ فِرْعَوْنَ
سُورَةَ الْعَذَابِ ۝

الَّذِينَ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُومُ
السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ۝

(۱) عنقریب وہ وقت آئے گا جب میری باتوں کی صداقت، اور جن باتوں سے روکتا تھا، ان کی شاعت تم پر واضح ہو جائے گی، پھر تم ندامت کا اظہار کرو گے، مگر وہ وقت ایسا ہو گا کہ ندامت بھی کوئی فائدہ نہیں دے گی۔

(۲) یعنی اسی پر بھروسہ کرتا اور اسی سے ہر وقت استعانت کرتا ہوں اور تم سے بیزاری اور قطع تعلق کا اعلان کرتا ہوں۔
(۳) وہ انہیں دیکھ رہا ہے۔ پس وہ مستحق ہدایت کو ہدایت سے نوازتا اور ضلالت کا استحقاق رکھنے والے کو ضلالت سے ہمکنار کرتا ہے۔ ان امور میں جو حکمتیں ہیں، ان کو وہی خوب جانتا ہے۔

(۴) یعنی اس کی قوم قبط نے اس مومن کے اظہار حق کی وجہ سے اس کے خلاف جو تدبیریں اور سازشیں سوچ رکھی تھیں، ان سب کو ناکام بنا دیا اور اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نجات دے دی۔ اور آخرت میں اس کا گھر جنت ہو گا۔

(۵) یعنی دنیا میں انہیں سمندر میں غرق کر دیا گیا اور آخرت میں ان کے لیے جہنم کا سخت ترین عذاب ہے۔

(۶) اس آگ پر برزخ میں یعنی قبروں میں وہ لوگ روزانہ صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں، جس سے عذاب قبر کا ثبات ہوتا ہے۔ جس کا بعض لوگ انکار کرتے ہیں۔ احادیث میں تو بڑی وضاحت سے عذاب قبر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

کے سوال کے جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نَعَمَ عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ (صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی عذاب القبر) ”ہاں! قبر کا عذاب حق ہے۔“ اسی طرح ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ”جب تم میں سے کوئی

مرد ہے تو (قبر میں) اس پر صبح و شام اس کی جگہ پیش کی جاتی ہے یعنی اگر وہ جنتی ہے تو جنت اور جہنمی ہے تو جہنم اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ تیری اصل جگہ ہے، جہاں قیامت والے دن اللہ تعالیٰ تجھے بھیجے گا۔ (صحیح بخاری،

باب المیت بعرض علیہ مقعدہ بالغداة والعشی۔ مسلم، کتاب الجنۃ، باب عرض مقعد المیت) اس کا مطلب ہے کہ منکرین عذاب قبر قرآن و حدیث دونوں کی صراحتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔

(۷) اس سے بالکل واضح ہے کہ عرض علی النار کا معاملہ جو صبح و شام ہوتا ہے، قیامت سے پہلے کا ہے اور قیامت سے پہلے

اور جب کہ دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو کمزور لوگ تکبر والوں سے (جن کے یہ تابع تھے) کہیں گے کہ ہم تو تمہارے پیرو تھے تو کیا اب تم ہم سے اس آگ کا کوئی حصہ ہٹا سکتے ہو؟ (۴۷)

وہ بڑے لوگ جواب دیں گے ہم تو سبھی اس آگ میں ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درمیان فیصلے کر چکا ہے۔ (۴۸)

اور (تمام) جنسی مل کر جنم کے داروغوں سے کہیں گے کہ تم ہی اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ کسی دن تو ہمارے عذاب میں کمی کر دے۔ (۴۹)

وہ جواب دیں گے کہ کیا تمہارے پاس تمہارے رسول معجزے لے کر نہیں آئے تھے؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں، وہ کہیں گے کہ پھر تم ہی دعا کرو^(۱) اور کافروں کی دعا محض بے اثر اور بے راہ ہے۔^(۲) (۵۰)

وَاذِ يَتَخَفُونَ فِي النَّارِ فَيَقُولُ الضُّعْفَاءُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا وَاتَّكَلْنَا لَكُمْ تَبَعًا فَمَنْ أَنْتُمْ مُعْتَدُونَ عَمَّا نَصَبْنَا مِنَ النَّارِ ۝۴۷

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُلٌّ فِيهَا إِنَّ اللَّهَ قَدَّحَهُم بَيْنَ الْعِمَادِ ۝۴۸

وَقَالَ الَّذِينَ فِي النَّارِ لِخَزَنَتِهِمْ اذْهَبُوا بَعْضُكُمْ يَخُوفُ عَمَّا يُومَأْنَ مِنَ الْعَذَابِ ۝۴۹

قَالُوا أَوَلَمْ تَكُنْ تَأْتِيكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا بَلَىٰ قَالُوا فَاذْهَبُوا وَمَا دَعَاؤُا الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝۵۰

برزخ اور قبر ہی کی زندگی ہے۔ قیامت والے دن ان کو قبر سے نکال کر سخت ترین عذاب یعنی جنم میں ڈال دیا جائے گا۔ آل فرعون سے مراد فرعون، اس کی قوم اور اس کے سارے پیروکار ہیں۔ یہ کہنا کہ ہمیں تو قبر میں مردہ آرام سے بڑا نظر آتا ہے، اسے اگر عذاب ہو تو اس طرح نظر نہ آئے۔ لغو ہے کیونکہ عذاب کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہمیں نظر بھی آئے۔ اللہ تعالیٰ ہر طرح عذاب دینے پر قادر ہے۔ کیا ہم دیکھتے نہیں ہیں کہ خواب میں ایک شخص نہایت المناک مناظر دیکھ کر سخت کرب و اذیت محسوس کرتا ہے۔ لیکن دیکھنے والوں کو ذرا محسوس نہیں ہوتا کہ یہ خوابیدہ شخص شدید تکلیف سے دوچار ہے۔ اس کے باوجود عذاب قبر کا نثار، محض ہٹ دھرمی اور بے جا تحکم ہے۔ بلکہ بیداری میں بھی انسان کو جو تکالیف ہوتی ہیں وہ خود ظاہر نہیں ہوتیں بلکہ صرف انسان کا ترپنا اور تلملانا ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ وہ تڑپے اور تلملے۔

(۱) ہم ایسے لوگوں کے حق میں اللہ سے کیوں کر کچھ کہہ سکتے ہیں جن کے پاس اللہ کے پیغمبر دلائل و معجزات لے کر آئے لیکن انہوں نے پروا نہیں کی؟

(۲) یعنی بالآخر وہ خود ہی اللہ سے فریاد کریں گے لیکن اس فریاد کی وہاں شنوائی نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ دنیا میں ان پر حجت تمام کی جا چکی تھی۔ اب آخرت تو ایمان، توبہ اور عمل کی جگہ نہیں، وہ تو دارالجزا ہے، دنیا میں جو کچھ کیا ہوگا، اس کا نتیجہ وہاں بھگتنا ہوگا۔

یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگانی دنیا میں بھی کریں گے^(۱) اور اس دن بھی جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے۔ (۵۱)

جس دن ظالموں کو ان کی (عذر) معذرت کچھ نفع نہ دے گی ان کے لیے لعنت ہی ہوگی اور ان کے لیے برا گھر ہو گا۔^(۳) (۵۲)

ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو ہدایت نامہ عطا فرمایا^(۴) اور

إِنَّا أَنْصَرُّهُمْ سُلْنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
وَيَوْمَ يُقَوْمُوا الْأَشْهَادُ ﴿۵۱﴾

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِينَ مَعَذَرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ
وَلَهُمْ سُوءُ النَّارِ ﴿۵۲﴾

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدَى وَأَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ

(۱) یعنی ان کے دشمن کو ذلیل اور ان کو غالب کریں گے۔ بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ بعض نبی قتل کر دیئے گئے، جیسے حضرت یحییٰ و زکریا علیہما السلام وغیرہما اور بعض ہجرت پر مجبور ہو گئے، جیسے ابراہیم علیہ السلام اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، وعدہ امداد کے باوجود ایسا کیوں ہوا؟ دراصل یہ وعدہ غالب حالات اور اکثریت کے اعتبار سے ہے، اس لیے بعض حالتوں میں اور بعض اشخاص پر کافروں کا غلبہ اس کے منافی نہیں۔ یا مطلب یہ ہے کہ عارضی طور پر بعض دفعہ اللہ کی حکمت و مشیت کے تحت کافروں کو غلبہ عطا فرمادیا جاتا ہے۔ لیکن بالاخر اہل ایمان ہی غالب اور سرخ رو ہوتے ہیں۔ جیسے حضرت یحییٰ و زکریا علیہما السلام کے قاتلین پر بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو مسلط فرمایا، جنہوں نے ان کے خون سے اپنی پیاس بجھائی اور انہیں ذلیل و خوار کیا، جن یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دے کر مارنا چاہا، اللہ نے ان یہودیوں پر رومیوں کو ایسا غلبہ دیا کہ انہوں نے یہودیوں کو خوب ذلت کا عذاب چکھایا۔ پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے رفقاء یقیناً ہجرت پر مجبور ہوئے لیکن اس کے بعد جنگ بدر، احد، احزاب، غزوہ خیبر اور پھر فتح مکہ کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے جس طرح مسلمانوں کی مدد فرمائی اور اپنے پیغمبر اور اہل ایمان کو جس طرح غلبہ عطا فرمایا، اس کے بعد اللہ کی مدد کرنے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟ (ابن کثیر)

(۲) اَشْهَادًا، شَهِيدًا (گواہ) کی جمع ہے۔ جیسے شریف کی جمع اشراف ہے۔ قیامت والے دن فرشتے اور انبیاء علیہم السلام گواہی دیں گے۔ یا فرشتے اس بات کی گواہی دیں گے کہ یا اللہ پیغمبروں نے تیرا پیغام پہنچا دیا تھا لیکن ان کی امتوں نے ان کی تکذیب کی۔ علاوہ ازیں امت محمدیہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی گواہی دیں گے۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔ اس لیے قیامت کو گواہوں کے کھڑا ہونے کا دن کہا گیا ہے۔ اس دن اہل ایمان کی مدد کرنے کا مطلب ہے ان کو ان کے اچھے اعمال کی جزا دی جائے گی اور انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا۔

(۳) یعنی اللہ کی رحمت سے دوری اور پھٹکار۔ اور معذرت کا فائدہ اس لیے نہیں ہو گا کہ وہ معذرت کی جگہ نہیں، اس لیے یہ معذرت، معذرت باطلہ ہوگی۔

(۴) یعنی نبوت اور تورات عطا کی۔ جیسے فرمایا، ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ﴿المائدة: ۴۴﴾

الْكِتَابِ ۞

هُدًى وَذِكْرَى لَأُولِي الْأَلْبَابِ ۝۳۴

فَأَصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ۝۳۵

إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِعَيْرِ سُطْنِ
أَتَاهُمْ إِنْ فِي صُدُورِهِمْ الْكُفْرُ مَا هُمْ بِبَالِغِيهِ ۝
فَأَسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝لَخَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ
وَالَّذِينَ آمَنُوا لَا يَتْلُمُونَ ۝

بنو اسرائیل کو اس کتاب کا وارث بنایا۔ (۵۳) (۱)

کہ وہ ہدایت و نصیحت تھی عقل مندوں کے لیے۔ (۵۴) (۲)

پس اے نبی! تو صبر کر اللہ کا وعدہ بلاشک (و شہ) سچا ہی ہے تو اپنے گناہ کی (۳) معافی مانگتا رہ اور صبح شام (۴) اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بیان کرتا رہ۔ (۵۵)

جو لوگ باوجود اپنے پاس کسی سند کے نہ ہونے کے آیات الہی میں جھگڑا کرتے ہیں ان کے دلوں میں بجز بڑائی کے اور کچھ نہیں وہ اس تک پہنچنے والے ہی نہیں، (۵) سو تو اللہ کی پناہ مانگتا رہ بیشک وہ پورا سننے والا اور سب سے زیادہ دیکھنے والا ہے۔ (۵۶)

آسمان و زمین کی پیدائش یقیناً انسان کی پیدائش سے بہت بڑا کام ہے، لیکن (یہ اور بات ہے کہ) اکثر لوگ بے علم ہیں۔ (۶) (۵۷)

(۱) یعنی تورات، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی باقی رہی، جس کے نسل بعد نسل وہ وارث ہوتے رہے۔ یا کتاب سے مراد وہ تمام کتابیں ہیں جو انبیاء بنی اسرائیل پر نازل ہوئیں، ان سب کتابوں کا وارث بنی اسرائیل کو بنایا۔

(۲) ہُدًى وَذِكْرَى، مصدر ہیں اور حال کی جگہ واقع ہیں، اس لیے منصوب ہیں۔ بمعنی ہاد اور مَذَكِّر ہدایت دینے والی اور نصیحت کرنے والی۔ عقل مندوں سے مراد عقل سلیم کے مالک ہیں۔ کیونکہ وہی آسمانی کتابوں سے فائدہ اٹھاتے اور ہدایت و نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ تو گدھوں کی طرح ہیں جن پر کتابوں کا بوجھ تولد ہوتا ہے لیکن وہ اس سے بے خبر ہوتے ہیں کہ ان کتابوں میں کیا ہے؟

(۳) گناہ سے مراد وہ چھوٹی چھوٹی لغزشیں ہیں، جو بہ تقاضائے بشریت سرزد ہو جاتی ہیں، جن کی اصلاح بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کردی جاتی ہے۔ یا استغفار بھی ایک عبادت ہی ہے۔ اجر و ثواب کی زیادتی کے لیے استغفار کا حکم دیا گیا ہے یا مقصد امت کی رہنمائی ہے کہ وہ استغفار سے بے نیاز نہ ہوں۔

(۴) عَشِيِّ سے، دن کا آخری اور رات کا ابتدائی حصہ اور اَبْكَار سے، رات کا آخری اور دن کا ابتدائی حصہ مراد ہے۔

(۵) یعنی وہ لوگ جو بغیر آسمانی دلیل کے بحث و حجت کرتے ہیں، یہ محض تکبر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں، تاہم اس سے جو ان کا مقصد ہے کہ حق کمزور اور باطل مضبوط ہو، وہ ان کو حاصل نہیں ہوگا۔

(۶) یعنی پھر یہ کیوں اس بات سے انکار کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا؟ جب کہ یہ کام

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرَةُ وَالَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الَّذِينَ كَفَرُوا
سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿۵۸﴾

إِنَّ السَّاعَةَ لَأَيُّمَةٌ وَلَا رَيْبَ فِيهَا وَالَّذِينَ
كَفَرُوا كَانُوا كَالْحِجَارَةِ يُنزَلُونَ ﴿۵۹﴾

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ
يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ
ذُخْرًا ﴿۶۰﴾

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْيَوْمَ الْإِسْلَامَ
وَالنَّهَارَ

اندھا اور بینا برابر نہیں نہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور بھلے
کام کیے بدکاروں کے (برابر ہیں) ^(۱) تم (بہت) کم نصیحت
حاصل کر رہے ہو۔ (۵۸)

قیامت بالیقین اور بے شبہ آنے والی ہے، لیکن (یہ اور
بات ہے کہ) بہت سے لوگ ایمان نہیں لاتے۔ (۵۹)

اور تمہارے رب کا فرمان (سرزد ہو چکا) ہے کہ مجھ سے
دعا کرو میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا ^(۲) یقین مانو کہ
جو لوگ میری عبادت سے خود سری کرتے ہیں وہ ابھی
ابھی ذلیل ہو کر جہنم میں پہنچ جائیں گے۔ ^(۳) (۶۰)

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے رات بنا دی کہ تم اس میں

آسان و زمین کی تخلیق سے بہت آسان ہے۔

(۱) مطلب ہے جس طرح بینا اور نابینا برابر نہیں، اسی طرح مومن و کافر اور نیکو کار اور بدکار برابر نہیں۔ بلکہ قیامت کے
دن ان کے درمیان جو عظیم فرق ہو گا، وہ بالکل واضح ہو کر سامنے آئے گا۔

(۲) گزشتہ آیت میں جب اللہ نے وقوع قیامت کا تذکرہ فرمایا، تو اب اس آیت میں ایسی رہنمائی دی جا رہی ہے، جسے
اختیار کر کے انسان آخرت کی سعادتوں سے بہکنا ہو سکے۔ اس آیت میں دعا سے اکثر مفسرین نے عبادت مراد لی ہے۔
یعنی صرف ایک اللہ کی عبادت کرو۔ جیسا کہ حدیث میں بھی دعا کو عبادت بلکہ عبادت کا مغز قرار دیا گیا ہے۔ الدُّعَاءُ هُوَ
الْعِبَادَةُ اور الدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ (مسند احمد ۴/۲۷۱، مشکوٰۃ الدعوات، علاوہ ازیں اس کے بعد يَسْتَكْبِرُونَ
عَنْ عِبَادَتِي کے الفاظ سے بھی واضح ہے کہ مراد عبادت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دعا سے مراد دعا ہی ہے یعنی اللہ سے
جلب نفع اور دفع ضرر کا سوال کرنا، کیونکہ دعا کے شرعی اور حقیقی معنی طلب کرنے کے ہیں، دوسرے مفہوم میں اس کا
استعمال مجازی ہے۔ علاوہ ازیں دعا بھی اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے اور حدیث مذکور کی رو سے بھی عبادت ہی ہے،
کیونکہ مافوق الاسباب طریقے سے کسی سے کوئی چیز مانگنا اور اس سے سوال کرنا، یہ اس کی عبادت ہی ہے۔ (فتح القدیر)
مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو طلب حاجات اور مدد کے لیے پکارنا جائز نہیں ہے۔
کیونکہ اس طرح مافوق الاسباب طریقے سے کسی کو حاجت روائی کے لیے پکارنا اس کی عبادت ہے اور عبادت اللہ کے
سوا کسی کی جائز نہیں۔

(۳) یہ اللہ کی عبادت سے انکار و اعراض یا اس میں دوسروں کو بھی شریک کرنے والوں کا انجام ہے۔

آرام حاصل کرو^(۱) اور دن کو دیکھنے والا بنادیا،^(۲) بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل و کرم والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر گزاری نہیں کرتے۔^(۳) (۶۱)

یہی اللہ ہے تم سب کا رب ہر چیز کا خالق اس کے سوا کوئی معبود نہیں پھر کہاں تم پھرے جاتے ہو۔^(۴) (۶۲)

اسی طرح وہ لوگ بھی پھیرے جاتے رہے جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ (۶۳)

اللہ ہی ہے^(۵) جس نے تمہارے لیے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ^(۶) اور آسمان کو چھت بنا دیا^(۷) اور تمہاری صورتیں بنائیں اور بہت اچھی بنائیں^(۸) اور تمہیں عمدہ عمدہ چیزیں کھانے کو عطا فرمائیں،^(۹) یہی اللہ تمہارا پروردگار ہے، پس بہت ہی برکتوں والا اللہ ہے سارے جہان کا پرورش کرنے والا۔ (۶۴)

مُبْصِرًا إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَئِنْ أُنْثِرُوا النَّاسُ لَوَيْسَكُنُورُونَ ﴿۶۱﴾

ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَىٰ تُوْفِكُونَ ﴿۶۲﴾

كَذَٰلِكَ يُؤْفِكُ الَّذِينَ كَانُوا يُبَايِعُوا اللَّهَ بِجَحْدُونَ ﴿۶۳﴾

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً
وَوَضَّعَ لَكُمُ الْفَأْسَنَ صُورَكُمْ وَسَرَّ ذَقَمَكُمْ مِّنَ
الطَّلِيحَاتِ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَتَبَرُّوْا اللَّهَ
رَبَّ الْعَالَمِينَ ﴿۶۴﴾

(۱) یعنی رات کو تاریک بنایا، تاکہ کاروبار زندگی معطل ہو جائیں اور لوگ امن و سکون سے سو سکیں۔

(۲) یعنی روشن بنایا تاکہ معاشی محنت اور تنگ و دو میں تکلیف نہ ہو۔

(۳) اللہ کی نعمتوں کا، اور نہ ان کا اعتراف ہی کرتے ہیں۔ یا تو کفر و جحود کی وجہ سے، جیسا کہ کافروں کا شیوہ ہے۔ یا منعم کے واجبات شکر سے اہمال و غفلت کی وجہ سے، جیسا کہ جاہلوں کا شعار ہے۔

(۴) یعنی پھر تم اس کی عبادت سے کیوں بدکتے ہو اور اس کی توحید سے کیوں پھرتے اور اٹھتے ہو۔

(۵) آگے نعمتوں کی کچھ قسمیں بیان کی جا رہی ہیں تاکہ اللہ کی قدرت کاملہ بھی واضح ہو جائے اور اس کا بلا شرکت غیرے معبود ہونا بھی۔

(۶) جس میں تم رہتے، چلتے پھرتے، کاروبار کرتے اور زندگی گزارتے ہو، پھر بالآخر موت سے ہمکنار ہو کر قیامت تک کے لیے اسی میں آسودہ خواب رہتے ہو۔

(۷) یعنی قائم اور ثابت رہنے والی چھت۔ اگر اس کے گرنے کا اندیشہ رہتا تو کوئی شخص آرام کی نیند سو سکتا تھا نہ کسی کے لیے کاروبار حیات کرنا ممکن ہوتا۔

(۸) جتنے بھی روئے زمین پر حیوانات ہیں، ان سب میں (تم) انسانوں کو سب سے زیادہ خوش شکل اور متناسب الأعضاء بنایا ہے۔

(۹) یعنی اقسام و انواع کے کھانے تمہارے لیے میا کیے، جو لذیذ بھی ہیں اور قوت بخش بھی۔

مُوَ الْحَيِّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ
لَهُ الدِّينَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ⑤

ثُمَّ لِيُؤَيِّدَ أَنْ أَعْبُدَ الدِّينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ
اللَّهِ لَنَا جَاهِلِيَّةً مِنَ رَبِّي ذَوَامِرُتُ أَنْ
أَسْلَمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ⑥

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ
ثُمَّ يُعْرِضُكُمْ لِطِفْلٍ ثُمَّ لِيَبْتَلِيَ أَشَدَّكُمْ ثُمَّ لِيَُنزِلُنَّ إِلَىٰ سِدْرٍ حَافٍ

وہ زندہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں پس تم خالص
اسی کی عبادت کرتے ہوئے اسے پکارو،^(۱) تمام خوبیاں
اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ (۶۵)
آپ کہہ دیجئے! کہ مجھے ان کی عبادت سے روک دیا گیا
ہے جنہیں تم اللہ کے سوا پکار رہے ہو،^(۲) اس بنا پر کہ
میرے پاس میرے رب کی دلیلیں پہنچ چکی ہیں، مجھے یہ
حکم دیا گیا ہے کہ میں تمام جہانوں کے رب کا تابع فرمان
ہو جاؤں۔ (۶۶)^(۳)

وہ وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پھر نطفے سے^(۴) پھر
خون کے لو تھڑے سے پیدا کیا پھر تمہیں بچہ کی صورت
میں نکالتا ہے، پھر (تمہیں بدھاتا ہے کہ) تم اپنی پوری

(۱) یعنی جب سب کچھ کرنے والا اور دینے والا وہی ہے۔ دو سرا کوئی بنانے میں شریک ہے نہ اختیارات میں۔ تو پھر
عبادت کا مستحق بھی صرف ایک اللہ ہی ہے، دو سرا کوئی اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ استمداد و استغاثہ بھی اسی سے کرو
کہ وہی سب کی فریادیں اور التجائیں سننے پر قادر ہے۔ دو سرا کوئی بھی مافوق الاسباب طریقے سے کسی کی بات سننے پر قادر
ہی نہیں ہے، جب یہ بات ہے تو دوسرے مشکل کشائی اور حاجت روائی کس طرح کر سکتے ہیں؟
(۲) چاہے وہ پتھر کی مورتیاں ہوں، انبیاء علیہم السلام اور صلحا ہوں اور قبروں میں مدفون اشخاص ہوں۔ مدد کے لیے کسی کو
مت پکارو، ان کے ناموں کی نذر نیاز مت دو، ان کے ورد نہ کرو، ان سے خوف مت کھاؤ اور ان سے امیدیں وابستہ نہ
کرو۔ کیوں کہ یہ سب عبادت کی قسمیں ہیں جو صرف ایک اللہ کا حق ہے۔

(۳) یہ وہی عقلی اور نقلی دلائل ہیں جن سے اللہ کی توحید یعنی اللہ کے واحد الہ اور رب ہونے کا اثبات ہوتا ہے، جو
قرآن میں جا بجا ذکر کیے گئے ہیں اسلام کے معنی ہیں اطاعت و انقیاد کے لیے جھک جانا، سراطعت خم کر دینا۔ یعنی اللہ کے
احکام کے سامنے میں جھک جاؤں، ان سے سرتابی نہ کروں۔ آگے پھر توحید کے کچھ دلائل بیان کیے جا رہے ہیں۔

(۴) یعنی تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا جو ان کی تمام اولاد کے مٹی سے پیدا ہونے کو مستلزم ہے۔ پھر اس
کے بعد نسل انسانی کے تسلسل اور اس کی بقا و تحفظ کے لیے انسانی تخلیق کو نطفے سے وابستہ کر دیا۔ اب ہر انسان اس نطفے
سے پیدا ہوتا ہے جو صلب پدر سے رحم مادر میں جا کر قرار پکڑتا ہے۔ سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے، کہ ان کی
پیدائش معجزانہ طور پر بغیر باپ کے ہوئی۔ جیسا کہ قرآن کریم کی بیان کردہ تفصیلات سے واضح ہے اور جس پر امت مسلمہ
کا اجماع ہے۔

قوت کو پہنچ جاؤ پھر بوڑھے ہو جاؤ۔^(۱) تم میں سے بعض اس سے پہلے ہی فوت ہو جاتے ہیں،^(۲) (وہ تمہیں چھوڑ دیتا ہے) تاکہ تم مدت معین تک پہنچ جاؤ^(۳) اور تاکہ تم سوچ سمجھ لو۔^(۴) (۶۷)

وہی ہے جو جلاتا ہے اور مار ڈالتا ہے،^(۵) پھر جب وہ کسی کام کا کرنا مقرر کرتا ہے تو اسے صرف یہ کہتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے۔^(۶) (۶۸)

کیا تو نے انہیں دیکھا جو اللہ کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں،^(۷) وہ کہاں پھیر دیے جاتے ہیں۔^(۸) (۶۹)

جن لوگوں نے کتاب کو جھٹلایا اور اسے بھی جو ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ بھیجا انہیں ابھی حقیقت حال معلوم ہو جائے گی۔ (۷۰)

وَمِنكُمْ مَنْ يُتَوَلَّىٰ مِنْ قَبْلُ وَلَبَّأَعْلَىٰ جَسَدًا لَّسَعَىٰ وَلَمَّا كَلَّمُوا
تَعْقِلُونَ ﴿۷۰﴾

هُوَ الَّذِي يُعْطِي وَيُخَيِّبُ ۖ وَإِذَا أَقْضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ
كُنْ فَيَكُونُ ﴿۷۱﴾

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ إِلَىٰ
يُضْعِفُونَ ﴿۷۲﴾

الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَهَمَّآ أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا
تَتْلُونَ ۖ يَعْلَمُونَ ﴿۷۳﴾

(۱) یعنی ان تمام کیفیتوں اور اطوار سے گزارنے والا وہی اللہ ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

(۲) یعنی رحم مادر میں مختلف ادوار سے گزر کر باہر آنے سے پہلے ہی ماں کے پیٹ میں، بعض بچپن میں، بعض جوانی میں اور بعض بڑھاپے سے قبل کولت میں فوت ہو جاتے ہیں۔

(۳) یعنی اللہ تعالیٰ یہ اس لیے کرتا ہے تاکہ جس کی جتنی عمر اللہ نے لکھ دی ہے، وہ اس کو پہنچ جائے اور اتنی زندگی دنیا میں گزار لے۔

(۴) یعنی جب تم ان اطوار اور مراحل پر غور کرو گے کہ نطفے سے ملتے، پھر مفعی، پھر بچہ، پھر جوانی، کولت اور بڑھاپا، تو تم جان لو گے کہ تمہارا رب بھی ایک ہی ہے اور تمہارا معبود بھی ایک، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی سمجھ لو گے کہ جو اللہ یہ سب کچھ کرنے والا ہے، اس کے لیے قیامت والے دن انسانوں کو دوبارہ زندہ کر دینا بھی مشکل نہیں ہے اور وہ یقیناً سب کو زندہ فرمائے گا۔

(۵) زندہ کرنا اور مارنا، اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ ایک بے جان نطفے کو مختلف اطوار سے گزار کر ایک زندہ انسان کے روپ میں ڈھال دیتا ہے۔ اور پھر ایک وقت مقررہ کے بعد اس زندہ انسان کو مار کر موت کی وادیوں میں سلا دیتا ہے۔

(۶) اس کی قدرت کا یہ حال ہے کہ اس کے لفظ کن (ہو جا) سے وہ چیز معرض وجود میں آ جاتی ہے، جس کا وہ ارادہ کرے۔

(۷) انکار و تکذیب کے لیے یا اس کے رد و ابطال کے لیے۔

(۸) یعنی ظہور دلائل اور وضوح حق کے باوجود وہ کس طرح حق کو نہیں مانتے۔ یہ تعجب کا اظہار ہے۔

جب کہ ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور زنجیریں ہوں گی گھسیٹ جائیں گے۔^(۱) (۷۱)
 کھولتے ہوئے پانی میں اور پھر جنم کی آگ میں جلانے جائیں گے۔^(۲) (۷۲)
 پھر ان سے پوچھا جائے گا کہ جنہیں تم شریک کرتے تھے وہ کہاں ہیں؟ (۷۳)
 جو اللہ کے سوا تھے^(۳) وہ کہیں گے کہ وہ تو ہم سے بہک گئے^(۴) بلکہ ہم تو اس سے پہلے کسی کو بھی پکارتے ہی نہ تھے۔^(۵) اللہ تعالیٰ کافروں کو اسی طرح گمراہ کرتا ہے۔^(۶) (۷۴)
 یہ بدلہ ہے اس چیز کا جو تم زمین میں ناحق پھولے نہ ساتے تھے۔ اور (بے جا) اتراتے پھرتے تھے۔^(۷) (۷۵)

إِذَا الْاَفْئَالُ فِيْ اَعْتَابِهِمْ وَالسَّلِيْلُ يُسْحَبُوْنَ ۝۱

فِي الْحَبِيْبَةِ كَشَفَى النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ۝۲

تَمْرَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝۳

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالُوْا صَلُّوا عَلٰى اَبَائِكُمْ لَوْ كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ اٰیْنَ

قَبْلَ سُبْحٰنِكَ ذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ۝۴

ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا

كُنْتُمْ تَمْرُقُوْنَ ۝۵

(۱) یہ وہ نقشہ ہے جو جہنم میں ان مکذبین کا ہو گا۔

(۲) مجاہد اور مقاتل کا قول ہے کہ ان کے ذریعے سے جنم کی آگ بھڑکائی جائے گی، یعنی یہ لوگ اس کا بندھن بنے ہوں گے۔

(۳) کیا وہ آج تمہاری مدد کر سکتے ہیں؟

(۴) یعنی پتہ نہیں، کہاں چلے گئے ہیں، وہ ہماری مدد کیا کریں گے؟

(۵) اقرار کرنے کے بعد، پھر ان کی عبادت کا ہی انکار کر دیں گے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا۔ ﴿وَاللّٰهُ رَءِیْفًا غَفُوْرًا﴾

مُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳﴾ (الانعام) ”اللہ کی قسم! ہم تو کسی کو شریک ٹھہراتے ہی نہیں تھے۔“ کہتے ہیں کہ یہ بتوں کے وجود اور ان

کی عبادت کا انکار نہیں ہے بلکہ اس بات کا اعتراف ہے کہ ان کی عبادت باطل تھی کیونکہ وہاں ان پر واضح ہو جائے گا کہ

وہ ایسی چیزوں کی عبادت کرتے رہے جو سن سکتی تھیں، نہ دیکھ سکتی تھیں اور نقصان پہنچا سکتی تھیں نہ نفع۔ (فتح القدیر)

اور اس کا دوسرا معنی واضح ہے اور وہ یہ کہ وہ شرک کا سرے سے انکار ہی کریں گے۔

(۶) یعنی ان مکذبین ہی کی طرح، اللہ تعالیٰ کافروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسلسل مکذیب اور کفر، یہ ایسی

چیزیں ہیں کہ جن سے انسانوں کے دل سیاہ اور زنگ آلودہ ہو جاتے ہیں اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے قبول حق کی توفیق سے

محروم ہو جاتے ہیں۔

(۷) یعنی تمہاری یہ گمراہی اس بات کا نتیجہ ہے کہ تم کفر و مکذیب اور فسق و فجور میں اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ ان پر تم

خوش ہوتے اور اتراتے تھے۔ اترانے میں مزید خوشی کا ظہار ہے جو تکبر کو مستلزم ہے۔

(اب آؤ) جنم میں ہمیشہ رہنے کے لیے (اس کے) دروازوں میں داخل ہو جاؤ، کیا ہی بری جگہ ہے تکبر کرنے والوں کی۔^(۱) (۷۶)

پس آپ صبر کریں اللہ کا وعدہ قطعاً سچا ہے،^(۲) انہیں ہم نے جو وعدے دے رکھے ہیں ان میں سے کچھ ہم آپ کو دکھائیں^(۳) یا (اس سے پہلے) ہم آپ کو وفات دے دیں، ان کا لوٹایا جانا تو ہماری ہی طرف ہے۔^(۴) (۷۷)

یقیناً ہم آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیج چکے ہیں جن میں سے بعض کے (واقعات) ہم آپ کو بیان کر چکے ہیں اور ان میں سے بعض کے (قصے) تو ہم نے آپ کو بیان ہی نہیں کیے اور کسی رسول کا یہ (مقدور) نہ تھا کہ کوئی معجزہ اللہ کی اجازت کے بغیر لاسکے^(۵) پھر جس

أَدْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَلِيدِينَ فِيهَا فِيئْسَ مَثْوَى
الْمُتَكَبِّرِينَ ⑤

فَأَصْبِرْ لَكَ وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا ۖ وَإِنَّا نُرِيكَ بَعْضَ الَّذِي
نَعِدُ هُمْ أَوْ نَوْفِيكَ فَإِلَيْنَا يَرْجِعُونَ ⑥

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا مِّن قَبْلِكَ وَمِنْهُمْ مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ
وَمِنْهُمْ مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ
بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ فَإِذَا جَاءَ أَمْرًا لِّلْقُضَىٰ بِالْحَقِّ وَخَبَرَ
هَٰذَاكَ الْمُبْتَطُونَ ⑤

(۱) یہ جنم پر مقرر فرشتے، اہل جنم کو کہیں گے۔

(۲) کہ ہم کافروں سے انتقام لیں گے۔ یہ وعدہ جلدی بھی پورا ہو سکتا ہے یعنی دنیا میں ہی ہم ان کی گرفت کر لیں یا حسب مشیت الہی تاخیر بھی ہو سکتی ہے، یعنی قیامت والے دن ہم انہیں سزا دیں۔ تاہم یہ بات یقینی ہے کہ یہ اللہ کی گرفت سے بچ کر کہیں جا نہیں سکتے۔

(۳) یعنی آپ کی زندگی میں ان کو جتلانے عذاب کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اللہ نے کافروں سے انتقام لے کر مسلمانوں کی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا، جنگ بدر میں ستر کافر مارے گئے، ۸ ہجری میں مکہ فتح ہو گیا اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہی پورا جزیرہ عرب مسلمانوں کے زیر نگیں آگیا۔

(۴) یعنی اگر کافر دنیوی مؤافذہ و عذاب سے بچ بھی گئے تو آخر جائیں گے کہاں؟ آخر میرے پاس ہی آئیں گے، جہاں ان کے لیے سخت عذاب تیار ہے۔

(۵) اور یہ تعداد میں، بہ نسبت ان کے جن کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے کہ قرآن کریم میں تو صرف ۲۵ انبیاء و رسل کا ذکر اور ان کی قوموں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

(۶) آیت سے مراد یہاں معجزہ اور خرق عادت واقعہ ہے، جو پیغمبر کی صداقت پر دلالت کرے۔ کفار، پیغمبروں سے مطالبے کرتے رہے کہ ہمیں فلاں فلاں چیز دکھاؤ، جیسے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار مکہ نے کئی چیزوں کا مطالبہ کیا، جس کی تفصیل سورہ بنی اسرائیل ۹۰-۹۳ میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ کسی پیغمبر کے اختیار میں یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی قوموں

وقت اللہ کا حکم آئے گا^(۱) حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا^(۲) اور اس جگہ اہل باطل خسارے میں رہ جائیں گے۔ (۷۸)

اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے چوپائے پیدا کیے^(۳) جن میں سے بعض پر تم سوار ہوتے ہو اور بعض کو تم کھاتے ہو۔ (۷۹)^(۴)

اور بھی تمہارے لیے ان میں بہت سے نفع ہیں^(۵) اور تاکہ اپنے سینوں میں چھپی ہوئی حاجتوں کو انہی پر سواری

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَنْعَامَ لِتَرْكَبُوا مِنْهَا
وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿٧٨﴾

وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَلِتَمْلِكُوا عَلَيْهَا صَالِحَةٌ
فِي صُدُورِكُمْ وَعَلَى الْفَالِكِ تَحْمِلُونَهَا ﴿٧٩﴾

کے مطالبے پر ان کو کوئی معجزہ صادر کر کے دکھلا دے۔ یہ صرف ہمارے اختیار میں تھا، بعض نبیوں کو تو ابتدا ہی سے معجزے دے دیے گئے تھے۔ بعض قوموں کو ان کے مطالبے پر معجزہ دکھلایا گیا اور بعض کو مطالبے کے باوجود نہیں دکھلایا گیا۔ ہماری مشیت کے مطابق اس کا فیصلہ ہوتا تھا۔ کسی نبی کے ہاتھ میں یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ جب چاہتا، معجزہ صادر کر کے دکھلا دیتا۔ اس سے ان لوگوں کی واضح تردید ہوتی ہے، جو بعض اولیاء کی طرف یہ باتیں منسوب کرتے ہیں کہ وہ جب چاہتے اور جس طرح چاہتے، خرق عادت امور (کرامات) کا ظہار کر دیتے تھے۔ جیسے شیخ عبدالقادر جیلانی کے لیے بیان کیا جاتا ہے۔ یہ سب من گھڑت قصے کمائیاں ہیں، جب اللہ نے پیغمبروں کو یہ اختیار نہیں دیا، جن کو اپنی صداقت کے ثبوت کے لیے، اس کی ضرورت بھی تھی تو کسی ولی کو یہ اختیار کیوں کر مل سکتا ہے؟ بالخصوص جب کہ ولی کو اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ نبی کی نبوت پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے، اس لیے معجزہ ان کی ضرورت تھی۔ لیکن اللہ کی حکمت و مشیت اس کی مقتضی نہ تھی، اس لیے یہ قوت کسی نبی کو نہیں دی گئی۔ ولی کی ولایت پر ایمان رکھنا ضروری نہیں ہے، اس لیے انہیں معجزے اور کرامات کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ یہ اختیار بلا ضرورت کیوں عطا کر سکتا ہے؟

(۱) یعنی دنیا یا آخرت میں جب ان کے عذاب کا وقت معین آجائے گا۔

(۲) یعنی ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اہل حق کو نجات اور اہل باطل کو عذاب۔

(۳) اللہ تعالیٰ اپنی ان گنت نعمتوں میں سے بعض نعمتوں کا تذکرہ فرما رہا ہے۔ چوپائے سے مراد اونٹ، گائے، بکری اور بھیڑ ہے۔ یہ نر، مادہ مل کر آٹھ ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الأنعام ۱۴۳-۱۴۴ میں ہے۔

(۴) یہ سواری کے کام میں بھی آتے ہیں، ان کا دودھ بھی پیا جاتا ہے، (جیسے بکری، گائے اور اونٹنی کا دودھ) ان کا گوشت انسان کی مرغوب ترین غذا ہے اور بار برداری کا کام بھی ان سے لیا جاتا ہے۔

(۵) جیسے ان سب کے اون اور بالوں سے اور ان کی کھالوں سے کئی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ ان کے دودھ سے گھی، مکھن، پنیر وغیرہ بھی بنتی ہیں۔

کر کے تم حاصل کر لو اور ان چوپایوں پر اور کشتیوں پر سوار کئے جاتے ہو۔^(۸۰)

اللہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا جا رہا ہے،^(۸۱) پس تم اللہ کی کن کن نشانیاں کا منکر بنتے رہو گے۔^(۸۱)

کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر اپنے سے پہلوں کا انجام نہیں دیکھا؟^(۸۲) جو ان سے تعداد میں زیادہ تھے قوت میں سخت اور زمین میں بہت ساری یادگاریں چھوڑی تھیں،^(۸۳) ان کے کیے کاموں نے انہیں کچھ بھی فائدہ نہ پہنچایا۔^(۸۴)

پس جب کبھی ان کے پاس ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر آئے تو یہ اپنے پاس کے علم پر اترنے لگے،^(۸۵) بالآخر جس چیز کو مذاق میں اڑا رہے تھے وہی ان پر الٹ پڑی۔^(۸۶)

وَيُرِيدُ اللَّهُ يَتُوبَ الْفَاسِقِينَ ۝۱۰۰

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوا أَكْثَرًا مِنْهُمْ وَأَشَدُّ قُوَّةً ۝۱۰۱
وَإِذَا رَأَى فِي الْأَرْضِ مِمَّا آغَتْ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝۱۰۲

فَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولُهُمْ بِالنَّبِيِّاتِ فَرِحُوا بِمَا عَدَّتْهُمْ مِنَ الْعِلْمِ ۝۱۰۳
وَمَا كَانُوا يَحْتَسِبُونَ ۝۱۰۴

(۱) ان سے مراد بچے اور عورتیں ہیں جنہیں ہودج سمیت اونٹ وغیرہ پر بٹھادیا جاتا تھا۔

(۲) جو اس کی قدرت اور وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں اور یہ نشانیاں آفاق میں ہی نہیں ہیں تمہارے نفسوں کے اندر بھی ہیں۔

(۳) یعنی یہ اتنی واضح، عام اور کثیر ہیں جن کا کوئی منکر انکار کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ یہ استفہام انکار کے لیے ہے۔

(۴) یعنی جن قوموں نے اللہ کی نافرمانی اور اس کے رسولوں کی تکذیب کی، یہ ان کی بستیوں کے آثار اور کھنڈرات تو دیکھیں جو ان کے علاقوں میں ہی ہیں کہ ان کا کیا انجام ہوا؟

(۵) یعنی عمارتوں، کارخانوں اور کمپنیوں کی شکل میں، ان کے کھنڈرات واضح کرتے ہیں کہ وہ کاریگری کے میدان میں بھی تم سے بڑھ کر تھے۔

(۶) فَمَا آغَتْ فِي مِمَّا اسْتَفْهَمُوا فِيهِ بھی ہو سکتا ہے اور نافیہ بھی۔ نافیہ کا مفہوم تو ترجمے سے واضح ہے۔ استفہامیہ کی رو سے مطلب ہو گا۔ ان کو کیا فائدہ پہنچایا؟ مطلب وہی ہے کہ ان کی کمائی ان کے کچھ کام نہیں آئی۔

(۷) علم سے مراد ان کے خود ساختہ مزعومات، توہمات، شبہات اور باطل دعوے ہیں۔ انہیں علم سے بطور استہزا تعبیر فرمایا وہ چونکہ انہیں علمی دلائل سمجھتے تھے، ان کے خیال کے مطابق ایسا کہا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی باتوں کے مقابلے میں یہ اپنے مزعومات و توہمات پر اترتے اور فخر کرتے رہے۔ یا علم سے مراد دنیوی باتوں کا علم ہے، یہ احکام و فرائض الہی کے مقابلے میں انہی کو ترجیح دیتے رہے۔

ہمارا عذاب دیکھتے ہی کہنے لگے کہ اللہ واحد پر ہم ایمان لائے اور جن جن کو ہم اس کا شریک بنا رہے تھے ہم نے

ان سب سے انکار کیا۔ (۸۴)

لیکن ہمارے عذاب کو دیکھ لینے کے بعد ان کے ایمان نے انہیں نفع نہ دیا۔ اللہ نے اپنا معمول یہی مقرر کر رکھا ہے جو اس کے بندوں میں برابر چلا آ رہا ہے^(۱) اور اس جگہ کافر خراب و خستہ ہوئے۔^(۲) (۸۵)

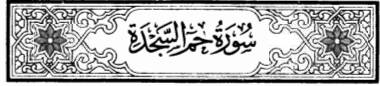
سورہ حم السجدة کی ہے اور اس میں چون آیتیں اور
چھ رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

حم۔ (۱) اتاری ہوئی ہے بڑے مہربان بہت رحم والے کی
طرف سے۔ (۲)

فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا امْكُتُوا لَنَا وَقَدْ أَبَاؤُنَا
كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ ۝

فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا امْكُتُوا لَنَا وَقَدْ أَبَاؤُنَا سُبَّتَ اللَّهُ
الَّذِي قَدْ خَلَقْتَنِي فِي عِبَادِهِ وَخَسِرْتَنِي الْكَافِرُونَ ۝



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

لَحْمِ ۝ تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

(۱) یعنی اللہ کا یہ معمول چلا آ رہا ہے کہ عذاب دیکھنے کے بعد توبہ اور ایمان مقبول نہیں۔ یہ مضمون قرآن کریم میں متعدد جگہ بیان ہوا ہے۔

(۲) یعنی معاینہ عذاب کے بعد ان پر واضح ہو گیا کہ اب سوائے خسارے اور ہلاکت کے ہمارے مقدر میں کچھ نہیں۔

☆ اس سورت کا دوسرا نام فضیلت ہے۔ اس کی شان نزول کی روایات میں بتلایا گیا ہے کہ ایک مرتبہ سرداران قریش نے باہم مشورہ کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیرو کاروں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہی ہو رہا ہے، ہمیں اس کے سدباب کے لیے ضرور کچھ کرنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے میں سے سب سے زیادہ بلیغ و فصیح آدمی ”عتبہ بن ربیعہ“ کا انتخاب کیا، تاکہ وہ آپ ﷺ سے گفتگو کرے۔ چنانچہ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں گیا اور آپ ﷺ پر عربوں میں انتشار و افتراق پیدا کرنے کا الزام عائد کر کے پیشکش کی کہ اس نئی دعوت سے اگر آپ ﷺ کا مقصد مال و دولت کا حصول ہے، تو وہ ہم جمع کیے دیتے ہیں، قیادت و سیادت منوانا چاہتے ہیں تو آپ ﷺ کو ہم اپنا لیڈر اور سردار مان لیتے ہیں، کسی حسین عورت سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو ایک نہیں ایسی دس عورتوں کا انتظام ہم کر دیتے ہیں اور اگر آپ ﷺ پر آسیب کا اثر ہے جس کے تحت آپ ﷺ ہمارے معبودوں کو برا کہتے ہیں، تو ہم اپنے خرچ پر آپ ﷺ کا علاج کر دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے اس کی تمام باتیں سن کر اس

كَيْبُ فَصَلَّتْ إِلَيْهِ مُرَائًا عَرَبِيًّا لَقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٥﴾

(ایسی) کتاب ہے جس کی آیتوں کی واضح تفصیل کی گئی ہے،^(۱) (اس حال میں کہ) قرآن عربی زبان میں ہے^(۲)

اس قوم کے لیے جو جانتی ہے۔^(۳)

خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا^(۴) ہے، پھر بھی ان کی اکثریت نے منہ پھیر لیا اور وہ سنتے ہی نہیں۔^(۵)

اور انہوں نے کہا کہ تو جس کی طرف ہمیں بلا رہا ہے ہمارے دل تو اس سے پردے میں ہیں^(۶) اور ہمارے

کانوں میں گرانی ہے^(۷) اور ہم میں اور تجھ میں ایک حجاب ہے، اچھا تو اب اپنا کام کیے جا ہم بھی یقیناً کام کرنے

والے ہیں۔^(۸)

بَيِّنًا أَوْ يَذِّبُهُمْ فَاعْرَضَ الْكُذُومُ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿٥﴾

وَقَالُوا أَفَلَاؤُنَا أَنِ كَذَّبْتَنَا فَتُتَابُ عَنِ اللَّهِ وَنَدَىٰ إِذْ أَبَيْنَا وَقُرْ

وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنَكَ حِجَابٌ فَاغْلُظْ إِنَّا غَالِمُونَ ﴿٥﴾

سورت کی تلاوت اس کے سامنے فرمائی، جس سے وہ بڑا متاثر ہوا۔ اس نے واپس جا کر سردارانِ قریش کو بتلایا کہ وہ جو چیز پیش کرتا ہے وہ جادو اور کمانت ہے نہ شعر و شاعری۔ مطلب اس کا آپ ﷺ کی دعوت پر سردارانِ قریش کو غور و فکر کی دعوت دینا تھا۔ لیکن وہ غور و فکر کیا کرتے؟ الٹا عتبہ پر الزام لگا دیا کہ تو بھی اس کے سحر کا سیر ہو گیا ہے۔ یہ روایات مختلف انداز سے اہل سیر و تفسیر نے بیان کی ہیں۔ امام ابن کثیر اور امام شوکانی نے بھی انہیں نقل کیا ہے۔ امام شوکانی فرماتے ہیں ”یہ روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ قریش کا اجتماع ضرور ہوا، انہوں نے عتبہ کو گفتگو کے لیے بھیجا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس سورت کا ابتدائی حصہ سنایا۔“

(۱) یعنی کیا حلال ہے اور کیا حرام؟ یا طاعات کیا ہیں اور معاصی کیا؟ یا ثواب والے کام کون سے ہیں اور عقاب والے کون سے؟

(۲) یہ حال ہے یعنی اس کے الفاظ عربی ہیں، جن کے معانی مفصل اور واضح ہیں۔

(۳) یعنی جو عربی زبان، اس کے معانی و مفہیم اور اس کے اسرار و اسلوب کو جانتی ہے۔

(۴) ایمان اور اعمالِ صالحہ کے حاملین کو کامیابی اور جنت کی خوش خبری سنانے والا اور مشرکین و مکذبین کو عذابِ نار سے ڈرانے والا۔

(۵) یعنی غور و فکر اور تدبر و تعقل کی نیت سے نہیں سنتے کہ جس سے انہیں فائدہ ہو۔ اسی لیے ان کی اکثریت ہدایت سے محروم ہے۔

(۶) أَكِنَّةٌ، کِنَانٌ کی جمع ہے۔ پردہ۔ یعنی ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں کہ ہم تیری توحید و ایمان کی دعوت کو سمجھ سکیں۔

(۷) وَقُرْ کے اصل معنی بوجھ کے ہیں، یہاں مراد ہمراہی ہے، جو حق کے سننے میں مانع تھا۔

(۸) یعنی ہمارے اور تیرے درمیان ایسا پردہ حائل ہے کہ تو جو کہتا ہے، وہ سن نہیں سکتے اور جو کرتا ہے، اسے دیکھ

آپ کہہ دیجئے! کہ میں تو تم ہی جیسا انسان ہوں مجھ پر وحی نازل کی جاتی ہے کہ تم سب کا معبود ایک اللہ ہی ہے^(۱) سو تم اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اس سے گناہوں کی معافی چاہو، اور ان مشرکوں کے لیے (بڑی ہی) خرابی ہے۔ (۶)

جو زکوٰۃ نہیں دیتے^(۲) اور آخرت کے بھی منکر ہی رہتے ہیں۔ (۷)

بیشک جو لوگ ایمان لائیں اور بھلے کام کریں ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ (۸)^(۳)

آپ کہہ دیجئے! کہ کیا تم اس (اللہ) کا انکار کرتے ہو اور تم اس کے شریک مقرر کرتے ہو جس نے دودن میں زمین پیدا کر دی،^(۴) سارے جمانوں کا پروردگار وہی ہے۔ (۹)

قُلْ إِنَّمَا آتَاكُمْ بِمَنِّكَ يُؤْتِي لِمَن يَشَاءُ اللَّهُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۱﴾
فَأَسْتَفْتِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ غَلِيبٌ ﴿۲﴾

الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿۳﴾

لَئِنِ الْكَافِرِينَ أَتَوْا عِلْمًا بِالصَّلَاةِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ﴿۴﴾

قُلْ إِنَّمَا لَكُمْ الْاَرْضُ عَلَىٰ مَا لَدَيْكُمْ فِي يَوْمِئِذٍ
وَإِنَّكُمْ لَعَلَّكُمْ لَهُ أَندَادُ إِنَّ رَبَّ الْعَالَمِينَ ﴿۵﴾

نہیں سکتے۔ اس لیے تو ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے اور ہم تجھے تیرے حال پر چھوڑ دیں، تو ہمارے دین پر عمل نہیں کرتا، ہم تیرے دین پر عمل نہیں کر سکتے۔

(۱) یعنی میرے اور تمہارے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے۔ مجرد وحی الہی کے۔ پھر یہ بعد و حجاب کیوں؟ علاوہ ازیں میں جو دعوت توحید پیش کر رہا ہوں، وہ بھی ایسی نہیں کہ عقل و فہم میں نہ آسکے، پھر اس سے اعراض کیوں؟

(۲) یہ سورت مکی ہے۔ زکوٰۃ ہجرت کے دوسرے سال فرض ہوئی۔ اس لیے اس سے مراد یا تو صدقات ہیں جس کا حکم مسلمانوں کو مکے میں بھی دیا جاتا رہا، جس طرح پہلے صرف صبح و شام کی نماز کا حکم تھا، پھر ہجرت سے ڈیڑھ سال قبل لیلۃ الایسراء کو پانچ فرض نمازوں کا حکم ہوا۔ یا پھر زکوٰۃ سے یہاں مراد کلمۃ شہادت ہے، جس سے نفس انسانی شرک کی آلودگیوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ (ابن کثیر)

(۳) ﴿أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ﴾ کا وہی مطلب ہے جو ﴿عَطَاءٌ غَيْرُ مَجْذُوذٍ﴾ (ہود-۱۰۸) کا ہے۔ یعنی نہ ختم ہونے والا اجر۔

(۴) قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ذکر کیا گیا ہے کہ ”اللہ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا“ یہاں اس کی کچھ تفصیل بیان فرمائی گئی ہے۔ فرمایا، زمین کو دودن میں بنایا۔ اس سے مراد ہیں۔ یَوْمَ الْأَحَدِ (اتوار) اور یَوْمَ الْاِثْنَيْنِ (بیر) سورۃ نازعات میں کہا گیا ہے ﴿وَالْاَرْضُ بَعْدَ ذَلِكَ دَخَانًا﴾ جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زمین کو آسمان کے بعد بنایا گیا ہے جب کہ یہاں زمین کی تخلیق کا ذکر آسمان کی تخلیق سے پہلے کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے کہ تخلیق اور چیز ہے اور دَحَىٰ جو اصل میں دَحُوٰ ہے (بچھانا یا پھیلانا) اور چیز۔ زمین کی

اور اس نے زمین میں اس کے اوپر سے پہاڑ گاڑ دیئے^(۱) اور اس میں برکت رکھ دی^(۲) اور اس میں (رہنے والوں کی) غذاؤں کی تجویز بھی اسی میں کر دی^(۳) (صرف) چار دن میں،^(۴) ضرورت مندوں کے لیے یکساں طور پر۔^(۵) (۱۰)

پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں (سا) تھا پس اسے اور زمین سے فرمایا کہ تم دونوں خوشی سے آؤ یا ناخوشی سے۔^(۶) دونوں نے عرض کیا ہم بخوشی حاضر ہیں۔ (۱۱)

پس دو دن میں سات آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں

وَجَعَلْ فِيهَا رَوَابِي مِنْ نُورٍ وَأَبْرَاجَ فِيهَا وَكَدْرَ فِيهَا
أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ آيَاتٍ سَوَاءٍ لِّلسَّالِفِينَ ۝

ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ
اِقْبِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ۝

فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ فِي يَوْمٍ وَاوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرًا

تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی، جیسا کہ یہاں بھی بیان کیا گیا ہے اور دُخَانُ کا مطلب ہے کہ زمین کو رہائش کے قابل بنانے کے لیے اس میں پانی کے ذخائر رکھے گئے، اسے پیداواری ضروریات کا مخزن بنایا گیا۔ ﴿ اٰخِرُ حَيٰوةِهَا مَمَاتٌ هَا وَمَوْجِئُهَا ﴾ اس میں پہاڑ، ٹیلے اور ہمدات رکھے گئے۔ یہ عمل آسمان کی تخلیق کے بعد دوسرے دو دنوں میں کیا گیا۔ یوں زمین اور اس کے متعلقات کی تخلیق پورے چار دنوں میں مکمل ہوئی۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورہ حم السجدة)

(۱) یعنی پہاڑوں کو زمین میں سے ہی پیدا کر کے ان کو اس کے اوپر گاڑ دیا تاکہ زمین ادھر یا ادھر نہ ڈولے۔
(۲) یہ اشارہ ہے پانی کی کثرت، انواع و اقسام کے رزق، معدنیات اور دیگر اسی قسم کی ایشیا کی طرف یہ زمین کی برکت ہے، کثرت خیر کا نام ہی برکت ہے۔

(۳) أَقْوَاتٌ، قُوْتٌ (غذا، خوراک) کی جمع ہے۔ یعنی زمین پر بسنے والی تمام مخلوقات کی خوراک اس میں مقدر کر دی ہے یا بندوبست کر دیا ہے۔ اور رب کی اس تقدیر یا بندوبست کا سلسلہ اتنا وسیع ہے کہ کوئی زبان اسے بیان نہیں کر سکتی، کوئی قلم اسے رقم نہیں کر سکتا اور کوئی کیلکولیٹر اسے گن نہیں سکتا۔ بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ہر زمین کے دوسرے حصوں میں پیدا نہیں ہو سکتیں۔ تاکہ ہر علاقے کی یہ یہ مخصوص پیداوار ان ان علاقوں کی تجارت و معیشت کی بنیادیں بن جائیں۔ چنانچہ یہ مفہوم بھی اپنی جگہ صحیح اور بالکل حقیقت ہے۔

(۴) یعنی تخلیق کے پہلے دو دن اور دومی کے دو دن سارے دن ملا کہ یہ کل چار دن ہوئے، جن میں یہ سارا عمل تکمیل کو پہنچا۔
(۵) سَوَاءٌ کا مطلب ہے، ٹھیک چار دن میں۔ یعنی پوچھنے والوں کو بتلا دو کہ تخلیق اور دُخَانُ کا یہ عمل ٹھیک چار دن میں ہوا یا پورا یا برابر جواب ہے سا تلکین کے لیے۔

(۶) یہ اتنا کس طرح تھا؟ اس کی کیفیت نہیں بیان کی جاسکتی۔ یہ دونوں اللہ کے پاس آئے جس طرح اس نے چاہا۔ بعض نے اس کا مفہوم لیا ہے کہ میرے حکم کی اطاعت کرو، انہوں نے کہا ٹھیک ہے ہم حاضر ہیں۔ چنانچہ اللہ نے آسمان کو حکم

اس کے مناسب احکام کی وحی بھیج دی^(۱) اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے زینت دی اور نگہبانی کی،^(۲) یہ تدبیر اللہ غالب و داناکہ ہے۔ (۱۲)

اب بھی یہ روگرداں ہوں تو کہہ دیجئے! کہ میں تمہیں اس کڑک (عذاب آسانی) سے ڈراتا ہوں جو مثل عادیوں اور شموادیوں کی کڑک کے ہوگی۔ (۱۳)

ان کے پاس جب ان کے آگے پیچھے سے پیغمبر آئے کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر ہمارا پروردگار چاہتا تو فرشتوں کو بھیجتا۔ ہم تو تمہاری رسالت کے بالکل منکر ہیں۔^(۳) (۱۴)

اب عادیوں نے تو بے وجہ زمین میں سرکشی شروع کر دی اور کہنے لگے کہ ہم سے زور آور کون ہے؟^(۴) کیا انہیں یہ نظر نہ آیا کہ جس نے انہیں پیدا کیا ہے وہ ان سے (بہت ہی) زیادہ زور آور ہے،^(۵) وہ (آخر تک) ہماری آیتوں کا

وَرَبَّنَا السَّمَاءُ الَّتِي بَابِصَابِغٍ مِّنْ حُفْلَا ذَلِكُمْ تَعْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝۱۲

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مَّتَلِّئُهَا صَاعِقَةً ۝۱۳

إِذْ جَاءَهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَنِي آدَمَ يَعْلَمُونَ خَلْقَهُمْ
الَّذِينَ كَفَرُوا وَاللَّهُ قَائِلُ الْوَسْطَىٰ رَبَّنَا الَّذِي لَمْ يَكُنْ لَنَا
فِي مَا كُنَّا نَسْتَدْعِيهِ لَكَرُونَ ۝۱۴

فَأَمَّا عَادُ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا
مَنْ أَشَدُّ قُوَّةً مِنَّا وَكُنَّا نَحْنُ الْمَوْلَىٰ لَهُمْ هُوَ أَشَدُّ
قُوَّةً مِنَّا وَكُنَّا بِآيَاتِهِ لَا يَجِدُونَ ۝۱۵

دیا، سورج، چاند اور ستارے نکال اور زمین کو کما، نہریں جاری کر دے اور پھل نکال دے (ابن کثیر) یا مفہوم ہے کہ تم دونوں وجود میں آ جاؤ۔

(۱) یعنی خود آسمانوں کو یا ان میں آباد فرشتوں کو مخصوص کاموں اور اوردو وظائف کا پابند کر دیا۔

(۲) یعنی شیطان سے نگہبانی، جیسا کہ دوسرے مقام پر وضاحت ہے، ستاروں کا ایک تیسرا مقصد دوسری جگہ آہتداء (راستہ معلوم کرنا) بھی بیان کیا گیا ہے (النحل-۱۶)

(۳) یعنی چونکہ تم ہماری طرح ہی کے انسان ہو، اس لیے ہم تمہیں نبی نہیں مان سکتے۔ اللہ تعالیٰ کو نبی بھیجنا ہوتا تو فرشتوں کو بھیجتا نہ کہ انسانوں کو۔

(۴) اس فقرے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ عذاب روک لینے پر قادر ہیں، کیونکہ وہ دراز قد اور نہایت زور آور تھے۔ یہ انہوں نے اس وقت کہا جب ان کے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام نے ان کو انذار و تنبیہ کے لیے عذاب الہی سے ڈرایا۔

(۵) یعنی کیا وہ اللہ سے بھی زیادہ زور آور ہیں، جس نے انہیں پیدا کیا اور انہیں قوت و طاقت سے نوازا۔ کیا ان کو بنانے کے بعد اس کی اپنی قوت و طاقت ختم ہو گئی ہے؟ یہ استفہام، استنکار اور تویح کے لیے ہے۔

(۶) ان معجزات کا جو انبیا کو ہم نے دیئے تھے، یا ان دلائل کا جو پیغمبروں کے ساتھ نازل کیے تھے یا ان آیات تکوینیہ کا جو

انکار ہی کرتے رہے۔ (۱۵)

بالآخر ہم نے ان پر ایک تیز و تند آندھی^(۱) منخوس دنوں میں^(۲) بھیج دی کہ انہیں دنیاوی زندگی میں ذلت کے عذاب کا مزہ چکھا دیں، اور (یقین مانو) کہ آخرت کا عذاب اس سے بہت زیادہ رسوائی والا ہے اور وہ مدد نہیں کیے جائیں گے۔ (۱۶)

رہے شمود، سو ہم نے ان کی بھی رہبری کی^(۳) پھر بھی انہوں نے ہدایت پر اندھے پن کو ترجیح دی^(۴) جس بنا پر انہیں (سراپا) ذلت کے عذاب کی کڑک نے ان کے کرتوتوں کے باعث پکڑ لیا۔ (۱۷)

اور (ہاں) ایمان دار اور پارساؤں کو ہم نے (بال بال) بچا لیا۔ (۱۸)

فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَحْسَاتٍ لَنُنذِرَ بَقِيَّتَهُمُ
عَذَابَ الْخُزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزَىٰ وَهُمْ
لَا يُبْصِرُونَ ﴿۱۵﴾

وَأَمَّا شَمُودُ فَوَهَدَيْنَاهُمْ فَأَتَيْنَاهُمُ الْعَيْ عَلَى الْهُدَىٰ فَآخَذْنَا هُمُ
صَعِقَةً الْعَذَابِ الْهُونِ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۱۶﴾

وَبَقَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿۱۷﴾

کائنات میں پھیلی اور بکھری ہوئی ہیں۔

(۱) صَرْصَرٌ، صُرَّةٌ (آواز) سے ہے۔ یعنی ایسی ہوا جس میں سخت آواز تھی۔ یعنی نہایت تند اور تیز ہوا، جس میں آواز بھی ہوتی ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ صر سے ہے، جس کے معنی برد (ٹھنڈک) کے ہیں۔ یعنی ایسی پالے والی ہوا جو آگ کی طرح جلا ڈالتی ہے۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں وَالْحَقُّ أَنَّهُمْ مُتَّصِفَةٌ بِجَمْعِ ذَلِكَ 'وہ ہوا ان تمام ہی باتوں سے متصف تھی۔

(۲) نَحْسَاتٌ کا ترجمہ 'بعض نے متواترپے درپے کا کیا ہے۔ کیونکہ یہ ہوا سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلتی رہی۔ بعض نے سخت، بعض نے گردوغبار والے اور بعض نے نحوست والے کیا ہے۔ آخری ترجمہ کا مطلب یہ ہو گا کہ یہ ایام جن میں ان پر سخت ہوا کا طوفان جاری رہا، ان کے لیے منخوس ثابت ہوئے۔ یہ نہیں کہ ایام ہی مطلقاً منخوس ہیں۔

(۳) یعنی ان کو توحید کی دعوت دی، اس کے دلائل ان کے سامنے واضح کیے اور ان کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کے ذریعے سے ان پر حجت تمام کی۔

(۴) یعنی انہوں نے مخالفت اور تکذیب کی، حتیٰ کہ اس اونٹنی تک کو ذبح کر ڈالا جو بطور معجزہ، ان کی خواہش پر چٹان سے ظاہر کی گئی تھی اور پیغمبر کی صداقت کی دلیل تھی۔

(۵) صَاعِقَةٌ 'عذاب شدید کو کہتے ہیں، ان پر یہ سخت عذاب چنگھاڑا اور زلزلے کی صورت میں آیا، جس نے انہیں ذلت و رسوائی کے ساتھ تباہ و برباد کر دیا۔

اور جس دن ^(۱) اللہ کے دشمن دوزخ کی طرف لائے جائیں گے اور ان (سب) کو جمع کر دیا جائے گا۔ ^(۲) (۱۹)

یہاں تک کہ جب بالکل جہنم کے پاس آجائیں گے ان پر ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے اعمال کی گواہی دیں گی۔ ^(۳) (۲۰)

یہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی، ^(۴) وہ جواب دیں گی کہ ہمیں اس اللہ نے قوت گویائی عطا فرمائی جس نے ہر چیز کو بولنے کی طاقت بخشی ہے، اسی نے تمہیں اول مرتبہ پیدا کیا اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے۔ ^(۵) (۲۱)

وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ۝

حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ
وَوَجَدُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

وَقَالُوا لَوْلُوهُمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا يَا اللَّهُ أَنْطَقْتَ اللَّهُ
الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَالْأَوَّلُ
يُرْجَعُونَ ۝

(۱) یہاں اذْخَرُ مخذوف ہے، وہ وقت یاد کرو جب اللہ کے دشمنوں کو جہنم کے فرشتے جمع کریں گے یعنی اول سے آخر تک کے دشمنوں کا اجتماع ہو گا۔

(۲) أَيْنَ: يُحْشَرُ أَوْلِيَهُمْ عَلَيَّ آخِرِهِمْ لِيَلَّا حَقُّوا (فتح القدير) یعنی ان کو روک کر اول و آخر کو باہم جمع کیا جائے گا۔ (اس لفظ کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے سورۃ النمل آیت نمبر ۱۷ کا حاشیہ)

(۳) یعنی جب وہ اس بات سے انکار کریں گے کہ انہوں نے شرک کا ارتکاب کیا، تو اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں پر مرگلا دے گا اور ان کے اعضاء بول کر گواہی دیں گے کہ یہ فلاں فلاں کام کرتے رہے، إِذَا مَا جَاءُوهَا میں ما زائد ہے تاکہ کے لیے۔ انسان کے اندر پانچ حواس ہیں۔ یہاں دو کا ذکر ہے۔ تیسری جلد (کھال) کا ذکر ہے جو مس یا لمس کا آلہ ہے۔ یوں حواس کی تین قسمیں ہو گئیں۔ باقی دو حواس کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ ذوق (چکھنا) بوجہ لمس میں داخل ہے، کیونکہ یہ چکھنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اس شے کو زبان کی جلد پر نہ رکھا جائے۔ اسی طرح سو گھنا (شم) اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ شے ناک کی جلد پر نہ گزرے۔ اس اعتبار سے جلوہ کے لفظ میں تین حواس آجاتے ہیں۔ (فتح القدير)

(۴) یعنی جب مشرکین اور کفار دیکھیں گے کہ خود ان کے اپنے اعضاء ان کے خلاف گواہی دے رہے ہیں، تو ازراہ تعجب یا بطور عتاب اور ناراضی کے، ان سے یہ کہیں گے۔

(۵) بعض کے نزدیک وَهُوَ سے اللہ کا کلام مراد ہے۔ اس لحاظ سے یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اور بعض کے نزدیک جلوہ انسانی ہی کا۔ اس اعتبار سے یہ انہی کے کلام کا تمہ ہے۔ قیامت والے دن انسانی اعضا کے گواہی دینے کا ذکر اس سے قبل سورۃ

اور تم (اپنی بد اعمالیاں) اس وجہ سے پوشیدہ رکھتے ہی نہ تھے کہ تم پر تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں گواہی دیں گی،^(۱) ہاں تم یہ سمجھتے رہے کہ تم جو کچھ بھی کر رہے ہو اس میں سے بہت سے اعمال سے اللہ بے خبر ہے۔^(۲) (۲۲)

تمہاری اسی بدگمانی نے جو تم نے اپنے رب سے کر رکھی تھی تمہیں ہلاک کر دیا^(۳) اور بالآخر تم زیاں کاروں میں ہو گئے۔ (۲۳)

اب اگر یہ صبر کریں تو بھی ان کا ٹھکانا جہنم ہی ہے۔ اور اگر یہ (عذرو) معافی کے خواستگار ہوں تو بھی (معذور و)

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَوُونَ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ
وَأَبْصَارُكُمْ وَأَجْزَاؤُكُمْ وَلَكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ
لَا يَعْلَمُ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿۲۲﴾

وَذَلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِينَ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرَأَيْتُمْ كَيْفَ
صَبَّحْتُمُ مِنَ الْخَيْرِينَ ﴿۲۳﴾

فَإِنْ يَصْبِرُوا فَالنَّارُ مَثْوًى لَهُمْ وَإِنْ يَسْتَعْتِبُوا فَمَا لَهُمْ
مِنَ الْمُعْتَبِينَ ﴿۲۴﴾

نور، آیت ۲۲، سورہ یسین، آیت ۶۵، میں بھی گزر چکا ہے اور صحیح احادیث میں بھی اسے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً جب اللہ کے حکم سے انسانی اعضا بول کر بتلائیں گے تو بندہ کہے گا، بُغْدًا لَكُنَّ وَسُخْفًا؛ فَعَنْكُنْ كُنْتُ أَنَا ضِلُّ صَحِيحِ مُسْلِم، کتاب الزہد، ”تمہارے لیے ہلاکت اور دوری ہو، میں تو تمہاری ہی خاطر جھگڑ رہا اور مدافعت کر رہا تھا۔“ اسی روایت میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ بندہ کہے گا کہ میں اپنے نفس کے سوا کسی کی گواہی نہیں مانوں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کیا میں اور میرے فرشتے کرانا کا تین گواہی کے لیے کافی نہیں۔ پھر اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اس کے اعضا کو بولنے کا حکم دیا جائے گا، (حوالہ مذکور)

(۱) اس کا مطلب ہے کہ تم گناہ کا کام کرتے ہوئے لوگوں سے تو چھپنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اس بات کا کوئی خوف تمہیں نہیں تھا کہ تمہارے خلاف خود تمہارے اپنے اعضا بھی گواہی دیں گے کہ جن سے چھپنے کی تم ضرورت محسوس کرتے۔ اس کی وجہ ان کا بعت و نشور سے انکار اور اس پر عدم یقین تھا۔

(۲) اس لیے تم اللہ کی حدیں توڑنے اور اس کی نافرمانی کرنے میں بے باک تھے۔

(۳) یعنی تمہارے اس اعتقاد فاسد اور گمان باطل نے کہ اللہ کو ہمارے بہت سے عملوں کا علم نہیں ہوتا، تمہیں ہلاکت میں ڈال دیا، کیوں کہ اس کی وجہ سے تم ہر قسم کا گناہ کرنے میں دلیر اور بے خوف ہو گئے تھے۔ اس کی شان نزول میں ایک روایت ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خانہ کعبہ کے پاس دو قرشی اور ایک ثقفی یادو ثقفی اور ایک قرشی جمع ہوئے۔ فریبہ بدن، قلیل القسم۔ ان میں سے ایک نے کہا، ”کیا تم سمجھتے ہو، ہماری باتیں اللہ سنتا ہے؟“ دوسرے نے کہا، ”ہماری جبری باتیں سنتا ہے اور سری باتیں نہیں سنتا۔“ ایک اور نے کہا، ”اگر وہ ہماری جبری (اوپنی) باتیں سنتا ہے تو ہماری سری (پوشیدہ) باتیں بھی یقیناً سنتا ہے۔“ جس پر اللہ تعالیٰ نے آیت ﴿وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَوُونَ﴾ نازل فرمائی، (صحیح بخاری، تفسیر سورہ عم السجدہ)

معاف نہیں رکھے جائیں گے۔^(۱) (۲۳)
 اور ہم نے ان کے کچھ ہم نشین مقرر کر رکھے تھے جنہوں نے ان کے اگلے پچھلے اعمال ان کی نگاہوں میں خوبصورت بنا رکھے تھے اور ان کے حق میں بھی اللہ کا قول ان امتوں کے ساتھ پورا ہوا جو ان سے پہلے جنوں انسانوں کی گزر چکی ہیں۔ یقیناً وہ زیاں کار ثابت ہوئے۔ (۲۵)

اور کافروں نے کہا اس قرآن کو سنو ہی مت^(۳) (اس کے پڑھے جانے کے وقت) اور بیہودہ گوئی کرو^(۴) کیا عجب کہ تم غالب آ جاؤ۔^(۵) (۲۶)
 پس یقیناً ہم ان کافروں کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ اور انہیں ان کے بدترین اعمال کا بدلہ (ضرور) ضرور دیں گے۔^(۶) (۲۷)

وَيَصْنَعُ اللَّهُ فُرْقَانًا فَرِيقًا لَهُمْ مَابِئِن آيَاتِهِمْ وَمَا خَلَقَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَبِيرِينَ ﴿۲۵﴾

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا هَذَا الْقُرْآنَ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَقْلِبُونَ ﴿۲۶﴾

فَلَنُذِيقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا عَذَابًا شَدِيدًا وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲۷﴾

(۱) ایک دوسرے معنی اس کے یہ کیے گئے ہیں کہ اگر وہ منانا چاہیں گے (عُتْبِيٰ رضا طلب کریں گے) تاکہ وہ جنت میں چلے جائیں تو یہ چیز ان کو کبھی حاصل نہ ہوگی۔ (المیر التفاسیر وفتح القدير) بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ وہ دنیا میں دوبارہ بھیجے جانے کی آرزو کریں گے جو منظور نہیں ہوگی۔ (ابن جریر طبری) مطلب یہ ہے کہ ان کا ابدی ٹھکانا جہنم ہے، اس پر صبر کریں (تب بھی رحم نہیں کیا جائے گا) جیسا کہ دنیا میں بعض دفعہ صبر کرنے والوں پر ترس آجاتا ہے) یا کسی اور طریقے سے وہاں سے نکلنے کی سعی کریں، مگر اس میں بھی انہیں ناکامی ہی ہوگی۔

(۲) ان سے مراد وہ شیاطین انس و جن ہیں جو باطل پر اصرار کرنے والوں کے ساتھ لگ جاتے ہیں، جو انہیں کفر و معاصی کو خوبصورت کر کے دکھاتے ہیں، پس وہ اس گمراہی کی دلدل میں پھنسے رہتے ہیں، حتیٰ کہ انہیں موت آجاتی ہے اور وہ خسارۂ ابدی کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

(۳) یہ انہوں نے باہم ایک دوسرے کو کہا۔ بعض نے لَا تَسْمَعُوا کے معنی کیے ہیں، اس کی اطاعت نہ کرو۔

(۴) یعنی شور کرو، تالیاں، سیٹیاں بجاؤ، چیخ چیخ کر باتیں کرو تاکہ حاضرین کے کانوں میں قرآن کی آواز نہ جائے اور ان کے دل قرآن کی بلاغت اور خوبیوں سے متاثر نہ ہوں۔

(۵) یعنی ممکن ہے اس طرح شور کرنے کی وجہ سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن کی تلاوت ہی نہ کرے جسے سن کر لوگ متاثر ہوتے ہیں۔

(۶) یعنی ان کے بعض اچھے عملوں کی کوئی قیمت نہیں ہوگی، مثلاً اکرام ضیف، صلہ رحمی وغیرہ۔ کیونکہ ایمان کی دولت

اللہ کے دشمنوں کی سزا یہی دوزخ کی آگ ہے جس میں ان کا بیٹھکی کا گھر ہے (یہ بدلہ ہے ہماری آیتوں سے انکار کرنے کا۔^(۱) (۲۸)

اور کافر لوگ کہیں گے اے ہمارے رب! ہمیں جنوں انسانوں (کے وہ دونوں فریق) دکھا جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا^(۲) (تاکہ) ہم انہیں اپنے قدموں تلے ڈال دیں تاکہ وہ جنہم میں سب سے نیچے (سخت عذاب میں) ہو جائیں۔^(۳) (۲۹)

(واقفی) جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے^(۴) پھر اسی پر قائم رہے^(۵) ان کے پاس فرشتے (یہ کہتے

ذَلِكَ جَزَاءُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿۲۸﴾
جَزَاءُ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿۲۸﴾

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا رَبَّنَا إِنَّكَ لَأَنْتَ الَّذِي آخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ لَنْفَعُنَّهُمْ الْإِنْسَانَ نَجَعَلُهُمْ أَحْتَرَابًا وَمَا يَكُونُ لَهُمْ مِنَ الشُّعْرَاءِ ﴿۲۹﴾

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا رَبَّنَا إِنَّهُمْ لَأَنْتَ اللَّهُ تَعَالَى فَتَقَامُوا عَلَيْهِمْ

سے وہ محروم رہے تھے، البتہ برے عملوں کی جزا نہیں ملے گی، جن میں قرآن کریم سے روکنے کا جرم بھی ہے۔

(۱) آیتوں سے مراد جیسا کہ پہلے بھی بتلایا گیا ہے، وہ دلائل و براہین واضح ہیں جو اللہ تعالیٰ انبیاء پر نازل فرماتا ہے یا وہ معجزات ہیں جو انہیں عطا کیے جاتے ہیں یا وہ دلائل تکوینیہ ہیں جو کائنات یعنی آفاق و انفس میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کافران سب ہی کافر کرتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ ایمان کی دولت سے محروم رہتے ہیں۔

(۲) اس کا مفہوم واضح ہی ہے کہ گمراہ کرنے والے شیاطین ہی نہیں ہوتے، انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی شیطان کے زیر اثر لوگوں کو گمراہ کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ تاہم بعض نے جن سے ابلیس اور انسان سے قابیل مراد لیا ہے، جس نے انسانوں میں سب سے پہلے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر کے ظلم اور کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا اور حدیث کے مطابق قیامت تک ہونے والے ناجائز قتلوں کے گناہ کا ایک حصہ بھی اس کو ملتا رہے گا۔ ہمارے خیال میں پہلا مفہوم زیادہ صحیح ہے۔

(۳) یعنی اپنے قدموں سے انہیں روندیں اور اس طرح ہم انہیں خوب ذلیل و رسوا کریں۔ جنہیوں کو اپنے لیڈروں پر جو غصہ ہو گا اس کی تشفی کے لیے وہ یہ کہیں گے۔ ورنہ دونوں ہی مجرم ہیں اور دونوں ہی یکساں جہنم کی سزا بھگتیں گے۔ جیسے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿يَكُلُّ ضَعْفٌ وَلَكِنْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (الأعراف: ۳۸) جنہیوں کے تذکرے کے بعد اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا تذکرہ فرما رہا ہے، جیسا کہ عام طور پر قرآن کا انداز ہے تاکہ ترہیب کے ساتھ ترغیب اور ترغیب کے ساتھ ترہیب کا بھی اہتمام رہے۔ گویا انذار کے بعد اب تبشیر۔

(۴) یعنی ایک اللہ وحدہ لا شریک۔ رب بھی وہی اور معبود بھی وہی۔ یہ نہیں کہ ربوبیت کا تو اقرار، لیکن الوہیت میں دوسروں کو بھی شریک کیا جا رہا ہے۔

(۵) یعنی سخت سے سخت حالات میں بھی ایمان و توحید پر قائم رہے، اس سے انحراف نہیں کیا۔ بعض نے استقامت کے

ہوئے) آتے ہیں^(۱) کہ تم کچھ بھی اندیشہ اور غم نہ کرو^(۲) (بلکہ) اس جنت کی بشارت سن لو جس کا تم وعدہ دیئے گئے ہو۔^(۳) (۳۰)

تمہاری دنیوی زندگی میں بھی ہم تمہارے رفیق تھے اور آخرت میں بھی رہیں گے،^(۴) جس چیز کو تمہارا جی چاہے اور جو کچھ تم مانگو سب تمہارے لیے (جنت میں موجود) ہے۔ (۳۱)

غفور و رحیم (موجود) کی طرف سے یہ سب کچھ بطور مہمانی کے ہے۔ (۳۲)

اور اس سے زیادہ اچھی بات والا کون ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک کام کرے اور کہے کہ میں یقیناً مسلمانوں میں سے ہوں۔^(۵) (۳۳)

نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی۔^(۶) برائی کو بھلائی سے دفع کرو پھر وہی جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے

السَّلَامَةُ الْأَخْفَاؤُ وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبِشُرُوا يَا جَنَّةَ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۳۰﴾

تَحْنُ أَوْلِيَاكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُنَّ أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ ﴿۳۱﴾

نُزُلَاتٍ مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ﴿۳۲﴾

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۳۳﴾

وَلَا تَتَّبِعُوا الْحَسَنَةَ وَلَا السَّيِّئَةَ لِإِنَّهُمَا لَبِئْسَ مَا كَانَا فِيهَا إِذَا الدَّيْرُ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿۳۴﴾

معنی اخلاص کیے ہیں۔ یعنی صرف ایک اللہ ہی کی عبادت و اطاعت کی۔ جس طرح حدیث میں بھی آتا ہے، ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا مجھے ایسی بات بتلا دیں کہ آپ ﷺ کے بعد کسی سے مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، «قُلْ آمَنْتُ بِاللَّهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ» (صحیح مسلم: کتاب الإیمان، باب جامع أوصاف الإسلام) ”کہہ، میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اس پر استقامت اختیار کر۔“

(۱) یعنی موت کے وقت، بعض کہتے ہیں، فرشتے یہ خوش خبری تین جگہوں پر دیتے ہیں، موت کے وقت، قبر میں اور قبر سے دوبارہ اٹھنے کے وقت۔

(۲) یعنی آخرت میں پیش آنے والے حالات کا اندیشہ اور دنیا میں مال و اولاد جو چھوڑ آئے ہو، ان کا غم نہ کرو۔

(۳) یعنی دنیا میں جس کا وعدہ تمہیں دیا گیا تھا۔

(۴) یہ مزید خوش خبری ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ بعض کے نزدیک یہ فرشتوں کا قول ہے، دونوں صورتوں میں مومن کے لیے یہ عظیم خوش خبری ہے۔

(۵) یعنی لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کے ساتھ ساتھ خود بھی ہدایت یافتہ، دین کا پابند اور اللہ کا مطیع ہے۔

(۶) بلکہ ان میں عظیم فرق ہے۔

ایسا ہو جائے گا جیسے دلی دوست- (۳۳)^(۱)

اور یہ بات انہیں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کریں (۳)^(۲) اور اسے سوائے بڑے نصیبی والوں کے کوئی نہیں پا سکتا۔ (۳۵)^(۳)

اور اگر شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آئے تو اللہ کی پناہ طلب کرو۔ (۳)^(۴) یقیناً وہ بہت ہی سننے والا جاننے والا ہے۔ (۵)^(۵) (۳۶)

اور دن رات اور سورج چاند بھی (اسی کی) نشانیوں میں سے ہیں، (۱)^(۶) تم سورج کو سجدہ نہ کرو نہ چاند

وَمَا يَلْقَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلْقَاهُمْ إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝۵

وَمَا يَنْزِعُكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعًا قَاتِلَةً يَا لَيْلِي إِنَّهُ هُوَ السَّيِّئُ الْعَلِيمُ ۝۶

وَمَنْ يَتَّبِعِ الْبَيْتَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَا يَسْمُدُوا لِلَّهِ سِينًا وَلَا لِقَمَرًا وَأَمْبَعًا وَاللَّهُ الَّذِي خَلَقَهُمْ إِنْ كُنْتُمْ

(۱) یہ ایک بہت ہی اہم اخلاقی ہدایت ہے کہ برائی کو اچھائی کے ساتھ ٹالو۔ یعنی برائی کا بدلہ احسان کے ساتھ، زیادتی کا بدلہ عفو کے ساتھ، غضب کا صبر کے ساتھ، بے ہودگیوں کا جواب چشم پوشی کے ساتھ اور مکروہات (ناپسندیدہ باتوں) کا جواب برداشت اور حلم کے ساتھ دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہارا دشمن، دوست بن جائے گا، دور دور رہنے والا قریب ہو جائے گا اور خون کا پیا سا، تمہارا گرویدہ اور جانثار ہو جائے گا۔

(۲) یعنی برائی کو بھلائی کے ساتھ ٹالنے کی خوبی اگرچہ نہایت مفید اور بڑی شمر آور ہے لیکن اس پر عمل وہی کر سکیں گے جو صابر ہوں گے۔ غصے کو پی جانے والے اور ناپسندیدہ باتوں کو برداشت کرنے والے۔

(۳) حَظٌّ عَظِيمٌ (بڑا نصیبیہ) سے مراد جنت ہے یعنی مذکورہ خوبیاں اس کو حاصل ہوتی ہیں جو بڑے نصیبی والا ہوتا ہے، یعنی جنتی جس کے لیے جنت میں جانا لکھ دیا گیا ہو۔

(۴) یعنی شیطان، شریعت کے کام سے پھیرنا چاہے یا احسن طریقے سے برائی کے دفع کرنے میں رکاوٹ ڈالے تو اس کے شر سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ طلب کرو۔

(۵) اور جو ایسا ہو یعنی ہر ایک کی سننے والا اور ہر بات کو جاننے والا، وہی پناہ کے طلب گاروں کو پناہ دے سکتا ہے۔ یہ ماقبل کی تعلیل ہے۔ اس کے بعد اب پھر بعض ان نشانیوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو اللہ کی توحید، اس کی قدرت کاملہ اور اس کی قوت تصرف پر دلالت کرتی ہیں۔

(۶) یعنی رات کو تاریک بنانا تاکہ لوگ اس میں آرام کر سکیں، دن کو روشن بنانا تاکہ کسب معاش میں پریشانی نہ ہو۔ پھر یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کا آنا جانا اور کبھی رات کا لہبا اور دن کا چھوٹا ہونا۔ اور کبھی اس کے برعکس دن کا لہبا اور رات کا چھوٹا ہونا۔ اسی طرح سورج اور چاند کا اپنے وقت پر طلوع و غروب ہونا اور اپنے اپنے مدار پر اپنی منزلیں طے کرتے رہنا اور آپس میں باہمی تصادم سے محفوظ رہنا، یہ سب اس بات کی دلیلیں ہیں کہ ان کا یقیناً کوئی خالق اور

إِنِّي أَتَعْبُدُونَ ﴿۳۷﴾

کو^(۱) بلکہ سجدہ اس اللہ کے لیے کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے،^(۲) اگر تمہیں اسی کی عبادت کرنی ہے تو۔ (۳۷)

پھر بھی اگر یہ کبر و غرور کریں تو وہ (فرشتے) جو آپ کے رب کے نزدیک ہیں وہ تو رات دن اس کی تسبیح بیان کر رہے ہیں اور (کسی وقت بھی) نہیں اکتاتے۔ (۳۸)

اس اللہ کی نشانوں میں سے (یہ بھی) ہے کہ تو زمین کو دبی دہائی دیکھتا ہے^(۳) پھر جب ہم اس پر مینہ برساتے ہیں تو وہ تروتازہ ہو کر ابھرنے لگتی ہے۔^(۴) جس نے اسے زندہ کیا وہی یقینی طور پر مردوں کو بھی زندہ کرنے والا ہے،^(۵) بیشک وہ ہر (ہر) چیز پر قادر ہے۔ (۳۹)

بیشک جو لوگ ہماری آیتوں میں کج روی کرتے ہیں^(۶) وہ



قَالُوا اسْتَكْبَرُوا فَالَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُونَ لَهُ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْأَوْنَ ﴿۳۸﴾

وَمِنَ الْبَيْتَةِ أَنَاكَ تَرَى الْكُرْسِيَّ خَاشِعَةً فَأَوَّارِكُنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ أَهْتَكُوتُ وَرَبَّتْ لِيَنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا الْمَوْجِي الْمَوْجِي إِنَّهُ عَلَّ حُلِّ شَمِي قَلْبِي ﴿۳۹﴾

إِنَّ الَّذِي يَلْجِدُونَ فِي آلِهَتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا أَمَنْ يَلْقَى

مالک ہے۔ نیز وہ ایک اور صرف ایک ہے اور کائنات میں صرف اسی کا تصرف اور حکم چلتا ہے۔ اگر تدبیر و امر کا اختیار رکھنے والے ایک سے زیادہ ہوتے تو یہ نظام کائنات ایسے مستحکم اور لگہ بندھے طریقے سے کبھی نہیں چل سکتا تھا۔

(۱) اس لیے کہ یہ بھی تمہاری طرح اللہ کی مخلوق ہیں، خدائی اختیارات سے بہرہ وریا ان میں شریک نہیں ہیں۔

(۲) خَلَقَهُمْ، میں جمع مونث کی ضمیر اس لیے آئی ہے کہ یہ یا تو خَلَقَ هَذِهِ الْأَزْوَاجَ الْمَذْكُورَةَ کے مفہوم میں ہے، کیونکہ غیر عاقل کی جمع کا حکم جمع مونث ہی کا ہے۔ یا اس کا مرجع صرف شمس و قمر ہی ہیں اور بعض ائمہ نوحا کے نزدیک تشبیہ بھی جمع ہے یا پھر مراد الآیات ہیں، (فتح القدير)

(۳) خَاشِعَةً کا مطلب، خشک اور قحط زدہ یعنی مردہ۔

(۴) یعنی انواع و اقسام کے خوش ذائقہ پھل اور غلے پیدا کرتی ہے۔

(۵) مردہ زمین کو بارش کے ذریعے سے اس طرح زندہ کر دینا اور اسے روئیدگی کے قابل بنا دینا، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مردوں کو بھی یقیناً زندہ کرے گا۔

(۶) یعنی ان کو مانتے نہیں بلکہ ان سے اعراض، انحراف اور ان کی تکذیب کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے الحاد کے معنی کیے ہیں وضع الکلام علی غیر مواضع، جس کی رو سے اس میں وہ باطل فرقتے بھی آجاتے ہیں جو اپنے غلط عقائد و نظریات کے اثبات کے لیے آیات الہی میں تحریف معنوی اور دجل و تلبیس سے کام لیتے ہیں۔

(کچھ) ہم سے مخفی نہیں،^(۱) (بتلاؤ تو) جو آگ میں ڈالا جائے وہ اچھا ہے یا وہ جو امن و امان کے ساتھ قیامت کے دن آئے؟ تم جو چاہو کرتے چلے جاؤ،^(۲) وہ تمہارا سب کیا کرایا دیکھ رہا ہے۔ (۴۰)

جن لوگوں نے اپنے پاس قرآن پہنچ جانے کے باوجود اس سے کفر کیا، (وہ بھی ہم سے پوشیدہ نہیں) یہ^(۳) بڑی با وقعت کتاب ہے۔ (۵)^(۴)

جس کے پاس باطل پھٹک بھی نہیں سکتا نہ اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے، یہ ہے نازل کردہ حکمتوں والے خوبیوں والے (اللہ) کی طرف سے۔^(۶) (۴۲)

آپ سے وہی کہا جاتا ہے جو آپ سے پہلے کے رسولوں

فِي النَّارِ خَيْرٌ مِّنْ يَّأْتِي أَمَّا قَوْمٌ فَالْقِيَمَةُ نَحْمَلُهَا شَيْئًا ۚ إِنَّا لَمَّا شِئْنَا مَنَّا
بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ۝

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَوَّابٌ ۝
حَكِيمٌ حَمِيدٌ ۝

مَا يَقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدَّ قَبِيلٌ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ إِنَّ رَبَّكَ

(۱) یہ لہدین (چاہے وہ کسی قسم کے ہوں) کے لیے سخت وعید ہے۔

(۲) یعنی کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ نہیں، یقیناً نہیں۔ علاوہ ازیں اس سے اشارہ کر دیا کہ لہدین آگ میں ڈالے جائیں گے اور اہل ایمان قیامت والے دن بے خوف ہوں گے۔

(۳) یہ امر کا لفظ ہے، لیکن یہاں اس سے مقصود وعید اور تہدید ہے۔ کفر و شرک اور معاصی کے لیے اذن اور اجابت نہیں ہے۔

(۴) بریکٹ کے الفاظ ان کی خبر محذوف کا ترجمہ ہیں بعض نے کچھ اور الفاظ محذوف مانے ہیں۔ مثلاً يُجَاوِزُونَ بِكُفْرِهِمْ (انہیں ان کے کفر کی سزا دی جائے گی) یا هَالِكُونَ (وہ ہلاک ہونے والے ہیں) یا يُعَذَّبُونَ۔

(۵) یعنی یہ کتاب، جس سے اعراض و انحراف کیا جاتا ہے معارضے اور طعن کرنے والوں کے طعن سے بہت بلند اور ہر عیب سے پاک ہے۔

(۶) یعنی وہ ہر طرح سے محفوظ ہے، آگے سے، کامطلب ہے، اور پیچھے سے، کامطلب ہے زیادتی یعنی باطل اس کے آگے سے آکر اس میں کمی اور نہ اس کے پیچھے سے آکر اس میں اضافہ کر سکتا ہے اور نہ کوئی تغیر و تحریف ہی کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کی طرف سے نازل کردہ ہے جو اپنے اقوال و افعال میں حکیم ہے اور حمید یعنی محمود ہے۔ یا وہ جن باتوں کا حکم دیتا ہے اور جن سے منع فرماتا ہے، عواقب اور غایات کے اعتبار سے سب محمود ہیں، یعنی اچھے اور مفید ہیں۔ (ابن کثیر)

سے بھی کہا گیا ہے، ^(۱) یقیناً آپ کا رب معافی والا ^(۲) اور دردناک عذاب والا ہے۔ ^(۳) (۴۳)

اور اگر ہم اسے عجمی زبان کا قرآن بناتے تو کہتے ^(۴) کہ اس کی آیتیں صاف صاف بیان کیوں نہیں کی گئیں؟ ^(۵) یہ کیا کہ عجمی کتاب اور آپ عربی رسول؟ ^(۶) آپ کہہ دیجئے! کہ یہ تو ایمان والوں کے لیے ہدایت و شفا ہے اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں تو (بہرا پن اور) بوجھ ہے اور یہ ان پر اندھا پن ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو کسی بہت دور دراز جگہ سے پکارے جا رہے ہیں۔ ^(۷) (۴۴)

لَا تُدْعَوْنَ لَهُمْ يُدْعَوْنَ لِقَوْلِهِمْ ۝

وَلَوْ جَعَلْنَاهُمْ قُرْآنًا فَجَعَلْنَاهُم مِّنَ الَّذِينَ يَشْكُرُونَ
عَمَّا وَعَدْنَاهُمْ وَإِنَّمَا كُنَّا نَسْتَأْذِنُ لَكُمْ لَعَلَّ كَيْفَ تَقُولُونَ
وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقُرْءَانَهُمْ عَلَيْهِمْ عَمًى
أُولَٰئِكَ يَنْتَدُونَ مِّنْ مَّكَانٍ يَّبْعِدُونَ ۝

(۱) یعنی پچھلی قوموں نے اپنے پیغمبروں کی تکذیب کے لیے جو کچھ کہا کہ یہ ساحر ہیں، مجنون ہیں، کذاب ہیں وغیرہ وغیرہ، وہی کچھ کفار مکہ نے بھی آپ ﷺ کو کہا ہے۔ یہ گویا آپ ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ ﷺ کی تکذیب اور آپ ﷺ کی سحر، کذب اور جنون کی طرف نسبت، نئی بات نہیں ہے، ہر پیغمبر کے ساتھ یہی کچھ ہوتا آیا ہے جیسے دوسرے مقام پر فرمایا۔ ﴿ مَا آتَى الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ مِّن رَّسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاهِرًا وَيَقُولُونَ * اقْتُوا صَوَابَهُ بَلْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ حُجْرٌ ﴾ (الذاریات- ۵۲، ۵۳) اور سراسر مطلب اس کا یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو توحید اور اخلاص کا جو حکم دیا گیا ہے، یہ وہی باتیں ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے رسولوں کو بھی کسی گئی تھیں۔ اس لیے کہ تمام شریعتیں ان باتوں پر متفق رہی ہیں بلکہ سب کی اولین دعوت ہی توحید و اخلاص تھی۔ (فتح القدیر)

(۲) یعنی ان اہل ایمان و توحید کے لیے جو مستحق مغفرت ہیں۔
(۳) ان کے لیے جو کافر اور اللہ کے پیغمبروں کے دشمن ہیں۔ یہ آیت بھی سورہ حجر کی آیت ﴿ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هٰٓؤُلَآءِ سَبِيلًا ۚ سَبِيلُ هٰٓؤُلَآءِ هِيَ سَبِيلُ الْكٰفِرِيْنَ ۗ اِنَّ سَبِيْلَ الْكٰفِرِيْنَ هِيَ الضَّلٰلَةُ ۗ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُضِلُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَهُمْ لَا يُدْرِيْنَ ۝۱۰۰ ﴾ کی طرح ہے۔
(۴) یعنی عربی کے بجائے کسی اور زبان میں قرآن نازل کرتے۔

(۵) یعنی ہماری زبان میں اسے بیان کیوں نہیں کیا گیا، جسے ہم سمجھ سکتے، کیونکہ ہم تو عرب ہیں، عجمی زبان نہیں سمجھتے۔
(۶) یہ بھی کافروں ہی کا قول ہے کہ وہ تعجب کرتے کہ رسول تو عربی ہے اور قرآن اس پر عجمی زبان میں نازل ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کو عربی زبان میں نازل فرما کر اس کے اولین مخاطب عربوں کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہنے دیا ہے۔ اگر یہ غیر عربی زبان میں ہوتا تو وہ عذر کر سکتے تھے۔

(۷) یعنی جس طرح دور کا شخص، دوری کی وجہ سے پکارنے والے کی آواز سننے سے قاصر رہتا ہے، اسی طرح ان لوگوں کی عقل و فہم میں قرآن نہیں آتا۔

یقیناً ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی تھی، سو اس میں بھی اختلاف کیا گیا اور اگر (وہ) بات نہ ہوتی (جو) آپ کے رب کی طرف سے پہلے ہی مقرر ہو چکی ہے^(۱) تو اُنکے درمیان (کبھی کا) فیصلہ ہو چکا ہوتا،^(۲) یہ لوگ تو اسکے بارے میں سخت بے چین کرنے والے شک میں ہیں۔^(۳) (۳۵)

جو شخص نیک کام کرے گا وہ اپنے نفع کے لیے اور جو برا کام کرے گا اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔ اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔^(۴) (۳۶)

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتَلَفَ فِيهِ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَفُضِيَ بَيْنَهُمْ وَلَاتَهُمُ لَعْنَةُ رَبِّكَ ۗ إِنَّهُمْ مُرِيدُوا

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِظَالِمٍ لِّلْعَالَمِينَ ۝

(۱) کہ ان کو عذاب دینے سے پہلے مہلت دی جائے گی۔ ﴿وَلَا يَكُن فُؤَادُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسْتَعْتَبٍ﴾ (فاطر: ۴۵)

(۲) یعنی فوراً عذاب دے کر ان کو تباہ کر دیا گیا ہوتا۔

(۳) یعنی ان کا انکار عقل و بصیرت کی وجہ سے نہیں، بلکہ محض شک کی وجہ سے ہے جو ان کو بے چین کئے رکھتا ہے۔

(۴) اس لیے کہ وہ عذاب صرف اسی کو دیتا ہے جو گناہ گار ہوتا ہے، نہ کہ جس کو چاہے، یوں ہی عذاب میں مبتلا کر دے۔

إِلَىٰ يَوْمِ نَدْوَىٰ ۖ وَعَلَّمَ السَّاعَةَ ۖ وَمَا تَحْمُرُ مِنْ شَرَاتٍ مِّنَ
الْبَاهِيَةِ ۖ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ ۖ وَلَا تَقْضَىٰ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۖ وَيَوْمَ
يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ كَانُوا يُدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۗ

قیامت کا علم اللہ ہی کی طرف لوٹایا جاتا ہے^(۱) اور جو جو پھل اپنے شگوفوں میں سے نکلتے ہیں اور جو مادہ حمل سے ہوتی ہے اور جو بچے وہ جنمتی ہے سب کا علم اسے ہے^(۲) اور جس دن اللہ تعالیٰ ان (مشرکوں) کو بلا کر دریافت فرمائے گا میرے شریک کہاں ہیں، وہ جواب دیں گے کہ ہم نے تو تجھے کہہ سنایا کہ ہم میں سے تو کوئی اس کا گواہ نہیں۔^(۳) (۳۷)

وَصَلَّ عَنَّمْ مَا كَانُوا يُدْعُونَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَظَلُّوا مَا كَانُوا مِنْ
تَحِيصٍ ۗ

اور یہ جن (جن) کی پرستش اس سے پہلے کرتے تھے وہ ان کی نگاہ سے گم ہو گئے^(۴) اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اب ان کے لیے کوئی بچاؤ نہیں۔^(۵) (۳۸)

لَا يَسْتَعْمِلُ الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْغَيْرِ ۖ وَإِنْ سَأَلَهُ الشَّرُّ

(۱) یعنی اللہ کے سوا اس کے وقوع کا کسی کو علم نہیں۔ اسی لیے جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے واقع ہونے کے بارے میں پوچھا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا: 'مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ'، 'اس کی بابت مجھے بھی اتنا ہی علم ہے جتنا تجھے ہے'، میں تجھ سے زیادہ نہیں جانتا۔ دوسرے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِلَىٰ رَبِّكَ مُنتَهِنَا﴾ (النازعات: ۳۲) ﴿لَا يَسْتَعْمِلُ الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْغَيْرِ﴾ (الأعراف: ۱۸۷)

(۲) یہ اللہ کے علم کامل و محیط کا بیان ہے اور اس کی اس صفت علم میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ یعنی اس طرح کا علم کامل کسی کو حاصل نہیں۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی نہیں۔ انہیں بھی اتنا ہی علم ہوتا ہے جتنا اللہ تعالیٰ انہیں وحی کے ذریعے سے بتلا دیتا ہے۔ اور اس علم وحی کا تعلق بھی منصب نبوت اور اس کے تقاضوں کی ادائیگی سے متعلق ہی ہوتا ہے نہ کہ دیگر فنون و معاملات سے متعلق۔ اس لیے کسی بھی نبی اور رسول کو، چاہے وہ کتنی ہی عظمت شان کا حامل ہو، 'عَالِمٌ مَا كَانَ وَمَا يَكُونُ' کہنا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ صرف ایک اللہ کی شان اور اس کی صفت ہے۔ جس میں کسی اور کو شریک ماننا شرک ہوگا۔

(۳) یعنی آج ہم میں سے کوئی شخص یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ تیرا کوئی شریک ہے؟

(۴) یعنی وہ ادھر ادھر ہو گئے اور حسب گمان انہوں نے کسی کو فائدہ نہیں پہنچایا۔

(۵) یہ گمان، یقین کے معنی میں ہے یعنی قیامت والے دن وہ یہ یقین کرنے پر مجبور ہوں گے کہ انہیں اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا۔ ﴿وَدَا الْجُحُومُونَ النَّارَ فَكَلَّمُوا اللَّهَ فَأَمَرُهُمْ فَأُغْوُوا لَهُمْ فَأَعْمَاهُمْ فَصَارُوا كَمَا يُصْرَفُونَ﴾ (الکہف: ۵۳)

(۶) یعنی دنیا کا مال و اسباب، صحت و قوت، عزت و رفعت اور دیگر دنیوی نعمتوں کے مانگنے سے انسان نہیں تھکتا، بلکہ

فَيُؤَسِّسُ قَوْمًا ۵

وَلَكِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِنَّا مِنْ بَعْدِ صَرَاءٍ مَسْتَتِهَ لَيَقُولَنَّ
هَذَا لِيُؤْمِنُوا بِالْإِسْلَامِ السَّاعَةَ قَلِيمًا ۚ وَلَكِنْ رُجِعْتُمُ إِلَىٰ
رَبِّكُمْ إِنَّ لِي عِنْدَ الْكُفْرَانِ لَعْنَةً ۚ فَكَلِمَتَيْنِ الَّذِينَ كَفَرُوا
بِمَا عَمِلُوا وَالَّذِينَ يَتَّبِعُهُمْ مِنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۖ عَالِيًا ۝

وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ ۚ وَإِذَا مَسَّهُ
الضَّرُّ فَذُو دَعَاؤٍ عَرِيضٍ ۝

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنَ عِنْدِ اللَّهِ تَكْفُرٌ ثُمَّ لَكُمْ مِنْهُ نِعْمَةٌ ۖ

تکلیف پہنچ جائے تو مایوس اور ناامید ہو جاتا ہے۔ (۳۹)^(۱)
اور جو مصیبت اسے پہنچ چکی ہے اس کے بعد اگر ہم
اسے کسی رحمت کا مزہ چکھائیں تو وہ کہہ اٹھتا ہے کہ اس
کا تو میں حقدار^(۲) ہی تھا اور میں تو خیال نہیں کر سکتا کہ
قیامت قائم ہوگی اور اگر میں اپنے رب کے پاس واپس
کیا گیا تو بھی یقیناً میرے لیے اس کے پاس بھی بہتری^(۳)
ہے، یقیناً ہم ان کفار کو ان کے اعمال سے خبردار کریں
گے اور انہیں سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ (۵۰)

اور جب ہم انسان پر اپنا انعام کرتے ہیں تو وہ منہ پھیر لیتا ہے
اور کنارہ کش ہو جاتا ہے^(۴) اور جب اسے مصیبت پڑتی ہے تو
بڑی لمبی چوڑی دعائیں کرنے والا بن جاتا ہے۔ (۵۱)^(۵)

آپ کہہ دیجئے! کہ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر یہ قرآن اللہ کی
طرف سے آیا ہوا ہو پھر تم نے اسے نہ مانا بس اس سے

مانگتا ہی رہتا ہے۔ انسان سے مراد انسانوں کی غالب اکثریت ہے۔

(۱) یعنی تکلیف پہنچنے پر فوراً مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے، جب کہ اللہ کے مخلص بندوں کا حال اس سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ
ایک تو دنیا کے طالب نہیں ہوتے، ان کے سامنے ہر وقت آخرت ہی ہوتی ہے، دوسرے، تکلیف پہنچنے پر بھی وہ اللہ کی
رحمت اور اس کے فضل سے مایوس نہیں ہوتے، بلکہ آزمائشوں کو بھی وہ کفارہٴ سینات اور رفع درجات کا باعث
گردانتے ہیں۔ گویا مایوسی ان کے قریب بھی نہیں پھلکتی۔

(۲) یعنی اللہ کے ہاں میں محبوب ہوں، وہ مجھ سے خوش ہے، اسی لیے مجھے وہ اپنی نعمتوں سے نواز رہا ہے۔ حالانکہ دنیا
کی کمی بیشی اس کی محبت یا ناراضی کی علامت نہیں ہے۔ بلکہ صرف آزمائش کے لیے اللہ ایسا کرتا ہے تاکہ وہ دیکھے کہ
نعمتوں میں اس کا شکر کون کر رہا ہے اور تکلیفوں میں صابر کون ہے؟

(۳) یہ کہنے والا منافق یا کافر ہے، کوئی مومن ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ کافر ہی یہ سمجھتا ہے کہ میری دنیا خیر کے ساتھ گزر
رہی ہے تو آخرت بھی میرے لیے ایسی ہی ہوگی۔

(۴) یعنی حق سے منہ پھیر لیتا اور حق کی اطاعت سے اپنا پہلو بدل لیتا ہے اور تکبیر کا اظہار کرتا ہے۔

(۵) یعنی بارگاہ الہی میں تضرع و زاری کرتا ہے تاکہ وہ مصیبت دور فرمادے۔ یعنی شدت میں اللہ کو یاد کرتا ہے، خوش
حالی میں بھول جاتا ہے، نزول نعمت کے وقت اللہ سے فریادیں کرتا ہے، حصول نعمت کے وقت اسے وہ یاد نہیں رہتا۔

أَخْلَصَ مِنْهُمُ الْوَفِيُّ شِقَاقٍ بَعِيدًا ⑤

بڑھ کر برکا ہوا کون ہو گا^(۱) جو مخالفت میں (حق سے) دور
چلا جائے۔^(۲) (۵۲)

عنقریب ہم انہیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں بھی دکھائیں
گے اور خود ان کی اپنی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر
کھل جائے کہ حق یہی ہے،^(۳) کیا آپ کے رب کا ہر چیز
سے واقف و آگاہ ہونا کافی نہیں۔^(۴) (۵۳)

یقین جانو! کہ یہ لوگ اپنے رب کے روبرو جانے سے
شک میں ہیں،^(۵) یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کیے
ہوئے ہے۔^(۶) (۵۴)

سَبِّحُوا لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَرَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ
إِنَّهُ الْحَقُّ أُولَئِكَ يَكْفُرُونَ إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ⑥

أَلَا إِنَّهُمْ فِي صِرَاطٍ مِّنْ لِّقَاءِ رَبِّهِمْ أَلَّا يَكْفُرُوا
بِشَيْءٍ عَظِيمٍ ⑦

(۱) یعنی ایسی حالت میں تم سے زیادہ گمراہ اور تم سے زیادہ دشمن کون ہو گا۔

(۲) شِقَاقٍ کے معنی ہیں، ضد، عناد اور مخالفت۔ بَعِيدٌ مل کر اس میں اور مبالغہ ہو جاتا ہے۔ یعنی جو بہت زیادہ مخالف اور عناد
سے کام لیتا ہے، حتیٰ کہ اللہ کے نازل کردہ قرآن کی بھی تکذیب کر دیتا ہے، اس سے بڑھ کر گمراہ اور بد بخت کون ہو سکتا ہے؟

(۳) جن سے قرآن کی صداقت اور اس کا من جانب اللہ ہونا واضح ہو جائے گا۔ یعنی اِنَّمَا میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔
بعض نے اس کا مرجع اسلام یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا ہے۔ مال سب کا ایک ہی ہے۔ آفَاقٌ، اَفُقٌ کی جمع ہے۔
کنارہ، مطلب ہے کہ ہم اپنی نشانیاں باہر کناروں میں بھی دکھائیں گے اور خود انسان کے اپنے نفسوں کے اندر بھی۔
چنانچہ آسمان و زمین کے کناروں میں بھی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں مثلاً سورج، چاند، ستارے، رات اور دن، ہوا
اور بارش، گرج چمک، بجلی، کڑک، نباتات و جمادات، اشجار، پہاڑ، اور انہار و بحار وغیرہ۔ اور آیات انفس سے انسان کا
وجود، جن اغلاط و مواد و بیستوں پر مرکب ہے وہ مراد ہیں۔ جن کی تفصیلات طب و حکمت کا دلچسپ موضوع ہے۔ بعض
کہتے ہیں، آفاق سے مراد شرق و غرب کے وہ دور دراز کے علاقے ہیں۔ جن کی فتح کو اللہ نے مسلمانوں کے لیے آسان فرما
دیا اور انفس سے مراد خود عرب کی سرزمین پر مسلمانوں کی پیش قدمی ہے، جیسے جنگ بدر اور فتح مکہ وغیرہ فتوحات میں
مسلمانوں کو عزت و سرفرازی عطا کی گئی۔

(۴) استغمام اقراری ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اقوال و افعال کے دیکھنے کے لیے کافی ہے، اور وہی اس بات کی
گواہی دے رہا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے جو اس کے سچے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔

(۵) اس لیے اسکی بابت غور و فکر نہیں کرتے، نہ اسکے لیے عمل کرتے ہیں اور نہ اس دن کا کوئی خوف ان کے دلوں میں ہے۔

(۶) بنا بریں اس کے لیے قیامت کا وقوع قطعاً مشکل امر نہیں کیوں کہ تمام مخلوقات پر اس کا غلبہ و تصرف ہے وہ اس میں
جس طرح چاہے تصرف کرے، کرتا ہے، کر سکتا ہے اور کرے گا، کوئی اس کو روکنے والا نہیں ہے۔

سورہ شوریٰ کی ہے اور اس میں تین آیتیں اور
پانچ رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

حم- (۱) عسق- (۲)

اللہ تعالیٰ جو زبردست ہے اور حکمت والا ہے اسی طرح
تیری طرف اور تجھ سے اگلوں کی طرف وحی بھیجتا رہا۔^(۱) (۳)
آسمانوں کی (تمام) چیزیں اور جو کچھ زمین میں ہے سب
اسی کا ہے وہ برتر اور عظیم الشان ہے۔^(۲)
قریب ہے آسمان اوپر سے پھٹ پڑیں^(۲) اور تمام فرشتے
اپنے رب کی پاکی تعریف کے ساتھ بیان کر رہے ہیں اور
زمین والوں کے لیے استغفار کر رہے ہیں۔^(۳) خوب سمجھ
رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہی معاف فرمائے والارحمت والا ہے۔^(۴) (۵)
اور جن لوگوں نے اس کے سوا دوسروں کو کارساز بنا لیا

سُورَةُ الشُّورَى

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حَمْدٌ ۱ عَسَقٌ ۲

كُنَّا نَكْفُرُ بِحُجُجِ الْبَيْتِ وَآلِي الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ اللَّهُ

الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۳

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ۴

تَكَذَّبَتِ السَّمٰوٰتُ وَيَتَّقُرْنَ مِنَ قُوَّةِ رَبِّكَ وَالْمَلٰئِكَةُ يَسْتَبْخِرُونَ بِحَمْدِ

رَبِّكَ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ اِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَفُوْرُ

الرَّحِيْمُ ۵

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهِ اَوْلِيَا۟ لِّلَّهِ حَفِيْظًا عَلَيْهِمْ مَّا نَتَّ

(۱) یعنی جس طرح یہ قرآن تیری طرف نازل کیا گیا ہے اسی طرح تجھ سے پہلے انبیاء پر صحیفے اور کتابیں نازل کی گئیں۔
وحی اللہ کا وہ کلام ہے جو فرشتے کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے پاس بھیجتا رہا ہے۔ ایک صحابی نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی کی کیفیت پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ کبھی تو یہ میرے پاس گھنٹی کی آواز کی مثل آتی ہے اور یہ
مجھ پر سب سے سخت ہوتی ہے، جب یہ ختم ہو جاتی ہے تو مجھے یاد ہو چکی ہوتی ہے اور کبھی فرشتہ انسانی شکل میں آتا ہے
اور مجھ سے کلام کرتا ہے اور وہ جو کتا ہے میں یاد کر لیتا ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، میں نے سخت سردی میں
مشاہدہ کیا کہ جب وحی کی کیفیت ختم ہوتی تو آپ سینے میں شرابور ہوتے اور آپ کی پیشانی سے پسینے کے قطرے گر رہے
ہوتے۔ (صحیح بخاری، باب بدء الوحی)

(۲) اللہ کی عظمت و جلال کی وجہ سے۔

(۳) یہ مضمون سورہ مومن کی آیت ۷ میں بھی بیان ہوا ہے۔

(۴) اپنے دوستوں اور اہل طاعت کے لیے یا تمام ہی بندوں کے لیے، کیوں کہ کفار اور نافرمانوں کی فوراً گرفت نہ کرنا
بلکہ انہیں ایک وقت میں تک مہلت دینا، یہ بھی اس کی رحمت و مغفرت ہی کی قسم سے ہے۔

ہے اللہ تعالیٰ ان پر نگران ^(۱) ہے اور آپ ان کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ ^(۲) (۶)

اسی طرح ہم نے آپ کی طرف عربی قرآن کی وحی کی ہے ^(۳) تاکہ آپ مکہ والوں کو اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو خبردار کر دیں ^(۴) اور جمع ہونے کے دن سے جس ^(۵) کے آنے میں کوئی شک نہیں ڈرا دیں۔ ایک گروہ جنت میں ہو گا اور ایک گروہ جہنم میں ہو گا۔ ^(۶) (۷)

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی امت کا بنا دیتا ^(۷) لیکن وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے

عَلَيْهِمْ يَوْمَئِذٍ ۝

وَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ
وَمَنْ حَوْلَهَا وَنُنذِرُكُمُ الْجَمْعَ الْأَدِيمَ فِيَوْمَئِذٍ يَتَّبِعُونَ فِي الْمَجْمَعِ
وَفِيَوْمَئِذٍ فِي السَّبْعِ ۝

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِنْ يُدْخِلُ مَنْ
يَشَاءُ فِي دَعْوَاهِ وَالظَّالِمُونَ مَا لَهُمْ مِنْ قَوْلٍ وَلَا نَصِيرٍ ۝

(۱) یعنی ان کے عملوں کو محفوظ کر رہا ہے تاکہ اس پر ان کو جزا دے۔

(۲) یعنی آپ اس بات کے مکلف نہیں ہیں کہ ان کو ہدایت کے راستے پر لگا دیں یا ان کے گناہوں پر ان کا مواخذہ فرمائیں، بلکہ یہ کام ہمارے ہیں، آپ کا کام صرف ابلاغ (پہنچا دینا) ہے۔

(۳) یعنی جس طرح ہم نے ہر رسول اس کی قوم کی زبان میں بھیجا، اسی طرح ہم نے آپ پر عربی زبان میں قرآن نازل کیا ہے، کیوں کہ آپ کی قوم یہی زبان بولتی اور سمجھتی ہے۔

(۴) اُمُّ الْقُرَىٰ، مکہ کا نام ہے۔ اسے ”بیتوں کی ماں“ اس لیے کہا گیا کہ یہ عرب کی قدیم ترین بستی ہے۔ گویا یہ تمام بیتوں کی ماں ہے جنہوں نے اسی سے جنم لیا ہے۔ مراد اہل مکہ ہیں۔ وَمَنْ حَوْلَهَا میں اس کے شرق و غرب کے تمام علاقے شامل ہیں۔ ان سب کو ذرا لیں کہ اگر وہ کفر و شرک سے تائب نہ ہوئے تو عذاب الہی کے مستحق قرار پائیں گے۔

(۵) قیامت والے دن کو جمع ہونے والا دن اس لیے کہا کہ اس میں اگلے پچھلے تمام انسان جمع ہوں گے علاوہ ازیں ظالم مظلوم اور مومن و کافر سب جمع ہوں گے اور اپنے اپنے اعمال کے مطابق جزا و سزا سے بہرہ ور ہوں گے۔

(۶) جو اللہ کے حکموں کو بجالایا ہو گا اور اس کی منہیات و محرمات سے دور رہا ہو گا وہ جنت میں اور اس کی نافرمانی اور محرمات کا ارتکاب کرنے والا جہنم میں ہو گا۔ یہی دو گروہ ہوں گے۔ تیسرا گروہ نہیں ہو گا۔

(۷) اس صورت میں قیامت والے دن صرف ایک ہی گروہ ہوتا یعنی اہل ایمان اور اہل جنت کا لیکن اللہ کی حکمت و مشیت نے اس جبر کو پسند نہیں کیا بلکہ انسانوں کو آزمانے کے لیے اس نے انسانوں کو ارادہ و اختیار کی آزادی دی، جس نے اس آزادی کا صحیح استعمال کیا، وہ اللہ کی رحمت کا مستحق ہو گیا، اور جس نے اس کا غلط استعمال کیا، اس نے ظلم کا ارتکاب کیا کہ اللہ کی دی ہوئی آزادی اور اختیار کو اللہ ہی کی نافرمانی میں استعمال کیا۔ چنانچہ ایسے ظالموں کا قیامت والے دن کوئی مددگار نہیں ہو گا۔

اور ظالموں کا حامی اور مددگار کوئی نہیں۔ (۸)
 کیا ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کارساز بنا لیے
 ہیں، (حقیقتاً تو) اللہ تعالیٰ ہی کارساز ہے وہی مردوں کو
 زندہ کرے گا اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ (۹)
 اور جس جس چیز میں تمہارا اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ
 ہی کی طرف ہے، (۱۰) یہی اللہ میرا رب ہے جس پر میں نے
 بھروسہ کر رکھا ہے اور جس کی طرف میں جھکتا ہوں۔ (۱۰)
 وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اس نے
 تمہارے لیے تمہاری جنس کے جوڑے بنا دیئے ہیں (۳)
 اور چوپایوں کے جوڑے بنائے ہیں (۴) تمہیں وہ اس میں
 پھیلا رہا ہے (۵) اس جیسی کوئی چیز نہیں (۱) وہ سننے اور

لَمْ يَخْتَفُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۗ قَالَتْ هُمُ الْوَالِدُ وَهُوَ يُعْطِي
 الْمَوْتَىٰ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠﴾

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي
 عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿١٠﴾

فَاِطْرَاقَ التَّهْمَاتِ وَالْأَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا
 وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا يَذُرُّكُمْ فِيهِ لَكُمْ فِيهَا لَبَسٌ لَكُمْ فِيهَا
 شَتَّىٰ ۗ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿١٠﴾

- (۱) جب یہ بات ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو ولی اور کارساز مانا جائے نہ کہ ان کو جن کے پاس کوئی اختیار ہی نہیں ہے، اور جو سننے اور جواب دینے کی طاقت رکھتے ہیں، نہ نفع و نقصان پہنچانے کی صلاحیت۔
- (۲) اس اختلاف سے مراد دین کا اختلاف ہے جس طرح یہودیت، عیسائیت اور اسلام وغیرہ میں آپس میں اختلافات ہیں اور ہر مذہب کا پیرو کار دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا دین سچا ہے، دراصل حالیکہ سارے دین بیک وقت صحیح نہیں ہو سکتے۔ سچا دین تو صرف ایک ہی ہے اور ایک ہی ہو سکتا ہے۔ دنیا میں سچا دین اور حق کا راستہ پہچاننے کے لیے اللہ تعالیٰ کا قرآن موجود ہے۔ لیکن دنیا میں لوگ اس کلام الہی کو اپنا حکم اور ثالث ماننے کے لیے تیار نہیں۔ بالآخر پھر قیامت کا دن ہی رہ جاتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ ان اختلافات کا فیصلہ فرمائے گا اور چوں کہ جنت میں اور دوسروں کو جہنم میں داخل فرمائے گا۔
- (۳) یعنی یہ اس کا احسان ہے کہ تمہاری جنس سے ہی اس نے تمہارے جوڑے بنائے، ورنہ اگر تمہاری بیویاں انسانوں کے بجائے کسی اور مخلوق سے بنائی جاتیں تو تمہیں یہ سکون حاصل نہ ہوتا جو اپنی ہم جنس اور ہم شکل بیوی سے ملتا ہے۔
- (۴) یعنی یہی جوڑے بنانے (مذکر و مؤنث) کا سلسلہ ہم نے چوپایوں میں بھی رکھا ہے، چوپایوں سے مراد وہی نر اور مادہ اٹھ جانور ہیں جن کا ذکر سورۃ الأنعام میں کیا گیا ہے۔
- (۵) يَذُرُّكُمْ كَمْ کے معنی پھیلانے یا پیدا کرنے کے ہیں یعنی وہ تمہیں کثرت سے پھیلا رہا ہے۔ یا نسلًا بعد نسل پیدا کر رہا ہے۔ انسانی نسل کو بھی اور چوپائے کی نسل کو بھی فِئِهِ كَمْ کا مطلب ہے فِي ذَلِكَ الْخَلْقِ عَلَيْكَ هَذِهِ الصَّفَةِ، یعنی اس پیدائش میں اس طریقے پر وہ تمہیں ابتدا سے پیدا کرتا رہا ہے۔ یا ”رحم میں“ یا ”پیٹ میں“ مراد ہے۔ یا فِئِهِ بمعنی بہ ہے یعنی تمہارا جوڑا بنانے کے سبب سے تمہیں پیدا کرتا پھیلاتا ہے کیوں کہ یہ زوجیت ہی نسل کا سبب ہے۔ (فتح القدر و ابن کثیر)
- (۶) نہ ذات میں نہ صفات میں، پس وہ اپنی نظیر آپ ہی ہے، واحد اور بے نیاز۔

دیکھنے والا ہے۔ (۱۱)

آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کی ہیں،^(۱) جس کی چاہے روزی کشادہ کر دے اور تنگ کر دے، یقیناً وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ (۱۲)

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کر دیا ہے جس کے قائم کرنے کا اس نے نوح (علیہ السلام) کو حکم دیا تھا اور جو (بذریعہ وحی) ہم نے تیری طرف بھیج دی ہے، اور جس کا تاکید حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو دیا^(۲) تھا، کہ اس دین کو قائم رکھنا^(۳) اور اس میں پھوٹ نہ^(۴) ڈالنا جس چیز کی طرف آپ

لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّهُ بِحَسْرَتِنَا عَلِيمٌ ﴿۱۱﴾

مَرَعَكُمْ مِّنَ الدِّينِ مَا وُطِّئَ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَّبِعُوا هَوَايَ كَبُرَ عَلَى الشُّرَكَاءِ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ ﴿۱۲﴾

(۱) مَقَالِيدُ، مِفْتَاحُ اور مِفْلَاحُ کی جمع ہے۔ خزانے یا چابیاں۔

(۲) شَرَعَ کے معنی ہیں، بیان کیا، واضح کیا اور مقرر کیا، لَكُم، (تمہارے لیے) یہ امت محمدیہ سے خطاب ہے۔ مطلب ہے کہ تمہارے لیے وہی دین مقرر یا بیان کیا ہے جس کی وصیت اس سے قبل تمام انبیا کو کی جاتی رہی ہے۔ اس ضمن میں چند جلیل القدر انبیا کے نام ذکر فرمائے۔

(۳) الدِّين سے مراد، اللہ پر ایمان، توحید، اطاعت رسول اور شریعت الہیہ کو ماننا ہے۔ تمام انبیا کا یہی دین تھا جس کی وہ دعوت اپنی اپنی قوم کو دیتے رہے۔ اگرچہ ہر نبی کی شریعت اور منج میں بعض جزوی اختلافات ہوتے تھے جیسا کہ فرمایا ﴿لِكُلِّ جَمَلَةٍ مِّنكُمْ فِرْعَوْنٌ وَمِثْلَانَا﴾ — (المائدہ: ۳۸) لیکن مذکورہ اصول سب کے درمیان مشترک تھے۔ اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: ہم انبیا کی جماعت علاقی بھائی ہیں، ہمارا دین ایک ہے، ”صحیح بخاری وغیرہ) اور یہ ایک دین وہی توحید و اطاعت رسول ہے، یعنی ان کا تعلق ان فروعی مسائل سے نہیں ہے جن میں دلائل باہم مختلف یا متعارض ہوتے ہیں یا جن میں کبھی فہم کا تباہن اور تفاوت ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان میں اجتہاد یا اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے اس لیے یہ مختلف ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں، تاہم توحید و اطاعت، فروعی نہیں، اصولی مسئلہ ہے جس پر کفر و ایمان کا دارومدار ہے۔

(۴) صرف ایک اللہ کی عبادت اور اس کی اطاعت (یا اس کے رسول کی اطاعت جو دراصل اللہ ہی کی اطاعت ہے) وحدت و اثناف کی بنیاد ہے اور اس کی عبادت و اطاعت سے گریز یا ان میں دوسروں کو شریک کرنا، افتراق و انتشار انگیزی ہے، جس سے ”پھوٹ نہ ڈالنا“ کہہ کر منع کیا گیا ہے۔

انہیں بلا رہے ہیں وہ تو (ان) مشرکین پر گراں گزرتی ہے،^(۱) اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنا برگزیدہ بناتا ہے^(۲) اور جو بھی اس کی طرف رجوع کرے وہ اس کی صحیح رہ نمائی کرتا ہے۔^(۳) (۱۳)

ان لوگوں نے اپنے پاس علم آجانے کے بعد ہی اختلاف کیا (اور وہ بھی) باہمی ضد بحث سے^(۴) اور اگر آپ کے رب کی بات ایک وقت مقرر تک کے لیے پہلے ہی سے قرار پائی ہوئی نہ ہوتی تو یقیناً ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا^(۵) اور جن لوگوں کو ان کے بعد کتاب دی گئی ہے وہ بھی اس کی طرف سے الجھن والے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔^(۶) (۱۴)

پس آپ لوگوں کو اسی طرف بلا تے رہیں اور جو کچھ آپ سے کہا گیا ہے اس پر مضبوطی^(۷) سے جم جائیں اور ان کی خواہشوں پر نہ چلیں^(۸) اور کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ

وَمَا تَقْرُؤُوا مِنَ الذِّكْرِ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَعِيَا لِيَوْمِهِمْ
وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَفُضِّى
بَيْنَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَلْبَغْيَ شَرِيكَ
مِنْهُمْ يُرِيدُ ۝

فَلْيَذَكِّرْكَ فَأَذَكَّرْنَاكَ وَاسْتَعْتَبْنَا مَا أَمَرْنَا وَلَا تَتَّبِعُوا مَا يَهْوَىٰ أَمْهَمٌ
وَقُلْ أَمَرْتُ بِمَا آتَىٰ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَأَمَرْتُ بِالْعَدْلِ

(۱) اور وہ وہی توحید اور اللہ ورسول کی اطاعت ہے۔

(۲) یعنی جس کو ہدایت کا مستحق سمجھتا ہے، اسے ہدایت کے لیے چن لیتا ہے۔

(۳) یعنی اپنا دین اپنانے کی اور عبادت کو اللہ کے لیے خالص کرنے کی توفیق اس شخص کو عطا کر دیتا ہے جو اس کی اطاعت و عبادت کی طرف رجوع کرتا ہے۔

(۴) یعنی انہوں نے اختلاف اور تفرق کا راستہ علم یعنی ہدایت آجانے اور اتمام حجت کے بعد اختیار کیا، جب کہ اختلاف کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ لیکن محض بغض و عناد، ضد اور حسد کی وجہ سے ایسا کیا۔ اس سے بعض نے یہود اور بعض نے قریش مکہ مراد لیے ہیں۔

(۵) یعنی اگر ان کی بابت عقوبت میں تاخیر کا فیصلہ پہلے سے نہ ہوتا تو فوراً عذاب بھیج کر ان کو ہلاک کر دیا جاتا۔

(۶) اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں جو اپنے سے ما قبل کے یہود و نصاریٰ کے بعد کتاب یعنی تورات و انجیل کے وارث بنائے گئے۔ یا مراد عرب ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنا قرآن نازل فرمایا اور انہیں قرآن کا وارث بنایا۔ پہلے مفسوم کے اعتبار سے ”الکتاب“ سے تورات و انجیل اور دوسرے مفسوم کے لحاظ سے اس سے مراد قرآن کریم ہے۔

(۷) یعنی اس تفرق اور شک کی وجہ سے، جس کا ذکر پہلے ہوا، آپ ان کو توحید کی دعوت دیں اور اس پر جتنے رہیں۔

(۸) یعنی انہوں نے اپنی خواہش سے جو چیزیں گھڑی ہیں، مثلاً بتوں کی عبادت وغیرہ، اس میں انکی خواہش کے پیچھے مت چلیں۔

نے جتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں میرا ان پر ایمان ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تم میں انصاف کرتا رہوں۔^(۱) ہمارا اور تم سب کا پروردگار اللہ ہی ہے ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں، ہم تم میں کوئی کٹ حجتی نہیں^(۲) اللہ تعالیٰ ہم (سب) کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ (۱۵)

اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی باتوں میں جھگڑا ڈالتے ہیں اس کے بعد کہ (مخلوق) اسے مان چکی^(۳) ان کی کٹ حجتی اللہ کے نزدیک باطل ہے،^(۴) اور ان پر غضب ہے اور ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ (۱۶)

اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی ہے اور ترازو بھی (اتاری ہے)^(۵) اور آپ کو کیا خبر شاید قیامت

بَيْنَكُمْ وَاللَّهِ رَبِّنَا وَرَبِّكُمْ لَأَعْمَالُنَا وَأَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاللَّهُ الْمُبْصِرُ ۝

وَالَّذِينَ يُحَادِّثُونَ فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا نُنزِّلُ إِلَيْهِمْ مِنْ حُجَّةٍ دَاحِضَةً عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۝

اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ كَرِيهٌُ ۝

(۱) یعنی جب بھی تم اپنا کوئی معاملہ میرے پاس لاؤ گے تو اللہ کے احکام کے مطابق اس کا عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کروں گا۔

(۲) یعنی کوئی جھگڑا نہیں، اس لیے کہ حق ظاہر اور واضح ہو چکا ہے۔

(۳) یعنی یہ مشرکین مسلمانوں سے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ جنہوں نے اللہ اور رسول کی بات مان لی ہے، تاکہ انہیں پھر راہ ہدایت سے ہٹادیں۔ یا مراد یہود و نصاریٰ ہیں جو مسلمانوں سے جھگڑتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارا دین تمہارے دین سے بہتر ہے اور ہمارا نبی بھی تمہارے نبی سے پہلے ہوا ہے، اس لیے ہم تم سے بہتر ہیں۔

(۴) دَاحِضَةً کے معنی کمزور، باطل، جس کو ثبات نہیں۔

(۵) الْكِتَاب سے مراد جس ہے یعنی تمام پیغمبروں پر جتنی کتابیں بھی نازل ہوئیں، وہ سب حق اور سچی تھیں۔ یا بطور خاص قرآن مجید مراد ہے اور اس کی صداقت کو واضح کیا جا رہا ہے۔ میزان سے مراد عدل و انصاف ہے۔ عدل کو ترازو سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ یہ برابری اور انصاف کا آلہ ہے۔ اس کے ذریعے سے ہی لوگوں کے درمیان برابری ممکن ہے۔ اسی کے ہم معنی یہ آیات بھی ہیں۔ ﴿لَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِزْلًا نُنزِّلُ الْوَحْيَ وَاللَّيْلَةَ وَالنَّهَارَ وَمَا يَدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ كَرِيهٌُ﴾ (سورة الرحمن، ۴) ”اسی نے آسمان کو بلند کیا اور اسی نے ترازو رکھی تاکہ تم تو لے میں کمی

بیشی نہ کرو۔ انصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول میں کمی نہ کرو۔“

﴿وَالَّذِينَ يُحَادِّثُونَ فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا نُنزِّلُ إِلَيْهِمْ مِنْ حُجَّةٍ دَاحِضَةً عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ﴾ (سورة الرحمن، ۴) ”اسی نے آسمان کو بلند کیا اور اسی نے ترازو رکھی تاکہ تم تو لے میں کمی بیشی نہ کرو۔ انصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول میں کمی نہ کرو۔“

قریب^(۱) ہی ہو۔ (۱۷)

اس کی جلدی انہیں پڑی ہے جو اسے نہیں مانتے^(۲) اور جو اس پر یقین رکھتے ہیں وہ تو اس سے ڈر رہے ہیں^(۳) انہیں اس کے حق ہونے کا پورا علم ہے۔ یاد رکھو جو لوگ قیامت کے معاملہ میں لڑ جھگڑ رہے ہیں،^(۴) وہ دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ (۱۸)^(۵)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا ہی لطف کرنے والا ہے، جسے چاہتا ہے کشادہ روزی دیتا ہے اور وہ بڑی طاقت بڑے غلبہ والا ہے۔ (۱۹)

جس کا ارادہ آخرت کی کھیتی کا ہو ہم اسے اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے^(۱) اور جو دنیا کی کھیتی کی طلب رکھتا ہو ہم اسے اس میں سے ہی کچھ دے دیں گے،^(۲) ایسے

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ مِنْهَا وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا الْحَقُّ أَكْرَانَ الَّذِينَ يُمَارُونَ فِي السَّاعَةِ لِيَصَلِّيَ بَعْضُهُمْ

اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْعَزِيزُ ﴿۱۹﴾

مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ شَيْءٍ ﴿۲۰﴾

(۱) قریب، مذکر اور مونث دونوں کی صفت کے لیے آجاتا ہے۔ خصوصاً جب کہ موصوف مونث غیر حقیقی ہو۔ ﴿إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِنَ الْمُحْسِنِينَ﴾ - (فتح القدیر)

(۲) یعنی استہزا کے طور پر یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کو آنا ہی کہاں ہے؟ اس لیے کہتے ہیں کہ قیامت جلدی آئے۔

(۳) اس لیے کہ ایک تو ان کو اس کے وقوع کا پورا یقین ہے۔ دوسرے ان کو خوف ہے کہ اس روز بے لاگ حساب ہو گا، کہیں وہ بھی مؤاخذۃ الہی کی زد میں نہ آجائیں۔ جیسے دوسرے مقام پر ہے۔ ﴿وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا فَلْيُبَهُمْ وَجِلَةٌ

أَكْفَرَالِي رَبِّهِمْ لَاجِبُونَ﴾ (المؤمنون، ۶۰)

(۴) یمارون، مُمَارَاة سے ہے جس کے معنی لڑنا جھگڑنا ہیں۔ یا مِرْيَبَة سے ہے، بمعنی ریب و شک۔

(۵) اس لیے کہ وہ ان دلائل پر غور و فکر ہی نہیں کرتے جو ایمان لانے کے موجب بن سکتے ہیں حالانکہ یہ دلائل روز و شب ان کے مشاہدے میں آتے ہیں۔ ان کی نظروں سے گزرتے ہیں اور ان کی عقل و فہم میں آسکتے ہیں۔ اس لیے وہ حق سے بہت دور جا پڑے ہیں۔

(۶) حَرْث کے معنی تخم ریزی کے ہیں۔ یہاں یہ بہ طریق استعارہ اعمال کے ثمرات و فوائد پر بولا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص دنیا میں اپنے اعمال و محنت کے ذریعے سے آخرت کے اجر و ثواب کا طالب ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی آخرت کی کھیتی میں اضافہ فرمائے گا کہ ایک ایک نیکی کا جردس گنا سے لے کر سات سو گنا بلکہ اس سے زیادہ تک بھی عطا فرمائے گا۔

(۷) یعنی طالب دنیا کو دنیا تو ملتی ہے لیکن اتنی نہیں جتنی وہ چاہتا ہے بلکہ اتنی ہی ملتی ہے جتنی اللہ کی مشیت اور تقدیر

شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔^(۱) (۲۰)
 کیا ان لوگوں نے ایسے (اللہ کے) شریک (مقرر کر رکھے)
 ہیں جنہوں نے ایسے احکام دین مقرر کر دیئے ہیں جو اللہ
 کے فرمائے ہوئے نہیں ہیں۔^(۲) اگر فیصلے کے دن کا وعدہ
 نہ ہوتا تو (ابھی ہی) ان میں فیصلہ کر دیا جاتا۔ یقیناً (ان)
 ظالموں کے لیے ہی دردناک عذاب ہے۔ (۲۱)

آپ دیکھیں گے کہ یہ ظالم اپنے اعمال سے ڈر رہے
 ہوں گے^(۳) جن کے وبال ان پر واقع ہونے والے
 ہیں،^(۴) اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک
 اعمال کیے وہ بہشتوں کے باغات میں ہوں گے وہ جو
 خواہش کریں اپنے رب کے پاس موجود پائیں گے یہی
 ہے بڑا فضل۔ (۲۲)

یہی وہ ہے جس کی بشارت اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو
 دے رہا ہے جو ایمان لائے اور (سنت کے مطابق) نیک
 عمل کیے تو کہہ دیجئے! کہ میں اس پر تم سے کوئی بدلہ
 نہیں چاہتا مگر محبت رشتہ داری کی،^(۵) جو شخص کوئی نیکی

أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْتِنَا
 بِهِ اللَّهُ وَكُلُوا كَلِمَةَ الْفَصْلِ لَمُضَىٰ بَيْنَهُمْ
 وَبَيْنَ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢٠﴾

تَرَى الظَّالِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا كَسَبُوا وَهُوَ وَاقِعٌ
 بِهِمْ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي رَوْضَةٍ
 الْجَنَّةِ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذَلِكَ
 هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿٢١﴾

ذَلِكَ الَّذِي يُبَشِّرُ اللَّهُ عِبَادَهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
 قُلْ إِنَّا أَنْتَلِكُمْ عَلَيْكُمْ آجْرًا إِلَّا الْمَرْدَةَ فِي الْعُرَىٰ وَمَنْ يَغْتَرَفْ
 حَسَنَةً يَّزِدْ لَهُ فِيهَا حَسَنًا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ شَكُورٌ ﴿٢٢﴾

کے مطابق ہوتی ہے۔

(۱) یہ وہی مضمون ہے جو سورہ بنی اسرائیل ۱۸ میں بھی بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا تو اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اتنی
 ضرور دیتا ہے جتنی اس نے لکھ دی ہے، کیوں کہ وہ سب کی روزی کا ذمہ لئے ہوئے ہے، طالب دنیا کو بھی اور طالب
 آخرت کو بھی۔ تاہم جو طالب آخرت ہو گا یعنی آخرت کے لیے کسب و محنت کرے گا تو قیامت والے دن اللہ تعالیٰ اسے
 أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً اجر و ثواب عطا فرمائے گا، جب کہ طالب دنیا کے لیے آخرت میں سوائے جہنم کے عذاب کے کچھ
 نہیں ہو گا۔ اب یہ انسان کو خود سوچ لینا چاہیے کہ اس کا فائدہ طالب دنیا بننے میں ہے یا طالب آخرت بننے میں۔

(۲) یعنی شرک و معاصی، جن کا حکم اللہ نے نہیں دیا ہے، ان کے بنائے ہوئے شریکوں نے انسانوں کو اس راہ پر لگایا ہے۔

(۳) یعنی قیامت والے دن۔

(۴) حالانکہ ڈرنا بے فائدہ ہو گا کیوں کہ اپنے کیے کی سزا تو انہیں بہر حال بھگتنی ہو گی۔

(۵) قبائل قریش اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان رشتہ داری کا تعلق تھا، آیت کا مطلب بالکل واضح ہے کہ میں

کرے ہم اس کے لیے اس کی نیکی میں اور نیکی بڑھا دیں گے۔^(۱) بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا (اور) بہت قدر دان ہے۔^(۲) (۲۳)

کیا یہ کہتے ہیں کہ (بیغیر نے) اللہ پر جھوٹ باندھا ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو آپ کے دل پر مر لگا دے^(۳) اور اللہ تعالیٰ اپنی باتوں سے جھوٹ کو مٹا دیتا ہے^(۴) اور سچ کو

أَمْ يُؤْمِنُونَ أَفْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَنْ يَخْتَارَ عَلَىٰ قَلْبِكَ وَيَمُنُّ اللَّهُ بِالْبَاطِلِ وَالْحَقِّ بِكَلِمَاتِهِ إِنَّهُ

وعظ و نصیحت اور تبلیغ و دعوت کی کوئی اجرت تم سے نہیں مانگتا، البتہ ایک چیز کا سوال ضرور ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان جو رشتے داری ہے، اس کا لحاظ کرو، تم میری دعوت کو نہیں مانتے تو نہ مانو، تمہاری مرضی۔ لیکن مجھے نقصان پہنچانے سے تو باز رہو، تم میرے دست و بازو نہیں بن سکتے تو رشتہ داری و قربت کے ناطے مجھے ایذا تو نہ پہنچاؤ اور میرے راستے کا روڑہ تو نہ بنو کہ میں فریضہ رسالت ادا کر سکوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے معنی کیے ہیں کہ میرے اور تمہارے درمیان جو قربت (رشتہ داری) ہے اس کو قائم رکھو۔ (صحیح البخاری، تفسیر سورۃ الشوریٰ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آل، یقیناً حسب و نسب کے اعتبار سے دنیا کی اشرف ترین آل ہے اس سے محبت، اس کی تعظیم و توقیر جزو ایمان ہے۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی احادیث میں ان کی تکریم اور حفاظت کی تائید فرمائی ہے لیکن اس آیت کا کوئی تعلق اس موضوع سے نہیں ہے، جیسا کہ شیعہ حضرات کھینچنا تانی کر کے اس آیت کو آل محمد ﷺ کی محبت کے ساتھ جوڑتے ہیں اور پھر آل کو بھی انہوں نے محدود کر دیا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ و حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما تک۔ نیز محبت کا مفہوم بھی ان کے نزدیک یہ ہے کہ انہیں معصوم اور الٰہی اختیارات سے متصف مانا جائے۔ علاوہ ازیں کفار مکہ سے اپنے گھرانے کی محبت کا سوال بطور اجرت تبلیغ نہایت عجیب بات ہے جو نبی ﷺ کی شان ارفع سے بہت ہی فروتر ہے آپ ﷺ کی تبلیغ کو قبول نہ کرنے کے باوجود آپ ﷺ کی طلب تو صرف قربت اور صلہ رحمی کی بنیاد پر محبت برقرار رکھنے کی تھی پھر یہ آیت اور سورت مکی ہے جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے درمیان ابھی عقد زواج بھی قائم نہیں ہوا تھا۔ یعنی ابھی وہ گھرانہ معرض وجود میں ہی نہیں آیا تھا جس کی خود ساختہ محبت کا اثبات اس آیت سے کیا جاتا ہے۔

(۱) یعنی اجر و ثواب میں اضافہ کریں گے۔ یا نیکی کے بعد اس کا بدلہ مزید نیکی کی توفیق کی صورت میں دیں گے جس طرح بدی کا بدلہ مزید بدیوں کا ارتکاب ہے۔

(۲) اس لیے وہ پردہ پوشی فرماتا اور محاف کر دیتا ہے اور زیادہ سے زیادہ اجر دیتا ہے۔

(۳) یعنی اس الزام میں اگر صداقت ہوتی تو ہم آپ کے دل پر مر لگا دیتے، جس سے وہ قرآن ہی محو ہو جاتا جس کے گھرنے کا متساب آپ کی طرف کیا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کو اس کی سخت ترین سزا دیتے۔

(۴) یہ قرآن بھی اگر باطل ہوتا (جیسا کہ کاذبین کا دعویٰ ہے) تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کو بھی مٹا ڈالتا، جیسا کہ اس کی

عَلَيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ⑤

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُو عَنِ السَّيِّئَاتِ
وَيَعْلَمُ مَا لَفَعَلُونَ ⑥

ثابت رکھتا ہے۔ وہ سینے کی باتوں کو جاننے والا ہے۔ (۲۴)
وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے (۱) اور
گناہوں سے درگزر فرماتا ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو
(سب) جانتا ہے۔ (۲۵)

ایمان والوں اور نیکو کار لوگوں کی سنتا ہے (۲) اور انہیں
اپنے فضل سے اور بڑھا کر دیتا ہے اور کفار کے لیے سخت
عذاب ہے۔ (۲۶)

اگر اللہ تعالیٰ اپنے (سب) بندوں کی روزی فراخ کر دیتا تو
وہ زمین میں فساد (۳) برپا کر دیتے لیکن وہ اندازے کے
ساتھ جو کچھ چاہتا ہے نازل فرماتا ہے۔ وہ اپنے بندوں
سے پورا خبردار ہے اور خوب دیکھنے والا ہے۔ (۲۷)

اور وہی ہے جو لوگوں کے ناامید ہو جانے کے بعد بارش
برساتا ہے (۴) اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے۔ وہی ہے

وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَيَزِيدُهُمْ مِّنْ
فَضْلِهِ ⑦ وَاللَّهُ زَوَّادٌ شَدِيدٌ ⑧

وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ وَلَكِن يُؤْتِلُ
يَقْدِرُ مَا يَشَاءُ لِأَنَّهُ يُعْبَادُهُ خَيْرٌ مِّنْ صَيُورٍ ⑨

وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْقُرْآنَ مِن بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنشُرُ رَحْمَتَهُ ⑩

عادت ہے۔

(۱) توبہ کا مطلب ہے، معصیت پر ندامت کا اظہار اور آئندہ اس کو نہ کرنے کا عزم۔ محض زبان سے توبہ کر لینا یا اس
گناہ اور معصیت کے کام کو تو نہ چھوڑنا اور توبہ کا اظہار کیے جانا، توبہ نہیں ہے۔ یہ استنزا اور مذاق ہے۔ تاہم خالص اور
حقیقی توبہ اللہ تعالیٰ یقیناً قبول فرماتا ہے۔

(۲) یعنی ان کی دعائیں سنتا ہے اور ان کی خواہشیں اور آرزوئیں پوری فرماتا ہے۔ بشرطیکہ دعا کے آداب و شرائط کا بھی
پورا اہتمام کیا گیا ہو۔ اور حدیث میں آتا ہے ”کہ اللہ اپنے بندے کی توبہ سے اس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے
جس کی سواری مع کھانے پینے کے سامان کے، صحرا، بیابان میں گم ہو جائے اور وہ ناامید ہو کر کسی درخت کے نیچے لیٹ
جائے کہ اچانک اسے اپنی سواری مل جائے اور فرط مسرت میں اس کے منہ سے نکل جائے، اے اللہ! تو میرا بندہ اور میں
تیرا رب یعنی شدت فرح میں وہ غلطی کر جائے۔“ (صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی الحوض علی التوبۃ
والفرح بہا)

(۳) یعنی اگر اللہ تعالیٰ ہر شخص کو حاجت و ضرورت سے زیادہ یکساں طور پر وسائل رزق عطا فرمادیتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ
کوئی کسی کی ماتحتی قبول نہ کرتا، ہر شخص شر و فساد اور بچی وعدوان میں ایک سے بڑھ کر ایک ہوتا جس سے زمین فساد سے بھر جاتی۔

(۴) جو انواع رزق کی پیداوار میں سب سے زیادہ مفید اور اہم ہے۔ یہ بارش جب ناامیدی کے بعد ہوتی ہے تو اس
نعت کا صحیح احساس بھی اسی وقت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس طرح کرنے میں حکمت بھی یہی ہے کہ بندے اللہ کی

وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ ﴿۲۸﴾

وَمِنَ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا
مِنْ ذَاتَةٍ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ جَمِيعِهِمْ إِذِ اشْتَاءَ قَدِيرٌ ﴿۲۹﴾

وَمَا آصَابَهُ مِنَ الْمُصِيبَةِ فَمَا كَسَبَتْ أَيْدِيَهُمْ وَيَعْفُوا
عَنْ ذُنُوبِهِمْ ﴿۳۰﴾

وَمَا آتَاهُمْ مِنْ مِعْجَزَاتٍ فِي الْأَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ

کار ساز اور قابل حمد و ثنا۔^(۱) (۲۸)

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش ہے اور ان میں جانداروں کا پھیلانا ہے۔ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ جب چاہے انہیں جمع کر دے۔^(۲) (۲۹)

تمہیں جو کچھ مصیبتیں پہنچتی ہیں وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوت کا بدلہ ہے، اور وہ تو بہت سی باتوں سے درگزر فرما دیتا ہے۔^(۳) (۳۰)

اور تم ہمیں زمین میں عاجز کرنے والے نہیں ہو،^(۴)

نعمتوں کی قدر کریں اور اس کا شکر بجالاتے۔

(۱) کار ساز ہے، اپنے نیک بندوں کی چارہ سازی فرماتا ہے، انہیں منافع سے نوازتا اور شرور و مملکت سے ان کی حفاظت فرماتا ہے۔ اپنے ان انعامات بے پایاں اور احسانات فراوان پر قابل حمد و ثنا ہے۔

(۲) ذَاتَةٌ (زمین پر چلنے پھرنے والا) کا لفظ عام ہے، جس میں جن و انس کے علاوہ وہ تمام حیوانات شامل ہیں، جن کی شکلیں، رنگ، زبائیں، طباع، اور انواع و اجناس ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔ اور وہ روئے زمین پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سب کو اللہ تعالیٰ قیامت والے دن ایک ہی میدان میں جمع فرمائے گا۔

(۳) اس کا خطاب اگر اہل ایمان سے ہو تو مطلب ہو گا کہ تمہارے بعض گناہوں کا کفارہ تو وہ مصائب بن جاتے ہیں جو تمہیں گناہوں کی پاداش میں پہنچتے ہیں اور کچھ گناہ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ یوں ہی معاف فرمادیتا ہے اور اللہ کی ذات بڑی کریم ہے، معاف کرنے کے بعد آخرت میں اس پر مواخذہ نہیں فرمائے گی۔

حدیث میں بھی آتا ہے کہ ”مومن کو جو بھی تکلیف اور ہم و حزن پہنچتا ہے، حتیٰ کہ اس کے پیر میں کاٹنا بھی چھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے گناہ معاف فرمادیتا ہے۔“ (صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب ماجاء فی كفارة المرض. مسلم، کتاب البر، باب ثواب المؤمن فیما یصیبه من مرض) اگر خطاب عام ہو تو مطلب ہو گا کہ تمہیں جو مصائب دینا پہنچتے ہیں، یہ تمہارے اپنے گناہوں کا نتیجہ ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ بہت سے گناہوں سے تو درگزر ہی فرمادیتا ہے یعنی یا تو ہمیشہ کے لیے معاف کر دیتا ہے۔ یا ان پر فوری سزا نہیں دیتا۔ (اور عقوبت و تعزیر میں تاخیر یہ بھی ایک گونہ معافی ہی ہے) جیسے دوسرے مقام پر فرمایا — ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكُوا عَلَىٰ ظُهُرِهِمْ صِوَارًا﴾ (فاطرہ: ۴) ”اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے کرتوتوں پر فوراً مواخذہ شروع فرمادے تو زمین پر کوئی چلنے والا ہی باقی نہ رہے۔“ اسی مفہوم کی آیت النحل، ۶۱، بھی ہے۔

(۴) یعنی تم بھاگ کر کسی ایسی جگہ نہیں جا سکتے کہ جہاں تم ہماری گرفت میں نہ آسکو یا جو مصیبت ہم تم پر نازل کرنا

تمہارے لیے سوائے اللہ تعالیٰ کے نہ کوئی کار ساز ہے نہ مددگار۔ (۳۱)

اور دریا میں چلنے والی پہاڑوں جیسی کشتیاں اس کی نشانیوں میں سے ہیں۔ (۳۲)

اگر وہ چاہے تو ہوا بند کر دے اور یہ کشتیاں سمندروں پر رکی رہ جائیں۔ یقیناً اس میں ہر صبر کرنے والے شکر گزار کے لیے نشانیاں ہیں۔ (۳۳)

یا انہیں ان کے کرتوتوں کے باعث تباہ کر دے، (۳) وہ تو بہت سی خطاؤں سے درگزر فرمایا کرتا ہے۔ (۳۴)

اور تاکہ جو لوگ ہماری نشانیوں میں جھگڑتے ہیں (۴) معلوم کر لیں کہ ان کے لیے کوئی چھٹکارا نہیں۔ (۵) (۳۵)

تو تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے وہ زندگانی دنیا کا کچھ یونسی سا اسباب ہے، (۶) اور اللہ کے پاس جو ہے وہ اس سے بدرجہ بہتر (۷) اور پائیدار ہے، وہ ان کے لیے ہے جو ایمان لائے اور صرف اپنے رب ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ (۳۶)

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي قَدْ خَلَقْتُكُمْ مِنْ نَارٍ وَآبٍ لَاطِنَةٍ ﴿۳۱﴾

وَمِنَ الْيَتِيمِ الْجَوَارِيِ الْبَعْرُوكَ الْأَعْلَامِ ﴿۳۲﴾

إِنِّي نَسِيتُكُمْ الْيَوْمَ فَبُظِّلْتُمْ زَوَاكِدَ عَلَى ظُهُورِكُمْ إِنِّي فِي ذَلِكَ لَكَيْتٌ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿۳۳﴾

أَوْ يُوبِقُهُمْ بِمَا كَسَبُوا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيرٍ ﴿۳۴﴾

وَيَعْلَمُ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِنَا مَا لَهُمْ مِنْ حَيْبٍ ﴿۳۵﴾

مَا آوَيْتُمْ مِنْ مَتَاعِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَى لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۳۶﴾

چاہیں، اس سے تم بچ جاؤ۔

(۱) الجوار یا الجوارِی جَارِیةً (چلنے والی) کی جمع ہے، بمعنی کشتیاں، جہاز یہ اللہ کی قدرت تامہ کی دلیل ہے کہ سمندروں میں پہاڑوں جیسی کشتیاں اور جہاز اس کے حکم سے چلتے ہیں، ورنہ اگر وہ حکم دے تو یہ سمندروں میں ہی کھڑے رہیں۔

(۲) یعنی سمندر کو حکم دے اور اس کی موجوں میں طغیانی آجائے اور یہ ان میں ڈوب جائیں۔

(۳) ورنہ سمندر میں سفر کرنے والا کوئی بھی سلامتی کے ساتھ واپس نہ آسکے۔

(۴) یعنی ان کا انکار کرتے ہیں۔

(۵) یعنی اللہ کے عذاب سے وہ کہیں بھاگ کر چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔

(۶) یعنی معمولی اور حقیر ہے، چاہے قارون کا خزانہ ہی کیوں نہ ہو، اس لیے اس سے دھوکے میں مبتلا نہ ہونا، اس لیے کہ یہ عارضی اور فانی ہے۔

(۷) یعنی نیکیوں کا جو اجر و ثواب اللہ کے ہاں ملے گا وہ متاع دنیا سے کہیں زیادہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی، کیوں کہ اس کو زوال اور فنا نہیں، مطلب ہے کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح مت دو، ایسا کرو گے تو پچھتاؤ گے۔

اور کبیرہ گناہوں سے اور بے حیائیوں سے بچتے ہیں اور غصے کے وقت (بھی) معاف کر دیتے ہیں۔^(۱) (۳۷) اور اپنے رب کے فرمان کو قبول کرتے ہیں^(۲) اور نماز کی پابندی کرتے ہیں^(۳) اور ان کا (ہر) کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے،^(۴) اور جو ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے (ہمارے نام پر) دیتے ہیں۔ (۳۸)

وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبِيرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ﴿۳۷﴾

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿۳۸﴾

(۱) یعنی لوگوں سے غم و درگزر کرنا ان کے مزاج و طبیعت کا حصہ ہے نہ کہ انتقام اور بدلہ لینا۔ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے۔ «مَا أَنْتَمَ لِنَفْسِهِ قَطُّ إِلَّا أَنْ تُنْتَهَكَ حُرْمَاتِ اللَّهِ». (البخاری، کتاب الأدب، باب يسروا ولا تعسروا۔ مسلم، کتاب الفضائل، باب مباحثہ صلی اللہ علیہ وسلم للاحق) ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کبھی بدلہ نہیں لیا، ہاں اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کا توڑا جانا آپ کے لیے ناقابل برداشت تھا۔“

(۲) یعنی اس کے حکم کی اطاعت، اس کے رسول کا اتباع اور اس کے زواجر سے اجتناب کرتے ہیں۔

(۳) نماز کی پابندی اور اقامت کا بطور خاص ذکر کیا کہ عبادت میں اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔

(۴) شُورَى، کالْفِظِ ذِكْرَى، اور بُشْرَى کی طرح باب مفاصلہ سے اسم مصدر ہے۔ یعنی اہل ایمان ہر اہم کام باہمی مشاورت سے کرتے ہیں، اپنی ہی رائے کو حرف آخر نہیں سمجھتے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ نے حکم دیا کہ مسلمانوں سے مشورہ کرو (آل عمران ۱۵۹) چنانچہ آپ جنگی معاملات اور دیگر اہم کاموں میں مشاورت کا اہتمام فرماتے تھے۔ جس سے مسلمانوں کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی اور معاملے کے مختلف گوشے واضح ہو جاتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہما جب نیزے کے وار سے زخمی ہو گئے اور زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی تو امر خلافت میں مشاورت کے لیے چھ آدمی نامزد فرمادیے۔ عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم۔ انہوں نے باہم مشورہ کیا اور دیگر لوگوں سے بھی مشاورت کی اور اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کو خلافت کے لیے مقرر فرمادیا۔ بعض لوگ مشاورت کے اس حکم اور تاکید سے ملوکیت کی تردید اور جمہوریت کا اثبات کرتے ہیں۔ حالانکہ مشاورت کا اہتمام ملوکیت میں بھی ہوتا ہے۔ بادشاہ کی بھی مجلس مشاورت ہوتی ہے، جس میں ہر اہم معاملے پر سوچ بچار ہوتا ہے اس لیے اس آیت سے ملوکیت کی نفی قطعاً نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں جمہوریت کو مشاورت کے ہم معنی سمجھنا یکسر غلط ہے۔ مشاورت ہر کہ و مہ سے نہیں ہو سکتی، نہ اس کی ضرورت ہی ہے۔ مشاورت کا مطلب ان لوگوں سے مشورہ کرنا ہے جو اس معاملے کی نزاکتوں اور ضرورتوں کو سمجھتے ہیں جس میں مشورہ درکار ہوتا ہے۔ جیسے بلڈنگ، پل وغیرہ بنانا ہو تو، کسی تاگنہ بان، درزی یا رکشہ ڈرائیور سے نہیں، کسی انجینئر سے مشورہ کیا جائے گا، کسی مرض کے بارے میں مشورے کی ضرورت ہوگی تو طب و حکمت کے ماہرین کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ جب کہ جمہوریت میں اس کے برعکس ہر بالغ شخص کو مشورے کا اہل سمجھا جاتا ہے، چاہے وہ کورا ان

وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَكْتُمُونَ ﴿۳۹﴾

وَجَاءُوا سِنِينَ سِنِينَ مِثْلَهَا فَمَنْ عَقَا وَأَصْلَحَ
فَآجُرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَرِجْبُ الظَّالِمِينَ ﴿۴۰﴾

وَلَمَنِ اتَّصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ
سَبِيلٍ ﴿۴۱﴾

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي
الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۴۲﴾

وَلَمَنْ صَبَرَ وَعَفَا إِنَّ ذَلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿۴۳﴾

وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ قَبِيحٍ مِّنْ بَعْدِهَا وَتَرَى الظَّالِمِينَ
لَمَّا رَأَوْا الْعَذَابَ يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مَرَدٌّ مِّنْ سَبِيلِ اللَّهِ ﴿۴۴﴾

اور جب ان پر ظلم (و زیادتی) ہو تو وہ صرف بدلہ لے لیتے
ہیں۔^(۱) (۳۹)

اور برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے،^(۲) اور جو معاف کر
دے اور اصلاح کر لے اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے، (نبی
الواقع) اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔ (۴۰)

اور جو شخص اپنے مظلوم ہونے کے بعد (برابر کا) بدلہ
لے لے تو ایسے لوگوں پر (الزام کا) کوئی راستہ نہیں۔ (۴۱)
یہ راستہ صرف ان لوگوں پر ہے جو خود دوسروں پر ظلم
کریں اور زمین میں ناحق فساد کرتے پھریں، یہی لوگ
ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (۴۲)

اور جو شخص صبر کر لے اور معاف کر دے یقیناً یہ بڑی
ہمت کے کاموں میں سے (ایک کام) ہے۔ (۴۳)

اور جسے اللہ تعالیٰ بہکا دے اس کا اس کے بعد کوئی چارہ ساز
نہیں، اور تو دیکھے گا کہ ظالم لوگ عذاب کو دیکھ کر کہہ رہے
ہوں گے کہ کیا واپس جانے کی کوئی راہ ہے۔ (۴۴)

پڑھ، بے شعور اور امور سلطنت کی نزاکتوں سے یکسر بے خبر ہو۔ بنا بریں مشاورت کے لفظ سے جمہوریت کا اثبات، تحکم
اور دھاندلی کے سوا کچھ نہیں، اور جس طرح سوشلزم کے ساتھ اسلامی کا لفظ لگانے سے سوشلزم مشرف بہ اسلام نہیں
ہو سکتا، اسی طرح ”جمہوریت“ میں ”اسلامی“ کی پیوند کاری سے مغربی جمہوریت پر خلافت کی قباہت کی قباہت نہیں آسکتی۔
مغرب کا یہ پورا اسلام کی سرزمین پر نہیں پنپ سکتا۔

(۱) یعنی بدلہ لینے سے وہ عاجز نہیں ہیں، اگر بدلہ لینا چاہیں تو لے سکتے ہیں، تاہم قدرت کے باوجود وہ معافی کو ترجیح دیتے
ہیں جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ والے دن اپنے خون کے پیاسوں کے لیے عفو عام کا اعلان فرما دیا، حدیبیہ میں
آپ نے ان ۸۰ آدمیوں کو معاف کر دیا، جنہوں نے آپ کے خلاف سازش تیار کی تھی، لیبید بن عاصم یہودی سے بدلہ
نہیں لیا جس نے آپ پر جاو کیا تھا، اس یہودیہ عورت کو آپ نے کچھ نہیں کہا جس نے آپ کے کھانے میں زہر ملا دیا
تھا، جس کی تکلیف آپ دم واپس تک محسوس فرماتے رہے، صلی اللہ علیہ وسلم (ابن کثیر)

(۲) یہ قصاص (بدلہ لینے) کی اجازت ہے۔ برائی کا بدلہ اگرچہ برائی نہیں ہے لیکن مشاکلت کی وجہ سے اسے بھی برائی ہی
کہا گیا ہے۔

اور تو انہیں دیکھے گا کہ وہ (جنم کے) سامنے لا کھڑے کیے جائیں گے مارے زلت کے جھکے جا رہے ہوں گے اور کن آنکھیوں سے دیکھ رہے ہوں گے، ایمان والے صاف کہیں گے کہ حقیقی زیاں کار وہ ہیں جنہوں نے آج قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو نقصان میں ڈال دیا۔ یاد رکھو کہ یقیناً ظالم لوگ دائمی عذاب میں ہیں۔^(۱) (۳۵)

ان کے کوئی مددگار نہیں جو اللہ تعالیٰ سے الگ ان کی امداد کر سکیں اور جسے اللہ گمراہ کر دے اس کے لیے کوئی راستہ ہی نہیں۔ (۳۶)

اپنے رب کا حکم مان لو اس سے پہلے کہ اللہ کی جانب سے وہ دن آجائے جس کا ہاٹ جانا ممکن^(۲) ہے، تمہیں اس روز نہ تو کوئی پناہ کی جگہ ملے گی نہ چھپ کر انجان بن جانے کی۔^(۳) (۳۷)

اگر یہ منہ پھیر لیں تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر

وَتَرَاهُمْ يُعْرَضُونَ عَلَيْهِمُ الْخَشِيعِينَ مِنَ الذَّلَالِ يَنْظُرُونَ مِنْ طَرَفٍ خَفِيٍّ وَقَالَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ الْغُيُوبِينَ الَّذِينَ خَبَرُوا أَنْفُسَهُمْ وَأَهْلِيهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَلَّا إِنَّ الظَّالِمِينَ فِي عَذَابٍ مُتَقَبِرٍ ۝

وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ أَوْلِيَاءَ يَنْصُرُونَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ سَبِيلٍ ۝

إِسْتَجِيبُوا لِلرَّبِّ نَحْوَ مَا قَبِلْتُمْ أَنْ تَأْتِيَكُمْ يَوْمَ لَا تَرَوْا لَهُ مِنَ اللَّهِ مَا لَكُمْ مِنْ مَلْجَأٍ تَوَكَّبُونَ وَمَا لَكُمْ مِنْ يُكَبِّرُ ۝

فَإِنْ عَرَضُوا مَا آتَيْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِظْنَا لَكَ إِلَّا الْبَلْعُ وَالنَّارُ

(۱) یعنی دنیا میں یہ کافر ہمیں یہو قوف اور دنیوی خسارے کا حامل سمجھتے تھے، جب کہ ہم دنیا میں صرف آخرت کو ترجیح دیتے تھے اور دنیا کے خساروں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ آج دیکھ لو حقیقی خسارے سے کون دوچار ہے۔ وہ جنہوں نے دنیا کے عارضی خسارے کو نظر انداز کیے رکھا اور آج وہ جنت کے مزے لوٹ رہے ہیں یا وہ جنہوں نے دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ رکھا تھا اور آج ایسے عذاب میں گرفتار ہیں، جس سے اب چھٹکارا ممکن ہی نہیں۔

(۲) یعنی جس کو رد کرنے اور ٹالنے کی کوئی طاقت نہیں رکھے گا۔

(۳) یعنی تمہارے لیے کوئی ایسی جگہ نہیں ہوگی کہ جس میں تم چھپ کر انجان بن جاؤ اور پچھانے نہ جاسکو یا نظر میں نہ آسکو جیسے فرمایا ﴿يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَعْتَدُ * كَلَّا لَا وَزَرَ * إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَعْتَدُ﴾ (القیامہ ۱۰-۱۲) "اس دن انسان کہے گا، کہیں بھاگنے کی جگہ ہے، ہرگز نہیں، کوئی راہ فرار نہیں ہوگی، اس دن تیرے رب کے پاس ہی ٹھکانا ہو گا۔" یا تکبیر بمعنی انکار ہے کہ تم اپنے گناہوں کا انکار نہ کر سکو گے کیوں کہ ایک تو وہ سب لکھے ہوئے ہوں گے۔ دوسرے خود انسان کے اعضا بھی گواہی دیں گے۔ یا جو عذاب تمہیں تمہارے گناہوں کی وجہ سے دیا جائے گا تم اس عذاب کا انکار نہیں کر سکو گے، کیوں کہ اعتراف گناہ کے بغیر تمہیں چارہ نہیں ہو گا۔

نہیں بھیجا، آپ کے ذمہ تو صرف پیغام پہنچانا ہے،^(۱) ہم جب کبھی انسان کو اپنی مہربانی کا مزہ چکھاتے^(۲) ہیں تو وہ اس پر اترا جاتا ہے^(۳) اور اگر انہیں ان کے اعمال کی وجہ سے کوئی مصیبت^(۴) پہنچتی ہے تو بے شک انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔^(۵) (۴۸)

آسمانوں کی اور زمین کی سلطنت اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے^(۶) جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے۔ (۴۹) یا انہیں جمع کر دیتا ہے^(۷) بیٹے بھی اور بیٹیاں بھی اور جسے

إِذَا قُمْنَا لِلْإِنْسَانِ وَمَارِجَهُ فَرِحَ بِهِ آوَانٌ يُعْبَهُمْ سَيِّئَةً
بِمَا قَدَّمَتْ آيَاتِهِمْ وَإِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ ﴿۵۰﴾

بِاللَّهِ مَلِكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ يُعِبُّ لِمَنْ
يَشَاءُ آيَاتًا كَمَا يُعِبُّ لِمَنْ يَشَاءُ الذُّكُورَ ﴿۵۱﴾

أَوْ يُؤْتِيهِمْ جُذُوعًا نَّارًا أَوْ يَجْعَلُ مِنْ يَشَاءُ عِظْمًا إِنَّهُ عَلِيمٌ

- (۱) جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾ (البقرة-۲۷۲) اور ﴿فَاتَّبَعَكَ الْبَلَدُ وَعَلَيْتَ الْحِسَابَ﴾ — (الرعد-۳۰) ﴿فَذَكَرْنَا إِثْمَانَ مَذَكُورًا﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ ﴿(الغاشية-۲۱، ۲۲) ان سب کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ذمے داری صرف اور صرف یہ ہے کہ اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچادیں، مانیں نہ مانیں، آپ سے اس کی باز پرس نہیں ہوگی، کیوں کہ ہدایت دینا آپ کے اختیار میں ہی نہیں ہے، یہ صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔
- (۲) یعنی وسائل رزق کی فراوانی، صحت و عافیت، اولاد کی کثرت، جاہ و منصب وغیرہ۔
- (۳) یعنی تکبر اور غرور کا اظہار کرتا ہے، ورنہ اللہ کی نعمتوں پر خوش ہونا یا اس کا اظہار ہونا ناپسندیدہ امر نہیں، لیکن وہ تحدیثِ نعمت اور شکر کے طور پر ہونہ کہ فخر و ریا اور تکبر کے طور پر۔
- (۴) مال کی کمی، بیماری، اولاد سے محرومی وغیرہ۔

(۵) یعنی فوراً نعمتوں کو بھی بھول جاتا ہے اور مُنْعِمٌ (نعمتیں دینے والے) کو بھی۔ یہ انسانوں کی غالب اکثریت کے اعتبار سے ہے جس میں ضعیف الایمان لوگ بھی شامل ہیں۔ لیکن اللہ کے نیک بندے اور کامل الایمان لوگوں کا حال ایسا نہیں ہوتا۔ وہ تکلیفوں پر صبر کرتے ہیں اور نعمتوں پر شکر۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءٌ شَكَرْ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءٌ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ وَلَيْسَ ذَلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ (صحیح مسلم، کتاب الزهد، باب المؤمن أمره خیر کلہ)

(۶) یعنی کائنات میں صرف اللہ ہی کی مشیت اور اسی کی تدبیر چلتی ہے، وہ جو چاہتا ہے، ہوتا ہے، جو نہیں چاہتا، نہیں ہوتا۔ کوئی دوسرا اس میں دخل اندازی کرنے کی قدرت و اختیار نہیں رکھتا۔

(۷) یعنی جس کو چاہتا ہے، مذکور اور مومن دونوں دیتا ہے۔ اس مقام پر اللہ نے لوگوں کی چار قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک وہ جن کو صرف بیٹے دیئے۔ دوسرے، وہ جن کو صرف بیٹیاں، تیسرے وہ جن کو بیٹے، بیٹیاں دونوں اور چوتھے، وہ جن کو بیٹا

قَدِيرٌ ①

چاہے بانجھ کر دیتا ہے، وہ بڑے علم والا اور کامل قدرت والا ہے۔ (۵۰)

ناممکن ہے کہ کسی بندہ سے اللہ تعالیٰ کلام کرے مگر وحی کے ذریعہ یا پردے کے پیچھے سے یا کسی فرشتہ کو بھیجے اور وہ اللہ کے حکم سے جو وہ چاہے وحی^(۱) کرے، بیشک وہ برتر ہے حکمت والا ہے۔ (۵۱)

اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح کو اتارا ہے،^(۲) آپ اس سے پہلے یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کتاب اور ایمان کیا چیز ہے؟^(۳) لیکن ہم نے اسے نور بنایا، اس کے ذریعہ سے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں، ہدایت دیتے ہیں،^(۴) بیشک آپ راہ راست

وَكَانَ لِشَيْءٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ الْأَوْحِيَ الْأَوَّلُونَ وَرَأَى حَبَابَ
أَوْرِيسِلَ رَسُولًا مَعِي بِأَذْنِهِ مَا يَشَاءُ لَكُمْ عَلَىٰ حَيْكُمِهِ ②

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحَنَا لِنُخَبِّرَنَّ بِمَا نَشَاءُ أُولَئِكَ
وَلَا يُلَاقُونَكَ وَلَٰكِنَّ جَهَنَّمَ نُورًا تَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنَ الْعِبَادِ
وَكَذَلِكَ تَهْدِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ③

نہ بنی۔ لوگوں کے درمیان یہ فرق و تفاوت اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے، اس تفاوت الہی کو دنیا کی کوئی طاقت بدلنے پر قادر نہیں ہے۔ یہ تقسیم اولاد کے اعتبار سے ہے۔ باپوں کے اعتبار سے بھی انسانوں کی چار قسمیں ہیں۔ ۱۔ آدم علیہ السلام کو صرف مٹی سے پیدا کیا، ان کا باپ ہے نہ ماں۔ ۲۔ حضرت حوا کو آدم علیہ السلام سے یعنی مرد سے پیدا کیا، ان کی ماں نہیں ہے۔ ۳۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صرف عورت کے بطن سے پیدا کیا، ان کا باپ نہیں ہے۔ ۴۔ اور باقی تمام انسانوں کو مرد اور عورت دونوں کے ملاپ سے۔ ان کے باپ بھی ہیں اور ماںیں بھی۔ فَسُبْحَانَ اللَّهِ الْعَلِيمِ الْقَدِيرِ (ابن کثیر)

(۱) اس آیت میں وحی الہی کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں پہلی یہ کہ دل میں کسی بات کا ڈال دینا یا خواب میں بتلا دینا اس یقین کے ساتھ کہ یہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ دوسری، پردے کے پیچھے سے کلام کرنا، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ طور پر کیا گیا۔ تیسری، فرشتے کے ذریعے اپنی وحی بھیجنا، جیسے جبرائیل علیہ السلام اللہ کا پیغام لے کر آتے اور پیغمبروں کو سناتے رہے۔

(۲) رُوح سے مراد قرآن ہے۔ یعنی جس طرح آپ سے پہلے اور رسولوں پر ہم وحی کرتے رہے، اسی طرح ہم نے آپ پر قرآن کی وحی کی۔ ہے۔ قرآن کو روح سے اس لیے تعبیر کیا ہے کہ قرآن سے دلوں کو زندگی حاصل ہوتی ہے جیسے روح میں انسانی زندگی کا راز مضمر ہے۔

(۳) کتاب سے مراد قرآن ہے، یعنی نبوت سے پہلے قرآن کا بھی کوئی علم آپ کو نہیں تھا اور اسی طرح ایمان کی ان تفصیلات سے بھی بے خبر تھے جو شریعت میں مطلوب ہیں۔

(۴) یعنی قرآن کو نور بنایا، اس کے ذریعے سے اپنے بندوں میں سے ہم جسے چاہتے ہیں، ہدایت سے نواز دیتے ہیں۔

کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ (۵۲)
 اس اللہ کی راہ کی (۱) جس کی ملکیت میں آسمانوں اور زمین
 کی ہر چیز ہے۔ آگاہ رہو سب کام اللہ تعالیٰ ہی کی طرف
 لوٹتے ہیں۔ (۵۳) (۲)

صِرَاطَ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اَلَّا يَلٰهٰ
 اللَّهُ تَصِيْرُ الْاُمُوْر ۝

سورہ زخرف کی ہے اور اس میں نواسی آیتیں ہیں اور
 سات رکوع ہیں۔

سُوْرَةُ الزُّخْرُفِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
 نہایت رحم والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

حم۔ (۱) قسم ہے اس واضح کتاب کی۔ (۲)
 ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے (۳) تم سمجھ لو۔ (۳)
 یقیناً یہ لوح محفوظ میں ہے اور ہمارے نزدیک بلند مرتبہ
 حکمت (۳) والی ہے۔ (۳)

حَمْدٌ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۝
 اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝
 وَاِنَّهٗ فِیْ اُوْر الْكِتٰبِ لَدٰینا لَعَلٰی حٰکِمَةٌ ۝

مطلب یہ ہے کہ قرآن سے ہدایت و رہنمائی انہی کو ملتی ہے جن میں ایمان کی طلب اور تڑپ ہوتی ہے وہ اسے طلب
 ہدایت کی نیت سے پڑھتے، سنتے اور غور و فکر کرتے ہیں، چنانچہ اللہ ان کی مدد فرماتا ہے اور ہدایت کا راستہ ان کے لیے
 ہموار کر دیتا ہے جس پر وہ چل پڑتے ہیں ورنہ جو اپنی آنکھوں کو ہی بند کر لیں، کانوں میں ڈاٹ لگالیں اور عقل و فہم کو ہی
 بروئے کار نہ لائیں تو انہیں ہدایت کیوں کر نصیب ہو سکتی ہے، جیسے فرمایا۔ ﴿قُلْ هُوَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هٰذِيْ وَبَشِعَاۗلُوْا الَّذِيْنَ
 لَا يُؤْمِنُوْنَ فِیْ اِذَا نَجَعُوْا وَّفَرُّوْا عَلٰیہُمْ مَّعٰی اٰلِہِکُمْ یُنٰکَدُوْنَ مِنْ مَّکٰنٍ بَیْہِیْمٍ﴾ (سورہ حم السجدہ ۴۴)

(۱) یہ صراط مستقیم، اسلام ہے۔ اس کی اضافت اللہ نے اپنی طرف فرمائی ہے جس سے اس راستے کی عظمت و فحامت
 شان واضح ہوتی ہے اور اس کے واحد راہ نجات ہونے کی طرف اشارہ بھی۔

(۲) یعنی قیامت والے دن تمام معاملات کا فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہو گا، اس میں سخت وعید ہے، جو مجازات (جزا و
 سزا) کو مستلزم ہے۔

(۳) جو دنیا کی فصیح ترین زبان ہے، دوسرے، اس کے اولین مخاطب بھی عرب تھے، انہی کی زبان میں قرآن اتارا تاکہ وہ
 سمجھنا چاہیں تو آسانی سے سمجھ سکیں۔

(۴) اس میں قرآن کریم کی اس عظمت اور شرف کا بیان ہے جو ملاءِ اعلیٰ میں اسے حاصل ہے تاکہ اہل زمین بھی اس
 کے شرف و عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو قرار واقعی اہمیت دیں اور اس سے ہدایت کا وہ مقصد حاصل کریں جس

کیا ہم اس نصیحت کو تم سے اس بنا پر ہٹالیں کہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔^(۱) (۵)

اور ہم نے اگلے لوگوں میں بھی کتنے ہی نبی بھیجے۔ (۶)

جو نبی ان کے پاس آیا انہوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ (۷)

پس ہم نے ان سے زیادہ زور آوروں^(۲) کو تباہ کر ڈالا اور اگلوں کی مثال گزر چکی ہے۔^(۳) (۸)

اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو یقیناً ان کا جواب یہی ہو گا کہ انہیں

غالب و دانا (اللہ) نے ہی^(۴) پیدا کیا ہے۔ (۹)

وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش (بچھونا)^(۵)

أَفَضَّرِبْ عَنْكُمْ الذِّكْرَ صَفْهَانُ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِينَ ①

وَكَمْ أَرْسَلْنَا مِنْ نَبِيِّنَا فِي الْأَقْلَامِينَ ②

وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ نَبِيِّ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ③

فَأَهْلَكْنَا أَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَ مَضَى مَثَلُ الْأَقْلَامِينَ ④

وَلَوْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُولُنَّ

خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ⑤

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَاَجْعَلَ لِكُرْسِيِّهَا سُبُلًا كَالْعُرَاقِ

کے لیے اسے دنیا میں اتارا گیا ہے اُمّ الْكِتَابِ سے مراد لوح محفوظ ہے۔

(۱) اس کے مختلف معنی کیے گئے ہیں مثلاً ۱- تم چوں کہ گناہوں میں بہت منہمک اور ان پر مصر ہو، اس لیے کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم تمہیں وعظ و نصیحت کرنا چھوڑ دیں گے؟ ۲- یا تمہارے کفر اور اسراف پر ہم تمہیں کچھ نہ کہیں گے اور تم سے درگزر کر لیں گے۔ ۳- یا ہم تمہیں ہلاک کر دیں اور کسی چیز کا تمہیں حکم دیں نہ منع کریں۔ ۴- چوں کہ تم قرآن پر ایمان لانے والے نہیں ہو، اس لیے ہم انزال قرآن کا سلسلہ ہی بند کر دیں۔ پہلے مفہوم کو امام طبری نے اور آخری مفہوم کو امام ابن کثیر نے زیادہ پسند کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اللہ کا لطف و کرم ہے کہ اس نے خیر اور ذکر حکیم (قرآن) کی طرف دعوت دینے کا سلسلہ موقوف نہیں فرمایا، اگرچہ وہ اعراض و انکار میں حد سے تجاوز کر رہے تھے، تاکہ جس کے لیے ہدایت مقدر ہے وہ اس کے ذریعے سے ہدایت اپنالے اور جن کے لیے شقاوت لکھی جا چکی ہے ان پر جنت قائم ہو جائے۔

(۲) یعنی اہل مکہ سے زیادہ زور آور تھے، جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿كَانُوا أَكْثَرُ مَعَهُمْ وَأَشَدَّ قُوَّةً﴾ (المؤمن ۸۲) ”وہ ان سے تعداد اور قوت میں کہیں زیادہ تھے۔“

(۳) یعنی قرآن مجید میں ان قوموں کا تذکرہ یا وصف متعدد مرتبہ گزر چکا ہے۔ اس میں اہل مکہ کے لیے تہدید ہے کہ پچھلی قومیں رسولوں کی تکذیب کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔ اگر یہ بھی تکذیب رسالت پر مصر رہے تو ان کی مثل یہ بھی ہلاک کر دیے جائیں گے۔

(۴) لیکن اس اعتراف کے باوجود انہی مخلوقات میں سے بہت سوں کو ان نادانوں نے اللہ کا شریک ٹھہرا لیا ہے۔ اس میں ان کے جرم کی شاعت و قباحت کا بھی بیان ہے اور ان کی سفاهت و جہالت کا اظہار بھی۔

(۵) ایسا بچھونا، جس میں ثبات و قرار ہے، تم اس پر چلتے ہو، کھڑے ہوتے اور سوتے ہو اور جہاں چاہتے ہو، پھرتے ہو،

تَهْتَدُونَ ﴿۱۰﴾

بنایا اور اس میں تمہارے لیے راستے کر دیے تاکہ تم راہ
پالیا کرو۔ (۱۰)

اسی نے آسمان سے ایک اندازے (۱۱) کے مطابق پانی
نازل فرمایا، پس ہم نے اس سے مردہ شہر کو زندہ کر دیا۔
اسی طرح تم نکالے جاؤ گے۔ (۱۱)

جس نے تمام چیزوں کے جوڑے (۱۲) بنائے اور تمہارے
لیے کشتیاں بنائیں اور چوپائے جانور (پیدا کیے) جن پر تم
سوار ہوتے ہو۔ (۱۲)

تاکہ تم ان کی پیٹھ پر جم کر سوار ہو ا کرو (۱۳) پھر اپنے رب کی
نعمت کو یاد کرو جب اس پر ٹھیک ٹھاک بیٹھ جاؤ اور کوپاک
ذات ہے اس کی جس نے اسے ہمارے بس میں کر دیا
حالانکہ ہمیں اسے قابو کرنے کی (۱۴) طاقت نہ تھی۔ (۱۳)

وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً يُقَدِّرُ فَأَنْشُرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا
كَذَلِكَ نُخْرِجُوكَ ﴿۱۱﴾

وَالَّذِي خَلَقَ الذُّرُوجَ لَهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنَ الظُّلُمِ وَالْأَنْعَامِ
مَنْ يَرْكَبُكُمْ ﴿۱۲﴾

لِتَسْوَأَ اَعْلَى ظُهُورِهِمْ فَتَوْتَدُوا كُرُوزًا يَمْشُونَ
عَلَيْهِمْ وَتَقُولُوا سُبْحٰنَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هٰذَا اَوْ مَا كُنَّا
لَهُ مُقْرِنِينَ ﴿۱۳﴾

اس نے اس کو پہاڑوں کے ذریعے سے جمادیا تاکہ اس میں حرکت و جنبش نہ ہو۔

(۱) یعنی ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے کے لیے راستے بنا دیئے تاکہ
کاروباری، تجارتی اور دیگر مقاصد کے لیے تم آ جا سکو۔

(۲) جس سے تمہاری ضرورت پوری ہو سکے، کیونکہ قدر حاجت سے کم بارش ہوتی تو وہ تمہارے لیے مفید ثابت نہ
ہوتی اور زیادہ ہوتی تو وہ طوفان بن جاتی، جس میں تمہارے ڈوبنے اور ہلاک ہونے کا خطرہ ہوتا۔

(۳) یعنی جس طرح بارش سے مردہ زمین شاداب ہو جاتی ہے، اسی طرح قیامت والے دن تمہیں بھی زندہ کر کے
قبور سے نکال لیا جائے گا۔

(۴) یعنی ہر چیز کو جو ڈا بھنا یا، نرا اور مادہ، نباتات، کھیتیاں، پھل، پھول اور حیوانات سب میں نرا اور مادہ کا سلسلہ ہے۔ بعض
کتے ہیں اس سے مراد ایک دوسرے کی مخالف چیزیں ہیں جیسے روشنی اور اندھیرا، مرض اور صحت، انصاف اور ظلم، خیر اور
شر، ایمان اور کفر، نرمی اور سختی وغیرہ۔ بعض کتے ہیں ازواج، اصناف کے معنی میں ہے۔ تمام انواع و اقسام کا خالق اللہ ہے۔

(۵) لَتَسْتَوْزُوا بِمَعْنَى لَتَسْتَفْرِوْا يَا لَتَسْتَعْلُوا جم کر بیٹھ جاؤ یا چڑھ جاؤ۔ ظُھُورِهِ میں ضمیر واحد باعتبار جنس کے ہے۔

(۶) یعنی اگر ان جانوروں کو ہمارے تابع اور ہمارے بس میں نہ کرتا تو ہم انہیں اپنے قابو میں رکھ کر ان کو سواری، بار
برداری اور دیگر مقاصد کے لیے استعمال نہیں کر سکتے تھے، مُقْرِنِينَ بمعنی مُطَبِّقِينَ ہے۔

اور بایقین ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔^(۱) (۱۴)

اور انہوں نے اللہ کے بعض بندوں کو اس کا جز ٹھہرا^(۲) دیا یقیناً انسان کھلم کھلانا شکر ہے۔ (۱۵)

کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے بیٹیاں تو خود رکھ لیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا۔^(۳) (۱۶)

(حالانکہ) ان میں سے کسی کو جب اس چیز کی خبر دی جائے جس کی مثال اس نے (اللہ) رحمن کے لیے بیان کی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غمگین ہو جاتا ہے۔ (۱۷)

کیا (اللہ کی) اولاد لڑکیاں ہیں جو زیورات میں پلین اور جگڑے میں (اپنی بات) واضح نہ کر سکیں؟^(۴) (۱۸)

وَالَّذِي رَتَبْنَا لِلْمُتَّقِينَ ①

وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ ②

أَمْ اتَّخَذُوا مَا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَأَصْنَعُوا بِالْبَنِينَ ③

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِمَا حَرَبَ لِلرَّحْمَنِ مَثَلًا هَلْ يَرَاهُ مُسْتَوْذَقًا ④

أَوْ مَن يَنْشَأُ فِي الْعِلْمَةِ وَهَوِّنِ الْفُضُولَ عَزِيمِينَ ⑤

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سواری پر سوار ہوتے تو تین مرتبہ اللہ اَکْبَرُ کہتے اور سُبْحَانَ الَّذِي... سے لَمُنْقَلَبُونَ تک آیت پڑھتے۔ علاوہ ازیں خیر و عافیت کی دعا مانگتے، جو دعاؤں کی کتابوں میں دیکھ لی جائے (صحیح مسلم، کتاب الحج، باب ما یقول اذا ركب.....)

(۲) عِبَادٌ سے مراد فرشتے اور جُزْءٌ سے مراد بیٹیاں یعنی فرشتے، جن کو مشرکین اللہ کی بیٹیاں قرار دے کر ان کی عبادت کرتے تھے۔ یوں وہ مخلوق کو اللہ کا شریک اور اس کا جزء مانتے تھے، حالانکہ وہ ان چیزوں سے پاک ہے۔ بعض نے جزء سے یہاں نذر نیاز کے طور پر نکالے جانے والے وہ جانور مراد لیے ہیں جن کا ایک حصہ مشرکین اللہ کے نام پر اور ایک حصہ بتوں کے نام پر نکالا کرتے تھے جس کا ذکر سورۃ الانعام، ۱۳۶ میں ہے۔

(۳) اس میں ان کی جمالت اور سفاہت کا بیان ہے جو انہوں نے اللہ کے لیے اولاد بھی ٹھہرائی ہوئی ہے جسے یہ خود ناپسند کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کی اولاد ہوتی تو کیا ایسا ہی ہو تا کہ خود تو اس کی لڑکیاں ہوتیں اور تمہیں وہ لڑکوں سے نوازتا۔

(۴) یَنْشَأُ، نَشُوءٌ سے ہے، بمعنی تربیت اور نشوونما۔ عورتوں کی دو صفات کا تذکرہ بطور خاص یہاں کیا گیا ہے۔ ۱۔ ان کی تربیت اور نشوونما زیورات اور زینت میں ہوتی ہے، یعنی شعور کی آنکھیں کھولتے ہی ان کی توجہ حسن افزا اور جمال افروز چیزوں کی طرف ہو جاتی ہے۔ مقصد اس وضاحت سے یہ ہے کہ جن کی حالت یہ ہے، وہ تو اپنے ذاتی معاملات کے درست کرنے کی بھی استعداد و صلاحیت نہیں رکھتیں۔ ۲۔ اگر کسی سے بحث و تکرار ہو تو وہ اپنی بات بھی صحیح طریقے سے (فطری حجاب کی وجہ سے) واضح نہیں کر سکتیں نہ فریق مخالف کے دلائل کا توڑ ہی کر سکتی ہیں۔ یہ عورت کی وہ دو فطری کمزوریاں ہیں جن کی بنا پر مرد حضرات عورتوں پر ایک گونہ فضیلت رکھتے ہیں۔ سیاق سے بھی مرد کی یہ برتری واضح ہے،

اور انہوں نے فرشتوں کو جو رحمن کے عبادت گزار ہیں عورتیں قرار دے لیا۔ کیا ان کی پیدائش کے موقع پر یہ موجود تھے؟ ان کی یہ گواہی لکھ لی جائے گی اور ان سے (اس چیز کی) باز پرس کی جائے گی۔ (۱۹)

اور کہتے ہیں اگر اللہ چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے۔ انہیں اس کی کچھ خبر نہیں، (۲۰) یہ تو صرف اٹکل پچو (جھوٹ باتیں) کہتے ہیں۔ (۲۰)

کیا ہم نے انہیں اس سے پہلے کوئی (اور) کتاب دی ہے جسے یہ مضبوط تھامے ہوئے ہیں۔ (۲۱)

(نہیں نہیں) بلکہ یہ تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک مذہب پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل کر

وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَنِ أَنْكَاثًا ۗ هُمْ يَدْعُونَ
خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُونَ ﴿١٩﴾

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ
أَنْكَاثٍ ۗ إِنَّا هُمْ الْغَاثُونَ ﴿٢٠﴾

أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا مِنْ قَبْلِهِ فَهُمْ بِهِ مُسْتَكْبِرُونَ ﴿٢١﴾

بَلْ قَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ
أَنْكَاثٍ ۗ إِنَّا هُمْ الْغَاثُونَ ﴿٢١﴾

کیوں کہ گفتگو اسی ضمن میں یعنی مرد و عورت کے درمیان جو فطری تفاوت ہے، جس کی بنا پر بچی کے مقابلے میں بچے کی ولادت کو زیادہ پسند کیا جاتا تھا، ہو رہی ہے۔

(۱) یعنی جزا کے لیے۔ کیوں کہ فرشتوں کے بنات اللہ ہونے کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں ہوگی۔

(۲) یعنی اپنے طور پر اللہ کی مشیت کا سارا، یہ ان کی ایک بڑی دلیل ہے کیوں کہ ظاہراً یہ بات صحیح ہے کہ اللہ کی مشیت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا، نہ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ اس کی مشیت، اس کی رضا سے مختلف چیز ہے۔ ہر کام یقیناً اس کی مشیت ہی سے ہوتا ہے لیکن راضی وہ انہی کاموں سے ہوتا ہے جن کا اس نے حکم دیا ہے نہ کہ ہر اس کام سے جو انسان اللہ کی مشیت سے کرتا ہے، انسان چوری، بدکاری، ظلم اور بڑے بڑے گناہ کرتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو کسی کو یہ گناہ کرنے کی قدرت ہی نہ دے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لے، اس کے قدموں کو روک دے اس کی نظر سلب کر لے۔ لیکن یہ جبری صورتیں ہیں جب کہ اس نے انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی دی ہے تاکہ اسے آزما لیا جائے، اسی لیے اس نے دونوں قسم کے کاموں کی وضاحت کر دی ہے، جن سے وہ راضی ہوتا ہے ان کی بھی اور جن سے ناراض ہوتا ہے، ان کی بھی۔ انسان دونوں قسم کے کاموں میں سے جو کام بھی کرے گا، اللہ اس کا ہاتھ نہیں پکڑے گا، لیکن اگر وہ کام جرم و معصیت کا ہو گا تو یقیناً وہ اس سے ناراض ہو گا کہ اس نے اللہ کے دینے ہوئے اختیار کا استعمال غلط کیا۔ تاہم یہ اختیار اللہ دنیا میں اس سے واپس نہیں لے گا، البتہ اس کی سزا قیامت والے دن دے گا۔

(۳) یعنی قرآن سے پہلے کوئی کتاب، جس میں ان کو غیر اللہ کی عبادت کرنے کا اختیار دیا گیا ہے جسے انہوں نے مضبوطی سے تھام رکھا ہے؟ یعنی ایسا نہیں ہے بلکہ تھلید آبا کے سوا ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

راہ یافتہ ہیں۔ (۲۲)

اسی طرح آپ سے پہلے بھی ہم نے جس بستی میں کوئی ڈرانے والا بھیجا وہاں کے آسودہ حال لوگوں نے یہی جواب دیا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو (ایک راہ پر اور) ایک دین پر پایا اور ہم تو انہی کے نقش پا کی پیروی کرنے والے ہیں۔ (۲۳)

(نبی نے) کہا بھی کہ اگر چہ میں تمہارے پاس اس سے بہتر (بہتر) مقصود تک پہنچانے والا طریقہ لے کر آیا ہوں جس پر تم نے اپنے باپ دادوں کو پایا، تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس کے منکر ہیں جسے دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے۔ (۲۳)^(۱)

پس ہم نے ان سے انتقام لیا اور دیکھ لے جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا؟ (۲۵)

اور جبکہ ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے والد سے اور اپنی قوم سے فرمایا کہ میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو، (۲۶)

بجز اس ذات کے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی مجھے ہدایت بھی کرے گا۔ (۲۷)^(۲)

اور (ابراہیم علیہ السلام) اسی کو اپنی اولاد میں بھی باقی رہنے والی بات قائم کر گئے تاکہ لوگ (شرک سے)

وَكُلَّكَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ مِثْلِهِمْ
فَعَقَدُوا ۗ ﴿۲۲﴾

فَلَوْ كُنَّا نُؤْتِيهِمْ آيَاتٍ مَّا تَدَّبَّرُوا لَمَّا
بِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ كُرْهُوْنَ ۗ ﴿۲۳﴾

فَأَنصَبْنَا لَهُمْ قَانظِرًا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكذِبِينَ ۗ ﴿۲۵﴾

وَلَدَّ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ إِنَّنِي بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ ۗ ﴿۲۶﴾

إِلَّا الَّذِي فَطَرَنِي فَإِنَّهُ سَيَهْدِينِ ۗ ﴿۲۷﴾

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يُرجِعُونَ ۗ ﴿۲۸﴾

(۱) یعنی اپنے آبا کی تقلید میں اتنے پختہ تھے کہ پیغمبر کی وضاحت اور دلیل بھی انہیں اس سے نہیں پھیر سکی۔ یہ آیت اندھی تقلید کے بطلان اور اس کی قباحت پر بہت بڑی دلیل ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے فتح القدیر، لشوکانی)

(۲) یعنی جس نے مجھے پیدا کیا ہے وہ مجھے اپنے دین کی سمجھ بھی دے اور اس پر ثابت قدم بھی رکھے گا، میں صرف اسی کی عبادت کروں گا۔

(۳) یعنی اس کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی وصیت اپنی اولاد کو کر گئے۔ جیسے فرمایا ﴿ وَوَضِعْنَا يَوْمَئِذٍ فِي عَقِبِهِمْ لَعَلَّكُمْ يَرْجِعُونَ ﴾ (البقرة ۱۳۳) بعض نے جَعَلَهَا میں فاعل اللہ کو قرار دیا ہے۔ یعنی اللہ نے اس کلمے کو ابراہیم علیہ السلام کے بعد ان کی اولاد میں باقی رکھا اور وہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرتے رہے۔

باز آتے رہیں۔^(۱) (۲۸)

بلکہ میں نے ان لوگوں کو اور ان کے باپ دادوں کو
مسلمان (اور اسباب)^(۲) دیا، یہاں تک کہ ان کے پاس حق
اور صاف صاف سنانے والا رسول آگیا۔^(۳) (۲۹)

اور حق کے پہنچنے ہی یہ بول پڑے کہ یہ تو جادو ہے اور ہم
اس کے منکر ہیں۔^(۴) (۳۰)

اور کہنے لگے، یہ قرآن ان دونوں بستیوں میں سے کسی
بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔^(۵) (۳۱)

کیا آپ کے رب کی رحمت کو یہ تقسیم کرتے ہیں؟^(۶) ہم

بَلْ مَسَّمَتْهُمُ فَلَوْلَاذِكُمْ هَلَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ
وَرَسُولٌ مُّبِينٌ ①

وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوا هَذَا بَشَرٌ أَتَانَا بِهِ كَمَا بَدَأَ الْفِرْعَوْنَ ②

وَقَالُوا لَوْلَا نَزَّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ
عَظِيمَةٍ ③

أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۗ مَنْ مَسَّمْنَا أَيُّهُم مَّعِينَتِنَا

(۱) یعنی اولاد ابراہیم میں یہ موحدین اس لیے پیدا کیے تاکہ ان کے توحید کے وعظ سے لوگ شرک سے باز آتے رہیں۔
لَعَلَّهُمْ میں ضمیر کا مرجع اہل مکہ ہیں یعنی شاید اہل مکہ اس دین کی طرف لوٹ آئیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین
تھا جو خالص توحید پر مبنی تھا نہ کہ شرک پر۔

(۲) یہاں سے پھر ان نعمتوں کا ذکر ہو رہا ہے جو اللہ نے انہیں عطا کی تھیں اور نعمتوں کے بعد عذاب میں جلدی نہیں کی
بلکہ انہیں پوری مہلت دی، جس سے وہ دھوکے میں مبتلا ہو گئے اور خواہشات کے بندے بن گئے۔

(۳) حق سے قرآن اور رسول سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ مُبِينٌ رسول کی صفت ہے،
کھول کر بیان کرنے والا یا جن کی رسالت واضح اور ظاہر ہے، اس میں کوئی اشتباہ اور خفا نہیں۔

(۴) قرآن کو جادو قرار دے کر اس کا انکار کر دیا، اور اگلے الفاظ میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق و تنقیص کی۔

(۵) دونوں بستیوں سے مراد مکہ اور طائف ہے اور بڑے آدمی سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک مکے کا ولید بن مغیرہ اور
طائف کا عروہ بن مسعود ثقفی ہے۔ بعض نے کچھ اور لوگوں کے نام ذکر کیے ہیں تاہم مقصد اس سے ایسے آدمی کا انتخاب
ہے جو پہلے سے ہی عظیم جاہ و منصب کا حامل، کثیر المال اور اپنی قوم میں مانا ہوا ہو، یعنی قرآن اگر نازل ہو تا تو دونوں
بستیوں میں سے کسی ایسی ہی شخصیت پر نازل ہوتا نہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر، جن کا دامن دولت دنیا سے بھی خالی
ہے، اور اپنی قوم میں قیادت و سیادت کے منصب پر بھی فائز نہیں ہیں۔

(۶) رحمت، نعمت کے معنی میں ہے، اور یہاں سب سے بڑی نعمت، نبوت، مراد ہے۔ استغنام انکار کے لیے ہے۔ یعنی یہ
کام ان کا نہیں ہے کہ رب کی نعمتیں بالخصوص نعمت نبوت یہ اپنی مرضی سے تقسیم کریں، بلکہ یہ صرف رب کا کام ہے
کیوں کہ وہی ہر بات کا علم اور ہر شخص کے حالات سے پوری واقفیت رکھتا ہے، وہی بہتر سمجھتا ہے کہ انسانوں میں سے
نبوت کا تاج کس کے سر پر رکھنا ہے اور اپنی وحی و رسالت سے کس کو نوازنا ہے۔

نے ہی ان کی زندگی دنیا کی روزی ان میں تقسیم کی ہے اور ایک کو دوسرے سے بلند کیا ہے تاکہ ایک دوسرے کو ماتحت کر لے^(۱) جسے یہ لوگ سمیٹتے پھرتے ہیں اس سے آپ کے رب کی رحمت بہت ہی بہتر ہے۔ (۳۲)

اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تمام لوگ ایک ہی طریقہ پر ہو جائیں^(۲) گے تو رحمن کے ساتھ کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتوں کو ہم چاندی کی بنا دیتے۔ اور زینوں کو (بھی) جن پر چڑھا کرتے۔ (۳۳)

اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت بھی جن پر وہ تکیہ لگا لگا کر بیٹھتے۔ (۳۴)
اور سونے کے بھی^(۳) اور یہ سب کچھ یونہی سادیا کی زندگی

الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَعْبُدُوا
بَعْضُهُمْ بَعْضًا سَخِرَهَا لِدَابِّ رِبِّكَ خَيْرًا مِّمَّا يَصِفُونَ ﴿٣٢﴾

وَكُلُوْا لَانَ يَكُوْنُ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ
يَكْفُرْ بِاللّٰحِزْمِيْنَ لِيُبَدِّلَ لَهُمُ سَعْفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ
عَلِيَّهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿٣٣﴾

طَلِيْحًا مِّمَّا يَكُوْنُ اٰجْوَابًا وَسُرَرًا عَلٰهَا يَكْتُمُوْنَ ﴿٣٤﴾

وَنُزُوْقًا وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ

(۱) یعنی مال و دولت، جاہ و منصب اور عقل و فہم میں ہم نے یہ فرق و تفاوت اس لیے رکھا ہے تاکہ زیادہ مال والا کم مال والے سے اونچے منصب والا چھوٹے منصب داروں سے، اور عقل و فہم میں حظ وافر رکھنے والا اپنے سے کم تر عقل و شعور رکھنے والے سے کام لے سکے۔ اللہ تعالیٰ کی اس حکمت بالغہ سے کائنات کا نظام بحسن و خوبی چل رہا ہے۔ ورنہ اگر سب مال میں، منصب میں، علم و فہم میں، عقل و شعور میں اور دیگر اسباب دنیا میں برابر ہوتے تو کوئی کسی کا کام کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا، اسی طرح کم تر اور حقیر سمجھے جانے والے کام بھی کوئی نہ کرتا۔ یہ احتیاج انسانی ہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرق و تفاوت کے اندر رکھ دی ہے جس کی وجہ سے انسان دوسرے انسان بلکہ انسانوں کا محتاج ہے، تمام حاجات و ضروریات انسانی، کوئی ایک شخص، چاہے وہ ارب پتی ہی کیوں نہ ہو، دیگر انسانوں کی مدد حاصل کیے بغیر خود فراہم کر ہی نہیں سکتا۔

(۲) اس رحمت سے مراد آخرت کی وہ نعمتیں ہیں جو اللہ نے اپنے نیک بندوں کے لیے تیار کر رکھی ہیں۔

(۳) یعنی دنیا کے مال و اسباب میں رغبت کرنے کی وجہ سے طالب دنیا ہی ہو جائیں گے اور رضائے الہی اور آخرت کی طلب سب فراموش کر دیں گے۔

(۴) یعنی بعض چیزیں چاندی کی اور بعض سونے کی، کیوں کہ تنوع میں حسن زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کا مال ہماری نظر میں اتنا بے وقعت ہے کہ اگر مذکورہ خطرہ نہ ہوتا تو اللہ کے سب منکروں کو خوب دولت دی جاتی لیکن اس میں خطرہ یہی تھا کہ پھر سب لوگ ہی دنیا کے پرستار نہ بن جائیں۔ دنیا کی حقارت اس حدیث سے بھی واضح ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔ "لَوْ كَانَتْ الدُّنْيَا تَرْتُنَّ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ مَا سَقَىٰ مِنْهَا كَافِرًا شَرْبَةً مَّاءٍ" (ترمذی، ابن ماجہ، کتاب الزہد) "اگر دنیا کی اللہ کے ہاں اتنی حیثیت بھی ہوتی جتنی ایک چمچے پر کی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کسی

کا فائدہ ہے اور آخرت تو آپ کے رب کے نزدیک (صرف) پرہیزگاروں کے لیے (ہی) ہے۔^(۱) (۳۵)

اور جو شخصِ رحمن کی یاد سے غفلت کرے^(۲)، ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں وہی اس کا ساتھی رہتا ہے۔^(۳) (۳۶)

اور وہ انہیں راہ سے روکتے ہیں اور یہ اسی خیال میں رہتے ہیں کہ یہ ہدایت یافتہ ہیں۔^(۴) (۳۷)

یہاں تک کہ جب وہ ہمارے پاس آئے گا کہے گا کاش! میرے اور تیرے درمیان مشرق اور مغرب کی دوری ہوتی (تو) بڑا براسا تھی ہے۔^(۵) (۳۸)

اور جب کہ تم ظالم ٹھہر چکے تو تمہیں آج ہرگز تم سب کا عذاب میں شریک ہونا کوئی نفع نہ دے گا۔^(۶) (۳۹)

کیا پس تو بہرے کو سنا سکتا ہے یا اندھے کو راہ دکھا سکتا

عَنْدَ رَبِّكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۵﴾

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نُقِضْ لَهُ سَيِّئَاتِهِ فَأُولَٰئِكَ فِي سُنَنِ ﴿۳۶﴾

وَأَنْتُمْ لَبِئْسَ أَجْرُكُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَيَصْبَوْنَ أَنْهُمْ مُهْتَدُونَ ﴿۳۷﴾

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُنَّ قَالَ يَا لَيْلَتِ بَيْتِي وَبَيْتِكَ بَعْدَ الْبَشَرَيْنِ

فَيْسَ الْقَرَيْنِ ﴿۳۸﴾

وَلَنْ يَنْفَعَكَ الْيَوْمَ إِذْ ظَلَمْتُمْ أَكْثَرِنِ الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ﴿۳۹﴾

أَفَأَنْتُمْ تُسْمِعُ الصُّمَّ أَوْ تَهْدِي الْعُمْى وَمَنْ كَانَ فِي ضَلَالٍ

کافر کو اس دنیا سے ایک گھونٹ پانی بھی پینے کو نہ دیتا۔

(۱) جو شرک و معاصی سے اجتناب اور اللہ کی اطاعت کرتے رہے، ان کے لیے آخرت اور جنت کی نعمتیں ہیں جن کو زوال و فنا نہیں۔

(۲) عَشَا يَعْشُوْا کے معنی ہیں آنکھوں کی بیماری رتو نہ دیا اس کی وجہ سے جو اندھا پن ہوتا ہے۔ یعنی جو اللہ کے ذکر سے اندھا ہو جائے۔

(۳) وہ شیطان اللہ کی یاد سے غافل رہنے والے کا ساتھی بن جاتا ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا اور نیکیوں سے روکتا ہے۔ یا انسان خود اسی شیطان کا ساتھی بن جاتا ہے اور اس سے جدا نہیں ہوتا بلکہ تمام معاملات میں اسی کی پیروی اور اس کے تمام وسوسوں میں اس کی اطاعت کرتا ہے۔

(۴) یعنی وہ شیطان ان کے حق کے راستے کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں اور اس سے انہیں روکتے ہیں اور انہیں برابر بھاتے رہتے ہیں کہ تم حق پر ہو، حتیٰ کہ وہ واقعی اپنے بارے میں یہی گمان کرنے لگ جاتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں۔ یا کافر شیطانوں کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہیں اور ان کی اطاعت کرتے رہتے ہیں۔ (فتح القدر)

(۵) مُشْتَرِكِينَ (تشبیہ ہے) مراد مشرق اور مغرب ہیں۔ فَيْسَ الْقَرَيْنِ کا مخصوص بالذم محذوف ہے۔ أَنْتَ أَيُّهَا الشَّيْطَانُ! اے شیطان تو بہت براسا تھی ہے۔ یہ کافر قیامت والے دن کے گا۔ لیکن اس دن اس اعتراف کا کیا فائدہ؟

ہے اور اسے جو کھلی گمراہی میں ہو۔^(۱) (۴۰)
پس اگر ہم تجھے یہاں سے^(۲) لے بھی جائیں تو بھی ہم
ان سے بدلہ لینے والے ہیں۔^(۳) (۴۱)
یا جو کچھ ان سے وعدہ کیا ہے^(۴) وہ تجھے دکھادیں ہم ان پر
بھی قدرت رکھتے ہیں۔^(۵) (۴۲)
پس جو وحی آپ کی طرف کی گئی ہے اسے مضبوط تھامے
رہیں^(۶) بیشک آپ راہ راست پر ہیں۔^(۷) (۴۳)
اور یقیناً یہ (خود) آپ کے لیے اور آپ^(۸) کی قوم کے لیے

مُبِينٌ ⑤
وَإِنَّا لَنَذَرُكَ بِكَ وَإِنَّا لَنَمُنُّهُمْ مُتَّبِعُونَ ⑥
أَوْ تُرِيكَ الَّذِي وَعَدْنَاهُمْ إِنَّكَ عَلَيْهِمْ مُقْتَدِرُونَ ⑦
فَأَمَّتْكِ يَا بُدْنَىٰ أُوحِيَ إِلَيْكَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ⑧
وَرَأَيْتَهُ لِيَدُكَ لَكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ ⑨

(۱) یعنی جس کے لیے شقاوت ابدی لکھ دی گئی ہے، وہ وعظ و نصیحت کے اعتبار سے بہرہ اور اندھا ہے، تیری دعوت و تبلیغ سے وہ راہ راست پر نہیں آسکتا۔ یہ استفہام انکاری ہے۔ جس طرح بہرہ سننے سے نابینا دیکھنے سے محروم ہے، اسی طرح کھلی گمراہی میں مبتلا حق کی طرف آنے سے محروم ہے۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے تاکہ ایسے لوگوں کے کفر سے آپ زیادہ تشویش محسوس نہ کریں۔

(۲) یعنی تجھے موت آجائے، قبل اس کے کہ ان پر عذاب آئے، یا تجھے کئے سے نکال لے جائیں۔

(۳) دنیا میں ہی، اگر ہماری مشیت متقاضی ہوئی، بصورت دیگر عذاب اخروی سے تو وہ کسی صورت نہیں بچ سکتے۔

(۴) یعنی تیری موت سے قبل ہی، یا کئے میں ہی، تیرے رہتے ہوئے ان پر عذاب بھیج دیں۔

(۵) یعنی ہم جب چاہیں ان پر عذاب نازل کر سکتے ہیں، کیوں کہ ہم ان پر قادر ہیں۔ چنانچہ آپ کی زندگی میں ہی بدر کی جنگ میں کافر عبرت ناک شکست اور زلت سے دوچار ہوئے۔

(۶) یعنی قرآن کریم کو، چاہے کوئی بھی اسے جھٹلاتا رہے۔

(۷) یہ فَاَسْتَمْسِكْ کی علت ہے۔

(۸) اس تخصیص کا یہ مطلب نہیں کہ دوسروں کے لیے نصیحت نہیں۔ بلکہ اولین مخاطب چون کہ قریش تھے، اس لیے

ان کا ذکر فرمایا، ورنہ قرآن تو پورے جہان کے لیے نصیحت ہے۔ ﴿وَمَا هُوَ إِلَّا كَذٌّ لِّلْعَالَمِينَ﴾ (سورۃ القلم، ۵۲) جیسے آپ

کو حکم دیا گیا کہ ﴿وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّكَ لَأَقْرَبِينَ﴾ (الشعراء، ۲۱۳) ”اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے“ اس کا مطلب یہ

نہیں کہ اللہ کا پیغام صرف رشتہ داروں کو ہی پہنچانا ہے۔ بلکہ مطلب ہے تبلیغ کی ابتدا اپنے ہی خاندان سے کریں بعض

نے یہاں ذکر بمعنی شرف لیا ہے۔ یعنی یہ قرآن تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے شرف و عزت کا باعث ہے کہ یہ ان کی

زبان میں اترا، اس کو وہ سب سے زیادہ سمجھنے والے ہیں اور اس کے ذریعے سے وہ پوری دنیا پر فضل و برتری پاسکتے ہیں،

اس لیے ان کو چاہئے کہ اس کو اپنائیں اور اس کے مقتضی پر سب سے زیادہ عمل کریں۔

صحیح ہے اور عنقریب تم لوگ پوچھے جاؤ گے۔ (۴۴)
اور ہمارے ان نبیوں سے پوچھو! جنہیں ہم^(۱) نے آپ
سے پہلے بھیجا تھا کہ کیا ہم نے سوائے رحمن کے اور معبود
مقرر کیے تھے جن کی عبادت کی جائے؟^(۲) (۴۵)

اور یسے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون
اور اسکے امراء کے پاس بھیجا تو (موسیٰ علیہ السلام نے جا کر)
کہا کہ میں تمام جمانوں کے رب کا رسول ہوں۔^(۳) (۴۶)
پس جب وہ ہماری نشانیاں لے کر اٹکے پاس آئے تو وہ
بے ساختہ ان پر ہنسنے لگے۔^(۴) (۴۷)

اور ہم انہیں جو نشانی دکھاتے تھے وہ دوسری سے بڑھی
چڑھی ہوتی تھی^(۵) اور ہم نے انہیں عذاب میں پکڑا

وَسَلَّ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِنْ
دُونِ الرَّحْمَنِ إِلَهًا يُعْبَدُونَ ﴿٤٥﴾

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ
فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٦﴾

فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِآيَاتِنَا أَذَاهُمْ مِنْهَا يَصْحُكُونَ ﴿٤٧﴾

وَأَنْزَلْنَاهُمْ مِنْ آيَةِ الْكُرْهُي أُنْحَمُوا وَأَخَذْنَاهُمْ
بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤٨﴾

(۱) پیغمبروں سے یہ سوال یا تو اسرا و معراج کے موقع پر بیت المقدس یا آسمان پر کیا گیا، جہاں انبیا علیہم السلام سے نبی
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقاتیں ہوئیں۔ یا اَتْبَاعَ کا لفظ محذوف ہے۔ یعنی ان کے پیروکاروں (اہل کتاب،
یہود و نصاریٰ) سے پوچھو، کیوں کہ وہ ان کی تعلیمات سے آگاہ ہیں اور ان پر نازل شدہ کتابیں ان کے پاس موجود ہیں۔

(۲) جواب یقیناً نفی میں ہے۔ اللہ نے کسی بھی نبی کو یہ حکم نہیں دیا۔ بلکہ اس کے برعکس ہر نبی کو دعوت توحید ہی کا حکم دیا گیا۔

(۳) قریش مکہ نے کہا تھا کہ اگر اللہ کسی کو نبی بنا کر بھیجتا ہی تو کئے اور طائف کے کسی ایسے شخص کو بھیجتا جو صاحب مال
و جاہ ہوتا۔ جیسے فرعون نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں کہا تھا کہ ”میں موسیٰ سے بہتر ہوں اور یہ مجھ
سے کمتر ہے“ یہ تو صاف بول بھی نہیں سکتا“ جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ غالباً اسی مشابہت احوال کی وجہ سے یہاں حضرت
موسیٰ علیہ السلام و فرعون کا قصہ دہرایا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں حضرت نبی کریم ﷺ کے لیے بھی تسلی کا پہلو ہے
کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی بہت سی آزمائشوں سے گزرنا پڑا، انہوں نے صبر اور عزم سے کام لیا، اسی طرح آپ
بھی کفار مکہ کی ایذاؤں اور ناروا رویوں سے دل برداشتہ نہ ہوں، صبر اور حوصلے سے کام لیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام
ہی کی طرح بلا تخریح و کامرانی آپ ہی کی ہے اور یہ اہل مکہ فرعون ہی کی طرح ناکام و نامراد ہوں گے۔

(۴) یعنی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے درباریوں کو دعوت توحید دی تو انہوں نے ان کے
رسول ہونے کی دلیل طلب کی، جس پر انہوں نے وہ دلائل و معجزات پیش کیے جو اللہ نے انہیں عطا فرمائے تھے۔ جنہیں
دیکھ کر انہوں نے استنزا اور مذاق کیا اور کہا کہ یہ کون سی ایسی چیزیں ہیں۔ یہ تو جادو کے ذریعے ہم بھی پیش کر سکتے ہیں۔

(۵) ان نشانوں سے وہ نشانیاں مراد ہیں جو طوفانِ ثمودی دل، جو کئیں، مینڈک اور خون وغیرہ کی شکل میں کیے بعد

تاکہ وہ باز آجائیں۔^(۱) (۳۸)

اور انہوں نے کہا اے جاوگر! ہمارے لیے اپنے رب سے^(۲) اس کی دعا کر جس کا اس نے تجھ سے وعدہ کر رکھا^(۳) ہے، یقین مان کہ ہم راہ پر لگ جائیں گے۔^(۴) (۳۹)

پھر جب ہم نے وہ عذاب ان سے ہٹالیا انہوں نے اسی وقت اپنا قول و قرار توڑ دیا۔ (۵۰)

اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرائی اور کہا^(۱) اے میری قوم! کیا مصر کا ملک میرا نہیں؟ اور میرے (مخلو)ں کے نیچے یہ نہریں بہ رہی ہیں،^(۲) کیا تم دیکھتے نہیں؟ (۵۱)

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا السَّاحِرُ لَوْ كُنَّا رَبُّكَ بِمَا عٰهَدَ عِنْدَكَ
إِنَّا لَمُهْتَدُونَ ﴿۳۹﴾

فَلَمَّا كَفَفْنَا عَنَّهُمُ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَكْفُرُونَ ﴿۵۰﴾

وَنَادَى فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ
وَهَذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي أَفَلَا مُبْصِرُونَ ﴿۵۱﴾

دیگرے انہیں دکھائی گئیں، جن کا تذکرہ سورہ اعراف، آیات ۱۳۳-۱۳۵ میں گزر چکا ہے۔ بعد میں آنے والی ہر نشانی پہلی نشانی سے بڑی چڑھی ہوتی، جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت واضح سے واضح تر ہو جاتی۔

(۱) مقصد ان نشانوں یا عذاب سے یہ ہوتا تھا کہ شاید وہ تکذیب سے باز آجائیں۔

(۲) کہتے ہیں اس زمانے میں جاوہر موم چیز نہیں تھی اور عالم فاضل شخص کو جاوگر کے لفظ سے ہی بطور تعظیم خطاب کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں معجزات اور نشانوں کے بارے میں بھی ان کا خیال تھا کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کے فن جاوگری کا کمال ہے۔ اس لیے انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو جاوگر کے لفظ سے مخاطب کیا۔

(۳) ”اپنے رب سے“ کے الفاظ اپنی مشرکانہ ذہنیت کی وجہ سے کہے کیونکہ مشرکوں میں مختلف رب اور الہ ہوتے تھے، موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے یہ کام کرواؤ!

(۴) یعنی ہمارے ایمان لانے پر عذاب ٹالنے کا وعدہ۔

(۵) اگر یہ عذاب ٹل گیا تو ہم تجھے اللہ کا سچا رسول مان لیں گے اور تیرے ہی رب کی عبادت کریں گے۔ لیکن ہر دفعہ وہ اپنا یہ عہد توڑ دیتے، جیسا کہ اگلی آیت میں ہے اور سورہ اعراف میں بھی گزرا۔

(۶) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسی کئی نشانیاں پیش کر دیں جو ایک سے بڑھ کر ایک تھیں تو فرعون کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں میری قوم موسیٰ کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اپنی ہزیمت کے داغ کو چھپانے اور قوم کو مسلسل دھوکے اور فریب میں مبتلا رکھنے کے لیے یہ نئی چال چلی کہ اپنے اختیار و اقتدار کے حوالے سے موسیٰ علیہ السلام کی بے توقیری اور کمتری کو نمایاں کیا جائے تاکہ قوم میری سلطنت و سطوت سے ہی مرعوب رہے۔

(۷) اس سے مراد دریائے نیل یا اس کی بعض شاخیں ہیں جو اس کے محل کے نیچے سے گزرتی تھیں۔

بلکہ میں بہتر ہوں بہ نسبت اس کے جو بے توقیر ہے ^(۱) اور صاف بول بھی نہیں سکتا۔ ^(۲) (۵۲)
 اچھا اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں آپڑے ^(۳) یا اس کے ساتھ پراباندھ کر فرشتے ہی آجاتے۔ ^(۴) (۵۳)
 اس نے اپنی قوم کو ہلایا پھلایا اور انہوں نے اسی کی مان لی، ^(۵) یقیناً یہ سارے ہی نافرمان لوگ تھے۔ (۵۴)
 پھر جب انہوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور سب کو ڈبو دیا۔ (۵۵)
 پس ہم نے انہیں گیا گزرا کر دیا اور پچھلوں کے لیے مثال بنا دی۔ ^(۶) (۵۶)

اور جب ابن مریم کی مثال بیان کی گئی تو اس سے تیری قوم (خوشی سے) چیخنے لگی ہے۔ (۵۷)
 اور انہوں نے کہا کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ؟ تجھ

أَمْرًا تَأْخِذِينَ هَذَا الَّذِي مَوْهَيْنُهُ دَوْلَابِيكَادُيُّونَ ۝

فَأَوْلَا لِقَىٰ عَلَيْهِ أَسْوَرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ أَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلِكَةُ مُعْتَرِينَ ۝

فَأَسْتَحَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ أَنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا ظَالِمِينَ ۝

فَلَمَّا أَسْفُونَا انْتَمَيْنَا إِلَيْهِمْ فَأَعْرَفْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ۝

فَعَمَلُهُمْ سَلْفًا وَمَثَلًا لِلْآخِرِينَ ۝

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ۝

وَقَالُوا لَهَذَا خَيْرٌ مِّمَّا نَحْنُ عَلَيْهِ لَئِن لَّا جَاءَ لَنَا بِنْتٌ

(۱) اُمّ اضراب کے لیے یعنی بِنّ (بلکہ) کے معنی میں ہے، بعض کے نزدیک استغمامیہ ہی ہے۔

(۲) یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کنکت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ سورہ طہ میں گزرا۔

(۳) اس دور میں مصر اور فارس کے بادشاہ اپنی امتیازی شان اور خصوصی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے سونے کے کڑے پہنتے تھے، اسی طرح قبیلوں کے سرداروں کے ہاتھوں میں بھی سونے کے کڑے اور گلے میں سونے کے طوق اور زنجیریں ڈال دی جاتی تھیں جو ان کی سرداری کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اسی اعتبار سے فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا کہ اگر اس کی کوئی حیثیت اور امتیازی شان ہوتی تو اس کے ہاتھ میں سونے کے کڑے ہونے چاہیے تھے۔

(۴) جو اس بات کی تصدیق کرتے کہ یہ اللہ کا رسول ہے یا بادشاہوں کی طرح اس کی شان کو نمایاں کرنے کے لیے اس کے ساتھ ہوتے۔

(۵) یعنی اسْتَحَفَّ عَقُولَهُمْ (ابن کثیر) اس نے اپنی قوم کی عقل کو ہلکا سمجھایا کر دیا اور انہیں اپنی جمالت و ضلالت پر قائم رہنے کی تاکید کی، اور قوم اس کے پیچھے لگ گئی۔

(۶) اسْفُونَا بمعنی اسْحَطُونَا یا اَغْضَبُونَا سَلْفٌ، سَلْفٌ کی جمع ہے جیسے خَدَمٌ، خَادِمٌ کی اور حَرَسٌ، حَارِسٌ کی ہے۔ معنی جو اپنے وجود میں دوسرے سے پہلے ہو۔ یعنی ان کو بعد میں آنے والوں کے لیے نصیحت اور مثال بنا دیا۔ کہ وہ اس طرح کفر و ظلم اور علو و فساد نہ کریں جس طرح فرعون نے کیا تاکہ وہ اس جیسے عبرت ناک حشر سے محفوظ رہیں۔

سے ان کا یہ کتنا محض جھگڑے کی غرض سے ہے، بلکہ یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو۔^(۱) (۵۸)

عیسیٰ (علیہ السلام) بھی صرف بندہ ہی ہے جس پر ہم نے احسان کیا اور اسے بنی اسرائیل کے لیے نشان قدرت بنایا۔^(۲) (۵۹)

اگر ہم چاہتے تو تمہارے عوض فرشتے کر دیتے جو زمین میں جانشینی کرتے۔^(۳) (۶۰)

فَمُرَّضُوهُمْ ۝۵۸

إِنَّ هُوَ الْأَعِزُّ الْأَعْمَىٰ وَعَجَلْنَا لَهُ مَثَلًا

يَذُوقُ إِسْرَائِيلَ ۝۵۹

وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مَنَّكُمْ فِي الْأَرْضِ يَغْلِبُونَ ۝۶۰

(۱) شرک کی تردید اور جھوٹے معبودوں کی بے وقعتی کی وضاحت کے لیے جب مشرکین مکہ سے کہا جاتا کہ تمہارے ساتھ تمہارے معبود بھی جنم میں جائیں گے تو اس سے مراد وہ پتھر کی مورتیاں ہوتی ہیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے، نہ کہ وہ نیک لوگ، جو اپنی زندگیوں میں لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے رہے، مگر ان کی وفات کے بعد ان کے معقدین نے انہیں بھی معبود سمجھنا شروع کر دیا۔ ان کی بابت تو قرآن کریم نے ہی واضح کر دیا ہے کہ یہ جنم سے دور رہیں گے۔

﴿ إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ﴾ (الأنبياء، ۱۰۱) کیوں کہ اس میں ان کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا۔ اسی لیے قرآن نے اس کے لیے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ لفظ ما ہے جو غیر عاقل کے لیے استعمال ہوتا ہے ﴿ إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبٌ جَهَنَّمَ ﴾ (الأنبياء، ۹۸) اس سے انبیاءِ علیہم السلام اور وہ صالحین نکل گئے، جن کو لوگوں نے اپنے طور پر معبود بنائے رکھا ہو گا۔ یعنی یہ تو ممکن ہے کہ دیگر مورتیوں کے ساتھ ان کی شکلوں کی بنائی ہوئی مورتیاں بھی اللہ تعالیٰ جنم میں ڈال دے لیکن یہ شخصیات تو بہر حال جنم سے دور ہی رہیں گی۔ لیکن مشرکین نبی ﷺ کی زبان مبارک سے حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر خیرن کر یہ کٹ جیتی اور مجادلہ کرتے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام قابل مدح ہیں دریاں جلیکے عیسائیوں نے انہیں معبود بنایا ہوا ہے، تو پھر ہمارے معبود کیوں برے؟ کیا وہ بھی بہتر نہیں؟ یا اگر ہمارے معبود جنم میں جائیں گے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام بھی پھر جنم میں جائیں گے۔ اللہ نے یہاں فرمایا، ان کا خوشی سے چلانا، ان کا جدل محض ہے۔ جدل کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ جھگڑنے والا جانتا ہے کہ اس کے پاس دلیل کوئی نہیں ہے لیکن محض اپنی بات کی سچ میں بحث و ٹکرا سے گریز نہیں کرتا۔

(۲) ایک اس اعتبار سے کہ بغیر باپ کے ان کی ولادت ہوئی، دوسرے، خود انہیں جو معجزات دیے گئے، احیائے موتی وغیرہ، اس لحاظ سے بھی۔

(۳) یعنی تمہیں ختم کر کے تمہاری جگہ زمین پر فرشتوں کو آباد کر دیتے، جو تمہاری ہی طرح ایک دوسرے کی جانشینی کرتے، مطلب یہ ہے کہ فرشتوں کا آسمان پر رہنا ایسا شرف نہیں ہے کہ ان کی عبادت کی جائے یہ تو ہماری مشیت اور قضا ہے کہ فرشتوں کو آسمان پر اور انسانوں کو زمین پر آباد کیا، ہم چاہیں تو فرشتوں کو زمین پر بھی آباد کر سکتے ہیں۔

اور یقیناً عیسیٰ (علیہ السلام) قیامت کی علامت ہے (۱) پس تم (قیامت) کے بارے میں شک نہ کرو اور میری تابعداری کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔ (۶۱)
اور شیطان تمہیں روک نہ دے، یقیناً وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ (۶۲)

اور جب عیسیٰ (علیہ السلام) معجزے لائے تو کہا۔ کہ میں تمہارے پاس حکمت لایا ہوں اور اس لیے آیا ہوں کہ جن بعض چیزوں میں تم مختلف ہو، انہیں واضح کر دوں، (۶۱) پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میرا کمال مانو۔ (۶۳)
میرا اور تمہارا رب فقط اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ پس تم سب اس کی عبادت کرو۔ راہ راست (یہی) ہے۔ (۶۴)
پھر (بنی اسرائیل کی) جماعتوں نے آپس میں اختلاف کیا، (۶۵) پس ظالموں کے لیے خرابی ہے دکھ والے دن کی آفت سے۔ (۶۵)

وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّقِعُونَ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾

وَلَا يَصُدُّكُمْ الشَّيْطَانُ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٦٢﴾

وَلَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِآيَاتٍ لَّكُم بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلَفُونَ فِيهِ فَأَتَقُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا عَلِيَّ ﴿٦٣﴾

إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦٤﴾

فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ﴿٦٥﴾

(۱) عِلْمٌ بمعنی علامت ہے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے قریب ان کا آسمان سے نزول ہو گا، جیسا کہ، صحیح اور متواتر احادیث سے ثابت ہے۔ یہ نزول اس بات کی علامت ہو گا کہ اب قیامت قریب ہے اسی لیے بعض نے اسے عین اور لام کے زبر کے ساتھ (عَلَمٌ) پڑھا ہے، جس کے معنی ہی نشانی اور علامت کے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک انہیں قیامت کی نشانی قرار دینا، ان کی معجزانہ ولادت کی بنیاد پر ہے۔ یعنی جس طرح اللہ نے ان کو بغیر باپ کے پیدا کیا۔ ان کی یہ پیدائش اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ فرمادے گا، اس لیے قدرت الہی کو دیکھتے ہوئے وقوع قیامت میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اِنِّہٖ میں ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

(۲) اس کے لیے دیکھئے آل عمران، آیت ۵۰ کا حاشیہ۔

(۳) اس سے مراد یسوع و نصاریٰ ہیں، یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تنقیص کی اور انہیں نعوذ باللہ ولد الزنا قرار دیا، جب کہ عیسائیوں نے غلو سے کام لے کر انہیں معبود بنا لیا۔ یا مراد عیسائیوں ہی کے مختلف فرقے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ایک دوسرے سے شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ ایک انہیں ابن اللہ، دوسرا اللہ اور ثالث ثلاثہ کہتا ہے اور ایک فرقہ مسلمانوں ہی کی طرح انہیں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول تسلیم کرتا ہے۔

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّمَاءَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۳۰﴾

الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدَاوًا إِلَّا الْمُتَّقِينَ ﴿۳۱﴾

يُعِيبُوا لِرِجَالِكُمْ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۳۲﴾

الَّذِينَ آمَنُوا بِالْآيَاتِ وَكَانُوا مُسْلِمِينَ ﴿۳۳﴾

ادْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ ﴿۳۴﴾

يَطَافُ عَلَيْهِمْ بِصَافٍ مِنْ ذَهَبٍ وَالْكَوَابِ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ وَأَنْتُمْ فِيهَا

یہ لوگ صرف قیامت کے منتظر ہیں کہ وہ اچانک ان پر آ پڑے اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔ (۲۶)

اس دن (گمراہے) دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے سوائے پرہیزگاروں کے۔^(۱) (۶۷)

میرے بندو! آج تو تم پر کوئی خوف (وہراس) ہے اور نہ تم (بد دل اور) غمزہ ہو گے۔^(۲) (۶۸)

جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے اور تھے بھی وہ (فرماں بردار) مسلمان۔ (۶۹)

تم اور تمہاری بیویاں ہشاش بشاش (راضی خوشی) جنت میں چلے جاؤ۔^(۳) (۷۰)

ان کے چاروں طرف سے سونے کی رکابیاں اور سونے کے گلاسوں کا دور چلایا جائے گا،^(۴) ان کے جی جس چیز کی خواہش کریں اور جس سے ان کی آنکھیں لذت پائیں،

(۱) کیوں کہ کافروں کی دوستی، کفر و فسق کی بنیاد پر ہی ہوتی ہے اور یہی کفر و فسق ان کے عذاب کا باعث ہوں گے؛ جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرائیں گے اور ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اہل ایمان و تقویٰ کی باہمی محبت، چونکہ دین اور رضائے الہی کی بنیاد پر ہوتی ہے اور یہی دین و ایمان خیر و ثواب کا باعث ہے۔ ان سے ان کی دوستی میں کوئی انتطاع نہیں ہو گا۔ وہ اسی طرح برقرار رہے گی جس طرح دنیا میں تھی۔

(۲) یہ قیامت والے دن ان متقین کو کہا جائے گا جو دنیا میں صرف اللہ کی رضا کے لیے ایک دوسرے سے محبت رکھتے تھے۔ جیسا کہ احادیث میں بھی اس کی فضیلت وارد ہے۔ بلکہ اللہ کے لیے بغض اور اللہ کے لیے محبت کو کمال ایمان کی بنیاد بتلایا گیا ہے۔

(۳) آذْوَابُكُمْ، سے بعض نے مومن بیویاں، بعض نے مومن ساتھی اور بعض نے جنت میں ملنے والی حور عین بیویاں مراد لی ہیں۔ یہ سارے ہی مفہوم صحیح ہیں کیوں کہ جنت میں یہ سب کچھ ہی ہو گا۔ تُحْبَرُونَ حَبْر سے ماخوذ ہے یعنی وہ فرحت و مسرت جو انہیں جنت کی نعمت و عزت کی وجہ سے ہوگی۔

(۴) صَحَافٌ، صَحْفَةٌ کی جمع ہے۔ رکابی۔ سب سے بڑے برتن کو حَفْنَةٌ کہا جاتا ہے، اس سے چھوٹا قَصْعَةٌ (جس سے دس آدمی شکر میرو جاتے ہیں) پھر صَحْفَةٌ (قَصْعَةٌ سے نصف) پھر مِکْنَلَةٌ ہے۔ مطلب ہے کہ اہل جنت کو جو کھانے ملیں گے، وہ سونے کی رکابیوں میں ہوں گے (فتح القدر)

سب وہاں ہو گا اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔ (۷۱)^(۱)
یہی وہ بہشت ہے کہ تم اپنے اعمال کے بدلے اس کے
وارث بنائے گئے ہو۔ (۷۲)

یہاں تمہارے لیے بکثرت میوے ہیں جنہیں تم کھاتے
رہو گے۔ (۷۳)

بیشک گنہگار لوگ عذابِ دوزخ میں ہمیشہ رہیں
گے۔ (۷۴)

یہ عذاب کبھی بھی ان سے ہلکا نہ کیا جائے گا اور وہ اسی
میں مایوس پڑے رہیں گے۔ (۷۵)^(۲)

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ یہ خود ہی ظالم تھے۔ (۷۶)
اور پکار پکار کر کہیں گے کہ اے مالک! تیرا رب ہمارا
کام ہی تمام کر دے، (۷۷)^(۳) وہ کہے گا کہ تمہیں تو ہمیشہ رہنا
ہے۔ (۷۸)^(۴)

ہم تو تمہارے پاس حق لے آئے لیکن تم میں سے اکثر
لوگ حق (۷۹)^(۵) سے نفرت رکھنے والے تھے؟ (۷۸)

کیا انہوں نے کسی کام کا پختہ ارادہ کر لیا ہے تو یقین مانو

خُلِدُونَ ﴿۷۱﴾

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۷۲﴾

لَكُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ كَثِيرَةٌ مِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿۷۳﴾

إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي عَذَابٍ جَهَنَّمَ خُلِدُونَ ﴿۷۴﴾

لَا يَأْتِيهِمْ فِيهَا مَاءٌ وَمُهُمْ فِيهِ مُبَدِّلُونَ ﴿۷۵﴾

وَمَا كُنْتُمْ لَهُمْ لَكِنَّا أَهْلُ الْعَلَمِينَ ﴿۷۶﴾

وَنَادُوا لِلَّهِ لِيَقْضِيَ عَلَيْنَا رَبُّنَا قَالَ إِنَّكُمْ مُنْكَرُونَ ﴿۷۷﴾

لَقَدْ جِئْتُمْ بِالْحَقِّ وَالَكِنَّ الْكُفْرَ لَمُبْتَلُونَ ﴿۷۸﴾

أَمْ أَرَبْتُمْ أَمْثَلًا مِمَّا كُنتُمْ تُبْرَمُونَ ﴿۷۹﴾

(۱) یعنی جس طرح ایک وارث، میراث کا مالک ہوتا ہے، اسی طرح جنت بھی ایک میراث ہے جس کے وارث وہ ہوں
گے جنہوں نے دنیا میں ایمان اور عمل صالح کی زندگی گزار لی ہوگی۔

(۲) یعنی نجات سے مایوس۔

(۳) مالک، داروغہ، جہنم کا نام ہے۔

(۴) یعنی ہمیں موت ہی دے دے تاکہ عذاب سے جان چھوٹ جائے۔

(۵) یعنی وہاں موت کہاں؟ لیکن یہ عذاب کی زندگی موت سے بھی بدتر ہوگی، تاہم اس کے بغیر چارہ بھی نہیں ہوگا۔

(۶) یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یا فرشتوں کا ہی قول بطور نیابت الہی ہے۔ جیسے کوئی افسر مجاز ”ہم“ کا استعمال حکومت کے
مفہوم میں کرتا ہے۔ اکثر سے مراد کل ہے، یعنی سارے ہی جنسی، یا پھر اکثر سے مراد رؤسا اور لیڈر ہیں۔ باقی جنسی ان
کے پیروکار ہونے کی حیثیت سے اس میں شامل ہوں گے۔ حق سے مراد، اللہ کا وہ دین اور پیغام ہے جو وہ پیغمبروں کے
ذریعے سے ارسال کرتا رہا۔ آخری حق قرآن اور دین اسلام ہے۔

کہ ہم بھی پختہ کام کرنے والے ہیں۔^(۱) (۷۹)

کیا ان کا یہ خیال ہے کہ ہم ان کی پوشیدہ باتوں کو اور ان کی سرگوشیوں کو نہیں سنتے، (یقیناً ہم برابر سن رہے ہیں)^(۲) بلکہ ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔^(۳) (۸۰)

آپ کہہ دیجئے! کہ اگر بالفرض رحمن کی اولاد ہو تو میں سب سے پہلے عبادت کرنے والا ہوتا۔^(۴) (۸۱)

آسمانوں اور زمین اور عرش کا رب جو کچھ یہ بیان کرتے ہیں اس سے (بہت) پاک ہے۔^(۵) (۸۲)

اب آپ انہیں اسی بحث مباحثہ اور کھیل کود میں چھوڑ دیجئے،^(۶) یہاں تک کہ انہیں اس دن سے سابقہ پڑ جائے جن کا یہ وعدہ دیئے جاتے ہیں۔^(۷) (۸۳)

أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ بَلَىٰ وَرُسُلْنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ ﴿۷۹﴾

قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ ﴿۸۰﴾

سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۸۱﴾

فَاذْرُهُمْ يُتَحَدَّثُونَ وَيَأْمُرُوا بِالْحَقِّ وَالْبِرِّ اَوَّامًا اَلَّذِي يُوْعَدُ وْنَ ﴿۸۲﴾

(۱) اِبْرَامَ کے معنی ہیں، اتقان و احکام۔ پختہ اور مضبوط کرنا۔ اُمّ اضراب کے لیے ہے بئ کے معنی میں۔ یعنی ان جنہیوں نے حق کو ناپسند ہی نہیں کیا بلکہ یہ اس کے خلاف منظم تدبیریں اور سازشیں کرتے رہے۔ جس کے مقابلے میں پھر ہم نے بھی اپنی تدبیر کی اور ہم سے زیادہ مضبوط تدبیر کس کی ہو سکتی ہے؟ اس کے ہم معنی یہ آیت ہے ﴿اَمْ يَحْسَبُونَ كَيْدًا﴾ (الطہور: ۳۴)

(۲) یعنی جو پوشیدہ باتیں وہ اپنے نفسوں میں چھپائے پھرتے ہیں یا خلوت میں آہستگی سے کرتے ہیں یا آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں، کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم وہ نہیں سنتے؟ مطلب ہے ہم سب سنتے اور جانتے ہیں۔

(۳) یعنی یقیناً سنتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے الگ ان کی ساری باتیں نوٹ کرتے ہیں۔

(۴) کیوں کہ میں اللہ کا مطیع اور فرماں بردار ہوں۔ اگر واقعی اس کی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے میں ان کی عبادت کرنے والا ہوتا۔ مطلب مشرکین کے عقیدے کا ابطال اور رد ہے جو اللہ کی اولاد ثابت کرتے ہیں۔

(۵) یہ اللہ کا کلام ہے جس میں اس نے اپنی تزییہ و تقدیس بیان کی ہے، یا رسول ﷺ کا کلام ہے اور آپ ﷺ نے بھی اللہ کے حکم سے اللہ کی ان چیزوں سے تزییہ و تقدیس بیان کی جن کا متساب مشرکین اللہ کی طرف کرتے تھے۔

(۶) یعنی اگر یہ ہدایت کا راستہ نہیں اپناتے تو اب انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیں اور دنیا کے کھیل کود میں لگا رہنے دیں۔ یہ تمہید و تنبیہ ہے۔

(۷) ان کی آنکھیں اسی دن کھلیں گی جب ان کے اس رویے کا انجام ان کے سامنے آئے گا۔

وہی آسمانوں میں معبود ہے اور زمین میں بھی وہی قابل عبادت ہے (۱) اور وہ بڑی حکمت والا اور پورے علم والا ہے۔ (۸۴)

اور وہ بہت برکتوں والا ہے جس کے پاس آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی بادشاہت ہے، (۲) اور قیامت کا علم بھی اسی کے پاس ہے (۳) اور اسی کی جانب تم سب لوٹائے جاؤ گے۔ (۸۵)

جنہیں یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ شفاعت کرنے کا اختیار نہیں رکھتے، (۵) ہاں (مستحق شفاعت وہ ہیں) جو حق بات کا اقرار کریں اور انہیں علم بھی ہو۔ (۸۶)

اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یقیناً یہ جواب دیں گے کہ اللہ نے، پھر یہ کہاں

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ﴿٨٤﴾

وَتَبَرَكَ الَّذِي لَهُ مَلَكُوتُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٥﴾

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَاءَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾

وَلَكِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّى يُؤْفَكُونَ ﴿٨٧﴾

(۱) یہ نہیں ہے کہ آسمانوں کا معبود کوئی اور ہو اور زمین کا کوئی اور۔ بلکہ جس طرح ان دونوں کا خالق ایک ہے، معبود بھی ایک ہی ہے۔ اسی کے ہم معنی یہ آیت ہے۔ ﴿ وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ يَعْلَمُ سِرُّكُمْ وَنَجْوَاهُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ ﴾ (سورۃ الانعام-۳) ”آسمان و زمین میں وہی اللہ ہے، وہ تمہاری پوشیدہ اور جہری باتوں کو جانتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو، وہ بھی اس کے علم میں ہے۔“

(۲) ایسی ذات کو، جس کے پاس سارے اختیارات اور زمین و آسمان کی بادشاہت ہو، اسے بھلا اولاد کی کیا ضرورت؟

(۳) جس کو وہ اپنے وقت پر ظاہر فرمائے گا۔

(۴) جہاں وہ ہر ایک کو اس کے عملوں کے مطابق جزا و سزا دے گا۔

(۵) یعنی دنیا میں جن بتوں کی یہ عبادت کرتے ہیں، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ اللہ کے ہاں ہماری سفارش کریں گے۔ ان معبودوں کو شفاعت کا قطعاً کوئی اختیار نہیں ہو گا۔

(۶) حق بات سے مراد کلمہ توحید لا الہ الا اللہ ہے اور یہ اقرار بھی علم و بصیرت کی بنیاد پر ہو، محض رسی اور تقلیدی نہ ہو۔ یعنی زبان سے کلمہ توحید ادا کرنے والے کو پتہ ہو کہ اس میں صرف ایک اللہ کا اثبات اور دیگر تمام معبودوں کی نفی ہے، پھر اس کے مطابق اس کا عمل ہو۔ ایسے لوگوں کے حق میں اہل شفاعت کی شفاعت مفید ہوگی۔ یا مطلب ہے کہ شفاعت کرنے کا حق صرف ایسے لوگوں کو ملے گا جو حق کا اقرار کرنے والے ہوں گے، یعنی انبیاء و صالحین اور فرشتے۔ نہ کہ معبودان باطل کو، جنہیں مشرکین اپنا شفاعت کنندہ خیال کرتے ہیں۔

لئے جاتے ہیں؟ (۸۷)
 اور ان کا پیغمبر کا اکثر یہ کہنا کہ اے میرے رب! یقیناً
 یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔ (۸۸)
 پس آپ ان سے منہ پھیر لیں اور کہہ دیں۔ (اچھا بھائی)
 سلام! انہیں عنقریب (خود ہی) معلوم ہو جائے گا۔ (۸۹)

وَقِيلَ لَهُ رَبِّ اِنَّ هٰؤُلَاءِ قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

فَاَصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْهِمْ وَيَعْلَمُوْنَ ۝

سورۃ دخان کی ہے اور اس میں انسٹھ آیتیں اور
 تین رکوع ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
 نہایت رحم والا ہے۔

حَمْدٌ ۙ وَالْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۙ

حم۔ (۱) قسم ہے اس وضاحت والی کتاب کی۔ (۲)
 یقیناً ہم نے اسے بابرکت رات (۳) میں اتارا ہے بیشک

اِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبْرَكَةٍ ۙ اِنَّا كُنَّا مُنذِرِيْنَ ۝

(۱) وَقِيلَ اس کا عطف وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ پر ہے یعنی وَعِنْدَهُمْ قِيْلَهُ اللہ کے پاس ہی قیامت اور اپنے پیغمبر کے
 شکوے کا علم کا ہے۔

(۲) یہ سلام متاثر ہے، جیسے — ﴿سَلَامٌ عَلَيْكَ لَا تُبْعَثُ الْجِبَلِيْنَ﴾ ﴿القصص ۵۵﴾ ﴿قَالَوْا لَسَلْمٰنَا﴾ ﴿الفرقان ۲۳﴾ میں
 ہے۔ یعنی دین کے معاملے میں میری اور تمہاری راہ الگ الگ ہے، تم اگر باز نہیں آتے تو اپنا عمل کیے جاؤ، میں اپنا کام
 کیے جا رہا ہوں، عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون؟

(۳) بابرکت رات (لَيْلَةُ مُبَارَكَةٍ) سے مراد شب قدر (لَيْلَةُ الْقَدْرِ) ہے۔ جیسا کہ دو سرے مقام پر صراحت ہے ﴿شَهْرُ
 رَمَضَانَ الَّذِي اُنزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ﴾ ﴿البقرۃ ۱۸۵﴾ ”رمضان کے مہینے میں قرآن نازل کیا گیا۔ ﴿اِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ ﴿سورۃ
 القدر﴾ ”ہم نے یہ قرآن شب قدر میں نازل فرمایا۔“ یہ شب قدر رمضان کے عشرہ اخیر کی طاق راتوں میں سے ہی کوئی ایک
 رات ہوتی ہے۔ یہاں قدر کی اس رات کو بابرکت رات قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بابرکت ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ ایک
 تو اس میں قرآن کا نزول ہوا۔ دوسرے، اس میں فرشتوں اور روح الامین کا نزول ہوتا ہے۔ تیسرے اس میں سارے سال میں
 ہونے والے واقعات کا فیصلہ کیا جاتا ہے، (جیسا کہ آگے آرہا ہے) چوتھے، اس رات کی عبادت ہزار مہینے (یعنی ۸۳ سال ۸۳ ماہ) کی
 عبادت سے بہتر ہے شب قدر یا لیلۃ مبارکہ میں قرآن کے نزول کا مطلب یہ ہے کہ اسی رات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر
 قرآن مجید کا نزول شروع ہوا۔ یعنی پہلے پہل اسی رات آپ پر قرآن نازل ہوا۔ یا یہ مطلب ہے کہ لوح محفوظ سے اسی رات
 قرآن بیت العزت میں اتارا گیا جو آسمان دنیا پر ہے۔ پھر وہاں سے حسب ضرورت و مصلحت ۲۳ سالوں تک مختلف اوقات میں

ہم ڈرانے والے ہیں۔ (۳)^(۱)
 اسی رات میں ہر ایک مضبوط کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ (۴)^(۲)
 ہمارے پاس سے حکم ہو کر، (۳)^(۳) ہم ہی ہیں رسول بنا کر بھیجے والے۔ (۵)^(۴)
 آپ کے رب کی مہربانی سے۔ (۴)^(۵) وہ ہی ہے سننے والا جاننے والا۔ (۶)^(۶)
 جو رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ (۷)^(۷)
 کوئی معبود نہیں اسکے سوا وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے، وہی تمہارا رب ہے اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا۔ (۸)^(۸)

فِيهَا يُفَرَّقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمًا ۝

اَمْرًا وَاٰمِرًا نَا اَنَا اَلْمَلٰٓئِكَةُ مُرْسِلٰتِيْنَ ۝

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاٰبَتِهِنَّ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

اَلَا اَلَا هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ سُلٰمًا وَّيُنَزِّلُ بِالْحَمْرِ الْاَوَّلٰتِيْنَ ۝

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اترتا رہا۔ بعض لوگوں نے لیلۃ مبارکہ سے شعبان کی پندرہویں رات مراد لی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے؛ جب قرآن کی نص صریح سے قرآن کا نزول شب قدر میں ثابت ہے تو اس سے شب براءت مراد لینا کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ علاوہ ازیں شب براءت (شعبان کی پندرہویں رات) کی بابت جتنی بھی روایات آتی ہیں، جن میں اس کی فضیلت کا بیان ہے یا ان میں اسے فیصلے کی رات کہا گیا ہے، تو یہ سب روایات سندا ضعیف ہیں۔ یہ قرآن کی نص صریح کا مقابلہ کس طرح کر سکتی ہیں؟

(۱) یعنی نزول قرآن کا مقصد لوگوں کو نفع و ضرر شرعی سے آگاہ کرنا ہے تاکہ ان پر حجت قائم ہو جائے۔

(۲) يُفَرَّقُ، يُفَصِّلُ وَبَيِّنُ، فیصلہ کر دیا جاتا اور یہ کام کو اس سے متعلق فرشتے کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ حَكِيْمًا، بمعنی پر حکمت کہ اللہ کا ہر کام ہی باحکمت ہوتا ہے یا بمعنی مُخْتَمًا (مضبوط، پختہ) جس میں تغیر و تبدیلی کا امکان نہیں۔ صحابہ و تابعین سے اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ اس رات میں آنے والے سال کی بابت موت و حیات اور وسائل زندگی کے فیصلے لوح محفوظ سے اتار کر فرشتوں کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ (ابن کثیر)

(۳) یعنی سارے فیصلے ہمارے حکم و اذن اور ہماری تقدیر و مشیت سے ہوتے ہیں۔

(۴) یعنی انزال کتب کے ساتھ اِذْ سَأَلُ رُسُلًا (رسولوں کا بھیجنا) یہ بھی ہماری رحمت ہی کا ایک حصہ ہے تاکہ وہ ہماری نازل کردہ کتابوں کو کھول کر بیان کریں اور ہمارے احکام لوگوں تک پہنچائیں۔ اس طرح مادی ضرورتوں کی فراہمی کے ساتھ ہم نے اپنی رحمت سے لوگوں کے روحانی تقاضوں کی تکمیل کا بھی سامان مہیا کر دیا۔

(۵) یہ آیت بھی سورہ اعراف کی آیت کی طرح ہیں ﴿ قُلْ يَاۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيۤ اَرْسَلْتُ اللّٰهَ بِالْحَمْرِ جَمِيْعًا لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا لَئِيۤنۡ لَّكُمۡ مِّنۡ اِنۡ

بلکہ وہ شگ میں پڑے کھیل رہے ہیں۔^(۹)
 آپ اس دن کے منتظر رہیں جب کہ آسمان ظاہر دھواں
 لائے گا۔^(۱۰)
 جو لوگوں کو گھیر لے گا، یہ دردناک عذاب ہے۔^(۱۱)
 کہیں گے کہ اے ہمارے رب! یہ آفت ہم سے دور کر
 ہم ایمان قبول کرتے ہیں۔^(۱۲)
 ان کے لیے نصیحت کہاں ہے؟ کھول کھول کر بیان کرنے
 والے پیغمبران کے پاس آپکے۔^(۱۳)
 پھر بھی انہوں نے ان سے منہ پھیرا اور کہہ دیا کہ سکھایا
 پڑھایا ہوا باؤلا ہے۔^(۱۴)
 ہم عذاب کو تھوڑا دور کر دیں گے تو تم پھر اپنی اسی حالت

بَلْهُمْ فِي شَكٍّ يَلْعَبُونَ ①
 فَارْتَوِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ②
 يَغشى النَّاسَ هَذَا صَذَابٌ أَلِيمٌ ③
 رَبَّنَا أَنْصِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ④
 أَنَّى لَهُمُ الذِّكْرَى وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ⑤
 ثُمَّ تَوَلَّوْا عُنُقَهُمْ وَقَالُوا مُعَلِّمُوهُمْ سُورُونَ ⑥
 إِنَّا كَاتِبُوا الْعَذَابَ قَلِيلًا لِّأَنَّهُمْ عَلِيمُونَ ⑦

السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ﴿۱۵۸﴾ (سورة الاعراف: ۱۵۸)

(۱) یعنی حق اور اس کے دلائل ان کے سامنے آگئے۔ لیکن وہ اس پر ایمان لانے کے بجائے شک میں مبتلا ہیں اور اس
 شک کے ساتھ استہزا اور کھیل کود میں پڑے ہیں۔
 (۲) یہ ان کفار کے لیے تمہید ہے کہ اچھا آپ اس دن کا انتظار فرمائیں جب کہ آسمان پر دھوئیں کا ظہور ہو گا۔ اس کے
 سبب نزول میں بتلایا گیا ہے کہ اہل مکہ کے معاندانہ رویے سے تنگ آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے قحط سالی
 کی بدعا فرمائی، جس کے نتیجے میں ان پر قحط کا عذاب نازل کر دیا گیا حتیٰ کہ وہ ہڈیاں کھالیں، اور مردار وغیرہ تک کھانے پر
 مجبور ہو گئے، آسمان کی طرف دیکھتے تو بھوک اور کمزوری کی شدت کی وجہ سے انہیں دھواں سا نظر آتا۔ بالآخر تنگ آکر
 نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عذاب ٹلنے پر ایمان لانے کا وعدہ کیا، لیکن یہ کیفیت دور ہوتے ہی
 ان کا کفر و عناد پھر اسی طرح عود کر آیا۔ چنانچہ پھر جنگ بدر میں ان کی سخت گرفت کی گئی۔ (صحیح بخاری کتاب التفسیر) بعض
 کہتے ہیں کہ قرب قیامت کی دس بڑی بڑی علامات میں سے ایک علامت دھواں بھی ہے جس سے کافر زیادہ متاثر ہوں
 گے اور مومن بہت کم۔ آیت میں اسی دھوئیں کا ذکر ہے۔ اس تفسیر کی رو سے یہ علامت قیامت کے قریب ظاہر ہوگی
 جب کہ پہلی تفسیر کی رو سے یہ ظاہر ہو چکی۔ امام شوکانی فرماتے ہیں، دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں، اس کی شان نزول
 کے اعتبار سے یہ واقعہ ظہور پذیر ہو چکا ہے جو صحیح سند سے ثابت ہے۔ تاہم علامات قیامت میں بھی اس کا ذکر صحیح
 احادیث میں آیا ہے، اس لیے وہ بھی اس کے منافی نہیں ہے، اس وقت بھی اس کا ظہور ہو گا۔
 (۳) پہلی تفسیر کی رو سے یہ کفار مکہ نے کہا اور دوسری تفسیر کی رو سے قیامت کے قریب کافر کہیں گے۔

پر آجاؤ گے۔ (۱۵)

جس دن ہم بڑی سخت پکڑ پکڑیں گے،^(۱) یقیناً ہم بدلہ

لینے والے ہیں۔ (۱۶)

یقیناً ان سے پہلے ہم قوم فرعون کو (بھی) آزما چکے ہیں^(۲)

جن کے پاس (اللہ کا) باعزت رسول آیا۔ (۱۷)

کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو میرے حوالے کر^(۳) دو، یقین

مانو کہ میں تمہارے لیے امانت دار رسول ہوں۔ (۱۸)^(۴)

اور تم اللہ تعالیٰ کے سامنے سرکشی نہ کرو،^(۵) میں

تمہارے پاس کھلی دلیل لانے والا ہوں۔ (۱۹)^(۶)

اور میں اپنے اور تمہارے رب کی پناہ میں آتا ہوں اس

سے کہ تم مجھے سنگسار کر دو۔ (۲۰)^(۷)

اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ سے الگ

ہی رہو۔ (۲۱)^(۸)

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنْتَقِمُونَ ﴿١٥﴾

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَ جَاءَهُمْ رَسُولُنَا يُرِيدُهُمْ ﴿١٦﴾

إِن أَدْرَأْتَنِي عِبَادَ اللَّهِ لَأُنْزِلَنَّكَ لَمَّا رَأَيْتَنِي أَيْنَ تُرِيدُ ﴿١٧﴾

وَإِن لَّا تَعْلَمُوا عَلَى اللَّهِ لَئِنِّي أَيُّكُمْ مُسْلِمٌ يُبِينُ ﴿١٨﴾

وَإِنِّي عَدْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَن تَرْتَدُّوا ﴿١٩﴾

وَإِن لَّمْ تَوْتَبِعُوا قَوْلِي فَأَعْرِضُوا ﴿٢٠﴾

(۱) اس سے مراد جنگ بدر کی گرفت ہے؛ جس میں ستر کا فرما رہے گئے اور ستر قیدی بنا لیے گئے۔ دوسری تفسیر کی رو سے یہ سخت گرفت قیامت والے دن ہوگی۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ یہ اس گرفت خاص کا ذکر ہے جو جنگ بدر میں ہوئی؛ کیوں کہ قریش کے سیاق میں ہی اس کا ذکر ہے۔ اگرچہ قیامت والے دن بھی اللہ تعالیٰ سخت گرفت فرمائے گا تاہم وہ گرفت عام ہوگی؛ ہر نافرمان اس میں شامل ہوگا۔

(۲) آزمانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے انہیں دنیوی خوشی، خوشحالی و فراغت سے نوازا اور پھر اپنا جلیل القدر پیغمبر بھی ان کی طرف ارسال کیا لیکن انہوں نے رب کی نعمتوں کا شکر ادا کیا اور نہ پیغمبر پر ایمان لائے۔

(۳) عِبَادَ اللَّهِ سے مراد یہاں موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل ہے جسے فرعون نے غلام بنا رکھا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ کیا۔

(۴) اللہ کا پیغام پہنچانے میں امانت دار ہوں۔

(۵) یعنی اس کے رسول کی اطاعت سے انکار کر کے اللہ کے سامنے اپنی بڑائی اور سرکشی کا اظہار نہ کرو۔

(۶) یہ ما قبل کی علت ہے کہ میں ایسی جنت وانحہ ساتھ لایا ہوں جس کے انکار کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

(۷) اس دعوت و تبلیغ کے جواب میں فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کی دھمکی دی؛ جس پر انہوں نے اپنے رب سے پناہ طلب کی۔

(۸) یعنی اگر مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو نہ لاؤ؛ لیکن مجھے قتل کرنے کی یا اذیت پہنچانے کی کوشش نہ کرو۔

ذَكَرَ رَبَّهُ أَنَّ كَوَلَّاهُ قَوْمٌ مُّؤْمِنُونَ ﴿٢١﴾

فَالْتَمِرْ بِجِبَادِي لَيْسَ لِإِنَّكُمْ مُّتَّبِعُونَ ﴿٢٢﴾

وَأَنْزَلْنَا الْبَحْرَ رُحُوا لَهُمْ جُنْدٌ مُّعْرِفُونَ ﴿٢٣﴾

كَمْ تَرَكُوا مِنْ جِثَّتِ وَعْيُونَ ﴿٢٤﴾

وَذُرُودٌ وَمَقَامٌ كَرِيمٌ ﴿٢٥﴾

وَتَعْنَةُ كَانُوا فِيهَا كَاهِنِينَ ﴿٢٦﴾

كَذَلِكَ نَعُدُّ وَأَوْدِنُهُمْ قَوْمًا آخِرِينَ ﴿٢٧﴾

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنظَرِينَ ﴿٢٨﴾

پھر انہوں نے اپنے رب سے دعا کی کہ یہ سب گنہگار لوگ ہیں۔^(۱) (۲۲)

(ہم نے کہہ دیا) کہ راتوں رات تو میرے بندوں کو لے کر نکل، یقیناً تمہارا^(۲) پیچھا کیا جائے گا۔ (۲۳)
تو دریا کو ساکن چھوڑ کر چلا جا،^(۳) بلاشبہ یہ لشکر غرق کر دیا جائے گا۔ (۲۴)

وہ بہت سے باغات^(۴) اور چشمے چھوڑ گئے۔ (۲۵)

اور کھیتیاں اور راحت بخش ٹھکانے۔ (۲۶)

اور وہ آرام کی چیزیں جن میں عیش کر رہے تھے۔ (۲۷)
اسی طرح ہو گیا^(۵) اور ہم نے ان سب کا وارث دوسری قوم کو بنا دیا۔^(۶) (۲۸)

سو ان پر نہ تو آسمان و زمین^(۷) روئے اور نہ انہیں

(۱) یعنی جب انہوں نے دیکھا کہ دعوت کا اثر قبول کرنے کے بجائے اس کا کفر و عناد اور بڑھ گیا تو اللہ کی بارگاہ میں دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیئے۔

(۲) چنانچہ اللہ نے دعا قبول فرمائی اور انہیں حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو راتوں رات لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ اور دیکھو! گھبرانا نہیں، تمہارا پیچھا بھی ہو گا۔

(۳) رَحُوا بمعنی ساکن یا خشک۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے لاشعی مارنے سے دریا معجزانہ طور پر ساکن یا خشک ہو جائے گا اور اس میں راستہ بن جائے گا، تم دریا پار کرنے کے بعد اسے اسی حالت میں چھوڑنا تاکہ فرعون اور اس کا لشکر بھی دریا کو پار کرنے کی غرض سے اس میں داخل ہو جائے اور ہم اسے وہیں غرق کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جیسا کہ پہلے تفصیل گزر چکی ہے۔

(۴) كَمْ خبریہ ہے جو نکثیر کا فائدہ دیتا ہے۔ دریائے نیل کے دونوں طرف باغات اور کھیتوں کی کثرت تھی، عالی شان مکانات اور خوش حالی کے آثار تھے۔ سب کچھ ہمیں دنیا میں ہی رہ گیا اور عبرت کے لیے صرف فرعون اور اس کی قوم کا نام رہ گیا۔

(۵) یعنی یہ معاملہ اسی طرح ہوا جس طرح بیان کیا گیا ہے۔

(۶) بعض کے نزدیک اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ لیکن بعض کے نزدیک بنی اسرائیل کا دوبارہ مصر آنا تاریخی طور پر ثابت نہیں، اس لیے ملک مصر کی وارث کوئی اور قوم بنی۔ بنی اسرائیل نہیں۔

(۷) یعنی ان فرعونوں کے نیک اعمال ہی نہیں تھے جو آسمان پر چڑھتے اور ان کا سلسلہ منقطع ہونے پر آسمان روتے، نہ

مملت ملی۔ (۲۹)

اور بے شک ہم نے (ہی) بنی اسرائیل کو (نخت) رسوا
کن سزا سے نجات دی۔ (۳۰)

(جو) فرعون کی طرف سے (ہو رہی) تھی۔ فی الواقع وہ
سرکش اور حد سے گزر جانے والوں میں سے تھا۔ (۳۱)

اور ہم نے دانستہ طور پر بنی اسرائیل کو دنیا جہان والوں پر
فوقیت دی۔^(۱) (۳۲)

اور ہم نے انہیں ایسی نشانیاں دیں جن میں صریح
آزمائش تھی۔^(۲) (۳۳)

یہ لوگ تو یہی کہتے ہیں۔^(۳) (۳۴)

کہ (آخری چیز) یہی ہمارا پہلی بار (دنیا سے) مرجانا ہے اور
ہم^(۴) دوبارہ اٹھائے نہیں جائیں گے۔ (۳۵)

وَلَقَدْ بَعَثْنَا لَبِيَّ إِسْرَائِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴿۲۹﴾

مِنْ قَوْمِهِ إِنَّهُ كَانَ عَالِيًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۰﴾

وَلَقَدْ اخْتَرْنَا لَهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۳۱﴾

وَإِنبِئُهُمْ مِنَ آيَاتِنَا بِأُولَئِكَ الَّذِينَ ﴿۳۲﴾

إِنَّ هَؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ﴿۳۳﴾

إِنْ هِيَ إِلَّا أَمْوَاتُنَا الْأُولَى وَمَا عَنَّا بِمُنشَرِينَ ﴿۳۴﴾

زمین پر ہی وہ اللہ کی عبادت کرتے تھے کہ اس سے محرومی پر زمین روتی۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان و زمین میں سے کوئی
بھی ان کی ہلاکت پر رونے والا نہیں تھا۔ (فتح القدیر)

(۱) اس جہان سے مراد بنی اسرائیل کے زمانے کا جہان ہے۔ علی الاطلاق کل جہان نہیں ہے۔ کیوں کہ قرآن میں امت
محمدیہ کو كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ کے لقب سے مقرب کیا گیا ہے۔ یعنی بنی اسرائیل اپنے زمانے میں دنیا جہاں والوں پر فضیلت
رکھتے تھے۔ ان کی یہ فضیلت اس استحقاق کی وجہ سے تھی جس کا علم اللہ کو ہے۔

(۲) آیات سے مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے تھے، ان میں آزمائش کا پہلو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ
دیکھے کہ وہ کیسے عمل کرتے ہیں؟ یا پھر آیات سے مراد وہ احسانات ہیں جو اللہ نے ان پر فرمائے۔ مثلاً فرعونوں کو غرق کر
کے ان کو نجات دینا، ان کے لیے دریا کو پھاڑ کر راستہ بنانا، بادلوں کا سایہ اور من و سلویٰ کا نزول وغیرہ۔ اس میں آزمائش
یہ ہے کہ ان احسانات کے بدلے میں یہ قوم اللہ کی فرماں برداری کا راستہ اختیار کرتی ہے یا اس کی ناشکری کرتے ہوئے
اس کی بغاوت اور سرکشی کا راستہ اپناتی ہے۔

(۳) یہ اشارہ کفار مکہ کی طرف ہے۔ اس لیے کہ سلسلہ کلام ان ہی سے متعلق ہے۔ درمیان میں فرعون کا قصہ ان کی
تمثیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ فرعون نے بھی ان کی طرح کفر پر اصرار کیا تھا، دیکھ لو، اس کا کیا حشر ہوا۔ اگر یہ بھی
اپنے کفر و شرک پر مصر رہے تو ان کا انجام بھی فرعون اور اس کے ماننے والوں سے مختلف نہیں ہو گا۔

(۴) یعنی یہ دنیا کی زندگی ہی بس آخری زندگی ہے۔ اس کے بعد دوبارہ زندہ ہونا اور حساب کتاب ہونا ممکن نہیں ہے۔

فَأَنزَلْنَا يَا بَنِي آدَمَ الْكِتَابَ فِيكُم مِّمَّا كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣٦﴾

اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادوں کو لے آؤ۔ (۳۶)
کیا یہ لوگ بہتر ہیں یا تبع کی قوم کے لوگ اور جو ان سے
بھی پہلے تھے۔ ہم نے ان سب کو ہلاک کر دیا یقیناً وہ گنہ
گار تھے۔ (۳۷)

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تُتِجُّوا بِالْأَدْنَىٰ مِنَ رَبِّكُم مَّا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٨﴾

ہم نے زمین اور آسمانوں اور ان کے درمیان کی چیزوں
کو کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ (۳۸)
بلکہ ہم نے انہیں درست تدبیر کے ساتھ ہی پیدا کیا
ہے، لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (۳۹)
یقیناً فیصلے کا دن ان سب کا طے شدہ وقت ہے۔ (۴۰)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِلْعَيْبِئِ ﴿٣٩﴾

مَا خَلَقْنَاهُنَّ إِلَّا بِالْحَقِّ وَاللَّيْنِ وَالرَّحْمَةِ لِئَلَّا يَتَّخِذَهُنَّ سَخِرًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ ﴿٤٠﴾

إِنَّ يَوْمَ الْفِصْلِ مِيعَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٤٠﴾

(۱) یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو کافروں کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تمہارا یہ عقیدہ واقعی صحیح ہے کہ دوبارہ زندہ ہونا ہے تو ہمارے باپ دادوں کو زندہ کر کے دکھا دو۔ یہ ان کا بدل اور کٹ جتنی تھی کیوں کہ دوبارہ زندہ کرنے کا عقیدہ قیامت سے متعلق ہے نہ کہ قیامت سے پہلے ہی دنیا میں زندہ ہو جانا یا کر دینا۔

(۲) یعنی یہ کفار مکہ کیا تبع اور ان سے پہلے کی قومیں، عاد و ثمود وغیرہ سے زیادہ طاقت ور اور بہتر ہیں، جب ہم نے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں، ان سے زیادہ قوت و طاقت رکھنے کے باوجود ہلاک کر دیا تو یہ کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ تبع سے مراد قوم سبا ہے۔ سبا میں حمیر قبیلہ تھا، یہ اپنے بادشاہ کو تبع کہتے تھے، جیسے روم کے بادشاہ کو قیصر، فارس کے بادشاہ کو کسریٰ، مصر کے حکمران کو فرعون اور حبشہ کے فرماں روا کو نجاشی کہا جاتا تھا۔ اہل تاریخ کا اتفاق ہے کہ تابعہ میں سے بعض تبع کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ حتیٰ کہ بعض مورخین نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ ملکوں کو فتح کرتے ہوئے سمرقند تک پہنچ گیا، اس طرح اور بھی کئی عظیم بادشاہ اس قوم میں گزرے اور اپنے وقت کی یہ ایک عظیم ترین قوم تھی جو قوت و طاقت، شوکت و حشمت اور فراغت و خوشحالی میں ممتاز تھی۔ لیکن جب اس قوم نے بھی پیغمبروں کی تکذیب کی تو اسے تس نس کر کے رکھ دیا گیا (تفصیل کے لیے دیکھئے سورہ سبا کی متعلقہ آیات) حدیث میں ایک تبع کے بارے میں آتا ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا تھا، اسے سب و شتم نہ کرو (مجمع الزوائد ۸۷/ ۸۶، صحیح الجامع للألبانی، ۱۳۱۹) تاہم ان کی اکثریت نافرمانوں کی ہی رہی ہے جس کی وجہ سے ہلاکت ان کا مقدر بنی۔

(۳) یہی مضمون اس سے قبل سورہ ص، ۲۷، سورہ المؤمنون ۱۱۵-۱۱۶، سورہ الحجر، ۸۵ وغیرہا میں بیان کیا گیا ہے۔

(۴) وہ مقصد یا درست تدبیر یہی ہے کہ لوگوں کی آزمائش کی جائے اور نیکیوں کو ان کی نیکیوں کی جزا اور بدوں کو ان کی بدیوں کی سزا دی جائے۔

(۵) یعنی وہ اس مقصد سے غافل اور بے خبر ہیں۔ اسی لیے آخرت کی تیاری سے لاپرواہ اور دنیا میں منہمک ہیں۔

(۶) یہی وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے انسانوں کو پیدا کیا گیا اور آسمان و زمین کی تخلیق کی گئی ہے۔

اس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ ان کی امداد کی جائے گی۔^(۱) (۴۱)

مگر جس پر اللہ کی مہربانی ہو جائے وہ زبردست اور رحم کرنے والا ہے۔ (۴۲)

پیشک زقوم (تھوہر) کا درخت۔ (۴۳)

گناہ گار کا کھانا ہے۔ (۴۴)

جو مثل تلچھٹ^(۲) کے ہے اور پیٹ میں کھولتا رہتا ہے۔ (۴۵)

مثل تیز گرم پانی کے۔ (۴۶)

اسے پکڑ لو پھر گھینٹے ہوئے بیج جنم تک پہنچاؤ۔ (۴۷)

پھر اس کے سر پر سخت گرم پانی کا عذاب بہاؤ۔ (۴۸)

(اس سے کہا جائے گا) پکھتا جا تو تو بڑا ذی عزت اور بڑے اکرام والا تھا۔^(۵) (۴۹)

یہی وہ چیز ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے۔ (۵۰)

پیشک (اللہ سے) ڈرنے والے امن چین کی جگہ میں ہوں گے۔ (۵۱)

بانوں اور چشموں میں۔ (۵۲)

باریک اور دبیز ریشم کے لباس پہنے ہوئے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔^(۶) (۵۳)

يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلَىٰ عَنْ قَوْلِ اللَّهِ شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤١﴾

إِلَّا مَنْ رَحِمَ اللَّهُ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٤٢﴾

إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقْوِمِ ﴿٤٣﴾

طَعَامُ الْإِثْمِ ﴿٤٤﴾

كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ﴿٤٥﴾

كَذَلِي الْمُهْمِي ﴿٤٦﴾

خَذُوهُ وَفَاعْتَلُوهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْحَدِيدِ ﴿٤٧﴾

ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ ﴿٤٨﴾

ذُقْ ذِقَاكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ﴿٤٩﴾

إِنَّ هَذَا مَا كُنْتُمْ بِهِ تَمْتَرُونَ ﴿٥٠﴾

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامِ آمِينَ ﴿٥١﴾

فِي جَنَّتٍ وَعُورٍ ﴿٥٢﴾

يَلْبَسُونَ مِنْ سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَقَابِلِينَ ﴿٥٣﴾

(۱) جیسے فرمایا ﴿وَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ﴾ (المؤمنون ۱۰۱) ﴿وَلَا يَسْتَلِ حَسَبُهُمْ حِمْيَرًا﴾ (المعارج ۱۰۰)۔

(۲) مہل پگھلا ہوا تانبہ، آگ میں پگھلی ہوئی چیز یا تلچھٹ تیل وغیرہ کے آخر میں جو گدلی سی مٹی کی تہ رہ جاتی ہے۔

(۳) وہ زقوم کی خوراک، کھولتے ہوئے پانی کی طرح پیٹ میں کھولے گی۔

(۴) یہ جنم پر مقرر فرشتوں سے کہا جائے گا، سوا، بمعنی وسط۔

(۵) یعنی دنیا میں اپنے طور پر تو بڑا ذی عزت اور صاحب اکرام بنا پھرتا تھا اور اہل ایمان کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

(۶) اہل کفر و فسق کے مقابلے میں اہل ایمان و تقویٰ کا مقام بیان کیا جا رہا ہے۔ جنہوں نے اپنا دامن کفر و فسق اور معاصی سے بچائے رکھا تھا۔ امین کا مطلب ایسی جگہ، جہاں ہر قسم کے خوف اور اندیشوں سے وہ محفوظ ہوں گے۔

یہ اسی طرح ہے^(۱) اور ہم بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں سے ان کا نکاح کر دیں گے۔^(۲) (۵۴)

دل جمعی کے ساتھ وہاں ہر طرح کے میووں کی فرمائشیں کرتے ہوں گے۔^(۳) (۵۵)

وہاں وہ موت چکھنے کے نہیں ہاں پہلی موت^(۴) (جو وہ مر چکے) انہیں اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی سزا سے بچا دیا۔ (۵۶) یہ صرف تیرے رب کا فضل ہے،^(۵) یہی ہے بڑی

كَذَلِكَ نَرْزُقُهُمْ بِحُورٍ عِينٍ ﴿۵۴﴾

يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ آمِنِينَ ﴿۵۵﴾

لَا يَأْكُفُونَ فِيهَا الْمَوْتِ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ وَوَفَّوهُم

عَذَابَ الْجَنَّةِ ﴿۵۶﴾

فَضْلًا لَّنَّ رَبَّكَ ذَٰلِكَ هُوَ الْغَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۵۷﴾

(۱) یعنی متقین کے ساتھ یقیناً ایسا ہی معاملہ ہو گا۔

(۲) حُورٌ حُورٌ آءُ کی جمع ہے۔ یہ حُورٌ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے کہ آنکھ کی سفیدی انتہائی سفید اور سیاہی انتہائی سیاہ ہو۔ حُورٌ آءُ اس لیے کہا جاتا ہے کہ نظر اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جائیں گی، عَيْنٌ، عَيْنَاتٌ کی جمع ہے، کشادہ چشم۔ جیسے ہرن کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ ہم پہلے وضاحت کر آئے ہیں کہ ہر جنسی کو کم از کم دو حوریں ضرور ملیں گی۔ جو حسن و جمال کے اعتبار سے چندے آفتاب و ماہتاب ہوں گی۔ البتہ ترمذی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے، جسے صحیح کہا گیا ہے کہ شہید کو خصوصی طور پر ۷۲ حوریں ملیں گی (ابواب فضائل الجہاد، باب ما جاء أی الناس أفضل)

(۳) آمِنِينَ (بے خونگی کے ساتھ) کا مطلب ان کے ختم ہونے کا اندیشہ ہو گا نہ ان کے کھانے سے بیماری وغیرہ کا خوف یا موت، تم کا وہ اور شیطان کا کوئی خوف نہیں ہو گا۔

(۴) یعنی دنیا میں انہیں جو موت آئی تھی، اس موت کے بعد انہیں موت کا مزہ نہیں چکھنا پڑے گا۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں لا کر دوزخ اور جنت کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا اور اعلان کر دیا جائے گا، اے جنتیو! تمہارے لیے جنت کی زندگی دائمی ہے، اب تمہارے لیے موت نہیں۔ اور اے جہنمیو! تمہارے لیے جہنم کا عذاب دائمی ہے، موت نہیں۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورہ مریم۔ مسلم، کتاب الجنۃ، باب النار یدخلها الجبارون والجنۃ یدخلها الضعفاء، دوسری حدیث میں فرمایا ”اے جنتیو! تمہارا مقدر اب صحت و قوت ہے، تم کبھی بیمار نہیں ہو گے۔ تمہارے لیے اب زندگی ہی زندگی ہے، موت نہیں۔ تمہارے لیے نعمتیں ہی نعمتیں ہیں، ان میں کمی نہیں ہوگی اور سدا جوان رہو گے، کبھی بڑھاپا طاری نہیں ہو گا۔“ (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمدامۃ علی العمل، و مسلم، کتاب مذکور)

(۵) جس طرح حدیث میں بھی ہے۔ فرمایا ”یہ بات جان لو! تم میں سے کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا، صحابہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! آپ کو بھی؟ فرمایا ”ہاں مجھے بھی، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت اور فضل میں

ڈھانپ لے گا“ (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمدامۃ علی العمل، و مسلم، کتاب مذکور)

کامیابی۔ (۵۷)

ہم نے اس (قرآن) کو تیری زبان میں آسان کر دیا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ (۵۸)
اب تو منتظر رہ یہ بھی منتظر ہیں۔ (۵۹)^(۱)

سورہ جاثیہ کی ہے اور اس میں سیس آیتیں اور چار رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

حم۔ (۱) یہ کتاب اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے نازل کی ہوئی ہے۔ (۲)

آسمانوں اور زمین میں ایمان داروں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔ (۳)

اور خود تمہاری پیدائش میں اور ان جانوروں کی پیدائش میں جنہیں وہ پھیلاتا ہے یقین رکھنے والی قوم کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ (۴)

اور رات دن کے بدلنے میں اور جو کچھ روزی اللہ تعالیٰ آسمان سے نازل فرما کر زمین کو اسکی موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے،^(۲) (اس میں) اور ہواؤں کے بدلنے میں بھی ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں نشانیاں ہیں۔^(۳) (۵)

فَأَمَّا يَئِسْرُهُمْ فَلِسَانُكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝

فَأَرْقُبْ إِنَّهُمْ مُرْتَدِّوْنَ ۝



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

حَمْدٌ ۝ تَنْزِيلٌ مِنَ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ۝

إِنَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآیٰتٌ لِّلَّذٰلِمِیْنَ ۝

وَفِیْ حَلٰكَتِكُمْ وَمَا یُبَدِّلُ مِنْ دَابَّةٍ الْیٰسَ لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝

وَاجْتِبَآلَافِ الْاَنْبِیَآءِ وَالتَّهٰرُومِ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ

رِزْقٍ فَلَخَلَّیْبِهٖ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَنَصَرَفِیْبِ الرِّیْلِیْبِ الْیٰسَ

لِقَوْمٍ یُّعْقَلُوْنَ ۝

(۱) تو عذاب الہی کا انتظار کر، اگر یہ ایمان نہ لائے۔ یہ منتظر ہیں اس بات کے کہ اسلام کے غلبہ و نفوذ سے قبل ہی شاید آپ موت سے ہمکنار ہو جائیں۔

(۲) آسمان و زمین، انسانی تخلیق، جانوروں کی پیدائش، رات دن کے آنے جانے اور آسمانی بارش کے ذریعے سے مردہ زمین میں زندگی کی لہر کا دوڑ جانا وغیرہ، آفاق و انفس میں بے شمار نشانیاں ہیں جو اللہ کی وحدانیت و ربوبیت پر دال ہیں۔

(۳) یعنی کبھی ہوا کا رخ شمال و جنوب کو، کبھی پورب پچھتم (مشرق و مغرب) کو ہوتا ہے، کبھی بحری ہوائیں اور کبھی بری ہوائیں، کبھی رات کو، کبھی دن کو، بعض ہوائیں بارش خیز، بعض نتیجہ خیز، بعض ہوائیں روح کی غذا اور بعض سب کچھ

یہ ہیں اللہ کی آیتیں جنہیں ہم آپ کو راستی سے سنا رہے ہیں، پس اللہ تعالیٰ اور اس کی آیتوں کے بعد یہ کس بات پر ایمان لائیں گے۔^(۱) (۶)

”ویل“ اور افسوس ہے ہر ایک جھوٹے گنہگار پر۔^(۲) (۷)

جو آیتیں اللہ کی اپنے سامنے پڑھی جاتی ہوئی سنے پھر بھی غرور کرتا ہو اس طرح اڑا رہے کہ گویا سنی ہی نہیں،^(۳) تو ایسے لوگوں کو دردناک عذاب کی خبر (پہنچا) دیجئے۔ (۸)

وہ جب ہماری آیتوں میں سے کسی آیت کی خبر لیتا ہے تو اس کی ہنسی اڑاتا ہے،^(۴) یہی لوگ ہیں جن کے لیے رسوائی کی مار ہے۔ (۹)

ان کے پیچھے دوزخ ہے،^(۵) جو کچھ انہوں نے حاصل کیا

بَلَاكِ الْبَيْتِ الْمَشْرُوقِ عَلَيْكَ بِالْحَقِّ يَا أَيُّهَا الْحَدِيثُ بَعْدَ
اللَّهِ وَالْبَيْتِ الْمُؤْمِنُونَ ①

وَيْلٌ لِّكُلِّ أَقَابِلِ آيَةٍ ②

يَتَمَعُّ لِبَيْتِ اللَّهِ مَنَظَرَ عَلَيْهِ فَمُحْتَمِلٌ كَانُوا كَوَيْسَمَهَا أَقَابِلِ
بِعْدَابِ الْبَيْتِ ③

وَإِذَا عَلِمْنَا مِنْ تَيْبَتِنَا أُنْيَا إِلَىٰ غَدَاةٍ مَا نُخْزُوا أُولَٰئِكَ لَهُمْ
عَذَابٌ مُّهِينٌ ④

مِنْ قَوْلِهِمْ جَهَنَّمَ وَلَا يُعْمَىٰ عَنْهُمْ فَكَانُوا شَيْئًا وَأَلْهَمْنَا الْغَدَاةَ

جھلسا دینے والی اور محض گردوغبار کا طوفان۔ ہواؤں کی اتنی قسمیں بھی دلالت کرتی ہیں کہ اس کائنات کا کوئی چلانے والا ہے اور وہ ایک ہی ہے۔ دویا دو سے زائد نہیں۔ تمام اختیارات کا مالک وہی ایک ہے، ان میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ سارا اور ہر قسم کا تصرف وہی کرتا ہے، کسی اور کے پاس ادنیٰ سا تصرف کرنے کا بھی اختیار نہیں۔ اسی مفہوم کی آیت سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۳ بھی ہے۔

(۱) یعنی اللہ کا نازل کردہ قرآن؛ جس میں اس کی توحید کے دلائل و براہین ہیں۔ اگر یہ اس پر بھی ایمان نہیں لاتے تو اللہ کی بات کے بعد کس کی بات ہے اور اس کی نشانیوں کے بعد کون سی نشانیاں ہیں، جن پر یہ ایمان لائیں گے؟ بَعْدَ اللَّهِ کا مطلب ہے، بَعْدَ حَدِيثِ اللَّهِ وَيَعْدُ آيَاتِهِ یہاں قرآن پر حدیث کا اطلاق کیا گیا ہے۔ جیسے ﴿اللَّهُ تَوَكَّلْ حَسْبَ الْعَدِيَّةِ﴾ (الزمر ۳۳) میں ہے۔

(۲) أَفَّا لِكَ بِمَعْنَى كَذَابٍ، أَيْنِيمُ، بہت گناہ گار۔ وَيْلٌ، بمعنی ہلاکت یا جہنم کی ایک وادی کا نام۔

(۳) یعنی کفر پر اڑا رہتا ہے اور حق کے مقابلے میں اپنے کو بڑا سمجھتا ہے اور اسی غرور میں سنی ان سنی کر دیتا ہے۔

(۴) یعنی اول تو وہ قرآن کو غور سے سنتا ہی نہیں ہے اور اگر کوئی بات اس کے کان میں پڑ جاتی ہے یا کوئی بات اس کے علم میں آ جاتی ہے تو اسے استہرا اور مذاق کا موضوع بنا لیتا ہے۔ اپنی کم عقلی اور نافرمانی کی وجہ سے یا کفر و معصیت پر اصرار و استکبار کی وجہ سے۔

(۵) یعنی ایسے کردار کے لوگوں کے لیے قیامت میں جہنم ہے۔

مِنْ دُونِ اللَّهِ أَطِيعُوا وَكُفِّرُوا بَعْدَ ذَلِكَ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۰﴾

هَذَا هُدًى وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَيْتِ الَّذِي يُبْعَثُونَ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكٰفِرِينَ ﴿۱۱﴾

اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ الْبَحْرَ حَبْرًا يَلْقَا فِي مَوْجِهِ صَعًا ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَلْبَسَهُمْ جُلُودًا حَرًّا ﴿۱۲﴾

وَسَخَّرَ لَكُمْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِمَّا تَشْتَهُونَ

تھا وہ انہیں کچھ بھی نفع نہ (۱) دے گا اور نہ وہ (کچھ کام آئیں گے) جن کو انہوں نے اللہ کے سوا کارساز (۲) بنا رکھا تھا، ان کے لیے تو بہت بڑا عذاب ہے۔ (۱۰)

یہ (سرتاپا) ہدایت (۳) ہے اور جن لوگوں نے اپنے رب کی آیتوں کو نہ مانا ان کے لیے بہت سخت دردناک عذاب ہے۔ (۱۱)

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے دریا (۴) کو تابع بنا دیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں (۵) چلیں اور تم اس کا فضل (۶) تلاش کرو اور تاکہ تم شکر بجالاؤ۔ (۷) (۱۲)

اور آسمان و زمین کی ہر چیز کو بھی اس نے اپنی طرف

(۱) یعنی دنیا میں جو مال انہوں نے کمایا ہو گا، جن اولاد اور جتنے پر وہ فخر کرتے رہے ہوں گے، وہ قیامت والے دن انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکیں گے۔

(۲) جن کو دنیا میں اپنا دوست، مددگار اور معبود بنا رکھا تھا، وہ اس روز ان کو نظر ہی نہیں آئیں گے، مدد تو انہوں نے کیا کرنی ہو گی؟

(۳) یعنی قرآن۔ کیوں کہ اس کے نزول کا مقصد ہی یہ ہے کہ لوگوں کو کفر و شرک کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لایا جائے۔ اس لیے اس کے سرتاپا ہدایت ہونے میں تو کوئی شک نہیں۔ لیکن ہدایت طے کی تو اسے ہی جو اس کے لیے اپنا سینہ واکرے گا۔ بصورت دیگر، تو ع راہ دکھلائیں گے رہو منزل ہی نہیں۔ والا معاملہ ہو گا۔

(۴) اَلْبَحْرُ، عَذَابٌ کی صفت ہے، بعض اسے رنج کی صفت بتاتے ہیں۔ رَجْزٌ بمعنی عَذَابٌ شَدِيدٌ

(۵) یعنی اس کو ایسا بنا دیا کہ تم کشتیوں اور جہازوں کے ذریعے سے اس پر سفر کر سکو۔

(۶) یعنی سمندروں میں کشتیوں اور جہازوں کا چلنا، یہ تمہارا کمال اور بہتر نہیں یہ اللہ کا حکم اور اس کی مشیت ہے۔ ورنہ اگر وہ چاہتا تو سمندروں کی موجوں کو اتنا سرکش بنا دیتا کہ کوئی کشتی اور جہاز ان کے سامنے ٹھہر ہی نہ سکتا۔ جیسا کہ کبھی کبھی وہ اپنی قدرت کے اظہار کے لیے ایسا کرتا ہے۔ اگر مستقل طور پر موجوں کی طغیانوں کا یہی عالم رہتا تو تم کبھی بھی سمندر میں سفر کرنے کے قابل نہ ہوتے۔

(۷) یعنی تجارت کے ذریعے سے، اور اس میں غوطہ زنی کر کے موتی اور دیگر ایشیا نکال کر اور دریائی جانوروں (مچھلی وغیرہ) کا شکار کر کے۔

(۸) یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ تم ان نعمتوں پر اللہ کا شکر کرو جو اس تخیر و بحر کی وجہ سے تمہیں حاصل ہوتی ہیں۔

فِي ذَلِكَ كَلَامٌ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿١٥﴾

سے تمہارے لیے تابع کر دیا ہے۔^(۱) جو غور کریں یقیناً وہ اس میں بہت سی نشانیاں پائیں گے۔ (۱۳)

قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُ اللَّهُ ذُنُوبَهُمْ وَلَا يَجْعَلُ لِيَكْفُرُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ غُيُوبٍ ﴿١٤﴾

آپ ایمان والوں سے کہہ دیں کہ وہ ان لوگوں سے درگزر کریں جو اللہ کے دنوں کی توقع نہیں رکھتے، تاکہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کو ان کے کرتوتوں کا بدلہ دے۔ (۱۳)

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رُجُوعٌ ﴿١٥﴾

جو نیکی کرے گا وہ اپنے ذاتی بھلے کے لیے اور جو برائی کرے گا اس کا وبال اسی پر ہے،^(۳) پھر تم سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ (۱۵)

وَلَقَدْ آتَيْنَا نوحَ إِسْرَائِيلَ إِذْ سَأَلَهُ رَبُّكَ أَنَّ يَكُونَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٦﴾

یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب، حکومت^(۴) اور نبوت دی تھی، اور ہم نے انہیں پاکیزہ (اور نفیس) روزیاں دی تھیں^(۵)

(۱) مطیع کرنے کا مطلب یہی ہے کہ ان کو تمہاری خدمت پر مامور کر دیا ہے، تمہارے مصالح و منافع اور تمہاری معاش سب انہی سے وابستہ ہے، جیسے چاند، سورج، روشن ستارے، بارش، پادل اور ہوائیں وغیرہ ہیں۔ اور اپنی طرف سے کا مطلب، اپنی رحمت اور فضل خاص سے۔

(۲) یعنی جو اس بات کا خوف نہیں رکھتے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایماندار بندوں کی مدد کرنے اور دشمنوں کو نیست و نابود کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ مراد کافر ہیں۔ اور ایام اللہ سے مراد قاتلے ہیں۔ جیسے ﴿وَذُكِّرْتُم بَلْ يَأْتِي اللَّهُ الْإِنسَانَ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ﴾ (ابراہیم: ۵) میں ہے۔ مطلب ہے کہ ان کافروں سے غمخوردگزر سے کام لو، جو اللہ کے عذاب اور اس کی گرفت سے بے خوف ہیں۔ یہ ابتدائی حکم تھا جو مسلمانوں کو پہلے دیا جاتا رہا تھا بعد میں جب مسلمان مقابلے کے قابل ہو گئے تو پھر سختی کا اور ان سے ٹکرا جانے (جہاد) کا حکم دے دیا گیا۔

(۳) یعنی جب تم ان کی ایذاؤں پر صبر اور ان کی زیادتیوں سے درگزر کرو گے، تو یہ سارے گناہ ان کے ذمے ہی رہیں گے، جن کی سزا ہم قیامت والے دن ان کو دیں گے۔

(۴) یعنی ہر گروہ اور فرد کا عمل، اچھا یا برا، اس کا فائدہ یا نقصان خود کرنے والے کو ہی پہنچے گا، کسی دوسرے کو نہیں۔ اس میں نیکی کی ترغیب بھی ہے، اور بدی سے ترہیب بھی۔

(۵) پس وہ ہر ایک کو اس کے عملوں کے مطابق جزا دے گا۔ نیکیوں کو نیک اور بروں کو بری۔

(۶) کتاب سے مراد تورات، حکم سے حکومت و بادشاہت یا فہم و قضا کی وہ صلاحیت ہے جو فصل خصوصیات اور لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے کے لیے ضروری ہے۔

(۷) وہ روزیاں جو ان کے لیے حلال تھیں اور ان ہی میں من و سلوئی کا نزول بھی تھا۔

اور انہیں دنیا والوں پر فضیلت دی تھی۔^(۱) (۱۶)
 اور ہم نے انہیں دین کی صاف صاف دلیلیں دیں،^(۲) پھر
 انہوں نے اپنے پاس علم کے پہنچ جانے کے بعد آپس کی ضد
 بحث سے ہی اختلاف برپا کر ڈالا،^(۳) یہ جن جن چیزوں میں
 اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ قیامت والے دن ان کے
 درمیان (خود) تیرا پ کرے گا۔^(۴) (۱۷)

پھر ہم نے آپ کو دین کی (ظاہر) راہ پر قائم کر دیا،^(۵) سو
 آپ اسی پر لگے رہیں اور نادانوں کی خواہشوں کی
 پیروی میں نہ پڑیں۔^(۶) (۱۸)

(یاد رکھیں) کہ یہ لوگ ہرگز اللہ کے سامنے آپ کے کچھ
 کام نہیں آسکتے۔ (سمجھ لیں کہ) ظالم لوگ آپس میں ایک
 دوسرے کے رفیق ہوتے ہیں اور پرہیزگاروں کا کارساز
 اللہ تعالیٰ ہے۔ (۱۹)

یہ (قرآن) لوگوں کے لیے بصیرت کی باتیں^(۷) اور ہدایت و

وَالَّذِينَ هُمْ يَنْتَظِرُونَ الْأَمْرَ فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ
 الْوَعْدُ بِغَيْرِ كَيْدٍ لَهُمْ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ
 الْقِيَامَةِ فَمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِّ عِزَّةٍ مِنَ الْأَمْرِ فَاتَّبَعْتَهَا وَلَا تَنْجِمُهُ أَحْوَاءُ
 الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝

إِنَّهُمْ لَنْ يَنْفَعُوا عَنَّاكَ مِنْ اللَّهِ شَيْئًا مَوْءَانِ الْفَالِقِينَ بَعْضُهُمْ
 أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ۝

هَذَا بَصَلَةُ الْإِنْسَانِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝

(۱) یعنی ان کے زمانے کے اعتبار سے۔

(۲) کہ یہ حلال ہیں اور یہ حرام۔ یا معجزات مراد ہیں۔ یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا علم، آپ کی نبوت کے شواہد اور
 آپ کی ہجرت گاہ کی تعیین مراد ہے۔

(۳) بَغْيًا بَيْنَهُمْ کا مطلب ہے، آپس میں ایک دوسرے سے حسد اور بغض و عناد کا مظاہرہ کرتے ہوئے یا جاہ و منصب
 کی خاطر۔ انہوں نے اپنے دین میں، علم آجانے کے باوجود، اختلاف یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار کیا۔

(۴) یعنی اہل حق کو اچھی جزا اور اہل باطل کو بری جزا دے گا۔

(۵) شریعت کے لغوی معنی ہیں، راستہ ملت اور منہاج۔ شاہراہ کو بھی شارع کہا جاتا ہے کہ وہ مقصد و منزل تک پہنچاتی
 ہے۔ پس شریعت سے یہاں مراد وہ دین ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے مقرر فرمایا ہے تاکہ لوگ اس پر چل کر اللہ
 کی رضا کا مقصد حاصل کر لیں۔ آیت کا مطلب ہے۔ ہم نے آپ کو دین کے ایک واضح راستے یا طریقے پر قائم کر دیا ہے
 جو آپ کو حق تک پہنچا دے گا۔

(۶) جو اللہ کی توحید اور اس کی شریعت سے ناواقف ہیں۔ مراد کفار مکہ اور ان کے ساتھی ہیں۔

(۷) یعنی ان دلائل کا مجموعہ ہے جو احکام دین سے متعلق ہیں اور جن سے انسانی ضروریات و حاجات وابستہ ہیں۔

رحمت ہے^(۱) اس قوم کے لیے جو یقین رکھتی ہے۔ (۲۰)
 کیا ان لوگوں کا جو برے کام کرتے ہیں یہ گمان ہے کہ ہم
 انہیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک
 کام کیے کہ ان کا مرنا جینا یکساں ہو جائے،^(۲) برا ہے وہ
 فیصلہ جو وہ کر رہے ہیں۔ (۲۱)

اور آسمانوں اور زمین کو اللہ نے بہت ہی عدل کے ساتھ
 پیدا کیا ہے اور تاکہ ہر شخص کو اس کے کیے ہوئے کام کا
 پورا بدلہ دیا جائے اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ (۲۲)^(۳)
 کیا آپ نے اسے بھی دیکھا؟ جس نے اپنی خواہش
 نفس کو اپنا معبود بنا رکھا^(۴) ہے اور باوجود سمجھ بوجھ
 کے اللہ نے اسے گمراہ کر دیا^(۵) ہے اور اس کے کان

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَحْمَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا
 وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءٌ عِندَ اللَّهِ وَمَا أَلَمُّمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿۲۱﴾

وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَالَّذِي يَلْعَنُ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا
 كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۲۲﴾

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عَمَلِهِ وَحَتَمَ عَلَىٰ
 سَمْعِهِ وَقَفَىٰ عَلَيْهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ عَنَبَ مَآءٍ فَمَنْ يُهْدِيهِ مِنْ

(۱) یعنی دنیا میں ہدایت کا راستہ بتلانے والا ہے اور آخرت میں رحمت الہی کا موجب ہے۔

(۲) یعنی دنیا اور آخرت میں دونوں کے درمیان کوئی فرق نہ کریں۔ اس طرح ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یا مطلب ہے کہ جس
 طرح دنیا میں وہ برابر تھے، آخرت میں بھی وہ برابر ہی رہیں گے کہ مر کر یہ بھی ناپید اور وہ بھی ناپید؟ نہ بدکار کو سزا نہ
 ایمان و عمل صالح کرنے والے کو انعام۔ ایسا نہیں ہو گا۔ اسی لیے آگے فرمایا ان کا یہ فیصلہ برا ہے جو وہ کر رہے ہیں۔

(۳) اور یہ عدل یہی ہے کہ قیامت والے دن بے لاگ فیصلہ ہو گا اور ہر شخص کو اس کے عملوں کے مطابق اچھی یا بری
 جزا دے گا۔ یہ نہیں ہو گا کہ نیک و بد دونوں کے ساتھ وہ یکساں سلوک کرے، جیسا کہ کافروں کا زعم باطل ہے، جس کی
 تردید گزشتہ آیت میں کی گئی ہے۔ کیوں کہ دونوں کو برابری کی سطح پر رکھنا ظلم یعنی عدل کے خلاف بھی ہے اور مسلمات
 سے انحراف بھی۔ اس لیے جس طرح کانٹے بو کر انگور کی فصل حاصل نہیں کی جاسکتی، اسی طرح بدی کا ارتکاب کر کے وہ
 مقام حاصل نہیں ہو سکتا جو اللہ نے اہل ایمان کے لیے رکھا ہے۔

(۴) پس وہ اسی کو اچھا سمجھتا ہے جس کو اس کا نفس اچھا اور اسی کو برا سمجھتا ہے جس کو اس کا نفس برا قرار دیتا ہے۔ یعنی اللہ اور
 رسول کے احکام کے مقابلے میں اپنی نفسانی خواہش کو ترجیح دیتا یا اپنی عقل کو اہمیت دیتا ہے۔ حالانکہ عقل بھی ماحول سے متاثر یا
 مفادات کی ایسہ ہو کر، خواہش نفس کی طرح غلط فیصلہ کر سکتی ہے۔ ایک معنی اس کے یہ کیے گئے ہیں، جو اللہ کی طرف سے نازل
 کردہ ہدایت اور رہبان کے بغیر اپنی مرضی کے دین کو اختیار کرتا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے ایسا شخص مراد ہے جو پتھر کو
 پوجتا تھا، جب اسے زیادہ خوب صورت پتھر مل جاتا، تو وہ پہلے پتھر کو پھینک کر دوسرے کو معبود بنا لیتا۔ (فتح القدیر)

(۵) یعنی بلوغ علم اور قیامت حجت کے باوجود وہ گمراہی ہی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ جیسے بہت سے پندار علم میں مبتلا گمراہ

بَعْدَ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٣٧﴾

اور دل پر مرگادی^(۱) ہے اور اس کی آنکھ پر بھی پردہ ڈال دیا^(۲) ہے، اب ایسے شخص کو اللہ کے بعد کون ہدایت دے سکتا ہے۔^(۳) (۲۳)

کیا اب بھی تم نصیحت نہیں پکڑتے۔^(۴) انہوں نے کہا کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا کی زندگی ہی ہے۔ ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں صرف زمانہ ہی مار ڈالتا ہے،^(۵) (دراصل) انہیں اس کا کچھ علم ہی نہیں۔ یہ تو صرف (قیاس اور) انکل سے ہی کام لے رہے ہیں۔ (۲۴)

اور جب ان کے سامنے ہماری واضح اور روشن آیتوں کی

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نُهَلِكُ إِلَّا آلَا

الدُّهُورِ وَمَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٣٧﴾

وَإِذْ أَتَى عَلَى اللَّهِ الْيَوْمَ الْآخِرُ لِيُنَازِلَ مَا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا

اہل علم کا حال ہے۔ ہوتے وہ گمراہ ہیں، موقف ان کا بے بنیاد ہوتا ہے۔ لیکن ”ہم چوماد دیگرے نیست“ کے گھمنڈ میں وہ اپنے ”دلائل“ کو ایسا سمجھتے ہیں گویا آسمان سے تارے توڑ لائے ہیں۔ اور یوں ”علم و فہم“ رکھنے کے باوجود وہ گمراہ ہی نہیں ہوتے، دوسروں کو بھی گمراہ کرنے پر فخر کرتے ہیں۔ نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ هَذَا الْعِلْمِ الضَّالِّ وَالْفَهْمِ السَّقِيمِ وَالْعَقْلِ الزَّائِعِ.

(۱) جس سے اس کے کان و عطر و نصیحت منسنے سے اور اس کا دل ہدایت کے بھنے سے محروم ہو گیا۔

(۲) چنانچہ وہ حق کو دیکھ بھی نہیں پاتا۔

(۳) جیسے فرمایا ﴿ مَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَيَذَرُ فِي تَطْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴾ (الأعراف: ۱۸۶)

(۴) یعنی غورو فکر نہیں کرتے تاکہ حقیقت حال تم پر واضح اور آشکارا ہو جائے۔

(۵) یہ دہریہ اور ان کے ہم نوا مشرکین مکہ کا قول ہے جو آخرت کے منکر تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بس یہ دنیا کی زندگی ہی پہلی اور آخری زندگی ہے، اس کے بعد کوئی زندگی نہیں اور اس میں موت و حیات کا سلسلہ، محض زمانے کی گردش کا نتیجہ ہے۔ جیسے فلاسفہ کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ہر چھتیس ہزار سال کے بعد ہر چیز دو بارہ اپنی حالت پر لوٹ آتی ہے۔ اور یہ سلسلہ، بغیر کسی صانع اور مدبر کے، از خود یوں ہی چل رہا ہے اور چلتا رہے گا، نہ اس کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ یہ گروہ دوریہ کہلاتا ہے (ابن کثیر) ظاہر بات ہے، یہ نظریہ، اسے عقل بھی قبول نہیں کرتی اور نقل کے بھی خلاف ہے۔ حدیث قدسی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ”ابن آدم مجھے ایذا پہنچاتا ہے۔ زمانے کو برا بھلا کہتا ہے۔ (یعنی اس کی طرف افعال کی نسبت کر کے، اسے برا کہتا ہے) حالانکہ (زمانہ بجائے خود کوئی چیز نہیں) میں خود زمانہ ہوں، میرے ہی ہاتھ میں تمام اختیارات ہیں، رات دن بھی میں ہی پھیرتا ہوں۔“ (البخاری، تفسیر سورۃ الحائثیۃ، مسلم، کتاب الألفاظ من الأدب،

باب النهی عن سب الدھر)

النَّوَابِغَاتِ أَنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۵﴾

تلاوت کی جاتی ہے، تو ان کے پاس اس قول کے سوا کوئی دلیل نہیں ہوتی کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادوں کو لاؤ۔^(۱) (۲۵)

آپ کہہ دیجئے! اللہ ہی تمہیں زندہ کرتا ہے پھر تمہیں مار ڈالتا ہے پھر تمہیں قیامت کے دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔ (۲۶)

اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن اہل باطل بڑے نقصان میں پڑیں گے۔ (۲۷)

اور آپ دیکھیں گے کہ ہر امت گھٹنوں کے بل گری ہوئی ہوگی۔^(۲) ہر گروہ اپنے نامہ اعمال کی طرف بلایا جائے گا، آج تمہیں اپنے کیے کا بدلہ دیا جائے گا۔ (۲۸)

یہ ہے ہماری کتاب جو تمہارے بارے میں سچ بچ بول رہی ہے،^(۳) ہم تمہارے اعمال لکھواتے جاتے تھے۔ (۲۹)^(۴) پس لیکن جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام^(۵)

قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۶﴾

وَلَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۶﴾

وَتَرَى كُلَّ أُمَّةٍ جَائِعَةٍ مُنْتَظِرِةٍ كُلُّ أُمَّةٍ مُنْتَظِرِةٍ إِلَىٰ كَيْفَ يُصْرَفُونَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۷﴾

هٰذَا كَيْفَ نَأْتِيكُمْ عَلَيْكُمْ يَا حَقَّ اِذَا كُنَّا نَسْتَسْمِعُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۸﴾

فَاَمَّا الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيهِمْ جَزَاءَهُمْ وَاَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيُجْزَوْنَ اَجْرَهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۳۹﴾

(۱) یہ ان کی سب سے بڑی دلیل ہے جو ان کی کٹ جتنی کا منظر ہے۔

(۲) ظاہر آیت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر گروہ ہی (چاہے وہ انبیاء کے پیروکار ہوں یا ان کے مخالفین) خوف و دہشت کے مارے گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوں گے (فتح القدیر) تا آنکہ سب کو حساب کتاب کے لیے بلایا جائے گا، جیسا کہ آیت کے اگلے حصے سے واضح ہے۔

(۳) اس کتاب سے مراد وہ رجسٹر ہیں جن میں انسان کے تمام اعمال درج ہوں گے۔ ﴿ وَذُخِرَ الْكِتَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِالْبَيِّنَاتِ وَالشُّهَادَاتِ ﴾ ﴿ الزمر: ۶۹﴾ ”اعمال نامے سامنے لائے جائیں گے، نبیوں اور شہدا کو گواہی کے لیے پیش کیا جائے گا۔“ یہ اعمال نامے انسانی زندگی کے ایسے مکمل ریکارڈ ہوں گے کہ جن میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہوگی۔ انسان ان کو دیکھ کر پکاراٹھے گا۔ ﴿ مَا لَ هٰذَا الْكِتَابِ الَّذِي لَا يَخْفَىٰ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهَا ﴾ ﴿ الکہف: ۶۹﴾ ”یہ کیا اعمال نامہ ہے جس نے چھوٹی بڑی چیز کسی کو بھی نہیں چھوڑا، سب کچھ ہی تو اس میں درج ہے۔“

(۴) یعنی ہمارے علم کے علاوہ فرشتے بھی ہمارے حکم سے تمہاری ہر چیز نوٹ کرتے اور محفوظ رکھتے تھے۔

(۵) یہاں بھی ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ذکر کر کے اس کی اہمیت واضح کر دی اور عمل صالح وہ اعمال خیر ہیں جو سنت

فِي رَحْمَتِهِ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ﴿۳۰﴾

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا إِذْ آذَنُوا أَنَّهُمْ يُكْفَرُونَ لَكِنَّمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ

فَأَسْتَكْبِرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ﴿۳۱﴾

وَإِذْ قِيلَ لِنَارِ اللَّهِ حَقُّهَا وَالسَّاعَةُ لَارْتَبَ فِيهَا قُلُوبُهُمْ

فَأَنذَرْتُمْ مَالِ السَّاعَةِ إِنَّ قُلُوبَهُمْ لَأَكْثَرُ أَقْوَاعًا

بِمُسْتَقْبَلِيهِمْ ﴿۳۲﴾

وَبَدَأَ لَهُمْ فِيهَا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۳﴾

وَقِيلَ الْيَوْمَ نَنفَسُكُمْ كَمَا نَفَسْتُمْ لِقَاءَ رَبِّكُمْ هَذَا وَمَا كُنْتُمْ

النَّارَ وَمَا لَكُمْ مِنْ لُحُورِينَ ﴿۳۴﴾

کیے تو ان کو ان کا رب اپنی رحمت تلے لے لے گا،^(۱) یہی صریح کامیابی ہے۔ (۳۰)

لیکن جن لوگوں نے کفر کیا تو (میں ان سے کہوں گا) کیا میری آیتیں تمہیں سنائی نہیں جاتی تھیں؟^(۲) پھر بھی تم تکبر کرتے رہے اور تم تھے ہی گنہ گار لوگ۔^(۳) (۳۱)

اور جب کبھی کہا جاتا کہ اللہ کا وعدہ یقیناً سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں تو تم جو اب دیتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے؟ ہمیں کچھ یوں ہی ساختا ہوا جاتا ہے لیکن ہمیں یقین نہیں۔^(۴) (۳۲)

اور ان پر اپنے اعمال کی برائیاں کھل گئیں اور جس کا وہ مذاق اڑا رہے تھے اس نے انہیں گھیر لیا۔^(۵) (۳۳)

اور کہہ دیا گیا کہ آج ہم تمہیں بھلا دیں گے جیسے کہ تم نے اپنے اس دن سے ملنے کو^(۶) بھلا دیا تھا تمہارا ٹھکانا

کے مطابق ادا کیے جائیں نہ کہ ہر وہ عمل جسے انسان اپنے طور پر اچھا سمجھ لے اور اسے نہایت اہتمام اور ذوق و شوق کے ساتھ کرے جیسے بہت سی بدعات مذہبی حلقوں میں رائج ہیں اور جو ان حلقوں میں فرائض و واجبات سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی لیے فرائض و سنن کا ترک تو ان کے ہاں عام ہے لیکن بدعات کا ایسا التزام ہے کہ اس میں کسی قسم کی کوتاہی کا تصور ہی نہیں ہے۔ حالاں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعات کو شرالامور (بدترین کام) قرار دیا ہے۔

(۱) رحمت سے مراد جنت ہے، یعنی جنت میں داخل فرمائے گا، جیسے حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ جنت سے فرمائے گا اَنْتِ رَحْمَتِيْ اَرْحَمُ بِكَ مِنْ اَنْشَاءِ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ ق) ”تو میری رحمت ہے تیرے ذریعے سے (یعنی تجھ میں داخل کر کے) میں جس پر چاہوں گا رحم کروں گا۔“

(۲) یہ بطور توخ کے ان سے کہا جائے گا، کیوں کہ رسول ان کے پاس آئے تھے، انہوں نے اللہ کے احکام انہیں سنائے تھے، لیکن انہوں نے پرواہی نہیں کی تھی۔

(۳) یعنی حق کے قبول کرنے سے تم نے تکبر کیا اور ایمان نہیں لائے، بلکہ تم تھے ہی گناہ گار۔

(۴) یعنی قیامت کا وقوع، محض ظن و تخمین ہے۔ ہمیں تو یقین نہیں کہ یہ واقعی ہوگی۔

(۵) یعنی قیامت کا عذاب، جسے وہ مذاق یعنی انہونا سمجھتے تھے، اس میں وہ گرفتار ہوں گے۔

(۶) جیسے حدیث میں آتا ہے۔ اللہ اپنے بعض بندوں سے کہے گا ”کیا میں نے تجھے بیوی نہیں دی تھی؟ کیا میں نے تیرا

جنم ہے اور تمہارا مددگار کوئی نہیں۔ (۳۴)

یہ اس لیے ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی ہنسی اڑائی تھی اور دنیا کی زندگی نے تمہیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا، پس آج کے دن نہ تو یہ (دوزخ) سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے عذر و معذرت قبول کیا جائے گا۔^(۱) (۳۵)

پس اللہ کی تعریف ہے جو آسمانوں اور زمین اور تمام جہان کا پالنا ہے۔ (۳۶)

تمام (بزرگی اور) بڑائی آسمانوں اور زمین میں اسی کی^(۲) ہے اور وہی غالب اور حکمت والا ہے۔ (۳۷)

ذَلِكُمْ يَأْتِكُمْ وَلِتَأْخُذَهُمُ الْيَتِيمَ الْهَرُورَ وَأَعْرَضْتُمْ كَيْدَ السَّيِّئِينَ
فَالْيَوْمَ لَا تُصِحُّونَ وَمَتَّأُوا لَكُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿۳۵﴾

قِيلَ لِلَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ آلِهَةً مِمَّنْ دُونِ اللَّهِ الَّذِينَ لَا يُنْفِقُونَ
عَلَيْهَا شَيْئًا وَلَا يَسْتَعْتَبُونَ ﴿۳۶﴾

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۳۷﴾

اکرام نہیں کیا تھا؟ کیا میں نے گھوڑے اور بیل وغیرہ تیری ماتحتی میں نہیں دیے تھے؟ تو سرداری بھی کرتا اور چنگی بھی وصول کرتا رہا۔ وہ کے گاہاں یہ تو ٹھیک ہے میرے رب! اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا: کیا تجھے میری ملاقات کا یقین تھا؟ وہ کے گا: نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ «فَالْيَوْمَ أَنْسَأَكُ كَمَا نَسَيْتَنِي» پس آج میں بھی (تجھے) جنم میں ڈال کر بھول جاؤں گا جیسے تو مجھے بھولے رہا۔» (صحیح مسلم، کتاب الزہد)

(۱) یعنی اللہ کی آیات و احکام کا استہزا اور دنیا کے فریب و غرور میں مبتلا رہنا، یہ دو جرم ایسے ہیں جنہوں نے تمہیں عذاب جنم کا مستحق بنا دیا، اب اس سے نکلنے کا امکان ہے اور نہ اس بات کی ہی امید کہ کسی موقع پر تمہیں توبہ اور رجوع کا موقعہ دے دیا جائے، اور تم توبہ و معذرت کر کے اللہ کو مانا۔ لَا يُسْتَعْتَبُونَ أَي لَا يُسْتَرْضَوْنَ وَلَا يُطْلَبُ مِنْهُمْ الرَّجُوعُ إِلَى طَاعَةِ اللَّهِ، لِأَنَّهُ يَوْمٌ لَا تُقْبَلُ فِيهِ تَوْبَةٌ وَلَا تَنْفَعُ فِيهِ مَعْذَرَةٌ. (فتح القدیر)

(۲) جیسے حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: «الْعَلَمَةُ إِزَارَتِي وَالْكَبْرِيَاءُ رِدَائِي، فَمَنْ نَازَعَنِي وَاحِدًا مِنْهُمَا أَنْسَأْتُهُ نَارِي». (صحیح مسلم، کتاب البر، باب تحریم الکبر)

سورۃ احقاف کی ہے اور اس میں پینتیس آیتیں ہیں اور چار رکوع ہیں۔

سُورَةُ الْحَقِّفَاتِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَمْدٌ ①

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ②

مَّا خَلَقْنَا السَّمَوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَالْحَقُّ

سَمْعٌ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَمَّا اُنزِلُوْا مُعْرِضُوْنَ ③

فَلَنْ اَرٰیئَهُمْ مَّا لَمْ يَخُفْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْزُوْا مَا خَلَقُوْا

مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ اَمْ یُشْرِكُوْنَ بِیْكَ مِنْ

قَبْلِ هٰذَا اَوْ اَشْرَکُوْا مِنْ قَبْلِهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ④

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نمائت رحم والا ہے۔

حم! ① اس کتاب کا اتارنا اللہ تعالیٰ غالب حکمت والے
کی طرف سے ہے۔ ②

ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی
تمام چیزوں کو بہترین تدبیر کے ساتھ ہی ایک مدت معین
کے لیے پیدا کیا ہے، ③ اور کافر لوگ جس چیز سے
ڈرائے جاتے ہیں منہ موڑ لیتے ہیں۔ ④

آپ کہہ دیجئے! بھلا دیکھو تو جنہیں تم اللہ کے سوا
پکارتے ہو مجھے بھی تو دکھاؤ کہ انہوں نے زمین کا کون سا
تکڑا بنایا ہے یا آسمانوں میں ان کا کون سا حصہ ہے؟ ⑤
اگر تم سچے ہو تو اس سے پہلے ہی کی کوئی کتاب یا کوئی علم

(۱) یہ فَوَاتِحُ سُورَاتِ ان مشابہات میں سے ہیں جن کا علم صرف اللہ کو ہے، اس لیے ان کے معانی و مطالب میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم ان کے دو فائدے بعض مفسرین نے بیان کیے ہیں، جنہیں ہم صفحہ ۱۱۴۲ پر بیان کر آئے ہیں۔

(۲) یعنی آسمان و زمین کی پیدائش کا ایک خاص مقصد بھی ہے اور وہ ہے انسانوں کی آزمائش۔ دوسرا، اس کے لیے ایک وقت بھی مقرر ہے۔ جب وہ وقت موعود آجائے گا تو آسمان و زمین کا یہ موجودہ نظام سارا بکھر جائے گا۔ نہ آسمان، یہ آسمان ہو گا نہ زمین، یہ زمین ہو گی۔ ﴿يَوْمَ يُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ﴾ (سورۃ ابراہیم: ۴۸)

(۳) یعنی عدم ایمان کی صورت میں بعثت، حساب اور جزا سے جو انہیں ڈرایا جاتا ہے، وہ اس کی پروا ہی نہیں کرتے، اس پر ایمان لاتے ہیں، نہ عذاب اخروی سے بچنے کی تیاری کرتے ہیں۔

(۴) اَرَاۤیْتُمْ بمعنی اَخْبِرُونِنِيْ یا اَزُوْنِنِيْ یعنی اللہ کو چھوڑ کر جن بتوں یا شخصیات کی تم عبادت کرتے ہو، مجھے بتلاؤ یا دکھاؤ کہ انہوں نے زمین و آسمان کی پیدائش میں کیا حصہ لیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ جب آسمان و زمین کی پیدائش میں بھی ان کا کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ مکمل طور پر ان سب کا خالق صرف ایک اللہ ہے تو پھر تم ان غیر حق معبودوں کو اللہ کی عبادت میں کیوں شریک کرتے ہو؟

ہی جو نقل کیا جاتا ہو، میرے پاس لاؤ۔^(۱) اور اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہو گا؟ جو اللہ کے سوا ایسوں کو پکارتا ہے جو قیامت تک اسکی دعا قبول نہ کر سکیں بلکہ ان کے پکارنے سے محض بے خبر ہوں۔^(۲) اور جب لوگوں کو جمع کیا جائے گا تو یہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی پرستش سے صاف انکار کر جائیں گے۔^(۳) اور انہیں جب ہماری واضح آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو منکر لوگ سچی بات کو جب کہ ان کے پاس آچکی، کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو صریح جادو ہے۔^(۴)

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مِمَّنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُمُ الْيَوْمَ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَفِلُونَ ﴿۱﴾
وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا لِعِبَادِنَاهُمْ كُفْرًا ﴿۲﴾
وَإِذَا سُئِلَ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاللَّهِ صِدْقٌ لِمَا جَاءَهُمْ هَذَا وَلَوْ كُنَّا بِأَعْيُنِنَا ﴿۳﴾

(۱) یعنی کسی نبی پر نازل شدہ کتاب میں یا کسی منقول روایت میں یہ بات لکھی ہو تو وہ لاکر دکھاؤ تاکہ تمہاری صداقت واضح ہو سکے۔ بعض نے اَنَارَةِ مِّنْ عِلْمٍ کے معنی واضح علمی دلیل کے کئے ہیں، اس صورت میں کتاب سے نقلی دلیل اور اَنَارَةِ مِّنْ عِلْمٍ سے عقلی دلیل مراد ہوگی۔ یعنی کوئی عقلی اور نقلی دلیل پیش کرو۔ پہلے معنی اس کے اثر سے ماخوذ ہونے کی بنیاد پر روایت کے کیے گئے ہیں یا بَيِّنَاتٍ مِّنْ عِلْمٍ پہلے انبیا علیہم السلام کی تعلیمات کا باقی ماندہ حصہ جو قابل اعتماد ذریعے سے نقل ہوتا آیا ہو، اس میں یہ بات ہو۔

(۲) یعنی یہی سب سے بڑے گمراہ ہیں جو پتھر کی مورتوں کو یا فوت شدہ اشخاص کو مدد کے لیے پکارتے ہیں جو قیامت تک جواب دینے سے قاصر ہیں۔ اور قاصر ہی نہیں، بلکہ بالکل بے خبر ہیں۔

(۳) یہ مضمون قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ یونس ۲۹۰۔ سورہ مریم ۸۱-۸۲۔ سورہ عنکبوت ۲۵، وغیرہا من الآیات۔ دنیا میں ان معبودوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو غیر ذی روح جمادات و نباتات اور مظاہر قدرت (سورج، آگ وغیرہ) ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو زندگی اور قوت گویائی عطا فرمائے گا، اور یہ چیزیں بول کر بتلائیں گی کہ ہمیں قطعاً اس بات کا علم نہیں ہے کہ یہ ہماری عبادت کرتے اور ہمیں تیری خدائی میں شریک گردانتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ زبان قال سے نہیں، زبان حال سے وہ اپنے جذبات کا اظہار کریں گی۔ واللہ اعلم۔ معبودوں کی دوسری قسم وہ ہے جو انبیا علیہم السلام، ملائکہ اور صالحین میں سے ہیں۔ جیسے عیسیٰ، حضرت عزیر علیہما السلام اور دیگر عباد اللہ الصالحین ہیں، یہ اللہ کی بارگاہ میں اسی طرح کا جواب دیں گے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب قرآن کریم میں منقول ہے۔ علاوہ ازیں شیطان بھی انکار کریں گے۔ جیسے قرآن میں ان کا قول نقل کیا گیا ہے۔ ﴿تَبٰرَكَ الَّذِي مَلَآ مَا كَانُوا لِيَٰكُنَ عِبَادًا لَّهِ غٰفِلِيْنَ﴾ (القصاص۔ ۳۰) ”ہم تیرے سامنے (اپنے عابدین سے) اظہار براءت کرتے ہیں، یہ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔“

کیا وہ کہتے ہیں کہ اسے تو اس نے خود گھڑ لیا ^(۱) ہے آپ کہہ دیجئے! کہ اگر میں ہی اسے بنالایا ہوں تو تم میرے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتے، ^(۲) تم اس (قرآن) کے بارے میں جو کچھ کہہ سن رہے ہو اسے اللہ خوب جانتا ہے، ^(۳) میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے وہی کافی ہے، ^(۴) اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ^(۵) (۸)

آپ کہہ دیجئے! کہ میں کوئی بالکل انوکھا پیغمبر تو نہیں ^(۶) نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ ^(۷) میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے اور میں تو صرف علی

أَمْ يَتَوَلَّوْنَ أَفْئِدَتَهُمْ كُلِّ إِنَّا فَعَرَيْتُهُمْ فَلَا تَتَّبِعُونَ
لِي مِنَّا لِي سَيِّئًا هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ كَفَىٰ بِهِ
شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ذُوهُوَ الْعَفْوَ الرَّحِيمُ ۝

قُلْ مَا مَنَعْتُكَ يَا عَائِشَةَ وَمَا أَحَدٌ مِنِّي سَائِعِلٌ بِي وَلَا يَكْفِي
إِنَّ أَكْبَرُ الْأَمَانِيهِ إِلَيَّ وَمَا آتَاكَ إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝

- (۱) اس حق سے مراد جو ان کے پاس آیا، قرآن کریم ہے، اس کے اعجاز اور قوت تاثیر کو دیکھ کر وہ اسے جادو سے تعبیر کرتے، پھر اس سے بھی انحراف کر کے یا اس سے بھی بات نہ بنتی تو کہتے کہ یہ تو محمد (ﷺ) کا اپنا گھڑا ہوا کلام ہے۔
- (۲) یعنی اگر تمہاری یہ بات صحیح ہو کہ میں اللہ کا بنایا ہوا رسول نہیں ہوں اور یہ کلام بھی میرا اپنا گھڑا ہوا ہے، پھر تو یقیناً میں بڑا مجرم ہوں، اللہ تعالیٰ اتنے بڑے جھوٹ پر مجھے پکڑے بغیر تو نہیں چھوڑے گا۔ اور اگر ایسی کوئی گرفت ہوئی تو پھر سمجھ لینا کہ میں جھوٹا ہوں اور میری کوئی مدد بھی مت کرنا۔ بلکہ ایسی حالت میں مجھے مؤاخذہ الہی سے بچانے کا تمہیں کوئی اختیار ہی نہیں ہو گا۔ اسی مضمون کو دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا گیا ہے ﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ * لَكَذَّبْنَا مَنَّهُ بِالْبَيِّنَاتِ * ثُمَّ لَاقَطْنَا مَنَّهُ الْاَوْتِينَ * فَمَا وَمَنكُوتِينَ اٰحِدًا عَنَّا خٰجِرِينَ﴾ (الحاقة ۳۳-۳۷)
- (۳) یعنی جس جس انداز سے بھی تم قرآن کی تکذیب کرتے ہو، کبھی اسے جادو، کبھی کمانت اور کبھی گھڑا ہوا کہتے ہو۔ اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ یعنی وہی تمہاری ان مذموم حرکتوں کا تمہیں بدلہ دے گا۔
- (۴) وہ اس بات کی گواہی کے لیے کافی ہے کہ یہ قرآن اسی کی طرف سے نازل ہوا ہے اور وہی تمہاری تکذیب و مخالفت کا بھی گواہ ہے۔ اس میں بھی ان کے لیے سخت وعید ہے۔
- (۵) اس کے لیے جو توبہ کر لے، ایمان لے آئے اور قرآن کو اللہ تعالیٰ کا سچا کلام مان لے۔ مطلب ہے کہ ابھی بھی وقت ہے کہ توبہ کر کے اللہ کی مغفرت و رحمت کے مستحق بن جاؤ۔
- (۶) یعنی پہلا اور انوکھا رسول تو نہیں ہوں، بلکہ مجھ سے پہلے بھی متعدد رسول آپ چکے ہیں۔
- (۷) یعنی دنیا میں۔ میں کے میں ہی رہوں گا یا یہاں سے نکلنے پر مجھے مجبور ہونا پڑے گا۔ مجھے موت طبعی آئے گی یا تمہارے ہاتھوں میرا قتل ہو گا؟ تم جلد ہی سزا سے دوچار ہو گے یا یسلی مہلت تمہیں دی جائے گی؟ ان تمام باتوں کا علم صرف اللہ کو ہے،

الاعلان آگاہ کر دینے والا ہوں۔ (۹)

آپ کہہ دیجئے! اگر یہ (قرآن) اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اسے نہ مانا ہو اور بنی اسرائیل کا ایک گواہ اس جیسی کی گواہی بھی دے چکا ہو اور وہ ایمان بھی لا چکا ہو اور تم نے سرکشی کی ہو،^(۱) تو بیشک اللہ تعالیٰ ظالموں کو راہ نہیں دکھاتا۔ (۱۰)

اور کافروں نے ایمان داروں کی نسبت کہا کہ اگر یہ (دین) بہتر ہو تا تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت کرنے نہ پاتے، اور چونکہ انہوں نے اس قرآن سے ہدایت نہیں پائی پس یہ کہہ دیں گے کہ قدیمی جھوٹ ہے۔^(۲) (۱۱)

قُلْ آتَيْنَاكُمْ إِنْ كَانِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَكَفَرْتُمْ بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِ قَالُوا وَسَتَجِدُنَا اللَّهُ لَأَنهٖدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۰﴾

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا كَانَ خَيْرًا مِنَّا سَبَقُونَا إِلَيْهَا وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَيَسْبِقُونَنَا هَٰذَا فَاذْكُرْ قَوْمَكَ ﴿۱۱﴾

مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ یا تمہارے ساتھ کل کیا ہو گا؟ تاہم آخرت کے بارے میں یقینی علم ہے کہ اہل ایمان جنت میں اور کافر جہنم میں جائیں گے۔ اور حدیث میں جو آتا ہے کہ نبی ﷺ نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی وفات پر، جب ان کے بارے میں حسن ظن کا ظہار کیا گیا، تو فرمایا «وَاللَّهِ مَا أَدْرِي - وَأَنَا رَسُولُ اللَّهِ - مَا يُفْعَلُ بِنَبِيِّ وَلَا بِكُم» (صحیح بخاری، مناقب الأنصار، باب مقدم النسب وأصحابه المدينة، "اللہ کی قسم، مجھے اللہ کا رسول ہونے کے باوجود علم نہیں کہ قیامت کو میرے اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا؟" اس سے کسی ایک معین شخص کے قطعی انجام کے علم کی نفی ہے۔ الایہ کہ ان کی بابت بھی نص موجود ہو۔ جیسے عشرہ مبشرہ اور اصحاب بدر وغیرہ۔

(۱) اس شاہد بنی اسرائیل سے کون مراد ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ یہ بطور جنس کے ہے۔ بنی اسرائیل میں سے ہر ایمان لانے والا اس کا مصداق ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مکے میں رہنے والا کوئی بنی اسرائیلی مراد ہے، کیونکہ یہ سورت مکی ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد عبد اللہ بن سلام ہیں اور وہ اس آیت کو مدنی قرار دیتے ہیں۔ صحیحین کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے (صحیح بخاری، مناقب الأنصار، باب مناقب عبد اللہ بن سلام۔ مسلم، فضائل الصحابة، اسی لیے امام شوکانی نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔ علیٰ مِثْلِهِ (اسی جیسی کتاب کی گواہی) کا مطلب ہے تورات کی گواہی جو قرآن کے منزل من اللہ ہونے کو مستلزم ہے۔ کیونکہ قرآن بھی توحید و معاد کے اثبات میں تورات ہی کی مثل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کی گواہی اور ان کے ایمان لانے کے بعد اس کے منزل من اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا ہے۔ اس لیے اس کے بعد تمہارے انکار و استکبار کا بھی کوئی جواز نہیں ہے۔ تمہیں اپنے اس رویے کا انجام سوچ لینا چاہیے۔

(۲) کفار مکہ، حضرت بلال، عمار، صہیب اور خباب رضی اللہ عنہم جیسے مسلمانوں کو، جو غریب و تلاش قسم کے لوگ تھے،

اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی۔ اور یہ کتاب ہے تصدیق کرنے والی عربی زبان میں تاکہ ظالموں کو ڈرائے اور نیک کاروں کو بشارت ہو۔ (۱۲)

بیشک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جسے رہے تو ان پر نہ تو کوئی خوف ہو گا اور نہ غمگین ہوں گے۔ (۱۳)

یہ تو اہل جنت ہیں جو سدا اسی میں رہیں گے، ان اعمال کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے۔ (۱۴)

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، اس کی ماں نے اسے تکلیف جمیل کر پیٹ میں رکھا اور تکلیف برداشت کر کے اسے جنا۔^(۱) اس

وَمِنْ قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۗ وَهَذَا كِتَابٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانِ عَرَبِيٍّ لَبِيدٍ ۚ وَلَئِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُوا سُورَتِي لَعَلَّكُمْ تَكُونُونَ ۝۱۲

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝۱۳

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ خَالِدِينَ فِيهَا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝۱۴

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۚ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۚ وَحَمَلُهُ وَفِطْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ

لیکن اسلام قبول کرنے میں انہیں سابقیت کا شرف حاصل ہوا، دیکھ کر کہتے کہ اگر اس دین میں بہتری ہوتی تو ہم جیسے ذی عزت و ذی مرتبہ لوگ سب سے پہلے اسے قبول کرتے نہ کہ یہ لوگ پہلے ایمان لاتے۔ یعنی اپنے طور پر انہوں نے اپنی بابت یہ فرض کر لیا کہ اللہ کے ہاں ان کا بڑا مقام ہے، اس لیے اگر یہ دین بھی اللہ کی طرف سے ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے قبول کرنے میں پیچھے نہ چھوڑتا، اور جب ہم نے اسے نہیں اپنایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک پرانا جھوٹ ہے۔ یعنی قرآن کو انہوں نے پرانا جھوٹ قرار دیا ہے۔ جیسے وہ اسے اَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ بھی کہتے تھے، حالانکہ دنیوی مال و دولت میں ممتاز ہونا، عند اللہ مقبولیت کی دلیل نہیں۔ (جیسے ان کو مغالطہ ہوا یا شیطان نے مغالطے میں ڈالا) عند اللہ مقبولیت کے لیے تو ایمان و اخلاص کی ضرورت ہے۔ اور اس دولت ایمان و اخلاص سے وہ جس کو چاہتا ہے، نوازتا ہے، جیسے وہ مال و دولت آزمائش کے طور پر جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے۔

(۱) اس مشقت و تکلیف کا ذکر، والدین کے ساتھ حسن سلوک کے حکم میں مزید تاکید کے لیے ہے۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماں، اس حکم احسان میں، باپ سے مقدم ہے، کیونکہ نو ماہ تک مسلسل حمل کی تکلیف اور پھر زچگی (وضع حمل) کی تکلیف، صرف تنہا ماں ہی اٹھاتی ہے، باپ کی اس میں شرکت نہیں۔ اسی لیے حدیث میں بھی ماں کے ساتھ حسن سلوک کو اولیت دی گئی ہے اور باپ کا درجہ اس کے بعد بتلایا گیا ہے۔ ایک صحابیؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہاری ماں، اس نے پھر یہی پوچھا، آپ ﷺ نے یہی جواب دیا، تیسری مرتبہ بھی یہی جواب دیا۔ چوتھی مرتبہ پوچھنے پر آپ ﷺ نے فرمایا، پھر تمہارا باپ (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب اول)

کے حمل کا اور اس کے دودھ چھڑانے کا زمانہ تیس مہینے کا ہے۔^(۱) یہاں تک کہ جب وہ اپنی پختگی اور چالیس سال کی عمر کو پہنچا^(۲) تو کہنے لگا اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے^(۳) کہ میں تیری اس نعمت کا شکر بجلاؤں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر انعام کی ہے اور یہ کہ میں ایسے نیک عمل کروں جن سے تو خوش ہو جائے اور تو میری اولاد بھی صالح بنا۔ میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ (۱۵)

یہی وہ لوگ ہیں جن کے نیک اعمال تو ہم قبول فرما لیتے ہیں اور جن کے بد اعمال سے درگزر کر لیتے ہیں؛ (یہ) جنتی لوگوں میں ہیں۔ اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا تھا۔ (۱۶)

اور جس نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ تم سے میں تنگ آگیا،^(۴) تم مجھ سے یہی کہتے رہو گے کہ میں مرنے کے

أَشَدُّهَا وَبَلَّغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ
الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ
وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي بُنْتُ إِلَيْكَ وَإِلَىٰ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝۱۵

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ
فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَعُودَ الصَّدِيقِ الَّذِينَ كَانُوا يُوعَدُونَ ۝۱۶

وَالَّذِينَ قَالَ لِلْأُولَادِ ابْنَ أَيْ لَكُمْ أَتَعْبُدُونَنِي أَنْ أُوْحِيَ وَوَقَدْ حَلَلْتُ

(۱) فِصَالُ کے معنی دودھ چھڑانا ہیں۔ اس سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے استدلال کیا ہے کہ کم از کم مدت حمل چھ مہینے یعنی چھ مہینے کے بعد اگر کسی عورت کے ہاں بچہ پیدا ہو جائے تو وہ بچہ حلال ہی کا ہو گا، حرام کا نہیں۔ اس لیے کہ قرآن نے مدت رضاعت دو سال (۲۴ مہینے) بتلائی ہے (سورہ لقمان، ۱۳، سورہ بقرہ، ۲۳۳) اس حساب سے مدت حمل صرف چھ مہینے ہی باقی رہ جاتی ہے۔

(۲) کمال قدرت (أَشَدُّهُ) کے زمانے سے مراد جوانی ہے، بعض نے اسے ۱۸ سال سے تعبیر کیا ہے، حتیٰ کہ پھر بڑھتے بڑھتے چالیس سال کی عمر کو پہنچ گیا۔ یہ عمر تو اے عقلی کے مکمل بلوغ کی عمر ہے۔ اسی لیے مفسرین کی رائے ہے کہ ہر نبی کو چالیس سال کے بعد ہی نبوت سے سرفراز کیا گیا (فتح القدر)

(۳) أَوْزِعْنِي بِمَعْنَى أَلْهِنْنِي ہے، مجھے توفیق دے۔ اس سے استدلال کرتے ہوئے علما نے کہا ہے کہ اس عمر کے بعد انسان کو یہ دعا کثرت سے پڑھتے رہنا چاہیے۔ یعنی رَبِّ أَوْزِعْنِي سے مِنَ الْمُسْلِمِينَ تک۔

(۴) مذکورہ آیت میں سعادت مند اولاد کا تذکرہ تھا، جو ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک بھی کرتی ہے اور ان کے حق میں دعائے خیر بھی۔ اب اس کے مقابلے میں بد بخت اور نافرمان اولاد کا ذکر کیا جا رہا ہے جو ماں باپ کے ساتھ گستاخی سے پیش آتی ہے۔ أَيْ لَكُمْ اَفْسُوس ہے تم پر، اے کاکلمہ، ناگواری کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی نافرمان اولاد، باپ

بعد پھر زندہ کیا جاؤں گا مجھ سے پہلے بھی امتیں گزر چکی ہیں،^(۱) وہ دونوں جناب باری میں فریادیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں تجھے خرابی ہو تو ایمان لے آ، بیشک اللہ کا وعدہ حق ہے، وہ جواب دیتا ہے کہ یہ تو صرف اگلوں کے افسانے ہیں۔^(۲) (۱۷)

وہ لوگ ہیں جن پر (اللہ کے عذاب کا) وعدہ صادق آگیا،^(۳) ان جنات اور انسانوں کے گروہوں کے ساتھ جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں،^(۴) یقیناً یہ نقصان پانے والے تھے۔ (۱۸) اور ہر ایک کو اپنے اپنے اعمال کے مطابق درجے ملیں گے^(۵) تاکہ انہیں ان کے اعمال کے پورے بدلے دے اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔^(۶) (۱۹)

اور جس دن کافر جنم کے سرے پر لائے جائیں گے^(۷)

الْقَوْمُ مِنْ حَمَلٍ، وَمَا سَخَّرْنَا لِقَوْمِكَ مِنْهُنَّ وَإِنَّكَ عِنْدَ اللَّهِ
حَسْبٌ، يَقُولُ هَذَا إِلَّا لَأَسْطُرًا لِّلَّذِينَ ۝

أُولَئِكَ الَّذِينَ سَخَّرَ اللَّهُ لِقَوْمِكَ فِي أَمْرٍ قَدْ خَلَّتْ مِنْ قَبْلِهِمْ
مِنَ الْجِنِّ وَالإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَبِيرِينَ ۝

وَلِكُلِّ دَرَجَةٍ مِمَّا عَمِلُوا، وَلِيُؤْفِقَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ
لَا يُظْلَمُونَ ۝

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَلَذَّبْتُمْ وَلِيبَتُكُمْ

کی ناصحانہ باتوں پر یا دعوت ایمان و عمل صالح پر ناگواری اور شدت غیظ کا اظہار کرتی ہے جس کی اولاد کو قطعاً اجازت نہیں ہے۔ یہ آیت عام ہے، ہر نافرمان اولاد اس کی مصداق ہے۔

(۱) مطلب ہے کہ وہ تو دوبارہ زندہ ہو کر دنیا میں نہیں آئے۔ حالانکہ دوبارہ زندہ ہونے کا مطلب قیامت والے دن زندہ ہونا ہے جس کے بعد حساب ہو گا۔

(۲) ماں باپ مسلمان ہوں اور اولاد کافر، تو وہاں اولاد اور والدین کے درمیان اسی طرح تکرار اور بحث ہوتی ہے جس کا ایک نمونہ اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

(۳) جو پہلے ہی اللہ کے علم میں تھا، یا شیطان کے جواب میں جو اللہ نے فرمایا تھا۔ ﴿لَا تَسْتَعْجِلْ بِهِمْ مِنْكَ وَرَبِّكَ تَعْلَمُ مَا تَعْمَلُونَ﴾ (سورہ ص-۸۵)

(۴) یعنی یہ بھی ان کافروں میں شامل ہو گئے جو انسانوں اور جنوں میں سے قیامت والے دن نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔
(۵) مومن اور کافر، دونوں کا، ان کے عملوں کے مطابق، اللہ کے ہاں مرتبہ ہو گا۔ مومن مراتب عالیہ سے سرفراز ہوں گے اور کافر جنم کے پست ترین درجوں میں ہوں گے۔

(۶) گناہ گار کو اس کے جرم سے زیادہ سزا نہیں دی جائے گی اور نیکو کار کے صلے میں کمی نہیں ہوگی۔ بلکہ ہر ایک کو خیر یا شر میں سے وہی کچھ ملے گا جس کا وہ مستحق ہو گا۔

(۷) یعنی اس وقت کو یاد کرو، جب کافروں کی آنکھوں سے پردے ہٹا دیئے جائیں گے اور وہ جہنم کی آگ دیکھ رہے یا

(کہا جائے گا) تم نے اپنی نیکیاں دنیا کی زندگی میں ہی برباد کر دیں اور ان سے فائدے اٹھا چکے، پس آج تمہیں ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی،^(۱) اس باعث کہ تم زمین میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس باعث بھی کہ تم حکم عدولی کیا کرتے تھے۔^(۲) (۲۰)

اور عاد کے بھائی کو یاد کرو، جبکہ اس نے اپنی قوم کو احقاف میں ڈرایا^(۳) اور یقیناً اس سے پہلے بھی ڈرانے والے گزر چکے ہیں اور اس کے بعد بھی یہ کہ تم سوائے

فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُم بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ
الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ
الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ ﴿۲۰﴾

وَأَذْكُرُ لَكُمْ عَلِيمًا إِذْ أَنْذَرَكُمْ يَوْمَئِذٍ بِالْأَخْقَافِ وَقَدْ خَلَّتِ
السُّدُورُ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا

اس کے قریب ہوں گے۔ بعض نے يُرْضَوْنَ کے معنی يُعَذَّبُونَ کے کیے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کلام میں قلب ہے۔ مطلب ہے، جب آگ ان پر پیش کی جائے گی نُعْرَضُ النَّارُ عَلَيْهِمْ (فتح القدیر)

(۱) طَبِيبَاتٌ سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو انسان ذوق و شوق سے کھاتے پیتے اور استعمال کرتے اور لذت و فرحت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن آخرت کی فکر کے ساتھ ان کا استعمال ہو تو بات اور ہے، جیسے مومن کرتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ احکام الہی کی اطاعت کر کے شکر الہی کا بھی اہتمام کرتا رہتا ہے۔ لیکن فکر آخرت سے بے نیازی کے ساتھ ان کا استعمال انسان کو سرکش اور باغی بنا دیتا ہے جیسے کافر کرتا ہے اور یوں وہ اللہ کی ناشکری کرتا ہے۔ چنانچہ مومن کو تو اس کے شکر و اطاعت کی وجہ سے یہ نعمتیں بلکہ ان سے بدرجہا بہتر نعمتیں آخرت میں پھر مل جائیں گی۔

جب کہ کافروں کو وہی کچھ کہا جائے گا جو یہاں آیت میں مذکور ہے۔ ﴿ اذْهَبْتُمْ طِبْيَاتِكُمْ ﴾ کا دوسرا ترجمہ ہے ”دنیا کی زندگی میں تم نے اپنے مزے اڑالیے اور خوب فائدہ اٹھالیا۔“

(۲) ان کے عذاب کے دو سبب بیان فرمائے، ناحق تکبر، جس کی بنیاد پر انسان حق کا اتباع کرنے سے گریز کرتا ہے اور دوسرا فسق۔ بے خوفی کے ساتھ معاصی کا ارتکاب۔ یہ دونوں باتیں تمام کافروں میں مشترک ہوتی ہیں۔ اہل ایمان کو ان دونوں باتوں سے اپنا دامن بچانا چاہیے۔

ملحوظہ: بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں آتا ہے کہ انکے سامنے عہد وغیرہ آتی تو یہ آیت انہیں یاد آجاتی اور وہ اسے ڈر سے اسے ترک کر دیتے کہ کہیں آخرت میں ہمیں بھی یہ نہ کہہ دیا جائے کہ تم نے اپنے مزے دنیا میں لوٹ لیے۔ تو یہ انکی وہ کیفیت ہے جو غایت ورع اور زہد و تقویٰ کی مظہر ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اچھی نعمتوں کا استعمال وہ جائز نہیں سمجھتے تھے۔

(۳) أَحْقَافٌ، حِفْفٌ کی جمع ہے۔ ریت کا بلند مستطیل ٹیلہ، بعض نے اس کے معنی پہاڑ اور غار کے کیے ہیں۔ یہ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم۔ عاد اولیٰ کے علاقے کا نام ہے۔ جو حضرموت (یمن) کے قریب تھا۔ کفار مکہ کی تکذیب کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے گزشتہ انبیا علیہم السلام کے واقعات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

اللَّهُ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۱﴾

اللہ تعالیٰ کے اور کی عبادت نہ کرو۔ بیشک میں تم پر بڑے دن کے عذاب سے خوف کھاتا ہوں۔^(۱)

قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَأْفِكَنَا عَنِ الْهَيْبَةِ قَالُوا إِنَّمَا نَعْبُدُ اللَّهَ إِن كُنْتُمْ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۲﴾

قوم نے جواب دیا، کیا آپ ہمارے پاس اس لیے آئے ہیں کہ ہمیں اپنے معبودوں (کی پرستش) سے باز رکھیں؟^(۲) پس اگر آپ سچے ہیں تو جس عذاب کا آپ وعدہ کرتے ہیں اسے ہم پر لاؤ لیں۔^(۲۲)

قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ لِّكُمْ فَأَرْسَلْتُ إِلَيْكَ يُوحٰنَ وَمَرْيَمَ أَن مَّكِّنْ لَهُمَا سَكَنًا مِّنْ دُونِ الْمَسٰكِنِ وَمَا كُنَّا بِمُعْجِزِيْنَكَ قَالُوا إِنَّمَا نَعْبُدُ اللَّهَ إِن كُنْتُمْ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۳﴾

(حضرت ہود نے) کہا (اس کا) علم تو اللہ ہی کے پاس ہے، میں تو جو پیغام دے کر بھیجا گیا تھا وہ تمہیں پہنچا رہا ہوں^(۳) لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ نادانی کر رہے ہو۔^(۲۳)

فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ أُوۡدِيۡهِمْ قَالُوا هٰذَا عَارِضٌ مُّطَّرٌ نَّآءٌ بَلْ هُوَ مَآءٌ سَمْعٰجِلٌ يَّرِيۡحُ فِيۡهَا عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۴﴾

پھر جب انہوں نے عذاب کو بصورت بادل دیکھا اپنی وادیوں کی طرف آتے ہوئے تو کہنے لگے، یہ ابر ہم پر برسنے والا ہے،^(۴) (نہیں) بلکہ دراصل یہ ابر وہ (عذاب) ہے جس کی تم جلدی کر رہے تھے،^(۱) ہوا ہے جس میں دردناک عذاب ہے۔^(۲۴)

(۱) یوم عظیم سے مراد قیامت کا دن ہے، جسے اس کی ہولناکیوں کی وجہ سے، بجا طور پر بڑا دن کہا گیا ہے۔

(۲) لِنَأْفِكْنَا، لِنَصْرِفْنَا يَا لِنَمْنَعْنَا يَا لِنُزِيلْنَا، سب متقارب المعنی ہیں۔ تاکہ تو ہمیں ہمارے معبودوں کی پرستش سے پھیر دے، روک دے، ہٹا دے۔

(۳) یعنی عذاب کب آئے گا؟ یا دنیا میں نہیں آئے گا، بلکہ آخرت میں تمہیں عذاب دیا جائے گا، اس کا علم صرف اللہ کو ہے، وہی اپنی مشیت کے مطابق فیصلہ فرماتا ہے، میرا کام تو صرف پیغام پہنچانا ہے۔

(۴) کہ ایک تو کفر پر اصرار کر رہے ہو۔ دوسرے، مجھ سے ایسی چیز کا مطالبہ کر رہے ہو جو میرے اختیار میں نہیں ہے۔

(۵) عرصہ دراز سے ان کے ہاں بارش نہیں ہوئی تھی، امنڈتے بادل دیکھ کر خوش ہوئے کہ اب بارش ہوگی۔ بادل کو عارض اس لیے کہا ہے کہ بادل عرض آسمان پر ظاہر ہوتا ہے۔

(۶) یہ حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں کہا کہ یہ محض بادل نہیں ہے، جیسے تم سمجھ رہے ہو۔ بلکہ یہ وہ عذاب ہے۔ جسے تم جلد لانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

(۷) یعنی وہ ہوا، جس سے اس قوم کی ہلاکت ہوئی، ان بادلوں سے ہی اٹھی اور نکلی اور اللہ کی مشیت سے ان کو اور ان کی ہر چیز کو تباہ کر گئی۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ

جو اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو ہلاک کر دے گی، پس وہ ایسے ہو گئے کہ بجز ان کے مکانات کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا^(۱) تھا۔ گنہ گاروں کے گروہ کو ہم یونہی سزا دیتے ہیں۔ (۲۵)

اور بالیقین ہم نے (قوم عاد) کو وہ مقدور دیئے تھے جو تمہیں تو دیئے بھی نہیں اور ہم نے انہیں کان آنکھیں اور دل بھی دے رکھے تھے۔ لیکن ان کے کانوں اور آنکھوں اور دلوں نے انہیں کچھ بھی نفع نہ پہنچایا^(۲) جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرنے لگے اور جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہی ان پر الٹ پڑی۔^(۳) (۲۶)

اور یقیناً ہم نے تمہارے آس پاس کی بستیاں تباہ کر

تَدِيرُكَ كُلِّ شَيْءٍ يَا مُرْسَرٍ يَا قَا صَبْحُوا لِيَوْمِي إِلَّا
مَسَلِكُهُمْ فَكَذَلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿۲۵﴾

وَلَقَدْ مَكَّنَّهُمْ فِي مَأْنٍ مَّا كُنَّا فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ
سَمْعًا وَبَصَرًا وَأَفْئِدَةً فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ
وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا
يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا يَهِ
يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۲۶﴾

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا مَا حولَكُم مِّنَ الْقَرْيَاتِ وَصَرَفْنَا الْآيَاتِ

لوگ تو بادل دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ بارش ہوگی، لیکن آپ ﷺ کے چہرے پر اس کے برعکس تشویش کے آثار نظر آتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: عائشہ رضی اللہ عنہا! اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس بادل میں عذاب نہیں ہوگا؟ جب کہ ایک قوم ہوا کے عذاب سے ہی ہلاک کر دی گئی، اس قوم نے بھی بادل دیکھ کر کہا تھا ”یہ بادل ہے جو ہم پر بارش برسائے گا۔“ (البخاری، تفسیر سورة الأحقاف، مسلم، کتاب صلوة الاستسقاء باب التعوذ عند رؤیة الريح والغيم والفرح بالمطر، ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب باد تند چلتی تو آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے «اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَهَا، وَخَيْرَ مَا فِيهَا، وَخَيْرَ مَا أُرْسِلَتْ بِهِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا، وَشَرِّ مَا أُرْسِلَتْ بِهِ». اور جب آسمان پر بادل گہرے ہو جاتے تو آپ ﷺ کا رنگ متغیر ہو جاتا اور خوف کی سی ایک کیفیت آپ ﷺ پر طاری ہو جاتی جس سے آپ ﷺ بے چین رہتے، کبھی باہر نکلتے، کبھی اندر داخل ہوتے، کبھی آگے ہوتے اور کبھی پیچھے پھر جب بارش ہو جاتی تو آپ ﷺ اطمینان کا سانس لیتے۔ (صحیح مسلم، باب مذکور)

(۱) یعنی کین (گہروالے) سب تباہ ہو گئے اور صرف مکانات (گھر) نشان عبرت کے طور پر باقی رہ گئے۔

(۲) یہ اہل مکہ کو خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ تم کیا چیز ہو؟ تم سے پہلی قومیں، جنہیں ہم نے ہلاک کیا، قوت و شوکت میں تم سے کہیں زیادہ تھیں، لیکن جب انہوں نے اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں (آنکھ، کان اور دل) کو حق کے سننے، دیکھنے اور اسے سمجھنے کے لیے استعمال نہیں کیا، تو بالآخر ہم نے انہیں تباہ کر دیا اور یہ چیزیں ان کے کچھ کام نہ آسکیں۔

(۳) یعنی جس عذاب کو وہ انہوں نے سمجھ کر بطور استہزا کہا کرتے تھے کہ لے آنا عذاب! جس سے تو ہمیں ڈراتا رہتا ہے، وہ عذاب آیا اور اس نے انہیں ایسا گھیرا کہ پھر اس سے نکل نہ سکے۔

دیں^(۱) اور طرح طرح کی ہم نے اپنی نشانیاں بیان کر
دیں تاکہ وہ رجوع کر لیں۔^(۲) (۲۷)

پس قرب الہی حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اللہ کے
سوا جن جن کو اپنا معبود بنا رکھا تھا انہوں نے ان کی مدد
کیوں نہ کی؟ بلکہ وہ تو ان سے کھو گئے، (بلکہ دراصل) یہ
ان کا محض جھوٹ اور (بالکل) بہتان تھا۔^(۳) (۲۸)

اور یاد کرو! جبکہ ہم نے جنوں کی ایک جماعت کو
تیری طرف متوجہ کیا کہ وہ قرآن سنیں، پس جب
(نبی کے) پاس پہنچ گئے تو (ایک دوسرے سے) کہنے
لگے خاموش ہو جاؤ،^(۴) پھر جب پڑھ کر ختم

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۲۷﴾

فَقَوْلًا نَصَرَ لَهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا
إِلَهًا بَدَلًا صَلُّوا عَلَيْهِمْ وَذَلِكَ أَفْكَهُمُ وَمَا كَانُوا
يَعْتَرُونَ ﴿۲۸﴾

وَأَذَصَوْفًا لِلْبَيْتِ نَفَرًا مِنَ الْعِجْنِ يَسْتَمْعُونَ الْقُرْآنَ
فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا أَنْصِتُوا فَلَمَّا قُضِيَ تَلَاوَالِ قَوْمِهِمْ
مُنْذِرِينَ ﴿۲۹﴾

(۱) آس پاس سے عاد، ثمود اور لوط کی وہ بستیاں مراد ہیں جو حجاز کے قریب ہی تھیں اور یمن اور شام و فلسطین کی طرف
آتے جاتے ان سے ان کا گزر ہوتا تھا۔

(۲) یعنی ہم نے مختلف انداز سے اور مختلف نوع کے دلائل ان کے سامنے پیش کیے کہ شاید وہ توبہ کر لیں۔ لیکن وہ ٹس
سے مس نہیں ہوئے۔

(۳) یعنی جن معبودوں کو وہ تقرب الہی کا ذریعہ سمجھتے تھے، انہوں نے ان کی کوئی مدد نہیں کی، بلکہ وہ اس موقع پر آئے
ہی نہیں، بلکہ گم رہے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ مشرکین مکہ بتوں کو الہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ انہیں بارگاہ الہی میں قرب
کا ذریعہ اور وسیلہ سمجھتے تھے۔ اللہ نے اس وسیلے کو یہاں اٹک (جھوٹ) اور افترا (بہتان) قرار دے کر واضح فرمادیا کہ یہ
ناجائز اور حرام ہے۔

(۴) صحیح مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مکہ کے قریب نخلہ وادی میں پیش آیا، جہاں آپ ﷺ صحابہ کرام
ﷺ کو فجر کی نماز پڑھا رہے تھے۔ جنوں کو تجسس تھا کہ آسمان پر ہم پر بہت زیادہ سختی کر دی گئی ہے اور اب ہمارا وہاں جانا تقریباً
ناممکن بنا دیا گیا ہے، کوئی بہت ہی اہم واقعہ رونما ہوا ہے جس کے نتیجے میں ایسا ہوا ہے۔ چنانچہ مشرق و مغرب کے مختلف اطراف
میں جنوں کی ٹولیاں واقعے کا سراغ لگانے کے لیے پھیل گئیں۔ ان ہی میں سے ایک ٹولی نے یہ قرآن سنا اور یہ بات سمجھ لی کہ نبی
صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا یہ واقعہ ہی ہم پر آسمان کی بندش کا سبب ہے۔ اور جنوں کی یہ ٹولی آپ پر ایمان لے آئی اور جا کر اپنی
قوم کو بھی بتلایا، مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب الجہر بالقراءۃ فی الصبح والقراءۃ علی الجن۔ صحیح بخاری میں
بھی بعض باتوں کا تذکرہ ہے۔ کتاب مناقب الانصار، باب ذکر الجن، بعض دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے
بعد آپ ﷺ جنوں کی دعوت پر ان کے ہاں بھی تشریف لے گئے اور انہیں جا کر اللہ کا پیغام سنایا، اور متعدد مرتبہ جنوں کا وفد

ہو گیا ^(۱) تو اپنی قوم کو خبردار کرنے کے لیے واپس لوٹ گئے۔ (۲۹)

کسے لگے اے ہماری قوم! ہم نے یقیناً وہ کتاب سنی ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد نازل کی گئی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے جو سچے دین کی اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ (۳۰)

اے ہماری قوم! اللہ کے بلانے والے کا کمانو، اس پر ایمان لاؤ ^(۲) تو اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں المناک عذاب سے پناہ دے گا۔ (۳۱)

اور جو شخص اللہ کے بلانے والے کا کمانہ مانے گا پس وہ زمین میں کہیں (بھاگ کر اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتا، ^(۳)

قَالُوا يَا قَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابَ الْأَنْزِيلِ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا
لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَيَهْدِي إِلَى الصِّرَاطِ وَالصِّرَاطِ مُسْتَقِيمٌ ﴿۲۹﴾

يَقَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابَ اللَّهِ وَأَمَّا نُوَايَا يَعْبُرُ لَكُمْ مِنَ ذُنُوبِكُمْ
وَيُجْرِكُمْ مِنَ عَذَابِ الْبُؤْسِ ﴿۳۰﴾

وَمَنْ لَا يُبَدِّدْ دَارِي اللَّهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَلَيْسَ لَهُ

آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ (فتح الباری، تفسیر ابن کثیر وغیرہ)

(۱) یعنی آپ ﷺ کی طرف سے تلاوت قرآن ختم ہو گئی۔

(۲) یہ جنوں نے اپنی قوم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ اس سے قبل قرآن کریم کے متعلق بتلایا کہ یہ تورات کے بعد ایک اور آسمانی کتاب ہے جو سچے دین اور صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

(۳) یہ ایمان لانے کے وہ فائدے بتلائے جو آخرت میں انہیں حاصل ہوں گے۔ مِنْ ذُنُوبِكُمْ میں من تبعیض کے لیے ہے یعنی بعض گناہ معاف فرمادے گا اور یہ وہ گناہ ہوں گے جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہو گا۔ کیوں کہ حقوق العباد معاف نہیں ہوں گے۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ثواب و عقاب اور اوامر و نواہی میں جنات کے لیے بھی حکم ہے جو انسانوں کے لیے ہے۔

اس امر میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات میں جنوں میں سے رسول بھیجے یا نہیں؟ ظاہر آیات قرآنیہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جنات میں کوئی رسول نہیں ہوا، تمام انبیاء و رسل علیہم السلام انسان ہی ہوئے ہیں ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ﴾ (النحل ۳۳) ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنَ الرُّسُلِ إِلَّا رِجَالًا لَّيَالِكُنَّ الْكَلِمَاتِ وَمَا يُرْسَلُونَ فِي الْأَسْوَاقِ﴾ (سورۃ الفرقان - ۲۰) ان آیات قرآنیہ سے واضح ہے کہ جتنے بھی رسول ہوئے، وہ انسان تھے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح انسانوں کے لیے رسول تھے اور ہیں، اسی طرح جنات کے رسول بھی آپ ﷺ ہی ہیں اور آپ ﷺ کے پیغام کو بھی جنات تک پہنچانے کا انتظام کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن کریم کے اس مقام سے ظاہر ہے۔
(۴) یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ زمین کی وسعتوں میں اس طرح گم ہو جائے کہ اللہ کی گرفت میں نہ آسکے۔

مِنْ دُورَةٍ أُولَئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۳۱﴾

نہ اللہ کے سوا اور کوئی اس کے مددگار ہوں گے،^(۱) یہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔ (۳۲)

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے وہ نہ تھکا، وہ یقیناً مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے؟ کیوں نہ ہو؟ وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔^(۲) (۳۳)

وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا جس دن جنم کے سامنے لائے جائیں گے (اور ان سے کہا جائے گا) کیا یہ حق نہیں ہے؟ تو جواب دیں گے کہ ہاں قسم ہے ہمارے رب کی^(۳) (حق ہے) (اللہ) فرمائے گا، اب اپنے کفر کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو۔^(۴) (۳۴)

پس (اے پیغمبر!) تم ایسا صبر کرو جیسا صبر عالی ہمت رسولوں نے کیا اور ان کے لیے (عذاب طلب کرنے میں) جلدی نہ کرو،^(۵) یہ جس دن اس عذاب کو دیکھ لیں گے جس کا وعدہ دیئے جاتے ہیں تو (یہ معلوم ہونے لگے

أُولَئِكَ يَرَوْنَ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَكَمْ يَعْيِي بِخَلْقِهِنَّ بِغَيْرِ عِلْمٍ أَنْ تُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ بَلْ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۳۱﴾

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَلَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۳۲﴾

فَأَصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَأَمْرٍ كَانَهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبِسُوا إِلَّا السَّاعَةَ مِنَ تَهْلَاكِهِمْ فَهَلْ يُهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمَ الْفَاسِقُونَ ﴿۳۳﴾

(۱) جو اسے اللہ کے عذاب سے بچالیں۔ مطلب یہ ہوا کہ نہ وہ خود اللہ کی گرفت سے بچنے پر قادر ہے نہ کسی دوسرے کی مدد سے ایسا ممکن ہے۔

(۲) راہی سے، رؤیت قلبی مراد ہے، یعنی کیا انہوں نے نہیں جانا۔ اَلَمْ يَلْمُوكُوا يَا لَأَمْ يَتَفَكَّرُوا کہ جو اللہ آسمان و زمین کو پیدا کرنے والا ہے، جن کی وسعت و بے کرائی کی انتہا نہیں ہے اور وہ ان کو بنا کر تھکا بھی نہیں۔ کیا وہ مردوں کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا؟ یقیناً کر سکتا ہے، اس لیے کہ وہ علیٰ کُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ کی صفت سے متصف ہے۔

(۳) وہاں اعتراف ہی نہیں کریں گے بلکہ اپنے اس اعتراف پر قسم کھا کر اسے مؤکد کریں گے۔ لیکن اس وقت کا یہ اعتراف بے فائدہ ہے، کیونکہ مشاہدے کے بعد اعتراف کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے؟ آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد اعتراف نہیں تو کیا انکار کریں گے؟

(۴) اس لیے کہ جب ماننے کا وقت تھا، اس وقت مانا نہیں، یہ عذاب اسی کفر اور انکار کا بدلہ ہے، جو اب تمہیں بھگتنا ہی بھگتنا ہے۔

(۵) یہ کفار کہہ کر روئے کے مقابلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے اور صبر کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔

گا کہ دن کی ایک گھڑی ہی (دنیا میں) ٹھہرے^(۱) تھے، یہ ہے پیغام پہنچا^(۲) دینا، پس بدکاروں کے سوا کوئی ہلاک نہ کیا جائے گا۔ (۳۵)

سورہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مدنی ہے اور اس میں اڑتیس آیتیں اور چار رکوع ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا^(۳) اللہ نے ان کے اعمال برباد کر دیئے۔^(۵)

۱) الَّذِينَ كَفَرُوا وَاصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ أَصْلَ أَعْمَالِهِمْ

اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور اس پر بھی ایمان لائے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اتاری گئی^(۴) ہے اور دراصل ان کے رب کی طرف سے سچا (دین) بھی وہی

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَيْنَا مِنْ حَقِّبِ

وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ كَفَرَتْ عَنْهُمْ سَبِيلَاتِهِمْ وَاصَلُّوا بِاللَّهِ

(۱) قیمت کا ہولناک عذاب دیکھنے کے بعد انہیں دنیا کی زندگی ایسے ہی معلوم ہوگی جیسے دن کی صرف ایک گھڑی یہاں گزار کر گئے ہیں۔

(۲) یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ آئی: هَذَا الَّذِي وَعَظَمْتُمْ بِهِ بَلَاغٌ يَهُ وَهُ نَصِيحَةٌ يَأْتِيهَا تِيرَا كَامٌ هُوَ۔

(۳) اس آیت میں بھی اہل ایمان کے لیے خوش خبری اور حوصلہ افزائی ہے کہ ہلاکت اخروی صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو اللہ کے نافرمان اور اس کی حدود پامال کرنے والے ہیں۔

☆ تفسیر سورہ محمد ﷺ اس کا دوسرا نام القتال بھی ہے۔

(۴) بعض نے اس سے مراد کفار قریش اور بعض نے اہل کتاب لیے ہیں۔ لیکن یہ عام ہے ان کے ساتھ سارے ہی کفار اس میں داخل ہیں۔

(۵) اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو سازشیں کیں، اللہ نے انہیں ناکام بنا دیا اور انہی پر ان کو الٹ دیا۔ دوسرا مطلب ہے کہ ان میں جو بعض مکارم اخلاق پائے جاتے تھے، مثلاً صلہ رحمی، قیدیوں کو آزاد کرنا، ممان نوازی وغیرہ یا خانہ کعبہ اور حجاج کی خدمت۔ ان کا کوئی صلہ انہیں آخرت میں نہیں ملے گا۔ کیونکہ ایمان کے بغیر اعمال پر اجر و ثواب مرتب نہیں ہوگا۔

(۶) ایمان میں اگرچہ وحی محمدی یعنی قرآن پاک پر ایمان لانا بھی شامل ہے لیکن اس کی اہمیت اور شرف کو مزید واضح اور

ہے، اللہ نے ان کے گناہ دور کر دیئے^(۱) اور ان کے حل کی اصلاح کر دی۔^(۲)

یہ اس لیے^(۳) کہ کافروں نے باطل کی پیروی کی اور مومنوں نے اس دین حق کی اتباع کی جو ان کے اللہ کی طرف سے ہے، اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے احوال اسی طرح بتاتا ہے۔^(۴)

تو جب کافروں سے تمہاری مذہبیز ہو تو گردنوں پر وار مارو۔^(۵) جب ان کو اچھی طرح کچل ڈالو تو اب خوب مضبوط قیدوبند سے گرفتار کرو^(۶) (پھر اختیار ہے) کہ خواہ

ذٰلِكَ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَتُوْا بِالْبَاطِلِ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
اَلْبَعُوْا الْعُقُبٰى مِنْ رِّدْمِكُمْ كَذٰلِكَ يَصُوْبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمَنًا لِّعَمَلِهِمْ ۝

وَإِذْ اَلْقَيْنَا لُحْمًا مُّذَقًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاصْصَبْ الرِّقَابَ سَلٰمًا لِّاِذْ اَنْتُمْ تَمْتُمُوْنَهُمْ
فَنُشِقُّوْا الرِّقَابَ وَفَاَمَّا مَنَّا فَبِعَدُوْرَاتِنَا وَاَنْتُمْ حٰثِيْنَ قَعَمِ الْعُرُوْبِ

نمایاں کرنے کے لیے اس کا علیحدہ بھی ذکر فرمایا۔

(۱) یعنی ایمان لانے سے قبل کی غلطیاں اور کوتاہیاں معاف فرمادیں۔ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی فرمان ہے کہ ”اسلام ما قبل کے سارے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔“ (صحیح الجامع الصغیر لألبانی)

(۲) بِاللّٰهُمَّ: کے معنی اَمْرُهُمْ، شَأْنُهُمْ، حَالُهُمْ، یہ سب متقارب المعنی ہیں۔ مطلب ہے کہ انہیں معاصی سے بچا کر رشد و خیر کی راہ پر لگادیا، ایک مومن کے لیے اصلاح حال کی یہی سب سے بہتر صورت ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ مال و دولت کے ذریعے سے ان کی حالت درست کر دی۔ کیونکہ ہر مومن کو مال ملتا بھی نہیں، علاوہ ازیں محض دنیوی مال اصلاح احوال کا یقینی ذریعہ بھی نہیں، بلکہ اس سے فساد احوال کا زیادہ امکان ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت مال کو پسند نہیں فرمایا۔

(۳) ذٰلِكَ: یہ مبتدا ہے، یا خبر ہے مبتدا محذوف کی آئی: اَلَا مَرُّ ذٰلِكَ یہ اشارہ ہے ان وعیدوں اور وعدوں کی طرف جو کافروں اور مومنوں کے لیے بیان ہوئے۔

(۴) تاکہ لوگ اس انجام سے بچیں جو کافروں کا مقدر ہے اور وہ راہ حق اپنائیں جس پر چل کر ایمان والے فوز و فلاح ابدی سے ہمکنار ہوں گے۔

(۵) جب دونوں فریقوں کا ذکر کر دیا تو اب کافروں اور غیر معاہد اہل کتاب سے جہاد کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ قتل کرنے کے بجائے۔ گردنیں مارنے کا حکم دیا کہ اس تعبیر میں کفار کے ساتھ غلظت و شدت کا زیادہ اظہار ہے۔ (فتح القدر)

(۶) یعنی زور دار معرکہ آرائی اور زیادہ سے زیادہ ان کو قتل کرنے کے بعد، ان کے جو آدمی قابو میں آجائیں، انہیں قیدی بنا لو اور مضبوطی سے انہیں جکڑ کر رکھو تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں۔

احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ^(۱) لے کر تا وقتیکہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔^(۲) یہی حکم ہے^(۳) اور اگر اللہ چاہتا تو (خود ہی ان سے بدلہ لے لیتا،^(۴) لیکن (اس کا نشانہ ہے) کہ تم میں سے ایک کا امتحان دوسرے کے ذریعہ سے لے لے،^(۵) جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید کر دیے جاتے ہیں اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہ کرے گا۔^(۶) انہیں راہ دکھائے گا اور ان کے حالات کی اصلاح کر دے گا۔^(۷)

اور انہیں اس جنت میں لے جائے گا جس سے انہیں شناسا کر دیا ہے۔^(۸) (۶)

أَوَدَّاهَا ذَٰلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَاسْتَعْمَرْتُمْ وَلَسِن لَيْبَلُوا بَعْضَكُمْ بَعْضٌ وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَن يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ ۝

سَيَهْدِيهِمْ وَيُضِلُّهُم بِاللَّهُ ۝

وَيَذَلُّهُمْ إِلَهَةً عَزَّوَجَلَّ اللَّهُ ۝

(۱) مَنْ كَامِلٌ ہے بغیر فدیہ لیے بطور احسان چھوڑنا اور فداء کا مطلب، کچھ معاوضہ لے کر چھوڑنا ہے۔ قیدیوں کے بارے میں اختیار دے دیا گیا جو صورت، حالات کے اعتبار سے اسلام اور مسلمانوں کے حق میں زیادہ بہتر ہو وہ اختیار کر لی جائے۔
(۲) یعنی کافروں کے ساتھ جنگ ختم ہو جائے، یا مراد ہے کہ محارب دشمن شکست کھا کر یا صلح کر کے ہتھیار رکھ دے یا اسلام غالب آجائے اور کفر کا خاتمہ ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک یہ صورت حال نہ ہو جائے، کافروں کے ساتھ تمہاری معرکہ آرائی جاری رہے گی جس میں تم انہیں قتل بھی کرو گے قیدیوں میں تمہیں مذکورہ دونوں باتوں کا اختیار ہے۔ بعض کہتے ہیں، یہ آیت منسوخ ہے اور سوائے قتل کے کوئی صورت باقی نہیں ہے۔ لیکن صحیح بات یہی ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں محکم ہے۔ اور امام وقت کو چاروں باتوں کا اختیار ہے، کافروں کو قتل کرے یا قیدی بنائے۔ قیدیوں میں سے جس کو یا سب کو چاہے بطور احسان چھوڑ دے یا معاوضہ لے کر چھوڑ دے۔ (فتح القدیر)

(۳) یا تم اسی طرح کرو، اَنْعَلُوا ذَٰلِكَ يَا ذَٰلِكَ حُنْمُ الْكُفَّارِ

(۴) مطلب کافروں کو ہلاک کر کے یا انہیں عذاب میں مبتلا کر کے۔ یعنی تمہیں ان سے لڑنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔
(۵) یعنی تمہیں ایک دوسرے کے ذریعے سے آزمائے تاکہ وہ جان لے کہ تم میں سے اس کی راہ میں لڑنے والے کون ہیں؟ تاکہ ان کو اجر و ثواب دے اور ان کے ہاتھوں سے کافروں کو ذلت و شکست سے دوچار کرے۔
(۶) یعنی ان کا اجر و ثواب ضائع نہیں فرمائے گا۔

(۷) یعنی انہیں ایسے کاموں کی توفیق دے گا جن سے ان کے لیے جنت کا راستہ آسان ہو جائے گا۔

(۸) یعنی جسے وہ بغیر ہمنامی کے پہچان لیں گے اور جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو از خود ہی اپنے اپنے گھروں میں جا داخل ہوں گے۔ اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”قسم ہے اس

اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا^(۱) اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔^(۲) (۷)

اور جو لوگ کافر ہوئے انہیں ہلاکی ہو اللہ ان کے اعمال غارت کر دے گا۔ (۸)

یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی نازل کردہ چیز سے ناخوش ہوئے،^(۳) پس اللہ تعالیٰ نے (بھی) ان کے اعمال ضائع کر دیئے۔^(۴) (۹)

کیا ان لوگوں نے زمین میں چل پھر کر اس کامعینہ نہیں کیا کہ ان سے پہلے کے لوگوں کا نتیجہ کیا ہوا؟^(۵) اللہ نے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن سَخَّرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُذِيقْ أَقْدَامَكُمْ ۝

وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعَسَا لَهُمْ وَأَصْلُ أَعْمَالِهِمْ ۝

ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ ۝

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ

ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ایک جنتی کو اپنے جنت والے گھر کے راستوں کا اس سے کہیں زیادہ علم ہوگا، جتنا دنیا میں اسے اپنے گھر کا تھا۔“ (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصاص يوم القيامة)

(۱) اللہ کی مدد کرنے سے مطلب، اللہ کے دین کی مدد ہے۔ کیونکہ وہ اسباب کے مطابق اپنے دین کی مدد اپنے مومن بندوں کے ذریعے سے ہی کرتا ہے۔ یہ مومن بندے اللہ کے دین کی حفاظت اور اس کی تبلیغ و دعوت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرماتا ہے یعنی انہیں کافروں پر فتح و غلبہ عطا کرتا ہے۔ جیسے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی روشن تاریخ ہے، وہ دین کے ہو گئے تھے تو اللہ بھی ان کا ہو گیا تھا، انہوں نے دین کو غالب کیا تو اللہ نے انہیں بھی دنیا پر غالب فرما دیا۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَبْغُوا﴾ (الحج، ۴۰) اللہ اس کی ضرور مدد فرماتا ہے جو اس کی مدد کرتا ہے۔“

(۲) یہ لڑائی کے وقت تَبَيَّنَتْ أَقْدَامٍ یہ عبارت ہے موطن حرب میں فہرو معونت سے۔ بعض کہتے ہیں اسلام، یا پل صراط پر ثابت قدم رکھے گا۔

(۳) یعنی قرآن اور ایمان کو انہوں نے ناپسند کیا۔

(۴) اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جو صورتہ اعمال خیر ہیں لیکن عدم ایمان کی وجہ سے اللہ کے ہاں ان پر اجر و ثواب نہیں ملے گا۔

(۵) جن کے بہت سے آثار ان کے علاقوں میں موجود ہیں۔ نزول قرآن کے وقت بعض تباہ شدہ قوموں کے کھنڈرات اور آثار موجود تھے، اس لیے انہیں چل پھر کر ان کے عبرت ناک انجام دیکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی کہ شاید ان کو دیکھ کر ہی یہ ایمان لے آئیں۔

انہیں ہلاک کر دیا اور کافروں کے لیے اسی طرح کی سزائیں ہیں۔^(۱۰)

وہ اس لیے کہ ایمان والوں کا کارساز خود اللہ تعالیٰ ہے اور اس لیے کہ کافروں کا کوئی کارساز نہیں۔^(۱۱)

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے انہیں اللہ تعالیٰ یقیناً ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور جو لوگ کافر ہوئے وہ (دنیا ہی کا) فائدہ اٹھا رہے ہیں اور مثل چوپایوں کے کھا رہے ہیں،^(۱۲) ان کا (اصل) ٹھکانا جہنم ہے۔^(۱۳) ہم نے کتنی بستیوں کو جو طاقت میں تیری اس بستی سے زیادہ تھیں جس سے تجھے نکالا ہم نے انہیں ہلاک کر دیا ہے، جن کا مددگار کوئی نہ اٹھا۔^(۱۴)

کیا ”پس وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل پر ہو اس شخص جیسا ہو سکتا ہے؟ جس کے لیے اس کا برا

مِنْ جَبَلِهِمْ دَمَرَا اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلِلْكَافِرِينَ أَمْتًا لَهَا ۝۱۰

ذَلِكَ يَلَقُ اللَّهُ سَوَى الَّذِينَ آمَنُوا وَإِنَّ الْكافِرِينَ لَأَمْوَالٌ لَهُمْ ۝۱۱

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ سَوَى لَهُمْ ۝۱۲

وَالَّذِينَ مِنْ قَوْمِكَانَ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ يَوْمَئِذٍ حَافِظُونَ ۝۱۳

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ يَتِيمَةٍ يُؤْتِيهِمْ مِنْ رِزْقِهِ لَمْ يَكُنْ لَهُ سَوْءَ عَمَلٍ

(۱) یہ اہل مکہ کو ڈرایا جا رہا ہے کہ تم کفر سے باز نہ آئے تو تمہارے لیے بھی ایسی ہی سزا ہو سکتی ہے؟ اور گزشتہ کافر قوموں کی ہلاکت کی طرح، تمہیں بھی ہلاکت سے دوچار کیا جا سکتا ہے۔

(۲) چنانچہ جنگ احد میں کافروں کے نعروں کے جواب میں مسلمانوں نے جو نعرے بلند کیے۔ مثلاً اَعْلُوْهُ هُبْلُ، اَعْلُوْهُ هُبْلُ (صلبت کا نام بلند ہو) کے جواب میں اللہ اَعْلَىٰ وَاَجَلُ، کافروں کے انہی نعروں میں سے ایک نعرے لَنَا الْعُرَىٰ وَلَا عُرَىٰ لَكُمْ کے جواب میں مسلمانوں کا نعرہ تھا اللہ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلَانَا لَكُمْ (صحیح بخاری، غزوة احد) ”اللہ ہمارا مددگار ہے، تمہارا کوئی مددگار نہیں۔“

(۳) یعنی جس طرح جانوروں کو پیٹ اور جنس کے تقاضے پورے کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ یہی حال کافروں کا ہے، ان کا مقصد زندگی بھی کھانے پینے کے علاوہ کچھ نہیں، آخرت سے وہ بالکل غافل ہیں۔ اس سے ضمناً کھڑے کھڑے کھانے کی ممانعت کا بھی اثبات ہوتا ہے، جس کا آج کل دعوتوں میں عام رواج ہے کیوں کہ اس میں بھی جانوروں سے مشابہت ہے جسے کافروں کا شیوہ بتلایا گیا ہے۔ احادیث میں کھڑے پانی پینے سے نہایت سختی سے منع کیا گیا ہے، جس سے کھڑے کھانے کی ممانعت بطریق اولیٰ ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے جانوروں کی طرح کھڑے ہو کر کھانے سے اجتناب کرنا نہایت ضروری ہے۔ دیکھئے زاد المعاد۔

وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ⑩

کام مزین کر دیا گیا ہو اور وہ اپنی نفسانی خواہشوں کا پیرو ہو؟^(۱) (۱۳)

اس جنت کی صفت جس کا پرہیز گاروں سے وعدہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس میں پانی کی نہریں ہیں جو بدبو کرنے والا نہیں،^(۲) اور دودھ کی نہریں ہیں جن کا مزہ نہیں بدلا،^(۳) اور شراب کی نہریں ہیں جن میں پینے والوں کے لئے بڑی لذت ہے^(۴) اور نہریں ہیں شہد کی جو بہت صاف ہیں^(۵) اور ان کے لیے وہاں ہر قسم کے میوے ہیں اور

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ فِيهَا أَنْهَارٌ مِنْ نَآءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِنْ لَبَنٍ بُيُوتٌ عَلَيْهِمْ وَأَنْهَارٌ مِنْ خَمْرٍ لَذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِنْ عَسَلٍ مُصَفًّى وَلَهُمْ فِيهَا مِنْ جُلُجِ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفُورَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاهُمْ ⑩

(۱) برے کام سے مراد، شرک و معصیت ہیں، مطلب وہی ہے جو پہلے بھی متعدد جگہ گزر چکا ہے کہ مومن و کافر، مشرک و موحد اور نیکو کار و بدکار برابر نہیں ہو سکتے۔ ایک کے لیے اللہ کے ہاں اجر و ثواب اور جنت کی نعمتیں ہیں، جب کہ دوسرے کے لیے جہنم کا ہولناک عذاب۔ اگلی آیت میں دونوں کا انجام بیان کیا جا رہا ہے۔ پہلے اس جنت کی خوبیاں اور محاسن، جس کا وعدہ متقین سے ہے۔

(۲) آسین کے معنی، متغیر یعنی بدل جانے والا، غیر آسن نہ بدلنے والا۔ یعنی دنیا میں تو پانی کسی ایک جگہ کچھ دیر پڑا رہے تو اس کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے اور اس کی بو اور ذائقے میں تبدیلی آ جاتی ہے جس سے وہ مضر صحت ہو جاتا ہے۔ جنت کے پانی کی یہ خوبی ہو گی کہ اس میں کوئی تغیر نہیں ہو گا۔ یعنی اس کی بو اور ذائقے میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ جب پیو، تازہ، مضر اور صحت افزا جب دنیا کا پانی خراب ہو سکتا ہے تو شریعت نے اسی لیے پانی کی بابت کہا ہے کہ یہ پانی اس وقت تک پاک ہے، جب تک اس کا رنگ یا بو نہ بدلے، کیونکہ رنگ یا بو متغیر ہونے کی صورت میں پانی ناپاک ہو جائے گا۔

(۳) جس طرح دنیا میں وہ دودھ بعض دفعہ خراب ہو جاتا ہے جو گایوں، بھینسوں اور بکریوں وغیرہ کے تھنوں سے نکلتا ہے۔ جنت کا دودھ چونکہ اس طرح جانوروں کے تھنوں سے نہیں نکلے گا، بلکہ اس کی نہریں ہوں گی، اس لیے، جس طرح وہ نہایت لذیذ ہو گا، خراب ہونے سے بھی محفوظ ہو گا۔

(۴) دنیا میں جو شراب ملتی ہے، وہ عام طور پر نہایت تلخ، بد مزہ اور بدبو دار ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اسے پی کر انسان بالعموم حواس باختہ ہو جاتا ہے، اول فول بکتا ہے اور اپنے جسم تک کا ہوش اسے نہیں رہتا۔ جنت کی شراب دیکھنے میں حسین، ذائقے میں اعلیٰ اور نہایت خوشبودار ہو گی اور اسے پی کر کوئی انسان نیسکے گا، نہ کوئی گرائی محسوس کرے گا۔ بلکہ ایسی لذت و فرحت محسوس کرے گا جس کا تصور اس دنیا میں ممکن نہیں جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿لَا يَجْعَلُونَ إِلَّا جَنَّتًا وَلَا يُهَيَّجُونَ﴾ (سورة الصافات ۴۷) ”نہ اس سے چکر آئے گا نہ عقل جائے گی“۔ مزید دیکھئے (سورة الواقعة ۱۹)۔

(۵) یعنی شہد میں بالعموم جن چیزوں کی آمیزش کا امکان رہتا ہے، جس کا مشاہدہ دنیا میں عام ہے جنت میں ایسا کوئی اندیشہ

ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے، کیا یہ مثل اس کے ہیں جو ہمیشہ آگ میں رہنے والا ہے؟ اور جنہیں گرم کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتوں کو نکلنے کے لئے کر دے گا۔^(۱) (۱۵)

اور ان میں بعض (ایسے بھی ہیں کہ) تیری طرف کان لگاتے ہیں، یہاں تک کہ جب تیرے پاس سے جاتے ہیں تو اہل علم سے (بوجہ کند ذہنی ولا پر واپسی کے) پوچھتے ہیں کہ اس نے ابھی کیا کہا تھا؟^(۲) یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر کر دی ہے اور وہ اپنی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں۔ (۱۶)

اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں اللہ نے انہیں ہدایت میں اور بڑھا دیا ہے اور انہیں ان کی پرہیزگاری عطا فرمائی ہے۔^(۳) (۱۷)

وَمَنْ مِّنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ إِلَيْكَ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِندِنَا قَالَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَعِبُوا
لِلَّذِينَ أَذْنُوا أَلْعَلَّ مَاذَا قَالَ لِنَفْسِهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَعِبُوا
اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ۝

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادْنَا هُدًىٰ وَآتَيْنَاهُمْ تَقْوَاهُمْ ۝

نہیں ہو گا۔ بالکل صاف شفاف ہو گا، کیونکہ یہ دنیا کی طرح مکھیوں سے حاصل کردہ نہیں ہو گا، بلکہ اس کی بھی نہریں ہوں گی۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جب بھی تم سوال کرو تو جنت الفردوس کی دعا کرو“ اس لیے کہ وہ جنت کا درمیانہ اور اعلیٰ درجہ ہے اور وہیں سے جنت کی نہریں پھونتی ہیں اور اس کے اوپر رحمان کا عرش ہے (صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب درجات المجاہدین فی سبیل اللہ)

(۱) یعنی جن کو جنت میں وہ اعلیٰ درجے نصیب ہوں گے جو مذکور ہوئے، کیا وہ ایسے جنہمیوں کے برابر ہیں جن کا یہ حال ہو گا؟ ظاہر بات ہے ایسا نہیں ہو گا۔ بلکہ ایک درجات میں ہو گا اور دوسرا درکات (جہنم) میں۔ ایک نعمتوں میں داد طرب و عیش دے رہا ہو گا، دوسرا عذاب جہنم کی سختیاں جھیل رہا ہو گا۔ ایک اللہ کا مہمان ہو گا جہاں انواع و اقسام کی چیزیں اس کی تواضع اور اکرام کے لیے ہوں گی اور دوسرا اللہ کا قیدی، جہاں اس کو کھانے کے لیے زقوم جیسا تلخ و کسلا کھانا اور پینے کے لیے کھولتا ہوا پانی ملے گا۔ ☆ میں تفاوت رہ از کجاست تابہ کجا۔

(۲) یہ منافقین کا ذکر ہے، ان کی نیت چونکہ صحیح نہیں ہوتی تھی، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں وہ مجلس سے باہر آکر صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا؟

(۳) یعنی جن کی نیت ہدایت حاصل کرنے کی ہوتی ہے تو اللہ ان کو ہدایت کی توفیق بھی دے دیتا ہے اور ان کو اس پر ثابت قدمی بھی عطا فرماتا ہے۔

تو کیا یہ قیامت کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ ان کے پاس اچانک آجائے یقیناً اس کی علامتیں تو آچکی ہیں،^(۱) پھر جبکہ ان کے پاس قیامت آجائے انہیں نصیحت کرنا کہاں ہوگا؟^(۲) (۱۸)

سو (اے نبی!) آپ یقین کر لیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں^(۳) اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگا کریں اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے حق میں بھی،^(۴) اللہ تم لوگوں کی آمدورفت کی اور رہنے سہنے کی جگہ کو خوب جانتا ہے۔^(۵) (۱۹)

فَمَنْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۖ فَتَذَاجَأَ ۖ أَشْرَاطُهَا ۚ فَإِنِّي لَهُمْ إِذَا جَاءَتْهُمْ ذُكَّرْتَهُمْ ۝

فَاعْلَمُوا أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ۚ وَاسْتَغْفِرُوا لِذَنبِكُمْ وَلِمَنْ يُؤْمِنُونَ ۚ وَالْمُؤْمِنَاتُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوَاكُمْ ۝

(۱) یعنی نبی ﷺ کی بعثت بجائے خود قرب قیامت کی ایک علامت ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے بھی فرمایا بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ (صحیح بخاری تفسیر سورة الساعات) ”میری بعثت اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ہے۔“ آپ ﷺ نے اشارہ کر کے واضح فرمایا کہ جس طرح یہ دونوں انگلیاں باہم ملی ہوئی ہیں، اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان فاصلہ نہیں ہے یا یہ کہ جس طرح ایک انگلی دوسری انگلی سے ذرا سا آگے ہے اسی طرح قیامت میرے ذرا سا بعد ہے۔

(۲) یعنی جب قیامت اچانک آجائے گی تو کافر کس طرح نصیحت حاصل کر سکیں گے؟ مطلب ہے اس وقت اگر وہ توبہ کریں گے بھی تو وہ مقبول نہیں ہوگی۔ اس لیے اگر توبہ کرنی ہے تو یہی وقت ہے۔ ورنہ وہ وقت بھی آسکتا ہے کہ ان کی توبہ بھی غیر مفید ہوگی۔

(۳) یعنی اس عقیدے پر ثابت اور قائم رہیں، کیونکہ یہی توحید اور اطاعت الہی، مدار خیر ہے اور اس سے انحراف یعنی شرک اور معصیت، مدار شر ہے۔

(۴) اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کا حکم دیا گیا ہے، اپنے لیے بھی اور مومنین کے لیے بھی۔ استغفار کی بڑی اہمیت اور فضیلت ہے۔ احادیث میں بھی اس پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا يَا أَيُّهَا النَّاسُ! تَوُوبُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ فَإِنِّي أَسْتَغْفِرُ اللَّهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً (صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب استغفار النسی فی الیوم واللیلۃ) ”لوگو! بارگاہ الہی میں توبہ و استغفار کیا کرو، میں بھی اللہ کے حضور روزانہ ستر مرتبہ سے زیادہ توبہ و استغفار کرتا ہوں۔“

(۵) یعنی دن کو تم جہاں پھرتے اور جو کچھ کرتے ہو اور رات کو جہاں آرام کرتے اور استقرار پکڑتے ہو، اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ مطلب ہے شب و روز کی کوئی سرگرمی اللہ سے مخفی نہیں ہے۔

اور جو لوگ ایمان لائے وہ کہتے ہیں کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی گئی؟^(۱) پھر جب کوئی صاف مطلب والی سورت^(۲) نازل کی جاتی ہے اور اس میں قتال کا ذکر کیا جاتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھتے ہیں جیسے اس شخص کی نظر ہوتی ہے جس پر موت کی بیوشی طاری ہو،^(۳) پس بہت بہتر تھا ان کے لیے۔ (۲۰)

فرمان کا بجا لانا اور اچھی بات کا کہنا۔^(۴) پھر جب کام مقرر ہو جائے،^(۵) تو اگر اللہ کے ساتھ سچے رہیں تو ان کے لیے بہتری ہے۔^(۶) (۲۱)

اور تم سے یہ بھی بعید نہیں کہ اگر تم کو حکومت مل جائے

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ فَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأُولَئِكَ لَهُمْ

طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ فَإِذَا عَزَمْتَ الْأَمْرَ فَلَكَ صِدْقٌ إِنَّ اللَّهَ لَكَانَ خَبِيرًا ۝

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتَقَطَعُوا

(۱) جب جہاد کا حکم نازل نہیں ہوا تھا تو مومنین، جو جذبہ جہاد سے سرشار تھے جہاد کی اجازت کے خواہش مند تھے اور کہتے تھے کہ اس بارے میں کوئی سورت نازل کیوں نہیں کی جاتی؟ یعنی جس میں جہاد کا حکم ہو۔

(۲) یعنی ایسی سورت جو غیر منسوخ ہو۔

(۳) یہ ان منافقین کا ذکر ہے جن پر جہاد کا حکم نہایت گراں گزرتا تھا ان میں بعض کمزور ایمان والے بھی بعض دفعہ شامل ہو جاتے تھے۔ سورہ نساء، آیت ۷۷ میں بھی یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔

(۴) یعنی حکم جہاد سے گھبرانے کے بجائے ان کے لیے بہتر تھا کہ وہ سمع و طاعت کا مظاہرہ کرتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات، گستاخی کے بجائے، اچھی بات کہتے۔ یہ اُولَئِكَ، بمعنی اَجْدَدُ (بہتر) ہے، جسے ابن کثیر نے اختیار کیا ہے۔ بعض نے اولیٰ کو تہدید و وعید کا کلمہ یعنی بدعا قرار دیا ہے۔ مَعْنَاهُ قَارِبَةٌ مَا يُبْلِكُهُ (ان کی ہلاکت قریب ہے) مطلب ہے، ان کی بزدلی اور نفاق ان کی ہلاکت کا سبب بنے گا۔ اس اعتبار سے طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ جملہ مستانہ ہو گا اور اس کی خبر محذوف ہوگی خَيْرٌ لَّكُمْ (فتح القدير، ايسر التفاسير)

(۵) یعنی جہاد کی تیاری مکمل ہو جائے اور وقت جہاد آجائے۔

(۶) یعنی اگر اب بھی نفاق چھوڑ کر، اپنی نیت اللہ کے لیے خالص کر لیں، یا رسول کے سامنے رسول ﷺ کے ساتھ لڑنے کا جو عہد کرتے ہیں، اس میں اللہ سے سچے رہیں۔

(۷) یعنی نفاق اور مخالفت کے مقابلے میں توبہ و اخلاص کا مظاہرہ بہتر ہے۔

تو تم زمین میں فساد برپا کر دو^(۱) اور رشتے ناتے توڑ ڈالو۔ (۲۲)

یہ وہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی پھٹکار ہے اور جن کی سماعت اور آنکھوں کی روشنی چھین لی ہے۔ (۲۳)^(۲)
کیا یہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ یا ان کے دلوں پر ان کے تالے لگ گئے ہیں۔ (۲۴)^(۳)

جو لوگ اپنی پیٹھ کے بل اٹلے پھر گئے اس کے بعد کہ ان کے لیے ہدایت واضح^(۴) ہو چکی یقیناً شیطان نے ان کے لیے (ان کے فعل کو) مزین کر دیا ہے اور انہیں ڈھیل دے رکھی ہے۔ (۲۵)^(۵)

یہ^(۶) اس لیے کہ انہوں نے ان لوگوں سے جنہوں نے اللہ کی نازل کردہ وحی کو برا سمجھا یہ کہا^(۷) کہ ہم بھی

أَحْسَبُكُمْ ۷۷

أُولَئِكَ الَّذِينَ كَعْتَهُمُ اللَّهُ فَاصْبِرْ لَهُمْ رِجْأَهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ۷۷

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ كُلُّبٍ أَفْقَالُهَا ۷۷

إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمِّنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّ لَهُمُ الْهُدَىٰ
الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمَلَىٰ لَهُمْ ۷۷

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَلَّذِينَ كُرِهُوا مَا كَانَ اللَّهُ سُبُطِيعَتُمْ فِي بَعْضِ

(۱) ایک دوسرے کو قتل کر کے۔ یعنی اختیار و اقتدار کا غلط استعمال کرو۔ امام ابن کثیر نے تَوَلَّيْتُمْ کا ترجمہ کیا ہے ”تم جہاد سے پھر جاؤ اور اس سے اعراض کرو“ یعنی تم پھر زمانہ جاہلیت کی طرف لوٹ جاؤ اور باہم خون ریزی اور قطع رحمی کرو۔ اس میں فساد فی الارض کی عموماً اور قطع رحمی کی خصوصاً ممانعت اور اصلاح فی الارض اور صلہ رحمی کی تاکید ہے، جس کا مطلب ہے کہ رشتے داروں کے ساتھ زبان سے، عمل سے اور بذل اموال کے ذریعے سے اچھا سلوک کرو۔ احادیث میں بھی اس کی بڑی تاکید اور فضیلت آئی ہے۔ (ابن کثیر)

(۲) یعنی ایسے لوگوں کے کانوں کو اللہ نے (حق کے سننے سے) بہرہ اور آنکھوں کو (حق کے دیکھنے سے) اندھا کر دیا ہے۔ یہ نتیجہ ہے ان کے مذکورہ اعمال میں سے۔

(۳) جس کی وجہ سے قرآن کے معانی و مفاہیم ان کے دلوں کے اندر نہیں جاتے۔

(۴) اس سے مراد منافقین ہی ہیں جنہوں نے جہاد سے گریز کر کے اپنے کفر و ارتداد کو ظاہر کر دیا۔

(۵) اس کا فاعل بھی شیطان ہے۔ یعنی مَدَّ لَهُمْ فِي الْأَمَلِ وَوَعَدَهُمْ طُولَ الْعُمُرِ یعنی لمبی آرزوؤں اور اس دھوکے میں مبتلا کر دیا کہ ابھی تو تمہاری بڑی عمر ہے، کیوں لڑائی میں اپنی جان گناتے ہو؟ یا فاعل اللہ ہے، اللہ نے انہیں ڈھیل دی۔ یعنی فوراً ان کا مؤاخذہ نہیں فرمایا۔

(۶) ”یہ“ سے مراد ان کا ارتداد ہے۔

(۷) یعنی منافقین نے مشرکین سے یا یہود سے کہا۔

الْأَمْوَالِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ أَسْرَارَهُمْ ۝

عنقریب بعض کاموں^(۱) میں تمہارا کما مائیں گے، اور اللہ ان کی پوشیدہ باتیں خوب جانتا ہے۔^(۲) (۲۶)

پس ان کی کیسی (درگت) ہوگی جبکہ فرشتے ان کی روح قبض کرتے ہوئے ان کے چہروں اور ان کی سریشوں پر ماریں گے۔^(۳) (۲۷)

یہ اس بنا پر کہ یہ وہ راہ چلے جس سے انہوں نے اللہ کو ناراض کر دیا اور انہوں نے اس کی رضامندی کو برا جانا، تو اللہ نے ان کے اعمال اکارت کر دیئے۔ (۲۸)

کیا ان لوگوں نے جن کے دلوں میں بیماری ہے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اللہ ان کے کیوں کو ظاہر ہی نہ کرے گا۔^(۴) (۲۹)

اور اگر ہم چاہتے تو ان سب کو تجھے دکھا دیتے پس تو انہیں ان کے چہرے سے ہی پہچان لیتا،^(۵) اور یقیناً تو انہیں ان کی بات کے ڈھب سے پہچان لے گا،^(۶)

فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَكُفْرَهُمْ ۝

ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ اتَّبَعُوا مَا آسَخَّ اللَّهُ وَكُفُّوا رِضْوَانَهُ فَآخَظَ أَعْمَالَهُمْ ۝

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ أَنْ لَنْ يُخْرِجَهُ اللَّهُ أَصْفَانَهُمْ ۝

لَوْ نَشَاءُ لَكُرَيْنَاكُمْ فَلَغَرْنَا نُهُمْ وَيَسِينُهُمْ وَكَلَمْنَا فِيهِمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ أَعْمَالَكُمْ ۝

(۱) یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی مخالفت میں۔

(۲) جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا بَيِّنْتُونَ ﴾ (النساء: ۸۱)

(۳) یہ کافروں کی اس وقت کی کیفیت بیان کی گئی ہے جب فرشتے ان کی روحمیں قبض کرتے ہیں۔ روحمیں فرشتوں سے بچنے کے لیے جسم کے اندر چھپتی اور ادھر ادھر بھاگتی ہیں تو فرشتے سختی اور زور سے انہیں پکڑتے، کھینچتے اور مارتے ہیں۔ یہ مضمون اس سے قبل سورۃ انعام، ۹۳ اور سورۃ انفال، ۵۰ میں بھی گزر چکا ہے۔

(۴) أَصْفَانًا، صِغْفَنَ کی جمع ہے، جس کے معنی حسد، کینہ اور بغض کے ہیں۔ منافقین کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بغض و عناد تھا، اس کے حوالے سے کہا جا رہا ہے کہ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہے؟

(۵) یعنی ایک ایک شخص کی اس طرح نشان دہی کر دیتے کہ ہر منافق کو عیانا پہچان لیا جاتا۔ لیکن تمام منافقین کے لیے اللہ نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ یہ اللہ کی صفت ستاری کے خلاف ہے، وہ بالعموم پردہ پوشی فرماتا ہے، پردہ دری نہیں۔ دوسرا اس نے انسانوں کو ظاہر پر فیصلہ کرنے کا اور باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد کرنے کا حکم دیا ہے۔

(۶) البتہ ان کا لہجہ اور انداز گفتگو ہی ایسا ہوتا ہے جو ان کے باطن کا غماز ہوتا ہے، جس سے اسے بیغیر تو ان کو یقیناً پہچان سکتا ہے۔ یہ عام مشاہدے میں آنے والی بات ہے، انسانوں کے دل میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ اسے لاکھ چھپائے لیکن انسان کی گفتگو، حرکات و سکنات اور بعض مخصوص کیفیات، اس کے دل کے راز کو آشکارا کر دیتی ہیں۔

وَلَتَبْلُوكُمْ حَتَّى تَعْلَمَ الْمُجْرِمِينَ مِنْكُمْ وَالصَّادِقِينَ
وَيَتْلُوا آخِبَارَكُمْ ①

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَشَاقُوا
الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ لَنُكَفِّرَنَّ اللَّهُ
شَيْئًا وَيَسْخِطَ أَعْمَالَهُمْ ②

يَأْتِيَهُمُ الَّذِينَ آمَنُوا وَاطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَلَا يُطِئُونَ
أَعْمَالَهُمْ ③

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ شَرًّا مَا تَلَاؤُهُمْ
كُفْرًا فَلَنُكَفِّرَنَّ اللَّهُ لَهُمْ ④

تمہارے سب کام اللہ کو معلوم ہیں۔ (۳۰)
یقیناً ہم تمہارا امتحان کریں گے تاکہ تم میں سے جماد
کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو ظاہر کر دیں اور ہم
تمہاری حالتوں کی بھی جانچ کر لیں۔ (۳۱)^(۱)
یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے لوگوں
کو روکا اور رسول کی مخالفت کی اس کے بعد کہ ان کے
لیے ہدایت ظاہر ہو چکی یہ ہرگز ہرگز اللہ کا کچھ نقصان
نہ کریں گے۔ (۲) عنقریب ان کے اعمال وہ غارت کر
دے گا۔ (۳)^(۳)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کا کما مانو
اور اپنے اعمال کو غارت نہ کرو۔ (۳۳)^(۴)
جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے اوروں کو روکا
پھر کفر کی حالت میں ہی مر گئے (یقین کر لو) کہ اللہ انہیں
ہرگز نہ بخشے گا۔ (۳۴)

(۱) اللہ تعالیٰ کے علم میں تو پہلے ہی سب کچھ ہے۔ یہاں علم سے مراد اس کا وقوع اور ظہور ہے تاکہ دوسرے بھی جان لیں اور
دیکھ لیں۔ اسی لیے امام ابن کثیر نے اس کا مفہوم بیان کیا ہے حَتَّى نَعْلَمَ وَفُوعُهُ ہم اس کے وقوع کو جان لیں۔ ابن عباس
رضی اللہ عنہما اس قسم کے الفاظ کا ترجمہ کرتے تھے لَنَرَىٰ تاکہ ہم دیکھ لیں۔ (ابن کثیر) اور یہی معنی زیادہ واضح ہے۔

(۲) بلکہ اپنا ہی بیزا غرق کریں گے۔

(۳) کیونکہ ایمان کے بغیر کسی عمل کی اللہ کے ہاں کوئی اہمیت نہیں۔ ایمان و اخلاص ہی ہر عمل خیر کو اس قابل بناتا ہے کہ
اس پر اللہ کے ہاں سے اجر ملے۔

(۴) یعنی منافقین اور مرتدین کی طرح ارتداد و نفاق اختیار کر کے اپنے عملوں کو برباد مت کرو۔ یہ گویا اسلام پر استقامت
کا حکم ہے۔ بعض نے کبار و فواحش کے ارتکاب کو بھی جب اعمال کا باعث گردانا ہے۔ اسی لیے مومنین کی صفات میں
ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ بڑے گناہ اور فواحش سے بچتے ہیں۔ (انجمن۔ ۳۲) اس اعتبار سے کبار و فواحش سے
بچنے کی اس میں تاکید ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی عمل خواہ کتنا ہی بہتر کیوں نہ معلوم ہو تاہو اگر اللہ اور
اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے دائرے سے باہر ہے تو رائیگاں اور برباد ہے۔

پس تم بودے بن کر صلح کی درخواست پر نہ اتر آؤ جبکہ تم ہی بلند و غالب رہو گے (۱) اور اللہ تمہارے ساتھ ہے، (۲) ناممکن ہے کہ وہ تمہارے اعمال ضائع کر دے۔ (۳) (۳۵) واقعی زندگی دنیا تو صرف کھیل کود ہے (۴) اور اگر تم ایمان لے آؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ تمہیں تمہارے اجر دے گا اور وہ تم سے تمہارے مال نہیں مانگتا۔ (۵) (۳۶) اگر وہ تم سے تمہارا مال مانگے اور زور دے کر مانگے تو تم اس سے بخیلی کرنے لگو گے اور وہ تمہارے کینے ظاہر کر دے گا۔ (۶) (۳۷)

فَلَا تَهْوُوا دَعْوَىٰ إِلَى السَّلْمَةِ وَأَنْتُمْ الرَّاغِبُونَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَزِيدَكُمْ أَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾

إِنَّمَا الْعَيْشُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أَجْرَكُمْ وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾

إِنْ يَسْأَلْكُمْ فَمَا يَسْأَلُكُمْ فَبِخِلُوا وَيُحِبُّوا إِسْخَاعَكُمْ ﴿۳۷﴾

(۱) مطلب یہ ہے کہ جب تم تعداد اور قوت و طاقت کے اعتبار سے دشمن پر غالب اور فائق تر ہو تو ایسی صورت میں کفار کے ساتھ صلح اور کمزوری کا مظاہرہ مت کرو، بلکہ کفر پر ایسی کاری ضرب لگاؤ کہ اللہ کا دین سربلند ہو جائے۔ غالب و برتر ہوتے ہوئے کفر کے ساتھ مصالحت کا مطلب، کفر کے اثر و نفوذ کے بڑھانے میں مدد دینا ہے۔ یہ ایک بڑا جرم ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کافروں کے ساتھ صلح کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ اجازت یقیناً ہے، لیکن ہر وقت نہیں۔ صرف اس وقت ہے جب مسلمان تعداد میں کم اور وسائل کے لحاظ سے فروتر ہوں۔ ایسے حالات میں لڑائی کی یہ نسبت صلح میں زیادہ فائدہ ہے تاکہ مسلمان اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بھرپور تیاری کر لیں، جیسے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ سے جنگ نہ کرنے کا دس سالہ معاہدہ کیا تھا۔

(۲) اس میں مسلمانوں کے لیے دشمن پر فتح و نصرت کی عظیم بشارت ہے۔ جس کے ساتھ اللہ ہو، اس کو کون شکست دے سکتا ہے؟

(۳) بلکہ وہ اس پر پورا اجر دے گا اور اس میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔

(۴) یعنی ایک فریب اور دھوکہ ہے، اس کی کسی چیز کی بنیاد ہے نہ اس کو ثبات اور نہ اس کا اعتبار۔

(۵) یعنی وہ تمہارے مالوں سے بے نیاز ہے۔ اسی لیے اس نے تم سے زکوٰۃ میں کل مال کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ اس کے ایک نہایت قلیل حصے کا یعنی صرف ڈھائی فی صد کا اور وہ بھی ایک سال کے بعد اپنی ضرورت سے زیادہ ہونے پر، علاوہ ازیں اس کا مقصد بھی تمہارے اپنے ہی بھائی بندوں کی مدد اور خیر خواہی ہے نہ کہ اللہ اس مال سے اپنی حکومت کے اخراجات پورے کرتا ہے۔

(۶) یعنی اگر ضرورت سے زائد کل مال کا مطالبہ کرے اور وہ بھی اصرار کے ساتھ اور زور دے کر تو یہ انسانی فطرت ہے کہ تم

خبردار! تم وہ لوگ ہو کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے بلائے جاتے ہو،^(۱) تو تم میں سے بعض بخیلی کرنے لگتے ہیں اور جو بخل کرتا ہے وہ تو دراصل اپنی جان سے بخیلی کرتا ہے۔^(۲) اللہ تعالیٰ غنی ہے اور تم فقیر (اور محتاج) ہو^(۳) اور اگر تم روگردان ہو جاؤ^(۴) تو وہ تمہارے بدلے تمہارے سوا اور لوگوں کو لائے گا جو پھر تم جیسے نہ ہوں گے۔^(۵) (۳۸)

سورۃ فتح مدنی ہے اور اس میں اتنی آیتیں ہیں اور چار رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

بیشک (اے نبی) ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی ہے۔ (۱)

مَا أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تُدْعُونَ لِلْفَتْحِ وَإِنِّي سَيِّئٌ اللَّهُ فِيمَنْ مَنَّ يَبْخُلُ وَمَنْ يَبْخُلْ فَإِنَّمَا يَحْمِلْ عَنْ نَفْسِهِ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَلَكُمْ ﴿۳۸﴾



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ﴿۱﴾

بخل بھی کرو گے اور اسلام کے خلاف اپنے بغض و عناد کا ظہار بھی۔ یعنی اس صورت میں خود اسلام کے خلاف بھی تمہارے دلوں میں عناد پیدا ہو جائے کہ یہ اچھا دین ہے جو ہماری محنت کی ساری کمائی اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتا ہے۔!

(۱) یعنی کچھ حصہ زکوٰۃ کے طور پر اور کچھ اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔

(۲) یعنی اپنے ہی نفس کو اتفاق فی سبیل اللہ کے اجر سے محروم رکھتا ہے۔

(۳) یعنی اللہ تمہیں خرچ کرنے کی ترغیب اس لیے نہیں دیتا کہ وہ تمہارے مال کا ضرورت مند ہے۔ نہیں، وہ تو غنی ہے، بے نیاز ہے، وہ تو تمہارے ہی فائدے کے لیے تمہیں یہ حکم دیتا ہے کہ اس سے ایک تو تمہارے اپنے نفسوں کا تزکیہ ہو۔ دوسرے، تمہارے ضرورت مندوں کی حاجتیں پوری ہوں۔ تیسرے، تم دشمن پر غالب اور برتر رہو۔ اس لیے اللہ کی رحمت اور مدد کے محتاج تم ہونے کہ اللہ تمہارا محتاج ہے۔

(۴) یعنی اسلام سے کفر کی طرف پھر جاؤ۔

(۵) بلکہ تم سے زیادہ اللہ اور رسول کے اطاعت گزار اور اللہ کی راہ میں خوب خرچ کرنے والے ہوں گے۔ نبی ﷺ سے اس کی بابت پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا "اس سے مراد یہ اور اس کی قوم ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر ایمان ثریا (ستارے) کے ساتھ بھی لٹکا ہوا ہو تو اس کو فارس کے کچھ لوگ حاصل کر لیں گے"۔ (الترمذی۔ ذکرہ الألبانی فی الصحیحۃ ۳/ ۱۴)

☆ ۶/ ۱ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ۱۴ سو کے قریب صحابہ رضی اللہ عنہم عمرے کی نیت سے مکہ تشریف لے گئے،

تاکہ جو کچھ تیرے گناہ آگے ہوئے اور جو پیچھے سب کو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے،^(۱) اور تجھ پر اپنا احسان پورا کر دے^(۲) اور تجھے سیدھی راہ چلائے۔^(۳)

اور آپ کو ایک زبردست مدد دے۔^(۳)

لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيَذَرُكَ بِرَحْمَتِهِ عَلَىٰكَ وَيَهْدِيكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ﴿۲﴾

وَيُصِرُّكَ اللَّهُ تَعَالَىٰ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ﴿۳﴾

لیکن مکے کے قریب حدیبیہ کے مقام پر کافروں نے آپ ﷺ کو روک لیا اور عمرہ نہیں کرنے دیا، آپ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنا نمائندہ بنا کر مکے بھیجا تاکہ وہ رؤسائے قریش سے گفتگو کر کے انہیں مسلمانوں کو عمرہ کرنے کی اجازت دینے پر آمادہ کریں۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکہ جانے کے بعد ان کی شہادت کی افواہ پھیل گئی، جس پر آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کی بیعت لی جو بیعت رضوان کہلاتی ہے۔ یہ افواہ غلط نکلی، تاہم کفار مکہ نے اجازت نہیں دی اور مسلمانوں نے آئندہ سال کے وعدے پر واپسی کا ارادہ کر لیا، وہیں اپنے سر بھی منڈا لیے اور قربانیاں کر لیں۔ نیز کفار سے اور بھی چند باتوں کا معاہدہ ہوا، جنہیں صحابہ رضی اللہ عنہم کی اکثریت ناپسند کرتی تھی لیکن نگاہ رسالت نے اس کے دور رس اثرات کا اندازہ لگاتے ہوئے، کفار کی شرائط پر ہی صلح کو بہتر سمجھا۔ حدیبیہ سے مدینے کی طرف آتے ہوئے راستے میں یہ سورت اتری، جس میں صلح کو فتح مبین سے تعبیر فرمایا گیا چونکہ یہ صلح مکہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور اس کے دو سال بعد ہی مسلمان مکے میں فاتحانہ طور پر داخل ہوئے۔ اسی لیے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے تھے کہ تم فتح مکہ کو فتح شمار کرتے ہو لیکن ہم حدیبیہ کی صلح کو فتح شمار کرتے ہیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کی بابت فرمایا کہ آج کی رات مجھ پر وہ سورت نازل ہوئی ہے جو مجھے دنیا و ما فیہا سے زیادہ محبوب ہے (صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الحديبية وتفسير سورة الفتح)

(۱) اس سے مراد ترک اولیٰ والے معاملات یا وہ امور ہیں جو آپ ﷺ نے اپنے فہم و اجتہاد سے کیے، لیکن اللہ نے انہیں ناپسند فرمایا، جیسے عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ وغیرہ کا واقعہ ہے جس پر سورہ عبس کا نزول ہوا، یہ معاملات و امور اگرچہ گناہ اور منافی عصمت نہیں، لیکن آپ ﷺ کی شان ارفع کے پیش نظر انہیں بھی کو تاہیاں شمار کر لیا گیا، جس پر معافی کا اعلان فرمایا جا رہا ہے۔ لِيَغْفِرَ میں لام تغلیل کے لیے ہے۔ یعنی یہ فتح مبین ان تین چیزوں کا سبب ہے جو آیت میں مذکور ہیں۔ اور یہ مغفرت ذنوب کا سبب، اس اعتبار سے ہے کہ اس صلح کے بعد قبول اسلام کرنے والوں کی تعداد میں بکثرت اضافہ ہوا، جس سے آپ ﷺ کے اجر عظیم میں بھی خوب اضافہ ہوا اور حسنات و بلند درجہات میں بھی۔

(۲) اس دین کو غالب کر کے جس کی تم دعوت دیتے ہو۔ یا فتح و غلبہ عطا کر کے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مغفرت اور ہدایت پر استقامت یہی اتمام نعت ہے (فتح القدیر)

(۳) یعنی اس پر استقامت نصیب فرمائے۔ ہدایت کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہات سے نوازے۔

وہی ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں سکون (اور اطمینان) ڈال دیا تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ ہی ساتھ اور بھی ایمان میں بڑھ جائیں،^(۱) اور آسمانوں اور زمین کے (کل) لشکر اللہ ہی کے ہیں۔^(۲) اور اللہ تعالیٰ دانا باحکمت ہے۔^(۳)

تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو ان جنتوں میں لے جائے جن^(۴) کے نیچے سرسبز رہی ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ان سے ان کے گناہ دور کر دے، اور اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔^(۵)

اور تاکہ ان منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرکہ عورتوں کو عذاب دے جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانیاں رکھنے والے ہیں،^(۶)

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ وَ لِلَّهِ جُودُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ كَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝

لِيَدْخُلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَ يُكَفِّرُ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَ كَانَ ذَلِكَ عِنْدَ اللَّهِ قَوْلًا عَظِيمًا ۝

وَعَذَابَ الْمُتَفَعِّلِينَ وَالْمُتَفَعِّلَاتِ وَ الْمُشْرِكِينَ وَ الشِّرْكِيَّاتِ الطَّاغُوتِ يَا لِلَّهِ طَمَعُ النَّاسِ عَلَيْهِمْ ذَاتُ السَّمَوَاتِ وَ الْعَرْضِ

(۱) یعنی اس اضطراب کے بعد، جو مسلمانوں کو شرائط صلح کی وجہ سے لاحق ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں سکینت نازل فرمادی، جس سے ان کے دلوں کو اطمینان، سکون اور ایمان مزید حاصل ہوا۔ یہ آیت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

(۲) یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنے کسی لشکر (مثلاً فرشتوں) سے کفار کو ہلاک کروادے۔ لیکن اس نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت ایسا نہیں کیا اور اس کے بجائے مومنوں کو قتال و جہاد کا حکم دیا۔ اسی لیے آگے اپنی صفت علیم و حکیم بیان فرمائی ہے۔ یا مطلب ہے کہ آسمان و زمین کے فرشتے اور اسی طرح دیگر ذی شوکت و قوت لشکر سب اللہ کے تابع ہیں اور ان سے جس طرح چاہتا ہے کام لیتا ہے۔ بعض دفعہ وہ ایک کافر گروہ کو ہی دوسرے کافر گروہ پر مسلط کر کے مسلمانوں کی امداد کی صورت پیدا فرمادیتا ہے۔ مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ اے مومنو! اللہ تعالیٰ تمہارا محتاج نہیں ہے، وہ اپنے پیغمبر اور اپنے دین کی مدد کا کام کسی بھی گروہ اور لشکر سے لے سکتا ہے۔ (ابن کثیر و ایسر التفسیر)

(۳) حدیث میں آتا ہے کہ جب مسلمانوں نے سورہ فتح کا ابتدائی حصہ سنا لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ تَوَّابُونَ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ”آپ ﷺ کو مبارک ہو، ہمارے لیے کیا ہے؟ جس پر اللہ نے آیت لِيَدْخُلَ الْمُؤْمِنِينَ نازل فرما دی (صحیح بخاری، باب غزوة الحديبية)، بعض کہتے ہیں کہ یہ لِيَزِدَا دُوا يَا يُنصِرُكَ کے متعلق ہے۔

(۴) یعنی اللہ کو اس کے مکملوں پر متمم کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے

(در اصل) انہیں پر برائی کا پھیرا ہے،^(۱) اللہ ان پر ناراض ہوا اور انہیں لعنت کی اور ان کے لیے دوزخ تیار کی

اور وہ (بست) بری لوٹنے کی جگہ ہے۔ (۶)

اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کے لشکر ہیں اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔^(۷) (۷)

یقیناً ہم نے تجھے گواہی دینے والا اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ (۸)

تاکہ (اے مسلمانو!) تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کا ادب کرو اور اللہ کی پاکی

بیان کرو صبح و شام۔ (۹)

جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ یقیناً اللہ سے بیعت کرتے ہیں،^(۳) ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے،^(۴) تو جو

شخص عہد شکنی کرے وہ اپنے نفس پر ہی عہد شکنی کرتا ہے^(۵) اور جو شخص اس اقرار کو پورا کرے جو اس نے

اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَكَفَّ أَعْيُنَهُمْ وَسَدَّ مَعِينَا ۝

وَبَلَّغَهُ جُودَ السَّلَاطِ وَالْأَرْضِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا أَوْ مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝

لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزُّوهَ وَتُوقِرُوهُ وَتُقْبِلُوهُ
بِغَرَّةٍ وَأَوْبِيلًا ۝

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ

فَمَنْ عَفَاكَ فَإِنَّمَا يَفْعِلْهُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفَى بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهِ

اللَّهُ فَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝

بارے میں گمان رکھتے ہیں کہ یہ مغلوب یا مقتول ہو جائیں گے اور دین اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (ابن کثیر)

(۱) یعنی یہ جس گردش، عذاب یا ہلاکت کے مسلمانوں کے لیے منتظر ہیں، وہ تو ان ہی کا مقدر بننے والی ہے۔

(۲) یہاں اسے منافقین اور کفار کے ضمن میں دوبارہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے ان دشمنوں کو ہر طرح ہلاک کرنے پر قادر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی حکمت و مشیت کے تحت ان کو جتنی چاہے مہلت دے دے۔

(۳) یعنی یہ بیعت دراصل اللہ ہی کی ہے، کیونکہ اسی نے جناد کا حکم دیا ہے اور اس پر اجر بھی وہی عطا فرمائے گا۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا کہ یہ اپنے نفسوں اور مالوں کا جنت کے بدلے اللہ کے ساتھ سودا ہے (التوبہ: ۱۱۱) یہ اسی طرح

ہے جیسے ﴿مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (النساء: ۸۰)

(۴) آیت سے وہی بیعت رضوان مراد ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان غنیؓ کی خبر شہادت سن کر ان کا انتقام لینے کے لیے حدیبیہ میں موجود ۱۳ یا ۱۵ سو مسلمانوں سے لی تھی۔

(۵) نَحَثٌ (عہد شکنی) سے مراد یہاں بیعت کا توڑ دینا یعنی عہد کے مطابق لڑائی میں حصہ نہ لینا ہے۔ یعنی جو شخص ایسا کرے گا تو اس کا وبال اسی پر پڑے گا۔

اللہ کے ساتھ کیا ہے^(۱) تو اسے عنقریب اللہ بہت بڑا اجر دے گا۔ (۱۰)

دیہاتوں میں سے جو لوگ پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے وہ اب تجھ سے کہیں گے کہ ہم اپنے مال اور بال بچوں میں لگے رہ گئے پس آپ ہمارے لیے مغفرت طلب کیجئے۔^(۲) یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔^(۳) آپ جو اب دے دیجئے کہ تمہارے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز کا بھی اختیار کون رکھتا ہے اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو^(۴) یا تمہیں کوئی نفع دینا چاہے^(۵) تو، بلکہ تم جو کچھ کر رہے ہو اس سے اللہ خوب

سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلْنَا أَمْوَالَنَا
وَأَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْنَا يَوْمَئِذٍ يَمْزُجُونَ بِالْيَسْتِغْفِرُ مَا لَيْسَ فِي
قُلُوبِهِمْ قَوْلٌ مِّنْ يَمِينِكَ لَكُم مِّنَ اللَّهِ سَيِّئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ
ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝

(۱) کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کی مدد کرے گا؟ ان کے ساتھ ہو کر لڑے گا؟ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح و غلبہ عطا فرمادے۔

(۲) اس سے مدینے کے اطراف میں آباد قبیلے، غفار، مزینہ، جہینہ، اسلم اور دہل مراد ہیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھنے کے بعد (جس کی تفصیل آگے آئے گی) عمرے کے لیے مکہ جانے کی عام منادی کرادی۔ مذکورہ قبیلوں نے سوچا کہ موجودہ حالات تو مکہ جانے کے لیے سازگار نہیں ہیں۔ وہاں ابھی کافروں کا غلبہ ہے اور مسلمان کمزور ہیں نیز مسلمان عمرے کے لیے پورے طور پر ہتھیار بند ہو کر بھی نہیں جاسکتے۔ اگر ایسے میں کافروں نے مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کا فیصلہ کر لیا تو مسلمان خالی ہاتھ ان کا مقابلہ کس طرح کریں گے؟ اس وقت کے جانے کا مطلب اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ آپ ﷺ کے ساتھ عمرے کے لیے نہیں گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بابت فرما رہا ہے کہ یہ تجھ سے مشوریتوں کا عذر پیش کر کے طلب مغفرت کی التجائیں کریں گے۔

(۳) یعنی زبانوں پر تو یہ ہے کہ ہمارے پیچھے ہمارے گھروں کی اور بیوی بچوں کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے ہمیں خود ہی رکن پڑا، لیکن حقیقت میں ان کا پیچھے رہنا، نفاق اور اندیشہ موت کی وجہ سے تھا۔

(۴) یعنی اگر اللہ تمہارے مال ضائع کرنے اور تمہارے اہل کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لے تو کیا تم میں سے کوئی اختیار رکھتا ہے کہ وہ اللہ کو ایسا نہ کرنے دے۔

(۵) یعنی تمہیں مدد پہنچانا اور تمہیں غنیمت سے نوازنا چاہیے۔ تو کوئی روک سکتا ہے؟ یہ دراصل مذکورہ متخلفین (پیچھے رہ جانے والوں) کا رد ہے جنہوں نے یہ گمان کر لیا تھا کہ وہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں گئے تو نقصان سے محفوظ اور منافع سے بہرہ ور ہوں گے۔ حالانکہ نفع و ضرر کا سارا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

باخبر ہے۔^(۱)

(نہیں) بلکہ تم نے تو یہ گمان کر رکھا تھا کہ پیغمبر اور مسلمانوں کا اپنے گھروں کی طرف لوٹ آنا قطعاً ناممکن ہے اور یہی خیال تمہارے دلوں میں رچ بس گیا تھا اور تم نے برا گمان کر رکھا تھا۔^(۲) دراصل تم لوگ ہو بھی ہلاک ہونے والے۔^(۳)

اور جو شخص اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان نہ لائے تو ہم نے بھی ایسے کافروں کے لیے دہکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔^(۴)

اور زمین اور آسمانوں کی بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب کرے۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔^(۵)

جب تم غنیمتیں لینے جانے لگو گے تو جھٹ سے یہ پیچھے چھوڑے ہوئے لوگ کہنے لگیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیجئے،^(۶) وہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

بَلْ كُنْتُمْ اَنْ تَنْتَقِبَ الرَّسُولَ وَالْمُؤْمِنُونَ اِلَىٰ اٰهْلِيهِمْ اَبَدًا
وَدَيِّنَ ذٰلِكَ فِي قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنًّا السَّوْءَ
وَكُنْتُمْ قَوْمًا اُوْرًا ﴿۱۰﴾

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ فَاِنَّ اَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ
سَعِيْرًا ﴿۱۱﴾

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ يَعْرِضُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيُعَذِّبُ
مَنْ يَّشَاءُ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲﴾

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا اَنْطَلَقْتُمْ اِلَىٰ مَعَانِمِ لِمَا تَخَذُوْهَا
ذُرُوْبًا تَنْبَغِيْكُمْ يٰرِيْدُوْنَ اَنْ يُبَيِّدُوْا كَلِمَ اللّٰهِ فَاِنَّ كُنْ

(۱) یعنی تمہیں تمہارے عملوں کی پوری جزا دے گا۔

(۲) اور وہ یہی تھا کہ اللہ اپنے رسول ﷺ کی مدد نہیں کرے گا۔ یہ وہی پہلا گمان ہے، تکرار تاکید کے لیے ہے۔

(۳) بُوْرًا، بائز کی جمع ہے، ہلاک ہونے والا، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کا مقدر ہلاکت ہے۔ اگر دنیا میں یہ اللہ کے عذاب سے بچ گئے تو آخرت میں توبیح کر نہیں جاسکتے وہاں تو عذاب ہر صورت میں بھگتنا ہو گا۔

(۴) اس میں متخلفین کے لیے توبہ و انابت الی اللہ کی ترغیب ہے کہ اگر وہ نفاق سے توبہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمادے گا، وہ بڑا بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔

(۵) اس میں غزوہ خیبر کا ذکر ہے جس کی فتح کی نوید اللہ تعالیٰ نے حدیبیہ میں دی تھی، نیز اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ یہاں سے جتنا بھی مال غنیمت حاصل ہو گا وہ صرف حدیبیہ میں شریک ہونے والوں کا حصہ ہے۔ چنانچہ حدیبیہ سے واپسی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کی مسلسل عہد شکنی کی وجہ سے خیبر پر چڑھائی کا پروگرام بنایا تو مذکورہ متخلفین نے بھی محض مال غنیمت کے حصول کے لیے ساتھ جانے کا ارادہ ظاہر کیا، جسے منظور نہیں کیا گیا۔ آیت میں مغانم سے مراد مغانم خیبر ہی ہیں۔

کے کلام کو بدل دیں (۱) آپ کہہ دیجئے! کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی فرما چکا ہے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چلو گے، (۲) وہ اس کا جواب دیں گے (نہیں نہیں) بلکہ تم ہم سے حسد کرتے ہو، (۳) (اصل بات یہ ہے) کہ وہ لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہیں۔ (۱۵) (۴)

آپ پیچھے چھوڑے ہوئے بدویوں سے کہہ دو کہ عنقریب تم ایک سخت جنگجو قوم کی طرف بلائے جاؤ گے کہ تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں گے (۵) پس اگر تم اطاعت کرو (۶) گے تو اللہ تمہیں بہت بہتر بدلہ دے گا (۷) اور اگر تم نے منہ پھیر لیا جیسا کہ اس سے پہلے تم منہ پھیر چکے ہو تو وہ تمہیں دردناک عذاب دے گا۔ (۸) (۱۶)

تَدْبِعُونَا كَذَلِكَ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَسْأَلُوا
بَلْ تَحْسَدُونَ عَلَى آلِ أَبِي سَلَمَةَ ۚ إِنَّ آلَ أَبِي سَلَمَةَ لَأَوْلِيَاءُ اللَّهِ

قُلْ لِلَّهِ الْخَلْفَيْنِ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتَدْعُونَ إِلَى قَوْمِ أُولَىٰ نَابِئِ
شَدِيدٍ لِقَاتِهِمْ أَوْ قَوْمٍ قَانِ طَلِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا
حَسَنًا وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝

(۱) اللہ کے کلام سے مراد اللہ کا خیر کی غنیمت کو اہل حدیبیہ کے لیے خاص کرنے کا وعدہ ہے۔ منافقین اس میں شریک ہو کر اللہ کے کلام یعنی اس کے وعدے کو بدلنا چاہتے تھے۔

(۲) یہ نفی بمعنی نہی ہے یعنی تمہیں ہمارے ساتھ چلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم بھی یہی ہے۔

(۳) یعنی یہ متخلفین کہیں گے کہ تم ہمیں حسد کی بنا پر ساتھ لے جانے سے گریز کر رہے ہو تاکہ مال غنیمت میں ہم تمہارے شریک نہ ہوں۔

(۴) یعنی بات یہ نہیں ہے جو وہ سمجھ رہے ہیں؛ بلکہ یہ پابندی ان کے پیچھے رہنے کی پاداش میں ہے۔ لیکن اصل بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔

(۵) اس جنگ جو قوم کی تعیین میں اختلاف ہے، بعض مفسرین اس سے عرب کے ہی بعض قبائل مراد لیتے ہیں، مثلاً ہوازن یا حثیمت؛ جن سے حنین کے مقام پر مسلمانوں کی جنگ ہوئی۔ یا میلثہ الکذاب کی قوم بنو حنیفہ۔ اور بعض نے فارس اور روم کے مجوسی و عیسائی مراد لیے ہیں۔ ان پیچھے رہ جانے والے بدویوں سے کہا جا رہا ہے کہ عنقریب ایک جنگجو قوم سے مقابلے کے لیے تمہیں بلایا جائے گا۔ اگر وہ مسلمان نہ ہوئے تو تمہاری اور ان کی جنگ ہوگی۔

(۶) یعنی خلوص دل سے مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑو گے۔

(۷) دنیا میں غنیمت اور آخرت میں پچھلے گناہوں کی مغفرت اور جنت۔

(۸) یعنی جس طرح حدیبیہ کے موقع پر تم نے مسلمانوں کے ساتھ مکہ جانے سے گریز کیا تھا، اسی طرح اب بھی تم جماد سے بھاگو گے، تو پھر اللہ کا دردناک عذاب تمہارے لیے تیار ہے۔

اندھے پر کوئی حرج نہیں ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی حرج ہے اور نہ بیمار پر کوئی حرج ہے،^(۱) جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے اسے اللہ ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جس کے (درختوں) تلے نہریں جاری ہیں اور جو منہ پھیر لے اسے دردناک عذاب (کی سزا) دے گا۔ (۱۷)

یقیناً اللہ تعالیٰ مومنوں سے خوش ہو گیا جبکہ وہ درخت تلے تجھ سے بیعت کر رہے تھے۔^(۲) ان کے دلوں میں جو تھا اسے اس نے معلوم کر لیا^(۳) اور ان پر اطمینان نازل فرمایا^(۴) اور انہیں قریب کی فتح عنایت فرمائی^(۵) (۱۸) اور بہت سی غنیمتیں جنہیں وہ حاصل کریں گے^(۶) اور

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمُرُوفِ حَرَجٌ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يَدْخُلْهُ جَنَّةً جَدَّتْ بِحَيْرَىٰ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَنْ يَتَّبِعِ بَدْعَ الْكُفْرِ يَأْتِ بِهَا عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۱۷﴾

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَايَعُواكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَنزَلَهُمْ مَعَهُمْ رَيْبًا ﴿۱۸﴾

وَمَعْلَمٌ كَثِيرًا يَأْخُذُ بِهَا وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۱۹﴾

(۱) بصارت سے محرومی اور لنگڑے پن کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذوری۔ یہ دونوں عذر تو لازمی ہیں۔ ان اصحاب عذریا ان جیسے دیگر معذورین کو جہاد سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ حرج کے معنی گناہ کے ہیں ان کے علاوہ جو بیماریاں ہیں، وہ عارضی عذر ہیں، جب تک وہ واقعی بیمار ہے، شرکت جہاد سے مستثنیٰ ہے۔ بیماری دور ہوتے ہی وہ حکم جہاد میں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوں گے۔

(۲) یہ ان اصحاب بیعت رضوان کے لیے رضائے الہی اور ان کے پکے سچے مومن ہونے کا سرٹیفکیٹ ہے، جنہوں نے حدیبیہ میں ایک درخت کے نیچے اس بات پر بیعت کی کہ وہ قریش مکہ سے لڑیں گے اور راہ فرار اختیار نہیں کریں گے۔

(۳) یعنی ان کے دلوں میں جو صدق و صفا کے جذبات تھے، اللہ ان سے بھی واقف ہے۔ اس سے ان دشمنان صحابہ ﷺ کا رد ہو گیا جو کہتے ہیں کہ ان کا ایمان ظاہری تھا، دل سے وہ منافق تھے۔

(۴) یعنی وہ ننتے تھے، جنگ کی نیت سے نہیں گئے تھے، اس لیے جنگی ہتھیار مطلوبہ تعداد میں نہیں تھے۔ اس کے باوجود جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن عفانؓ کا بدلہ لینے کے لیے ان سے جہاد کی بیعت لی تو بلا ادنیٰ تامل، سب لڑنے کے لیے تیار ہو گئے، یعنی ہم نے موت کا خوف ان کے دلوں سے نکال دیا اور اس کی جگہ صبر و سکینت ان پر نازل فرمادی جس کی بنا پر انہیں لڑنے کا حوصلہ ہوا۔

(۵) اس سے مراد وہی فتح خیبر ہے جو یہودیوں کا گڑھ تھا، اور حدیبیہ سے واپسی پر مسلمانوں نے اسے فتح کیا۔

(۶) یہ وہ غنیمتیں ہیں جو خیبر سے حاصل ہوئیں۔ یہ نہایت زرخیز اور شاداب علاقہ تھا، اسی حساب سے یہاں سے مسلمانوں کو بہت بڑی تعداد میں غنیمت کا مال حاصل ہوا، جسے صرف اہل حدیبیہ میں تقسیم کیا گیا۔

اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (۱۹)

اللہ تعالیٰ نے تم سے بہت ساری نعمتوں کا وعدہ کیا ہے^(۱) جنہیں تم حاصل کرو گے پس یہ تو تمہیں جلدی ہی عطا فرما دی^(۲) اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے،^(۳) تاکہ مومنوں کے لیے یہ ایک نشانی ہو جائے^(۴) اور (تاکہ) وہ تمہیں سیدھی راہ چلائے۔^(۵) (۲۰)

اور تمہیں اور (عنیمتیں) بھی دے جن پر اب تک تم نے قابو نہیں پایا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے قابو میں رکھا ہے^(۶) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲۱)
اور اگر تم سے کافر جنگ کرتے تو یقیناً پیٹھ دکھا کر بھاگتے پھر نہ تو کوئی کار ساز پاتے نہ مددگار۔^(۷) (۲۲)

وَعَدَّكُمْ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُوهَا فَجَعَلَ لَكُمْ هَذَا هَذَا
وَكَمَّتْ أَيْدِي النَّاسِ عَنْكُمْ وَلَيَكُونَنَّ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ
وَيَهْدِيكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝

وَأَخْرَى لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا وَكَانَ اللَّهُ
عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ۝

وَلَوْ قَاتَلَكُمْ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوْا الْآلِبَارِبُتْرَ لِيَهْدُونَ
وَلِيَأْتُوا لَأَنْصِبُوا ۝

(۱) یہ دیگر فتوحات کے نتیجے میں حاصل ہونے والی نعمتوں کی خوش خبری ہے جو قیامت تک مسلمانوں کو حاصل ہونے والی ہیں۔

(۲) یعنی فتح خیبر یا صلح حدیبیہ، کیونکہ یہ دونوں تو فوری طور پر مسلمانوں کو حاصل ہو گئیں۔

(۳) حدیبیہ میں کافروں کے ہاتھ اور خیبر میں یہودیوں کے ہاتھ اللہ نے روک دیئے، یعنی ان کے حوصلے پست کر دیئے اور وہ مسلمانوں سے مصروف پیکار نہیں ہوئے۔

(۴) یعنی لوگ اس واقعے کا تذکرہ پڑھ کر اندازہ لگالیں گے کہ اللہ تعالیٰ قلت تعداد کے باوجود مسلمانوں کا محافظ اور دشمنوں پر ان کو غالب کرنے والا ہے یا یہ روک لینا، تمام موعودہ باتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی نشانی ہے۔

(۵) یعنی ہدایت پر استقامت عطا فرمائے یا اس نشانی سے تمہیں ہدایت میں اور زیادہ کرے۔

(۶) یہ بعد میں ہونے والی فتوحات اور ان سے حاصل ہونے والی غنیمت کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح چار دیواری کر کے کسی چیز کو اپنے قبضے میں کر لیا جاتا ہے اور پھر اس کی بابت بے فکری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ نے ان فتوحات کو اپنے حیطہ اقتدار میں لیا ہوا ہے۔ یعنی گواہی تمہاری فتوحات کا دائرہ وہاں تک وسیع نہیں ہوا ہے۔ لیکن اللہ نے انہیں تمہارے لیے اپنے قابو میں کیا ہوا ہے، وہ جب چاہے گا، تمہیں اس پر غلبہ عطا کر دے گا، جس میں کوئی شک والی بات نہیں ہے، اس لیے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ بعض نے أَحَاطَ کے معنی عَلِمَ کے کیے ہیں، یعنی اسے معلوم ہے کہ وہ علاقے بھی تم فتح کرو گے۔

(۷) یہ حدیبیہ میں متوقع جنگ کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ اگر یہ قریش مکہ صلح نہ کرتے بلکہ جنگ کا راستہ اختیار

سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَكِنْ نَجِدُ لِسُنَّةِ
اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ
مَكَّةَ ۝ لَمَّا جَاءَ الْغُرُوبَ ۚ قُلْ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيِ
مَعَهُمْ قَالِ إِنَّ بَيْعَةَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَوْ كُنَّا لَرَجَلًا مُؤْمِنًا مِمَّنْ
مُؤْمِنَاتٍ

اللہ کے اس قاعدے کے مطابق جو پہلے سے چلا آیا ہے،^(۱) تو کبھی بھی اللہ کے قاعدے کو بدلتا ہوا نہ پائے گا۔ (۲۳)

وہی ہے جس نے خاص مکہ میں کافروں کے ہاتھوں کو تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے روک لیا اس کے بعد کہ اس نے تمہیں ان پر غلبہ دے دیا تھا،^(۲) اور تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ (۲۴)

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے لیے موقوف جانور کو اس کی قربان گاہ میں پہنچنے سے (روکا)،^(۳) اور اگر ایسے (ہست سے)

کرتے تو یہ پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوتے، کوئی ان کا مددگار نہ ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم وہاں تمہاری مدد کرتے اور ہمارے مقابلے میں کس کو ٹھہرنے کی طاقت ہے؟

(۱) یعنی اللہ کی یہ سنت اور عادت پہلے سے چلی آ رہی ہے کہ جب کفر و ایمان کے درمیان فیصلہ کن معرکہ آرائی کا مرحلہ آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی مدد فرما کر حق کو سر بلندی عطا کرتا ہے، جیسے اس سنت اللہ کے مطابق بدر میں تمہاری مدد کی گئی۔

(۲) جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حدیبیہ میں تھے تو کافروں نے ۸۰ آدمی جو ہتھیاروں سے لیس تھے، اس نیت سے بھیجے کہ اگر انہیں موقع مل جائے تو دھوکے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے خلاف کارروائی کریں چنانچہ یہ مسلح جتھہ جبل تنعیم کی طرف سے حدیبیہ میں آیا، جس کا علم مسلمانوں کو بھی ہو گیا اور انہوں نے ہمت کر کے ان تمام آدمیوں کو گرفتار کر لیا اور بارگاہ رسالت میں پیش کر دیا۔ ان کا جرم تو شدید تھا اور ان کو جو بھی سزا دی جاتی، صحیح ہوتی۔ لیکن اس میں خطرہ یہی تھا کہ پھر جنگ ناگزیر ہو جاتی۔ جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر جنگ کے بجائے صلح چاہتے تھے کیونکہ اسی میں مسلمانوں کا مفاد تھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو معاف کر کے چھوڑ دیا۔ (صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب قول اللہ تعالیٰ وهو الذی کف ایذہم عنکم، بطن مکہ سے مراد حدیبیہ ہے۔ یعنی حدیبیہ میں ہم نے تمہیں کفار سے اور کفار کو تم سے لڑنے سے روکا۔ یہ اللہ نے احسان کے طور پر ذکر فرمایا ہے۔

(۳) ہڈی اس جانور کو کہا جاتا ہے جو حاجی یا معتمر (عمرو کرنے والا) اپنے ساتھ لے کے جاتا تھا۔ یا وہیں سے خرید کر ذبح کرتا تھا محل (حلال ہونے کی جگہ) سے مراد وہ قربان گاہ ہے جہاں ان کو لے جا کر ذبح کیا جاتا ہے جاہلیت کے زمانے میں۔ یہ مقام معتمر کے لیے مروہ پھاڑی کے پاس اور حاجیوں کے لیے منی تھا۔ اور اسلام میں ذبح کرنے کی جگہ مکہ منی اور پورے حدود حرم ہیں۔ مَعْكُوفًا، حال ہے۔ یعنی یہ جانور اس انتظار میں رکھے ہوئے تھے کہ مکے میں داخل ہوں تاکہ

لَوْ تَكْفُرُوا هُنَّ أُنْثَىٰ فَكْفُرُوا هُنَّ مُشْرِكَةٌ مِّمَّنْ كَفَرُوا فَتَعَرُوهَا بِغَيْرِ عِلْمٍ
لِيُدْخِلَ اللَّهُ فِيْ رَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ لَو تَزَوَّجُوا الْوَالِدَاتِ بَنَاتَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوا مِنْهُنَّ عَدَاؤًا بَيْنَنَا ۖ

مسلمان مرد اور (بہت سی) مسلمان عورتیں نہ ہوتیں جن کی تم کو خبر نہ تھی^(۱) یعنی ان کے پس جانے کا احتمال نہ ہوتا جس پر ان کی وجہ سے تم کو بھی بے خبری میں ضرر پہنچتا،^(۲) (تو تمہیں لڑنے کی اجازت دے دی جاتی^(۳)) لیکن ایسا نہیں کیا گیا^(۴) تاکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کرے اور اگر یہ الگ الگ ہوتے تو ان میں جو کافر تھے ہم ان کو دردناک سزا دیتے۔^(۵) (۲۵) جب کہ^(۶) ان کافروں نے اپنے دلوں میں حسیت کو جگہ دی اور حسیت بھی جاہلیت کی، سو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور مومنین پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی^(۷) اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تقوے کی بات پر

لِيُدْخِلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَبِيَّةَ الْحَبِيَّةَ
الْجَاهِلِيَّةَ فَاتَّزَلَّ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى
الْمُؤْمِنِينَ وَالزَّوْجَةِ الْمُتَّقَىٰ وَكَانُوا أَحْسَىٰ

انہیں قریبان کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کافروں نے ہی تمہیں بھی مسجد حرام سے روکا اور تمہارے ساتھ جو جانور تھے، انہیں بھی اپنی قریبان گاہ تک نہیں پہنچنے دیا۔

(۱) یعنی مکے میں اپنا ایمان چھپائے رہ رہے تھے۔

(۲) کفار کے ساتھ لڑائی کی صورت میں ممکن تھا کہ یہ بھی مارے جاتے اور تمہیں ضرر پہنچتا، معرّوۃ کے اصل معنی عیب کے ہیں۔ یہاں مراد کفارہ اور وہ برائی اور شرمندگی ہے جو کافروں کی طرف سے تمہیں اٹھانی پڑتی۔ یعنی ایک تو قتل خطا کی دیت دینی پڑتی اور دوسرے، کفار کا یہ طعنہ سہنا پڑتا کہ یہ اپنے مسلمان ساتھیوں کو بھی مار ڈالتے ہیں۔

(۳) یہ لَوْلَا کا محذوف جواب ہے۔ یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی تو تمہیں مکے میں داخل ہونے کی اور قریش مکہ سے لڑنے کی اجازت دے دی جاتی۔

(۴) بلکہ اہل مکہ کو مہلت دے دی گئی تاکہ جس کو اللہ چاہے قبول اسلام کی توفیق دے دے۔

(۵) تَزَوَّجُوا بمعنی تَمَيَّزُوا ہے مطلب یہ ہے کہ مکے میں آباد مسلمان، اگر کافروں سے الگ رہائش پذیر ہوتے، تو ہم تمہیں اہل مکہ سے لڑنے کی اجازت دے دیتے اور تمہارے ہاتھوں ان کو قتل کرواتے اور اس طرح انہیں دردناک سزا دیتے۔ عذاب الیم سے مراد یہاں قتل، قیدی بنانا اور قہر و غلبہ ہے۔

(۶) إِذْ كَاظَمُوا لَوْ تَعَدَّبْنَا سے یا وَذُكِّرُوا وَمَحْذُوف ہے۔ یعنی اس وقت کو یاد کرو، جب کہ ان کافروں نے.....

(۷) کفار کی اس حسیت جاہلیہ (عار اور غرور) سے مراد اہل مکہ کا مسلمانوں کو مکے میں داخل ہونے سے روکنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے ہمارے بیٹوں اور باپوں کو قتل کیا ہے۔ لات و عزیٰ کی قسم ہم انہیں کبھی یہاں داخل نہیں ہونے

دیں گے یعنی انہوں نے اسے اپنی عزت اور وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ اسی کو حمیت جاہلیہ کہا گیا ہے، کیونکہ خانہ کعبہ میں عبادت کے لیے آنے سے روکنے کا کسی کو حق حاصل نہیں تھا۔ قریش مکہ کے اس معاندانہ رویے کے جواب میں خطرہ تھا کہ مسلمانوں کے جذبات میں بھی شدت آجاتی اور وہ بھی اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنا کر کے جانے پر اصرار کرتے، جس سے دونوں کے درمیان لڑائی چھڑ جاتی، اور یہ لڑائی مسلمانوں کے لیے سخت خطرناک رہتی (جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے) اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں سکینت نازل فرمادی یعنی انہیں صبر و تحمل کی توفیق دے دی اور وہ پیغمبر ﷺ کے ارشاد کے مطابق حدیبیہ میں ہی ٹھہرے رہے جوش اور جذبے میں آکر کے جانے کی کوشش نہیں کی۔ بعض کہتے ہیں کہ اس حمیت جاہلیہ سے مراد قریش مکہ کا وہ رویہ ہے جو صلح کے لیے اور معاہدے کے وقت انہوں نے اختیار کیا۔ یہ رویہ اور معاہدہ دونوں مسلمانوں کے لیے بظاہر ناقابل برداشت تھا۔ لیکن انجام کے اعتبار سے چونکہ اس میں اسلام اور مسلمانوں کا بہترین مفاد تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نہایت ناگواری اور گرانی کے باوجود اسے قبول کرنے کا حوصلہ عطا فرمادیا۔ اس کی مختصر تفصیل اس طرح ہے۔ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ کے بھیجے ہوئے نمائندوں کی یہ بات تسلیم کر لی کہ اس سال مسلمان عمرے کے لیے مکہ نہیں جائیں گے اور یہیں سے واپس ہو جائیں گے تو پھر آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معاہدہ لکھنے کا حکم دیا۔ انہوں نے آپ ﷺ کے حکم سے، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھی۔ انہوں نے اس پر اعتراض کر دیا کہ 'رحمن' کو ہم نہیں جانتے۔ ہمارے ہاں جو لفظ استعمال ہوتا ہے، اس کے ساتھ یعنی بِاسْمِکَ اللّٰہُمَّ، (اے اللہ! تیرے نام سے) لکھیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اسی طرح لکھوایا۔ پھر آپ ﷺ نے لکھوایا "یہ وہ دستاویز ہے جس پر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اہل مکہ سے مصالحت کی ہے" قریش کے نمائندوں نے کہا، اختلاف کی بنیاد تو آپ ﷺ کی رسالت ہی ہے، اگر ہم آپ ﷺ کو رسول اللہ مان لیں تو اس کے بعد جھگڑای کیا رہ جاتا ہے؟ پھر ہمیں آپ ﷺ سے لڑنے کی اور بیت اللہ میں جانے سے روکنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آپ ﷺ یہاں محمد رسول اللہ کی جگہ "محمد بن عبد اللہ" لکھیں۔ چنانچہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایسا ہی لکھنے کا حکم دیا۔ (یہ مسلمانوں کے لیے نہایت اشتعال انگیز صورت حال تھی، اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر سکینت نازل نہ فرماتا تو وہ کبھی اسے برداشت نہ کرتے) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ سے "محمد رسول اللہ" کے الفاظ مٹانے اور کائے سے انکار کر دیا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ یہ لفظ کہاں ہے؟ جتانے کے بعد خود آپ ﷺ نے اسے اپنے دست مبارک سے مٹا دیا اور اس کی جگہ محمد بن عبد اللہ تحریر کرنے کو فرمایا۔ اس کے بعد اس معاہدے یا صلح نامے میں تین باتیں لکھیں گئیں۔ ۱- اہل مکہ میں سے جو مسلمان ہو کر آپ کے پاس آئے گا، اسے واپس کر دیا جائے گا۔ ۲- جو مسلمان اہل مکہ سے جا ملے گا، وہ اس کو واپس کرنے کے پابند نہیں ہوں گے۔ ۳- مسلمان آئندہ سال کے میں آئیں گے اور یہاں تین دن قیام کر سکیں گے، تاہم انہیں ہتھیار ساتھ لانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ (صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب صلح الحدیبیۃ فی الحدیبیۃ) اور اس کے ساتھ دو باتیں اور لکھی گئیں۔ ۱- اس سال لڑائی موقوف رہے گی۔ ۲- قبائل میں سے جو چاہے مسلمانوں کے ساتھ اور جو چاہے قریش کے ساتھ ہو جائے۔

بِهَا وَأَهْلُهَا وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٣٦﴾

جمائے رکھا^(۱) اور وہ اس کے اہل اور زیادہ مستحق تھے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ (۳۶)

یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو خواب سچا دکھایا کہ ان شاء اللہ تم یقیناً پورے امن و امان کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہو گے سر منڈواتے ہوئے اور سر کے بال کترواتے ہوئے (چین کے ساتھ) نذر ہو کر،^(۲) وہ ان امور کو جانتا ہے جنہیں تم نہیں جانتے،^(۳) پس اس نے اس سے پہلے ایک نزدیک کی فتح تمہیں میسر کی۔^(۴) (۲۷) وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے ہر دین پر غالب کرے،^(۵) اور اللہ

لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ بِالْوَيْبِ الْمَوْتِ لَتَنْدُخُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ أَوْ يَمِينٍ مَّحَلِّعِينَ رُءُوسِكُمْ وَمَقْصِرِينَ لَأَخَذُوا مِنْكُمْ مَالَهُمْ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ فَجَعَلَ مِنْ ذَلِكَ فِتْنًا قُرَيْبًا ﴿٣٦﴾

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ

(۱) اس سے مراد کلمۂ توحید و رسالت لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ہے، جس سے حدیبیہ والے دن مشرکین نے انکار کیا (ابن کثیر) یا وہ صبر و وقار ہے جس کا مظاہرہ انہوں نے حدیبیہ میں کیا یا وہ وفائے عہد اور اس پر ثبات ہے جو تقویٰ کا نتیجہ ہے۔ (فتح القدیر)

(۲) واقعہ حدیبیہ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں مسلمانوں کے ساتھ بیت اللہ میں داخل ہو کر طواف و عمرہ کرتے ہوئے دکھایا گیا۔ نبی کا خواب بھی بمنزلہ وحی ہی ہوتا ہے۔ تاہم اس خواب میں یہ تعین نہیں تھی کہ یہ اسی سال ہو گا، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان اسے بشارت عظیمہ سمجھتے ہوئے، عمرے کے لیے فوراً ہی آمادہ ہو گئے اور اس کے لیے عام منادی کرادی گئی اور چل پڑے۔ بالآخر حدیبیہ میں وہ صلح ہوئی، جس کی تفصیل ابھی گزری، دراصل حالیکہ اللہ کے علم میں اس خواب کی تعبیر آئندہ سال تھی، جیسا کہ آئندہ سال مسلمانوں نے نہایت امن کے ساتھ یہ عمرہ کیا اور اللہ نے اپنے پیغمبر کے خواب کو سچا کر دکھایا۔

(۳) یعنی اگر حدیبیہ کے مقام پر صلح نہ ہوتی تو جنگ سے کئے میں مقیم کمزور مسلمانوں کو نقصان پہنچتا، صلح کے ان فوائد کو اللہ ہی جانتا تھا۔

(۴) اس سے فتح خیبر و فتح مکہ کے علاوہ، صلح کے نتیجے میں جو بہ کثرت مسلمان ہوئے وہ بھی مراد ہے، کیونکہ وہ بھی فتح کی ایک عظیم قسم ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمان ڈیڑھ ہزار تھے، اس کے دو سال بعد جب مسلمان مکہ میں فاتحانہ طور پر داخل ہوئے تو ان کی تعداد دس ہزار تھی۔

(۵) اسلام کا یہ غلبہ دیگر ادیان پر دلائل کے لحاظ سے تو ہر وقت مسلم ہے۔ تاہم دنیوی اور عسکری لحاظ سے بھی قرون اولیٰ اور اس کے مابعد عرصہ دراز تک، جب تک مسلمان اپنے دین پر عامل رہے انہیں غلبہ حاصل رہا، اور آج بھی یہ

عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا وَلَكِنْ بِإِذْنِ اللَّهِ شَهِدْنَا ۝

مُحَمَّدًا رَسُولَ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ وَأَمَّا رَبُّنَّامُ
تَرَاهُمْ زَعَامَةً فَإِنِ ابْتِغَوْا نَفْسًا مِنَّا فَذَلِكُمُ اللَّهُ رَضُوا أَنَا نُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ
وَعُوذُهُمْ مِنَ اتِّرَابِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُ قَوْمٍ أَتَوْا بِتُورٍ وَنُوحٍ فِي
الْأَنْجِيلِ يَكْفُرُونَ أُولَئِكَ نَمُكِّدُهُمْ فِي أَعْيُنِنَا فَاصْبِرْ لِحُكْمِ اللَّهِ
عَلَىٰ سَوْقِهِ يُحْيِي الرُّبَاةَ لِيُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَأَعَدَّ اللَّهُ لِلَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ۝

تعالیٰ کافی ہے گو ابھی دینے والا۔ (۲۸)
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ
ہیں کافروں پر سخت ہیں آپس میں رحمدل ہیں، تو انہیں دیکھے
گا کہ رکوع اور سجدے کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل اور
رضامندی کی جستجو میں ہیں، ان کا نشان ان کے چروں پر
سجدوں کے اثر سے ہے، ان کی یہی مثال تورات میں ہے
اور ان کی مثال انجیل میں ہے،^(۱) مثل اس کھیتی کے
جس نے اپنا کھو انکا^(۲) پھر اسے مضبوط کیا اور وہ موٹا ہو گیا
پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہو گیا اور کسانوں کو خوش کرنے
لگا^(۳) تاکہ ان کی وجہ سے کافروں کو چڑائے،^(۴) ان ایمان
والوں اور نیک اعمال والوں سے اللہ نے بخشش کا اور بہت
بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ (۲۹)^(۵)

ماوی غلبہ ممکن ہے بشرطیکہ مسلمان، مسلمان بن جائیں ﴿وَإِنَّكُمْ لَآتُونَ إِنْ لُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (آل عمران ۱۳۹) یہ دین
غالب ہونے کے لیے ہی آیا ہے، مغلوب ہونے کے لیے نہیں۔

(۱) انجیل پر وقف کی صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ ان کی یہ خوبیاں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ ان کی یہی خوبیاں
تورات و انجیل میں مذکور ہیں۔ اور آگے کززع میں اس سے پہلے ہُنْ مَحْذُوف ہو گا۔ اور بعض فِي التَّوْرَةِ پر وقف کرتے
ہیں یعنی ان کی مذکورہ صفت تورات میں ہے اور ﴿مَثَلُ قَوْمٍ أَتَوْا بِتُورٍ وَنُوحٍ فِي التَّوْرَةِ﴾ کے ساتھ ملاتے ہیں۔ یعنی انجیل میں
ان کی مثال، مانند اس کھیتی کے ہے۔ (فتح القدر)

(۲) شَطَاةً سے پودے کا وہ پہلا طور ہے جو دانہ پھاڑ کر اللہ کی قدرت سے باہر نکلتا ہے۔

(۳) یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مثال بیان فرمائی گئی ہے۔ ابتدا میں وہ قلیل تھے، پھر زیادہ اور مضبوط ہو گئے، جیسے کھیتی،
ابتدا میں کمزور ہوتی ہے، پھر دن بدن قوی ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ مضبوط تھے پر وہ قائم ہو جاتی ہے۔

(۴) یا کافر غیظ و غضب میں مبتلا ہوں۔ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بڑھتا ہوا اثر و نفوذ اور ان کی روز افزوں قوت و طاقت،
کافروں کے لیے غیظ و غضب کا باعث تھی، اس لیے کہ اس سے اسلام کا دائرہ پھیل رہا اور کفر کا دائرہ سمٹ رہا تھا۔ اس
آیت سے استدلال کرتے ہوئے بعض ائمہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض و عناد رکھنے والوں کو کافر قرار دیا ہے۔ علاوہ
انہیں اس فرقہ ضالہ کے دیگر عقائد بھی ان کے کفر پر ہی دال ہیں۔

(۵) اس پوری آیت کا ایک ایک جز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت و فضیلت، اخروی مغفرت اور اجر عظیم کو واضح کر رہا

سورۃ حجرات مدنی ہے اور اس میں اٹھارہ آیتیں اور دو رکوع ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْبَلُوْا مَوَابِيْعَ يَدِيْ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِٖ
وَ اتَقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ①

اے ایمان والے لوگو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو^(۱) اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سنے والا جاننے والا ہے۔ (۱)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ
وَ لَا تَجْهَرُوْا اِلَيْهِ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ
اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ②

اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اوپر نہ کرو اور نہ ان سے اونچی آواز سے بات کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں (ایسا نہ ہو کہ) تمہارے اعمال اکارت جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ (۲)

ہے، اس کے بعد بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان میں شک کرنے والا مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے تو اسے کیوں کر دعوائے مسلمانی میں سچا سمجھا جا سکتا ہے؟

☆ یہ طویل مفصل میں پہلی سورت ہے۔ حجرات سے نازعات تک کی سورتیں طَوَالٌ مُفَصَّلٌ کہلاتی ہیں۔ بعض نے سورۃ ق کو پہلی سورت قرار دیا ہے۔ (ابن کثیر و فتح القدیر) ان کا فجر کی نماز میں پڑھنا مسنون و مستحب ہے اور عس سے سورۃ الشمس تک اَوْسَاطٌ مُفَصَّلٌ اور سورۃ ضحیٰ سے والناس تک قِصَاصٌ مُفَصَّلٌ ہیں۔ ظہر اور عشا میں اوساط اور مغرب میں قصار پڑھنی مستحب ہیں (الیر القاسمیر)

(۱) اس کا مطلب ہے کہ دین کے معاملے میں اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہ کرو نہ اپنی سمجھ اور رائے کو ترجیح دو، بلکہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو۔ اپنی طرف سے دین میں اضافہ یا بدعات کی ایجاد، اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے کی ناپاک جسارت ہے جو کسی بھی صاحب ایمان کے لائق نہیں۔ اسی طرح کوئی فتویٰ، قرآن و حدیث میں غور و فکر کے بغیر نہ دیا جائے اور دینے کے بعد اگر اس کا نقص شرعی کے خلاف ہونا واضح ہو جائے تو اس پر اصرار بھی اس آیت میں دینے گئے حکم کے منافی ہے۔ مومن کی شان تو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے سامنے سر تسلیم و اطاعت خم کر دینا ہے نہ کہ ان کے مقابلے میں اپنی بات پر یا کسی امام کی رائے پر اڑے رہنا۔

(۲) اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس ادب و تعظیم اور احترام و تکریم کا بیان ہے جو ہر مسلمان سے مطلوب ہے۔ پہلا ادب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں جب تم آپس میں گفتگو کرو تو تمہاری آواز نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے

إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَئِكَ
الَّذِينَ امْتَنَّ اللَّهُ قُلُوبَهُمُ لِلتَّقْوَى لِيُفَكِّرُوا بِهِمْ مَغْفِرَةً
وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۲۹﴾

إِنَّ الَّذِينَ ينادونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ
لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۰﴾

وَأُولَئِكَ هُمْ صَرُوفٌ أَسْمَى تَضَرُّعًا إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ
وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۳۱﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ

بیشک جو لوگ رسول اللہ (ﷺ) کے حضور میں اپنی
آوازیں پست رکھتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں
کو اللہ نے پرہیزگاری کے لیے جانچ لیا ہے۔ ان کے لیے
مغفرت ہے اور بڑا ثواب ہے۔ (۱) (۳)

جو لوگ آپ کو حجروں کے پیچھے سے پکارتے ہیں ان میں
سے اکثر بالکل بے عقل ہیں۔ (۲) (۴)
اگر یہ لوگ یہاں تک صبر کرتے کہ آپ خود سے نکل کر
ان کے پاس آجاتے تو یہی ان کے لیے بہتر ہوتا، (۳) اور
اللہ غفور و رحیم ہے۔ (۵) (۵)

اے مسلمانو! اگر تمہیں کوئی فاسق خبر دے تو تم اس کی
اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو (۵) ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی

و سلم کی آواز سے بلند نہ ہو۔ دو سرا ادب؛ جب خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام کرو تو نہایت وقار اور سکون سے کرو،
اس طرح اونچی اونچی آواز سے نہ کرو جس طرح تم آپس میں بے تکلفی سے ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہو۔ بعض نے
کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یا محمد، یا احمد نہ کہو بلکہ ادب سے یا رسول اللہ کہہ کر خطاب کرو اگر ادب و احترام کے
ان تقاضوں کو ملحوظ نہ رکھو گے تو بے ادبی کا احتمال ہے جس سے بے شعوری میں تمہارے عمل برباد ہو سکتے ہیں اس آیت
کی شان نزول کے لیے دیکھئے صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الحجرات، تاہم حکم کے اعتبار سے یہ عام ہے۔
(۱) اس میں ان لوگوں کی تعریف ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و جلالت کا خیال رکھتے ہوئے اپنی
آوازیں پست رکھتے تھے۔

(۲) یہ آیت قبیلہ بنو تمیم کے بعض اعرابیوں (گنوار قسم کے لوگوں) کے بارے میں نازل ہوئی، جنہوں نے ایک روز دو پہر
کے وقت، جو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قیلو لے کا وقت تھا، حجرے سے باہر کھڑے ہو کر عامیانہ انداز سے یا محمد یا محمد کی
آوازیں لگائیں تاکہ آپ ﷺ باہر تشریف لے آئیں۔ (مسند احمد ۳/ ۶۰۳۸۸ - ۶۰۳۹۳) اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ان کی
اکثریت بے عقل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان اور آپ ﷺ کے ادب و احترام
کے تقاضوں کا خیال نہ رکھنا، بے عقلی ہے۔

(۳) یعنی آپ ﷺ کے نکلنے کا انتظار کرتے اور آپ ﷺ کو نہ دینے میں جلد بازی نہ کرتے تو دین و دنیا دونوں لحاظ سے بہتر ہوتا۔

(۴) اس لیے مؤاخذہ نہیں فرمایا بلکہ آئندہ کے لیے ادب و تعظیم کی تاکید بیان فرمادی۔

(۵) یہ آیت اکثر مفسرین کے نزدیک حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جنہیں رسول اللہ صلی

قوم کو ایذا پہنچا دو پھر اپنے کیے پر پشیمانی اٹھاؤ۔ (۶)
 اور جان رکھو کہ تم میں اللہ کے رسول موجود ہیں، (۱) اگر
 وہ تمہارا کہا کرتے رہے بہت امور میں، تو تم مشکل میں پڑ
 جاؤ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارے لئے محبوب بنا دیا
 ہے اور اسے تمہارے دلوں میں زینت دے رکھی ہے
 اور کفر کو اور گناہ کو اور نافرمانی کو تمہاری نگاہوں میں
 ناپسندیدہ بنا دیا ہے، یہی لوگ راہ یافتہ ہیں۔ (۷)
 اللہ کے احسان و انعام سے (۲) اور اللہ دانا اور باحکمت
 ہے۔ (۸)

اور اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان
 میں میل ملاپ کر دیا کرو۔ (۳) پھر اگر ان دونوں میں سے

تُصِيبُوا قَوْمًا بِمِآثِمِهِمْ لَمْ يَأْتِكُمْ رُسُومُ اللَّهِ لِيُظَاهِرَكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ
 لَعَلَّكُمْ تَهْتَكُونَ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبِيبُ الْإِيمَانِ وَذَرِيَّتِي فِي قُلُوبِكُمْ
 وَكَرَّهَتْ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَئِكَ
 هُمُ الرَّشِيدُونَ ۝

فَضَلَّ مِنَ اللَّهِ وَفِعْمَةٍ وَاللَّهُ جَلِيلٌ حَكِيمٌ ۝

وَكَانَ طَلَامِعَتَيْنِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ إِقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا إِنَّهُمْ

اللہ علیہ وسلم نے بنوا المصطلق کے صدقات وصول کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ لیکن انہوں نے آکریوں ہی رپورٹ دے دی
 کہ انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے جس پر آپ ﷺ نے ان کے خلاف فوج کشی کا ارادہ فرمایا، تاہم پھر یہ
 لگ گیا کہ یہ بات غلط تھی اور ولید بن ہبیرہ تو وہاں گئے ہی نہیں۔ لیکن سند اور امرواقتہ دونوں اعتبار سے یہ روایت صحیح
 نہیں ہے۔ اس لیے اسے ایک صحابی رسول ﷺ پر چسپاں کرنا صحیح نہیں ہے۔ تاہم شان نزول کی بحث سے قطع نظر اس
 میں ایک نہایت ہی اہم اصول بیان فرمایا گیا ہے جس کی انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر نہایت اہمیت ہے۔ ہر فرد اور
 ہر حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کے پاس جو بھی خبر یا اطلاع آئے بالخصوص بد کردار، فاسق اور مفسد قسم کے لوگوں
 کی طرف سے، تو پہلے اس کی تحقیق کی جائے تاکہ غلط فہمی میں کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہو۔

(۱) جس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی تعظیم اور اطاعت کرو، اس لیے کہ وہ تمہارے مصالح زیادہ بہتر جانتے ہیں، کیونکہ ان پر
 وحی اترتی ہے۔ پس تم ان کے پیچھے چلو، ان کو اپنے پیچھے چلانے کی کوشش مت کرو۔ اس لیے کہ اگر وہ تمہاری پسند کی
 باتیں ماننا شروع کر دیں تو اس سے تم خود ہی زیادہ مشقت میں پڑ جاؤ گے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَلَوْ كُنَّا فَاعِلِينَ
 لَقَدَدْتِ الْمَمْلُوكَ وَالْأَرْضَ وَمَنْ فِيهَا﴾ (المؤمنون، ۷۱)

(۲) یہ آیت بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت، ان کے ایمان اور ان کے رشد و ہدایت پر ہونے کی واضح دلیل ہے۔
 وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ۔

(۳) اور اس صلح کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں قرآن و حدیث کی طرف بلایا جائے یعنی ان کی روشنی میں ان کے اختلاف کا
 حل تلاش کیا جائے۔

ایک جماعت دوسری جماعت پر زیادتی کرے تو تم (سب) اس گروہ سے جو زیادتی کرتا ہے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے،^(۱) اگر لوٹ آئے تو پھر انصاف کے ساتھ صلح کرا دو^(۲) اور عدل کرو بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔^(۳) (۹)

(یاد رکھو) سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں پس اپنے دو بھائیوں میں ملاپ کرا دیا کرو،^(۴) اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔^(۵) (۱۰)

فَلَنْ يَبْتَغِيَ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْآخَرَىٰ فَعَالُوا الْبِرَّ تَتَّبِعُوا حَتَّىٰ تَتَّبِعُوا
إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَازْتُمْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝

(۱) یعنی اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کے مطابق اپنا اختلاف دور کرنے پر آمادہ نہ ہو، بلکہ بغاوت کی روش اختیار کرے تو دوسرے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ سب مل کر بغاوت کرنے والے گروہ سے لڑائی کریں تاکہ وہ اللہ کے حکم کو ماننے کے لیے تیار ہو جائے۔

(۲) یعنی باغی گروہ، بغاوت سے باز آجائے تو پھر عدل کے ساتھ یعنی قرآن و حدیث کی روشنی میں دونوں گروہوں کے درمیان صلح کرا دی جائے۔

(۳) اور ہر معاملے میں انصاف کرو، اس لیے کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے اور اس کی یہ پسند اس بات کو مستلزم ہے کہ وہ انصاف کرنے والوں کو بہترین جزا سے نوازے گا۔

(۴) یہ بیچنے کے حکم کی ہی تاکید ہے۔ یعنی جب مومن سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، تو ان سب کی اصل ایمان ہوئی۔ اس لیے اس اصل کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ ایک ہی دین پر ایمان رکھنے والے آپس میں نہ لڑیں بلکہ ایک دوسرے کے دست و بازو، ہمدرد و غم گسار اور مونس و خیر خواہ بن کر رہیں۔ اور کبھی غلط فہمی سے ان کے درمیان بعد اور نفرت پیدا ہو جائے تو اسے دور کر کے انہیں آپس میں دوبارہ جوڑ دیا جائے۔ (مزید دیکھیے سورہ توبہ، آیت ۱۱۱ کا حاشیہ)۔

(۵) اور ہر معاملے میں اللہ سے ڈرو، شاید اس کی وجہ سے تم اللہ کی رحمت کے مستحق قرار پا جاؤ۔ (ترجمی امید والی بات) مخاطب کے اعتبار سے ہے۔ ورنہ اللہ کی رحمت تو اہل ایمان و تقویٰ کے لیے یقینی ہے۔

اس آیت میں باغی گروہ سے قتال کا حکم ہے دراصل حالیکہ حدیث میں مسلمان سے قتال کو کفر کہا گیا ہے۔ تو یہ کفر اس وقت ہو گا جب بلا وجہ مسلمان سے قتال کیا جائے۔ لیکن اس قتال کی بنیاد اگر بغاوت ہے تو یہ قتال نہ صرف جائز ہے بلکہ اس کا حکم دیا گیا ہے جو تاکید و استہباب پر دال ہے۔ اسی طرح باغی گروہ کو قرآن نے مومن ہی قرار دیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ صرف بغاوت سے، جو کبیرہ گناہ ہے، وہ گروہ ایمان سے خارج نہیں ہو گا۔ جیسا کہ خوارج اور بعض معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ مرتکب کبائر ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ اب بعض نہایت اہم اخلاقی ہدایات مسلمانوں کو دی جا رہی ہیں۔

اے ایمان والو! مرد دوسرے مردوں کا مذاق نہ اڑائیں ممکن ہے کہ یہ ان سے بہتر ہو اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں ممکن ہے کہ یہ ان سے بہتر ہوں،^(۱) اور آپس میں ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ^(۲) اور نہ کسی کو برے لقب دو۔^(۳) ایمان کے بعد فسق برانام ہے،^(۴) اور جو توبہ نہ کریں وہی ظالم لوگ ہیں۔^(۵)

اے ایمان والو! بہت بدگمانیوں سے بچو یقین مانو کہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔^(۵) اور بھید نہ ٹھولا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ خَفَوْهُ مِنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا تَلْمِزُوا الَّذِينَ آمَنُوا عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَرُوا بِاللِّقَابِ يُؤْمِنُ بِالْإِسْلَامِ الْقَسْوُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَنْ لَمْ يُبْتَغْ قَادِلِيكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ⑤

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ

(۱) ایک شخص دوسرے کسی شخص کا استہزا یعنی اس سے مسخرپن اسی وقت کرتا ہے جب وہ اپنے کو اس سے بہتر اور اس کو اپنے سے حقیر اور کمتر سمجھتا ہے۔ حالانکہ اللہ کے ہاں ایمان و عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے اور کون نہیں؟ اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ اس لیے اپنے کو بہتر اور دوسرے کو کم تر سمجھنے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے۔ بنا بریں آیت میں اس سے منع فرما دیا گیا ہے اور کہتے ہیں کہ عورتوں میں یہ اخلاقی بیماری زیادہ ہوتی ہے اس لیے عورتوں کا الگ ذکر کر کے انہیں بھی بطور خاص اس سے روک دیا گیا ہے۔ اور حدیث رسول ﷺ میں لوگوں کے حقیر سمجھنے کو کبر سے تعبیر کیا گیا ہے التَّكْبُرُ بَطْرُ الْحَقِّ وَعَمَظُ النَّاسِ (ابوداؤد کتاب اللباس باب ما جاء في الكبر) اور کبر اللہ کو نہایت ہی ناپسند ہے۔

(۲) یعنی ایک دوسرے پر طعنہ زنی مت کرو، مثلاً تو تو فلاں کا بیٹا ہے، تیری ماں ایسی ویسی ہے، تو فلاں خاندان کا ہے نا وغیرہ۔ (۳) یعنی اپنے طور پر استہزا اور تحقیر کے لیے لوگوں کے ایسے نام رکھ لینا جو انہیں ناپسند ہوں۔ یا اچھے بھلے ناموں کو بگاڑ کر بولنا، یہ تنابز بالا لقاب ہے، جس کی یہاں ممانعت کی گئی ہے۔

(۴) یعنی اس طرح نام بگاڑ کر یا برے نام تجویز کر کے بلانا یا قبول اسلام اور توبہ کے بعد اسے سابقہ دین یا گناہ کی طرف منسوب کر کے خطاب کرنا، مثلاً اے کافر، اے زانی یا شرابی وغیرہ، یہ بہت برا کام ہے۔ الاِسْمُ مِمَّا الذَّكْرُ کے معنی میں ہے یعنی بِسْمِ الْإِسْمِ الَّذِي يُذَكَّرُ بِالْفِسْقِ بَعْدَ دُخُولِهِمْ فِي الْإِيمَانِ (فتح القدير) البتہ اس سے بعض وہ صفاتی نام بعض حضرات کے نزدیک مستثنیٰ ہیں جو کسی کے لیے مشہور ہو جائیں اور وہ اس پر اپنے دل میں رنج بھی محسوس نہ کریں، جیسے لنگڑے پن کی وجہ سے کسی کا نام لنگڑا پڑ جائے۔ کالے رنگ کی بنا پر کالی یا کالو مشہور ہو جائے۔ وغیرہ (القرطبي)

(۵) ظنُّ کے معنی ہیں گمان کرنا۔ مطلب ہے کہ اہل خیر و اہل اصلاح و تقویٰ کے بارے میں ایسے گمان رکھنا جو بے اصل ہوں اور تمہارا افتراء کے ضمن میں آتے ہوں اسی لیے اس کا ترجمہ بدگمانی کیا جاتا ہے۔ اور حدیث میں اس کو أَخَذْتُ الْحَدِيثِ (سب سے بڑا جھوٹ) کہہ کر اس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ (البخاری، کتاب الأدب، باب بَأْيُهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ - صحيح مسلم، كتاب البر، باب تحريم الظن والتجسس)

کرو^(۱) اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت کرے۔^(۲) کیا تم میں سے کوئی بھی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے؟ تم کو اس سے گھن آئے گی،^(۳) اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ (۱۴)

اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک (ہی) مرد و عورت سے پیدا کیا ہے^(۴) اور اس لیے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو گے اور قبیلہ بنا دیئے^(۵) ہیں، اللہ کے نزدیک تم سب

إِنَّكُمْ وَأَنْتُمْ مَسْجُودٌ وَلَا تَعْبُدُوا بَعْضَكُمْ بَعْضًا أَيُّبْتُ أَحَدُكُمْ بِأَخِي تَأْكُلُ لَحْمَ أَخِيهِ مِثْلًا لَكَرْهُتُمْوهُ وَأَتَعُوهُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ ﴿۱۴﴾

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿۱۴﴾

ور نہ فسق و فجور میں مبتلا لوگوں سے ان کے گناہوں کی وجہ سے اور ان کے گناہوں پر بدگمانی رکھنا، یہ وہ بدگمانی نہیں ہے جسے یہاں گناہ کہا گیا ہے اور اس سے اجتناب کی تاکید کی گئی ہے۔ إِنَّ الظَّنَّ القَبِيحَ بِمَنْ ظَاهِرُهُ النَّخِيرُ، لَا يَجُوزُ، وَإِنَّهُ لَا حَرَجَ فِي الظَّنِّ القَبِيحِ بِمَنْ ظَاهِرُهُ القَبِيحُ (القرطبی)

(۱) یعنی اس ٹوہ میں رہنا کہ کوئی غامی یا عیب معلوم ہو جائے تاکہ اسے بدنام کیا جائے، یہ تجسس ہے جو منع ہے اور حدیث میں بھی اس سے منع کیا گیا ہے۔ بلکہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر کسی کی غامی، کوتاہی تمہارے علم میں آجائے تو اس کی پردہ پوشی کرو۔ نہ کہ اسے لوگوں کے سامنے بیان کرتے پھرو، بلکہ جستجو کر کے عیب تلاش کرو۔ آج کل حریت اور آزادی کا بڑا چرچا ہے۔ اسلام نے بھی تجسس سے روک کر انسان کی حریت اور آزادی کو تسلیم کیا ہے لیکن اس وقت تک جب تک وہ کھلے عام بے حیائی کا ارتکاب نہ کرے یا جب تک دو سروں کے لیے ایذا کا باعث نہ ہو۔ مغرب نے مطلق آزادی کا درس دے کر لوگوں کو فساد عام کی اجازت دے دی ہے جس سے معاشرے کا تمام امن و سکون برباد ہو گیا ہے۔

(۲) غیبت کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کے سامنے کسی کی برائیوں اور کوتاہیوں کا ذکر کیا جائے جسے وہ برا سمجھے اور اگر اس کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جائیں جو اس کے اندر موجود ہی نہیں ہیں تو وہ بہتان ہے۔ اپنی اپنی جگہ دونوں ہی بڑے جرم ہیں۔

(۳) یعنی کسی مسلمان بھائی کی کسی کے سامنے برائی بیان کرنا ایسے ہی ہے جیسے مردار بھائی کا گوشت کھانا۔ مردار بھائی کا گوشت کھانا تو کوئی پسند نہیں کرتا۔ لیکن غیبت لوگوں کی نہایت مرغوب غذا ہے۔

(۴) یعنی آدم و حوا علیہما السلام سے۔ یعنی تم سب کی اصل ایک ہی ہے ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہو۔ مطلب ہے کسی کو محض خاندان اور نسب کی بنا پر فخر کرنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ سب کا نسب حضرت آدم علیہ السلام سے ہی جا کر ملتا ہے۔

(۵) شُعُوبٌ، شَعْبٌ کی جمع ہے۔ برادری یا بڑا قبیلہ، شعب کے بعد قبیلہ، پھر عمارہ، پھر بطن، پھر فیصلہ اور پھر عشیرہ ہے (فتح القدر) مطلب یہ ہے کہ مختلف خاندانوں، برادریوں اور قبیلوں کی تقسیم محض تعارف کے لیے ہے۔ تاکہ آپس میں

میں سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔^(۱)

یقین مانو کہ اللہ وانا اور باخبر ہے۔ (۱۳)

دیہاتی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ آپ کہہ دیجئے کہ درحقیقت تم ایمان نہیں لائے لیکن تم یوں کہو کہ ہم اسلام لائے (مخالفت چھوڑ کر مطیع ہو گئے) حالانکہ ابھی تک تمہارے دلوں میں ایمان داخل ہی نہیں ہوا۔^(۲) تم اگر اللہ کی اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرنے لگو گے تو اللہ تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہ کرے گا۔

پیشک اللہ بخشے والا مہربان ہے۔ (۱۴)

مومن تو وہ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر (پکا) ایمان لائیں پھر شک و شبہ نہ کریں اور اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہیں؛ (اپنے دعوئے ایمان میں) یہی سچے اور راست گو ہیں۔^(۳) (۱۵) کہہ دیجئے! کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کو اپنی دینداری سے

قَالَ الْكَرْبُ امْتًا قُلْ تَتَّقُونُوا وَلَكِنْ قُولُوا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِي قُلُوْبِكُمْ وَاَنْ تُطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلُمَكُمْ مِنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ عَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵﴾

اِيْمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ ثُمَّ لَمْ يَزَالُوْا وَّجِهًا وَّآيَا مَوْءِيْهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُوْلٰئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾

قُلْ اَعْلَمُوْنَ اللّٰهَ يَدِيْنُكُمْ وَاَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ السَّمٰوٰتِ

صلہ رحمی کر سکو۔ اس کا مقصد ایک دوسرے پر برتری کا اظہار نہیں ہے۔ جیسا کہ بد قسمتی سے حسب و نسب کو برتری کی بنیاد بنا لیا گیا ہے۔ حالانکہ اسلام نے آکر اسے مٹایا تھا اور اسے جاہلیت سے تعبیر کیا تھا۔

(۱) یعنی اللہ کے ہاں برتری کا معیار خاندان، قبیلہ اور نسل و نسب نہیں ہے جو کسی انسان کے اختیار میں ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ معیار تقویٰ ہے جس کا اختیار کرنا انسان کے ارادہ و اختیار میں ہے۔ یہی آیت ان علما کی دلیل ہے جو نکاح میں کفالت نسب کو ضروری نہیں سمجھتے اور صرف دین کی بنیاد پر نکاح کو پسند کرتے ہیں (ابن کثیر)

(۲) بعض مفسرین کے نزدیک ان اعراب سے مراد بنو اسد اور خزیمہ کے منافقین ہیں جنہوں نے قحط سالی میں محض صدقات کی وصولی کے لیے یا قتل ہونے اور قیدی بننے کے اندیشے کے پیش نظر زبان سے اسلام کا اظہار کیا تھا۔ ان کے دل ایمان، اعتقاد صحیح اور خلوص نیت سے خالی تھے (فتح القدیر) لیکن امام ابن کثیر کے نزدیک ان سے وہ اعراب (بادیہ نشین) مراد ہیں جو نئے مسلمان ہوئے تھے اور ایمان ابھی ان کے اندر پوری طرح راسخ نہیں ہوا تھا۔ لیکن دعویٰ انہوں نے اپنی اصل حیثیت سے بڑھ کر ایمان کا کیا تھا۔ جس پر انہیں یہ ادب سکھایا گیا کہ پہلے مرتبے پر ہی ایمان کا دعویٰ صحیح نہیں۔ آہستہ آہستہ ترقی کے بعد تم ایمان کے مرتبے پر پہنچو گے۔

(۳) نہ کہ وہ جو صرف زبان سے اسلام کا اظہار کر دیتے ہیں اور مذکورہ اعمال کا سرے سے کوئی اہتمام ہی نہیں کرتے۔

وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللَّهُ بِحَيْثُ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

آگاہ کر رہے ہو،^(۱) اللہ ہر اس چیز سے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے بخوبی آگاہ ہے۔ اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔^(۲) (۱۶)

اپنے مسلمان ہونے کا آپ پر احسان جتاتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اپنے مسلمان ہونے کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ دراصل اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت کی اگر تم راست گو ہو۔^(۳) (۱۷)

یقین مانو کہ آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتیں اللہ خوب جانتا ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اسے اللہ خوب دیکھ رہا ہے۔ (۱۸)

يَتُوبُونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا قُلْ لَا تَمُوتُوا عَلَىٰ إِسْلَامِكُمْ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بَصِيرًا تَعْمَلُونَ ۝

سورہ ق کی ہے اور اس میں پینتالیس آیتیں اور تین رکوع ہیں۔

سُورَةُ ق

(۱) تعلیم، یہاں اعلام اور اخبار کے معنی میں ہے۔ یعنی آئنا کہہ کر تم اللہ کو اپنے دین و ایمان سے آگاہ کر رہے ہو؟ یا اپنے دلوں کی کیفیت اللہ کو بتا رہے ہو؟

(۲) تو کیا تمہارے دلوں کی کیفیت پر یا تمہارے ایمان کی حقیقت سے وہ آگاہ نہیں؟

(۳) یہی اعراب نبی ﷺ کو کہتے کہ دیکھو ہم مسلمان ہو گئے اور آپ ﷺ کی مدد کی، جب کہ دوسرے عرب آپ ﷺ سے سرریکا رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرماتے ہوئے فرمایا، تم اللہ پر اسلام لانے کا احسان مت جتلاؤ، اس لیے کہ اگر تم اخلاص سے مسلمان ہوئے ہو تو اس کا فائدہ تمہیں ہی ہو گا، نہ کہ اللہ کو۔ اس لیے یہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں قبول اسلام کی توفیق دے دی نہ کہ تمہارا احسان اللہ پر ہے۔

☆ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید کی نماز میں سورہ ق اور أَفْتَرَبْتِ السَّاعَةَ پڑھا کرتے تھے۔ (صحیح مسلم، باب ما یقرأ بہ فی صلاة العیدین) ہر جمعے کے خطبے میں بھی پڑھتے تھے (صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبۃ) امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ عیدین اور جمعے میں پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ بڑے مجمعوں میں یہ سورت پڑھا کرتے تھے، کیونکہ اس میں ابتدائے خلق، بعث و نشور، معاد و قیام، حساب، جنت دوزخ، ثواب و عتاب اور ترغیب و ترہیب کا بیان ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

قَالَ وَالْقُرْآنَ الْمَجِیْدَ ۝۱

بَلْ عَجِبُوْا اَنْ جَاءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ

هُدٰى سَمِیْعٌ عَجِیْبٌ ۝۲

ق! بہت بڑی شان والے اس قرآن کی قسم ہے۔ (۱)

بلکہ انہیں تعجب معلوم ہوا کہ ان کے پاس انہی میں سے ایک آگاہ کرنے والا آیا تو کافروں نے کہا کہ یہ ایک عجیب

چیز ہے۔ (۲)

کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے۔ پھر یہ واپسی دور (از

عقل) ہے۔ (۳)

زمین جو کچھ ان میں سے گھٹاتی ہے وہ ہمیں معلوم ہے

اور ہمارے پاس سب یاد رکھنے والی کتاب ہے۔ (۴)

بلکہ انہوں نے سچی بات کو جھوٹ کہا ہے جبکہ وہ ان کے

پاس پہنچ چکی ہیں وہ ایک الجھاؤ میں پڑ گئے ہیں۔ (۵)

مَلَاۤءِ اٰمِنًا وَاٰتٰىرًاۤ اَبَآءَ ذٰلِكَ رَجَعُوْاۤ اَعْبٰدٌ ۝۳

فَاَنْ عَلِمْنَا مَا يَلْمُزُۤا الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حٰفِیْظٌ ۝۴

بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَمَنْ یُّؤْتِرُهُمْ ۝۵

(۱) اس کا جواب قسم محذوف ہے لَتُبْعَثُنَّ (تم ضرور قیامت والے دن اٹھائے جاؤ گے) بعض کہتے ہیں اس کا جواب

بالمعاد کا مضمون کلام ہے جس میں نبوت اور معاد کا اثبات ہے۔ (فتح القدر و ابن کثیر)

(۲) حالانکہ اس میں کوئی تعجب والی بات نہیں ہے۔ ہر نبی اسی قوم کا ایک فرد ہوتا تھا جس میں اسے مبعوث کیا جاتا تھا۔

اسی حساب سے قریش مکہ کو ڈرانے کے لیے قریش ہی میں سے ایک شخص کو نبوت کے لیے چن لیا گیا۔

(۳) حالانکہ عقلی طور پر اس میں بھی کوئی استحالہ نہیں ہے۔ آگے اس کی کچھ وضاحت ہے۔

(۴) یعنی زمین انسان کے گوشت، ہڈی اور بال وغیرہ کو بوسیدہ کر کے کھا جاتی ہے یعنی اسے ریزہ ریزہ کر دیتی ہے وہ نہ

صرف ہمارے علم میں ہے بلکہ ہمارے پاس لوح محفوظ میں بھی درج ہے۔ اس لیے ان تمام اجزا کو جمع کر کے انہیں دوبارہ

زندہ کر دینا ہمارے لیے قطعاً مشکل امر نہیں ہے۔

(۵) حَقُّ (سچی بات) سے مراد قرآن، اسلام یا نبوت محمدیہ ہے، مفہوم سب کا ایک ہی ہے تریج کے معنی مختلط، مضطرب یا

ملبتس کے ہیں۔ یعنی ایسا معاملہ جو ان پر مشتبہ ہو گیا ہے، جس سے وہ ایک الجھاؤ میں پڑ گئے ہیں، کبھی اسے جاودہ کر کہتے

ہیں، کبھی شاعر اور کبھی کاہن۔

کیا انہوں نے آسمان کو اپنے اوپر نہیں دیکھا؟ کہ ہم نے اسے کس طرح بنایا ہے^(۱) اور زمینت دی ہے^(۲) اس میں کوئی شکاف نہیں۔^(۳) (۶)

اور زمین کو ہم نے بچھا دیا ہے اور اس میں ہم نے پہاڑ ڈال دیئے ہیں اور اس میں ہم نے قسم قسم کی خوشنما چیزیں اگادی ہیں۔^(۴) (۷)

تاکہ ہر رجوع کرنے والے بندے کے لیے بینائی اور دانائی کا ذریعہ ہو۔^(۵) (۸)

اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی برسایا اور اس سے باغات اور کٹنے والے کھیت کے غلے پیدا کیے۔^(۶) (۹)

اور کھجوروں کے بلند وبالاد رخت جن کے خوشے تہ بہ تہ ہیں۔^(۷) (۱۰)

أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ ۝

وَالْأَرْضِ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَواسِيَ وَأَجْمَعْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ ثَمَرٍ ثُمَّ يَجْحَدُونَ ۝

بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ ۝

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبَارَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ جِبْتًا وَحَبَّ الْعَسِيِّدِ ۝

وَالنَّخْلَ حَلِيقًا لَهَا طَلْعٌ نَضِيدٌ ۝

(۱) یعنی بغیر ستون کے، جن کا اسے کوئی سہارا ہو۔

(۲) یعنی ستاروں سے اسے مزین کیا۔

(۳) اسی طرح کوئی فرق و تفاوت بھی نہیں ہے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا۔ ﴿الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا مَا تَرَى فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفَوتٍ فَإِنَّهُمْ بَصَرُهُمْ الَّذِي بَدَّلُوا وَجْهًا وَلَا لِيَهُمْ تَعَلُّفٌ * ثُمَّ انْصَبِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبُ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيدٌ﴾
المملک۔ ۳-۲

(۴) اور بعض نے زوج کے معنی جوڑا کیے ہیں۔ یعنی ہر قسم کی نباتات اور اشیا کو جوڑا جوڑا (نرا اور مادہ) بنایا ہے۔ بہنج کے معنی، خوش منظر، شاداب اور حسین۔

(۵) یعنی آسمان و زمین کی تخلیق اور دیگر اشیا کا مشاہدہ اور ان کی معرفت ہر اس شخص کے لیے بصیرت و دانائی اور عبرت و نصیحت کا باعث ہے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہے۔

(۶) کٹنے والے غلے سے مراد وہ کھیتیاں ہیں، جن سے گندم، مکئی، جوار، باجرہ، دالیں اور چاول وغیرہ پیدا ہوتے ہیں اور پھر ان کا ذخیرہ کر لیا جاتا ہے۔

(۷) بَاسِقَاتٍ کے معنی طَوَّالًا شَاهِقَاتٍ، بلند وبالاطلع کھجور کا وہ گدرا گدرا پھل، جو پہلے پہل نکلتا ہے۔ نَضِيدٌ کے معنی تہ بہ تہ۔ باغات میں کھجور کا پھل بھی آجاتا ہے۔ لیکن اسے الگ سے بطور خاص ذکر کیا، جس سے کھجور کی وہ اہمیت واضح ہے جو عرب میں اسے حاصل ہے۔

يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَأَصْحَابُ الرَّيْسِ وَشَمُودُ ۝

وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ وَالْحَمَانَ لُوطُ ۝

وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ

فَقَحَقَّ وَجْهِي ۝

أَفَعَيَّبْنَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ۝

بندوں کی روزی کے لیے اور ہم نے پانی سے مردہ شہر کو

زندہ کر دیا۔ اسی طرح (قبروں سے) نکلنا ہے۔ (۱۱)

ان سے پہلے نوح کی قوم نے اور رس والوں نے اور
شمود نے۔ (۱۲)

اور عاد نے اور فرعون نے اور برادران لوط نے۔ (۱۳)

اور ایک (۱۳) والوں نے اور تبع کی قوم (۱۴) نے بھی تکذیب
کی تھی۔ سب نے پیغمبروں کو جھٹلایا (۱۵) پس میرا وعدہ
عذاب ان پر صادق آگیا۔ (۱۴)

کیا ہم پہلی بار کے پیدا کرنے سے تھک گئے؟ (۱۶) بلکہ یہ

(۱) یعنی جس طرح بارش سے مردہ زمین کو زندہ اور شاداب کر دیتے ہیں، اسی طرح قیامت والے دن ہم قبروں سے
انسانوں کو زندہ کر کے نکال لیں گے۔

(۲) أَصْحَابُ الرَّيْسِ کی تعین میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ امام ابن جریر طبری نے اس قول کو ترجیح دی ہے
جس میں انہیں اصحاب احدود قرار دیا گیا ہے، جس کا ذکر سورہ بروج میں ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے ابن کثیر فتح القدر،
سورۃ الفرقان آیت ۳۸)

(۳) أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ کے لیے دیکھئے سورۃ الشعراء آیت ۱۷۶ کا حاشیہ۔

(۴) قَوْمُ تَبَّعٍ کے لیے دیکھئے سورۃ الدخان آیت ۳۷ کا حاشیہ۔

(۵) یعنی ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے پیغمبر کو جھٹلایا۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے۔ گویا
آپ ﷺ کو کہا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ اپنی قوم کی طرف سے اپنی تکذیب پر غمگین نہ ہوں، اس لیے کہ یہ کوئی نئی
بات نہیں ہے، آپ ﷺ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی ان کی قوموں نے یہی معاملہ کیا۔ دوسرے اہل مکہ کو
تبئیہ ہے کہ پچھلی قوموں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی تو دیکھ لو ان کا کیا انجام ہوا؟ کیا تم بھی اپنے لیے یہی انجام
پسند کرتے ہو؟ اگر یہ انجام پسند نہیں کرتے تو تکذیب کا راستہ چھوڑ دو اور پیغمبر ﷺ پر ایمان لے آؤ۔

(۶) کہ قیامت والے دن دوبارہ پیدا کرنا ہمارے لیے مشکل ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ جب پہلی مرتبہ پیدا کرنا ہمارے لیے مشکل
نہیں تھا تو دوبارہ زندہ کرنا تو پہلی مرتبہ پیدا کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ۞ وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ
يُعِيدُهُمْ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ۝ (الروم، ۲۷) سورہ یسین آیت ۷۸-۷۹ میں بھی یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔ اور حدیث قدسی میں ہے۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ابن آدم یہ کہہ کر مجھے ایزد اپنچاتا ہے کہ اللہ مجھے ہرگز دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے جس طرح اس نے
پہلی مرتبہ مجھے پیدا کیا۔ حالانکہ پہلی مرتبہ پیدا کرنا دوسری مرتبہ پیدا کرنے سے زیادہ آسان نہیں ہے“ یعنی اگر مشکل ہے تو

لوگ نئی پیدائش کی طرف سے شک میں ہیں۔^(۱) (۱۵)
 ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں جو
 خیالات اٹھتے ہیں ان سے ہم واقف ہیں^(۲) اور ہم اس
 کی رگ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔^(۳) (۱۶)
 جس وقت دو لینے والے جا لیتے ہیں ایک دائیں طرف
 اور ایک بائیں طرف بیٹھا ہوا ہے۔ (۱۷)
 (انسان) منہ سے کوئی لفظ نکال نہیں پاتا مگر کہ اس کے
 پاس نگہبان تیار ہے۔^(۴) (۱۸)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ
 إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۝

إِذْ يَتَلَفَّى الثَّمَلَقِينَ مِنَ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَيْدٌ ۝

مَا يَكُوطُ مَنْ قَوْلِ الْإِلَهِ يُرَوِّبُ عَيْنَيْهِ ۝

پہلی مرتبہ پیدا کرنا نہ کہ دوسری مرتبہ (البخاری 'تفسیر سورۃ الإخلاص)

(۱) یعنی یہ اللہ کی قدرت کے منکر نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ انہیں قیامت کے وقوع اور اس میں دوبارہ زندگی کے بارے میں ہی شک ہے۔

(۲) یعنی انسان جو کچھ چھپاتا اور دل میں مستور رکھتا ہے، وہ سب ہم جانتے ہیں۔ وسوسہ، دل میں گزرنے والے خیالات کو کہا جاتا ہے جس کا علم اس انسان کے علاوہ کسی کو نہیں ہوتا۔ لیکن اللہ ان وسوسوں کو بھی جانتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے ”اللہ تعالیٰ نے میری امت سے دل میں گزرنے والے خیالات کو معاف فرما دیا ہے یعنی ان پر گرفت نہیں فرمائے گا۔ جب تک وہ زبان سے ان کا اظہار یا ان پر عمل نہ کرے۔“ (البخاری، کتاب الأیمان باب إذا حنت ناسیافی الأیمان مسلم، باب تجاوز اللہ عن حدیث النفس والخواطر بالقلب إذا لم تستقر)

(۳) وَرَبُّدٌ، شہ رگ یا رگ جان کو کہا جاتا ہے جس کے کٹنے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ رگ حلق کے ایک کنارے سے انسان کے کندھے تک ہوتی ہے۔ اس قرب سے مراد قرب علمی ہے یعنی علم کے لحاظ سے ہم انسان کے بالکل بلکہ اتنے قریب ہیں کہ اس کے نفس کی باتوں کو بھی جانتے ہیں۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ نَحْنُ سے مراد فرشتے ہیں۔ یعنی ہمارے فرشتے انسان کی رگ جان سے بھی قریب ہیں۔ کیونکہ انسان کے دائیں بائیں دو فرشتے ہر وقت موجود رہتے ہیں، وہ انسان کی ہر بات اور عمل کو نوٹ کرتے ہیں ﴿يَتَلَفَّى الثَّمَلَقِينَ﴾ کے معنی ہیں يَأْخُذَانِ وَيَبْتِنَانِ۔ امام شوکانی نے اس کا مطلب بیان کیا ہے کہ ہم انسان کے تمام احوال کو جانتے ہیں، بغیر اس کے کہ ہم ان فرشتوں کے محتاج ہوں جن کو ہم نے انسان کے اعمال و اقوال لکھنے کے لیے مقرر کیا ہے، یہ فرشتے تو ہم نے صرف اتمام حجت کے لیے مقرر کیے ہیں۔ دو فرشتوں سے مراد بعض کے نزدیک ایک نیکی اور دو سرا بدی لکھنے کے لیے۔ اور بعض کے نزدیک رات اور دن کے فرشتے مراد ہیں۔ رات کے دو فرشتے الگ اور دن کے دو فرشتے الگ (فتح القدیر)

(۴) رَقِيبٌ، محافظ، نگران اور انسان کے قول اور عمل کا انتظار کرنے والا۔ عَيْنِدٌ حاضر اور تیار۔

اور موت کی بے ہوشی حق لے کر آپہنچی،^(۱) یہی ہے جس سے توبہ کرتا پھرتا تھا۔^(۱۹)

اور صورت پھونک دیا جائے گا۔ وعدہ عذاب کا دن یہی ہے۔^(۲۰) اور ہر شخص اس طرح آئے گا کہ اس کے ساتھ ایک لانے والا ہو گا اور ایک گواہی دینے والا۔^(۲۱)

یقیناً تو اس سے غفلت میں تھا لیکن ہم نے تیرے سامنے سے پردہ ہٹا دیا پس آج تیری نگاہ بہت تیز ہے۔^(۲۲) اس کا ہم نشین (فرشتہ) کہے گا یہ حاضر ہے جو کہ میرے پاس تھا۔^(۲۳)

ڈال دو جنم میں ہر کافر سرکش کو۔^(۲۴) جو نیک کام سے روکنے والا حد سے گزر جانے والا اور شک کرنے والا تھا۔^(۲۵)

جس نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود بنا لیا تھا پس اسے سخت عذاب میں ڈال دو۔^(۲۶)

اس کا ہم نشین (شیطان) کہے گا اے ہمارے رب! میں نے اسے گمراہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ خود ہی دور دراز کی گمراہی میں تھا۔^(۲۷)

وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذَلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ ۝

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ذَلِكَ يَوْمُ الْوَعْدِ ۝

وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَعَ سَائِرٍ وَشَهِيدٍ ۝

لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَذَا أَكْثَرَ مِمَّا عَدَّ عَضُدٌ ۝

فَبَصُرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ۝

وَقَالَ قَرِينُهُ هَذَا مَا لَدَىٰ عَيْنِي ۝

أَلْقَيْتُ فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَلْبٍ عَيْنِي ۝

مَنَّانٍ لِلْغَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيبٍ ۝

لَاذِي جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَأَلْقِيَهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيدِ ۝

قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطَعْتَهُ وَلَكِن كَانَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ۝

(۱) دوسرے معنی اس کے ہیں، موت کی سختی حق کے ساتھ آئے گی، یعنی موت کے وقت، حق واضح اور ان وعدوں کی صداقت ظاہر ہو جاتی ہے جو قیمت اور جنت و دوزخ کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کرتے رہے ہیں۔

(۲) تَحِيدٌ، تَمِيلٌ عَنْهُ وَتَفَرُّهُ، تو اس موت سے بدکرتا اور بھاگتا تھا۔

(۳) سَائِرٌ (یا کتنے والا) اور شَهِيدٌ (گواہ) کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام طبری کے نزدیک یہ دو فرشتے ہیں۔ ایک انسان کو محشر تک ہانک کر لانے والا اور دوسرا گواہی دینے والا۔

(۴) یعنی فرشتہ انسان کا سارا ریکارڈ سامنے رکھ دے گا اور کہے گا کہ یہ تیری فرد عمل ہے جو کہ میرے پاس تھی۔

(۵) اللہ تعالیٰ اس فرد عمل کی روشنی میں انصاف اور فیصلہ فرمائے گا۔ اَلْقِيَا سے الشَّدِيدُ تک اللہ کا قول ہے۔

(۶) اس لیے اس نے فوراً میری بات مان لی، اگر یہ تیرا مخلص بندہ ہوتا تو میرے بہکاوے میں ہی نہ آتا یہاں قَرِينٌ

حق تعالیٰ فرمائے گا بس میرے سامنے جھکڑے کی بات مت کرو میں تو پہلے ہی تمہاری طرف وعید (وعدہ عذاب) بھیج چکا تھا۔^(۱) (۲۸)

میرے ہاں بات بدلتی نہیں^(۲) اور نہ میں اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا ہوں۔^(۳) (۲۹)

جس دن ہم دوزخ سے پوچھیں گے کیا تو بھر چکی؟ وہ جواب دے گی کیا کچھ اور زیادہ بھی ہے؟^(۴) (۳۰)

قَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنَ النَّاسِ وَلِيًّا ۗ وَوَدَّ قَوْمًا يَتَّبِعُونَ آلَ عَادِ ۖ

يَأْتِيكُمُ الْقَوْمُ لَدَيْكَ وَمَا أَنْزَلْنَا لَهُمُ الْكِتَابَ ۖ

يَوْمَ نَقُولُ لَهُمْ هَلْ مِنْكُمْ شَيْءٌ ۚ

(ساتھی) سے مراد شیطان ہے۔

(۱) یعنی اللہ تعالیٰ کافروں اور ان کے ہم نشین شیطانوں کو کہے گا کہ یہاں موقوف حساب یا عدالت انصاف میں لڑنے جھکڑنے کی ضرورت نہیں نہ اس کا کوئی فائدہ ہی ہے، میں نے تو پہلے ہی رسولوں اور کتابوں کے ذریعے سے ان وعیدوں سے تم کو آگاہ کر دیا تھا۔

(۲) یعنی جو وعدے میں نے کیے تھے، ان کے خلاف نہیں ہو گا بلکہ وہ ہر صورت میں پورے ہوں گے اور اسی اصول کے مطابق تمہارے لیے عذاب کا فیصلہ میری طرف سے ہوا ہے جس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

(۳) کہ بغیر جرم کے جو انہوں نے نہ کیا ہو اور بغیر گناہ کے جس کا صدور ان سے نہ ہوا ہو، میں ان کو عذاب دے دوں؟ ظلام یہاں ظالم کے معنی میں ہے۔ یا محاورہ بولا گیا ہے، جیسے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص اپنے غلاموں پر بڑا ظلم کرتا ہے، فلاں شخص بڑا ظالم ہے مقصد، مبالغے کا نہیں بلکہ صرف اس کی طرف سے ظلم کیے جانے کا اظہار ہوتا ہے۔ یا مقصود نفی میں مبالغہ ہے۔ یعنی میں بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿لَا تَكْفُرْ بِاللَّهِ وَالنَّاسِ جَمِيعًا﴾ (آلہم السجدة: ۱۳) ”میں جہنم کو انسانوں اور جنوں سے بھروں گا۔“ اس وعدے کا جب ایفا ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کافر جن وانس کو جہنم میں ڈال دے گا، تو جہنم سے پوچھے گا کہ تو بھر گئی ہے یا نہیں؟ وہ جواب دے گی، کیا کچھ اور بھی ہے؟ یعنی اگرچہ میں بھر گئی ہوں لیکن یا اللہ تیرے دشمنوں کے لیے میرے دامن میں اب بھی گنجائش ہے۔ جہنم سے اللہ تعالیٰ کی یہ گفتگو اور جہنم کا جواب دینا، اللہ کی قدرت سے قطعاً بعید نہیں ہے۔ حدیث میں بھی آتا ہے ”آگ میں لوگ ڈالے جائیں گے اور جہنم کے گی: هل من مزید کیا کچھ اور بھی ہیں؟ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ جہنم میں اپنا پیر رکھ دے گا، جس سے جہنم پکار اٹھے گی، ”قَطِّ قَطِّ“ یعنی بس، بس“ (صحیح بخاری، تفسیر سورہ ق) اور جنت کے بارے میں آتا ہے کہ جنت میں ابھی خالی جگہ باقی رہ جائے گی تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے نئی مخلوق پیدا فرمائے گا جو وہاں آباد ہوگی۔

(صحیح مسلم کتاب الجنة باب النار اید حملها الجبارون والجنة اید حملها الضعفاء)

وَأَزَلَّتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ ﴿۳۱﴾

اور جنت پر ہمہ نگاروں کے لیے بالکل قریب کر دی جائے گی ذرا بھی دور نہ ہوگی۔ (۳۱) (۱)

هَذَا مَا تَوْعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ ﴿۳۲﴾

یہ ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ہر اس شخص کے لیے جو رجوع کرنے والا اور پابندی کرنے والا ہو۔ (۳۲) (۲)

مَنْ عَشِيَ الرَّحْمَنُ بِالْقَيْبِ وَجَّاهٌ لِّقَلْبٍ مُّنِيبٍ ﴿۳۳﴾

جو رحمن کا غائبانہ خوف رکھتا ہو اور توجہ والا دل لایا ہو۔ (۳۳) (۳)

لَا ذُلٌّ لَّهُمْ فِي سَلْمِ ذَلِكَ يَوْمِ الْخُلُودِ ﴿۳۴﴾

تم اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ یہ ہمیشہ رہنے کا دن ہے۔ (۳۴)

لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ﴿۳۵﴾

یہ وہاں جو چاہیں انھیں ملے گا (بلکہ) ہمارے پاس اور بھی زیادہ ہے۔ (۳۵) (۴)

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي

اور ان سے پہلے بھی ہم بہت سی امتوں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ان سے طاقت میں بہت زیادہ تھیں وہ شہروں میں

الْبِلَادِ هَلْ مِنْ عَجِيبٍ ﴿۳۶﴾

ڈھونڈتے ہی (۵) رہ گئے، کہ کوئی بھاگنے کا ٹھکانا

(۱) اور بعض نے کہا ہے کہ قیامت، جس روز جنت قریب کر دی جائے گی، دور نہیں ہے۔ کیونکہ وہ لامحالہ واقع ہو کر رہے گی اور کُلُّ مَا هُوَ آتٍ فَهُوَ قَرِيبٌ اور جو بھی آنے والی چیز ہے، وہ قریب ہی ہے دور نہیں۔ (ابن کثیر)

(۲) یعنی اہل ایمان جب جنت کا اور اس کی نعمتوں کا قریب سے مشاہدہ کریں گے تو کہا جائے گا کہ یہی وہ جنت ہے جس کا وعدہ ہر اواب اور حفیظ سے کیا گیا تھا۔ اواب، بہت رجوع کرنے والا، یعنی اللہ کی طرف۔ کثرت سے توبہ و استغفار اور تسبیح و ذکر الہی کرنے والا۔ خلوت میں اپنے گناہوں کو یاد کر کے اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑانے والا اور ہر مجلس میں استغفار کرنے والا۔ حفیظ، اپنے گناہوں کو یاد کر کے ان سے توبہ کرنے والا یا اللہ کے حقوق اور اس کی نعمتوں کو یاد رکھنے والا یا اللہ کے اوامر و نواہی کو یاد رکھنے والا (فتح القدیر)

(۳) مُنِيبٌ، اللہ کی طرف رجوع کرنے والا اور اس کا اطاعت گزار دل۔ یا بمعنی سَلِيمٌ، شرک و معصیت کی نجاستوں سے پاک دل۔

(۴) اس سے مراد رب تعالیٰ کا دیدار ہے جو اہل جنت کو نصیب ہوگا، جیسا کہ ﴿لَا يَذُنُّنَّ أَحْسَنُوا لِحُضْرَتِي وَزِيَادًا﴾ (یونس ۳۶) کی تفسیر میں گزرا۔

(۵) ﴿فَمَقَّوْنِي بِالْإِلَادِ﴾ (شہروں میں چلے پھرے) کا ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ ان اہل مکہ سے زیادہ تجارت و کاروبار کے لیے مختلف شہروں میں پھرتے تھے۔ لیکن ہمارا عذاب آیا تو انہیں کہیں پناہ اور راہ فرار نہیں ملی۔

ہے۔؟ (۳۶)

اس میں ہر صاحب دل کے لیے عبرت ہے اور اس کے لیے جو دل^(۱) سے متوجہ ہو کر کان لگائے^(۲) اور وہ حاضر ہو۔^(۳) (۳۷)

یقیناً ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ اس کے درمیان ہے سب کو (صرف) چھ دن میں پیدا کر دیا اور ہمیں نکلانے چھو اتک نہیں۔ (۳۸)

پس یہ جو کچھ کہتے ہیں آپ اس پر صبر کریں اور اپنے رب کی تسبیح تعریف کے ساتھ بیان کریں سورج نکلنے سے پہلے بھی اور سورج غروب ہونے سے پہلے بھی۔^(۴) (۳۹)
اور رات کے کسی وقت بھی تسبیح کریں^(۵) اور نماز کے بعد بھی۔^(۶) (۴۰)

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ﴿۳۶﴾

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَابَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ ﴿۳۷﴾

فَأَصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ﴿۳۸﴾

وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ﴿۳۹﴾

(۱) یعنی دل بیدار، جو غور و فکر کر کے حقائق کا ادراک کر لے۔

(۲) یعنی توجہ سے وہ وحی الہی سنے جس میں گزشتہ امتوں کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

(۳) یعنی قلب اور دماغ کے لحاظ سے حاضر ہو۔ اس لیے کہ جو بات کو ہی نہ سمجھے، وہ موجود ہوتے ہوئے بھی ایسے ہے جیسے نہیں ہے۔

(۴) یعنی صبح و شام اللہ کی تسبیح بیان کر دیا عصر اور فجر کی نماز پڑھنے کی تاکید ہے۔

(۵) ”یمن“ جمع ہے کے لیے ہے۔ یعنی رات کے کچھ حصے میں بھی اللہ کی تسبیح کریں یا رات کی نماز (تہجد) پڑھیں۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ﴾ (سودہ بنی اسرائیل۔ ۷۹) ”رات کو اٹھ کر نماز تہجد پڑھیں جو آپ کے لیے مزید ثواب کا باعث ہے“ بعض کہتے ہیں کہ معراج سے قبل مسلمانوں کے لیے صرف فجر اور عصر کی نماز اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تہجد کی نماز بھی فرض تھی۔ معراج کے موقع پر پانچ نمازیں فرض کر دی گئیں۔ (ابن کثیر)

(۶) یعنی اللہ کی تسبیح کریں۔ بعض نے اس سے وہ تسبیحات مراد لی ہیں، جن کے پڑھنے کی تاکید نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض نمازوں کے بعد فرمائی ہے۔ مثلاً ۳۳ مرتبہ سُبْحَانَ اللَّهِ - ۳۳ مرتبہ الْحَمْدُ لِلَّهِ اور ۳۴ مرتبہ اللَّهُ أَكْبَرُ وغیرہ (البخاری) کتاب الأذان، باب الذکر بعد الصلوٰۃ - کتاب الدعوات، باب الدعاء بعد الصلوٰۃ - مسلم، کتاب المساجد باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ و بیان صفتہ) مگر یہ تسبیحات اس سورت کے نزول کے

وَأَسْمِعُ يَوْمَ يُنَادَى الْمُنَادُ مِنْ مَكَانٍ قَرِيبٍ ﴿۳۱﴾

اور سن رکھیں^(۱) کہ جس دن ایک پکارنے^(۲) والا قریب ہی کی جگہ سے پکارے گا۔^(۳) (۳۱)

يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذَلِكَ يَوْمَ الْخُرُوجِ ﴿۳۲﴾

جس روز اس تند و تیز چیخ کو یقین کے ساتھ سن لیں گے، یہ دن ہو گا نکلنے کا۔^(۴) (۳۲)

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِنَّا لَالمُصِيتُ ﴿۳۳﴾

ہم ہی جلاتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں^(۵) اور ہماری ہی طرف لوٹ پھر کر آتا ہے۔^(۶) (۳۳)

يَوْمَ تَشَقُّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ذَلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ ﴿۳۴﴾

جس دن زمین پھٹ جائے گی اور یہ دوڑتے ہوئے^(۷) (نکل پڑیں گے) یہ جمع کر لینا ہم پر بہت ہی آسان ہے۔^(۸) (۳۴)

بہت عرصہ بعد بتائی گئی تھیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اُدبار الوجود سے مراد مغرب کے بعد دو رکعتیں ہیں۔

(۱) یعنی قیامت کے جو احوال وحی کے ذریعے سے بیان کیے جا رہے، انہیں توجہ سے سنیں۔

(۲) یہ پکارنے والا اسرائیل فرشتہ ہو گا یا جبرائیل اور یہ ندا وہ ہو گی جس سے لوگ میدان محشر میں جمع ہو جائیں گے۔ یعنی نَفْخِ ثانیہ۔

(۳) اس سے بعض نے صحفہ بیت المقدس مراد لیا ہے، کہتے ہیں یہ آسمان کے قریب ترین جگہ ہے اور بعض کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص یہ آواز اس طرح سنے گا، جیسے اس کے قریب سے ہی آواز آرہی ہے۔ (فتح القدیر) اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔

(۴) یعنی یہ چیخ یعنی نَفْخِ قیامت یقیناً ہو گا جس میں یہ دنیا میں شک کرتے تھے۔ اور یہی دن قبروں سے زندہ ہو کر نکلنے کا ہو گا۔

(۵) یعنی دنیا میں موت سے ہمتا کرنا اور آخرت میں زندہ کر دینا، یہ ہمارا ہی کام ہے، اس میں کوئی ہمارا شریک نہیں ہے۔

(۶) وہاں ہم ہر شخص کو اس کے عملوں کے مطابق جزا دیں گے۔

(۷) یعنی اس آواز دینے والے کی طرف دوڑیں گے۔ جس نے آواز دی ہو گی۔ مُسْرِعِينَ إِلَى الْمُنَادِي الَّذِي نَادَاهُمْ (فتح القدیر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب زمین پھٹے گی تو سب سے پہلے زندہ ہو کر نکلنے والا میں ہوں گا أَنَا أَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْأَرْضُ (صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب تفضیل نبینا صلی اللہ علیہ وسلم علی جمیع الخلائق)

یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں ہم، بخوبی جانتے ہیں اور آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں،^(۱) تو آپ قرآن کے ذریعہ انہیں سمجھاتے رہیں جو میرے وعید (ڈراوے کے وعدوں) سے ڈرتے ہیں۔^(۲) (۳۵)

سورۃ ذاریات مکی ہے اور اس میں ساٹھ آیتیں اور تین رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

- قسم ہے بکھیرنے والیوں کی اڑا کر۔^(۱)
 پھر اٹھانے والیاں بوجھ کو۔^(۲)
 پھر چلنے والیاں نرمی سے۔^(۳)
 پھر کام کو تقسیم کرنے والیاں۔^(۴)

عَنْ أَعْلُوٰ بِمَا يَقُولُونَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكَرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ ۝



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

- وَالذَّارِيَاتِ ذُرَّوٰٓا۟ ۝
 فَالْحٰلِكٰتِ وَفِرَآا۟ ۝
 فَالْجٰوِيٰتِ يُعْرٰٓا۟ ۝
 فَالْمُقَدِّمٰتِ اٰمَآٓا۟ ۝

(۱) یعنی آپ ﷺ اس بات کے مکلف نہیں ہیں کہ ان کو ایمان لانے پر مجبور کریں۔ بلکہ آپ ﷺ کا کام صرف تبلیغ و دعوت ہے، وہ کرتے رہیں۔

(۲) یعنی آپ ﷺ کی دعوت و تذکیر سے وہی نصیحت حاصل کرے گا جو اللہ سے اور اس کی وعیدوں سے ڈرتا اور اس کے وعدوں پر یقین رکھتا ہو گا۔ اسی لیے حضرت قتادہ یہ دعا فرمایا کرتے تھے «اللَّهُمَّ اجْعَلْنَا مِمَّنْ يَخَافُ وَعِيدِكَ، وَيَرْجُو مَوْعُودَكَ، يَا بَارِئُ يَا رَحِيمُ» اے اللہ ہمیں ان لوگوں میں سے کر جو تیری وعیدوں سے ڈرتے اور تیرے وعدوں کی امید رکھتے ہیں۔ اے احسان کرنے والے رحم فرمانے والے۔“

(۳) اس سے مراد ہوائیں ہیں جو مٹی کو اڑا کر بکھیر دیتی ہیں۔

(۴) وَقَوَّ، ہر وہ بوجھ جسے کوئی جاندار لے کر چلے، حاملات سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو بادلوں کو اٹھائے ہوئے ہیں یا پھر وہ بادل ہیں جو پانی کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں جیسے چوپائے، حمل کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

(۵) جَارِيَاتُ، پانی میں چلنے والی کشتیاں، يُسْرًا آسانی سے۔

(۶) مُفَسِّمٰتٌ اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کاموں کو تقسیم کر لیتے ہیں۔ کوئی رحمت کا فرشتہ ہے تو کوئی عذاب کا، کوئی پانی کا ہے تو کوئی سختی (یعنی قحط سالی وغیرہ) کا، کوئی ہواؤں کا فرشتہ ہے تو کوئی موت اور حوادث کا۔ بعض نے ان سب سے صرف ہوائیں مراد لی ہیں اور ان سب کو ہواؤں کی صفت بنایا ہے، جیسے فاضل مترجم نے بھی اسی

یقین مانو کہ تم سے جو وعدے کیے جاتے ہیں (سب) سچے

ہیں۔ (۵)

اور بیشک انصاف ہونے والا ہے۔ (۶)

قسم ہے راہوں والے آسمان کی۔ (۷)

یقیناً تم مختلف بات میں پڑے ہوئے ہو۔ (۸)

اس سے وہی باز رکھا جاتا ہے جو پھیر دیا گیا ہو۔ (۹)

بے سند باتیں کرنے والے غارت کر دیئے گئے۔ (۱۰)

جو غفلت میں ہیں اور بھولے ہوئے ہیں۔ (۱۱)

پوچھتے ہیں کہ یوم جزا کب ہو گا؟ (۱۲)

ہاں یہ وہ دن ہے کہ یہ آگ پر پٹائے جائیں گے۔ (۱۳)

إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ ۝

وَأَنَّ الَّذِينَ لِيُوَاقِعَهُ ۝

وَالسَّمَاءَ ذَاتِ الْحُبُوبِ ۝

إِنَّكُمْ لَأِن قَوْلٍ مُّنتَلِبِ ۝

يُؤْتِكُمْ عَنْهُ مِنْ آفَاقٍ ۝

جِبَلِ الْمُنْتَصِفُونَ ۝

الَّذِينَ هُمْ عَنْ عَهْدٍ يُسَالِفُونَ ۝

يَحْسَبُونَ أَنَّ يَوْمَ الدِّينِ ۝

يَوْمَ هُمْ مَحَلٌّ الْكَارِيفَتُونَ ۝

کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ لیکن ہم نے امام ابن کثیر اور امام شوکانی کی تفسیر کے مطابق تشریح کی ہے۔ قسم سے مقصد مقسم علیہ کی سچائی کو بیان کرنا ہوتا ہے یا بعض دفعہ صرف تاکید مقصود ہوتی ہے اور بعض دفعہ مقسم علیہ کو دلیل کے طور پر پیش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں قسم کی یہی تیسری قسم ہے۔ آگے جواب قسم یہ بیان کیا گیا ہے کہ تم سے جو وعدے کیے جاتے ہیں یقیناً وہ سچے ہیں اور قیامت برپا ہو کر رہے گی جس میں انصاف کیا جائے گا۔ یہ ہواؤں کا چلنا، بادلوں کا پانی کو اٹھانا، سمندروں میں کشتیوں کا چلنا اور فرشتوں کا مختلف امور کو سرانجام دینا، قیامت کے وقوع پر دلیل ہے، کیونکہ جو ذات یہ سارے کام کرتی ہے جو بظاہر نہایت مشکل اور اسباب عادیہ کے خلاف ہیں، وہی ذات قیامت والے دن تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ بھی کر سکتی ہے۔

(۱) دوسرا ترجمہ، حسن و جمال اور زینت و رونق والا کیا گیا ہے، چاند، سورج، کوکب و سیارات، روشن ستارے، اس کی بلندی اور وسعت، یہ سب چیزیں آسمان کی رونق و زینت اور خوب صورتی کا باعث ہیں۔

(۲) یعنی اے اہل مکہ! تمہارا کسی بات میں آپس میں اتفاق نہیں ہے۔ ہمارے پیغمبر کو تم میں سے کوئی جاوگر، کوئی شاعر، کوئی کاہن اور کوئی کذاب کہتا ہے۔ اسی طرح کوئی قیامت کی بالکل نفی کرتا ہے، کوئی شک کا اظہار، علاوہ ازیں ایک طرف اللہ کے خالق اور رازق ہونے کا اعتراف کرتے ہو، دوسری طرف دوسروں کو بھی معبود بنا رکھا ہے۔

(۳) یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے، یا حق سے یعنی بعث و توحید سے یا مطلب ہے مذکورہ اختلاف سے وہ شخص پھیر دیا گیا جسے اللہ نے اپنی توفیق سے پھیر دیا، پہلے مفہوم میں ذم ہے۔ دوسرے میں مدح۔

(۴) يَفْتَنُونَ کے معنی ہیں يُحَرِّقُونَ وَيُعَذِّبُونَ، جس طرح سونے کو آگ میں ڈال کر جانچا رکھا جاتا ہے، اسی طرح یہ

ذُو قُوَّةٍ ۖ فَتَنَّا لَهُمُ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْمِلُونَ ﴿۱۳﴾

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿۱۴﴾

الْحَزِينِ ۖ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ أَنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُجْسِبِينَ ﴿۱۵﴾

كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مِنَ النَّارِ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۱۶﴾

وَيَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هُمُومًا وَلَا تَتَّبِعُوا هُمُومًا ﴿۱۷﴾

وَفِي آيَاتِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴿۱۸﴾

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ ﴿۱۹﴾

اپنی فتنہ پر دوازی کا مزہ چکھو،^(۱) یہی ہے جس کی تم جلدی
بچا رہے تھے۔ (۱۳)

بیشک تقویٰ والے لوگ بہشتوں اور چشموں میں ہوں
گے۔ (۱۴)

ان کے رب نے جو کچھ انہیں عطا فرمایا ہے اسے لے
رہے ہوں گے وہ تو اس سے پہلے ہی نیکو کار تھے۔ (۱۵)

وہ رات کو بہت کم سویا کرتے تھے۔ (۱۶)

اور وقت سحر استغفار کیا کرتے تھے۔ (۱۷)

اور ان کے مال میں مانگنے والوں کا اور سوال سے بچنے
والوں کا حق تھا۔ (۱۸)

اور یقین والوں کے لیے تو زمین میں بہت سی نشانیاں

آگ میں ڈالے جائیں گے۔

(۱) فِتْنَةٌ، بمعنی عذاب یا آگ میں جلنا۔

(۲) مُجْسِبٌ کے معنی ہیں رات کو سونا۔ مَا يَهْبِجُونَ میں ما تاکید کے لیے ہے۔ وہ رات کو کم سوتے تھے، مطلب ہے ساری رات سو کر غفلت اور عیش و عشرت میں نہیں گزار دیتے تھے۔ بلکہ رات کا کچھ حصہ اللہ کی یاد میں اور اس کی بارگاہ میں گزر گزرتے ہوئے گزارتے تھے۔ جیسا کہ احادیث میں بھی قیام اللیل کی تاکید ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں فرمایا ”لوگو! لوگوں کو کھانا کھلاؤ، صلہ رحمی کرو، سلام پھیلاؤ اور رات کو اٹھ کر نماز پڑھو، جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں، تم سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔“ (مسند احمد ۵/۲۵۱)

(۳) وقت سحر، قبولیت دعا کے بہترین اوقات میں سے ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ”جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے اور ندا دیتا ہے کہ کوئی توبہ کرنے والا ہے کہ میں اس کی توبہ قبول کروں؟ کوئی بخشش مانگنے والا ہے کہ میں اسے بخش دوں، کوئی سائل ہے کہ میں اس کے سوال کو پورا کر دوں۔ یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب صلوة المسافرین، باب الترغیب فی الدعاء والذکر فی آخر اللیل والإجابة فیہ)

(۴) محروم سے مراد وہ ضرورت مند ہے جو سوال سے اجتناب کرتا ہے۔ چنانچہ مستحق ہونے کے باوجود لوگ اسے نہیں دیتے۔ یا وہ شخص ہے جس کا سب کچھ آفت ارضی و سماوی میں تباہ ہو جائے۔

- ہیں۔ (۲۰)
- اور خود تمہاری ذات میں بھی، تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔ (۲۱)
- اور تمہاری روزی اور جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے سب آسمان میں ہے۔^(۱) (۲۲)
- آسمان و زمین کے پروردگار کی قسم! کہ یہ بالکل برحق ہے ایسا ہی جیسے کہ تم باتیں کرتے ہو۔ (۲۳)
- کیا تجھے ابراہیم (علیہ السلام) کے معزز مہمانوں کی خبر بھی پہنچی ہے؟^(۲) (۲۴)
- وہ جب ان کے ہاں آئے تو سلام کیا، ابراہیم نے جواب سلام دیا (اور کہا یہ تو) اجنبی لوگ ہیں۔^(۳) (۲۵)
- پھر (چپ چاپ جلدی جلدی) اپنے گھر والوں کی طرف گئے اور ایک فریبہ بچھڑے (کا گوشت) لائے۔ (۲۶)
- اور اسے ان کے پاس رکھا اور کہا آپ کھاتے کیوں نہیں؟^(۴) (۲۷)
- پھر تو دل ہی دل میں ان سے خوفزدہ ہو گئے^(۵) انہوں نے کہا
- وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿۲۱﴾
- وَفِي السَّمَاءِ رُزُقَكُمْ وَأَنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۲۲﴾
- قَدَرَتِ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ إِنَّكُمْ لَمِنَ مُنْجَعُونَ ﴿۲۳﴾
- هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ ﴿۲۴﴾
- إِذْ دَعَا عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كُنْتُمْ قَدَرًا عَزِيمًا ﴿۲۵﴾
- قَرَأَ عَلَىٰ أَهْلِهِ فَجَاءَ بِعِجَلٍ سَعِيمٍ ﴿۲۶﴾
- فَكَرِهَ لَهُمْ أَنَّهُمْ قَالُوا أَتَاكُمُونَ ﴿۲۷﴾
- فَأَوْحَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً قَالُوا لَا تَمْنُنْ بِهِمْ عَلَيْهِمْ ﴿۲۸﴾

(۱) یعنی بارش بھی آسمان سے ہوتی ہے جس سے تمہارا رزق پیدا ہوتا ہے اور جنت دوزخ ثواب و عتاب بھی آسمانوں میں ہے جن کا وعدہ کیا جاتا ہے۔

(۲) اِنَّہُ میں ضمیر کا مرجع (یہ) وہ امور و آیات ہیں جو مذکور ہوئیں۔

(۳) هلْ استفہام کے لیے ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تنبیہ ہے کہ اس قصے کا تجھے علم نہیں، بلکہ ہم تجھے وحی کے ذریعے سے مطلع کر رہے ہیں۔

(۴) یہ اپنے جی میں کہا، ان سے خطاب کر کے نہیں کہا۔

(۵) یعنی سامنے رکھنے کے باوجود انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ ہی نہیں بڑھایا تو پوچھا۔

(۶) ڈر اس لیے محسوس کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھے، یہ کھانا نہیں کھا رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آنے والے کسی خیر کی نیت سے نہیں بلکہ شرکی نیت سے آئے ہیں۔

آپ خوف نہ کیجئے۔^(۱) اور انہوں نے اس (حضرت ابراہیم)

کو ایک علم والے لڑکے کی بشارت دی۔ (۲۸)

پس ان کی بیوی آگے بڑھی اور حیرت^(۲) میں آکر اپنے

منہ پر ہاتھ مار کر کہا کہ میں تو بڑھیا ہوں اور ساتھ ہی

بأنجھ۔ (۲۹)

انہوں نے کہا ہاں تیرے پروردگار نے اسی طرح فرمایا

ہے، بیشک وہ حکیم و علیم ہے۔^(۳) (۳۰)

فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتَانِ حَصْرًا فَصَلَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ
عَقِيمٌ ۝

قَالُوا كَذَلِكَ قَالَ رَبُّكَ إِنَّهُ هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ۝

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چہرے پر خوف کے آثار دیکھ کر فرشتوں نے کہا۔

(۲) صرّة کے دوسرے معنی ہیں چیخ و پکار، یعنی چیختے ہوئے کہا۔

(۳) یعنی جس طرح ہم نے تجھے کہا ہے، یہ ہم نے اپنی طرف سے نہیں کہا ہے، بلکہ تیرے رب نے اسی طرح کہا ہے جس کی ہم تجھے اطلاع دے رہے ہیں، اس لیے اس پر تعجب کی ضرورت ہے نہ شک کرنے کی، اس لیے کہ اللہ جو چاہتا ہے وہ لامحالہ ہو کر رہتا ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿۳۱﴾

قَالُوا إِنَّا أَنْسَلْنَا إِلَيْكَ قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ﴿۳۲﴾

لَا تَسْئَلْ عَلَيْهِمْ حِجَابًا لَّنْ يُبَيِّنَ ﴿۳۳﴾

مُتَوَكِّفًا عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۴﴾

فَأَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ يُهْمِلُ الْيَهُودِيَّةَ ﴿۳۵﴾

فَمَا وَجَدْنَا لَهُمْ عَابِدِينَ إِلَّا الْيَهُودِيَّةَ ﴿۳۶﴾

(حضرت ابراہیم علیہ السلام) نے کہا کہ اللہ کے بھیجے ہوئے (فرشتو!) تمہارا کیا مقصد ہے؟ (۳۱)

انہوں نے جواب دیا کہ ہم گناہ گار قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ (۳۲)

تاکہ ہم ان پر مٹی کے کنکر برسائیں۔ (۳۳)

جو تیرے رب کی طرف سے نشان زدہ ہیں، ان حد سے گزر جانے والوں کے لیے۔ (۳۴)

پس جتنے ایمان والے وہاں تھے ہم نے انہیں نکال لیا۔ (۳۵)

اور ہم نے وہاں مسلمانوں کا صرف ایک ہی گھر پایا۔ (۳۶)

(۱) خَطْبُ شَان، قصہ۔ یعنی اس بشارت کے علاوہ تمہارا اور کیا کام اور مقصد ہے جس کے لیے تمہیں بھیجا گیا ہے۔

(۲) اس سے مراد قوم لوط ہے جن کا سب سے بڑا جرم لواطت تھا۔

(۳) برسائیں کا مطلب ہے، ان کنکریوں سے انہیں رجم کر دیں۔ یہ کنکریاں خالص پتھر کی تھیں نہ آسانی اولے تھے، بلکہ مٹی کی بنی ہوئی تھیں۔

(۴) مُسَوِّمَةً (نامزد یا نشان زدہ) ان کی مخصوص علامت تھی جن سے انہیں پہچان لیا جاتا تھا، یا وہ عذاب کے لیے مخصوص تھیں، بعض کہتے ہیں کہ جس کنکری سے جس کی موت واقع ہوئی تھی، اس پر اس کا نام لکھا ہوتا تھا مُسْرِفِينَ، جو شرک و ضلالت میں بہت بڑھے ہوئے اور فحش و فجور میں حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔

(۵) یعنی عذاب آنے سے قبل ہم نے ان کو وہاں سے نکل جانے کا حکم دے دیا تھا تاکہ وہ عذاب سے محفوظ رہیں۔

(۶) اور یہ اللہ کے پیغمبر حضرت لوط علیہ السلام کا گھر تھا، جس میں ان کی دو بیٹیاں اور کچھ ان پر ایمان لانے والے تھے۔ کہتے ہیں یہ کل تیرہ آدمی تھے۔ ان میں حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی شامل نہیں تھی۔ بلکہ وہ اپنی قوم کے ساتھ عذاب سے ہلاک ہونے والوں میں سے تھی۔ (الیر القامیر) اسلام کے معنی ہیں، اطاعت و انقیاد۔ اللہ کے حکموں پر سراطعات خم کر دینے والا مسلم ہے، اس اعتبار سے ہر مومن، مسلمان ہے۔ اسی لیے پہلے ان کے لیے مومن کا لفظ استعمال کیا، اور پھر ان ہی کے لیے مسلم کا لفظ بولا گیا ہے۔ اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ ان کے مصداق میں کوئی فرق نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ مومن اور مسلم کے درمیان کرتے ہیں۔ قرآن نے جو کہیں مومن اور کہیں مسلم کا لفظ استعمال کیا ہے تو وہ ان معانی کے اعتبار سے ہے جو عربی لغت کی رو سے ان کے درمیان ہے۔ اس لیے لغوی استعمال کے مقابلے میں حقیقت شرعیہ کا اعتبار زیادہ ضروری ہے اور حقیقت شرعیہ کے اعتبار سے ان کے درمیان صرف وہی فرق ہے جو حدیث

اور وہاں ہم نے ان کے لیے جو دردناک عذاب کا ڈر رکھتے ہیں ایک (کامل) علامت چھوڑی۔^(۱) (۳۷)

موسیٰ (علیہ السلام کے قصے) میں (بھی ہماری طرف سے تنبیہ ہے) کہ ہم نے اسے فرعون کی طرف کھلی دلیل دے کر بھیجا۔ (۳۸)

پس اس نے اپنے بل بوتے پر منہ موڑا^(۲) اور کہنے لگایہ جاوگر ہے یا دیوانہ ہے۔ (۳۹)

بالآخر ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو اپنے عذاب میں پکڑ کر دریا میں ڈال دیا وہ تھامی ملامت کے قابل۔^(۳) (۴۰)

اسی طرح عادیوں میں^(۴) بھی (ہماری طرف سے تنبیہ ہے) جب کہ ہم نے ان پر خیر و برکت سے^(۵) خالی

وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ الْعَذَابَ الْكَلِيمَ ﴿۳۷﴾

وَقَالَ مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿۳۸﴾

فَقَوْلًا يَرْثِيهِ وَقَالَ لِمِصْرٍ آدِمْ بَنُونَ ﴿۳۹﴾

فَلَمَّا نَسُوا مَا وَعَدْنَاهُمْ فِي الْكِتَابِ وَهُوَ مَجْلِيءٌ ﴿۴۰﴾

وَقِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَةَ ﴿۴۱﴾

جبرائیل علیہ السلام سے ثابت ہے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اسلام کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا، لا اِلهَ اِلاَّ اللہ کی شہادت، اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، حج اور صیام رمضان۔ اور جب ایمان کی بابت پوچھا گیا تو فرمایا ”اللہ پر ایمان لانا“ اس کے ملائکہ، کتابوں، رسولوں اور تقدیر (خیر و شر کے من جانب اللہ ہونے) پر ایمان رکھنا، یعنی دل سے ان چیزوں پر یقین رکھنا ایمان اور احکام و فرائض کی ادائیگی اسلام ہے۔ اس لحاظ سے ہر مومن، مسلمان اور ہر مسلمان مومن ہے (فتح القدیر) اور جو مومن اور مسلم کے درمیان فرق کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ یہاں قرآن نے ایک ہی گروہ کے لیے مومن اور مسلم کے الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن ان کے درمیان جو فرق ہے اس کی رو سے ہر مومن، مسلم بھی ہے، تاہم ہر مسلم کا مومن ہونا ضروری نہیں (ابن کثیر) بہر حال یہ ایک علمی بحث ہے۔ فریقین کے پاس اپنے موقف پر استدلال کے لیے دلائل موجود ہیں۔

(۱) یہ آیت یا کامل علامت وہ آثار عذاب ہیں جو ان ہلاک شدہ بہتوں میں ایک عرصے تک باقی رہے۔ اور یہ علامت بھی انہی کے لیے ہیں جو عذاب الہی سے ڈرنے والے ہیں، کیونکہ وعظ و نصیحت کا اثر بھی وہی قبول کرتے اور آیات میں غور و فکر بھی کرتے ہیں۔

(۲) جانبِ اوقویٰ کو رکن کہتے ہیں۔ یہاں مراد اس کی اپنی قوت اور لشکر ہے۔

(۳) یعنی اس کے کام ہی ایسے تھے کہ جن پر وہ ملامت ہی کا مستحق تھا۔

(۴) اُنّی: تَرَكْنَا فِيهَا قِصَّةً عَادٍ آيَةً مِمَّا نَسُوا فِيهَا نِسْيَانًا مِمَّا كَانُوا يَكْفُرُونَ۔

(۵) الرِّيحَ الْعَقِيمَةَ (بأنجھ ہوا) جس میں خیر و برکت نہیں تھی، وہ ہوا درختوں کو ٹھرا اور کرنے والی تھی نہ بارش کی

آندھی بھیجی۔ (۴۱)

وہ جس جس چیز پر گرتی تھی اسے بوسیدہ ہڈی کی طرح
(چوراچورا) کر دیتی تھی۔ (۴۲)

اور ٹھوس (کے قصے) میں بھی (عبرت) ہے جب ان سے کہا
گیا کہ تم کچھ دنوں تک فائدہ اٹھا لو۔ (۴۳)

لیکن انہوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی جس پر
انہیں ان کے دیکھتے دیکھتے (تیزو تند) کڑا کے (۴) نے
ہلاک کر دیا۔ (۴۴)

پس نہ تو وہ کھڑے ہو سکے (۴) اور نہ بدلہ لے سکے۔ (۴۵)

اور نوح (علیہ السلام) کی قوم کا بھی اس سے پہلے (یہی
حال ہو چکا تھا) وہ بھی بڑے نافرمان لوگ تھے۔ (۴۶)

آسمان کو ہم نے (اپنے) ہاتھوں سے بنایا ہے (۴) اور یقیناً
ہم کشادگی کرنے والے ہیں۔ (۴۷)

مَا تَدْمِينُ جَنِّي ۚ أَتَمَّتْ عَلَيْهِمُ الْإِجْعَالُتُهُ كَالرَّيْمِ ۝۵

وَرَفِي كَسُودِ إِذْ قِيلَ لَهُمُ تَمَتُّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ ۝۶

فَقَتَا عَنِ أُمُودٍ يُرِيدُونَ فَاِخْتَذُوا الصُّعُقَةَ ۚ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۝۷

فَمَا اسْتَطَاعُوا مِنْ قِيَامٍ وَمَا كَانُوا مُتَعَبِينَ ۝۸

وَقَوْمٌ يُؤْتَوْنَ مِنْ قَبْلِهَا هُمُ كَانُوا قَوْمًا فَسِيقِينَ ۝۹

وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَا بِأَيْمَانٍ ۚ وَآثَانَ الْمِيسُورِ ۝۱۰

پیامبر، بلکہ صرف ہلاکت اور عذاب کی ہوا تھی۔

(۱) یہ اس ہوا کی تاثیر تھی جو قوم عاد پر بطور عذاب بھیجی گئی تھی۔ یہ تند و تیز ہوا، سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلتی
ری (الحاقہ)

(۲) یعنی جب انہوں نے اپنے ہی طلب کردہ معجزے اوٹنی کو قتل کر دیا، تو ان کو کہہ دیا گیا کہ اب تین دن اور تم دنیا کے
مزے لو، تین دن کے بعد تم ہلاک کر دیئے جاؤ گے یہ اسی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے اسے حضرت صالح علیہ
السلام کی ابتدائے نبوت کا قول قرار دیا ہے۔ الفاظ اس مفہوم کے بھی متحمل ہیں بلکہ سیاق سے یہی معنی زیادہ قریب ہیں۔
(۳) یہ صاعقہ (کڑا) آسمانی چیخ تھی اور اس کے ساتھ نیچے سے رَجْفَةٌ (زلزلہ) تھا جیسا کہ سورۃ اعراف ۷۸ میں ہے۔
(۴) چہ جائیکہ وہ بھاگ سکیں۔

(۵) یعنی اللہ کے عذاب سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکے۔

(۶) قوم نوح، عاد، فرعون اور ٹھوس وغیرہ سے بہت پہلے گزری ہے۔ اس نے بھی اطاعت الہی کے بجائے اس کی بغاوت کا
راستہ اختیار کیا تھا۔ بالآخر اسے طوفان میں ڈبو دیا گیا۔

(۷) السَّمَاءُ منصوب ہے۔ بَنَيْنَا محذوف کی وجہ سے۔ بَنَيْنَا السَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا

(۸) یعنی آسمان پہلے ہی بہت وسیع ہے لیکن ہم اس کو اس سے بھی زیادہ وسیع کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ یا آسمان سے

وَالْأَرْضُ قَرَشْنَهَا فَانْعَمَ الْمُهْدُونَ ۝

اور زمین کو ہم نے فرش بنا دیا ہے۔^(۱) پس ہم بہت ہی اچھے بچھانے والے ہیں۔ (۴۸)

وَمِنْ كُلِّ مَمَىٰ خَلَقْنَا رُوحَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝

اور ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کیا^(۲) ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔^(۳) (۴۹)

فَعَرَفُوا إِلَىٰ آلِ اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝

پس تم اللہ کی طرف دوڑھاگ (یعنی رجوع) کرو،^(۴) یقیناً میں تمہیں اس کی طرف سے صاف صاف تمبیہ کرنے والا ہوں۔ (۵۰)

وَلَا تَعْلَمُوا مَتَىٰ اللَّهُ الْعَاقِبَاتِ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝

اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ ٹھہراؤ۔ بیشک میں تمہیں اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔^(۵) (۵۱)

كَذَٰلِكَ مَا أَنَّىٰ إِلَيْنِ مِنَ جَلْعِهِمْ مَن تَسْأَلُ ۙ

اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں ان کے پاس جو بھی رسول آیا انہوں نے کہہ دیا کہ یا تو یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔ (۵۲)

فَأَلْوَاسًا حِزَابًا وَمُجْتَبُونَ ۝

کیا یہ اس بات کی ایک دوسرے کو وصیت کرتے گئے

أَقْوَامًا يَّوَابِهٍ بَلْ لَّهُمْ حَقٌّ مَّا لَنَا مِنَ ۝

بارش برساکر روزی کشادہ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں یا مٹوسیع کو وٹسوع سے قرار دیا جائے (طاقت و قدرت رکھنے والے) تو مطلب ہو گا کہ ہمارے اندر اس جیسے اور آسمان بنانے کی بھی طاقت و قدرت موجود ہے۔ ہم آسمان و زمین بنا کر تھک نہیں گئے ہیں بلکہ ہماری قدرت و طاقت کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔

(۱) یعنی فرش کی طرح اسے بچھا دیا ہے۔

(۲) یعنی ہر چیز کو جوڑا جوڑا، نر اور مادہ یا اس کی مقابل اور ضد کو بھی پیدا کیا ہے۔ جیسے روشنی اور اندھیرا، خشکی اور تزی، چاند اور سورج، میٹھا اور کڑوا، رات اور دن، خیر اور شر، زندگی اور موت، ایمان اور کفر، شقاوت اور سعادت، جنت اور دوزخ، جن و انس وغیرہ، حتیٰ کہ حیوانات (جاندار) کے مقابل، جمادات (بے جان) اس لیے ضروری ہے کہ دنیا کا بھی جوڑا ہو یعنی آخرت، دنیا کے بالمقابل دوسری زندگی۔

(۳) یہ جان لو کہ ان سب کا پیدا کرنے والا صرف ایک اللہ ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

(۴) یعنی کفر و معصیت سے توبہ کر کے فوراً بارگاہ الہی میں جھک جاؤ، اس میں تاخیر مت کرو۔

(۵) یعنی میں تمہیں کھول کھول کر ڈرا رہا اور تمہاری خیر خواہی کر رہا ہوں کہ صرف ایک اللہ کی طرف رجوع کرو، اسی پر اعتماد اور بھروسہ کرو اور صرف اسی ایک کی عبادت کرو، اس کے ساتھ دوسرے معبودوں کو شریک مت کرو۔ ایسا کرو گے تو یاد رکھنا، جنت کی نعمتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤ گے۔

<p>ہیں۔^(۱) (۵۳)</p> <p>(نہیں) بلکہ یہ سب کے سب سرکش ہیں۔^(۲) تو آپ ان سے منہ پھیر لیں آپ پر کوئی ملامت نہیں۔ (۵۴)</p> <p>اور نصیحت کرتے رہیں یقیناً یہ نصیحت ایمان والوں کو نفع دے گی۔^(۳) (۵۵)</p> <p>میں نے جنات اور انسانوں کو محض اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔^(۴) (۵۶)</p> <p>نہ میں ان سے روزی چاہتا ہوں نہ میری یہ چاہت ہے کہ یہ مجھے کھلائیں۔^(۵) (۵۷)</p> <p>اللہ تعالیٰ تو خود ہی سب کا روزی رسال تو انہی والا اور زور آور ہے۔ (۵۸)</p> <p>پس جن لوگوں نے ظلم کیا ہے انہیں بھی ان کے</p>	<p>فَوَلَّوْا عَنْهُمْ فَأَنْتُمْ أَعْمٰوٓمٌ ﴿۵۳﴾</p> <p>وَذَرَوْا لِلذَّٰرِيٓنَ النَّصِيحَةَ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الْوَيٰضِيٰتَ ۙ وَذَرَوْا لِلذَّٰرِيٓنَ وَالْإِنْسَٰنِ الْاٰلِئِمٰٓةَ ۙ وَمَا رِيَدُوْهُم مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَا اُرِيْدُوْا اَنْ يُعْطَوْۙنَ ﴿۵۴﴾</p> <p>اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزٰٓقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَبِيْنُ ﴿۵۵﴾</p> <p>قَالَ لِلذَّيْنِ ظَلَمُوْا اَذُوْبًا مِّثْلَ ذُوْبٍ اَصْحٰبِهِمْ</p>
---	--

- (۱) یعنی ہر بعد میں آنے والی قوم نے اس طرح رسولوں کی تکذیب کی اور انہیں جادوگر اور دیوانہ قرار دیا جیسے کچھلی قومیں بعد میں آنے والی قوموں کے لیے وصیت کر کے جاتی رہی ہیں۔ یکے بعد دیگرے ہر قوم نے یہی تکذیب کا راستہ اختیار کیا۔
- (۲) یعنی ایک دوسرے کو وصیت تو نہیں کی بلکہ ہر قوم ہی اپنی اپنی جگہ سرکش ہے، اس لیے ان سب کے دل بھی تشابہ ہیں اور ان کے طور اطوار بھی ملتے جلتے۔ اس لیے متاخرین نے بھی وہی کچھ کہا اور کیا جو متقدمین نے کہا اور کیا۔
- (۳) اس لیے کہ نصیحت سے فائدہ انہیں کو پہنچتا ہے۔ یا مطلب ہے کہ آپ نصیحت کرتے رہیں، اس نصیحت سے وہ لوگ یقیناً فائدہ اٹھائیں گے جن کی بابت اللہ کے علم میں ہے کہ وہ ایمان لائیں گے۔
- (۴) اس میں اللہ تعالیٰ کے اس ارادہ شرعیہ تکلیفیہ کا اظہار ہے جو اس کو محبوب و مطلوب ہے کہ تمام انس و جن صرف ایک اللہ کی عبادت کریں اور اطاعت بھی اسی ایک کی کریں۔ اگر اس کا تعلق ارادہ تکوینی سے ہوتا پھر تو کوئی انس و جن اللہ کی عبادت و اطاعت سے انحراف کی طاقت ہی نہ رکھتا۔ یعنی اس میں انسانوں اور جنوں کو اس مقصد زندگی کی یاد دہانی کرائی گئی ہے، جسے اگر انہوں نے فراموش کیے رکھا تو آخرت میں سخت باز پرس ہوگی اور وہ اس امتحان میں ناکام قرار پائیں گے جس میں اللہ نے ان کو ارادہ و اختیار کی آزادی دے کر ڈالا ہے۔
- (۵) یعنی میری عبادت و اطاعت سے میرا مقصود یہ نہیں ہے کہ یہ مجھے کما کر کھلائیں، جیسا کہ دوسرے آقاؤں کا مقصود ہوتا ہے، بلکہ رزق کے سارے خزانے تو خود میرے ہی پاس ہیں میری عبادت و اطاعت سے تو خود ان ہی کو فائدہ ہوگا کہ ان کی آخرت سنور جائے گی نہ کہ مجھے کوئی فائدہ ہوگا۔

قَالَ مَسْتَجَابُونَ ﴿۵۱﴾

ساتھیوں کے حصہ کے مثل حصہ ملے گا،^(۱) لہذا وہ مجھ سے جلدی طلب نہ کریں۔^(۲) (۵۹)
پس خرابی ہے منکروں کو ان کے اس دن کی جس کا وعدہ دیئے جاتے ہیں۔ (۶۰)

سورہ طور کی ہے اور اس میں انچاس آیتیں ہیں اور دو رکوع ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

قسم ہے طور کی۔^(۱)
اور لکھی ہوئی کتاب کی۔^(۲)
جو جھلی کے کھلے ہوئے ورق میں ہے۔^(۳)
اور آباد گھر کی۔^(۴)

وَالظُّوْرُ ﴿۱﴾
وَكُتِيبٌ مِّنظُوْرٍ ﴿۲﴾
فِي رَقٍ مِّنْشُوْرٍ ﴿۳﴾
وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ﴿۴﴾

(۱) ذُبُوْب کے معنی بھرے ڈول کے ہیں۔ کنویں سے ڈول میں پانی نکال کر تقسیم کیا جاتا ہے اس اعتبار سے یہاں ڈول کو حصے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مطلب ہے کہ ظالموں کو عذاب سے حصہ پہنچے گا، جس طرح اس سے پہلے کفر و شرک کا ارتکاب کرنے والوں کو ان کے عذاب کا حصہ ملا تھا۔

(۲) لیکن یہ حصہ عذاب انہیں کب پہنچے گا، یہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے، اس لیے طلب عذاب میں جلدی نہ کریں۔
(۳) طُوْر، وہ پہاڑ ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ سے ہم کلام ہوئے۔ اسے طور سینا، بھی کہا جاتا ہے۔ اللہ نے اس کے اسی شرف کی بنا پر اس کی قسم کھائی ہے۔

(۴) مَسْنُوْر کے معنی ہیں۔ مکتوب، لکھی ہوئی چیز۔ اس کا مصداق مختلف بیان کیے گئے ہیں۔ قرآن مجید، لوح محفوظ، تمام کتب منزلہ یا وہ انسانی اعمال نامے جو فرشتے لکھتے ہیں۔

(۵) یہ متعلق ہے مَسْنُوْر کے۔ رَق، وہ باریک چیز جس پر لکھا جاتا تھا۔ مَسْنُوْر، بمعنی مَسْنُوْط، پھیلا یا کھلا ہوا۔

(۶) یہ بیت معمور، ساتویں آسمان پر وہ عبادت خانہ ہے جس میں فرشتے عبادت کرتے ہیں۔ یہ عبادت خانہ فرشتوں سے اس طرح بھرا ہوتا ہے کہ روزانہ اس میں ستر ہزار فرشتے عبادت کے لیے آتے ہیں جن کی پھر دوبارہ قیامت تک باری نہیں آتی۔ جیسا کہ احادیث معراج میں بیان کیا گیا ہے۔ بعض بیت معمور سے مراد خانہ کعبہ لیتے ہیں، جو عبادت کے لیے آنے والے انسانوں سے ہر وقت بھرا رہتا ہے۔ معمور کے معنی ہی آباد اور بھرے ہوئے کے ہیں۔

اور اونچی چھت کی۔^(۱) (۵)
 اور بھڑکائے ہوئے سمندر کی۔^(۲) (۶)
 بیشک آپ کے رب کا عذاب ہو کر رہنے والا ہے۔ (۷)
 اسے کوئی روکنے والا نہیں۔^(۳) (۸)
 جس دن آسمان تھر تھرانے لگے گا۔^(۴) (۹)
 اور پہاڑ چلنے پھرنے لگیں گے۔ (۱۰)
 اس دن جھٹلانے والوں کی (پوری) خرابی ہے۔ (۱۱)
 جو اپنی بیہودہ گوئی میں اچھل کود کر رہے ہیں۔^(۵) (۱۲)
 جس دن وہ دھکے دے^(۶) دے کر آتش جہنم کی طرف

وَالسَّعِقَ الْرُفُوعَ ۝
 وَالْبَصِيرَ السَّجُودَ ۝
 إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝
 نَالَهُ مِنْ دَانِعٍ ۝
 يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَمُورًا ۝
 وَتُكْسِفُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝
 قَوْلِينَ يَوْمِئِذٍ لِّلْمَلَكِئِدِينَ ۝
 الَّذِينَ هُمْ فِي حَوْضٍ مُّبَعُونَ ۝
 يَوْمَ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ تَارِيحِهِمْ دَعَا ۝

(۱) اس سے مراد آسمان ہے جو زمین کے لیے بمنزلہ چھت کے ہے۔ قرآن نے دوسرے مقام پر اسے ”محفوظ چھت“ کہا ہے۔ ﴿ وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا لَّا تَمَسُّهُنَّ مِنِّي السَّمَكُوتُونَ ﴾ (سورۃ الأنبياء ۳۲) بعض نے اس سے عرش مراد لیا ہے جو تمام مخلوقات کے لیے چھت ہے۔

(۲) مجبور کے معنی ہیں، بھڑکے ہوئے۔ بعض کہتے ہیں، اس سے وہ پانی مراد ہے جو زیر عرش ہے جس سے قیامت والے دن بارش نازل ہوگی، اس سے مراد جسم زندہ ہو جائیں گے۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد سمندر ہیں، ان میں قیامت والے دن آگ بھڑک اٹھے گی۔ جیسے فرمایا ﴿ وَذَٰلِكَ الْبَإْسُ الَّذِي بَدَأَ الشَّيْطَانُ ﴾ (الشکویر ۱) ”اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے۔“ امام شوکانی نے اسی مفہوم کو اولیٰ قرار دیا ہے اور بعض نے مسجور کے معنی مملوء (بھرے ہوئے) کے لیے ہیں، یعنی فی الحال سمندروں میں آگ تو نہیں ہے، البتہ وہ پانی سے بھرے ہوئے ہیں، امام طبری نے اس قول کو اختیار کیا ہے۔ اس کے اور بھی کئی معنی بیان کیے گئے ہیں (دیکھئے تفسیر ابن کثیر)

(۳) یہ مذکورہ قسموں کا جواب ہے۔ یعنی یہ تمام چیزیں، جو اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی مظہر ہیں اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ کا وہ عذاب بھی یقیناً واقع ہو کر رہے گا جس کا اس نے وعدہ کیا ہے، اسے کوئی ٹالنے پر قادر نہیں ہوگا۔

(۴) مور کے معنی ہیں حرکت و اضطراب۔ قیامت والے دن آسمان کے نظم میں جو اختلال اور کواکب و سیارگان کی ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے جو اضطراب واقع ہوگا، اس کو ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور یہ مذکورہ عذاب کے لیے طرف ہے۔ یعنی یہ عذاب اس روز واقع ہوگا جب آسمان تھر تھرائے گا اور پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ کر روٹی کے گالوں اور ریت کے ذروں کی طرح اڑ جائیں گے۔

(۵) یعنی اپنے کفر و باطل میں مصروف اور حق کی تکذیب و استہزا میں لگے ہوئے ہیں۔

(۶) الدع کے معنی ہیں نہایت سختی کے ساتھ دھکیلنا۔

لائے جائیں گے۔ (۱۳)

یہی وہ آتش دوزخ ہے جسے تم جھوٹ بتلاتے تھے۔ (۱۴)^(۱)

(اب بتاؤ) کیا یہ جادو ہے؟ یا تم دیکھتے ہی نہیں ہو۔ (۱۵)^(۲)

جاؤ دوزخ میں اب تمہارا صبر کرنا اور نہ کرنا تمہارے لیے یکساں ہے۔ تمہیں فقط تمہارے کیے کا بدلہ دیا جائے گا۔ (۱۶)

یقیناً پرہیزگار لوگ جنتوں میں اور نعتوں میں ہیں۔ (۱۷)^(۳)
جو انہیں ان کے رب نے دے رکھی ہیں اس پر خوش خوش ہیں، (۱۸)^(۴) اور ان کے پروردگار نے انہیں جہنم کے عذاب سے بھی بچالیا ہے۔ (۱۸)

تم مزے سے کھاتے پیتے رہو ان اعمال کے بدلے جو تم کرتے تھے۔ (۱۹)^(۵)

برابر بچھے ہوئے شاندار تختے پر تکیے لگائے ہوئے۔ (۲۰)^(۶) اور

هٰذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿۱۳﴾

اَفَصِرْهُنَّ اَلْمَرْءَاتُ لَمْ يُحْيُوْنَ ﴿۱۴﴾

اِضْلُوْهَا فَاَنْصِرُوْهُنَّ اَوْ لَنْصِرُوْهُنَّ سَوَآءٌ عَلَيْنَا اِنَّمَا تَجْعَلُوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنَّتٍ ذَّرِيْعَةٍ ﴿۱۶﴾

فَكِرِهِيْنَ بِمَا اَلَنَهُمْ رَبُّهُمُ وَرَوَّاهُمْ رَبُّهُمُ عَنَّا اَبْجَحِيْوْا ﴿۱۷﴾

كُلُوْا وَاَشْرَبُوْا مِنْ اَيِّ مَا اَشْتَاءْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾

مُنْكِبِيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ وَّزَوَّجْنَاهُمْ بِمُحْرَبِيْنَ ﴿۱۹﴾

(۱) یہ جہنم پر مقرر فرشتے (زبانیں) انہیں کہیں گے۔

(۲) جس طرح تم دنیا میں پیغمبروں کو جادوگر کہا کرتے تھے، بتلاؤ! کیا یہ بھی کوئی جادو کا کرتب ہے؟

(۳) یا جس طرح تم دنیا میں حق کے دیکھنے سے اندھے تھے، یہ عذاب بھی تمہیں نظر نہیں آ رہا ہے؟ یہ تفریق و توخیج کے لیے انہیں کہا جائے گا، ورنہ ہرچیز ان کے مشاہدے میں آچکی ہوگی۔

(۴) اہل کفر و اہل شقاوت کے بعد اہل ایمان و اہل سعادت کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

(۵) یعنی جنت کے گھر، لباس، کھانے، سواریاں، حسین و جمیل بیویاں (حور عین) اور دیگر نعمتیں ان سب پر وہ خوش ہوں گے، کیونکہ یہ نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے بدرجہا بڑھ کر ہوں گی اور مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ۔ کا مصداق۔

(۶) دوسرے مقام پر فرمایا ﴿كُلُوْا وَاَشْرَبُوْا مِنْ اَيِّ مَا اَشْتَاءْتُمْ اَلَا تَسْلَفُوْنَ فِيْ الْاَنْبَاءِ الْخَالِيَةِ﴾۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی رحمت حاصل کرنے کے لیے ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ بہت ضروری ہیں۔

(۷) مَصْفُوْفَةٍ، ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے۔ گویا وہ ایک صف ہیں۔ یا بعض نے اس کا مفہوم بیان کیا ہے کہ

ہم نے ان کے نکاح بڑی بڑی آنکھوں والی (حوروں) سے
کردیئے ہیں۔ (۲۰)

اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان
میں ان کی پیروی کی ہم ان کی اولاد کو ان تک پہنچا دیں
گے اور ان کے عمل سے ہم کچھ کم نہ کریں گے،^(۱) ہر
شخص اپنے اپنے اعمال کا گروہی ہے۔^(۲) (۲۱)

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ
ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلْتَنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ
كُلُّ أُمَّةٍ لِيَمَّا كَسَبَ وَرَبُّنَا ۝

کے چہرے ایک ایک دوسرے کے سامنے ہوں گے، جیسے میدان جنگ میں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے ہوتی ہیں۔ اس
مفہوم کو قرآن میں دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ﴿عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ﴾ - (الصافات، ۴۴) ”ایک دوسرے
کے سامنے تختوں پر فروکش ہوں گے۔“

(۱) یعنی جن کے باپ اپنے اخلاص و تقویٰ اور عمل و کردار کی بنیاد پر جنت کے اعلیٰ درجوں پر فائز ہوں گے، اللہ تعالیٰ
ان کی ایماندار اولاد کے بھی درجے بلند کر کے، ان کو ان کے باپوں کے ساتھ ملا دے گا۔ یہ نہیں کرے گا کہ ان کے باپوں
کے درجے کم کر کے ان کی اولاد والے کمتر درجوں میں انہیں لے آئے۔ یعنی اہل ایمان پر دو گونہ احسان فرمائے گا۔ ایک
تو باپ بیٹوں کو آپس میں ملا دے گا تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، بشرطیکہ دونوں ایماندار ہوں۔ دوسرا، یہ کہ کم تر
درجے والوں کو اٹھا کر اونچے درجوں پر فائز فرما دے گا۔ ورنہ دونوں کے ملاپ کا یہ طریقہ بھی ہو سکتا ہے کہ اے کلاس
والوں کو بی کلاس دے دے، یہ بات چونکہ اس کے فضل و احسان سے فروتر ہوگی، اس لیے وہ ایسا نہیں کرے گا بلکہ بی
کلاس والوں کو اے کلاس عطا فرمائے گا۔ یہ تو اللہ کا وہ احسان ہے جو اولاد پر، آپا کے عملوں کی برکت سے ہو گا اور حدیث
میں آتا ہے کہ اولاد کی دعا و استغفار سے آپا کے درجات میں بھی اضافہ ہوتا ہے ایک شخص کے جب جنت میں درجے بلند
ہوتے ہیں تو وہ اللہ سے اس کا سبب پوچھتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تیری اولاد کی تیرے لیے دعائے مغفرت کرنے کی وجہ
سے۔ (مسند احمد، ۲/۵۰۹) اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آتا ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس
کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ البتہ تین چیزوں کا ثواب، موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے ایک صدقہ جاریہ۔
دوسرا، وہ علم جس سے لوگ فیض یاب ہوتے رہیں اور تیسری، نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہو۔“ (مسلم، کتاب
الوصیة، باب ما یلحق الإنسان من الشواب بعد وفاته)

(۲) رَہِیْنٌ بِمَعْنَىٰ مَرْهُوْبٌ (گروہ شدہ چیز) ہر شخص اپنے عمل کا گروہی ہو گا۔ یہ عام ہے، مومن اور کافر دونوں کو شامل
ہے اور مطلب ہے کہ جو جیسا (اچھایا برا) عمل کرے گا، اس کے مطابق (اچھی یا بری) جزا پائے گا۔ یا اس سے مراد صرف
کافر ہیں کہ وہ اپنے اعمال میں گرفتار ہوں گے، جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَہِیْنَةٌ﴾ * اِلَّا الَّذِیْنَ
اَلْمَلٰئِیْہِیْنَ ﴿ (المقدر، ۳۸-۳۹) ”ہر شخص اپنے اعمال میں گرفتار ہو گا۔ سوائے اصحاب الیمین (اہل ایمان) کے۔“

ہم ان کے لیے میوے اور مرغوب گوشت کی ریل پیل کر دیں گے۔^(۱) (۲۲)

(خوش طبعی کے ساتھ) ایک دوسرے سے جام (شراب) کی چھینا چھینی کریں گے^(۲) جس شراب کے سرور میں تو بیہودہ گوئی ہوگی نہ گناہ۔^(۳) (۲۳)

اور ان کے ارد گرد ان کے نو عمر غلام چل پھر رہے ہوں گے گویا کہ وہ موتی تھے جو ڈھکے رکھے تھے۔^(۴) (۲۴)

اور آپس میں ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر سوال کریں گے۔^(۵) (۲۵)

کہیں گے کہ اس سے پہلے ہم اپنے گھر والوں کے درمیان بہت ڈرا کرتے تھے۔^(۶) (۲۶)

پس اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا احسان کیا اور ہمیں تیز و تند گرم ہواؤں کے عذاب سے بچالیا۔^(۷) (۲۷)

وَأَمَدَدْنَاهُمْ بِغَاكِهِمْ وَكَلِمَةٍ مَّوَالِيَتِهِمْ ۝۲۲

يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَّا لَغْوِ فِيهَا وَلَا تَأْتِيهِمْ ۝۲۳

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكَوْنٌ ۝۲۴

وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝۲۵

قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ۝۲۶

فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَدْنَا عَدَابَ النَّوْمِ ۝۲۷

(۱) أَمَدَدْنَاهُمْ بِمَعْنَى زِدْنَاهُمْ، یعنی خوب دیں گے۔

(۲) يَتَنَازَعُونَ، يَتَعَاطَوْنَ وَيَتَنَازَلُونَ ایک دوسرے سے لیں گے۔ یا پھر وہ معنی ہیں جو فاضل مترجم نے کیے ہیں۔ کاس،

اس پیالے اور جام کو کہتے ہیں جو شراب یا کسی اور مشروب سے بھرا ہوا ہو۔ خالی برتن کو کاس نہیں کہتے۔ (فتح القدیر)

(۳) اس شراب میں دنیا کی شراب کی تاثیر نہیں ہوگی، اسے پی کر نہ کوئی ہنسنے لگا کہ لغو گوئی کرے نہ اتنا مدہوش اور

مست ہو گا کہ گناہ کا ارتکاب کرے۔

(۴) یعنی جنتیوں کی خدمت کے لیے انہیں نو عمر خادم بھی دیئے جائیں گے جو ان کی خدمت کے لیے پھر رہے ہوں گے

اور حسن و جمال اور صفائی و رعنائی میں وہ ایسے ہوں گے جیسے موتی، بننے ڈھک کر رکھا گیا ہو، تاکہ ہاتھ لگنے سے اس کی

چمک دک ماند پڑے۔

(۵) ایک دوسرے سے دنیا کے حالات پوچھیں گے کہ دنیا میں وہ کن حالات میں زندگی گزارتے اور ایمان و عمل کے

تقاضے کس طرح پورے کرتے رہے؟

(۶) یعنی اللہ کے عذاب سے۔ اس لیے اس عذاب سے بچنے کا اہتمام بھی کرتے رہے، اس لیے کہ انسان کو جس چیز کا ڈر

ہو تا ہے، اس سے بچنے کے لیے وہ تنگ و دو بھی کرتا ہے۔

(۷) سَمُومٌ، لو، جھلس ڈالنے والی گرم ہوا کو کہتے ہیں، جہنم کے ناموں میں سے ایک نام بھی ہے۔

ہم اس سے پہلے ہی اس کی عبادت کیا کرتے تھے،^(۱) بیشک وہ محسن اور مہربان ہے۔ (۲۸)

تو آپ سمجھاتے رہیں کیونکہ آپ اپنے رب کے فضل سے نہ تو کاہن ہیں نہ دیوانہ۔^(۲) (۲۹)

کیا کافریوں کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے، ہم اس پر زمانے کے حوادث (یعنی موت) کا انتظار کر رہے ہیں۔^(۳) (۳۰)

کہہ دیجئے! تم منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔^(۴) (۳۱)

کیا ان کی عقلیں انہیں یہی سکھاتی ہیں؟^(۵) یا یہ لوگ ہی سرکش ہیں۔^(۶) (۳۲)

کیا یہ کہتے ہیں کہ اس نبی نے (قرآن) خود گھڑ لیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔^(۷) (۳۳)

إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوهُ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ ﴿۲۸﴾

فَذَكِّرْ فَمَا أَنتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ ﴿۲۹﴾

أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ مَّتَرْتَابٍ بِهِ رِيبَ الْمُنُونِ ﴿۳۰﴾

قُلْ تَرْتَابُوا فَإِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْذِرِينَ ﴿۳۱﴾

أَمْ تَأْتُرُهُمْ آحَادٌ مِّنْهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿۳۲﴾

أَمْ يَقُولُونَ نَقَّوْلَهُ بَلْ أَدَّبُوا بِعِزِّي ﴿۳۳﴾

(۱) یعنی صرف اسی ایک کی عبادت کرتے تھے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے، یا یہ مطلب ہے کہ اسی سے عذاب جنم سے بچنے کے لیے دعا کرتے تھے۔

(۲) اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ وعظ و تبلیغ اور نصیحت کا کام کرتے رہیں اور یہ آپ کی بابت جو کچھ کہتے رہتے ہیں، ان کی طرف کان نہ دھریں، اس لیے کہ آپ اللہ کے فضل سے کاہن ہیں نہ دیوانہ (جیسا کہ یہ کہتے ہیں) بلکہ آپ پر باقاعدہ ہماری طرف سے وحی آتی ہے، جو کہ کاہن پر نہیں آتی، آپ جو کلام لوگوں کو سناتے ہیں، وہ دانش و بصیرت کا آئینہ دار ہوتا ہے، ایک دیوانے سے اس طرح گفتگو کیوں کر ممکن ہے؟

(۳) زینب کے معنی ہیں حوادث، متون، موت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ مطلب ہے کہ قریش مکہ اس انتظار میں ہیں کہ زمانے کے حوادث سے شاید اس (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو موت آجائے اور ہمیں چین نصیب ہو جائے، جو اس کی دعوت توحید نے ہم سے چھین لیا ہے۔

(۴) یعنی دیکھو! موت پہلے کسے آتی ہے؟ اور ہلاکت کس کا مقدر بنتی ہے؟

(۵) یعنی یہ تیرے بارے میں جو اس طرح اناپ شناپ جھوٹ اور غلط سلسلہ باتیں کرتے رہتے ہیں، کیا ان کی عقلیں ان کو یہی سمجھتی ہیں؟

(۶) نہیں بلکہ یہ سرکش اور گمراہ لوگ ہیں، اور یہی سرکشی اور گمراہی انہیں ان باتوں پر برا لگینے کرتی ہے۔

(۷) یعنی قرآن گھڑنے کے الزام پر ان کو آمادہ کرنے والا بھی ان کا کفر ہی ہے۔

اجھا اگر یہ سچے ہیں تو بھلا اس جیسی ایک (ہی) بات یہ
(بھی) تولے آئیں۔^(۱) (۳۳)

کیا یہ بغیر کسی (پیدا کرنے والے) کے خود بخود پیدا ہو گئے
ہیں؟^(۲) یا یہ خود پیدا کرنے والے ہیں؟^(۳) (۳۵)

کیا انہوں نے ہی آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ بلکہ یہ
یقین نہ کرنے والے لوگ ہیں۔^(۴) (۳۶)

یا کیا ان کے پاس تیرے رب کے خزانے ہیں؟^(۵) یا
یا (ان خزانوں کے) یہ داروغہ ہیں۔^(۶) (۳۷)

یا کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر سنتے
ہیں؟^(۷) (اگر ایسا ہے) تو ان کا سننے والا کوئی روشن دلیل
پیش کرے۔ (۳۸)

کیا اللہ کی تو سب لڑکیاں ہیں اور تمہارے ہاں لڑکے

قَلِيْلًا اَنْكَرًا سَدِيْدًا مِّمْلٰةً اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۳۳﴾

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ سَمٰیۙ اَمْ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾

اَمْ خَلَقُوْا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِلَا اَوْتُوْنٰ ﴿۳۶﴾

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزٰوِيْنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُخْتَبِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

اَمْ لَهُمْ سُلٰوِيْنٌ مِّمَّوْنَ فَاِذْ قَلِيْلًا مِّنْ مَّعْمُوْرٍ يَّمْلٰئِنُ
تُبٰوِيْنِ ﴿۳۸﴾

اَمْ لَهٗ الْاِنْتٰكُ وَالْاِنْتٰكُ الْاِنْتٰوْنَ ﴿۳۹﴾

(۱) یعنی اگر یہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں کہ یہ قرآن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اپنا گھڑا ہوا ہے تو پھر یہ بھی اس جیسی کتاب بنا کر پیش کر دیں جو نظم، اعجاز و بلاغت، حسن بیان، ندرت اسلوب، تعین حقائق اور حل مسائل میں اس کا مقابلہ کر سکے۔

(۲) یعنی اگر واقعی ایسا ہے تو پھر کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ انہیں کسی بات کا حکم دے یا کسی بات سے منع کرے۔ لیکن جب ایسا نہیں ہے بلکہ انہیں ایک پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے، تو ظاہر ہے اس کا انہیں پیدا کرنے کا ایک خاص مقصد ہے، وہ انہیں پیدا کر کے یوں ہی کس طرح چھوڑ دے گا؟

(۳) یعنی یہ خود بھی اپنے خالق نہیں ہیں، بلکہ یہ اللہ کے خالق ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔

(۴) بلکہ اللہ کے وعدوں اور وعیدوں کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔

(۵) کہ یہ جس کو چاہیں روزی دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں یا جس کو چاہیں نبوت سے نوازیں۔

(۶) مُصَيِّرٌ يَّا مُسَيِّرٌ، سَطْرٌ سے ہے، لکھنے والا جو محافظ و نگران ہو، وہ چونکہ ساری تفصیلات لکھتا ہے، اس لیے یہ محافظ اور نگران کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی کیا اللہ کے خزانوں یا اس کی رحمتوں پر ان کا تسلط ہے کہ جس کو چاہیں دیں یا نہ دیں۔

(۷) یعنی کیا یہ ان کا دعویٰ ہے کہ سیڑھی کے ذریعے سے یہ بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح آسمانوں پر جا کر ملائکہ کی باتیں یا ان کی طرف جو وحی کی جاتی ہے، وہ سن آئے ہیں۔

(۳۹)؟ ہیں

کیا تو ان سے کوئی اجرت طلب کرتا ہے کہ یہ اس کے
تاوان سے بوجھل ہو رہے ہیں۔ (۳۰)^(۱)

کیا انکے پاس علم غیب ہے جسے یہ لکھ لیتے ہیں؟ (۳۱)^(۲)
کیا یہ لوگ کوئی فریب کرنا چاہتے ہیں؟ (۳۲)^(۳) تو یقین کر لیں
کہ فریب خوردہ کافر ہی ہیں۔ (۳۲)^(۴)

کیا اللہ کے سوا ان کا کوئی معبود ہے؟ (ہرگز نہیں) اللہ
تعالیٰ ان کے شرک سے پاک ہے۔ (۳۳)^(۵)

اگر یہ لوگ آسمان کے کسی ٹکڑے کو گرتا ہوا دیکھ لیں
تب بھی کہہ دیں کہ یہ تہ بہ تہ بادل ہے۔ (۳۴)^(۶)

تو انہیں چھوڑ دے یہاں تک کہ انہیں اس دن سے سابقہ
پڑے جس میں یہ بے ہوش کر دیئے جائیں گے۔ (۳۵)^(۷)

جس دن انہیں ان کا ٹکر کچھ کام نہ دے گا اور نہ وہ مدد
کیے جائیں گے۔ (۳۶)^(۸)

پیشک ظالموں کے لیے اسکے علاوہ اور عذاب بھی ہیں
لیکن ان لوگوں میں سے اکثر بے علم ہیں۔ (۳۷)^(۹)

أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَقْرَمٍ مُتَمَلِّئُونَ ﴿۳۰﴾

أَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ﴿۳۱﴾

أَمْ يُرِيدُونَ كَيْدًا فَالَّذِينَ كَفَرُوا هُمْ الْمَكِيدُونَ ﴿۳۲﴾

أَمْ لَهُمْ آلِهَةٌ تَمِيزُ اللَّهُ مَا تَشَاءُونَ ﴿۳۳﴾

وَإِنْ يَرَوْا كِسْفًا مِنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَّرْكُومٌ ﴿۳۴﴾

فَذَرَهُمْ حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ ﴿۳۵﴾

يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿۳۶﴾

وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذَلِكَ وَلَٰكِن لَّا تَرَوْهُم

لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۷﴾

(۱) یعنی اس کی ادائیگی ان کے لیے مشکل ہو۔

(۲) کہ ضرور ان سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مرجائیں گے اور ان کو موت اس کے بعد آئے گی۔

(۳) یعنی ہمارے پیغمبر کے ساتھ، جس سے اس کی ہلاکت واقع ہو جائے۔

(۴) یعنی کید و مکر ان ہی پر الٹ پڑے گا اور سارا نقصان انہی کو ہو گا۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَا يَجِئُ الْمَكْرَ السَّيِّئِ إِلَّا يَأْخُذُ﴾

(فاطر، ۳۳) چنانچہ بدر میں یہ کافر مارے گئے اور بھی بہت سی جگہوں پر ذلت و رسوائی سے دوچار ہوئے۔

(۵) مطلب ہے کہ اپنے کفر و عناد سے پھر بھی باز نہ آئیں گے، بلکہ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہیں گے کہ یہ عذاب

نہیں، بلکہ ایک پر ایک بادل چڑھا آرہا ہے، جیسا کہ بعض موقعوں پر ایسا ہوتا ہے۔

(۶) یعنی نیا میں، جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَلَا تَنْفَعُهُمُ مِنَ الْعَذَابِ الَّذِي دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾

(آلہم السجدۃ، ۲۱)

(۷) اس بات سے کہ دنیا کے یہ عذاب اور مصائب، اس لیے ہیں تاکہ انسان اللہ کی طرف رجوع کریں۔ یہ نکتہ چونکہ

تو اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر سے کام لے، بیشک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ صبح کو جب تو اٹھے^(۱) اپنے رب کی پاکی اور حمد بیان کر۔ (۳۸) اور رات کو بھی اس کی تسبیح پڑھ^(۲) اور ستاروں کے ڈوبتے وقت بھی۔ (۳۹)^(۳)

سورہ نجم کی ہے اور اس میں باٹھ آیتیں اور تین رکوع ہیں۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ﴿۳۸﴾

وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ﴿۳۹﴾



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

نہیں سمجھتے اس لیے گناہوں سے تائب نہیں ہوتے بلکہ بعض دفعہ پہلے سے بھی زیادہ گناہ کرنے لگ جاتے ہیں۔ جس طرح ایک حدیث میں فرمایا کہ ”منافق جب بیمار ہو کر صحت مند ہو جاتا ہے تو اس کی مثال اونٹ کی سی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اسے کیوں رسیوں سے باندھا گیا۔ اور کیوں کھلا چھوڑ دیا گیا؟ (ابوداؤد، کتاب الجنائز، نمبر ۳۰۸۹)

(۱) اس کھڑے ہونے سے کون سا کھڑا ہونا مراد ہے؟ بعض کہتے ہیں جب نماز کے لیے کھڑے ہوں۔ جیسا کہ آغاز نماز میں سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ أَسْمُكَ . . . پڑھی جاتی ہے۔ بعض کہتے ہیں، جب نیند سے بیدار ہو کر کھڑے ہوں۔ اس وقت بھی اللہ کی تسبیح و تحمید مسنون ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جب کسی مجلس سے کھڑے ہوں۔ جیسے حدیث میں آتا ہے۔ جو شخص کسی مجلس سے اٹھتے وقت یہ دعا پڑھ لے گا تو یہ اس کی مجلس کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ . (سنن الترمذی، أبواب الدعوات، باب ما یقول إذا قام من مجلسه)

(۲) اس سے مراد قیام اللیل۔ یعنی نماز تہجد ہے، جو عمر بھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول رہا۔

(۳) آئی: وَفَتْ إِذْبَارَهَا مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ اس سے مراد فجر کی دو سنتیں ہیں، نوافل میں سب سے زیادہ اس کی نبی ﷺ حفاظت فرماتے تھے۔ اور ایک روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا ”فجر کی دو سنتیں دنیا و ما فیما سے بہتر ہے“ (صحیح بخاری، کتاب التہجد، باب تعاهد رکعتی الفجر ومن سماهما تطوعاً، و صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب استحباب رکعتی الفجر)

☆ یہ پہلی سورت ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے مجمع عام میں تلاوت کیا، تلاوت کے بعد آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے پیچھے جتنے لوگ تھے، سب نے سجدہ کیا، سوائے امیہ بن خلف کے، اس نے اپنی مٹھی میں

<p>قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے۔^(۱)</p> <p>کہ تمہارے ساتھی نے نہ راہ گم کی ہے نہ وہ ٹیڑھی راہ پر ہے۔^(۲)</p> <p>اور نہ وہ اپنی خواہش سے کوئی بات کہتے ہیں۔^(۳)</p> <p>وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے۔^(۴)</p> <p>اسے پوری طاقت والے فرشتے نے سکھایا ہے۔^(۵)</p> <p>جو زور آور ہے^(۶) پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔^(۷)</p>	<p>وَالْقَوْمِ إِذَا هَوَىٰ ۝۱</p> <p>مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۝۲</p> <p>وَيَسْتَوِيٰ عَنِ الْهَوَىٰ ۝۳</p> <p>إِنَّ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝۴</p> <p>عَلَّمَكَ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۝۵</p> <p>ذُو زُرِّهٖ فَاسْتَوَىٰ ۝۶</p>
---	--

مٹی لے کر اس پر سجدہ کیا۔ چنانچہ یہ کفر کی حالت میں ہی مارا گیا (صحیح بخاری، تفسیر سورہ نجم) بعض طریق میں اس شخص کا نام عقبہ بن ربیعہ بتلایا گیا ہے (تفسیر ابن کثیر) وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے اس سورت کی تلاوت آپ ﷺ کے سامنے کی، آپ ﷺ نے اس میں سجدہ نہیں کیا (صحیح بخاری، باب مذکور) اس کا مطلب یہ ہوا کہ سجدہ کرنا مستحب ہے، فرض نہیں۔ اگر کبھی چھوڑ بھی دیا جائے تو جائز ہے۔

(۱) بعض مفسرین نے ستارے سے ثریا ستارہ اور بعض نے زہرہ ستارہ مراد لیا ہے اور بعض نے جنس نجوم 'ہویٰ' اوپر سے نیچے گرنا، یعنی جب رات کے اختتام پر فجر کے وقت وہ گرتا ہے، یا شیطین کو مارنے کے لیے گرتا ہے یا بقول بعض قیامت والے دن گریں گے۔

(۲) یہ جواب قسم ہے۔ صَاحِبُكُمْ (تمہارا ساتھی) کہہ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو واضح کر دیا گیا ہے کہ نبوت سے پہلے چالیس سال اس نے تمہارے ساتھ اور تمہارے درمیان گزارے ہیں، اس کے شب و روز کے تمام معمولات تمہارے سامنے ہیں، اس کا اخلاق و کردار تمہارا جانا پہچانا ہے۔ راست بازی اور امانت داری کے سوا تم نے اس کے کردار میں کبھی کچھ اور بھی دیکھا؟ اب چالیس سال کے بعد جو وہ نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے تو ذرا سوچو، وہ کس طرح جھوٹ ہو سکتا ہے؟ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ وہ نہ گمراہ ہوا ہے نہ بہکا ہے۔ ضلالت، راہ حق سے وہ انحراف ہے جو جمالت اور لاعلمی سے ہو اور غوایت، وہ کبھی ہے جو جانتے بوجھتے حق کو چھوڑ کر اختیار کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کی گمراہیوں سے اپنے پیغمبر کی تزیین بیان فرمائی۔

(۳) یعنی وہ گمراہ یا بہک کس طرح سکتا ہے، وہ تو وحی الہی کے بغیر لب کشائی ہی نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ مزاح اور خوش طبعی کے موقعوں پر بھی آپ ﷺ کی زبان مبارک سے حق کے سوا کچھ نہ نکلتا تھا (سنن الترمذی، ابواب البر، باب ماجاء فی المزاح) اسی طرح حالت غضب میں، آپ ﷺ کو اپنے جذبات پر اتنا کنٹرول تھا کہ آپ ﷺ کی زبان سے کوئی بات خلاف واقعہ نہ نکلتی (ابوداؤد، کتاب العلم، باب فی کتاب العلم)

(۴) اس سے مراد جبرائیل علیہ السلام فرشتہ ہے جو قوی اعضا کا مالک اور نہایت زور آور ہے، پیغمبر پر وحی لانے اور اسے

اور وہ بلند آسمان کے کناروں پر تھا۔ ^(۷)	وَهُوَ بِالْأُفْقِ الْأَعْلَى ۝
پھر نزدیک ہوا اور اتر آیا۔ ^(۸)	ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى ۝
پس وہ دو کمانوں کے بقدر فاصلہ رہ گیا بلکہ اس سے بھی کم۔ ^(۹)	فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى ۝
پس اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی ^(۱۰) جو بھی پہنچائی۔ ^(۱۱)	فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۝
دل نے جھوٹ نہیں کہا جسے (پیغمبر نے) دیکھا۔ ^(۱۲)	مَا كَذَّبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۝
کیا تم جھگڑا کرتے ہو اس پر جو (پیغمبر) دیکھتے ہیں۔ ^(۱۳)	أَفَتُكْفِرُونَ بِهِ عَلَيٰ مَا يَرَىٰ ۝
اسے تو ایک مرتبہ اور بھی دیکھا تھا۔ ^(۱۴)	وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ ۝
سدرۃ المنتسیٰ کے پاس۔ ^(۱۵)	عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ ۝
اسی کے پاس جنت الماویٰ ہے۔ ^(۱۶)	عِنْدَ مَا جِئْتُمُ الْمَآوَىٰ ۝

سکھلانے والا یہی فرشتہ ہے۔

(۱) یعنی جبرائیل علیہ السلام یعنی وحی سکھلانے کے بعد آسمان کے کناروں پر جا کھڑے ہوئے۔

(۲) یعنی پھر زمین پر اترے اور آہستہ آہستہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوئے۔

(۳) بعض نے ترجمہ کیا ہے، 'دو ہاتھوں کے بقدر' یہ نبی ﷺ اور جبرائیل علیہ السلام کی باہمی قربت کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ اور نبی ﷺ کی قربت کا اظہار نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ باور کراتے ہیں۔ آیات کے سیاق سے صاف واضح ہے کہ اس میں صرف جبرائیل علیہ السلام اور پیغمبر کا بیان ہے۔ اسی قربت کے موقع پر نبی ﷺ نے جبرائیل علیہ السلام کو انکی اصل شکل میں دیکھا اور یہ بعثت کے ابتدائی ادوار کا واقعہ ہے جس کا ذکر ان آیات میں کیا گیا۔ دوسری مرتبہ اصل شکل میں معراج کی رات دیکھا۔

(۴) یعنی جبرائیل علیہ السلام، اللہ کے بندے حضرت محمد ﷺ کے لیے جو وحی یا پیغام لے کر آئے تھے، وہ انہوں نے آپ ﷺ تک پہنچایا۔

(۵) یعنی نبی ﷺ نے جبرائیل علیہ السلام کو اصل شکل میں دیکھا کہ ان کے چہ سو پر ہیں۔ ایک پر مشرق و مغرب کے درمیان فاصلے جتنا تھا، اس کو آپ ﷺ کے دل نے جھٹلایا نہیں، بلکہ اللہ کی اس عظیم قدرت کو تسلیم کیا۔

(۶) یہ ایلیۃ المعراج کو جب اصل شکل میں جبرائیل علیہ السلام کو دیکھا، اس کا بیان ہے۔ یہ سدرۃ المنتسیٰ، ایک بیری کا درخت ہے جو چھٹے یا ساتویں آسمان پر ہے اور یہ آخری حد ہے، اس سے اوپر کوئی فرشتہ نہیں جا سکتا۔ فرشتے اللہ کے احکام بھی میس سے وصول کرتے ہیں۔

(۷) اسے جنت الماویٰ، اس لیے کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کا ماویٰ و مسکن یہی تھا، بعض کہتے ہیں کہ رو صیں

جب کہ سدرہ کو چھپائے لیتی تھی وہ چیز جو اس پر چھا رہی تھی۔^(۱) (۱۶)
 نہ تو نگاہ ہمکنی نہ حد سے بڑھی۔^(۲) (۱۷)
 یقیناً اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے بعض نشانیاں دیکھ لیں۔^(۳) (۱۸)
 کیا تم نے لات اور عزریٰ کو دیکھا۔ (۱۹)
 اور منات تیسرے پچھلے کو۔^(۴) (۲۰)

إذِ يَنْشَى السِّدْرَةَ مَا يَنْشَى ⑤

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى ⑥

لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى ⑦

أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ ⑧

وَمَنْوَةَ الْعَالِيَةِ الْأَخْرَىٰ ⑨

یہاں آکر جمع ہوتی ہیں۔ (فتح القدر)

(۱) سدرۃ المنتہیٰ کی اس کیفیت کا بیان ہے جب شب معراج میں آپ ﷺ نے اس کا مشاہدہ کیا، سونے کے پروانے اس کے گرد منزلہ رہے تھے، فرشتوں کا عکس اس پر پڑ رہا تھا، اور رب کی تجلیات کا مظہر بھی وہی تھا۔ (ابن کثیر وغیرہ) اسی مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تین چیزوں سے نوازا گیا۔ پانچ وقت کی نمازیں، سورۃ بقرہ کی آخری آیات اور اس مسلمان کی مغفرت کا وعدہ جو شرک کی آلودگیوں سے پاک ہو گا (صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب ذکر سدرۃ المنتہیٰ)

(۲) یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہیں دائیں بائیں ہوئیں اور نہ اس حد سے بلند اور متجاوز ہوئیں جو آپ ﷺ کے لیے مقرر کردی گئی تھی۔ (ایسر التفاسیر)

(۳) جن میں یہ جبرائیل علیہ السلام اور سدرۃ المنتہیٰ کا دیکھنا اور دیگر مظاہر قدرت کا مشاہدہ ہے جس کی کچھ تفصیل احادیث معراج میں بیان کی گئی ہے۔

(۴) یہ مشرکین کی توبخ کے لیے کہا جا رہا ہے کہ اللہ کی یہ توشان ہے جو مذکور ہوئی کہ جبرائیل علیہ السلام جیسے عظیم فرشتوں کا وہ خالق ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے اس کے رسول ہیں، جنہیں اس نے آسمانوں پر بلا کر بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ بھی کروایا اور وحی بھی ان پر نازل فرماتا ہے۔ کیا تم جن معبودوں کی عبادت کرتے ہو، ان کے اندر بھی یہ یا اس قسم کی خوبیاں ہیں؟ اس ضمن میں عرب کے تین مشہور بتوں کے نام بطور مثال لیے۔ لَات، بعض کے نزدیک یہ لفظ اللہ سے ماخوذ ہے، بعض کے نزدیک لَات پلینٹ سے ہے، جس کے معنی موڑنے کے ہیں، پجاری اپنی گردنیں اس کی طرف موڑتے اور اس کا طواف کرتے تھے۔ اس لیے یہ نام پڑ گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ لات میں تاشدود ہے۔ لَتْ پلٹ سے اسم فاعل (ستو گھولنے والا) یہ ایک نیک آدمی تھا، حاجیوں کو ستو گھول گھول کر پلایا کرتا تھا، جب یہ مر گیا تو لوگوں نے اس کی قبر کو عبادت گاہ بنا لیا، پھر اس کے مجتے اور بت بن گئے۔ یہ طائف میں بتو تھیف کا سب سے بڑا بت تھا۔ عَزَّىٰ کہتے ہیں یہ اللہ کے صفاتی نام عَزِيْز سے ماخوذ ہے، اور یہ اَعْرُج کی تائید ہے بمعنی عَزِيْزۃ بعض کہتے ہیں

کیا تمہارے لیے لڑ کے اور اللہ کے لیے لڑکیاں ہیں؟^(۱) (۲۱)

یہ تو اب بڑی بے انصافی کی تقسیم ہے۔ (۲۲)^(۲)
در اصل یہ صرف نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے ان کے رکھ لیے ہیں اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ یہ لوگ تو صرف اٹکل کے اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور یقیناً ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔ (۲۳)

الَّذِي الذَّكَرُ وَالْأُنثَى ①

بَلْ أَنْتُمْ إِذَا قَسَمْتُمْ ضَيْزَى ②

إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءُ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَالْبَنَاءُ كُمْ مِمَّا أَنْزَلَ
اللَّهُ بِهِمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِنْ يَكْفُرُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا هُوَ
إِلَّا الظَّنُّ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ رَبِّهِمْ الْهُدَى ③

کہ یہ غفغان میں ایک درخت تھا جس کی عبادت کی جاتی تھی، بعض کہتے ہیں کہ شیطان (بھوتی) تھی جو بعض درختوں میں ظاہر ہوتی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ سنگ ایضاً تھا جس کو پوجتے تھے۔ یہ قریش اور بنو کنانہ کا خاص معبود تھا۔ مَنْوَةٌ، مَنَى یعنی سے ہے جس کے معنی صَبَّ (ہمانے) کے ہیں۔ اس کا تقرب حاصل کرنے کے لیے لوگ کثرت سے اس کے پاس جانور ذبح کرتے اور ان کا خون بہاتے تھے۔ یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک بت تھا (فتح القدر) یہ قدید کے بالمقابل مثل جگہ میں تھا، بنو خزاعہ کا یہ خاص بت تھا۔ زمانہ جاہلیت میں اس اور خزرج میں سے احرام باندھتے تھے اور اس بت کا طواف بھی کرتے تھے (ایسر التفاسیر و ابن کثیر) ان کے علاوہ مختلف اطراف میں اور بھی بہت سے بت اور بت خانے پھیلے ہوئے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد اور دیگر مواقع پر ان بتوں اور دیگر تمام بتوں کا خاتمہ فرما دیا۔ ان پر جو تہ اور عمارتیں بنی ہوئی تھیں، وہ مسمار کروادیں، ان درختوں کو کٹوا دیا، جن کی تعظیم کی جاتی تھی اور وہ تمام آثار و مظاہر مٹا ڈالے گئے جو بت پرستی کی یادگار تھے، اس کام کے لیے آپ ﷺ نے حضرت خالد، حضرت علی، حضرت عمرو بن عاص اور حضرت جریر بن عبد اللہ الجبلی وغیرہم رضوان اللہ علیہم اجمعین کو، جہاں جہاں یہ بت تھے، بھیجا اور انہوں نے جا کر ان سب کو ڈھا کر سرزمین عرب سے شرک کا نام مٹا دیا۔ (ابن کثیر) قرون اولیٰ کے بت بعد ایک مرتبہ پھر عرب میں شرک کے یہ مظاہر عام ہو گئے تھے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے مجدد الدعوة شیخ محمد بن عبد الوہاب کو توفیق دی، انہوں نے درعیہ کے حاکم کو اپنے ساتھ ملا کر قوت کے ذریعے سے ان مظاہر شرک کا خاتمہ فرمایا اور اسی دعوت کی تجدید ایک مرتبہ پھر سلطان عبدالعزیز والی نجد و حجاز (موجودہ سعودی حکمرانوں کے والد اور اس مملکت کے بانی) نے کی اور تمام پختہ قبروں اور قبوں کو ڈھا کر سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا احیا فرمایا اور یوں الحمد للہ اب پورے سعودی عرب میں اسلامی احکام کے مطابق نہ کوئی پختہ قبر ہے اور نہ کوئی مزار

(۱) مشرکین مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، یہ اس کی تردید ہے، جیسا کہ متعدد جگہ یہ مضمون گزر چکا ہے۔

(۲) ضیضی، حق و صواب سے ہٹی ہوئی۔

أَمَّا الَّذِينَ مَا تَدْعُو ۝

فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَىٰ ۝

وَلَمْ يَكُن لِّكَ فِي السَّمَوَاتِ لَاقِعُنِي سَعَاءُ مَا كُنتُمْ بِشَيْئًا مِنَ الْأَرْوَاحِ
بَعْدَ أَنْ يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ ۝

إِنَّ الَّذِينَ يُرْمُونَكَ بِالْآخِرَةِ لَمُسُونُواكَ الْمَلَائِكَةَ

تَمِيمَةَ الْأَنْبِيَاءِ ۝

وَاللَّهُ بِهِ مِنْ عَلَمَانِ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ

لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۝

فَاغْرِضْ عَنْ مَنْ تَوَلَّىٰ عَنْ وَكُورًا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ

الدُّنْيَا ۝

ذَلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ

صَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ اهْتَدَىٰ ۝

وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ

أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَبُوا بِالْحَنَفِ ۝

کیا ہر شخص جو آرزو کرے اسے میسر ہے؟ (۲۳)

اللہ ہی کے ہاتھ ہے یہ جہان اور وہ جہان۔ (۲۵)

اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی مگر یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خوشی اور اپنی چاہت سے جس کے لیے چاہے اجازت دے دے۔ (۲۶)

پیشک جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کا زائد نام مقرر کرتے ہیں۔ (۲۷)

حالانکہ انہیں اس کا کوئی علم نہیں وہ صرف اپنے گمان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور پیشک وہم (وگمان) حق کے مقابلے میں کچھ کام نہیں دیتا۔ (۲۸)

تو آپ اس سے منہ موڑ لیں جو ہماری یاد سے منہ موڑے اور جن کا ارادہ بجز زندگی دنیائے دنیا کے اور کچھ نہ ہو۔ (۲۹)

یہی ان کے علم کی انتہا ہے۔ آپ کا رب اس سے خوب واقف ہے جو اس کی راہ سے بھٹک گیا ہے اور وہی خوب واقف ہے اس سے بھی جو راہ یافتہ ہے۔ (۳۰)

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تاکہ اللہ تعالیٰ برے عمل کرنے والوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دے اور نیک کرنے والوں کو اچھا بدلہ

(۱) یعنی یہ جو چاہتے ہیں کہ ان کے یہ معبود انہیں فائدہ پہنچائیں اور ان کی سفارش کریں یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

(۲) یعنی وہی ہو گا جو وہ چاہے گا کیونکہ تمام اختیارات اسی کے پاس ہیں۔

(۳) یعنی فرشتے، جو اللہ کی مقرب ترین مخلوق ہے، ان کو بھی شفاعت کا حق صرف انہی لوگوں کے لیے ملے گا جن کے لیے اللہ پسند کرے گا، جب یہ بات ہے تو پھر یہ پتھر کی مورتیاں کس طرح کسی کی سفارش کر سکیں گی؟ جن سے تم آس لگائے بیٹھے ہو، نیز اللہ تعالیٰ مشرکوں کے حق میں کسی کو سفارش کرنے کا حق بھی کب دے گا، جب کہ شرک اس کے نزدیک ناقابل معافی ہے؟

عنایت فرمائے۔^(۱) (۳۱)

ان لوگوں کو جو بڑے گناہوں سے بچتے ہیں اور بے حیائی سے بھی^(۲) سوائے کسی چھوٹے سے گناہ کے۔^(۳) بیشک تیرا رب بہت کشادہ مغفرت والا ہے، وہ تمہیں بخوبی جانتا ہے جبکہ اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور جبکہ تم اپنی

الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كِبْرَ الْأَثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَاتِ رَبَّكَ
وَأَسْمِعِ الْمَغْفِرَةَ هُوَ أَعْلَمُ بِكُلِّ إِثْمٍ أَنْشَأْتُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَإِنَّكُمْ لِرَبِّكُمْ
فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ فَالْحَرُونَ أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمِمَّنْ اتَّقَى ۝

(۱) یعنی ہدایت اور گمراہی اسی کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے اور جسے چاہتا ہے، گمراہی کے گڑھے میں ڈال دیتا ہے، تاکہ نیکو کار کو اس کی نیکیوں کا صلہ اور بدکار کو اس کی برائیوں کا بدلہ دے ﴿وَلَهُ مَنَاقِبُ السَّمَوَاتِ وَمَنَاقِبُ الْأَرْضِ﴾ یہ جملہ معترضہ ہے اور لَبِيزِي کا تعلق گزشتہ گفتگو سے ہے۔ (فتح القدیر)

(۲) کَبَارُ، کَبِيرَةٌ کی جمع ہے۔ کبیرہ گناہ کی تعریف میں اختلاف ہے۔ زیادہ اہل علم کے نزدیک ہر وہ گناہ کبیرہ ہے جس پر جنم کی وعید ہے، یا جس کے مرتکب کی سخت مذمت قرآن و حدیث میں مذکور ہے اور اہل علم یہ بھی کہتے ہیں کہ چھوٹے گناہ پر اصرار و دوام بھی اسے کبیرہ گناہ بنا دیتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے معنی اور ماہیت کی تحقیق میں اختلاف کی طرح، اس کی تعداد میں بھی بہت اختلاف ہے۔ بعض علما نے انہیں کتابوں میں جمع بھی کیا ہے۔ جیسے کتاب الکبائر للذہبی اور الزواجر وغیرہ۔ فَوَاحِشُ، فَاحِشَةٌ کی جمع ہے، بے حیائی پر مبنی کام، جیسے زنا، لواطت وغیرہ۔ بعض کہتے ہیں، جن گناہوں میں حد ہے، وہ سب فواحش میں داخل ہیں۔ آج کل بے حیائی کے مظاہرہ چونکہ بہت عام ہو گئے ہیں، اس لیے بے حیائی کو ”تمذیب“ سمجھ لیا گیا ہے، حتیٰ کہ اب مسلمانوں نے بھی اس ”تمذیب بے حیائی“ کو اپنا لیا ہے۔ چنانچہ گھروں میں ٹی وی، وی سی آر وغیرہ عام ہیں، عورتوں نے نہ صرف پردے کو خیر باد کہہ دیا ہے، بلکہ بن سنور کر اور حسن و جمال کا مجسم اشتہار بن کر باہر نکلنے کو اپنا شعار اور وطیرہ بنا لیا ہے۔ مخلوط تعلیم، مخلوط ادارے، مخلوط مجالس اور دیگر بہت سے موقعوں پر مرد و زن کا بے باکناہ اختلاط اور بے محابا گفتگو روز افزوں ہے، دراصل حالیکہ یہ سب ”فواحش“ میں داخل ہیں۔ جن کی بابت یہاں بتلایا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کی مغفرت ہونی ہے، وہ کبائر و فواحش سے اجتناب کرنے والے ہوں گے نہ کہ ان میں مبتلا۔

(۳) لَمَمٌ کے لغوی معنی ہیں، کم اور چھوٹا ہونا، اسی سے اس کے یہ استعمالات ہیں أَلَمٌ بِالْمَكَانِ (مکان میں تھوڑی دیر ٹھہرا) أَلَمٌ بِالطَّعَامِ (تھوڑا سا کھلایا)، اسی طرح کسی چیز کو محض چھولینا، یا اس کے قریب ہونا، یا کسی کام کو ایک مرتبہ یا دو مرتبہ کرنا، اس پر دوام و استمرار نہ کرنا، یا محض دل میں خیال کا گزرنے، یا یہ سب صورتیں لَمَمٌ کہلاتی ہیں، (فتح القدیر) اس کے اس مفہوم اور استعمال کی رو سے اس کے معنی صغیرہ گناہ کیے جاتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بڑے گناہ کے مبادیات کا ارتکاب، لیکن بڑے گناہ سے اجتناب کرنا، یا کسی گناہ کا ایک دو مرتبہ کرنا پھر ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ دینا، یا کسی گناہ کا محض دل میں خیال کرنا لیکن عملاً اس کے قریب نہ جانا، یہ سارے صغیرہ گناہ ہوں گے، جو اللہ تعالیٰ کبائر سے اجتناب کی برکت سے معاف فرمادے گا۔

ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے^(۱) پس تم اپنی پاکیزگی آپ بیان نہ کرو،^(۲) وہی پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے۔ (۳۲) کیا آپ نے اسے دیکھا جس نے منہ موڑ لیا۔ (۳۳) اور بہت کم دیا اور ہاتھ روک لیا۔^(۳) (۳۴) کیا اسے علم غیب ہے کہ وہ (سب کچھ) دیکھ رہا ہے؟^(۴) (۳۵)

کیا اسے اس چیز کی خبر نہیں دی گئی جو موسیٰ (علیہ السلام) کے۔ (۳۶)

اور وفادار ابراہیم (علیہ السلام) کے صحیفوں میں تھا۔ (۳۷) کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ (۳۸) اور یہ کہ ہر انسان کے لیے صرف وہی ہے جس کی کوشش خود اس نے کی۔^(۵) (۳۹)

اور یہ کہ بیشک اس کی کوشش عنقریب دیکھی

أَفَرَأَيْتَ الَّذِي تَوَلَّى ۝

وَإَعْطَى قَلِيلًا وَأَكْدَى ۝

أَجْنَدًا لَهُمْ الْعَلِيمُ الْقَهُورِيُّ ۝

أَمْ لَمْ يُنَبِّأْ بِمَا فِي صُفِّ مُوسَى ۝

وَأَنبَاهِهِمَ الَّذِي تَوَلَّى ۝

أَلَّا سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَذَرَوْهُم ۝

وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى ۝

وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَى ۝

(۱) اَجْنَةً، جَبْنِيْنُ کی جمع ہے جو پیٹ کے بچے کو کہا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ لوگوں کی نظروں سے مستور ہوتا ہے۔

(۲) یعنی جب اس سے تمہاری کوئی کیفیت اور حرکت مخفی نہیں، حتیٰ کہ جب تم ماں کے پیٹ میں تھے، جہاں تمہیں کوئی دیکھنے پر قادر نہیں تھا، وہاں بھی تمہارے تمام احوال سے وہ واقف تھا، تو پھر اپنی پاکیزگی بیان کرنے کی اور اپنے منہ میاں مٹھونے کی کیا ضرورت ہے؟ مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ کرو۔ تاکہ ریا کاری سے تم بچو۔

(۳) یعنی تھوڑا سادے کر ہاتھ روک لیا۔ یا تھوڑی سی اطاعت کی اور پیچھے ہٹ گیا اَکْدَى کے اصل معنی ہیں کہ زمین کھودتے کھودتے سخت پتھر آجائے اور کھدائی ممکن نہ رہے۔ بالآخر وہ کھدائی چھوڑ دے تو کہتے ہیں اَکْدَى یعنی اس کا استعمال اس شخص کے لیے کیا جانے لگا جو کسی کو کچھ دے لیکن پورا نہ دے، کوئی کام شروع کرے لیکن اسے پایہ تکمیل تک نہ پہنچائے۔

(۴) یعنی کیا وہ دیکھ رہا ہے کہ اس نے فی سبیل اللہ خرچ کیا تو اس کا مال ختم ہو جائے گا؟ نہیں، غیب کا یہ علم اس کے پاس نہیں ہے بلکہ وہ خرچ کرنے سے گریز محض بخل، دنیا کی محبت اور آخرت پر عدم یقین کی وجہ سے کر رہا ہے اور اطاعت الہی سے انحراف کی وجوہات بھی یہی ہیں۔

(۵) یعنی جس طرح کوئی کسی دوسرے کے گناہ کا ذمے دار نہیں ہو گا، اسی طرح اسے آخرت میں اجر بھی انہی چیزوں کا ملے گا، جن میں اس کی اپنی محنت ہو گی۔ (اس جزا کا تعلق آخرت سے ہے، دنیا سے نہیں۔ جیسا کہ بعض سوشلسٹ قسم

جائے گی۔^(۱) (۳۰)

پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ (۳۱)
 اور یہ کہ آپ کے رب ہی کی طرف پہنچتا ہے۔ (۳۲)
 اور یہ کہ وہی ہنساتا ہے اور وہی رلاتا ہے۔ (۳۳)
 اور یہ کہ وہی مارتا ہے اور جلاتا ہے۔ (۳۴)
 اور یہ کہ اسی نے جو ژالعیٰ نروماہ پیدا کیا ہے۔ (۳۵)
 نطفہ سے جبکہ وہ ٹپکایا جاتا ہے۔ (۳۶)
 اور یہ کہ اسی کے ذمہ دوبارہ پیدا کرنا ہے۔ (۳۷)
 اور یہ کہ وہی مالدار بناتا ہے اور سرمایہ دیتا ہے۔ (۳۸)^(۲)

تُخَيِّرُنَاهُ الْجِزَاءَ أَلَدًا نَّيًّا
 وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ
 وَإِنَّهُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَىٰ
 وَإِنَّهُ هُوَ آمَاتٌ وَآخِيًا
 وَإِنَّهُ خَلَقَ الرُّوحَيْنِ الْأَنثَىٰ وَالنَّثَىٰ
 مِنْ نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ
 وَأَنَّ عَلَيْهِ النَّشْأَةَ الْأُخْرَىٰ
 وَإِنَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ وَالْغَنَىٰ

کے اہل علم اس کا یہ مفہوم باور کرا کے غیر حاضر زمینداری اور کرایہ داری کو ناجائز قرار دیتے ہیں) البتہ اس آیت سے ان علما کا استدلال صحیح ہے جو کہتے ہیں کہ قرآن خوانی کا ثواب میت کو نہیں پہنچتا۔ اس لیے کہ یہ مردہ کا عمل ہے نہ اس کی محنت۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو مردوں کے لیے قرآن خوانی کی ترغیب دی نہ کسی نص یا اشارہ النص سے اس کی طرف رہنمائی فرمائی۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی یہ عمل منقول نہیں۔ اگر یہ عمل عمل خیر ہوتا تو صحابہ رضی اللہ عنہم اسے ضرور اختیار کرتے۔ اور عبادات و قربات کے لیے نص کا ہونا ضروری ہے، اس میں رائے اور قیاس نہیں چل سکتا۔ البتہ دعا اور صدقہ و خیرات کا ثواب مردوں کو پہنچتا ہے، اس پر تمام علما کا اتفاق ہے، کیونکہ یہ شارع کی طرف سے منصوص ہے۔ اور وہ جو حدیث ہے کہ مرنے کے بعد تین چیزوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے، تو وہ بھی دراصل انسان کے اپنے عمل ہیں جو کسی نہ کسی انداز سے اس کی موت کے بعد بھی جاری رہتے ہیں۔ اولاد کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود انسان کی اپنی کمائی قرار دیا ہے۔ (سنن النسائی، کتاب السبوع، باب النحت علی الکسب) صدقہ جاریہ، وقف کی طرح انسان کے اپنے آثار عمل ہیں۔ ﴿وَتَنْبِئُكَ مَا فَتَنَّاكَ بِهِمْ﴾ (یس ۳۰) اسی طرح وہ علم، جس کی اس نے لوگوں میں نشر و اشاعت کی اور لوگوں نے اس کی اقتدا کی، تو یہ اس کی سعی اور اس کا عمل ہے اور بمصدق حدیث نبوی «مَنْ دَعَا إِلَىٰ هُدًى، كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلُ أُجُورِ مَنْ تَبِعَهُ، مَنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْئًا». (سنن أبی داؤد کتاب السنۃ، باب لزوم السنۃ) اقتدار کرنے والوں کا اجر بھی اسے پہنچتا رہے گا۔

اس لیے یہ حدیث، آیت کے منافی نہیں ہے۔ (ابن کثیر)

(۱) یعنی دنیا میں اس نے اچھایا برا جو بھی کیا، چھپ کر کیا یا علانیہ کیا، قیامت والے دن سامنے آجائے گا اور اس پر اسے پوری جزا دی جائے گی۔

(۲) یعنی کسی کو اتنی تو گمری دیتا ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا اور اس کی تمام حاجتیں پوری ہو جاتی ہیں اور کسی کو اتنا

اور یہ کہ وہی شعرئ (ستارے) کا رب ہے۔^(۱) (۳۹)
 اور یہ کہ اسی نے عدا اول کو ہلاک کیا ہے۔^(۲) (۵۰)
 اور ثمود کو بھی (جن میں سے) ایک کو بھی باقی نہ رکھا۔ (۵۱)
 اور اس سے پہلے قوم نوح کو، یقیناً وہ بڑے ظالم اور
 سرکش تھے۔ (۵۲)
 اور مؤتلفہ (شر یا الٹی ہوئی بستیوں کو) اسی نے
 الٹ دیا۔^(۳) (۵۳)
 پھر اس پر چھا دیا جو چھایا۔^(۴) (۵۴)
 پس اے انسان تو اپنے رب کی کس کس نعمت کے بارے
 میں جھگڑے گا؟^(۵) (۵۵)
 یہ (نبی) ڈرانے والے ہیں پہلے ڈرانے والوں میں
 سے۔ (۵۶)
 آنے والی گھڑی قریب آگئی ہے۔ (۵۷)
 اللہ کے سوا اس کا (وقت معین پر کھول) دکھانے والا اور
 کوئی نہیں۔ (۵۸)
 پس کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو؟^(۶) (۵۹)

وَأَنَّ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ ۝
 وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ عَلِيمٌ ۝
 وَثَمُودَ إِذْ كَانُوا فِي وَادٍ طَوِيٍّ ۝
 وَقَوْمَ نُوحٍ لَمَّا كَانُوا فِي الْفُلِ ۝
 وَالْمُؤْتَفِكَةَ ۝
 فَيَأْتِي آلَهِ إِلَهِ رَبِّكَ تَتَمَارَى ۝
 هَذَا نَذِيرٌ مِنَ النَّذِيرِ الْأُولَى ۝
 أَمْ نَفِيتَ الْأَرْزَاقَ ۝
 لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ ۝
 أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ هَذَا الْفُلَّاءِ لَيْسَ عَلَيْهِمْ عِلْمٌ ۝

سرمایہ دے دیتا ہے کہ اس کے پاس ضرورت سے زاد بیچ رہتا ہے اور وہ اس کو جمع کر کے رکھتا ہے۔

(۱) رب تو وہ ہر چیز کا ہے، یہاں اس ستارے کا نام اس لیے لیا ہے کہ بعض عرب قبائل اس کو پوجا کرتے تھے۔

(۲) قوم عاد کو اولیٰ اس لیے کہا کہ یہ ثمود سے پہلے ہوئی، یا اس لیے کہ قوم نوح کے بعد سب سے پہلے یہ قوم ہلاک کی گئی۔ بعض کہتے ہیں، عاد نامی دو قومیں گزری ہیں، یہ پہلی ہے جسے باد تند سے ہلاک کیا گیا جب کہ دوسری زمانے کی گردشوں کے ساتھ مختلف ناموں سے چلتی اور بکھرتی ہوئی موجود رہی۔

(۳) اس سے مراد حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں ہیں، جن کو ان پر الٹ دیا گیا۔

(۴) یعنی اس کے بعد ان پر پتھروں کی بارش ہوئی۔

(۵) یا شک کرے گا اور ان کو جھٹلائے گا، جب کہ وہ اتنی عام اور واضح ہیں کہ ان کا انکار ممکن ہے نہ ان کا انخافی۔

(۶) بات سے مراد قرآن کریم ہے، یعنی اس سے تم تعجب کرتے اور اس کا استہزا کرتے ہو، حالانکہ اس میں نہ تعجب والی

وَصَحْلُونَ وَلَا تَبْلُغُونَ ۞

وَأَنْتُمْ سَمِيدُونَ ۞

فَأَسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا ۞

اور بس رہے ہو؟ روتے نہیں؟ (۶۰)

(بلکہ) تم کھیل رہے ہو۔ (۶۱)

اب اللہ کے سامنے سجدے کرو اور (اسی کی) عبادت

کرو۔ (۶۲) (۱)

الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ

سورہ قمر کی ہے اور اس میں پچپن آیتیں اور
تین رکوع ہیں۔

سُورَةُ الْقَمَرِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۞

قیامت قریب آگئی (۲) اور چاند چھٹ گیا۔ (۱) (۳)

إِنْتَبِطِ السَّاعَةُ وَأَنْشَقَّ الْقَمَرُ ۞

کوئی بات ہے نہ استنزا و تکذیب والی۔

(۱) یہ مشرکین اور مکذبین کی توبیح کے لیے حکم دیا۔ یعنی جب ان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ قرآن کو ماننے کے بجائے، اس کا استنزا و استخفاف کرتے ہیں اور ہمارے پیغمبر کے وعظ و نصیحت کا کوئی اثر ان پر نہیں ہو رہا ہے، تو اے مسلمانو! تم اللہ کی بارگاہ میں جھک کر اور اس کی عبادت و اطاعت کا مظاہرہ کر کے قرآن کی تعظیم و توقیر کا اہتمام کرو۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ نے سجدہ کیا، حتیٰ کہ اس وقت مجلس میں موجود کفار نے بھی سجدہ کیا۔ جیسا کہ احادیث میں ہے۔

☆ یہ بھی ان سورتوں میں سے ہے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عید میں پڑھا کرتے تھے۔ کَمَا مَرَّ.

(۲) ایک توبہ اعتبار اس زمانے کے جو گزر گیا، کیونکہ جو باقی ہے، وہ تھوڑا ہے۔ دوسرے ہر آنے والی چیز قریب ہی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی بابت فرمایا کہ میرا وجود قیامت سے متصل ہے، یعنی میرے اور قیامت کے درمیان کوئی نبی نہیں آئے گا۔

(۳) یہ وہ معجزہ ہے جو اہل مکہ کے مطالبے پر دکھایا گیا، چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے حتیٰ کہ لوگوں نے حرا پہاڑ کو اس کے درمیان دیکھا۔ یعنی اس کا ایک ٹکڑا پہاڑ کے اس طرف اور ایک ٹکڑا اس طرف ہو گیا۔ (صحیح بخاری، کتاب مناقب الأنصار، باب انشقاق القمر و تفسیر سورة اقترت الساعة۔ و صحیح مسلم کتاب صفة القيامة، باب انشقاق القمر) جمہور سلف و خلف کا یہی مسلک ہے (فتح القدیر) امام ابن کثیر لکھتے ہیں ”علا کے درمیان یہ بات متفق علیہ ہے کہ انشقاق قمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوا اور یہ آپ ﷺ کے واضح معجزات میں سے ہے، صحیح سند سے ثابت احادیث متواترہ اس پر دلالت کرتی ہیں۔“

وَأَنْ يَرَوْا آيَةً يُعَرِّضُوا وَيُعَاسِرُوا يَعْرِضُونَ ①

یہ اگر کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ پہلے سے چلا آتا ہوا جادو ہے۔^(۱)

وَكَذَّبُوا وَابْتَعُوا أَهْوَاءَهُمْ وَكَلَّأُوا أَمْوَالَهُمْ بَعْدَ ②

انہوں نے جھٹلایا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی اور ہر کام ٹھہرے ہوئے وقت پر مقرر ہے۔^(۲)

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْآيَاتِ مَا بَيَّنَّ لَهُمْ مَزْجِرًا ③

یقیناً ان کے پاس وہ خبریں آچکی ہیں جن میں ڈانٹ ڈپٹ (کی نصیحت) ہے۔^(۳)

حِكْمَةً بِالْعَبَاةِ فَمَا تَغْنُمُ الثَّوَابُ ④

اور کامل عقل کی بات ہے^(۴) لیکن ان ڈراؤنی باتوں نے بھی کچھ فائدہ نہ دیا۔^(۵)

فَتَوَلَّوْا عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِيَ إِلَىٰ أَهْلِهِ مُتَمَكِّرًا ⑤

پس (اے نبی) تم ان سے اعراض کرو جس دن ایک پکارنے والا ناگوار چیز کی طرف پکارے گا۔^(۶)

مُتَمَكِّرًا أَبْصَارُهُمْ يَتَرَفُّونَ مِنَ الْأَحْبَابِ كَأَنَّهُمْ بَرَاءٌ لِّمَنْ تَمَجَّرُ ⑥

یہ جھکی آنکھوں قبروں سے اس طرح نکل کھڑے ہوں

(۱) یعنی قریش نے ایمان لانے کے بجائے، اسے جادو قرار دے کر اپنے اعراض کی روش برقرار رکھی۔

(۲) یہ کفار کہہ کی تکذیب اور اتباع اہوا کی تردید و بطلان کے لیے فرمایا کہ ہر کام کی ایک غایت اور انتہا ہے، وہ کام اچھا ہو یا برا۔ یعنی بالآخر اس کا نتیجہ نکلے گا، اچھے کام کا نتیجہ اچھا اور برے کام کا برا۔ اس نتیجے کا ظہور دنیا میں بھی ہو سکتا ہے اگر اللہ کی مشیت مقتضی ہو، ورنہ آخرت میں تو یقینی ہے۔

(۳) یعنی گزشتہ امتوں کی ہلاکت کی، جب انہوں نے تکذیب کی۔

(۴) یعنی ان میں عبرت و نصیحت کے پہلو ہیں، کوئی ان سے سبق حاصل کر کے شرک و معصیت سے بچنا چاہے تو بیخ سکتا ہے۔ مُزْدَجَّرًا اصل میں مُزْتَجَرٌ ہے ذَجْرٌ سے مصدر میسی۔

(۵) یعنی ایسی بات جو تباہی سے پھیر دینے والی ہے یا یہ قرآن حکمت بالغہ ہے جس میں کوئی نقص یا خلل نہیں ہے۔ یا اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دے اور اس کو گمراہ کرے، اس میں بڑی حکمت ہے جس کو وہی جانتا ہے۔

(۶) یعنی جس کے لیے اللہ نے شقاوت لکھ دی ہے اور اس کے دل پر مر لگا دی ہے، اس کو پیغمبروں کا ڈراوا کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے؟ اس کے لیے تو ﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنذِرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ﴾ والی بات ہے۔ تقریباً اسی مفہوم کی یہ آیت ہے۔

﴿ قُلْ فَلِلَّهِ الْحُكْمُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴾ (الأنعام: ۱۳۹)

(۷) یوم سے پہلے اذکر مخزوف ہے، یعنی اس دن کو یاد کرو۔ نُكْرٌ، نہایت ہولناک اور دہشت ناک مراد میدان محشر اور موقف حساب کے احوال اور آزمائشیں ہیں۔

گے کہ گویا وہ پھیلا ہوا مڈی دل ہے۔^(۷)
 پکارنے والے کی طرف دوڑتے ہوں گے^(۸) اور کافر
 کہیں گے یہ دن تو بہت سخت ہے۔^(۸)
 ان سے پہلے قوم نوح نے بھی ہمارے بندے کو جھٹلایا تھا
 اور دیوانہ بنا کر جھڑک دیا گیا تھا۔^(۹)
 پس اس نے اپنے رب سے دعا کی کہ میں بے بس ہوں تو
 میری مدد کر۔^(۱۰)
 پس ہم نے آسمان کے دروازوں کو زور کے مینہ سے
 کھول دیا۔^(۱۱)
 اور زمین سے چشموں کو جاری کر دیا پس اس کام کے لئے
 جو مقدر کیا گیا تھا (دونوں) پانی جمع ہو گئے۔^(۱۲)
 اور ہم نے اسے تختوں اور کیلوں والی (کشتی) پر سوار کر
 لیا۔^(۱۳)
 جو ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی۔ بدلہ اس کی
 طرف سے جس کا کفر کیا گیا تھا۔^(۱۴)

مُهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ يَقُولُ الْكٰفِرُونَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۝

كَذٰبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ كَلَدُوا عِبَادَنَا وَقَالُوْا
 بَعْنُوْنَ وَاذْذٰجِرٌ ۝

فَدَعَا رَبَّ اٰتٰى مَغْلُوْبًا فَانصُرْ ۝

فَفَتَحْنَا الْاَبْوَابَ السَّمٰوٰتِ مَاءً مُّنْهَرٍ ۝

وَوَجَعْنَا الْاَرْضَ عُرُوْسًا فَالْتَقٰى الْمَآءُ عَلَى اٰرْقَمٍ قُدْرٌ ۝

وَصَلَلْنٰهُ عَلَى ذٰلِكَ الْاَوَامِرِ وَاذْذٰجِرٌ ۝

تَجَرَّوْا بِاَعْيُنِنَا فَرَآءَيْنَ كَانَ كُفْرًا ۝

(۱) یعنی قبروں سے نکل کر وہ اس طرح پھیلیں گے اور موقف حساب کی طرف اس طرح نہایت تیزی سے جائیں گے، گویا مڈی دل ہے جو آنا فنا فضائے بسط میں پھیل جاتا ہے۔

(۲) مُهْطِعِينَ، مُسْرِعِينَ، دوڑیں گے، پیچھے نہیں رہیں گے۔

(۳) وَاذْذٰجِرٌ وَاذْذٰجِرٌ ہے، یعنی قوم نوح نے نوح علیہ السلام کی تکذیب ہی نہیں کی، بلکہ انہیں جھڑکا اور ڈرایا دھمکایا بھی۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿لٰكِنَّ كَلِمَةً تَنْقُذُ يَوْمًا لَّذٰلِكَ لَوَلَوْ كُنُوْا مِنَ الْمُتَّوْعِيْنَ﴾ ﴿الشعراء: ۱۱۲﴾ ”اے نوح! اگر تو باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر دیا جائے گا۔“

(۴) مُنْهَرٌ، بمعنی کثیرا زور دار ہمنر، صَبَّ (بننے) کے معنی میں آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ چالیس دن تک مسلسل خوب زور سے پانی برستا رہا۔

(۵) یعنی آسمان اور زمین کے پانی نے مل کر وہ کام پورا کر دیا جو قضا و قدر میں لکھ دیا گیا تھا یعنی طوفان بن کر سب کو غرق کر دیا۔

(۶) دُسْرٌ دَسَارٌ کی جمع، وہ رسیاں، جن سے کشتی کے تختے باندھے گئے، یا وہ کیلیں اور مٹھیں جن سے کشتی کو جوڑا گیا۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا آيَةَ قَهْلٍ مِنْ مَثَلِكُمْ ⑩

اور بیشک ہم نے اس واقعہ کو نشانی بنا کر^(۱) باقی رکھا پس کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا۔^(۲) (۱۵)

فَكَيْفَ كَانَ عَدَابِي وَنُذِرِ ⑪

بتاؤ میرا عذاب اور میری ڈرانے والی باتیں کیسی رہیں؟ (۱۶)

وَلَقَدْ بَيَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلَّذِي كَرَّمْنَا مِنْ مَثَلِكُمْ ⑫

اور بیشک ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے^(۳) پس کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟ (۱۷)

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَدَابِي وَنُذِرِ ⑬

قوم عاد نے بھی جھٹلایا پس کیسا ہوا میرا عذاب اور میری ڈرانے والی باتیں۔ (۱۸)

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْكُمْ رِجَاعًا صَرَافِي يَوْمَ يُغْمَسُ فِيهِ لُجُومُ نَحْسٍ مُنْتَمِرَةٍ ⑭

ہم نے ان پر تیز و تند مسلسل چلنے والی ہوا، ایک پیہم منحوس دن میں بھیج دی۔^(۴) (۱۹)

(۱) تَرَكْنَاهَا فِي ضَمِيرٍ كَارِحٍ سَفِينَةٍ هِيَ - يَافِعْلَةٌ. یعنی تَرَكْنَا هَذِهِ الْفِعْلَةَ الَّتِي فَعَلْنَاهَا بِهِمْ عِبْرَةً وَمَوْعِظَةً (فتح القدير)

(۲) مَثَلِكُمْ اصل میں مُذَكِّبٌ ہے۔ تاکو وال سے بدل دیا گیا اور ذال معممہ کو وال بنا کر، وال کا وال میں ادغام کر دیا گیا۔ معنی ہیں عبرت پکڑنے اور نصیحت حاصل کرنے والا۔ (فتح القدير)

(۳) یعنی اس کے مطالب و معافی کو سمجھنا اس سے عبرت و نصیحت حاصل کرنا اور اسے زبانی یاد کرنا ہم نے آسان کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن کریم اعجاز و بلاغت کے اعتبار سے نہایت اونچے درجے کی کتاب ہونے کے باوجود کوئی شخص تھوڑی سی توجہ دے تو وہ عربی گرامر اور معانی و بلاغت کی کتابیں پڑھے بغیر بھی اسے آسانی سے سمجھ لیتا ہے، اسی طرح یہ دنیا کی واحد کتاب ہے، جو لفظ بہ لفظ یاد کر لی جاتی ہے ورنہ چھوٹی سی چھوٹی کتاب کو بھی اس طرح یاد کر لینا اور اسے یاد رکھنا نہایت مشکل ہے۔ اور انسان اگر اپنے قلب و ذہن کے در پیچے وارکھ کر اسے عبرت کی آنکھوں سے پڑھے، نصیحت کے کانوں سے سنے اور سمجھنے والے دل سے اس پر غور کرے تو دنیا و آخرت کی سعادت کے دروازے اس کے لیے کھل جاتے ہیں اور یہ اس کے قلب و دماغ کی گراہیوں میں اتر کر کفر و معصیت کی تمام آلودگیوں کو صاف کر دیتی ہے۔

(۴) کہتے ہیں یہ بدھ کی شام تھی، جب اس تند، بخ اور شاں شاں کرتی ہوئی ہوا کا آغاز ہوا، پھر مسلسل ۷ راتیں اور ۸ دن چلتی رہی۔ یہ ہوا گھروں اور قلعوں میں بند انسانوں کو بھی وہاں سے اٹھاتی اور اس طرح زور سے انہیں زمین پر پٹختی کہ ان کے سران کے دھڑوں سے الگ ہو جاتے۔ یہ دن ان کے لیے عذاب کے اعتبار سے منحوس ثابت ہوا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بدھ کے دن میں یا کسی اور دن میں نحوست ہے، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ مُسْتَمِرَةٌ کا مطلب یہ عذاب اس وقت تک جاری رہا جب تک سب ہلاک نہیں ہو گئے۔

تَزْرَعُ النَّاسُ مَا لَهُمْ أَعْجَازٌ يُخْلِفُ مُنْقَعِرٍ ①

جو لوگوں کو اٹھا اٹھا کر دے پختی تھی، گویا کہ وہ جڑ سے کٹے ہوئے کھجور کے تنے ہیں۔^(۱) (۲۰)

فَلَيْفَ كَانَ عَدَابِي وَنُذْرٍ ②

پس کیسی رہی میری سزا اور میرا ڈرانا؟^(۲)

وَلَعَدُ يُسْرِنَا الْقُرْآنَ لِلَّذِي قَهَلَ مِنْ مُنْذِرِكُمْ ③

یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے، پس کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟^(۳) (۲۲)

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذْرِ ④

قوم ثمود نے ڈرانے والوں کو جھٹلایا۔^(۴)

فَقَالُوا أَبْتَرْنَا وَمَا وَجَدْنَا لِيَ إِذْ كُنَّا إِذْ بَعِثْنَا صَالِحًا وَاسْعُرٍ ⑤

اور کہنے لگے کیا ہمیں میں سے ایک شخص کی ہم فرما برداری کرنے لگیں؟ تب تو ہم یقیناً غلطی اور دیوانگی میں پڑے ہوئے ہوں گے۔^(۵) (۲۳)

بِأَيْقِي الْوَادِعِينَ وَبَيْنَ يَدَيْهِمْ كَذَابُ آبِ إِيمِرٍ ⑥

کیا ہمارے سب کے درمیان صرف اسی پر وحی اتاری گئی؟ نہیں بلکہ وہ جھوٹا شیخی خور ہے۔^(۶) (۲۵)

سَيَعْمُونَ غَدًا مِنَ كَذَابِ الْإِيسُرِ ⑦

اب سب جان لیں گے کل کو کہ کون جھوٹا اور شیخی خور تھا؟^(۷) (۲۶)

إِنَّمَا سُرِبُوا لِنَفْسِهِمْ فَارْتَبِعْتَهُمْ وَأَصْطَبِرُوا ⑧

بیشک ہم ان کی آزمائش کے لیے اونٹنی بھیجیں گے۔^(۸)

(۱) یہ درازی قد کے ساتھ ان کی بے بسی اور لاچارگی کا بھی اظہار ہے کہ عذاب الہی کے سامنے وہ کچھ نہ کر سکے دران حالیکہ انہیں اپنی قوت و طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ اَعْجَازُ، عَجْزُ کی جمع ہے، جو کسی چیز کے پچھلے حصے کو کہتے ہیں۔ مُنْقَعِرٌ، اپنی جڑ سے اکھڑ جانے اور کٹ جانے والا۔ یعنی کھجور کے ان تنوں کی طرح، جو اپنی جڑ سے اکھڑا اور کٹ چکے ہوں، ان کے لاشے زمین پر پڑے ہوئے تھے۔

(۲) یعنی ایک بشر کو رسول مان لینا، ان کے نزدیک گمراہی اور دیوانگی تھی۔ سَعُرٌ، سَعِيرٌ کی جمع ہے، آگ کی لپٹ۔ یہاں اس کو دیوانگی یا شدت و عذاب کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔

(۳) اَسْرٌ، بمعنی مُتَكَبِّرٌ، یا کذب میں حد سے تجاوز کرنے والا، یعنی اس نے جھوٹ بھی بولا ہے تو بہت بڑا۔ کہ مجھ پر وحی آتی ہے۔ بھلا ہم میں سے صرف اسی ایک پر وحی آئی تھی؟ یا اس ذریعے سے ہم پر اپنی بڑائی جتنا اس کا مقصود ہے۔

(۴) یہ خود پیغمبر پر الزام تراشی کرنے والے۔ یا حضرت صالح علیہ السلام؟ جن کو اللہ نے وحی و رسالت سے نوازا۔ غَدًا یعنی کل سے مراد قیامت کا دن ہے یا دنیا میں ان کے لیے عذاب کا مقررہ دن۔

(۵) کہ یہ ایمان لاتے ہیں یا نہیں؟ یہ وہی اونٹنی ہے جو اللہ نے خود ان کے کہنے پر پتھر کی ایک چٹان سے ظاہر فرمائی تھی۔

پس (اے صالح) تو ان کا منتظر رہ اور صبر کر۔^(۱) (۲۷)
 ہاں انہیں خبر کر دے کہ پانی ان میں تقسیم شدہ ہے،^(۲) ہر
 ایک اپنی باری پر حاضر ہو گا۔^(۳) (۲۸)
 انہوں نے اپنے ساتھی کو آواز دی^(۴) جس نے (اونٹنی
 پر) وار کیا^(۵) اور (اس کی) کوچیں کٹ دیں۔ (۲۹)
 پس کیوں کر ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ (۳۰)
 ہم نے ان پر ایک چیخ بھیجی پس ایسے ہو گئے جیسے باڑ
 بنانے والے کی روندی ہوئی گھاس۔^(۶) (۳۱)
 اور ہم نے نصیحت کے لیے قرآن کو آسان کر دیا ہے پس
 کیا ہے کوئی جو نصیحت قبول کرے۔ (۳۲)
 قوم لوط نے بھی ڈرانے والوں کی تکذیب کی۔ (۳۳)
 بیشک ہم نے ان پر پتھر برسائے والی ہوا بھیجی^(۷) سوائے

وَيَذَّبُهُمُ إِنَّ الْمَاءَ وَسَمَاءُ بَيْنَهُمْ كُلُّ شَرْبٍ مُّخْتَصَرٌ ۝

فَنَادُوا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَرَ ۝

كَلَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ۝

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا

كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ ۝

وَلَقَدْ يَتْرَأْنَا الْقُرْآنَ لِلَّذِينَ هُمْ مِنْ مُّذَكِّرٍ ۝

كَذَٰبَتْ قَوْمٌ لُّوطًا بِالنُّذُرِ ۝

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَامِلًا بِالْآلِ لُوطًا بَيْنَهُمْ بِسُجُورٍ ۝

(۱) یعنی دیکھ کہ یہ اپنے وعدے کے مطابق ایمان کا راستہ اپناتے ہیں یا نہیں؟ اور ان کی ایذاؤں پر صبر کر۔

(۲) یعنی ایک دن اونٹنی کے پانی پینے کے لیے اور ایک دن قوم کے پانی پینے کے لیے۔

(۳) مطلب ہے ہر ایک کا حصہ اس کے ساتھ ہی خاص ہے جو اپنی اپنی باری پر حاضر ہو کر وصول کرے دوسرا اس روز نہ آئے شُرْبٌ، حصہ آب۔

(۴) یعنی جس کو انہوں نے اونٹنی کو قتل کرنے کے لیے آمادہ کیا تھا، جس کا نام قدار بن سالف بتلایا جاتا ہے، اس کو پکارا کہ وہ اپنا کام کرے۔

(۵) یا تلوار یا اونٹنی کو پکڑا اور اس کی ٹانگیں کٹ دیں اور پھر اسے ذبح کر دیا۔ بعض نے فَتَعَاطَى کے معنی فَجَسَسَ کیے ہیں، پس اس نے جسارت کی۔

(۶) حَظِيْرَةٌ، بمعنی مَحْظُوْرَةٌ، باڑ جو خشک جھاڑیوں اور لکڑیوں سے جانوروں کی حفاظت کے لیے بنائی جاتی ہے۔ مُخْتَصِرٌ، اسم فاعل ہے صَاحِبِ النَحِيْرَةِ - هَشِيْمٌ، خشک گھاس یا کٹی ہوئی خشک کھیتی یعنی جس طرح ایک باڑ بنانے والے کی خشک لکڑیاں اور جھاڑیاں مسلسل روندے جانے کی وجہ سے چورا چورا ہو جاتی ہیں وہ بھی اس باڑ کی مانند ہمارے عذاب سے چورا ہو گئے۔

(۷) یعنی ایسی ہوا بھیجی جو ان کو کنکریاں مارتی تھی۔ یعنی ان کی ہتیبوں کو ان پر ٹاندا دیا گیا، اس طرح کہ ان کا اوپر والا حصہ نیچے اور نیچے والا حصہ اوپر، اس کے بعد ان پر ہتھکڑ پتھروں کی بارش ہوئی جیسا کہ سورہ ہود وغیرہ میں تفصیل گزری۔

لوط (علیہ السلام) کے گھر والوں کے، انہیں ہم نے سحر کے وقت نجات دے دی۔^(۱) (۳۳)

اپنے احسان سے^(۲) ہر ہر شکر گزار کو ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ (۳۵)

یقیناً (لوط علیہ السلام) نے انہیں ہماری پکڑ سے ڈرایا^(۳) تھا لیکن انہوں نے ڈرانے والوں کے بارے میں (شک و شبہ اور) جھگڑا کیا۔^(۴) (۳۶)

اور ان (لوط علیہ السلام) کو ان کے مہمانوں کے بارے میں پھسلایا^(۵) پس ہم نے ان کی آنکھیں اندھی کر دیں،^(۶) (اور کہہ دیا) میرا عذاب اور میرا ڈرانا چکھو۔ (۳۷)

اور یقینی بات ہے کہ انہیں صبح سویرے ہی ایک جگہ

وَقَصَّهُ مِّنْ عَذَابِنَا كَذَلِكَ نَجْزِي مَنْ شَكَرَ ۝

وَلَقَدْ آتَيْنَاهُم بَشْرًا فَمَتَّوْنَا فَمَتَّارًا وَاِلَّا لِنَذِرُ ۝

وَلَقَدْ آتَيْنَاهُم دُرَّةً وَّاُذُنًا صَافِيَةً فَطَمَسْنَا اَعْيُنَهُمْ فَذُوقُوا عَذَابِنَا وَاِنَّكُمْ لَعَادِي ۝

وَلَقَدْ صَبَّحَهُم بُرُوقًا عَنَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ ۝

(۱) آل لوط سے مراد خود حضرت لوط علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے لوگ ہیں، جن میں حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی شامل نہیں، کیونکہ وہ مومنہ نہیں تھی، البتہ حضرت لوط علیہ السلام کی دو بیٹیاں ان کے ساتھ تھیں، جن کو نجات دی گئی۔ سحر سے مراد رات کا آخری حصہ ہے۔

(۲) یعنی ان کو عذاب سے بچانا، یہ ہماری رحمت اور احسان تھا جو ان پر ہوا۔

(۳) یعنی عذاب آنے سے پہلے، ہماری سخت گرفت سے ڈرایا تھا۔

(۴) لیکن انہوں نے اس کی پروا نہیں کی بلکہ شک کیا اور ڈرانے والوں سے جھگڑتے رہے۔

(۵) یا ہسلایا یا مانگا لوط علیہ السلام سے ان کے مہمانوں کو۔ مطلب یہ ہے کہ جب لوط علیہ السلام کی قوم کو معلوم ہوا کہ چند خوبرو نوجوان لوط علیہ السلام کے ہاں آئے ہیں (جو دراصل فرشتے تھے اور ان کو عذاب دینے کے لیے ہی آئے تھے) تو انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ ان مہمانوں کو ہمارے سپرد کر دیں تاکہ ہم اپنے بگڑے ہوئے ذوق کی ان سے تسکین کریں۔

(۶) کہتے ہیں کہ یہ فرشتے جبرائیل میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام تھے۔ جب انہوں نے بد فعلی کی نیت سے فرشتوں (مہمانوں) کو لینے پر زیادہ اصرار کیا تو جبرائیل علیہ السلام نے اپنے پر کا ایک حصہ انہیں مارا، جس سے ان کی آنکھوں کے ڈھیلے ہی باہر نکل آئے، بعض کہتے ہیں، صرف آنکھوں کی بصارت زائل ہوئی، بہر حال عذاب عام سے پہلے یہ عذاب خاص ان لوگوں کو پہنچا جو حضرت لوط علیہ السلام کے پاس بد نیتی سے آئے تھے۔ اور آنکھوں سے یا بینائی سے محروم ہو کر گھر پہنچے۔ اور پھر صبح اس عذاب عام میں تباہ ہو گئے جو پوری قوم کے لیے آیا۔ (تفسیر ابن کثیر)

پکڑنے والے مقررہ عذاب نے عارت کر دیا۔^(۱) (۳۸)
 پس میرے عذاب اور میرے ڈراوے کا مزہ چکھو۔ (۳۹)
 اور یقیناً ہم نے قرآن کو پسند و وعظ کے لیے آسان کر دیا
 ہے۔^(۲) پس کیا کوئی ہے نصیحت پکڑنے والا۔ (۴۰)
 اور فرعونیوں کے پاس بھی ڈرانے والے آئے۔^(۳) (۴۱)
 انہوں نے ہماری تمام نشانیاں جھٹلائیں^(۴) پس ہم نے انہیں
 بڑے غالب قوی پکڑنے والے کی طرح پکڑ لیا۔^(۵) (۴۲)
 (اے قریشیو!) کیا تمہارے کافران کافروں سے کچھ بہتر
 ہیں؟^(۶) یا تمہارے لیے اگلی کتابوں میں چھٹکارا لکھا ہوا
 ہے؟^(۷) (۴۳)
 یا یہ کہتے ہیں کہ ہم غلبہ پانے والی جماعت ہیں۔^(۸) (۴۴)

فَذُوُوا عَذَابِيْ وَنَذِرْ ۝
 وَقَدْ يَتْرِكُوا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّذَكِّرٍ ۝

وَلَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۝
 كَذَّبُوا بِالآيَاتِ الَّتِي كَانَتْ لَهُمْ آخِذًا عَنْ يَدِهِمْ فِيمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝

الْقَائِلَةُ خَيْرٌ مِّنْ أُولَئِكَ أَمْ لَهُمْ بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ ۝

أَمْ يَرِيقُونَ مِن مَّحْمِيَةٍ مَّتَّصِرٍ ۝

- (۱) یعنی صبح ان کے پاس عذاب مستقر آگیا۔ مستقر کے معنی 'ان پر نازل ہونے والا' جو انہیں ہلاک کیے بغیر نہ چھوڑے۔
 (۲) تیسیر قرآن کا اس سورت میں بار بار ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ یہ قرآن اور اس کے فہم و حفظ کو آسان کر دینا،
 اللہ کا احسان عظیم ہے، اس کے شکر سے انسان کو کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔
 (۳) نَذِرٌ، نَذِيرٌ (ڈرانے والا) کی جمع ہے یا بمعنی اِنْذَارٍ مصدر ہے۔ (فتح القدر)
 (۴) وہ نشانیاں جن کے ذریعے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور فرعونیوں کو ڈرایا۔ یہ نو نشانیاں تھیں جن کا
 ذکر پہلے گزر چکا ہے۔
 (۵) یعنی ان کو ہلاک کر دیا، کیونکہ وہ عذاب، ایسے غالب کی گرفت تھی جو انتقام لینے پر قادر ہے، اس کی گرفت کے بعد
 کوئی بچ نہیں سکتا۔
 (۶) یہ استفہام انکار یعنی نفی کے لیے ہے۔ یعنی اے اہل عرب! تمہارے کافر گزشتہ کافروں سے، بہتر نہیں ہیں، جب وہ
 اپنے کفر کی وجہ سے ہلاک کر دیئے گئے، تو تم جب کہ تم ان سے بدتر ہو، عذاب سے سلامتی کی امید کیوں رکھتے ہو؟
 (۷) ذُبُرٌ سے مراد گزشتہ انبیاء پر نازل شدہ کتابیں ہیں۔ یعنی کیا تمہاری باہت کتب منزلہ میں صراحت کر دی گئی ہے کہ یہ
 قریش یا عرب، جو مرضی کرتے رہیں، ان پر غالب نہیں آئے گا۔
 (۸) تعداد کی کثرت اور وسائل قوت کی وجہ سے، کسی اور کا ہم پر غالب آنے کا امکان نہیں۔ یا مطلب ہے کہ ہمارا
 معاملہ مجتمع ہے، ہم دشمن سے انتقام لینے پر قادر ہیں۔

عنقریب یہ جماعت شکست دی جائے گی اور پیٹھ دے کر بھاگے گی۔^(۱) (۳۵)

بلکہ قیامت کی گھڑی ان کے وعدے کے وقت ہے اور قیامت بڑی سخت اور کڑوی چیز ہے۔^(۲) (۳۶)

پیشک گناہ گار گمراہی میں اور عذاب میں ہیں۔ (۳۷) جس دن وہ اپنے منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے (اور ان سے کہا جائے گا) دوزخ کی آگ لگنے کے مزے چکھو۔^(۳) (۳۸)

پیشک ہم نے ہر چیز کو ایک (مقررہ) اندازے پر پیدا کیا ہے۔^(۴) (۳۹)

اور ہمارا حکم صرف ایک دفعہ (کا ایک کلمہ) ہی ہوتا ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا۔ (۵۰)

سَيَوْمُ الْجَحِيمِ وَيَوْمُ ثَوَابٍ كَثِيرٍ

بَلِ السَّاعَةِ موعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَذْهَىٰ وَأَمْرٌ

إِنَّ الْمُنَجِّمِينَ فِي صَلَاتِهِمْ وُسْعَةٌ

يَوْمَ يُصْحَرُونَ فِي النَّارِ عَلٰى رُءُوسِهِمْ ذُرًّا وَمَأْسًا سَعْرٌ

إِنَّا كُلُّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ

وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاٰدًا وَّاحِدًا كَلِمَةً بَّالْبَصْرِ

(۱) اللہ نے ان کے زعمِ باطل کی تردید فرمائی؛ جماعت سے مراد کفار مکہ ہیں۔ چنانچہ بدر میں انہیں شکست ہوئی اور یہ پیٹھ دے کر بھاگے، رؤسائے شرک اور اساطین کفر ہلاک کر دیئے گئے۔ جنگ بدر کے موقع پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہایت الحاح و زاری سے اپنے خیمے میں مصروفِ دعا تھے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا (حَسْبُكَ يَا سُوْلَ اللّٰهِ! اَلْحَحَّتْ عَلٰى رَبِّكَ)۔ ”بس کیجئے! اللہ کے رسول! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رب کے سامنے بہت الحاح و زاری کر لی۔“ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خیمے سے باہر تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہی آیت تھی۔ (البخاری، تفسیر سورۃ اقصیٰ الساعۃ)

(۲) اَذْهَىٰ ذَهَاءً سے ہے، سخت رسوا کرنے والا؛ اَمْرٌ مَرَّآةً سے ہے، نہایت کڑوا۔ یعنی دنیا میں جو یہ قتل کیے گئے، قیدی بنائے گئے وغیرہ، یہ ان کی آخری سزا نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت سزائیں ان کو قیامت والے دن دی جائیں گی جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

(۳) سَعْرٌ بھی جنم کا نام ہے یعنی اس کی حرارت اور شدت عذاب کا مزہ چکھو۔

(۴) اُثْمَرٌ سنت نے اس آیت اور اس جیسی دیگر آیات سے استدلال کرتے ہوئے تقدیر الہی کا اثبات کیا ہے جس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مخلوقات کے پیدا کرنے سے پہلے ہی سب کا علم تھا اور اس نے سب کی تقدیر لکھ دی ہے اور فرقہ قدریہ کی تردید کی ہے جس کا ظہور عمد صحابہ کے آخر میں ہوا۔ (ابن کثیر)

وَلَقَدْ أَمَلْنَا أَنفُسَنَا عَلَىٰ فِئَةٍ مِّن مَّنْ كَرِهُوا ۝۱۱

وَكُلُّ شَيْءٍ عَمَلَةٌ فِي الزُّبُرِ ۝۱۲

وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُّسْتَقَرٌّ ۝۱۳

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهْرٍ ۝۱۴

فِي مَقْعَدٍ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝۱۵

اور ہم نے تم جیسے بہتیروں کو ہلاک کر دیا ہے، (۱) پس کوئی ہے نصیحت لینے والا۔ (۵۱)

جو کچھ انہوں نے (اعمال) کیے ہیں سب نامہ اعمال میں لکھے ہوئے ہیں۔ (۲) (۵۲)

(اسی طرح) ہر چھوٹی بڑی بات بھی لکھی ہوئی ہے۔ (۳) (۵۳) یقیناً ہمارا ڈر رکھنے والے جنتوں اور نہروں میں ہونگے۔ (۴) (۵۴)

راستی اور عزت کی بیشک میں (۵) قدرت والے بادشاہ کے پاس۔ (۶) (۵۵)

سورہ رمن منی ہے اور اس میں اٹھتر آیتیں اور تین رکوع ہیں۔



سُورَةُ الرَّحْمٰنِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(۱) یعنی گزشتہ امتوں کے کافروں کو، جو کفر میں تمہارے ہی جیسے تھے۔ اَشْبَانِعُكُمْ اَی: اَشْبَانِعُكُمْ وَنَظَرْنَا اَی: فَسَحَ الْقَدِیْرِ

(۲) یا دوسرے معنی ہیں، لوح محفوظ میں درج ہیں۔

(۳) یعنی مخلوق کے تمام اعمال، اقوال و افعال لکھے ہوئے ہیں، چھوٹے ہوں یا بڑے، حقیر ہوں یا جلیل، اشقیاء کے ذکر کے بعد اب سعد کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

(۴) یعنی مختلف اور متنوع باغات میں ہوں گے۔ نَهْرٌ، بطور جنس کے ہے جو جنت کی تمام نہروں کو شامل ہے۔

(۵) مَقْعَدٍ صِدْقٍ، عزت کی بیشک یا مجلس حق، جس میں گناہ کی بات ہوگی نہ لغویات کا ارتکاب۔ مراد جنت ہے۔

(۶) مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ، قدرت والا بادشاہ یعنی وہ ہر طرح کی قدرت سے بہرہ ور ہے جو چاہے کر سکتا ہے، کوئی اسے عاجز نہیں کر سکتا۔ عِنْدَ (پاس) یہ کنایہ ہے اس شرف منزلت اور عزت و احترام سے، جو اہل ایمان کو اللہ کے ہاں حاصل ہوگا۔

☆ اس کو بعض حضرات نے منیٰ قرار دیا ہے، تاہم صحیح یہی ہے کہ یہ کسی ہے (فتح القدیر) اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوئی ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا بات ہے کہ تم خاموش رہتے ہو، تم سے تو اچھے جن ہیں کہ جب جن والی رات کو میں نے یہ سورت ان پر پڑھی تو میں جب بھی ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ پڑھتا، تو وہ اس کے

الرَّحْمَنُ ① عَمَّ الْقُرْآنَ ②
 خَلَقَ الْإِنْسَانَ ③
 عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ④
 أَلْقَمَسُ وَالْقَمَرُ يُسْبَانُ ⑤
 وَالْجَمْعُ وَالشُّجْرُ يُجْبَدَانِ ⑥
 وَالسَّمَاءُ رَفَعَهَا وَوَضَعَهَا الْبَيَانَ ⑦
 أَكْثَفُوا فِي الْبَيَانِ ⑧

رحمن نے۔ (۱) قرآن سکھایا۔ (۲)
 اسی نے انسان کو پیدا کیا۔ (۳)
 اور اسے بولنا سکھایا۔ (۴)
 آفتاب اور ماہتاب (مقررہ) حساب سے ہیں۔ (۵)
 اور ستارے اور درخت دونوں سجدہ کرتے ہیں۔ (۶)
 اسی نے آسمان کو بلند کیا اور اسی نے ترازور رکھی۔ (۷)
 تاکہ تم تولنے میں تجاوز نہ کرو۔ (۸)

جواب میں کہتے۔ (لَا بَشِيءَ مِنْ نِعْمِكَ رَبَّنَا! نَكْذِبُ فَلَكَ الْاِحْمَدُ)۔ (ترمذی، تفسیر سورة الرحمن، ذکرہ الالبانی فی صحیح الترمذی)

(۱) کہتے ہیں کہ یہ اہل مکہ کے جواب میں ہے جو کہتے تھے کہ یہ قرآن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کوئی انسان سکھاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کے اس قول کے جواب میں ہے کہ رحمن کیا ہے؟ قرآن سکھانے کا مطلب ہے، اسے آسان کر دیا، یا اللہ نے اپنے پیغمبر کو سکھایا اور پیغمبر نے امت کو سکھایا۔ اس سورت میں اللہ نے اپنی بہت سی نعمتیں گنوائی ہیں۔ چونکہ تعلیم قرآن ان میں قدر و منزلت اور اہمیت و افادیت کے لحاظ سے سب سے نمایاں ہے، اس لیے پہلے اسی نعمت کا ذکر فرمایا ہے۔ (فتح القدیر)

(۲) یعنی یہ بند و غیرہ جانوروں سے ترقی کرتے کرتے انسان نہیں بن گئے ہیں۔ جیسا کہ ڈارون کا فلسفہ ارتقا ہے۔ بلکہ انسان کو اسی شکل و صورت میں اللہ نے پیدا فرمایا ہے جو جانوروں سے الگ ایک مستقل مخلوق ہے۔ انسان کا لفظ بطور جنس کے ہے۔

(۳) اس بیان سے مراد ہر شخص کی اپنی مادری بولی ہے جو بغیر سیکھے از خود ہر شخص بول لیتا اور اس میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر لیتا ہے، حتیٰ کہ وہ چھوٹا بچہ بھی بولتا ہے، جس کو کسی بات کا علم اور شعور نہیں ہوتا۔ یہ اس تعلیم الہی کا نتیجہ ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

(۴) یعنی اللہ کے ٹھہرائے ہوئے حساب سے اپنی اپنی منزلوں پر رواں دواں رہتے ہیں، ان سے تجاوز نہیں کرتے۔

(۵) جیسے دوسرے مقام پر فرمایا — ﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالْدَّابُّ﴾ الآية (المحج۔ ۱۸)

(۶) یعنی زمین میں انصاف رکھا، جس کا اس نے لوگوں کو حکم دیا، جیسے فرمایا ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ

الْكِتَابَ وَالْبَيَانَ لِيُتَوَكَّرَ النَّاسُ بِالْفِتْنَةِ﴾ (الحديد۔ ۲۵)

(۷) یعنی انصاف سے تجاوز نہ کرو۔

انصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول میں کم نہ دو۔ (۹)
 اور اسی نے مخلوق کے لیے زمین بچھادی۔ (۱۰)
 جس میں میوے ہیں اور خوشے والے کھجور کے درخت
 ہیں۔ (۱۱)

اور بھس والا اناج ہے (۱۲) اور خوشبودار پھول ہیں۔ (۱۳)
 پس (اے انسانو اور جنو!) تم اپنے پروردگار کی کس کس
 نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۱۳)

اس نے انسان کو بجنے والی مٹی سے پیدا کیا جو ٹھیکری کی
 طرح تھی۔ (۱۴)

اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔ (۱۵)
 پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۱۶)
 وہ رب ہے دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا۔ (۱۷)

وَأَقِيمُوا الزَّوْزَانَ بِالْقَيْطِ وَلَا تَشْبُرُوا الِّمَيْزَانَ ①
 وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ ②
 فِيهَا فَاكِهَةٌ وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ ③

وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ④
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَكُمْ لِبَنِي ⑤

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ⑥

وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَلَأٍ حَرِيقٍ ⑦
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَكُمْ لِبَنِي ⑧
 رَبِّ الشَّرْقَيْنِ وَرَبِّ الْمَغْرِبَيْنِ ⑨

(۱) اَنَّمَامٌ، كَمِّ کی جمع ہے، وَعَاءُ النَّعْمِ، کھجور پر چڑھا ہوا غلاف۔

(۲) حَبٌّ سے مراد ہر وہ خوراک ہے جو انسان اور جانور کھاتے ہیں۔ خشک ہو کر اس کا پودا بھس بن جاتا ہے جو جانوروں کے کام آتا ہے۔

(۳) یہ انسانوں اور جنوں دونوں سے خطاب ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں گنوا کر ان سے پوچھ رہا ہے۔ یہ تکرار اس شخص کی طرح ہے جو کسی پر مسلسل احسان کرے لیکن وہ اس کے احسان کا منکر ہو، جیسے کہے، میں نے تیرا فلاں کام کیا، کیا تو انکار کرتا ہے؟ فلاں چیز تجھے دی، کیا تجھے یاد نہیں؟ تجھ پر فلاں احسان کیا، کیا تجھے ہمارا ذرا خیال نہیں؟ (فتح القدیر)

(۴) صَلْصَالٍ خشک مٹی، جس میں آواز ہو۔ فَخَّازٌ آگ میں پکی ہوئی مٹی، جسے ٹھیکری کہتے ہیں۔ اس انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، جن کا پہلے مٹی سے پتلا بنایا گیا اور پھر اس میں اللہ نے روح پھونکی۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے حوا کو پیدا فرمایا، اور پھر ان دونوں سے نسل انسانی چلی۔

(۵) اس سے مراد سب سے پہلا جن ہے جو ابوالجن ہے، یا جن بطور جنس کے ہے۔ جیسا کہ ترجمہ جنس کے اعتبار سے ہی کیا گیا ہے۔ مارجِ آگ سے بلند ہونے والے شعلے کو کہتے ہیں۔

(۶) یعنی تمہاری یہ پیدائش بھی اور پھر تم سے مزید نسلوں کی تخلیق و افزائش، یہ اللہ کی نعمتوں میں سے ہے۔ کیا تم اس نعمت کا انکار کرو گے؟

(۷) ایک گرمی کا مشرق اور ایک سردی کا مشرق، اسی طرح مغرب ہے۔ اس لیے دونوں کو تشبیہ ذکر کیا ہے، موسموں کے

تو (اے جنو اور انسانو!) تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۱۸)

اس نے دو دریا جاری کر دیے جو ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ (۱۹)

ان دونوں میں ایک آڑ ہے کہ اس سے بڑھ نہیں سکتے۔^(۱) (۲۰)

پس اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۲۱)

ان دونوں میں سے موتی اور مونگے برآمد ہوتے ہیں۔^(۲) (۲۲)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّجَلٌ مِّنْ اِنۡفُسِكُمْ ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لِقُلُوۡبِكُمْ اٰيٰتِهٖۤ ۗ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸﴾

مَرَجَ الْوَادِيۡنِ يَجۡمَعۡنِ ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لِقُلُوۡبِكُمْ اٰيٰتِهٖۤ ۗ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۹﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّجَلٌ مِّنْ اِنۡفُسِكُمْ ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لِقُلُوۡبِكُمْ اٰيٰتِهٖۤ ۗ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۰﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّجَلٌ مِّنْ اِنۡفُسِكُمْ ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لِقُلُوۡبِكُمْ اٰيٰتِهٖۤ ۗ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۱﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّجَلٌ مِّنْ اِنۡفُسِكُمْ ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لِقُلُوۡبِكُمْ اٰيٰتِهٖۤ ۗ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۲﴾

اعتبار سے مشرق و مغرب کا مختلف ہونا اس میں بھی انس و جن کی بہت سی مصلحتیں ہیں، اس لیے اسے بھی نعمت قرار دیا گیا ہے۔

(۱) مَرَجَ بِمعنی اَزْمَلَ جاری کر دیئے۔ اس کی تفصیل سورۃ الفرقان، آیت ۵۳ میں گزر چکی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دو دریاؤں سے مراد بعض کے نزدیک ان کے الگ الگ وجود ہیں، جیسے ٹھٹھے پانی کے دریا ہیں، جن سے کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں اور انسان ان کا پانی اپنی دیگر ضروریات میں بھی استعمال کرتا ہے۔ دوسری قسم سمندروں کا پانی ہے جو کھارا ہے، جس کے کچھ اور فوائد ہیں۔ یہ دونوں آپس میں نہیں ملتے۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ کھارے سمندروں میں ہی ٹھٹھے پانی کی لہریں چلتی ہیں اور یہ دونوں لہریں آپس میں نہیں ملتیں، بلکہ ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز ہی رہتی ہیں۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کھارے سمندروں میں ہی کئی مقامات پر ٹھٹھے پانی کی لہریں بھی جاری کی ہوئی ہیں اور وہ کھارے پانی سے الگ ہی رہتی ہیں۔ دوسری صورت یہ بھی ہے کہ اوپر کھارا پانی ہو اور اس کی تہ میں نیچے چشمہ آب شیریں۔ جیسا کہ واقعاً بعض مقامات پر ایسا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ جن مقامات پر ٹھٹھے پانی کے دریا کا پانی سمندر میں جا کر گرتا ہے، وہاں کئی لوگوں کا مشاہدہ ہے کہ دونوں پانی میلوں دور تک اس طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں کہ ایک طرف بیٹھا دریا پانی اور دوسری طرف وسیع و عریض سمندر کا کھارا پانی، ان کے درمیان اگرچہ کوئی آڑ نہیں۔ لیکن یہ باہم نہیں ملتے۔ دونوں کے درمیان یہ وہ برزخ (آڑ) ہے جو اللہ نے رکھ دی ہے، دونوں اس سے تجاوز نہیں کرتے۔

(۲) مَرَجَانَّ سے چھوٹے موتی یا پھر مونگے مراد ہیں۔ کہتے ہیں کہ آسمان سے بارش ہوتی ہے تو سپیاں اپنے مونہ کھول

پھر تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟^(۲۳)
 اور اللہ ہی کی (ملکیت میں) ہیں وہ جہاز جو سمندروں میں
 پہاڑ کی طرح بلند (چل پھر رہے) ہیں۔^(۲۴)
 پس (اے انسانو اور جنو!) تم اپنے رب کی کس کس نعمت
 کو جھٹلاؤ گے؟^(۲۵)
 زمین پر جو ہیں سب فنا ہونے والے ہیں۔^(۲۶)
 صرف تیرے رب کی ذات جو عظمت اور عزت والی ہے
 باقی رہ جائے گی۔^(۲۷)
 پھر تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟^(۲۸)

يَأْتِي آلَهُمْ رَبُّكَ مَلَكًا ۝
 وَكَالْجَوَارِ الْمَهِكَّةِ فِي الْخَوَارِ الْكَلِمِ ۝
 يَأْتِي آلَهُمْ رَبُّكَ مَلَكًا ۝
 كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝
 وَيَبْقَىٰ وَجْهَ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝
 يَأْتِي آلَهُمْ رَبُّكَ مَلَكًا ۝

دیتی ہیں، جو قطرہ ان کے اندر پڑ جاتا ہے، وہ موتی بن جاتا ہے۔ مشہور یہی ہے کہ موتی وغیرہ ٹیٹھے پانی کے دریاؤں سے
 نہیں، بلکہ صرف آب شور یعنی سمندروں سے ہی نکلتے ہیں۔ لیکن قرآن نے تشبیہ کی ضمیر استعمال کی ہے جس سے معلوم
 ہوتا ہے کہ دونوں سے ہی موتی نکلتے ہیں۔ چونکہ موتی کثرت کے ساتھ سمندروں سے ہی نکلتے ہیں، اس لیے اس کی
 شہرت ہو گئی ہے۔ تاہم شیریں دریاؤں سے اس کی نفی ممکن نہیں بلکہ موجودہ دور کے تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ ٹیٹھے
 دریا میں بھی موتی ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے مسلسل جاری رہنے کی وجہ سے ان سے موتی نکالنا مشکل امر ہے۔ بعض نے
 کہا ہے کہ مراد مجموعہ ہے، ان میں سے کسی ایک سے بھی موتی نکل جائیں تو ان پر تشبیہ کا اطلاق صحیح ہے۔ بعض نے کہا
 کہ شیریں دریا بھی عام طور پر سمندر میں ہی گرتے ہیں اور وہیں سے موتی نکالے جاتے ہیں، اس لیے گو منبع دریائے
 شور ہی ہوئے، لیکن دوسرے دریاؤں کا حصہ بھی اس میں شامل ہے لیکن موجودہ دور کے تجربات کے بعد ان تاویلات
 اور تکلفات کی ضرورت نہیں۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔

(۱) یہ جہاز اور موتی زینت اور حسن و جمال کا مظہر ہیں اور اہل شوق و اہل ثروت انہیں اپنے ذوق جمال کی
 تسکین اور حسن و رعنائی میں اضافے ہی کے لیے استعمال کرتے ہیں، اس لیے ان کا نعمت ہونا بھی واضح ہے۔
 (۲) الْجَوَارِ جَارِيَةٌ (چلنے والی) کی جمع اور محذوف موصوف (السُّفُنُ) کی صفت ہے۔ مَنَشَاتٌ کے معنی مرفوعات ہیں،
 یعنی بلند کی ہوسیں، مراد بادبان ہیں، جو بادبانی کشتیوں میں جھنڈوں کی طرح اونچے اور بلند بنائے جاتے ہیں۔ بعض نے
 اس کے معنی مصنوعات کے کیے ہیں یعنی اللہ کی بنائی ہوئی جو سمندر میں چلتی ہیں۔
 (۳) ان کے ذریعے سے بھی نقل و حمل کی جو آسانیاں ہیں، محتاج وضاحت نہیں، اس لیے یہ بھی اللہ کی عظیم نعمت ہے۔
 (۴) فَنَاءٌ دُنْيَا کے بعد، جزا و سزا یعنی عدل کا اہتمام ہو گا، لہذا یہ بھی ایک نعمت عظمیٰ ہے جس پر شکر الہی واجب ہے۔

سب آسمان و زمین والے اسی سے مانگتے ہیں۔ (۱) ہر روز وہ ایک شان میں ہے۔ (۲) (۲۹)
 پھر تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۳) (۳۰)
 (جنوں اور انسانوں کے گروہو!) عنقریب ہم تمہاری طرف پوری طرح متوجہ ہو جائیں گے۔ (۴) (۳۱)
 پھر تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۳۲)
 اے گروہ جنات و انسان! اگر تم میں آسمانوں اور زمین کے کناروں سے باہر نکل جانے کی طاقت ہے تو نکل بھاگو! (۵)
 بغیر غلبہ اور طاقت کے تم نہیں نکل سکتے۔ (۶) (۳۳)
 پھر اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۳۴)
 تم پر آگ کے شعلے اور دھواں چھوڑا جائے گا (۷) پھر تم

يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاۤىٕنٍ ﴿٢٩﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِمَ كَفَرْتُمْ ﴿٣٠﴾

سَمْعُرُؤُا كَلِمَآءٍ اِلٰهَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣١﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِمَ كَفَرْتُمْ ﴿٣٢﴾

يُعٰصِرُ الْمَجِيْنَ وَالْاَرْضِ اِنْ اَسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفَعُوْا مِنْ اَقْطَارِ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَاَنْفَعُوْا وَاَلَا تَنْفَعُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿٣٣﴾

فَيٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِمَ كَفَرْتُمْ ﴿٣٤﴾

يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ شَوٰطِٔ مِّنْ سَمٰوٰتٍ كٰرِهٍ وَّحٰمٰسٍ فَلَا تَنْصُرُوْنَ ﴿٣٥﴾

(۱) یعنی سب اس کے محتاج اور اس کے در کے سوالی ہیں۔

(۲) ہر روز کا مطلب، ہر وقت۔ شان کے معنی امر یا معاملہ، یعنی ہر وقت وہ کسی نہ کسی کام میں مصروف ہے، کسی کو بیمار کر رہا ہے، کسی کو شفیاب، کسی کو تو مگر بنا رہا ہے تو کسی تو مگر کو فقیر۔ کسی کو گدا سے شاہ اور شاہ سے گدا، کسی کو بلند یوں پر فائز کر رہا ہے، کسی کو بستی میں گرا رہا ہے، کسی کو ہست سے نیست اور نیست کو ہست کر رہا ہے وغیرہ۔ الغرض کائنات میں یہ سارے تصرف اسی کے امر و مشیت سے ہو رہے ہیں اور شب و روز کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جو اس کی کارگزاری سے خالی ہو۔ هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ، لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ۔

(۳) اور اتنی بڑی ہستی کا ہر وقت بندوں کے امور و معاملات کی تدبیر میں لگے رہنا، کتنی بڑی نعمت ہے۔

(۴) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ کو فراغت نہیں ہے بلکہ یہ محاورہ بولا گیا ہے جس کا مقصد وعید و تہدید ہے۔ تَقَالٰنِ (جن و انس کو) اس لیے کہا گیا ہے کہ انکو تکالیف شرعیہ کلابند کیا گیا ہے، اس پابندی یا بوجھ سے دوسری مخلوق مستثنیٰ ہے۔

(۵) یہ تہدید بھی نعمت ہے کہ اس سے بدکار، بدیوں کے ارتکاب سے باز آجائے اور محسن زیادہ نیکیاں کمائے۔

(۶) یعنی اللہ کی تقدیر اور قضا سے تم بھاگ کر کہیں جا سکتے ہو تو چلے جاؤ، لیکن یہ طاقت کس میں ہے؟ اور بھاگ کر آخر کہاں جائے گا؟ کون سی جگہ ایسی ہے جو اللہ کے اختیارات سے باہر ہو۔ یہ بھی تہدید ہے جو مذکورہ تہدید کی طرح نعمت ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ میدان محشر میں کہا جائے گا، جب کہ فرشتے ہر طرف سے لوگوں کو گھیر رکھے ہونگے۔ دونوں ہی مفہوم اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔

(۷) مطلب یہ ہے کہ اگر تم قیامت والے دن کہیں بھاگ کر گئے بھی، تو فرشتے آگ کے شعلے اور دھواں تم پر چھوڑ کر

مقابلہ نہ کر سکو گے۔^(۱) (۳۵)

پھر اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۳۶)

پس جب کہ آسمان پھٹ کر سرخ ہو جائے جیسے کہ سرخ چڑھ۔^(۲) (۳۷)

پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۳۸)

اس دن کسی انسان اور کسی جن سے اس کے گناہوں کی پریشانی نہ کی جائے گی۔^(۳) (۳۹)

پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۴۰)

گناہ گار صرف حلیہ سے ہی پہچان لیے جائیں گے^(۴) اور انکی پیشانیوں کے بال اور قدم پکڑ لیے جائیں گے۔^(۵) (۴۱)

پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۴۲)

یہ ہے وہ جہنم جسے مجرم جھوٹا جانتے تھے۔ (۴۳)

يَأْتِي آلَهُمْ لَيْكًا لَّيَكْتُمُونَ ﴿۳۵﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا فَكَيْفَ كَانَتْ رُؤُوسُ كَالَّذِينَ ﴿۳۶﴾

يَأْتِي آلَهُمْ لَيْكًا لَّكْتُمُونَ ﴿۳۷﴾

يَوْمَ سَيُؤْتِيهِمُ اللَّهُ أَسْمَاءَ غَيْرِهَا يُؤْتِيهِمْ فَرِحُونَهَا وَأَسْتَبْشِرُوا ﴿۳۸﴾

يَأْتِي آلَهُمْ لَيْكًا لَّكْتُمُونَ ﴿۳۹﴾

يَعْرِفُ الْمَجْرُمُونَ بِسِيَاهِهِمْ يُؤَوِّدُهُمُ الْوَأْوَامُ ﴿۴۰﴾

وَالَّذِينَ كَفَرُوا ﴿۴۱﴾

يَأْتِي آلَهُمْ لَيْكًا لَّكْتُمُونَ ﴿۴۲﴾

هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ ﴿۴۳﴾

یا پگھلا ہوا تانبہ تمہارے سروں پر ڈال کر تمہیں واپس لے آئیں گے۔ نوحاس کے دوسرے معنی پگھلے ہوئے تانبے کے کئے گئے ہیں۔

(۱) یعنی اللہ کے عذاب کو ٹالنے کی تم قدرت نہیں رکھو گے۔

(۲) قیامت والے دن آسمان پھٹ پڑے گا، فرشتے زمین پر اتر آئیں گے، اس دن یہ نار جہنم کی شدت حرارت سے پگھل کر سرخ نرمی کے چمڑے کی طرح ہو جائے گا۔ دہان، سرخ چمڑہ۔

(۳) یعنی جس وقت وہ قبروں سے باہر نکلیں گے۔ ورنہ بعد میں موقف حساب میں ان سے باز پرس کی جائے گی۔ بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ گناہوں کی بابت نہیں پوچھا جائے گا، کیونکہ ان کا تو پورا ریکارڈ فرشتوں کے پاس بھی ہو گا اور اللہ کے علم میں بھی۔ البتہ پوچھا جائے گا کہ تم نے یہ کیوں کیے؟ یا یہ مطلب ہے، ان سے نہیں پوچھا جائے گا بلکہ انسانی اعضا خود بول کر ہر بات بتلائیں گے۔

(۴) یعنی جس طرح اہل ایمان کی علامت ہوگی کہ ان کے اعضائے وضو چمکتے ہوں گے۔ اسی طرح گناہ گاروں کے چہرے سیاہ، آنکھیں نیلگوں اور وہ دہشت زدہ ہوں گے۔

(۵) فرشتے ان کی پیشانیاں اور ان کے قدموں کے ساتھ ملا کر پکڑیں گے اور جہنم میں ڈال دیں گے، یا کبھی پیشانیوں سے اور کبھی قدموں سے انہیں پکڑیں گے۔

اس کے اور کھولتے ہوئے گرم پانی کے درمیان چکر کھائیں گے۔^(۱) (۴۴)

پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۴۵)
اور اس شخص کے لیے جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا دو جنتیں ہیں۔^(۲) (۴۶)

پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۴۷)
(دونوں جنتیں) بہت سی ٹہنیوں اور شاخوں والی ہیں۔^(۳) (۴۸)

پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۴۹)
ان دونوں (جنتوں) میں دو بستے ہوئے چشمے ہیں۔^(۴) (۵۰)
پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۵۱)
ان دونوں جنتوں میں ہر قسم کے میوؤں کی دو قسمیں ہوں گی۔^(۵) (۵۲)

پھر تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۵۳)
جنتی ایسے فرشتوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے جن کے

يَطُوفُونَ فِيهَا وَيَبْرَأُونَ حَيْرَانَ ﴿٤٤﴾

يَأْتِي آلَاهُ رَبُّكُمَا تَلَذُّبِينَ ﴿٤٥﴾

وَلَمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ ﴿٤٦﴾

يَأْتِي آلَاهُ رَبُّكُمَا تَلَذُّبِينَ ﴿٤٧﴾

ذَوَاتًا أَشْجَارٍ ﴿٤٨﴾

يَأْتِي آلَاهُ رَبُّكُمَا تَلَذُّبِينَ ﴿٤٩﴾

فِي مَاءٍ عَيْنَيْنِ تَجْرِيَنِ ﴿٥٠﴾

يَأْتِي آلَاهُ رَبُّكُمَا تَلَذُّبِينَ ﴿٥١﴾

فِي مَاءٍ مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ رَدْمِينَ ﴿٥٢﴾

يَأْتِي آلَاهُ رَبُّكُمَا تَلَذُّبِينَ ﴿٥٣﴾

مُكَبَّرِينَ عَلَى رُؤُوسِهِمْ يَبْتَاطِبُهُمْ مِنْ لَسْتَبْرَقٍ وَدَجَانًا

(۱) یعنی کبھی انہی حجیم کا عذاب دیا جائے گا اور کبھی مَاءَ حَمِيمٍ پینے کا عذاب۔ ان، گرم۔ یعنی سخت کھولتا ہوا گرم پانی، جو ان کی استرووں کو کاٹ دے گا۔ أَعَادَنَا اللَّهُ مِنْهَا۔

(۲) جیسے حدیث میں آتا ہے۔ ”دو باغ چاندی کے ہیں، جن میں برتن اور جو کچھ ان میں ہے، سب چاندی کے ہوں گے۔ دو باغ سونے کے ہیں اور ان کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے، سب سونے کے ہی ہوں گے۔“ (صحیح بخاری، تفسیر مسودۃ الرحمن، بعض آثار میں ہے کہ سونے کے باغ خواص مومنین مُقَرَّبِينَ اور چاندی کے باغ عام مومنین أَصْحَابِ الْيَمِينِ کے لیے ہوں گے۔ (ابن کثیر)

(۳) یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اس میں سایہ گنجان اور گہرا ہوگا، نیز پھلوں کی کثرت ہوگی، کیونکہ کہتے ہیں ہر شاخ اور نشئی پھلوں سے لدی ہوگی۔ (ابن کثیر)

(۴) ایک کانام تَسْنِيمٌ اور دوسرے کا سَلْسَبِيلٌ ہے۔

(۵) یعنی ذائقے اور لذت کے اعتبار سے ہر پھل دو قسم کا ہوگا، یہ مزید فضل خاص کی ایک صورت ہے۔ بعض نے کہا کہ

استر دیزریشم کے ہوں گے،^(۱) اور ان دونوں جنتوں کے میوے بالکل قریب ہوں گے۔^(۲) (۵۴)

پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۵۵)

وہاں (شرعیلی) نیچی نگاہ والی حوریں ہیں^(۳) جنہیں ان سے پہلے کسی جن وانس نے ہاتھ نہیں لگایا۔^(۴) (۵۶)

پس اپنے پالنے والے کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۵۷)

وہ حوریں مثل یاقوت اور مونگے کے ہوں گی۔^(۵) (۵۸)

پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۵۹)

الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ۝

يَأْتِي الْأَرْضَ رَيْكًا مَّكَدِّبِينَ ۝

فَيَهْوَنَ قُصُورُهُنَّ وَالظُّرُفُفَ كَمَا تَطْلُبُهُنَّ إِنَّهُنَّ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانِحٌ ۝

يَأْتِي الْأَرْضَ رَيْكًا مَّكَدِّبِينَ ۝

كَأَمْثَلِ الْيَاقُوتِ وَالْمَرْجَانِ ۝

يَأْتِي الْأَرْضَ رَيْكًا مَّكَدِّبِينَ ۝

ایک قسم خشک میوے کی اور دوسری تازہ میوے کی ہوگی۔

(۱) ابری یعنی اوپر کا کپڑا ہمیشہ استر سے بہتر اور خوب صورت ہوتا ہے، یہاں صرف استر کا بیان ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اوپر (ابری) کا کپڑا اس سے کہیں زیادہ عمدہ ہوگا۔

(۲) اتنے قریب ہوں گے کہ بیٹھے بیٹھے بلکہ لیٹے لیٹے بھی توڑ سکیں گے۔ ﴿فَطَوَّفَتْهَا ذَاتِ الْأَعْيُنِ﴾ (الحاقة: ۲۳)

(۳) جن کی نگاہیں اپنے خاوندوں کے علاوہ کسی پر نہیں پڑیں گی اور ان کو اپنے خاوند ہی سب سے زیادہ حسین اور اچھے معلوم ہوں گے۔

(۴) یعنی باکرہ اور نئی نویلی ہوں گی۔ اس سے قبل وہ کسی کے نکاح میں نہیں رہی ہوں گی۔ یہ آیت اور اس سے ما قبل کی بعض آیات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جو جن مومن ہوں گے، وہ بھی مومن انسانوں کی طرح جنت میں جائیں گے اور ان کے لیے بھی وہی کچھ ہو گا جو دیگر اہل ایمان کے لیے ہو گا۔

(۵) یعنی صفائی میں یاقوت اور سفیدی و سرفخی میں موتی یا مونگے کی طرح ہوں گی۔ جس طرح صحیح احادیث میں بھی ان کے حسن و جمال کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے: يَبْرِي مِثْعُ شَوْقِينَ مِنْ وَرَاءِ الْعُظْمِ وَاللَّحْمِ (صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء فی صفة الجنة۔ صحیح مسلم، کتاب الجنة و صفة نعيمها، باب أول زمرة تدخل الجنة.....) ”ان کے حسن و جمال کی وجہ سے ان کی پنڈلی کا گودا گوشت اور ہڈی کے باہر سے نظر آئے گا۔“ ایک دوسری روایت میں فرمایا کہ ”جنتیوں کی بیویاں اتنی حسین و جمیل ہوں گی کہ اگر ان میں سے ایک عورت اہل ارض کی طرف جھانک لے تو آسمان و زمین کے درمیان کا سارا حصہ چمک اٹھے اور خوشبو سے بھر جائے، اور اس کے سر کا دوپٹہ اتنا قیمتی ہو گا کہ وہ دنیا و ماہیما سے بہتر ہے۔“ (صحیح بخاری، کتاب الجهاد باب الحور العين)

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ۝

يَمَأْتِي آلَهُمْ رَيْبٌ مَّا كَذَّبُوا ۝

وَمِنْ دُونِهَا جَهَنَّمُ ۝

يَمَأْتِي آلَهُ رَيْبٌ مَّا كَذَّبُوا ۝

مُدْمَأْتِمِينَ ۝

يَمَأْتِي آلَهُ رَيْبٌ مَّا كَذَّبُوا ۝

بَيْنَهُمَا عَيْنٌ نَّضَّاعَتِينَ ۝

يَمَأْتِي آلَهُ رَيْبٌ مَّا كَذَّبُوا ۝

بَيْنَهُمَا قَاكِرَةٌ وَعُشٌّ ذُرِّيَّانُ ۝

يَمَأْتِي آلَهُ رَيْبٌ مَّا كَذَّبُوا ۝

بَيْنَهُنَّ حَيْرَاتٌ حَسَنَاتٌ ۝

يَمَأْتِي آلَهُ رَيْبٌ مَّا كَذَّبُوا ۝

حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْبُيُوتِ ۝

احسان کا بدلہ احسان کے سوا کیا ہے۔^(۱) (۶۰)

پس اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۶۱)

اور ان کے سوا دو جنتیں اور ہیں۔^(۲) (۶۲)

پس تم اپنے پرورش کرنے والے کی کس کس نعمت کو

جھٹلاؤ گے؟ (۶۳)

جو دونوں گہری سبز سیاہی مائل ہیں۔^(۳) (۶۴)

بتاؤ اب اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ

گے؟ (۶۵)

ان میں دو (جوش سے) اٹپنے والے چشمے ہیں۔^(۴) (۶۶)

پھر تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۶۷)

ان دونوں میں میوے اور کھجور اور انار ہوں گے۔^(۵) (۶۸)

کیا اب بھی رب کی کسی نعمت کی تکذیب تم کرو گے؟ (۶۹)

ان میں نیک سیرت خوبصورت عورتیں ہیں۔^(۶) (۷۰)

پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۷۱)

(گوری رنگت کی) حوریں جنتی خیموں میں رہنے والیاں

ہیں۔^(۷) (۷۲)

(۱) پہلے احسان سے مراد نیکی اور اطاعت الہی اور دوسرے احسان سے اس کا صلہ، یعنی جنت اور اس کی نعمتیں ہیں۔

(۲) دُونِهَا سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ یہ دو باغ شان اور فضیلت میں پچھلے دو باغوں سے، جن کا ذکر آیت ۳۶ میں گزرا، کم تر ہوں گے۔

(۳) کثرت سیرابی اور سبزے کی فراوانی کی وجہ سے وہ مائل بہ سیاہی ہوں گے۔

(۴) یہ صفت تَجْرِيَانِ سے ہلکی ہے اَلْجَزْيُ أَفْوَى مِنَ النَّضْحِ (ابن کثیر)

(۵) جب کہ پہلی دو جنتوں (باغوں) کی صفت میں بتلایا گیا ہے کہ ہر پھل دو قسم کا ہو گا۔ ظاہر ہے اس میں شرف و فضل کی جو زیادتی ہے، وہ دوسری بات میں نہیں ہے۔

(۶) خَيْرَاتُ سے مراد اخلاق و کردار کی خوبیاں ہیں اور حَسَنَاتُ کا مطلب ہے حسن و جمال میں یکتا۔

(۷) حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جنت میں موتیوں کے خیمے ہوں گے، ان کا عرض ساٹھ میل ہو گا، اس

پس (اے انسانو اور جنو!) تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۷۳)

انکو ہاتھ نہیں لگایا کسی انسان یا جن نے اس سے قبل۔ (۷۴)
پس اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کے ساتھ تم تکذیب کرتے ہو؟ (۷۵)

سبز مسندوں اور عمدہ فرشوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے۔ (۷۶)^(۱)

پس (اے جنو اور انسانو!) تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (۷۷)^(۲)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰتٰىنَا مَالًا كَثِيْرًا ۝۳۱

لَمْ يَطْمِئِنُّوْا اِلٰى شَيْءٍ مِّنْهُمْ وَلَا جِاۤءَانُ ۝۳۲

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰتٰىنَا مَالًا كَثِيْرًا ۝۳۳

مُنِيْبِيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُفْيَةٍ وَعَبْقَرِيْ حَسٰنٍ ۝۳۴

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰتٰىنَا مَالًا كَثِيْرًا ۝۳۵

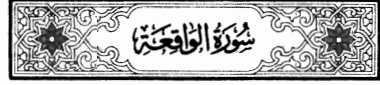
کے ہر کوئے میں جنتی کے اہل ہوں گے، جس کو دوسرے کوئے والے نہیں دیکھ سکیں گے۔ مومن اس میں گھومے گا۔
(صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الرحمن و کتاب بدء الخلق، باب ماجاء فی صفة الجنة، صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب فی صفة خیام الجنة)

(۱) رَفْرَفٍ، مسند، عالیچہ یا اس قسم کا عمدہ فرش، عَبْقَرِيْ، ہر نفیس اور اعلیٰ چیز کو کہا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے یہ لفظ استعمال فرمایا، فَلَمْ اَرَ عَبْقَرِيًّا يَنْفِرِيْ فَرَسِيْ (البخاری، کتاب المناقب، باب فضل عمر۔ و صحیح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر رضی اللہ عنہ) ”میں نے کوئی عبقری ایسا نہیں دیکھا جو عمر کی طرح کام کرتا ہو۔“ مطلب یہ ہے کہ جنتی ایسے تختوں پر فروکش ہوں گے جس پر سبز رنگ کی مسندیں، عالیچے اور اعلیٰ قسم کے خوب صورت منقش فرش بچھے ہوں گے۔

(۲) یہ آیت اس سورت میں ۳۱ مرتبہ آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اپنی اقسام و انواع کی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے اور ہر نعمت یا چند نعمتوں کے ذکر کے بعد یہ استفسار فرمایا ہے، حتیٰ کہ میدان محشر کی ہولناکیوں اور جہنم کے عذاب کے بعد بھی یہ استفسار فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ امور آخرت کی یاد دہانی بھی نعمتِ عظیمہ ہے تاکہ بچنے والے اس سے بچنے کی سعی کر لیں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی، کہ جن بھی انسانوں کی طرح اللہ کی ایک مخلوق ہے بلکہ انسانوں کے بعد یہ دوسری مخلوق ہے جسے عقل و شعور سے نوازا گیا ہے اور اس کے بدلے میں ان سے صرف اس امر کا تقاضا کیا گیا ہے کہ وہ صرف ایک اللہ کی عبادت کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ مخلوقات میں یہی دو ہیں جو شرعی احکام و فرائض کے مکلف ہیں، اسی لیے انہیں ارادہ و اختیار کی آزادی دی گئی ہے تاکہ ان کی آزمائش ہو سکے، تیسرے، نعمتوں کے بیان سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا جائز و مستحب ہے۔ یہ زہد و تقویٰ کے خلاف ہے اور نہ تعلق مع اللہ میں مانع، جیسا کہ بعض اہل

تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ﴿٥٦﴾

تیرے پروردگار کا نام بابرکت ہے ^(۱) جو عزت و جلال والا ہے۔ (۷۸)



سورۃ واقعہ کی ہے اور اس میں چھانوے آیتیں اور تین رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

جب قیامت قائم ہو جائے گی۔ ^(۲) (۱)

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝

جس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں۔ ^(۳)

لَيْسَ لَوْقَعَتَهَا كُذُوبٌ ۝

وہ پست کرنے والی اور بلند کرنے والی ہوگی۔ ^(۳) (۳)

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝

تصوف باور کراتے ہیں۔ چوتھے بار باریہ سوال کہ تم اللہ کی کون کون سی نعمتوں کی تکذیب کرو گے؟ یہ تو بیخ اور تہدید کے طور پر ہے، جس کا مقصد اس اللہ کی نافرمانی سے روکنا ہے، جس نے یہ ساری نعمتیں پیدا اور مہیا فرمائیں۔ اسی لیے نبی ﷺ نے اس کے جواب میں یہ پڑھنا پسند فرمایا ہے۔ لَا بِشَيْءٍ مِّنْ نِّعَمِكَ رَبَّنَا نَكَذَّبْتَ فَلَكَ الْحَمْدُ ”اے ہمارے رب ہم تیری کسی بھی نعمت کی تکذیب نہیں کرتے، پس تمام تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں“ (سنن الترمذی والصحیحۃ للالبانی) لیکن اندرونِ صلاۃ اس جواب کا پڑھنا شروع نہیں۔

(۱) تَبَارَكَ، برکت سے ہے جس کے معنی دوام و ثبات کے ہیں۔ مطلب ہے اس کا نام ہمیشہ رہنے والا ہے، یا اس کے پاس ہمیشہ خیر کے خزانے ہیں۔ بعض نے اس کے معنی بلندی اور علو شان کے کیے ہیں اور جب اس کا نام اتنا بابرکت یعنی خیر اور بلندی کا حامل ہے تو اس کی ذات کتنی برکت اور عظمت و رفعت والی ہوگی۔

☆ اس سورت کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ سُورَةُ الْغِنَى (تو نگر کی سورت) ہے اور جو شخص اس کو ہر رات پڑھے گا اسے کبھی فاقہ نہیں آئے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سورت کی فضیلت میں کوئی مستند روایت نہیں ہے۔ ہر رات پڑھنے والی اور بچوں کو سکھانے والی روایتیں بھی ضعیف بلکہ موضوع ہیں۔ (دیکھئے الأحادیث الضعیفہ،

للالبانی حدیث نمبر ۲۹۰۱-ج ۱/۳۰۵)

(۲) واقعہ بھی قیامت کے ناموں میں سے ہے، کیونکہ یہ لامحالہ واقع ہونے والا ہے، اس لیے اس کا یہ نام بھی ہے۔

(۳) پستی اور بلندی سے مطلب ذلت اور عزت ہے۔ یعنی اللہ کے اطاعت گزار بندوں کو یہ بلند اور نافرمانوں کو پست کرے

جبکہ زمین زلزلہ کے ساتھ ہلا دی جائے گی۔ (۴)	إِذَا دُجِبَتِ الْأَرْضُ رَجَا ۝
اور پھاڑ بالکل ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔ (۵) ^(۱)	وَدُجِبَتِ الْجِبَالُ بَسًا ۝
پھر وہ مثل پر آگندہ غبار کے ہو جائیں گے۔ (۶)	مَكَانَاتٍ هَبَّ آتَمَّهَا طَبَا ۝
اور تم تین جماعتوں میں ہو جاؤ گے۔ (۷) ^(۲)	وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً ۝
پس داہنے ہاتھ والے کیسے اچھے ہیں داہنے ہاتھ والے۔ (۸) ^(۳)	فَأَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ لَا مَا أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ۝
اور بائیں ہاتھ والے کیا حال ہے بائیں ہاتھ والوں کا۔ (۹) ^(۴)	وَأَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ لَا مَا أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ۝
اور جو آگے والے ہیں وہ تو آگے والے ہی ہیں۔ (۱۰) ^(۵)	وَالطَّيِّفُونَ الطَّيِّفُونَ ۝
وہ بالکل نزدیکی حاصل کیے ہوئے ہیں۔ (۱۱)	أُولَئِكَ الْمُتَحَرِّفُونَ ۝
نعمتوں والی جنتوں میں ہیں۔ (۱۲)	فِي جَنَّاتِ النَّوَافِرِ ۝
(بہت بڑا) گروہ تو اگلے لوگوں میں سے ہو گا۔ (۱۳)	ثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَوَّلِينَ ۝
اور تھوڑے سے پچھلے لوگوں میں سے۔ (۱۴) ^(۶)	وَكَلِيلٌ مِنَ الْآخِرِينَ ۝

گی، چاہے دنیا میں معاملہ اس کے برعکس ہو۔ اہل ایمان وہاں معزز و مکرم ہوں گے اور اہل کفر و عصیان ذلیل و خوار۔

(۱) رَجَا کے معنی حرکت و اضطراب (زلزلہ) اور بس کے معنی ریزہ ریزہ ہو جانے کے ہیں۔

(۲) أَزْوَاجًا: أَصْنَافًا کے معنی میں ہے۔

(۳) اس سے عام مومنین مراد ہیں جن کو ان کے اعمال نامے داہنے ہاتھوں میں دیئے جائیں گے جو ان کی خوش بختی کی علامت ہوگی۔

(۴) اس سے مراد کافر ہیں جن کو ان کے اعمال نامے بائیں ہاتھوں میں پکڑائے جائیں گے۔

(۵) ان سے مراد خواص مومنین ہیں، یہ تیسری قسم ہے جو ایمان قبول کرنے میں سبقت کرنے اور نیکی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو قرب خاص سے نوازے گا، یہ ترکیب ایسے ہی ہے، جیسے کہتے ہیں، تو تو ہے اور زید زید، اس میں گویا زید کی اہمیت اور فضیلت کا بیان ہے۔

(۶) ثَلَاثَةٌ: اس بڑے گروہ کو کہا جاتا ہے جس کا گننا ناممکن ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اولین سے مراد حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک کی امت کے لوگ ہیں اور آخرین سے امت محمدیہ کے افراد۔ مطلب یہ ہے کہ پچھلی امتوں میں سابقین کا ایک بڑا گروہ ہے، کیونکہ ان کا زمانہ بہت لمبا ہے جس میں ہزاروں انبیاء کے سابقین شامل ہیں ان کے مقابلے میں امت محمدیہ کا زمانہ (قیامت تک) تھوڑا ہے، اس لیے ان میں سابقین بھی بہ نسبت گزشتہ امتوں کے

یہ لوگ سونے کے تاروں سے بنے ہوئے تختوں پر- (۱۵)
 ایک دوسرے کے سامنے تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے- (۱۶)^(۱)
 ان کے پاس ایسے لڑکے جو ہمیشہ (لڑکے ہی) رہیں گے
 آمدورفت کریں گے- (۱۷)
 آنخورے اور جگ لے کر اور ایسا جام لے کر جو بہتی
 ہوئی شراب سے پر ہو- (۱۸)
 جس سے نہ سر میں درد ہو نہ عقل میں فتور آئے- (۱۹)^(۲)
 اور ایسے میوے لیے ہوئے جو ان کی پسند کے
 ہوں- (۲۰)
 اور پرندوں کے گوشت جو انہیں مرغوب ہوں- (۲۱)
 اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں- (۲۲)

عَلَى سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ ①
 مُتَّكِئِينَ عَلَيْهَا مُتَقَرَّبِينَ ②
 يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّغْلَدُونَ ③
 بَأَكْوَابٍ وَأَبَارِيقٍ وَكَأْسٍ مِنْ مَرْعِينٍ ④
 لَا يَصُدُّ عَنْهُمْ سَاهٌ وَلَا يُبْرُونَ ⑤
 وَكَأَكْهَبَةٍ مِمَّا يَنْتَجَرُونَ ⑥
 وَكَمْ مِنْ ظُلْمٍ أَعْيَنَهُمْ عَلَىٰ ⑦
 حُورٍ عِينٍ ⑧

تھوڑے ہوں گے- اور ایک حدیث میں آتا ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ”مجھے امید ہے کہ تم جنتیوں کا نصف ہو گے“۔ (صحیح مسلم، نمبر ۲۰۰) تو یہ آیت کے مذکورہ مفہوم کے مخالف نہیں۔ کیونکہ امت محمدیہ کے سابقین اور عام مومنین ملا کر باقی تمام امتوں سے جنت میں جانے والوں کا نصف ہو جائیں گے، اس لیے محض سابقین کی کثرت (سابقہ امتوں میں) سے حدیث میں بیان کردہ تعداد کی نفی نہیں ہوگی۔ مگر یہ قول محل نظر ہے اور بعض نے اولین و آخرین سے اسی امت محمدیہ کے افراد مراد لیے ہیں۔ یعنی اس کے پہلے لوگوں میں سابقین کی تعداد زیادہ اور پچھلے لوگوں میں تھوڑی ہوگی۔ امام ابن کثیر نے اسی دوسرے قول کو ترجیح دی ہے۔ اور یہی زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے، فِی جَنَّتِ النَّعِيمِ اور عَلٰی سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ کے درمیان۔

(۱) مَوْضُونَةٌ بنے ہوئے، جڑے ہوئے۔ یعنی مذکورہ جنتی سونے کے تاروں سے بنے اور سونے جو اہر سے جڑے ہوئے تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے تکیوں پر بیٹھے ہوں گے یعنی رو در رو ہوں گے نہ کہ پشت بہ پشت۔
 (۲) یعنی وہ بڑے نہیں ہوں گے کہ بوڑھے ہو جائیں نہ ان کے خدو خال اور قد و قامت میں کوئی تغیر واقع ہوگا، بلکہ ایک ہی عمر اور ایک ہی حالت پر رہیں گے، جیسے نوجوان لڑکے ہوتے ہیں۔

(۳) صُدَاعٌ ایسے سرد رو کو کہتے ہیں جو شراب کے نشے اور خمار کی وجہ سے ہو اور اِنْتَرَفٌ کے معنی، وہ فتور عقل جو مدہوشی کی بنیاد پر ہو۔ دنیا کی شراب کے نتیجے میں یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں، آخرت کی شراب میں سرور اور لذت تو یقیناً ہوگی لیکن یہ خرابیاں نہیں ہوں گی۔ مَعِينٌ، چشمہ جاری جو خشک نہ ہو۔

جو چھپے ہوئے موتیوں کی طرح ہیں۔ ^(۱) (۲۳)	كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ ﴿۲۳﴾
یہ صلہ ہے ان کے اعمال کا۔ (۲۴)	جَزَاءً لِّمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲۴﴾
نہ وہاں بکواس سنیں گے اور نہ گناہ کی بات۔ (۲۵)	لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْتِيهَا
صرف سلام ہی سلام کی آواز ہوگی۔ ^(۲) (۲۶)	إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا ﴿۲۵﴾
اور داہنے ہاتھ والے کیا ہی اچھے ہیں داہنے ہاتھ	وَأَصْحَابُ الْيَمِينِ ذُو الْأَصْحَابِ الْيَمِينِ ﴿۲۶﴾
والے۔ ^(۳) (۲۷)	
وہ بغیر کانٹوں کی بیروں۔ (۲۸)	فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ ﴿۲۸﴾
اور تہ بہ تہ کیلوں۔ (۲۹)	وَذَلْفٍ مَّزْمُودٍ ﴿۲۹﴾
اور لمبے لمبے سایوں۔ ^(۴) (۳۰)	وَذَلْفٍ مَّزْمُودٍ ﴿۳۰﴾
اور بستے ہوئے پانیوں۔ (۳۱)	وَأَمْوَاتٍ مَّوْبُوءٍ ﴿۳۱﴾
اور بکثرت پھلوں میں۔ (۳۲)	وَفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ﴿۳۲﴾
جو نہ ختم ہوں نہ روک لیے جائیں۔ ^(۵) (۳۳)	لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ ﴿۳۳﴾

(۱) مَکْنُونٌ، جسے چھپا کر رکھا گیا، اس کو کسی کے ہاتھ لگے ہوں نہ گردوغبار سے پہنچا ہو۔ ایسی چیز بالکل صاف ستھری اور اصلی حالت میں رہتی ہے۔

(۲) یعنی دنیا میں تو باہم لڑائی جھگڑے ہی ہوتے ہیں، حتیٰ کہ بسن بھائی بھی اس سے محفوظ نہیں، اس اختلاف و نزاع سے دلوں میں کدورتیں اور بغض و عناد پیدا ہوتا ہے جو ایک دوسرے کے خلاف بدزبانی، سب و شتم، غیبت اور چغل خوری وغیرہ پر انسان کو آمادہ کرتا ہے۔ جنت ان تمام اخلاقی گندگیوں اور بے ہودگیوں سے نہ صرف پاک ہوگی، بلکہ وہاں سلام ہی سلام کی آوازیں سننے میں آئیں گی، فرشتوں کی طرف سے بھی اور آپس میں اہل جنت کی طرف سے بھی۔ جس کا مطلب ہے کہ وہاں سلام و تحیہ تو ہو گا لیکن دل اور زبان کی وہ خرابیاں نہیں ہوں گی جو دنیا میں عام ہیں حتیٰ کہ بڑے بڑے دین دار بھی ان سے محفوظ نہیں۔

(۳) اب تک سابقین (مُقَرَّبِينَ) کا ذکر تھا، اَصْحَابُ الْيَمِينِ سے اب عام مومنین کا ذکر ہو رہا ہے۔

(۴) جیسے ایک حدیث میں ہے کہ ”جنت کے ایک درخت کے سائے تلے ایک گھوڑ سوار سو سال تک چلتا رہے گا“ تب بھی وہ سایہ ختم نہیں ہوگا۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الواقِعہ، ’مسلم‘ کتاب الجنۃ، ’باب ان فی الجنۃ شجرۃ.....)

(۵) یعنی یہ پھل موسمی نہیں ہوں گے کہ موسم گزر گیا تو یہ پھل بھی آئندہ فصل تک ناپید ہو جائیں، یہ پھل اس طرح فصل گل و لالہ کے پابند بھی نہیں ہوں گے، بلکہ ہر وقت دستیاب رہیں گے۔

اور اونچے اونچے فرشوں میں ہوں گے۔ ^(۱) (۳۳)	وَفُوشٍ مَّرْفُوعَةٍ ۞
ہم نے ان (کی بیویوں کو) خاص طور پر بنایا ہے۔ (۳۵)	إِنَّا أَنْشَأْنَاهُنَّ إِنثَاءً ۞
اور ہم نے انہیں کنواریاں بنا دیا ہے۔ ^(۲) (۳۶)	فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا ۞
محبت والیاں اور ہم عمر ہیں۔ ^(۳) (۳۷)	عُرُبًا أَكْرَابًا ۞
دائیں ہاتھ والوں کے لیے ہیں۔ (۳۸)	لِأَصْطَبِ الْمِيمِينَ ۞
جم غفیر ہے اگلوں میں سے۔ ^(۴) (۳۹)	ثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَقْلَابِ ۞
اور بہت بڑی جماعت ہے پچھلوں میں سے۔ ^(۵) (۴۰)	وَتَلَاثَةٌ مِنَ الْأَخْيَرِينَ ۞
اور بائیں ہاتھ والے کیا ہیں بائیں ہاتھ والے۔ ^(۶) (۴۱)	وَأَصْطَبِ الْبَيْتَالَةِ مَا أَصْطَبِ الْبَيْتَالِ ۞
گرم ہوا اور گرم پانی میں (ہوں گے) (۴۲)	فِي مَقْنُونٍ وَصَيْبِهِ ۞

(۱) بعض نے فرشوں سے بیویوں اور مرفوعہ سے بلند مرتبہ کا مفہوم مراد لیا ہے۔

(۲) أَنْشَأْنَاهُنَّ کا مرجع اگرچہ قریب میں نہیں ہے لیکن سیاق کلام اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد اہل جنت کو ملنے والی بیویاں اور حور عین ہیں۔ حوریں، ولادت کے عام طریقے سے پیدا شدہ نہیں ہوں گی، بلکہ اللہ تعالیٰ خاص طور پر انہیں جنت میں اپنی قدرت خاص سے بنائے گا، اور جو دنیاوی عورتیں ہوں گی، تو وہ بھی حوروں کے علاوہ اہل جنت کو بیویوں کے طور پر ملیں گی، ان میں بوڑھی، کالی، بد شکل، جس طرح کی بھی ہوں گی، سب کو اللہ تعالیٰ جنت میں جوانی اور حسن و جمال سے نواز دے گا، نہ کوئی بوڑھی، بوڑھی رہے گی، نہ کوئی بد شکل، بد شکل بلکہ سب باکرہ (کنواری) کی حیثیت میں ہوں گی۔

(۳) عُرُبٌ، عُرُوبَةٌ کی جمع ہے۔ ایسی عورت جو اپنے حسن و جمال اور دیگر محاسن کی وجہ سے خاوند کو نہایت محبوب ہو۔ اَنْرَابٌ تَرْبٌ کی جمع ہے۔ ہم عمر، یعنی سب عورتیں جو اہل جنت کو ملیں گی، ایک ہی عمر کی ہوں گی، جیسا کہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ سب جنتی ۳۳ سال کی عمر کے ہوں گے، (سنن ترمذی، باب ماجاء فی سنن اهل الجنة) یا مطلب ہے کہ خاوندوں کی ہم عمر ہوں گی۔ مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔

(۴) یعنی آدم علیہ السلام سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک کے لوگوں میں سے یا خود امت محمدیہ کے اگلوں میں سے۔

(۵) یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے یا آپ کی امت کے پچھلوں میں سے۔

(۶) اس سے مراد اہل جہنم ہیں، جن کو ان کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے، جو ان کی مقدر شدہ شقاوت کی علامت ہوگی۔

اور سیاہ دھوئیں کے سائے میں۔^(۱) (۳۳)
 جو نہ ٹھنڈا ہے نہ فرحت بخش۔^(۲) (۳۴)
 بیشک یہ لوگ اس سے پہلے بہت نازوں میں پلے ہوئے
 تھے۔^(۳) (۳۵)

اور بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے۔ (۳۶)
 اور کہتے تھے کہ کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور
 ہڈی ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر دوبارہ اٹھا کھڑے کیے
 جائیں گے۔ (۳۷)

اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی؟^(۴) (۳۸)
 آپ کہہ دیجئے کہ یقیناً سب اگلے اور پچھلے۔ (۳۹)
 ضرور جمع کئے جائیں گے ایک مقرر دن کے وقت۔ (۵۰)
 پھر تم اے گمراہو جھٹلانے والو! (۵۱)
 البتہ کھانے والے ہو تھوہر کا درخت۔ (۵۲)

وَقِيلَ مَنْ يَحْمُومٌ ﴿۳۳﴾
 لَا بَأْسَ وَ لَا كِبْرٌ ﴿۳۴﴾
 إِنَّكُمْ كَانُوا أَقْبَلَ ذَلِكَ مُتْرَفِينَ ﴿۳۵﴾
 وَ كَانُوا يُصْرَفُونَ عَلَى الْيَدَنِ الْعَظِيمِ ﴿۳۶﴾
 وَ كَانُوا يَعْزُبُونَ عَنْ أَيْدِي مَنَّا وَ كُنَّا رِأْيَاءَ عِظَامِنَا أَزْوَاجًا لِمَنْ يُؤْتُونَ ﴿۳۷﴾

أَوِ آبَاؤُنَا الَّذِينَ ﴿۳۸﴾
 قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ﴿۳۹﴾
 لَمَجْمُوعُونَ إِلَىٰ مِيقَاتٍ يُعَمَّرُ فِيهَا ﴿۴۰﴾
 ثُمَّ لَكُمْ فِيهَا الضَّالُّونَ الْمَكِيدُونَ ﴿۴۱﴾
 لَأَكُونَنَّ مِنْ شَجَرٍ مِنْ زُفُورٍ ﴿۴۲﴾

(۱) سَمُومٌ: آگ کی حرارت یا گرم ہوا جو مسام بدن میں گھس جائے۔ حَمِيمٌ، کھولتا ہوا پانی، يَحْمُومٌ، جَمَمَةٌ سے ہے، بمعنی سیاہ، اور احم بہت زیادہ سیاہ چیز ہو تو کہا جاتا ہے، يَحْمُومٌ۔ کے معنی سخت کالا دھواں مطلب یہ ہے کہ جہنم کے عذاب سے تنگ آکر وہ ایک سائے کی طرف دوڑیں گے، لیکن جب وہاں پہنچیں گے تو معلوم ہو گا کہ یہ سایہ نہیں ہے، جہنم ہی کی آگ کا سخت سیاہ دھواں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حَمٌّ سے ہے جو اس چربی کو کہتے ہیں جو آگ میں جل جل کر سیاہ ہو گئی ہو۔ بعض کہتے ہیں، یہ حِمَمٌ سے ہے، جو کونکے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے امام ضحاک فرماتے ہیں۔ آگ بھی سیاہ ہے، اہل نار بھی سیاہ روہوں گے اور جہنم میں جو کچھ بھی ہو گا، سیاہ ہی ہو گا۔ اللَّهُمَّ أَجْرُنَا مِنَ النَّارِ۔

(۲) یعنی سایہ ٹھنڈا ہوتا ہے، لیکن یہ جس کو سایہ سمجھ رہے ہوں گے، وہ سایہ ہی نہیں ہو گا، جو ٹھنڈا ہو، وہ تو جہنم کا دھواں ہو گا، وَلَا كِبْرِيْنِمٌ جس میں کوئی حسن منظر یا خیر نہیں۔ یا حلاوت نہیں۔

(۳) یعنی دنیا میں آخرت سے غافل ہو کر عیش و عشرت کی زندگی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

(۴) اس سے معلوم ہوا کہ عقیدہ آخرت کا انکار ہی کفر و شرک اور معاصی میں ڈوبے رہنے کا بنیادی سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آخرت کا تصور، اس کے ماننے والوں کے ذہنوں میں دھندلا جاتا ہے، تو ان میں بھی فسق و فجور عام ہو جاتا ہے۔ جیسے آج کل عام مسلمانوں کا حال ہے۔

اور اسی سے پیٹ بھرنے والے ہو۔ ^(۱) (۵۳)	قَمَالُؤُنْ وَمَعَهَا الْبُطُونُ ۞
پھر اس پر گرم کھولتا پانی پینے والے ہو۔ (۵۴)	فَشَرِبُونَ عَلَيْهِ مِنَ الْعَمِيرِ ۞
پھر پینے والے بھی پیاسے اونٹوں کی طرح۔ ^(۲) (۵۵)	فَشَرِبُونَ شُرْبَ الْهَيْجَرِ ۞
قیامت کے دن ان کی مہمانی یہ ہے۔ ^(۳) (۵۶)	هَذَا نُزْلُهُمْ يَوْمَ الدِّينِ ۞
ہم ہی نے تم سب کو پیدا کیا ہے پھر تم کیوں باور نہیں کرتے؟ ^(۴) (۵۷)	عَنْ خَلْقِكُمْ فَكُلُوا لِمَا أُصْدَقْتُمْ ۞
اچھا پھر یہ تو بتلاؤ کہ جو منی تم ٹپکاتے ہو۔ (۵۸)	أَقْرَبُ بِكُمْ مَا تُمْنُونَ ۞
کیا اس کا (انسان) تم بناتے ہو یا پیدا کرنے والے ہم ہی ہیں؟ ^(۵) (۵۹)	مَا أَنْتُمْ تَخْلُقُونَ فَآمَرُكُمْ الْخَالِقُونَ ۞
ہم ہی نے تم میں موت کو متعین کر دیا ہے ^(۶) اور ہم اس سے بارے ہوئے نہیں ہیں۔ ^(۷) (۶۰)	عَنْ قَدَرٍ نَّأْتِكُمُ الْمَوْتَ وَمَا عَنِ بَسْمِ بَرِّقِينَ ۞

(۱) یعنی اس کریمہ النظر اور نہایت بد ذائقہ اور تلخ درخت کا کھانا تمہیں اگرچہ سخت ناگوار ہو گا، لیکن بھوک کی شدت سے تمہیں اسی سے اپنا پیٹ بھرنا ہو گا۔

(۲) هَيْجَرٌ، اَهِيمٌ کی جمع ہے، ان پیاسے اونٹوں کو کہا جاتا ہے جو ایک خاص بیماری کی وجہ سے پانی پر پانی پیئے جاتے ہیں لیکن ان کی پیاس نہیں بجھتی۔ مطلب یہ ہے کہ زقوم کھانے کے بعد پانی بھی اس طرح نہیں پیو گے جس طرح عام معمول ہوتا ہے، بلکہ ایک تو بطور عذاب کے تمہیں پینے کے لیے کھولتا ہوا پانی ملے گا۔ دوسرا تم اسے پیاسے اونٹوں کی طرح پیئے جاؤ گے لیکن تمہاری پیاس دور نہیں ہوگی۔

(۳) یہ بطور استہزا اور تمکرم کے فرمایا، ورنہ مہمانی تو وہ ہوتی ہے جو مہمان کی عزت کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے بعض مقام پر فرمایا ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (آل عمران، ۳۱) ”ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجئے۔“

(۴) یعنی تم جانتے ہو کہ تمہیں پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے، پھر تم اس کو مانتے کیوں نہیں ہو؟ یا دوبارہ زندہ کرنے پر یقین کیوں نہیں کرتے؟

(۵) یعنی تمہارے بیویوں سے مباشرت کرنے کے نتیجے میں تمہارے جو قطرات منی عورتوں کے رحموں میں جاتے ہیں، ان سے انسانی شکل و صورت بنانے والے ہم ہیں یا تم؟

(۶) یعنی ہر شخص کی موت کا وقت مقرر کر دیا ہے، جس سے کوئی تجاوز نہیں کر سکتا۔ چنانچہ کوئی بچپن میں، کوئی جوانی میں اور کوئی بڑھاپے میں فوت ہوتا ہے۔

(۷) یا مغلوب اور عاجز نہیں ہیں، بلکہ قادر ہیں۔

کہ تمہاری جگہ تم جیسے اور پیدا کر دیں اور تمہیں نئے سرے سے اس عالم میں پیدا کریں جس سے تم (بالکل) بے خبر ہو۔^(۶۱)

تمہیں یقینی طور پر پہلی دفعہ کی پیدائش معلوم ہی ہے پھر کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے؟^(۶۲)

اچھا پھر یہ بھی بتلاؤ کہ تم جو کچھ بولتے ہو۔^(۶۳) اسے تم ہی اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔^(۶۴)

اگر ہم چاہیں تو اسے ریزہ ریزہ کر ڈالیں اور تم حیرت کے ساتھ باتیں بناتے ہی رہ جاؤ۔^(۶۵)

کہ ہم پر تو تاوان ہی پڑ گیا۔^(۶۶)

عَلَىٰ أَنْ يُبَدِّلَ أُمَّةً لَكُمْ وَيُنشِئَ لَكُمْ فَمَا لَتَكْفُرُونَ ۝

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَتَذَكَّرُونَ ۝

أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ ۝

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا زِينَتَكُمْ لِكُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلِّ مَأْكَلٍ وَكُلِّ مَسْكَنٍ ۝

لَقَدْ أَنشَأْنَا لَكُمْ فَجَاءًا مِّمَّا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ۝

إِنَّا لَنَعْلَمُ الْمُؤْمِنِينَ ۝

(۱) یعنی تمہاری صورتیں مسخ کر کے تمہیں بندر اور خنزیر بنا دیں اور تمہاری جگہ تمہاری شکل و صورت کی کوئی اور مخلوق پیدا کر دیں۔

(۲) یعنی کیوں یہ نہیں سمجھتے کہ جس طرح اس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا (جس کا تمہیں علم ہے) وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔

(۳) یعنی زمین میں تم جو بیج بولتے ہو، اس سے ایک درخت زمین کے اوپر نمودار ہو جاتا ہے۔ غلے کے ایک بے جان دانے کو پھاڑ کر اور زمین کے سینے کو چیر کر اس طرح درخت اگانے والا کون ہے؟ یہ بھی منی کے قطرے سے انسان بنا دینے کی طرح ہماری ہی قدرت کا شاہکار ہے یا تمہارے کسی ہنریا چھو منتر کا نتیجہ ہے؟

(۴) یعنی کھیتی کو سرسبز و شاداب کرنے کے بعد، جب وہ پکنے کے قریب ہو جائے تو ہم اگر چاہیں تو اسے خشک کر کے ریزہ ریزہ کر دیں اور تم حیرت سے منہ ہی نکتے رہ جاؤ۔ نَفَكُهُ اضداد میں سے ہے اس کے معنی نعت و خوش حالی بھی ہیں اور حزن و یاس بھی۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں، اس کے مختلف معانی کیے گئے ہیں، تَتَوَعُّونَ كَلَامَكُمْ، تَتَذَكَّرُونَ، تَخْرَنُونَ، تَعَجِبُونَ، تَلَاوَمُونَ اور تَفْجَعُونَ وغیرہ۔ ظَلَلْتُمْ، اصل میں ظَلَلْتُمْ، بمعنی صِرْتُمْ اور تَفَكَّهُونَ تَتَفَكَّهُونَ ہے۔

(۵) یعنی ہم نے پہلے زمین پر بل چلا کر اسے ٹھیک کیا پھر بیج ڈالا، پھر اسے پانی دیتے رہے، لیکن جب فصل کے پکنے کا وقت آیا تو وہ خشک ہو گئی، اور ہمیں کچھ بھی نہ ملا یعنی یہ سارا خرچ اور محنت ایک تاوان ہی ہوا جو ہمیں برداشت کرنا پڑا۔ تاوان کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ انسان کو اس کے مال یا محنت کا معاوضہ نہ ملے، بلکہ وہ یوں ہی ضائع ہو جائے یا زبردستی اس سے کچھ وصول کر لیا جائے اور اس کے بدلے میں اسے کچھ نہ دیا جائے۔

بلکہ ہم بالکل محروم ہی رہ گئے۔ (۶۷)
 اچھا یہ بتاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو۔ (۶۸)
 اسے بادلوں سے بھی تم ہی اتارتے ہو یا ہم
 برساتے ہیں؟ (۶۹)
 اگر ہماری فشا ہو تو ہم اسے کڑوا زہر کر دیں پھر تم ہماری
 شکر گزاری کیوں نہیں کرتے؟ (۷۰)^(۱)
 اچھا ذرا یہ بھی بتاؤ کہ جو آگ تم سلگاتے ہو۔ (۷۱)
 اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم اس کے پیدا
 کرنے والے ہیں؟ (۷۲)^(۲)
 ہم نے اسے سبب نصیحت^(۳) اور مسافروں کے فائدے
 کی چیز بنایا ہے۔ (۷۳)^(۴)
 پس اپنے بہت بڑے رب کے نام کی تسبیح کیا کرو۔ (۷۴)

مَنْ مِّنْكُمْ مَّحْرُومٌ ﴿۶۷﴾
 أَقْوَمُ يَوْمَئِذٍ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ﴿۶۸﴾
 مَا أَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْبُرْنِ أَمْ مِّنْ الْمُنْزِلُونَ ﴿۶۹﴾
 لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أَجَا فَا لَوْلَا تَشْكُرُونَ ﴿۷۰﴾
 أَقْوَمُ يَوْمَئِذٍ النَّارَ الَّتِي تُوقُونَ ﴿۷۱﴾
 ءَأَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ مِّنْ الْمُنْشِئِينَ ﴿۷۲﴾
 عَنْ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَمَتَاعًا لِلْمُعْوِنِينَ ﴿۷۳﴾
 فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿۷۴﴾

(۱) یعنی اس احسان پر ہماری اطاعت کر کے ہمارا عملی شکر ادا کیوں نہیں کرتے؟

(۲) کہتے ہیں عرب میں دو درخت ہیں، مرغ اور عفار، ان دونوں سے شہنیاں لے کر، ان کو آپس میں رگزا جائے تو اس سے آگ کے شرارے نکلنے ہیں۔

(۳) کہ اس کے اثرات اور فوائد حیرت انگیز ہیں اور دنیا کی بے شمار چیزوں کی تیاری کے لیے اسے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ جو ہماری قدرت عظیمہ کی نشانی ہے، پھر ہم نے جس طرح دنیا میں یہ آگ پیدا کی ہے، ہم آخرت میں بھی پیدا کرنے پر قادر ہیں۔ جو اس سے ۶۹ درجہ حرارت میں زیادہ ہوگی۔ (کَمَا فِي الْحَدِيثِ)

(۴) مُفَوِّينَ، مُفَوِّیِیَ کی جمع ہے، فَوَاءٌ یعنی خالی صحرا میں داخل ہونے والا، مراد مسافر ہے۔ یعنی مسافر صحراؤں اور جنگلوں میں ان درختوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس سے روشنی گرمی اور ایندھن حاصل کرتے ہیں۔ بعض نے مُفَوِّیِیَ سے وہ فقرا مراد لیے ہیں جو بھوک کی وجہ سے خالی پیٹ ہوں۔ بعض نے اس کے معنی مُسْتَفْتِعِينَ (فائدہ اٹھانے والے) کیے ہیں۔ اس میں امیر، غریب، مقیم اور مسافر سب آجاتے ہیں اور سب ہی آگ سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اسی لیے حدیث میں جن تین چیزوں کو عام رکھنے کا اور ان سے کسی کو نہ روکنے کا حکم دیا گیا ہے، ان میں پانی اور گھاس کے علاوہ آگ بھی ہے، (ابوداؤد، کتاب السبوع، باب فی منع الماء، وسنن ابن ماجہ، کتاب الرھون، باب المسلمون شرکاء فی ثلاث، امام ابن کثیر نے اس مفہوم کو زیادہ پسند کیا ہے۔

پس میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے گرنے کی۔^(۱) (۷۵)
 اور اگر تمہیں علم ہو تو یہ بہت بڑی قسم ہے۔ (۷۶)
 کہ بیشک یہ قرآن بہت بڑی عزت والا ہے۔^(۲) (۷۷)
 جو ایک محفوظ کتاب میں درج ہے۔^(۳) (۷۸)
 جسے صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔^(۴) (۷۹)
 یہ رب العالمین کی طرف سے اترا ہوا ہے۔ (۸۰)
 پس کیا تم ایسی بات کو سرسری (اور معمولی) سمجھ رہے
 ہو؟^(۵) (۸۱)
 اور اپنے حصے میں یہی لیتے ہو کہ جھپٹاتے پھرو۔ (۸۲)
 پس جبکہ روح نرخرے تک پہنچ جائے۔ (۸۳)

فَلَا أَقْسِمُ بِمَوْقِعِ النُّجُومِ ۝
 وَإِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ۝
 فِي كِتَابٍ مُّكْتَبٍ ۝
 لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۝
 تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝
 أَفَأَنْتُمْ مُّسْتَكْبِرُونَ ۝
 وَتَجْمَلُونَ رِزْقَكُمْ وَأَنْتُمْ مُّكَذِّبُونَ ۝
 تَالْوَالِدَاتُ إِذَا بِالْقَبْرِ السَّالْوُونَ ۝

(۱) فَلَا أَقْسِمُ میں لا زائد ہے جو تاکید کے لیے ہے۔ یا یہ زائد نہیں ہے۔ بلکہ ماقبل کی کسی چیز کی نفی کے لیے ہے۔ یعنی یہ قرآن کمانت یا شاعری نہیں ہے بلکہ میں ستاروں کے گرنے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ قرآن عزت والا ہے..... مَوَاقِعِ النُّجُومِ سے مراد ستاروں کے طلوع و غروب کی جگہیں اور ان کی منزلیں اور مدار ہیں۔ بعض نے ترجمہ کیا ہے ”قسم کھاتا ہوں آبیوں کے اترنے کی پیغیروں کے دلوں میں (موضع القرآن) یعنی نجوم‘ قرآن کی آیات اور مواقع‘ قلوب انبیا۔ بعض نے اس کا مطلب قرآن کا آہستہ آہستہ بتدریج اترنا اور بعض نے قیامت والے دن ستاروں کا جھرننا مراد لیا ہے۔ (ابن کثیر)

(۲) یہ جواب قسم ہے۔

(۳) یعنی لوح محفوظ ہیں۔

(۴) لَا يَمَسُّهُ میں ضمیر کا مرجع لوح محفوظ ہے اور پاک لوگوں سے مراد فرشتے، بعض نے اس کا مرجع‘ قرآن کریم کو بنایا ہے یعنی اس قرآن کو فرشتے ہی چھوتے ہیں، یعنی آسمانوں پر فرشتوں کے علاوہ کسی کی بھی رسائی اس قرآن تک نہیں ہوتی۔ مطلب مشرکین کی تردید ہے جو کہتے تھے کہ قرآن شیاطین لے کر اترتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا یہ کیوں کر ممکن ہے۔ یہ قرآن تو شیطانی اثرات سے بالکل محفوظ ہے۔

(۵) حدیث سے مراد قرآن کریم ہے مُّذَاهَنَةً‘ وہ نرمی جو کفر و نفاق کے مقابلے میں اختیار کی جائے دریاں حایکہ ان کے مقابلے میں سخت تر رویے کی ضرورت ہے۔ یعنی اس قرآن کو اپنانے کے معاملے میں تمام کافروں کو خوش کرنے کے لیے نرمی اور اعراض کا راستہ اختیار کر رہے ہو۔ حالانکہ یہ قرآن جو مذکورہ صفات کا حامل ہے، اس لائق ہے کہ اسے نہایت خوشی سے اپنایا جائے۔

اور تم اس وقت آنکھوں سے دیکھتے رہو۔^(۱) (۸۴)
ہم اس شخص سے بہ نسبت تمہارے بہت زیادہ قریب
ہوتے ہیں^(۲) لیکن تم نہیں دیکھ سکتے۔^(۳) (۸۵)
پس اگر تم کسی کے زیر فرمان نہیں۔ (۸۶)
اور اس قول میں سچے ہو تو (ذرا) اس روح کو تو
لوناؤ۔^(۴) (۸۷)
پس جو کوئی بارگاہ الہی سے قریب کیا ہوا ہوگا۔^(۵) (۸۸)
اسے تو راحت ہے اور غذائیں ہیں اور آرام والی
جنت ہے۔ (۸۹)
اور جو شخص داہنے (ہاتھ) والوں میں سے ہے۔^(۶) (۹۰)
تو بھی سلامتی ہے تیرے لیے کہ تو داہنے والوں میں سے
ہے۔ (۹۱)

وَأَنْتُمْ صِغِيرٌ مِّنْظُرُونَ ﴿۱﴾
وَمَنْ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلَكِنْ لَا تُبْصِرُونَ ﴿۲﴾
فَلَوْلَا إِرَادَةُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ لَخَرَّبْتُم بِئِنَّ ﴿۳﴾
تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۴﴾
فَأَتَاكَ إِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿۵﴾
فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّتُ نَعِيمٌ ﴿۶﴾
وَأَتَاكَ إِنْ كَانَ مِنَ الْمُصْطَبِ الْيَمِينِ ﴿۱﴾
فَسَلِّوْا لَهُ مِنَ الصَّلَاةِ الْيَمِينِ ﴿۲﴾

(۱) یعنی روح نکلے ہوئے دیکھتے ہو لیکن اسے ٹال سکنے کی یا اسے کوئی فائدہ پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے۔
(۲) یعنی مرنے والے کے ہم، تم سے بھی زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اپنے علم، قدرت اور رؤیت کے اعتبار سے۔ یا ہم سے مراد اللہ کے کارندے یعنی موت کے فرشتے ہیں جو اس کی روح قبض کرتے ہیں۔
(۳) یعنی اپنی جمالت کی وجہ سے تمہیں اس بات کا ادراک نہیں کہ اللہ تو تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے یا روح قبض کرنے والے فرشتوں کو تم دیکھ نہیں سکتے۔

(۴) دَانَ يَدِينُ کے معنی ہیں، ماتحت ہونا، دوسرے معنی ہیں بدلہ دینا۔ یعنی اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ کوئی تمہارا آقا اور مالک نہیں جس کے تم زیر فرمان اور ماتحت ہو یا کوئی جزا سزا کا دن نہیں آئے گا، تو اس قبض کی ہوئی روح کو اپنی جگہ پر واپس لونا کر دکھاؤ اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تمہارا گمان باطل ہے۔ یقیناً تمہارا ایک آقا ہے اور یقیناً ایک دن آئے گا جس میں وہ آقا ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا دے گا۔

(۵) سورت کے آغاز میں اعمال کے لحاظ سے انسانوں کی جو تین قسمیں بیان کی گئی تھیں، ان کا پھر ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہ ان کی پہلی قسم ہے جنہیں مقررین کے علاوہ سابقین بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ نیکی کے ہر کام میں آگے آگے ہوتے ہیں اور قبول ایمان میں بھی وہ دوسروں سے سبقت کرتے ہیں اور اپنی اسی خوبی کی وجہ سے وہ مقررین بارگاہ الہی قرار پاتے ہیں۔

(۶) یہ دوسری قسم ہے، عام مومنین۔ یہ بھی جنم سے بچ کر جنت میں جائیں گے، تاہم درجات میں سابقین سے کم تر ہوں گے۔ موت کے وقت فرشتے ان کو بھی سلامتی کی خوش خبری دیتے ہیں۔

لیکن اگر کوئی جھٹلانے والوں گمراہوں میں سے ہے۔^(۱) (۹۲)
تو کھولتے ہوئے گرم پانی کی ممانی ہے۔ (۹۳)
اور دوزخ میں جانا ہے۔ (۹۴)
یہ خبر سراسر حق اور قطعاً یقینی ہے۔ (۹۵)
پس تو اپنے عظیم اشان پروردگار کی تسبیح کر۔^(۲) (۹۶)

سورۃ حدید مدنی ہے اور اس میں انتیس آیتیں اور
چار رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

آسمانوں اور زمین میں جو ہے (سب) اللہ کی تسبیح کر رہے
ہیں،^(۳) وہ زبردست باحکمت ہے۔ (۱)
آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے،^(۴) وہی
زندگی دیتا ہے اور موت بھی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲)
وہی پہلے ہے اور وہی پیچھے، وہی ظاہر ہے اور وہی
مخفی،^(۵) اور وہ ہر چیز کو بخوبی جاننے والا ہے۔ (۳)

وَأَقْرَبَ كَانَ مِنَ الْمُكذِبِينَ الصَّالِحِينَ ﴿۹۲﴾
فَنَزَلْنَا مِنْ حَيْبِهِ ﴿۹۳﴾
وَتَصْلِيَةً مَجْجِيو ﴿۹۴﴾
إِنَّ هَذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ ﴿۹۵﴾
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿۹۶﴾



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سَبِّحْ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱﴾

لَهُ الْمَلِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲﴾

هُوَ الْاَكْبَرُ الْاَعْظَمُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ يُخَبِّرُ عَنْ شَيْءٍ عِلْمُهُ ﴿۳﴾

(۱) یہ تیسری قسم ہے جنہیں آغاز سورت میں أَصْحَابُ الْمَشْئِمَةِ کہا گیا تھا، بائیں ہاتھ والے یا حاملین نحوست۔ یہ اپنے کفر و نفاق کی سزایا اس کی نحوست عذاب جنم کی صورت میں بھگتیں گے۔

(۲) حدیث میں آتا ہے کہ دو کلمے اللہ کو بہت محبوب ہیں، زبان پر ہلکے اور وزن میں بھاری۔ سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللَّهِ الْعَظِيمِ (صحیح بخاری) ”آخری حدیث“ و صحیح مسلم کتاب الذکر باب فضل التہلیل والتسبیح والنداء،

(۳) یہ تسبیح زبان حال سے نہیں، بلکہ زبان مقال سے ہے اسی لیے فرمایا گیا ہے، ﴿وَلٰكِنْ لَا تَقْفُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ (سنی اسرائیل، ۳۴) ”تم انکی تسبیح نہیں سمجھ سکتے۔“ حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے کہ انکے ساتھ پہاڑ بھی تسبیح کرتے تھے۔ (الأنبیاء، ۷۹) اگر یہ تسبیح حال یا تسبیح دلالت ہوتی تو حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ اسکو خاص کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

(۴) اس لیے وہ ان میں جس طرح چاہتا ہے تعریف فرماتا ہے، اس کے سوا ان میں کسی کا حکم اور تعریف نہیں چلتا۔ یا مطلب ہے کہ بارش، نباتات اور روزیوں کے سارے خزانے اسی کی ملک میں ہیں۔

(۵) وہی اول ہے یعنی اس سے پہلے کچھ نہ تھا، وہی آخر ہے، اس کے بعد کوئی چیز نہیں ہوگی، وہی ظاہر ہے یعنی وہ سب پر غالب ہے، اس پر کوئی غالب نہیں۔ وہی باطن ہے، یعنی باطن کی ساری باتوں کو صرف وہی جانتا ہے یا لوگوں کی نظروں

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر مستوی (۱) ہو گیا۔ وہ (خوب) جانتا ہے اس چیز کو جو زمین میں جائے (۲) اور جو اس سے نکلے (۳) اور جو آسمان سے نیچے آئے (۴) اور جو کچھ چڑھ کر اس میں جائے، (۵) اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے (۶) اور جو تم کر رہے

هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلْفِي فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

اور عقلوں سے مخفی ہے۔ (فتح القدیر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو یہ دعا پڑھنے کی تاکید فرمائی تھی۔ «اللَّهُمَّ! رَبَّ السَّمَوَاتِ السَّبْعِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ، مَنزِلَ التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْفُرْقَانِ، فَالِقَ الْخَبِّ وَالنَّوَى، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْءٍ أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهِ، اللَّهُمَّ أَنْتَ الْأَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ، وَأَنْتَ الْآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ، وَأَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ، وَأَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُونَكَ شَيْءٌ، أَقْضِ عَنَّا الدَّيْنَ وَأَغْنِنَا مِنَ الْفَقْرِ» (صحیح مسلم) کتاب الذکر والدعاء باب ما یقول عند النوم وأخذ المصحح) اس دعائیں جو ادائیگی قرض کے لیے مسنون ہے، اول و آخر اور ظاہر و باطن کی تفسیر بیان فرمادی گئی ہے۔ (۱) اسی مضمون کی آیات سورہ اعراف، ۵۴، سورہ یونس، ۳، اور الم سجدہ، ۴ وغیرہا من الآیات میں گزر چکی ہیں۔ ان کے حواشی ملاحظہ فرمائیے جائیں۔

(۲) یعنی زمین میں بارش کے جو قطرے اور غلہ جات و میوہ جات کے جو بیج داخل ہوتے ہیں، انکی کیت و کیفیت کو وہ جانتا ہے۔ (۳) جو درخت، چاچے وہ پھلوں کے ہوں یا غلوں کے یا زینت و آرائش اور خوشبو والے پھولوں کے بوئے ہوں، یہ جتنے بھی اور جیسے بھی باہر نکلتے ہیں، سب اللہ کے علم میں ہیں۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَعِنْدَنَا مَفَازٌ غَيْبٍ لَّا يَعْلَمُهَا إِلَّا اللَّهُ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْيَدِ وَالْيَمِينِ مَا تَسْقُطُ مِنَ السَّمَاءِ وَلَا يَخْرُجُ فِي ظِلْمَتِ الْأَرْضِ وَلَا يَخْرُجُ وَلَا يَأْتِي إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾ (سورہ الأنعام، ۵۹) ”اور اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں تمام مخفی اشیا کے خزانے، ان کو کوئی نہیں جانتا، بجز اللہ کے، اور وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے جو کچھ خشکی میں اور جو کچھ دریاؤں میں ہیں۔ کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس کو بھی جانتا ہے، اور کوئی دانہ کوئی زمین کے تاریک حصوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک چیز گرتی ہے، مگر یہ سب کتاب مبین میں ہیں۔“

(۴) بارش، اولے، برف، تقدیر اور وہ احکام، جو فرشتے لے کر اترتے ہیں۔ (۵) فرشتے انسانوں کے جو عمل لے کر چڑھتے ہیں جس طرح حدیث میں آتا ہے کہ ”اللہ کی طرف رات کے عمل دن سے پہلے اور دن کے عمل رات سے پہلے چڑھتے ہیں۔“ (صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب إن اللہ لا ینام) (۶) یعنی تم خشکی میں ہو یا تری میں، رات ہو یا دن، گھروں میں ہو یا صحراؤں میں، ہر جگہ ہر وقت وہ اپنے علم و بصیرت کے لحاظ سے تمہارے ساتھ ہے یعنی تمہارے ایک ایک عمل کو دیکھتا ہے، تمہاری ایک ایک بات کو جانتا اور سنتا ہے۔ یہی مضمون سورہ ہود، ۳، سورہ رعد، ۱۰ اور دیگر آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔ (۴)

آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ اور تمام کام اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ (۵)

وہی رات کو دن میں لے جاتا ہے اور وہی دن کو رات میں داخل کر دیتا ہے (۱) اور سینوں کے بھیدوں کا وہ پورا عالم ہے۔ (۶) اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور اس مال میں سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تمہیں (دوسروں کا) جانشین بنایا (۲) ہے پس تم میں سے جو ایمان لائیں اور خیرات کریں انہیں بہت بڑا ثواب ملے گا۔ (۷)

تم اللہ پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ حالانکہ خود رسول تمہیں اپنے رب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے اور اگر تم مومن ہو تو وہ تو تم سے مضبوط عہد و پیمان بھی لے چکا ہے۔ (۸) (۳)

وہ (اللہ) ہی ہے جو اپنے بندے پر واضح آیتیں اتارتا ہے

لَهُ مَلِكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ①

يُولِيهِ الْكَيْلَ فِي الْبَيْتِ وَيُورِيهِ الْتَهَارَ فِي الْبَيْتِ وَهُوَ جَلِيلٌ
بَدَأَ الصُّدُورَ ②

أَمْثَلًا يَا لِلَّهِ دَرَمُولَهُ وَأَنْفَعُوا أَمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلِفِينَ فِيهَا
فَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَأَنْفَعُوا لَهُمْ أَجْرًا كَثِيرًا ③

وَمَا كُنْزُكُمْ تَوْفِيقًا يَا لِلَّهِ وَالرَّسُولَ يَعْزُمُ لَكُمْ لِيَوْمَ تَوَابٍ بَرِيئَةً
وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ ④

هُوَ الَّذِي يُتَوَلَّى عَلَى عِبْدِهِ وَإِلَيْهِ يُبْطَلُ لِيُخَوِّجَكُمْ مِنْ

(۱) یعنی تمام چیزوں کا مالک وہی ہے، وہ جس طرح چاہتا ہے، ان میں تصرف فرماتا ہے، اس کے حکم و تصرف سے کبھی رات لمبی، دن چھوٹا اور کبھی اس کے برعکس دن لمبا اور رات چھوٹی ہو جاتی ہے اور کبھی دونوں برابر۔ اسی طرح کبھی سردی، کبھی گرمی، کبھی بہار اور کبھی خزاں۔ موسموں کا تغیر و تبدل بھی اسی کے حکم و مشیت سے ہوتا ہے۔

(۲) یعنی یہ مال اس سے پہلے کسی دوسرے کے پاس تھا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے پاس بھی یہ مال نہیں رہے گا، دوسرے اسکے وارث بنیں گے، اگر تم نے اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا تو بعد میں اسکے وارث بننے والے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے تم سے زیادہ سعادت حاصل کر سکتے ہیں اور اگر وہ اسے نافرمانی میں خرچ کریں گے تو تم بھی معاونت کے جرم میں ماخوذ ہو سکتے ہو۔ (ابن کثیر) حدیث میں آتا ہے کہ ”انسان کہتا ہے، میرا مال، میرا مال، حالانکہ تیرا مال، ایک تو وہ ہے جو تو نے کھاپی کے فنا کر دیا، دوسرا وہ ہے جسے پن کر لو سیدہ کر دیا اور تیسرا وہ ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کر کے آخرت کے لیے ذخیرہ کر لیا۔ اسکے علاوہ جو کچھ ہے، وہ سب دوسرے لوگوں کے حصے میں آئے گا۔“ (صحیح مسلم، کتاب الزہد و مسند أحمد، ۴/۳۳)

(۳) ابن کثیر نے اخذ کا فاعل الرسول کو بنایا ہے اور مراد وہ بیعت لی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لیتے تھے کہ خوشی اور ناخوشی ہر حالت میں سماع و طاعت کرنی ہے اور امام ابن جریر کے نزدیک اس کا فاعل اللہ ہے اور مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں سے اس وقت لیا تھا جب انہیں آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا تھا، جو عہد الست کہلاتا ہے، جس کا ذکر سورۃ الأعراف، ۱۷۲ میں ہے۔

تاکہ وہ تمہیں اندھیروں سے نور کی طرف لے جائے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نرمی کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (۹) تمہیں کیا ہو گیا ہے جو تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے؟ دراصل آسمانوں اور زمینوں کی میراث کا مالک (تمنا) اللہ ہی ہے۔ تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے نبی سبیل اللہ دیا ہے اور قتال کیا ہے وہ (دوسروں کے) برابر نہیں،^(۱) بلکہ ان سے بہت بڑے درجے کے ہیں جنہوں نے فتح کے بعد خیراتیں دیں اور جہاد کیے۔^(۲) ہاں بھلائی کا وعدہ تو اللہ تعالیٰ کا ان سب سے ہے جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے اللہ خبردار ہے۔ (۱۰)

کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح قرض دے پھر اللہ تعالیٰ اسے اس کے لیے بڑھاتا چلا جائے اور اس کے لیے

الطَّلُوبِ إِلَى الثَّوْرِ وَإِنَّ اللَّهَ بِكُمْ لَرَوِّفٌ رَّحِيمٌ ①

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُفْعَلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَبَلَّغُوا مِيرَاثَ السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضِ لَأَيَّتَوْنِي وَمَنْكُم مَّنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلًا
أُولَئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَعُوا مِنْ بَعْدِ وَقَاتَلُوا
وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحَسَنَىٰ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ②

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضْعِفُهُ لَهُ وَهُوَ
أَجْرٌ كَرِيمٌ ③

(۱) فتح سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک فتح مکہ ہے۔ بعض نے صلح حدیبیہ کو فتح مبین کا مصداق سمجھ کر اسے مراد لیا ہے۔ بہر حال صلح حدیبیہ یا فتح مکہ سے قبل مسلمان تعداد اور قوت کے لحاظ سے بھی کم تر تھے اور مسلمانوں کی مالی حالت بھی بہت کمزور تھی۔ ان حالات میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور جہاد میں حصہ لینا، دونوں کام نہایت مشکل اور بڑے دل گردے کا کام تھا؛ جب کہ فتح مکہ کے بعد یہ صورت حال بدل گئی۔ مسلمان قوت و تعداد میں بھی بڑھتے چلے گئے اور ان کی مالی حالت بھی پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہو گئی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے دونوں ادوار کے مسلمانوں کی بابت فرمایا کہ یہ اجر میں برابر نہیں ہو سکتے۔

(۲) کیونکہ پہلوں کا اتفاق اور جہاد، دونوں کام نہایت کٹھن حالات میں ہوتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل فضل و عزم کو دیگر لوگوں کے مقابلے میں مقدم رکھنا چاہیے۔ اسی لیے اہل سنت کے نزدیک شرف و فضل میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سب سے مقدم ہیں، کیوں کہ مومن اول بھی وہی ہیں اور منفق اول اور مجاہد اول بھی وہی۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنی زندگی اور موجودگی میں نماز کے لیے آگے کیا، اور اسی بنیاد پر مومنوں (صحابہ کرام) نے انہیں استحقاق خلافت میں مقدم رکھا۔ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ.

(۳) اس میں وضاحت فرمادی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان شرف و فضل میں تفاوت تو ضرور ہے لیکن تفاوت درجات کا مطلب یہ نہیں کہ بعد میں مسلمان ہونے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایمان و اخلاق کے اعتبار سے بالکل ہی گئے گزرے تھے، جیسا کہ بعض حضرات، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، ان کے والد حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ، اور دیگر بعض ایسے ہی جلیل القدر صحابہ کے بارے میں ہرزہ سرائی یا انہیں ملقاء کہہ کر انکی تنقیص و اہانت کرتے ہیں۔ نبی ﷺ نے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں

پسندیدہ اجر ثابت ہو جائے (۱۱)

(قیامت کے) دن تو دیکھے گا کہ مومن مردوں اور عورتوں کا نور انکے آگے آگے اور انکے دائیں دوڑ رہا ہوگا (۳) آج تمہیں ان جنتوں کی خوشخبری ہے جبکہ نیچے نہیں جاری ہیں جن میں ہمیشہ کی رہائش ہے۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔ (۱۲) (۳)

اس دن منافق مرد و عورت ایمان والوں سے کہیں گے کہ ہمارا انتظار تو کرو کہ ہم بھی تمہارے نور سے کچھ روشنی حاصل کر لیں۔ (۳) جواب دیا جائے گا کہ تم اپنے پیچھے لوٹ جاؤ (۵) اور روشنی تلاش کرو۔ پھر ان کے اور ان کے درمیان (۶) ایک دیوار حاصل کر دی جائے گی جس میں دروازہ بھی ہو گا۔ اس کے اندرونی حصہ میں تو

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَى نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ
وَبِأَيْمَانِهِمْ يَبْتَغُونَ الْوَيْسُوتَ وَمِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ
فِيهَا ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۲﴾

يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ الَّذِينَ آمَنُوا أَمْ نُنظَرُ وَنَا
نَقْتَسِبُ مِنْ نُورِهِمْ قِيلَ انْجِعُوا وِرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا
فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورَةٍ فَإِنْ يَابَتْ يُابِئُتُ فِيهَا الرَّحِمَةُ وَظَاهِرًا
مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۱﴾

فرمایا ہے کہ لَا تَسْبُوا أَصْحَابِي ”میرے صحابہ پر سب و شتم نہ کرو“ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص احد پھاڑ جتنا سونا بھی اللہ کی راہ میں خرچ کر دے تو وہ میرے صحابی کے خرچ کیے ہوئے ایک مد بلکہ نصف مد کے بھی برابر نہیں۔“ (صحیح بخاری و صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة)

(۱) اللہ کو قرض حسن دینے کا مطلب ہے، اللہ کی راہ میں صدقہ و خیرات کرنا۔ یہ مال، جو انسان اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے، اللہ ہی کا دیا ہوا ہے، اس کے باوجود اسے قرض قرار دینا، یہ اللہ کا فضل و احسان ہے کہ وہ اس انفاق پر اسی طرح اجر دے گا جس طرح قرض کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔

(۲) یہ عرصہ محشر میں پل صراط میں ہو گا، یہ نور ان کے ایمان اور عمل صالح کا صلہ ہو گا، جس کی روشنی میں وہ جنت کا راستہ آسانی سے طے کر لیں گے۔ امام ابن کثیر اور امام ابن جریر وغیرہمانے وَبِأَيْمَانِهِمْ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ ان کے دائیں ہاتھوں میں ان کے اعمال نامے ہوں گے۔

(۳) یہ وہ فرشتے کہیں گے جو ان کے استقبال اور پیشوائی کے لیے وہاں ہوں گے۔

(۴) یہ منافقین کچھ فاصلے تک اہل ایمان کے ساتھ ان کی روشنی میں چلیں گے، پھر اللہ تعالیٰ منافقین پر اندھیرا مسلط فرماوے گا، اس وقت وہ اہل ایمان سے یہ کہیں گے۔

(۵) اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جا کر اسی طرح ایمان اور عمل صالح کی پونجی لے کر آؤ، جس طرح ہم لائے ہیں۔ یا استہزاکے طور پر اہل ایمان کہیں گے کہ پیچھے جہاں سے ہم یہ نور لائے تھے وہیں جا کر اسے تلاش کرو۔

(۶) یعنی مومنین اور منافقین کے درمیان۔

رحمت^(۱) ہوگی اور باہر کی طرف عذاب ہوگا۔^(۲) (۱۳)
یہ چلا کر ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے^(۳)
وہ کہیں گے کہ ہاں تھے تو سہی لیکن تم نے اپنے آپکو فتنہ میں
پھنسا رکھا^(۴) تھا اور انتظار میں ہی رہے^(۵) اور شک و شبہ کرتے
رہے^(۶) اور تمہیں تمہاری فضول تمناؤں نے دھوکے میں ہی
رکھا^(۷) یہاں تک کہ اللہ کا حکم آپنچا^(۸) اور تمہیں اللہ کے
بارے میں دھوکہ دینے والے نے دھوکے میں ہی رکھا۔^(۹) (۱۴)
الغرض، آج تم سے نہ فدیہ (اور نہ بدلہ) قبول کیا جائے
گا اور نہ کافروں سے تم (سب) کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ وہی
تمہاری رفیق ہے^(۱۰) اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ (۱۵)
کیا اب تک ایمان والوں کے لیے وقت نہیں آیا کہ انکے
دل ذکر الہی سے اور جو حق اتر چکا ہے اس سے نرم ہو

يُنَادُوهُمْ أَمْ يَكُنْ مَعَكُمْ قَالُوا بَلَىٰ وَلَكَيْلُمْ فَتَنُهُمْ أَنْفُسُهُمْ
وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّبْتُمْ الْأَمَانِي حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ
وَعَزَّوْا بِاللَّهِ الْعَزَّوَزِ ۝۷

قَالُوا مِمَّا رَدُّوهُمُ وَإِنَّا لَنَدِينُهُمْ فِدْيَةٌ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَمَّا مَوْئِدُ
النَّارِ هِيَ مَوْلَانَهُمْ وَبَيْنَ الْمُصِيدِ ۝۱۰

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعُوا لَهُمْ لِيَذُكَّرُوا وَيَأْتُرَلَ
مِنَ السَّعْيِ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ آوَوْا إِلَى الْكُتُبِ مِنْ قَبْلِ قَطَالِ

(۱) اس سے مراد جنت ہے جس میں اہل ایمان داخل ہو چکے ہوں گے۔

(۲) یہ وہ حصہ ہے جس میں جہنم ہوگی۔

(۳) یعنی دیوار حائل ہونے پر منافقین مسلمانوں سے کہیں گے کہ دنیا میں ہم تمہارے ساتھ نمازیں نہیں پڑھتے تھے،
اور جہاد وغیرہ میں حصہ نہیں لیتے تھے؟

(۴) کہ تم نے اپنے دلوں میں کفر اور نفاق چھپا رکھا تھا۔

(۵) کہ شاید مسلمان کسی گردش کا شکار ہو جائیں۔

(۶) دین کے معاملے میں، اسی لیے قرآن کو مانانہ دلائل و معجزات کو۔

(۷) جس میں تمہیں شیطان نے مبتلا کیے رکھا۔

(۸) یعنی تمہیں موت آگئی، یا مسلمان بالآخر غالب رہے اور تمہاری آرزوؤں پر پانی پھر گیا۔

(۹) یعنی اللہ کے حکم اور اس کے قانون اعمال (مصلحت دینے) کی وجہ سے تمہیں شیطان نے دھوکے میں ڈالے رکھا۔

(۱۰) مولیٰ اسے کہتے ہیں جو کسی کے کاموں کا مولیٰ یعنی ذمے دار بنے۔ گویا اب جہنم ہی اس بات کی ذمے دار ہے کہ انہیں سخت
سے سخت تر عذاب کا مزا چکھائے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہمیشہ ساتھ رہنے والے کو بھی مولیٰ کہہ لیتے ہیں، یعنی اب جہنم کی آگ ہی
ان کی ہمیشہ کی ساتھی اور رفیق ہوگی۔ بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جہنم کو بھی عقل و شعور عطا فرمائے گا پس وہ کافروں کے خلاف
غیظ و غضب کا اظہار کرے گی۔ یعنی ان کی والی بنے گی اور انہیں عذاب الیم سے دوچار کرے گی۔

عَلَيْكُمْ أَلَمْ تَدْعُوا قُلُوبَهُمْ وَكَيْفَ مَنَعَهُمْ فَيَقُولُونَ ﴿۱۶﴾

جائیں^(۱) اور انکی طرح نہ ہو جائیں جنہیں ان سے پہلے کتاب دی گئی تھی^(۲) پھر جب ان پر ایک زمانہ دراز گزر گیا تو انکے دل سخت ہو گئے^(۳) اور ان میں بہت سے فاسق ہیں۔^(۴) (۱۶)

یقین مانو کہ اللہ ہی زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔ ہم نے تو تمہارے لیے اپنی آیتیں بیان کر دیں تاکہ تم سمجھو۔ (۱۷)

إِنَّمَا نَحْنُ اللَّهُ يَحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّكُمْ لَأَنَّ الْأَيَّاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۱۷﴾

بیشک صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جو اللہ کو خلوص کے ساتھ قرض دے رہے ہیں۔ انکے لیے یہ بڑھایا جائے گا^(۵) اور ان کے لیے پسندیدہ اجر و ثواب ہے۔^(۶) (۱۸)

إِنَّ الْمُصَدِّقِينَ وَالْمُصَدِّقَاتِ وَأَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا لِيُضْعِفَ لَهُمْ أُولَئِكَ أَجْرَهُمْ ﴿۱۸﴾

اللہ اور اس کے رسول پر جو ایمان رکھتے ہیں وہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق^(۷) اور شہید ہیں ان کے

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ﴿۱۹﴾
وَالشَّهَدَاءُ أُولَئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ وَالَّذِينَ كَفَرُوا

(۱) خطاب اہل ایمان کو ہے۔ اور مطلب ان کو اللہ کی یاد کی طرف مزید متوجہ اور قرآن کریم سے کسب ہدایت کی تلقین کرنا ہے۔ خشوع کے معنی ہیں، دلوں کا نرم ہو کر اللہ کی طرف جھک جانا، حق سے مراد قرآن کریم ہے۔

(۲) جیسے یہود و نصاریٰ ہیں۔ یعنی تم ان کی طرح نہ ہو جانا۔

(۳) چنانچہ انہوں نے اللہ کی کتاب میں تحریف اور تبدیلی کر دی، اس کے عوض دنیا کا شہنشاہ قلیل حاصل کرنے کو انہوں نے شعار بنا لیا، اس کے احکام کو پس پشت ڈال دیا، اللہ کے دین میں لوگوں کی تقلید اختیار کر لی اور ان کو اپنا رب بنا لیا، مسلمانوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تم یہ کام مت کرو ورنہ تمہارے دل بھی سخت ہو جائیں گے اور پھر یہی کام جو ان پر لعنت الہی کا سبب بنے، تمہیں اچھے لگیں گے۔

(۴) یعنی ان کے دل فاسد اور اعمال باطل ہیں۔ دوسرے مقام پر اللہ نے فرمایا ﴿يَمَّا أَنْفَضَهُمْ سَنِيَةً لَعَلَّهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِمْ وَسَبَّوْا حَقًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ﴾ (المائدہ: ۱۳)

(۵) یعنی ایک کے بدلے میں کم از کم دس گنا اور اس سے زیادہ سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ تک۔ یہ زیادتی اخلاص نیت، حاجت و ضرورت اور مکان و زمان کی بنیاد پر ہو سکتی ہے۔ جیسے پہلے گزرا کہ جن لوگوں نے فتح مکہ سے قبل خرچ کیا، وہ اجر و ثواب میں ان سے زیادہ ہوں گے، جنہوں نے اس کے بعد خرچ کیا۔

(۶) یعنی جنت اور اسکی نعمتیں، بلکہ کبھی زوال اور فنا نہیں۔ آیت میں مُصَدِّقِينَ اصل میں مُصَدِّقِينَ ہے۔ تاکو صادمیں مدغم کر دیا گیا۔

(۷) بعض مفسرین نے یہاں وقف کیا ہے۔ اور آگے وَالشَّهَدَاءُ کو الگ جملہ قرار دیا ہے صدقیت کمال ایمان اور کمال صدق و

وَكَذَّبُوا بِالَّذِينَ أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ①

لیے ان کا اجر اور ان کا نور ہے، اور جو لوگ کفر کرتے ہیں اور ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں وہ جہنمی ہیں۔ (۱۹)

خوب جان رکھو کہ دنیا کی زندگی صرف کھیل تماشازینت اور آپس میں فخر (وغور) اور مال و اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے آپ کو زیادہ بتلانا ہے، جیسے بارش اور اس کی پیداوار کسانوں^(۱) کو اچھی معلوم ہوتی ہے پھر جب وہ خشک ہو جاتی ہے تو زرد رنگ میں اس کو تم دیکھتے ہو پھر وہ بالکل چورا چورا ہو جاتی ہے^(۲) اور آخرت میں سخت عذاب^(۳) اور اللہ کی مغفرت اور رضامندی ہے^(۴) اور دنیا کی زندگی بجز دھوکے کے سامان کے اور

إِعْلَمُوا أَنَّهَا الْعِيشَةُ الدُّنْيَا الْعِيبُ وَالْمَوْتُ يَنْبَغِي وَيُنْفَخُونَ بُيُوتَهُمْ
وَنُكَّاتٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ
بِنَبَاتِهِ ثُمَّ هِيَ جُحُومٌ مُمِصَةٌ أَكْثَرُهُمْ حَطًّا مَا فِي الدَّخْرِ
عَذَابٌ شَدِيدٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا ② مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ③ وَمَا الْحَيَاةُ
الدُّنْيَا إِلَّا لَمْتَمَاعٌ الْغُرُورِ ④

صفا کا نام ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ”آدمی ہمیشہ بچ بولتا ہے اور بچ ہی کی تلاش اور کوشش میں رہتا ہے۔ حتیٰ کہ اللہ کے ہاں اسے صدیق لکھ دیا جاتا ہے (متفق علیہ۔ مشکوٰۃ: کتاب الآداب، باب حفظ اللسان) ایک اور حدیث میں صدیقین کا وہ مقام بیان کیا گیا ہے جو جنت میں انہیں حاصل ہو گا۔ فرمایا ”جنتی“ اپنے سے اوپر کے بالا خانے والوں کو اس طرح دیکھیں گے، جیسے چمکتے ہوئے مشرقی یا مغربی ستارے کو تم آسمان کے کنارے پر دیکھتے ہو، یعنی انکے درمیان درجات کا تافرق ہو گا۔ صحابہ نے پوچھا، یہ انبیاء کے درجات ہوں گے جن کو دوسرے حاصل نہیں کر سکیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ”ہاں، تم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ پر ایمان لائے اور پیغمبروں کی تصدیق کی۔ (صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة وأهلها مخلوقة) یعنی ایمان اور تصدیق کا حق ادا کیا۔ (فتح الباری)

(۱) کُفَّارٌ، کسانوں کو کہا گیا ہے، اس لیے کہ اس کے لغوی معنی ہیں چھپانے والے۔ کافروں کے دلوں میں اللہ کا اور آخرت کا انکار چھپا ہوتا ہے، اس لیے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ اور کاشت کاروں کے لیے یہ لفظ اس لیے بولا گیا ہے کہ وہ بھی زمین میں بچ بولتے یعنی انہیں چھپا دیتے ہیں۔

(۲) یہاں دنیا کی زندگی کو سرعت زوال میں بھیتی سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح بھیتی جب شاداب ہوتی ہے تو بڑی بھلی لگتی ہے، کاشت کار اسے دیکھ کر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ لیکن وہ بہت ہی جلد خشک اور زرد ہو کر چورا چورا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دنیا کی زیب و زینت، مال اور اولاد اور دیگر چیزیں انسان کا دل بھاتی ہیں۔ لیکن یہ زندگی چند روزہ ہی ہے، اس کو بھی ثبات و قرار نہیں۔

(۳) یعنی اہل کفر و عصیان کے لیے، جو دنیا کے کھیل کود میں ہی مصروف رہے اور اسی کو انہوں نے حاصل زندگی سمجھا۔

(۴) یعنی اہل ایمان و طاعت کے لیے، جنہوں نے دنیا کو ہی سب کچھ نہیں سمجھا، بلکہ اسے عارضی، فانی اور دارالامتحان

کچھ بھی تو نہیں۔^(۱) (۲۰)

(آؤ) دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف^(۲) اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین کی وسعت کے برابر ہے^(۳) یہ ان کے لیے بنائی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دے^(۴) اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔^(۵) (۲۱) نہ کوئی مصیبت دنیا میں آتی ہے^(۶) نہ (خاص) تمہاری جانوں میں،^(۷) گمراہی سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے،^(۸) یہ (کام) اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے۔ (۲۲)

تاکہ تم اپنے سے فوت شدہ کسی چیز پر رنجیدہ نہ ہو جایا کرو

سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَحِجَّةٍ حُرَّةً ۚ أَعْرَضُوا سَائِبَاتٍ
الْأَرْضِ ۚ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ
يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۲۰﴾

مَا صَابِقِينَ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ ۚ الْآيَةُ كِتَابٍ مِّن
قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿۲۱﴾

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِينَ

سمجھتے ہوئے اللہ کی ہدایات کے مطابق اس میں زندگی گزاری۔

- (۱) لیکن اس کے لیے جو اس کے دھوکے میں مبتلا رہا اور آخرت کے لیے کچھ نہیں کیا۔ لیکن جس نے اس حیات دنیا کو طلب آخرت کے لیے استعمال کیا تو اس کے لیے یہی دنیا، اس سے بہتر زندگی حاصل کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔
- (۲) یعنی اعمال صالحہ اور توبہ النصوح کی طرف کیونکہ یہی چیزیں مغفرت رب کا ذریعہ ہیں۔
- (۳) اور جس کا عرض اتنا ہو، اس کا طول کتنا ہو گا؟ کیونکہ طول، عرض سے زیادہ ہی ہوتا ہے۔
- (۴) ظاہر ہے اس کی چاہت اسی کے لیے ہوتی ہے جو کفر و معصیت سے توبہ کر کے ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کر لیتا ہے، اسی لیے وہ ایسے لوگوں کو ایمان اور اعمال صالحہ کی توفیق سے بھی نوازدیتا ہے۔
- (۵) وہ جس پر چاہتا ہے، اپنا فضل فرماتا ہے، جس کو وہ کچھ دے، کوئی روک نہیں سکتا اور جس سے روک لے، اسے کوئی دے نہیں سکتا، تمام خیر اسی کے ہاتھ میں ہے، وہی کریم مطلق اور جواد حقیقی ہے جس کے ہاں بخل کا تصور نہیں۔
- (۶) مثلاً قحط، سیلاب اور دیگر آفات ارضی و سماوی۔
- (۷) مثلاً بیماریاں، تعب و تکان اور تنگ دستی وغیرہ۔
- (۸) یعنی اللہ نے اپنے علم کے مطابق تمام مخلوقات کی پیدائش سے پہلے ہی سب باتیں لکھ دیں ہیں۔ جیسے حدیث میں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قَدَّرَ اللَّهُ الْمَقَادِيرَ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ (صحیح مسلم، کتاب القدر، باب حجج آدم و موسیٰ علیہما السلام) ”اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال قبل ہی ساری تقدیریں لکھ دی تھیں۔“

اور نہ عطا کردہ چیز پر اترا جاؤ،^(۱) اور اترانے والے شیخی خوروں کو اللہ پسند نہیں فرماتا۔ (۲۳)

جو (خود بھی) بخل کریں اور دوسروں کو (بھی) بخل کی تعلیم دیں۔ سنو! جو بھی منہ پھیرے^(۲) اللہ بے نیاز اور سزاوار حمد و ثنا ہے۔ (۲۴)

یقیناً ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (ترازو) نازل فرمایا^(۳) تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔ اور ہم نے لوہے کو اتارا^(۴) جس میں سخت ہیبت و قوت ہے^(۵) اور لوگوں کے لیے اور بھی (ہمت سے) فائدے ہیں^(۶) اور اس لیے بھی کہ اللہ جان لے کہ اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد بے دیکھے کون کرتا

مُخْتَلِفٌ فُجُورٌ ﴿۲۳﴾

لَا الَّذِينَ يَخْلَوْنَ وَيَتَأَمَّنُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمَنْ يَتَّخِذْ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَفِيُّ الْعَمِيدُ ﴿۲۴﴾

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَتَّقِسُ وَرَسُولُهُ يَبَيِّنُ الْبَيِّنَاتِ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَزِيزُ ﴿۲۵﴾

(۱) یہاں جس حزن اور فرح سے روکا گیا ہے، وہ وہ غم اور خوشی ہے جو انسان کو ناجائز کاموں تک پہنچا دیتی ہے، ورنہ تکلیف پر رنجیدہ اور راحت پر خوش ہونا، یہ ایک فطری عمل ہے۔ لیکن مومن تکلیف پر صبر کرتا ہے کہ اللہ کی مشیت اور تقدیر ہے۔ جزع فزع کرنے سے اس میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ اور راحت پر، اترا تا نہیں ہے، اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ کہ یہ صرف اس کی اپنی سچی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا فضل و کرم اور اس کا احسان ہے۔

(۲) یعنی اتفاق فی سبیل اللہ سے، کیونکہ اصل بخل یہی ہے۔

(۳) میزان سے مراد انصاف ہے اور مطلب ہے کہ ہم نے لوگوں کو انصاف کرنے کا حکم دیا ہے۔ بعض نے اس کا ترجمہ ترازو کیا ہے، ترازو کے اتارنے کا مطلب ہے، ہم نے ترازو کی طرف لوگوں کی رہنمائی کی کہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو قول کر پورا پورا حق دو۔

(۴) یہاں بھی اتارا پیدا کرنے اور اس کی صنعت سکھانے کے معنی میں ہے۔ لوہے سے بے شمار چیزیں بنتی ہیں، یہ سب اللہ کے اس الہام و ارشاد کا نتیجہ ہے جو اس نے انسان کو کیا ہے۔

(۵) یعنی لوہے سے جنگی ہتھیار بنتے ہیں۔ جیسے تلوار، نیزہ، بندوق اور اب ایٹم، توپیں، جنگی جہاز، آبدوزیں، گنیں، راکٹ اور ٹینک وغیرہ بے شمار چیزیں۔ جن سے دشمن پر وار بھی کیا جاتا ہے اور اپنا دفاع بھی۔

(۶) یعنی جنگی ہتھیاروں کے علاوہ لوہے سے اور بھی ہمت سی چیزیں بنتی ہیں، جو گھروں میں اور مختلف صنعتوں میں کام میں آتی ہیں، جیسے چھریاں، چاقو، قینچی، ہتھوڑا، سوئی، زراعت، نجارت، (بڑھئی) اور عمارت وغیرہ کا سامان اور چھوٹی بڑی بے شمار مشینیں اور ساز و سامان۔

ہے،^(۱) بیشک اللہ قوت والا اور زبردست ہے۔^(۲) (۲۵)
بیشک ہم نے نوح اور ابراہیم (علیہما السلام) کو پیغمبر بنا کر
بھیجا اور ہم نے ان دونوں کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب
جاری رکھی تو ان میں سے کچھ تو راہ یافتہ ہوئے اور ان
میں سے اکثر بہت نافرمان رہے۔ (۲۶)

ان کے بعد پھر بھی ہم اپنے رسولوں کو پے در پے بھیجتے رہے
اور ان کے بعد عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کو بھیجا اور انہیں
انجیل عطا فرمائی اور ان کے ماننے والوں کے دلوں میں
شفقت اور رحم پیدا کر دیا^(۳) ہاں رہبانیت (ترک دنیا) تو ان
لوگوں نے از خود ایجاد کر لی تھی^(۴) ہم نے ان پر اسے واجب

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ
وَالْكِتَابَ فَمِنْهُمْ مُهْتَدٍ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَسِقُونَ ﴿۲۶﴾

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ
الْإِنْجِيلَ وَجَعَلْنَا قُلُوبَ الَّذِينَ كَفَرُوا قَٰلِقَةً ذُرِّيَّتَهُ
وَرَهْبَانِيَّةً لِأَيُّدِهِمْ أَلْبِيسُوا عَلَيْهِمَ إِلَّا ابْنِيَّعَادَ وَرِضْوَانَ
اللَّهِ فَمَا ذَعَبُوا حَقًّا رِعَايَتَهُمَا فَإِنَّمَا الَّذِينَ آمَنُوا وَنَهَمُوا

(۱) یہ لِقَوْمٍ پر عطف ہے۔ یعنی رسولوں کو اس لیے بھی بھیجا ہے تاکہ وہ جان لے کہ کون اس کے رسولوں پر اللہ کو
دیکھے بغیر ایمان لاتا اور ان کی مدد کرتا ہے۔

(۲) اس کو اس بات کی حاجت نہیں ہے کہ لوگ اس کے دین کی اور اس کے رسولوں کی مدد کریں بلکہ وہ چاہے تو اس
کے بغیر ہی ان کو غالب فرمادے۔ لوگوں کو تو ان کی مدد کرنے کا حکم ان کی اپنی ہی بھلائی کے لیے دیا گیا ہے، تاکہ اس طرح
وہ اپنے اللہ کو راضی کر کے اس کی مغفرت و رحمت کے مستحق بن جائیں۔

(۳) رَافَةً کے معنی نرمی اور رحمت کے معنی شفقت کے ہیں۔ پیروکاروں سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے
حواری ہیں۔ یعنی ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے پیار اور محبت کے جذبات پیدا کر دیئے۔ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم
ایک دوسرے کے لیے رحیم و شفیق تھے۔ رَحْمَاءَ بَيْنَهُمْ۔ یہود، آپس میں اس طرح ایک دوسرے کے ہمدرد اور غم
خوار نہیں، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار تھے۔

(۴) رَهْبَانِيَّةً رَهْبٌ (خوف) سے ہے یا رَهْبَانٌ (درویش) کی طرف منسوب ہے اس صورت میں رے پر پیش رہے گا یا اسے
رہنہ کی طرف منسوب مانا جائے تو اس صورت میں رے پر زبر ہوگا۔ رہبانیت کا مفہوم ترک دنیا ہے یعنی دنیا اور علاق دنیا
سے منقطع ہو کر کسی جنگل، صحرا میں جا کر اللہ کی عبادت کرنا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ایسے
بادشاہ ہوئے جنہوں نے تو رات اور انجیل میں تبدیلی کر دی، جسے ایک جماعت نے قبول نہیں کیا۔ انہوں نے بادشاہوں کے ڈر
سے پہاڑوں اور غاروں میں پناہ حاصل کر لی۔ یہ اس کا آغاز تھا، جسکی بنیاد اضطراب پر تھی۔ لیکن اگلے بعد آنے والے بہت سے
لوگوں نے اپنے بزرگوں کی اندھی تقلید میں اس سرمدری کو عبادت کا ایک طریقہ بنا لیا اور اپنے آپ کو گرجاؤں اور معبدوں
میں محبوس کر لیا اور اسکے لیے علاق دنیا سے انقطاع کو ضروری قرار دے لیا۔ اسی کو اللہ نے ابتداع (خود گھڑنے) سے تعبیر فرمایا ہے۔

أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ﴿۳۵﴾

نہ کیا^(۱) تھا سوائے اللہ کی رضا جوئی کے۔^(۲) سو انہوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی،^(۳) پھر بھی ہم نے ان میں سے جو ایمان لائے تھے انہیں ان کا اجر دیا^(۴) اور ان میں زیادہ تر لوگ نافرمان ہیں۔ (۲۷)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرتے رہا کرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اللہ تمہیں اپنی رحمت کا دوہرا حصہ دے گا^(۵) اور تمہیں نور دے گا جس کی روشنی میں تم چلو پھرو گے اور تمہارے گناہ بھی معاف فرما دے گا، اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۲۸)

یہ اس لیے کہ اہل کتاب^(۶) جان لیں کہ اللہ کے فضل کے کسی حصے پر بھی انہیں اختیار نہیں اور یہ کہ (سارا) فضل اللہ ہی کے ہاتھ ہے وہ جسے چاہے دے، اور اللہ ہے ہی بڑے فضل والا۔ (۲۹)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَالْمُؤْمِنِينَ وَذُكِّرْكُمْ
مَعْلَمِينَ مِنْ رَبِّكُمْ وَيَعْمَلْ لَكُمْ نُورًا تمشونَ بِهِ وَيُغْفِرْ لَكُمْ
وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۳۵﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَالْمُؤْمِنِينَ وَذُكِّرْكُمْ
مَعْلَمِينَ مِنْ رَبِّكُمْ وَيَعْمَلْ لَكُمْ نُورًا تمشونَ بِهِ وَيُغْفِرْ لَكُمْ
وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۳۵﴾

(۱) یہ بچھلی بات ہی کی تاکید ہے کہ یہ رہبانیت ان کی اپنی ایجاد تھی، اللہ نے اس کا حکم نہیں دیا تھا۔

(۲) یعنی ہم نے تو ان پر صرف اپنی رضا جوئی فرض کی تھی۔ دوسرا ترجمہ اس کا ہے کہ انہوں نے یہ کام اللہ کی رضا تلاش کرنے کے لیے کیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمادی کہ اللہ کی رضا، دین میں اپنی طرف سے بدعات ایجاد کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتی، چاہے وہ کتنی ہی خوش نما ہو۔ اللہ کی رضا تو اس کی اطاعت سے ہی حاصل ہوگی۔

(۳) یعنی گو انہوں نے مقصد اللہ کی رضا جوئی بتلایا، لیکن اس کی انہوں نے پوری رعایت نہیں کی، ورنہ وہ ابتداء (بدعت ایجاد کرنے) کے بجائے اتباع کا راستہ اختیار کرتے۔

(۴) یہ وہ لوگ ہیں جو دین عیسوی پر قائم رہے تھے۔

(۵) یہ دوگانہ اجر اہل ایمان کو ملے گا جو نبی ﷺ سے قبل پہلے کسی رسول پر ایمان رکھتے تھے پھر نبی ﷺ پر بھی ایمان لے آئے جیسا کہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ صحیح البخاری، کتاب العلم، باب تعلیم الرجل أمته وأهله وصحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب وجوب الإیمان برسالة نبینا، ایک دوسری تفسیر کے مطابق جب اہل کتاب نے اس بات پر فخر کا اظہار کیا کہ انہیں دوگانہ اجر ملے گا، تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے حق میں یہ آیت نازل فرمائی۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے، تفسیر ابن کثیر)

(۶) لئلا میں لازماً نہ دے اور معنی ہیں لیتعلم اهل الكتاب انهم لا يقدرُونَ على أن يتألوا شيئاً من فضل الله (فتح القدیر)

سورۃ مجادلہ مدنی ہے اور اس میں بائیس آیتیں اور تین رکوع ہیں۔



شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات سنی جو تجھ سے اپنے شوہر کے بارے میں تکرار کر رہی تھی اور اللہ کے آگے شکایت کر رہی تھی؛ اللہ تعالیٰ تم دونوں کے سوال و جواب سن رہا تھا،^(۱) بیشک اللہ تعالیٰ سننے دیکھنے والا ہے۔ (۱)

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا وَتَشْتَكِي اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ عَمَّا رُوٰى مَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ ۝۱

تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں (یعنی انہیں ماں کہہ بیٹھتے ہیں) وہ دراصل ان کی مائیں نہیں بن جاتیں؛ ان کی مائیں تو وہی ہیں جن کے بطن سے وہ پیدا ہوئے،^(۲) یقیناً یہ لوگ ایک نامعقول اور جھوٹی بات کہتے

الَّذِيْنَ يُظَاهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِنْ اَسْوَءِ مَا هُمْ بِاَعْلَمُوْنَ اِنَّ اَعْتَابَهُمْ لَنْ كَثُرَةً ۝۱
اِلَّا اِلَىٰ وَاٰلِهِمْ لَيَقُولُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُورًا ۝۲
اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۲

(۱) یہ اشارہ ہے حضرت خولہ بنت مالک بن ثعلبہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ کی طرف؛ جن کے خاوند حضرت اوس بن صامت رضی اللہ عنہ نے ان سے ظہار کر لیا تھا؛ ظہار کا مطلب ہے؛ بیوی کو یہ کہہ دینا اَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ اُمِّي (تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے) زمانہ جاہلیت میں ظہار کو طلاق سمجھا جاتا تھا۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا سخت پریشان ہوئیں اس وقت تک اس کی بابت کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ اس لیے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کچھ توقف فرمایا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث و تکرار کرتی رہیں۔ جس پر یہ آیات نازل ہوئیں؛ جن میں مسئلہ ظہار اور اس کا حکم و کفارہ بیان فرما دیا گیا۔ (ابوداؤد؛ کتاب الطلاق؛ باب فی الظہار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح لوگوں کی باتیں سننے والا ہے کہ یہ عورت گھر کے ایک کونے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مجادلہ کرتی اور اپنے خاوند کی شکایت کرتی رہی؛ مگر میں اس کی باتیں نہیں سنتی تھی۔ لیکن اللہ نے آسمانوں پر سے اس کی بات سن لی؛ (سنن ابن ماجہ؛ المقدمة؛ باب فیما اُنکرت الجہمیة۔ صحیح بخاری میں بھی تعلقاً اس کا مختصر ذکر ہے۔

کتاب التوحید؛ باب قول اللہ تعالیٰ وکان اللہ سمیعاً بصیراً)

(۲) یہ ظہار کا حکم بیان فرمایا کہ تمہارے کہہ دینے سے تمہاری بیوی تمہاری ماں نہیں بن جائے گی۔ اگر ماں کے بجائے کوئی شخص اپنی بیٹی یا بن وغیرہ کی پیٹھ کی طرح اپنی بیوی کو کہہ دے تو یہ ظہار ہے یا نہیں؟ امام مالک اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ سے

ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔^(۱) (۲)
 جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اپنی کسی ہوئی بات
 سے رجوع کر لیں^(۲) تو ان کے ذمہ آپس میں ایک
 دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے^(۳) ایک غلام آزاد کرنا
 ہے، اس کے ذریعہ تم نصیحت کیے جاتے ہو۔ اور اللہ
 تعالیٰ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔ (۳)

ہاں جو شخص نہ پائے اس کے ذمہ دو مہینوں کے لگاتار
 روزے ہیں اس سے پہلے کہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں
 اور جس شخص کو یہ طاقت بھی نہ ہو اس پر ساٹھ مسکینوں کا
 کھانا کھلانا ہے۔ یہ اس لیے کہ تم اللہ کی اور اس کے رسول
 کی حکم برداری کرو، یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اور

وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا
 فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَآتُوا ذَلِكَ يُوعَظُونَ بِهِ وَاللَّهُ
 بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۲﴾

مَنْ كَرِهَ جِدَافَ ذِمَّتِهِمْ مِنْ غَيْرِ مَقَالَةٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَآتُوا
 فَمِنْ كَرِهَ جِدَافَ ذِمَّتِهِمْ مِنْ غَيْرِ مَقَالَةٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَآتُوا
 وَرَسُولِهِ ذَلِكَ حُدُودُ اللَّهِ وَاللَّهُ يُلَقِّنُ بِنُحْيٍ عَذَابَ الْبَعْرِ ﴿۳﴾

بھی ظہار قرار دیتے ہیں؛ جب کہ دوسرے علماء سے ظہار تسلیم نہیں کرتے۔ (پہلا قول ہی صحیح معلوم ہوتا ہے) اسی طرح اس
 میں بھی اختلاف ہے کہ پیٹھ کی جگہ اگر کوئی یہ کہے کہ تو میری ماں کی طرح ہے، پیٹھ کا نام نہ لے۔ تو علمائے کتب ہیں کہ اگر ظہار کی
 نیت سے وہ مذکورہ الفاظ کہے گا تو ظہار ہو گا، بصورت دیگر نہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر ایسے عضو کے ساتھ
 تشبیہ دے گا جس کا دیکھنا جائز ہے تو یہ ظہار نہیں ہو گا، امام شافعی رحمہ اللہ بھی کہتے ہیں کہ ظہار صرف پیٹھ کی طرح کہنے سے ہی
 ہو گا۔ (فتح القدیر)

(۱) اسی لیے اس نے کفارے کو اس قول منکر اور جھوٹ کی معافی کا ذریعہ بنا دیا۔

(۲) اب اس حکم کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔ رجوع کا مطلب ہے، بیوی سے ہم بستری کرنا چاہیں۔

(۳) یعنی ہم بستری سے پہلے وہ کفارہ ادا کریں۔ ۱- ایک غلام آزاد کرنا۔ ۲- اس کی طاقت نہ ہو تو پے در پے بلاناغہ دو مہینے
 کے روزے۔ اگر درمیان میں بغیر عذر شرعی کے روزہ چھوڑ دیا تو نئے سرے سے پورے دو مہینے کے روزے رکھنے پڑیں
 گے۔ عذر شرعی سے مراد بیماری یا سفر ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بیماری وغیرہ کی وجہ سے بھی روزہ چھوڑے
 گا تو نئے سرے سے روزے رکھنے ہوں گے۔ ۳- اگر پے در پے دو مہینے کے روزے رکھنے کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ
 مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہر مسکین کو دو مد (نصف صاع یعنی سوا کلو) اور بعض کہتے ہیں ایک مد کافی ہے۔
 لیکن قرآن کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانا اس طرح کھلایا جائے کہ وہ شکم سیر ہو جائیں یا اتنی ہی مقدار میں ان کو
 کھانا دیا جائے۔ ایک مرتبہ ہی سب کو کھلانا بھی ضروری نہیں بلکہ متعدد اقساط میں یہ تعداد پوری کی جا سکتی ہے۔ (فتح
 القدیر) تاہم یہ ضروری ہے جب تک یہ تعداد پوری نہ ہو جائے، اس وقت تک بیوی سے ہم بستری جائز نہیں۔

کفار ہی کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (۳)

بیشک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ ذلیل کیے جائیں گے جیسے ان سے پہلے کے لوگ ذلیل کیے گئے تھے، (۴) اور بیشک ہم واضح آیتیں اتار چکے ہیں اور کافروں کے لیے تو ذلت والاعذاب ہے۔ (۵)

جس دن اللہ تعالیٰ ان سب کو اٹھائے گا پھر انہیں ان کے کیے ہوئے عمل سے آگاہ کرے گا، جسے اللہ نے شمار رکھا ہے اور جسے یہ بھول گئے تھے، (۶) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے۔ (۷)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ آسمانوں کی اور زمین کی ہر چیز سے واقف ہے۔ تین آدمیوں کی سرگوشی نہیں ہوتی مگر اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ کی مگر ان کا چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم کی اور نہ زیادہ کی مگر وہ ساتھ ہی ہوتا ہے (۸) جہاں بھی وہ ہوں، (۹) پھر قیامت کے دن

إِنَّ الَّذِينَ يُعَادُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَيُؤْتُوا مَأْزِمَاتٍ الَّذِينَ مِنَ قِبَلِهِمْ وَقَدْ آتَيْنَا آيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ ۝

يَوْمَ يَرَى الْمُؤْمِنُ اللَّهُ جَبِينًا فَأَقْبَرَتْهُمْ بِمَا عَمِلُوا أَحْصَاهُ اللَّهُ وَنَسُوا اللَّهَ وَاللَّهُ عَظِيمٌ ۝

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَتْلُو مَآئِي السَّمَوَاتِ وَمَآئِي الْأَرْضِ مَا يَكُونُ مِنْهُ نَجْوَى لِمَنْ أَتَاهُمْ إِلَّا هُمْ يُعْلَمُونَ وَلَا أَذَى مِنْ ذَلِكَ وَلَا تَأْخُذُ الْأَعْيُنُ مِنْ رُبِّهِمْ وَلَا تَحْزَنُ الْيَدَانُ مِنْهُمَا وَلَا يَمُوتُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ اللَّهَ لَبُظِيمٌ ۝

(۱) کُتِبُوا، ماضی مجہول کا صیغہ ہے، مستقبل میں ہونے والے واقعے کو ماضی سے تعبیر کر کے واضح کر دیا کہ اس کا وقوع اور تحقق اسی طرح یقینی ہے جیسے کہ وہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ یہ مشرکین مکہ بدر والے دن ذلیل کیے گئے، کچھ مارے گئے، کچھ قیدی ہو گئے اور مسلمان ان پر غالب رہے۔ مسلمانوں کا غلبہ بھی ان کے حق میں نہایت ذلت تھا۔

(۲) اس سے مراد گزشتہ امتیں ہیں جو اسی مخالفت کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔

(۳) یہ ذہنوں میں پیدا ہونے والے اشکال کا جواب ہے کہ گناہوں کی اتنی کثرت اور ان کا اتنا تنوع ہے کہ ان کا احصا بظاہر ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہارے لیے یقیناً ناممکن ہے بلکہ تمہیں تو خود اپنے کیے ہوئے سارے کام بھی یاد نہیں ہوں گے لیکن اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں، اس نے ایک ایک کا عمل محفوظ کیا ہوا ہے۔

(۴) اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ آگے اس کی مزید تاکید ہے کہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

(۵) یعنی مذکورہ تعداد کا خصوصی طور پر ذکر اس لیے نہیں ہے کہ وہ اس سے کم یا اس سے زیادہ تعداد کے درمیان ہونے والی گفتگو سے بے خبر رہتا ہے بلکہ یہ تعداد بطور مثال ہے، مقصد یہ بتلانا ہے کہ تعداد تھوڑی ہو یا زیادہ۔ وہ ہر ایک کے ساتھ ہے اور ہر ظاہر اور پوشیدہ بات کو جانتا ہے۔

(۶) خلوت میں ہوں یا جلوت میں، شہروں میں ہوں یا جنگل صحراؤں میں، آبادیوں میں ہوں یا بے آباد پہاڑوں بیابانوں

انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کرے گا^(۱) بیشک اللہ تعالیٰ

ہر چیز سے واقف ہے۔ (۷)

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا؟ جنہیں کانا چھوسی سے روک دیا گیا تھا وہ پھر بھی اس روکے ہوئے کام کو دوبارہ کرتے ہیں^(۲) اور آپس میں گناہ کی اور ظلم و زیادتی کی اور نافرمانی پیغمبر کی سرگوشیاں کرتے ہیں^(۳) اور جب تیرے پاس آتے ہیں تو تجھے ان لفظوں میں سلام کرتے ہیں جن لفظوں میں اللہ تعالیٰ نے نہیں کہا^(۴) اور اپنے دل میں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر جو ہم کہتے ہیں سزا کیوں نہیں دیتا،^(۵) ان کے لیے جہنم کافی (سزا) ہے

اللَّهُ تَرَىٰ أَلْبَانًا مِنَ الْبَيْتِ الْعَجْوِي لَمْ يُعْوَدُونَ لِمَا لَهُمْ عِنْدَهُ
وَيَسْتَعِجُونَ بِالْآثِمِ وَالْمُذْذِرِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَإِذْ أُنزِلَتْ
حُجُورَهُمْ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ أَكَلَّا لَعْنَتَنَا
اللَّهُ بِمَا نَفَرْنَا مِنْهُمْ حُبًّا وَهُمْ يَسْتَوُونَ لَيْسَ الْمُبْدِي ۝

اور غاروں میں، جہاں بھی وہ ہوں، اس سے چھپے نہیں رہ سکتے۔

(۱) یعنی اس کے مطابق ہر ایک کو جزا دے گا۔ نیک کو اس کی نیکیوں کی جزا اور بد کو اس کی بدیوں کی سزا۔

(۲) اس سے مدینے کے یہودی اور منافقین مراد ہیں۔ جب مسلمان ان کے پاس سے گزرتے تو یہ باہم سر جوڑ کر اس طرح سرگوشیاں اور کانا چھوسی کرتے کہ مسلمان یہ سمجھتے کہ شاید ان کے خلاف یہ کوئی سازش کر رہے ہیں، یا مسلمانوں کے کسی لشکر پر دشمن نے حملہ کر کے انہیں نقصان پہنچایا ہے، جس کی خبر ان کے پاس پہنچ گئی ہے۔ مسلمان ان چیزوں سے خوف زدہ ہو جاتے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سرگوشیاں کرنے سے منع فرمادیا۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد انہوں نے پھر یہ مذموم سلسلہ شروع کر دیا۔ آیت میں ان کے اسی کردار کو بیان کیا جا رہا ہے۔

(۳) یعنی ان کی سرگوشیاں نیکی اور تقویٰ کی باتوں میں نہیں ہوتیں، بلکہ گناہ، زیادتی اور معصیت رسول ﷺ پر مبنی ہوتی ہیں مثلاً کسی کی غیبت، الزام تراشی، بے ہودہ گوئی، ایک دوسرے کو رسول ﷺ کی نافرمانی پر اکسانا وغیرہ۔

(۴) یعنی اللہ نے تو سلام کا طریقہ یہ بتلایا کہ تَمَّ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللَّهِ، کہو لیکن یہ یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اس کے بجائے کہتے السَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا عَلِيَّكَ (تم پر موت وارد ہو) اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جواب میں صرف یہ فرمایا کرتے تھے۔ وَعَلَيْكُمْ يَا وَعَلَيْكَ (اور تم پر ہی ہو) اور مسلمانوں کو بھی آپ ﷺ نے تاکید فرمائی کہ جب کوئی اہل کتاب تمہیں سلام کرے تو تم جواب میں «عَلَيْكَ» کہا کرو یعنی عَلَيْكَ مَا قُلْتُ (تو نے جو کہا ہے، وہ تجھ پر ہی وارد ہو) (صحیح بخاری و مسلم، کتاب الأدب، باب لم یکن النبوی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشا ولا متفحشا)۔

(۵) یعنی وہ آپس میں یا اپنے دلوں میں کہتے کہ اگر یہ سچا نبی ہو تا تو اللہ تعالیٰ یقیناً ہماری اس قبیح حرکت پر ہماری گرفت

جس میں یہ جائیں گے،^(۱) سو وہ برا ٹھکانا ہے۔ (۸)
 اے ایمان والو! تم جب سرگوشی کرو تو یہ سرگوشیاں گناہ اور
 ظلم (زیادتی) اور نافرمانی پیغمبر کی نہ ہوں،^(۲) بلکہ نیکی اور
 پرہیزگاری کی باتوں پر سرگوشی کرو^(۳) اور اس اللہ سے
 ڈرتے رہو جس کے پاس تم سب جمع کیے جاؤ گے۔ (۹)
 (بری) سرگوشیاں، پس شیطانی کام ہے جس سے ایمان
 داروں کو رنج پہنچے۔^(۴) گو اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر وہ
 انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور ایمان والوں کو
 چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں۔^(۵) (۱۰)
 اے مسلمانو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں ذرا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَنَاجُوا بِالْأَلْسِنَةِ
 وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَةِ الرَّسُولِ وَتَنَاجُوا بِالْأَيْدِي وَالسَّمْوِيِّ
 وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ①

إِنَّمَا النَّجْوَى مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيْسَ
 بِضَرْبِهِمْ شَيْءٌ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَعَلَى اللَّهِ قَلْبُكَ
 الْمُؤْمِنُونَ ②

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَسْتَأْذِنُوا فَاذْهَبُوا
 إِلَى الْمَجْلِسِ

ضرور فرماتا۔

- (۱) اللہ نے فرمایا کہ اگر اللہ نے اپنی مشیت اور حکمت بالغہ کے تحت دنیا میں ان کو فوری گرفت نہیں فرمائی تو کیا وہ آخرت میں
 جہنم کے عذاب سے بھی بچ جائیں گے؟ نہیں یقیناً نہیں۔ جہنم ان کی مختصر ہے جس میں وہ داخل ہوں گے۔
- (۲) جس طرح یہود اور منافقین کا شیوہ ہے۔ یہ گویا اہل ایمان کو تربیت اور کردار سازی کے لیے کہا جا رہا ہے۔ کہ اگر تم
 اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہو تو تمہاری سرگوشیاں یہود اور اہل نفاق کی طرح اٹم و عدوان پر نہیں ہونی چاہئیں۔
- (۳) یعنی جس میں خیر ہی خیر ہو اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت پر مبنی ہو۔ کیونکہ یہی نیکی اور تقویٰ ہے۔
- (۴) یعنی اٹم و عدوان اور معصیت رسول ﷺ پر مبنی سرگوشیاں یہ شیطانی کام ہیں، کیونکہ شیطان ہی ان پر آمادہ کرتا
 ہے، تاکہ وہ اس کے ذریعے سے مومنوں کو غم و حزن میں مبتلا کرے۔
- (۵) لیکن یہ سرگوشیاں اور شیطانی حرکتیں، مومنوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتیں، لہذا یہ کہ اللہ کی مشیت ہو اس لیے تم
 اپنے دشمنوں کی ان اوجھی حرکتوں سے پریشان نہ ہو کرو۔ بلکہ اللہ پر بھروسہ رکھو، اس لیے کہ تمام معاملات کا اختیار اسی
 کے ہاتھ میں ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے، نہ کہ یہود اور منافقین، جو تمہیں تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں۔ سرگوشی کے سلسلے
 میں ہی مسلمانوں کو ایک اخلاقی ہدایت یہ دی گئی ہے کہ جب تم تین آدمی اکٹھے ہو، تو اپنے میں سے ایک کو چھوڑ کر دو
 آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں، کیونکہ یہ طریقہ اس ایک آدمی کو غم میں ڈال دے گا۔ (صحیح بخاری، کتاب
 الاستئذان، باب إذا كانوا أكثر من ثلاثة فلا بأس بالمساراة والمناجاة۔ و صحیح مسلم کتاب السلام،
 باب تحريم مناجاة الاثنتين دون الثالث بغير رضاه) البتہ اس کی رضامندی اور اجازت سے ایسا کرنا جائز ہے۔
 کیونکہ اس صورت میں دو آدمیوں کا سرگوشی کرنا، کسی کے لیے تشویش کا باعث نہیں ہو گا۔

قَاتَسُوا بَيْسَ اللهِ لَكُمْ وَإِذَا قِيلَ اسْتُرُوا فَأَلْتُمُوهُنَّ وَإِذْ يَعْبُرُ
 اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ
 وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ①

کشاہگی پیدا کرو تو تم جگہ کشاہہ کرو (۱) اللہ تمہیں کشاہگی
 دے گا، (۲) اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو جاؤ تو تم
 اٹھ کھڑے ہو جاؤ (۳) اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کے
 جو ایمان لائے ہیں اور جو علم دیئے گئے ہیں درجے
 بلند کر دے گا، (۴) اور اللہ تعالیٰ (ہر اس کام سے) جو تم
 کر رہے ہو (خوب) خبردار ہے۔ (۱۱)

اے مسلمانو! جب تم رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے
 سرگوشی کرنا چاہو تو اپنی سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ
 دے دیا کرو (۵) یہ تمہارے حق میں بہتر اور پاکیزہ تر

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَادَاكُمُ الرَّسُولُ فَصَلُّوا مِمَّا بَيْنَ يَدَيْهِ
 لَعَلَّكُمْ تُصَلُّونَ ذَلِكَ يُخَوِّدُ كُفْرًا وَظُلْمًا وَإِنِ اتَّقَى اللهُ
 عُذْرًا لَكُمْ ②

(۱) اس میں مسلمانوں کو مجلس کے آداب بتلائے جا رہے ہیں۔ مجلس کا لفظ عام ہے، جو ہر اس مجلس کو شامل ہے، جس
 میں مسلمان خیر اور اجر کے حصول کے لیے جمع ہوں، وعظ و نصیحت کی مجلس ہو یا جمعہ کی مجلس ہو۔ (تفسیر القرطبی) ”کھل
 کر بیٹھو“ کا مطلب ہے کہ مجلس کا دائرہ وسیع رکھو تاکہ بعد میں آنے والوں کے لیے بیٹھے کی جگہ رہے۔ دائرہ تنگ مت
 رکھو کہ بعد میں آنے والے کو کھڑا رہنا پڑے یا کسی بیٹھے ہوئے کو اٹھا کر اس کی جگہ وہ بیٹھے کہ یہ دونوں باتیں ناشائستہ
 ہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ”کوئی شخص، کسی دوسرے شخص کو اس کی جگہ سے اٹھا کر خود نہ بیٹھے،
 اس لیے مجلس کے دائرے کو فراخ اور وسیع کر لو۔ (صحیح بخاری، کتاب الجمعة، باب لا یقیم الرجل أحاه
 یوم الجمعة ویقع فی مکانہ۔ و صحیح مسلم، کتاب السلام، باب تحریم إقامة الإنسان من موضعه
 المباح الذی سبق إلیہ)

(۲) یعنی اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں وسعت و فراخی عطا فرمائے گا یا جہاں بھی تم وسعت و فراخی کے
 طالب ہو گے، مثلاً مکان میں، رزق میں، قبر میں۔ ہر جگہ تمہیں فراخی عطا فرمائے گا۔

(۳) یعنی جماد کے لیے، نماز کے لیے یا کسی بھی عمل خیر کے لیے۔ یا مطلب ہے کہ جب مجلس سے اٹھ کر جانے کو کہا
 جائے، تو فوراً چلے جاؤ۔ مسلمانوں کو یہ حکم اس لیے دیا گیا کہ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے اٹھ کر
 جانا پسند نہیں کرتے تھے لیکن اس طرح بعض دفعہ ان لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خلوت میں
 کوئی گفتگو کرنا چاہتے تھے۔

(۴) یعنی اہل ایمان کے درجے، غیر اہل ایمان پر اور اہل علم کے درجے اہل ایمان پر بلند فرمائے گا۔ جس کا مطلب یہ ہوا
 کہ ایمان کے ساتھ علوم دین سے واقفیت مزید رفق درجات کا باعث ہے۔

(۵) ہر مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مناجات اور خلوت میں گفتگو کرنے کی خواہش رکھتا تھا، جس سے نبی صلی اللہ

ہے،^(۱) ہاں اگر نہ پاؤ تو بیشک اللہ تعالیٰ بخشے والا مہربان ہے۔ (۱۲)
 کیا تم اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ نکالنے سے ڈر گئے؟
 پس جب تم نے یہ نہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی تمہیں
 معاف فرمادیا^(۲) تو اب (بخوبی) نمازوں کو قائم رکھو
 زکوٰۃ دیتے رہا کرو اور اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی
 تابعداری کرتے رہو۔^(۳) تم جو کچھ کرتے ہو اس (سب)
 سے اللہ (خوب) خبردار ہے۔ (۱۳)

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا؟ جنہوں نے اس قوم
 سے دوستی کی جن پر اللہ غضبناک ہو چکا ہے،^(۴) نہ یہ
 (منافق) تمہارے ہی ہیں نہ ان کے ہیں^(۵) باوجود علم کے
 پھر بھی جھوٹ پر قسمیں کھا رہے ہیں۔^(۶) (۱۴)

وَأَشْفَقْتُمْ أَنَّ تُغَيَّرَ مَوَازِينَ يَدَي نَجْوَيْكُمْ صَدَقْتُمْ وَادَّكُرْتُمْ
 فَتَعَلُّوْا وَأَتَابِ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ
 وَاطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مَا هُمْ بِنِعْمَتِكَ وَاكِلًا
 مِنْهُمْ وَيَصِلُوْنَ عَلَى الْكٰذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾

علیہ وسلم کو خاصی تکلیف ہوتی۔ بعض کہتے ہیں کہ منافقین یوں ہی بلا وجہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مناجات میں
 مصروف رہتے تھے، جس سے مسلمان تکلیف محسوس کرتے تھے، اس لیے اللہ نے یہ حکم نازل فرمادیا، تاکہ آپ ﷺ
 سے گفتگو کرنے کے رجحان عام کی حوصلہ شکنی ہو۔

(۱) بہتر اس لیے کہ صدقے سے تمہارے ہی دوسرے غریب مسلمان بھائیوں کو فائدہ ہو گا اور پاکیزہ تر اس لیے کہ یہ
 ایک عمل صالح اور اطاعت الہی ہے جس سے نفوس انسانی کی تطہیر ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ امر بطور
 استحباب کے تھا، وجوب کے لیے نہیں۔

(۲) یہ امر گواہی دیتا تھا، پھر بھی مسلمانوں کے لیے شاق تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جلد ہی اسے منسوخ فرمادیا۔
 (۳) یعنی فرانس و احکام کی پابندی، اس صدقے کا بدل بن جائے گی، جسے اللہ نے تمہاری تکلیف کے لیے معاف فرمادیا ہے۔
 (۴) جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا، وہ قرآن کریم کی صراحت کے مطابق یہود ہیں۔ اور ان سے دوستی کرنے والے
 منافقین ہیں۔ یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں، جب مدینے میں منافقین کا بھی زور تھا اور یہودیوں کی سازشیں بھی عروج
 پر تھیں۔ ابھی یہود کو جلا وطن نہیں کیا گیا تھا۔

(۵) یعنی یہ منافقین مسلمان ہیں اور نہ دین کے لحاظ سے یہودی ہی ہیں۔ پھر یہ کیوں یہودیوں سے دوستی کرتے ہیں؟
 صرف اس لیے کہ ان کے اور یہود کے درمیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی عداوت قدر مشترک ہے۔
 (۶) یعنی قسمیں کھا کر مسلمانوں کو باور کراتے ہیں کہ ہم بھی تمہاری طرح مسلمان ہیں یا یہودیوں سے انکے رابطے نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے،^(۱) تحقیق جو کچھ یہ کر رہے ہیں برا کر رہے ہیں۔ (۱۵)
ان لوگوں نے تو اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے^(۲) اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں^(۳) ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ (۱۶)

ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ کے ہاں کچھ کام نہ آئیں گی۔ یہ تو جہنمی ہیں ہمیشہ ہی اس میں رہیں گے۔ (۱۷)
جس دن اللہ تعالیٰ ان سب کو اٹھا کھڑا کرے گا تو یہ جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں (اللہ تعالیٰ) کے سامنے بھی قسمیں کھانے لگیں گے^(۴) اور سمجھیں گے کہ وہ بھی کسی (دلیل) پر ہیں،^(۵) یقین مانو کہ بیشک وہی جھوٹے ہیں۔ (۱۸)
ان پر شیطان نے غلبہ حاصل کر لیا ہے،^(۶) اور انہیں اللہ کا ذکر بھلا دیا ہے^(۷) یہ شیطانی لشکر ہے۔ کوئی شک نہیں

أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۵﴾

إِنَّمَا وَآيَاتِهِمْ جَهَنَّمَ فَصَلُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ فَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿۱۶﴾

لَنْ نُعْطِيَهُمْ أَجْرًا وَلَا أَجْرَهُمْ وَلَا نُؤْتِيهِمْ أَجْرًا بِسَبَبِ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۱۷﴾

يَوْمَ يَرَىٰ عَذَابُ اللَّهِ جَهَنَّمَ أَفَيْتَعْلَمُونَ لَّهُ كَمَا يَعْلَمُونَ لَكُمْ وَيَسْتَبِينَ عَنْهُمْ عَلَىٰ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّهُمْ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴿۱۸﴾

إِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنسَاهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ أُولَٰئِكَ حِزْبٌ

(۱) یعنی یہودیوں سے دوستانہ تعلق رکھنے اور جھوٹی قسمیں کھانے کی وجہ سے۔

(۲) اَیْمَانٌ، بِیْمَانٍ کی جمع ہے۔ بمعنی قسم۔ یعنی جس طرح ڈھال سے دشمن کے وار کو روک کر اپنا بچاؤ کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنی قسموں کو مسلمانوں کی تلواروں سے بچنے کے لیے ڈھال بنا رکھا ہے۔

(۳) یعنی جھوٹی قسمیں کھا کر یہ اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں، جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو ان کے بارے میں حقیقت و واقعہ کا علم نہیں ہوتا اور وہ ان کے غرے میں آکر قبول اسلام سے محروم رہتے ہیں۔ اور یوں یہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنے کا جرم بھی کرتے ہیں۔

(۴) یعنی ان کی بدبختی اور سنگ دلی کی انتہا ہے کہ قیامت والے دن، جہاں کوئی چیز مخفی نہیں رہے گی، وہاں بھی اللہ کے سامنے جھوٹی قسمیں کھانے کی شونچ پشیمانہ جسارت کریں گے۔

(۵) یعنی جس طرح دنیا میں وہ وقتی طور پر جھوٹی قسمیں کھا کر کچھ فائدے اٹھالیتے تھے، وہاں بھی سمجھیں گے کہ یہ جھوٹی قسمیں ان کے لیے مفید رہیں گی۔

(۶) اسْتَحْوَذَ کے معنی ہیں گھیر لیا، احاطہ کر لیا، جمع کر لیا، اسی لیے اس کا ترجمہ غلبہ حاصل کر لیا، کیا جاتا ہے کہ غلبے میں یہ سارے مفہوم آجاتے ہیں۔

(۷) یعنی اس نے جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے، ان سے شیطان نے ان کو غافل کر دیا ہے اور جن چیزوں سے اس

الْقَيْظِ وَالْآلَانَ حِزْبَ الْقَيْظِ هُمُ الْغُيُورُونَ ﴿۱۹﴾

إِنَّ الَّذِينَ يُعَادُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ﴿۲۰﴾

كَتَبَ اللَّهُ لَأَعْلَابِنَ آتَا وَرَسُولِي إِنَّ اللَّهَ لَمَوْلَىٰ عِبْرَةَ ﴿۲۱﴾

لَا حَيْدَ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ
وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ
أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَنَّهُمْ بِرُوحٍ مِّنْهُ وَيَجْعَلُ لَهُمُ

کہ شیطانی لشکر ہی خسارے والا ہے۔ (۱۹)

بیشک اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی جو لوگ
مخالفت کرتے ہیں (۲۰) وہی لوگ سب سے زیادہ ذلیلوں
میں ہیں۔ (۲۰)

اللہ تعالیٰ لکھ چکا ہے (۲۱) کہ بیشک میں اور میرے
پیغمبر غالب رہیں گے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ زور آور اور
غالب ہے۔ (۲۱)

اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والوں کو
آپ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والوں
سے محبت رکھتے ہوئے ہرگز نہ پائیں گے (۲۰) گو وہ ان کے
باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے کنبہ (قبیلے)

نے منع کیا ہے، ان کا وہ ان سے ارتکاب کرتا ہے، انہیں خوب صورت دکھلا کر، یا مغالطوں میں ڈال کر یا تمناؤں اور
آرزوؤں میں مبتلا کر کے۔

(۱) یعنی مکمل خسارہ انہی کے حصے میں آئے گا۔ گویا دوسرے ان کی بہ نسبت خسارے میں ہی نہیں ہیں۔ اس لیے کہ
انہوں نے جنت کا سودا گراہی لے کر کر لیا، اللہ پر جھوٹ بولا اور دنیا و آخرت میں جھوٹی قسمیں کھاتے رہے۔

(۲) مُحَادَّةٌ ایسی شدید مخالفت، عناد اور جھگڑے کو کہتے ہیں کہ فریقین کا باہم ملنا نہایت مشکل ہو گیا دونوں دو کناروں
(حد) پر ہیں جو ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ اسی سے یہ ممانعت کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اسی لیے
دربان اور پسرے دار کو بھی حداد کہا جاتا ہے۔ (فتح القدیر)

(۳) یعنی جس طرح گزشتہ امتوں میں سے اللہ اور رسول ﷺ کے مخالفوں کو ذلیل اور تباہ کیا گیا، ان کا شمار بھی انہیں
اہل ذلت میں ہو گا اور ان کے حصے میں بھی دنیا و آخرت کی ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

(۴) یعنی تقدیر اور لوح محفوظ میں، جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ مضمون سورہ سہمٰن، ۵۱، ۵۲ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔
(۵) جب یہ بات لکھنے والا سب پر غالب اور نہایت زور آور رہے، تو پھر اور کون ہے جو اس فیصلے میں تبدیلی کر سکے؟
مطلب یہ ہوا کہ یہ فیصلہ قدر محکم اور امر مبرم ہے۔

(۶) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمائی کہ جو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت میں کامل ہوتے ہیں، وہ اللہ اور رسول
ﷺ کے دشمنوں سے محبت اور تعلق خاطر نہیں رکھتے۔ گویا ایمان اور اللہ رسول ﷺ کے دشمنوں کی محبت و نصرت ایک دل میں
جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں اور بھی کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے، مثلاً آل عمران ۲۸، سورہ توبہ ۲۴ وغیرہ۔

کے (عزیز) ہی کیوں نہ ہوں۔^(۱) یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو لکھ دیا^(۲) ہے اور جن کی تائید اپنی روح سے کی^(۳) ہے اور جنہیں ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہے اور یہ اللہ سے خوش ہیں^(۴) یہ خدائی لشکر ہے، آگاہ رہو بیشک اللہ کے

جَذِبْتُمْ مَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ الَّذِينَ فِيهَا أَلَمُوا لَمْ يَمُوتُوا وَرَضُوا عَنْهُ أُولَئِكَ حِزْبُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۲۸﴾

(۱) اس لیے کہ ان کا ایمان ان کو ان کی محبت سے روکتا ہے اور ایمان کی رعایت، ابوت، نبوت، اخوت اور خاندان و برادری کی محبت و رعایت سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عملاً ایسا کر کے دکھایا۔ ایک مسلمان صحابی نے اپنے باپ، اپنے بیٹے، اپنے بھائی اور اپنے بچپا، ماموں اور دیگر رشتے داروں کو قتل کرنے سے گریز نہیں کیا، اگر وہ کفر کی حمایت میں کافروں کے ساتھ لڑنے والوں میں شامل ہوتے۔ سیر و تواریخ کی کتابوں میں یہ مثالیں درج ہیں۔ اسی ضمن میں جنگ بدر کا واقعہ بھی قابل ذکر ہے، جب اسیران بدر کے بارے میں مشورہ ہوا کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے یا قتل کر دیا جائے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا تھا کہ ان کافر قیدیوں میں سے ہر قیدی کو اس کے رشتے دار کے سپرد کر دیا جائے جسے وہ خود اپنے ہاتھوں سے قتل کرے۔ اور اللہ تعالیٰ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہی مشورہ پسند آیا تھا۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے سورہ انفال، ۶۷ کا حاشیہ)

(۲) یعنی راح اور مضبوط کر دیا ہے۔

(۳) روح سے مراد اپنی نصرت خاص، یا نور ایمان ہے جو انہیں ان کی مذکورہ خوبی کی وجہ سے حاصل ہوا۔

(۴) یعنی جب یہ اولین مسلمان، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایمان کی بنیاد پر اپنے عزیز و اقارب سے ناراض ہو گئے، حتیٰ کہ انہیں اپنے ہاتھوں سے قتل تک کرنے میں تامل نہیں کیا تو اس کے بدلے میں اللہ نے ان کو اپنی رضامندی سے نواز دیا۔ اور ان پر اس طرح اپنے انعامات کی بارش فرمائی کہ وہ بھی اللہ سے راضی ہو گئے۔ اس لیے آیت میں بیان کردہ اعزاز۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ اگرچہ خاص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل نہیں ہوا ہے، تاہم وہ اس کا مصداق اولین اور مصداق اتم ہیں۔ اسی لیے اس کے لغوی مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے مذکورہ صفات سے متصف ہر مسلمان رضی اللہ عنہ کا مستحق بن سکتا ہے، جیسے لغوی معنی کے لحاظ سے ہر مسلمان شخص پر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا (دعا) جملے کے طور پر اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اہل سنت نے ان کے مفہوم لغوی سے ہٹ کر ان کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کسی اور کے لیے بولنا، لکھنا جائز قرار نہیں دیا ہے۔ یہ گویا شعار ہیں۔ رضی اللہ عنہم، صحابہ کے لیے اور علیہم الصلوٰۃ والسلام انبیاء کرام کے لیے۔ یہ ایسے ہی ہے، جیسے رحمۃ اللہ علیہ (اللہ کی رحمت اس پر ہو) یا اللہ اس پر رحم فرمائے) کا اطلاق لغوی مفہوم کی رو سے زندہ اور مردہ دونوں پر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک دعائیہ کلمہ ہے جس کے

گروہ والے ہی کامیاب لوگ ہیں۔^(۱) (۲۲)

سورہ حشر مدنی ہے اور اس میں چوبیس آیتیں اور
تین رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتی
ہے، اور وہ غالب باحکمت ہے۔ (۱)

وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے کافروں کو ان
کے گھروں سے پہلے حشر کے وقت نکالا،^(۲) تمہارا گمان



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سُبْحَانَكَ يَا اللَّهُ وَمَا نَالِي السَّمُوتُ وَمَا نَالِي الْأَرْضُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ①

هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ
لِأَدْلَى الْحَشْرِ مَا ظَنَنُوا أَن يُخْرِجُوا وَظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ تَالِعَمَهُمْ حُضُومُهُمْ

ضرورت مند زندہ اور مردہ دونوں ہی ہیں۔ لیکن ان کا استعمال مردوں کے لیے خاص ہو چکا ہے۔ اس لیے اسے زندہ کے
لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔

(۱) یعنی یہی گروہ مومنین فلاح سے ہمکنار ہو گا، دوسرے ان کی بہ نسبت ایسے ہی ہوں گے، جیسے وہ فلاح سے بالکل
محروم ہیں، جیسا کہ واقعی وہ آخرت میں محروم ہوں گے۔

☆ یہ سورت یہود کے ایک قبیلے بنو نضیر کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس لیے اسے سورۃ النضیر بھی کہتے ہیں۔
(صحیح بخاری تفسیر سورۃ الحشر)

(۲) مدینے کے اطراف میں یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے، بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع۔ ہجرت مدینہ کے بعد نبی صلی
اللہ علیہ وسلم نے ان سے معاہدہ بھی کیا لیکن یہ لوگ درپردہ سازشیں کرتے رہے اور کفار مکہ سے بھی مسلمانوں کے
خلاف رابطہ رکھا، حتیٰ کہ ایک موقع پر جب کہ آپ ﷺ ان کے پاس گئے ہوئے تھے، بنو نضیر نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم پر اوپر سے ایک بھاری پتھر پھینک کر آپ ﷺ کو مار ڈالنے کی سازش تیار کی، جس سے وحی کے ذریعے سے
آپ ﷺ کو بروقت اطلاع کر دی گئی، اور آپ ﷺ وہاں سے واپس تشریف لے آئے۔ ان کی اس عمد شکنی کی وجہ
سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر لشکر کشی کی، یہ چند دن اپنے قلعوں میں محصور رہے، بالآخر انہوں نے جان
بخشی کی صورت میں جلا وطنی پر آمادگی کا اظہار کیا، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا۔ اسے اول حشر (پہلی
بار اجتماع) سے اس لیے تعبیر کیا کہ یہ ان کی پہلی جلا وطنی تھی، جو مدینے سے ہوئی، یہاں سے یہ خیبر میں جا کر مقیم ہو گئے،
وہاں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں انہیں دوبارہ جلا وطن کیا اور شام کی طرف دھکیل دیا، جہاں کہتے ہیں کہ تمام
انسانوں کا آخری حشر ہو گا۔

(بھی) نہ تھا کہ وہ نکلیں گے اور وہ خود (بھی) سمجھ رہے تھے کہ ان کے (سنگین) قلعے انہیں اللہ (کے عذاب) سے بچالیں گے ^(۱) پس ان پر اللہ (کا عذاب) ایسی جگہ سے آڑا کہ انہیں گمان بھی نہ تھا ^(۲) اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا ^(۳) وہ اپنے گھروں کو اپنے ہی ہاتھوں اجاڑ رہے تھے ^(۴) اور مسلمانوں کے ہاتھوں (برباد کروا رہے تھے) ^(۵) پس اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو۔ ^(۱) (۲)

اور اگر اللہ تعالیٰ نے ان پر جلاوطنی کو مقدر نہ کر دیا ہوتا

مِنَ اللَّهِ فَإِنَّهُمْ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا وَقَدْ فَرَّقَ بَيْنَهُمُ الرُّعْبَ يُخْرَجُونَ بِمُؤْتَمَرٍ يَأْتِيهِمُ الْيَوْمَ الْيَوْمَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَاحْتَسِبُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ ①

وَلَوْلَا أَنْ كَتَبَ اللَّهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَادَ لَعَدَّ بَعْضُ فِي الدُّنْيَا

(۱) اس لیے کہ انہوں نے نہایت مضبوط قلعے تعمیر کر رکھے تھے جس پر انہیں گھنڈ تھا اور مسلمان بھی سمجھتے تھے کہ اتنی آسانی سے یہ قلعے فتح نہیں ہو سکیں گے۔

(۲) اور وہ یہی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کر لیا تھا جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

(۳) اس رعب کی وجہ سے ہی انہوں نے جلاوطنی پر آمادگی کا اظہار کیا ورنہ عبد اللہ بن ابی (رئیس المنافقین) اور دیگر لوگوں نے انہیں پیغامات بھیجے تھے کہ تم مسلمانوں کے سامنے جھکتا نہیں، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو یہ خصوصی وصف عطا فرمایا تھا کہ دشمن ایک مہینے کی مسافت پر آپ ﷺ سے مرعوب ہو جاتا تھا۔ اس لیے سخت دہشت اور گہرا ہٹ ان پر طاری ہو گئی۔ اور تمام تر اسباب و وسائل کے باوجود انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور صرف یہ شرط مسلمانوں سے منوائی کہ جتنا سامان وہ لاد کر لے جاسکتے ہیں انہیں لے جانے کی اجازت ہو چنانچہ اس اجازت کی وجہ سے انہوں نے اپنے گھروں کے دروازے اور شہتیر تک اکھیر ڈالے تاکہ انہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔

(۴) یعنی جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب جلاوطنی ناگزیر ہے تو انہوں نے دوران محاصرہ اندر سے اپنے گھروں کو برباد کرنا شروع کر دیا تاکہ وہ مسلمانوں کے بھی کام کے نہ رہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ سامان لے جانے کی اجازت سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے وہ اپنے اپنے اونٹوں پر جتنا سامان لاد کر لے جاسکتے تھے، اپنے گھرا دیڑا دیڑا کر وہ مسلمان انہوں نے اونٹوں پر رکھ لیا۔

(۵) باہر سے مسلمان ان کے گھروں کو برباد کرتے رہے تاکہ ان پر گرفت آسان ہو جائے یا یہ مطلب ہے کہ ان کے اڈھڑے ہوئے گھروں سے بقیہ مسلمان نکالنے اور حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو مزید تحزیب سے کام لینا پڑا۔

(۶) کہ کس طرح اللہ نے ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈالا۔ دراصل حایکہ وہ ایک نہایت طاقت ور اور باوسائل قبیلہ تھا، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہلت عمل ختم ہو گئی اور اللہ نے اپنے مؤاخذے کے کٹنجے میں کئے کا فیصلہ کر لیا تو پھر ان کی اپنی طاقت اور وسائل ان کے کام آئے نہ دیگر اعوان و انصار ان کی کچھ مدد کر سکے۔

تو یقیناً انہیں دنیا ہی میں عذاب دیتا،^(۱) اور آخرت میں
(تو) ان کے لیے آگ کا عذاب ہے ہی۔ (۳)

یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول
کی مخالفت کی اور جو بھی اللہ کی مخالفت کرے گا تو اللہ
تعالیٰ بھی سخت عذاب کرنے والا ہے۔ (۴)

تم نے کھجوروں کے جو درخت کاٹ ڈالے یا جنہیں تم
نے ان کی جڑوں پر باقی رہنے دیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے
فرمان سے تھا اور اس لیے بھی کہ فاسقوں کو اللہ تعالیٰ
رسوا کرے۔ (۵)^(۲)

اور ان کا جو مال اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ہاتھ لگایا
ہے جس پر نہ تو تم نے اپنے گھوڑے دوڑائے ہیں اور نہ
اونٹ بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو جس پر چاہے غالب کر
دیتا ہے،^(۳) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۶)

وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ النَّارِ ۝

ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَمَنْ يُشَاقِ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ
شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

مَا تَطْعَمُونَ مِنْ لَبَنَةٍ أَوْ مَرْتَمَةٍ أَوْ قَنَاطٍ عَلَىٰ أُصُولِهَا إِنْ ذُنُوبُ اللَّهِ
وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ ۝

وَأَقَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْهُمْ مِمَّا أَوْجَعْتُمْ عَلَيْهِمْ مِنْ خَبَلٍ
وَلَارِكَابٍ وَالْكِبَاقِ لَيْسَ لِطُرُسِكُمْ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

(۱) یعنی اللہ کی تقدیر میں پہلے سے ہی اس طرح ان کی جلا وطنی لکھی ہوئی نہ ہوتی تو ان کو دنیا میں ہی سخت عذاب سے دوچار کر
دیا جاتا؛ جیسا کہ بعد میں ان کے بھائی یسود کے ایک دوسرے قبیلے (بنو قریظہ) کو ایسے ہی عذاب میں مبتلا کیا گیا کہ ان کے جو ان
مردوں کو قتل کر دیا گیا، دوسروں کو قیدی بنا لیا گیا اور ان کا مال مسلمانوں کے لیے غنیمت بنا دیا گیا۔

(۲) لَبَنَةٍ، کھجور کی ایک قسم ہے، جیسے عَجْوہ، برنی وغیرہ کھجوروں کی قسمیں ہیں۔ یا عام کھجور کا درخت مراد ہے۔ دوران
محاصرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مسلمانوں نے بنو نضیر کے کھجوروں کے درختوں کو آگ لگادی، کچھ کاٹ ڈالے
اور کچھ چھوڑ دیئے۔ جس سے مقصود دشمن کی آڑ کو ختم کرنا۔ اور یہ واضح کرنا تھا کہ اب مسلمان تم پر غالب ہیں، وہ
تمہارے اموال و جائیداد میں جس طرح چاہیں، تصرف کرنے پر قادر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی مسلمانوں کی اس حکمت عملی
کی تصویب فرمائی اور اسے یسود کی رسوائی کا ذریعہ قرار دیا۔

(۳) بنو نضیر کا یہ علاقہ، جو مسلمانوں کے قبضے میں آیا، مدینے سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا، یعنی مسلمانوں کو اس کے
لیے لمبا سفر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یعنی اس میں مسلمانوں کو اونٹ اور گھوڑے دوڑانے نہیں پڑے۔ اسی
طرح لڑنے کی بھی نوبت نہیں آئی اور صلح کے ذریعے سے یہ علاقہ فتح ہو گیا، یعنی اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو بغیر لڑے
ان پر غالب فرما دیا۔ اس لیے یہاں سے حاصل ہونے والے مال کو فنیہ قرار دیا گیا، جس کا حکم غنیمت سے مختلف ہے۔
گویا وہ مال فنیہ ہے؛ جو دشمن بغیر لڑے چھوڑ کر بھاگ جائے یا صلح کے ذریعے سے حاصل ہو۔ اور جو مال باقاعدہ لڑائی

بستیوں والوں کا جو (مال) اللہ تعالیٰ تمہارے لئے بھڑے بغیر اپنے رسول کے ہاتھ لگائے وہ اللہ کا ہے اور رسول کا اور قربت والوں کا اور یتیموں مسکینوں کا اور مسافروں کا ہے تاکہ تمہارے دولت مندوں کے ہاتھ میں ہی یہ مال گردش کرتا نہ رہ جائے اور تمہیں جو کچھ رسول دے لے لو، اور جس سے روکے رک جاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے

رہا کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔ (۷)

(فیء کا مال) ان مہاجر مسکینوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے نکال دیئے گئے ہیں وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے طلب گار ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی راست باز لوگ ہیں۔ (۸)

اور (ان کے لیے) جنہوں نے اس گھر میں (یعنی مدینہ) اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنا لی ہے (۹) اور اپنی طرف ہجرت کر کے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ دے دیا جائے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہیں رکھتے (۱۰) بلکہ خود اپنے اوپر انہیں

مَا آتَاكَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ
وَلِلَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْقُرَىٰ وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي بَيْتِ الْمَدِينَةِ
لَا يَأْتِيَنَّكُمْ أُولَئِكَ بِشَيْءٍ مِنَ الْغَنَاءِ إِنَّكُمْ أَنْتُمْ أُولُوهُ
وَمَا نَهَمُّكُمْ عَنْهُ فَأَتَاهُمُ أَثْوَابُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ
يَبْتَغُونَ قَضَاءً مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَصْرُفُونَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ
أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝

وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُخْرِجُونَ مَنْ هَاجَرَ
إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُوقِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْتُونَ
عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُوقِ شَعْرَةً
فَنَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الصَّالِحُونَ ۝

اور غلبہ حاصل کرنے کے بعد ملے، وہ غنیمت ہے۔

(۱) اس میں مال فیء کا ایک صحیح ترین مصرف بیان کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی مہاجرین کی فضیلت، ان کے اخلاص اور ان کی راست بازی کی وضاحت ہے، جس کے بعد ان کے ایمان میں شک کرنا گویا قرآن کا انکار ہے۔

(۲) ان سے انصار مدینہ مراد ہیں، جو مہاجرین کے مدینہ آنے سے قبل مدینے میں آباد تھے اور مہاجرین کے ہجرت کر کے آنے سے قبل، ایمان بھی ان کے دلوں میں قرار پکڑ چکا تھا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ مہاجرین کے ایمان لانے سے پہلے، یہ انصار ایمان لاپچکے تھے، کیونکہ ان کی اکثریت مہاجرین کے ایمان لانے کے بعد ایمان لائی ہے۔ یعنی مِنْ قَبْلِهِمْ کا مطلب مِنْ قَبْلِ هِجْرَتِهِمْ ہے۔ اور دَارًا سے دَارُ الْهِجْرَةِ یعنی مدینہ مراد ہے۔

(۳) یعنی مہاجرین کو اللہ کا رسول ﷺ جو کچھ دے، اس پر حسد اور انقباض محسوس نہیں کرتے، جیسے مال فیء کا اولین مستحق بھی ان کو قرار دیا گیا۔ لیکن انصار نے برا نہیں منایا۔

ترجیح دیتے ہیں گو خود کو کتنی ہی سخت حاجت ہو^(۱) (بات یہ ہے) کہ جو بھی اپنے نفس کے بخل سے بچایا گیا وہی کامیاب (اور بامراد) ہے۔^(۲) (۹)

اور (ان کے لیے) جو ان کے بعد آئیں جو کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ایمان داروں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ (اور دشمنی) نہ ڈال،^(۳) اے ہمارے رب بیشک تو شفقت و مہربانی کرنے

وَالَّذِينَ جَاءُوا مِن بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْبَلَاءِ
الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ
آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَؤُوفٌ رَحِيمٌ ﴿۹﴾

(۱) یعنی اپنے مقابلے میں مہاجرین کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ خود بھوکا رہتے ہیں لیکن مہاجرین کو کھلاتے ہیں۔ جیسے حدیث میں ایک واقعہ آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مہمان آیا، لیکن آپ ﷺ کے گھر میں کچھ نہ تھا، چنانچہ ایک انصاری اسے اپنے گھر لے گیا، گھر جا کر بیوی کو بتلایا تو بیوی نے کہا کہ گھر میں تو صرف بچوں کی خوراک ہے۔ انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ بچوں کو تو آج بھوکا سلا دیں اور ہم خود بھی ایسے ہی کچھ کھائے بغیر سو جائیں گے۔ البتہ مہمان کو کھلاتے وقت چراغ بجھا دینا تاکہ اسے ہماری بابت علم نہ ہو کہ ہم اس کے ساتھ کھانا نہیں کھا رہے ہیں۔ صبح جب وہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم دونوں میاں بیوی کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی ہے: ﴿وَيُؤْتُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ﴾ (صحیح بخاری، تفسیر سورة الحشر) ان کے ایثار کی یہ بھی ایک نہایت عجیب مثال ہے کہ ایک انصاری کے پاس دو بیویاں تھیں تو اس نے ایک بیوی کو اس لیے طلاق دینے کی پیشکش کی کہ عدت گزرنے کے بعد اس سے اس کا دوسرا مہاجر بھائی نکاح کر لے۔ (صحیح البخاری۔ کتاب النکاح)

(۲) حدیث میں ہے ”شخ سے بچو، اس حرص نفس نے ہی پہلے لوگوں کو ہلاک کیا، اسی نے انہیں خون ریزی پر آمادہ کیا اور انہوں نے محارم کو حلال کر لیا۔“ (صحیح مسلم، کتاب البر، باب تحریم الظلم)

(۳) یہ مال فیء کے مستحقین کی تیسری قسم ہے، یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد آنے والے اور صحابہ کے نقش قدم پر چلنے والے۔ اس میں تابعین اور تبع تابعین اور قیامت تک ہونے والے اہل ایمان و تقویٰ آگئے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ وہ انصار و مہاجرین کو مومن ماننے اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرنے والے ہوں نہ کہ ان کے ایمان میں شک کرنے اور ان پر سب و شتم کرنے اور ان کے خلاف اپنے دلوں میں بغض و عناد رکھنے والے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اس آیت سے استنباط کرتے ہوئے یہی بات ارشاد فرمائی ہے: إِنَّ الرَّافِضِيَّ الَّذِي يَسُبُّ الصَّحَابَةَ، لَيْسَ لَهُ فِي مَالِ الْفَيْءِ نَصِيبٌ لِعَدَمِ اتِّصَافِهِ بِمَا مَدَحَ اللَّهُ بِهِ هَؤُلَاءِ فِي قَوْلِهِمْ رَأْفُضِي كَرَامَ رضی اللہ عنہم پر سب و شتم کرتے ہیں

والا ہے۔ (۱۰)

کیا تو نے منافقوں کو نہ دیکھا؟ کہ اپنے اہل کتاب کافر بھائیوں سے کہتے ہیں اگر تم جلا وطن کیے گئے تو ضرور بالضرور ہم بھی تمہارے ساتھ نکل کھڑے ہوں گے اور تمہارے بارے میں ہم کبھی بھی کسی کی بات نہ مانیں گے اور اگر تم سے جنگ کی جائے گی تو بخدا ہم تمہاری مدد کریں^(۱) گے، لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ یہ قطعاً جھوٹے ہیں۔ (۲)^(۱۱)

اگر وہ جلا وطن کیے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہ جائیں گے اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی مدد (بھی) نہ کریں^(۳) گے اور اگر (بالفرض) مدد پر آجھی گئے^(۴) تو پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے) ہوں گے پھر مدد نہ کیے جائیں گے۔ (۵)^(۱۲)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِن قُوتِلْتُمْ لَنَنصُرَنَّكُمْ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿۱۰﴾

لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُوهُمْ وَلَئِنْ نَصَرُوهُمْ لَيُؤْتُوا الْأَعْدَاءَ عَلَيْهِمْ أَلْيَوْمَ تَصْرَفُونَ ﴿۱۱﴾

مال نبی ؑ سے حصہ نہیں ملے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مدح کی ہے اور منافقین ان کی مذمت کرتے ہیں۔ (ابن کثیر) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ «أُمِرْتُمْ بِالْإِسْتِغْفَارِ لِأَصْحَابِ مُحَمَّدٍ ﷺ فَسَبَّيْتُمُوهُمْ! سَمِعْتُ نَبِيَّكُمْ يَقُولُ: «لَا تَذْهَبْ هَذِهِ الْأُمَّةُ حَتَّى يَلْعَنَ آخِرُهَا أَوْلَهَا»۔ (رواہ البغوی) ”تم لوگوں کو اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استغفار کا حکم دیا گیا۔ مگر تم نے ان پر لعن طعن کی۔ میں نے تمہارے نبی کو فرماتے ہوئے سنا کہ یہ امت اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک کہ اس کے آخرین اولین پر لعنت نہ کریں۔“ (خوالہ مذکور)

(۱) جیسے پہلے گزر چکا ہے کہ منافقین نے بنو نضیر کو یہ پیغام بھیجا تھا۔

(۲) چنانچہ ان کا جھوٹ واضح ہو کر سامنے آیا کہ بنو نضیر جلا وطن کر دیئے گئے، لیکن یہ ان کی مدد کو پہنچے نہ ان کی حمایت میں مدینہ چھوڑنے پر آمادہ ہوئے۔

(۳) یہ منافقین کے گزشتہ جھوٹے وعدوں ہی کی مزید تفصیل ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، بنو نضیر، جلا وطن اور بنو قریظہ قتل اور اسیر کیے گئے، لیکن منافقین کسی کی مدد کو نہیں پہنچے۔

(۴) یہ بطور فرض، بات کی جارہی ہے، ورنہ جس چیز کی نفی اللہ تعالیٰ فرمادے، اس کا وجود کیوں کر ممکن ہے، مطلب ہے کہ اگر یہودی مدد کرنے کا ارادہ کریں۔

(۵) یعنی شکست کھا کر۔

(۶) مراد یہودی ہیں، یعنی جب ان کے مددگار منافقین ہی شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوں گے تو یہودی کس طرح منصور و

(مسلمانو! یقین مانو) کہ تمہاری ہیبت ان کے دلوں^(۱) میں بہ نسبت اللہ کی ہیبت کے بہت زیادہ ہے، یہ اس لیے کہ یہ بے سمجھ لوگ ہیں۔^(۲) (۱۳)

یہ سب مل کر بھی تم سے لڑ نہیں سکتے ہاں یہ اور بات ہے کہ قلعہ بند مقامات میں ہوں یا دیواروں کی آڑ میں ہوں،^(۳) ان کی لڑائی تو ان میں آپس میں ہی بہت سخت ہے^(۴) گو آپ انہیں متحد سمجھ رہے ہیں لیکن ان کے دل دراصل ایک دوسرے سے جدا ہیں۔^(۵) اس لیے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں۔^(۶) (۱۳)

ان لوگوں کی طرح جو ان سے کچھ ہی پہلے گزرے ہیں جنہوں نے اپنے کام کا وبال چکھ لیا^(۷) اور جن کے لیے

لَا تُمْرُوا سُدًّا رَهْبَةً فِي صُدُورِهِمْ مِنَ اللَّهِ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿۱۳﴾

لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قَوْمٍ مُّخَضَّنَةٍ أَوْ مِنْ وَرَاءِ جُدُرٍ بَأْسُهُمْ بِيَهُمْ شَدِيدٌ مَحْشَبُهُمْ جَمِيعًا وَقَالُوا لَهُمْ شَقِيذٌ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۳﴾

كَمَثَلِ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاتُ أُولِي أَرْهَامٍ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۳﴾

کامیاب ہوں گے؟ بعض نے اس سے مراد منافقین لیے ہیں کہ وہ مدد نہیں کیے جائیں گے، بلکہ اللہ ان کو ذلیل کرے گا اور ان کا نفاق ان کے لیے نافع نہیں ہو گا۔

(۱) یہود کے یا منافقین کے یا سب کے ہی دلوں میں۔

(۲) یعنی تمہارا یہ خوف ان کے دلوں میں ان کی ناسمجھی کی وجہ سے ہے، ورنہ اگر یہ سمجھدار ہوتے تو سمجھ جاتے کہ مسلمانوں کا غلبہ و تسلط اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اس لیے ڈرنا اللہ تعالیٰ سے چاہیے نہ کہ مسلمانوں سے۔

(۳) یعنی یہ منافقین اور یہودی مل کر بھی کھلے میدان میں تم سے لڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ البتہ قلعوں میں محصور ہو کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر تم پر وار کر سکتے ہیں، جس سے یہ واضح ہے کہ یہ نہایت بزدل ہیں اور تمہاری ہیبت سے لرزاں و ترساں ہیں۔

(۴) یعنی آپس میں یہ ایک دوسرے کے سخت خلاف ہیں۔ اس لیے ان میں باہم تو تکرار اور تھکافضیحی عام ہے۔

(۵) یہ منافقین کا آپس میں دلوں کا حال ہے۔ یا یہود اور منافقین کا یا مشرکین اور اہل کتاب کا۔ مطلب یہ ہے کہ حق کے مقابلے میں یہ ایک نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے دل ایک نہیں ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف بغض و عناد سے بھرے ہوئے۔

(۶) یعنی یہ اختلاف اور تشدد ان کی بے عقلی کی وجہ سے ہے، اگر ان کے پاس سمجھنے والی عقل ہوتی تو یہ حق کو پہچان لیتے اور اسے اپنالیتے۔

(۷) اس سے بعض نے مشرکین مکہ مراد لیے ہیں، جنہیں غزوہ بنی نضیر سے کچھ عرصہ قبل جنگ بدر میں عبرت ناک

المناک عذاب (تیار) ہے۔^(۱۵)

شیطان کی طرح کہ اس نے انسان سے کہا کفر کر، جب وہ کفر کر چکا تو کہنے لگا میں تو تجھ سے بری ہوں،^(۲) میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔^(۳)

پس دونوں کا انجام یہ ہوا کہ آتش (دوزخ) میں ہمیشہ کے لیے گئے اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔^(۴)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو^(۵) اور ہر شخص دیکھ (بھال) لے کہ کل (قیامت) کے واسطے اس نے (اعمال کا) کیا (ذخیرہ) بھیجا ہے۔^(۶) اور (ہر وقت) اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔^(۷)

اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے اللہ

كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ ائْتِنَا كَفْرًا قَالَ إِنَّي
بِرَبِّي مُتَّقٍ إِنَّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْمَالِكِينَ ﴿۱۵﴾

فَكَانَ عَاوَجَةً مَمَّانًا كَأَمْثَالِ النَّارِ خَالِدًا فِيهَا وَفِيهَا
جَذَرُ الظَّالِمِينَ ﴿۱۶﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلَسْتُمْ بِتَافِهِمْ
يَعْلَمُونَ ﴿۱۷﴾

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ سَمُوا اللَّهَ فَأَنسَوْهُمُ انْفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ

شکست ہوئی تھی۔ یعنی یہ بھی مغلوبیت اور ذلت میں مشرکین ہی کی طرح ہیں جن کا زمانہ قریب ہی ہے۔ بعض نے یہود کے دوسرے قبیلے بنو قینقاع کو مراد لیا ہے جنہیں بنو نضیر سے قبل جلا وطن کیا جا چکا تھا جو زمان و مکان دونوں لحاظ سے ان کے قریب تھے۔ (ابن کثیر)

(۱) یعنی یہ وبال جو انہوں نے چکھا، یہ تو دنیا کی سزا ہے، آخرت کی سزا اس کے علاوہ ہے جو نہایت دردناک ہوگی۔

(۲) یہ یہود اور منافقین کی ایک اور مثال بیان فرمائی کہ منافقین نے یہودیوں کو اسی طرح بے یار و مددگار چھوڑ دیا، جس طرح شیطان انسان کے ساتھ معاملہ کرتا ہے، پہلے وہ انسان کو گمراہ کرتا ہے اور جب انسان شیطان کے پیچھے لگ کر کفر کا ارتکاب کر لیتا ہے تو شیطان اس سے براءت کا اظہار کر دیتا ہے۔

(۳) شیطان اپنے اس قول میں سچا نہیں ہے، مقصد صرف اس کفر سے علیحدگی اور براءت ہے جو انسان شیطان کے گمراہ کرنے سے کرتا ہے۔

(۴) یعنی خلود فی النار، جہنم کی دائمی سزا۔

(۵) اہل ایمان کو خطاب کر کے انہیں وعظ کیا جا رہا ہے۔ اللہ سے ڈرنے کا مطلب ہے، اس نے جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے، انہیں بجالاؤ۔ جن سے روکا ہے، ان سے رک جاؤ، آیت میں یہ بطور تاکید دو مرتبہ فرمایا کیونکہ یہ تقویٰ (اللہ کا خوف) ہی انسان کو نیکی کرنے پر اور برائی سے اجتناب پر آمادہ کرتا ہے۔

(۶) اسے کل سے تعبیر کر کے اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اس کا وقوع زیادہ دور نہیں، قریب ہی ہے۔

(۷) چنانچہ وہ ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا دے گا، نیک کو نیکی کی جزا اور بد کو بدی کی جزا۔

مُهِمَّ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۹

(کے احکام) کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی انہیں اپنی جانوں سے غافل کر دیا،^(۱) اور ایسے ہی لوگ نافرمان (فاسق) ہوتے ہیں۔ (۱۹)

اہل نار اور اہل جنت (باہم) برابر نہیں۔^(۲) جو اہل جنت ہیں وہی کامیاب ہیں (اور جو اہل نار ہیں وہ ناکام ہیں)^(۳) (۲۰)

اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے^(۴) تو تو دیکھتا کہ خوف الہی سے وہ پست ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا^(۵)

لَا يَسْتَوِي اَصْحَابُ النَّارِ وَاَصْحَابُ الْجَنَّةِ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ مُرْفَعُوْنَ ۝۲۰

لَوْ اَنْزَلْنٰ هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهُ خٰشِعًا مُّتَصَدِّقًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَبَلَكَ الْاَمْثَالَ يُنْقَرُ بِهَا

(۱) یعنی اللہ نے بطور جزا انہیں ایسا کر دیا کہ وہ ایسے عملوں سے غافل ہو گئے جن میں ان کا فائدہ تھا اور جن کے ذریعے سے وہ اپنے نفسوں کو عذاب الہی سے بچا سکتے تھے۔ یوں انسان خدا فراموشی سے خود فراموشی تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی عقل اس کی صحیح رہنمائی نہیں کرتی، آنکھیں اس کو حق کا راستہ نہیں دکھاتیں اور اس کے کان حق کے سننے سے سرے ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً اس سے ایسے کام سرزد ہوتے ہیں جس میں اس کی اپنی تباہی و بربادی ہوتی ہے۔

(۲) جنہوں نے اللہ کو بھول کر یہ بات بھی بھلائے رکھی کہ اس طرح وہ خود اپنے ہی نفسوں پر ظلم کر رہے ہیں اور ایک دن آئے گا کہ اس کے نتیجے میں ان کے یہ جسم، جن کے لیے دنیا میں وہ بڑے بڑے پاڑ بیلتے تھے، جنم کی آگ کا ایندھن بنیں گے۔ اور ان کے مقابلے میں دوسرے وہ لوگ تھے، جنہوں نے اللہ کو یاد رکھا، اس کے احکام کے مطابق زندگی گزاری۔ ایک وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی بہترین جزا عطا فرمائے گا اور اپنی جنت میں انہیں داخل فرمائے گا، جہاں ان کے آرام و راحت کے لیے ہر طرح کی نعمتیں اور سہولتیں ہوں گی۔ یہ دونوں فریق یعنی جنتی اور جہنمی برابر نہیں ہوں گے۔ بھلا یہ برابر ہو بھی کس طرح سکتے ہیں۔ ایک نے اپنے انجام کو یاد رکھا اور اس کے لیے تیاری کرنا رہا۔ دوسرا اپنے انجام سے غافل رہا اس لیے اس کے لیے تیاری میں بھی جہرمانہ غفلت برتی۔

(۳) جس طرح امتحان کی تیاری کرنے والا کامیاب اور دوسرا ناکام ہوتا ہے۔ اسی طرح اہل ایمان و تقویٰ جنت کے حصول میں کامیاب ہو جائیں گے، کیونکہ اس کے لیے وہ دنیا میں نیک عمل کر کے تیاری کرتے رہے گویا دنیا دار العمل اور دارالامتحان ہے۔ جس نے اس حقیقت کو سمجھ لیا اور اس نے انجام سے بے خبر ہو کر زندگی نہیں گزاری، وہ کامیاب ہو گا اور جو دنیا کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر اور انجام سے غافل، فسق و فجور میں مبتلا رہا، وہ خاسر و ناکام ہو گا۔ اللّٰهُمَّ اَجْعَلْنَا مِنَ الْفٰتَنِیْنَ

(۴) اور پہاڑ میں قم و ادراک کی وہ صلاحیت پیدا کر دیتے جو ہم نے انسان کے اندر رکھی ہے۔

(۵) یعنی قرآن کریم میں ہم نے بلاغت و فصاحت، قوت و استدلال اور وعظ و تذکیر کے ایسے پہلو بیان کیے ہیں کہ انہیں سن کر

لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۳۱﴾

هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ
هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ﴿۳۲﴾

هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ
الْمُؤْمِنُ الْمُهِيمُنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللَّهِ
عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۳۳﴾

هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى
يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ ﴿۳۴﴾

ہم ان مثالوں کو لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ
غور و فکر کریں۔ (۳۱)

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، چھپے (۳۲) کھلے کا
جاننے والا مہربان اور رحم کرنے والا۔ (۳۲)

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بادشاہ، نہایت
پاک، سب عیبوں سے صاف، امن دینے والا، نگہبان،
غالب زور آور، اور بڑائی والا، پاک ہے اللہ ان چیزوں
سے جنہیں یہ اس کا شریک بناتے ہیں۔ (۳۳)

وہی اللہ ہے پیدا کرنے والا وجود بخشے والا، (۳۴) صورت
بنانے والا، اسی کے لیے (نہایت) اچھے نام ہیں، (۳۵) ہر چیز
خواہ وہ آسمانوں میں ہو خواہ زمین میں ہو اس کی پاکی بیان
کرتی ہے، (۳۶) اور وہی غالب حکمت والا ہے۔ (۳۴)

پہاڑ بھی، باوجود اتنی تختی اور وسعت و بلندی کے، خوف الہی سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ یہ انسان کو سمجھایا اور ڈرایا جا رہا ہے کہ تجھے
عقل و فہم کی صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ لیکن اگر قرآن سن کر تیرا دل کوئی اثر قبول نہیں کرتا تو تیرا انجام اچھا نہیں ہو گا۔

(۱) تاکہ قرآن کے مواعظ سے وہ نصیحت حاصل کریں اور زواج کو سن کر نافرمانیوں سے اجتناب کریں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس
آیت میں نبی ﷺ سے خطاب ہے کہ ہم نے آپ ﷺ پر یہ قرآن مجید نازل کیا جو ایسی عظمت شان کا حامل ہے کہ اگر ہم
اسے کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا، لیکن یہ آپ ﷺ پر ہمارا احسان ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کو اتنا قوی اور
مضبوط کر دیا کہ آپ ﷺ نے اس چیز کو برداشت کر لیا جس کو برداشت کرنے کی طاقت پہاڑوں میں بھی نہیں ہے۔ (فتح القدیر)
اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی صفات بیان فرما رہا ہے جس سے مقصود توحید کا اثبات اور شرک کی تردید ہے۔

(۲) غیب، مخلوقات کے اعتبار سے ہے، ورنہ اللہ کے لیے تو کوئی چیز غیب نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کائنات کی ہر چیز کو
جانتا ہے چاہے وہ ہمارے سامنے ہو یا ہم سے غائب ہو۔ حتیٰ کہ وہ تاریکیوں میں چلنے والی چیزوں کو بھی جانتا ہے۔

(۳) کہتے ہیں کہ خلق کا مطلب ہے اپنے ارادہ و مشیت کے مطابق اندازہ کرنا اور برائے کے معنی ہیں اسے پیدا کرنا، گھڑنا،
وجود میں لانا۔

(۴) اسمائے حسنیٰ کی بحث سورہ اعراف، ۱۸۰ میں گزر چکی ہے۔

(۵) زبان حال سے بھی اور زبان مقال سے بھی، جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔

(۶) جس چیز کا بھی فیصلہ کرتا ہے، وہ حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

سورہ ممتحنہ مدنی ہے اور اس میں تیرہ آیتیں اور
دو رکوع ہیں۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے اور (خود) اپنے
دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ^(۱) تم تو دوستی سے ان کی طرف
پیغام بھیجتے ہو اور وہ اس حق کے ساتھ جو تمہارے پاس
آچکا ہے کفر کرتے ہیں، پیغمبر کو اور خود تمہیں بھی محض اس
وجہ سے جلا وطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان رکھتے
ہو،^(۳) اگر تم میری راہ میں جہاد کے لئے اور میری

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ
إِلَيْهِم بِالْمُؤَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ يُخَيِّبُونَ الرَّسُولَ
وَأَيُّكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ جِهَادًا فِى سَبِيلِ
أَبْنَاءِ مَرْضَاتِي فِدْوَةٌ لِلَّهِمْ بِالْمُؤَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا خَفَيْتُمْ وَمَا
أَعْلَمْتُمْ وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ①

(۱) کفار مکہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان حدیبیہ میں جو معاہدہ ہوا تھا، اہل مکہ نے اس کی خلاف ورزی کی۔ اس
لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مسلمانوں کو خفیہ طور پر لڑائی کی تیاری کا حکم دے دیا۔ حضرت حاطب بن ابی
بلتعہؓ، ایک مہاجر بدری صحابی تھے، جن کی قریش کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں تھی، لیکن ان کے بیوی بچے کے
میں ہی تھے۔ انہوں نے سوچا کہ میں قریش مکہ کو آپ ﷺ کی تیاری کی اطلاع کر دوں تاکہ اس احسان کے بدلے وہ
میرے بال بچوں کا خیال رکھیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک عورت کے ذریعے سے یہ پیغام تحریری طور پر اہل مکہ کی طرف
روانہ کر دیا، جس کی اطلاع بذریعہ وحی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کر دی گئی چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ، حضرت
مقداد اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کو فرمایا کہ جاؤ روضہ خاخ پر ایک عورت ہوگی جو مکہ جا رہی ہوگی، اس کے پاس ایک
رقعہ ہے، وہ لے آؤ، چنانچہ وہ حضرات گئے اور اس سے یہ رقعہ لے آئے جو اس نے سر کے بالوں میں چھپا رکھا تھا۔ آپ
ﷺ نے حضرت حاطبؓ سے پوچھا۔ یہ تم نے کیا کیا؟ انہوں نے فرمایا کہ میں نے یہ کام کفر و ارتداد کی بنا پر نہیں کیا
بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دیگر ماجریں کے رشتے دار کے میں موجود ہیں جو ان کے بال بچوں کی حفاظت کرتے
ہیں۔ میرا وہاں کوئی رشتہ دار نہیں ہے تو میں نے یہ سوچا کہ میں اہل مکہ کو کچھ اطلاع کر دوں تاکہ وہ میرے احسان مند
رہیں اور میرے بچوں کی حفاظت کریں۔ آپ ﷺ نے ان کی سچائی کی وجہ سے انہیں کچھ نہیں کہا۔ تاہم اللہ نے تنبیہ
کے طور پر یہ آیات نازل فرمادیں، تاکہ آئندہ کوئی مومن کسی کافر کے ساتھ اس طرح کا تعلق مودت قائم نہ کرے۔

(صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الممتحنہ، 'وصحیح مسلم'، کتاب فضائل الصحابة)

(۲) مطلب ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خبریں ان تک پہنچا کر ان سے دوستانہ تعلق قائم کرنا چاہتے ہو؟

(۳) جب ان کا تمہارے ساتھ اور حق کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو تمہارے لیے کیا یہ مناسب ہے کہ تم ان سے محبت اور

رضامندی کی طلب میں نکلتے ہو (تو ان سے دوستیاں نہ کرو) ^(۱) تم ان کے پاس محبت کا پیغام پوشیدہ پوشیدہ بھیجتے ہو اور مجھے خوب معلوم ہے جو تم نے چھپایا اور وہ بھی جو تم نے ظاہر کیا، تم میں سے جو بھی اس کام کو کرے گا وہ یقیناً راہ راست سے ہٹ جائے گا۔ ^(۲) (۱)

اگر وہ تم پر کہیں قابو پالیں تو وہ تمہارے (کھلے) دشمن ہو جائیں اور برائی کے ساتھ تم پر دست درازی اور زبان درازی کرنے لگیں اور (دل سے) چاہنے لگیں کہ تم بھی کفر کرنے لگ جاؤ۔ ^(۳) (۲)

تمہاری قرابتیں، رشتہ داریاں، اور اولاد تمہیں قیامت کے دن کام نہ آئیں گی، ^(۴) اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گا ^(۵) اور جو کچھ تم کر رہے ہو اسے اللہ خوب دیکھ رہا ہے۔ (۳)

(مسلمانو!) تمہارے لیے حضرت ابراہیم میں اور ان کے

إِنْ يَتَفَقَّهُوْكُمْ يَكُوْنُوْا اِلَيْكُمْ اَعْدَاءً وَيَسْطُوْا اِلَيْكُمْ اَيُّدِيْكُمْ
وَلَيْسَ لَكُمْ بِالشُّرُوْهِ وَوَدُوْدًا اَوْ تَوَكُّرًا ۝۷

لَنْ يَنْفَعَكُمْ اِحْسَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ ۝۸ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يَنْصِلُ بَيْنَكُمْ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۹

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اٰمُوْرًا حَسَنَةً فِىْ اٰبْرٰهِيْمَ وَاَلَّذِيْنَ مَعَهُۥ اِذْ قَالُوْا

ہمدردی کا رویہ اختیار کرو؟

(۱) یہ جواب شرط جو محذوف ہے، کا ترجمہ ہے۔

(۲) یعنی میرے اور اپنے دشمنوں سے محبت کا تعلق جوڑنا اور انہیں خفیہ نامہ و پیام بھیجنا، یہ گمراہی کا راستہ ہے، جو کسی مسلمان کے شایان شان نہیں۔

(۳) یعنی تمہارے خلاف ان کے دلوں میں تو اس طرح بغض و عناد ہے اور تم ہو کہ ان کے ساتھ محبت کی پیٹلیں بڑھا رہے ہو؟

(۴) یعنی جس اولاد کے لیے تم کفار کے ساتھ محبت کا اظہار کر رہے ہو، یہ تمہارے کچھ کام نہیں آئے گی، پھر اس کی وجہ سے تم کافروں سے دوستی کر کے کیوں اللہ کو ناراض کرتے ہو۔ قیامت والے دن جو چیز کام آئے گی تو اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت ہے، اس کا اہتمام کرو۔

(۵) دوسرے معنی ہیں تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا یعنی اہل طاعت کو جنت میں اور اہل معصیت کو جہنم میں داخل کرے گا۔ بعض کہتے ہیں آپس میں جدائی کا مطلب ہے کہ ایک دوسرے سے بھاگیں گے۔ جیسے فرمایا ﴿يَوْمَ يُفِيْضُ السُّرُوْبُ مِنْ اٰخِيْبِهِ﴾ (سورہ عس، ۳۴) یعنی شدت ہول سے بھائی، بھائی سے بھاگے گا۔

لَعُوْهُمْ اِنَّا بِيْرُدُّوا مِنْكُمْ وَمَا نَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرًا
 يَكُوْمُوْنَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اِنْ هَاقَىٰ تُوْمُرُنَا
 بِاللّٰهِ وَحَمَاهُ اِلَّا قَوْلُ اِبْرٰهِيْمَ لَاقْتَعِفِرَنَّ لَكَ وَمَا
 اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ رَبَّنَا عَلِمَكُنَا وَكَلَّمَا وَاَلَيْكَ
 اٰتِنَا وَاَلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۰﴾

ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے،^(۱) جبکہ ان سب نے اپنی قوم سے بر ملا کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو ان سب سے بالکل بیزار ہیں۔^(۲) ہم تمہارے (عقائد کے) منکر ہیں جب تک تم اللہ کی وحدانیت پر ایمان نہ لاؤ ہم میں تم میں ہمیشہ کے لیے بغض و عداوت ظاہر ہو گئی^(۳) لیکن ابراہیم کی اتنی بات تو اپنے باپ سے ہوئی تھی^(۴) کہ میں تمہارے لیے استغفار ضرور کروں گا اور تمہارے لیے مجھے اللہ کے سامنے کسی چیز کا اختیار کچھ بھی نہیں۔ اے ہمارے پروردگار تجھی پر ہم نے بھروسہ کیا ہے^(۵) اور تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں اور تیری ہی

(۱) کفار سے عدم موالات کے مسئلے کی توضیح کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال دی جا رہی ہے اُسوۃ کے معنی ہوتے ہیں، ایسا نمونہ جس کی اقتدا کی جائے۔

(۲) یعنی شرک کی وجہ سے ہمارا اور تمہارا کوئی تعلق نہیں، اللہ کے پرستاروں کا بھلا غیر اللہ کے پجاریوں سے کیا تعلق؟

(۳) یعنی یہ علیحدگی اور بیزاری اس وقت تک رہے گی جب تک تم کفر و شرک چھوڑ کر توحید کو نہیں اپنالو گے۔ ہاں جب تم ایک اللہ کو ماننے والے بن جاؤ گے تو پھر یہ عداوت موالات میں اور یہ بغض محبت میں بدل جائے گا۔

(۴) یہ ایک اشتنا ہے جو نبی ابراہیم میں مقدر محذوف مضاف سے ہے۔ یعنی قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسُوۃً حَسَنَةً فِيْ مَقَالٰتِ اِبْرٰهِيْمَ اِلَّا قَوْلَهُ لَآ اِبْنِيْهٖ يٰ اُسُوۃً حَسَنَةً سے اشتنا ہے، اس لیے کہ قول بھی منجملہ اسوہ ہے۔ گویا کہا جا رہا ہے۔ (قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسُوۃً حَسَنَةً فِيْ اَقْوَالِهِ وَاَفْعَالِهِ اِلَّا قَوْلَهُ لَآ اِبْنِيْهٖ) (فتح القدیر) مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی ایک قابل تقلید نمونہ ہے، البتہ ان کا اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا کرنا ایک ایسا عمل ہے جس میں ان کی پیروی نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ ان کا یہ فعل اس وقت کا ہے جب ان کو اپنے باپ کی بابت علم نہیں تھا، چنانچہ جب ان پر یہ واضح ہو گیا کہ ان کا باپ اللہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اپنے باپ سے بھی اظہارِ براعت کر دیا، جیسا کہ سورۃ براءت ۱۱۳ میں ہے۔ (سورۃ براءت سورۃ توبہ کو کہا جاتا ہے)

(۵) توکل کا مطلب ہے۔ امکانی حد تک ظاہری اسباب و وسائل اختیار کرنے کے بعد معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ مطلب نہیں کہ ظاہری وسائل اختیار کیے بغیر ہی اللہ پر اعتماد اور توکل کا اظہار کیا جائے، اس سے ہمیں منع کیا گیا ہے، اس لیے توکل کا یہ مفہوم بھی غلط ہو گا۔ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اونٹ کو باہر کھڑا کر کے اندر

طرف لوٹنا ہے۔ (۳)

اے ہمارے رب! تو ہمیں کافروں کی آزمائش میں نہ ڈال^(۱) اور اے ہمارے پالنے والے ہماری خطاؤں کو بخش دے، بیشک تو ہی غالب، حکمت والا ہے۔ (۵)

یقیناً تمہارے لیے ان میں^(۲) اچھا نمونہ (اور عمدہ پیروی ہے خاص کر) ہر اس شخص کے لیے جو اللہ کی اور قیامت کے دن کی ملاقات کی امید رکھتا ہو،^(۳) اور اگر کوئی روگردانی کرے^(۴) تو اللہ تعالیٰ بالکل بے نیاز ہے اور

سزاوار حمد و ثنا ہے۔ (۶)

کیا عجب کہ عنقریب ہی اللہ تعالیٰ تم میں اور تمہارے دشمنوں میں محبت پیدا کر دے۔^(۵) اللہ کو سب قدر تیں

ہیں اور اللہ (بڑا) غفور رحیم ہے۔ (۷)

جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَاعْتَصِمْنَا بِكَ إِنَّا نَعْتَمِدُ
الْعَرْشَ الْحَكِيمَ ۝

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهَا آسَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ
الْآخِرَ وَمَن يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ السَّمِيدُ ۝

عَسَى اللَّهُ أَن يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ كَادِبْتُمْ بِهِمْ مَوَدَّةً
وَاللَّهُ قَدِيرٌ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

لَا يَهْتَكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا كَانُوا فِي الدِّينِ

آگیا، آپ ﷺ نے پوچھا تو کہا میں اونٹ اللہ کے سپرد کر آیا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا۔ یہ توکل نہیں ہے۔ «أَعْقِلْ وَتَوَكَّلْ» پہلے اسے کسی چیز سے باندھ، پھر اللہ پر بھروسہ کر۔ (ترمذی) انابت کا مطلب ہے، اللہ کی طرف رجوع کرنا۔

(۱) یعنی کافروں کو ہم پر غلبہ و تسلط عطا نہ فرما، اس طرح وہ سمجھیں گے کہ وہ حق پر ہیں، اور یوں ہم ان کے لیے فتنے کا باعث بن جائیں گے یا یہ مطلب ہے کہ ان کے ہاتھوں یا اپنی طرف سے ہمیں کسی سزا سے دوچار نہ کرنا، اس طرح بھی ہمارا وجود ان کے لیے فتنہ بن جائے گا، وہ کہیں گے کہ اگر یہ حق پر ہوتے تو ان کو یہ تکلیف کیوں پہنچتی؟

(۲) یعنی ابراہیم علیہ السلام کے اور ان کے ساتھی اہل ایمان میں۔ یہ تکرار تاکید کے لیے ہے۔

(۳) کیونکہ ایسے ہی لوگ اللہ سے اور عذابِ آخرت سے ڈرتے ہیں، یہی لوگ حالات و واقعات سے عبرت پکڑتے اور نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

(۴) یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوے کو اپنانے سے گریز کرے۔

(۵) یعنی ان کو مسلمان کر کے تمہارا بھائی اور ساتھی بنا دے، جس سے تمہارے مابین عداوت، دوستی اور محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، فتح مکہ کے بعد لوگ فوج در فوج مسلمان ہونا شروع ہو گئے اور ان کے مسلمان ہوتے ہی نفرتیں، محبت میں تبدیل ہو گئیں، جو مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے، وہ دست و بازو بن گئے۔

وَأَمْ يَخْرُجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَ تُقْسِبُوا
إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِبِينَ ﴿۱﴾

لڑی (۱) اور تمہیں جلا وطن نہیں کیا (۲) ان کے ساتھ سلوک و احسان کرنے اور منصفانہ بھلے برتاؤ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں روکتا، (۳) بلکہ اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ (۴) (۸)

اللہ تعالیٰ تمہیں صرف ان لوگوں کی محبت سے روکتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائیاں لڑیں اور تمہیں دیس نکالے دیئے اور دیس نکالا دینے والوں کی مدد کی جو لوگ ایسے کفار سے محبت کریں (۵) وہ (قطعاً) ظالم ہیں۔ (۶) (۹)

إِنَّمَا يَنْهَى اللَّهُ مِنَ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُواكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۱﴾

(۱) یہ ان کافروں کے بارے میں ہدایات دی جا رہی ہیں جو مسلمانوں سے محض دین اسلام کی وجہ سے بغض و عداوت نہیں رکھتے اور اس بنیاد پر مسلمانوں سے نہیں لڑتے، یہ پہلی شرط ہے۔

(۲) یعنی تمہارے ساتھ ایسا رویہ بھی اختیار نہیں کیا کہ تم ہجرت پر مجبور ہو جاؤ۔ یہ دوسری شرط ہے۔ ایک تیسری شرط یہ ہے جو اگلی آیت سے واضح ہوتی ہے، کہ وہ مسلمانوں کے خلاف دوسرے کافروں کو کسی قسم کی مدد بھی نہ پہنچائیں۔ مشورے اور رائے سے اور نہ ہتھیاروں وغیرہ کے ذریعے سے۔

(۳) یعنی ایسے کافروں سے احسان اور انصاف کا معاملہ کرنا ممنوع نہیں ہے۔ جیسے حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی مشرکہ ماں کی بابت صلہ رحمی یعنی حسن سلوک کرنے کا پوچھا، آپ ﷺ نے فرمایا: صَلِّئِي أُمَّتِكَ (صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقة والصدقة علی الأقربین.... بخاری، کتاب الأدب، باب صلة الوالد المشرك، "اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔"

(۴) اس میں انصاف کرنے کی ترغیب ہے حتیٰ کہ کافروں کے ساتھ بھی۔ حدیث میں انصاف کرنے والوں کی فضیلت یوں بیان ہوئی ہے «إِنَّ الْمُقْسِبِينَ عِنْدَ اللَّهِ، عَلَىٰ مَنَابِرٍ مِّنْ نُورٍ، عَنِ يَمِينِ الرَّحْمَنِ عَزَّ وَجَلَّ - وَكَلْنَا يَدَيْهِ يَمِينٌ - الَّذِينَ يَدْعُونَ فِي حُكْمِهِمْ وَأَهْلِيهِمْ، وَمَا وُلُّوا» (صحیح مسلم، کتاب الإمامة، باب فضيلة الإمام العادل، "انصاف کرنے والے نور کے منبروں پر ہوں گے جو رحمن کے دائیں جانب ہوں گے اور رحمن کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں، جو اپنے فیصلوں میں اپنے اہل میں اور اپنی رعایا میں انصاف کا اہتمام کرتے ہیں"

(۵) یعنی ارشاد الہی اور امر ربانی سے اعراض کرتے ہوئے۔

(۶) کیوں کہ انہوں نے ایسے لوگوں سے محبت کی ہے جو محبت کے اہل نہیں تھے، اور یوں انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا کہ انہیں اللہ کے عذاب کے لیے پیش کر دیا۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ (المائدة: ۵۱)

اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو تم ان کا امتحان لو۔^(۱) دراصل ان کے ایمان کو بخوبی جاننے والا تو اللہ ہی ہے لیکن اگر وہ تمہیں ایمان والیاں معلوم ہوں^(۲) تو اب تم انہیں کافروں کی طرف واپس نہ کرو، یہ ان کے لیے حلال نہیں اور نہ وہ ان کے لیے حلال ہیں،^(۳) اور جو خرچ ان کافروں کا ہوا ہو وہ انہیں ادا کرو،^(۴) ان عورتوں کو ان کے مہر دے کر ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں^(۵)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَيَّبَاتٍ فَأَمْتَحِنُوهُنَّ إِنَّهُنَّ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَحْسَبُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ لَأَهْلُنَّ جُنَّ لَهُمْ وَلَا يُحْسِبُونَ لَهُنَّ ذُنُوهُنَّ مَا أَتَقَفُوا وَلَإِيْمَانَهُمْ عَلَيْكُمْ أَنْ تَسْئَلُوهُنَّ إِذَا تَيَمَّمْتُمُوهُنَّ الْبُيُوتَ وَلَا تَسْئَلُوهُنَّ الْكُفْرَ وَلَا تَسْئَلُوهُنَّ مَا أَنْفَقُوا وَلَا تَسْئَلُوهُنَّ مَا أَنْفَقُوا وَلَيْسَ لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْكُمْ شَيْءٌ ۝

(۱) معاہدہ حدیبیہ میں ایک شق یہ تھی کہ مکے سے کوئی مسلمانوں کے پاس چلا جائے گا تو اس کو واپس کرنا پڑے گا۔ لیکن اس میں مرد و عورت کی صراحت نہیں تھی۔ بظاہر ”کوئی“ (أَحَدٌ) میں دونوں ہی شامل تھے۔ چنانچہ بعد میں بعض عورتیں مکے سے ہجرت کر کے مسلمانوں کے پاس چلی گئیں تو کفار نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا، جس پر اللہ نے اس آیت میں مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی اور یہ حکم دیا۔ امتحان لینے کا مطلب ہے اس امر کی تحقیق کرو کہ ہجرت کر کے آنے والی عورت جو ایمان کا اظہار کر رہی ہے، اپنے کافر خاوند سے ناراض ہو کر یا کسی مسلمان کے عشق میں یا کسی اور غرض سے تو نہیں آئی ہے اور صرف یہاں پناہ لینے کی خاطر ایمان کا دعویٰ کر رہی ہے۔

(۲) یعنی تم اپنی تحقیق سے اس نتیجے پر پہنچو اور تمہیں گمان غالب حاصل ہو جائے کہ یہ واقعی مومنہ ہیں۔
(۳) یہ انہیں ان کے کافر خاوندوں کے پاس واپس نہ کرنے کی علت ہے کہ اب کوئی مومن عورت کسی کافر کے لیے حلال نہیں۔ جیسا کہ ابتدائے اسلام میں یہ جائز تھا، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح ابو العاص ابن ربیع کے ساتھ ہوا تھا، جب کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ لیکن اس آیت نے آئندہ کے لیے ایسا کرنے سے منع کر دیا، اسی لیے یہاں فرمایا گیا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے حلال نہیں، اس لیے انہیں کافروں کے پاس مت لوٹاؤ۔ ہاں اگر شوہر بھی مسلمان ہو جائے تو پھر ان کا نکاح برقرار رہ سکتا ہے۔ چاہے خاوند عورت کے بعد ہجرت کر کے آئے۔

(۴) یعنی ان کے کافر خاوندوں نے ان کو جو مہر ادا کیا ہے، وہ تم انہیں ادا کرو۔
(۵) یہ مسلمانوں کو کہا جا رہا ہے کہ یہ عورتیں جو ایمان کی خاطر اپنے کافر خاوندوں کو چھوڑ کر تمہارے پاس آگئی ہیں، تم ان سے نکاح کر سکتے ہو، بشرطیکہ ان کا حق مہر تم ادا کرو۔ تاہم یہ نکاح مسنون طریقے سے ہی ہو گا۔ یعنی ایک تو انقضائے عدت (استبراء رحم) کے بعد ہو گا۔ دوسرے، اس میں ولی کی اجازت اور دو عادل گواہوں کی موجودگی بھی ضروری ہے۔ البتہ عورت مدخول بہا نہیں ہے تو پھر بلا عدت فوری نکاح جائز ہے۔

اور کافر عورتوں کی ناموس اپنے قبضہ میں نہ رکھو^(۱) اور جو کچھ تم نے خرچ کیا ہو،^(۲) مانگ لو اور جو کچھ ان کافروں نے خرچ کیا ہو^(۳) وہ بھی مانگ لیں یہ اللہ کا فیصلہ ہے جو تمہارے درمیان کر رہا ہے،^(۴) اللہ تعالیٰ بڑے علم (اور) حکمت والا ہے۔ (۱۰)

اور اگر تمہاری کوئی بیوی تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور کافروں کے پاس چلی جائے پھر تمہیں اس کے بدلے کا وقت مل جائے^(۵) تو جن کی بیویاں چلی گئی ہیں انہیں ان کے اخراجات کے برابر ادا کر دو، اور اس اللہ تعالیٰ

وَلَنْ قَاتِلَكُمْ مِنْ آذْوَابِكُمْ إِلَى الْكُفْرِ فَعَايَبْتُمْ قَاتِلُوا
الَّذِينَ ذَهَبَتْ آذْوَابُكُمْ وَيَمَلَّ مَا أَتَقَفُوا وَأَتَقُوا اللَّهَ الَّذِي
أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿۱۰﴾

(۱) عِصْمٌ عِصْمَةٌ کی جمع ہے، یہاں اس سے مراد عصمت عقد نکاح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر خاوند مسلمان ہو جائے اور بیوی بدستور کافر اور مشرک رہے تو ایسی مشرک عورت کو اپنے نکاح میں رکھنا جائز نہیں ہے۔ اسے فوراً طلاق دے کر اپنے سے علیحدہ کر دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی دو مشرک بیویوں کو اور حضرت طلحہ ابن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ (ابن کثیر) البتہ اگر بیوی کتابیہ (یہودی یا عیسائی) ہو تو اسے طلاق دینا ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ ان سے نکاح جائز ہے، اس لیے اگر وہ پہلے سے ہی بیوی کی حیثیت سے تمہارے پاس موجود ہے تو قبول اسلام کے بعد اسے علیحدہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) یعنی ان عورتوں پر جو کفر پر برقرار رہنے کی وجہ سے کافروں کے پاس چلی گئی ہیں۔

(۳) یعنی ان عورتوں پر جو مسلمان ہو کر ہجرت کر کے مدینے آگئی ہیں۔

(۴) یعنی یہ حکم مذکور کہ دونوں ایک دوسرے کو حق مہر ادا کریں بلکہ مانگ کر لیں، اللہ کا حکم ہے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس دور کے ساتھ ہی خاص تھا۔ اس پر مسلمانوں کا جماع ہے۔ (فتح القدیر) اس کی وجہ وہ معاہدہ ہے جو اس وقت فریقین کے درمیان تھا۔ اس قسم کے معاہدے کی صورت میں آئندہ بھی اس پر عمل کرنا ضروری ہو گا۔ بصورت دیگر نہیں۔

(۵) فَعَايَبْتُمْ (پس تم سزا دو یا بدلہ لو) کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ مسلمان ہو کر آنے والی عورتوں کے حق مہر جو تمہیں ان کے کافر شوہروں کو ادا کرنے تھے، وہ تم ان مسلمانوں کو دے دو، جن کی عورتیں کافر ہونے کی وجہ سے کافروں کے پاس چلی گئی ہیں۔ اور انہوں نے مسلمانوں کو مہر ادا نہیں کیا۔ (یعنی یہ بھی سزا کی ایک صورت ہے) دو سرا مفہوم یہ ہے کہ تم کافروں سے جہاد کرو اور جو مال غنیمت حاصل ہو، اس میں تقسیم سے پہلے ان مسلمانوں کو، جن کی بیویاں دارالکفر چلی گئی ہیں، ان کے خرچ کے بقدر ادا کر دو۔ گویا مال غنیمت سے مسلمانوں کے نقصان کا جبر (ازالہ) یہ بھی سزا ہے (ایسراف التفسیر) اور ابن کثیر (ایسراف التفسیر) سے بھی ازالہ کی صورت نہ ہو تو بہت المال سے تعاون کیا جائے۔ (ایسراف التفسیر)

سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔ (۱۱)

اے پیغمبر! جب مسلمان عورتیں آپ سے ان باتوں پر بیعت کرنے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا کاری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی اور کوئی ایسا ہستان نہ باندھیں گی جو خود اپنے ہاتھوں بیروں کے سامنے گھڑ لیں اور کسی نیک کام میں تیری بے حکمی نہ کریں گی تو آپ ان سے بیعت کر لیا کریں،^(۱) اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کریں بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے اور معاف کرنے والا ہے۔ (۱۲)

اے مسلمانو! تم اس قوم سے دوستی نہ رکھو جن پر اللہ کا غضب نازل ہو چکا ہے^(۲) جو آخرت سے اس طرح مایوس

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَ أَلَاؤُ الْمُؤْمِنَاتِ يُبَايِعَنَّكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِيهِ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَهْبِئْنَ فِيكَ فِي مَعْرُوفٍ مَّيْبَعُوهُنَّ وَأَسْتَعِزَّ لَكُنَّ لِلَّهِ رِئَاءَ اللَّهِ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿۱۱﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَلَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْبَيْتِ وَمَنْ كُنْتُمْ عَلَيْهِمْ

(۱) یہ بیعت اس وقت لیتے جب عورتیں ہجرت کر کے آئیں، جیسا کہ صحیح بخاری تفسیر سورہ ممتحنہ میں ہے۔ علاوہ ازیں فتح مکہ والے دن بھی آپ ﷺ نے قریش کی عورتوں سے بیعت لی۔ بیعت لیتے وقت آپ ﷺ صرف زبان سے عمد لیتے۔ کسی عورت کے ہاتھ کو آپ ﷺ نہیں چھوتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ”اللہ کی قسم بیعت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ نے کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا۔ بیعت کرتے وقت آپ ﷺ صرف یہ فرماتے کہ میں نے ان باتوں پر تجھ سے بیعت لے لی۔“ (صحیح البخاری تفسیر سورہ الممتحنہ) بیعت میں آپ ﷺ یہ عمد بھی عورتوں سے لیتے تھے کہ وہ نوحہ نہیں کریں گی، گریبان چاک نہیں کریں گی، سر کے بال نہیں نوچیں گی اور جاہلیت کی طرح بین نہیں کریں گی۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم وغیرہما) اس بیعت میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ کا ذکر نہیں ہے، اس لیے کہ یہ ارکان دین اور شعائر اسلام ہونے کے اعتبار سے محتاج وضاحت نہیں۔ آپ ﷺ نے بطور خاص ان چیزوں کی بیعت لی جن کا عام ارتکاب عورتوں سے ہوتا تھا، تاکہ وہ ارکان دین کی پابندی کے ساتھ ان چیزوں سے بھی اجتناب کریں۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ علما و دعاة اور واعظین حضرات اپنا زور خطابت ارکان دین کے بیان کرنے میں ہی صرف نہ کریں جو پہلے ہی واضح ہیں، بلکہ ان خرابیوں اور رسموں کی بھی پر زور انداز میں تردید کیا کریں جو معاشرے میں عام ہیں اور نماز روزے کے پابند حضرات بھی ان سے اجتناب نہیں کرتے۔

(۲) اس سے بعض نے سیود، بعض نے منافقین اور بعض نے تمام کافر مراد لیے ہیں۔ یہ آخری قول ہی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اس میں سیود و منافقین بھی آجاتے ہیں، علاوہ ازیں سارے کفار ہی غضب الہی کے مستحق ہیں، اس لیے مطلب یہ ہو گا کہ کسی بھی کافر سے دوستانہ تعلق مت رکھو، جیسا کہ یہ مضمون قرآن میں کئی جگہ بیان کیا گیا ہے۔

الْقُبُورِ ۳

ہو چکے ہیں جیسے کہ مردہ اہل قبر سے کافر نامید ہیں۔^(۱) (۱۳)

سورہ صف مدنی ہے اور اس میں چودہ آیتیں اور
دور کوع ہیں۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

سَبَّحَهُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ①

زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتی ہے
اور وہی غالب حکمت والا ہے۔^(۱)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَعْمَلُونَ ②

اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے
نہیں۔^(۲)

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَعْمَلُونَ ③

تم جو کرتے نہیں اس کا کہنا اللہ تعالیٰ کو سخت
ناپسند ہے۔^(۳)

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًا كَانَهُمْ

بیٹھ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی

(۱) آخرت سے مایوس ہونے کا مطلب، قیامت کے برپا ہونے سے انکار ہے۔ اصحاب القبور (قبروں میں مدفون لوگوں) سے مایوس ہونے کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ آخرت میں دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔ ایک دوسرے سے معنی اس کے یہ کیے گئے ہیں کہ قبروں میں مدفون کافر، ہر قسم کی خیر سے مایوس ہو گئے۔ کیونکہ مر کر انہوں نے اپنے کفر کا انجام دیکھ لیا، اب وہ خیر کی کیا توقع کر سکتے ہیں؟ (ابن جریر طبری)

☆ اس کی شان نزول میں آتا ہے کہ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم آپس میں بیٹھے کہہ رہے تھے کہ اللہ کو جو سب سے زیادہ پسندیدہ عمل ہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے چاہئیں تاکہ ان پر عمل کیا جاسکے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر پوچھنے کی جرأت کوئی نہیں کر رہا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمادی (مسند احمد ۵/۳۵۲، وسنن الترمذی تفسیر سورہ الصف)

(۲) یہاں ندا اگرچہ عام ہے لیکن اصل خطاب ان مومنوں سے ہے جو کہہ رہے تھے کہ ہمیں اَحَبُّ الْأَعْمَالِ کا علم ہو جائے تو ہم انہیں کریں، لیکن جب انہیں بعض پسندیدہ عمل بتلائے گئے تو ست ہو گئے۔ اس لیے ایسے لوگوں کو توبیح کی جا رہی ہے کہ خیر کی جو باتیں کہتے ہو، کرتے کیوں نہیں ہو، جو بات منہ سے نکالتے ہو، اسے پورا کیوں نہیں کرتے؟ جو زبان سے کہتے ہو، اس کی پاسداری کیوں نہیں کرتے؟

(۳) یہ اسی کی مزید تاکید ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں پر سخت ناراض ہوتا ہے۔

راہ میں صف بستہ جماد کرتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہیں۔^(۱) (۳)

اور (یاد کرو) جبکہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم کے لوگو! تم مجھے کیوں ستا رہے ہو حالانکہ تمہیں (بخوبی) معلوم ہے کہ میں تمہاری جانب اللہ کا رسول ہوں^(۲) پس جب وہ لوگ ٹیڑھے ہی رہے تو اللہ نے انکے دلوں کو (اور) ٹیڑھا کر دیا،^(۳) اور اللہ تعالیٰ نافرمان قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ (۵)

اور جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا اے (میری قوم) بنی اسرائیل! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں مجھ سے پہلے کی کتاب تورات کی میں تصدیق کرنے والا ہوں^(۴) اور اپنے بعد آنے والے ایک رسول کی میں تمہیں خوشخبری

بُيِّنَ مَرَّضُوهُمْ ⑤

وَاذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ لِمَ تُوذُّونَنِي وَقَدْ كَفَرْتُمْ مَعِيَ
رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ فَمَا آؤُاْءَاغْرَأُ اللَّهُ فُلُوكُمْ وَاللَّهُ لَكِنِّي
الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ⑤

وَاذْ قَالَ عِيسَىٰ ابْنُ مَرْيَمَ بَنِي إِسْرٰءِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي
مِن بَعْدِي اسْمًا أَحْمَدُ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بٰئِنْتِنَا قَالُوا

(۱) یہ جماد کا ایک انتہائی نیک عمل بتلایا گیا جو اللہ کو بہت محبوب ہے۔

(۲) یہ جانتے ہوئے بھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے سچے رسول ہیں، بنی اسرائیل انہیں اپنی زبان سے ایذا پہنچاتے تھے، حتیٰ کہ بعض جسمانی عیوب ان کی طرف منسوب کرتے تھے، حالانکہ وہ بیماری ان کے اندر نہیں تھی۔

(۳) یعنی علم کے باوجود حق سے اعراض کیا اور حق کے مقابلے میں باطل کو خیر کے مقابلے میں شر کو اور ایمان کے مقابلے میں کفر کو اختیار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی سزا کے طور پر ان کے دلوں کو مستقل طور پر ہدایت سے پھیر دیا۔ کیونکہ یہی سنت اللہ جلی آرہی ہے۔ کفر و ضلالت پر دوام و استمرار ہی دلوں پر مہر لگنے کا باعث ہوتا ہے، پھر فسق، کفر اور ظلم اس کی طبیعت اور عادت بن جاتی ہے، جس کو کوئی بدلنے پر قادر نہیں ہے۔ اسی لیے آگے فرمایا، اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو اپنی سنت کے مطابق گمراہ کیا ہوتا ہے، اب کون اسے ہدایت دے سکتا ہے جسے اس طریقے سے اللہ نے گمراہ کیا ہو؟

(۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ اس لیے بیان فرمایا کہ بنی اسرائیل نے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی، اسی طرح انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی انکار کیا، اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ یہ یہود آپ ﷺ ہی کے ساتھ اس طرح نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ان کی تو ساری تاریخ نبی انبیا علیہم السلام کی تکذیب سے بھری پڑی ہے۔ تورات کی تصدیق کا مطلب یہ ہے کہ میں جو دعوت دے رہا ہوں، وہ وہی ہے جو تورات کی بھی دعوت ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ جو پیغمبر مجھ سے پہلے تورات لے کر آئے اور اب میں انجیل لے کر آیا ہوں، ہم دونوں کا اصل ماخذ ایک ہی ہے۔ اس لیے جس طرح تم موسیٰ و ہارون اور داود و سلیمان علیہم السلام پر ایمان لائے، مجھ پر

سنانے والا ہوں جن کا نام احمد ہے۔^(۱) پھر جب وہ انکے پاس کھلی

دلیلیں لائے تو یہ کہنے لگے 'یہ تو کھلا جادو ہے۔' (۲)

اس شخص سے زیادہ ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ

(افترا) باندھے^(۳) حالانکہ وہ اسلام کی طرف بلایا جاتا

ہے^(۴) اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔ (۵)

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھادیں^(۵)

اور اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچانے والا ہے^(۶) گو کافر

برائیاں۔ (۸)

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے

کر بھیجا تاکہ اسے اور تمام مذاہب پر غالب کر دے^(۷)

هَذَا يَصْرُحُ بِمَعْنَى ①

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ وَهُوَ يُدْعَى إِلَى

الْإِسْلَامِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ②

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ الْبَيِّنَاتِ الَّتِي بَيَّنَّا لِلنَّاسِ لِيُخْرِجُوهُمْ مِنَ النُّورِ

وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ⑤

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظَاهِرَهُ عَلَى الْبَيِّنَاتِ

كُلِّهَا وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ①

بھی ایمان لاؤ، اس لیے کہ میں تورات کی تصدیق کر رہا ہوں نہ کہ اس کی تردید و تکذیب۔

(۱) یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد آنے والے آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی خوش خبری سنائی۔

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَنَا دَعْوَةُ أَبِي إِبْرَاهِيمَ وَبَشَارَةُ عِيسَى (أيسر العفاسير) "میں اپنے باپ

ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا مصداق ہوں۔" احمد 'یہ فاعل سے اگر مبالغے کا معنی ہو تو معنی

ہوں گے، دوسرے تمام لوگوں سے اللہ کی زیادہ حمد کرنے والا اور اگر یہ مفعول سے ہو تو معنی ہوں گے کہ آپ ﷺ کی

خوبیوں اور کمالات کی وجہ سے جتنی تعریف آپ ﷺ کی کی گئی، اتنی کسی کی بھی نہیں کی گئی۔ (فتح القدير)

(۲) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیش کردہ معجزات کو جادو سے تعبیر کیا، جس طرح گزشتہ قومیں بھی اپنے پیغمبروں کو

اسی طرح کستی رہی ہیں۔ بعض نے اس سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم لیے ہیں اور قَالُوا كَا فاعل کفار مکہ کو بنایا ہے۔

(۳) یعنی اللہ کی اولاد قرار دے، یا جو جانور اس نے حرام قرار نہیں دیئے، ان کو حرام باور کرائے۔

(۴) جو تمام دینوں میں اشرف اور اعلیٰ ہے، اس لیے جو شخص ایسا ہو، اس کو کب یہ زیب دیتا ہے کہ وہ کسی پر بھی افترا

گھڑے، چہ جائیکہ اللہ پر افترا باندھے؟

(۵) نور سے مراد قرآن، یا اسلام یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا دلائل و براہین ہیں۔ "منہ سے بجھادیں" کا مطلب، وہ طعن و

تشنیع کی باتیں ہیں جو ان کے مومنوں سے نکلتی تھیں۔

(۶) یعنی اس کو آفاق میں پھیلانے والا اور دوسرے تمام دینوں پر غالب کرنے والا ہے۔ دلائل کے لحاظ سے، یا مادی غلبے

کے لحاظ سے یا دونوں لحاظ سے۔

(۷) یہ گزشتہ بات ہی کی تائید ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے پھر دہرایا گیا ہے۔

اگرچہ مشرکین ناخوش ہوں۔^(۹) اے ایمان والو! کیا میں تمہیں وہ تجارت بتلا دوں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچالے؟^(۱۰) اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم میں علم ہو۔^(۱۱) اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف فرمادے گا اور تمہیں ان جنتوں میں پہنچائے گا جن کے نیچے نہرس جاری ہوں گی اور صاف ستھرے گھروں میں جو جنت عدن میں ہوں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔^(۱۲) اور تمہیں ایک دوسری (نعمت) بھی دے گا جسے تم چاہتے ہو وہ اللہ کی مدد اور جلد فتح یابی ہے،^(۱۳) ایمان والوں کو خوشخبری دے دو۔^(۱۳)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُجْنِبُكُمْ مِّنْ عَذَابِ أَلِيمٍ ۝

تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

يَعْرِضُ لَكُمُ الذُّكُورُ وَمِنْ ذُلِّكُمْ جَنَّتٌ مَّجْرَىٰ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَسَائِرٌ طَيِّبَةٌ فِي جَنَّتٍ عَدْنٍ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

وَأخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا تَصَدَّقُونَ بِاللَّهِ وَكَلِمَةً قَرِيبًا وَيَتَرَى الْمُؤْمِنِينَ ۝

(۱) تاہم یہ لامحالہ ہو کر رہے گا۔

(۲) اس عمل (یعنی ایمان اور جہاد) کو تجارت سے تعبیر کیا، اس لیے کہ اس میں بھی انہیں تجارت کی طرح ہی نفع ہو گا، اور وہ نفع کیا ہے؟ جنت میں داخلہ اور جہنم سے نجات۔ اس سے بڑا نفع اور کیا ہو گا، اور وہ نفع کیا ہے؟ اس بات کو دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّهُمْ لِيَوْمِئِذٍ لَّهُمْ الْجَنَّةُ﴾ (التوبة: ۱۱۱) ”اللہ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور مالوں کا سودا جنت کے بدلے میں کر لیا ہے۔“

(۳) یعنی جب تم اس کی راہ میں لڑو گے اور اس کے دین کی مدد کرو گے، تو وہ بھی تمہیں فتح و نصرت سے نوازے گا۔ ﴿إِن تَصَرُّوْا لِلَّهِ يَتَصَرَّكُمْ وَيَبِيَّتْ أَمَّاؤُكُمْ﴾ (سورۃ محمد: ۷) ﴿وَلَيَصْرُنَّ اللَّهُ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ لَأَنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ (الحج: ۴۰) آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں اسے فتح قریب، قرار دیا۔ اور اس سے مراد فتح مکہ ہے اور بعض نے فارس و روم کی عظیم الشان سلطنتوں پر مسلمانوں کے غلبے کو اس کا مصداق قرار دیا ہے۔ جو خلافت راشدہ میں مسلمانوں کو حاصل ہوا۔

(۴) جنت کی بھی، مرنے کے بعد۔ اور فتح و نصرت کی بھی، دنیا میں۔ بشرطیکہ اہل ایمان ایمان کے تقاضے پورے کرتے رہیں۔ ﴿وَأَن تَكُونُوا أَتَقْوُونَ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ﴾ (آل عمران: ۱۴۹) آگے اللہ تعالیٰ مومنوں کو اپنے دین کی نصرت کی مزید ترغیب دے رہا ہے۔

اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کے مددگار بن جاؤ۔^(۱) جس طرح حضرت مریم کے بیٹے حضرت عیسیٰ نے حواریوں سے فرمایا کہ کون ہے جو اللہ کی راہ میں میرا مددگار بنے؟ حواریوں نے کہا، ہم اللہ کی راہ میں مددگار ہیں،^(۲) پس بنی اسرائیل میں سے ایک جماعت تو ایمان لائی اور ایک جماعت نے کفر کیا^(۳) تو ہم نے مومنوں کی انکے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد کی پس وہ غالب آگئے۔^(۴) (۱۳)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنْصَارًا لِلَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ عَنْ أَنْصَارِ اللَّهِ فَأَنْتُمْ تَلْبِغُونَهُمْ مِنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَتَ طَلِيفَةٌ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ ﴿۱۳﴾

(۱) تمام حالتوں میں، اپنے اقوال و افعال کے ذریعے سے بھی اور جان و مال کے ذریعے سے بھی۔ جب بھی، جس وقت بھی اور جس حالت میں بھی تمہیں اللہ اور اس کا رسول اپنے دین کے لیے پکارے تم فوراً ان کی پکار پر لبیک کہو، جس طرح حواریین نے عیسیٰ علیہ السلام کی پکار پر لبیک کہا۔

(۲) یعنی ہم آپ ﷺ کے اس دین کی دعوت و تبلیغ میں مددگار ہیں جس کی نشرو اشاعت کا حکم اللہ نے آپ ﷺ کو دیا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایام حج میں فرماتے ”کون ہے جو مجھے پناہ دے تاکہ میں لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچا سکوں، اس لیے کہ قریش مجھے فریضہ رسالت ادا نہیں کرنے دیتے۔“ حتیٰ کہ آپ ﷺ کی اس پکار پر مدینے کے اوس اور خزرج نے لبیک کہا، آپ ﷺ کے ہاتھ پر انہوں نے بیعت کی اور آپ ﷺ کی مدد کا وعدہ کیا۔ نیز آپ ﷺ کو یہ پیشکش کی کہ اگر آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آجائیں تو آپ ﷺ کی حفاظت کی ذمہ داری ہم قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ جب آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو وعدے کے مطابق انہوں نے آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کے تمام ساتھیوں کی پوری مدد کی، حتیٰ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ان کا نام ہی ”انصار“ رکھ دیا اور اب یہ ان کا علم بن گیا۔ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَأَوْصَاهُمْ (ابن کثیر)

(۳) یہ یہود تھے جنہوں نے نبوت عیسیٰ علیہ السلام ہی کا انکار نہیں کیا بلکہ ان پر اور ان کی ماں پر بہتان تراشی کی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ اختلاف و تفرق اس وقت ہوا، جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھایا گیا۔ ایک نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے ہی زمین پر ظہور فرمایا تھا، اب وہ پھر آسمان پر چلا گیا ہے، یہ فرقہ یعقوبیہ کہلاتا ہے۔ نسطوریہ فرقے نے کہا کہ وہ ابن اللہ تھے، باپ نے بیٹے کو آسمان پر بلا لیا ہے۔ تیسرے فرقے نے کہا وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے، یہی فرقہ صحیح تھا۔

(۴) یعنی نبی ﷺ کو معوث فرما کر ہم نے اسی آخری جماعت کی، دوسرے باطل گروہوں کے مقابلے میں مدد کی۔ چنانچہ یہ صحیح عقیدے کی حامل جماعت نبی ﷺ پر بھی ایمان لے آئی اور یوں ہم نے ان کو دلائل کے لحاظ سے بھی سب کافروں پر غلبہ عطا فرمایا اور قوت و سلطنت کے اعتبار سے بھی۔ اس غلبے کا آخری ظہور اس وقت پھر ہوگا، جب قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ نزول ہوگا، جیسا کہ اس نزول اور غلبے کی صراحت احادیث صحیحہ میں تو اتر کے ساتھ منقول ہے۔

سورہ جمعہ مدنی ہے اور اس میں گیارہ آیتیں اور
دو رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

(ساری چیزیں) جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اللہ تعالیٰ کی
پاکی بیان کرتی ہیں (جو) بادشاہ نہایت پاک (ہے) غالب و
با حکمت ہے۔ (۱)

وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں (۱) میں ان ہی میں سے
ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنا تا ہے
اور ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا
ہے۔ یقیناً یہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (۲)
اور دوسروں کے لیے بھی انہی میں سے جو اب تک ان
سے نہیں (۳) ملے۔ اور وہی غالب با حکمت ہے۔ (۳)



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَسْمِعُ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ الْمَلِكِ الْقَدِيمِ

الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ①

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبِينَ قَبْلَ لُقْمَانَ صَالِحٍ مُبِينٍ ②

وَالْآخِرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ③

☆ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز میں سورہ جمعہ اور منافقون پڑھا کرتے تھے، (صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب ما یقرأ فی صلوة الجمعة)، تاہم ان کا جمعہ کی رات کو عشا کی نماز میں پڑھنا صحیح روایت سے ثابت نہیں۔ البتہ ایک ضعیف روایت میں ایسا آتا ہے۔ (اللسان المیزان لابن حجر ترجمۃ سعید بن سما لثین حرب)

(۱) اُمِّيِّينَ سے مراد عرب ہیں جن کی اکثریت ان پڑھ تھی۔ ان کے خصوصی ذکر کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ کی رسالت دوسروں کے لیے نہیں تھی، لیکن چونکہ اولین مخاطب وہ تھے، اس لیے اللہ کا ان پر یہ زیادہ احسان تھا۔

(۲) یہ اُمِّيِّينَ پر عطف ہے یعنی بَعَثَ فِي الْآخِرِينَ مِنْهُمْ آخِرِينَ سے فارس اور دیگر غیر عرب لوگ ہیں جو قیامت تک آپ ﷺ پر ایمان لانے والے ہوں گے۔ بعض کہتے ہیں کہ عرب و عجم کے وہ تمام لوگ ہیں جو عہد صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے بعد قیامت تک ہوں گے چنانچہ اس میں فارس، روم، بربڑ، سوڈان، ترک، مغول، کرد، چینی اور اہل ہند وغیرہ سب آجاتے ہیں۔ یعنی آپ ﷺ کی نبوت سب کے لیے ہے چنانچہ یہ سب ہی آپ ﷺ پر ایمان لائے۔ اور اسلام لانے کے بعد یہ بھی منہم کا مصداق یعنی اولین اسلام لانے والے اُمِّيِّينَ میں سے ہو گئے کیونکہ تمام مسلمان امت واحدہ ہیں۔ اسی ضمیر کی وجہ سے بعض کہتے ہیں کہ آخِرین سے مراد بعد میں ہونے والے عرب ہیں کیونکہ منہم کی ضمیر کا مرجع اُمِّيِّينَ ہیں۔ (فتح القدیر)

یہ اللہ کا فضل ہے^(۱) جسے چاہے اپنا فضل دے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل کا مالک ہے۔ (۳)

جن لوگوں کو تورات پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا پھر انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہو۔^(۲) اللہ کی باتوں کو جھٹلانے والوں کی بڑی بڑی مثال ہے اور اللہ (ایسے) ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ (۵)

کہہ دیجئے کہ اے یہودیو! اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ تم اللہ کے دوست ہو دوسرے لوگوں کے سوا^(۳) تو تم موت کی تمنا کرو^(۴) اگر تم سچے ہو۔^(۵) (۶)

ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۳﴾

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِلُوا الصَّالَةَ لَمْ آلُفُوا يَحْمِلُوا صَالَتِ الْمَسَارِعِ مِثْلَ مُسَدِّقَاتٍ يَسَّرْنَ لَكُمُ الصَّالَةَ لَئِنْ كَذَبْتُمْ عَلَيْهَا لَأَنْتُمْ لَمُبْدُونَ ﴿۴﴾

قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنْتُمْ آدَمِيَّةٌ مِنْ دُونِ

النَّاسِ فَتَمَتَّعُوا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۵﴾

(۱) یہ اشارہ نبوت محمدی (عَلَى صَاحِبِهَا الصَّلَاةُ وَالتَّحِيَّةُ) کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور اس پر ایمان لانے والوں کی طرف بھی۔

(۲) اَسْفَارًا، سَفَرُ کی جمع ہے۔ معنی ہیں بڑی کتاب۔ کتاب جب پڑھی جاتی ہے تو انسان اس کے معنوں میں سفر کرتا ہے۔ اس لیے کتاب کو بھی سفر کہا جاتا ہے (فتح القدر) یہ بے عمل یہودیوں کی مثال بیان کی گئی ہے کہ جس طرح گدھے کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی کمر پر جو کتابیں لدی ہوئی ہیں، ان میں کیا لکھا ہوا ہے؟ یا اس پر کتابیں لدی ہوئی ہیں یا کوڑا کرکت۔ اسی طرح یہ یہودی ہیں یہ تورات کو تو اٹھائے پھرتے ہیں، اس کو پڑھنے اور یاد کرنے کے وعدے بھی کرتے ہیں، لیکن اسے سمجھتے ہیں نہ اس کے مقتضایہ عمل کرتے ہیں، بلکہ اس میں تاویل و تحریف اور تغیر و تبدل سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے یہ حقیقت میں گدھے سے بھی بدتر ہیں، کیونکہ گدھا تو پیدائشی طور پر فہم و شعور سے ہی عاری ہوتا ہے، جب کہ ان کے اندر فہم و شعور ہے لیکن یہ اسے صحیح طریقے سے استعمال نہیں کرتے۔ اسی لیے آگے فرمایا کہ ان کی بڑی بڑی مثال ہے۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا، ﴿أُولَٰئِكَ كَالْأَعْمَىٰ بَلْ يُرَىٰ لِلْإِنسَانِ لِمَ لَا يَشْكُرُ﴾ (الأعراف، ۷۹) ”یہ چوپائے کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔“ یہی مثال مسلمانوں کی اور بالخصوص علما کی ہے جو قرآن پڑھتے ہیں، اسے یاد کرتے ہیں اور اس کے معانی و مطالب کو سمجھتے ہیں، لیکن اس کے مقتضایہ عمل نہیں کرتے۔

(۳) جیسے وہ کہا کرتے تھے کہ ”ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔“ (المائدہ، ۱۸) اور دعویٰ کرتے تھے کہ ”جنت میں صرف وہی جائے گا جو یہودی یا نصرانی ہو گا۔“ (البقرہ، ۱۱۱)

(۴) تاکہ تمہیں وہ اعزاز و اکرام حاصل ہو جو تمہارے زعم کے مطابق تمہارے لیے ہونا چاہیے۔

(۵) اس لیے کہ جس کو یہ علم ہو کہ مرنے کے بعد اس کے لیے جنت ہے، وہ تو وہاں جلد پہنچنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ حافظ ابن

یہ کبھی بھی موت کی تمنا نہ کریں گے بوجہ ان اعمال کے جو اپنے آگے اپنے ہاتھوں بھیج رکھے ہیں ^(۱) اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ (۷)

کہہ دیجئے! کہ جس موت سے تم بھاگتے پھرتے ہو وہ تو تمہیں پہنچ کر رہے گی پھر تم سب چھپے کھلے کے جاننے والے (اللہ) کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور وہ تمہیں تمہارے کیے ہوئے تمام کام بتا دے گا۔ (۸)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! جمعہ کے دن نماز کی اذان دی جائے تو تم اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ ^(۲) یہ تمہارے حق میں بہت ہی

وَلَا يَمُنُّونَ إِلَّا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝

قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَشْرُونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مِثْلِكُمْ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ طَيْرٍ عَقِيبٍ وَالشَّهَادَةُ فَيُنْفِثُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَادَىٰ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

کثیر نے اس کی تفسیر دعوتِ مباہلہ سے کی ہے۔ یعنی اس میں ان سے کہا گیا ہے کہ اگر تم نبوتِ محمدیہ کے انکار اور اپنے دعوئے ولایت و محبیت میں سچے ہو تو مسلمانوں کے ساتھ مباہلہ کرو۔ یعنی مسلمان اور یہودی دونوں مل کر بارگاہِ الہی میں دعا کریں کہ یا اللہ ہم دونوں میں سے جو جھوٹا ہے اسے موت سے ہمکنار فرما دے۔ (دیکھئے سورہ بقرہ ۹۳ کا حاشیہ)

(۱) یعنی کفر و معاصی اور کتابِ الہی میں تحریف و تغیر کا جو ارتکاب یہ کرتے رہے ہیں، ان کے باعث کبھی بھی یہ موت کی آرزو نہیں کریں گے۔

(۲) یہ اذان کس طرح دی جائے، اس کے الفاظ کیا ہوں؟ یہ قرآن میں کہیں نہیں ہے۔ البتہ حدیث میں ہے جس سے معلوم ہوا کہ حدیث کے بغیر قرآن کو سمجھنا ممکن ہے نہ اس پر عمل کرنا ہی۔ جمعہ کو جمعہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس دن اللہ تعالیٰ ہر چیز کی پیدائش سے فارغ ہو گیا تھا، یوں گویا تمام مخلوقات کا اس دن اجتماع ہو گیا، یا نماز کے لیے لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے اس بنا پر کہتے ہیں۔ (فتح القدر) فَاسْعَوْا کا مطلب یہ نہیں کہ دوڑ کر آؤ، بلکہ یہ ہے کہ اذان کے فوراً بعد آجاؤ اور کاروبار بند کر دو۔ کیونکہ نماز کے لیے دوڑ کر آنا ممنوع ہے، وقار اور سکینت کے ساتھ آنے کی تاکید کی گئی ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب الأذان و صحیح مسلم، کتاب المساجد)

بعض حضرات نے ذَرُّوا النَّبِيْعَ (خرید و فروخت چھوڑ دو) سے استدلال کیا ہے کہ جمعہ صرف شہروں میں فرض ہے، اہل دیہات پر نہیں۔ کیونکہ کاروبار اور خرید و فروخت شہروں میں ہی ہوتی ہے، دیہاتوں میں نہیں۔ حالانکہ اول تو دنیا میں کوئی گاؤں ایسا نہیں جہاں خرید و فروخت اور کاروبار نہ ہوتا ہو، اس لیے یہ دعویٰ ہی خلاف واقعہ ہے۔ دو سرائیج اور کاروبار سے مطلب، دنیا کے مشاغل ہیں، وہ جیسے بھی اور جس قسم کے بھی ہوں۔ اذان جمعہ کے

بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ (۹)

پھر جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو^(۱) اور بکثرت اللہ کا ذکر کیا کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (۱۰)

اور جب کوئی سودا بکتا دیکھیں یا کوئی تماشا نظر آجائے تو اس کی طرف دوڑ جاتے ہیں اور آپ کو کھڑا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔^(۲) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کے پاس جو ہے^(۳) وہ کھیل اور تجارت سے بہتر ہے۔^(۴) اور اللہ تعالیٰ بہترین روزی رساں ہے۔^(۵) (۱۱)

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَبِهُوا فِي الْأَرْضِ وَأَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا لِلَّهِ كَثِيرًا عَالَمِكُمْ مُتَعِلِّقُونَ ﴿۱۰﴾

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا لَانَفْسَهُمَا وَتَرَكُوا قُلُوبَهُمْ
فَلَمَّا عِنْدَ اللَّهِ حَيُّونَ مِنَ اللَّهِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللَّهُ
خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿۱۱﴾

بعد انہیں ترک کر دیا جائے۔ کیا اہل دیہات کے مشاغل دنیا نہیں ہوتے؟ کیا کھیتی باڑی، کاروبار اور مشاغل دنیا سے مختلف چیز ہے؟

(۱) اس سے مراد کاروبار اور تجارت ہے۔ یعنی نماز جمعہ سے فارغ ہو کر تم پھر اپنے اپنے کاروبار اور دنیا کے مشاغل میں مصروف ہو جاؤ۔ مقصد اس امر کی وضاحت ہے کہ جمعہ کے دن کاروبار بند رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف نماز کے وقت ایسا کرنا ضروری ہے۔

(۲) ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعے کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک قافلہ آگیا، لوگوں کو پتہ چلا تو خطبہ چھوڑ کر باہر خرید و فروخت کے لیے چلے گئے کہ کہیں سامان فروخت ختم نہ ہو جائے صرف ۱۲ آدمی مسجد میں رہ گئے۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الجمعۃ، صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ، باب وإذا رأوا تجارۃ أو لہوا...) اَنْفِضَا ضُ کے معنی ہیں، مائل اور متوجہ ہونا، دوڑ کر منتشر ہو جانا۔ اِلَيْهَا میں ضمیر کا مرجع تِجَارَةٌ ہے۔ یہاں صرف ضمیر تجارت پر اکتفا کیا، اس لیے کہ جب تجارت بھی، باوجود جائز اور ضروری ہونے کے، دوران خطبہ مذموم ہے تو کھیل وغیرہ کے مذموم ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ علاوہ ازیں قَائِمًا سے معلوم ہوا کہ خطبہ جمعہ کھڑے ہو کر دینا سنت ہے۔ چنانچہ حدیث میں بھی آتا ہے کہ آپ ﷺ کے دو خطبے ہوتے تھے، جن کے درمیان آپ ﷺ بیٹھتے تھے، قرآن پڑھتے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت فرماتے۔ (صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ)

(۳) یعنی اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کی اطاعت کی جو جزائے عظیم ہے۔

(۴) جس کی طرف تم دوڑ کر گئے اور مسجد سے نکل گئے اور خطبہ جمعہ کی سماعت بھی نہیں کی۔

(۵) پس اسی سے روزی طلب کرو اور اطاعت کے ذریعے سے اسی کی طرف وسیلہ پکڑو۔ اس کی اطاعت اور اس کی طرف انابت تحصیل رزق کا بہت بڑا سبب ہے۔

سورۃ منافقون مدنی ہے اور اس میں گیارہ آیتیں اور دو رکوع ہیں۔



شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

تیرے پاس جب منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ بیشک آپ اللہ کے رسول ہیں،^(۱) اور اللہ جانتا ہے کہ یقیناً آپ اس کے رسول ہیں۔^(۲) اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعاً جھوٹے ہیں۔^(۳) انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے^(۴) پس اللہ کی راہ سے رک گئے^(۵) بیشک برا ہے وہ کام جو یہ کر رہے ہیں۔^(۶)

یہ اس سبب سے ہے کہ یہ ایمان لا کر پھر کافر ہو گئے^(۷) پس ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی۔ اب یہ نہیں سمجھتے۔^(۸) جب آپ انہیں دیکھ لیں تو ان کے جسم آپ کو خوشنا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِذْ اٰجَاءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَحْمَدُكَ لَوْ سُوْلَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَمٰكُرُ اِنَّا لَنَرٰكَ لِرَسُوْلِهِ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱

اِنۡحَدُوْا اَيۡمَانَهُمْ جَنَّةً مَّصَدُوْعًا عَنۡ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَنۡتُمْ سَاكِنُوْنَ اَيۡمَانُوْنَ ۝۲

ذٰلِكَ يۡاَيۡمَانُكُمْ اَمۡنُوۡا لِمَنۡ كَفَرُوْا قَطِيْعَةً عَلٰۤىۤ اَقۡلُوْبِهِمْ فَهَمۡ لَاقِفَتَهُوْنَ ۝۳
وَ اِذَا رَاۡتَهُمْ تُعۡجِبُكُمْ اَجۡسَامُهُمْ وَاَنْ قُوْلُوْا سَمِعۡنَا بِقُوْلِهِمْ كَاۡنَهُمْ

(۱) منافقین سے مراد عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ہیں۔ یہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو قسمیں کھا کھا کر کہتے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

(۲) یہ جملہ متضاد ہے جو مضمون ماقبل کی تاکید کے لیے ہے جس کا اظہار منافقین بطور منافق کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ تو ویسے ہی زبان سے کہتے ہیں، ان کے دل اس یقین سے خالی ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ آپ ﷺ واقعی اللہ کے رسول ہیں۔

(۳) اس بات میں کہ وہ دل سے آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دیتے ہیں۔ یعنی دل سے گواہی نہیں دیتے صرف زبان سے دھوکہ دینے کے لیے اظہار کرتے ہیں۔

(۴) یعنی وہ جو قسم کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تمہاری طرح مسلمان ہیں اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، انہوں نے اپنی اس قسم کو ڈھال بنا رکھا ہے اس کے ذریعے سے وہ تم سے بچے رہتے ہیں اور کافروں کی طرح یہ تمہاری تلواروں کی زد میں نہیں آتے۔

(۵) دوسرا ترجمہ ہے کہ انہوں نے شک و شبہات پیدا کر کے لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکا۔

(۶) اس سے معلوم ہوا کہ منافقین بھی صریح کافر ہیں۔

معلوم ہوں،^(۱) یہ جب باتیں کرنے لگیں تو آپ ان کی باتوں پر (اپنا) کان لگائیں،^(۲) گویا کہ یہ لکڑیاں ہیں دیوار کے سہارے سے لگائی ہوئیں،^(۳) ہر (سخت) آواز کو اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔^(۴) یہی حقیقی دشمن ہیں ان سے بچو اللہ انہیں غارت کرے کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔^(۵)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تمہارے لیے اللہ کے رسول استغفار کریں تو اپنے سرمٹکاتے ہیں^(۶) اور آپ دیکھیں گے کہ وہ تکبر کرتے ہوئے رک جاتے ہیں۔^(۷) ان کے حق میں آپ کا استغفار کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہے۔^(۸) اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز نہ بخشے گا۔^(۹) بیشک اللہ تعالیٰ (ایسے) نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔^(۱۰) یہی وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس

خُذُوا مَسَدًا يُصَلُّونَ كُلَّ صِيحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرُوهُمْ
فَاتَّكَمُوا لَمَّْا آتَىٰ يُؤَقُّونَ ۝

وَإِذْ أَيْدِيهِمْ أَصْفَرَتْ لَهُمْ أَمْزَلُوهُ فَاسْتَعْفُوا لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ
إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝

وَأِذْ أَيْدِيهِمْ أَصْفَرَتْ لَهُمْ أَمْزَلُوهُ فَاسْتَعْفُوا لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ
إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝

هُمُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ لَأَنْتُمْ مَعَا عَلَىٰ مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ

(۱) یعنی ان کے حسن و جمال اور رونق و شادابی کی وجہ سے۔

(۲) یعنی زبان کی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے۔

(۳) یعنی اپنی درازنی قد اور حسن و رعنائی، عدم فہم اور قلت خیر میں ایسے ہیں گویا کہ دیوار پر لگائی ہوئی لکڑیاں ہیں جو دیکھنے والوں کو تو بھلی لگتی ہیں لیکن کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور مطلب ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں اس طرح بیٹھتے ہیں جیسے دیوار کے ساتھ لگی ہوئی لکڑیاں ہیں جو کسی بات کو سمجھتی ہیں نہ جانتی ہیں۔ (فتح القدر)

(۴) یعنی بزدل ایسے ہیں کہ کوئی زوردار آواز سن لیں تو سمجھتے ہیں کہ ہم پر کوئی آفت نازل ہو گئی ہے۔ یا گھبراہٹتے ہیں کہ ہمارے خلاف کسی کارروائی کا آغاز تو نہیں ہو رہا ہے۔ جیسے چور اور خائن کا دل اندر سے دھک دھک کر رہا ہوتا ہے۔

(۵) یعنی استغفار سے اعراض کرتے ہوئے اپنے سروں کو موڑ لیتے ہیں۔

(۶) یعنی کہنے والے کی بات سے منہ موڑ لیں گے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اعراض کر لیں گے۔

(۷) اپنے نفاق پر اصرار اور کفر پر استمرار کی وجہ سے وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں استغفار اور عدم استغفار ان کے حق میں برابر ہے۔

(۸) اگر اسی حالت نفاق میں وہ مر گئے۔ ہاں اگر وہ زندگی میں کفر و نفاق سے تائب ہو جائیں تو بات اور ہے، پھر ان کی مغفرت ممکن ہے۔

ہیں ان پر کچھ خرچ نہ کرو یہاں تک کہ وہ ادھر ادھر ہو جائیں^(۱) اور آسمان و زمین کے کل خزانے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں^(۲) لیکن یہ منافق بے سمجھ ہیں۔^(۳) (۷)

یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم اب لوٹ کر مدینہ جائیں گے تو عزت والا وہاں سے ذلت والے کو نکال دے گا۔^(۴) سنو! عزت تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان داروں کے لیے ہے^(۵) لیکن یہ منافق

يَنْفِقُوا وَيَلْبَسُوا حُرْلِينَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنَّ الْمُنْفِقِينَ
لَا يَعْقِلُونَ ①

يَعُولُونَ لَكِن يَجْعَلُونَ إِلَى الْمَدِينَةِ كَيْفَ مَخْرَجًا أَكْثَرُ مِنْهَا الْأَذَى
وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُنْفِقِينَ
لَا يَعْلَمُونَ ②

(۱) ایک غزوے میں (جسے اہل سیر غزوہ مریض یا غزوہ بنی المصطلق کہتے ہیں) ایک ماجر اور ایک انصاری کا بھگڑا ہو گیا، دونوں نے اپنی اپنی حمایت کے ٹیے انصار اور ماجرین کو پکارا، جس پر عبد اللہ بن ابی منافق نے انصار سے کہا کہ تم نے ماجرین کی مدد کی اور ان کو اپنے ساتھ رکھا، اب دیکھ لو، اس کا نتیجہ سامنے آ رہا ہے یعنی یہ اب تمہارا کھا کر تمہیں پر غرا رہے ہیں۔ ان کا علاج تو یہ ہے کہ ان پر خرچ کرنا بند کر دو، یہ اپنے آپ تترتیر ہو جائیں گے۔ نیز اس نے یہ بھی کہا کہ ہم (جو عزت والے ہیں) ان ذیلیوں (ماجروں) کو مدینے سے نکال دیں گے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے یہ کلمات خبیث سن لیے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آکر بتلایا، آپ ﷺ نے عبد اللہ بن ابی کو بلا کر پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ جس پر حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ابی کو بلا کر پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ جس پر حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ابی کو بلا کر پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ جس پر حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ابی کو بلا کر پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ جس پر حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ابی کو بلا کر پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

(صحیح البخاری، تفسیر سورۃ المنافقون)

(۲) مطلب یہ ہے کہ ماجرین کا رازق اللہ تعالیٰ ہے اس لیے کہ رزق کے خزانے اسی کے پاس ہیں، وہ جس کو جتنا چاہے دے اور جس سے چاہے روک لے۔

(۳) منافق اس حقیقت کو نہیں جانتے، اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ انصار اگر ماجرین کی طرف دست تعاون دراز نہ کریں تو وہ بھوکے مر جائیں گے۔

(۴) اس کا کہنے والا رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی تھا، عزت والے سے اس کی مراد تھی، وہ خود اور اس کے رفقاء اور ذلت والے سے (نحوذ باللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان۔

(۵) یعنی عزت اور غلبہ صرف ایک اللہ کے لیے ہے اور پھر وہ اپنی طرف سے جس کو چاہے عزت و غلبہ عطا فرمادے۔ چنانچہ وہ اپنے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کو عزت اور سرفرازیں عطا فرماتا ہے نہ کہ ان کو جو اس کے نافرمان ہوں۔ یہ منافقین کے قول کی تردید فرمائی کہ عزتوں کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے اور معزز بھی وہی ہے جسے وہ معزز سمجھے، نہ کہ وہ جو اپنے آپ کو معزز یا اہل دنیا جس کو معزز سمجھیں اور اللہ کے ہاں معزز صرف اور صرف اہل ایمان ہوں گے،

جانتے نہیں۔^(۸)

اے مسلمانو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں۔^(۲) اور جو ایسا کریں وہ بڑے ہی زیاں کار لوگ ہیں۔^(۹)

اور جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) اس سے پہلے خرچ کرو^(۳) کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے تو کہنے لگے اے میرے پروردگار! مجھے تو تھوڑی دیر کی مہلت کیوں نہیں^(۴) دیتا؟ کہ میں صدقہ کروں اور نیک لوگوں میں سے ہو جاؤں۔^(۱۰)

اور جب کسی کا مقررہ وقت آجاتا ہے پھر اسے اللہ تعالیٰ ہرگز مہلت نہیں دیتا اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اللہ تعالیٰ بخوبی باخبر ہے۔^(۱۱)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ
وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ①

وَأَنْفُسُكُمْ مَا آذَنَّاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ
فَيَقُولُ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ آجِلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقْتُ
وَأَكُنَّ مِنَ الصّٰلِحِينَ ②

وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا وَاللَّهُ خَبِيرٌ
بِمَا تَعْمَلُونَ ③

کافر اور اہل نفاق نہیں۔

(۱) اس لیے ایسے کام نہیں کرتے جو ان کے لیے مفید ہیں اور ان چیزوں سے نہیں بچتے جو ان کے لیے نقصان دہ ہیں۔
(۲) یعنی مال اور اولاد کی محبت تم پر اتنی غالب نہ آجائے کہ تم اللہ کے بتلائے ہوئے احکام و فرائض سے غافل ہو جاؤ اور اللہ کی قائم کردہ حلال و حرام کی حدوں کی پروا نہ کرو۔ منافقین کے ذکر کے فوراً بعد اس تنبیہ کا مقصد یہ ہے کہ یہ منافقین کا کردار ہے جو انسان کو خسارے میں ڈالنے والا ہے۔ اہل ایمان کا کردار اس کے برعکس ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ ہر وقت اللہ کو یاد رکھتے ہیں، یعنی اس کے احکام و فرائض کی پابندی اور حلال و حرام کے درمیان تمیز کرتے ہیں۔
(۳) خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ کی ادائیگی اور دیگر امور خیر میں خرچ کرنا ہے۔

(۴) اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کی ادائیگی اور انفاق فی سبیل اللہ میں اور اسی طرح اگر حج کی استطاعت ہو تو اس کی ادائیگی میں قطعاً تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ موت کا کوئی پتہ نہیں کس وقت آجائے؟ اور یہ فرائض اس کے ذمے رہ جائیں کیونکہ موت کے وقت آرزو کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

سورۃ تعابین مدنی ہے اور اس میں اٹھارہ آیتیں اور دو رکوع ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

(تمام چیزیں) جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں^(۱) اسی کی سلطنت ہے اور اسی کی تعریف ہے،^(۲) اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔^(۱)

يَسْتَعِيْزُ بِاللّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ لَهٗ الْمُلْكُ وَلَهٗ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

اسی نے تمہیں پیدا کیا ہے سو تم میں سے بعضے تو کافر ہیں اور بعض ایمان والے ہیں، اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ خوب دیکھ رہا ہے۔^(۳)

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَا تَرٰوْنَ مِنْكُمْ مُّؤْمِنُوْنَ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

اسی نے آسمانوں کو اور زمین کو عدل و حکمت سے پیدا کیا،^(۴) اسی نے تمہاری صورتیں بنا لیں اور بہت اچھی

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ حَاسِنٌ صُوْرًا ۝ وَاللّٰهُ الْمَوْجِبُ ۝

(۱) یعنی آسمان و زمین کی ہر مخلوق اللہ تعالیٰ کی ہر نقص و عیب سے تزیین و تقدیس بیان کرتی ہے۔ زبان حال سے بھی اور زبان مقال سے بھی۔ جیسا کہ پہلے گزرا۔

(۲) یعنی یہ دونوں خوبیاں بھی اسی کے ساتھ خاص ہیں۔ اگر کسی کو کوئی اختیار حاصل ہے تو وہ اسی کا عطا کردہ ہے جو عارضی ہے، کسی کے پاس کچھ حسن و کمال ہے تو اسی مبداء فیض کی کرم گستری کا نتیجہ ہے، اس لیے اصل تعریف کا مستحق بھی صرف وہی ہے۔

(۳) یعنی انسان کے لیے خیر و شر، نیکی اور بدی اور کفر و ایمان کے راستوں کی وضاحت کے بعد اللہ نے انسان کو ارادہ و اختیار کی جو آزادی دی ہے۔ اس کی رو سے کسی نے کفر کا اور کسی نے ایمان کا راستہ اپنایا ہے۔ اس نے کسی پر جبر نہیں کیا۔ اگر وہ جبر کرتا تو کوئی شخص بھی کفر و معصیت کا راستہ اختیار کرنے پر قادر ہی نہ ہوتا۔ لیکن اس طرح انسان کی آزمائش ممکن نہیں تھی، جب کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت انسان کو آزمانا تھا۔ ﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوَةَ لَیَبْلُوْكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (سورۃ المملک ۱۲) بنا بریں جس طرح کافر کا خالق اللہ ہے، کفر کا خالق بھی اللہ ہے لیکن یہ کفر اس کافر کا عمل و کسب ہے جس نے اسے اپنے ارادے سے اختیار کیا ہے۔ اسی طرح مومن اور ایمان کا خالق بھی اللہ ہے لیکن ایمان اس مومن کا کسب و عمل ہے جس نے اسے اختیار کیا ہے اور اس کسب و عمل پر دونوں کو ان کے عملوں کے مطابق جزا ملے گی، کیونکہ وہ سب کے عمل دیکھ رہا ہے۔

(۴) اور وہ عدل و حکمت یہی ہے کہ محسن کو اس کے احسان کی اور بدکار کو اس کی بدی کی جزا دے، چنانچہ وہ اس عدل کا

بنائیں^(۱) اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔^(۲) (۳)

وہ آسمان و زمین کی ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم چھپاؤ اور جو ظاہر کرو وہ (سب کو) جانتا ہے۔ اللہ تو سینوں کی باتوں تک کو جاننے والا ہے۔^(۳) (۴)

کیا تمہارے پاس اس سے پہلے کے کافروں کی خبر نہیں پہنچی؟ جنہوں نے اپنے اعمال کا وبال چکھ لیا^(۴) اور جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔^(۵) (۵)

یہ اس لیے^(۶) کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لے کر آئے تو انہوں نے کہہ دیا کہ کیا انسان ہماری رہنمائی کرے گا؟^(۷) پس انکار کر دیا^(۸) اور منہ

يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسْتَوُونَ
وَمَا تُعْتَبُونَ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ③

الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوا وَبَالَ أَعْمَلِهِمْ
وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ④

ذَلِكَ بِأَنَّهُ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَعَالُوا
آبَتِرُهُمْ زِينَتِكُمْ وَالْمُنَى وَاللَّهُ عَزِيزٌ
حَمِيدٌ ⑤

مکمل اہتمام قیامت والے دن فرمائے گا۔

(۱) تمہاری شکل و صورت، قد و قامت اور خدوخال نہایت خوب صورت بنائے، جس سے اللہ کی دوسری مخلوق محروم ہے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّبَكَ بِالْكُفْرِ * الَّذِي خَلَقَكَ مَسْجُودًا لَعَلَّكَ تَمُودًا * فِي آتِي صُورَةٍ مَاشَاءَ بَيْنَكَ﴾ (سورۃ الانفطار: ۶-۸) ﴿وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُم مِّنَ اللَّيْلِ نَارًا﴾ (سورۃ المؤمن: ۶۴)

(۲) کسی اور کی طرف نہیں کہ اللہ کے محاسبے اور مؤاخذے سے بچاؤ ہو جائے۔

(۳) یعنی اس کا علم کائنات ارضی و سماوی سب پر محیط ہے بلکہ تمہارے سینوں کے رازوں تک سے وہ واقف ہے۔ اس سے قبل جو وعدے اور وعیدیں بیان ہوئی ہیں، یہ ان کی تائید ہے۔

(۴) یہ اہل مکہ سے بالخصوص اور کفار عرب سے بالعموم خطاب ہے۔ اور ما قبل کافروں سے مراد قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود وغیرہ ہیں۔ جنہیں ان کے کفر و معصیت کی وجہ سے دنیا میں عذاب سے دوچار کر کے تباہ و برباد کر دیا گیا۔

(۵) یعنی دنیوی عذاب کے علاوہ آخرت میں۔

(۶) ذلک، یہ اشارہ ہے اس عذاب کی طرف جو دنیا میں انہیں ملا اور آخرت میں بھی انہیں ملے گا۔

(۷) یہ ان کے کفر کی علت ہے کہ انہوں نے یہ کفر، جو ان کے عذاب دارین کا باعث بنا، اس لیے اختیار کیا کہ انہوں نے ایک بشر کو اپنا ہادی ماننے سے انکار کر دیا۔ یعنی ایک انسان کا رسول بن کر لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے آنا، ان کے لیے ناقابل قبول تھا جیسا کہ آج بھی اہل بدعت کے لیے رسول کو بشر ماننا نہایت گراں ہے۔

هَدَاهُمْ اللَّهُ تَعَالَى .

(۸) چنانچہ اس بنا پر انہوں نے رسولوں کو رسول ماننے سے اور ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔

پھیر (۱) لیا اور اللہ نے بھی بے نیازی کی، (۲) اور اللہ تو ہے ہی بہت بے نیاز (۳) سب خوبیوں والا۔ (۶)

ان کافروں نے خیال کیا ہے کہ دوبارہ زندہ نہ کیے جائیں گے۔ (۵) آپ کہہ دیجئے کہ کیوں نہیں اللہ کی قسم! تم ضرور دوبارہ اٹھائے جاؤ گے (۶) پھر جو تم نے کیا ہے اس کی خبر دینے جاؤ گے (۷) اور اللہ پر یہ بالکل ہی آسان ہے۔ (۸)

سو تم اللہ پر اور اس کے رسول پر (۹) اور اس نور پر جسے

رَزَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ كُنْ يُجْعَلُوا عَلَىٰ بَنِي وَرَبِّي
لَتُجْعَلُنَّ فِيهِمْ آيَاتٍ وَمَا عَمِلْتُمْ وَاذَلِكَ
عَلَىٰ اللَّهِ يَسِيرٌ ۝

فَأَمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالنُّورِ الَّذِي أَنْزَلْنَا وَاللَّهُ

(۱) یعنی ان سے اعراض کیا اور جو دعوت وہ پیش کرتے تھے، اس پر انہوں نے غور و تدبر ہی نہیں کیا۔

(۲) یعنی ان کے ایمان اور ان کی عبادت سے۔

(۳) اس کو کسی کی عبادت سے کیا فائدہ اور اس کی عبادت سے انکار کرنے سے کیا نقصان؟

(۴) یا محمود ہے (تعریف کیا گیا) تمام مخلوقات کی طرف سے۔ یعنی ہر مخلوق زبان حال و قال سے اس کی حمد و تعریف میں رطب اللسان ہے۔

(۵) یعنی یہ عقیدہ کہ قیامت والے دن دوبارہ زندہ نہیں کیے جائیں گے، یہ کافروں کا محض گمان ہے، جس کی پشت پر دلیل کوئی نہیں۔ زعم کا اطلاق کذب پر بھی ہوتا ہے۔

(۶) قرآن مجید میں تین مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے رب کی قسم کھا کر یہ اعلان کرے کہ اللہ تعالیٰ ضرور دوبارہ زندہ فرمائے گا۔ ان میں سے ایک یہ مقام ہے اس سے قبل ایک مقام سورہ یونس، آیت ۵۳ اور دوسرا مقام سورہ سبأ، آیت ۳ ہے۔

(۷) یہ وقوع قیامت کی حکمت ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو کیوں دوبارہ زندہ کرے گا؟ اس لیے تاکہ وہاں ہر ایک کو اس کے عمل کی پوری جزا دی جائے۔ کیونکہ دنیا میں ہم دیکھتے کہ یہ جزا مکمل شکل میں بالعموم نہیں ملتی۔ نیک کو نہ بد کو۔ اب اگر قیامت والے دن بھی مکمل جزا کا اہتمام نہ ہو تو دنیا ایک کھلنڈرے کا کھیل اور فعل عبث ہی قرار پائے گی، جب کہ اللہ کی ذات ایسی باتوں سے بہت بلند ہے۔ اس کا تو کوئی فعل عبث نہیں، چہ جائیکہ جن وانس کی تخلیق کو بے مقصد اور ایک کھیل سمجھ لیا جائے۔ تَعَالَى اللَّهُ عَنِ ذَلِكَ عَلْوًا كَبِيرًا۔

(۸) یہ دوبارہ زندگی، انسانوں کو کتنی ہی مشکل یا مستبعد نظر آتی ہو، لیکن اللہ کے لیے بالکل آسان ہے۔

(۹) فَأَمِنُوا میں فاصیہ ہے جو شرط مقدر پر دلالت کرتی ہے۔ آئین: إِذَا كَانَ الْأَمْرُ هَكَذَا فَصَدِّقُوا بِاللَّهِ یعنی جب معاملہ اس طرح ہے جو بیان ہوا، تو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اس کی تصدیق کرو۔

ہم نے نازل فرمایا ہے ایمان لاؤ^(۱) اور اللہ تعالیٰ تمہارے
ہر عمل پر باخبر ہے۔ (۸)

جس دن تم سب کو اس جمع ہونے کے دن^(۲) جمع کرے گا
وہی دن ہے ہار جیت کا^(۳) اور جو شخص اللہ پر ایمان لا کر
نیک عمل کرے اللہ اس سے اس کی برائیاں دور کر دے
گا اور اسے جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں
بہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بہت
بڑی کامیابی ہے۔ (۹)

اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی
(سب) جہنمی ہیں (جو) جنم میں ہمیشہ رہیں گے، وہ بہت
برا ٹھکانا ہے۔ (۱۰)

کوئی مصیبت اللہ کی اجازت کے بغیر نہیں پہنچ سکتی،^(۴)

بِمَا تَعْمَلُونَ خَيْرٌ ۝

يَوْمَ يَجْمَعُ لِيَوْمِ الْجُمُعَةِ ذِكْرُ يَوْمِ التَّعَابُنِ وَمَنْ يُوْمِنْ بِاللَّهِ
وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُكْفِرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي
مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ خَالِدِينَ فِيهَا
وَيَسُوءُ الْمَصِيرُ ۝

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ

(۱) آپ ﷺ کے ساتھ نازل ہونے والا یہ نور قرآن مجید ہے جس سے گمراہی کی تاریکیاں چھٹی ہیں اور ایمان کی
روشنی بھلتی ہے۔

(۲) قیامت کو یوم الجمع اس لیے کہا کہ اس دن اول و آخر سب ایک ہی میدان میں جمع ہوں گے۔ فرشتے پکارے گا تو سب
اس کی آواز سنیں گے، ہر ایک کی نگاہ آخر تک پہنچ جائے گی، کیونکہ درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہوگی۔ جیسے دوسرے
مقام پر فرمایا ﴿ ذَلِكِ يَوْمِ الْجُمُعَةِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ ﴿ (ہود: ۱۰۳) ”وہ دن جس میں سب لوگ جمع کیے جائیں
گے اور وہ دن ہے جس میں سب حاضر کیے جائیں گے۔“ ﴿ فَمَنْ كَانَ مِنَ الْقَائِلِينَ وَالْآخِرِينَ * لَمْ يَجْعَلْهُنَّ إِلَّا مِيقَاتٍ يَوْمَ
تُجْمَعُونَ ﴾ (الواقعة - ۵۰، ۴۹)

(۳) یعنی ایک گروہ جیت جائے گا اور ایک ہار جائے گا، اہل حق اہل باطن پر، ایمان والے اہل کفر پر اور اہل طاعت اہل
معصیت پر جیت جائیں گے، سب سے بڑی جیت اہل ایمان کو یہ حاصل ہوگی کہ وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے اور وہاں ان گھروں
کے بھی وہ مالک بن جائیں گے جو جہنمیوں کے لیے تھے۔ اگر وہ جہنم میں جانے والے کام نہ کرتے۔ اور سب سے بڑی ہار جہنمیوں
کے حصے میں آئے گی جو جہنم میں داخل ہوں گے، جنہوں نے خیر کو شر سے، عمدہ چیز کو ردى سے اور نعمتوں کو عذاب سے بدل لیا۔ غبن
کے معنی نقصان اور خسارے کے بھی ہیں، یعنی نقصان کا دن۔ اس دن کافروں کو تو خسارے کا احساس ہو گا ہی۔ اہل ایمان کو بھی
اس اعتبار سے خسارے کا احساس ہو گا کہ انہوں نے اور زیادہ نیکیاں کر کے مزید درجات کیوں نہ حاصل کیے۔

(۴) یعنی اس کی تقدیر اور مشیت سے ہی اس کا ظہور ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں اس کے نزول کا سبب کفار کا یہ قول ہے

جو اللہ پر ایمان لائے اللہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے^(۱) اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ (۱۱)
(لوگو) اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو۔ پس اگر تم اعراض کرو تو ہمارے رسول کے ذمہ صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے۔^(۲) (۱۲)

اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور مومنوں کو اللہ ہی پر توکل رکھنا چاہیے۔^(۳) (۱۳)
اے ایمان والو! تمہاری بعض بیویاں اور بعض بچے تمہارے دشمن ہیں^(۴) پس ان سے ہوشیار رہنا^(۵) اور اگر تم معاف کر دو اور درگزر کر جاؤ اور بخش دو تو اللہ تعالیٰ بخشے والا مہربان ہے۔^(۶) (۱۴)

يَهْدِي قَلْبَهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ⑪

وَاطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَأِنَّمَا عَلَى رَسُولِنَا الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ⑫

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَى اللَّهِ قَلِمَةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ⑬

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَئِن آذَاكُمْ جُنُودُهُمْ وَإِذَا كُفِرْتُمْ عَنْ الْكُفْرِ فَاصْدُرُوا لَهُمْ وَإِن تَضَرَّرْتُم بِهِمْ فَاصْدُرُوا لَهُمْ وَإِن تَضَرَّرْتُم بِهِمْ فَاصْدُرُوا لَهُمْ ⑭

اللَّهُ عَفُورٌ ذَرِيعٌ ⑮

کہ اگر مسلمان حق پر ہوتے تو دنیا کی مصیبتیں انہیں نہ پہنچتیں۔ (فتح القدر)

(۱) یعنی وہ جان لیتا ہے کہ اسے جو کچھ پہنچا ہے۔ اللہ کی مشیت اور اس کے حکم سے ہی پہنچا ہے، پس وہ صبر اور رضا بالقضاکا مظاہرہ کرتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، اس کے دل میں یقین راح کر دیتا ہے جس سے وہ جان لیتا ہے کہ اس کو پہنچنے والی چیز اس سے چوک نہیں سکتی اور جو اس سے چوک جانے والی ہے، وہ اسے پہنچ نہیں سکتی۔ (ابن کثیر)
(۲) یعنی ہمارے رسول کا اس سے کچھ نہیں بگڑے گا، کیونکہ اس کا کام صرف تبلیغ ہے۔ امام زہری فرماتے ہیں، اللہ کا کام رسول بھیجتا ہے، رسول کا کام تبلیغ اور لوگوں کا کام تسلیم کرنا ہے۔ (فتح القدر)
(۳) یعنی تمام معاملات اسی کو سونپیں، اسی پر اعتماد کریں اور صرف اسی سے دعا و التجا کریں، کیونکہ اس کے سوا کوئی حاجت روا اور مشکل کشا ہی نہیں۔

(۴) یعنی جو تمہیں عمل صالح اور اطاعت الہی سے روکیں، سمجھ لو وہ تمہارے خیر خواہ نہیں، دشمن ہیں۔

(۵) یعنی ان کے پیچھے گلے سے بچو۔ بلکہ انہیں اپنے پیچھے لگاؤ تاکہ وہ بھی اطاعت الہی اختیار کریں، نہ کہ تم ان کے پیچھے لگ کر اپنی عاقبت خراب کر لو۔

(۶) اس کا سبب نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ مکے میں مسلمان ہونے والے بعض مسلمانوں نے مکہ چھوڑ کر مدینہ آنے کا ارادہ کیا، جیسا کہ اس وقت ہجرت کا حکم نہایت تاکید کے ساتھ دیا گیا تھا۔ لیکن ان کے بیوی بچے آڑے آگئے اور انہوں نے انہیں ہجرت نہیں کرنے دی۔ پھر بعد میں جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگئے تو دیکھا کہ ان سے پہلے آنے والوں نے دین میں بہت زیادہ سمجھ حاصل کر لی ہے تو انہیں اپنے بیوی بچوں پر غصہ آیا، جنہوں نے انہیں ہجرت

تمہارے مال اور اولاد تو سراسر تمہاری آزمائش ہیں۔^(۱)

اور بہت بڑا اجر اللہ کے پاس ہے۔^(۲) (۱۵)

پس جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو اور سنتے

اور مانتے چلے جاؤ^(۳) اور اللہ کی راہ میں خیرات کرتے رہو

جو تمہارے لیے بہتر ہے^(۴) اور جو شخص اپنے نفس کی

حرص سے محفوظ رکھا جائے وہی کامیاب ہے۔^(۵)

اگر تم اللہ کو اچھا قرض دو گے (یعنی اس کی راہ میں خرچ

کرو گے)^(۶) تو وہ اسے تمہارے لیے بڑھاتا جائے گا اور

تمہارے گناہ بھی معاف فرما دے گا۔^(۷) اللہ بڑا قدر دان

بڑا بردبار ہے۔^(۸) (۱۷)

وہ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے زبردست حکمت والا

(ہے)۔ (۱۸)

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللَّهُ عِنْدَكَ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۱۵﴾

فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَأَسْمِعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفِقُوا

خَيْرًا لَّأَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُؤْتِ شَيْئًا فَنَفْسُهُ

فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۶﴾

إِنْ تَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضْعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ

وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ ﴿۱۷﴾

عَلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۸﴾

سے روکے رکھا تھا، چنانچہ انہوں نے ان کو سزا دینے کا ارادہ کیا۔ اللہ نے اس میں انہیں معاف کرنے اور درگزر سے کام

لینے کی تلقین فرمائی۔ (سنن الترمذی، تفسیر سورۃ التغابن)

(۱) جو تمہیں کسب حرام پر اکساتے اور اللہ کے حقوق ادا کرنے سے روکتے ہیں، پس اس آزمائش میں تم اسی وقت سرخ

رو ہو سکتے ہو، جب تم اللہ کی معصیت میں ان کی اطاعت نہ کرو۔ مطلب یہ ہوا کہ مال و اولاد جہاں اللہ کی نعمت ہیں، وہاں

یہ انسان کی آزمائش کا ذریعہ بھی ہیں۔ اس طریقے سے اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ میرا اطاعت گزار کون ہے اور نافرمان کون؟

(۲) یعنی اس شخص کے لیے جو مال و اولاد کی محبت کے مقابلے میں اللہ کی اطاعت کو ترجیح دیتا ہے اور اس کی معصیت

سے اجتناب کرتا ہے۔

(۳) یعنی اللہ اور رسول ﷺ کی باتوں کو توجہ اور غور سے سنو اور ان پر عمل کرو۔ اس لیے کہ صرف سن لینا بے فائدہ

ہے، جب تک عمل نہ ہو۔

(۴) خَيْرًا أَيُّ: إِفْنَاقًا خَيْرًا، يَكُنُ الْإِفْنَاقُ خَيْرًا إِفْنَاقًا عَامٌ هُوَ صِدْقَاتُ وَاجِبَةٌ أَوْ نَافِلَةٌ دُونِهَا كُشَالٌ هُوَ۔

(۵) یعنی اخلاص نیت اور طیب نفس کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے۔

(۶) یعنی کئی کئی گنا بڑھانے کے ساتھ وہ تمہارے گناہ بھی معاف فرما دے گا۔

(۷) وہ اپنے اطاعت گزاروں کو أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً اَجْرًا وَثَابًا سے نوازتا ہے اور معصیت کاروں کا فوری مؤاخذہ

نہیں فرماتا۔

سورۃ طلاق مدنی ہے اور اس میں بارہ آیتیں اور دو رکوع ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اے نبی! (اپنی امت سے کہو کہ) جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دینا چاہو (۱) تو ان کی عدت (کے دنوں کے آغاز) میں انہیں طلاق دو (۲) اور عدت کا حساب رکھو، (۳) اور اللہ سے جو تمہارا پروردگار ہے ڈرتے رہو، تم انہیں ان کے گھروں سے نکالو (۴) اور نہ وہ (خود) نکلیں (۵) ہاں یہ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَالْتَقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِعَاقِبَةٍ مُّسَيِّئَةٍ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهُ يُعَذِّبُكَ بِذَلِكَ أَمْرًا ۝۱

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب آپ کے شرف و مرتبت کی وجہ سے ہے، ورنہ حکم تو امت کو دیا جا رہا ہے۔ یا آپ ہی کو بطور خاص خطاب ہے اور جمع کا صیغہ بطور تعظیم کے ہے اور امت کے لیے آپ ﷺ کا اسوہ ہی کافی ہے۔ طَلَّقْتُمْ کا مطلب ہے جب طلاق دینے کا پختہ ارادہ کر لو۔

(۲) اس میں طلاق دینے کا طریقہ اور وقت بتلایا ہے لِعِدَّتِهِنَّ میں لام توقيت کے لیے ہے۔ یعنی لِأَوَّلِ بَا لاسْتِقْبَالِ عِدَّتِهِنَّ (عدت کے آغاز میں) طلاق دو۔ یعنی جب عورت حیض سے پاک ہو جائے تو اس سے ہم بستری کے بغیر طلاق دو۔ حالت طہرا سکی عدت کا آغاز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حیض کی حالت میں یا طہر میں ہم بستری کرنے کے بعد طلاق دینا غلط طریقہ ہے۔ اسکو فقہ طلاق بدعی سے اور پہلے (صحیح) طریقے کو طلاق سنت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسکی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آتا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حیض کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو رسول اللہ ﷺ غضبناک ہوئے اور انہیں اس سے رجوع کرنے کے ساتھ حکم دیا کہ حالت طہر میں طلاق دینا، اور اسکے لیے آپ ﷺ نے اسی آیت سے استدلال فرمایا۔ (صحیح بخاری کتاب الطلاق) تاہم حیض میں دی گئی طلاق بھی باوجود بدعی ہونے کے واقع ہو جائے گی۔ محدثین اور جمہور علماء اسی بات کے قائل ہیں۔ البتہ امام اہل قیام اور امام ابن تیمیہ طلاق بدعی کے قائل نہیں ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے نیل الأوطار کتاب الطلاق، باب النہی عن الطلاق فی الحيض وفي الطهر اور دیگر شروحات حدیث)

(۳) یعنی اس کی ابتدا اور انتہا کا خیال رکھو، تاکہ عورت اس کے بعد نکاح ثانی کر سکے، یا اگر تم ہی رجوع کرنا چاہو، (پہلی اور دوسری طلاق کی صورت میں) تو عدت کے اندر رجوع کر سکو۔

(۴) یعنی طلاق دیتے ہی عورت کو اپنے گھر سے مت نکالو، بلکہ عدت تک اسے گھر میں ہی رہنے دو، اور اس وقت تک رہائش اور نان و نفقہ تمہاری ذمہ داری ہے۔

(۵) یعنی عدت کے دوران خود عورت بھی گھر سے باہر نکلنے سے احتراز کرے، (۱) ایہ کہ کوئی بہت ہی ضروری معاملہ ہو۔

اور بات ہے کہ وہ کھلی برائی کر بیٹھیں،^(۱) یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں، جو شخص اللہ کی حدوں سے آگے بڑھ جائے اس نے یقیناً اپنے اوپر ظلم کیا،^(۲) تم نہیں جانتے شاید اس کے بعد اللہ تعالیٰ کوئی نئی بات پیدا کر دے۔^(۳) (۱)

(۱) یعنی بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھے یا بد زبانی اور بد اخلاقی کا مظاہرہ کرے جس سے گھروالوں کو تکلیف ہو۔ دونوں صورتوں میں اس کا اخراج جائز ہو گا۔

(۲) یعنی احکام مذکورہ اللہ کی حدیں ہیں، جن سے تجاوز خود اپنے آپ پر ہی ظلم کرنا ہے، کیونکہ اس کے دینی اور دنیوی نقصانات خود تجاوز کرنے والے کو ہی بھگتنے پڑیں گے۔

(۳) یعنی مرد کے دل میں مطلقہ عورت کی رغبت پیدا کر دے اور وہ رجوع کرنے پر آمادہ ہو جائے، جیسا کہ پہلی اور دوسری طلاق کے بعد خاوند کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔ اسی لیے بعض مفسرین کی رائے ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صرف ایک طلاق دینے کی تلقین اور بیک وقت تین طلاقیں دینے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ اگر وہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے دے (اور شریعت اسے جائز قرار دے کر نافذ بھی کر دے) تو پھر یہ کتابہ فائدہ ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ کوئی نئی بات پیدا کر دے۔ (فتح القدیر) اسی سے امام احمد اور دیگر بعض علمائے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ رہائش اور نفقہ کی جو تائید کی گئی ہے وہ ان عورتوں کے لیے ہے جن کو ان کے خاوندوں نے پہلی یا دوسری طلاق دی ہو۔ کیونکہ ان میں خاوند کے رجوع کا حق برقرار رہتا ہے۔ اور جس عورت کو مختلف اوقات میں دو طلاقیں مل چکی ہوں تو تیسری طلاق اس کے لیے طلاق بتہ یا باندہ ہے، اس کا سُكُنَى (رہائش) اور نفقہ خاوند کے ذمے نہیں ہے۔ اس کو فوراً خاوند کے مکان سے دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے گا، کیونکہ خاوند اب اس سے رجوع کر کے اسے اپنے گھر آباد نہیں کر سکتا حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ۔ اس لیے اب اسے خاوند کے پاس رہنے کا اور اس سے نان و نفقہ وصول کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس کی تائید حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے اس واقعے سے ہوتی ہے کہ جب ان کے خاوند نے ان کو تیسری طلاق بھی دے دی اور اس کے بعد انھیں خاوند کے مکان سے نکلنے کے لیے کہا گیا تو وہ آمادہ نہیں ہوئی بالآخر معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو آپ ﷺ نے یہی فیصلہ فرمایا کہ ان کے لیے رہائش اور نفقہ نہیں ہے، انھیں فوراً کسی دوسری جگہ منتقل ہو جانا چاہیے۔ بلکہ بعض روایات میں صراحت بھی ہے، 'إِنَّمَا النَّفَقَةُ وَالسُّكُنَى لِلْمَرْأَةِ؛ إِذَا كَانَ لَزَوْجِهَا عَلَيْهَا الرَّجْعَةُ رواه أحمد والنسائی۔ البتہ بعض روایات میں حاملہ عورت کے لیے بھی نفقہ اور رہائش کی صراحت ہے۔ (تفصیل اور حوالوں کے لیے دیکھئے، (نبیل الاوطار) باب ماجاء فی نفقۃ المبتوتۃ وسکنها وباب النفقۃ والسکنی للمعتدۃ الرجعیۃ، بعض لوگ ان روایات کو قرآن کے مذکورہ

پس جب یہ عورتیں اپنی عدت پوری کرنے کے قریب پہنچ جائیں تو انہیں یا تو قاعدہ کے مطابق اپنے نکاح میں رہنے دو یا دستور کے مطابق انہیں الگ کر دو^(۱) اور آپس میں سے دو عادل شخصوں کو گواہ کر لو^(۲) اور اللہ کی رضامندی کے لیے ٹھیک ٹھیک گواہی دو۔^(۳) یہی ہے وہ جس کی نصیحت اسے کی جاتی ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے چھٹکارے کی شکل نکال دیتا ہے۔^(۴)

اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہ ہو اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا اللہ اسے کافی ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اپنا کام پورا کر کے ہی رہے گا۔^(۵) اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔^(۶)

تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض سے ناامید ہو

وَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْرُهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهُدُوا ذُوَى عَدَالٍ تَنْكِحُوا أَيْمَانَهُنَّ بِاللَّهِ ذَلِكَ يُعْظِمُ بِهِ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ﴿۶﴾

وَيَرْزُقَهُنَّ مِنْ حَيْثُ كَانَتْ يَدَايُهُنَّ وَمِنْ بَيْنِ يَدَيْهِمْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴿۷﴾

وَأَلَىٰ يَمِينِنَ مِنَ الْمَجْصُوعِ مِنَ نِسَائِكُمُ إِنْ رَأَيْتُمْ فَوَاحِشَهُنَّ

حکم ﴿۶﴾ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ جَعَلْنَا لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ نِسَائِكُم مِّمَّا كَانَتْ يَدَايُهُنَّ وَمِنْ بَيْنِ يَدَيْهِمْ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ﴿۷﴾ کے خلاف باور کرا کے ان کو رد کرتے ہیں جو صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کا حکم اپنے گرد و پیش کے قرآن کے پیش نظر مطلقہ رجعیہ سے متعلق ہے۔ اور اگر اسے عام مان بھی لیا جائے تو یہ روایات اس کی مخصوص ہیں یعنی قرآن کے عموم کو ان روایات نے مطلقہ رجعیہ کے لیے خاص کر دیا اور مطلقہ باندہ کو اس عموم سے نکال دیا ہے۔

(۱) مطلقہ مدخولہ کی عدت تین حیض ہے۔ اگر رجوع کرنا مقصود ہو تو عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے رجوع کر لو۔ بصورت دیگر انہیں معروف کے مطابق اپنے سے جدا کر دو۔

(۲) اس رجعت اور بعض کے نزدیک طلاق پر گواہ کر لو۔ یہ امر وجوب کے لیے نہیں، استحباب کے لیے ہے۔ یعنی گواہ بنا لینا بہتر ہے تاہم ضروری نہیں۔

(۳) یہ تاکید گواہوں کو ہے کہ وہ کسی کی رو رعایت اور لالچ کے بغیر صحیح صحیح گواہی دیں۔

(۴) یعنی شداہد اور آزمائشوں سے نکلنے کی سبیل پیدا فرما دیتا ہے۔

(۵) یعنی وہ جو چاہے۔ اسے کوئی روکنے والا نہیں۔

(۶) تنگیوں کے لیے بھی اور آسانیوں کے لیے بھی۔ یہ دونوں اپنے وقت پر انتہا پذیر ہو جاتے ہیں۔ بعض نے اس سے حیض اور عدت مراد لی ہے۔

گئی ہوں، اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جنہیں حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو^(۱) اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کے وضع حمل ہے^(۲) اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اللہ اس کے (ہر) کام میں آسانی کر دے گا۔ (۳)

یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہاری طرف اتارا ہے اور جو شخص اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے گناہ مٹا دے گا اور اسے بڑا بھاری اجر دے گا۔ (۵)

تم اپنی طاقت کے مطابق جہاں تم رہتے ہو وہاں ان (طلاق والی) عورتوں کو رکھو^(۳) اور انہیں تنگ کرنے کے لیے تکلیف نہ پہنچاؤ^(۴) اور اگر وہ حمل سے ہوں تو

تَلَيْتُمْ أَشْفَرًا وَإِنِّي لَأَعْلَمُ لَكُمْ لِمَنْ تَصْعَقُونَ
مَلْمُؤِينَ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا ۝

ذَلِكَ أَمْرُ اللَّهِ أَنْزَلَهُ إِلَيْنَا وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ سُبُلًا مَخْرُجًا ۝

أَسْكُوتُونَ مِنْ حَيْثُ سَكَتْتُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَلَا تَنْصَرُوا مِنْهُنَّ يَتَّبِعُكُمْ عَلَيْكُمْ ذُنُوبٌ حَتَّى تُصْعَقُوا
فَإِنْ أَضَعْتُمْ كُفْرًا فَهُنَّ أُجُورُهُنَّ وَأَنْزَلُوا إِلَيْنَا يَكْتُمُونَ بِأَعْيُنِهِمْ فَلَنْ

(۱) یہ ان کی عدت ہے جن کا حیض عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے بند ہو گیا یا جنہیں حیض آنا شروع ہی نہیں ہوا۔ واضح رہے کہ نادر طور پر ایسا ہوتا ہے کہ عورت سن بلوغت کو پہنچ جاتی ہے اور اسے حیض نہیں آتا۔

(۲) مطلقہ اگر حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہے، چاہے دوسرے روز ہی وضع حمل ہو جائے۔ علاوہ ازیں ظاہر آیت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر حاملہ عورت کی عدت یہی ہے چاہے وہ مطلقہ ہو یا اس کا خاوند فوت ہو گیا ہو۔ احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ (دیکھئے صحیح بخاری و صحیح مسلم اور دیگر سنن، کتاب الطلاق) دیگر عورتیں جن کے خاوند فوت ہو جائیں، ان کی عدت ۴ مہینے ۱۰ دن ہے۔ (سورہ بقرہ، ۲۳۴)

(۳) یعنی مطلقہ رجوعی کو۔ اس لیے کہ مطلقہ باندہ کے لیے تو رہائش اور نفقہ ضروری ہی نہیں ہے، جیسا کہ گزشتہ صفحے میں بیان ہوا۔ اپنی طاقت کے مطابق رکھنے کا مطلب ہے کہ اگر مکان فراخ ہو اور اس میں متعدد کمرے ہوں تو ایک کمرہ اس کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ بصورت دیگر اپنا کمرہ اس کے لیے خالی کر دے۔ اس میں حکمت یہی ہے کہ قریب رہ کر عدت گزارے گی تو شاید خاوند کا دل پہنچ جائے اور رجوع کرنے کی رغبت اس کے دل میں پیدا ہو جائے۔ خاص طور پر اگر سچے بھی ہوں تو پھر رغبت اور رجوع کا قوی امکان ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمان اس ہدایت پر عمل نہیں کرتے، جس کی وجہ سے اس حکم کے نواہد و حکم سے بھی وہ محروم ہیں۔ ہمارے معاشرے میں طلاق کے ساتھ ہی جس طرح عورت کو فوراً اچھوت بنا کر گھر سے نکال دیا جاتا ہے، یا بعض دفعہ لڑکی والے اسے اپنے گھر لے جاتے ہیں، یہ رواج قرآن کریم کی صریح تعلیم کے خلاف ہے۔

(۴) یعنی نان نفقہ میں یا رہائش میں اسے تنگ اور بے آبرو کرنا تاکہ وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ عدت کے دوران

قَالَ سَمِعَ اللَّهَ ۲۸

جب تک بچہ پیدا ہو لے انہیں خرچ دیتے رہا کرو^(۱) پھر اگر تمہارے کہنے سے وہی دودھ پلائیں تو تم انہیں ان کی اجرت دے دو^(۲) اور باہم مناسب طور پر مشورہ کر لیا کرو^(۳) اور اگر تم آپس میں کشمکش کرو تو اس کے کہنے سے کوئی اور دودھ پلائے گی۔^(۴)

کشاہدی والے کو اپنی کشاہدی سے خرچ کرنا چاہیے^(۵) اور جس پر اس کے رزق کی تنگی کی گئی ہو^(۶) اسے چاہیے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اسے دے رکھا ہے اسی میں سے (اپنی حسب حیثیت) دے، کسی شخص کو اللہ تکلیف نہیں دیتا مگر اتنی ہی جتنی طاقت اسے دے رکھی ہے،^(۷) اللہ تنگی کے

لِيُنْفِقَ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ لَا يَكْفُلُ اللَّهُ فَنفسًا الْآدَمَاءَ أَنهِنَّ سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عَذِيبَتِهِمْ

ایسا رویہ اختیار نہ کیا جائے۔ بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ عدت ختم ہو جانے کے قریب ہو تو پھر رجوع کر لے اور بار بار ایسا کرے، جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں کیا جاتا تھا۔ جس کے سدباب کے لیے شریعت نے طلاق کے بعد رجوع کرنے کی حد مقرر فرمادی تاکہ کوئی شخص آئندہ اس طرح عورت کو تنگ نہ کرے، اب ایک انسان دو مرتبہ تو ایسا کر سکتا ہے یعنی طلاق دے کر عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لے۔ لیکن تیسری مرتبہ جب طلاق دے گا تو اس کے بعد اس کے رجوع کا حق بھی ختم ہو جائے گا۔

(۱) یعنی مطلقہ خواہ باندہ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر حاملہ ہے تو اس کا نفقہ و سکنی ضروری ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا ہے۔

(۲) یعنی طلاق دینے کے بعد اگر وہ تمہارے بچے کو دودھ پلائے، تو اس کی اجرت تمہارے ذمے ہے۔

(۳) یعنی باہمی مشورے سے اجرت اور دیگر معاملات طے کر لیے جائیں۔ مثلاً بچے کا باپ عرف کے مطابق اجرت دے اور ماں باپ کی استطاعت کے مطابق اجرت طلب کرے، وغیرہ۔

(۴) یعنی آپس میں اجرت وغیرہ کا معاملہ طے نہ ہو سکے تو کسی دوسری انا کے ساتھ معاملہ کر لے جو اسکے بچے کو دودھ پلائے۔

(۵) یعنی دودھ پلانے والی عورتوں کو اجرت اپنی طاقت کے مطابق دی جائے اگر اللہ نے مال و دولت میں فراخی عطا فرمائی ہے تو اسی فراخی کے ساتھ مرضعت کی خدمت ضروری ہے۔

(۶) یعنی مالی لحاظ سے وہ کمزور ہو۔

(۷) اس لیے وہ غریب اور کمزور کو یہ حکم نہیں دیتا کہ وہ دودھ پلانے والی کو زیادہ اجرت ہی دے۔ مطلب ان ہدایات کا یہ ہے کہ بچے کی مال اور بچے کا باپ دونوں ایسا مناسب رویہ اختیار کریں کہ ایک دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے اور بچے کو دودھ پلانے کا مسئلہ سنگین نہ ہو۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿لَا تَشَاوِرُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَرُوا مَن يَبْغِي بَعْضُهُمْ أَمْوَالَهُمْ﴾

بعد آسانی و فراغت بھی کر دے گا۔^(۷)

اور بہت سی بستی والوں نے اپنے رب کے حکم سے اور اس کے رسولوں سے سرتابی کی^(۲) توہم نے بھی ان سے سخت حساب کیا اور انہیں عذاب دیا ان دیکھا (سخت عذاب۔^(۳) (۸)

پس انہوں نے اپنے کروتوت کا مزہ چکھ لیا اور انجام کار ان کا خسارہ ہی ہوا۔ (۹)

ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے، پس اللہ سے ڈرو اے عقل مند ایمان والو۔ یقیناً اللہ نے تمہاری طرف نصیحت اتا رہی ہے۔ (۱۰)

(یعنی) رسول^(۳) جو تمہیں اللہ کے صاف صاف احکام پڑھ سنانا ہے تاکہ ان لوگوں کو جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں وہ تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے،^(۵) اور جو شخص اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے^(۶) اللہ اسے

وَكَايِنَ مِنْ قَرْيَةٍ عَنَّتْ عَنْ قَوْمِهَا وَوَسَّلَهُمْ فَمَا جَاءَهَا بِهَا
شَدِيدًا وَعَذَّبْنَا عَدَابًا ثَقِيلًا ۝

فَدَاقَتَ وَيَالَ أَمْوَالًا وَكَانَ عَاقِبَةُ أَمْرِهَا خُسْرًا ۝

عَدَا اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فَاثْقُوا لِلَّهِ يَا أُولِيَ الْأَلْبَابِ إِنَّ
الَّذِينَ آمَنُوا فَذَنبُوا أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَوْمًا ۝

رَسُولًا تَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللَّهِ مُمْتَنِينَ لِيُخَوِّجَ الَّذِينَ آمَنُوا
وَعَلِمُوا الصَّلَاةَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ
صَالِحًا يُدْخِلْهُ خِلْفَةَ حَبَّتِ تَعْبَى مِنْ حَبَّتِ الْأَنْهَارِ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا
قَدْ أَحْسَنَ اللَّهُ لَهُ رِزْقًا ۝

يُؤَلِّفُ ﴿البقرة- ۲۳۳﴾ ”نہ ماں کو بچے کی وجہ سے تکلیف پہنچائی جائے اور نہ باپ کو۔“

(۱) چنانچہ جو اللہ پر اعتماد و توکل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو آسانی و کشادگی سے بھی نواز دیتا ہے۔

(۲) عَنَّتْ، أَي: تَمَرَّدَتْ وَطَعَتْ وَاسْتَكْبَرَتْ عَنِ اتِّبَاعِ أَمْرِ اللَّهِ وَمُتَابَعَةِ رُسُلِهِ.

(۳) نُكْرًا، مُنْكَرًا فَظْنِيًّا حساب اور عذاب، دونوں سے مراد دنیاوی و مؤاخذہ اور سزا ہے، یا پھر بقول بعض کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ عَذَابًا نُكْرًا وہ عذاب ہے جو دنیا میں قحط، خست و مسخ وغیرہ کی شکل میں انہیں پہنچا، اور حِسَابًا شَدِيدًا وہ ہے جو آخرت میں ہو گا۔ (فتح القدير)

(۴) رسول، ذکر سے بدل ہے، بطور مبالغہ رسول کو ذکر سے تعبیر فرمایا، جیسے کہتے ہیں، وہ تو مجسم عدل ہے۔ یا ذکر سے مراد قرآن ہے اور رسولاً سے پہلے اُزْسَلْنَا محذوف ہے یعنی ذکر (قرآن) کو نازل کیا اور رسول کو ارسال کیا۔

(۵) یہ رسول کا منصب اور فریضہ بیان کیا گیا کہ وہ قرآن کے ذریعے سے لوگوں کو اخلاقی پستیوں سے شرک و ضلالت کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان و عمل صالح کی روشنی کی طرف لاتا ہے۔ رسول سے یہاں مراد الرسول یعنی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

(۶) عمل صالح میں دونوں باتیں شامل ہیں، احکام و فرائض کی ادائیگی اور معصیات و منہیات سے اجتناب۔ مطلب ہے

ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں جاری ہیں جن میں یہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بیشک اللہ نے اسے بہترین روزی دے رکھی ہے۔ (۱۱)

اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور اسی کے مثل زمینیں بھی۔^(۱) اس کا حکم ان کے درمیان اترتا ہے^(۲) تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو بہ اعتبار علم گھیر رکھا ہے۔^(۳) (۱۲)

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْأَنْزِيلُ فِيهَا لِيُنزِلَ عَلَيْكُمْ مِنْ سَمَاءٍ قَدِيرًا وَإِنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۱۲﴾

کہ جنت میں وہی اہل ایمان داخل ہوں گے، جنہوں نے صرف زبان سے ہی ایمان کا اظہار نہیں کیا تھا، بلکہ انہوں نے ایمان کے تقاضوں کے مطابق فرائض پر عمل اور معاصی سے اجتناب کیا تھا۔

(۱) اُنِّي خَلَقْتُ مِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ یعنی سات آسمانوں کی طرح، اللہ نے سات زمینیں بھی پیدا کی ہیں۔ بعض نے اس سے سات اقالیم مراد لیے ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں۔ بلکہ جس طرح اوپر نیچے سات آسمان ہیں، اسی طرح سات زمینیں ہیں، جن کے درمیان بعد و مسافت ہے اور ہر زمین میں اللہ کی مخلوق آباد ہے (القرطبی) احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ أَخَذَ شِبْرًا مِّنَ الْأَرْضِ ظُلْمًا فَإِنَّهُ يُطَوَّقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرْضِينَ (صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب تحریم الظلم) ”جس نے کسی کی ایک باشت زمین بھی ہتھیالی تو قیامت والے دن اس زمین کا اتنا حصہ ساتوں زمینوں سے طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔“ (صحیح بخاری کے الفاظ ہیں خسف به إلى سبع أرضين ”اس کو ساتوں زمینوں تک دھنسا دیا جائے گا۔“ (صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب إثم من ظلم شيئاً من الأرض) بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر زمین میں، اسی طرح کا پیغمبر ہے، جس طرح کا پیغمبر تمہاری زمین پر آیا، مثلاً آدم، آدم کی طرح نوح، نوح کی طرح ابراہیم، ابراہیم کی طرح۔ عیسیٰ، عیسیٰ کی طرح (علیم السلام)۔ لیکن یہ بات کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں۔

(۲) یعنی جس طرح ہر آسمان پر اللہ کا حکم نافذ اور غالب ہے، اسی طرح ہر زمین پر اس کا حکم چلتا ہے، آسمانوں کی طرح ساتوں زمینوں کی بھی وہ تدبیر فرماتا ہے۔

(۳) پس اس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں، چاہے وہ کیسی ہی ہو۔



سورہ تحریم مدنی ہے اس میں بارہ آیتیں اور
دو رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

اے نبی! جس چیز کو اللہ نے آپ کے لیے حلال کر دیا ہے
اسے آپ کیوں حرام کرتے ہیں؟ (کیا) آپ اپنی بیویوں
کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اللہ بخشنے والا
رحم کرنے والا ہے۔ (۱)

تحقیق کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے قسموں کو کھول ڈالنا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ
أَزْوَاجِكَ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ①

قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کو اپنے لیے حرام کر لیا تھا، وہ کیا تھی؟ جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار
فرمایا۔ اس سلسلے میں ایک تو وہ مشہور واقعہ ہے جو صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں نقل ہوا ہے کہ آپ ﷺ حضرت زینب
بنت جحش رضی اللہ عنہا کے پاس کچھ دیر ٹھہرتے اور وہاں شہد پیتے، حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما دونوں نے
وہاں معمول سے زیادہ دیر تک آپ کو ٹھہرنے سے روکنے کے لیے یہ اسکیم تیار کی کہ ان میں سے جس کے پاس بھی آپ
ﷺ تشریف لائیں تو وہ ان سے یہ کہے کہ اللہ کے رسول! آپ ﷺ کے منہ سے مغایر (ایک قسم کا پھول، جس میں
بساند ہوتی ہے) کی بو آ رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، میں نے تو زینب رضی اللہ عنہا کے گھر
صرف شہد پیا ہے۔ اب میں قسم کھاتا ہوں کہ یہ نہیں پیوں گا، لیکن یہ بات تم کسی کو مت بتانا۔ (صحیح البخاری،
تفسیر سورۃ التحريم) سنن نسائی میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایک لونڈی تھی جس کو آپ ﷺ نے اپنے اوپر حرام کر
لیا تھا۔ (شیخ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے) (سنن النسائی، ۸۳/۳) جب کہ کچھ دوسرے علماء سے ضعیف قرار دیتے
ہیں۔ اس کی تفصیل دوسری کتابوں میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ یہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا تھیں، جن سے نبی صلی
اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم تولد ہوئے تھے۔ یہ ایک مرتبہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر آ گئی تھیں جب کہ
حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا موجود نہیں تھیں۔ اتفاق سے انہی کی موجودگی میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا آ گئیں، انہیں نبی صلی اللہ
علیہ وسلم کے ساتھ اپنے گھر میں خلوت میں دیکھنا ناگوار گزرا، جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی محسوس فرمایا، جس پر
آپ ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو راضی کرنے کے لیے قسم کھا کر ماریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور حفصہ
رضی اللہ عنہا کو تاکید کی کہ وہ یہ بات کسی کو نہ بتلائے۔ امام ابن حجر ایک تو یہ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ مختلف طرق سے نقل ہوا
ہے جو ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ دوسری بات وہ یہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے بیک وقت دونوں ہی واقعات
اس آیت کے نزول کا سبب بنے ہوں۔ (فتح الباری، تفسیر سورۃ التحريم) امام شوکانی نے بھی اسی رائے کا اظہار

وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ①

وَإِذْ أَسْرَأَ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا بَيَّنَّاتُ بِهِ
وَآظَهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ
فَلَمَّا بَيَّنَّاتُهَا قَالَتْ مَنْ أَبَاكَ هَذَا قَالَ بَيَّاتِي
الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ②

مقرر کر دیا ہے (۱) اور اللہ تمہارا کارساز ہے اور وہی
(پورے) علم والا، حکمت والا ہے۔ (۲)

اور یاد کر جب نبی نے اپنی بعض عورتوں سے ایک
پوشیدہ بات کہی، (۲) پس جب اس نے اس بات کی خبر کر
دی (۳) اور اللہ نے اپنے نبی کو اس پر آگاہ کر دیا تو نبی
نے تھوڑی سی بات تو بتادی اور تھوڑی سی ٹال گئے، (۳)
پھر جب نبی نے اپنی اس بیوی کو یہ بات بتائی تو وہ کہنے لگی
اس کی خبر آپ کو کس نے دی۔ (۵) کہا سب جاننے والے
پوری خبر رکھنے والے اللہ نے مجھے یہ بتلایا ہے۔ (۳)
(اے نبی کی دونوں بیویو! اگر تم دونوں اللہ کے سامنے

إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا وَإِنْ تَظَاهَرَا

کیا ہے اور دونوں قصوں کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام کرنے کا اختیار
کسی کے پاس بھی نہیں ہے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ اختیار نہیں رکھتے۔

(۱) یعنی کفارہ ادا کر کے اس کام کو کرنے کی، جس کو نہ کرنے کی قسم کھائی ہو، اجازت دے دی، قسم کا یہ کفارہ
سورۃ مائدہ ۸۹ میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کفارہ ادا کیا۔ (فتح القدیر) اس امر میں علما
کے مابین اختلاف ہے کہ اگر کوئی شخص کسی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لے تو اس کا کیا حکم ہے؟ جمہور علما کے نزدیک
بیوی کے علاوہ کسی چیز کو حرام کرنے سے وہ چیز حرام ہوگی نہ اس پر کفارہ ہے، اگر بیوی کو اپنے اوپر حرام کرے گا تو
اس سے اس کا مقصد اگر طلاق ہے۔ تو طلاق ہو جائے گی اور اگر طلاق کی نیت نہیں ہے تو راجح قول کے مطابق یہ
قسم ہے، اس کے لیے کفارہ بیعت کی ادائیگی ضروری ہے۔ (ایسر التفاسیر)

(۲) وہ پوشیدہ بات شہد کو یا ماریہ رضی اللہ عنہا کو حرام کرنے والی بات تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے کی تھی۔

(۳) یعنی حفصہ رضی اللہ عنہا نے وہ بات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جا کر بتلادی۔

(۴) یعنی حفصہ رضی اللہ عنہا کو بتلادیا کہ تم نے میرا راز افاش کر دیا ہے۔ تاہم اپنی تکریم و عظمت کے پیش نظر ساری بات بتانے
سے اعراض فرمایا۔

(۵) جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ رضی اللہ عنہا کو بتلایا کہ تم نے میرا راز ظاہر کر دیا ہے تو وہ حیران ہوئیں کیونکہ
انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ کسی کو یہ بات نہیں بتلائی تھی اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ
وہ آپ کو بتلادیں گی، کیونکہ وہ شریک معاملہ تھیں۔

(۶) اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے علاوہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوا تھا۔

عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيْلٌ مِّنَ الْمُرْسَلِيْنَ
وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظٰهِرُوْنَ ۝

توبہ کرو (تو بہت بہتر ہے) ^(۱) یقیناً تمہارے دل جھک پڑے ہیں ^(۲) اور اگر تم نبی کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو گی پس یقیناً اس کا کارساز اللہ ہے اور جبریل ہیں اور نیک اہل ایمان اور ان کے علاوہ فرشتے بھی مدد کرنے والے ہیں۔ ^(۳)

اگر وہ (پیغمبر) تمہیں طلاق دے دیں تو بہت جلد انہیں ان کا رب! تمہارے بدلے تم سے بہتر بیویاں عنایت فرمائے گا، ^(۴) جو اسلام والیاں، ایمان والیاں اللہ کے حضور جھکنے والیاں توبہ کرنے والیاں، عبادت بجالانے والیاں روزے رکھنے والیاں ہوں گی پیوہ اور کنواریاں۔ ^(۵) اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے گھروالوں کو اس آگ سے بچاؤ ^(۶) جس کا بندھن انسان ہیں اور پتھر

عَنِ رَبِّهَا اِنْ طَلَّقَنَّ اَنْ يُبَدِّلَ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّمَّا مَتَّكْنَ
مُسْلِمَاتٍ مُّؤْمِنَاتٍ فَيَذَّاتِ تَبَدُّتٍ عِيْدَتٍ سَبَّحَتْ
يُنَبِّئُ وَاَبْكَارًا ۝

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْذًا
النَّاسِ وَاَلْحِجَابَةَ عَلَيْهِمْ مَلٰٓئِكَةٌ عَلٰٓظٌ يَّشٰدُوْنَ لَا يَعْصُوْنَ

(۱) یا تمہاری توبہ قبول کر لی جائے گی، یہ شرط (اِنْ تَتُوبَا) کا جواب محذوف ہے۔

(۲) یعنی حق سے ہٹ گئے ہیں اور وہ ہے ان کا ایسی چیز کا پسند کرنا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ناگوار تھی۔ (فتح القدیر)

(۳) یعنی نبی ﷺ کے مقابلے میں تم جتھ بندی کرو گی تو نبی کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گی، اس لیے کہ نبی کا مددگار تو اللہ بھی ہے اور مومنین اور ملائکہ بھی۔

(۴) یہ تمہیہ کے طور پر ازواج مطہرات کو کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو تم سے بھی بہتر بیویاں عطا کر سکتا ہے۔

(۵) تَبَدُّتٍ، تَبَدُّتٍ کی جمع ہے، (لوٹ آنے والی) پیوہ عورت کو تَبَدُّتٍ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ خاوند سے واپس لوٹ آتی ہے اور پھر اس طرح بے خاوند رہ جاتی ہے جیسے پہلے تھی۔ اَبْكَارًا، بَنُوْر کی جمع ہے، کنواری عورت۔ اسے بکر اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ ابھی اپنی اسی پہلی حالت پر ہوتی ہے جس پر اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ (فتح القدیر) بعض روایات میں آتا ہے کہ تَبَدُّتٍ سے حضرت آسیہ (فرعون کی بیوی) اور بَنُوْر سے حضرت مریم (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ) مراد ہیں۔ یعنی جنت میں ان دونوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں بنا دیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو۔ لیکن ان روایات کی بنیاد پر ایسا خیال رکھنا یا بیان کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ سند آہ روایات پایہ اعتبار سے ساقط ہیں۔

(۶) اس میں اہل ایمان کو ان کی ایک نہایت اہم ذمے داری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور وہ ہے، اپنے ساتھ اپنے گھر والوں کی بھی اصلاح اور ان کی اسلامی تعلیم و تربیت کا اہتمام، تاکہ یہ سب جہنم کا بندھن بننے سے بچ جائیں۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب بچہ سات سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اسے نماز کی تلقین کرو، اور دس

جس پر سخت دل مضبوط فرشتے مقرر ہیں جنہیں جو حکم اللہ تعالیٰ دیتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے بلکہ جو حکم دیا جائے بجالاتے ہیں۔ (۶)

اے کافرو! آج تم عذر و بہانہ مت کرو۔ تمہیں صرف تمہارے کرتوت کا بدلہ دیا جا رہا ہے۔ (۷)

اے ایمان والو! تم اللہ کے سامنے سچی خالص توبہ کرو۔^(۱) قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے گناہ دور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ جس دن اللہ تعالیٰ نبی کو اور ایمان داروں کو جو ان کے ساتھ ہیں رسوا نہ کرے گا۔ ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے دائیں دوڑ رہا ہو گا۔ یہ دعائیں کرتے ہوں گے اے ہمارے رب ہمیں کامل نور عطا فرما^(۲) اور ہمیں بخش دے یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے۔ (۸)

اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو^(۳) اور ان پر سختی

اللَّهُ مَا أَمَرَهُمْ وَيَقْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ①

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَدُوا الْيَوْمَ إِنَّمَا جُؤِرُونَ
مَالِكُمْ تَعْمَلُونَ ②

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوَلُّوْا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا عَلَىٰ رَبِّكُمْ
أَنَّ يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيْنَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ نوره
تَسْبِيحِي بَيْنَ يَدَيْهِمْ وَيَأْتِيَهُمْ يَقُولُونَ بَرَئْنَا آلِهَتَنَا
فُؤْرَتَنَا وَأَغْوَيْنَا إِنَّا لَنَّا عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرُونَ ③

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ

سال عمر کے بچوں میں نماز سے تساہل دیکھو تو انہیں سرزنش کرو۔ (سنن ابی داؤد، و سنن الترمذی۔ کتاب الصلوٰۃ) فقمانے کہا ہے، اسی طرح روزے ان سے رکھوائے جائیں اور دیگر احکام کے اتباع کی تلقین انہیں کی جائے۔ تاکہ جب وہ شعور کی عمر کو پہنچیں تو اس دین حق کا شعور بھی انہیں حاصل ہو چکا ہو۔ (ابن کثیر)

(۱) خالص توبہ یہ ہے کہ ۱۔ جس گناہ سے وہ توبہ کر رہا ہے، اسے ترک کر دے۔ ۲۔ اس پر اللہ کی بارگاہ میں ندامت کا اظہار کرے۔ ۳۔ آئندہ اسے نہ کرنے کا عزم رکھے۔ ۴۔ اگر اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے تو جس کا حق غصب کیا ہے، اس کا ازالہ کرے، جس کے ساتھ زیادتی کی ہے، اس سے معافی مانگے۔ محض زبان سے توبہ کر لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

(۲) یہ دعا اہل ایمان اس وقت کریں گے جب منافقین کا نور بجھا دیا جائے گا، جیسا کہ سورہ حدید میں تفصیل گزری۔ اہل ایمان کہیں گے، جنت میں داخل ہونے تک ہمارے اس نور کو باقی رکھ اور اس کا تمام فرما۔

(۳) کفار کے ساتھ جہاد، و قتال کے ساتھ اور منافقین سے، ان پر حدود الہی قائم کر کے، جب وہ ایسے کام کریں جو موجب حد ہوں۔

وَمَا لَهُمْ حَمِيمٌ وَيَسُّ الْمَصِيدِ ①

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا الْامْرَأَتِ ذُو نُوْرٍ وَّ امْرَأَتِ
لُوْطٍ كَانَتَا تَعْتَمِدُ عِبْدَئِنِّ مِنَ عِبَادِ نَا صَالِحِيْنَ
فَعَاثَتُهُمَا فَكَرِهْنَا عَلَيْنَا عَنهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَفَعِلَ
اِحْدَا الْاٰنْكَرُ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ②

کرو (۱) ان کا ٹھکانا جہنم ہے (۲) اور وہ بہت بری جگہ ہے۔ (۹)
اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے نوح کی اور لوط کی بیوی کی
مثال بیان فرمائی (۳) یہ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو
(شائستہ اور) نیک بندوں کے گھر میں تھیں، پھر ان کی
انہوں نے خیانت کی (۴) پس وہ دونوں (نیک بندے) ان
سے اللہ کے (کسی عذاب کو) نہ روک سکے (۵) اور حکم
دے دیا گیا (اے عورتو) دوزخ میں جانے والوں کے
ساتھ تم دونوں بھی چلی جاؤ۔ (۱۰) (۱)

(۱) یعنی دعوت و تبلیغ میں سختی اور احکام شریعت میں درستی اختیار کریں۔ کیونکہ یہ لاتوں کے بھوت ہیں جو باتوں سے
ماننے والے نہیں ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ حکمت تبلیغ کبھی نرمی کی متقاضی ہوتی ہے اور کبھی سختی کی۔ ہر جگہ نرمی بھی
مناسب نہیں اور ہر جگہ سختی بھی مفید نہیں رہتی۔ تبلیغ و دعوت میں حالات و ظروف اور اشخاص و افراد کے اعتبار سے
نرمی یا سختی کرنے کی ضرورت ہے۔

(۲) یعنی کافروں اور منافقوں دونوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔

(۳) مَثَلٌ کا مطلب ہے کسی ایسی حالت کا بیان کرنا جس میں ندرت و غرابت ہو، تاکہ اس کے ذریعے سے ایک دوسری
حالت کا تعارف ہو جائے جو ندرت و غرابت میں اس کے مماثل ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ ان کافروں کے حال کے لیے اللہ
نے ایک مثال بیان فرمائی ہے۔ جو نوح اور لوط علیہما السلام کی بیوی کی ہے۔

(۴) یہاں خیانت سے مراد عصمت میں خیانت نہیں، کیونکہ اس بات پر اجماع ہے کہ کسی نبی کی بیوی بدکار نہیں ہوئی۔
(فتح القدیر) خیانت سے مراد ہے کہ یہ اپنے خاوندوں پر ایمان نہیں لائیں، نفاق میں مبتلا رہیں اور ان کی ہمدردیاں اپنی
کافر قوموں کے ساتھ رہیں، چنانچہ نوح علیہ السلام کی بیوی، حضرت نوح علیہ السلام کی بابت لوگوں سے کہتی کہ یہ مجھوں
(دیوانہ) ہے اور لوط علیہ السلام کی بیوی اپنی قوم کو گھر میں آنے والے مہمانوں کی اطلاع پہنچاتی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ
دونوں اپنی قوم کے لوگوں میں اپنے خاوندوں کی چھٹیاں کھاتی تھیں۔

(۵) یعنی نوح اور لوط علیہما السلام دونوں باوجود اس بات کے کہ وہ اللہ کے پیغمبر تھے، جو اللہ کے مقرب ترین بندوں میں
سے ہوتے ہیں، اپنی بیویوں کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکے۔

(۶) یہ انہیں قیامت والے دن کہا جائے گا یا موت کے وقت انہیں کہا گیا کافروں کی یہ مثال بطور خاص یہاں ذکر کرنے
سے مقصود ازواج مطہرات کو تنبیہ کرنا ہے کہ وہ بے شک اس رسول کے حرم کی زینت ہیں، جو تمام مخلوق میں سب
سے بہتر ہے۔ لیکن انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اگر انہوں نے رسول کی مخالفت کی یا انہیں تکلیف پہنچائی تو وہ بھی اللہ کی

اور اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے لیے فرعون کی بیوی کی مثال بیان فرمائی^(۱) جبکہ اس نے دعا کی کہ اے میرے رب! میرے لیے اپنے پاس جنت میں مکان بنا اور مجھے فرعون سے اور اس کے عمل سے بچا اور مجھے ظالم لوگوں سے خلاصی دے۔ (۱۱)

اور (مثال بیان فرمائی) مریم بنت عمران کی^(۲) جس نے اپنے ناموس کی حفاظت کی پھر ہم نے اپنی طرف سے اس میں جان پھونک دی اور (مریم) اس نے اپنے رب کی باتوں^(۳) اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور عبادت گزاروں میں سے تھی۔^(۴) (۱۲)

وَصَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَاتٍ فَرَعُونَ إِذْ قَالَتْ
رَبِّ اٰنِىْ لِيْ عِنْدَ رَبِّىْ اٰيَةً وَوَجِّعْنِىْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ
وَجِّعْنِىْ مِنَ الْعَوَمِ الَّذِيْنَ اٰتٰى ۝۱۱

وَمَرْيَمَ اٰتٰىتْ عِمْرٰنَ الْبَتٰى اَحْصٰتَ فَرْجِهٖا فَنَضٰىنٰهٖ
مِنْ ذُرِّيَّتِهٖا وَصَدَقَتْ رَّبُّهٗا وَكُنْتُمْ مِنْ الْغٰفِيْنَ ۝۱۲

گرفت میں آسکتی ہیں، اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر کوئی ان کو بچانے والا نہیں ہو گا۔

(۱) یعنی ان کی ترغیب، ثبات قدمی، استقامت فی الدین اور شدا اند میں صبر کے لیے۔ نیز یہ بتلانے کے لیے کہ کفر کی صولت و شوکت، ایمان والوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، جیسے فرعون کی بیوی ہے جو اپنے وقت کے سب سے بڑے کافر کے تحت تھی۔ لیکن وہ اپنی بیوی کو ایمان سے نہیں روک سکا۔

(۲) حضرت مریم علیہا السلام کے ذکر سے مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ باوجود اس بات کے کہ وہ ایک بگڑی ہوئی قوم کے درمیان رہتی تھیں، لیکن اللہ نے انہیں دنیا و آخرت میں شرف و کرامت سے سرفراز فرمایا اور تمام جہان کی عورتوں پر انہیں فضیلت عطا فرمائی۔

(۳) کلمات رب سے مراد، شَرَّحَ الٰہی ہیں۔

(۴) یعنی ایسے لوگوں میں سے یا خاندان میں سے تھیں جو فرماں بردار، عبادت گزار اور صلاح و طاعت میں ممتاز تھا۔ حدیث میں ہے۔ جتنی عورتوں میں سب سے افضل حضرت خدیجہ، حضرت فاطمہ، حضرت مریم اور فرعون کی بیوی آسیہ ہیں رضی اللہ عنہن، (مسند أحمد، ۱/۲۹۳۔ مجمع الزوائد، ۲۲۳/الصحيحة للالبانسي، نمبر ۱۵۰۸) ایک دوسری حدیث میں فرمایا ”مردوں میں تو کامل بہت ہوئے ہیں، مگر عورتوں میں کامل صرف فرعون کی بیوی آسیہ، مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد (رضی اللہ عنہن) ہیں اور عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی فضیلت عورتوں پر ایسے ہے جیسے ٹرید کو تمام کھانوں پر فضیلت حاصل ہے۔ (صحیح بخاری کتاب بدء الخلق، باب ضرب اللہ مثلاً..... و صحیح مسلم کتاب

سورہ ملک مکی ہے اس میں تیس آیتیں اور دو رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نمائت رحم والا ہے۔

بہت بابرکت ہے وہ (اللہ) جس کے ہاتھ میں بادشاہی
ہے (۱) اور جو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ (۱)
جس نے موت اور حیات کو اس لیے پیدا کیا کہ تمہیں
آزمائے کہ تم میں سے اچھے کام کون کرتا ہے، (۲) اور وہ
غالب (اور) بخشنے والا ہے۔ (۲)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

تَبَارَكَ الَّذِیْ بَیْدَہِ الْمَلٰئِکَ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ
قَدِیْرٌ ۝

لَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لَیَبْلُوْکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ
عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝

☆ اس کی فضیلت میں متعدد روایات آتی ہیں، جن میں سے صرف چند روایات صحیح یا حسن ہیں۔ ایک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ کی کتاب میں ایک سورت ہے جس میں صرف ۳۰ آیت ہیں، یہ آدمی کی سفارش کرے گی۔ یہاں تک کہ اس کو بخش دیا جائے گا" (سنن الترمذی، سنن ابی داؤد، ابن ماجہ، ومسند أحمد، ۲/۲۹۹، ۳۲۱) دوسری روایت میں ہے "قرآن مجید میں ایک سورت ہے، جو اپنے پڑھنے والے کی طرف سے لڑے گی، حتیٰ کہ اسے جنت میں داخل کروائے گی"۔ (مجمع الزوائد، ۷/۱۷۲۔ ذکرہ الألبانی فی صحیح الجامع الصغیر، نمبر ۳۶۳۳) سنن ترمذی کی ایک روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو سونے سے قبل سورۃ الم السجدہ اور سورۃ ملک ضرور پڑھتے تھے۔ (ابواب فضائل القرآن) ایک روایت شیخ البانی نے الصحیحہ میں نقل کی ہے سورۃ تَبَارَكَ هِيَ الْمَانِعَةُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ (نمبر ۱۱۳۰ ج ۳، ص ۱۳۱) سورۃ ملک عذاب قبر سے روکنے والی ہے، یعنی اس کا پڑھنے والا امید ہے کہ عذاب قبر سے محفوظ رہے گا۔ بشرطیکہ وہ احکام و فرائض اسلام کا پابند ہو۔

(۱) تَبَارَكَ، بَرَكَةٌ سے ہے، النَّمَاءُ وَالزِّيَادَةُ، بڑھوتری اور زیادتی کے معنی میں۔ بعض نے معنی کیے ہیں، مخلوقات کی صفات سے بلند اور برتر۔ تفاعل کا سینہ مبالغے کے لیے ہے۔ "اسی کے ہاتھ میں بادشاہی ہے" یعنی ہر طرح کی قدرت اور غلبہ اسی کو حاصل ہے، وہ کائنات میں جس طرح کا تصرف کرے، کوئی اسے روک نہیں سکتا، وہ شاہ کو گدا اور گدا کو شاہ بنا دے، امیر کو غریب غریب کو امیر کر دے۔ کوئی اس کی حکمت و مشیت میں دخل نہیں دے سکتا۔

(۲) روح، ایک ایسی غیر مرئی چیز ہے کہ جس بدن سے اس کا تعلق و اتصال ہو جائے، وہ زندہ کہلاتا ہے اور جس بدن سے اس کا تعلق منقطع ہو جائے، وہ موت سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ اس نے یہ عارضی زندگی کا سلسلہ، جس کے بعد موت ہے اس لیے قائم کیا ہے تاکہ وہ آزمائے کہ اس زندگی کا صحیح استعمال کون کرتا ہے؟ جو اسے ایمان و اطاعت کے لیے استعمال کرے گا، اس کے لیے بہترین جزا ہے اور دوسروں کے لیے عذاب۔

جس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے۔ (تو اسے دیکھنے والے) اللہ رحمن کی پیدائش میں کوئی بے ضابطگی نہ دیکھے گا،^(۱) دوبارہ (نظرس ڈال کر) دیکھ لے کیا کوئی شکاف بھی نظر آ رہا ہے۔^(۲) (۳)

پھر دوہرا کر دو دو بار دیکھ لے تیری نگاہ تیری طرف ذلیل (وعاجز) ہو کر تھکی ہوئی لوٹ آئے گی۔^(۳) (۴)

بیشک ہم نے آسمان دنیا کو چرانگوں (ستاروں) سے آراستہ کیا اور انہیں شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ^(۳) بنا دیا اور شیطانوں کے لیے ہم نے (دوزخ کا جلانے والا) عذاب تیار کر دیا۔ (۵)

اور اپنے رب کے ساتھ کفر کرنے والوں کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے۔ (۶)

جب اس میں یہ ڈالے جائیں گے تو اس کی بڑے زور کی آواز سنیں گے اور وہ جوش مار رہی ہوگی۔ (۷)

قریب ہے کہ (ابھی) غصے کے مارے پھٹ جائے،^(۸)

الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا مَّا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ
مِن تَفْوِيتٍ تَارِجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُطُورٍ ۝

تَعْرَاجِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَائِسًا
وَهُوَ خَائِدٌ ۝

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ وَجَعَلْنَاهَا
رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ۝

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُرْتَبُونَ عَذَابَ جَهَنَّمَ وَيَسُئُ الْمُبْسِطُ ۝

إِذَا نْفَخُوا فِيهَا سَمِعُوا لها شَهيقًا وَهي تَفُورُ ۝

تَكَادُ تَمَيِّدُ مِنَ الْعَيْظِ كُلِّمًا لِّئَلَّا فِيهَا قُوِحٌ سَأَلْتَهُمْ خَزَنَتُنَا

(۱) یعنی کوئی تناقص، کوئی کجی، کوئی نقص اور کوئی خلل، بلکہ وہ بالکل سیدھے اور برابر ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ان سب کا پیدا کرنے والا صرف ایک ہی ہے متعدد نہیں ہیں۔

(۲) بعض دفعہ دوبارہ غور سے دیکھنے سے کوئی نقص اور عیب نکل آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دعوت دے رہا ہے کہ بار بار دیکھو کہ کیا تمہیں کوئی شکاف نظر آتا ہے؟

(۳) یہ مزید تاکید ہے جس سے مقصد اپنی عظیم قدرت اور وحدانیت کو واضح تر کرنا ہے۔

(۴) یہاں ستاروں کے دو مقصد بیان کیے گئے ہیں ایک آسمانوں کی زینت، کیونکہ وہ چرانگوں کی طرح جلتے نظر آتے ہیں۔ دوسرے، شیطان اگر آسمانوں کی طرف جانے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ شرارہ بن کر ان پر گرتے ہیں۔ تیسرا مقصد ان کا یہ ہے جسے دوسرے مقامات پر بیان فرمایا گیا ہے کہ ان سے برو بخر میں راستوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔

(۵) شہیق، اس آواز کو کہتے ہیں جو گدھا پہلی مرتبہ نکالتا ہے، یہ قہقہہ ترین آواز ہوتی ہے۔ جہنم بھی گدھے کی طرح چیخ اور چلا رہی اور آگ پر رکھی ہوئی ہانڈی کی طرح جوش مار رہی ہوگی۔

(۶) یا مارے غیظ و غضب کے اس کے حصے ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ یہ جہنم کافروں کو دیکھ کر غضب ناک

جب کبھی اس میں کوئی گروہ ڈالا جائے گا اس سے جہنم کے داروغے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے پاس ڈرانے والا کوئی نہیں آیا تھا؟^(۸)

وہ جواب دیں گے کہ بیشک آیا تھا لیکن ہم نے اسے جھٹلایا اور ہم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ بھی نازل نہیں فرمایا۔ تم بہت بڑی گمراہی میں ہی ہو۔^(۹)

اور کہیں گے کہ اگر ہم سنتے ہوتے یا عقل رکھتے ہوتے تو دوزخیوں میں (شریک) نہ ہوتے۔^(۱۰)

پس انہوں نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔^(۱۱) اب یہ دوزخی دفع ہوں (دور ہوں)^(۱۲)

بیشک جو لوگ اپنے پروردگار سے عتابانہ طور پر ڈرتے رہتے ہیں ان کے لیے بخشش ہے اور بڑا ثواب ہے۔^(۱۳)

اللَّهُ يَا أَيُّهَا رَبِّي ۝

قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِن سَمِيٍّ فَآتِنَا آيَاتِنَا إِنَّا لَنُؤْمِنُ بِالْآيَاتِ لَئِن كُنَّا فِي سَبِيلٍ ۝

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝

فَأَعْرَضُوا بِأَن يَرْجِعُوا إِلَىٰ مُنْقَلَبِ السَّعِيرِ ۝

إِنَّ الَّذِينَ يَصْنَعُونَ رِجْمًا بِالْغَيْبِ لَهُمْ سَعِيرٌ ۝
وَأَجْرُكَ يُرِيدُ ۝

ہوگی، جس کا شعور اللہ تعالیٰ اس کے اندر پیدا فرمادے گا۔ اللہ تعالیٰ کے لیے جہنم کے اندر یہ ادراک و شعور پیدا کر دینا کوئی مشکل نہیں ہے۔

(۱) جس کی وجہ سے تمہیں آج جہنم کے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا ہے۔

(۲) یعنی ہم نے پیغمبروں کی تصدیق کرنے کے بجائے انہیں جھٹلایا، آسمانی کتابوں کا ہی سرے سے انکار کر دیا، حتیٰ کہ اللہ کے پیغمبروں کو ہم نے کہا کہ تم بڑی گمراہی میں جھٹلا ہو۔

(۳) یعنی غور اور توجہ سے سنتے اور ان کی باتوں اور نصیحتوں کو آویزہ گوش بنا لیتے، اسی طرح اللہ کی دی ہوئی عقل سے بھی سوچنے سمجھنے کا کام لیتے تو آج ہم دوزخ والوں میں شامل نہ ہوتے۔

(۴) جس کی بنا پر مستحق عذاب قرار پائے، اور وہ ہے کفر اور انبیاء علیہم السلام کی تکذیب۔

(۵) یعنی اب ان کے لیے اللہ سے اور اس کی رحمت سے دوری ہی دوری ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ 'سُخِّقُ'، جہنم کی ایک وادی کا نام ہے۔

(۶) یہ اہل کفر و تکذیب کے مقابلے میں اہل ایمان کا اور ان نعمتوں کا ذکر ہے جو انہیں قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں ملیں گی۔ بِالْغَيْبِ کا ایک مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کو دیکھا تو نہیں، لیکن پیغمبروں کی تصدیق کرتے ہوئے وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتے رہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لوگوں کی نظروں سے غائب، یعنی خلوتوں میں اللہ سے ڈرتے رہے۔

وَأَمْرًا وَقَوْلًا وَأَوْحَاهُ بِرُوحِهِ إِلَيْهِ بِذَاتِ
الضُّمُورِ ⑬

الَّذِي عَلَّمَ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ⑭

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا
وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهَا وَإِلَيْهِ النُّشُورُ ⑮

وَأَمْنًا مِمَّنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمْ الْأَرْضَ
فَإِذَا هِيَ تُنْمَرُ ⑯

تم اپنی باتوں کو چھپاؤ یا ظاہر کرو^(۱) وہ تو سینوں کی
پوشیدگیوں کو بھی بخوبی جانتا ہے۔^(۲) (۱۳)
کیا وہی نہ جانے جس نے پیدا کیا؟^(۳) پھر وہ باریک بین
اور باخبر بھی ہو۔^(۴) (۱۴)

وہ ذات جس نے تمہارے لیے زمین کو پست و مطیع کر
دیا^(۵) تاکہ تم اس کی راہوں میں چلتے پھرتے رہو^(۶) اور
اللہ کی روزیاں کھاؤ (پیو)^(۷) اسی کی طرف (تمہیں) جی کر
اٹھ کھڑا ہونا ہے۔ (۱۵)

کیا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ آسمانوں والا
تمہیں زمین میں دھنسا دے اور اچانک زمین لرزنے
لگے۔^(۸) (۱۶)

(۱) یہ پھر کافروں سے خطاب ہے۔ مطلب ہے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں چھپ کر باتیں کرو یا
علانیہ، سب اللہ کے علم میں ہے۔ اس سے کوئی بات مخفی نہیں۔

(۲) یہ سرو جہر جانے کی تعلیل ہے کہ وہ تو سینوں کے رازوں اور دلوں کے بھیدوں تک سے واقف ہے، تمہاری باتیں
کس طرح اس سے پوشیدہ رہ سکتی ہیں؟

(۳) یعنی سینوں اور دلوں اور ان میں پیدا ہونے والے خیالات، سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، تو کیا وہ اپنی مخلوق سے
بے علم رہ سکتا ہے، استفہام، انکار کے لیے ہے، یعنی نہیں رہ سکتا۔

(۴) لَطِيفٌ کے معنی ہی باریک بین کے ہیں الَّذِي لَطَفَ عِلْمُهُ بِمَا فِي الْقُلُوبِ (فتح القدیر) جس کا علم اتنا
لطیف ہے کہ دلوں میں پرورش پانے والی باتوں کو بھی وہ جانتا ہے۔

(۵) ذَلُولٌ کے معنی، مطیع و منقاد کے ہیں جو تمہارے سامنے جھک جائے، سرتابی نہ کرے۔ یعنی زمین کو تمہارے لیے
نرم اور آسان کر دیا ہے، اسے اس طرح سخت نہیں بنایا کہ تمہارا اس پر آباد ہونا اور چلنا پھرنا مشکل ہو جاتا۔

(۶) مَنَاكِبٍ مَنَكِبٌ کی جمع ہے، جانب۔ یہاں اس سے مراد اس کے راستے اور اطراف و جوانب ہیں۔ امر اباحت کے
لیے ہے، یعنی اس کے راستوں میں چلو۔

(۷) یعنی زمین کی پیداوار سے کھاؤ پیو۔

(۸) یعنی اللہ تعالیٰ جو آسمانوں پر یعنی عرش پر جلوہ گر ہے، یہ کافروں کو ڈرایا جا رہا ہے کہ آسمانوں والی ذات جب چاہے
تمہیں زمین میں دھنسا دے۔ یعنی وہی زمین جو تمہاری قرار گاہ ہے اور تمہاری روزی کا مخزن و منبع ہے، اللہ تعالیٰ اسی

یا کیا تم اس بات سے نڈر ہو گئے ہو کہ آسمانوں والا تم پر پتھر برسا دے؟^(۱) پھر تو تمہیں معلوم ہو ہی جائے گا کہ میرا ڈرانا کیسا تھا۔^(۲) (۱۷)

اور ان سے پہلے لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا تو دیکھو ان پر میرا عذاب کیسا کچھ ہوا؟ (۱۸)

کیا یہ اپنے اوپر پر کھولے ہوئے اور (کبھی کبھی) سینے ہوئے (اڑنے والے) پرندوں کو نہیں دیکھتے،^(۳) انہیں (اللہ) رحمن ہی (ہوا و فضا میں) تھامے ہوئے ہے۔^(۴)

پیشک ہر چیز اس کی نگاہ میں ہے۔ (۱۹)

سوائے اللہ کے تمہارا وہ کون سا لشکر ہے جو تمہاری مدد کر سکے^(۵) کافر تو سرا سردھو کے ہی میں ہیں۔^(۶) (۲۰)

اگر اللہ تعالیٰ اپنی روزی روک لے تو ہٹاؤ کون ہے جو پھر تمہیں روزی دے گا؟^(۷) بلکہ (کافر) تو سرکشی اور بدکنے

أَمَّا أَمْنَتُمْ فَمَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا
فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرٍ ۝

وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرٍ ۝

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الظَّيْرِ فَوَهُمْ صَفِيَتْ وَيَقْبِضُنْ

مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَنُ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ ۝

أَمْ نَحْنُ هَذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَكُمْ يَنْصَرُّكُمْ مِنْ دُونِ

الْمُحْسِنِينَ إِنَّا لَكَاذِبُونَ إِلَّا الظَّنُّ عُرُورٌ ۝

أَمْ نَحْنُ هَذَا الَّذِي يُرْسِلُكُمْ أَنْ تَسْكُرُوا فَمَا بَلِّ لَكُمْ جُؤَا

فِي عُتُوِّكُمْ وَتُعْتَوِرُ ۝

زمین کو، جو نہایت پرسکون ہے، حرکت و جنبش میں لا کر تمہاری ہلاکت کا باعث بنا سکتا ہے۔

(۱) جیسے اس نے قوم لوط اور اصحاب الفیل (ہاتھیوں والے ابرہہ اور اس کے لشکر) پر برسائے اور پتھروں کی بارش سے ان کو ہلاک کر دیا۔

(۲) لیکن اس وقت یہ علم، بے فائدہ ہو گا۔

(۳) پرندہ جب ہوا میں اڑتا ہے تو وہ پر پھیلا لیتا ہے اور کبھی دوران پرواز پروں کو سمیٹ لیتا ہے۔ یہ پھیلانا، صَفًّا اور سمیٹ لینا قَبْضُ ہے۔

(۴) یعنی دوران پرواز ان پرندوں کو تھامے رکھنے والا کون ہے، جو انہیں زمین پر گرنے نہیں دیتا؟ یہ اللہ رحمن ہی کی قدرت کا ایک نمونہ ہے۔

(۵) یہ استفہام تفریع و توتیح کے لیے ہے۔ جُنْدُ کے معنی ہیں لشکر، جتھہ۔ یعنی کوئی لشکر اور جتھہ ایسا نہیں ہے جو تمہیں اللہ کے عذاب سے بچا سکے۔

(۶) جس میں انہیں شیطان نے جلا کر رکھا ہے۔

(۷) یعنی اللہ بارش نہ برسائے، یا زمین ہی کو پیداوار سے روک دے یا تیار شدہ فصلوں کو تباہ کر دے، جیسا کہ بعض بعض دفعہ وہ ایسا کرتا ہے، جس کی وجہ سے تمہاری خوراک کا سلسلہ موقوف ہو جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسا کر دے تو کیا کوئی

پراڑ گئے ہیں۔^(۱) (۲۱)

اچھا وہ شخص زیادہ ہدایت والا ہے جو اپنے منہ کے بل اوندھا ہو کر چلے^(۲) یا وہ جو سیدھا (بیروں کے بل) راہ راست پر چلا ہو؟^(۳) (۲۲)

کہہ دیجئے کہ وہی (اللہ) ہے جس نے تمہیں پیدا کیا^(۴) اور تمہارے کان آنکھیں اور دل بنائے^(۵) تم بہت ہی کم شکرگزاری کرتے ہو۔^(۶) (۲۳)

کہہ دیجئے؛ کہ وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلا دیا اور اس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے۔^(۷) (۲۴)

أَفَمَنْ يَمْشِي مُكِبًّا عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّنْ يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۲۱﴾

قُلْ هُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ﴿۲۲﴾

قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿۲۳﴾

اور ہے جو اللہ کی اس مشیت کے برعکس تمہیں روزی مہیا کر دے؟

(۱) یعنی وعظ و نصیحت کی ان باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا، بلکہ وہ حق سے سرکشی اور اعراض و نفور میں ہی بڑھتے چلے جا رہے ہیں، عبرت پکڑتے ہیں اور نہ غور و فکر کرتے ہیں۔

(۲) منہ کے بل اوندھا چلنے والے کو دائیں، بائیں اور آگے کچھ نظر نہیں آتا، نہ وہ ٹھوکروں سے محفوظ ہوتا ہے۔ کیا ایسا شخص اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے؟ یقیناً نہیں پہنچ سکتا۔ اسی طرح دنیا میں اللہ کی معصیتوں میں ڈوبا ہوا شخص آخرت کی کامیابی سے محروم رہے گا۔

(۳) جس میں کوئی کجی اور انحراف نہ ہو اور اسکو آگے اور دائیں بائیں بھی نظر آ رہا ہو۔ ظاہر ہے یہ شخص اپنی منزل مقصود کو پہنچ جائے گا۔ یعنی اللہ کی اطاعت کا سیدھا راستہ اپنانے والا، آخرت میں سرخو رہے گا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مومن اور کافر دونوں کی اس کیفیت کا بیان ہے جو قیامت والے دن اکی ہوگی۔ کافر منہ کے بل جہنم میں لے جائے جائیں گے اور مومن سیدھے اپنے قدموں پر چل کر جنت میں جائیں گے، جیسے کافروں کے بارے میں دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَيَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ﴾ (سورۃ بنی اسرائیل، ۹۷) ”ہم انہیں قیامت والے دن منہ کے بل اکٹھا کریں گے۔“

(۴) یعنی پہلی مرتبہ پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے۔

(۵) جن سے تم سن سکو، دیکھ سکو اور اللہ کی مخلوق میں غور و فکر کر کے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر سکو۔ تین قوتوں کا ذکر فرمایا ہے جن سے انسان مسوعات، مبصرات اور معقولات کا ادراک کر سکتا ہے، یہ ایک طرح سے اتمام حجت بھی ہے اور اللہ کی ان نعمتوں پر شکر نہ کرنے کی مذمت بھی۔ اسی لیے آگے فرمایا، تم بہت ہی کم شکرگزاری کرتے ہو۔

(۶) یعنی شُكْرًا قَلِيلًا يَا زَمَنًا قَلِيلًا یا قلت شکر سے مراد ان کی طرف سے شکر کا عدم وجود ہے۔

(۷) یعنی انسانوں کو پیدا کر کے زمین میں پھیلانے والا بھی وہی ہے اور قیامت والے دن سب جمع بھی اسی کے پاس ہوں

کافر) پوچھتے ہیں کہ وہ وعدہ کب ظاہر ہو گا اگر تم سچے ہو

(تو بتاؤ؟) ^(۱) (۲۵)

آپ کہہ دیجئے کہ اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے، ^(۲) میں تو صرف کھلے طور پر آگاہ کر دینے والا ہوں۔ ^(۳) (۲۶)

جب یہ لوگ اس ^(۴) وعدے کو قریب تر پالیں گے اس وقت ان کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے ^(۵) اور کہہ دیا جائے گا کہ یہی ہے جسے تم طلب کیا کرتے تھے۔ ^(۶) (۲۷)

آپ کہہ دیجئے: اچھا اگر مجھے اور میرے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ ہلاک کر دے یا ہم پر رحم کرے (بہر صورت یہ تو بتاؤ) کہ کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچائے گا؟ ^(۷) (۲۸)

آپ کہہ دیجئے! کہ وہی رحمن ہے ہم تو اس پر ایمان لا

وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۲۵﴾

قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿۲۶﴾

فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً سَيِّئَتْ وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَقِيلَ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَنذَرُونَ ﴿۲۷﴾

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَهْلَكَنِيَ اللَّهُ وَمَنْ مَعِيَ أَوْ رَحِمَنَا فَمَنْ يُجِزِ الْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ ﴿۲۸﴾

قُلْ هُوَ الرَّحْمَنُ الْمَتَّابُ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا فَسْتَعْلِمُونَ

گے، کسی اور کے پاس نہیں۔

(۱) یہ کافر بطور استہزا اور قیامت کو مستبعد سمجھتے ہوئے کہتے تھے۔

(۲) اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، دوسرے مقام پر فرمایا، ﴿قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهُ عِنْدَ رَبِّي﴾ (الأعراف: ۱۸۷)

(۳) یعنی میرا کام تو اس انجام سے ڈرانا ہے جو میری تکذیب کی وجہ سے تمہارا ہو گا۔ دوسرے لفظوں میں میرا کام انذار ہے، غیب کی خبریں بتلانا نہیں۔ الایہ کہ جس کی بابت خود اللہ مجھے بتلا دے۔

(۴) رَأَوْهُ میں ضمیر کا مرجع اکثر مفسرین کے نزدیک عذاب قیامت ہے۔

(۵) یعنی زلت، ہولناکی اور دہشت سے ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی۔ جس کو دوسرے مقام پر چہروں کے سیاہ ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (آل عمران: ۱۰۶)

(۶) تَدْعُونَ اور تَدْعُونَ کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی یہ عذاب جو تم دیکھ رہے ہو، وہی ہے جسے تم دنیا میں جلد طلب کرتے تھے۔ جیسے سورہ ص، ۱۶- اور الأنفال، ۳۲، وغیرہ میں ہے۔

(۷) مطلب یہ ہے کہ ان کافروں کو تو اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہے، چاہے اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کو موت یا قتل کے ذریعے سے ہلاک کر دے یا انہیں مہلت دے دے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہم باوجود ایمان کے خوف اور رجا کے درمیان ہیں، پس تمہیں تمہارے کفر کے باوجود عذاب سے کون بچائے گا؟

چکے^(۱) اور اسی پر ہمارا بھروسہ ہے۔^(۲) تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ صریح گمراہی میں کون ہے؟^(۳) (۲۹) آپ کہہ دیجئے! کہ اچھا یہ تو بتاؤ کہ اگر تمہارے (پینے کا) پانی زمین میں اتر جائے تو کون ہے جو تمہارے لیے تھرا ہو پانی لائے؟^(۴) (۳۰)

سورہ قلم کی ہے اور اس میں باون آیتیں اور دو رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔
ن،^(۵) قسم ہے قلم کی اور^(۶) اس کی جو کچھ کہ وہ (فرشتے) لکھتے ہیں۔^(۷) (۱)
تو اپنے رب کے فضل سے دیوانہ نہیں ہے۔^(۸) (۲)

مَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

قُلْ اَرَايَكُمْ اَنْ اصْبِهَ مَاذُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ
تَجِيئٍ ۝



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۝

مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ۝

(۱) یعنی اس کی وحدانیت پر، اسی لیے اس کے ساتھ شریک نہیں ٹھہراتے۔

(۲) کسی اور پر نہیں۔ ہم اپنے تمام معاملات اسی کے سپرد کرتے ہیں، کسی اور کے نہیں۔ جیسے مشرک کرتے ہیں۔

(۳) تم ہو یا ہم؟ اس میں کافروں کے لیے سخت وعید ہے۔

(۴) غَوْرٌ کے معنی ہیں خشک ہو جانا یا اتنی گہرائی میں چلا جانا کہ وہاں سے پانی نکالنا ناممکن ہو۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ پانی خشک فرمادے کہ اس کا وجود ہی ختم ہو جائے یا اتنی گہرائی میں کر دے کہ ساری مشینیں پانی نکالنے میں ناکام ہو جائیں تو بتلاؤ! پھر کون ہے جو تمہیں جاری، صاف اور تھرا ہوا پانی مہیا کر دے؟ یعنی کوئی نہیں ہے۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تمہاری مصیبتوں کے باوجود وہ تمہیں پانی سے بھی محروم نہیں فرماتا۔

(۵) ن، اسی طرح حروف مقطعات میں سے ہے، جیسے اس سے قبل ص، ق اور دیگر فوارج سور گزر چکے ہیں۔

(۶) قلم کی قسم کھائی، جس کی اس لحاظ سے ایک اہمیت ہے کہ اس کے ذریعے سے تمہیں و توضیح ہوتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ خاص قلم ہے جسے اللہ نے سب سے پہلے پیدا فرمایا اور اس کو تقدیر لکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس نے ابد تک ہونے والی ساری چیزیں لکھ دیں۔ (سنن ترمذی، تفسیر سورۃ ن والقلم وقال الألبانی صحیح)

(۷) یَسْطُرُونَ کا مرجع اصحاب قلم ہیں، جس پر قلم کا لفظ دلالت کرتا ہے۔ اس لیے کہ آرزو کتابت کا ذکر کتاب کے وجود کو مستلزم ہے۔ مطلب ہے کہ اس کی بھی قسم جو لکھنے والے لکھتے ہیں، یا پھر مرجع فرشتے ہیں، جیسے ترجمہ سے واضح ہے۔

(۸) یہ جواب قسم ہے، جس میں کفار کے قول کا رد ہے، وہ آپ کو مجنون (دیوانہ) کہتے تھے۔ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ

- وَأَنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ ①
 وَإِنَّكَ لَعَلَّ خُلُقٍ عَظِيمٍ ②
 فَتَجَبَّرْهُ وَابْيُضِرُّوْنَ ③
 بِرَبِّكَ الْمَقْتُونِ ④
 إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ
 وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ⑤
 فَلَا تَطِعِ الْمُكَذِّبِينَ ⑥
 وَذُؤَالِوَيْدِهِمْ فَيَذْهُبُونَ ⑦
- اور بے شک تیرے لیے بے انتہا اجر ہے۔ (۳)^(۱)
 اور بیشک تو بہت بڑے (عمدہ) اخلاق پر ہے۔ (۴)^(۲)
 پس اب تو بھی دیکھ لے گا اور یہ بھی دیکھ
 لیں گے۔ (۵)^(۳)
 کہ تم میں سے کون فتنہ میں پڑا ہوا ہے۔ (۶)
 بیشک تیرا رب اپنی راہ سے بھٹنے والوں کو خوب جانتا ہے،
 اور وہ راہ یافتہ لوگوں کو بھی بخوبی جانتا ہے۔ (۷)
 پس تو جھٹلانے والوں کی نہ مان۔ (۸)^(۴)
 وہ تو چاہتے ہیں کہ تو ذرا ڈھیلا ہو تو یہ بھی ڈھیلے
 پڑ جائیں۔ (۹)^(۵)

الَّذِي كُرِّمَتْكَ لِعَجْنُونَ ﴿۱﴾ (الحجر: ۶)

- (۱) فریضہ نبوت کی ادائیگی میں جتنی زیادہ تکلیفیں برداشت کیں اور دشمنوں کی باتیں تو نے سنی ہیں اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ مَنْ کے معنی قطع کرنے کے ہیں۔
- (۲) خُلُقٍ عَظِيمٍ سے مراد اسلام، دین یا قرآن ہے مطلب ہے کہ تو اس خلق پر ہے جس کا حکم اللہ نے تجھے قرآن میں یا دین اسلام میں دیا ہے۔ یا اس سے مراد وہ تہذیب و شائستگی، نرمی اور شفقت، امانت و صداقت، حلم و کرم اور دیگر اخلاقی خوبیاں ہیں، جس میں آپ نبوت سے پہلے بھی ممتاز تھے اور نبوت کے بعد ان میں مزید بلندی اور وسعت آئی۔ اسی لیے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی بابت سوال کیا گیا تو فرمایا: كَمَا خُلِقْتُ الْقُرْآنَ (صحیح مسلم، کتاب المسافرین، باب جامع صلاة الليل ومن نام عنه أو مرض، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ جواب خلق عظیم کے مذکورہ دونوں مفہوموں پر حاوی ہے۔
- (۳) یعنی جب حق واضح ہو جائے گا اور سارے پردے اٹھ جائیں گے۔ اور یہ قیامت کے دن ہو گا۔ بعض نے اسے جنگ بدر سے متعلق قرار دیا ہے۔
- (۴) اطاعت سے مراد یہاں وہ مدارات ہے جس کا اظہار انسان اپنے ضمیر کے خلاف کرتا ہے۔ یعنی مشرکوں کی طرف جھکنے اور ان کی خاطر مدارات کی ضرورت نہیں ہے۔
- (۵) یعنی وہ تو چاہتے ہیں کہ تو ان کے معبودوں کے بارے میں نرم رویہ اختیار کرے تو وہ بھی تیرے بارے میں نرم رویہ اختیار کریں لیکن باطل کے ساتھ مدابنت کا نتیجہ ہو گا کہ باطل پرست اپنی باطل پرستی کو چھوڑنے میں ڈھیلے ہو جائیں گے۔ اس لیے حق میں مدابنت حکمت تبلیغ اور کار نبوت کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔

اور تو کسی ایسے شخص کا بھی کہا نہ ماننا جو زیادہ قسمیں کھانے والا۔ (۱۰)

بے وقار، کمینہ، عیب گو، چغتل خور۔ (۱۱)
بھلائی سے روکنے والا حد سے بڑھ جانے والا گنگار۔ (۱۲)
گردن کش پھر ساتھ ہی بے نسب ہو۔ (۱۳)
اس کی سرکشی صرف اس لیے ہے کہ وہ مال والا اور بیٹوں والا ہے۔ (۱۴)

جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہہ دیتا ہے کہ یہ تو اگلوں کے قصے ہیں۔ (۱۵)
ہم بھی اس کی سونڈ (ناک) پر داغ دیں گے۔ (۱۶)
پیشک ہم نے انہیں اسی طرح آزما لیا (۱۷) جس طرح ہم نے بلغ والوں کو (۱۸) آزمایا تھا جبکہ انہوں نے

وَلَا تَطْعَمُ كُلَّ حَلَالٍ مَّهِينٍ ﴿۱۰﴾

هَتَايَتَشَاءُ، يَسْتَبِيرُ ﴿۱۱﴾

مَتَا كَرِهَ لِمَنْ عَدَىٰ بَدَايَتِهِ ﴿۱۲﴾

عُتِلَّ بَعْدَ ذَلِكَ نَعِيمٌ ﴿۱۳﴾

أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ﴿۱۴﴾

إِذَا شِئِلَ عَلَيْهِ الْيَمِينُ قَالَ آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۵﴾

سَتَسِمُهُ عَلَى الْعُطُورِ ﴿۱۶﴾

إِنَّا بَلَوْنَاهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوا

لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ ﴿۱۷﴾

(۱) یہ ان کافروں کی اخلاقی پستیوں کا ذکر ہے جن کی خاطر پیغمبر کو مداہنت کرنے سے روکا جا رہا ہے۔ یہ صفات ذمہ کسی ایک شخص کی بیان کی گئی ہیں یا عام کافروں کی؟ پہلی بات کا مؤخذ اگرچہ بعض روایتیں ہیں، مگر وہ غیر مستند ہیں۔ اس لیے مقصود عام یعنی ہر وہ شخص ہے جس میں مذکورہ صفات پائی جائیں۔ زَنِيمٌ، ولد الحرام یا مشہور و بدنام۔

(۲) یعنی مذکورہ اخلاقی قباحتوں کا ارتکاب وہ اس لیے کرتا ہے کہ اللہ نے اسے مال اور اولاد کی نعمتوں سے نوازا ہے یعنی وہ شکر کے بجائے کفرانِ نعمت کرتا ہے۔ بعض نے اسے وَلَا تَطْعَمُ کے متعلق قرار دیا ہے۔ یعنی جس شخص کے اندر یہ خرابیاں ہوں، اس کی بات صرف اس لیے مان لی جائے کہ وہ مال و اولاد رکھتا ہے؟

(۳) بعض کے نزدیک اس کا تعلق دنیا سے ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ جنگِ بدر میں ان کافروں کی ناکوں کو تلواروں کا نشانہ بنایا گیا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ قیامت والے دن جہنمیوں کی علامت ہوگی کہ ان کی ناکوں کو داغ دیا جائے گا۔ یا اس کا مطلب چروں کی سیاہی ہے۔ جیسا کہ کافروں کے چہرے اس دن سیاہ ہوں گے۔ بعض کہتے ہیں کہ کافروں کا یہ حشر دنیا اور آخرت دونوں جگہ ممکن ہے۔

(۴) مراد اہل مکہ ہیں۔ یعنی ہم نے ان کو مال و دولت سے نوازا، تاکہ وہ اللہ کا شکر کریں، نہ کہ کفر و تکبر۔ لیکن انہوں نے کفر و استکبار کا راستہ اختیار کیا تو ہم نے انہیں بھوک اور قحط کی آزمائش میں ڈال دیا، جس میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کی وجہ سے کچھ عرصہ جتلارہے۔

(۵) بلغ والوں کا قصہ عربوں میں مشہور تھا۔ یہ بلغ صَنْعَاءَ (یعنی) سے دو فرسخ کے فاصلے پر تھا۔ اس کا مالک اس کی

قسمیں کھائیں کہ صبح ہوتے ہی اس باغ کے پھل
اتار لیں گے۔^(۱) (۱۷)

اور ان شاء اللہ نہ کہا۔ (۱۸)

پس اس پر تیرے رب کی جانب سے ایک بلا چاروں
طرف گھوم گئی اور یہ سو ہی رہے تھے۔^(۲) (۱۹)

پس وہ باغ ایسا ہو گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی۔^(۳) (۲۰)

اب صبح ہوتے ہی انہوں نے ایک دوسرے کو آوازیں
دیں۔ (۲۱)

کہ اگر تمہیں پھل اتارنے ہیں تو اپنی کھیتی پر سویرے
ہی سویرے چل پڑو۔ (۲۲)

پھر یہ سب چپکے چپکے یہ باتیں کرتے ہوئے چلے۔^(۴) (۲۳)

کہ آج کے دن کوئی مسکین تمہارے پاس نہ آنے
پائے۔^(۵) (۲۴)

وَلَا يَسْتَنْوُونَ ﴿۱۷﴾

كَلَّمَآءَ عَلَيْهَا أَلْمِيقَاتِ مِنْ رَبِّكَ وَهُمْ نَكَاهُونَ ﴿۱۸﴾

فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ﴿۱۹﴾

فَتَنَادَوُا مُصْبِحِينَ ﴿۲۰﴾

إِنْ أَعَدُّوا عَلٰى حَرْبِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۲۱﴾

فَانظُرُوا وَهُمْ يَوَخَّافُونَ ﴿۲۲﴾

إِنْ لَّابَدٌ مِّمَّا خَلَقْنَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مَسْكِينًا ﴿۲۳﴾

پیداوار میں سے غریب و مساکین پر بھی خرچ کرتا تھا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد جب اس کی اولاد اس کی وارث بنی تو انہوں نے کہا کہ ہمارے تو اپنے اخراجات ہی بمشکل پورے ہوتے ہیں، ہم اس کی آمدنی میں سے مساکین اور سائلین کو کس طرح دیں؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس باغ کو ہی تباہ کر دیا۔ کہتے ہیں یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے تھوڑے عرصے بعد ہی پیش آیا۔ (فتح القدر) یہ ساری تفصیل تفسیری روایات کی ہے۔

(۱) صَزَمَ کے معنی ہیں، پھل اور کھیتی کا کاٹنا، مُصْبِحِينَ حال ہے۔ یعنی صبح ہوتے ہی پھل اتار لیں گے اور پیداوار کاٹ لیں گے۔

(۲) بعض کہتے ہیں، راتوں رات اسے آگ لگ گئی، بعض کہتے ہیں، جبرائیل علیہ السلام نے آکر اسے تمس نس کر دیا۔

(۳) یعنی جس طرح کھیتی کٹنے کے بعد خشک ہو جاتی ہے، اس طرح سارا باغ اجڑ گیا۔ بعض نے ترجمہ کیا ہے، سیاہ رات کی طرح ہو گیا۔ یعنی جل کر۔

(۴) یعنی باغ کی طرف جانے کے لیے ایک تو صبح صبح نکلے۔ دوسرے آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے گئے تاکہ کسی کو ان کے جانے کا علم نہ ہو۔

(۵) یعنی وہ ایک دوسرے کو کہتے رہے کہ آج کوئی باغ میں آکر ہم سے کچھ نہ مانگے جس طرح ہمارے باپ کے زمانے

اور لپکے ہوئے صبح صبح گئے۔ (سمجھ رہے تھے) کہ ہم قابو پاگئے۔^(۱) (۲۵)

جب انہوں نے باغ دیکھا^(۲) تو کہنے لگے یقیناً ہم راستہ^(۳) بھول گئے۔ (۲۶)

نہیں نہیں بلکہ ہماری قسمت پھوٹ گئی۔^(۴) (۲۷)

ان سب میں جو بہتر تھا اس نے کہا کہ میں تم سے نہ کتنا تھا کہ تم اللہ کی پاکیزگی کیوں نہیں بیان کرتے؟^(۵) (۲۸)

تو سب کہنے لگے ہمارا رب پاک ہے بیشک ہم ہی ظالم تھے۔^(۶) (۲۹)

پھر وہ ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے آپس میں ملامت کرنے لگے۔ (۳۰)

کہنے لگے ہائے افسوس! یقیناً ہم سرکش تھے۔ (۳۱)

کیا عجب ہے کہ ہمارا رب ہمیں اس سے بہتر بدلہ دے

وَعَدَا عَلٰى حَرْدٍ قَدِيرٍ ۝

فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوا اِنَّا لَضَالُّونَ ۝

بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ۝

قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَكُمْ لَوْلَا رُحْمَتُنَا ۝

قَالُوا سُبْحٰنَ رَبِّنَا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَتَلَوْمُونَ ۝

قَالُوا لِيُوْثِقْ لَنَا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

عَلٰى رَبِّنَا اَنْ يُّبَدِّلَ لَنَا خَيْرًا مِنْهَا اِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَارْغُبُونَ ۝

میں آیا کرتے تھے اور اپنا حصہ لے جاتے تھے۔

(۱) حَرْدِ کے ایک معنی تو قوت و شدت، کیے گئے ہیں، جس کو مترجم مرحوم نے ”لپکے ہوئے“ سے تعبیر کیا ہے۔ بعض نے غصہ اور حسد کیے ہیں، یعنی مساکین پر غیظ و غضب کا اظہار یا حسد کرتے ہوئے۔ قَادِرِيْنَ حال ہے یعنی اپنے معاملے کا انہوں نے اندازہ کر لیا، یا اپنے زعم میں انہوں نے اپنے باغ پر قدرت حاصل کر لی، یا مطلب ہے مساکین پر انہوں نے قابو پایا۔

(۲) یعنی باغ والی جگہ کو راکھ کا ڈھیر یا اسے تباہ و برباد دیکھا۔

(۳) یعنی پہلے پہل تو ایک دوسرے کو کہا۔

(۴) پھر جب غور کیا تو جان گئے کہ یہ آفت زدہ اور تباہ شدہ باغ ہمارا ہی باغ ہے جسے اللہ نے ہمارے طرز عمل کی پاداش میں ایسا کر دیا ہے اور واقعی یہ ہماری حرماں نہیں ہے۔

(۵) بعض نے تسبیح سے مراد یہاں اِنْ شَاءَ اللّٰهُ کہنا مراد لیا ہے۔

(۶) یعنی اب انہیں احساس ہوا کہ ہم نے اپنے باپ کے طرز عمل کے خلاف قدم اٹھا کر غلطی کا ارتکاب کیا ہے جس کی سزا اللہ نے ہمیں دی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ معصیت کا عزم اور اس کے لیے ابتدائی اقدامات بھی، ارتکاب معصیت کی طرح جرم ہے جس پر مؤاخذہ ہو سکتا ہے، صرف وہ ارادہ معاف ہے جو سوسے کی حد تک رہتا ہے۔

دے ہم تو اب ^(۱) اپنے رب سے ہی آرزو رکھتے ہیں۔ (۳۲)

یوں ہی آفت آتی ہے ^(۲) اور آخرت کی آفت بہت بڑی ہے۔ کاش انہیں سمجھ ہوتی۔ ^(۳) (۳۳)

پرہیز گاروں کے لیے ان کے رب کے پاس نعمتوں والی جنتیں ہیں۔ (۳۴)

کیا ہم مسلمانوں کو مثل گناہ گاروں کے کر دیں گے۔ ^(۴) (۳۵)

تمہیں کیا ہو گیا، کیسے فیصلے کر رہے ہو؟ ^(۵) (۳۶)
کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ^(۶) ہے جس میں تم پڑھتے ہو؟ ^(۷) (۳۷)

کہ اس میں تمہاری من مانی باتیں ہوں؟ ^(۸) (۳۸)
یا تم نے ہم سے کچھ قسمیں لی ہیں؟ جو قیامت تک باقی رہیں کہ تمہارے لیے وہ سب ہے جو تم اپنی طرف سے مقرر کر لو۔ ^(۹) (۳۹)

كَذَلِكَ الْعَذَابُ وَالْعَذَابُ الْآخِرَةُ أَكْبَرُ
لَوْ كُنْتُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۳۲﴾

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٍ التَّيَّامِينِ ﴿۳۳﴾

أَفَتَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ﴿۳۴﴾

مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿۳۵﴾

أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ﴿۳۶﴾

إِنْ لَكُمْ مِنْهُ لَمَّا تَحْكُمُونَ ﴿۳۷﴾

أَمْ لَكُمْ آيَاتُنَا عَالِمَةً إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ إِنْ لَكُمْ
لَمَّا تَحْكُمُونَ ﴿۳۸﴾

(۱) کہتے ہیں کہ انہوں نے آپس میں عہد کیا کہ اب اگر اللہ نے ہمیں مال دیا تو اپنے باپ کی طرح اس میں سے غریب و مساکین کا حق بھی ادا کریں گے۔ اسی لیے ندامت اور توبہ کے ساتھ رب سے امیدیں بھی وابستہ کیں۔

(۲) یعنی اللہ کے حکم کی مخالفت اور اللہ کے دیے ہوئے مال میں بخل کرنے والوں کو ہم دنیا میں اسی طرح عذاب دیتے ہیں۔ (اگر ہماری مشیت اس کی مقتضی ہو)

(۳) لیکن افسوس وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے، اس لیے پروا نہیں کرتے۔

(۴) مشرکین مکہ کہتے تھے کہ اگر قیامت ہوئی تو وہاں بھی ہم مسلمانوں سے بہتر ہی ہوں گے، جیسے دنیا میں ہم مسلمانوں سے زیادہ آسودہ حال ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا، یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم مسلمانوں یعنی اپنے فرماں برداروں کو مجرموں یعنی نافرمانوں کی طرح کر دیں؟ مطلب ہے کہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ عدل و انصاف کے خلاف دونوں کو یکساں کر دے۔

(۵) جس میں یہ بات لکھی ہو جس کا تم دعویٰ کر رہے ہو، کہ وہاں بھی تمہارے لیے وہ کچھ ہو گا جسے تم پسند کرتے ہو؟

(۶) یا ہم نے تم سے پکا عہد کر رکھا ہے، جو قیامت تک باقی رہنے والا ہے کہ تمہارے لیے وہی کچھ ہو گا جس کا تم اپنی

ان سے پوچھو تو کہ ان میں سے کون اس بات کا ذمہ دار
(اور دعویٰ دار) ہے؟^(۱) (۳۰)

کیا ان کے کوئی شریک ہیں؟ تو چاہے کہ اپنے اپنے
شریکوں کو لے آئیں اگر یہ سچے ہیں۔^(۲) (۳۱)

جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی اور سجدے کے لیے
بلائے جائیں گے تو (سجدہ) نہ کر سکیں گے۔^(۳) (۳۲)

نگاہیں نیچی ہوں گی اور ان پر زلت و خواری چھا رہی ہو
گی،^(۴) حالانکہ یہ سجدے کے لیے (اس وقت بھی)

بلائے جاتے تھے جبکہ صحیح سالم تھے۔^(۵) (۳۳)

پس مجھے اور اس کلام کو جھٹلانے والے کو چھوڑ دے^(۶)

سَلِّمُوا لَهُمْ بِذَلِكَ رَبُّهُمُ ۞

أَمْ أَلَمَ أَنْ نُرَكِّبَهُ أَفْئِدَةً مُّؤْتَوِيَةً وَأَبْصَارًا كَانُوا صِدْقَيْنِ ۞

يَوْمَ يَكْتُمُ عَنْ سَاقِي وَيَذْعَبُونَ إِلَى السُّجُودِ

فَلَا يَسْتَطِيعُونَ ۞

خَائِسَةً أَبْصَارُهُمْ تَرَاهُمْ ذَلَّةً وَقَدْ كَانُوا بِآيَاتِنَا عَلِيمِينَ

إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَلِيمُونَ ۞

فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَلِّبُ بِهِدَا الْاٰحْدِيثِ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ

بابت فیصلہ کرو گے۔

(۱) کہ وہ قیامت والے دن ان کے لیے وہی کچھ فیصلہ کروائے گا جو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے فرمائے گا۔

(۲) یا جن کو انہوں نے شریک ٹھہرا رکھا ہے، وہ ان کی مدد کر کے ان کو اچھا مقام دلوادیں گے؟ اگر ان کے شریک ایسے
ہیں تو ان کو سامنے لائیں تاکہ ان کی صداقت واضح ہو۔

(۳) بعض نے کشف ساق سے مراد قیامت کے شدائد اور اس کی ہولناکیاں لی ہیں لیکن ایک صحیح حدیث میں اس کی
تفسیر اس طرح بیان ہوئی ہے کہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا، (جس طرح کہ اس کی شان کے لائق
ہے) تو ہر مومن مرد اور عورت اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں گے، البتہ وہ لوگ باقی رہ جائیں گے جو دکھلاوے اور
شہرت کے لیے سجدے کرتے تھے، وہ سجدہ کرنا چاہیں گے لیکن ان کی ریڑھ کی ہڈی کے منکے، تختے کی طرح ایک ہڈی بن
جائیں گے جس کی وجہ سے ان کے لیے جھلکانا نامکن ہو جائے گا (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ ن والقلم) اللہ تعالیٰ کی یہ پنڈلی
کس طرح کی ہوگی؟ اسے وہ کس طرح کھولے گا؟ اس کیفیت کو ہم جان سکتے ہیں نہ بیان کر سکتے ہیں۔ اس لیے جس طرح
ہم بلا کیف و بلا تشبیہ اس کی آنکھوں، کان، ہاتھ وغیرہ پر ایمان رکھتے ہیں، اسی طرح پنڈلی کا ذکر بھی قرآن اور حدیث میں
ہے، اس پر بلا کیف ایمان رکھنا ضروری ہے۔ یہی سلف اور محدثین کا مسلک ہے۔

(۴) یعنی دنیا کے برعکس ان کا معاملہ ہوگا، دنیا میں تکبر و عناد کی وجہ سے ان کی گردنیں اکڑی ہوتی تھیں۔

(۵) یعنی صحت مند اور توانا تھے، اللہ کی عبادت میں کوئی چیز ان کے لیے مانع نہیں تھی۔ لیکن دنیا میں اللہ کی عبادت سے

یہ دور رہے۔

(۶) یعنی میں ہی ان سے نمٹ لوں گا، تو ان کی فکر نہ کر۔

ہم انہیں اس طرح آہستہ آہستہ کھینچیں گے کہ انہیں معلوم بھی نہ ہو گا۔^(۱) (۳۳)

اور میں انہیں ڈھیل دوں گا، بیشک میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔^(۲) (۳۵)

کیا تو ان سے کوئی اجرت چاہتا ہے جس کے تاوان سے یہ دبے جاتے ہوں۔^(۳) (۳۶)

یا کیا ان کے پاس علم غیب ہے جسے وہ لکھتے ہوں۔^(۴) (۳۷)

پس تو اپنے رب کے حکم کا صبر سے (انتظار کر) اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جا جب^(۵) کہ اس نے غم کی حالت میں دعا کی۔^(۶) (۳۸)

حَدِيثٌ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾

وَأَمْرًا لَهُمْ لَنْ يَكِيدُوا مِتِّينَ ﴿٣٥﴾

أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَغْرَمٍ مُثْقَلُونَ ﴿٣٦﴾

أَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ﴿٣٧﴾

فَأَصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ

إِذْ نَادَى وَهُوَ مَكْظُومٌ ﴿٣٨﴾

(۱) یہ اسی استدراج (ڈھیل دینے) کا ذکر ہے جو قرآن میں کئی جگہ بیان کیا گیا ہے اور حدیث میں بھی وضاحت کی گئی ہے کہ نافرمانی کے باوجود، دنیوی مال و اسباب کی فراوانی، اللہ کا فضل نہیں ہے، اللہ کے قانون اعمال کا نتیجہ ہے، پھر جب وہ گرفت کرنے پر آتا ہے تو کوئی بچانے والا نہیں ہوتا۔

(۲) یہ گزشتہ مضمون ہی کی تاکید ہے۔ کینڈ خفیہ تدبیر اور چال کو کہتے ہیں، اچھے مقصد کے لیے ہو تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اسے اردو زبان کا کید نہ سمجھا جائے جس میں ذم ہی کا مفہوم ہوتا ہے۔

(۳) یہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن تو بخ ان کو کی جارہی ہے جو آپ پر ایمان نہیں لارہے تھے۔

(۴) یعنی کیا غیب کا علم ان کے پاس ہے، لوح محفوظ ان کے تصرف میں ہے کہ اس میں سے جو بات چاہتے ہیں، نقل کر لیتے ہیں (وہاں سے لکھ لاتے ہیں) اس لیے یہ تیری اطاعت اختیار کرنے اور تجھ پر ایمان لانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں، ایسا نہیں ہے۔

(۵) فأصبز میں فاء تفریح کے لیے ہے۔ یعنی جب واقعہ ایسا نہیں ہے تو اسے پیغمبر! تو فریضہ رسالت ادا کرتا رہ اور ان مکذبین کے بارے میں اللہ کے فیصلے کا انتظار کر۔

(۶) جنہوں نے اپنی قوم کی روش مکذیب کو دیکھتے ہوئے غلت سے کام لیا اور رب کے فیصلے کے بغیر ہی از خود اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔

(۷) جس کے نتیجے میں انہیں مچھلی کے پیٹ میں، جب کہ وہ غم و اندوہ سے بھرے ہوئے تھے، اپنے رب کو مدد کے لیے پکارنا پڑا۔ جیسا کہ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

لَوْلَا أَنْ تَذَرِكُهُ نِعْمَةً مِنْ رَبِّهِ لَتَبِيدَ بِالْعَرَاءِ
وَهُوَ مَذْمُومٌ ۝

فَأَجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝

وَأَنْ يَكِيدَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُؤْتُواكَ بِبَصَائِرِهِمْ لَتَسْمَعُوا الَّذِي كُفِرُوا
وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ۝

وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۝

اگر اسے اس کے رب کی نعمت نہ پالیتی تو یقیناً وہ برے
حالوں میں چھٹیل میدان میں ڈال دیا جاتا۔ (۴۹)^(۱)
اسے اس کے رب نے پھر نوازا (۴۹)^(۲) اور اسے نیک کاروں
میں کر دیا۔ (۵۰)^(۳)

اور قریب ہے کہ کافر اپنی تیز نگاہوں سے آپ کو پھسلا
دیں، (۴۹)^(۴) جب کبھی قرآن سنتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں یہ تو
ضرور دیوانہ ہے۔ (۵۱)^(۵)

در حقیقت یہ (قرآن) تو تمام جہان والوں کے لیے سراسر

(۱) یعنی اللہ تعالیٰ اگر انہیں توبہ و مناجات کی توفیق نہ دیتا اور ان کی دعا قبول نہ فرماتا تو انہیں ساحل سمندر کے بجائے،
جہاں ان کے سائے اور خوراک کے لیے بیل دار درخت اگا دیا گیا، کسی بنجر زمین میں پھینک دیا جاتا اور عند اللہ ان کی
حیثیت بھی مذموم رہتی، جب کہ قبولیت دعا کے بعد وہ محمود ہو گئے۔

(۲) اس کا مطلب ہے کہ انہیں توانا و تندرست کرنے کے بعد دوبارہ رسالت سے نوازا کر انہیں اپنی قوم کی طرف بھیجا
گیا۔ جیسا کہ سورہ صافات ۱۳۶ سے بھی واضح ہے۔

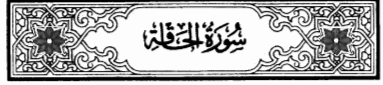
(۳) اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ”کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں یونس بن متی سے بہتر
ہوں۔“ (صحیح مسلم، کتاب الفضائل باب فی ذکر یونس.....) مزید دیکھئے: صفحہ ۱۰۹-۱۰۹ حاشیہ نمبر ۱۔

(۴) یعنی اگر تجھے اللہ کی حمایت و حفاظت نہ ہوتی تو ان کفار کی حاسدانہ نظروں سے تو نظریہ کا شکار ہو جاتا۔ یعنی ان کی
نظر تجھے لگ جاتی۔ امام ابن کثیر نے اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے، مزید لکھتے ہیں: ”یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نظر کا لگ
جانا اور اس کا دوروں پر، اللہ کے حکم سے، اثر انداز ہونا، حق ہے۔ جیسا کہ متعدد احادیث سے بھی ثابت ہے، چنانچہ
احادیث میں اس سے بچنے کے لیے دعائیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ اور یہ بھی ناید کی گئی ہے کہ جب تمہیں کوئی چیز اچھی
لگے تو ماشاء اللہ یا بارک اللہ، کہا کرو۔ تاکہ اسے نظر نہ لگے، اسی طرح کسی کو کسی کی نظر لگ جائے تو فرمایا، اے غسل
کروا کے اس کا پانی اس شخص پر ڈالا جائے جس کو اس کی نظر لگی ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے تفسیر ابن کثیر اور کتب
حدیث) بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ تجھے تبلیغ رسالت سے پھیر دیتے۔

(۵) یعنی حسد کے طور پر بھی اور اس غرض سے بھی کہ لوگ اس قرآن سے متاثر نہ ہوں، بلکہ اس سے دور ہی رہیں۔
یعنی آنکھوں کے ذریعے سے بھی یہ کفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے اور زبانوں سے بھی
آپ کو ایذا پہنچاتے اور آپ کے دل کو مجروح کرتے۔

نصیحت ہی ہے۔^(۱) (۵۲)

سورہ حاقہ کئی ہے اور اس میں باون آیتیں اور
دو رکوع ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

ثابت ہونے والی^(۱) (۱)

ثابت ہونے والی کیا ہے؟^(۲) (۲)

اور تجھے کیا معلوم کہ وہ ثابت شدہ کیا ہے؟^(۳) (۳)

اس کھڑک دینے والی کو ثمود اور عاد نے جھٹلایا تھا۔^(۴) (۴)

(جس کے نتیجے میں) ثمود تو بے حد خوفناک (اور اونچی)

آواز سے ہلاک کر دیئے گئے۔^(۵) (۵)

اور عاد بید تیز و تند ہوا سے غارت کر دیئے گئے۔^(۶) (۶)

الْحَاقَّةُ ۱

مَا الْحَاقَّةُ ۲

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحَاقَّةُ ۳

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهُمْ إِذِ انبَأَتْ بِأَنْعَامِهَا ۴

فَاتَّخَذَتْهُمْ قَوْمَ لُوطٍ بِطَغْوَاهُمْ إِذِ انبَأَتْ بِأَنْعَامِهَا ۵

وَاتَّخَذَتْهُمْ قَوْمَ لُوطٍ بِطَغْوَاهُمْ إِذِ انبَأَتْ بِأَنْعَامِهَا ۶

(۱) جب واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن جن و انس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے آیا ہے تو پھر اس کو لانے والا اور بیان کرنے والا
مجنون (دیوانہ) کس طرح ہو سکتا ہے؟

(۲) یہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اس میں امر الہی ثابت ہو گا اور خودیہ بھی بہر صورت وقوع پذیر ہونے
والی ہے، اس لیے اسے الْحَاقَّةُ سے تعبیر فرمایا۔

(۳) یہ لفظاً استفہام ہے لیکن اس کا مقصد قیامت کی عظمت اور فحاشی شان بیان کرنا ہے۔

(۴) یعنی کس ذریعے سے تجھے اس کی پوری حقیقت سے آگاہی حاصل ہو؟ مطلب اس کے علم کی نفی ہے۔ گویا کہ تجھے
اس کا علم نہیں، کیوں کہ تو نے ابھی اسے دیکھا ہے اور نہ اس کی ہولناکیوں کا مشاہدہ کیا ہے، گویا کہ وہ مخلوقات کے دائرہ
علم سے باہر ہے (فتح القدر) بعض کہتے ہیں کہ قرآن میں جس کی بابت بھی صیغہ ماضی مَا أَدْرَاكَ استعمال کیا گیا ہے، اس کو
بیان کر دیا گیا ہے اور جس کو مضارع کے صیغے وَمَا يَذْرِبُكَ کے ذریعے سے بیان کیا گیا ہے، اس کا علم لوگوں کو نہیں دیا
گیا ہے۔ (فتح القدر وایسر التفاسیر)

(۵) اس میں قیامت کو کھڑک دینے والی کہا ہے، اس لیے کہ یہ اپنی ہولناکیوں سے لوگوں کو بیدار کر دے گی۔

(۶) طَآغِيَةٌ ایسی آواز جو حد سے تجاوز کر جانے والی ہو، یعنی نہایت خوف ناک اور اونچی آواز سے قوم ثمود کو ہلاک کیا
گیا، جیسا کہ پہلے متعدد جگہ گزرا۔

(۷) صَرَصِرٌ پالے والی ہوا۔ عَابِيَةٌ، سرکش، کسی کے قابو میں نہ آنے والی۔ یعنی نہایت تند و تیز، پالے والی اور بے قابو

جسے ان پر لگاتار سات رات اور آٹھ دن تک (اللہ نے) مسلط رکھا^(۱) پس تم دیکھتے کہ یہ لوگ زمین پر اس طرح گر گئے جیسے کہ بھجور کے کھوکھلے تھے ہوں۔^(۲) (۷)

کیا ان میں سے کوئی بھی تجھے باقی نظر آ رہا ہے؟ (۸)

فرعون اور اس سے پہلے کے لوگ اور جن کی بستیاں الٹ دی گئی،^(۳) انہوں نے بھی خطائیں کیں۔ (۹)

اور اپنے رب کے رسول کی نافرمانی کی (بالآخر) اللہ نے انہیں (بھی) زبردست گرفت میں لے لیا۔^(۴) (۱۰)

جب پانی میں طغیانی آگئی^(۵) تو اس وقت ہم نے تمہیں کشتی میں چڑھالیا۔^(۶) (۱۱)

ناکہ اسے تمہارے لیے نصیحت اور یادگار بنا دیں،^(۷) اور (ناکہ) یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔^(۸) (۱۲)

پس جبکہ صور میں ایک پھونک پھونکی جائے گی۔^(۹) (۱۳)

سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَمْعَ لَيَالٍ وَثَمِينَةَ أَيَّامٍ لِحُسُومًا
فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَارِعِينَ كَانَهُمْ أَعْمَاءُ تَفْعِلُ خَائِدِينَ ﴿٧﴾
فَقُلْ تَرَى لَهُمْ مِنْ بَاقِيَةٍ ﴿٨﴾
وَجَاءَ دُرُوعُونَ وَمَنْ ثَمَلَةٌ أَمْوَةٌ مُؤْتِيكَ بِالنَّاطِقِ أَمْوَةٌ ﴿٩﴾
فَعَصَوْا رَسُولَ رَبِّهِمْ فَأَخَذَهُمْ أَخْذَةً رَابِيَةً ﴿١٠﴾
إِنَّا لَنَّاظِمُونَ الْبَاقِيَةَ فِي الْبَاقِيَةِ ﴿١١﴾
لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذَكُّرًا وَتَعْيِبًا أَدْنَىٰ وَأَعْيِبُهُ ﴿١٢﴾
فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَاحِدَةٌ ﴿١٣﴾

ہوا کے ذریعے سے حضرت ہود علیہ السلام کی قوم عاد کو ہلاک کیا گیا۔

(۱) حَسْمٌ کے معنی کانٹے اور جدا جدا کر دینے کے ہیں اور بعض نے حُسُومًا کے معنی پے در پے کئے ہیں۔

(۲) اس سے ان کے درازی قد کی طرف بھی اشارہ ہے خَائِدِينَ کھوکھلے۔ بے روح جسم کو کھوکھلے تھے سے تشبیہ دی ہے۔

(۳) اس سے قوم لوط مراد ہے۔

(۴) رَابِيَةً، رَبَا يَزِيئُو سے ہے جس کے معنی زائد کے ہیں۔ یعنی ان کی ایسی گرفت کی جو دوسری قوموں کی گرفت سے زائد یعنی سب میں سخت تر تھی۔ گویا أَخْذَةً رَابِيَةً کا مفہوم ہوا، نہایت سخت گرفت۔

(۵) یعنی پانی ارتقاع اور بلندی میں تجاوز کر گیا یعنی پانی خوب چڑھ گیا۔

(۶) کسم سے مخاطب عمد رسالت کے لوگ ہیں، مطلب ہے کہ تم جن آبا کی پشتوں سے ہو، ہم نے انہیں کشتی میں سوار کر کے پھرے ہوئے پانی سے بچایا تھا۔ اَلنَّجَارِيَةِ سے مراد سفینہ نوح علیہ السلام ہے۔

(۷) یعنی یہ فعل کہ کافروں کو پانی میں غرق کر دیا اور مومنوں کو کشتی میں سوار کرا کے بچالیا، تمہارے لیے اس کو عبرت و نصیحت بنا دیں تاکہ تم اس سے نصیحت حاصل کرو اور اللہ کی نافرمانی سے بچو۔

(۸) یعنی سننے والے، اسے سن کر یاد رکھیں اور وہ بھی اس سے عبرت پکڑیں۔

(۹) مَلْذَمِينَ کا انجام بیان کرنے کے بعد اب بتلایا جا رہا ہے کہ یہ «الْحَاقَّةُ» کس طرح واقع ہوگی اسرائیل کی ایک ہی

اور زمین اور پہاڑ اٹھالیے جائیں^(۱) گے اور ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔ (۱۳)
اس دن ہو پڑنے والی (قیامت) ہو پڑے گی۔ (۱۵)
اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس دن بالکل بودا ہو جائے گا۔^(۲) (۱۶)

اس کے کناروں پر فرشتے ہوں گے،^(۳) اور تیرے پروردگار کا عرش اس دن آٹھ (فرشتے) اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔^(۴) (۱۷)

اس دن تم سب سامنے پیش کیے جاؤ گے، تمہارا کوئی بھید پوشیدہ نہ رہے گا۔ (۱۸)

سو جسے اس کا نامہ اعمال اسکے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا^(۵) تو وہ کہنے لگے گا کہ لومیرا نامہ اعمال پڑھو۔^(۶) (۱۹)

وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً ﴿۱۳﴾

فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾

وَانشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾

وَالْمَلَائِكَةُ عَلَى السَّمَوَاتِ مُبْسُوتَاتٌ يَرَوْنَ رَبَّكَ فَذُكِّرْتَهُمْ يَوْمَئِذٍ نَّبِيئَةٌ ﴿۱۷﴾

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾

فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَذَا مَا أقرُّهُ وَإِنَّا لَكَنَّا بِهٖ ﴿۱۹﴾

پھونک سے یہ برپا ہو جائے گی۔

(۱) یعنی اپنی جگہوں سے اٹھالیے جائیں گے اور قدرت الہی سے اپنی قرار گاہوں سے ان کو اکھیر لیا جائے گا۔

(۲) یعنی اس میں کوئی قوت اور استحکام نہیں رہے گا جو چیز پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے، اس میں استحکام کس طرح رہ سکتا ہے۔

(۳) یعنی آسمان تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے پھر آسمانی مخلوق فرشتے کہاں ہوں گے؟ فرمایا، وہ آسمانوں کے کناروں پر ہوں گے، اس کا ایک مطلب تو ہو سکتا ہے کہ فرشتے آسمان پھٹنے سے قبل اللہ کے حکم سے زمین پر آجائیں گے تو گویا فرشتے دنیا کے کنارے پر ہوں گے، یا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ آسمان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر مختلف ٹکڑوں میں ہو گا تو ان ٹکڑوں پر جو زمین کے کناروں میں اور بجائے خود ثابت ہوں گے، ان پر ہوں گے۔ (فتح القدیر)

(۴) یعنی ان مخصوص فرشتوں نے عرش الہی کو اپنے سروں پر اٹھایا ہوا ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس عرش سے مراد وہ عرش ہو جو فیصلوں کے لیے زمین پر رکھا جائے گا جس پر اللہ تعالیٰ نزول اجلال فرمائے گا۔ (ابن کثیر)

(۵) یہ پیشی اس لیے نہیں ہو گی کہ جن کو اللہ نہیں جانتا، ان کو جان لے، وہ تو سب کو ہی جانتا ہے، یہ پیشی خود انسانوں پر حجت قائم کرنے کے لیے ہو گی۔ ورنہ اللہ سے تو کسی کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

(۶) جو اس کی سعادت، نجات اور کامیابی کی دلیل ہو گا۔

(۷) یعنی وہ مارے خوشی کے ہر ایک کو کہے گا کہ لو پڑھ لو، میرا اعمال نامہ تو مجھے مل گیا ہے، اس لیے کہ اسے پتہ ہو گا کہ اس میں

إِنَّ ظَنَنْتُ أَنْ مَالِي حَسَابِيَةٌ ۝

فَهَوِّنِي عَيْشَةً رَاضِيَةً ۝

فِي حَجَّةٍ عَلِيَّةٍ ۝

فَطَوُّهَا دَابَّةٌ ۝

كَلِمَاتُ اللَّهِ يُؤَدِّئُنَّهَا لِيَمْسَلِفُوا فِي الْأَنْبَاءِ

الْحَالِيَةِ ۝

وَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ ۙ فَيَقُولُ يَأْتِينِي لَهُ

أُوتُ كِتَابِيَةٌ ۝

وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَةٌ ۝

يَلِيَّتُهَا كَانَتْ الْفَاضِيَةُ ۝

مَا آعْنَى عَنِّي مَالِيَةٌ ۝

هَلَاكَ عَنِّي سُلْطَنِيَّةٌ ۝

مجھے تو کامل یقین تھا کہ مجھے اپنا حساب ملنا ہے۔^(۱) (۲۰)

پس وہ ایک دل پسند زندگی میں ہو گا۔ (۲۱)

بلند و بالا جنت میں۔^(۲) (۲۲)

جس کے میوے جھکے پڑے ہوں گے۔^(۳) (۲۳)

(ان سے کہا جائے گا) کہ مزے سے کھاؤ، پوچھو اپنے ان اعمال

کے بدلے جو تم نے گزشتہ زمانے میں کیے۔^(۴) (۲۴)

لیکن جسے اس (کے اعمال) کی کتاب اس کے بائیں ہاتھ

میں دی جائے گی، وہ تو کہے گا کہ کاش کہ مجھے میری کتاب

دی ہی نہ جاتی۔^(۵) (۲۵)

اور میں جانتا ہی نہ کہ حساب کیا ہے۔^(۶) (۲۶)

کاش! کہ موت (میرا) کام ہی تمام کر دیتی۔^(۷) (۲۷)

میرے مال نے بھی مجھے کچھ نفع نہ دیا۔ (۲۸)

میرا غلبہ بھی مجھ سے جاتا^(۸) رہا (۲۹)

اس کی نیکیاں ہی نیکیاں ہوں گی، کچھ برائیاں ہوں گی تو وہ اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادی ہوں گی یا ان برائیوں کو بھی حسنت میں تبدیل کر دیا ہو گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ فضل و کرم کی یہ مختلف صورتیں اختیار فرمائے گا۔

(۱) یعنی آخرت کے حساب کتاب پر میرا کامل یقین تھا۔

(۲) جنت میں مختلف درجات ہوں گے، ہر درجے کے درمیان بہت فاصلہ ہو گا، جیسے مجاہدین کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ نے مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے تیار کیے ہیں۔ دو درجوں کے درمیان زمین و آسمان جتنا فاصلہ ہو گا۔“ (صحیح مسلم، کتاب الإمارة، صحیح بخاری، کتاب الجہاد)

(۳) یعنی بالکل قریب ہوں گے یعنی کوئی لیٹے لیٹے بھی توڑنا چاہے گا تو ممکن ہو گا۔ قَطُوفٌ، قَطِيفٌ کی جمع ہے، چنے یا توڑے ہوئے، مراد پھل ہیں۔ مَا يُقَطِّفُ مِنَ الشِّمَارِ

(۴) یعنی دنیا میں اعمال صالحہ کیے، یہ جنت ان کا صلہ ہے۔

(۵) کیوں کہ نامہ اعمال کا بائیں ہاتھ میں ملنا بدبختی کی علامت ہو گا۔

(۶) یعنی مجھے بتلایا ہی نہ جاتا، کیوں کہ سارا حساب ان کے خلاف ہو گا۔

(۷) یعنی موت ہی فیصلہ کن ہوتی اور دوبارہ زندہ نہ کیا جاتا تاکہ یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔

(۸) یعنی جس طرح مال میرے کام نہ آیا، جاہ و مرتبہ اور سلطنت و حکومت بھی میرے کام نہ آئی۔ اور آج میں اکیلا ہی

(حکم ہو گا) اسے پکڑ لو پھر اسے طوق پہنا دو۔ (۳۰)
 پھر اسے دوزخ میں ڈال دو۔^(۱) (۳۱)
 پھر اسے ایسی زنجیر میں جس کی پیمائش ستر ہاتھ کی ہے جکڑ
 دو۔^(۲) (۳۲)
 بیشک یہ اللہ عظمت والے پر ایمان نہ رکھتا تھا۔^(۳) (۳۳)
 اور مسکین کے کھلانے پر رغبت نہ دلاتا تھا۔^(۴) (۳۴)
 پس آج اس کا نہ کوئی دوست ہے۔ (۳۵)
 اور نہ سوائے پیپ کے اس کی کوئی غذا ہے۔^(۵) (۳۶)
 جسے گناہ گاروں کے سوا کوئی نہیں کھائے گا۔^(۶) (۳۷)
 پس مجھے قسم ہے ان چیزوں کی جنہیں تم دیکھتے ہو۔ (۳۸)
 اور ان چیزوں کی جنہیں تم نہیں دیکھتے۔^(۷) (۳۹)
 کہ بیشک یہ (قرآن) بزرگ رسول کا قول ہے۔^(۸) (۴۰)

خُدُوهُ فَعَلُوهُ ﴿۳۰﴾
 ثُمَّ الْحَبِيرَ صَلْوَةً ﴿۳۱﴾
 ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ ﴿۳۲﴾
 إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ﴿۳۳﴾
 وَلَا يَخْشَى عَلَى طَعَامِ الْمَسْكِينِ ﴿۳۴﴾
 فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هُنَا حَاطِبٌ ﴿۳۵﴾
 وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غَشَلٍ ﴿۳۶﴾
 لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخِطُؤُنُ ﴿۳۷﴾
 فَلَا أُنْبِئُكُمْ بِمَا تُبْصِرُونَ ﴿۳۸﴾
 وَمَا لَا تُبْصِرُونَ ﴿۳۹﴾
 إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿۴۰﴾

یہاں سزا بھگتے پر مجبور ہوں۔

(۱) یہ اللہ تعالیٰ، ملائکہ جہنم کو حکم دے گا۔

(۲) یہ ذراغ (ہاتھ)، کس کا ذراع ہو گا؟ اور یہ کتنا ہو گا؟ اس کی وضاحت ممکن نہیں، تاہم اس سے اتنا معلوم ہوا کہ زنجیر کی لمبائی ستر ذراع ہوگی۔

(۳) یہ مذکورہ سزا کی علت یا مجرم کے جرم کا بیان ہے۔

(۴) یعنی عبادت و اطاعت کے ذریعے سے اللہ کا حق ادا کرتا تھا اور نہ وہ حقوق ادا کرتا تھا، جو بندوں کے بندوں پر ہیں۔ گویا اہل ایمان میں یہ جامعیت ہوتی ہے کہ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں۔

(۵) بعض کہتے ہیں کہ یہ جہنم میں کوئی درخت ہے، بعض کہتے ہیں کہ زقوم ہی کو یہاں غشلین کہا گیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ جہنمیوں کی پیپ یا ان کے جسموں سے نکلنے والا خون اور بدبودار پانی ہو گا آعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ۔

(۶) خَاطِئُونَ سے مراد اہل جہنم ہیں جو کفر و شرک کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوں گے۔ اس لیے کہ یہی گناہ ایسے ہیں جو خلود فی النار کا سبب ہیں۔

(۷) یعنی اللہ کی پیدا کردہ وہ چیزیں، جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی قدرت و طاقت پر دلالت کرتی ہیں، جنہیں تم دیکھتے ہو یا نہیں دیکھتے، ان سب کی قسم ہے۔ آگے جواب قسم ہے۔

(۸) بزرگ رسول سے مراد حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور قول سے مراد تلاوت ہے یعنی رسول

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ ﴿٥﴾

وَلَا يَقُولُ كَالَّذِينَ قَلِيلًا مَّا تَأْتَتْكُمُ الْكُوفُورُ ﴿٦﴾

تَأْتِيكَ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٧﴾

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ ﴿٨﴾

لَا خَدَّ نَأْمُهُ يَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ

لَقَرْطَعًا نَأْمُهُ الْوَيْبِينَ ﴿٩﴾

یہ کسی شاعر کا قول نہیں ^(۱) (افسوس) تمہیں بہت کم یقین ہے۔ (۳۱)

اور نہ کسی کاہن کا قول ہے، ^(۲) (افسوس) بہت کم نصیحت لے رہے ہو۔ ^(۳) (۳۲)

(یہ تو) رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔ ^(۴) (۳۳)

اور اگر یہ ہم پر کوئی بھی بات بنالیتا۔ ^(۵) (۳۴)

تو البتہ ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے۔ ^(۶) (۳۵)

پھر اس کی شہ رگ کاٹ دیتے۔ ^(۷) (۳۶)

کریم کی تلاوت ہے یا قول سے مراد ایسا قول ہے جو یہ رسول کریم اللہ کی طرف سے تمہیں پہنچاتا ہے۔ کیوں کہ قرآن رسول یا جبرائیل علیہ السلام کا قول نہیں ہے، بلکہ اللہ کا قول ہے، جو اس نے فرشتے کے ذریعے سے پیغمبر پر نازل فرمایا ہے، پھر پیغمبر اسے لوگوں تک پہنچاتا ہے۔

(۱) جیسا کہ تم سمجھتے اور کہتے ہو۔ اس لیے کہ یہ اصناف شعر سے ہے نہ اس کے مشابہ ہے، پھر یہ کسی شاعر کا کلام کس طرح ہو سکتا ہے؟

(۲) جیسا کہ بعض دفعہ تم یہ دعویٰ بھی کرتے ہو، حالانکہ کہانت بھی ایک شے دیگر ہے۔

(۳) قلت دونوں جگہ نفی کے معنی میں ہے، یعنی تم بالکل قرآن پر ایمان لاتے ہو نہ اس سے نصیحت ہی حاصل کرتے ہو۔

(۴) یعنی رسول کی زبان سے ادا ہونے والا یہ قول، رب العالمین کا اتارا ہوا کلام ہے۔ اسے تم کبھی شاعری اور کبھی کہانت کہہ کر اس کی تکذیب کرتے ہو؟

(۵) یعنی اپنی طرف سے گھڑ کر ہماری طرف منسوب کر دیتا، یا اس میں کمی بیشی کر دیتا، تو ہم فوراً اس کا مؤاخذہ کرتے اور اسے ڈھیل نہ دیتے۔ جیسا کہ اگلی آیات میں فرمایا۔

(۶) یادائیں ہاتھ کے ساتھ اس کی گرفت کرتے، اس لیے کہ دائیں ہاتھ سے گرفت زیادہ سخت ہوتی ہے اور اللہ کے تو دونوں ہاتھ ہی دائیں ہیں۔ (كَمَا فِي الْحَدِيثِ)

(۷) خیال رہے یہ سزا، خاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں بیان کی گئی ہے جس سے مقصد آپ کی صداقت کا اظہار ہے۔ اس میں یہ اصول بیان نہیں کیا گیا ہے کہ جو بھی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے گا تو جھوٹے مدعی کو ہم فوراً سزا سے دوچار کر دیں گے۔ لہذا اس سے کسی جھوٹے نبی کو اس لیے سچا باور نہیں کرایا جاسکتا کہ دنیا میں وہ مؤاخذہ الہی سے بچا رہا۔ واقعات بھی شاہد ہیں کہ متعدد لوگوں نے نبوت کے جھوٹے دعوے کیے اور اللہ نے انہیں ڈھیل دی اور دنیوی مؤاخذہ سے وہ بالعموم محفوظ ہی رہے۔ اس لیے اگر اسے اصول مان لیا جائے تو پھر متعدد جھوٹے مدعیان نبوت کو ”سچا

پھر تم میں سے کوئی بھی مجھے اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔^(۱) (۴۷)

یقیناً یہ قرآن پر ہیروز گاروں کے لیے نصیحت ہے۔^(۲) (۴۸)
ہمیں پوری طرح معلوم ہے کہ تم میں سے بعض اس کے جھٹلانے والے ہیں۔ (۴۹)

بیشک (یہ جھٹلانا) کافروں پر حسرت ہے۔^(۳) (۵۰)
اور بیشک (و شبہ) یہ یقینی حق ہے۔^(۴) (۵۱)
پس تو اپنے رب عظیم کی پاکی بیان کر۔^(۵) (۵۲)

سورۃ معارج کی ہے اور اس میں چوالیس آیتیں اور دو رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

ایک سوال کرنے والے^(۶) نے اس عذاب کا سوال کیا جو

فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ﴿۴۷﴾

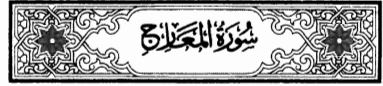
وَأِنَّهُ لَتَذَكَّرٌ لِلَّذِينَ ﴿۴۸﴾

وَأَنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنْكُمْ مُكَذِّبِينَ ﴿۴۹﴾

وَأِنَّهُ لَكَسْرٌ وَعَلَىٰ الْكَافِرِينَ ﴿۵۰﴾

وَأِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ﴿۵۱﴾

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿۵۲﴾



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ ﴿۱﴾

نبیؐ مانا پڑے گا۔

(۱) اس سے معلوم ہوا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سچے رسول تھے، جن کو اللہ نے سزا نہیں دی، بلکہ دلائل و معجزات اور اپنی خاص تائید و نصرت سے انہیں نوازا۔

(۲) کیوں کہ وہی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ورنہ قرآن تو سارے ہی لوگوں کی نصیحت کے لیے آیا ہے۔

(۳) یعنی قیامت والے دن اس پر حسرت کریں گے، کہ کاش ہم نے قرآن کی تکذیب نہ کی ہوتی۔ یا یہ قرآن بجائے خود ان کے لیے حسرت کا باعث ہو گا، جب وہ اہل ایمان کو قرآن کا جراتے ہوئے دیکھیں گے۔

(۴) یعنی قرآن کا اللہ کی طرف سے ہونا بالکل یقینی ہے، اس میں قطعاً شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ یا قیامت کی بابت جو خبر دی جا رہی ہے، وہ بالکل حق اور سچ ہے۔

(۵) جس نے قرآن کریم جیسی عظیم کتاب نازل فرمائی۔

(۶) کہتے ہیں یہ نصر بن حارث تھا یا ابو جہل تھا جس نے کہا تھا ﴿اللَّهُمَّ إِنَّكَ لَهَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ كَأَمْطَرْنَا عَلَيْكَ حِجَارًا مِنَ السَّمَاءِ﴾ آیت (الأنفال، ۳۲) چنانچہ یہ شخص جنگ بدر میں مارا گیا۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں جنہوں نے اپنی قوم کے لیے بد دعا کی تھی اور اس کے نتیجے میں اہل مکہ پر قحط سالی مسلط کی گئی تھی۔

<p>واضح ہونے والا ہے۔ (۱)</p> <p>کافروں پر، جسے کوئی ہٹانے والا نہیں۔ (۲)</p> <p>اس اللہ کی طرف سے جو سیڑھیوں والا ہے۔ (۳) (۱)</p> <p>جس کی طرف فرشتے اور روح چڑھتے ہیں (۲) ایک دن</p> <p>میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہے۔ (۳) (۳)</p> <p>پس تو اچھی طرح صبر کر۔ (۵)</p> <p>بیشک یہ اس (عذاب) کو دور سمجھ رہے ہیں۔ (۶)</p> <p>اور ہم اسے قریب ہی دیکھتے ہیں۔ (۷) (۴)</p>	<p>لِلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ ﴿١﴾</p> <p>قَرْنَ اللّٰهُ ذِي الْمَعَارِجِ ﴿٢﴾</p> <p>تَعْرُوبُ الْمَلَكَةِ وَالرُّوْحُ اللَّيْلِيُّ يَوْمَ كَانَ مَقْدَارُهُ</p> <p>خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ ﴿٣﴾</p> <p>فَاصْبِرْ صَبْرًا جَبِيلًا ﴿٥﴾</p> <p>إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا ﴿٦﴾</p> <p>وَنَرَاهُ قَرِيبًا ﴿٧﴾</p>
--	---

(۱) یا درجات والا، بلند یوں والا ہے، جس کی طرف فرشتے چڑھتے ہیں۔

(۲) روح سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں، ان کی عظمت شان کے پیش نظر ان کا الگ خصوصی ذکر کیا گیا ہے، ورنہ فرشتوں میں وہ بھی شامل ہیں۔ یا روح سے مراد انسانی روہیں ہیں جو مرنے کے بعد آسمان پر لے جانی جاتی ہیں۔ جیسا کہ بعض روایات میں ہے۔

(۳) اس یوم کی تعیین میں بہت اختلاف ہے، جیسا کہ الم السجدہ کے آغاز میں ہم بیان کر آئے ہیں۔ یہاں امام ابن کثیر نے چار اقوال نقل فرمائے ہیں۔ پہلا قول ہے کہ اس سے وہ مسافت مراد ہے جو عرش عظیم سے اسفل سافلین (زمین کے ساتویں طبقے) تک ہے۔ یہ مسافت ۵۰ ہزار سال میں طے ہونے والی ہے۔ دوسرا قول ہے کہ یہ دنیا کی کل مدت ہے۔ ابتدائے آفرینش سے وقوع قیامت تک، اس میں سے کتنی مدت گزر گئی اور کتنی باقی ہے، اسے صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ تیسرا قول ہے کہ یہ دنیا و آخرت کے درمیان کا فاصلہ ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ یہ قیامت کے دن کی مقدار ہے۔ یعنی کافروں پر یہ یوم حساب پچاس ہزار سال کی طرح بھاری ہو گا۔ لیکن مومن کے لیے دنیا میں ایک فرض نماز پڑھنے سے بھی مختصر ہو گا۔ (مسند احمد، ۳/ ۷۵) امام ابن کثیر نے اسی قول کو ترجیح دی ہے کیوں کہ احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے کو قیامت والے دن جو عذاب دیا جائے گا اس کی تفصیل بیان فرماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، «حَتَّىٰ يَخْشَكُمُ اللّٰهُ بَيْنَ عِبَادِهِ فِي يَوْمٍ كَأَنَّ مِقْدَارَهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ» (صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب إسم مانع الزکوٰۃ) ”یہاں تک کہ اللہ اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا“ ایسے دن میں، جس کی مدت تمہاری گنتی کے مطابق پچاس ہزار سال ہوگی۔“ اس تفسیر کی رو سے فی یوم کا تعلق عذاب سے ہو گا، یعنی وہ واقع ہونے والا عذاب قیامت والے دن ہو گا جو کافروں پر پچاس ہزار سال کی طرح بھاری ہو گا۔

(۴) دور سے مراد ناممکن اور قریب سے اس کا یقینی واقع ہونا ہے۔ یعنی کافر قیامت کو ناممکن سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کا

يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالذَّهَبِ ۝

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝

وَلَا يَسْئَلُ حِمِيمٌ حَمِيمًا ۝

يُبْخَرُونَهُمْ يُؤَدُّ الْمُجْرِمُ لُوَيْقَتَيْهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ مِثْلًا

بَيْنِيهِ ۝

وَصَاحِبِيهِ وَأَخِيهِ ۝

وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ۝

وَمَنْ فِي الْأَرْضِ حَمِيمًا لَمْ يُعْجِبْهُ ۝

كَلَّا إِنَّهَا لَأَكْظَىٰ ۝

نَزَّاعَةً لِّلسَّمَوَاتِ ۝

تَنَزَّلُ عُقُوبًا أَدْبُرًا وَتَوَلَّىٰ ۝

وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ ۝

جس دن آسمان مثل تیل کی تلچھٹ کے ہو جائے گا۔ (۸)

اور پہاڑ مثل رنگین اون کے ہو جائیں گے۔ (۹)

اور کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا۔ (۱۰)

(حالانکہ) ایک دوسرے کو دکھائیے جائیں گے،

گناہ گار اس دن کے عذاب کے بدلے فدیے میں اپنے

بیٹوں کو۔ (۱۱)

اپنی بیوی کو اور اپنے بھائی کو۔ (۱۲)

اور اپنے کنبے کو جو اسے پناہ دیتا تھا۔ (۱۳)

اور روئے زمین کے سب لوگوں کو دینا چاہے گا تاکہ یہ

اسے نجات دلا دے۔ (۱۴)

(مگر) ہرگز یہ نہ ہو گا، یقیناً وہ شعلہ والی (آگ)

ہے۔ (۱۵)

جو منہ اور سر کی کھال کھینچ لانے والی ہے۔ (۱۶)

وہ ہر اس شخص کو پکارے گی جو پیچھے ہٹتا اور منہ موڑتا

ہے۔ (۱۷)

اور جمع کر کے سنبھال رکھتا ہے۔ (۱۸)

عقیدہ ہے کہ وہ ضرور آکر رہے گی اس لیے کہ کُلُّ مَا هُوَ آتٍ فَهُوَ قَرِيبٌ ”ہر آنے والی چیز قریب ہے۔“

(۱) یعنی دھنی ہوئی روٹی کی طرح، جیسے سورۃ القارعتہ میں ہے۔ ﴿كَالْعِهْنِ الْمَنْقُوشِ﴾

(۲) لیکن سب کو اپنی اپنی پڑی ہوگی، اس لیے تعارف اور شناخت کے باوجود ایک دوسرے کو نہیں پوچھیں گے۔

(۳) یعنی اولاد، بیوی، بھائی اور خاندان یہ ساری چیزیں انسان کو نہایت عزیز ہوتی ہیں، لیکن قیامت والے دن مجرم

چاہے گا کہ اس سے فدیے میں یہ عزیز چیزیں قبول کر لی جائیں اور اسے چھوڑ دیا جائے۔ فَصِيلَةٌ خاندان کو کہتے ہیں،

کیوں کہ وہ قبیلے سے جدا ہوتا ہے۔

(۴) یعنی وہ جہنم۔ یہ اس کی شدت حرارت کا بیان ہے۔

(۵) یعنی گوشت اور کھال کو جلا کر رکھ دے گی۔ انسان صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ جائے گا۔

(۶) یعنی جو دنیا میں حق سے پیٹھ پھیرتا اور منہ موڑتا تھا اور مال جمع کر کے خزانوں میں سینت سینت کر رکھتا تھا، اسے اللہ

کی راہ میں خرچ کرتا تھا نہ اس میں سے زکوٰۃ نکالتا تھا۔ اللہ تعالیٰ جہنم کو قوت گویائی عطا فرمائے گا اور جہنم بزبان قال خود

بیشک انسان بڑے کچے دل والا بنایا گیا ہے۔ ^(۱) (۱۹)	إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝
جب اسے مصیبت پہنچتی ہے تو ہڑبڑا اٹھتا ہے۔ (۲۰)	إِذَا مَسَّهُ الْكَرْهُ جُوعًا ۝
اور جب راحت ملتی ہے تو بجل کرنے لگتا ہے۔ (۲۱)	وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۝
مگر وہ نمازی۔ (۲۲)	إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۝
جو اپنی نماز پر پیشگی کرنے والے ہیں۔ ^(۲) (۲۳)	الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝
اور جن کے مالوں میں مقررہ حصہ ہے۔ ^(۳) (۲۴)	وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مِّمَّا كَسَبُوا ۝
مانگنے والوں کا بھی اور سوال سے بچنے والوں کا بھی۔ ^(۴) (۲۵)	لِتَسْأَلُوا بِمَا كَسَبْتُمْ ۝
اور جو انصاف کے دن پر یقین رکھتے ہیں۔ ^(۵) (۲۶)	وَالَّذِينَ يَصِدَّقُونَ يَوْمَئِذٍ هُمْ كَرِيمُونَ ۝
اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ ^(۶) (۲۷)	وَالَّذِينَ هُمْ مِنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ ۝

ایسے لوگوں کو پکارے گی، جن پر ان کے عملوں کی پاداش میں جہنم واجب ہوگی۔ بعض کہتے ہیں، پکارنے والے تو فرشتے ہی ہوں گے اسے منسوب جہنم کی طرف کر دیا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ کوئی نہیں پکارے گا، یہ صرف تمثیل کے طور پر ایسا کہا گیا ہے۔ مطلب ہے کہ مذکورہ افراد کا ٹھکانا جہنم ہو گا۔

(۱) سخت حریم اور بہت جزع فزع کرنے والے کو ہلوع کہا جاتا ہے، جس کو ترچے میں بڑے کچے دل والا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیوں کہ ایسا شخص ہی بخیل و حریم اور زیادہ جزع فزع کرنے والا ہوتا ہے، آگے اس کی صفت بیان کی گئی ہے۔
(۲) مراد ہیں مومن کامل اور اہل توحید، ان کے اندر مذکورہ اخلاقی کمزوریاں نہیں ہوتیں، بلکہ اس کے برعکس وہ صفات محمودہ کے پیکر ہوتے ہیں۔ ہمیشہ نماز پڑھنے کا مطلب ہے، وہ نماز میں کوتاہی نہیں کرتے، ہر نماز اپنے وقت پر نہایت پابندی اور التزام کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ کوئی مشغولیت انہیں نماز سے نہیں روکتی اور دنیا کا کوئی فائدہ انہیں نماز سے غافل نہیں کرتا۔

(۳) یعنی زکوٰۃ مفروضہ۔ بعض کے نزدیک یہ عام ہے، صدقات واجبہ اور نافلہ دونوں اس میں شامل ہیں۔
(۴) محروم میں وہ شخص بھی داخل ہے جو رزق سے ہی محروم ہے، وہ بھی جو کسی آفت سماوی وارضی کی زد میں آکر اپنی پونجی سے محروم ہو گیا اور وہ بھی جو ضرورت مند ہونے کے باوجود اپنی صفت تعفف کی وجہ سے لوگوں کی عطا اور صدقات سے محروم رہتا ہے۔

(۵) یعنی وہ اس کا انکار کرتے ہیں نہ اس میں شک و شبہ کا اظہار۔
(۶) یعنی اطاعت اور اعمال صالحہ کے باوجود، اللہ کی عظمت و جلالت کے پیش نظر اس کی گرفت سے لرزاں و ترساں

إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَا تُؤْمِنُونَ ﴿۲۸﴾

بیشک ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں۔^(۱) (۲۸)

وَالَّذِينَ هُمْ لِأُؤْتِحِهِمْ حُفَظُونَ ﴿۲۹﴾

اور جو لوگ اپنی شرمگاہوں کی (حرام سے) حفاظت کرتے ہیں۔^(۲) (۲۹)

إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿۳۰﴾

ہاں ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں جن کے وہ مالک ہیں انہیں کوئی ملامت نہیں۔^(۳) (۳۰)

فَمَنِ ابْتغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُذْنُونَ ﴿۳۱﴾

اب جو کوئی اس کے علاوہ (راہ) ڈھونڈے گا تو ایسے لوگ حد سے گزر جانے والے ہوں گے۔^(۴) (۳۱)

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَكْتِنْتُهُمْ وَوَعَيْدُهُمْ زَعُونَ ﴿۳۲﴾

اور جو اپنی امانتوں کا اور اپنے قول و قرار کا پاس رکھتے ہیں۔^(۵) (۳۲)

وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَتِهِمْ قَائِمُونَ ﴿۳۳﴾

اور جو اپنی گواہیوں پر سیدھے اور قائم رہتے ہیں۔^(۶) (۳۳)

وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿۳۴﴾

اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔^(۷) (۳۴)

أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ ﴿۳۵﴾

یہی لوگ جنتوں میں عزت والے ہوں گے۔^(۸) (۳۵)

رہتے ہیں، اور یقین رکھتے ہیں کہ جب تک اللہ کی رحمت ہمیں اپنے دامن میں نہیں ڈھانک لے گی، ہمارے یہ اعمال نجات کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔ جیسا کہ اس مفہوم کی حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

(۱) یہ سابقہ مضمون ہی کی تائید ہے کہ اللہ کے عذاب سے کسی کو بھی بے خوف نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر وقت اس سے ڈرتے رہنا اور اس سے بچاؤ کی ممکنہ تدابیر اختیار کرتے رہنا چاہئیں۔

(۲) یعنی انسان کی جنسی تسکین کے لیے اللہ نے دو جائز ذرائع رکھے ہیں ایک بیوی اور دوسری ملک بئیمین (لونڈی)۔ آج کل ملک بئیمین کا مسئلہ تو اسلام کی بتلائی ہوئی تدابیر کی رو سے تقریباً ختم ہو گیا ہے، تاہم اسے قانوناً اس لیے ختم نہیں کیا گیا ہے کہ آئندہ کبھی اس قسم کے حالات ہوں تو ملک بئیمین سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ہر حال اہل ایمان کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ جنسی خواہش کی تکمیل و تسکین کے لیے ناجائز ذریعہ اختیار نہیں کرتے۔

(۳) یعنی ان کے پاس لوگوں کی جو امانتیں ہوتی ہیں، اس میں وہ خیانت نہیں کرتے اور لوگوں سے جو عہد کرتے ہیں، انہیں توڑتے نہیں، بلکہ ان کی پاسداری کرتے ہیں۔

(۴) یعنی اسے صحیح صحیح ادا کرتے ہیں، چاہے اس کی زد میں ان کے قریبی عزیز ہی آجائیں، علاوہ ازیں اسے چھپاتے بھی نہیں، نہ اس میں تبدیلی ہی کرتے ہیں۔

قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا قَسَمَ لَكَ مَهْطِعِينَ ﴿۳۶﴾

عَنِ الْمَيِّمِينَ وَعَنِ الشِّمَالِ حَزِينِينَ ﴿۳۷﴾

أَيُّطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ ﴿۳۸﴾

كَلَّا إِنَّهَا خَلْقُهُمْ تَمَّامًا يَعْلَمُونَ ﴿۳۹﴾

فَلَا أَقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغْرِبِ إِنَّا لَعَلِّدُونَ ﴿۴۰﴾

عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ خَيْرًا مِنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿۴۱﴾

فَذَرَهُمْ خِيْرًا يُخَوِّضُونَ وَيَلْمِزُوا حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُؤْعَذُونَ ﴿۴۲﴾

پس کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ تیری طرف دوڑتے آتے ہیں۔ (۳۶)

دائیں اور بائیں سے گروہ کے گروہ۔ (۳۷) (۱)
کیا ان میں سے ہر ایک کی توقع یہ ہے کہ وہ نعمتوں والی جنت میں داخل کیا جائے گا؟ (۳۸)

(ایسا) ہرگز نہ ہو گا۔ ہم نے انہیں اس (چیز) سے پیدا کیا ہے جسے وہ جانتے ہیں۔ (۳۹) (۲)

پس مجھے قسم ہے مشرقوں اور مغربوں (۴۰) کے رب کی (کہ) ہم یقیناً قادر ہیں۔ (۴۰)

اس پر کہ انکے عوض ان سے اچھے لوگ لے آئیں (۴۱) اور ہم عاجز نہیں ہیں۔ (۴۱) (۳)

پس تو انہیں جھگڑاتا کھیلتا چھوڑ دے (۴۲) یہاں تک کہ یہ اپنے اس دن سے جا ملیں جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا

(۱) یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے کفار کا ذکر ہے کہ وہ آپ کی مجلس میں دوڑے دوڑے آتے، لیکن آپ کی باتیں سن کر عمل کرنے کے بجائے ان کا مذاق اڑاتے اور ٹولیوں میں بٹ جاتے۔ اور دعویٰ یہ کرتے کہ اگر مسلمان جنت میں گئے تو ہم ان سے پہلے جنت میں جائیں گے۔ اللہ نے اگلی آیت میں ان کے اس زعم باطل کی تردید فرمائی۔

(۲) یعنی یہ کس طرح ممکن ہے کہ مومن اور کافر دونوں جنت میں جائیں، رسول کو ماننے والے اور اس کی تکذیب کرنے والے دونوں کو اخروی نعمتیں ملیں؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

(۳) یعنی مَاءٌ مَّهِينٌ (حقیر قطرے) سے۔ جب یہ بات ہے تو کیا تکبر اس انسان کو زیب دیتا ہے؟ جس تکبر کی وجہ سے ہی یہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب بھی کرتا ہے۔

(۴) ہر روز سورج ایک الگ جگہ سے نکلتا اور الگ مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے مشرق بھی بہت ہیں اور مغرب بھی اتنے ہی۔ مزید تفصیل کے لیے سورہ صافات، ۵ دیکھئے۔

(۵) یعنی ان کو ختم کر کے ایک نئی مخلوق آباد کر دینے پر ہم پوری طرح قادر ہیں۔

(۶) جب ایسا ہے تو کیا ہم قیامت والے دن ان کو دوبارہ زندہ نہیں اٹھا سکیں گے۔

(۷) یعنی فضول اور لاپرواہی، بحثوں میں پھنسے اور اپنی دنیا میں مگن رہیں، تاہم آپ اپنی تبلیغ کا کام جاری رکھیں، ان کا رویہ آپ کو اپنے منصب سے غافل، یا بددل نہ کر دے۔

ہے۔ (۳۲)

جس دن یہ قبروں سے دوڑتے ہوئے نکلیں گے، گویا کہ وہ کسی جگہ کی طرف تیز تیز جا رہے ہیں۔ (۳۳)^(۱)
ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی، (۳۴) ان پر زلت چھا رہی ہوگی، (۳۵) یہ ہے وہ دن جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ (۳۴)^(۲)

سورہ نوح کی ہے اور اس میں اٹھائیس آیتیں اور دو رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

یقیناً ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف (۵) بھیجا کہ اپنی قوم کو ڈرا دو (اور خیردار کر دو) اس سے پہلے کہ ان کے پاس دردناک عذاب آجائے۔ (۱)^(۱)

يَوْمَ يُرْجَوْنَ مِنَ الْجِبَاتِ اسْرِءًا كَانَهُمْ إِلَىٰ نُصْبٍ

يُؤْفَفُونَ ﴿۳۳﴾

خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهُفُهُمْ ذَلَّةٌ ذَلِكِ الْيَوْمِ الَّذِي كَانُوا

يُوعَدُونَ ﴿۳۴﴾



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِنَّا كَلَّمْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ

يَاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱﴾

(۱) اَجْدَاثُ جمع ہے۔ جَدَّتْ کے معنی قبریں۔ نُصْبٌ۔ تھانے، جہاں بتوں کے نام پر جانور ذبح کیے جاتے ہیں، اور بتوں کے معنی میں بھی استعمال ہے۔ یہاں اسی دوسرے معنی میں ہے۔ بتوں کے پجاری، جب سورج طلوع ہوتا تو نہایت تیزی سے اپنے بتوں کی طرف دوڑتے کہ کون پہلے اسے بوسہ دیتا ہے۔ بعض اسے یہاں عَلَمٌ کے معنی میں لیتے ہیں کہ جس طرح میدان جنگ میں فوجی اپنے عَلَمٌ (جھنڈے) کی طرف دوڑتے ہیں۔ اسی طرح قیامت والے دن قبروں سے نہایت برق رفتاری سے نکلیں گے۔ يُوْفَفُونَ يُسْرِعُونَ کے معنی میں ہے۔

(۲) جس طرح مجرموں کی آنکھیں جھکی ہوتی ہیں کیونکہ انہیں اپنے کرتوتوں کا علم ہوتا ہے۔

(۳) یعنی سخت زلت انہیں اپنی لپیٹ میں لے رہی ہوگی اور ان کے چہرے مارے خوف کے سیاہ ہوں گے۔ اسی سے عَلَامٌ مُّرَافِقٌ کی ترکیب ہے، جو قریب البلوغت ہو یعنی غَشِيْبَةُ الْاِحْتِلَامِ۔ (فتح القدير)

(۴) یعنی رسولوں کی زبانی اور آسمانی کتابوں کے ذریعے سے۔

(۵) حضرت نوح علیہ السلام جلیل القدر پیغمبروں میں سے ہیں، صحیح مسلم وغیرہ کی حدیث شفاعت میں ہے کہ یہ پہلے رسول ہیں۔ نیز کہا جاتا ہے کہ انہی کی قوم سے شرک کا آغاز ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی قوم کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا۔

(۶) قیامت کے دن عذاب یا دنیا میں عذاب آنے سے قبل، جیسے اس قوم پر طوفان آیا۔

(نوح علیہ السلام نے) کہا اے میری قوم! میں تمہیں صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔^(۱) (۲)
کہ تم اللہ کی عبادت کرو^(۲) اور اسی سے ڈرو^(۳) اور میرا کہنا مانو۔^(۳) (۳)

تو وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں ایک وقت مقررہ تک چھوڑ دے گا۔^(۵) یقیناً اللہ کا وعدہ جب آجاتا ہے تو مؤخر نہیں ہوتا^(۴) کاش کہ تمہیں سمجھ ہوتی۔^(۴) (۳)
(نوح علیہ السلام نے) کہا اے میرے پروردگار! میں نے اپنی قوم کو رات دن تیری طرف بلایا ہے۔^(۸) (۵)
مگر میرے بلانے سے یہ لوگ اور زیادہ بھاگنے

قَالَ يٰ قَوْمِ اِنَّ لَكُمْ نَذِيْرًا مُّبِيْنًا ﴿٧١﴾

اِنَّ اَعْبُدُ وَاللّٰهَ وَالْتَقُوْا وَاَطِيعُوْنَ ﴿٧٢﴾

يَغْفِرْ لَكُمْ مِنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُوَخِّرْكُمْ اِلَىٰ اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٧٣﴾

قَالَ رَبِّ اِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لِيَسْلُوْا وَتَهْتٰوْا ﴿٧٤﴾

فَكَرِهْتُمْ لِذِكْرِيْ اِلَّا فِرًاۗا ﴿٧٥﴾

(۱) اللہ کے عذاب سے، اگر تم ایمان نہ لائے۔ اسی لیے عذاب سے نجات کا نسخہ تمہیں بتلانے آیا ہوں۔ جو آگے بیان ہو رہا ہے۔

(۲) اور شرک چھوڑ دو، صرف اسی ایک کی عبادت کرو۔

(۳) اللہ کی نافرمانیوں سے اجتناب کرو، جن سے تم عذاب الہی کے مستحق قرار پا سکتے ہو۔

(۴) یعنی میں تمہیں جن باتوں کا حکم دوں، اس میں میری اطاعت کرو، اس لیے کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول اور اس کا نمائندہ بن کر آیا ہوں۔

(۵) اس کے معنی یہ کیے گئے ہیں کہ ایمان لانے کی صورت میں تمہاری موت کی جو مدت مقرر ہے، اس کو مؤخر کر کے تمہیں مزید مہلت عمر عطا فرمائے گا اور وہ عذاب تم سے دور کر دے گا جو عدم ایمان کی صورت میں تمہارے لیے مقدر تھا۔ چنانچہ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اطاعت، نیکی اور صلہ رحمی سے عمر میں حقیقتاً اضافہ ہوتا ہے۔ حدیث میں بھی ہے: صِلَةُ الرَّحِمِ تَزِيْدُ فِي الْعُمْرِ صِلَةُ رَحْمِيْ اُضَافَةُ عُمْرٍ كَابِعْثُ هُوَ۔ (ابن کثیر) بعض کہتے ہیں، تاخیر کا مطلب برکت ہے، ایمان سے عمر میں برکت ہوگی۔ ایمان نہیں لاؤ گے تو اس برکت سے محروم رہو گے۔

(۶) بلکہ لامحالہ واقع ہو کر رہتا ہے، اس لیے تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ ایمان و اطاعت کا راستہ فوراً اپنالو، تاخیر میں خطرہ ہے کہ وعدہ عذاب الہی کی پیٹ میں نہ آجاؤ۔

(۷) یعنی اگر تمہیں علم ہوتا تو تم اسے اپنانے میں جلدی کرتے جس کا میں تمہیں حکم دے رہا ہوں یا اگر تم یہ بات جانتے ہوئے کہ اللہ کا عذاب جب آجاتا ہے تو ملتا نہیں ہے۔

(۸) یعنی تیرے حکم کی تعمیل میں، بغیر کسی کوتاہی کے رات دن میں نے تیرا پیغام اپنی قوم کو پہنچایا ہے۔

لگے۔^(۶)

میں نے جب کبھی انہیں تیری بخشش کے لیے بلایا^(۲) انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیں^(۳) اور اپنے کپڑوں کو اوڑھ لیا^(۴) اور اڑ گئے^(۵) اور بڑا تکبر کیا۔^(۶)

پھر میں نے انہیں آواز بلند بلایا۔^(۸)

اور بیشک میں نے ان سے علانیہ بھی کہا اور چپکے چپکے بھی۔^(۷)

اور میں نے کہا کہ اپنے رب سے اپنے گناہ بخشواؤ^(۸) (اور معافی مانگو) وہ یقیناً بڑا بخشنے والا ہے۔^(۹)

وہ تم پر آسمان کو خوب برستا ہوا چھوڑ دے گا۔^(۱۰)

اور تمہیں خوب پے در پے مال اور اولاد میں ترقی دے گا

وَاتَّقِ كَلِمَٰدَٰعُوْثُهُمْ لَعَنُوْهُمُ لَعْنًا لَّهْمُ جَعَلُوْا اَصَابِعَهُمْ
فِيْ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَشْشَوْا بَيْنَٰهُمْ وَاصْوَوْا
وَاسْتَكْبَرُوْا اسْتَكْبَرُوْا ۝

ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جَهَٰرًا ۝

ثُمَّ اِنِّيْ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا ۝

يُرْسِلُ السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا ۝

وَيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ جَنٰتٍ

(۱) یعنی میری پکار سے یہ ایمان سے اور زیادہ دور ہو گئے ہیں۔ جب کوئی قوم گمراہی کے آخری کنارے پر پہنچ جائے تو پھر اس کا یہی حال ہوتا ہے، اسے جتنا اللہ کی طرف بلاؤ، وہ اتنا ہی دور بھاگتی ہے۔

(۲) یعنی ایمان اور اطاعت کی طرف، جو سب مغفرت ہیں۔

(۳) تاکہ میری آواز نہ سن سکیں۔

(۴) تاکہ میرا چہرہ نہ دیکھ سکیں یا اپنے سروں پر کپڑے ڈال لیں تاکہ میرا کلام نہ سن سکیں۔ یہ ان کی طرف سے شدت عداوت کا اور وعظ و نصیحت سے بے نیازی کا اظہار ہے۔ بعض کہتے ہیں، اپنے کو کپڑوں سے ڈھانک لینے کا مقصد یہ تھا کہ پیغمبران کو پہچان نہ سکے اور انہیں قبولیت دعوت کے لیے مجبور نہ کرے۔

(۵) یعنی کفر پر مصر رہے، اس سے باز نہیں آئے اور توبہ نہیں کی۔

(۶) قبول حق اور امتثال امر سے انہوں نے سخت تکبر کیا۔

(۷) یعنی مختلف انداز اور طریقوں سے انہیں دعوت دی۔ بعض کہتے ہیں کہ اجتماعات اور مجلسوں میں بھی انہیں دعوت دی اور گھروں میں فرداً فرداً بھی تیرا پیغام پہنچایا۔

(۸) یعنی ایمان اور اطاعت کا راستہ اپنالو، اور اپنے رب سے گزشتہ گناہوں کی معافی مانگ لو۔

(۹) وہ توبہ کرنے والوں کے لیے بڑا رحیم و غفار ہے۔

(۱۰) بعض علما اسی آیت کی وجہ سے نماز استسقا میں سورہ نوح علیہ السلام کے پڑھنے کو مستحب سمجھتے ہیں۔ مروی ہے کہ

اور تمہیں باغات دے گا اور تمہارے لیے نہریں نکال دے گا۔^(۱۲)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی برتری کا عقیدہ نہیں رکھتے۔^(۱۳)

حالانکہ اس نے تمہیں طرح طرح سے پیدا کیا ہے۔^(۱۴)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے اوپر تلے کس طرح سات آسمان پیدا کر دیئے ہیں۔^(۱۵)

اور ان میں چاند کو خوب جگمگاتا بنایا ہے^(۱۶) اور سورج کو

وَيَجْعَلُ لَكُمْ اَنْهَارًا ﴿۱۲﴾

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾

وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمَاوٰتٍ ﴿۱۵﴾

وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ایک مرتبہ نماز استسقا کے لیے منبر پر چڑھے تو صرف آیات استغفار (جن میں یہ آیت بھی تھی) پڑھ کر منبر سے اتر آئے۔ اور فرمایا کہ میں نے بارش کو، بارش کے ان راستوں سے طلب کیا ہے جو آسمانوں میں ہیں، جن سے بارش زمین پر اترتی ہے۔ (ابن کثیر) حضرت حسن بصری کے متعلق مروی ہے کہ ان سے آکر کسی نے قحط سالی کی شکایت کی تو انہوں نے اسے استغفار کی تلقین کی، کسی دوسرے شخص نے فقر و فاقہ کی شکایت کی، اسے بھی انہوں نے یہی نسخہ بتلایا۔ ایک اور شخص نے اپنے باغ کے خشک ہونے کا شکوہ کیا، اسے بھی فرمایا، استغفار کر۔ ایک شخص نے کہا، میرے گھر اولاد نہیں ہوتی، اسے بھی کہا اپنے رب سے استغفار کر۔ کسی نے جب ان سے کہا کہ آپ نے استغفار ہی کی تلقین کیوں کی؟ تو آپ نے یہی آیت تلاوت کر کے فرمایا، کہ میں نے اپنے پاس سے یہ بات نہیں کی، یہ وہ نسخہ ہے جو ان سب باتوں کے لیے اللہ نے بتلایا ہے۔ (ایسر التفاسیر)

(۱) یعنی ایمان و طاعت سے تمہیں اخروی نعمتیں ہی نہیں ملیں گی، بلکہ دنیاوی مال و دولت اور بیٹوں کی کثرت سے بھی نوازے جاؤ گے۔

(۲) وقار، توقیر سے ہے بمعنی عظمت اور رجاخوف کے معنی میں ہے، یعنی جس طرح اس کی عظمت کا حق ہے، تم اس سے ڈرتے کیوں نہیں ہو؟ اور اس کو ایک کیوں نہیں ماننے اور اس کی اطاعت کیوں نہیں کرتے؟

(۳) پہلے نطفہ، پھر ملتقہ، پھر مضغ، پھر عظام اور لحم اور پھر خلق تام، جیسا کہ سورہ انبیاء، ۵- المؤمنون، ۱۳، اور المؤمن، ۶۷ وغیرہ میں تفصیل گزری۔

(۴) جو اس کی قدرت اور کمال صنعت پر دلالت کرتے اور اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ عبادت کے لائق صرف وہی ایک اللہ ہے۔

(۵) جو روئے زمین کو منور کرنے والا اور اس کے ماتھے کا جھومر ہے۔

وَاللَّهُ أَنْتَبَهُمْ مِنَ الْأَرْضِ بَنَاتًا ۝

لَهُمْ يُعْبِدُونَ فِيهَا وَيُخْرِجُهُمْ إِخْرَاجًا ۝

وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ بِسَاطًا ۝

لِتَسْلُكُوا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝

قَالَ نُوحٌ رَبِّ انْتَهَمْ عَصَوِي وَأَتَّبِعُوا مَن كُوِّبَ بِهِ مَالُهُ

وَوَلَّكَهُ الْإِلَهَ سَارًا ۝

روشن چراغ بنایا ہے۔ (۱۶)

اور تم کو زمین سے ایک (خاص اہتمام سے) اگلیا ہے (۲)

(اور پیدا کیا ہے) (۱۷)

پھر تمہیں اسی میں لوٹا لے جائے گا اور (ایک خاص

طریقہ) سے پھر نکالے گا۔ (۱۸) (۳)

اور تمہارے لیے زمین کو اللہ تعالیٰ نے فرش بنا

دیا ہے۔ (۱۹) (۴)

تاکہ تم اس کی کشادہ راہوں میں چلو پھرو۔ (۲۰) (۵)

نوح (علیہ السلام) نے کہا اے میرے پروردگار! ان

لوگوں نے میری توفیق فرمائی کی (۱) اور ایسوں کی فرمانبرداری

کی جن کے مال و اولاد نے ان کو (یقیناً) نقصان ہی میں

بڑھایا ہے۔ (۲۱) (۷)

(۱) تاکہ اس کی روشنی میں انسان معاش کے لیے، جو انسانوں کی انتہائی ناگزیر ضرورت ہے، کسب و محنت کر سکے۔

(۲) یعنی تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو، جنہیں مٹی سے بنایا گیا اور پھر اس میں اللہ نے روح پھونکی۔ یا اگر تمام انسانوں کو مخاطب سمجھا جائے، تو مطلب ہو گا کہ تم جس نطفے سے پیدا ہوتے ہو وہ اسی خوراک سے بنتا ہے جو زمین سے حاصل ہوتی ہے، اس اعتبار سے سب کی پیدائش کی اصل زمین ہی قرار پاتی ہے۔

(۳) یعنی مرکز، پھر اسی مٹی میں دفن ہوتا ہے اور پھر قیامت والے دن اسی زمین سے تمہیں زندہ کر کے نکالا جائے گا۔

(۴) یعنی اسے فرش کی طرح بچھا دیا ہے، تم اس پر اسی طرح چلتے پھرتے ہو، جیسے اپنے گھر میں بیچھے ہوئے فرش پر چلتے اور اٹھتے بیٹھتے ہو۔

(۵) سُبُلٌ، سَبِيلٌ کی جمع اور فِجَاجٌ، فِجَجٌ (کشادہ راستہ) کی جمع ہے۔ یعنی اس زمین پر اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے کشادہ راستے بنا دیے ہیں تاکہ انسان آسانی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ، ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ملک سے دوسرے ملک میں جا سکے۔ اس لیے یہ راستے بھی انسان کی کاروباری اور تمدنی ضرورت ہے، جس کا انتظام کر کے اللہ نے انسانوں پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔

(۶) یعنی میری نافرمانی پر اڑے ہوئے ہیں اور میری دعوت پر لبیک نہیں کہہ رہے ہیں۔

(۷) یعنی ان کے اصغر نے اپنے بڑوں اور اصحاب ثروت ہی کی پیروی کی جن کے مال و اولاد نے انہیں دنیا اور آخرت کے خسارے میں ہی بڑھایا ہے۔

وَمَكَرُوا مَكْرًا كَبِيرًا ﴿۲۲﴾

اور ان لوگوں نے بڑا سخت فریب کیا۔^(۱) (۲۲)
اور کہا انہوں نے کہ ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا
اور نہ وہ اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر
کو (چھوڑنا)^(۲) (۲۳)

وَقَالُوا لَآتَنَزَّلُ إِلَهُكُمْ وَلَا تَنَزَّلُ رَبُّكُمْ وَلَا سَمَوَاتُ عَادَ
وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ﴿۲۳﴾

اور انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا^(۳) (الیٰ) تو ان
ظالموں کی گمراہی اور بڑھا۔ (۲۴)

وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا ﴿۲۴﴾

یہ لوگ بہ سبب^(۴) اپنے گناہوں کے ڈبو دیئے گئے اور
جنم میں پہنچا دیئے گئے اور اللہ کے سوا اپنا کوئی مددگار
انہوں نے نہ پایا۔ (۲۵)

مِمَّا خَلَقْتَنَّهُمْ أَغْرَقُوا فَأَنزَلْنَا نَارًا فَكَلِمٌ يَجِدُهَا هُم
مِّنْ دُونِ اللَّهِ أَضْرًا ﴿۲۵﴾

اور (حضرت) نوح (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے

وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَآتَنَزَّلْ عَلَيَّ الْكُرْسِيُّ مِنَ السَّمَاءِ كَإِنِّي
رَأَيْتُ السَّمَوَاتِ بِرُؤْيَا بَدِيًّا ﴿۲۶﴾

(۱) یہ مکریا فریب کیا تھا؟ بعض کہتے ہیں، ان کا بعض لوگوں کو حضرت نوح علیہ السلام کے قتل کرنے پر ابھارنا تھا، بعض کہتے ہیں مال و اولاد کی وجہ سے جس فریب نفس کا وہ شکار ہوئے، حتیٰ کہ بعض نے کہا، اگر یہ حق پر نہ ہوتے تو ان کو یہ نعمتیں کیوں میر آتیں؟ اور بعض کے نزدیک ان کے بڑوں کا یہ کہنا تھا کہ تم اپنے معبودوں کی عبادت مت چھوڑنا، بعض کے نزدیک ان کا کفر ہی، بڑا کفر تھا۔

(۲) یہ قوم نوح علیہ السلام کے وہ لوگ تھے جن کی وہ عبادت کرتے تھے اور ان کی اتنی شرت ہوئی کہ عرب میں بھی ان کی پوجا ہوتی رہی۔ چنانچہ وڈو متہ الجندل میں قبیلہ کلب کا، سواع ساحل بحر کے قبیلہ حذیل کا، یغوث سبا کے قریب جرف جلد میں مراد اور بنی غلیف کا، یعوق، ہمدان قبیلے کا اور نسو، حیر قوم کے قبیلہ ذوالکلاع کا معبود رہا۔ (ابن کثیر فتح القدر) یہ پانچوں قوم نوح علیہ السلام کے نیک آدمیوں کے نام تھے، جب یہ مر گئے تو شیطان نے ان کے عقیدت مندوں کو کہا کہ ان کی تصویریں بنا کر تم اپنے گھروں اور دکانوں میں رکھ لو تاکہ ان کی یاد تازہ رہے اور ان کے تصور سے تم بھی ان کی طرح نیکیاں کرتے رہو۔ جب یہ تصویریں بنا کر رکھنے والے فوت ہو گئے تو شیطان نے ان کی نسلوں کو یہ کہہ کر شرک میں ملوث کر دیا کہ تمہارے آباؤ ان کی عبادت کرتے تھے جن کی تصویریں تمہارے گھروں میں لٹک رہی ہیں، چنانچہ انہوں نے ان کی پوجا شروع کر دی۔ (صحیح البخاری، تفسیر مسودۃ نوح)

(۳) اضلوا کا قائل (مرجع) قوم نوح کے رؤسا ہیں۔ یعنی انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا اس کا مرجع یہی مذکورہ پانچ بت ہیں، اس کا مطلب ہو گا کہ ان کے سبب بہت سے لوگ گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی کہا تھا۔ ﴿رَبِّ اِنَّهُمْ اَضَلُّوا مِنْ حَبْلِ الْاَرْنَبِ﴾ (ابراہیم ۳۶)

(۴) مما میں صا زائد ہے، مِنْ حَطِيئَتِهِمْ اَي: مِنْ اَجْلِهَا وَبِسَبَبِهَا اَغْرَقُوا بِالطُّوفَانِ (فتح القدیر)

پالنے والے! تو روئے زمین پر کسی کافر کو رہنے سنے والا
نہ چھوڑ۔^(۱) (۲۶)

اگر تو انہیں چھوڑ دے گا تو (یقیناً) یہ تیرے (اور) بندوں
کو (بھی) گمراہ کر دیں گے اور یہ فاجروں اور ڈھیٹ
کافروں ہی کو جنم دیں گے۔ (۲۷)

اے میرے پروردگار! تو مجھے اور میرے ماں باپ اور جو
ایمان کی حالت میں میرے گھر میں آئے اور تمام مومن
مردوں اور عورتوں کو بخش دے^(۲) اور کافروں کو سوائے
بربادی کے اور کسی بات میں نہ بڑھا۔^(۳) (۲۸)

سورہ جن کی ہے اور اس میں اٹھائیس آیتیں اور
دو رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

(اے محمد ﷺ) آپ کہہ دیں کہ مجھے وحی کی گئی ہے کہ
جنوں کی ایک جماعت^(۳) نے (قرآن) سنا اور کہا کہ ہم

إِنَّكَ إِن تَذَرَهُمْ بِيْضًا وَعِبَادًا لَّكَ وَلَا يَلِدُوا وَلَا أَفْآجِدُوا
كَفَّارًا ۝

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيْ مُؤْمِنًا
وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِيْنَ اِلَّا
بِتَارًا ۝



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اِنَّهُ اسْمَعُ نَفْسِیْنَ اَلْحَنِ فَاَقْوَالُ اَنَا مَعْنَا فَاَنَا حَبِیْبٌ ۝

(۱) یہ بدعا اس وقت کی جب حضرت نوح علیہ السلام ان کے ایمان لانے سے بالکل مایوس ہو گئے اور اللہ نے بھی اطلاع
کردی کہ اب ان میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ (ہود، ۳۶) دِيَارًا، فَيَنْعَالُ کے وزن پر دِيَاوًا ہے۔ واؤ کو یا سے بدل کر
اوعام کر دیا گیا، مَنْ يَسْكُنُ الدِّيَارَ مطلب ہے کسی کو باقی نہ چھوڑ۔

(۲) کافروں کے لیے بدعا کی تو اپنے لیے اور مومنین کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔

(۳) یہ بدعا قیامت تک آنے والے ظالموں کے لیے ہے جس طرح مذکورہ دعائے تمام مومن مردوں اور تمام مومن
عورتوں کے لیے ہے۔

(۴) یہ واقعہ سورہ احقاف ۲۹ کے حاشیے پر گزر چکا ہے کہ نبی ﷺ وادی نخلہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فجر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ
کچھ جنوں کا وہاں سے گزر ہوا تو انہوں نے آپ ﷺ کا قرآن سنا۔ جس سے وہ متاثر ہوئے۔ یہاں بتلایا جا رہا ہے کہ اس وقت
جنوں کا قرآن سننا، آپ کے علم میں نہیں آیا، بلکہ وحی کے ذریعے سے آپ کو اس سے آگاہ فرمایا گیا۔

نے عجیب قرآن سنا ہے۔ (۱)

جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ (۲) ہم اس پر ایمان لائے (۳) (اب) ہم ہرگز کسی کو بھی اپنے رب کا شریک نہ بنائیں گے۔ (۴)

اور بیشک ہمارے رب کی شان بڑی بلند ہے نہ اس نے کسی کو (اپنی) بیوی بنایا ہے نہ بیٹا۔ (۵) (۳)

اور یہ کہ ہم میں کا یو توف اللہ کے بارے میں خلاف حق باتیں کہا کرتا تھا۔ (۴)

اور ہم تو یہی سمجھتے رہے کہ ناممکن ہے کہ انسان اور

يُعِدِّي إِلَى التُّسْبِيحِ قَامَتَا يَهُوْنُ لَنْ نُشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا ۝

وَأَنَّهُ تَعَلَّى جَدًّا رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا ۝

وَأَنَّهُ كَانَ يَفُولُ سَفِيهُنَا عَلَى اللَّهِ شَطَطًا ۝

وَأَنَّا كَلَّمْنَا نَأْنَ لَنْ تَعُولَ الْإِنْسَانَ وَالْحِجْنَ عَلَى اللَّهِ

(۱) عَجَبًا، مصدر ہے بطور مبالغہ۔ یا مضاف محذوف ہے۔ ذَا عَجَبٍ یا مصدر، اسم فاعل کے معنی میں ہے مُعْجَبًا۔ مطلب ہے کہ ہم نے ایسا قرآن سنا ہے جو فصاحت و بلاغت میں بڑا عجیب ہے یا مواضع کے اعتبار سے عجیب ہے یا برکت کے لحاظ سے نہایت تعجب انگیز ہے۔ (فتح القدیر)

(۲) یہ قرآن کی دوسری صفت ہے کہ وہ راہ راست یعنی حق و صواب کو واضح کر تا یا اللہ کی معرفت عطا کرتا ہے۔ (۳) یعنی ہم نے تو اس کو سن کر اس بات کی تصدیق کر دی کہ واقعی یہ اللہ کا کلام ہے، کسی انسان کا نہیں، اس میں کفار کو توبخ و تنبیہ ہے کہ جن تو ایک مرتبہ سن کر ہی اس قرآن پر ایمان لے آئے، تھوڑی سی آیات سن کر ہی ان کی کلیا پلٹ گئی اور وہ یہ بھی سمجھ گئے کہ یہ کسی انسان کا بنایا ہوا کلام نہیں ہے لیکن انسانوں کو، خاص طور پر ان کے سرداروں کو اس قرآن سے فائدہ نہیں ہوا، درال حایکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے انہوں نے متعدد مرتبہ قرآن سنا، علاوہ ازیں خود آپ ﷺ بھی ان ہی میں سے تھے اور ان ہی کی زبان میں آپ ان کو قرآن سناتے تھے۔

(۴) نہ اس کی مخلوق میں سے، نہ کسی اور معبود کو۔ اس لیے کہ وہ اپنی ربوبیت میں متفرد ہے۔

(۵) جَدُّ کے معنی عظمت و جلال کے ہیں یعنی ہمارے رب کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ اس کی اولاد یا بیوی ہو۔ گویا جنوں نے ان مشرکوں کی غلطی کو واضح کیا جو اللہ کی طرف بیوی یا اولاد کی نسبت کرتے تھے، انہوں نے ان دونوں کمزوریوں سے رب کی تخریب و تقدیس کی۔

(۶) سَفِيهُنَا (ہمارے بیوقوف) سے بعض نے شیطان مراد لیا ہے اور بعض نے ان کے ساتھی جن اور بعض نے بطور جنس۔ یعنی ہر وہ شخص جو یہ گمان باطل رکھتا ہے کہ اللہ کی اولاد ہے۔ شَطَطًا کے کئی معنی کئے گئے ہیں، ظلم، جھوٹ، باطل، کفر میں مبالغہ وغیرہ۔ مقصد، راہ اعتدال سے دوری اور حد سے تجاوز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات کہ اللہ کی اولاد ہے ان بے وقوفوں کی بات ہے جو راہ اعتدال و صواب سے دور، حد سے متجاوز اور کاذب و افترا پرداز ہیں۔

كَذَّبًا ۝

وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِنَ الْإِنسِ يُعْوِذُونَ بِرِجَالٍ مِنَ الْبَجْرِ
فَرَادُوهُمْ رَهَقًا ۝

وَأَنَّهُمْ طَلَبُوا كَمَا طَلَفْتُمْ أَن لَّنْ يَبْعَثَ اللَّهُ أَحَدًا ۝

وَأَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَا مُلْأَتًا حَرَسَاتٍ أَعْيُنًا
وَشُهَبًا ۝

وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدًا لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَسْتَمِعِ
الْأَنَ يَجِدْ لَهُ مِنْهَا بِأُذُنًا ۝

جنات اللہ پر جھوٹی باتیں لگائیں۔^(۱) (۵)

بات یہ ہے کہ چند انسان بعض جنات سے پناہ طلب کیا کرتے تھے^(۲) جس سے جنات اپنی سرکشی میں اور بڑھ گئے۔^(۳) (۶)

اور (انسانوں) نے بھی تم جنوں کی طرح گمان کر لیا تھا کہ اللہ کسی کو نہ بھیجے گا (یا کسی کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا)^(۴) (۷)

اور ہم نے آسمان کو ٹٹول کر دیکھا تو اسے سخت چوکیداروں اور سخت شعلوں سے پر پایا۔^(۵) (۸)

اس سے پہلے ہم باتیں سننے کے لیے آسمان میں جگہ جگہ بیٹھ جایا کرتے تھے۔^(۶) اب جو بھی کان لگاتا ہے وہ ایک شعلے کو اپنی ناک میں پاتا ہے۔^(۷) (۹)

(۱) اسی لیے ہم ان کی تصدیق کرتے رہے اور اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے رہے۔ حتیٰ کہ ہم نے قرآن سنا تو پھر ہم پر اس عقیدے کا بطلان واضح ہوا۔

(۲) زمانہ جاہلیت میں ایک رواج یہ بھی تھا کہ وہ سفر پر کہیں جاتے تو جس وادی میں قیام کرتے، وہاں جنات سے پناہ طلب کرتے، جیسے علاقے کے بڑے آدمی اور رئیس سے پناہ طلب کی جاتی ہے۔ اسلام نے اس کو ختم کیا اور صرف ایک اللہ سے پناہ طلب کرنے کی تاکید کی۔

(۳) یعنی جب جنات نے یہ دیکھا کہ انسان ہم سے ڈرتے ہیں اور ہماری پناہ طلب کرتے ہیں تو ان کی سرکشی اور تکبر میں اضافہ ہو گیا۔ رَهَقًا۔ یہاں سرکشی، طغیانی اور تکبر کے مفہوم میں ہے۔ اس کے اصل معنی ہیں گناہ اور محارم کو ڈھانکنا یعنی ان کا ارتکاب کرنا۔

(۴) بَعَثَ کے دونوں مفہوم ہو سکتے ہیں، جیسا کہ ترجمے سے واضح ہے۔

(۵) حَرَسٌ، حَارِسٌ (چوکیدار، نگران) کی اور شُهَبٌ، شِهَابٌ (شعلہ) کی جمع ہے۔ یعنی آسمانوں پر فرشتے چوکیداری کرتے ہیں کہ آسمانوں کی کوئی بات کوئی اور نہ سنے لے اور یہ ستارے آسمان پر جانے والے شیاطین پر شعلہ بن کر گرتے ہیں۔

(۶) اور آسمانی باتوں کی کچھ سن گن پا کر کاہنوں کو بتلادیا کرتے تھے جس میں وہ اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا دیا کرتے تھے۔

(۷) لیکن بعثت محمدیہ کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا گیا، اب جو بھی اس نیت سے اوپر جاتا ہے، شعلہ اس کی ناک میں ہوتا ہے اور ٹوٹ کر اس پر گرتا ہے۔

ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ کسی برائی کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے رب کا ارادہ ان کے ساتھ بھلائی کا ہے۔^(۱) (۱۰)

اور یہ کہ (پیشک) بعض تو ہم میں نیکو کار ہیں اور بعض اس کے برعکس بھی ہیں، ہم مختلف طریقوں سے بٹے ہوئے ہیں۔^(۲) (۱۱)

اور ہم نے سمجھ لیا^(۳) کہ ہم اللہ تعالیٰ کو زمین میں ہرگز عاجز نہیں کر سکتے اور نہ ہم بھاگ کر اسے ہرا سکتے ہیں۔ (۱۲)

ہم تو ہدایت کی بات سنتے ہی اس پر ایمان لاپکے اور جو بھی اپنے رب پر ایمان لائے گا اسے نہ کسی نقصان کا اندیشہ ہے نہ ظلم و ستم کا۔^(۴) (۱۳)

ہاں ہم میں بعض تو مسلمان ہیں اور بعض بے انصاف ہیں^(۵) پس جو فرماں بردار ہو گئے انہوں نے تو راہ راست کا قصد کیا۔ (۱۴)

اور جو ظالم ہیں وہ جنم کا ایندھن بن گئے۔^(۶) (۱۵)

وَإِنَّا لَنَرِيكَ أَشْرًا تُرِيدُ بِمَنْ فِي الْأَرْضِ آمَهُ أَرَادًا
بِهِمْ مَرًّا بُهْمًا رَشَدًا ۝

وَإِنَّا لَمِنَ الظَّالِمِينَ وَمِمَّا دُونَ ذَلِكَ كُنَّا طَرَائِقَ
قَدَدًا ۝

وَإِنَّا ظَلَمْنَا أَنْ لَنْ نُعْجِزَ اللَّهَ فِي الْأَرْضِ وَلَنْ نُعْجِزَهُ
هَرًّا يَا ۝

وَإِنَّا لَنَسْمَعُ مَا نَهَى الْأَمَّالِيهِ ۝ فَمَنْ يُؤْمِنْ بِرَبِّهِ فَلَا
يَنَافُ بِغَنَّا وَلَا رَهَقًا ۝

وَإِنَّا لَمِنَ الْمُتْلِمُونَ وَمِمَّا الْفَاطُونَ ۝ فَمَنْ أَسْلَمَ فَأُولَئِكَ تَحَرَّوْا
رَشَدًا ۝

وَإِنَّا لَنَقِيطُونَ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۝

(۱) یعنی اس حراست آسمانی سے مقصد اہل زمین کے لیے کسی شر کے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا یعنی ان پر عذاب نازل کرنا ہے یا بھلائی کا ارادہ یعنی رسول بھیجنا ہے۔

(۲) قَدَدٌ: چیز کا ٹکڑا، صَارَ الْقَوْمُ قَدَدًا اس وقت بولتے ہیں جب ان کے احوال ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ یعنی ہم متفرق جماعتوں اور مختلف اصناف میں بٹے ہوئے ہیں۔ مطلب ہے کہ جنات میں بھی مسلمان، کافر، یہودی، عیسائی، مجوسی وغیرہ ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ان میں بھی مسلمانوں کی طرح قدریہ، مرجئیہ اور رافضیہ وغیرہ ہیں۔ (فتح القدری)

(۳) ظَنَّ: یہاں علم اور یقین کے معنی میں ہے، جیسے اور بھی بعض مقامات پر ہے۔

(۴) یعنی نہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ ان کی نیکیوں کے اجر و ثواب میں کوئی کمی کر دی جائے گی اور نہ اس بات کا خوف کہ ان کی برائیوں میں اضافہ ہو جائے گا۔

(۵) یعنی جو نبوت محمدیہ پر ایمان لائے وہ مسلمان اور اس کے منکر بے انصاف ہیں۔ قَاسِطٌ: ظالم اور غیر منصف اور مُفْسِطٌ: عادل یعنی ثلاثی مجرد سے ہو تو معنی ظلم کرنے کے اور مزید فید سے ہو تو انصاف کرنے کے۔

(۶) اس سے معلوم ہوا کہ انسانوں کی طرح جنات بھی دوزخ اور جنت دونوں میں جانے والے ہوں گے۔ ان میں جو کافر

اور (اے نبی یہ بھی کہہ دو) کہ اگر لوگ راہ راست پر سیدھے رہتے تو یقیناً ہم انہیں بہت وافر پانی پلاتے۔ (۱۶) تاکہ ہم اس میں انہیں آزمالیں،^(۱) اور جو شخص اپنے پروردگار کے ذکر سے منہ پھیر لے گا تو اللہ تعالیٰ اسے سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا۔^(۲) (۱۷)

اور یہ کہ مسجدیں صرف اللہ ہی کے لئے خاص ہیں پس اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔^(۳) (۱۸)

وَأَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ لَأَسْقَيْنَهُمْ مَاءً عَذَابًا ۝
لِنَقِمَنَّهُمْ فِيهِ ۚ وَمَنْ يُعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِ يَسْلُكْهُ
عَذَابًا صَعَدًا ۝

وَأَنَّ السَّجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا ۝

ہوں گے وہ جہنم میں اور مسلمان جنت میں جائیں گے۔ یہاں تک جنات کی گفتگو ختم ہو گئی۔ اب آگے پھر اللہ کا کلام ہے۔ (۱) أَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوا، اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرًا مِّنَ الْجَنِّ پَر عطف ہے یعنی یہ بات بھی میری طرف وحی کی گئی ہے کہ الطَّرِيقَةَ سے مراد راہ راست یعنی اسلام ہے۔ عَذْبًا کے معنی کثیر۔ وافر پانی سے مطلب دنیوی خوش حال ہے۔ یعنی دنیا کا مال و اسباب دے کر ہم ان کی آزمائش کرتے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْعُرَىٰ الْأُمَمِ وَالْقَوَالِقَمَاتِ عَلَيَهُمْ بَرَكَاتٌ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ﴾ (الأعراف: ۹۶) یہی بات اہل کتاب کے ضمن میں بھی فرمائی گئی ہے۔ سورہ مائدہ، ۶۶۔ بعض کہتے ہیں اس آیت کا نزول اس وقت ہوا تھا جب کفار قریش پر قحط سالی مسلط کر دی گئی تھی۔ الطَّرِيقَةَ کے دوسرے معنی گمراہی کے راستے کے کئے گئے ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے یہ مادی خوش حالی استدر راج کے طور پر ہوگی۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿فَلَقْنَا نِسْمًا فَرَقْنَا بِهَا مِثْقَالَ حَبِّ خَلْبٍ﴾ (الأنعام: ۳۳) ﴿الْمُؤْمِنُونَ أَكْمَلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْهِمْ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (المؤمنون: ۵۲) امام ابن کثیر کے نزدیک لِنَقِمَنَّهُمْ کے پیش نظر یہ دوسرا مفہوم زیادہ قرین قیاس ہے جب کہ امام شوکانی کے نزدیک پہلا زیادہ صحیح ہے۔

(۲) صَعَدًا، أُنِي: عَذَابًا شَدِيدًا مُّوجِعًا مُّؤَلِّمًا (ابن کثیر) نہایت سخت، الم ناک عذاب۔

(۳) مسجد کے معنی سجدہ گاہ کے ہیں۔ سجدہ بھی ایک رکن نماز ہے، اس لیے نماز پڑھنے کی جگہ کو مسجد کہا جاتا ہے۔ آیت کا مطلب واضح ہے کہ مسجدوں کا مقصد صرف ایک اللہ کی عبادت ہے، اس لیے مسجدوں میں کسی اور کی عبادت، کسی اور سے دعا و مناجات، کسی اور سے استغاثہ و استمداد جائز نہیں۔ یہ امور ویسے تو مطلقاً ہی ممنوع ہیں اور کہیں بھی غیر اللہ کی عبادت جائز نہیں ہے لیکن مسجدوں کا بطور خاص اس لیے ذکر کیا ہے کہ ان کے قیام کا مقصد ہی اللہ کی عبادت ہے۔ اگر یہاں بھی غیر اللہ کو پکارنا شروع کر دیا گیا تو یہ نہایت ہی فتنہ اور ظالمانہ حرکت ہوگی۔ لیکن بد قسمتی سے بعض نادان مسلمان اب مسجدوں میں بھی اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ بلکہ مسجدوں میں ایسے کتبے آویزاں کیے ہوئے ہیں، جن میں اللہ کو چھوڑ کر دوسروں سے استغاثہ کیا گیا ہے۔ اَهِ! فَلْيَبْتَكَ عَلَى الْإِسْلَامِ مَنْ كَانَ بِأَكْبَارًا.

اور جب اللہ کا بندہ اس کی عبادت کے لیے کھڑا ہوا تو قریب تھا کہ وہ بھیڑکی بھیڑبن کر اس پر پل پڑیں۔^(۱۹) آپ کہہ دیجئے کہ میں تو صرف اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔^(۲۰) کہہ دیجئے کہ مجھے تمہارے کسی نقصان نفع کا اختیار نہیں۔^(۲۱)

کہہ دیجئے کہ مجھے ہرگز کوئی اللہ سے بچا نہیں سکتا^(۲۲) اور میں ہرگز اس کے سوا کوئی جائے پناہ بھی پا نہیں سکتا۔^(۲۳) البتہ (میرا کام) اللہ کی بات اور اس کے پیغامات (لوگوں کو) پہنچا دینا ہے،^(۲۴) جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی نہ مانے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں ایسے لوگ ہمیشہ رہیں گے۔^(۲۵)

(ان کی آنکھ نہ کھلے گی) یہاں تک کہ اسے دیکھ لیں جس کا ان کو وعدہ دیا جاتا ہے^(۲۶) پس عقرب جان لیں گے کہ

وَأَنَّهُ لَتَتَاقَا مَرَعَبًا اللَّهُ يَدْعُوهُ كَادُوا يُكْفُتُونَ عَلَيْهِ لِيَدًّا ۝

قُلْ إِنَّمَا أَدْعُوا رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِهِ أَحَدًا ۝

قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا ۝

قُلْ إِنِّي لَنْ يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ وَلَنْ أَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا ۝

إِلَّا بَلَاغًا مِنَ اللَّهِ وَرِسَالَاتِهِ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ جَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا أَبَدًا ۝

حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا سَائِدُونَ فَسِيَغَلُفُونَ مَنِ الْأَعْفُفُ نَائِمًا وَاَوَّاقِلْ عَدَا ۝

(۱) عَبْدُ اللَّهِ سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور مطلب ہے کہ انس و جن مل کر چاہتے ہیں کہ اللہ کے اس نور کو اپنی پھونکوں سے بجھادیں۔ اس کے اور بھی مفہوم بیان کیے گئے ہیں لیکن امام ابن کثیر نے اسے راجح قرار دیا ہے۔

(۲) یعنی جب سب آپ کی عداوت پر متحہ ہو گئے اور تل گئے ہیں تو آپ فرما دیجئے کہ میں تو صرف اپنے رب کی عبادت کرتا ہوں، اسی سے پناہ طلب کرتا اور اسی پر بھروسہ کرتا ہوں۔

(۳) یعنی مجھے تمہاری ہدایت یا گمراہی کا یا کسی اور نفع نقصان کا اختیار نہیں ہے، میں تو صرف اس کا ایک بندہ ہوں جسے اللہ نے وحی و رسالت کے لیے جن لیا ہے۔

(۴) اگر میں اس کی نافرمانی کروں اور وہ مجھے اس پر وہ عذاب دینا چاہے۔

(۵) یہ لَا أَمْلِكُ لَكُمْ سے مستثنیٰ ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ لَنْ يُجِيرَنِي سے مستثنیٰ ہو، یعنی اللہ سے کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ تبلیغ رسالت کا وہ فریضہ بجالائوں جس کی ادائیگی اللہ نے مجھ پر واجب کی ہے۔ رَسَالَاتِهِ کا عطف اللہ پر ہے، یا بَلَاغًا پر۔ یا پھر عبارت اس طرح ہے۔ إِلَّا أَنْ أُبَلِّغَ عَنِ اللَّهِ وَأَعْمَلَ بِرِسَالَتِهِ. (فتح القدیر)

(۶) یا مطلب یہ ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی عداوت اور اپنے کفر پر مصر رہیں گے، یہاں تک کہ دنیا یا آخرت میں وہ عذاب دیکھ لیں، جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

کس کا مددگار کمزور اور کس کی جماعت کم ہے۔^(۱) (۲۳)
کہہ دیجئے کہ مجھے معلوم نہیں کہ جس کا وعدہ تم سے کیا
جاتا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے دور کی
مدت مقرر کرے گا۔^(۲) (۲۵)

وہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنے غیب پر کسی کو مطلع
نہیں کرتا۔ (۲۶)

سوائے اس پیغمبر کے جسے وہ پسند کر لے^(۳) لیکن اس کے
بھی آگے پیچھے پھرے دار مقرر کر دیتا ہے۔^(۴) (۲۷)
ناکہ ان کے اپنے رب کے پیغام پہنچا دینے کا علم ہو
جائے^(۵) اللہ تعالیٰ نے انکے آس پاس (کی تمام چیزوں)

قُلْ إِنْ أَدْرِي أَقْرَبُ مَا تُوْعَدُونَ أَمْ لِيَجْعَلَ
لَهُ رَبِّي أَمَدًا ﴿۲۵﴾

عِلْمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ﴿۲۶﴾

إِلَّا سَمِئًا تَضَىٰ مِنْ سُرُورٍ فَإِنَّهُ يَسْمَعُ
مَنْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَمَنْ خَلْفَهُ رَصَدًا ﴿۲۷﴾

لِيَعْلَمَ أَنْ قَدْ أَبْتَغُوا رَسُولَهُ وَاحْتَاطُوا بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ
وَاحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾

(۱) یعنی اس وقت ان کو پتہ لگے گا کہ مومنوں کا مددگار کمزور ہے یا مشرکوں کا؟ اور اہل توحید کی تعداد کم ہے یا غیر اللہ کے
پجاریوں کی؟ مطلب یہ ہے کہ پھر مشرکین کا تو سرے سے کوئی مددگار ہی نہیں ہو گا اور اللہ کے ان گنت لشکروں کے
مقابلے میں ان مشرکین کی تعداد بھی آئے میں نمک کے برابر ہی ہوگی۔

(۲) مطلب یہ ہے کہ عذاب یا قیامت کا علم، یہ غیب سے تعلق رکھتا ہے جس کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ وہ
قریب ہے یا دور؟

(۳) یعنی اپنے پیغمبر کو بعض امور غیب سے مطلع کر دیتا ہے جن کا تعلق یا تو اس کے فرائض رسالت سے ہوتا ہے یا وہ
اس کی رسالت کی صداقت کی دلیل ہوتے ہیں۔ اور ظاہر بات ہے کہ اللہ کے مطلع کرنے سے پیغمبر عالم الغیب نہیں ہو
سکتا۔ کیوں کہ پیغمبر بھی اگر عالم الغیب ہو تو پھر اس پر اللہ کی طرف سے غیب کے اظہار کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا۔ اللہ
تعالیٰ اپنے غیب کا اظہار اسی وقت اور اسی رسول پر کرتا ہے، جس کو پہلے اس غیب کا علم نہیں ہوتا۔ اس لیے عالم الغیب
صرف اللہ ہی کی ذات ہے، جیسا کہ یہاں بھی اس کی صراحت فرمائی گئی ہے۔

(۴) یعنی نزول وحی کے وقت، پیغمبر کے آگے پیچھے فرشتے ہوتے ہیں جو شیاطین اور جنات کو وحی کی باتیں سننے نہیں دیتے۔

(۵) لِيَعْلَمَ میں ضمیر کا مرجع کون ہے؟ بعض کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تاکہ آپ جان لیں کہ آپ
سے پہلے رسولوں نے بھی اللہ کا پیغام اسی طرح پہنچایا جس طرح آپ نے پہنچایا۔ یا نگران فرشتوں نے اپنے رب کا پیغام
پیغمبر تک پہنچا دیا ہے اور بعض نے اس کا مرجع اللہ کو بنایا ہے۔ اس صورت میں مطلب ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کی
فرشتوں کے ذریعے سے حفاظت فرماتا ہے تاکہ وہ فریضہ رسالت کی ادائیگی صحیح طریقے سے کر سکیں۔ نیز وہ اس وحی کی
بھی حفاظت فرماتا ہے جو پیغمبروں کو کی جاتی ہے تاکہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات لوگوں تک ٹھیک

کا احاطہ کر رکھا ہے^(۱) اور ہر چیز کی گنتی کا شمار کر رکھا ہے۔^(۲) (۲۸)

سورہ مزمل کی ہے اور اس میں ہیں آیتیں اور دو رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اے کپڑے میں لپٹنے والے۔^(۳) (۱)

رات (کے وقت نماز) میں کھڑے ہو جاؤ مگر کم۔^(۴)

آدھی رات یا اس سے بھی کچھ کم کر لے۔^(۵) (۳)

یا اس پر بڑھادے^(۶) اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر (صاف) پڑھا کر۔^(۷) (۵)

یقیناً ہم تجھ پر بہت بھاری بات عنقریب نازل کریں گے۔^(۸) (۶)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يَا أَيُّهَا الْمُرْسَلُ ۝

ثَوَابِكُ إِلَّا قَلِيلًا ۝

تَضَفَّةً أَوْ أَنْفُصَ مِنْهُ وَقِيلًا ۝

أَوْرَدَ عَلَيْكَ وَرَثِلَ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝

ٹھیک پہنچا دیے ہیں یا فرشتوں نے پیغمبروں تک وحی پہنچا دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اگرچہ پہلے ہی سے ہر چیز کا علم ہے لیکن ایسے موقعوں پر اللہ کے جاننے کا مطلب اس کے تحقق کا عام مشاہدہ ہے، جیسے ﴿لِنَعْلَمَ مَنْ يَرْجِعُهُ الرَّسُولَ﴾ (البقرة: ۱۳۳) اور ﴿وَلِنَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلِنَعْلَمَنَّ الْمُنْفِقِينَ﴾ (سورة العنكبوت) وغیرہ آیات میں ہے۔ (ابن کثیر)

(۱) فرشتوں کے پاس کی یا پیغمبروں کے پاس کی۔

(۲) کیوں کہ وہی عالم الغیب ہے، جو ہو چکا اور جو آئندہ ہو گا، سب کا اس نے شمار کر رکھا ہے۔ یعنی اس کے علم میں ہے۔

(۳) جس وقت ان آیات کا نزول ہوا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم چادر اوڑھ کر لیٹے ہوئے تھے، اللہ نے آپ کی اسی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے خطاب فرمایا، مطلب ہے کہ اب چادر چھوڑ دیں اور رات کو تھوڑا قیام کریں یعنی نماز تہجد پڑھیں۔ کما جاتا ہے کہ اس حکم کی بنا پر نماز تہجد آپ کے لیے واجب تھی۔ (ابن کثیر)

(۴) یہ قلیل سے بدل ہے، یعنی یہ قیام نصف رات سے کچھ کم (ثلث) یا کچھ زیادہ (دو ثلث) ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

(۵) چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ آپ کی قراءت ترتیل کے ساتھ ہی ہوتی تھی اور آپ نے اپنی امت کو بھی ترتیل کے ساتھ، یعنی ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کی تلقین کی ہے۔

(۶) رات کا قیام چوں کہ نفس انسانی کے لیے بالعموم گراں ہے، اس لیے یہ جملہ معترضہ کے طور پر فرمایا کہ ہم اس سے

بیشک رات کا اٹھنا دل جمعی کے لیے انتہائی مناسب ہے^(۱)
 اور بات کو بہت درست کر دینے والا ہے۔^(۲)
 یقیناً تجھے دن میں بہت شغل رہتا ہے۔^(۳)
 تو اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کر اور تمام خلائق سے کٹ
 کر اس کی طرف متوجہ ہو جا۔^(۴)
 مشرق و مغرب کا پروردگار جس کے سوا کوئی معبود نہیں،
 تو اسی کو اپنا کارساز بنا لے۔^(۵)
 اور جو کچھ وہ کہیں تو ستارہ اور وضعیتاری کے ساتھ ان
 سے الگ تھلگ رہ۔^(۶)
 اور مجھے اور ان جھلانے والے آسودہ حال لوگوں کو چھوڑ
 دے اور انہیں ذرا سی مہلت دے۔^(۷)

إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ مِنْ أَشَدِّ وَطْأٍ وَأَوْمُومٍ ۝
 إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَمِعًا طَوِيلًا ۝
 وَادْكُرُ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبْتَئِلْ إِلَيْهِ تَتَّبِعِلَا ۝
 رَبُّ الشَّرْقِيِّ وَالْمَغْرِبِيِّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ كَوِيلًا ۝
 وَأَصْبِرْ عَلَى مَا يَفْعُلُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَبِيلًا ۝
 وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ۝

بھی بھاری بات تجھ پر نازل کریں گے، یعنی قرآن، جس کے احکام و فرائض پر عمل، اس کے حدود کی پابندی اور اس کی تبلیغ و دعوت، ایک بھاری اور جاں گسل عمل ہے۔ بعض نے ثقات (بھاری پن) سے وہ بوجھ مراد لیا ہے جو وحی کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑتا تھا جس سے سخت سردی میں بھی آپ پسینے سے شرابور ہو جاتے۔ (ابن کثیر)

(۱) اس کا دوسرا مفہوم ہے کہ رات کی تمناؤں میں کان معافی قرآن کے فہم میں دل کے ساتھ زیادہ موافقت کرتے ہیں جو ایک نمازی تہجد میں پڑھتا ہے۔

(۲) دوسرا مفہوم ہے کہ دن کے مقابلے میں رات کو قرآن زیادہ واضح اور حضور قلب کے لیے زیادہ موثر ہے، اس لیے کہ اس وقت دوسری آوازیں خاموش ہوتی ہیں۔ فضا میں سکون غالب ہوتا ہے اس وقت نمازی جو پڑھتا ہے وہ آوازوں کے شور اور دنیا کے ہنگاموں کی نذر نہیں ہوتا بلکہ نمازی اس سے خوب محفوظ ہوتا اور اس کی اثر آفرینی کو محسوس کرتا ہے۔

(۳) سَبَّحَ کے معنی ہیں اَلنَّجْمِيُّ وَالذَّوْرَانُ (چلنا اور گھومنا پھرنا) یعنی دن کے وقت دنیاوی مصروفیتوں کا جوم رہتا ہے۔ یہ پہلی بات ہی کی تائید ہے۔ یعنی رات کو نماز اور تلاوت زیادہ مفید اور موثر ہے۔ یعنی اس پر مداومت کر، دن ہو یا رات، اللہ کی تسبیح و تحمید اور تکبیر و تہلیل کرتا رہ۔

(۴) تَبْتَئِلْ کے معنی اَنْفِطَاعٌ اور علیحدگی کے ہیں، یعنی اللہ کی عبادت اور اس سے دعا و مناجات کے لیے یکسو اور ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو جانا۔ یہ رہبانیت سے مختلف چیز ہے۔ رہبانیت تو تجرد اور ترک دنیا ہے۔ جو اسلام میں ناپسندیدہ چیز ہے۔ اور تَبْتَئِلْ کا مطلب ہے امور دنیا کی ادائیگی کے ساتھ عبادت میں اشتغال، خشوع، خضوع اور اللہ کی طرف یکسوئی۔ یہ محمود و مطلوب ہے۔

إِنَّ لَدَيْنَا أَكْوَاجًا وَيَحِيمًا ﴿٧﴾

یقیناً ہمارے ہاں سخت بیڑیاں ہیں اور سلگتی ہوئی
جنم ہے۔ (۱۲)

وَكَمَا مَادَا عَصَاةٍ وَعَدَّ آبَا لِيَمَا ﴿٨﴾

اور خلق میں اٹکنے والا کھانا ہے اور رد دینے والا عذاب
ہے۔ (۱۳) ^(۱)

يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ﴿٩﴾

جس دن زمین اور پہاڑ تھر تھرا جائیں گے اور پہاڑ مثل
بھر بھری ریت کے ٹیلوں کے ہو جائیں گے۔ (۱۴) ^(۲)

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ
رَسُولًا ﴿١٠﴾

بیشک ہم نے تمہاری طرف بھی تم پر گواہی دینے والا
رسول بھیج دیا ہے جیسے کہ ہم نے فرعون کے پاس رسول
بھیجا تھا۔ (۱۵)

فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيزِلًا ﴿١١﴾

تو فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے
سخت (وبال کی) پکڑ میں پکڑ لیا۔ (۱۶) ^(۳)

فَكَيْفَ تَسْتَعْتُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ

تم اگر کافر رہے تو اس دن کیسے پناہ پاؤ گے جو دن بچوں کو
بوڑھا کر دے گا۔ (۱۷) ^(۵)

شَيْبًا ﴿١٢﴾

(۱) اُنْكَالٌ، نکل کی جمع ہے، قیود (بیڑیاں) اور بعض نے اَغْلَالٌ کے معنی میں لیا ہے۔ یعنی طوق - جَحِيمًا، بھڑکتی آگ۔
ذَا عَصَاةٍ حلق میں انک جانے والا نہ حلق سے نیچے اترے اور نہ باہر نکلے۔ یہ زَقُومٌ یا صَرِيحٌ کا کھانا ہو گا۔ صَرِيحٌ ایک
کانٹے دار بھاڑی ہے جو سخت بدبودار اور زہریلی ہوتی ہے۔

(۲) یعنی یہ عذاب اس دن ہو گا جس دن زمین اور پہاڑ بھونچال سے تہ وبالا ہو جائیں گے اور بڑے بڑے پرہیزگار پرہیزگار
کے ٹیلوں کی طرح بے حیثیت ہو جائیں گے۔ کَثِيبٌ ریت کا ٹیلہ، مَّهِيلًا بھر بھری، پیروں کے نیچے سے نکل جانے والی ریت۔
(۳) جو قیامت والے دن تمہارے اعمال کی گواہی دے گا۔

(۴) اس میں اہل مکہ کو تنبیہ ہے کہ تمہارا حشر بھی وہی ہو سکتا ہے جو فرعون کاموسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی وجہ سے ہوا۔
(۵) شَيْبٌ، اَشْبَابٌ کی جمع ہے، قیامت والے دن، قیامت کی ہولناکی سے فی الواقع بچنے پر بوڑھے ہو جائیں گے یا تمثیل
کے طور پر ایسا کہا گیا ہے۔

حدیث میں بھی آتا ہے کہ قیامت والے دن اللہ آدم علیہ السلام کو کہے گا کہ اپنی اولاد میں سے جنم کے لیے نکال لے۔
حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے، یا اللہ کس طرح؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، ہر ہزار میں سے ۹۹۹۔ اس وقت حمل والی
عورتوں کا حمل گر جائے گا اور نیچے بوڑھے ہو جائیں گے۔ یہ بات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بہت شاق گزری اور ان کے
چہرے فق ہو گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قوم یا جوج و ما جوج میں ۹۹۹ ہوں گے اور تم سے ایک... اللہ کی رحمت سے

لِلسَّمَاءِ مَنْقَطِرِيهِمْ مَكَانَ وَعَدَاهُ مَعْمُولًا ⑤

إِنَّ هَذَا مِنْ ذِكْرِكَ ۖ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ إِلَىٰ رَبِّهِ

سَبِيلًا ⑥

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِنْ ثُلُثِي اللَّيْلِ
وَتَصُغَّهُ وَتُلْتَهُ وَطَائِعَةٌ مِنَ الَّذِينَ مَعَكَ وَاللَّهُ
يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ عَلِمَ أَنْ لَنْ تُحْصُوهُ فَتَابَ
عَلَيْكُمْ فَاقْرُؤُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ عَلَيْهِ أَنْ
سَيَلُونُ مِنْكُمْ مَرْضًى وَالْمَخْرُجُونَ فِي الْأَرْضِ

جس دن آسمان پھٹ جائے گا^(۱) اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہو کر
ہی رہنے والا ہے۔^(۲) (۱۸)

بیشک یہ نصیحت ہے پس جو چاہے اپنے رب کی طرف راہ
اختیار کرے۔ (۱۹)

آپ کا رب بخوبی جانتا ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھ
کے لوگوں کی ایک جماعت قریب دو تہائی رات کے اور
آدھی رات کے اور ایک تہائی رات کے تہجد پڑھتی
ہے^(۳) اور رات دن کا پورا اندازہ اللہ تعالیٰ کو ہی
ہے^(۴) وہ (خوب) جانتا ہے کہ تم اسے ہرگز نہ نبھا
سکو گے^(۵) پس اس نے تم پر مہربانی کی^(۶) لہذا جتنا قرآن

مجھے امید ہے کہ تمام جنتیوں میں سے آدھا تم ہم لوگ ہو گے۔ الحدیث (البخاری تفسیر سورۃ الحج)

(۱) یہ یوم کی دوسری صفت ہے۔ اس دن ہولناکی سے آسمان پھٹ جائے گا۔

(۲) یعنی اللہ تعالیٰ نے جو بعث بعد الموت، حساب کتاب اور جنت و دوزخ کا وعدہ کیا ہوا ہے، یہ یقیناً محالہ ہو کر رہتا ہے۔

(۳) جب سورت کے آغاز میں نصف رات یا اس سے کم یا زیادہ، قیام کا حکم دیا گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے
ساتھ صحابہ کی ایک جماعت رات کو قیام کرتی، کبھی دو تہائی سے کم، کبھی نصف رات اور کبھی ثلث (ایک تہائی حصہ)
جیسا کہ یہاں ذکر ہے۔ لیکن ایک تو رات کا یہ مستقل قیام نہایت گراں تھا۔ دوسرے وقت کا یہ اندازہ نصف رات یا
ثلث یا دو ثلث حصہ قیام کرنا ہے، اس سے بھی زیادہ مشکل تر تھا۔ اس لیے اللہ نے اس آیت میں تخفیف کا حکم نازل فرما
دیا جس کا مطلب بعض کے نزدیک ترک قیام کی اجازت ہے اور بعض کے نزدیک یہ ہے کہ اس کے فرض کو استحباب
میں بدل دیا گیا۔ اب یہ نہ امت کے لیے فرض ہے نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ تخفیف
صرف امت کے لیے ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کا پڑھنا ضروری تھا۔

(۴) یعنی اللہ تعالیٰ تو رات کی گھڑیاں گن سکتا ہے کہ کتنی گزر گئی ہیں اور کتنی باقی ہیں؟ تمہارے لیے یہ اندازہ ناممکن ہے۔

(۵) جب تمہارے لیے رات کے گزرنے کا صحیح اندازہ ممکن ہی نہیں، تو تم مقررہ اوقات تک نماز تہجد میں مشغول بھی
کس طرح رہ سکتے ہو؟

(۶) یعنی اللہ نے قیام اللیل کے حکم کو منسوخ کر دیا اور اب صرف اس کا استحباب باقی رہ گیا ہے۔ اور وہ بھی وقت کی
پابندی کے بغیر۔ نصف شب، یا ثلث شب یا دو ثلث کی پابندی بھی ضروری نہیں۔ اگر تم تھوڑا سا وقت صرف کر کے دو
رکعت بھی پڑھ لو گے تو عند اللہ قیام اللیل کے اجر کے مستحق قرار پاؤ گے۔ تاہم اگر کوئی شخص ۸ رکعت تہجد کا

پڑھنا تمہارے لئے آسان ہوتا ہی پڑھو،^(۱) وہ جانتا ہے کہ تم میں بعض بیمار بھی ہوں گے، بعض دوسرے زمین میں چل پھر کر اللہ تعالیٰ کا فضل (یعنی روزی بھی) تلاش کریں گے^(۲) اور کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد بھی

يَسْتَعْمُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ وَالْآخِرُونَ يُعَارِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَاقْرَأْ وَأَمَّا تَبَسَّرْ مِنْهُ وَأَوْمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاقْرَأُوا اللَّهُ قُرْصًا حَسَنًا وَمَا تَقَدَّمُوا

اہتمام کرے گا جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا، تو یہ زیادہ بہتر ہو گا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام قرار پائے گا۔

(۱) فَاقْرَأْ کا مطلب ہے فَصَلُّوا اور قرآن سے مراد الصَّلَاةَ ہے۔ قیام اللیل میں چوں کہ قیام لمبا ہوتا ہے اور قرآن زیادہ پڑھا جاتا ہے اس لیے نماز تہجد کو ہی قرآن سے تعبیر کر دیا گیا ہے جیسے نماز میں سورہ فاتحہ نہایت ضروری ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حدیث قدسی میں؛ جو سورہ فاتحہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے، سورہ فاتحہ کو نماز سے تعبیر فرمایا ہے، فَسَمِعْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي. الْحَدِيثُ۔ اس لیے ”جتنا قرآن پڑھنا آسان ہو پڑھ لو“ کا مطلب ہے۔ رات کو جتنی نماز پڑھ سکتے ہو، پڑھ لو۔ اس کے لیے نہ وقت کی پابندی ہے اور نہ رکعات کی۔ اس آیت سے بعض لوگ استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنی ضروری نہیں ہے جتنا کسی کے لیے آسان ہو، پڑھ لے، اگر کوئی ایک آیت بھی کہیں سے پڑھ لے گا تو نماز ہو جائے گی۔ لیکن اول تو یہاں قراءت بمعنی نماز ہے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ اس لیے آیت کا تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ نماز میں کتنی قراءت ضروری ہے؟ دوسرے، اگر اس کا تعلق قراءت سے ہی مان لیا جائے، تب بھی یہ استدلال اپنے اندر کوئی قوت نہیں رکھتا۔ کیوں کہ مَا تَبَسَّرْ کی تفسیر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی ہے کہ وہ کم سے کم قراءت؛ جس کے بغیر نماز نہیں ہوگی وہ سورہ فاتحہ ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ ضرور پڑھو جیسا کہ صحیح اور نہایت قوی اور واضح احادیث میں یہ حکم ہے۔ اس تفسیر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہ کہنا کہ نماز میں سورہ فاتحہ ضروری نہیں، بلکہ کوئی سی بھی ایک آیت پڑھ لو، نماز ہو جائے گی۔ بڑی جسارت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے بے اعتنائی کا مظاہرہ ہے۔ نیز ائمہ کے اقوال کے بھی خلاف ہے جو انہوں نے اصول فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس آیت سے ترک فاتحہ خلف الامام پر استدلال جائز نہیں، اس لیے کہ دو آیتیں متعارض ہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص جہری نماز میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھے تو بعض احادیث کی رو سے بعض ائمہ نے اسے جائز کہا ہے اور بعض نے نہ پڑھنے ہی کو ترجیح دی ہے۔ (تفصیل کے لیے فریضت فاتحہ خلف الامام پر

تحریر کردہ کتب ملاحظہ فرمائیں)

(۲) یعنی تجارت اور کاروبار کے لیے سفر کرنا اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں یا ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانا پڑے گا۔

کریں گے،^(۱) سو تم بہ آسانی جتنا قرآن پڑھ سکو پڑھو^(۲) اور نماز کی پابندی رکھو^(۳) اور زکوٰۃ دیتے رہا کرو اور اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دو۔^(۴) اور جو نیکی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں بہتر سے بہتر اور ثواب میں بہت زیادہ پاؤ گے^(۵) اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے رہو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۲۰)

سورۃ مدثر کی ہے اور اس میں چھین آیتیں اور دور کوع ہیں۔



شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اے کپڑا اوڑھنے والے۔^(۱)

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝

(۱) اسی طرح جہاد میں بھی پر مشقت سفر اور مشقیں کرنی پڑتی ہیں۔ اور یہ تینوں چیزیں۔ بیماری، سفر اور جہاد۔ نوبت بہ نوبت ہر ایک کو لاحق ہوتی ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قیام اللیل کے حکم میں تخفیف کر دی ہے۔ کیوں کہ تینوں حالتوں میں یہ نہایت مشکل اور بڑا صبر آزما کام ہے۔

(۲) اسباب تخفیف کے ساتھ تخفیف کا یہ حکم دوبارہ بطور تاکید بیان کر دیا ہے۔

(۳) یعنی پانچ نمازوں کی جو فرض ہیں۔

(۴) یعنی اللہ کی راہ میں حسب ضرورت و توفیق خرچ کرو، اسے قرض حسن سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں سات سو گنا بلکہ اس سے زیادہ تک اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔

(۵) یعنی نفلی نمازیں، صدقات و خیرات اور دیگر نیکیاں جو بھی کرو گے، اللہ کے ہاں ان کا بہترین اجر پاؤ گے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک یہ آیت نمبر ۲۰ مدینہ میں نازل ہوئی ہے، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اس کا نصف حصہ کی اور نصف مدنی ہے۔ (امیر القاسم)

(۶) سب سے پہلے جو وحی نازل ہوئی وہ ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ ہے اس کے بعد وحی میں وقفہ ہو گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سخت مضطرب اور پریشان رہتے۔ ایک روز اچانک پھر وہی فرشتہ، جو عار حرام میں پہلی مرتبہ وحی لے کر آیا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہے، جس سے آپ پر ایک خوف سا طاری ہو گیا اور گھر جا کر گھر والوں سے کہا کہ مجھے کوئی کپڑا اوڑھا دو، مجھے کپڑا اوڑھا دو۔ چنانچہ انہوں نے آپ کے جسم پر ایک کپڑا ڈال دیا، اسی حالت میں یہ وحی نازل ہوئی۔ (صحیح البخاری و مسلم، سورۃ المدثر و کتاب الایمان) اس اعتبار سے

کھڑا ہو جا اور آگاہ کر دے۔ ^(۱) (۲)	فَرَّقَانْدَرٌ ۞
اور اپنے رب ہی کی بڑائیاں بیان کر۔ (۳)	وَرَبِّكَ فَكَبِّرُ ۞
اپنے کپڑوں کو پاک رکھا کر۔ ^(۲) (۳)	وَنِيَابِكَ فَطَهِّرُ ۞
نپاکی کو چھوڑ دے۔ ^(۳) (۵)	وَالرُّجْزَ فَاهْجُرُ ۞
اور احسان کر کے زیادہ لینے کی خواہش نہ کر۔ ^(۳) (۶)	وَلَا تَمُنْ سُنْتَكِبُو ۞
اور اپنے رب کی راہ میں صبر کر۔ (۷)	وَرَبِّكَ فَاصْبِرُ ۞
پس جب کہ صور میں پھونک ماری جائے گی۔ (۸)	فَإِذَا نَفَخَ فِي الْسَاقُورِ ۞
تو وہ دن بڑا سخت دن ہو گا۔ (۹)	فَذَلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيبٌ ۞
(جو) کافروں پر آسان نہ ہو گا۔ ^(۵) (۱۰)	عَلَى الْكَيْفِ مِمَّنْ عَدُوٍّ يُسِيبُ ۞
مجھے اور اسے چھوڑ دے جسے میں نے اکیلا پیدا	ذَرَفِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَجِيدًا ۞
کیا ہے۔ ^(۶) (۱۱)	
اور اسے بہت سال دے رکھا ہے۔ (۱۲)	وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا ۞
اور حاضر باش فرزند بھی۔ ^(۷) (۱۳)	وَبَيْنَيْنِ شُهُودًا ۞

یہ دوسری وحی اور فترت وحی کے بعد پہلی وحی ہے۔

(۱) یعنی اہل مکہ کو ذرا، اگر وہ ایمان نہ لائیں۔

(۲) یعنی قلب و نیت کے ساتھ کپڑے بھی پاک رکھ۔ یہ حکم اس لیے دیا کہ مشرکین مکہ طہارت کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔

(۳) یعنی بتوں کی عبادت چھوڑ دے۔ یہ دراصل لوگوں کو آپ کے ذریعے سے حکم دیا جا رہا ہے۔

(۴) یعنی احسان کر کے یہ خواہش نہ کر کہ بدلے میں اس سے زیادہ ملے گا۔

(۵) یعنی قیامت کا دن کافروں پر بھاری ہو گا، کیوں کہ اس روز کفر کا نتیجہ انہیں بھگتنا ہو گا، جس کا ارتکاب وہ دنیا میں کرتے رہے ہوں گے۔

(۶) یہ کلمہ و وعید و تمہید ہے کہ اسے، جسے میں نے ماں کے پیٹ میں اکیلا پیدا کیا، اس کے پاس مال تھانہ اولاد، اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ یعنی میں خود ہی اس سے نمٹ لوں گا۔ کہتے ہیں کہ یہ ولید بن مغیرہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ کفر و طغیان میں بہت بڑھا ہوا تھا، اس لیے اس کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۷) اسے اللہ نے اولاد ذکر سے نوازا تھا اور وہ ہر وقت اس کے پاس ہی رہتے تھے، گھر میں دولت کی فراوانی تھی، اس لیے بیٹوں کو تجارت و کاروبار کے لیے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ بعض کہتے ہیں، یہ بیٹے سات تھے بعض کے نزدیک

۱۱۳ اور بعض کے نزدیک ۱۱۳ تھے ان میں سے تین مسلمان ہو گئے تھے، خالد ہشام اور ولید بن عبدالمطلب (فتح القدر)

اور میں نے اسے بہت کچھ کشادگی دے رکھی ہے۔^(۱) (۱۳)

پھر بھی اس کی چاہت ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔^(۲) (۱۵)

نہیں نہیں،^(۳) وہ ہماری آیتوں کا مخالف ہے۔^(۴) (۱۶)

عقرب میں اسے ایک سخت چڑھائی چڑھاؤں گا۔^(۵) (۱۷)

اس نے غور کر کے تجویز کی۔^(۶) (۱۸)

اسے ہلاکت ہو کیسی (تجویز) سوچی؟^(۷) (۱۹)

وہ پھر غارت ہو کس طرح اندازہ کیا۔^(۸) (۲۰)

اس نے پھر دیکھا۔^(۹) (۲۱)

پھر تیوری چڑھائی اور منہ بنایا۔^(۱۰) (۲۲)

پھر پیچھے ہٹ گیا اور غرور کیا۔^(۱۱) (۲۳)

اور کہنے لگا یہ تو صرف جاوہ ہے جو نقل کیا جاتا

وَمَهَّدَكَ لَهُ تَبْهِيْدًا ۝۱۳

ثُمَّ يَنْظِمُهُ أَنْزِيْدًا ۝۱۵

كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عِيْدًا ۝۱۶

سَأَرْهِفُهُ صُعُوْدًا ۝۱۷

إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝۱۸

فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۱۹

ثُمَّ قِيلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۲۰

ثُمَّ نَظَرَ ۝۲۱

ثُمَّ عَسَىٰ وَبَسَرَ ۝۲۲

ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝۲۳

فَقَالَ إِنَّ هَذَا إِلَٰهٌ حَرُودٌ ۝۲۴

(۱) یعنی مال و دولت میں ریاست و سرداری میں اور درازی عمر میں۔

(۲) یعنی کفر و معصیت کے باوجود، اس کی خواہش ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔

(۳) یعنی میں اسے زیادہ نہیں دوں گا۔

(۴) یہ کَلَّا کی علت ہے۔ عِنْدًا اس شخص کو کہتے ہیں جو جاننے کے باوجود حق کی مخالفت اور اس کو رد کرے۔

(۵) یعنی ایسے عذاب میں مبتلا کروں گا جس کا برداشت کرنا نہایت سخت ہو گا، بعض کہتے ہیں، جہنم میں آگ کا پہاڑ ہو گا جس پر اس کو چڑھایا جائے گا۔ اِذْهَاتِي کے معنی ہیں۔ انسان پر بھاری چیز لا دینا۔ (فتح القدیر)

(۶) یعنی قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سن کر، اس نے اس امر پر غور کیا کہ میں اس کا کیا جواب دوں؟ اور اپنے جی میں اس نے وہ تیار کیا۔

(۷) یہ اس کے حق میں بد دعائیہ کلمے ہیں، کہ ہلاک ہو، مارا جائے، کیا بات اس نے سوچی ہے؟

(۸) یعنی پھر غور کیا کہ قرآن کا رد کس طرح ممکن ہے۔

(۹) یعنی جواب سوچتے وقت چہرے کی سلوٹیں بدلیں، اور منہ بسورا، جیسا کہ عموماً کسی مشکل بات پر غور کرتے وقت آدمی ایسا ہی کرتا ہے۔

(۱۰) یعنی حق سے اعراض کیا اور ایمان لانے سے تکبر کیا۔

ہے۔^(۱) (۲۳)

سوائے انسانی کلام کے کچھ بھی نہیں۔ (۲۵)

میں عنقریب اسے دوزخ میں ڈالوں گا۔ (۲۶)

اور تجھے کیا خبر کہ دوزخ کیا چیز ہے؟^(۲) (۲۷)

نہ وہ باقی رکھتی ہے نہ چھوڑتی ہے۔ (۲۸)^(۳)

کھال کو جھلسا دیتی ہے۔ (۲۹)

اور اس میں انیس (فرشتے مقرر) ہیں۔^(۴) (۳۰)

ہم نے دوزخ کے داروغے صرف فرشتے رکھے ہیں۔ اور

ہم نے ان کی تعداد صرف کافروں کی آزمائش کے لیے

مقرر کی ہے^(۵) تاکہ اہل کتاب یقین کر لیں،^(۶) اور

اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہو جائے^(۷) اور اہل کتاب

اور اہل ایمان شک نہ کریں اور جن کے دلوں میں بیماری

ہے وہ اور کافر کہیں کہ اس بیان سے اللہ تعالیٰ کی کیا مراد

إِنَّ هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝

سَأُصَلِّيهِ وَسَقَرُ ۝

وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ ۝

لَأَشْبَعِي وَلَا تَذَرُ ۝

لَوْ أَحَاطَ بِالْبَشَرِ ۝

عَلَيْهَا سَعَةً عَشْرَ ۝

وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ الْأَمْلَکَ ۚ وَمَا جَعَلْنَا عِدَّةَ لَهُمْ

إِلَّا قَلِيلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا ۚ لَیَسْتَعِیْنَ ۚ الَّذِينَ أُوتُوا الْکِتَابَ

وَرَزَقُوا مِنَ الدِّینِ ۚ أَمْ نُوَئِلُ بِمَا نُوَئِلُ ۚ لَیْسَ رِئَابَ ۚ الَّذِينَ أُوتُوا

الْکِتَابَ ۚ وَالْمُؤْمِنُونَ ۚ وَلَیَقُولُ الَّذِينَ فِی قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ

وَ الْکُفْرُ ۚ وَنَ مَا آذَانَ ۚ اللَّهُ بِهِ ۚ أَمْ تَلَا ۚ كَذَٰلِكَ یُضِلُّ

(۱) یعنی کسی سے یہ سیکھ آیا اور وہاں سے نقل کر لیا ہے اور دعویٰ کر دیا کہ اللہ کا نازل کردہ ہے۔

(۲) دوزخ کے ناموں یا درجات میں سے ایک کا نام سقر بھی ہے۔

(۳) ان کے جسموں پر گوشت چھوڑے گی نہ ہڈی یا مطلب ہے جنہیوں کو زندہ چھوڑے گی نہ مردہ، لَا یَمُوتُ فِیْهَا

وَلَا یَحْیَیْ

(۴) یعنی جنم پر بطور دربان ۱۹ فرشتے مقرر ہیں۔

(۵) یہ مشرکین قریش کا رد ہے؛ جب جنم کے داروغوں کا اللہ نے ذکر فرمایا تو ابو جہل نے جماعت قریش کو خطاب کرتے

ہوئے کہا کہ کیا تم میں سے ہر دس آدمیوں کا گروپ، ایک ایک فرشتے کے لیے کافی نہیں ہو گا۔ بعض کہتے ہیں کہ کلدہ

نامی شخص نے جسے اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا، کہا، تم سب صرف دو فرشتے سنبھال لینا، ۷۱ فرشتوں کو تو میں اکیلا ہی کافی

ہوں۔ کہتے ہیں اسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کشتی کا بھی کئی مرتبہ چیلنج دیا اور ہر مرتبہ شکست کھائی مگر ایمان

نہیں لایا۔ کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ رکنہ بن عبد یزید کے ساتھ بھی آپ ﷺ نے کشتی لڑی تھی لیکن وہ شکست کھا کر

مسلمان ہو گئے تھے۔ (ابن کثیر) مطلب یہ ہے کہ یہ تعداد بھی ان کے استہزائے آزمائش کا سبب بن گئی۔

(۶) یعنی جان لیں کہ یہ رسول برحق ہے اور اس نے وہی بات کی ہے جو پچھلی کتابوں میں بھی درج ہے۔

(۷) کہ اہل کتاب نے ان کے پیغمبر کی بات کی تصدیق کی ہے۔

ہے؟^(۱) اسی طرح اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔^(۲) تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا،^(۳) یہ توکل بنی آدم کے لیے سراسرپند و نصیحت ہے۔^(۴) (۳۱)
 سچ کہتا ہوں^(۵) قسم ہے چاند کی۔ (۳۲)
 اور رات کی جب وہ پیچھے ہٹے۔ (۳۳)
 اور صبح کی جب کہ روشن ہو جائے۔ (۳۴)
 کہ (یقیناً وہ جنم) بڑی چیزوں میں سے ایک ہے۔^(۶) (۳۵)
 بنی آدم کو ڈرانے والی۔ (۳۶)
 (یعنی) اسے^(۷) جو تم میں سے آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے ہٹنا

اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَى لِلْمُتَذَكِّرِينَ ﴿۳۱﴾

كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾

وَاللَّيْلِ إِذَا دُبِّرَ ﴿۳۳﴾

وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ﴿۳۴﴾

إِنَّمَا الْإِنشَاءُ الْكَبِيرِ ﴿۳۵﴾

نَذِيرٍ لِلنَّبِيِّينَ ﴿۳۶﴾

لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَتَّقَى مَا أَوْتَيْنَاكَ ﴿۳۷﴾

- (۱) بیمار دل والوں سے مراد منافقین ہیں یا پھر وہ ہیں جن کے دلوں میں شکوک تھے کیوں کہ مکے میں منافقین نہیں تھے۔ یعنی یہ پوچھیں گے کہ اس تعداد کو یہاں ذکر کرنے میں اللہ کی کیا حکمت ہے؟
- (۲) یعنی گزشتہ گمراہی کی طرح، جسے چاہتا ہے گمراہ اور جسے چاہتا ہے، راہ یاب کرتا ہے، اس میں جو حکمت بالغہ ہوتی ہے، اسے صرف اللہ ہی جانتا ہے۔
- (۳) یعنی یہ کفار و مشرکین سمجھتے ہیں کہ جنم میں ۱۹ فرشتے ہی تو ہیں، جن پر قابو پانا کون سا مشکل کام ہے؟ لیکن ان کو معلوم نہیں کہ رب کے لشکر تو اتنے ہیں کہ جنہیں اللہ کے سوا کوئی جانتا ہی نہیں۔ صرف فرشتے ہی اتنی تعداد میں ہیں کہ ۷۰ ہزار فرشتے روزانہ اللہ کی عبادت کے لیے بیت المعمور میں داخل ہوتے ہیں، پھر قیامت تک ان کی باری نہیں آئے گی۔ (صحیح البخاری و مسلم)
- (۴) یعنی یہ جنم اور اس پر مقرر فرشتے، انسانوں کی پند و نصیحت کے لیے ہیں کہ شاید وہ نافرمانیوں سے باز آجائیں۔
- (۵) کَلَّا، یہ اہل مکہ کے خیالات کی نفی ہے یعنی جو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم فرشتوں کو مغلوب کر لیں گے ہرگز ایسا نہیں ہو گا۔ قسم ہے چاند کی اور رات کی جب وہ پیچھے ہٹے یعنی جانے لگے۔
- (۶) یہ جواب قسم ہے۔ کُبْرَى، کُبْرَى کی جمع ہے تین نہایت اہم چیزوں کی قسموں کے بعد اللہ نے جنم کی بڑائی اور ہولناکی کو بیان کیا ہے جس سے اس کی بڑائی میں کوئی شک نہیں رہتا۔
- (۷) یعنی یہ جنم ڈرانے والی ہے یا اس نذیر سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا قرآن ہے کیوں کہ قرآن بھی اپنے بیان کردہ وعدہ و وعید کے اعتبار سے انسانوں کے لیے نذیر ہے۔

- چاہے۔^(۱) (۳۷)
- ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے۔^(۲) (۳۸)
- گرد آئیں ہاتھ والے۔^(۳) (۳۹)
- کہ وہ بہشوں میں بیٹھے ہوئے گناہ گاروں سے۔^(۴) (۴۰)
- سوال کرتے ہوں گے۔^(۵) (۴۱)
- تمہیں دوزخ میں کس چیز نے ڈالا۔^(۶) (۴۲)
- وہ جواب دیں گے کہ ہم نمازی نہ تھے۔^(۷) (۴۳)
- نہ مسکینوں کو کھانا کھلاتے تھے۔^(۸) (۴۴)
- اور ہم بحث کرنے والے (انکاریوں) کا ساتھ دے کر
بحث مباحث میں مشغول رہا کرتے تھے۔^(۹) (۴۵)
- اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے۔^(۱۰) (۴۶)
- یہاں تک کہ ہمیں موت آگئی۔^(۱۱) (۴۷)
- پس انہیں سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہ دے
گی۔^(۱۲) (۴۸)
- كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۱﴾
اِلَّا اَصْحَابَ الْيَمِيْنِ ﴿۲﴾
فِي جَنَّاتٍ يَتَسَاءَلُوْنَ ﴿۳﴾
عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴﴾
مَا سَأَلَكُمْ فِيْ سَفَرٍ ﴿۵﴾
قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۶﴾
وَلَمْ نَكُ نَطْعَمُ الْيَسِيْرِيْنَ ﴿۷﴾
وَلَمْ نَخُوضْ مَعَ الْخَائِضِيْنَ ﴿۸﴾
وَلَمْ نَكُ نَكْتَبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۹﴾
حَتّٰى اُنشَاَ الْيَقِيْنَ ﴿۱۰﴾
فَمَا تَفْعَلُوْنَ شِعَاعَةَ الشَّفِيْعِيْنَ ﴿۱۱﴾

(۱) یعنی ایمان و اطاعت میں آگے بڑھنا چاہے یا اس سے پیچھے ہٹنا چاہے۔ مطلب ہے کہ انذار ہر ایک کے لیے ہے جو ایمان لائے یا کفر کرے۔

(۲) رہن گروی رکھنے کو کہتے ہیں۔ یعنی ہر شخص اپنے عمل کا گروی ہے، وہ عمل اسے عذاب سے چھڑالے گا؛ (اگر نیک ہو گا) یا اسے ہلاک کروادے گا۔ (اگر برا ہو گا)

(۳) یعنی وہ اپنے گناہوں کے امیر نہیں ہوں گے، بلکہ اپنے نیک اعمال کی وجہ سے آزاد ہوں گے۔

(۴) فِيْ جَنّٰتٍ، اَصْحَابُ الْيَمِيْنِ سے حال ہے۔ اہل جنت بالا خانوں میں بیٹھے، جہنمیوں سے سوال کریں گے۔

(۵) نماز حقوق اللہ میں سے اور مساکین کو کھانا حقوق العباد میں سے ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم نے اللہ کے حقوق ادا کیے نہ بندوں کے۔

(۶) یعنی کج بحثی اور گمراہی کی حمایت میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔

(۷) یقین کے معنی موت کے ہیں، جیسے دوسرے مقام پر ہے۔ ﴿وَعَبَدْنَا رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَنَّكَ الْيَقِيْنُ﴾ (الحجر ۹۹)

(۸) یعنی جو صفات مذکورہ کا حامل ہو گا، اسے کسی کی شفاعت بھی فائدہ نہیں پہنچائے گی، اس لیے کہ وہ کفر کی وجہ سے محل شفاعت ہی نہیں ہو گا، شفاعت تو صرف ان کے لیے مفید ہو گی جو ایمان کی وجہ سے شفاعت کے قابل ہوں گے۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكَرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿۳۹﴾

انہیں کیا ہو گیا ہے؟ کہ نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں۔ (۳۹)

كَانَهُمْ حُمْرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿۴۰﴾

گویا کہ وہ بد کے ہوئے گدھے ہیں۔ (۴۰)

فَوَيْتٌ مِنَ مَّوَدَّةِ ﴿۴۱﴾

جو شیر سے بھاگے ہوں۔ (۴۱)

بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِنْهُمْ أَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنتَشَرَةً ﴿۴۲﴾

بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے کھلی ہوئی کتابیں دی جائیں۔ (۴۲)

كَلَّا بَلْ لَا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ﴿۴۳﴾

ہرگز ایسا نہیں (ہو سکتا بلکہ) یہ قیامت سے بے خوف ہیں۔ (۴۳)

كَلَّا إِنَّهُ تَذَكُّرٌ ﴿۴۴﴾

جی بات تو یہ ہے کہ یہ (قرآن) ایک نصیحت ہے۔ (۴۴)

فَمَنْ سَاءَ ذَكَرًا ﴿۴۵﴾

اب جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔ (۴۵)

وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ هُوَ أَهْلُ التَّعْوَىٰ

اور وہ اس وقت نصیحت حاصل کریں گے جب اللہ تعالیٰ چاہے، (۴۶) وہ اسی لائق ہے کہ اس سے ڈریں اور اس لائق بھی کہ وہ بخشنے۔ (۴۶)

وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۴۷﴾

اللہ کی طرف سے شفاعت کی اجازت بھی انہی کے لیے ملے گی نہ کہ ہر ایک کے لیے۔

(۱) یعنی یہ حق سے نفرت اور اعراض کرنے میں ایسے ہیں جیسے وحشی، خوف زدہ گدھے، شیر سے بھاگتے ہیں جب وہ ان کا شکار کرنا چاہے۔ فَنَسْوَدَةٌ بمعنی شیر بعض نے تیر انداز معنی بھی کیے ہیں۔

(۲) یعنی ہر ایک کے ہاتھ میں اللہ کی طرف سے ایک ایک کتاب مفتوح نازل ہو جس میں لکھا ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ بغیر عمل کے یہ عذاب سے براءت چاہتے ہیں، یعنی ہر ایک کو پروانہ نجات مل جائے۔ (ابن کثیر)

(۳) یعنی ان کے فساد کی وجہ ان کا آخرت پر عدم ایمان اور اس کی تکذیب ہے جس نے انہیں بے خوف کر دیا ہے۔

(۴) لیکن اس کے لیے جو اس قرآن کے مواعظ و نصائح سے عبرت حاصل کرنا چاہے۔

(۵) یعنی اس قرآن سے ہدایت اور نصیحت اسے ہی حاصل ہوگی جسے اللہ چاہے گا۔ ﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ (التکویر، ۲۹)

(۶) یعنی وہ اللہ ہی اس لائق ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور وہی معاف کرنے کے اختیارات رکھتا ہے۔ اس لیے وہی اس بات کا مستحق ہے کہ اسکی اطاعت کی جائے اور اسکی نافرمانی نہ بچا جائے تاکہ انسان اسکی مغفرت و رحمت کا سزاوار قرار پائے۔

سورۂ قیامت کی ہے اور اس میں چالیس آیتیں اور
دور کوع ہیں۔

سُورَةُ الْقِيَامَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَا اُقْسِمُ بِبُورِ الْقِيَمَةِ ①

وَلَا اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ الْكَوَّامَةِ ②

اَيَسَّبُ الْاِنْسَانُ اَنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهُ ③

بَلْ قَدِ اِرْسَيْنَا عَلٰى اَنْ نُسَوِّىْ بَنَانَهُ ④

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيُعْجَرَ اَمَامَهُ ⑤

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔ (۱)

اور قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو ملامت کرنے
والا ہو۔ (۲)

کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع کریں
گے ہی نہیں۔ (۳)

ہاں ضرور کریں گے ہم تو قادر ہیں کہ اس کی پور پور تک
درست کر دیں۔ (۴)

بلکہ انسان تو چاہتا ہے کہ آگے آگے نافرمانیاں کرتا
جائے۔ (۵)

(۱) لَا اُقْسِمُ میں لازائدہ ہے جو عربی زبان کا ایک اسلوب ہے، جیسے ﴿مَا مَنَعَكَ الْاَلْتَمَعَدُ﴾ (الأعراف ۱۳) اور ﴿اِنَّا كَلِمَاتٌ مِّنْ اَمَلِ الْكِتٰبِ﴾ (الحديد ۲۹) اور دیگر بہت سے مقامات میں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قسم سے پہلے کفار کے کلام کا رد ہے، وہ کہتے تھے مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ لآ کے ذریعے سے کہا گیا، جس طرح تم کہتے ہو، معاملہ اس طرح نہیں ہے میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں، قیامت کے دن کی قسم کھانے سے مقصد اس کی اہمیت و عظمت کو واضح کرنا ہے۔

(۲) یعنی بھلائی پر بھی کرتا ہے کہ زیادہ کیوں نہیں کی۔ اور برائیوں پر بھی، کہ اس سے باز کیوں نہیں آتا؟ دنیا میں بھی جن کے ضمیر بیدار ہوتے ہیں، ان کے نفس انہیں ملامت کرتے ہیں، تاہم آخرت میں تو سب کے ہی نفس ملامت کریں گے۔

(۳) یہ جواب قسم ہے۔ انسان سے مراد یہاں کافر اور لٹھ انسان ہے جو قیامت کو نہیں مانتا۔ اس کا گمان غلط ہے، اللہ تعالیٰ یقیناً انسانوں کے اجزا کو جمع فرمائے گا۔ یہاں ہڈیوں کا بطور خاص ذکر ہے، اس لیے کہ ہڈیاں ہی پیدائش کا اصل ڈھانچہ اور قالب ہیں۔

(۴) بَنَانٌ، ہاتھوں اور پیروں کے ان اطراف (کناروں) کو کہتے ہیں جو جوڑوں، ناخن، لطیف رگوں اور باریک ہڈیوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جب یہ باریک اور لطیف چیزیں ہم بالکل صحیح صحیح جوڑ دیں گے تو بڑے بڑے حصوں کو جوڑ دینا ہمارے لیے کیا مشکل ہو گا؟

(۵) یعنی اس امید پر نافرمانی اور حق کا انکار کرتا ہے کہ کون سی قیامت آتی ہے۔

پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئے گا۔^(۶)
 پس جس وقت کہ نگاہ پتھرا جائے گی۔^(۷)
 اور چاند بے نور ہو جائے گا۔^(۸)
 اور سورج اور چاند جمع کر دیئے جائیں گے۔^(۹)
 اس دن انسان کے گا کہ آج بھاگنے کی جگہ کہاں
 ہے؟^(۱۰)
 نہیں نہیں کوئی پناہ گاہ نہیں۔^(۱۱)
 آج تو تیرے پروردگار کی طرف ہی قرار گاہ ہے۔^(۱۲)
 آج انسان کو اس کے آگے بھیجے ہوئے اور پیچھے
 چھوڑے ہوئے سے آگاہ کیا جائے گا۔^(۱۳)
 بلکہ انسان خود اپنے اوپر آپ حجت ہے۔^(۱۴)
 اگرچہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔^(۱۵)

يَسْأَلُ أَيَّانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۝
 فَإِذَا سِرُّوا الْبَصَرَ ۝
 وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝
 وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝
 يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَعْرُ ۝
 كَلَّا لَا وَزَرَ ۝
 إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَعْرَىٰ ۝
 يُنَبِّئُ الْإِنْسَانَ يَوْمَئِذٍ يَمَآئِذَا مَرَّ وَآخَرَ ۝
 بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝
 وَلَوْ أَلْفَىٰ مَعَادٍ يُرَىٰ ۝

- (۱) یہ سوال اس لیے نہیں کرتا کہ گناہوں سے تائب ہو جائے، بلکہ قیامت کو ناممکن الوقوع سمجھتے ہوئے پوچھتا ہے اسی لیے فسق و فجور سے باز نہیں آتا۔ تاہم اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ قیامت کے آنے کا وقت بیان فرما رہا ہے۔
- (۲) دہشت اور حیرانی سے برق، تَحْيِيرٌ وَأَنْدَهَشَ جیسے موت کے وقت عام طور پر ہوتا ہے۔
- (۳) جب چاند کو گرہن لگتا ہے تو اس وقت بھی وہ بے نور ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ خسف قمر، جو علامات قیامت میں سے ہے، جب ہو گا تو اس کے بعد اس میں روشنی نہیں آئے گی۔
- (۴) یعنی بے نوری میں۔ مطلب ہے کہ چاند کی طرح سورج کی روشنی بھی ختم ہو جائے گی۔
- (۵) یعنی جب یہ واقعات ظہور پذیر ہوں گے تو پھر اللہ سے یا جہنم کے عذاب سے راہ فرار ڈھونڈھے گا، لیکن اس وقت راہ فرار کہاں ہوگی؟
- (۶) وَزَرَ پھاڑنا یا قلعے کو کتے ہیں جہاں انسان پناہ حاصل کر لے۔ وہاں ایسی کوئی پناہ گاہ نہیں ہوگی۔
- (۷) جہاں وہ بندوں کے درمیان فیصلے فرمائے گا۔ یہ ممکن نہیں ہو گا کہ کوئی اللہ کی اس عدالت سے چھپ جائے۔
- (۸) یعنی اس کو اس کے تمام اعمال سے آگاہ کیا جائے گا، قدیم ہو یا جدید، اول ہو یا آخر، چھوٹا ہو یا بڑا۔ ﴿وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا﴾ (الکہف: ۳۹)
- (۹) یعنی اسکے اپنے ہاتھ پاؤں، زبان اور دیگر اعضا گواہی دیں گے، یا یہ مطلب ہے کہ انسان اپنے عیوب خود جانتا ہے۔
- (۱۰) یعنی لڑے جھگڑے، ایک سے ایک تامل کرے، لیکن ایسا کرنا نہ اسکے لیے مفید ہے اور نہ وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتا ہے۔

لَا تُحْرِكُوا بِهِ لِسَانَكَ لِتَتَّعَلَ بِهِ ①

(۱) نبی آپ قرآن کو جلدی (یاد کرنے) کے لیے اپنی زبان کو حرکت (۱) نہ دیں۔ (۱۶)

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ②

اس کا جمع کرنا اور (آپ کی زبان سے) پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔ (۱۷)

فَإِذَا قَرَأْتَهُ فَاعْبُدْهُ ③

ہم جب اسے پڑھ (۳) لیں تو آپ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں۔ (۱۸)

كُلَّمَا نَزَّلْنَا بَيِّنَاتٍ ④

پھر اس کا واضح کر دینا ہمارے ذمہ ہے۔ (۱۹)

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْمُنَاجَلَةَ ⑤

نہیں نہیں تم جلدی ملنے والی (دنیا) کی محبت رکھتے ہو۔ (۲۰)

وَتَذَرُونَ الْأَرْضَ ⑥

اور آخرت کو چھوڑ بیٹھے ہو۔ (۲۱)

وَجُؤا بِيَوْمِ طَاوُوسٍ ⑦

اس روز بہت سے چرے تروتازہ اور بارونق ہوں گے۔ (۲۲)

(۱) حضرت جبرائیل علیہ السلام جب وحی لے کر آتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ساتھ تجلت سے پڑھتے جاتے کہ کہیں کوئی لفظ بھول نہ جائے۔ اللہ نے آپ کو فرشتے کے ساتھ ساتھ اس طرح پڑھنے سے منع فرما دیا۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ القیامۃ) یہ مضمون پہلے بھی گزر چکا ہے۔ ﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ﴾ (سورۃ طہ ۱۱۳) چنانچہ اس حکم کے بعد آپ خاموشی سے سنتے۔

(۲) یعنی آپ کے سینے میں اس کا جمع کر دینا اور آپ کی زبان پر اس کی قراءت کو جاری کر دینا ہماری ذمہ داری ہے، تاکہ اس کا کوئی حصہ آپ کی یادداشت سے نہ نکلے اور آپ کے ذہن سے محو نہ ہو۔

(۳) یعنی فرشتے (جبرائیل علیہ السلام) کے ذریعے سے جب ہم اس کی قراءت آپ پر پوری کر لیں۔

(۴) یعنی اس کے شرائع و احکام لوگوں کو پڑھ کر سنائیں اور ان کا اتباع بھی کریں۔

(۵) یعنی اس کے مشکل مقامات کی تشریح اور حلال و حرام کی توضیح، یہ بھی ہمارے ذمہ ہے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے جملات کی جو تفصیل، مہمات کی توضیح اور اس کے عموماًت کی جو تخصیص بیان فرمائی ہے، جسے حدیث کہا جاتا ہے، یہ بھی اللہ کی طرف سے ہی الامام اور سمجھائی ہوئی باتیں ہیں۔ اس لیے انہیں بھی قرآن کی طرح ماننا ضروری ہے۔

(۶) یعنی یوم قیامت کی تکذیب، مَا أَنْزَلَ اللَّهُ کی مخالفت اور حق سے اعراض، اس لیے ہے کہ تم نے دنیا کی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھ رکھا ہے اور آخرت تمہیں بالکل فراموش ہے۔

اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ ^(۱) (۲۳)	إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾
اور کتنے چہرے اس دن (بدرواقع اور) اداس ہوں گے۔ ^(۲) (۲۴)	وَوَجُوهٌ يُّوْمٍ يَدْبِرُونَ ﴿۲۴﴾
سمجھتے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ دینے والا معاملہ ^(۳) کیا جائے گا۔ (۲۵)	تَقُولُونَ أَن يُعْطَلَ بِهَا فَاقْتُلُوا ﴿۲۵﴾
نہیں نہیں ^(۴) جب روح ہنسی تک ^(۵) پہنچے گی۔ (۲۶)	كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ الْمُرَاةَ ﴿۲۶﴾
اور کہا جائے گا کہ کوئی جھاڑ پھونک ^(۶) کرنے والا ہے۔؟ (۲۷)	وَقِيلَ مَنْ مَّرَاةٍ ﴿۲۷﴾
اور جان لیا اس نے کہ یہ وقت جدائی ہے۔ ^(۷) (۲۸)	وَذُكِّنَ أَنَّهَا الْمُرَاةُ ﴿۲۸﴾
اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی۔ ^(۸) (۲۹)	وَالصَّغَبَاتُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾
آج تیرے پروردگار کی طرف چلنا ہے۔ (۳۰)	إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاكُ ﴿۳۰﴾
اس نے نہ تو تصدیق کی نہ نماز ادا کی۔ ^(۹) (۳۱)	فَلَا صَدَقَ وَلَا وُصِّلَ ﴿۳۱﴾

(۱) یہ اہل ایمان کے چہرے ہوں گے جو اپنے حسن انجام کی وجہ سے مطمئن، مسرور اور منور ہوں گے۔ مزید دیدار الہی سے بھی حظ اندوز ہوں گے۔ جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے اور اہل سنت کا متفقہ عقیدہ ہے۔

(۲) یہ کافروں کے چہرے ہوں گے باسیرۃً متغیر، زرد، غم و حزن سے سیاہ اور بے رونق۔

(۳) اور وہ یہی کہ جنم میں ان کو پھینک دیا جائے گا۔

(۴) یعنی یہ ممکن نہیں کہ کافر قیامت پر ایمان لے آئیں۔

(۵) تَرَافِي، تَرْفُوةٌ کی جمع ہے۔ یہ گردن کے قریب، سینے اور کندھے کے درمیان ایک ہڈی ہے۔ یعنی جب موت کا آہنی پنجہ تمہیں اپنی گرفت میں لے لے گا۔

(۶) یعنی حاضرین میں سے کوئی ہے جو جھاڑ پھونک کے ذریعہ سے تمہیں موت کے پنجے سے چھڑالے۔ بعض نے اس کا ترجمہ یہ بھی کیا ہے کہ اس کی روح کون لے کر چڑھے؟ ملائکہ رحمت یا ملائکہ عذاب؟ اس صورت میں یہ قول فرشتوں کا ہے۔

(۷) یعنی وہ شخص یقین کر لے گا جس کی روح ہنسی تک پہنچ گئی ہے کہ اب، مال، اولاد اور دنیا کی ہر چیز سے جدائی کا مرحلہ آ گیا ہے۔

(۸) اس سے یا تو موت کے وقت پنڈلی کا پنڈلی کے ساتھ مل جانا مراد ہے، یا پے در پے تکلیفیں۔ جمہور مفسرین نے دوسرے معنی کئے ہیں۔ (فتح القدر)

(۹) یعنی اس انسان نے رسول اور قرآن کی تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی یعنی اللہ کی عبادت نہیں کی۔

بلکہ جھٹلایا اور روگردانی کی۔^(۱) (۳۲)
 پھر اپنے گھروالوں کے پاس اتراتا ہوا گیا۔^(۲) (۳۳)
 افسوس ہے تجھ پر حسرت ہے تجھ پر۔^(۳) (۳۴)
 وائے ہے اور خرابی ہے تیرے لیے۔^(۴) (۳۵)
 کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے بیکار چھوڑ دیا
 جائے گا۔^(۵) (۳۶)
 کیا وہ ایک گاڑھے پانی کا قطرہ نہ تھا جو ٹپکایا گیا تھا؟ (۳۷)
 پھر وہ لبو کا لو تھڑا ہو گیا پھر اللہ نے اسے پیدا کیا اور
 درست بنا دیا۔^(۵) (۳۸)
 پھر اس سے جوڑے یعنی نروادہ بنائے۔ (۳۹)
 کیا (اللہ تعالیٰ) اس (امر) پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ
 کر دے۔^(۶) (۴۰)

سورۃ دہر مدنی ہے اور اس میں آیتیں آتیں اور
 دور کوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
 نہایت رحم والا ہے۔

وَلَا يَكُنْ كَذَّابًا وَتَوَلَّى ۞
 ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَمْتَلِئُ ۞
 أَوَّلَىٰ لَكَ فَأُولَىٰ ۞
 ثُمَّ أَوَّلَىٰ لَكَ فَأُولَىٰ ۞
 أَيْحَسِبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى ۞
 أَلَمْ يَكُنْ نَظْفَةً مِّنْ مَّيْمَتِي يُمْنِي ۞
 ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ فَعَلَقٍ فَسَوَىٰ ۞

فَجَعَلَ مِنْهُ التُّرُجْبِينَ الذِّكْرَ وَالْأُنْثَىٰ ۞
 أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَدِيرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۞



سُورَةُ الْأَنْشَاكِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

(۱) یعنی رسول کو جھٹلایا اور ایمان و اطاعت سے روگردانی کی۔

(۲) 'يَمْتَلِئُ' اتراتا اور اکڑتا ہوا۔

(۳) یہ کلمہ وعید ہے کہ اس کی اصل ہے اَوْلَاكَ اللَّهُ مَا نَكَرَهُمُ اللَّهُ تَجِبْہِ ایسی چیز سے دوچار کرے جسے تو ناپسند کرے۔

(۴) یعنی اس کو کسی چیز کا حکم دیا جائے گا، نہ کسی چیز سے منع کیا جائے گا، نہ اس کا محاسبہ ہو گا نہ معاقدہ۔ یا اس کو قبر میں
 ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا جائے گا وہاں سے اسے دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا۔

(۵) فَسَوَّىٰ یعنی اسے ٹھیک ٹھاک کیا اور اس کی تکمیل کی اور اس میں روح پھونکی۔

(۶) یعنی جو اللہ انسان کو اس طرح مختلف اطوار سے گزار کر پیدا فرماتا ہے کیا مرنے کے بعد دوبارہ اسے زندہ کرنے پر
 قادر نہیں ہے؟

☆ اس کے مدنی اور کئی ہونے میں اختلاف ہے۔ جمہور اسے مدنی قرار دیتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آخری دس آیات

هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مِّنْ كُورٍ ۝
 إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاقٍ نَّبْتَلِيهِ كَيْفَ نَعْمَدُهُ
 سَمِيعًا أَعْبِيدًا ۝
 إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۝
 إِنَّا عَمَدْنَا لِلْكَفَرِ بَيْنَ سَلْسَلَاوَأَعْلَاوَسَعِيرًا ۝

یقیناً گزرا ہے انسان پر ایک وقت زمانے میں ^(۱) جب کہ
 یہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ (۱)
 بیشک ہم نے انسان کو طے جلے لطف سے امتحان کے لیے ^(۲)
 پیدا کیا اور اس کو سنتا دیکھتا بنایا۔ ^(۳) (۲)
 ہم نے اسے راہ دکھائی اب خواہ وہ شکر گزار بنے خواہ
 ناشکرا۔ ^(۳) (۳)
 یقیناً ہم نے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور شعلوں

مکی ہیں، باقی سب مدنی۔ (فتح القدیر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعے کے دن فجر کی نماز میں اَلَمْ تَنْزِلُ السَّجْدَةَ اور سورہ دہر پڑھا کرتے تھے۔ (صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب ما یقرأ فی یوم الجمعة) اس سورت کو سورۃ الانسان بھی کہا جاتا ہے۔

(۱) هَلْ بِمعنی قَدْ ہے جیسا کہ ترجمے سے واضح ہے۔ الْإِنْسَانُ سے مراد، بعض کے نزدیک ابوالبشر یعنی انسان اول حضرت آدم ہیں اور حِينٌ (ایک وقت) سے مراد، روح پھونکے جانے سے پہلے کا زمانہ ہے، جو چالیس سال ہے۔ اور اکثر مفسرین کے نزدیک الانسان کا لفظ بطور جنس کے استعمال ہوا ہے اور حِينٌ سے مراد حمل یعنی رحم مادر کی مدت ہے۔ جس میں وہ قابل ذکر چیز نہیں ہوتا۔ اس میں گویا انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ ایک پیکر حسن و جمال کی صورت میں جب باہر آتا ہے تو رب کے سامنے اکڑتا اور اترتا ہے، اسے اپنی حیثیت یاد رکھنی چاہیے کہ میں تو وہی ہوں جب میں عالم نیست میں تھا تو مجھے کون جانتا تھا؟

(۲) طے جلے کا مطلب، مرد اور عورت دونوں کے پانی کا ملنا اور پھر ان کا مختلف اطوار سے گزرتا ہے۔ پیدا کرنے کا مقصد، انسان کی آزمائش ہے ﴿لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملک: ۳)
 (۳) یعنی اسے سماعت اور بصارت کی قوتیں عطا کیں، تاکہ وہ سب کچھ دیکھ اور سن سکے اور اس کے بعد اطاعت یا معصیت دونوں راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکے۔

(۴) یعنی مذکورہ قوتوں اور صلاحیتوں کے علاوہ ہم نے خود بھی انبیاء علیہم السلام، اپنی کتابوں اور داعیان حق کے ذریعے سے صحیح راستے کو بیان اور واضح کر دیا ہے۔ اب یہ اس کی مرضی ہے کہ اطاعت الہی کا راستہ اختیار کر کے شکر گزار بندہ بن جائے یا معصیت کا راستہ اختیار کر کے اس کا ناشکرا بن جائے۔ جیسے ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، كُلُّ النَّاسِ يَغْدُو فَبَايَعُ نَفْسَهُ فَمُؤَبِّقُهَا أَوْ مُنْتَفِقُهَا (صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب فضل الوضوء) ”ہر شخص اپنے نفس کی خرید و فروخت کرتا ہے، پس اسے ہلاک کر دیتا ہے یا اسے آزاد کر لیتا ہے“ یعنی اپنے عمل و کسب کے ذریعے سے ہلاک یا آزاد کرتا ہے، اگر شرمکمانے گا تو اپنے نفس کو ہلاک اور خیر کمانے گا تو نفس کو آزاد کرالے گا۔

- والی آگ تیار کر رکھی ہے۔^(۱) (۳)
- بیشک نیک لوگ وہ جام نہیں گے جس کی آمیزش کافور کی ہے۔^(۲) (۵)
- جو ایک چشمہ ہے۔^(۳) جس سے اللہ کے بندے پئیں گے اس کی نمریں نکال لے جائیں گے^(۴) (جدھر چاہیں)۔ (۶)
- جو نذر پوری کرتے ہیں^(۵) اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی برائی چاروں طرف پھیل جانے والی ہے۔^(۶) (۷)
- اور اللہ تعالیٰ کی محبت^(۷) میں کھانا کھلاتے ہیں مسکین، یتیم اور قیدیوں کو۔ (۸)
- ہم تو تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے
- إِنَّ الْأَبْرَادَ يَتَسَوَّوْنَ مِنَ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ۝
عَيْنَا يَتَرَّبُّ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُعَجَّرُونَهَا تَفْجِيرًا ۝
يُؤْتُونَ بِالنَّارِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطَرًّا ۝
وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝
إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لِئَلَّا تُرِيدُوا مِنْكُمْ جَزَاءً وَتَشْكُرُوا ۝

(۱) یہ اللہ کی دی ہوئی آزادی کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے۔

(۲) اشقیاء کے مقابلے میں یہ سعدا کا ذکر ہے، کانس اس جام کو کہتے ہیں جو بھرا ہوا ہو اور پھلک رہا ہو۔ کافور ٹھنڈی اور ایک مخصوص خوشبو کی حامل ہوتی ہے، اس کی آمیزش سے شراب کا ذائقہ دو آتشہ اور اس کی خوشبو مشام جان کو معطر کرنے والی ہو جائے گی۔

(۳) یعنی یہ کافور ملی شراب، دو چار صراحیوں یا منکوں میں نہیں ہوگی، بلکہ اس کا چشمہ ہوگا، یعنی یہ ختم ہونے والی نہیں ہوگی۔ (۴) یعنی اس کو جدھر چاہیں گے، موڑ لیں گے، اپنے محلات و منازل میں، اپنی مجلسوں اور بینکوں میں اور باہر میدانوں اور تفریح گاہوں میں۔

(۵) یعنی صرف ایک اللہ کی عبادت و اطاعت کرتے ہیں، نذر بھی مانتے ہیں تو صرف اللہ کے لیے، اور پھر اسے پورا کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نذر کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ بشرطیکہ معصیت کی نہ ہو۔ چنانچہ حدیث میں ہے ”جس شخص نے نذر مانی کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے گا تو وہ اسکی اطاعت کرے اور جس نے معصیت الہی کی نذر مانی ہے تو وہ اللہ کی نافرمانی نہ کرے“ یعنی اسے پورا نہ کرے۔ (صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب النذر فی الطاعة)

(۶) یعنی اس دن سے ڈرتے ہوئے محرمات اور معصیات کا ارتکاب نہیں کرتے۔ برائی پھیل جانے کا مطلب ہے کہ اس روز اللہ کی گرفت سے صرف وہی بچے گا جسے اللہ اپنے دامن عفو و رحمت میں ڈھانک لے گا۔ باقی سب اس کے شرکی لپیٹ میں ہوں گے۔

(۷) یا طعام کی محبت کے باوجود وہ اللہ کی رضا کے لیے ضرورت مندوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ قیدی اگر غیر مسلم ہو، تب بھی اس کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید ہے، جیسے جنگ بدر کے کافر قیدیوں کی بابت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو

کھلاتے ہیں نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں نہ شکرگزاری۔ (۹)
پیشک ہم اپنے پروردگار سے اس دن کا خوف کرتے
ہیں^(۱) جو اداسی اور سختی والا ہو گا۔ (۱۰)

پس انہیں اللہ تعالیٰ نے اس دن کی برائی سے بچالیا^(۲)
اور انہیں تازگی اور خوشی پہنچائی۔^(۳) (۱۱)

اور انہیں ان کے صبر^(۴) کے بدلے جنت اور ریشمی
لباس عطا فرمائے۔ (۱۲)

یہ وہاں تختوں پر تکیے لگائے ہوئے بیٹھیں گے۔ نہ وہاں
آفتاب کی گرمی دیکھیں گے نہ جاڑے کی سختی۔^(۵) (۱۳)
ان جنتوں کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے^(۶)

إِنَّا نَخَافُ مِنْ رَبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيًّا ⑩

قَوْمُهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّهْمُ نَصْرَةً وَسُرُورًا ⑪

وَجَزَاءُ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَجَرِيْرًا ⑫

ثُمَّ كَيْفَ يَنْفَعُهَا عَلَى الْأَرْبَابِكُمْ لَا يَرُونَ فِيهَا سُمًّْا وَلَا
ذَمًّا مَهْرِيْرًا ⑬

وَدَائِبُهُمْ عَلَيْهِمْ ظِلَالٌ هَادٍ لِّلْكَلْبِ قَطْرٌ مِّمَّا تَرَائِبُهَا ⑭

حکم دیا کہ ان کی تکریم کرو۔ چنانچہ صحابہ پہلے ان کو کھانا کھلاتے، خود بعد میں کھاتے۔ (ابن کثیر) اسی طرح غلام اور نوکر چاکر
بھی اسی ذیل میں آتے ہیں جن کے ساتھ حسن سلوک کی ناکید ہے۔ آپ ﷺ کی آخری وصیت یہی تھی کہ ”نماز اور
اپنے غلاموں کا خیال رکھنا۔ ابن ماجہ، کتاب الوصایا، باب هل أوصى رسول الله صلى الله عليه وسلم،

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قَمْطَرِيْرٌ کے معنی طویل کے کئے ہیں، عَبُوسٌ، سخت۔ یعنی وہ دن نہایت سخت
ہو گا اور تختیوں اور ہولناکیوں کی وجہ سے کافروں پر بڑا لمبا ہو گا۔ (ابن کثیر)

(۲) جیسا کہ وہ اس کے شر سے ڈرتے تھے اور اس سے بچنے کے لیے اللہ کی اطاعت کرتے تھے۔

(۳) تازگی چروں پر ہوگی اور خوشی دلوں میں۔ جب انسان کا دل مسرت سے لبریز ہوتا ہے تو اس کا چہرہ بھی مسرت سے
گنکار ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے کہ جب آپ ﷺ خوش ہوتے تو آپ کا چہرہ مبارک
اس طرح روشن ہو تا گویا چاند کا ٹکڑا ہے۔“ (البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة تبوك، مسلم، کتاب التوبة،
باب حدیث توبة كعب بن مالك،

(۴) صبر کا مطلب ہے دین کی راہ میں جو تکلیفیں آئیں انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرنا، اللہ کی اطاعت میں نفس کی
خواہشات اور لذات کو قربان کرنا اور معصیتوں سے اجتناب کرنا۔

(۵) ذَمْمَهْرِيْرٌ، سخت جاڑے کو کہتے ہیں۔ مطلب ہے کہ وہاں ہمیشہ ایک ہی موسم رہے گا، اور وہ ہے موسم بہار، نہ سخت
گرمی اور نہ کڑا کے کی سردی۔

(۶) گو وہاں سورج کی حرارت نہیں ہوگی، اس کے باوجود درختوں کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے یا یہ مطلب ہے
کہ ان کی شانیں ان کے قریب ہوں گی۔

اور ان کے (میوے اور) گچھے نیچے لٹکائے ہوئے ہوں گے۔^(۱۳)

اور ان پر چاندی کے برتنوں اور ان جاموں کا دور کرایا جائے گا^(۱۴) جو شیشے کے ہوں گے۔^(۱۵)

شیشے بھی چاندی^(۱۶) کے جن کو (ساتی نے) اندازے سے ناپ رکھا ہو گا۔^(۱۷)

اور انہیں وہاں وہ جام پلائے جائیں گے جن کی آمیزش زنجبیل کی ہو گی۔^(۱۸)

جنت کی ایک نہر سے جس کا نام سلسبیل ہے۔^(۱۹)

اور ان کے ارد گرد گھومتے پھرتے ہوں گے وہ کم سن بچے جو ہمیشہ رہنے والے ہیں^(۲۰) جب تو انہیں دیکھے تو سمجھے

وَيَطَافُ عَلَيْهِمْ بِآيَاتِهِمْ مِنْ فضةٍ وَالْكَوَابِ كَأَنَّهُمْ قَوَارِيرٌ ﴿۱۳﴾

قَوَارِيرٌ أَمِْنْ فضةٍ تَدْرُدُّهَا تَعْدِبِرًا ﴿۱۴﴾

وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا ﴿۱۵﴾

عَيْنًا فِيهَا تُسْقَى سَلْسَبِيلًا ﴿۱۶﴾

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُغْتَلَبُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ

حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَدْنُورًا ﴿۱۷﴾

(۱) یعنی درختوں کے پھل، گوش بر آواز فرماں بردار کی طرح، انسان کا جب کھانے کو جی چاہے گا تو وہ جھک کر اتنے قریب ہو جائیں گے کہ بیٹھے، لیٹے بھی انہیں توڑ لے۔ (ابن کثیر)

(۲) یعنی خادم انہیں لے کر جنتیوں کے درمیان پھریں گے۔

(۳) یعنی یہ برتن اور آب خورے چاندی اور شیشے سے بنے ہوں گے۔ نہایت نفیس اور نازک۔ گویا یہ صنعت ایسی ہے کہ جس کی کوئی نظیر دنیا میں نہیں ہے۔

(۴) یعنی ان میں شراب ایسے اندازے سے ڈالی گئی ہو گی کہ جس سے وہ سیراب بھی ہو جائیں، تنگی محسوس نہ کریں۔ اور برتنوں اور جاموں میں بھی زائد نہ بچی رہے۔ مہمان نوازی کے اس طریقے میں بھی مہمانوں کی عزت افزائی ہی کا اہتمام ہے۔

(۵) زَنْجَبِيلٌ (سونٹھ، خشک ادراک) کو کہتے ہیں۔ یہ گرم ہوتی ہے۔ اس کی آمیزش سے ایک خوشگوار تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں عربوں کی یہ مرغوب چیز ہے۔ چنانچہ ان کے قہوہ میں بھی زنجبیل شامل ہوتی ہے۔ مطلب ہے کہ جنت میں ایک وہ شراب ہو گی جو ٹھنڈی ہو گی جس میں کافور کی آمیزش ہو گی اور دوسری شراب گرم، جس میں زنجبیل کی ملاوٹ ہو گی۔

(۶) یعنی اس شراب زنجبیل کی بھی نہر ہو گی جسے سلسبیل کہا جاتا ہے۔

(۷) شراب کے اوصاف بیان کرنے کے بعد، ساتیوں کا وصف بیان کیا جا رہا ہے ”ہمیشہ رہیں گے“ کا ایک مطلب تو یہ ہے جنتیوں کی طرح ان خادموں کو بھی موت نہیں آئے گی۔ دوسرا، یہ کہ ان کا بچپن اور ان کی رعنائی ہمیشہ برقرار رہے گی۔ وہ نہ بوڑھے ہوں گے نہ ان کا حسن و جمال متغیر ہو گا۔

وَإِذَا رَأَيْتَ كُفْرًا يَتَّبِعُهُ فَإِذَا رَأَيْتَ كُفْرًا يَتَّبِعُهُ فَإِذَا رَأَيْتَ كُفْرًا يَتَّبِعُهُ ①

عَلَيْهِمْ شِيَابٌ سُنْدُسٌ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ وَحُلُوفٌ أُصْوَدٌ

مِنْ قَصَبٍ وَسَفْهُمٌ رُحْمٌ يُرَبُّونَهُمْ وَيُرَبُّونَهُمْ وَيُرَبُّونَهُمْ ②

إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيَكُمْ مَشْكُورًا ③

إِنَّا نَحْنُ نُزَلِّلُ مَا حَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا ④

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا يُطْعِمُنَّكَ اللَّهُ لَدُنْكَ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ كَفُورًا ⑤

کہ وہ بکھرے ہوئے سچے موتی ہیں۔^(۱) (۱۹)
تو وہاں جہاں کہیں بھی نظر ڈالے گا^(۲) سراسر نعمتیں اور

عظیم الشان سلطنت ہی دیکھے گا۔ (۲۰)

ان کے جسموں پر سبز باریک اور موٹے ریشمی کپڑے
ہوں گے^(۳) اور انہیں چاندی کے نگن کا زیور پہنایا
جائے گا۔^(۴) اور انہیں ان کا رب پاک صاف شراب

پلائے گا۔ (۲۱)

(کہا جائے گا کہ یہ ہے تمہارے اعمال کا بدلہ اور تمہاری
کوشش کی قدر کی گئی۔ (۲۲)

بیشک ہم نے تجھ پر بتدریج قرآن نازل کیا ہے۔^(۵) (۲۳)

پس تو اپنے رب کے حکم پر قائم رہ^(۶) اور ان میں سے
کسی گنہگار یا ناشکرے کا کمانہ مان۔^(۷) (۲۴)

(۱) حسن و صفائی اور تازگی و شادابی میں وہ موتیوں کی طرح ہوں گے ”بکھرے ہوئے“ کا مطلب ’خدمت کے لیے ہر
طرف پھیلے ہوئے اور نہایت تیزی سے مصروف خدمت ہوں گے۔

(۲) ہم طرف مکان ہے وَإِذَا رَأَيْتَ نَمَّ، أَي: هُنَاكَ یعنی وہاں جنت میں جہاں کہیں بھی دیکھو گے۔

(۳) سُنْدُسٌ ’باریک ریشمی لباس اور اِسْتَبْرَقٌ ’موٹا ریشم۔

(۴) جیسے ایک زمانے میں بادشاہ ’سردار اور ممتاز قسم کے لوگ پہنا کرتے تھے۔

(۵) یعنی ایک ہی مرتبہ نازل کرنے کے بجائے حسب ضرورت و اقتضا مختلف اوقات میں نازل کیا۔ اس کا دوسرا مطلب
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ قرآن ہم نے نازل کیا ہے، یہ تیرا اپنا گھڑا ہوا نہیں ہے، جیسا کہ مشرکین دعویٰ کرتے ہیں۔

(۶) یعنی اس کے فیصلے کا انتظار کر۔ وہ تیری مدد میں کچھ تاخیر کر رہا ہے تو اس میں اس کی حکمت ہے۔ اس لیے صبر اور
حوصلے کی ضرورت ہے۔

(۷) یعنی اگر یہ تجھے اللہ کے نازل کردہ احکام سے روکیں تو ان کا کمانہ مان، بلکہ تبلیغ و دعوت کا کام جاری رکھ اور اللہ پر
بھروسہ رکھ، وہ لوگوں سے تیری حفاظت فرمائے گا، فاجر، جو افعال میں اللہ کی نافرمانی کرنے والا ہو اور کفور جو دل سے کفر

کرنے والا ہو یا کفر میں حد سے بڑھ جانے والا ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد ولید بن مغیرہ ہے جس نے نبی صلی اللہ
علیہ وسلم سے کہا تھا کہ اس کام سے باز آجا، ہم تجھے تیرے کہنے کے مطابق دولت میاں کر دیتے ہیں اور عرب کی جس

عورت سے تو شادی کرنا چاہے، ہم تیری شادی کر دیتے ہیں۔ (فتح القدیر)

وَأَذْكُرُ اسْمَ رَبِّكَ بَلُورَةً وَأَصِيلًا ①

وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ②

إِنَّ هَؤُلَاءِ يُجِبُّونَ الْعَاقِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ
بَوْمًا مَبِينًا ③

عَنْ خَلْقِهِمْ وَشَدَّ دَنَا سَرَّهُمْ وَإِذَا شِئْنَا بَدَلْنَا
أَمْنًا لَهُمْ تَبْدِيلًا ④

إِنَّ هَذَا بِرَبِّكَ كَوْنٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ⑤

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا

اور اپنے رب کے نام کا صبح و شام ذکر کیا کر۔ (۲۵) (۱)

اور رات کے وقت اس کے سامنے سجدے کر اور بہت
رات تک اس کی تسبیح کیا کر۔ (۲۶) (۲)

بیشک یہ لوگ جلدی ملنے والی (دنیا) کو چاہتے ہیں (۳)
اور اپنے پیچھے ایک بڑے بھاری دن کو چھوڑے
دیتے ہیں۔ (۲۷) (۳)

ہم نے انہیں پیدا کیا اور ہم نے ہی ان کے جوڑ اور
بندھن مضبوط کیے (۵) اور ہم جب چاہیں ان کے عوض
ان جیسے اوروں کو بدل لائیں۔ (۲۸) (۴)

یقیناً یہ تو ایک نصیحت ہے پس جو چاہے اپنے رب کی راہ
لے لے۔ (۲۹) (۵)

اور تم نہ چاہو گے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی چاہے (۸) بیشک

(۱) صبح و شام سے مراد ہے، تمام اوقات میں اللہ کا ذکر کر۔ یا صبح سے مراد فجر کی نماز اور شام سے عصر کی نماز ہے۔

(۲) رات کو سجدہ کر، سے مراد بعض نے مغرب و عشا کی نمازیں مراد لی ہیں۔ اور تسبیح کا مطلب، جو باتیں اللہ کے لائق نہیں
ہیں، ان سے اسکی یاد پڑ کر بیان کر، بعض کے نزدیک اس سے رات کی نفلی نماز، یعنی تہجد ہے امر مذہب و استحباب کے لیے ہے۔

(۳) یعنی یہ کفار مکہ اور ان جیسے دوسرے لوگ دنیا کی محبت میں گرفتار ہیں اور ساری توجہ اسی پر ہے۔

(۴) یعنی قیامت کو، اس کی شدتوں اور ہولناکیوں کی وجہ سے اسے بھاری دن کہا اور چھوڑنے کا مطلب ہے کہ اس کے
لیے تیاری نہیں کرتے اور اس کی پروا نہیں کرتے۔

(۵) یعنی ان کی پیدائش کو مضبوط بنایا، یا ان کے جوڑوں کو، رگوں اور پٹھوں کے ذریعے سے، ایک دوسرے کے ساتھ ملا
دیا ہے، بلفظ دیگر: ان کا مانجھا کڑا کیا۔

(۶) یعنی ان کو ہلاک کر کے ان کی جگہ کسی اور قوم کو پیدا کر دیں یا اس سے مطلب قیامت کے دن دوبارہ پیدائش ہے۔

(۷) یعنی اس قرآن سے ہدایت حاصل کرے۔

(۸) یعنی تم میں سے کوئی اس بات پر قادر نہیں ہے کہ وہ اپنے کو ہدایت کی راہ پر لگالے، اپنے لیے کسی نفع کو جاری کر
لے، ہاں اگر اللہ چاہے تو ایسا ممکن ہے، اس کی مشیت کے بغیر تم کچھ نہیں کر سکتے۔ البتہ صحیح قصد و نیت پر وہ اجر ضرور
عطا فرماتا ہے إِنَّمَّا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوَىٰ "اعمال کا دار و مدار، نیتوں پر ہے، ہر آدمی کے لیے وہ
ہے جس کی وہ نیت کرے۔"

حَكِيمًا ۞

يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ وَالظَّالِمِينَ اَعْدَاءَ لَهُمْ
عَذَابًا أَلِيمًا ۞

اللہ تعالیٰ علم والا با حکمت ہے۔ (۱) (۳۰)

جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کر لے، اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (۲) (۳۱)

سورہ مرسلات مکی ہے اور اس میں پچاس آیتیں اور
دو رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۞

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا ۞

دل خوش کن چلتی ہواؤں کی قسم۔ (۱) (۳)

فَالْعَصْفِ عَصْفًا ۞

پھر زور سے جھونکا دینے والیوں کی قسم۔ (۲) (۴)

وَالنُّشُورِ نَشْرًا ۞

پھر (ابر کو) ابھار کر پراگندہ کرنے والیوں کی قسم۔ (۳) (۵)

(۱) چون کہ وہ علیم و حکیم ہے اس لیے اس کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے، بنا بریں ہدایت اور گمراہی کے فیصلے بھی یوں ہی الٹ پٹ نہیں ہو جاتے، بلکہ جس کو ہدایت دی جاتی ہے وہ واقعی اس کا مستحق ہوتا ہے اور جس کے حصے میں گمراہی آتی ہے، وہ حقیقتاً اسی لائق ہوتا ہے۔

(۲) وَالظَّالِمِينَ اس لیے منصوب ہے کہ اس سے پہلے یُعَذِّبُ، محذوف ہے۔

☆ - یہ سورت مکی ہے جیسا کہ صحیحین میں مروی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم منیٰ کے ایک غار میں تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورہ مرسلات کا نزول ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تلاوت فرما رہے تھے اور میں اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کر رہا تھا کہ اچانک ایک سانپ آگیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اسے مار دو، لیکن وہ تیزی سے غائب ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”تم اس کے شر سے اور وہ تمہارے شر سے بچ گیا“۔ (بخاری، تفسیر سورہ المرسلات۔ مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرہا) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دفعہ مغرب کی نماز میں بھی یہ سورت پڑھی ہے۔ (بخاری، کتاب الأذان، باب القراءة فی المغرب۔ مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب القراءة فی الصبح)

(۳) اس مفہوم کے اعتبار سے عرفا کے معنی پے در پے ہوں گے۔ بعض نے مُرْسَلَات سے فرشتے یا انبیاء مراد لیے ہیں۔ اس صورت میں عرفا کے معنی وحی الہی، یا احکام شریعت ہوں گے۔ یہ مفعول لہ ہو گا لِأَجْلِ الْعُرْفِ بِالنُّشُورِ بِتَنْزِعِ الْخَافِضِ - بِالْعُرْفِ

(۴) یا فرشتے مراد ہیں، جو بعض دفعہ ہواؤں کے عذاب کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں۔

(۵) یا ان فرشتوں کی قسم، جو بادلوں کو منتشر کرتے ہیں یا فضائے آسمانی میں اپنے پر پھیلاتے ہیں۔ تاہم امام ابن کثیر اور امام طبری نے ان تینوں سے ہوائیں مراد لینے کو راجح قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ترجمے میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

پھر حق و باطل کو جدا جدا کر دینے والے۔ ^(۱) (۳)	فَالْقَارِعَاتِ قَرَعًا ۝
اور وحی لانے والے فرشتوں کی قسم۔ ^(۲) (۵)	فَالْمَلٰٓئِكٰتِ ذِكْرًا ۝
جو (وحی) الزام اتارنے یا آگاہ کر دینے کے لیے ہوتی ہے۔ ^(۳) (۶)	عُدُوًا وَّ نَذْرًا ۝
جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے ہو یقیناً ہونے والی ہے۔ ^(۴) (۷)	اٰتِمًا وَّ وَعْدًا لَّوٰاۡقِعًا ۝
پس جب ستارے بے نور کر دیئے جائیں گے۔ ^(۵) (۸)	فَاِذَا الشُّجُوْرُ مُطْبَسٰتٌ ۝
اور جب آسمان توڑ پھوڑ دیا جائے گا۔ ^(۶) (۹)	وَ اِذَا السَّمَآءُ كُوْرِبٰتٌ ۝
اور جب پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے کر کے اڑا دیئے جائیں گے۔ ^(۷) (۱۰)	وَ اِذَا الْجِبَالُ سُفُفٰتٌ ۝
اور جب رسولوں کو وقت مقررہ پر لایا جائے گا۔ ^(۸) (۱۱)	وَ اِذَا الرُّسُلُ اُنۡتَدِتْ ۝
کس دن کے لیے (ان سب کو) مؤخر کیا گیا ہے؟ ^(۹) (۱۲)	لَاۡتٰی يَوْمًا وَّ اُجِدَتْ ۝

- (۱) یعنی ان فرشتوں کی قسم جو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والے احکام لے کر اترتے ہیں۔ یا مراد آیات قرآنیہ ہیں، جن سے حق و باطل اور حلال و حرام کی تمیز ہوتی ہے۔ یا رسول مراد ہیں جو وحی الہی کے ذریعے سے حق و باطل کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہیں۔
- (۲) جو اللہ کا کلام پیغمبروں کو پہنچاتے ہیں یا رسول مراد ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل کردہ وحی اپنی امتوں کو پہنچاتے ہیں۔
- (۳) دونوں مفعول لہ ہیں لِأَجْلِ الْاِعۡذَارِ وَالْاِنۡذَارِ یعنی فرشتے وحی لے کر آتے ہیں تاکہ لوگوں پر حجت قائم ہو جائے اور یہ عذر باقی نہ رہے کہ ہمارے پاس تو کوئی اللہ کا پیغام ہی لے کر نہیں آیا یا مقصد ڈرانا ہے، ان کو جو انکار یا کفر کرنے والے ہوں گے۔ یا معنی ہیں مومنوں کے لیے خوشخبری، اور کافروں کے لیے ڈراوا۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ مُرْسَلَاتٌ عَاصِفَاتٌ اور نَاشِرَاتٌ سے مراد ہوائیں اور فَارِقَاتٌ وَّ مُلۡفِیَاتٌ سے فرشتے ہیں۔ یہی بات راجح ہے۔
- (۴) قسموں سے مراد، مقسم علیہ کی اہمیت سامعین پر واضح کرنا اور اس کی صداقت کو ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ مقسم علیہ (یا جواب قسم) یہ ہے کہ تم سے قیامت کا جو وعدہ کیا جاتا ہے، وہ یقیناً واقع ہونے والی ہے، یعنی اس میں شک کرنے کی نہیں بلکہ اس کے لیے تیاری کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ قیامت کب واقع ہوگی؟ اگلی آیات میں اسے واضح کیا جا رہا ہے۔
- (۵) طَمَسٌ کے معنی مٹ جانے اور بے نشان ہونے کے ہیں، یعنی جب ستاروں کی روشنی ختم بلکہ ان کا نشان تک مٹ جائے گا۔
- (۶) یعنی انہیں زمین سے اکھڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا اور زمین بالکل صاف اور ہموار ہو جائے گی۔
- (۷) یعنی فصل و قضا کے لیے، ان کے بیانات سن کر ان کی قوموں کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔
- (۸) یہ استفہام تعظیم اور تعجب کے لیے ہے یعنی کیسے عظیم دن کے لیے، جس کی شدت اور ہولناکی، لوگوں کے لیے سخت تعجب انگیز ہوگی، ان پیغمبروں کو جمع ہونے کا وقت دیا گیا ہے۔

فیصلے کے دن کے لیے۔ ^(۱) (۱۳)	لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ ۝
اور تجھے کیا معلوم کہ فیصلے کا دن کیا ہے؟ (۱۳)	وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الْقِيَامَةِ ۝
اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے۔ ^(۲) (۱۵)	وَالَّذِينَ يَوْمِ الْبُرْجِ ۝
کیا ہم نے انہوں کو ہلاک نہیں کیا؟ (۱۶)	أَلَمْ نُهَمِكِ الْاَوَّلِينَ ۝
پھر ہم ان کے بعد پچھلوں کو لائے۔ ^(۳) (۱۷)	ثُمَّ نُنْعِمُهُمُ الْاٰخِرِينَ ۝
ہم گنہگاروں کے ساتھ اسی طرح کرتے ہیں۔ ^(۴) (۱۸)	كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ۝
اس دن جھٹلانے والوں کے لیے ویل (افسوس) ہے۔ (۱۹)	وَالَّذِينَ يَوْمِ الْبُرْجِ ۝
کیا ہم نے تمہیں حقیر پانی سے (منی سے) پیدا نہیں کیا۔ (۲۰)	اَلَمْ نَخْلُقَكُمْ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ۝
پھر ہم نے اسے مضبوط و محفوظ جگہ میں رکھا۔ ^(۵) (۲۱)	فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّيْكٰنٍ ۝
ایک مقررہ وقت تک۔ ^(۶) (۲۲)	اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝
پھر ہم نے اندازہ کیا ^(۷) اور ہم کیا خوب اندازہ کرنے والے ہیں۔ (۲۳)	فَقَدَرْنَا مَنَاقِبَ الْقَدْرُوْنَ ۝
اس دن تکذیب کرنے والوں کی خرابی ہے۔ (۲۴)	وَالَّذِيْنَ يَوْمِ الْبُرْجِ ۝
کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا؟ (۲۵)	اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۝

- (۱) یعنی جس دن لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا، کوئی جنت میں اور کوئی دوزخ میں جائے گا۔
- (۲) یعنی ہلاکت ہے، بعض کہتے ہیں، وَاِلٰی جَنَّمَ كِيَاكِيَا کا نام ہے۔ یہ آیت اس سورت میں بار بار دہرائی گئی ہے۔ اس لیے کہ ہر مذہب کا جرم ایک دوسرے سے مختلف نوعیت کا ہو گا اور اسی حساب سے عذاب کی نوعیتیں بھی مختلف ہوں گی، بنا بریں اسی ویل کی مختلف قسمیں ہیں جسے مختلف مکذبین کے لیے الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ (فتح القدر)
- (۳) یعنی کفار مکہ اور ان کے ہم مشرب، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی۔
- (۴) یعنی سزا دیتے ہیں دنیا میں یا آخرت میں۔
- (۵) یعنی رحم مادر میں۔
- (۶) یعنی مدت حمل تک، چھ یا نو مہینے۔
- (۷) یعنی رحم مادر میں جسمانی ساخت و ترکیب کا صحیح اندازہ کیا کہ دونوں آنکھوں، دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں اور دونوں کانوں کے درمیان اور دیگر اعضا کا ایک دوسرے کے درمیان کتنا فاصلہ رہنا چاہیے۔

زندوں کو بھی اور مردوں کو بھی۔ ^(۱) (۲۶)	أَحْيَاءَ وَأَمْوَاتًا ۝
اور ہم نے اس میں بلند و بھاری پہاڑ بنا دیئے ^(۲) اور تمہیں سیراب کرنے والا مٹھاپانی پلایا۔ (۲۷)	وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ شَامِخَاتٍ وَأَسْقَيْنَكُم مَّاءً مُّزْسَلًّا ۝
اس دن جھوٹ جاننے والوں کے لیے وائے اور افسوس ہے۔ (۲۸)	وَنِلَّ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝
اس دوزخ کی طرف جاؤ جسے تم جھٹلاتے رہے تھے۔ ^(۳) (۲۹)	إِنطَلِقُوا إِلَىٰ مَأْتِكُمْ بِهِ نَكِّدًا يُّونَ ۝
چلو تین شاخوں والے سائے کی طرف۔ ^(۴) (۳۰)	إِنطَلِقُوا إِلَىٰ ظِلِّ ذِي تِلْكَ شَعْبٍ ۝
جو دراصل نہ سایہ دینے والا ہے اور نہ شعلے سے بچا سکتا ہے۔ ^(۵) (۳۱)	لَا ظَلِيلٌ وَلَا يَنْبِيءٌ مِنَ النَّهَبِ ۝
یقیناً دوزخ چنگاریاں پھینکتی ہے جو مثل محل کے ہیں۔ ^(۶) (۳۲)	إِنهَاتَنِي بِشَرِّهِ كَالْقَصْرِ ۝
گویا کہ وہ زرد اونٹ ہیں۔ ^(۷) (۳۳)	كَأَنَّهُ جِلَّتْ صَفْرُ ۝
آج ان جھوٹ جاننے والوں کی درگت ہے۔ (۳۴)	وَنِلَّ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝
آج (کا دن) وہ دن ہے کہ یہ بول بھی نہ سکیں	هَذَا يَوْمٌ لَا يَنْطَعُونَ ۝

(۱) یعنی زمین زندوں کو اپنی پشت پر اور مردوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتی جمع کر لیتی ہے۔

(۲) رَوَاسِيَ رَاسِيَّةٌ کی جمع۔ نَوَابِتُ جسے ہوئے پہاڑ، شَامِخَاتُ بلند۔

(۳) یہ فرشتے جنہیوں کو کہیں گے۔

(۴) جنم سے جو دھواں آئے گا، وہ بلند ہو کر تین جتوں میں پھیل جائے گا یعنی جس طرح دیوار یا درخت کا سایہ ہوتا ہے جس میں

آدمی راحت اور عافیت محسوس کرتا ہے، یہ دھواں حقیقت میں اس طرح کا سایہ نہیں ہوگا، جس میں جنہی کچھ سکون حاصل کر لیں۔

(۵) یعنی جنم کی حرارت سے بچنا بھی ممکن نہیں ہوگا۔

(۶) اس کا ایک اور ترجمہ ہے: جو لکڑی کے بوٹے یعنی بھاری ٹکڑے کے مثل ہیں۔ (بوٹے بمعنی شہتیر کے ٹکڑے، جسے گیلی بھی کہتے ہیں)

(۷) صَفْرُ، أَصْفَرُ (زرد) کی جمع ہے لیکن عرب میں اس کا استعمال اسود کے معنی میں بھی ہے۔ اس معنی کی بنا پر مطلب یہ

ہے کہ اس کی ایک ایک چنگاری اتنی اتنی بڑی ہوگی جیسے محل یا قلعہ۔ پھر ہر چنگاری کے مزید اتنے بڑے بڑے ٹکڑے ہو جائیں گے جیسے اونٹ ہوتے ہیں۔

گے۔^(۱) (۳۵)

وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْبُدُونَ ۝۳۵

نہ انہیں معذرت کی اجازت دی جائے گی۔^(۲) (۳۶)

وَيَلَّيْلُ يَوْمَهُدِ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝۳۶

هَذَا يَوْمُ الْقَضِ الْجَعْلُ وَالْأَقْلَبِينَ ۝۳۷

اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے۔ (۳۷)
یہ ہے فیصلہ کا دن ہم نے تمہیں اور اگلوں کو سب کو جمع کر لیا ہے۔^(۳) (۳۸)

فَإِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيدُوا ۝۳۸

پس اگر تم مجھ سے کوئی چال چل سکتے ہو تو چل لو۔^(۴) (۳۹)

وَيَلَّيْلُ يَوْمَهُدِ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝۳۹

وائے ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ (۴۰)
پیشک پر بیہزار لوگ سایوں میں ہیں^(۵) اور بتے چشموں میں۔ (۴۱)

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلِّ وَعُيُونٍ ۝۴۰

وَفَوَازِكِهِمْ وَمَا يَشْتَهُونَ ۝۴۱

اور ان میوں میں جن کی وہ خواہش کریں۔^(۶) (۴۲)
(اے جنتیو!) کھاؤ پیو مزے سے اپنے کیے ہوئے اعمال کے بدلے۔^(۷) (۴۳)

كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا لِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝۴۲

(۱) محشر میں کافروں کی مختلف حالتیں ہوں گی، ایک وقت وہ ہو گا کہ وہ وہاں بھی جھوٹ بولیں گے، پھر اللہ تعالیٰ ان کے مومنوں پر مہر لگا دے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے۔ پھر جس وقت ان کو جہنم میں لے جایا جا رہا ہو گا، اس وقت عالم اضطراب و پریشانی میں ان کی زبانیں پھر گنگ ہو جائیں گی۔ بعض کہتے ہیں بولیں گے تو سہی، لیکن ان کے پاس حجت کوئی نہیں ہو گی۔ گویا ان کو بات کرنی ہی نہیں آئے گی۔ جیسے ہم دنیا میں ایسے شخص کی بابت کہتے ہیں جس کے پاس کوئی تسلی بخش دلیل نہیں ہوتی، وہ تو ہمارے سامنے بول ہی نہیں سکا۔

(۲) مطلب یہ ہے کہ ان کے پاس پیش کرنے کے لیے کوئی معقول عذر ہی نہیں ہو گا جسے وہ پیش کر کے چھٹکارا پاسکیں۔
(۳) یہ اللہ تعالیٰ بندوں سے خطاب فرمائے گا کہ ہم نے تمہیں اپنی قدرت کاملہ سے فیصلہ کرنے کے لیے ایک ہی میدان میں جمع کر لیا ہے۔

(۴) یہ سخت وعید اور تہدید ہے کہ اگر تم میری گرفت سے بچ سکتے ہو اور میرے حکم سے نکل سکتے ہو تو بچ اور نکل کے دکھاؤ۔ لیکن وہاں کس میں یہ طاقت ہو گی؟ یہ آیت بھی ایسے ہی ہے، جیسے یہ آیت ہے ﴿يَعْمَلُونَ الْبُحْنَ وَالْإِلْسِينَ إِنَّهُمْ لَمُنْظَرُونَ﴾ (الرحمن، ۳۳)

(۵) یعنی درختوں اور محلات کے سائے، آگ کے دھوئیں کا سایہ نہیں ہو گا جیسے مشرکین کے لیے ہو گا۔

(۶) ہر قسم کے پھل، جب بھی خواہش کریں گے، آمو جو ہوں گے۔

(۷) یہ بطور احسان انہیں کہا جائے گا۔ بِمَا كُنْتُمْ فِيهَا تَعْمَلُونَ میں بنا سبب کے لیے ہے یعنی جنت کی یہ نعمتیں ان اعمال صالحہ کی وجہ

یقیناً ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں۔ (۴۴)^(۱)
 اس دن سچا نہ جاننے والوں کے لیے ویل (افسوس) ہے۔ (۴۵)^(۲)
 (اے جھٹلانے والو) تم دنیا میں) تھوڑا سا کھالو اور فائدہ اٹھا لو بیشک تم گنہگار ہو۔ (۴۶)^(۳)
 اس دن جھٹلانے والوں کے لیے سخت ہلاکت ہے۔ (۴۷)
 ان سے جب کہا جاتا ہے کہ رکوع کر لو تو نہیں کرتے۔ (۴۸)^(۴)
 اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے۔ (۴۹)^(۵)
 اب اس قرآن کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے؟ (۵۰)^(۶)

إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۴۴﴾
 وَيَوْمَئِذٍ يُؤْمِنُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْمَلَكِ الَّذِينَ
 كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۴۵﴾
 وَيَوْمَئِذٍ يُؤْمِنُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْمَلَكِ الَّذِينَ
 كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۴۶﴾
 وَيَوْمَئِذٍ يُؤْمِنُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْمَلَكِ الَّذِينَ
 كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۴۷﴾
 وَيَوْمَئِذٍ يُؤْمِنُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْمَلَكِ الَّذِينَ
 كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۴۸﴾
 وَيَوْمَئِذٍ يُؤْمِنُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْمَلَكِ الَّذِينَ
 كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۴۹﴾
 وَيَوْمَئِذٍ يُؤْمِنُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْمَلَكِ الَّذِينَ
 كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۵۰﴾

سے تمہیں ملی ہیں جو تم دنیا میں کرتے رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ، جس کی وجہ سے انسان جنت میں داخل ہوگا، اعمالِ صالحہ ہیں۔ جو لوگ عملِ صالح کی بغیر ہی اللہ کی رحمت و مغفرت کے امیدوار بن جاتے ہیں، ان کی مثال ایسے ہی ہے، جیسے کوئی زمین میں بل چلائے اور بیج بوئے بغیر، فصل کا امیدوار بن جائے یا تخم حنظل بو کر خوش ذائقہ پھلوں کی امید رکھے۔

(۱) اس میں بھی اسی امر کی ترغیب و تلقین ہے کہ اگر آخرت میں حسن انجام کے طالب ہو تو دنیا میں نیکی اور بھلائی کا راستہ اپناؤ۔
 (۲) کہ اہل تقویٰ کے حصے میں تو جنت کی نعمتیں آئیں اور ان کے حصے میں بڑی بدبختی۔
 (۳) یہ مکذبین قیامت کو خطاب ہے اور یہ امر، تمہید و وعید کے لیے ہے، یعنی اچھا چند روز خوب عیش کر لو، تم جیسے مجرمین کے لیے شکنجہ عذاب تیار ہے۔
 (۴) یعنی جب ان کو نماز پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے، تو نماز نہیں پڑھتے۔
 (۵) یعنی ان کے لیے جو اللہ کے اوامر و نواہی کو نہیں مانتے۔

(۶) یعنی جب اس قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے تو اس کے بعد اور کون سا کلام ہے جس پر یہ ایمان لائیں گے؟ یہاں بھی حدیث کا اطلاق قرآن پر ہوا ہے، جیسا کہ اور بھی بعض مقامات پر کیا گیا ہے۔ ایک ضعیف روایت میں ہے کہ جو سورہ تین کی آخری آیت آتیس اللہ۔ الآیۃ پڑھے تو وہ جواب میں کہے بلیٰ وَاَنَا عَلَيَّ ذَلِكَ مِنَ الشَّاهِدِينَ اور سورہ قیامت کے آخر کے جواب میں بلیٰ اور قَبَائِلِ حَدِيثِ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ کے جواب میں آمَنَّا بِاللَّهِ۔ کہے۔ (ابوداؤد، باب مقدار الركوع والسجود، وضعیف ثبی داود، البانی، بعض علما کے نزدیک سامع کو بھی جواب دینا چاہیے۔

سورہ نبا کی ہے اور اس میں چالیس آیتیں اور دو رکوع ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

(۱) یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ (۱)

اس بڑی خبر کے متعلق۔ (۲)

جس کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔ (۳)

یقیناً یہ ابھی جان لیں گے۔ (۴)

پھر یائقیں انہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ (۵)

کیا ہم نے زمین کو فرش نہیں بنایا؟ (۶)

اور پہاڑوں کو میخیں (نہیں بنایا؟) (۷)

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ۝

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝

الَّذِي هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُونَ ۝

كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ۝

كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ۝

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهْدًا ۝

وَ الْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝

(۱) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلعت نبوت سے نوازا گیا اور آپ نے توحید، قیامت وغیرہ کا بیان فرمایا اور قرآن کی تلاوت فرمائی تو کفار و مشرکین باہم ایک دوسرے سے پوچھتے کہ یہ قیامت کیا واقعی ممکن ہے؟ جیسا کہ یہ شخص دعویٰ کر رہا ہے یا یہ قرآن واقعی اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے جیسا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتا ہے۔ استفہام کے ذریعے سے اللہ نے پہلے ان چیزوں کی وہ حیثیت نمایاں کی جو ان کی ہے۔ پھر خود ہی جواب دیا کہ.....

(۲) یعنی جس بڑی خبر کی بابت ان کے درمیان اختلاف ہے، اس کے متعلق استفہام ہے۔ اس بڑی خبر سے بعض نے قرآن مجید مراد لیا ہے کافر اس کے بارے میں مختلف باتیں کرتے تھے، کوئی اسے جادو، کوئی کمانت، کوئی شعر اور کوئی پہلوں کی کہانیاں بتلاتا تھا۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد قیامت کا پرہونا اور دوبارہ زندہ ہونا ہے۔ اس میں بھی ان کے درمیان کچھ اختلاف تھا۔ کوئی بالکل انکار کرتا تھا کوئی صرف شک کا ظہار۔ بعض کہتے ہیں کہ سوال کرنے والے مومن و کافروں میں ہی تھے، مومنین کا سوال تو اضافہ یقین اور ازدیاد بصیرت کے لیے تھا اور کافروں کا استفہام اور تسخر کے طور پر۔

(۳) یہ ڈانٹ اور زجر ہے کہ عنقریب سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ آگے اللہ تعالیٰ اپنی کارگیری اور عظیم قدرت کا تذکرہ فرما رہا ہے تاکہ توحید کی حقیقت ان کے سامنے واضح ہو اور اللہ کا رسول انہیں جس چیز کی دعوت دے رہا تھا، اس پر ایمان لانا ان کے لیے آسان ہو جائے۔

(۴) یعنی فرش کی طرح تم زمین پر پلتے پھرتے، اٹھتے، بیٹھتے، سوتے اور سارے کام کاج کرتے ہو۔ زمین کو ڈوڈو لٹا ہوا نہیں رہنے دیا۔

(۵) اَوْتَادٌ، وَتَدٌ کی جمع ہے میخیں۔ یعنی پہاڑوں کو زمین کے لیے میخیں بنایا تاکہ زمین ساکن رہے، حرکت نہ کرے،

اور ہم نے تمہیں جوڑا جوڑا پیدا کیا۔ ^(۸)	وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا ۝
اور ہم نے تمہاری نیند کو آرام کا سبب بنایا۔ ^(۹)	وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ مَسَابِقًا ۝
اور رات کو ہم نے پردہ بنایا ہے۔ ^(۱۰)	وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ۝
اور دن کو ہم نے وقت روزگار بنایا۔ ^(۱۱)	وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝
اور تمہارے اوپر ہم نے سات مضبوط آسمان بنائے۔ ^(۱۲)	وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝
اور ایک چمکتا ہوا روشن چراغ (سورج) پیدا کیا۔ ^(۱۳)	وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَاجًا ۝
اور بدلیوں سے ہم نے بکثرت بہتا ہوا پانی برسایا۔ ^(۱۴)	وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً نَّجَاًا ۝
تاکہ اس سے اناج اور سبزہ اگائیں۔ ^(۱۵)	لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ۝
اور گھنے باغ (بھی اگائیں)۔ ^(۱۶)	وَجَدَّتْ آلْفَاافًا ۝
بیشک فیصلہ کے دن کا وقت مقرر ہے۔ ^(۱۷)	إِنِّي يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۝

کیوں کہ حرکت و اضطراب کی صورت میں زمین رہائش کے قابل ہی نہ ہوتی۔

(۱) یعنی مذکر اور مؤنث۔ نر اور مادہ یا ازواج بمعنی اصناف و الوان ہے۔ یعنی مختلف شکلوں اور رنگوں میں پیدا کیا، خوب صورت، بد صورت، دراز قد، کوتاہ قد، سفید اور سیاہ وغیرہ۔

(۲) سُبَاتُ کے معنی قطع کرنے کے ہیں۔ رات بھی انسان و حیوان کی ساری حرکتیں منقطع کر دیتی ہے تاکہ سکون ہو جائے اور لوگ آرام کی نیند سولیں۔ یا مطلب ہے کہ رات تمہارے اعمال کاٹ دیتی ہے یعنی عمل کے سلسلے کو ختم کر دیتی ہے۔ عمل ختم ہونے کا مطلب آرام ہے۔

(۳) یعنی رات کا اندھیرا اور سیاہی ہر چیز کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے، جس طرح لباس انسان کے جسم کو چھپا لیتا ہے۔

(۴) مطلب ہے کہ دن کو روشن بنایا تاکہ لوگ کسب معاش کے لیے جدوجہد کر سکیں۔

(۵) ان میں سے ہر ایک کا فاصلہ پانچ سو سال کی مسافت جتنا ہے، جو اس کے استحکام اور مضبوطی کی دلیل ہے۔

(۶) اس سے مراد سورج ہے اور جَعَلَ بمعنی خَلَقَ ہے۔

(۷) مُعْصِرَاتُ وہ بدلیاں جو پانی سے بھری ہوئی ہوں لیکن ابھی برسی نہ ہوں۔ جیسے الْمَرْأَةُ الْمُعْصِرَةُ اس عورت کو کہتے ہیں جس کی ماہواری قریب ہو، نَجَاًا کثرت سے بننے والا پانی۔

(۸) حَبٌّ (دانا) وہ اناج جسے خوراک کے لیے ذخیرہ کر لیا جاتا ہے، جیسے گندم، چاول، جو، مکئی وغیرہ اور نبات، سبزیاں اور چارہ وغیرہ جو جانور کھاتے ہیں۔

(۹) آلْفَاافًا شاخوں کی کثرت کی وجہ سے ایک دوسرے سے ملے ہوئے درخت یعنی گھنے باغ۔

(۱۰) یعنی اولین اور آخرین سب کے جمع ہونے اور وعدے کا دن۔ اسے فیصلے کا دن اس لیے کہا کہ اس دن جمع ہونے کا

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الضُّورِ كَتَاتُونَ أَتَوَابًا ۝

وَأُتِيحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۝

وَأُسْبِطَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝

إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝

لِلظَّالِمِينَ مَا بَأْسًا ۝

لِيُسْجَنَ فِيهَا أَحْقَابًا ۝

جس دن کہ صور میں پھونکا جائے گا۔ پھر تم فوج در فوج

چلے آؤ گے۔ (۱۸) ^(۱)

اور آسمان کھول دیا جائے گا تو اس میں دروازے

دروازے ہو جائیں گے۔ (۱۹) ^(۲)

اور پہاڑ چلائے جائیں گے پس وہ سراب ہو جائیں

گے۔ (۲۰) ^(۳)

بیشک دوزخ گھات میں ہے۔ (۲۱) ^(۴)

سرکشوں کا ٹھکانا وہی ہے۔ (۲۲)

اس میں وہ مدتوں تک پڑے رہیں گے۔ (۲۳) ^(۵)

مقصد ہی تمام انسانوں کا ان کے اعمال کی روشنی میں فیصلہ کرنا ہے۔

(۱) بعض نے اس کا مفہوم یہ بھی بیان کیا ہے کہ ہر امت اپنے رسول کے ساتھ میدان محشر میں آئے گی۔ یہ دوسرا نفع ہو گا، جس میں سب لوگ قبروں سے زندہ اٹھ کر نکل آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی نازل فرمائے گا، جس سے

انسان کھیتی کی طرح اگ آئے گا۔ انسان کی ہر چیز بوسیدہ ہو جائے گی، سوائے ریزہ کی ہڈی کے آخری سرے کے۔ اسی

سے قیامت والے دن تمام مخلوقات کی دوبارہ ترکیب ہوگی۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورہ عم)

(۲) یعنی فرشتوں کے نزول کے لیے راستے بن جائیں گے اور وہ زمین پر اتر آئیں گے۔

(۳) سَرَابٌ وہ ریت جو دور سے پانی محسوس ہوتی ہو۔ پہاڑ بھی سراب کی طرح صرف دور سے نظر آنے والی چیز بن کر رہ

جائیں گے۔ اور اس کے بعد بالکل ہی معدوم ہو جائیں گے، ان کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ بعض کہتے ہیں کہ قرآن میں

پہاڑوں کی مختلف حالتیں بیان کی گئی ہیں، جن میں جمع و تطبیق کی صورت یہ ہے کہ پہلے انہیں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا ﴿فَدَمَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً﴾ (المحافۃ ۱۱۳) ۲۔ وہ دھنی ہوئی روٹی کی طرح ہو جائیں گے ﴿كَالْبُحَيْنِ الْمُنْقُوشِ﴾ (المقارعة) ۵۔ وہ گردو غبار

ہو جائیں گے ﴿فَكَانَتْ هَبًا مُّنبَثًّا﴾ (الواقعة) ۶۔ ان کو اڑا دیا جائے گا ﴿يَلْمِزُهُمْ فِي نَسْفَاتِهَا﴾ (طلہ) ۱۰۵۔ اور پانچویں

حالت یہ ہے کہ وہ سراب ہو جائیں گے۔ یعنی لَا شَيْءَ جِيسَاكَ اس مقام پر ہے۔ (فتح القدير)

(۴) گھات ایسی جگہ کو کہتے ہیں، جہاں چھپ کر دشمن کا انتظار کیا جاتا ہے تاکہ وہاں سے گزرے تو فوراً اس پر حملہ کر دیا

جائے۔ جہنم کے داروغے بھی جہنمیوں کے انتظار میں اسی طرح بیٹھے ہیں یا خود جہنم اللہ کے حکم سے کفار کے لیے گھات

لگائے بیٹھی ہے۔

(۵) أَحْقَابٌ، حُقُبٌ کی جمع ہے، بمعنی زمانہ۔ مراد ابد اور ہمیشگی ہے۔ ابد الابد تک وہ جہنم میں ہی رہیں گے۔ یہ سزا کافروں اور مشرکوں کے لیے ہے۔

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ﴿۲۳﴾

نہ کبھی اس میں نختی کا مزہ چکھیں گے، نہ پانی کا۔ (۲۳)

إِلَّا هِيمًا وَعَسَاءًا قَا ﴿۲۴﴾

سوائے گرم پانی اور (بستی) پیپ کے۔ (۲۴)

جَزَاءً وَفَاكًا ﴿۲۵﴾

(ان کو) پورا پورا بدلہ ملے گا۔ (۲۵)

إِنَّهُمْ كَانُوا إِلَّا يَرْجُونَ حِسَابًا ﴿۲۶﴾

انہیں تو حساب کی توقع ہی نہ تھی۔ (۲۶)

وَكَذَّبُوا بِالْآيَاتِ الَّتِي كَانَتْ آيَاتِنا ﴿۲۷﴾

اور بے باکی سے ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے

تھے۔ (۲۷)

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا ﴿۲۸﴾

ہم نے ہر ایک چیز کو لکھ کر شمار کر رکھا ہے۔ (۲۸)

فَذُوقُوا الْعَذَابَ لَكُمْ أَذْنَابًا ﴿۲۹﴾

اب تم (اپنے کیے کا) مزہ چکھو ہم تمہارا عذاب ہی

بڑھاتے رہیں گے۔ (۲۹)

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ﴿۳۰﴾

یقیناً پرہیزگار لوگوں کے لیے کامیابی ہے۔ (۳۰)

حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا ﴿۳۱﴾

باغات ہیں اور انگور ہیں۔ (۳۱)

وَأَنْهَابَ آثْرَابًا ﴿۳۲﴾

اور نوجوان کنواری ہم عمر عورتیں ہیں۔ (۳۲)

(۱) جو جنمیوں کے جسموں سے نکلے گی۔

(۲) یعنی یہ سزا ان کے ان اعمال کے مطابق ہے جو وہ دنیا میں کرتے رہے ہیں۔

(۳) یہ پہلے جملے کی تعلیل ہے۔ یعنی وہ مذکورہ سزا کے اس لیے مستحق قرار پائے کہ عقیدہ بعث بعد الموت کے وہ قائل ہی نہیں تھے کہ حساب کتاب کی وہ امید رکھتے۔

(۴) یعنی لوح محفوظ میں۔ یا وہ ریکارڈ مراد ہے جو فرشتے لکھتے رہے۔ پہلا مفہوم زیادہ صحیح ہے، جیسا کہ دوسرے مقام پر

فرمایا ﴿وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ﴾ (یسس، ۳)

(۵) عذاب بڑھانے کا مطلب ہے کہ اب یہ عذاب دائمی ہے۔ جب ان کے چڑھے گل جائیں گے تو دوسرے بدل

دیئے جائیں گے۔ (النساء، ۵۶) جب آگ بجھنے لگے گی، تو پھر بھڑکا دی جائے گی۔ (بنی اسرائیل، ۹۷)

(۶) اہل شقاوت کے تذکرے کے بعد، یہ اہل سعادت کا تذکرہ اور ان نعمتوں کا بیان ہے جن سے حیات اخروی میں وہ

بہرہ ور ہوں گے۔ یہ کامیابی اور نعمتیں انہیں تقویٰ کی بدولت حاصل ہوں گی۔ تقویٰ، ایمان و اطاعت کے تقاضوں کی

تکمیل کا نام ہے، خوش قسمت ہیں وہ لوگ، جو ایمان لانے کے بعد تقویٰ اور عمل صالح کا اہتمام کرتے ہیں۔ جَعَلْنَا

اللَّهُ مِنْهُمْ.

(۷) یہ مفازا سے بدل ہے۔

(۸) كَوَاعِبَ كَاعِبَةٍ کی جمع ہے، یہ تَحَبُّبٌ (نُحْنُذُ) سے ہے، جس طرح نُحْنُذُ ابھرا ہوا ہوتا ہے، ان کی چھاتیوں میں بھی

اور چھلکتے ہوئے جام شراب ہیں۔^(۱) (۳۳)
 وہاں نہ تو وہ بیسودہ باتیں سنیں گے اور نہ جھوٹی باتیں
 سنیں گے۔^(۲) (۳۵)
 (ان کو) تیرے رب کی طرف سے (ان کے نیک اعمال کا)
 یہ بدلہ ملے گا جو کفنی انعام ہو گا۔^(۳) (۳۶)
 (اس رب کی طرف سے ملے گا جو کہ) آسمانوں کا اور
 زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کا پروردگار
 ہے اور بڑی بخشش کرنے والا ہے۔ کسی کو اس سے بات
 چیت کرنے کا اختیار نہیں ہو گا۔^(۴) (۳۷)
 جس دن روح اور فرشتے صفیں باندھ کر کھڑے ہوں
 گے^(۵) تو کوئی کلام نہ کر سکے گا مگر جسے رحمن اجازت
 دے دے اور وہ ٹھیک بات زبان سے نکالے۔^(۶) (۳۸)
 یہ دن حق ہے^(۷) اب جو چاہے اپنے رب کے پاس
 (نیک اعمال کر کے) ٹھکانا بنا لے۔^(۸) (۳۹)

وَكَا سَادِهَاتَا ﴿۳۳﴾
 لَكَيْسَعُونَ فِيهَا الْقَوَائِدَ الْكِبَارَا ﴿۳۵﴾
 جَزَاءً مِّن رَّبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾
 رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ
 لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾
 يَوْمَ يَقُومُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰئِكَةُ صَفًّا لَا يَتَكَلَّمُونَ
 اِلَّا مَن اُوْن لَّهٗ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾
 ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ اِلٰى رَبِّهِ مَا يٰٓا ﴿۳۹﴾

ایسا ہی ابھار ہو گا جو ان کے حسن و جمال کا ایک منظر ہے۔ آنز اب ہم عمر۔

- (۱) دہاقا، بھرے ہوئے یا لگاتار، ایک کے بعد ایک۔ یا صاف شفاف، کائنات، ایسے جام کو کہتے ہیں جو لبالب بھرا ہوا ہو۔
 (۲) یعنی کوئی بے فائدہ اور بے ہودہ بات وہاں نہیں ہوگی، نہ ایک دوسرے سے جھوٹ بولیں گے۔
 (۳) عطاء کے ساتھ حساب مبالغے کے لیے آتا ہے، یعنی اللہ کی داد و دہش کی وہاں فراوانی ہوگی۔
 (۴) یعنی اس کی عظمت، ہیبت اور جلالت اتنی ہوگی کہ ابتداء اس سے کسی کو بات کرنے کی ہمت نہ ہوگی، اسی لیے اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کے لیے بھی لب کشائی نہیں کر سکے گا۔
 (۵) یہاں جبرائیل علیہ السلام سمیت ذرّوح کے کئی مفہوم بیان کئے گئے ہیں، امام ابن کثیر نے بنی آدم (انسان) کو اَشْبَهُ (قرین قیاس) قرار دیا ہے۔
 (۶) یہ اجازت اللہ تعالیٰ ان فرشتوں کو اور اپنے پیغمبروں کو عطا فرمائے گا اور وہ جو بات کریں گے حق و صواب ہی ہوگی، یا یہ مفہوم ہے کہ اجازت صرف اسی کے بارے میں دی جائے گی جس نے درست بات کہی ہو۔ یعنی کلمہ توحید کا قراری رہا ہو۔
 (۷) یعنی لامحالہ آنے والا ہے۔
 (۸) یعنی اس آنے والے دن کو سامنے رکھتے ہوئے ایمان و تقویٰ کی زندگی اختیار کرے تاکہ اس روز وہاں اس کو اچھا

ہم نے تمہیں عنقریب آنے والے عذاب سے ڈرا دیا (اور چونکہ کر دیا) ہے۔^(۱) جس دن انسان اپنے ہاتھوں کی کمائی کو دیکھ لے گا^(۲) اور کافر کہے گا کہ کاش! میں مٹی ہو جاتا۔^(۳) (۳۰)

سورہ نازعات مکی ہے اور اس میں چھالیس آیتیں اور دو رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

- ذوب کر سختی سے کھینچنے والوں کی قسم! (۱)
بند کھول کر چھڑا دینے والوں کی قسم! (۲)
اور تیرے پھرنے والوں کی قسم! (۳)

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ عَلٰٓا بَابًا قَرِيْبًا ۙ يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَعُوْلُ الْكَافِرُ يَلَيْتَوْنِ كُنْتُ شَرْبًا ۝



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَالنَّزِعَاتِ عَرْقًا ۝
وَاللَّيْلِ نَسْطًا ۝
وَالسَّجِيْطِ سَبِيْحًا ۝

ٹھکانہ مل جائے۔

(۱) یعنی قیامت والے دن کے عذاب سے جو قریب ہی ہے۔ کیوں کہ اس کا آنا یقینی ہے اور ہر آنے والی چیز قریب ہی ہے، کیوں کہ بہر صورت اسے آکر ہی رہنا ہے۔

(۲) یعنی اچھایا برا، جو عمل بھی اس نے دنیا میں کیا وہ اللہ کے ہاں پہنچ گیا ہے، قیامت والے دن وہ اس کے سامنے آجائے گا اور اس کا مشاہدہ کر لے گا ﴿وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا﴾ (الکہف، ۳۹) ﴿يُنْتَبِذُ الْاِنْسَانَ يَوْمَئِذٍ يَمَاقِرًا وَاٰخِرُ﴾ (القیامہ، ۳۳)

(۳) یعنی جب وہ اپنے لیے ہولناک عذاب دیکھے گا تو یہ آرزو کرے گا۔ بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حیوانات کے درمیان بھی عدل و انصاف کے مطابق فیصلہ فرمائے گا، حتیٰ کہ ایک سینگ والی بکری نے بے سینگ کے جانور پر کوئی زیادتی کی ہوگی، تو اس کا بھی بدلہ دلائے گا اس سے فراغت کے بعد اللہ تعالیٰ جانوروں کو حکم دے گا کہ مٹی ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ مٹی ہو جائیں گے۔ اس وقت کافر بھی آرزو کریں گے کہ کاش وہ بھی حیوان ہوتے اور آج مٹی بن جاتے۔ (تفسیر ابن کثیر)

(۴) نَزَع کے معنی، سختی سے کھینچنا، عَرْقًا ذوب کر۔ یہ جان نکالنے والے فرشتوں کی صفت ہے فرشتے کافروں کی جان، نہایت سختی سے نکالتے ہیں اور جسم کے اندر ذوب کر۔

(۵) نَسَطُ کے معنی، گرہ کھول دینا۔ یعنی مومن کی جان فرشتے بہ سہولت نکالتے ہیں، جیسے کسی چیز کی گرہ کھول دی جائے۔

(۶) سَبَّحَ کے معنی، تیرنا، فرشتے روح نکالنے کے لیے انسان کے بدن میں اس طرح تیرتے پھرتے ہیں جیسے خواص سمندر سے موتی نکالنے کے لیے سمندر کی گہرائیوں میں تیرتا ہے۔ یا مطلب ہے کہ نہایت تیزی سے اللہ کا حکم لے کر

پھر دوڑ کر آگے بڑھنے والوں کی قسم! (۳)	فَالشَّيْطَانُ سَبْقًا ۝
پھر کام کی تدبیر کرنے والوں کی قسم! (۵)	فَالْمُدْبِرَاتِ أَمْرًا ۝
جس دن کانپنے والی کانپے گی۔ (۶)	يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝
اس کے بعد ایک پیچھے آنے والی (پیچھے پیچھے) آئے گی۔ (۷)	تَتَّبِعَهَا الْإِزْدَقَةُ ۝
(ہمت سے) دل اس دن دھڑکتے ہوں گے۔ (۸)	قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِعَةٌ ۝
جن کی نگاہیں نیچی ہوں گی۔ (۹)	أَبْصَارًا خَاشِعَةً ۝
کہتے ہیں کہ کیا ہم پہلی کی سی حالت کی طرف پھر لوٹائے جائیں گے؟ (۱۰)	يَقُولُونَ ءَأِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ ۝
کیا اس وقت جب کہ ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں	ءَأَإِنَّا لَمَّا نَحْنَرُهُ ۝

آسمان سے اترتے ہیں۔ کیوں کہ تیز رو گھوڑے کو بھی سانع کہتے ہیں۔

(۱) یہ فرشتے اللہ کی وحی، انبیاء تک، دوڑ کر پہنچاتے ہیں تاکہ شیطان کو اس کی کوئی سن گن نہ ملے۔ یا مومنوں کی روحیں جنت کی طرف لے جانے میں نہایت سرعت سے کام لیتے ہیں۔

(۲) یعنی اللہ تعالیٰ جو کام ان کے سپرد کرتا ہے، وہ اس کی تدبیر کرتے ہیں اصل مدبر تو اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بالغہ کے تحت فرشتوں کے ذریعے سے کام کرواتا ہے تو انہیں بھی مدبر کہہ دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے پانچوں صفات فرشتوں کی ہیں اور ان فرشتوں کی اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے۔ جو اب قسم محذوف ہے یعنی ﴿لَتَبْعَنَّ كُفْرًا﴾ اس بعث و جزاء کے لیے کئی مواقع پر قسم کھائی ہے جیسے سورہ تغابن، ۷ میں بھی اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر مذکورہ الفاظ میں اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔ یہ بعث و جزا کب ہوگی؟ اس کی وضاحت آگے فرمائی۔

(۳) یہ نفعہ اولیٰ ہے جسے نفعہ فنا کہتے ہیں، جس سے ساری کائنات کانپ اور لرز اٹھے گی اور ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ (۴) یہ دوسرا نفعہ ہو گا، جس سے سب لوگ زندہ ہو کر قبروں سے نکل آئیں گے۔ یہ دوسرا نفعہ پہلے نفعہ سے چالیس سال بعد ہو گا۔ اسے رَادِفَةٌ اس لیے کہا ہے کہ یہ پہلے نفعے کے بعد ہی ہو گا۔ یعنی نفعہ ثانیہ، نفعہ اولیٰ کا ردیف ہے۔ (۵) قیامت کے احوال اور شدائد سے۔

(۶) یعنی أَبْصَارًا أَصْحَابَهَا، ایسے دہشت زدہ لوگوں کی نظریں بھی (بجز مومنوں کی طرح) جھکی ہوئی ہوں گی۔ (۷) حَافِرَةٌ، پہلی حالت کو کہتے ہیں۔ یہ منکرین قیامت کا قول ہے کہ کیا ہم پھر اس طرح زندہ کر دیئے جائیں گے جس طرح مرنے سے پیشتر تھے؟

گے؟ (۱۱)

کہتے ہیں کہ پھر تو یہ لوٹنا نقصان دہ ہے۔ (۱۲)
(معلوم ہونا چاہیے) وہ تو صرف ایک (خونفاک)
ڈانٹ ہے۔ (۱۳)

کہ (جس کے ظاہر ہوتے ہی) وہ ایک دم میدان میں جمع
ہو جائیں گے۔ (۱۴)

کیا موسیٰ (علیہ السلام) کی خبر تمہیں پہنچی ہے؟ (۱۵)
جب کہ انہیں ان کے رب نے پاک میدان طوئی میں
پکارا۔ (۱۶)

(کہ) تم فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی اختیار کر لی
ہے۔ (۱۷)

اس سے کہو کہ کیا تو اپنی درستگی اور اصلاح چاہتا ہے۔ (۱۸)
اور یہ کہ میں تجھے تیرے رب کی راہ دکھاؤں تاکہ تو اس

قَالُوا يَا لَيْلَ وَإِنَّمَا لَكِ إِذَا كُنَّا عَايِسُونَ ﴿۱۱﴾

فَأَنبَأَهُمْ رَبُّهُمْ بِوَجَدَةِ ﴿۱۲﴾

فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۳﴾

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ ﴿۱۴﴾

إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ يَا لَيْلَ يَا لَيْلَ الْمُعْتَدِينَ طُوًى ﴿۱۵﴾

إِذْ هَبَّ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ﴿۱۶﴾

قَالَ هَلْ لَكَ إِلَهٌ إِلَّا أَن تَزُولَ ﴿۱۷﴾

وَأَهْدِيكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْضَىٰ ﴿۱۸﴾

(۱) یہ انکار قیامت کی مزید تاکید ہے کہ ہم کس طرح زندہ کر دیئے جائیں گے جب کہ ہماری ہڈیاں بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گی۔

(۲) یعنی اگر واقعی ایسا ہوا جیسا کہ محمد (ﷺ) کہتا ہے، پھر تو یہ دوبارہ زندگی ہمارے لیے سخت نقصان دہ ہوگی۔

(۳) سَآهَرَةٌ سے مراد زمین کی سطح یعنی میدان ہے۔ سطح زمین کو سَآهَرَةٌ اس لیے کہا گیا ہے کہ تمام جانداروں کا سونا اور بیدار ہونا اسی زمین پر ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ چشیل میدانوں اور صحراؤں میں خوف کی وجہ سے انسان کی نیند اڑ جاتی ہے اور وہاں بیدار رہتا ہے، اس لیے سَآهَرَةٌ کہا جاتا ہے۔ (فتح القدر) بہر حال یہ قیامت کی منظر کشی ہے کہ ایک ہی نفع سے سب لوگ ایک میدان میں جمع ہو جائیں گے۔

(۴) یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے واپسی پر آگ کی تلاش میں کوہ طور پر پہنچ گئے تھے تو وہاں ایک درخت کی اوٹ سے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا، جیسا کہ اس کی تفصیل سورہ ط کے آغاز میں گزری طُوًى اسی جگہ کا نام ہے، ہم کلامی کا مطلب نبوت و رسالت سے نوازنا ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام آگ لینے گئے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں رسالت عطا فرمادی۔

(۵) یعنی کفر و معصیت اور تکبر میں حد سے تجاوز کر گیا ہے۔

(۶) یعنی کیا ایسا راستہ اور طریقہ تو پسند کرتا ہے جس سے تیری اصلاح ہو جائے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اور مطہع ہو جا۔

<p>(۱) سے ڈرنے لگے۔ (۱۹)</p> <p>پس سے بڑی نشانی دکھائی۔ (۲۰)</p> <p>تو اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی۔ (۲۱)</p> <p>پھر پلٹا دوڑ دھوپ کرتے ہوئے۔ (۲۲)</p> <p>پھر سب کو جمع کر کے پکارا۔ (۲۳)</p> <p>تم سب کا رب میں ہی ہوں۔ (۲۴)</p> <p>تو (سب سے بلند و بالا) اللہ نے بھی اسے آخرت کے اور دنیا کے عذاب میں گرفتار کر لیا۔ (۲۵)</p> <p>پیشک اس میں اس شخص کے لیے عبرت ہے جو ڈرے۔ (۲۶)</p> <p>کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟ (۸)</p>	<p>فَأَرَاهُمُ الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ ۝</p> <p>مَكَدَّ بَ وَعَظَىٰ ۝</p> <p>ثُمَّ أَدْبَرَ يَسْعَىٰ ۝</p> <p>فَصَحَّرَ قُنَادَىٰ ۝</p> <p>فَقَالَ إِنَّا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ ۝</p> <p>فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْإِبْرَةِ وَالْأُولَىٰ ۝</p> <p>إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ ۝</p> <p>مَا أَنْتُمْ أَشَدَّ خَلْقًا أَمَّا السَّمَاوَاتُ فَبُنِيَانًا ۝</p>
---	--

- (۱) یعنی اس کی توحید اور عبادت کا راستہ، تاکہ تو اس کے عقاب سے ڈرے۔ اس لیے کہ اللہ کا خوف اسی دل میں پیدا ہوتا ہے جو ہدایت پر چلنے والا ہوتا ہے۔
- (۲) یعنی اپنی صداقت کے وہ دلائل پیش کئے جو اللہ کی طرف سے انہیں عطا کئے گئے تھے۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے تھے۔ مثلاً یذبیض اور عصا اور بعض کے نزدیک آیات تسبیح۔
- (۳) لیکن ان دلائل و معجزات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور محمد صیب و نافرمانی کے راستے پر وہ گامزن رہا۔
- (۴) یعنی اس نے ایمان و اطاعت سے اعراض ہی نہیں کیا بلکہ زمین میں فساد پھیلانے اور موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے کی سعی کرتا رہا، چنانچہ جادو گروں کو جمع کر کے ان کا مقابلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کرایا، تاکہ موسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا ثابت کیا جاسکے۔
- (۵) اپنی قوم کو، یا قتال و محاربہ کے لیے اپنے لشکروں کو، یا جادو گروں کو مقابلے کے لیے جمع کیا اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ربوبیت اعلیٰ کا اعلان کیا۔
- (۶) یعنی اللہ نے اس کی ایسی گرفت فرمائی کہ اسے دنیا میں آئندہ آنے والے متمرذین کے لیے نشان عبرت بنا دیا اور قیامت کا عذاب اس کے علاوہ ہے، جو اسے وہاں ملے گا۔
- (۷) اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور کفار مکہ کو تنبیہ ہے کہ اگر انہوں نے گزشتہ لوگوں کے واقعات سے عبرت نہ پکڑی تو ان کا انجام بھی فرعون کی طرح ہو سکتا ہے۔
- (۸) یہ کفار مکہ کو خطاب ہے اور مقصود زجر و توبیح ہے کہ جو اللہ اتنے بڑے آسمانوں اور ان کے عجائبات کو پیدا کر سکتا ہے، اس

تعالیٰ نے اسے بنایا۔ (۲۷)

اسکی بلندی اونچی کی پھر اسے ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ (۲۸)^(۱)

اسکی رات کو تاریک بنایا اور اسکے دن کو نکالا۔ (۲۹)^(۲)

اور اس کے بعد زمین کو (ہموار) بچھا دیا۔ (۳۰)^(۳)

اس میں سے پانی اور چارہ نکالا۔ (۳۱)

اور پہاڑوں کو (مضبوط) گاڑ دیا۔ (۳۲)

یہ سب تمہارے اور تمہارے جانوروں کے فائدے کے لیے (ہیں) (۳۳)

پس جب وہ بڑی آفت (قیامت) آجائے گی۔ (۳۴)

جس دن کہ انسان اپنے کیے ہوئے کاموں کو یاد کرے گا۔ (۳۵)

اور (ہر) دیکھنے والے کے سامنے جہنم ظاہر کی جائے گی۔ (۳۶)^(۴)

رَفَعْنَا سَنَكُمَا مَسُوْبَهُمَا ۝
وَأَغْطَشْنَا لَيْلَهَا وَأَخْرَجْنَا ضُحَاهَا ۝
وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا ۝
أَخْرَجْنَا مِنْهَا مَاءً وَارْوَاهَا ۝
وَالْحِبَالَ اتُّسِمَا ۝
مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۝
فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَةُ الْكُبْرَى ۝
يَوْمَ يَصْدَكُ الْأُنسَانُ مَأْسَىٰ ۝
وَبَرَزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَرَىٰ ۝

کے لیے تمہارا دوبارہ پیدا کرنا کون سا مشکل ہے۔ کیا تمہیں دوبارہ پیدا کرنا آسمان کے بنانے سے زیادہ مشکل ہے؟

(۱) بعض نے سَمَكُ کے معنی چھت بھی کیے ہیں، ٹھیک ٹھاک کرنے کا مطلب، اسے ایسی شکل و صورت میں ڈھالنا ہے کہ جس میں کوئی تفاوت، کجی، شکاف اور خلل باقی نہ رہے۔

(۲) أَغْطَشْنَا أَظْلَمَ أَخْرَجَ کا مطلب اَبْرَزَا اور نَهَا زَهَا کی جگہ ضَحَّهَا اس لیے کہا کہ چاشت کا وقت سب سے اچھا اور عمدہ ہے۔ مطلب ہے کہ دن کو سورج کے ذریعے سے روشن بنایا۔

(۳) یہ حم السجدہ ۹ میں گزر چکا ہے کہ خَلَقَ (پیدائش) اور چیز ہے اور دَحَىٰ (ہموار کرنا) اور چیز ہے۔ زمین کی تخلیق آسمان سے پہلی ہوئی ہے لیکن اس کو ہموار آسمان کی پیدائش کے بعد کیا گیا ہے اور یہاں اسی حقیقت کا بیان ہے۔ اور ہموار کرنے یا پھیلانے کا مطلب ہے کہ زمین کو رہائش کے قابل بنانے کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے اللہ نے ان کا اہتمام فرمایا، مثلاً زمین سے پانی نکالا، اس میں چارہ اور خوراک پیدا کی، پہاڑوں کو میٹھوں کی طرح مضبوط گاڑ دیا تاکہ زمین نہ ہلے۔ جیسا کہ یہاں بھی آگے یہی بیان ہے۔

(۴) یعنی کافروں کے سامنے کر دی جائے گی تاکہ وہ دیکھ لیں کہ اب ان کا دامن ٹھکانا جہنم ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مومن اور کافر دونوں ہی اسے دیکھیں گے، مومن اسے دیکھ کر اللہ کا شکر کریں گے کہ اس نے ایمان اور اعمالِ صالحہ کی بدولت انہیں اس سے بچالیا، اور کافر جو پہلے ہی خوف و دہشت میں مبتلا ہوں گے، اسے دیکھ کر ان کے غم و حسرت میں اور اضافہ ہو جائے گا۔

تو جس (شخص) نے سرکشی کی (ہوگی)۔ (۳۷)^(۱)
 اور دنیوی زندگی کو ترجیح دی (ہوگی)۔ (۳۸)^(۲)
 (اس کا ٹھکانا جہنم ہی ہے۔ (۳۹)^(۳)
 ہاں جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے^(۴)
 سے ڈرتا رہا ہو گا اور اپنے نفس کو خواہش سے
 روکا ہو گا۔ (۴۰)^(۵)
 تو اس کا ٹھکانا جنت ہی ہے۔ (۴۱)^(۶)
 لوگ آپ سے قیامت کے واقع ہونے کا وقت دریافت
 کرتے ہیں۔ (۴۲)^(۷)
 آپ کو اس کے بیان کرنے سے کیا تعلق؟ (۴۳)^(۸)
 اس کے علم کی انتہا تو اللہ کی جانب ہے۔ (۴۴)
 آپ تو صرف اس سے ڈرتے رہنے والوں کو آگاہ کرنے
 والے ہیں۔ (۴۵)^(۹)

فَأَمَّا مَنْ طَغَى ۖ
 وَآسَأَ الْعُمُورَ الدُّنْيَا ۖ
 فَأَنَّى الْمُجِيزُ هِيَ الْمَأْوَى ۖ
 وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى ۖ

فَأَنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَى ۖ
 يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسِمُهَا ۖ

فِيمَا آتَتْ مِنْ دُونِهَا ۖ

إِلَىٰ رَبِّكَ مُنْتَهِيهَا ۖ

إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ مَّنْ يَخْطُبُهَا ۖ

(۱) یعنی کفر و معصیت میں حد سے تجاوز کیا ہو گا۔

(۲) یعنی دنیا کو ہی سب کچھ سمجھا ہو گا اور آخرت کے لیے کوئی تیاری نہیں کی ہوگی۔

(۳) اس کے علاوہ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہو گا، جہاں وہ اس سے بچ کر پناہ لے لے۔

(۴) کہ اگر میں نے گناہ اور اللہ کی نافرمانی کی تو مجھے اللہ سے بچانے والا کوئی نہیں ہو گا، اس لیے وہ گناہوں سے اجتناب کرتا رہا ہو۔

(۵) یعنی نفس کو ان معاصی اور محارم کے ارتکاب سے روکتا رہا ہو جن کی طرف نفس کا میلان ہوتا تھا۔

(۶) جہاں وہ قیامت پذیر، بلکہ اللہ کا مسلمان ہو گا۔

(۷) یعنی قیامت کب واقع اور قائم ہوگی؟ جس طرح کشتی اپنے آخری مقام پر پہنچ کر لنگر انداز ہوتی ہے اسی طرح قیامت کے وقوع کا صحیح وقت کیا ہے؟

(۸) یعنی آپ کو اس کی بابت یقینی علم نہیں ہے، اس لیے آپ کا اس کو بیان کرنے سے کیا تعلق؟ اس کا یقینی علم تو صرف اللہ ہی کے پاس ہے۔

(۹) یعنی آپ کا کام صرف انذار (ڈرانا) ہے، نہ کہ غیب کی خبریں دینا، جن میں قیامت کا علم بھی ہے جو اللہ نے کسی کو

جس روز یہ اسے دیکھ لیں گے تو ایسا معلوم ہو گا کہ صرف دن کا آخری حصہ یا اول حصہ ہی (دنیا میں) رہے ہیں۔^(۱) (۳۶)

سورہ عبس کی ہے اور اس میں پالیس آیتیں اور ایک رکوع ہے۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

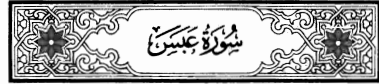
وہ ترش رو ہوا اور منہ موڑ لیا۔^(۱)

(صرف اس لیے) کہ اس کے پاس ایک نابینا آیا۔^(۲)

تجھے کیا خبر شاید وہ سنور جاتا۔^(۳)

یا نصیحت سنتا اور اسے نصیحت فائدہ پہنچاتی۔^(۴)

كَأَنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ رَوَّوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحًى



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَبَسَ وَتَوَلَّى ۱

أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَى ۲

وَمَا يَدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَسْمَعَى ۳

أَوْ يَدْرِيكَ ذَنْفَعَهُ الْذَكَرَى ۴

بھی نہیں دیا ہے۔ مَنْ يَخْشَاهَا اس لیے کہا کہ انذار و تبلیغ سے اصل فائدہ وہی اٹھاتے ہیں جن کے دلوں میں اللہ کا خوف ہوتا ہے، ورنہ انذار و تبلیغ کا حکم تو ہر ایک کے لیے ہے۔

(۱) عَشِيَّةٌ ظہر سے لے کر غروب شمس تک اور ضحیٰ، طلوع شمس سے نصف النہار تک کے لیے بولا جاتا ہے۔ یعنی جب کافر جنم کا عذاب دیکھیں گے تو دنیا کی عیش و عشرت اور اس کے مزے سب بھول جائیں گے اور انہیں ایسا محسوس ہو گا کہ وہ دنیا میں پورا ایک دن بھی نہیں رہے۔ دن کا پہلا حصہ یا دن کا آخری حصہ ہی صرف دنیا میں رہے ہیں یعنی دنیا کی زندگی انہیں اتنی قلیل معلوم ہو گی۔

☆ اس کی شان نزول میں تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اشرف قریش بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک ابن ام مکتوم جو نابینا تھے، تشریف لے آئے اور اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی باتیں پوچھنے لگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کچھ ناگواری محسوس کی اور کچھ بے توجہی سی برتی۔ چنانچہ تنبیہ کے طور پر ان آیات کا نزول ہوا۔ (ترمذی، تفسیر سورہ عبس۔ صحیحۃ الألبانی)

(۲) ابن ام مکتوم کی آمد سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر جو ناگواری کے اثرات ظاہر ہوئے، اسے عَبَسَ سے اور بے توجہی کو تَوَلَّى سے تعبیر فرمایا۔

(۳) یعنی وہ نابینا تھے سے دینی رہنمائی حاصل کر کے عمل صالح کرتا جس سے اس کا اخلاق و کردار سنور جاتا، اس کے باطن کی اصلاح ہو جاتی اور تیری نصیحت سننے سے اس کو فائدہ ہوتا۔

جو بے پروائی کرتا ہے۔ (۵)	أَمَّا مَنِ اسْتَفْتَى ۞
اس کی طرف تو توپوری توجہ کرتا ہے۔ (۶)	فَأَنبَتَ لَهُ تَصَدَى ۞
حالانکہ اس کے نہ سنورنے سے تجھ پر کوئی الزام نہیں۔ (۷)	وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزِلَّ ۞
اور جو شخص تیرے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے۔ (۸)	وَأَمَّا مَنْ جَاءَهُ يَسْعَى ۞
اور وہ ڈر (بھی) رہا ہے۔ (۹)	وَهُوَ يَخْطَى ۞
تو اس سے تو بے رخی برتا ہے۔ (۱۰)	فَأَنبَتَ عَنْهُ تَالَهَى ۞
یہ ٹھیک نہیں (قرآن تو نصیحت کی چیز) ہے۔ (۱۱)	كَلَّا إِنَّمَا تَدْعُ كُفْرًا ۞
جو چاہے اس سے نصیحت لے۔ (۱۲)	فَمَنْ شَاءَ ذَكُرًا ۞
(یہ تو) پر عظمت صحیفوں میں (ہے)۔ (۱۳)	فِي ضُفُوفٍ مُّكْرَمَةٍ ۞

(۱) ایمان سے اور اس علم سے جو تیرے پاس اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ یاد و سرا ترجمہ ہے جو صاحب ثروت و غنا ہے۔
 (۲) اس میں آپ ﷺ کو مزید توجہ دلائی گئی ہے کہ مخلصین کو چھوڑ کر معرینین کی طرف توجہ مبذول رکھنا صحیح بات نہیں ہے۔
 (۳) کیوں کہ تیرا کام تو صرف تبلیغ ہے۔ اس لیے اس قسم کے کفار کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔
 (۴) اس بات کا مطالبہ بن کر کہ تو خیر کی طرف اس کی رہنمائی کرے اور اسے وعظ و نصیحت سے نوازے۔
 (۵) یعنی اللہ کا خوف بھی اس کے دل میں ہے، جس کی وجہ سے یہ امید ہے کہ تیری باتیں اس کے لیے مفید ہوں گی اور وہ ان کو اپنائے گا اور ان پر عمل کرے گا۔

(۶) یعنی ایسے لوگوں کی تو قدر افزائی کی ضرورت ہے نہ کہ ان سے بے رخی برتنے کی۔ ان آیات سے یہ بات معلوم ہوئی کہ دعوت و تبلیغ میں کسی کو خاص نہیں کرنا چاہیے بلکہ اصحاب حیثیت اور بے حیثیت، امیر اور غریب، آقا و غلام، مرد اور عورت، چھوٹے اور بڑے سب کو یکساں حیثیت دی جائے اور سب کو مشترکہ خطاب کیا جائے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اپنی حکمت بالغہ کے تحت ہدایت سے نواز دے گا۔ (ابن کثیر)

(۷) یعنی غریب سے یہ اعراض اور اصحاب حیثیت کی طرف خصوصی توجہ، یہ ٹھیک نہیں۔ مطلب ہے کہ، آئندہ اس کا اعادہ نہ ہو۔

(۸) یعنی جو اس میں رغبت کرے، وہ اس سے نصیحت حاصل کرے، اسے یاد کرے اور اس کے موجبات پر عمل کرے۔ اور جو اس سے اعراض کرے اور بے رخی برتے، جیسے اشراف قریش نے کیا، تو ان کی نگر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۹) یعنی لوح محفوظ میں، کیوں کہ وہیں سے یہ قرآن اترتا ہے۔ یا مطلب ہے کہ یہ صحیفے اللہ کے ہاں بڑے محترم ہیں کیوں کہ وہ علم و حکمت سے پر ہیں۔

جو بلند و بالا اور پاک صاف ہیں۔ ^(۱) (۱۳)	مَرْفُوعَةٌ مُطَهَّرَةٌ ۞
ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ^(۲) (۱۵)	يَا أَيُّدِي سَفَرَةٍ ۞
جو بزرگ اور پاکباز ہیں۔ ^(۳) (۱۶)	كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۞
اللہ کی مار انسان پر کیسا ناشکرا ہے۔ ^(۴) (۱۷)	فُقِيلَ الْإِنْسَانَ مَا أُكْفَرَهُ ۞
اسے اللہ نے کس چیز سے پیدا کیا۔ (۱۸)	مِنْ أَبِي شَيْءٍ خَلَقَهُ ۞
(اسے) ایک نطفہ سے، ^(۵) پھر اندازہ پر رکھا اس کو۔ ^(۶) (۱۹)	مِنْ نُطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَرَهُ ۞
پھر اس کے لیے راستہ آسان کیا۔ ^(۷) (۲۰)	ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ۞
پھر اسے موت دی اور پھر قبر میں دفن کیا۔ ^(۸) (۲۱)	ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ۞

(۱) مَرْفُوعَةٌ اللہ کے ہاں رفیع القدر ہیں، یا شہادت اور تقاض سے بلند ہیں۔ مُطَهَّرَةٌ، وہ بالکل پاک ہیں کیوں کہ انہیں پاک لوگوں (فرشتوں) کے سوا کوئی چھوٹا ہی نہیں ہے۔ یا کمی بیشی سے پاک ہے۔

(۲) سَفَرَةٌ، مسافر کی جمع ہے، یہ سفارت سے ہے۔ مراد یہاں وہ فرشتے ہیں جو اللہ کی وحی اس کے رسولوں تک پہنچاتے ہیں۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول کے درمیان سفارت کا کام کرتے ہیں۔ یہ قرآن ایسے سفیروں کے ہاتھوں میں ہے جو اسے لوح محفوظ سے نقل کرتے ہیں۔

(۳) یعنی خلق کے اعتبار سے وہ کریم یعنی شریف اور بزرگ ہیں اور افعال کے اعتبار سے وہ نیکو کار اور پاکباز ہیں۔ یہاں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ حامل قرآن (حافظ اور عالم) کو بھی اخلاق و کردار اور افعال و اطوار میں کِرَامٍ بَرَرَةٍ کا مصداق ہونا چاہیے۔ (ابن کثیر) حدیث میں بھی سَفَرَةٌ کا لفظ فرشتوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جو قرآن پڑھتا ہے اور وہ اس کا ماہر ہے، وہ السَّفَرَةُ الْكِرَامُ الْبَرَرَةُ (فرشتوں) کے ساتھ ہو گا اور جو قرآن پڑھتا ہے، لیکن مشقت کے ساتھ۔ (یعنی ماہرین کی طرح سہولت اور روانی سے نہیں پڑھتا) اس کے لیے دو گنا اجر ہے۔

(صحیح بخاری، تفسیر سورۃ عبس مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل الماہر بالقرآن.....)

(۴) اس سے وہ انسان مراد ہے جو بغیر کسی سند اور دلیل کے قیامت کی تکذیب کرتا ہے، فُقِيلَ یعنی لُغْنِ اور مَا أُكْفَرَهُ! فعل تجب ہے، کس قدر ناشکرا ہے۔ آگے اس انسان کفور کو غور و فکر کی دعوت دی جا رہی ہے کہ شاید وہ اپنے کفر سے باز آجائے۔

(۵) یعنی جس کی پیدائش ایسے حقیر قطرہ آب سے ہوئی ہے، کیا اسے تکبر زیب دیتا ہے؟

(۶) اس کا مطلب ہے کہ اسکے مصالح نفس اسے میا کیے، اسکو دو ہاتھ دو پیر اور دو آنکھیں اور دیگر آلات و خواص عطا کیے۔

(۷) یعنی خیر اور شر کے راستے اس کے لیے واضح کر دیئے۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد ماں کے پیٹ سے نکلنے کے راستہ ہے۔ لیکن پہلا مفہوم زیادہ صحیح ہے۔

(۸) یعنی موت کے بعد، اسے قبر میں دفنانے کا حکم دیا تاکہ اس کا احترام برقرار رہے ورنہ درندے اور پرندے اس کی

پھر جب چاہے گا سے زندہ کر دے گا۔ (۲۲)
 ہرگز نہیں،^(۱) اس نے اب تک اللہ کے حکم کی بجا آوری
 نہیں کی۔ (۲۳)
 انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کو دیکھے۔^(۲) (۲۴)
 کہ ہم نے خوب پانی برسایا۔ (۲۵)
 پھر پھاڑ زمین کو اچھی طرح۔ (۲۶)
 پھر اس میں سے اناج اگائے۔ (۲۷)
 اور انگور اور ترکاری۔ (۲۸)
 اور زیتون اور کھجور۔ (۲۹)
 اور گنجان باغات۔ (۳۰)
 اور میوہ اور (گھاس) چارہ (بھی اگایا)۔^(۳) (۳۱)
 تمہارے استعمال و فائدہ کے لیے اور تمہارے چوپایوں
 کے لیے۔ (۳۲)
 پس جب کہ کان بہرے کر دینے والی (قیامت) آجائے
 گی۔^(۴) (۳۳)
 اس دن آدمی اپنے بھائی سے۔ (۳۴)
 اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے۔ (۳۵)
 اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ (۳۶)
 ان میں سے ہر ایک کو اس دن ایسی فکر (دامن گیر) ہوگی
 جو اس کے لیے کافی ہوگی۔^(۵) (۳۷)

ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشُرَهُ ﴿٢٢﴾
 كَلَّا لَمَّا يُفْضِ مَآ أَمْرَهُ ﴿٢٣﴾
 فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ ﴿٢٤﴾
 أَكَا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ﴿٢٥﴾
 ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ﴿٢٦﴾
 فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ﴿٢٧﴾
 وَعَبًّا وَنَضْبًا ﴿٢٨﴾
 وَزَيْتُونًا تَأْمَلًا ﴿٢٩﴾
 وَجَدَايِقَ غُلَبًا ﴿٣٠﴾
 فَكَاكِمَةً وَأَبَاًا ﴿٣١﴾
 مَنَآ عَاكِلًا وَلَا نَعْمًا كَلًا ﴿٣٢﴾
 فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاعِثَةُ ﴿٣٣﴾
 يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ﴿٣٤﴾
 وَأُوَيْهِ وَآبِيهِ ﴿٣٥﴾
 وَصَاحِبَتِهِ وَبَيْنِيهِ ﴿٣٦﴾
 لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ﴿٣٧﴾

لاش کو کوچ کوچ کر کھاتے جس سے اس کی بے حرمتی ہوتی۔

(۱) یعنی معاملہ اس طرح نہیں ہے، جس طرح یہ کافر کہتا ہے۔

(۲) کہ اسے اللہ نے کس طرح پیدا کیا، جو اس کی زندگی کا سبب ہے اور کس طرح اس کے لیے اسباب معاش مہیا کئے
 تاکہ وہ ان کے ذریعے سعادت اخروی حاصل کر سکے۔

(۳) آبًا، وہ گھاس چارہ جو خود رو ہو اور جسے جانور کھاتے ہیں۔

(۴) قیامت کو صَاحِثَةٌ (بہرا کر دینے والی) اس لیے کہا کہ وہ ایک نہایت سخت چیخ کے ساتھ واقع ہوگی جو کانوں کو بہرا کر دے گی۔

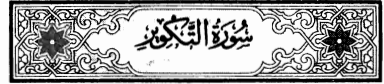
(۵) یا اپنے اقربا اور احباب سے بے نیاز اور بے پروا کر دے گا۔ حدیث میں آتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ سب لوگ میدان

اس دن بہت سے چہرے روشن ہوں گے۔ (۳۸)
 (جو) ہنستے ہوئے اور ہشاش بشاش ہوں گے۔ (۳۹)^(۱)
 اور بہت سے چہرے اس دن غبارِ آلود ہوں گے۔ (۴۰)
 جن پر سیاہی چڑھی ہوئی ہوگی۔ (۴۱)^(۲)
 وہ یہی کافرِ کدرا لوگ ہوں گے۔ (۴۲)^(۳)

وَوُجُوًا يُومِئِدُ مَسْفِرًا ۙ ﴿۳۸﴾
 صَاحِلَةً مُّسْتَبْشِرَةً ۙ ﴿۳۹﴾
 وَوُجُوًا يُومِئِدُ عَلَيْهَا غُبْرًا ۙ ﴿۴۰﴾
 تَرَهَقَهَا قَدْرًا ۙ ﴿۴۱﴾
 أُولَٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرَةُ الْفَجْرَةُ ۙ ﴿۴۲﴾

سورہ تکویر کی ہے اور اس میں انتیس آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
 نہایت رحم والا ہے۔
 جب سورج لپیٹ لیا جائے گا۔ (۱)^(۴)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۙ ﴿۱﴾

محشر میں ننگے بدن، ننگے پیر، پیدل اور غیر محنتوں ہوں گے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا، اس طرح شرم گاہوں پر نظر نہیں پڑے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں یہی آیت تلاوت فرمائی۔ یعنی ﴿لِجَلِّ امْرِئِيْنَ مِنْهُمْ﴾ ﴿الترمذی تفسیر سورۃ عبس النسانی، کتاب الجنائز، باب البعث﴾ اس کی وجہ بعض کے نزدیک یہ ہے کہ انسان اپنے گھر والوں سے اس لیے بھاگے گا تاکہ وہ اس کی وہ تکلیف اور شدت نہ دیکھیں جس میں وہ مبتلا ہو گا۔ بعض کہتے ہیں اس لیے کہ انہیں علم ہو گا کہ وہ کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے اور ان کے کچھ کام نہیں آسکتے۔ (فتح القدیر)

(۱) یہ اہل ایمان کے چہرے ہوں گے، جنہیں ان کے اعمال نامے ان کے دائیں ہاتھ میں ملیں گے جس سے انہیں اپنی اخروی سعادت و کامیابی کا یقین ہو جائے گا، جس سے ان کے چہرے خوشی سے تہمتارہے ہوں گے۔
 (۲) یعنی زلت اور معاینۃ عذاب سے ان کے چہرے غبارِ آلود، کدورت زدہ اور سیاہ ہوں گے، جیسے محزون اور نہایت غمگین آدمی کا چہرہ ہوتا ہے۔

(۳) یعنی اللہ کا رسولوں کا اور قیامت کا انکار کرنے والے بھی تھے اور بد کردار و بد اطوار بھی۔ اللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْنَا مِنْهُمْ۔
 ☆ اس سورت میں بطور خاص قیامت کی منظر کشی کی گئی ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ”جس کو یہ بات پسند ہے کہ وہ قیامت کو اس طرح دیکھے، جیسے آنکھ سے دیکھنا ہوتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ ﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾، إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ اور إِذَا السَّمَاءُ انْفَضَّتْ ﴿غور اور توجہ سے﴾ پڑھے۔ (الترمذی، تفسیر سورۃ التکویر،

مسند أحمد ۲/۳۶۲۷-۱۰۰۰ ذکرہ الألبانی فی الصحیحہ 'نمبر ۱۰۸۱' ج ۳)

(۴) یعنی جس طرح سر پہ عمامہ لپیٹا جاتا ہے، اس طرح سورج کے وجود کو لپیٹ کر پھینک دیا جائے گا۔ جس سے اس کی

اور جب ستارے بے نور ہو جائیں گے۔ (۲) ^(۱)	وَلَاذَ الْجِبَالِ سُبُوتٌ ﴿۲﴾
اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔ (۳) ^(۲)	وَلَاذَ الْعِشَارِ عُطُلَاتٌ ﴿۳﴾
اور جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں۔ (۴) ^(۳)	وَلَاذَ الْوُحُوشِ جُحُوتٌ ﴿۴﴾
اور جب وحشی جانور اکٹھے کیے جائیں گے۔ (۵) ^(۴)	وَلَاذَ الْبِحَارِ سُبُوتٌ ﴿۵﴾
اور جب سمندر بھڑکائے جائیں گے۔ (۶) ^(۵)	وَلَاذَ الْغُفُوسِ زُجُوتٌ ﴿۶﴾
اور جب جانیں (جسوں سے) ملا دی جائیں گی۔ (۷) ^(۶)	وَلَاذَ الْمَوَدَّةِ غُطُوتٌ ﴿۷﴾
اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے سوال کیا جائے گا۔ (۸)	يَأْتِي ذَيْبٌ قُتِلَتْ ﴿۸﴾
کہ کس گناہ کی وجہ سے وہ قتل کی گئی؟ (۹) ^(۷)	وَلَاذَ الضُّحَفِ فُتْرَتٌ ﴿۹﴾
اور جب نامہ اعمال کھول دیئے جائیں گے۔ (۱۰) ^(۸)	

روشنی از خود ختم ہو جائے گی۔ حدیث میں ہے الشمس والقمر مکوران يوم القيامة (صحیح بخاری، بدء الخلق، باب صفة الشمس والقمر بحسبان) ”قیامت والے دن چاند اور سورج لپیٹ دیئے جائیں گے۔“ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ لپیٹ کر ان دونوں کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا تاکہ مشرکین مزید ذلیل و خوار ہوں جو ان کی عبادت کرتے تھے۔ (فتح الباری، باب مذکور)

(۱) دوسرا ترجمہ ہے جھڑ کر گر جائیں گے یعنی آسمان پر ان کا وجود ہی نہیں رہے گا۔

(۲) یعنی انہیں زمین سے اکھڑ کر ہواؤں میں چلا دیا جائے گا اور وہ دھنی ہوئی روٹی کی طرح اڑیں گے۔

(۳) عِشَارٌ، عَشْرَاءُ کی جمع ہے، حمل والیاں یعنی گابھن اونٹنیاں، گابھن اونٹنیاں، جب ان کا حمل دس مہینوں کا ہو جاتا تو عربوں میں یہ بہت نفیس اور قیمتی سمجھی جاتی تھیں۔ جب قیامت برپا ہوگی تو ایسا ہولناک منظر ہو گا کہ اگر کسی کے پاس اس قسم کی قیمتی اونٹنی بھی ہوں گی تو وہ ان کی بھی پروا نہیں کرے گا۔

(۴) یعنی انہیں بھی قیامت والے دن جمع کیا جائے گا۔

(۵) یعنی ان میں اللہ کے حکم سے آگ بھڑک اٹھے گی۔

(۶) اس کے کئی مفہوم بیان کئے گئے ہیں۔ زیادہ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کو اس کے ہم مذہب و ہم مشرب کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ مومن کو مومنوں کے ساتھ اور بد کو بدوں کے ساتھ، یہودی کو یہودیوں کے ساتھ اور عیسائی کو عیسائیوں کے ساتھ۔ وَعَلَىٰ هَذَا الْقِيَاسِ .

(۷) اس طرح دراصل قاتل کو سرزنش کی جائے گی کیونکہ اصل مجرم تو وہی ہو گا نہ کہ موعودہ، جس سے بظاہر سوال ہو گا۔

(۸) موت کے وقت یہ صحیفہ لپیٹ دیئے جاتے ہیں، پھر قیامت والے دن حساب کے لیے کھول دیئے جائیں گے، جنہیں

اور جب آسمان کی کھال اتار لی جائے گی۔ (۱۱)	وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ﴿۱۱﴾
اور جب جنم بھڑکائی جائے گی۔ (۱۲)	وَإِذَا الْجِبَابِمْ سُورَتْ ﴿۱۲﴾
اور جب جنت نزدیک کر دی جائے گی۔ (۱۳)	وَإِذَا الْجَنَّةُ أُنزِلَتْ ﴿۱۳﴾
تو اس دن ہر شخص جان لے گا جو کچھ لے کر آیا ہو گا۔ (۱۴)	عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ ﴿۱۴﴾
میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے۔ (۱۵)	فَلَا أَقْسَمُ بِأَنْفُسِي ﴿۱۵﴾
چلنے پھرنے والے چھپنے والے ستاروں کی۔ (۱۶)	أَلْبَوَارِ الْكُنُوسِ ﴿۱۶﴾
اور رات کی جب جانے لگے۔ (۱۷)	وَاللَّيْلِ إِذَا عَنَصَسَ ﴿۱۷﴾
اور صبح کی جب چمکنے لگے۔ (۱۸)	وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾
یقیناً یہ ایک بزرگ رسول کا کہا ہوا ہے۔ (۱۹)	إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿۱۹﴾
جو قوت والا ہے، (۲۰) عرش والے (اللہ) کے نزدیک بلند مرتبہ ہے۔ (۲۰)	ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ﴿۲۰﴾

ہر شخص دیکھ لے گا بلکہ ہاتھوں میں پکڑا دیئے جائیں گے۔

- (۱) یعنی وہ اس طرح ادھیڑ دیئے جائیں گے جس طرح چھت ادھیڑ دی جاتی ہے۔
- (۲) یہ جواب ہے یعنی جب مذکورہ امور ظہور پذیر ہوں گے، جن میں سے پہلے چھ امور کا تعلق دنیا سے ہے اور دوسرے چھ امور کا آخرت سے۔ اس وقت ہر ایک کے سامنے اس کی حقیقت آجائے گی۔
- (۳) اس سے مراد ستارے ہیں خُنُوسٌ، خَنَسٌ سے ہے جس کے معنی پیچھے ہٹنے کے ہیں۔ یہ ستارے دن کے وقت اپنے منظر سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور نظر نہیں آتے۔ اور یہ زحل، مشتری، مریخ، زہرہ، عطارد ہیں، یہ خاص طور پر سورج کے رخ پر ہوتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ سارے ہی ستارے مراد ہیں، کیوں کہ سب ہی اپنے غائب ہونے کی جگہ پر غائب ہو جاتے ہیں یا دن کو چھپے رہتے ہیں اَلْبَوَارِ چلنے والے، اَلْكُنُوسِ چھپ جانے والے، جیسے ہرن اپنے مکان اور مسکن میں چھپ جاتا ہے۔
- (۴) عَسَسَ اضماد میں سے ہے، یعنی آنے اور جانے دونوں معنوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے، تاہم یہاں جانے کے معنی میں ہے۔

(۵) یعنی جب اس کا ظہور و طلوع ہو جائے، یا وہ پھٹ اور نکل آئے۔

(۶) اس لیے کہ وہ اسے اللہ کی طرف سے لے کر آیا ہے۔ مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔

(۷) یعنی جو کام اس کے سپرد کیا جائے، اسے پوری قوت سے کرتا ہے۔

<p>(۱) جس کی (آسمانوں میں) اطاعت کی جاتی ہے امین^(۱) ہے۔ (۲۱)</p> <p>اور تمہارا ساتھی دیوانہ نہیں ہے۔^(۲) (۲۲)</p> <p>اس نے اس (فرشتے) کو آسمان کے کھلے کنارے پر دیکھا بھی ہے۔^(۳) (۲۳)</p> <p>اور یہ غیب کی باتوں کو بتلانے میں بخیل بھی نہیں۔^(۴) (۲۴)</p> <p>اور یہ قرآن شیطاں مردود کا کلام نہیں۔^(۵) (۲۵)</p> <p>پھر تم کہاں جا رہے ہو۔^(۶) (۲۶)</p> <p>یہ تو تمام جہان والوں کے لیے نصیحت نامہ ہے۔ (۲۷)</p> <p>(بالخصوص) اس کے لیے جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلنا چاہے۔ (۲۸)</p>	<p>مُطَاعٍ كَمَا أَمِينٌ ﴿۲۱﴾</p> <p>وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ ﴿۲۲﴾</p> <p>وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأَفْقِ الْمِيمِينِ ﴿۲۳﴾</p> <p>وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَبِينٍ ﴿۲۴﴾</p> <p>وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَجِيعٍ ﴿۲۵﴾</p> <p>فَأَيُّنَ تَدَّهَبُونَ ﴿۲۶﴾</p> <p>إِنَّ هُوَ لَآذِكُرُّ لِلْعَالَمِينَ ﴿۲۷﴾</p> <p>لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَعِزَّ ﴿۲۸﴾</p>
--	--

(۱) یعنی فرشتوں کے درمیان اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ وہ فرشتوں کا مرجع اور مطاع ہے نیز وحی کے سلسلے میں امین ہے۔
(۲) یہ خطاب اہل مکہ سے ہے اور صاحب سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یعنی تم جو گمان رکھتے ہو کہ تمہارا ہم نسب اور ہم وطن ساتھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) دیوانہ ہے۔ نعوذ باللہ۔ ایسا نہیں ہے؛ ذرا قرآن پڑھ کر تو دیکھو کہ کیا کوئی دیوانہ ایسے معارف و حقائق بیان کر سکتا ہے اور گزشتہ قوموں کے صحیح صحیح حالات بتلا سکتا ہے جو اس قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔

(۳) یہ پہلے گزر چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو دو مرتبہ ان کی اصلی حالت میں دیکھا ہے، جن میں سے ایک کا یہاں ذکر ہے۔ یہ ابتدائے نبوت کا واقعہ ہے، اس وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام کے چھ سو پرتھے؛ جنہوں نے آسمان کے کناروں کو بھردیا تھا۔ دو سری مرتبہ معراج کے موقع پر دیکھا۔ جیسا کہ سورہ نجم میں تفصیل گزر چکی ہے۔

(۴) یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت وضاحت کی جا رہی ہے کہ آپ کو جن باتوں کی اطلاع دی جاتی ہے؛ جو احکام و فرائض آپ کو بتلائے جاتے ہیں؛ ان میں سے کوئی بات آپ اپنے پاس نہیں رکھتے بلکہ فریضہ رسالت کی ذمے داریوں کا احساس کرتے ہوئے ہر بات اور ہر حکم لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں۔

(۵) جس طرح نجومیوں کے پاس شیطاں آتے ہیں اور آسمانوں کی بعض چوری چھپی باتیں ادھوری شکل میں انہیں بتلا دیتے ہیں۔ قرآن ایسا نہیں ہے۔

(۶) یعنی کیوں اس سے اعراض کرتے ہو؟ اور اس کی اطاعت نہیں کرتے؟

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۰﴾

اور تم بغیر پروردگار عالم کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے۔ (۲۹) (۱)



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ﴿۱﴾

وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَبَرَتْ ﴿۲﴾

وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿۳﴾

وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ﴿۴﴾

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا كَذَّبَتْ وَاعْتَرَتْ ﴿۵﴾

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّبَكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ﴿۶﴾

سورۃ انفطار کی ہے اور اس میں انیس آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نمایت رحم والا ہے۔

جب آسمان پھٹ جائے گا۔ (۱) (۲)

اور جب ستارے جھڑ جائیں گے۔ (۲)

اور جب سمندر بہہ نکلیں گے۔ (۳) (۳)

اور جب قبریں (شق کر کے) اکھاڑ دی جائیں گی۔ (۴) (۴)

(اس وقت) ہر شخص اپنے آگے بھیجے ہوئے اور پیچھے
چھوڑے ہوئے (یعنی اگلے پیچھے اعمال) کو معلوم کر لے
گا۔ (۵) (۵)

اے انسان! تجھے اپنے رب کریم سے کس چیز نے برکایا؟ (۶) (۶)

(۱) یعنی تمہاری چاہت، اللہ کی توفیق پر منحصر ہے، جب تک تمہاری چاہت کے ساتھ اللہ کی مشیت اور اس کی توفیق بھی شامل نہیں ہوگی، اس وقت تک تم سیدھا راستہ بھی اختیار نہیں کر سکتے۔ یہ وہی مضمون ہے جو ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ﴾ (الفصص ۵۶) وغیرہ آیات میں بیان ہوا ہے۔

(۲) یعنی اللہ کے حکم اور اس کی بیعت سے پھٹ جائے گا اور فرشتے نیچے اتر آئیں گے۔

(۳) اور سب کا پانی ایک ہی سمندر میں جمع ہو جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ پیچھی ہوا بھیجے گا۔ جو اس میں آگ بھڑکا دے گی جس سے فلک شگاف شعلے بلند ہوں گے۔

(۴) یعنی قبروں سے مردے زندہ ہو کر باہر نکل آئیں گے۔ بُعْثِرَتْ 'اکھیز دی جائیں گی' یا ان کی مٹی پلٹ دی جائے گی۔

(۵) یعنی جب مذکورہ امور واقع ہوں گے تو انسان کو اپنے تمام کیے دھرے کا علم ہو جائے گا، جو بھی اچھلایا برا عمل اس نے کیا ہو گا، وہ سامنے آجائے گا۔ پیچھے چھوڑے ہوئے عمل سے مراد اپنے پیچھے اپنے کردار و عمل کے اچھے یا برے نمونے ہیں جو دنیا میں وہ چھوڑ آیا اور لوگ ان نمونوں پر عمل کرتے ہیں۔ یہ نمونے اگر اچھے ہیں تو اس کے مرنے کے بعد ان نمونوں پر جو لوگ بھی عمل کریں گے، اس کا ثواب اسے بھی پہنچتا ہے گا اور اگر برے نمونے اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے تو جو بھی اسے اپنانے گا، ان کا گناہ بھی اس شخص کو پہنچتا ہے گا، جس کی مسامی سے وہ برا طریقہ یا کام رائج ہوا۔

(۶) یعنی کس چیز نے تجھے دھوکے اور فریب میں مبتلا کر دیا کہ تو نے اس رب کے ساتھ کفر کیا، جس نے تجھ پر احسان کیا

الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوِّكَ فَعَدَلَكَ ۝

جس (رب نے) تجھے پیدا کیا،^(۱) پھر ٹھیک ٹھاک کیا،^(۲) پھر
(درست اور) برابر بنایا۔^(۳) (۷)

فِي آتِي صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ ۝

جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔^(۴) (۸)

كَذَٰلِكَ نَتَلَوُّنَ بِالْأَدْبَانِ ۝

ہرگز نہیں بلکہ تم تو جزا و سزا کے دن کو جھٹلاتے
ہو۔^(۵) (۹)

وَأَنَّ عَلَيْكُمْ لِحُطْبَيْنِ ۝

یقیناً تم پر گنہگار عزت والے۔^(۱۰)

كِرَامًا كَتِيبٍ ۝

لکھنے والے مقرر ہیں۔^(۱۱)

يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۝

جو کچھ تم کرتے ہو وہ جاننے ہیں۔^(۱۲) (۱۳)

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝

یقیناً نیک لوگ (جنت کے عیش و آرام اور) نعمتوں میں

اور تجھے وجود بخشا، تجھے عقل و فہم عطا کی اور اسباب حیات تیرے لیے مہیا کیے۔

(۱) یعنی حقیر لطف سے، جب کہ اس سے پہلے تیرا وجود نہیں تھا۔

(۲) یعنی تجھے ایک کامل انسان بنا دیا، تو سستا ہے، دیکھتا ہے اور عقل و فہم رکھتا ہے۔

(۳) تجھے معتدل، کھڑا اور حسن صورت والا بنایا، یا تیری دونوں آنکھوں، دونوں کانوں، دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں کو برابر برابر بنایا۔ اگر تیرے اعضاء میں یہ برابری اور مناسبت نہ ہوتی تو تیرے وجود میں حسن کے بجائے بے ذہب پن ہو جاتا۔ اسی تخلیق کو دوسرے مقام پر اَحْسَنَ تَقْوِيمٍ سے تعبیر فرمایا، ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾

(۴) اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ بچے کو جس کے چاہے مشابہ بنا دے۔ باپ کے، ماں کے یا ماموں اور چچا کے۔

دوسرا مطلب ہے کہ وہ جس شکل میں چاہے، ڈھال دے، حتیٰ کہ قبیح ترین جانور کی شکل میں بھی پیدا کر سکتا ہے لیکن یہ

اس کا لطف و کرم اور مہربانی ہے کہ وہ ایسا نہیں کرتا اور بہترین انسانی شکل میں ہی پیدا فرماتا ہے۔

(۵) كَلًّا، حَقًّا کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور کافروں کے اس طرز عمل کی نفی بھی جو اللہ کریم کی رافت و رحمت

سے دھوکے میں مبتلا ہونے پر مبنی ہے یعنی اس فریب نفس میں مبتلا ہونے کا کوئی جواز نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ

تمہارے دلوں میں اس بات پر یقین نہیں ہے کہ قیامت ہوگی اور وہاں جزا و سزا ہوگی۔

(۶) یعنی تم تو جزا و سزا کے منکر ہو، لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارا ہر قول اور ہر فعل نوٹ ہو رہا ہے۔ اللہ کی

طرف سے فرشتے تم پر بطور نگران مقرر ہیں جو تمہاری ہر اس بات کو جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔ یہ گویا انسانوں کو تنبیہ

ہے کہ ہر عمل اور بات سے پہلے سوچ لو کہ وہ غلط تو نہیں۔ یہ وہی بات ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔ مثلاً ﴿عَنِ الْمُنِفِئِينَ وَحَنِ

الْجَمَالِ قَبِيئًا * مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَاتِدٌ﴾ (سورۃ ق، ۱۷ - ۱۸) یعنی ” ایک فرشتہ اس کے دائیں اور دوسرا

ہوں گے۔ (۱۳)

اور یقیناً بدکار لوگ دوزخ میں ہوں گے۔ (۱۳)^(۱)

بدلے والے دن اس میں جائیں گے۔ (۱۵)^(۲)

وہ اس سے کبھی غائب نہ ہونے پائیں گے۔ (۱۶)^(۳)

تجھے کچھ خبر بھی ہے کہ بدلے کا دن کیا ہے۔ (۱۷)

میں پھر (کتا ہوں کہ) تجھے کیا معلوم کہ جزا (اور سزا) کا

دن کیا ہے۔ (۱۸)^(۴)

(وہ ہے) جس دن کوئی شخص کسی شخص کے لیے کسی چیز کا

مختار نہ ہو گا، اور (تمام تر) احکام اس روز اللہ کے ہی

ہوں گے۔ (۱۹)^(۵)

وَأِنَّ الْفُجَّارَ لَكَيْ جَحِيمٌ ﴿۱۳﴾

يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ﴿۱۵﴾

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ﴿۱۶﴾

وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمَ الدِّينِ ﴿۱۷﴾

كُلُّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمَ الدِّينِ ﴿۱۸﴾

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ

يَوْمَ لِلَّهِ ﴿۱۹﴾

اس کے بائیں جانب بیٹھا ہوا ہے، انسان جو بولتا ہے، اس کے پاس نگران، تیار اور حاضر ہے، یعنی لکھنے کے لیے۔ کہتے ہیں ایک فرشتہ نیکی اور دوسرا بدی لکھتا ہے۔ اور احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ دن کے دو فرشتے الگ اور رات کے دو فرشتے الگ ہیں۔ آگے نیکیوں اور بدوں، دونوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

(۱) جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا، ﴿فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي النَّارِ﴾ (الشوریٰ: ۷)

(۲) یعنی جس جزا و سزا کے دن کا وہ انکار کرتے تھے اسی دن جہنم میں اپنے اعمال کی پاداش میں داخل ہوں گے۔

(۳) یعنی کبھی اس سے جدا نہیں ہوں گے اور اس سے غائب نہیں ہوں گے۔ بلکہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

(۴) تکرار، اس کی عظمت و ضخامت اور اس دن کی ہولناکیوں کی وضاحت کے لیے ہے۔

(۵) یعنی دنیا میں تو اللہ نے عارضی طور پر، آزمانے کے لیے، انسانوں کو کم و بیش کے کچھ فرق کے ساتھ اختیارات دے رکھے ہیں۔ لیکن قیامت والے دن تمام اختیارات کلیتاً صرف اور صرف اللہ کے پاس ہوں گے۔ جیسے فرمایا ﴿لِلَّهِ

الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (سورہ مؤمن، ۱۶) چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی حضرت صفیہ

رضی اللہ عنہا اور اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا تھا، «لَا أَمْلِكُ لَكُمْ مِنْ اللَّهِ شَيْئًا» (صحیح مسلم، کتاب

الإيمان، اور بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کو بھی متنبہ فرمایا، «أَتَقْدِرُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، وَاللَّهِ! لَا أَمْلِكُ لَكُمْ مِنْ

اللَّهِ شَيْئًا» (مسلم، کتاب مذکور، بخاری، سورہ الشعراء)

سورہ مطفین کی ہے اور اس میں چھتیس آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔ (۱)
کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں۔ (۲)
اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم
دیتے ہیں۔ (۳)^(۱)
کیا انہیں اپنے مرنے کے بعد جی اٹھنے کا خیال نہیں۔ (۴)
اس عظیم دن کے لیے۔ (۵)
جس دن سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے
ہوں گے۔ (۶)^(۲)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَبِئْسَ الَّذِیْنَ لَا مُطَفِّفِیْنَ ۝
الَّذِیْنَ اِذَا الْكٰتِلُوْا عَلَی النَّاسِ سَبَوْنَهُمْ ۝
وَاِذَا كَانُوْا لَهُمْ اَوْدُوْا وُزُوْهُمْ یَخِیْرُوْنَ ۝
اَلَا یَظُنُّوْنَ اَنَّ لَیْلَکَ اَنْتُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝
لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝
یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

☆- بعض اسے کمی اور بعض مدنی قرار دیتے ہیں، بعض کے نزدیک کمے اور مدینے کے درمیان نازل ہوئی۔ اس کی شان نزول میں یہ روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ ناپ تول کے لحاظ سے خمیث ترین لوگ تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی، جس کے بعد انہوں نے اپنی ناپ تول صحیح کر لی۔ (ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب الصوفی فی الکیل والوزن)

(۱) یعنی لینے اور دینے کے الگ الگ پیمانے رکھنا اور اس طرح ڈنڈی مار کر ناپ تول میں کمی کرنا، بہت بڑی اخلاقی بیماری ہے جس کا نتیجہ دین و آخرت میں تباہی ہے۔ ایک حدیث میں ہے، جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے، تو اس پر قحط سالی، سخت محنت اور حکمرانوں کا ظلم مسلط کر دیا جاتا ہے۔ (ابن ماجہ، نمبر ۳۰۱۹، ذکرہ الألبانی فی الصحیحۃ نمبر ۱۰۶۱ من عدۃ طرق ولہ شواہد)

(۲) یہ ڈنڈی مارنے والے اس بات سے نہیں ڈرتے کہ ایک بڑا ہولناک دن آنے والا ہے جس میں سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے جو تمام پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جن کے دلوں میں اللہ کا خوف اور قیامت کا ڈر نہیں ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ جس وقت رب العالمین کے لیے کھڑے ہوں گے تو پینہ انسانوں کے آدھے آدھے کانوں تک پہنچا ہو گا۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ المطففین) ایک اور روایت میں ہے کہ قیامت والے دن سورج مخلوق کے اتنا قریب ہو گا کہ ایک میل کی مقدار کے قریب فاصلہ ہو گا۔ حدیث کے راوی حضرت سلیم بن عامر کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ نبی ﷺ نے میل سے زمین کی مسافت والا میل

یقیناً بدکاروں کا نامہ اعمال بحین میں ہے۔^(۷)
 تجھے کیا معلوم بحین کیا ہے؟ (۸)
 (یہ تو) لکھی ہوئی کتاب ہے۔ (۹)
 اس دن جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہے۔ (۱۰)
 جو جزا و سزا کے دن کو جھٹلاتے رہے۔ (۱۱)
 اسے صرف وہی جھٹلاتا ہے جو حد سے آگے نکل جانے والا (اور) گناہ گار ہوتا ہے۔ (۱۲)
 جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہہ دیتا ہے کہ یہ اگلوں کے افسانے ہیں۔^(۱۳)
 یوں نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی وجہ سے زنگ چڑھ گیا ہے۔^(۱۴)

كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَارِ لَفِي سِجِّينٍ ﴿٧﴾
 وَمَا أَدْرَاكَ مَا سِجِّينٌ ﴿٨﴾
 كِتَابٌ مَّزْمُورٌ ﴿٩﴾
 وَبِئْسَ يَوْمِئِذٍ الْمَكْتَدِبِينَ ﴿١٠﴾
 الَّذِينَ يُكَلِّبُونَ بَيُوتَ الَّذِينَ الدِّينِ ﴿١١﴾
 وَمَا يُكَلِّبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ﴿١٢﴾
 إِذِ اشْتَلَىٰ عَلَيْهِمُ الْغُتَا قَالَ آسَاطِيرُ الْأُولِينَ ﴿١٣﴾
 كَلَّا بَلْ عَصَوْنَا أَمْرًا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ نَحَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿١٤﴾

مراد لیا ہے یا وہ سلائی جس سے سرمہ آنکھوں میں ڈالا جاتا ہے) پس لوگ اپنے اعمال کے مطابق پسینے میں ہوں گے، یہ پسینہ کسی کے ٹخنوں تک، کسی کے گھٹنوں تک، کسی کی کمر تک ہو گا اور کسی کے لیے یہ لگام بنا ہوا ہو گا، یعنی اس کے منہ تک پسینہ ہو گا۔ (صحیح مسلم، صفة القيامة والجنة، باب فی صفة يوم القيامة)

(۱) سِجِّينٌ، 'بعض کہتے ہیں سِجِّين (قید خانہ) سے ہے، مطلب ہے کہ قید خانے کی طرح ایک نہایت تنگ مقام ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ زمین کے سب سے نچلے حصے میں ایک جگہ ہے، جہاں کافروں، ظالموں اور مشرکوں کی روہیں اور ان کے اعمال نامے جمع اور محفوظ ہوتے ہیں۔ اسی لیے آگے اسے "لکھی ہوئی کتاب" قرار دیا ہے۔

(۲) یعنی اس کا گناہوں میں انہماک اور حد سے تجاوز اتنا بڑھ گیا ہے کہ اللہ کی آیات سن کر ان پر غور و فکر کرنے کے بجائے انہیں اگلوں کی کہانیاں بتلاتا ہے۔

(۳) یعنی یہ قرآن کہانیاں نہیں، جیسا کہ کافر کہتے اور سمجھتے ہیں۔ بلکہ یہ اللہ کا کلام اور اس کی وحی ہے جو اس کے رسول پر جبرائیل علیہ السلام امین کے ذریعے سے نازل ہوئی ہے۔

(۴) یعنی ان کے دل اس قرآن اور وحی الہی پر ایمان اس لیے نہیں لاتے کہ ان کے دلوں پر گناہوں کی کثرت کی وجہ سے پردے پڑ گئے ہیں اور وہ زنگ آلود ہو گئے ہیں، زین، گناہوں کی وہ سیاہی ہے جو مسلسل ارتکاب گناہ کی وجہ سے اس کے دل پر چھا جاتی ہے۔ حدیث میں ہے "بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ پڑ جاتا ہے، اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو وہ سیاہی دور کر دی جاتی ہے، اور اگر توبہ کے بجائے گناہ پر گناہ کیے جاتا ہے تو وہ سیاہی بڑھتی جاتی ہے، حتیٰ کہ اس کے پورے دل پر چھا جاتی ہے۔ یہی وہ زین ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ (ترمذی، باب تفسیر سورة

كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ ﴿۱۵﴾

ہرگز نہیں یہ لوگ اس دن اپنے رب سے اوٹ میں رکھے جائیں گے۔ (۱۵)

سَمِعْتُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ﴿۱۶﴾

پھر یہ لوگ بالیقین جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ (۱۶)
پھر کہہ دیا جائے گا کہ یہی ہے وہ جسے تم جھٹلاتے رہے۔ (۱۷)

ثُمَّ يُقَالُ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُونَ ﴿۱۷﴾

یقیناً یقیناً نیکو کاروں کا نامہ اعمال علیین میں ہے۔ (۱۸)
تجھے کیا پتا کہ علیین کیا ہے؟ (۱۹)

كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ ﴿۱۸﴾

وَمَا أَدْرَاكَ مَا عِلِّيُّونَ ﴿۱۹﴾

(وہ تو) لکھی ہوئی کتاب ہے۔ (۲۰)

كِتَابٌ مَّرْقُومٌ ﴿۲۰﴾

مقرب (فرشتے) اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ (۲۱)

يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ ﴿۲۱﴾

یقیناً نیک لوگ (بڑی) نعمتوں میں ہوں گے۔ (۲۲)

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿۲۲﴾

مسکریوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے۔ (۲۳)

عَلَى الْأَرْبَابِ يُنظَرُونَ ﴿۲۳﴾

تو ان کے چہروں سے ہی نعمتوں کی تروتازگی پہچان لے گا۔ (۲۴)

تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ﴿۲۴﴾

یہ لوگ سر بہر خالص شراب پلائے جائیں گے۔ (۲۵)
جس پر مشک کی مہر ہوگی، سبقت لے جانے والوں کو اسی

يُسْتَوُونَ مِنْ رَحِيْقٍ عُقُقٍ ﴿۲۵﴾

خَمِيْمٌ مُسْكٌ وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ

المططففين، ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب ذکر الذنوب۔ مسند أحمد ۲/۳۹۷

(۱) ان کے برعکس اہل ایمان رویت باری تعالیٰ سے مشرف ہوں گے۔

(۲) عِلِّيِّينَ، عَلُوُّ (بلندی) سے ہے۔ یہ سَجِّينُ کے برعکس، آسمانوں میں یا جنت میں یا سدرۃ المنتہیٰ یا عرش کے پاس جگہ ہے جہاں نیک لوگوں کی روحمیں اور ان کے اعمال نا سے محفوظ ہوتے ہیں؛ جس کے پاس مقرب فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔

(۳) جس طرح دنیا میں خوش حال لوگوں کے چہروں پر بالعموم تازگی اور شادابی ہوتی ہے جو ان آسائشوں، سمولتوں اور دنیوی نعمتوں کی مظہر ہوتی ہے جو انہیں فراوانی سے حاصل ہوتی ہیں۔ اسی طرح اہل جنت پر اعزاز و تکریم اور نعمتوں کی جو ارزانی ہوگی، اس کے اثرات ان کے چہروں پر بھی ظاہر ہوں گے، وہ اپنے حسن و جمال اور رونق و بہجت سے پہچان لیے جائیں گے کہ یہ جنتی ہیں۔

(۴) رَحِيْقٌ صَافٌ شَافٌ اور خالص شراب کو کہتے ہیں جس میں کسی چیز کی آمیزش نہ ہو۔ مَخْمُومٌ (سر بہ مہر) اس کے خالص پن کی مزید وضاحت کے لیے ہے، بعض کے نزدیک یہ مخلوط کے معنی میں ہے، یعنی شراب میں کتوری کی آمیزش ہوگی جس سے اس کا ذائقہ دو بالا اور خوشبو مزید خوش کن اور راحت افزا ہو جائے گی۔ بعض کہتے ہیں، یہ ختم سے ہے۔

میں سبقت کرنی چاہیے۔^(۱) (۲۶)
 اور اس کی آمیزش تسنیم کی ہوگی۔^(۲) (۲۷)
 (یعنی) وہ چشمہ جس کا پانی مقرب لوگ پیئیں گے۔ (۲۸)
 گنکار لوگ ایمان والوں کی ہنسی اڑایا کرتے
 تھے۔^(۳) (۲۹)
 اور ان کے پاس سے گزرتے ہوئے آپس میں آنکھ کے
 اشارے کرتے تھے۔^(۴) (۳۰)
 اور جب اپنے والوں کی طرف لوٹتے تو دل گلیاں کرتے
 تھے۔^(۵) (۳۱)
 اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے یقیناً یہ لوگ گمراہ (بے راہ)

الْمُتَفِئِسُونَ ﴿۲۶﴾
 وَمَرَّاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ ﴿۲۷﴾
 مَبْنًى يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ﴿۲۸﴾
 إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ﴿۲۹﴾
 وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ﴿۳۰﴾
 وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ﴿۳۱﴾
 وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَؤُلَاءَ لَضَالِّونَ ﴿۳۲﴾

یعنی اس کا آخری گھونٹ کستوری کا ہو گا۔ بعض ختمام کے معنی خوشبو کرتے ہیں، ایسی شراب جس کی خوشبو کستوری کی طرح ہوگی۔ (ابن کثیر) حدیث میں بھی یہی لفظ آیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ”جس مومن نے کسی پیاسے مومن کو ایک گھونٹ پانی پلایا، اللہ تعالیٰ اسے قیامت والے دن الرَّحِيقِ الْمَخْتُومِ پلائے گا، جس نے کسی بھوکے مومن کو کھانا کھلایا، اللہ تعالیٰ اسے جنت کے پھل کھلائے گا، جس نے کسی ننگے مومن کو لباس پہنایا، اللہ تعالیٰ اسے جنت کا سبز لباس پہنائے گا۔“ (مسند أحمد ۳/ ۱۳-۱۴)

(۱) یعنی عمل کرنے والوں کو ایسے عملوں میں سبقت کرنی چاہیے جس کے صلے میں جنت اور اس کی یہ نعمتیں حاصل ہوں۔ جیسے فرمایا ﴿لِيُثَلَّ هَذَا قَلْبِي عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ (الصافات ۷۱)
 (۲) تَسْنِيمٌ کے معنی بلندی کے ہیں۔ اونٹ کی کوبان، جو اس کے جسم سے بلند ہوتی ہے، اسے سِنَامٌ کہتے ہیں۔ قبر کے اونچا کرنے کو بھی تَسْنِيمُ الْقُبُورِ کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں تسنیم شراب کی آمیزش ہوگی جو جنت کے بلالی علاقوں سے ایک چشمے کے ذریعے سے آئے گی۔ یہ جنت کی بہترین اور اعلیٰ شراب ہوگی۔
 (۳) یعنی انہیں حقیر جانتے ہوئے ان کا استنہا کرتے اور مذاق اڑاتے تھے۔
 (۴) غَمَزٌ کے معنی ہوتے ہیں، پلکوں اور ابرؤں سے اشارہ کرنا۔ یعنی ایک دوسرے کو اپنی پلکوں اور ابرؤں سے اشارہ کر کے ان کی تحقیر اور ان کے مذہب پر طعن کرتے۔
 (۵) یعنی اہل ایمان کا ذکر کر کے خوش ہوتے اور دل گلیاں کرتے۔ دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ جب اپنے گھروں میں لوٹتے تو وہاں خوشحالی اور فراغت ان کا استقبال کرتی اور جو چاہتے وہ انہیں مل جاتا۔ اس کے باوجود انہوں نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا بلکہ اہل ایمان کی تحقیر اور ان پر حسد کرنے میں ہی مشغول رہے۔ (ابن کثیر)

ہیں۔^(۱) (۳۲)
یہ ان پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجے گئے۔^(۲) (۳۳)
پس آج ایمان والے ان کافروں پر نہیں گئے۔^(۳) (۳۴)
تختوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے۔^(۴) (۳۵)
کہ اب ان منکروں نے جیسا یہ کرتے تھے پورا پورا بدلہ
پالیا۔^(۵) (۳۶)

وَمَا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَفِظِينَ ۝
فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ۝
عَلَى الْأَرْكَانِ يُنظَرُونَ ۝
هَلْ يُؤْتِيهِمُ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ۝

وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝

سورۃ اشقاق مکی ہے اور اس میں پچیس آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نمایت رحم والا ہے۔

جب آسمان پھٹ جائے گا۔^(۱)

اور اپنے رب کے حکم پر کان لگائے گا^(۲) اور اسی کے
لائق وہ ہے^(۳)

(۱) یعنی اہل توحید، اہل شرک کی نظر میں اور اہل ایمان اہل کفر کے نزدیک گمراہ ہوتے ہیں۔ یہی صورت حال آج بھی
ہے۔ گمراہ اپنے کو اہل حق اور اہل حق کو گمراہ باور کراتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک سراسر باطل فرقہ اپنے سوا کسی کو مومن کہتا
ہے اور نہ سمجھتا ہے۔ هَذَا مَا اللَّهُ نَعَالِي۔

(۲) یعنی یہ کافر مسلمانوں پر نگران بنا کر تو نہیں بھیجے گئے ہیں کہ یہ ہر وقت مسلمانوں کے اعمال و احوال ہی دیکھتے اور ان
پر تبصرے کرتے رہیں، یعنی جب یہ ان کے مکلف ہی نہیں ہیں تو پھر کیوں ایسا کرتے ہیں۔

(۳) یعنی جس طرح دنیا میں کافر اہل ایمان پر ہنتے تھے، قیامت والے دن یہ کافر اللہ کی گرفت میں ہوں گے اور اہل
ایمان ان پر نہیں گئے۔ ان کو ہنسی اسی بات پر آئے گی کہ یہ گمراہ ہونے کے باوجود ہمیں گمراہ کہتے اور ہم پر ہنتے تھے۔ آج
ان کو پتہ چل گیا کہ گمراہ کون تھا؟ اور کون اس قابل تھا کہ اس کا استہزا کیا جائے۔

(۴) نُؤْتِبُ بِمَعْنَى أُتِنِبُ، بدلہ دے دیئے گئے، یعنی کیا کافروں کو، جو کچھ وہ کرتے تھے، اس کا بدلہ دے دیا گیا ہے۔
(۵) یعنی جب قیامت برپا ہوگی۔

(۶) یعنی اللہ اس کو پھنسنے کا جو حکم دے گا، اسے سنے گا اور اطاعت کرے گا۔

(۷) یعنی اس کے یہی لائق ہے کہ سنے اور اطاعت کرے، اس لیے کہ وہ سب پر غالب ہے اور سب اس کے ماتحت
ہیں۔ اس کے حکم سے سرتابی کرنے کی کس کو مجال ہو سکتی ہے؟

اور جب زمین (کھینچ کر) پھیلا دی جائے گی۔ (۳) ^(۱)	وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۝
اور اس میں جو ہے اسے وہ اگل دے گی اور خالی ہو جائے گی۔ (۴) ^(۲)	وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۝
اور اپنے رب کے حکم پر کان لگائے گی (۴) ^(۳) اور اسی کے لائق وہ ہے۔ (۵)	وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَخَضَّتْ ۝
اے انسان! تو اپنے رب سے ملنے تک یہ کوشش اور تمام کام اور محنتیں کر کے اس سے ملاقات کرنے والا ہے۔ (۶) ^(۴)	يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِرٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَذًّا حَافِلِيْعِيْنِهٖ ۝
تو (اس وقت) جس شخص کے واسطے ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا۔ (۷)	فَأَتَا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۝
اس کا حساب تو بڑی آسانی سے لیا جائے گا۔ (۸) ^(۵)	فَسَوِّفَ يُحَاسَبُ جِسَابًا يَسِيْرًا ۝

- (۱) یعنی اس کے طول و عرض میں مزید وسعت کر دی جائے گی۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس پر جو پہاڑ وغیرہ ہیں، سب کو ریزہ ریزہ کر کے زمین کو صاف اور ہموار کر کے بچھا دیا جائے گا۔ اس میں کوئی اونچ نیچ نہیں رہے گی۔
- (۲) یعنی اس میں جو مردے دفن ہیں، سب زندہ ہو کر باہر نکل آئیں گے جو خزانے اس کے بطن میں موجود ہیں، وہ انہیں ظاہر کر دے گی، اور خود بالکل خالی ہو جائے گی۔
- (۳) یعنی القا اور تعلی کا جو حکم اسے دیا جائے گا، وہ اس کے مطابق عمل کرے گی۔
- (۴) یہاں انسان بطور جنس کے ہے جس میں مومن اور کافر دونوں شامل ہیں۔ کدرح، سخت محنت کو کہتے ہیں، وہ محنت خیر کے کاموں کے لیے ہو یا شر کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ جب مذکورہ چیزیں ظہور پذیر ہوں گی یعنی قیامت آجائے گی تو اے انسان تو نے جو بھی اچھا یا برا عمل کیا ہو گا، وہ تو اپنے سامنے پالے گا اور اسی کے مطابق تجھے اچھی یا بری جزا بھی ملے گی۔ آگے اس کی مزید تفصیل و وضاحت ہے۔

(۵) آسان حساب یہ ہے کہ مومن کا اعمال نامہ پیش ہو گا۔ اس کی غلطیاں بھی اس کے سامنے لائی جائیں گی، پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل و کرم سے انہیں معاف فرما دے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جس کا حساب لیا گیا وہ ہلاک ہو گیا۔ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! اللہ مجھے آپ پر قربان کرے کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا، جس کے دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال دیا گیا، اس کا حساب آسان ہو گا۔“ (مطلب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ تھا کہ اس آیت کی رو سے حساب تو مومن کا بھی ہو گا لیکن وہ ہلاکت سے دوچار نہیں ہو گا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی ”یہ تو پیشی ہے۔ (یعنی مومن کے ساتھ معاملہ حساب کا نہیں ہو گا، ایک سرسری سی پیشی ہو گی) مومن رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے، جس کا مناقشہ

وَيَنْتَقِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝
وَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ وَرَأَاهُ ظَهْرًا ۝

اور وہ اپنے اہل کی طرف ہنسی خوشی لوٹ آئے گا۔ (۹)
ہاں جس شخص کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا
جائے گا۔ (۱۰)

مَوْتٌ يَدْعُوا مَجْرُورًا ۝

تو وہ موت کو بلانے لگے گا۔ (۱۱)

وَيَصِلُ سَعِيرًا ۝

اور بھڑکتی ہوئی جہنم میں داخل ہو گا۔ (۱۲)

إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝

یہ شخص اپنے متعلقین میں (دنیا میں) خوش تھا۔ (۱۳)
اس کا خیال تھا کہ اللہ کی طرف لوٹ کر ہی نہ
جائے گا۔ (۱۴)

إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَخُورَ ۝

کیوں نہیں، (۱۵) حالانکہ اس کا رب اسے بخوبی دیکھ رہا
تھا۔ (۱۶)

بَلَىٰ إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا ۝

مجھے شفق کی قسم! (۱۷) اور رات کی! (۱۸)

فَلَا أَقْسِرُ بِالشَّفَقِ ۝

ہو یعنی پوچھ گچھ ہوئی وہ مار گیا۔ (صحیح البخاری تفسیر مسودۃ الانشقاق) ایک اور روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعض نماز میں یہ دعا پڑھتے تھے۔ «اللَّهُمَّ حَاسِنِي حَسَابًا يَسِيرًا» (اے اللہ میرا حساب آسان فرماتا) نماز سے فراغت کے بعد میں نے پوچھا حَسَابًا يَسِيرًا (آسان حساب) کا کیا مطلب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس کا اعمال نامہ دیکھے گا اور پھر اسے معاف فرما دے گا..... (مسند احمد ۶/۳۸)

(۱) یعنی جو اس کے گھر والوں میں سے جنتی ہوں گے۔ یا اس سے مراد وہ حور عین اور ولدان ہیں جو جنتیوں کو ملیں گے۔

(۲) نُجُورًا اِهْلَاكًا، خسارہ۔ یعنی وہ جھٹھے گا، پکارے گا، واویلا کرے گا کہ میں تو مارا گیا، ہلاک ہو گیا۔

(۳) یعنی دنیا میں اپنی خواہشات میں لگن اور اپنے گھر والوں کے درمیان بڑا خوش تھا۔

(۴) یہ اس کے خوش ہونے کی علت ہے۔ یعنی آخرت پر اس کا عقیدہ ہی نہیں تھا۔ حود کے معنی ہیں، لوٹنا۔ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ النَّحْوَرِ بَعْدَ النَّكْوَرِ (صحیح مسلم، الحج، باب ما یقول إذا ركب إلى سفر الحج وغيره۔ ترمذی، ابن ماجہ) مسلم میں بعد الکون ہے۔ مطلب ہے، ”اس بات سے میں پناہ مانگتا ہوں کہ ایمان کے بعد کفر، اطاعت کے بعد معصیت یا خیر کے بعد شر کی طرف لوٹوں۔“

(۵) ایک ترجمہ اس کا یہ بھی ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ نہ لوٹے اور دوبارہ زندہ نہ ہو، یا بکلی، کیوں نہیں، یہ ضرور اپنے رب کی طرف لوٹے گا۔

(۶) یعنی اس سے اس کا کوئی عمل مخفی نہیں تھا۔

(۷) شَفَقًا، اس سرفی کو کہتے ہیں جو سورج غروب ہونے کے بعد آسمان پر ظاہر ہوتی ہے اور عشا کا وقت شروع ہونے

اور اس کی جمع کردہ ^(۱) چیزوں کی قسم۔ (۱۷)
 اور چاند کی جب کہ وہ کامل ہو جاتا ہے۔ ^(۲) (۱۸)
 یقیناً تم ایک حالت سے دوسری حالت پر پہنچو گے۔ ^(۳) (۱۹)
 انہیں کیا ہو گیا کہ ایمان نہیں لاتے۔ (۲۰)
 اور جب ان کے پاس قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں
 کرتے۔ ^(۴) (۲۱)
 بلکہ جنہوں نے کفر کیا وہ جھٹلا رہے ہیں۔ ^(۵) (۲۲)
 اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں رکھتے
 ہیں۔ ^(۶) (۲۳)
 انہیں المناک عذابوں کی خوشخبری سنا دو۔ (۲۴)
 ہاں ایمان والوں اور نیک اعمال والوں کو بے شمار اور نہ
 ختم ہونے والا اجر ہے۔ (۲۵)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝
 وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ۝
 لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ ۝
 فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝
 وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ۝
 بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يَكْتُمُونَ ۝
 وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُكْتُمُونَ ۝
 قَدَّبَسْتُمْ لَهُمُ بَعْدَآبِ الْآلِيمِ ۝
 إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ
 أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝



سُورَةُ الْبُرُوجِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورہ بروج کی ہے اور اس میں بائیس آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
 نہایت رحم والا ہے۔

تک رہتی ہے۔

- (۱) اندھیرا ہوتے ہی ہر چیز اپنے ماویٰ اور مسکن کی طرف جمع اور سمٹ آتی ہے یعنی رات کا اندھیرا جن چیزوں کو اپنے
 دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔
 (۲) إِذَا اتَّسَقَ کے معنی ہیں جب وہ مکمل ہو جائے جیسے وہ تیرھویں کی رات سے سوہویں تاریخ کی رات تک رہتا ہے۔
 (۳) طَبَقٌ کے اصل معنی شدت کے ہیں۔ یہاں مراد وہ شدا ند ہیں جو قیامت والے دن واقع ہوں گے۔ یعنی اس روز
 ایک سے بڑھ کر ایک حالت طاری ہوگی۔ (فتح الباری تفسیر سورۃ انشقاق) یہ جواب قسم ہے۔
 (۴) احادیث سے یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا سجدہ کرنا ثابت ہے۔
 (۵) یعنی ایمان لانے کے بجائے جھٹلاتے ہیں۔
 (۶) یعنی تکذیب یا جو افعال وہ چھپ کر کرتے ہیں۔
 ☆ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر اور عصر میں سورۃ الطارق اور سورۃ البروج پڑھتے تھے۔ (الترمذی)

وَالسَّمَاءَ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۝
 وَالْيَوْمَ الْمَوْعُودِ ۝
 وَسَاءَ لِمَنْ أَهْلَكَ الْأَخْذُودِ ۝
 النَّارِ ذَاتِ الْوُجُودِ ۝
 إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ ۝
 وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ ۝

وَمَا نَعْمُوا لَهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝

برجوں والے آسمان کی قسم! (۱)
 وعدہ کیے ہوئے دن کی قسم! (۲)
 حاضر ہونے والے اور حاضر کیے گئے کی قسم! (۳)
 (کہ) خندقوں والے ہلاک کیے گئے۔ (۴)
 وہ ایک آگ تھی ایندھن والی۔ (۵)
 جبکہ وہ لوگ اس کے آس پاس بیٹھے تھے۔ (۶)
 اور مسلمانوں کے ساتھ جو کر رہے تھے اس کو اپنے
 سامنے دیکھ رہے تھے۔ (۷)
 یہ لوگ ان مسلمانوں (کے کسی اور گناہ کا بدلہ نہیں لے
 رہے تھے، سوائے اس کے کہ وہ اللہ غالب لائق حمد کی
 ذات پر ایمان لائے تھے۔ (۸)

(۱) بُرُوجُ بُرُوجِ محل کی جمع ہے۔ بُرُوجُ کے اصل معنی ہیں ظہور۔ یہ کواکب کی منزلیں ہیں جنہیں ان کے محل اور قصور کی حیثیت حاصل ہے۔ ظاہر اور نمایاں ہونے کی وجہ سے انہیں بروج کہا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے، 'الفرقان'، ۶۱ کا حاشیہ۔ بعض نے بروج سے مراد ستارے لیے ہیں۔ یعنی ستارے والے آسمان کی قسم۔ بعض کے نزدیک اس سے آسمان کے دروازے یا چاند کی منزلیں مراد ہیں۔ (فتح القدیر)
 (۲) اس سے مراد بالاتفاق قیامت کا دن ہے۔

(۳) شَهِيدٌ اور مَشْهُودٌ کی تفسیر میں بہت اختلاف ہے۔ امام شوکانی نے احادیث و آثار کی بنیاد پر کہا ہے کہ شاہد سے مراد جمعہ کا دن ہے، اس دن جس نے جو بھی عمل کیا ہو گا یہ قیامت کے دن اس کی گواہی دے گا۔ اور مشہود سے عرفہ (۹ ذوالحجہ) کا دن ہے جہاں لوگ حج کے لیے جمع اور حاضر ہوتے ہیں۔

(۴) یعنی جن لوگوں نے خندقیں کھود کر اس میں رب کے ماننے والوں کو ہلاک کیا، ان کے لیے ہلاکت اور بربادی ہے، قَتِيلٌ بمعنی لُئِنَ

(۵) النَّارِ، الْأَخْذُودِ سے بدل اِشْتِمَالِ ہے ذَاتِ الْوُجُودِ، النَّارِ کی صفت ہے۔ یعنی یہ خندقیں کیا تھیں؟ ایندھن والی آگ تھیں، جو اہل ایمان کو اس میں جھونکنے کے لیے دہکائی گئی تھی۔

(۶) کافر یا شاہ یا اسکے کارندے، آگ کے کنارے بیٹھے اہل ایمان کے جلنے کا تماشا دیکھ رہے تھے، جیسا کہ اگلی آیت میں ہے۔

(۷) یعنی ان لوگوں کا جرم، جنہیں آگ میں جھونکا جا رہا تھا، یہ تھا کہ وہ اللہ غالب پر ایمان لے آئے تھے۔ اس واقعے کی تفصیل جو صحیح احادیث سے ثابت ہے، مختصراً اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِينَ وَاللَّهُ عَلَى
كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝

جس کے لیے آسمان و زمین کا ملک ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے
سامنے ہے ہر چیز۔ (۹)

واقعہ اصحاب الاخذود:

گزشتہ زمانے میں ایک بادشاہ کا جادوگر اور کاہن تھا، جب وہ کاہن بوڑھا ہو گیا تو اس نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے ایک ذہین لڑکا دو، جسے میں یہ علم سکھا دوں۔ چنانچہ بادشاہ نے ایک سمجھدار لڑکا تلاش کر کے اس کے سپرد کر دیا۔ لڑکے کے راستے میں ایک راہب کا بھی مکان تھا، یہ لڑکا آتے جاتے اس کے پاس بھی بیٹھتا اور اس کی باتیں سنتا، جو اسے اچھی لگتیں۔ اسی طرح سلسلہ چلتا رہا۔ ایک مرتبہ یہ لڑکا جا رہا تھا کہ راستے میں ایک بہت بڑے جانور (شیر یا سانپ وغیرہ) نے لوگوں کا راستہ روک رکھا تھا۔ لڑکے نے سوچا، آج میں پتہ کرتا ہوں کہ جادوگر صحیح ہے یا راہب؟ اس نے ایک پتھر پکڑا اور کہا ”اے اللہ، اگر راہب کا معاملہ تیرے نزدیک جادوگر کے معاملے سے بہتر اور پسندیدہ ہے تو اس جانور کو مار دے، تاکہ لوگوں کی آمد و رفت جاری ہو جائے۔“ یہ کہہ کر اس نے پتھر مارا اور وہ جانور مر گیا۔ لڑکے نے جا کر یہ واقعہ راہب کو بتلایا۔ راہب نے کہا، بیٹے! اب تم فضل و کمال کو پہنچ گئے ہو اور تمہاری آزمائش شروع ہونے والی ہے۔ لیکن اس دور ابتلا میں میرا نام ظاہر نہ کرنا۔ یہ لڑکا مادر زاد اندھے، برص اور دیگر بعض بیماریوں کا علاج بھی کرتا تھا۔ لیکن ایمان باللہ کی شرط پر، اسی شرط پر اس نے بادشاہ کے ایک نابینا مصاحب کی آنکھیں بھی، اللہ سے دعا کر کے صحیح کر دیں۔ یہ لڑکا یہی کہتا تھا کہ اگر تم ایمان لے آؤ گے تو میں اللہ سے دعا کروں گا، وہ شفا عطا فرمادے گا، چنانچہ اس کی دعا سے اللہ شفا یاب فرمادیتا۔ یہ خبر بادشاہ تک بھی پہنچی تو وہ بہت پریشان ہوا، بعض اہل ایمان کو تو اس نے قتل کروا دیا۔ اس لڑکے کے بارے میں اس نے چند آدمیوں کو کہا کہ اسے پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر نیچے پھینک دو، اس نے اللہ سے دعا کی، پہاڑ میں لرزش پیدا ہوئی، جس سے وہ سب گر کر مر گئے اور اللہ نے اسے بچالیا۔ بادشاہ نے اسے دوسرے آدمیوں کے سپرد کر کے کہا کہ ایک کشتی میں بٹھا کر سمندر کے بیچ میں لے جا کر اسے پھینک دو، وہاں بھی اس کی دعا سے کشتی الٹ گئی، جس سے وہ سب غرق ہو گئے اور یہ بچ گیا۔ اس لڑکے نے بادشاہ سے کہا، اگر تو مجھے ہلاک کرنا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک کھلے میدان میں لوگوں کو جمع کرو اور ”بِسْمِ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِ“ کہہ کر مجھے تیرا مار۔ بادشاہ نے ایسا ہی کیا، جس سے وہ لڑکا مر گیا لیکن سارے لوگ پکار اٹھے، کہ ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لائے۔ بادشاہ اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ چنانچہ اس نے خندق میں کھدوائیں اور اس میں آگ جلوائی اور حکم دیا کہ جو ایمان سے انحراف نہ کرے، اس کو آگ میں پھینک دو۔ اس طرح ایمان دار آتے رہے اور آگ کے حوالے ہوتے رہے، حتیٰ کہ ایک عورت آئی، جس کے ساتھ ایک بچہ تھا، وہ ذرا ٹھٹھکی، تو بچہ بول پڑا، اماں، صبر کر، تو حق پر ہے۔“ (صحیح مسلم، ملخصاً، کتاب الزهد والرفاق، باب قصة اصحاب الاخذود) امام ابن کثیر نے اور بھی بعض واقعات نقل کیے ہیں جو اس سے مختلف ہیں اور کہا ہے، ممکن ہے اس قسم کے متعدد واقعات مختلف جگہوں پر ہوئے ہوں۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے تفسیر ابن کثیر)

بیشک جن لوگوں نے مسلمان مردوں اور عورتوں کو ستایا پھر توبہ (بھی) نہ کی تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور جلنے کا عذاب ہے۔ (۱۰)

بیشک ایمان قبول کرنے والوں اور نیک کام کرنے والوں کے لیے وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ (۱۱)

یقیناً تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ (۱۲)^(۱)
وہی پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ (۱۳)^(۲)

وہ بڑا بخشش کرنے والا اور بہت محبت کرنے والا ہے۔ (۱۴)
عرش کا مالک عظمت والا ہے۔ (۱۵)^(۳)
جو چاہے اسے کر گزرنے والا ہے۔ (۱۶)^(۴)

إِنَّ الَّذِينَ قَاتَلُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ كَفَرُوا فَكَفَّهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَأَكْبَمَ عَذَابُ الْحَرِيقِ ﴿۱۰﴾

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ﴿۱۱﴾

إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ﴿۱۲﴾
إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ ﴿۱۳﴾

وَهُوَ الْعَظِيمُ الْوَدُودُ ﴿۱۴﴾
ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ﴿۱۵﴾
فَعَالٌ لَمَّا يُرِيدُ ﴿۱۶﴾

(۱) یعنی جب وہ اپنے ان دشمنوں کی گرفت پر آئے جو اس کے رسولوں کی تکذیب کرتے اور اس کے حکموں کی مخالفت کرتے ہیں۔ تو پھر اس کی گرفت سے انہیں کوئی نہیں بچا سکتا۔

(۲) یعنی وہی اپنی قوت اور قدرت کاملہ سے پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے اور پھر قیامت والے دن دوبارہ انہیں اسی طرح پیدا فرمائے گا جس طرح اس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔

(۳) یعنی تمام مخلوقات سے معظم اور بلند ہے اور عرش جو سب سے اوپر ہے، وہ اس کا مستقر ہے۔ جیسا کہ صحابہ و تابعین اور محدثین کا عقیدہ ہے۔ الْمَجِيدُ صاحب فضل و کرم۔ یہ مرفوع اس لیے ہے کہ یہ ذُو۔ یعنی رب کی صفت ہے، عرش کی صفت نہیں۔ اگرچہ بعض لوگ اسے عرش کی صفت تسلیم کر کے اسے مجرور پڑھتے ہیں۔ معنا دونوں صحیح ہیں۔ (ابن کثیر)

(۴) یعنی وہ جو چاہے، کر گزرتا ہے، اس کے حکم اور مشیت کو ٹالنے والا کوئی نہیں ہے نہ اس سے کوئی پوچھے والا ہی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان کے مرض الموت میں کسی نے پوچھا،

کیا کسی طیب نے آپ کو دیکھا؟ انہوں نے فرمایا، ہاں۔ پوچھا، اس نے کیا کہا؟ فرمایا، اس نے کہا ہے، اِنِّي فَعَالٌ لَمَّا اُرِنْدُ میں جو چاہوں کروں، میرے معاملے میں کوئی دخل دینے والا نہیں۔ (ابن کثیر) مطلب یہ تھا کہ معاملہ اب طیبوں کے ہاتھوں میں نہیں رہا، میرا آخری وقت آگیا ہے اور اللہ ہی اب میرا طیب ہے، جس کی مشیت کو ٹالنے کی کسی کے اندر طاقت نہیں ہے۔

تجھے لشکروں کی خبر بھی ملی ہے؟^(۱) (۱۷)

(یعنی) فرعون اور شمود کی۔ (۱۸)

(کچھ نہیں) بلکہ کافر تو جھٹلانے میں پڑے ہوئے ہیں۔ (۱۹)

اور اللہ تعالیٰ بھی انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔^(۲) (۲۰)

بلکہ یہ قرآن ہے بڑی شان والا۔ (۲۱)

لوح محفوظ میں (لکھا ہوا)۔^(۳) (۲۲)

هَلْ أُنَبِّئُكَ حَدِيثَ الْجُبُودِ ۝

فِرْعَوْنَ وَشَمُودَ ۝

بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَنْذِيرٍ ۝

وَاللَّهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ ۝

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ ۝

فِي لَوْحٍ مَحْفُوظٍ ۝

سورۃ طارق کی ہے اور اس میں سترہ آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

قسم ہے آسمان کی اور اندھیرے میں روشن ہونے والے کی۔^(۱)

تجھے معلوم بھی ہے کہ وہ رات کو نمودار ہونے والی چیز کیا ہے؟^(۲)



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ ۝

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ ۝

(۱) یعنی ان پر جب میرا عذاب آیا اور میں نے انہیں اپنی گرفت میں لیا، جسے کوئی ٹال نہیں سکا۔

(۲) یہ ﴿إِنْ يَنْظُرَنَّ بِكَ كَلِمَاتٍ﴾ ہی کا اثبات اور اس کی تاکید ہے۔

(۳) یعنی لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے، جہاں فرشتے اس کی حفاظت پر مامور ہیں، اللہ تعالیٰ حسب ضرورت و اقتضا اسے نازل فرماتا ہے۔

☆ حضرت خالد عدوانی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بازار تھیمت میں کمان یا لانچی کے سارے پر کھڑے دیکھا، آپ میرے پاس مدد حاصل کرنے آئے تھے، میں نے وہاں آپ سے سورۃ الطارق سنی، میں نے اسے یاد کر لیا اور اس حالیکہ میں ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا۔ پھر مجھے اللہ نے اسلام سے نواز دیا اور اسلام کی حالت میں میں نے اسے پڑھا۔ (مسند أحمد، ۴/ ۳۳۵-۳۳۶، مجمع الزوائد، ۷/ ۱۳۶) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ مغرب کی نماز میں سورۃ بقرۃ اور نساء پڑھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو فرمایا، تو لوگوں کو فتنے میں ڈالتا ہے؟ تجھے یہی کافی تھا کہ وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ وَالشَّمْسِ اور اس جیسی سورتیں پڑھتا۔ (نسائی، کتاب الافتتاح، باب القراءۃ فی المغرب)

النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝

إِنْ كُنْ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝

خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ۝

يَعْرُبُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝

إِنَّهُ عَلَى رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۝

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ۝

فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ ۝

وہ روشن ستارہ ہے۔^(۱) (۳)

کوئی ایسا نہیں جس پر نگہبان فرشتہ نہ ہو۔^(۲) (۴)

انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ (۵)

وہ ایک اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔^(۳) (۶)

جو پیٹھ اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔^(۴) (۷)

بیشک وہ اسے پھیر لانے پر یقیناً قدرت رکھنے والا ہے۔^(۵) (۸)

جس دن پوشیدہ بھیدوں کی جانچ پڑتال ہوگی۔^(۶) (۹)

تو نہ ہو گا اس کے پاس کچھ زور نہ مددگار۔^(۷) (۱۰)

(۱) طارق سے کیا مراد ہے؟ خود قرآن نے واضح کر دیا۔ روشن ستارہ۔ طَارِقٌ طُرُوقٌ سے ہے جس کے لغوی معنی کھٹکھٹانے کے ہیں، لیکن طارق رات کو آنے والے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ستاروں کو بھی طارق اسی لیے کہا ہے کہ یہ دن کو چھپ جاتے اور رات کو نمودار ہوتے ہیں۔

(۲) یعنی ہر نفس پر اللہ کی طرف سے فرشتے مقرر ہیں جو اس کے اچھے یا برے سارے عمل لکھتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں یہ انسانوں کی حفاظت کرنے والے فرشتے ہیں، جیسا کہ سورہ رد کی آیت نمبر ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی حفاظت کے لیے بھی انسان کے آگے پیچھے فرشتے ہوتے ہیں، جس طرح قول و فعل لکھنے والے ہوتے ہیں۔

(۳) یعنی منی سے، جو قضائے شہوت کے بعد زور سے نکلتی ہے۔ یہی قطرہ آب (منی) رحم عورت میں جا کر، اگر اللہ کا حکم ہوتا ہے تو، حمل کا باعث بنتا ہے۔

(۴) کہا جاتا ہے کہ پیٹھ، مرد کی اور سینہ عورت کا، ان دونوں کے پانی سے انسان کی تخلیق ہوتی ہے۔ لیکن اسے ایک ہی پانی اس لیے کہا کہ یہ دونوں مل کر ایک ہی بن جاتا ہے۔ تَرَائِبٌ، تَرَائِبَةٌ کی جمع ہے، سینے کا وہ حصہ جو ہار پینے کی جگہ ہے۔

(۵) یعنی انسان کے مرنے کے بعد، اسے دوبارہ زندہ کرنے پر وہ قادر ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا مطلب ہے کہ وہ اس قطرہ آب کو دوبارہ شرمگاہ کے اندر لوٹانے کی قدرت رکھتا ہے جہاں سے وہ نکلا تھا۔ پہلے مفہوم کو امام شوکانی اور امام ابن جریر طبری نے زیادہ صحیح قرار دیا ہے۔

(۶) یعنی ظاہر ہو جائیں گے، کیوں کہ ان پر جزا و سزا ہوگی۔ بلکہ حدیث میں آتا ہے ”ہر غدر (بد عمدی) کرنے والے کے سرین کے پاس جھنڈا گاڑ دیا جائے گا اور اعلان کر دیا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی غداری ہے۔“ (صحیح بخاری، کتاب الجزیة، باب إثم الغادر للبر والفاجر۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب تحریم الغدن مطلب یہ ہے کہ وہاں کسی کا کوئی عمل مخفی نہیں رہے گا۔

(۷) یعنی خود انسان کے پاس اتنی قوت ہوگی کہ وہ اللہ کے عذاب سے بچ جائے، نہ کسی اور طرف سے اس کو کوئی ایسا

بارش والے آسمان کی قسم! (۱۱)
 اور پھیننے والی زمین کی قسم! (۱۲)
 بیشک یہ (قرآن) البتہ دو ٹوک فیصلہ کرنے والا کلام
 ہے۔ (۱۳)
 یہ ہنسی کی (اور بے فائدہ) بات نہیں۔ (۱۴)
 البتہ کافر داؤ گھلتا میں ہیں۔ (۱۵)
 اور میں بھی ایک چال چل رہا ہوں۔ (۱۶)
 تو کافروں کو مہلت دے (۱۷) انہیں تھوڑے دنوں چھوڑ
 دے۔ (۱۷)

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝
 وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝
 إِنَّهُ لَقَوْلُ فَصْلٍ ۝
 وَمَا هُوَ بِالِهَزْلِ ۝
 إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۝
 وَكَيْدُهُمْ هَاكِنٌ ۝
 فَتَعْمَلُ الْكُفْرَيْنَ إِنَّهُمْ لَمَهْمُومُونَ ۝

مددگار مل سکے گا جو اسے اللہ کے عذاب سے بچا سکے۔

(۱) رَجْعُ کے لغوی معنی ہیں، لوٹنا پلٹنا۔ بارش بھی بار بار اور پلٹ پلٹ کر ہوتی ہے، اس لیے بارش کو رَجْعُ کے لفظ سے
 تعبیر کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بادل، سمندروں سے ہی پانی لیتا ہے اور پھر وہی پانی زمین پر لوٹا دیتا ہے، اس لیے بارش کو
 رَجْعُ کہا۔ بعض کہتے ہیں بطور تَفَاوُلِ عرب بارش کو رَجْعُ کہتے تھے تاکہ وہ بار بار ہوتی رہے۔ (فتح القدیر)
 (۲) یعنی زمین بھٹتی ہے تو اس سے پودا باہر نکلتا ہے، زمین بھٹتی ہے تو چشمہ جاری ہو جاتا ہے اور اسی طرح ایک دن
 آئے گا کہ زمین پھٹے گی، سارے مردے زندہ ہو کر باہر نکل آئیں گے۔ اس لیے زمین کو پھیننے والی اور شکاف والی کہا۔
 (۳) یہ جواب قسم ہے، یعنی کھول کر بیان کرنے والا ہے جس سے حق اور باطل دونوں واضح ہو جاتے ہیں۔
 (۴) یعنی کھیل کود اور مذاق والی چیز نہیں ہے، هَزْلٌ: جِدٌّ (قصد و ارادہ) کی ضد ہے۔ یعنی ایک واضح مقصد کی حامل کتاب
 ہے، امو و لعب کی طرح بے مقصد نہیں ہے۔
 (۵) یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو دین حق لے کر آئے ہیں، اس کو ناکام کرنے کے لیے سازشیں کرتے ہیں، یا نبی صلی
 اللہ علیہ وسلم کو دھوکہ اور فریب دیتے ہیں اور منہ پر ایسی باتیں کرتے ہیں کہ دل میں اس کے برعکس ہوتا ہے۔
 (۶) یعنی میں ان کی چالوں اور سازشوں سے غافل نہیں ہوں، میں بھی ان کے خلاف تدبیر کر رہا ہوں یا ان کی چالوں کا
 توڑ کر رہا ہوں۔ كَيْدٌ خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں جو برے مقصد کے لیے ہو تو بری ہے اور مقصد نیک ہو تو بری نہیں۔
 (۷) یعنی ان کے لیے تعیل عذاب کا سوال نہ کر، بلکہ انہیں کچھ مہلت دے دے۔ ذُو نِدَا: قَلِيلًا يَا قَرِيبًا یہ امثال و
 استدراج بھی کافروں کے حق میں اللہ کی طرف سے ایک کید کی صورت ہے جیسے فرمایا ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ

* وَأَنْزِلْ لَهُمُ الْمَنِّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿ (الأعراف ۱۸۲-۱۸۳)

سورۃ اعلیٰ کی ہے اور اس میں انمیس آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

اپنے بہت ہی بلند اللہ کے نام کی پاکیزگی بیان کر۔ (۱)

جس نے پیدا کیا اور صحیح سالم بنایا۔ (۲)

اور جس نے (ٹھیک ٹھاک) اندازہ کیا اور پھر راہ
دکھائی۔ (۳)

اور جس نے تازہ گھاس پیدا کی۔ (۴)

پھر اس نے اس کو (سکھا کر) سیاہ کوڑا کر دیا۔ (۵)

ہم تجھے پڑھائیں گے پھر تو نہ بھولے گا۔ (۶)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الَّذِیْ خَلَقَ قَسْوَمِیْ

وَ الَّذِیْ قَدَّرَ قَهْدَیْ

وَ الَّذِیْ اَنْحَوٰی الْمَرْعٰی

فَجَعَلَهَا غُتَاۗءَ اَحْوٰی

سَقَمٰۗءُ لَكَ فَلَا تَنْسٰی

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سورت اور سورۃ الغاشیہ عیدین اور جمعہ کی نماز میں پڑھا کرتے تھے۔ اسی طرح وتر کی پہلی رکعت میں سورۃ الاعلیٰ، دوسری میں سورۃ الکافرون اور تیسری میں سورۃ اخلاص پڑھتے تھے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کو جن سورتوں کے پڑھنے کی تلقین کی تھی، انمیس ایک یہ بھی تھی (صحاح میں یہ ساری تفصیل موجود ہے) (۱) یعنی ایسی چیزوں سے اللہ کی پاکیزگی جو اس کے لائق نہیں ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جواب میں پڑھا کرتے تھے 'سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی' (مسند أحمد ۱/۲۳۲، ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الدعاء فی

الصلوٰۃ وقال الألبانی صحیح)

(۲) دیکھئے سورۃ الانفطار کا حاشیہ نمبر ۷۔

(۳) یعنی نیکی اور بدی کی۔ اسی طرح ضروریات زندگی کی۔ یہ ہدایت حیوانات کو بھی عطا فرمائی۔ قَدَّرَ کا مفہوم ہے، اشیاء کی جنسوں، ان کی انواع و صفات اور خصوصیات کا اندازہ فرما کر انسان کی بھی ان کی طرف رہنمائی فرمادی تاکہ انسان ان سے استفادہ کر سکے۔

(۴) جسے جانور چرتے ہیں۔

(۵) گھاس خشک ہو جائے تو اسے غُتَاۗءَ کہتے ہیں، اَحْوٰی سیاہ کر دیا۔ یعنی تازہ اور شاداب گھاس کو ہم سکھا کر سیاہ کوڑا بھی کر دیتے ہیں۔

(۶) حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آتے تو آپ سے جلدی جلدی پڑھتے تاکہ بھول نہ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اس طرح جلدی نہ کریں۔ نازل شدہ وحی ہم آپ کو پڑھوائیں گے یعنی آپ کی زبان پر جاری کر دیں گے، پس آپ اسے بھولیں گے نہیں۔ مگر جسے اللہ چاہے گا، لیکن اللہ نے ایسا نہیں چاہا، اس لیے آپ کو سب کچھ یاد ہی رہا۔ بعض نے کہا

إِلَّا نَشَأَ اللَّهُ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَى ①

وَدَبِيرُهُ لَكُمْ لِيُذْهِبَ ②

فَذَكِّرْ إِنْ نَفَعَتِ الذِّكْرَى ③

سَيَذَكُّهُ مَنْ يَشَاءُ ④

وَيَجْعَلُهَا لِمَنْ يَشَاءُ ⑤

الَّذِي يَصْلَى النَّكَارَ الْكُبْرَى ⑥

فَهُوَ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى ⑦

مگر جو کچھ اللہ چاہے۔ وہ ظاہر اور پوشیدہ کو جانتا ہے۔^(۱) (۷)

ہم آپ کے لیے آسانی پیدا کر دیں گے۔^(۲) (۸)
تو آپ نصیحت کرتے رہیں اگر نصیحت کچھ فائدہ دے۔^(۳) (۹)

ڈرنے والا تو نصیحت لے گا۔^(۴) (۱۰)

(ہاں) بد بخت اس سے گریز کرے گا۔^(۵) (۱۱)

جو بڑی آگ میں جائے گا۔^(۶) (۱۲)

جہاں پھرنے وہ مرے گا نہ جیے گا،^(۷) (بلکہ حالت نزع میں

کہ اس کا مفہوم ہے کہ جن کو اللہ منسوخ کرنا چاہے گا وہ آپ کو بھلا دے گا۔ (فتح القدر)

(۱) یہ عام ہے، جہر قرآن کا وہ حصہ بھی ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاد کر لیں، اور جو آپ کے سینے سے نکل کر دیا جائے، وہ مخفی ہے۔ اس طرح جہر اونچی آواز سے پڑھے، مخفی پست آواز سے پڑھے۔ مخفی، چھپ کر عمل کرے اور جہر ظاہر، ان سب کو اللہ جانتا ہے۔

(۲) یہ بھی عام ہے، مثلاً ہم آپ پر وحی آسان کر دیں گے تاکہ اس کو یاد کرنا اور اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔ ہم آپ کی اس طریقے کی طرف رہنمائی کریں گے جو آسان ہو گا۔ ہم جنت والا عمل آپ کے لیے آسان کر دیں گے، ہم آپ کے لیے ایسے افعال و اقوال آسان کر دیں گے جن میں خیر ہو اور ہم آپ کے لیے ایسی شریعت مقرر کریں گے، جو سہل، مستقیم اور معتدل ہوگی، جس میں کوئی کجی، عسر اور تنگی نہیں ہوگی۔

(۳) یعنی وعظ و نصیحت وہاں کریں جہاں محسوس ہو کہ فائدہ مند ہوگی۔ یہ وعظ و نصیحت اور تعلیم کے لیے ایک اصول اور ادب بیان فرما دیا۔ (ابن کثیر) امام شوکانی کے نزدیک مفہوم یہ ہے کہ آپ نصیحت کرتے رہیں، چاہے فائدہ دے یا نہ دے۔ کیونکہ انذار و تبلیغ دونوں صورتوں میں آپ کے لیے ضروری تھی۔ یعنی اذَلَّمْ تَنْفَعْ یہاں محذوف ہے۔

(۴) یعنی آپ کی نصیحت سے وہ یقیناً عبرت حاصل کریں گے جن کے دلوں میں اللہ کا خوف ہو گا، ان میں خشیت الہی اور اپنی اصلاح کا جذبہ مزید قوی ہو جائے گا۔

(۵) یعنی اس نصیحت سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے کیوں کہ ان کا کفر پر اصرار اور اللہ کی معصیتوں میں انہماک جاری رہتا ہے۔

(۶) ان کے برعکس جو لوگ صرف اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے عارضی طور پر جہنم میں رہ گئے ہوں گے انہیں اللہ تعالیٰ ایک طرح کی موت دے دے گا۔ حتیٰ کہ وہ آگ میں جل کر کوئلہ ہو جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ انہما وغیرہ کی سفارش سے ان کو گروہوں کی شکل میں نکالے گا، ان کو جنت کی نہر میں ڈالا جائے گا، جنتی بھی ان پر پانی ڈالیں گے، جس سے وہ

پڑا رہے گا۔ (۱۳)

بیشک اس نے فلاح پالی جو پاک ہو گیا۔ (۱۴)^(۱)
اور جس نے اپنے رب کا نام یاد رکھا اور نماز
پڑھتا رہا۔ (۱۵)

لیکن تم تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ (۱۶)
اور آخرت بہت بہتر اور بہت بقا والی ہے۔ (۱۷)^(۲)
یہ باتیں پہلی کتابوں میں بھی ہیں۔ (۱۸)
(یعنی) ابراہیم اور موسیٰ کی کتابوں میں۔ (۱۹)

سورہ غاشیہ کمی ہے اور اس میں چھبیس آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

کیا تجھے بھی چھپالینے والی (قیامت) کی خبر پہنچی ہے۔ (۱)^(۳)
اس دن بہت سے چہرے ذلیل ہوں گے۔ (۲)^(۴)
(اور) محنت کرنے والے تھکے ہوئے ہوں گے۔ (۳)^(۵)

قَدْ آخِرَ مَنْ تَزَلَّى ۝

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى ۝

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝

وَالْآخِرَةَ خَيْرٌ لَّأَنْفَى ۝

إِنَّ هَذَا لَبِئْسَ الضَّعِيفُ الْأُولَى ۝

ضَعِيفٌ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى ۝



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ ۝

وَجُودًا يُؤْمِنُهَا شَاعِعَةٌ ۝

عَابِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝

اس طرح جی اٹھیں گے جیسے سیلاب کے کوڑے پر دانہ اگ آتا ہے۔ (صحیح مسلم 'کتاب الإيمان' باب
إثبات الشفاعة وإخراج الموحدين من النار)

(۱) جنہوں نے اپنے نفس کو اخلاقِ رزیلہ سے اور دلوں کو شرک و معصیت کی آلودگیوں سے پاک کر لیا۔

(۲) کیوں کہ دنیا اور اس کی ہر چیز فانی ہے، جب کہ آخرت کی زندگی دائمی اور ابدی ہے، اس لیے عاقل فانی چیز کو باقی
رہنے والی پر ترجیح نہیں دیتا۔

☆ بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز میں سورہ جمعہ کے ساتھ سورہ غاشیہ بھی پڑھتے
تھے۔ (موطأ امام مالک، باب القراءة فی صلاة الجمعة)

(۳) ہَلْ بِمَعْنَى قَدْ ہے۔ غَاشِيَةٌ سے مراد قیامت ہے۔ اس لیے کہ اس کی ہولناکیاں تمام مخلوق کو ڈھانک لیں گی۔

(۴) یعنی کافروں کے چہرے۔ خَاشِعَةٌ جھکے ہوئے، پست اور ذلیل۔ جیسے، نمازی، نماز کی حالت میں اللہ کے سامنے
عاجزی اور تذلل سے جھکا ہوتا ہے۔

(۵) نَاصِبَةٌ کے معنی ہیں، تھک چرچور ہو جانا۔ یعنی انہیں اتنا پر مشقت عذاب ہو گا کہ اس سے ان کا سخت برا حال ہو

تَصَلَّى نَارًا حَامِيَةً ①

تُسْفَى مِنْ عَيْنِ ابْنَةِ ②

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ صَرْمِهِ ③

لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعِهِ ④

وَجُودًا يُؤْمِنُهَا تَاعِمَةٌ ⑤

لَسَعِيهَا رَاضِيَةٌ ⑥

فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ⑦

لَا تَسْمَعُ فِيهَا الْأَفْيَةَ ⑧

فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ⑨

فِيهَا سُرُورٌ مَرْفُوعَةٌ ⑩

وَأَنْجَابٌ مُوَضَّوعَةٌ ⑪

وَتَسَامِرٌ مَصْفُوفَةٌ ⑫

وَدَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ ⑬

أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ⑭

وہ دیکتی ہوئی آگ میں جائیں گے۔ (۴)

اور نہایت گرم چشمے کا پانی ان کو پلایا جائے گا۔ (۵)

ان کے لیے سوائے کانٹے دار درختوں کے اور کچھ کھانا

نہ ہو گا۔ (۶)

جو نہ موٹا کرے گا نہ بھوک مٹائے گا۔ (۷)

بہت سے چرے اس دن تروتازہ اور (آسودہ حال) ہوں

گے۔ (۸)

اپنی کوشش پر خوش ہوں گے۔ (۹)

بلند و بالا جنتوں میں ہوں گے۔ (۱۰)

جہاں کوئی بیسودہ بات نہیں سنیں گے۔ (۱۱)

جہاں بہتا ہوا چشمہ ہو گا۔ (۱۲)

(اور) اس میں اونچے اونچے تخت ہوں گے۔ (۱۳)

اور آنخورے رکھے ہوئے (ہوں گے)۔ (۱۴)

اور ایک قطار میں لگے ہوئے تکیے ہوں گے۔ (۱۵)

اور مٹھلی مسندیں پھیلی پڑی ہوں گی۔ (۱۶)

کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کیے گئے

گا۔ اس کا ایک دوسرا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں عمل کر کر کے تھکے ہوئے ہوں گے یعنی بہت عمل کرتے رہے ہوں گے۔ لیکن وہ عمل باطل مذہب کے مطابق یا بدعات پر مبنی ہوں گے، اس لیے ”عبادات“ اور ”اعمال شاقہ“ کے باوجود جہنم میں جائیں گے۔ چنانچہ اسی مفہوم کی رو سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿عَالِمَةٌ تَاصِيَةٌ﴾ سے نصاریٰ مراد لیے ہیں (صحیح البخاری تفسیر سورۃ عاشیۃ)

(۱) یہاں وہ سخت کھولتا ہوا پانی مراد ہے جس کی گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔ (فتح القدر)

(۲) یہ ایک کانٹے دار درخت ہوتا ہے جسے خشک ہونے پر جانور بھی کھانا پسند نہیں کرتے۔ بہر حال یہ بھی زقوم کی طرح ایک نہایت تلخ، بدمزہ اور ناپاک ترین کھانا ہو گا، جو جزو بدن بنے گا، نہ اس سے بھوک ہی مٹے گی۔

(۳) یہ اہل جنت کا تذکرہ ہے، جو جہنمیوں کے برعکس نہایت آسودہ حال اور ہر قسم کی آسائشوں سے بہرہ ور ہوں گے۔ عین بطور جنس کے ہے یعنی متعدد چشمے ہوں گے۔ نَمَارِقُ، بمعنی وَسَائِدُ (تکیے) ہے دَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ، قالین اور گدے بستر مَبْثُوثَةٌ پھیلی ہوئی، یعنی یہ مسندیں جگہ جگہ بچھی ہوں گی۔ اہل جنت جہاں آرام کرنا چاہیں گے، کر سکیں گے۔

<p>ہیں۔^(۱) (۱۷)</p> <p>اور آسمان کو کہ کس طرح اونچا کیا گیا ہے۔^(۲) (۱۸)</p> <p>اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح گاڑ دیئے گئے ہیں۔^(۳) (۱۹)</p> <p>اور زمین کی طرف کہ کس طرح بچھائی گئی ہے۔^(۴) (۲۰)</p> <p>پس آپ نصیحت کر دیا کریں (کیونکہ) آپ صرف نصیحت کرنے والے ہیں۔^(۵) (۲۱)</p> <p>آپ کچھ ان پر داروغہ نہیں ہیں۔^(۶) (۲۲)</p> <p>ہاں! جو شخص روگردانی کرے اور کفر کرے۔ (۲۳)</p>	<p>وَالِی السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۷﴾</p> <p>وَالِی الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۸﴾</p> <p>وَالِی الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿۱۹﴾</p> <p>فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۰﴾</p> <p>لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُضَيِّطٍ ﴿۲۱﴾</p> <p>إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكُفِرًا ﴿۲۲﴾</p>
---	---

(۱) اونٹ عرب میں عام تھے اور ان عربوں کی غالب سواری یہی تھی 'اس لیے اللہ نے اسی کا ذکر کر کے فرمایا کہ اس کی خلقت پر غور کرو، اللہ نے اسے کتنا بڑا وجود عطا کیا ہے اور کتنی قوت و طاقت اس کے اندر رکھی ہے۔ اس کے باوجود وہ تمہارے لیے نرم اور تابع ہے، تم اس پر جتنا چاہو بوجھ لادو، وہ انکار نہیں کرے گا، تمہارا ماتحت ہو کر رہے گا۔ علاوہ ازیں اس کا گوشت تمہارے کھانے کے، اس کا دودھ تمہارے پینے کے اور اس کی اونگرمی حاصل کرنے کے کام آتی ہے۔

(۲) یعنی آسمان کتنی بلندی پر ہے، پانچ سو سال کی مسافت پر، پھر بھی بغیر ستون کے وہ کھڑا ہے۔ اس میں کوئی خشکاف اور کجی بھی نہیں ہے۔ نیز ہم نے اسے ستاروں سے مزین کیا ہوا ہے۔

(۳) یعنی کس طرح انہیں زمین پر بیٹوں کی طرح گاڑ دیا گیا ہے تاکہ زمین حرکت نہ کرے۔ نیز ان میں جو معدنیات اور دیگر منافع ہیں، وہ اس کے علاوہ ہیں۔

(۴) یعنی کس طرح اسے ہموار کر کے انسان کے رہنے کے قابل بنایا ہے، وہ اس پر چلتا پھرتا، کاروبار کرتا اور فلک بوس عمارتیں تعمیر کرتا ہے۔

(۵) یعنی آپ کا کام صرف تذکیر اور تبلیغ و دعوت ہے، اس کے علاوہ یا اس سے بڑھ کر نہیں۔

(۶) کہ انہیں ایمان لانے پر مجبور کریں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ہجرت سے قبل کا حکم ہے جو آیت سیف سے منسوخ ہو گیا، کیوں کہ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ «أَمِرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَقُولُوا: (لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ) فَإِذَا قَالُواهَا، عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّهَا؛ وَحَسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ». (صحیح بخاری) باب وجوب الزکوٰۃ مسلم کتاب الإیمان، باب الأمر بقتال الناس حتى يقولوا.....) "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کر لیں۔ جب وہ یہ اقرار کر لیں گے تو انہوں نے مجھ سے اپنے خونوں اور مالوں کو بچالیا۔ سوائے حق اسلام کے، (جو اگر ہمارے علم میں نہ آیا تو) ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔"

اسے اللہ تعالیٰ بہت بڑا عذاب دے گا۔ (۲۴) ^(۱)

بیشک ہماری طرف ان کا لوٹنا ہے۔ (۲۵)

پھر بیشک ہمارے ذمہ ہے ان سے حساب لینا۔ (۲۶) ^(۲)

سورہ فجر کی ہے اور اس میں تیس آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

قسم ہے فجر کی! ^(۱)

اور دس راتوں کی! ^(۲)

اور جفت اور طاق کی! ^(۳)

اور رات کی جب وہ چلنے لگے۔ ^(۴)

کیا ان میں عقلمند کے واسطے کافی قسم ہے۔؟ ^(۵)

فَيَعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ﴿٢٤﴾

إِنَّ الْبَيْنَا إِيَّاهُمْ ﴿٢٥﴾

ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿٢٦﴾



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴿١﴾

وَالْفَجْرِ ﴿١﴾

وَلَيْلٍ عَشْرٍ ﴿٢﴾

وَالشَّمْعِ وَالْوَتْرِ ﴿٣﴾

وَالْأَيْلِ إِذَا يَسْرُ ﴿٤﴾

هَلْ فِي ذَلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرِ ﴿٥﴾

(۱) یعنی جنم کا دائمی عذاب۔

(۲) مشہور ہے کہ اس کے جواب میں اللّٰهُمَّ! حَاسِبِنَا حَسَابًا يَسِيرًا۔ پڑھا جائے۔ یہ دعا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے جو آپ ﷺ اپنی بعض نمازوں میں پڑھتے تھے، جیسا کہ سورہ اشقاق میں گزرا۔ لیکن اس کے جواب میں پڑھنا، یہ آپ ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔

(۳) اس سے مراد مطلق فجر ہے، کسی خاص دن کی فجر نہیں۔

(۴) اس سے اکثر مفسرین کے نزدیک ذوالحجہ کی ابتدائی دس راتیں ہیں۔ جن کی فضیلت احادیث سے ثابت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”عشرہ ذوالحجہ میں کیے گئے عمل صالح اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ حتیٰ کہ جمادنی سمیل اللہ بھی اتنا پسندیدہ نہیں، سوائے اس جماد کے جس میں انسان شہید ہی ہو جائے۔“ (البخاری، کتاب العیدین، باب فضل العمل فی ایام التشریق)

(۵) اس سے مراد جفت اور طاق عدد ہیں یا وہ معدودات جو جفت اور طاق ہوتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ دراصل مخلوق کی قسم ہے، اس لیے کہ مخلوق جفت (جوڑا) یا طاق (فرد) ہے۔ اس کے علاوہ نہیں۔ (ایسر التفاسیر)

(۶) یعنی جب آئے اور جب جائے، کیوں کہ سَبْرٌ (چلنا) آتے، جاتے دونوں صورتوں میں ہوتا ہے۔

(۷) ذلک سے مذکورہ مقسم بہ اشیا کی طرف اشارہ ہے یعنی کیا ان کی قسم اہل عقل و دانش کے واسطے کافی نہیں ہے؟ حِجْرُ کے معنی ہوتے ہیں، روکنا، منع کرنا۔ انسانی عقل بھی انسان کو غلط کاموں سے روکتی ہے، اس لیے عقل کو بھی حجر کہا

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے عادیوں کے ساتھ کیا کیا۔^(۶)
 ستونوں والے ارم کے ساتھ۔^(۷)
 جس کی مانند (کوئی قوم) ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی۔^(۸)
 اور شموادیوں کے ساتھ جنہوں نے وادی میں بڑے بڑے پتھر تراشے تھے۔^(۹)
 اور فرعون کے ساتھ جو میٹھوں والا تھا۔^(۱۰)
 ان سمجھوں نے شہروں میں سر اٹھا رکھا تھا۔^(۱۱)

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۖ
 إِرْمَادَاتِ الْعِمَادِ ۖ
 الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۖ
 وَشَمُوْدَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۖ
 وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۖ
 الَّذِينَ طَعَنُوا فِي الْبِلَادِ ۖ

جاتا ہے، جس طرح اسی مفہوم کے اعتبار سے اسے نُبھیتہ بھی کہتے ہیں۔ جو اب قسم یا قسم علیہ لَتَبْعَنَّ ہے کیوں کہ کئی سورتوں میں عقیدے کی اصلاح پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ بعض کے نزدیک جو اب قسم آگے آنے والے الفاظ ﴿إِنَّ رَبَّكَ لَيَأْتِيَنَّكَ﴾ ہے۔ آگے بہ طریق استشاد اللہ تعالیٰ بعض ان قوموں کا ذکر فرما رہا ہے جو تکذیب و عناد کی بنا پر ہلاک کی گئی تھیں۔ مقصد اہل مکہ کو تنبیہ ہے کہ اگر تم ہمارے رسول ﷺ کی تکذیب سے باز نہ آئے تو تمہارا بھی اسی طرح مواخذہ ہو سکتا ہے، جیسے گزشتہ قوموں کا اللہ نے کیا۔

(۱) ان کی طرف حضرت ہود علیہ السلام نبی بنا کر بھیجے گئے تھے انہوں نے تکذیب کی، بلا آخر اللہ تعالیٰ نے سخت ہوا کا عذاب ان پر نازل کیا جو متواتر سات راتیں اور آٹھ دن چلتی رہی (الحاقہ: ۷-۱۰) اور انہیں تیس تیس کر کے رکھ دیا۔
 (۲) اِزْمٌ، عَادِیے عطف بیان یا بدل ہے۔ یہ قوم عاد کے دادا کا نام ہے۔ ان کا سلسلہ نسب ہے، عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح۔ (فتح القدیر) اس کا مقصد یہ وضاحت ہے کہ یہ عاد اولیٰ ہے۔ ذات العمد (ستونوں والے) سے اشارہ ہے ان کی قوت و طاقت اور دراز قامتی کی طرف۔
 علاوہ ازیں وہ فن تعمیر میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے اور نہایت مضبوط بنیادوں پر عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرتے تھے۔ ذات العمد میں دونوں ہی مفہوم شامل ہو سکتے ہیں۔

(۳) یعنی ان جیسی دراز قامت اور قوت و طاقت والی قوم کوئی اور پیدا نہیں ہوئی۔ یہ قوم کہا کرتی تھی ﴿مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ (حکم السجدة: ۱۵) ”ہم سے زیادہ کوئی طاقت ور ہے؟“
 (۴) یہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم تھی، اللہ نے اسے پتھر تراشنے کی خاص صلاحیت و قوت عطا کی تھی، حتیٰ کہ یہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر ان میں اپنی رہائش گاہیں تعمیر کر لیتے تھے، جیسا کہ قرآن نے کہا ہے ﴿وَتَخْتَوْنَ مِنَ الْجِبَالِ أَنْ يَقُولَنَّ﴾ (الشعراء: ۱۳۹)
 (۵) اس کا مطلب یہ ہے کہ بڑے لشکروں والا تھا جس کے پاس خیموں کی کثرت تھی جنہیں میخیں گاڑ کر کھڑا کیا جاتا تھا۔

فَاكْتَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ۝۱۳

كَصَبَ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝۱۴

إِنَّ رَبَّكَ لَيَا لَمِرْصَادٌ ۝۱۵

فَاتَّأَمَّ الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ ۝۱۶

فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۝۱۷

وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ ۝۱۸

أَهَانَنِ ۝۱۹

كَلَّا بَلْ لَّا تَكْفُرُونَ الْبَيْتَةَ ۝۲۰

وَلَا تَحْضُرُونَ عَلَى طَعَامِ الْمُسْكِينِ ۝۲۱

اور بہت فساد مچا رکھا تھا۔ (۱۳)

آخر تیرے رب نے ان سب پر عذاب کا کوڑا

برسایا۔ (۱۴)

یقیناً تیرا رب گھات میں ہے۔ (۱۵)

انسان (کایہ حال ہے کہ) جب اسے اس کا رب آزما تا ہے

اور عزت و نعمت دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے

رب نے مجھے عزت دار بنایا۔ (۱۶)

اور جب وہ اس کو آزما تا ہے اس کی روزی تنگ کر دیتا

ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے میری اہانت کی

(اور ذلیل کیا)۔ (۱۷)

ایسا ہرگز نہیں (بلکہ بات یہ ہے) کہ تم (ہی) لوگ

یتیموں کی عزت نہیں کرتے۔ (۱۸)

اور مسکینوں کے کھلانے کی ایک دوسرے کو ترغیب

نہیں دیتے۔ (۱۹)

یا اس سے اس کے ظلم و ستم کی طرف اشارہ ہے کہ میٹوں کے ذریعے سے وہ لوگوں کو سزائیں دیتا تھا۔ (فتح القدیر)

(۱) یعنی ان پر آسمان سے اپنا عذاب نازل فرما کر ان کو تباہ و برباد یا انہیں عبرت ناک انجام سے دوچار کر دیا۔

(۲) یعنی تمام مخلوقات کے اعمال دیکھ رہا ہے اور اس کے مطابق وہ دنیا اور آخرت میں جزا دیتا ہے۔

(۳) یعنی جب اللہ کسی کو رزق و دولت کی فراوانی عطا فرماتا ہے تو وہ اپنی بابت اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے کہ اللہ اس

پر بہت مہربان ہے، حالانکہ یہ فراوانی امتحان اور آزمائش کے طور پر ہوتی ہے۔

(۴) یعنی وہ تنگی میں مبتلا کر کے آزما تا ہے تو اللہ کے بارے میں بدگمانی کا اظہار کرتا ہے۔

(۵) یعنی بات اس طرح نہیں ہے جیسے لوگ سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مال اپنے محبوب بندوں کو بھی دیتا ہے اور ناپسندیدہ

افراد کو بھی، تنگی میں بھی وہ اپنوں اور بیگانوں دونوں کو مبتلا کرتا ہے۔ اصل مدار دونوں حالتوں میں اللہ کی اطاعت پر ہے۔

جب اللہ مال دے تو اللہ کا شکر کرے، تنگی آئے تو صبر کرے۔

(۶) یعنی ان کے ساتھ وہ حسن سلوک نہیں کرتے جس کے وہ مستحق ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ”وہ گھر

سب سے بہتر ہے جس میں یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے اور وہ گھر بدترین ہے جس میں اس کے ساتھ بد سلوکی کی

جائے۔ پھر اپنی انگلی کے ساتھ اشارہ کر کے فرمایا، میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ساتھ ساتھ ہوں

گے جیسے یہ دو انگلیاں ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ (ابوداؤد، کتاب الأدب، باب فی ضم الیتیم)

اور (مردوں کی) میراث سمیٹ سمیٹ کر کھاتے ہو۔^(۱) (۱۹)

اور مال کو جی بھر کر عزیز رکھتے ہو۔^(۲) (۲۰)
یقیناً جس^(۳) وقت زمین کوٹ کوٹ کر برابر کر دی جائے گی۔ (۲۱)

اور تیرا رب (خود) آجائے گا اور فرشتے صفیں باندھ کر (آجائیں گے)۔^(۴) (۲۲)

اور جس دن جنم بھی لائی جائے گی^(۵) اس دن انسان کو سمجھ آئے گی مگر آج اسکے سمجھنے کا فائدہ کہاں؟^(۶) (۲۳)
وہ کہے گا کہ کاش کہ میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سلمان کیا ہوتا۔^(۷) (۲۴)

پس آج اللہ کے عذاب جیسا عذاب کسی کا نہ ہو گا۔ (۲۵)
نہ اس کی قید و بند جیسی کسی کی قید و بند ہو گی۔^(۸) (۲۶)

وَتَأْكُلُونَ الثَّرَاثَ أَكْلًا لَّئِنَّا ۝

وَيُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝
كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝

وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝

وَجِئْنَا يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ
وَأَنَّى لَهُ الذِّكْرَى ۝

يَقُولُ يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي ۝

يَوْمَئِذٍ لَا يَعبُدُ عَذَابَ أَحَدٍ ۝

وَلَا يُؤْتِيهِمْ مَخْرَجًا وَلَا حَتْفًا أَحَدٍ ۝

(۱) یعنی جس طریقے سے بھی حاصل ہو، حلال طریقے سے یا حرام طریقے سے لَعْنًا بمعنی جَمْعًا

(۲) جَمًّا بمعنی کثیرًا

(۳) یا تمہارا عمل ایسا نہیں ہونا چاہیے جو مذکور ہوا، کیوں کہ ایک وقت آنے والا ہے جب.....

(۴) کہا جاتا ہے کہ جب فرشتے، قیامت والے دن آسمان سے نیچے اتریں گے تو ہر آسمان کے فرشتوں کی الگ صف ہو گی، اس طرح سات صفیں ہوں گی جو زمین کو گھیر لیں گی۔

(۵) ستر ہزار لگاموں کے ساتھ جنم جہڑی ہوئی ہوگی اور ہر لگام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے جو اسے کھینچ رہے ہوں گے۔ (صحیح مسلم، کتاب الجنۃ، باب فی شدۃ حر نار جہنم و بعد قعرھا۔ ترمذی، ابواب صفۃ

جہنم، باب ماجاء فی صفۃ النار) اسے عرش کے بائیں جانب کھڑا کر دیا جائے گا، پس اسے دیکھ کر تمام مقرب اور انبیاء علیہم السلام گھٹنوں کے بل گر پڑیں گے اور یَا رَبِّ! نَفْسِنِیْ نَفْسِنِیْ پکاریں گے۔ (فتح القدیر)

(۶) یعنی یہ ہونا تک منظر دیکھ کر انسان کی آنکھیں کھلیں گی اور اپنے کفر و معاصی پر نادم ہوگا، لیکن اس روز اس ندامت اور نصیحت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

(۷) یہ افسوس اور حسرت کا اظہار، اسی ندامت کا حصہ ہے جو اس روز فائدہ مند نہیں ہوگی۔

(۸) اس لیے کہ اس روز تمام اختیارات صرف ایک اللہ کے پاس ہوں گے۔ دوسرے، کسی کو اسکے سامنے رائے یا دم زنی

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾
اِمْرِئِي إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً مُّرْوِيَةً ﴿٢٨﴾

فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ﴿٢٩﴾
وَادْخُلِي جَنَّتِي ﴿٣٠﴾

اے اطمینان والی روح- (۲۷)
تو اپنے رب کی طرف^(۱) لوٹ چل اس طرح کہ تو اس
سے راضی وہ تجھ سے خوش- (۲۸)
پس میرے خاص بندوں میں داخل ہو جا- (۲۹)
اور میری جنت میں چلی جا- (۳۰)

سورہ بلد کی ہے اور اس میں بیس آیتیں ہیں-

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے-

میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں- (۱)
اور آپ اس شہر میں مقیم ہیں- (۲)

سُورَةُ الْبَلَدِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَا اَقِمْ بِهَذَا الْبَلَدِ ﴿١﴾
وَاَنْتَ حَلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ ﴿٢﴾

نہیں ہو گا حتیٰ کہ اسکی اجازت کے بغیر کوئی کسی کی سفارش تک نہیں کر سکے گا۔ ایسے حالات میں کافروں کو جو عذاب ہو گا اور
جس طرح وہ اللہ کی قید و بند میں جکڑے ہوں گے، اس کا یہاں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا چہ جائیکہ اس کا کچھ اندازہ ممکن ہو۔ یہ تو
مجرموں اور ظالموں کا حال ہو گا لیکن اہل ایمان و طاعت کا حال اس سے بالکل مختلف ہو گا، جیسا کہ اگلی آیات میں ہے۔

(۱) یعنی اس کے اجر و ثواب اور ان نعمتوں کی طرف جو اس نے اپنے بندوں کے لیے جنت میں تیار کی ہیں۔ بعض کہتے
ہیں قیامت والے دن کہا جائے گا بعض کہتے ہیں کہ موت کے وقت بھی فرشتے خوشخبری دیتے ہیں، اسی طرح قیامت
والے دن بھی اسے یہ کہا جائے گا جو یہاں مذکور ہے۔ حافظ ابن کثیر نے ابن عساکر کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ نبی
کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو یہ دعا پڑھنے کا حکم دیا، «اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ نَفْسًا، بِلِكَ مُطْمَئِنَّةً، تُؤْمِنُ
بِلِقَاتِكَ، وَتَرْضَىٰ بِفَضْلِكَ وَتَقْنَعُ بِعَطَايِكَ»۔ (ابن کثیر)

(۲) اس سے مراد مکہ مکرمہ ہے جس میں اس وقت، جب اس سورت کا نزول ہوا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام تھا،
آپ ﷺ کا مولد بھی یہی شہر تھا۔ یعنی اللہ نے آپ ﷺ کے مولد و مسکن کی قسم کھائی، جس سے اس کی عظمت کی مزید
وضاحت ہوتی ہے۔

(۳) یہ اشارہ ہے اس وقت کی طرف جب مکہ فتح ہوا، اس وقت اللہ نے نبی ﷺ کے لیے اس بلد حرام میں قتال کو
حلال فرمایا تھا جب کہ اس میں لڑائی کی اجازت نہیں ہے چنانچہ حدیث ہے، نبی ﷺ نے فرمایا، «اس شہر کو اللہ نے اس
وقت سے حرمت والا بنایا ہے، جب سے اس نے آسمان و زمین پیدا کیے۔ پس یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حرمت سے قیامت
تک حرام ہے، نہ اس کا درخت کاٹا جائے نہ اس کے کانٹے اکھڑے جائیں، میرے لیے اسے صرف دن کی ایک ساعت

اور (قسم ہے) انسانی باپ اور اولاد کی۔ ^(۱) (۳)	وَوَالِدًا وَمَا وُلِدَ ۝
یقیناً ہم نے انسان کو (بڑی) مشقت میں پیدا کیا ہے۔ ^(۲) (۴)	لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝
کیا یہ گمان کرتا ہے کہ یہ کسی کے بس میں ہی نہیں؟ ^(۳) (۵)	أَيَحْسَبُ أَنْ لَنْ يَقْدَرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ۝
کتنا (پھرتا) ہے کہ میں نے تو بہت کچھ مال خرچ کر ڈالا۔ ^(۴) (۶)	يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُبَدًا ۝
کیا (یوں) سمجھتا ہے کہ کسی نے اسے دیکھا (ہی) نہیں؟ ^(۵) (۷)	أَيَحْسَبُ أَنْ لَمْ يَرَهُ أَحَدٌ ۝
کیا ہم نے اس کی دو آنکھیں نہیں بنائیں۔ ^(۶) (۸)	أَلَمْ جَعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ ۝
اور زبان اور ہونٹ (نہیں بنائے) ^(۷) (۹)	وَلِسَانًا وَتَفَتُّيْنِ ۝

کے لیے حلال کیا گیا تھا اور آج اس کی حرمت پھر اسی طرح لوٹ آئی ہے، جیسے کل تھی..... اگر کوئی یہاں قتال کے لیے دلیل میں میری لڑائی کو پیش کرے تو اس سے کہو کہ اللہ کے رسول کو تو اس کی اجازت اللہ نے دی تھی جب کہ تمہیں یہ اجازت اس نے نہیں دی۔“ (صحیح بخاری، کتاب العلم، باب لیبغ الشاہد منکم الغائب۔ مسلم، کتاب الحج، باب تحریم مکة.....) اس اعتبار سے معنی ہوں گے وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ فِي الْمُسْتَقْبَلِ یہ جملہ معترضہ ہے۔

(۱) بعض نے اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد لی ہے، اور بعض کے نزدیک یہ عام ہے، ہر باپ اور اس کی اولاد اس میں شامل ہے۔

(۲) یعنی اس کی زندگی محنت و مشقت اور شداوند سے معمور ہے۔ امام طبری نے اسی مفہوم کو اختیار کیا ہے، یہ جواب قسم ہے۔

(۳) یعنی کوئی اس کی گرفت کرنے پر قادر نہیں؟

(۴) لُبْدًا۔ کثیر، ڈھیر۔ یعنی دنیا کے معاملات اور فضولیات میں خوب بیہ اڑاتا ہے، پھر فخر کے طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا پھرتا ہے۔

(۵) اس طرح اللہ کی نافرمانی میں مال خرچ کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کوئی اسے دیکھنے والا نہیں ہے؟ حالانکہ اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ جس پر وہ اسے جزا دے گا۔ آگے اللہ تعالیٰ اپنے بعض انعامات کا تذکرہ فرما رہا ہے تاکہ ایسے لوگ عبرت پکڑیں۔

(۶) جن سے یہ دیکھتا ہے۔

(۷) زبان سے وہ بولتا اور اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے۔ ہونٹوں سے وہ بولنے اور کھانے کے لیے مدد حاصل کرتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ اس کے چہرے اور منہ کے لیے خوب صورتی کا بھی باعث ہیں۔

ہم نے دکھائیے اس کو دونوں راستے۔ (۱۰)^(۱)
 سو اس سے نہ ہو سکا کہ گھائی میں داخل ہوتا۔ (۱۱)^(۲)
 اور کیا سمجھا کہ گھائی ہے کیا؟ (۱۲)
 کسی گردن (غلام لونڈی) کو آزاد کرنا۔ (۱۳)
 یا بھوک والے دن کھانا کھلانا۔ (۱۴)
 کسی رشتہ دار یتیم کو۔ (۱۵)
 یا خاکسار مسکین کو۔ (۱۶)^(۳)
 پھر ان لوگوں میں سے ہو جاتا جو ایمان لاتے (۱۷)^(۴) اور ایک
 دوسرے کو صبر کی اور رحم کرنے کی وصیت کرتے

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝
 فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝
 وَآذْرُوكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝
 فَكَّ رَقَبَةً ۝
 أَوْ اطْعَمُوهُ يَوْمَ ذِي مَسْجِنٍ ۝
 يُتِيمًا ذَا مَعْرَبَةٍ ۝
 أَوْ وَسَّكَيْتُمْ ذَا مَتْرَبَةٍ ۝
 ذُو كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَّصَّوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَّصَّوْا
 بِالرَّحْمَةِ ۝

(۱) یعنی خبر کی بھی اور شر کی بھی اور ایمان کی بھی، سعادت کی بھی اور شقاوت کی بھی۔ جیسے فرمایا، ﴿لَا تَأْخُذْ بِهَا النَّفْسَ﴾
 ﴿إِنَّمَا تَأْخُذُ بِهَا وَاللَّهُ لَكُونًا﴾ (الدھر - ۳) نَجْدُ کے معنی ہیں، اونچی جگہ۔ اس لیے بعض نے یہ ترجمہ کیا ہے ”ہم نے انسان
 کی (ماں کے) دو پستانوں کی طرف رہنمائی کر دی“ یعنی وہ عالم شیر خوارگی میں ان سے اپنی خوراک حاصل کرے۔ لیکن
 پہلا مفہوم زیادہ صحیح ہے۔

(۲) عَقَبَةُ گھائی کو کہتے ہیں یعنی وہ راستہ جو پہاڑ میں ہو۔ یہ عام طور پر نہایت دشوار گزار ہوتا ہے۔ یہ جملہ یہاں
 استفہام بمعنی انکار کے مفہوم میں ہے۔ یعنی أَفَلَا أَفْتَحْتُمْ الْعَقَبَةَ کیا وہ گھائی میں داخل نہیں ہوا؟ مطلب ہے نہیں
 ہوا۔ یہ ایک مثال ہے اس محنت و مشقت کی وضاحت کے لیے جو نیکی کے کاموں کے لیے ایک انسان کو شیطان کے
 وسوسوں اور نفس کے شہوانی تقاضوں کے خلاف کرنی پڑتی ہے، جیسے گھائی پر چڑھنے کے لیے سخت جدوجہد کی ضرورت
 ہوتی ہے۔ (فتح القدر)

(۳) مَسْجِنِي، مَسْجِنِي، مَسْجِنِي (بھوک) يَوْمِ ذِي مَسْجِنٍ، بھوک والے دن۔ ذَا مَتْرَبَةٍ (مٹی والا) یعنی جو فقرو غریب کی
 وجہ سے مٹی (زمین) پر پڑا ہو۔ اس کا گھریا بھی نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ کسی گردن کو آزاد کر دینا، کسی بھوکے کو، رشتے
 دار یتیم کو یا مسکین کو کھانا کھلانا، یہ دشوار گزار گھائی میں داخل ہونا ہے جس کے ذریعے سے انسان جہنم سے بچ کر جنت
 میں جا پہنچے گا۔ یتیم کی کفالت ویسے ہی بڑے اجر کا کام ہے، لیکن اگر وہ رشتے دار بھی ہو تو اس کی کفالت کا اجر بھی دگنا
 ہے۔ ایک صدقے کا، دوسرا صلہ رحمی کا۔ اسی طرح غلام آزاد کرنے کی بھی بڑی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔ آج کل
 اس کی ایک صورت کسی مقروض کو قرض کے بوجھ سے نجات دلانا ہو سکتی ہے، یہ بھی ایک گونہ فَكَّ رَقَبَةٍ ہے۔

(۴) اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ اعمال خیر، اسی وقت نافع اور اخروی سعادت کا باعث ہوں گے جب ان کا کرنے والا
 صاحب ایمان ہو گا۔

ہیں۔^(۱) (۱۷)

یہی لوگ ہیں دائیں بازو والے (خوش بختی والے) (۱۸)
اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کے ساتھ کفر کیا یہ کم
بختی والے ہیں۔ (۱۹)
انہی پر آگ ہوگی جو چاروں طرف سے گھیری^(۲) ہوئی ہو
گی۔ (۲۰)

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ۝

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَاهُمْ أَصْحَابُ الشِّمَّةِ ۝

عَلَيْهِمْ نَارُ مُّؤَصَّدَةٌ ۝

سورہ شمس کی ہے اور اس میں پندرہ آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی۔^(۱)
قسم ہے چاند کی جب اس کے پیچھے آئے۔^(۲)
قسم ہے دن کی جب سورج کو نمایاں کرے۔^(۳)
قسم ہے رات کی جب اسے ڈھانپ لے۔^(۴)
قسم ہے آسمان کی اور اس کے بنانے کی۔^(۵)
قسم ہے زمین کی اور اسے ہموار کرنے کی۔^(۶)
قسم ہے نفس کی اور اسے درست بنانے کی۔^(۷)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا ۝

وَالْقَمَرُ إِذَا تَلَّهَا ۝

وَالنَّهَارُ إِذَا جَلَّهَا ۝

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا ۝

وَالسَّمَاءَ وَمَا بَنَاهَا ۝

وَالْأَرْضَ وَمَا طَرَاهَا ۝

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝

(۱) اہل ایمان کی صفت ہے کہ وہ ایک دوسرے کو صبر کی اور رحم کی تلقین کرتے ہیں۔

(۲) مؤصَّدة کے معنی مُغلَقَة (بند) یعنی ان کو آگ میں ڈال کر چاروں طرف سے بند کر دیا جائے گا، تاکہ ایک تو آگ
کی پوری شدت و حرارت ان کو پہنچے۔ دوسرے، وہ بھاگ کر کہیں نہ جا سکیں۔

(۳) یا اس کی روشنی کی، یا مطلب صُحٰی سے دن ہے۔ یعنی سورج کی اور دن کی قسم۔

(۴) یعنی جب سورج غروب ہونے کے بعد وہ طلوع ہو، جیسا کہ پہلے نصف مینے میں ایسا ہوتا ہے۔

(۵) یا تاریکی کو دور کرے، ظلمت کا پہلے ذکر تو نہیں ہے لیکن سیاق اس پر دلالت کرتا ہے۔ (فتح القدر)

(۶) یعنی سورج کو ڈھانپ لے اور ہر سمت اندھیرا چھا جائے۔

(۷) یا اس ذات کی جس نے اسے بنایا۔ پہلے معنی کی رو سے ما بمعنی مَنْ ہو گا۔

(۸) یا جس نے اسے ہموار کیا۔

(۹) یا جس نے اسے درست کیا۔ درست کرنے کا مطلب ہے، اسے متناسب الاعضاء بنایا، بے ڈھبا اور بے ڈھکا نہیں بنایا۔

<p>پھر سمجھ دی اس کو بد کاری کی اور بچ چلنے کی۔ (۸)^(۱) جس نے اسے پاک کیا وہ کامیاب ہوا۔ (۹)^(۲) اور جس نے اسے خاک میں ملا دیا وہ ناکام ہوا۔ (۱۰)^(۳) (قوم) ثمود نے اپنی سرکشی کے باعث جھٹلایا۔ (۱۱)^(۴) جب ان میں کا بڑا بد بخت اٹھ کھڑا ہوا۔ (۱۲)^(۵) انہیں اللہ کے رسول نے فرما دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی اونٹنی اور اس کے پینے کی باری کی (حفاظت کرو)۔ (۱۳)^(۶) ان لوگوں نے اپنے پیغمبر کو جھوٹا سمجھ کر اس اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں،^(۷) پس ان کے رب نے ان کے</p>	<p>فَالَهُمَا غُورٌ وَمَا وَتَقُولُنَّهَا ۝ وَذَاقُوا لَمَمَ مَنْ زَكَّاهَا ۝ وَذَاقَ خَابَ مَنْ دَسَّهَا ۝ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا ۝ إِذِ انبَعَثَ أَشْقَاهَا ۝ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا ۝ فَكَذَّبُوهُ فَصَبَوْهُمَا فَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمُ لُحُوبًا يَدُومُونَ قَسُوطَهَا ۝</p>
---	--

(۱) الامام کا مطلب یا تو یہ ہے کہ انہیں اچھی طرح سمجھا دیا اور انہیں انبیا علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کے ذریعے سے خیر و شر کی پہچان کروادی۔ یا مطلب ہے کہ ان کی عقل اور فطرت میں خیر اور شر، نیکی اور بدی کا شعور ودیعت کر دیا۔ تاکہ وہ نیکی کو اپنائیں اور بدی سے اجتناب کریں۔

(۲) شرک سے، معصیت سے اور اخلاقی آلائشوں سے پاک کیا، وہ اخروی فوز و فلاح سے ہمکنار ہو گا۔

(۳) یعنی جس نے اسے گمراہ کر لیا، وہ خسارے میں رہا۔ دَسَّ، تَدَسَّنَسْتُ سے ہے، جس کے معنی ہیں۔ ایک چیز کو دوسری چیز میں چھپا دینا۔ دَسَّاهَا کے معنی ہوں گے جس نے اپنے نفس کو چھپا دیا اور اسے بے کار چھوڑ دیا اور اسے اللہ کی اطاعت اور عمل صالح کے ساتھ مشہور نہیں کیا۔

(۴) طُغْيَانًا، وہ سرکشی جو حد سے تجاوز کر جائے اسی طُغْيَان نے انہیں تکذیب پر آمادہ کیا۔

(۵) جس کا نام مفسرین قدر بن سالف بتلاتے ہیں۔ اس نے ایسا کام کیا کہ یہ رئیس الاشقیاء بن گیا سب سے بڑا شقی (بد بخت)۔

(۶) یعنی اس اونٹنی کو کوئی نقصان نہ پہنچائے، اسی طرح اس کے لیے پانی پینے کا جودن ہو، اس میں بھی گڑبوند نہ جائے۔ اونٹنی اور قوم ثمود دونوں کے لیے پانی کا ایک ایک دن مقرر کر دیا گیا تھا۔ اس کی حفاظت کی تاکید کی گئی۔ لیکن ان ظالموں نے پروا نہیں کی۔

(۷) یہ کام ایک ہی شخص قدر نے کیا تھا۔ لیکن چون کہ اس شرارت میں قوم بھی اس کے ساتھ تھی اس لیے اس میں سب کو برابر کا مجرم قرار دیا گیا۔ اور تکذیب اور اونٹنی کی کوچیں کاٹنے کی نسبت پوری قوم کی طرف کی گئی۔ جس سے یہ اصول معلوم ہوا کہ ایک برائی کا ارتکاب کرنے والے اگر چند ایک افراد ہوں لیکن پوری قوم اس برائی پر تکبیر کرنے کے بجائے اسے پسند کرتی ہو تو اللہ کے ہاں پوری قوم اس برائی کی مرتکب قرار پائے گی اور اس جرم یا برائی میں برابر کی شریک سمجھی جائے گی۔

گناہوں کے باعث ان پر ہلاکت ڈالی^(۱) اور پھر ہلاکت کو عام کر دیا اور اس بستی کو برابر کر دیا۔^(۲) (۱۳)
وہ نہیں ڈرتا اس کے تباہ کن انجام سے۔^(۳) (۱۵)

وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا ۝

سورہ لیل کی ہے اور اس میں اکیس آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

قسم ہے رات کی جب چھا جائے۔^(۱) (۱)

اور قسم ہے دن کی جب روشن ہو۔^(۲) (۲)

اور قسم ہے اس ذات کی جس نے نرمادہ کو پیدا
کیا۔^(۳) (۳)

یقیناً تمہاری کوشش مختلف قسم کی ہے۔^(۴) (۴)

جس نے دیا (اللہ کی راہ میں) اور ڈرا (اپنے رب
سے)۔^(۵) (۵)



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ۝

وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ۝

وَمَا خَلَقَ الذُّكْرَ وَالْأُنثَىٰ ۝

إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ۝

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۝

(۱) كَذَمَدَمَ عَلَيْهِمْ، ان کو ہلاک کر دیا اور ان پر سخت عذاب نازل کیا۔

(۲) عام کر دیا، یعنی اس عذاب میں سب کو برابر کر دیا، کسی کو نہیں چھوڑا، چھوٹا بڑا، سب کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ یا زمین کو ان پر برابر کر دیا یعنی سب کو تہ خاک کر دیا۔

(۳) یعنی اللہ تعالیٰ کو یہ ڈر نہیں ہے کہ اس نے انہیں سزا دی ہے کہ کوئی بڑی طاقت اس کا اس سے بدلہ لے گی۔ وہ انجام سے بے خوف ہے کیوں کہ کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو اس سے بڑھ کر یا اس کے برابر ہی ہو، جو اس سے انتقام لینے کی قدرت رکھتی ہو۔

(۴) یعنی افق پر چھا جائے جس سے دن کی روشنی ختم اور اندھیرا ہو جائے۔

(۵) یعنی رات کا اندھیرا ختم اور دن کا اجالا پھیل جائے۔

(۶) یہ اللہ نے اپنی قسم کھائی، کیوں کہ مرد و عورت دونوں کا خالق اللہ ہی ہے ما موصولہ ہے۔ بمعنی الَّذِي۔

(۷) یعنی کوئی اچھے عمل کرتا ہے، جس کا صلہ جنت ہے اور کوئی برے عمل کرتا ہے جس کا بدلہ جہنم ہے۔ یہ جو اب قسم ہے شَتَّىٰ، شَيْنَتَّىٰ کی جمع ہے، جیسے مَرَبِضٌ کی جمع مَرَضَىٰ۔

(۸) یعنی خیر کے کاموں میں خرچ کرے گا اور محارم سے بچے گا۔

اور نیک بات کی تصدیق کرتا رہے گا۔ ^(۱) (۶)	وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۝
تو ہم بھی اسکو آسان راستے کی سہولت دیں گے۔ ^(۲) (۷)	فَسَيُسِّرُهَا لِلْيُسْرَىٰ ۝
لیکن جس نے بخیلی کی اور بے پرواہی برتی۔ ^(۳) (۸)	وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۝
اور نیک بات کی تکذیب کی۔ ^(۴) (۹)	وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۝
تو ہم بھی اس کی تنگی و مشکل کے سلمان میسر کر دیں گے۔ ^(۵) (۱۰)	فَسَيُسِّرُهَا لِلْيُسْرَىٰ ۝
اس کا مال اسے (اوندھا) کرنے کے وقت کچھ کام نہ آئے گا۔ ^(۶) (۱۱)	وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ۝
پیشک راہ دکھا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ ^(۷) (۱۲)	إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ۝

(۱) یا مجھے صلے کی تصدیق کرے گا، یعنی اس بات پر یقین رکھے گا کہ انفاق اور تقویٰ کا اللہ کی طرف سے عمدہ صلہ ملے گا۔
(۲) یُسْرَىٰ کا مطلب نیکی اور الْخَصْلَةُ الْحُسْنَىٰ ہے۔ یعنی ہم اس کو نیکی و اطاعت کی توفیق دیتے اور ان کو اس کے لیے آسان کر دیتے ہیں۔ مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جنہوں نے چھ غلام آزاد کیے، جنہیں اہل مکہ مسلمان ہونے کی وجہ سے سخت اذیت دیتے تھے۔ (فتح القدر)
(۳) یعنی اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرے گا اور اللہ کے حکم سے بے پرواہی کرے گا۔
(۴) یا آخرت کی جزا اور حساب کتاب کا انکار کرے گا۔

(۵) عُسْرَىٰ (تنگی) سے مراد کفر و معصیت اور طریق شر ہے۔ یعنی ہم اس کے لیے نافرمانی کا راستہ آسان کر دیں گے، جس سے اس کے لیے خیر و سعادت کے راستے مشکل ہو جائیں گے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون کئی جگہ بیان کیا گیا ہے کہ جو خیر و رشد کا راستہ اپناتا ہے، اس کے صلے میں اللہ اسے خیر کی توفیق سے نوازتا ہے اور جو شر و معصیت کو اختیار کرتا ہے، اللہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور یہ اس تقدیر کے مطابق ہی ہوتا ہے جو اللہ نے اپنے علم سے لکھ رکھی ہے۔ (ابن کثیر) یہ مضمون حدیث میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”تم عمل کرو، ہر شخص جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے، وہ اس کے لیے آسان کر دیا جاتا ہے، جو اہل سعادت سے ہوتا ہے، اسے اہل سعادت والے عمل کی توفیق دے دی جاتی ہے اور جو اہل شقاوت سے ہوتا ہے، اس کے لیے اہل شقاوت والے عمل آسان کر دیئے جاتے ہیں۔“ (صحیح البخاری، تفسیر سورۃ السلیل)

(۶) یعنی جب جہنم میں گرے گا تو یہ مال، جسے وہ خرچ نہیں کرتا تھا، کچھ کام نہ آئے گا۔

(۷) یعنی حلال اور حرام، خیر اور شر، ہدایت اور ضلالت کو واضح اور بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ (جو کہ ہم نے کر دیا ہے)

وَأَنَّ لَنَا الْآخِرَةَ وَالْأُولَى ⑤

فَأَيُّكُمْ نَارًا تَلْقَى ⑥

لَا يَصْلُهَا إِلَّا الرَّاغِبِينَ ⑦

الَّذِينَ كَذَّبَ وَتَوَلَّى ⑧

وَسَيَصِيبُهُمُ الْآسْفُ ⑨

الَّذِينَ يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ⑩

وَمَا لِاحِدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى ⑪

إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى ⑫

اور ہمارے ہی ہاتھ آخرت اور دنیا ہے۔ (۱۳)

میں نے تو تمہیں شعلے مارتی ہوئی آگ سے ڈرا دیا ہے۔ (۱۴)

جس میں صرف وہی بد بخت داخل ہو گا۔ (۱۵)

جس نے جھٹلایا اور (اس کی پیروی سے) منہ پھیر لیا۔ (۱۶)

اور اس سے ایسا شخص دور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیزگار ہو گا۔ (۱۷)

جو پاکی حاصل کرنے کے لیے اپنا مال دیتا ہے۔ (۱۸)

کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں کہ جس کا بدلہ دیا جا رہا ہو۔ (۱۹)

بلکہ صرف اپنے پروردگار بزرگ و بلند کی رضا چاہنے کے لیے۔ (۲۰)

(۱) یعنی دونوں کے مالک ہم ہی ہیں، ان میں جس طرح چاہیں تصرف کریں اس لیے ان دونوں کے یا ان میں سے کسی ایک کے طالب ہم سے ہی مانگیں کیوں کہ ہر طالب کو ہم ہی اپنی مشیت کے مطابق دیتے ہیں۔

(۲) اس آیت سے مراد فرقہ نے (جو ایک باطل فرقہ گزرا ہے) استدلال کیا ہے کہ جہنم میں صرف کافر ہی جائیں گے۔ کوئی مسلمان چاہے کتنا ہی گناہ گار ہو، وہ جہنم میں نہیں جائے گا۔ لیکن یہ عقیدہ ان نصوص صریحہ کے خلاف ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے مسلمان بھی، جن کو اللہ تعالیٰ کچھ سزا دینا چاہے گا، کچھ عرصے کے لیے جہنم میں جائیں گے، پھر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ملائکہ اور دیگر صالحین کی شفاعت سے نکال لیے جائیں گے، یہاں حصر کے انداز میں جو کہا گیا ہے، اس کا مطلب ہے کہ جو لوگ کچھ کافر اور نہایت بد بخت ہیں، جہنم دراصل ان ہی کے لیے بنائی گئی ہے، جس میں وہ لازمی اور حتمی طور پر اور ہمیشہ کے لیے داخل ہوں گے۔ اگر کچھ نافرمان قسم کے مسلمان جہنم میں جائیں گے تو وہ لازمی اور حتمی طور پر اور ہمیشہ کے لیے نہیں جائیں گے، بلکہ بطور سزا ان کا یہ دخول عارضی ہو گا۔ (فتح القدر)

(۳) یعنی جہنم سے دور رہے گا اور جنت میں داخل ہو گا۔

(۴) یعنی جو اپنا مال اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرتا ہے تاکہ اس کا نفس بھی اور اس کا مال بھی پاک ہو جائے۔

(۵) یعنی بدلہ اتارنے کے لیے خرچ نہ کرتا ہو۔

(۶) بلکہ اخلاص سے اللہ کی رضا اور جنت میں اس کے دیدار کے لیے خرچ کرتا ہے۔

وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ ۝

یقیناً وہ (اللہ بھی) عنقریب رضامند ہو جائے گا۔ (۲۱) (۱)

سورہ ضحیٰ کی ہے اور اس میں گیارہ آیتیں ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

وَالضُّحَىٰ ۝

قسم ہے چاشت کے وقت کی۔ (۲)

وَأَنبَلِ إِذَا سَجَىٰ ۝

اور قسم ہے رات کی جب چھا جائے۔ (۳)

نہ تو تیرے رب نے تجھے چھوڑا ہے اور نہ وہ بیزار ہو گیا
ہے۔ (۴)

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ ۝

یقیناً تیرے لیے انجام آغاز سے بہتر ہو گا۔ (۵)

وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ۝

تجھے تیرا رب بہت جلد (انعام) دے گا اور تو راضی (و
خوش) ہو جائے گا۔ (۶)

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝

(۱) یا وہ راضی ہو جائے گا، یعنی جو شخص ان صفات کا حامل ہو گا، اللہ تعالیٰ اسے جنت کی نعمتیں اور عزت و شرف عطا فرمائے گا، جس سے وہ راضی ہو جائے گا۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے بلکہ بعض نے اجماع تک نقل کیا ہے کہ یہ آیات حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔ تاہم معنی و مفہوم کے اعتبار سے یہ عام ہیں، جو بھی ان صفات عالیہ سے متصف ہو گا وہ بارگاہ الہی میں ان کا مصداق قرار پائے گا۔

☆ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہو گئے دو تین راتیں آپ نے قیام نہیں فرمایا، ایک عورت آپ ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) معلوم ہوتا ہے کہ تیرے شیطان نے تجھے چھوڑ دیا ہے، دو تین راتوں سے میں دیکھ رہی ہوں کہ وہ تیرے قریب نہیں آیا۔ جس پر اللہ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ (صحیح البخاری) تفسیر سورۃ الضحیٰ، یہ عورت ابوسب کی بیوی ام جمیل تھی۔ (فتح الباری)

(۲) چاشت (ضحیٰ) اس وقت کو کہتے ہیں، جب سورج بلند ہوتا ہے۔ یہاں مراد پورا دن ہے۔

(۳) سَجَىٰ کے معنی ہیں سکن، جب ساکن ہو جائے، یعنی جب اندھیرا کھل چھا جائے، کیونکہ اس وقت ہر چیز ساکن ہو جاتی ہے۔

(۴) جیسا کہ کافر سمجھ رہے ہیں۔

(۵) یا آخرت دنیا سے بہتر ہے۔ دونوں مفہوم معانی کے اعتبار سے صحیح ہیں۔

(۶) اس سے دنیا کی فتوحات اور آخرت کا اجر و ثواب مراد ہے۔ اس میں وہ حق شفاعت بھی داخل ہے جو آپ ﷺ کو

- کیا اس نے تجھے یتیم پا کر جگہ نہیں دی؟^(۱) (۶)
 اور تجھے راہ بھولا پا کر ہدایت نہیں دی۔^(۲) (۷)
 اور تجھے نادار پا کر تو نگر نہیں بنا دیا؟^(۳) (۸)
 پس یتیم پر تو بھی سختی نہ کیا کر۔^(۴) (۹)
 اور نہ سوال کرنے والے کو ڈانٹ ڈپٹ۔^(۵) (۱۰)
 اور اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کرتا رہ۔^(۶) (۱۱)

- الَّذِي يَدْعُكَ يَتِيمًا فَادْوِي ۝
 وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَى ۝
 وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَى ۝
 فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝
 وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝
 وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝

سورۃ الم نشرح کی ہے اور اس میں آٹھ آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
 نہایت رحم والا ہے۔

کیا ہم نے تیرا سینہ نہیں کھول دیا۔^(۷) (۱)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

الَّذِي نَشْرَعُ لَكَ صَدْرَكَ ۝

اپنی امت کے گناہ گاروں کے لیے ملے گا۔

(۱) یعنی باپ کے سہارے سے بھی تو محروم تھا، ہم نے تیری دست گیری اور چارہ سازی کی۔

(۲) یعنی تجھے دین شریعت اور ایمان کا پتہ نہیں تھا، ہم نے تجھے راہ یاب کیا، نبوت سے نوازا اور کتاب نازل کی، ورنہ اس سے قبل تو ہدایت کے لیے سرگرداں تھا۔

(۳) تو نگر کا مطلب ہے، اپنے سوا تجھ کو ہر ایک سے بے نیاز کر دیا، پس تو فقر میں صابر اور غنا میں شاکر رہا۔ جیسے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی فرمان ہے کہ ”تو نگری، ساز و سامان کی کثرت کا نام نہیں ہے، اصل تو نگری دل کی تو نگری ہے۔“

(صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب لیس الغنی عن کثرة العوض)

(۴) بلکہ اس کے ساتھ نرمی و احسان کا معاملہ کر۔

(۵) یعنی اس سے سختی اور تکبر نہ کر، نہ درشت اور تلخ لہجہ اختیار کر۔ بلکہ جواب بھی دینا ہو تو پیار اور محبت سے دو۔

(۶) یعنی اللہ نے تجھ پر جو احسانات کیے ہیں، مثلاً ہدایت اور رسالت و نبوت سے نوازا، یتیمی کے باوجود تیری کفالت و سرپرستی کا انتظام کیا، تجھے قناعت و تو نگری عطا کی وغیرہ۔ انہیں جذبات تشکر و ممنونیت کے ساتھ بیان کرتا رہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے انعامات کا تذکرہ اور ان کا اظہار اللہ کو پسند ہے لیکن تکبر اور فخر کے طور پر نہیں بلکہ اللہ کے فضل و کرم اور اس کے احسان سے زیر بار ہوتے ہوئے اور اس کی قدرت و طاقت سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں وہ ہمیں ان نعمتوں سے محروم نہ کر دے۔

(۷) گزشتہ سورت میں تین انعامات کا ذکر تھا، اس سورت میں مزید تین احسانات جملائے جا رہے ہیں۔ سینہ کھول دینا،

<p>اور تجھ پر سے تیرا بوجھ ہم نے اتار دیا۔ (۱)</p> <p>جس نے تیری پیٹھ توڑ دی تھی۔ (۳)</p> <p>اور ہم نے تیرا اذ کر بلند کر دیا۔ (۴)</p> <p>پس یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ (۵)</p> <p>بیشک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ (۶)</p>	<p>وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۝</p> <p>الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝</p> <p>وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝</p> <p>فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝</p> <p>إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝</p>
---	---

ان میں پہلا ہے۔ اس کا مطلب ہے سینے کا منور اور فراخ ہو جانا، تاکہ حق واضح بھی ہو جائے اور دل میں سما بھی جائے۔ اسی مفہوم میں قرآن کریم کی یہ آیت ہے ﴿فَمَنْ شَرَّدَ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُمْ لَيْسَ لَهُمْ صَوْلَةٌ إِلَّا لِسُلْطَانِهِ﴾ (سورۃ الأنعام: ۱۱۵) جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت سے نوازنے کا ارادہ کرے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ یعنی وہ اسلام کو دین حق کے طور پر پہچان بھی لیتا ہے اور اسے قبول بھی کر لیتا ہے۔ اس شرح صدر میں وہ شق صدر بھی آجاتا ہے جو معتبر روایات کی رو سے دو مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا گیا۔ ایک مرتبہ بچپن میں، جب کہ آپ ﷺ عمر کے چوتھے سال میں تھے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور انہوں نے آپ ﷺ کا دل چیرا اور اس سے وہ حصہ شیطانی نکال دیا جو ہر انسان کے اندر ہے، پھر اسے دھو کر بند کر دیا، (صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الإسرائاء) دو سری مرتبہ معراج کے موقع پر۔ اس موقع پر آپ ﷺ کا سینہ مبارک چاک کر کے دل نکالا گیا، اسے آب زمزم سے دھو کر اپنی جگہ رکھ دیا گیا اور اسے ایمان و حکمت سے بھر دیا گیا۔ (صحیحین، أبواب المعراج و کتاب الصلوٰۃ)

(۱) یہ بوجھ نبوت سے قبل چالیس سالہ دور زندگی سے متعلق ہے۔ اس دور میں اگرچہ اللہ نے آپ ﷺ کو گناہوں سے محفوظ رکھا، کسی بت کے سامنے آپ ﷺ سجدہ ریز نہیں ہوئے، کبھی شراب نوشی نہیں کی اور بھی دیگر برائیوں سے دامن کش رہے، تاہم معروف معنوں میں اللہ کی عبادت و اطاعت کا نہ آپ ﷺ کو علم تھا نہ آپ ﷺ نے کی۔ اس لیے آپ ﷺ کے دل و دماغ پر اس چالیس سالہ عدم عبادت و عدم اطاعت کا بوجھ تھا، جو حقیقت میں تو نہیں تھا، لیکن آپ ﷺ کے احساس و شعور نے اسے بوجھ بنا رکھا تھا۔ اللہ نے اسے اتار دینے کا اعلان فرما کر آپ ﷺ پر احسان فرمایا۔ یہ گویا وہی مفہوم ہے جو ﴿يَفْعَلُكَ اللَّهُ نَأْفَتَكُمْ مِنْ دِينِكُمْ وَنَأْفَتُكُمْ عَنْ دِينِكُمْ﴾ (سورۃ الفتح) کا ہے۔ بعض کہتے ہیں، یہ نبوت کا بوجھ تھا جسے اللہ نے ہلکا کر دیا، یعنی اس راہ کی مشکلات برداشت کرنے کا حوصلہ اور تبلیغ و دعوت میں آسائیاں پیدا فرمادیں۔

(۲) یعنی جہاں اللہ کا نام آتا ہے وہیں آپ ﷺ کا نام بھی آتا ہے۔ مثلاً اذان، نماز اور دیگر بہت سے مقامات پر، گزشتہ کتابوں میں آپ ﷺ کا تذکرہ اور صفات کی تفصیل ہے، فرشتوں میں آپ ﷺ کا ذکر خیر ہے، آپ ﷺ کی اطاعت کو اللہ نے اپنی اطاعت قرار دیا اور اپنی اطاعت کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی اطاعت کا بھی حکم دیا، وغیرہ۔

(۳) یہ آپ ﷺ کے لیے اور صحابہ اللہ علیہم السلام کے لیے خوشخبری ہے کہ تم اسلام کی راہ میں جو تکلیفیں برداشت کر رہے ہو تو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بعد ہی اللہ تمہیں فراغت و آسانی سے نوازے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جسے

فَاذًا قَوَّعَتْ فَاَنْصَبَ ۞
وَالِي رَبِّكَ فَاَرْغَبَ ۞

پس جب تو فارغ ہو تو عبادت میں محنت کر۔ (۷)
اور اپنے پروردگار ہی کی طرف دل لگا۔ (۸)

سورہ تین مکی ہے اور اس میں آٹھ آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی۔ (۱)
اور طور سینین کی۔ (۲)
اور اس امن والے شہر کی۔ (۳)

یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا۔ (۴)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۞

وَالَّتِیْنِ وَالزَّیْتُونِ ۞

وَطُوْرٍ سِیْنِیْنِ ۞

وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ ۞

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۞

ساری دنیا جانتی ہے۔

(۱) یعنی نماز سے یا تبلیغ سے یا جماد سے، تو دعائیں محنت کر، یا اتنی عبادت کر کہ تو تھک جائے۔

(۲) یعنی اسی سے جنت کی امید رکھ، اسی سے اپنی حاجتیں طلب کر اور تمام معاملات میں اسی پر اعتماد اور بھروسہ رکھ۔

(۳) یہ وہی کوہ طور ہے جہاں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوا تھا۔

(۴) اس سے مراد مکہ مکرمہ ہے، جس میں قرآن کی اجازت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں جو اس میں داخل ہو جائے، اسے بھی امن حاصل ہو جاتا ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ دراصل تین مقامات کی قسم ہے، جن میں سے ہر ایک جگہ میں

جلیل القدر، صاحب شریعت پیغمبر مبعوث ہوا۔ انجیر اور زیتون سے مراد وہ علاقہ ہے جہاں اس کی پیداوار ہے اور وہ ہے بیت المقدس، جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیغمبر بن کر آئے۔ طور سینا یا سینین پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا کی

گئی اور شہر مکہ میں سید المرسل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ (ابن کثیر)

(۵) یہ جواب قسم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ اس کا منہ نیچے کو جھکا ہوا ہے، صرف انسان کو دراز قامت، سیدھا بنایا ہے جو اپنے ہاتھوں سے کھانا پیتا ہے۔ پھر اس کے اعضا کو نہایت تناسب کے ساتھ بنایا، ان میں

جانوروں کی طرح بے ڈھنگا پن نہیں ہے۔ ہر اہم عضو دو دو بنائے اور ان میں نہایت مناسب فاصلہ رکھا، پھر اس میں عقل و تدبیر، فہم و حکمت اور سمع و بصر کی قوتیں ودیعت کیں، جو دراصل یہ انسان اللہ کی قدرت کا مظہر اور اس کا پر تو

ہے۔ بعض علمائے اس حدیث کو بھی اسی معنی و مفہوم پر محمول کیا ہے، جس میں ہے کہ إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اَدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهِ (مسلم، کتاب البر والصلة والآداب) ”اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا“ انسان کی پیدائش میں ان تمام

چیزوں کا اہتمام ہی احسن تقویم ہے، جس کا ذکر اللہ نے تین قسموں کے بعد فرمایا۔ (فتح القدر)

پھر اسے نچوں سے نچا کر دیا۔^(۱) (۵)
 لیکن جو لوگ ایمان لائے اور (پھر) نیک عمل کیے تو ان
 کے لیے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہو گا۔^(۲) (۶)
 پس تجھے اب روز جزا کے جھٹلانے پر کون سی چیز آمادہ
 کرتی ہے۔^(۳) (۷)
 کیا اللہ تعالیٰ (سب) حاکموں کا حاکم نہیں ہے۔^(۴) (۸)

سورہ علق کی ہے اور اس میں انہیں آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
 نہایت رحم والا ہے۔

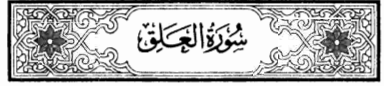
پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔^(۵) (۱)

ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝

فَمَا يَكْفُرُكَ بَعْدُ يَا لِدِينٍ ۝

أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْعَالَمِينَ ۝



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

إِقْرَأْ يَا سُورَةَ الَّتِي أَنْزَلْنَا خَلَقَ ۝

(۱) یہ اشارہ ہے انسان کے ارذل عمر (بہت زیادہ عمر) کی طرف۔ جس میں جوانی اور قوت کے بعد بڑھاپا اور ضعف آجاتا ہے اور انسان کی عقل اور ذہن بچنے کی طرح ہو جاتا ہے۔ بعض نے اس سے کردار کا وہ سفلہ پن لیا ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان انتہائی پست اور سانپ بچھو سے بھی زیادہ گیا گزرا ہو جاتا ہے اور بعض نے اس سے ذلت و رسوائی کا وہ عذاب مراد لیا ہے جو جہنم میں کافروں کے لیے ہے۔ گویا انسان اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت سے انحراف کر کے اپنے کو احسن تقویم کے بلند رتبہ و اعزاز سے گرا کر جہنم کے اسفل سافلین میں ڈال لیتا ہے۔

(۲) آیت ما قبل کے پہلے مفہوم کے اعتبار سے یہ جملہ مبینہ ہے، مومنوں کی کیفیت بیان کر رہا ہے اور دوسرے تیسرے مفہوم کے اعتبار سے، ما قبل کی تاکید ہے کہ اس انجام سے اس نے مومنوں کا اشتنا کر دیا۔ (فتح القدر)

(۳) یہ انسان سے خطاب ہے، 'زجر و توبخ کے لیے۔ کہ اللہ نے تجھے بہترین صورت میں پیدا کیا اور وہ تجھے اس کے برعکس قعر ذلت میں بھی گرانے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا کوئی مشکل نہیں۔ اس کے بعد بھی تو قیامت اور جزا کا انکار کرتا ہے؟

(۴) جو کسی پر ظلم نہیں کرتا اور اس کے عدل ہی کا یہ تقاضا ہے کہ وہ قیامت برپا کرے اور ان کی داد دے کرے جن پر دنیا میں ظلم ہوا۔ پہلے گزر چکا ہے کہ ایک ضعیف حدیث میں اس کا یہ جواب دینا منقول ہے۔ بَلَىٰ، وَأَنَا عَلَيَّ ذَلِكَ مِنَ الشَّاهِدِينَ (السرمذی)

(۵) یہ سب سے پہلی وحی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت آئی جب آپ ﷺ غار حرا میں مصروف عبادت تھے۔ فرشتے نے آکر کہا، پڑھ، آپ ﷺ نے فرمایا، میں تو پڑھا ہوا ہی نہیں ہوں، فرشتے نے آپ ﷺ کو پکڑ کر زور سے

جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔^(۱)
 تو پڑھتا رہا تیرا رب بڑے کرم والا ہے۔^(۲)
 جس نے قلم کے ذریعے (علم) سکھایا۔^(۳)
 جس نے انسان کو وہ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔^(۴)
 سچ مچ انسان تو آپ سے باہر ہو جاتا ہے۔^(۵)
 اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو بے پروا (یا تو نگر) سمجھتا ہے۔^(۷)

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۖ
 إِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۙ
 الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۖ
 عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۖ
 كَلَّمَكَ الْإِنْسَانُ لَيْطَلًى ۖ
 أَنْ رَأَاهُ اسْتَعْجَلِي ۖ
 إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ ۗ
 أَرَأَيْتَ الَّذِي يُبَاهِي ۖ
 عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ ۗ
 أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَىٰ الْهُدَىٰ ۖ

یقیناً لوٹنا تیرے رب کی طرف ہے۔^(۸)
 (بھلا) اسے بھی تو نے دیکھا جو بندے کو روکتا ہے۔^(۹)
 جبکہ وہ بندہ نماز ادا کرتا ہے۔^(۱۰)
 بھلا بتلا تو اگر وہ ہدایت پر ہو۔^(۱۱)

بھینچا، اور کہا پڑھ، آپ ﷺ نے پھر وہی جواب دیا۔ اس طرح تین مرتبہ اس نے آپ ﷺ کو بھینچا۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے صحیح بخاری، بدء الوحي، مسلم، الایمان، باب بدء الوحي) آفرأ جو تیری طرف وحی کی جاتی ہے وہ پڑھ۔ خَلَقَ، جس نے تمام مخلوق کو پیدا کیا۔

(۱) مخلوقات میں سے بطور خاص انسان کی پیدائش کا ذکر فرمایا جس سے اس کا شرف واضح ہے۔

(۲) یہ بطور تاکید فرمایا اور اس میں بڑے بلیغ انداز سے اس اعتذار کا بھی ازالہ فرمادیا، جو آپ ﷺ نے پیش کیا کہ میں تو قاری ہی نہیں۔ اللہ نے فرمایا، اللہ بہت کرم والا ہے پڑھ، یعنی انسانوں کی کوتاہیوں سے درگزر کرنا اس کا وصف خاص ہے۔

(۳) قَلَمٌ کے معنی ہیں قطع کرنا، تراشنا، قلم بھی پہلے زمانے میں تراش کر ہی بنائے جاتے تھے، اس لیے آراء کتابت کو قلم سے تعبیر کیا۔ کچھ علم تو انسان کے ذہن میں ہوتا ہے، کچھ کا اظہار زبان کے ذریعے سے ہوتا ہے اور کچھ انسان قلم سے کاغذ پر لکھ لیتا ہے۔ ذہن و حافظہ میں جو ہوتا ہے، وہ انسان کے ساتھ ہی چلا جاتا ہے۔ زبان سے جس کا اظہار کرتا ہے، وہ بھی محفوظ نہیں رہتا۔ البتہ قلم سے لکھا ہوا، اگر وہ کسی وجہ سے ضائع نہ ہو تو ہمیشہ محفوظ رہتا ہے، اسی قلم کی بدولت تمام علوم، پچھلے لوگوں کی تاریخیں اور اسلاف کا علمی ذخیرہ محفوظ ہے۔ حتیٰ کہ آسمانی کتابوں کی حفاظت کا بھی ذریعہ ہے۔ اس سے قلم کی اہمیت محتاج وضاحت نہیں رہتی۔ اسی لیے اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور اس کو تمام مخلوقات کی تقدیر لکھنے کا حکم دیا۔

(۴) مفسرین کہتے ہیں کہ روکنے والے سے مراد ابو جہل ہے جو اسلام کا شدید دشمن تھا۔ عَبْدًا سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

(۵) یعنی جس کو یہ نماز پڑھنے سے روک رہا ہے، وہ ہدایت پر ہو۔

أَوْامِرًا تَتَّقُونَ ﴿۱۲﴾

أَرَيْتَ إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّى ﴿۱۳﴾

أَلَمْ يَعْلَم بِآيَاتِ اللَّهِ بَازِيًّا ﴿۱۴﴾

یا پرہیزگاری کا حکم دیتا ہو۔ (۱۲)

بھلا دیکھو تو اگر یہ جھٹلاتا ہو اور منہ پھیرتا ہو تو۔ (۱۳)

کیا اس نے نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اسے خوب دیکھ رہا ہے۔ (۱۴)

كَلَّا لَئِنْ كُنْتُمْ تُبَدِّلُونَ لَتَنْفَعُنَّ الْإِنْسَانِيَةَ ﴿۱۵﴾

یقیناً اگر یہ باز نہ رہا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ (۱۵)

نَاصِيَةً كَازِبَةٍ خَالِطَةٍ ﴿۱۶﴾

ایسی پیشانی جو جھوٹی خطا کار ہے۔ (۱۶)

فَلْيَبْذُرْ غَلْبًا وَدَائِبَةً ﴿۱۷﴾

یہ اپنی مجلس والوں کو بلا لے۔ (۱۷)

سَدَّ عُرْوَةَ الرَّبَابِيَةِ ﴿۱۸﴾

ہم بھی (دورخ کے) پیادوں کو بلا لیں گے۔ (۱۸)

(۱) یعنی اخلاص، توحید اور عمل صالح کی تعلیم، جس سے جہنم کی آگ سے انسان بچ سکتا ہے۔ تو کیا یہ چیزیں (نماز پڑھنا

اور تقویٰ کی تعلیم دینا) ایسی ہیں کہ ان کی مخالفت کی جائے اور اس پر اس کو دھمکیاں دیں جائیں؟

(۲) یعنی یہ ابو جہل اللہ کے پیغمبر کو جھٹلاتا ہو اور ایمان سے اعراض کرتا ہو آیت: **بَعْنَى أَخْبَرْنِي (مجھے تولاؤ) ہے۔**

(۳) مطلب یہ ہے کہ یہ شخص جو مذکورہ حرکتیں کر رہا ہے کیا نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے، وہ اس کی اس کو جزا

دے گا۔ یعنی یہ آئم تَعْلَمُ مذکورہ شرطوں ﴿إِنْ كَانَ عَلَى الْهُدَى * أَوْامِرًا تَتَّقُونَ﴾ ﴿إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّى﴾ کی جزا ہے۔

(۴) یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور دشمنی سے اور آپ ﷺ کو نماز پڑھنے سے جو روکتا ہے، اس سے باز نہ

آیا لَنْسَفَعَنَّ کے معنی ہیں لَتَأْخُذَنَّ تو ہم اسے اس کی پیشانی سے پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ حدیث میں آتا ہے ابو جہل نے

کہا تھا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کعبے کے پاس نماز پڑھنے سے باز نہ آیا تو میں اس کی گردن پر پاؤں رکھ دوں گا۔ (یعنی

اسے روندوں گا اور یوں ذلیل کروں گا) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو

فرشتے اسے پکڑ لیتے۔“ (صحیح البخاری، تفسیر سورة العلق)

(۵) پیشانی کی یہ صفات بطور مجاز ہیں، جھوٹی ہے اپنی بات میں، خطا کار ہے اپنے فعل میں۔

(۶) حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ ابو جہل گزرا تو کہا اے محمد! (صلی

اللہ علیہ وسلم) میں نے تجھے نماز پڑھنے سے منع نہیں کیا تھا؟ اور آپ ﷺ سے سخت دھمکی آمیز باتیں کیں، آپ ﷺ

نے کڑا جواب دیا تو کہنے لگا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) تو مجھے کس چیز سے ڈراتا ہے؟ اللہ کی قسم، اس وادی میں سب

سے زیادہ میرے حمایتی اور مجلس والے ہیں، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں،

اگر وہ اپنے حمایتیوں کو بلاتا تو اسی وقت ملائکہ عذاب اسے پکڑ لیتے۔ (ترمذی، تفسیر سورة اقرأ مسند احمد ۱/۳۲۹ و تفسیر

ابن جریر) اور صحیح مسلم کے الفاظ ہیں کہ اس نے آگے بڑھ کر آپ ﷺ کی گردن پر پیر رکھنے کا ارادہ کیا کہ ایک دم

كَلَّا لَا تَطْعَمُهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿١٩﴾

۱۹

خبردار! اس کا کہنا ہرگز نہ ماننا اور سجدہ کر اور قریب
ہو جا۔ (۱۹)

سورہ قدر کی ہے اور اس میں پانچ آیتیں ہیں۔

سُورَةُ الْقَدْرِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یقیناً ہم نے اسے شب قدر میں نازل فرمایا۔ (۱)
تو کیا سمجھا کہ شب قدر کیا ہے؟ (۲)

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ﴿١﴾
وَمَا آدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ﴿٢﴾

اللے پاؤں پیچھے ہٹا اور اپنے ہاتھوں سے اپنا بچاؤ کرنے لگا، اس سے کہا گیا، کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ ”میرے اور محمد
(صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان آگ کی خندق، ہولناک منظر اور بہت سارے پر ہیں۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا، اگر یہ میرے قریب ہوتا تو فرشتے اس کی بوٹی بوٹی نوح لیتے۔“ (کتاب صفة القيامة، باب إن الإنسان
ليطعمي الزنانية، داروئے اور پولیس۔ یعنی طاقتور لشکر، جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

☆ اس سورت کے کلی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ میں بھی اختلاف ہے۔ قَدْر کے معنی
قدر و منزلت بھی ہیں، اس لیے اسے شب قدر کہتے ہیں، اس کے معنی اندازہ اور فیصلہ کرنا بھی ہیں، اس میں سال بھر کے
لے فیصلے کیے جاتے ہیں، اسی لیے اسے لَيْلَةُ الْحُكْم بھی کہتے ہیں، اس کے معنی تنگی کے بھی ہیں۔ اس رات اتنی
کثرت سے زمین پر فرشتے اترتے ہیں کہ زمین تنگ ہو جاتی ہے۔ شب قدر یعنی تنگی کی رات، یا اس لیے یہ نام رکھا گیا
کہ اس رات جو عبادت کی جاتی ہے، اللہ کے ہاں اس کی بڑی قدر ہے اور اس پر بڑا ثواب ہے۔ اس کی تعین میں بھی
شدید اختلاف ہے۔ (فتح القدیر) تاہم احادیث و آثار سے واضح ہے کہ یہ رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں
سے کوئی ایک رات ہوتی ہے۔ اس کو مبمم رکھنے میں یہی حکمت ہے کہ لوگ پانچوں ہی طاق راتوں میں اس کی فضیلت
حاصل کرنے کے شوق میں، اللہ کی خوب عبادت کریں۔

(۱) یعنی اتارنے کا آغاز کیا، یا لوح محفوظ سے اس بیت العزت میں، جو آسمان دنیا پر ہے، ایک ہی مرتبہ اتار دیا، اور وہاں
سے حسب واقع نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا رہا تا آنکہ ۲۳ سال میں پورا ہو گیا۔ اور لیلۃ القدر رمضان میں ہی ہوتی
ہے، جیسا کہ قرآن کی آیت ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ (البقرة: ۱۸۵) سے واضح ہے۔

(۲) اس استفہام سے اس رات کی عظمت و اہمیت واضح ہے، گویا کہ مخلوق اس کی تہ تک پوری طرح نہیں پہنچ سکتی، یہ
صرف ایک اللہ ہی ہے جو اس کو جانتا ہے۔

بَيْتَةَ الْقَدْحِ بِرَبِّهِمْ مِنْ الْفِ سَهْوٍ ۝

تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ۝

سَلَامٌ لَهَا حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

شب قدر ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔^(۱) (۳)
اس (میں ہر کام) کے سرانجام دینے کو اپنے رب کے حکم
سے فرشتے اور روح (جبرائیل) اترتے ہیں۔^(۲) (۴)
یہ رات سراسر سلامتی کی ہوتی ہے^(۳) اور فجر کے طلوع
ہونے تک (رہتی ہے)۔ (۵)

سورہ بینہ مدنی ہے اور اس میں آٹھ آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

اہل کتاب کے کافر^(۳) اور مشرک لوگ^(۵) جب تک کہ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

لَمْ یَكُنْ الَّذِیْنَ كَفَرُوا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِیْنَ مُنْفَكِّیْنَ

(۱) یعنی اس ایک رات کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے اور ہزار مہینے ۸۳ سال ۴ مہینے بنتے ہیں۔ یہ امت محمدیہ پر
اللہ کا کتنا احسان عظیم ہے کہ مختصر عمر میں زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کے لیے کیسی سہولت عطا فرمادی۔

(۲) روح سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں، یعنی فرشتے حضرت جبرائیل علیہ السلام سمیت، اس رات میں زمین
پر اترتے ہیں، ان کاموں کو سرانجام دینے کے لیے جن کا فیصلہ اس سال میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(۳) یعنی اس میں شر نہیں۔ یا اس معنی میں سلامتی والی ہے کہ مومن اس رات کو شیطان کے شر سے محفوظ رہتے ہیں۔
یا فرشتے اہل ایمان کو سلام عرض کرتے ہیں، یا فرشتے ہی آپس میں ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں۔ شب قدر کے لیے
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خاص یہ دعائے تالی ہے «اللَّهُمَّ! إِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي» (ترمذی أبواب
الدعوات ابن ماجہ، کتاب الدعاء، باب الدعاء بالعفو والعافية)

☆ اس کا دوسرا نام سورہ لَمْ یَكُنْ بھی ہے۔ حدیث میں ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ
عنه سے فرمایا، اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں سورہ ﴿لَمْ یَكُنْ الَّذِیْنَ كَفَرُوا﴾ تجھے پڑھ کر سناؤں۔ حضرت ابی بوللہ نے
پوچھا، کیا اللہ نے آپ کے سامنے میرا نام لیا ہے؟ آپ نے فرمایا، ”ہاں“ جس پر (مارے خوشی کے) حضرت ابی بوللہ کی
آنکھوں میں آنسو آگئے۔ (صحیح البخاری، تفسیر سورہ لم یکن)

(۴) اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔

(۵) مشرک سے مراد عرب و عجم کے وہ لوگ ہیں جو بتوں اور آگ کے پجاری تھے۔ مُنْفَكِّیْنَ باز آنے والے، بَیِّنَةٌ
(دلیل) سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یعنی یہود و نصاریٰ اور عرب و عجم کے مشرکین اپنے کفر و شرک سے باز
آننے والے نہیں ہیں یہاں تک کہ ان کے پاس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن لے کر آجائیں اور وہ ان کی ضلالت و
جمالت بیان کریں اور انہیں ایمان کی دعوت دیں۔

ان کے پاس ظاہر دلیل نہ آجائے باز رہنے والے نہ تھے
(وہ دلیل یہ تھی کہ) (۱)

اللہ تعالیٰ کا ایک رسول (۱) جو پاک صحیفے پڑھے۔ (۲)
جن میں صحیح اور درست احکام ہوں۔ (۳) (۳)

اہل کتاب اپنے پاس ظاہر دلیل آجانے کے بعد ہی
(اختلاف میں بڑا کر) متفرق ہو گئے۔ (۴) (۴)

انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا (۵) کہ صرف اللہ
کی عبادت کریں اسی کے لیے دین کو خالص رکھیں۔

ابراہیم حنیف (۶) کے دین پر اور نماز کو قائم رکھیں اور
زکوٰۃ دیتے رہیں یہی ہے دین سیدھی ملت کا۔ (۷) (۷)

پیشک جو لوگ اہل کتاب میں سے کافر ہوئے اور مشرکین

حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيْئَةُ ۝

رَسُولٌ مِنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُطَهَّرَةً ۝

فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝

وَمَنَّاتَرَى الَّذِينَ آذُوا الْكُتُبَ الْآمِنِينَ بَعْدَ مَا جَاءَهُمُ

الْبَيْئَةُ ۝

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَّا حُفَاةَ

وَلَيْعْمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ ۝

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي كَارِجَتِهِمْ

(۱) یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۲) یعنی قرآن مجید جو لوح محفوظ میں پاک صحیفوں میں درج ہے۔

(۳) یہاں کُتُب سے مراد احکام دینیہ اور قَيِّمَةٌ، معتدل اور سیدھے۔

(۴) یعنی اہل کتاب، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے قبل مجتمع تھے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی بعثت ہو

گئی، اس کے بعد یہ متفرق ہو گئے، ان میں سے کچھ مومن ہو گئے، لیکن اکثریت ایمان سے محروم ہی رہی۔ نبی صلی اللہ

علیہ وسلم کی بعثت و رسالت کو دلیل سے تعبیر کرنے میں یہی نکتہ ہے کہ آپ ﷺ کی صداقت واضح تھی جس میں مجال

انکار نہیں تھی۔ لیکن ان لوگوں نے آپ ﷺ کی تکذیب محض حسد اور عناد کی وجہ سے کی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں

تفرق کار کتاب کرنے والوں میں صرف اہل کتاب کا نام لیا ہے، حالانکہ دوسروں نے بھی اس کار کتاب کیا تھا، کیوں

کہ یہ بہر حال علم والے تھے اور آپ ﷺ کی آمد اور صفات کا تذکرہ ان کی کتابوں میں موجود تھا۔

(۵) یعنی ان کی کتابوں میں انہیں حکم تو یہ دیا گیا تھا کہ.....

(۶) حَقِيقَتُ کے معنی ہیں، مائل ہونا، کسی ایک طرف یکسو ہونا۔ حُفَاةٌ، جمع ہے۔ یعنی شرک سے توحید کی طرف اور تمام

ادیان سے منقطع ہو کر صرف دین اسلام کی طرف مائل اور یکسو ہوتے ہوئے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا۔

(۷) الْقَيِّمَةُ محذوف موصوف کی صفت ہے۔ دِينُ الْمِلَّةِ الْقَيِّمَةِ أَي: الْمُسْتَقِيمَةِ يَا الْأُمَّةُ الْمُسْتَقِيمَةُ

الْمُعْتَدِلَةُ، یہی اس ملت یا امت کا دین ہے جو سیدھی اور معتدل ہے۔ اکثر ائمہ نے اس آیت سے اس بات پر

استدلال کیا ہے کہ اعمال، ایمان میں داخل ہیں۔ (ابن کثیر)

خَلِيدِينَ فِيهَا أُولَئِكَ لَهُمْ شَرٌّ مِنَ الْبَرِيَّةِ ۝

سب دوزخ کی آگ میں (جائیں گے) جہاں وہ ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے۔ یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔ (۶)^(۱)
 بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے یہ لوگ بہترین خلائق ہیں۔ (۷)^(۲)

ان کا بدلہ انکے رب کے پاس بھیجی والی جنتیں ہیں جنکے نیچے سرسبز بہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا^(۳) اور یہ اس سے راضی ہوئے۔^(۴) یہ ہے اس کے لیے جو اپنے پروردگار سے ڈرے۔ (۸)^(۵)

سورہ زلزال مدنی ہے اور اس میں آٹھ آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
 نہایت رحم والا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝

جَزَاءُ لَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ يَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يُخَلِدُونَ فِيهَا أَبَدًا بِإِذْنِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ ذَلِكَ لِمَنْ حَسِبَ رَبَّهُ ۝



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

(۱) یہ اللہ کے رسولوں اور اس کی کتابوں کا انکار کرنے والوں کا انجام ہے۔ نیز انہیں تمام مخلوقات میں بدترین قرار دیا گیا۔
 (۲) یعنی جو دل کے ساتھ ایمان لائے اور جنہوں نے اعضا کے ساتھ عمل کیے، وہ تمام مخلوقات سے بہتر اور افضل ہیں۔
 جو اہل علم اس بات کے قائل ہیں کہ مومن بندے ملائکہ سے شرف و فضل میں بہترین ہیں۔ ان کی ایک دلیل یہ آیت بھی ہے۔ الْبَرِيَّةُ: برآ (خلق) سے ہے۔ اسی سے اللہ کی صفت البارئ ہے۔ اس لیے بَرِيَّةٌ اصل میں بَرِيَّةٌ ہے، ہمہ کو یا سے بدل کر یا کیا میں ادغام کر دیا گیا۔

(۳) ان کے ایمان و طاعت اور اعمال صالحہ کے سبب۔ اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے۔ ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾ (التوبہ: ۷۲)

(۴) اس لیے کہ اللہ نے انہیں ایسی نعمتوں سے نوازا، جن میں ان کی روح اور بدن دونوں کی سعادتیں ہیں۔
 (۵) یعنی یہ جزا اور رضامندی ان لوگوں کے لیے ہے جو دنیا میں اللہ سے ڈرتے رہے اور اس ڈر کی وجہ سے اللہ کی نافرمانی کے ارتکاب سے بچتے رہے۔ اگر کسی وقت بہ تقاضائے بشریت نافرمانی ہو گئی تو فوراً توبہ کر لی اور آئندہ کے لیے اپنی اصلاح کر لی، حتیٰ کہ ان کی موت اسی اطاعت پر ہوئی نہ کہ معصیت پر۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ سے ڈرنے والا معصیت پر اصرار اور دوام نہیں کر سکتا اور جو ایسا کرتا ہے، حقیقت میں اس کا دل اللہ کے خوف سے خالی ہے۔

☆ اس کے مدنی اور مکی ہونے میں اختلاف ہے، اس کی فضیلت میں متعدد روایات منقول ہیں لیکن ان میں سے کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔

جب زمین پوری طرح جھنجھوڑ دی جائے گی۔ (۱)
 اور اپنے بوجھ باہر نکال پھینکے گی۔ (۲)
 انسان کہنے لگے گا کہ اسے کیا ہو گیا؟ (۳)
 اس دن زمین اپنی سب خبریں بیان کر دے گی۔ (۴)
 اس لیے کہ تیرے رب نے اسے حکم دیا ہو گا۔ (۵)
 اس روز لوگ مختلف جماعتیں ہو کر (واپس) لوٹیں (۶)
 گے تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھادیے جائیں۔ (۷)
 پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھ

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝
 وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝
 وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ۝
 يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝
 يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَدْعَىٰ لَهَا ۝
 يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۝
 فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝

(۱) اس کا مطلب ہے سخت بھونچال سے ساری زمین لرزائے گی اور ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی، یہ اس وقت ہو گا جب پہلا نغمہ پھونکا جائے گا۔

(۲) یعنی زمین میں جتنے انسان دفن ہیں، وہ زمین کا بوجھ ہیں، جنہیں زمین قیامت والے دن باہر نکال پھینکے گی۔ یعنی اللہ کے حکم سے سب زندہ ہو کر باہر نکل آئیں گے۔ یہ دوسرے نغمے میں ہو گا، اسی طرح زمین کے خزانے بھی باہر نکل آئیں گے۔

(۳) یعنی دہشت زدہ ہو کر کہے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے، یہ کیوں اس طرح ہل رہی ہے اور اپنے خزانے اگل رہی ہے۔

(۴) یہ جواب شرط ہے۔ حدیث میں ہے، نبی ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور پوچھا جانتے ہو، زمین کی خبریں کیا ہیں؟ صحابہ اللہ ﷺ نے عرض کیا، اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، اس کی خبریں یہ ہیں کہ جس بندے یا بندی نے زمین کی پشت پر جو کچھ کیا ہو گا، اس کی گواہی دے گی۔ کہے گی فلاں فلاں شخص نے فلاں فلاں عمل، فلاں فلاں دن میں

کیا تھا۔ (ترمذی، أبواب صفة القيامة و تفسیر سورۃ اذا زلزلت۔ مسند احمد ۳/۳۷۴)

(۵) یعنی زمین کو یہ قوت گویائی اللہ عطا فرمائے گا، اس لیے اس میں تعجب والی بات نہیں ہے، جس طرح انسانی اعضا میں اللہ تعالیٰ یہ قوت پیدا فرمادے گا، زمین کو بھی اللہ تعالیٰ متکلم بنا دے گا اور وہ اللہ کے حکم سے بولے گی۔

(۶) يَصْدُرُ، يَرْجِعُ (لوٹیں گے) یہ ورود کی ضد ہے۔ یعنی قبروں سے نکل کر موقف حساب کی طرف، یا حساب کے بعد جنت اور دوزخ کی طرف لوٹیں گے۔ أَشْتَاتًا، متفرق، یعنی ٹولیاں ٹولیاں۔ بعض بے خوف ہوں گے، بعض خوف زدہ، بعض کے رنگ سفید ہوں گے جیسے جنتیوں کے ہوں گے اور بعض کے رنگ سیاہ، جو ان کے جنسی ہونے کی علامت ہو گی۔ بعض کا رخ دائیں جانب ہو گا تو بعض کا بائیں جانب۔ یا یہ مختلف گروہ ادیان و مذاہب اور اعمال و افعال کی بنیاد پر ہوں گے۔

(۷) یہ متعلق ہے يَصْدُرُ کے یا اس کا تعلق اَوْحَىٰ لَهَا سے ہے۔ یعنی زمین اپنی خبریں اس لیے بیان کرے گی تاکہ انسانوں کو ان کے اعمال دکھادیے جائیں۔

لے گا۔ (۷) (۱)

اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا۔ (۸) (۲)

سورۃ عادیات مکی ہے اور اس میں گیارہ آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

ہانپتے ہوئے دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم! (۱) (۳)

پھر ٹاپ مار کر آگ جھاڑنے والوں کی قسم! (۲) (۴)

پھر صبح کے وقت دھاوا بولنے والوں کی قسم (۵) (۳)

وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا ۝

فَالْمُورِيَاتِ قَدْحًا ۝

فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا ۝

(۱) پس وہ اس سے خوش ہو گا۔

(۲) وہ اس پر سخت پشیمان اور مضطرب ہو گا۔ ذَرَّةٌ بعض کے نزدیک چبوتنی سے بھی چھوٹی چیز ہے۔ بعض اہل لغت کہتے ہیں، انسان زمین پر ہاتھ مارتا ہے، اس سے اس کے ہاتھ پر جو مٹی لگ جاتی ہے، وہ ذرہ ہے۔ بعض کے نزدیک سوراخ سے آنے والی سورج کی شعاعوں میں گرد وغبار کے جو ذرات سے نظر آتے ہیں، وہ ذرہ ہے۔ لیکن امام شوکانی نے پہلے معنی کو اولیٰ کہا ہے۔ امام مقاتل کہتے ہیں کہ یہ سورت ان دو آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جن میں سے ایک شخص، سائل کو تھوڑا سا صدقہ دینے میں تامل کرتا اور دوسرا شخص چھوٹا گناہ کرنے میں کوئی خوف محسوس نہ کرتا تھا۔ (فتح القدر)

(۳) عَادِيَاتٌ، عَادِيَاتُ کی جمع ہے۔ یہ عَدُوٌّ سے ہے جیسے غَزُوٌّ ہے۔ غَاذِيَاتُ کی طرح اس کے واؤ کو بھی یا سے بدل دیا گیا ہے۔ تیز رو گھوڑے۔ ضَبْحٌ کے معنی بعض کے نزدیک ہانپنا اور بعض کے نزدیک ہنہاننا ہے۔ مراد وہ گھوڑے ہیں جو ہانپتے یا ہنہاتے ہوئے جہاد میں تیزی سے دشمن کی طرف دوڑتے ہیں۔

(۴) مُورِيَاتٌ، اِنزَاءٌ سے ہے۔ آگ نکالنے والے۔ قَدْحٌ کے معنی ہیں۔ صَدَقٌ چلنے میں گھٹنوں یا ایزریوں کا ٹکرائنا، یا ٹاپ مارنا۔ اسی سے قَدْحٌ بِالزَّيْنَادِ ہے۔ چقماق سے آگ نکالنا۔ یعنی ان گھوڑوں کی قسم جن کی ٹاپوں کی رگڑ سے پتھروں سے آگ نکلتی ہے، جیسے چقماق سے نکلتی ہے۔

(۵) مُغِيرَاتٌ، اَعَاَزٌ يُغِيرُ سے ہے، شب خون مارنے یا دھاوا بولنے والے۔ صُبْحًا صبح کے وقت، عرب میں عام طور پر حملہ اسی وقت کیا جاتا تھا، شب خون تو وہ مارتے ہیں جو فوجی گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں، لیکن اس کی نسبت گھوڑوں کی

پس اس وقت گردوغبار اڑاتے ہیں۔ ^(۱)	فَأَثَرُنَ بِهِ نَفْعًا ۝
پھر اسی کے ساتھ فوجوں کے درمیان گھس جاتے ہیں۔ ^(۲)	فَوَسَّطَنَ بِهِ جَمْعًا ۝
یقیناً انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ ^(۳)	إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ ۝
اور یقیناً وہ خود بھی اس پر گواہ ہے۔ ^(۴)	وَأَنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَكَهْمِيدٌ ۝
یہ مال کی محبت میں بھی بڑا سخت ہے۔ ^(۵)	وَأَنَّهُ يُحِبُّ الْغَيْرَ لَسَدِيدٌ ۝
کیا اسے وہ وقت معلوم نہیں جب قبروں میں جو (کچھ) ہے نکال لیا جائے گا۔ ^(۶)	أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ ۝
اور سینوں کی پوشیدہ باتیں ظاہر کر دی جائیں گی۔ ^(۷)	وَمَوْصَلًا بِأَبِي الصُّدُورِ ۝
پیشک ان کا رب اس دن ان کے حال سے پورا باخبر ہو گا۔ ^(۸)	إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ ۝

طرف اس لیے کی ہے کہ دھاوا بولنے میں فوجیوں کے یہ بہت زیادہ کام آتے ہیں۔

(۱) أَثَارٌ، اڑانا، نفع، گردوغبار۔ یعنی یہ گھوڑے جس وقت تیزی سے دوڑتے یا دھاوا بولتے ہیں تو اس جگہ پر گردوغبار چھا جاتا ہے۔

(۲) فَوَسَّطَنَ، درمیان میں گھس جاتے ہیں۔ اس وقت، یا حالت گردوغبار میں۔ جَمْعًا دشمن کے لشکر۔ مطلب ہے کہ اس وقت، یا جب کہ فضا گردوغبار سے اٹی ہوئی ہے، یہ گھوڑے دشمن کے لشکروں میں گھس جاتے ہیں اور گھسان کی جنگ کرتے ہیں۔

(۳) یہ جواب قسم ہے۔ انسان سے مراد کافر، یعنی بعض افراد ہیں۔ كَنُودٌ بمعنی كَفُورٌ، ناشکرا۔

(۴) یعنی انسان خود بھی اپنی ناشکری کی گواہی دیتا ہے۔ بعض لَسْمِيدٌ کا فاعل اللہ کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن امام شوکانی نے پہلے مفہوم کو راجح قرار دیا ہے، کیوں کہ مابعد کی آیات میں ضمیر کا مرجع انسان ہی ہے۔ اس لیے یہاں بھی انسان ہی ہونا زیادہ صحیح ہے۔

(۵) خَبِيرٌ سے مراد مال ہے، جیسے ﴿إِنَّ تَرَاثِيمًا يُوسَفَةَ﴾ (البقرة: ۱۸۰) میں ہے معنی واضح ہیں۔ ایک دوسرا مفہوم یہ ہے کہ نہایت حریص اور بخیل ہے جو مال کی شدید محبت کا لازمی نتیجہ ہے۔

(۶) بُعْثِرَ، نَبْرٌ وَبُيْعَتْ یعنی قبروں کے مردوں کو زندہ کر کے اٹھا کھڑا کر دیا جائے گا۔

(۷) حُصِّلَ، مَبْتَرٌ وَبَيْنَ، یعنی سینوں کی باتوں کو ظاہر اور کھول دیا جائے گا۔

(۸) یعنی جو رب ان کو قبروں سے نکال لے گا، ان کے سینوں کے رازوں کو ظاہر کر دے گا، اس کے متعلق ہر شخص

سورہ قارعہ مکی ہے اور اس میں گیارہ آیتیں ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْقَارِعَةُ ①

مَا الْقَارِعَةُ ②

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ ③

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ④

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ ⑤

فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ⑥

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

کھڑکھڑانے والی- (۱)

کیا (۱) ہے وہ کھڑکھڑانے والی- (۲)

تجھے کیا معلوم کہ وہ کھڑکھڑانے والی کیا ہے- (۳)

جس دن انسان بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہو جائیں
گے- (۲) (۳)

اور پہاڑ دھنے ہوئے رنگین اون کی طرح ہو جائیں
گے- (۳) (۵)

پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے- (۳) (۶)

جان سکتا ہے کہ وہ کتنا ناخبر ہے؟ اور اس سے کوئی چیز مخفی نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ پھر وہ ہر ایک کو اس کے عملوں کے مطابق
اچھی یا بری جزا دے گا۔ یہ گویا ان اشخاص کو تنبیہ ہے جو رب کی نعمتیں تو استعمال کرتے ہیں، لیکن اس کا شکر ادا کرنے
کے بجائے، اس کی ناشکری کرتے ہیں۔ اسی طرح مال کی محبت میں گرفتار ہو کر مال کے وہ حقوق ادا نہیں کرتے جو اللہ نے
اس میں دوسرے لوگوں کے رکھے ہیں۔

(۱) یہ بھی قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ جیسے اس سے قبل اس کے متعدد نام گزر چکے ہیں، مثلاً، 'الْحَاقَّةُ'
الطَّاقَةُ، الصَّاعَةُ، الْغَاشِيَةُ، السَّاعَةُ، الْوَاغِيَةُ وغیرہ۔ الْقَارِعَةُ اسے اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اپنی ہولناکیوں
سے دلوں کو بیدار اور اللہ کے دشمنوں کو عذاب سے خبردار کر دے گی، جیسے دروازہ کھٹکھٹانے والا کرتا ہے۔

(۲) فِرَاشٌ، چھپر اور شمع کے گرد منڈلانے والے پرندے وغیرہ۔ مَبْثُوثٌ، منتشر اور بکھرے ہوئے۔ یعنی قیامت والے
دن انسان بھی پروانوں کی طرح پرانگندہ اور بکھرے ہوئے ہوں گے۔

(۳) عِهْنٌ، اس اون کو کہتے ہیں جو مختلف رنگوں کے ساتھ رنگی ہوئی ہو، 'مَنْفُوشٌ' دھنی ہوئی۔ یہ پہاڑوں کی وہ کیفیت بیان
کی گئی ہے جو قیامت والے دن انکی ہوگی۔ قرآن کریم میں پہاڑوں کی یہ کیفیت مختلف انداز میں بیان کی گئی ہے، جسکی تفصیل
پہلے گزر چکی ہے۔ اب آگے ان دو فریقوں کا جمالی ذکر کیا جا رہا ہے جو قیامت والے دن اعمال کے اعتبار سے ہوں گے۔

(۴) مَوَازِينٌ، مِيزَانٌ کی جمع ہے۔ ترازو، جس میں صحائف اعمال تولے جائیں گے۔ جیسا کہ اس کا ذکر سورہ اعراف- آیت ۸

- وہ تو دل پسند آرام کی زندگی میں ہو گا۔ (۷)^(۱)
 اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے۔ (۸)^(۲)
 اس کا ٹھکانا ہاویہ ہے۔ (۹)^(۳)
 تجھے کیا معلوم کہ وہ کیا ہے۔ (۱۰)^(۴)
 وہ تند تیز آگ (ہے)۔ (۱۱)^(۵)

سورہ نکاشرکی ہے اور اس میں آٹھ آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
 نہایت رحم والا ہے۔

سُورَةُ النَّازِعَاتِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورہ کہف (۱۰۵) اور سورہ انبیاء (۳۷) میں بھی گزرا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہاں یہ میزان نہیں، موازن کی جمع ہے یعنی ایسے اعمال جن کی اللہ کے ہاں کوئی اہمیت اور خاص وزن ہو گا۔ (فتح القدر) لیکن یہاں مفہوم ہی راجح اور صحیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کی نیکیاں زیادہ ہوں گی اور وزن اعمال کے وقت ان کی نیکیوں والا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔

- (۱) یعنی ایسی زندگی، جس کو وہ صاحب زندگی پسند کرے گا۔
 (۲) یعنی جس کی برائیاں نیکیوں پر غالب ہوں گی، اور برائیوں کا پلڑا بھاری اور نیکیوں کا ہلکا ہو گا۔
 (۳) ہاویۃ جہنم کا نام ہے، اس کو ہاویہ اس لیے کہتے ہیں کہ جنسی اس کی گہرائی میں گرے گا۔ اور اس کو اہم (ماں) سے اس لیے تعبیر کیا کہ جس طرح انسان کے لیے ماں، جائے پناہ ہوتی ہے اسی طرح جہنمیوں کا ٹھکانا جہنم ہو گا۔ بعض کہتے ہیں کہ ام کے معنی دماغ کے ہیں۔ جنسی، جہنم میں سر کے بل ڈالے جائیں گے۔ (ابن کثیر)
 (۴) یہ استفہام اس کی ہولناکی اور شدت عذاب کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ وہ انسان کے وہم و تصور سے بالا ہے، انسانی علوم اس کا احاطہ نہیں کر سکتے اور اس کی کنہ نہیں جان سکتے۔

(۵) جس طرح حدیث میں ہے کہ انسان دنیا میں جو آگ جلاتا ہے، یہ جہنم کی آگ کا سترواں حصہ ہے، جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے ۶۹ درجہ زیادہ ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة النار وأنها مخلوقہ۔ مسلم، کتاب الجنۃ، باب فی شدۃ حورنار جہنم) ایک اور حدیث میں ہے کہ ”آگ نے اپنے رب سے شکایت کی کہ میرا ایک حصہ دوسرے حصے کو کھائے جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے دوسرائے لینے کی اجازت فرمادی۔ ایک سانس گرمی میں اور ایک سانس سردی میں پس جو سخت سردی ہوتی ہے یہ اس کا ٹھکانا سانس ہے، اور نہایت سخت گرمی جو پڑتی ہے، وہ جہنم کا گرم سانس ہے۔“ (بخاری، کتاب و باب مذکور) ایک اور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جب گرمی زیادہ سخت ہو تو نماز ٹھنڈی کر کے پڑھو، اس لیے کہ گرمی کی شدت جہنم کے جوش کی وجہ سے ہے۔ (حوالہ

زیادتی کی چاہت نے تمہیں غافل کر دیا۔ ^(۱)	أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ ۝
یہاں تک کہ تم قبرستان جا بیٹھے۔ ^(۲)	حَتَّىٰ ذُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝
ہرگز نہیں تم عنقریب معلوم کر لو گے۔ ^(۳)	كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝
ہرگز نہیں پھر تمہیں جلد علم ہو جائے گا۔ ^(۴)	ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝
ہرگز نہیں اگر تم یقینی طور پر جان لو۔ ^(۵)	كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۝
تو بیشک تم جہنم دیکھ لو گے۔ ^(۶)	لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۝
اور تم اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے۔ ^(۷)	ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۝
پھر اس دن تم سے ضرور بالضرور نعمتوں کا سوال ہو گا۔ ^(۸)	ثُمَّ لَتَسْتَأْذِنَ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝

مذکور، مسلم، کتاب المساجد

(۱) اَلْهَىٰ يُلْهِيهِ كے معنی ہیں، غافل کر دینا۔ تَكَاثُرٌ، زیادتی کی خواہش۔ یہ عام ہے، مال، اولاد، اعوان و انصار اور خاندان و قبیلہ وغیرہ سب کو شامل ہے۔ ہر وہ چیز، جس کی کثرت انسان کو محبوب ہو اور کثرت کے حصول کی کوشش و خواہش اسے اللہ کے احکام اور آخرت سے غافل کر دے۔ یہاں اللہ تعالیٰ انسان کی اسی کمزوری کو بیان کر رہا ہے، جس میں انسانوں کی اکثریت ہر دور میں مبتلا رہی ہے۔

(۲) اس کا مطلب ہے کہ حصول کثرت کے لیے محنت کرتے کرتے، تمہیں موت آگئی، اور تم قبروں میں جا بیٹھے۔

(۳) یعنی تم جس تکاثر و تفاخر میں ہو، یہ صحیح نہیں۔

(۴) اس کا انجام عنقریب تم جان لو گے، یہ بطور تاکید دو مرتبہ فرمایا۔

(۵) اس کا جواب محذوف ہے۔ مطلب ہے کہ اگر تم اس غفلت کا انجام اس طرح یقینی طور پر جان لو، جس طرح دنیا کی کسی دیکھی بھالی چیز کا تمہیں یقین ہوتا ہے تو تم یقیناً اس تکاثر و تفاخر میں مبتلا نہ ہو۔

(۶) یہ قسم محذوف کا جواب ہے یعنی اللہ کی قسم تم جہنم ضرور دیکھو گے یعنی اس کی سزا بھگتو گے۔

(۷) پہلا دیکھنا دور سے ہو گا، یہ دیکھنا قریب سے ہو گا، اسی لیے اسے عَيْنَ الْيَقِينِ (جس کا یقین مشاہدہ یعنی سے حاصل ہو) کہا گیا۔

(۸) یہ سوال ان نعمتوں کے بارے میں ہو گا، جو اللہ نے دنیا میں عطا کی ہوں گی۔ جیسے آنکھ، کان، دل، دماغ، امن و صحت، مال و دولت اور اولاد وغیرہ۔ بعض کہتے ہیں، یہ سوال صرف کافروں سے ہو گا۔ بعض کہتے ہیں، ہر ایک سے ہی ہو گا کیوں کہ محض سوال مستلزم عذاب نہیں۔ جنہوں نے ان نعمتوں کا استعمال اللہ کی ہدایات کے مطابق کیا ہو گا، وہ سوال کے باوجود عذاب سے محفوظ رہیں گے، اور جنہوں نے کفرانِ نعمت کا ارتکاب کیا ہو گا، وہ دھریے جائیں گے۔

سورہ عصر کی ہے اور اس میں تین آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

زمانے کی قسم۔^(۱)

بیشک (بالیقین) انسان سرتا سر نقصان میں ہے۔^(۲)
سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل^(۳)
کیے اور (جنہوں نے) آپس میں حق کی وصیت کی^(۴) اور
ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔^(۵)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالْعَصْرِ ۝

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهِۦٓ اَكْفُر ۝

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَكُوۡلُوا بِرِزْقِہٖۤ

وَکُوۡلُوا بِالصَّبْرِ ۝

(۱) زمانے سے مراد، شب و روز کی یہ گردش اور ان کا اول بدل کر آنا ہے۔ رات آتی ہے تو اندھیرا چھا جاتا ہے اور دن طلوع ہوتا ہے تو ہر چیز روشن ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں کبھی رات لمبی، دن چھوٹا اور کبھی دن لمبا، رات چھوٹی ہو جاتی ہے۔ یہی مرور ایام، زمانہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور کارگیری پر دلالت کرتا ہے۔ اسی لیے رب نے اس کی قسم کھائی ہے۔ یہ پہلے بتلایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنی مخلوق میں سے جس کی چاہے قسم کھا سکتا ہے لیکن انسانوں کے لیے اللہ کی قسم کے علاوہ کسی چیز کی قسم کھانا جائز نہیں ہے۔

(۲) یہ جواب قسم ہے۔ انسان کا خسارہ اور ہلاکت واضح ہے کہ جب تک وہ زندہ رہتا ہے، اس کے شب و روز سخت محنت کرتے ہوئے گزرتے ہیں پھر جب موت سے ہم کنار ہوتا ہے تو موت کے بعد بھی آرام و راحت نصیب نہیں ہوتی، بلکہ وہ جہنم کا بندھن بنتا ہے۔

(۳) ہاں اس خسارے سے وہ لوگ محفوظ ہیں جو ایمان اور عمل صالح کے جامع ہیں، کیوں کہ ان کی زندگی چاہے جیسی بھی گزری ہو، موت کے بعد وہ بہر حال ابدی نعمتوں اور جنت کی پر آسائش زندگی سے بہرہ ور ہوں گے۔ آگے اہل ایمان کی مزید صفات کا تذکرہ ہے۔

(۴) یعنی اللہ کی شریعت کی پابندی اور محرمات و معاصی سے اجتناب کی تلقین۔

(۵) یعنی مصائب و آلام پر صبر، احکام و فرائض شریعت پر عمل کرنے میں صبر، معاصی سے اجتناب پر صبر، لذات و خواہشات کی قربانی پر صبر، صبر بھی اگرچہ تو اوصافِ باہق میں شامل ہے، تاہم اسے خصوصیت سے الگ ذکر کیا گیا، جس سے اس کا شرف و فضل اور خصال حق میں اس کا ممتاز ہونا واضح ہے۔

سورہ حمزہ کی ہے اور اس میں نو آیتیں ہیں۔

سُورَةُ الْهُمْنَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نمایت رحم والا ہے۔

بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کی جو عیب ٹونے والا
غیبت کرنے والا ہو۔ (۱)

جو مال کو جمع کرتا جائے اور گنتا جائے۔ (۲)

وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس سدا رہے
گا۔ (۳)

ہرگز نہیں (۴) یہ تو ضرور توڑ پھوڑ دینے والی آگ میں
پھینک دیا جائے گا۔ (۵)

اور تجھے کیا معلوم کہ ایسی آگ کیا ہوگی؟ (۶)

وہ اللہ تعالیٰ کی سلگائی ہوئی آگ ہوگی۔ (۶)

وَيَلِّ لِكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٌ ۝

الَّذِي جَمَعَ مَا لَا وِعَادَ لَهُ ۝

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝

كَلَّا لَيَكْبِتُنَّ فِي الْحُطْمَةِ ۝

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطْمَةُ ۝

تَأْتِيهِمُ الْمَوْقِدَةُ ۝

(۱) هُمَزَةٌ اور لُمَزَةٌ، بعض کے نزدیک ہم معنی ہیں۔ بعض اس میں کچھ فرق کرتے ہیں۔ هُمَزَةٌ وہ شخص ہے جو درود رو
برائی کرے اور لُمَزَةٌ، وہ جو پیٹھ پیچھے غیبت کرے۔ بعض اس کے برعکس معنی کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں هُمَزٌ، آنکھوں
اور ہاتھوں کے اشارے سے برائی کرنا ہے اور لُمَزٌ زبان سے۔

(۲) اس سے مراد یہی ہے کہ جمع کرنا اور گن گن کر رکھنا یعنی سنت سنت کر رکھنا اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا۔
ورنہ مطلق مال جمع کر کے رکھنا مذموم نہیں ہے۔ یہ مذموم اسی وقت ہے جب زکوٰۃ و صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کا
اہتمام نہ ہو۔

(۳) أَخْلَدُهُ کا زیادہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ”اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا“ یعنی یہ مال جسے وہ جمع کر کے رکھتا ہے، اس کی عمر
میں اضافہ کر دے گا اور اسے مرنے نہیں دے گا۔

(۴) یعنی معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا اس کا زعم اور گمان ہے۔

(۵) ایسا بجیل شخص حطمہ میں پھینک دیا جائے گا۔ یہ بھی جنم کا ایک نام ہے، توڑ پھوڑ دینے والی۔

(۶) یہ استفہام اس کی ہولناکی کے بیان کے لیے ہے، یعنی وہ اتنی ہولناک آگ ہوگی کہ تمہاری عقلیں اس کا ادراک
نہیں کر سکتیں اور تمہارا فہم و شعور اس کی تمہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

جو دلوں پر چڑھتی چلی جائے گی۔^(۱) (۷)
وہ ان پر ہر طرف سے بند کی ہوئی ہوگی۔^(۲) (۸)
بڑے بڑے ستونوں میں۔ (۹)

الَّتِي تَطْلُبُ عَلَى الْأَقْدَامِ ۖ
إِنَّمَا عَلَيْهِمْ مُّؤَصَّدَةٌ ۖ
فِي عَمَدٍ مُّثَمَّكَدَةٍ ۖ

سورہ فیل کی ہے اور اس میں پانچ آیات ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔
کیا تو نے نہ دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے
ساتھ کیا کیا؟^(۳) (۱)

سُورَةُ الْفِيلِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْمَ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ۖ

(۱) یعنی اس کی حرارت دلوں تک پہنچ جائے گی۔ ویسے تو دنیا کی آگ کے اندر بھی یہ خاصیت ہے کہ وہ ہر چیز کو جلا ڈالتی ہے لیکن دنیا میں یہ آگ دل تک پہنچ نہیں پاتی کہ انسان کی موت اس سے قبل ہی واقع ہو جاتی ہے۔ جہنم میں ایسا نہیں ہوگا وہ آگ دلوں تک بھی پہنچ جائے گی، لیکن موت نہیں آئے گی، بلکہ آرزو کے باوجود بھی موت نہیں آئے گی۔
(۲) مؤصّدة بند، یعنی جہنم کے دروازے اور راستے بند کر دیئے جائیں گے، تاکہ کوئی باہر نہ نکل سکے، اور انہیں لوہے کی میخوں کے ساتھ باندھ دیا جائے گا، جو لمبے لمبے ستونوں کی طرح ہوں گی، بعض کے نزدیک عمّد سے مراد بیڑیاں یا طوق ہیں اور بعض کے نزدیک ستون ہیں جن میں انہیں عذاب دیا جائے گا۔ (فتح القدر)
(۳) جو یمن سے خانہ کعبہ کی تخریب کے لیے آئے تھے اَلَمْ تَرَ کے معنی ہیں اَلَمْ تَعْلَمَ کیا تجھے معلوم نہیں؟ استفہام تقریر کے لیے ہے، یعنی تو جانتا ہے یا وہ سب لوگ جانتے ہیں جو تیرے ہم عصر ہیں۔ یہ اس لیے فرمایا کہ عرب میں یہ واقعہ گزرے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ مشہور ترین قول کے مطابق یہ واقعہ اس سال پیش آیا جس سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی۔ اس لیے عربوں میں اس کی خبریں مشہور اور متواتر تھیں۔ یہ واقعہ مختصراً حسب ذیل ہے۔
واقعہ اصحاب الفیل:

جشہ کے بادشاہ کی طرف سے یمن میں ابرہہ الاشرم گورنر تھا، اس نے صنعاء میں ایک بہت بڑا گرجا (عبادت گھر) تعمیر کیا اور کوشش کی کہ لوگ خانہ کعبہ کے بجائے عبادت اور حج و عمرہ کے لیے ادھر آیا کریں۔ یہ بات اہل مکہ اور دیگر قبائل عرب کے لیے سخت ناگوار تھی۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص نے ابرہہ کے بنائے ہوئے عبادت خانے کو غلاظت سے پلید کر دیا، جس کی اطلاع اس کو کر دی گئی کہ کسی نے اس طرح اس گرجا کو ناپاک کر دیا ہے، جس پر اس نے خانہ کعبہ کو ڈھانے کا عزم کر لیا اور ایک لشکر جرار لے کر کے پر حملہ آور ہوا، کچھ ہاتھی بھی اس کے ساتھ تھے۔ جب یہ لشکر وادی محسر کے پاس پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے غول بھیج دیئے جن کی چونچوں اور پنجوں میں کنکریاں تھیں جو چنے یا مسور

کیا ان کے مکر کو بے کار نہیں کر دیا؟^(۱) (۲)
 اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے۔^(۳) (۳)
 جو انہیں مٹی اور پتھر کی کنکریاں مار رہے تھے۔^(۴) (۴)
 پس انہیں کھائے ہوئے بھوس کی طرح کر دیا۔^(۵) (۵)

سورہ قریش کی ہے اور اس میں چار آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
 نہایت رحم والا ہے۔

قریش کے مانوس کرنے کے لیے (۱)
 (یعنی) انہیں جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے
 کے لیے۔^(۵) (اس کے شکر یہ میں)۔ (۲)

أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ﴿۱﴾
 وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ﴿۲﴾
 تَرْمِذُهُمْ بِحِجَارٍ مِّنْ سِجِّيلٍ ﴿۳﴾
 فَجَعَلْنَاهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ﴿۴﴾

سُورَةُ قُرَيْشٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بِإِذْنِ قُرَيْشٍ ﴿۱﴾

الْيَوْمِ رِحْلَةَ الْهُنَاقِ وَالْعَصِيفِ ﴿۲﴾

کے برابر تھیں، جس فوجی کے بھی یہ کنکری لگتی وہ پکھل جاتا اور اس کا گوشت جھڑ جاتا اور بالآخر مر جاتا۔ خود ابرہہ کا بھی صنعا پہنچتے پہنچتے یہی انجام ہوا۔ اس طرح اللہ نے اپنے گھر کی حفاظت فرمائی۔ ککے کے قریب پہنچ کر ابرہہ کے لشکر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا کے، جو ککے کے سردار تھے، اونٹوں پر قبضہ کر لیا، جس پر عبدالمطلب نے آکر ابرہہ سے کہا کہ تو میرے اونٹ واپس کر دے جو تیرے لشکریوں نے پکڑے ہیں۔ باقی رہا خانہ کعبہ کا مسئلہ، جس کو ڈھانے کے لیے تو آیا ہے تو وہ تیرا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، وہ اللہ کا گھر ہے، وہی اس کا محافظ ہے، تو جانے اور بیت اللہ کا مالک اللہ جانے۔ (ایسر القاسم)

(۱) یعنی وہ جو خانہ کعبہ کو ڈھانے کا ارادہ لے کر آیا تھا، اس میں اس کو ناکام کر دیا۔ استغمام تقریری ہے۔

(۲) ابابیل، پرندے کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی ہیں غول در غول۔

(۳) سِجِّیلِ مٹی کو آگ میں پکا کر اس سے بنائے ہوئے کنکر۔ ان چھوٹے چھوٹے پتھروں یا کنکروں نے توپ کے گولوں اور بندوں کی گولیوں سے زیادہ مسلک کام کیا۔

(۴) یعنی ان کے اجزائے جسم اس طرح بکھر گئے جیسے کھائی ہوئی بھوسی ہوتی ہے۔

☆ اسے سورہ ایلاف بھی کہتے ہیں، اس کا تعلق بھی گزشتہ سورت سے ہے۔

(۵) اِنْلَاف کے معنی ہیں، مانوس اور عادی بنانا، یعنی اس کام سے کلفت اور نفرت کا دور ہو جانا۔ قریش کی گزران کا ذریعہ تجارت تھی۔ سال میں دو مرتبہ ان کا تجارتی قافلہ باہر جاتا اور وہاں سے اشیائے تجارت لاتا۔ سردیوں میں یمن، جو گرم علاقہ تھا اور گرمیوں میں شام کی طرف جو ٹھنڈا تھا۔ خانہ کعبہ کے خدمت گزار ہونے کی وجہ سے تمام اہل عرب ان

پس انہیں چاہیے کہ اسی گھر کے رب کی عبادت کرتے رہیں۔ (۳)

جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا^(۱) اور ڈر (اور خوف) میں امن (وامان) دیا۔ (۴)

سورہ ماعون کی ہے اور اس میں سات آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

کیا تو نے (اسے بھی) دیکھا جو (روز) جزا کو جھٹلاتا ہے؟^(۱)

یہی وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ (۲)

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ ۝

الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ ۝



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

أَذَيْتَ الَّذِي يَكْتُمُ بِالْإِيمَانِ ۝

فَذَلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝

کی عزت کرتے تھے، اس لیے ان کے قافلے بلا روک ٹوک سفر کرتے، اللہ تعالیٰ اس سورت میں قریش کو بتلا رہا ہے کہ تم جو گرمی، سردی میں دو سفر کرتے ہو تو ہمارے اس احسان کی وجہ سے کہ ہم نے تمہیں مکے میں امن عطا کیا ہے اور اہل عرب میں معزز بنایا ہوا ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہوتی تو تمہارا سفر ممکن نہ ہوتا۔ اور اصحاب الفیل کو بھی ہم نے اسی لیے تباہ کیا ہے کہ تمہاری عزت بھی برقرار رہے اور تمہارے سفروں کا سلسلہ بھی، جس کے تم خوگر ہو، قائم رہے، اگر ابرہہ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو تمہاری عزت و سیادت بھی ختم ہو جاتی اور سلسلہ سفر بھی منقطع ہو جاتا۔ اس لیے تمہیں چاہیے کہ صرف اسی بیت اللہ کے رب کی عبادت کرو۔

(۱) مذکورہ تجارت اور سفر کے ذریعے سے۔

(۲) عرب میں قتل و غارت گری عام تھی لیکن قریش مکہ کو حرم مکہ کی وجہ سے جو احترام حاصل تھا، اس کی وجہ سے وہ خوف و خطر سے محفوظ تھے۔

☆ اس سورت کو سُورَةُ الدِّينِ، سُورَةُ اَرَايَاتِ اور سُورَةُ النَّيْمِ بھی کہتے ہیں۔ (فتح القدير)

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اور استغمام سے مقصد اظہار تعجب ہے۔ روایت معرفت کے مفہوم میں ہے اور دین سے مراد آخرت کا حساب اور جزا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ کلام میں حذف ہے۔ اصل عبارت ہے ”کیا تو نے

اس شخص کو پہچانا جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے؟ آیا وہ اپنی اس بات میں صحیح ہے یا غلط؟

(۴) اس لیے کہ ایک تو بخیل ہے۔ دوسرا، قیامت کا منکر ہے، بھلا ایسا شخص یتیم کے ساتھ کیوں کر حسن سلوک کر سکتا ہے؟ یتیم کے ساتھ تو وہی شخص اچھا برتاؤ کرے گا جس کے دل میں مال کے بجائے انسانی قدروں اور اخلاقی ضابطوں کی

اور مسکین کو کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔^(۱) (۳)
ان نمازیوں کے لیے افسوس (اور ویل نامی جہنم کی جگہ)
ہے۔ (۳)

جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔^(۲) (۵)
جو ریا کاری کرتے ہیں۔^(۳) (۶)
اور برتنے کی چیز روکتے ہیں۔^(۳) (۷)

سورہ کوثر کی ہے اور اس میں تین آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

یقیناً ہم نے تجھے (حوض) کوثر (اور بہت کچھ) دیا

وَلَا يَخُصُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْيَتَامَىٰ ۝

قَوْلٍ لِلْمُصَلِّينَ ۝

الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝

الَّذِينَ هُمْ يُرْآؤُونَ ۝

وَيَسْتَعِزُّونَ الْمُنَافِقِينَ ۝



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

إِنَّا أَنْعَمْنَا بِكَ الْكَوْثَرَ ۝

اہمیت و محبت ہوگی۔ دوسرے اسے اس امر کا یقین ہو کہ اس کے بدلے میں مجھے قیامت والے دن اچھی جزا ملے گی۔

(۱) یہ کام بھی وہی کرے گا جس میں مذکورہ خوبیاں ہوں گی ورنہ یہ یتیم کی طرح مسکین کو بھی دکھنا ہی دے گا۔

(۲) اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو نماز یا تو پڑھتے ہی نہیں۔ یا پہلے پڑھتے رہے ہیں، پھر ست ہو گئے یا نماز کو اس کے اپنے مسنون وقت میں نہیں پڑھتے، جب جی چاہتا ہے پڑھ لیتے ہیں یا تاخیر سے پڑھنے کو معمول بنا لیتے ہیں یا خشوع خضوع کے ساتھ نہیں پڑھتے۔ یہ سارے ہی مفہوم اس میں آجاتے ہیں، اس لیے نماز کی مذکورہ ساری ہی کوتاہیوں سے بچنا چاہیے۔ یہاں اس مقام پر ذکر کرنے سے یہ بھی واضح ہے کہ نماز میں ان کوتاہیوں کے مرتکب وہی لوگ ہوتے ہیں جو آخرت کی جزا اور حساب کتاب پر یقین نہیں رکھتے۔ اسی لیے منافقین کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے۔ ﴿وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُفَّاءً﴾ (النساء: ۱۱۳)

(۳) یعنی ایسے لوگوں کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ ہوئے تو نماز پڑھ لی، بصورت دیگر نماز پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے، یعنی صرف نمود و نمائش اور ریا کاری کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔

(۴) مَعْنَى: شَيْءٌ قَلِيلٌ کہتے ہیں۔ بعض اس سے مراد زکوٰۃ لیتے ہیں، کیوں کہ وہ بھی اصل مال کے مقابلے میں بالکل تھوڑی سی ہی ہوتی ہے، (ڈھائی فی صد) اور بعض اس سے گھروں میں برتنے والی چیزیں مراد لیتے ہیں جو پڑوسی ایک دوسرے سے عاریتاً مانگ لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ گھریلو استعمال کی چیزیں عاریتاً دے دینا اور اس میں کبیدگی محسوس نہ کرنا اچھی صفت ہے اور اس کے برعکس بخل اور کجوسی برتنا، یہ منکرین قیامت ہی کا شیوہ ہے۔

☆ اس کا دوسرا نام سُورَةُ النَّحْرِ بھی ہے۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَاقْسُو
إِنْ شَاءَ بِكَ هُوَ الْكَافِرُونَ

ہے۔^(۱)

پس تو اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر۔^(۲)
یقیناً تیرا دشمن ہی لاوارث اور بے نام و نشان
ہے۔^(۳)

سورہ کافرون کی ہے اور اس میں چھ آیات ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

(۱) کَذُوْنٌ، کثرت سے ہے۔ اس کے متعدد معنی بیان کیے گئے ہیں۔ ابن کثیر نے ”خیر کثیر“ کے مفہوم کو ترجیح دی ہے کیوں کہ اس میں ایسا عموم ہے کہ جس میں دوسرے معانی بھی آجاتے ہیں۔ مثلاً صحیح احادیث میں بتلایا گیا ہے کہ اس سے ایک نسر مراد ہے جو جنت میں آپ ﷺ کو عطا کی جائے گی۔ اسی طرح بعض احادیث میں اس کا مصداق حوض بتلایا گیا ہے، جس سے اہل ایمان جنت میں جانے سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے پانی پیئیں گے۔ اس حوض میں بھی پانی اسی جنت والی نسر سے آرہا ہو گا۔ اسی طرح دنیا کی فتوحات اور آپ ﷺ کا رفع و دوام ذکر اور آخرت کا اجر و ثواب، سب ہی چیزیں ”خیر کثیر“ میں آجاتی ہیں۔ (ابن کثیر)

(۲) یعنی نماز بھی صرف ایک اللہ کے لیے اور قربانی بھی صرف ایک اللہ کے نام پر۔ مشرکین کی طرح ان میں دوسروں کو شریک نہ کر۔ نَحْرٌ کے اصل معنی ہیں اونٹ کے حلقوم میں نیزہ یا چھری مار کر اسے ذبح کرنا۔ دوسرے جانوروں کو زمین پر لٹا کر ان کے گلوں پر چھری پھیری جاتی ہے اسے ذبح کرنا کہتے ہیں۔ لیکن یہاں نحر سے مراد مطلق قربانی ہے، علاوہ ازیں اس میں بطور صدقہ و خیرات جانور قربان کرنا، حج کے موقع پر منیٰ میں اور عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کرنا، سب شامل ہیں۔

(۳) اَبْتَرٌ ایسے شخص کو کہتے ہیں جو مقطوع النسل یا مقطوع الذکر ہو، یعنی اس کی ذات پر ہی اس کی نسل کا خاتمہ ہو جائے یا کوئی اس کا نام لیوانہ رہے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد نہ رہے نہ رہی تو بعض کفار نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتر کہا، جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تسلی دی کہ ابتر تو نہیں، تیرے دشمن ہی ہوں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی نسل کو بھی باقی رکھا گو اس کا سلسلہ لڑکی کی طرف سے ہی ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کی امت بھی آپ ﷺ کی اولاد معنوی ہی ہے، جس کی کثرت پر آپ ﷺ قیامت والے دن فخر کریں گے، علاوہ ازیں آپ ﷺ کا ذکر پوری دنیا میں نہایت عزت و احترام سے کیا جاتا ہے، جبکہ آپ ﷺ سے بغض و عناد رکھنے والے صرف صفحات تاریخ پر ہی موجود رہ گئے ہیں لیکن کسی دل میں ان کا احترام نہیں اور کسی زبان پر ان کا ذکر خیر نہیں۔

☆ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف کی دو رکعتوں اور فجر اور مغرب کی سنتوں میں

آپ کہہ دیجئے کہ اے کافرو! (۱)

نہ میں عبادت کرتا ہوں اس کی جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ (۲)

نہ تم عبادت کرنے والے ہو اس کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ (۳)

اور نہ میں عبادت کروں گا جسکی تم عبادت کرتے ہو۔ (۴)

اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کر رہا ہوں۔ (۵)

تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے۔ (۶)

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ۝

لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝

وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝

وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ ۝

وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ۝

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ﴾ اور سورہ اخلاص پڑھتے تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو فرمایا کہ رات کو سوتے وقت، یہ سورت پڑھ کر سوؤ گے تو شرک سے بری قرار پاؤ گے۔ (مسند أحمد، ۵/ ۳۵۶۔ ترمذی، نمبر ۳۴۰۳۔

أبو داؤد، نمبر ۵۰۵۵، مجمع الزوائد، ۱۰/ ۱۲۱) بعض روایات میں خود آپ ﷺ کا عمل بھی یہ بتلایا گیا ہے۔ (ابن کثیر)

(۱) الْكَافِرُونَ میں الف لام جنس کے لیے ہے۔ لیکن یہاں بطور خاص صرف ان کافروں سے خطاب ہے جن کی بابت اللہ کو علم تھا کہ ان کا خاتمہ کفر و شرک پر ہو گا۔ کیوں کہ اس سورت کے نزول کے بعد کئی مشرک مسلمان ہوئے اور انہوں نے اللہ کی عبادت کی۔ (فتح القدر)

(۲) بعض نے پہلی آیت کو حال کے اور دوسری کو استقبال کے مفہوم میں لیا ہے، لیکن امام شوکانی نے کہا ہے کہ ان تکلفات کی ضرورت نہیں ہے۔ تاکید کے لیے تکرار، عربی زبان کا عام اسلوب ہے، جسے قرآن کریم میں کئی جگہ اختیار کیا گیا ہے۔ جیسے سورہ رحمن، سورہ حسرات میں ہے۔ اسی طرح یہاں بھی تاکید کے لیے یہ جملہ دہرایا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ کبھی ممکن نہیں کہ میں توحید کا راستہ چھوڑ کر شرک کا راستہ اختیار کر لوں، جیسا کہ تم چاہتے ہو۔ اور اگر اللہ نے تمہاری قسمت میں ہدایت نہیں لکھی ہے، تو تم بھی اس توحید اور عبادت الہی سے محروم ہی رہو گے۔ یہ بات اس وقت فرمائی گئی، جب کفار نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک سال ہم آپ ﷺ کے معبود کی اور ایک سال آپ ﷺ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں۔

(۳) یعنی اگر تم اپنے دین پر راضی ہو اور اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہو، تو میں اپنے دین پر راضی ہوں، میں اسے کیوں چھوڑوں؟ ﴿لَنَا آخِمْأَلْنَا وَلَكُمْ آخِمْأَلِكُمْ﴾ (القصص، ۵۵)

سورہ نصر مدنی ہے اور اس میں تین آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے۔ (۱)

اور تو لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق آتا دیکھ
لے۔ (۲)

تو اپنے رب کی تسبیح کرنے لگ حمد کے ساتھ اور اس سے
مغفرت کی دعا مانگ، بیشک وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا
ہے۔ (۳)

سورہ تبت مکی ہے اور اس میں پانچ آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

سُورَةُ النَّصْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِذْ جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱

وَرَاٰی النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْ لِنَفْسِكَ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳

سُورَةُ التَّبٰتِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

☆ نزول کے اعتبار سے یہ آخری سورت ہے۔ (اصحیح مسلم، کتاب التفسیر) جس وقت یہ سورت نازل ہوئی تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سمجھ گئے کہ اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری وقت آگیا ہے، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسبیح و تحمید اور استغفار کا حکم دیا گیا ہے جیسے حضرت ابن عباس اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ صحیح بخاری میں ہے (تفسیر سورہ النصر)

(۱) اللہ کی مدد کا مطلب، اسلام اور مسلمانوں کا کفر اور کافروں پر غلبہ ہے، اور فتح سے مراد فتح مکہ ہے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد و مسکن تھا، لیکن کافروں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا، چنانچہ جب ۸ ہجری میں یہ مکہ فتح ہو گیا تو لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے شروع ہو گئے، جب کہ اس سے قبل ایک ایک دو دو فرد مسلمان ہوتے تھے۔ فتح مکہ سے لوگوں پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پیغمبر ہیں اور دین اسلام دین حق ہے، جس کے بغیر اب نجات اخروی ممکن نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب ایسا ہو تو۔

(۲) یعنی یہ سمجھ لے کہ تبلیغ رسالت اور احقاق حق کا فرض، جو تیرے ذمے تھا، پورا ہو گیا اور اب تیرا دنیا سے کوچ کرنے کا مرحلہ قریب آگیا ہے، اس لیے حمد و تسبیح الہی اور استغفار کا خوب اہتمام کر۔ اس سے معلوم ہوا کہ زندگی کے آخری ایام میں ان چیزوں کا اہتمام کثرت سے کرنا چاہیے۔

☆ اسے سُورَةُ النَّصْرِ بھی کہتے ہیں۔ اس کی شان نزول میں آتا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ اپنے

تَبَّتْ يَدَاكَ لِهَيْبِ وَتَبَّتْ ①

مَا غَفَى عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ②

سَيَصِلُ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ③

وَأَمْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ④

ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ (خود) ہلاک ہو گیا۔^(۱)

نہ تو اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی۔^(۲)
وہ عنقریب بھڑکنے والی آگ میں جائے گا۔^(۳)

اور اس کی بیوی بھی (جائے گی) جو لکڑیاں ڈھونڈنے والی ہے۔^(۴)

رشتہ داروں کو انذار و تبلیغ کریں تو آپ ﷺ نے صفا پہاڑی پر چڑھ کر یاصباحاۃ! کی آواز لگائی۔ اس طرح کی آواز خطرے کی علامت سمجھی جاتی ہے، چنانچہ اس آواز پر لوگ اکٹھے ہو گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ذرا بتلاؤ، اگر میں تمہیں خبر دوں کہ اس پہاڑی پشت پر ایک گھڑسوار لشکر ہے جو تم پر حملہ آور ہوا چاہتا ہے، تو تم میری تصدیق کرو گے؟ انہوں نے کہا، کیوں نہیں۔ ہم نے کبھی آپ ﷺ کو جھوٹا نہیں پایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر میں تمہیں ایک بڑے عذاب سے ڈرانے آیا ہوں۔ (اگر تم کفر و شرک میں مبتلا رہے) یہ سن کر ابولہب نے کہا تَبَّتْ لَكَ! تیرے لیے ہلاکت ہو، کیا تو نے ہمیں اس لیے جمع کیا تھا؟ جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمادی۔ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ تبت) ابولہب کا اصل نام عبدالعزیٰ تھا، اپنے حسن و جمال اور چہرے کی سرفی کی وجہ سے اسے ابولہب (شعلہ فروزاں) کہا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں اپنے انجام کے اعتبار سے بھی اسے جہنم کی آگ کا ایندھن بنا تھا۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی چچا تھا، لیکن آپ ﷺ کا شدید دشمن تھا اور اس کی بیوی ام جمیل بنت حرب بھی دشمنی میں اپنے خاوند سے کم نہ تھی۔

(۱) يَدَا، يَدَا (ہاتھ) کا تشبیہ ہے، مراد اس سے اس کا نفس ہے، 'جز بول کر کل مراد لیا گیا ہے یعنی ہلاک و برباد ہو جائے۔ یہ بدعا ان الفاظ کے جواب میں ہے جو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق غصے اور عداوت میں بولے تھے۔ وَتَبَّتْ (اور وہ ہلاک ہو گیا) یہ خبر ہے یعنی بدعا کے ساتھ ہی اللہ نے اس کی ہلاکت اور بربادی کی خبر بھی دے دی۔ چنانچہ جنگ بدر کے چند روز بعد یہ عدیہ بیماری میں مبتلا ہوا، جس میں طاعون کی طرح گلٹی سی نکلتی ہے، اسی میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ تین دن تک اس کی لاش یوں ہی پڑی رہی، حتیٰ کہ سخت بدبودار ہو گئی۔ بالآخر اس کے لڑکوں نے بیماری کے پھیلنے اور عار کے خوف سے، اس کے جسم پر دور سے ہی پتھر اور مٹی ڈال کر اسے دفنایا۔ (ایسر اتقاہیر)

(۲) کمائی میں اس کی ریسمانہ حیثیت اور جاہ و منصب اور اس کی اولاد بھی شامل ہے۔ یعنی جب اللہ کی گرفت آئی تو کوئی چیز اس کے کام نہ آئی۔

(۳) یعنی جہنم میں یہ اپنے خاوند کی آگ پر لکڑیاں لالا کر ڈالے گی، تاکہ آگ مزید بھڑکے۔ یہ اللہ کی طرف سے ہو گا، یعنی جس طرح یہ دنیا میں اپنے خاوند کی، اس کے کفر و عناد میں، مددگار تھی، آخرت میں بھی عذاب میں اس کی مددگار ہو گی۔ (ابن کثیر) بعض کہتے ہیں کہ وہ کانٹے دار جھاڑیاں ڈھو ڈھو کر لاتی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں لاکر بچھا

فِي جَبِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ ۝

اسکی گردن میں پوست کھجور کی بٹی ہوئی رسی ہوگی۔ (۵)

سورۃ اخلاص کی ہے اور اس میں چار آیتیں ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ۝

آپ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ تعالیٰ ایک (ہی) ہے۔ (۱)

اللّٰهُ الصَّمَدُ ۝

اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے۔ (۲)

لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُولَدْ ۝

نہ اس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ (۳)

وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝

اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔ (۴)

دیتی تھی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اس کی چغل خوری کی عادت کی طرف اشارہ ہے۔ چغل خوری کے لیے یہ عربی محاورہ ہے۔ یہ کفار قریش کے پاس جا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غیبت کرتی اور انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت پر اسکتی تھی۔ (فتح الباری)

(۱) جِنْدُ گِرْدَن۔ مَسَدٌ، مضبوط بٹی ہوئی رسی۔ وہ مونج کی یا کھجور کی پوست کی ہو یا آہنی تاروں کی۔ جیسا کہ مختلف لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ وہ دنیا میں ڈالے رکھتی تھی جسے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جنم میں اس کے گلے میں جو طوق ہو گا، وہ آہنی تاروں سے بنا ہوا ہو گا۔ مَسَدٌ سے تشبیہ اس کی شدت اور مضبوطی کو واضح کرنے کے لیے دی گئی ہے۔

☆۔ یہ مختصری سورت بڑی فضیلت کی حامل ہے، اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ثلث (ایک تہائی ۱/۳) قرآن قرار دیا ہے اور اسے رات کو پڑھنے کی ترغیب دی ہے۔ (البخاری، کتاب الصوحید، وفضائل القرآن، باب فضل قل هو اللہ أحد، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم ہر رکعت میں دیگر سورتوں کے ساتھ اسے بھی ضرور پڑھتے تھے، جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا ”تمہاری اس کے ساتھ محبت تمہیں جنت میں داخل کر دے گی“۔ (البخاری، کتاب الصوحید، کتاب الأذان، باب الجمع بین السورتین فی الركعة۔ مسلم، کتاب صلاة المسافرين، اس کا سبب نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب بیان کرو۔ (مسند أحمد، ۵/ ۱۳۳-۱۳۴)

(۲) یعنی سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔

(۳) یعنی نہ اس سے کوئی چیز نکلی ہے نہ وہ کسی چیز سے نکلا ہے۔

(۴) اس کی ذات میں، نہ اس کی صفات میں اور نہ اس کے افعال میں۔ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ ۱۱) حدیث

سورۃ فلق کی ہے اور اس میں پانچ آیتیں ہیں۔

سُورَةُ الْفَلَقِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

آپ کہہ دیجئے! کہ میں صبح کے رب کی پناہ میں آتا

قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”انسان مجھے گالی دیتا ہے یعنی میرے لیے اولاد ثابت کرتا ہے“ حالانکہ میں ایک ہوں بے نیاز ہوں، میں نے کسی کو جنا ہے نہ کسی سے پیدا ہوا ہوں اور نہ کوئی میرا ہمسرہ ہے۔“ (صحیح البخاری) تفسیر سورۃ قل هو اللہ احد، اس سورت میں ان کا بھی رد ہو گیا جو متعدد خداؤں کے قائل ہیں اور جو اللہ کے لیے اولاد ثابت کرتے ہیں اور جو اس کو دوسروں کا شریک گردانتے ہیں اور ان کا بھی جو سرے سے وجود باری تعالیٰ ہی کے قائل نہیں۔

☆۔ اس کے بعد سورۃ الناس ہے، ان دونوں کی مشترکہ فضیلت متعدد احادیث میں بیان کی گئی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”آج کی رات مجھ پر کچھ ایسی آیات نازل ہوئی ہیں، جن کی مثل میں نے کبھی نہیں دیکھی“ یہ فرما کر آپ ﷺ نے یہ دونوں سورتیں پڑھیں۔ (صحیح مسلم، کتاب صلوة المسافرین، باب فضل قراءۃ المعوذتین، والترمذی، ابو حابس، جہنی، جہنہ، سے آپ ﷺ نے فرمایا ”اے ابو حابس! کیا میں تمہیں سب سے بہترین تعویذ نہ بتاؤں جس کے ذریعے سے پناہ طلب کرنے والے پناہ مانگتے ہیں، انہوں نے عرض کیا، ہاں، ضرور بتلائے! آپ ﷺ نے دونوں سورتوں کا ذکر کر کے فرمایا یہ دونوں معوذتان ہیں۔“ (صحیح النسائی، لئلبانی، نمبر ۵۰۲۰) نبی صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں اور جنوں کی نظر سے پناہ مانگا کرتے تھے، جب یہ دونوں سورتیں نازل ہوئیں تو آپ ﷺ نے ان کے پڑھنے کو معمول بنا لیا اور باقی دوسری چیزیں چھوڑ دیں۔ (صحیح الترمذی، لئلبانی، نمبر ۲۱۵۰) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب آپ ﷺ کو کوئی تکلیف ہوتی تو معوذتین ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ پڑھ کر اپنے جسم پر پھونک لیتے، جب آپ ﷺ کی تکلیف زیادہ ہو گئی تو میں یہ سورتیں پڑھ کر آپ ﷺ کے ہاتھوں کو برکت کی امید سے، آپ ﷺ کے جسم پر پھیرتی۔ (بخاری، فضائل القرآن، باب المعوذات، مسلم، کتاب السلام، باب رقیۃ المریض بالمعوذات، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا، تو جبرائیل علیہ السلام یہی دو سورتیں لے کر حاضر ہوئے اور فرمایا کہ ایک یہودی نے آپ ﷺ پر جادو کیا ہے، اور یہ جادو فلاں کنویں میں ہے، آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیج کر اسے منگوا لیا، (یہ ایک کنکھی کے دندانوں اور بالوں کے ساتھ ایک تانت کے اندر گیارہ پڑی ہوئی تھیں اور موم کا ایک پتلا تھا جس میں سوئیاں چھوٹی ہوئی تھیں) جبرائیل علیہ السلام کے حکم کے مطابق آپ ﷺ ان دونوں سورتوں میں سے ایک ایک آیت پڑھتے جاتے اور گرہ کھلتی

<p>ہوں۔^(۱) (۱)</p> <p>ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے۔^(۲) (۲)</p> <p>اور اندھیری رات کی تاریکی کے شر سے جب اس کا اندھیرا پھیل جائے۔^(۳) (۳)</p> <p>اور گرہ (لگا کر ان) میں پھونکنے والیوں کے شر سے (بھی)^(۴) (۴)</p> <p>اور حسد کرنے والے کی برائی سے بھی جب وہ حسد</p>	<p>مِنْ شَيْءٍ مَّا خَلَقَ ۝</p> <p>وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ۝</p> <p>وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ ۝</p> <p>وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝</p>
--	---

جاتی اور سوئی نکلتی جاتی۔ خاتے تک پہنچتے پہنچتے ساری گرہیں بھی کھل گئیں اور سوئیاں بھی نکل گئیں اور آپ ﷺ اس طرح صبح ہو گئے جیسے کوئی شخص جگڑ بندی سے آزاد ہو جائے۔ (صحیح بخاری، مع فتح الباری، کتاب الطب، باب السحر۔ مسلم، کتاب السلام، باب السحر۔ والسنن) آپ ﷺ کا یہ معمول بھی تھا کہ رات کو سوتے وقت سورہٴ اخلاص اور موذتین پڑھ کر اپنی ہتھیلیوں پر پھونکتے اور پھر انہیں پورے جسم پر ملتے، پہلے سر، چہرے اور جسم کے اگلے حصے پر ہاتھ پھیرتے، اس کے بعد جہاں تک آپ ﷺ کے ہاتھ پہنچتے۔ تین مرتبہ آپ ﷺ ایسا کرتے۔ (صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل المعوذات)

(۱) فَلَقَ کے راجح معنی صبح کے ہیں۔ صبح کی تخصیص اس لیے کی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ رات کا اندھیرا ختم کر کے دن کی روشنی لا سکتا ہے، وہ اللہ اسی طرح خوف اور دہشت کو دور کر کے پناہ مانگنے والے کو امن بھی دے سکتا ہے۔ یا انسان جس طرح رات کو اس بات کا منتظر ہوتا ہے کہ صبح روشنی ہو جائے گی، اسی طرح خوف زدہ آدمی پناہ کے ذریعے سے صبح کاسیابی کے طلوع کا امیدوار ہوتا ہے۔ (فتح القدر)

(۲) یہ عام ہے، اس میں شیطان اور اس کی ذریت، جنم اور ہر اس چیز سے پناہ ہے جس سے انسان کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ (۳) رات کے اندھیرے میں ہی خطرناک درندے اپنی کچھاروں سے اور موذی جانور اپنے بلوں سے اور اسی طرح جرائم پیشہ افراد اپنے مذموم ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نکلتے ہیں۔ ان الفاظ کے ذریعے سے ان تمام سے پناہ طلب کی گئی ہے۔ غَاسِقٍ، رات، وَقَبَ داخل ہو جائے، چھا جائے۔

(۴) نَفَّاثَاتُ، مونث کا صیغہ ہے، جو النَّفُّوسُ (موصوف محذوف) کی صفت ہے مِنْ شَرِّ النَّفُّوسِ النَّفَّاثَاتِ یعنی گرہوں میں پھونکنے والے نفسوں کی برائی سے پناہ۔ اس سے مراد جادو کا کالا عمل کرنے والے مرد اور عورت دونوں ہیں۔ یعنی اس میں جادو گروں کی شرارت سے پناہ مانگی گئی ہے۔ جادوگر، پڑھ پڑھ کر پھونک مارتے اور گرہ لگاتے جاتے ہیں۔ عام طور پر جس پر جادو کرنا ہوتا ہے اس کے بال یا کوئی چیز حاصل کر کے اس پر یہ عمل کیا جاتا ہے۔

کرے۔^(۱) (۵)

سورہ ناس مکی ہے اور اس میں چھ آیتیں ہیں۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے۔

آپ کہہ دیجئے! کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ میں
آتا ہوں۔^(۲) (۱)

لوگوں کے مالک کی^(۳) (اور)^(۲)

لوگوں کے معبود کی (پناہ میں)^(۳) (۳)

و سوسہ ڈالنے والے پیچھے ہٹ جانے والے کے شر
سے۔^(۵) (۳)

سُورَةُ النَّاسِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝

مَلِكِ النَّاسِ ۝

اِلٰهِ النَّاسِ ۝

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَفِیِّ ۝

(۱) حسد یہ ہے کہ حاسد، محمود سے زوال نعمت کی آرزو کرتا ہے، چنانچہ اس سے بھی پناہ طلب کی گئی ہے۔ کیوں کہ حسد بھی ایک نہایت بری اخلاقی بیماری ہے، جو نیکیوں کو کھا جاتی ہے۔

☆ اس کی فضیلت گزشتہ سورت کے ساتھ بیان ہو چکی ہے۔ ایک اور حدیث ہے جس میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں بچھو ڈس گیا۔ نماز سے فراغت کے بعد آپ ﷺ نے پانی اور نمک منگوا کر اس کے اوپر ملا اور ساتھ ساتھ ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ، قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ پڑھتے رہے۔ (مجمع الزوائد ۵ / ۱۱۱ - وقال الهیثمی اسنادہ حسن)

(۲) رَبِّ (پروردگار) کا مطلب ہے جو ابتدا سے ہی، جب کہ انسان ابھی ماں کے پیٹ میں ہی ہوتا ہے، اس کی تدبیر و اصلاح کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ بالغ عاقل ہو جاتا ہے۔ پھر وہ یہ تدبیر چند مخصوص افراد کے لیے نہیں، بلکہ تمام انسانوں کے لیے کرتا ہے اور تمام انسانوں کے لیے ہی نہیں، بلکہ اپنی تمام مخلوقات کے لیے کرتا ہے، یہاں صرف انسانوں کا ذکر انسان کے اس شرف و فضل کے انظار کے لیے ہے جو تمام مخلوقات پر اس کو حاصل ہے۔

(۳) جو ذات، تمام انسانوں کی پرورش اور نگہداشت کرنے والی ہے، وہی اس لائق ہے کہ کائنات کی حکمرانی اور بادشاہی بھی اس کے پاس ہو۔

(۴) اور جو تمام کائنات کا پروردگار ہو، پوری کائنات پر اسی کی بادشاہی ہو، وہی ذات اس بات کی مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور وہی تمام لوگوں کا معبود ہو۔ چنانچہ میں اسی عظیم و برتر ہستی کی پناہ حاصل کرتا ہوں۔

(۵) اَلْوَسْوَاسِ، بعض کے نزدیک اسم فاعل اَلْمَوْسُوْسِ کے معنی میں ہے اور بعض کے نزدیک یہ ذِی الْوَسْوَاسِ ہے۔

الَّذِي يُوسُّوسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۝

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝

جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ (۵)
(خواہ) وہ جن میں سے ہو یا انسان میں سے۔ (۶) ^(۱)

وسوسہ، مخفی آواز کو کہتے ہیں۔ شیطان بھی نہایت غیر محسوس طریقوں سے انسان کے دل میں بری باتیں ڈال دیتا ہے، اسی کو وسوسہ کہا جاتا ہے۔ الخَنَّاسِ (کھسک جانے والا یہ شیطان کی صفت ہے۔ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو یہ کھسک جاتا ہے اور اللہ کی یاد سے غفلت برتی جائے تو دل پر چھا جاتا ہے۔

(۱) یہ وسوسہ ڈالنے والوں کی دو قسمیں ہیں۔ شیاطین الجن کو تو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو گمراہ کرنے کی قدرت دی ہے۔ علاوہ ازیں ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان اس کا ساتھی ہوتا ہے جو اس کو گمراہ کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا وہ آپ کے ساتھ بھی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! میرے ساتھ بھی ہے، لیکن اللہ نے اس پر میری مدد فرمائی ہے، اور وہ میرا مطیع ہو گیا ہے۔ مجھے خیر کے علاوہ کسی بات کا حکم نہیں دیتا۔ (صحیح مسلم، کتاب صفۃ القیامۃ، باب تحریش الشیطن وبعثہ سراپاہ لفتنۃ الناس...) اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اعکاف فرماتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے آئیں۔ رات کا وقت تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں چھوڑنے کے لیے ان کے ساتھ گئے۔ راستے میں دو انصاری صحابی وہاں سے گزرے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلا کر فرمایا کہ یہ میری اہلیہ، صفیہ بنت جحی، ہیں۔ انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی بابت ہمیں کیا بدگمانی ہو سکتی تھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تو ٹھیک ہے، لیکن شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ تمہارے دلوں میں کچھ شبہ نہ ڈال دے۔ (صحیح بخاری، کتاب الأحکام، والشہادۃ تکون عند الحاکم فی ولایۃ القضاء)

دوسرے شیطان، انسانوں میں سے ہوتے ہیں جو ناصح، مشفق کے روپ میں انسانوں کو گمراہی کی ترغیب دیتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ شیطان جن کو گمراہ کرتا ہے یہ ان کی دو قسمیں ہیں، یعنی شیطان انسانوں کو بھی گمراہ کرتا ہے اور جنات کو بھی۔ صرف انسانوں کا ذکر تظلیب کے طور پر ہے، ورنہ جنات بھی شیطان کے وسوسوں سے گمراہ ہونے والوں میں شامل ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ جنوں پر بھی قرآن میں ”رجال“ کا لفظ بولا گیا ہے۔ (سورۃ الجن، ۶) اس لیے وہ بھی ناس کا مصداق ہیں۔

رموز اوقاف قرآن مجید

ہر زبان کے اہل زبان جب گفتگو کرتے ہیں تو کہیں ٹھہر جاتے ہیں، کہیں نہیں ٹھہرتے۔ کہیں کم ٹھہرتے ہیں، کہیں زیادہ اور اس ٹھہرنے اور نہ ٹھہرنے کو بات کے صحیح بیان کرنے اور اس کا صحیح مطلب سمجھنے میں بہت دخل ہے۔ قرآن مجید کی عبارت بھی گفتگو کے انداز میں واقع ہوئی ہے۔ اسی لئے اہل علم نے اس کے ٹھہرنے نہ ٹھہرنے کی علامتیں مقرر کر دی ہیں، جن کو رموز اوقاف قرآن مجید کہتے ہیں۔ ضروری ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے ان رموز کو ملحوظ رکھیں اور وہ یہ ہیں :

○ جہاں بات پوری ہو جاتی ہے، وہاں چھوٹا سا دائرہ لگا دیتے ہیں۔ یہ حقیقت میں گول (ت) جو بصورت (ة) لکھی جاتی ہے۔ اور یہ وقف تام کی علامت ہے یعنی اس پر ٹھہرنا چاہیے، اب (ة) تو نہیں لکھی جاتی۔ چھوٹا سا دائرہ ڈال دیا جاتا ہے۔ اس کو آیت کہتے ہیں۔ دائرہ پر اگر کوئی اور علامت نہ ہو تو رک جائیں ورنہ علامت کے مطابق عمل کریں۔

۵ یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس موقع پر غیر کوفین کے نزدیک آیت ہے۔ وقف کریں تو اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اس کا حکم بھی وہی ہے جو دائرہ کا ہے۔

م یہ علامت وقف لازم کی ہے۔ اس پر ضرور ٹھہرنا چاہیے۔ اگر نہ ٹھہرا جائے تو احتمال ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جائے۔ اس کی مثال اردو میں یوں سمجھنی چاہیے کہ مثلاً کسی کو یہ کہنا ہو کہ ”اٹھو۔ مت بیٹھو“ جس میں اٹھنے کا امر اور بیٹھنے کی نہی ہے۔ تو اٹھو پر ٹھہرنا لازم ہے، اگر ٹھہرا نہ جائے تو ”اٹھو مت۔ بیٹھو“ ہو جائے گا۔ جس میں اٹھنے کی نہی اور بیٹھنے کے امر کا احتمال ہے۔ اور یہ قائل کے مطلب کے خلاف ہو جائے گا۔

ط وقف مطلق کی علامت ہے۔ اس پر ٹھہرنا چاہیے۔ یہ علامت وہاں ہوتی ہے جہاں مطلب تمام نہیں ہوتا اور بات کسنے والا ابھی کچھ اور کہنا چاہتا ہے۔

ج وقف جائز کی علامت ہے۔ یہاں ٹھہرنا بہتر اور نہ ٹھہرنا جائز ہے۔

ز علامت وقف مجوز کی ہے۔ یہاں نہ ٹھہرنا بہتر ہے۔
ص علامت وقف مرض کی ہے۔ یہاں ملا کر پڑنا چاہیے لیکن اگر کوئی تھک کر ٹھہر جائے
تو رخصت ہے۔ معلوم رہے کہ (ص) پر ملا کر پڑھنا (ز) کی نسبت زیادہ ترجیح رکھتا ہے۔
صلے الوصل اولیٰ کا اختصار ہے۔ یہاں ملا کر پڑھنا بہتر ہے۔
ق قبیل علیہ الوقف کا خلاصہ ہے۔ یہاں ٹھہرنا نہیں چاہیے۔
صل قد یوصل کا مخفف ہے۔ یہاں ٹھہرا بھی جاتا ہے اور کبھی نہیں۔ بوقت ضرورت وقف
کر سکتے ہیں۔

قف یہ لفظ قف ہے۔ جس کے معنی ہیں ٹھہر جاؤ۔ اور یہ علامت وہاں استعمال کی جاتی ہے
جہاں پڑھنے والے کے ملا کر پڑھنے کا احتمال ہو۔

سکتہ سکتہ کی علامت ہے۔ یہاں کسی قدر ٹھہر جانا چاہیے مگر سانس نہ ٹوٹنے پائے۔
وقفہ لمبے سکتہ کی علامت ہے۔ یہاں سکتہ کی نسبت زیادہ ٹھہرنا چاہیے لیکن سانس نہ
توڑیں۔ سکتہ اور وقفہ میں یہ فرق ہے کہ سکتہ میں کم ٹھہرنا ہوتا ہے، وقفہ میں زیادہ۔
لا کے معنی نہیں کے ہیں۔ یہ علامت کہیں آیت کے اوپر استعمال کی جاتی ہے اور
کہیں عبارت کے اندر۔ عبارت کے اندر ہو تو ہرگز نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ آیت کے
اوپر ہو تو اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک ٹھہر جانا چاہیے بعض کے نزدیک نہیں ٹھہرنا
چاہیے لیکن ٹھہرا جائے یا نہ ٹھہرا جائے اس سے مطلب میں خلل واقع نہیں ہوتا۔

ك كذلك کا مخفف ہے، اس سے مراد ہے کہ جو رمزاں سے پہلی آیت میں آچکی ہے،
اُس کا حکم اس پر بھی ہے۔

∴ یہ تین نقاط والے دو وقف قریب قریب آتے ہیں۔ ان کو معانقہ کہتے ہیں۔ کبھی اس
کو مختصر کر کے (مع) لکھ دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں وقف گویا معانقہ کر
رہے ہیں۔ ان کا حکم یہ ہے کہ ان میں سے ایک پر ٹھہرنا چاہیے دوسرے پر نہیں۔ ہاں
وقف کرنے میں رموز کی قوت اور ضعف کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

قرآن مجید کی سورتوں کی فہرست

شمار پارہ	صفحہ نمبر	نام سورت	نمبر شمار
۱	۱	سورة الفاتحة	۱
۳ - ۲ - ۱	۷	سورة البقرة	۲
۴ - ۳	۱۲۹	سورة آل عمران	۳
۶ - ۵ - ۴	۲۰۱	سورة النساء	۴
۷ - ۶	۲۸۱	سورة المائدة	۵
۸ - ۷	۳۴۰	سورة الأنعام	۶
۹ - ۸	۴۰۶	سورة الأعراف	۷
۱۰ - ۹	۴۷۷	سورة الأنفال	۸
۱۱ - ۱۰	۵۰۴	سورة التوبة	۹
۱۱	۵۵۹	سورة يونس	۱۰
۱۲ - ۱۱	۵۹۷	سورة هود	۱۱
۱۳ - ۱۲	۶۳۷	سورة يوسف	۱۲
۱۳	۶۷۶	سورة الرعد	۱۳
۱۳	۶۹۴	سورة إبراهيم	۱۴
۱۳ - ۱۳	۷۱۰	سورة الحجر	۱۵
۱۴	۷۲۶	سورة النحل	۱۶
۱۵	۷۶۵	سورة بني إسرائيل	۱۷
۱۶ - ۱۵	۷۹۸	سورة الكهف	۱۸
۱۶	۸۳۲	سورة مريم	۱۹
۱۶	۸۵۳	سورة طه	۲۰
۱۷	۸۸۳	سورة الأنبياء	۲۱
۱۷	۹۱۰	سورة الحج	۲۲
۱۸	۹۳۹	سورة المؤمنون	۲۳
۱۸	۹۶۲	سورة النور	۲۴
۱۹ - ۱۸	۹۹۳	سورة الفرقان	۲۵
۱۹	۱۰۱۳	سورة الشعراء	۲۶
۲۰ - ۱۹	۱۰۴۳	سورة النمل	۲۷

شماره پاره	صفحه نمبر	نام سورت	نمبر شمار
۲۰	۱۰۶۸	سورة القصص	۲۸
۲۱ - ۲۰	۱۰۹۹	سورة العنكبوت	۲۹
۲۱	۱۱۲۳	سورة الروم	۳۰
۲۱	۱۱۳۲	سورة لقمان	۳۱
۲۱	۱۱۵۵	سورة السجدة	۳۲
۲۲ - ۲۱	۱۱۶۳	سورة الأحزاب	۳۳
۲۲	۱۱۹۷	سورة سبأ	۳۴
۲۲	۱۲۱۶	سورة فاطر	۳۵
۲۳ - ۲۲	۱۲۳۲	سورة یس	۳۶
۲۳	۱۲۴۹	سورة الصافات	۳۷
۲۳	۱۲۷۲	سورة ص	۳۸
۲۴ - ۲۳	۱۲۹۰	سورة الزمر	۳۹
۲۴	۱۳۱۴	سورة المؤمن	۴۰
۲۵ - ۲۴	۱۳۴۱	سورة حم السجدة	۴۱
۲۵	۱۳۶۰	سورة الشوری	۴۲
۲۵	۱۳۷۷	سورة الزخرف	۴۳
۲۵	۱۳۹۶	سورة الدخان	۴۴
۲۵	۱۴۰۵	سورة الجاثية	۴۵
۲۶	۱۴۱۵	سورة الأحقاف	۴۶
۲۶	۱۴۲۸	سورة محمد	۴۷
۲۶	۱۴۴۱	سورة الفتح	۴۸
۲۶	۱۴۵۵	سورة الحجرات	۴۹
۲۶	۱۴۶۳	سورة ق	۵۰
۲۷ - ۲۶	۱۴۷۲	سورة الذاریات	۵۱
۲۷	۱۴۸۲	سورة الطور	۵۲
۲۷	۱۴۹۱	سورة النجم	۵۳
۲۷	۱۵۰۰	سورة القمر	۵۴
۲۷	۱۵۱۰	سورة الرحمن	۵۵
۲۷	۱۵۲۰	سورة الواقعة	۵۶

شماره پاره	صفحه نمبر	نام سورت	نمبر شمار
۲۷	۱۵۳۱	سورة الحديد	۵۷
۲۸	۱۵۳۳	سورة المجادلة	۵۸
۲۸	۱۵۵۳	سورة الحشر	۵۹
۲۸	۱۵۶۳	سورة الممتحنة	۶۰
۲۸	۱۵۷۱	سورة الصف	۶۱
۲۸	۱۵۷۶	سورة الجمعة	۶۲
۲۸	۱۵۸۰	سورة المنافقون	۶۳
۲۸	۱۵۸۴	سورة التغابن	۶۴
۲۸	۱۵۹۰	سورة الطلاق	۶۵
۲۸	۱۵۹۷	سورة التحريم	۶۶
۲۹	۱۶۰۳	سورة الملك	۶۷
۲۹	۱۶۱۰	سورة القلم	۶۸
۲۹	۱۶۱۹	سورة الحاقة	۶۹
۲۹	۱۶۲۵	سورة المعارج	۷۰
۲۹	۱۶۳۱	سورة نوح	۷۱
۲۹	۱۶۳۷	سورة الجن	۷۲
۲۹	۱۶۴۴	سورة المزمل	۷۳
۲۹	۱۶۴۹	سورة المدثر	۷۴
۲۹	۱۶۵۶	سورة القيامة	۷۵
۲۹	۱۶۶۱	سورة الدهر	۷۶
۲۹	۱۶۶۷	سورة المرسلات	۷۷
۳۰	۱۶۷۳	سورة النبأ	۷۸
۳۰	۱۶۷۸	سورة النازعات	۷۹
۳۰	۱۶۸۴	سورة عبس	۸۰
۳۰	۱۶۸۸	سورة التكويد	۸۱
۳۰	۱۶۹۲	سورة الانقطار	۸۲
۳۰	۱۶۹۵	سورة المطففين	۸۳
۳۰	۱۶۹۹	سورة الانشقاق	۸۴
۳۰	۱۷۰۳	سورة البروج	۸۵

شماره پاره	صفحه نمبر	نام سورت	نمبر شمار
۳۰	۱۷۰۶	سورة الطارق	۸۶
۳۰	۱۷۰۹	سورة الأعلى	۸۷
۳۰	۱۷۱۱	سورة الغاشية	۸۸
۳۰	۱۷۱۴	سورة الفجر	۸۹
۳۰	۱۷۱۸	سورة البلد	۹۰
۳۰	۱۷۲۱	سورة الشمس	۹۱
۳۰	۱۷۲۳	سورة الليل	۹۲
۳۰	۱۷۲۶	سورة الضحی	۹۳
۳۰	۱۷۲۷	سورة الشرح	۹۴
۳۰	۱۷۲۹	سورة التين	۹۵
۳۰	۱۷۳۰	سورة العلق	۹۶
۳۰	۱۷۳۳	سورة القدر	۹۷
۳۰	۱۷۳۴	سورة البينة	۹۸
۳۰	۱۷۳۷	سورة الزلزال	۹۹
۳۰	۱۷۳۸	سورة العاديات	۱۰۰
۳۰	۱۷۴۰	سورة القارعة	۱۰۱
۳۰	۱۷۴۲	سورة التكاثر	۱۰۲
۳۰	۱۷۴۳	سورة العصر	۱۰۳
۳۰	۱۷۴۴	سورة الهمزة	۱۰۴
۳۰	۱۷۴۵	سورة الفيل	۱۰۵
۳۰	۱۷۴۶	سورة قريش	۱۰۶
۳۰	۱۷۴۷	سورة الماعون	۱۰۷
۳۰	۱۷۴۸	سورة الكوثر	۱۰۸
۳۰	۱۷۵۰	سورة الكافرون	۱۰۹
۳۰	۱۷۵۱	سورة النصر	۱۱۰
۳۰	۱۷۵۲	سورة تبت	۱۱۱
۳۰	۱۷۵۳	سورة الإخلاص	۱۱۲
۳۰	۱۷۵۴	سورة الفلق	۱۱۳
۳۰	۱۷۵۶	سورة الناس	۱۱۴

لَنْ وَذَرَاةَ الشُّؤْمَانِ الْإِسْلَامِيَّةَ وَالْأَوْقَافَ وَالِدَعْوَةَ وَالْإِنشَاءَ

في المملكة العربية السعودية

المشرفة على مجمع الملك فهد

لطباعة المصحف الشريف في المدينة المنورة

إذيسرها أن يصدر المجمع هذه الطبعة من القرآن الكريم

وترجمة معانية إلى اللغة الأردية

تسأل الله أن ينفع به الناس

وأن يحجزني

خالد بن الحزمين الشريفين الملك فهد بن عبدالعزيز آل سعود

أحسن الجزاء على جهوده العظيمة في نشر كتاب الله الكريم

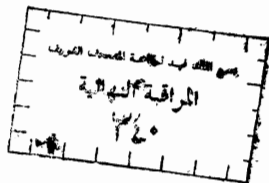
والله ولي التوفيق

وزارت اسلامی امور، اوقاف، دعوت و ارشاد

مملکت سعودی عرب

نگران ”شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس مدینہ منورہ“
کے لیے باعث مسرت ہے کہ کمپلیکس یہ قرآن کریم
مع اردو ترجمہ و تفسیر شائع کرے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں میں اس کا نفع عام کرے
اور خادم حرمین شریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز آل سعود
کو اشاعت قرآن کریم کے سلسلہ میں عظیم
کوششوں پر جزاء عطا فرمائے۔
اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔



حُفُو وَالطَّبَعِ حَفُوَطَةٌ

لِجَمِيعِ الْمَلَائِكَةِ هَذَا طَائِفَةِ الْمُصْحَفِ الشَّرِيفِ

ص.ب ٦٢٦٢ - المدينة المنورة



حقوق طبع بحق ناشر محفوظ ہیں
شاہ فہد قرآن شریف پرنٹنگ کمپنیز
پوسٹ بکس نمبر ۶۲۱۲ مدینہ منورہ

ح) مجمع الملك فهد لطباعة المصحف الشريف ، ١٤١٧هـ

فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر

القرآن الكريم وترجمة معانيه إلى اللغة الأردنية / ترجمة مجمع

الملك فهد لطباعة المصحف الشريف - المدينة المنورة .

١٧٧٦ ص ، ٢١ × ١٤ سم

ردمك ١-١٤-٧٧٠-٩٩٦٠

١- القرآن - ترجمة - اللغة الأردنية ٢- القرآن - تفسير

أ- مجمع الملك فهد لطباعة المصحف الشريف (مترجم)

١٧/١٠٥٦

ديوي ٢٢١،٤٩١٤٣٩

رقم الإيداع : ١٧/١٠٥٦

ردمك : ١-١٤-٧٧٠-٩٩٦٠



قرآن کریم
مع اردو ترجمہ
دفعہ